إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

جلد اول

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور • کراچی • پاکستان

إنّ هذا العلم دين فانظروا عمّن تأخذون دينكم (صحیح مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد اوّل

تصحیح و نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن

پروفیسر مفتی مُنیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد اول)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
تصحیح	مولانا حافظ محمد ابراہیم فیضی
	مولانا فیصل ندیم احمد قادری (ایم اے، ایل ایل بی، بی ایڈ)
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
طبع	ششم، مارچ 2011ء
	ہفتم، اپریل 2012ء
	ہشتم، جنوری 2013ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ4
قیمت	-/400 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 32630411-021-32212011۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

ختم نبوت ﷺ زندہ باد **عظمت صحابہ زندہ باد**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- ❖ گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- ❖ گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- ❖ کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ❖ ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- ❖ اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- ❖ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- ❖ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- ❖ عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- ❖ **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- ❖ اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد **پاکستان پائندہ باد**

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

انتساب

میں اپنی اس ناچیز علمی وفقہی کاوش کو اپنے والد ماجد قاضی حبیب الرحمٰن نور اللہ مرقدہٗ اور والدہ کریمہ مداللہ ظلہا العالی کے نام منسوب و معنون کرتا ہوں، جنہوں نے پسماندگی اور ظلمت کے ماحول میں مجھے نورِ علم سے آشنا کیا اور ذوقِ آگہی عطا کیا، لڑکپن کی ناتجربہ کاری کے باعث میرے قدم جب بھی علم وعرفان کے جادۂ مستقیم سے ڈگمگانے لگے تو ان کی دعاؤں اور تربیت نے ثابت قدم رکھا۔

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ (بنی اسرائیل)

ناکارۂ خلائق

منیب الرحمٰن

محمد اقبال نعیمی

ریسرچ اینڈ رجسٹریشن آفیسر محکمہ اوقاف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

میں نے ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور سے شائع کردہ کتاب "تفہیم المسائل (حصہ اول)" تالیف پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے پروف پوری توجہ سے پڑھے ہیں میرے علم کے مطابق اس کتاب میں درج آیات قرآنی کے الفاظ اور اعراب غلطیوں سے مبرا ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

فقط

حافظ محمد ابراہیم فیضی

فہرست مضامین

انتساب	
مافی الضمیر	
کلمات تشکر	
تبرکات اکابر	
کتاب العقائد	
اللہ میاں، اللہ سائیں کہنا	29
عذاب قبر	31
کلمہ طیبہ کا ذکر قرآن میں	32
آثار قیامت	32
قیامت کا دن	34
دجال کی حقیقت	34
جنت کے کھانے کیسے ہوں گے؟	36
برزخ سے کیا مراد ہے؟	37
ارشاد احمد حقانی سے مکالمہ لفظ ''مولانا'' کا اطلاق	39
اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی	44
دولت مندوں کی جنت سے دوری	45
مفلس کون	45
کتاب الطہارت	47
غسل کے بعد وضو	49

نیل پالش اور وضو	49
کیا جھوٹ بولنے سے وضو ٹوٹتا ہے	50
دوران نماز وضو کا ٹوٹنا	50
وضو کی جگہ پر جوتے دھونا	50
ہاتھ پاک کرنا	51
آنسو بہنے سے وضو پر اثر	51
حائض اور جنب کے لئے قرآن کی تلاوت اور چھونے کا حکم	52
معلمات اور طالبات کا ایام کے دوران تعلیم قرآن	52
پان یا نسوار منہ میں رکھ کر سلام کا جواب دینا	52
ڈرائی کلین کیے ہوئے کپڑوں کی طہارت کا مسئلہ	53
بغل اور زیر ناف بالوں کے ازالے کے لئے کون سا طریقہ بہتر ہے؟	54
کتاب الصلوٰۃ	55
باب الاذان، دعا بعد الاذان و دعا کے کلمات	57
تثویب کیا ہے؟	65
بیت الخلاء میں اذان کا جواب	65
خطبے کے دوران کلام و نشست کے آداب	66
نماز کی نیت میں تاخیر	66
رکوع اور سجود میں کتنی دیر ٹھہرے	67
تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا	67
نمازی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے؟	68
نابالغ بچے کی امامت	69

سورۃ الکوثر کی صرف دو آیتیں پڑھنا	69
قرآن مجید کی سورتوں کا ترتیب سے پڑھنا	85
نماز میں قرأت کا مسئلہ	86
قرأت میں تلفظ کا مسئلہ	86
التحیات نماز میں ہے، قرآن میں نہیں	86
وتر میں دعائے قنوت کی جگہ ''قل ھواللہ'' پڑھنا	87
مسجد میں دوبارہ جماعت کرانا	87
عورت، مرد کی نماز	88
سترہ کے مسئلے پر ایک علمی بحث	89
نمازی کے آگے کا فاصلہ	118
نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا	119
فوجی ٹوپی اور ہیٹ پہن کر نماز پڑھنا	119
نماز میں ٹوپی پہننے کا حکم	120
سلام کے الفاظ	121
قضا نمازوں کا حکم	122
بہت سی قضا نمازوں کو تخفیف کے ساتھ پڑھنے کا مسئلہ	122
قضا نمازیں ادا کرنا	124
قضائے عمری سے کیا مراد ہے؟	125
قضا میں سنتوں کا چھوڑنا	129
قضائے عمری پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے؟	129
فجر اور عصر سے پہلے نفل، قضائے عمری، وتر کی قضا	129

129	سفر کی قضا میں سنتوں کی قضا
129	فجر اور عصر سے پہلے قضائے عمری
130	ظہر یا جمعہ کی ابتدائی چار سنتیں رہ جائیں تو کب پڑھیں؟
131	کیا عبادت میں نیابت جائز ہے؟
132	کیا بخار کی حالت میں نماز قضا کی جاسکتی ہے؟
133	نماز میں صاحب ترتیب کون ہے؟
133	صاحب ترتیب پہلے قضا پڑھے
133	نمازی کے آگے جوتے رکھنا☆فجر کی سنتوں کی قضا
134	جماعت کھڑی ہو چکی اور فجر کی سنتیں
134	اوقات مکروہہ
135	رمضان میں فرض جماعت سے نہ پڑھے، وتر جماعت سے پڑھے یا نہیں؟
136	نماز میں بلاضرورت امام کو لقمہ دینا اور امام کا لقمہ لینا
139	الٹی شلوار اور قمیص پہن کر نماز پڑھنا
139	لباس کو ٹخنوں تک لٹکانے کا شرعی حکم
143	رکوع میں بھول کر سجدہ کی تسبیح پڑھنا
143	تکبیر بھول جائے تو؟
144	نماز میں بھول، سجدۂ سہو
144	نماز وتر میں دعائے قنوت بھول کر رکوع میں چلا گیا تو کیا کرے؟
145	کیا سجدۂ سہو کی ضرورت ہے؟
145	عیدین میں سجدۂ سہو
146	سجدۂ تلاوت کا طریقہ

فجر اور عصر کے بعد سجدۂ تلاوت کا حکم	146
عورت کا باپردہ مسجد میں جا کر مسئلہ پوچھنا اور سجدۂ تلاوت	147
کیسٹس پر تلاوت سننا اور سجدۂ تلاوت	148
سجدۂ شکر کی شرعی حیثیت	148
ترجمہ قرآن پڑھنے سے تلاوت کا ثواب	149
نماز کی قصر	150
مسافت قصر، آغاز قصر	151
قصر کب تک پڑھے؟	151
مسلسل تین جمعوں کے چھوڑنے کا حکم	152
فیکٹری، کارخانے میں نماز جمعہ	152
کیا نماز جمعہ کی قضا ہے؟	153
کیا شوہر اپنی بیوی کی میت کو غسل دے سکتا ہے؟	154
ایک سے زائد میتوں کی نماز جنازہ ایک ساتھ پڑھنے کا حکم	155
نماز جنازہ کی تکرار	156
میت کا سوگ	156
کیا میت کی آنکھ سے لینس نکالنے ضروری ہیں؟	157
نماز جنازہ میں تکبیر کا چھوٹنا	158
دفن کے بعد میت کو دوسری جگہ منتقل کرنا	158
امانتاً میت کو قبر میں دفن کرنا	159
میت کے اہل خانہ کے لئے کھانا بھیجنا	159
میت کے گھر ضیافت کا اہتمام	160

ایصال ثواب کی حقیقت	161
میت کے ترکے سے ایصال ثواب کے لئے صدقہ کرنا	161
سوئم، دسواں اور چالیسواں	163
مفاد عامہ کے لئے مختص اور ہر قسم کی تعمیرات کے لئے ممنوع جگہ پر مسجد بنانا	164
ایک مسجد کی رقم یا مال دوسری مسجد پر خرچ کرنا	168
مسجد کی تعمیر میں غیر مسلم کا چندہ لگانا	169
مساجد و مدارس میں تعلیم القرآن کے لئے زکوٰۃ و فطرے کا استعمال	170
مسجد کے فنڈ سے مچڑاغاں	171
مسجد میں محراب نہیں ہے	172
مسجد میں گیس لیمپ اور ڈیٹول سے غسل	172
مصلے کو موڑنا	173
مسجد میں سلام کا جواب دینا	173
غیر مسلموں کا مسجد بنانا	174
استخارہ کیا ہے؟	176
استخارہ سے فیصلہ	177
مسجد میں سوال کرنے اور سائل کو دینے کا شرعی حکم	178
مسجد کے فنڈ سے امام مسجد کے بیٹے کو وظیفہ دینا	183
کتاب الصوم	185
کیا روزے کی زبانی نیت ضروری ہے؟	187
روزہ اور غسل واجب	188
سائرن، ٹی وی، اذان سے سحری کا اختتام	188

شوال المکرم کے چھ روزے	188
روزے میں جھوٹ، چغلی اور غیبت کا حکم	189
روزے کی حالت میں خون دینا، آنکھ کان میں دوا ڈالنا وغیرہ	190
روزے میں خواتین کا میک اپ کرنا	190
روزے میں مسواک کا حکم	191
روزے میں خون دینا	191
روزے میں وکس لگانے کا حکم	191
رزوے میں آنکھ، ناک، کان میں دوا کا استعمال	192
مفسدات صوم وجدید مسائل	192
بچے کی ولادت کے کتنے دن بعد روزہ رکھا جائے	193
قضا روزے	197
ایام مخصوص میں چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا اور نماز کی معافی	198
تین روزہ، پانچ روزہ یا دس روزہ تراویح	199
رمضان المبارک کی عشرۂ اخیرہ میں شبینوں کا اہتمام	201
عورتوں کا اجتماعی اعتکاف	201
مسجد الحرام میں اعتکاف کے مسائل	202
رویت ہلال، چاند کے چھوٹا بڑا ہونے کا مسئلہ	203
یوم شک کا روزہ	204
کیا مسلسل تیس دن کے کئی قمری مہینے ہو سکتے ہیں؟	204
عید کے دو مہینے ناقص نہ ہونے کا مطلب	205
پاکستان میں رمضان شروع کر کے سعودی عرب میں عید منانا	206

عیدی دینا	207
کیا جمعہ کے دن نفلی روزہ رکھنا مکروہ ہے؟	208
کتاب الزکوٰۃ	211
سونے چاندی پر زکوٰۃ	213
زیورات کی ملکیت، زکوٰۃ	214
زکوٰۃ فنڈ سے قرض حسنہ دینا	215
زکوٰۃ فنڈ کی سودی اسکیموں میں انویسٹمنٹ	215
بینک اور زکوٰۃ کی کٹوتی	216
پیشہ ور بھکاریوں کا مسئلہ	217
بری اور جہیز کے سامان اور زیورات کی ملکیت کا مسئلہ	218
کتاب الحج	221
حج فرض ادا نہ کیا تو کیا حکم ہے؟	223
غیر شادی شدہ بالغ بیٹی گھر پر بیٹھی ہو اور حج پر جانا	223
عورت، احرام اور ایام	224
عورتوں کا بغیر محرم کے سفر حج	224
دوران حج عورتوں کو ایام مخصوصہ شروع ہو جانا	225
دوران حج ایام مخصوصہ	226
عمرہ، حج میں مانع حیض دوائیوں کا استعمال	227
حج بدل کے لئے کسے بھیجا جائے	228
حج بدل کا شرعی حکم	228
حج بدل کی وصیت پوری کرنا	229

مرحومین کا حج بدل	229
"قربانی" قربانی کا وجوب	230
خصی جانور کی قربانی	231
عقیقے کا گوشت	231
دوران حج شوہر کا انتقال ہو جائے تو عورت کیا کرے؟	231
قربانی کے فضائل ومسائل	232
ذبح کا طریقہ	236
کتاب النکاح	239
خفیہ نکاح کا شرعی حکم	241
ٹیلیفون پر نکاح	242
سول میرج کی شرعی حیثیت	243
محرم وصفر میں نکاح	243
مایوں اور مہندی کی شرعی حیثیت	244
قرآن میں نکاح کا لکھنا	244
قادیانی مرد سے مسلمان عورت کا نکاح	244
تجدید ایمان اور تجدید نکاح	245
نامناسب حرکت	246
مہر کی شرعی مقدار	246
حضور ﷺ اور حضرت خدیجہ کا خطبۂ نکاح	247
کتاب الطلاق	249
طلاق کا احسن طریقہ	251

طلاق لینے کا طریقہ	252
تحریری طلاق	252
طلاق مغلظہ کے باوجود بیوی کا شوہر کے ساتھ رہنا اور اولاد کے نسب کا مسئلہ	253
حاملہ کو طلاق دینا	255
طلاق کا حق بیوی کو دینا	256
طلاق بائن کا ایک دقیق فقہی مسئلہ	257
موضوع بحث، پس منظر، الاستفتاء	257
جواب	258
متابعۃ الجواب	264
رد ''متابعۃ الجواب''	271
مسلمہ اصول کی خلاف ورزی	271
استفتاء میں لفظی و معنوی تحریف	271
علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کا اپنے سابق جواب پر استقرار سے گریز	273
اصل فتویٰ کی ''بناء استدلال'' کا ذکر...........	273
علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کا نظریہ	274
علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کی تازہ بنائے استدلال	274
البحرالرائق کی اصل عبارت اور اس کا صحیح مفہوم	274
جدالممتاز کی عبارت سے استدلال	276
پس نوشت	281
تصدیقات و تائیدات علماء کرام	302
دو طلاق کے بعد رجوع	307

بہن سے قطع تعلق کی قسم کھانا	307
مشروط طلاق دینا، دارالعلوم کراچی کے فتویٰ کا رد	309
دوطلاق کے بعد نکاح پھر تیسری طلاق	313
دوران عدت گھر سے باہر نکلنا	313
بدزبان بیوی	315
نکمے مفت خور شوہر سے نجات	315
ماں کے نام سے نسبت	316
لے پالک	316
لے پالک کا نسب	317
"میراث" ترکے کی تقسیم	319
"عاق" کی شرعی حیثیت	320
لاوارث بچی کی ولدیت کا مسئلہ	321
کتاب البیوع	325
سونے کے کاروبار میں شراکت	327
اسلام میں نیلام عام	327
نیلام کا جواز	328
ہنڈی کی بیع	329
گنے کا پیشگی سودا	329
ٹھیکے کے حصول اور بل کی وصولی کے لئے رشوت کا لین دین	330
لائسنسوں کی فروخت	332
فلیٹ، دکان کی پگڑی	333

منافع کی شرح	333
انعامی بانڈز پر انعام	334
کروڑ پتی، مالا مال اسکیم اور پرائز بانڈ	335
انعامی بانڈز کی پرچیوں کا کاروبار	336
انعامی بانڈز پر انعام کے جواز کا مسئلہ	337
کاروباری اداروں کی انعامی اسکیمیں	337
قومی بچت اسکیمیں، سود یا منافع	338
بینک کی ملازمت	338
کتاب الیمین	341
قسم کی قسمیں	343
کافر ملت پر معلق کر کے قسم کھانا	343
قسم کی شدت	345
مشروط قسم	345
اللہ تعالیٰ سے وعدہ	345
قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے	346
قسم توڑنا	347
جھوٹی قسم	348
وعدہ کے وقت ان شاء اللہ کہنا	348
وعدہ معاف گواہ کا حکم	349
اسماء	351
نام رکھنے کا طریقہ	352

نام تبدیل کرنا	353
عبدالنبی نام	354
''پرویز'' اور ''قیصر'' نام رکھنا	356
سیرت	357
تاریخ ویوم ولادت سید المرسلین ﷺ	358
نبی کریم ﷺ کے نام کے ساتھ (ؐ) لکھنے پر اکتفا کرنا	358
حضرت خضر علیہ السلام کون ہیں؟	359
عورتوں کے متفرق مسائل	365
بیٹی کی پیدائش اظہار رنج وغم	367
شادی شدہ عورت اور چوڑیاں	368
عورتوں کی محفل میلاد	368
عورتوں کا قبرستان جانا	368
عورتوں کا آپس میں مصافحہ ومعانقہ	369
عدت کے دوران ٹی وی دیکھنا	369
خواتین کی تزئین جائز، ناجائز	370
شوہر کو بتائے بغیر خرچ کرنا	370
شوہر کو مذاقاً پاگل بدتمیز کہنا	372
بہو کے ساتھ ناروا سلوک	372
ضبط تولید کا مسئلہ	374
حلال و حرام جائز و ناجائز	377
وظیفے کی تعریف	379

بدشگونی کا شرعی حکم	379
تیرہ تیزی کیا ہے؟	381
آخری بدھ	382
یوم عاشورا اور کاروبار	382
نظر بد سے بچنے کے لئے مکان پر سینگ، کالا کپڑا لٹکانا یا کالا دھاگا باندھنا	383
نظر لگنے کا حکم	385
ستاروں کی تاثیر	385
سورج گرہن اور ستاروں کی تاثیر کے بابت اسلام کا نظریہ	387
صلوٰۃ کسوف	391
ستاروں کی تاثیر	392
اوجھڑی حلال یا حرام	394
پولٹری فارم کی مرغیوں کی خوراک	395
مرد کے لئے زیور پہننا	396
اعتراف جرم	396
بالوں میں خصاب لگانا یا رنگنا	397
خودکشی حرام کیوں؟	398
چوری شدہ مال	400
حلال کمائی اور دوسرے لوگ	401
تعویذ کی شرعی حیثیت	401
رات کے وقت ناخن کاٹنا	403
''اذان'' کے نام سے فلم بنانا	403

آنکھوں کی گناہ سے حفاظت	404
دوسروں کی چیزیں استعمال کرنا	405
انسان کا گھر میں اور باہر الگ الگ رویہ	405
دوسرے لوگوں کو تکلیف دینا	406
بزرگان دین کے مزارات پر عقیدت	406
میت کے لئے ایصال ثواب کا اہتمام	407
میت کو دوسری جگہ دفن کرنا	407
قرآن مجید سفر میں کیسے لے جائیں	408
کیا سینے میں دو دل ہو سکتے ہیں؟	409
شیخ محمد یوسف لدھیانوی سے کچھ مسائل میں اختلاف	412
والدین کی نصیحت	413
کارخانوں اور دفاتر میں نماز جمعہ	414
ٹی وی، ویڈیو کا مسئلہ	417
اختلاف امت اور صراط مستقیم	419
شبیہ بیت اللہ کا طواف	420
قبروں پر منتیں اور چڑھاوے	420
ترجمہ میں علمی خیانت	422
صفات باری تعالیٰ کا مظہر بننے کا مفہوم	425

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد للّٰہ رب العالمین، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَحْمَۃٍ لِّلْعَالَمِیْنَ، سیدنا و مولٰنا محمد و علٰی اله الطیبین الطاهرین وعلی صاحبته الصدیقین الکاملین، وعلی اولیآء امته وعلماء ملته من الفقهآء المجتهدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

مافی الضمیر

''تفہیم المسائل'' کے عنوان سے میں نے مارچ 1999ء میں روزنامہ ''ایکسپریس'' کراچی کے جمعہ ایڈیشن میں ہفتہ وار کالم شروع کیا تھا جو قارئین کے ارسال کردہ دینی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ الحمدللہ علیٰ احسانہٖ یہ کالم کافی مقبول ہوا۔ قارئین نے نہایت دلچسپی کے ساتھ اس میں حصہ لیا اور دیگر علمی حلقوں نے بھی پذیرائی اور حوصلہ افزائی سے نوازا۔ اب یہ دسمبر 2000ء تک شائع شدہ سوالات و جوابات پر مشتمل دینی و علمی مواد ''تفہیم المسائل'' ہی کے نام سے کتابی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ جلد اول ہے اور انشاء اللہ العزیز آئندہ مجلدات وقفے وقفے سے آتی رہیں گی۔

میں نے دیگر معاصر اخبارات کے اس نوع کے کالموں کی طرح نہ تو بالکل اختصار سے کام لیا ہے کہ محض ''ہاں ہاں'' یا ''نہ'' اور ''جائز'' یا ''ناجائز'' کی حد تک جواب دے دیا جائے اور نہ ہی دلائل کا انبار لگایا ہے کہ کتاب طویل ہو جائے اور عام قاری کا ذہن اکتا جائے، بلکہ حتی الوسع توسط و اعتدال سے کام لیا ہے اور حسب ضرورت مختصر دلائل اور حوالہ جات بھی درج کر دیئے ہیں تاکہ دینی ذوق رکھنے والوں کی علمی ضیافت کا بھی اہتمام ہو جائے اور ان کی کماحقہ تسلی و تشفی بھی ہو سکے۔

اخبار میں مطبوعہ سوالات و جوابات کے علاوہ چند مدلل و جامع فقہی فتاویٰ بھی اس میں شامل ہیں، جو بعض معاصر اہل فتویٰ سے تحریری بحث و تمحیص کے نتیجے میں مرتب ہوئے، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ دارالعلوم نعیمیہ کے شیخ الحدیث اور شرح صحیح مسلم و ''تبیان القرآن'' کے مصنف علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم العالی کا وجود اور علمی خدمات دارالعلوم نعیمیہ، اہلسنت اور ملت اسلامیہ کے لئے سرمایہ افتخار ہیں، ان کی مشاورت، رہنمائی اور علمی سرپرستی اس کتاب کی تسوید و تبییض اور روزمرہ دینی امور میں ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے، ان کی صحت و درازیٔ عمر اور تصنیفی و تدریسی

فیوض و برکات کے تادیر جاری رہنے کے لئے میں انتہائی خلوص کے ساتھ بارگاہ الوہیت میں دست بدعاء ہوں۔

دارالعلوم نعیمیہ کے استاذ حدیث مولانا احمد سعیدی زید مجدہم سے بھی دینی وفقہی مسائل میں مشاورت کرتا رہتا ہوں، ان کا علمی تعاون بھی میرے شامل حال رہا ہے۔ بناء بریں ان کا شکر گزار ہوں۔

عزیز محترم مولانا نور نبی حلف الرشید علامہ مفتی عبدالرحیم شاہ پور چاکر سندھ نے تفہیم المسائل کے منتشر و غیر مرتب سوال و جواب کی با قاعدہ تبویب (Classification) کی ہے جو بلاشبہ بہت اہم کام ہے اور اس کے بغیر اس مواد کو کتابی شکل میں لانا میرے لئے دشوار ہوتا، میں ان کے اس مخلصانہ علمی تعاون پر ان کا شکر گزار ہوں اور ان کی علمی ترقی کے لئے دعا گوں ہوں۔

کتاب کی پروف ریڈنگ اور تصحیح کیلئے میں اس شعبے کے ماہر مولانا حافظ محمد ابراہیم فیضی صاحب کا از حد شکر گزار ہوں وہ چونکہ صاحب علم بھی ہیں اس لئے جو تحریر ان کی نظر سے گزر جائے اس میں لفظی و معنوی سقم کم رہتا ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہ انہیں ماجور فرمائے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ اگر دوران مطالعہ وہ میری کسی علمی فروگزاشت پر مطلع ہوں تو ازراہِ کرم ضرور مطلع فرمائیں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جاسکے۔ انشاء اللہ العزیز وقتاً فوقتاً تفہیم المسائل کی آئندہ مجلدات آپ کے سامنے آتی رہیں گی۔ میں انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ وہ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل اس سعی ناتمام کو اپنی بارگاہ عالیہ میں مقبول و ماجور فرمائے اور اسے اہل علم و ارباب فکر ونظر اور دین اسلام سے محبت رکھنے والوں کی نظر میں قبولِ دوام نصیب فرمائے۔

بندۂ عاجز

منیب الرحمٰن

مہتمم دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

چیئرمین

مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان

کلمات تشکر

الحمدللہ علیٰ احسانہ کہ اللہ جل شانہ کے بے پایاں فضل وکرم اور اس کے حبیب کریم ﷺ کے توسل سے ''تفہیم المسائل'' جلد اول کو ہمارے تصورات اور توقعات سے بدرجہا زائد کامیابی نصیب ہوئی، رب کریم نے اسے قبول عام عطا کیا، اہل علم اور ارباب فکر ونظر نے کلمات تحسین سے نوازا اور پہلا ایڈیشن تقریباً تین ہفتے میں ہی ختم ہوگیا اور طلب برقرار رہی۔ ہم اس انعام ربانی پر اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہیں اور ہمارا قلب جذباتِ تشکر سے معمور ہے، ہم اپنے تمام ہمدردوں اور کرم فرماؤں کے لئے بھی سراپا سپاس ہیں، کیونکہ ارشاد نبوی ہے: مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ۔

دوسرے ایڈیشن کی آمد میں تاخیر اس لئے ہوئی کہ ہم نے پوری کتاب پر نظر ثانی کی ہے، مکررات کو حذف (Delete) کر دیا ہے، موقع ومحل کی مناسبت سے بعض مقامات پر تشریح و اضافہ کیا ہے اور بعض جگہ معمولی ترمیم کی ہے۔ اس کے علاوہ لفظی ومعنوی تصحیح اور طباعت کے معیار کو حتی الامکان مزید بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ بعض احباب کی فرمائش پر عربی عبارات کے پر اعراب بھی لگا دیئے ہیں، حالانکہ کمپوزنگ میں یہ بہت مشکل کام ہے۔

مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کے ساتھ طلاق بائن کے مسئلے پر جو تحریری مباحثہ شامل اشاعت تھا، اسے اہل علم اور مدرسین حضرات اور ائمہ وخطباء کرام نے نہایت دلچسپی، توجہ اور انہماک سے پڑھا ہے۔ احباب کی فرمائش پر اب ہم نے اسے واقعاتی ترتیب کے مطابق از سر نو مرتب کیا ہے، ان کا اصل فتویٰ اور اس پر ہم نے جو ان کا تعاقب کیا، وہ اور ہمارے تعاقب پر ان کا ردعمل، جو ان کی طرف سے ''متابعت الجواب'' کے عنوان سے ہمیں موصول ہوا، من وعن انہی کے الفاظ مبارکہ میں نقل کر دیا ہے تاکہ ریکارڈ کا حصہ بن جائے۔ علمی دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان کا پورا موقف انہی کی تحریر میں قارئین کے سامنے آئے۔ اسی طرح اپنے موقف کی تائید میں ہم نے امام اہلسنت اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام احمد رضا خان رضی اللہ عنہ کے متعلقہ فتاویٰ بھی لفظ بہ لفظ نقل

کر دیے ہیں۔امید ہے اب یہ مسئلہ اظہر من الشمس ہو کر سامنے آئے گا۔علمی وقار اور شخصی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک وقیع علمی بحث مزید دلچسپی کا باعث بنے گی۔

ہم نے اپنے جملہ معاونین بالخصوص جناب نجیب الدین شیخ صاحب اور محترم اظہر احمد صاحب کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں اور انتہائی خلوص اور عجز و نیاز کے ساتھ اللہ رحیم و کریم کی بارگاہ میں ان کے حق میں بے پایاں اجر و ثواب اور خیر و برکت کے لئے دعا گو ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ جلد ثانی بھی جلد طبع ہو کر منظر عام پر آئے۔ہم نے اللہ کی توفیق و عنایت سے کام شروع کر دیا ہے۔اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ۔

سراپا تشکر و امتنان

منیب الرحمٰن

تبرکاتِ اکابر

شیخ الحدیث علامہ مفتی عبد القیوم ہزاروی مدظلہم العالی

صدر تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان

ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

چیئرمین سنی سپریم کونسل جماعت اہلسنّت پاکستان

JAMIA NIZAMIA RIZVIA — الجامعة النظامية الرضوية

YOUR REF: ______
OUR REF: ______
DATE: ______

۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
۲۴ جولائی ۲۰۰۱ء

عزیزم محترم مولانا قاضی منیب الرحمٰن صاحب، زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج شریف، خیریت مطلوب،

آپ کی حسین وجمیل تالیف، "تفہیم المسائل" موصول ہوئی، شکریہ

ماشاء اللہ ظاہری اور باطنی حسن سے مرصع ہے۔ تقریر وتحریر میں آپکا انداز بیان خوب ہے، معاشرہ کی ضرورت کو سہل انداز میں بیان کیا گیا ہے، امید ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

کیونکہ بہت سے معاشرتی معاملات ومسائل باقی ہیں جن کی عوام کو ضرورت ہے۔ اس لئے تفہیم المسائل کی دوسری جلد پیش نظر رہنی چاہئے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکے علم وعمل اور تقریر وتحریر اور خدمت دین میں مزید خلوص وبرکت فرمائے، آمین۔

[signature]

(مفتی) محمد عبد القیوم ہزاروی

جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور/شیخوپورہ

G.P.O Box No. 1016, Inside Lahori Gate, Lahore-54000, PAKISTAN.
New Educational Complex, Sargodha Road, Sheikhupura.
Ph: 92-42-7657314, Fax: 92-42-7657842, A/C No: 3481-0, Muslim Commercial Bank, Shah Alam Market, Lahore

حضرت علامہ عبدالحکیم شرف قادری مدظلہم، شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور

مکتبہ قادریہ

جامعہ نظامیہ رضویہ لوہاری منڈی لاہور

حوالہ نمبر .... ۷۸۶/۹۲ تاریخ ۲۰۰۱-۷-۲۵ الغا

محترم و مکرم حضرت علامہ مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب مدظلہ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! مزاج شریف

آپ کی ارسال کردہ تصنیف لطیف "تفہیم المسائل" موصول ہوئی، جستہ جستہ مقامات سے مطالعہ کر کے لطف اندوز ہوا، آج کے قاری کو ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے جن میں مختصر، مدلل اور واضح انداز میں مسائل بیان کئے گئے ہوں نیز ان کی زبان بھی شستہ اور عام فہم ہو، الحمدللہ! آپ کی تالیف جمیل میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں، مولا کریم اسے قبول عام عطا فرمائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب رہے۔

ارشاد الحق حقانی اور مولوی یوسف لدھیانوی پر آپ نے معقول گرفت کی ہے۔

علامہ سعیدی صاحب، علامہ جمیل احمد نعیمی اور دیگر اساتذہ کی خدمت میں السلام علیکم

والسلام

محمد عبدالحکیم شرف قادری

﴿كتاب العقائد﴾

اللہ میاں، اللہ سائیں کہنا

سوال: کیا اللہ میاں، اور اللہ سائیں کہنا جائز ہے۔؟

(محمد ناصر خان چشتی، نارتھ کراچی)

جواب: سورۂ بنی اسرائیل آیت نمبر 110 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (بنی اسرائیل:110)

"(اے رسول!) آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو، اس کے سب ہی نام اچھے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کو تعبیر کرنے کے لئے اسم ذات "اللہ" ہے، اس سے قریب تر صفاتی نام "الرحمٰن" ہے، باقی اس کے بہت سے صفاتی نام ہیں جو قرآن وحدیث میں مذکور ہیں، مثلاً الستار، الغفار، الروٴف، الرحیم وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو تعبیر کرنے کے لئے جو بھی اسماء، صفات اور کلمات استعمال کے جائیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے شایان شان ہوں۔ "میاں" اور "سائیں" ایسے کلمات اللہ تعالیٰ کی ذات کے شایان شان نہیں ہیں، کیونکہ اگرچہ استعمال کرنے والا انہیں اچھے معنوں میں استعمال کر رہا ہو، لیکن ان میں کم تر معنیٰ کا وہم پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے اسم جلالت کے ساتھ ان کلمات کا استعمال درست نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ، اللہ جل شانہ اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ یا باری تعالیٰ کے کلمات استعمال کرنے چاہئیں۔

ذیل میں ہم کتب لغت کے حوالے سے لفظ "میاں" اور "سائیں" کے معانی درج کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمایئے!

میاں: اردو زبان میں شوہر، خواجہ سرا، ایک کلمہ جس سے برابر والے یا اپنے سے کم درجہ شخص کو خطاب کرتے ہیں، بیٹا وغیرہ معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(قائد اللغات، فیروز اللغات)

سائیں: خاوند، فقیر، بھکاری وغیرہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (قائد اللغات)

ان معانی سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ اللہ جل شانہٗ کے شایان شان نہیں ہیں، ان میں سے بعض معانی ایسے ہیں جو ذات باری تعالیٰ کے لئے نقص اور اہانت کا پہلو رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہماری رائے میں ''اللہ میاں'' اور ''اللہ سائیں'' ایسے کلمات بولنے سے بالکل گریز کرنا چاہیے اور اپنے گھروں، دفاتر، مجالس اور بچوں کے ساتھ گفتگو میں اللہ جل شانہٗ کا ذکر کرتے وقت اسی احتیاط پر عمل کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی شان جلالت تو بہت بلند تر ہے۔ وہ ہر نقص، عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٨٠﴾ (الصافات)

''آپ کا رب جو بڑی عزت والا ہے، ہر اس عیب سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں''۔

ذات پاک رسالت مآب ﷺ کے لئے بھی اللہ جل شانہ نے ایسا ذو معنی کلمہ استعمال کرنے سے منع فرمایا جس کے معنی شان رسالت کے مطابق نہ ہوں، خواہ استعمال کرنے والے کی نیت بھی درست ہو، لیکن اس سے کوئی بدنیت، بدمذہب اور بدطینت شخص دور کا ایسا معنی مراد لے سکتا ہے، جس سے اہانت اور بے ادبی کا پہلو نکلتا ہو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ (البقرہ)

اے ایمان والو! (اگر دوران کلام رسول اللہ ﷺ کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہو تو) رَاعِنَا (یا رسول اللہ) نہ کہو بلکہ اُنْظُرْنَا (یا رسول اللہ) کہو اور (ادب کا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ کی بات کو) خوب توجہ سے سنو، (تا کہ انہیں دوبارہ بتانے میں زحمت نہ دینی پڑے)''۔

عذاب قبر

سوال: قرآن اوراحادیث مبارکہ کی روشنی میں عذاب قبر ثابت کیجئے ؟۔

(ایس، خان کیماڑی کراچی)

جواب: عذاب قبر قرآن و حدیث کی نصوص قطعیہ سے ثابت ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۟ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ (المومن)

''انہیں (قوم فرعون کو) جہنم کی آگ پر صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اور جب قیامت قائم ہوگی (تو فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ) فرعونیوں کو زیادہ سخت عذاب میں داخل کرو''۔

اس آیت میں قیام قیامت سے پہلے فرعون اور قوم فرعون کو صبح وشام نار جہنم پر پیش کیے جانے کا ذکر ہے، یہی عذاب قبر ہے، قبر سے مراد زمین کا وہ گڑھا ہی نہیں جس میں مردے کو دفن کیا جاتا ہے بلکہ عالم برزخ ہے، یعنی انسان کی موت اور قیام قیامت کا درمیانی عرصہ، اس میں اس کے وجود کے ذرات، خاک یا راکھ کی شکل میں ہوں یا کسی اور شکل میں جہاں کہیں بھی ہوں، ان کے ساتھ قدرت کی طرف سے روح کا کوئی نہ کوئی تعلق قائم ہوتا ہے، جس کی کیفیت کا ہم اس دنیا میں ادراک نہیں کر سکتے اور اسے عذاب یا ثواب پہنچتا ہے۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ (نوح:5)

''وہ (قوم نوح) اپنے گناہوں کے سبب (طوفان نوح میں) غرق کر دیئے گئے، پھر آگ میں ڈالے گئے''۔

یہاں غرقاب ہونے کے بعد جس عذاب کا ذکر ہے وہ عذاب قبر ہی ہے۔ عذاب قبر کے ثبوت میں کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں جو حد شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں۔

کلمۂ طیبہ کا ذکر قرآن میں

سوال: بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ''کلمۂ طیبہ'' جسے ''کلمۂ اسلام'' بھی کہتے ہیں، اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ کیا اتنی بنیادی چیز قرآن میں نظر انداز کی جاسکتی ہے؟۔
(آصف انور، لانڈھی، کراچی)

جواب: قرآن کسی ایک آیت کسی ایک سورت یا کسی ایک جزء کا نام نہیں ہے بلکہ پورا قرآن اللہ کا کلام ہے، سارے قرآن پر لفظاً و معناً ایمان فرض عین ہے۔ کسی ایک آیت کا انکار پورے قرآن کے انکار کے مترادف ہے۔ قرآن مجید سارے کا سارا یکبارگی نازل نہیں ہوا بلکہ وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی حکمت سے نازل کیا جاتا رہا۔ اس لئے قرآن مجید میں عقائد، مسائل واحکام اور قصص وواقعات متفرق طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کو کلمۂ طیبہ بھی کہتے ہیں اور کلمۂ اسلام بھی کہتے ہیں۔ اس کے دونوں اجزاء قرآن مجید میں دو مقامات پر الگ الگ آئے ہیں۔ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' قرآن مجید کی 37 ویں سورت ''الصافات'' کی آیت نمبر 35 میں مذکور ہے اور ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' قرآن پاک کی 48 ویں سورت ''الفتح'' کی آخری آیت، آیت نمبر 29 کی ابتداء میں مذکور ہے۔ ان دونوں کو یکجا کرنے سے کلمہ طیبہ بنتا ہے۔

آثار قیامت

سوال: قیامت کس دن قائم ہوگی؟ اور قیامت کی نشانیاں کیا ہیں؟
(محمد اشرف، منظور کالونی، کراچی)

جواب: صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ قیامت جمعہ کے دن قائم ہوگی، احادیث مبارکہ میں قیامت کی کئی نشانیاں بتائی گئی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: علم اٹھ جائے گا، جہالت کا غلبہ ہوگا، بدکاری اور شراب نوشی کی وبا عام ہوگی، آبادی میں مردوں کی بہ نسبت عورتوں کا تناسب بڑھ جائے گا، امانت ضائع کردی جائے گی اور اس کی نشانی رسول اللہ ﷺ نے یہ بتائی کہ مسلمانوں کی زمامِ اقتدار نااہلوں کے پاس چلی جائے گی، قومی دولت کو ذاتی

جاگیر سمجھ لیا جائے گا، امانت کو مال غنیمت سمجھ کر اس پر ہاتھ صاف کر دیا جائے گا، لوگ زکوٰۃ کو تاوان اور جرمانہ سمجھیں گے یعنی یا تو دیں گے نہیں اور اگر دیں گے تو بے دلی سے علم دین، دینی مقاصد کے لئے نہیں بلکہ دنیوی مقاصد کے لئے حاصل کیا جائے گا۔ مرد اپنی بیوی کا اطاعت گزار ہوگا اور ماں کا نافرمان، لوگ ذہنی اور فکری طور پر باپ سے دور ہو جائیں گے اور دوستوں سے قریب تر، مساجد میں لڑائی جھگڑے اور شور و غوغا ہوگا، بدکار و سرکش لوگ سردار و رہنما بن جائیں گے، نہایت کمینہ شخص قوم کا رئیس ہوگا، بڑے لوگوں کی تعظیم (ان کے کسی علمی، ادبی اور اخلاقی کمال یا تقویٰ کی بناء پر نہیں) بلکہ ان کے شر کے خوف سے ہو گی، آلاتِ غنا و موسیقی اور گانے بجانے کا بڑا شہرہ ہوگا، لوگ اپنے آباء و اجداد اور بزرگوں یعنی اسلاف کو لعن طعن کریں گے، باندی اپنے آقا کو جنے گی۔ وہ لوگ جو کبھی چرواہے تھے، جوتے اور لباس تک کے محتاج تھے بڑے بڑے محلات تعمیر کریں گے۔ احادیث مبارکہ میں اور بھی بہت سی علامات مذکور ہیں۔ لیکن ہمیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے یہ بھی کافی ہیں، بشرطیکہ ہم نے قبول حق کے لئے اپنے ذہن کے دریچے اور دل کی آنکھیں بند نہ کر دی ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ الحج (46)

"آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ وہ دل بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں جو سینوں میں دھڑکتے ہیں"۔

اور رب کریم کا فرمان ہے:۔

وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ

"اور جو میری نصیحت (کو قبول کرنے) سے رخ پھیر لے گا تو اس کے لئے معیشت تنگ ہو جائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے، وہ (حیرت کے مارے) کہے گا:

اَلْیَوْمَ تُنْسٰی ﴿۱۲۶﴾ (طٰہٰ: 124 تا 126)

اے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، میں تو دنیا میں (اچھا بھلا) بینا تھا، رب فرمائے گا، اسی طرح (دنیا میں) تیرے پاس میری آیات آئی تھیں تو، تو نے انہیں بھلا دیا تھا، تم بھی آج اسی طرح نظر انداز کر دیئے جاؤ گے''۔

قیامت کا دن

سوال: یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ قیامت کا دن 10 محرم الحرام بروز جمعہ نماز عصر کے وقت ہوگا؟۔ (ڈینئیل سردار بھٹی، کراچی)

جواب: صحیح مسلم میں جمعہ کے بارے میں حدیث ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے، جمعہ کا دن ہے، اس روز حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی، اسی دن انہیں جنت میں داخل کیا گیا، اسی دن انہیں جنت سے نکالا گیا اور قیامت بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔'' غنیۃ الطالبین میں، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے، لکھا ہے کہ ''قیامت عاشورہ کے دن قائم ہوگی''۔

دجال کی حقیقت

سوال: دجال کیا ہے؟ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ تفصیل سے وضاحت فرمائیے؟

(ڈاکٹر عبداللہ ناصر بٹ، لانڈھی)

جواب: ''دجال'' کا لفظ ''دجل'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں ''چھپانا'' اور ''ڈھانپ لینا''۔ ''کذاب'' کو بھی ''دجال'' اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حق کو باطل کے سبب سے چھپا دیتا ہے ''دجل'' کے معنی فریب اور ملمع کاری کے ہیں۔ احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں ''دجال'' کی بابت جو ارشادات اور علامات ملتی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ظہورِ دجال علاماتِ قیامت میں سے ہے۔

(۲) اس کا ظہور قیامت سے پہلے ہوگا۔

(۳) یہ شخص اعور (کانا) ہوگا اور اس کی کانی آنکھ انگور کی طرح پھولی ہوئی ہوگی۔

(۴) اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ''ک، ف، ر'' لکھا ہوگا۔

(۵) اس کے ساتھ آگ اور پانی کے دریا ہوں گے، وہ ایک آدمی کو قتل کر کے پھر زندہ کرے گا۔

(۶) وہ مشرق کی طرف سے نمودار ہوگا، دجال کا لقب ''مسیح'' ہوگا، لیکن وہ مسیح ضلالت ہوگا، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسیح ہدایت ہیں۔

(۷) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ ''دجال'' پہلے نبوت کا دعویٰ کرے گا اور پھر الوہیت کا۔

(۸) قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ دجال کا ذکر نہیں ہے، البتہ بعض اکابر علماء جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ بعض آیات مبارکہ میں اشارۃً دجال کا ذکر ہے۔

(۹) دجال کے دعوائے الوہیت کو باطل ثابت کرنے کے لئے بعض احادیث مبارکہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ کانا ہوگا، اللہ تو کانا نہیں ہے اور اگر وہ اپنی الوہیت کے دعوے میں سچا ہوتا تو اپنے جسمانی نقص اور عیب کو دور کرتا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دجال کا ظہور اہل ایمان کی ابتلاء، آزمائش اور امتحان کے لئے ہوگا۔ اسی باعث اس کے ہاتھ پر ''خرق عادت'' یعنی کرشماتی اور محیر العقول امور کا ظہور ہوگا۔

(۱۰) احادیث مبارکہ میں یہ نہیں ہے کہ دجال کا ذکر ''سورۂ کہف'' میں ہے، بلکہ یہ ہے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی تین آیات یا ابتدائی دس آیات یا آخری دس آیات یا ہو سکے تو پوری سورۂ کہف کی تلاوت کرتے رہا کرو، اس کی برکت سے اللہ جل شانہٗ تمہیں فتنۂ دجال سے محفوظ فرمائے گا۔

جنت کے کھانے کیسے ہوں گے؟

سوال: کیا جنت میں دنیاوی کھانوں کی طرح بھی کھانے ہوں گے یا خالی پھل اور میوے ہوں گے؟ (جبران سرتاج، پولیس لائن، کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ (البقرہ:25)

"اور آپ بشارت سنا دیجئے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے کہ ان کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، جب انہیں (باغات) کے کسی پھل کا رزق دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور ان کو (صورتاً) ملتے جلتے پھل دیے جائیں گے"۔

وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْۤ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ (حم السجدہ:31)

"اور تمہارے لئے اس (جنت) میں ہر وہ چیز ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کرو"۔

وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ (الزخرف:71)

اور وہاں ہر وہ چیز ہو گی جسے ان کے دل چاہیں اور آنکھیں لذت پائیں"۔

فِیْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ (الرحمٰن:68)

"اور ان میں پھل اور کھجوریں اور انار ہیں"۔

ان آیات مبارکہ میں پھلوں کا بھی ذکر ہے، یہ بھی ذکر ہے کہ اہل جنت کو من پسند چیزیں ملیں گی، جس چیز کی وہ خواہش کریں گے، انہیں مل جائے گی، ظاہر ہے وہ کسی بھی چیز کی خواہش کر سکتے ہیں اور ہر طیب و طاہر اور حلال چیز انہیں دستیاب ہو گی۔ باقی رہا یہ سوال

کہ وہ پھل اور کھانے کس طرح کے ہوں گے؟ تو قرآن نے فرمایا کہ دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہوں گے تا کہ طبیعت ان کی طرف مائل ہو، انسیت ہو، لیکن جنتی پھلوں، میووں اور طعام کی جو لذت ہوگی دنیا میں ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل جنت کو جو پھل بار بار دیئے جائیں گے، وہ صورتاً تو پہلے پھلوں کے مشابہ ہوں گے لیکن ہر بار ذائقہ نیا ہوگا، لذت نئی ہوگی۔

برزخ سے کیا مراد ہے؟

سوال: (۱) برزخ سے کیا مراد ہے؟ (۲) اگر قیامت یوم عاشورہ بروز جمعہ واقع ہوگی تو یوم عاشورہ دنیا کے مختلف ممالک میں ایک آدھ دن کے فرق سے ہوتا ہے، پھر یوم جمعہ کا تعین کیسے ہوگا؟ (۳) کیا جنت یا دوزخ میں انسان مکمل جسم کے ساتھ رہے گا یا صرف روح وہاں پر ہوگی؟ (۴) رمضان المبارک میں جن لوگوں نے جان بوجھ کر روزے نہیں رکھے، کیا وہ سزا کے مستحق ہو گئے؟ (محمد شاہد اعجاز، ناظم آباد، کراچی)

جواب: (۱) ''برزخ'' دو چیزوں کے درمیان حد فاصل کو کہتے ہیں۔ علم العقائد کی اصطلاح میں انسان کی موت سے لے کر قیامت قائم ہونے تک (یعنی عالم آخرت کے آغاز تک) کا جو درمیانی وقفہ ہے، اسے عالم برزخ کہتے ہیں، خواہ وہ عرصہ انسان کا وجود خاکی کسی قبر میں گزرے، گل سڑ کر خاک بن چکا ہو یا جل کر راکھ ہو چکا ہو، کسی درندے کی خوراک اور اس کی جزءِ بدن بن کر تحلیل ہو چکا ہو۔ الغرض جس حالت اور جس کیفیت میں بھی اس پر یہ دور گزرا ہے، گزر رہا ہے یا قیامت تک گزرے گا، وہ عالم برزخ کہلاتا ہے۔ اس عرصے میں اس کے اجزاء بدن کے ساتھ اس کی روح کا کسی نہ کسی قسم کا تعلق قائم رہتا ہے اور از روئے قرآن و حدیث وہ عذاب وثواب اور رنج و راحت کی کیفیات سے گزرتا رہتا ہے۔

(۲) اگر اللہ کے حکم اور تقدیر سے قیامت اس یوم عاشورہ کو واقع ہوگی جو جمعہ کے دن آئے گا تو ممالک کی تقسیم تو ہمارے اعتبار سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے ساری زمین ایک ہے، تو جہاں بھی یوم عاشورہ جمعہ کے روز آئے گا، وہاں سے قیامت کا آغاز ہو جائے گا، زمین، سیاروں،

ثوابت اور مظاہر کائنات کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہو جائے گا اور پھر قبروں یا برزخ کی کیفیات واحوال سے مردوں کے زندہ کیے جانے اور حشر ونشر کے مراحل آئیں گے۔

(۳) قرآن وسنت کی نصوص اور تصریحات سے یہی معلوم ہوا ہے کہ انسان اپنے جسم کے ساتھ جنت یا دوزخ میں جائے گا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ (النساء:56)

''بلاشبہ جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا، عنقریب ہم انہیں آگ میں جھونک دیں گے۔ جب بھی ان (کے جسموں) کی کھالیں جل کر پک جائیں گی، ہم انہیں دوسری کھالوں سے تبدیل کردیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھیں''۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۙ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَ مِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ (ابراہیم:16-17)

''دوزخ اس کے پیچھے ہے اور اسے پلایا جائے گا (جہنمیوں کے زخموں سے رسنے والا) پیپ کا پانی، وہ بمشکل اس کا تھوڑا تھوڑا گھونٹ لے گا اور وہ اسے گلے سے نیچے اتار نہ سکے گا اور ہر طرف سے اسے موت گھیر لے گی اور وہ مرے گا نہیں اور اس کے پیچھے ایک سخت عذاب ہوگا''۔

اسی طرح اہل جنت کی کیفیات واحوال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۙ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۙ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۚ يُسْقَوْنَ مِنْ

''بلاشبہ نیک لوگوں ضرور نعمتوں میں سرشار (عزت کی اونچی) مسندوں پر (بیٹھے) دیکھتے ہوں گے، آپ ان کے

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ (المطففین:22 تا 26)

چہروں کو راحت کی تروتازگی (کی علامات) سے پہچانیں گے، انہیں صاف شفاف مہر بند شراب پلائی جائے گی جس کی مہر مشک ہے''۔

الغرض اسی طرح کی متعدد آیات ہیں جن سے قطعیت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ اہل جنت، جنت میں اور اہل جہنم، جہنم میں اپنے جسموں کے ساتھ ہوں گے۔

(۴) رمضان المبارک میں جن لوگوں نے قصداً بغیر عذر کے روزے چھوڑے ہیں، وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں اور سزا کے حق دار ہوں گے۔ انہیں چاہیے کہ اپنی اس کوتاہی پر توبہ کریں اور روزوں کی قضا بھی کریں۔

ارشاد احمد حقانی سے مکالمہ لفظ ''مولانا'' کا اطلاق

روزنامہ جنگ، کراچی کے 7 نومبر 1998ء کی اشاعت میں ادارتی صفحے پر محترم ارشاد احمد حقانی کے کالم ''حرف تمنا'' میں ان کی عبدالودود صاحب کے ساتھ مراسلت شائع ہوئی ہے، جس میں عبدالودود صاحب نے منجملہ اور باتوں کے لفظ ''مولانا'' کے غیر اللہ پر اطلاق کو ناجائز قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک یہ لفظ اللہ جل شانہٗ کی ذات کے لئے خاص ہے، جیسے ان کے فرمان کے مطابق عدالت میں جج کو (My Lord) کہہ کر مخاطب کرنا، ان کے ساتھ خاص ہے اور عدالت سے باہر کسی اور شخص کو اس لفظ سے مخاطب نہیں کیا جا سکتا حالانکہ یہ بھی کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہے، محض ان کے ذہن کی اختراع ہے۔ سطور ذیل میں ہم اس مسئلے کی مکمل وضاحت کر رہے ہیں تاکہ عوام کے ذہن میں کوئی خلجان باقی نہ رہے۔

لفظ ''مولانا'' کا مادہ (Origin) ''وَلْیٌ'' ہے اور لفظ ''مولانا'' دو کلمات سے مرکب ہے۔ مولیٰ + نا، ''مولیٰ'' مصدر میمی مبنی للفاعل یعنی فاعلی معنی میں ہے اور ''نا'' ضمیر جمع متکلم ہے، لہٰذا دوسری ضمائر (Pronouns) کے ساتھ مل کر اس کی مرکب صورت ''مولاہ'' ''مولاک'' ''مولائی'' وغیرہ ہوگی۔

لفظ ''مولیٰ'' عربی زبان کے اسمائے اضداد (The Word with Opposite Meanings) میں سے ہے، یعنی ایسے کلمات جو دو متضاد معنوں کے لئے وضع کیے گئے ہیں اور دونوں میں ان کا استعمال حقیقت ہے، مجاز نہیں، جیسے ''بیع وشراء'' کے کلمات ان میں سے ہر ایک خرید و فروخت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور سیاق و سباق (Context) اور محل استعمال سے معنی کا تعین ہوتا ہے، مثلاً قرآن مجید کی سورۃ البقرہ آیت نمبر 207 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط (البقرہ:207)

''اور لوگوں میں سے ایک شخص ایسا ہے جو اللہ کی رضا جوئی کی خاطر اپنی جان کو بیچ دیتا ہے''۔

اور سورۃ التوبہ آیت نمبر 111 میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط (توبہ:111)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے جنت کے عوض ان کی جان و مال کو خرید لیا ہے''۔

ان دو آیات میں مادہ ''شِرَاءٌ'' اور ''شِرٰی'' کے دو مشتقات (Derivaties) ہیں۔ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''يَشْرِیْ'' بصیغۂ مضارع (Present & Futuire Tense) بیچنے کے معنی میں، اور دوسری آیت میں ''اِشْتَرٰی'' بصیغۂ ماضی (Past Tense) خریدنے کے معنی میں ارشاد فرمائے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کلمات یعنی ''یَشْرِی'' اور ''اِشْتَرٰی'' کا مادہ و مصدر (Origion) ایک ہے اور معانی (خرید و فروخت) ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی طرح عربی زبان کا کلمہ ''اَلْجُوْن'' بھی متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یعنی اس کے معنی ''سفید'' بھی ہیں اور ''سیاہ'' بھی۔

اس تمہید کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ لفظ ''مولانا'' جب کسی عالم دین کے لئے بولا جائے گا تو اس کے معنی ہوں گے، ہمارے سردار، ہمارے آقا وغیرہ۔ اور ظاہر ہے یہاں اس

لفظ سے دینی سیادت وسربراہی مراد ہے اور یہ محض عقیدت ومحبت کے اظہار اور احترام و اکرام کے لئے ہمارے ہاں بولا جاتا ہے، یہ کوئی عہدہ ومنصب یا لقب (Title) نہیں ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے اور محترم ارشاد احمد حقانی کا اسے ''غلط العام'' قرار دینا دینی علوم میں مہارت تامہ نہ ہونے کی دلیل ہے۔

اللہ جل شانہٗ کے بعض اسماء صفات وہ ہیں جو اس کی ذات اعلیٰ واجل کے ساتھ خاص ہیں، ان کا استعمال غیر اللہ کے لئے جائز نہیں ہے، جیسے اللہ، رحمٰن، عالم الغیب وغیرہ اور بعض اسماء باری تعالیٰ ایسے ہیں جن کا استعمال قرآن میں ذات باری تعالیٰ کے لئے بھی ہوا ہے اور غیر اللہ بطور خاص رسول اللہ ﷺ کے بھی جیسے عزیز، رؤف، رحیم، سمیع، بصیر، شهید، ولی، والی، غنی، کریم، حکیم، مومن وغیرہ۔ ان اسماء صفات کو جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو استقلال ذاتی کے معنی ہیں، یعنی ان صفات عالیہ کا مصدر ومنبع خود اللہ جل شانہٗ کی ذات ہے کسی اور سے مستعار ومستفاد نہیں اور جب ان صفات محمودہ کا اطلاق رسول اللہ ﷺ یا مخلوق میں سے کسی اور کے لئے کیا جاتا ہے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ صفات اللہ تعالیٰ کی عطا وانعام سے انہیں حاصل ہیں، ان کا اصل مصدر ومنبع اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ لفظ ''مولیٰ'' بھی ایسی ہی صفات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندوں دونوں کے لئے استعمال ہوتی ہیں، بس فرق جہت (Angle, Viewpoint) کا ہوتا ہے، قرآن مجید کی سورۃ التحریم آیت نمبر 4 میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِیْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ (تحریم آیت:4)

''تو یقیناً اللہ ان کا مولیٰ (مددگار) ہے اور جبرائیل اور صالح مومنین بھی''۔

اس آیت میں لفظ ''مولیٰ'' کا اطلاق ایک ہی مقام پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر، جبرائیل امین پر اور صالح مومنین پر کیا گیا ہے۔ سورۃ النحل آیت نمبر 76 میں ارشاد ہے:

وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَیْنَمَا یُوَجِّهْهُّ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ ؕ (النحل:76)

''اور وہ (ناکارہ غلام) اپنے مولیٰ (آقا) پر بوجھ ہے اور وہ اسے جدھر بھیجے

کوئی بھلائی لے کر نہ آئے''۔

اس آیت میں آقا پر لفظ ''مولیٰ'' کا اطلاق کیا ہے اور متعدد آیات میں ذات باری تعالیٰ کے لئے بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے، جیسے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 286 میں ہے: اَنۡتَ مَوۡلٰنَا یعنی تو ہمارا مولیٰ (مددگار) ہے۔ اسی طرح احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی لفظ ''مولیٰ'' کا استعمال غیر اللہ کے لئے بکثرت آیا ہے، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں ہے کہ حجۃ الوداع سے واپسی پر ''غدیر خم'' کے پاس آپ نے فرمایا: ''مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوۡلَاہُ'' یعنی جس کا میں محب ہوں، علی بھی اس کے محب ہیں۔

صحیح بخاری کتاب المغازی میں ہے کہ غزوہ احد کے موقع پر ابوسفیان نے نعرہ لگایا: ''اُعۡلُ ھُبَل'' یعنی ہبل (مشرکین مکہ کا بت) کا نام سربلند ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: ''اس نعرے کا جواب دو، صحابہ نے عرض کیا: ''کیا جواب دیں؟'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کہو، اَللّٰہُ اَعۡلٰی وَاَجَلُّ'' (یعنی اللہ ہی کی ذات بلند ترین اور عظیم ترین ہے) ابو سفیان نے پھر دوسرا نعرہ لگایا ''لَنَا الۡعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمۡ'' (یعنی ہمارا تو عزیٰ بت ہے اور تمہارا تو کوئی عزیٰ نہیں ہے) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: اسے اس نعرے کا جواب دو، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا: کہو، ''اَللّٰہُ مَوۡلَانَا وَلَا مَوۡلٰی لَکُمۡ'' (یعنی اللہ ہمارا کارساز مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے) اس کا مطلب یہ نہیں کہ غیر اللہ کے لئے ''مولیٰ'' کا کلمہ استعمال کرنا منع ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے گا اور تمہارے بت جو نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ حرکت کر سکتے ہیں، نہ انہیں شعور ہے نہ عقل، جو اپنے اوپر سے مکھی بھی نہیں اڑا سکتے وہ تمہاری کیا مدد کریں گے؟ جب کہ اللہ عزوجل جو قادر و قیوم ہے وہ ہماری مدد فرمائے گا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ عالم دین کو اخلاص وللّٰہیت، عجز و نیاز اور انکسار کا پیکر ہونا چاہیے اور اس بات کی خواہش وآرزو نہیں کرنی چاہیے کہ لوگ انہیں مولانا، علامہ یا حضرت کے القاب

سے پکاریں، کیونکہ اس سے اپنی تقدیس کا زعم پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ‌ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ (النساء:49)	''کیا آپ نے انہیں نہ دیکھا جو اپنی پاکیزگی نفس کا دم بھرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاکیزگی عطا فرماتا ہے''۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلَا تُزَكُّوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ‌ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم:32)	''خودستائی نہ کیا کرو وہی بہتر جانتا ہے (درحقیقت) متقی کون ہے؟''۔

ہاں اگر مسلمان عقیدت و محبت سے کسی عالم دین کے لئے تکریم و اعزاز کے طور پر لفظ ''مولانا'' یا ایسا ہی کوئی اور کلمہ استعمال کریں تو یہ شرعاً درست ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں یہ ''غلط العام'' نہیں بلکہ از روئے قرآن وحدیث بالکل درست ہے۔

لفظ ''مولانا'' کا اطلاق

عنوان بالا کے تحت میری گزارشات پر جناب الیاس اختر انصاری کا مراسلہ ''جنگ'' کی 13 نومبر کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری اصولی بحث سے اتفاق رائے کا اظہار کیا ہے، یعنی لفظ مولانا کے معنی اور کتاب و سنت کی روشنی میں ''غیر اللہ'' پر اس لفظ کے اطلاق کا جواز۔ اس سے انکار کی گنجائش اس لئے بھی نہیں کہ یہ قرآن کے صریح انکار کے مترادف ہے۔ البتہ انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ عالم عرب میں یہ استعمال اہل علم کے لئے متعارف نہیں ہے، بلکہ اس کے متبادل لفظ ''شیخ'' اہل علم کے لئے بولا جاتا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ لفظ مولانا کی طرح لفظ ''شیخ'' بھی عربی زبان میں متعدد اور متضاد معانی کے لئے وضع کیا گیا ہے، مثلاً بوڑھا، معمر، استاذ، عالم، قوم کا سردار، فضیلت اور مرتبے والا وغیرہ، لیکن فضیلت محمود ہی نہیں بلکہ فضیلت مذموم پر بھی بولا جاتا ہے، جیسے شیخ النار، شیطان کو کہتے ہیں۔ اور سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ شیطان بعض

مواقع پر ''شیخ نجد'' کی صورت میں مشرکین مکہ کے ہمراہ رہا۔ جہاں تک عرف کا تعلق ہے تو وہ مختلف ممالک، علاقوں اور خطوں میں جدا جدا بھی ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں، بشرطیکہ کوئی شرعی مانع نہ ہو، جیسے اللہ جل شانہٗ کی ذات کے لئے لفظ ''خدا'' کا استعمال جنوبی ایشیاء، ایران، افغانستان اور وسطی ایشیاء میں لفظ ''تنکری'' کا ترکی میں اور لفظ ''God'' کا یورپ، امریکہ اور دنیا کے دیگر خطوں میں۔ اسی طرح آل رسول ﷺ کے لئے عالم عرب میں ''شریف'' کا کلمہ استعمال ہوتا ہے اور ہمارے سارے خطے میں ''سید''، جب کہ عالم عرب میں ''سید'' آج بھی (مسٹر۔MR) یعنی محترم جناب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا دینی حوالے سے کسی مسئلے پر شرعی دلیل کے بغیر اعتراض محض کٹ حجتی اور اعتراض برائے اعتراض ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی

سوال: افریقہ کے ایک ملک ملاوی کے انڈین باشندے نے جو مسلم ہے اور ان کا نام ''الطاف اللہ ہے'' کہا کہ ''اللہ تعالیٰ افریقن قوم کے اندر عقل ڈالنا بھول گیا اور اللہ سے غلطی ہو گئی'' (العیاذ باللہ) وہاں ایک عالم نے انہیں متوجہ کیا یہ کلمہ کفر ہے، توبہ کرو اور تجدید نکاح کرو، لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا اس کا نکاح باقی ہے یا اس کی بیوی اس کے نکاح سے خارج ہو چکی ہے، شرعی حکم بیان کیجئے؟۔

(عبدالقادر علی محمد، ایم اے جناح روڈ، کراچی)

جواب: فرعون سے مکالمہ کے دوران قرآن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''(ترجمہ) میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے (طٰہٰ:52)''۔ اسی طرح قرآن حضرت مریم سے فرشتوں کا مکالمہ نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''(ترجمہ) ہم آپ کے رب ہی کے حکم سے اترتے ہیں ہمارے آگے اور ہمارے پیچھے اور اس کے درمیان جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے (مریم:64)''۔

صورت مسئولہ میں قائل مذکور نے ذات باری تعالیٰ کی طرف سہو ونسیان اور غلطی کی

صریح نسبت کی، یہ اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ وجل شانہ کی صریح توہین ہے اور کفر ہے اور عالم دین کے متوجہ کرنے کے باوجود اس کا توبہ پر آمادہ نہ ہونا اصرار علی الکفر ہے۔ یہ کلمات ادا کرتے ہی اس کا نکاح فسخ ہوگیا اور عدت کے بعد اس کی بیوی کسی کے ساتھ بھی اپنی مرضی سے نکاح کرنے کے لئے آزاد ہے۔ البتہ اگر وہ صدق دل کے ساتھ کفر سے تائب ہو جائے اور شان الوہیت میں جو گستاخی کی ہے اس پر نادم ہو کر اس سے رجوع کرلے، تو وہ دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں۔

دولت مندوں کی جنت سے دوری

سوال: کیا امیر ترین، دولت مند، سرمایہ دار 500 برس تک جنت سے دور کردیئے جائیں گے؟ (ڈینئیل سردار بھٹی، کراچی)

جواب: ملا علی قاری نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ اور علامہ شرف الدین حسین طیبی نے اپنی شرح الطیبی میں ایک حدیث مبارکہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فقراء، مہاجرین، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم امراء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔

یہ صحابہ کرام کی نسبت سے ان فقراء اور اہل ایمان کا ذکر ہے جو مکمل طور پر شریعت پر عامل ہوں اور ہر قسم کے فسق وفجور سے محفوظ ہوں۔ ظاہر ہے جس کا پرچۂ امتحان جتنا طویل ہوگا، اس کا جواب اور حساب کتاب بھی اتنا ہی تفصیلی ہوگا۔ چونکہ فقراء مومنین کے پاس ضرورت سے زائد دولت ہی نہیں لہٰذا اس پر جواب دہی کی ذمے داری بھی نہیں، اس کے برعکس جن اہل ثروت کو اللہ تعالیٰ نے وافر دولت دی ہے، انہیں اس دولت کی آمد وخرچ کا تفصیلی حساب بھی دینا ہوگا۔ یہ امر ذہن میں رہے کہ یہ ان اہل ثروت کا ذکر ہے جو اپنی دولت شریعت کے مطابق جمع اور خرچ کرتے ہیں اور جو لوگ اس معاملے میں شرعی احکام کو نظر انداز کرتے ہیں، ان کا حساب کتاب نہایت دشوار ہوگا۔

مفلس کون؟

سوال: شریعت میں مفلس کس کو کہا گیا ہے؟۔ (محمد مختار احمد، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: صحیح مسلم میں حدیث ہے'' حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ سے) فرمایا'' کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟'' انہوں نے عرض کیا (یارسول اللہ ﷺ) ہمارے نزدیک تو مفلس وہ ہے جس کے پاس نقد رقم اور ساز و سامان دنیا نہ ہو، آپ نے فرمایا:'' میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ (یعنی عبادات کا ذخیرۂ آخرت) لے کر آئے گا، لیکن (بدقسمتی سے) اس نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی ہو گی، کسی پر ناجائز تہمت لگائی ہو گی، کسی کا مال باطل طریقے سے کھایا ہو گا، کسی کا ناحق خون بہایا ہو گا، کسی کو مارا پیٹا ہو گا، تو ان میں سے ہر ایک'' مظلوم'' کو اس کے ڈھائے ہوئے مظالم کے بدلے میں اس کی نیکیاں منتقل کر دی جائیں گی۔ اور اگر ان مظلومین کے حقوق کی ادائیگی کے لئے اس کی نیکیاں ناکافی ہوں گی، تو ان کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

﴿کتاب الطهارت﴾

غسل کے بعد وضو

سوال: کیا غسل کے بعد نماز کی ادائیگی کے لئے وضو ضروری ہے؟

(شازیہ وشہناز، کراچی)

جواب: غسل کرنے کے بعد نماز پڑھنے کے لئے وضو کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر غسل میں پورے بدن پر پانی ڈالنے سے پہلے صحیح طریقے سے کلی کر لی ہے اور ناک میں اندر تک پانی ڈال لیا ہے، تو اب غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہے، تاہم غسل کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ پہلے سنت کے مطابق با قاعدہ وضو کریں اور پھر پورے بدن پر پانی ڈالیں۔ غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں اندر تک پانی ڈالنا فرض ہے۔ غسل طہارت اور غسل مسنون میں فرض نہیں ہے سنت ہے۔

نیل پالش اور وضو

سوال: کیا ازروئے شریعت نیل پالش کا استعمال جائز ہے اور نیل پالش کے ساتھ وضو ہو جائے گا؟

(سارہ مجید، گارڈن ویسٹ، کراچی)

جواب: اگر نیل پالش کے اجزائے ترکیبی میں کوئی حرام اور ناپاک چیز شامل نہیں ہے تو اس کا استعمال جائز ہے۔ اگر کوئی خاتون باوضو ہے اور اس نے وضو کی حالت میں ایسی نیل پالش استعمال کی ہے، جس میں کوئی ناپاک اور حرام چیز شامل نہیں ہے، تو جب تک وہ پہلا وضو قائم ہے، وہ نماز پڑھ سکتی ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق نیل پالش سے ناخن پر کیمیکل کی ایک سطح جم جاتی ہے جو چکناہٹ کی وجہ سے ''واٹر پروف'' ہوتی ہے، یعنی وضو کا پانی اس میں سرایت کر کے ناخن کی اصل سطح تک نہیں پہنچ پاتا۔ ایسی صورت میں جب تک نیل پالش کو کھرچ کر صاف نہ کر دیا جائے، وضو نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی ایسی نیل پالش مارکیٹ میں دستیاب ہے جس میں کوئی ناپاک اور حرام چیز شامل نہیں ہے اور اس کے لگانے کے بعد پانی اس میں سے سرایت کر کے ناخن کی اصل سطح تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے استعمال سے وضو ہو جائے گا۔

کیا جھوٹ بولنے سے وضو ٹوٹتا ہے؟

سوال: وضو کرنے کے بعد جھوٹ بولا، کسی کی غیبت کی، فحش کلامی کی تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا بحال رہتا ہے، کیا تازہ وضو کیے بغیر نماز پڑھ سکتے ہیں؟

(منور احمد ملیر، کراچی)

جواب: فقہی طور پر تو وضو قائم رہتا ہے اور اس سے نماز پڑھ لی تو ادا ہو جائے گی۔ لیکن اس کی کامل روحانیت، نورانیت، اجر وثواب اور برکت حاصل نہیں ہو گی، لہٰذا افضل اور مستحب یہ ہے کہ دوبارہ تازہ وضو کر کے نماز پڑھے اور اگر چاہتا ہے کہ ان گناہوں کا اثر اور نحوست پوری طرح سے زائل ہو جائے تو صدق دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ بھی کرے۔

دورانِ نماز وضو کا ٹوٹنا

سوال: (۱) نماز با جماعت کے دوران اگر اگلی صف میں کھڑے کسی نمازی کا وضو ٹوٹ جائے اور اطراف سے نکلنے کا راستہ نہ ہو، تو نمازی کیا کرے، کیا صفوں کو چیرتا ہوا نکل سکتا ہے؟

جواب: (۱) اگر نماز با جماعت ہو رہی ہے اور اگلی صفوں میں کھڑے کسی نمازی کا وضو ٹوٹ جائے تو اسے چاہیے کہ اسی لمحے نماز کو ترک کر دے اور پچھلی صفوں میں سے نمازیوں کے درمیان میں سے راستہ بناتے ہوئے نکل جائے یا جس صف میں کھڑا ہے وہاں نمازیوں کے آگے سے گزر کر کنارے پر چلا جائے اور کنارے سے راستہ بنا کر نکل جائے، نمازی کو چاہیے کہ اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لے تاکہ دوسرے نمازیوں کو پتہ چل جائے کہ اس کا وضو ٹوٹ چکا ہے اور اسے وضو کرنے کے لئے پیچھے جانا ہے۔ جب وضو کر کے واپس آئے اور جماعت بدستور جاری ہو تو سب سے پچھلی صف میں جہاں جگہ ملے کھڑا ہو جائے اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد، اس کی بیچ کی کوئی رکعت نکل گئی ہو تو اسے پڑھ لے۔

سوال: (۲) مسجد میں وضو کی جگہ اکثر لوگ جوتے دھوتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟

جواب: (۲) وضو کی جگہ جوتے دھونا معیوب تو لگتا ہے لیکن دھو سکتے ہیں بشرطیکہ اگر وہ ناپاک ہیں تو ان کے چھینٹے کسی کے بدن یا لباس پر نہ پڑیں۔

ہاتھ پاک کرنا

سوال: بہت سے لوگ بیت الخلاء سے آنے کے بعد ہاتھ نہیں دھوتے۔ کیا یہ درست ہے؟ یا صرف پانی سے ہاتھ دھوتے ہیں، صابن استعمال نہیں کرتے؟۔

جواب: اسلام ایسا دین ہے جو تزکیہ، طہارت اور نفاست کی تعلیم دیتا ہے۔ جب تک مومن کا بدن، لباس اور نماز کی جگہ پاک نہ ہو، نماز ادا کرنے کا اہل ہی نہیں ہوتا۔ قضائے حاجت کے بعد ہاتھ دھونا طبعی نفاست کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر حضرات کا بھی یہی مشورہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صابن سے ہاتھ دھولیا کریں ورنہ یرقان کا مرض لاحق ہونے کا خدشہ ہے۔ حضور انور ﷺ کے عہد مبارک میں صابن نہیں تھا لیکن صفائی میں مبالغے اور احتیاط کے لئے ہاتھوں کو مٹی پر رگڑ کر دھویا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴿۲۲۲﴾ (البقرہ:222)

"بلا شبہ اللہ توبہ کرنے والوں اور نہایت عمدہ طریقے سے پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے"۔

حضور ﷺ نے فرمایا: "طہارت نصف ایمان ہے" (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی) اور اسلام کا سارا نظام عبادت و اطاعت اس کے حصول کا ذریعہ ہے۔ نماز میں جسم، لباس اور مقام نماز کا پاک ہونا شرط لازم ہے۔ نماز، روزے اور زکوٰۃ ان تمام عبادات سے بندۂ مومن کے قلب اور قالب، جان و مال، ظاہر و باطن، بدن و روح اور ذہن کی تطہیر مقصود ہے۔ اس سے انسان میں اخلاص، للّٰہیت، حضورِ قلب، سخاوت، شجاعت اور صبر و ضبط نفس پیدا ہوتا ہے۔

آنسو بہنے سے وضو پر اثر

سوال: آنکھ میں تنکا پڑنے سے پانی بہنے لگتا ہے۔ رونے سے آنسو بہہ نکلتے ہیں اور کبھی آنکھ دکھنے سے پانی بہتا ہے، کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ (سید عمیر الحسن، دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: آنکھ میں تنکا وغیرہ پڑنے سے جو پانی بہتا ہے یا رونے والے کے آنسوؤں سے

وضونہیں ٹوٹتا، البتہ آنکھ دکھ جانے سے جو پانی بہتا ہے اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔

حائض اور جُنب کے لئے قرآن کی تلاوت اور چھونے کا حکم

سوال: کیا حائض عورت اور جنبی مرد کے لئے قرآن مجید کی تلاوت جائز ہے اور یہ لوگ قرآن پاک کو چھوسکتے ہیں؟۔ (عمران قریشی، خداداد کالونی، کراچی)

جواب: حائض عورت اور جنبی مرد کے لئے قرآن کی تلاوت منع ہے اور قرآن کو چھونا یعنی ہاتھ میں پکڑنا بھی منع ہے۔ البتہ اگر کوئی بے وضو ہے تو وہ زبانی قرآن کی تلاوت کرسکتا ہے۔ تاہم مصحف شریف کو کسی غلاف یا پاک کپڑے میں لپیٹے بغیر چھونا منع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ۝ ''اس قرآن کو نہ چھوئیں مگر (وہی لوگ) جو پاکیزہ ہوں''۔ (الواقعہ:79)

معلّمات اور طالبات کا ایام کے دوران تعلیم قرآن

سوال: اسکولوں اور کالجوں بلکہ یونیورسٹی کی سطح تک قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے، کہیں ناظرہ، کہیں ترجمہ اور کہیں تفسیر پڑھائی جاتی ہے۔ بعض اوقات معلمات اور طالبات ایام سے ہوتی ہیں، ایسی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہیے؟ (فاطمہ بنت عبداللہ، کراچی)

جواب: جو معلّمہ اور طالبہ ایام سے ہے، وہ قرآن کی نہ تلاوت کرے اور نہ چھوئے۔ ایسی طالبات جو باوضو اور طہارت سے ہوں، وہ تلاوت کریں اور دوسری سنیں۔ ترجمہ، تفسیر اور مسائل اگر معلّمہ ایام سے ہوں تب بھی بیان کرسکتی ہیں۔ اگر وہ صرف قرآن یا مترجم قرآن یا قرآنی تفسیر پر مشتمل نصابی کتاب سامنے رکھنا ضروری سمجھیں تو پاک کپڑے یا غلاف میں لپیٹ کر پکڑسکتی ہیں۔ اسی طرح ناظرہ پڑھاتے ہوئے ایک ایک لفظ الگ کرکے طالبات کو سمجھاسکتی ہیں۔

پان یا نسوار منہ میں رکھ کر سلام کا جواب دینا

سوال: کسی کے منہ میں پان یا نسوار ہے اور کوئی اسے سلام کرتا ہے تو سلام کا جواب دینا

چاہیے یا نہیں؟ اس حالت میں درود پاک پڑھنا یا ذکر و تلاوت کرنا جائز ہے یا نہیں؟
(نور خان برکی، سبزی منڈی، کراچی)

جواب: کسی کے منہ میں پان یا نسوار ہو اور کوئی اسے سلام کرے تو اسے جواب دینا چاہیے۔ کیونکہ سلام کرنا سنت ہے اور جواب دینا واجب ہے۔ مسجد میں کچی پیاز لہسن یا کوئی بھی بد بودار چیز کھا کر جانا اس لئے منع ہے کہ اس سے فرشتوں کو اذیت پہنچتی ہے اور دوسرے نمازیوں کے لئے باعث کراہت و اذیت ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جسمانی، روحانی، صوری اور معنوی ہر اعتبار سے پاک و صاف ہو کر کھڑا ہو۔ لہٰذا ادب کا تقاضا تو یہ ہے کہ باوضو بھی ہو، کلی یا مسواک کر کے منہ کو اچھی طرح صاف کرے اور ہو سکے تو خوشبو لگا کر قرآن مجید کی تلاوت کرے اور درود پاک پڑھے۔ مستند ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق چونکہ تمباکو کینسر اور دیگر مہلک امراض کا سبب بن سکتا ہے لہٰذا اس سے اجتناب بہتر ہے۔

ڈرائی کلین کیے ہوئے کپڑوں کی طہارت کا مسئلہ

سوال: شہروں میں لوگ اکثر اپنے کپڑے دھوبی اور ڈرائی کلینرز سے دھلواتے ہیں، ان کپڑوں میں کچھ تو پاک ہوتے ہیں اور کچھ ناپاک اور دھوبی لوگ ان کپڑوں کو ایک ساتھ مشین میں ڈال دیتے ہیں، اسی استعمال شدہ پانی میں انہیں صاف کر کے، چمکا کر استری کر کے دے دیتے ہیں، کیا اس طرح یہ سارے کپڑے شرعاً پاک ہو جاتے ہیں اور ایسا لباس پہن کر بلا تردد نماز پڑھ سکتے ہیں؟۔ (م، ن، خان چشتی، ٹانک سرحد)

جواب: اگر فی الواقع صورتحال ایسی ہے جیسا کہ سوال میں بیان کی گئی ہے کہ پاک و ناپاک کپڑے ایک ساتھ مشین میں ڈال دیئے جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ ماءِ مستعمل ناپاک ہوتا ہے۔ اور اگر اسی میں میل نکال کر کپڑوں کو چمکا کر خشک کر کے استری کر دیا جاتا ہے تو یہ شرعاً پاک نہیں ہوں گے اور انہیں پہن کر نماز پڑھی جائے تو ادا نہیں ہو گی، کیونکہ طہارت لباس نماز کے لئے شرط ہے۔ لیکن اگر مشین میں یہ انتظام ہے کہ وہ استعمال شدہ پانی کو خارج کر دیتی ہے یا اس سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد تازہ پاک پانی اس میں

ڈال کر کپڑوں کو پاک کرلیا جاتا ہے، جیسا کہ آج کل گھروں میں عام طور پر آٹو میٹک واشنگ مشینوں میں یہ سہولت موجود ہے، تو کپڑے شرعاً پاک ہو جاتے ہیں۔ مشین آٹو میٹک نہ بھی ہو تو پہلے استعمال شدہ پانی کو نکال کر دوبارہ پانی ڈالا جاسکتا ہے یا کپڑوں کو باہر نکال کر پانی میں ایک دو بار بھگو کر نچوڑا جاسکتا ہے۔ مسئلے کی یہ تفصیل ہم نے ان لوگوں کے لئے درج کی ہے جو ممکنہ حد تک شرعی احتیاط پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور دنیوی معاملات کی طرح دینی معاملات میں بھی اپنے قلبی اطمینان کی حد تک تحقیق کر کے اس پر عمل کرتے ہیں۔ ورنہ خالص فقہی جواب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ڈرائی کلین کے سارے طریقہ کار (Process) کا یقینی علم نہ ہو تو محض شک وشبے کی بنا پر کپڑے کا حکم تبدیل نہیں ہوگا بلکہ اپنی سابقہ حالت پر برقرار رہے گا یعنی اگر ڈرائی کلین کیے جانے سے پہلے شرعاً پاک تھا تو اب بھی پاک سمجھا جائے گا اور اگر پہلے ناپاک تھا تو ڈرائی کلین کے بعد بھی وہی حکم رہے گا۔ واضح رہے کہ کپڑے کا میلا اور اجلا ہونا اور بات ہے اور شرعاً پاک و ناپاک ہونا اور بات ہے۔

بغل کے اور زیر ناف بالوں کے ازالے کیلئے کون سا طریقہ بہتر ہے؟

سوال: عام طور پر مرد بغل کے اور زیر ناف بالوں کو مونڈتے ہیں اور خواتین اس سلسلے میں کریم یا پاؤڈر کا استعمال کرتی ہیں، کیا اس کے برعکس کرنا جائز ہے؟ (م، ن، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: زیر ناف بالوں کا ازالہ دین فطرت کی ان اقدار میں سے ہے جو ملت ابراہیمی میں بھی شامل تھیں اور ہمارے نبی مکرم ﷺ کی شریعت مطہرہ میں بھی شامل ہیں۔ شریعت کا اصل مقصود تطہیر و نفاست ہے اور ان غیر ضروری بالوں کا ازالہ ہے، اس کے تین طریقے ہو سکتے ہیں۔ مونڈنا (یعنی استرے یا بلیڈ کا استعمال) قصر (تراشنا، قینچی وغیرہ سے) اور نتف (اکھیڑنا، آج کل اس کے لئے کریم یا پاؤڈر کا استعمال ہوتا ہے) شرعاً یہ تینوں طریقے مرد اور عورت دونوں کے لئے درست ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ تاہم حدیث وفقہ کے کلمات کی روشنی میں مرد کے لئے حلق (مونڈنا) افضل ہے اور عورت کے لئے نتف (کریم یا پاؤڈر کے ذریعے) لیکن اس کے برعکس بھی جائز ہے۔

﴿كتاب الصلوٰة﴾

باب الاذان، دعاء بعد الاذان ودعا کے کلمات

نوٹ:۔ پاکستان ٹیلی ویژن سینٹرل ڈائریکٹریٹ اسلام آباد سے ڈائریکٹر پروگرامز جناب محسن علی صاحب کی طرف سے باقاعدہ دستخط شدہ یہ استفتاء موصول ہوا تھا۔ جس کا جواب ہم نے انہیں ارسال کیا اور بعد ازاں اس کی عمومی افادیت کے پیش نظر اسے روزنامہ ''جنگ'' کراچی، روزنامہ ''ایکسپریس'' کراچی، ماہنامہ ''السعید'' ملتان، ماہنامہ ''نور الحبیب'' بصیر پور نے بھی شائع کیا، اوراس کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے اسے تفہیم المسائل میں شامل کیا ہے۔

ٹیلی ویژن سے اذان نشر کرنے کے بعد دعاء مسنون مع ترجمہ پڑھی جاتی ہے، اس ''دعابعد الاذان'' کے بارے میں وقتاً فوقتاً بعض حضرات کی جانب سے چند اعتراضات کیے جاتے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) یہ کہ ''اَلدَّرَجَۃُ الرَّفِیْعَۃُ'' اور ''اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ'' کے کلمات اضافی ہیں، کیونکہ یہ ''صحیحین'' میں مذکور نہیں ہیں۔

(۲) یہ کہ اس دعاء میں رسول اللہ ﷺ کے لئے جن مقامات رفیعہ کی دعا کی جاتی ہے وہ تو آپ کو پہلے سے ہی حاصل ہیں، جب کہ اس دعا سے یہ تاثر ملتا ہے کہ گویا آپ ابھی ان مراتب پر فائز نہیں ہوئے اور ہماری دعاؤں کی ضرورت ہے۔ اس طرح اس دعا سے معترضین کی سوچ کے مطابق توہین رسالت کا پہلو نکلتا ہے۔

(۳) یہ کہ ''وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ'' کے کلمات بصورت دعاء احادیث میں مذکور نہیں ہیں۔ جواباً مندرجہ ذیل گزارشات پیش خدمت ہیں۔

(۱) ''دعابعد الاذان'' متعدد احادیث صحیحہ صریحہ سے ثابت ہے اور یہ اپنی اصل کے اعتبار سے سنت ہے۔

(۲) اہل سنت کے کسی بھی مکتبۂ فکر کے نزدیک یہ قطعی اور طے شدہ اصول نہیں ہے کہ صرف ''صحیحین'' یا ''صحاح ستہ'' میں مندرج احادیث ہی لائق استناد ہیں اور ان کتب احادیث

سے باہر کوئی بھی حدیث لائق استناد اور حجت نہیں ہے، ورنہ تو احادیث کی بقیہ تمام کتب بیک جنبش قلم ساقط الاعتبار اور قابل تنسیخ قرار پائیں گی اور صحاح، سنن، مسانید، معاجم اور مصنفات پر مشتمل دسیوں ماٰخذ حدیث ہمارے قابل فخر سرمایۂ حدیث سے حذف اور کالعدم ہو جائیں گے۔ حدیث کو ''صرف معیارِ صحت'' پر پرکھا جاتا ہے اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف احادیث بھی معتبر ہوتی ہیں اور یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ ''حدیث ضعیف'' اور ''حدیث موضوع'' میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

(۳) ٹیلی ویژن پر جو ''دعا بعد الاذان'' نشر کی جاتی ہے اس کے بیشتر الفاظ ''صحیح بخاری'' اور ''صحاح ستہ'' میں موجود ہیں۔ دراصل متعدد کتب احادیث اور روایات میں منقول الفاظ مبارکہ کو نہایت کمال اور شان جامعیت کے ساتھ اس دعاء میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اور اس دعاء میں ایک بھی ایسا لفظ نہیں ہے جو بلفظہٖ یا قریب المعنیٰ الفاظ کے ساتھ کسی نہ کسی حدیث میں مذکور نہ ہو۔

معترضین نے جن کلمات کو اضافی قرار دیا ہے وہ مندرجہ ذیل احادیث سے ماخوذ ہیں:

(الف) عَنْ اَیُّوْبَ وَ عَنْ جَابِرِ الْجُعْفِیِّ قَالَا: مَنْ قَالَ عِنْدَ الْاِقَامَةِ اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَآئِمَةِ اَعْطِ سَیِّدَنَا مُحَمَّدَانِ الْوَسِیْلَةَ وَارْفَعْ لَهُ الدَّرَجَاتِ حُقَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

(المصنف للحافظ عبد الرزاق الجزء الاول حدیث نمبر 1991 صفحہ:496,495 باب الدعاء بین الاذان والاقامۃ مطبوعۃ: المجلس العلمی پاکستان)

''حضرت ایوب اور جابر جعفی روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے اقامت کے وقت (یعنی اذان کے بعد) یہ دعا مانگی ''اے اللہ! اس دعوت کامل اور (تا قیامت) قائم ہونے والی نماز کے رب تو ہمارے آقا محمد ﷺ کو (مقام) وسیلہ عطا فرما اور ان کے درجات کو بلند فرما، تو (قیامت میں) نبی ﷺ پر اس کی شفاعت واجب ہے''۔

دعا بعد الاذان میں ''الدَّرَجَۃُ الرَّفِیْعَۃ'' کے کلمات مندرجہ بالا حدیث پاک کے خط کشیدہ الفاظ سے ماخوذ و مفہوم ہیں۔

(ب) عَنْ جَابِرِ بِنْ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِیْنَ سَمِعَ النِّدَاءَ: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ ھٰذِہٖ الدَّعْوَۃِ التَّامَّۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْقَائِمَۃِ اٰتِ مُحَمَّدَانِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَابْعَثْہُ الْمَقَامَ الْمَحْمُوْدَنِ الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ حَلَّتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ

(السنن الکبریٰ للبیہقی صفحہ:401 مطبوعہ ملتان)

''حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اذان سن کر یہ دعا پڑھے: ''اے اللہ! میں اس دعوت کامل اور (تا قیامت) قائم ہونے والی نماز کے وسیلے سے تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو محمد ﷺ کو مقام وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور انہیں اس مقام محمود پر فائز فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے، بلاشبہ تو وعدے کے خلاف نہیں فرماتا'' تو اس کے لئے (قیامت کے دن) میری شفاعت جائز ہو جائے گی۔

دعاء بعد الاذان میں ''اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ'' کا جملہ بعینہٖ اور بلفظہٖ مندرجہ بالا حدیث مبارک سے لفظاً ماخوذ ہے۔

(۴) رہا معترضین کا یہ سوال کہ اس دعا سے توہین رسالت کا پہلو نکلتا ہے اور حضور ﷺ کو تو چودہ سو سال قبل ہی اللہ تعالیٰ نے یہ مقامات رفیعہ عطا فرما دیئے تھے، ہماری دعاؤں کی ان کو کیا احتیاج ہے؟ وغیرہ، تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ یہ کتاب و سنت اور دین کے مزاج سے ناواقفی کی بناء پر ہے، ورنہ معمولی تامل بھی فرماتے تو یہ اشکال رفع ہو جاتا۔ تاہم اس کی چند توجیہات درج ذیل ہیں:

(الف) نبی کریم ﷺ کے لئے مقام وسیلہ، فضیلت، درجہ رفیعہ اور مقام محمود کی اللہ تعالیٰ

سے دعا کرنے سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ حضور ﷺ کو ہماری دعاؤں کی احتیاج ہے۔ بلکہ اس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی ذات سے اپنی محبت، عقیدت اور اخلاص کا اظہار مقصود ہے جو بلاشبہ ہمارے لئے دنیا و آخرت میں فلاح و نجات کا باعث ہے۔ کیا ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت، تسبیح اور تحمید اس لئے کرتے ہیں کہ معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ ہماری بندگی کا تقاضا ہے اور اس کا فیض خود ہماری ذات کو پہنچتا ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا'' یعنی اے ایمان والو! تم ان پر درود بھیجو اور خوب سلام بھیجا کرو'' نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنے کا مطلب اللہ تعالیٰ کی ذات سے ان پر نزول رحمت کی دعا مانگنا ہے، حالانکہ وہ تو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں، برکتوں اور انوار و تجلیات کا مہبط و منبع ہیں بلکہ ''رحمۃ للعالمین'' ہیں تو پھر یہ حکم کیوں؟ اس کی حکمت تک ہم پہنچ سکیں یا نہیں ہم پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل واجب ہے۔ اسی طرح دعاء بعد الاذان میں بھی ارشاد رسول ﷺ کی تعمیل ضروری ہے اور ہم اس پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یقیناً ماجور ہوں گے۔

(ج) اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درجات و مراتب کی کوئی انتہا نہیں ہے بلکہ یہ لامتناہی ہیں۔ اس لئے ایک درجے کے بعد دوسرے درجے اور ایک مرتبے کے بعد دوسرے مرتبے کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بالکل ممکن ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کے لئے ارشاد فرمایا:

عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ (النساء:113)

''اور آپ جو کچھ نہیں جانتے تھے، وہ (سب کچھ) اس (اللہ) نے آپ کو سکھا دیا اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے سب کچھ اور کائنات میں سب سے زیادہ علم عطا کرنے کے باوجود اپنے حبیب کریم کو یہ دعاء مانگنے کی تلقین فرمائی: ''وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴿﴾'' اور کہہ دیجئے! اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما (طٰہٰ) ایسا کیوں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات علم کی کوئی انتہا نہیں ہے، اس لئے اس کی بارگاہ میں زیادہ اور مزید زیادتی کی دعاء علم

یا مراتب علم کی کمی کی طرف مشیر نہیں بلکہ ان میں اضافے کی دلیل ہے۔

(د) اگر یہ کہا جائے کہ جو مقام رفعت وفضیلت پہلے سے حاصل ہو، اس کے لئے دعاء کرنے کا کیا جواز ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ رسول اللہ ﷺ نہ صرف یہ کہ روز اول سے مہدی یعنی ہدایت یافتہ تھے بلکہ ساری امت کے لئے ہادی ومرشد بن کر تشریف لائے تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ

(سورۃ المائدہ: 15-16)

''بے شک جلوہ گر ہوا تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب، اللہ اس کے ذریعے سلامتی کی راہوں پر لاتا ہے ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنے ارادہ سے انہیں تاریکیوں سے نکالتا ہے نور کی طرف''۔

اس کے باوجود آپ ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے اندر اپنے رب ذوالجلال سے دعا مانگتے تھے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ یعنی ''اے اللہ تو ہمیں سیدھے راستے پر چلا'' اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عطائے نعمت اور بندے کی طرف سے حصول نعمت کے باوجود بقاء و دوام نعمت کے لئے مسلسل بارگاہ الوہیت میں رجوع کی ضرورت رہتی ہے اور یہ تشکر نعمت کی ایک بہترین صورت بھی ہے۔

(۵) ''دعا بعد الاذان'' پر ایک اور اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ احادیث میں ''حَلَّتْ لَهٗ شَفَاعَتِيْ''، ''حَلَّتْ عَلَيْهِ شَفَاعَتِيْ'' اور ''حَلَّتْ عَلَيْهِ الشَّفَاعَةُ'' حُقَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ''، ''وَجَبَتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ'' اور ''جَعَلَهُ اللّٰهُ فِيْ شَفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' کے الفاظ تو آتے ہیں لیکن ''وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ'' بہ انداز دعا کے الفاظ نہیں آئے، مذکورہ بالا الفاظ بطور وعدہ اور بشارت کے ہیں۔ یعنی جو صاحب ایمان اذان کے بعد یہ دعاء مانگے وہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا آخرت میں حق دار قرار پائے گا، اسی وعدہ

اور بشارت کے کلمات سے اکتساب فیض کرتے ہوئے دعاء کے آخر میں دعاء شفاعت کے کلمات شامل کردیئے گئے ہیں جو معنی حدیث کے عین مطابق ہے۔ لیکن معترض کی تسلی کے لئے یہ عرض ہے کہ ایک اور روایت میں یہ دعائیہ کلمات لفظاً بھی مذکور ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ سَمِعَ النِّدَآءَ فَقَالَ اَشْهَدُاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَبَلِّغْهُ دَرَجَةَ الْوَسِیْلَةِ عِنْدَكَ وَاجْعَلْنَا فِیْ شَفَاعَتِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَجَبَتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ۔

(المعجم الکبیر صفحہ: 66 حدیث 12554، الجزاء الثانی عشر، داراحیاء التراث العربی)

"حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اذان سن کر یہ دعاء پڑھے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، اے اللہ! ان پر اپنی رحمت نازل فرما اور انہیں اپنے پاس "درجۂ وسیلہ" پر پہنچا اور ہمیں روز قیامت ان کی شفاعت نصیب فرما، تو اس کے لئے شفاعت (نبی کریم ﷺ کے ذمۂ کرم پر) واجب ہے۔

اس حدیث پاک میں "دعاء شفاعت" کے کلمات بھی صراحۃً مذکور ہیں (یہ حدیث مجمع الزوائد جلد نمبر 1 صفحہ 333 پر بھی درج ہے)

(۵) رہا یہ سوال کہ متفرق احادیث میں روایت کیے گئے کلمات کو یکجا کرنے کا کیا جواز ہے؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مثلاً کلمۂ طیبہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کلمۂ اسلام کہلاتا ہے۔ لیکن یہ قرآن مجید میں یکجا کسی ایک مقام پر مذکور نہیں ہے بلکہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" سورہ محمد" کی آیت نمبر 19 اور "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" سورۃ الفتح کی آیت نمبر 29 سے ماخوذ ہے اور جمعہ کی پہلی چار سنتوں اور فرض جمعہ کے بعد

چھ سنتیں کسی ایک حدیث میں یکجا مروی نہیں ہیں بلکہ متفرق احادیث کو یکجا کر کے ان پر عمل کیا جاتا ہے۔اسی طرح قرآن مجید میں ارکان صلوٰۃ کسی ایک مقام پر ترتیب کے ساتھ ذکر نہیں کیے گئے بلکہ متعدد و متفرق آیات میں وہ الگ الگ مذکور ہیں ۔لیکن چونکہ سارا قرآن باہم مربوط ہےاوراس کی آیات ایک دوسرے کی تصدیق و تکمیل کرتی ہیں ۔اس لئے متفرق آیات میں الگ الگ مذکور ارکان صلوٰۃ کو ایک ترتیب سے مرتب انداز میں بیان کیا جاتا ہےاوران پر عمل کیا جاتا ہے۔

(۲) ''دعاء بعد الاذان'' کی احادیث کے چند حوالہ جات درج ذیل ہیں:

(۱) صحیح البخاری الجزء الاول صفحہ : 1901 حدیث نمبر 614، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان۔

(۲) صحیح مسلم الجزء الاول صفحہ: 289 حدیث نمبر 753، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان۔

(۳) سنن الترمذی الجزء الاول صفحہ: 253 حدیث نمبر 211، مطبوعہ دار الفکر، بیروت۔

(۴) سنن ابی داؤد الجزء الاول صفحہ: 186 حدیث نمبر 529، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان۔

(۵) سنن ابی داؤد الجزء الاول صفحہ: 184-185 حدیث نمبر 523، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان۔

(۶) سنن النسائی الجزء الاول صفحہ: 356,355 حدیث نمبر 679، مطبوعہ مکتبہ المؤید ریاض۔سعودی عرب

(۷) سنن ابن ماجہ الجزاء الاول صفحہ: 399 حدیث نمبر 622، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، لبنان۔

(۸) السنن الکبریٰ صفحہ: 410 مطبوعہ نشر السنۃ ملتان۔

(۹) المصنف للحافظ عبد الرزاق الجزء الاول صفحہ: 496,495 حدیث نمبر 1911، مطبوعہ

المجلس العلمی پاکستان۔

(١٠) المعجم الکبیر الجزء الثانی صفحہ: 66 حدیث نمبر 12554 ، مطبوعہ دار الاحیاء التراث العربی، لبنان۔

(١١) المعجم الاوسط الجزء الرابع صفحہ: 397 حدیث نمبر 3675، مطبوعہ مکتبہ الریاض، سعودی عرب۔

(٧) محولہ بالا احادیث میں سے حدیث نمبر 2 اور حدیث نمبر 5 میں رسول اللہ ﷺ نے موذن کے ساتھ کلمات اذان دہرانے کا حکم فرمایا ہے اور فرمایا کہ اس کے بعد مجھ پر درود پڑھو کیونکہ جو صاحب ایمان مجھ پر درود بھیجے گا، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ لہٰذا افضل اور مسنون امر یہ ہے کہ اذان کے بعد اولاً درود شریف پڑھا جائے اور اس کے بعد مسنون دعا پڑھی جائے۔ اس سے انشاء اللہ اجر وثواب میں بے پایاں اضافہ ہوگا اور فرمان رسول اللہ ﷺ کی کما حقہ تعمیل بھی ہوگی۔

(٨) میرے نزدیک زیر بحث دعاء مسنون بعد الاذان کا مناسب ترجمہ یہ ہے:

ترجمہ: ''اے اللہ اس دعوت کامل اور تا قیامت قائم ہونے والی نماز کے رب تو محمد ﷺ کو جنت میں نمایاں مقام، فضیلت اور بلند درجہ عطا فرما اور انہیں اس مقام محمود پر فائز فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے۔ اور قیامت کے دن ہمیں ان کی شفاعت نصیب فرما۔ بے شک تو وعدے کے خلاف نہیں فرماتا۔'' محولہ بالا حدیث نمبر 2 اور 5 میں نبی کریم ﷺ نے اذان کے بعد درود بھیجنے کا حکم فرمایا اور اس کے بعد فرمایا کہ: ''پھر اللہ عزوجل سے میرے لئے ''الوسیلہ'' کی دعا مانگو کیونکہ یہ جنت میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے صرف ایک بندہ خاص ہی کے شایان شان ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بندۂ خاص میں ہی ہوں گا''۔ ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں، میں نے ''الوسیلہ'' کا ترجمہ ''جنت میں نمایاں مقام'' کیا ہے اس طرح حدیث کی صحیح ترجمانی ہوگی اور رسول اللہ ﷺ کی منشا بھی واضح ہوجائے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق سمجھنے، اسے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

تثویب کیا ہے؟

سوال: کیا اذان کے بعد تثویب کہنا جائز ہے؟

(مولانا عبدالعزیز فیضی، مدینہ مسجد، خداداد کالونی)

جواب: ''تثویب'' کسی اعلان کے دوبارہ اعلان کرنے کو کہتے ہیں، فقہی اصطلاح میں تثویب کے معنی ہیں اذان اور اقامت کے درمیان ''نماز با جماعت'' کا دوبارہ اعلان کرنا کیونکہ اذان بھی فی نفسہ ایک اعلان ہے۔ فتاویٰ شامی میں ہے کہ مغرب کے سوا باقی تمام نمازوں کے لئے تثویب جائز ہے کیونکہ دینی امور میں لوگوں میں سستی کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ ''قامت قامت'' (یعنی نماز کھڑی ہو رہی ہے) یا ''الصلوٰۃ الصلوٰۃ'' یا جو بھی لوگوں کے درمیان اس مقصد کے لئے متعارف کلمات ہوں جائز ہیں، جیسے کراچی کی بعض مساجد میں ''الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ'' پڑھا جاتا ہے،۔ علامہ شامی عنایہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اصلاً تو تثویب نماز فجر کے لئے شروع ہوئی تھی لیکن بعد میں متاخرین فقہاء نے اسے مغرب کے علاوہ تمام نمازوں کے لئے جاری کر دیا۔ اور جس بات کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کو بھی پسند ہوتی ہے۔ (رد المختار جلد نمبر 1 صفحہ: 264 مطبوعہ بیروت) فتاویٰ عالمگیری جلد نمبر 1 صفحہ نمبر 56 پر ہے تثویب فجر کے سوا ہر نماز میں متاخرین کے نزدیک مستحسن ہے۔

بیت الخلاء میں اذان کا جواب

سوال: اگر بیت الخلاء میں اذن کی آواز سنائی دے تو کیا اس کا جواب دے سکتے ہیں؟

(سید محبوب شاہ، قائد آباد، کراچی)

جواب: بیت الخلاء میں اذان کی آواز سنائی دے تو جواب نہیں دینا چاہیے۔ وہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کا نام لینا یا قرآن کی تلاوت کرنا یا تسبیحات و درود پڑھنا یا کلمات اذان کو دہرانا خلاف ادب اور گناہ ہے۔

خطبے کے دوران کلام اور نشست کے آداب

سوال: اذان خطبہ کا جواب اور دعا مقتدی کو آواز سے پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ دوران خطبہ آیت درود آ جائے تو مقتدی کو درود آواز سے پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ اور خطبے کے دوران نمازیوں کو کس طرح بیٹھنا چاہیے؟ (مولانا عبدالعزیز فیضی، جامع مسجد خداداد کالونی، کراچی)

جواب: بہتر ہے کہ نمازی اذان خطبہ کے کلمات کا اعادہ اور بعد الاذان دعا آواز سے پڑھنے کے بجائے دل میں پڑھیں۔ اس طرح اگر امام خطبے کے دوران آیت درود پڑھے تو نمازی آواز سے درود پاک پڑھنے کے بجائے دل میں پڑھیں۔ خطبۂ جمعہ کے دوران مقتدیوں کے لئے کسی خاص ہیئت میں بیٹھنے کا لازمی حکم نہیں ہے۔ بس اتنا ضروری ہے کہ صف بستہ ہو کر باادب بیٹھیں، ہو سکے تو اس طرح بیٹھیں جیسے حالت تشہد میں بیٹھتے ہیں، لیکن اگر کسی کو زیادہ دیر تک اس طرح بیٹھنے میں دشواری ہو تو وہ جس طرح بیٹھنے میں آسانی محسوس کرے، اس طرح بیٹھ جائے۔

نماز کی نیت میں تاخیر

سوال: رمضان المبارک کی نماز تراویح میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ مقتدی کو نیت کے الفاظ ادا کرنے میں کچھ وقت لگ جاتا ہے اور اس عرصے میں حافظ صاحبان قرأت شروع کر دیتے ہیں اور ہم لوگ ثناء (**سبحانک اللھم**) نہیں پڑھ پاتے؟

(سید عزیز برنی، دستگیر کالونی)

جواب: نیت دل کے ارادے کا نام ہے یعنی یہ کہ انسان کے ذہن میں یہ بات بالکل مستحضر ہو کہ آپ کون سی نماز پڑھ رہے ہیں، کتنی رکعات ہیں، وقت کا تعین وغیرہ۔ لفظاً نیت کرنے کو متاخرین فقہاء امت نے محض اس غرض سے مستحسن قرار دیا کہ توجہ مقصد کی جانب مرکوز ہو جائے، ذہنی انتشار نہ رہے، لہٰذا اگر کبھی آپ لفظاً نیت نہ بھی کریں لیکن حضور ذہن ہے تو تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دیجئے، اجر میں کوئی کمی نہیں آئے گی، انشاء اللہ، اور نماز تراویح میں تو 20 رکعات کی نیت (دس دوگانہ کی صورت میں) ایک ساتھ بھی کر سکتے

ہیں، بار بار نیت کے الفاظ دہرانا ضروری نہیں ہے۔

رکوع اور سجود میں کتنی دیر ٹھہرے

سوال: رکوع وسجود میں کتنی دیر ٹھہرنا فرض ہے؟ (سید محمد علی اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: رکوع وسجود میں ایک مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہنے کی مقدار ٹھہرنا فرض ہے، اس سے کم وقفہ کیا تو رکوع اور سجدہ ادا نہیں ہوں گے۔ تین بار رکوع وسجود کی تسبیحات پڑھنا سنت ہے اور اتنی دیر تک ٹھہرے رہنا بھی سنت ہے، تین سے زیادہ طاق مرتبہ تسبیحات پڑھنا مستحب ہے۔

تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا

سوال: قعدۂ نماز میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنے کی شرعاً کیا حیثیت ہے اور اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ (سہیل ساجد، کیماڑی، کراچی)

جواب: (۱) صحیح مسلم میں حدیث ہے: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تو اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھتے اور جو انگلی انگوٹھے کے قریب ہے اس سے اشارہ کرتے دراں حالیکہ آپ کا بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر بچھا ہوتا''۔

(۲) ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد میں بیٹھتے تو بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھتے اور دایاں، دائیں پر اور شہادت کے وقت ترپن کا عقد بناتے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے''۔

اس موضوع پر احادیث مبارکہ بکثرت ہیں اور حد شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں۔ **الفقہ علی المذہب الاربعہ** مؤلفہ عبدالرحمٰن الجزیری میں ہے: ''امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک سبابہ (انگشت شہادت) کے سوا تمام انگلیوں کے ساتھ مٹھی بند کرکے اور سبابہ سے اشارہ کرے اسی کو ترپن کا عقد کہتے ہیں، اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک خنصر اور بنصر (چھنگلی اور اس کے برابر والی انگلی) کو بند کرے اور درمیانی انگلی کو انگوٹھے کے ساتھ ملا کر حلقہ بنائے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ''**اشهد ان**

لا الہ الا اللہ ''میں ''لا'' پر انگلی اٹھائے اور ''الا'' پر رکھ دے، تاکہ نفی کے ساتھ رفع (انگلی اٹھانے) اور اثبات کے ساتھ وضع (انگلی رکھنے) کی مناسبت ہو۔ امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے نزدیک لفظ اللہ پر انگلی اٹھائے تاکہ قول اور عمل سے توحید ظاہر ہو۔ ائمہ ثلاثہ ترپن کا عقد بنانے کے قائل ہیں اور امام احمد بن حنبل حلقہ بنانے کے قائل ہیں اور دونوں طریقے حدیث سے ثابت ہیں۔ الغرض رفع سبابہ پر ائمہ اربعہ اور احناف کے تینوں ائمہ کا اجماع ہے۔ بعض متاخرین فقہاء احناف کے اقوال کی روشنی میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ التحیات میں کلمہ شہادت پڑھتے وقت انگشت شہادت اٹھانے کو جائز نہیں سمجھتے۔ علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثانی صفحات 168 تا 177 میں حضرت مجدد الف ثانی کا موقف تفصیل کے ساتھ بیان کر کے ان کے دلائل کا جواب دیا ہے۔ علمی ذوق رکھنے والے حضرات اس مقام کا مطالعہ کریں۔

نمازی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے؟

سوال: ایک نمازی مسجد میں پہنچا، اس وقت امام رکوع میں تھا۔ مقتدی نیت کر کے پہلے ہاتھ باندھ کر ''سبحانک اللھم'' پڑھے یا صرف ہاتھ باندھ کر رکوع میں چلا جائے؟۔

(زاہد حسین، مانسہرہ کالونی، کراچی)

جواب: جب نمازی مسجد میں داخل ہو اور امام کو رکوع میں پائے، تو سب سے پہلے، دیکھے کہ اسے صف میں کہاں کھڑا ہونا ہے، اگر پہلی صف مکمل ہے تو نئی صف میں درمیان میں امام کے بالکل پیچھے کھڑا ہو، اگر اس صف میں پہلے سے کچھ نمازی کھڑے ہیں تو وسط صف سے جس طرف آدمی کم ہوں، اس طرف کھڑا ہو جائے۔ اگر دونوں طرف آدمی برابر ہوں تو پھر دائیں جانب کھڑا ہو، پہلے بالکل سیدھا کھڑا ہو کر نیت کرے اور تکبیر تحریمہ (اللہ اکبر) کہے، پھر دوسری تکبیر (یعنی تکبیر رکوع) کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ ہاتھ باندھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حالت قیام میں ہاتھ تب باندھے جاتے ہیں جب کچھ پڑھنا ہو، اگر یہ سمجھتا ہے کہ ''سبحانک اللھم'' پڑھنے سے امام رکوع سے

اٹھ جائے گا تو ثناء پڑھنا چھوڑ دے۔ اگر عجلت میں سیدھا کھڑے ہوئے بغیر تکبیر تحریمہ جھکتے ہوئے کہی اور اس طرح رکوع میں چلا گیا تو فرض قیام رہ جانے سے رکعت نہیں ملے گی۔

نابالغ بچے کی امامت

سوال: بعض بچے کم عمری میں قرآن مجید حفظ کر لیتے ہیں، کیا نابالغ بچے کی اقتدا میں نماز تراویح پڑھی جاسکتی ہے؟۔ (سید عمیر الحسن، فیڈرل بی ایریا)

جواب: تراویح کی امامت کا شرعی معیار بھی وہی ہے جو فرض نمازوں کا ہے لہٰذا نابالغ بچے کی اقتدا میں نماز تراویح کا پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح داڑھی منڈے حافظ قرآن کی امامت بھی جائز نہیں ہے۔

سورۃ الکوثر کی صرف دو آیتیں پڑھنا

محترم المقام جناب مفتی صاحب، دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

صورت مسئولہ یہ ہے کہ ایک امام صاحب رمضان المبارک میں وتر کی نماز با جماعت پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے ایک رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ الکوثر کی قرأت شروع کی، ابتدائی دو آیات پڑھیں مگر تیسری آیات یاد نہ رہی، انہوں نے ایک بار ابتدائی آیات کا تکرار بھی کیا مگر اس کے باوجود تیسری آیت زبان پر جاری نہ ہو سکی۔ انہوں نے اسی قدر قرأت پر اکتفا کرتے ہوئے اللہ اکبر کہا اور بقیہ نماز حسب معمول مکمل کر لی، سجدہ سہو نہیں کیا۔ امام صاحب نے یہ سمجھا کہ کم از کم مقدار واجب کی حد تک قرأت ہو چکی ہے۔ ترک واجب نہیں ہوا۔ لہٰذا سجدۂ سہو کی ضرورت نہیں ہے اور نماز بلا کراہت مکمل ہو گئی۔ اس کے برعکس بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ امام کو سجدۂ سہو کرنا چاہیے تھا اور چونکہ انہوں نے سجدۂ سہو نہیں کیا، اس لئے نماز واجب الاعادہ ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شرع متین امام صاحب کا موقف درست ہے یا معترضین کا؟ از روئے شرع متین وفقہ حنفی مفصل و مدلل جواب عنایت فرما کر عنداللہ

ماجور ہوں اور حق وصواب کی طرف ہماری رہنمائی فرمائیں۔

المستفتی

عبدالرزاق، مانسہرہ، ہزارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب هو الموفق للصواب بتوفيق الله تعالىٰ وعونهٖ

صورت مسئولہ کا براہ راست اور مختصر جواب یہ ہے کہ امام صاحب کا موقف درست ہے اور معترضین کا اعتراض بے جا، ''سورۃ فاتحہ'' کے بعد ''سورۃ الکوثر'' کی ابتدائی دو آیات پڑھنے سے ''ضم سورۃ'' کا واجب ادا ہو گیا اور قرأت بہ مقدار واجب ہو گئی، ترک واجب نہیں ہوا، لہٰذا سجدۂ سہو کی ضرورت نہیں، کیونکہ ''سورۃ الکوثر'' کی ابتدائی دو آیات کے حروف کی مجموعی تعداد تیس بن جاتی ہے اور علامہ محمد امین ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ نے اسقاط واجب کے لئے اسی کو معیار قرار دیا ہے۔

تفصیلی دلائل حسب ذیل ہیں:

نماز میں سورۃ الفاتحہ کے بعد ''ضم سورۃ'' کے وجوب کے لئے مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ وارد ہوئی ہیں:

(۱) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ اَمَرَنَا نَبِیُّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَقْرَءَ الْفَاتِحَةَ وَمَا تَیَسَّرَ
(صحیح ابن حبان جلد 3 صفحہ: 211، ابو داؤد جلد 1 صفحہ: 118)

حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز میں فاتحہ اور جو کچھ میسر ہو قرآن میں سے پڑھیں۔

(۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (مَرْفُوْعًا) لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْکِتٰبِ فَمَا زَادَ۔ وَقَالَ الْحَاکِمُ هٰذَا حَدِیْثٌ،

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ نماز فاتحہ اور کچھ زائد حصے کے بغیر نہیں ہوتی۔

صَحِیْحٌ لَا غُبَارَ عَلَیْهِ
(ابو داؤد جلد 1 صفحہ 118، ومستدرک حاکم جلد 1 صفحہ:239)

(۳) لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَءْ بِفَاتِحَةِ الْکِتٰبِ فَصَاعِدًا (مسلم جلد 1 صفحہ: 169، نسائی جلد 1 صفحہ:145)

سورۃ فاتحہ اور کچھ زائد حصے کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

(۴) لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَءْ بِالْحَمْدِ وَسُوْرَةٍ فِیْ فَرِیْضَةٍ اَوْ غَیْرِهَا (ترمذی صفحہ:61، ابن ماجہ صفحہ:60، مصنف یا ابن ابی شیبہ جلد 1 صفحہ:361)

نماز الحمد (سورۃ فاتحہ) اور کسی سورۃ کے ملانے کے بغیر نہیں ہوتی خواہ نماز فرض ہو یا اس کے علاوہ۔

(۵) لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْکِتٰبِ وَاٰیَتَیْنِ (اَیْ طَوِیْلَتَیْنِ) (شرح نقایہ جلد 1 صفحہ: 69، کنز العمال جلد 7 صفحہ:314 بحوالہ طبرانی)

سورۃ فاتحہ اور دو لمبی آیتوں کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

(۶) لَا تَجْزِیْ الْمَکْتُوْبَةُ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْکِتٰبِ وَثَلَاثِ اٰیَاتٍ فَصَاعِدًا (کنز العمال جلد 7 صفحہ:313 بحوالہ ابن عدی عن ابن عمر و نصب الرایہ جلد 1 صفحہ:365)

فرض نماز نہیں ہوتی سورۃ فاتحہ اور تین آیات یا اس سے کچھ زیادہ کے بغیر۔

(۷) لَا تَجْزِیْ صَلٰوةٌ لَا یُقْرَءُ فِیْهَا بِفَاتِحَةِ الْکِتٰبِ وَشَیْءٍ مَعَهَا مِنَ الْقُرْاٰنِ (نصب الرایہ جلد 1 صفحہ:365 بحوالہ ابو نعیم)

وہ نماز درست نہیں ہوتی جس میں سورۃ فاتحہ اور کچھ حصہ قرآن کا نہ پڑھا جائے۔

(۸) عَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ مَرْفُوْعًا اِذَا اسْتَقْبَلْتَ الْقِبْلَةَ فَکَبِّرْ ثُمَّ اقْرَءْ

حضرت رفاعہ بن رافع سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جب تم

بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ اقْرَءْ بِمَا شِئْتَ — نماز کے لئے قبلہ رخ ہوتو پہلے تکبیر کہو۔
(صحیح ابن حبان جلد 3 صفحہ: 209 واللفظ لہ و — پھر سورۃ فاتحہ پڑھو اور پھر قرآن میں جو
ابوداؤد جلد 1 صفحہ: 125) — حصہ چاہو پڑھو۔

ان احادیث طیبہ کو علامہ وصی احمد محدث سورتی متوفی 1334ھ نے اپنی تصنیف التعلیق المجلّی حاشیة منیة المصلی میں "ضم السورۃ او ما یقوم مقامها من الایات الیها" کے حاشیہ پر (صفحہ نمبر 272) یکجا کیا ہے۔ ان احادیث طیبہ میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ وجوب قرأت کے لئے فصاعداً (کچھ زائد) او غیرھا (اس کے علاوہ) وایتین (اور دو آیات) ماتیسر (جو بھی آسان ہو) مازاد (کچھ زاد) ثلاث ایات (تین آیات) وشئی معها من القرآن (قرآن کا کچھ حصہ) اور ثم اقراء بما شئت (پھر قرآن میں سے جو حصہ چاہو پڑھو) کے الفاظ وارد ہیں، جن کا منشا یہ ہے کہ اس کا مدار یسر پر ہے اور دو یا تین آیات سے بھی استقاط واجب ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات مبارکہ کی روشنی میں فقہاء کرام نے "ضم سورۃ" یعنی سورۃ الفاتحہ کے بعد قرأت کی مقدار واجب کے لئے ضوابط بیان کیے ہیں اور مسائل کا استنباط کیا ہے۔ زیر بحث مسئلہ سے متعلق چند اہم حوالہ جات درج ذیل ہیں:

(۱) علامہ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم الحلبی متوفی 776ھ اپنی تصنیف صغیری شرح منیة المصلی صفحہ 167 (مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی 1348ھ) پر رقم طراز ہیں:

> ثم یضم الی الفاتحة سورۃ او ثلاث أیات قصار قدرا قصر سورۃ وجوبا فان قرء مع الفاتحة أیة قصیرۃ او أیتین قصیرتین لم یخرج عن حد الکراهة ای کراهة التحریم لترك الواجب وان قرأ ثلاث أیات قصار او کانت ألایة والایتان تعدل ثلث أیات قصار خرج عن حد الکراهة المذکورۃ۔

(۲) مصنف مذکور اپنی تصنیف غنیۃ المستملی شرح منیۃ المصلی (المعروف کبیری) صفحہ 355 (مطبع ہوپ لاہور 1283ھ) پر لکھتے ہیں:

ثم یضم الی الفاتحة سورة اوثلث أیات قصار قدر ا قصر سورة و تقدم ان ذالك واجب كالفاتحة فان قرء مع الفاتحة آية قصيرة او آيتين قصيرتين لم يخرج عن حدالكراهة اى كراهة التحريم لا خلاله بالواجب وان قرء ثلث أيات قصار او كانت الآيه والآ يتان تعدل ثلث أيات قصار خرج عن حد الكراهة المذكورة۔

علامہ حلبی کی ان دو عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ ''ضم سورۃ'' یا تین چھوٹی آیات کا ملانا واجب ہے، لہٰذا اگر نماز میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ ایک یا دو آیات قصیرہ (چھوٹی آیات) پڑھیں تو ترک واجب کی وجہ سے یہ مکروہ تحریمی ہوگا (اور اس کی تلافی کے لئے سجدۂ سہو لازم ہوگا) لیکن اگر تین آیات قصار (چھوٹی آیات) پڑھیں یا ایک آیت طویلہ یا دو ایسی آیات پڑھیں جو تین'' آیات قصار'' کے برابر ہیں تو مکروہ تحریمی کا ارتکاب لازم نہیں آئے گا (لہٰذا اسقاط واجب کی بناء پر نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی اور سجدۂ سہو لازم نہیں ہوگا)۔

(۳) علامہ احمد بن اسماعیل الطحطاوی الحنفی متوفی 1231ھ حاشیہ مراقی الفلاح شرح نور الایضاح للشیخ حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی الحنفی متوفی 1069ھ کے صفحہ 148 (مطبوعہ مطبع مصطفی البابی الحلبی مصر 1356ھ) پر رقم طراز ہیں:

(قوله او ثلاث آيات قصار) قدرا قصر سورة او آية طويلة تعدل ثلاث آيات قصار۔	یعنی نماز میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ تین آیات قصار یا ایک آیت طویلہ جو تین آیات قصار کے برابر ہو کا ملانا واجب ہے۔

علامہ شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ متوفی 1386ھ لکھتے ہیں:

سوال نمبر 14: ایک مسجد کا امام الحمد کے بعد رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿١٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿١٨﴾ پڑھ کر رکوع میں چلا جاتا ہے اس صورت میں نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ (قاری محمد سلیمان مدرسہ عالیہ عربیہ، مسجد فتح پوری، دہلی)

جواب: صورت مذکورہ میں نماز تو ہو جاتی ہے لیکن امام کو ایسا نہ کرنا چاہیے کہ خلاف سنت ہے۔ (فقط، محمد مظہر اللہ غفر اللہ لہ، مسجد جامع فتح پوری دہلی)

(بحوالہ فتاوی مظہری مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی 1390ھ صفحہ:106)

(۵) بعینہ اسی استفتاء کے جواب میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے دار الافتاء کا فتویٰ درج ذیل ہے۔

جواب: بصورت مسئولہ سورۂ کوثر کی دو آیت پڑھنے سے قرأت کا فرض ادا ہو گیا کیونکہ یہ مقدار تین چھوٹی آیتوں کے برابر ہے۔ اور امام صاحب نے بغیر سجدہ سہو نماز مکمل کرادی درست کیا اس صورت میں سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔ اس لئے امام صاحب کا موقف درست ہے۔

فقط

ابو بکر سعید الرحمٰن

دار الافتاء جامعہ علوم اسلامیہ کراچی

(۶) مندرجہ بالا فقہی آراء و حوالہ جات میں ''آیات قصار'' کا ذکر بار بار آیا ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''آیت قصیرہ'' کا معیار کیا ہے؟ کیونکہ قرآن مجید میں چند آیات طوال بہت واضح اور متعارف ہیں، مثلاً ''سورۃ البقرہ'' آیات 286,282,255,177 وغیرہ، ان کے مقابلے میں اکثر آیات قصار ہیں اور آیات کا چھوٹا بڑا ہونا ایک اضافی امر ہے، چنانچہ فقہاء کرام نے اداءِ فرض اور اسقاط فرض کے لئے ''اَدْنٰی مَا یُطْلَقُ عَلَیْهِ الْقُرْآن'' یا ''اَقْصَرُ الْاٰیَةِ'' کو معیار قرار دیا ہے اور قرآن مجید کی سب سے چھوٹی آیت ''لَمْ یَلِدْ'' (الاخلاص:3) ہے جو صورتاً پانچ حروف پر مشتمل ہے اور تحقیقاً چھ حروف پر یا ''ثُمَّ نَظَرَ''

المدثر:21)جو چھ حروف پر مشتمل ہے۔

علامہ محمد بن علی بن محمد الحصکفی المتوفی 1088ھ (بحوالہ ردالمختار علی درالمختار صفحہ 501 جلد اول مطبوعہ استنبول 1327ھ) لکھتے ہیں:

وَ فَرْضُ الْقِرَاءَ ةِ آيَةٌ عَلَى الْمَذْهَبِ) هِيَ لَغَةُ الْعَلَامَةُ وَ عُرْفاً طَائِفَةٌ مِّنَ الْقُرْآنِ مُتَرْجَمَةٌ اَقَلُّهَا سِتَّةُ اَحْرُفٍ وَلَوْ تَقْدِيْرًا كَلَمْ يَلِدْ۔

اور اس کی شرح میں علامہ محمد امین ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

(قوله على المذهب) اى الذى هو ظاهر الرواية عن الامام وفى رواية عنه ما يطلق عليه اسم القرآن ولم يشبه قصد خطاب احد وجزم القدورى بأنه الصحيح من مذهب الامام ورجحه الزيلعى بأنه اقرب الى القواعد الشرعية لان المطلق ينصرف الى الادنى وفى البحر فيه نظر بل ينصرف الى الكامل قلت وهو مدفوع بأن براء ة الذمة لا تتوقف على الكامل والالزم فرضية الطمأنينة فى الركوع والسجود قال فى شرح المنية وعلى هذه الرواية لايجزى عنده نحو ثم نظر اى لانه يشبه قصد الخطاب والاخبار تأمل وفى رواية ثالثة عنه وهى قولهما ثلاث آيات قصار او آية طويلة۔

ان دونوں عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"ادائے فرض" کے لئے سب سے چھوٹی آیت ہی کافی ہے۔ یہ ظاہر الروایہ کے مطابق امام اعظم کا مذہب ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صاحب قدوری اور علامہ زیلعی نے اسی کو امام اعظم کا مذہب صحیح قرار دیا ہے، اور یہ قواعد شرعیہ کے قریب تر بھی ہے، کیونکہ

مطلق سے ''فردادنیٰ'' ہی مراد ہوتا ہے، پھر علامہ شامی نے اس پر علامہ زین الدین ابن نجیم متوفی 970ھ صاحب البحرالرائق کے اس اعتراض - کہ مطلق سے تو فرد کامل مراد ہوتا ہے؟ کا ذکر کر کے اسے رد کیا ہے کہ جب سوال ''اسقاط فرض'' اور ''براءۃ الذمہ'' (یعنی کسی فریضے سے عہدہ برا ہونا) کا ہو تو اس وقت ''فردِادنیٰ'' ہی مراد ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نماز کے رکن ''رکوع'' کے سلسلے میں حالت رکوع تک محض جھکنے ہی کو اسقاط فرض کے لئے کافی سمجھتے ہیں کیونکہ یہی رکوع کی ادنیٰ مقدار ہے اور اگر اسقاط فرض کے لئے ''فرد کامل'' معیار ہوتا تو رکوع میں تعدیل اور طمانیت فرض ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

(۷) اب زیر بحث مسئلہ ''ضم سورۃ'' واجب ہے اور اس کی مقدار فقہاء احناف کی متفقہ رائے کے مطابق ''تین آیات قصار'' ہیں یا ایسی ایک آیت طویلہ یا دو آیات جو تین آیات قصار کے مساوی ہوں اور یہ بدیہی امر ہے کہ اس کے لئے فقہاء کرام کی نظر قرآن مجید کی ایسی تین آیات قصار کی جانب متوجہ ہوگی جو کسی ایک مقام پر ''متوالیہ'' یعنی مسلسل ہوں اور وہ اکثر اجلہ وفقہاء کرام کی رائے میں یہ ہیں: ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ یعنی ''سورۃ المدثر'' کی آیات 22,21 اور 23۔

چنانچہ ذیل میں ہم ان فقہاء کرام کی آراء اور عبارات باحوالہ پیش کر رہے ہیں جنہوں نے ان تین آیات قصار کو قرأت واجبہ کے لئے معیار قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان تین آیات قصار کے برابر اگر ایک طویل آیت پڑھ لی جائے یا دو آیتیں پڑھ لی جائیں تو واجب ادا ہو جاتا ہے اور سجدۂ سہو لازم نہیں آتا۔

(۱) علامہ محمد بن علی بن محمد الحصکفی متوفی 1088ھ رقم طراز ہیں (بحوالہ الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار صفحہ 427 جلد اول مطبوعہ استنبول 1327ھ):

(وضم) اقصر (سورۃ) کالکوثر او ما قام مقامها وهو ثلاث آیات قصار نحو ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ وکذالو کانت الآیة والآیتان تعدل ثلاثا

قصار ا۔

(ب) علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحی بن عبدالحلیم لکھنوی متوفی 1304ھ، الہدایہ مؤلفہ علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی المرغینانی متوفی 593ھ کے حاشیے میں ملا الہداد کے حوالے سے صاحب ہدایہ (مطبوعہ المکتبۃ العربیۃ دستگیر کالونی، کراچی) کی عبارت (متن) ''ثم یقرأ بفاتحۃ الکتاب و سورۃ او ثلاث آیات من ای سورۃ شاء'' کے حاشیہ پر صفحہ 88 پر لکھتے ہیں:

قوله او ثلث آيات الخ۔ قلت او آية طويلة ففى الذخيرة قراءة ثلث آيات قصار او آية طويلة من واجبات الصلوٰة بالاجماع فلو قرء مع الفاتحة آية قصيرة سهواً فعليه السهو ذكر فى شرح اوراد انه لواكتفى مع الفاتحة على قوله تعالىٰ: ''وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا'' او قوله تعالىٰ: ''وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'' كما ذكر فى الاوراد انه يقرء التحية الوضوء الفاتحة مع الآية الاولى فى الركعة الاولى ومع الثانية فى الركعة الثانية جاز بلا كراهة اذ الواجب مع الفاتحة هو قدر ثلث آيات قصار كما هو المذكور فى الكتب المعتبرة والآيات القصار۔ مثل قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝۔

(ج) علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحی عبدالحلیم لکھنوی متوفی 1304ھ ''السعایہ فی کشف ما فی شرح الوقایہ'' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور 1396ھ صفحات 130,129 پر رقم طراز ہیں:

ونكر المصنف السورة ليفيد ان الواجب انما هو اقصر سورة الكوثر والاخلاص ومازاد عليه سنة او مندوب ولو قال وضم قدر سورة لكان اولى لماصرحوا من انه لوقرء قدرا قصر سورة نحو ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ خرج عن عهدة الوجوب۔ ولهذا قال العينی فی شرح تحفة الملوك الواجب قرأة السورة مع الفاتحة او قدرها انتهی۔ وفی غنية المستملی ان قرء ثلث أيات قصار او كانت الاية والايتان تعدل ثلث أيات خرج عن حد الكراهة المذكورة يعنی كراهة التحريم انتهی۔ وقال الحصكفی فی شرح ملتقی الا بحرلم اره لغيره وهو مهم فيه يسر عظيم لدفع كراهية التحريم انتهی۔

(د) علامہ الشاہ احمد رضا خان فاضل بریلوی متوفی 1340ھ العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ جلد سوم صفحہ نمبر 152 پر (مطبوعہ سنی دارالاشاعت علویہ رضویہ لائل پور 1393ھ) ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

مسئلہ: از بیکانیر مارواڑ محلہ مہاوتان مرسلہ قاضی تمیز الدین صاحب 9 ربیع الاول شریف 1338ھ۔

میں نے ایک معلم صاحب کی زبانی سنا ہے کہ نماز میں تین آیات شریف سے کم مضمون پڑھا جائے گا یعنی دو آیت شریف پڑھی جائیں گی تو نماز نہیں ہوگی اگر غلطی سے پڑھی گئی تو نماز کو دہرانا چاہیے۔ ایک امام نے پہلی رکعت میں ایک رکوع پڑھا دوسری رکعت میں وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَ يَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ تو قبلہ وکعبہ یہ دوسری رکعت میں جو پڑھا گیا وہ میں نے لکھا ہے یہ صرف دو آیت شریف ہیں، آیا نماز صحیح ہوگئی یا نہیں یا دہرانا پڑے گی۔

بینوا توجروا۔

الجواب: نماز میں ایک آیت پڑھنا فرض ہے مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس کے ترک سے نماز نہ ہوگی اور پوری سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد متصلاً تین آیتیں چھوٹی چھوٹی یا ایک آیت کہ تین چھوٹی آیت کے برابر ہو پڑھنا واجب ہے اور اگر اس میں کمی کرے گا نماز ہو تو جائے گی یعنی فرض ادا ہو جائے گا مکروہ تحریمی ہوگی بھول کر ہے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا اور قصداً ہے تو نماز پھیرنی واجب ہوگی اور بلا عذر ہے تو گنہگار بھی ہوگا مثلاً تین آیتیں یہ ہیں: ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ یا یہ اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ تو ظاہر ہے کہ وہ دو آیتیں وَاِنْ یَّكَادُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بلکہ اس میں کی پہلی ہی آیت ان تین چھوٹی آیتوں سے بڑی ہے تو نماز واجب ادا ہوگئی دہرانے کی حاجت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(ہ) علامہ محمد امجد علی اعظمی متوفی 1367ھ اپنی تصنیف ''بہار شریعت'' مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کراچی کی جلد سوم صفحہ نمبر 61 پر واجبات نماز کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

سورۃ ملانا یعنی ایک چھوٹی سورت اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ یا تین چھوٹی آیتیں جیسے ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ یا ایک یا دو آیتیں تین چھوٹی کے برابر پڑھنا۔

(۸) یہاں تک تو وہ حوالہ جات درج کیے گئے ہیں جن میں فقہاء کرام نے ''سورۃ المدثر'' کی تین آیات قصیرہ کو (21 تا 23) اسقاط واجب کے لئے مدار و معیار قرار دیا ہے یعنی یہ یا ان کے مساوی ایک طویل آیت یا دو آیتیں۔

چنانچہ علامہ عبدالحی فرنگی محلی نے مذکورہ بالا پیراگراف نمبر 7 (ب) میں حاشیہ ہدایہ پر ملا الهداد کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کی ایک رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 64 پڑھ لے یا سورۃ النساء کی آیت نمبر 110 پڑھ لے تو نماز ادا ہو جائے گی حالانکہ بظاہر یہ طویل آیات نہیں ہیں لیکن کم از کم مقدار واجب ان سے

پورا ہو جاتا ہے، اسی طرح فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے بھی اپنے فتویٰ میں لکھا ہے کہ سورۃ القلم کی آیت 51 یا سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی تین مختصر ترین آیات بھی ادائے واجب کے لئے کافی ہیں۔

(۹) بعض فقہاء کرام (مثلاً علامہ زین الدین ابن نجیم متوفی 970ھ) کی عبارات میں ہے کہ ''ثلاث آیات فصار کالکوثر'' اس عبارت میں ''سورۃ الکوثر'' کی آیات پر ''قصیرہ'' کا اطلاق لغوی اور عرفی اعتبار سے ہے، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ جو تین چھوٹی آیات ''ضم سورۃ'' کے وجوب کے لئے معیار ہیں وہ سورۂ کوثر کی تین آیات ہیں، کیونکہ اس سے پہلے ہم با حوالہ بیان کر چکے ہیں کہ وہ تین آیات قصار جو ''ضم سورۃ'' کے وجوب کو ساقط کرتی ہیں، وہ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَکْبَرَ ۝ ہیں یا ایسی ایک یا دو آیات جو مقدار میں ان کے مساوی ہوں۔

(۱۰) اب تک فقہاء کرام کی وہ آراء و عبارات تھیں جن میں تین آیات قصیرہ کو معیار بنایا گیا ہے، لیکن علامہ محمد امین ابن عابدین شامی نے ان تین آیات قصار کی تعداد حروف کو بھی معیار بنایا ہے جو مجموعی طور پر تیس حروف ہیں۔ لہٰذا تیس حروف پر مشتمل ایک یا دو آیات قرآنی پڑھنے سے بھی واجب ساقط ہو جاتا ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ردالمحتار مطبوعہ استنبول 1327ھ جلد اول کے صفحات 427 اور 502 پر اپنے اس موقف کو بیان فرمایا ہے، دونوں حوالہ جات بالترتیب درج ذیل ہیں:

(۱) (قولہ تعدل ثلاثا قصارا) ای مثل ثُمَّ نَظَرَ الخ وھی ثلاثون حرفا فلو قرأ آیۃ طویلۃ قدر ثلاثین حرفا یکون قدأتی بقدر ثلاث آیات لکن سیأتی فی فصل جھر الامام ان فرض القرأۃ آیۃ وان الآیۃ عرفا طائفۃ من القرآن مترجمۃ اقلھا ستۃ احرف ولو تقدیراً ''کَلَمْ یَلِدْ'' الا اذا کانت کلمۃ فلا صح عدم الصحۃ اھ ومقتضاہ انہ لو قرأ آیۃ

طویلة قدر ثمانیة عشر حرفا یکون قد أتی بقدر ثلاث آیات وقد یقال ان المشروع ثلاث أیات متوالیة علی النظم القرآنی مثل ثُمَّ نَظَرَ الخ ولا یوجد ثلاث متوالیة اقصر منها فالواجب اما هی اوما یعدلها من غیرها لا ما یعدل ثلاثة امثال اقصر آیة وجدت فی القرآن ولذا قال تعدل ثلاثا قصارا ولم یقل تعدل ثلاثة امثال اقصر آیة علی ان فی بعض العبارات تعدل اقصر سورة فتأمل وسنذکر فی فصل الجهر زیادة فی هذا البحث۔

(ب) (تنبیه) لم ارمن قدر ادنٰی ما یکفی بحد مقدار من الآیة الطویلة وظاهر کلام البحر کغیره انه موکول الی العرف لا الی عدد حروف اقصر آیة وعلی هذا لواراد قرأة قدر ثلاث آیات التی هی واجبة عندالامام لا بدان یقرأ من الآیة الطویلة مقدار ثلاثة امثال مما یسمی بقراء ته قارئا عرفا ولذا فرضوا المسئلة بآیة الکرسی وآیة المداینة وفی التتارخانیة والمعراج وغیرهما لو قرأ آیة طویلة کآیة الکرسی او المداینة البعض فی رکعة والبعض فی رکعة اختلفوا فیه علی قول ابی حنیفة قیل لا یجوز لانه ماقرأ آیة تامة فی کل رکعة وعامتهم علی انه یجوز لان بعض هذه الآیات یزید علی ثلاث قصار او یعدلها فلا تکون قرأته اقل من ثلاث آیات اھ لکن التعلیل الا خیر ربما یفید اعتبار العدد فی الکلمات او الحروف ویفیده قولهم لو قرأ آیة تعدل اقصر سورة جاز وفی بعض العبارات تعدل ثلاثا

قصارا ای کقوله تعالیٰ ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ وقدرها من حيث الكلمات عشر ومن حيث الحروف ثلاون فلو قرأ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ يبلغ مقدار هذه الآيات الثلاث فعلى ماقلناه لواقتصر على هذا المقدار فى كل ركعة كفى عن الواجب ولم ارمن تعرض لشئى من ذلك فليتأمل۔

پیراگراف نمبر 4 کی بحث میں تحریر کیا جاچکا ہے کہ قرآن مجید کی چھوٹی سے چھوٹی آیت چھ حروف پر مشتمل ہے، اس پیراگراف کے جزء (ا) میں علامہ شامی فرماتے ہیں کہ اس کا مقتضاء یہ ہے کہ اٹھارہ حروف پر مشتمل ایک طویل آیت سے بھی واجب ساقط ہو جانا چاہیے، لیکن اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ تین آیات قصار متواتر ہونی چاہیے، جیسے ثُمَّ نَظَرَ الخ۔ اوران تین سے کم تر مسلسل آیات قرآن میں موجود نہیں ہیں۔ پس اقل مقدار معیار واجب یا تو یہی ہیں اور یا جوان کے مساوی ہوں، یہی وجہ ہے "ثلاثة امثال اقصر اية" کے برابر کو معیار نہیں بنایا گیا، یعنی اگر سب سے چھوٹی (یعنی چھ حرفی) آیت کی تین مثل کو معیار قرار دیا جاتا تو اٹھارہ حروف والی آیت سے بھی واجب ساقط ہو جاتا۔ لہٰذا بات سب سے چھوٹی آیت کی تین مثلوں کی نہیں بلکہ سب سے چھوٹی تین آیتوں کی ہے یا ان کے مساوی ایک یا دو آیتیں۔ اس عبارت کے شروع میں علامہ شامی نے کہا ہے کہ "ثُمَّ نَظَرَ" الخ میں تیس حروف ہیں۔

علامہ شامی نے نمبر 10 جزء (ب) کی عبارت میں بعض علماء کا اختلاف ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جمہور فقہاء اس امر کو جائز قرار دیتے ہیں کہ اگر ایک طویل آیت پوری نہ بھی پڑھی بلکہ تین آیات متوایہ قصیرہ کے برابر (یعنی دس کلمات یا تیس حروف کے برابر) آیت طویل کا حصہ پڑھ لیا تو بھی واجب ادا ہو جائے گا۔ مثلاً اگر آیت الکرسی اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ تک بھی پڑھ لی تو دس کلمات یا تیس

حروف پورے ہو جاتے ہیں، لہٰذا نماز ادا ہو جائے گی۔

تین آیات قصار (یعنی ثُمَّ نَظَرَ الخ) کی تعداد کلمات وحروف کو نماز کے اندر واجب قرأت کے ادا اور اسقاط واجب کے لئے معیار قرار دینے کی بات سب سے پہلے علامہ شامی ہی نے کی ہے، اسی لئے انہوں نے اظہار تفاخر اور تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا ہے کہ "ولم ادمن تعرض لشئی من ذالك فليتامل"۔

(ج) علامہ شامی کی اتباع میں تین آیات قصار (یعنی ثُمَّ نَظَرَ الخ) کی تعداد حروف کو ادا واجب کے لئے معیار قرار دینے کی بات ہمارے فقہاء متاخرین بلکہ معاصرین نے بھی کی ہے۔ چنانچہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند مطبوعہ دار الاشاعت کراچی 1986ء جلد دوم صفحہ 226 پر سوال نمبر 407 مع جواب درج ذیل ہے:

سوال: (407) جو آیت سورۂ کوثر کے برابر ہو تو بڑی آیت شمار ہوگی۔ کسی کتاب فقہ کی عبارت تحریر فرما دیجئے کہ کم سے کم بڑی آیت کی مقدار کیا ہے؟

جواب: درمختار میں ہے وضم اقصر سورة کالکوثر اوما قام مقامها وهو ثلث ايات قصار نحو ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ وفی الشامی قوله تعدل ثلاثا قصارا ای مثل ثم نظر الخ وهی ثلثون حرفاً فلو قرء اية طويلة قدر ثلثين حرفاً يكون قد اتی بقدر ثلث ايات الخ۔ فقط

(د) اسی طرح بعینہٖ اسی استفتاء کے جواب میں دار العلوم کراچی کا فتویٰ ملاحظہ ہو جسے مفتی محمد طلحہ صاحب نے لکھا اور نائب مفتی دار الافتاء مفتی محمد عبد المنان صاحب نے اس کی تائید و تصویب کی۔

الجواب

فقہاء کرام نے سورۂ فاتحہ کے ساتھ تین چھوٹی یا ایک بڑی آیت کو ملانا واجب قرار دیا ہے جس کی مقدار احتیاطاً تیس حروف بیان کی گئی ہے اور مذکورہ صورت میں سورة الکوثر کی دو آیات کے حروف کی مقدار تیس تک پہنچ جاتی ہے لہٰذا یہ نماز درست ہو گئی ہے۔ نہ سجدہ سہو کی

ضرورت تھی اور نہ نماز کا اعادہ واجب ہے۔

فی الدر المختار:۔ (ضم) اقصر (سورة) کالکوثر او ماقام مقامها، وهو ثلاث آیات قصار، نحو۔ ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ وکذالو کانت الآیة او الآیتان تعدل ثلاثاً قصاراً۔

وفی الشامية:۔ ای مثل ثم نظر۔ الخ، وهی ثلاثون حرفاً، فلو قرأ آیة طویلة قدر ثلاثین حرفاً، یکون قدأتی بقدر ثلاث آیات...... (جلد 1 صفحہ 458) واللہ اعلم۔

الجواب صحیح محمد عبدالمنان

محمد طلحہ عفی عنہ، دارالافتاء دارالعلوم کراچی نمبر 14

(۱۱) اس مسئلے میں حرف آخر یہ ہے کہ علامہ الشاہ احمد رضا خاں قادری بریلوی علیہ الرحمۃ متوفی 1340ھ نے اپنی تصنیف جلد الممتار علی ردالمحتار جلد اول مطبوعہ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی 1985ھ میں علامہ شامی کی عبارت ''ولا یوجد ثلاث متوالية اقصر منها'' پر اپنے حاشیے میں صفحہ 239 پر رقم طراز ہیں:

(قوله) ولا یوجد ثلاث متوالية، (اقول) بلی فقوله تعالیٰ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿٢﴾ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿٣﴾ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿٤﴾ ثمانية وعشرون حرفاً، مقروءً ا وخمسة وعشرون مکتوبًا، وقوله تعالیٰ: وَالْفَجْرِ ﴿١﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿٢﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿٣﴾ خمسة وعشرون حرفا والمکتوب ستة وعشرون، فاذن ینبغی ادارة الحکم علی خمسة وعشرین حرفاً سواء اریدت المقروات کما هو الالیق، او المکتوبات، ۱۲۔

یعنی علامہ شامی کا یہ کہنا کہ ''ثم نظر الخ'' سے مختصر تر مسلسل تین آیات قرآن مجید

میں اور کہیں نہیں۔ کیوں نہیں؟ ارشاد باری تعالیٰ: قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ یہ تین مسلسل آیات ہیں اور ان کے حروف کی مجموعی تعداد اگر پڑھے جانے والوں (مقروءہ) کا اعتبار کریں تو اٹھائیس بنتی ہے اور لکھے جانے والوں (یعنی مکتوبہ) کا اعتبار کریں تو پچیس بنتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قول: وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ تین مسلسل آیات ہیں اور ان کے حروف کی مجموعی تعداد پچیس بنتی ہے اور مکتوبہ کی چھبیس بنتی ہے، تو زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ اداءِ واجب قرأت یا اسقاط واجب کا معیار و مقدار پچیس حروف پر ہونا چاہیے (نہ کہ تیس پر) خواہ پڑھے جانے والے حروف (مقروءۃ) کا اعتبار کیا جائے یا حیطۂ کتابت (مکتوبات) میں آنے والے حروف کا۔

اس تشریح کی روشنی میں تو سورۂ کوثر کی ابتدائی دو آیات پڑھنے سے بہ طریقہ اولیٰ مقدار قرأت واجبہ ادا ہو جاتی ہے۔ الحمدللہ یہ اس مسئلے پر کافی ووافی تحریر ہے۔ تَقَبَّلَ اللّٰهُ ذَالِكَ، فَقَط هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

مفتی منیب الرحمٰن

مہتمم دار العلوم نعیمیہ

قرآن مجید کی سورتوں کو ترتیب سے پڑھنا

سوال: کیا نماز میں سورتوں کو ترتیب سے پڑھنا واجب ہے؟ اور آیا نماز میں قرآن مجید کی سورتیں خلاف ترتیب پڑھنے سے کوئی خرابی لازم آئے گی یا سجدۂ سہو کرنا پڑے گا؟۔

(محمد حنیف طیب، جامع مسجد رحمانیہ، گوہر آباد، کراچی)

جواب: تلاوت کرنے والے کے لئے قرآن مجید ترتیب مصحف کے مطابق پڑھنا واجب ہے اور نماز میں بھی قرآن کی سورتوں کو ترتیب کے مطابق پڑھنا چاہیے لیکن یہ مسئلہ واجبات تلاوت سے ہے، واجبات نماز سے نہیں ہے لہٰذا اگر کسی نے بھول کر نماز کی رکعات میں سورتیں خلاف ترتیب پڑھ لیں تو بھی نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔ سجدۂ سہو لازم نہیں آئے گا۔ تاہم جان بوجھ کر خلاف ترتیب پڑھنے سے گریز کرنا چاہیے۔

نماز میں قرأت کا مسئلہ

سوال: اگر کوئی شخص نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ ''الناس'' پڑھ لیتا ہے تو اب دوسری رکعت میں کیا پڑھے؟۔ (منور احمد، ملیر، کراچی)

جواب: دوسری رکعت میں بھی سورۃ الناس ہی پڑھ لے۔

سوال: گاؤں میں اکثر مولوی صاحبان چھوٹی چھوٹی مساجد کے امام ہیں ان کے تلفظ اتنے کمزور ہیں کہ جب وہ پڑھتے ہیں تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا اور ان کے مخارج بھی صحیح نہیں ہیں کیا ان کے پیچھے نماز ہو جائے گی؟۔ (غلام نبی جسکانی، کراچی)

جواب: مساجد کے متولیان اور منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ باقاعدہ امام کا تقرر کرتے وقت اس امر کا خیال کریں کہ وہ صحیح العقیدہ ہو، ضروریات دین کا علم رکھتا ہو، نماز کے تمام مسائل ضروری جزئیات وتفصیلات کے ساتھ جانتا ہو اور کم از کم بقدر جواز نماز قرأت صحیح کرتا ہو۔ افضلیت کے معیار کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ اگر امام کی قرأت میں ایسی خرابی ہے جو جواز صلوٰۃ سے مانع ہے تو ایسے امام کی اقتداء میں نماز نہ پڑھیں، پڑھ لی ہو تو اعادہ کرلیں۔ باقی شخصی پسند و ناپسند کا شرعی مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

التحیات نماز میں ہے، قرآن میں نہیں

سوال: التحیات قرآن پاک میں ہے یا نہیں؟۔ (رشید احمد قریشی، کراچی)

جواب: نماز میں دو رکعت کے بعد اور آخر میں ایک خاص ہیئت میں بیٹھنے کو ''قعدہ'' کہتے ہیں۔ فرض، واجب اور سنت مؤکدہ نماز میں درمیان کا ''قعدہ'' واجب اور آخری ''قعدے'' پر بیٹھنا فرض ہے، نفل نماز کا ہر ''قعدہ'' فرض ہوتا ہے۔ ''قعدے'' میں ''التحیات'' کا مکمل پڑھنا واجب ہے، اس کے پہلے لفظ کی مناسبت سے اسے ''التحیات'' کہتے ہیں اور چونکہ اس کا آخری حصہ کلمۂ شہادت پر مشتمل ہے، اس لئے اس کی مناسبت سے اسے ''تشہد'' (گواہی دینا) بھی کہتے ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے دونوں مبارک

ہاتھوں میں پکڑ کر اسی اہمیت کے ساتھ مجھے ''تشہد'' کی تعلیم فرمائی، جس طرح آپ ﷺ مجھے قرآن کی کسی سورت کی تعلیم ارشاد فرمایا کرتے تھے، پھر انہوں نے حضور ﷺ کی تعلیم کردہ پوری ''التحیات'' پڑھ کر سنائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''التحیات'' کے کلمات اس ترتیب کے ساتھ اور اس کا صریح حکم تو قرآن میں نازل نہیں ہوا، لیکن ''صاحب قرآن'' حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے قرآن جیسی اہمیت کے ساتھ بہ نفس نفیس صحابہ کرام کو تعلیم فرمایا۔ نماز اور اس کا مکمل طریق ادا بہ کمال و تمام تواتر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے اور آج تک امت کا اس پر تعامل ہے اور ''التحیات'' کے کلمات ترتیب و تفصیل کے ساتھ احادیث صحیحہ، مشہورہ کے ذریعہ حضور ﷺ سے ثابت ہیں۔

وتر میں دعائے قنوت کی جگہ ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ'' پڑھنا

سوال: اگر کسی کو دعائے قنوت یاد نہ ہو تو وتر کی تیسری رکعت میں دعائے قنوت کی جگہ ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ'' پڑھنے سے نماز ادا ہو جائے گی؟۔ (عبدالماجد، لسبیلہ، کراچی)

جواب: وتر کی تیسری رکعت میں مطلقاً دعاء پڑھنا واجب ہے اور بطور خاص ''دعائے قنوت'' پڑھنا سنت ہے لہٰذا پہلی فرصت میں اسے یاد کریں تا کہ نماز وتر کے اجر کامل سے محروم نہ رہیں۔ جب تک ''دعائے قنوت'' مسنون یاد نہیں کر پاتے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ تک پڑھ لیا کریں، یہ بھی یاد نہ ہو تو ''اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي'' تین بار پڑھ لیں اور اگر یہ بھی فوری طور پر یاد نہ ہو سکے تو ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ'' پڑھنے سے بھی واجب ادا ہو جائے گا۔

مسجد میں دوبارہ جماعت کرانا

سوال: مسجد میں دوبارہ جماعت کرانا جائز ہے؟۔ (محمد جیلانی، نارتھ کراچی)

جواب: کسی محلے کی مسجد میں، جب ایک بار اذان و اقامت کے ساتھ باقاعدہ جماعت ہو چکی ہو، تو دوبارہ اذان و اقامت کے ساتھ جماعت کرنا مکروہ ہے۔ اس سے مساجد فتنہ و افتراق کا مرکز بننے سے بھی محفوظ رہتی ہیں۔ ایسی مساجد، جو شارع عام پر واقع ہوں۔ ایئر

پورٹ، بندرگاہ، ریلوے اسٹیشن، بس اڈے، مارکیٹ وغیرہ پر واقع ہوں، جہاں لوگوں کے قافلے اور گروپ آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہاں الگ اذان واقامت کے ساتھ ایک سے زیادہ جماعتیں کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمختار میں حرمین طیبین میں بھی ایک سے زائد جماعتوں کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ حرمین طیبین میں بھی زائرین کے قافلے ہروقت آتے رہتے ہیں، اسی طرح اگر محلے کی مسجد میں باہر کے لوگ آکر باجماعت نماز پڑھ کر چلے گئے ہوں تو اہل محلہ کے لئے اذان واقامت کے ساتھ اپنی معمول کی جماعت بلاشبہ قائم کرنا جائز ہے، درمختار میں ہے کہ اگر کسی محلے کی مسجد میں باقاعدہ امام و موذن مقرر نہ ہوں تو وہاں تکرار جماعت میں کوئی حرج نہیں ہے، مسجد محلہ میں جماعت ثانیہ کی کراہت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لوگ غفلت اور کاہلی میں مبتلا ہوکر جماعت اولیٰ کی اہمیت کو نظرانداز کردیں گے اور ایسے لوگوں کے لئے جماعت ثانیہ بلاشبہ ناجائز ہے۔ البتہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اگر اتفاقاً کچھ لوگ کسی عذر یا مانع کے سبب تاخیر سے آجائیں اور وہ پہلی جماعت کی جگہ سے ہٹ کر جماعت ثانیہ کرلیں تو جائز ہے۔ ایسی صورت میں جماعت ثانیہ کے لئے اذان دینا تو جائز نہیں ہے البتہ اقامت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عورت اور مرد کی نماز

سوال: کیا میاں بیوی ایک ساتھ، ماں اپنے بیٹے کے ساتھ یا خالہ بھانجے کے ساتھ الگ جائے نماز پر نماز ادا کرسکتی ہیں؟

جواب: اگر مرد امام ہے اور عورت مقتدی اور امام نے عورتوں کی امامت کی نیت بھی کر رکھی ہے یا مرد اور عورت دونوں کسی ایک امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں اور ان دونوں صورتوں میں عورت برابر میں کھڑی ہے تو مرد کی نماز فاسد ہوجائے گی بشرطیکہ عورت بالغہ یا قریب البلوغت ہو، خواہ وہ اس کی بیوی یا محرم ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اگر عورت بعد میں آکر کھڑی ہوئی اور امام یا مقتدی نے اسے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور وہ نہ ہٹی تو اس عورت کی نماز فاسد ہوگی۔ لیکن اگر مرد اور عورت دو یا زائد کسی ایک کمرے میں اپنی اپنی نماز علیحدہ پڑھ

رہے ہیں اور کسی پاک جگہ یا بڑی جائے نماز پر یا الگ الگ جائے نماز بچھا کر برابر یا آگے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھ رہے ہیں تو دونوں یا سب کی نماز بلا کراہت ادا ہو جائے گی۔ ماں، بہن، خالہ، پھوپھی، بھتیجی، بھانجی اور بیوی وغیرہ تو محارم میں سے ہیں، کسی بھی عورت کے لئے غیر محرم مرد کے ساتھ نشست و برخاست شرعاً جائز نہیں ہے۔

سترہ کے مسئلے پر ایک علمی بحث

حضرت مفتی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

جناب مولانا صاحب بندہ کو ایک مسئلہ درپیش یہ ہے کہ عمدۃ الفقہ کتاب الصلوٰۃ میں حضرت مولانا سید زوار حسین نے یہ مسئلہ لکھا ہے:

''امام کا سترہ تمام مقتدیوں کے لئے کافی ہے پس جب امام کے آگے سترہ ہو تو اگر کوئی مقتدیوں کی صف کے سامنے سے گزرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے اور یہی حکم مسبوق کے لئے بھی ہے کیونکہ اعتبار نماز شروع کرنے کے وقت کا ہے اور اس وقت امام کا سترہ اس کے لئے کافی تھا پس اب بھی وہی کافی رہے گا۔ (صفحہ 276)

یہ مسئلہ مولانا نے کس کتاب سے لیا ہے اور اس مسئلہ کی خوب وضاحت فرمائیے۔ امید ہے کہ بندہ کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے۔

المستفتی

سید محمد فرحان حسین

الجواب باسم ملهم الصواب

سید صاحب مرحوم نے مندرجہ بالا مسئلہ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتاب ''شامی'' سے لیا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے: وكفت سترة الامام لكل (قوله للكل) اى للمقتدين به كلهم وعليه فلو مرمارفى قبلة الصف فى المسجد الصغير له لم يكره اذا كان للامام سترة و ظاهر التعميم شمول المسبوق وبه صرح القهستانى وظاهره الاكتفاء بهاولو بعد فراغ امامه والا فما فائدته؟ (شامی جلد، صفحہ

638)واللہ سبحانہ اعلم۔ محمد نصر اللہ احمد پوری

دارالافتاء دارالعلوم زکریا F-B ایریا، کراچی

نوٹ: مندرجہ بالا فتویٰ ہمیں موصول ہوا اور اس کے نتیجے میں جو علمی وفقہی بحث ہوئی، وہ درج ذیل ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الجواب هو الموفق للصواب

زیر بحث صورت مسئلہ یہ ہے کہ امام نماز سے فارغ ہو چکا، امام اور مدرک، مقتدی منتشر ہو رہے ہیں، جب کہ مسبوق کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کر رہا ہے، تو ایسی صورت میں کیا لوگ بلا تردد اس مسبوق مقتدی کے آگے سے گزر سکتے ہیں اور کیا وہ دانستہ ایسا کرنے سے گنہگار نہیں ہوں گے؟۔

مستفتی سید محمد فرحان حسین کے والد محترم سید ایوب حسین صاحب اس امر کے مدعی تھے کہ چونکہ امام کا سترہ مقتدی کے لئے بھی سترہ ہے اور یہ حکم مسبوق کو بھی شامل ہے جب کہ وہ فراغت امام کے بعد تنہا کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز پڑھ رہا ہو، اور انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں سید زوار حسین صاحب کی کتاب ''عمدۃ الفقہ'' کی محولہ بالا عبارت پیش کی، میں نے عرض کیا کہ اگر آپ کے نزدیک اس عبارت کا محمل یہ ہے تو یہ کتب فقہ وفتاویٰ سے مؤید نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں دارالعلوم زکریا کے مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری کا فتویٰ حاصل کیا جو اس بحث کے شروع میں درج ہے۔

مفتی صاحب محترم نے اپنے فتویٰ کو فتاوی شامی کی عبارت سے مزین کیا ہے، لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ انہوں نے علامہ شامی کی نا تمام عبارت پیش کی ہے اور اس کا تکملہ یعنی آخری حصہ نظر انداز کر دیا، ایسا اگر دانستہ کیا جائے تو علمی خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور سہواً ایسا ہو جائے تو تسامح کہلاتا ہے، ہم حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اسے تسامح پر محمول کرتے ہیں۔ مفتی صاحب موصوف نے فتاویٰ شامی کی جو عبارت چھوڑ دی ہے، وہ یہ ہے:

وقد يقال فائدته التنبيه على انه كالمدرك لا يطلب منه نصب سترة قبل الدخول في الصلوة وان كان يلزم ان يصير منفردا بلا سترة بعد سلام امامه لان العبرة لوقت الشروع وهو وقته كان مستترا بسترة امامه تامل

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 1 صفحہ 429، داراحیاء التراث العربی)

اس عبارت کا مستفاد یہ ہے کہ "مسبوق مقتدی" صرف اس حد تک مدرک کی طرح ہے کہ جماعت میں شمولیت کے وقت وہ سترے کا اہتمام نہیں کرے گا، یعنی "دخول فی الصلوٰۃ" سے پہلے اس سے نصب سترہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ اعتبار (اہتمام سترہ کے مسئلہ میں) وقت شروع کا ہے اور اس وقت وہ اپنے امام کے سترہ کے ساتھ مستتر ہے۔ لیکن امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ اب منفرد ہے اور بلا سترہ ہے (لہٰذا اس کے آگے سے گزرنے والے کو محتاط رہنا ہوگا، احتراز کرنا ہوگا، کیونکہ یہ موجب گناہ ہے)۔

مسبوق کو حسب درجہ جماعت کا اجر تو ملے گا، انشاء اللہ العزیز، لیکن جب وہ اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کرتا ہے تو اس پر منفرد کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً:

(۱) اس سے دوران اقتداء کوئی ترک واجب ہوا تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے لیکن امام کے سلام پھیرنے کے بعد اس سے کوئی ترک واجب ہو جائے تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہے ورنہ نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

(۲) امام کی اقتداء میں دوران قرأت امام مقتدی پر سکوت واجب ہے لیکن جب فراغت امام کے بعد مقتدی اپنی بقیہ نماز کے لئے کھڑا ہوگا تو اس پر قرأت فرض ہے۔

(۳) امام کی اقتداء کے دوران جس رکعت میں شامل ہوا، وہی محسوب ہوگی، لیکن بعد میں جب اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کے لئے کھڑا ہوگا تو اصل ترتیب کا لحاظ کرے گا، سورۃ والی رکعت یا رکعات پہلے پڑھے گا اور بغیر سورۃ والی بعد میں، اس کی جب اپنی دو رکعات مکمل ہوں گی تو قعدۂ اولیٰ بھی اس پر واجب ہوگا۔

(۴) امام بخاری اور دیگر محدثین نے جس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے اس باب کا عنوان یہ قائم کیا ہے "سترة الامام سترة لمن خلفه" اور فقہی ضابطہ یہ ہے کہ جب حکم مشتق پر لگے تو اس حکم کی علت "ماخذ اشتقاق" ہوتا ہے، یعنی "امامت"، تو اس قاعدے کی رو سے امام کا سترہ مقتدی کے لئے اس وقت تک سترہ ہے جب تک وہ امامت میں ہے، جب امامت سے فارغ ہو گیا تو اب اس کا سترہ مقتدی کے لئے سترہ نہ رہا، چہ جائیکہ وہ فارغ ہو کر گھر چلا گیا ہو۔ علی هذا القیاس۔

امید ہے کہ مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری صاحب علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی محولہ بالا جامع گفتگو کی روشنی میں اپنے فتویٰ پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

فَقَطْ هٰذَا مَا عِنْدِی، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

مفتی منیب الرحمٰن
مہتمم دار العلوم نعیمیہ
بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی

الجواب باسم ملهم الصدق والصواب

تعلیمی سال کے اوائلی ایام کی طویل ترین مصروفیت و مشغولیت کے بعد استفتاء دیکھنا شروع کیے، اولاً سریع الطلب سوالات کے جوابات قلمبند کیے گئے، دوران تسلسل چند ایام قبل اپنے ہی تحریر کے گئے ایک فتوے پر نظر پڑی، جس کے ساتھ محترم مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے قلم سے تحریر شدہ "اصلاح الجواب" بھی منسلک تھا۔

جس میں بندہ کے جواب پر چند غلط فہمیاں اور ان کی تفصیل درج تھی، چونکہ اس پر "اظہار مافی الضمیر" کے لئے قدرے وقت مطلوب تھا، اس لئے اس میں مزید تاخیر ہوتی چلی گئی، بفضلہٖ تعالیٰ ساعۃ حاضرہ میں کچھ رقم کرنے بیٹھا ہوں، اللہ عز و جل اس کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین یارب العالمین)

احقر اپنی اس مختصر تحریر کو دو حصوں پر تقسیم کرے گا:

(۱) اولاً مسئلہ مبحوثہ کی وضاحت اور تحقیق ہو گی۔ (۲) ثانیاً محترم مفتی صاحب کی جانب سے

تحریر کیے گئے ''جواب الجواب'' پر نظر ثانی کی جسارت کی جائے گی۔

زیر بحث صورت مسئولہ وہی ہے جو موصوف مفتی صاحب نے تحریر فرمائی ہے:

صورت مسئولہ یہ ہے کہ امام نماز سے فارغ ہو چکا، امام اور مدرک مقتدی منتشر ہو رہے ہیں، جب کہ مسبوق کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کر رہا ہے، تو ایسی صورت میں کیا لوگ بلاتردد اس مسبوق مقتدی کے آگے سے گزر سکتے ہیں؟ اور کیا وہ دانستہ ایسا کرنے سے گنہگار نہیں ہوں گے؟

دراصل اتنی بات پر تو جملہ فقہاء کرام متفق ہیں کہ دوران جماعت امام کے سلام پھیرنے سے قبل تمام مقتدی سترہ کے ساتھ مستتر ہیں، اس اتفاقی مسئلہ کو بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے:

علامہ وھبۃ الزحیلی رقم طراز ہیں:

وسترة الامام سترة لمن خلفه بالاتفاق

(الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد 2، صفحہ 941)

لیکن تحقیق طلب امر یہ ہے کہ:

آیا امام کا سترہ امام کے لئے اور مقتدیوں کے ہر فرد کے لئے (خواہ وہ مسبوق ہو یا مدرک یا لاحق) مستقلاً سترہ ہے۔

اس صورت میں امام اگر سلام پھیرنے کے بعد غائب بھی ہو جائے تب بھی مسبوق سترہ کے ساتھ مستتر رہے گا، جس طرح امام کی موجودگی میں لوگوں کا اس کے آگے گزرنا بلاشبہ صحیح تھا، اس طرح امام کی غیوبت میں اس کے آگے گزرنا بلاشبہ صحیح ہوگا، کیونکہ امام اگرچہ معدوم ہے، لیکن اس کا وہ سترہ موجود ہے جو مسبوق کے لئے بھی مستقلاً سترہ ہے۔

یا یہ کہ امام کے سامنے موجود سترہ فقط امام کے لئے کفایت کرے گا، جب کہ مقتدیوں کے لئے امام بذات خود سترہ ہے۔

اس صورت میں جب تک مسبوق خلف الامام ہے۔ اس وقت تک اس کے آگے سے

گزرنا بلا شبہ صحیح اور درست ہوگا، لیکن جونہی امام اپنی نماز سے فارغ ہوگا، تو مسبوق بلا سترہ ہو جائے گا اور اس کے آگے گزرنا مکروہ اور باعث گناہ ہوگا۔

واضح رہے کہ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے، جمہور فقہاء کرام کا مسلک یہ ہے کہ امام کا سترا امام کے لئے اور تمام مقتدیوں کے لئے مستقلاً سترہ ہے۔ جب کہ بعض فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ امام کے سامنے موجود سترہ صرف امام کے لئے خاص ہے، باقی خلف الامام مقتدیوں کے لئے خود امام بذاتہ سترہ ہے۔

معروف فقیہہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ (التوفی 970ھ) نے اس اختلاف کو بایں الفاظ نقل فرمایا ہے:

وقد اختلف العلماء فی ان سترۃ الامام ھل ھی بنفسھا سترۃ للقوم ولہ اوھی سترۃ لہ خاصۃ وھو سترۃ لمن خلفہ (البحر الرائق جلد 2، صفحہ 18)

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے اس اختلاف کی جانب یوں اشارہ فرمایا:

لکن اختلفوا ھل سترتھم سترۃ الامام ام سترتھم الامام نفسہ (اعلاء السنن جلد 5، صفحہ 82)

ثمرہ اختلاف مسبوق کے حق میں ظاہر ہوتا ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد جب وہ کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کر رہا ہے تو کیا وہ اس وقت سترہ کے ساتھ مستتر ہے یا نہیں؟

تو جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ یہ مسبوق سترہ کے ساتھ مستتر ہے۔ کیونکہ امام اگرچہ موجود نہیں، لیکن اس کا وہ سترہ موجود ہے جس کے ساتھ وہ اور اس کے تمام مقتدی بشمول مسبوق مستتر تھے، لہٰذا مسبوق جس سترہ کے ساتھ قبل از فراغ امام مستتر تھا، اب بھی وہ اسی سترہ کے ساتھ مستتر ہے اور جمہور ہی کے مسلک کو کتب فقہ وفتاوٰی میں اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ:

(۱) شیخ الاسلام برہان الدین علی بن ابی بکر الفرغانی (التوفی 593ھ) فرماتے ہیں:

وسترۃ الامام سترۃ للقوم لانہ علیہ السلام صلی ببطحاء
مکۃ الی عنزۃ ولم یکن للقوم سترۃ (ہدایہ جلد 1، صفحہ 139)

(۲) علامہ ابن نجیم الحنفی (المتوفی 970ھ) رقم طراز ہیں:

ان سترۃ الامام تجزئی عن اصحابہ
(البحر الرائق جلد 2، صفحہ 18)

(۳) علامہ عالم بن علاء الانصاری الاندریتی (المتوفی 786ھ) فرماتے ہیں:

سترۃ الامام تجزئی اصحابہ
(الفتاویٰ التتارخانیہ جلد 1 صفحہ: 630)

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا عبارات میں "قوم" اور "اصحاب" کے الفاظ مدرک، لاحق اور مسبوق تینوں قسم کے مقتدیوں کو شامل ہیں۔

(۴) صاحب ملتقی الابحر رقم طراز ہیں:

وسترۃ الامام مجزئۃ عن القوم
(ملتقی الابحر مع المجمع جلد 1، صفحہ: 122)

اس عبارت میں بھی "قوم" کی تعمیم شمولیت مسبوق کی جانب مشعر ہے، یعنی امام کا سترہ امام کے ساتھ تمام مقتدیوں کے لئے کافی ہوگا، خواہ وہ مسبوق ہو یا مدرک اور لاحق۔ چنانچہ اس عبارت کی توضیح میں "صاحب مجمع الانھر" شمولیت مسبوق کی تصریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

وسترۃ الامام مجزئۃ ای کافیۃ (عن القوم) وان کان
مسبوقا (مجمع الانھر فی شرح ملتقی الابحر جلد 1: صفحہ 122)

(۵) علامہ علاء الدین الحصکفی رحمہ اللہ (المتوفی 1088ھ) فرماتے ہیں:

(وکفت سترۃ الامام) للکل
(شرح تنویر الابصار جلد 1، صفحہ 638)

مذکورہ عبارت میں لفظ ''کل'' شمولیت مسبوق میں سابقہ عمومی الفاظ سے بھی زیادہ واضح ہے۔

گزشتہ جملہ عبارات میں اگرچہ تعمیم الفاظ تمام مقتدیوں کو محیط ہے۔ لیکن تمام مقتدیوں کی شمولیت کے صریح الفاظ نہیں ہیں۔ معروف فقیہہ علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی 1252ھ) نے یہ کسر بھی پوری فرمادی اور انہوں نے مذکورہ عبارت کی تشریح میں تمام مقتدیوں کی شمولیت کی صراحت فرمادی، چنانچہ فرماتے ہیں:

(قولہ لکل) ای للمقتدین بہ کلھم (ردالمحتار جلد 1 صفحہ:638)

اگر مسبوق فقط سلام امام تک ہی مستتر رہتا، بعدہٗ غیر مستتر ہو جاتا تو اس مقصد کی تعبیر کے لئے ''و کفت سترۃ الامام لمن خلفہ'' یا ''للمامومین'' یا ''للمقتدین'' کے الفاظ کافی ہوتے، اس سے زائد تعمیمی الفاظ کی چنداں حاجت نہیں تھی۔ یقیناً ''اصحاب، قوم'' اور ''کل'' جیسے حد درجہ تعمیمی الفاظ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مسبوق حسب سابق اپنی نماز کے آخر تک مستتر رہے گا۔

باقی رہی مذکورہ عبارات میں وہ تاویل جو فاضل مفتی صاحب نے ایک عبارت کا مستفاد بتاتے ہوئے بیان فرمائی کہ:

> ''مسبوق مقتدی صرف اس حد تک مدرک کی طرح ہے کہ جماعت میں شمولیت کے وقت وہ سترہ کا اہتمام نہیں کرے گا، یعنی دخول فی الصلوٰۃ سے پہلے اس سے نصب سترہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا...... لیکن امام کے سلام پھیرنے یعنی امام کے نماز سے فراغت کے بعد وہ اب منفرد ہے اور بلا سترہ ہے (لہٰذا اس کے آگے گزرنے والے کو محتاط رہنا ہوگا، احتراز کرنا ہوگا کیونکہ یہ موجب گناہ ہے)''۔

چونکہ یہ تاویل مذکورہ فقہاء کرام اور جمہور ائمہ احناف کی منشاء کے خلاف تھی (کیونکہ ان کے نزدیک مقدیوں کا سترہ امام نہیں کہ اس کی غیر موجودگی میں مسبوق مقتدی بلا سترہ ہو

جائیں، بلکہ تمام مقتدیوں کا وہی سترہ ہے جو امام کا سترہ ہے امام اگرچہ موجود نہیں لیکن وہ سترہ تو موجود ہے جس کے ساتھ امام اور تمام مقتدی مستتر تھے۔ اس لئے ان کے نزدیک مسبوق فراغت امام کے بعد بھی مستتر ہے بلاسترہ نہیں)۔

اس لئے خاتمۃ المحققین علامہ ابن عابدین (المتوفی 1252ھ) نے انتہائی زوردار انداز سے مسلک جمہور کی توضیح وتائید فرماتے ہوئے مذکورہ تاویل کی تضعیف فرمائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

(۲) وکفت سترۃ الامام (قولہ للکل) ...... وظاھرہ التعمیم شمول المسبوق وبہ صرح القھستانی وظاھرہ الاکتفاء بھا ولو بعد فراغ امامہ والا فما فائدتہ؟...... لان العبرۃ لوقت الشروع وھو وقتہ کان مستترا بسترۃ امامہ تامل

(ردالمحتار جلد 1، صفحہ 638)

یعنی امام کا سترہ تمام مقتدیوں کے لئے کافی ہے اور (متن کے لفظ ''کل'' کے) عموم سے ظاہر ہے کہ مقتدیوں میں مسبوق مقتدی بھی شامل ہے، چنانچہ ''قہستانی'' میں اس (شمول مسبوق) کی صراحت ہے اور اس (شمول مسبوق) کے ظاہر کا تقاضا یہی ہے کہ امام کے فارغ ہونے کے بعد بھی یہی سترہ مسبوق کے لئے کافی ہو، ورنہ پھر اس شمول وعموم کا کیا فائدہ؟ کیونکہ اعتبار نماز شروع کرنے کے وقت کا ہے اور اس وقت امام کا سترہ اس (مسبوق) کے لئے کافی تھا پس اب بھی وہی سترہ اس کے لئے کافی رہے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی 1252ھ) نے مذکورہ بحث فرماتے ہوئے درمیان میں بطور جملہ معترضہ اس تاویل کو بصیغہ مجہول ذکر فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وقد یقال فائدتہ التنبیہ علی انہ کالمدرک لا یطلب منہ سترۃ قبل الدخول فی الصلوٰۃ وان کان یلزم ان یصیر منفرداً بلا سترۃ بعد سلام امامہ (حوالہ بالا)

یعنی اور کبھی کہا جاتا ہے کہ اس (لفظ ''کل'' کے عموم وشمول) کا فائدہ یہ ہے کہ (اس عموم وشمول سے) اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ مسبوق مدرک کی طرح ہے بایں طور کہ نماز میں داخل ہونے سے قبل اس سے نصب سترہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، اگرچہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد یہ مسبوق منفرد بلاسترہ سمجھا جائے۔

دراصل متن کے عموم کی یہ تاویل ان بعض فقہاء کی جانب سے کی گئی ہے جو مقتدیوں کے لئے امام کو بذاتہ سترہ تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ علامہ شامی نے اس تاویل کو بصیغہ مجہول ذکر کر کے اس کی تضعیف کرتے ہوئے مسلک جمہور کو بے غبار بنا دیا۔

یا یہ کہ چونکہ متن کی عبارت سے انہیں بعض فقہاء کا مسلک بھی ایک گونہ مفہوم ہوسکتا تھا تو علامہ شامی نے وہ مفہوم بصیغۂ مجہول ذکر کر کے تضعیف کر دی، تا کہ مسلک جمہور کی صحت میں کوئی شبہ نہ رہے۔

یاد رہے کہ جو کلام بصیغۂ مجہول ذکر کیا جائے، ارباب فتاویٰ کے نزدیک اس سے اس کام کی تضعیف مقصود ہوتی ہے (اور ایسے مجہول کلام پر عمل اور فتویٰ جائز نہیں ہوتا) الا یہ کہ مصنف کتاب کی یہ جبلت خاصہ ہو کہ وہ صحیح اقوال بھی صیغ مجہولہ سے بیان فرماتے ہوں یا یہ کہ سیاق وسباق سے اس کی تصحیح معلوم ہوتی ہو، ''قیل'' اور ''یقال'' سے ذکر کیے گئے کلام کے ضعیف ہونے کی تو تصریح بھی موجود ہے۔

چنانچہ سید عمیم الاحسان مجددی ''ادب المفتی'' میں رقم طراز ہیں:

ولا یجزم بالضعیف بصیغة التمریض کقیل ویقال الا
بقرینة السیاق او التزام قائله کمئولف الملتقی
(ادب المفتی مع المجموعة صفحہ 574)

جب کہ یہاں نہ تو علامہ شامی کی یہ عادت ہے کہ وہ صحیح اقوال کو بھی صیغ مجہولہ سے ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی سیاق وسباق اس کلام مجہول کی تائید کرتا ہے، خصوصاً جب کہ یہ ضعف کی ادنیٰ سے ادنیٰ قسم ہے، جس میں قائلین کے اسماء گرامی بھی ضبط تحریر میں لانا مناسب نہیں

سمجھے گئے۔

(۷) جمہور آئمہ احناف کا مسلک صحیحین کی درج ذیل احادیث سے ماخوذ ہے:

(۱) عن ابن عباس انه قال اقبلت راكبا على حمار اتان يومئذ قد ناهزت الاحتلام ورسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى بالناس بمنى الى غير جدار فمررت بين يدى بعض الصف فنزلت وارسلت الاتان ترتع ودخلت فى الصف فلم ينكر علىٰ ذلك احد

(بخاری جلد 1، صفحہ: 71، مسلم جلد 1، صفحہ 196)

(۲) عن ابى جحيفة ان اباه راى رسول الله صلى الله عليه وسلم فى قبة حمراء من ادم (الى ان قال) وخرج رسول الله صلى الله عليه وسلم فى حلة حمراء مشمرا فصلى الى العنزة بالناس ركعتين ورايت الناس والدواب يمرون بين يدى العنزة (مسلم جلد 1، صفحہ 196)

(۳) عن ابى جحيفة قال سمعت ابى يقول ان النبى ﷺ صلى بهم بالبطحاء بين يديه عنزة الظهر ركعتين والعصر ركعتين تمر بين يديه المرأة والحمار

(بخاری جلد 1، صفحہ 71، مسلم جلد 1، صفحہ 196 وقال ابن همام متفق عليه فتح القدیر جلد 1 صفحہ: 355)

چنانچہ علامہ ابن نجیم الحنفی (المتوفی 970ھ) نے جمہور کے مسلک کے مستدل بیان فرماتے ہوئے انہی احادیث کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

ان سترة الامام تجزىء عن اصحابه كما هو ظاهر الاحاديث الثابتة فى الصحيحين (البحر الرائق جلد 2، صفحہ: 18)

نیز شیخ الاسلام برہان الدین علی ابن ابی بکر المرغینانی (593ھ) نے جمہور کے مسلک کا مستدل تیسری حدیث کو بنایا ہے (ہدایہ جلد 1، صفحہ:139)

صاحب ''مجمع الانھر'' نے بھی جمہور کا مسلک ذکر کرنے کے بعد انہی احادیث کا حوالہ دیا ہے، چنانچہ جمہور کا مسلک بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

كما هو ظاهر الا حاديث الثابتة فى الصحيحين من الاقتصار على سترة عليه السلام وهو سترة للقوم
(مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر جلد 1، صفحہ:122)

الحاصل جمہور کا مسلک یہ ہے کہ امام کا سترہ امام کے لئے اور تمام مقتدیوں کے لئے کافی ہے، خواہ وہ مسبوق ہوں یا مدرک اور لاحق اور فراغ امام کے بعد بھی مسبوق مستتر رہیں گے، کیونکہ امام اگرچہ موجود نہیں لیکن وہ سترہ موجود ہے جس کے ساتھ امام اور تمام مقتدی (بشمول مسبوق) مستتر تھے اور بوجہ استتار مسبوق کے آگے گزرنا صحیح ہوگا اور اسی کو ہی کتب فقہ وفتاویٰ میں اختیار کیا گیا ہے اور متاخرین ارباب فتاویٰ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ (کمامر)

جب کہ بعض فقہاء کرام کا مسلک یہ ہے کہ امام کا سترہ فقط امام کے لئے کفایت کرے گا اور باقی مقتدیوں کے لئے امام بذاتہ سترہ ہوگا، یہ مسلک چونکہ بلا دلیل تھا اس لئے اس کو متون میں تو بالکل نظر انداز کر دیا تاہم کتب فتاویٰ میں اس کا قدرے تذکرہ ملتا ہے لیکن وہاں بھی اس کو صیغ مجہولہ سے ذکر کر کے اس کی تضعیف کر دی گئی ہے۔

(۱) چنانچہ علامہ سید احمد طحطاوی نے اس کو بایں الفاظ ذکر فرمایا ہے:

وقيل السترة له وهو بنفسه سترة من خلفه
(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر جلد 1، صفحہ 267)

(۲) علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی 1252ھ) نے تنویر الابصار اور درمختار کی عبارت ''(وكفت سترة الامام) للكل'' کے تحت ان بعض فقہاء کے مسلک کی جانب یوں اشارہ فرمایا:

وقد يقال فائدته التنبيه على انه كالمدرك لا يطلب منه سترة قبل الدخول فی الصلوٰة وان کان یلزم ان یصیر منفرداً بلا سترة بعد سلام امامه (ردالمحتار جلد 1 صفحہ 638)

الحاصل بعض فقہاء کے نزدیک امام بذاتہ تمام مقتدیوں کے لئے سترہ ہے تو فراغ امام کے بعد مسبوق بلاسترہ ہوگا اور اس کے آگے سے گزرنا ناجائز ہوگا۔

ان بعض فقہاء کا مسلک درج ذیل وجوہ کی بنا پر غیر مفتی بہ ضعیف اور مرجوع ہے:

(۱) کتب فقہ وفتاویٰ میں ان کے مسلک کو صیغ مجہولہ سے ذکر کیا گیا جب کہ اصول افتاء کے مطابق صیغہ مجہول ضعف عبارت کی نشاندہی کرتا ہے خصوصاً قیل اور یقال سے ذکر کیے گئے کلام کے ضعیف ہونے کی تو تصریح بھی موجود ہے۔ (کمامر تفصیله من ادب المفتی)

(۲) یہ مسلک جمہور کے مسلک کے خلاف ہے۔ (کما یفهم من کتب الفقه)

(۳) کسی بھی معتبر ومستند فقیہہ سے اس کی تصحیح یا تائید ثابت نہیں۔

(۴) یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔

(۵) متون میں اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔

(٦) فقہاء احناف نے اس کو مرجوع قرار دیا (کما هو الظاهر من العبادات الماضیه)

(۷) علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی 1252ھ) نے اس کو حاشیہ در میں ضعیف قرار دیا جب کہ حاشیہ علامہ شامی کو ''خاتمة التحقیقات والترجیحات فی المذهب الحنفی'' تسلیم کیا گیا ہے (کما سیاتی من الفقه الاسلامیة وادلته)

جمہور کا مسلک درج ذیل وجوہ کی بناء پر راجح اور مفتیٰ بہ ہے۔

(۱) فقہاء احناف نے اسی کو راجح قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم (970ھ) نے اولاً جمہور کا مسلک اور ثانیاً بعض فقہاء کا مسلک ذکر فرمایا (مر عبارته فی الصفحات الماضیة) بعدہ ان الفاظ میں فیصلہ فرمایا:

فظاهر کلام ائمتنا الاول ولھذا قال فی الھدایۃ وسترۃ
الامام سترۃ للقوم (البحر الرائق جلد 1، صفحہ:18)

ہمارے ائمہ احناف کے کلام سے پہلا ہی مسلک ظاہر ہوتا ہے (یعنی وہ اول مسلک رکھتے ہیں) یہی وجہ ہے کہ (متن حنفیہ) ہدایہ میں (اسی مسلک کو اختیار کرتے ہوئے) صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کو یوں تعبیر کیا ہے:

''امام کا سترہ پوری قوم (تمام مقتدی بشمول مسبوق) کے لئے کافی ہے''۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے جہاں ''فظاھر کلام ائمتنا الاول'' کہہ کر مسلک جمہور کو ترجیح دی ہے، وہاں موصوف کا جملہ ''کلام ائمتنا'' بھی غور طلب ہے جس میں انہوں نے ایک لطیف انداز میں بعض فقہاء کے مسلک کی تضعیف فرمائی ہے۔

تاہم اس میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر ''کلام بعض ائمتنا'' کہا جاتا تو اس کا یہ مطلب نکالا جا سکتا تھا کہ وہ فقہاء کرام جو اس کے برعکس مسلک رکھتے ہیں وہ بھی شاید ائمہ احناف ہیں، تو موصوف نے ''کلام ائمتنا'' کہہ کر اس جانب اشارہ فرمایا کہ جو فقہا مذہب حنیفہ میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں وہ تمام کے تمام اول مذہب رکھتے ہیں، جب کہ بعض فقہاء جو دوسرا مسلک رکھتے ہیں، انہیں ائمہ احناف نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ کم درجہ کے فقیہہ ہیں۔

نیز اگر ''کلام بعض ائمتنا'' کہا جاتا تو اس میں یہ احتمال ہوتا کہ شاید اس کے بر خلاف مسلک کے حاملین فقہاء کرام بھی اتنی ہی تعداد میں ہوں گے، حالانکہ حقیقت ایسے نہیں تھی تو علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے ''وظاھر کلام ائمتنا'' کہہ کر اس جانب اشارہ فرمایا کہ دوسرا مسلک رکھنے والے اتنے قلیل ہیں کہ ان کا ذکر وعدم ذکر مساوی ہے، ''القلیل کالمعدوم'' کے تحت انہوں نے تمام ائمہ احناف کا مسلک اول قرار دے دیا اور یہی دو نکتے ''ظاھر کلام اکثر ائمتنا'' نہ کہنے میں ہیں۔

اور اگر ائمہ سے مراد ائمہ مجتہدین ہوں اور اس کو ائمہ ثلاثہ کے مقابلہ میں لایا گیا ہو تو پھر تو

بات ہی ختم ہے کہ ہمارے تمام ائمہ احناف کا یہی مسلک ہے۔ جب کہ ائمہ ثلاثہ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل اس کے برخلاف دوسرا مسلک رکھتے ہیں، اور پھر موصوف نے مسلک احناف کو صحیحین کی احادیث سے مدلل کہہ کر ترجیح دی۔

(۲) جمہور فقہاء کرام نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

(۳) علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی 1252ھ) نے اسی کو ترجیح دی ہے اور حاشیہ علی الدر میں اس کو خوب وضاحت سے بیان کیا، جب کہ حاشیہ ابن عابدین علی الدر کو "خاتمہ التحقیقات والترجیحات" تسلیم کیا گیا ہے۔

چنانچہ علامہ وہبۃ الزحیلی فرماتے ہیں:

> تعتبر حاشية ابن عابدين (1252ھ) علامة الشام وهى (ردالمحتار على الدر المختار) خاتمة التحقيقات والترجيحات فى المذهب الحنفى ۱۲
>
> (الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد 1، صفحہ:75)

نیز سید عمیم الاحسان مجددی صاحب "ادب المفتی" نے ردالمحتار کو معتبر فتاویٰ میں شمار کیا ہے۔ (ادب المفتی مع المجموعہ صفحہ 573)

(۴) اس مسلک کو فقہاء نے "وظاهر" یا اس کے ہم معنی الفاظ سے ذکر کیا ہے:

(راجع الى البحر الرائق جلد2، صفحه 18 ومجمع الانهر جلد1صفحه: 122 و رد المحتار جلد1صفحه: 638) جب کہ اسی قسم کے الفاظ ترجیح کی علامت ہوا کرتے ہیں۔

چنانچہ علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

> فى خزانة الروايات نقلًا عن جامع المضمرات شرح مختصر القدورى اما العلامات المعلمة على الافتاء فقوله وعليه الفتوىٰ وبه يفتى (الى ان قال) هو الظاهر

وهو الاظهر (عمدۃ الرعایۃ صفحہ 16)

خصوصاً اختلاف کی صورت میں ظاہر پر ہی بناء کی جاتی ہے تاوقتیکہ اس کا خلاف واضح نہ ہو جائے۔

چنانچہ قاعدہ فقیہہ ہے:۔

لبناء علی الظاهر واجب مالم يتبين خلافه
(اصول المسائل الاخلافیۃ صفحہ 65 مع المجموعۃ)

(۵) متن حنفیہ میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ (كذا قال ابن نجيم في البحر كمامر)

(۶) یہ مسلک لوگوں کے لئے اوسع اور ایسر ہے اور اس کی ترجیح قاعدہ فقیہہ کے عین مطابق ہے المشقة تجلب التيسير (اصول المسائل الخلافیہ صفحہ:122)

یاد رہے کہ اس مسلک جمہور کو اختیار کرنے والوں میں شیخ الاسلام برہان الدین علی بن ابی بکر الفرغانی (المتوفی 593ھ) اصحاب الترجیح اور علامہ ابن نجیم الحنفی (المتوفی 970ھ) اصحاب التمیز میں سے ہیں، جب کہ علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی 1252ھ) خاتم المحققین تسلیم کیے گئے ہیں۔

الحاصل مسلک جمہور ہر لحاظ سے راجح اور مفتیٰ بہ ہے۔

باقی موصوف مفتی صاحب نے جو بندہ کے فتویٰ سے متعلق درج ذیل کلام کی ہے کہ:

مفتی صاحب محترم نے اپنے فتویٰ کو فتاویٰ شامی کی عبارت سے مزین کیا ہے، لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ انہوں نے علامہ شامی کی ناتمام عبارت پیش کی ہے اور اس کا تکملہ یعنی آخری حصہ نظر انداز کر دیا۔

تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ علامہ شامی کی عبارت کی تقطیع درج ذیل ہے وكفت سترة الامام للكل متن کی عبارت ہے، وظاهره سے علامہ شامی نے اس کا پہلا مطلب بیان فرمایا جب کہ وقد يقال سے بطور جملہ معترضہ دوسرا مطلب ذکر فرمایا اور آخر میں لان العبرة سے مطلب اول کی دلیل بیان فرمائی۔ اول مطلب راجح جب کہ ثانی مطلب

ممنوع ہے۔

بندہ نے مستفتی کے سوال پر حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب کی عبارت کا ماخذ وظاهره سے وقد یقال کی عبارت تک بتایا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی عبارت کا ماخذ یہی عبارت شامیہ ہے۔

راجح مطلب کو ذکر کرنے اور مرجوع مطلب ترک کرنے پر ''افسوس کا اظہار'' نا قابل فہم ہے جب کہ مرجوع پر فتویٰ ناجائز ہے (کما سیاتی) باقی موصوف مفتی صاحب نے مسئلہ کی وضاحت فرماتے ہوئے راجح مطلب ترک کر کے مرجوح پر فتویٰ کیوں دیا؟ واللہ اعلم بحقیقته۔

نیز اگر بقول مفتی صاحب یہ مکمل ایک عبارت ہے تو مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے بندہ کا تحریر کردہ حصہ عبارت تحریر کر کے اس کا مستفاد کیوں واضح نہیں کیا گیا؟ اور نا معلوم اس کو کس حکمت کی بناء پر نظر انداز کر دیا گیا؟

اس کے بعد موصوف مفتی صاحب نے بندہ کی ترک کردہ عبارت اور اس کا مستفاد بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

مفتی صاحب موصوف نے فتاویٰ شامی کی جو عبارت چھوڑی ہے وہ یہ ہے:۔

وقد یقال فائدته التنبیه علی انه کالمدرك لا یطلب منه نصب سترة قبل الدخول فی الصلوة وان کان یلزم ان یصیر منفردا بلا سترة بعد سلام امامه لان العبرة لوقت الشروع وهو وقته کان مستترا بسترة امامه تامل۔

(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 1 صفحہ 420، دار احیاء التراث العربی)

اس عبارت کا مستفاد یہ ہے کہ مسبوق مقتدی صرف اس حد تک مدرک کی طرح ہے کہ جماعت میں شمولیت کے وقت وہ سترہ کا اہتمام نہیں کرے گا یعنی ''دخول فی الصلوة'' سے پہلے اس سے نصب سترہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

کیونکہ اعتبار (اہتمام سترہ کے مسئلہ میں) وقت شروع کا ہے اور اس وقت وہ اپنے امام کے سترہ کے ساتھ مستتر ہے لیکن امام کے سلام پھیرنے یعنی امام کے نماز سے فراغت کے بعد وہ اب منفرد ہے اور بلا سترہ ہے۔

موصوف مفتی صاحب کی مندرجہ بالا تحریر میں درج ذیل امور قابل غور ہیں:۔

(۱) عبارت کا مستفاد بیان فرماتے ہوئے لفظ "وقد یقال" کا مستفاد بیان نہیں کیا گیا، جس سے اس عبارت کا ضعف واضح ہو جاتا۔

(۲) لان العبرۃ الخ جو وظاہرہ الخ کی علت تھی، اس کو وقد یقال الخ کی علت بنا دیا گیا، حالانکہ اگر لان العبرۃ الخ اس مطلب ثانی کی علت بنائی جائے تو علت اور معلول میں کوئی جوڑ اور ربط نہیں بنتا۔

کیونکہ معلول کا حاصل یہ ہے کہ مسبوق مقتدی سلام امام کے بعد منفرد، بلا سترہ ہو جائے گا، جب کہ علت کا حاصل یہ ہے کہ سترہ کے مسئلہ میں وقت شروع کا اعتبار ہے، اگر شروع نماز میں مقتدی سترہ کے ساتھ مستتر تھا تو (اپنی) آخر نماز تک مستتر رہے گا اور اگر شروع نماز میں (امام کے آگے سترہ نہ ہونے کی بناء پر) مستتر نہیں تھا تو شروع نماز کی طرح (اپنی) آخر نماز تک غیر مستتر رہے گا۔

جب کہ یہاں مسبوق مقتدی کے متعلق اتنی بات پر تو اتفاق ہے کہ وہ شروع نماز میں سترہ کے ساتھ مستتر ہے (دریں صورت کہ امام کے آگے سترہ موجود ہے) تو مذکورہ اصول (الماخوذ من العلۃ) کے تحت مسبوق مقتدی اپنی آخر نماز تک سترہ کے ساتھ مستتر ہونا چاہیے۔

اگر سید زوار حسین شاہ صاحب کی اردو عبارت پر بھی غور کر لیا جاتا (جو شامی ہی کی عبارت سے ماخوذ ہے) تو اس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی کہ کہ لان العبرۃ الخ کا تعلق وظاہرہ الخ سے ہے اور یہ فحش غلطی معرض وجود میں نہ آتی۔

واضح رہے کہ "ان العبرۃ لوقت الشروع" صغریٰ ہے جب کہ "وھو وقتہ کان

مستتراً بسترۃ امامہ" کبریٰ ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا،" فیکون مستترا لسترۃ امامہ"۔

(۳) ضعیف عبارت پر فتویٰ دیا گیا ہے کیونکہ "قیل" اور "یقال" سے ذکر کی گی عبارت ضعیف ہوتی ہے، الا یہ کہ مصنف کی عادت یا سیاق وسباق سے اس کی تصحیح ثابت ہو (کما مرمن ادب المفتی) حالانکہ یہ بلاضرورت شدید ضعیف پر فتویٰ ناجائز ہے۔ چنانچہ "ادب المفتی" میں ہے۔

لا یجوز العمل والافتاء بالضعیف والمرجوح الا عن ضرورۃ (ادب المفتی صفحہ 576 مع المجموعۃ)

(۴) نیز گزشتہ دلائل وترجیحات کی بنا پر یہ مرجوح قول ہے اور مرجوع قول پر فتویٰ خلاف اجماع ہے کیونکہ مرجوع راجح کے مقابلہ میں کالعدم ہے اور متقابلات میں ترجیح بلا مرجح ممنوع ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی (م 1252ھ) نے علامہ قاسم رحمہ اللہ علیہ کا درج ذیل قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

عن العلامۃ قاسم ان الحکم والفتیا بما ھو مرجوح خلاف الاجماع وان المرجوح فی مقابلۃ الراجع بمنزلۃ العدم والترجیح بغیر مرجح فی المتقابلات ممنوع (شرح عقود رسم المفتی صفحہ 41)

آگے مفتی صاحب فرماتے ہیں:

مسبوق کو حسب درجہ جماعت کا اجر تو ملے گا، انشاء اللہ العزیز لیکن جب وہ اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کرتا ہے تو اس پر منفرد کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس کے بعد موصوف مفتی صاحب نے چند مثالیں پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسبوق امام کی فراغت کے بعد منفرد ہو جاتا ہے حالانکہ امام کے سلام پھیرنے

کے بعد مسبوق کے بالاطاق منفرد ہو جانے کا دعویٰ صحیح نہیں ہے، کیونکہ درج ذیل نظائر سے آپ کو علم ہو گا کہ مسبوق بعض احکام میں منفرد نہیں ہے۔

(۱) مسبوق اپنی بقیہ نماز میں ترتیب قراۃ کے لحاظ سے اگرچہ منفرد ہے لیکن تشہد کے اعتبار سے منفرد نہیں ہے۔ چنانچہ اگر مسبوق نے مغرب کی فقط ایک رکعت پائی ہے تو سلام امام کے بعد کھڑے ہو کر قرآت میں علی ترتیب المنفرد ہو گا، قرأت کے اعتبار سے اس کی گزشتہ رکعتیں آخری دو رکعتیں تصور کی جائیں گی، لیکن ایک رکعت پڑھنے کے بعد اس پر قعدۂ اولیٰ واجب ہو گا، کیونکہ تشہد کے اعتبار سے یہ منفرد نہیں بلکہ اس کا تعلق امام سے باقی ہے، امام کے ساتھ پڑھی ہوئی رکعت اور اس کی پڑھی ہوئی رکعت کل دو رکعتیں ہو گئیں اور دو رکعتوں کے بعد قعدہ اولیٰ واجب ہوتا ہے، بخلاف منفرد کے وہ اگر ایک پڑھ کر قعدۂ اولیٰ کی مقدار بیٹھ گیا تو قیام میں تاخیر کی بنا پر اس پر سجدۂ سہو واجب ہو گا۔

(۲) اسی طرح اگر مسبوق قضاء ماسبق کے لئے کھڑا ہو گیا، لیکن امام پر اس کے دخول سے قبل سجدۂ سہو واجب ہو گیا تھا، تو اس صورت میں اگر امام سجدۂ سہو کرے تو اس کو چاہیے کہ اپنی رکعت کو مقید بالسجدہ کرنے سے قبل لوٹ آئے اور امام کے ساتھ سجدہ سہو میں شریک ہو اور اگر اس نے اپنی رکعت کو مقید بالسجدہ کر لیا اور سجدۂ سہو کے لئے نہیں لوٹ سکا تو اس کو چاہیے کہ اپنی نماز کے آخر میں سجدہ سہو کرے، بخلاف منفرد کے کہ اس پر کسی دوسرے کے سہو کی بناء پر سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا۔

(۳) مسبوق پر بالاتفاق تکبیرات تشریق واجب ہیں، بخلاف منفرد کے امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اس پر تکبیرات تشریق واجب نہیں (ماخوذ من الھندیہ)

(۴) مسبوق کے لئے قضاء ماسبق پر افتتاح کے لئے رفع یدین مسنون نہیں، بخلاف منفرد کے اس پر ابتداء صلوٰۃ کے لئے رفع یدین مسنون ہے۔

''اسی طرح کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں مسبوق منفرد کے حکم میں نہیں، اگرچہ بعض احکام داخلیہ میں وہ منفرد کے حکم میں بھی ہے''۔

موصوف مفتی صاحب آگے فرماتے ہیں:

(مسبوق) جب اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کے لئے کھڑا ہوگا تو اصل ترتیب کا لحاظ کرے گا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ وہ مسبوق قرأت میں اگر چہ اصل ترتیب کا لحاظ کرے گا، لیکن تشہد کے اعتبار سے وہ اصل ترتیب کا لحاظ نہیں کرے گا بلکہ اس کا حکم منفرد سے مختلف ہو گا۔ (کما مر)

مزید فاضل مفتی صاحب رقم طراز ہیں:

اس کی جب اپنی دو رکعت مکمل ہوں گی تو قعدۂ اولیٰ بھی اس پر واجب ہوگا۔ ۱۲

یاد رہے کہ یہ حکم مسبوق کے لئے ہر حال میں نہیں، کیونکہ مثلاً اگر اس نے مغرب کی ایک رکعت پائی ہے تو سلام امام کے بعد ایک رکعت پڑھ کر مسبوق پر قعدۂ اولیٰ واجب ہوگا، یہاں اس کو دو رکعت مکمل کر کے قعدۂ اولیٰ کرنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ منفرد کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ دو رکعت مکمل کر کے قعدۂ اولیٰ کرے۔

آخر میں موصوف صاحب نے غیر حنفی محدثین کے تراجم ابواب کو مستدل بنایا ہے جن کا عنوان ''سترة الامام سترة لمن خلفه'' ہے۔

یہاں اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ اس ترجمۃ الباب سے فقط اتنا ثابت ہوتا ہے کہ قبل از سلام خلف الامام مقتدیوں کے لئے امام کا سترہ کافی ہے اور اس میں تو کسی کا بھی اختلاف نہیں، اختلاف تو اس میں ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد اس کا سترہ مسبوق مقتدی کے لئے کافی ہے یا نہیں؟ اور اس مسئلہ میں محدثین خاموش ہیں۔

چنانچہ اس کی وضاحت فقہاء احناف نے انہی ابواب کی احادیث سے استنباط کر کے کی ہے کہ فراغ امام کے بعد بھی مسبوق امام کے...... سترہ کے ساتھ...... مستتر رہے گا۔

چنانچہ اس پر ''مجمع الانهر'' کی عبارت تو بالکل واضح ہے۔

(وسترة الامام مجزئة) اى كافية (عن القوم) وان كان مسبوقا كما هو ظاهر الاحاديث الثابتة فى الصحيحين

من الاقتصار علی سترته علیه الصلاۃ والسلام وھو سترۃ للقوم (مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر جلد 1، صفحہ 122)

نیز ''شامی'' کے حوالہ سے ''فراغ امام کے بعد'' اسی سترہ کے کافی ہونے کی تصریح بھی گزر چکی ہے، ورنہ یہ کہنا تو مشکل ہوگا کہ فقہاء احناف کا یہ مسلک ان ابواب کی احادیث کے خلاف ہے یا یہ کہ انہوں نے ان ابواب کی احادیث سے استنباط میں غلطی کی ہے۔

آخر میں موصوف مفتی صاحب نے ایک فقہی ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ ''جب حکم مشتق پر لگے تو اس حکم کی علت ماخذ اشتقاق ہوتا ہے'' موصوف نے ترجمۃ الباب کی عبارت میں ''امام'' پر حکم لگا کر اس کے ماخذ اشتقاق ''امامت'' کو علت قرار دیتے ہوئے اپنا مدعا یوں ثابت فرمایا:

''تو اس قاعدہ کی رو سے امام کا سترہ مقتدی کے لئے اس وقت تک سترہ ہے جب تک وہ امامت میں ہے، جب امامت سے فارغ ہوگیا، تو اب اس کا سترہ مقتدی کے لئے سترہ نہ رہا چہ جائیکہ وہ فارغ ہوکر گھر چلا گیا ہو''

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ یہاں حکم امام پر مقصود نہیں کہ ''امام کا سترہ امام کے لئے کافی ہے'' بلکہ اس کے ''خلف'' پر حکم مقصود ہے کہ ''امام کا سترہ اس کے خلف کے لئے بھی سترہ ہے'' اور ''خلف'' مشتق منہ ہے جب کہ مذکورہ فقہی ضابطہ کا انطباق وہاں صحیح ہوگا، جہاں حکم مشتق پر لگے، لہذا یہاں اس فقہی ضابطہ کا انطباق درست نہیں معلوم ہوتا۔

امید ہے کہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب احادیث اور اقوال فقہاء ودیگر حجج شرعیہ کی روشنی میں اپنے فتویٰ پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

ھذا ما فھمت واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم حررہ

محمد نصر اللہ احمد پوری

دار الافتاء جامعہ دار العلوم زکریا الخیریہ

نزد فلاح مسجد ایف۔ بی ایریا بلاک نمبر 14، کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم، اقول وباللہ التوفیق

دار العلوم زکریا کے محترم مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری نے ''سترہ'' کے مسئلہ پر ایک فتویٰ تحریر کیا تھا، جس میں انہوں نے اپنے موقف پر ''فتاویٰ شامی'' کی ایک عبارت سے استدلال کیا تھا۔ مستفتی وہ فتویٰ ہمارے پاس لائے تو ہم نے مفتی صاحب سے اختلاف کیا اور اپنے موقف کے حق میں فتاویٰ شامی کو محولہ بالا عبارت ہی کا تکملہ پیش کیا، جسے مفتی صاحب نے نظر انداز کر دیا تھا اور تائید مزید کے طور پر چند دیگر فقہی شواہد کی جانب انہیں متوجہ کیا اور اپنے موقف پر نظر ثانی کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد تقریباً دو ماہ کی محنت شاقہ کے بعد مفتی صاحب نے پندرہ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط فتویٰ تحریر فرمایا اور ہمیں اپنے موقف پر نظر ثانی کا مشورہ دیتے ہوئے اپنے موقف کی صحت پر اصرار کیا۔

ہم نے مفتی صاحب کی تحریر کا خالص معروضی انداز میں بغور مطالعہ کیا ہے اور اس پر ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں:

(۱) ہم جب کسی دینی وفقہی مسئلے پر کسی صاحب علم کے ساتھ تحریراً یا تقریراً بحث اور تبادلۂ خیال کرتے ہیں تو عجب نفس، انانیت اور فتح وشکست ہمارے پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ طلب حق اور صواب وخطا کے درمیان تمیز مقصود ہوتی ہے، ہم اگر کسی شرعی مسئلے میں صواب کو پانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہی ہماری منزل ہوتی ہے۔

(۲) مفتی وفقیہ کی شان اور پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اصل مبحث کے دائرے میں رہ کر گفتگو کرے۔ علامہ شامی کی عبارت کا مستفاد کیا ہے؟ یہی مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس کے علاوہ مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری صاحب نے جو حوالہ جات لکھے ہیں وہ سترہ سے متعلق تو ہیں، مبحث سے متعلق نہیں ہیں۔ مثلاً (۱) یہ کہ امام کا سترہ، مقتدی کے لئے بھی سترہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ مدرک ہو، لاحق ہو یا مسبوق...... یہ اصولی مسئلہ مجمع علیہ ہے اور بنائے بحث نہیں ہے۔ (۲) امام کا سترہ مقتدی کا سترہ ہوتا ہے یا امام بذات خود مقتدی کے لئے سترہ ہوتا ہے؟ یہ مسئلہ بھی بنائے بحث نہیں ہے۔ لہٰذا ان امور کی بابت حوالہ جات یا گفتگو جس کی زحمت مفتی صاحب

نے اٹھائی، خارج از بحث ہے۔
(۳) مبحث یہ ہے کہ: ''امام اپنی نماز پڑھ کر چلا گیا اور مسبوق اپنی بقیہ نماز پوری کر رہا ہے، آیا اس وقت مسبوق کے سامنے سے بغیر سترہ کے گزرنا جائز ہے؟، کیونکہ امام کا سترہ تمام مقتدین کے لئے سترہ ہوتا ہے یا اب مسبوق کے سامنے سے بغیر سترہ کے گزرنا جائز نہیں ہے کیونکہ امام کے چلے جانے کے بعد امام کا سترہ جو مقتدین کا بھی سترہ تھا، اب باقی نہ رہا''۔ اس مسئلے میں ہمارا موقف ثانی الذکر ہے جب کہ جناب مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری کا موقف اول الذکر ہے۔ اوران کی پیش کردہ عبارات ان کے موقف پر دلیل نہیں ہیں، لہٰذا ان کا ذکر مبحث سے غیر متعلق ہے۔
(۴) ہمارے موقف پر دلائل حسب ذیل ہیں:
علامہ شامی فرماتے ہیں:

''وظاهر التعميم شمول المسبوق وبه صرح القهستانی وظاهره الاكتفاء بها ولو بعد فراغ امامه والا فما فائدته؟ وقد يقال فائدته التنبيه على انه كالمدرك لا يطلب منه نصب سترة قبل الدخول فی الصلوة وان كان يلزم ان يصير منفردا بلا سترة بعد سلام امامه لان العبرة لوقت الشروع وهو وقته، كان مستترا بسترة امام فتامل (ردالمحتار جلد 1، صفحہ 429 مطبوعہ بیروت)

میرے اس استدلال پر مفتی محمد نصر اللہ صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ضعیف قول پر فتویٰ دیا ہے کیونکہ قیل اور یقال سے ذکر کی گئی عبارت ضعیف ہوتی ہے الا یہ کہ مصنف کی عادت یا سیاق وسباق سے اس کی تصحیح ثابت ہوئے، فتویٰ صفحہ ۱۲۔
اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ شامی کا مختار یہی ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق منفرد ہو جاتا ہے:

درمختار میں مذکور ہے: "ولو سلم ساھیا ان بعد امامہ لزمہ السھو" اس عبارت پر علامی شامی نے لکھا ہے:

"لانہ منفرد فی ھذہ الحالۃ" (ردالمحتار جلد 1، صفحہ 402)

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد اگر مسبوق سہواً سلام پھیر دے تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہے، علامہ شامی اس کا سبب یہ بیان فرماتے ہیں: کیونکہ مسبوق اس حالت میں منفرد ہے۔ اس عبارت سے علامہ شامی کا یہ نظریہ روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق منفرد کے حکم میں ہوتا ہے اور جب وہ منفرد ہوتا ہے تو امام کا سابقہ سترہ اس کا سترہ کیسے ہوگا؟

(۵) اگر بر سبیل تنزل یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس مسئلے میں دو اقوال ہیں، ایک قول کی بناء پر امام کے نماز سے فراغت کے بعد بھی مسبوق مقتدی کے آگے سے بلا سترہ گزرنا بلا تردد جائز ہے، جو مفتی محمد نصر اللہ صاحب کا مختار ہے، اور دوسرے قول کی بناء پر فراغت امام کے بعد مسبوق نمازی کے سامنے سے بلا سترہ گزرنا ناجائز اور موجب گناہ ہے، یہ ہمارا موقف ہے، کیونکہ نمازی کے آگے سے گزرنے کی بابت احادیث مبارکہ میں سخت وعید آئی ہے اور جب ایک مسئلے میں دو قول ہوں، ایک کا تقاضا اباحت ہو اور دوسرے کا تحریم، تو تحریم کو ترجیح دی جائے گی، کیونکہ یہ اصول فقہ میں مقرر ہے کہ جب اباحت اور تحریم میں تعارض ہو تو تحریم کو اباحت پر ترجیح دی جائے گی، لہٰذا یہی قول راجح قرار پائے گا جس کے مطابق فراغت امام کے بعد مسبوق کے سامنے سے بغیر سترہ کے گزرنا جائز نہیں ہے، احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں تقابل اباحت وتحریم میں ہے نہ کہ عسر و یسر میں جیسا کہ مفتی احمد پوری صاحب نے سمجھا۔ احوط یہی ہے کہ احادیث میں مذکور وعید کا خطرہ مول نہ لیا جائے۔

(۶) امام کا سترہ مقید ہے اور مقید کا تحقق اپنی قید کے ساتھ ہوتا ہے، لہٰذا امام کا سترہ قوم کے لئے سترہ اسی وقت ہوگا، جب امام موجود ہو اور نماز پڑھ رہا ہو اور جب نماز سے فارغ ہو کر جا چکا، تو جب امام ہی نہیں تو اس کا سترہ کہاں ہوگا، کیونکہ مقید کا تحقق اپنی قید کے ساتھ ہوتا

ہے، کسی دیوار، درخت، ستون یا لکڑی کا نام تو ''سترة الامام'' نہیں ہے کہ اسے ''علی کل حال'' اور ''فی جمیع الاحیان'' سترة الامام کہا اور سمجھا جائے گا۔ بلکہ یہ تو اس کا ایک عارضی وصف ہے، اضافی صفت ہے اور کوئی بھی چیز امام کا سترہ اس وقت کہلائے گی جب امام بالفعل نماز میں ہو اور وہ چیز اس کے لئے ساتر ہو۔ اس دلیل کی بابت محترم مفتی احمد پوری صاحب نے ہم پر یہ پھبتی کسی ہے کہ ہم نے غیر حنفی محدثین کے ترجمۃ الباب سے استدلال کیا ہے، یہ بات مفتی صاحب سے بہتر کون جانتا ہے کہ ہماری درسیات تفسیر و حدیث کی اکثر کتب غیر حنفی محدثین کی ہیں اور ہمارا اصل مستدل تو حدیث رسول ہے، اور زیر بحث ''ترجمۃ الباب'' کو ہماری معلومات کے مطابق کسی حنفی محدث وفقیہ نے احناف اور دوسرے ائمہ کے درمیان مختلف فیہ قرار نہیں دیا۔

اس سلسلے میں مزید گزارش یہ ہے کہ عوام فقہی اختلافات اور فقہی دلائل کی باریکیوں سے واقف نہیں ہیں، تو مسائل کی توجیہہ وترجیح اس انداز میں کرنی چاہیے کہ عوام کے ذہنوں میں عبادت صلوٰۃ کی جلالت وعظمت جاگزیں ہو، دینی شعائر کی حرمت وعظمت ان کے دلوں میں پیدا ہو اور یہ تب ہی ہوگا کہ اس مسئلے میں احتیاط کو معمول بنایا جائے، اگر امام کی فراغت کے بعد مسبوق کے سامنے سے بلا تردد گزرنے کو رواج دیا جائے تو اس سے نماز کی بے وقعتی اور بے حرمتی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوگی۔

(۷) مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری صاحب سے اپنے زیر بحث فتویٰ میں متعدد زلات واغلاط سرزد ہوئی ہیں جن میں سے بعض کو ہم غلط فاحش کہہ سکتے ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

علامہ شامی کی مسلسل عبارت ہے:

لان العبرة لوقت الشروع وھو وقته کان مستترا بسترة امامه

''اس عبارت میں لان العبرة لوقت الشروع ایک جملہ ہے اور وھو وقته الی

آخرہ یہ دوسرا جملہ ہے اور " وقتہ " کی ضمیر مسبوق کی طرف راجع ہے اور ان دونوں جملوں کا معنی اس طرح ہے: کیونکہ (اہتمام سترہ کے مسئلہ میں) اعتبار (نماز) شروع کرنے کے وقت کا ہے اور وہ (وقت شروع) مسبوق کا وہ وقت ہے جب وہ امام کے سترہ کے ساتھ مستتر تھا"۔

مفتی احمد پوری صاحب نے ان دونوں جملوں کو صغریٰ اور کبریٰ بنایا ہے چونکہ ان جملوں میں حد اوسط صغریٰ میں محمول اور کبریٰ میں موضوع ہے، اس لئے شکل اول بنی۔ لیکن مفتی صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ نتیجہ دینے کی دو شرطیں ہیں (۱) ایجاب صغریٰ (۲) کلیۃ کبریٰ۔ اور اس صورت میں کبریٰ کلیہ نہیں ہے بلکہ ھو ضمیر کے موضوع ہونے کی وجہ سے یہ قضیہ شخصیہ ہے۔ اگر مفتی صاحب ان دو جملوں کو صغریٰ اور کبریٰ قرار دے کر ان سے نتیجہ نکالنے سے پہلے منطق کی ابتدائی کتب ایساغوجی اور مرقاۃ ہی کو پڑھ لیتے تو ان سے یہ فاحش غلطی سرزد نہ ہوتی۔

(۸) مفتی صاحب نے اس عبارت کا ترجمہ یا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے کہ سترہ کے مسئلے میں وقت شروع کا اعتبار ہے، اگر نماز کے شروع میں مقتدی سترہ کے ساتھ مستتر تھا تو اپنی نماز کے آخر تک مستتر رہے گا، ملاحظہ ہو فتویٰ صفحہ نمبر 12۔ یہاں وقتہ کی ضمیر مطلقاً مقتدی کی طرف نہیں بلکہ مسبوق کی طرف راجع ہے جیسا کہ چند سطور بعد مفتی صاحب نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن مفتی صاحب سے تسامح ہوا ہے یا انہوں نے دانستہ معنوی تحریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

" تو اپنی آخر نماز تک مستتر رہے گا' علامہ شامی کی زیر بحث عبارت میں آخر کا لفظ نہیں ہے، یہ لفظ مفتی صاحب نے اپنا موقف ثابت کرنے کے لئے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے، اگر ہے تو دکھائیں۔

(۹) مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ فقہاء جب یہ لکھتے ہیں کہ: " اس عبارت کا ظاہر مطلب یہ ہے" تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ تحقیق یا نظر دقیق اس کے خلاف ہے، جب کہ مفتی صاحب نے ظاہر کا مقابل مرجوع سمجھا۔

(۱۰) ''لان العبرة الى آخرہ'' کو مفتی صاحب نے اس سے متصل عبارت کی علت قرار دینے کے بجائے ابتدائی عبارت'' وظاهر التعميم'' کی علت قرار دیا ہے، یہ ان کی فاحش غلطی ہے اس کی وضاحت یوں ہے کہ:

جب علامہ شامی نے یہ لکھا: '' درمختار کی ظاہر عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ امام کے فارغ ہونے کے بعد بھی مسبوق کے لئے امام کا سترہ برقرار رہے گا، ورنہ اسے مسبوق کے لئے سترہ قرار دینے کا کیا فائدہ؟''

پھر بتایا کہ: '' یہ کہا جائے گا کہ اس کا فائدہ اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ مسبوق مدرک کی طرح ہے اور نماز میں داخل ہونے سے پہلے اس سے سترہ نصب کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، اگر چہ یہ لازم ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ بغیر سترہ کے رہ جائے''۔

پھر بتایا کہ نماز میں داخل ہونے سے پہلے اس سے سترہ نصب کرنے کا مطالبہ کیوں نہیں کیا جائے گا؟ تو اس کی دلیل یہ دی کہ: '' اعتبار شروع وقت کا ہے اور اس وقت مسبوق امام کے سترہ سے مستتر تھا''۔

امید ہے کہ ہماری اس تشریح سے حضرت مفتی صاحب پر بخوبی یہ امر عیاں ہو جائے گا کہ: ''لان العبرة الخ'' ''قد يقال الخ'' کی علت ہے، نہ کہ '' وظاهر التعميم'' کی، جیسا کہ انہوں نے سمجھا اور متبادر بھی یہی ہے کہ وہ قریب کے جملے کی علت ہو نہ کہ بعید کی۔

(۱۱) مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ کے صفحہ نمبر 13 پر لکھا ہے:

'' مسبوق اپنی بقیہ نماز میں ترتیب قرأت کے لحاظ سے اگر چہ منفرد ہے، لیکن تشہد کے لحاظ سے منفرد نہیں ہے، چنانچہ اگر مسبوق نے مغرب کی ایک رکعت پائی ہے تو سلام امام کے بعد کھڑے ہو کر قرأت میں علی ترتیب المنفرد ہوگا، قرأت کے اعتبار سے اس کی گزشتہ رکعتیں آخری دو رکعتیں تصور کی جائیں گی، لیکن ایک رکعت پڑھنے کے بعد اس پر قعدۂ اولیٰ واجب ہوگا، کیونکہ تشہد کے اعتبار سے یہ منفرد نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق امام سے باقی ہے''۔

یہ انہوں نے نرالی منطق پیش کی ہے اور عجیب دلیل وضع کی ہے، کیونکہ ہمارا موقف

یہ ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق منفرد کی طرح ہو جاتا ہے، اس کا یہ مطلب تو ہم نے بیان نہیں کیا کہ اس کا پچھلی پڑھی ہوئی نماز سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ مفتی صاحب نے جو چند تفریعات اس ضمن میں درج کی ہیں، وہ سعی لا حاصل ہے اور ان کی اس غلط فہمی پر مبنی ہیں۔

(۱۲) مفتی صاحب کے فتویٰ میں املا کی جو اغلاط ہیں ہم ان کی نشاندہی ضروری نہیں سمجھتے، انہیں خود ہی اپنی تحریر بغور پڑھ لینی چاہیے۔

آخر میں ہم ایک بار پھر گزارش کرتے ہیں کہ مفتی صاحب کا سارا زور اس بات پر ہے کہ ہم نے "قد یقال" پر مشتمل قول ضعیف سے استدلال کیا ہے، ہمارا ان سے مطالبہ ہے کہ وہ کسی معتبر و مستند فقیہ کا صریح قول نقل فرمائیں کہ امام سلام پھیر کر اور نماز سے فارغ ہو کر چلا گیا، پھر بھی اس کا سترہ مسبوق کے لئے سترہ رہے گا اور لوگ اس کے سامنے سے گزرنے پر گناہگار نہیں ہوں گے، لہٰذا جو چاہے بلا تردد گزرتا رہے۔ فتاویٰ شامی کی عبارت تو ہمارے درمیان مفہوم کے اعتبار سے مختلف فیہ ہے اور اصل مبحث ہے۔ اور یہ مسئلہ نادر الوقوع تو نہیں ہے کہ ہمارے اجلہ فقہاء کرام کو یہ صورت مسئلہ درپیش نہ آئی ہو لہٰذا تصریح نہ ملنے کا یہ سبب ہے۔ یہ مسئلہ تو ہر مسجد میں دن میں پانچ بار پیش آتا ہے۔

فقط ھذا ما عندی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واکمل

مفتی منیب الرحمٰن مہتمم دار العلوم نعیمیہ

بلاک 15، فیڈرل بی ایریا، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا المکرم الفاضل المحتشم حضرت مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب زید مجدہم

بعد سلام مسنون! خیر و عافیت مزاج گرامی

آپ کے حسب امر میں نے آپ کا جواب استفتاء اور جواب الجواب اور مفتی نصر اللہ احمد پوری کی ہر دو تحریر اول سے آخر تک پڑھیں۔ بحمدہ تعالیٰ آپ کا موقف حق وصواب

موافق عبارات فقہیہ و حدیثیہ ہے۔مخالف نے پردۂ عناد سے اپنی غلط کہی ہوئی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے مرتبط جملوں کو کھینچ تان کر بے ربط جملوں سے جوڑنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔

ماشاءاللہ آپ نے حق واضح فرمادیا ہے اس قدر کافی ہے مخالف شاید اس کے جواب میں مزید لکھے مگر مجھے آپ سے توقع ہے کہ آپ اپنے قیمتی اوقات اس سے زیادہ اہم امور میں صرف فرمائیں گے۔ والسلام آپ کا مخلص

محمد ابراہیم القادری غفرلہ

خادم جامعہ غوثیہ رضویہ باغ حیات علی شاہ، سکھر

نمازی کے آگے کا فاصلہ

سوال: نمازی کے آگے کتنی لمبائی اور چوڑائی والی چیز ہونی چاہیے کہ اس سے آگے گزرنے والا گنہگار نہ ہو؟ (عبدالغفور ملیر توسیعی کالونی، کھوکھراپار، کراچی)

جواب: حالت نماز میں نمازی کے آگے سے گزرنے والے کے بارے میں حدیث شریف میں بڑی وعید آئی ہے، یہ شدید گناہ ہے۔نمازی کے آگے کسی ایسی چیز کا ہونا جو اس کے لئے آڑ اور اوٹ بن جائے اور جس کے بعد نمازی کے سامنے یا آگے گزرنے والا گنہگار نہ ہو، اسے فقہی اصطلاح میں ''سترہ'' کہتے ہیں۔اس کی مقدار یہ ہے کہ لمبائی ایک سے تین ہاتھ کے برابر ہو اور موٹائی کم از کم ایک انگلی کے برابر۔نمازی کو چاہیے کہ سترہ اپنے مقام سجدہ کے آگے نصب کردے، اگر زمین سخت ہو اور لگانا دشوار ہو تو رکھ دے، بعض فقہاء نے کہا ہے کہ سترے کے لئے اگر کچھ بھی دستیاب نہ ہو تو نمازی اپنے آگے خط کھینچ دے یا محراب کی ہیئت بنالے، یہ گویا محض علامتی سترہ ہوگا۔اگر کسی کھلے میدان میں باجماعت نماز ہو رہی ہے تو صرف امام کے آگے سترہ کافی ہے، سب مقتدیوں کے لئے ضروری نہیں، چھوٹی مسجد میں نمازی کے آگے دیوار محراب تک کسی کو نہیں گزرنا چاہیے۔بڑی مسجد میں نماز کے مقام سجدہ سے دو یا تین صفوں کا فاصلہ چھوڑ کر گزر سکتے ہیں۔

نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا

سوال: بعض نوجوان اور تندرست لوگ بھی نفل نماز بیٹھ کر پڑھتے ہیں کیا یہ درست ہے؟ جب کہ نماز میں قیام فرض ہے؟۔

جواب: نوافل میں قیام فرض نہیں ہے، البتہ کھڑے ہو کر نفل پڑھنا افضل ہے اور بیٹھ کر نفل پڑھنے کے مقابلے میں اس کا ثواب دوگنا ہے تاہم نوافل بلا عذر بھی بیٹھ کر پڑھنا جائز ہیں، بس ثواب میں کمی ہوگی، یعنی قیام کے بہ نسبت نصف ثواب ملے گا۔ بعض لوگ قدرت واستطاعت کے باوجود بیٹھ کر نوافل پڑھتے ہیں، خاص طور پر عشاء کے بعد کے دو نوافل اور دلیل کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے بیٹھ کر نوافل پڑھے تھے۔ یہ استدلال غلط ہے، حضور ﷺ کا بیٹھ کر نفل پڑھنا آپ کی خصوصیات میں سے ہے اور آپ کے ثواب میں بھی کمی نہیں ہوتی تھی۔

فوجی ٹوپی اور ہیٹ پہن کر نماز پڑھنا

سوال: کیا فوجی ٹوپی، ہیٹ اور کرکٹ کیپ وغیرہ میں نماز ہو جاتی ہے؟ یاد رہے یہ تمام چیزیں یہودیوں اور عیسائیوں کی پیداوار ہیں؟۔ (انور حسین، کیماڑی، کراچی)

جواب: بہت سی ایسی اشیاء ہم روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں جو اہل مغرب کی ایجاد ہیں۔ جن امور سے "تشبہ بالکفار" (کفار، غیر مسلموں یا بد مذہبوں سے مشابہت) لازم آتی ہے اور جو مکروہ تحریمی کے درجے میں ہیں وہ ایسے امور ہیں جو کسی مذہب کا شعار یا امتیازی علامت ہوں، جسے دیکھ کر عام آدمی کا ذہن اس طرف منتقل ہو جائے، جیسے سینے پر صلیب کا نشان لٹکانا عیسائیوں کا شعار ہے، زنار ہندوؤں کی مذہبی شناخت ہے وغیرہ۔ فوجی ٹوپی یا ہیٹ یا کرکٹ ہیٹ یہ چیزیں کسی کا مذہبی شعار نہیں ہیں۔ لہٰذا فوجی ٹوپی یا کرکٹ کے سامنے کے چھجے کو پیچھے موڑ کر نماز پڑھ لی جائے یا ہیٹ کے اردگرد کا چھجہ ایسے موڑا جا سکتا ہو کہ سجدے کے وقت پیشانی کے زمین پر جمنے میں حارج نہ ہو تو نماز ہو جائے گی۔ یہ امر ذہن میں رہے کہ یہاں لباس مسنون یا افضلیت واستحباب

کی بات نہیں ہو رہی بلکہ محض یہ چیزیں پہن کر نماز کے جواز یا عدم جواز کی بات ہو رہی ہے۔ باقی لباس مسنون کیا ہے یا مستحب کیا ہے؟ نماز کے آداب اور وقار کا شرعی تقاضا کیا ہے؟ یہ مسئلہ یہاں زیر بحث نہیں ہے، آخر لوگ پینٹ پہن کر بھی نماز پڑھتے ہیں۔ ہاں افضل یہی ہے کہ مسنون لباس خارج نماز بھی پہنا جائے اور اس کو پہن کر نماز پڑھی جائے۔

نماز میں ٹوپی پہننے کا حکم

سوال: نماز میں ٹوپی پہننے کا شرعی حکم کیا ہے؟ کیا ننگے سر نماز پڑھنا جائز ہے؟ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ نماز کے وقت سر پر چھوٹا سا رومال باندھ لیتے ہیں یا مسجد میں باریک جالی دار ٹوپیاں رکھی ہوتی ہیں وہ پہن لیتے ہیں اور نماز کے بعد اتار دیتے ہیں۔ ان سب کا حکم کیا ہے؟۔ (سید ذاکر شاہ، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف:31)

"اے اولاد آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس زیب تن کر لیا کرو"۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ جل شانہ نے لباس کے لئے زینت کا لفظ استعمال فرما کر اپنے عبادت گزار بندوں کو یہ حکم فرمایا ہے کہ نماز کے وقت ان کا لباس اپنی استطاعت کے مطابق عمدہ اور صاف ستھرا ہونا چاہیے کیونکہ اس وقت بندہ اللہ کے دربار میں اس کے حضور کھڑے ہو کر نذرانہ بندگی بجالاتا ہے اور اپنی التجائیں پیش کرتا ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ نماز کے وقت اپنا سب سے بہتر لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جمال کو پسند فرماتا ہے، اس لئے میں اپنے رب کی رضا کے لئے زیب و زینت اختیار کرتا ہوں اور پھر مندرجہ بالا آیت کی تلاوت فرماتے، اس کی روشنی میں ہمارے فقہاء کرام نے جو مسائل بیان فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) نماز میں صرف بقدر واجب ستر پوشی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق صاف، عمدہ اور مکمل لباس پہننا چاہیے۔

(۲) بعض مخصوص شعبوں یا محنت و مشقت سے وابستہ لوگوں کو کام کاج کے لئے الگ لباس پہننا پڑتا ہے، اس پر داغ دھبے بھی لگ جاتے ہیں اور دیکھنے میں باوقار نہیں لگتا ہے، وہ لباس اگر پاک ہے اور مکمل ستر پوش ہے تو اس سے نماز تو ادا ہو جائے گی لیکن افضل یہ ہے کہ نماز کے وقت صاف ستھرا اور باوقار لباس پہن لیا کریں۔

(۳) ننگے سر نماز پڑھنے سے ادا ہو جاتی ہے لیکن افضل یہ ہے کہ عمامہ یا ٹوپی پہن کر نماز پڑھی جائے۔

(۴) نماز کے وقت سر پر چھوٹا سا رومال باندھ لینا یا جالی کی ٹوپی پہن لینا اور پھر اسے اتار پھینکنا، ایسی ہر وضع جسے اختیار کر کے بندہ کسی معزز آدمی کے سامنے یا کسی باوقار محفل میں نہیں جاتا، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اور نماز کے وقار کے منافی ہے۔

(۵) کم از کم اتنا تو ضرور کریں کہ کپڑے کی صاف ستھری عمدہ ٹوپی اپنے پاس رکھیں اور نماز و تلاوت وغیرہ کے وقت پہن لیا کریں۔

سلام کے الفاظ

سوال: ہماری مسجد میں امام صاحب نماز باجماعت میں سلام پھیرتے وقت ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کے بجائے سلام علیکم رحمۃ اللہ'' کہتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟۔

(حکیم محمود علی بیگ پی سی ایچ ایس، کراچی)

جواب: نماز کے اختتام پر ''السلام'' کہنا واجب ہے اور ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہنا سنت ہے اگر کسی نے صرف السلام یا سلام علیکم یا علیکم السلام کہا تب بھی نماز ہو جائے گی لیکن اس سے ترک سنت لازم آئے گا جو اجر و ثواب میں کمی کا سبب ہے، اس لئے افضل یہ ہے کہ سنت کے مطابق ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہے ممکن ہے امام صاحب یہی مسنون کلمات کہتے ہوں آپ کے سننے میں فرق ہو بہتر یہ ہے کہ انہیں علیحدگی میں توجہ دلا دیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار جلد اول صفحہ 230 پر درج ہے۔

قضا نمازوں کا حکم

سوال: قضا نمازیں کس طرح ادا کی جائیں؟ کیا ہر فرض نماز کے ساتھ دو نفل پڑھ سکتے ہیں؟۔ (محمد عامر شیخ، لطیف آباد، حیدرآباد)

جواب: کوئی بھی مسلمان (مرد یا عورت) جس دن سے بلوغت کی عمر کو پہنچا ہے اس دن سے روانہ پانچ وقت کی نماز اس کے مقررہ شرعی وقت کے اندر اس پر فرض ہے، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ادا کرتا رہا ہے تو الحمدللہ، اسے اس سعادت پر اپنے رب کریم کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور اگر کوئی نماز اپنے مقررہ وقت کے اندر نہیں پڑھی جا سکی تو اسے "قضاء" کہتے ہیں اور ایسی قضا نمازوں کا حساب رکھنا اور ان کا بطور قضاء پڑھنا فرض ہے۔ اگر ایسی قضاء نمازیں بدقسمتی سے اتنی زیادہ ہو جائیں کہ ان کو باقاعدہ وقت کے تعین کے ساتھ ساتھ دن اور تاریخ کے بھی تعین کے ساتھ پڑھنا مشکل ہو گیا ہے یعنی نمازوں کی تعداد، اوقات، ایام اور تواریخ کا حساب رکھنا دشوار ہو گیا ہے تو اسے عرف عام میں "قضائے عمری" کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان تین اوقات (طلوع، زوال، غروب) کے علاوہ جو مکروہ تحریمی ہیں، جب بھی فرصت ملے قضا نمازیں پڑھتے رہیں اور ہر وقت کی نماز کے ساتھ یعنی وقتی نماز سے پہلے یا بعد میں کم از کم اس وقت کی ایک قضا بھی پڑھ لیں اور نیت اس طرح کریں کہ مثلاً فجر یا ظہر یا عصر یا مغرب یا عشاء اور وتر کی پہلی یا آخری نماز جو میرے ذمے باقی ہے، اسے بطور قضا ادا کرتا ہوں، اس طرح اگر بالفرض ہماری پڑھی ہوئی قضا نمازیں، اس تعداد سے زیادہ ہو گئیں جو ہمارے ذمے باقی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نفل شمار ہوں گی اور انشاء اللہ ان کا بھی اجر ملے گا۔ ہر فرض نماز کے ساتھ دو یا زیادہ نفل پڑھنا بہت اچھی بات ہے لیکن نفل فرضوں کا بدل نہیں ہو سکتے البتہ فرضوں کے اندر کچھ کمی رہ گئی ہو تو اس کی تلافی کا سبب بن سکتے ہیں۔

بہت سی قضا نمازوں کو تخفیف کے ساتھ پڑھنے کا مسئلہ

سوال: جس شخص کے ذمہ کئی سال کی مثلاً پانچ دس سال کی نمازیں قضا ہوں، وہ پڑھنا

چاہیے تو بعض علماء نے جو قضاء عمری کی نمازوں میں تخفیف کا مسئلہ لکھا ہے وہ یہ ہے کہ پہلی تخفیف ہر رکوع اور ہر سجدہ میں تین تین بار (سبحان ربی العظیم "، " سبحان ربی الاعلی " کی جگہ صرف ایک ایک بار کہے دوسری تخفیف یہ کہ فرضوں کی تیسری اور چوتھی رکعت میں "الحمد شریف" کی جگہ فقط "سبحان اللہ" تین بار کہہ کر رکوع کر لے، تیسری تخفیف یہ کہ پچھلی التحیات کے بعد مکمل درود ابراہیمی اور دعا کی جگہ صرف "اللھم صل علی محمد و الہ" کہہ کر سلام پھیر دے، چوتھی تخفیف یہ کہ وتروں کی تیسری رکعت میں دعا قنوت کی جگہ اللہ اکبر کہہ کر فقط ایک یا تین بار "رب اغفرلی" کہے۔ لیکن جن کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے وہاں کسی فقہ کی کتاب کا حوالہ نہیں ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ بتائیں یہ کون سی حدیث یا فقہ سے ثابت ہے؟ (احمد بخش سکندری، جامع مسجد قبا، لیاقت آباد، کراچی)

جواب: صاحب درمختار علامہ علاؤالدین حصکفی نے واجبات صلوٰۃ کا بیان کرتے ہوئے ان میں "تعدیل ارکان" کو بھی شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ رکوع وسجود میں ایک تسبیح سکون کے ساتھ ٹھہرے رہنا واجب ہے، اس سے اشارتاً معلوم ہوا کہ رکوع وسجود میں تسبیحات کا پڑھنا، تعداد سے قطع نظر، واجبات صلوٰۃ میں سے نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2، صفحہ 139 المطبوعہ دار احیاء التراث العربی) اسی کتاب کے صفحہ 152 پر علامہ ابن عابدین شامی نے رکوع وسجود میں تین بار تسبیح پڑھنے کو نماز کی سنتوں میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر رکوع وسجود میں تسبیح مطلقاً نہ پڑھی یا تین سے کم پڑھیں تو کراہت تنزیہی لازم آئے گی، اسی کتاب کے صفحہ 175 پر مزید لکھا ہے کہ اگرچہ قواعد مذہب کی رو سے رکوع وسجود میں تین تسبیح پڑھنا واجب ہونا چاہیے لیکن روایت سے ان کا سنت ہونا ہی ثابت ہے اور تین سے زیادہ طاق مرتبہ پڑھنا مستحب ہے۔ لہٰذا اگر قضاء نمازوں کی کثرت کی بناء پر تخفیف کر کے رکوع و سجدے میں صرف ایک بار تسبیح پڑھ لی تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی صرف کراہت تنزیہی لازم آئے گی، لیکن اسے عام معمول نہیں بنانا چاہیے۔ فرض کی پچھلی دو رکعات میں قرأت فرض یا واجب نہیں ہے، لہٰذا نمازی اگر کچھ بھی نہ پڑھے اور ایک تسبیح کی مقدار سکوت کر کے

کھڑا رہے یا محض ایک بار ''سبحان اللہ'' پڑھے تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، اور اگر قضاء شدہ نمازیں کثیر ہوں تو فریضۂ شرعی سے سبکدوش ہونے کے لئے فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں قضا پڑھتے ہوئے تخفیف کر سکتا ہے، یا کبھی نیند کا غلبہ ہو یا بھوک و پیاس کا غلبہ ہو یا کوئی ضرورت شدیدہ لاحق ہو یا بچہ چلا رہا ہوں اور ماں نماز پڑھتے ہوئے بے چین ہو جائے یا کوئی مدد کے لئے پکار رہا ہو تو ادا نماز میں بھی تخفیف کر سکتا ہے، لیکن اسے معمول نہیں بنانا چاہیے کیونکہ افضل تو قرأت ہی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس پر دوام فرمایا ہے (ہدایہ اولین صفحہ 148 مطبع شرکت علمیہ) علامہ علاؤ الدین حصکفی نے الدر المختار میں لکھا ہے کہ نماز وتر میں جو دعائے قنوت واجب ہے اس سے کوئی معین دعا مراد نہیں ہے بلکہ مطلق دعا مراد ہے اس کے تحت علامہ شامی نے لکھا ہے کہ کسی بھی دعاء کے پڑھنے سے واجب ادا ہو جائے گا۔ البتہ مخصوص دعا ''اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُكَ'' کا پڑھنا سنت ہے۔ آگے چل کر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ جو مسنون دعاء قنوت کو صحیح طور پر نہ پڑھ سکتا ہو تو وہ ''رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً'' والی دعا پڑھ لے، اور ابو اللیث سمرقندی کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ'' تین بار پڑھ لے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ''یَارَبِّ'' تین بار پڑھ لے۔ (فتاویٰ شامی طبع جدید صفحہ 385,143، جلد 2) لہٰذا اگر کسی کے ذمے قضا نمازیں کثیر تعداد میں ہوں تو وہ اس تخفیف سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور کسی ضرورت شدیدہ کے موقع پر ادا نماز پڑھتے وقت بھی تخفیف کر سکتا ہے لیکن اسے عادت اور معمول نہ بنائے۔ افضل دعاء مسنون ہی کا پڑھنا ہے اور اسی میں کامل اجر ہے۔

قضا نمازیں ادا کرنا

سوال: ایک آدمی سے بہت سی نمازیں قضا ہو گئیں مگر اسے تعداد معلوم نہیں۔ اگر وہ ہر وقت کی نماز کے ساتھ ایک نماز قضا ادا کرے تو فجر اور عصر میں کس طرح ادا کرے گا کیونکہ وہ مکروہ وقت ہوتا ہے؟ (محمد مختار احمد، ڈیرہ غازی خان)

جواب: علماء نے فرمایا ہے کہ ایسی صورتحال میں جب بھی اسے توفیق ہو اور موقع ملے،

قضا نمازیں پڑھتا رہے، فرض کی قضا فرض ہے اور وتر کی نماز چونکہ واجب ہے، اس لئے اس کی قضا بھی واجب ہے، سنتوں کی قضا نہیں ہے۔ ایک ترتیب سے پڑھتا چلا جائے یعنی فجر کے دو فرض، ظہر کے چار فرض، عصر کے چار فرض، مغرب کے تین فرض، عشا کے چار فرض اور تین وتر۔ ذہن میں یہ نیت کرے کہ وہ پہلی نماز فجر یا ظہر یا عصر یا مغرب یا عشاء یا وتر جو میرے ذمے باقی ہے ادا کر رہا ہوں، جو ادا کرتا چلا جائے گا وہ منہا ہو جائے گی اور اس کے بعد والی پہلی ہو جائے گی۔ اذان فجر یعنی صبح صادق سے فرائض فجر تک، اس کے بعد سے طلوع آفتاب تک اور فرائض عصر کے بعد ان تین اوقات میں نوافل پڑھنے منع ہیں لیکن قضا نمازیں پڑھ سکتے ہیں اور سجدۂ تلاوت بھی کر سکتے ہیں۔ صرف تین اوقات جو مکروہ تحریمی ہیں ان میں قضا نمازیں نہیں پڑھنی چاہئیں یعنی طلوع آفتاب (آفتاب کی پہلی کرن نمودار ہونے سے بیس منٹ تک) غروب آفتاب (یعنی غروب آفتاب سے پہلے کے بیس منٹ) اور ضحوۂ کبریٰ (زوال سے پہلے کا وقت)۔

قضائے عمری سے کیا مراد ہے؟

سوال: ایک مولانا صاحب نے ایک اخبار میں اس سوال کے جواب میں کہ قضاء عمری کیسے ادا کی جائے؟ فرمایا کہ قضاء عمری کچھ نہیں ہے۔ بس توبہ واستغفار کریں، اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے، اس جواب سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قضا شدہ نمازوں کی قضا لازم نہیں ہے بس توبہ کر لینا کافی ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر کسی کی ایک یا کئی نمازیں قضا ہو گئی ہوں تو کیا محض توبہ واستغفار سے ان کی تلافی اور بارگاہ الٰہی سے معافی ہو جائے گی یا قضا پڑھے بغیر انسان بری الذمہ نہیں ہو سکتا؟۔ (عزیز الحسن برنی محمد فرحان، دستگیر کالونی)

جواب: نماز ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد و عورت پر فرض قطعی اور فرض عین ہے حتیٰ کہ اگر کھڑے ہو کر پڑھنے پر قدرت نہیں ہے تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھنے پر بھی قادر نہیں ہے تو لیٹے لیٹے اشارے سے رکوع و سجود کرے، الغرض جب تک ہوش و حواس قائم ہیں، نماز کا فریضہ ساقط نہیں ہوتا۔ ایک نماز بھی بلا عذر اپنے وقت کے اندر نہ پڑھنا، غفلت سے چھوڑ دینا گناہ کبیرہ

ہے اور گناہ کبیرہ کا مرتکب فاسق کہلاتا ہے۔ ہاں کبھی بھولے سے وقت نکل جائے یا انسان بے اختیار سویا رہ جائے، یعنی یہ عادت و معمول نہ ہو، تو اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے ''جس کی نماز سوتے میں رہ جائے یا بھولے سے رہ جائے تو جیسے ہی اسے یاد آئے (یا بیدار ہو) فوراً پڑھ لے (بشرطیکہ وہ تین اوقات نہ ہوں جن میں ہر قسم کی نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے)''۔ نماز اپنے وقت کے اندر نہ پڑھی ہو، کوئی عذر بھی نہ ہو اور فوت ہو جائے تو اس کی قضا لازم ہے، قضا پڑھنے کے باوجود، بلا عذر وقت کے اندر پڑھنے کا جو گناہ ہے اس پر رب تبارک و تعالیٰ سے توبہ کرتے رہنا چاہیے۔ رب کا مطالبہ ادائے کامل (وقت کے اندر پڑھنے) کا تھا، بندے نے اپنی کوتاہی کی بناء پر ادائے ناقص کی (یعنی وقت مقررہ گزرنے کے بعد پڑھی) لہٰذا قضا پڑھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ قبول فرمالے تو اس کا کرم ہے اور وہ رد فرمادے تو یہ اس کا حق ہے۔ بندے پر لازم ہے کہ قضا بھی پڑھے، اپنی تقصیر کی معافی بھی مانگتا رہے اور اس کی رحمت سے قبولیت کی آس بھی لگائے رکھے۔ بالغ ہونے کے بعد سے جتنی بھی نمازیں فوت ہوئی ہیں۔ ایک ایک کر کے ان سب فرائض کی قضا (مع وتر عشاء) لازم ہے اور قضا پڑھنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ کسی کے علم میں نہیں کہ زندگی کے کتنے ماہ و سال اور کتنی سانسیں باقی ہیں اور کیا خبر زندگی کا چراغ کب گل ہو جائے۔ اگر بدقسمتی سے فوت شدہ نمازیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا حساب ہی نہیں ہے اور ان سب کو اکٹھا پڑھنا دشوار ہو تو یہ معمول بنالے کہ ہر نماز کے ساتھ ایک ایک دن کی نمازیں یا کم از کم ایک وقت کی نماز بطور قضا پڑھے۔ قضا پڑھنے کے لئے سنتیں چھوڑنی پڑیں تو چھوڑ دے۔ فتوح الغیب میں شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے ''جو شخص فرض چھوڑ کر نفل و سنت میں مشغول ہوگا تو یہ اس کی جانب سے قبول نہیں کیے جائیں گے اور وہ رسوا ہوگا''۔ (فتاویٰ رضویہ طبع جدید) اسی مقام پر عوارف المعارف کے حوالے سے شیخ شہاب الدین سہروردی کا یہ قول درج ہے ''ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ جب تک فرض ادا نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ کوئی نفل بھی قبول نہیں فرماتا۔ (ایسے لوگوں کو) اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے کہ ''تمہاری مثال اس بندۂ سوء کی سی ہے جو قرض ادا کرنے سے پہلے تحفے بانٹتا پھرے''۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''ہمیں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی قبول نہیں''۔ (فتاویٰ رضویہ، بحوالہ الجامع الکبیر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں غزوۂ خندق کے موقع پر دشمن کے خوف اور یلغار کے خطرے کے پیش نظر ایک دن مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ سنن ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ خندق کے موقع پر ایک دن مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حد تک جنگ میں مشغول رکھا کہ آپ کی چار نمازیں فوت ہوگئیں۔ جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا جتنا بھی اللہ نے چاہا پھر آپ نے بلال کو حکم فرمایا، انہوں نے اذان و اقامت کہی اور آپ نے ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر انہوں نے اقامت کہی اور آپ نے عصر کی نماز پڑھی، (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باجماعت قضا نمازیں پڑھیں) اسی سے علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ جو صاحب ترتیب ہو یعنی جس کی مسلسل چھ نمازیں قضا نہ ہوئی ہوں اور کسی سبب سے اس کی ایک دو نمازیں قضا ہو جائیں تو وہ پہلے اپنی فوت شدہ نماز پڑھے اور پھر اس وقت کی نماز پڑھے۔ بشرطیکہ وقت کی گنجائش ہو، جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے ظہر، عصر اور مغرب کی فوت شدہ نمازوں کی قضا پڑھی اور پھر عشاء کی نماز پڑھی جس کا وقت ابھی باقی تھا۔ تاہم اگر کسی کے ذہن میں قضاء عمری کا تصور یہ ہے کہ کسی خاص دن یا خاص موقع و مقام پر ایک ایک یا چند نمازیں قضا پڑھ لے گا تو اس سے زندگی بھر کی ساری فوت شدہ نمازوں کی تلافی ہو جائے گی، تو یہ تصور بالکل فاسد اور باطل ہے، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، اور یہ تصور بھی باطل ہے کہ فوت شدہ نمازوں کی قضا پڑھے بغیر محض توبہ و استغفار سے معافی ہو جائے گی۔ یہ اسلام کے تصور توبہ کی بالکل باطل تشریح اور لوگوں کو گناہ پر قائم رہنے کا حوصلہ دلانا ہے۔ توبہ کی تو لازمی شرط یہ ہے کہ انسان شریعت کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کے مطابق اپنے گناہ کی تلافی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی کوتاہی و غفلت پر اللہ تعالیٰ سے معافی

بھی مانگے۔

سوال: میری عمر 75 سال کے لگ بھگ ہے، 22 سال سے متواتر نماز پڑھ رہی ہوں، اندازاً چالیس سال کی نمازیں میرے ذمے باقی ہیں، مختلف امراض لاحق ہیں، قضا نمازوں اور روزوں کا فدیہ اپنی نادار اولاد کو دے سکتی ہوں؟ (عزیزہ، کراچی)

جواب: سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر شکر ادا کیجئے کہ اس نے آخرت کی جوابدہی اور عذاب آخرت کا خوف آپ کے دل میں پیدا کیا۔ اب آپ گزشتہ گناہوں کی تلافی کرنا چاہتی ہیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا ضمیر ابھی زندہ ہے اور ایمان کی حرارت باقی ہے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور صدق دل سے توبہ کریں، اس کے بعد حسب توفیق پانچ وقت کے فرائض اور وتر کی قضا پڑھیں۔ کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتیں تو بیٹھ کر پڑھیں، رکوع وسجود کرنے کی بھی طاقت نہیں ہے تو اشارے سے پڑھیں۔ اگر بیٹھ کر اشارے سے پڑھنے کی بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر اشارے سے پڑھیں۔ جب نماز اشارے سے پڑھی جائے تو حسب استطاعت سجدے کے لئے رکوع کے بہ نسبت زیادہ جھکیں۔ اور اگر لیٹ کر اشارے سے پڑھنے کی بھی قدرت نہ ہو تو پھر عذر کی بناء پر نماز چھوڑ دے اور صحت یاب ہونے پر قضاء کرے۔ زندگی میں قضا نمازوں کی تلافی فدیئے سے نہیں ہو سکتی، پڑھنی لازمی ہیں۔ البتہ انتہائی ضعیف العمر شخص یا دائمی مریض یا انتہائی کمزور جو روزے رکھنے کی جسمانی طاقت نہیں رکھتا، وہ فدیہ دے، ایک روزے کا فدیہ دو کلو گرام 150 گرام گندم کا آٹا یا اس کی قیمت ہے۔ نماز کے فدیے کے بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی حکم وارد نہیں ہوا۔ تاہم فقہاء نے روزے پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ مرض وفات میں وفات سے پہلے بقائمی ہوش وحواس، اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اس کے ذمے نمازیں باقی ہیں تو فدیہ نماز کی وصیت کرے، اس کے ورثاء اس کے ترکے سے فدیہ ادا کریں، اگر قضا نمازیں بہت زیادہ ہیں اور ترکے کی ایک تہائی سے فدیہ پورا نہیں ہوتا تو باقی وارثوں کی مرضی پر ہے۔ ایک دن کی پانچ نمازوں (فرائض) اور وتر کو ملا کر چھ روزوں کے فدیے کے

برابر دینا ہوں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی شان کریمی سے نمازوں کے بدل کے طور پر قبول فرما لے تو اس کا کرم ہوگا، ورنہ مالی صدقے کا اجر ضرور ملے گا، انشاء اللہ۔ نماز، روزے کا فدیہ، کفارہ صوم، کفارہ قسم، زکوٰۃ اور نذر کی رقوم اپنے باپ، دادا، ماں، دادی، نانی، نانا (یعنی اصول) اور بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسی، نواسا (یعنی فروع) کو دینے سے ادا نہیں ہوگی۔

سوال: پچھلے دنوں میں نے آپ کا جواب پڑھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ قضائے عمری پڑھنے کے لئے اگر سنت بھی چھوڑنی پڑے تو چھوڑ دینا چاہیے۔ کیا سنت مؤکدہ بھی چھوڑ سکتے ہیں؟ اگر ایک شخص کو دس سال کی نماز پڑھنی ہے تو کیا وہ دس سال تک سنت نہیں پڑھے گا؟

جواب: جی ہاں! جب آپ گزشتہ قضا نمازیں پڑھ رہے ہوں تو سنت مؤکدہ بھی چھوڑ سکتے ہیں، (نوٹ: اس جواب پر اشکال اور اس کا تفصیلی جواب جلد ثانی میں آرہا ہے)۔

سوال: نماز قضائے عمری پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے یا عام نماز کی طرح پڑھی جائے گی یعنی جو سورتیں عام نماز میں پڑھی جاتی ہیں ویسے ہی پڑھی جائیں گی؟

جواب: قضا نماز عام نمازوں کی طرح ہی پڑھی جائے گی اگر بہت زیادہ ہوں تو قرأت اور تسبیحات میں تخفیف کر سکتے ہیں۔

سوال: کیا فجر اور عصر کی نماز سے پہلے نفل اور قضا عمری نماز پڑھ سکتے ہیں۔

جواب: صبح صادق کے بعد اور فجر کی فرض نماز سے پہلے نفل نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ فجر کی دو سنتیں اور قضا نمازیں پڑھ سکتے ہیں اور عصر سے پہلے نفل اور قضا دونوں پڑھ سکتے ہیں۔

سوال: کیا وتر کی بھی قضائے عمری پڑھی جائے گی؟

جواب: چونکہ وتر کی نماز واجب ہے اس لئے اس کی قضا پڑھنا بھی واجب ہے۔

سوال: فجر کی نماز قصر اور قضاء عمری میں دو رکعت فرض سے پہلے دو سنت پڑھنا ضروری ہے یا نہیں: (عبدالسمیع خان، کراچی)

جواب: حالت سفر میں فجر کی سنتیں پڑھ لینا افضل ہے کیونکہ فجر کی سنتیں زیادہ مؤکدہ

ہیں۔ فجر کی گزشتہ نمازیں پڑھی جارہی ہوں تو سنتیں پڑھنا ضروری نہیں ہے۔

سوال: میں فجر اور عصر کی نمازیں نمازوں کے اوقات میں پڑھنے سے پہلے قضاء عمری نمازیں پڑھتا ہوں کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: اگر آپ کے ذمے قضا نمازیں باقی ہیں تو یہ طریقہ صحیح ہے بلکہ اگر فجر اور عصر کے وقت نماز ادا کرنے کے بعد وقت میں گنجائش ہے تو اس میں بھی قضا نماز پڑھ سکتے ہیں۔

سوال: چار سنت اور چار فرض پڑھتے وقت اگر دو رکعت کے بعد بیٹھ کر التحیات پڑھنا بھول جائیں تو سجدہ سہوادا کر کے نماز ہو جائے گی یا دوبارہ پڑھنی ضروری ہے؟

جواب: جی ہاں! اس صورت میں سجدہ سہوادا کرنے سے نماز صحیح طور پرادا ہو جائے گی۔

ظہر یا جمعہ کی ابتدائی چار سنتیں رہ جائیں تو کب پڑھے؟

سوال: ظہر کی جماعت کھڑی ہوگئی اور آنے والا نمازی امام کی اقتداء میں جماعت میں شامل ہو گیا، اس طرح اس کی فرضوں سے پہلے کی چار سنتیں رہ گئیں یا امام خطبہ جمعہ کے لئے کھڑا ہو گیا اور اس وقت آنے والا نمازی ابتدائی چار سنتیں چھوڑ کر خطبہ سننے کے لئے بیٹھ گیا اور پھر نماز جمعہ ادا کی گئی۔ اب ان دونوں صورتوں میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا وہ نماز کی ابتدائی چھوڑی ہوئی سنتیں پہلے پڑھے یا انہیں فرائض کے بعد والی سنتوں کے بعد پڑھے؟

(جاوید خان، کیماڑی، کراچی)

جواب: علامہ علاؤالدین حصکفی نے اپنے فتاویٰ الدر المختار میں لکھا ہے کہ اگر ظہر کی پہلی چار سنتیں رہ جائیں تو انہیں فرض کے بعد والی دو سنتوں سے پہلے پڑھے، یہ امام محمد کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمحتار میں لکھا ہے کہ اگر چہ فقہ کی عام متون میں یہی ہے، لیکن فتح القدیر میں اسے ترجیح دی گئی ہے کہ پہلے کی چھوڑی ہوئی چار سنتوں کو فرض کے بعد والی دو سنتوں کے بعد پڑھے، الامداد اور فتاویٰ العتابی میں اسی کو مختار قرار دیا گیا ہے اور مبسوط شیخ الاسلام میں بھی اس کو صحیح ترین قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ظہر یا جمعہ کی پہلی چھوڑی ہوئی سنتوں کو دونوں طرح پڑھنا درست ہے، لیکن میری

رائے میں علامہ شامی نے جسے مختار اور صحیح ترین قرار دیا ہے، وہی زیادہ بہتر اور راجح ہے، یعنی یہ کہ پہلے فرض کے بعد والی سنتوں کو اپنے مقام پر پڑھا جائے اور پھر پہلے کی چھوڑی ہوئی سنتیں پڑھ لی جائیں کیونکہ پہلے والی تو اپنے مقام سے ہٹ چکی ہیں، کم از کم بعد والی تو اپنے مقام پر پڑھ لی جائیں، اور سنن ابن ماجہ کی ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ سے فرض ظہر سے پہلے والی چار سنتیں رہ جاتیں تو آپ انہیں بعد والی دو رکعتوں کے بعد پڑھتے (سنن ابن ماجہ باب من فاتتہ الاربع قبل الظہیر) یہ ساری بحث فتاویٰ شامی جلد 1 صفحہ 483 پر موجود ہے۔

کیا عبادت میں نیابت جائز ہے؟

سوال: حج بھی، نماز اور روزے کی طرح جسمانی عبادت ہے، کیا عبادات میں نیابت جائز ہے، کیونکہ ''حج بدل'' تو سنتے رہتے ہیں، نماز اور روزے کے بارے میں سننے میں نہیں آیا؟۔ (قاری مختار احمد، گوہر آباد، کراچی)

جواب: ''بدل'' سے مراد ہے: عبادت میں نیابت، یعنی کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے عبادت ادا کرنا، اس طرح کہ وہ فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ اس معنی میں یہ مسئلہ فرض عبادت سے متعلق ہے۔ شریعت کا اصول یہ ہے کہ بدنی عبادت میں نیابت یا بدل کی گنجائش نہیں ہے جس عاقل و بالغ مسلمان مرد یا عورت کے ذمے شریعت نے فرض عائد کیا ہے اسی کے ادا کرنے سے وہ عہدہ برآ ہوگا اور فرض ساقط ہوگا۔ کسی اور کے ادا کرنے سے فرض ساقط نہیں ہوگا۔ روزہ بلا عذر یا عارضی سبب (سفر یا مرض) سے چھوٹ جائے تو اس کا بدل قضا ہے، دائمی عذر (ضعف یا مرض) ہو تو اس کا بدل فدیہ ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ''کوئی شخص وفات پا جائے اور اس کے ذمے فرض روزے رہ گئے ہوں، تو اس کا ولی اس کی جانب سے روزے رکھے''۔ اس حدیث پاک کا منشا یہ ہے کہ اس کا ولی اس کی جانب سے قضا شدہ روزوں کا فدیہ ادا کرے، اگر وفات پانے والے نے وصیت کی ہو تو یہ حکم وجوب

پر محمول ہوگا؟ ورنہ یہ حکم استحبابی ہے اور ولی یا ورثاء کی مرضی پر موقوف ہے۔ نماز میں بدل یا نیابت کا کوئی تصور نہیں ہے، بصورت عذر بیٹھ کر، لیٹ کر اور اشارے سے بھی پڑھ سکتا ہے اور بلا عذر نہ پڑھے تو قضا ہے۔ مالی عبادت میں بدل اور نیابت کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ یعنی ایک مال دار شخص اپنی زکوٰۃ یا فطرہ ادا کرنے کے لئے کسی کو اپنا نائب بنا سکتا ہے۔ حج میں چونکہ بدنی اور مالی دونوں پہلو ہیں، اس لئے اس میں شریعت نے نیابت اور بدل کی گنجائش رکھی ہے لیکن جو مال دار شخص تندرست ہے اور خود حج ادا کرنے پر قادر ہے تو زندگی میں اس کے لئے بدل کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر بیمار ہے، ضعیف ہے یا معذور ہے تو کسی کو اپنی طرف سے ''حج بدل'' کرنے پر مامور کرے یا عذر و مرض کوئی سبب مانع تو نہیں تھا لیکن بدقسمتی اور لاپرواہی کی بناء پر زندگی میں فریضۂ حج ادا نہیں کر سکا، تو موت سے پہلے ''حج بدل'' کی وصیت کرے اور کسی وارث یا غیر وارث کو اس پر مامور کرے۔ اگر کوئی عذر مانع بھی نہیں تھا اور بدقسمتی سے موت سے پہلے وصیت بھی نہیں کی تو ورثاء اگر اس پر رحم کرتے ہوئے رضا کارانہ طور پر خود اس کا حج بدل ادا کر دیں یا کرا دیں تو اللہ کی رحمت اور کرم سے مقبولیت کی امید کرنی چاہیے کہ شاید وہ فرض کو ساقط فرما دے، ورنہ اجر سے تو یقیناً محروم نہیں فرمائے گا۔

کیا بخار کی حالت میں نماز قضا کی جا سکتی ہے؟

سوال: اگر طبیعت زیادہ خراب ہو جائے (مثلاً تیز بخار ہو جائے) تو کیا نماز قضا کی جا سکتی ہے؟ گناہ تو نہیں ملے گا؟۔ (دانیال، کراچی)

جواب: طبیعت خراب ہونے یا تیز بخار کی صورت میں نماز قضا کرنا جائز نہیں ہے اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے، رکوع وسجود کی ادائیگی پر قادر نہیں ہے تو اشارے سے رکوع وسجدہ کرے، تکلیف زیادہ ہے تو سنتیں چھوڑ دے صرف فرض پڑھ لے، ترک کرنے پر گناہ گار ہوگا توبہ کرے اور بعد میں قضا پڑھے۔

نماز میں صاحب ترتیب کون ہے؟

سوال: صاحب ترتیب نمازی کون کہلاتا ہے جس کی فجر کی نماز قضا ہوتی رہتی ہے کیا وہ صاحب ترتیب رہتا ہے؟۔
(ابواللحم شہزاد، کراچی)

جواب: جس خوش نصیب مومن کی بلوغت کے بعد کبھی چھ نمازیں مسلسل قضا نہ ہوئی ہوں وہ ''صاحب ترتیب'' کہلاتا ہے۔ جس کی بدقسمتی سے فجر کی یا کوئی ایک نماز قضا ہو جاتی ہے مگر وہ اسے دوسری نماز سے پہلے قضا پڑھ لیتا ہے تو وہ بدستور ''صاحب ترتیب'' رہتا ہے۔

صاحب ترتیب پہلے قضا پڑھے

سوال: اگر بدقسمتی سے کسی کی فجر اور ظہر کی نماز قضا ہوگئی ہے اور عصر کی جماعت کھڑی ہونے والی ہے تو وہ کیا کرے؟۔
(شہزاد، کراچی)

جواب: اگر وہ ''صاحب ترتیب'' ہے تو پہلے فجر اور ظہر کی قضا نماز پڑھے پھر عصر کی نماز ادا کرے، ہاں اگر وقت تنگ ہے اور صرف اتنی گنجائش ہے کہ ایک وقت کی فرض نماز پڑھ لے تو اس صورت میں اس وقت کی نماز کی ادا کو مقدم کرلے اور قضا بعد میں پڑھے۔

نمازی کے آگے جوتے رکھنا ☆ فجر کی سنتوں کی قضا

سوال: (الف) کیا نمازی اپنے جوتے سامنے رکھ کر نماز پڑھ سکتا ہے؟
(ب) کیا نماز فجر کی قضاء پڑھتے وقت سنتوں کی قضا بھی ضروری ہے؟
(سید محبوب شاہ، قائد آباد، کراچی)

جواب: (الف) حفاظت کے نقطۂ نظر سے نمازی اپنے جوتے سامنے رکھ کر نماز پڑھ سکتا ہے، اس طرح جوتے چوری ہونے کا خدشہ نہیں رہے گا اور نماز میں اس کی توجہ نہیں بٹے گی، خاص طور پر جب کہ جوتے نئے اور قیمتی ہوں، البتہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت جوتے جھاڑ لینے چاہئیں تاکہ مسجد آلودہ نہ ہو۔ اگر دوسرے نمازیوں کی طبعی ناگواری کا اندیشہ ہو تو آج کل پلاسٹک کے شاپنگ بیگ عام ہیں، نمازی ساتھ لیتا آئے

اور جو بچے اس میں ڈال کر سامنے رکھ لے۔

(ب) فجر کی سنتوں کی تاکید دیگر اوقات کی مؤکدہ سنتوں کے مقابلے میں زیادہ ہے بلکہ فقہاء نے انہیں واجب سے قریب تر قرار دیا ہے، لہٰذا اگر فجر کی قضا اسی روز طلوعِ آفتاب کے 20 منٹ بعد پڑھی جائے تو ساتھ سنتیں بھی پڑھ لیں، یہ افضل ہے، بعد میں ضرورت نہیں ہے۔

جماعت کھڑی ہو چکی اور فجر کی سنتیں

سوال: جب مسجد میں فجر کی جماعت کھڑی ہو چکی ہو تو مقتدی سنتیں پڑھے یا جماعت میں شامل ہو جائے؟ (محمد ناصر خان چشتی، ٹانک صوبہ سرحد)

جواب: مسجد میں فجر کی جماعت کھڑی ہو چکی ہے اور اس دوران نمازی مسجد میں آیا، تو وہ کیا کرے، آیا فجر کی سنتیں پڑھ کر جماعت میں شامل ہو یا براہِ راست جماعت میں شامل ہو جائے؟ اگر مسجد اتنی بڑی ہے کہ نمازی پیچھے دور کھڑے ہو کر سنتیں پڑھے تو امام کی قرأت کی آواز اس تک نہیں پہنچتی، ایسی صورت میں اگر وہ سنتیں پڑھ کر جماعت کو پا سکتا ہے تو سنتیں پڑھ کر جماعت میں شامل ہو جائے۔ لیکن اگر مسجد چھوٹی ہے اور امام کی قرأت کی آواز ساری مسجد میں سنائی دیتی ہے، تو نمازی کو چاہیے کہ سنتیں چھوڑ دے اور براہِ راست جماعت میں شامل ہو جائے، کیونکہ قرأت کا سننا واجب ہے اور سورج نکلنے کے (بقیہ صفحہ 431 پر)

اوقاتِ مکروہہ

سوال: وہ کون سے اوقات ہیں جن میں نفل پڑھنے کی ممانعت ہے، مگر فرض کی قضا پڑھ سکتے ہیں؟۔ (ریاض حسین، رحیم یار خان)

جواب: مندرجہ ذیل اوقات میں نفل پڑھنے کی ممانعت ہے مگر فرض کی قضا پڑھ سکتے ہیں:

(ا) طلوعِ فجر (صبح صادق)۔ سے فجر کے فرض تک، سوائے فجر کی دو سنتوں کے نفل پڑھنا منع ہے۔

(۲) فجر کے فرض کے بعد سے طلوع آفتاب تک۔

(۳) نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک۔

(۴) جب امام خطبۂ جمعہ کے لئے کھڑا ہوا (اس وقت سنتوں کی بھی ممانعت ہے)

(۵) عید کے دن نماز عید سے پہلے گھر پر اور عید گاہ میں دونوں جگہ۔ البتہ جس شخص کا اشراق کے نوافل پڑھنے کا معمول ہو، مسجد میں یا گھر پر، تو وہ پڑھ لے۔

(۶) نماز عید کے بعد مسجد یا عید گاہ میں نوافل پڑھنا منع ہے، شاید اس ممانعت کی وجہ یہ ہو کہ لوگ نماز عید سے فراغت کے بعد منتشر ہوتے ہیں، آپس میں ملتے ہیں، مصافحہ یا معانقہ کرتے ہیں تو اگر کوئی وہاں نفل کی نیت باندھ کر کھڑا ہو جائے تو لوگوں کو دشواری ہوگی یا نماز کی بے حرمتی ہوگی۔ البتہ نماز عید سے واپس گھر آ کر پڑھنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

(۷) عرفات میں جب ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر پڑھی جائیں تو دونوں نمازوں کے درمیان نفل پڑھنا منع ہے۔

(۸) مزدلفہ میں جب مغرب وعشاء کی نمازیں ملا کر پڑھی جائیں تو دونوں نمازوں کے درمیان نفل پڑھنا منع ہے۔

(۹) جب فرض کا وقت تنگ ہو رہا ہو تو وقتی فرض کے سوا ہر نماز یہاں تک کہ فجر وظہر کی سنتیں بھی مکروہ ہیں۔

رمضان میں فرض جماعت سے نہ پڑھے، وتر جماعت سے پڑھے یا نہیں؟

سوال: رمضان المبارک میں نماز عشاء میں بعض اوقات آدمی دیر سے پہنچتا ہے اور اس دوان میں فرض کی جماعت نکل جاتی ہے تو کیا ایسی صورت میں آدمی وتر با جماعت پڑھے یا تنہا پڑھے؟۔ (عمران، خداداد کالونی، کراچی)

جواب: نمازی کو چاہیے کہ مسجد میں پہنچنے کے بعد پہلے اپنی فرض نماز تنہا پڑھے اور پھر تراویح کی جماعت میں شریک ہو جائے اور وتر بھی جماعت کے ساتھ پڑھے کیونکہ جماعت کا اجر تنہا نماز کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ جب فرض کی جماعت ترک ہو جانے کے

باوجود تراویح باجماعت پڑھتے ہیں جب کہ تراویح کی نماز سنت مؤکدہ ہے اور اس کی جماعت کو فرض کی جماعت کے تابع نہیں سمجھتے تو وتر کی نماز جو واجب ہے،اس کی جماعت فرض کی جماعت کے تابع کس طرح ہوگی؟۔

نماز میں بلاضرورت امام کو لقمہ دینا اور امام کا لقمہ لینا

سوال: مغرب کی جماعت ہو رہی تھی، تیسری رکعت میں قعدہ (التحیات) کے بعد امام صاحب دوسری رکعت سمجھ کر کھڑے ہوئے تو کسی نمازی نے لقمہ دیا اور امام صاحب واپس قعدہ میں لوٹ گئے اور سجدۂ سہو کر کے نماز ختم کر دی، کیا یہ نماز درست ہے یا دہرانی پڑے گی؟۔ (محمد ممتاز کشمیری، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: نماز میں امام سے سہو ہو جائے تو مقتدی کے امام کو غلطی پر متنبہ کرنے کو فقہی اصطلاح میں ''تلقین'' کہتے ہیں اور امام کی طرف سے مقتدی کی اصلاح قبول کرنے کو ''تلقن'' کہتے ہیں، اسے ہم اردو میں لقمہ دینے سے تعبیر کرتے ہیں۔ لقمہ دیتے وقت مقتدی ''اللہ اکبر'' یا ''سبحان اللہ'' کہتا ہے، یہ کلمات لفظاً تو تسبیح ربانی کے کلمات ہیں لیکن معنیً کلام ہے اور کلام مفسد نماز ہے، لیکن چونکہ نماز کی صحت کے ساتھ تکمیل شرعاً مطلوب ہے اور امام و مقتدی دونوں کا مفاد بھی اس سے وابستہ ہے اس لئے شرعاً خلاف قیاس لقمہ دینے اور لینے کی اجازت دی گئی ہے مگر صرف ضرورت کی حد تک، یعنی صرف اس حد تک کہ نماز فاسد نہ ہو جائے اور نماز کے اندر رہتے ہوئے اس کی تلافی ہو سکے، لہٰذا اگر ضرورت شرعی کے بغیر مقتدی نے لقمہ دیا تو اس کی نماز بھی فاسد ہو جائے گی۔ اب صورت مسئولہ میں چونکہ امام نے تیسری رکعت کا قعدہ کر لیا ہے اور نماز کے ارکان مکمل ہو گئے ہیں اس لئے امام کے کھڑے ہونے سے نماز فاسد نہیں ہوگی۔ لہٰذا مقتدی اسے لقمہ نہ دیں، اور امام کی پیروی کریں، اگر امام چوتھی رکعت کا سجدہ کر لینے سے پہلے واپس آ کر بیٹھ گیا تو وہ سجدۂ سہو کر کے نماز مکمل کر لے اور مقتدی بھی اس کی پیروی کریں، اور اگر امام نے (نماز مغرب میں) چوتھی رکعت کا سجدہ کر لیا تو وہ ایک رکعت اور ملا لے تا کہ دو نفل ہو جائیں اور آخر میں سجدۂ سہو

کر کے نماز مکمل کر لے۔ واضح رہے کہ یہ سجدہ سہو سلام میں تاخیر کی وجہ سے ہوگا اگر امام صورت مسئولہ میں چوتھی رکعت کا رکوع کر کے سجدے میں جا رہا ہے تو اس وقت مقتدی کا لقمہ دینا اور امام کا لقمہ لینا دونوں صحیح ہیں۔ فتاویٰ درمختار میں لکھا ہے کہ امام نماز کے قعدۂ اخیرہ (تشہد) کے بعد بھول کر کھڑا ہو جائے تو مقتدی امام کی پیروی کرنے کی بجائے بیٹھے بیٹھے امام کی واپسی کا انتظار کریں اگر وہ کھڑے کھڑے سلام پھیر دے یا واپس لوٹ آئے تو اس کی پیروی کریں اور اگر امام اگلی رکعت زائد کے سجدے میں چلا گیا تو مقتدی بیٹھے بیٹھے سلام کرلیں اور امام کا ساتھ نہ دیں۔ لیکن علامہ شبلی نے اس کی شرح میں ایک قول لکھا ہے کہ امام لوٹ کر آئے یا نہ آئے مقتدی ہر صورت میں اس کی پیروی کریں اور یہی قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ہم نے اسی کے موافق لکھا ہے۔

فتاویٰ رضویہ جلد 3، صفحہ نمبر 402 پر ہے کہ آپ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا کہ:

''اگر امام کو قعدۂ اولیٰ میں اپنی عادت سے دیر لگی اور مقتدی نے بخیال اس امر کے کہ امام کو سہو ہوا ہوگا، تکبیر بآواز بلند بناء بر اطلاع امام کہی تو نماز مقتدی کی فاسد ہوئی یا نہیں؟'' اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے لکھا: ''ہمارے امام رضی اللہ عنہ کے نزدیک اصل ان مسائل میں یہ ہے کہ بتانا اگرچہ لفظاً قرأت یا ذکر مثلاً تسبیح و تکبیر ہے اور یہ سب اجزاء و اذکار نماز سے ہیں مگر معنیً کلام ہے کہ اس کا حاصل امام سے خطاب کرنا اور سکھانا ہوتا ہے یعنی تو بھولا، اس کے بعد تجھے یہ کرنا چاہیے، پر ظاہر کہ اس سے یہی غرض مراد ہوتی ہے اور سامع کو بھی یہی معنی مفہوم، تو اس کے کلام ہونے میں کیا شک رہا۔ اگرچہ صورتاً قرآن یا ذکر قرآن ہے ولہٰذا اگر نماز میں کسی یحییٰ نامی کو خطاب کی نیت سے یہ آیت کریمہ: ''یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ'' پڑھی، بالاتفاق نماز جاتی رہی، حالانکہ وہ حقیقتاً قرآن ہے۔

اس بناء پر قیاس یہ تھا کہ مطلقاً بتانا اگرچہ برمحل ہو مفسد نماز ہو کہ جب وہ بلحاظ معنی کلام ٹھہرا، تو بہرحال افساد نماز کرے گا، مگر حاجت اصلاح نماز کے وقت یا جہاں خاص نص وارد ہے ہمارے ائمہ نے اس قیاس کو ترک فرمایا اور حکم استحسان جس کے اعلیٰ وجود سے نص و

ضرورت ہے جواز کا حکم دیا، ولہٰذا صحیح یہ ہے کہ جب امام قرأت میں بھولے مقتدی کو مطلقا بتانا ناروا اگر چہ قدر واجب پڑھ چکا، اگر چہ ایک سے دوسرے، کی طرف انتقال ہی کیا ہو کہ صورت اولیٰ میں واجب ادا ہو چکا، مگر احتمال ہے کہ رکنے الجھنے کے سبب کوئی لفظ اس کی زبان سے ایسا نکل جائے جو مفسد نماز ہو لہٰذا مقتدی کو اپنی نماز درست رکھنے کے لئے بتانے کی حاجت ہے...... آگے کافی تفصیلی کلام کرنے کے بعد اعلیٰ حضرت لکھتے ہیں...... جب یہ اصل ممہد ہوئی، حکم صورت مسئولہ واضح ہو گیا، ظاہر ہے کہ جب امام کو قعدۂ اولیٰ میں دیر ہوئی اور مقتدی نے اس گمان سے یہ قعدۂ اخیرہ ہی سمجھا ہے تبیہ کی تو دو حال سے خالی نہیں یا تو واضع میں اس کا گمان غلط ہوگا۔ یعنی امام قعدۃ ہی اولیٰ میں سمجھا ہے اور دیر اس وجہ سے ہوئی کہ اس نے اس بار التحیات زیادہ ترتیل سے، ادا کی، جب تو ظاہر ہے کہ مقتدی کا بتانا نہ صرف بے ضرورت بلکہ محض غلط واقع ہوا تو یقیناً کلام ٹھہرا اور مفسد نماز ہوا، ''لقول الحلیة ان ماوراء ذلک یعمل فیه بقضیة القیاس ولقوله المعدول به عن القیاس لا یقاس علیه ولقول الفتح یبقی ماوراء علی المنع ولقول التبیین لا یقاس علیه غیره وهذا واضح جدا''، یا اس کا گمان صحیح تھا غور کیجئے تو اس صورت میں بھی اس بتانے کا محض لغو بے حاجت واقع ہونا اور اصلاح نماز سے اصلاً تعلق نہ رکھنا ثابت کہ جب امام قعدۂ اولیٰ میں اتنی تاخیر کر چکا جس سے مقتدی اس کے سہو پر مطلع ہوا تو لاجرم یہ تاخیر بقدر کثیر ہوئی اور جو کچھ ہونا تھا یعنی ترک واجب ولزوم سجدۂ سہو ہو چکا اب اس کے بتانے سے مرتفع نہیں ہو سکتا اور اس سے زیادہ کسی دوسرے خلل کا اندیشہ نہیں جس سے بچنے کو یہ فعل کیا جائے کہ غایت درجہ وہ بھول کر سلام پھیر دے گا پھر اس سے نماز تو نہیں جاتی وہی سہو کا سہو رہے گا، ہاں جس وقت سلام شروع کرتا اس وقت حاجت متحقق ہوتی اور مقتدی کو بتانا چاہیے تھا کہ اب نہ بتانے میں خلل وفساد نماز کا اندیشہ ہے کہ یہ تو اپنے گمان میں نماز تمام کر چکا عجب نہیں کہ کلام وغیرہ کوئی قاطع نماز اس سے واقع ہو جائے، اس سے پہلے نہ خلل واقع کا ازالہ تھا نہ خلل آئندہ کا اندیشہ، تو سوا فضول و بے فائدہ کے کیا باقی رہا، لہٰذا مقتضائے نظر فقہی پر اس

صورت میں بھی فسادنماز ہے،نظیراس کی یہ ہے کہ جب امام قعدۂ اولیٰ چھوڑ کر پورا کھڑا ہو جائے تواب مقتدی بیٹھنے کااشارہ نہ کرے ورنہ ہمارے امام کے مذہب پر مقتدی کی نماز جاتی رہے گی کہ پورا کھڑا ہونے کے بعد امام کوقعدۂ اولیٰ کی طرف عودنا جائز تھا،تو اس کا بتانا محض بے فائدہ رہااوراپنے اصلی حکم کی رو سے کلام ٹھہر کر مفسد نماز ہوا۔

الٹی شلوار اور قمیص پہن کر نماز پڑھنا

سوال: ایک شخص نماز کی نیت کر کے کھڑا ہو گیااور نماز پڑھنا شروع کردی،نماز کے دوران اس کی نظر پڑی تو اسے پتا چلا کہ اس نے شلوار یا قمیص الٹی پہن رکھی ہے تواب وہ کیا کرے، نماز مکمل کرے یانماز توڑ کر کپڑے صحیح کر کے پہنے اور پھر نماز پڑھے۔پہلی صورت میں اگراس نے نماز جاری رکھی اور مکمل کرلی تو کیا حکم ہے؟۔(کامران قریشی،گلستان جوہر،کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس (زینت) پہن لیا کرو''(الاعراف:31) آیت مبارکہ میں اس جانب اشارہ ہے کہ نماز میں محض سترعورت (ستر پوشی) کافی نہیں بلکہ انسان ایسا لباس پہن لے جو باوقار ہو اس میں زینت و جمال بھی ہو اور ستر پوشی بھی شرعی تقاضوں کے مطابق پوری ہو،لہٰذا الٹا لباس پہن کر نماز پڑھنا احترام نماز کے منافی ہے لیکن چونکہ ایسا سہواً ہو گیا اور یہ ''مفسدات صلوٰۃ'' میں سے نہیں ہے بلکہ وجوہ تحسین میں سے ہے۔لہٰذا نماز ادا ہو گئی،اعادہ کی ضرورت نہیں۔

لباس کو ٹخنوں کے نیچے تک لٹکانے کا شرعی حکم

سوال: بعض اوقات لباس (تہبند،شلوار وغیرہ) ٹخنوں کے نیچے تک لٹکا ہوتا ہے اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ بہت سے لوگوں کا لباس عام حالات میں تو لٹکا ہوتا ہے لیکن جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو شلوار کو اڑس لیتے ہیں یا پینٹ وغیرہ کے پائنچے کی تہیں بنا کر اونچا کرلیتے ہیں،اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ بعض لوگ ہاف کٹ کی آستین پہنتے ہیں،کیا ایسی قمیص پہن کر نماز پڑھنا،جس کی آستین ہاف سائز کی ہو جائز ہے؟۔

(سید عمیر الحسن برنی،فیڈرل بی ایریا)

جواب: یہ سوال تفصیل طلب ہے، اس لئے پہلے چند احادیث مبارکہ ذکر کی جاتی ہیں،
اس کے بعد چند اصطلاحات کا مفہوم اور فقہی مسائل درج کیے جائیں گے۔
(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس
کے تہبند کا جو حصہ ٹخنوں کے نیچے ہوگا، وہ جہنمی ہوگا''۔ (صحیح بخاری)
(۲) حضرت جابر بن سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے
فرمایا: ''اپنا تہبند آدھی پنڈلیوں تک اونچا رکھو اور اگر ایسا نہ کرو تو ٹخنوں تک اونچا رکھو او
تہبند لٹکانے سے اجتناب کرو، کیونکہ یہ تکبر کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ نے تکبر کو پسند نہیں
فرمایا''۔ (سنن ابوداؤد)
(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ج
شخص تکبر کی وجہ سے اپنا کپڑا گھسیٹ کر چلے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر نظر رحمت
نہیں فرمائے گا''۔ (یہ سن کر) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''یارسول اللہ
ﷺ! اگر میں خیال نہ رکھوں (یعنی میری توجہ ہٹ جائے) تو میرے تہبند کی ایک جانب
ڈھلک جاتی ہے''۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''تم ان لوگوں میں سے نہیں جو تکبر کی وج
سے ایسا کرتے ہیں''۔ (صحیح بخاری)
(۴) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے تھے ک
سورج کو گہن لگ گیا، آپ جلدی سے اٹھے، اس حال میں کہ آپ کا تہبند زمین پر گھسٹ ر
تھا۔ یہاں تک کہ آپ مسجد میں آئے اور لوگ بھی پلٹ کر آ گئے، پھر آپ نے دو رکعت نما
(کسوف) پڑھائی۔'' (صحیح بخاری)

اس موضوع پر احادیث تو بہت ہیں لیکن ہم نے اختصار کے پیش نظر جو احادیث پر اکتف
کیا ہے۔ البتہ ایک اور حدیث، جس کا زیر بحث مسئلے سے تعلق ہے، کا ذکر ضروری ہے۔
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مجھے
سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ کہ (نماز میں) نہ بالوں کو سنواروں اور

کپڑوں کو موڑوں''۔(صحیح مسلم)

مندرجہ بالا احادیث مبارکہ میں بعض جگہ ٹخنوں کے نیچے کپڑا لٹکانے کی مطلقاً ممانعت فرمائی گئی ہے اور بعض جگہ اسے تکبر، خیلاء اور بطراً کی قید کے ساتھ مقید کر کے منع فرمایا گیا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بعض اوقات بے خیالی میں جو کپڑا لٹک جاتا تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کی رخصت و رعایت عطا فرمائی اور فرمایا'' تم ان لوگوں میں سے نہیں جو تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں''۔ دونوں طرح کی احادیث میں تطبیق کرنے کے بعد محدثین کرام اور فقہاء عظام نے جو مسائل بیان کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) افضل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی متابعت کی جائے اور کپڑا ٹخنوں سے اوپر رکھا جائے، اس کے افضل و اولیٰ ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(۲) اگر کوئی شخص تکبر کی بنا پر کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے تو یہ مکروہ تحریمی ہے اور تکبر کی نیت سے ایسا کرنے والے کی نماز واجب الاعادہ ہے۔

(۳) اگر کسی شخص کا کپڑا ٹخنوں سے کبھی کبھار یا عادتاً نیچے لٹک جاتا ہے لیکن وہ تکبر کی نیت سے ایسا نہیں کرتا تو یہ مکروہ تنزیہی ہے اور خلاف اولیٰ ہے۔ امام ہو یا منفرد یا مقتدی نماز صحیح ادا ہو جاتی ہے۔

(۴) لباس کا ٹخنوں سے نیچے نہ لٹکنا، بنیادی طور پر آداب لباس میں سے ہے اور جو لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں، انہیں ہر وقت کرنا چاہیے، نہ کہ صرف نماز کی حد تک تاہم یہ امر مسلم ہے کہ جو عمل خارج نماز مکروہ یا ممنوع ہے۔ نماز میں بطریق اولیٰ ممنوع ہے۔

(۵) کپڑوں کو نیفے کی جانب سے سمیٹنا، جسے اردو میں اڑسنا کہتے ہیں یا پائنچے کی جانب سے موڑنا اور انہیں چڑھانا،'' کف ثوب'' کہلاتا ہے اور از روئے حدیث یہ ممنوع ہے۔ لہٰذا جو لوگ نماز سے پہلے'' لٹکانے'' کی ممانعت سے بچنے کے لئے کپڑا اڑس لیتے ہیں یا نیچے کی جانب سے موڑ لیتے ہیں، جسے پائنچے چڑھانا کہتے ہیں، یہ شرعاً'' کف ثوب'' ہے اور از روئے حدیث ممنوع ہے اور یہ ایک ممانعت سے بچنے کے لئے دوسری ممانعت کا ارتکاب

کرنا ہے۔

(۶) آستین موڑ کر یا چڑھا کر بھی، جسے فقہ میں تشمیر کہتے ہیں، نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اگر یہ عمل نماز شروع کرنے سے پہلے کیا جائے، اور اگر یہ عمل نماز کے اندر کیا جائے تو فقہی اعتبار سے عمل کثیر کی تعریف میں آتا ہے اور اس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

(۷) اگر کسی کی آستین ہاف کٹ ہے یعنی وضع اور ساخت کے اعتبار سے ہی ایسی بنی ہوئی ہے تو اس سے نماز بلا کراہت ادا ہو جائے گی۔

یہ مسئلہ ''یعنی شلوار یا تہبند کا بہ نیت تکبر ٹخنوں سے نیچے لٹکانا مکروہ تحریمی ہے اور بلانیت تکبر لٹک جانا یا لٹکانا مکروہ تنزیہی ہے جو خلاف اولیٰ کے درجے میں ہے، جن محدثین کرام اور فقہاء عظام نے بیان فرمایا ہے ان کے اسماء گرامی وحوالہ جات حسب ذیل ہیں:

امام یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی 676ھ شرح صحیح مسلم جلد 2، صفحہ 195۔ (۲) حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی 852ھ فتح الباری جلد 10، صفحہ 263 (۳) علامہ موفق الدین ابن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ المغنی جلد 1، صفحہ 341 (۴) علامہ بدر الدین عینی حنفی متوفی 855ھ عمدۃ القاری جلد 1، صفحہ 295 (۵) ملا علی قاری حنفی متوفی 1014ھ مرقات جلد 8 صفحہ 238 (۶) ملا نظام الدین متوفی 1161ھ، فتاوی ہندیہ (عالمگیری) جلد 5، صفحہ 333 (۷) امام احمد رضا بریلوی متوفی 1340ھ، فتاوی رضویہ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن جلد 7، صفحہ 388 (۸) مولانا محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی، التعلیق الصبیح جلد 4، صفحہ 395 (۹) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، متوفی 1052ھ لمعات جلد 4، صفحہ 175 (۱۰) نماز میں کپڑا اڑسنے یا کپڑا موڑنے کو بعض فقہاء نے مکروہ تحریمی کہا ہے اور بعض نے مکروہ تنزیہی۔

علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمحتار جلد 1 صفحہ 677 میں اسے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔

ان مسائل کی تفصیلی بحث شرح صحیح مسلم جلد 6، مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی اور فتاوی رضویہ جلد 7 میں موجود ہے۔

رکوع میں بھول کر سجدے کی تسبیح پڑھنا

سوال: اگر نمازی اپنی نماز میں رکوع میں ''سبحان ربی العظیم'' کے بجائے ''سبحان ربی الاعلیٰ'' پڑھ لے یا سجدے میں ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کے بجائے ''سبحان ربی العظیم'' پڑھ لے تو کیا اس سے سجدۂ سہو لازم آئے گا؟ (نور نبی، شاہ پور چاکر، سندھ)

جواب: رکوع وسجود کی تسبیحات سنت ہیں لہٰذا اگر یہ بھولے سے رہ جائیں یا رکوع میں بھول کر سجدے کی تسبیح اور سجدے میں بھول کر رکوع کی تسبیح پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہو جاتی ہے اور اس سے سجدہ سہو لازم نہیں ہوا۔ البتہ اگر رکوع یا سجدے میں جھکا اور سر اٹھایا اور ایک تسبیح کی مقدار بھی نہ رکا تو تعدیل رکن کا واجب فوت ہو جائے گا اور سجدۂ سہو لازم آئے گا۔

تکبیر بھول جائے تو؟

سوال: اگر امام نماز عید میں عید کی زائد تکبریں بھول جائے؟ دعائے قنوت کی تکبیر بھول جائے یا رکوع وجود کی تکبیرات بھول جائے تو کیا اس سے سجدۂ سہو لازم آئے گا؟۔

(پیر عبدالحلیم سرہندی، گلشن معمار، کراچی)

جواب: نماز میں رکوع وسجود کی جو تکبیرات ہیں، انہیں تکبیرات انتقال کہا جاتا ہے کیونکہ نمازی اللہ اکبر کہہ کر ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہوتا ہے، یہ تکبیرات سنت ہیں، اسی طرح رکوع سے اٹھتے ہوئے سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ، رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ جو تسبیح پڑھی جاتی ہے، یہ بھی سنت ہے لہٰذا اگر تکبیرات انتقال یا رکوع سے اٹھنے کی تسبیح بھولے سے رہ جائے تو نماز ادا ہو جاتی ہے اور سجدۂ سہو لازم نہیں آتا۔ البتہ نماز عیدین کی زائد تکبیرات، نماز وتر میں دعائے قنوت شروع کرنے کے لئے تکبیر جسے تکبیر قنوت کہتے ہیں، نماز عید کی دوسری رکعت میں رکوع کی تکبیر، یہ سب تکبیریں واجب ہیں اور اگر یہ بھولے سے رہ جائیں تو ان کی تلافی کے لئے سجدۂ سہو لازم ہوگا اور نہ کیا تو نماز واجب الاعادہ ہو گی۔ تاہم فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر نماز عید میں مجمع کثیر ہو اور امام ان تکبیرات واجب میں سے کوئی ایک یا زائد بھول جائے اور سجدۂ سہو نہ کیا تو کثرت جماعت کی رعایت سے

نماز صحیح ادا ہو جائے گی لیکن اگر سجدۂ سہو کر لیا جائے تو افضل ہے۔

نماز میں بھول، سجدۂ سہو

سوال: اگر نماز میں غلطی ہو جائے یا بھول سے کوئی بھی آیت دوبارہ پڑھی جائے تو کیا نماز دوبارہ ادا کرنی چاہیے یا سجدۂ سہو ادا کیا جائے؟ سجدۂ سہو کس طرح ادا کیا جاتا ہے؟

(شہناز شاہد، کراچی)

جواب: نماز میں واجب چھوٹ جانے، فرض یا واجب میں تین تسبیحات (سبحان ربی الاعلیٰ) کے برابر تاخیر ہونے سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے۔ اگر سجدۂ سہو کر دیا جائے تو اس غلطی کی تلافی ہو جاتی ہے۔ ایک نماز میں ایک سے زیادہ واجب ترک ہو جائیں، تب بھی ایک ہی ''سجدۂ سہو'' کافی ہے۔ ''سجدۂ سہو'' کا طریقہ یہ ہے کہ آخری التحیات (تشہد) پڑھ کر دائیں جانب سلام پھیریں اور پھر دو سجدے کریں اور اس کے بعد التحیات، درود شریف اور دعاء پڑھ کر سلام پھیر لیں نماز مکمل ہو جائے گی۔ اگر سجدۂ سہو واجب تھا مگر نماز کے اندر ادا نہیں ہوا تو پھر پوری نماز از سرِ نو پڑھنی چاہیے۔

نماز وتر میں دعائے قنوت بھول کر رکوع میں چلا گیا تو کیا کرے؟

سوال: کوئی شخص وتر کی نماز پڑھ رہا ہے، تیسری رکعت میں دعا قنوت پڑھے بغیر بھول کر رکوع میں چلا گیا تو کیا کرے، پلٹ کر واپس آئے یا نماز جاری رکھے؟

(عبداللہ، لانڈھی، کراچی)

جواب: اگر کوئی شخص وتر کی نماز پڑھ رہا ہے اور تیسری رکعت میں بھول کر رکوع میں چلا گیا تو پلٹ کر واپس نہ آئے بلکہ نماز کو جاری رکھے اور آخر میں سجدۂ سہو کر لے، سجدۂ سہو سے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ اگر رکوع کر لیا اور پھر یاد آنے پر لوٹ کر کھڑا ہو گیا اور دعائے قنوت پڑھ لی تو رکوع کا اعادہ نہ کرے اور سجدۂ سہو کرے۔

کیا سجدۂ سہو کی ضرورت ہے؟

سوال: اگر نماز کے دوران نمازی سے بھول ہو جائے اور اس سے مندرجہ ذیل امور میں سے کوئی ایک ادا کرنے سے رہ جائے تو آیا نماز ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ ان کی تلافی کے لئے سجدۂ سہو کی ضرورت ہوگی یا نہیں؟

(ا) ثناء (سبحانک اللھم) تعوذ، تسمیہ پڑھنا بھول جائے۔

(ب) رکوع و سجود کی تکبیرات انتقال کہنا بھول جائے۔

(ج) رکوع میں سجود کی تسبیح (یعنی سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی) پڑھنا بھول جائے یا رکوع کی تسبیح سجدے میں اور سجدے کی تسبیح رکوع میں پڑھ لی ہو۔

(د) آمین کہنا بھول جائے۔

(ہ) رکوع سے اٹھتے وقت "سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" کہنا بھول جائے یا اس کی جگہ اللہ اکبر کہہ دیا ہو۔

(و) "التحیات" کے بعد "درود شریف" اور "دعا" پڑھنا بھول جائے۔

(عبدالمتین قریشی، خداداد کالونی)

جواب: یہ تمام امور نماز میں "سنت" ہیں اور اگر ان میں سے کوئی ایک امر یا ایک سے زائد امور سہو (بھول) کے نتیجے میں نمازی سے چھوٹ جائیں تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی اور ان کی تلافی کے لئے "سجدۂ سہو" کی ضرورت نہیں ہوگی، کیونکہ "سجدۂ سہو" فرض رکن کی ادائیگی میں تاخیر اور واجب رکن کے ترک ہو جانے سے لازم آتا ہے۔ تاہم اگر کسی نے دانستہ کسی سنت کو ترک کیا تو گناہ گار ہوگا۔

عیدین میں سجدۂ سہو

سوال: نماز عیدین میں ترک واجب پر سجدۂ سہو کیا جا سکتا ہے؟۔

(ضیاء اللہ خان ضیاء، نوکوٹ)

جواب: نماز جمعہ اور نماز عیدین میں اگر کوئی سہو ہو جائے جس سے "سجدۂ سہو" لازم آتا

ہے تو ''سجدۂ سہو'' ادا کیا جا سکتا ہے البتہ ہمارے فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر مجمع کثیر ہو اور اس کی رعایت سے سجدۂ سہو نہ کیا جائے تو بھی نماز ادا ہو جائے گی۔

سجدۂ تلاوت کا طریقہ

سوال: سجدۂ تلاوت کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: قبلہ رخ ہو کر اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلے جائیں اور تسبیحات سجدہ پڑھ کر اللہ اکبر کہہ کر سجدے سے اٹھ جائیں، بس سجدۂ تلاوت مکمل ہو گیا، سلام پھیرنے یا نماز کی طرح باقاعدہ نیت باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس مقام سجدہ پاک ہونا چاہیے۔ کھڑے ہو کر سجدے میں جائیں تو افضل ہے اور اگر بیٹھے بیٹھے سجدہ کیا تو بھی ادا ہو جائے گا۔

فجر اور عصر کی نماز کے بعد سجدۂ تلاوت کا حکم

سوال: بعض اوقات نماز فجر اور عصر کے بعد لوگ تلاوت کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر آیت سجدہ آجائے تو سجدہ تلاوت کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(نور بی، شاہ پور چاکر وسندھ)

جواب: نماز فجر اور نماز عصر کے بعد سجدۂ تلاوت کر سکتے ہیں اور قضا نماز بھی پڑھ سکتے ہیں۔ صرف تین اوقات ایسے ہیں جن میں ہر قسم کی نماز اور سجدہ منع یعنی مکروہ تحریمی ہے۔ (۱) طلوع آفتاب کے بعد 20 منٹ تک (۲) زوال کا وقت (۳) غروب آفتاب سے پہلے تقریباً 20 منٹ کا وقت، البتہ اگر اس دن کی عصر کی نماز کسی کوتاہی یا عذر کے سبب نہیں پڑھی تو پڑھ لے، قضا کی بہ نسبت کراہت کے ساتھ ادا بہتر ہے۔

نوٹ: (۱) ان تینوں اوقات میں اگر اتفاقاً جنازہ آجائے تو نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں۔ البتہ اگر جنازہ پہلے سے موجود ہو تو تاخیر کر کے ان مکروہ اوقات میں پڑھنا منع ہے۔

(۲) صبح صادق، یعنی جب روزہ بند ہوتا ہے، سے نماز فجر تک فجر کی دو سنتوں کے علاوہ نفل پڑھنا منع ہے اور اسی طرح فرائض فجر کے بعد سے طلوع آفتاب تک نفل پڑھنا منع ہے اور فرض عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک نفل پڑھنا منع ہے لیکن ان تینوں اوقات میں قضا

نماز بھی پڑھ سکتے ہیں اور سجدۂ تلاوت بھی کر سکتے ہیں۔ البتہ غروب آفتاب سے قبل کے آخری بیس منٹ میں قضاء نماز پڑھنا اور سجدۂ تلاوت کرنا بھی منع ہے، لیکن اس دن کی عصر کی نماز رہ گئی ہو تو وہ پڑھ لینی چاہیے۔

عورت کا باپردہ مسجد میں جا کر مسئلہ پوچھنا، سجدۂ تلاوت

سوال: (ا) کیا عورت باپردہ ہو کر شرعی مسئلہ پوچھنے کے لئے مسجد میں جا سکتی ہے جب کہ گھر میں کوئی دینی مسائل نہ جانتا ہو؟

(ب) نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کی جائے تو سجدہ کس طرح ادا ہو گا؟ (ن، خ۔ کراچی)

جواب: (ا) صحابیات نبی کریم ﷺ سے دینی مسائل پوچھنے آتی تھیں۔ لہٰذا خواتین باپردہ ہو کر کسی عالم دین سے شرعی مسئلہ معلوم کرنے کے لئے جا سکتی ہیں، ان کے لئے ایک صورت یہ بھی ہے کہ گھر کے کسی مرد کے ذریعے مسئلہ معلوم کرالیں، تحریری طور پر بھی معلوم کر سکتی ہیں۔ آج کل ٹیلی فون کا آسان ذریعہ بھی ہے، ویسے مسلمانوں کے گھر میں دینی مسائل کی آسان اور عام فہم کتابیں بھی ہونی چاہئیں۔ تاہم پیچیدہ مسائل کے لئے عالم سے رجوع ضروری ہے۔

(ب) نماز میں آیت سجدۂ تلاوت کی جائے تو آیت کے اختتام پر اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلا جائے اور سجدے کی تسبیحات پڑھ کر اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو جائے اور مزید چند آیات پڑھ کر رکوع اور حسب معمول نماز مکمل کرے۔ اگر آیت سجدہ پڑھتے ہی اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور رکوع ہی میں سجدۂ تلاوت کی بھی نیت کرے تو اس صورت میں بھی سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا۔ اگر بروقت سجدۂ تلاوت کرنا بھول گیا، رکوع میں بھی نیت نہ کی، لیکن نماز کے دوران ہی یاد آ گیا یا سلام پھیرتے ہی فوراً یاد آ گیا اور کوئی ایسا عمل ابھی نہیں کیا جو مفسد صلوٰۃ ہے تو فوراً سجدۂ تلاوت کرے اور سجدۂ سہو بھی کرے۔ نماز کے بعد یاد آیا تو اب بیرون نماز اس کی قضاء نہیں ہے، نماز کے اندر سجدۂ تلاوت قصداً چھوڑا تو گناہ گار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے۔

کیسٹس پر تلاوت سننا اور سجدۂ تلاوت

سوال: کوئی شخص آڈیو یا ویڈیو کیسٹس پر تلاوت سنتا ہے اور آیت سجدہ آجاتی ہے، کیا سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا، اسی طرح ان کیسٹس میں دینی تقاریر یا نعتیں بھری ہوتی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کا نام نامی بار بار آتا ہے، کیا سننے والے پر درود شریف پڑھنا واجب ہے؟ (حافظ ہدایت واجد حسین، دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: آڈیو، ویڈیو کیسٹس پر ریکارڈنگ کی صورت میں دوران تلاوت آیت سجدہ آجائے تو کیسٹ سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہے، اسی طرح کیسٹ سنتے ہوئے سید المرسلین ﷺ کا نام نامی اسم گرامی آجائے تو درود پاک پڑھنا واجب نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی صاحب ذوق خوش نصیب آیت سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت کر لیتا ہے یا رسول اللہ ﷺ کا نام نامی اسم گرامی سن کر درود پاک پڑھ لیتا ہے تو وہ یقیناً عنداللہ ماجور ہوگا۔

سجدۂ شکر کی شرعی حیثیت

سوال: کیا سجدۂ شکر شرعاً جائز ہے؟ اس کا طریقہ کیا ہے؟

(عنایت اللہ، اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: متعدد مواقع پر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے "سجدۂ شکر" ادا کرنا ثابت ہے، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں حدیث شریف ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کسی اچھی بات کی خوشخبری سنائی جاتی تو آپ اس پر رب ذوالجلال کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر جاتے۔ ایک موقع پر ایک لنجے اور ایک ناقص الخلقت شخص کے پاس سے آپ کا گزر ہوا تو آپ سواری سے اترے اور سجدۂ شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس عیب، معذوری اور مصیبت سے محفوظ رکھا ہے۔

جب نبی کریم ﷺ کو دشمن اسلام ابوجہل کے قتل کی خبر دی گئی تو ایک روایت میں ہے کہ آپ نے نماز شکر ادا کی اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے پانچ بار سجدۂ شکر ادا کیا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو جب یہ خبر ملی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم ﷺ کو ان

سے نکاح کا حکم دیا ہے تو انہوں نے اس نعمت پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ تاہم سجدۂ شکر نہ فرض ہے، نہ واجب اور نہ سنت، بلکہ یہ مستحب ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ باوضو ہو کر اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں جائے اور حسب توفیق تسبیح پڑھ کر اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے سے اٹھ جائے۔

کسی مسرت کے موقع پر یا دفع بلا کے موقع پر نماز شکرانہ ادا کرنی ہو تو دو نوافل یا حسب توفیق زیادہ نوافل تنہا ادا کرنے چاہئیں، نماز شکرانہ کی جماعت نہیں۔

ترجمۂ قرآن پڑھنے سے تلاوت کا ثواب

سوال: بدقسمتی سے کسی شخص کو ناظرہ قرآن پڑھنا نہیں آتا تو اگر وہ ترجمہ قرآن (اردو زبان میں) مسلسل تلاوت کی نیت سے پڑھے تو کیا اسے تلاوت قرآن مجید کا اجر و ثواب ملے گا؟ بعض لوگ قرآن مجید کھول کر سطروں پر انگلی پھیرتے ہوئے صرف ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھتے رہتے ہیں اور اس طرح صفحے پلٹتے پلٹتے مکمل کر لیتے ہیں اور اسے ختم بسم اللہ کہتے ہیں، کیا ''ختم بسم اللہ'' کی شریعت میں کوئی اصل ہے؟ (بلال خان، گارڈن ویسٹ، کراچی)

جواب: قرآن مجید کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ۝ (یوسف)

''ہم نے اسے واضح عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھو''۔

قرآن مجید کی تلاوت بزبان عربی یہ الگ اور مستقل عبادت ہے، اس کے معنی کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا یہ بلاشبہ بہت بڑی سعادت بلکہ نزول قرآن کا مدعا و مقصود ہے۔ ترجمۂ قرآن کو مطلب قرآن سمجھنے کے لئے پڑھنا، اجر و سعادت کی بات ہے لیکن ترجمۂ قرآن، کلام اللہ نہیں ہے۔ اس لئے اسے اردو، انگریزی یا کسی اور زبان میں بہ نیت تلاوت پڑھنے سے تلاوت قرآن مجید کا ثواب نہیں ملے گا۔ ترجمۂ قرآن بندے کا کلام ہے، اللہ تعالیٰ کا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ پر پہلی وحی قرآنی چالیس سال کی عمر میں نازل ہوئی اور 23 سال کی مدت میں اس کی تکمیل ہوئی۔ لہٰذا اگر کسی کی عمر چالیس سال یا اس سے بھی زائد ہے تو اس عمر میں قرآن مجید کو پڑھنا سنت رسول ﷺ ہے۔ صحابہ کرام مختلف عمروں میں مشرف

بہ اسلام ہوئے اور انہوں نے قرآن اور دین اسلام کی تعلیم حاصل کی، لہٰذا آپ عمر کے کسی بھی حصے میں ہوں، بلا تاخیر قرآن کی تعلیم وتعلم کا سلسلہ شروع کر دیں، دنیا کے کسی بھی مذہب یا نظام حیات میں حصول علم کے لئے عمر کی قید نہیں ہے۔ اس لئے جہل دائمی اور ابدی عذر نہیں۔ صورت مذکور میں ''ختم بسم اللہ'' کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ تاہم جتنی بار کوئی ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھے گا، چونکہ یہ اسمائے الٰہیہ پر مشتمل ہے، اس لئے اس کا اجر وثواب ضرور ملے گا۔

نماز قصر

سوال: نماز قصر سے کیا مراد ہے؟ قصر پڑھنے کے لئے کم از کم مسافت کتنی ہے؟ قصر کہاں سے شروع کرے اور کہاں ختم کرے اور قصر کب تک پڑھے؟ (سید اکرم شاہ، اوگی، مانسہرہ)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (النساء:101)

''اور جب تم زمین میں سفر کے لئے نکلو تو تمہارے لئے اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ تم قصر نماز پڑھو''۔

قصر

اللہ تعالیٰ نے حالت سفر میں فرض نماز میں اپنے بندوں کے لئے تخفیف فرمائی ہے یعنی یہ کہ ظہر، عصر اور عشاء کی چار رکعات کی بجائے دو پڑھی جائیں۔ فجر ومغرب اور وتر کی رکعات بغیر تخفیف کے پڑھی جائیں گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح منقول ہے۔ مسافر اگر حالت سفر میں ہے یعنی دوران سفر مسافت سفر طے کر رہا ہے تو وہ فرائض کو قصر کے ساتھ پڑھے اور سنتیں چھوڑ دے۔ اور اگر ہے تو وہ مسافر لیکن کسی منزل پر چودہ دن یا اس سے کم مدت کے لئے قیام کر لیا ہے تو وہ فرض تو قصر کے ساتھ پڑھے اور سنت موکدہ پوری پڑھے۔ البتہ فجر کی سنتیں ہر حال میں پڑھنی ضروری ہیں کیونکہ یہ قریب بہ وجوب ہیں، یہی وجہ ہے کہ باقی اوقات کی سنن مؤکدہ تو بلا عذر بھی بیٹھ کر پڑھی جا سکتی ہیں، اگر چہ کھڑے ہو

کر پڑھنی افضل ہیں، لیکن فجر کی سنتیں بلا عذر بیٹھ کر پڑھنی جائز نہیں ہے۔ فرض نمازوں میں اس اختصار کو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی اصطلاح میں "قصر" کہا جاتا ہے۔ یہ "قصر" اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے بندوں کے لئے ایک طرح کی رخصت و رعایت ہے جسے حدیث پاک میں "تصدق" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے استفادہ "شکر نعمت" اور اسے نظر انداز کرنا "کفرانِ نعمت" کی ایک صورت ہے لہٰذا حالت سفر میں قصر واجب ہے۔

مسافت قصر

کم از کم "مسافت سفر" جس کا سفر شروع کرنے سے "قصر" واجب ہو جاتی ہے وہ مقدار سفر ہے جو انسان اوسط رفتار سے یا اونٹ کی متوسط رفتار سے اپنی طبعی ضروریات و لوازمات (اس سے مراد مناسب آرام، کھانے اور دیگر حاجات کی تکمیل ہے) اور شرعی فرائض (یعنی نمازوں) کی ادائیگی کے ساتھ تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے۔ جدید پیمانے کے مطابق 98.734 کلومیٹر کی مسافت یا اس سے زائد کا سفر کرنے کا ارادہ ہو تو قصر پڑھنا چاہیے۔

آغاز قصر

فقہاء نے لکھا ہے کہ جب اپنی بستی کی شہری حدود سے نکل جائے تو قصر شروع کر دے اور سفر سے واپسی پر جب حدود شہر میں داخل ہو جائے تو پوری نماز پڑھے۔

رہا یہ مسئلہ کہ حدود شہر کہاں ختم ہوتی ہیں تو فقہائے کرام نے شہر سے باہر قبرستان کو اس کی حد قرار دیا ہے، جیسا کہ اب بھی عموماً دیہات میں ہوتا ہے۔ تاہم بڑے شہروں اور قصبوں میں (جہاں بلدیاتی ادارے قائم ہیں، جیسے کارپوریشن، میونسپل کمیٹی وغیرہ) باقاعدہ حدود شہر کی نشاندہی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

قصر کب تک پڑھے؟

احناف کے نزدیک دوران سفر اگر کسی مقام پر پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کا

ارادہ ہو تو وہاں پوری نماز پڑھے، ایسے مقام کو "وطن اقامت" کہتے ہیں۔ اگر پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو قصر پڑھے، خواہ خلاف ارادہ قیام پندرہ دن سے طویل ہی کیوں نہ ہو جائے۔

مسلسل تین جمعوں کی نماز چھوڑنے کا حکم

سوال: اگر کوئی مسلمان متواتر تین جمعوں کی نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے تو کیا وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا؟

جواب: جامع ترمذی، سنن ابی داود، نسائی، ابن ماجہ اور دیگر مستند کتب احادیث میں ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: "جو شخص (بلا عذر شرعی) محض سستی اور کاہلی سے تین جمعوں کی نماز چھوڑے گا، (اس گناہ کی پاداش میں) اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دے گا"۔ تارک جمعہ کے لئے یہ ایک سخت وعید اور تنبیہ ہے۔ صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم نے سنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برسر منبر ارشاد فرما رہے تھے، "لوگ نماز جمعہ چھوڑنے کی عادت سے باز آ جائیں، ورنہ سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافلوں میں سے ہو جائیں گے"۔ ان احادیث کی روشنی میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بلا عذر تارک جمعہ اسلام سے خارج ہو جائے گا، البتہ یہ امر بالکل واضح ہے کہ اگر اس نے توبہ نہ کی اور اپنی اس روش کو نہ بدلا تو خدانخواستہ وہ قبول خیر اور توفیق اعمال صالحہ کی سعادت سے محروم ہو جائے گا اور یہ اس کی نافرمانی کی سزا کے طور پر ہوگا۔ اللہ جل شانہ، سب اہل ایمان کو ایسے انجام سے محفوظ فرمائے۔

فیکٹری، کارخانے میں نماز جمعہ

سوال: حکومت کی جانب سے جمعۃ المبارک کی چھٹی ختم ہونے کی وجہ سے بعض اداروں اور اسکولوں میں جہاں مساجد نہیں ہوتیں لوگوں کو دفتر سے باہر جانا پڑتا ہے اور بڑے مسائل پیش آتے ہیں، ان حالات میں فیکٹری، کارخانے یا اسکول کی انتظامیہ نماز جمعہ کے لئے اسکول یا فیکٹری کے اندر ہی انتظام کرتی ہے۔ کیا فیکٹری یا اسکول میں نماز جمعہ ہو جائے

گی؟ (قاری محمد صدیق، خطیب مسجد خلفائے راشدین، گلشن اقبال)

جواب: اصولی طور پر شرائط جمعہ میں سے ایک شرط ''اذنِ عام'' ہے اور اس کی تحقیق کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جامع مسجد کے دروازے سب آنے والوں کے لئے کھلے ہوں۔ علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے کہ اگر دشمن کے خوف سے قلعے کا دروازہ بند ہو، جیسے قدیم زمانے میں شہروں کے اردگرد حفاظت کی غرض سے شہر پناہ، قلعے اور فصیلیں ہوا کرتی تھیں، لیکن قلعے کے اندر تمام رہنے والوں کے لئے جامع مسجد کے دروازے کھلے ہوں تو وہاں جمعہ پڑھانا جائز ہے۔

آج کل سیکورٹی کے مسائل نہایت شدید ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں اور اداروں میں غیر متعلقہ لوگوں کا بلا اجازت داخلہ بند ہوتا ہے۔ ایوان صدر، ایوان وزیر اعظم، گورنر ہاؤسز۔ کے پی ٹی، پاکستان اسٹیل، سیکورٹی پرنٹنگ پریس اور متعدد سول اور رفائی ادارے اس کی نمایاں مثالیں ہیں اور اب تو تقریباً تمام کارخانوں اور تعلیمی اداروں حتی کہ جامعات میں بھی غیر متعلقہ لوگوں کا داخلہ بند ہے۔ لہٰذا اگر ان اداروں کے اندر نماز جمعہ کا اہتمام کیا جائے تو جائز ہے کیونکہ ان کے اوقات کار میں اتنا وقفہ نہیں ہوتا کہ لوگ باہر کھلی مساجد میں جا کر نماز جمعہ پڑھیں اور واپس آئیں اور اس میں بہت سی انتظامی دشواریاں ہوتی ہیں۔ کمپنی، کارخانے یا تعلیمی ادارے میں باقاعدہ مسجد ہے تو مسجد اور جماعت دونوں کا ثواب ملے گا اور اگر باقاعدہ مسجد نہیں ہے بلکہ محض کوئی جگہ یا کمرہ نماز کے لئے مختص ہے تو نماز ادا ہو جائے گی۔ جماعت کا بھی ثواب ملے گا لیکن مسجد کا ثواب نہیں ملے گا۔

کیا نماز جمعہ کی قضاء ہے؟

سوال: کیا نماز جمعہ جو کہ فرض ہے اگر کسی وجہ سے فوت ہو جائے تو کیا اس کی قضاء پڑھی جائے گی؟۔ (محمد سہیل، نارتھ کراچی)

جواب: نماز جمعہ فرض عین ہے اس کی فرضیت کا حکم ''سورۃ الجمعہ'' کی آیت 9 میں نازل ہوا ہے۔ نماز جمعہ کے ترک پر احادیث مبارکہ میں بڑی وعید آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا کہ: ''جس شخص نے غیر اہم اور معمولی بات سمجھتے ہوئے تین جمعے ترک کر دیئے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دے گا (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) تاہم اگر کسی شخص کی نماز جمعہ عذر کی بناء پر (مثلاً سفر، بیماری یا معذوری) یا بدقسمتی سے بلا عذر فوت ہوگئی ہے تو اس پر جمعے کی قضا نہیں ہے بلکہ وہ ظہر کی نماز پڑھے۔

کیا شوہر اپنی بیوی کی میت کو غسل دے سکتا ہے؟

سوال: ایک اخبار میں ایک مفتی صاحب کا یہ فتویٰ شائع ہوا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی میت کو کوئی محرم نہ ہونے کی صورت میں غسل دے سکتا ہے: کیا از روئے فقہ حنفی یہ مسئلہ درست ہے؟ اور عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت علی نے حضرت فاطمہ کو غسل دیا تھا: کیا صحیح روایت سے یہ بات ثابت ہے؟ (کامران قریشی، خداداد کالونی، کراچی)

جواب: اگر کسی خاتون کا انتقال ہو جائے اور کوئی عورت اسے غسل دینے کے لئے دستیاب نہ ہو تو اس کا محرم اسے تیمم کرائے، یعنی بامر مجبوری غسل ساقط ہو جائے گا۔ واضح رہے محرم کسی عورت کے اس مرد قرابت دار کو کہتے ہیں جس کے ساتھ از روئے شرع اس کا نکاح دائمی طور پر حرام ہو جیسے باپ، بیٹا، دادا، پوتا، چچا، ماموں، بھتیجا، بھانجا وغیرہ۔ اور اسی طرح وہ مرد قرابت دار جو رضاعت اور مصاہرت کے رشتے سے محرم بنتے ہیں۔ اگر مرحومہ عورت کا کوئی محرم دستیاب نہ ہو تو اجنبی شخص ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر اسے تیمم کرائے اور اپنی نگاہیں نیچی رکھے۔ مذکورہ بالا مجبوری کی صورت میں شوہر بھی اپنی بیوی کو تیمم کرا سکتا ہے، البتہ اس پر اجنبی شخص کی طرح نگاہیں نیچی رکھنے کی پابندی نہیں ہے (فتاویٰ عالمگیری جلد 1، صفحہ 160، فتاویٰ شامی جلد 1، صفحہ 575) محترم مفتی صاحب نے اخبار مذکور میں یہ مسئلہ غلط لکھا ہے'' کہ شوہر اپنی مرحومہ بیوی کی میت کو غسل بھی دے سکتا ہے اگر محرم موجود نہ ہو''۔ غالباً مفتی صاحب نے توجہ نہیں فرمائی یا ان سے تسامح ہوا ہے۔ امید ہے کہ وہ اپنے بیان کردہ مسئلے پر نظر ثانی فرما کر اسی اخبار میں تصحیح نامہ شائع کرائیں گے تاکہ لوگوں کو صحیح مسئلہ معلوم ہو جائے۔ اگر بیوی زندگی کی آخری سانس تک شوہر کے نکاح صحیح میں تھی یا شوہر نے

طلاق رجعی دے دی تھی لیکن عدت کے اندر بیوی کا انتقال ہو گیا تو مسئلہ وہی ہے جو ہم نے بطور بالا میں درج کیا ہے اور اگر عدت گزرنے کے بعد بیوی کا انتقال ہوا یا شوہر نے اسے طلاق بائن یا طلاق مغلظہ دے رکھی تھی تو عدت کے اندر انتقال ہونے کی صورت میں بھی شوہر کی حیثیت اجنبی کی سی ہے اور اس کا مسئلہ بھی ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔ شوہر تمام صورتوں میں بیوی کی میت کو کندھا دے سکتا ہے کیونکہ اجنبی مردوں پر بھی کسی عورت کی میت کو کندھا دینے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ البتہ اسے اپنی بیوی کی میت کا چہرہ دیکھنے کی اجازت صرف دو صورتوں میں ہے، ایک اس صورت میں کہ بوقت وفات اس کے نکاح میں تھی اور دوسری اس صورت میں کہ بصورت طلاق رجعی عدت کے اندر اس کا انتقال ہوا ہو۔ بعض لوگوں میں جو مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا۔ اس کے بارے میں امام احمد رضا خان قادری نے لکھا ہے کہ یہ کسی حدیث صحیح سے ثابت نہیں ہے (فتاوی رضویہ جلد 4، صفحہ 9) مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بہار شریعت جلد 4، صفحہ 123 پر یہی مسئلہ درج کیا ہے جو ہم نے تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے۔

ایک سے زائد میتوں کی نماز جنازہ ایک ساتھ پڑھنے کا حکم

سوال: اگر کسی جگہ کئی جنازے اکٹھے ہو جائیں تو سب کی نماز جنازہ ایک ساتھ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر پڑھ سکتے ہیں تو اس کی صورت ترتیب کیا ہوگی؟

(محمد رضوان الحسن، سیکٹر 11، اے نارتھ کراچی)

جواب: اگر کئی جنازے ایک وقت میں آجائیں تو افضل یہ ہے کہ ان کی نماز جنازہ الگ الگ پڑھی جائے، سب سے پہلے اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے جو ان سب میں سے افضل ہو، اس کے بعد اسی ترتیب سے ایک ایک کر کے سب کی پڑھی جائے، سب کی نماز جنازہ ایک ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ امام کے سامنے انہیں ترتیب کے ساتھ آگے پیچھے رکھ لیا جائے جو سب سے افضل ہے وہ امام کے سامنے قریب ترین ہو اور اس کے بعد اسی ترتیب کے ساتھ یکے بعد دیگرے سب کو رکھ لیا جائے اور نیت باندھتے وقت امام

اور مقتدی سب کی نیت کرلیں۔

نماز جنازہ کی تکرار

سوال: کیا میت کی نماز جنازہ کی تکرار جائز ہے، بار بار پڑھی جاسکتی ہے۔ جس نے کسی میت کی نماز جنازہ ایک بار پڑھی ہو، کیا وہ اسی میت کی نماز جنازہ دوبارہ پڑھ سکتا ہے؟

(نصیر اور عابد ہجرت کالونی، کراچی)

جواب: نماز جنازہ کی تکرار جائز نہیں ہے، فقہاء احناف کا یہی مسلک ہے، البتہ اگر میت کا جو قریب ترین وارث ہے اس نے نہ پڑھی ہو اور کچھ دوسرے لوگوں نے پڑھ لی ہو تو وہ دوبارہ پڑھ سکتا ہے ایسی صورت میں دوبارہ اس کے ساتھ وہ لوگ شریک جنازہ ہو سکتے ہیں جنہوں نے پہلی بار نہ پڑھی ہو۔ ولی اقرب نے نماز جنازہ پڑھ لی ہو یا اس کی اجازت سے کسی نے پڑھ لی ہو تو پھر اس کا اعادہ نہیں ہے۔ البتہ اگر پہلی بار نماز جنازہ پڑھی جارہی تھی کہ نماز باطل ہوگئی، مثلاً جس نے پڑھائی ہو باوضو نہیں تھا تو اس صورت میں سب اعادہ کریں گے۔

میت کا سوگ

سوال: جب کوئی شخص وفات پاتا ہے تو کچھ لوگ مہینوں تک سوگ مناتے ہیں، کیا یہ شرعاً درست ہے؟

(عبدالحمید بلوچ، آسو گوٹھ ملیر، کراچی)

جواب: شرعاً تین دن سے زیادہ سوگ جائز نہیں، اسی طرح تعزیت کے لئے آنے والوں کی خاطر میت کے اہل خانہ کا تین دن تک بیٹھنا جائز ہے اس سے زیادہ نہیں۔ کسی عزیز کی وفات پر بے اختیار رونا آجائے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو یہ فطرت کا تقاضا ہے اور جائز ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، اس پر صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اظہار تعجب کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ”آنکھ روتی ہے، دل غمگین ہوتا ہے لیکن ہم اپنی زبان سے اپنے رب کی رضا کے خلاف کوئی کلمہ نہیں کہتے“۔ میت پر نوحہ یا بین کرنا

یعنی عورتوں کا اونچی آواز سے رونا منع ہے، اسی طرح سوگ کے طور پر اپنے رخساروں پر تھپڑ مارنا، گریبان پھاڑنا اور زمانہ جاہلیت کے طریقوں کے مطابق ماتم کرنا یا مبالغہ آرائی کے ساتھ میت کا ذکر کرنا منع ہے۔ بیوہ عورت کے لئے شوہر کے سوگ کی مدت چار ماہ دس دن ہے۔ جسے عدت وفات کہتے ہیں لیکن یہ صرف اس حد تک کہ اس عرصہ میں سادہ لباس پہنے، بناؤ سنگھار اور زیب و زینت نہ کرے، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سوا چار ماہ تک رونے رلانے کا سلسلہ جاری رکھے، سوگ کے لئے بیوہ کو سیاہ لباس پہننا ضروری نہیں۔

کیا میت کی آنکھ سے لینس نکالنے ضروری ہیں؟

سوال: میرے ایک عزیز نے آنکھ کا آپریشن کرا کے کنٹیکٹ لینس لگوا لئے تھے، ان کے انتقال کے وقت یہ لینس ان کی آنکھوں میں لگے ہوئے تھے، کسی بزرگ نے متوجہ کیا کہ میت کی آنکھوں سے یہ لینس نکال لو ورنہ انہیں قبر میں عذاب ہوگا، چنانچہ ان کے صاحبزادے نے نکال لئے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ بات درست ہے؟ کیونکہ آج کل جدید طب اور سرجری نے اتنی ترقی کر لی ہے، مصنوعی اعضاء بھی لگائے جاتے ہیں، انسانی جسم کے اندر بھی چیزیں فٹ کی جاتی ہیں، ان سب کا کیا حکم ہے؟ کیا موت کے بعد ان کا نکالنا ضروری ہے؟ اگر نہ نکالیں تو ان کی وجہ سے میت کو قبر میں عذاب ہوگا؟ (علی محمد، کیاڑی)

جواب: ایسے آلات یا اعضاء جو آپریٹ کر کے بدن کے اندر فٹ کیے گئے ہوں جیسے ٹانگوں میں راڈ یا دل کے لئے بیٹری وغیرہ یا جو بدن کے ساتھ جڑے ہوئے یا چپکے ہوئے ہوں، جیسے آنکھوں میں کنٹیکٹ لینس یا دانت یا ایسا شخص جس کی آنکھ کا ڈھیلا نہیں ہوتا آنکھ بند رہتی ہے جس کی وجہ سے دیکھنے میں اس کا چہرہ معیوب لگتا ہے، اس میں مصنوعی ڈھیلا یا قورنیہ فٹ کر دیتے ہیں، جس سے بینائی تو بحال نہیں ہوتی لیکن چہرے کا حسن بحال ہو جاتا ہے، اسی طرح مصنوعی ٹانگیں ہوتی ہیں، موت کے بعد میت کے بدن سے ان کا جدا کرنا ضروری نہیں ہے اور یہ نظریہ باطل ہے کہ ان کی وجہ سے میت کو قبر میں عذاب ہوگا۔ البتہ اگر مصنوعی ٹانگ ہے جو بدن کے ساتھ جڑی ہوئی یا باندھی ہوئی ہے اور کسی قطع برید یا آپریشن

کے بغیر اسے کھول کر اس لئے جدا کر دیا جائے کہ کسی زندہ ضرورت مند انسان کے کام آ جائے تو اس میں حرج نہیں ہے، اور اگر وہ کسی خیراتی ادارے یا مخیر شخص سے محض برائے استعمال مستعار لی گئی تھی تو پھر تو اسے لازماً جدا کر کے متعلقہ ادارے یا شخص کو واپس کر دینا چاہیے۔ اسی طرح اگر دانت سونے کا ہے اور اسے کسی قطع و برید یا آپریشن کے بغیر (یعنی میت کو ایذا پہنچائے بغیر) وارث مال سمجھ کر نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے، ورنہ چھوڑ دے۔

نماز جنازہ میں تکبیر کا چھوٹنا

سوال: ایک شخص نماز جنازہ میں شریک ہونے سے رہ گیا، جب وہ شخص پہنچا تو ایک تکبیر ہو چکی تھی اس کے لئے کیا احکام ہیں؟

جواب: وہ امام کی اگلی تکبیر کا انتظار کرے، اس تکبیر کے ساتھ اللہ اکبر کہہ کر امام کے ساتھ شامل ہو جائے، ایک دو یا جتنی تکبیریں رہ گئی ہیں، امام کے سلام پھیرنے کے بعد، اتنی تکبیریں کہہ کر سلام پھیر دے، نماز جنازہ صحیح ادا ہو جائے گا۔

دفن کے بعد میت کو دوسری جگہ منتقل کرنا

سوال: میت کو ایک جگہ دفن کرنے کے بعد اس کی قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن کرنا، جائز ہے یا نہیں؟ از روئے شرع اس کا حکم بیان کیجئے؟ (ضیاء الدین، چترال)

جواب: فقہائے کرام نے کسی ضرورت شرعیہ کے بغیر ایسا کرنے سے منع کیا ہے، کیونکہ تدفین کے بعد میت اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی جاتی ہے اور وہی اس کے حال کو بہتر جانتا ہے اور تبدیلی احوال پر بھی اسی کو قدرت و اختیار ہے۔ میت کی خبر کھودنے میں اس کا حال افشا ہو سکتا ہے، کیا خبر وہ کس حال میں ہے؟ ضرورت شرعیہ سے مراد یہ ہے کہ بالفرض میت کو غصب شدہ زمین میں دفن کر دیا یا مالک کی اجازت کے بغیر دوسرے شخص کی زمین میں دفن کر دیا اور اس کا مطالبہ ہے کہ میت کو اس کی زمین سے نکالا جائے تو ایسی صورت میں نکالنا یا منتقل کرنا جائز ہے۔

امانتاً میت کو قبر میں دفن کرنا

سوال: بعض اوقات کسی شخص کا انتقال وطن سے دور ہو جاتا ہے اور اسے وقتی طور پر وہاں امانت کے طور پر دفن کر دیتے ہیں اور نیت یہ ہوتی ہے کہ بعد میں اس میت کو قبر سے نکال کر اپنے وطن منتقل کر کے دوبارہ تدفین کی جائے گی۔ کیا ایسا کرنا از روئے شریعت درست ہے؟
(ذوالفقار علی، آزاد کشمیر)

جواب: فقہائے اسلام نے عذر شرعی کے بغیر میت کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ کسی عورت کا بیٹا دوسرے شہر میں دفن کر دیا گیا ہو اور وہ اس کے لئے بے قرار ہو اور اس کی میت قبر سے نکا کر اپنے شہر منتقل کرانا چاہتی ہو تو اس کی تسکین کے لئے ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ اس مسئلے پر ہمارے علماء کا اتفاق ہے۔

میت کو دفن کرنے کے بعد قبر سے نکال کر دوسرے مقام پر دفن کرنے کے ارادے سے امانت کے طور پر دفن کرنے کی شریعت میں کوئی سند جواز اور اصل نہیں ہے۔ امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ''فتاوی رضویہ'' میں اس عمل کو حرام قرار دیا ہے۔

میت کے اہل خانہ کے لئے کھانا بھیجنا

سوال: جس گھر میں میت ہو گئی ہو، اس گھر والوں کے لئے کھانا بھیجنے کا شرعی حکم کیا ہے؟
(علی مردان، پشاور)

جواب: صاحب مشکوٰۃ نے ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ''موتہ'' سے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل خانہ سے فرمایا: ''جعفر کے اہل خانہ کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان پر ایسی مصیبت نازل ہوئی ہے کہ انہیں (کھانے کے اہتمام کا) ہوش نہیں ہے''۔

علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ ''میت کے رشتے داروں اور پڑوسیوں کے لئے یہ امر

مستحب ہے کہ میت کے اہل خانہ کے لئے ایک دن کے کھانے کا اہتمام کریں کیونکہ یہ واضح طور پر ایک نیکی ہے اور میت کے پسماندگان کو اصرار کر کے کھانا کھلانا چاہیے"۔

ملا علی قاری نے مذکورہ بالا حدیث کے ذیل میں ''طیبی'' کے حوالے سے فقہاء کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ میت کے پسماندگان کے لئے تین دن کے کھانے کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ مدت تعزیت شرعاً تین دن ہے۔

مولانا احمد علی سہارنپوری نے لکھا ہے کہ تدفین کے دن جو لوگ تجہیز و تکفین اور تدفین کے اہتمام میں مصروف رہے ہوں، وہ بھی اہل میت کے لئے پڑوسیوں، رشتے داروں اور احباب کے بھیجے ہوئے کھانے میں سے کھا سکتے ہیں۔

میت کے گھر ضیافت کا اہتمام

سوال: بعض مقامات پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جس گھر میں میت ہوتی ہے تدفین کے بعد چند روز تک رشتے دار و احباب ان کے ہاں قیام یا آمد و رفت کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں، اہل میت کو خواستہ یا نخواستہ ان کے لئے کھانے وغیرہ کا اہتمام کرنا پڑتا ہے اور وہ مزے سے کھاتے رہتے ہیں اور یہ امر اہل میت کے لئے مصیبت کا باعث بن جاتا ہے اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ (سید ظہیر الاسلام قادری، نارتھ ناظم آباد، کراچی)

جواب: ابن ماجہ نے جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں ''ہم اہل میت کے گھر جمع ہونے اور کھانے کے اہتمام کو نوحہ خوانی کی طرح (ممنوع فعل) سمجھتے تھے''۔ صاحب علاء السنن نے علامہ سندھی کے حوالے سے اس روایت کے تحت لکھا ہے کہ اس ''روایت'' کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بات پر صحابہ کرام کا اجماع تھا یا اس روایت کا درجہ ''حدیث تقریری'' کا ہے۔

علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے ''اہل میت کے ہاں ضیافت کا اہتمام مکروہ ہے اور یہ بدعت قبیحہ ہے کیونکہ ضیافت خوشی کے مواقع پر کی جاتی ہے نہ کہ رنج کے مواقع پر۔

ایصالِ ثواب کی حقیقت

سوال: میں نے ایک پمفلٹ میں پڑھا کہ ایصال ثواب کا عقیدہ رکھنا کفر ہے اور انہوں نے اس کی وضاحت میں قرآن کی آیت کا ترجمہ لکھا تھا کہ ہر شخص اپنے اعمال لے کر جائے گا اور صرف وہی اس کے کام آئیں گے۔ اس میں لکھا تھا کہ قرآن پڑھ کر ثواب مردوں کو بخشنا غلط ہے؟۔ (محمد عرفان المانی، پاکستان چوک، کراچی)

جواب: ''ایصالِ ثواب'' سے مراد اپنے کسی مالی صدقے یا نفلی عبادت کا ثواب کسی دوسرے کو پہنچانا ہے، یہ ایک جائز اور مستحسن امر ہے اور ائمہ اربعہ کا اس پر اجماع ہے۔ قرآن کی متعدد آیات مبارکہ اور احادیث کریمہ سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے، اعمال صالحہ نجات کا وسیلہ ضرور ہیں، لیکن نجات حقیقی کا انحصار اللہ کے کرم وعنایت پر ہے، کون سا عمل مقبول ہے اور کون سا مردود؟ یہ بھی اسی کے کرم پر منحصر ہے، حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا، مگر اس ذات باری تعالیٰ کے فضل وکرم سے''۔ صحابہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! آپ بھی نہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں بھی نہیں، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی مغفرت کے سائے میں لے لے''۔ سید المرسلین ﷺ کی مغفرت کلی قطعی کی نوید تو قرآن نے دی ہے بلکہ آپ ﷺ تو گناہگاران امت کے لئے وسیلہ شفاعت ومغفرت ہیں، اس کے باوجود حضور ﷺ کا یہ فرمانا، تعلیم امت، کمال عبدیت کے اظہار اور جلالت باری تعالیٰ کے اقرار کے لئے ہے۔ قرآن کی تلاوت کرکے اس کا ثواب مردوں کو پہنچایا جاسکتا ہے اور پڑھنے والے کو بھی پورا ثواب ملے گا۔

میت کے ترکے سے ایصال ثواب کے لئے صدقہ

سوال: بعض اوقات لوگ ظاہر داری کی خاطر میت ہی کے مال سے یا برداری میں اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لئے قرض لے کر ایصال ثواب، صدقات اور چہلم وغیرہ کے موقع پر کھانے کا اہتمام کرتے ہیں، حالانکہ میت کے ورثاء میں اس کے نابالغ بچے بھی شامل

ہوتے ہیں۔اس کا شرعی حکم بیان کیجئے؟۔ (عبدالقدیر خان، نئی کراچی)

جواب: میت کی وفات کے بعد اس کے متروکہ مال پر اس کا حق ملکیت ساقط ہو جاتا ہے اور وہ مال اس کے شرعی وارثوں کی ملکیت میں آ جاتا ہے۔اہل میت کو میت کے متروکہ مال میں وراثت کی تقسیم سے پہلے، تصرف کا حق صرف امور ذیل کے لئے ہے:

(۱) میت کی تجہیز و تکفین اور تدفین کے مصارف۔

(۲) مرنے والے کے ذمے کسی کا قرض ہو تو اس کی ادئیگی۔

(۳) مرنے والے نے اگر کوئی وصیت کی ہو تو اس کی تعمیل و تکمیل۔وصیت کی مقدار ترکے کی مقدار کے ایک تہائی کے برابر ہو، ایک تہائی سے زائد متروکہ پر وصیت نافذ نہیں ہوگی۔ البتہ اگر ورثاء بالغ ہوں اور وہ برضا و رغبت ایک تہائی سے زائد وصیت کے لئے اپنے اپنے حصے سے دستبردار ہونا چاہیں تو یہ ان کی طرف سے میت کے لئے ایصال ثواب، تبرع اور نفلی صدقہ ہوگا اور اگر کچھ وارث نابالغ ہوں تو جو بالغ وارث تہائی ترکے سے زائد خرچ کرنا چاہے، اس کی ذمہ داری صرف اس کی ذات پر ہوگی۔

اگر سب بالغ ورثا مل کر یا کوئی ایک وارث اپنی طرف سے یا وصیت کے مطابق شرعی حد میں رہتے ہوئے چہلم یا کسی اور موقع پر کھانے کا اہتمام کریں اور دولت مندوں و فقراء کو کھلائیں تو جائز ہے۔البتہ انہیں نابالغ وارثوں کی طرف سے یا ان کے حصے میں سے اس طرح کا تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔اگر کریں گے تو اس کا بار صرف ان کی اپنی ذات پر ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا ۝ (سورۃ النساء)

"بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں اور وہ وقت دور نہیں کہ وہ جہنم کی شعلے مارتی آگ میں داخل ہوں گے"۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَ اٰتُوا الْیَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ۝ (سورۃ النساء: 2)

"اور یتیموں کو ان کا مال دو اور طیب کو خبیث سے نہ بدلو (یعنی اپنے مال کو جو تمہارے لئے حلال اور طیب ہے یتیم کے مال سے نہ بدلو جو تمہارے لئے ازروئے حکم شرعی حرام اور ناپاک ہے (یعنی ہوتا یہ تھا کہ یتیم کے سرپرست اپنا گھٹیا مال یتیم کو دے کر اس کا عمدہ مال لے لیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی حقیقت بیان فرمائی) اور ان (یتیموں) کے اموال کو اپنے مال میں خلط ملط کر کے نہ کھاؤ، بلاشبہ یہ بہت بڑا گناہ ہے"۔

جو صدقات محض ظاہرداری کے لئے اور اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لئے دیئے جائیں گے اس کا نہ کرنے والے کو کوئی ثواب اور نہ ہی میت کو اس کا فیض پہنچے گا۔ اجر تو صرف اسی عمل کا ملتا ہے جو محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا جائے نہ کہ دکھاوے کے لئے اور پھر ایسے کام کے لئے اپنے آپ کو بار قرض میں مبتلا کرنا کون سی دانشمندی ہے۔ تاہم اگر محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے صدقہ مطلوب ہو اور اس کے لئے قرض بھی لیا ہو تو یقیناً اجر پائے گا اور میت کو بھی اجر ملے گا لیکن قرض کی ادائیگی کا بار صرف اس پر ہوگا جس نے قرض لیا ہے، نابالغ وارثوں پر ہرگز نہیں ہوگا۔

سوئم، دسواں اور چالیسواں

سوال: اسلام میں سوئم، دسویں اور چہلم کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(بشریٰ جعفری، نارتھ ناظم آباد، کراچی)

جواب: اہل سنت کے ائمہ اربعہ کے نزدیک بالاتفاق ایصال ثواب جائز ہے۔ یعنی کسی مالی صدقے، نفلی عبادت یا عمل خیر کا ثواب کسی دوسرے مسلمان کو پہنچانا۔ خواہ وہ زندہ ہو یا انتقال ہو چکا ہو۔ اس سلسلے میں بکثرت آیات واحادیث موجود ہیں۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور وہ موجود نہ تھے۔ انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں غائب تھا اور میری والدہ فوت ہو گئیں، اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا ان کو فائدہ پہنچے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں''، انہوں نے کہا کہ ''میں آپ ﷺ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا پھلوں والا باغ اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کر دیا''۔ قرآن میں والدین کے لئے، جملہ اہل ایمان کے لئے دعا کی ترغیبات واحکام، نماز جنازہ میں میت کے لئے دعائے مغفرت اسی لئے ہے کہ ایک مومن کے عمل خیر کا فائدہ میت کو پہنچتا ہے۔ سوئم یا چہلم دراصل یہی ایصال ثواب ہے۔ خواہ فقراء کو کھانا کھلایا جائے یا قرآن خوانی کر کے ایصال ثواب کیا جائے، یا میت کو ثواب پہنچانے کی نیت سے کسی مسجد یا دار العلوم میں صدقہ جاریہ کے طور پر دیا جائے، یہ تمام صورتیں جائز ہیں۔ تیسرے یا چالیسویں دن کا تعین سہولت کے لئے ہوتا ہے، یہ ہرگز ضروری نہیں ہیں۔ ان سے پہلے یا بعد میں بھی ایصال ثواب ہو سکتا ہے۔ جیسے ہم آسانی کے لئے شادی وغیرہ کی تقریبات کے دن مقرر کرتے ہیں۔ دینی مجالس، مدارس کے جلسوں یا ختم بخاری وغیرہ کے لئے دن مقرر کرتے ہیں۔ یہ صرف سہولت کے لئے ہے البتہ سوئم یا چہلم کی یہ صورت مناسب نہیں ہے کہ امراء آ کر دعوت طعام سے لطف اندوز ہو کر چلے جائیں اور فقراء کو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے، زیادہ بہتر یہ ہے کہ صرف فقراء ومساکین کو ایصال ثواب کی نیت سے دیا جائے۔

مفاد عامہ کے لئے مختص اور ہر قسم کی تعمیرات کیلئے ممنوع جگہ پر مسجد بنانا

سوال: گلشن اقبال کراچی میں ایک اپارٹمنٹس کے مالک نے ایک جگہ پر مسجد تعمیر کرنے

کی اجازت دی جو مفاد عامہ کے لئے کے ڈی اے کی جانب سے مختص ہے، یہ 60 فٹ
چوڑی جگہ ہے جس کے نیچے پانی کی مین پائپ لائن گزر رہی ہے اور اس جگہ کے دونوں
جانب عرضاً 15 فٹ ایک جانب اور 15 فٹ دوسری جانب یعنی کل 90 فٹ کی چوڑائی
میں ہر قسم کی تعمیرات ممنوع ہے۔ کے ڈی اے نے بلڈر کو پابند کیا تھا کہ وہ باؤنڈری وال
اس پر قبضے یا تعمیرات کے لئے نہیں بلکہ اس لئے تعمیر کرے کہ کوئی اس پر ناجائز تعمیرات اور
تجاوزات نہ کر سکے۔ لیکن بلڈر کی اجازت سے اس پر باقاعدہ مسجد تعمیر کر لی گئی۔ جب
علاقے کے کچھ مکینوں نے متوجہ کیا کہ یہ تعمیر نہ صرف بلا اجازت بلکہ خلاف قانون اور
خلاف شرع ہے تو مسجد سے وابستہ بعض مذہبی جذباتی لوگوں نے مسجد کے شرعی و قانونی
پہلوؤں پر متوجہ کرنے والے مکینوں کو شوٹ کرنے کی دھمکی دی۔ دریافت طلب امر یہ ہے
کہ ازروئے شرع وفقہ حنفی کیا:۔

(۱) مفاد عامہ کے لئے مختص اور ہر قسم کی تعمیرات کے لئے ممنوع جگہ پر مسجد بنانا جائز ہے
جب کہ مجاز ادارے سے اس کی نہ اجازت لی گئی ہے، نہ اسے باقاعدہ قانونی شکل دی گئی
ہے اور نہ ہی ارادے کے افسران اعلیٰ ایسی اجازت دے سکتے ہیں کیونکہ اس کے نیچے مین
پائپ لائن پانی کی جارہی ہے؟

(۲) کیا یہ تعمیر کردہ شرعاً مسجد ہے اور اس میں نماز پڑھنے والوں کو مسجد میں نماز پڑھنے کا
ثواب ملے گا؟

(۳) کیا ایسی مسجد بنانے والا عنداللہ اجر کا مستحق ہوگا جب کہ قریب ہی شرعی اور قانونی مسجد
موجود ہے؟

(۴) مسجد ضرار قرآن میں کسے کہا گیا ہے، کیا ایسی مساجد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے؟۔

(۵) خالص شرعی مسئلے پر متوجہ کرنے والوں کو جو شخص شوٹ کرنے کی علانیہ دھمکی دے اس کا
کیا حکم ہے اور اس کی رپورٹ کرنی چاہیے؟

(۶) کیا ایسی تعمیر بلا اجازت وخلاف قانون غصب کے حکم میں نہیں ہے؟۔

نوٹ: چار صفحات پر مشتمل (مع نقشہ سائٹ پلان واسکیچ) تفصیلی سوالات کو لفظ بہ لفظ نق
کرنے کی گنجائش نہیں ہے، یہ خلاصہ اور نچوڑ درج کر دیا گیا ہے۔
(محمد اظہر احمد، محمد ظفر احمد، سید حضور حسین رضوی، گلشن اقبال، کراچ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الجواب هو الموفق للصواب

(۱) برتقدیر صدق سائل صورت مسئولہ میں مسجد ایک ایسی جگہ پر بنائی گی ہے جو حکومت
ملک ہے اور مفاد عامہ میں عملاً زیر استعمال ہے یعنی اس کے نیچے سے پانی کی پائپ لائن گ
رہی ہے، جس میں ردو بدل، توسیع اور مرمت کا حق مستقبل میں بھی متعلقہ حکومتی ادار
حاصل ہے اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ آئے دن ایسے توسیعی کام ہوتے رہتے ہیں اور مستفتی
بیان کے مطابق بلڈر یا الاٹی کو زمین کے اس حصے پر باؤنڈری وال کی تعمیر کی ذمہ دار
ملکیتی مقاصد کے لئے نہیں بلکہ تجاوزات سے تحفظ کے لئے دی گئی ہے، ایسی صورت می
وہ جگہ بلڈر کی ملکیت نہیں ہے اور نہ غیر مملوکہ زمین پر اس کی جانب سے وقف برائے مسج
اطلاق درست ہوسکتا ہے۔ اور شرعی مسجد کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ غیر
حق متعلق نہ ہو، چنانچہ فتاوی ردالمحتار جلد 1 صفحہ 255 میں ہے۔

''وفي الواقعات بنى مسجد على سور المدينة لا ينبغي
ان يصلي فيه لانه حق العامة فلم يخلص الله تعالى
كالمبنى في ارض مغصوبة''

یعنی ''الواقعات میں ہے کہ فصیل شہر پر ایک مسجد بنائی گئی ہو تو اس میں نماز پڑھنا جائ
نہیں ہے کیونکہ وہ عوام الناس کا حق ہے، تو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کسی جگہ کو خاص
کر دینا جو وقف مسجد کی شرط ہے وہ اس میں نہیں پائی گئی، یہ تو اس مسجد کی مانند ہے جو غصب
شدہ زمین پر بنائی گئی ہو''۔ تو جس طرح فصیل شہر کے ساتھ عوام الناس کا حق متعلق ہے
بالکل اسی طرح زمین کے اس حصے کے ساتھ بھی ہے جس کے نیچے سے پانی کی پائپ لائن

گزر رہی ہے اور بادی النظر میں ادارے کے مجاز افسران اس جگہ کو بطور مسجد باقاعدہ قانونی شکل یا منظوری دینے کے مجاز بھی نہیں ہیں تاوقتیکہ مفاد عامہ سے وابستہ پانی کی پائپ لائن کو کسی دوسری جگہ منتقل نہ کردیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں بھی ہے:

''مسجد بنی علی سور المدینة قالوا لا یصلی فیه، لان السور حق العامة''۔

جب مجاز اتھارٹی نے استفتاء کے مطابق اس جگہ ہر قسم کی تعمیر کو منع کیا ہوا ہے اور اس کے علی الرغم یہاں مسجد بنائی گئی ہے تو یہ شرعی اور فقہی مسجد نہیں ہے اور اس پر مسجد کے احکام لاگو نہیں ہوں گے جو لوگ علم کے باوجود اس میں نماز پڑھیں گے ان سے فرض تو ساقط ہو جائے گا لیکن ارض مغصوبہ میں تصرف کرنے کے گناہ گار ہوں گے اور ان کو مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب بہر حال نہیں ہوگا۔

(۲) قرآن مجید نے ''مسجد ضرار'' کی مذمت کرتے ہوئے سورۂ توبہ آیات نمبر 107 میں اس کے چار مقاصد شر بیان فرمائے ہیں، یعنی (۱) کفر (۲) مسلمانوں کو ضرر پہنچانا (۳) مومنوں میں تفریق پیدا کرنا (۴) اسے مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں کی آماجگاہ بنانا۔ لہٰذا اگر کوئی مسجد محض رضائے الٰہی کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کے لئے یا کسی مسجد کو ویران کرنے کے لئے بنائی جائے تو شرعاً مذموم بات ہے ایسا کرنے والا اجر سے محروم رہے گا۔

(۳) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ایک مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کی جان، اس کا مال اور اس کی آبرو۔ کسی مسلمان کو قتل کی دھمکی دینا حرام ہے، اگر کوئی خون ناحق کو حلال سمجھ کر کہتا ہے تو یہ کفر ہے، اور اگر حرمت کا اعتقاد رکھتے ہوئے کہتا ہے تو فسق ہے اور اس سے فی الفور اسے توبہ کرنی چاہیے۔ اگر ظاہر حال سے کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ایسا شخص خدانخواستہ کوئی عملی اقدام بھی کرسکتا ہے تو اپنے تحفظ کے لئے قانونی اقدامات کرنا ہر شخص کا حق ہے۔ کسی کو جان سے مارنے کی دھمکی دینے کو، سائل کا مذہبی جوش و

جذبے سے تعبیر کرنا غلط ہے، یہ تو دین اور مذہب کے منافی جذبہ ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو حدودِ شرع کی حرمت کو قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۴) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے (یعنی صدائے احتجاج بلند کرے) اور جو یہ بھی نہ کر سکے تو کم از کم اسے دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔

(۵) صحیح مسلم کتاب المساجد کی حدیث نمبر 1075 میں رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری کا واقعہ مذکور ہے کہ جب آپ بنی نجار کی بستی میں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے مسجد بنانے کا ارادہ فرمایا تو بنی نجار کے سرداروں کو بلایا اور فرمایا کہ ''اپنا یہ باغ مجھے فروخت کر دو''۔ انہوں نے رضائے الٰہی کیلئے بلا معاوضہ زمین دینے کی پیش کش کی۔ اکمال اکمال المعلم جلد 2 صفحہ 228 پر ہے: واقدی نے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عفراء کے دو بیٹوں سے یہ زمین دس دینار کے عوض خریدی تھی اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی طرف سے قیمت ادا کر دی تھی، یہ زمین درحقیقت سہل اور سہیل نامی دو یتیم بچوں کی تھی، اس لئے حضور ﷺ نے بلا معاوضہ لینا پسند نہ فرمایا۔ تو مسجد بنانے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا اپنا عمل مبارک یہ تھا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ایک مسجد کی رقم یا مال دوسری مسجد پر خرچ کرنا

سوال: میں ایک مسجد کا جنرل سیکرٹری تھا۔ کمیٹی تبدیل ہوگئی، نئی انتظامیہ خائن لوگوں پر مشتمل ہے۔ میری تحویل میں مسجد کی کچھ رقم ہے لیکن اگر میں رقم انتظامیہ کے ان افراد کو دے دوں تو مجھے یقین ہے کہ وہ رقم میں خیانت کریں گے، کیا میں یہ رقم کسی اور مسجد میں صرف کر سکتا ہوں؟ (ابن سعید، کراچی)

جواب: کسی مسجد کی رقم یا سامان کا دوسری مسجد میں صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ کو اندیشہ ہے کہ انتظامیہ کے لوگ اس میں خیانت کریں گے تو خود اس رقم کو مسجد کی کسی

ضرورت پر دیانتداری سے صرف کر دیں۔

مسجد کی تعمیر میں غیر مسلم کا چندہ لگانا

سوال: کیا مسجد کی تعمیر میں غیر مسلم کا چندہ لگانا جائز ہے، اگر کسی ادارے میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی ہوں اور ان سے تعمیر مسجد کے لئے چندہ ماہانہ لیا جاتا ہو تو کیا بلا امتیاز اس رقم کا استعمال تعمیر مسجد میں جائز ہے؟ (عبداللہ، کیماڑی، کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ (التوبہ)

''مشرکوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مساجد تعمیر کریں، حالانکہ وہ خود اپنی ذات پر کفر کے گواہ ہیں، وہ ایسے (بد نصیب) لوگ ہیں کہ ان کے اعمال رائیگاں چلے گئے ہیں اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اللہ کی مسجدیں تو صرف وہی لوگ آباد کر سکتے ہیں جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور وہ نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور اللہ کے سوا کسی سے خائف نہ ہوئے۔ پس امید ہے کہ وہ لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کے اس واضح ارشاد کی روشنی میں مسجد کی تعمیر و مرمت، تزئین و آرائش اور مصارف میں غیر مسلم کا مال لگانا جائز نہیں ہے، تعمیر مسجد فنڈ میں غیر مسلموں سے رضا کارانہ چندہ لینا یا جبری کٹوتی کرنا، جائز نہیں ہے اور ایسی حاصل شدہ رقم کا مسجد پر لگانا ناجائز ہے لہٰذا یہ رقم انہیں واپس کر دینی چاہیے۔ اس پر جملہ مفسرین وفقہاء امت کا اجماع ہے۔

مساجد و مدارس میں تعلیم القرآن کے لئے زکوٰۃ وفطرے کا استعمال

سوال: آج کل کراچی کی بعض مساجد میں اہل محلہ کے بچوں کے لئے تعلیم القرآن کے مدارس و مکاتب قائم ہیں، جہاں بچوں کو ناظرہ قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے یا بعض جگہ حفظ کا بھی انتظام ہے، مساجد کے منتظمین ان مدارس و مکاتب کے نام پر اہل محلہ سے زکوٰۃ و فطرے، کی رقوم جمع کرتے ہیں اور اس سے مدرسین کو تنخواہیں ادا کرتے ہیں، کیا ان کا یہ عمل جائز ہے؟ (عبدالرحمٰن، اورنگی ٹاؤن۔کراچی)

جواب: زکوٰۃ، فطرہ، فدیۂ صوم، کفارۂ قسم، کفارۂ صوم، نذر وغیرہ یہ سب صدقات واجبہ کہلاتے ہیں۔قرآن نے زکوٰۃ کا حکم تو بار بار دیا ہے، لیکن زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل بیان نہیں کیے۔ یہ تمام تفصیلات احادیث میں بیان کی گئی ہیں لیکن زکوٰۃ کے جس شعبے کو قرآن نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ شعبہ مصارف زکوٰۃ ہے، یعنی ان افراد، طبقات اور مدات کا بیان جن پر زکوٰۃ وفطرہ کی رقوم صرف کی جاسکتی ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (التوبہ)

''صدقات (اموال زکوٰۃ و صدقات واجبہ) صرف فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور جو انہیں وصول کرنے پر مقرر کیے گئے ہیں اور جن کے دلوں کو اسلام سے مانوس کرنا مقصود ہے اور (غلامی سے) گردنیں آزاد کرانے میں اور جو بار قرض تلے دبے ہوئے ہیں اور جو (کل وقتی) اللہ کی راہ میں (مصروف عمل ہیں اور مسافروں کے لئے (یہ صدقات) اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ہیں اور اللہ بہت جاننے والا بڑی

حکمت والا ہے''۔

اس آیت مبارکہ میں مصارف زکوٰۃ اور تمام صدقات واجبہ کے لئے قرآن نے آٹھ مدات واضح طور پر مقرر فرمادی ہیں۔زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے (آپ کے دست اقدس پر) بیعت کی، زیاد نے اس موقع پر ایک طویل حدیث بیان کی اور اسی موقع پر یہ واقعہ نقل کیا کہ آپ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ عنایت فرمائیے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف کا بیان نہ کسی نبی کی مرضی پر چھوڑا ہے اور نہ ہی کسی غیر نبی کی مرضی پر، بلکہ خود ہی فیصلہ فرمادیا ہے اور ان کے آٹھ حصے (یعنی آٹھ قسمیں) مقرر کردیے ہیں، اگر تم ان آٹھ مدات میں سے کسی ایک کے تحت حق دار بنتے ہو تو بتاؤ میں (مال زکوٰۃ میں سے) تم کو دے دوں گا''۔ (سنن ابی داؤد) اور تمام صدقات واجبہ کے مصارف متعین ہیں اور کسی کو ان میں ردوبدل کا اختیار نہیں ہے۔مدارس تعلیم القرآن اور مکاتب تعلیم القرآن میں مقامی لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ خود زکوٰۃ اور فطرہ دینے والے ہیں، ان کی تعلیم پر زکوٰۃ وفطرہ کی رقوم صرف کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے بچوں کو ٹیوشن پڑھوا کر اس کی اجرت زکوٰۃ اور فطرے سے ادا کی جائے، یہ ناجائز ہے اور اس طرح انسان زکوٰۃ، فطرہ اور فدیے کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔مساجد، محلے کی کمیٹیاں یا بعض دینی رفاعی تنظیمات جو ان مقاصد کے لئے زکوٰۃ وفطرہ وصول کرتی ہیں، ان کا یہ عمل قطعاً ناجائز ہے اور اس کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں گے۔

مسجد فنڈ سے چراغاں

سوال: کیا مسجد کے چندے کی جمع شدہ رقم سے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یا دیگر ایام مقدسہ پر مسجد میں چراغاں کرنے، جھنڈیاں لگانے پر خرچ کرنا جائز ہے؟ (محمد شہزاد قریشی، نیو کراچی)

جواب: اگر چندہ خاص برائے تعمیر دیا گیا ہو تو متولی یا انتظامیہ پر لازم ہے کہ اسے صرف

تعمیر پر خرچ کرے البتہ جو چندہ مسجد کے مصارف عمومی و مصارف جاریہ کے لئے دیا جاتا ہے جس میں مسجد کے ملازمین کے مشاہرے، مسجد کی مرمت و دیکھ بھال کے مصارف اور نمازیوں کو سہولتوں کی فراہمی مثلاً گیزر و کولر وغیرہ کی فراہمی شامل ہے، اسی طرح آج کل ان مصارف میں ایام مقدسہ کا چراغاں وغیرہ بھی شامل ہے اور چندہ دینے والے اسے دیکھتے ہیں اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے لہٰذا یہ جائز ہے۔

مسجد میں محراب نہیں ہے

سوال: محلے کی ایک مسجد ہے جس میں محراب نہیں ہے اور اس میں جماعت بھی گراؤنڈ فلور کے بجائے پہلی منزل پر ہوتی ہے، لوگوں کو دور سے پتا بھی نہیں چلتا کہ یہ مسجد ہے، کیا محراب کے بغیر مسجد کا وجود مناسب ہے؟۔ (آغا عبدالوحید خان، گلشن حدید۔ کراچی)

جواب: کسی مسجد کے شرعاً مسجد ہونے کے لئے محراب کا ہونا ضروری نہیں ہے، عہد رسالت اور عہد خلفائے راشدین میں مساجد میں محراب نہیں تھے، مساجد میں محراب کا سلسلہ عہد بنی امیہ میں شروع ہوا ہے، محراب اور مینار کا یہی فائدہ ہے کہ دور سے مسجد کی نشاندہی ہو جاتی ہے اور محراب کے ذریعے وسط مسجد کا تعین ہو جاتا ہے جس سے صفوں کو بنانے اور سیدھا رکھنے میں آسانی ہوتی ہے، تاہم محراب کے بغیر بھی مسجد، مسجد ہی رہے گی اور یہ اس کا کوئی شرعی نقص نہیں ہے، اگر پہلی منزل پر جماعت ہوتی ہے تو یہ بھی جائز ہے، تاہم شرعاً یہ ضروری ہے کہ فرش زمین سے لے کر ماوراء تک وہ مسجد ہی رہے، مسجد کے منافی کسی مصرف میں استعمال نہ کی جائے۔

مسجد میں گیس لیمپ اور ڈیٹول سے غسل

سوال: مسجد میں بدبو کی وجہ سے پیاز، لہسن اور بدبودار چیز کھا کر آنا منع ہے، جب کہ بعض مساجد میں گیس لیمپ جلائے جاتے ہیں اور گیس سے بدبو نکلتی ہے، کیا ڈیٹول سے نہانا جائز ہے؟۔ (محمد شہزاد قریشی، نیو کراچی)

جواب: پیاز، لہسن یا بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت ہے کہ اس سے دوسرے

نمازیوں اور فرشتوں کو اذیت ہوتی ہے اور یہ چیزیں کچی کھا کر آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جب کہ گیس لیمپ اور سرد علاقوں میں ہیٹر ضرورت کے تحت جلائے جاتے ہیں، ڈیٹول سے غسل کرنا جائز ہے، معمولی سی اسپرٹ انجکشن لگانے کے لئے بھی لگائی جاتی ہے تا کہ زخم نہ بنے، جراثیم مر جائیں اور انفیکشن نہ ہو۔

مصلے کو موڑنا

سوال: کہا جاتا ہے کہ آدمی نماز پڑھتے ہوئے درمیان میں اٹھ کر پانی پینے کے لئے یا کسی کام سے جائے تو "جائے نماز" کو تھوڑا موڑ دے ورنہ شیطان اس پر تھوک دیتا ہے۔
(نائلہ، کراچی)

جواب: یہ قول باطل ہے، شریعت میں اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ "جائے نماز" بچھا ہوا چھوڑ سکتے ہیں البتہ اگر احتیاطاً لپیٹ کر رکھا جائے کہ اس پر کسی کے ناپاک قدم نہ پڑیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

مسجد میں سوال کا جواب دینا

سوال: لوگ مسجد میں آتے ہیں تو سلام کرتے ہیں، مسجد میں پہلے سے موجود لوگ نماز، تلاوت یا ذکر اللہ میں مشغول ہوتے ہیں، کیا ان سب پر سلام کا جواب دینا ضروری ہے؟۔
(قاری محمد صدیق، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے، تلاوت کر رہا ہے، ذکر، تسبیح یا درود پڑھنے میں مشغول ہے، دینی کتب کے مطالعے میں مشغول ہے، خطبہ دے رہا ہے، وعظ و تقریر میں مشغول ہے، کھانا کھا رہا ہے تو اسے سلام نہیں کرنا چاہیے اور اگر کسی نے سلام کیا تو ان پر جواب دینا واجب نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شخص غسل خانے میں ہے تو اسے سلام نہیں کرنا چاہیے۔ جو لوگ خلاف شرع لہو ولعب، گانے بجانے، کبوتر اڑانے یا کسی علانیہ فسق میں مشغول ہوں تو انہیں بھی سلام نہ کیا جائے کیونکہ سلام تکریم کی علامت ہے اور یہ لوگ شرعاً تکریم و احترام کے مستحق نہیں ہیں۔

غیر مسلموں کا مسجد بنانا

سوال: ایک اخبار میں ایک مولانا صاحب نے ہندو کا مسجد کی تعمیر کے لئے زمین وقف کرنا جائز قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر ہندو کے نزدیک مسجد بنانا کارِ ثواب ہے تو اس کا مسجد کے لئے جگہ وقف کرنا صحیح ہے اور اس میں نماز پڑھنا بھی صحیح ہے، چونکہ وہ ایک دفعہ مسجد بن چکی ہے، اس لئے اگر اس کی دوبارہ تعمیر کی بھی ضرورت ہو تو صحیح ہے، کیا یہ جواب شرعاً درست ہے؟۔ (نور نبی، شاہ پور چاکر، سندھ)

جواب: یہ جواب شرعاً درست نہیں ہے، نہ غیر مسلموں کا مسجد تعمیر کرنا جائز ہے اور نہ ہی مسجد کی تعمیر کے لئے مسلمانوں کا غیر مسلموں سے چندہ لینا جائز ہے۔

مختصر اُدلائل حسب ذیل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (التوبہ)

''مشرکوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مساجد تعمیر کریں درآں حالیکہ وہ اپنے کفر پر قائم ہوں، ان کے اعمال اکارت ہیں اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اللہ تعالیٰ کی مساجد تو صرف وہ لوگ تعمیر کر سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان لا چکے ہیں۔

اس آیت کے تحت علامہ ابوبکر جصاص اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھتے ہیں: ''اس آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ کفار کو مسجد میں داخل ہونے، مساجد کو بنانے، اس کے مصالح کا انتظام کرنے اور اس کا نگران بننے سے روک دیا جائے، کیونکہ لفظ ان دونوں باتوں کو شامل ہے (یعنی تعمیر کرنا اور آباد کرنا)''۔ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں: ''کافر کے لئے مسجد کی تعمیر کرنا جائز نہیں ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ مسجد عبادت کی جگہ ہے، پس مسجد

کا معظم ہونا واجب ہے اور کافر مسجد کی توہین کرتا ہے اور اس کی تعظیم نہیں کرتا''۔ علامہ علی بن محمد خازن تفسیر خازن میں لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر واجب کر دیا ہے کہ وہ کفار کو مساجد کی تعمیر سے روکیں، کیونکہ مسجدیں تو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لئے تعمیر کی جاتی ہیں، تو جو شخص اللہ تعالیٰ کا منکر ہو، اس کے لئے مساجد اللہ کی تعمیر جائز نہیں ہے''۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں: ''مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ کفار کو مساجد کی تعمیر سے منع کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مساجد صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا منکر ہو اس کو مساجد بنانے کا کوئی حق نہیں ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی ردالمحتار میں لکھتے ہیں۔

''جب ذمی (اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہری) کسی ایسی چیز کے بارے میں وصیت کریں جو صرف ہمارے نزدیک عبادت ہے اور ان کے نزدیک عبادت نہیں ہے، مثلاً وہ حج کی وصیت کرے یا مسلمانوں کے لئے مسجد بنانے کی یا مسلمانوں کی مساجد میں چراغ روشن کرنے کی تو یہ وصیت بالاجماع باطل ہے''۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے ''اگر کوئی ذمی اپنے گھر کو مسلمانوں کی مسجد کی طرح مسجد بنادے اور انہیں اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دے اور پھر وہ مر جائے تو وہ گھر اس کے ورثاء کو وراثت میں مل جائے گا (یعنی مسجد نہیں بنے گا) یہ تمام فقہاء کا قول ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ میں لکھتے ہیں: ''اہل ذمہ کا وقف کرنا جائز نہیں ہے، سوائے ان امور کے جو ان کے اور ہمارے دونوں (مذاہب) کے نزدیک عبادت ہو حتیٰ کہ اگر ذمی اپنے گھر کو مسلمانوں کے لئے مسجد بنادے تو وہ جائز نہیں ہے''۔ ان دلائل کی روشنی میں مساجد کی تعمیر، توسیع اور ضروریات کے لئے غیر مسلموں سے مالی اعانت لینا جائز نہیں ہے، یہودی اور عیسائی تو کافر ہیں، ہندو مشرک ہیں، وہ ہندوستان میں بابری مسجد کو شہید کر چکے ہیں، ان کی مذہبی کتب اور عقائد میں یہ کہیں بھی درج نہیں ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کے لئے مسجد بنانا کار ثواب اور رضاء الٰہی کا باعث ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن مجید میں فرمان باری تعالیٰ

ہے کہ: ''وہ اپنی جانوں پر کفر کے گواہ ہیں''۔ لہٰذا یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ ہندو تعمیر مسجد کو عبادت الٰہی اور تقرب الٰہی کا ذریعہ یا کارِ ثواب سمجھ سکتا ہے۔ مسجد کا تو قیام ہی توحید کے اعلان اور کفر و شرک کے بطلان کے لئے ہوتا ہے۔ ہر روز دعاءِ قنوت میں ہم اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و پیمان کرتے ہیں کہ ''اے اللہ! جو تیرا جفا کار اور تیرا دشمن ہے ہم اس سے قطع تعلق کا اعلان کرتے ہیں''۔

استخارہ کیا ہے؟

سوال: استخارہ کیا ہے؟ اس کا طریقہ کیا ہے؟ کب تک کرتے ہیں؟ اس کا نتیجہ کیسے معلوم ہوگا؟۔ (فاطمہ بنت عبداللہ، اقبال، کراچی)

جواب: صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں تمام امور میں استخارہ کی تعلیم فرماتے تھے، (اس کا طریقہ وہ یوں بتاتے کہ) جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو دو رکعت نفل پڑھ کر یہ دعا مانگو: ''اے اللہ! میں تیرے علم سے خیر کی رہنمائی چاہتا ہوں اور تیری قدرت کاملہ سے قوت (فکر و عمل) مانگتا ہوں اور میں تجھ سے تیرے فضل عظیم کا سوال کرتا ہوں کیونکہ تو قادر ہے اور میں بے بس ہوں، تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا اور تو غیبوں کا جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تیرے علم کے مطابق یہ کام میرے دین، میرے معاش، میرے انجام کار اور میرے فوری اور دیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے بہتر ہے تو اسے میرے لئے مقدر فرمادے اور اسے میرے لئے آسان فرمادے اور پھر اس میں میرے لئے برکت فرما، اور اگر تیرے علم کے مطابق یہ کام میرے دین، معاش، انجام کار اور میرے فوری اور دیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے برا ہے تو تو (اپنی قدرت سے) اسے مجھ سے دور کردے اور مجھے اس سے دور کردے اور اس کے بدلے میں خیر جہاں بھی ہے، اسے میرے لئے مقدر فرما اور پھر میرے دل کو اس پر رضامند فرمادے''۔

طبرانی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تک استخارہ کرتا رہے یہاں تک کہ اس کا دل کسی ایک بات پر مطمئن ہو جائے۔

استخارہ کے لفظی معنی ہیں؟ ''خیر طلب کرنا'' یعنی ایسا مباح کام جس کے بارے میں انسان کو تردد ہو کہ کروں یا نہ کروں، اس میں مجھے کامیابی ہوگی یا ناکامی، اس کے نتائج میرے لئے مفید ہوں گے یا نقصان دہ۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ دو رکعت نفل پڑھ کر یہ دعاء پڑھے اور اول و آخر درود شریف اور سورۂ فاتحہ پڑھے اور اس کے بعد باوضو قبلہ رو لیٹ جائے۔ بعض علماء نے اپنے تجربات کی روشنی میں لکھا ہے کہ اگر خواب میں سفیدی یا سبزی نظر آئے تو اسے مثبت اشارہ سمجھے اور سیاہی یا سرخی نظر آئے تو اسے منفی اشارہ سمجھے۔ لیکن خواب دیکھنا یا خواب میں کچھ نظر آنا، یہ استخارہ کے لئے ضروری نہیں بلکہ اصل چیز ہے معاملے کے کسی ایک رخ کی جانب ذہن کا مائل ہو جانا اور اطمینان قلب۔ جب تک کسی ایک جانب دل کا جھکاؤ نہ ہو اور دل کسی ایک جانب جم نہ جائے یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ جب ایک مرتبہ اطمینان قلب ہو جائے تو پھر اللہ پر توکل کر کے اس کام کو کر دیں۔ انشاء اللہ العزیز اللہ تعالیٰ کی تائید، رحمت اور مدد شامل حال ہوگی۔

استخارہ سے فیصلہ

سوال: ایک لڑکی جس کا نکاح پانچ ماہ قبل ہو چکا ہے۔ اس کی رخصتی اور نکاح کو برقرار رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ استخارہ پر چھوڑ اگیا۔ لڑکی نے استخارہ کیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ حد نگاہ ہریالی ہی ہریالی ہے۔ ایک بزرگ جو سبز لباس پہنے ہیں، ان کے ہاتھ میں سفید تسبیح ہے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف لے جاتے ہیں اور آسمان چھونے کو کہتے ہیں اور کہتے ہیں تمہارا مرتبہ اور مقام یہ ہے۔ رہنمائی فرمایئے؟۔ (نام نامعلوم)

جواب: ''استخارہ'' کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے ہوتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے رہنمائی حاصل کی جائے اب جب کہ نکاح ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس کی کامیابی کی دعا مانگنی چاہیے حتی الامکان اسے نباہنے کی کوشش کرنی چاہیے، بلا سبب اور بلا جواز نکاح کو ختم کرنا یا خلع و طلاق لینا اچھی بات نہیں تاہم بظاہر آپ کی علامات اچھی ہیں۔ استخارے کی جو بھی تعبیر آئے وہ کوئی قطعی امر نہیں ہوتا۔ استخارے پر عمل نہ کرنے کا

کوئی کفارہ نہیں ہے، استخارہ ان لوگوں کو مفید ہوتا ہے جو ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست نہ ہوں، کمال ایمان یہ ہے کہ انسان اپنے معاملات اللہ کے سپرد کردے اس کی رضا کو مقدم جانے اور ہر پیش آمدہ معاملے میں اس سے سلامتی، عافیت اور امان کا طلب گار رہے۔

مسجد میں سوال کرنے اور سائل کو دینے کا شرعی حکم

سوال: اکثر جگہ مساجد میں لکھا ہوتا ہے کہ ''مسجد میں سوال کرنا منع ہے'' لہٰذا بتایئے کہ از روئے شرع مسجد میں سوال کرنے کا حکم کیا ہے اور آیا سائل کو مسجد کے اندر دینا منع ہے یا جائز ہے، از راہ کرم دلائل کی روشنی میں جواب تحریر کیجئے؟۔ (سید ذاکر شاہ بٹگرام، ہزارہ)

جواب: شرعاً اصولی طور پر سوال کرنا ایک انتہائی ناپسندیدہ امر ہے، لہٰذا اس کی اجازت صرف ناگزیر حالات میں دی گئی ہے اور ضرورت شدیدہ کے بغیر سوال کرنے یا اسے پیشے کے طور پر اختیار کرنے پر احادیث مبارکہ میں بڑی وعید آئی ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱) ''عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا یَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَایَزَالُ الرَّجُلُ یَسْأَلُ النَّاسَ حَتّٰی یَأْتِیَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَیْسَ فِیْ وَجْهِهٖ مُزْعَةُ لَحْمٍ''

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص لوگوں سے ہمیشہ سوال کرتا رہتا ہے، وہ قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ہوگا''۔

(صحیح مسلم صفحہ 33 جلد 1)

(۲) ''عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ یَقُوْلُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ سَأَلَ النَّاسَ اَمْوَالَهُمْ تَکَثُّرًا فَاِنَّمَا سَأَلَ جَمْرًا فَلْیَسْتَقِلَّ اَوْ لِیَسْتَکْثِرْ''

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

جو شخص لوگوں سے (ضرورت شدیدہ سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ) محض مال و دولت کی کثرت کی ہوس میں مبتلا ہو کر ان کے اموال کا سوال کرتا ہے، تو (ایسی صورتحال میں درحقیقت) وہ جہنم کا انگارہ مانگتا ہے، (اب یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ) کم پر قناعت کرے یا زیادہ کی خواہش کرے"۔

(صحیح مسلم صفحہ 333 جلد 1)

(۳) "وَمَنْ سَأَلَ النَّاسَ لِيُثْرِيَ بِهٖ مَالَهٗ كَانَ خُمُوْشًا فِيْ وَجْهِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَرَضْفًا يَأْكُلُهٗ مِنْ جَهَنَّمَ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُقِلَّ وَمَنْ شَآءَ فَلْيُكْثِرْ"

"جو شخص (افلاس کی بناء پر نہیں بلکہ) محض مال میں اضافے کے لئے لوگوں سے سوال کرتا ہے تو قیامت کے دن اس کا یہ سوال اس کے چہرے پر زخم اور گھاؤ کی شکل میں ظاہر ہوگا اور جہنم کا گرم جلتا ہوا پتھر ہوگا جس کو وہ وہاں کھائے گا، اب (پیشہ ور مانگنے والوں پر منحصر ہے) جس کا جی چاہے کم سوال کرے یا چاہے تو زیادہ کرے"۔ (جامع ترمذی)

ان احادیث کی روشنی میں علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: جس کے پاس ایک دن کی خوراک ہو، خواہ وہ اس کے پاس عملاً موجود ہو یا اس طور پر کہ وہ اس کے کمانے کی استعداد اور مواقع رکھتا ہے تو وہ شخص ایک صحت مند کمانے والے شخص کے حکم میں ہے۔ ایسے شخص کے حال سے واقفیت رکھنے کے باوجود اسے دینے والا گنہگار ہوگا کیونکہ یہ حرام کام میں اعانت ہے، ہاں البتہ کوئی شخص طلب علم یا جہاد میں مشغول ہے (یعنی وہ اپنے معاش کے لئے فارغ نہیں ہے) اور ضرورت مند بھی ہے تو اسے خوراک اور لباس کے لئے دینا جائز ہے۔ (حاشیہ فتاویٰ شامی صفحہ 95,94، جلد 2)

رہا یہ سوال کہ شرعاً کن حالات میں سوال کرنا جائز ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"إِنَّ الْمَسْئَلَةَ لَا تَحِلُّ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ إِلَّا لِذِيْ

فَقْرٍ مُدْقِعٍ اَوْ غُرْمٍ مُفْظِعٍ"

"بلاشبہ سوال کرنا نہ تو مالدار شخص کے لئے جائز ہے اور نہ ہی تندرست وتوانا شخص کے لئے، ہاں، ایسے مفلس ونادار شخص کے لئے ضرورۃً جائز ہے، جسے افلاس نے زمین پر دے مارا ہو یا وہ قرض وتاوان کے کسی بھاری بوجھ تلے دب گیا ہو"۔(جامع ترمذی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿١١﴾ وَمَا أَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿١٣﴾ أَوْ إِطْعٰمٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ﴿١٤﴾ يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿١٥﴾ أَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿١٦﴾ (البلد)

"تو کیوں نہ داخل ہو وہ دشوار گزار گھاٹی میں، اور آپ کیا جانیں کہ (وہ گھاٹی کیا ہے؟ (بار قرض یا غلامی سے) کسی کی گردن چھڑانا، یا (شدید) بھوک کے دن کھانا کھلانا، (خصوصاً ایسے) یتیم کو جو قرابت دار (بھی) ہو، یا خاک بسر (بھوک کے مارے) مسکین کو"۔

اب آتے ہیں زیر بحث مسئلے کی طرف کہ مسجد میں سوال کرنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ تو ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿٥٥﴾ (المائدہ)

"تمہارا دوست صرف اللہ ہے، اور اس کا رسول ہے اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں بھی (ہوں تو) زکوٰۃ (صدقہ) دیتے ہیں"۔

اس آیت کی تفسیر میں اس کا شان نزول بیان کرتے ہوئے علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی نے تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں، امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی

شافعی نے تفسیر کبیر میں، علامہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر در منثور میں، حافظ عماد الدین ابن کثیر حنبلی نے تفسیر ابن کثیر میں۔ علامہ احمد شہاب الدین خفاجی حنفی نے عنایت القاضی میں اور علامہ سید محمود آلوسی حنفی نے تفسیر روح المعانی میں اپنی اپنی اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ایک روز صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی، ایک شخص نے مسجد میں سوال کیا، اس کو کسی نے نہ دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے، انہوں نے حالت رکوع میں ہاتھ کے اشارے سے اپنے دائیں ہاتھ کی چھنگلی کی انگوٹھی اس کو دے دی۔

حضرت عبد اللہ بن ابو بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کسی شخص نے آج کسی مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟ حضرت ابو بکر نے عرض کیا: میں مسجد میں داخل ہوا تو وہاں ایک سائل سوال کر رہا تھا، میں نے عبد الرحمٰن کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا دیکھا تو میں نے اس سے وہ ٹکڑا لے کر اس سائل کو دے دیا''۔ (سنن ابی داؤد صفحہ 235 جلد 1)

اب اہم فقہاء احناف اور مستند کتب فتاویٰ سے چند حوالہ جات پیش کرتے ہیں۔

علامہ ابراہیم حلبی حنفی لکھتے ہیں:

''وَعُلِمَ مِمَّا تَقَدَّمَ حُرْمَةُ السُّوَالِ فِی الْمَسْجِدِ لِاَنَّهٗ کَنَشْدَانِ الضَّالَّةِ وَالْبَیْعِ وَنَحْوِهٖ وَکَرَاهَةِ الْاِعْطَاءِ لِاَنَّهٗ یَحْمِلُ السُّوَالَ وَقِیْلَ لَا اِذَا لَمْ یَتَخَطِّ النَّاسَ وَلَمْ یَمُرَّ بَیْنَ یَدَیْ مُصَلٍّ وَالْاَوَّلُ اَحْوَطُ''

''گزشتہ عبارت سے یہ معلوم ہو گیا کہ مسجد میں سوال کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ گم شدہ چیز تلاش کرنے اور خرید و فروخت کے لئے آواز لگانے کی مثل ہے، اور ایسے سائل کو دینا اس لئے مکروہ ہے کہ یہ (مسجد میں) سوال کرنے پر ابھارنا ہے، ایک قول یہ ہے کہ مسجد میں سوال کرنا مکروہ نہیں ہے، بہ شرطیکہ مانگنے والا لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے اور نمازیوں کے آگے نہ گزرے، لیکن پہلا قول

زیادہ احتیاط پر مبنی ہے"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

""یُکْرَهُ إِعْطَاءُ السَّائِلِ فِي الْمَسْجِدِ إِلَّا إِذَا لَمْ یَتَخَطَّ رِقَابَ النَّاسِ فِي الْمُخْتَارِ كَمَا فِي الْاِخْتِیَارِ وَمَتْنِ مَوَاهِبِ الرَّحْمٰنِ لِأَنَّ عَلِیًّا تَصَدَّقَ بِخَاتِمِهٖ فِي الصَّلٰوةِ فَمَدَحَهُ اللّٰهُ بِقَوْلِهٖ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ""

""مسجد میں سائل کو دینا مکروہ ہے، ہاں اگر وہ لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے تو پھر قول مختار کے مطابق وہ مکروہ نہیں ہے، اسی طرح ''اختیار'' اور ''مواہب الرحمٰن'' میں مذکور ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز کی حالت میں انگوٹھی صدقہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل کی ''جو لوگ رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں''۔

(درمختار حاشیہ ردالمحتار جلد 5 صفحہ 368)

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"''اختیار'' میں یہ مذکور ہے کہ اگر سائل نمازیوں کے سامنے سے گزرتا ہے اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہے تو اس کو دینا مکروہ ہے کیونکہ یہ لوگوں کو ایذا دینے پر معاونت ہے حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ اس طرح ایک پیسہ دینے کا کفارہ ستر پیسے بھی نہیں ہو سکتے، علامہ طحطاوی نے کہا ہے کہ یہ کراہت نمازیوں کی گردنیں پھلانگنے کی وجہ سے ہے جس کو ایذا لازم ہے اور جب وہاں گزرنے کے لئے جگہ کشادہ ہو تو پھر کوئی کراہت نہیں ہے، جیسا کہ اس عبارت کے مفہوم مخالف سے معلوم ہوتا ہے"۔

صدر الشریعہ علامہ محمد امجد علی فتاویٰ امجدیہ جلد اول صفحہ نمبر 252 پر لکھتے ہیں:

""مسجد میں سوال کرنے کے متعلق علماء حنفیہ کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ مطلقاً ناجائز، دوسرا یہ کہ چار شرطوں کے ساتھ جائز ہے اور یہ شرطیں نہ ہوں تو نا

جائز، شرط اول یہ کہ مصلی کے آگے سے نہ گزرے، دوم یہ کہ لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے، سوم یہ کہ الحاح کے ساتھ سوال نہ ہو (یعنی از حد گڑگڑا کر سوال نہ کرے) چہارم یہ کہ ضرورت کے لئے سوال کرتا ہو، قول دوم کو بزازیہ وغیرہ میں اختیار فرمایا اور صاحب درمختار نے بھی کتاب الحظر میں تنہا اسی قول کا ذکر کیا"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی فتاویٰ درمختار میں لکھتے ہیں:

"جس شخص کے پاس ایک دن کی خوراک ہو، خواہ وہ خوراک بالفعل موجود ہو یا اس میں اس کو کما کر حاصل کرنے کی استعداد ہو یعنی یہ کہ وہ تندرست اور کمانے والا ہو، اس کے لئے خوراک کا سوال کرنا جائز نہیں ہے اور اس کو دینے والا اس کے حال کو جانتا ہو تو وہ گنہگار ہوگا کیونکہ وہ ایک حرام کی مدد کر رہا ہے، اور اگر وہ ضرورت مند ہو اور کپڑوں کا سوال کرے یا جہاد یا طلب علم میں مشغول ہونے کی وجہ سے خوراک کا سوال کرے اور وہ ضرورت مند بھی ہو تو یہ سوال جائز ہے اور اس کو دینا بھی جائز ہے (درمختار برحاشیہ فتاویٰ شامی جلد2 صفحہ 95,94)

خلاصہ کلام یہ کہ اگر سائل ضرورت مند ہے، ضرورت وقتی کے لئے بھی اس کے پاس نہیں، وہ کمانے کے قابل بھی نہیں، وقار اور عزت نفس کو قائم رکھتے ہوئے سوال کرتا ہے، نمازیوں کے آگے سے نہیں گزرتا، نمازیوں کی گردنیں نہیں پھلانگتا، گڑگڑا کر اپنی عزت نفس کو مجروع نہیں کرتا، زور زور سے بول کر نمازیوں کی نماز، دعا اور تلاوت و ذکر میں مخل نہیں ہوتا یعنی انہیں ایذا نہیں پہنچتا، تو اسے مسجد میں دینا جائز ہے۔

چنانچہ علامہ امجد علی لکھتے ہیں: " خلاصہ یہ کہ سائل میں اگر وہ شرائط نہ پائی جائیں تو سوال بھی جائز نہیں اور دینا بھی ناجائز"۔

مسجد کے فنڈ سے امام مسجد کے بیٹے کو وظیفہ دینا؟

سوال: ہماری مسجد کے امام وخطیب تقریباً 50 سال تک مسجد میں امامت وخطابت کرتے

رہے اب انتقال ہو گیا ہے۔ امام صاحب مرحوم کے چار پانچ بیٹے ہیں جو دنیاوی تعلیم وغیرہ پڑھے ہوئے ہیں اور کلین شیو ہیں اور برسر روزگار اور ملازمت وغیرہ کرتے ہیں پوچھنا یہ ہے کہ مسجد کمیٹی امام مرحوم کے صرف ایک بیٹے کو ماہانہ ہزار روپیہ دیتی ہے اور رمضان المبارک میں پانچ چھ ہزار روپیہ دیتی ہے مسجد کمیٹی کے کچھ ممبران اور نمازی حضرات نے اعتراض کیا ہے کہ مسجد فنڈ سے امام مرحوم کے بیٹے کو بلاوجہ رقم دینا شریعت کے خلاف ہے اور ناجائز ہے۔ ہماری اس مسئلہ میں قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں راہنمائی فرمایئے؟۔

جواب: آپ کی مسجد کے متوفی امام وخطیب کے بیٹے چونکہ مسجد کی کسی خدمت سے وابستہ نہیں ہیں، جس کا معاوضہ انہیں مسجد فنڈ سے دیا جائے، اس لئے مسجد فنڈ سے انہیں ماہانہ یا سالانہ رقم یا وظیفہ دینا جائز نہیں ہے، البتہ اگر مسجد کی انتظامیہ کے افراد یا اہل محلہ اپنے مرحوم امام وخطیب کی طویل خدمات کی قدر دانی یا ان سے حسن عقیدت کی بناء پر ان کی اولاد کے ساتھ تبرع اور احسان کے طور پر مالی مدد کرنا چاہتے ہوں تو وہ اس کے لئے الگ سے فنڈ قائم کریں اور خود بھی حصہ ڈالیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیں، جو رقم اس فنڈ میں جمع ہو جائے، وہ امام صاحب مرحوم کی اولاد کو دے دیں۔

﴿کتاب الصوم﴾

کیا روزے کی زبانی نیت ضروری ہے؟

سوال: (۱) اگر کوئی شخص رمضان المبارک میں روزے کی نیت سے سحری کے لئے اٹھتا ہے، سحری کرتا ہے، با قاعدہ روزہ رکھتا ہے، لیکن زبانی روزے کی نیت نہیں کرتا، کیا اس کا روزہ ہو جائے گا؟

(۲) دل سے روزے کی نیت کی ہے، سحری کے لئے نہیں اٹھتا یا ارادہ تو تھا لیکن سویا ہوا رہ جاتا ہے، لیکن صبح اٹھ کر باقاعدہ روزہ رکھتا ہے، روزے سے رہتا ہے، البتہ لفظاً زبانی نیت نہیں کرتا، کیا اس طرح روزہ ادا ہو جائے گا؟۔ (ضیاء الرحمن، دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: نیت دل کے ارادے کا نام ہے اور یہ قلب و ذہن کا عمل ہے، اس لئے عہد رسالت ﷺ میں ان عبادات کے لئے لفظاً نیت کے کلمات مذکور نہیں ہیں، اور ان نفوس قدسیہ کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ ہر وقت اور ہر عبادت میں حضوری قلب، توجہ الی اللہ اور اخلاص وللٰہیت کی کیفیت سے سرشار رہتے تھے۔ وہ جسم و روح، قلب اور قالب کی یکسوئی، جمعیت اور عزیمت کے ساتھ دوران عبادت بلکہ ہر حال میں ذات باری تعالیٰ کی جانب متوجہ رہتے تھے، اس لئے ان کو لفظاً نیت کی چنداں ضرورت ہی نہیں تھی، بلکہ اسی بنا پر بعض متقدمین نے لفظاً نیت کو بدعت کہا، لیکن متاخرین فقہا کرام اور جمہور علماء امت نے جب یہ دیکھا کہ اب لوگوں میں ''حضوری قلب'' اور ''استحضار نیت'' کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی تو انہوں نے لفظاً نیت کو مستحسن و مستحب قرار دیا تاکہ عبادت گزار کا ذہن اگر کسی اور جانب متوجہ ہے یا بٹا ہوا ہے تو کلمات نیت ادا کرنے سے اصل مقصود یعنی عبادت کی جانب متوجہ ہو جائے۔ ان تمہیدی کلمات کے بعد گزارش ہے کہ مذکورہ بالا پہلی دو صورتوں میں جب کہ اس شخص کی نیت روزے کی ہے اور عملاً روزہ رکھ رہا ہے، تو لفظاً نیت کے کلمات ادا نہ کرنے کے باوجود روزہ صحیح طور پر ادا ہو جائے گا اور اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی، اور پہلی صورت میں تو اس کا سحری کے لئے اٹھنا اور سحری کرنا یہ بین طور پر اس کی نیت صوم پر دلالت کرتا ہے، ہاں البتہ اگر کوئی شخص نیت صوم و نیت عبادت کے بغیر بھوکا پیاسا رہے تو یہ روزہ

نہیں ہوگا بلکہ فاقہ کشی ہوگی۔

روزہ اور غسل واجب

سوال: غسل واجب تھا، لیکن تاخیر سے اٹھنے کے باعث وقت کی اتنی گنجائش نہیں کہ غسل کر کے سحری کریں، تو کیا حالت جنابت میں سحری کرنا اور روزے کا شروع ہو جانا جائز ہے؟ (غلام یاسین، کورنگی، کراچی)

جواب: اگر ایسی صورتحال درپیش ہو تو ہاتھ دھو کر کلی کر کے سحری کر لیں اور سحری ختم ہونے کے بعد سہولت کے مطابق غسل کر لیں، اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، اسی طرح دن میں سوتے میں غسل واجب ہو جائے تو یہ روزے کے منافی نہیں ہے۔ البتہ غسل جنابت میں اتنی تاخیر نہ کی جائے کہ ایک فرض نماز کا وقت نکل جائے۔

سائرن، ٹی وی کے اعلان یا اذان پر سحری کا اختتام

سوال: سحری کا وقت ختم ہونے کا علم گھڑی، سائرن، ٹی وی، ریڈیو کے اعلان یا اذان پر روزہ بند کرنا چاہیے؟

جواب: سحری کا وقت ختم ہونے کا علم گھڑی، سائرن، ٹی وی، ریڈیو کے اعلان یا اذان جس ذریعے سے بھی ہو جائے فوراً کھانا پینا بند کر دینا چاہیے کیونکہ یہ تمام ذرائع ظن غالب کا سبب ہیں۔ ان میں سے جس ذریعے سے بھی معلوم ہو جائے، کھانا پینا فوراً بند کر دینا چاہیے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک سائرن بج رہا ہے یا جب تک اذان جاری رہے ہم کھا پی سکتے ہیں یہ درست نہیں ہے، یہ تمام علامات اختتام سحر کی ہیں اس لئے سائرن یا اذان شروع ہوتے ہی کھانا پینا بند کر دینا چاہیے کیونکہ اذان ختم ہونے میں بعض اوقات تین چار منٹ لگ جاتے ہیں، اختتام اذان تک کھانے پینے سے روزہ فاسد ہو جائے گا، احتیاط کرنی چاہیے۔

شوال المکرم کے چھ روزے

سوال: شوال المکرم کے چھ روزوں کی، جنہیں عرف عام میں شش عید کے روزے کہا

تا ہے، شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ روزے عید الفطر کے متصل رکھنا ضروری ہیں یا وقفے
ے اور تسلسل کے بغیر بھی رکھے جاسکتے ہیں؟۔ (کامران قریشی، گلستان جوہر، کراچی)

جواب: صحیح مسلم میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول
ہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے رمضان المبارک کے روزے رکھے اور پھر اس کے
بعد شوال کے چھ روزے رکھے، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے عمر بھر روزہ رکھا''۔ یعنی اس
کے صلے اور انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اسے دائمی روزے کا اجر عطا ہوگا۔ اس
حدیث مبارک کی رو سے عید الفطر کے بعد شوال المکرم کے چھ روزے رکھنا مستحب ہے۔
علامہ ابن عابدین شامی نے فتح القدیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ چھ روزے عید الفطر کے
بعد متصل اور مسلسل نہ رکھے جاسکیں تو متفرق طور پر رکھنا بھی باعث اجر ہے۔

روزے میں جھوٹ، غیبت اور چغلی کا حکم

سوال: روزے کی حالت میں اگر کوئی شخص جھوٹ بولے، غیبت کرے یا کسی کی چغلی
کھائے تو کیا اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا؟ (محمد ناصر، چشتی نارتھ، کراچی)

جواب: جھوٹ، غیبت، چغلی وغیرہ ویسے بھی قبیح گناہ ہیں اور قرآن مجید میں ان گناہوں
کی شدید مذمت بھی فرمائی گئی ہے اور ان پر عذاب کی وعید بھی سنائی گئی ہے۔ روزے کی
حالت میں ان گناہوں کی شدت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، ان معاصی کے ارتکاب سے
اگرچہ روزہ فقہی طور پر فاسد نہیں ہوتا، لیکن اس عبادت کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو بے پایاں
اجر رکھا ہے، اس سے انسان محروم ہو جاتا ہے، چنانچہ احادیث مبارکہ میں ارشاد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ:

(۱) ''جو شخص (روزہ رکھنے کے باوجود) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ
تعالیٰ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ بھوکا اور پیاسا رہے''۔ (صحیح بخاری)

(۲) ''جب تم میں سے کوئی روزے دار ہو تو نہ بیہودہ باتیں کرے اور نہ ہی چیخے چلائے، اگر
کوئی اس کے ساتھ گالی گلوچ یا لڑائی جھگڑے پر اتر آئے تو کہہ دے (بھائی مجھے معاف

کرو) میرا روزہ ہے"۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(۴) "بہت سے روزے دار ایسے ہیں جنہیں روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا"۔ (الغرض حقیقی اور کامل روزہ وہی ہے جس میں انسان تمام فواحش، منکرات اور برائیوں سے بچے)

روزے کی حالت میں خون دینا، آنکھ کان میں دوا ڈالنا وغیرہ

سوال: روزے کی حالت میں خون دینا، گلوکوز چڑھانا، آنکھ کان میں دوا ڈالنے کا شرعی حکم کیا ہے؟۔ (عائشہ اقبال وشاز یہ ڈیفینیل منظور کالونی، کراچی)

جواب: روزے کی حالت میں روزے دار کو خون یا گلوکوز چڑھانا، نس یا پٹھوں میں انجکشن لگانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ میں اس پر ایک مفصل مضمون لکھ چکا ہوں جو اسی کتاب میں "مفسدات صوم" کے عنوان سے شامل ہے۔ آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا جب کہ کان میں دوا ڈالنے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ دلائل میرے مذکورہ بالا مضمون میں ملاحظہ فرمائیں۔

نوٹ: (یہ مضمون صفحہ 192 پر موجود ہے)

روزے کی حالت میں خواتین کا میک اپ کرنا

سوال: روزے کی حالت میں خواتین کا میک اپ کرنا، لپ اسٹک لگانا، ہیر کٹنگ کرانا کیسا ہے؟ (عائشہ اقبال وشاز یہ ڈیفینیل منظور کالونی، کراچی)

جواب: روزے کی حالت میں خواتین کا میک اپ کرنا جائز ہے، بشرطیکہ غیر محرم مردوں کے سامنے بے پردگی اور نمود ونمائش مقصود نہ ہو، لپ اسٹک لگانا جائز ہے بشرطیکہ اس کے اجزاء ترکیبی میں کوئی ناپاک چیز شامل نہ ہو اور اگر لپ اسٹک واٹر پروف ہے اور اس کے لگے رہنے کی وجہ سے ہونٹوں کی جلد وضو کے دوران پانی سے تر نہیں ہوتی تو وضو ادا نہیں ہوگا، اور ایسے ناتمام وضو سے نماز صحیح ادا نہیں ہوگی اور جو چیز کسی شرعی فرض کی صحت ادا میں مانع بن جائے وہ جائز نہیں ہے۔ ہیر کٹنگ اگر معمولی مقدار میں ہو مثلاً لمبائی میں بالوں کو برابر رکھنا

تو اس حد تک جائز اور اگر اتنی مقدار میں ہو جس سے مردوں کے ساتھ مشابہت پیدا ہو تو ناجائز ہے۔ حدیث پاک میں عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے والے مردوں اور مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں کو لعنت کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔

روزے میں مسواک کا حکم

سوال: کیا روزے کی حالت میں مسواک کرنا جائز ہے؟ اسی طرح سے ٹوتھ پیسٹ یا ٹوتھ پاؤڈر سے دانتوں کو برش کرنے کا شرعاً حکم کیا ہے؟

(سید ذاکر شاہ، سعید آباد، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)

جواب: روزے کی حالت میں مسواک کرنا جائز ہے بلکہ ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنا سنت اور باعث جزا ہے، برش کا حکم بھی مسواک ہی کی طرح ہے، البتہ اس بات کی احتیاط کریں کہ پاؤڈر یا پیسٹ کے ذرات حلق میں نہ جائیں۔

روزے میں خون دینے کا حکم

سوال: کیا روزے کی حالت میں کسی ضرورت مند مریض کو خون دینا جائز ہے؟

(عنایت اللہ، فرنٹیئر کالونی)

جواب: روزے کی حالت میں ضرورت مند مریض کو خون دینا جائز ہے، اسی طرح بلڈ ٹیسٹ کے لئے بھی خون نکالنا جائز ہے۔ البتہ اتنا زیادہ خون نہ نکالا جائے کہ روزے کی استطاعت باقی نہ رہے۔

روزے میں VICKS لگانے کا حکم

سوال: بعض اوقات نزلہ، زکام ہوتا ہے تو ناک میں Vicks لگاتے ہیں، کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

(کامران، گلشن اقبال)

جواب: Vicks ایک قسم کا کیمیکل ہوتا ہے اسے جب ناک کے نتھنوں کے اندر لگاتے ہیں تو کیمیکل کے اجزاء حلق کے راستے اندر جاتے ہیں لہٰذا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔

البتہ ایسی Vicks جو سر درد کی صورت میں پیشانی پر لگائے جاتے ہیں یا کسی اور عضو میں درد ہو تو اس پر لگائے جاتے ہیں اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، کیونکہ بدن کے مساموں کے ذریعے، پانی، تیل یا کوئی اور چیز اندر جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

روزے میں آنکھ، ناک، کان میں دوا کا استعمال

سوال: حالت روزہ میں آنکھ، کان یا ناک میں دوا ڈال سکتے ہیں؟

(محمد عدیل الدین، کراچی)

جواب: عام طور پر موجودہ دور کے اہل فتاویٰ کی رائے یہ ہے کہ آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ آنکھ اور حلق کے درمیان کوئی منفذ (Route) نہیں ہے اور ناک اور کان میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ناک کا مسئلہ تو بالکل واضح ہے، قدیم فقہاء کی رائے یہ تھی کہ چونکہ کان اور معدے کے درمیان منفذ (Route) ہے اس لئے کان میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن جدید طبی تحقیق اور علم تشریح الاعضاء (اناٹومی) کی رو سے یہ رائے درست نہیں ہے، جدید تحقیق یہ ہے کہ آنکھ اور حلق کے درمیان منفذ (Route) ہے اور کان اور حلق کے درمیان منفذ (Route) نہیں ہے لہٰذا آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور کان میں دوا ڈالنے سے نہیں ٹوٹے گا۔

”مفسدات صوم و جدید مسائل“

مسلم فقہی اصولوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں بعض مسائل پر نظر ثانی کی ضرورت:

قرآن و سنت اسلامی شریعت کی اساس اور فقہی احکام کے استنباط و استخراج کی بنیاد ہے۔ قرآن و سنت کی نصوص صریحہ قطعیہ ناقابل تنسیخ، غیر متبدل اور نافذ العمل رہیں گی۔ ہمارے ائمہ مذاہب، ائمہ مجتہدین اور فقہا کرام نے ایسے اصول وضع کیے ہیں جن کی روشنی میں ہر دور میں پیش آنے والے شرعی مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن و سنت تا قیامت سرچشمۂ ہدایت اور مآخذ قانون رہیں گے۔

جدید طبی اور سائنسی تحقیقات کا دروازہ کھلا ہے اور کھلا رہے گا، مسلمہ فقہی اصول یہ ہے کہ جدید طبی اور سائنسی تحقیقات کی بابت ان شعبوں کے ماہرین کی آراء بطور سند اور حجت تسلیم کی جاتی رہیں گی، البتہ ان مسلمہ طبی اور سائنسی آراء کی روشنی میں ان کے بارے میں فقہی اصولوں کے تحت شرعی احکام کا اطلاق وانطباق فقہاء عصر کا کام ہے۔

علم تشریح الاعضاء (Anotomy) میں حیرت انگیز ترقی دور جدید کا کارنامہ ہے۔ آج تقریباً ہر انسانی عضو کی ہیئت اور ساخت کے بارے میں ''عین الیقین'' کی حد تک معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ جب کہ چند صدیاں قبل ان کے بارے میں محض ظن غالب کی بنیاد پر رائے قائم کر کے مسائل وضع کیے گئے تھے۔ مثلاً ایک مختلف فیہ مسئلہ فقہ حنفی کی تمام مستند و معتبر کتب فتاویٰ میں درج ہے کہ آیا ''مثانۂ پیشاب'' میں جو پیشاب جمع ہوتا ہے، یہ مسامات کے ذریعہ رس کر آتا ہے یا مثانے اور پیٹ کے درمیان کوئی سوراخ یا قدرتی نالی ہے؟ امام اعظم ابو حنیفہ کی رائے یہ تھی کہ کوئی نالی نہیں ہے۔ امام ابو یوسف کی رائے تھی کہ نالی ہے۔ امام محمد اس مسئلے میں متذبذب تھے، اسی ظن وتخمین کی بنیاد پر ان ائمہ عظام نے مسائل وضع فرمائے۔ اس مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جلیل القدر فقیہ علامہ کمال الدین ابن ہمام صاحب فتح القدیر نے فرمایا کہ یہ بنیادی طور پر فقہ کا نہیں بلکہ طب کا مسئلہ ہے، اگر اس عضو کی تشریح پر ان ائمہ کا اتفاق ہوتا تو ان کا فقہی مسئلہ وضع کرنے میں بھی کوئی اختلاف واقع نہ ہوتا۔

اس تمہید کے بعد گزارش ہے کہ صحیح بخاری اور دیگر کتب احادیث میں فساد صوم کا جو اصل الاصول رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، وہ یہ ہے کہ: ''روزہ (بدن میں) کسی چیز کے داخل ہونے سے ٹوٹتا ہے، خارج ہونے سے نہیں ٹوٹتا''۔ ہمارے قدیم فقہاء کی ایک رائے یہ تھی کہ دماغ اور معدے کے درمیان نالی (Passage) ہے، لہٰذا اگر کوئی چیز خارج سے دماغ میں پہنچ گئی تو اس راستے سے معدے میں از خود پہنچ جائے گی۔ پس ثابت ہوا کہ دماغ میں کسی سوراخ یا گہرے زخم کے ذریعے دوا یا غذا پہنچنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا،

اب تازہ ترین طبی تحقیق یہ ہے کہ دماغ اور معدے کے درمیان کوئی روٹ یا نالی نہیں ہے، لہٰذا اس قطعی طبی تحقیق کی روشنی میں علماء کو یہ فتویٰ دینا چاہیے کہ دماغ میں کوئی دوا یا غذا پہنچنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

معدے تک کوئی دوا یا غذا پہنچنے کے منافذ طبیعہ (Physical Passage or Route) منہ، ناک، دبر اور قبل ہیں۔ ہمارے قدیم فقہاء کی رائے یہ تھی کہ کان کے راستے سے معدے تک نالی ہے، جس کی وجہ سے کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور ہمارے موجودہ دور کے فقہاء بھی یہی فتویٰ دیتے چلے آرہے ہیں، لیکن تازہ ترین طبی تحقیق یہ ہے کہ کان اور معدے کے درمیان کوئی منفذ (Route) نہیں ہے، لہٰذا ہمارے اہل فتویٰ کو اس مسئلے پر نظر ثانی کر کے یہ فتویٰ دینا چاہیے کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ہاں اگر کسی کے کان کا پردہ پھٹا ہوا (Damage) ہے تو پھر کان میں دوا یا تیل ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔

اسی طرح ہمارے قدیم فقہا کا خیال تھا کہ آنکھ اور حلق کے درمیان کوئی منفذ نہیں ہے، لہٰذا اب تک ہمارے علماء کرام یہی فتویٰ دیتے چلے آرہے ہیں کہ آنکھ میں سرمہ لگانے اور دوا ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، لیکن تازہ ترین طبی تحقیق یہ ہے کہ آنکھ اور حلق کے درمیان راستہ ہے۔ آنکھ کے ڈھیلے کے پیچھے غدودوں سے قدرت کے خود کار نظام کے تحت نمکین پانی رستا رہتا ہے جو دافع عفونت (Antiseptic) اور جراثیم کش (Antibiotic) ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خلاقی کا کرشمہ ہے کہ یہ نمکین پانی آنکھ کی تطہیر کرتا ہے، مختلف عوارض سے اس کا تحفظ کرتا ہے اور آنکھ کے گوشے میں دو باریک نالیوں کے ذریعے حلق میں چلا جاتا ہے، جب کہ ہمارے قدیم فقہاء کا خیال یہ تھا کہ حلق میں جو دوا یا سرمے کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے یہ مساموں کے ذریعے حلق میں اترتے ہیں، لہٰذا جب روٹ یا نالی موجود ہے، اس کا سائز یا قطر (Diameter) موضوع بحث نہیں ہے تو اب ہمارے علماء کو یہ فتویٰ دینا چاہیے کہ آنکھ میں دوا ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ اس اصول کے تحت

سرمہ لگانے سے بھی ٹوٹتا۔ لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ نے روزے کی حالت میں سرمہ لگانے کی اجازت دی ہے اور وہ شارع مجاز ہیں۔ لہٰذا خلاف قیاس استحسانا سرمے کے جواز کا فتویٰ دیا جائے گا۔

دمہ (Inthmus) کے مریض کے پھیپھڑوں کی نالیاں سکڑ جاتی ہیں اور انہیں سانس لینے میں شدید دشواری پیش آتی ہے ایسی صورتحال میں وہ (Inhaler) استعمال کرتے ہیں جس کے ذریعے ناک اور حلق کے راستے گیس اور مائع باریک بوندوں کی شکل میں دوا کے اجزاء مریض کے پھیپڑوں میں پہنچتے ہیں اور نالیاں کھل جاتی ہیں اور مریض آسانی سے سانس لینے لگتا ہے۔ لہٰذا Inhaler کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اگر دمہ کا مریض اس اسٹیج پر ہے کہ Inhaler کے استعمال کے بغیر مریض کا دن گزارنا مشکل ہے تو وہ معذور ہے اور روزے کے بدلے میں فدیہ دے۔

ہمارے قدیم فقہاء کرام نے مفسدات صوم کی تین صورتیں بتائی ہیں، ایک یہ کہ صورتا اور معنیً دونوں طرح وہ مفسد پایا جائے، جیسے مباشرت، دوسرے یہ کہ صرف معنیً مفسد پایا جائے صورتا نہ ہو، جیسے استمنا بالید، تیسرے یہ کہ محض صورتا پایا جائے معنیً یعنی مقصود کے اعتبار سے نہ ہو، جیسے بوس و کنار سے انزال ہو جائے۔ پہلی صورت میں کفارہ ہے اور پچھلی دو صورتوں میں صرف قضا لازم ہے۔ اسی طرح ٹھوس یا مائع خوراک میں یہ تینوں صورتیں صادق آتی ہیں۔ اول یہ کہ صورتا اور معنیً دونوں طرح وجہ فساد پائی جائے۔ جیسے انسان معمول کے مطابق روزے کی حالت میں ٹھوس یا مائع غذا منہ کے ذریعے کھائے یا پیئے، دوم یہ کہ محض صورتا وجہ فساد پائی جائے جیسے کوئی شخص کاغذ چبا کر حلق سے اتار لے اور سوم یہ کہ صرف معنیً یعنی مقصدیت کے اعتبار سے مفسد پایا جائے۔ جیسے پٹھوں (Muscular) میں یا رگوں (Veins) میں انجکشن لگایا جائے۔ پہلی صورت میں کفارہ لازم آئے گا اور آخری دو صورتوں میں قضا لازم آئے گی۔ انجکشن کے مفسد صوم ہونے کے بارے میں ہمارے دور حاضر کے علماء مختلف الرائے ہیں، جو اس نظریے پر سختی سے کاربند ہیں کہ منفذ

معتاد (Usual Route) کے ذریعے (یعنی منہ، ناک وغیرہ) اگر معدے میں کوئی چیز پہنچے گی تو روزہ ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں، وہ بدستور یہی رائے رکھتے ہیں کہ انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ انجکشن سے براہ راست معدے تک کوئی چیز نہیں پہنچتی۔ لیکن جو علماء وجہ فساد یا ذریعہ فساد کی معنویت اور مقصدیت کو پیش نظر رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نس یا پٹھے میں انجکشن لگانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ عام طریقے سے غذا معدے میں پہنچنے کے بعد تحلیل (Dissolve) ہوتی ہے اور اس کے صالح اجزاء گلوکوز، حیاتین (Vitamins) لحمیات (Proteins) اور معدنیات (کیلشیم، فاسفورس، آئرن وغیرہ) کی شکل میں خون میں شامل ہو کر انسان کی رگوں، پٹھوں اور دیگر اعضاء میں پہنچ کر انہیں قوت و طاقت اور قوام (Sustenance) عطا کرتے ہیں، جو مقصد بالواسطہ اور طویل جسمانی عمل ہضم (Digestion) اور ترسیل خون کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ بالکل وہی مقصد انجکشن کے ذریعے براہ راست حاصل ہو جاتا ہے، لہٰذا اہل فتویٰ علماء کرام سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اس مسئلے میں از سر نو غور فرمائیں اور انجکشن کو معنیً مفسد صوم قرار دیں۔ ماہرین فقہ علماء کرام جدید ماہرین طب سے رابطہ کر کے ہماری پیش کردہ ان طبی و سائنسی معلومات اور ان سے اخذ کردہ فقہی نتائج پر بہتر طور پر رائے قائم کر سکیں گے۔ علم و اجتہاد اور تفقہ کا دروازہ نہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ بند ہوگا۔ ایسی جدید طبی و سائنسی تحقیقات جو علم الیقین اور عین الیقین کی حد تک طے شدہ ہیں، انہیں تسلیم کر کے ان پر مسلمہ فقہی اصولوں کے اطلاق و انطباق (Application) کے سلسلے میں بالخصوص ایسے مسائل میں غور و فکر ہمارا دینی فریضہ ہے جو ہمارے قدیم فقہاء کرام نے محض ظن و تخمین (Estimation) کی بنیاد پر طے فرمائے تھے۔ انجکشن کے مفسد صوم ہونے کی تفصیلی بحث مع ادلہ شرح صحیح مسلم جلد اول و جلد ثالث (مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی) میں مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ حدیث و فقہ کے تفصیلی حوالہ جات سے ہم نے دانستہ احتراز کیا ہے کیونکہ اخبار کے صفحات اور مزاج اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

بچے کی ولادت کے کتنے دن بعد روزہ رکھا جائے

سوال: میری بیوی کے بیٹا ہوا اور جلد وفات پا گیا۔ اگر اس کا خون پندرہ یا بیس دن میں بند ہو جائے گا تو کیا وہ رمضان کا روزہ رکھ سکتی ہے اور شوہر کی اس سے قربت ہو سکتی ہے؟

(عبداللہ خان، کراچی)

جواب: بچے کی پیدائش کے بعد زچہ کو جو خون جاری ہوتا ہے اسے نفاس کہتے ہیں اس کی زیادہ سے زیادہ ممکنہ مدت چالیس دن ہے، خواہ بچہ پیدا ہوتے ہی مر گیا ہو یا زندہ ہو، یعنی اگر بچے کی پیدائش کے چالیس دن گزرنے کے بعد بھی خون جاری رہے تو یہ نفاس کا خون نہیں ہے بلکہ یہ نسوانی بیماری ہے۔ لہٰذا زچہ کو ایسی صورت میں چالیسواں دن پورا ہونے کے بعد غسل کر کے پاک ہو جانا چاہیے۔ وہ روزے بھی رکھے اور نماز بھی پڑھے، ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرے، خون بہنے میں وقفہ نہ بھی ہو تو نماز اور روزہ ادا ہو جائیں گے۔ لیکن نفاس کی کم از کم مدت کوئی مقرر نہیں ہے، یہ مختلف اشخاص کی جسمانی صلاحیت، عادت، مزاج اور صحت پر موقوف ہے۔ لہٰذا جب زچہ کا خون، جو بچے کی پیدائش کے بعد جاری ہوتا ہے، بند ہو جائے، خواہ پانچ دن بعد ہو، دس دن بعد ہو یا بیس دن بعد ہو، اسی دن سے نفاس کی مدت ختم ہو جائے گی اور ایسی خاتون کو غسل کر کے پاک ہو جانا چاہیے اور نماز روزے کا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے۔ چالیس دن کی مدت پوری کرنا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح پاک ہونے کے بعد اس سے شوہر کی قرابت بھی جائز ہے۔

قضا روزے

سوال: گزشتہ سال کے قضاء روزے اگلے رمضان المبارک کے آغاز سے قبل ہی ادا کرنے ضروری ہیں یا بعد میں بھی ادا کیے جا سکتے ہیں ان کی نیت کس طرح کی جا سکتی ہے اور قضا نمازوں کے لئے بھی شرعی طور پر کیا حکم ہے؟ (ثوبیہ نازش و عائشہ اقبال، ناظم آباد، کراچی)

جواب: رمضان المبارک کے قضا روزے، رمضان کے بعد اولین فرصت میں ادا کرنے چاہئیں کسی کے پاس یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ اگلے سال رمضان تک لازمی طور پر زندہ

رہے گا۔ تاہم اگر کسی نے بدقسمتی سے گزشتہ رمضان المبارک کے قضا روزے آئندہ رمضان تک ادا نہیں کیے تو اس کے بعد ادا کرے۔ قضا نمازیں بھی اولین فرصت میں ادا کرے۔

ایام مخصوص میں چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا اور نماز کی معافی

سوال: میں ایک ڈاکٹر ہوں اور ایک مسئلے کے لئے عرصے سے پریشان ہوں، ایام مخصوص میں عورت کی جو نمازیں رہ جاتی ہیں وہ معاف ہیں اور اس پر ان کی قضا لازم نہیں ہے جب کہ ان ایام میں اس کے جو روزے چھوٹ جاتے ہیں، اس پر ان کی قضا لازم ہے۔ دونوں کے احکام میں تفاوت کیوں ہے جب کہ دونوں بدنی عبادات ہیں؟

جواب: صحیح مسلم میں حدیث ہے۔ حضرت معاذہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا ''کیا وجہ ہے کہ حائض عورت ایام مخصوص میں چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کرتی ہے مگر ان دنوں کی چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضا نہیں کرتی''؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ''کیا تو حروریہ ہے'' (معاذہ کہتی ہیں کہ) میں نے جواباً عرض کیا ''میں حروریہ نہیں ہوں۔ میں تو محض مسئلہ معلوم کرنا چاہتی ہوں''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ''حضور انور ﷺ کے زمانے میں جب ہمیں یہ ایام آتے تو ہمیں روزوں کی قضا کا حکم تو دیا جاتا تھا اور نمازوں کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا''۔

صحیح مسلم ہی کی ایک اور حدیث میں ہے۔ حضور ﷺ نے فاطمہ بنت حبیش سے فرمایا ''تب تمہیں حیض آئے تو نماز کو چھوڑ دو اور جب ایام ختم ہو جائیں تو غسل کر کے (پاک ہو جاؤ اور) نماز شروع کر دو''۔

حدیث میں ''حروریہ'' کا تذکرہ ہے، اس سے مراد خوارج ہیں، کیونکہ کوفہ کے قریب ایک مقام ''حروراء'' تھا جہاں پہلی بار جمع ہو کر خوارج نے اپنی تنظیم قائم کی تھی۔ یہ اسلام کی جمعیت سے خروج کرنے والا ایک انتہا پسند گروہ تھا اور یہ اپنے دور کے ''انارکسٹ'' تھے۔ اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے معاذہ سے پوچھا تم اس طرح کا سوال کر رہی ہو، کہیں تم خارجی تو نہیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت

پر ایام مخصوص میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا نہیں ہے۔ عہد رسالت میں اور عہد صحابہ میں بھی یہی سب کا عقیدہ وعمل تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ مستند قول اس سلسلے میں اور کس کا ہو سکتا ہے؟ صرف عہد خلافت علی رضی اللہ عنہ میں خارجیوں کا ایک اقلیتی انتہا پسند گروہ پیدا ہوا جس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ ایام مخصوص کی چھوٹی ہوئی نمازوں کی بھی قضا ہے مگر یہ باطل فرقہ ختم ہو گیا اور ان کے نظریات پر آج کوئی بھی کاربند نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ نمازوں کی قضا نہیں ہے اور روزں کی قضا ہے تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے::

مَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج:78) ''اس نے تم پر دین میں تنگی نہیں رکھی''۔

اور فرمان باری تعالیٰ ہے:

يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ:185) ''اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا''۔

فرمان رسول ہے'' دین کو آسان کر کے پیش کرو اور اس میں لوگوں کے لئے دشواریاں نہ پیدا کرو''۔ تو اس میں حکمت یہی سمجھ میں آتی ہے کہ روزے سال میں صرف ایک ماہ رمضان کے فرض ہیں لہٰذا روزوں کی قضا کو حائض پر لازم کر دیا گیا، اور نماز تو مستقل اور دائمی فریضہ ہے لہٰذا حائض پر اس کی قضا لازم کرنے میں اس کے لئے دشواری ہوتی، اس لئے عورتوں کے لئے رعایت رکھی گئی ہے۔ بندگی غیر مشروط اطاعت کا نام ہے۔ احکام شریعت کی حکمت تک ہمارے ذہن کی رسائی ہو جائے تو یہ ہماری سعادت ہے اور کبھی ہم حکمت کو نہ سمجھ پائیں تو یہ ہمارے ذہن نارسا کی کوتاہی ہوتی ہے۔

تین روزہ، پانچ روزہ یا دس روزہ تراویح

سوال: کیا تاجر حضرات تین روزہ، پانچ روزہ یا دس روزہ تراویح ادا کر سکتے ہیں؟ شرعی طور پر کیا پورے رمضان المبارک کے مہینے میں تراویح ادا کرنا ضروری ہے، شرعی حکم بیان

کیجئے؟ (ثوبیہ نازش، عائشہ اقبال مسلم لیگ کوارٹرز، ناظم آباد، کراچی)

جواب: تین دن سے کم یعنی ایک یا دو دن میں قرآن ختم کرنا مکروہ ہے۔ کم از کم تین دن یا اس سے زیادہ دنوں میں مثلاً پانچ، سات، دس دن وغیرہ میں قرآن مجید ختم کر سکتے ہیں، بشرطیکہ قرآن مجید صحیح پڑھا جائے، الفاظ کی ادائیگی صحیح ہو اور سننے والے کی سمجھ میں آئے۔ اگر تین روزہ یا پانچ روزہ تراویح کا اہتمام اس لئے کیا جاتا ہے کہ رمضان المبارک میں ایک سے زیادہ قرآن مجید نماز تراویح میں پڑھنے اور سننے کی سعادت حاصل ہو جائے تو یہ خیر کا باعث ہے، بڑی سعادت کی بات ہے۔ لیکن اگر اس کا مقصد یہ ہو کہ تین، پانچ، سات یا دس راتوں میں قرآن مجید ختم کر کے بقیہ ایام رمضان میں تراویح نہیں پڑھیں گے تو یہ اجر سے محرومی کا باعث ہے، خواہ دکانداری، تجارت اور کاروبار کے لئے ایسا کریں یا محض جسم و جان کی راحت کے لئے یہ گناہ ہے، کیونکہ تراویح کی نماز سنت مؤکدہ ہے اور پورے رمضان کے لئے ہے، مردوں اور عورتوں سب کے لئے تراویح پڑھنا سنت ہے جو لوگ عذر شرعی یعنی انتہائی ضعیفی یا بیماری کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکتے ہوں یا نہ رکھ رہے ہوں، وہ بھی تراویح پڑھیں، نماز تراویح روزوں کے تابع نہیں ہے بلکہ مستقل عبادت ہے۔

سوال: آج کل کراچی میں پانچ روزہ، چھ روزہ یا دس روزہ تراویح اور ختم قرآن کا رواج بہت عام ہو گیا ہے، کیا یہ طریقہ کار شرعاً درست ہے؟ (محمد ناصر خان چشتی، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: پورے رمضان المبارک کے ماہ مقدس میں نماز تراویح باجماعت پڑھنا سنت ہے۔ پانچ روزہ، چھ روزہ یا دس روزہ تراویح کا جہاں انتظام ہوتا ہے، اگر اس کے شرکاء کی نیت یہ ہو کہ اس ختم قرآن کے بعد، بقیہ رمضان المبارک میں نماز تراویح نہیں پڑھیں گے یا باجماعت نہیں پڑھیں گے تو ان کا یہ طریقہ کار غلط ہے اور یہ فکر درست نہیں ہے کیونکہ اس طرح قرآن مجید کے سماع کی سنت تو پوری ہو جائے گی، لیکن رمضان المبارک کے باقی ایام کے لئے تراویح کی سنت کا تارک ہو گا۔ ہاں البتہ اگر اس کے بعد بقیہ ایام میں یہ لوگ باقاعدگی سے کسی مسجد میں تراویح باجماعت پڑھتے ہیں تو پھر کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ

تین، پانچ، چھ یا دس ایام میں قرآن مجید صحیح پڑھا جاتا ہو۔

رمضان المبارک کے عشرۂ اخیر میں شبینوں کا اہتمام

سوال: رمضان المبارک کے عشرۂ اخیر میں عام طور پر سہ روزہ، پنج روزہ یا ہفت روزہ شبینے پڑھے جاتے ہیں، یہ شبینے با جماعت نوافل کی شکل میں پڑھے جاتے ہیں، کیا یہ طریقہ شرعاً درست ہے؟
(محمد وقاص جعفر، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: اصولی طور پر نوافل کی جماعت کے لئے ''تداعی'' یعنی باقاعدہ اعلان کر کے اور ترغیب دے کر بلانا منع ہے، کیونکہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کسی خاص نفلی عبادت کو لوگ فرض و واجب کے برابر اہمیت دیں یا فرض و واجب کا درجہ دیں اور صرف شارع ہی اس کا مجاز ہے، اس لئے احتیاط کی بناء پر اس سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن شبینوں کے بارے میں فرض، واجب یا سنت کا تاثر کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا سب اسے نفلی عبادت سمجھتے ہیں با جماعت، ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، آخری عشرۂ رمضان المبارک میں ''قیام اللیل'' کی سعادت بھی مل جاتی ہے اور ''شب قدر'' کی برکات کو پانے کے شوق کی بھی تسکین ہوتی ہے۔

عورتوں کا اجتماعی اعتکاف

سوال: عورتوں کا اجتماعی اعتکاف کیسا ہے جب کہ تمام عورتیں کسی دوسرے مقام پر یا کسی دوسری عورت کے گھر میں جب کہ وہ خود بھی معتکفہ ہے؟ اعتکاف کی جگہ شرعی پردہ کا اہتمام بھی ہے، اعتکاف کی جگہ محفوظ بھی ہے اور اعتکاف کی جگہ تمام سہولتیں موجود ہیں؟
(کلیم بھائی، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: اعتکاف اپنی حقیقت اور روح کے اعتبار سے عزلت نشینی اور خلوت گزینی کی عبادت ہے کہ بندۂ مومن سب سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی ذات سے لو لگائے اور اسی کے ذکر و فکر میں مگن رہے، اگر صحیح تربیت کا اہتمام نہ ہو تو اجتماعیت سے اس کی روح مجروح ہوتی ہے، تاہم خواتین کسی ایک مکان میں اعتکاف کر سکتی ہیں، بشرطیکہ (۱) وہاں شرعی حجاب کا اہتمام ہو (۲) غیر محرم مردوں کا گزر نہ ہو (۳) وہ شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنے

شوہروں سے، ورنہ اپنے والدین سے اجازت لے کر بیٹھیں (۴) اور اعتکاف کے دیگر مسائل اور قیود شرعیہ کی پابندی کریں۔

مسجد الحرام میں اعتکاف کے مسائل

سوال: میرا عمرے پر جانے کا ارادہ ہے اور میری یہ بھی تمنا ہے کہ میں مسجد الحرام میں رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ میں اعتکاف بیٹھوں، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ (۱) وہاں ہوٹل پر جا کر سحر و افطار کر سکتے ہیں جب کہ کھانا لا کر دینے والا کوئی نہ ہو (۲) وہاں معتکف کے لئے جگہ مخصوص نہیں ہوتی کیا جگہ تبدیل کر سکتے ہیں (۳) کیا ایام اعتکاف میں بکثرت طواف کر سکتے ہیں (۴) معتکف کے لئے حرم میں وہی پابندیاں ہیں جو یہاں ہیں؟

(جاوید اختر، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اعتکاف حرم کعبہ میں کیا جائے، مسجد نبوی میں یا اپنے محلّہ کی مسجد میں، مسائل و احکام شرعی سب جگہ یکساں ہیں۔ شرعاً پوری مسجد معتکف (جائے اعتکاف) ہوتی ہے، لہٰذا آپ کو اجازت ہے کہ پوری مسجد میں جہاں جگہ ملے بیٹھ جائیں، ضرورت کے وقت لیٹ جائیں، جہاں چاہیں نماز پڑھیں اور جہاں چاہیں تلاوت و اذکار کریں، کسی خاص جگہ کی پابندی نہیں ہے۔ چونکہ بیت اللہ اور مطاف (جائے طواف) بھی ''مسجد الحرام'' میں شامل ہیں اور طواف عبادت ہے، اسی لئے آپ ایام اعتکاف میں جس قدر طواف کر سکیں کریں، اس سے بڑی سعادت اور عبادت کیا ہوگی۔ جہاں تک سحر و افطار کے کھانے کا مسئلہ ہے تو ہم نے سنا ہے کہ وہاں افطار کا انتظام بہت ہوتا ہے اگر خدانخواستہ ایسا کوئی انتظام نہیں ہو سکے تو پھر آپ جائیں اور ہوٹل سے پارسل کھانا خرید کر لے آئیں اور حرم پاک میں واپس آ کر وہیں بیٹھ کر کھائیں۔ ضرورت سے زیادہ حرم پاک سے باہر نہ ٹھہریں اور نہ کسی سے کلام کریں، غسل واجب کے لئے اور قضاء حاجت کے لئے آپ جائیں، غسل مسنون کے لئے نہ جائیں۔

''رویت ہلال'' چاند کے چھوٹا بڑا ہونے کا مسئلہ

سوال: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی 29 شعبان کو اعلان کرتی ہے کہ رمضان کا چاند نظر نہیں آیا، پرسوں رمضان کا پہلا روزہ ہوگا، اگلے دن شام کو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چاند نسبتاً بڑا نظر آتا ہے اور کافی دیر تک مطلع پر رہتا ہے، لوگ یہ دیکھ کر شبہے میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ شاید دوسرے دن کا چاند ہے اور لگتا ہے کہ رویت ہلال کمیٹی کا اعلان درست نہیں تھا، ایک روزہ ضائع ہوگیا، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (امیر احمد شاہ، ہزارہ)

جواب: صحیح مسلم میں حدیث ہے ابوالبختری کہتے ہیں کہ ہم سفر عمرہ میں تھے، جب ہم وادی نخلہ میں پہنچے تو ہم نے ایک دوسرے سے کہا کہ دیکھو یہ (رمضان کا) چاند ہے اور بعض نے خیال ظاہر کیا کہ یہ تیسری رات کا چاند ہے اور بعض نے کہا کہ یہ دوسری رات کا چاند ہے، ہماری عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوئی تو ہم نے اُن سے چاند کے بارے میں اختلاف رائے کا ذکر کیا، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہم سے دریافت فرمایا کہ تم نے چاند کس رات کو دیکھا تھا؟ ہم لوگوں نے کہا کہ فلاں رات کو دیکھا تھا، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے (تمہارے) دیکھنے کے لئے اسے بڑھا دیا ہے، وہ حقیقت میں اسی رات کا چاند ہے، جس رات تم لوگوں نے اسے دیکھا تھا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کی رو سے طلوع ماہ رمضان یا شوال وغیرہ کے لئے چاند کی رویت کا اعتبار ہے۔ چاند کے چھوٹے بڑے ہونے (یعنی سائز) کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور نہ ہی اس امر کا اعتبار ہے کہ چاند مطلع پر کتنی دیر رہا۔ ہمارے لئے تو فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی آخری اور قطعی حجت ہے، ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سننے کے بعد بھی تردد کا اظہار کرنا، شکوک میں مبتلا ہونا، یہ مومن کی شان نہیں ہے۔ لیکن کوئی شخص خالص سائنسی اور فنی بنیاد پر، یعنی علم موسمیات وفلکیات کی رو سے بھی اس مسئلے کو جاننا چاہیے تو سائنس سے بھی حدیث پاک کی تائید ہوتی ہے۔ ماہرین فلکیات بتاتے ہیں کہ بعض اوقات 29 تاریخ کو چاند کا ظہور ونمود تو مطلع پر ہو جاتا ہے، لیکن اس کا درجہ اور وقت اس قدر کم ہوتا ہے کہ اس

کی رویت ممکن نہیں ہوتی اور تیس دن پورے ہونے کے بعد جب چاند طلوع ہوتا ہے تو
چونکہ اس کی عمر بھی زیادہ ہوتی ہے (یعنی 40 گھنٹے یا زائد) بلند درجے پر بھی ہوتا ہے، سائز
بھی بڑا ہو جاتا ہے اور مطلع پر زیادہ دیر تک نظر بھی آتا ہے، لہٰذا جو لوگ پوری دینی و سائنسی
معلومات نہیں رکھتے، وہ خواہ مخواہ شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یوم شک کا روزہ

سوال: ''یوم شک'' کے روزے سے کیا مراد ہے، اس سے کیوں منع کیا گیا ہے؟
(فرحان، دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ اگر 29 شعبان کو رمضان المبارک کا چاند نظر نہ آئے
تو اگلے دن روزہ رکھ لیتے ہیں کہ اگر رمضان بالفرض شروع ہو چکا ہو تو رمضان کا فرض روزہ
ہو جائے گا، ورنہ نفلی روزے کا ثواب تو مل ہی جائے گا، یعنی خود روزہ رکھنے والا روزے کی
حیثیت کے بارے میں متردد ہوتا ہے، اسے ''یوم شک'' کا روزہ کہتے ہیں، اس سے حضور
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس نے ''یوم شک'' کا روزہ
رکھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی (مشکوٰۃ بحوالہ ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن
ماجہ) فرضی عبادات قطعی اور یقینی نیت کے ساتھ ادا کی جانی چاہیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا
واضح ارشاد ہے کہ (رمضان کا) چاند دیکھ کر روزے رکھو اور (شوال کا) چاند دیکھ کر روزے
چھوڑ دو، اگر (29 شعبان یا 29 رمضان کو) مطلع ابر آلود ہو (اور چاند نظر نہ آئے) تو تیس
دن کا مہینہ پورا کرلو۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری وصحیح مسلم)

کیا مسلسل تیس دن کے کئی قمری مہینے ہو سکتے ہیں؟

سوال: کیا مسلسل تین چار اسلامی مہینے تیس تیس دن کے ہو سکتے ہیں یا مسلسل کئی اسلامی
مہینے انتیس دن کے ہو سکتے ہیں یا از روئے قرآن وسنت ایسا نہیں ہو سکتا؟
(قاری محمد صدیق، خطیب مسجد خلفاء راشدین، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: پہلے تو یہ غلط فہمی دور فرمالیجئے کہ قمری مہینہ اسلامی ہے اور شمسی مہینہ انگریزی یا غیر

اسلامی ہے، شمس و قمر دونوں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ اس لئے دونوں اسلامی ہیں۔ قمری مہینے کے ساتھ ہمارے روزوں اور زکوٰۃ کی عبادت کا تعلق ہے اور شمسی نظام کے حساب سے نمازوں کے اوقات، سحر اور افطار اور طلوع و غروب کے اوقات متعلق ہیں۔

قرآن و سنت میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنے قمری مہینے مسلسل 30 دن کے ہو سکتے ہیں اور کتنے مسلسل 29 دن کے ہو سکتے ہیں۔ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز نے فتاویٰ رضویہ جلد 12 صفحہ 30 پر بحوالہ تحفہ شاہیہ علامہ قطب الدین شیرازی لکھا ہے کہ "زیادہ سے زیادہ مسلسل چار قمری مہینے 30 دن کے ہو سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مسلسل تین مہینے ممکنہ طور پر 29 کے ہو سکتے ہیں"۔ حال ہی میں ایک ماہر فلکیات نے لکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانچ مہینے ہو سکتے ہیں۔

عید کے دو مہینے ناقص نہ ہونے کا مطلب

سوال: صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ عید کے دو مہینے یعنی رمضان و ذوالحجہ ناقص نہیں ہوتے، اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں کسی ایک سال میں 29 دن کے نہیں ہوتے؟ (سید ذاکر شاہ، سعید آباد بلدیہ ٹاؤن، کراچی)

جواب: اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ از راہ کرم ان دونوں مبارک مہینوں میں عبادت گزاروں کے اجر میں کمی نہیں فرماتا بلکہ اپنے فضل و کرم سے پورا اجر عطا فرماتا ہے۔ باقی قرآن و حدیث میں قمری مہینوں کے ایام کی تعداد کے اعتبار سے کوئی تصریح یا تعیین نہیں ہے کہ دو یا تین مہینے مسلسل 30 دن کے نہیں ہو سکتے یا اگر رمضان 30 دن کا ہوگا تو ذوالحجہ 29 دن کا ہوگا؟ ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور 30 دن کا ہوگا یا یہ کہ جس دن عیدالفطر ہوگی، اسی دن عاشورہ محرم ہوگا وغیرہ۔ یہ سب لوگوں کے خود ساختہ قیاسات، مفروضات اور تخمینے ہیں۔ ہاں البتہ حدیث پاک میں سید المرسلین حضرت محمد مصطفی ﷺ کا ایک واضح ارشاد موجود ہے اور وہ یہ کہ "قمری مہینہ 29 دن سے کم کا نہیں ہو سکا اور 30 دن سے زیادہ کا نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی شخص کے تجربے اور مشاہدے میں ایک چیز دو چار

مرتبہ کسی ایک انداز میں واقع ہو جائے تو یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے، کسی اصول شرعی کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

پاکستان میں رمضان شروع کر کے سعودی عرب میں عید منانا

سوال: میں نے رمضان المبارک کا آغاز پاکستان میں کیا ہے اور پاکستان کی رویت کے مطابق روزہ رکھنا شروع کیا ہے، اب میرا عمرے پر جانے کا پروگرام ہے اور میں عید الفطر تک مدینہ منورہ میں قیام کروں گا۔ اب بتائیے کہ میں عید وہاں کے حساب سے مناؤں یا پاکستان کے حساب سے اپنے روزے مکمل کروں، کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ میرے اٹھائیس روزے مکمل ہوئے ہوں اور وہاں عید ہو جائے، میرے لئے شرعی حکم کیا ہے؟

(عید محمد فریدی، لیاقت آباد، کراچی)

جواب: یہ ایسے سب لوگوں کا مسئلہ ہے جو پاکستان میں رمضان المبارک کا آغاز کر کے عمرے کے لئے یا ملازمت کے لئے سعودی عرب جاتے ہیں یا سعودی عرب میں رمضان المبارک کے کچھ ایام گزار کر عید الفطر منانے پاکستان آتے ہیں، اگر وہ پاکستان میں اہل وطن کے ساتھ عید منائیں تو بعض اوقات ان کے روزے 31 ہو جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ بلاشبہ گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے اور اس کو حل کرنے کے لئے فقہی بصیرت درکار ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے بارے میں علماء میں دو آراء ہوں۔ پاکستان سے سعودی عرب جانے والے کے 29 روزے پورے ہو جائیں یا سعودی عرب سے پاکستان آنے والے کے 30 روزے پورے ہو جائیں اور پھر مقامی لوگوں کے ساتھ عید کر لیں تو لوگوں کو زیادہ تردد نہیں ہوتا، کیونکہ ہر جگہ رمضان المبارک (یا قمری مہینہ) 29 دن کا ہوتا ہے اور کبھی 30 دن کا۔ زیادہ تردد تب ہوتا ہے کہ جب پاکستان سے سعودی عرب جانے والے کے صرف 28 روزے ہوتے ہوں اور عید ہو جائے یا سعودی عرب سے پاکستان آنے والے کے 30 روزے پورے ہو چکے ہوں اور اگلے دن عید نہ ہو بلکہ روزہ ہو، اس طرح روزہ رکھنے کی صورت میں اس کے 31 روزے ہو جائیں گے جب کہ حساب و کتاب کی رو سے قمری مہینہ

زیادہ سے زیادہ 30 دن کا ہوتا ہے۔اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ "پس تم میں سے جو ماہ رمضان کو پائے تو اس پر لازم ہے کہ اس کا روزہ رکھے"۔ (البقرہ:185)

لہٰذا اس امر ربانی کا تقاضا یہ ہے کہ چونکہ سعودی عرب سے پاکستان آنے والے نے یہاں رمضان پالیا ہے ابھی ہلال شوال طلوع نہیں ہوا،تو وہ روزہ رکھے، خواہ اس کے روزے 31 ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ دوسری جانب ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے: "جس دن لوگ روزہ رکھیں اس دن روزہ ہے اور جس دن لوگ عید کریں اس دن عید ہے" (جامع ترمذی صفحہ 124) لہٰذا اس حدیث مبارک کی روشنی میں پاکستان سے سعودی عرب جانے والا جب دیکھے کہ مقامی لوگ عید منا رہے ہیں تو وہ بھی منائے، خواہ اس کے روزوں کی تعداد صرف 28 ہوئی ہے یہ صورت ایسی ہی ہے جیسے بعض بلاد مغرب مثلاً ناروے، ڈنمارک وغیرہ میں سال کے بعض ایام میں عشاء کا وقت داخل ہی نہیں ہوتا، مغرب کا وقت ختم ہوتے ہی فجر کا وقت شروع ہو جاتا ہے، لہٰذا ان پر جن ایام میں عشاء کا وقت داخل ہی نہیں ہوتا تو وہ اس نماز کے لئے عند اللہ جوابدہ بھی نہیں ہیں۔ ان کے لئے دن میں چار نمازیں ہی رہ جائیں گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے گونگے شخص پر نماز میں قرأت کا فرض ساقط ہو جاتا ہے، جس کا کوئی ہاتھ یا پاؤں کٹا ہوا ہے اس پر وضو میں اس ہاتھ یا پاؤں کے دھونے کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ تاہم جو لوگ احتیاط پر عمل کرنا چاہیں، وہ سعودی عرب میں اپنے اٹھائیسویں روزے کے بعد عید منائے جانے کی صورت میں ایک دن کی بعد میں قضا کر لیں۔

عیدی دینا

سوال: عیدین کے موقع پر عیدی دینا کیسا ہے؟ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(ناصر خان چشتی، ڈیرہ اسماعیل خان)

جواب: عیدین کے موقع پر عیدی دینا نہ شرعاً ضروری ہے نہ ہی اس کی بابت نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا کوئی عمل مبارک بھی بطور خاص اس موقع کے لئے

ثابت نہیں ہے۔ لیکن چھوٹوں پر شفقت کی حضور ﷺ نے ترغیب فرمائی ہے اور ترک رحم و شفقت پر وعید فرمائی ہے، لہٰذا اگر دینی و روحانی مسرت کے اس موقع پر اپنے چھوٹوں پر شفقت کرتے ہوئے انہیں کچھ رقم یا کوئی چیز بطور ہدیہ دے دیں تو یہ مستحسن امر ہے۔ اسی طرح چھوٹے بڑے کی تمیز کے بغیر عمومی طور پر رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "آپس میں ایک دوسرے کو تحفہ ہدیہ دیا کرو تا کہ تمہارے درمیان الفت و محبت کے جذبات پروان چڑھیں" لہٰذا ایک دوسرے کو ہدایا اور تحائف دینا عید کے موقع پر ہو یا عام ایام میں اجر و ثواب اور خیر و برکت کا باعث ہے اور یہ خصلت باہمی محبت میں اضافے کا باعث ہے۔ لیکن خاص عید کے موقع پر اسے کوئی خصوصی شرعی حیثیت دینا یا ایسا تصور کرنا درست نہیں ہے۔

کیا جمعہ کے دن کا نفلی روزہ رکھنا مکروہ ہے؟

سوال: میرا یہ معمول ہے کہ میں جمعہ کے دن نفلی روزہ رکھتا ہوں، بعض حضرات اس سے منع کرتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے، از راہ کرم اس مسئلے کی وضاحت کیجئے؟

جواب: صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے؟ تو انہوں نے جواباً فرمایا: رب کعبہ کی قسم ہاں، (رقم الحدیث: 2577) دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص جمعے کے دن کا روزہ نہ رکھے سوائے اس کے کہ اس سے پہلے ایک دن کا یا اس کے بعد ایک دن کا روزہ اس کے ساتھ رکھے، (رقم الحدیث: 2579) اس سے اگلی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف جمعہ کے دن کو (نفلی) روزے کے لئے مخصوص کرنے کی ممانعت فرمائی، ہاں اگر کسی شخص کا مخصوص تواریخ کو روزہ رکھنے کا معمول ہے (جیسے ایام بیض یعنی چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے روزے اور اس تاریخ کو اتفاق سے جمعہ کا دن آجائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے) ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں بعض ائمہ نے حدیث میں مذکور استثنائی صورت کے علاوہ محض جمعہ کے دن بطور خاص نفلی روزہ رکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ شاید

اس کی حکمت یہ ہو کہ (۱) مسلمانوں میں بھی کہیں یہود کی روش نہ سرایت کر جائے کہ جمعہ کے دن کی تو غیر معمولی تعظیم کریں اور باقی دنوں میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے یکسر غافل ہو جائیں، اسی لئے اگر کوئی جمعہ کے ساتھ جمعرات یا ہفتہ کا دن ملا کر روزہ رکھتا ہے تو یہ کراہت سے مستثنیٰ ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ، امام محمد اور امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک جمعہ کے دن کا نفلی روزہ بلا کراہت جائز ہے۔ امام اعظم کی دلیل یہ حدیث ہے: ''امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر مہینہ کے تین دن (15,14,13) اور جمعہ کو روزہ رکھتے تھے اور بہت کم یہ روزہ چھوڑتے تھے''۔

کتاب الزکوٰۃ

سونے چاندی پر زکوٰۃ

سوال: کیا ذاتی استعمال کے سونے اور چاندی کے زیورات پر زکوٰۃ واجب ہے؟

(ضیاء الرحمٰن، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: سونا چاندی ازروئے شریعت خلقی طور پر مال ہیں لہٰذا یہ کسی بھی ہیئت میں ہوں ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ مثلاً برتن، سامان آرائش، مالیاتی سکے، سونے یا چاندی کی ڈلی، استعمال کے زیورات وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے موٹے اور بھاری کنگن تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' کیا تم ان کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟'' اس نے عرض کیا ''نہیں'' حضور ﷺ نے فرمایا'' تو کیا تم اس بات پر خوش ہوگی کہ اللہ تعالیٰ (زکوٰۃ نہ دینے کی بناء پر) ان کنگنوں کے عوض قیامت کے دن تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟'' (یہ وعید عذاب) سنتے ہی اس نے وہ کنگن اتار کر رسول اللہ ﷺ کو دے دیئے اور عرض کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو دے دیئے ہیں یعنی یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں صدقہ ہیں۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں سونے کے ''اوضاح'' (ایک خاص زیور کا نام ہے) پہنتی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''یارسول اللہ! کیا یہ بھی اس کنز میں شامل ہے (جس پر سورۂ توبہ آیت 35,34 میں عذاب جہنم کی وعید آئی ہے)؟'' حضور ﷺ نے فرمایا'' جو سونے کے زیورات اتنی مقدار کو پہنچ جائیں کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور پھر ان کی زکوٰۃ ادا کردی جائے تو ان پر کنز کا اطلاق نہیں ہوتا''۔ (سنن ابی داؤد، موطا امام مالک) ان احادیث مبارکہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ استعمال کے زیورات پر بھی زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ دونوں خواتین نے سونے کے زیورات پہن رکھے تھے۔

اگر کسی زیور میں سونا اور چاندی مخلوط ہوں تو غالب چیز کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر غالب حصہ سونے کا ہے تو اسے سونا قرار دے کر زکوٰۃ عائد کی جائے گی اور اگر غالب حصہ چاندی کا ہے تو چاندی کی شرح سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، اور اگر کسی چیز پر محض سونے چاندی کی ملمع کاری ہے تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ ہیرے، زمرد، یاقوت اور دوسرے قیمتی پتھر اگر ذاتی استعمال میں ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ تجارت کے لئے ہوں تو ان پر زکوٰۃ ہے۔

زیورات کی ملکیت، زکوٰۃ

سوال: شادی کے موقع پر دولہا والوں کی طرف سے دلہن کو جو زیورات دیئے جاتے ہیں وہ کس کی ملکیت ہوتے ہیں؟ اکثر یہ مسئلہ ناراضگی کا سبب بنتا ہے اور ان کی زکوٰۃ کس کے ذمے ہے؟ (محمد علی، اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: ہمارے معاشرے میں شادی کے موقع پر دولہا والے دلہن کو زیورات وغیرہ دیتے ہیں اسے عرف عام میں ''بری'' کہتے ہیں۔ حالات خوشگوار ہیں تو یہ سوال ہی زیر بحث نہیں آتا کہ ان کا اصل مالک کون ہے؟ خدانخواستہ ازدواجی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو پھر لوگ علماء سے پوچھنے آتے ہیں اور فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر کتابی مسئلہ نہیں ہے اس کا مدار اس علاقے یا برادری کی روایات پر ہے کہ آیا وہ اپنی بیوی یا بہو کو زیورات ہبہ کر کے مالک بنا دیتے ہیں یا اسے عاریتاً محض استعمال کے لئے دیتے ہیں، اس پر ہی فیصلہ ہوگا۔ اور اگر دیتے وقت تو ہبہ کی نیت ہو اور بعد میں اختلاف رونما ہونے پر نیت میں فتور آجائے تو یہ فکری خیانت ہے اور مومن کی شان کے منافی ہے۔ اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ نکاح کے وقت طے کر دیا جائے اور نکاح نامہ میں اس کا اندراج کر دیا جائے تاکہ بعد میں ناراضگی پیدا نہ ہو اور ویسے بھی شرعاً و قانوناً ملکیت مطلق نہیں رہتی جب ملکیت کا مسئلہ طے ہوگا تو یہ مسئلہ ازخود طے ہو جائے گا کہ ایسے زیورات کی زکوٰۃ عنداللہ کس کے ذمہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مسئولیت کے خوف سے وہ زکوٰۃ ادا کرے گا۔

زکوٰۃ فنڈ سے قرض حسنہ دینا

سوال: ”راجپوتانہ ویلفیئر ایسوسی ایشن“ قریشی و شیخ برادری کی ایک سماجی فلاحی تنظیم ہے، جس میں برادری کے لوگوں سے زکوٰۃ، فطر، صدقات اور چرم قربانی کی مد میں رقم جمع کی جاتی ہے اور برادری کے مستحق افراد میں حسب ضرورت تقسیم کی جاتی ہے۔ کیا زکوٰۃ فنڈ سے تعمیر مکان یا کاروبار کے لئے ”قرض حسنہ“ دیا جاسکتا ہے، جسے بعد میں بالاقساط وصول کیا جاتا ہے؟

(عبدالقادر شیخ، چیئرمین زکوٰۃ کمیٹی)

جواب: ”ایسوسی ایشن“ زکوٰۃ و فطرہ دینے والوں کی وکیل ہے جب تک وہ زکوٰۃ کی رقم مستحقین کو مالکانہ بنیاد پر نہیں دیں گے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی اور ایسوسی ایشن کے اراکین اس کے لئے عند اللہ جوابدہ ہوں گے۔ محض ”قرض حسنہ“ کے طور پر رقم اور بعد میں بالاقساط وصول کرنے سے زکوٰۃ یا صدقات کی ادائیگی نہیں ہوئی اور اس سلسلے میں لوگوں کا دباؤ ڈالنا غلط ہے۔ البتہ اگر برادری کے اہل ثروت زکوٰۃ، فطرہ، چرم قربانی اور صدقات کے علاوہ ایک ”قرض حسنہ“ فنڈ قائم کرلیں اور اس کا کھاتہ صدقات کی رقوم سے الگ رکھا جائے تو یہ بلاشبہ ایک ”صدقہ جاریہ“ اور کار خیر ہوگا۔

زکوٰۃ فنڈ کی سودی اسکیموں میں انویسٹمنٹ؟

سوال: ایک برادری کا فلاحی ادارہ ہے۔ وہ لوگ برادری کی زکوٰۃ، فطرہ اور چرم قربانی جمع کر کے اس رقم کا کل یا کچھ حصہ انویسٹمنٹ کی سودی اسکیموں (مثلاً نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ وغیرہ) میں لگاتے ہیں اور ان رقوم سے حاصل شدہ سود یا منافع کو مستحقین میں تقسیم کرتے ہیں، کیا یہ شرعاً درست ہے؟۔

(محمد تقی خان لودھی، نیو کراچی)

جواب: زکوٰۃ، صدقات کی رقوم کا سودی اسکیموں میں لگانا اور ان پر سود لینا حرام ہے اور اس طرح مستحقین کی اعانت کوئی نیکی نہیں ہے۔ اس طرح تو ہر مالدار شخص اپنی ذاتی حیثیت میں بھی یہ کرنے لگے گا تاکہ زکوٰۃ کی رقم سودی اسکیم میں انویسٹ کردے اور اس کا سود بانٹتا پھرے۔ زکوٰۃ سود تو کجا، اگر محض شخصی نام پر یا تنظیم کے نام پر، بلا سودی کرنٹ اکاؤنٹ میں

جمع رکھی ہے تب بھی ادا نہیں ہوگی تاوقتیکہ مستحقین کو پہنچا نہ دی جائے۔ سوائے اس صورت کے کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا مستحق ہی نہ مل رہا ہو۔ الغرض تنظیم کے ارکان کا یہ عمل کلی طور پر خلاف شرح ہے۔

بینک اور زکوٰۃ کی کٹوتی

سوال: ہر سال بینک اپنی مرضی سے ہمارے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ کاٹ لیتا ہے، ہم اکثر اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ زکوٰۃ فنڈ میں خورد برد ہوگیا، زکوٰۃ فنڈ سے فلاں وزیر نے بنگلہ بنالیا فلاں نے گاڑیاں خریدلیں، کبھی لکھا ہوتا ہے کہ مستحق لوگوں تک زکوٰۃ نہیں پہنچ رہی اور کبھی یہ خبر سننے کو ملتی ہے کہ فلاں علاقے کے زکوٰۃ کمیٹی کے چیئرمین بدعنوانی میں ملوث پائے گئے، یہ بھی سنا تھا کہ زکوٰۃ دینی مدرسوں کو نہیں دی جارہی۔ آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ ایسی صورت میں بینک سے زکوٰۃ کٹوا دینا صحیح ہے یا نہیں؟ یعنی جب کہ زکوٰۃ فنڈ صحیح طور پر مستحق لوگوں تک نہ پہنچ رہا ہو؟ (عظمیٰ یاسمین، بلاک ٹی نارتھ ناظم آباد، کراچی)

جواب: جیسا کہ آپ نے خود تفصیلات درج فرمائی ہیں کہ نہ تو زکوٰۃ کی کٹوتی کے وقت شرعی حدود و قیود کا لحاظ رکھا جاتا ہے نہ اصل زر اور سود میں تفریق کی جاتی ہے اور نہ ہی صرف زکوٰۃ میں شرعی حدود کی مکمل پاسداری کا اہتمام کیا جاتا ہے بلکہ حکومت کے زیر تحویل زکوٰۃ میں خورد برد کی داستانیں اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ اس لئے ہم سرکاری نظام وصولی و تقسیم زکوٰۃ پر مکمل اعتماد کا اظہار کرنے میں محتاط ہیں۔ اب چونکہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اپنے ایک فیصلے کی روشنی میں اہل تشیع کی طرح اہلسنت کو بھی یہ حق دے دیا ہے کہ وہ سرکاری مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ کی کٹوتی سے اپنے آپ کو مستثنیٰ قرار دے سکتے ہیں، لہٰذا شرعی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ آپ اپنی زکوٰۃ کی خود تشخیص کریں، پوری زکوٰۃ شریعت کے مطابق نکال کر مصارف شرعیہ پر صرف کریں اور عنداللہ بری الذمہ ہوں، البتہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو لازمی کٹوتی سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیں اور پھر زکوٰۃ ادا بھی نہ کریں تو یہ عدالتی فیصلے کا غیر شرعی استعمال ہوگا اور منشاء شریعت کو باطل کرنے کے مترادف ہوگا۔ اللہ

تعالیٰ اس فریب نفس سے ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔

پیشہ ور بھکاریوں کا مسئلہ

سوال: آج کل مسجدوں میں بس اسٹاپ پر، بس کے اندر، دروازہ کھٹکھٹا کر، سر راہ راستہ روک کر لوگ بھیک مانگتے ہیں، عورتیں، لڑکیاں، بچے، جوان اور بوڑھے سب۔ کیا ان لوگوں کو صدقہ خیرات دینی چاہیے؟ (ابرارالحق، گولڈن ٹاؤن، ایئرپورٹ، کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (البقرہ:273)

"(صدقہ و خیرات کے مستحق) ایسے نادار لوگ ہیں جو خود کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں (دینی کام کے لئے) وقف کیے ہوئے ہیں جو زمین میں چل پھر کر (روزی کمانے کی) مہلت نہیں پاتے ناواقف (حال) شخص ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے انہیں غنی سمجھتا ہے۔ (اے مخاطب!) تم (کیفیت افلاس کو) ان کی صورت سے پہچان لو گے، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے"۔

اس ارشاد ربانی سے معلوم ہوا کہ صدقات وخیرات کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف ہیں، انہیں معاشی تگ ودو کی فرصت نہیں ہے وہ خوددار ہیں، عزت نفس کا پاس رکھتے ہیں، باوجود شدید حاجت مند ہونے کے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے، کسی کے دامن سے لپٹ کر یا گڑگڑا کر مانگتے نہیں، وہ اتنے خوددار ہیں کہ ناواقف حال شخص انہیں خوشحال سمجھتا ہے ایسے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی مدد کرنی چاہیے انہیں خود چل کر تلاش کرنا چاہیے۔ جن لوگوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان لوگوں کی اکثریت

پیشہ ور بھکاریوں کی ہے ان کو خیرات دینا ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ جوان بچیوں سے بھیک منگوانا انتہائی معیوب فعل ہے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ ان کا سروے کرے ان میں سے جو افراد واقعی معذور، لاوارث اور مفلوک الحال ہیں، ضعیف، مریض اور بے سہارا ہیں، روزی کمانے کے اہل نہیں ہیں ان کے لئے کفالت گھر قائم کرے۔ حکومت کے پاس زکوۃ کے اربوں روپے جمع ہیں اور جنہوں نے اپنی خودداری اور عزت نفس کو پامال کر کے بھیک کو ذریعہ معاش بنا رکھا ہے۔ بھیک مانگتے ہیں پھر عیاشی کرتے ہیں ان میں بعض بری مجالس کے زیر اثر نشے کے عادی ہو جاتے ہیں یہ لوگ اخلاقی مجرم ہیں اور ان کا سد باب کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

بری اور جہیز کے سامان اور زیورات کی ملکیت کا مسئلہ

سوال: میری شادی ایک خاتون عشرت پروین سے ہوئی تھی۔ میری اہلیہ کو شادی کے موقع پر ان کے والدین نے جہیز کا سامان دیا، جس میں ٹی وی، وی سی آر، ٹیپ ریکارڈر، الماری وغیرہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ زیور کا سیٹ بھی تھا، اور ایک سیٹ زیور بری میں ہم نے دیا تھا۔ میری اہلیہ بیمار تھی، ان کے والدین نے وعدہ کیا تھا کہ وہ علاج کا خرچ برداشت کرتے رہیں گے، لیکن انہوں نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ اہلیہ شدید بیمار ہوگئی، ساتھ ہی میرا کاروبار بھی ختم ہوگیا اور میں غربت کا شکار ہوگیا۔ میں نے بامر مجبوری بیوی کا مذکورہ بالا سامان بیچ کر ان کے علاج پر لگا دیا، آخر کار وہ وفات پا گئیں، اہلیہ کے والدین نے ان کی حیات میں جہیز کا زیور کا سیٹ اور ہماری طرف سے دیا ہوا بری کا سیٹ حفاظت کے بہانے لاکر میں رکھوا دیا اور اب وہ ہمارا بری کا سیٹ بھی واپس کرنے پر آمادہ نہیں ہیں بلکہ جہیز کے سامان کا، جو اہلیہ کے علاج کی خاطر بیچ دیا گیا تھا، مطالبہ کر رہے ہیں، لہٰذا بتایئے کہ از روئے شریعت مسئلے کا حل کیا ہے؟ (اسلم پرویز فہمی، حیدرآباد)

نوٹ: (سوال کا خلاصہ درج کیا گیا ہے، طویل سوالات کی ان سطور میں گنجائش نہیں ہے)

جواب: امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''جہیز ہمارے بلاد کے عرف عام

شائع سے خاص ملک زوجہ ہوتا ہے، جس میں شوہر کا کچھ حق نہیں، طلاق ہوئی تو کل لے گئی
اور مرگئی تو اس کے ورثاء پر تقسیم ہوگا، ردالمحتار میں ہے: (ترجمہ) ہر شخص جانتا ہے کہ جہیز
عورت کی ملکیت ہوتا ہے، جب شوہر اس کو طلاق دے دے تو وہ تمام جہیز لے لے گی اور
جب عورت مرجائے تو جہیز اس کے وارثوں کا ہوگا، (باب النفقہ جلد نمبر 2 صفحہ نمبر 653
بحوالہ فتاوی رضویہ، رضا فاؤنڈیشن جلد نمبر 12 صفحہ نمبر 203) لہٰذا آپ کی اہلیہ کا سارا
سامان جہیز ٹی وی، وی سی آر، ٹیپ ریکارڈر، الماری وغیرہ بشمول زیورات کے آپ کی اہلیہ
ہی کی ملکیت ہے اور اب ان کے انتقال کے بعد ان کے ترکہ میں شامل ہوگا اور ان کے تمام
شرعی وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ آپ نے اپنی اہلیہ کا جو سامان بیچ کر ان کے علاج پر لگا دیا ہے،
اگر ان کی اجازت سے ایسا کیا ہے تو درست ہے اور اگر ان کی اطلاع، اجازت یا رضامندی
کے بغیر ایسا کیا ہے تو وہ ساری رقم آپ کے ذمے قرض ہے اور ان کے ترکے کا حصہ ہے،
جیسے کہ اگر آپ نے ان کی زندگی میں ان کا مہر ادا نہ کیا ہو تو وہ بھی آپ کے ذمہ قرض ہے اور
ان کے ترکے میں شامل ہے۔ اب رہا بری کے سامان اور زیورات کا مسئلہ جو آپ نے
شادی کے موقع پر اپنی اہلیہ کو دیا تھا تو اس کے بارے میں امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:
"دلہن کا گہنا جوڑا جو بری میں جاتا ہے اگر نصاً یا عرفاً اس میں بھی تملیک مقصود ہوتی ہو جیسے
شکر، میوہ، عطر، پھلیل وغیرہ میں مطلقاً ہوتی ہے تو وہ بھی قبضہ منکوحہ ملک منکوحہ ہوگا، ہمارے
یہاں شرفا کا عرف ظاہر یہی ہے، ولہٰذا بعد رخصت اس کے واپس لینے کو سخت معیوب و
موجب مطعونی جانتے ہیں، اور اگر لے لیں تو طعنہ زن یہی کہتے ہیں کہ دے کر پھیر لیا یا
صرف دکھانے کو دیا تھا، جب دلہن آگئی چھین لیا، یعنی یہ ان کی رسم معہود کے خلاف ہے۔
(فتاوی رضویہ، رضا فاؤنڈیشن جلد نمبر 12 صفحہ نمبر 208)

امام احمد رضا قادری کی اس تصریح کے مطابق ہمارے اس خطے میں شرفا کے یہاں
عرف یہی ہے کہ بری کا زیور اور سامان دلہن کی ملکیت ہوتا ہے، اس کو ہبہ کہا جاتا ہے اور ہبہ
سے رجوع اگرچہ شرعاً مباح اور موثر ہے لیکن یہ انتہائی قبیح اور مکروہ فعل ہے۔ چنانچہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص صدقہ کر کے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کتا قے کرے، پھر اپنی قے میں رجوع کر کے اسے کھالے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث 4058) فتاوی درمختار اور ردالمحتار میں ہے کہ اگر میاں بیوی نکاح کے بعد ایک دوسرے کو کوئی چیز ہبہ کریں تو اس میں تو رجوع جائز ہی نہیں ہے۔ اور موت کے ساتھ ہبہ بہر صورت مکمل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میری رائے میں آپ کی بیوی کا دین مہر، اگر اب تک آپ کے ذمے ہے اور آپ نے ادا نہیں کیا، آپ کے ذمہ قرض ہے، بیوی کے ترکے کا حصہ ہے اور دونوں طرف کا زیور بھی اب بیوی کا ترکہ ہے، اگر آپ کی فوت شدہ بیوی کی اولاد نہیں ہے تو کل ترکے میں سے آپ کا حصہ نصف ہے، بقیہ ترکہ دیگر ورثاء کا ہے۔ البتہ اگر شادی کے وقت وضاحت کر دی گئی ہو کہ بری کے زیورات دولہا کی ملکیت ہوں گے اور دلہن محض عاریتاً انہیں استعمال کرے گی تو پھر بری کا زیور آپ کا ہے اور دلہن کے والدین کو چاہیے کہ آپ کو واپس کر دیں۔ اگر کسی برادری کے عرف یا رسم میں یہ بالکل طے ہے کہ بری کے زیورات اور سامان دولہا کی ملکیت ہوں گے تو پھر اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ بعد میں نیت میں فتور کا آ جانا خیانت ہے، اگر دلہن کے والدین نے اپنی بیٹی کے علاج کے مصارف برداشت کرنے کا وعدہ کیا تھا تو انہیں وعدہ وفا کرنا چاہیے، وعدہ شکنی پر گنہگار ہوں گے۔ لیکن ویسے علاج معالجہ شوہر کی ذمہ داری ہے۔

﴿کتاب الحج﴾

”حج فرض“ ادا نہیں کیا تو کیا حکم ہے؟

سوال: کوئی شخص تندرست ہے، مال دار ہے، حج پر جانے میں کوئی مانع اور رکاوٹ بھی نہیں ہے، اگر وہ خود حج پر نہ جائے اور کسی کو اپنی طرف سے نائب بنا کر حج بدل کے لئے بھیج دے تو کیا اس طرح وہ فرض سے سبکدوش ہو جائے گا؟ (سید عمیر برنی، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: جب کوئی شخص صاحب ایمان، عاقل و بالغ ہو، جسمانی طور پر سفر حج کے قابل ہو، حج کی مالی استطاعت بھی رکھتا ہو اور کوئی رکاوٹ بھی اسے درپیش نہ ہو تو اس پر بذات خود حج ادا کرنا لازم ہے، اسے ”حجۃ الاسلام“ کہتے ہیں اور کسی مہلک مرض، جسمانی معذوری (جیسے نابینا ہونا، لنگڑا ہونا یا ایسے امراض میں مبتلا ہونا جن میں ماہر ڈاکٹر کی رائے میں سفر اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے) میں مبتلا نہ ہو تو کسی کو اپنا نائب مقرر کر کے حج بدل کرانے سے اس کا حج ادا نہیں ہوگا۔ ہاں البتہ اگر وہ اپنی بدقسمتی اور کوتاہی کی بناء پر زندگی بھر اس سعادت سے محروم رہا تو اس پر لازم ہے کہ اپنی وفات سے پہلے اپنے حج بدل کے لئے کسی کو مقرر کر لے یا اس کی وصیت ضرور کرے، اگر اس نے اپنا حج بدل کرانے کی وصیت کی تو یہ مصارف اس کے ترکے سے ادا کرنے ہوں گے، بشرطیکہ ایک تہائی یا کم ترکہ اس کے لئے کافی ہو اور اگر خدانخواستہ ایک تہائی ترکہ کافی نہیں ہے تو بقیہ رقم کی فراہمی اس کے وارثوں کی رضامندی پر منحصر ہے۔

غیر شادی شدہ بالغ بیٹی گھر پر بیٹھی ہو اور حج پر جانا

سوال: اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں پر حج فرض ہوتا ہے، لیکن وہ حج پر نہیں جاتے اور کہتے ہیں جوان بیٹی گھر پر بیٹھی ہوئی ہے۔ ذمے داری سر پر ہے، ایسے میں حج کیسے ادا ہو گا؟ یعنی وہ بیٹی کے غیر شادی شدہ ہونے کو بھی حج میں شرعی رکاوٹ سمجھتے ہیں؟

(پروفیسر صلاح الدین ظہیر، کورنگی، کراچی)

جواب: یہ تصور غلط ہے۔ بیٹی کا غیر شادی شدہ ہونا حج کی فرضیت یا ادائیگی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کہیں بھی باہم تصادم یا ٹکراؤ نہیں ہے، بلکہ

زیادہ بہتر یہ ہے کہ حج پر جائیں وہاں مقامات مقدسہ اور متبرک اوقات میں اپنی بیٹی کے بہتر اور مناسب رشتے کے لئے دعا کریں اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے کمال امید رکھیں کہ وہ ان کا مقدر سنوار دے گا۔ البتہ اگر عذر یہ ہے کہ حج پر جانے کی صورت میں بیٹی یا بیٹیوں اور بیوی کی نگہداشت اور حفاظت کے لئے کوئی محرم مرد رشتہ دار نہیں ہے تو اس عذر کے ازالے تک حج موخر کر سکتا ہے۔ محرم سے مراد قریبی رشتہ دار ہے جس سے از روئے شرع نکاح دائمی طور پر حرام ہے، جیسے باپ، بیٹا، بھائی، چچا، ماموں، بھتیجا، بھانجا یا اس طرح کے (رضاعی دودھ شریک) رشتے۔

عورت، احرام اور ایام

سوال: عورت حج کا احرام باندھنا چاہتی ہے لیکن وہ ایام سے ہے یا عین میقات پر اسے ماہواری شروع ہوگئی تو وہ احرام باندھ سکتی ہے یا نہیں؟ (جمیلہ بیگم، اورنگی ٹاؤن)

جواب: حیض یا نفاس والی عورت احرام باندھ سکتی ہے، اسے چاہیے کہ حیض یا نفاس ہی کی حالت میں غسل کر کے احرام باندھ لے۔ ائمہ اربعہ کے نزدیک اس کا احرام کے لئے غسل کرنا مستحب ہے، البتہ غیر مقلدین اسے واجب قرار دیتے ہیں۔

عورتوں کا بغیر محرم کے سفر حج

سوال: کیا عورت بغیر محرم کے حج یا عمرے پر جا سکتی ہے؟ محرم سے کون لوگ مراد ہیں، کیا چند عورتیں ایک ساتھ مل کر جا سکتی ہیں؟ (نور بی، شہداد پور، سندھ)

جواب: محرم کسی عورت کے ان مرد رشتے داروں کو کہتے ہیں جن کے ساتھ اس کا نکاح دائمی طور پر حرام ہے، جیسے باپ، بیٹا، چچا، ماموں، بھانجا وغیرہ۔ حرمت نکاح کا سبب نسبی قرابت بھی ہے، رشتہ رضاعت (یعنی دودھ کے رشتے سے) اور رشتہ مصاہرت (یعنی سسرالی رشتے سے) بھی۔

شرعاً کسی بھی عورت کا شوہر یا محرم کے بغیر تین دن سے زیادہ کی مسافت کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ خواہ یہ سفر حج وعمرہ کے لئے ہو یا کسی اور مقصد کے لئے۔ تین دن کی

مسافت سے مراد وہ فاصلہ ہے جو بندہ اوسط رفتار سے پیدل چل کر یا اونٹ پر سوار ہو کر طے کرے، جس میں رات کا آرام، نمازوں کی اپنے اوقات پر ادائیگی اور دو پہر کا مناسب وقفہ بھی شامل ہے۔ فقہاء کرام نے اس کا تخمینہ اٹھارہ فرسخ یا 54 میل شرعی یا 61 میل 640 گز یا 98.73 کلومیٹر لگایا ہے۔ خواہ سفر ہوائی جہاز، ریل گاڑی یا کار وغیرہ کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو، یہی مسافت شرعاً معتبر ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' جو عورت اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو، اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ تین راتوں کی مسافت کا سفر محرم کے بغیر کرے۔ مرد کے لئے فرضیت حج کی جو شرائط ہیں (یعنی اسلام، حریت، عاقل و بالغ ہونا، زاد راہ، سفر کے خطرات سے محفوظ ہونا، سفر پر جسمانی قدرت وغیرہ) عورت کے لئے ایک شرط زائد ہے اور وہ ہے سفر کے لئے شوہر یا محرم کی رفاقت، لہٰذا اگر اسے محرم کی رفاقت میسر نہیں ہے تو شرعاً اس پر حج فرض نہیں ہے اور وہ اس عذر کی بناء پر حج نہ کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ نہیں ہوگی۔ اگر کسی عورت کے ساتھ شوہر یا محرم نہیں ہے تو محض چند عورتوں کی رفاقت کی وجہ سے اس کا سفر حج پر جانا جائز نہیں ہے۔ شریعت نے عورت کے سفر کے لئے جو محرم کا ساتھ ہونا لازمی قرار دیا ہے تو یہ حکم حکمت سے خالی نہیں ہے، اللہ کرے ہر ایک کا سفر ہر اعتبار سے خوشگوار اور خیر و عافیت سے ہو۔ لیکن سفر میں بیماری، دشواری اور مشکلات اور حوادث کا پیش آنا۔ خارج از مکان نہیں ہے۔ سفر حج میں بعض اوقات دشواریاں پیش آجاتی ہیں، عورت اپنے آپ کو محرم کے ساتھ ہی محفوظ تصور کر سکتی ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اگر عورت نے محرم کے بغیر حج کر لیا تو ادا تو ہو جائے گا لیکن اس کا یہ عمل (بغیر محرم کے سفر) مکروہ تحریمی ہے، بہنوئی محرم نہیں ہے۔

دوران حج عورتوں کو ایام مخصوصہ شروع ہو جانا

سوال: حج کے دوران عورت کے ایام شروع ہو جائیں تو کیا کرے؟

(بنت زبیر، کورنگی کراچی)

جواب: حج کے دوران عورت کے ایام شروع ہو جائیں تو سارے مناسک حج، مثلاً وقوف منیٰ، وقوف عرفات، وقوف مزدلفہ، قربانی، رمی جمرات وغیرہ حسب معمول ادا کرے صرف طواف نہیں کرسکتی، کیونکہ طواف میں طہارت شرط ہے۔ لہٰذا جب ایام سے پاک ہو جائے تو طواف زیارت کرے اور اس کا حج مکمل ہو جائے گا۔ اگر احرام سے پہلے ہی حالت حیض میں ہے۔ تب بھی اسی حالت میں غسل کر کے نیت کرے اور اپنے محرم یا شوہر کے ساتھ سارے مناسک حج ادا کرے۔

دوران حج ایام مخصوصہ

سوال: ایام حج شروع ہوتے ہی عورت ایام سے تھی، یا دوران حج اس کے ایام مخصوصہ شروع ہو گئے تو وہ کیا کرے؟ (ابن حکیم خان، بنگش کالونی)

جواب: محرم عورت ایام مخصوصہ میں اپنے حج کو جاری رکھے اور تمام ارکان حج ادا کرے البتہ طواف وسعی نہیں کرسکتی، اور ناپاکی کی حالت میں وہ مسجد حرام میں داخل نہیں ہوسکتی۔ بخاری شریف میں حدیث ہے۔

''ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سفر حج کے دوران ہم مقام سرف (جو مکۃ المکرمہ سے چند میل کے فاصلے پر ہے) میں تھے کہ میرے ایام مخصوصہ شروع ہو گئے، اس عالم میں رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور میں اس صدمے کی بنا پر رو رہی تھی (کہ مبادا میں حج سے محروم نہ رہ جاؤں) رسول اللہ ﷺ نے میری کیفیت کو جان کر بیان فرمایا کہ ''تمہارے ایام مخصوصہ شروع ہو گئے ہیں؟'' میں نے عرض کی ''جی ہاں!'' آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے لئے مقدر فرمایا ہوا ہے، تم دیگر حجاج کی طرح تمام ارکان حج ادا کرتی چلی جاؤ، البتہ پاک ہونے سے پہلے بیت اللہ کا طواف نہ کرنا''۔

جب عورت کے ایام مخصوصہ ختم ہو جائیں اور وہ غسل کر کے پاک ہو جائے تو پھر طواف زیارت کرے (اسے طواف افاضہ بھی کہتے ہیں) جو حج کا رکن ہے، اس کے بغیر وہ احرام

سے باہر نہیں آسکتی۔ البتہ اگر طواف زیارت (جو کہ حج کا رکن ہے) کے ادا کرنے کے بعد عورت کے ایام شروع ہو جائیں اور وہ ''طواف صدر'' (جسے طواف وداع بھی کہتے ہیں) ادا نہ کرسکے تو اس کے لئے کوئی حرج نہیں کیونکہ اس عذر کی بنا پر طواف صدر کا وجوب اس سے ساقط ہو جاتا ہے اور اس بنا پر اس پر کوئی دم بھی نہیں ہوگا۔

عمرہ حج میں مانع حیض دوائیوں کا استعمال

سوال: خواتین حج یا عمرے پر جاتی ہیں، کیا وہ مانع حیض دوائیں استعمال کرسکتی ہیں تاکہ مناسک حج وعمرہ اور حرمین طیبین میں عبادات بھرپور طریقے سے ادا کرسکیں، عبادت کا تسلسل قائم رہے، کیونکہ وہاں قیام کی مدت حکومت کی طرف سے متعین ہوتی ہے؟

(ہومیو ڈاکٹر عاقل اظہر عثمانی، پرنسپل داتا گنج بخش ہومیو پیتھک میڈیکل کالج، کراچی)

جواب: خواتین چاہیں تو ایام حج وعمرہ میں ''مانع حیض'' دوائیں استعمال کرسکتی ہیں۔ بشرطیکہ طبی اور جسمانی لحاظ سے ان کے لئے مضر صحت نہ ہوں، اور کسی بڑے جسمانی عارضے کا سبب نہ بنیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو'' (البقرہ:195) اگر بے ضرر مانع حیض دواؤں سے ایام نہ آئیں اور ان خواتین کو حرمین طیبین میں زیادہ سے زیادہ عبادت کا موقع ملے تو یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔ تاہم اگر کسی خاتون کو دوران حج وعمرہ ایام شروع بھی ہو جائیں تو اس کے مسائل ایکسپریس کی گزشتہ اشاعت میں تحریر کرچکا ہوں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے کرم پر یقین کامل ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اجر میں کمی نہیں فرمائے گا، کیونکہ یہ ایک ایسا نفسیاتی عارضہ ہے جس میں خواتین کی کسی ذاتی کوتاہی فکر وعمل کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ''اللہ تعالیٰ کسی (نفس انسانی) کو اس کی وسعت وطاقت سے زیادہ (کسی عمل) کی تکلیف نہیں دیتا''۔ (البقرہ:286)

حج بدل کے لئے کسے بھیجا جائے

سوال: کیا حج بدل کے لئے ایسے شخص کو بھیجا جائے جس نے اپنا فریضہ حج پہلے سے ادا کرلیا ہے یا کسی ایسے شخص کو بھی بھیج سکتے ہیں جس نے اپنا فرض حج نہ کیا ہو؟

(منور احمد ملیر، کراچی)

جواب: بہتر یہ ہے کہ حج بدل کے لئے ایسے شخص کو بھیجا جائے جس نے اپنا فریضۂ حج پہلے ہی ادا کرلیا ہو اور ترجیحی طور پر ایسے شخص کا انتخاب کرنا چاہیے جو دین دار ہو اور مسائل و مناسک حج سے اچھی طرح واقف ہو۔

سوال: اگر کسی کو حج بدل کرانا ہو تو کیا وہ ایسے شخص کا انتخاب کرسکتا ہے، جس شخص نے اپنا فریضہ حج ادا نہیں کیا؟ کیا اسے بھیجا سکتا ہے؟ (ضیاء الرحمٰن، دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: ترجیحی طور پر حج بدل کے لئے کسی نیک، صالح اور متقی شخص کا انتخاب کرنا چاہیے، اور ان میں سے بھی کسی صاحب علم کو ترجیح دینی چاہیے جو مسائل حج اور مسائل دین سے کما حقہ واقف ہو تا کہ عبادت بشری استطاعت کی حد تک کامل و تمام ادا ہو۔ جس نے اپنا فریضۂ حج ادا کیا ہوا ہے، حج بدل کے لئے اس کو ترجیح دینی چاہیے، جس نے اپنا فریضۂ حج پہلے سے ادا نہیں کیا ہے، اگر اسے بھیج دیا تو ادا تو ہو جائے گا، لیکن یہ خلاف اولیٰ ہے، البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مرد کی طرف سے مرد ہی حج بدل ادا کرے اور عورت کی طرف سے عورت، اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔

حج بدل کا شرعی حکم

سوال: ''حج بدل'' کا شرعی حکم کیا ہے؟ کن حالات میں اس کی اجازت ہے اور کس کو بھیجنا چاہیے؟ (نجیب الدین شیخ، نارتھ ناظم آباد، کراچی)

جواب: عبادات کی تین قسمیں ہیں (۱) خالص بدنی عبادتیں، جیسے نماز اور روزہ، ان میں نیابت یا قائم مقامی جائز نہیں ہے، ہر مکلف (عاقل و بالغ) کو بذات خود ادا کرنی لازمی ہیں۔ (۲) خالص مالی عبادت، جیسے زکوٰۃ، فطرہ، قربانی، نذر وغیرہ، ان میں نیابت بالاتفاق جائز

ہے، جیسے کوئی مالدار شخص اپنی زکوٰۃ یا فطرہ ادا کرنے کے لئے کسی کو اپنا وکیل مقرر کر سکتا ہے۔

(۳) مرکب عبادت، یعنی ایسی عبادت جس کی دو حیثیتیں ہیں، مالی بھی اور بدنی بھی جیسے عبادت حج، اس میں اگر مکلّف خود ادا کرنے کی جسمانی قدرت رکھتا ہے تو اسے خود ادا کرنا لازمی ہے ورنہ کسی کو اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے لیکن یہ شرط فرض حج کے لئے ہے۔ کوئی کسی کی طرف سے نفلی حج کرنا چاہیے یا کسی سے کرانا چاہے تو کسی شرط یا استثناء کے بغیر کر سکتا ہے۔ خواہ جس کی طرف سے کیا جا رہا ہے یا کرایا جا رہا ہے، وہ زندہ ہے یا وفات پا چکا ہے، اس نے اجازت دی ہو یا نہ دی ہو، وہ خود جسمانی طور پر قدرت کھتا ہو یا مریض یا معذور ہو، کوئی شخص اپنے زندہ یا مرحوم والدین یا عزیز و اقارب کی طرف سے خود بھی حج کر سکتا ہے اور کسی دوسرے کو بھی کرا سکتا ہے، الغرض فرض کے مقابلے میں نفلی عبادت میں زیادہ وسعت اور سہولت ہوتی ہے۔ اسی طرح ان عبادات کا ایصال ثواب بھی کر سکتا ہے۔

حج بدل کی وصیت پوری کرنا

سوال: میں اپنے مرحوم والدین کے لئے حج بدل کرانا چاہتا ہوں جب کہ انہوں نے اس کی وصیت کی تھی، کیا ان کی طرف سے یہ حج بدل ادا ہو جائے گا؟ (محمد انور، لانڈھی، کراچی)

جواب: ایصال ثواب کے لئے جو حج بدل یا عمرہ کیا جائے، یہ نفلی عبادت ہے، والدین زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں، انہوں نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، ان کے ایصال ثواب کے لئے آپ خود بھی حج اور عمرہ کر سکتے ہیں اور کسی اور کو بھی چاہیں تو بھیج سکتے ہیں، جس کے ایصال ثواب کے لئے حج و عمرہ کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ از راہ کرم اسے بھی اجر عطا فرمائے گا۔ کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا، انشاء اللہ العزیز اور جو بھیجنے والا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اجر پائے گا۔

مرحومین کا حج بدل

سوال: اکثر حضرات اپنے مرحوم عزیزوں کے ایصال ثواب کے لئے دوسرے افراد کو حج بدل کے طور پر حج کے لئے بھجواتے ہیں۔ اگر کسی مرحوم شخص مرد یا عورت نے اپنی زندگی میں

خود ہی حج کا فریضہ ادا کرلیا ہو تو کیا اس کے نام سے بھی حج بدل کیا جا سکتا ہے؟

(سید صفدر علی، کراچی)

جواب: حج بدل کی دو قسمیں ہیں ایک فرض، دوسرا نفلی۔

(۱) حج بدل فرض تو وہ ہے کہ کوئی شخص مالی اعتبار سے صاحب استطاعت ہے، اس پر حج فرض ہے لیکن وہ کسی مرض، معذوری یا ضعیف العمری کی وجہ سے سفر حج اور مناسک حج ادا کرنے کی جسمانی قدرت نہیں رکھتا، اس پر لازم ہے کہ اپنی جانب سے حج بدل ادا کرنے کے لئے اپنے وطن اقامت سے کسی کو اپنا حج بدل ادا کرنے کے لئے بھیجے اور اس کے تمام مصارف سفر ادا کرے، ترجیحاً کسی نیک اور دین دار شخص کا انتخاب کرے اور اگر اس نے اپنا حج پہلے سے ادا کرلیا ہے تو ایسا شخص زیادہ بہتر ہے۔

(۲) صاحب استطاعت کے لئے کوئی عذر تھا یا نہیں لیکن بد قسمتی سے اس نے نہ تو زندگی میں خود حج کیا اور نہ ہی کسی کو اپنی جانب سے حج بدل پر بھیجا اور اب ظاہری علامات کے اعتبار سے اس کی موت سر پر ہے، تو وہ اپنی طرف سے حج بدل کرنے کے لئے اپنے کسی وارث یا کسی دوسرے معتمد شخص کو وصیت کرے۔ تمام مصارف حج، اگر وہ اس عرصے میں انتقال کر گیا، تو بطور وصیت اس کے ترکے سے ادا کیے جائیں گے۔

(۳) نفلی حج بدل یا عمرہ کوئی صاحب خیر باقاعدہ بتا کر یا بلا اجازت و اطلاع بھی اپنے کسی بزرگ، والدین، شیخ طریقت، اساتذہ، اقرباء و احباء یا رسول اللہ ﷺ کے نام سے بھی ایصال ثواب کے لئے کر سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نیت کرتے وقت اس شخص یا ہستی کا نام لے گا جس کی طرف سے حج بدل یا عمرہ کر رہا ہے۔

قربانی کا وجوب

سوال: میں غریب بھی ہوں اور قرض دار بھی، قربانی کر سکتا ہوں؟

(حافظ نور الامین، کراچی)

جواب: آپ کے لئے بہتر تو یہ ہے کہ پہلے قرض سے سبکدوش ہوں، کیونکہ آپ کے

لئے دوسرے کا قرض ادا کرنا واجب ہے جب کہ قربانی نفلی ہوگی تاہم قربانی کر دی تو ادا ہو جائے گی اور ثواب ملے گا۔

خصی جانور کی قربانی

سوال: خصی جانور کی قربانی کرنا کیسا ہے؟ کیا کسی جانور کا خصی ہونا عیب میں شمار ہوگا جب کہ عیب دار جانور کی قربانی جائز نہیں ہے؟

(محمد سہیل: عائشہ بیکری، سیکٹر 11-A نارتھ، کراچی)

جواب: خصی جانور کی قربانی جائز ہے، امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں ''حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قربانی کے دن دو سرمئی رنگ کے سینگوں والے خصی مینڈھے ذبح کیے''۔ (سنن ابی داؤد جلد 2، صفحہ 3) اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ نر جانور کا خصی ہونا، قربانی کے معاملے میں عیب نہیں ہے۔ بلکہ فقہا نے اسے افضل قرار دیا ہے کیونکہ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مویشیوں کے تاجروں کے نزدیک یہ عیب نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنے ریوڑ میں افزائش نسل کے لئے نر جانور خریدنا چاہتا ہے تو آنڈو کو ہی لازماً لے گا۔

عقیقے کا گوشت

سوال: کیا عقیقہ کا گوشت بچے کے والدین کھا سکتے ہیں؟

(محمد یاسین، پی آئی بی کالونی، کراچی)

جواب: عقیقے کے گوشت کا وہی حکم ہے جو قربانی کے گوشت کا ہے، اسے بچے کے والدین، دادا، دادی، نانا، نانی سب لوگ کھا سکتے ہیں۔

دوران حج شوہر کا انتقال ہوجائے تو عورت کیا کرے؟

سوال: ایک خاتون اپنے شوہر کے ساتھ سفر حج پر ہے، دوران سفر اس کے شوہر کا انتقال ہوجاتا ہے تو وہ کیا کرے، حج مکمل کرے یا حج کو نا تمام چھوڑ کر واپس وطن لوٹ آئے یا دہیں

پر عدت گزارے۔ (احمد عبداللہ، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: حج کے لئے گھر سے روانہ ہوتے وقت عورت کے ساتھ شوہر یا کسی محرم رشتے دار کا رفیق ہونا ضروری ہے، شرعاً محرم اس قریبی مرد رشتے دار کو کہتے ہیں، جس کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہو اگر اسے شوہر یا محرم کی رفاقت میسر نہیں ہے تو مالی استطاعت کے باوجود اس پر حج فرض نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ گھر سے حج کے لئے روانہ ہوتے وقت اس کو شوہر کی رفاقت حاصل تھی، لہٰذا اس کا سفر حج شرعاً درست ہے۔ اب اگر حج سے پہلے یا دوران حج قضاء الٰہی سے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ حج پورا کرے، اگر کوئی اور محرم موجود ہے تو اس کے ساتھ، ورنہ شرعی حجاب کے اہتمام کے ساتھ وہ ایسی عورتوں کے گروپ کے ساتھ ساتھ رہے، جن کے محارم اگرچہ موجود ہیں لیکن وہ خدا ترس اور دین دار ہیں۔ حرمین طیبین میں مقررہ مدت سے زائد اقامت ویسے بھی خلاف قانون ہے اور مومن کے لئے عزت نفس کا تحفظ بھی مقاصد شریعت میں ہے، لہٰذا جب حسب پروگرام واپس گھر پہنچ جائے تو گھر پر عدت پوری کرے۔

قربانی کے فضائل و مسائل

قربانی سے مراد ہر وہ عمل ہے، جسے اللہ تعالیٰ کی رضا، حصول اجر و ثواب اور اس کی بارگاہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے انجام دیا جائے۔ بطور خاص جانور کی قربانی کو عربی میں ''اضحیہ'' کہتے ہیں، اس کی جمع ''اضاحی'' ہے۔ قربانی کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے، جتنی انسانی تاریخ۔ لیکن امت مسلمہ ہر سال جو قربانی کرتی ہے، یہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی یادگار ہے، چنانچہ: ''زید بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ (ایک موقع پر) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اس میں ہمارے لئے کیا اجر ہے؟ آپ نے فرمایا: قربانی کے جانور کے ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اون کا کیا حکم ہے؟ آپ

ﷺ نے فرمایا: قربانی کے جانور کی اون کے ہر روئیں کے بدلے میں ایک نیکی ہے"۔
(مشکوٰۃ بحوالہ مسند امام احمد وسنن ابن ماجہ)

ایام قربانی میں قربانی ایسی نیکی ہے جس کا کوئی اور بدل نہیں ہے، چنانچہ: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایام قربانی (10 تا 12 ذی الحجہ) میں انسان کا کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قربانی کے جانور کا خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں ہے، اور قیامت کے روز قربانی کا یہ جانور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت حاضر ہوگا، اور بلاشبہ قربانی کے جانور کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مرتبۂ قبولیت کو پا لیتا ہے، تو اے مومنو!) خوش دلی سے قربان کیا کرو، (مشکوٰۃ بحوالہ جامع ترمذی وسنن ابن ماجہ) حضور انور ﷺ نے اپنی قربانی کے مواقع پر امت کو بھی یاد فرمایا، چنانچہ: "حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے کالے رنگ کا سینگوں والا مینڈھا قربانی کے لئے منگوایا، آپ نے فرمایا: عائشہ! چھری لاؤ! پھر فرمایا: اسے پتھر پر رگڑ کر تیز کر دو، میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی، پھر آپ نے چھری لی اور مینڈھے کو پکڑ کر پہلو کے بل لٹایا اور فرمایا: اللہ کے نام سے، اے اللہ! تو اسے محمد ﷺ، آل محمد ﷺ اور امت محمد ﷺ کی جانب سے قبول فرما، پھر آپ نے اسے ذبح کر دیا" (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم) ایک ہی قربانی میں پوری امت کو شریک کرنا یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت ہے، کسی اور کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ایصال ثواب کے لئے قربانی کرنا یہ حضور کے نزدیک بھی پسندیدہ امر ہے، چنانچہ: حضرت حنش رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت علی نے دو مینڈھوں کی قربانی کی، میں نے عرض کیا کہ یہ آپ نے کیوں کیا؟ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ میں ان کی جانب سے قربانی کروں تو میں اس لئے ایسا کرتا ہوں (مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابی داؤد جامع ترمذی وغیرہ)"۔

☆ قربانی ہر صاحب نصاب بالغ مرد اور عورت پر واجب ہے، زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے کم از کم نصاب پر پورا قمری سال گزرنا شرط ہے، جب کہ قربانی اور فطرے کے وجوب کے لئے محض نصاب کا مالک ہونا کافی ہے، سال گزرنا شرط نہیں ہے۔

☆ قربانی کے لئے اونٹ پانچ سال، گائے، بیل اور بھینس دو سال، دنبہ، بکرا، بکری ایک سال کے ہونے چاہیں، اس سے کم عمر کے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ البتہ بھیڑ اور دنبہ اتنے فربہ ہوں کہ دیکھنے میں ایک سال کے نظر آئیں تو ان کی قربانی جائز ہے۔

☆ قربانی کے جانوروں کی عمر پورا ہونے کی ظاہری علامت ثنی (دو دانت کا) ہونا ہے، لہٰذا کھیرا جانور یعنی جس کے سامنے کے دو دانت ابھی نہیں گرے یا دودھ کے دانت گرنے کے بعد نئے دانت نہیں نکلے اسے قربانی کے لئے نہیں خریدنا چاہیے۔ البتہ اگر جانور گھر کا پلا ہوا ہے اور اس کی عمر ایک سال پوری ہوگئی ہے تو اس کی قربانی شرعاً جائز ہے۔ خواہ سامنے کے دو دانت ابھی نہ گرے ہوں۔ عام کاروباری لوگوں پر اعتماد بالکل نہیں کرنا چاہیے بلکہ دو دانت باقاعدہ دیکھ کر خریدنا چاہیے۔

☆ قربانی کا جانور تمام عیوب فاحشہ سے سلامت ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں فقہا کرام نے یہ ضابطہ بیان کیا ہے کہ ہر وہ عیب جو کسی منفعت کو بالکل زائل کر دے یا جمال کو بالکل ضائع کر دے، اس کی وجہ سے قربانی جائز نہیں ہے اور جو عیب اس سے کم تر درجے کا ہو، اس کی وجہ سے قربانی ممنوع نہیں ہوتی۔

☆ جو جانور اندھا، کانا یا لنگڑا ہو یا بہت بیمار اور لاغر ہو یا جس کا کوئی کان، دم یا چکتی تہائی سے زیادہ کٹے ہوئے ہوں یا پیدائشی کان نہ ہوں یا ناک کٹی ہو یا دانت نہ ہوں یا بکری کا ایک تھن یا گائے بھینس کے دو تھن خشک ہوں، ان سب جانوروں کی قربانی جائز نہیں ہے۔

☆ جس جانور کے پیدائشی سینگ نہ ہوں یا سینگ اوپر سے ٹوٹا ہوا ہے، کان، چکتی یا دم ایک تہائی یا اس سے کم کٹے ہوئے ہیں تو ایسے جانوروں کی قربانی جائز ہے۔

☆ صاحب نصاب نے عیب دار جانور خریدا، یا خریدتے وقت بے عیب تھا بعد میں عیب دار

ہو گیا تو ان دونوں صورتوں میں اس کے لئے ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں، دوسرا بے عیب جانور خریدے اور قربانی کرے اور اگر خدانخواستہ ایسا شخص صاحب نصاب نہیں ہے تو دونوں صورتوں میں اس جانور کی قربانی کرسکتا ہے۔

☆ خصی جانور کی قربانی آنڈو کے بہ نسبت افضل ہے کیونکہ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے، اگر گائے کے ساتویں حصے کی قیمت بکری سے زیادہ ہو تو وہ افضل ہے اور اگر قیمتیں برابر ہوں تو بکری کی قربانی افضل ہے، کیونکہ بکری کا گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

☆ بکرا، بکری، بھیڑ، دنبے کی قربانی صرف ایک فرد کی طرف سے ہوسکتی ہے۔ اونٹ، گائے وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ سات افراد شریک ہوسکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ سب کی نیت تقرب یعنی عبادت اور حصول اجر وثواب کی ہو۔ سات سے کم افراد بھی ایک گائے کی قربانی میں برابر کے حصے دار ہوسکتے ہیں۔ مثلاً چھ یا پانچ یا چار یا تین یا دوحتی کہ ایک آدمی بھی پوری گائے کی قربانی کرسکتا ہے، سات حصے داروں کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆ سات افراد نے مل کر قربانی کا جانور خریدا، بعد ازاں قربانی سے پہلے ایک حصے دار کا انتقال ہو گیا۔ اگر مرحوم کے سب ورثاء باہمی رضامندی سے یا کوئی ایک وارث یا چند اپنے حصے وراثت میں سے اجازت دے دیں تو استحساناً اس کی قربانی ہو جائے گی۔

☆ فوت شدہ والدین اور قرابت داروں کے لئے ایصال ثواب کی نیت سے قربانی کی جا سکتی ہے۔ اپنی واجب قربانی ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ توفیق دے تو رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے لئے ایصال ثواب کی نیت سے قربانی کرنا افضل ہے، کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا اور حضور انور ﷺ کی نسبت سے اس کی قبولیت کا بھی یقین ہے۔

شریعت کی رو سے ہر عاقل و بالغ اللہ کی بارگاہ میں اپنے عمل کے لئے جوابدہ ہے۔ لہٰذا ایک مشترکہ خاندان میں اگر ایک سے زیادہ افراد صاحب نصاب ہیں تو سب پر فرداً فرداً قربانی واجب ہے، محض ایک قربانی سب کے لئے کافی نہیں ہوگی بلکہ تعین کے بغیر ادا ہی نہیں ہوگی۔

☆ قربانی کی گائے میں عقیقہ کا حصہ ڈال سکتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ لڑکے کے لئے دو حصے ہوں اور لڑکی کے لئے ایک حصہ، اگر دو حصے کی استطاعت نہ ہو تو لڑکے کے لئے ایک حصہ بھی ڈالا جاسکتا ہے۔

☆ افضل یہ ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کیے جائیں، ایک حصہ ذاتی استعمال کے لئے، ایک حصہ اعزاء واقرباء اور احباب کے لئے اور ایک حصہ فقراء اور ناداروں پر صرف کیا جائے۔ سارا گوشت رضا الٰہی کے لئے مستحقین کو دے دینا عزیمت اور اعلیٰ درجے کی نیکی ہے اور اگر خود زیادہ ضرورت مند ہے تو کل یا اکثر گوشت ذاتی استعمال میں لانے کی رخصت واجازت ہے، لیکن یہ روح قربانی کے منافی ہے۔

نوٹ: شریعت کے مطابق ذبح کیے ہوئے حلال جانور کے مندرجہ ذیل اعضاء کھانے منع ہیں۔ دم مسفوح (ذبح کے وقت بہنے والا خون) ذکر، گائے، بکری کے پیشاب کی جگہ (فرج)، خصیتین (کپورے) مثانہ، دبر (جانور کے پاخانے کی جگہ) حرام مغز، اوجھڑی اور آنتیں۔ ان میں سے دم مسفوح حرام قطعی ہے اور باقی مکروہ تحریمی ہیں۔

☆ قربانی کا وقت 10 ذی الحجہ کی صبح صادق سے لے کر 12 ذی الحجہ کے غروب آفتاب تک ہے، گیارہویں اور بارہویں شب میں بھی قربانی ہوسکتی ہے مگر رات کو ذبح کرنا مکروہ ہے۔ ایسے شہر اور قصبات جہاں عید کی نماز پڑھی جاتی ہے، وہاں نماز عید سے پہلے قربانی جائز نہیں ہے۔

☆ قربانی کے جانور نے ذبح سے پہلے بچہ دے دیا، یا ذبح کرنے کے بعد پیٹ سے زندہ بچہ نکلا، دونوں صورتوں میں یا اسے بھی قربان کردیں، یا زندہ صدقہ کردیں یا فروخت کر کے قیمت صدقہ کردیں، اگر بچہ مردہ نکلے تو اسے پھینک دیں، قربانی ہوجائے گی۔

ذبح کا طریقہ

ذبح کرتے وقت جانور کو بائیں پہلو پر قبلہ رو لٹائیں اور خود ذبح کریں یا کسی سے ذبح کرائیں، چھری تیز ہو اور کم از کم تین رگیں کاٹنی چاہئیں۔

ذبح سے پہلے کی دعا

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفاً وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذَالِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ، اَللّٰھُمَّ لَکَ وَمِنْکَ پھر بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرْ پڑھ کر چھری پھیر دیں۔

ذبح کے بعد کی دعا

"اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ خَلِیْلِکَ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَحَبِیْبِکَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ"

اگر دوسرے کی طرف سے ہو تو منی کی بجائے من فلاں (اس شخص کا نام) لیں، گائے ہے تو تمام شرکاء کے نام لیں۔

قربانی کی کھالیں

قربانی کے جانور کی کھال قصاب کو اجرت میں دینا جائز نہیں ہے کھال بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کر دینی چاہیے، کسی نادار شخص کو شخصی طور پر بھی دی جا سکتی ہے، لیکن دینی اداروں کو دینا افضل ہے، کیونکہ یہ تبلیغ و اشاعت دین کے کام میں اعانت بھی ہے اور صدقہ جاریہ بھی۔

عقیقہ کی دعا: لڑکے کے لئے

اَللّٰھُمَّ ھٰذِہٖ عَقِیْقَۃُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ دَمُھَا بِدَمِہٖ وَلَحْمُھَا بِلَحْمِہٖ وَعَظْمُھَا بِعَظْمِہٖ وَجِلْدُھَا بِجِلْدِہٖ وَشَعْرُھَا بِشَعْرِہٖ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا فِدَآءً لَّہٗ مِنَ النَّارِ بِسْمِ اللّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرْ۔

لڑکی کے لئے

اَللّٰھُمَّ ھٰذِہٖ عَقِیْقَۃُ فُلَانَۃِ بِنْتِ فُلَانٍ دَمُھَا بِدَمِھَا وَلَحْمُھَا

بِلَحْمِهَا وَعَظْمُهَا بِعَظْمِهَا وَجِلْدُهَا بِجِلْدِهَا وَشَعْرُهَا بِشَعْرِهَا
اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا فِدَاءً لَّهَا مِنَ النَّارِ بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔
(نوٹ: فلاں فلاں کی جگہ لڑکے یا لڑکی کا نام اور اس کے والد کا نام لیں)

"اے اللہ! یہ فلاں بن فلاں (یا فلانہ بنت فلاں) کا عقیقہ ہے اس کی جان کو اس کی جان کے بدلے میں، اس کے گوشت کو اس کے گوشت کے بدلے میں، اس کی ہڈیوں کو اس کی ہڈیوں کے بدلے میں، اس کی جلد اس کی جلد کے بدلے میں، اس کے بال اس کے بالوں کے بدلے میں (صدقہ ہیں)، اے اللہ تو (از راہ کرم) اس عقیقے کی برکت سے اس بچے کو نار جہنم سے محفوظ فرما (اور اسے ہر قسم کی آفات سے سلامتی عطا فرما)

تکبیرات تشریق

نویں ذی الحجہ کی فجر سے تیرہویں ذی الحجہ کی عصر تک ہر نماز با جماعت کے بعد ایک مرتبہ بلند آواز سے یہ تکبیر کہنا واجب ہے اور تین مرتبہ کہنا افضل ہے۔ عید گاہ آتے اور جاتے بھی با آواز بلند یہ تکبیر کہنا چاہیے۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

﴿کتابُ النکاح﴾

خفیہ نکاح کا شرعی حکم

سوال: بعض اوقات لڑکا لڑکی خفیہ طور پر نکاح کر لیتے ہیں اس میں یا تو دونوں کے والدین کی رضامندی شامل نہیں ہوتی یا لڑکی کے والدین کی رضامندی شامل نہیں ہوتی بلکہ بعض صورتوں میں انہیں اطلاع تک نہیں ہوتی ایسے نکاح کا شرعی حکم کیا ہے ایک مولوی صاحب نے اخبار میں لکھا ہے کہ ایسا نکاح باطل ہے؟ (امیر الدین، حیدرآباد سندھ)

جواب: ''خفیہ نکاح'' سے کیا مراد ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی تنہائی میں ایجاب و قبول کرلیں تو ایسا نکاح فاسد ہے کیونکہ صحت نکاح کے لئے دو عاقل و بالغ مسلمان مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی شرط ہے، یعنی یہ کہ وہ ایسے دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کریں خواہ بذات خود لڑکا اور لڑکی ایجاب و قبول کریں یا اپنے مجاز وکیل کے ذریعے۔ یہاں تک کہ علامہ علاؤ الدین حصکفی نے فتاویٰ درمختار میں لکھا ہے کہ اگر لڑکا اور لڑکی نے خلوت میں ایجاب و قبول کیا اور یہ کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنا کر نکاح کرتے ہیں تو نکاح جائز نہیں۔ اگر خفیہ نکاح سے مراد یہ ہے کہ کسی نے والدین کی رضا مندی اور اجازت کے بغیر نکاح کرلیا ہے، نکاح کرنے والی لڑکی بالغہ ہے اور اس نے نکاح اپنے ہم منصب کے ساتھ یعنی کفو میں کیا ہے نکاح کا انعقاد مجلس میں گواہوں کی موجودگی میں ہوا ہے۔ لڑکی نے برضا و رغبت براہ راست یا اپنے وکیل مجاز کی معرفت ایجاب و قبول کیا ہے تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اخلاقاً ایسا نہیں ہونا چاہیے بہت سے امور اخلاقی اقدار کے خلاف ہونے کے باوجود قانونی اور شرعی طور پر نافذ ہو جاتے ہیں اور موثر ہوتے ہیں، لیکن جس معاشرے میں دفاتر اور اداروں میں مرد و زن کا آزادانہ اختلاط ہو، تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم ہو لڑکیوں کے گھروں سے باہر حجاب شرعی کے بغیر آزادانہ آمدورفت ہو تو ایسے معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے، فقط اس کی تمنا اور آرزو کی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر لڑکی نے اپنا نکاح برضا و رغبت کیا ہے مگر غیر کفو میں کیا ہے یعنی وہ رشتہ داری، حسن و جمال، منصب اور پیشے کے اعتبار سے اس کے خاندان کے

لئے باعث عار ہے تو اس سلسلے میں فقہاء کرام کی مختلف آراء ہیں، بعض کے نزدیک یہ نکاح جائز ہی نہیں ہے جب کہ ولی اس پر راضی نہ ہو وہ اسے فسخ کر سکتا ہے، بعض کے نزدیک ولی کو اس سلسلے میں عدالت کے ذریعے نکاح کو فسخ کرانے کا حق حاصل ہے، بعض کے نزدیک ہم کفو ہونے کے لئے اسلام ہی کافی ہے۔ تاہم موجودہ شہری معاشرے میں جہاں انسان مخلوط ہوں، دین داری اور تقویٰ کو چھوڑ کر دولت ہی معیار عزت قرار پائے وہاں یہ ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس کا ہم کفو ہے اور کون نہیں ہے، بلکہ یہ بحث ہی بے معنی ہو جاتی ہے اگر ہمیں ان نتائج سے بچنا ہے تو اپنی اولاد کی دینی تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ٹیلی فون پر نکاح

سوال: میں نے اپنی کزن کے ساتھ تین گواہوں کی موجودگی میں فون پر نکاح کیا ہے جب کہ میں کراچی میں تھا اور لڑکی سرحد میں، کیا یہ نکاح ہو گیا؟ (نسیم اختر، لی مارکیٹ، کراچی)

جواب: شرعاً نکاح کے جواز کے لئے شرط یہ ہے کہ مجلس نکاح میں دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول ہو، فریقین (یعنی لڑکا اور لڑکی) دونوں موجود ہوں اور براہ راست ایجاب وقبول کریں یا وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک موجود نہ ہو تو اپنے اپنے وکیل کے ذریعے ایجاب وقبول کر سکتے ہیں، حکومت کے مجوزہ نکاح نامے میں دونوں کے وکیل مع گواہوں کے کالم اور دستخطوں کی نشاندہی موجود ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لڑکا محض نکاح میں موجود ہوتا ہے اور لڑکی کی طرف سے اس کا وکیل مجاز ایجاب وقبول کرتا ہے جو باقاعدہ گواہوں کی موجودگی میں لڑکی سے نکاح کی اجازت لے کر آتا ہے، لہٰذا اگر لڑکے یا لڑکی نے جو محفل نکاح میں اصالتہً یا وکالتہً موجود نہیں ہے، محض ٹیلی فون پر ایجاب و قبول کیا تو یہ نکاح شرعاً نہیں ہوا اور وہ بدستور ایک دوسرے کے اجنبی ہیں۔ ایسے نکاح کے جواز کی شرعی صورت یہ ہے کہ لڑکا یا لڑکی جو مجلس نکاح میں موجود نہیں، تحریری طور پر یا ٹیلی فون پر کسی کو اپنا وکیل بنالے اور وہ وکیل اس کی جانب سے بالمشافہ ایجاب وقبول کرے تو یہ شرعاً جائز ہوگا۔ آپ کے نکاح میں چونکہ یہ شرط مفقود ہے لہٰذا آپ کا نکاح شرعاً نہیں ہوا

اوراس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

سول میرج کی شرعی حیثیت

سوال: ''سول میرج'' کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (شاہد، کراچی)

جواب: لڑکی اپنا شناختی کارڈ، میڈیکل سرٹیفکیٹ یا کوئی بھی دستاویزی ثبوت پیش کر کے کسی مجاز عدالت کے سامنے اپنے آپ کو شناخت کرا کے اپنی بلوغت کا ثبوت پیش کر دے اور عدالت کو مطمئن کر دے کہ وہ اپنی آزادانہ مرضی سے بلا جبر کسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ عدالت اس کو مطمئن ہونے کے بعد اجازت دے دے اور وہ اپنے پسندیدہ شخص سے باقاعدہ نکاح کر لے تو اسے عرف عام اور قانون کی اصطلاح میں ''سول میرج'' کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں والدین اور سرپرست کی مرضی اور اجازت شامل نہیں ہوتی۔ تاہم قانوناً یہ شادی منعقد ہو جاتی ہے۔ اس سے معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں بعض اوقات نوبت قتل تک جا پہنچتی ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے شادی کے لئے عاقلہ و بالغہ لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔ لہٰذا والدین کو چاہیے کہ وہ شادی کے لئے لڑکی کی آزادانہ مرضی ضرور معلوم کر لیں۔ لڑکی کو بھی چاہیے کہ وہ جذباتی فیصلہ نہ کرے کیونکہ جذباتی فیصلے بعض اوقات تباہ کن ثابت ہوتے ہیں اور ایسی شادیاں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ لڑکی اگر ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو کے ساتھ شادی کر لے تو ولی کو عدالت کے ذریعے نکاح فسخ کرانے کا حق حاصل ہے، کفو سے مراد یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی حسب ونسب مال و دولت، دین داری اور صنعت و حرفت یعنی پیشہ کے لحاظ سے ہم پلہ ہوں۔ آج کل کے جدید شہری ماحول میں عہدہ ومنصب اور تعلیم بھی اس معیار میں شامل ہے۔

محرم اور صفر میں نکاح

سوال: کیا محرم اور صفر میں نکاح کرنا منع ہے؟ (سید اکرم شاہ، لسبیلہ، کراچی)

جواب: محرم، صفر یا سال کے کسی بھی مہینے میں نکاح کرنا منع نہیں ہے۔

مایوں اور مہندی کی شرعی حیثیت

سوال: مایوں اور مہندی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (شہناز شاہد و شاز یہ ڈینیل، کراچی)

جواب: مایوں اور مہندی کی شرعی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے یہ معاشرتی رسوم ہیں لیکن اگر ان میں خلاف شرع باتیں شامل ہوں مثلاً بے پردگی، گانا بجانا، مرد وزن کا اختلاط وغیرہ تو ان محرمات کے سبب یہ حرام ہوں گی۔ شرعاً صرف نکاح ہے یعنی مجلس میں گواہوں کی موجودگی میں تاکہ اس کا اعلان ہو جائے اور شرعی حجاب کے ساتھ باوقار انداز میں رخصتی ہے اور شب زفاف کے بعد ولیمہ سنت ہے باقی سب خرافات ہیں۔

قرآن میں نکاح کا لکھنا

سوال: ایک شخص نے قرآن مجید کے اندر یہ لکھا کہ میں اپنی بیٹی کا نکاح فلاں شخص سے کراؤں گا، بعد میں اس نے کسی اور سے اپنی بیٹی کا نکاح کرا دیا، کیا یہ نکاح ہو گیا؟ نکاح پڑھانے والے کا کیا حکم ہے؟ (محمد علی جلبانی، ٹنڈو الہ یار)

جواب: مذکورہ بالا صورت میں کسی شخص کا یہ کہنا یا لکھنا کہ میں اپنی بیٹی کا نکاح فلاں شخص سے کراؤں گا۔ یہ نکاح منعقد نہیں ہوا بلکہ یہ محض ارادہ نکاح ہے لہٰذا وہ اپنی بیٹی کا نکاح شریعت کے مطابق کسی سے بھی کرا سکتا ہے اور وہ نکاح جائز ہوگا اور اس کا پڑھانا بھی جائز ہے۔ البتہ کسی سے یہ کہا ہو کہ میں اپنی بیٹی کا نکاح تم سے یا تمہارے بیٹے سے کراؤں گا تو بھی یہ نکاح منعقد نہیں ہوا ہاں اس طرح کا وعدہ کر کے خلاف ورزی کی ہو تو وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔ قرآن مجید ان کاموں کے لئے، قسمیں کھانے کے لئے نازل نہیں ہوا، یہ تو کتاب ہدایت ہے، تلاوت کرنے، سمجھنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کے لئے ہے۔

قادیانی مرد سے مسلمان عورت کا نکاح

سوال: کیا کسی قادیانی مرد (جس کے قادیانی ہونے پر تین یا اس سے زائد افراد گواہی دے چکے ہوں) کو حنفی مسلمان لڑکی کا رشتہ دینا جائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو ایسی صورت میں

لڑکی کے والدین اور لڑکی کے لئے کیا حکم ہے؟ کیا یہ سب دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے یا نہیں؟ اس رشتے کی حمایت کرنے والے افراد کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(اے آفتاب، لانڈھی، کراچی)

جواب: کوئی شخص پہلے مسلمان تھا اور پھر اسلام سے منحرف ہو کر قادیانی ہو گیا تو یہ مرتد ہے اور مرتد سے مسلمان کا نکاح باطل ہے، اگر کسی شخص کا باپ یا دادا مرتد ہو کر قادیانی ہو گیا تھا بعد میں اس کے اولاد ہوئی جو اس باطل عقیدے پر قائم رہی تو یہ لوگ کافر ہیں اور کافر سے بھی مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور مشرک مردوں کے ساتھ (مومن عورتوں کا) نکاح نہ کراؤ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں'' (البقرہ: 221) اس آیت میں مشرک سے نکاح کی ممانعت کے حکم میں کافر، مجوسی اور بت پرست سب شامل ہیں۔ جو مسلمان والدین جان بوجھ کر حلال سمجھ کر اپنی بیٹی کا نکاح قادیانی کے ساتھ کریں تو اس سے کفر لازم آتا ہے انہیں چاہیے کہ فوراً توبہ کریں اور تجدید نکاح کریں۔

تجدید ایمان اور تجدید نکاح

سوال: تجدید ایمان اور تجدید نکاح کا فتویٰ ایک مسلمان پر کب لگایا جائے گا؟

(چشتی دلبر چوہان، گلشن حدید، ضلع ملیر، کراچی)

جواب: زوجین میں سے جب کسی ایک سے کفر سرزد ہو جائے گا تو ان کا نکاح باطل ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو جاتے ہیں، جس شخص (شوہر ہو یا بیوی) نے ارتکاب کفر کیا ہے، اس پر لازم ہے کہ کفر سے توبہ کرے، تجدید ایمان کرے اور دو گواہوں کی موجودگی میں تجدید نکاح کریں، لیکن یہ تجدید نکاح عورت کی رضامندی پر موقوف ہے، یک طرفہ طور پر نہیں ہو سکتا، باقاعدہ ایجاب وقبول ہوگا اور مہر بھی مقرر کیا جائے گا۔ اب رہا سوال کہ کن صورتوں میں کسی پر التزام کفر کیا جائے گا تو سارے کفریات کا احاطہ ممکن نہیں ہے تاہم چند اصولی باتیں سمجھ لیں۔ مثلاً سارے قرآن مجید یا کسی ایک آیت کا انکار کرنا، مطلقاً حدیث کا انکار کرنا، دین کے ان سب عقائد، ارکان اور اصول یا ان میں سے کسی ایک

کا انکار جونصوص صریحہ قطعیہ سے ثابت ہیں، توہین رسالت اور مسلمہ شعائر دین کی توہین وتحقیر، شریعت کے حلال کوحرام قرار دینا اور حرام کو حلال قرار دینا، جیسے زنا، سرقہ، قتل اور شراب نوشی کوحرام جان کر کرنا گناہ کبیرہ، فسق وفجور اور ضلالت ہے اوران گناہوں میں سے کسی ایک کوحلال سمجھ کر کرنا کفر ہے۔ باقی جب کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس کے بارے میں سیاق وسباق کو سامنے رکھ کرفتویٰ صادر کیا جاتا ہے۔

نامناسب حرکت

سوال: شوہر اگر غلطی سے اپنی بیوی کا دودھ چوس لے تو کیا اس سے نکاح پر اثر پڑے گا؟
(ش ب، جگہ نامعلوم)

جواب: انسانی جزو سے نفع اٹھانا حرام وممنوع ہے۔ لہٰذا آپ کے شوہر کا یہ فعل شرعاً حرام ہے، تاہم اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ رضاعت یعنی دودھ کے رشتے سے جو حرمت نکاح ثابت ہوتی ہے، وہ ایام رضاعت (مدت شیرخوارگی) تک محدود ہے اوراس کی زیادہ سے زیادہ مدت شرعاً دو سال کی عمر تک ہے اور بعض فقہاء سے احتیاط ڈھائی سال تک کا قول مروی ہے۔

مہر کی شرعی مقدار

سوال: مہر کی شرعی مقدار کیا ہے یا مہر شرعی کسے کہتے ہیں؟ (سید ذاکر شاہ، لانڈھی، کراچی)

جواب: مہر شرعی وہی ہے جس پر فریقین نکاح کا آپس میں اتفاق ہو جائے، شریعت نے اس کی کوئی انتہائی حد مقرر نہیں کی بلکہ اسے فریقین کی باہمی رضامندی پر چھوڑا ہے اوراس میں مختلف مالی حیثیتوں کے افراد کے لئے کم یا زیادہ کی گنجائش رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے زیادہ مقدار میں مہر مقرر کرنے پر گرفت فرمانا چاہی تو ایک عورت نے کھڑے ہو کر دریافت کیا کہ جس چیز کو شریعت نے کھلا چھوڑا ہے، آپ کو اس کی تحدید کا کیا حق ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خاتون کے موقف کو درست تسلیم کرتے ہوئے فرمایا ”عورت نے درست کہا، عمر کی بات غلط ہے“۔ بس شرط

یہ ہے کہ محض کسی کو دباؤ میں رکھنے کے لئے بھاری مہر مقرر نہیں کرنا چاہیے جب کہ نظریہ یہ ہو کہ کس کو لینا ہے اور کس کو دینا ہے، کیونکہ یہ سوچ شریعت کی منشا اور روح کے خلاف ہے۔ ادا کرنے کی نیت بھی ہو اور ادا کرنا بھی چاہیے۔ البتہ حدیث پاک میں کم از کم مہر کی مقدار دس درہم (یعنی تقریباً 30.618 گرام چاندی یا اس کی قیمت) مقرر کی گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت خدیجہ کا خطبۂ نکاح

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جب حضرت خدیجہ سے نکاح ہوا تو اس کا خطبہ کس نے پڑھا اور اس کے کلمات کیا تھے؟ (فاطمہ بنت عبداللہ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جب حضرت خدیجہ سے نکاح ہوا تو اس وقت آپ کی عمر 25 سال اور حضرت خدیجہ کی عمر 40 سال تھی۔ تقریب نکاح میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے وکالت کا فریضہ آپ کے چچا حضرت ابو طالب نے انجام دیا اور حضرت خدیجہ کی وکالت ان کے چچا عمرو بن اسد نے کی۔ تقریب نکاح میں قبیلہ مضر کے رؤساء اور مکہ کے امراء و اشراف جمع تھے۔ حضرت ابو طالب نے جو فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا، اس کا ترجمہ یہ ہے:

"سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں حضرت ابراہیم کی اولاد سے، حضرت اسماعیل کی کھیتی سے، معد کی نسل سے اور مضر کی اصل سے پیدا فرمایا۔ نیز ہمیں اپنے گھر کا پاسبان اور اپنے حرم کا منتظم مقرر کیا، ہمیں ایک ایسا گھر دیا جس کا حج کیا جاتا ہے اور ایسا حرم بخشا جہاں امن میسر آتا ہے، نیز ہمیں لوگوں کا حکمران مقرر کیا۔ حمد کے بعد، میرا یہ بھتیجا جس کا نام محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے، اس کا دنیا کے جس بڑے سے بڑے آدمی کے ساتھ موازنہ کیا جائے گا، اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ اگر یہ مالدار نہیں تو کیا ہوا، مال تو ایک ڈھلنے والا سایہ ہے اور بدل جانے والی چیز ہے۔ اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس کی قرابت کو تم خوب جانتے ہو، اس نے خدیجہ بنت خویلد کا رشتہ طلب کیا ہے اور ساڑھے بارہ اوقیہ سونا مہر مقرر کیا ہے اور بخدا مستقبل میں اس کی شان بہت بلند ہوگی"۔

﴿کتاب الطلاق﴾

طلاق کا احسن طریقہ

سوال: طلاق اگرچہ ایک انتہائی ناپسندیدہ فعل ہے، لیکن بعض اوقات اس کی نوبت آہی جاتی ہے۔ طلاق دینے کا احسن طریقہ کیا ہے جس کے نتیجے میں پیچیدگیاں کم سے کم ہوں؟
(سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال)

جواب: اسلامی تعلیمات کا منشا اور مزاج یہی ہے کہ عورت، مرد کے مابین ''رشتہ مناکحت'' تاحیات قائم رہے، مگر بعض حالات میں طلاق اور خلع کا راستہ کھلا ہے۔ طلاق کی وہ صورت جسے فقہانے ''احسن'' قرار دیا ہے اور اسے ''طلاق سنی'' سے تعبیر کیا ہے درج ذیل ہے۔ (نوٹ: ''طلاق سنی'' کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ طلاق دینا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، البتہ آپ ﷺ نے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت حفصہ کو طلاق دی تھی، لیکن بعد میں رجوع کرلیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ طلاق کا وہ طریقہ ہے جو خود رسول اللہ ﷺ نے تعلیم فرمایا) شوہر نے جن ایام طہر (پاکیزگی، یہ اصطلاح ''حیض'' کے مقابلے میں استعمال ہوتی ہے) میں اپنی بیوی سے ہم بستری نہ کی ہو، ان میں اپنی بیوی کو ایک ''طلاق رجعی'' دے دے یعنی یوں کہے کہ ''میں نے تمہیں ایک طلاق دی''۔ یا ''میں تمہیں ایک طلاق دیتا ہوں''۔ اس کے بعد تین حیض گزرنے پر ''عدت'' مکمل ہو جاتی ہے۔ ''طلاق رجعی'' کا فائدہ یہ ہے کہ ''عدت'' کے دوران یہ شوہر جب چاہے رجوع کرسکتا ہے، اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہ رجوع عمل سے بھی ہوسکتا ہے۔ محض زبانی یہ کہہ کر بھی کہ ''میں رجوع کرتا ہوں'' اور اس کے لئے کسی فتوے یا عدالتی فیصلے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ بہ حیثیت مسلمان مسئلہ شرعیہ معلوم ہونا چاہیے، اور اگر خدانخواستہ شوہر نے عدت کے اندر رجوع نہ کیا ہو تو عدت گزرنے پر یہی ''طلاق رجعی'' ایک ''طلاق بائن'' ہو جاتی ہے اور میاں بیوی جب چاہیں بغیر کسی ''حلالے'' یا کسی رکاوٹ کے باہمی رضامندی سے دوبارہ عقد نکاح کرسکتے ہیں اور اس عقد ثانی کے بعد صرف ایک تبدیلی رونما ہوگی کہ شوہر کو آئندہ صرف دو طلاقوں کا حق حاصل رہے گا، اور آئندہ اگر کسی وجہ سے اس نے ''دو طلاقیں'' (ایک ساتھ یا الگ

الگ وقفوں میں) دیں تو طلاق مغلظہ ہو جائے گی۔

طلاق لینے کا طریقہ

سوال: طلاق لینا چاہتی ہوں، کیا طریقہ اختیار کروں؟ (زینب حبیب، کراچی)

جواب: اگر شوہر صحیح ہو، شریعت کے مطابق تمام حقوق ادا کر رہا ہو، اپنی مالی حیثیت کے مطابق نان و نفقہ یعنی خوراک، لباس اور رہن سہن کی سہولتیں بھی دے رکھی ہوں تو طلاق لینا شرعاً انتہائی ناگوار بات ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری بھی ہے، حتی الامکان کوشش کر کے اپنے جذبات و خواہشات کو قابو میں رکھیں۔ اگر خدانخواستہ آپ اپنے جذبات سے ایسی ہی مغلوب ہیں کہ آپ کے لئے اللہ تعالیٰ کی حدود میں رہ کر شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنا مشکل ہے، یا خدانخواستہ آپ کسی گناہ میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو پھر قرآن مجید نے گلو خلاصی کی یہ صورت سورۃ البقرہ میں تعلیم فرمائی ہے کہ عورت اپنا حق مہر معاف کر دے یا لے رکھا ہے تو شوہر کو واپس کر دے اور شوہر اس کے بدلے میں اسے آزادی دے دے، یہ شریعت کی اصطلاح میں "خلع" کہلاتا ہے، اس سے ایک طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے دوبارہ دلوں کو مائل فرما دے تو دونوں باہمی رضامندی سے نکاح کر سکتے ہیں، عدت کے اندر بھی اور عدت کے بعد بھی۔ "خلع" کی یہ صورت عدالت کے باہر بھی ہو سکتی ہے، اس کے لئے عدالت سے رجوع کرنا ضروری نہیں ہے۔

تحریری طلاق

سوال: میری شادی تین سال قبل ہوئی تھی۔ میری بیوی گاؤں میں رہتی ہے، میں نے اسے تین طلاقیں لکھ کر بھیجی ہیں، کیا اس طرح طلاق واقع ہو جاتی ہے؟۔

(نظام الدین بالادی، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی)

جواب: طلاق زبانی دی جائے یا تحریری طور پر واقع ہو جاتی ہے اور تین طلاقیں دینے سے عورت حرام ہو جاتی ہے، لہٰذا اب وہ آپ کی بیوی نہیں رہی، اور جس وقت تین طلاق لکھ کر دی ہے، عدت کا حساب اس وقت سے ہوگا۔

طلاق مغلظہ کے باوجود بیوی کا شوہر کے ساتھ رہنا اور اولاد کے نسب کا مسئلہ

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور اس کے بعد وہ میاں بیوی بدستور ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے، طلاق کے تقریباً 6 ماہ بعد ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی اور اب وہ دوبارہ پانچ ماہ کی حاملہ ہے، اس دوران شوہر نے بیوی پر دباؤ ڈالا کہ وہ طلاق کے معاملے کو صیغہ راز میں رکھے۔ مگر جب بیوی کے والدین کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنی بیٹی کو اپنے ہاں بلوایا۔ اب شوہر نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ نیوٹاؤن مسئلہ معلوم کرنے گئے تھے مگر وہاں کوئی عالم نہ ملا، پھر انہوں نے ایک وکیل سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ طلاقیں تین طہر میں الگ الگ دینے سے موثر ہوتی ہیں، ورنہ نہیں، تم مزے سے زندگی گزارو۔ شوہر نے یہ بھی عذر تراشا کہ وہ طلاقیں دیتے وقت غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ بعد میں وہ بڑا پچھتایا، لیکن سارا واقعہ اسے پوری طرح یاد ہے اور معلوم ہے، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ (۱) آیا تین طلاقیں دیتے ہی واقع ہوگئی تھیں؟ (۲) اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کے بعد دونوں کے میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے کا کیا حکم ہے؟ (۳) عدت کب سے شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی؟ (۴) پہلی بچی کے نسب کا کیا حکم ہے؟ (۵) دوسرے حمل سے پیدا ہونے والے بچے کا حکم؟ (۶) جن لوگوں یا خاندان کے افراد نے طلاق سے باخبر ہونے کے باوجود اس جوڑے کے ساتھ میل جول رکھا، ان کا کیا حکم ہے؟ (۷) وکیل صاحب کا کیا حکم ہے؟

(عبداللہ، دستگیر کالونی، کراچی)

(نوٹ: تفصیلی سوال کا خلاصہ درج کیا گیا ہے)

جواب: صورت مسئولہ میں بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق دیتے وقت خاتون حاملہ تھی کیونکہ تین طلاقیں شوہر نے 14 اپریل 99ء کو دیں اور 10 اکتوبر 99ء کو بچی پیدا ہوئی۔ تاہم حالت حمل میں بھی طلاق دی جائے تو شرعاً موثر ہوتی ہے اور اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ لہٰذا 10 اکتوبر 99ء کو بچی پیدا ہوتے ہی عدت ختم ہوگئی اور اب وہ خاتون

شوہر کے لئے مکمل طور پر اجنبی ہوگئی۔ ایک مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں تو وہ شرعاً تین ہی شمار ہوتی ہیں، اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے اور طلاق ثلاثہ مغلظہ کے بعد شوہر کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ عدت کے اندر بھی وطی کرنا حرام ہے، لہٰذا دوران عدت اگر میاں بیوی مباشرت کرتے رہے ہیں تو انہیں حرام اور گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ توبہ کرتے رہنا چاہیے۔ اس بچی کے ثبوت نسب میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ یہ اس شخص کی صحیح النسب بیٹی ہے اور اس کی وارث بھی بنے گی۔ پہلی بچی کی پیدائش کے بعد جوان دونوں نے میاں بیوی کے طور پر رہتے ہوئے زندگی گزاری اور اس دوران جتنی بار بھی مباشرت کی، وہ شرعاً زنا کے حکم میں ہے، جو گناہ کبیرہ ہے اور دونوں کو تاحیات اس ارتکاب گناہ پر اللہ تعالیٰ سے عجز و نیاز کے ساتھ اور صدق دل سے معافی مانگتے رہنا چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ (اس جرم کو تو) معاف نہیں فرماتا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جس کے لئے چاہے سب گناہوں کو بخش دیتا ہے''۔ لیکن یہ عفو و مغفرت بندے کا حق نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان کرم پر موقوف ہے۔ اس گناہ کی تلافی کا مالی کفارہ نہیں ہے۔ شوہر کا یہ کہنا کہ وہ غنودگی یا نیند کے عالم میں تھا، اس لئے درست نہیں کہ انہیں سب کچھ یاد ہے، اپنی غلطی اور اس کی سنگینی کا بھی انہیں اس وقت احساس تھا۔ دارالاسلام میں احکام شرعیہ ضروریہ سے جہالت عذر نہیں ہے، اور کراچی جیسے شہر میں مسائل شرعیہ بتانے والے سینکڑوں علماء موجود ہیں اور دسیوں دارالافتاء ہیں، ایک نیوٹاؤن ہی نہیں ہے۔ تاہم وکیل کے گمراہ کرنے پر چونکہ انہیں بقاء نکاح کا شبہ تھا اور خاتون بدستور ان کے فراش پر رہیں، لہٰذا بچہ ثابت النسب ہوگا۔ خاتون کے سابق شوہر کی اولاد ہو گا اور اس کا وارث بھی بنے گا۔ اور دونوں بچوں کی کفالت کے مصارف ان کے باپ کے ذمے ہوں گے۔

فتاویٰ عالمگیری جلد 1 صفحہ 540 پر ہے:

ولو طلقها ثلاثاثم تزوجها قبل ان تنكح زوجا غيره

فجاء ت منه بولد ولا یعلمان بفساد النکاح فالنسب ثابت وان کانا یعلمان بفساد النکاح یثبت النسب ایضا عند ابی حنیفۃ۔

”یعنی اگر شوہر نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، پھر قبل اس کے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرتی (اور وہ اس کو طلاق دیتا اور عدت گزر جاتی) اس نے اس سے نکاح (ثانی) کرلیا اور اس کے نتیجے میں بچہ پیدا ہوگیا اور ان دونوں (میاں بیوی) کو فساد نکاح کا علم نہیں تھا تو بچے کا نسب ثابت ہو جائے گا، اور اگر انہیں فساد نکاح کا علم بھی تھا تب بھی امام ابوحنیفہ کے نزدیک بچہ ثابت النسب ہوگا“۔

نوٹ: اس جیسی صورتحال میں جو سوال میں مذکور ہے، اگر قرب وجوار کے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ طلاق مغلظہ کے باوجود، وہ لوگ میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں تو انہیں ایسے لوگوں کو فہمائش کرنی چاہیے اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں تو ان کا سماجی مقاطعہ کرنا چاہیے۔

اسی طرح اگر خاوند کے والدین اور اہل خانہ طلاق مغلظہ کا علم ہونے کے باوجود سکوت اختیار کیے رہیں تو وہ بھی شدید گنہگار ہیں اور انہیں توبہ کرنی چاہیے۔ جس وکیل نے گمراہ کیا ہے وہ بھی ضال اور مضل ہے اور اسے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہیے۔

حاملہ کو طلاق

سوال: کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ حاملہ ہے تو کیا ایسی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی؟ (سید عزیز برنی، دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: کسی بات کا اخلاقاً معیوب ہونا، شقاوت اور سنگ دلی کا مظہر ہونا، بے مروتی اور قطع رحمی کا باعث بننا اور اس کا قانوناً وشرعاً نافذ ہونا، دو الگ امور ہیں۔ ہماری روزمرہ زندگی میں بہت سی ایسی باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں جو انتہائی بداخلاقی کے زمرے میں آتی ہیں۔

لیکن ان کے ارتکاب سے قانونی وفطری نتائج ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ حالت حمل میں دی گئی طلاق کی بھی یہی صورتحال ہے کہ اگرچہ یہ انتہائی سنگ دلی، بے رحمی اور بے مروتی کی بات ہے، لیکن اگر خدانخواستہ کسی نے اپنی حاملہ بیوی کو طلاق دے دی تو ضرور واقع ہو جائے گی، سورۃ الطلاق آیت نمبر 4 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے'' یعنی بچہ پیدا ہوتے ہی عدت ختم ہو جائے گی اور فرمان باری تعالیٰ ہے ''اگر وہ (طلاق یافتہ عورتیں) حاملہ ہوں تو وضع حمل تک انہیں نفقہ دو''۔ قرآن کا حاملہ عورت کی عدت بیان کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ حالت حمل میں طلاق واقع اور موثر ہو جاتی ہے۔

طلاق کا حق بیوی کو دینا

سوال: نکاح کے وقت اگر شوہر اپنی بیوی کو طلاق کا حق تفویض کرنا چاہے تو کیا یہ درست ہے؟ اس کا صحیح شرعی طریقہ کیا ہے؟ (انیسہ کریم، کھارادر، کراچی)

جواب: شوہر چاہے تو طلاق کا حق بیوی کو تفویض کر سکتا ہے، لیکن یہ تب ہوگا جب عورت اس کے نکاح میں آجائے۔ اس کا صحیح شرعی طریقہ یہ ہے کہ نکاح کے وقت لڑکی براہ راست لڑکے سے کہے ''میں نے اپنے نفس کو اتنے مہر کے عوض اس شرط کے ساتھ تیرے نکاح میں دیا کہ بعد میں جب کبھی بھی میں چاہوں، مجھے خود کو طلاق دینے کا اختیار حاصل ہوگا''۔ یا لڑکی کا وکیل لڑکے سے کہے کہ ''میں اپنی مؤکلہ فلاں بنت فلاں کو اتنے مہر کے عوض اس شرط کے ساتھ تیرے نکاح میں دیا کہ بعد میں جب کبھی میری موکلہ چاہے اسے اپنے آپ کو طلاق دینے کا اختیار حاصل رہے گا''۔ اور ان دونوں صورتوں میں لڑکا اصالتاً یا وکالتاً کہے کہ مجھے اس شرط کے ساتھ آپ سے نکاح قبول ہے، تو ایسی صورت میں وہ نکاح منعقد ہو جائے گا اور بیوی کو تاحیات غیر مشروط حق طلاق حاصل رہے گا۔ اور اگر نکاح کے وقت لڑکی اس دائمی اختیار طلاق کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کر دے کہ مثلاً (ا) اگر تو نے مجھے نان نفقہ نہ دیا (ب) یا تو نے مجھے مارا پیٹا (ج) یا تو نے مجھے والدین سے ملنے نہ دیا وغیرہ تو ان شرائط کے پانے کی صورت میں اسے اختیار طلاق حاصل ہوگا ورنہ نہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طلق بائن کا ایک دقیق فقہی مسئلہ

علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی رئیس: دارالافتاء، دارالعلوم امجدیہ سے ایک علمی بحث

موضوع بحث

POINT OF DISCUSSION

''طلاق بائن کو دوسری طلاق بائن صرف اس وقت لاحق ہوتی ہے، جب دوسری کو پہلی کی خبر بنانا ممکن نہ ہو، خواہ دوسری بائن سے بھی طلاق کی نیت کی ہو''۔

پس منظر

ایک مستفتی ''محمد عتیق اللہ'' طلاق کا ایک استفتاء لے کر دارالعلوم امجدیہ میں علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کے پاس گیا، انہوں نے صورت مسئولہ کو دیکھ کر'' طلاق مغلظہ'' کا فتویٰ صادر فرمایا، فتویٰ کے استدلال کی بنیاد علامہ شامی کی اس عبارت پر تھی کہ تَلْحَقُ الْبَائِنَ فِیْ ظَاھِرِ الرِّوَایَۃِ بِشَرْطِ النِّیَّۃِ (جلد2،صفحہ 145)اس عبارت کا مفہوم انہوں نے یہ سمجھا کہ:''اگر شوہر نے اپنی بیوی کو ایک طلاق بائن دی ہو اور پھر بہ نیت طلاق دوسری طلاق بائن دے دے تو یہ دوسری طلاق بائن، پہلی بائن کو لاحق ہو جاتی ہے''۔

مستفتی کے سوال اور علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کے جواب کی عبارت لفظ بہ لفظ درج ذیل ہے:

الاستفتاء

بخدمت جناب مفتی صاحب

السلام علیکم!

میں ایک شرعی مسئلے کی بابت آپ سے مشورہ چاہتا ہوں کہ میرا ایک بھائی غصہ کی حالت میں اپنی بیوی کو ایک مرتبہ کہتا ہے میں نے تمہیں طلاق دی اس کے تیسرے دن

دوبارہ رجوع کرلیا۔ اس کے تقریباً پانچ ماہ گزرنے کے بعد غصہ کی حالت میں اس نے اپنی بیوی سے دو مرتبہ کہا ''میں نے تمہیں آزاد کیا، میں نے تمہیں آزاد کیا''۔

برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں اس مسئلے کو حل فرمائیں کیا شوہر اپنی بیوی سے دوبارہ رجوع کرسکتا ہے یا نہیں؟ (سائل: محمد عتیق اللہ، سیکٹر 11-BB246 نارتھ، کراچی)

باسمہ تعالیٰ

الجواب: یہ سوال خود شوہر محمد سمیع اللہ ولد محمد یاسین نے ہمارے دارالافتاء آکر پیش کیا ہے اس نے اپنے سوال میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی بیوی سیدہ روبی تبسم بنت پرویز حسین کو پہلے ایک طلاق دی پھر تیسرے دن رجوع بھی کرلیا۔ اس کے تقریباً پانچ ماہ بعد غصہ کی حالت میں دو مرتبہ یہ کہا ''میں نے تمہیں آزاد کیا، میں نے تمہیں آزاد کیا''۔ صورت مسئولہ میں جب شوہر نے ایک طلاق دی تھی، تو یہ ایک طلاق رجعی واقعہ ہوئی تھی۔ طلاق رجعی کا حکم یہ ہے کہ شوہر اگر چاہے تو عدت کے اندر رجوع کرسکتا ہے۔ رجوع قول سے بھی ہوتا ہے اور فعل سے بھی۔ شوہر نے تیسرے دن جب رجوع کرلیا تو اس کا رجوع کرنا صحیح تھا اور یہ رجوع بھی ہوگیا تھا اور شمار میں یہ طلاق باقی رہی۔ مگر جب اس کے بعد اس نے یہ کہا کہ (۱) ''میں نے تمہیں آزاد کیا'' (۲) ''میں نے تمہیں آزاد کیا'' تو ہم نے خود شوہر سے جب یہ دریافت کیا کہ دوسری مرتبہ جو آپ نے لفظ آزاد کہا، اس سے آپ کی کیا مراد تھی؟۔ تو اس نے ہمیں زبانی بتایا کہ میری دوسرے لفظ سے مراد بھی طلاق تھی۔ لہٰذا جب دوسرے لفظ ''تمہیں آزاد کیا'' سے بھی شوہر نے طلاق کی نیت کی، تو اس صورت میں یہ طلاق بائن دوسری بائن طلاق کو لاحق ہوگئی اور یہ طلاق بائن اس سے قبل دی گئی طلاق سے مل کر تین طلاقیں ہوئیں۔ چنانچہ فتاوی شامی میں ہے: تَلْحَقُ الْبَائِنَ فِيْ ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ بِشُرُوْطِ النِّيَّةِ (جلد 2، صفحہ 145) لہٰذا شخص مذکورہ کی بیوی پر تین طلاق واقع ہوگئیں اور اس کی بیوی بحرمت مغلظہ اس پر حرام ہوگئی۔ اب ان دونوں کا دوبارہ آپس میں نکاح بھی بغیر حلالہ شرعی نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم میں ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ

زَوْجًا غَیْرَہٗ۔ یعنی پھر اگر تیسری طلاق اسے دی، تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

عبدالعزیز حنفی غفرلہ

دارالافتاء دارالعلوم امجدیہ عالمگیر روڈ کراچی

10 رجب المرجب 1419ھ، 31 اکتوبر 1998ء

ہماری دانست میں علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کا یہ فتوی درست نہیں تھا، ہمارا حسن ظن یہ تھا کہ ہوسکتا ہے کہ کثرت مشاغل اور قلت توجہ کے سبب مفتی صاحب سے تسامح ہوگیا ہو، لہٰذا ہم نے اس فتوے کا صحیح جواب مفصل و مدلل لکھا اور مفتی صاحب سے گزارش کی کہ وہ دلائل شرعیہ کی روشنی میں اپنی غلطی پر مطلع ہونے کے بعد اپنے سابق فتوے سے رجوع فرمائیں اور درست فتویٰ جاری فرمائیں۔ بعینہٖ اسی مسئلے پر ہمارا فتویٰ درج ذیل ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الجواب هو الموفق للصواب، بتوفيق الله ووسيلة حبيبه الكريم عليه الصلوٰة والتسليم

صورت مسئولہ میں مسمی محمد سمیع اللہ نے اپنی بیوی کو ایک طلاق رجعی دی اور پھر دوران عدت رجوع کرلیا، یہ درست ہے۔ لیکن یہ طلاق مجموعی نصاب طلاق میں شامل ہونے کے لئے بدستور موثر رہے گی۔ اس کے بعد اس نے اپنی بیوی سے بہ نیت طلاق کہا: "میں نے تمہیں آزاد کیا، میں نے تمہیں آزاد کیا"۔ یہ طلاق بائن کے کلمات ہیں۔ درمختار میں "اَنْتِ حُرَّۃٌ" (تو آزاد ہے) کو طلاق بائن کے کلمات میں شمار کیا ہے، اور اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے: "اَنْتِ حُرَّۃٌ" (تو آزاد ہے) اور "اَعْتَقْتُکِ" (میں نے تمہیں آزاد کیا)، معنی مترادف ہیں (ردالمحتار صفحہ 245 جلد 2 مطبوعہ بیروت) فتاوی عالمگیری مطبوعہ کوئٹہ صفحہ 376 جلد 1) میں بھی یہی درج ہے۔

اس تمہید کی روشنی میں پیش آمدہ صورتحال میں محمد سمیع اللہ کی بیوی کو ایک طلاق بائن

واقع ہوگئی اور پہلی طلاق رجعی کے ساتھ مل کر مجموعی طور پر دو طلاقیں واقع ہو چکی ہیں، اور اب فریقین عدت کے دوران یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضا مندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں، لیکن آئندہ شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کی گنجائش باقی رہے گی اور خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو حرمت مغلظہ ہو جائے گی۔

دارالعلوم امجدیہ کے فاضل مفتی کا "میں نے تمہیں آزاد کیا، میں نے تمہیں آزاد کیا" کو دو بائن طلاقیں شمار کر کے اسے حرمت مغلظہ قرار دینا درست نہیں ہے، کیونکہ درمختار علی ہامش ردالمحتار (جلد 2، صفحہ 471-470) مطبوعہ بیروت میں ہے۔

اِذَا أَمْكَنَ جَعْلُهُ اِخْبَارًا عَنِ الْاَوَّلِ كَانْتَ بَائِنٌ كَانْتِ بَائِنٌ بَائِنٌ أَوْ أَبَنْتُكِ بِتَطْلِيقَةٍ فَلَا يَقَعُ لِاَنَّهُ اِخْبَارٌ فَلَا ضَرُوْرَةَ فِيْ جَعْلِهِ اِنْشَاءً بِخِلَافِ أَبَنْتُكِ بِأُخْرٰى أَوْ أَنْتِ طَالِقٌ بَائِنٌ۔

"طلاق بائن کو (دوسری) بائن لاحق نہیں ہوتی، جب کہ دوسری کو پہلی کی حکایت و خبر قرار دینا درست ہو، جیسے شوہر یوں کہے: تو بائن ہے، بائن ہے یا یہ کہے کہ میں نے تجھے ایک طلاق بائن دی۔ تو یہ دوسری بائن واقع نہیں ہو گی، کیونکہ یہ پہلی ہی کی حکایت و خبر ہے۔ تو اسے انشاء یعنی نئی طلاق قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر وہ کوئی ایسے کلمات کہہ دے جنہیں پہلی کی خبر قرار دینا ممکن نہ ہو تو وہ دوسری طلاق شمار ہو گی، جیسے یوں کہے کہ: "میں نے تجھے دوسری طلاق بائن دی"۔

اسی طرح فتاوی عالمگیری (صفحہ 377) جلد 1) مطبوعہ کوئٹہ میں ہے:

لَا يَلْحَقُ الْبَائِنُ الْبَائِنَ بِاَنْ قَالَ لَهَا ۔ طلاق بائن، بائن کو لاحق نہیں ہوتی، مثلاً

أَنْتِ بَائِنٌ، ثُمَّ قَالَ لَهَا أَنْتِ بَائِنٌ، لَا يَقَعُ اِلَّا طَلْقَةٌ وَّاحِدَةٌ بَائِنَةٌ لِاَنَّهُ يُمكِنُ جَعْلُهُ خَبراً عَنِ الْاَوَّلِ۔

کسی نے اپنی بیوی سے کہا، تو بائن ہے، پھر اس نے کہا تو بائن ہے، تو اس سے ایک ہی طلاق بائن واقع ہو گی، کیونکہ دوسری کو پہلی کی حکایت و خبر قرار دینا ممکن ہے۔

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہل سنت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز سے مسئلہ دریافت کیا گیا کہ:

ایک شخص نے بحالت غصہ اپنی زوجہ سے بہ نیت طلاق ایک وقت میں تین بار کہا کہ ''میں نے تجھے آزاد کیا'' اس صورت میں کون سی طلاق واقع ہو گی مغلظہ یا بائنہ یا رجعی؟

آپ نے جواباً ارشاد فرمایا:

یہاں تین طلاق کا حکم دینا یوں غلط ہے کہ تمام متون و شروح و فتاویٰ میں تصریح ہے کہ کنایہ بائنہ طلاق بائن کے بعد طلاق جدید نہیں ٹھہرتا بلکہ اسی طلاق اول سے اخبار ہوتا ہے ''اِلَّا اَنْ یَّنُصَّ بِمَا لَا یَحْتَمِلُهٗ'' (یعنی سوائے اس کے کہ ایسے الفاظ سے تصریح کر دے کہ پہلی طلاق بائن کی حکایت و خبر واقع ہونے کا سرے سے احتمال ہی نہ رکھے) اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے درمختار کی وہ عبارت استشہاد کے طور پر نقل فرمائی ہے، جس کا ہم اوپر حوالہ (مع ترجمہ) دے چکے ہیں، (فتاویٰ رضویہ صفحہ 585 ،جلد 12 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور) اسی طرح اسی ایڈیشن کے صفحہ 578 پر اعلیٰ حضرت رقم طراز ہیں کہ: ''اگر زید نے ان تینوں لفظوں میں کل یا بعض کسی سے طلاق دینے کا قصد کیا تھا تو ایک طلاق بائن واقع ہوئی''۔ پھر آگے اعلیٰ حضرت نے فتاویٰ عالمگیری کی وہ عبارت بطور استشہاد درج فرمائی ہے، جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اسی طرح اسی ایڈیشن کے صفحہ 572 پر اعلیٰ حضرت ''فَاِنَّ الْبَائِنَ لَا یَلْحَقُ الْبَائِنَ کَمَا فِی الْمُتُوْنِ'' کہہ کر فرماتے ہیں: ''صورت مذکورہ میں طلاق مغلظ تو کسی طرح نہ ہوئی، ہاں اگر ان چار لفظوں میں جو زید

نے کہے اگر کسی ایک لفظ یا دو تین یا چاروں سے عورت کو طلاق دینے کی نیت زید نے کی تو ایک طلاق بائن ہوگئی''۔

مفتی دارالعلوم امجدیہ نے فتاویٰ شامی صفحہ 645، جلد 2 کے حوالے سے اپنے موقف کے حق میں یہ عبارت نقل کی ہے: ''تَلْحَقُ الْبَائِنَ فِیْ ظَاهِرِ الرِّوَایَةِ بِشَرْطِ النِّیَّةِ'' یہ عبارت سیاق وسباق کے بغیر نامکمن و ناتمام نقل کی گئی ہے، پہلے اصل عبارت ملاحظہ ہو:

وَاَماَّ الْکِنَایَةُ الرَّوَاجِعُ کَاِعْتَدِّیْ وَ اسْتَبْرِئِیْ رَحِمَکِ وَاَنْتِ وَاحِدَةٌ وَمَا اَلْحَقِ بِهَا فَاِنَّهَا وَاِنْ کَانَتْ تَلْحَقُ الْبَائِنُ فِی ظَاهِرِ الرِّوَایَةِ بِشَرْطِ النِّیَةِ لٰکِنَّهَا لَمَّا وَقَعَ بِهَا الرَّجْعِیُّ کَانَتْ فِی مَعْنَی الصَّرِیْحِ کَمَا فِی الْبَدَائِعِ اَیْ فَهِیَ مُلْحِقَةٌ بِالصَّرِیْحِ فِیْ حُکْمِ اللَّحَاقِ لِلْبَائِنِ اَفَادَهٗ فِی الْبَحْرِ۔

''اور لیکن وہ کنایات جن سے رجعی طلاقیں واقع ہوتی ہیں جیسے اِعْتَدِّیْ، اِسْتَبْرِئِیْ، رَحِمَکِ، اَنْتِ وَاحِدَةٌ اور ان سے ملتے جلتے کلمات، یہ اگرچہ نیت طلاق کی شرط کے ساتھ ظاہر الراویہ کے مطابق بائن کو لاحق ہوتے ہیں، لیکن چونکہ ان سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے لہٰذا یہ معنیٰ صریح ہیں، جیسے ''بَدَائِعُ الصَّنَائِعِ'' میں ہے، یعنی یہ بائن کو لاحق ہونے میں طلاق صریح کے حکم میں ہیں، اَلْبَحْرُ الرَّائِقُ کا یہی مستفاد ہے۔

چونکہ کتب فقہ وفتاویٰ کی مغلق عبارات کو محض سرسری نظر سے سمجھنا اور مصنف کے اصل مفہوم تک رسائی حاصل کرنا دشوار امر ہے، اسی لئے مفتی دار العلوم امجدیہ نے یہاں کئی ٹھوکریں کھائی ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) انہوں نے سیاق وسباق سے غیر مربوط ناقص وناتمام عبارت نقل کر دی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحیح مفہوم کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا۔ یہ پوری عبارت استفتاء کے جواب سے متعلق ہی نہیں ہے، استفتاء میں تو یہ سوال سامنے آیا کہ: آیا طلاق بائن، بائن کو لاحق ہوتی ہے یا نہیں؟

علامہ شامی کی محولہ بالا عبارت بنیادی طور پر اس امر سے بحث کرتی ہے کہ "طلاق صریح، طلاق بائن کولاحق ہوتی ہے، تو دونوں صورتوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

(۲) علامہ شامی نے دراصل اس عبارت میں طلاق رجعی کی دو قسمیں یا دو صورتیں بیان فرمائی ہیں، ایک یہ کہ لفظاً اور معنیً دونوں اعتبار سے طلاق صریح ہو جیسے "اَنْتِ طَالِقٌ" اس کے بائن کولاحق ہونے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ لفظاً تو صریح نہ ہو لیکن معنیً صریح ہو، جیسے اِعْتَدِّیْ، اِسْتَبْرِئِیْ، رَحِمَکِ، اَنْتِ وَاحِدَۃٌ وَغَیْرُھا، انہیں علامہ شامی "الکنایات الرواجع" کی اصطلاح استعمال کر کے ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اگر ایسے کلمات نیت طلاق کے ساتھ کہے جائیں تو یہ "ظاہر الروایہ" کے مطابق بائن کے ساتھ لاحق ہو جاتے ہیں، یعنی چونکہ ان کلمات سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے، اس لئے بائن کے ساتھ "لحاق" کے معاملے میں یہ طلاق صریح ہی کے حکم میں ہیں۔ ان ادلہ کی روشنی میں دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اپنے فتوے پر نظر ثانی فرمائیں۔

مفتی منیب الرحمن

مہتمم دار العلوم نعیمیہ

11 رجب المرجب 1419ھ، 9 نومبر 1998ء

نوٹ: علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کے استدلال کی بنیاد اس بات پر تھی کہ شوہر نے جب دو بار کہا "میں نے تمہیں آزاد کیا" تو اس سے دو بائن طلاقیں واقع ہو گئیں اور دلیل یہ دی کہ بائن کو بائن لاحق ہوتی ہے، جب یہ فتویٰ ہمارے پاس آیا تو ہم نے 9 نومبر 1998ء کو متعدد حوالہ جات کے ساتھ اس جواب کا رد لکھا اور ثقہ علماء کرام اور مفتیان عظام نے اس کی بھرپور تائید کی۔ ان مؤیدین میں جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور اور تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان کے ناظم اعلیٰ علامہ مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی کی ذات گرامی بھی شامل ہے، جن کی سرپرستی و نگرانی میں رضا فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام فتاویٰ رضویہ کی تخریج، تحقیق اور عربی عبارات کے تراجم کے ساتھ جدید دلکش انداز میں طباعت و اشاعت کا عظیم منصوبہ گزشتہ کئی

برسوں سے انتہائی کامیابی اور سرعت رفتار کے ساتھ جاری وساری ہے۔

ہمارے استدلال کی بنیاد اس مسلمہ فقہی اصول پر تھی کہ طلاق بائن کو دوسری بائن صرف اس وقت لاحق ہوتی ہے جب دوسری کو پہلی کی خبر بنانا ممکن نہ ہو، اور صورت مسئولہ میں دوسری بائن کو پہلی بائن کی خبر بنانا ممکن ہے، اس لئے صرف ایک طلاق بائن واقع ہوئی اور پہلی طلاق صریح کو ملا کر یہ دو طلاقیں واقع ہوئیں۔ اور اب زوجین عدت کے دوران یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ ہمارا مدلل و مفصل فتویٰ سطور بالا میں آپ نے ملاحظہ فرمایا، لیکن مقام افسوس ہے کہ مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب قبول حق پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس کے بعد کی پیش رفت حسب ذیل ہے:

29 نومبر 1998ء کو دارالعلوم امجدیہ کے مفتی صاحب نے بزعم خویش ہمارے جواب کا رد لکھا اور اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی، اس پر 10 دسمبر 1998ء کی تاریخ کے ساتھ حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا قادری ازہری کی تائید بھی ثبت ہے، لیکن ایسے مبہم انداز میں جسے کسی بھی فتوے پر ثبت کیا جا سکتا ہے۔ ہم تک یہ ''جواب الجواب'' رمضان المبارک سے قبل پہنچا۔ ان کا مکمل نظر ثانی شدہ جوابی فتویٰ، جس میں انہیں اپنے سابقہ موقف پر اصرار ہے، ''متابعۃ الجواب'' کی صورت میں ہمیں موصول ہوا۔ اس لئے ہم آئندہ سطور میں اس کا ذکر اسی عنوان سے کریں گے۔ پہلے مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کا ''متابعۃ الجواب'' ملاحظہ فرمایئے۔

متابعۃ الجواب

سائل محمد عتیق اللہ کی جانب سے طلاق کے بارے میں ہم سے جو سوال کیا گیا تھا ہم نے اس سلسلے میں میاں بیوی دونوں کو اپنے دارالافتاء میں بلایا شوہر محمد سمیع اللہ ولد محمد یاسین نے ہمارے سامنے جو تفصیلی بیان دیا اس کی فوٹو کاپی بھی ہم من وعن اس جواب کے ساتھ منسلک کر رہے ہیں۔ شوہر کا بیان یہ ہے:

''عرض یہ ہے کہ میں محمد سمیع اللہ ولد محمد یاسین شوہر روبی تبسم نے اپنی بیوی سے روزمرہ

کی لڑائی جھگڑے کے باعث اوران کے مطالبہ پرایک طلاق دی تھی تاکہ بیوی اپنی اصلاح کرے اورمزید طلاق کی نوبت نہ آئے اس کے بعد بیوی نے یقین دہانی کرائی کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا، اس یقین دہانی کے بعد میں نے رجوع کر لیا اور ہم میاں بیوی کی طرح رہے۔لیکن تھوڑے عرصے کے بعد پھروہی لڑائی جھگڑا شروع ہوگیا پھر میں نے سمجھایا کہ یہ طریقہ اچھا نہیں ہے اس طرح گھر بسنے کی بجائے اجڑ جاتا ہے بہت سمجھانے اور اصلاح کرنے کے باوجود میری بیوی کو سمجھ نہ آیا۔ برابرلڑائی جھگڑا بحث ومباحثہ کرتی رہی اور کئی مرتبہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ کیا آخر کار میں نے مجبور اور تنگ ہوکر اپنی زوجیت سے خارج کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ جان کر کہ ایک طلاق تو میں نے پہلے دے دی تھی جس سے میں نے رجوع کرلیا تھا۔اب مزید دوطلاق دے کر اپنی زوجیت سے ہمیشہ کے لئے خارج کردوں لہٰذا میں نے اسی ارادہ اور نیت سے دومرتبہ لفظ آزاد کہا میں نے لفظ اس طرح سے ادا کیا ''میں نے تمہیں آزاد کیا، میں نے تمہیں آزاد کیا''۔ یہ دولفظ میں نے علیحدہ علیحدہ طلاق کی نیت سے ادا کیا۔ یعنی پہلا لفظ میں نے تمہیں آزاد کیا اس سے بھی طلاق کی نیت کی اور دوسری مرتبہ بھی میں نے تمہیں آزاد کیا اسے بھی میں نے تیسری طلاق کی نیت سے کہا یعنی دومرتبہ میری مراداورنیت علیحدہ علیحدہ طلاق ہی کی تھی''۔

اس بیان کے حوالہ سے شریعت کی روشنی میں ہم نے اس کا جو جواب دیا تھا وہ صحیح ہے۔ مگر دارالعلوم نعیمیہ کراچی کے پروفیسر صاحب نے اپنی غلط فہمی کی وجہ سے اسے غلط ثابت کرنے بلکہ حرام کو حلال بنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ نیز پروفیسر صاحب نے جتنی بھی عبارات نقل کی ہیں اس میں انہوں نے وہ عبارات نقل نہیں کی جن سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ جب دوسرے لفظ بائن سے دوسری طلاق کی نیت کرے تو یہ دوسری طلاق ہے اور جو عبارت ہم نے پیش کی ہے اسے ناتمام ونامکمل سمجھا یہ ان کی فہم کا قصور ہے۔

(۱)اولاًان کو یہ جاننا اور سمجھنا چاہیے کہ کسی مسئلہ کی تائید میں اسی قدر عبارت پیش کی جاتی ہے جتنی کہ نفس مسئلہ سے متعلق ہوتی ہے،تمام صفحات تحریر نہیں کیے جاتے،واضح رہے کہ الفاظ

کنایات سے جب نیت طلاق ہو یا دلالت حال یعنی مذاکرہ طلاق ہو یا پھر طلاق کے وقت شوہر حالت غضب میں ہو تو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ الفاظ کنایات طلاق کے لئے تو وضع نہیں کیے گئے ہیں دوسرے معنی کا بھی احتمال رکھتے ہیں۔ چنانچہ درمختار میں ہے:

(کنایة) عِنْدَ الْفُقَهَاءِ (مَالَمْ يُوْضَعْ لَهُ) اَیِ الطَّلَاقِ (وَاحْتَمَلَهُ) وَغَيْرَهُ وَالْكِنَايَاتُ (لَا تُطَلَّقُ بِهَا) قَضَاءً (اِلَّا بِنِيَّةٍ اَوْ دَلَالَةِ الْحَالِ) وَهِيَ حَالَةُ مَذَاكِرَةُ الطَّلَاقِ اَوِ الْغَضَبِ فَالْحَالَاتُ ثَلَاثٌ رِضًا وَّغَضَبٌ وَّ مَذَاكِرَةٌ

(صفحہ 635 جلد 2)

یہ تین حالات ہیں اور دلالت حال کی وجہ سے تو تمام الفاظ کنایات سے طلاق واقع ہوتی ہے۔ لیکن اس بات کی فخر الاسلام وغیرہ بعض مشائخ نے مخالفت کی ہے انہوں نے فرمایا الفاظ کنایات میں بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جب تک ان سے نیت طلاق نہ ہو اس وقت تک طلاق واقع نہیں ہوتی چنانچہ فتاوی شامی میں ہے۔

اِنَّ الْكِنَايَاتِ كُلَّهَا يَقَعُ بِهَا الطَّلَاقُ وَقَدْ تَبِعَ فِیْ ذَالِکَ الْقَدُوْرِیْ وَالسَّرْخسِیّ فِیْ الْمَبْسُوْطِ وَخَالَفَهَا فَخْرُ الْاِسْلَامِ وَغَيْرُهُ مِنَ الْمَشَائِخِ فَقَالُوْا بَعْضُهَا لَا يَقَعُ بِهَا اِلَّا بِالنِّيَّةِ (صفحہ 236 جلد 2)

اور بائن کو بائن اس وقت تک لاحق نہیں ہوتی جب تک دوسری بائن کو پہلی طلاق سے خبر بنانا ممکن ہو۔ چنانچہ درمختار میں ہے:

لَا يَلْحَقُ الْبَائِنُ الْبَائِنَ اِذَا اَمْكَنَ جَعْلُهُ اِخْبَارًا عَنِ الْاَوَّلِ كَانْتَ بَائِنٌ بَائِنٌ اَوْ اَبَنْتُکِ بِتَطْلِيْقَةٍ فَلَا يَقَعُ لِاَنَّهُ اِخْبَارٌ فَلَا ضَرُوْرَةَ فِی جَعْلِهِ اِنْشَاءً (درمختار صفحہ 648 جلد 2)

اور جب دوسری کو پہلی سے خبر بنانا ممکن نہ ہو تو دوسری انشاء طلاق کے لئے ہوگی اور یہ

اس صورت میں جب کہ لفظ منافی ہو دوسری کو پہلی سے خبر بنانے یا دوسری بائن سے وہ دوسری طلاق کی نیت کرے تو اس نیت کی وجہ سے دوسری کو پہلی کی خبر نہیں بنا سکتے۔ چنانچہ علامہ شامی نے اِذَا اَمْکَنَ پر لکھا:

قَالَ فِی الْبَحْرِ وَیَنْبَغِیْ اَنَّہٗ اِذَا اَبَانَھا ثُمَّ قَالَ لَھَا اَنْتِ بَائِنٌ نَاوِیاً طَلْقَۃً ثَانِیَۃً اَنْ تَقَعَ الثَّانِیَۃُ بِنِیَّۃٍ لِاَنَّہٗ بِنِیَّۃٍ لَا یَصْلُحُ خَبَرًا (صفحہ 648 جلد 2)

بحر میں فرمایا اور مناسب ہے کہ جب شوہر نے بیوی کو بائن طلاق دی پھر اسے دوسری طلاق کی نیت کرتے ہوئے کہا تو بائن ہے تو شوہر کی نیت کی وجہ سے یہ دوسری طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس لئے کہ شوہر کی نیت کی وجہ سے یہ دوسری پہلی کی خبر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس کے بعد فرمایا فھو کما ابنتک باُخریٰ یعنی یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ کہے میں نے تجھے بائن کیا دوسری طلاق سے۔ تو جس طرح لفظ اُخریٰ کی وجہ سے اس دوسری طلاق بائن کو پہلی سے خبر نہیں بنا سکتے اسی طرح دوسرے لفظ بائن سے طلاق ثانی کی نیت کی تو اس صورت میں بھی اس دوسری بائن طلاق کو پہلی بائن سے خبر نہیں بنا سکتے لہٰذا یہ دوسری بائن اس صورت میں پہلی بائن کو لاحق ہو گی۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ اگر الفاظ کنایہ کی تکرار سے محض طلاق کی نیت کی تو اس سے تو ایک طلاق واقع ہو گی اس صورت میں کنایہ بائن پہلی بائن کو لاحق نہیں ہو گی مگر جب دوسری بائن سے دوسری بائن طلاق کی نیت کرے تو اس صورت میں یہ دوسری پہلی کو لاحق ہو گی۔

اور حضرت صدر الشریعہ خلیفہ اعلیٰ حضرت مفتی امجد علی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب ''بہار شریعت'' میں درمختار اور ردالمحتار کے حوالے سے یہی مسئلہ تحریر فرمایا ہے جو ہم نے اپنے جواب میں تحریر کیا۔ فقہ حنفی کی اردو میں سب سے پہلی مستند و معتمد و متفق علیہ و مایہ ناز کتاب ''بہار شریعت'' (شرعی مسائل کا انسائیکلو پیڈیا) میں ہے ''اور بائن بائن کو لاحق نہیں ہوتی جب کہ یہ ممکن ہو کہ دوسری کو پہلی کی خبر دینا کہہ سکیں مثلاً پہلے کہا تھا کہ تو بائن ہے اس

کے بعد پھر یہ لفظ کہا تو اس سے دوسری واقع نہ ہوگی کہ یہ طلاق کی خبر ہے یا دوبارہ کہا میں نے تجھے بائن کر دیا اور اگر دوسری سے پہلے کو خبر دینا نہ کہہ سکیں مثلاً پہلے طلاق بائن دی پھر کہا میں نے دوسری بائن دی تو اب دوسری پڑے گی یونہی پہلی صورت میں بھی دو واقع ہوں گی جب کہ دوسری طلاق کی نیت ہو"۔ (بہار شریعت صفحہ 19، جلد 8)

(۲) ثانیاً: دار العلوم نعیمیہ کے پروفیسر صاحب نے خود اپنے فتوے میں منقولہ فقہ کی عبارت اِلَّا اَنْ یَّنصَّ لِمَا لَا یَحْتَمِلُهٗ پر بھی غور نہیں کیا یہ عبارت تو ہماری مؤید ہے اور افسوس یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لکھے ہوئے ہی کو نہ سمجھا۔

(۳) ثالثاً۔ دار العلوم نعیمیہ کراچی کے پروفیسر صاحب نے اعلیٰ حضرت محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ رضویہ سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں انہوں نے قطع و برید سے کام لیا فتاویٰ رضویہ میں اور ہم سے پوچھے گئے استفتاء میں موجود فرق کو بھی نہیں سمجھا وہاں صرف تین مرتبہ الفاظ کنایہ استعمال کیے گئے ہیں نیت کا تذکرہ نہیں ہے جب کہ یہاں ہم سے پوچھے گئے استفتاء میں سائل خود تصریح کر رہا ہے کہ اس نے دوسری مرتبہ جو کہا کہ "تمہیں آزاد کیا ہے" سے علیحدہ دوسری طلاق کی نیت ہے، اور یہ پہلی سے مل کر تیسری طلاق ہے اس فرق کو سمجھنا ہر ذی عقل پر لازم ہے اور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے درمختار کی جو عبارت لَا یَلْحَقُ الْبَائِنُ الْبَائِنَ اِذَا اَمْکَنَ جَعْلَهٗ اِخْبَارًا لکھی تھی پروفیسر صاحب نے وہ مکمل عبارت نہیں لکھی جس سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ طلاق بائن بائن کو اس وقت لاحق نہیں ہوتی جب دوسری بائن کو پہلی بائن کی خبر بنا سکتے ہوں۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے جیسا کہ خود اس کے آخر میں لکھا کہ یہاں ایک پڑنے کی صحیح وجہ یہ ہے کہ جو فقیر نے بیان کی اور اعلیٰ حضرت عظیم البرکت محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ وجہ درمختار کے حوالے سے یہ بیان فرمائی یہاں دوسری طلاق بائن کو پہلی کی خبر بنا سکتے ہیں لہٰذا دوسری بائن کو انشائے طلاق بنانا کوئی ضروری نہیں بخلاف اَبَنْتُکِ بِاُخْرٰی برخلاف اس کے کہ شوہر نے اَبَنْتُکِ بِاُخْرٰی کہا تو اس صورت میں دوسری بائن کو پہلی بائن سے خبر بنانا ممکن نہیں۔ یا پھر شوہر دوسری بار

لفظ بائن طلاق ثانی کی نیت سے کہے تو اس صورت میں بھی دوسری بائن طلاق ہوگی۔ تو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے جو لکھا ہے وہ حق ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب نے اسے سمجھا نہیں اس لئے کہ صرف الفاظ کنایات کی تکرار سے تو ایک ہی طلاق ہوتی ہے جب کہ ہر لفظ سے جداگانہ طلاق کی نیت نہ ہو اگر ان میں سے کسی لفظ سے شوہر کی نیت طلاق کی نہ ہو تو اصلاً کچھ بھی واقع نہیں ہوتا لیکن جب دوسرے لفظ بائن سے دوسری طلاق کی نیت کی تو اس نیت کی وجہ سے دوسری بائن طلاق واقع ہوگی۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے بھی خود اس بات کی تصریح فرمائی ہے۔ فتاویٰ رضویہ جلد پنجم صفحہ 417 میں ہے:

ثُمَّ مَا اَفَادُوْا هٰهُنَا مِنْ اَنَّهٗ لَوْ نَوٰى بِطَالِقٍ وَّاحِدَةً وَبِبَائِنٍ اُخْرٰى يُؤَيِّدُ مَا سَنُحَقِّقُهٗ اِذَا اَرَادَ بِقَوْلِهٖ اَنْتِ بَائِنٌ بَائِنٌ بَائِنَتَيْنِ فَهُوَ كَمَا نَوٰى وِفَاقًا لِلْعَلَامَةِ الْبَحْرِ مُلْتَقَطًا۔

یعنی جس نے اپنے قول اَنْتِ بَائِنٌ بَائِنٌ سے دو بائن طلاق مراد لی تو پس وہ ویسی ہیں جیسی اس نے نیت کی علامہ بحر کا اس پر اتفاق ہے۔ جامعہ اسلامیہ گلستان جوہر کراچی کے مفتی صاحب بھی دارالعلوم نعیمیہ کراچی کے پروفیسر کی رو میں بہہ گئے اسی لئے تو انہوں نے بھی لکھا کہ "بائن بائن کو لاحق نہیں ہوتی اور اس کی وجہ صرف ثانی کا اول کے لئے خبر بننے اور حکایت ہونے کا امکان ہے" "نیت کچھ بھی ہو" ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ "نیت کچھ بھی ہو"۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کتب فقہ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ جب دوسری بائن سے شوہر دوسری طلاق کی نیت کرے تو اب نیت کی وجہ سے ثانی کو اول کے لئے خبر نہیں بنا سکتے۔ جامعہ اسلامیہ گلستان جوہر کے مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ علامہ شامی نے بحرالرائق کا رد فرمایا اس سے نفس مسئلہ کے متعلق ہمارے دیئے گئے جواب میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اس لئے کہ علامہ شامی کے رد کرنے سے علامہ بحر کے قول کو ناقابل دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ علامہ بحر کا بھی فقہ میں ایک اعلیٰ مقام ہے اور خاص اسی عبارت پر اعلیٰ حضرت مجدد دین و ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حاشیہ جدالممتار علی ردالمحتار مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی صفحہ نمبر 531

پر یہ عبارت:

''اَقُوْلُ لَا یَرْتَابُ اَحَدٌ اَنَّ الْکِنَایَاتِ لَا بُدَّلَهَا مِنْ نِیَّةٍ لٰکِنْ هٰهُنَا ثَلٰثَةُ اَشْیَاءَ نِیَّةُ الطَّلَاقِ عَلَی الْاِطْلَاقِ وَهٰذَا هُوَ الَّذِیْ لَا بُدَّ مِنْهُ فِی الْکِنَایَاتِ وَنِیَّةُ التَّاکِیْدِ وَنِیَّةُ الْاِسْتِیْنَافِ بِاَنْ یُّرِیْدَ وَیَقْصِدُ اِیْقَاعَ طَلَاقٍ جَدِیْدٍ غَیْرَ الْاَوَّلِ وَالْعَلَّامَةُ الْبَحْرِ لَا یَقُوْلُ بِاشْتِرَاطِ نِیَّةِ التَّاکِیْدِ حَتّٰی یَرِدَ عَلَیْهِ اَنَّهُمْ لَمْ یَشْتَرِطُوْا ذٰلِکَ بَلْ اِنَّمَا یَقُوْلُ بِاشْتِرَاطِ عَدَمِ نِیَّةِ الْاِسْتِیْنَافِ کَقَوْلِهٖ اَبَنْتُکِ بِاُخْرٰی فَاِنَّ الْوُقُوْعَ اِنَّمَا هُوَ بِاَبَنْتُکِ لَا بِاُخْرٰی وَاِنَّمَا هُوَ مُعَیَّنٌ لِنِیَّةِ الْاِسْتِیْنَافِ عِنْدَ النَّاسِ فَلَمْ لَا تَکْفِیْهِ نِیَّةُ فِیْمَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ رَبِّهٖ وَکَلَامُهُمْ غَیْرُ صَرِیْحٍ فِیْ اَنَّهٗ لَا یُقْبَلُ مِنْهُ الْاِسْتِیْنَافُ اَصْلًا، وَاِنْ نَوٰی وَیُحْمَلُ عَلَی التَّاکِیْدِ جَبْرًا عَلَیْهِ وَکَرْهًا وَهَلْ هُوَ اِلَّا حَجْرٌ لَّهٗ عَنْ تَصَرُّفِ قَصْدِهٖ قَصْدًا خَاصًّا مَعَ کَوْنِهٖ اَهْلًا، وَالْمَرْاَةُ مَحَلًّا، وَاللَّفْظُ صَالِحًا وَهُوَ الْمُشَدِّدُ عَلٰی نَفْسِهٖ، فَلِمَ لَا یُقْبَلُ فَیَتَاَمَّلُ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ''۔

کو پڑھ لیتے تو ان کو شاید یہ تائید کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی اور اب رہی ان کی یہ بات کہ ''استثناء'' ہوتا تو فقہاء اس پر تحریر فرماتے اتنی تعجب خیز بات ہے جوش مخالفت کے باعث ان کو یہ معلوم نہ ہوا کہ اِذَا اَمْکَنَ کی قید اس کا فائدہ دے رہی ہے۔ اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دینے والے نعیمیہ کے پروفیسر صاحب پر تعجب ہے کہ انہوں نے فقہ کی عبارت کا معنی ہی نہ سمجھا اِذَا اَمْکَنَ والی عبارت میں یہ ہے کہ جب دوسری کو خبر بنانا ممکن ہو جب خبر بنایا جائے گا ورنہ وہ انشاء ہوگی اور انہوں نے انشاء کو ہی ناممکن بنادیا لہٰذا یہ حضرات اپنی تحریرات پر نظر ثانی کریں۔

عبدالعزیز حنفی غفرلہ

دارالافتاء دارالعلوم امجدیہ عالمگیر روڈ کراچی

9 شعبان المعظم 1419ھ، 29 نومبر 1998ء

تائید

علامہ مفتی محمد اختر رضا خان القادری الازہری صاحب مدظلہم

لَقَدْ اَصَابَ مَنْ اَجَابَ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاِلَیْهِ

الْمَرْجِعُ وَالْمَآبُ وَاَنَا الْفَقِیْرُ اِلٰی رَحْمَةِ اللّٰهِ الْمُفْتِیْ

مُحَمَّد اَخْتَرْ رَضَا الْقَادِرِیُ الْاَزْهَرِیْ غُفِرَلَهٗ

20 شعبان المعظم 1419ھ

10-12-98

نوٹ: مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب نے اپنے سابق موقف پر اصرار کرتے ہوئے یہ ''متابعۃ الجواب'' تحریر فرمایا اور ہمارے حسن ظن کے برعکس قبول حق پر آمادہ نہ ہوئے تو ہم نے ان کی مزید تشفی اور احقاق حق کے لئے ''ردمتابعۃ الجواب'' لکھا جو سطور ذیل میں پیش خدمت ہے۔

رد ''متابعۃ الجواب''

(۱) مسلمہ اصول کی خلاف ورزی

جب کسی مسئلے، فتویٰ یا عبارت پر کوئی علمی مناقشہ ومباحثہ شروع ہو جائے تو اصل مبحث (Point of Duscussion) وہی عبارت رہتی ہے نہ کہ اس کی کوئی تبدیل شدہ ترمیم شدہ صورت، تبدیل شدہ عبارت کو سابقہ بحث کی متابعت (Follow up) قرار دینا، دیدہ ودانستہ فریب دہی اور خیانت کہلائے گی یا نرم سے نرم الفاظ میں اسے خود فریبی ہی کہیں گے، خاص طور پر اس صورت میں جب یہ انجام کار سعی لاحاصل ٹھہرے اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔

(۲) استفتاء میں لفظی ومعنوی تحریف

ایک دن مسماۃ روبی تبسم کے بھائی اور مسمّی محمد سمیع اللہ ہمارے دارالعلوم میں آئے اور

بتایا کہ دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب نے ہمیں گھر پر فون کر کے دوبارہ بلایا ہے، ہم نے کہا ضرور جائیے، ہوسکتا ہے کہ مفتی صاحب نے حق منکشف ہونے اور اتنے وقیع علماء کی تائیدات پڑھ کر اپنے موقف پر نظر ثانی کی ہو اور اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر لیا ہو، کیونکہ کسی بھی حق پرست عالم دین کا شعار یہی ہوتا ہے کہ وہ حق آشکار ہونے کے بعد اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور درحقیقت اس میں علم کا وقار اور عالم حق کی عظمت کا راز مضمر ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ واپس پلٹ کر ہمارے پاس آئے تو بتایا کہ مفتی صاحب نے مستفتی سے ایک نیا بیان لکھوایا ہے اور فرمایا ہے کہ ''اب یہ میری عزت کا مسئلہ ہے'' ایسے ہی موقع کے لئے قرآن نے فرمایا:

وَاِذَا قِیۡلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتۡہُ الۡعِزَّۃُ بِالۡاِثۡمِ (بقرہ:206)

''اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر، تو پندار نفس اسے گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے''۔

ورنہ ہماری ناموس و آبرو تو ناموس دین کا صدقہ اور ناموس سید الابرار کا صدقہ ہے، بقول اعلیٰ حضرت عظیم البرکت،

تری بات کوئی کیوں پوچھے رضا   تجھ سے کتے ہزار پھرتے ہیں

چنانچہ علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی نے اپنی زیر نگرانی مرتبہ دوسرے استفتاء میں کئی ایسے جملے شامل فرما دیئے جو ان کے اصل استفتاء و فتویٰ میں ہرگز مذکور نہ تھے۔ مثلاً:

(۱) آخر کار میں نے مجبور اور تنگ ہو کر اپنی زوجیت سے خارج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ (۲) یہ جان کر کہ ایک طلاق تو میں نے پہلے ہی دے دی تھی جس سے میں نے رجوع کر لیا تھا، اب مزید دو طلاق دے کر اپنی زوجیت سے ہمیشہ کے لئے خارج کر دوں۔ (۳) یہ دو لفظ میں نے علیحدہ علیحدہ طلاق کی نیت سے ادا کیے۔ (۴) اور دوسری مرتبہ بھی میں نے تمہیں آزاد کیا، اسے بھی میں نے تیسری طلاق کی نیت سے کہا۔ یعنی دونوں مرتبہ میری مراد اور نیت علیحدہ علیحدہ طلاق ہی کی تھی وغیرہ۔

اس تحریر کے انصاف پسند اور جویائے حق قارئین اور اہل علم سے میری مؤدبانہ و عاجزانہ گزارش ہے کہ علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کے اولین استفتاء وفتویٰ کا مکمل متن۔ جسے ہم نے اس بحث کے شروع میں من وعن نقل کر دیا اور مفتی صاحب موصوف کے ''متابعۃ الجواب'' میں جو تحریف کر کے ایک بالکل نیا استفتاء مرتب کیا گیا ہے، ایک بار رک کر پھر دونوں کو پڑھیں، مقام حیرت ہے کہ صورت مسئلہ یا واقعہ ایک ہی ہے، مستفتی اور مفتی بھی وہی ہیں، تو پھر استفتاء میں ترمیم وتحریف کیوں؟ کیا یہ اہل حق کا شیوہ ہے؟ ہم فیصلہ اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ ازراہ کرم آپ بار دگر دونوں کا تقابلی مطالعہ فرمائیں، خط کشیدہ جملوں کو بار بار پڑھیں تو وہ آپ کو مستفتی کے اولین استفتاء میں نہیں ملیں گے، یہ قبلہ مفتی صاحب کی فن کاری و لفظی ہیر پھیر ہے اور اسی تضاد سے اصل کہانی آپ کی سمجھ میں آ جائے گی، کہ آیا اصل مسئلہ ''احقاق حق'' اور ''ابطال باطل'' کا ہے یا ''تحفظ انا'' اور پندار نفس کا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ اس محنت شاقہ اور ڈیڑھ ماہ کی سعی لاحاصل کے بعد بھی ان کے ہاتھ نامرادی کے سوا کچھ نہ آیا۔ ہمارے اس عاجزانہ دعوے کا ثبوت سطور ذیل سے مل جائے گا۔

(۳) علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کا اپنے سابق جواب پر استقرار سے گریز

اگر دارالعلوم کے فاضل مفتی کا اپنے سابق جواب پر قلبی اطمینان اور شرح صدر تھا تو حضرت مفتی محمد اختر رضا خان قادری اور دیگر اجلہ علماء کرام سے اسی کی تائید و تصویب کرا دیتے، اسے انہوں نے ریکارڈ سے غائب کیوں فرما دیا؟ قصہ اندروں کیا ہے؟

(۴) اصل فتویٰ کی ''بناء استدلال'' کا ذکر ''متابعۃ الجواب'' میں سرے سے غائب، آخر کیوں؟

علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی نے اپنے اولین اصل فتوے میں اپنے استدلال کی بنیاد فتاویٰ شامی قدیم جلد 2 صفحہ 645 کی ایک عبارت پر قائم کی تھی، اس پر ہمارا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ یہ عبارت ''الکنایات الرواجع'' سے متعلق ہے، استفتاء کی صورت مسئولہ سے اس کا کوئی

تعلق نہیں ہے، لہٰذا بناء استدلال ہی غلط تھی، مفتی صاحب نے ہمارے اس اعتراض کا کوئی جواب تو نہیں دیا، لیکن عملاً ''متابعۃ الجواب'' میں اس عبارت کو بالکل ترک کر دیا، یہ بالفعل تو غلطی کا اعتراف ہے اور اس سے رجوع کے مترادف ہے، لیکن اعتراف صریح کے لئے حوصلہ اور جرأت ایمانی چاہیے۔ ہم نے ازراہ ادب واحترام اس امر کا ذکر بھی نہیں کیا تھا کہ مذکورہ عبارت کا مفتی صاحب نے جو ترجمہ درج فرمایا تھا، وہ بھی نحوی اعتبار سے (Grammaticaly) غلط تھا، مفعول کو فاعل قرار دے کر ترجمہ فرمایا گیا تھا ''تَلْحَقُ الْبَائِنَ بِشَرْطِ النِّيَّةِ فِيْ ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ'' کا ترجمہ وہ فرماتے ہیں کہ بائن، بشرطیکہ نیت کی ہو، ظاہر الروایہ کے مطابق لاحق ہوتی ہے یہاں وہ ''البائن'' کو ''تلحق'' کا فاعل قرار دے کر ترجمہ کر رہے ہیں، حالانکہ ''البائن'' مفعول واقع ہو رہا ہے اور ''تلحق'' کا فاعل ضمیر مستتر ہے۔ جو ''الکنایات الرواجع'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔

(۵) علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کا نظریہ

علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کا نظریہ یہ ہے کہ جب الفاظ کنایہ مکرر ہوں، دوسرے مکرر لفظ سے دوسری طلاق کی نیت کی جائے تو وہ نیت معتبر و موثر ہوتی ہے اور اس طرح دوسری طلاق بائن پہلی بائن کو لاحق ہو جاتی ہے۔

(۵) علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کی تازہ بنائے استدلال

اپنی سابق بنائے استدلال سے علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی نے عملی اور سکوتی رجوع کر کے اب تازہ بناء ''البحر الرائق'' اور ''جد الممتار'' کی عبارات پر رکھی ہے، لیکن ادباً عرض ہے کہ انہوں نے ان دونوں کتابوں کی عبارات سے مغالطہ کھایا، بنابریں غلط نتیجہ اخذ کیا، جیسا کہ ہم سطور ذیل میں واضح کریں گے۔

(۷) البحر الرائق کی اصل عبارت اور اس کا صحیح مفہوم

پہلے اصل عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وَيَنْبَغِيْ اَنَّهُ اِذَا اَبَانَهَا ثُمَّ قَالَ لَهَا اَنْتِ بَائِنٌ نَاوِيًا طَلْقَةً ثَانِيَةً

يَنْبَغِی اَنْ تَقَعَ الثَّانِيَةُ بِنِيَّتِهِ بِنِيَّتِهِ لِاَنَّهُ بِنِيَّتِهِ لَا يَصْلَحُ خَبَرًا فَهُوَ كَمَالَوْ قَالَ اَبَنْتُکِ بِاُخْرٰی اِلَّا اَنْ يُّقَالَ اَنَّ الْوُقُوْعَ اِنَّمَا هُوَ بِلَفْظٍ صَالِحٍ لَهُ وَهُوَ اُخْرٰی بِخِلَافِ مُجَرَّدِ النِّيَّةِ

(البحرالرائق جلد 3 صفحہ 308 مطبوعہ مصر)

عبارت کا اصل مفہوم

''جب ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق بائن دے، پھر اس کو دوسری بار کہے کہ تم بائن ہو، اور اس سے دوسری طلاق کی نیت کرے تو چاہیے کہ اس سے دوسری طلاق واقع ہو، کیونکہ اس کی نیت کی وجہ سے اب دوسری طلاق پہلی طلاق کی خبر نہیں بن سکتی، پھر ''اِلَّا اَنْ يُّقَالَ'' فرما کر اس قول کا رد فرما دیا کہ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کوئی دوسرا لفظ اس نیت کی صلاحیت رکھے (علامہ شامی نے فرمایا'' یوں کہنا تھا، جب کوئی دوسرا لفظ اس نیت کی معاونت کرے) جیسا کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق بائن دینے کے بعد کہے،'' میں نے تجھے دوسری طلاق بائن دی'' تو یہاں پر'' دوسری (اخری) کا لفظ دوسری طلاق کی نیت کی صلاحیت رکھتا ہے (یا معاونت کرتا ہے) برخلاف اس کے کہ وہ صرف دوسری طلاق کی نیت کرے''۔

اور صورت مسئولہ میں جب سائل نے دوسری بار اپنی بیوی کو کہا'' میں نے تمہیں آزاد کیا'' تو اس میں صرف دوسری طلاق کی نیت کی ہے، کوئی ایسا لفظ نہیں جو دوسری طلاق کی نیت کی معاونت کرے، جیسا کہ اس جملے میں ہے کہ'' میں نے تجھے دوسری بائن طلاق دی'' لہٰذا یہاں بائن بائن کو لاحق نہیں ہو گی۔

البحرالرائق کے حاشیے پر علامہ سید ابن عابدین شامی حنفی متوفی 1252ھ نے اس مسئلے کو بہت زیادہ واضح فرما دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

'' فقہاء نے کہا ہے کہ کنایات طلاق میں ثانی اول کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب دوسری کو پہلی کی خبر بنانا ممکن نہ ہو، اور انہوں نے یہ نہیں کہا کہ دوسری اول کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب دوسری طلاق میں دوسری طلاق کی نیت کی جائے، اور یہ اس بات کی واضح

دلیل ہے کہ جب دوسری طلاق کو پہلی طلاق کی خبر بنانا ممکن ہو تو دوسری طلاق پہلی طلاق کو لاحق نہیں ہوگی، خواہ دوسری طلاق سے علیحدہ طلاق ہی کی نیت کیوں نہ کرے"۔ یہ ہم نے علامہ شامی کی مکمل عبارت کا ماحصل اور خلاصہ درج کیا ہے، تاہم جو حضرات اصل عبارت ملاحظہ فرمانا چاہیں، ان کی تسکین خاطر کے لئے پوری عبارت ذیل میں درج ہے:

(اَنَّهُ اِذَا اَبَانَهَا الخ) لَا يَخْفٰى اِنْدِ فَاعُهُ بِمَامَرَّ عَنِ الْمُحِيْطِ مِنْ اِلْغَاءِ النِّيَّةِ فِيْ اَصْلِ الْبَيْنُوْنَةِ لِكَوْنِهَا حَاصِلَةً وَكَذَا مَا قَدَّمَهُ عَنِ الْحَاوِىْ مِنْ قَوْلِهِ وَلَا يَقَعُ بِكِنَايَاتِ الطَّلَاقِ شَىْءٌ وَاِنْ نَوٰى عَلٰى اَنَّ تَعْبِيْرَهُمْ بِاِمْكَانِ كَوْنِهٖ خَبَرًا ظَاهِرٌ فِىْ كَوْنِهٖ اِحْتِرَازًا عَمَّا لَا يُمْكِنُ جَعْلُهُ خَبَرًا، لَا عَمَّالَوْنَوٰى بِهٖ طَلْقَةً ثَانِيَةً لِاَنَّ كُلَّ بَائِنٍ لَا بُدَّ فِيْهِ مِنَ النِّيَّةِ، فَاِذَا نَوٰى بِالْبَائِنِ الثَّانِى الطَّلَاقَ وَاَمْكَنَ جَعْلَهُ خَبَرًا عَنِ الْاَوَّلِ لَا يَقَعُ وَلَيْسَ الْمُرَادُ اَنْ يَّنْوِىَ الطَّلَاقَ الْاَوَّلَ بِخُصُوْصِهٖ وَاِلَّا كَانَ عَلَيْهِمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا بِخِلَافِ اِذَا نَوٰى بِهِ الْاَوَّلَ وَلَهُمْ عَنِ التَّعْبِيْرِ بِهٰذَا اِلَى التَّعْبِيْرِ بِالْاِمْكَانِ الْمَذْكُوْرِ دَلِيْلٌ وَاضِحٌ عَلٰى اَنَّهُ مَتٰى اَمْكَنَ جَعَلَ الثَّانِىْ خَبَرًا لَا يَقَعُ وَاِنْ نَوٰى بِهٖ طَلْقَةً اُخْرٰى

(منحۃ الخالق علی ہامش البحر الرائق جلد 3 صفحہ 308)

علامہ شامی کی اس تصریح سے واضح ہو گیا کہ صورت مسئولہ میں سائل نے جب دوسری طلاق کی نیت سے مکرر کہا: "میں نے تمہیں آزاد کیا" تو اس صورت میں صرف ایک طلاق بائن واقع ہوئی اور دوسری واقع نہیں ہوئی۔

(۸) جد الممتار کی عبارت سے استدلال

علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی نے دوسری دلیل اعلیٰ حضرت کی حسب ذیل عبارت سے دی ہے:

1000۔ قَوْلُهُ (48) لا شَکَّ اَنَّ الْمُرَادَ بِهِ الْبَائِنُ الْمَنْوِیُّ (471-774) اَقُوْلُ لَا یَرْتَابُ اَحَدٌ اَنَّ الْکِنَایَاتِ لَا بُدَّ لَهَا مِنْ نِیَّةٍ لٰکِنْ ھٰھُنَا ثَلٰثَةُ اَشْیَاءٍ، نِیَّةُ الطَّلَاقِ عَلَی الطَّلَاقِ وَھٰذَا ھُوَ الَّذِیْ لَابُدَّ مِنْهُ فِی الْکِنَایَاتِ، وَنِیَّةُ التَّاکِیْدِ، وَنِیَّةُ الْاِسْتِیْنَافِ بِاَنْ یُّرِیْدَ وَیَقْصِدَ اِیْقَاعَ طَلَاقٍ جَدِیْدٍ غَیْرِ الْاَوَّلِ، وَالْعَلَّامَةُ الْبَحْرِ لَا یَقُوْلُ بِاشْتِرَاطِ نِیَّةِ التَّاکِیْدِ حَتّٰی یَرِدَ عَلَیْهِ اِنَّهُمْ لَمْ یَشْتَرِطُوْا ذٰلِکَ بَلْ اِنَّمَا یَقُوْلُ بِاشْتِرَاطِ عَدَمِ نِیَّةِ الْاِسْتِیْنَافِ لِاَنَّهُ بَعْدَ نِیَّةِ الْاِسْتِیْنَافِ کَقَوْلِهِ اَبَنْتُکِ بِاُخْرٰی، فَاِنَّ الْوُقُوْعَ اِنَّمَا ھُوَ بِاَبَنْتُکِ لَا بِاُخْرٰی وَاِنَّمَا ھُوَ مُعَیَّنٌ لِنِیَّةِ الْاِسْتِیْنَافِ عِنْدَ النَّاسِ، فَلِمَ لَا تَکْفِیْهِ نِیَّتُهُ فِیْمَا بَیْنَهُ وَبَیْنَ رَبِّهِ، وَکَلَامُھُمْ غَیْرُ صَرِیْحٍ فِی اَنَّهُ لَا یُقْبَلُ مِنْهُ الْاِسْتِیْنَافُ اَصْلًا، وَاِنْ نَوٰی وَیُحْمَلُ عَلَی التَّاکِیْدِ جَبْرًا عَلَیْهِ وَکَرْھًا وَھَلْ ھُوَ اِلَّا حَجْرٌ لَّهُ عَنْ تَصَرُّفِ قَصْدِهِ قَصْدًا خَاصًّا مَعَ کَوْنِهٖ اَھْلًا، وَالْمَرْاَةُ مَحَلًّا، وَاللَّفْظُ صَالِحًا وَھُوَ الْمُشَدِّدُ عَلٰی نَفْسِهٖ، فَلِمَ لَایُقْبَلُ فَیَتَاَمَّلُ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ ۱۲

(جدالممتار جلد 2 صفحہ 532-531 مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی 3)

اس عبارت سے بھی مفتی صاحب مذکور کو سوائے کلی ناکامی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا، اس عبارت میں اعلیٰ حضرت نے یہ اعتراض کیا ہے کہ جب ایک شخص اپنی بیوی کو کہتا ہے ''تو بائن ہے'' پھر دوسری طلاق کی نیت سے دوبارہ کہتا ہے ''تو بائن ہے''، تو دوسری طلاق کے وقوع سے کیا چیز مانع ہے؟ وہ شخص طلاق دینے کا اہل ہے، اس کی بیوی طلاق کا محل ہے اور لفظ دوسری طلاق کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ شخص خود اپنے اوپر تنگی کر رہا ہے تو پھر دوسری

طلاق کی نیت کو کیوں قبول نہیں کیا جائے گا، اس میں تامل کرنا چاہیے۔

اہل علم سے یہ امر مخفی نہیں کہ جب محققین کسی قول کے بعد تامل کرنے کا حکم دیتے ہیں تو اس میں کسی لطیف امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہاں تامل میں اس اعتراض کے جواب کی طرف اشارہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہاں دوسری بائن طلاق کی نیت کا معاون کوئی اور لفظ نہیں ہے، جیسے ''میں نے تجھے دوسری بائن طلاق دی'' (اَبَنْتُکِ بِاُخْریٰ) میں لفظ ''دوسری'' (بِاُخْریٰ) ہے، جیسا کہ خود علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی نے اس کی تصریح کی ہے اور اعلیٰ حضرت نے بھی اس قول کو نقل فرمایا ہے۔

اور صورت مسئولہ میں بھی جب سائل نے ''میں نے تجھے آزاد کیا'' کو مکرر کہا اور اس سے دوسری طلاق کی نیت کی تو اس نیت کا معاون کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے، اس لئے یہاں بھی دوسری طلاق واقع نہیں ہوگی۔

رہا یہ امر کہ کنایات طلاق میں جب دوسرے لفظ سے دوسری طلاق کی نیت کی جائے تو اعلیٰ حضرت کے نزدیک صرف ایک طلاق واقع ہوگی اور دوسری طلاق نہیں ہوگی، تو اس پر دلیل اسی کتاب کی اسی بحث میں یہ عبارت ہے:

999۔ قَالَ (47) اِذَا اَمْکَنَ جَعْلَهٗ اِخْبَارًا عَنِ الْاَوَّلِ (471-774)ف: اَقُوْلُ لَیْسَ الْمُرَادُ خُصُوْصَ اِمْکَانِ خَبْرِیَّتِهٖ بَلِ الْمُرَادُ اِمْکَانُ اَنْ لَّا یَجْعَلَ طَلَاقًا بِرَاْسِهٖ بِاَنْ یَّجْعَلَ خَبْرًا اَوْ تَاکِیْدًا اَوْ تَفْرِیْعًا اَوْ غَیْرَ ذٰلِکَ، دَلِیْلُهٗ مَافِی الْهِنْدِیَةِ عَنِ الْمُحِیْطِ وَ قَالَ حَرَّمْتُ نَفْسِیْ عَلَیْکِ فَاسْتَبْرِیْ وَنَوٰی بِهِمَا طَلَاقًا فَهِیَ وَاحِدَةٌ بَائِنَةٌ، لِاَنَّهٗ لَا یَقَعُ عَلٰی بَائِنٍ بَائِنٌ وَکَذٰلِکَ اِذَا قَالَ نَوَیْتُ بِقَوْلِیْ حَرَّمْتُ نَفْسِیْ وَاحِدَةً وَبِقَوْلِیْ اِسْتَبْرِیْ ثَلٰثًا فَهِیَ وَاحِدَةٌ الخ، فَلْیُحْفَظْ ۱۲ (جد الممتار جلد 2 صفحہ 531)

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: ''میں نے تجھ کو اپنے نفس پر حرام کرلیا، پس تو پردہ کر'' اوران دونوں لفظوں سے طلاق کا ارادہ کیا تو صرف ایک طلاق بائن واقع ہوگی، کیونکہ بائن پر بائن واقع نہیں ہوتی، اسی طرح اگر اس نے یہ کہا کہ میں نے ''اپنے نفس پر حرام کیا'' اس لفظ سے ایک طلاق کا ارادہ کیا تھا اور ''تو پردہ کر'' اس سے تین طلاق کا ارادہ کیا تھا، تب بھی ایک ہی طلاق واقع ہوگی، اس کو خوب یاد رکھنا چاہیے۔

اعلیٰ حضرت نے اس جزیئے کو عالمگیری سے نقل کیا ہے اور عالمگیری نے المحیط سے نقل کیا ہے۔ اس جزیئے میں کنایات طلاق میں دوسرے لفظ سے دوسری طلاق کی نیت، بلکہ تین طلاق کی نیت کے باوجود اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز نے ایک ہی طلاق واقع ہونے کی تصریح کی ہے، جب کہ اس جزیئے میں بھی عنداللہ اور عندالناس کا فرق جاری ہوسکتا ہے، اور وہ شخص بھی طلاق دینے کا اہل ہے، اس کی بیوی بھی طلاق کا محل ہے اور وہ لفظ، نیت طلاق کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، اور دوسرے لفظ سے دوسری طلاق یا تین طلاق کی نیت کرے وہ شخص اپنے اوپر تنگی کرنے والا ہے، اس کے باوجود ''صاحب المحیط''، ''صاحب الہندیہ'' اور خود اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز نے یہاں دوسرے لفظ کو سے دوسری طلاق یا تین طلاقوں کی نیت کو مؤثر نہیں مانا نیز جب کوئی شخص اپنی بیوی کو دوبارہ ایک ہی لفظ مکرر کر کے کہے ''تو بائن ہے، بائن ہے'' تو یہاں ظاہراً تاکید ہے، اور جب وہ کہتا ہے: ''میں نے تجھ کو اپنے نفس پر حرام کرلیا، سو تو پردہ کر'' تو یہاں دوسرا لفظ مختلف ہے اور اس کا ظاہر تاکید نہیں ہے، تو جب یہاں اس دوسرے لفظ سے وہ دوسری طلاق کا یا تین طلاق کا ارادہ کرے تب بھی ایک ہی طلاق واقع ہوگی، تو جب وہ ''تو بائن ہے، تو بائن ہے'' کہے اور دوسرے لفظ سے دوسری طلاق کا ارادہ کرے تو بطریق اولیٰ ایک طلاق واقع ہوگی۔ اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے وہاں ''فلیتامل'' فرمایا تھا اور یہاں ''فلیحفظ'' فرمایا۔ یعنی وہاں ''تامل'' (خوب غور کر، سوچ سمجھ لے، گہرائی اور گیرائی میں جا کر سوچ تاکہ تجھ پر اس کی حکمت آشکارا ہو) میں اپنے اعتراض کے جواب کی طرف اشارہ فرمایا اور یہاں ''فلیحفظ'' فرمایا کہ

اس جزیئے کو خوب یاد کرلو، پلے باندھ لو، ہمیشہ کام آئے گا۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کی یہ عبارت ہمارے موقف کی صحت اور صواب ہونے پر اور مفتی دار العلوم امجدیہ کے موقف کے بطلان اور ناصواب ہونے پر واضح اور روشن دلیل ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے فتاویٰ رضویہ کے باب الکنایات میں جمہور فقہاء کی تصریحات کے مطابق متعدد فتاویٰ دیئے ہیں، سردست ہم ان میں سے چار فتاویٰ کی نقول آئندہ صفحات پر پیش کررہے ہیں، جن عبارات سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے، ہم نے متعلقہ جگہ ان پر خط کھینچ دیا ہے اور آخر میں وجہ استدلال بھی بیان کردی ہے۔

حضرت صدر الشریعہ علامہ مفتی امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ خلیفہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز کی تصنیف عظیم ''بہار شریعت'' بلاشبہ اردو میں مسائل شریعت کا انسائیکلو پیڈیا ہے، یہ عظیم المرتبت کتاب مستند، معتمد، معتبر، متفق علیہ اور مایہ ناز ہے، لیکن اس اعتراف عظمت کے باوجود ہم بصد عجز و نیاز بغایت ادب یہ عرض کریں گے کہ ہر قسم کی غلطی اور امکان خطا سے کلی طور پر مبرا صرف کتاب ربانی قرآن مجید ہے، اور خود اعلیٰ حضرت کی تصریح کے مطابق معصوم عن الخطاء صرف اور صرف ذات پاک سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انبیاء کرام ورسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نفوس قدسیہ ہیں۔

بہار شریعت کا جزئیہ، جس کا مفتی دار العلوم امجدیہ نے اپنے موقف کی تائید میں حوالہ دیا ہے، ہماری نظر میں تھا، لیکن ہم نے اس کو اولاً تو اس لئے ترک کردیا کہ یہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ العزیز کے متعدد فتاویٰ اور ''جد الممتار'' کی تحقیق کے خلاف ہے، ثانیاً اس لئے بہار شریعت میں جزئیہ ''ردالمحتار'' اور درمختار کے حوالہ سے لکھا ہوا ہے، ہمارے حسن ظن کے مطابق مفتی دار العلوم امجدیہ کو بھی یہ معلوم ہوگا کہ دوسرے لفظ سے دوسری طلاق کی نیت کے مقبول ہونے کا جزئیہ ''درمختار'' میں اصلاً مذکور نہیں ہے۔ اور ''ردالمحتار'' میں علامہ شامی نے دلائل سے اس کے برخلاف ثابت کیا ہے کہ دوسرے لفظ سے دوسری طلاق کی نیت کے باوجود ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ اگر مفتی دار العلوم امجدیہ کو اس بارے میں

ہمارے اس قول کی صداقت پر شبہ ہے تو ''درمختار'' اور ''ردالمحتار'' دونوں موجود ہیں، ''فَأْتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ''۔

جہاں تک مفتی دارالعلوم امجدیہ کے فتویٰ پر حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا قادری مدظلہم کی تصدیق وتائید کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں بھی ہمارا حسن ظن یہی ہے کہ وہ حالت سفر میں اپنے مشاغل کثیرہ کی وجہ سے ''فتاویٰ رضویہ'' ''جدالممتار'' اور دیگر ''کتب فتاویٰ کی متعلقہ ابحاث کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں فرما سکے، مفتی دارالعلوم امجدیہ کی فقاہت وثقاہت کے بارے میں مکمل معلومات نہ ہونے کے باعث اعتماد کر بیٹھے، ہم ان سے بھی مسئلے سے متعلق تمام ریکارڈ کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد نظر ثانی اور مفتی دارالعلوم امجدیہ کے ''متابعۃ الجواب'' کی تصویب وتائید سے رجوع کی مؤدبانہ گزارش کریں گے۔

الحمد لله على احسانه ہم نے مفتی دارالعلوم امجدیہ کے تمام اشکالات دور کر کے یہ مسئلہ بے غبار کر دیا کہ کنایات مکررہ میں ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے، خواہ ہر لفظ سے طلاق کی نیت کی جائے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مفتی دارالعلوم امجدیہ کو توفیق دے کہ وہ بے جا ضد اور انا کو ترک کر کے حق اور صواب کو قبول فرمائیں اور ہم پر حرام کو حلال کرنے کا اتہام ناروا لگانے کے بجائے حلال شرعی کو حرام قرار دینے کی روش سے باز آ جائیں، وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ، هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ تَعَالٰى وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

مفتی منیب الرحمٰن

مہتمم دارالعلوم نعیمیہ

پس نوشت

جناب مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کی دانستہ مغالطہ آرائی یا خود فریبی

مفتی دارالعلوم امجدیہ نے اپنے ''متابعۃ الجواب'' میں یہ مغالطہ آرائی بھی فرمائی ہے کہ ہم نے اپنے فتویٰ میں ''فتاویٰ رضویہ'' سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں صرف تین مرتبہ الفاظ کنایہ استعمال کیے گئے ہیں، نیت کا تذکرہ نہیں، یہ کذب صریح ہے، ان کے اس خود

فریبی پر مبنی تحریر من وعن انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''ثالثاً دارالعلوم نعیمیہ کراچی کے پروفیسر صاحب نے اعلیٰ حضرت محدث بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتاویٰ رضویہ سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں انہوں نے قطع و برید سے کام لیا، فتاویٰ رضویہ میں اور ہم سے پوچھے گئے استفتاء میں موجود فرق کو بھی نہیں سمجھا وہاں صرف تین مرتبہ الفاظ کنایہ استعمال کیے گئے ہیں نیت کا تذکرہ نہیں ہے''۔

موصوف کی دانستہ غلط بیانی کو واضح کرنے کے لئے ہم نے اپنے فتوے میں بطور استشہاد فتاویٰ رضوی جلد 12 صفحہ 578-572 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن کا جو حوالہ درج کیا تھا، اس کی نقل ملاحظہ کیجئے۔ اس میں ''قصد'' اور ''نیت'' کے الفاظ موجود ہیں۔

اسی ایڈیشن کے صفحہ 578 پر اعلیٰ حضرت رقم طراز ہیں کہ: ''اگر زید نے ان تینوں لفظوں میں کل یا بعض، کسی سے طلاق دینے کا قصد کیا تھا تو ایک طلاق بائن واقع ہوئی''۔ پھر آگے اعلیٰ حضرت نے فتاویٰ عالمگیری کی وہ عبارت بطور استشہاد درج فرمائی ہے۔ جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اسی طرح اسی ایڈیشن کے صفحہ 572 پر اعلیٰ حضرت ''فَاِنَّ الْبَائِنَ لَا یَلْحَقُ الْبَائِنَ کَمَا فِی الْمُتُوْنِ'' کہہ کر فرماتے ہیں:

''صورت مذکورہ میں طلاق مغلظہ تو کسی طرح نہ ہوئی، ہاں اگر ان چار لفظوں میں جو زید نے کہے اگر کسی ایک لفظ یا دو تین یا چاروں سے عورت کو طلاق دینے کی نیت زید نے کی تو ایک طلاق بائن ہوگی، اب ہم حجت قاطعہ، ملزمہ کے طور پر اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ مع سوال و جواب پیش کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

مسئلہ 278 از پیلی بھیت محلہ پکریا، مسئولہ محمد بشیر احمد صاحب 15 رجب 1339ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسمی زید جس کی علمی لیاقت علم عربی میں قریب دستار بندی ہے اپنی بیوی کو چند بار یہ الفاظ بحالت صحت نفس کہے کہ میں تم کو خوشی سے اجازت دیتا ہوں جہاں تمہارا دل چاہے چلی جاؤ خواہ تم دوسرا خاوند کر لو خواہ بلا خاوند رہو، مگر بی بی چند بار یہ الفاظ سن کر بھی خاموش رہی تو کچھ دن کے بعد یہ کہا مجھ کو افسوس ہے

کہ کیسی بے حیا عورت ہے کہ میں خوشی سے اجازت چلے جانے کی دیتا ہوں اور میرا پیچھا نہیں چھوڑتی جب بی بی پر یہ ملامت ڈالی تو بی بی نے جانے کی تیاری کی زید نے کاغذات دیہہ زمیندار بی بی جس کا زید کارکن تھا حوالہ کردیئے تو اب اس مسئلہ میں شرع شریف کا کیا حکم ہے اور بیوی اب زید سے راضی نہیں ہے اور زید سے قطع تعلق کرتی ہے۔

الجواب

یہ الفاظ کنایہ ہیں نیت پر حکم ہے، اگر زید نے بہ نیت طلاق کہے ایک طلاق ہوگئی اور عورت نکاح سے نکل گئی، اس سے بلا حلالہ اس کی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے جب کہ اس سے پہلے اس عورت کو دو طلاقیں نہ دے چکا ہو، اور اگر وہ قسم کھا کر انکار کردے کہ میں نے یہ الفاظ بہ نیت طلاق نہ کہے تھے تو طلاق نہ مانی جائے گی، اگر جھوٹی قسم کھائے گا وبال اس پر رہے گا۔ واللہ تعالٰی اعلم۔

مسئلہ 279۔ از آرہ، مسئولہ مولوی عبدالغفور صاحب، 13 شعبان 1339ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ زید نے اپنی بی بی منکوحہ زینب سے کہا بصورت نااتفاقی کہ ہم تمہارے ہاتھ کا کھانا نہیں کھائیں گے، تب اس پر بی بی مذکور نے کہا کہ جب کھانا نہیں کھاؤ گے تو ہم کو صفائی دے دو۔ تب زید نے کہا کہ صفائی دے دیا۔ بی بی نے کہا صفائی دے دیا تو پھر کہا کہ صفائی دے دیا پھر بی بی نے کہا صفائی دے دیا تو کہا صفائی دے دیا تو بی بی نے کہا کہ تب ہم کہیں چلے جائیں تو زید نے کہا کہ کہیں چلی جاؤ اس صورت مذکورہ میں طلاق مغلظہ واقع ہوئی کہ نہیں اگر طلاق واقع نہیں ہوئی تو کیا دلیل بحوالہ کتب معتبرہ تحریر فرمائیں، بینوا توجروا۔

الجواب

صورت مذکورہ میں طلاق مغلظہ کسی طرح نہ ہوئی فَاِنَّ الْبَائِنَ لَا یَلْحَقُ الْبَائِنَ(1) کَمَا فِی الْمُتُوْنِ (کیونکہ بائنہ طلاق بائنہ کو لاحق نہیں ہوتی۔ جیسا کہ متون میں ہے۔

1۔ درمختار باب الکنایات مطبع مجتبائی دہلی 1/225

ت) ہاں اگر ان چار لفظوں میں جو زید نے کہے اگر کسی ایک لفظ یا دو تین یا چاروں سے عورت کو طلاق دینے کی نیت زید نے کی تو ایک طلاق بائن ہوگئی عورت نکاح سے نکل گئی عورت کی رضا سے اس سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے اور اگر اصلاً کسی لفظ سے نیت طلاق نہ کی تو وہ بدستور اس کی زوجہ ہے طلاق نہ ہوئی۔

مسئلہ 182، مرسلہ حکیم احمد حسین محلہ طویلہ، 7 شوال 1308ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید و ہندہ میاں بی بی میں باہم جھگڑا رہتا تھا اکثر اسے تکلیف دیتا اور مارتا ایک دن اس سے زیور مانگا اس نے انکار کیا کہا تجھے چاقو سے مار ڈالوں گا ہندہ بخوف جان والدین کے یہاں چلی آئی تو شوہر نے چوری کا الزام بھی لگایا اور تھانہ میں رپٹ کا ارادہ کیا لوگوں نے سمجھایا اس وقت یہ گفتگو ہوئی جو لکھی جاتی ہے، ناصح کیا فضیحت کراؤ گے۔ زید: وہ میری بیوی ہی نہیں رہی فضیحت کیسی۔ ناصح: دیکھو لغو باتیں نہ کرو۔ زید: جب وہ میری بلا اجازت چلی گئی میرے نکاح سے باہر ہے اور وہ میرے کام کی نہ رہی مجھ کو اس سے کچھ غرض نہیں۔ ناصح: دیکھو کنایہ اشارہ سے بھی طلاق ہو جاتی ہے ذرا سوچ سمجھ کر کہو تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ زید: مجھ کو اس سے کچھ غرض نہیں نہ وہ میری بیوی ہے آیا اس گفتگو سے وہ عورت مطلقہ ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

زید کا پچھلا قول کہ "نہ وہ میری بیوی ہے" مذہب مختار پر اصلاً الفاظ طلاق سے نہیں یہاں تک کہ بہ نیت طلاق بھی کہے تاہم واقع نہ ہوگی۔ عالمگیری میں ہے:

لَوْقَالَ: "تُوْزَنُ۔ مِنْ نَنی" لَا یَقَعُ وَاِنْ نَوٰی هُوَ الْمُخْتَارُ کَذَا فِیْ جَوَاهِرِ الْاَخْلَاطِیْ(1)۔	"اگر کہا تو میری بیوی نہیں ہے، تو طلاق کی نیت کے باوجود طلاق نہ ہوگی، یہی قول مختار ہے، جیسا کہ جواہر اخلاطی میں ہے"۔(ت)

1۔ فتاوٰی ہندیہ الفصل السابع فی الطلاق بالالفاظ الفارسیہ نورانی کتب خانہ پشاور 386/1

اسی طرح ''مجھ کو اس سے کچھ غرض نہیں'' یہ بھی لفظ طلاق نہیں کہ غرض بمعنی شوق مستعمل ہے کَمَا فِی الْقَامُوْسِ (جیسا کہ قاموس میں ہے۔ت) یا قصد و خواہش کَمَا فِی الْمُنْتَخَبِ (جیسا کہ منتخب میں ہے۔ت) یا حاجت کَمَا فِی شُرُوْحِ النِّصَابِ (جیسا کہ شروح نصاب میں ہے۔ت) اور انشاء کی نفی سے طلاق واقع نہیں ہوتی اگرچہ بہ نیت طلاق اطلاق کرے۔ عالمگیری میں ہے:

لَوْ قَالَ لَا حَاجَةَ لِیْ فِیْکِ یَنْوِی الطَّلَاقَ فَلَیْسَ بِطَلَاقٍ کَذَا فِی السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ اِذَا قَالَ لَا اُرِیْدُکِ اَوْلَا اُحِبُّکِ اَوْلَا اَشْتَهِیْکِ اَوْلَا رَغْبَةَ لِیْ فِیْکِ فَاِنَّهٗ لَا یَقَعُ وَاِنْ نَوٰی فِی قَوْلِ اَبِیْ حَنِیْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کَذَا فِی الْبَحْرِ الرَّائِقِ (1)۔

اگر کہا ''مجھے تیرے بارے میں کوئی حاجت نہیں'' اور طلاق کی نیت کی ہو تو بھی طلاق نہ ہوگی، سراج وہاج میں ایسے ہی ہے۔ اور جب کہا ''میں تجھے نہیں چاہتا''، ''میں تجھے پسند نہیں کرتا'' ''تیرے بارے مجھے رغبت نہیں'' اگر نیت ہو تب بھی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالٰی کے نزدیک طلاق نہ ہوگی، البحر الرائق میں یوں ہی ہے۔ (ت)

اِذْهَبِیْ یَحْتَمِلُ رَدًّا وَنَحْوُ خَلِیَّةٌ بَرِیَّةٌ یَصْلَحُ سَبًّا (اِلٰی قَوْلِهٖ) فِی الْغَضَبِ تَوَقَّفَ الْاَوَّلَانِ اِنْ نَوٰی وَقَعَ وَاِلَّا لَا (2)۔

اس لئے کہ یہ جواب بھی بن سکتا ہے، اور تو جدا ہے، تو بری ہے، یہ الفاظ ڈانٹ کا احتمال رکھتے ہیں اس کے قول کہ ''غصہ میں پہلے دونوں الفاظ موقوف رہیں گے، اگر طلاق کی نیت کی تو طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں''۔ (ت)

1۔ فتاوٰی ہندیہ۔ الفصل الخامس فی الکنایات، نورانی کتب خانہ پشاور 1/375

2۔ درمختار، باب الکنایات، مطبع مجتبائی دہلی۔ 1/25-224

مبسوط امام سرخسی میں ہے:

وَعَنْ اَبِیْ یُوْسُفَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَّهُ الْحَقُّ بِهٰذِهِ الْاَلْفَاظِ خَلَّیْتُ سَبِیْلَکِ، فَارَقْتُکِ لَا سَبِیْلَ اِلَیْکِ، لَا مِلْکَ لِیْ عَلَیْکِ لِاَنَّهَا تَحْتَمِلُ السَّبَّ، اَیْ لَا مِلْکَ لِیْ عَلَیْکِ لِاَنَّکِ اَدْوَنُ مِنْ اَنْ تَمْلُکِیْ وَفَارَقْتُکِ اِتِّقَاءَ لِشَرِّکِ وَخَلَّیْتُ سَبِیْلَکِ لِهَوَانِکِ عَلَیَّ (1) (مُلَخَّصاً)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالٰی کے نزدیک یہ "میں نے تیرا راستہ کھول دیا"، "میں تجھ سے جدا ہو" اور "میری تجھ پر کوئی ملکیت نہیں" کے ساتھ ملحق ہے کیونکہ یہ الفاظ ڈانٹ کا احتمال بھی رکھتے ہیں یعنی "میری تجھ پر ملکیت نہیں" کا یہ معنٰی بھی ہوسکتا ہے کہ تو اس قابل نہیں کہ میں تیرا مالک بنوں، اور میں تجھ سے جدا ہوا یعنی تیرے شر سے جدا ہوں، میں نے تیرا راستہ کھولا کیونکہ میرے ہاں تو حقیر ہے۔ (ملخصا) (ت)

فتح القدیر میں ہے:

یُدَیَّنُ فِی الْغَضَبِ لِاَنَّ هٰذِهِ الْاَلْفَاظِ تُذْکَرُ لِلْاَبْعَادِ وَحَالَةِ الْغَضَبِ یَبْعَدُ الْاِنْسَانُ عَنِ الزَّوْجَةِ (2)۔

غصہ میں ان الفاظ کے متعلق خاوند کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ یہ الفاظ دور کرنے کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں جب کہ غصہ کی حالت میں انسان بیوی سے دور رہتا ہے۔ (ت)

یہ بات کہ ان میں اصلاً کسی لفظ سے طلاق کی نیت نہ کی تھی اگر زید قسم کھا کر کہہ دے قبول کر لیں گے اور حکم طلاق نہ دیں گے اگر زید جھوٹی قسم کھائے گا وبال اس پر ہوگا یہ قسم گھر میں عورت بھی کرسکتی ہے۔

1۔ مبسوط امام سرخسی، باب ماتقع بہ الفرقۃ الخ دار المعرفۃ بیروت 81/6

2۔ فتح القدیر، فصل فی الطلاق قبل الدخول مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر 402/3

درمختار میں ہے:

وَيَكْفِيْ تَحْلِيْفُهَا لَهٗ فِيْ مَنْزِلِهٖ، وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ۔	عورت کا مرد سے گھر میں قسم لینا کافی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم (ت)

(فتاویٰ رضویہ جلد 12 صفحات 571 تا 574، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

اسی میں ہے:

رَجُلٌ قَالَ لِاِمْرَأَتِهٖ مرابکار نیستی وَنَوٰی بِهِ الطَّلَاقَ لَا يَقَعُ كَذَافِي الظَّهِيْرِيَّةِ (1)	کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا ''تو میرے لئے کام کی نہیں'' تو نیت کے باوجود طلاق نہ ہوگی، جیسا کہ ظہیریہ میں ہے۔ (ت)

ہاں ''وہ میری بیوی نہ رہی'' کنایات طلاق سے ہے۔ عالمگیری میں ہے:

لَوْ قَالَ صِرْتِ غَيْرَ اِمْرَأَتِيْ فِيْ رِضَا اَوْسَخَطٍ تُطَلَّقُ اِذَا نَوٰی كَذَافِي الْخَلَاصَةِ (2)۔	اگر خاوند نے رضا یا ناراضگی سے کہا ''تو میری بیوی نہ رہی'' اگر طلاق کی نیت ہو تو طلاق ہو جائے گی، جیسا کہ خلاصہ میں ہے (ت)

اسی طرح یہ لفظ بھی کہ ''وہ میرے نکاح سے باہر ہے'' صریح نہیں کنایہ ہے۔

لِاَنَّ الْخُرُوْجَ مِنَ النِّكَاحِ يَكُوْنُ بِالطَّلَاقِ وَبِكُلِّ فُرْقَةٍ جَاءَ تْ مِنْ قِبَلِهٖ كَتَقْبِيْلِهٖ بِنْتَهَا اَوْمِنْ قِبَلِهَا كَتَقْبِيْلِهَا اِبْنَهٗ وَغَيْرِ ذٰلِكَ فَلَمْ يَتَعَيَّنْ لِاِفَادَةِ الطَّلَاقِ وَصَارَ كَقَوْلِهٖ	کیونکہ نکاح سے خروج، طلاق کے ساتھ اور دیگر وجوہ سے بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً خاوند بیوی کی بیٹی کا (شہوت کے ساتھ) بوسہ لے یا اس کے علاوہ بھی کئی طرح سے فرقت کے اسباب ہو سکتے ہیں

1۔ فتاویٰ ہندیہ الفصل السابع فی الطلاق بالالفاظ الفارسیہ نورانی کتب خانہ پشاور 1/380

2۔ فتاویٰ ہندیہ الفصل الخامس فی الکنایات، نورانی کتب خانہ پشاور 1/376

لَمْ يَبْقَ اَوْ لَيْسَ بَيْنِیْ وَبَيْنَکِ نِکَاحٌ بَلْ هُمَا عِبَارَتَانِ عَنْ مَّعْنًی وَّاحِدٍ، وَهٰذَا يَتَوَقَّفُ عَلَی النِّيَّةِ فَکَذَا ذَاکَ۔

لہٰذا یہ لفظ طلاق کے لئے خاص نہ رہا، جب وہ کہے "نکاح باقی نہ رہا" یا "تیرے میرے درمیان نکاح نہیں ہے" بلکہ یہ دونوں ہم معنی ہیں تو نیت پر موقوف ہوں گے، یہ بھی ایسا ہے (ت)

عالمگیری میں ہے:

لَوْ قَالَ لَهَا لَا نِکَاحَ بَيْنِیْ وَبَيْنَکِ اَوْقَالَ لَمْ يَبْقَ بَيْنِیْ وَبَيْنَکِ نِکَاحٌ يَقَعُ الطَّلَاقُ اِذَا نَوٰی (1)

اگر کہا "تیرے میرے درمیان نکاح باقی نہیں رہا" اگر نیت ہو تو طلاق ہوگی ورنہ نہیں (ت)

یوں ہی "وہ میرے کام کی نہ رہی" بھی کنایات سے ہے کَمَا حَقَّقْنَاهُ فِیْ مَا عَلَّقْنَاهُ عَلٰی رَدِّ الْمُحْتَارِ (جیسا کہ ہم نے اس کی تحقیق ردالمحتار کے حاشیہ میں کر دی ہے۔ت) مگر سوق کلام سے ظاہر یہ ہے کہ زید نے یہ الفاظ بطور اخبار کہے، نہ نیت انشائے طلاق۔ تیسرا لفظ دوسرے پر معطوف ہے اور دوسرا پہلے کی شرح و بیان علت، اور اس اخبار کا مبنی وہ غلط گمان جو عوام زمانہ میں شائع ہے کہ عورت بے اجازت شوہر گھر سے چلی جائے تو نکاح سے نکل جاتی ہے اور جو اخبار و اقرار طلاق بر بنائے غلط فہمی مسئلہ ہو دیانۃً اصلاً موثر نہیں۔

فِی الْخَيْرِيَّةِ عَنِ الْاَشْبَاهِ عَنْ جَامِعِ الْفُصُوْلَيْنِ وَالْقُنْيَةِ، اِذَا اَقَرَّ بِالطَّلَاقِ بِنَاءً عَلٰی مَا اَفْتٰی بِهِ الْمُفْتِیْ ثُمَّ تَبَيَّنَ عَدَمُ الْوُقُوْعِ فَاِنَّهٗ لَا يَقَعُ (2)

خیریہ میں اشباہ سے اور وہاں سے جامع الفصولین اور قنیہ سے منقول ہے کہ اگر مفتی کے فتویٰ کی بناء پر طلاق ہونے کا اقرار کیا تو پھر معلوم ہوا کہ طلاق نہ ہوئی تو اس اقرار کو طلاق نہ قرار دیا جائے گا۔

(ت)

1۔ فتاوٰی ہندیہ، الفصل الخامس فی الکنایات، نورانی کتب خانہ پشاور، 375/1

2۔ فتاوٰی خیریہ کتاب الطلاق دارالمعرفۃ بیروت، 47/1

خیر بہر حال مدار کار نیت پر ہے، اگر زید نے ان تینوں لفظوں میں کل یا بعض کسی سے طلاق دینے کا قصد کیا تھا تو ایک طلاق بائن واقع ہوئی کہ عورت راضی ہو تو اب یا عدت کے بعد جب چاہے بے حلالہ اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ عالمگیری میں ہے:

لَا یَلْحَقُ الْبَائِنُ الْبَائِنَ بِاَنْ قَالَ لَھَا اَنْتِ بَائِنٌ ثُمَّ قَالَ لَھَا اَنْتِ بَائِنٌ لَا یَقَعُ اِلَّا طَلْقَۃٌ وَّاحِدَۃٌ بَائِنَۃٌ (1)

اگر کہا: تجھے ایک بائنہ طلاق، اس کے بعد دوبارہ کہا تجھے بائنہ طلاق، تو ایک ہی بائنہ طلاق، ہوگی کیونکہ پہلی بائنہ کے بعد دوسری بائنہ اس کو لاحق نہیں ہو کے بعد دوسری بائنہ اس کو لاحق نہیں ہو سکتی (ت)

اور اگر ان تین میں سے کسی لفظ سے طلاق دینے کی نیت نہ کی اگر چہ اخیر کے دونوں لفظ بہ نیت طلاق کہے ہوں تو اصلاً طلاق نہ ہوئی وہ بدستور اس کی زوجہ ہے اور نیت طلاق نہ ہونے میں شوہر کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہے اگر وہ بقسم کہہ دے کہ میں نے ان تینوں لفظوں میں کسی سے نیت انشائے طلاق نہ کی تھی قطعاً مان لیں گے اور انہیں زوج و زوجہ جانیں گے اگر وہ اس قسم میں جھوٹا ہے تو وبال اس پر ہے عورت پر الزام نہیں۔ درمختار میں ہے:

اَلْقَوْلُ لَہٗ بِیَمِیْنِہٖ فِیْ عدمِ النِّیَّۃِ (2) وَاللہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔

(نیت نہ ہونے میں خاوند کی بات معتبر ہوگی۔ت)

(فتاوٰی رضویہ جلد نمبر 12 صفحات 576, 577, 578 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مسئلہ نمبر 284: از پیلی بھیت محلہ بشیر خاں متصل مکان مینہ شاہ مرسلہ نظام الدین شانہ گر 29 رمضان المبارک 1311ھ۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی عورت مدخولہ سے تین بار کہا "میں نے تجھے آزاد کیا" اس صورت میں نکاح قائم رہا یا نہیں؟ اور اب اس سے نکاح

1۔ فتاوٰی ہندیہ الفصل الخامس فی الکنایات نورانی کتب خانہ پشاور 377/1

2۔ درمختار باب الکنایات مطبع مجتبائی دہلی 224/1

کر سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

یہ لفظ کہ "مرد نے عورت سے کہا" اگر ان سے طلاق کے معنی مراد نہ تھے جب تو طلاق اصلاً نہ ہوئی اور اگر بہ نیت طلاق کہے تو ایک طلاق پڑ گئی عورت نکاح سے نکل گئی مگر حلالہ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں، نہ اسے کچھ انتظار کی حاجت، دونوں آپس میں راضی ہوں تو اسی وقت پھر نئے سرے سے نکاح کرلیں، ہاں اگر شوہر نے خود ہی ان میں کوئی لفظ تین طلاقوں کی نیت سے کہا تو بے شک طلاق مغلظہ ہوگئی کہ اب بے حلالہ کے اس سے نکاح نہیں کرسکتا۔

فِی الْهِنْدِیَةِ لَوْقَالَ اَعْتَقْتُکِ طُلِّقَتْ بِالنِّیَّةِ کَذَا فِی مِعْرَاجِ الدِّرَایَةِ(1) وَفِی الدُّرِّ کِنَایَةُ مَالَمْ یُوْضَعْ لَهٗ اَیِ الطَّلَاقِ وَاحْتَمَلَهٗ وَغَیْرُهٗ وَیَقَعُ الْبَائِنُ اِنْ نَوَاهَا اَوِ اثْنَتَیْنِ وَثَلٰثٌ اِنْ نَوَاهُ وَلَا یَلْحَقُ الْبَائِنُ اِذَا اَمْکَنَ جَعْلُهٗ اِخْبَارًا عَنِ الْاَوَّلِ کَانَتْ بَائِنٌ بَائِنٌ اَوْ اَبَنْتُکِ بِتَطْلِیْقَةٍ فَلَا یَقَعُ لِاَنَّهٗ اِخْبَارٌ فَلَا ضَرُوْرَةَ فِی جَعْلِهٖ اِنْشَاءً بِخِلَافِ اَبَنْتُکِ بِاُخْرٰی اَوْ قَالَ نَوَیْتُ الْبَیْنُوْنَةِ الْکُبْرٰی لِتَعَذُّرِ حَمْلِهٖ عَلَی الْاِخْبَارِ فَیَجْعَلُ اِنْشَاء اھ(2) مُلْتَقَطًا۔

ہندیہ میں ہے اگر خاوند نے کہا "میں نے تجھے آزاد کیا" تو نیت طلاق سے طلاق ہو جائے گی، جیسا کہ معراج الدرایہ میں ہے اھ اور در میں ہے وہ لفظ کنایہ ہوتا ہے جو طلاق کے لئے وضع نہ ہو اور وہ طلاق اور غیر طلاق دونوں قسم کا احتمال رکھتا ہو تو ایسے لفظ سے بائنہ طلاق ہوگی ایک یا دو کی نیت سے ایک اور تین کی نیت سے تین ہوں گی اور ایسا لفظ پہلے بائنہ طلاق کو لاحق نہ ہوگا مگر جب وہ پہلی طلاق کی حکایت کا احتمال رکھتا ہو تو اس کو خبر و حکایت ہی قرار دیا جائے گا، مثلاً یوں کہے "تو بائن بائن ہے" یا کہے "میں نے

1۔ فتاوی ہندیہ الفصل الخامس فی الکنایات نورانی کتب خانہ پشاور، 376/1

2۔ درمختار باب الکنایات مطبع مجتبائی دہلی، 224/1

ایک طلاق بائنہ دی ہے" تو دوسری بائنہ
واقع نہ ہوگی" کیونکہ اس کو انشاء بنانے کی
ضرورت نہیں، اس کے برخلاف جب
یوں کہے "میں نے تجھے دوسری بائنہ
طلاق دی" یا کہے "میں نے بڑی بائنہ کی
نیت کی ہے" تو اس صورت میں اس کو خبر
قرار دینا درست نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس کو
انشاء ہی ماننا پڑے گا اھ ملتقطاً (ت)

(فتاوی رضویہ جلد نمبر 12 صفحہ 581-582 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مسئلہ نمبر 320: از ملک متوسط شہر رائپور محلہ بجنا تھ بارہ مرسلہ منشی محمد اسحٰق مولود خواں عرائض نویس 9 جمادی الآخرہ 1312ھ۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص مسمی طالع ورخاں نے بحالت غیظ و غضب ایک خط اپنے خسر حقیقی کے نام لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے جناب ماموں نجم خاں صاحب دام ظلہٗ بعد السلام علیکم واضح ہو میں نے آپ سے بارہا کہا کہ عمدہ کو یہاں سے مت لے جاؤ، مگر آپ لے ہی گئے بغیر رضا مندی، آپ نے اپنی ہی ضد کی، میں بھی اُس کے اطوار سے نہایت درجہ ناخوش تھا، اس چار مہینہ کے عرصہ میں کبھی میری خدمت نہ کی، اطوار ناشائستہ جو اس میں ہیں ان کا دفع غیر ممکن ہے، اس سے بڑھ کر خراب عادات عمدہ میں ہیں، لہٰذا بخوشی تمام آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص کے ساتھ کردو، کیونکہ جس حالت میں میرا دل اس سے خوش نہیں اور اس کا بھی مجھ سے نہیں ایسی حالت میں ایک دوسرے کی جان کے ضرور خواہاں رہیں گے ایسا نہ ہونا سبب، برضا و رغبت آپ کو اجازت دیا، اس کا خراب نہ ہونا سبب دوسرے نکاح کی اجازت دیا، تاکہ خدائے پاک مجھ کو اپنے فضل سے مرتکب گناہ نہ کرے، اس خط کو بطور طلاق نامہ

کے تصور فرمائیں اگر آپ اس کا نکاح کرا دیں گے تو مجھ کو کسی نوع کا عذر تکرار آگے نہیں اور نہ کروں گا صرف ڈیڑھ سو روپیہ نکاح میں صرف ہوا اس کا تو البتہ افسوس ہے کہ حج کا روپیہ خرچ ہو گیا مگر کیا علاج ہے کچھ چارہ نہیں، مرضی، مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ آپ اپنے دل میں بھی اس کا رنج نہ کریں تحریر مختصر کو کثیر تصور فرمائیں، عمدہ سے اور مجھ سے اب کچھ سروکار نہ رہا، جو رشتہ پہلے تھا وہی اب قائم رہے گا، سرمست خاں اس خط کو حرف بحرف پڑھ کر ماموں صاحب اور عمدہ کو بھی سنا دیں تا کہ اس پر شرعاً طلاق واجب ہو جائے، کیونکہ وہ میری بلا اجازت گئی تو نکاح کے باہر ہونا اظہر من الشمس ہے، فقط بندہ طالع ورخاں از مقام ساکولی۔

جس وقت یہ خط پہنچا سرمست خاں نے عمدہ اور اس کے والد نجم خاں کو سنا دیا بعد ایک ہفتہ کے طالع ورخاں اپنے خسر کے یہاں آئے اور کہنے لگے کہ میری زوجہ عمدہ کو میرے ساتھ روانہ کر دو، نجم خاں نے روبرو چند آدمیوں کے بھیجنے کا اقرار کیا پھر بعد دو گھنٹہ کے طالع ورخاں لینے آئے تو معلوم ہوا کہ نجم خاں دیہات پر چلا گیا۔ بعد چند ماہ کے نجم خاں نے طالع ورخاں سے صراحتاً کہہ دیا کہ ہم لڑکی کو کیسے روانہ کریں تم نے تو طلاق نامہ لکھ کر روانہ کر دیا، پھر بائیس 22 ماہ کے بعد طالع ورخاں نے اپنے خسر کے نام یہ خط لکھا:

جناب ماموں صاحب! بعد سلام علیک واضح ہو میں نے یہاں پر کئی علماء سے دریافت کیا سب یہی کہتے ہیں طلاق ہو چکی اس لئے عرض پرداز ہوں کہ آپ اپنی لڑکی کا نکاح کرا دیجئے مجھ سے کوئی واسطہ نہ رہا آپ رنجیدہ نہ ہوں امر مجبوری ہے ورنہ کوئی صورت لانے کی کیا ہوتا فقط۔

پھر نو ماہ کے بعد خسر کو خط لکھا کہ فرنگی محل کے علماء سے خط بھیج کر فتویٰ طلب کیا تھا، جواب آیا کہ طلاق ہو چکی، مہر کی نسبت انہوں نے فتویٰ دیا کہ نصف مہر دینا چاہیے، مگر میں اور جوابوں کا منتظر ہو۔ پس عرض یہ ہے کہ صورت مرقومہ بالا میں عمدہ پر طلاق ہوئی یا نہیں؟ اگر ہوئی تو کن لفظوں سے؟ اور کس قسم کی؟ اور کتنی طلاقیں متحقق ہوئیں؟ غرض عمدہ طالع ورخاں کے نکاح میں رہی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

اَللّٰھُمَّ ھِدَایَةَ الْحَقِّ وَالصَّوَابِ۔ اس خط میں آٹھ لفظ تھے:

(۱) بخوشی تمام اجازت دیتا ہوں کہ اس کا نکاح کسی دوسرے کے ساتھ کردو۔

(۲) برضا ورغبت آپ کو اجازت دیا۔

(۳) اس کا خراب نہ ہونا سبب دوسرے نکاح کی اجازت دیا۔

(۴) اس خط کو بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں۔

(۵) اگر آپ اس کا نکاح کرادیں گے تو مجھ کو کسی نوع کا عذر تکرار آگے نہیں اور نہ کروں گا۔

(۶) عمدہ سے اور مجھ سے کوئی سروکار نہ رہا۔

(۷) اس خط کو ماموں صاحب اور عمدہ کو سنادیں کہ اس پر شرعاً طلاق واجب ہوجائے۔

(۸) وہ میری بلا اجازت گئی تو نکاح کے باہر ہونا اظہر من الشمس ہے۔

ان میں لفظ چہارم صالح ایقاع طلاق نہیں کہ بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں، کے صاف یہ معنی کہ حقیقت میں طلاق نامہ نہیں، فتاوٰی امام قاضی خاں میں ہے:

امراة قالت لزوجها مرا طلاق ده فقال الزوج داده انگار او کرده انگار لا یقع وان نوی کانه قال لها بالعربیة احسبی انک طالق وان قال ذلک لا یقع وان نوی(1) اھ ملخصاً۔

بیوی نے خاوند سے کہا "مجھے طلاق دے" خاوند نے جواب میں کہا "تو دی ہوئی یا کی ہوئی خیال کرلے" تو طلاق نہ ہوگی اگرچہ طلاق کی نیت کی ہو، کیونکہ عربی میں اس کا معنی یوں ہے "تو گمان کرلے تو طلاق والی ہے" اور اگر یوں بالفاظ عربی کہا تو طلاق نہ ہوگی چاہے طلاق کی نیت کی ہو۔ اھ ملخصا (ت)

اسی میں ہے:

1۔ فتاوٰی قاضی خاں کتاب الطلاق نولکشور لکھنؤ 1/210

لو قيل لرجل اطلقت امرأتک فقال عدها مطلقة اواحسبها مطلقة لاتطلق امرأته(1) اھ تمام تحقیق ذلک فی فتاونا المفصلة

ایک شخص نے دوسرے سے کہا "کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے" اور دوسرا جواب میں کہے "تو اس کو طلاق دی ہوئی شمار کر لے، تو مطلقہ سمجھ لے" تو بیوی کو طلاق نہ ہوگی۔ اھ، اس کی مکمل تحقیق ہمارے مفصل فتووں میں ہے(ت)

لفظ پنجم ظاہراً ترک نزاع کا وعدہ ہے:

آگے بمعنی آئندہ اوھو تعلیق علی النکاح ان ارید بقوله آگے بعد الانکاح، او اخبار عن النیة فی بعض الالفاظ السابقة ان اریدبه من بعد ما کتبت ھذا۔

آگے بمعنی آئندہ یا یہ نکاح کر دینے پر معلق ہے اگر اس نے "آگے" کے لفظ سے نکاح کر دینے کے بعد کی نیت کی ہو، یا پہلے مذکور الفاظ لکھنے کے بعد مراد لی ہو۔ اسے محفوظ کرلو۔(ت)

لفظ ششم بھی الفاظ طلاق سے نہیں، سر بمعنی خیال وخواہش اور کار بمعنی حاجت ہے، سروکار نہیں یعنی غرض، مطلب حاجت کام نہیں اور ان الفاظ سے طلاق نہیں ہوتی اگرچہ بہ نیت طلاق کہے۔ خانیہ و بزازیہ وغیرہما میں ہے:

لو قال لاحاجة لی فیک ونوی الطلاق لا یقع وکذالو قال مرابکار نیستی وکذالو قال ما اریدک(2)

اگر خاوند نے کہا "مجھے تجھ میں کوئی حاجت نہیں" تو طلاق کی نیت کے باوجود طلاق نہ ہوگی۔ یوں ہی اگر اس نے کہا "تو میرے کام کی نہیں" یوں ہی اگر اس نے کہا "میں تجھے نہیں چاہتا" تو طلاق نہ ہوگی(ت)

1۔ فتاوی قاضی خان کتاب الطلاق نولکشور لکھنؤ 213/1

2۔ فتاوی قاضی خاں کتاب الطلاق نولکشور لکھنؤ 213/1

بحرالرائق میں ہے:

اذا قال لا حاجة لی فیک اولا اریدک او احبک اولا اشتھیک اولا رغبة لی فیک فانه لا یقع وان نوٰی (1)

اگر خاوند نے یہ الفاظ کہے "مجھے تجھ میں حاجت نہیں، میں تجھے نہیں چاہتا، میں تجھے پسند نہیں کرتا، مجھے تیری خواہش نہیں، تجھ میں میرے لئے رغبت نہیں" تو طلاق کی نیت کے باوجود طلاق نہ ہوگی۔

(ت)

لفظ ہشتم بھی محض لغو وغلط ہے کہ ایک باطل خیال جہاں پر نکاح سے باہر ہونا بتاتا ہے بے اجازت شوہر عورت چلی جائے تو نکاح سے باہر نہیں ہوتی اور جو اقرار غلط بنا پر ہو معتبر نہیں۔ خانیہ میں ہے:

صبی قال ان شربت فکل امرأة اتزوجھا فھی طالق فشرب وھو صبی فتروج وھو بالغ وظن صھره ان الطلاق واقع فقال ھذا البالغ (آرے حرام است برمن) لا تحرم امرأته ھو الصحیح لانه ما اقر بالحرمة ابتداء وانما اقر بالسبب الذی تصادقا علیه وذلک السبب باطل (2) اھ ملخصاً۔

ایک بچے نے کہا "اگر میں یہ پی لوں تو جس عورت سے بھی نکاح کروں تو اس کو طلاق" پھر اس نے دوران بچپن وہ چیز پی لی، پھر بالغ ہونے کے بعد اس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس کے سسرال نے خیال کیا کہ اس کے مذکور قول کی وجہ سے طلاق ہوگئی ہے تو اس لڑکے نے کہا "ہاں یہ مجھ پر حرام ہے" تو اس صورت میں صحیح قول کے مطابق اس کی بیوی اس پر حرام نہ ہوگی، کیونکہ یہاں ابتداء بیوی کو حرام نہیں کہا بلکہ اس نے

1۔ البحرالرائق باب الکنایات ایچ ایم سعید کمپنی کراچی 303/3

2۔ فتاوٰی قاضی خاں باب التعلیق نولکشور لکھنؤ 235/1

اس سبب کے وجود کا اقرار کیا جس پر دونوں سچے ہیں اور جس سبب پر اس نے یہ اقرار کیا وہ باطل ہے۔ اھ ملخصا (ت)

بقیہ چار الفاظ میں تین لفظ پیشین کا حاصل اجازتِ نکاح دینا ہے اور وہ بے شک کنایات سے ہے۔

فانه ینبئ عن رفع قید النکاح واخراجها عن عصمة لنفسه کقوله تزوجی(1) کما فی الخانیة زاتغی الازواج(2) کما فی الکنز وو ھبتک للازواج(3) کما فی الھندیة۔

کیونکہ یہ الفاظ نکاح کی قید کو ختم کرنے کی خبر دیتے ہیں اور اپنی عصمت سے نکالنے کی خبر دیتے ہیں جیسے کہ خاوند یوں کہے "تو نکاح کر" جیسا کہ خانیہ میں ہے "تو خاوند تلاش کر" جیسا کہ کنز میں ہے "میں نے تجھ کو خاوندوں کے سپرد کیا" جیسا کہ ہندیہ میں ہے۔ (ت)

<u>مگر ان تین اور ان کے ساتھ کتنی کنایات بائنہ ہوں سب سے ہوگی تو ایک ہی طلاق بائن ہوگی اگرچہ سب سے نیت کی ہو فَاِنَّ الْبَائِنَ لَا یَلْحَقُ الْبَائِنَ</u> (کیونکہ بائن طلاق کے بعد دوسری بائنہ لاحق نہیں ہوسکتی۔ (ت)

لفظ ہفتم طلاق صریح ہے مگر اس شرط پر معلق کہ سرمست خاں، نجم خاں اور عمدہ کو حرف بحرف خط پڑھ کر سنادے۔

فان لفظه تاکہ تفید ھھنا ترتب الطلاق علی الاسماع ای ربط

اس لئے کہ "تاکہ" کا لفظ یہاں سنانے پر طلاق کو مرتب کرنے کے لئے ہے یعنی

1۔ فتاوٰی قاضی خاں فصل فی الکنایات نولکشور لکھنؤ 216/1
2۔ کنز الدقائق باب الکنایات ایچ ایم سعید کمپنی کراچی صفحہ 116
3۔ فتاوٰی ہندیہ الفصل الخامس فی الکنایات نورانی کتب خانہ پشاور 376/1

حصول ذاک بحصول هذا وهذا هو معنی التعلیق وفی الدر المختار یکفی معنی الشرط(1)

اس چیز کے حاصل ہو جانے پر اس چیز کا حصول بتانے کے لئے ہے اور یہی تعلیق کا معنی ہوا ہے۔ اور درمختار میں ہے کہ تعلیق کا معنی ہی شرط کے لئے کافی ہوتا ہے۔ (ت)

تو ان آٹھ لفظوں کا حاصل صرف دو لفظ رہے، ایک کنایہ جس سے بلحاظ نیت طلاق بائن پڑے گی دوسرا صریح معلق جس سے بعد تحقق شرط طلاق رجعی ہوگی، صریح کا حکم تو دیانۃً وقضاءً دونوں میں سے ایک ہی ہے کہ اگر سرمست خاں نے خط مذکور دونوں کو حرف بحرف سنا دیا تو طلاق ہوگئی اور اگر ان میں سے ایک کو سنانے میں بھی کچھ کمی رہی ہے جسے حرف بحرف سنانا نہ کہیں تو نہ ہوئی مگر حکم کنایہ یہاں مختلف ہے دیانۃً حاجت نیت ہے۔ ردالمحتار میں ہے:

لا یقع دیانة بدون النیة ولو وجدت دلالة الحال فوقوعه بواحد من النیة او دلالة الحال انما هو فی القضاء فقط کما هو صریح البحر وغیره(2)

کنایہ کی صورت میں نیت کے بغیر طلاق نہ ہوگی اور اگر دلالت حال بھی پائی جائے تو طلاق کا وقوع نیت یا دلالت حال میں سے ایک کے ساتھ ہوگا یہ صرف قضاءً طلاق ہوتی ہے، بحر وغیرہ کی صراحت یہی ہے۔ (ت)

اور قضاءً بوجہ قرائن سباق وسیاق وقوع طلاق کا حکم علی الاطلاق۔

فان اللفظ وان کان مما یصلح ردا کما فی الغرر والبحر والخانیة لکن قد حفته قرائن ترد معنی الرد کقوله لهذا وقوله ایا

غرر، بحر اور خانیہ میں جیسا کہ مذکور ہے کہ لفظ اگرچہ جواب بن سکتا ہو مگر وہاں قرائن کا ہجوم اس کے جواب ہونے کو مردود قرار دیتا ہے، جیسا کہ یہاں ایسا نہ

1۔ درمختار باب التعلیق مطبع مجتبائی دہلی 230/1

2۔ ردالمحتار باب الکنایات داراحیاء التراث العربی بیروت 463/2

نہ ہونا سبب وقولہ اس کا خرابانہ ہونا سبب وقولہ تاکہ خدائے پاک الخ فان ھذہ التعلیلات والتفریعات لاتلائم قصد الرد کما لا یخفی ودلالۃ القال کدلالۃ الحال۔	ہونا سبب، اس کا خرابانہ ہونا سبب، تاکہ خدائے پاک الخ" کے الفاظ ہیں، کیونکہ یہ الفاظ تعلیل اور تفریع ہونے کی بناء پر، جواب کے ارادہ سے مناسب نہیں ہیں جیسا کہ مخفی نہیں ہے، اور دلالت قال، دلالت حال کی طرح ہے۔(ت)

ردالمحتار میں نہر الفائق سے ہے: دلالۃ الحال تعم دلالۃ المقال(1) (دلالت حال، دلالت قال کو بھی شامل ہے۔ت) مگر خط کی بناء پر وقوع طلاق کا حکم اسی حالت میں ہوسکتا ہے جب کہ شوہر مقر یا گواہان عادل شرعی دومرد یا ایک مرد دوعورت سے ثابت ہو کہ یہ خط اس کا ہے ورنہ صرف مشابہت خط پر حکم نہیں۔اشباہ میں ہے:

ان کتب علی وجہ الرسالۃ مصدر معنونا و ثبت ذٰلک باقرارہ او بالبینۃ فکالخطاب(2)	اگر خط کا عنوان شروع کر کے لکھا اور پھر اس کے اقرار یا گوہوں سے ثابت ہو جائے تو یہ لکھنا زبانی خطاب کی طرح ہے۔(ت)

پس صورت مستفسرہ میں حکم قضایہ ہے کہ اگر اس خط کا طالعور خاں کا ہونا نہ اس کے اقرار سے ثابت نہ گواہان عادل سے، جب تو اصلاً حکم طلاق نہیں، اور اگر اقرار یا شہادت سے ثبوت ہے تو عمدہ پر طلاق بائن پڑ گئی، اگر سرمست خاں نے عمدہ ونجم خاں دونوں کو حرف بحرف سنادیا جب تو دو طلاقیں بائن ہوئیں۔

فان الصریح یلحق البائن والرجعی اذا لحقہ صار مثلہ لعدم	اس لئے کہ صریح طلاق بائنہ کو لاحق ہو سکتی ہے اور جب بائنہ کے بعد اس کو

1۔ردالمحتار باب الکنایات دار احیاء التراث العربی بیروت 463/2

2۔الاشباہ والنظائر الفن الثالث احکام الکتابۃ ادارۃ القرآن کراچی 297-98/2

امکان اثبات الرجعة کما فی البزازیة وغیرھا۔ | رجعی لاحق ہوتو وہ رجعی طلاق بھی بائنہ کی طرح ہو جاتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں رجوع کا امکان نہیں رہتا، جیسا کہ بزازیہ وغیرہ میں ہے۔(ت)

ورنہ ایک ضرور ہوئی، بہر حال عدہ نکاح سے نکل گئی، یہی تفصیل جو حکم قضائی ہے عدہ کو اسی پر عمل واجب ہے۔ فان المرأة کالقاضی(1) کما فی الفتح وغیرہ (کیونکہ بیوی اس میں قاضی کی طرح ہے، جیسا کہ فتح وغیرہ میں ہے۔ت)

اور حکم دیانت یہ ہے کہ اگر یہ خط طالع ورخاں کا ہے اور اس نے الفاظ کنایہ میں کل یا بعض سے نیت ازالۂ نکاح کی تو طلاق بائن ہوئی پھر اس کے ساتھ وہ خط سنانے کی شرط بھی پوری پائی گئی تو دو طلاقیں بائن ہوئیں بہر حال عدہ نکاح سے باہر ہوئی اور اگر نیت نہ کی تو سنانے کی شرط پائے جانے کی حالت میں ایک طلاق رجعی پڑی جس میں اسے اختیار رجعت تا ایام عدت تھا، اور اگر اس شرط میں بھی کمی رہی تو اصلاً طلاق نہ پڑی، یونہی اگر یہ خط اس کا نہیں جب بھی طلاق نہ ہوئی اگرچہ گواہ گواہی دیں یا خود اس نے غلط اقرار کر دیا ہو۔

فان الاقرار الکاذب لا أثر له دیانة ھذا جملة القول والتفصیل فی فتونا المذکورة۔ | اس لئے کہ جھوٹے اقرار کا کوئی اثر دیانتا نہیں ہے، یہ تمام خلاصہ کلام ہے اور تفصیل ہمارے فتاوٰی میں مذکور ہے۔(ت)

اور جب کہ عدہ و طالعورخاں میں خلوت صحیحہ ہوگئی ہو جیسا کہ بیان سوال سے ظاہر ہے کہ وہ چار مہینے شوہر کے یہاں رہی تو بعد طلاق کل مہر واجب الادا ہے، نصف ساقط ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ واللہ تعالٰی اعلم۔

ان فتاوٰی میں امام اہلسنّت مولانا احمد رضا خان قادری رحمہ اللہ تعالٰی علیہ نے صراحت فرمادی کہ:

---

(1) البحر الرائق کتاب الطلاق باب الطلاق الصریح ایچ ایم سعید کمپنی کراچی 257/3

(ا) چند بار یہ الفاظ بر نیت طلاق کہے، یعنی ہر بار یہ الفاظ نیت طلاق سے کہے اور تاکید خلاف اصل ہے، اصل استیناف ہے (رد المحتار جلد 2 صفحہ 460) اس کے باوجود اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے صرف ایک طلاق بائن کا فتویٰ دیا۔

(۲) ایک شخص نے اپنی بیوی کو چار بار ''صفائی دے دیا'' کہا اور چاروں دفعہ طلاق کی نیت کی، پھر بھی اعلیٰ حضرت نے صرف ایک طلاق بائن کا حکم لگایا ہے اور دلیل یہی دی کہ بائن، بائن کو لاحق نہیں ہوتی۔

(۳) انہوں نے تصریح فرما دی کہ کنایات طلاق کو خواہ کتنی مرتبہ مکرر کہا جائے اور خواہ سب کے ساتھ طلاق کی نیت کی جائے، تو صرف ایک طلاق بائن واقع ہو گی، اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ بائن بائن کو لاحق نہیں ہوتی اور ہمارا موضوع بحث بھی یہی ہے کہ شوہر نے کلمات: ''میں نے تمہیں آزاد کیا'' کو مکرر کہا اور دوسری بار دوسری طلاق کی نیت کی، تو یہاں بھی صرف ایک طلاق واقع ہو گی۔

(۴) وجہ استدلال یہ ہے کہ طلاق ثانی کو اول کی خبر صرف اس وقت نہیں بنایا جا سکتا جب وہ کہے: ''میں نے دوسری طلاق دی'' یا یہ کہے میں نے ''بینونت کبریٰ'' (یعنی طلاق مغلظہ کی نیت کی) اعلیٰ حضرت نے پہلی طلاق کی خبر بنانے سے صرف ان دو صورتوں کا استثناء فرمایا ہے جب ایک ''طلاق بائن'' کو شوہر دوبار نیت محض سے نہیں بلکہ لفظاً کہے: ''میں نے دوسری طلاق دی'' یا میں نے ''بینونت کبریٰ'' کی نیت کی، تو چونکہ ان دو صورتوں میں طلاق (بائن) ثانی کو اول کی خبر بنانا ممکن نہیں، اس لئے دونوں سے ''انشاء طلاق'' کا حکم دیا جائے گا اور یہی دو استثنائی صورتیں ہیں۔ اگر ان کے علاوہ کوئی تیسری استثنائی صورت (Exceptional Case) بھی ہوتی (جیسا کہ حضرت مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ اگر ایک طلاق بائن دی، اس کے بعد دوسری طلاق بائن دی اور دوسری بائن سے دوسری طلاق کی نیت کی تو یہ موثر ہو کر پہلی بائن سے لاحق ہو جائے گی) کہ دوسری طلاق کی نیت سے ''تو بائن ہے'' کہے تو یہ پہلی کے ساتھ لاحق ہو جائے گی، تو اعلیٰ حضرت فاضل

بریلوی قدس سرہ العزیز اس کا بھی ذکر فرما دیتے، کیونکہ یہ مقام بیان ہے اور مقام بیان میں کسی چیز کا ذکر نہ کرنا، اس بات کا بیان ہے کہ وہ مراد نہیں ہے، **کما لا یخفی۔**

نوٹ: اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ میں (استفتا اور فتویٰ دونوں) ہم نے ایسے متعلقہ پیرا گراف خط کشیدہ کر دیئے ہیں، قارئین اور خاص طور پر اہل علم اور اہل فتویٰ سے گزارش ہے وہ دو تین بار ان کا مطالعہ کریں، مسئلہ انشاء اللہ العزیز نکھر کر سامنے آجائے گا۔ دار العلوم امجدیہ ہماری مادر علمی ہے، ماضی میں ہمارے عظیم اکابر شیخ الحدیث علامہ عبد المصطفیٰ الازہری، حضرت علامہ مفتی محمد وقار الدین، حضرت علامہ مفتی سید شجاعت علی قادری رحمہم اللہ اجمعین اس سے وابستہ رہے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی ذات میں ایک ادارہ، ایک انجمن اور ایک جامعہ تھے، وہ ہمارے مسلک کی پہچان تھے۔ علامہ مفتی عبد العزیز حنفی صاحب سے بھی ہمارا کوئی ذاتی اختلاف وعناد نہیں ہے، ہم ان سمیت ہر صاحب علم کا احترام کرتے ہیں۔ اہل علم کا حوادث ونوازل میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے، لیکن یہ مسئلہ فقہاء احناف کا متفقہ، مسلمہ اور معروف مسئلہ ہے۔ ہم نے حق کی طرف رجوع کے لئے پہلے مفتی صاحب محترم سے خود رجوع کیا تھا، پھر حضرت قبلہ مفتی ظفر علی نعمانی صاحب اور علامہ شاہ تراب الحق قادری صاحب کے پاس سارا مواد مع تصدیقات اہل علم وفتویٰ ارسال کیا، اور ان دونوں حضرات سے میں نے بذات خود فون پر بھی گزارش کی کہ مفتی عبد العزیز حنفی صاحب سے اپنے فتویٰ پر نظر ثانی کے لیے کہیں، حضرت قبلہ مفتی ظفر علی نعمانی صاحب نے فرمایا کہ اب یہ لوگ میری بات سنتے اور مانتے نہیں ہیں، اس لئے میں نے احقاق حق کے لئے اسے ریکارڈ کا حصہ بنایا ہے اور تفہیم المسائل میں شامل کیا ہے۔

الحمد للہ! ہمارے فتویٰ پر اجلہ علماء کرام کی تصدیقات ثبت ہیں، وللہ الحمد۔

تصدیقات وتائیدات علماء کرام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب غلطی پر غلطی کرتے چلے جارہے ہیں، علامہ بحر نے ماتن کی عبارت ''لا البائن'' کی تشریح میں مسلمہ قیود پر بحث کرتے ہوئے ایک اعتراض کر کے پھر خود ہی اس کا جواب بھی ''الا ان یقال'' سے دے دیا۔ اسی اعتراض کے مزید دو جواب علامہ شامی نے ''منحة الخالق'' میں بھی دیئے۔ اعلیٰ حضرت نے بحر کے اعتراض کی تقریر کو اپنے زوردار الفاظ میں بیان کر کے علامہ بحر کے اعتراض کے مبنیٰ کو واضح کیا تاکہ علامہ بحر پر سطحیت کا الزام نہ آئے کہ نیت کے عدم اعتبار پر تصریحات کے باوجود علامہ کا اعتراض چشم پوشی ہے۔

اسی نکتہ کی طرف فلیتامل سے اشارہ فرمایا کہ یہ علامہ بحر کے اعتراض کی تقریر ہے یہ کسی کا قول یا مذہب نہیں، ردالمحتار کے حوالہ کو بہار شریعت میں بھی مسلمہ اور واضح قرار دے کر مسئلہ کو بیان کیا اور نیت سے مراد ایسی نیت جس سے خبر ہونا ناممکن ہو جائے اور یہ جب ہی ہوگا جب کہ وہ نیت جدید طلاق پر دال سے موید ہو۔ لہٰذا مولانا عبدالعزیز حنفی صاحب فارغ البالی سے کتب فقہ کی اس بحث کو دیکھیں۔ امکن یمکن، لا یمکن، الفاظ کو نظر انداز نہ کریں۔ انہی الفاظ پر بحث کا مدار ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

[signature]

مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی

جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

تصویب

صورۃ مسئولہ میں جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب کا جواب حق اور صواب ہے اور دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب کا فتویٰ غلط ہے لہٰذا مفتی منیب الرحمٰن کے فتویٰ پر عمل کیا

جائے فقہ کی چھوٹی بڑی سب کتابوں میں تصریح ہے کہ بائن بائن کولاحق نہیں ہوتی اور اس کی وجہ صرف ثانی کا اول کے لئے خبر بننے اور حکایت ہونے کا امکان ہے۔ نیت کچھ بھی ہو امجدیہ کے مفتی صاحب کو یہ بات سمجھ نہیں آئی اور نیت کی وجہ سے غلطی ہوگئی اور انہوں نے ان کنایات کے متعلق علامہ شامی کی نامکمل عبارت نقل کردی جن سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے، اور ان کی دیانت پر تعجب ہے کہ پورے جملہ سے خبر میں جملہ شرطیہ کی صرف ایک جز نقل کردی، مبتداء اور خبر کے متعلقات کو ترک کردیا اور ترجمہ بھی ذکر نہیں کیا تاکہ بات کھل نہ جائے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بائن ثانی سے دوسری طلاق کی نیت سے طلاق ثانی واقع نہیں ہوتی، اس کی پوری بحث میں درمختار کے قول ''اِذَا اَمْکَنَ جَعْلَہٗ اِخْبَارًا'' کے ماتحت علامہ ابن عابدین نے لکھا اور شامی نے البحرالرائق سے نقل کردہ عبارت کا رد فرمادیا اگر مناسب ہو تو دیکھ لیں۔ مفتی صاحب کی نقل کردہ عبارت میں تلحق کے ضمیر کا مرجع صرف اعتدی، استبرئی رحمک، انت واحدۃ اور ان کے ساتھ ملحقات ہیں، جملہ کنایات نہیں، یہاں سے مفتی صاحب کو عدم فہم سے غلطی لگی اور فقہاء کے مسلمہ اجماعی ضابطہ کلیہ البائن لایلحق البائن کو اڑادیا اور یہ نہ سمجھ سکے کہ اگر اس قاعدہ میں نیت کی وجہ سے کوئی استثناء ہوا تو فقہاء اس پر تحریر فرماتے اور متون میں لکھتے جیسے دوسری استثنائی صورتیں انہوں نے تحریر فرمادیں ہیں۔

الخلاصہ۔ الحق مع المنیب المجیب جزاہ اللہ خیر الجزاء۔ واللہ اعلم

محمد رفیق غفرلہ

دارالافتاء جامعہ مدینۃ العلوم گلستان جوہر بلاک 15، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دارالعلوم نعیمیہ کراچی کے مفتی جناب پروفیسر منیب الرحمٰن صاحب کی طرف سے لکھے گئے ''ردمتابعۃ الجواب'' کے بعد مزید لکھنے کی ضرورت نہیں تھی فنی اور فقہی اعتبار سے دارالعلوم امجدیہ کے مفتی صاحب کا اصل فتویٰ صحیح نہیں تھا۔ حقیقت حال واضح ہونے کے

بعد ہمارا خیال تھا کہ دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب، دار العلوم نعیمیہ کے مفتی صاحب کا شکریہ ادا کریں گے لیکن اس کے برعکس انہوں نے اس کو اپنی ''انا'' کا مسئلہ بنالیا اور پہلے فتویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے متابعۃ الجواب کے عنوان سے سعی لاحاصل شروع کردی۔ معلوم نہیں امجدیہ کے مفتی صاحب نے دار العلوم نعیمیہ کے مفتی صاحب کے دیگر مؤیدین کو چھوڑ کر صرف میری تائید پر تنقید کیوں فرمائی۔

الحمد للہ نفس الامر میں ہمارا موقف صحیح اور ثابت ہے اس لئے مفتی صاحب کو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اور دیگر فقہاء کرام کی کتب سے کوئی ایک فتویٰ بھی ایسا نہیں ملا جس میں تصریح ہو کہ دوسری بائن سے صرف دوسری طلاق کی نیت کرنے سے دوسری طلاق شمار کی جائے گی البتہ امجدیہ کے مفتی صاحب کو جد الممتار سے اس موضوع پر ایک بحث مل گئی۔ جس کا نعیمیہ کے مفتی صاحب نے جواب تحریر فرما دیا ہے۔ فتاویٰ روایات پر دیئے جاتے ہیں صرف بحث من حیث البحث پر نہیں دیئے جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء نے یسر اور عدم تضیق کی وجہ سے دوسری بائن سے استیناف کی نیت کو کافی نہیں سمجھا بلکہ استیناف کی نیت کے لئے ایسے لفظ کا ہونا ضروری سمجھا جو لفظ استیناف کی نیت کے لئے معین ہو کمافی البحر جیسے ابنتک باخری میں لفظ اخری ہے کہ استیناف اور انشاء کی نیت کے لئے معین اور ممد ہے لہٰذا ابنتک سے دوسری طلاق واقع ہو جائے گی معلوم ہوا یہاں متعدد صورتیں ہیں۔

(۱) اول: بائن کے دوسرے لفظ سے تاکید کی نیت ہو تو ایک طلاق بائن ہوگی۔

(۲) دوم: بائن کے دوسرے لفظ سے صرف طلاق کی نیت ہو۔ استیناف اور انشاء کی نیت نہ ہو تو بھی دونوں لفظوں سے ایک بائن ہوگی۔

(۳) سوم: دوسرے لفظ سے استیناف کی نیت ہو لیکن نیت پر کوئی لفظ دلالت کرنے والا مذکور نہ ہو جیسے زیر بحث مسئلہ میں ہے۔ اس صورت میں فقہاء کرام کے نزدیک ایک طلاق بائن ہوگی۔

(۴) چہارم: دوسرے لفظ سے استیناف کی نیت ہو اور اس نیت پر کوئی امر دلالت کرنے والا مذکور ہو۔ دو طلاقیں واقع ہوں گی۔ ابھی تک میری معلومات یہی ہیں لَعَلَّ اللّٰهُ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَالِكَ اَمْرًا۔ میں جناب مفتی منیب الرحمٰن کے "ردالمتابعۃ الجواب" کی تصدیق کرتا ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسعود ..... عفی عنہ
دارالافتاء جامعہ مدینۃ العلم ملتان ..... کراچی
10—11—98

تائید

مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب کا جواب صحیح ہے اس لئے کہ عالمگیری اور شامی کا حوالہ دیا ہے کہ لا یلحق البائن البائن کہ طلاق بائن، بائن کو لاحق (شامل) نہیں ہوتی۔ پہلی ایک طلاق سے ایک طلاق واقع ہوئی جو طلاق بائن ہے اور دوسری تاکید ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ تجدید نکاح نئے مہر کے ساتھ کم از کم دو گواہوں کی موجودگی میں ہو۔ حلالہ کی ضرورت نہیں اور تعداد میں عمر بھر شوہر ایک طلاق کا مالک رہے گا یہ کام عدت میں ہو یا عدت کے بعد ہو۔ مفتی دارالعلوم امجدیہ مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔

هذا مانسح لی و الله تعالی اعلموا حکم واتم برهانهٗ۔

مفتی اہلسنت مفتی ابو ..... غلام .....
مہتمم ..... دارالعلوم ..... آباد

11/11/98

الجواب باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

صورۃ مسئولہ میں دار العلوم نعیمیہ کے مفتی صاحب کا فتویٰ حق اور درست ہے اور دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب کا فتویٰ (کہ مرد کا یہ کہنا میں نے تمہیں آزاد کیا میں نے تمہیں آزاد کیا ان الفاظ سے دو بائن طلاق واقع ہوئیں) یہ کہنا درست نہیں۔

لان البائن الکنائی لا یلحق البائن۔ اھ

وایضا قال فی البحر...... لیس المبانۃ محلاً للبائن۔ اھ

کیونکہ لفظ آزاد کیا یہ بائن کنائی میں سے ہے جو بائن کو لاحق نہیں ہو سکتا اگرچہ مرد بہ نیت طلاق کیوں نہ کہے۔ کیونکہ یہاں ثانی کا اول کیلئے خبر بننے اور حکایت ہونے کا امکان ہے۔

قال فی الرد...... فعلم ان قولھم اذا امکن الخ احترا زعما اذا لم یمکن جعلہ خبرا کما فی أ بنتك بأخری لاعما اذا نوی بہ طلاقا آخر فتدبر۔ وایضافیہ۔ فقولھم البائن لایلحق البائن لاشك ان المراد بہ البائن المنوی، اذ غیرالمنوی لایقع بہ شئی اصلاً۔ اھ (ردالمحتار ۴/۵۴۵)

اور البحرالرائق میں ہے:

الا ان یقال ان الوقوع انما ھو بلفظ صالح لہ بخلاف مجرد النیۃ الخ (البحرالرائق ۳/۵۳۵)

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں صورت مسئولہ میں دار العلوم نعیمیہ کے مفتی صاحب کا جواب (کہ دو طلاقیں ہوں گی یعنی ایک طلاق بائن واقع ہوگی اور ایک پہلی طلاق رجعی کے ساتھ مل کر مجموعی دو طلاقیں شمار ہوں گی اور اب فریقین عدت کے دوران یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں) حق اور صحیح ہے اور دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب کا جواب (کہ صورت مسئولہ میں تین طلاقیں ہو گئیں) یہ درست نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم ورسولہ بالصواب
کتبہ احقر محمد [illegible] نعیمی غفرلہ
۱۶/۱۱/۹۵ دار الافتاء جامعہ [illegible] نعیمیہ ملیر کراچی

دوطلاق کے بعد رجوع

سوال: اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو دو مرتبہ کہہ دیا کہ تجھے طلاق ہے تجھے طلاق ہے۔ تو کیا اس کے بعد رجوع کی گنجائش باقی رہتی ہے؟ (منور احمد، ملیر، کراچی)

جواب: اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے دو مرتبہ کہا کہ تجھے طلاق ہے یا میں تجھے طلاق دیتا ہوں یا میں نے تجھے طلاق دی تو دو طلاق رجعی واقع ہو جائیں گی۔ وہ چاہے تو عدت کے اندر یک طرفہ طور پر عقد ثانی کے بغیر رجوع کر سکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کر لے تو رجوع صحیح ہوگا، لیکن اب اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور اگر شوہر نے رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ عقد ثانی بھی کر سکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کر سکتی ہے۔ اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقد ثانی کیا تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور ایک طلاق خدانخواستہ دے دی تو وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔

بہن سے قطع تعلق کی قسم کھانا

سوال: ''الف'' اور ''ب'' دونوں حقیقی بہن بھائی ہیں۔ ''الف'' کسی بات پر اپنی بہن ''ب'' سے ناراض ہو جاتا ہے اور قسم کھا کر غصہ میں اپنی بہن ''ب'' سے کہتا ہے کہ آج کے بعد میں تمہارے گھر کبھی نہیں جاؤں گا۔ (چاہے تم فوت ہو یا اور کوئی) اگر میری بیوی بھی تمہارے گھر گئی تو وہ مجھ پر طلاق ہوگی۔ اب ''الف'' اور ''ب'' (اس کی بہن) کے درمیان راضی نامہ ہو چکا ہے۔ ''الف'' کی بہن اب ''الف'' اور اس کی بیوی کی دعوت کرنا چاہتی ہے۔ اگر ''الف'' اپنی خوشی سے اپنی بیوی کو اپنی بہن کے گھر جانے کی اجازت دے دیتا ہے اور خود بھی بہن کے گھر جانا چاہا ہے (دونوں ابھی تک بہن ''ب'' کے گھر نہیں گئے)۔ تو ایسی صورت میں کیا طلاق واقع ہو جائے گی یا نہیں؟ تفصیل سے جواب دیں۔ شکریہ۔ (نعیم افضل، مانسہرہ)

جواب: آپ نے جو صورت مسئلہ بیان کی ہے، از روائے شریعت اس کا جواب درج ذیل ہے:

''الف'' کا یہ قسم کھانا کہ وہ اپنی بہن ''ب'' کے گھر کبھی نہیں جائے گا، شرعاً ناپسندیدہ امر ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''کسی مومن کے لئے (خواہ مرد ہو یا عورت) یہ جائز نہیں کہ اپنے بھائی یا بہن کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے''۔ یہ مقاطعہ اگر کسی قریبی عزیز یا عزیزہ کے ساتھ کیا جائے تو یہ بڑا گناہ ہے کیونکہ اس سے قطع رحمی (رشتہ قرابت کو توڑنا) بھی لازم آتی ہے، تو جتنا عرصہ وہ اپنی اس قسم پر قائم رہ کر بہن سے قطع تعلق کیے رہے، اس کے لئے صدق دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے، اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''تم میں سے جو شخص کسی بات (کے کرنے یا نہ کرنے) کی قسم کھالے اور پھر اسے معلوم ہو کہ شرعاً ایسی قسم پر قائم رہنے کے بجائے اس کو توڑ دینا بہتر ہے، تو اسے چاہیے کہ ایسی قسم کو توڑ دے اور اس کا کفارہ ادا کرے''۔ تاہم خلاف شرع ہونے کے باوجود شرعاً ایسی قسم منعقد ہو جاتی ہے، لیکن اس پر قائم رہنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے کیونکہ یہ قسم اصولی طور پر خلاف شرع ہے۔ لہٰذا ''الف'' کو چاہیے کہ فوراً اپنی بہن ''ب'' سے میل جول کا سلسلہ قائم کریں، اپنی قسم کو توڑ دیں اور اس کا کفارہ ادا کریں، کفارہ قسم قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے'' دس مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس فراہم کرنا، اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھنا''۔

''الف'' نے اپنی بیوی کے بارے میں جو یہ کہا کہ ''اگر میری بیوی تمہارے گھر گئی تو وہ مجھ پر طلاق ہو گی'' بیوی بھی ''قطع رحمی'' کا سلسلہ ختم کر کے ان کے گھر چلی جائے اور اس طرح ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی اور ''الف'' عدت کے اندر یک طرفہ طور پر رجوع کر سکتا ہے، قولاً (یعنی یہ کہے کہ میں نے طلاق سے رجوع کیا) یا فعلاً (کہ ازدواجی تعلقات قائم کرے) لیکن آئندہ اسے لفظ طلاق استعمال کرتے ہوئے یا طلاق کی دھمکی دیتے ہوئے بہت محتاط رہنا ہوگا، کیونکہ ایک طلاق کا حق وہ استعمال کر چکا ہے اور اب اس کے پاس صرف

دوطلاق کا اختیار باقی ہے اور اگر خدانخواستہ آئندہ جب کبھی بھی وہ طلاق دے گا، یہ پہلی والی دی ہوئی طلاق اس کے ساتھ جمع ہو کر موثر ہو جائے گی۔لہٰذا حد درجہ احتیاط لازم ہے۔

مشروط طلاق دینا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تم نے پان کھایا تو میری طرف سے طلاق سمجھو، اس نے یہ جملہ کچھ دنوں کے وقفہ سے تین سے زائد بار کہا، لیکن جس کام کے ساتھ مشروط کیا تھا وہ ایک ہی تھا، کچھ دنوں کے بعد اس کی بیوی نے پان کھالیا؟ اس سے بیوی پر طلاق واقع ہوگئی یا نہیں، از روئے شرع جواب دیجئے۔نوازش ہوگی۔ (عبداللہ، اورنگی ٹاؤن، کراچی)

نوٹ: دارالعلوم کراچی کو مندرجہ بالا استفتاء ارسال کیا گیا، وہاں سے مندرجہ ذیل جواب موصول ہوا، مستفتی وہ فتویٰ لے کر ہمارے پاس آئے ہم نے اس کا بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مفتی صاحب کو تسامح ہو گیا ہے اور عدم توجہ یا قلت غور وفکر کی وجہ سے وہ غلط نتیجے پر پہنچے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ مفتی محمد یعقوب صاحب مفتی دارالعلوم کراچی سے وضاحت طلب کی جائے۔سطور ذیل میں مفتی دارالعلوم کراچی کا جواب اور اس کے مفتی صاحب مذکور کے نام ہمارا مکتوب ملاحظہ فرمایئے: (منیب الرحمٰن)

الجواب حامدًا ومصلیاً

صورت مسئولہ میں پان کھانے کی وجہ سے شخص مذکور کی بیوی پر تینوں طلاق واقع ہو گئیں اور نکاح ختم ہو کر حرمت مغلظہ ثابت ہوگئی اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر آپس میں دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا۔(ماخذہ امداد الفتاویٰ 440/2)

فی الدر (صفحہ 376 جلد 3)

فی ایمان الفتح مالفظه: وقد عرف فی الطلاق انه لو قال: ان دخلت الدار فانت طالق ان دخلت الدار فانت طالق ان دخلت الدار فانت طالق وقع الثلاث (قوله وقع

الثلاث) يعنى بدخول واحد كما تدل عليه عبارة ايمان الفتح اه و كذا ايضا فى الهندية(429/1)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

محمد یعقوب عفی اللہ عنہ

دارالافتاء دارالعلوم کراچی 14

محترم مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب

رئیس شعبہ افتاء جامعہ دارالعلوم، کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کے دارالافتاء سے 17 ذیقعدہ 1420ھ کو (حوالہ نمبر 87/400) ایک فتویٰ جاری ہوا ہے جس پر آپ کے دستخط برائے تائید وتوثیق ثبت ہیں، اس فتوے کی نقل منسلک ہے۔ مستفتی نے دریافت یہ کیا تھا کہ ایک شخص نے تین سے زائد بار اپنی بیوی سے کہا کہ ''اگر تم نے پان کھایا تو میری طرف سے طلاق سمجھو''۔ آپ کی طرف سے جواب دیا گیا کہ ''تین طلاقیں واقع ہو گئیں''۔ آپ حضرات نے ''میری طرف سے طلاق سمجھو'' کو ''انت طالق'' کے معنی میں لیا ہے، جب کہ کتب فتاویٰ میں اس کے برعکس فقہی آراء موجود ہیں، ہم ان میں سے چند کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں:

(ا) امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز سے ایک طویل استفتاء میں دریافت کیا گیا کہ شوہر نے لکھا ''اس خط کو بطور طلاق نامہ کے تصور فرمائیں'' انہوں نے جواب دیا:

''صالح ایقاع طلاق نہیں کہ بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں'' کے صاف یہ معنی کہ حقیقت میں ''طلاق نامہ'' نہیں، فتاویٰ امام قاضی خان میں ہے:

اِمْرَاَةٌ قَالَتْ لِزَوْجِهَا: مرا طلاق ده، فَقَالَ الزَّوْجُ "داده انگار" او "کرده انگار" لَا يَقَعُ وَاِنْ نَوٰى كَاَنَّهٗ قَالَ لَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ اِحْسَبِىْ اِنَّكِ طَالِقٌ، وَاِنْ قَالَ ذٰلِكَ وَاِنْ نَوٰى (فتاویٰ قاضی خان، کتاب الطلاق، جلد 1 صفحہ 310

مطبوعہ نولکشور لکھنو) فتاویٰ رضویہ جلد 12 صفحہ 631 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور، اسی مقام پر ہے:

لَوْقِيْلَ لِرَجُلٍ اَطَلَّقْتَ اِمْرَأَتَکَ قَالَ: ”عُدَّهَا مُطَلَّقَةً“ اَوْ ”اِحْسِبْهَا مُطَلَّقَةً“ لَا تُطَلَّقُ اِمْرَأَتُهٗ

فتاویٰ قاضی خان، کتاب الطلاق جلد 1 صفحہ 213، مطبوعہ نولکشور، لکھنو۔

(۲) فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”داده انگار“ اَوْ ”کرده انگار“ لَا يَقَعُ وَاِنْ نَوٰى وَلَوْ قَالَ لَهَا بَعْدَ هَا طَلَبَتِ الطَّلَاقَ (جلد 1، صفحہ 380 مطبوعہ دارالاشاعت العربیہ قندھار)

(۳) امداد الفتاویٰ، جلد 2 صفحہ 449

سوال کی متعلقہ عبارت میں ہے: ”آخر لوگوں نے کہا: تم اس قدر مارتے ہو، اگر وہ موافق نہیں ہے تو اس کو طلاق دے، تو اس نے کہا: ”تم لوگ ایسا ہی سمجھو“ جواب میں درج ہے: فی العالمگرية: اِمْرَأَةٌ قَالَتْ لِزَوْجِهَا: مرا طلاق ده، فَقَالَ الزَّوْجُ: ”داده گیر و کرده گیر“ او قال: ”داده بار“ و ”کرده بار“ اِنْ نَّوٰى يَقَعُ وَيَكُوْنُ رَجْعِيًّا وَاِنْ لَّمْ يَنْوِلَا يَقَعُ، وَفِيْهَا: ”داده انگار“ او ”کرده انگار“، لَا يَقَعُ وَاِنْ نَّوٰى، صفحہ 72 جلد 2۔ اور یہ لفظ کہ ”تم لوگ ایسے ہی سمجھو“ ترجمہ ”داده انگار“ کا معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی۔

آپ حضرات نے امداد الفتاویٰ جلد 2 صفحہ 440 کے جس حوالے سے اپنے فتویٰ کو مؤید کیا ہے، وہاں تعلیق وتکرار کی حد تک تو بات درست ہو سکتی ہے، باقی صورت مسئولہ میں کوئی مماثلت نہیں ہے، لہٰذا بادی النظر میں یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اسی طرح آپ نے الدر المختار اور عالمگیری کے جو حوالہ جات درج فرمائے ہیں، وہ صورت مسئولہ پر منطبق نہیں ہوتے، کیونکہ صورت مسئولہ میں ”میری طرف سے طلاق سمجھو“ کے الفاظ ہیں، بالصراحت

''انت طالق'' یا ''تمہیں طلاق'' کے الفاظ نہیں ہیں۔
لہٰذا گزارش ہے کہ آپ صورت مسئولہ پر دوبارہ غور فرمائیں کہ آپ کو فتاویٰ قاضی خان، فتاویٰ عالمگیری، فتاویٰ رضویہ اور امداد الفتاویٰ کی محولہ بالا عبارات کی روشنی میں کچھ گنجائش نظر آتی ہے یا نہیں، اگر جواب اثبات میں ہے تو رجوع فرمائیں اور اگر جواب نفی میں ہے تو وضاحت فرمائیں کہ ان عبارات و فتاویٰ کا اطلاق صورت مسئولہ پر کیوں نہیں ہوتا؟

مفتی منیب الرحمٰن
مہتمم دارالعلوم نعیمیہ
بلاک 15، فیڈرل بی ایریا، کراچی

نوٹ: چند ماہ کے وقفے اور غور و فکر کے بعد دارالعلوم کراچی کے مفتی محمد یعقوب صاحب نے ہمیں مندرجہ ذیل جواب ارسال فرمایا اور سابقہ فتوے سے رجوع فرمالیا، بلاشبہ یہ ایک معتدل، متوازن، معقول اور قابل تقلید روش ہے، (منیب الرحمٰن)

محترم جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ نے احقر کے فتویٰ 87/440 پر جو تبصرہ فرمایا ہے اس پر غور کیا گیا۔ احقر نے ''طلاق سمجھو'' کے جملہ کو ''طلاق ہی ہے'' یا ''طلاق دی'' کے ہم معنی سمجھ کر اپنے فتویٰ میں طلاق واقع ہونے کا حکم لکھا تھا، اس وقت خانیہ کا جزئیہ اور آپ کے ذکر کردہ جزئیات کی طرف ذہن نہیں گیا آپ کے توجہ دلانے سے مذکورہ جزئیات پر غور کیا اور دوسری کتب فقہ کی طرف مزید مراجعت کی، وہاں بھی خانیہ کے حوالہ سے یہی جزئیات ملے۔ غور و فکر کے بعد آپ کا تبصرہ درست معلوم ہوا، اور ان جزئیات کی روشنی میں ''طلاق سمجھو'' سے طلاق واقع ہونے کا حکم لگانا واقعۃً درست نہیں، لہٰذا احقر اپنے سابقہ فتویٰ 87/440 سے رجوع کرتا ہے، اور اب ہمارا فتویٰ یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں پان کھانے کی وجہ سے شخص مذکور کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔ آپ کے توجہ دلانے کا بہت بہت شکریہ۔

جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ والسلام

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

محمد یعقوب عفی اللہ عنہ

دارالافتاء دارالعلوم، کراچی

دو طلاق کے بعد نکاح اور پھر تیسری طلاق

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں، پھر نکاح ثانی کر لیا اور اس کے بعد ایک طلاق دی، کیا اب رجوع کر سکتا ہے؟ (بنت عبداللہ، کراچی)

جواب: اگر کوئی شخص بدقسمتی سے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دے دے تو وہ عدت کے اندر عقد ثانی کے بغیر بھی یک طرفہ طور پر رجوع کر سکتا ہے، خواہ عملاً رجوع کرے یعنی بیوی سے ازدواجی قربت قائم کرے یا محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا، تو یہ رجوع صحیح ہوگا اور وہ دوبارہ حسب سابق میاں بیوی ہوں گے، اور اب شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہ جاتا ہے، اگر اس نے خدانخواستہ کسی بھی وقت ایک طلاق اور دے دی تو یہ طلاق مغلظہ ہو جائے گی اور عورت اس پر حرام ہو جائے گی، لیکن اگر شوہر نے دو طلاقیں دیں اور شوہر نے عدت کے اندر رجوع نہ کیا تو عدت گزرتے ہی وہ دو طلاقیں بائن ہو جائیں گی، اب عورت نکاح کے لئے آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے جس شخص کے ساتھ چاہے نکاح کر سکتی ہے سابقہ شوہر کے ساتھ بھی باہمی رضامندی کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے، اگر خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو پہلی دو طلاقوں کے ساتھ مل کر تین طلاقیں ہو جائیں گی اور بیوی اس پر مکمل طور پر حرام ہو جائے گی یعنی طلاق مغلظہ ہو جائے گی۔

دوران عدت گھر سے باہر نکلنا

سوال: کیا عدت گزارنے والی عورت کو ایام عدت میں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہے؟ (کھتری عصمت علی پٹیل، کراچی)

جواب: عدت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) عدت طلاق، یعنی یہ کہ شوہر نے کسی ناگزیر سبب کی بنا پر طلاق دے دی ہو تو از روئے شریعت عورت پر عدت گزارنا لازم ہے۔

(۲) عدت وفات۔ یعنی یہ کہ شوہر کا انتقال ہو جائے تو بھی از روئے شریعت عورت پر عدت گزارنا لازم ہے۔

ایام عدت میں عورت کو گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ سورۃ الطلاق آیت نمبر 1 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَ لَا يَخْرُجْنَ

''ایام عدت میں اپنی مطلقہ عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ خود نکلیں''۔

اس آیت میں ''بیوت'' (گھروں) کی نسبت ان طلاق یافتہ عورتوں کی طرف کی گئی ہے، جو عدت گزار رہی ہیں۔ یہ اس امر کی جانب نفیس اشارہ ہے کہ ایام عدت میں ان کا نان ونفقہ اور سکنیٰ (رہائش، جائے سکونت) شوہر کے ذمے ہے اور یہ ان مطلقہ عورتوں کا شرعی حق ہے۔

تاہم اگر کسی ضرورت کے تحت انہیں دن کے وقت گھر سے نکلنا پڑے تو شام سے پہلے لازماً واپس آ جانا چاہیے۔ ''عدت طلاق'' کی صورت میں تو شریعت نے مطلقہ عورت کی جملہ ضرورت کا کفیل اس کے طلاق دینے والے شوہر کو قرار دیا ہے۔ اس لیے اسے کسی ناگزیر ضرورت کے سوا گھر سے نکلنے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ البتہ شوہر کی وفات کی صورت میں اگر کسی معاشی مجبوری کے تحت دن کو گھر سے نکلنے پر مجبور ہو یعنی وہ خود بھی مالدار اور خود کفیل نہ ہو اور اس کے متعلقین یا بالغ اولاد بھی اس کی کفالت کا بوجھ اٹھانے کیلئے نہ ہوں یا اس کے اہل نہ ہوں یا اس پر آمادہ نہ ہوں تو مجبوراً دن کے وقت گھر سے جائے اور شام سے پہلے گھر واپس آ جائے۔

بدزبان بیوی

سوال: میرے دوست آٹھ بچوں کے باپ ہیں۔ دو سال کا عرصہ ہوگیا ہے وہ جب بھی اپنی بیوی سے رجوع کرتے ہیں، ان کی بیوی بدزبانی کرتی ہیں۔ میرے دوست کا اپنی بیوی کے ساتھ رہنا سنت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟ کیا انہیں طلاق دے دینی چاہئے؟
(مرتضٰی خان۔ کراچی)

جواب: ایسی بیوی جو بدخلق، تندمزاج اور بدخو ہو، اسے قرآن کی اصطلاح میں ناشزہ کہا جاتا ہے، ایسی عورت کے لیے قرآن مجید میں سورۃ النساء آیت نمبر ۳۴ میں تین مراحل کا اصلاحی نسخہ تجویز کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے میں اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ یہ اصلاحی تدبیر کارگر نہ ہو تو اس کی خواب گاہ الگ کردی جائے اور اس کا بھی اس پر کوئی اثر مرتب نہ ہو تو اسے معمولی تادیبی سزا دی جائے۔ اگر وہ ان میں سے کسی بھی مرحلے میں اصلاح قبول کرلے اور اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور گستاخانہ رویے سے باز آجائے تو بغیر کسی انتقامی کارروائی کے کھلے دل سے اسے اپنالو، اور قرآن فرماتا ہے کہ اس سے کوئی زیادتی نہ کرو لیکن اگر آپ کے بیان کردہ حقائق درست ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے دوست کی اہلیہ ہرگز مائل بہ اصلاح نہیں، ایسی صورت میں وہ دونوں احسن طریقے سے اپنی راہیں جدا کرسکتے ہیں۔ اسلام نے طلاق یا خلع کا انتہائی ناخوشگوار، تلخ اور تکلیف دہ راستہ انہی ناگواریوں سے بچ نکلنے کے لیے رکھا ہے۔

نکمے، مفت خور شوہر سے نجات

سوال: ایک عورت نکمے، ہڈحرام اور مفت خورے شوہر سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے، جو کچھ نہیں کرتا اور سسرال میں بیٹھ کر بیوی کی تنخواہ پر گزارہ کرتا ہے، عورت حق مہر سے بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار ہے۔ فسخ نکاح کا دعویٰ دائر کیا ہے، مگر شوہر عدالت میں حاضر ہی نہیں ہوتا، عورت کی گلوخلاصی کیسے ممکن ہے؟ (چشتی دلبر چوہان، گلشن حدید۔ کراچی)

جواب: عورت کو چاہئے کہ عدالت میں فسخ نکاح کیلئے دعوی دائر کرے اور اس کی وجوہ

تحریر کرے کہ شوہر رہائش اور مصارف زندگی (نان نفقہ) نہیں دے رہا، عدالت پر لازم ہے کہ پولیس کے زریعے (یعنی ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کرے) شوہر کو اصالتاً عدالت میں طلب کرے اور اسے جوابِ دعویٰ داخل کرنے کا موقع دے، اگر عدالت حقائق، واقعات اور شواہد کو دیکھ کر مطمئن ہو جائے کہ شوہر بیوی کے حقوق پورے نہیں کر رہا اور نہ اس پر آمادہ ہے تو فسخ نکاح کا حکم جاری کر سکتی ہے۔

ماں کے نام سے نسبت

سوال: کیا یہ بات درست ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کو ماں کے نام سے پکارا جائے گا؟ (عبدالماجد، گارڈن ویسٹ۔ کراچی)

جواب: عوام میں یہ بات مشہور ہے "قیامت کے روز لوگوں کو ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔" یہ بات شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ حدیث پاک ہے: حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن تمہیں، تمہارے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا، تو اپنے نام اچھے رکھا کرو"۔

(مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد، ابوداؤد)

صحیح بخاری میں بھی اس عنوان سے ایک باب قائم ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "اشعۃ اللمعات" شرح مشکوٰۃ میں ماں کے نام سے پکارے جانے کی بعض روایات کا ذکر کر کے ان کی حکمت اور تاویل بیان کی ہے، لیکن لکھا ہے "اگر روایت ثابت ہو تو" اس طرح کی ضعیف روایت طبرانی میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن ماں کے نام سے پکارا جانا روایت صحیح سے ثابت نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ماں کے نام سے پکارا جانا، ایک استثنائی صورت ہے، اور یہ ان کی شان اعجاز ہے۔

لے پالک بچہ

سوال: متبنّیٰ یا لے پالک کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ کیا گود لئے ہوئے بچے کی ولدیت میں حقیقی باپ کے بجائے مربی باپ کا نام لکھنا اور بولنا درست ہے؟ کیا نکاح کے وقت

ایسے لڑکے یا لڑکی کے حقیقی باپ کا نام لیا جائے یا اس کا جس نے اسے گود لیا اور پالا ہے؟

(عبدالجواد، لسبیلہ۔ کراچی)

جواب: سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۴ میں ہے: ''اور اس (اللہ تعالیٰ) نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے (حقیقی) بیٹے نہیں قرار دیا، یہ تمہاری خود ساختہ باتیں ہیں، اللہ تعالیٰ حق (بات) ارشاد فرماتا ہے اور وہ راہ راست کی جانب رہنمائی فرماتا ہے۔''

اسی سورۃ مبارکہ کی آیت نمبر ۵ میں ہے: ''انہیں ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت سے پکارو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی بات مبنی برانصاف ہے۔'' حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ہم نے حضرت محمد ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا اور ذہن میں محفوظ رکھا کہ ''جس شخص نے جان بوجھ کر اپنی نسبت ''ابنیت'' و ''ولدیت'' اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف کی تو اس پر جنت حرام ہے''۔

ان آیات واحادیث کی روشنی میں اپنی تسکین نفس یا انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت کسی بچے کی پرورش ونگہداشت اور تعلیم وتربیت بلاشبہ نہایت مستحسن اور اجر کی بات ہے، لیکن بچے کے نسب کو بدلنے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس پر سخت وعید آئی ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ متبنّی (منہ بولا بیٹا یا بیٹی) اپنے مربی اور گود لینے والے شخص کے شرعاً اور قانوناً وارث نہیں بن سکتے۔ البتہ اپنی زندگی میں کوئی شخص انہیں کچھ ہبہ (Gift) کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

لے پالک کا نسب

سوال: اگر کوئی شخص کسی اور شخص کے بچے کو گود لے اور اس کی نسب اپنی طرف منسوب کرے اور بعد میں اسکول، شناختی کارڈ کے ب فارم، پاسپورٹ وغیرہ میں اس کی حقیقی ولدیت کی جگہ اپنا نام لکھوائے تو کیا یہ درست ہے اور کیا بعد میں وہ بچہ اس کی وراثت کا حق دار ہوسکتا ہے؟

(سید محبوب عالم، نارتھ ناظم آباد، کراچی)

جواب: کسی یتیم یا نادار ماں باپ کی اولاد یا کسی قریبی عزیز کے بچے یا بچی کو حصول اجرو

ثواب کے لئے یا صلہ رحمی کے طور پر گود لینا، پالنا، پرورش، تعلیم وتربیت کا اہتمام کرنا ایک عمل خیر ہے اور ایسا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اجر وثواب کا حق دار ہوگا، اپنی کفالت میں پرورش پانے والے بچے یا بچی کو محض پیار اور شفقت ومحبت کے اظہار کے لئے بیٹا یا بیٹی کہہ کر پکارنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن کسی لے پالک کے بچے، متبنی یا منہ بولے بیٹے یا بیٹی کو حقیقی بیٹا یا بیٹی سمجھنا اس کا درجہ دینا اس کی ولدیت کو تبدیل کرنا۔ اپنے آپ کو اس کا والد قرار دینا یہ سب امور شرعاً ناجائز اور حرام ہیں۔ سورۃ الاحزاب آیت نمبر 4 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَ کُمْ اَبْنَآءَ کُمْ ؕ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاهِکُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ یَهْدِی السَّبِیْلَ۝۔

’’اور اس (اللہ تعالیٰ) نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا۔ یہ سب تمہاری اپنی خود ساختہ باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ حق (بات) ارشاد فرماتا ہے اور وہ راہ راست کی جانب رہنمائی فرماتا ہے‘‘۔

اسی سورہ مبارکہ کی آیت نمبر 5 میں ہے:

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ

’’انہیں (لے پالکوں کو) ان کے (حقیقی) باپوں کے نام سے پکارو اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی بات مبنی بر انصاف ہے‘‘۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ بیان کرتے ہیں۔ میرے دونوں کانوں نے سنا اور میرے دل نے اس بات کو محفوظ کرلیا کہ حضرت محمد ﷺ ارشاد فرمارہے تھے ’’جو اپنی نسبت ابوت اپنے (حقیقی) باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کرے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ شخص اس کا (حقیقی) باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے‘‘۔ (صحیح

البخاری رقم الحدیث:6766 صحیح مسلم رقم الحدیث:63 سنن ابی داوٗد:53) حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔ ''جس شخص نے جان بوجھ کر اپنا نسب اپنے (حقیقی) باپ کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف منسوب کیا تو اس نے کفر کیا''۔ (تفسیر قرطبی جلد 16 صفحہ 121) ان آیات واحادیث مبارکہ کی روشنی میں، کسی لے پاک بچے یا بچی کا نسب اپنی طرف منسوب کرنا، تعلیمی اسناد اور شناختی کارڈ کے فارم میں باپ کی حیثیت سے اپنا نام درج کرانا شرعاً ناجائز امر ہے۔ اور اس پر حدیث مبارکہ میں بڑی سخت وعید آئی ہے۔ اگر کسی نے یہ کام نادانستہ اور شرعی مسئلے سے لاعلمی کی بناء پر کیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور اس کا ازالہ کریں تاکہ تمام متعلقہ لوگوں کو اس کا صحیح نسب معلوم ہو جائے جیسا کہ سطور بالا میں واضح ہو چکا ہے کہ منہ بولی اولاد حقیقی اولاد کے حکم میں نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کے وارث بننے یا وراثت کا مطالبہ کرنے کا سوال شرعاً خارج از امکان ہے بلکہ ایسا مطالبہ ہی شرعاً گناہ ہے۔ شرعاً صرف حقیقی اولاد ہی وارث قرار پاتی ہے، اگر کوئی شخص کسی گمنام بچے کو بھی گود لے جس کے والدین کا نہ کوئی اتا پتا ہے اور نہ کوئی کسی کے علم میں ہے۔ تب بھی اسے اپنی حقیقی اولاد قرار نہ دے بلکہ اسے اپنا دینی بھائی یا بہن قرار دے یا عبداللہ (اللہ کا بندہ) کہہ دے۔

ترکے کی تقسیم

سوال: ایک شخص کا انتقال ہوا ہے اس کے پسماندگان میں اس کی والدہ دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟ (نسیم اختر، دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: جو شخص فوت ہو جائے اس کے ترکے میں سب سے پہلے اس کے تجہیز و تکفین کے مصارف وضع کیے جائیں گے، اس کے بعد اگر اس کے ذمے کسی کا قرض ہے تو وہ ادا کیا جائے گا اس کے بعد اگر اس نے کسی کارخیر، صدقہ جاریہ یا کسی غیر وارث کے حق میں وصیت کی ہے تو بقیہ ترکے کی ایک تہائی مقدار تک وہ نافذ ہوگی۔ ان امور کے بعد بقیہ ترکہ، میت کی وفات کے وقت جو ورثاء موجود تھے ان میں تقسیم ہوگا، صورت مسئولہ میں تقسیم

حسب ذیل شرح سے ہوگی۔ ترکہ کے کل 48 حصے ہوں گے ان میں سے والدہ کو 8 حصے دو بیٹے 20 حصے (فی کس دس حصہ) چار بیٹیاں 20 حصے) فی کس پانچ حصے)۔

سوال: ایک خاتون کا انتقال ہوا ہے، اس کے ماں باپ پہلے ہی وفات پا چکے ہیں، شوہر بھی نہیں ہے، اولاد بھی کوئی نہیں ہے، کوئی بھائی بھی نہیں ہے، صرف مندرجہ ذیل ورثاء ہیں (۱) ایک حقیقی بہن (۲) ایک صرف ماں شریک بہن (۳) تین بھتیجے ایک بھتیجی (۴) دو بھانجے ایک بھانجی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شرع ترکہ کس طرح سے تقسیم ہوگا اور یہ کہ آیا صرف باپ شریک بہن کا ترکے میں حصہ ہوگا؟ (انیس بتول، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: کسی میت کے ترکے سے پہلے (۱) اس کی تجہیز و تکفین کے مصارف وضع کیے جائیں گے (۲) اس کے بعد اگر اس کے ذمے کسی کا قرض ہے تو ادا کیا جائے گا۔ (۳) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہوگی تو بقیہ ترکے کی ایک تہائی حد تک وہ نافذ ہوگی، (۴) اس کے بعد اس میں وراثت جاری ہوگی۔ صورت مسئولہ میں ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ ترکے کے کل اٹھارہ حصے کیے جائیں اور اس میں سے ورثاء کے حصے مندرجہ ذیل ہوں گے:

(۱) حقیقی بہن = 9 حصے، (۲) ماں شریک (اخیافی) بہن = 3 حصے، (۳) تین بھتیجے، کل چھ حصے، ان میں سے ہر ایک کو دو دو حصے ملیں گے، بھتیجی اور بھانجے و بھانجی محروم رہیں گے اور انہیں کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ "میت کے ذوی الفروض (یعنی وہ وارث جن کے حصے شریعت نے مقرر کر دیئے ہیں) وارثوں کو ان کے مقررہ حصے دینے کے بعد اگر ترکہ بچ جائے اور کوئی عصبہ وارث نہ ہو تو سارا ترکہ قریب ترین مرد وارث کو ملے گا"۔

عاق کی شرعی حیثیت

سوال: بعض اوقات اخبارات میں اشتہار شائع ہوتے ہیں کہ میں نے اپنے فلاں بیٹے کو عاق کر دیا ہے، میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے، میں نے اسے وراثت سے محروم کر دیا ہے

وغیرہ، ایسے اعلانات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (عبدالمتین، گلبرگ، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: ''عاق'' کے معنی نافرمان کے ہیں۔ ''عقوق'' کے معنی ہیں ''نافرمانی''۔ حدیث پاک میں ''عقوق الوالدین'' (یعنی والدین کی نافرمانی) کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے، لہٰذا والدین کی نافرمانی دنیا و آخرت میں رسوائی کا باعث ہے۔ کوئی بھی عاقل و بالغ شخص اپنے تصرفات اور افعال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن کسی نافرمانی صلبی و نسبی اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ وراثت، ورثہ اور ترکہ اس مال کو کہتے ہیں جو مرنے والا پیچھے چھوڑ جاتا ہے، اس کی ورثاء میں تقسیم کے اصول، تناسب اور ترجیحات شریعت نے متعین کردی ہیں۔ اس میں ترمیم و تنسیخ کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ حتیٰ کہ مرنے والے اور ترکہ چھوڑنے والے کو بھی نہیں، لہٰذا نہ کوئی مورث و متوفی کسی وارث کو محروم کرسکتا ہے اور نہ غیر وارث کو وارث بنا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''وارث کے حق میں وصیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے''۔ جس کسی نے اپنی اولاد کو وراثت سے محروم قرار دیا ہو، شرعاً غیر موثر ہے۔

لاوارث بچی کی ولدیت کا مسئلہ

سوال: کم و بیش ایک سال پہلے ایک نوزائدہ بچی ملی جس کے بارے میں جوہر آباد تھانے میں ایف آئی آر کٹوائی گئی اور ایدھی سینٹر وغیرہ کو اطلاع دی گئی تھی، ہم خود بھی صاحب اولاد ہیں اس لئے انسانی ہمدردی کے تحت وہ بچی ہمارے یہاں پرورش پا رہی ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ شناختی کارڈ کے ''ب'' فارم اور دیگر سرکاری کاغذات میں ولدیت کے خانے میں کس کا نام لکھا جائے۔ برائے مہربانی بچی کے بہتر مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب عنایت فرمائیں؟۔ (منظور احمد، دستگیر کالونی، کراچی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب ھو الموافق للصواب

شریعت کی رو سے کسی شخص کے نسب (یعنی نسبت ابنیت) کو اس کے حقیقی باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب کرنا منع ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی بچے کو (یا بچی کو) گود لیا ہو، لے پالک بنایا ہو یا متبنّیٰ بنایا ہو تو وہ اس کے سلسلہ نسب میں ولدیت کی جگہ اس کے حقیقی باپ کا نام لے اور لکھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور (اللہ نے) تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی) بیٹا نہیں بنایا، یہ تمہاری خود ساختہ باپ ہے، اور اللہ تعالیٰ حق بات فرماتا ہے اور وہی (سیدھی) راہ دکھاتا ہے، ان (منہ بولے بیٹوں) کو ان کے (حقیقی) باپ کی طرف سے منسوب کر کے پکارا کرو، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت انصاف کی بات ہے، پھر اگر تمہیں ان کے باپ معلوم نہ ہوں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہیں (یا بشری رشتے کے لحاظ سے تمہارے چچازاد ہیں)'' (الاحزاب:5,4)

ان آیات مبارکہ کی تفسیر میں علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی مالکی نے اپنی تفسیر ''الجامع الاحکام القرآن'' میں حدیث صحیح نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے اپنا نسب دانستہ اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے''۔

قرآن نے بتایا کہ جس شخص کی حقیقی ولدیت معلوم نہ ہو، اسے اپنا دینی بھائی کہو، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' یعنی مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں'' یا اپنا ''مولیٰ'' کہو، مولیٰ عربی زبان میں آقا کو بھی کہتے ہیں، غلام کو بھی کہتے ہیں، آزاد کرنے والے اور آزاد کردہ غلام کو بھی کہتے ہیں، چچازاد اور دوست کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، علامہ محمود آلوسی بغدادی نے تفسیر روح المعانی میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے متبنّٰی سالم تھے، جب قرآن میں متبنّٰی (لے پالک) کو بیٹا کہنے کی ممانعت کا حکم نازل ہوا تو پھر لوگ انہیں سالم بن حذیفہ کہنے کی بجائے سالم مولیٰ

حذیفہ کہنے لگے۔اب چونکہ ہمارے ہاں لوگ ''مولیٰ'' کی اصلاح، اس کے سیاق وسباق اور متعدد معانی پر اس کے اطلاق اور عام طور پر واقف نہیں ہیں، نہ ہی یہ اصطلاح بہ آسانی رواج پا سکتی ہے اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے وقت، تعلیمی اسناد اور دیگر تمام دستاویزات میں ولدیت کا خانہ لازمی طور پر ہوتا ہے، اس لئے آپ اپنی لے پالک بچی کی ولدیت میں اپنا نام تو ہرگز نہ لکھیں، یا تو بنت عبداللہ (کیونکہ جو بھی اس کا حقیقی باپ ہے، وہ اللہ کا بندہ ہی ہوگا) یا بنت آدم لکھ دیں، کیونکہ اصلاً تو سب اولاد آدم ہیں۔

کتاب البیوع

سونے کے کاروبار میں شراکت

سوال: الف، کا سرمایہ ہے، ب، اس کا کارندہ ہے، ج، سونے کے زیورات بناتا اور دکانداروں کو بیچتا ہے۔ الف، کا سرمایہ ہوگا، وہ براہ راست نہیں بلکہ اپنے کارندے، ب، کے ذریعے مشترکہ کاروبار میں عملاً شریک رہے گا۔ ج، کی محنت، تجربہ اور مہارت ہوگی۔ طے شدہ منافع پر نہیں بلکہ نفع ونقصان میں شراکت کی بنیاد پر، کیا یہ کاروباری شراکت جائز ہے؟۔

(محمد انیس، لیاقت آباد)

جواب: مذکورہ بالا صورت میں کاروباری شراکت جائز ہے۔ بشرطیکہ (۱) خدانخواستہ نقصان کی صورت میں نقصان کا سارا بار سرمایہ لگانے والے فریق، الف، پر ہو۔ (۲) منافع کی صورت میں، الف، کے وکیل یا ایجنٹ کے طور پر شراکتی کاروبار، ج، کے درمیان مصروف عمل ہے۔ الف، اور، ب، کا باہمی معاملہ ہے کہ وہ مقررتنخواہ پر کام کرے گا یا، الف، کے حصہ منافع میں سے ایک مقررہ حصہ لے گا۔

اسلام میں نیلام عام

سوال: بعض احادیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے ''بیع علی البیع'' یعنی ''دوسرے کے سودے پر سودا کرنے'' اور ''سوم علی السوم'' دوسرے کے نرخ پر نرخ بڑھانے سے منع فرمایا ہے اور ''نجش'' سے منع فرمایا ہے'' نجش'' سے کیا مراد ہے۔ ان احادیث کی روشنی میں اسلام میں'' نیلام عام'' کی کہاں تک گنجائش ہے؟

(محبوب الٰہی، ناظم آباد، کراچی)

جواب: ''بیع علی البیع'' سے مراد یہ ہے کہ فریقین میں ایک چیز کا سودا طے پا گیا اور باہمی رضامندی سے قیمت بھی طے پاگئی اور انہوں نے مزید غور وفکر کے لئے تین دن یا اس سے کم کی مہلت مقرر کردی، جس کی شریعت میں اجازت اور گنجائش ہے، اسے'' خیار شرط'' کہتے ہیں۔ اب اس'' مدت خیار'' کے دوران کوئی شخص بائع (فروخت کنندہ) سے کہے کہ آپ یہ سودا منسوخ کردیں، میں آپ کو اس سے زیادہ قیمت دلا دوں گا یا دے دوں گا

یا کوئی شخص خریدار سے کہے کہ آپ یہ سودا فسخ کر دیں، میں اس سے کم رقم میں یہ چیز آپ کو دلا دوں گا، یہ دونوں صورتیں شرعاً ناجائز اور حرام ہیں۔

''نرخ پر نرخ بڑھانے'' کی صورت یہ ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ ایک چیز کے لین دین پر باہم رضامند اور آمادہ ہو چکے ہوں، لیکن ابھی ''عقد بیع'' یعنی سودا مکمل نہ ہوا ہو کہ ایک تیسرا شخص درمیان میں آ کر بائع کو لالچ دے کہ میں تمہیں اس سے زیادہ قیمت دے دوں گا، یہ صورت بھی شرعاً حرام ہے۔

''نجش'' کے لغوی معنی ہیں ''جوش دلانا'' اصطلاح شریعت میں اس سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی چیز کو خریدنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا، لیکن دوسرے خریدار کو جوش دلانے اور برانگیختہ کرنے کے لئے زیادہ قیمت لگائے، یہ دوسرے کو ارادتاً نقصان پہنچانا ہے اور شرعاً حرام ہے۔

نیلام کا جواز

بعض فقہا کرام نے نجش کی ممانعت پر قیاس کرتے ہوئے نیلام کی بیع کو بھی مکروہ قرار دیا ہے، کیونکہ نیلام میں بڑھ چڑھ کر بولی لگائی جاتی ہے لیکن جمہور فقہاء کرام اور ائمہ نے نیلام کی بیع کو ''جامع ترمذی'' میں مروی حدیث کی رو سے جائز قرار دیا ہے۔

حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چادر اور ایک پیالہ بیچا اور فرمایا ''اس چادر اور پیالے کو کون خریدے گا؟'' ایک شخص نے عرض کیا کہ میں ان کو ایک درہم کے بدلے میں خرید لوں گا۔ آپ نے دوبارہ فرمایا ایک درہم سے زیادہ میں کون خریدے گا تو ایک شخص نے دو درہم دے دیئے، آپ نے وہ پیالہ اور چادر اس شخص کو دے دیئے'' امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

البتہ جو لوگ نیلام کی بیع کی ممانعت پر نجش سے استدلال کرتے ہیں، ان کا جواب یہ ہے کہ زیادہ قیمت لگانا اس وقت منع ہے جب کسی شخص کا ارادہ خریدنے کا نہ ہو بلکہ دھوکہ دے کر اور جوش دلا کر قیمت بڑھانا مقصود ہو، یہ امر بلا شبہ حرام ہے لیکن اگر بولی لگانے والے کا ارادہ فی الواقع خریدنے کا ہو تو یہ منع نہیں ہے۔ اسی لئے ائمہ اربعہ نے نیلام کی بیع کو

جائز قرار دیا ہے۔

ہنڈی کی بیع
(Bill of Exchange)

(شمشاد احمد خان، کراچی)

سوال: کیا "ہنڈی" کی بیع شرعاً جائز ہے؟

جواب: ہنڈی سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص "الف" نے "ب" کو کچھ مال فروخت کیا اور "ب" نے رقم بعد میں ادا کرنے کا وعدہ کیا اور "الف" کو اس سلسلے میں ایک دستاویز لکھ کر دے دی کہ وہ اسے (مثلاً) چھ ماہ بعد ایک لاکھ روپے ادا کرے گا تو اس دستاویز کو "ہنڈی" کہتے ہیں۔ اب "الف" اس دستاویز کو لے کر ایک شخص یا بینک کے پاس جاتا ہے کہ آپ اس ہنڈی کو مجھ سے مثلاً دس فیصد کمیشن پر خرید یں اور اس طرح بینک اسے ایک لاکھ کی بجائے نوے ہزار روپے دے دے گا اور چھ ماہ بعد مقررہ تاریخ پر بینک "ب" سے ایک لاکھ روپے وصول کرلے گا۔ کمیشن کی مقدار کا انحصار اس مدت کی کمی بیشی پر ہوتا ہے جس کے بعد ہنڈی کی ادائیگی لازم ہوتی ہے۔ "ہنڈی کی بیع" دراصل قرض کی بیع ہے اور اس میں ایک شخص اپنا واجب الادا قرض اس شخص یا ادارے کو بیچ رہا ہے، جس پر اس کا قرض واجب نہیں ہے اور یہ ناجائز ہے۔

اس بیع کے عدم جواز کا سبب یہ ہے کہ اس میں "غرر" (دھوکا) ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ مقروض دیوالیہ ہو جائے یا اس کی جملہ املاک کسی حادثے کے نتیجے میں تلف ہو جائیں تو وہ دستاویز جس کی بیع ہوئی ہے اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے گی۔

بعض علماء نے ہنڈی کی بیع کو اس بناء پر ناجائز قرار دیا ہے کہ یہ زیادتی اور تاخیر کے ساتھ نقود کا نقود سے تبادلہ ہے اور "ربوالفضل" کی حرمت کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔

گنے کا پیشگی سودا

سوال: میں گنے کا کاروبار کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں اس وقت گنے کے کارخانے بند ہیں جب کھلیں گے تو تب ہمارا گنا 36 روپے من کے حساب سے مل میں جائے گا، جس میں چار

روپے فی من کرایہ نکال کر 32 روپے من کسان کو پڑے گا۔ اس وقت چونکہ مل بند ہے اس لئے کاشتکار اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے 20 سے 26 روپے کے حساب سے گنا بیوپاری کو بیچ دیتا ہے اور اپنی ضروریات پوری کرتا ہے، جب کہ وہ گنا اسی کاشتکار کی زمین پر اُگا ہوتا ہے۔ چار پانچ ماہ بعد وہ بیوپاری گنا کاٹ کے مل میں لے جاتا ہے جہاں اسے 36 روپے مل جاتے ہیں۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا یہ بیوپاری کا منافع ہے یا سود؟

جواب: مبیع (فروخت کی جانے والی چیز) یا ثمن (فریقین کے درمیان کسی چیز کی طے شدہ قیمت) میں سے ایک چیز پیشگی دے دی جائے اور دوسری بعد میں تاخیر کے ساتھ، تو اسے فقہی اصطلاح میں ''بیع سلم'' کہتے ہیں، اس کے جواز کے لئے ضروری ہے کہ تمام امور پہلے سے طے ہوں تاکہ بعد میں آپس میں جھگڑا نہ ہو، مثلاً فی من قیمت، گنے کی مقدار، مقام تفویض یعنی یہ کہ بائع خریدار کو وہ گنا کہاں سپرد کرے گا؟ وغیرہ۔ اب آگے خریدار کی قسمت کہ اسے کتنا نفع یا نقصان ہوتا ہے۔ یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ کاروبار نفع حاصل کرنے کے لئے ہی کیا جاتا ہے، نفع اور سود میں فرق ہے، نفع جائز اور حلال ہے اور سود حرام، گنے کے کاروبار کی جو صورت سوال میں درج ہے وہ سود نہیں ہے۔

ٹھیکے کے حصول اور بل کی وصولی کے لئے رشوت کا لین دین

سوال: میں گورنمنٹ کا ٹھیکدار ہوں، ہمیں ٹھیکہ حاصل کرنے کے لئے رشوت دینی پڑتی ہے۔ پھر ورک آرڈر لینے سے کام کی تکمیل تک مختلف مراحل میں متعلقہ افسران اور سرکاری اہلکاروں کو رشوت دینی پڑتی ہے، بل کی وصولی بھی رشوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان حالات میں حکم شرعی کیا ہے، ہمارے لئے دوسرا کام بھی دشوار ہے؟ (ج،م، کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے'' آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ ہی (رشوت کے طور پر) وہ مال حاکموں تک پہنچاؤ، تاکہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ کھاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو (کہ یہ فعل ناجائز ہے)''(البقرہ:188) جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے

اور لینے والے (دونوں) پر لعنت فرمائی ہے۔ اسلام میں فقہی اعتبار سے ایمان وعمل کے درجات ہیں۔ اعلیٰ درجے کو عزیمت کہتے ہیں، یعنی ایمان وعمل کا کامل ترین درجہ، جو اہل عزیمت اور اولوالعزم اہل ایمان کا شعار ہے۔ یعنی خواہ حالات کتنے ناساز گار کیوں نہ ہوں، لیکن بندہ مومن ایمان وعمل کے جادۂ مستقیم سے سرمو انحراف نہ کرے۔ اس مرتبۂ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کسی بھی صورت میں نہ رشوت لے اور نہ دے اور اس استقامت ایمانی کی راہ میں حائل ہر مشکل کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے لیکن ظاہر ہے کہ بعض بندے ضعیف الایمان اور کم ہمت بھی ہوتے ہیں۔ اسے فقہی طور پر رخصت یا حالت اضطرار واکراہ کا نام دیا گیا ہے لہٰذا ان تمام احوال کو پیش نظر رکھ کر فقہاء کرام نے رشوت کے جو تفصیلی احکام بیان فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں۔

(۱) منصب قضاء حاصل کرنے کے لئے رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں بلکہ ایسا شخص منصب قضاء کا اہل ہی نہیں ہے۔

(۲) کسی شخص کا حاکم سے اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لئے رشوت دینا، ایسے امور میں رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، اگر وہ رشوت دے کر اپنے حق میں ناجائز فیصلہ کرانا چاہتا ہے تو اس کا باطل اور حرام ہونا بالکل واضح ہے، لیکن اگر وہ فیصلہ انصاف پر مبنی ہو تب بھی اس کے لئے رشوت کا لین دین ناجائز ہے۔

(۳) کسی بھی صاحب اقتدار واختیار کے لئے رشوت لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے کوئی تعذر، دشواری اور اضطرار نہیں ہے جو رشوت کے جواز کا سبب قرار پائے، البتہ کسی شخص پر ظلم ہو رہا ہے، ظلماً اس کی جان یا مال تلف کیا جا رہا ہے، رشوت دیئے بغیر اس کا حق روکا جا رہا ہے۔ جلد یا بدیر اس کے ملنے کی کوئی توقع نہیں ہے، تو ایسی ناگزیر صورتحال میں فقہاء کرام نے اس کے لئے اپنی جان ومال اور آبرو کو ظلم سے بچانے کے لئے یا اپنے غصب شدہ حق کو حاصل کرنے کے لئے، اضطراری صورتحال میں صرف رشوت دینا جائز قرار دیا ہے، لینا بہرحال حرام ہے۔ اس مخصوص صورت حال میں بھی رشوت دینے کی

اجازت رخصت شرعی کی بنا پر ہے، کم ہمت صاحبان ایمان کے لئے، ورنہ عزیمت یہی ہے کہ حرام سے ہر صورت حال میں بچا جائے۔ الا یہ کہ جان کو خطرہ درپیش ہو۔ رشوت کے بارے میں یہ مسائل ممتاز فقہاء اسلام علامہ قاضی خان، علامہ ابن ہمام، علامہ ابن نجیم، علامہ شامی رحمہم اللہ اجمعین کی کتب سے ماخوذ ہیں (بحوالہ شرح صحیح مسلم) اب جو صورت دریافت کی گئی ہے اس اصولی گفتگو کے بعد اس کا جواب یہ ہے:

(ا) ٹھیکہ لینے کے لئے رشوت دینا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ ٹھیکہ لینا آپ کا حق نہیں ہے۔

(ب) اگر کام ٹھیکے کے معاہدے میں طے شدہ شرائط کے مطابق انجام نہیں دیا، میٹریل ناقص ہے، کوالٹی مطلوبہ معیار کے مطابق نہیں ہے تو اسے رشوت دے کر پاس کرانا اور کلیرنس سرٹیفکیٹ یا کمپلیشن سرٹیفکیٹ لینا ناجائز اور حرام ہے۔

(ج) اگر کام طے شدہ شرائط اور مطلوبہ معیار کے مطابق انجام دے دیا ہے لیکن افسر مجاز بل کو روکے ہوئے ہے، ادائیگی سے انکار کر رہا ہے، مگر افسران بالا سے یا عدالت سے اپیل کرنے پر اس کا حق مل سکتا ہے تو رشوت نہ دے اور حق طلبی کے لئے یہ طریقہ کار اختیار کرے۔ لیکن اگر رشوت کا چینل اوپر تک ہے اور افسران بالا سے یا عدالت سے رجوع کرنے اور اپیل کرنے سے حق ملنے کے امکانات مزید معدوم ہو جاتے ہیں تو پھر بصورت مجبوری واضطرار رشوت دے کر اپنا حق وصول کر لے اور اپنے اس فعل پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور رزق حلال کے حصول کی جستجو کرتا رہے۔ بعض اوقات لوگ رشوت اس لئے دیتے ہیں کہ انہیں ان کے استحقاق سے زیادہ مل جائے، وقت مقررہ سے پہلے مل جائے، تو ان مقاصد کے لئے رشوت دینا ناجائز ہے۔

لائسنسوں کی فروخت

سوال: بعض لوگ اپنے سیاسی اثر و رسوخ کی بناء پر حکومت سے امپورٹ لائسنس یا ٹرانسپورٹ کا "روٹ پرمٹ" اپنے نام لے لیتے ہیں اور آج کل حکومتیں سیاسی رشوت کے طور پر ایسی نوازشات کرتی رہتی ہیں اور پھر یہ لوگ ان "لائسنسوں" یا "پرمٹوں" کو

بالترتیب پیشہ ور تاجروں یا ٹرانسپورٹروں کو بیچ دیتے ہیں ایسی بیع شرعاً جائز ہے یا نہیں؟
(جمیل احمد خان، کھارادر، کراچی)

جواب: اگر یہ لائسنس یا پرمٹ کسی خاص آدمی کے نام پر جاری کیے گئے ہیں اور قابل منتقلی نہیں ہیں، تو ان کا دوسرے شخص کو فروخت کرنا شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ یہ جھوٹ اور دھوکا دہی پر مبنی ہے، لیکن اگر یہ لائسنس یا پرمٹ کسی خاص شخص کے نام پر نہیں ہے بلکہ ان کی حیثیت ایک ایسی دستاویز کی ہے کہ جو اس کا حامل ہو، اس کے ذریعے مال بیرون ملک سے درآمد کرسکتا ہے یا ٹرانسپورٹ متعلقہ روٹوں پر چلا سکتا ہے تو پھر ان کی حیثیت ڈاک کے ٹکٹوں کی سی ہوگی اور ان کی بیع جائز ہے۔

فلیٹ، دکان کی پگڑی

سوال: ہمارے ملک کے بڑے شہروں اور تجارتی مراکز میں یہ طریقہ کار عام ہے کہ فلیٹ اور دکانیں کرائے پر دی جاتی ہیں، کرایہ اگرچہ معمولی ہوتا ہے لیکن بھاری رقم بطور پگڑی وصول کی جاتی ہے اور ہر ایک کرایہ دار جب فلیٹ یا دکان دوسرے کرایہ دار کو منتقل کرتا ہے اور قبضہ دیتا ہے تو پگڑی وصول کرتا ہے۔ موقع ومحل کے اعتبار سے پگڑی کی شرح مقرر ہوتی ہے۔ کیا یہ پگڑی کا لین دین شرعاً جائز ہے؟
(سید آفاق علی، کراچی)

جواب: چونکہ قبضہ کوئی حسی یا عینی چیز نہیں ہے، اس لئے یہ بیع باطل ہے، بعض لوگوں نے اس کے جواز کا یہ حیلہ تجویز کیا ہے کہ دکان اور فلیٹ میں کچھ چیزیں از قسم فرنیچر وسامان وغیرہ رکھ دی جائیں اور پگڑی کی مالیت کے برابر ان کی قیمت مقرر کر کے لی جائے۔ گویا یہ "اونٹ کے گلے میں بلی" والی بات ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ فقہی یا قانونی حیلہ اور بات ہے اور خداوند علیم وخبیر کے سامنے سرخرو ہونا اور بات ہے، وہ ظاہر وباطن اور نیتوں کا حال جانتا ہے۔

منافع کی شرح

سوال: شرعاً منافع کی زیادہ سے زیادہ مقدار کیا ہے؟

جواب: (۱) بنیادی طور پر بیع وشراء اور کاروبار کا مقصد نفع کا حصول ہے۔ شرح منافع کی

کمی بیشی کا مدار محض کسی کی خواہش پر نہیں بلکہ حالات اور طلب و رسد (Demand & Supply) کے معاشی اصولوں پر ہے۔ شریعت نے کم از کم یا زیادہ سے زیادہ منافع کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ بس اتنا ضرور ملحوظ رہے کہ زیادہ سے زیادہ حصول نفع اور کثرت مال کی خواہش انسان کو سنگدل اور شقی القلب نہ بنادے، کسی کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ اسی لئے بیع و شراء کی وہ صورتیں جو استحصال کا سبب بنتی ہیں، شرعاً ممنوع ہیں۔ مثلاً احتکار (Hoarding) یعنی مال کی طلب کے باوجود اسے جمع کیے رکھنا اور مارکیٹ میں سپلائی نہ کرنا، محض اسے لئے ذخیرہ اندوزی کرنا کہ مال کی طلب بڑھے اور لوگ با مجبوریٔ تجارت فطری اصولوں کے برعکس زیادہ سے زیادہ نفع دینے پر مجبور ہو جائیں۔ اسی طرح حدیث پاک میں ''تلقی الجلب'' کو بھی منع فرمایا، یعنی یہ کہ کوئی شخص مارکیٹ تک پہنچنے سے پہلے کھیت، کھلیان، باغات میں یا گلے بانوں سے وہیں پر جا کر اس لئے مال خریدے کہ لاعلمی اور ناتجربہ کاری کے سبب ایک جانب انہیں نقصان پہنچائے اور دوسری جانب شہری آبادی پر نہایت مہنگے داموں بیچے، اور اگر کوئی نیک دل خدا ترس تاجر زیادہ منافع ملنے کے واضح امکان کے باوجود قناعت اور انسان دوستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رضا کارانہ طور پر اپنے لئے ایک کم سے کم مقدار نفع مقرر کر دیتا ہے، خواہ مارکیٹ کا رجحان زیادہ ہی کیوں نہ ہو تو ایسے تاجروں کے بارے میں ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے'' قیامت کے دن دیانت دار، صداقت شعار تاجر کا حشر انبیاء و صالحین کے ساتھ ہوگا''۔

انعامی بانڈز پر انعام

سوال: کیا انعامی بانڈز کا لین دین اور اس پر انعام کی رقم کا لینا جائز ہے؟۔

(ایم خان آفریدی، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)

جواب: انعامی بانڈز حکومت پاکستان جاری کرتی ہے، شیڈولڈ کمرشل بینکوں یا قومی بچت کے مراکز کے ذریعے درج قیمت پر انہیں فروخت کرتی ہے اور اسی قیمت پر خریدتی ہے، اس آزادانہ خرید و فروخت میں کسی مدت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ خریدار کی نہ اس میں کوئی رقم

ڈوبتی ہے نہ ایسا کوئی خطرہ اس میں ہے اور نہ ہی اسے اس پر کوئی طے شدہ زائد رقم ملتی ہے۔ ان بانڈز کا اس طرح لین دین بغیر کسی شرعی قباحت کے جائز ہے اور اب سپریم کورٹ آف پاکستان کی شریعت اپیلٹ بنچ بھی اسے جائز قرار دے چکی ہے۔ جن علماء نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا تھا ہمیں معلوم نہیں کہ وہ اب بھی اپنے فتوے پر قائم ہیں یا رجوع کر چکے ہیں۔ تاہم انہوں نے جو عدم جواز کی بنیاد قائم کی، وہ ان مفروضوں پر تھی کہ یہ قرض ہے جو بینک عوام سے لیتے ہیں اور ان کا سود سب پر مساوی تقسیم کرنے کے بجائے چند افراد کو انعام کی شکل میں دے دیتے ہیں اور ان کے نزدیک چونکہ سود کی مجموعی رقم چند افراد کو مل جاتی ہے اور باقی محروم رہتے ہیں لہٰذا یہ قمار بھی ہے، لیکن یہ سب مفروضے غلط ہیں، کیونکہ یہ قرض نہیں ہے بلکہ خرید و فروخت ہے، قرض کی واپسی کے لئے مدت متعین ہوتی ہے، انعامی بانڈ میں کسی مدت کا تعین نہیں ہے بلکہ بانڈز کا حامل جب چاہے اسے حکومت کو فروخت کر کے اپنی پوری رقم لے سکتا ہے۔ ان بانڈز کا اجراء حکومت پاکستان کرتی ہے، بینک نہیں کرتے، وہ صرف ان کی خرید و فروخت کے لئے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں۔ اس میں کوئی سودی معاہدہ بھی نہیں ہے۔

کروڑ پتی اسکیم، مالا مال اور پرائز بانڈ

سوال: بینکوں کی کروڑ پتی اسکیم، مالا مال اسکیم اور پرائز بانڈ پر انعام کا کیا حکم ہے؟

(محمد اشرف، منظور کالونی، کراچی)

جواب: بینکوں کا سارا کاروبار سود پر قائم ہے، کروڑ پتی اسکیم، مالا مال اسکیم یا اس طرح کی اور ترغیبی اسکیمیں اور ان سے ملنے والی رقوم ناجائز ہیں، کیونکہ یہ حرام میں معاونت کرتی ہیں البتہ "پرائز بانڈ" کی مساوی قیمت پر، یعنی بانڈ پر درج قیمت پر خرید و فروخت جائز ہے اور ان پر ملنے والا انعام بھی جائز ہے، علمائے اہلسنت اسے پہلے بھی جائز قرار دیتے تھے اب "سپریم کورٹ شریعت اپیلٹ بنچ" نے بھی اس کے جواز کا فیصلہ صادر کر دیا ہے البتہ "پرائز بانڈز" کی پرچیوں کا، کاروبار ناجائز اور حرام ہے۔

انعامی بانڈز کی پرچیوں کا کاروبار

سوال: (۱) مجھے ایک آدمی نے کچھ رقم دی ہے اور کہا کہ میرے پاس خرچ ہو جائے گا تم اپنے پاس رکھو۔ میں نے رکھ لی میں نے وہ رقم اپنے کاروبار میں لگالی اور اس بندہ کو میں ماہانہ کچھ نہ کچھ خرچ اخراجات کے لئے دیتا ہوں، اس پر کچھ لوگ بولتے ہیں یہ سود ہے، آپ فرمائیں۔ یہ کیسا ہے؟۔

(۲) جناب عالی! میں پرائز بانڈ کی پرچیوں کا کام کرتا ہوں اس کاروبار میں نفع ونقصان دونوں ہوتے ہیں یہ کاروبار کیسا ہے جائز ہے یا ناجائز؟

(۳) پرائز بانڈز رکھنا اور اس پر جو انعام ملتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ اس کا کاروبار کر سکتے ہیں یا نہیں؟ (صالح محمد داؤد، حسین آباد، کراچی)

جواب: (۱) (الف) کسی بھی رقم پر، جسے کاروبار میں لگایا گیا ہو یا بطور قرض دیا گیا ہو، طے شدہ شرح کے مطابق ماہانہ مقررہ رقم دینا اور لینا سودی لین دین ہے اور شرعاً حرام ہے، البتہ اگر رقم شرعی مضاربت کے اصول پر کاروبار کے لئے دی گئی ہے۔ نفع میں شرح تناسب طے کر لیا ہو اور خدانخواستہ بصورت نقصان، اس کی ذمہ داری قبول کی جائے تو جائز ہے۔

(ب) اگر رقم بطور امانت وحفاظت رکھنے کے لئے دی ہے تو امین کا اس میں تصرف کرنا اور استعمال میں لانا جائز نہیں ہے ورنہ بصورت اتلاف اس پر ضمان ہوگا۔

(۲) انعامی بانڈ کی پرچیوں کا کاروبار کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ ایسے ''انعامی بانڈز'' کا حامل، بانڈز اپنی ملکیت اور قبضے میں رکھتا ہے اور ایک شخص ایک مخصوص رقم کے عوض ''انعامی بانڈز'' کے کچھ نمبرز یا سیریز لکھ دیتا ہے اور طے یہ ہوتا ہے کہ اگر اس پرچی پر درج سیریز میں سے کسی خاص نمبر پر انعام نکل آیا تو بانڈز کا حامل اس پرچی کے خریدار کو انعام کی پوری رقم دے گا، یہ اس لئے حرام ہے کہ اس میں پرچی کے عوض خریدار کو بانڈز نہیں ملتے اور ان نمبرات پر انعام نہ نکلنے کی صورت میں خریدار کی رقم ڈوب جاتی ہے، لہٰذا یہ قمار کی ایک شکل ہے۔

(۳) پرائز بانڈ رکھنا اور ان پر ملنے والا انعام جائز ہے۔

انعامی بانڈ پر انعام کے جواز کا مسئلہ

وضاحتی نوٹ: پرائز بانڈ کے انعام کے بارے میں آپ میرا موقف 18 اکتوبر کے تفہیم المسائل میں پڑھ چکے ہیں۔ عدم جواز کے بارے میں ایک صاحب نے ایک فتویٰ کی فوٹو اسٹیٹ ارسال کی ہے، یہ سب فتاویٰ ہمارے علم میں ہیں۔ اخبار میں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں، جگہ محدود ہے۔ سپریم کورٹ شریعت اپلیٹ کا فیصلہ ''آل پاکستان لیگل ڈائجسٹ جلد نمبر XLIV مطبوعہ 1992ء میں مل جائے گا، اس میں (ر) جسٹس شفیع الرحمٰن اور (ر) جسٹس پیر کرم شاہ الازہری مرحوم کی آراء پر پرائز بانڈ پر ملنے والے انعام کے جواز کے بارے میں قمار اور لاٹری وغیرہ کی شرعی حیثیت پر فیصلے کے ضمن میں درج ہیں۔ جو حضرات علمی ذوق رکھتے ہیں، جنہیں مطالعے کا شغف ہے اور فقہی مسائل کی تحقیق میں دلچسپی ہے اور تفصیلی بحث اور دلائل جاننا چاہتے ہیں تو شرح صحیح مسلم جلد 4 صفحہ 111 تا 126 مصنف علامہ غلام رسول سعیدی کا مطالعہ فرمائیں اور اس کے بعد بھی تشنگی محسوس کریں تو ہم سے رجوع فرمائیں۔

کاروباری اداروں کی انعامی اسکیمیں

سوال: آج کل عموماً بہت سے صنعتی اور کاروباری ادارے اپنی مصنوعات کی فروخت میں اضافے کے لئے انعامی اسکیموں کا اعلان کرتے ہیں۔ کیا شرعاً جائز ہیں؟

(کامران قریشی، خداداد کالونی، کراچی)

جواب: مصنوعات کی فروخت میں ترغیب اور اضافے کے لئے انعامی اسکیمیں جائز ہیں، بشرطیکہ متعلقہ کمپنی دیانت داری سے انعام کی رقم ادا کرے، ورنہ اس کے مالکان جھوٹ اور دھوکہ دہی کے مرتکب اور گناہ گار ہوں گے اور اس حیلے سے حاصل کردہ مال میں ان کے لئے خیر اور برکت نہیں ہوگی۔

وہ انعام اپنی جانب سے یا اپنے منافع میں سے ادا کریں، انعامی رقم کی کمی پورا کرنے

کے لئے مال کی کوالٹی یا مقررہ مقدار میں کمی نہ کریں، ورنہ وہ خیانت کے مرتکب ہوں گے۔

ایسا بھی نہ ہو کہ جس نمبر پر انعام نکالنا مقصود ہو، اسے کمپیوٹر میں پہلے سے فیڈ کر دیا جائے اور اسے مارکیٹ میں سپلائی کرنے کے بجائے اپنے پاس رکھ لیا جائے یا اپنے کسی من پسند آدمی کو دے دیا جائے، یہ بھی خیانت اور فراڈ ہے۔ یا یہ کہ انعام کے لئے کسی مخصوص نمبر کو کمپیوٹر میں فیڈ کرنے کے بعد اسے تلف کر دیا جائے تا کہ اس کا کوئی دعویدار ہی سامنے نہ آئے۔ یہ بھی جھوٹ، فریب اور خیانت کے زمرے میں آئے گا اور ایسے لوگ دنیا میں روحانی خیر و برکت سے محروم رہیں گے اور اخروی عذاب کے مستحق ہوں گے۔

ہاں، اگر کوئی ترغیبی انعامی اسکم ان معائب یا ان جیسے دیگر مفاسد سے پاک ہے، اس میں ملاوٹ، مقدار میں کمی، جھوٹ، خیانت اور فریب کا شائبہ نہیں ہے تو شرعاً جائز ہے۔

قومی بچت اسکیمیں سود یا منافع

سوال: قومی بچت اسکیموں کے ذریعے ملنے والی رقم کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ کیا چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف سود کا خاتمہ کر دیں گے (ڈینیل، سردار بھٹی، منظور کالونی، کراچی)

جواب: قومی بچت اسکیموں پر منافع کے نام سے ملنے والی رقم سود ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ چیف ایگزیکٹو سود کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں یا نہیں یا اس میں کامیاب ہوسکیں گے یا نہیں، تو ان کے عزائم اور پروگرام کا مجھے علم نہیں ہے، نہ میں اس پوزیشن میں ہوں کہ ان سے رابطہ کر کے آپ کو آگاہ کر سکوں۔ ہو سکے تو آپ اس موضوع پر ان سے براہ راست خط و کتابت کریں یا کسی ذمے دار سرکاری شخصیت سے رابطہ کریں۔ سود کے مفاسد پر تفصیلی گفتگو اس کالم میں نہیں ہوسکتی، گنجائش نہیں ہے۔

بینک کی ملازمت

سوال: (ا) کیا از روئے شریعت بینک کی ملازمت حرام ہے؟ (ب) کیا بیوٹی پارلر کا کاروبار اور اس کی آمدنی شرعاً جائز ہے؟ (سید محمد یامن، نارتھ کراچی)

جواب: (ا) ہمارے ہاں بینکوں میں چونکہ سارا کاروبار سودی ہے، اس لئے اس کی

ملازمت شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ یہ حرام میں معاونت ہے۔ البتہ جس شخص کے پاس گزر بسر اور اپنی اور اپنے زیر کفالت افراد کی بنیادی ضروریات کے لئے کوئی حلال ذریعہ روزی نہ ہو تو دلی کراہت اور ناگواری کے ساتھ ملازمت کرے اور رزق حلال کے لئے جدوجہد کرتا رہے، جب روزی کا حلال ذریعہ مل جائے تو اسے فوراً چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرے۔

(ب) ''بیوٹی پارلر'' میں اگر عورتیں ہی عورتوں کی تزئین اور سنگھار کا کام کرتی ہیں اور غیر مردوں کا کوئی عمل دخل نہ ہو تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ عورتوں سے عورتوں کے ستر کے معاملے میں حدود شرع کی پاس داری ہو، البتہ عورتوں کا بالوں کی تراش اس طرح کرنا کہ مردوں سے مشابہت ہو تو یہ ناجائز ہے اور ایسی عورتوں پر حضور ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

﴿كتاب اليمين﴾

قسم کی قسمیں

سوال: بعض لوگ قسم کھاتے وقت اس طرح کے کلمات استعمال کرتے ہیں، مثلاً تیرے سر کی قسم، میری جان کی قسم، ماں باپ کی قسم، اولاد کی قسم، عرش الٰہی کی قسم، رسول اللہ ﷺ کی قسم وغیرہ، کیا ان کلمات سے قسم ہو جاتی ہے؟ (محمد احتشام خاں، الفلاح سوسائٹی، کراچی)

جواب: شریعت میں قسم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی ہوتی ہے یا کلام اللہ کی قسم ہوتی ہے۔ غیر اللہ کی قسم کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے، نہ ایسی قسم منعقد ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی کفارہ ہے۔ حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے آباء واجداد (یعنی غیر اللہ) کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے، سو جو قسم کھانا چاہے وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے یا خاموش رہے''۔

کافر ملت پر معلق کر کے قسم کھانا

سوال: بعض لوگ قسم کھاتے وقت جوش میں آ کر اس طرح کے کلمات استعمال کرتے ہیں کہ: اگر میں نے یہ کام کیا ہو یا ایسا کام کروں تو یہودی ہو جاؤں یا عیسائی ہو جاؤں یا کافر ہو کر مروں یا ایمان سے محروم ہو جاؤں اور وہ قسم میں جھوٹا ہے یا قسم توڑ دی، تو کیا حکم ہے؟
(کھتری عصمت علی پٹیل، کراچی)

جواب: (نوٹ): اس سوال کا جواب میں نے طبع اول میں مختصر طور پر لکھا تھا، جس میں صرف ایک شق کا ذکر تھا اور حدیث بھی درج کی تھی، مقصود یہ تھا کہ لوگ اس کی سنگینی اور حدیث میں بیان کی گئی وعید کو پڑھ کر اس طرح کے کلمات استعمال کرنے سے اجتناب کریں، کیونکہ جو ''مُبتلیٰ بہٖ'' (یعنی جس نے ایسی قسم کھالی) ہے، اس کے لئے تو رخصت و رعایت شرعی کا پہلو مفید ہوتا ہے، لیکن جو اب تک ایسے فعل سے بچے ہوئے ہیں، ان کے لئے وعید کا پہلو مفید ہوتا ہے تاکہ آئندہ بھی احتیاط پر عمل کریں۔ لیکن ہمارے محترم دوست علامہ مفتی محمد رفیق حسنی صاحب مہتمم جامعہ مدینۃ العلوم و نائب رئیس مجلس الفقہ الاسلامی پاکستان نے فقہی باریک بینی اور احتیاط کی جانب متوجہ کیا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا

تفصیلی جواب تحریر کردیا جائے تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ میں محترم مفتی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس مسئلے کو فقہی اعتبار سے جامع بنانے کی طرف متوجہ فرمایا۔ تفصیلی جواب درج ذیل ہے:

جس شخص نے کسی کام کے کرنے کو "ملت غیر اسلام" پر معلق کیا، مثلاً کہا اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی ہوں، تو اس کے تین محامل ہیں:

(۱) اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ کام اسی طرح "واجب الامتناع" ہے (یعنی اس کا نہ کرنا ضروری ہے) جیسے یہودی نہ ہونا ضروری ہے، اس صورت میں وہ کافر نہیں ہوگا، لیکن چونکہ حدیث میں ایسی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے، اس لئے وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، اور حدیث میں جو اس کو کافر فرمایا گیا ہے، وہ زجر و توبیخ پر مشتمل ہے۔

(البحر الرائق جلد 4 صفحہ 284 مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ، کوئٹہ)

(۲) اور اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ کام بالکل نہیں کرے گا، اور اس نے یہ کام کیا تو اس کا یہودی ہونا صحیح، برحق اور حلال ہے، اس صورت میں وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے ماضی کے حوالے سے کسی کام کے نہ کرنے کی جھوٹی قسم کھائی اور کہا کہ اگر اس نے یہ کام کیا ہو تو وہ یہودی ہے، اور اس کا یہودی ہونا صحیح اور برحق ہے، تو اس صورت میں وہ فی الفور کافر ہو جائے گا، کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے (البحر الرائق جلد 4 صفحہ 285-286 مطبوعہ کوئٹہ اور الدر المختار و رد المحتار جلد 5 صفحہ 392 تا 394 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت 1419ھ)

(۳) اور اگر اس نے یہودیت کی تعظیم کی نیت سے قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی ہوں، اس صورت میں بھی وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی تعظیم کرنا کفر ہے، اور اگر اس نے یہودیت کی تعظیم کی نیت نہیں کی تھی، تو وہ کافر نہیں ہوگا، اور حدیث پاک میں جو ارشاد ہے، "وہ کافر ہو جائے گا" وہ کفران نعمت پر محمول ہے (صحیح مسلم مع شرح النووی، رقم الحدیث: 110، مطبوعہ مکتبہ نزار، مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ 1417ھ)

حدیث مبارک، جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، یہ ہے:

"ثابت بن قیس ضحاک بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے درخت کے نیچے (یعنی بیعت رضوان، جو صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست اقدس پر بیعت کی، اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جس شخص نے "ملت غیر اسلام" پر قسم جھوٹی کھائی (یعنی یمین غموس) تو وہ ایسا ہی ہے، جیسا اس نے کہا"۔

قسم کی شدت

سوال: بعض لوگ طیش میں آکر اس طرح کہہ دیتے ہیں کہ اگر میں یہ کام کروں تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہو، اس کی لعنت ہو، مجھ پر آسمان پھٹ پڑے، مجھ پر خدا کی مار ہو، مجھ پر خدا کی پھٹکار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت سے محروم ہو جاؤں، مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو وغیرہ، آیا ان کلمات سے قسم ہوتی ہے یا نہیں؟ (محمد عرفان احمد، بفرزون، کراچی)

جواب: ان کلمات سے قسم تو نہیں ہوتی، لیکن ایسے کلمات استعمال کرنے یا اپنے خلاف بددعا سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اگر ایسے الفاظ استعمال کیے، پھر جھوٹا ثابت ہوا تو گناہگار ہو گا اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنا چاہیے۔

مشروط قسم

سوال: بعض لوگ قسم کھانے کے ارادہ سے یوں کہہ دیتے ہیں کہ اگر میں یہ کام کروں تو فلاں چیز مجھ پر حرام ہے، یعنی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دے دیا، یا یہ کہ تجھ سے بات کرنا مجھ پر حرام ہے؟۔ (شمیم وحید، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: کسی کے کہنے سے حلال چیز حرام تو نہیں ہوتی کہ اشیاء کو حلال و حرام قرار دینے کا حق و اختیار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہے، بندے کے اختیار میں نہیں ہے تاہم اس سے قسم منعقد ہو جائے گی اور اگر وہ اسے توڑے گا تو کفارہ لازم ہو گا۔

اللہ تعالیٰ سے وعدہ

سوال: میں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ "اے اللہ! اگر میرا فلاں کام ہو گیا، تو میں یہ

کام کروں گا"۔ جب میرا وہ کام ہو گیا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے کچھ وعدے پورے کیے اور کچھ نہ کر سکا۔ کیا کفارہ ادا کرنا ہوگا؟ (کامران سعید احمد خاں، بفرزون، کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (بنی اسرائیل)

"اور عہد کو پورا کرو بے شک (قیامت کے دن) عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی"۔

اور سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں اہل ایمان کی صفات عالیہ کو بیان کرتے ہوئے آیت نمبر 8 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (المومنون)

"اور جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پاس داری کرتے ہیں"۔

حدیث پاک میں وعدہ شکنی کو منافق کی نشانی بتایا گیا ہے لہٰذا وعدہ بندوں سے کیا گیا ہے یا رب ذوالجلال سے، دونوں صورتوں میں اسے وفا کرنا چاہیے اور جن معاملات میں عہد شکنی ہوئی ہے ان پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خلوص دل سے استغفار کریں، اس کا کفارہ کوئی نہیں تاہم کسی وعدے کا ایفا اب بھی ممکن ہو، تو اسے ضرور پورا کریں یہی اس کی تلافی کی صحیح صورت ہے۔

قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے

سوال: بعض اوقات انسان غصے کے عالم میں اس طرح کی قسم کھالیتا ہے کہ:

(ا) قسم کھا کر اپنے والدین سے کہتا ہے کہ میں آئندہ آپ کی بات نہیں مانوں گا۔

(ب) اپنے کسی بھائی، عزیز یا دوست سے قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں آئندہ تم سے ہرگز کلام نہیں کروں گا۔

(ج) قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں حج نہیں کروں گا یا رمضان کا روزہ نہیں رکھوں گا، وغیرہ تو ان تمام صورتوں میں اسے کیا کرنا چاہیے، قسم کو پورا کرے یا توڑ دے؟۔ (جلیل صدیقی، ناظم آباد)

جواب: اگر کسی شخص نے کسی ایسے کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائی کہ قسم پر قائم رہنے میں شریعت کی خلاف ورزی لازم آتی ہے، تو اس پر لازم ہے کہ قسم کو فی الفور توڑ دے، شریعت کے مطابق کام کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے، حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "ایک شخص کسی بات کی قسم کھالیتا ہے، پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ دینی خیر اور بھلائی اس قسم کے پورا کرنے میں نہیں بلکہ اس کے برعکس کام کرنے میں ہے، تو اسے چاہیے کہ ایسی قسم کو توڑ دے اور اس کا کفارہ ادا کرے اور وہ کام کرے جس میں دینی اور اخروی خیر اور فلاح ہے"۔

سوال میں مذکور قسم کی تمام صورتیں ایسی ہیں، جن پر قائم رہنا شرعاً ممنوع ہے۔ مثلاً:

(۱) والدین کی اطاعت سے انکار حرام ہے قطع رحمی ہے۔

(۲) تین دن سے زیادہ کسی دینی بھائی سے ترک تکلم اور ترک تعلق ناجائز ہے اور کسی قرابت دار سے ترک تعلق قطع رحمی کا بھی سبب ہے۔

(۳) بلا عذر شرعی ان امور کا تارک فاسق اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

لہٰذا ان تمام صورتوں میں شرعاً ضروری ہے کہ قسم فوراً توڑ دے اور والدین کی اطاعت پر کمربستہ ہو جائے۔

اپنے بھائی، عزیز یا دوست سے تجدید تعلق کرے، حج اور روزے کی ادائیگی کا التزام کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے۔

قسم توڑنا

سوال: ایک شخص نے آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں قسم کھائی اور پھر اس کے خلاف کیا، یعنی قسم کو توڑ دیا، ایسی قسم کا کیا کفارہ ہے؟ (خلیل احمد عباسی، لانڈھی)

جواب: ایسی قسم کو اصطلاح شریعت میں "یمین منعقدہ" کہتے ہیں۔ اگر اس قسم کے پورا کرنے اور اس پر قائم رہنے میں کوئی شرعی قباحت لازم نہ آتی ہو، تو حتی الامکان اسے پورا کرنا چاہیے، تاہم اگر کسی کمزوری یا مجبوری کے تحت اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکے اور اسے توڑ

دے تو فقہی اصطلاح میں اسے ''حانث'' ہونا کہتے ہیں۔اس کی تلافی کے لئے کفارہ ادا کرنا چاہیے اور ایسی قسم کا کفارہ قرآن مجید میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے:

دس مسکینوں کو اپنے اوسط معیار کے مطابق دو وقت کا کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو لباس فراہم کرنا اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو تین دن کے روزے رکھنا۔

جھوٹی قسم

سوال: ایک شخص کسی گزشتہ واقعہ کے بارے میں جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھاتا ہے۔اس قسم کا کفارہ کیا ہے؟ (شاہد خاں، کراچی)

جواب: قصداً جھوٹی قسم کھانا گناہ کبیرہ ہے۔ اصطلاح شریعت میں ایسی قسم کو ''یمین غموس'' کہتے ہیں۔اس جھوٹی قسم کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔اس گناہ کی تلافی اور اس کے اخروی عذاب سے بچنے کی ایک ہی امکانی صورت ہے کہ انسان صدق دل سے اپنے گناہ پر نادم ہو اور اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتا رہے۔

وعدہ کے وقت ان شاء اللہ کہنا

سوال: جب وعدہ کے وقت ان شاء اللہ کہا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ پورا نہیں ہوگا کیا ایسا کہنا درست ہے؟ (گوہر رحمان، بفرزون، کراچی)

جواب: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ (الکہف)

''اور کسی کام کی بابت یہ ہرگز نہ کہنا کہ میں کل یہ کام کرنے والا ہوں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہیے''۔

اس ارشاد ربانی کا مقصد یہ ہے کہ انسان آئندہ کسی کام کے کرنے نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کرے یا عزم کرے تو ساتھ ان شاء اللہ بھی کہہ دیا کرے، یعنی اپنے ارادے کو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے وابستہ کرے کیونکہ ہر بات اور ہر کام مشیت الٰہی کے تابع ہے۔الغرض ان اللہ کہنا اپنے ارادے کو روبہ عمل لانے کے لئے اخلاص نیت کا اظہار ہے اور اس بات پر

ایمان وایقان کا ثبوت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت کے تابع ہے۔ گویا ان شاء اللہ کہنے والا یہ بتانا چاہتا ہے کہ میرا یہ کام کرنے کا پختہ ارادہ ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کے برعکس ہوئی تو پھر میں بے بس ہوں۔ انشاء اللہ کہنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توفیق بھی شامل حال ہو جاتی ہے۔ جو لوگ کسی بات کا وعدہ بھی کریں ساتھ ہی ان شاء اللہ بھی کہیں لیکن کہنے والے یا سننے والے کی نیت یہ ہو کہ چونکہ ان شاء اللہ کہہ دیا ہے اس لئے یہ کام نہیں ہوگا یا کہنے والا اس وعدے کو پورا نہیں کرے گا تو یہ ان شاء اللہ کی غلط تعبیر ہے۔ یہ سوچ گمراہانہ ہے ایسی سوچ سے توبہ کرنی چاہیے البتہ اگر کوئی شخص کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے لیکن متصلاً ان شاء اللہ بھی کہہ دے (مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قسم میں کل ان شاء اللہ آؤں گا) تو یہ قسم شرعاً معتبر نہیں ہوگی اور اس کے ٹوٹنے سے کفارہ لازم نہیں آئے گا۔

وعدہ معاف گواہ کا حکم

سوال: کسی جرم میں شریک ہو کر بعد میں وعدہ معاف گواہ بن جانا، اسلام کی رو سے اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: جرم کا ارتکاب، جرم کی نوعیت کے اعتبار سے معیوب اور مذموم فعل ہے البتہ اعتراف جرم کرنا اور اپنے آپ کو شرعی سزا اور اپنے کیے ہوئے فعل کی تلافی کے لئے پیش کرنا اچھی بات ہے اس کو حقیقی معنی میں "توبہ" کہتے ہیں۔ آج کل ایک اصطلاح "وعدہ معاف گواہ" یا "سلطانی گواہ" کی ہمارے ہاں رائج ہے، ہمارے ملک میں مروجہ ضابطہ قانون اس کی اجازت بھی دیتا ہے اور اسے تسلیم بھی کرتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص کسی جرم میں شریک ہے اس شرط کے ساتھ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سامنے بطور گواہ پیش ہو کر جرم کے ثبوت پیش کرتا ہے اور خود بھی اعتراف جرم کرتا ہے کہ اسے سزا سے بری کر دیا جائے گا، چونکہ مروجہ قانون حاکم مجاز کو اس گواہی کے قبول کرنے اور شریک جرم گواہ کو معاف کرنے کی اجازت دیتا ہے، لہٰذا جرم کے ثبوت کے لئے اس کی گواہی قبول کر لی جاتی ہے اسے سزا سے بری کر دیا جاتا ہے، اس کو "وعدہ معاف گواہ" یا

''سلطانی گواہ'' کہتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اسلام میں اس گواہی کی حیثیت کیا ہے؟ اور آیا حاکم مجاز کو اس کا شرعاً اختیار حاصل ہے؟۔ اگر ایسا شخص کسی کے قتل کے جرم میں شریک ہے یا ایسے جرم کے ارتکاب میں شریک ہے، جس کے نتیجے میں اس پر اسلامی قانون قصاص یا اسلامی حدود کا اطلاق ہوتا ہے اور جرم شرعاً ثابت ہو جاتا ہے، تو حاکم و قاضی کو ثبوت جرم کے بعد حدود الٰہیہ میں معافی کا اختیار نہیں ہے اور قصاص میں مطلقاً معافی یا دیت لے کر مصالحت کا اختیار مقتول کے ورثاء کو ہے یا خود مجروح کو، حاکم و قاضی کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے۔ ایسے جرائم جن کی سزا شریعت نے مقرر نہیں کی اور اسے حاکم وقت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے، تعزیری جرائم کہلاتے ہیں۔ ان میں عام حالات میں بھی حاکم و قاضی کو سزا میں کمی بیشی کا اختیار ہوتا ہے، لہٰذا اگر حاکم یا قاضی ایسے امور، جن میں ثبوت جرم کے بعد حاکم کسی شریک جرم شخص کو ''بصورت اعتراف جرم'' سزا میں تخفیف اور رعایت دے دے تو وہ اس کا مجاز ہے۔ اس میں کم از کم ہر دور کے اہل اقتدار کے لئے عبرت کا ایک سامان تو ہے کہ وہ اپنے جن ماتحتوں پر اعتماد کر کے انہیں جرم کے ارتکاب پر آمادہ کرتے ہیں اور خلاف قانون احکام کی بجا آوری کا انہیں حکم دیتے ہیں، تو کل ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ یہ لوگ اس کے خلاف گواہ بن کر آ جائیں اور اسے اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے۔ لیکن ایسے شریک جرم وعدہ معاف گواہوں کی سزا میں تخفیف تو حکمت کی بناء پر کر لینا بر سبیل تنزلی قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن بالکل سزا سے بری کر دینا حکمت کے منافی ہے، کیونکہ اس طرح تحفظ کا یقین انہیں بآسانی قانون شکنی اور ارتکاب جرم پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اس کی ضرورت بعض فنی نوعیت کے محکمانہ کاموں یا اہل اقتدار کے پراسرار نوعیت کے ظالمانہ جرائم کی تحقیق کے لئے پیش آ سکتی ہے، کیونکہ ان معاملات تک سرکاری عمال حکومت کے علاوہ عام لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی۔

﴿اسماء﴾

نام رکھنے کا طریقہ

سوال: قرآن مجید سے نام رکھنے کا طریقہ کیا ہے؟ شریعت میں اس کی کیا حیثیت ہے؟
(عبداللطیف قادری، مظفرآباد، آزاد کشمیر)

جواب: قرآن مجید سے نام رکھنے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، یہ ایک جاہلانہ تصور ہے۔ احادیث مبارکہ میں بچوں کے نام رکھنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے جو ارشادات منقول ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) تم قیامت کے روز اپنے اور اپنے باپ کے نام سے پکارے جاؤ گے، تو (تمہیں چاہیے کہ) اچھے نام رکھو۔

(۲) انبیائے کرام کے ناموں پر اپنے نام رکھو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب نام ''عبداللہ'' اور ''عبدالرحمٰن'' ہیں اور سب سے سچے نام ''حارث'' اور ''ہمام'' ہیں اور برے ''حرب'' اور ''مرہ'' ہیں۔

(۳) میرے نام (یعنی محمد اور احمد) پر اپنے نام رکھو اور میری کنیت (یعنی ابوالقاسم) پر اپنی کنیت نہ رکھو۔ اس حدیث کی تشریح میں علماء کے دو اقوال ہیں، ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے نام اور کنیت کو یکجا کر کے کسی کا نام نہ رکھو۔ جیسے ''ابوالقاسم محمد'' یا یہ کہ حضور ﷺ کا نام رکھنا، آپ کی ''حیات ظاہری'' میں منع تھا تاکہ بلانے میں اشتباہ نہ ہو، آپ کے وصال کے بعد منع نہیں ہے۔

(۴) حضرت عمرؓ کی ایک بیٹی کا نام ''عاصیہ'' تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بدل کر ''جمیلہ'' رکھ دیا۔

مطلب یہ کہ نام بامعنی ہونے چاہئیں اور ان سے اچھے معانی نکلتے ہوں۔

''عبداللہ''، ''عبدالرحمٰن'' اور اس طرح کے نام، جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے ''بندگی'' کی نسبت ظاہر ہوتی ہو، اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ہیں۔ لیکن ایسے شخص کو پھر نام توڑ کر نہیں پکارنا چاہیے۔ مثلاً کسی کا نام عبدالرحمٰن، عبدالغفار، عبدالستار، عبدالجبار وغیرہ ہے تو

لوگ بعض اوقات انہیں ''رحمٰن صاحب''، ''غفار صاحب''، ''ستار صاحب'' اور جبار صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ رحمٰن، غفار، ستار اور جبار تو اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں اور ہر وہ نام جس میں اللہ تعالیٰ کے اسم ذات یا اسماء صفات کے ساتھ عبد کی اضافت لگائی گئی ہو، ہمیشہ پورا لینا چاہیے۔ حضور ﷺ کے اسم مبارک پر نام رکھنا مستحسن ہے۔

نام تبدیل کرنا

سوال: بعض اوقات بچہ بڑا ہو جاتا ہے، اکثر بیمار رہتا ہے یا لڑکی کے رشتے نہیں آتے یا رشتے کی بات بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے تو بعض عامل قسم کے لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ نام کا اثر ہے، نام تبدیل کر دو، تو سوال یہ ہے کہ کیا شخصیت پر نام کا اثر ہوتا ہے، اس کے نیک یا بد اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اگر بڑی عمر میں نام تبدیل کیا جائے تو شریعت میں اس کی گنجائش ہے؟۔ (کامران قریشی، گلستان جوہر، کراچی)

جواب: نام کے شخصیت پر اثر انداز ہونے یا نیک و بد اثرات مرتب ہونے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ تاہم احادیث میں نبی کریم ﷺ سے بچوں کے نام رکھنے کے بارے میں چند اصول ثابت ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) اچھا نام رکھنا نیک فال ہے اور اس کا حضور ﷺ نے استحبابا حکم بھی فرمایا۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہیں قیامت کے دن تمہارے اپنے اور تمہارے باپوں کے ناموں سے (یعنی ابن فلاں کہہ کر) پکارا جائے گا لہٰذا (اپنے بچوں کے) اچھے پیارے نام رکھو'' (مسند احمد و سنن ابی داؤد بحوالہ مشکوٰۃ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے ناموں میں سے جو نام اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں، وہ عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم) سنن ابی داؤد کی ایک روایت ہے کہ ''سب سے سچے نام حارث اور ہمام ہیں''۔

(۲) جس نام کے معنی برے ہوں، اس پر مطلع ہونے پر اسے بدل دینا چاہیے۔ حضرت

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر کی ایک بیٹی کا نام ''عاصیہ'' (نافرمان) تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بدل کر ''جمیلہ'' رکھ دیا (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم) لہٰذا معنی کے اعتبار سے برے نام کو تبدیل کرنا مستحب ہے۔

(۳) جن ناموں سے تکبر، تعلّی یا پارسائی اور پندار نفس کا تاثر ابھرتا ہو یا جو الوہی صفات پر مشتمل ہوں، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا چنانچہ آپ نے ''ملک الاملاک''، ''شہنشاہ''، ''ابو الحکم'' ایسے ناموں کو ناپسند فرمایا۔ ایک شخص اپنے قبیلے کے لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کیا کرتا تھا اور قبیلے کے لوگ اس کے فیصلوں کو برضا و رغبت تسلیم کرلیا کرتے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس عمل کی تحسین فرمائی لیکن اس بناء پر جوان کا نام ''ابو الحکم'' پڑ گیا تھا، اسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناپسند کرتے ہوئے فرمایا: (حقیقی) حکم اور حاکم اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور ان کے بڑے بیٹے کی نسبت سے ان کا نام ''ابو شریح'' رکھ دیا۔

(۴) بعض ناموں میں اپنے معنی کے اعتبار سے نیک شگون ہوتا ہے۔ جیسے افلح (بہت زیادہ کامیاب) یعلی (بلند)، نافع نجیح (کامیاب) برکت، اسلام وغیرہ۔ ان ناموں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لئے ناپسند فرمایا کہ کوئی شخص آکر پوچھے گا۔ برکت ہے؟ یا اسلام ہے؟ یا افلح، نجیح، نافع ہے تو آگے سے جواب ملے گا: برکت چلا گیا، اسلام چلا گیا، نافع نہیں ہے وغیرہ۔ اور اس سے ذہن پر اچھا اثر مرتب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ممانعت مکروہ تنزیہی کے درجے میں ہے۔

(۵) اسلام میں بدشگونی، بدفالی وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بیماری، پریشانی اور مشکل میں بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے۔

عبدالنبی نام

سوال: میرا نام عبدالنبی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اپنا نام بدلو، کیا یہ نام ناجائز ہے؟

(عبدالنبی، کورنگی، کراچی)

جواب: قرآن مجید میں لفظ ''عبد'' کا اطلاق پانچ قسم کے لوگوں پر کیا گیا ہے۔ ان میں

سے ایک غلام اور مملوک پر عبد کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جیسے سورۃ البقرہ آیت 178 میں فرمایا:

وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ "عبد (غلام) کے بدلے میں (بطور قصاص) عبد (غلام کو قتل کیا جائے)"

سورۃ النحل آیت نمبر 75 میں فرمایا:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ "اللہ تعالیٰ عبد مملوک (غلام) کی مثال بیان فرماتا ہے، جس کو کسی چیز پر قدرت و اختیار نہیں ہے"۔

اسی طرح سورۃ النور آیت نمبر 32 میں عبد کی نسبت اس کے مالک کی طرف کرتے ہوئے فرمایا:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ۔ "تم اپنے (بے نکاح) آزاد مردوں اور عورتوں کا نکاح اپنے نیک عباد (غلاموں) اور باندیوں کے ساتھ کرو"۔

ان آیات مبارکہ میں عبد کی نسبت مخلوق (یعنی اس کے مالک) سے کی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میرا بندہ (عبدی) اور میری باندی (امتی)، (حقیقت یہ ہے کہ) تم سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہو اور تمہاری سب عورتیں اللہ تعالیٰ کی باندیاں ہیں، بلکہ (بہتر یہ ہے کہ) یوں کہو کہ میرا غلام، میری خادمہ، میرا خادم اور غلام (عبد) بھی اپنے آقا کو میرا رب نہ کہے بلکہ میرا سردار (سیدی) کہے"۔

ان آیات واحادیث سے "عبد النبی" اور "عبد الرسول" کا صریح جواز ثابت ہوتا ہے۔

علامہ بدرالدین عینی حنفی نے لکھا ہے کہ کسی شخص کے لئے اپنے غلام کو میرا عبد کہنا جائز ہے اور حدیث میں ممانعت ہے یہ مکروہ تنزیہی کے درجے میں ہے، حرام نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے علامہ دمیری شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ نسبت کا شرف حاصل کرنے کے

لئے کوئی شخص ''عبدالنبی'' نام رکھے تو جائز ہے، لہٰذا اسے زیادہ سے زیادہ خلاف اولیٰ کہا جاسکتا ہے۔ امام احمد رضا بریلوی نے لکھا ہے کہ بعض متاخرین نے جو ''عبدالنبی'' کو مکروہ کہا ہے، یہ بھی نام رکھنے کی حد تک ہے، نسبت کا شرف حاصل کرنے کے لئے کوئی کہے تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔ جو لوگ عبدالنبی، عبدالرسول اور عبدالمصطفیٰ نام رکھنے کو کفر و شرک، بدعت یا گمراہی کہتے ہیں، یہ محض دین میں غلو ہے اور قرآن کے اطلاقات کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔

''پرویز'' اور ''قیصر'' نام رکھنا

سوال: (ا) بعض مسلمان پرویز اور قیصر نام رکھتے ہیں، ان کے کیا معنی ہیں۔ کیا یہ نام رکھنا جائز ہے؟ ''عزیر'' کے کیا معنی ہیں؟

(ب) کیا بچوں کا نام رکھنے کے لئے تاریخ، ستارے اور برج کا حساب معلوم کرنا ضروری ہے؟۔ (عبدالحمید، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: (ا) ''پرویز'' کے معنی ہیں ''نہایت اعلیٰ'' مہذب، فاتح، بلند اختر، عزیز، ارجمند وغیرہ اور ''قیصر'' لاطینی زبان میں اس بچے کو کہتے ہیں جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہو اور ماں فوت ہو جائے اور اسے پیٹ چیر کر یعنی آپریشن کر کے نکالا جائے، روم کا اول بادشاہ ''اغسطوس'' بھی اسی طرح پیدا ہوا تھا، لیکن بعد میں وہ خوش نصیب ثابت ہوا۔ پرویز ''خسرو ثانی'' شاہ ایران کا لقب تھا اور اس طرح روم کے بادشاہوں کا لقب ''قیصر'' قرار پایا۔ لہٰذا پرویز اور قیصر کے معنی میں تو کوئی خرابی نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ غیر مسلم بادشاہوں کے امتیازی لقب تھے اس لئے بہتر یہ ہے کہ یہ نام نہ رکھے جائیں، کیونکہ نام میں نسبت کا بھی اعتبار ہوتا ہے ''عزیر'' انبیائے بنی اسرائیل میں ایک مقدس نبی کا نام ہے، جنہیں یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا تھا کسی نبی مقدس کے نام پر نام رکھنا ہو تو نسبت کا اعتبار ہوتا ہے۔

(ب) بچے کے نام کے لئے تاریخ پیدائش، ستاروں اور برجوں کا جاننا ضروری نہیں ہے، بس اسلام کی تعلیمات فقط اتنی ہیں کہ نام بامعنی اور انبیائے کرام علیہم السلام یا اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے نام پر ہو تو نسبت کی برکت بھی حاصل ہوگی۔

﴿سیرت﴾

تاریخ ویوم ولادت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سوال: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت کس دن اور کس تاریخ کو ہوئی؟

(محمد سہیل، نارتھ کراچی)

جواب: جمہور علماء امت کے نزدیک ختم المرسلین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت پیر بارہ ربیع الاول عام الفیل میں ہوئی اس پر قرون اولیٰ سے امت کا تعامل رہا ہے اور اس پر تقریباً اجماع ہے۔ جسٹس علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری نے اپنی سیرت کی مشہور عالم تصنیف ''ضیاء النبی'' صفحات 33 تا 41 میں اس موضوع پر مدلل اور مفصل بحث کی ہے اور تاریخ طبری اور تاریخ ابن خلدون، سیرت ابن ہشام، مدارج النبوۃ، اعلام النبوۃ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، الوفا ابن جوزی، عیون الاثر اور مصنف ابن ابی شیبہ بحوالہ سیرۃ ابن کثیر، الشمامۃ العنبر یہ فی مولد خیر البریہ اور سیرۃ خاتم النبیین کے حوالہ جات سے اسے ثابت کیا ہے۔ اور علامہ شبلی نعمانی اور قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے جو ماہر فلکیات محمود پاشا اور دیگر ماہرین تقویم پر اعتماد کر کے 9 ربیع الاول تاریخ ولادت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بتائی ہے، اس کا رد کیا ہے اور بتایا کہ حدیث مرفوع کے مقابلے میں ان اقوال کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جہاں تک یوم ولادت کا تعلق ہے تو وہ صحیح مسلم اور دیگر احادیث کے مطابق قطعی طور پر پیر کا دن ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ (ﷺ) لکھنے پر اکتفا

سوال: ہماری مس نے بتایا کہ بعض لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم مبارک کے ساتھ جگہ بچانے یا وقت کی قلت کے سبب تخفیف کر کے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بجائے (ﷺ) لکھ دیتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے حالانکہ ہمارے ہاں یہ رواج عام ہے اکثر جگہ میں نے مذہبی کتابوں میں بھی لکھا ہوا دیکھا ہے، شرعی مسئلہ کیا ہے؟

(ماہ نور، نارتھ کراچی)

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور آپ پر صلوٰۃ بھیجنا اللہ تبارک وتعالیٰ اور ملائکہ کی سنت جلیلہ ہے۔ جو مومن حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم

مبارک سن کر آپ پر ہدیہ نہ بھیجے اس کے لئے حدیث مبارک میں بڑی وعید آئی ہے۔ اکابر امت نے درود اور فضائل درود پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں جب تحریراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر مبارک آئے تو ہر بار ''صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' پورا لکھا جائے اس کو تخفیف کر کے (ص) لکھنا حرام اور ناجائز ہے۔ علامہ سید احمد طحطاوی حنفی نے ''حاشیہ الطحطاوی علی الدر المختار صفحہ 5 پر فتاویٰ تاتارخانیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جو شخص سید الانبیاء کی تخفیف کے ارادے سے ایسا کرے تو اس سے کفر لازم آتا ہے۔ بہرکیف احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے مکمل اجتناب کیا جائے، اس طرح ''صلعم'' لکھنا بھی منع ہے۔ اسی طرح رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بجائے (رح) اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بجائے (رض) لکھنا بھی جائز نہیں ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کون ہیں؟

سوال: حضرت خضر علیہ السلام کون ہیں؟ نبی یا ولی، زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں؟۔
(محمد ناصر خان چشتی، بفرزون، نارتھ کراچی)

جواب: اصل لفظ ''خَضِر'' (خ کی زبر اور ض کی زیر کے ساتھ) ہے، بعض اہل سیر و تاریخ نے ''خِضْر'' (خ کی زیر اور ض کے سکون کے ساتھ) اور ''خضرون'' بھی نقل کیا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ یہ ان کا وصف ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں: سبز، ہرا، سبز ترکاری، بہت سرسبز و شاداب جگہ۔ وجہ تسمیہ یعنی اس نام کے ساتھ معروف ہونے کے بارے میں بھی کئی اقوال ہیں: (۱) ان کے حسن و جمال کی وجہ سے یہ نام رکھا گیا، (۲) یہ کہ وہ جس زمین پر بیٹھتے، اس پر سبزہ اُگ آتا، (۳) سفید گھاس یا بالوں کی چادر پر انہوں نے نماز پڑھی تو وہ ہری ہو گئی، (۴) یہ کہ حضرت موسیٰ اور یوشع علیہما السلام جب ان کی تلاش میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے آثار و علامات کی روشنی میں پلٹ کر آئے تو انہوں نے اسے سطح سمندر پر سبز چادر پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، وغیرہ۔ یہ سب اقوال حافظ عماد الدین ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں نقل کیے ہیں اور زیادہ راجح بات یہ ہے کہ خضر ان کا اصل نام نہیں بلکہ لقب یا صفاتی نام تھا، یہ الگ بات ہے کہ بعض شخصیات کے القاب اصل نام سے زیادہ مشہور ہو

جاتے ہیں۔ ابن کثیر نے وہب بن منبہ کی روایت سے ان کا نام ونسب یہ بتایا ہے:

ایلیا بن مکان بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیه السلام۔ انہوں نے نام کے بارے میں اور بھی اقوال نقل کیے ہیں۔ مثلاً العمرامریا، ارمیاہ، الیسع وغیرہ۔ ان کے بارے میں محدثین اور اہل سیرت وتاریخ اور اہل تصوف کے کئی اقوال وروایات ہیں: مثلاً (۱) یہ کہ وہ نبی تھے (۲) وہ ولی تھے (۳) وہ وفات پا چکے ہیں (۴) وہ اب تک زندہ ہیں (۵) ان کا تعلق نوع انسانی سے نہیں، وہ فرشتہ تھے۔ سب کے اپنے اپنے دلائل ہیں اور سب نے فریق مخالف کے دلائل کا جواب بھی دیا ہے اور رد بھی کیا ہے۔ ہم بطور نمونہ صحیح مسلم کے شارح علامہ یحیٰ بن شرف الدین نووی کی رائے نقل کرتے ہیں: ''جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت خضر زندہ ہیں اور ہمارے ہاں موجود ہیں، یہ امر صوفیاء اور عرفاء کے درمیان متفق علیہ ہے اور صوفیاء کی حضرت خضر کو دیکھنے، ان سے ملاقات کرنے، ان سے علم حاصل کرنے اور ان سے سوال وجواب کے متعلق حکایات مشہور ہیں اور مقدس مقامات اور مواضع خیر میں ان کے موجود ہونے کے متعلق بے شمار واقعات ہیں''۔ امام بخاری حضرت خضر اور حضرت الیاس کی حیات کے قائل نہیں ہیں، وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگ اب روئے زمین پر زندہ ہیں ایک سو سال بعد ان میں سے کوئی زندہ نہیں رہے گا''۔ صحیح مسلم میں بھی یہ روایت ہے اور اس میں روئے زمین کی قید نہیں ہے بلکہ مطلق ارشاد ہے۔ جو لوگ حیات خضر کے منکر ہیں، وہ قرآن مجید کی اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں:

وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (الانبیاء)

''اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر کے لئے (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنا مقدر نہ کیا، پس اگر آپ کی وفات ہو جائے تو کیا یہ لوگ یہاں ہمیشہ رہیں گے، ہر جان کو موت کا (مزہ) ضرور چکھنا ہے''۔

جو لوگ حیات خضر کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے آب حیات پی لیا تھا۔

قرآن مجید کی سورۃ الکہف میں نام کے بغیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے (ایک خاص سیاق و سباق Context) حضرت خضر کا تفصیلی ذکر ہے۔ مفسرین کرام کا اس پر اجماع ہے کہ اس سے حضرت خضر ہی مراد ہیں، ہم اختصار کی بناء پر صرف چند آیات کا ترجمہ درج کرتے ہیں:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾

(الکہف)

"تو انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (خضر) کو پایا، جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی اور اسے اپنا "علم لدنی" سکھایا، موسیٰ نے ان سے فرمایا: کیا میں اس شرط پر آپ کے ساتھ رہوں کہ آپ مجھے سکھا دیں گے اس سے جو بھلائی پانے کا علم آپ کو دیا گیا، انہوں نے فرمایا: بے شک آپ ہرگز میرے ساتھ صبر نہ کرسکیں گے اور آپ اس چیز پر کس طرح صبر کریں گے جس کا اپنے علم سے آپ نے احاطہ نہیں کیا"۔

اس تمہید کے بعد قرآن و حدیث اور تاریخ و سیرت کے دستیاب علمی مواد کی روشنی میں ہمارے نزدیک ان اکابر مفسرین کی رائے ہی قابل ترجیح ہے، جنہوں نے حضرت خضر کی نبوت کا قول کیا ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿٧٤﴾ (الکہف:74)

"پھر وہ دونوں (حضرت موسیٰ و خضر) چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ ایک لڑکے سے ملے تو اس (خضر) نے اسے

قتل کر دیا، موسیٰ نے فرمایا کہ کیا آپ نے
ایک بے قصور شخص کی جان، کسی جان کے
بدلے (یعنی قصاص) کے بغیر لے لی،
بے شک آپ نے بہت برا کام کیا"۔

تشریعی طور پر یعنی قانون شریعت کی رو سے جب تک کوئی شخص کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہ کرے (جیسے مرتد ہو جانا، یا ناحق کسی کو قصداً قتل کرنا) جس سے اس کے (بطور قصاص یا حد) قتل کا جواز پیدا ہوتا ہو، قتل کرنا جائز نہیں ہے، نہ ہی اسے اس امکان کے پیش نظر کہ وہ جرم کا ارتکاب کرے گا، کسی کو پیشگی سزا دی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود حضرت خضر کا اسے قتل کرنا، جس کی حکمت یا سبب انہوں نے آیت 80 میں آگے چل کر بتایا ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام انہوں نے اللہ تعالیٰ کے تکوینی امر کے تحت کیا۔ جس کا حکم انہیں بذریعہ وحی ربانی دیا گیا ہوگا، اسی لئے آگے چل کر آیت نمبر 82 میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "یہ کام میں نے اپنے اختیار سے نہیں کیا" یعنی اللہ تعالیٰ کی وحی والہام کے تعمیل میں کیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی امر تھا، تکوین سے مراد کائنات میں تخلیق وایجاد کے وہ تمام امور جو محض اللہ تعالیٰ کے امر، ارادے اور مشیت سے نافذ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہوسکتا ہے، وہ ولی ہوں اور اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام انہیں ان تکوینی امور کا حکم فرما دیا ہو اور انہوں نے تعمیل کی ہو۔ اس اعتراض یا اشکال کا جواب یہ ہے کہ ولی کا الہام ظنی ہوتا ہے، دوسروں کے لئے حجت نہیں ہوتا، جب کہ نبی کی وحی اللہ تعالیٰ کا امر لازمی اور قطعی حجت ہوتی ہے، مزید یہ کہ حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعے میں "علم لدنی" میں حضرت خضر کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے اور اگر انہیں ولی مانا جائے تو ولی امتی ہوتا ہے اور امتی نبی سے علم میں افضل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر سید مودودی نے تفہیم القرآن میں لکھا ہے: معلوم ہوتا ہے کہ "حضرت خضر بشر نہیں تھے بلکہ فرشتوں میں سے تھے" اور انہوں نے قرآن میں جو حضرت خضر پر "عبد" یا "رجل" کا اطلاق کیا گیا ہے، اس کی تاویلات کی ہیں کہ غیر بشر پر بھی ان کا اطلاق

ہوسکتا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ نبی بشر تشریع کا مکلف ہوتا ہے اور اس سے بظاہر خلاف شریعت تکوینی امر کا صدور نہیں ہوسکتا کہ ایک بے قصور لڑکے کو قتل کر دیں سید مودودی کا یہ اشکال اور اس کے نتیجے میں خضر کو فرشتہ قرار دینے کا استدلال اس لئے باطل ہے کہ حضرت ابراہیم یقینی طور پر نبی و رسول اور نوع انسان سے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ''ذبح اسماعیل'' کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے تکوینی امر کی تعمیل میں کوئی تردد نہیں کیا بلکہ فوراً تعمیل کر دی۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکمیل ذبح سے پہلے اپنے امر سے انہیں روک دیا۔

رہا یہ سوال کہ آیا حضرت خضر علیہ السلام اب بھی زندہ ہیں یا نہیں؟ دونوں طرف دلائل کا انبار ہے، صوفیاء کرام کے ملاقات خضر کے حوالے سے متعدد مشاہدات، تجربات اور دعوے ہیں۔ لیکن یہ سب ظنی امور ہیں، ہمارے پاس ان کے ردو قبول کا کوئی قطعی پیمانہ نہیں ہے بلکہ ظن غالب قائم کرنا بھی دشوار ہے، کیونکہ قرآن وحدیث اس کے بارے میں ساکت ہیں۔ تاہم عارف باللہ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے میں حرف آخر کے طور پر لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی سے جب حیات و وفات خضر علیہ السلام کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے مکاشفہ فرمایا، تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت خضر ان کے سامنے موجود ہیں، آپ نے ان سے ان کی حقیقت حال دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں اور الیاس علیہما السلام زندہ نہیں ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو یہ قوت عطا فرمائی ہے کہ ہم مجسم ہو جاتے ہیں اور زندوں کے سے کام کرتے ہیں، مثلاً جب اللہ تعالیٰ چاہے تو ہم گمراہ کی رہنمائی کرتے ہیں، مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔ ''علم لدنی'' کی تعلیم دیتے ہیں، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ چاہے روحانی نسبت عطا کرتے ہیں اور اولیاء اللہ میں سے قطب مدار کے معاون و مددگار ہوتے ہیں۔

﴿عورتوں کے

متفرق مسائل﴾

بیٹی کی پیدائش پر اظہار رنج وغم

سوال: بعض لوگ بیٹیوں کی پیدائش کو اپنے لئے باعث عار سمجھتے ہیں یا اسے اپنی ذات پر ایک بار سمجھتے ہیں جب کہ بیٹے کی پیدائش کی خبر سن کر وہ کھل اٹھتے ہیں، شریعت کے نزدیک یہ طرز فکر کیسا ہے؟۔ (سارہ مجید، گارڈن ویسٹ، کراچی)

جواب: مشرکین مکہ کے طرز عمل کے بارے میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (النحل)

''اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کی پیدائش) کی خوش خبری دی جاتی ہے تو (غم کے مارے) اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غصے سے بھر جاتا ہے''۔

قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ سوال میں جس طرز فکر کا ذکر ہے، وہ مشرکین مکہ کا تھا۔ بیٹا ہو یا بیٹی، اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، باقی رہا یہ سوال کہ مستقبل میں انسان کے لئے بیٹا زیادہ مفید ثابت ہوگا یا بیٹی، اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ سورۃ النساء کی آیت میراث میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا (النساء:11)

''تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم (خود) نہیں جانتے کہ تم کو نفع پہنچانے کے کون زیادہ قریب ہے''۔

ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے:

(۱) ''جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے بیٹیاں عطا کر کے آزمائش میں ڈالا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی نعمت جان کر ان کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا، تو وہ قیامت میں اس کے لئے عذاب جہنم سے نجات کا وسیلہ بن جائیں گی''۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس مومن نے دو بچیوں کو پال پوس کر جوان کیا، وہ قیامت کے روز میرے اتنے قریب ہوگا، جیسے ہاتھ کی انگلیاں''۔

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کی ایک بیٹی ہو اور وہ اس کی بہترین تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے اپنی بیٹی کو خوب نوازے، تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس بیٹی کو عذاب جہنم سے نجات کا وسیلہ بنا دے گا''۔

شادی شدہ عورت اور چوڑیاں

سوال: کیا شادی شدہ عورت کے لئے چوڑیاں پہننا ضروری ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سہاگ کی نشانی ہے اور نہ پہننا بیوگی کی علامت ہے؟ (ریاض، کراچی)

جواب: چوڑیاں پہننے یا نہ پہننے کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ یہ سہاگ کی علامت ہے اور نہ ہی یہ نہ پہننا بیوگی کی علامت ہے، یہ محض رسم و رواج کا حصہ ہے تاہم زیب و زینت کے لئے عورتیں چوڑیاں پہنیں تو کوئی ممانعت نہیں ہے۔

عورتوں کا محفل میلاد

سوال: کیا عورتیں محفل میلاد میں شرکت کرسکتی ہیں؟ مائیکروفون پر تقریر کرنا اور نعت و سلام پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: خواتین کا چار دیواری کے اندر یا مکمل باپردہ جلسہ گاہ میں دینی اجتماع منعقد کرنا، محفل میلاد میں شرکت کرنا، تقریر کرنا، نعت اور صلوٰۃ و سلام پڑھنا یا تلاوت کرنا، یہ سب امور جائز ہیں بشرطیکہ بے پردگی نہ ہو۔ عورت کی آواز بھی عورت ہے، حدیث پاک میں اسے فتنہ و آزمائش قرار دیا گیا ہے لہٰذا اگر مائیک کی آواز چار دیواری کے اندر تک یا جلسہ گاہ کے اندر تک محدود ہے تو حسب ضرورت اس کا استعمال جائز ہے اور اگر یہ آواز غیر محرم مردوں تک پہنچ رہی ہے تو اسے استعمال نہ کیا جائے یا اس کی آواز کی حد کو شرکاء تک محدود رکھا جائے۔

عورتوں کا قبرستان جانا

سوال: کیا عورت قبرستان جاسکتی ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عورت قبرستان میں نہ جائے کیونکہ وہ مردے کو بے لباس دکھائی دیتی ہے؟ (ریاض الدین، صغیر سینٹر، کراچی)

جواب: ابتدائے اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے مطلقاً قبرستان میں جانے سے منع فرمایا یعنی سب کو خواہ عورت ہو یا مرد، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے (ابتداءً) تمہیں قبرستان میں جانے سے منع کا تھا مگر اب (میں اجازت دیتا ہوں کہ) وہاں جایا کرو، کیونکہ زیارت قبور سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے''۔ حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ اجازت عام ہے، مردوں کے ساتھ بظاہر تخصیص کا کوئی قرینہ نہیں ہے، مگر اس کے باوجود فقہائے کرام نے عورتوں کو قبرستان جانے سے اس لئے منع کیا ہے کہ کہیں وہ بے پردہ ہو کر نہ جائیں، غیر محرم مردوں کے سامنے نہ آئیں۔ وہاں جا کر رونا، چلانا شروع نہ کریں، الغرض شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہو اور دعا و ایصال ثواب تو گھر میں بیٹھ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے کہ جوان عورتوں کے لئے تو قبرستان جانا مکروہ ہے، البتہ بوڑھی عورتیں (باپردہ ہو کر شرعی احکام کی پابندی کے ساتھ) جا سکتی ہیں، اگر مقصد عبرت حاصل کرنا ہو، دعائے مغفرت کرنا ہو یا بزرگان دین کے مزارات سے برکت حاصل کرنا مقصود ہو۔

عورتوں کا آپس میں مصافحہ اور معانقہ

سوال: بعض عورتیں محافل مقدسہ (میلاد، قرآن خوانی، آیت کریمہ وغیرہ) کے بعد فرداً فرداً آپس میں مصافحہ و معانقہ کرتی ہیں، شاید مبارک باد کے طور پر کرتی ہوں، کیا یہ جائز ہے؟ (عطیہ بشیر، نارتھ ناظم آباد)

جواب: عورتوں کا آپس میں ملاقات کے موقع پر یا کسی مسرت و شادمانی کے موقع پر مصافحہ و معانقہ کرنا جائز ہے، اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ محافل مقدسہ پر اظہار مسرت بھی جائز ہے۔

عدت کے دوران ٹی وی دیکھنا

سوال: کیا عدت کے دوران ٹی وی دیکھنا جائز ہے؟ (عبدالرحیم، چاکیواڑہ، کراچی)

جواب: ٹی وی کے جائز یا ناجائز ہونے کا عدت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کی اچھی

چیزیں دیکھنا، مثلاً تلاوت، ترجمہ، نعت، دینی پروگرام، علمی و معلوماتی پروگرام، خبریں وغیرہ دوسروں کے ساتھ ''معتدہ'' بھی دیکھ سکتی ہے، ناچ گانے، فحش پروگرام، فلمیں، بے ہودہ ڈرامے وغیرہ سب کے لئے منع ہیں۔

خواتین کی تزئین جائز، ناجائز

سوال: آپ نے 17 ستمبر کے تفہیم المسائل میں بیوٹی پارلر کے کاروبار کو بعض شرائط پر جائز قرار دیا ہے، اس سلسلے میں وضاحتیں مطلوب ہیں، ان کا جواب تحریر کر کے میری الجھن دور کریں۔ (طویل خط کا خلاصہ درج کیا گیا ہے) (صائمہ عثمان روحیلہ)

جواب: (۱) دلہن کا میک اپ جائز ہے، جسے دلہن بنانا کہتے ہیں، بشرطیکہ اس کام میں استعمال ہونے والے کریم پاؤڈر وغیرہ میں کوئی حرام یا ناپاک اجزا شامل نہ ہوں (۲) چہرے کا مساج بھی جائز ہے (۳) ابرو بنانا اور چہرے کے بال اتارنا (Threading) شرعاً اگرچہ مستحسن نہیں ہے لیکن شوہر کی دلداری کے لئے فقہاء نے اسے مباح قرار دیا ہے (۴) بالوں کو رنگنا یا مہندی لگانا جائز ہے (۵) لمبے بالوں کو برابر کرنے کے لئے ایک دو انچ کاٹنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس پر مردوں کے ساتھ مشابہت کرنے یا مردانہ وضع اختیار کرنے کا اطلاق نہیں ہوتا (۶) چھوٹے بچوں کے بال کاٹنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ تمام امور جن کے جواز کا ذکر کیا ہے عورتوں کے لئے مردوں سے کرانا حرام ہے اور ایسی عورتوں سے کرانا بھی منع ہے جو عورتوں کے جسمانی معائب یا محاسن دوسرے مردوں کے سامنے بیان کریں۔ ایسا میک اپ بھی منع ہے جس پر گھنٹوں لگ جائیں اور بیچ میں فرض نمازیں بھی ترک ہو جائیں یا اس میک اپ کو برقرار رکھنے کے لئے انسان وضو نہ کرے اور اس طرح نمازیں چھوٹ جائیں۔ عورت کا اصل حسن عفت، حیاء، پاک دامنی اور حسن سیرت ہے، تقویٰ و طہارت ہے جو خالق کو پسند ہے باقی سب فریب نفس اور فریب نظر ہے۔

شوہر کو بتائے بغیر خرچ کرنا

سوال: میرا تعلق دعوت اسلامی سے ہے، مجھے شوہر سے ماہانا ایک لگی بندھی رقم گھر کے

خرچ کے لئے ملتی ہے، میں اس میں سے کچھ بچا لیتی ہوں، اس بچت میں سے شوہر کو بتائے بغیر اپنے اور بچی کے زیور کی زکوٰۃ دے دیتی ہوں، کبھی کسی کو سیپارے اور دینی کتابیں لے دیتی ہوں، دعوت اسلامی کے لئے ہفتہ وار اجتماع کے لئے یا محفل میلاد کے لئے بس کے کرائے یا طعام کے اہتمام کے لئے بھی دیتی رہتی ہوں، کیا یہ جائز ہے؟۔

(نجمہ قادری رضوی، کراچی)

جواب: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب عورت اپنے گھر کے طعام میں سے (اللہ تعالیٰ کی راہ) میں خرچ کرے لیکن اسراف کیے بغیر، تو اسے بھی اجر ملے گا اور اس کے شوہر کو بھی''۔ ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب عورت اپنے شوہر کی کمائی سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ کرتی ہے (یعنی صدقہ کرتی ہے) تو اسے بھی آدھا ثواب ملے گا۔ ان احادیث کی روشنی میں علماء نے مندرجہ ذیل مسائل بیان فرمائے ہیں۔

(۱) عورت کو اجر اس لئے ملے گا کہ عملاً اسی نے صدقہ دیا اور شوہر کو اس لئے کہ وہ کمانے والا ہے اور صدقہ اس کی کمائی سے دیا گیا ہے بلکہ احادیث میں اس کی صراحت بھی ہے، عورت کو اجر ملنے سے شوہر کے اجر میں کمی واقع نہیں ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ غنی اور کریم ہے، وہ سب پر مہربان ہے اور اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں۔

(۲) عورت کے کار خیر میں خرچ کرنے کے جواز کو فقہاء نے اس پر محمول کیا ہے کہ اسے صراحۃً یا اشارات و کنایات سے معلوم ہو گیا ہو کہ شوہر اس کے اس عمل سے خوش ہے یا کم از کم ناراض نہیں ہے۔

(۳) زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ اجازت لے یا کبھی کبھی تذکرے کے طور پر بتا دیا کرے۔

(۴) اور اگر اسے شوہر نے صراحت سے یا قطعی طور پر ایسا کرنے سے منع کر دیا ہو تو پھر احتیاط سے کام لے البتہ زیورات کی زکوٰۃ فرض ہے، اس کے لئے شوہر سے باقاعدہ

اجازت لے یا اسی زیور میں سے دے اگر اس کا کوئی ذریعہ آمدن نہیں ہے۔
(۵) عورت اپنی بنیادی ضروریات کے لئے (یعنی خوراک، لباس، رہائش وغیرہ) شوہر کی اجازت کے بغیر بھی خرچ کرسکتی ہے۔

شوہر کو از راہ مذاق پاگل بدتمیز کہنا

سوال: کیا بیوی کے لئے مذاقاً اپنے شوہر کو جاہل، پاگل، بدتمیز وغیرہ کہنا جائز ہے؟۔
(آغا عبدالوحید خان، گلشن حدید، کراچی)

جواب: بیوی کا شوہر کو مذاقاً ایسے کلمات کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ توہین کے کلمات ہیں اور شوہر ہی نہیں کسی کو بھی ایسے کلمات سے مخاطب کرنے کو قرآن نے منع فرمایا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ (الحجرات:11)

''اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ، کوئی بعید نہیں کہ جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) مذاق اڑانے والے سے بہتر ہو''۔

اور فرمایا:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ (الہمزۃ)

''افسوس اور خرابی ہے اس کے لئے جو (دوسروں کے) عیب تلاش کرتا ہے اور (ان پر) طعن کرتا ہے''۔

البتہ السلام میں مزاح لطیف کی اجازت ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی بعض اوقات مزاح فرمایا کرتے تھے، مثلاً ایک شخص نے آپ سے اونٹ مانگا، آپ نے فرمایا: ''اسے اونٹ کا بچہ دے دو'' اس نے عرض کیا کہ ''اونٹ کا بچہ میرے کس کام کا'' آپ نے فرمایا: ''(اللہ تعالیٰ کے بندے) ہر اونٹ کسی نہ کسی اونٹ کا بچہ ہی ہے''۔

بہو کے ساتھ ناروا سلوک

سوال: سسرال والے بہو کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں (طویل خط میں تفصیلات

(نزہت، نارتھ کراچی)

درج ہیں)؟۔

جواب: اس خط میں جو واقعات درج ہیں وہ یہ ہیں کہ نئی دلہن بیاہ کر لانے کے بعد سسرال والے خود تو Relex ہو جاتے ہیں اور اسے سارے کاموں میں جھونک دیتے ہیں، ذرا سی کام میں کوتاہی ہو جائے تو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ الغرض کہ زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے۔ سسرال والوں کو یہ ذہن نشین کرنا چاہیے کہ وہ ایک خادمہ بیاہ کر نہیں لائے بلکہ ایک بیٹی اور بیوی بیاہ کر لائے ہیں۔ بعض اوقات اس کے اپنے آبائی گھر اور سسرال کے ماحول میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اسے حالات کو سمجھنے اور ذہنی مطابقت پیدا کرنے کے لئے مناسب وقت ملنا چاہیے اور تنہا سارے کام کا بار اس پر ڈالنا درست نہیں ہے۔ ساس، سسر اسے بیٹی بنا کر لائے ہیں تو ماں باپ بن کر اسے سہارا دیں۔ ہمارے آقا ﷺ نے تو قرون وسطیٰ کے زر خرید غلاموں سے بھی ایسا کام لینے سے منع فرمایا تھا جو ان کے بس میں نہ ہو بلکہ آپ نے فرمایا'' ان سے وہ کام نہ لو جو تم خود نہیں کر سکتے اور کام دشوار ہو تو اس میں ان کا ہاتھ بٹاؤ، ان کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو''۔ خاندان کا اجتماعی نظام جو ہمارے اسلامی معاشرے کا سرمایہ افتخار ہے، یہ باہمی تعاون، ایک دوسرے کی دلداری، غمگساری اور محبت و احترام پر قائم ہے، یہ نظام لگے بندھے کڑے ضابطوں پر نہیں بلکہ ''فضل و احسان'' پر قائم ہے یعنی ہر فرد کی کوشش ہو کہ بڑھ چڑھ کر دوسرے کا ہاتھ بٹائے، خود دکھ سہے اور دوسرے کو راحت پہنچائے۔ ایسا مسئلہ کہیں نہیں ہے کہ بہو سارے خاندان کی خادمہ بن جائے گی اور باقی اس پر راج کریں گے، حکم چلائیں گے۔ اگر سعادت مند بہو مل جائے جو اپنی بساط کے مطابق دوسرے کے کام آئے تو یہ کسی کا استحقاق نہیں بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم سمجھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ:228)

''اور ان عورتوں کیلئے بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے حقوق ہیں''۔

ضبط تولید کا مسئلہ

سوال: کیا ضبط تولید کے لئے احتیاطی اقدامات مثلاً گولیاں انجکشن، چھلے وغیرہ کا استعمال جائز ہے: (زاہد علی، کیماڑی، کراچی)

جواب: ضبط تولید (برتھ کنٹرول) کے مسئلے پر شریعت مطہرہ کے احکام درج ذیل ہیں:

(۱) حدیث مبارک کی رو سے استقرار حمل کے بعد 120 دن میں جنین میں جان پڑ جاتی ہے لہٰذا اس کے بعد اسقاط حمل قتل نفس ہے اور اس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (الاسراء:31)

"تنگی رزق کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں، بلاشبہ ان کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے"۔

لہٰذا اگر محض تنگی رزق کے ڈر سے احتیاطی تدبیر کے طور پر مانع حمل طریقے اختیار کیے جائیں اور وہ بھی کسی شخصی مجبوری کے تحت نہیں بلکہ قومی اور ملکی پالیسی کے طور پر، تو یہ قرآن کے منشا کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود:6)

"اور زمین پر جو بھی چلنے والا (جاندار) ہے، اس کا رزق اللہ تعالیٰ (کے ذمہ کرم) پر ہے"۔

(۲) یہ قانونِ قدرت ہے کہ آج تک جس تناسب سے آبادی میں اضافہ ہوتا چلا آیا ہے، اسی تناسب سے وسائل رزق میں بھی اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس میں انسان کی محنت، جدوجہد منصوبہ بندی اور تدبیر کے ساتھ ساتھ خالق کائنات کی قدرت کا بھی دخل ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ "مسبب الاسباب" کی مشیت کے بغیر اسباب موثر ہو ہی نہیں سکتے۔

(۳) آج کے دور میں معیشت کی ترقی کے لئے سائنس، ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کی تمام تر اعجاز آفرینی کے باوجود، افرادی قوت ایک بنیادی عنصر ہے، ہمارے ملک جیسے کئی ترقی پذیر یا

پسماندہ ممالک کے زرمبادلہ کا ایک بڑا ذریعہ غیر ممالک میں مصروف عمل تارکین وطن کی جانب سے رقوم کی ترسیل ہے اور ترقی یافتہ ممالک ہمارے لوگوں کو ورک ویزا یا امیگریشن ویزا ہماری محبت میں یا کسی جذبہ غریب پروری کے تحت نہیں دیتے بلکہ اپنی قوم وملکی ضرورت کے تحت دیتے ہیں۔

(۴) بہت سے ترقی یافتہ ممالک، جہاں کے لوگ تعیش پسندی، خودغرضی اور آوارگی کی وجہ سے رشتہ ازدواج کے بندھن اور بچوں کی پیدائش اور پرورش کو ایک بوجھ سمجھتے ہیں، افرادی قوت کی قلت سے دوچار ہیں۔

(۵) کوئی شادی شدہ جوڑا ذاتی وجوہ کی بناء پر مانع حمل طریقے استعمال کرے، مثلاً گولیاں، انجکشن، چھلا، کنڈوم وغیرہ تو اس کی جائز وجوہ درج ذیل ہیں:

(ا) بعض خواتین کے ہاں آپریشن سے بچے پیدا ہوتے ہیں اور دو یا تین آپریشن کے بعد ڈاکٹر مشورہ دیتے ہیں کہ مزید آپریشن سے زچہ کی جان کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے یا کوئی مہلک بیماری لاحق ہوسکتی ہے۔

(ب) عورت کی صحت اتنی کمزور ہے کہ وہ حمل کا بار اٹھانے کے قابل نہ ہو اور بصورت حمل اسے جسمانی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔

(ج) ماں باپ کی طرف سے کسی موروثی نقص کی بناء پر بچے ناقص الاعضاء، معذور یا بعض لاعلاج امراض ورثے میں لے کر پیدا ہو رہے ہیں اور ڈاکٹر کا یہ کہنا ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

(د) ماں بچوں کو اپنا دودھ پلاتی ہے اور قلیل وقفے میں مزید بچہ پیدا ہونے سے، پہلے بچے کی نشوونما اور نگہداشت متاثر ہوتی ہے۔

(ہ) کوئی شخص کسی ایسے ادارے یا شعبے میں کام کرتا ہے جہاں تحفظ کے انتظامات غیر تسلی بخش ہیں یا ایسے کارخانے جہاں شدید جسمانی محنت کرنی پڑتی ہے اور جہاں ڈاکٹروں کے بقول ایک مقررہ وقت سے زیادہ کام صحت کے لئے مہلک ثابت ہوسکتا ہے، لیکن کثیر اولاد ہونے

کی بناء پر بچوں کی پرورش وتعلیم وتربیت کے مصارف پورے کرنے کے لئے وقت مقررہ سے زائد(Over Time) بھی کرنا پڑتا ہے یا بعض لوگ اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے نا جائز ذرائع اختیار کرتے ہیں تو ایسی تمام صورتوں میں شخصی وجوہ کی بناء پر مانع حمل تدابیر اختیار کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ ان کا استعمال عورت کے لئے مضر صحت یا مہلک ثابت نہ ہو البتہ مرد یا عورت کا اپنے آپ کو مصنوعی عمل سے مستقل طور پر بانجھ کرا دینا نا جائز ہے۔

﴾حلال و حرام
جائز و نا جائز﴿

وظیفے کی تعریف

سوال: وظیفہ کسے کہتے ہیں، کیا اس کے لئے کسی خاص عمر کی شرط ہے؟

(انیس الرحمٰن خان، سرجانی ٹاؤن، کراچی)

جواب: نوافل، تلاوت، اذکار، تسبیح، درود پاک یا ادعیہ ماثورہ کو بطور نفل ایک خاص پابندی اور التزام کے ساتھ پڑھنے کو وظیفہ کہتے ہیں، اس کے لئے کسی خاص عمر کی قید نہیں ہے۔ احادیث مبارکہ میں بعض مخصوص اوقات اور مواقع کے لئے دعائیں اور تسبیحات مذکور ہیں، اللہ تعالیٰ توفیق دے تو ضرور پڑھیں۔

سوال: سالگرہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (ڈینیئل سردار بھٹی، کراچی)

جواب: ''سالگرہ'' کا مطلب ہے کسی کی ولادت کے دن خوشی منانا۔ اگر اس کا مطلب اسراف وتبذیر کا مظاہرہ، گانا بجانا، رقص وسرور، عورتوں اور مردوں کا بے حجاب اختلاط اور دیگر خلاف شرع حرکات ہیں تو یہ نہ تو سالگرہ کے نام پر جائز ہیں اور نہ اس کے علاوہ کسی اور عنوان سے جائز ہیں۔ اس طرح سالگرہ کے نام سے کوئی خاص عبادت بھی بطور خاص مشروع نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص اپنے یا اپنے بچوں کی ولادت پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہے تو وہ نفلی نماز پڑھ کر نفلی روزہ رکھ کر حسب توفیق صدقہ وخیرات کر کے یا عمل صالح کی کوئی بھی جائز اور مشروع صورت اختیار کرے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

بدشگونی کا شرعی حکم

سوال: کیا اسلام میں بدشگونی جائز ہے، کسی دن یا خاص ایام کو نحس قرار دینے کی گنجائش ہے۔ کیا قرآن مجید میں بعض دنوں کو نحس قرار دیا گیا ہے؟

(مولانا شبیر احمد، اسکاوٹ کالونی، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: شریعت اسلام میں بدشگونی کرنا منع ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ کفار بدشگونی کیا کرتے تھے چنانچہ کفار بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا:

فَإِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا ''تو جب انہیں بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے

هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۝ (الاعراف:131)

ہیں یہ ہماری وجہ سے ہے اور اگر انہیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو (اسے) موسیٰ اور ان کے اصحاب کی نحوست قرار دیتے ہیں۔ سنو! ان (کافروں) کی نحوست، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقدر ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے''۔

رہا یہ سوال کہ قرآن میں ماضی کی اقوام کے حوالے سے بعض دنوں کی نحوست کا تذکرہ ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ (حم السجدہ:16)

''تو ہم نے (قوم عاد کی) نحوست کے دنوں میں ان پر خوفناک آواز والی آندھی بھیجی''۔

اور فرمایا

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۝ (القمر)

''بے شک ہم نے ان پر نہایت سخت آواز والی تیز آندھی ان کی دائمی نحوست کے دن بھیجی''۔

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ کسی دن میں بالذات اور مطلقاً نیک شگونی یا بدشگونی نہیں ہوتی کہ جو اچھا ہے تو ہر ایک کے لئے اچھا ہو اور برا ہے تو ہر ایک کے لئے برا ہو، بلکہ دن تو سارے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے لئے اچھائی یا برائی ان کے اپنے عقائد و اعمال کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ قوم عاد پر نزول عذاب کی ابتداء شوال کے آخری بدھ کے دن سے ہوئی تھی اور پھر کئی دن تک آندھی چلتی رہی۔ مفسر قرآن، صاحب تفسیر روح المعانی علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں: ''میں کہتا ہوں کہ تمام ایام برابر ہیں اور بدھ کے دن کی نحوست میں کوئی خصوصیت نہیں ہے اور ہر گزرنے والی ساعت کسی

شخص کے لئے اچھی اور مبارک ہوتی ہے اور دوسرے شخص کے لئے بری اور منحوس ہوتی ہے اور ہر دن کسی شخص کے لئے خیر اور دوسرے شخص کے لئے شر ہوتا ہے ہر دن بلکہ ہر ساعت میں کسی نہ کسی شخص پر کوئی نہ کوئی مصیبت اور بلا نازل ہوتی ہے، تو اس قاعدے کے تحت تو تمام ایام اور ساعات منحوس قرار پائیں گی بلکہ قرآن میں فرمایا کہ قوم عاد پر یہ عذاب سات راتوں اور آٹھ دن تک مسلسل نازل ہوا چنانچہ فرمایا:

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (الحاقہ)

''اور رہے قوم عاد کے لوگ تو وہ ایک سخت گرجتی ہوئی نہایت تیز آندھی سے ہلاک کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آندھی کو سات راتوں اور آٹھ دن تک مسلسل ان پر مسلط کر دیا تھا''۔

تو کیا اس قاعدے کی رو سے ہفتے کے ساتوں دن ہر ایک کے لئے منحوس قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات جلد نمبر 3 صفحہ 620 پر لکھتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لا طیرۃ'' یعنی حصول نفع اور دفع ضرر میں بدشگونی کے لئے کوئی تاثیر اور دخل نہیں اور بدشگونی نہیں کرنا چاہیے اور نہ اس کا اعتبار کرنا چاہیے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا، شریعت نے اس کو سبب نہیں بنایا''۔ انہوں نے مزید لکھا ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لا صفر'' بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد ماہ صفر ہے جو محرم کے بعد آتا ہے۔ عام لوگ اس ماہ کو مصیبتوں، بلاؤں، آفات اور حادثات کا مہینہ قرار دیتے تھے۔ یہ اعتقاد بھی باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

تیرہ تیزی کیا ہے؟

سوال: بعض لوگ ماہ صفر کو منحوس سمجھتے ہیں بعض اس ماہ کے ابتدائی تیرہ دن کو نحس خیال کرتے ہیں اور انہیں ''تیرہ تیزی'' کہتے ہیں۔ ان ایام میں نکاح یا شادی نہیں کرتے سفر پر جانا بھی منحوس سمجھتے ہیں۔ بعض پورے صفر کے مہینے کو ہی نحس سمجھتے ہیں اور اسے خالی کا چاندیا

خالی کا مہینہ کہتے ہیں اور اسے خوشی کی تقریبات سے خالی رکھتے ہیں اس سلسلے میں شرعی مسئلہ کیا ہے؟ (سید ذاکر شاہ، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)

جواب: صفرالمظفر کے قمری مہینے میں کوئی نحوست نہیں ہے، نہ ابتدائی تیرہ ایام میں اور نہ ہی بقیہ ایام میں عوام میں یہ باتیں غلط طور پر مشہور ہیں، بخاری شریف میں ہے: ''**لا ھامة ولا صفر**'' ایسی ہی ایک روایت صحیح مسلم میں بھی ہے۔ نیز یہ بھی غلط ہے کہ اس مہینے میں آفات اور بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ شریعت میں ایسا عقیدہ رکھنا باطل ہے۔ تمام مہینوں کی طرح اس مہینے کے تمام دنوں میں بھی شادی بیاہ، نکاح، سفر کاروبار الغرض تمام جائز کام جائز ہے۔

آخری چارشنبہ

سوال: بعض لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی حیات مبارکہ کے آخری سال ماہ صفر کے آخری بدھ والے دن صحت یاب ہوئے تھے اور اس روز آپ نے غسل فرمایا بعض لوگ اس خوشی میں ہر سال ماہ صفر کے آخری بدھ والے دن مٹھائی بانٹتے اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ (ضیاء الاسلام دہلوی، فیڈرل بی ایریا)

جواب: لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ ماہ صفر کے آخری بدھ کے دن صحت یاب ہوئے اور آپ نے غسل بھی فرمایا تھا بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ جس مرض میں رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تھا اس کی ابتدا اسی دن ہوئی تھی لیکن اس بناء پر اس دن کو نحس سمجھنا بھی درست نہیں ہے۔ اس روایت سے قطع نظر صدقہ وخیرات کرنا یا ایصال ثواب کے لئے فاتحہ پڑھنا درست ہے، اس کی کسی بھی وقت ممانعت نہیں ہے۔

یوم عاشورہ اور کاروبار

سوال: کیا 10 محرم الحرام ''یوم عاشور'' کے دن یا جمعہ کے دن یا کسی اور موقع پر کاروبار کرنا حرام ہے؟ کیا جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد ظہر کے فرض بھی پڑھنا ضروری ہیں؟ اور کیا کسی عذر کے سبب جمعہ یا ظہر کی سنتیں چھوڑی جا سکتی ہیں؟

جواب: سال کے کسی بھی دن حلال کاروبار کی ممانعت نہیں۔ قرآن مجید سورۂ جمعہ آیت نمبر 9 میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (الجمعہ:9)

''اے ایمان والو! جب نماز جمعہ کے لئے ندا (یعنی اذان) دی جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر (یعنی نماز) کی طرف دوڑے چلے آؤ اور کاروبار چھوڑ دو''۔

یعنی صرف نماز جمعہ کے وقت کاروبار منع ہے۔ اذان جمعہ سے پہلے اور نماز جمعہ کے بعد کاروبار کرنا جائز ہے اور قرآن نے ایسی تجارت اور کاروبار کو اللہ کے فضل سے تعبیر کیا ہے، جو بندے کو اللہ کی عبادت سے نہ روکے۔ اسی طرح ان اوقات میں بھی کاروبار منع ہوگا جو فرض نمازوں اور دینی فرائض کی ادائیگی میں حائل ہوں۔ جمعہ کے دن نماز جمعہ باجماعت پڑھ لی جائے تو ظہر کی نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ باقی کسی شدید ہنگامی نوعیت کی مصروفیت، سفر، بیماری، مجبوری، تنگی وقت (یعنی کسی نماز کا وقت صرف اتنا رہ جائے کہ صرف فرض ادا کیے جا سکتے ہوں) یا کسی اور عذر شرعی کے بغیر سنن مؤکدہ، خواہ وہ جمعہ کے وقت کی ہوں یا دیگر اوقات کی چھوڑنی نہیں چاہئیں اور اگر کبھی چھوٹ جائیں تو اسے عادت اور وتیرہ نہیں بنانا چاہیے۔

نظر بد سے بچنے کے لئے مکان پر سینگ، کالا کپڑا لٹکانا یا کالا دھاگا باندھنا

سوال: بعض لوگ گھروں یا دکانوں پر بیل کے سینگ، کالا کپڑا، صراحی وغیرہ لٹکاتے ہیں، (یعنی نظر بد کی تاثیر سے بچنے کے لئے) اور ہاتھ یا گلے میں کالا دھاگا باندھتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ (انور حسین، کراچی)

جواب: تاثیر نظر حق ہے۔ نظر بد سے بچنے، اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت میں پناہ لینے اور مخلوق کے ہر شر سے امان طلب کرنے کے لئے خالق عزوجل ہی سے عفو و سلامتی کا خواستگار

ہونا چاہیے۔اس کے لئے مختلف مواقع پر احادیث مبارکہ میں دعائیں تعلیم فرمائی گئی ہیں، چنانچہ نظر بد سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ سے جو دعا منقول ہے، وہ یہ ہے:

''اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّةِ مِنْ شَرِّ كُلِّ هَآمَّةٍ وَعَيْنٍ لَآمَّةٍ'' ترجمہ: ''میں ہر موذی جانور اور نظر بد کے شر سے اللہ تعالیٰ کے کامل اور تمام کلمات (مبارکہ) کی پناہ میں آتا ہوں''۔ یہ دعا پڑھ کر اپنے آپ کو، اپنے اہل وعیال یعنی بیوی بچوں کو اور ہر اس چیز کو دم کرنا چاہیے، جس کے لئے عافیت اور سلامتی مقصود ہے۔ اہل اللہ، عارفین کاملین اور علماء عاملین نے یہ بھی بتایا ہے کہ نظر بد سے بچنے کے لئے قرآن مجید کی سورۃ القلم کی آخری دو آیات مبارکہ آیت نمبر 51-52 پڑھ کر دم کرے، وہ آیات مبارکہ یہ ہیں:

وَ اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَ يَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ وَ مَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (القلم)

''اور یقیناً ایسا لگتا ہے کہ کافر گویا آپ کو اپنی نظر (بد) لگا کر گرا دیں گے۔ وہ جب قرآن سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور مجنون ہیں، اور وہ قرآن تو صرف تمام جہانوں کے لئے نصیحت ہے''۔

ان آیات کے شان نزول کے بارے میں منقول ہے کہ اہل عرب میں بعض لوگ نظریں لگانے میں بڑی شہرت کے حامل تھے، وہ بعض اوقات دعویٰ کر کے نظر لگاتے اور ان کی نظر بد کا جو بھی چیز نشانہ بنتی وہ ہلاک ہو جاتی، ایسے کئی واقعات لوگوں کے مشاہدے میں تھے، چنانچہ کفار مکہ نے معاذ اللہ! رسول اللہ ﷺ کو گزند پہنچانے کے لئے ان نظر بازوں کو استعمال کیا، انہوں نے لاکھ جتن کیے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو ان کے شر سے محفوظ رکھا، کفار کے دیگر مکر وفریب اور تدابیر شر کی طرح یہ حیلہ بھی ناکام ونامراد ثابت ہوا۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ حضرت حسن کا فرمان ہے: ''جس کو نظر بد لگے، اس کو یہ آیات پڑھ کر دم کیا جائے۔ انسان کو کوئی اچھی صورت، اچھی چیز، فن پارہ یا کمال وہنر کا کوئی ایسا مظہر ونمونہ نظر آئے، جو دل کو لبھائے اور اس کی طرف دل مائل ہو تو ''مَاشَاءَ اللّٰهُ

لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ''اور''فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ''پڑھ لینا چاہیے تاکہ وہ چیز نہیں ہے۔ ان چیزوں کو بالذات موثر ماننا شرک ہے اور ان کی تاثیر ذاتی کا ایمان و اعتقاد رکھے بغیر انہیں اختیار کرنا گمراہی، ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی ہے۔

نظر لگنے کا حکم

سوال: کیا نظر کی تاثیر یا نظر لگنے کا ثبوت قرآن وسنت میں ملتا ہے اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(محمد یاسین، ماڈل کالونی)

جواب: نظر کی تاثیر حدیث سے ثابت ہے صحیح مسلم میں ہے کہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر رسول اللہ ﷺ نے ایک لڑکی کو دیکھا، جس کے چہرے پر جھائیاں تھیں۔ آپ نے فرمایا:''اس کو نظر لگ گئی ہے اس پر دم کراؤ''۔ صحیح بخاری میں ہے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دم کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تمہارے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے صاحبزادوں حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق کو انہی کلمات کے ساتھ دم کیا کرتے تھے۔ وہ کلمات دعا یہ ہیں:

''اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّآمَّۃِ مِنْ شَرِّ کُلِّ ھَآمَّۃٍ وَّعَیْنٍ لَآمَّۃٍ'' ترجمہ:''میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کے کامل وتمام کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور ہر موذی سے اور ہر نظر بد سے''۔

ستاروں کی تاثیر

سوال: کیا ستارے انسان کے مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ برج سے کیا مراد ہے؟ کیا ستاروں کے ذریعے مستقبل کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے؟

(ڈاکٹر عطاء المصطفیٰ جمیل راٹھور، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: علم ہیئت (Astronamy) کے ماہرین اور قدیم یونانی فلسفیوں کا قول ہے کہ سات آسمانوں میں سے ہر آسمان پر ایک ستارہ گردش کر رہا ہے جسے وہ''کوکب سیارہ'' کہتے ہیں۔ آٹھویں آسمان پر حرکت نہ کرنے والے ستارے ہیں جنہیں''ثوابت'' کہتے

ہیں۔آٹھویں آسمان پر سیاروں کے اجتماع سے مختلف اوقات میں مختلف شکلیں بنتی ہیں جو نویں آسمان، فلک اطلس پر اس کے شفاف ہونے کی وجہ سے منعکس ہوتی ہیں، انہیں یہ لوگ ''برج'' کا نام دیتے ہیں، یہ برج بارہ ہیں، حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔ سبع سیارات کے نام ہیں: قمر، عطارد، زہرہ، شمس، مشتری، زحل۔ اہل نجوم (ستارہ پرست، جو ستاروں کی تاثیر کے قائل ہیں) کہتے ہیں: کہ فلاں ستارہ فلاں برج میں پہنچ جائے تو بارش ہوتی ہے یا قحط پڑتا ہے یا طوفان آتے ہیں وغیرہ۔ اسی طرح یہ لوگ انسان کے نام اور تاریخ پیدائش سے سیارہ نکالتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ اس کی پیدائش کے وقت یہ سیارہ فلاں برج میں تھا اور اس کی یہ تاثیر ہے، یہ سعد ہے یا نحس ہے۔

قرآن نے آسمانوں کی تعداد نو نہیں بلکہ سات بتائی ہے۔قرآن میں ''بروج'' کا ذکر ہے، لیکن ''بروج'' سے سورج کے سفر کی منازل ہیں۔ اسلام کی رو سے بارش کے برسنے، قحط سالی یا طوفان آنے، سعد یا نحس ہونے میں ستاروں کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔تمام امور اللہ تعالیٰ کی تقدیر، مشیت اور حکم کے تابع ہیں، اسی کی ہستی مؤثر بالذات ہے۔ صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں حدیث ہے: صحابی زید بن خالد بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیبیہ میں صبح کی نماز پڑھائی، اس وقت رات کی بارش کا اثر باقی تھا، نماز سے فارغ ہو کر آپ حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا فرمایا؟'' صحابہ نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندوں میں سے بعض کی صبح ایمان پر ہوئی اور بعض کی کفر پر ہوئی ہے، جس شخص نے یہ کہا کہ ہم پر خدا کے فضل وکرم سے بارش ہوئی، اس نے مجھ پر ایمان رکھا اور ستاروں کا کفر کیا، اور جس نے یہ کہا کہ فلاں فلاں ستاروں کی تاثیر سے بارش ہوئی، اس نے میرا انکار کیا اور ستاروں پر ایمان رکھا۔

سورج گرہن اور ستاروں کی تاثیر کی بابت اسلام کا نظریہ

قرآن مجید بنیادی طور پر "کتاب ہدایت" ہے، سورۃ البقرہ آیت نمبر 2 میں اسے "اہل تقویٰ" کے لئے ذریعہ ہدایت اور آیت نمبر 185 میں سارے عالم انسانیت کے لئے ہادی قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں آیات میں تطبیق اس طرح کی گئی ہے کہ قرآن کا پیغام ہدایت اور دعوت تو بلاشبہ ساری انسانیت کے لئے ہے لیکن اس سے فیض وہی پاتے ہیں جو اہل تقویٰ و ایمان ہیں۔ لہٰذا کتاب وسنت اور نبوت ورسالت کا بنیادی موضوع اور مشن عالم انسانیت کی رشد و ہدایت ہے۔ قرآن مجید میں اگر کہیں انفس و آفاق، حیات و کائنات، طبیعات، فلکیات، ارضیات اور دیگر سائنسی وفنی علوم کی جانب اشارات وتصریحات ملتی ہیں تو ان کا مقصد بھی اہل فکر ونظر کے لئے تعقل اور تفکر وتدبر کی دعوت ہے، تذکیر وموعظت ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قدرت وجلالت، اس کی کتاب مقدس اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی حقانیت وصداقت پر حجت قائم ہو جائے، اس میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کے بندوں کی فلاح وبقا کے لئے استعمال میں لانے کی ترغیب بھی ہے۔

اشیاء کی حقیقت، ان کے آثار اور ان میں تغیر وتبدل کی سائنسی توجیہات کیا ہیں؟ یہ قرآن وحدیث کا اصل موضوع نہیں ہے، یہ ضمنی مباحث ہیں، تاہم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر ان مباحث کو اپنی عظیم قدرت کی نشانی کے طور پر ضرور بیان فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (یاسین)

"اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے، یہ بڑی غالب اور علیم ہستی کا مقرر کیا ہوا نظام ہے، اور ہم نے چاند کے لئے بھی منزلیں مقرر فرمادی ہیں یہاں تک کہ وہ لوٹ کر کھجور کی پرانی شاخ کی مانند (باریک) ہو جاتا ہے، نہ سورج کی یہ

مجال کہ وہ (اپنی گردش کے دوران) چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے، اور ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہا ہے“۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝ (الرحمٰن)

”سورج اور چاند حساب (اور قدرت کے مقررہ ضابطے) کے پابند ہیں اور (زمین پر بچھا ہوا) سبزہ اور (کھڑے) درخت (اس کے حضور) سجدہ ریز ہیں“

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَ لَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (فاطر: 41)

”بے شک اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی جگہ سے (نہ) ہٹیں اور اگر وہ ہٹ جائیں تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی انہیں کوئی روک نہ سکے“۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ

”بلاشبہ زمین و آسمان کی پیدائش، گردش لیل و نہار اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لئے سمندر میں رواں دواں ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل فرمایا، پھر اس سے مردہ زمین کو زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کی

الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴿۱۶۴﴾
(البقرہ)

گردش اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں، ضرور (ان سب میں) اہل عقل و خرد کے لئے (اللہ تعالیٰ کی معرفت کی) نشانیاں ہیں''۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ سورج، چاند، ستارے، بحر و بر، ہوائیں، بادل اور گردش لیل و نہار حتی کہ پورا نظام کائنات اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے، یہ سب مظاہر کائنات ایک قادر مطلق ہستی کے غیر مرئی (Unseen) نظم و ضبط کی لڑی میں اتنی شدت سے بندھے ہوئے ہیں کہ کسی کو مجال انحراف نہیں ہے۔ یعنی یہ نظام کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک مربوط، منضبط اور منظم شاہکار قدرت ہے۔

موجودہ دور میں کسوف (سورج گرہن) اور خسوف (چاند گرہن) کی سائنسی توجیہہ اور عادی سبب تو سب کو معلوم ہے کہ جب دوران گردش زمین اور سورج کے درمیان چاند حائل ہو جاتا ہے تو سورج کی روشنی جزوی یا کلی طور پر زمین پر پہنچ نہیں پاتی اور تاریکی چھا جاتی ہے، اسے سورج گرہن کہتے ہیں اور جب چاند اور سورج کے درمیان زمین حائل ہو جاتی ہے تو چاند گرہن ہو جاتا ہے۔ سائنس دانوں اور ماہرین فلکیات کے نزدیک یہ ایک معمول کی بات ہے جو وقتاً فوقتاً ظہور میں آتی رہتی ہے، لیکن اسلام کی نظر میں یہ ایک غیر معمولی صورتحال ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور قدرت و کمال کی ایک عظیم نشانی ہے اور مومن صادق اسے اسی زاویہ نظر سے دیکھتا ہے۔ گویا منظر (Scenario) ایک ہی ہے لیکن مومن اور کافر و ملحد کے زاویۂ نظر اور طرز فکر میں بنیادی فرق ہے۔ کیونکہ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ قدرت باری تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہے تو اس کی حکمت قرآن نے یہ بتائی ہے کہ:

''ہم اپنی نشانیاں (اپنے عذاب سے) ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں (بنی اسرائیل: 59)''

یعنی یہ مقام عبرت ہے کہ جب سورج جیسا عظیم منبع حرارت و نور اور معلوم کائنات کا

سب سے بڑا مظہر ایک خاص وقت میں اور ایک خاص مرحلے پر زمین تک اپنی روشنی کی ترسیل پر قادر نہیں ہوتا اور اس کی روشنی کی شعاعوں کی راہ میں ایک محدود وقت کے لئے زمین یا چاند کا حائل ہونا محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے اور کسی کے بس میں نہیں کہ وہ اپنی قدرت و طاقت کے بل پر اس میں کوئی تبدیلی لائے یا اس گرہن کو ٹال دے یا اس کی مدت میں کمی بیشی کر دے۔ تو اس موقع پر انسان یہ سوچے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ سورج کے منبع حرارت و نور سے روشنی کو بالکل سلب فرما دے تو کس کے بس میں ہے کہ اسے بحال کر سکے اور جب قیامت قائم ہوگی تو ایسا ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ○ (التکویر)

"جب سورج لپیٹ دیا جائے گا (یعنی سورج کی وہ روشنی جو ساری کائنات کو منور کرتی ہے، اسی پر لپیٹ دی جائے گی اور اس کی ترسیل (Transmission) روک دی جائے گی)"۔

لہٰذا بندۂ مومن جب قدرت باری تعالیٰ کی ایسی آیات عظیم کو دیکھے تو سراپا تسلیم و رضا بن کر اس کے حضور سجدہ ریز ہو جائے اور یہ سوچے کہ جب سورج اور چاند جیسے عظیم مظاہر کائنات اس کے حکم کے آگے بے بس ہیں تو انسان عاقل کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس کی حکم عدولی کرے، چنانچہ احادیث مبارکہ میں بکثرت آیا ہے کہ جب سورج گرہن لگتا تو حضور ﷺ بے اختیار نماز کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔ جب عہد رسالت میں سورج گرہن لگا تو یہ ایک اتفاقی امر تھا کہ ان ہی دنوں نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تھا، اس لئے بعض لوگوں نے سورج گرہن کو اسی کا سبب قرار دیا، تو رسول اللہ ﷺ نے ان باطل نظریات کی واضح تردید کرتے ہوئے فرمایا، سورج یا چاند کو کسی کی موت یا حیات کی وجہ سے گہن نہیں لگتا بلکہ یہ دونوں (کسوف و خسوف) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جب تم یہ نشانیاں دیکھو تو نماز پڑھو (صحیح مسلم) ایک اور روایت میں ہے

کہ اس تاریکی کو دیکھ کر قبر کی تاریکی کو یاد کرو اور عذاب قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو۔
پس معلوم ہوا کہ سورج گرہن کا کسی کی موت و حیات اور نفع و نقصان سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ ہی کسی شبھ گھڑی یا نحس ساعت سے اس کا کوئی تعلق ہے، اسلام کی رو سے یہ سارے توہمات، نظریات اور عقائد باطل ہیں، فقط اتنی بات درست ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سورج گرہن کے موقع پر نماز کسوف پڑھنا اس لئے تھا کہ اس عالم اسباب میں لوگوں کی نظر اسباب پر ہوتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر ذات مسبب الاسباب پر ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی جلالت، عظمت اور ہیبت دل پر چھا جاتی تھی کہ حرارت و نور کے اتنے بڑے سرچشمے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے کنٹرول کر رکھا ہے، اگر یہ زمین کے قریب آ جائے تو سب کچھ جل کر خاکستر ہو جائے اور اگر زمین سے بہت دور چلا جائے تو شدید سردی کے سبب سارے ذی حیات فنا ہو جائیں۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو نماز، توبہ و استغفار، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، اور ذکر و تسبیح کی تعلیم دی۔ سورج گرہن کے وقت سورج کی طرف دیکھنے کی شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے، البتہ اگر طبی لحاظ سے ماہرین کی رائے میں نقصان کا اندیشہ ہو تو ضرور احتیاط کریں یا ان آلات کی مدد سے دیکھیں جو تجویز کیئے گئے ہوں۔ یہ خیال بھی شرعاً بالکل باطل ہے کہ سورج گرہن کے موقع پر خواتین بالخصوص حاملہ خواتین پر کوئی خاص اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان توہمات کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ البتہ خواتین کو بھی چاہیے کہ نماز، ذکر، توبہ و استغفار اور تسبیح و تحمید میں مشغول رہیں۔

صلوٰۃ کسوف

سورج گرہن کے وقت دو رکعت نماز پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، باجماعت پڑھنا مستحب ہے، چار رکعات یا زیادہ بھی پڑھی جا سکتی ہیں، اس میں اذان و اقامت نہیں ہے، فقہ حنفی کے مطابق خطبہ بھی نہیں ہے اور یہ نماز عام نوافل کی طرح پڑھی جائے گی، افضل یہ ہے کہ سورج روشن ہونے تک نماز میں مشغول رہیں۔ قرأت طویل کریں اور رکوع و سجود میں

تسبیحات بھی زیادہ پڑھیں۔نماز سے فارغ ہو چکے ہوں تو دعا واذکار اور استغفار میں مشغول رہیں۔نماز باجماعت میں قرأت بلند آواز سے نہ کریں۔یہ نماز تنہا بھی پڑھی جا سکتی ہے، باجماعت پڑھنی ہو تو عید گاہ یا مسجد میں پڑھیں۔چاند گرہن کی نماز مستحب ہے، اسے تنہا پڑھیں۔رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر تکبیر کہنے اور صدقہ دینے کا بھی حکم فرمایا ہے۔ لہٰذا صدقہ وخیرات بھی مستحب ہے۔

ستاروں کی تاثیر

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ صحابہ نے عرض کیا: ''اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (ﷺ) ہی بہتر جانتے ہیں''۔ آپ ۔نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندوں میں سے بعض کی صبح ایمان پر ہوئی اور بعض کی کفر پر، جس شخص نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم پر بارش ہوئی، اس نے مجھ پر ایمان رکھا اور ستاروں کا کفر کیا اور جس شخص نے یہ کہا کہ فلاں ستارے کی تاثیر سے ہم پر بارش ہوئی، اس نے میرا کفر کیا اور ستاروں پر ایمان رکھا (واضح رہے کہ اس رات بارش ہوئی تھی اور صبح تک اس کا اثر باقی تھا''۔اس حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے یا ہوتا ہے، وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوتا ہے کہ اس کی ہستی موثر بالذات ہے، کائنات کے تکوینی نظام میں ستاروں یا کسی اور چیز کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔

عالم اسباب میں بعض چیزیں بظاہر علت اور معلول اور سبب اور مسبب (Cause and Effect) کے رشتے میں منسلک ہیں، لیکن ان امور میں بھی اسباب کی تاثیر قطعی اور ذاتی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت کے تابع ہے۔ مثلاً شافی الامراض بالذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کی مشیت ہوتی ہے تو دوا سے شفا مل جاتی ہے ورنہ نہیں۔اسی طرح وہ اپنی مشیت کو نافذ کرنے میں اسباب کا محتاج نہیں ہے بلکہ یہ محض

اس کی سنت جاریہ ہے، مثلاً عالم اسباب میں انسان کی تخلیق کا سبب والدین ہیں، لیکن اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باپ کے وسیلے کے بغیر، حضرت حوا علیہا السلام کو عورت کے وسیلے کے بغیر اور حضرت آدم علیہ السلام کو مرد و زن دونوں کے وسیلے کے بغیر پیدا فرما کر یہ ثابت کر دیا کہ اس کی قدرت اسباب کی محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝ (الواقعہ)

"تو مجھے قسم ہے ان جگہوں کی جہاں ستارے واقع ہوتے ہیں، اگر تم سمجھو تو یہ بڑی قسم ہے، بے شک یہ بڑی عزت والا قرآن ہے، محفوظ کتاب میں (ہے)، اس کو صرف پاک لوگ چھونے کے اہل ہیں، (یہ) رب العالمین کی جانب سے نازل کیا ہوا ہے، تو کیا تم اس کلام کے ساتھ لاپرواہی کرتے ہو اور تم (قرآن میں) اپنا حصہ یہ رکھتے ہو کہ (اسے) جھٹلاتے ہو"۔

قدیم فلاسفہ یونان اور علماء ہیئت کا یہ کہنا ہے کہ سات آسمانوں میں ہر آسمان پر ایک گردش کرنے والا ستارہ ہے جسے "کوکب سیارہ" کہتے ہیں، پہلے آسمان پر قمر، دوسرے پر عطارد، تیسرے پر زہرہ، چوتھے پر شمس، پانچویں پر مریخ، چھٹے پر مشتری اور ساتویں پر زحل ہے۔ آٹھویں آسمان پر "ثابت" ستارے ہیں جو حرکت نہیں کرتے، نواں آسمان فلک اطلس ہے جس پر کوئی ستارہ نہیں ہے۔ آٹھویں آسمان پر ستاروں کے اجتماع سے جو ہیئت بنتی ہے وہ نویں آسمان کے شفاف ہونے کی بناء پر اس پر منعکس ہوتی ہے۔ یہ بارہ شکلیں ہیں: ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔ ان کو علماء ہیئت "برج" کہتے ہیں۔

اہل نجوم جوستاروں کی تاثیر کے قائل ہیں، کہتے ہیں کہ فلاں ستارہ جب فلاں برج میں پہنچ جائے تو مثلاً بارش ہوتی ہے یا قحط پڑتا ہے یا دریاؤں اور سمندروں میں طوفان آتے ہیں، یا اچھی فصل پیدا ہوتی ہے وغیرہ، یہ لوگ کسی شخص کے نام اور اس کی تاریخ پیدائش سے اس کا ستارہ نکالتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں کہ اس کی پیدائش کے وقت اس کا ستارہ فلاں برج میں تھا اور یہ ستارہ سعد ہے یا نحس۔ اور پھر اس کی زندگی کے واقعات کو اس ستارے سے جوڑتے ہیں کہ مثلاً جب وہ فلاں برج میں پہنچے گا تو اسے سفر میں، تجارت میں یا کسی اور مقصد میں کامیابی ہوگی یا ناکامی۔ اخبارات میں کالم شائع ہوتے ہیں کہ ''آپ کا یہ ہفتہ کیسا رہے گا'' یہ سب اٹکل پچو باتیں ہیں، ظن وتخمین کے خیالی گھوڑے ہیں جو دوڑائے جاتے ہیں۔ اسلام میں ایسے باطل نظریات کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، قضا وقدر، تقدیر اور نظام کائنات کی باگ دوڑ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے، وہ مالک ومختار ہے، اس کی مشیت کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا۔ علامہ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا؟   وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار وزبوں

قرآن مجید میں ''بروج'' کا ذکر ضرور ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور برجوں والے آسمان کی قسم (البروج:1)'' لیکن ان بروج سے مراد سورج، چاند اور ستاروں کی منزلیں ہیں، کسی چیز یا کسی شخص کے خیر وشر میں یہ موثر بالذات نہیں ہیں اور حدیث پاک کی رو سے جو ان ستاروں کو تکوینی امور میں موثر بالذات مانے، وہ کافر ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا منکر ہے۔

اوجھڑی حلال یا حرام

سوال: جانور کی اوجھڑی کھانا حلال ہے یا حرام؟ بعض لوگ بڑے شوق سے کھاتے ہیں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ (محمد علی، اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: رسول اللہ ﷺ نے حلال جانور کے جن اجزاء کو حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں ذکر، فرج، خصیتین، غدود، پتہ، مثانہ اور دم مسفوح (بہنے والا خون) ان میں سے دم مسفوح

(ذبح کے وقت بہنے والا خون) تو حرام قطعی ہے کیونکہ اس کی حرمت نص قرآنی سے ثابت ہے اور باقی چھ چیزیں مکروہ تحریمی ہیں۔ اوجھڑی کو ہم مثانے پر قیاس کرتے ہیں۔ گوبر کا مستقر ہونے کی وجہ سے اوجھڑی کا بھی یہی حکم ہونا چاہیے۔ اور طبیعت اور فطرت سلیم بھی اسے پسند نہیں کرتی بلکہ گھن آتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اور نبی (ﷺ) ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتے ہیں"۔ اگر مثانے اور اوجھڑی میں علت مشترکہ کو دیکھا جائے تو اس کا حکم بھی مکروہ تحریمی ہونا چاہیے، لیکن اگر اس پہلو سے دیکھا جائے کہ اس کی ممانعت حدیث میں مذکور نہیں ہے تو کم از کم مکروہ تنزیہی تو بہر حال قرار پائے گی۔

پولٹری فارم کی مرغیوں کی خوراک

سوال: پولٹری فارم کی غذا (Feed) کے بارے میں سنا ہے کہ اس میں ذبیحہ کے جانوروں کا خون اور ہڈیاں وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔ قرآن مجید میں جانور کے ذبح کے وقت بہنے والے خون کو حرام قرار دیا گیا ہے اور جو چیز حرام ہو وہ ناپاک بھی ہوتی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ آیا (ا) حلال جانوروں کی غذا حرام اور ناپاک چیز سے تیار ہو سکتی ہے (ب) اور یہ کہ کیا (بہنے والے) خون کی بیع جائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی قیمت حلال ہے؟

جواب: (ا) ماکول اللحم (یعنی جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے یا جو عرف عام میں حلال جانور کہلاتے ہیں) کی غذا ان اشیاء سے ہو سکتی ہے۔ دیہاتوں میں مرغیاں گلی کوچوں میں پھرتی ہیں اور نجاست بھی کھاتی رہتی ہیں۔ فقہی اصطلاح میں گندگی کھانے والے جانور کو "جلالہ" کہتے ہیں۔ اگر نجاست کھانے یا پیشاب پینے سے جانور کا گوشت یا دودھ بدبودار ہو جائے تو اس کا استعمال مکروہ تحریمی ہے، بعض فقہاء نے اس کے پسینے کو بھی مکروہ لکھا ہے۔ لہٰذا ذبح سے پہلے یا دودھ استعمال کرنے کے لئے ایسے جانوروں کو اتنی مدت کے لئے تھان پر باندھ کر رکھا جائے کہ بدبو کا ازالہ ہو جائے۔ فتاویٰ درمختار میں لکھا ہے کہ مرغی کو تین دن تک، بکری کو چار دن تک اور اونٹ، گائے وغیرہ کو دس دن تک رکھا جائے۔ فتاویٰ شامی میں بزازیہ کے حوالے سے مردار کھانے والے اونٹ کو ایک ماہ تک،

گائے کو بیس دن تک اور بکری کو دس دن تک باندھے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاہم ظاہر ہے کہ یہ اپنے قیاسات ہیں۔ لیکن اگر ان جانوروں کے گوشت میں ناپاک اشیاء کی بدبو سرایت نہ کرے اور اثر انداز نہ ہو تو ان کا کھانا مطلقاً حلال ہے۔ فتاویٰ ردالمحتار (شامی) اور درمختار میں یہی مسئلہ لکھا ہے۔ چونکہ فارم کی مرغیوں کے گوشت میں کسی بدبو کا اثر نہیں ہوتا لہٰذا وہ مطلقاً حلال ہیں۔ الغرض حلال جانور کی غذا حرام یا نجس وغیرہ سے ہو سکتی ہے، اس کے حلال اور طیب ہونے کی شرط نہیں ہے۔ (ب) ذبح کے وقت بہنے والا خون حرام اور ناپاک ہے لہٰذا شرعاً اس کی بیع جائز نہیں ہے اور اس کے عوض بائع کو حاصل ہونے والی قیمت اس کے لئے حلال نہیں ہے لیکن اس خون کو جمع کرنے اور پیک کرنے کا خرچ وہ لے سکتا ہے۔

مرد کے لئے زیور پہننا

سوال: (۱) کیا مرد کے لئے زیور پہننا جائز ہے؟ (۲) لوہے، تانبے، چاندی کی انگوٹھی جائز ہے؟ (محمد شریف بلوچ لیاری، کراچی)

جواب: (۱) مرد کے لئے زیور پہننا مطلقاً حرام ہے۔ (۲) لوہے، تانبے، پیتل، جست اور دیگر دھاتوں کی انگوٹھیاں مرد اور عورت دونوں کے لئے ناجائز ہیں۔ (۳) مرد کے لئے سونے کی انگوٹھی، کڑے یا بالیاں حرام ہیں البتہ چاندی کی ایک انگوٹھی مرد کے لئے جائز ہے جس کا وزن ساڑھے چار ماشے سے زیادہ نہ ہو۔

اعتراف جرم

سوال: کیا مجرمان سے اعتراف جرم کرانے کے لئے انہیں جسمانی اذیت دینا درست ہے، اسے جسمانی ریمانڈ کا نام دیا جاتا ہے؟ (محمد ایوب عباسی، بولٹن مارکیٹ، کراچی)

جواب: ملزم سے تفتیشی ادارے کا تفتیش کرنا، تحقیق کرنا درست ہے، لیکن کسی جرم کے قطعی ثبوت کے بغیر سزا دینا، اذیت پہنچانا یا جبراً اقرار جرم کرانا، خواہ اس نے جرم کا ارتکاب نہ کیا ہو، درست نہیں ہے۔

بالوں میں خضاب لگانا یا رنگنا

سوال: از روئے شریعت بالوں اور داڑھی میں رنگ لگانا کہاں تک درست ہے؟
(منور رمضان، معمار کوٹ، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: اس مسئلے کی شرعی حیثیت جاننے کے لئے یہ احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمایئے:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''یہود و نصاریٰ اپنے بالوں کو نہیں رنگتے، سو تم ان کی مخالفت کرو''۔
(صحیح بخاری جلد 2 صفحہ 875، سنن ابوداؤد جلد 2 صفحہ 222)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سفید بالوں کو متغیر کرو اور یہود کی مشابہت نہ کرو''۔ (جامع ترمذی صفحہ 266)

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جن چیزوں سے بالوں کا رنگ تبدیل کیا جاتا ہے، ان میں سب سے اچھی چیز مہندی اور کتم ہے''۔
(جامع ترمذی صفحہ 266)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ''نبی کریم ﷺ بغیر بالوں کے چمڑے کی جوتی پہنتے تھے اور اپنی داڑھی کو سرخ اور زرد رنگ سے رنگتے تھے''۔
(سنن ابوداؤد جلد 2 صفحہ 222)

(۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سفید بالوں کو نہ اکھاڑو، جس شخص کے بال بھی سفید ہوں گے، وہ قیامت کے دن اس کے لئے نور بن جائیں گے''۔
(سنن ابوداؤد جلد 2 صفحہ 224)

(۶) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آخر زمانہ میں ایک قوم کبوتر کے پوٹوں کی طرح سیاہ رنگ کے ساتھ اپنے بالوں کو رنگے گی، وہ (میدان حشر میں) جنت کی خوشبو نہیں پائے گی''۔ (سنن ابوداؤد جلد 2 صفحہ 222)

(۷) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''آخر زمانہ میں ایک قوم ہوگی جو اپنے بالوں کو سیاہ رنگ

کے ساتھ رنگے گی، اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا"۔

(مجمع الزوائد جلد 5 صفحہ 161)

سید المرسلین ﷺ کی داڑھی مبارک میں آپ ﷺ کے وصال مبارک تک زیادہ سے زیادہ بیس بال سفید تھے، بعض روایات میں ہے کہ سرخ اور زرد رنگ سے رنگے ہوئے تھے اور بعض میں ہے کہ سفید تھے، ان روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جس صحابی نے جس حال میں مشاہدہ کیا، اسے بیان کر دیا۔ سفیدی اصل حالت ہے اور سرخ یا زرد رنگ وصف زائد ہے اور اصول یہ ہے کہ جس روایت میں وصف زائد ہو، وہ قابل ترجیح ہوتی ہے۔ بعض صحابہ و تابعین سے سیاہ رنگ کے استعمال کی روایات بھی ثابت ہیں، ان تمام احادیث و آثار کی روشنی میں خلاصہ کلام حسب ذیل ہے:

امام شافعی کے نزدیک سفید بالوں کو رنگنا مستحب ہے (یعنی سرخ، زرد، عنابی وغیرہ) اور سیاہ خضاب مکروہ تحریمی ہے۔ امام مالک کے نزدیک بالوں کو رنگنا مستحب اور سیاہ رنگ خلاف اولیٰ ہے۔ امام احمد کے نزدیک سفید بالوں کو رنگنا مستحب ہے اور سیاہ رنگ مکروہ ہے، بعض کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے۔ بعض صحابہ اور تابعین سے جو سیاہ رنگ ثابت ہے وہ حالت جنگ پر محمول ہے اور اس دور میں جہاد تقریباً تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ سیاہ خضاب کے بارے میں چونکہ احادیث مبارکہ میں وعید آئی ہے اس لئے مکروہ ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہیے، اس مسئلے پر مفصل اور مدلل بحث شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی جلد 6 صفحہ 410 تا 427 پر موجود ہے، علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والے اصحاب اس کا مطالعہ کریں۔

خودکشی حرام کیوں؟

سوال: جب ہر کام اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتا ہے تو خودکشی پر سزا کیوں ہے اور یہ فعل حرام کیوں ہے؟ (سعید اسد اللہ، کورنگی)

جواب: "مشیت الٰہی" اور "رضائے الٰہی" میں بڑا فرق ہے۔ دنیا میں ہر کام اللہ تعالیٰ

کی مشیت سے ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا بھی ہو۔ جیسے ایک معلم اپنے طلبہ کو پڑھاتا ہے، اس کی رضا اس میں ہوتی ہے کہ سب طالب علم دل لگا کر پڑھیں۔ خوب محنت کریں، آوارگی نہ کریں، اعلیٰ درجے میں کامیاب ہوں، لیکن بدقسمتی سے ایک طالب علم آوارہ ہے، پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ امتحان میں کامیابی اور ناکامی کا ایک ضابطہ ہے، معلم امتحان لیتا ہے۔ وہ طالب علم فیل ہو جاتا ہے۔ استاد کا اسے فیل کرنا، یہ اس کی مشیت ہے، قانون ہے، ضابطہ ہے لیکن اس کی رضا نہیں ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل عطا کی ہے، کتاب الٰہی اور انبیاء کرام کے ذریعے شریعت کے احکام عطا کیے ہیں، نیکی اور بدی کی پہچان اور دونوں کا انجام بھی بتا دیا ہے۔ اسے اپنے اختیار اور صوابدید کے مطابق خیر وشر میں سے ایک راستے کو منتخب کرنے کا اختیار دیا ہے اور اسی اختیار پر جزا اور سزا ہے۔ انسان اپنی جان کا مالک نہیں ہے، انسان کی جان کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے ہمیں صرف اس جسم و جان، عقل وخرد اور صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا اختیار دیا ہے۔ یعنی ہم اپنی جان کے متصرف ہیں۔ مالک نہیں ہیں لہٰذا ہمیں اپنی جان تلف کرنا تو درکنار، ایک عضو تلف کرنے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا ''اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔ ''اپنے آپ کو قتل نہ کرو''۔ لہٰذا ''اتلاف عضو'' اور ''اتلاف جان'' (خودکشی) حرام ہے، گناہ ہے اور اس پر سزا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص زہر کھا کر خودکشی کرے گا، اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جہنم میں زہر کھاتا رہے گا اور مسلسل اذیت پاتا رہے گا جو کسی بلند وبالا مینار یا بلڈنگ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرے گا، وہ جہنم کے گڑھے میں گرتا ہی چلا جائے گا، علیٰ ہذا القیاس۔ حضور ﷺ نے دوسری صورتوں کا بھی ذکر فرمایا۔ تو اب یہ جرم اور اس کی یہ سزا اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کا قانون مکافات عمل تو ہے اس کی رضا نہیں ہے، اس کی رضا تو اس میں تھی کہ اس کا بندہ اس کے احکام پر عمل کرتا اور جنت کی ابدی نعمتوں سے فیض یاب ہوتا۔

چوری شدہ مال

سوال: جن گھروں میں چوریاں ہوتی ہیں، کیا ان کا مال حلال کا نہیں ہوتا؟ کیونکہ اکثر لوگوں سے سننے میں آیا ہے کہ حلال کا مال کبھی ضائع نہیں ہوتا؟

(ڈینیئل سردار بھٹی، منظور کالونی)

جواب: کسی کا مال چوری ہو جائے یا ڈاکے میں لٹ جائے یا کسی ناگہانی آفت میں تلف ہو جائے تو یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ خدانخواستہ وہ مال حلال کا نہیں تھا، ایسا مال حلال کمائی کا بھی ہو سکتا ہے اور حرام کا بھی، حرام مال ہونے کی صورت میں ہمارے ہاں یہ مقولہ عام ہے کہ مال حرام بود بجائے حرام رفت، مگر اس سے سارا قصہ تمام نہیں ہوتا، اگر حرام کا مال تلف بھی ہو جائے تب بھی ''کسب حرام'' کا جواب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دینا پڑے گا اور جس کا حق مارا ہے، اس کا تاوان بھی دنیا یا آخرت میں دینا پڑے گا۔ تاہم اگر حلال کمائی کسی آفت کا شکار ہو جائے یا چوری ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش اور امتحان سمجھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ (البقرہ)

''اور البتہ ہم تم کو کچھ ڈر، بھوک اور (تمہارے) مالوں، جانوں اور پھلوں میں کمی کے ذریعہ ضرور آزمائیں گے اور (اے حبیب! مصیبت میں) صبر کرنے والوں کو بشارت دیجئے''۔

ایسی آزمائش کے موقع پر صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ یا تو دنیا میں ہی بہتر بدل عطا فرمائے گا یا آخرت میں اجر عظیم سے نوازے گا یا اسے گناہوں کا کفارہ بنا دے گا یا درجات میں بلندی عطا فرمائے گا۔ ایسے موقع پر اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ پڑھنے کے بعد یہ دعا مانگنی چاہیے جو حدیث میں تعلیم فرمائی گئی ہے: اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِي فِي مُصِيْبَتِي هٰذِهِ وَاَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِّنْهَا، ترجمہ: اے اللہ! مجھے اس مصیبت پر اجر عطا فرما اور مجھے اس کا بہتر بدل عطا

فرماتو (یقیناً) اللہ تعالیٰ اسے بہتر بدل عطا فرمائے گا (صحیح مسلم)

حلال کمائی اور دوسرے لوگ

سوال: ایک شخص ہے جو خود حلال کماتا ہے مگر اس کے دو بھائی حرام کماتے ہیں اور تینوں بھائی مل کر رہتے ہیں اور ایک ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ حلال کمانے والا چھوٹا ہے اور بڑوں کو منع کرتا ہے مگر وہ نہیں مانتے۔ چھوٹے بھائی کے لئے کیا حکم ہے؟ (محمد اسرار الحق، کراچی)

جواب: جو بھائی حلال روزی کماتا ہے، وہ دوسرے بھائیوں کو حرام کمائی سے منع کرے، اگر وہ کسی بھی تدبیر سے باز نہ آئیں تو ان سے علیحدگی اختیار کر لے، ہم ہر روز وتر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتے ہیں کہ "اے اللہ! جو تیرا نافرمان ہے ہم اس سے قطع تعلق کرتے ہیں"۔ اور علیحدگی کے بعد بھی انہیں حرام سے بچنے کی ترغیب و تلقین کرتے رہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ اُن کے قلوب کو خیر کی طرف مائل فرمادے اور اللہ تعالیٰ سے بھی ان کی ہدایت کے لئے دعا کرتے رہیں، اور اگر علیحدگی میں کوئی ایسی وجوہ حائل ہوں جن کا ازالہ اس کے بس میں نہیں ہے تو کھاتے پیتے وقت یہ نیت کریں کہ میں اپنی حلال کمائی کا حصہ کھا رہا ہوں، جو شخص حلال کماتا ہے، حلال کھاتا ہے، کوئی اور سبب مانع نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے۔

تعویز کی شرعی حیثیت

سوال: کیا تعویذ باندھنا جائز ہے۔ بعض لوگ اسے شرک کہتے ہیں؟

(نور نبی، شاہ پور چاکر، سندھ)

جواب: "عوذ" اور "عیاذ" کے معنی ہیں پناہ مانگنا، کسی کے شر سے پناہ مانگنا اور کسی کی حفاظت و پناہ میں آنا۔ "تعویذ" سے مراد وہ اسمائے مقدسہ اور آیات ہیں جو کسی شر یا مرض سے بچاؤ کے لئے گلے میں باندھے جاتے ہیں۔ کسی کے لئے دعائے خیر، آیات الٰہی یا کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنا یا اسمائے مبارکہ اور آیات لکھ کر تعویذ کی صورت میں باندھنا یا لٹکانا شرعاً جائز ہے۔ امراض جس طرح جسمانی و طبعی ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی، اخلاقی اور اعتقادی

بھی ہوتے ہیں، اس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے "شافی الامراض بالذات" صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی مشیت کے بغیر شفاء کا ملنا ناممکن ہے لیکن یہ عالم اسباب ہے اور ہم شرعاً اسباب کو اختیار کرنے کے مکلف ہیں یا یہ کہ اسباب کا اختیار کرنا جائز ہے۔ جیسے بیماری کی صورت میں ہم ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں اور دواؤں کا استعمال کرتے ہیں، لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ طبیب کی تشخیص اور دوا کی تاثیر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ اس طرح دعا، دم اور تعویذ وغیرہ ازالہ مرض وشر کے روحانی اسباب ہیں جیسے دوا مادی سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ (بنی اسرائیل)

"اور ہم قرآن میں ایسی چیز نازل فرماتے ہیں جو اہل ایمان کے لئے (وسیلہ) شفا و رحمت ہے اور اس سے ظالموں کے لئے خسارے میں اضافہ ہی ہوتا ہے"۔

اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ قرآن اخلاقی اور اعتقادی امراض کے لئے شفا ہے، تاہم جمہور مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ آیات قرآنی پڑھ کر دم کرنے یا آیات و اسمائے الٰہی کا تعویذ باندھنے سے اللہ تعالیٰ جسمانی امراض سے بھی شفا عطا فرماتا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد اور مسند احمد میں حدیث ہے کہ حضرت ابو سعید خدری نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا اور ایک شخص جو بچھو کے کاٹنے سے تڑپ رہا تھا اسے شفا مل گئی۔ انہوں نے اس پر بکریوں کا ریوڑ معاوضہ بھی لیا۔ لیکن صحابہ کا آپس میں اختلاف ہوگیا کہ آیا یہ اجرت، جسے آج کل کی اصطلاح میں نذرانہ کہتے ہیں، جائز ہے یا نہیں لہٰذا انہوں نے توقف کیا اور مدینہ طیبہ پہنچ کر حضور ﷺ سے اس کا شرعی حکم دریافت کیا تو آپ نے نہ صرف اسے جائز قرار دیا بلکہ فرمایا کہ اس میں سے مجھے بھی دو۔ یہ بعض مواقع پر حضور اس لئے کرتے تھے تاکہ صحابہ کرام کو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ آیات قرآنی اور کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنے

(نظر بد یا موذی جانوروں کے ایذا یا جنات وغیرہ کے اثر یا مرگی کے دورے سے تحفظ کے لئے) کا ثبوت و جواز متعدد احادیث مبارکہ اور رسول اللہ ﷺ کے اپنے عمل مبارک سے بھی ثابت ہے۔ لیکن یہ قرآن مجید کی ضمنی اور اضافی برکات ہیں۔ بنیادی طور پر قرآن مجید کتاب ہدایت اور ضابطۂ عمل ہے جس پر ایمان بھی ضروری ہے اور اس کے احکام پر عمل بھی، اور قرآن پاک کی اسی جہت کو غالب حیثیت حاصل ہے۔ جن احادیث مبارکہ میں تعویذ یا دم کی ممانعت آئی ہے وہ اس پر محمول ہے کہ (۱) وہ دم یا منتر کلمات شرک و کفر یا کلمات ضلالت پر مشتمل ہو اور (۲) یا یہ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کو فراموش کر کے محض اسباب کو موثر بالذات مانے۔ بلاشبہ موثر بالذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اسباب میں تاثیر اسی نے پیدا فرمائی اور وہ جب چاہے اسے سلب فرما سکتا ہے۔

رات کے وقت ناخن کاٹنا

سوال: کہا جاتا ہے کہ رات کے وقت ناخن نہیں کاٹنے چاہئیں کیونکہ اس سے برکت ختم ہو جاتی ہے، کیا یہ درست ہے؟ (نائلہ، کراچی)

جواب: رات کے وقت ناخن کاٹنے کی شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے، ممکن ہے کسی بزرگ نے اسے کاہلی سمجھ کر منع کیا ہو۔

''اذان'' کے نام سے فلم بنانا

سوال: عرض یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں شعبہ شوبز سے تعلق رکھنے والی ایک اداکارہ نے لفظ ''اذان'' پر فلم بنانے کا اعلان کر رکھا ہے جس پر علماء کرام سمیت سائل کو اس نام سے فلم بنانے پر شدید اعتراض ہے۔ اس سلسلے میں اخبارات کے ذریعے اس پر زبردست احتجاج کیا گیا، جس کے جواب میں موصوفہ نے جہاں شعائر اللہ کی بے حرمتی کی وہاں علماء کرام کی شان میں بھی گستاخی کی۔ راقم نے بھی وقتاً فوقتاً اس موضوع پر اپنی سی کوشش کی، جس کے نتیجہ میں اب ان کا جو موقف سامنے آیا ہے، اس کے متن کی کاپی بھی اس سوال کے ساتھ منسلک ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے التماس ہے کہ قرآن و سنت کی

روشنی میں رہنمائی فرمائیں کہ کیا واقعی ''اذان'' کے نام کو کرپشن، تعصب، لسانیت کے سدباب کے لئے اور فلم میں علامتی طور پر ادا کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ بصورت دیگر اس نام سے فلم رد کنے پر کیا اقدام کیے جاسکتے ہیں؟

(سید منیر احمد، خواجہ چوک، حیدرآباد سندھ)

جواب: ''اذان'' اسلامی شعائر میں سے ایک شعار ہے۔ اس کو اسلامی شعار کے بجائے لہو ولعب میں استعمال کرنا حرام ہے۔ جب کہ فلم بنانا، فلم میں کام کرنا یا معاونت کرنا ناجائز و حرام ہے۔

تو ایک کام جو اپنی اصل اور صورت ظاہری دونوں اعتبار سے ایک سے زائد شرعی ممنوعات پر مشتمل ہے، اس کے تعارف و فروغ کے لئے ''اذان'' کے نام کو استعمال کرنا جو ایک خالص اسلامی شعار ہے، حرام اور کفر کے قریب ہے۔ لہٰذا اس سے اجتناب لازمی ہے اور حکومت کو چاہیے کہ فلموں کے لئے اسلامی شعائر کا نام استعمال کرنے پر پابندی لگائے۔

آنکھوں کی گناہ سے حفاظت

سوال: میں ایک دکان دار ہوں۔ ایک لڑکی بائیں کھڑی، دوسری دائیں، تیسری سامنے، میں اپنی آنکھیں بچا نہیں سکتا، کیا کروں؟ (احمد شاہ)

جواب: آپ نے جو صورت حال بیان کی ہے کہ یہ واقعی آزمائش ہے۔ ایسے ہی امور کو شریعت نے ''فتنہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ (النور)

''اور (اے رسول ﷺ) آپ مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے، بلاشبہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے''۔

سب سے اولین احتیاط تو یہ ہے کہ اپنی نگاہیں حتی الامکان بچائے رکھے، غیر ارادی پہلی نظر پر تو اللہ تعالیٰ کے ہاں مواخذہ نہیں ہے، لیکن لذت نگاہ، حظ نفس اور شہوت رانی کے لئے غیر محرم خاتون کو دیکھنا حرام ہے، ''لاحول'' پڑھتے رہا کریں۔

معوذتین پڑھتے رہا کریں (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) جب نفس آمادہ لذت کرے تو جہنم کی آگ کے شعلوں کا ذہن میں تصور کریں، حضرت ذوالنون نے فرمایا ''جب نظر نہ آنے والا شیطان تمہیں بہکائے تو اس کے شر اور وسوسے سے اس ذات باری تعالیٰ کی مدد مانگو جو شیطان کے دائرہ نگاہ سے بھی باہر ہے اور جس کی نگاہ وقدرت میں شیطان اور اس کا مکر وفریب ہے۔ اس کے علاوہ کوشش بھی کرتے رہیں اور دعا بھی کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل ایسا وسیلہ رزق عطا فرمائے جس میں غیر محرم عورتوں سے واسطہ نہ پڑے۔

دوسروں کی چیزیں استعمال کرنا

سوال: بہت سے لوگ دوسروں سے چیزیں لے کر استعمال کے بعد ادھر ادھر ڈال دیتے ہیں؟

جواب: حسن اخلاق اور شرافت نفس کا تقاضا ہے کہ دوسرے کی چیز بلا اجازت استعمال نہیں کرنی چاہیے اگر اس نے استعمال کی آزادانہ اجازت دے رکھی ہے تو استعمال کے بعد چیز جہاں سے اٹھائی ہے وہیں رکھ دینی چاہیے تاکہ اسے تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔

انسان کے گھر میں اور باہر الگ الگ رویہ

سوال: بہت سے لوگ دینی مجالس میں شرکت کرتے ہیں اس کے علاوہ مذہبی لٹریچر بھی پڑھتے ہیں، مگر گھر میں جن کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے ہیں، انہیں ہر طرح سے آزار پہنچاتے ہیں جب کہ گھر سے باہر دوسروں کے ساتھ اچھا رویہ رکھتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ (تبسم حمید)

جواب: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے ''تم میں سے سب سے بہتر شخص وہ ہے جس کا

رویہ، سلوک اور برتاؤ اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہو"۔ کسی شخص کی سیرت و کردار، اخلاق کا اصلی رخ اور داخلی پرت اس کے اہل خانہ کے سامنے ہی اپنی اصل شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں بے ساختگی ہوتی ہے، تصنع اور فریب نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس بعض لوگ دہری شخصیت کے مالک ہوتے ہیں گھریلو زندگی میں بدخو، بدکلام اور بداطوار ہوتے ہیں۔ جب کہ گھر سے باہر خارجی زندگی میں اپنی شخصیت پر خوش اخلاقی کا نقاب چڑھا لیتے ہیں۔ اسلام ایسی دوعملی کو پسند نہیں فرماتا، آدمی کو چاہیے کہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ بھی اسی حسن اخلاق سے پیش آئے جس سے دوسروں کے ساتھ پیش آتا ہے۔

دوسرے لوگوں کو تکلیف دینا

سوال: میری رہائش کے قریب ایک صاحب روزانہ 12 بجے اپنی گاڑی میں ایک بڑا تھیلا گوشت کا لے کر آتے ہیں اور کتے، بلیوں، کوؤں اور چیلوں کو کھلاتے ہیں۔ یہ کام وہ اپنے گھر کے آگے نہیں بلکہ میرے گھر کے آگے کرتے ہیں جہاں ہر وقت کتے، بلیاں، کوے جمع رہتے ہیں۔ برائے مہربانی یہ بتایئے کہ ان کو اس کا کوئی ثواب ملے گا؟ (محمد علی خان)

جواب: جانوروں کو کھلانا بلاشبہ ثواب ہے لیکن ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ ایک ہاتھ سے ثواب کمائے اور دوسرے ہاتھ سے اسے گنوائے۔ پڑوسیوں کے بھی حقوق ہوتے ہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں، لہٰذا مذکورہ شخص کو پڑوسیوں کے لئے باعث آزار بننے کے بجائے اپنے گھر کے سامنے یہ کار خیر کرنا چاہیے اور اگر جگہ ایسی ہے کہ راہ چلنے والوں کے لئے اذیت کا باعث ہے تو پھر کسی ایسی جگہ کا انتخاب کریں جہاں کسی کو تکلیف واذیت نہ پہنچے۔

بزرگان دین کے مزارات پر عقیدت

سوال: کیا بزرگان دین کی قبور کو تعظیماً سجدہ کرنا، ان کا طواف کرنا اور بوسہ دینا شرعاً جائز ہے؟ (تاج محمد، لانڈھی، کراچی)

جواب: انبیائے کرام علیہم السلام، اولیائے کرام یا کسی کی بھی قبر کو عبادت کی نیت سے سجدہ کیا جائے تو یہ شرک ہے، محض تعظیم و توقیر کی نیت سے سجدہ کیا جائے تو یہ بھی شرعاً حرام

ہے، صرف بیت اللہ کا طواف ہی عبادت ہے، قبور انبیائے کرام علیہم السلام یا اولیائے کرام کا طواف تعظیماً کیا جائے تو یہ بھی ناجائز ہے، عامۃ المسلمین کو قبر کو بوسہ دینے سے بھی منع کیا جائے، زیادہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔

میت کے ایصال ثواب کے لئے اہتمام

سوال: اہل میت کی طرف سے میت کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی اور کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے جسے عام طور پر وہ تمام رشتے دار اور احباب کھاتے ہیں جو معاشی طور پر خوشحال ہوتے ہیں، کیا یہ کھانا مال داروں کے لئے جائز ہے یا صرف فقراء کے لئے جائز ہے؟۔

(عبدالقادر نجمی، نئی کراچی، کراچی)

جواب: کتاب وسنت سے تقریباً تواتر کی حد تک یہ بات ثابت ہے کہ میت کے ایصال ثواب کے لئے جو بھی نیک عمل کیا جائے مثلاً قرآن خوانی، مستحقین کے لئے کھانے کا اہتمام یا لباس کی فراہمی، نقد صدقات یا مساجد و مدارس کی تعمیر میں حصہ لے کر صدقہ جاریہ کا اہتمام کرنا وغیرہ۔ تو اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اس سلسلے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں۔

ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کا جو اہتمام ہوتا ہے اور ان مواقع پر کھانے کا جو اہتمام ہوتا ہے، اس کی حیثیت نفلی صدقے کی ہے۔ افضل تو بلاشبہ یہی ہے کہ یہ صرف فقراء و مستحقین پر صرف کیا جائے اور اس صورت میں اس کا اجر بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں یقیناً زائد ہو گا۔ تاہم چونکہ یہ نفلی صدقہ ہے اس لئے مال داروں کے لئے بھی اس کا کھانا جائز ہے اور اس پر بھی اجر ملے گا۔

میت کو دوسری جگہ دفن کرنا

سوال نمبر1: جس قبرستان میں سیلابی پانی جمع ہو اور قبروں کے اندر بھی پانی بھرا ہوا ہو تو کیا میت کو نکال کر کسی اور قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں؟

سوال نمبر2: شرعی عذر کیا ہے، جس کے تحت قبر سے میت کو نکال کر کہیں اور دفن کیا جائے؟

سوال نمبر3: سونے چاندی کے ذاتی استعمال کی کتنی مقدار ہے جس کو وزن کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے؟۔ (عبداللہ، محمود آباد، کراچی)

جواب نمبر1: عذر شرعی کی وجہ سے قبر کو کھودنا جائز ہے اور میت کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کرنا بھی جائز ہے۔ جب قبرستان میں سیلاب یا سیم وتھور کا پانی آجائے تو ان صورتوں میں میت کو دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اگر غالب امکان یہ ہے کہ میت گل سڑ چکی ہے، سلامت نہیں رہی یا اس پر تغیرات آچکے ہیں تو قبر کو اندر سے چھیڑے بغیر اوپر سے مرمت کرلیں کہ قبر کا نشان باقی رہے۔

جواب نمبر2: شرعی عذر یہ ہے کہ میت کو کسی دوسرے شخص کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر دفن کیا گیا ہو اور وہ شخص مطالبہ کرے کہ زمین خالی کی جائے یا قبرستان میں سیلاب کا پانی آئے اور خدشہ ہو کہ زمین پانی میں ڈوب جائے گی تو ان صورتوں میں میت کو دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔

جواب نمبر3: فقہائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ چاندی دو سو درہم یعنی 612.36 گرام ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے جب کہ سونا 20 دینار یعنی 87.48 گرام ہو تو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ البتہ اگر نقد رقم ہے یا مال تجارت ہے یا متفرق چیزیں ہیں اور ان کی مجموعی مالیت 612.36 گرام چاندی کی مروجہ قیمت کے برابر بن جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید سفر میں کیسے لے جائیں

سوال: میری نواسی امریکہ سے آئی ہوئی ہے وہ اپنے ساتھ قرآن شریف لے جانا چاہتی ہے کیا وہ اپنے سوٹ کیس کے درمیان قرآن شریف رکھ کر لے جاسکتی ہے، بے ادبی تو نہیں ہوگی، یہ سوٹ کیس کارگو میں دے دیا جائے تو گناہ تو نہیں ہوگا؟

(حکیم محمود علی بیگ پی ای سی ایچ ایس، کراچی)

جواب: زیادہ بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ قرآن مجید کسی پاک کپڑے یا بیگ میں لپیٹ کر اپنے

گلے میں لٹکا لے یا مسافروں کے سروں کے اوپر ہلکا سامان رکھنے کے لئے جو خانہ ہوتا ہے
اس میں دوسرے سامان کے اوپر رکھ لے اس میں کوئی دشواری ہو تو کپڑے میں لپیٹ کر
بیگ میں سامان کے اوپر یا درمیان میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ کسی مسلم ملک کی ایئر لائن یا خاص
طور پر پی آئی اے میں سفر کر رہے ہیں تو ہمارا مشاہدہ ہے کہ عملے کے لوگ بھی اس سلسلے میں
کافی تعاون کرتے ہیں، آپ عملے کی مدد بھی لے سکتے ہیں کیونکہ موجودہ دور میں ہمارے
اعمال کا معیار تو بلاشبہ بہت گرا ہوا ہے، لیکن قرآن مجید کی توقیر و احترام کے بارے میں
بالعموم ہر طبقے کا مسلمان حساس ہوتا ہے۔

کیا سینے میں دو دل ہو سکتے ہیں

سوال: اخبارات میں آیا ہے کہ ایک ایسا لڑکا پیدا ہوا ہے جس کے سینے میں دو دل ہیں،
جب کہ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔ یہ خبر پڑھ کر میرا
ایمان متزلزل ہو رہا ہے اور اسلام کے بارے میں میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے
اور فاسد خیالات پیدا ہو رہے ہیں از راہ کرم میرے ان خدشات کا ازالہ فرما دیجئے؟
(ن س، لانڈھی، کراچی)

جواب: سورۃ الاحزاب آیت نمبر 4 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۝ (الاحزاب)

"اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کے لئے اس کے سینے میں دو دل نہیں بنائے اور تم اپنی جن بیویوں سے ظہار کرتے ہو (یعنی یہ کہتے ہو کہ تو میرے لئے میری ماں کی پشت کی طرح ہے) اللہ نے انہیں تمہاری ماں نہیں بنایا۔ اور نہ ہی اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی) بیٹا بنایا ہے یہ سب تمہارے

اپنے منہ کی (بنائی ہوئی) باتیں ہیں اور
اللہ تعالیٰ حق فرماتا ہے اور وہی (سیدھی)
راہ دکھاتا ہے"۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے "قلب" کی اصطلاح استعارہ کے طور استعمال کی ہے۔ یہاں قلب سے مراد گوشت کا وہ ٹکڑا یا لوتھڑا نہیں ہے جو انسان کے سینے میں دھڑکتا ہے اور جو بدن میں رگوں کے ذریعے صاف خون کو پمپ کرتا ہے اور جس کے صحیح کام کرنے پر انسان کی جسمانی صحت کا مدار ہے۔ بلکہ اس سے مراد انسان کی قوت عاقلہ ہے، جس کے ذریعے وہ حقائق کا ادراک کرتا ہے اور وہ خیر و شر میں تمیز کرتا ہے۔ جو محبت یا نفرت کا محل ہوتا ہے۔ اور یہ انسان کی عقل یا انسان کا دماغ ہے۔ قرآن و حدیث میں اسے کہیں "قلب" سے تعبیر کیا ہے، کہیں "نفس" سے، کہیں "عقل" سے اور کہیں "فواد" کہا ہے۔ رہا یہ سوال کہ جب قرآن و حدیث میں اس سے مراد عقل و دماغ ہے تو اس کے لئے "قلب" کی اصطلاح کیوں استعمال کی گئی؟ تو جواباً عرض ہے کہ قرآن مجید بنیادی طور پر طب یا سائنس کی کتاب نہیں ہے بلکہ "کتاب ہدایت" ہے، لہٰذا اس میں ایسے الفاظ، استعارات اور اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جو لوگوں کے عرف محاورہ اور روزمرہ کے مطابق ہوں تاکہ اتمام حجت ہو جائے اور حق ثابت ہو جائے۔ عرف عام اور روزمرہ اور محاورات میں ادراک، احساس، محبت اور نفرت کے لئے مجازاً قلب (دل) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، مثلاً میں نے دل میں سوچا میرے دل میں یہ خیال آیا، میرا دل اس کو نہیں مانتا، میرا دل اس سے نفرت کرتا ہے، میرے دل میں اس کی بڑی عزت یا محبت ہے وغیرہ۔ ائمہ اربعہ میں سے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک کا یہی قول ہے کہ عقل کا محل و مرکز دماغ ہے اور جدید طب اور سائنس بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس تفصیلی بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ آیت میں قلب سے مراد دل نہیں بلکہ عقل ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بچہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے سینے میں دو دل ہیں تو یہ قرآن کے منافی نہیں ہے اور نہ ہی اس پر شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے

کی ضرورت ہے۔ باقی یہ سوال کہ ''اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کے لئے اس کے سینے میں دو دل نہیں بنائے'' اس کا مطلب کیا ہے؟ تو امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور علامہ قرطبی نے تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے:

(۱) جب عقل انسانی ایک ہے تو ایک انسان کی عقل میں یا تو ایمان ہوگا یا کفر، دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

(۲) ایک ہی عقل میں اللہ تعالیٰ اور غیر اللہ کی محبت ایک ہی درجے میں جمع نہیں ہو سکتی۔

(۳) یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان کے دل میں تقویٰ بھی ہو، اللہ تعالیٰ سے ڈرے بھی اور غیر اللہ سے بھی اس طرح ڈرے جیسے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے چنانچہ فرمایا:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ:165)

''اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے ہیں، اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیے، اور جو اہل ایمان ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سے (سب سے) زیادہ محبت کرتے ہیں''

اور فرمایا:

وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ (الاحزاب:37)

''آپ لوگوں کی طعن و تشنیع سے ڈرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی اس بات کا سب سے زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے ڈریں''۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ محمد یوسف لدھیانوی کی خدمت میں چند گزارشات بہ سلسلہ "آپ کے مسائل اور ان کا حل"

تمہید: ہر جمعہ کو روزنامہ "جنگ" کراچی کے "اقرا ایڈیشن" میں شیخ محمد یوسف لدھیانوی کا کالم "آپ کے مسائل اور ان کا حل" شائع ہوتا ہے، اس کالم پر ادارے کی طرف سے موصوف کی اجارہ داری ہے، لہٰذا جوابات میں وہ اپنے ذاتی نظریات کو اکثر ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ وقتاً فوقتاً یہ نوٹ لکھا جاتا ہے کہ مسائل کا جواب "فقہ حنفی" کے مطابق دیا جاتا ہے لیکن بعض اوقات اس کی رعایت نہیں کی جاتی۔ اس سے قارئین غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں، بعض اوقات دین کی مصلحت اور حکمت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سطور ذیل میں ہم چند اہم مسائل کی نشاندہی کر رہے ہیں تاکہ قارئین کی صحیح رہنمائی ہو سکے۔

شہید کی نماز جنازہ

روزنامہ جنگ کراچی کے 26 ستمبر 1997ء کے ایڈیشن میں شیخ لدھیانوی لکھتے ہیں:

"جو شخص کسی کے ہاتھ سے بے گناہ قتل کیا جائے، وہ شہید ہے اور شہید کی نماز جنازہ نہیں ہوتی"۔

یہ مسئلہ احناف کے مسلمہ اور اجتماعی موقف کے سراسر خلاف ہے۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصلوٰۃ علی الشہید میں حدیث نمبر 1344 میں ہے:

"حضرت عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک دن نکلے اور آپ ﷺ نے شہداء احد کی نماز جنازہ پڑھی، جیسے کہ میت پر پڑھی جاتی ہے، پھر آپ ﷺ (خطبہ دینے کے لئے) منبر کی طرف پلٹے اور فرمایا: "میں (آخرت میں) تمہارا پیشرو ہوں اور میں تم پر گواہ ہوں، اور اللہ کی قسم میں اس وقت بھی اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں، یا (آپ ﷺ نے فرمایا) زمین کی کنجیاں دی

گئی ہیں اور بخدا مجھے اس بات کا خدشہ نہیں ہے کہ تم میرے بعد شرک کرو گے لیکن مجھے یہ خدشہ ضرور ہے کہ تم دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جاؤ گے''۔

اس حدیث کے تحت محدثین وشارحین نے لکھا ہے کہ اگر ایک واقعے کے بارے میں ایک روایت اثبات کی ہو اور دوسری نفی کی تو ترجیح کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ روایت ''اثبات'' کو ترجیح دی جائے گی۔اس کے علاوہ المبسوط مصنفہ شمس الائمہ محمد ابن احمد سرخسی، ردالمختار مصنفہ علامہ ابن عابدین شامی، عالمگیری مؤلفہ ملا نظام الدین، الہدایہ مصنفہ شیخ الاسلام برہان الدین مرغینانی اور فقہ حنفی کی تمام امہات کتب میں یہ مسئلہ درج ہے۔ بلکہ فقہاء احناف نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ قرآن وسنت میں جو''حیات شہداء'' کے بارے میں فرمایا گیا ہے وہ عالم برزخ وآخرت کے اعتبار سے ہے، دنیوی احکام کے اعتبار سے ان پر موت کا اطلاق کیا جائے گا، یہی وجہ ہے کہ شہید کی میراث تقسیم ہوتی ہے، شہید کی بیوہ عدت وفات گزرنے کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔

اگر چہ یہ بات قوی آثار وروایات سے ثابت ہے کہ بسا اوقات شہدا کے دنیوی اجسام بھی باقی رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان اجسام کو زندہ رکھتا ہے۔ عام برزخی زندگی تو کفار کو بھی حاصل ہے۔اور ان کی ارواح کا ان کے اجسام کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق قائم ہوتا ہے، جس سے وہ عذاب کی اذیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کے برعکس ثواب و جزا کی لذت کو محسوس کرتے ہیں۔شہید کا امتیاز یہ ہے کہ اس کی زندگی شہادت کے بعد بھی جسمانی اور بدنی زندگی ہوتی ہے۔

والدین کی نصیحت

اسی اشاعت میں ''اطاعت والدین'' کے تحت شیخ لکھتے ہیں: ''لیکن نہ ان کو نصیحت کرو''۔یعنی والدین کی ناحق بات پر ان کو قبول حق کی نصیحت نہ کرو۔ یہ مسئلہ قرآن کے عمومی حکم ''وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ'' (یعنی ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت ونصیحت کرو) کے سراسر خلاف ہے۔

احادیث مبارکہ میں بھی ماں باپ کو دعوت حق اور نصیحت کا ثبوت ملتا ہے، امام محمد بن اسماعیل بخاری نے "الادب المفرد" میں "باب عرض الاسلام علی الام النصرانیة" کے تحت حدیث نمبر 34 نقل کی ہے، راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سنا، وہ فرمارہے تھے: "میرے بارے میں جس یہودی ونصرانی نے بھی سنا، اس نے مجھ سے محبت کی، (بات یہ ہے کہ) میں چاہتا تھا کہ میری ماں اسلام قبول کرے تو وہ انکار کر دیتیں، میں نے پھر انہیں دعوت اسلام دی تو انہوں نے انکار کر دیا، پھر میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میری ماں کے لئے دعا فرمایئے (کہ وہ اسلام قبول کرلے) حضور نے دعا فرمائی، میں واپس آیا اور وہ اپنا دروازہ بند کر چکی تھیں، انہوں نے (اندر ہی سے) آواز دی، ابو ہریرہ میں نے اسلام قبول کرلیا، میں نے اس خوشخبری کی اطلاع حضور ﷺ کو دی اور عرض کی: (یا رسول اللہ ﷺ) میرے لئے اور میری ماں کے لئے دعا فرمایئے! تو حضور انور ﷺ نے فرمایا: "اے اللہ! تو اپنے بندے ابو ہریرہ اور اس کی ماں دونوں کو لوگوں کی نظروں میں محبوب بنادے"۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی ماں کو بار بار قبول حق کی نصیحت کی اور حضور ﷺ نے نہ صرف یہ کہ انہیں اس "دعوت حق" سے منع نہیں فرمایا بلکہ ان کی ماں کے لئے دعا فرما کر ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب انسان اپنے والدین کو نصیحت کرے، ناحق بات پر ان کی غلطی کی نشاندہی کرنا چاہے تو ملامت و ملاطفت کا لب ولہجہ اختیار نہ کرے، ادب کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھے، مثلاً یوں کہے کہ: "ابا جان! میرے خیال میں مسئلہ یہ ہے، بہتر ہوگا آپ کسی عالم سے معلوم کریں، اگر میں غلطی پر ہوا تو میری اصلاح ہو جائے گی، وغیرہ"۔

کارخانوں اور دفاتر میں نماز جمعہ

حکومت پاکستان نے جب فروری 1997ء میں تقریباً 20 سال کے بعد اچانک جمعہ کی تعطیل کو منسوخ کر دیا تو یہ سوال اٹھایا گیا کہ کارخانوں اور دفاتر کی مساجد میں نماز جمعہ ادا

کرنا جائز ہے یا نہیں؟ شیخ لدھیانوی سے جب یہی سوال کیا گیا تو انہوں نے جنگ کے صفحات پر جواب دیا کہ: "جہاں عام مسلمانوں کو آ کر نماز پڑھنے کا اذن عام نہ ہو، وہاں نماز جمعہ ادا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ نماز جمعہ کی صحت کے لئے اذن عام شرط ہے"۔ اصولی طور پر تو شیخ کی یہ بات درست ہے، لیکن مسند افتاء کے لئے نفس مسئلہ کو جاننے کے ساتھ ساتھ فقاہت، دینی بصیرت، مصالح دینیہ کا ادراک، عرف سے آگاہی، فرع کو اصل پر قیاس کرنے، ایک جیسی نظائر کے ایک دوسرے پر انطباق، مجتہدانہ فکر اور اصابت رائے بھی ضروری ہے۔ مشہور قول ہے کہ: "جو فقیہہ اپنے دور کے عرف سے آگاہ نہیں، وہ جاہل ہے"۔

چنانچہ صحت جمعہ کی ایک شرط "اذن عام" کے تحت "درمختار" اور "ردالمحتار" میں ہے کہ اگر دشمن کے خطرے کے پیش نظر قلعے (فصیل شہر کا دروازہ ہو۔ لیکن حدود قلعہ کے اندر رہنے والوں کے لئے اذن عام ہو تو یہ نماز جمعہ کی صحت ادا کے لئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان فقہاء عظام کی تربتوں میں اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے کہ انہوں نے اپنے دور کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے احکام شریعت کے انطباق اور اطلاق (Application) میں وسعت پیدا کی، جہاں تک حدود شرع میں ممکن ہوا یسر کو ملحوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ کے پیارے حبیب ﷺ کے فرمان کے مطابق تنفیر کے بجائے تبشیر کی راہ اختیار کی۔

علامہ شامی نے تو یہاں تک توسع اختیار کی ہے کہ درمختار کی یہ عبارت کہ (اَلْاِذْنُ الْعَامُ)...... مِنَ الْاِمَامِ، وَهُوَ يَحْصُلُ بِفَتْحِ اَبْوَابِ الْجَامِعِ لِلْوَارِدِيْنَ (کافی) فَلَا يَضُرُّ غَلْقُ بَابِ الْقَلْعَةِ لِعَدُوٍّ اَوْ لِعَادَةٍ قَدِيْمَةٍ، لِاَنَّ الْاِذْنَ الْعَامَّ مُقَرَّرَةٌ لِاَهْلِهٖ وَغَلْقُهٗ لِمَنْعِ الْعَدُوِّ لَا الْمُصَلِّيْ نَعَمْ لَوْ لَمْ يَغْلُقْ لَكَانَ اَحْسَنَ كَمَا فِيْ "مَجْمَعِ الْاَنْهُرِ" مَعْزِيًا "لِشَرْحِ عُيُوْنِ الْمَذَاهِبِ" ترجمہ: "امام کی جانب سے اذن عام...... اور وہ مسجد جامع میں آنے والوں کے لئے دروازے کھلے رکھنے سے حاصل ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر مسجد جامع کے دروازے کسی قدیم عادت یا خطرہ دشمن کے پیش نظر بند ہوں تو اذن عام کے لئے مضر نہیں ہے، کیونکہ اس کے اہل (یعنی اندر رہنے والوں) کے لئے تو بہر حال

ثابت ہے اور دروازے کی بندش نمازی کے لئے نہیں ہے، دشمن کو روکنے کے لئے ہے، تاہم اگر دروازہ بند نہ ہوتا تو بہتر ہوتا الخ‘‘۔

علامہ شامی اس کے تحت لکھتے ہیں: ’’قُلْتُ: وَيَنْبَغِيْ اَنْ يَّكُوْنَ مَحَلُّ النِّزَاعِ مَا اِذَا كَانَتْ لَاتُقَامُ اِلَّا فِيْ مَحَلٍّ وَّاحِدٍ، اَمَّا لَوْ تَعَدَّدَتْ فَلَا، لِاَنَّهٗ لَمْ يَتَحَقَّقُ التَّفْوِيْتُ كَمَا اَفَادَهُ التَّعْلِيْلُ تَاَمَّلْ ‘‘ترجمہ: ’’میں کہتا ہوں، (مسجد جامع کے دروازے کی بندش) محل نزاع تب قرار پانا چاہیے جب کہ نماز صرف ایک ہی جگہ ہوتی ہو، لیکن اگر نماز جمعہ کئی جگہ ہو رہی ہو تو پھر یہ مسئلہ محل نزاع نہیں رہے گا، کیونکہ نماز جمعہ کا فوت ہونا متحقق نہیں ہوگا، جب کہ تعلیل اس کا فائدہ دے رہی ہے، غور کیجئے‘‘۔ یعنی علامہ شامی کے نزدیک موجودہ حالات میں بعض مقامات پر اگر سیکورٹی اور تحفظ کی خاطر کسی مسجد جامع میں اذن عام نہ بھی ہو یا دروازے باہر والوں کے لئے بند ہوں، تب بھی جمعہ جائز ہوگا، اذن عام کی شرط متحقق ہوگی کیونکہ اور متعدد مقامات (یعنی مساجد جامع) ایسے ہیں جو سب کیلئے کھلے ہیں۔ (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان)

ہمارے دور میں سیکورٹی اور سلامتی کے مسائل سنگین خطرات سے دوچار ہیں، بعض صنعتی اور انتظامی ادارے انتہائی حساس اور دفاعی نوعیت کے ہیں اور تقریباً ہر صنعتی ادارے میں باہر کے غیر متعلقہ افراد کا داخلہ خصوصی اجازت اور پاس کے بغیر منع ہے۔ بعض اداروں میں ہزاروں افراد کام کرتے ہیں اور وہ میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں، جیسے پاکستان اسٹیل، پی آئی اے، پورٹ، شپ یارڈ، کینٹ، واہ فیکٹری، کامرہ فیکٹری وغیرہ۔ ان میں سے بعض اداروں کی حدود کے اندر ایک سے زائد مساجد ہیں۔ تو اگر ’’اذن عام‘‘ کی کڑی شرط کا غیر دانشمندانہ اطلاق کر کے ان اداروں میں نماز جمعہ کے صحیح نہ ہونے کا فتویٰ دے دیا جائے تو مسلمانوں کی عظیم اکثریت اسلام کے ایک عظیم شعار، سعادت جمعہ سے محروم رہ جائے گی۔ کیونکہ ان لوگوں کے لئے کارخانوں کی حدود سے باہر آ کر کھلی مساجد میں جمعہ پڑھنا تقریباً ناممکن العمل ہو جائے گا۔ اور تو چھوڑیے، ایوان صدر، گورنر ہاؤسز، وزیر اعظم ہاؤس وغیرہ کی

حدود میں جمعہ ناجائز قرار پائے گا، کیونکہ سیکورٹی کے مقاصد کے تحت ان اداروں میں داخلے کا اذن عام نہیں ہے اور نہ ہی یہ اعلیٰ اربابِ اقتدار محفوظ ترین سیکورٹی کے بغیر باہر کھلی مساجد میں آ کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ کار نہیں ہے کہ جو رخصت ہمارے فقہاء متقدمین نے پرانے ادوار میں ادائے جمعہ کے لئے قلعہ بند بستیوں کے رہنے والوں کے لئے دی تھیں، اس کا اطلاق موجودہ دور کے ''ٹائٹ سیکورٹی'' والے اداروں، کارخانوں، دفاتر اور اڈوں وغیرہ پر بھی کر کے جمعہ کی شرط ''اذن عام'' میں نرمی پیدا کی جائے۔

ہاں البتہ وہ حساس نوعیت کے (Sensitive) والے ادارے جہاں باقاعدہ مساجد ہیں، جن کی تاسیس ہی مسجد کے لئے کی گئی ہے، وہاں باجماعت پنج وقتہ اور جمعہ کی نماز پڑھنے سے مسجد اور جماعت دونوں کا ثواب ملے گا، لیکن جہاں باقاعدہ فرش سے مسجد قرار دیئے بغیر، کوئی کمرہ، ہال یا عمارت کا کوئی حصہ وقتی ضرورت کے تحت نماز کے لئے مختص کر دیا گیا تو وہاں باجماعت نماز پنج وقتہ اور جمعہ کی ادائیگی تو ہو جائے گی لیکن مسجد کا ثواب نہیں ملے گا۔

ٹی وی، ویڈیو کا مسئلہ

ٹی وی، ویڈیو، وی سی آر، وی سی پی وغیرہ کے استعمال اور استفادے کے بارے معاصر علماء کی دو آراء ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا استعمال بالکل ناجائز ہے، یہ رائے ہندوستان کے ممتاز عالم دین علامہ اختر رضا خان بریلوی اور ان کے ہم خیال علماء کی ہے۔ دوسری رائے ہندوستان کے ممتاز عالم دین مولانا مدنی میاں، مفتی محمد وقارالدین قادری مرحوم اور ان کے ہم خیال علماء کی ہے۔ چنانچہ مفتی محمد وقارالدین قادری مرحوم سے جب ان آلات کی مرمت اور کاروبار کے جواز اور استعمال کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواباً فرمایا کہ: ''ان کے جائز و ناجائز ہونے کا حکم فی نفسہ ان پر نہیں بلکہ ان کے استعمال پر ہوتا ہے۔ ان کا جیسا استعمال ہوگا، ویسا ہی حکم ہوگا، لہٰذا ان کی مرمت کر کے روزی کمانا جائز ہے''۔ مزید لکھتے ہیں: ''ریڈیو اور ٹی وی مشینی آلات ہیں، ان سے جائز کام بھی لئے جاتے ہیں اور ناجائز کام بھی، یہ صرف حرام کے لئے استعمال نہیں ہوتے اور نہ محض غلط کاموں کے لئے بنائے جاتے

ہیں، جس طرح چھری اور بندوق وغیرہ جیسے آلات سے جہاد بھی کیا جاتا ہے اور اپنے ذاتی کاموں اور شکار میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور انہی سے انسان کو قتل کرنے والا فعل قبیح بھی کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جو آلات صرف معصیت کے لئے متعین نہ ہوں، ان کا بنانا اور مرمت کرنا جائز ہے تو ریڈیو اور ٹی وی کی مرمت کرنا بھی جائز ہے، اسی طرح اس کی مرمت کی اجرت بھی حلال ہے۔ ٹی وی کے ایسے پروگرام جو دینی ہوں اور جن میں عورت یا اس کی آواز نہ ہو۔ دیکھنے اور سننے میں کوئی حرج نہیں''۔ (وقار الفتاویٰ صفحہ 218-219)

شیخ لدھیانوی صاحب سے دریافت کیا گیا کہ دولت پور کی مسجد میں تقریب نکاح کی مووی (Movie) بن رہی تھی، کسی نے امام صاحب سے کہا کہ منع کریں، امام صاحب نے کہا کہ حرمین طیبین میں بھی مووی بنتی ہے۔ شیخ نے ''جنگ'' کے صفحات پر جواب دیا کہ امام کا یہ فعل حرام ہے اور اس امام کی اقتدا میں نماز جائز نہیں ہے۔ شیخ نے دولت پور کے امام کا مسئلہ تو بیدھڑک بتا دیا، لیکن امام حرم کے پیچھے نماز کے جواز یا عدم جواز کا مسئلہ نہیں بتایا۔ کسی بھی عالم ربانی کو کسی طمع و لالچ اور خوف و خطر کے بغیر پورا مسئلہ بتانا چاہیے۔ دولت پور کا امام تو کسی وڈیرے یا کمیٹی کا ملازم و ماتحت ہوگا، جب کہ امام حرم تو ''مدیر العام لشؤون الحرمین الطیبین''، یعنی ڈائریکٹر جنرل برائے امور حرمین طیبین ہیں، اور ان کا عہدہ مملکت کے نائب وزیر کے برابر ہے، وہ مملکت کی جانب سے امور حرمین کے مجاز و مختار ہیں۔ شریعت میں حلال و حرام کا معیار دولت پور اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے لئے ایک ہے۔ بلکہ اگر مسجد الحرام میں نیکی کا اجر دوسرے مقامات کے بہ نسبت ایک لاکھ گنا ہے تو گناہ کا وبال بھی زیادہ ہوگا۔ لیکن بعض لوگوں کے نزدیک معیار حق و باطل، جائز و ناجائز افراد اور مقامات کے اعتبار سے بدل جاتا ہے یا ممکن ہے مصلحتیں حائل ہو جاتی ہوں۔

بقول ولی دکنی

پہلے وہ آپ کہہ کر بلاتے تھے، اب وہ تو کہتے ہیں
وقت کے ساتھ خطابات بدل جاتے ہیں

پہلے تھے میخانہ میں، اب ہیں مسجد میں ولی
عمر کے ساتھ مقامات بدل جاتے ہیں

اسی طرح حرمین طیبین کے مختلف ائمہ عظام کی رنگین تصاویر کے البم بھی موجود ہیں، جو ان کی مرضی سے وقتاً فوقتاً جاتی رہیں۔ لدھیانوی صاحب ذرا ہمت کر کے ہمیں بتائیں کہ ان کے نزدیک حکم شرعی کیا ہے؟ افراد کے اعتبار سے شرعی احکام کی حیثیت اور جائز و ناجائز کا معیار بدلنے کی رسم علماء یہود نے ایجاد کی تھی، جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ:31)

"انہوں نے اپنے دینی پیشواؤں اور راہبوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا رب بنا لیا"۔

اس لئے لدھیانوی صاحب سے ہماری گزارش ہے کہ دین و شریعت کا مسئلہ وہ بتائیں جس کا اطلاق وہ یکساں طور پر ہر ایک اور ہر جگہ کر سکیں۔

اختلاف امت اور صراط مستقیم

شیخ لدھانوی جنگ کے فورم کو اپنی کتاب "اختلاف امت اور صراط مستقیم" کی تشہیر کے لئے استعمال کرتے ہیں اور مختلف سوالات کے جوابات میں لکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ میری کتاب میں مطالعہ کریں۔

اس کتاب میں شیخ لدھیانوی کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ مختلف مسالک و مکاتب فکر کے عقائد و نظریات تحریر کرتے ہیں اور پھر اپنے نقطہ نظر سے ان کی تردید کرتے ہیں۔ اس کتاب میں موصوف نے اہل سنت و جماعت جنہیں وہ بزعم خویش بریلوی سے تعبیر کرتے ہیں، پہ یہ ظلم عظیم کیا ہے کہ پہلے اپنی طرف سے فرضی عقائد ان کی طرف منسوب کیے ہیں اور پھر اپنے انداز سے ان کی تردید کی ہے۔ کسی کی طرف مسلمہ ثبوت کے بغیر کوئی بات منسوب کرنا شرعاً کذب، تہمت اور بہتان کے زمرے میں آتا ہے جو گناہ کبیرہ ہے، تاہم یہاں نمونے کے طور پر ایک مثال ذکر کر رہے ہیں:

شبیہ بیت اللہ کا طواف

لدھیانوی صاحب اپنی کتاب ''اختلاف امت اور صراط مستقیم'' کے صفحہ نمبر 92 پر نمبر (10) کے تحت لکھتے ہیں: ''اب میں اس ''عید میلاد النبی'' کا آخری کارنامہ عرض کرتا ہوں، کچھ عرصہ سے ہمارے کراچی میں ''عید میلاد النبی'' کے موقع پر آنحضرت ﷺ کے روضہ اطہر اور بیت اللہ کی شبیہ بنائی جاتی ہے اور جگہ جگہ بڑے چوکوں میں سانگ بنا کر رکھے جاتے ہیں۔ لوگ ان سے تبرک حاصل کرتے ہیں اور ''بیت اللہ'' کی خود ساختہ شبیہ کا طواف بھی کرتے ہیں اور یہ سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں اور علماء کی نگرانی میں کرایا جارہا ہے۔ فیا اسفاہ!''۔

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ علماء اہلسنت کے نزدیک شبیہ کا حکم اصل کا نہیں ہے، اور مزید یہ کہ ہمارے نزدیک صرف مسجد الحرام، مکہ مکرمہ میں بیعت اللہ کا طواف عبادت ہے۔ خود مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں بھی ''بیت اللہ'' کی شبیہ بنا کر اس کا طواف کرنا عبادت نہیں ہے، چہ جائیکہ کراچی یا دنیا کے کسی اور مقام پر ایسا کیا جائے۔ اہل سنت و جماعت کے کسی ثقہ و مستند عالم دین یا مفتی نے نہ ایسی بات کہیں لکھی اور نہ ہی کبھی ایسی بات کہی اور نہ کسی مستند عالم دین نے ان بدعات کی نگرانی کی ہے، لہٰذا یہ سراسر بہتان اور افتراء ہے اور لدھیانوی صاحب کو اس سے رجوع کرنا چاہیے۔ اگر کوئی کہے کہ ایسا ہوتا تو ہے۔ اگر بفرض محال کہیں ایسا ہو رہا ہے تو کیا کسی کے عقائد ثابت کرنے اور کسی کی طرف عقائد منسوب کرنے کا شرعی طریقہ یہی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی عیسائی، یہودی یا ہندو یہ کہے کہ اسلام میں شراب بنانا، بیچنا اور پینا جائز ہے کیونکہ میں نے خود دیکھا ہے لنڈن کے فلاں مقام پر ایک مسلمان شراب پی رہا تھا اور ایک مسلمان شراب بیچ رہا تھا اور فلاں مقام پر فلاں مسلمان کا شراب کا کارخانہ ہے۔

قبروں پر منتیں اور چڑھاوے

(شیخ محمد یوسف لدھیانوی نے اپنی کتاب ''اختلاف امت اور صراط مستقیم'' کے

صفحات 76,75 پر مندرجہ بالاعنوان کے تحت جو کچھ لکھا ہے، وہ من وعن درج ذیل ہے):

بہت سے لوگ نہ صرف اولیاء اللہ سے مرادیں مانگتے ہیں، بلکہ ان کی منتیں بھی مانتے ہیں کہ اگر ان کا فلاں کام ہو جائے تو ان کی قبر پر غلاف یا شیرینی چڑھائیں گے یا اتنی رقم ان کی نذر کریں گے۔ اس سلسلہ میں چند مسائل معلوم کر لینا ضروری ہے۔

(۱) منت ماننا و نذر و نیاز دینا عبادت ہے اور غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں۔ ہمارے حنفیہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

''وَاعْلَمْ اَنَّ النَّذْرَ الَّذِیْ یَقَعُ لِلْاَمْوَاتِ مِنْ اَکْثَرِ الْعَوَامِ وَمَا یُؤْخَذُ مِنَ الدَّرَاھِمِ وَالشَّمْعِ وَالزَّیْتِ وَنَحْوِھَا اِلٰی ضَرَائِحِ الْاَوْلِیَاءِ الْکِرَامِ تَقَرُّبًا اِلَیْھِمْ فَھُوَ بِالْاِجْمَاعِ بَاطِلٌ وَ حَرَامٌ. مَالَمْ یَقْصِدُوْا صَرْفَھَا لِفُقَرَاءِ الْاَنَامِ، وَقَدْ ابْتُلِیَ النَّاسِ بِذٰلِکَ لَا سِیَّمَا فِیْ ھٰذِہِ الْاِعْصَارِ وَقَدْ بَسَطَہُ الْعَلَامَۃُ قَاسِمُ فِیْ شَرْحِ دُرَدِ الْبِحَارِ''۔ (درمختار قبیل باب الاعتکاف)

''جاننا چاہیے کہ اکثر عوام کی طرف سے مردوں کے نام کی جو نذر مانی جاتی ہے اور اولیائے کرام کی قبروں پر روپے پیسے، شمع تیل وغیرہ۔ ان کے تقرب کی خاطر جو لائے جاتے ہیں وہ بالاجماع باطل اور حرام ہے۔ اور لوگ اس میں بکثرت مبتلا ہیں خصوصاً اس زمانے میں۔ اور اس مسئلہ کو علامہ قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے دررالبحار'' کی شرح میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے''۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ'' ایسی نذر کے باطل اور حرام ہونے کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ یہ نذر مخلوق کے لئے ہے۔ اور مخلوق کے نام کی منت ماننا جائز نہیں۔ کیونکہ نذر عبادت ہے۔ اور عبادت مخلوق کی نہیں ہوتی...... دوم یہ کہ جس کے نام کی منت مانی گئی ہے وہ میت ہے۔ اور مردہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا...... سوم یہ کہ اگر نذر ماننے والے کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا مرا ہوا شخص بھی تکوینی امور میں تصرف رکھتا ہے تو اس کا یہ عقیدہ کفر ہے (ردالمحتار صفحہ 139) (اختلاف امت اور صراط مستقیم صفحہ 76,75)

ترجمہ میں علمی خیانت

مذکورہ بالا اقتباس کے پیراگراف نمبر (1) میں علامہ علاء الدین حصکفی کی کتاب ''الدر المختار'' کی عربی عبارت دی گئی ہے جو بالکل درست طور پر نقل کی گئی ہے، لیکن اس کے اردو ترجمے میں بہت بڑی علمی خیانت کا ارتکاب کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سہواً یا اتفاقی غلطی نہیں ہے بلکہ دانستہ طور پر ایسا کیا گیا ہے، جس کا مقصد اپنی طرف سے مزعومہ (Pretended) عقائد کو اہلسنت و جماعت کی طرف منسوب کر کے عامۃ المسلمین کو ان سے بدظن کرنا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی کی عربی عبارت میں ایک جملہ ہے: ''**مالم یقصدوا صرفها لفقرآء الانام**''۔ صاحب درمختار نے نذر باطل میں سے اس صورت کو مستثنیٰ (Exempt) کر دیا ہے، جو باطل وحرام کے زمرے میں نہیں آتی بلکہ شرعاً بالکل جائز ہے اور وہ یہ ہے کہ:

''عوام اولیاء اللہ کی قبروں پر جو نقد رقوم یا شمع و تیل وغیرہ لاتے ہیں، اگر وہ اس نیت سے لائے جاتے ہیں کہ (اللہ کے) نادار بندوں پر خرچ کیے جائیں یا وہ ان سے فائدہ اٹھائیں تو یہ بالکل جائز ہے اور الحمدللہ اہلسنت و جماعت کا یہی عقیدہ ونظریہ ہے۔

علامہ محمد امین ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ''ردالمحتار'' میں درمختار کی مذکورہ بالا عبارت کی تشریح کرتے ہوئے جو حرام و باطل ہونے کی صورت لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص صاحب قبر ولی اللہ کو مخاطب کر کے یہ کہے: ''اے بزرگ محترم! اگر میرا (فلاں) گمشدہ عزیز (سلامتی کے ساتھ) واپس آ گیا یا میرا (فلاں) مریض شفایاب ہو گیا یا میرا (فلاں) کام ہو گیا، تو یہ سونا چاندی یا کھانا یا شمع و تیل آپ کے لئے ہے، تو یہ نذر باطل و حرام ہے اور آگے علامہ شامی نے اس کے حرام ہونے کی وجوہ تحریر فرمائی ہیں، جنہیں جناب شیخ محمد یوسف لدھیانوی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، اسی عبارت میں متصلاً علامہ شامی نے اولیاء اللہ کے مزارات پر دی جانے والی نذر کے جائز ہونے کی وجوہ بھی لکھ دی ہیں اور علمی دیانت وامانت کا تقاضا یہ تھا کہ پوری عبارت نقل کی جاتی، پورا مفہوم ترجمے میں بیان کر دیا جاتا تاکہ قارئین کو جائز اور ناجائز دونوں صورتیں معلوم ہو جاتیں اور علامہ شامی کا پو

موقف سامنے آجاتا۔لیکن چونکہ اس سے جناب لدھیانوی کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ تو اہل سنت و جماعت کے عقائد و نظریات کو باطل ثابت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، اس لئے اپنے مطلب کے خلاف عبارت پر قینچی چلادی اور اسے قلمزد (Censor) کردیا، آیئے! ہم پہلے علامہ شامی کی محولا بالا عبارت درج کرتے ہیں اور پھر اس کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

''وَاعْلَمْ اَنَّ النَّذْرَ الَّذِیْ یَقَعُ لِلْاَمْوَاتِ مِنْ اَکْثَرِ الْعَوَامِ وَمَا یُوْخَذُ مِنَ الدَّرَاهِمِ وَالشَّمْعِ وَالزَّیْتِ وَنَحْوِهَا اِلٰی ضَرَائِحِ الْاَوْلِیَاءِ الْکِرَامِ تَقَرُّبًا اِلَیْهِمْ فَهُوَ بِالْاِجْمَاعِ بَاطِلٌ وَ حَرَامٌ.

مَطْلَبٌ فِی النَّذْرِ الَّذِیْ یَقَعُ لِلْاَمْوَاتِ مِنْ اَکْثَرِ الْعَوَامِ مِنْ شَمْعٍ اَوْ زَیْتٍ اَوْ نَحْوِهٖ. قَوْلُهٗ: (تَقَرُّبًا اِلَیْهِمْ) کَاَنْ یَقُوْلُ: یَاسَیِّدِیْ فُلَانٌ اِنْ رُدَّ غَائِبِیْ اَوْ عُوْفِیَ مَرِیْضِیْ اَوْ قَضَیْتُ حَاجَتِیْ فَلَکَ مِنَ الذَّهَبِ اَوِالْفِضَّةِ اَوِالطَّعْمِ اَوِ الشَّمْعِ اَوِ الزَّیْتِ، کَذَا (بحر) قَوْلُهٗ: (بَاطِلٌ وَ حَرَامٌ) لِوُجُوْهٍ: مِنْهَا اَنَّهٗ نَذْرٌ لِمَخْلُوْقٍ وَالنَّذْرُ لِلْمَخْلُوْقِ لَایَجُوْزُ، لِاَنَّهٗ عِبَادَةٌ وَالْعِبَادَةُ لَا تَکُوْنُ لِمَخْلُوْقٍ، وَمِنْهَا، اَنَّ الْمَنْذُوْرَ لَهٗ مَیِّتٌ وَالْمَیِّتُ لَا یَمْلِکُ، وَمِنْهَا: اَنَّهٗ اِنْ ظَنَّ اَنَّ الْمَیِّتَ یَتَصَرَّفُ فِی الْاُمُوْرِ دُوْنَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَاِعْتِقَادُهٗ ذٰلِکَ کُفْرٌ. اَللّٰهُمَّ اِلَّا اَنْ قَالَ: یَا اللّٰهُ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ اِنْ شَفَیْتَ مَرِیْضِیْ اَوْ رَدَدْتَ غَائِبِیْ اَوْ قَضَیْتَ حَاجَتِیْ اَنْ اُطْعِمَ الْفُقَرَآءَ الَّذِیْنَ بِبَابِ السَّیِّدَةِ نَفِیْسَةَ اَوْ الْاِمَامِ الشَّافِعِیِّ اَوِ الْاِمَامِ اللَّیْثِ اَوْ اَشْتَرِیْ حُصُرًا لِمَسَاجِدِهِمْ اَوْ زَیْتًا لِوُقُوْدِهَا اَوْ دَرَاهِمَ لِمَنْ یَقُوْمُ بِشَعَآئِرِهَا اِلٰی غَیْرِ ذٰلِکَ مِمَّا یَکُوْنُ فِیْهِ نَفْعٌ لِلْفُقَرَاءِ وَالنَّذْرُ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ۔ (ردالمحتار علی الدرمختار جلد 3 صفحہ 380-379 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، لبنان)

یعنی ہاں، یہ صورت بالکل جائز ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ: اے اللہ! اگر میرا (فلاں) مریض شفایاب ہوگیا یا میرا (فلاں) گمشدہ عزیز (سلامتی کے ساتھ) واپس آگیا یا میرا

(فلاں) کام ہو گیا تو میں تیرے نام کی نذر مانتا ہوں کہ سیدہ نفیسہ یا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یا امام ابواللیث کے مزار پر جو فقراء ہیں، میں انہیں کھانا کھلاؤں گا یا ان کی مساجد کے لئے چٹائیاں (دریاں) خرید کر دوں گا یا وہاں (پر جو چراغ جلائے جاتے ہیں، ان) کے لئے تیل خرید کر دوں گا، یا جو لوگ وہاں کا انتظام وانصرام کرتے ہیں، انہیں نقد رقم دوں گا، وغیرہ (الغرض) نذر اللہ عزوجل کے لئے ہو اور اس سے فائدہ (وہاں کے) فقراء کو پہنچانا مقصود ہو تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔ اور علامہ حصکفی نے بھی اپنی استثنائی عبارت میں نذر کے مال کو خرچ کرنے کا جائز محل ومصرف بیان کیا ہے اور وہ ایسے مستحقین ہیں جو ان مساجد یا مزارات کے پاس رہتے ہیں، تو ان پر نذر کی ان رقوم کا خرچ کرنا جائز ہے، البتہ نذر کے اس مال کا ایسے متولی وسجادہ نشین پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے جو نادار نہیں ہے بلکہ مالدار ہے۔ چنانچہ آگے چل کر صفحہ 78 پر جناب لدھیانوی نے خود صورت جواز کو تسلیم کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

(۴) ''اور اگر کسی شخص نے منت اللہ کی مانی ہو اور محض اس بزرگ کی روح کا ایصال ثواب مقصود ہو یا وہاں کے فقراء کو نفع پہنچانا مقصود ہو تو اس کو حرام اور شرک نہیں کہا جائے گا''۔ لیکن پھر صفحہ 79 پر مسلمانوں کی نیت پر حملہ آور ہوتا ہے اور لوگوں کی نیتوں اور دلوں کے احوال کا فیصلہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں، جس کا شریعت نے انہیں حق نہیں دیا، کیونکہ شریعت میں ظاہر حال پر حکم لگایا جاتا ہے اور باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے، مگر جناب لدھیانوی حد شرعی سے تجاوز کر کے لکھتے ہیں:

''مگر مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ بزرگوں کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں، ان کی یہ نیت ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ وہ یہ کہہ کر ''ہم خدا کی منت مان رہے ہیں اور بزرگوں کو صرف ایصال ثواب مقصود ہوتا ہے، اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں''۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

''اے مومنو! بہت سی بدگمانیوں سے اجتناب کرو، بے شک بعض بدگمانیاں

گناہ (کا باعث) ہیں''۔

(الحجرات:12)

اور ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے:

اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْث

''(لوگوں کے بارے میں) بدگمانی کرنے سے بچے رہو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

صفات باری تعالیٰ کا مظہر بننے کا مفہوم

ہمارے ایک شاگرد ڈاکٹر حافظ قاری عطاء المصطفیٰ جمیل راٹھور نے ہمارے حوالے سے جامع مسجد قبا کرمانوالہ، بلاک نمبر 1 گلستان جوہر میں خطاب جمعہ کے دوران حدیث کے حوالے سے یہ بیان کیا کہ بندہ تقرب الٰہی کی منزلیں طے کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کی صفات جلیلہ کا مظہر بن جاتا ہے، اس پر جناب کامران احمد انصاری گلستان جوہر کراچی نے ایک مفصل اعتراض تحریری شکل میں ان پر وارد کر دیا کہ جو کچھ آپ بیان کر رہے ہیں، یہ تو شرک کے زمرے میں آتا ہے، پہلے حدیث پاک ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ: مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اَحْبَبْتُهٗ فَکُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ مَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَکْرَهُ مَسَاءَتَهٗ وَلَا بُدَّ لَهٗ مِنْهُ (رواہ البخاری بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح باب ذِکْرُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالتَّقَرُّبُ اِلَیْهِ)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: جو شخص میرے کسی ولی سے عداوت کرے، میں اس کے خلاف اعلان

جنگ کرتا ہوں، اور بندہ اپنے جس عمل سے، جو مجھے محبوب ترین ہے، میرے قریب ہوتا ہے، وہ اس پر میرے عائد کردہ فرائض ہیں، اور (ادائیگی فرائض کے بعد) میرا بندہ نوافل ادا کرتے کرتے مسلسل میرے قریب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں، پھر میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے کسی چیز کا سوال کرے تو میں ضرور اسے عطا کرتا ہوں، اور اگر وہ (کسی چیز کے شر سے) میری پناہ مانگے تو میں ضرور اسے پناہ دیتا ہوں، اور میں جس چیز کے کرنے کا ارادہ فرمالوں تو پھر اس میں تاخیر نہیں کرتا، سوائے مومن کی جان لینے کے موقع پر، کہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اسے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتا اور (بہر کیف) موت کا قانون قدرت تو اس پر نافذ ہونا ہی ہے"۔

اس حدیث قدسی کا ایک مفہوم جو عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے یہ ہے: کہ اللہ تعالیٰ کا بندے کے کان، آنکھیں، ہاتھ اور پیر بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنی صلاحیتوں (سماعت، بصارت، گرفت اور رفتار) اور ان اعضاء و جوارح (کان، آنکھیں، ہاتھ اور پیر) کو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کاموں میں استعمال کرتا ہے اور اس کے محرمات، ممنوعات اور مکروہات سے انہیں بچائے رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک مفہوم ہے اور اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر عطاء المصطفیٰ جمیل راٹھور صاحب نے ہمارے حوالے سے اس حدیث کا مفہوم یہ بیان کیا کہ بندہ فرائض کی ادائیگی سے کما حقہ، عہدہ برا ہونے کے بعد، عبادات نافلہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے تقرب کی منزلیں طے کرتے کرتے اس کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے اور وہ اللہ کے نور تجلی سے دیکھتا ہے، سنتا ہے وغیرہ۔ اس مفہوم پر کامران احمد انصاری صاحب نے شرک کا فتویٰ صادر فرما دیا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ حدیث کا یہ مطلب و مفہوم کس عالم جلیل نے کہاں بیان کیا ہے، تو میں نے ان کی تشفی کے لئے یہ سطور سپرد قلم کی ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر بحث حدیث مبارک کا سیاق وسباق یہ ہے کہ بندہ فرائض کی ادائیگی سے کما حقہ عہدہ برا ہونے کے بعد نوافل ادا کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کے تقرب کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ جل شانہ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں، بعد میں آنے والی عبارت "مقام محبوبیت باری تعالیٰ" پر فائز ہونے کا ثمرہ اور اکرام واعزاز ہے۔

چنانچہ حدیث قدسی کے کلمات مبارکہ یہ ہیں:

"فَاِذَا اَحْبَبْتُهُ فَكُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا" الخ

"پس جب میں اپنے بندے کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ کام کرتا ہے اور میں اس کے پیر ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے" الخ

مقام غور یہ ہے کہ اگر اس کے اعضاء و جوارح اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع نہ ہوتے تو وہ مقام محبوبیت پر کیسے فائز ہوتا؟ یہ اعزاز و اکرام جو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما رہا ہے، یہ تو "مقام محبوبیت باری تعالیٰ" پر فائز ہونے کا ثمرہ ہے۔ لہٰذا جو مفہوم حدیث قدسی کا آپ بیان کر رہے ہیں، وہ حدیث رسول اللہ ﷺ کا منطوق نہیں ہے۔

باقی ہم یہ بات نہ کہتے ہیں اور نہ اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جلیلہ اس میں منتقل ہو جاتی ہیں یا اس میں حلول کر جاتی ہیں، بلکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ وہ بندۂ محبوب صفات الٰہی کا مظہر بن جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن وعطا سے خرق عادت تصرفات کر لیتا ہے، ایسے خرق عادت امور کا ظہور اگر رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات سے ہو تو شریعت کی اصطلاح میں اسے "معجزہ" کہتے ہیں اور کسی ولی اللہ اور عبد صالح کی ذات سے ہو تو اسے "کرامت" کہتے ہیں۔ مخلوق کا صفات الٰہی کا مظہر ہونا، قرآن مجید سے ثابت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (القصص)

(از شیخ اشرف علی تھانوی): "سو جب وہ اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو اس میدان کی داہنی جانب سے (جو کہ موسیٰ کی داہنی جانب تھی) اس مبارک مقام میں ایک درخت میں سے آواز آئی کہ:

"اے موسیٰ میں رب العالمین ہوں"۔

تو آپ کیا تاویل کریں گے کہ معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ نے درخت میں حلول کرلیا تھا؟ یا یہ کہ وہ درخت اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا مظہر بن گیا تھا۔

شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند شیخ انور شاہ کشمیری فیض الباری (شرح صحیح بخاری جلد 4 صفحہ 429) پر زیر بحث حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب درخت سے "میں اللہ ہوں" کی آواز آسکتی ہے تو نفلی عبادت کرنے والے کا کیا حال ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سمع وبصر کا مظہر نہ ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے مقرب بندوں کے سمع وبصر ہو جانا ایسی صورت میں کیونکر مستبعد ومحال ہوسکتا ہے جب کہ وہ ابن آدم جو رحمٰن کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے، شرف وکمال میں شجر موسیٰ سے کسی طرح کم نہیں ہے"۔

شیخ انور شاہ کشمیری کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"فَاِذَا صَحَّ الشَّجَرَةَ يُنَادِيْ فِيْهَا بِاَنِّيْ اَنَا اللّٰهُ، فَمَا بَالُ الْمُتَصَرِّفِ بِالنَّوَافِلِ اَنْ لَّا يَكُوْنَ اللّٰهُ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ؟ كَيْفَ وَاَنَّ ابْنَ آدَمَ الَّذِيْ خُلِقَ عَلٰى صُوْرَةِ الرَّحْمٰنِ لَيْسَ بِاَدْوَنَ مِنْ شَجَرَةِ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ"۔

تو جناب کامران احمد انصاری صاحب

آپ کا کیا خیال ہے، دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث انور شاہ کشمیری بندے کو صفات الٰہیہ کا مظہر مان کر عقیدۂ توحید سے انکار کر رہے ہیں یا شرک کی تعلیم دے رہے ہیں؟

اسی حدیث مبارک کی شرح میں امام المفسرین امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر جلد 5

نمبر 427 پر لکھتے ہیں:

اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مقربین کی آنکھوں، کانوں بلکہ تمام اعضاء میں غیر اللہ کے لئے کوئی حصہ باقی نہیں رہا، اس لئے کہ اگر یہاں اللہ تعالیٰ کے غیر کے لئے کوئی حصہ باقی رہتا تو اللہ تعالیٰ یہ کبھی نہ فرماتا کہ میں اس کی سمع اور بصر ہو جاتا ہوں"۔

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

"اور اس لئے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم میں نے خیبر کا دروازہ جسمانی قوت سے نہیں بلکہ ربانی قوت سے اکھاڑا تھا، اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس وقت حضرت علی کی نظر عالم اجساد سے منقطع ہو چکی تھی اور ملکی قوتوں نے حضرت علی کو عالم کبریا کے نور سے چمکا دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کی روح قوی ہو کر ارواح ملکیہ کے جواہر سے مشابہ ہو گئی تھی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں وہ قدرت حاصل ہو گئی جو ان کے غیر کو حاصل نہ تھی۔ اور اس طرح جب کوئی بندہ نیکیوں پر دوام اختیار کرتا ہے تو وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے "کُنْتُ لَهٗ سَمْعًا وَبَصَرًا" فرمایا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے جلال کا نور اس کی سمع ہو جاتا ہے تو وہ قریب اور دور کی آواز کو سن سکتا ہے اور جب نور (الٰہی) اس کی بصر ہو جاتا ہے تو وہ دور و نزدیک کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے اور جب یہ نور (جلال) اس کا ہاتھ ہو جاتا ہے تو وہ بندہ مشکل اور آسان، قریب اور دور ہر طرح کے امور میں تصرف کرنے پر قادر ہو جاتا ہے"۔

ہمارے نزدیک "مظہریت باری تعالیٰ" کا یہی مفہوم ہے اور اکابر امت کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے اور یہ شرک و بدعت نہیں بلکہ عین توحید ہے۔ اور بندے کو یہ کمالات اور تصرفات اللہ تعالیٰ کے اذن اور عطا سے حاصل ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران:49)

"میں اللہ کے اذن سے پیدائشی نابینا اور برص کے مریض کو شفایاب کرتا ہوں اور مرے کو زندہ کرتا ہوں"۔

اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ (آل عمران:49)

''اور میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی صورت بناتا ہوں، پھر میں اس میں پھونکتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے (اڑتا ہوا) پرندہ بن جاتا ہے''۔

یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام شفا دینے کی نسبت، زندہ کرنے کی نسبت اور پیدا کرنے یا بنانے کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں مگر چونکہ وہ اذن الٰہی سے مظہر صفات ربانی بن کر یہ تصرفات کرتے ہیں، اس لئے یہ عین توحید ہے۔

ضروری یادداشت

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

کی زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی مؤثر تصنیف

تفسیر سورۃ النسآء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم تفسیر، اندازِ بیان مؤثر و دلکش
قدیم و جدید اہم تفاسیر کا نچوڑ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

جلد دوم

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور • کراچی • پاکستان

إن هذا العلم دين فانظروا عمن تأخذون دينكم (مسلم)

یہ علم دین ہے، تمہیں خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد دوم

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد دوم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
تصحیح	مولانا فیصل ندیم احمد قادری (ایم اے، ایل ایل بی، بی ایڈ)
طبع بار	ہفتم اکتوبر 2011ء
	ہشتم اکتوبر 2012ء
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ5
قیمت	=/400روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔37221953 فیکس:۔042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔37247350۔فیکس042-37225085

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔021-32212011-32630411۔فیکس:۔021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میں نے پبلشر "ضیاء القرآن پبلی کیشنز"

سے شائع کردہ کتاب

"تفہیم المسائل (حصہ دوم)"

تالیف وتصنیف

پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب

کے پروف پوری توجہ سے پڑھے ہیں، میرے علم کے

مطابق اس کتاب میں درج قرآنی آیات کے الفاظ اور

اعراب غلطیوں سے مبرا ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

فقط

حافظ محمد ابراھیم فیضی

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ

وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ مَا فِیْ جَمِیْعِ الْقُرْاٰنِ حَرْفًا حَرْفًا وَّبِعَدَدِ کُلِّ حَرْفٍ اَلْفًا اَلْفًا

صفحہ نمبر	مضمون
	انتساب
5	حدیثِ دل
9	**کتاب العقائد**
11	اللہ تعالیٰ کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرنا
14	ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
15	رسول اللہ ﷺ کو سرورِ کائنات، سرورِ کونین اور سیدُ المرسلین کہنا
21	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''اے حبیب!'' کہنے کا جواز
22	کیا ''درودِ تاج'' پڑھنا شرک ہے؟
24	جنات نظر کیوں نہیں آتے
25	گمراہ پیر
27	محاورہ کلمۂ کفر ہے
28	روزانہ ۷۸۶ مرتبہ بسم اللہ پڑھنے پر خواہش کا پورا ہونا
29	کیا رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت کعبہ جھکا تھا، جبریل امین علیہ السلام نے ہر ستر ہزار سال بعد طلوع ہونے والا ستارہ بہتر ہزار مرتبہ دیکھا تھا، اس کا حوالہ
30	کعبے میں بت سرنگوں ہو گئے
32	اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق، ایک دلچسپ عقلی سوال
38	کسی بندے کے بارے میں کہنا ''(العیاذ باللہ) ہمارے اللہ وہ ہیں''
39	تخلیق ارض وسماء سے پہلے عرش کہاں تھا

41	کافرملت پر معلق کر کے قسم کھانا
42	جنت کی حوریں کیا ہیں اور نیک خواتین کے لئے کیا ہوگا
44	ناگہانی مصیبت کا نزول
46	انتقال کرنے والے خواب میں نظر آتے ہیں
46	''میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں''، کیا یہ کلمۂ کفر ہے
51	انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد کتنی ہے
54	قیامت کے دن کس کی نسبت سے پکارا جائے گا؟
58	مسلکی اختلافات سے ذہنی اضطراب
62	**کتاب الطہارت**
65	محض خواب دیکھنے پر غسل کا وجوب
65	ناپاک بدن پر پاک کپڑے
65	ناپاک کپڑا پہننے سے کیا بدن ناپاک ہو جاتا ہے
66	جلد سے جڑے ہوئے مصنوعی بالوں کی طہارت کا مسئلہ
66	حضرت علی ﷜ کا حضرت فاطمہ کو غسل دینا (وضاحتی نوٹ)
68	نفاس کی مدت
69	کیا ڈیڑھ سالہ بچی کے پیشاب سے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں
69	خواتین کا ایام مخصوص میں مہندی لگانا
69	گلی کوچوں کے ناپاک پانی کا بدن یا کپڑوں پر لگنا
71	**کتاب الصلوٰۃ**
73	مسجد میں داخل ہوتے وقت اونچی آواز سے سلام کرنا
77	گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں نماز کا تذکرہ

79	تائب کی امامت کا حکم
81	امام کا صفیں درست کرنے کی ہدایت کرنا
82	اوّابین کے نوافل پڑھنے کا طریقہ
84	نماز میں سورت ملانا بھول گیا
84	نماز میں سہو کے مسائل
86	مقتدی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے
87	اذان یا اقامت میں کوئی کلمہ رہ جائے تو کیا حکم ہے
88	امام مقدار واجب تلاوت کر لے اور اس کے بعد اس سے غلطی ہو جائے تو مقتدی لقمہ دے سکتا ہے
89	نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر دعا کرنا
90	مقتدی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے
90	غیر مسلم ملک میں نماز باجماعت، جمعہ اور روزے کا مسئلہ
91	ناپاکی کی حالت میں نماز پڑھنا
91	بڑی مسجد کی تعریف
92	فاسق کی اذان
93	قضاء نمازوں کے ہوتے ہوئے صلوٰۃ التسبیح پڑھنا
94	''بکثرت قضا نمازیں باقی ہوں تو ان کی ادائیگی کے لئے سنن مؤکدہ چھوڑ سکتے ہیں'' اس مسئلے پر ایک فتویٰ اور اس کا جواب
101	نماز کے لئے کپڑے اڑسنے، موڑنے اور سمیٹنے اور آستینیں چڑھا کر نماز پڑھنے کے مسائل
104	امام کا مسجد میں ہوائی چپل پہن کر پھرنا

جمعہ کی سنتیں	106
مسافر قصر نماز کہاں سے شروع کرے	107
قصر واجب ہے	108
سفر میں سنتِ مؤکدہ پڑھنے کا مسئلہ	108
فجر کی قضاء ظہر میں پڑھنا	108
دعا کے وقت ہاتھ کیسے رکھے جائیں	109
نماز میں کوئی سورت دوبارہ پڑھنا	111
مسبوق اپنی بقیہ نماز کس طرح ادا کرے؟	111
نوافل تہجد کی جگہ قضاء پڑھنا	112
وضو اور نماز کے باطل ہونے کا غلط مسئلہ	113
سفر کی قضاء حضر میں اور حضر کی قضاء سفر میں	114
کیا توبہ کے بعد بھی قضائے عمری پڑھنا ضروری ہے؟	114
صلوٰۃ التسبیح باجماعت پڑھنا	115
نمازِ عید کا خطبہ سننا	115
تارکُ الصلوٰۃ کا حکم	116
ایک دکاندار یا کاروبار سے وابستہ مختلف افراد کا باری باری مختلف مساجد میں نمازِ جمعہ پڑھنا	117
نوافل بیٹھ کر پڑھنا	118
سورۂ فاتحہ کی آیت کا چھوٹ جانا	119
نماز باجماعت میں دُعاء قنوت کا رہ جانا	120
بیت اللہ کی طرف سجدہ کرنے اور حجرِ اسود کو بوسہ دینے پر صیہونیوں کا اعتراض	120

123	مسجد اور اس سے ملحقہ مدرسے کو دانستہ بم سے اڑانے والوں کا شرعی حکم
126	قرآن اور تلاوتِ قرآن کے آداب
128	نماز کے اندر قرأت میں غلطی کا مسئلہ
129	مستحب پر دوام
130	مسجد نبوی ﷺ میں چالیس نمازوں کی فضیلت
131	سلام پڑھنے کی منت
133	نماز با جماعت کی صف بندی میں بچوں کا مقام
137	صلوٰۃِ قصر کا مسئلہ
139	سنتوں کی قضا
140	مرضِ ریاح میں نماز کی ادائیگی
141	قرآن کی تلاوت کے دوران ''ں'' آجائے تو کس طرح پڑھیں
141	عورتوں کی جماعت
142	سجدۂ تلاوت بھول جائیں تو
142	ایک جگہ پنج وقتہ نماز ادا کی جارہی تھی، اب قریب مسجد بن گئی تو
142	نماز میں قصر، وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت کے مسائل
151	**کتاب الجنائز**
151	اپنے یا احباب کیلئے زندگی میں قبر تیار کرنا
151	تدفین کے بعد میت کا قبر سے نکالنا
153	نمازِ جنازہ کا سلام ہاتھ باندھے ہوئے پھیرے یا ہاتھ چھوڑ کر
154	متعدد جنازے ایک ساتھ کیسے پڑھے جائیں
155	دعاء بعد الجنازہ

	کتاب الزکوٰۃ

163	زکوٰۃ: اہمیت، فضیلت، مسائل
163	زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لئے قرآنی وعیدیں
167	زکوٰۃ کی تشخیص، ادائیگی اور مصارف کے پیچیدہ مسائل
167	زکوٰۃ کا مفہوم
167	وجوبِ زکوٰۃ
167	نصابِ زکوٰۃ
168	حولانِ حول کا مفہوم
168	اموالِ تجارت پر زکوٰۃ
169	صنعت کاروں کی تشخیص
169	تشخیصِ زکوٰۃ کے وقت واجب الادا قرض کا مسئلہ
169	طویل میعادی قرض اور صنعتی قرض کا مسئلہ
170	مکان، دکان، فلیٹس اور پلاٹوں پر زکوٰۃ
171	استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ
172	بچوں کی شادی کے لئے مختص زیورات پر زکوٰۃ
172	حج کے لئے جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ
172	پھنسا ہوا قرض زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہوتا
172	زکوٰۃ کہاں صَرف کی جائے؟
173	زکوٰۃ کا سب سے اہم شعبہ
174	مدارس تعلیم القرآن
174	کمیونٹیز اور برادریوں کے رفاہی فنڈ

مساجد کی تعمیر و مصارف پر زکوٰۃ خرچ کرنا	174
ہسپتالوں میں زکوٰۃ سے نادار مریضوں کا علاج	175
جامعات کے مستحق طلبہ کی اعانت	175
محض رقم الگ کر دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی	176
دورانِ سال زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی	176
زکوٰۃ فنڈ سے قرضِ حسن	176
زکوٰۃ فنڈ کا انویسٹمنٹ	177
اپنے اصول و فروع کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا	177
ہر فرد مسئول ہے	177
زکوٰۃ کی شرح اور حکمتِ زکوٰۃ	178
تنگیٔ رزق یا رِ قرض سے سبکدوش ہونے کا وظیفہ	178
شوہر مقروض ہو اور بیوی کے پاس سونا ہو	179
زکوٰۃ کا نصاب	179
زکوٰۃ بینک کے منافع یا اصل رقم پر دی جائے	179
بیٹی کی زکوٰۃ کی رقم سے انکم ٹیکس میں چھوٹ حاصل کرنا	180
بنو ہاشم کے لئے بنو ہاشم کی زکوٰۃ	180
سید کی غیر سیدہ بیوی کو زکوٰۃ دینا	181
بیوی اور بہو کے سونے کی زکوٰۃ	181
بہن کو زکوٰۃ دینا	181
کیا دو سال کی زکوٰۃ اکٹھے دی جا سکتی ہے	181
صدقات کے فنڈ سے قرضِ حسن	182

زیورات پر زکوٰۃ جبکہ نقد رقم نہ ہو	182
اگر عید الفطر کے دن صدقہ' فطر نہ ادا کر سکا ہو تو	183
کتاب الصوم	
تراویح کی رکعات کتنی ہیں	187
کیا تراویح بیٹھ کر پڑھی جا سکتی ہیں	187
چار چار رکعات کی نیت کے ساتھ 'تراویح'' پڑھنا	187
پانچ روزہ تراویح	188
روزے کی حالت میں سر پر مہندی اور خوشبو لگانا	188
مسنون دعاء افطار کب پڑھی جائے	188
کیا دس سالہ بچی پر روزہ فرض ہے	189
ڈاکٹر کا ٹیوبلائزیشن کے ذریعے بچوں کی ولادت کا آپریشن کرنا	189
روزے کی حالت میں اگر بتی سلگانا	190
روزے میں INHALER کا استعمال	190
روزے کی حالت میں آنکھ میں سرمہ لگانا یا دوا کے ڈراپ ڈالنا	190
روزے کی حالت میں لپ اسٹک لگانا	191
معتکف خاتون کا اپنے لئے کھانا خود تیار کرنا	191
روزے میں سحری کے بعد اگر غسل واجب ہو جائے تو روزہ رہے گا	191
بیوی ''بائی پاس آپریشن'' کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتی	191
سحری میں اذان شروع ہونے کے بعد کھانا اور پینا	192
کوئی شخص دوسرے ملک سے رمضان کے روزے رکھ کر آئے تو اب تکمیل کس حساب سے کرے	192

193	رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو بعد نمازِ تراویح مخصوص سورتیں پڑھنا
194	روزے کی حالت میں خون دینا
195	حاملہ عورت کو الٹی آ جائے تو کیا روزہ توڑ دے
195	رمضان المبارک میں عشاء کی نماز تنہا پڑھنے والا، وتر جماعت کے ساتھ پڑھے یا تنہا
200	روزے میں سرمہ لگانے کے جواز پر ایک دلچسپ اور مفید علمی بحث جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں بعض فقہی مسائل پر نظرِ ثانی کی ضرورت
207	ایک ہی ملک میں روزہ اور عید الگ الگ کیوں ہوتے ہیں
207	اسلامک ایجوکیشن انٹرنیشنل (برطانیہ) کی جانب سے رویتِ ہلال کے مسئلے پر استفسار
219	**عید الفطر خوشی اور شکر کا دن ہے،** عید کا تاریخی پس منظر، عظمت اور فلسفہ
219	لفظ عید کے معنی اور وجہ تسمیہ
220	عید، انسانی فطرت کا تقاضہ
220	قرآن مجید میں ذکرِ عید
221	عیدِ میلادِ مصطفیٰ کا ثبوت ایک لطیفہ پیرائے میں
221	اسلام میں عید کا آغاز
222	عید کے ایام کو مقرر کرنے کی حکمت
223	یوم عید کے مستحبات
223	عید گاہ جاتے وقت راستہ تبدیل کرنا
223	ون وے ٹریفک کا نظریہ

223	عید نہ منانا
	کتاب الحج
227	قرض لے کر حج کرنا
229	قرعہ اندازی کے ذریعے حج پر بھیجنا
229	ایام حج میں اگر عورت کے مخصوص ایام شروع ہو جائیں؟
230	احرام باندھتے وقت عورت اگر حالتِ حیض میں ہو تو کیا کرے؟
230	پانچ سال کے بچے کو عمرے پر لے جانا
231	آخری عشرے میں عمرے کی ادائیگی اور ابتداء شوال میں واپسی
231	عمرے کا احرام باندھا ہوا ہے فلائٹ پر سیٹ نہیں ملی
235	**کتاب الاضاحی** (قربانی کے مسائل)
235	اگر ایام قربانی میں قربانی نہ کی ہو؟
236	خصی جانور کی قربانی کا حکم
236	سات سے کم افراد گائے کی قربانی میں مساوی طور پر شریک ہو سکتے ہیں؟
237	حلال جانور کے ممنوع اجزاء
237	دم مسفوح سے کیا مراد ہے؟
	کتاب النکاح
241	کیا یہ نکاح جائز ہے؟
241	غیر کتابیہ کافرہ عورت سے نکاح
242	دلہن کا پالکی میں بٹھا کر لے جانا
244	بھابھی اور چچی محرم نہیں

بیوی کا شوہر سے یہ کہنا کہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں	245
مسئلہ رضاعت	245
ماں کو رضاعت پر مجبور کرنا	245
حرمت رضاعت کا ایک پیچیدہ مسئلہ	246
منگنی کے بعد لڑکے اور لڑکی کا آپس میں بلا تکلف بے حجاب ملاقاتیں کرنا	252
جہیز و بری کے سامان کی ملکیت کا مسئلہ	253
نکاح کے وقت ولدیت میں سوتیلے باپ کا نام لینا، نکاح نامے میں سوتیلے باپ کا نام لکھنا، ایسے نکاح کا شرعی حکم	257
شوہر کے انتقال کی خبر سننے کے بعد عدت گزار کر عورت کا دوسرا نکاح کرنا اور پھر پہلے شوہر کی واپسی	263
کتاب الطلاق	
کورٹ میرج کے نتیجے میں رخصتی سے قبل طلاق کا حکم	267
شوہر کا طلاق سے انکار، دیانت و قضا کا فرق	268
تفویضِ طلاق	271
عدالتی طلاق	272
ارادۂ طلاق، طلاق نہیں	272
طلاقِ ثلاثہ کا مسئلہ	274
طلاق کا مسئلہ	275
لکھ کر دینا "طاق دیا ہوں"	276
کسی شرط کے ساتھ معلق کی گئی طلاق سے کیسے نجات حاصل کی جائے؟	277
عدالتی خلع کا شرعی حکم	277

خاتون کا نکاح ہوا، رخصتی نہیں ہوئی اور اسے طلاق ہوگئی یا شوہر کا انتقال ہو گیا، عدت ومہر کے احکام	279
طلاق نامے پر جعلی یا فرضی دستخط سے طلاق واقع نہیں ہوتی	280
کیا ماں کے کہنے پر شرعاً بیوی کو طلاق دینا ضروری ہے؟	280
کتاب الفرائض	
اولاد کے درمیان ہبہ میں مساوات	295
وراثت کے متفرق مسائل	296
ترکے کے مسائل	300
میرے سوالات	300
مسئلۂ وراثت	301
ورثہ کی تقسیم	302
مسئلۂ وراثت	302
وارث کون ہیں؟	303
مسئلۂ وراثت	303
مسئلۂ وراثت	304
ورثہ کی تقسیم	304
عقدِ ثانی سے سابق شوہر کے ترکے میں بیوہ کا حق وراثت ساقط نہیں ہوتا	306
مسئلۂ وراثت	307
مسئلۂ وراثت	308
فوت شدہ قرض خواہ کی رقم کو وارثوں کی مرضی کے بغیر ایصالِ ثواب میں لگانا	309
فاتحہ کس کے مال سے دی جائے؟	310

مسئلۂ وراثت	311
مسئلۂ وراثت	312
مسئلۂ وصیت	313
مسئلۂ امانت	314
میں (بیوہ) آپ سے مدد اور تعاون کی طلب گار	315
باپ کا اولاد کے درمیان مساوات کا رویہ	319
کتاب البیوع	
گاہک کو "آخری دام" بتا کر پھر تخفیف کرنا	327
قسطوں پر اشیاء کی خریداری	328
تیس سال پہلے کی ایڈوانس رقم اب کتنی وصول کرے	328
ایڈوانس دے کر مال نہ اٹھانا	329
کیا "نیوتا" یا "عذر" پر سود کا اطلاق ہو سکتا ہے؟	330
"قرضِ حَسَن" کی تعریف	331
سیرت	
حضور ﷺ کو بکریاں چرانے والا کہنا	337
حضرت خضر علیہ السلام کے نبی یا فرشتہ ہونے کی بحث	338
امام اعظم رضی اللہ عنہ کی کنیت "ابو حنیفہ" کی حکمت	343
حلال وحرام .... جائز وناجائز	
غیر صحابی کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" کہنا یا لکھنا؟	347
کیا "۷۸۶" لکھنا صحیح ہے	349

مصنوعی طریقے سے شوہر کا تولیدی جرثومہ (Sperm) اپنی بیوی کے رحم میں پہنچانے کا جواز	355
فاتحہ کا طریقہ	358
امریکہ میں ایک مسلم مذبح کے متعلق مسائل	358
منت کی چادریں اور تالے	361
ربیع الاوّل میں چراغاں	365
خون سے فاتحہ لکھنا	366
رجب کے کونڈے	377
اجتماعی قرآن خوانی	378
قبر بیٹھ جائے تو کیا کریں؟	380
غیر آل ابوبکر صدیق کا اپنے نام کے ساتھ صدیقی لکھنا	382
جس کا کوئی پیر نہ ہو، کیا اس کا پیر شیطان ہوتا ہے؟	383
قرآن مجید کی تلاوت کے آداب	387
قرآن مجید کی تلاوت کن مواقع اور مقامات پر منع ہے	388
مکروہ اوقات میں قرآن مجید کی تلاوت	389
نوجوان لڑکوں کا گھٹنوں سے اوپر والی نیکر پہن کر گھومنا	389
نومسلم بالغ کا ختنہ	390
ماں باپ کی قدم بوسی	390
اگر پیدائش کے موقع پر بچے کا عقیقہ نہ کیا جاسکا ہو تو بعد میں کیا جاسکتا ہے	391
V.C.D کیا ہے اور کیا یہ دینی معلومات اور تبلیغ کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے؟	396

	متفرق
402	اللہ تعالیٰ رحیم ہے تو اپنے بندوں کو آگ میں کیوں ڈالے گا؟
402	گم شدہ چیز کے ملنے کے لئے دعاء
403	برصغیر کے کس عالم نے سب سے زیادہ فتاویٰ لکھے ہیں
403	برسی پر کھانا پکا کر تقسیم کرنا
403	رزق میں برکت کیلئے دعاء
404	کھانے اور پھل وغیرہ پر فاتحہ
405	بند دکان میں بلی مرگئی
405	شوہر والدین سے ملنے نہیں دیتے
405	کبوتروں کو دانہ ڈالنا
406	دعوتِ دین کا اسلوب

☆☆☆......☆···☆···☆......☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللّٰه رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علٰی رحمة للعٰلمین، سیدنا ومولانا محمدٍوّعلٰی اٰله الطیبین الطاھرین وعلٰی صحابته الصدیقین الکاملین، وعلٰی اولیاءِ امته وعلماءِ ملته من الفقهاء المجتهدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

حدیثِ دل

الحمدللہ علیٰ احسانہ ''تفہیم المسائل'' کے عنوان سے ہم نے روزنامہ ''ایکسپریس'' کی اشاعت جمعہ کے دینی صفحے پر سوال وجواب کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے قبولِ عام عطا فرمایا، ملک اور بیرونِ ملک دینی ذوق رکھنے والے قارئین کرام نے اس کی تحسین فرمائی۔ بعد میں ہم نے اس کی افادیت کے پیشِ نظر احباب کی خواہش پر کتابی شکل میں تفہیم المسائل (جلداول) کے نام سے شائع کیا اور قلیل مدت میں اس کے چار ایڈیشن شائع ہوگئے، ہم اللہ تعالیٰ کے اس بے پایاں کرم اور اہلِ علم وقارئین کرام کی حوصلہ افزائی پر متشکر وممنون ہیں۔

اب تفہیم المسائل جلد دوم پیشِ خدمت ہے، اس میں بعض نئے مفید اور دلچسپ مسائل ہیں، اس امر کا اندازہ آپ کو فہرست پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہو جائے گا، ہمیں امید ہے انشاء اللہ العزیز قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔ ہم نے سلسلہ تفہیم المسائل کی اشاعت کی ذمہ داری اہلسنّت کے انتہائی مؤقر وممتاز اشاعتی ادارے ''ضیاء القرآن پبلی کیشنز'' کو تفویض کی ہے۔ یہ ادارہ محسنِ اہلسنّت منبعِ کرم حضرت علامہ جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری قدس سرہم العزیز کی باقیاتِ صالحات میں سے ہے، اور یہ ''وہ شجرۂ طیبہ ہے'' جس کی مہک وبہار میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ادارے کے منتظم اعلیٰ صاحبزادہ حفیظ البرکات شاہ صاحب زید مجدہٗ گفتار و کردار، نفاستِ طبع، متوازن ومتواضع مزاج، طبیعت میں ٹھہراؤ، رچاؤ اور وقار وتمکنت میں، ''اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْهِ'' کے مصداق، اپنے والد گرامی کا عکس ہیں، یہ حضرت قبلہ پیر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا فیضانِ نظر اور حسنِ تربیت ہے، بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے جس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

اللہ کرے وہ اسی روش پر ہمیشہ قائم ودائم رہیں اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں۔ مشاغل کثیرہ کے سبب بعض اوقات ہم روزنامہ ایکسپریس میں اپنا ہفتہ وار کالم تسلسل کے ساتھ اور بلاناغہ جاری نہیں رکھ سکے، قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مصروفیت کار سے ایسی فراغت عطا فرمائے کہ اس مشن کو تسلسل اور تندہی سے جاری رکھ سکیں۔

ہم پیش آمدہ دینی مسائل کے حل کیلئے شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم کی تفسیر تبیان القرآن اور شرح صحیح مسلم سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں اور براہ راست بھی ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ان کا وجود اہلسنت وجماعت کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، انہوں نے تحریری میدان میں جو علمی شاہکار تخلیق کیے ہیں، مجھے امید ہے وہ آئندہ صدیوں بلکہ ہزاریوں تک مطلع علم پر آفتابِ نصف النہار کی طرح ضوفگن رہیں گے، جبکہ ان سے بغض وحسد رکھنے والوں کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا، ارشاد باری تعالیٰ حق اور سچ ہے: فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد: 17)، (ترجمہ) ''یعنی جھاگ تو بے فائدہ ہونے کی وجہ سے زائل ہو جاتا ہے، لیکن جو چیز انسانیت کیلئے نفع رساں ہوتی ہے، (اللہ تعالیٰ کی توفیق سے) وہ زمین میں قرار ودوام پاتی ہے''۔ آپ بھی ہمارے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل علامہ محترم کو اپنی تمام تر جسمانی، فکری، علمی اور عقلی قویٰ کی سلامتی کے ساتھ تادیر اپنے دین متین کی خدمت کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

ممکن ہے مجھ سے کسی مسئلے کے تفہم یا تفہیم میں خطا ہوگئی ہو، اگر کوئی صاحبِ علم ہماری کسی خطا پر مطلع ہوں تو ازراہِ کرم میری اصلاح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، ہم ان کے ممنون رہیں گے۔ میں مولانا محمد ابراہیم فیضی اور مولانا محمد ناصر خان چشتی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اِن منتشر ومتنوع مسائل کی ترتیب وتدوین اور تبویب میں تعاون فرمایا اور تصحیح کی ذمہ داری کو بھی احسن طریقے سے نبھایا۔ اسی طرح ان فتاویٰ کا ریکارڈ محفوظ رکھنے میں مولانا منور احمد نعیمی کا تعاون بھی شامل رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو ماجور فرمائے۔

انشاء اللہ العزیز! ''تفہیم المسائل'' کی آئندہ مجلدات بھی آتی رہیں گی۔ آخر میں ہم بہ صد عجز ونیاز وبہ غایتِ خلوص اللہ جل شانہ، سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہِ بے کس پناہ میں ملتجی ہیں کہ وہ اپنے

حبیب کریم علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہ الوف التحیّۃ والتّسلیم کے طفیل اس سعی ناتمام کو اپنے حضور عالی شان میں مقبول وماجور فرمائے اور اہل علم، ارباب فکر ونظر اور دینی مطالعے کا ذوق رکھنے والے قارئین کی نظر میں اسے وقعت وتکریم عطا فرمائے۔ آمین۔

بندۂ عاجز

منیب الرحمٰن

15/جون 2003ء

کتاب العقائد

اللہ تعالیٰ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کرنا

سوال: ہمارے مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض علماء اللہ تعالیٰ کیلئے واحد کا صیغہ استعمال کرتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، وغیرہ، جبکہ اس کے برعکس بعض دیگر علماء ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں، ہوسکتا ہے وہ اسے فرطِ ادب سے تعبیر کرتے ہوں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، وغیرہ۔ اس میں کونسا طریقہ درست ہے، کیا اللہ تعالیٰ کیلئے جمع کے صیغے کے استعمال سے شرک کا ایہام تو نہیں ہوتا؟ مدلل و مفصل تحریر کیجئے۔

(مولانا محمد ناصر خان چشتی...... R-618 بلاک 14، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: قرآن مجید میں ہمیں یہ دونوں باتیں ملتی ہیں۔ قرآن مجید کا عمومی اسلوب اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جلالت کیلئے واحد کے صیغے کا استعمال ہے، مثلاً: اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ، ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ، وغیرہ۔ لیکن بعض مقامات پر جمع کے صیغے کا استعمال بھی ہے، مثلاً: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: ۹)

ترجمہ: ''بلاشبہ ہم ہی نے ذکر (قرآن) نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

قرآن مجید میں دس مقامات پر نَزَّلْنَا (ہم نے اتارا)، دو مقامات پر نَزَّلْنٰہُ (ہم نے اسے اتارا)، ایک مقام پر نَزَّلَہٗ (اس نے اسے اتارا)، ایک مقام پر نُنَزِّلُہٗ (ہم اسے اتارتے ہیں)، چالیس مقامات پر اَنْزَلْنَا (ہم نے اتارا)، چودہ مقامات پر اَنْزَلْنٰہُ (ہم نے اسے اتارا)، ایک مقام پر اَنْزَلْنٰھَا (ہم نے اسے اتارا)، کے کلمات مبارکہ آئے ہیں، ان کے علاوہ عَبْدِنَا (ہمارے بندے)، لَطَمَسْنَا، نَّطْمِسَ (ہم مٹادیں گے)، حَشَرْنٰھُمْ (ہم نے انہیں جمع کیا)، وٰعَدْنَا (ہم نے وعدہ کیا)، فَاَنْۢبَتْنَا (ہم نے اگایا)، ظَلَّلْنَا (ہم نے سایہ کیا)، نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ (ہم اتارنے والے ہیں)، بَیَّنّٰہُ (ہم نے وضاحت سے بیان کیا)، الْمُنْزِلِیْنَ (ہم اتارنے والے ہیں)، صَرَّفْنَا (ہم نے پھیرا)، سُقْنٰہُ (ہم نے چلایا)، لِنُبَیِّنَ (تاکہ ہم واضح طور پر بیان کریں)، فَاَسْکَنّٰہُ (ہم نے ٹھہرایا)، مُنْذِرِیْنَ (ڈرانے والے)، وَضَعْنَا (ہم نے (بوجھ) اتارا)، اَرْسَلْنَا (ہم نے بھیجا)، فَاَسْقَیْنٰکُمُوْہُ (ہم نے تمہیں وہ پلایا)، وغیرہ، تو قرآن مجید میں ذات

باری تعالیٰ کیلئے واحد و جمع دونوں کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ سورۃ الحجر آیت نمبر ۹ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''ہر چند کہ یہ جمع کا صیغہ ہے لیکن بادشاہوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی عظمت کے اظہار کیلئے خود کو جمع کے صیغے کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ ان میں سے جب کوئی ایک کام کرتا ہے یا کوئی بات کہتا ہے تو وہ اس کو یوں کہتا ہے کہ ہم نے یہ کام کیا یا ہم نے یہ بات کہی، (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۱۲۳، مطبوعہ دار الحیاء و التراث العربی، بیروت)''

ہماری فہم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بالعموم اپنی احدیت، وحدانیت اور فردیت (یکتائی) کو اجاگر فرمایا ہے، بعض مقامات پر اس نے اپنی عزت و جلالت، سطوت و شوکت، ہیبت و دبدبہ اور قدرتِ کاملہ محیطہ کے اظہار کیلئے جمع کے کلمات بھی استعمال فرمائے ہیں۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''اللہ عزّ و جلّ کو ضمائر مفرد سے یاد کرنا مناسب ہے کہ وہ واحد، احد، فرد، وِتر ہے اور تعظیماً ضمائر جمع میں بھی حرج نہیں، اس کی نظیر قرآن میں ضمائر متکلم میں تو صدہا جگہ ہے، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، اور ضمائر خطاب میں صرف ایک جگہ ہے، وہ بھی کلام کافر سے کہ عرض کرے گا: رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا، اس میں بھی علماء نے تاویل فرمادی ہے کہ یہ اِرْجِعُوْنِ کی جمع باعتبار تکرار ہے یعنی اِرْجِعْ اِرْجِعْ اِرْجِعْ۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: بہر حال یوں کہنا مناسب ہے کہ'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے''، مگر اس میں کفر و شرک کا حکم کسی طرح نہیں ہو سکتا، نہ گناہ ہی کہا جائے گا، بلکہ خلافِ اولیٰ''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج ۶، ص ۱۳۶-۱۳۷، مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی)۔

علامہ غلام جیلانی میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''بشیر القاری شرح صحیح البخاری'' صفحات ۲۴۱ تا ۲۴۳ میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے، جو حضرات چاہیں مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض مقامات پر اپنے لیے جو جمع کے کلمات ارشاد فرمائے ہیں، وہ اس کی ذاتِ جلیل کے لئے خاص ہے، اس نے ایسے کلمات بندوں کی زبان سے بیان نہیں فرمائے، بلکہ جہاں بندوں کو اپنی بارگاہِ عالی کیلئے کچھ عرض کرنے کا حکم ہوا ہے، وہ کلمات مفردہ پر مشتمل ہے، مثلاً:

(۱) سورۂ آل عمران آیت ۲۶، ۲۷ میں مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی، تَنْزِعُ، تُعِزُّ، تُذِلُّ، تُوْلِجُ، تُخْرِجُ، تَرْزُقُ، سب مفرد کے صیغے ہیں۔

(۲) سورۂ انعام آیت نمبر ۱۲ میں ''کَتَبَ''، (۳) اسی سورت کی آیت میں ''شَهِيْدٌ''، قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ'' (۴) آیت نمبر ۶۵ میں ''قُلْ هُوَ الْقَادِرُ''

(۵) سورۃ یونس آیت نمبر ۳۴ میں قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ (۶) سورۃ الرعد میں قُلْ هُوَ رَبِّیْ

(۷) سورۂ الاسراء آیت ۲۴ میں قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا (۸) اس سورۃ کی آیت نمبر ۸۰ میں قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ (۹) سورہ طٰہٰ آیت نمبر ۱۱۴ میں قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۱۰) سورۃ المومنون آیت نمبر ۲۹ میں قُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا (۱۱) اسی سورہ کی آیت ۱۱۸ میں قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (۱۲) سورۂ اخلاص آیت نمبر ۱ میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔

اسی طرح قرآن مجید میں بارگاہ الوہیت سے تعلیم مومنین کیلئے دعا کے جتنے کلمات ارشاد فرمائے گئے ہیں، وہ سب کے سب مفرد کلمات ہیں، سورۂ ''فاتحہ'' ہی میں ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ انبیاء کرام کی سب دعائیں مفرد کے صیغوں کے ساتھ ہیں، سورۂ بقرہ کے آخر میں ہے، وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْلَنَا، وَارْحَمْنَا، فَانْصُرْنَا، (یعنی ہمیں معاف فرمادے، ہمیں بخش دے، ہم پر رحم فرما، ہماری مدد فرما) سب مفرد کے صیغے ہیں۔

میں یہ اِدّعاء تو نہیں کرتا کہ تمام احادیث مبارکہ یا اکثر میرے مطالعے سے گذر چکی ہیں، لیکن جہاں تک میرا محدود مطالعہ ہے، رسول اللہ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے لئے جمع کا صیغہ ثابت نہیں ہے، تو بندوں کیلئے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اسلوبِ دعا اور رسول اللہ ﷺ کی سنتِ طیبہ میں ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے مفرد کلمات ہی ارشاد فرمائے ہیں۔

مولانا غلام جیلانی نے تو طنز و تعریض کے طور پر یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض حضرات کے اکابر نے اپنے لئے ننگِ اسلاف، بندۂ ظلوم وجہول، ناکارۂ خلائق، کمترین خلائق کے کلمات استعمال فرمائے ہیں، تو کیا ان کے تلامذہ اور متوسلین اپنے ان اکابر کیلئے یہی کلمات استعمال کریں گے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جلالت کیلئے مفرد کا صیغہ ہی استعمال کرنا اولیٰ ہے، لیکن اگر کوئی جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے تو اسے شرک و بدعت یا گمراہی قرار دینا درست نہیں ہے، یہ بھی بہر حال مباح اور جائز ہے---

ادب گاہیست زیرِ آسماں ازعرش نازک تر

سوال: ایک مقامی اخبار میں مفتی صاحب سے سوال کیا گیا کہ: میں نوافل پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو بخشنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح قرآنِ پاک کی تلاوت ختمِ قرآن کے بعد اس کا ثواب رسول اللہ ﷺ کو بخشا جا سکتا ہے؟ نیز اس کے لئے کیا نیت کی جائے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ: نوافل ادا کر کے اس کا ثواب نبی اکرم ﷺ کو بخش دیں۔ اسی طرح قرآن کریم کو پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو ایصالِ ثواب کیا جا سکتا ہے، کیا یہ اندازِ بیان مقامِ رسالت کے شایانِ شان ہے؟

(فضل واحد...... ضلع مردان، صوبہ سرحد)

جواب: اصولی طور پر تو یہ مسئلہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ بلکہ جمیع انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو ایصالِ ثواب نہ صرف جائز بلکہ مستحسن امر ہے اور امتی کے لئے باعثِ سعادت ہے کہ وہ اپنی بدنی و مالی عبادات یعنی نوافل، تلاوت، اذکار و تسبیحات، تلاوتِ قرآن مجید، حج وعمرہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا ایصالِ ثواب اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کے لئے کرے، اور یہ بات بھی درست ہے کہ اس ایصالِ ثواب کے لئے کوئی مخصوص طریقہ کار اختیار کرنا ضروری نہیں ہے، نیت دل کے ارادے کا نام ہے۔ اس ایصالِ ثواب کی نیت سے یہ عبادات اور اعمالِ خیر انجام دیئے تو یہ بھی کافی ہے اور اختتامِ عبادت کے بعد لفظاً دعا کر کے ایصالِ ثواب کریں تو بھی احسن ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے لئے ''ثواب بخش دینا'' کا لفظ مقامِ نبوت کے شایانِ شان نہیں ہے، اس سے بے ادبی جھلکتی ہے۔ اُردو کی لغت فیروز اللغات میں بخشش کے معنی درج ہیں: 'انعام، عطیہ، معافی، عفو و درگزر' اس لفظ کے معانی میں ''معافی اور درگزر'' مقامِ رسالت کے شایانِ شان نہیں ہیں کہ اُمتی ایسا کلمہ استعمال کرے۔ کیونکہ قرآن مجید میں سورۂ بقرہ آیت: ۱۰۴ میں رسول اللہ ﷺ کیلئے ایسا ذومعنی لفظ استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا ہے، جس کا ایک معنی تو مقامِ رسالت کے موافق ہو لیکن دوسرا دور کا کوئی معنی ایسا ہو جسے کوئی بدعقیدہ اور گستاخ شخص توہین آمیز معنوں میں استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے بجائے ہمارے فقہاء کرام اور بزرگانِ دین نے ''اِہداء'' (یعنی حضور ﷺ کی بارگاہ میں ثواب کا ہدیہ کرنا) کا کلمہ استعمال فرمایا ہے۔ یعنی اپنی عبادات اور اعمالِ خیر کا ثواب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ہدیتاً پیش کرنا، یعنی یوں کہے کہ ''اے اللہ! میں

اس کا ثواب رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ کرتا ہوں' یا یہ کہے کہ" یا رسول اللہ! میں اپنے اعمال کو آپ کی خدمت میں ہدیہ کرتا ہوں۔ قبول فرمائیے۔" اہلِ عقیدت نے کہا ہے کہ

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

رسول اللہ ﷺ کو سرورِ کائنات، سرورِ کونین اور سیدُ المرسلین کہنا

سوال: عرض یہ ہے کہ میرے حسب ذیل دو سوالات کا جواب از روئے قرآن و حدیث عنایت فرمائیں:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مولائے کل، سرکارِ دو عالم، سرورِ کائنات، سرورِ کونین اور سید المرسلین کہا جاتا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ تمام صفات ہیں تو پھر اللہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: محمد صرف نبی ہی تو ہیں اور ان سے پہلے بھی نبی گزر چکے ہیں یعنی تمام نبی برابر ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:" اللہ کے علاوہ کوئی حاکم، حاجت روا اور معبود نہیں، اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے، (سورۂ مومن: ۳)، (خواجہ احمد بخاری......ملیر، کراچی)۔

جواب: حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ان القابات کے اہل ہیں اور ان سب اعزازات کے حامل ہیں، قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات مبارکہ ہمارے اس دعوے کی روشن دلیل ہیں:

> " اور (اے حبیب یاد کیجئے!) جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے یہ عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور حکمت دے دوں، پھر تمہارے پاس ایک عظیم رسول آئے جو اس چیز کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہو، تو تم اس پر ضرور بہ ضرور ایمان لانا اور ضرور بہ ضرور اس کی مدد کرنا، فرمایا: کیا تم نے اقرار کرلیا اور میرے اس بھاری عہد کو قبول کرلیا؟ انہوں نے عرض کیا: ہم نے اقرار کرلیا، فرمایا: تم اس عہد پر گواہ ہو جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں، پھر جو شخص اس کے بعد عہد سے پھر گیا، سو وہ لوگ فاسق ہوں گے۔" (آل عمران: ۸۲۔۸۱)

اس ارشادِ باری تعالیٰ کی رو سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں اور رسولوں

کے نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام سے عالمِ ارواح میں آپ پر ایمان لانے اور آپ کی نصرت کا پختہ عہد و اقرار لیا، چنانچہ اس آیت کے تحت علامہ محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

''ابن جریر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم یا ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی بھیجا تو اس سے یہ عہد لیا کہ اگر اس کی زندگی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تو وہ ان پر ایمان لائے گا ان کی نصرت کرے گا اور اپنی امت کو ان پر ایمان لانے کا حکم دے گا، آگے چل کر وہ مسندِ ابو یعلیٰ کے حوالے سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم آج اگر تمہارے درمیان موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری پیروی کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ ہوتا۔'' (روح المعانی ۳/۲۱۰_۲۰۹)

اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت و رسالت کو تمام مخلوق اور تمام انسانیت کے لیے عام فرما دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (الاحزاب:28)

''اے نبی ہم نے آپ کو شاہد اور (قیامت تک کے) تمام لوگوں کے لیے (رحمتِ الٰہی کی) بشارت دینے والا اور (عذابِ الٰہی سے) ڈرانے والے بنا کر بھیجا ہے''۔

قُلْ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف:158)

''کہہ دیجئے! اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول (مبعوث ہوا) ہوں،

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء:107)

''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی تو بھیجا ہے''۔

جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سید المرسلین، سرورِ کائنات اور سرورِ کونین ایسے القاب مبارکہ کا تعلق ہے تو حدیث کی معروف کتاب ''مشکوٰۃ المصابیح'' میں باب فضائل سید المرسلین صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ'' میں کتبِ احادیث کے حوالے سے متعدد روایات درج ہیں جن میں سے ہم چند کا ذکر سطور ذیل میں کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وكان النبى يبعث الى قومه خاصة وبعثت الى الناس عامة

''اور (ماضی کی امتوں میں اللہ کی سنت یہ رہی کہ) ہر نبی بطورِ خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور مجھے سارے انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔''

اُرسلت الی الخلق کافة.

''مجھے ساری مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔''

انا سید ولد ادم یوم القیمة ولا فخر و بیدی لواء الحمد ولا فخر وما من نبی یومئذ ادم فمن سواہ الا تحت لوائی۔

''میں قیامت کے دن ساری اولادِ آدم کا سردار ہوں گا اور یہ بات میں فخر کے طور پر نہیں (بلکہ تشکر کے طور پر) کہہ رہا ہوں اور حمدِ باری تعالیٰ کا پرچم میرے ہی ہاتھ میں ہوگا اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں، اور اُس دن آدم اور ان کے علاوہ جو نبی بھی ہوگا وہ میرے ہی پرچم کے نیچے ہوگا''۔

انا قائد المرسلین ولا فخر وانا خاتم النبیین ولا فخر وانا اوّل شافع واوّل مشفع۔

''میں تمام رسولوں کا قائد ہوں گا اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں، اور میں خاتم النبیین ہوں اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں، اور سب سے پہلے شفاعت کرنے والا میں ہی ہوں گا اور میری ہی شفاعت سب سے پہلے (اللہ کی بارگاہ میں) مقبول ہوگی''۔

اذا کان یو م القیمة کنت امام النبیین و خطیبھم وصاحب شفاعتھم غیر فخر۔

''قیامت کے دن میں انبیاء کا امام ہوں گا اور ان کا ترجمان ہوں گا، اور ان کی شفاعت کا ذمہ دار ہوں گا اور یہ میں بطورِ فخر نہیں کہہ رہا۔''

جہاں تک ''مولائے کل'' کے لقب کا تعلق ہے تو اس کا اطلاق بھی بلاشبہ جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (الاحزاب:٦)

''نبی مومنوں سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔

''ولی'' کے معنی قریب کے ہیں، یہ قرب مکانی بھی ہوسکتا ہے اور زمانی بھی، نسبت کا قرب

بھی ہوسکتا ہے، محبت کرنے والا، دوست، نصرت کرنے والا، رشتہ داری، ملکیت، معاملات کا منتظم ونگران اور حاکم وغیرہ، یہ لفظ متعدد معانی پر مشتمل ہے، اسی سے ''مولیٰ'' بھی ہے، ''مولیٰ'' کے معنی ہیں مالک آقا، آزاد کردہ غلام، محبت کرنے والا، رشتے دار وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ہم ''مولیٰ'' کہتے ہیں تو قرب، نصرت، محبت، تصرف واختیار سب معنوں کو یہ شامل ہوتا ہے۔ اور قرآن مجید میں غیر اللہ پر بھی ''ولی'' کا اطلاق کیا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''تو یقیناً اللہ ان کا مددگار ہے اور جبریل اور صالح مومنین، اور اس کے بعد فرشتے بھی (ان کے) مددگار ہیں''۔ (التحریم:۴)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ، جبریل امین اور صالح مومنین سب پر ''مولیٰ'' کا اطلاق کیا گیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ تو جبریل امین اور مومنین صالحین بلکہ سب انبیاء سے بڑا ہے تو آپ کو مولائے کل کیوں نہیں کہہ سکتے۔ سورۂ احزاب کی مندرجہ بالا آیت کے تحت علامہ محمود آلوسی نے ''روح المعانی'' میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقام ہے تو مومنوں پر واجب ہے کہ رسول کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب جانیں اور رسول کا حکم ان پر ان کے نفسانی تقاضوں سے زیادہ نافذ العمل اور موثر ہو، اور نبی کا حق ان پر ان کی جانوں کے حق سے زیادہ ہو۔

آپ کا یہ کہنا کہ تمام نبی برابر ہیں، قرآن کی رو سے درست نہیں، بلاشبہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ:۲۸۵)

''(رسول اور تمام مومن یہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے میں ہم رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے کہ ایک پر ایمان لائیں اور دوسرے پر نہ لائیں، بلکہ ہم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے سب رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ البتہ قرآن مجید خود رسولوں کے درمیان تفاوتِ مراتب کی تصدیق کرتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ

دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ

(البقرہ:۲۵۳)

''یہ سب رسول، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کسی کو (سب پر) درجوں میں بلندی عطا فرمائی۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں دیں اور روح القدس (جبریل) سے ہم نے ان کی مدد فرمائی۔''

مفسرین کرام کے مطابق وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (اور ان میں سے کسی کو (سب پر) درجوں میں بلندی عطا فرمائی)'' سے سید المرسلین ﷺ ہی مراد ہیں۔

آپ کا یہ ارشاد کہ اگر یہ تمام القاب رسول اللہ ﷺ کے لیے ہیں تو پھر اللہ کے لیے کیا ہے؟ جواباً گذارش ہے کہ اللہ جل شانہ اس عظیم المرتبت، رفیع الشان رسولِ مکرم کا خالق ہے، مالک ہے، معبود ہے، مسجود ہے، مختار ہے اور یہ رسول عظیم اپنی اس تمام تر رفعتِ شان کے باوجود اس کے بندۂ خاص ہیں، مخلوق ہیں، نیاز مند ہیں۔ وہ رب العلمین، واجب الوجود ہے، ازلی ہے، ابدی ہے، وہ سب سے بے نیاز ہے، اور بشمول رسولِ کریم سب اس کے نیازمند اور محتاج ہیں۔ رحمۃ للعلمین ﷺ کی ساری رفعتیں، عظمتیں اور شانیں اس کی عطا سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضور کی تواضع کا عالم یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

عن عائشة رضی اللّٰه عنها عن النبی ﷺ قال: سددوا وقاربوا وابشروا فانه لا یدخل احدا الجنة عمله، قالوا: ولا انت یا رسول اللّٰه؟ قال: ولا انا الا ان یتغمدنی اللّٰه بمغفرة و رحمة۔

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: راہِ راست پر چلو، اور اللہ کا قرب اختیار کرو اور (اجر و ثواب کی) بشارت دو، کیونکہ کسی کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کرے گا، (صحابہ نے) عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کی نجات کا مدار بھی عمل پر نہیں ہوگا؟ فرمایا: میرا بھی نہیں سوائے اس کے اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت و مغفرت سے ڈھانپ لے (یعنی اپنی آغوشِ رحمت میں پناہ دے دے''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: ٦٤٦٧)

باقی رہا آپ کا یہ اشکال کہ اگر رسول اللہ ﷺ پر ایسی صفات کا اطلاق کر دیا جائے جو اللہ

تعالیٰ کے لیے ہیں تو کیا اس سے شرک لازم نہیں آئے گا۔ جواباً گزارش ہے کہ اس سے شرک بالکل لازم نہیں آئے گا، کیونکہ قرآن مجید میں متعدد ایسی صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے آئی ہیں جیسے رؤف، رحیم، عزیز، شاہد، سمیع، بصیر وغیرہ، ان صفات کا اطلاق قرآن ہی میں رسول اللہ صلی اللہ وسلم پر بھی ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ابراء (شفا دینا)، احیاء (زندہ کرنا)، خلق (پیدا کرنا) کی صفات کا اطلاق ہوا ہے، یہ قطعاً شرک نہیں بلکہ عین توحید ہے، کیونکہ جب یہ صفاتِ جلیلہ اللہ تعالیٰ کے لیے بولی جاتی ہیں تو معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات ہیں، ان کا مصدر و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، کسی اور سے مستعار یا مستفاد نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے اپنی ذات و صفات میں مستقل بالذات ہونے کے عقیدے کو ''واجب الوجود'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے برعکس انبیاء کرام، رسلِ عظام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم میں یہ صفات ذاتی نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن و عطا سے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (البقرہ:255)

''کون ہے جو اس کی بارگاہ میں (کسی کی) شفاعت کرے، مگر جسے وہ خود اذن عطا فرما دے''۔

اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْـَٔۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَاُبْرِیُٔ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ (آل عمران:۴۹)

''میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے جیسی صورت بناتا ہوں، پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے اذن سے اڑنے والا (پرندہ) بن جاتا ہے، اور میں اللہ کے اذن سے مادرزاد اندھے اور برص کے مریض کو شفاء دیتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں''۔

خلق، ابراء (شفایاب کرنا) اور احیاء (زندہ کرنا) اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، اگر کوئی اپنی ذات سے ان کا دعویٰ کرے یا کوئی ان امور کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذاتی کمال سمجھے تو یہ شرک ہوگا۔ لیکن اگر یہی کمالات اللہ تعالیٰ کے اذن و عطا سے کرنے کا دعویٰ کرے یا کوئی ان کی طرف منسوب کرے تو یہ عین توحید ہے۔ اسی طرح خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے کمالات اللہ تعالیٰ کے اذن و عطا سے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ’’اے حبیب!‘‘ کہنے کا جواز؟

سوال: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہاں اور کس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے لفظ سے مخاطب کیا ہے، جس کے معنی ہیں اے حبیب، اور کیا اے نبی کا ترجمہ اے حبیب! معنی میں تصرف نہیں ہے اور کیا معنی کا تصرف یا تاویل جائز ہے؟

(خواجہ احمد بخاری......C-78 الفلاح ہاؤسنگ پروجیکٹ ملیر ہالٹ)۔

جواب: مشکوٰۃ المصابیح میں باب فضائل سید المرسلین میں سنن دارمی اور جامع ترمذی کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث نقل کی گئی ہے، وہ فرماتے ہیں:

’’(ترجمہ) رسول اللہ علیہ وسلم کے کچھ احباب بیٹھے ہوئے تھے، حضور ﷺ، باہر تشریف لائے یہاں تک کہ ان کے قریب ہوگئے۔ آپ نے سنا کہ صحابہ آپس میں مذاکرہ کررہے تھے، ان میں سے کسی نے کہا: بیشک اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل (دوست) بنایا ہے، دوسرے نے کہا: موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے کلام کیا ہے، ایک اور نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ اور اس کی (جانب سے مقدس) روح ہیں۔ ایک اور نے کہا: آدم کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس گئے اور فرمایا: میں نے تم سب کی گفتگو سن لی ہے اور (اس امر پر) تمہاری حیرت کو بھی نوٹ کیا کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں، ہاں ہاں وہ اسی شان کے (مالک) ہیں اور موسیٰ اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کی باتیں کرنے والے ہیں ان کی بھی یہی شان ہے، عیسیٰ اللہ کی جانب سے روح اور اس کا کلمہ ہیں اور بلاشبہ ان کی یہی شان ہے، اور آدم اللہ کے برگزیدہ و چنیدہ (Selected) ہیں اور ان کی یہی شان ہے، مگر سنو! میں اللہ کا حبیب ہوں‘‘۔

تو اس حدیث مبارک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں، واضح رہے کہ ’’حبیب‘‘ اور ’’محبوب‘‘ ہم معنی ہیں۔ اسی طرح قرآن نے متعدد مقامات پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ متقین، متوکلین، صابرین، مقسطین، توابین، محسنین، مطہرین سے محبت فرماتا ہے اور حضور ﷺ تو ان سب کے سردار و امام ہیں بلکہ ان سب کو یہ شرف حضور کی

نسبتِ غلامی سے ملا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے سب سے قریب درجے میں محبوب ہیں۔ اس لیے حضور کو اللہ تعالیٰ کا حبیب یا محبوب کہنا درست ہے۔ کیونکہ جس سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کے حبیب یا محبوب کا اطلاق بالکل درست ہے۔

باقی یَاَیُّهَا النَّبِیُّ! کا معنی کسی نے ''اے حبیب!'' یا ''اے محبوب!'' نہیں کیا، بلکہ اُس کا ترجمہ سب نے ''اے نبی!'' کیا ہے، بعض مفسرین ومترجمین کرام نے اس کا ترجمہ ''اے (غیب بتانے والے) نبی! کیا۔ ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ لفظ ''نبی'' کے ایک معنی ہیں ''غیب کی خبر دینے والا۔'' البتہ جہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''قُل'' کے کلمے کے ساتھ مخاطب فرمایا جس کے معنی ہیں کہو، کہہ دو، کہیے، کہہ دیجیے، اس میں ضمیر مخاطب مستتر (پوشیدہ) ہے، یعنی ''اَنتَ'' (تو، تم) اور ظاہر ہے اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو اس کا ترجمہ کہہ دیجیے ''اے نبی!''، ''اے رسول!''، ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!'' یا ''اے حبیب!'' یا ''اے محبوب!'' کرنا درست ہے اور صرف کہو یا کہہ دو یا کہہ دیجیے کر دیں تو تب بھی درست ہے۔

کیا درود تاج پڑھنا شرک ہے؟

سوال: ہمارے لوگ درود تاج، درود لکھی، دعائے گنج العرش اور اس طرح کے دیگر ورد و وظائف بڑے شوق سے اور ثواب کی نیت سے پڑھتے ہیں۔ کیا یہ واقعی کارِ ثواب ہے؟ ایک مقامی اخبار میں لکھا ہے کہ درود تاج پڑھنا شرک ہے، دعائے گنج العرش نام ہی مہمل ہے، ان کی کوئی سند نہیں ہے اور انہیں پڑھنے والا وعید کا حقدار ہے، وغیرہ۔

(محمد ناصر خان چشتی، گلشن اقبال.....حافظ محمد شمیم، قیوم آباد)

جواب: درود تاج کو علماء عاملین اور صوفیاء کرام ہمیشہ وفورِ شوق اور محبت سے پڑھتے رہے ہیں۔ اہل اللہ کے ہاں اس کو بکثرت شوق سے پڑھا جانا ہی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اس کی قبولیت کی روشن دلیل ہے۔ کسی ورد، وظیفہ، درود یا دعاء کا کتاب وسنت میں نہ ہونا اور بات ہے اور کتاب وسنت کے خلاف ہونا اور بات۔ یہ دونوں باتیں اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل جدا ہیں، لیکن اس سے سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دیا جاتا ہے اور ہر چیز کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ قرآن وسنت میں نہیں ہے، لہٰذا باطل ہے۔ قرآن وسنت میں مذکورہ دعائیں پڑھنا بلاشبہ کار

ثواب اور برکت وسعادت کی بات ہے، لیکن قرآن وسنت کی کسی نصِ صریح میں یہ حکم نہیں کہ صرف وہی درود اور دعائیں پڑھنا جائز ہیں جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں اور اس کے علاوہ ہر درود و وظیفہ باطل ہے۔ قرآن وسنت میں نماز کی ادائیگی کا طریقہ تو متعین فرما دیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر اس سے انحراف کر کے نماز پڑھی جائے گی تو قبول نہیں ہوگی، البتہ درود اور وظائف پڑھنے کا طریقہ یا کلمات متعین نہیں ہیں، لہٰذا ایسا درود اور وظیفہ جائز ہے جو کلماتِ خیر پر مشتمل ہو اس میں کوئی کلمہ خلافِ شرع نہ ہو۔ اگر کسی دعاء اور درود کے کلمات شرعاً جائز ہیں تو اس سے قطعِ نظر کہ وہ سندِ صحیح کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں یا نہیں، پڑھنا جائز ہیں اور ثواب کا باعث ہیں۔ ہاں اگر کسی کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف ان خاص کلمات کے ساتھ درود اور دعا پڑھنا جائز ہے اس سے ہٹ کر کسی اور طریقے سے پڑھنا ناجائز، تو یہ عقیدہ درست نہیں ہوگا۔ مہمل تو بے معنی لفظ کو کہتے ہیں اور ''گنج العرش'' تو بامعنی نام ہے اور اس طرح کا نام رکھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

درود تاج رسول اللہ ﷺ کے فضائل و کمالات اور محاسن پر مشتمل ہے اور اس میں کوئی شرکیہ کلمہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی شخص العیاذ باللہ: ان کلمات کو شرک سے تعبیر کرتا ہو کہ ''دَافِعِ الْبَلَاءِ وَالْوَبَاءِ وَالْقَحْطِ وَالْمَرَضِ وَالْاَلَمِ'' یعنی حضور ﷺ ہر بلاء ومصیبت، ہر وبا، قحط، مرض اور رنج والم کو دور کرنے والے ہیں، مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ان بلاؤں، وباؤں، امراض، قحط اور ہر رنج والم کے ازالے کے لئے وسیلہ ہیں، آپ کی برکت سے یہ مصائب دفع ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے نجات عطا فرماتا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے روزمرہ زندگی میں ہم کہتے ہیں مجھے فلاں بیماری سے اس دوا نے شفاء دی، فلاں ڈاکٹر کے ہاتھ میں بڑی شفاء ہے، یا فلاں چیز نے مجھے بیمار کر دیا، اس طرح کے کلمات استعمال کرنے والے کو نہ کوئی مشرک کہتا ہے اور نہ سمجھتا ہے، کیونکہ اس کا مسلمان ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ دوا یا طبیب کو بالذات شافی نہیں جانتا، بلکہ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شفاء دینے والا ہے اور دوا یا طبیب وسیلہ شفاء ہیں۔

قرآنِ پاک میں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ

اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (آل عمران:۴۹)

''میں تمہارے پاس ایک نشانی لے کر آیا ہوں تمہارے رب کی طرف سے، کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے جیسی صورت بناتا ہوں، پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اڑتا ہوا پرندہ بن جاتی ہے اللہ کے حکم سے، اور میں شفایاب کرتا ہوں مادر زاد اندھے اور برص والے کو، اور میں زندہ کرتا ہوں مردے اللہ کے حکم سے اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں اس چیز کی جو تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو''۔

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام خلق (پیدا کرنے)، نفخ (پھونک مارنے)، شفاء دینے، زندہ کرنے اور غیب کی خبریں دینے کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرتے ہیں کہ میں اللہ کے حکم سے یہ سب کام انجام دیتا ہوں، جو دراصل مخلوق کے نہیں بلکہ خالق کے کام ہیں۔ظاہر ہے کہ وہ اپنے ذاتی کمال سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن، حکم اور عطا سے یہ سارے کام کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی اپنی ذاتی قدرت سے بلاؤں، آفات، بیماریوں اور آلام کو دفع کرتا ہے تو یہ شرک ہے، اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے ایسا کرتے ہیں تو یہ عین توحید ہے اور یہ قرآن پاک کے خلاف نہیں بلکہ قرآن کے مطابق ہے، اور ہم بھی درود تاج میں مذکورہ بالا کلمات اسی عقیدے سے پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قضاء حاجات اور دفعِ مشکلات کا وسیلہ ہیں اور یہ عقیدہ توحید کے منافی نہیں ہے۔باقی ہر درود اور دعاء کے لئے سند صحیح سے ثابت ہونا شرعاً ضروری نہیں ہے۔ ورنہ دنیا بھر کے لوگوں کا اپنی اپنی زبان میں اللہ تعالیٰ کی ثناء کرنا، نبی پر درود بھیجنا اللہ سے دعائیں مانگنا خلافِ شرع قرار پائے گا۔

جنات نظر کیوں نہیں آتے؟

سوال: انسانوں کو آگ نظر آتی ہے تو جنات کیوں نظر نہیں آتے ہیں، حالانکہ وہ آگ ہی سے پیدا کئے گئے ہیں؟، (سیّد محمد فرحان زیدی..... نیول کالونی، کراچی)۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (الرحمٰن:۱۵)

''اور اس نے جن کو خالص آگ کے شعلے سے پیدا کیا''۔

شیاطین بھی جنات ہی کی نوع سے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ

''ابلیس کے سواسب فرشتوں نے سجدہ کیا، وہ جنات میں سے تھا اور اس نے اپنے رب کی حکم عدولی کی''۔ (الکہف:۵۰)

دوسرے مقام پر شیاطین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (الاعراف:۲۷)

''بلاشبہ وہ (شیطان) اور اس کا کنبہ تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ پاتے''۔

ہمیں نظر نہ آنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ جس آگ سے انہیں بنایا ہے، ہوسکتا ہے وہ اتنی لطیف ہو کہ نظر نہ آ سکتی ہو، کیونکہ شیطان نے اپنے اس مادۂ تخلیق کی لطافت کی بنا پر اپنے آپ کو انسان سے افضل قرار دیا ہے:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف:۱۲)

''(اللہ نے) فرمایا: تجھے (آدم کو) سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا، جبکہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا؟ بولا، میں اس سے بہتر ہوں، (اے اللہ!) تو نے مجھے آگ سے تخلیق کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے''۔

یعنی اس نے آگ کی لطافت کو مٹی کی کثافت پر فضیلت کا سبب قرار دیا۔ اور ہمیں تو بہت سی خاکی مخلوق بھی، انتہائی چھوٹے جراثیم (Virus)، خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتے، لہٰذا جنات بھی لطیف ناری مخلوق ہوتے ہوئے ہمیں نظر نہ آئیں تو یہ حیرت واستعجاب کی بات نہیں ہے۔ واللہ اعلم

گمراہ پیر

سوال: ایک شخص بظاہر تبلیغ دین کا کام بھی کرتا ہے، لوگوں کو مرید بھی بناتا ہے یعنی بیعت وارشاد کا کام بھی کرتا ہے۔ اور تعلّی کے طور پر کہتا ہے کہ میں فلاں بزرگ کو مزار سے نکال کر پھینک دوں گا اور اپنا قبضہ کرلوں گا، ساتھ ہی مدرسہ تعلیم القرآن، جس میں محلے کے ۹۰ طلبہ وطالبات قرآن

کریم کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، اپنے ذاتی مفادات کے لئے بند کر دیا۔ بتایئے ازروئے قرآن و سنت ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟ (محمد اقبال نقشبندی مجددی ملنگی...... سیکٹر 5-E، نیو کراچی)

جواب: رسول اللہ ﷺ نے جنازہ، میت اور قبر کی تکریم و احترام کا حکم دیا ہے، صحیح مسلم میں روایت ہے، آپ نے فرمایا:

"قبر کے اوپر نہ بیٹھو اور قبر کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھو۔"

یعنی ایسا نظر آئے کہ قبر کو سجدہ کیا جا رہا ہے۔ اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً قبر کی اہانت و تحقیر بھی جائز نہیں اور حد شرع سے بڑھ کر تکریم بھی جائز نہیں ہے۔ صحیح مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص آگ کی چنگاری پر بیٹھے کہ اس سے اس کے کپڑے جل جائیں اور آگ کا اثر اس کی جلد تک پہنچ جائے، (اس اذیت کا برداشت کرنا) اس سے بہتر ہے کہ وہ قبر پر بیٹھ جائے (اور اس کا وبال اور گناہ اس کے ذمے آئے)"۔

بخاری و مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے:

"حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ ایک جنازے کا ہمارے پاس سے گزر ہوا، رسول اللہ ﷺ (جنازے کو دیکھ کر) کھڑے ہوگئے، ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے ہوگئے، ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم) یہ تو ایک یہودی عورت کا جنازہ ہے، آپ نے فرمایا: موت ایک ہولناک چیز ہے، پس جب تم جنازہ دیکھو تو (موت کی ہولناکی کا تصور کر کے) کھڑے ہو جایا کرو"۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں میت، جنازے اور قبر کی تکریم اور ان چیزوں کو دیکھ کر آخرت کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قبر پر بیٹھنے کی رسول اللہ ﷺ نے شدت سے ممانعت فرمائی ہے اور اس کی سنگینی کو آگ میں جلنے سے زیادہ شدید بتایا ہے۔ تو قبر کا کھودنا اور میت کو قبر سے نکالنا تو قبر کے اوپر بیٹھنے سے بدرجہا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص جو دین کی تبلیغ اور بیعت و ارشاد کا کام کرتا ہے، وہ دین کی بنیادی تعلیمات سے اس قدر ناواقف ہے۔ اسی لئے امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جاہل کے تبلیغ کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اگر وہ مسئلہ جانتے ہوئے اور حکم شرعی کو رد کرتے ہوئے ایسا کہتے ہیں، تو یہ فسق ہے اور انہیں توبہ

کرنی چاہئے۔ اگر وہ قبر کسی ولی اللہ کی ہے اور وہ شخص ان کے مقام سے واقف ہے اور ان سے عناد رکھتے ہوئے ایسا کہتا ہے تو حدیث قدسی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''جو شخص میرے کسی ولی سے عداوت رکھے گا، میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں''۔

ویسے کسی شخص کی ملکیتی زمین میں اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر کسی میت کو دفن کر دیا گیا ہو تو وہ میت کے ورثاء سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ میت کو اس کی ملکیتی یا غصب شدہ زمین سے نکال کر دوسری جگہ دفن کیا جائے۔

سوال کے دوسرے حصے میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ پیر صاحب نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے ''مدرسہ تعلیم القرآن'' بند کر دیا ہے، یہ سوال مبہم ہے اور ذاتی مفاد کی وضاحت سوال میں نہیں ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ مدرسہ اس پیر صاحب کے ذاتی مکان یا ذاتی ملکیتی جگہ پر چل رہا تھا، تو اگرچہ یہ سعادت اور خیر سے محرومی کی بات ہے، لیکن شرعاً انہیں ایسا کرنے کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ انہوں نے ابتداءً اسے وقف نہ کیا ہو بلکہ عاریتاً مدرسہ تعلیم القرآن کے لئے دیا ہو۔ اور اگر وہ مدرسہ کسی ایسی جگہ چل رہا تھا جو مدرسے ہی کے مقاصد کے لئے وقف تھی یا اس کے اصل مالک نے برضا و رغبت اس کی اجازت دے رکھی تھی تو پیر صاحب کو اس کے بند کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ قرآن مجید نے ''سورۃ القلم'' کی ابتدائی آیات میں دشمنانِ رسول کے جو اوصاف رذیلہ بیان فرمائے ہیں، ان میں ایک مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ یعنی ''خیر کے کاموں میں رکاوٹیں ڈالنے والا'' بھی ہے۔ الغرض اگر سوال میں درج کردہ واقعات و الزامات حقیقت ہیں، محض بہتان طرازی نہیں ہے تو ایسا شخص منصبِ تبلیغ، بیعت و ارشاد اور دینی رہنمائی کا اہل نہیں ہے، حق واضح ہونے پر انہیں اپنے طرزِ عمل سے رجوع کر کے توبہ کرنی چاہئے۔

محاورہ کلمۂ کفر ہے؟

سوال: یہ جملہ کفر کیوں ہے؟ (میری آنتیں قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھ رہی ہیں؟)۔

(عرفان اللہ قادری.....کراچی)

جواب: ''میری آنتیں قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھ رہی ہیں'' یہ اردو زبان کا محاورہ ہے اور یہ محاورہ اس

وقت بولا جاتا ہے جب کسی شخص کا معدہ خالی ہو اور بھوک کی شدت اسے ستا رہی ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے علامہ اقبال کا یہ شعر ہے۔

پروانے کو چراغ بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

ظاہر ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کر دیا تھا اور ان کے گھر میں باقی کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ سوائے اللہ جل جلالہ اور اس کے حبیب ﷺ کی برکات اور مقدس نام کے۔ مذکورہ بالا محاورے میں بظاہر کوئی موجب کفر بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کلمۂ کفر ہے۔ ہاں البتہ شرعی احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ اور اس کے حبیب کریم ﷺ کے اسماء گرامی کو روزمرہ محاورات میں اس طرح استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ہمیشہ تقدس و تعظیم کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کا نام لینا چاہئے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ قرآنی کلمات ہیں اور اعضاء کا حسب حال اللہ کی تسبیح بیان کرنا عقلاً کوئی بعید بات نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (اسرا:۴۴)

''اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے''۔

(بقیہ جواب صفحہ 409 پر ملاحظہ کریں)

روزانہ ۷۸۶ مرتبہ بسم اللہ پڑھنے پر خواہش کا پورا ہونا

سوال: آپ کا کالم شروع ہونے سے پہلے ایکسپریس اخبار میں ایک بار یہ چھپا تھا کہ کوئی سات روز تک روزانہ ۷۸۶ مرتبہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھے تو اس کی ہر خواہش پوری ہوگی، کیا یہ درست ہے؟ ایسی کوئی حدیث ہے؟ (م الف ع.....کراچی)

جواب: میرے ناقص علم میں حدیث کا کوئی ایسا حوالہ یا روایت نہیں ہے، نہ ہی سلف صالحین میں سے کسی ایک کا ایسا قول مجھے معلوم ہے، جو بزرگ ایسا عمل بتائیں، انہی سے اس کا اصل معلوم فرمالیجئے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اللہ تعالیٰ کے اسم ذات اور مقدس اسماء صفات پر مشتمل ہے، اسے جتنی بار بھی پڑھیں گے، اجر و ثواب ملے گا۔ مخصوص تعداد کے بارے میں کسی بزرگ کا مجرب عمل ہو تو ان سے رہنمائی حاصل کیجئے۔

کیا رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت کعبہ جھکا تھا؟ جبریل امین نے ہر ستر ہزار سال بعد طلوع ہونے والا ستارہ بہتر ہزار مرتبہ دیکھا تھا اس کا حوالہ

سوال: (۱): بعض علماء بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کی ولادت کے وقت کعبہ جھکا تھا، اس کے بارے میں یہ بات کونسی کتاب میں ہے حوالہ لکھ دیں۔ امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کے سلام کا معروف شعر بھی ہے۔

جن کے سجدے کو محراب کعبہ جھکی
ان بھنوؤں کی لطافت پہ لاکھوں سلام

سوال: (۲) حضور اکرم ﷺ نے ایک بار جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ کی عمر کتنی ہے، جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ ایک ستارہ ستر ہزار سال کے بعد نکلتا تھا اس کو میں نے بہتر ہزار مرتبہ دیکھا، یہ بات بھی کون سی کتاب میں ہے حوالہ لکھیں۔

(محمد عارف الحق قادری.....لودھراں، پنجاب)

جواب: (۱) اس کے بارے میں علامہ مفتی محمد خان قادری نے اپنی تالیف ''شرح سلام رضا'' میں حاشیۂ سیرۃ حلبیہ کا حوالہ دیا ہے لیکن ہمیں یہ حوالہ مل نہیں سکا۔ تاہم اس سے قریب تر مفہوم کی جو روایت ملی ہے، وہ یہ ہے:

عن عبدالمطلب قال: كنت فی الكعبة فرأيت الاصنام سقطت من اماكنها و خرت سجداً و سمعت صوتا من جدار الكعبة يقول: ولد المصطفى المختار الذی تهلک بيده الكفار و يطهر من عبادة الاصنام ويامر بعبادة الملک العلام.

''عبدالمطلب بیان کرتے ہیں کہ میں کعبہ میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ بت اپنی جگہوں سے گر کر سجدہ ریز ہوگئے اور میں نے دیوار کعبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مصطفیٰ مختار کی ولادت ہوگئی جن کے ہاتھوں کفار کی ہلاکت ہوگی اور وہ (بیت اللہ کو) بت پرستی سے پاک کریں گے اور مالک حقیقی علام (الغیوب) کی عبادت کا حکم دیں گے۔ (انسان

العیون فی سیرۃ الامین المامون الشہیر بالسیرۃ الحلبیہ ،مؤلفہ علی بن برہان الدین الحلبی ،
ج اول ص ۱۱۵۔ ۱۱۴)۔"

اور دوسرے مقام پر ہے:

ولیلۃ ولادتہ ﷺ تزلزلت الکعبۃ ولم تسکن ثلاثۃ ایام ولیالیھا۔

"اور ولادت مصطفیٰ ﷺ کی شب کعبہ لرز گیا اور تین دن اور تین رات وہ ساکن نہیں ہوئے" (سیرۃ حلبیہ ۱/۱۱۶)

مدارج النبوۃ جلد دوم صفحہ ۳۲ مصنفہ علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مترجم مفتی غلام معین الدین نعیمی میں ہے:

حضرت عبدالمطلب سے منقول ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں شب ولادت، کعبہ کے پاس تھا جب آدھی رات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ کعبہ مقام ابراہیم کی طرف جھکا اور سجدہ کیا اور اس سے تکبیر کی آواز آئی کہ:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ رَبُّ مُحَمَّدِ نِ الْمُصْطَفٰی اَلْاٰنَ قَدْ طَھَّرَنِیْ رَبِّیْ مِنْ اَنْجَاسِ الْاَصْنَامِ وَاَرْجَاسِ الْمُشْرِکِیْنَ

"ترجمہ: اللہ بلند و بالا ہے اللہ بلند و بالا ہے وہ رب ہے محمد مصطفیٰ کا، اب مجھے میرا رب بتوں کی پلیدی اور مشرکوں کی نجاست سے پاک فرمائے گا"۔

اور غیب سے آواز آئی رب کعبہ کی قسم، کعبہ کو برگزیدگی ملی، خبردار ہو جاؤ کعبہ کو ان کا قبلہ، ان کا مسکن ٹھہرایا۔ اور وہ بت جو کعبہ کے گرد اگرد نصب تھے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور سب سے بڑا بت جسے ہبل کہتے تھے منہ کے بل گر پڑا تھا۔ ندا آئی کہ سیدہ آمنہ سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور ابر رحمت ان پر اتر آیا ہے۔

شواہد النبوۃ (مصنفہ علامہ نورالدین عبدالرحمن جامی مترجم بشیر حسین ناظم) صفحہ نمبر ۷۵ پر ہے:

کعبے میں بت سرنگوں ہو گئے

حضرت عبدالمطلب کا بیان ہے کہ میں حضور علیہ السلام کی ولادت کے وقت طواف کعبہ میں مصروف تھا۔ جب آدھی رات گزری تو میں نے خانہ کعبہ کو مقام ابراہیم کی طرف سجدہ اور اللہ اکبر

کی آوازیں بلند کرتے دیکھا اور کہتے سنا کہ اب مجھے مشرکوں کی نجاستوں اور زمانۂ جہالت کی ناپاکیوں سے پاک وصاف کر دیا گیا ہے۔ پھر اس میں تمام بت جھک گئے، میں نے ہبل کی طرف دیکھا جو سب سے بڑا بت تھا تو وہ بھی اوندھے منہ ایک پتھر پر پڑا ہوا تھا اور منادی نے یہ صدا دی کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے محمد پیدا ہو چکے ہیں۔ اس وقت میں صفا پہاڑ پر چلا گیا، صفا پہاڑ کو میں نے پرغوغا دیکھا۔ مجھے ایسا نظر آتا تھا گویا تمام پرندے اور بادل مکہ پر سایہ کرنے آئے ہیں۔ پھر میں حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی طرف آیا، دروازہ بند تھا۔ میں نے کہا کہ دروازہ کھولو۔ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے کہا ابا جان! محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا: لاؤ ذرا دیکھوں تو کہنے لگیں: اجازت نہیں۔ پھر میں نے کہا: اے آمنہ رضی اللہ عنہا! اس بچے کو تین دن تک کسی کو مت دکھانا۔ یہ کہہ کر میں نے تلوار سونتی اور گھر سے باہر چلا گیا۔ میں نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو تلوار سونتے ہوئے تھا اور چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے تھا، کہنے لگا: اے عبدالمطلب! واپس جا تاکہ ملائکہ مقربین اور تمام علیین کے رہنے والے تیرے بچے کی زیارت سے فارغ ہوں۔ اس سے میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں اسی حالت میں باہر آ گیا تاکہ قریش کو محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش کی خبر دوں لیکن میری زبان ایک ہفتہ تک بند ہو گئی اور میں کسی سے بات نہ کر سکا۔

یہ تمام روایات سند کے بغیر ہیں، ویسے فضائل میں ضعیف روایات بھی معتبر ہوتی ہیں۔

(۲) ستارے سے متعلق حدیث مندرجہ ذیل ہے:

> **عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ سأل جبريل عليه الصلوة والسلام فقال يا جبريل كم عمرت من السنين؟ فقال يا رسول الله! لست اعلم غير ان فی الحجاب الرابع نجما يطلع فی كل سبعين الف مرة، رأيته اثنين و سبعين الف مرة فقال يا جبريل وعزة ربی جل جلاله أنا ذالک الكوكب.**

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا اے جبریل! آپ کی عمر کتنی ہے؟ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ ''حجاب رابع'' میں ایک ستارہ ستر ہزار سال

میں ایک مرتبہ طلوع ہوتا ہے اور میں اسے بہتر ہزار مرتبہ دیکھ چکا ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا اے جبریل! میرے رب کی عزت وجلال کی قسم، وہ ستارہ میں ہی ہوں"۔

(سیرۃ حلبیہ، جلد اول صفحہ ۴۹)

اسی روایت کو علامہ اسماعیل حقی نے اپنی تفسیر روح البیان میں سورۃ توبہ کی آیات ۱۲۹۔۱۲۸ کی تفسیر میں نقل کیا ہے، (روح البیان، ج ۳، ص ۶۸۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔ سند دونوں جگہ مذکور نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق، ایک دلچسپ عقلی سوال

سوال: اللہ تعالیٰ نے اب تک کروڑوں اور اربوں انسان پیدا کیے ہیں تو اس سلسلے میں (یعنی انسان کی پیدائش میں) اللہ تعالیٰ کا Criteria کیا ہے، مطلب یہ کہ فلاں انسان اس دور میں پیدا ہوں گے اور فلاں اس دور میں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس دور میں پیدا ہونے کے بجائے ۵۰۰ سال پہلے یا اس سے بھی پہلے پیدا ہوا ہوتا تو مجھے ہر لحاظ سے فائدہ ہوتا۔ اچھا ماحول، اچھے لوگ، اچھی چیزیں اور اچھی صحبت میسر آتی۔ اس دور میں تو بڑے بڑے بزرگ اور ولی اللہ تھے، آج کتنے نظر آتے ہیں؟ تو بس سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو جو مختلف ادوار میں پیدا فرماتا ہے اس کی منطق (Logic) یا حکمت کیا ہے؟ (عبداللہ...... دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: آپ کا سوال عقلی ہے، نہایت دلچسپ بھی اور گہرے غور وفکر کا بھی متقاضی ہے۔ اگرچہ اس کالم میں زیادہ تفصیل کی گنجائش تو نہیں ہے، لیکن اس حد تک وضاحت ناگزیر ہے کہ مسئلہ بہ آسانی ذہن نشین ہو جائے اور اشکال رفع ہو جائے۔ بنیادی طور پر یہ قضا وقدر کا مسئلہ ہے اور اس مسئلے میں زیادہ بحث و تمحیص کو شریعت نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قادرِ مطلق اور مالک ومختار ہے اور وہ اپنے کسی عمل کے لئے کسی کے آگے مسئول اور جوابدہ نہیں ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (الانبیاء: ۲۳)

"اللہ سے نہیں پوچھا جا سکتا ان کاموں کے متعلق جو کرتا ہے اور ان سب سے باز پرس کی

جائے گی"۔

لہٰذا کون سا کام کب کیا جائے؟ کس کی تخلیق پہلے ہو اور کس کی بعد میں؟ یہ باری تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے، مخلوق میں سے کوئی یہ سوال کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ ایسا سوال ایک نامعقول جسارت اور مقام بندگی سے برتر معاملہ ہے اور اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ اس کے افعال مبارکہ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے تو اس توفیق خیر اور سعادت وہبی پر اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور اگر مشیت باری تعالیٰ کا کوئی فعل ہماری سمجھ سے بالاتر ہو، ماورائے عقل ہو، اس کی حکمت وحقیقت تک ہماری ناقص وناتمام عقل کی رسائی نہ ہوسکے، تو اس کے حق وصواب ہونے پر ایمان کامل رکھتے ہوئے معاملہ اللہ کی طرف تفویض کردینا چاہئے، اسی لئے علماء ربانیین نے تقدیر کو "سر الٰہی" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جو ضروری نہیں کہ ہم پر منکشف ہوجائے۔ اسلام، تسلیم ورضا اور مکمل خودسپردگی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ (النساء: ۷۸)

"تم جہاں کہیں بھی ہوگے موت تم کو پالے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو، اور اگر انہیں کچھ بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ (تو) اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر انہیں کچھ برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ (اے رسول) یہ آپ کی طرف سے ہے، آپ فرمادیجئے کہ (خیر ہو یا شر، نفع ہو یا ضرر) سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے"۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ (الواقعہ: ۶۰)

"ہم نے ہی تمہارے درمیان موت کو مقدر فرمایا"۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ (فاطر: ۱۱)

"اللہ ہی کے علم سے ہر ماں حاملہ ہوتی ہے اور وہ (بچہ) جنتی ہے اور جس معمر شخص کو (بھی) عمر (طویل) دی جاتی ہے یا کسی کی عمر کم کی جاتی ہے، وہ سب کچھ، لوح محفوظ میں (مرقوم) ہے"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ایسے تکوینی امور مثلاً کون کب پیدا کیا جائے، کس کی عمر کتنی ہو، کوئی مرد ہو یا عورت، کوئی حسین وجمیل ہو یا بدصورت، کوئی دانا ہو یا نادان وغیرہ، جن میں انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے، ان پر جزا اور سزا کا مدار نہیں ہے۔ اسی طرح کسی غیر اختیاری امر پر نہ کسی پر اللہ کے غضب کا نزول ہوتا ہے اور نہ ہی اس بنا پر وہ جزاء کا حقدار ہوتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَآ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ۫ وَمَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ ؕ

(النساء:۷۹)

"(اے مخاطب!) تجھے جو بھلائی پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی ذات کے سبب ہے"۔

اللہ تعالیٰ یہود کی سرکشی کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَبِمَا نَقۡضِہِمۡ مِّیۡثَاقَہُمۡ وَکُفۡرِہِمۡ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَقَتۡلِہِمُ الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ وَّقَوۡلِہِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیۡہَا بِکُفۡرِہِمۡ فَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا

"پھر ہم نے ان کی عہد شکنی کے باعث (ان پر لعنت کی) اور آیاتِ الٰہی کے انکار، ان کے انبیاء کو ناحق قتل کرنے، اور (سرکشی کی بناء پر) یہ کہنے کے سبب کہ ہمارے دلوں پر پردے (چڑھے ہوئے) ہیں۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے ان کے کفر کے سبب (سزا کے طور پر) ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور (اب ان میں سے) بہت کم ایمان لائیں گے"۔ (النساء:۱۵۵)

یہ سزا جسے قرآن مجید نے جا بجا ختم، طبع، غلاف، اَکِنَّۃٌ اور اس جیسے دیگر کلمات کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ مفسرینِ کرام نے بتایا ہے کہ یہ کوئی حسی یا حقیقی مہر، غلاف یا پردہ نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کے قلوب واذہان میں نورِ ایمانی اور ہدایت کے داخل ہونے کے تمام راستے بند ہوگئے ہیں، بلکہ قبولِ خیر سے ان کے صریح انکار، عناد، ضد اور ہٹ دھرمی کو علامتی طور پر ان کلمات سے تعبیر کیا ہے، اور اب وہ محض مجبور ہوگئے ہیں یا ان سے مراد ایسی علامات ہیں جن سے فرشتے ان کو پہچان لیں گے، جیسے دنیا میں بھی قیدیوں کے مخصوص لباس ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت میں میری امت کی امتیازی پہچان یہ ہوگی کہ وہ مُحَجَّلْ (پنج کلیان) ہوں گے، یعنی

ان کے اعضاءِ وضو چمک رہے ہوں گے اور نورانی ہوں گے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم

(الحدید: ۱۲)

"(اے محبوب!) جس دن آپ مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں جانب دوڑتا ہوا ہوگا"۔

اور اس کے برعکس کفار، منکرینِ آخرت اور فساق و فجار کی کیفیت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے:

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (المطففین: ۱۴)

"ہرگز نہیں بلکہ ان کے اعمال (بد) کے سبب ان کے دل زنگ آلود ہو چکے ہیں"۔

اب رہا یہ سوال کہ سعادت و شقاوت، خیر و شر جب سب کچھ پہلے ہی سے تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے تو اس میں بندے کا کیا قصور؟ تو جواباً گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم تھا کہ کون کیا کرے گا؟ نیک ہوگا یا بد، سعادت مند ہوگا یا شقی و بدنصیب؟۔ الغرض اپنے علم حق کے مطابق اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے، یعنی یہ نہیں کہ چونکہ تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے اس لئے اس نے لازماً ایسا ہی کرنا ہے، بلکہ جو کچھ اس نے آگے چل کر کرنا تھا وہ لکھ دیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک آرکیٹیکٹ اور انجینئر کسی پل یا ڈیم کا ڈیزائن بناتا ہے، اس کے تعمیراتی سامان کا ایک معیار مقرر کرتا ہے، پھر مقررہ ڈیزائن اور معیار کے مطابق اسے تعمیر کیا جاتا ہے اور آرکیٹیکٹ اور انجینئر پہلے ہی یہ بتا دیتا ہے کہ یہ پل یا ڈیم اتنی مدت کے لئے کارآمد ہوگا اور پھر عملاً ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ انجینئر ہزار سال تک کی پیشین گوئی کر دیتا تو وہ پل ہزار سال تک کارآمد رہتا، بلکہ اس کا تعلق اس پل یا ڈیم کے ڈیزائن یا استعداد پر ہے اور انجینئر کی پیش گوئی اس کے فنی علم و تجربے کی روشنی میں ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کے ظن و تخمین اور علم میں خطا کا احتمال ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے علم یقینی میں رائی کے دانے کے برابر بلکہ اس کے کروڑویں حصے کے برابر بھی خطا کا کوئی احتمال نہیں۔

کوئی عالم، انجینئر یا سائنسدان تو درپیش حالات و واقعات اور حقائق کے پیش نظر رائے قائم کرتا ہے لیکن وہ عالم الغیب نہیں ہے۔ مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا اسے علم نہیں ہوتا،

غیر متوقع طور پر کوئی بہت بڑا سیلاب آ جائے، زلزلہ آ جائے، میٹریل ناقص نکل آئے، آندھی یا طوفان آ جائے، یا اچانک آگ لگ جائے وغیرہ، تو اس کے سارے کے سارے تخمینے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور اس کی پیش گوئی یا تخمینہ ناکام ہو جائے گا۔ جبکہ علمِ الٰہی ماضی، حال اور مستقبل، غیب و شہود، حوادث و آفات، ظاہر و پوشیدہ، کمالات و نقائص سب پر محیط ہے، لہٰذا اس میں کسی بھی درجے میں کسی بھی مرحلے میں از ابتداءِ آفرینش تا ابد کسی بھی خطا کا عقلاً یا عادتاً کوئی امکان نہیں ہے۔

یہ مسئلہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیر ازل میں کسی کے بارے میں کیوں لکھ دیا کہ وہ بامراد ہوگا یا نامراد، اس کے برعکس کیوں نہیں لکھ دیا؟ ۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک معلم اپنے ایک شاگرد کے جملہ احوال کو جانتا ہے اور ان حقائق کے پیش نظر وہ پیش گوئی کر دیتا ہے کہ تم فیل ہو جاؤ گے اور وہ فیل ہو جاتا ہے، اس کو عام محاورے میں نوشتۂ دیوار کہتے ہیں۔ کیا اگر اسے معلم کہہ دیتا کہ تم یونیورسٹی میں ٹاپ کرو گے تو ایسا ہو جاتا، ہرگز نہیں۔ مزید یہ کہ استاد کا اپنے شاگرد کی ناکامی کی پیش گوئی کرنا اس کی رضا اور تمنا نہیں ہے بلکہ قانونِ مکافاتِ عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی فرق رضاءِ الٰہی اور مشیتِ الٰہی میں ہے، کفار و مشرکین اور فساق و فجار کو نارِ جہنم کا عذاب دینا رضاءِ الٰہی نہیں بلکہ مشیتِ ربانی اور قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔

اب اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں کہ کسی کو پہلی صدی میں اور کسی کو پندرھویں صدی ہجری میں پیدا کرنے میں خالق کی حکمت کیا ہے اور کیا اس دور میں پیدا ہونے والوں کے ساتھ معاذ اللہ خالق جل شانہٗ نے کوئی ناانصافی تو نہیں فرمائی؟ اس کا ایک سادہ اور اٹل جواب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار اور قادرِ مطلق ہے اور وہ اپنے کسی عمل کے لئے کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے، لیکن اس کا کوئی عمل حکمت سے خالی بھی نہیں ہے اور اس نے اپنے کرمِ عالی اور فضل و احسان سے کسی کو محروم نہیں رکھا۔ اگر اس نے سابقین اولین کے لئے درجات رکھے ہیں تو متاخرین یا بعد میں آنے والوں کے لئے بھی حصولِ خیر کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ بلاشبہ قرونِ اولیٰ میں نیکیوں کی فراوانی تھی۔ ماحول سارے کا سارا ایمان افروز اور روح پرور تھا۔ ایسے ماحول میں نیک بن کر رہنا اور نیکی کرنا نسبتاً آسان تر تھا، آج صورتِ حال بالکل برعکس ہے، برائی معاشرے میں اس طرح اندر تک سرایت کئے ہوئے ہے جیسے انسان کی نس نس میں خون دوڑ رہا ہے۔ ایسے ماحول میں خیر کے

جادۂ مستقیم پر رہنا جہادِ اکبر نہیں تو اور کیا ہے۔ مگر خیر کے راستے میں رکاوٹیں جس قدر زیادہ ہیں اتنا ہی اجر و ثواب بھی زیادہ ہے۔ حدیث پاک ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّکُمْ فِیْ زَمَانٍ مَنْ تَرَکَ مِنْکُمْ عُشْرَ مَا اُمِرَ بِهٖ هَلَکَ ثُمَّ یَاْتِیْ زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَا اُمِرَ بِهٖ نَجَا۔

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کرام سے) فرمایا: تم ایک ایسے (مبارک) دور میں ہو کہ تم میں سے جو شخص احکام شریعت کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دے گا ہلاک ہو جائے گا، پھر (تمہارے بعد) ایک ایسا دور آئے گا کہ ان لوگوں میں سے جو شخص احکامِ شریعت کے دسویں حصے پر بھی عمل پیرا رہا تو نجات پالے گا''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

رسول اللہ ﷺ سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والا کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''بے شک میری امت میں سے مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے لوگ وہ ہیں جو میرے (وصال کے) بعد آئیں گے، ان میں سے ایک شخص تمنا کرے گا کہ کاش میں اپنا گھر بار اور مال و متاع سب کچھ قربان کر دوں اور (اس کے صلے میں) مجھے اللہ کے رسول کا دیدار نصیب ہو جائے، (صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)۔''

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا: ''جب میری امت (کے عقائد، اخلاق اور معاملات) میں بگاڑ پیدا ہوگا تو اس وقت جو شخص میری سنت پر قائم رہے گا، اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا''۔ (بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ)''

تو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں ہمارے لئے بڑی بشارتیں، سعادتیں، اجر و ثواب اور انعام و اکرام کا خزانہ موجود ہے جو ہمارا منتظر ہے، کاش کوئی ہم میں سے اسے حاصل کرنے کے لئے پیش قدمی کرے، اس لئے اس دورِ پرفتن میں پیدا ہونا مایوسی کی بات نہیں ہے، بلکہ اجر و ثواب کے مواقع زیادہ ہیں۔

کسی بندے کے بارے میں کہنا ”(العیاذ باللہ) ہمارے اللہ وہ ہیں“

سوال: میرے کچھ سسرالی جو ایک معروف شخص کے پیروکار و عقیدت مند ہیں، جن میں میرے شوہر کی سگی بہنیں بھی شامل ہیں، یہ لوگ اپنے مرشد کے بارے میں کہتے ہیں کہ: (نعوذ باللہ) ”ہمارے اللہ وہ ہیں“ ان کے ایک ساتھی کا انتقال ہوا تو ان کا کہنا تھا کہ اسے پیر صاحب نے اپنے پاس بلا لیا، اس کے جنازے میں کلمے کے بجائے پیر صاحب کے نعرے لگاتے رہے۔ یہ لوگ اذان اور نماز کو نہیں مانتے اور نہ ہی قرآن شریف پڑھتے ہیں بلکہ مذاق اڑاتے ہیں۔ میری نند جو پیر صاحب کی پیروکار ہے، اس کی شادی اس جیسے خیالات رکھنے والے شخص سے ہو رہی ہے۔

جناب میں معلوم یہ کرنا چاہتی ہوں کہ:

۱) میری ساس اور سسر جو کہ نماز اور روزے کے پابند ہیں، اس شادی کے کرنے میں ان کے لئے کیا حکم ہے؟، کیا وہ گناہگار ہوں گے؟۔

۲) کیا میرے شوہر اور میں اس شادی میں شرکت کر سکتے ہیں؟۔

۳) جن والدین کی اولاد اس طرح کے خیالات رکھتی ہو ان کو اپنی اولاد کے ساتھ کیسا سلوک رکھنا چاہئے؟۔

۴) اگر کسی شخص کی بیوی اس پیر صاحب کی پیروکار ہو جائے تو ان کے نکاح پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا نکاح قائم رہے گا؟ (اہلیہ انور احمد، کراچی)۔

جواب: بر تقدیر صدق سائلہ جو شخص غیر اللہ کے بارے میں کہے کہ (العیاذ باللہ) ہمارے اللہ وہ ہیں، یہ صریح کفر اور شرک ہے اور جو راہنما یا پیشوا یہ جانتا ہو کہ اسے (معاذ اللہ) اللہ کہا جا رہا ہے اور وہ اپنے پیروکار کو روکے ٹوکے نہیں تو یہ کفر و شرک پر رضامندی ہے اور یہ بھی کفر ہے۔ ایسے لوگ اگر شادی شدہ ہوں تو ان کا نکاح باطل ہو جائے گا تاوقتیکہ یہ کفر سے توبہ نہ کرلیں۔ پھر ان کی تجدید نکاح ہو سکے گی۔ جب تک یہ لوگ اپنے (سوال میں بیان کردہ) عقائدِ کفریہ پر قائم ہوں، ان سے ہر طرح کا میل جول، رشتہ نکاح قائم کرنا اور ان کی سماجی تقریب میں شرکت کرنا حرام ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے: ”اور ظالموں کی طرف میلان نہ رکھو ورنہ تمہیں جہنم کی آگ چھوئے گی۔“

۱) آپ کی ساس اور سسر اگر ان کے کفر پر مطلع ہونے کے باوجود اس پر راضی ہوں گے اور ایسے

شخص کو اپنی بیٹی کا رشتہ دیں گے تو یہ "رضا علی الکفر" کی بنا پر کفر ہے۔
۲) آپ لوگوں کے لئے شرعاً اس شادی میں شرکت سے اجتناب لازم ہے۔
۳) والدین کو چاہئے کہ ایسے عقائد کی حامل اولاد کو ان عقائدِ باطلہ کے کفر پر مطلع کر کے انہیں اُن سے رجوع کی دعوت بلکہ حکم دیں، اور اگر وہ باطل سے "رجوع الی الاسلام" پر آمادہ نہ ہوں تو ان سے قطعِ تعلق کر لیں، ہر مسلمان روزانہ دعائے قنوت میں اپنے رب سے یہ عہد و پیمان کرتا ہے کہ:

وَنَخْلَعُ وَ نَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ

یعنی "اے اللہ! جو تیرا نافرمان ہے ہم اس سے قطعِ تعلق کرتے ہیں۔"
۴) اگر وہ شخص صحیح العقیدہ مسلمان ہے تو بیوی کے کفریہ عقائد اختیار کرنے سے نکاح باطل ہو جائے گا تاوقتیکہ وہ اپنے کفر پر مطلع ہونے کے بعد توبہ کر کے دوبارہ اسلام قبول کر لے۔ تجدیدِ ایمان کے بعد تجدیدِ نکاح بھی کرنی ہوگی۔

تخلیق ارض و سماء سے پہلے عرش کہاں تھا؟

سوال: زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے عرشِ الٰہی کہاں تھا؟ (عبداللہ...... گلشن اقبال، کراچی)

جواب: اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّ کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ
لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (ھود: ۷)

"اور (اللہ) وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کس کا عمل سب سے اچھا ہے"۔

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ قرآن مجید میں ہے کہ عرش پانی پر تھا، تو پانی کس چیز پر تھا؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہوا کی پشت پر تھا، (جامع البیان، رقم الحدیث: ۱۳۹۰۵)"۔

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ ھ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اس کا عرش پانی پر تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی عجیب و غریب قدرت کے اظہار کے لئے یہ فرمایا ہے، کیونکہ کسی عمارت کو بنانے والا اپنی عمارت کو سخت زمین پر پانی سے

دور رکھ کر بناتا ہے تاکہ اس کی عمارت منہدم نہ ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پانی پر بنایا تاکہ عقل والے اس کی قدرت کے کمال کو جان لیں، (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۹۲)''۔

امام رازی آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت پر دلالت ہے، کیونکہ عرش تمام آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑا ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کو پانی پر قائم کیا ہے، پس اگر اللہ تعالیٰ کسی ستون کے بغیر کسی وزنی چیز کو رکھنے پر قادر نہ ہوتا تو عرش پانی پر نہ ہوتا، اور اللہ تعالیٰ نے پانی کو بھی بغیر کسی سہارے کے قائم کیا، نیز عرش کے پانی پر ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ عرش پانی کے ساتھ ملتصق اور متصل ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ آسمان زمین کے اوپر ہے۔

(تفسیر کبیر، ج ۶، ص ۳۲۰۔۳۱۹)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ پانی سے مراد وہی پانی ہے جو عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر ہے اور عرش سے مراد وہی عرش معروف ہے، اور عرش کے پانی پر ہونے کا معنیٰ عام ہے، خواہ عرش پانی سے متصل ہو یا منفصل، (روح المعانی ج ۷ ص ۱۵)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی تبیان القرآن جلد پنجم صفحہ ۵۰۳ پر لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ پانی سے مراد یہی معروف پانی ہے یا اس سے مراد مادے کی مائع حالت (FLUID) ہے جس پر بطور استعارہ پانی کا اطلاق کیا گیا ہے، اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ زمین و آسمان سے پہلے پانی کی تخلیق ہو چکی تھی، اور ایک اور آیت سے یہ معلوم ہوا کہ پانی ہی اصل کائنات اور منبع حیات ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (الانبیاء: ۳۰)

کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا، اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے پیدا کیا، تو کیا وہ ایمان نہیں لاتے''۔

کافر ملت پر معلق کر کے قسم کھانا

سوال: بعض لوگ قسم کھاتے وقت جوش میں آکر اس طرح کے کلمات استعمال کرتے ہیں کہ:
''اگر میں نے یہ کام کیا ہو یا ایسا کام کروں تو یہودی ہو جاؤں یا عیسائی ہو جاؤں یا کافر ہو کر مروں یا ایمان سے محروم ہو جاؤں''، اور وہ قسم میں جھوٹا ہے یا قسم توڑ دی، تو کیا حکم ہے؟
(کھتری عصمت علی پٹیل، کراچی)۔

جواب: جس شخص نے کسی کام کے کرنے کو ''ملتِ غیر اسلام'' پر معلق کیا، مثلاً کہا ''اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی ہوں''، تو اس کے تین محامل ہیں:

۱) اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ کام اسی طرح ''واجب الامتناع'' ہے (یعنی اس کا نہ کرنا ضروری ہے)، جیسے یہودی نہ ہونا ضروری ہے اس صورت میں وہ کافر نہیں ہوگا، لیکن چونکہ حدیث میں ایسی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے، اس لئے وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا اور حدیث میں جو اس کو کافر فرمایا گیا ہے، وہ زجر و توبیخ پر مشتمل ہے،
(البحر الرائق، ج ۴، ص ۲۸۴ مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ، کوئٹہ)۔

اور اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ کام بالکل نہیں کرے گا، اور اس نے یہ کام کیا تو اس کا یہودی ہونا صحیح، برحق اور حلال ہے تو اس صورت میں وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے ماضی کے حوالے سے کسی کام کے نہ کرنے کی جھوٹی قسم کھائی اور کہا کہ اگر اس نے یہ کام کیا ہو تو یہودی ہے، اور اس کا یہودی ہونا صحیح اور برحق ہے، تو اس صورت میں وہ فی الفور کافر ہو جائے گا، کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، (البحر الرائق، ج ۴، ص ۲۸۶۔۲۸۵ مطبوعہ کوئٹہ، الدر المختار علیٰ رد المحتار، ج ۵، ص ۳۹۴۔۳۹۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۹ھ)۔

اس سلسلے میں تیسری بات یہ ہے کہ اگر اس نے یہودیت کی تعظیم کی نیت سے قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی ہوں تو ایسی صورت میں بھی وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی تعظیم کرنا کفر ہے، اور اگر اس نے یہودیت کی تعظیم کی نیت نہیں کی تھی تو وہ کافر نہیں ہوگا، اور حدیث پاک میں جو ارشاد ہے، ''وہ کافر ہو جائے گا'' یہ کفرانِ نعمت پر محمول ہے۔

(صحیح مسلم مع شرح النووی، رقم الحدیث: ۱۱۰، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ)۔

حدیث مبارک، جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، یہ ہے: ''ثابت بن قیس ضحاک بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے درخت کے نیچے (یعنی بیعت رضوان، جو صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوئی) رسول اللہ ﷺ (کے دست اقدس پر) بیعت کی، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے ''ملتِ غیرِ اسلام'' پر جھوٹی قسم کھائی (یعنی یمینِ غموس) تو وہ ایسا ہی ہے، جیسا اس نے کہا۔''

جنت کی حوریں کیا ہیں؟ اور نیک خواتین کے لئے کیا ہوگا؟

سوال: قرآن مجید میں حوروں کا تذکرہ ہے، یہ بھی علماء سے سنتے رہتے ہیں کہ نیک مردوں کو جنت میں حوریں ملیں گی، تو نیک وصالح اور پاکباز خواتین کو کیا ملے گا؟ (صالحہ خاتون، کراچی)

جواب: قرآن مجید میں چار مقامات پر صراحت کے ساتھ حوروں کا تذکرہ آیا ہے، متعلقہ آیات مبارکہ اور ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۙ﴿۵۱﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ ۟ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ

''بیشک پرہیز گار امن کی جگہ میں ہوں گے، باغات اور چشموں میں، باریک اور دبیز ریشم کا لباس پہنے آمنے سامنے (بیٹھے ہوئے) ہوں گے، ایسا ہی ہوگا اور ہم گوری کشادہ چشم عورتیں ان کی زوجیت میں دیں گے''۔ (الدخان: ۵۱ تا ۵۴)

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (الطور: ۲۰)

''وہ برابر بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے (بیٹھے) ہوں گے، اور ہم انہیں زوجیت میں دیں گے گوری، کشادہ چشم عورتیں''۔

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ (الرحمٰن: ۷۲)

''گوری کشادہ چشم بیویاں خیموں میں (باپردہ) ٹھہرائی ہوئی ہوں گی۔''

وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۙ﴿۲۲﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ (الواقعہ: ۲۲، ۲۳)

''گوری کشادہ چشم بیویاں، جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔''

معتبر و مستند تفاسیر میں احادیث و روایات کے حوالے سے حوروں کے متعلق جو تشریحات آئی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

امام طبرانی روایت کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! قرآن مجید میں "حورعین" کا تذکرہ ہے، اس کی تفسیر فرمایئے! آپ نے فرمایا: وہ گورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی ہوں گی اور ان کی اتنی گھنی پلکیں ہوں گی، میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! قرآن کی آیت كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ کی تفسیر بیان فرمائیں، آپ نے فرمایا! جیسے صدف میں موتی صاف اور شفاف ہوتا ہے، جس کو کسی نے چھوا تک نہ ہو، وہ اس طرح صاف اور غیر کے لمس اور مس سے پاک ہوں گی، (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا یارسول اللہ! كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ کی تفسیر بیان فرمایئے! آپ نے فرمایا: ان کی جلد اس طرح ہوگی جیسے انڈے کے چھلکے کے اندر لپٹی ہوئی جھلی باریک ہوتی ہے۔ (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا یارسول اللہ! دنیا کی عورتیں، آپ نے فرمایا: دنیا کی عورتیں "حورعین" سے اس طرح افضل ہوں گی، جس طرح ظاہر باطن سے افضل ہوتا ہے۔ (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس فضیلت کا سبب؟ آپ نے فرمایا: اس فضیلت کا سبب ان کے روزے اور ان کی نمازیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے چہروں میں نور پیدا فرمادے گا، ان کا جسم ریشم کی طرح ہوگا، رنگ گورا ہوگا، کپڑے سبز ہوں گے، سنہرے زیورات ہوں گے، ان کی انگوٹھی موتی کی ہوگی، ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی، وہ کہیں گی: سنو! ہم دائمی ہیں، کبھی نہیں مریں گی، سنو! ہم ہمیشہ نعمت میں ہیں، کبھی مغموم نہیں ہوں گی، ہم قیام کرنے والیاں ہیں، کبھی سفر نہیں کریں گی، ہم خوش ہونے والیاں ہیں، کبھی ناراض نہیں ہوں گی، اس کو مبارک ہو جس کے لئے ہم ہیں اور وہ ہمارے لئے ہے، (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا! ہماری بعض عورتیں دنیا میں (یکے بعد دیگرے) دو خاوندوں سے نکاح کرتی ہیں، بعض تین سے اور بعض چار سے تو ایسی عورتیں جنت میں کس خاوند کے نکاح میں ہوں گی؟ آپ نے فرمایا: ام سلمہ! اس عورت کو اختیار دیا جائے گا، اور جس خاوند کا اخلاق دنیا میں سب سے اچھا ہوگا وہ اس کو اختیار کرے گی، وہ کہے گی: اے میرے رب! اس خاوند کا اخلاق سب سے اچھا تھا، میرا اس سے نکاح کردے، اے ام سلمہ! دنیا اور آخرت کی خیر اچھے اخلاق کے ساتھ وابستہ ہے"۔ (المعجم الکبیر، جلد ۲۳ صفحات، ۳۸۷،۳۸۶)

امام سیوطی بیان کرتے ہیں: امام احمد اور امام ترمذی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، ادنیٰ درجے کا جنتی شخص وہ ہوگا جس کی بہتر (72) بیویاں ہوں گی، دو دنیا کی

عورتیں ہوں گی اور ستر آخرت کی''۔ (درمنثور، ج ا، ص ۳۹)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی صالحہ، عابدہ، زاہدہ، طیبہ وطاہرہ خواتین کو بھی اللہ تعالیٰ جنت میں شباب اور بے مثال حسن و جمال عطا فرمائے گا اور سب عالم شباب میں ہوں گی، وہ حورانِ جنت سے کم تر نہیں ہوں گی، بلکہ شاید برتر ہی ہوں گی، ایک روایت میں ہے کہ ایک بڑھیا خاتون نے حضور ﷺ سے التجا کی کہ میرے لئے جنت کی دعا فرمایئے! آپ کبھی کبھی مزاح لطیف بھی فرماتے تھے، آپ نے فرمایا: ''کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی، یہ سن کر وہ عورت افسردہ ہوگئی تو اس کی تسلی خاطر کے لئے آپ نے فرمایا: ''جو خوش نصیب بھی جنت میں جائے گا، عالم شباب میں جائے گا''۔

یہ بھی ہوسکتا ہے جن صالح مردوں اور عورتوں کی دنیا میں شادی نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ جنت میں ایسے مردوں اور عورتوں کے مابین نکاح فرمادے، اگر خدانخواستہ کوئی بیوی جنتی ہے، مگر خاوند جہنمی یا اس کے برعکس، تو ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے جنتی مردوں اور عورتوں کے درمیان نکاح کے حکم فرمادے جن کا دنیوی رفیقِ حیات اپنی بداعمالیوں اور شقاوت کی وجہ سے جہنم میں جاچکا ہے، اللہ ہم سب کو ایسی صورتحال سے امان وعافیت عطا فرمائے۔

ایک مفسر مولانا مودودی نے یہ لکھا ہے کہ ممکن ہے یہی دنیا کی عورتیں، جو جنتی ہوں گی، جنت میں جاکر جمال وشبابِ بے مثال کی وجہ سے ''حورعین'' کی صورت میں ڈھل جائیں، لیکن جب ایسی روایات موجود ہیں جن میں جنت کی ''حورعین'' کے الگ وجود کی تصریح فرمادی گئی، تو ہمارے لیے کسی دلیل شرعی کے بغیر اس کے انکار یا گریز کا کوئی جواز نہیں ہے، جب کہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، صادق الوعد ہے تو اس کی قدرت وکرم سے کوئی بھی چیز بعید نہیں ہے۔

ناگہانی مصیبت کا نزول؟

سوال: اگر کسی کے گھر میں چوری یا ڈکیتی ہوجائے، یا آگ لگ جائے تو کیا یہ سمجھنا درست ہے کہ ان کا تمام مال واسباب حرام کا تھا، یا یہ نظریہ غلط ہے؟ (محمد شاہد اعجاز۔ناظم آباد، کراچی)

جواب: شریعت نے کوئی ایسا قاعدہ کلیہ نہیں بتایا کہ ہمیشہ کسی واقعے کا ظہور ایک ہی سبب کی بنا پر ہوگا۔ کسی ناگہانی مصیبت یا افتاد کے نازل ہونے کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں اور اس کا قطعی علم

اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو ہوتا ہے۔ ہم صرف اپنی دستیاب معلومات کے مطابق قیاس ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں قطعی سبب کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں حسن ظن سے کام لینا چاہئے، کسی بھی افتاد کی ممکنہ وجوہ حسب ذیل ہوسکتی ہیں:

۱) یہ کہ انسان کو کسی غلطی، جبر یا ظلم کی سزا مل رہی ہے، کیونکہ قدرت اپنی حکمت کے تحت کبھی مہلت دیتی ہے اور کبھی جلد مواخذہ فرما لیتی ہے۔

۲) یہ کہ اس ابتلاء و آزمائش میں انسان کے لئے خیر کا پہلو پوشیدہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مسلمان کو جو بھی تکلیف، دشواری، غم و اندوہ، حزن و ملال، حتیٰ کہ اسے کانٹا بھی اگر چبھ جائے تو اللہ تعالیٰ اس تکلیف کے عوض اس کے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے (بشرطیکہ جزع و فزع نہ کرے، صبر و استقامت کا مظاہرہ کرے اور تقدیرِ الٰہی پر شاکی نہ ہو بلکہ راضی ہو)''

(مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین)

(ب) حدیث قدسی میں اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے: ''جب میں اپنے بندے کی دو محبوب چیزیں لے کر (یعنی اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی سلب کر کے) اسے مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہوں اور وہ اس (مصیبت) پر صبر کرتا ہے تو میں ان کے بدلے میں اسے جنت دے دیتا ہوں''۔

(مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری)

(ج) ''جب بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں (یعنی اس کے علم اور تقدیر میں) کوئی اعلیٰ مرتبہ پہلے سے مقدر ہو جاتا ہے، جس کا وہ اپنے عملِ صالح کے ذریعے حقدار نہیں بن پاتا تو اللہ تعالیٰ اسے جان، مال یا اولاد کی کسی مصیبت میں مبتلا فرما دیتا ہے۔ پھر وہ اس (ابتلاء) پر صبر کرتا ہے، یہاں تک کہ صبر و استقامت کے ذریعے اس مقامِ عالی کا حقدار بن جاتا ہے جو اللہ کے علم میں پہلے سے اس کے لئے مقدر ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابی داؤد)

(د) ''جو لوگ دنیا میں عافیت و سلامتی کی زندگی گزار چکے ہوتے ہیں، وہ جب قیامت کے دن اہل ابتلاء و آزمائش کے اجر کو دیکھیں گے تو تمنا کریں گے کہ کاش (دنیا میں) ان کی کھالیں قینچیوں سے کاٹی جاتیں''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ جامع ترمذی)

۳) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو اس کی غلطی، تمرّد و سرکشی یا کسبِ حرام پر متنبہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس پر کوئی ناگہانی افتاد ڈال دی جاتی ہے تاکہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو اور اپنی اس

(باغیانہ) روش یا دینی معاملات میں غفلت وتساہل سے باز آ جائے، ایسے میں وہ افتاد یعنی جان و مال کا سلب ہو جانا، انسان کو اچھا تو نہیں لگتا لیکن انجامِ کار اس میں خیر ہوتی ہے، بشرطیکہ انسان اس ابتلاء سے سبق حاصل کر لے اور خواب غفلت سے بیدار ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (البقرہ:۲۱۶)

''کوئی بعید نہیں کہ تم ایک چیز کو (ظاہرِ حال میں) اپنے لئے برا سمجھو لیکن وہ (حقیقتِ حال میں) تمہارے لئے خیر ہو''۔

امید ہے اس تفصیلی جواب سے آپ کی تسلی ہو جائے گی۔

انتقال کرنے والے خواب میں نظر آتے ہیں؟

سوال: انتقال کرنے والے خواب میں کیوں نظر آتے ہیں، میرے بعض مرحوم اقارب کھانا کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں، (مسز عائشہ بھومبل، وردانہ۔عزیز آباد)۔

جواب: اس کا ایک سبب تو نفسیاتی ہے کہ انسان کے ذہن میں جو اشخاص، افکار اور خیالات بکثرت تازہ رہتے ہیں، وہ کبھی کبھی خواب میں بھی متشکل ہو کر آ جاتے ہیں، بعض اوقات اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ آپ کو ان سے محبت ہوتی ہے یا ان ارواح کو آپ سے محبت ہوتی ہے، کھانا کھاتے ہوئے نظر آنا کوئی تشویش کی بات نہیں ہے، بہتر ہے کہ آپ ان کے لئے دعاء مغفرت کریں اور ہو سکے تو ان کے ایصال ثواب کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق صدقہ و خیرات کریں، حدیث شریف میں ہے کہ اس سے عالم برزخ میں انہیں راحت ملتی ہے، اگر خدانخواستہ کسی اذیت وعذاب کی کیفیت سے دوچار ہوں تو اللہ تعالیٰ دعاءِ مغفرت وایصال ثواب کی برکت سے تخفیف فرماتا ہے۔

''میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں''، کیا یہ کلمۂ کفر ہے؟

سوال: ''بکر نے زید سے کہا کہ آپ بادشاہ بننے والے ہیں''، تو زید نے کہا کہ: ''میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے کہ میں بادشاہ بننے والا ہوں''، کیا یہ جملہ کلمۂ کفر ہے؟

(عرفان اللہ قادری۔جامع مسجد فہد گارڈن، کراچی)

جواب: یہ کلمہ کفر نہیں ہے، کیونکہ ہر فرشتے کے بارے میں علم غیب کلی کا اعتقاد شرعاً ثابت نہیں ہے، بالعموم فرشتے انہی امور کا علم رکھتے ہیں جو انہیں تفویض کئے جاتے ہیں، جیسے قبضِ ارواح اور ہر ذی روح کی اَجَل (یعنی موت کا وقت اور مقام) کا علم ''ملک الموت'' (فرشتۂ اجل) اور اس کے کارندوں کو ہے، قیامِ قیامت کا علم حضرت اسرافیل کو ہے، علیٰ ھذا القیاس وہ فرشتے جو بادلوں کو چلانے اور بارش برسانے پر مامور ہیں یا وہ فرشتے جو رحمِ مادر میں جنین میں روح ڈالنے پر مامور ہیں یا وہ فرشتے جو بندوں کے اعمال کا ریکارڈ لکھنے پر مامور ہیں وغیرہ، انہیں ''کراماً کاتبین'' (معزز لکھنے والے) کہا جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ

(الانفطار: ۱۰۔۱۲)

''اور بیشک تم پر ضرور نگہبان (مقرر) ہیں، معزز (فرشتے) لکھنے والے، وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (قٓ:۱۸)

''وہ زبان سے کوئی بات نہیں کہتا، مگر اس کے پاس (اس کا) نگہبان لکھنے کے لئے تیار ہوتا ہے''۔

یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ وہ انسان کے قلبی واردات، وسوسوں، ذہن کے پوشیدہ گوشوں میں مچلنے والی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشات اور سینوں میں پوشیدہ رازوں کو بھی جانتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (قٓ:۱۶)

''اور بلاشبہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان وسوسوں کو (بھی) جانتے ہیں جو اس کا نفسِ امارہ (اس کے ذہن میں) ڈالتا رہتا ہے اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ (المومن:۱۹)

"اللہ جانتا ہے خیانت کرنے والی نگاہوں کو اور جو (راز) سینوں میں پوشیدہ ہیں،

یعنی ربِ ذوالجلال کسی غیر محرم پر پڑنے والی اچانک بے اختیار نظر کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کس مرحلے پر کسی شیطان صفت انسان کی نظر میں فریبِ نفس اور لذتِ شیطانی پیدا ہوئی اور وہ نفس انسانی میں پوشیدہ شرارتوں اور خباثتوں کو بھی بخوبی جانتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ ہر فرشتے کے لئے ہر بات کا ہر حال میں جاننا ضروری نہیں ہے، اس سلسلے میں یہ حدیث پاک ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُفَضِّلُ الصَّلٰوةَ الَّتِىْ يُسْتَاكُ لَهَا عَلَى الصَّلٰوةِ الَّتِىْ لَا يُسْتَاكُ لَهَا بِسَبْعِيْنَ ضِعْفاً۔ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يُفَضِّلُ الذِّكْرُ الْخَفِىُّ عَلَى الَّذِىْ لَا يَسْمَعُ الْحَفَظَةُ بِسَبْعِيْنَ ضِعْفاً، وَيَقُوْلُ: اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ وَجَمَعَ اللّٰهُ الْخَلَآئِقَ لِحِسَابِهِمْ، وَجَآءَتِ الْحَفَظَةُ بِمَا حَفِظُوْا وَكَتَبُوْا، قَالَ اللّٰهُ لَهُمْ: اُنْظُرُوْا، هَلْ بَقِىَ لَهُ مِنْ شَىْءٍ؟ فَيَقُوْلُوْنَ: رَبَّنَا مَا تَرَكْنَا شَيْئًا مِمَّا عَلِمْنَاهُ وَحَفِظْنَاهُ اِلَّا وَقَدْ اَحْصَيْنَاهُ وَكَتَبْنَاهُ ، فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ لَهُ: اِنَّ لَكَ عِنْدَنَا خَبِيْئًا لَا تَعْلَمُهُ ، وَاَنَا اُجِيْزُكَ [اُحَدِّثُكَ] بِهٖ وَهُوَ الذِّكْرُ الْخَفِىُّ۔

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ جس نماز کے لئے (وضو کے وقت) مسواک کی گئی ہو، اسے اس نماز پر ستر درجے فضیلت عطا فرماتے تھے، جس کے لئے مسواک نہ کی گئی ہو" اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وہ ذکر خفی جسے نگہبان فرشتے (بھی) نہیں سن سکتے، ستر درجے زیادہ فضیلت رکھتا ہے" اور آپ فرماتے تھے: "جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ مخلوق کو ان کے حساب کے لئے جمع فرمائے گا، اور نگہبان فرشتے (وہ سارا ریکارڈ لے کر)، جو انہوں نے محفوظ رکھا ہوگا اور لکھا ہوگا، حاضر ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا: (اچھی طرح) دیکھ لو، کیا اس

کے (اعمالِ حسنہ میں) کوئی چیز رہ تو نہیں گئی، تو وہ فرشتے عرض کریں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایسی کوئی چیز، جسے ہم جانتے تھے اور ہم نے اسے (ریکارڈ میں) محفوظ کر رکھا ہے، نہیں چھوڑی مگر ہم نے اس کا احاطہ کر لیا ہے اور لکھ دیا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے فرمائے گا: ہمارے پاس تمہارے لئے ایک پوشیدہ چیز ہے، جسے تم نہیں جانتے اور اب میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتا ہوں (یا تمہیں اس کے علم کی اجازت دیتا ہوں) اور وہ میرے بندہ کا ''ذکر خفی'' ہے''۔

(مختصر اتحاف السادة المہرۃ بزوائد المسانید العشرۃ، کتاب الاذکار رقم الحدیث: ۶۸۰۹، اس حدیث کو حارث، ابویعلیٰ، احمد بن حنبل، بزار، ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث شرط مسلم پر صحیح ہے)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی ''تبیان القرآن'' جلد نمبر ۳ ص ۵۰۷۔۵۰۸ پر لکھتے ہیں:

آیا دل کی باتوں کو کراماً کاتبین لکھتے ہیں یا نہیں؟

بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں اور ارادوں پر مطلع ہوتے ہیں اور ان کو لکھ لیتے ہیں۔

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''جب میرا بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے تو اس کو نہ لکھو اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس کا ایک گناہ لکھ لو، اور اگر وہ نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو ایک نیکی لکھ لو اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو دس نیکیاں لکھ لو۔'' امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے اور ایک روایت اس طرح کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''فرشتے عرض کرتے ہیں اے رب! تیرا بندہ گناہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے، حالانکہ اسے گناہ پر خوب بصیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کا انتظار کرو، اگر یہ اس گناہ کو کرے تو اس کا گناہ لکھ لو اور اگر اس کو ترک کر دے تو اس کی ایک نیکی لکھ لو، کیونکہ اس نے میری وجہ سے اس گناہ کو ترک کیا ہے۔'' (صحیح مسلم، ایمان، ۲۰۵، ۲۰۳، (۱۲۸) ۳۲۷/ صحیح البخاری، ج ۸، رقم الحدیث: ۷۵۰۱/ سنن ترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۰۸۴/ سنن کبریٰ للنسائی، ج ۶، رقم الحدیث: ۱۱۱۸۱/ صحیح ابن حبان، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۸۰/ مسند احمد، ج ۳، رقم

الحدیث:۷۳۰۰)۔

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں اور ارادوں پر مطلع ہوتے ہیں اور بعض دیگر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کے احوال اور نیات پر مطلع نہیں ہوتے۔

امام عبداللہ بن محمد ابوالشیخ الاصبہانی المتوفی ۳۹۶ھ روایت کرتے ہیں:

''ضمرہ بن حبیب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' فرشتے اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کے عمل لے کر اوپر چڑھتے ہیں، اس عمل کو وہ بہت زیادہ اور بہت بابرکت گمان کرتے ہیں، وہ اللہ کی سلطنت میں جہاں تک اللہ چاہتا ہے، اس عمل کو لے کر پہنچتے ہیں۔ اللہ عزوجل ان کی طرف وحی فرماتا ہے تم میرے بندے کے عمل کی حفاظت کرنے والے ہو، اور میں اس کے دل کی نگہبانی کرنے والا ہوں۔ میرے اس بندہ نے یہ عمل میرے لیے اخلاص سے نہیں کیا، اس کو سجین (جہنم کی ایک وادی) میں ڈال دو۔ اور وہ اللہ عزوجل کے بندوں میں سے ایک اور بندے کے عمل کو لے کر اوپر چڑھیں گے، اور اس عمل کو بہت کم گمان کریں گے۔ پھر وہ اللہ کی سلطنت میں سے جہاں تک اللہ چاہے گا، اس عمل کو لے کر پہنچیں گے۔ پھر اللہ عزوجل ان کی طرف وحی فرمائے گا تم حفاظت کرنے والے ہو اور جو کچھ اس کے دل میں ہے، میں اس پر نگہبان ہوں۔ اس کے اس عمل کو دگنا چوگنا کر دو اور اس کو علیین میں ڈال دو۔'' (کتاب العظمۃ، رقم الحدیث: ۵۲۲، ص ۱۸۵، مطبوعہ بیروت/ کتاب الزہد لابن المبارک، رقم الحدیث: ۴۵۲، مطبوعہ بیروت)

امام ابن المبارک کی روایت میں ہے'' میرے اس بندے نے اخلاص سے عمل کیا ہے، اس کو علیین میں لکھ دو''۔

بظاہر ان حدیثوں میں تعارض ہے، لیکن حقیقت میں تعارض نہیں ہے، کیونکہ جس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر مطلع ہوتے ہیں۔ وہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ابن حبان اور سنن ترمذی اور سنن نسائی کی روایت ہے اور جس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر مطلع نہیں ہوتے، وہ کتاب العظمۃ اور کتاب الزہد کی روایت ہے، اور ثانی الذکر کتابیں اول الذکر کتابوں کے پائے کی نہیں ہیں۔ نیز اول الذکر حدیث متصل ہے اور ثانی الذکر مرسل روایت ہے، اور اول الذکر سنداً صحیح ہے اور ثانی الذکر سنداً ضعیف ہے۔ اس لیے ترجیح پہلی

حدیث کو ہے اور راجح یہی ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر بھی مطلع ہوتے ہیں اور مؤخر روایت کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ریا اور اخلاص کو مستثنیٰ فرمایا ہے، اخلاص کو مخفی رکھا، تاکہ قیامت کے دن اس بندے کی عزت افزائی کی جائے، اور ریا کو مخفی رکھا، تاکہ ریاکار کے عمل کی قیامت کے دن زیادہ رسوائی ہو، جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

البتہ احادیثِ مبارکہ، روایات اور احوال سیرت النبی ﷺ میں متعدد واقعات مروی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علمِ غیب سے بارہا لوگوں کے احوال قلبی اور وارداتِ قلبی کو ان کے بتانے سے پہلے بتادیا۔ ''اس بات کا میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے۔'' یہ اردو زبان کا محاورہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات میرے خواب وخیال میں بھی نہیں آئی یا اس بات کی بابت میں نے کبھی سوچا تک نہیں۔ یعنی اگر میں نے ایسا سوچا ہوتا یا اس کی منصوبہ بندی کی ہوتی تو فرشتوں یا ''کراماً کاتبین'' کو علم ہوتا، اس سے معاذ اللہ، فرشتوں کی توہین یا تنقیص مقصود نہیں ہوتی کہ اسے کفر یا ضلالت یا فسق پر محمول کیا جائے۔

انبیاءِ کرام کی تعداد کتنی ہے؟

سوال: انبیاءِ کرام کی تعداد کتنی ہے، دلیل اور حوالے کے ساتھ بتایئے؟

(مولانا علی عمران صدیقی، اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب: قرآن مجید میں سورۃ النساء آیت نمبر ۱۶۳ میں متعدد انبیاءِ کرام علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''(اے حبیب!) بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف وحی (نازل) فرمائی، جیسے ہم نے نوح اور ان کے بعد دوسرے انبیاء کی طرف وحی (نازل) فرمائی اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں کی طرف عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی (نازل) فرمائی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔'' اس کے بعد اگلی آیت میں ارشاد فرمایا:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ

(النساء: ۱۶۴)

''اور ہم نے ایسے رسول (بھیجے) جن کا قصہ ہم نے اس سے پہلے آپ کو بیان فرمایا اور ہم نے ایسے رسول بھی بھیجے جن کا قصہ ہم نے آپ سے (ابھی تک) بیان نہیں کیا''۔

بعینہ اسی مفہوم کی آیت سورۃ المومن میں بھی موجود ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (مومن:۷۸)

''اور بلاشبہ ہم نے آپ سے پہلے (بھی) رسول بھیجے، ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان فرما دیا ہے اور ان میں سے بعض کا حال آپ پر (ابھی تک) بیان نہیں فرمایا''۔

سارے انبیاء کرام و رسلِ عظام علیہم السلام کے اسماء مبارکہ اور احوال قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں، تاہم جن انبیاء کرام کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، ان کے اسماء مبارکہ یہ ہیں:

ا۔حضرت آدم علیہ السلام، ۲۔حضرت نوح علیہ السلام، ۳۔حضرت ابراہیم علیہ السلام، ۴۔حضرت اسماعیل علیہ السلام، ۵۔حضرت اسحاق علیہ السلام، ۶۔حضرت یعقوب علیہ السلام، ۷۔حضرت یوسف علیہ السلام، ۸۔حضرت موسیٰ علیہ السلام، ۹۔حضرت ہارون علیہ السلام، ۱۰۔حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، ۱۲۔حضرت ہود علیہ السلام، ۱۳۔حضرت داؤد علیہ السلام، ۱۴۔حضرت سلیمان علیہ السلام، ۱۵۔حضرت ایوب علیہ السلام، ۱۶۔حضرت الیاس علیہ السلام، ۱۷۔حضرت الیسع علیہ السلام، ۱۸۔حضرت یحییٰ علیہ السلام، ۱۹۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام، ۲۰۔حضرت یونس علیہ السلام، ۲۱۔حضرت ادریس علیہ السلام، ۲۲۔حضرت ذوالکفل علیہ السلام، ۲۳۔حضرت صالح علیہ السلام، اور ۲۴۔حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کے علاوہ سورۃ الکہف میں حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر ہے لیکن ان کا نام مذکور نہیں ہے، ان کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ وہ نبی تھے اور دوسرا یہ کہ وہ نبی نہیں تھے لیکن راجح قول یہی ہے کہ وہ نبی تھے، اسی طرح حضرت لقمان کے بارے میں بھی دو قول ہیں لیکن قولِ راجح یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے بلکہ ایک مردِ حکیم و دانا تھے۔

باقی رہا یہ سوال کہ انبیاء کرام کی کل تعداد کتنی ہے تو اس سلسلے میں مسند امام احمد بن حنبل میں ایک طویل حدیث مذکور ہے۔ جس میں آگے چل کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قال: قلت یا رسول اللّٰہ! کم وَفِیْ عِدَّۃُ الانبیاء؟ قال: مائة الف و اربعة و عشرون الفا، الرسل من ذالک ثلث مائه و خمسة عشر جما غفیراً

''(حضرت ابوذر) بیان کرتے ہیں، میں نے عرض کیا یارسول اللہ! انبیاء کرام کی گنتی کتنی پوری ہوئی؟ فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار، ان میں سے رسول تین سو پندرہ کا جم غفیر (بڑی جماعت) ہے''۔(مسند امام احمد، رقم الحدیث:۲۲۱۸۹)

علامہ غلام رسول سعیدی نے تبیان القرآن جلد اوّل صفحہ ۶۱۹ پر ''نبیوں، رسولوں اور صحیفوں کی تعداد کی تحقیق کے عنوان کے تحت اس موضوع پر متعدد روایات با حوالہ جمع کی ہیں، جن میں سے ایک درج ذیل ہے:

''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! انبیاء کتنے ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! رسول کتنے ہیں آپ نے فرمایا تین سو تیرہ جم غفیر ہیں، میں نے کہا بہت اچھے ہیں، میں نے کہا یا رسول اللہ! پہلا نبی کون ہے؟ آپ نے فرمایا آدم، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وہ نبی مرسل ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور ان میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی پھر ان کو اپنے سامنے بنایا، پھر آپ نے فرمایا: اے ابوذر! چار نبی سریانی ہیں آدم، شیث، اور اخنوخ، یہ ادریس ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قلم سے خط کھینچا اور نوح، اور چار نبی عرب ہیں: ھود، صالح، شعیب اور تمہارے نبی، اے ابوذر! میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے کتنی کتابیں نازل کیں، آپ نے فرمایا سو صحیفے اور چار کتابیں، شیث پر پچاس صحیفے نازل کیے گئے، اخنوخ پر تیس صحیفے نازل کیے گئے، ابراہیم پر دس صحیفے نازل کیے گئے اور موسیٰ پر تورات سے پہلے دس صحیفے نازل کیے گئے اور تورات، انجیل، زبور اور فرقان کو نازل کیا گیا''۔

(حلیۃ الاولیاء، ج۱، ص۱۶۷، مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اس حدیث کو امام ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے''۔(موارد الظمآن، ص ۵۴۔۵۲، مطبوعہ دارالکتاب العلمیہ بیروت)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بعض روایات میں رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ مذکور ہے اور بعض

میں تین سو پندرہ ہے۔ اگرچہ اکثر روایات میں انبیاء کرام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار مذکور ہے اور ہم ان احادیث کی روشنی میں اس تعداد کا بطور تعیین ذکر کر سکتے ہیں، لیکن افضل واولیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب مقدس قرآن مجید کی اتباع کرتے ہوئے ہم اجمالاً اپنے عقیدے کو اس طرح بیان کریں کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف اوقات میں اپنے جن برگزیدہ بندوں کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ سب برحق تھے اور ہم سب پر ایمان لاتے ہیں، ہم تعداد کی تعیین کے مکلف نہیں ہیں، کیونکہ روایات واحادیث کی روشنی میں تعداد متعین کرلی جائے تو ان سب کے اسماء مبارکہ تو پھر بھی ہمارے علم میں متعین نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (البقرہ:۲۸۶)

''رسول مکرم ایمان لائے اس کلام پر جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اور مومن (بھی ایمان لائے)، سب (کے سب) ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، (یہ اقرار کرتے ہوئے) کہ ہم (ایمان لانے میں) اس کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے (کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کردیں)''۔

قیامت کے دن کس کی نسبت سے پکارا جائے گا؟

سوال: ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ جب قیامت کے دن میدانِ حشر میں پکار ہوگی تو انسان کو کس نام کے ساتھ پکارا جائے گا؟ اپنی والدہ کے نام سے یا اپنے والد کے نام سے پکارا جائے گا۔ ہمیں قرآن مجید اور حدیث پاک کی روشنی میں اس کا جواب چاہیے؟

(محمد اختر..... کراچی)

جواب: قرآن مجید کی کسی آیت میں صراحت کے ساتھ یہ مسئلہ بیان نہیں کیا گیا، البتہ قرآن مجید کی اس آیت کے تحت مفسرین کرام نے اس مسئلے پر گفتگو فرمائی ہے:

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ (الاسراء:۷۱)

''جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ہمراہ بلائیں گے''۔

اس آیت مبارکہ کا واضح معنی تو یہ ہے کہ قیامت میں لوگوں کو ان پیشواؤں کے ہمراہ حساب و کتاب اور سوال و جواب کے لئے بلایا جائے گا۔ انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں کے ہمراہ بارگاہِ رب العالمین میں حاضر ہوں گے، اور ائمہ کے ہمراہ ان کے پیروکاروں کو طلب کیا جائے گا۔ چنانچہ جو گمراہ اور باطل پرست لوگ ہیں، وہ اپنی عذر خواہی اس انداز میں کریں گے:

رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۞ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (الاحزاب: ۶۸-۶۷)

"اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور وڈیروں کی پیروی کی، تو انہوں نے ہمیں راہ (راست) سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے پروردگار! انہیں (ہمارے مقابلے میں) دگنا عذاب دے اور ان پر بڑی بھاری لعنت فرما"۔

تاہم بعض مفسرین نے زیرِ بحث آیت میں لفظ "امام" کو اُمّ (بمعنی ماں) کی جمع قرار دے کر ایک نئے انداز سے اس کی تفسیر کی ہے، ذیل میں ہم چند تفاسیر کے حوالہ جات درج کر رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر کا یہ نیا انداز سب سے پہلے علامہ زمخشری صاحبِ "تفسیرِ کشاف" نے اختیار کیا ہے۔

نئے انداز کی تفسیر یہ ہے کہ "امام" اُم (بمعنی ماں) کی جمع ہے اور یہ کہ لوگوں کو قیامت کے دن ان کی ماؤں کی نسبت سے پکارا جائے گا اور (باپوں کے بجائے) ماؤں کے نام کے ساتھ پکارنے میں حکمت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق کی پاسداری ہو جائے اور حضرت حسن و حسین کا شرف ظاہر کرنا مقصود ہے اور یہ کہ جو لوگ "ولد الزنا" ہیں، ان کی (سرعام) رسوائی نہ ہو"۔ (تفسیر الکشاف، ج ۲ ص ۶۳۷ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ زمخشری کی اس تفسیر کا حوالہ علامہ آلوسی حنفی بغدادی نے بھی دیا ہے، لیکن پھر اسے دلائل سے رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"صاحبِ تفسیرِ کشاف نے محمد بن کعب سے اسے روایت کیا ہے اور اس تفسیر کے قابلِ قبول نہ ہونے کے دلائل یہ ہیں: اولاً، اس لئے کہ "اُمّ" کی جمع امام غیر معروف ہے اور اس کی معروف جمع "امہات" ہے۔ ثانیاً اس لئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق کی رعایت تو اس میں ہے کہ انہیں "شانِ امتیازی" کے طور پر ماں کے نام سے پکارا جائے (یعنی سب کو اگر ماں کے نام سے پکارا

جائے تو اس میں ان کا امتیاز کہاں رہے گا؟)، کیونکہ باپ کے بغیر ان کی پیدائش ان کے لئے باعثِ کرامت وافتخار ہے (کیونکہ یہ ایک معجزہ ہے)، تو اس افتخار کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس سے چشم پوشی کی کہ اس بنا پر مجبوراً سب کو ماؤں کی نسبت سے پکارا جائے، اور حضرات حسنین کریمین کا شرف تو ویسے ہی کامل دائم ہے، کیونکہ ان کے باپ کا مرتبہ ان کی ماں سے زیادہ ہے، اور رہے "اولاد الزنا" تو اس میں ان کا تو کوئی گناہ نہیں ہے جو ان کے لئے باعثِ رسوائی ہو، رسوائی تو ان کی ماؤں کے لئے ہے (اور یہ قائم رہتی ہے) خواہ دوسروں کو ان کی ماؤں کے نام سے پکارا جائے یا ان کے باپوں کے نام سے"۔

اس کے بعد علامہ آلوسی نے ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے، جس میں اس امر کو تو تسلیم کیا ہے۔ کہ "امّ" کی جمع امام معروف نہیں ہے، لیکن حضرات حسنین کریمین کی نسبت ماں کی طرف کرنے سے ان کی نسبی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہونا، بہت بڑا شرف ہے۔ اس طرح "اولاد الزنا" کے رسوائی سے بچنے کی بھی تاویل کی ہے کہ ماں کی نسبت تو دنیا میں بھی لوگوں کو معلوم تھی، لیکن باپ کی نسبت معلوم ہونے پر رسوائی ہوگی۔ لیکن آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے "صاحب کشاف" کا موقف کسی روایت پر مبنی ہو، لیکن وہ حدیثِ صحیح کے معارض ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "قیامت کے دن تمہیں تمہارے ناموں اور تمہارے باپوں کے ناموں سے پکارا جائے گا"۔ (روح المعانی، ج۹ ص۱۷۶۔۱۷۵، مطبوعہ دارالفکر بیروت)

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی مالکی حکماء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: "اور امام، امّ کی جمع ہے، حکماء نے کہا ہے اس میں تین حکمتیں ہیں، ایک عیسیٰ علیہ السلام کے سبب، دوسری حضرات حسنین کریمین کے شرف کا اظہار اور تیسرا یہ کہ اولاد الزنا کی رسوائی نہ ہو۔ پھر لکھتے ہیں کہ یہ قول محلِ نظر ہے، کیونکہ حدیث صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو قیامت کے دن جمع فرمائے گا، تو ہر بدعہد کے لئے ایک (علامتی) جھنڈا ہوگا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی بدعہدی (کا نشان) ہے، یہ حدیث متفق علیہ ہے، اس حدیث میں "فلاں بن فلاں" کے الفاظ ہیں نہ کہ "فلاں بن فلانہ" کے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آخرت میں لوگوں کو ان کے ناموں اور ان کے باپوں کے ناموں سے پکارا جائے گا اور یہ ان لوگوں کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کی

نسبت سے پکارا جائے گا"۔ (الجامع لاحکام القرآن، ج ۵، ص ۲۶۷)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قیامت کے دن ماؤں کے ناموں کے ساتھ پکارے جانے کے قول کو ان کی تمام تر عقلی توجیہات اور فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود جلیل القدر مفسرین کرام علامہ محمود آلوسی اور علامہ قرطبی مالکی نے حدیث صحیح سے معارض ہونے کی بناء پر رد کیا ہے اور حدیث صحیح کو عقلی توجیہات پر ترجیح ہے۔

حدیث پاک میں ہے: حضرت ابوالدرداء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تمہیں تمہارے ناموں اور تمہارے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا، تو اپنے نام اچھے رکھا کرو۔ (مشکوۃ ص ۴۰۸)

اس حدیث کے تحت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات شرح مشکوۃ المصابیح میں لکھتے ہیں: "بعض روایات میں آیا ہے کہ روز قیامت لوگوں کو ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا اور اس کی حکمت یہ بیان کی کہ اولادِ زنا کو شرمساری نہ ہو اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کے حال کی رعایت کہ اللہ نے ان کو بن باپ کے پیدا کیا اور حضرات حسنین کی شرافتِ نسبت کے اظہار کے لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی نسبت کا اظہار ہو، اگر یہ روایت پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو حدیث کی توجیہ کی جائے کہ لفظ "آباء" تغلیب کے طور پر آیا ہے (جیسے حکم تو مرد و زن سب کے لئے ہوتا ہے لیکن صیغہ مذکر کا آتا ہے) جیسے ماں باپ دونوں کو "اَبَوَیْن" کہا جاتا ہے، اور کبھی آباء کہا جاتا ہے، اور کبھی امہات، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض کو باپوں کے ناموں سے پکارا جائے اور بعض لوگوں کو ماؤں کے ناموں سے، یا بعض مواقع پر ماؤں کے ناموں سے اور بعض مواقع پر باپوں کے ناموں سے، واللہ اعلم، (اشعۃ اللمعات، ج ۴، ص ۵۰ مطبوعہ لکھنو)"۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تاویلات و توجیہات اس پر موقوف ہیں کہ ماں کے نام سے پکارے جانے کی روایت صحیح ہو۔ اسی حدیث کی شرح میں صاحب عون المعبود لکھتے ہیں:

طبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے، جیسے کہ ابن قیم نے سنن ابی داؤد کے حاشیے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بعض بندوں کی پردہ داری کے لئے ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا، علقمی نے کہا ہے کہ دونوں روایات میں تطبیق اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ صحیح النسب لوگوں کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا، اور سنن ابی داؤد کی روایت اسی سے متعلق

ہے، اور طبرانی کی حدیث دوسروں سے متعلق ہے، یا یہ کہ بعض کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا اور بعض کو ماں کے نام سے۔

تفہیم المسائل جلد اول میں ہم نے "حدیثِ صحیح" ہی کو راجح قرار دیا تھا اور اب بھی ہمارا موقف یہی ہے، تاہم دیگر روایات، اقوال، توجیہات اور تاویلات بھی درج کر دی ہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مسلکی اختلافات سے ذہنی اضطراب

سوال: ہمارے ملک میں، جو مسلمانوں کا ملک ہے، کئی مسالک اور مذہبی مکاتبِ فکر (SchoolsofThought) پائے جاتے ہیں، ہر ایک نے اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی ہے، ہر ایک اپنے آپ کو حق اور دوسرے کو باطل سمجھتا ہے، خالص دینِ اسلام کی دعوت دینے والا کوئی نہیں، فقط صرف مسالک کی طرف دعوت دی جاتی ہے، ایسے حالات میں عام آدمی کیا کرے؟ سادہ لوح بندے کدھر جائیں؟، کوئی غیر مسلم اسلام سے متاثر ہو تو کیا کرے؟۔ ان حقائق و واقعات پر غور کرتے ہیں تو شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ازراہِ کرم بتایئے کہ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ (عبداللہ۔ پی ای سی ایچ ایس اور متعدد دوسرے افراد)۔

جواب: میں نے آپ سب حضرات کے مفصل خطوط کو کافی غور اور توجہ سے پڑھا ہے۔ اس مفہوم پر مشتمل گفتگو اکثر محافل میں ہوتی ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے والے لوگ اکثر پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک طبقہ وہ ہے جو تلاشِ حق میں سرگرداں ہے، یہ لوگ حق کو جاننے، اسے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے دل و جان سے آمادہ ہیں، ان کا ذہنی اضطراب اور تلاشِ حق کے لئے بے قراری لائقِ تحسین ہے، ان کا جذبہ قابلِ قدر ہے اور وہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب کے حقدار ہوں گے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو شرحِ صدر کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی باہمی فکری آویزش اور بین المسالک مسلکی تصادم سے اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے، غلبۂ اسلام کی جدوجہد نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہی اور اس سے لادینی قوتوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو مسلمانوں کی باہمی فکری آویزش اور مسلکی تصادم کو مذہب سے گریز اور انحراف

کے لئے ایک بہانہ اور وجہ جواز (Justification) بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سوچ اور طرزِ فکر قابلِ مذمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ تاہم نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا ہے، ہمارے لئے یہ جائز نہیں کہ ہم شخصی طور پر کسی کے بارے میں بدگمانی کریں۔ لہٰذا ہر ایک کو اپنی علمی استعداد اور فکری استطاعت کے مطابق مطمئن کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔

سوچ اور فکر کا اختلاف (Approach) اور اختلافِ رائے انسان کی فطرت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خلاقی، صناعی اور قدرت ہے کہ اس نے انسانوں کی صورتوں کے ساتھ ساتھ ان کے اذہان میں بھی بڑا تنوع (Variety Andvariation) پیدا فرمایا ہے۔ آپ کو ایسے دو انسان بہت کم ملیں گے یا شاید بالکل نہ ملیں، جن کی ذہنی سوچ ہر چیز کے بارے میں یکساں ہو۔ لہٰذا اختلافِ فکر و نظر آپ کو حیاتِ اجتماعی کے ہر شعبے میں نظر آئے گا۔ کسی مقدمے کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے اور قطعی فیصلے تک پہنچنے میں آئین کی تعبیر و تشریح (Interpretation) اور قوانین کے اطلاق (Application) میں اعلیٰ عدالتوں کے ججوں میں اختلاف ہوتا ہے، حالانکہ مقدمے کے حقائق و واقعات ان سب کے سامنے یکساں طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح قوانین کی تعبیر و تشریح میں ماہرینِ قانون کے درمیان اختلاف رائے ہوتا ہے۔ مرض کی تشخیص (Diagnosis) میں ماہر ڈاکٹروں کے درمیان بعض اوقات اختلاف رائے ہوتا ہے۔ اسی طرح سیاست، معیشت اور حیاتِ انسانی کے دیگر شعبوں میں بھی اختلافات موجود ہیں۔ لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان تمام شعبوں کی بساطِ کار لپیٹ دی جائے یا ڈاکٹرز سے علاج کرانا چھوڑ دیا جائے، کیونکہ اختلافات ہیں اور بندہ کس کی سنے اور کدھر جائے۔ اس کے برعکس ہر عقلمند انسان اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے بہتر سے بہتر کی جستجو جاری رکھتا ہے، اندھی تقلید (Blind Faith) کسی کی نہیں کرتا۔ لہٰذا مذہب کے معاملے میں بھی ہمیں اپنی خداداد صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے حق و صواب کو سمجھنے اور پانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس امر کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اسلام کے بنیادی معتقدات سے روگردانی نہ ہونے پائے۔ اختلافات تو دنیا کے تمام مذاہب میں ہیں، خواہ وہ الہامی مذاہب (Revealed Religion) ہوں یا انسانوں کے خودساختہ مذاہب ہوں، مثلاً یہودیت، مسیحیت، ہندومت، بدھ مت وغیرہ۔

لہٰذا اولاً تو ہم میں سے ہر ایک کو اس امر کی آگاہی ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد اور

اصول ونظریات کیا ہیں؟ اور پھر یہ جاننا ہوگا کہ کون سا مسلک یا مکتبہ فکر کتاب وسنت کے عین مطابق ہے کہ جس میں توحید، ناموسِ الوہیت وناموسِ رسالت وعقیدۂ ختمِ نبوت کی مکمل پاسداری ہو، جو رسالت مآب ﷺ، اصحابِ رسول اور ان کے اتباع سلفِ صالحین، ائمہ مجتہدین، اولیاء کرام اور علماءِ ربانیین کے طریق پر ہو۔ کیونکہ ہم ہر نماز میں سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں: ''(اے اللہ!) ہمیں سیدھی راہ پر چلا، ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا، ان لوگوں کی راہ نہیں جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ان کی جو گمراہ ہوئے''۔

پھر قرآن مجید نے دوسرے مقام اپنے ان انعام یافتہ بندوں، جن کی حیات کو ہمارے لئے مشعلِ راہ قرار دیا ہے، کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرمادی: ''اور جس نے اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کی تو وہ لوگ (حشر میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی جو اس کے انبیاء، صدیقین، شہداء اور عبادِ صالحین ہیں''۔

اور اللہ تعالیٰ نے حق و باطل، صواب وخطاء، نور وظلمت اور خیر وشر میں تمیز کا ملکہ ہر انسان کی فطرت میں ودیعت فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ''کیا ہم نے انسان کو (دیکھنے کے لئے) دو آنکھیں (بولنے کے لئے) ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کئے اور ہم نے اسے (خیر وشر کی) دونوں راہوں کو سجھا دیا ہے، (البلد: ۱۰-۸)''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''انسان اپنی ذات پر کامل بصیرت کے ساتھ (شاہد) ہے، خواہ وہ کتنے ہی عذر تراشتا رہے، (القیامہ)''۔ جب انسان تلاشِ حق (In Search of Truth) میں آگے بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نورِ ہدایت اس کی رہنمائی فرماتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''بھلا اللہ تعالیٰ جس کے سینے کو (قبول) اسلام کے لئے کھول دے، تو وہ اپنے رب کی جانب سے ایک (عظیم) نور (معرفت) سے فیض یاب ہوتا ہے، (الزمر: 22)''۔

رسول اللہ ﷺ نے مستقبل کی خبر دیتے ہوئے پہلے ہی ہماری رہنمائی فرمادی تھی کہ جب مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ جائیں تو صرف وہ گروہ ہدایت یافتہ اور حق وصواب پر ہوگا جو: ''اس جادۂ مستقیم پر (سختی سے) کاربند ہو، جس پر میں اور میرے اصحاب (ہمیشہ) کاربند رہے ہیں۔''
اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا دست (تائید وحمایت) جماعت پر ہوتا ہے۔'' اس لئے فرمایا: ''جماعت (کی اتباع) کو لازم پکڑو، کیونکہ جو بکری ریوڑ سے جدا ہو کر دور چلی جاتی ہے

یا ایک جانب کو ہو جاتی ہے اسے بھیڑیا شکار کر لیتا ہے۔" یہ بھیڑیا، یہ دشمنِ ایمان، شیطان ہے۔
اور خود اللہ جل شانہٗ کا فرمان ہے:

"جو شخص مومنوں کی (اجماعی راہ کو چھوڑ کر) کسی دوسری راہ کو اختیار کرے گا، ہم اسے اسی رخ پر پھیر دیں گے، جسے اس نے (از خود) اختیار کر لیا ہے اور اسے ہم جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے، (النساء: 115)

☆......☆......☆

کتاب الطہارت

محض خواب دیکھنے پر غسل کا وجوب؟

سوال: ایک شخص مباشرت کا خواب دیکھتا ہے لیکن جب صبح بیدار ہو کر اٹھتا ہے تو اس کے بدن یا لباس پر کوئی داغ، دھبہ یا نشان نہیں ہوتا تو کیا محض خواب دیکھنے سے اس پر غسل جنابت فرض ہو جاتا ہے؟ (مظہر کمال۔ گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب: محض احتلام کا خواب دیکھنے پر، جبکہ بیدار ہونے پر اس کے جسم پر یا لباس پر کوئی داغ، دھبہ یا نشان نہ ہو، اس پر غسل جنابت فرض نہیں ہوتا اور وہ شرعاً پاک ہے۔

ناپاک بدن پر پاک کپڑے

سوال: ایک شخص جس پر غسل جنابت فرض ہے، وہ کسی ضروری کام کی بنا پر غسل کئے بغیر پاک کپڑے پہن لیتا ہے، تو کیا محض حالتِ جنابت میں پہننے سے پاک کپڑا ناپاک ہو گیا یا بعد میں غسل کر کے پاک ہو کر اسی لباس کو پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے؟ (مظہر کمال۔ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: پاک کپڑا محض حالتِ جنابت میں پہننے سے ناپاک نہیں ہوتا، وہ بعد میں غسل کر کے پاک ہو کر اور دوبارہ وہی لباس پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ انسان کا پسینہ بھی ناپاک نہیں ہوتا۔ لہٰذا حالتِ جنابت میں کسی کو پسینہ آ گیا اور پاک کپڑا بدن سے مس ہو گیا تو ناپاک نہیں ہوگا۔ اسی طرح بیوی یا شوہر میں سے کوئی ایک ناپاک ہے اور دوسرے کا بدن اس سے مس ہو گیا تو وہ اس سے ناپاک نہیں ہوگا البتہ اگر بدن پر منی یا خون کا دھبہ ہے اور پاک کپڑا پہن لیا ہے اور پسینہ آنے سے وہ ناپاکی کپڑے پر لگ گئی تو کپڑے کے اس حصے کو دھو کر پاک کر لیں، باقی لباس پاک رہے گا۔

ناپاک کپڑا پہننے سے کیا بدن ناپاک ہو جاتا ہے؟

سوال: ایک شخص کے کپڑوں پر پیشاب یا کوئی اور ناپاکی (مثلاً پاخانہ وغیرہ) لگ جاتا ہے اور وہ اس کے جسم کے کسی حصے پر نہیں لگتا، تو وہ شخص اگر باوضو ہے تو ناپاک کپڑے اتار کر اور پاک کپڑے پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے؟ (مظہر کمال۔ گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب: محض ناپاک کپڑا پہننے سے بدن ناپاک نہیں ہوتا بشرطیکہ نجاست بدن پر نہ لگے۔ البتہ

اگر نجاست مرطوب ہونے کی بناء پر بدن پر لگ جاتی ہے یا بدن کسی وجہ سے پانی یا پسینے سے تر ہوگیا اور وہ نجاست اس پر لگ گئی تو اس سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا، صرف اس ناپاک جگہ کو دھولے، وضو بدستور قائم رہے گا۔

جلد سے جڑے ہوئے مصنوعی بالوں کی طہارت کا مسئلہ؟

سوال: آج کل جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے مستقل بنیادوں پر جو مصنوعی بال لگائے جارہے ہیں کیا ایسے بال لگوا کر طہارت حاصل کی جاسکتی ہے کیونکہ ان بالوں کو جلد کے ساتھ مستقل طور پر جوڑ دیا جاتا ہے؟ (شمیم یاسر۔شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

جواب: اگر یہ بال جلد کے ساتھ جڑ گئے ہیں یعنی انہیں ظاہراً اگی ہوئی شکل یا مستقل پیوستگی کی شکل میں کر دیا گیا ہے تو وہ اصل بالوں ہی کے حکم میں ہوں گے بشرطیکہ وہ بال کسی ناپاک اور حرام چیز سے نہ بنائے گئے ہوں یا کسی حرام جانور کے نہ ہوں، کیونکہ ایسی صورت میں ان کے ہوتے ہوئے طہارت ممکن ہی نہیں رہے گی اس لئے کہ جو چیز اصلاً ناپاک ہو اسے دھوکر پاک نہیں کیا جاسکتا۔ دھونے سے صرف وہ چیز پاک ہوسکتی ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے پاک ہو لیکن اس کو حقیقی، حکمی یا مصنوعی نجاست لاحق ہوئی ہو۔ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اگر مصنوعی بال فی نفسہٖ پاک ہوں تو وہ اصل بالوں کے حکم میں ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جن مواقع پر اصل بالوں کے لئے مسح کافی ہے، وہاں ان پر بھی مسح کافی ہوگا اور جہاں اصلی بالوں کو دھونا اور ان کی جڑوں تک پانی کا پہنچنا ضروری ہے وہاں ان کا بھی وہی حکم ہوگا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ کو غسل دینا (وضاحتی نوٹ)

میں نے کامران قریشی کے استفسار پر، شوہر کے اپنی بیوی کی میت کو غسل دینے کے مسئلے پر، ایک مقامی اخبار میں شائع شدہ اور ایک مفتی صاحب سے منسوب ایک فقہی مسئلے کی تصحیح کی تھی، جو جمعہ ۱۵ ستمبر کی اشاعت میں آچکی ہے۔ ہمارے ایک اور قاری سید عمیر الحسن برنی، جو ماشاءاللہ دینی مسائل کا ذوق رکھتے ہیں، کے توجہ دلانے پر اس مسئلے کی مکمل تشریح و توضیح کے لئے یہ سطور درج کی جارہی ہیں۔ یہ ساری تفصیل فتاویٰ شامی مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت جلد نمبر ۳ ص ۸۵ سے ماخوذ ہیں۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

''شوہر کے لئے اپنی بیوی کی میت کو غسل دینا اور چھونا منع ہے، صحیح ترین قول کے مطابق دیکھنا منع نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ جائز ہے کیونکہ حضرت علی نے بی بی فاطمہ کو غسل دیا تھا، ہم جواباً کہتے ہیں کہ حضرت علی کا غسل دینا اس پر محمول ہے کہ ان کا بی بی فاطمہ کے ساتھ رشتۂ زوجیت بعداز وفات بھی قائم تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''رشتۂ نکاح اور رشتۂ نسب موت کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے میرے رشتۂ نکاح اور میرے رشتۂ نسب کے''۔ حالانکہ بعض صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تھا۔ (نوٹ اس روایت کو حاکم نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے (۳/۱۴۲) اور علامہ ذہبی نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے اسے منقطع کہا ہے۔)

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: شوہر کے اپنی بیوی کو غسل دینے کی ممانعت سے البحر الرائق کی اس عبارت کی طرف اشارہ ہے کہ غاسل کے لئے شرط یہ ہے کہ اس کے لئے مغسول (جسے غسل دیا جائے) کی طرف دیکھنا جائز ہو، یہی وجہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کو غسل نہیں دے سکتے، اور عنقریب یہ مسئلہ آئے گا کہ مرد کا انتقال ہو جائے اور صرف عورتیں ہوں یا عورت کا انتقال ہو جائے اور صرف مرد ہوں تو کیا کریں؟ ظاہر یہ ہے کہ غاسل کے لئے مغسول کو دیکھنے کے جواز کا مسئلہ غسل کے وجوب یا جواز کے لئے شرط ہے، صحت غسل کے لئے نہیں۔ ''شوہر کے لئے بیوی کی میت کو دیکھنا منع نہیں ہے''۔ ''منحہ'' میں اس قول کو ''القنیہ'' کی طرف منسوب کیا ہے اور فتاویٰ خانیہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا کہ اگر مردہ عورت کا محرم مرد ہے تو اسے اپنے ہاتھ سے تیمم کرائے اور اگر اجنبی مرد ہے تو اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر تیمم کرائے اور نگاہیں اس کے بازوؤں پر نہ ڈالے، اسی طرح شوہر اپنی بیوی کو تیمم کرائے مگر اس کے لئے نگاہیں نیچے رکھنے کی پابندی نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ چھونے سے دیکھنا کم تر چیز ہے۔ ہم کہتے ہیں ''شرح المجمع'' کے مصنف نے کہا ہے (درحقیقت) حضرت فاطمہ کو ان کی دائی ام ایمن نے غسل دیا تھا۔ حضرت علی کے غسل دینے کی روایت اس پر محمول ہے کہ انہوں نے تیاری کی تھی اور سارا سامان فراہم کیا تھا، اور اگر یہ (غسل علی کی) روایت درست بھی ہو تو ان کی خصوصیت پر محمول ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود نے اعتراض کیا تو حضرت علی نے جواب دیا کہ ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: بے شک فاطمہ دنیا اور آخرت (دونوں)

میں تمہاری بیوی ہے۔" (اس روایت کو امام شافعی، امام دار قطنی، امام بیہقی اور امام ابونعیم نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔) یہ اس امر کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک عام حکم شرعی یہی تھا کہ شوہر کے لئے اپنی بیوی کو غسل دینا جائز نہیں ہے اور حضرت علی اپنے لئے خصوصیت کے دعویدار تھے۔

نفاس کی مدت

سوال: اکثر خواتین بچے کی ولادت کے بعد سوا مہینے یعنی چالیس دن تک غسل نہیں کرتیں، اس مدت کے دوران نماز، تلاوت سب کچھ موقوف ہو جاتا ہے، کیا یہ درست ہے؟

(رخسانہ شاکر۔ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: زچگی (Delivery) یعنی بچے کی ولادت کے بعد عورت کے رحم سے جو خون جاری ہوتا ہے، اسے نفاس کہتے ہیں، اس کی زیادہ سے زیادہ ممکنہ مدت چالیس دن ہے، یعنی چالیس دن تک اگر خون جاری رہا تو اسے نفاس ہی سمجھا جائے گا، اور وہ شرعاً ناپاک رہے گی، اور اس عرصے کی نمازیں اسے معاف ہیں، لہٰذا ان کی قضا بھی اس پر نہیں ہے۔ اس عرصے میں رمضان کا روزہ رکھنا بھی منع ہے، لیکن روزہ معاف نہیں ہے، بعد میں اس کی قضا لازم ہوگی۔ اگر خون چالیس دن پورے ہونے کے بعد بھی جاری رہے تو اب یہ نفاس نہیں ہے، بلکہ استحاضہ ہے، یعنی 'سیلان الرحم' کی بیماری ہے۔ اب نفاس والی عورت پر لازم ہے کہ غسل کر کے پاک ہو جائے اور نمازیں پڑھے، روزے رکھے اور تلاوت کرے، بیت اللہ کا طواف بھی کر سکتی ہے۔ خون مستقل جاری رہتا ہے تو یہ بیماری ہے اور شرعی عذر ہے، بس اتنا ہے کہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرے یا ہو سکے تو غسل کرے، اور خون کے قطرے آنے کے باوجود وہ نماز پڑھتی رہے اور تلاوت کرتی رہے۔ نفاس کے لئے کم سے کم کوئی مدت متعین نہیں ہے، لہذا خون جب بھی رک جائے، خواہ ایک دن بعد یا زیادہ دنوں کے بعد، غسل کر کے پاک ہو جائے اور نمازیں شروع کر دے، تلاوت کرے وغیرہ۔ چالیس دن پورے کرنے ضروری نہیں ہیں۔ اگر چالیس دنوں سے کم مدت میں، خواہ ان ایام کی تعداد کوئی بھی ہو، خون بند ہو گیا، لیکن عورت نے غسل کر کے اور پاک ہو کر نمازیں نہیں شروع کیں، تو ان دنوں کی قضا اس پر لازم ہوگی۔

کیا ڈیڑھ سالہ بچی کے پیشاب سے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں

سوال: میری بچی ڈیڑھ سال کی ہے، کبھی اس کا پیشاب میرے کپڑوں اور بدن پر گر جاتا ہے تو کیا اس صورت میں دوبارہ غسل کرنے اور کپڑے بدلنے ضروری ہیں؟

(ڈاکٹر بشریٰ۔گلستان جوہر)۔

جواب: بدن کے جس حصے پر اور کپڑے پر جہاں بچی کا پیشاب لگا ہے، وہ ناپاک ہو جاتے ہیں، بس انہیں دھوڈالیں، نہ دوبارہ غسل کی ضرورت ہے نہ اس سے وضوٹوٹتا ہے۔

خواتین کا ایامِ مخصوص میں مہندی لگانا

سوال: کیا خواتین ایامِ مخصوص میں مہندی لگاسکتی ہیں اور اگر لگادی جائے تو ایام گزرنے پر غسل کرکے پاک ہوسکتی ہیں؟ (لبنیٰ رشید، کیماڑی، کراچی)

جواب: جی ہاں، خواتین ایام مخصوص میں مہندی لگاسکتی ہیں، اپنے ہاتھ پاؤں پر یا بالوں پر، اور ایام گزرنے پر جب وہ غسل کریں گی تو پاک ہو جائیں گی۔

گلی کوچوں کے ناپاک پانی کا بدن یا کپڑوں پر لگنا

سوال: ہم جب گھروں سے نکلتے ہیں تو اکثر گلی کوچوں میں پانی جمع رہتا ہے اور وہ بدن یا کپڑوں پر لگ جاتا ہے، کیا اس کا ازالہ متاثرہ جگہ کے دھولینے سے ہو جاتا ہے، یا وضو یا غسل کرنا پڑے گا؟ (سیّد محمد عارف۔شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

جواب: عام طور پر یہ یقین یا ظنِ غالب ہوتا ہے کہ یہ پانی گٹر کا ہے جو سیورج لائن کے بند ہونے یا کسی لائن یا مین ہول کے ٹوٹ جانے سے ابلنے لگتا ہے اور گلی کوچوں میں پھیل جاتا ہے، یہ پانی ناپاک ہے اور بدن یا کپڑے کے جس حصے پر لگے، اسے اچھی طرح سے دھوڈالیں۔اس کے ازالے کے لئے غسل یا وضو کی ضرورت نہیں، اگر آپ پہلے سے باوضو ہیں تو آپ کا وضو بدستور قائم رہے گا۔

كتاب الصلوٰة

مسجد میں داخل ہوتے وقت اونچی آواز سے سلام کرنا

سوال: آج کل لوگ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز سے سلام کرتے ہیں، جس سے نماز واذکار میں مشغول نمازیوں کا خیال بٹ جاتا ہے اور بعض نمازی بیٹھے ہوئے نمازیوں سے ہاتھ ملاتے ہیں اور بعض نمازی آپس میں گفتگو کرتے ہیں، بعض دفعہ وہ گفتگو تفریح و مذاق کا رخ اختیار کر جاتی ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں کہ اس طرح کے معمولات مسجد میں جائز ہیں یا نہیں۔

(قاری محمد صدیق قادری، خطیب جامع مسجد خلفائے راشدین گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

عن عبد اللّٰہ بن عمرو ان رجلا سال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ای الاسلام خیرٌ؟ قال: تطعم الطعام و تقرئ السلام علی من عَرفتَ و من لم تعرف۔(مشکوٰۃ، باب السلام ص۳۹۷)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کی کون سی خصلت سب سے اچھی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تم (مساکین کو) کھانا کھلاؤ اور (ہر مسلمان کو) سلام کرو، خواہ تم اسے جانتے ہو یا نہیں''۔

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: للمؤمن علی المؤمن ستُّ خصال یعودہ اذا مرض ویشھَدہ اذامات و یجیبہ اذا دعاہ و یُسَلِّم علیہ اذا لقیہ و یشمتہُ اذا عطس و ینصح لہ اذا غاب او شھد لم اجدہ۔(مشکوٰۃ، باب السلام، صفحہ ۳۹۷)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک مومن کے دوسرے مومن پر چھ (عمومی) حقوق ہیں، جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے، جب وہ وفات پائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو، جب وہ دعوت دے تو اسے قبول کرے، جب اس سے ملاقات ہو تو اسے سلام کرے، جب اسے چھینک آئے

تو (اس کی الحمدللہ کے جواب میں) "یَرْحَمُكَ اللّٰہ" کہے اور وہ موجود ہو یا نہ ہو (ہر حال میں) اس کی خیر خواہی کرے"۔

عن ابی اُمامة قال: قال رسول ﷺ: ان اولی الناس باللّٰہ من بدا بالسلام۔ (مشکوٰۃ باب السلام صفحہ ۳۹۸)

"حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عام لوگوں کے بہ نسبت اللہ تعالیٰ (کی رحمت و مغفرت) کا سب سے زیادہ حق دار وہ ہے جو سلام کی ابتدا کرے"۔

عن ابی هریرة قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: یسلم الراکب علی الماشی والماشی علی القاعد والقلیل علی الکثیر

"حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سوار پیدل کو سلام کرے، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور جو تعداد میں کم ہوں وہ اپنے بہ نسبت زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں"۔

عن ابی هریرة قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ یسلم الصغیر علی الکبیر والمار علی القاعد والقلیل علی الکثیر۔ (مشکوٰۃ باب السلام)

"حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھوٹا بڑے کو سلام کرے، (راستے پر) چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے زیادہ کو سلام کریں"۔

عن ابی هریرة عن رسول اللّٰہ ﷺ قال: اذا اتی احد کم الی مجلس فلیسلم فان بدا له ان یجلس فلیجلس ثم اذا قام فلیسلم فلیست الاولیٰ باحق من الاٰخرة۔ (مشکوٰۃ باب السلام)

"حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کسی مجلس میں پہنچے تو سلام کرے، اگر وہ بیٹھنا مناسب سمجھے تو بیٹھ جائے، پھر جب مجلس سے (روانہ ہونے کے لیے) اُٹھے تو تب بھی سلام کرے کیونکہ پہلا دوسرے سے کوئی زیادہ اہم نہیں ہے، (یعنی اسلامی شعار ہونے کے اعتبار سے دونوں کی یکساں اہمیت ہے)"۔

ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ "سلام" اسلام کا شعار ہے، سنت متوارثہ ہے، اسلامی

اخلاقیات کا اعلیٰ نمونہ ہے، دنیا کی ہر قوم میں باہمی ملاقات کے موقع پر تحیت کے کچھ خاص کلمات رائج ہیں، جیسے انگریزوں کے ہاں گڈ مارننگ، گڈ نائٹ وغیرہ، فارسی میں صبح بہ بخیر، شب بخیر وغیرہ۔ لیکن اسلام کا شعارِ ملاقات والوداع سب سے منفرد ہے، یہ ایک جامع کلمۂ دعاء وخیر خواہی ہے، اللہ کی سلامتی ورحمت وبرکت کی دعا ہے اور اپنی جانب سے بھی پیغامِ سلامتی ہے۔
ایک حدیث مبارک میں آپ نے پڑھ لیا کہ آدمی باہر سے آ کر مجلس میں شریک ہو تو سلام کرے، اُٹھ کر جانے لگے تو سلام کرے، اگرچہ اہلِ مجلس میں سے ہر ایک پر اس کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے ایک یا چند افراد نے جواب دے دیا تو جواب کی ''سنتِ کفایہ'' ادا ہوگئی۔
لیکن اگر مسجد میں لوگ نماز میں مشغول ہیں، تلاوتِ قرآن کریم، تسبیح، اوراد ووظائف اور درود شریف پڑھنے میں مشغول ہیں یا وعظ وتذکیر اور درس وتدریس کی مجلس میں مشغول ہیں تو پھر آنے والا اونچی آواز سے سلام نہ کرے (اور اگر اس نے اونچی آواز سے سلام کر بھی دیا تو ان لوگوں پر سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے) بلکہ وہ خاموشی سے آئے اور اپنی عبادت میں مشغول ہو جائے، ہاں اگر کوئی شخص یا چند اشخاص کسی عبادت، تلاوت، اوراد واذکار وغیرہ میں مشغول نہیں ہیں تو ان کے قریب جا کر انہیں سلام کرے، تاکہ جو لوگ مصروفِ عبادت ہیں ان کی توجہ اور یکسوئی میں خلل واقع نہ ہو۔ یہ مسئلہ مسجد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ خارجِ مسجد بھی کوئی مجلسِ وعظ، تلاوت، درود خوانی یا ذکر وفکر کی مجلس برپا ہو تو جا کر خاموشی سے بیٹھ جائے۔ جہاں سلام کی اجازت ہے وہاں مصافحہ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی کھانا کھانے میں مشغول ہو تو بھی اسے سلام نہ کرے۔ لیکن اگر اسے کسی نے سلام کر دیا تو وہ جواب دے دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے کھانے کے دوران بات چیت کا جواز ثابت ہے۔ البتہ اگر بھوک ہو اور کھانے کی طلب ہو تو سلام عرض کر دیں، شاید وہ پیش کش کرے۔
مسجد میں شور وغوغا کرنا، دنیوی باتیں کرنا، گپ شپ کرنا، ہنسی مذاق کی باتیں کرنا، کاروباری لین دین کی باتیں کرنا سخت منع ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ: من سمع رجلاً ینشد ضالة فی المسجد فلیقل لاردها الله علیک فان المساجد لم تُبنَ لهذا.

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کسی

شخص کو مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو کہے کہ اللہ کرے تجھے یہ چیز نہ ملے کیونکہ مساجد اس مقصد کے لیے نہیں بنائی گئیں''۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال نهی رسول الله ﷺ عن تناشد الاشعار فی المسجد و عن البیع والاشتراء فیه وان یتحلق الناس یوم الجمعة قبل الصلوة فی المسجد.

''عمرو بن شعیب اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مساجد میں (فحش) اشعار پڑھنے، خرید و فروخت کرنے اور جمعہ کے دن مسجد میں نماز جمعہ سے پہلے حلقے بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا''۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ: اذا رایتم من یبیع او یبتاعُ فی المسجد فقولوا لا اربح الله تجارتک و اذا رایتم من ینشد فیه ضالة فقولوا لاردالله علیک.(مشکوٰة، باب المساجد)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: جب تم دیکھو کہ کوئی شخص مسجد میں لین دین کر رہا ہے تو کہو کہ اللہ تمہاری تجارت میں نفع نہ دے اور جب تم دیکھو کہ کوئی گمشدہ چیز کا اعلان کر رہا ہے تو کہو کہ اللہ تعالیٰ یہ گمشدہ چیز تمہیں نہ لوٹائے''

عن الحسن مرسلا قال قال رسول الله ﷺ: یا تی علی الناس زمان یکون حدیثهم فی مساجد فی امر دنیاهم فلا تجالسوهم فلیس لله فیهم حاجة.(مشکوٰة باب المساجد)

''حضرت حسن سے ایک حدیث مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ وہ مساجد میں دنیوی باتیں کریں گے ان کے ساتھ نہ بیٹھو، اللہ کو ان (کی عبادت) سے کوئی غرض نہیں''۔

علامہ ابن عابدین شامی مسجد میں باتیں کرنے کی ممانعت کو منکرات یا ''لہوالحدیث'' (بیہودہ یا بے مقصد باتوں) پر محمول کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''المصفّی میں ہے مسجد میں بات چیت کے لیے بیٹھنا شرعاً جائز ہے کیونکہ اہل صفہ کا رہن سہن مسجد ہی میں ہوتا تھا وہ وہاں پر سوتے بھی تھے اور بات چیت بھی کرتے تھے، لہٰذا کسی کے لیے اس

سے منع کرنا جائز نہیں ہے۔ ’’الجامع البرہانی‘‘ میں بھی اسی طرح ہے‘‘۔

(فتاویٰ شامی ۲/ ۴۸۷ طبع جدید بیروت)

لیکن ظاہر ہے کہ اہل صفہ زیادہ تر دین ہی کی باتیں کرتے تھے، احادیث کا بیان کرتے تھے یا یہ اس طرح کی ضروری باتوں پر محمول ہے جیسے کسی مسجد کی انتظامیہ کے لوگ مسجد میں بیٹھ کر مسجد کے انتظامی معاملات پر بات کرتے ہیں یا کچھ لوگ کسی دینی، ملی اور فلاحی مسئلے پر بات کرتے ہیں۔ زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت نفلی اعتکاف کی نیت کر لینی چاہئے۔

گزشتہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں نماز کا تذکرہ

سوال: کہا جاتا ہے کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ہمارے رسول اکرم ﷺ اور آپ کی امت پر معراج کی شب فرض ہوئی، جبکہ عمومی طور پر نماز کا تذکرہ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات میں بھی ملتا ہے، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں کون کون سے اوقات کی نمازیں فرض تھیں، تحریر فرمائیے، (زاہد اللہ۔ اوگی، مانسہرہ)۔

جواب: قرآنی ارشادات کے مطابق تمام نبی اپنی امتوں کو نماز کی تعلیم دیتے رہے ہیں، انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو نماز پڑھائی بھی ہے اور پڑھی بھی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ (ابراہیم: ۴۰)

’’اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے (بھی)‘‘۔

قرآن میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

وَكَانَ یَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (مریم: ۵۵)

’’وہ اپنے اہل وعیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے‘‘۔

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ (لقمان: ۱۷)

’’اے میرے بیٹے نماز پڑھو‘‘۔

اللہ جل شانہٗ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرماتا ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ (طٰہٰ: ۱۴)

''میری یاد (کوتازہ رکھنے) کے لئے نماز پڑھو''۔

بنی اسرائیل کوحکم ہوا:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (بقرہ:۴۳)

''اور نماز قائم کرو''۔

قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ (مریم:۳۱)

''اور (اللہ تعالیٰ نے) مجھے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے''۔

امام نسائی اپنی سند کے ساتھ واقعہ معراج بیان کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:'' (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) پھر میں پانچ نمازوں (کا حکم لے کر) لوٹا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: جایئے! اپنے ربّ سے مزید تخفیف کی گزارش کیجئے، کیونکہ بنی اسرائیل پر صرف دو نمازیں فرض کی گئی تھیں، لیکن وہ ان کو بھی نہ پڑھ سکے، (سنن نسائی، جلد ۱، ص ۵۲)''۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر (یعنی شریعت موسیٰ علیہ السلام میں) دو نمازیں فرض تھیں۔

اس کے علاوہ ایک اور روایت میں ہے کہ نمازِ عشاء ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت کی خصوصیت ہے، چنانچہ امام ابوداؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت معاذ ابن جبل سے روایت کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'' اس نماز (عشاء) کو تاخیر سے پڑھا کرو کیونکہ تم کو اس نماز کے سبب پچھلی تمام امتوں پر فضیلت دی گئی ہے اور تم سے پہلے کسی امت نے یہ نماز نہیں پڑھی، (سنن ابوداؤد، ج ۱، ص ۶۱)''۔ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پنجگانہ نمازوں میں ہر ایک نماز کسی نہ کسی اولوالعزم نبی نے پڑھی ہے، گویا ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت میں سب کو جمع کر دیا گیا ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ:'' حضرت آدم علیہ السلام نے صبح کی نماز پڑھی، حضرت داؤد علیہ السلام نے ظہر کی نماز پڑھی، حضرت سلیمان علیہ السلام نے عصر کی نماز پڑھی، حضرت یعقوب علیہ السلام نے مغرب کی نماز پڑھی اور حضرت یونس علیہ السلام نے عشاء کی نماز پڑھی، (الاصابہ، ج ۴، ص ۳۶۴ بحوالہ علامہ حلبی رافعی شارح مسند شافعی)''۔اس روایت کی رو سے امت محمدیہ سے پہلے عشاء کی نماز حضرت یونس علیہ السلام نے پڑھی ہے، لیکن گزشتہ روایت کی رو سے ان کی یا کسی اور نبی کی امت نے نہیں پڑھی۔

جہاں تک پانچ اوقات کی نماز کی فرضیت کا تعلق ہے، وہ تو شب معراج ہی کو فرض ہوئی ہے، لیکن فی نفسہ نماز نزول وحی کے ساتھ ہی فرض ہو گئی تھی۔ السیرۃ النبویہ لابن ہشام برحاشیہ روض الانف ج ۱ ص ۱۶۲، اور انسان العیون ج ۱ ص ۴۲۶ میں ہے کہ جبریل امین نے وضو کیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا، پھر آپ نے جبریل علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھی۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح الزرقانی علی المواہب، المقصد الخامس فی المعراج والاسراء ۶/۱۴۲ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل پر دو وقت کی نماز فرض تھی، دو رکعت صبح اور دو رکعت رات کی، اور بعض کے نزدیک دو رکعت زوال کی بھی تھیں، لیکن وہ اس پر کاربند نہ رہ سکے،

(فتاویٰ رضویہ ۵/۴۴ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)''۔

رہا یہ سوال کہ انبیاء سابقین کی نمازوں کا طریق ادا کیا تھا، یہ جاننا نہ ہماری ضرورت ہے، نہ ہم اس کے مکلف ہیں اور نہ ہی قرآنِ مجید اور احادیثِ صحیحہ میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں۔

تائب کی امامت کا حکم

سوال: ایک شخص کچھ عرصہ پہلے گانے، ڈرامے اور بے حیائی کی فلمیں دیکھتا تھا اور اس نے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا (ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی طرف صاف دل سے خالص توبہ کرو) کے مطابق توبہ کر لی، کیا ایسا شخص امامت کے قابل ہے، جبکہ اس میں اہلیت امامت کی تمام شرائط موجود ہیں، کیا اس پر کوئی حد شرعی قائم ہوگی۔

(شاہد جمیل۔ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: موسیقی کے ساتھ فحش گانے، بیہودہ ڈرامے اور بے حیائی کی فلمیں دیکھنا گناہ ہے۔ صورتِ مسئولہ میں جب اس شخص نے صدق دل سے توبہ کر لی ہے تو وہ امامت کے قابل ہے اور اس کی اقتداء میں نماز صحیح ہے۔ جب تک توبہ کے منافی اس سے فسق و فجور کا صدور نہ ہو تو اس کے ماضی کے کردار کے حوالے سے بدگمانی ناجائز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ٘ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

(الحجرات: ۱۲)

''اے ایمان والو! بہت سے گمان سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں''۔

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "بدگمانیوں سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم)"۔ توبۃ النصوح اور توبہ صادق کی ظاہری علامت یہ ہے کہ بندے نے جس گناہ سے توبہ کی ہے، دوبارہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان کریمی سے توبہ کی قبولیت کا وعدہ فرمایا ہے اور اسے اپنے ذمۂ کرم پر لیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (النسا: ١٧)

"وہ توبہ جس (کی قبولیت) کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے گناہ کر بیٹھیں، پھر جلدی سے توبہ کرلیں تو وہ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ اپنی رحمت سے رجوع فرماتا ہے، اور اللہ خوب جاننے والا بہت حکمت والا ہے"۔

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں"۔ (مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابن ماجہ و سنن بیہقی)

سوال میں مذکور شخص پر کوئی حدِ شرعی عائد نہیں ہوتی۔ عامۃ المسلمین سے بھی گزارش ہے کہ اگر چہ شرعاً تصویر کا حکم اصل کا نہیں ہوتا، لیکن موسیقی اور گانے بجانے کے آلات کے ساتھ فحش گانے سننا، بیہودہ ڈرامے اور بے حیائی کی فلمیں اور ناچ گانے کے پروگرام دیکھنا مکروہِ تحریمی ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہئے اور کسی تھیٹر وغیرہ میں جا کر غیر محرم عورتوں کو براہِ راست بے حجاب اور نیم عریاں لباس میں دیکھنا بھی مکروہِ تحریمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "بے شک شیطان انسان (کی رگ و پے) میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہے جیسے (رگوں میں) خون رواں ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین)"۔ اور فرمان رسول ﷺ ہے: "آنکھوں کا زنا (غیر محرمات کو بے حجاب) دیکھنا ہے، اور کانوں کا زنا (فحش باتیں) سننا ہے، اور زبان کا زنا (بے حیائی کی باتیں کرنا ہے، اور ہاتھ کا زنا چھونا ہے اور پاؤں کا زنا (برائی کی طرف) قدم اٹھانا اور دل (گناہ کی) خواہش اور آرزو کرتا ہے اور شرم گاہ (گناہ سے رک کر) اس کی تکذیب کرتی ہے یا (گناہ میں مبتلا ہو کر) اس کی تصدیق کرتی ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)"۔ یعنی مومن کو گناہ کے مبادیات اور محرکات سے بچنا چاہئے ورنہ گناہ میں مبتلا ہونے کا ہر وقت اندیشہ ہے۔

امام کا صفیں درست کرنے کی ہدایت کرنا

سوال: سوال یہ ہے کہ بندہ نے اب تک جہاں بھی نماز جمعہ ادا کی ہے۔ ائمہ کرام یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ صفیں سیدھی کرلیں اور ساتھ کوئی اور جملہ بھی کہہ دیتے ہیں آیا اس کا کوئی شرعی جواز ہے؟ اگر ہے تو مفصل جواب دیں۔ مہربانی ہوگی۔ ہاں آیا امام صاحب نماز کی امامت پہ بھی یہ الفاظ دہرا سکتا ہے یا کہ نہیں؟ (ارشد علی، پنجاب)۔

جواب: رسول اللہ ﷺ نے باجماعت نماز میں صفوں کی درستی پر بہت زور دیا ہے، تاکید فرمائی ہے اور صفوں میں خلا چھوڑنے اور صفیں ٹیڑھی بنانے پر وعید بھی فرمائی ہے، آپ کا ارشاد ہے: ''اللہ کے بندو! تمہیں لازماً صفیں سیدھی رکھنی چاہئیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو بگاڑ دے گا (یا انہیں پھیر دے گا یا ان میں اختلاف پیدا فرمادے گا)''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)

اور آپ نے ارشاد فرمایا: ''صفوں کو (سیدھا اور) برابر رکھو، کیونکہ صفوں کی درستی سے نماز کی تکمیل ہوتی ہے''۔ (مشکوٰۃ)

''ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نماز کے وقت) ہمارے کندھوں کی چھو کر صفوں کو درست کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے: صفیں برابر رکھو اور ان میں بگاڑ پیدا نہ کرو ورنہ تمہارے دلوں میں بگاڑ (اور نفاق) پیدا ہوگا، تم میں جو زیادہ سمجھدار ہیں، وہ میرے قریب کھڑے ہوں، اور اس کے بعد دوسرے درجہ بدرجہ''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نماز کی اقامت کہی گئی، پھر رسول اللہ ﷺ ہماری جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: صفوں کو سیدھا کرو اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہوا کرو، کیونکہ میں (دوران نماز) اپنی پیٹھ کے پیچھے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے کہ سامنے دیکھتا ہوں''۔ (مشکوٰۃ) اسی طرح مشکوٰۃ شریف میں متعدد روایات درج ہیں، جن کی رو سے آپ ﷺ صفوں کی درستی کے لئے یہ کلمات ارشاد فرماتے تھے: ''سَوُّوْا، اِسْتَوُوْا، اِعْتَدِلُوْا (یعنی صفوں کو برابر کرو، سیدھا کرو، ٹھیک کرو)''۔ اور آپ فرماتے تھے: ''صفوں کو سیدھا کرو، کندھے ایک دوسرے کے برابر رکھو (یعنی آگے پیچھے نہ کرو)، اور صفوں میں (دو آدمیوں کے درمیان) خلا نہ چھوڑو، کیونکہ اس میں شیطان گھس جاتا ہے (اور تمہارے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، بگاڑ پیدا کرتا ہے)''۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صفیں سیدھی رکھو، کندھے ایک دوسرے کے برابر رکھو، صفوں میں (دو آدمیوں کے درمیان) خالی جگہ نہ چھوڑو، (صفیں سیدھی کرنے کے لئے) تمہارا دینی بھائی ہاتھ بڑھائے تو اس کے ساتھ نرمی اختیار کرو، شیطان کے لئے بیچ میں کشادہ جگہ نہ چھوڑو، جو صف کو ملا کر رکھے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے وابستہ رکھے گا اور جو صف کا سلسلہ توڑ دے گا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا رشتہ توڑ دے گا''۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد ونسائی)

ان احادیث مبارکہ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صفوں کی درستگی کا کتنا اہتمام اور تاکید فرماتے تھے اور آپ نے صفوں کو برابر نہ رکھنے والوں کے لئے کتنی شدید وعیدیں فرمائیں۔ عہد رسالت مآب ﷺ اور عہد خلفاء راشدین وسلف صالحین میں یہ تاکید شدید اس لئے بھی تھی کہ مساجد ناپختہ تھیں، صفوں کی نشاندہی کے لئے لائنوں، دریوں، چٹائیوں اور قالینوں کا اہتمام نہیں تھا، لہٰذا صفوں کی درستی کے لئے انتہائی توجہ کی ضرورت تھی۔ آج کل ہمارے لئے بڑی آسانیاں ہیں، اگر کسی مسجد میں نمازی کم ہیں یا مسجد بالکل چھوٹی ہے اور امام سمجھتا ہے کہ صفیں درست بن رہی ہیں تو اگر زبانی تاکید نہ بھی کرے تو حرج نہیں ہے، لیکن اگر تاکیدِ صفوف کو سنت رسول اللہ ﷺ سمجھتے ہوئے زبانی بھی کہہ دے تو تعمیلِ سنت کا اجر ملے گا۔ مسجد بڑی ہو، نمازی زیادہ ہوں تو بہتر یہی ہے کہ امام تاکیداً صفیں درست کرائے، امام اگر ضرورت محسوس کرے تو اقامت مکمل ہونے کے بعد نمازیوں کو صفوں کی درستی کے لئے مزید وقت دے سکتا ہے اور اس مقصد کے لئے تکبیر تحریمہ میں چند لمحے کی تاخیر بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اوّابین کے نوافل پڑھنے کا طریقہ

سوال: ''اوّابین'' کے نوافل پڑھنے کا کیا طریقہ ہے؟ کیا یہ نوافل نماز مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھے جاتے ہیں؟ اور کیا نفلی عبادت کے بعد دعا مانگنی چاہئے۔ (محمد سلیم، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: ''اوّاب'' کے لفظی معنی ہیں ''توبہ کرنے والا''، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ''طلب مغفرت کے لئے رجوع کرنے والا''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِىْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ

غَفُوۡرًا (بنی اسرائیل:۲۵)

" تمہارا رب خوب جانتا ہے، جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اگر تم نیک ہوئے تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کو بہت بخشنے والا ہے جو اس کی طرف رجوع کرنے والے (اوّابین) ہیں"۔

مغرب کی نماز کے بعد کم از کم چھ رکعات نوافل پڑھنا مستحب ہے، ان کو "اوّابین" کہتے ہیں، یہ نماز دو دو رکعت کر کے تین سلام کے ساتھ پڑھنا افضل ہے، یعنی ہر دو رکعت پر سلام پھیرے۔ مغرب کے فرض کے بعد دو رکعت سنت مؤکدہ اوّابین کے نوافل کے ساتھ ملا کر پڑھ سکتے ہیں، ان نوافل میں مطلق نماز کی نیت کافی ہے، یعنی نیت میں اوّابین کا لفظاً ذکر یا ذھن میں اس مفہوم کا استحضار (Presence) ضروری نہیں ہے اور سنت کی نیت سے بھی پڑھ سکتے ہیں کیونکہ یہ سنن زوائد میں سے ہیں۔ اوّابین کی کم از کم چھ رکعات ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک اور روایت کے مطابق ان کی تعداد بیس رکعات ہے، (ترمذی ج ۱ ص ۵۸ باب ماجاء فی فضل التطوع ست رکعات)۔ نفل نماز کے بعد دعا مانگی جا سکتی ہے، دعا مانگنا افضل ہے اور اس کے لئے کسی وقت کی تحدید نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُجِیۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ

" میں دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھ سے دعا مانگے"۔

حدیث شریف کی معروف کتاب "سنن ترمذی" میں ہے:

عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَن صلّی بعد المغرب ستّ رَکعاتٍ لم یتکلم فیما بینھُنّ بِسُوۡءٍ عُدِلۡنَ لَہٗ بِعِبَادۃِ ثِنۡتَیۡ عَشۡرَۃَ سَنَۃً۔

" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے نماز مغرب کے بعد چھ رکعات (نفل) اس طرح پڑھے کہ ان کے درمیان کوئی بری بات نہیں کی تو وہ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) بارہ سال کی (نفلی) عبادت کے برابر ہوں گے"۔ (رقم الحدیث:۴۳۵)

اس حدیث کے تحت امام ابوعیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی ایک روایت ہے کہ "جس نے مغرب کے بعد بیس رکعات نفل پڑھے، اللہ تعالیٰ اس

کے لئے جنت میں ایک گھر تعمیر فرمادے گا''۔ مغرب کے بعد کے چھ نوافل کی فضیلت کے بارے میں ''سُنن ابن ماجہ'' میں دو مقامات پر الگ الگ عنوانات کے تحت یہ حدیث مذکور ہے (احادیث نمبر ۱۱۶۷، ۱۳۷۳) اور تحفۃ الاشراف میں حدیث نمبر ۱۵۴۱۲ کے تحت درج ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب وضعیف قرار دیا ہے، لیکن فضائل اعمال میں ضعیف احادیث معتبر ہوتی ہیں۔

نماز میں سورت ملانا بھول گیا

سوال: ایک شخص نے چار رکعت نماز سنت کی نیت کی، سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملانی بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا، بعد میں یاد آیا کہ سورت ملانا رہ گئی ہے، کیا سجدۂ سہو سے نماز ہو جائے گی؟

(حافظ محمد ارشاد۔ امام و خطیب جامع مسجد اللہ والی۔ لائنز ایریا، صدر، کراچی)

جواب: اگر فرض کی پہلی دو رکعات اور باقی کسی بھی نماز (وتر، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ، نفل) کی کسی بھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملانا بھول جائے اور رکوع میں چلا جائے تو رکوع میں یاد آنے پر بھی پلٹ کر نہ آئے بلکہ نماز مکمل کرے اور آخر میں سجدۂ سہو کرلے، نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، کیونکہ سورت کا ملانا واجب ہے اور ترک واجب کی تلافی سجدۂ سہو سے ہو جاتی ہے۔

نماز میں سہو کے مسائل

سوال: اگر کوئی نمازی بھول کر رکوع یا سجود میں قرأت کرلے تو کیا اس سے سجدۂ سہو لازم آئے گا؟ (آثاراللہ۔ قاری بختیار احمد۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب: یہ مسئلہ ہمارے اکابر فقہاء کرام میں مختلف فیہ ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے:

قال المقدسی: وکما لوقرأ القران هنا اوفی الرکوع یلزمه السهو مع انه کلام الله تعالٰی وکما لو ذکر التشهد فی القیام مع انه توحیدالله تعالٰی۔

''مقدسی نے کہا ہے کہ اسی طرح اگر یہاں (یعنی التحیات کے بعد) یا رکوع میں قرآن پڑھا تو سجدۂ سہو لازم ہوگا، حالانکہ یہ تو اللہ کا کلام ہے اور اسی طرح اگر قیام میں تشہد (یعنی التحیات) پڑھی تو سجدۂ سہو لازم آئے گا، حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار

ہے"۔ (فتاوی شامی، ج ۲ ص ۵۷۴ طبع جدید)

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق مؤلفہ علامہ فخر الدین زیلعی ج ۱ ص ۱۹۳ پر ہے:

وكذا لو قرأ اية فى الركوع اوالسجود اوالقومة اوالقعود فعليه السهو لانه ليس بمواضع القراءة.

"اوراسی طرح اگر رکوع یا سجود یا قومہ (رکوع سے اٹھنے کے بعد سجدے میں جانے سے پہلے جو ایک تسبیح کی مقدار رک کر قیام کرتے ہیں) یا قعود (یعنی التحیات) میں ایک آیت پڑھی تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہے، کیونکہ یہ مقام قرأت نہیں ہے"۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں ج ۱ ص ۵۲۱ پر لکھا ہے:

ولوقرأ التشهد فى الركوع اوالسجود لا سهو عليه لانه ثناء وهما محله، بخلاف القراءة فيهما فان فيه السهو۔

"اگر نمازی نے رکوع وسجود میں التحیات پڑھی تو اس پر سجدۂ سہو نہیں ہے، کیونکہ یہ (التحیات) ثناء ہے اور رکوع وسجود ثناء پڑھنے کا محل ہے، اس کے برعکس اگر رکوع وسجود میں قرآن پڑھا تو اس پر سجدۂ سہو لازم آئے گا (کیونکہ رکوع وسجود محل قرأت نہیں ہیں)"۔

علامہ زین الدین ابن نجیم، البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج ۲ ص ۹۷ پر لکھتے ہیں:

وقد اقتصر المصنف على هذه الواجبات فى باب صفة الصلوٰة وبقى واجب اخر وهو عدم تاخير الفرض والواجب وعدم تغييرهما وعليه تفرع مسائل منها وكذا لو قرأ آية فى الركوع اوالسجود والقومة فعليه السهو كما فى الظهيرية وغيرها وعلله فى المحيط بتاخير ركن او واجب عليه۔

"اور مصنف نے "باب صفة الصلوٰة" میں انہی واجبات کے بیان پر اکتفاء کیا ہے اور ایک اور واجب کا بیان رہ گیا ہے اور وہ ہے: فرض اور واجب میں تاخیر نہ کرنا اور ان میں تبدیلی نہ کرنا اور اس پر کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ: اور اسی طرح اگر اس نے رکوع یا سجدہ یا قومہ (یعنی رکوع کے بعد سجدہ میں جانے سے پہلے ایک تسبیح کی مقدار جو قیام ہوتا ہے) کی حالت میں ایک آیت پڑھ لی تو اس پر سجدۂ سہو واجب

ہے، جیسا کہ ظہیر یہ وغیرہ میں ہے، محیط میں اس سجدۂ سہو کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس قرأت سے رکن یا واجب میں تاخیر ہو جاتی ہے"۔

علامہ علاؤالدین بن مسعود کاسانی بدائع الصنائع ج ۱ ص ۱۶۹ پر لکھتے ہیں:

ولو قرأ القران فی رکوعہ او فی سجودہ او فی قیامہ، لا سہو علیہ، لانہ ثناء و ھذہ الارکان مواضع الثناء۔

"اور اگر اس (نمازی) نے اپنے رکوع یا سجود یا قومہ میں قرآن پڑھا، تو اس پر سجدۂ سہو واجب نہیں ہے، کیونکہ قرآن بھی اللہ کی ثناء ہے اور یہ ارکان (رکوع، سجود اور قومہ) بھی محل ثناء ہیں"۔

آپ نے اکابر فقہاء کرام کے اقوال ملاحظہ فرمائے، یہ سب ہمارے وہ عظیم اسلاف ہیں جن کی کتب سے نقل کر کے ہر مفتی فتویٰ دیتا ہے اور جتنے بھی اہل سنت و جماعت حنفی لوگ ہیں، بہ طیب خاطر ان پر عمل کرتے ہیں اور ان کو حجت مانتے ہیں، ان میں سے صرف علاؤالدین کاسانی، رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے پر سجدۂ سہو کے عدم وجوب کے قائل ہیں اور ان کی دلیل بھی معقول ہے۔لیکن چونکہ باقی تمام فقہاء کرام، جن کے حوالہ جات اوپر دیئے گئے ہیں، رکوع و سجود اور قومہ میں قرآن پڑھنے پر سجدۂ سہو کو واجب قرار دیتے ہیں، لہٰذا عامۃ المسلمین کو چاہئے کہ احتیاط پر عمل کریں اور ایسے موقع پر سجدۂ سہو کریں۔

مقتدی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے؟

سوال: فرض نماز میں جب امام قرأت شروع کر دے تو ثناء نہیں پڑھنی چاہئے جبکہ آپ نے سوال و جواب کے کالم میں فرمایا ہے کہ اگر نمازی کو گمان یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد ثناء حالتِ قیام میں پڑھ کر امام کو رکوع میں پالے گا تو ثناء پڑھ لے، (عبداللہ......لانڈھی، کراچی)۔

جواب: میں نے جو کچھ تحریر کیا تھا، وہ قرآن مجید کی اس آیت ربانی میں جو ارشاد باری تعالیٰ ہے، وہ اس کی تعمیل ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

(الاعراف: ۲۰۴)

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔
فقہاءِ احناف نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ فَاسْتَمِعُوْا (یعنی توجہ سے سنو) پر عمل تب ہوگا جب امام جہری نماز (مغرب، عشاء اور فجر) میں اونچی آواز سے تلاوت کرتا ہے، اور جب امام سری نماز (یعنی ظہر وعصر) میں آہستہ آواز سے تلاوت کرتا ہے تو مقتدی اَنْصِتُوْا (خاموش رہو) پر عمل کر رہا ہے، اور جب امام کو رکوع یا سجدے کی حالت میں پائے، تو فتاویٰ عالمگیری ج ا ص ۹۱ پر ہے:
''اور اگر مقتدی امام کو رکوع میں پائے یا سجدے کی حالت میں، تو سوچے، اگر اس کا غالب گمان یہ ہو کہ اگر وہ ثناء پڑھے گا تو امام کو اس رکوع یا سجدے میں پالے گا، تو حالتِ قیام میں ثناء پڑھ کر امام کے ساتھ شامل ہو جائے، ورنہ (یعنی اگر اس کا غالب گمان یہ ہے کہ اس کے ثناء پڑھنے سے امام رکوع یا سجدے سے اٹھ جائے گا تو) ثناء وتعوذ (اعوذ باللہ) نہ پڑھے، اور اگر مقتدی امام کو قعدے میں پائے تو ثناء نہ پڑھے بلکہ تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد دوسری تکبیر (تکبیر انتقال) کہہ کر قعدے میں چلا جائے، (البحر الرائق میں ''باب فی صفۃ الصلوٰۃ'' کے تحت یہ مسئلہ اسی طرح درج ہے)۔

اذان یا اقامت میں کوئی کلمہ رہ جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال: اگر اذان کے کلمات میں غلطی ہو جائے یا کوئی کلمہ رہ جائے، مثلاً ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ'' تو اذان کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں، نیز اقامت میں اگر کلمہ ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ'' رہ جائے تو اقامت کا اعادہ بھی ضروری ہے یا نہیں، اگر اسی اقامت سے نماز پڑھ لی، آیا نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ وضاحت فرمائیے، (حافظ آثار اللہ، مانسہرہ)۔

جواب: اذان یا اقامت میں کوئی کلمہ رہ جانے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کوئی کلمہ رہ جائے اور اذان یا اقامت کے دوران میں ہی یاد آ گیا، تو اس کا حکم یہ ہے کہ جہاں سے کوئی کلمہ چھوٹا ہے، پلٹ کر وہاں سے دوبارہ ترتیب کے مطابق سارے کلمات ادا کر کے اذان یا اقامت کو مکمل کرے۔ علامہ علاؤ الدین بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں: ''(ترجمہ) ان مسائل اذان واقامت میں سے ایک یہ ہے کہ کلمات اذان واقامت کو ترتیب کے مطابق پڑھے، یہاں تک اگر کسی کلمے کو دوسرے کلمے پر مقدم کر کے پڑھ لیا تو پھر ترتیب کے مطابق کلمات کو ملا کر پڑھے اور جو کلمہ بھول

کر پہلے پڑھ چکا تھا، اسے دوبارہ ترتیب کے مطابق اپنے مقام پر پڑھے"۔

(بدائع الصنائع ج ۱ ص ۶۴۳)

اذان یا اقامت کا کلمہ رہ جانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ درمیان میں سے کوئی کلمہ بھولے سے رہ گیا اور دوران اذان واقامت یاد نہ آیا، بلکہ اذان واقامت کے اختتام کے بعد خود یاد آیا یا کسی نے یاد دلایا تو اب اذان یا اقامت کا اعادہ ضروری نہیں ہے، (لیکن کرنا افضل ہے) کیونکہ اذان واقامت کا مقصد نماز کا اعلان کرنا ہے اور وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اور اعادے کے بغیر بھی نماز کی صحت یا جواز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ علامہ شیخ نظام الدین لکھتے ہیں: "اگر مؤذن اپنی اذان یا اقامت میں کسی کلمے کو خلاف ترتیب دوسرے کلمے پر مقدم کر دے، جیسے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰه کو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه سے پہلے پڑھ لے، تو بہتر صورت تو یہ ہے کہ جو کلمہ خلافِ ترتیب پہلے پڑھ لیا گیا ہے، اس کا اعتبار نہ کرے اور دوبارہ ترتیب کے مطابق وہاں سے پڑھے جہاں سے کوئی کلمہ رہ گیا ہے، اور اگر بھولے سے چھوڑے ہوئے کلمہ کا اعادہ کر کے ترتیب کے مطابق اذان کی تکمیل نہ کی، بلکہ ویسے ہی مکمل کر لی تو نماز جائز ہوگی"۔

(فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۵۶)

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: "اور اذان کے دو کلمات کے درمیان فصل (یعنی سکتہ) نہ کرے بلکہ روانی سے پڑھے تاکہ وہ ایک مسلسل کلام معلوم ہو، اور اقامت کہتے وقت اپنی آواز کو اذان کے بہ نسبت ذرا پست رکھے، اور کلماتِ اذان واقامت، جیسے کہ شریعت میں وارد ہوئے ہیں اسی ترتیب کے مطابق پڑھے، اگر بعض کلمات میں ترتیبِ شرعی کے خلاف تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو تو رعایتِ ترتیب کے لئے اعادہ سنت ہے"۔ (فتح القدیر شرح ہدایہ ج ۱ ص ۲۴۸)

امام مقدارِ واجب تلاوت کر لے اور اس کے بعد اس سے غلطی ہو جائے تو مقتدی لقمہ دے سکتا ہے؟

سوال: امام نے بقدرِ واجب تلاوت کر لی اور اس کے بعد تلاوت جاری تھی کہ امام سے غلطی ہو گئی، مقتدی امام کو بتائے یا نہیں، اگر مقتدی نے بتایا تو اس کی نماز فاسد تو نہیں ہوگی، اسی طرح امام کے لقمہ لینے سے امام کی نماز بھی فاسد تو نہیں ہوگی؟ (زاہد اللہ۔ لانڈھی، کراچی)۔

جواب: اصولی طور پر تو مقتدی کو بلاضرورت لقمہ نہیں دینا چاہئے، ورنہ بلاضرورت لقمہ دینے سے اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور امام کے لقمہ لینے سے اس کی نماز بھی فاسد ہو جائے گی، لیکن قرأت کا مسئلہ اس ضابطے سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا اگر امام سورۂ فاتحہ کے بعد قرأت مقدار واجب سے زیادہ بھی پڑھ لے (یعنی ایک طویل آیت یا تین چھوٹی آیات) تو غلطی پر مقتدی لقمہ دے دے اور امام اس کا لقمہ لے سکتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں ''سورۃ المؤمنون'' کی تلاوت کی اور ایک کلمہ درمیان میں رہ گیا، نماز سے فراغت کے بعد آپ نے فرمایا: تم میں ابی ابن کعب نہیں تھے جو بتا دیتے، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے سمجھا: شاید یہ کلمہ منسوخ ہو گیا ہے، آپ نے فرمایا: اگر منسوخ ہوا ہوتا تو میں تمہیں بتا دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کی قرأت مقدار واجب سے طویل بھی ہو اور اس سے غلطی ہو جائے تو مقتدی کو بتا دینا چاہئے اور امام کو لقمہ لے لینا چاہئے۔

نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر دعا کرنا

سوال: اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ فرض نماز کے بعد بعض لوگ سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھتے ہیں، کیا یہ طریقہ کار درست ہے؟ کیا احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے، یہ لوگ کیا پڑھتے ہیں؟

(سیّد محمد علی۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: علامہ محمد بن محمد جزری نے حصن الحصین میں طبرانی اور بزار کے حوالے سے مندرجہ ذیل حدیث نقل کی ہے: ''حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھ لیتے اور نماز سے فارغ ہو جاتے تو اپنا دایاں ہاتھ سر پر رکھ کر یہ دعا مانگتے تھے:

بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، اَللّٰهُمَّ اَذْهِبْ عَنِّی الْهَمَّ وَالْحُزْنَ

''اللہ کے نام سے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو بہت مہربان نہایت رحم والا ہے، اے اللہ! (از راہِ کرم) تو مجھ سے ہر قسم کے رنج والم اور غم کو دور فرما''۔

ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز فرض پڑھ کر فارغ ہو جاتے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ کر یہ دعا فرماتے:

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَالرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَللّٰهُمَّ اَذْهِبْ عَنِّى الْهَمَّ وَالْحُزْنَ

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمان و رحیم ہے، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اے اللہ (از راہِ کرم) مجھ سے ہر قسم کے رنج والم اور غم واندوہ کو دور فرما''۔

مقتدی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے؟

سوال: ایک نمازی مسجد میں داخل ہوا تو جماعت کھڑی تھی، اور امام رکوع میں تھا، اب وہ کیا کرے؟ تکبیرِ تحریمہ کہہ کر اور ہاتھ باندھنے کے بعد رکوع میں جائے یا بغیر ہاتھ باندھے ''اللہ اکبر'' کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور امام کے ساتھ شامل ہو جائے؟ (محمد انصر۔ دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: باہر سے آنے والا نمازی جب امام کو رکوع میں پائے تو سیدھا کھڑے ہو کر حالت قیام میں تکبیرِ تحریمہ کہے اور پھر تکبیرِ انتقال یعنی رکوع کے لئے اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں جائے اور امام کے ساتھ شامل ہو جائے، ہاتھ باندھنے کی ضرورت نہیں، اگر اسے غالب گمان یہ ہو کہ اس کے ''سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ'' (یعنی ثناء) پڑھنے سے امام رکوع سے اٹھ جائے گا تو وہ ثناء نہ پڑھے اور رکوع میں چلا جائے۔ اگر عجلت یا بے خیالی میں تکبیرِ تحریمہ کے بعد رکوع کی تکبیر کہنا بھول گیا تو بھی نماز ادا ہو جائے گی کیونکہ تکبیرِ انتقال سنت ہے اور نسیاناً ترکِ سنت سے سجدۂ سہو لازم نہیں آتا اور نماز صحیح طور پر ادا ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر تکبیرِ تحریمہ حالتِ قیام میں نہ کہی، بلکہ اتنا جھکتے ہوئے کہی کہ ہاتھ پھیلائیں تو گھٹنوں تک پہنچ جائیں تو نماز ادا نہیں ہوگی، لہٰذا احتیاط ضروری ہے۔ اگر نمازی کا گمانِ غالب یہ ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کے بعد ''سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ'' (یعنی ثناء) حالتِ قیام میں پڑھ کر امام کو رکوع میں پالے گا تو پھر ہاتھ باندھ کر ثناء پڑھ لے اور پھر اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔

غیر مسلم ملک میں نماز باجماعت، جمعہ اور روزے کا مسئلہ؟

سوال: بہت سے لوگوں کو روزگار کے لئے غیر مسلم ممالک جانا پڑتا ہے، وہاں پر نماز باجماعت پنجگانہ، جمعہ اور روزے کے لئے کیا کرے؟ (سید عشرت۔ بفرزون، نارتھ کراچی)۔

جواب: آج کل تقریباً ہر غیر مسلم ملک میں مساجد، اسلامک سینٹر، کمیونٹی سینٹر موجود ہیں، جہاں

سے بہت سے معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ قریب ترین مسجد کہاں ہے؟ حلال اشیاء خوراک اور حلال گوشت کہاں سے ملتا ہے، وغیرہ۔ جہاں آپ کی ملازمت یا روزگار ہے، اگر قریب کوئی مسجد یا اسلامی مرکز نہیں ہے تو تنہا نماز پڑھیں، اگر کسی ایک جگہ دو تین مسلمان بھائی کام کررہے ہیں تو آپس میں مل کر جماعت کرلیا کریں، دو ہوں تو ایک امام بن جائے اور ایک مقتدی۔ اکیلے ہیں یا بدقسمتی سے دوسرے ساتھی نماز نہیں پڑھتے تو آپ سے جماعت کی مسئولیت نہیں ہوگی۔ آپ کے قریب کوئی مسجد یا اسلامی مرکز نہیں ہے جہاں نماز جمعہ کا اہتمام ہوتا ہے یا ہے مگر غیر مسلم ادارہ آپ کو چھٹی نہیں دیتا تو ظہر کی نماز پڑھ لیا کریں۔ روزے باقاعدہ رکھیں، صبح صادق اور غروب کے اوقات کسی قریب ترین اسلامک سینٹر سے معلوم کرلیں۔ غروب کا وقت تو ہر ملک میں اخبارات وغیرہ سے معلوم ہوجاتا ہے۔

ناپاکی کی حالت میں نماز پڑھنا

سوال: میں کسی کے ہاں مہمان تھا، رات کو جنابت ہوگئی، غسل واجب ہوگیا، شرم کے مارے میزبانوں کو بتایا نہیں اور معمول کے مطابق وضو کر کے نماز پڑھ لی، اب کیا کروں؟

(اویس یار افغانی۔ لانڈھی، کراچی)

جواب: مشہور مقولہ ہے کہ "شرع میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے" انسانی احوال و کیفیات کو سب جانتے ہیں، آپ کو اپنے میزبان کو بتادینا چاہیے تھا کہ مجھے غسل کرنا ہے، سب سے زیادہ حیا تو بندے کو رب سے کرنا چاہیے۔ حالتِ جنابت میں نماز پڑھ کر آپ نے گناہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے توبہ کریں اور اس نماز کی قضا بھی پڑھیں۔

بڑی مسجد کی تعریف

سوال: آپ نے تفہیم المسائل میں لکھا ہے کہ بڑی مسجد میں نمازی کے آگے سے گزر سکتے ہیں، بڑی مسجد کی تعریف کیا ہے؟ (ابوالمجاہد محمد عبدالرشید ہمایوں۔ گلستان جوہر، کراچی)۔

جواب: میں نے مسئلہ یہ تحریر کیا تھا کہ "مسجدِ صغیر" میں نمازی کہیں بھی کھڑا ہو، دیوارِ محراب تک اس کے آگے سے گزرنا سترہ کے بغیر جائز نہیں ہے، البتہ "مسجدِ کبیر" یا کھلے میدان میں ایک محدود فاصلے کے بعد نمازی کے آگے سے گزر سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ حالتِ قیام میں آدابِ نماز کے

مطابق نمازی اپنے ''مقامِ سجدہ'' پر نظر جمائے رکھے تو آگے جتنی جگہ تک اس کی نظر پھیل سکتی ہے، وہاں تک نہیں گزر سکتے، اس کے آگے سے گزرنا جائز ہے۔

''مسجدِ کبیر'' کی تعبیر کے بارے میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں، مثلاً یہ کہ اس کا طول وعرض ۴۰ یا ۶۰ ذراع شرعی یعنی مروجہ ۲۰ یا ۳۰ میٹر سے کم نہ ہو۔ ہم آسانی اور سہولت کے لئے کم از کم مقدار پر فتوی دے سکتے ہیں، یعنی یہ کہ مسجد کا طول وعرض ۲۰ میٹر سے زیادہ ہو تو نمازی کے آگے سے تین صف کے بعد سترہ کے بغیر بھی گزر سکتے ہیں اور جو صاحبان احتیاط کرنا چاہیں وہ ۳۰ میٹر طول وعرض کو معیار بنا سکتے ہیں۔

فاسق کی اذان

سوال: ہماری ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس میں کوئی مؤذن نہیں ہے۔ بعض اوقات امام کو دیر ہو جاتی ہے، کیا اس صورت میں داڑھی منڈا ہوا شخص اذان واقامت کہہ سکتا ہے؟

(عرفان اللہ قادری۔ جامع مسجد فہد گارڈن، کراچی)۔

جواب: شرعاً داڑھی منڈا فاسق معلن ہے، اور فاسق معلن کو مؤذن مقرر نہیں کرنا چاہئے، لیکن جیسا کہ سوال سے ظاہر ہے کہ یہ عام معمول کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ شاذ ونادر ہی ایسی صورت پیش آجاتی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''اور فاسق کا اذان دینا مکروہ ہے لیکن اگر دے دی گئی تو اعادہ نہیں کیا جائے گا، ذخیرہ میں یہ مسئلہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے''۔

(ج ۱، ص ۵۴، مطبع رشیدیہ کوئٹہ)

علامہ ابن عابدین شامی نے اس مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''توفیق'' سے مجھ پر جو بات آشکار ہوئی، وہ یہ ہے کہ شریعت میں اذان کا مقصود اصلی یہ بتانا ہے کہ نماز کا وقت داخل ہو چکا ہے، پھر یہ ہر علاقے میں اسلام کا شعار بن گیا تو اس اعتبار سے کہ دخولِ وقتِ نماز کی بابت اور اس ضمن میں مؤذن کے قول کے معتبر ہونے کے لئے چند شرائط ہیں، یعنی مسلمان، عاقل وبالغ اور عالم ہونا۔ اور اس سے پہلے ''معین الاحکام'' کے حوالے سے ہم بتا چکے ہیں کہ جب مؤذن مسلمان، مرد، عاقل و بالغ اور اوقات نماز کا جاننے والا ہو تو اس کے اعلانِ دخولِ وقتِ نماز کے لئے اتنا ہی (یعنی اذان) کافی ہے اور اس کے قول پر اعتبار کیا جائے۔ آگے چل کر علامہ شامی،

مجنون، ناقص العقل نشے میں مدہوش، وغیرہ افراد کی اذان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس سے مقصدِ اذان تو حاصل ہو جائے گا لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ ان سب کی اذان کا اعادہ مستحب ہے۔ پھر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ بظاہر اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی اذان کا اعادہ اس صورت میں مستحب ہے جبکہ اذان کے لئے باقاعدہ شرعی شرائط کا حامل مؤذن مقرر ہو، لیکن اگر ایسے لوگوں کی ایک جماعت موجود ہو جو اوقاتِ نماز کے جاننے والے ہوں اور ان کے ہوتے ہوئے کوئی فاسق یا کم عقل بچہ اذان دے تو ایسی اذان نہ تو مکروہ ہے اور نہ ہی اس کا اعادہ کیا جائے گا کیونکہ اذان کا مقصد حاصل ہو چکا"۔

(فتاویٰ شامی: ج ۲، ص ۵۸۔ ۵۷، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ نے فتاویٰ شامی کے حوالہ سے فاسق کی اذان کے اعادہ کو مستحب قرار دیا ہے"۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۲، ص ۳۸۸ مطبوعہ مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)

قضاء نمازوں کے ہوتے ہوئے صلوٰۃ التسبیح پڑھنا

سوال: زید فرض نمازوں کے ساتھ قضاء نمازیں ادا کر رہا ہے تو کیا زید مہینے میں ایک بار "صلوٰۃ التسبیح" پڑھ سکتا ہے۔ (عرفان اللہ قادری۔ جامع مسجد فہد گارڈن، کراچی)

جواب: صلوٰۃ التسبیح بڑی فضیلت والی نماز ہے، لہٰذا مہینے میں ایک بار تو کیا اگر کوئی مردِ صالح اسے روز ایک بار پڑھے تو نہایت سعادت، اجر و ثواب اور خیر و برکت کی بات ہے۔ لیکن سوال میں آپ نے قضاء نماز کے ساتھ تقابل کر کے اسے پڑھنے کا مسئلہ دریافت فرمایا ہے۔ جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے پاس اتنا ہی وقت ہے کہ وقتی فرض نماز کو پڑھنے کے بعد یا تو اپنے ذمے واجب الادا قضاء نمازیں پڑھ لے یا صلوٰۃ التسبیح پڑھے، تو ایسی صورت میں نوافل پر قضاء نماز کو ترجیح دینی چاہئے۔ چند ہفتے قبل ہم اسی کالم میں امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ کے حوالے سے حضرت علی کا یہ قول نقل کر چکے ہیں جس کے ذمہ فرائض کی قضاء باقی ہو، اس کے سنت اور نوافل مقبول نہیں ہیں۔ اور سر پر قضاء نمازوں کا بوجھ لدا ہو اور کوئی شخص ان سے عہدہ برآ ہونے کے بجائے نوافل پڑھتا رہے تو یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص بارِ قرض تلے دبا ہو اور قرض ادا کرنے کے بجائے خیرات بانٹتا پھرے۔

''بکثرت قضا نمازیں باقی ہوں تو ان کی ادائیگی کے لئے سنن مؤکدہ چھوڑ سکتے ہیں'' اس مسئلے پر ایک فتویٰ اور اس کا جواب

سوال: عرض یہ ہے کہ آپ کی تفہیم المسائل جلد اول کے صفحہ نمبر ۱۱۷ پر ایک سائل نے آپ سے سوال کیا کہ کیا قضا نمازیں ادا کرنے کے لئے سنت مؤکدہ چھوڑ سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: چھوڑ سکتے ہیں، میں نے بھی ایسا کرنا شروع کر دیا، مگر ایک صاحب نے کہا ایسا کرنا غلط ہے، پھر میں نے ایک دارالافتاء سے فتویٰ لیا؟ جو آپ کو ارسال کر رہا ہوں، برائے مہربانی تفصیلی جواب عنایت فرمائیں، (عرفان اللہ قادری، کراچی)

جواب: پہلے وہ فتویٰ ملاحظہ فرمایئے، جو عرفان اللہ قادری صاحب نے ''دارالافتاء اہلسنت'' سے حاصل کر کے ہمیں ارسال فرمایا ہے، وہ درج ذیل ہے:

صورتِ مستفسرہ میں زید اپنی قضا نمازوں کی ادائیگی کے لئے سنتِ مؤکدہ نہیں چھوڑ سکتا کہ سنت مؤکدہ کا ترک اساءت اور نادراً ترک پر عتاب اور ترک کی عادت پر استحقاق عذاب ہے، خاتم المحققین علامہ ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

وَالسُّنَنُ نَوْعَانِ، سُنَّةُ الْهُدٰى وَتَرْكُهَا يُوْجِبُ اِسَاءَةً وَكَرَاهِيَةً.

''اور سنت کی دو قسمیں ہیں، ایک ''سنت الہدیٰ'' اور ان کا چھوڑنا گناہ اور کراہیت کا سبب بنتا ہے''۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۲۱۸، دارالکتب العلمیہ)

علامہ علاؤ الدین حصکفی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

وَحُكْمُهَا مَا يُؤْجَرُ عَلٰى فِعْلِهٖ وَيُلَامُ عَلٰى تَرْكِهٖ

''اور ان کا حکم یہ ہے کہ کرنے پر ثواب ملے گا اور چھوڑنے پر ملامت کیا جائے گا''۔

(الدرالمختار مع شامی ج ۱ ص ۲۰۰، دارالکتب العلمیہ)

اس کے تحت علامہ شامی علیہ الرحمہ تلویح کے حوالے سے فرماتے ہیں:

تَرْكُ السُّنَّةِ الْمُؤَكَّدَةِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْحَرَامِ يَسْتَحِقُّ حِرْمَانَ الشَّفَاعَةِ لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ: "مَنْ تَرَكَ سُنَّتِيْ لَمْ تَنَلْ شَفَاعَتِيْ وَفِي التَّحْرِيْرِ: اَنَّ تَارِكَهَا يَسْتَوْجِبُ التَّضْلِيْلَ وَاللَّوْمَ اھ وَالْمُرَادُ

اَلتَّرْکُ بِلاَ عُذْرٍ عَلٰی سَبِیْلِ الْاِصْرَارِ کَمَا فِیْ "شَرْحِ التَّحْرِیْرِ" لِاِبْنِ اَمِیْرِ حَاجّ۔

"سنت مؤکدہ کا چھوڑنا حرام کے قریب ہے اور ایسا شخص شفاعت سے محروم ہونے کا مستحق ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: "جس نے میری سنت کو چھوڑا، وہ میری شفاعت کو نہیں پائے گا" اور "تحریر" میں ہے کہ تارکِ سنت گمراہ قرار دیئے جانے اور ملامت کا سزاوار ہے، مراد یہ ہے کہ جو سنت کو کسی عذر کے بغیر چھوڑے اور اس ترک پر اصرار کرے، جیسا کہ ابن امیر حاج کی "شرح التحریر" میں ہے"۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۲۲۰، دارالکتب العلمیہ)

یہی علامہ شامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

قَوْلُهٗ (وَسَنَّ مُؤَکَّدًا) اَیْ اِسْتِنَانًا مُؤَکَّدًا بِمَعْنٰی اَنَّهٗ طَلَبَ طَلَبًا مُؤَکَّدًا زِیَادَةً عَلٰی بَقِیَّةِ النَّوَافِلِ وَلِهٰذَا کَانَتِ السُّنَّةُ مُؤَکَّدَةٌ قَرِیْبَةٌ مِنَ الْوَاجِبِ فِیْ لُحُوْقِ الْاِثْمِ کَمَا فِی الْبَحْرِ۔

"ان (علامہ حصکفی) کا قول (اور سنت قرار دیا گیا ہے تاکید کے ساتھ) یعنی اس کا سنت ہونا تاکیداً ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ باقی نوافل کے مقابلے میں (شارع نے) زیادہ تاکید کے ساتھ اس کے کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ لہٰذا سنت مؤکدہ (بصورتِ ترک) گناہ کو لاحق ہونے میں واجب کے قریب ہے، جیسے کہ تحریر میں ہے"۔

مذکورہ بالا عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سنت مؤکدہ کی بہت تاکید آئی ہے، جو بلا عذر ایک بار بھی ترک کرے تو مستحقِ ملامت ہے، اور ترک کی عادت کرے تو فاسق مردود الشہادۃ، مستحقِ نار ہے، اور بعض ائمہ نے فرمایا کہ وہ گمراہ ٹھہرایا جائے گا اور گناہ گار ہے، اگرچہ اس کا گناہ واجب کے ترک سے کم ہے۔ تلویح میں ہے کہ اس کا ترک قریب حرام کے ہے۔ اس کا تارک اس بات کا مستحق ہے کہ معاذ اللہ شفاعت سے محروم ہو جائے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جو میری سنت کو ترک کرے گا اسے میری شفاعت نہ ملے گی، سنت مؤکدہ کو سنن الہدیٰ بھی کہتے ہیں۔

صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: قضاء نوافل سے اہم ہیں، یعنی جس وقت نفل پڑھتا، انہیں چھوڑ کر ان کے بدلے قضائیں پڑھے کہ بری الذمہ ہو جائے، البتہ تراویح اور

بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ نہ چھوڑے''۔ (بہار شریعت ص ۷۴ حصہ چہارم مکتبہ رضویہ)

کتبہ مفتی محمد فاروق العطاری المدنی

تصدیق وتصویب مفتی محمد ابوبکر صدیق العطاری،

دارالافتاء اہلسنت، جامع مسجد کنز الایمان

مورخہ: ۱۷ ستمبر ۲۰۰۱ء

ہمارا جواب ایک خاص سیاق وسباق (Context) میں تھا کہ ایک خاتون کے ذمے چالیس سال کی قضاء نمازیں ہیں اور وہ خاتون وقتی فرض بھی بہ مشکل ادا کرپاتی ہیں، ہم نے ان کے تفصیلی سوال کو اختصار کے ساتھ لکھا تھا، اب سوال یہ درپیش تھا کہ وقتی فرض نماز کے علاوہ ان میں جتنی استطاعت ہے، اس میں اگر سنت مؤکدہ پڑھتی ہیں تو ماضی کی قضاء نمازیں رہ جاتی ہیں، اور اگر اس وقت میں ماضی کی قضاء نمازیں پڑھتی ہیں تو وقتی نماز کی ''سنن مؤکدہ'' رہ جاتی ہیں تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟ قضاء نماز پڑھنے کو ترجیح دے یا وقتی ''سنن مؤکدہ'' کو؟۔ تو ہم نے لکھا تھا کہ ماضی کی قضاء نمازوں کو ترجیح دے۔ اس سے العیاذ باللہ! سنتوں کا استخفاف یا ان کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں ہے۔ اگر کسی نے ہماری تحریر سے یہ تاثر لیا ہے تو ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں عفو ومغفرت کے طلب گار ہیں کہ ہم اپنا پورا مفہوم اپنے قارئین تک نہ پہنچا سکے۔ ''سنن مؤکدہ'' کے فقہی احکام وہی ہیں جو مذکورہ بالا فتوے میں بیان کئے گئے ہیں۔ جہاں ''سنت مؤکدہ'' کے ترک کو ''تضلیل اور ملامت'' کا موجب قرار دیا گیا ہے وہ بلاعذر اور اصرار پر محمول ہے، علامہ شامی نے ابن الامیر حاج کی ''شرح التحریر'' کے حوالے سے یہی بات لکھی جس کا مذکورہ بالا فتویٰ میں حوالہ دیا گیا ہے۔

فقہ میں ایک اصول ''اَلْاَھَمُّ فَالْاَھَمُّ'' ہے، یعنی بعض اوقات ایک چیز اہم ہوتی ہے، لیکن جب اس کا اہم ترین چیز سے تعارض ہوجائے تو اہم ترین کے مقابلے میں اہم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَلَا یَجُوْزُ تَرْکُھَا لِعَالِمٍ صَارَ مَرْجِعاً فِی الْفَتَاوٰی (بِخِلَافِ بَاقِی السُّنَنِ) فَلَہٗ تَرْکُھَا لِحَاجَۃِ النَّاسِ اِلَیٰ فَتْوَاہُ۔

''اور فجر کی سنتوں کا ایسے عالم کے لئے بھی چھوڑنا جائز نہیں ہے جس سے عامۃ المسلمین

فتویٰ کے لئے رجوع کرتے ہوں، جبکہ ایسا ''مرجع فی الفتاویٰ'' باقی سنن مؤکدہ کو چھوڑ سکتا ہے، کیونکہ لوگوں کو اس سے فتویٰ لینے کی ضرورت ہوتی ہے''۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(فَلَهُ تَرْکُهَا الخ) اَلظَّاهِرُ اَنَّ مَعْنَاهُ اَنَّهُ يَتْرُكُهَا وَقْتَ اِشْتِغَالِهِ بِالْاِفْتَاءِ لِاَجْلِ حَاجَةِ النَّاسِ الْمُجْتَمِعِيْنَ عَلَيْهِ وَيَنْبَغِیْ اَنْ يُّصَلِّيَهَا اِذَا فَرَغَ فِی الْوَقْتِ وَظَاهِرُ التَّفْرِقَةِ بَيْنَ سُنَّةِ الْفَجْرِ وَغَيْرِهَا اَنَّهُ لَيْسَ لَهُ تَرْكُ الصَّلٰوةِ الْجَمَاعَةِ لِاَنَّهَا مِنَ الشَّعَائِرِ فَهِیَ اَكَّدُ مِنْ سُنَّةِ الْفَجْرِ وَلِذَا يَتْرُكُهَا لَوْخَافَ فَوْتَ الْجَمَاعَةِ، وَاَفَادَ اَنَّهُ يَنْبَغِیْ اَنْ يَّكُوْنَ الْقَاضِیْ وَطَالِبُ الْعِلْمِ كَذَالِكَ لَاسِيَّمَا الْمُدَرِّسُ، اَقُوْلُ: فِی الْمُدَرِّسِ نَظْرٌ، بِخِلَافِ الطَّالِبِ اِذَا خَافَ فَوْتَ الدَّرْسِ اَوْ بَعْضَهٗ تَاَمَّلْ.

''(اس کے لئے سنن مؤکدہ کا چھوڑنا جائز ہے) اس کا ظاہر معنیٰ یہ ہے کہ جب فتویٰ دینے میں مشغول ہو تو سنت مؤکدہ کو چھوڑ دے، کیونکہ جو لوگ فتویٰ لینے کے لئے جمع ہیں، ان کی ضرورت ہے، ہاں جب فتویٰ دینے سے فارغ ہو جائے اور نماز کا وقت ہے تو سنتیں پڑھ لے، سنتِ فجر اور باقی سننِ مؤکدہ میں اس فرق سے عیاں ہے کہ اس کی خاطر جماعتِ نماز کو نہیں چھوڑیں گے، کیونکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا، شعائرِ اسلام میں سے ہے اور اس کی تاکید سنتِ فجر سے بھی زیادہ ہے۔ لہٰذا اگر جماعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو سنتِ فجر کو چھوڑ دے، طیبی نے اس کا یہ فائدہ بھی بتایا ہے کہ قاضی (اگر قضاء میں مشغول ہے) اور طالب علم (اگر استاذ سے سبق پڑھنے میں مشغول ہے) اور اسی طرح مدرس بھی سنن مؤکدہ کو چھوڑ سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مدرس کے لئے ترک سنت کی رخصت محلِ نظر ہے، بخلاف طالب علم کے کہ جب اس کا کل یا بعض سبق فوت ہونے کا اندیشہ ہو (تو اس کی رخصت قابلِ فہم ہے) اس باریکی پر غور کریں (یعنی طالب علم کے لئے تو مجبوری ہے، استاذ کے لئے مجبوری نہیں ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار ج ۲ ص ۳۹۵، داراحیاء التراث العربی بیروت)

علامہ حصکفی اور علامہ شامی کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ مفتی کے لئے فتویٰ دینا فرضِ کفایہ ہے۔ لہٰذا وہ سنتِ فجر کے سوا باقی ''سنن مؤکدہ'' چھوڑ سکتا ہے، جبکہ وہ عامۃ المسلمین کے لئے مرجع فتاویٰ ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے۔ البتہ فتوے کے بعد وقت ملے تو پڑھ لے۔

اسی طرح سنتِ فجر بھی، جن کی تاکید باقی ''سننِ مؤکدہ'' سے زیادہ ہے، اگر جماعتِ فجر کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو چھوڑ دے، کیونکہ جماعت شعائرِ دین میں سے ہے اور سنتِ فجر سے اس کی تاکید زیادہ ہے۔ ''تخصص فی الدین'' اور ''تفقہ فی الدین'' بھی چونکہ فرض کفایہ ہے' اس لئے اگر طالب علم کے سبق اور سنتِ مؤکدہ میں تعارض ہو جائے تو وہ سنتیں چھوڑ سکتا ہے۔ اور قضاء نماز تو فرض عین ہے، اور اس کی تاکید جماعت اور سنتِ فجر سے زیادہ ہے، تو بصورتِ تعارض اسے ترجیح دی جائے گی۔ عام حالات میں تو سنتیں چھوڑنے کا وہی حکم ہے جو مذکورہ بالا فتویٰ میں بتایا گیا ہے، البتہ ''مردود الشہادۃ'' ہونے کا جو مفتی صاحب نے ذکر فرمایا ہے، اس کا ہمیں علم نہیں ہے کیونکہ قرآن نے صرف ''محدود فی القذف'' کو مردود الشہادۃ قرار دیا ہے۔

یہ امر بھی واضح ہو کہ سنن اپنی اصل کے اعتبار سے، خواہ مؤکدہ ہوں یا غیر مؤکدہ، نفلی عبادت ہیں۔ البتہ اہمیت اور حکم شرعی کے اعتبار سے نفل محض' سنتِ غیر مؤکدہ اور سنتِ مؤکدہ میں فرق ہے، تعارض کے وقت تدریج کا اعتبار ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''شیطان کا بڑا دھوکا ہے کہ آدمی کو نیکی کے پردے میں ہلاک کرتا ہے، نادان سمجھتا ہی نہیں، نیک کام کر رہا ہوں، اور نہ جانا کہ نفل بے فرض نرے دھوکے کی ٹٹی ہے، اس کے قبول کی امید تو مفقود اور اس کے ترک کا عذاب گردن پر موجود۔ اے عزیز! فرض خاص سلطانی قرض ہے اور نفل گویا تحفہ و نذرانہ۔ قرض نہ دیجئے اور بالائی بیکار تحفے بھیجئے وہ قابل قبول ہوں گے خصوصاً اس شہنشاہ غنی کی بارگاہ میں جو تمام جہان و جہانیاں سے بے نیاز ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۱۷۸، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اور آگے چل کر حدیث کا حوالہ دیتے ہیں:

لما حضر ابابکر الموت دعا عمر فقال اتق اللّٰہ یاعمر واعلم ان لہ عملا بالنہار لایقبلہ باللیل وعملا باللیل لایقبلہ بالنہار واعلم انہ لایقبل نافلۃ حتی تؤدی الفریضۃ الحدیث۔

''جب خلیفہ رسول اللہ ﷺ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نزع کا وقت ہوا امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا: اے عمر! اللہ سے ڈرنا اور جان لو کہ اللہ

کے کچھ کام دن میں ہیں کہ انہیں رات میں کرو تو قبول نہ فرمائے گا اور کچھ کام رات میں کہ انہیں دن میں کرو تو مقبول نہ ہوں گے، اور خبردار رہو کہ کوئی نفل قبول نہیں ہوتا جب تک فرض ادا نہ کرلیا جائے، الحدیث

(حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۳۶، دارالکتاب العربی بیروت، الجامع الکبیر ج ۱۳ ص ۵۳، مسند ابوبکر صدیق رقم الحدیث: ۱۸۹)"۔

امام احمد رضا قادری مزید لکھتے ہیں:

"حضور پرنور سیدنا غوث اعظم مولائے اکرم حضرت شیخ محی الملّۃ والدین ابومحمد عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب مستطاب فتوح الغیب شریف میں کیا کیا جگر شگاف مثالیں ایسے شخص کے لئے ارشاد فرمائی ہیں جو فرض چھوڑ کر نفل بجالائے، فرماتے ہیں: اس کی کہاوت ایسی ہے جیسے کسی شخص کو بادشاہ اپنی خدمت کے لئے بلائے، یہ وہاں تو حاضر نہ ہوا اور اس کے غلام کی خدمت گاری میں موجود ہے۔ پھر حضرت امیر المومنین مولی المسلمین سیدنا مولیٰ علی مرتضی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے اس کی مثال نقل فرمائی کہ جناب ارشاد فرماتے ہیں: ایسے شخص کا حال اس عورت کی طرح ہے جسے حمل رہا جب بچہ ہونے کے دن قریب آئے اسقاط ہوگیا اب وہ نہ حاملہ ہے نہ بچہ والی۔ یعنی جب پورے دنوں پر آکر اسقاط ہو تو محنت تو پوری اٹھائی اور نتیجہ خاک نہیں کہ اگر بچہ ہوتا تو ثمرہ موجود تھا، حمل باقی رہتا تو آگے امید لگی تھی، اب نہ حمل نہ بچہ، نہ امید نہ ثمرہ اور تکلیف وہی جھیلی جو بچہ والی کو ہوتی۔ ایسے ہی اس نفل خیرات دینے والے کے پاس سے روپیہ تو اٹھا مگر جبکہ فرض چھوڑا یہ نفل بھی قبول نہ ہوا تو خرچ کا خرچ ہوا اور حاصل کچھ نہیں۔ اسی کتاب مبارک میں حضور مولیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ:

فَاِنِ اشْتَغَلَ بِالسُّنَنِ وَالنَّوَافِلِ قَبْلَ الْفَرَائِضِ لَمْ یُقْبَلْ مِنْهُ وَاُهِیْنَ۔

"اگر فرض چھوڑ کر سنت و نفل میں مشغول ہوگا یہ قبول نہ ہوں گے اور خوار کیا جائے گا"۔

(فتوح الغیب مع الشرح ص ۲۷۳)

یوں ہی شیخ محقق مولانا عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ نے اس کی شرح میں فرمایا کہ:

ترک آنچہ لازم و ضروری ست و اہتمام بآنچہ نہ ضروری است از فائدہ عقل و خرد دور است چہ دفع ضرر اہم ست بر عاقل از جلب نفع بلکہ بحقیقت نفع دریں صورت منتفی است"۔

''لازم اور ضروری چیز کا ترک اور جو ضروری نہیں اس کا اہتمام، عقل و خرد میں فائدہ سے دور ہے کیونکہ عاقل کے ہاں حصولِ نفع سے دفعِ ضرر اہم ہے بلکہ اس صورت میں نفع منتفی ہے''۔ (فتوح الغیب مع شرح عبدالحق الدہلوی ص ۲۷۳)

حضرت شیخ الشیوخ امام شہاب الملۃ والدین سہروردی قدس سرہ العزیز عوارف شریف کے باب الثامن والثلثین میں حضرت خواص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل فرماتے ہیں:

بَلَغَنَا اَنَّ اللّٰهَ لَایَقْبَلُ نَافِلَةً حَتّٰی یُؤَدِّیَ فَرِیْضَةً یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالیٰ مَثَلُکُمْ کَمَثَلِ الْعَبْدِ السُّوْءِ بَدَأَ بِالْھَدْیَةِ قَبْلَ قَضَاءِ الدَّیْنِ.

''ہمیں خبر پہنچی کہ اللہ عزوجل کوئی نفل قبول نہیں فرماتا یہاں تک کہ فرض ادا کیا جائے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے فرماتا ہے کہاوت تمہاری بد بندہ کی مانند ہے جو قرض ادا کرنے سے پہلے تحفہ پیش کرے، (عوارف المعارف ملحق باحیاء العلوم باب ۳۸ ص ۱۶۸، مکتبہ و مطبع المشہد الحسینی قاہرہ)''۔

خود حدیث میں ہے: حضور پرنور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں:

اربع فرضھن اللّٰه فی الاسلام فمن جاء بثلث لم یغنین عنه شیئاً حتی یاتی بھن جمیعاً الصلوٰة والزکوٰة وصیام رمضان وحج البیت. رواہ الامام احمد فی مسندہ بسند حسن عن عمارة بن حزم رضی اللّٰه تعالیٰ عنه.

''چار چیزیں اللہ تعالیٰ نے اسلام میں فرض کی ہیں جو ان میں سے تین ادا کرے وہ اسے کچھ کام نہ دیں جب تک پوری چاروں نہ بجا لائے نماز، زکوٰۃ، روزۂ رمضان، حج کعبہ، (اسے امام احمد نے اپنی مسند میں سند حسن کے ساتھ حضرت عمارہ بن حزم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، (مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۲۰۱، دار الفکر بیروت، کنز العمال، ج ۱، ص ۳۰، مؤسسۃ الرسالہ بیروت)''۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

امرنا باقام الصلوٰة وایتاء الزکوة ومن لم یزک فلا صلوٰة له. رواہ الطبرانی فی الکبیر بسند صحیح.

''ہمیں حکم دیا گیا کہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز قبول نہیں۔
اسے طبرانی نے المعجم الکبیر میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔
(مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۶۲، دار الفکر بیروت)

سبحان اللہ! جب زکوٰۃ نہ دینے والے کی نماز، روزہ، حج تک مقبول نہیں تو اس نفل خیرات نام کی کائنات سے کیا امید ہے بلکہ انہی سے اصبہانی کی روایت میں آیا کہ فرماتے ہیں:

من اقام الصلوٰۃ ولم یؤت الزکوٰۃ فلیس بمسلم ینفعہ۔

''جو نماز ادا کرے اور زکوٰۃ نہ دے وہ مسلمان نہیں کہ اسے اس کا عمل کام آئے''۔
(فتاویٰ رضویہ، ج ۱۰ ص ۱۸۱۔۱۷۹ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)

فرض کی قضاء بھی فرض ہے اور امام احمد رضا قادری کے بقول جو فرض چھوڑ کر سنت اور نفل میں مشغول ہوگا، یہ قبول نہ ہوں گے اور ایسا شخص جو فرائض کو ترک کر کے سنت و نفل میں مشغول ہوگا، وہ رسوا ہوگا۔ اسلام کی تعلیمات اور فکر اعلیٰحضرت سے غفلت ہی کا نتیجہ ہے کہ اہلسنت بعض مخصوص راتوں اور مخصوص مواقع پر ساری ساری رات عبادت و قیام اور نعت و درود و سلام میں گزار دیتے ہیں، لیکن اپنی روزمرہ زندگی میں فرائض کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو ان کا حق ہے، نتیجہ یہ ہے کہ سالہا سال کی نمازوں کا بار قضاء ان کے سر پر رہتا ہے اور لمحہ موت کب مقدر ہے، کوئی ایک پل کی گارنٹی نہیں دے سکتا، میں نے مسئلہ ایسے لوگوں پر فرض کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے لکھا تھا اور میری ناقص فہم کے مطابق اعلیٰحضرت کی فکر بھی یہی ہے۔ باقی صورت مسئولہ کے برعکس کہ کبھی کبھار کسی کی نماز رہ جائے، جبکہ وہ عادتاً نمازی ہو تو ایسے اشخاص کے لئے فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

اَلْاِشْتِغَالُ بِالْفَوَائِتِ اَوْلٰی وَاَھَمُّ مِنَ النَّوَافِلِ اِلَّا السُّنَنَ الْمَعْرُوْفَۃَ۔

''سنن مؤکدہ کے علاوہ دیگر نوافل پڑھنے سے قضاء نمازوں کی ادائیگی میں مشغول ہونا اولیٰ اور اہم ہے''۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۲۵)

نماز کے لئے کپڑے اڑسنے، موڑنے اور سمیٹنے اور آستینیں چڑھا کر نماز پڑھنے کے مسائل

سوال: بعض لوگ نماز پڑھنے کے لئے جب کھڑے ہوتے ہیں تو شلوار اور پاجامے کو نیفے سے

اڑس لیتے ہیں، بعض لوگ پینٹ کے پائنچے کو تہیں بنا کر موڑتے ہیں، بعض لوگ رکوع وسجود میں جاتے وقت کپڑوں کو سمیٹ لیتے ہیں، بعض کی آستینیں چڑھی ہوتی ہیں اور اسی حالت میں نماز پڑھتے ہیں اور بعض لوگ بشرٹ پہن کر نماز پڑھتے ہیں، جن کی آستینیں ہاف کٹ ہوتی ہیں، کہنیوں تک یا کہنیوں سے اوپر تک، ان سب کا کیا حکم ہے۔

(مولانا سید نذیر احمد شاہ، خطیب جامع مسجد اسکاؤٹ کالونی)

جواب: حدیث پاک میں ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو سات (اعضاء) پر سجدہ کا حکم دیا گیا ہے اور بال سنوارنے اور کپڑوں کو موڑنے سے منع کیا گیا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۱۰۰۱)۔ اس حدیث میں ''کفِ ثوب'' سے ممانعت کا حکم ہے۔ ہمارے نزدیک کپڑوں کو نیفے کی جانب اڑسنا، پتلون کے پائنچے کی تہیں بنا کر نیچے سے موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا سب اس کا مصداق بنتے ہیں، اسی طرح آستینوں کی تہیں بنا کر موڑنا یا جسے عرفِ عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ''تشمیر'' کہتے ہیں، اس پر بھی ''کفِ ثوب'' کا اطلاق ہوتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث مبارک اور دیگر احادیث کی روشنی کی رو سے ممنوع ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ''اور کپڑے کا سمیٹنا یعنی اوپر اٹھانا مکروہ ہے، خواہ مٹی سے بچنے کے لئے ایسا کرے، جیسے آستین چڑھانا یا دامن کو اوپر اٹھانا اور کپڑے کے ساتھ کھیلنا۔''

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

یعنی جس طرح ایک شخص نماز میں داخل ہوتے وقت ہی آستین یا دامن چڑھائے ہوئے تھا، اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ کراہت صرف اس صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ نماز کے اندر آستین چڑھائے تو تب مکروہ ہے، جیسا کہ ''شرح المنیہ'' سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔ لیکن ''القنیہ'' میں کہا ہے کہ: ''اس امر میں اختلاف رائے ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اور وہ (نماز میں داخل ہونے سے) پہلے ہی کسی کام کی بناء پر آستین چڑھائے ہوئے تھا یا اس کی ہیئت ہی ایسے ہے''۔ اس کی مثال یوں ہے، جیسے اس نے وضو کے لئے آستین چڑھائی، پھر امام کے ساتھ رکعت پانے کی خاطر عجلت کی اور اسی حالت میں نماز میں داخل ہو گیا، تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اب نماز کے اندر عمل قلیل کے ذریعے آستینیں کھول

دے یا اپنی حالت پر چھوڑ دے، میں نے کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں پایا، لیکن زیادہ واضح بات پہلے والی بات ہے (یعنی یہ کہ عمل قلیل سے کھول دے)، اس کی دلیل علامہ حصکفی کے اس قول سے ملتی ہے کہ: "اگر نمازی کی ٹوپی گر جائے تو اٹھا کر سر پر رکھ لینا ہی افضل ہے، غور کیجئے"۔

آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ "خلاصہ" اور "منیہ" میں کراہت کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا ہے کہ آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی ہیں، اور اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ کہنیوں سے نیچے تک چڑھانا، باعث کراہت نہیں ہے، لیکن "البحر الرائق" میں لکھا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً آستینیں چڑھانا (کہنیوں سے نیچے ہو یا اوپر) کراہت کا سبب ہے کیونکہ "کفِ ثوب" تمام صورتوں پر صادق آتا ہے۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۳۵۰ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا "آستینیں کہنی تک چڑھی ہوئی نماز پڑھنی مکروہ ہے یا نہیں؟" جواب دیا: "ضرور مکروہ اور سخت وشدید مکروہ ہے۔" (فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۳۱۱ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔ "کفِ ثوب" کو بیشتر فقہاء کرام نے مکروہِ تحریمی کہا ہے اور بقول علامہ ابن عابدین شامی جو کراہت کی نفی کرتے ہیں وہ کراہتِ تحریمی کی نفی کرتے ہیں، کراہتِ تنزیہی سب کے نزدیک ثابت ہے، (منحۃ الخالق حاشیۃ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۴) اور اس حکم کراہت میں وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو شروع میں ذکر کر دی گئی ہیں۔ نماز میں ہیئتِ لباس کے بارے میں اللہ جلّ شانہ کا ارشاد ہے، "اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس (زینت) اختیار کیا کرو۔"

یعنی نماز باوقار لباس پہن کر پڑھنی چاہئے اور اوپر "کفِ ثوب" کی جتنی صورتیں بیان کی ہیں، یہ سب وقار کے منافی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ وضع اختیار کر کے کسی باوقار اور ذی وجاہت ہستی کے سامنے نہیں جاتا، چہ جائے کہ "احکم الحاکمین" کی بارگاہ میں حاضر ہو۔

اگر کوئی شخص ہاف کٹ آستین والی قمیص پہنے ہوئے ہے، یعنی ایسی قمیص جس کی آستین کی اصل وضع اور ساخت ہاف کٹ ہے، یعنی کہنیوں یا اس سے اوپر ہے، اس کو پہن کر نماز پڑھی جائے تو مکروہ نہیں ہوگی، کیونکہ نماز میں پہنچوں تک آستینوں کا رکھنا ضروری نہیں ہے، عہدِ رسالت سے لے کر آج تک کے مسلمان احرام باندھ کر نماز پڑھتے ہیں اور احرام میں پوری کلائیاں ڈھکی ہوئی نہیں ہوتیں اور نہ انہیں ڈھکنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز نبی ﷺ اور متعدد صحابہ کرام نے ایک کپڑا اپنے جسم پر لپیٹ کر بھی نماز پڑھی ہے اور اس صورت میں پوری کلائیوں کا ڈھکنا متصور ہی نہیں ہے۔

امام کا مسجد میں ہوائی چپل پہن کر پھرنا

سوال: ہمارے محلے کی مسجد کے امام قاری صاحب گزشتہ ہفتہ سے مسجد میں ہوائی چپل پہن کر آرہے ہیں۔ایک دن کسی نمازی نے یہ سوچ کر سوال کر دیا کہ کہیں بھول کر چپل نہ پہن لی ہو، پوچھا ''قاری صاحب! آپ نے بھول کر تو چپل نہیں پہنی''؟اس پر قاری صاحب نے چار پانچ نمازیوں کی موجودگی میں جواب دیا کہ ''یہ چپل پاک وصاف ہے، میں اسے پہن کر نماز بھی پڑھتا ہوں، بلکہ نماز پڑھا بھی سکتا ہوں''۔اس جواب پر نمازیوں پر سکتہ طاری ہوگیا، سب نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کرلی، لیکن اب یہ صورتحال فتنہ کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے، از راہِ کرم اس مسئلے کی شرعی حیثیت بیان کرکے ہمیں مطمئن کریں؟ (آغا عبدالوحید خان، جہانگیر روڈ، کراچی)۔

جواب: صحیح بخاری میں ایک باب کا عنوان ہے ''باب الصلوٰۃ فی النعال'' اس باب کے تحت امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ اپنی سند کے ساتھ ابو مسلمہ سعید بن زید ازدی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک سے پوچھا: ''کیا نبی ﷺ جوتا پہن کر نماز پڑھتے تھے؟ انہوں نے کہا: ''جی ہاں۔''

اس حدیث کے تحت علامہ بدر الدین ابو محمد محمود عینی متوفی ۸۵۵ھ نے جوتے پہن کر نماز پڑھنے یا جوتے کے اوپر کھڑے ہوکر نماز پڑھنے اور ناپاک جوتے کے پاک ہونے کے مسائل اور اس سلسلے میں ائمہ کے اقوال بیان کئے ہیں، بحث کے اختتام پر وہ لکھتے ہیں کہ اس سے ایک مسئلہ یہ واضح ہوتا ہے کہ مسجد میں (پاک) جوتے پہن کر چلنا جائز ہے''۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری ج ۴ ص ۱۲۰۔۱۱۹ مطبوعہ بیروت)

لیکن چونکہ آج کل مساجد عہدِ نبوی ﷺ، اور عہدِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح کچی یا ریتلے فرش کی نہیں ہوتیں، بلکہ بہت صاف وشفاف پختہ فرش کی ہوتی ہیں، دریاں یا قالین بچھے ہوتے ہیں، اس لئے جوتے پہن کر ان پر چلنا پھرنا، خواہ وہ جوتے پاک ہی کیوں نہ ہوں، لوگوں کی نفاستِ طبع پر گراں گزرتا ہے اور اب جوتے پہن کر مساجد میں جانا یا چلنا پھرنا کہیں بھی معمول نہیں ہے، اس لئے امام صاحب کو اس سے اجتناب کرنا چاہئے، یہ امر کوئی سنت ومستحب تو ہے نہیں کہ حصول ثواب کے لئے اس پر اصرار کیا جائے، زیادہ سے زیادہ یہ سنن زوائد میں سے ہے۔

چنانچہ شیخ نظام الدین متوفی ۱۱۶۱ھ لکھتے ہیں:

"اور جوتے پہن کر مسجد میں داخل ہونا مکروہ ہے۔" فتاویٰ سراجیہ میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح بیان کیا ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۲۱، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے کئی صدیاں قبل بھی امتِ مسلمہ میں یہ مسئلہ معروف تھا کہ جوتے پہن کر مسجد میں نہیں جانا چاہئے اور شریعت کا مزاج یہ ہے کہ اگر کسی بات سے لوگوں کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو جواز بلکہ بعض صورتوں میں افضلیت کے باوجود اس کا چھوڑ دینا بہتر ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے (حطیم کعبہ کی) دیواروں کی بابت پوچھا کہ کیا وہ بیت اللہ کا حصہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، میں نے عرض کیا تو انہیں بیت اللہ میں داخل کیوں نہیں کیا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری قوم (قریش) کے پاس (تعمیری فنڈ کی) کمی واقع ہوگئی تھی، (حضرت عائشہ فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا اس (بیت اللہ) کا دروازہ بلند کیوں ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری قوم نے اسے بلند اس لئے رکھا تاکہ (ان کی اجارہ داری رہے اور) وہ جسے چاہیں بیت اللہ میں داخل ہونے دیں، اور اگر تمہاری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی اور ان میں زمانۂ جاہلیت کے اثرات نہ ہوتے اور مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ان کے ذہن اسے قبول نہیں کریں گے تو میں (حطیم کعبہ کی) دیواروں کو (عمارت) بیت اللہ میں شامل کر دیتا اور (بیت اللہ کے) دروازے کو سطح زمین سے ملا دیتا"۔

(صحیح بخاری رقم الحدیث: ۱۴۸۹، کتاب الحج)

امام بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول روایت کیا ہے: "لوگوں سے ان کے عرف کے مطابق بات کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ (تمہاری بے تدبیری سے) اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے"۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل: ۱۲۵)

"(لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلایئے

اوران سے بحث بھی کرنی ہوتو احسن طریقے سے کیجئے''۔

کسی امام یا مبلغ دین کا کسی مسئلے کو جواز بنا کر مسلمانوں کی عقیدت کو مجروح کرنا حکمت دعوت وارشاد کے منافی ہے اور اپنے علمی زعم وافتخار میں مبتلا ہونے کی دلیل ہے۔ کسی مقدس ومتبرک مقام کی تعظیم کے لئے جوتے اتارنا قرآن سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰىؕ اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًىؕ (طٰہٰ: ۱۱۔۱۲)

''جب وہ (موسیٰ) آگ کے پاس آئے تو انہیں ندا کی گئی، اے موسیٰ! بیشک میں تیرا رب ہوں، تو (آپ) اپنے جوتے اتار دیں، یقیناً آپ وادیٔ مقدس طویٰ میں ہیں''۔

اس آیت کے تحت امام ابوعبداللہ محمد قرطبی اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''(اس موقع پر) اللہ تعالیٰ سے کلام کے وقت عاجزی اور تواضع کے لئے جوتے اتارنے کا حکم دیا گیا ہے اور سلف صالحین سے لے کر آج تک بیت اللہ کا طواف کرتے وقت تعظیماً جوتے اتار لئے جاتے ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ وادیٔ مقدس کی تعظیم کے لئے یہ حکم ہوا، جیسا کہ حرم پاک کی تعظیم کے لئے جوتے پہن کر داخل نہیں ہوتے، اور آگے چل کر امام قرطبی ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضرت بشیر بن خصاصیہ جوتے پہن کر قبروں کے درمیان چل رہے تھے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''جب تم اس جگہ (یعنی قبرستان میں) ہوتو اپنے جوتے اتار لیا کرو''۔

(الجامع لاحکام القرآن ج۱۱ ص ۱۷۳، مکتبہ الغزالی دمشق)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم وجوباً نہیں فرمایا بلکہ یہ استحباب کے درجے میں ہے، اور جب قبور اور اہل قبور کا اتنا ادب ہے تو مسجد کا ادب تو اس سے زیادہ ہونا چاہئے، کیونکہ حدیث پاک میں آیا ہے'' مسجدیں اللہ کا گھر ہیں (یعنی اس کی عبادت اور رحمت وبرکت کے نزول کے مقدس مقامات ہیں)''۔

جمعہ کی سنتیں

سوال: جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے اور بعد کتنی سنتیں پڑھنی چاہئیں اور ان کی ترتیب کیا ہے؟ (شوکت علی، نیو کراچی)

جواب: جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے چار سنتیں پڑھنی چاہئیں اور نماز جمعہ کے بعد چھ سنتیں، اس طرح کہ پہلے چار سنتیں پڑھ کر سلام پھیر دیں اور پھر دو سنتیں پڑھ کر سلام پھیریں۔

علامہ شمس الدین محمد بن احمد سرخسی المبسوط ج ۱ ص ۱۵۷ پر رقم طراز ہیں: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے اور جمعہ کے بعد کی سنتوں میں اختلاف ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ چار رکعت پڑھتے تھے۔ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کا اسی پر عمل ہے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے بعد نماز پڑھے وہ چار رکعت نماز پڑھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جمعہ کے بعد چھ رکعت نماز پڑھتے تھے، پہلے چار رکعت، اس کے بعد دو رکعت، امام ابو یوسف کا اس پر عمل ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے دو اور پھر چار رکعت نماز پڑھتے تھے، بعض علماء نے ظہر کے بعد کی سنتوں پر قیاس کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی ہے کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعت پڑھے تا کہ ایک فرض کے بعد اس کی مثل نفل پڑھنا لازم نہ آئے۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۳۲ میں ہے عطا کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جمعہ کے بعد چھ رکعات پڑھتے تھے، پہلے دو رکعت پھر چار رکعت، جامع ترمذی ص ۱۰۱ پر ہے، حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جمعہ کے بعد پہلے دو رکعت پڑھی جائیں پھر چار، فقہاء احناف نے امام ابو یوسف کے قول کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعت پڑھی جائیں اور پھر دو، علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں فقہاء احناف کے حوالے سے یہی قول نقل کیا ہے، اس مسئلے کی پوری تفصیل شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ سعیدی صاحب کی ج ۲ ص ۴۴۵-۴۴۶ پر موجود ہے۔

مسافر قصر نماز کہاں سے شروع کرے؟

سوال: ایک شخص دیہات سے پندرہ دن سے کم کے ارادے سے سفر کرتا ہے۔ کیا قصر فوراً شروع ہوگی یا مقررہ فاصلہ طے کرنے کے بعد؟ (محمد الیاس، لانڈھی)

جواب: اگر کوئی شخص اپنے شہر، قصبے یا گاؤں سے اتنی مسافت کے سفر پر روانہ ہوتا ہے جو سفر

شرعی کہلاتا ہے اور جس سے قصر لازم ہے (یعنی ۹۸.۴۳۴۷ کلومیٹر یا ۶۱ میل ۴۶۰ گز)، تو جب وہ اپنی بستی کی حدود سے نکل کر جائے تو قصر شروع کردے۔ شہروں اور قصبات کی حدود آج کل کارپوریشن اور میونسپلٹی یعنی بلدیاتی ادارے طے کرتے ہیں اور دیہاتوں کی حدود کو مقامی لوگ خود سمجھتے ہیں۔

قصر واجب ہے؟

سوال: جب کوئی آدمی جانتا ہو کہ قصر واجب ہے، مگر وہ پوری نماز پڑھے تو وہ کیسا ہے؟

(محمد الیاس، لانڈھی)

جواب: احناف کے نزدیک حالتِ سفر میں قصر واجب ہے، لہٰذا قصر کو ترک کرکے پوری نماز پڑھنے والا گنہگار ہوگا۔ درمختار میں ہے (یعنی) پوری نماز پڑھنا مسافر کے حق میں رخصت نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے والا گنہگار ہے۔

سفر میں سنتِ مؤکدہ پڑھنے کا مسئلہ

سوال: کیا مسافر سنتِ مؤکدہ پڑھے یا نہ پڑھے، نیز کیا ایسا کوئی عذرِ شرعی ہے جس سے سنتِ مؤکدہ چھوڑ سکتے ہیں؟ (محمد الیاس، لانڈھی)

جواب: اگر مسافر دورانِ سفر اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہے تو راستے میں وہ سنت مؤکدہ چھوڑ دے، اور اگر وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے اور حالتِ قرار و سکون میں ہے تو سنتِ مؤکدہ پڑھ لیا کرے اور پوری پڑھے، مگر فجر کی دو سنتیں ہر حال میں یعنی دورانِ سفر بھی پڑھے، کیونکہ فجر کی تاکید زیادہ آئی ہے، (فتاویٰ شامی طبع جدید، ج ۲، ص ۵۳۵)۔

فجر کی قضاء ظہر میں پڑھنا

سوال: کیا نماز فجر کی قضاء نماز ظہر کے بعد ایک ساتھ ادا کرسکتے ہیں؟

(محمد شاہد اعجاز۔ ناظم آباد، کراچی)

جواب: جی ہاں۔ بالکل پڑھ سکتے ہیں، لیکن اگر آپ صاحبِ ترتیب ہیں، شروع سے یا اب بن چکے ہیں، تو پہلے فجر کی قضاء پڑھیں، پھر ظہر کی ادا پڑھیں "صاحبِ ترتیب" وہ شخص ہے جس کی

کبھی چھ نمازیں مسلسل قضاء نہ ہوئی ہوں۔ اصل اور کامل صاحبِ ترتیب تو وہی کہلائے گا کہ جب سے بالغ ہوا ہے اور اس پر نمازیں فرض ہوئی ہیں اس نے کبھی چھ نمازیں تسلسل کے ساتھ قضاء نہیں کیں لیکن آج کل عملی تنزل کے دور میں فقہاء کرام اس کو بھی صاحبِ ترتیب شمار کرتے ہیں جو زندگی کے کسی بھی مرحلے میں پچھلی نمازیں جو اس کے ذمے واجب الادا تھیں، ادا کر کے دوبارہ صاحبِ ترتیب بن گیا ہو اور اب اس پر مداومت و پابندی کر رہا ہو۔

دعا کے وقت ہاتھ کیسے رکھے جائیں

سوال: بعض لوگ دعا کے وقت دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں مکمل ملا کر رکھتے ہیں، بعض ایک دو انگلیوں کی نوک ملا دیتے ہیں، بعض دونوں ہاتھوں کو الگ الگ رکھتے ہیں، صحیح طریقہ کیا ہے، سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق کون سا طریقہ ہے، (مولانا علی عمران صدیقی ...... اورنگی ٹاؤن)

جواب: اس مسئلے کی وضاحت سے پہلے مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي شَيْءٍ مِنْ دُعَائِهِ اِلَّا فِي الْاِسْتِسْقَاءِ وَ اَنَّهُ يَرْفَعُ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ اِبْطَيْهِ۔

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ دعاء استسقاء (یعنی نزول بارش کی دعاء) کے سوا کسی اور دعاء میں اپنے ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے اور دعا استسقاء میں آپ ہاتھوں کو اتنا بلند فرماتے کہ آپ کی دونوں بغلوں کی سفیدی نظر آتی"۔

(صحیح بخاری، ج ۱ ص ۱۴۰)

اس حدیث کی شرح میں امام نووی لکھتے ہیں:

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعاء استسقاء کے سوا اور مواقع پر دعاء کے وقت اپنے ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے لیکن یہ بات درست نہیں ہے بلکہ "دعاء استسقاء" کے علاوہ اور بے شمار مواقع پر بھی دونوں ہاتھ اُٹھانا ثابت ہے اور میں نے "شرح المہذب" میں باب صفۃ الصلوٰۃ" کے آخر میں صحیح بخاری وصحیح مسلم کی تقریباً تیس احادیث کو اس موضوع پر جمع کیا ہے، اور علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر "تبیان القرآن" (ج ۴،ص ۱۸۳۔۱۷۲) میں بیرون نماز ہاتھ اُٹھا کر دعاء کرنے کے موضوع پر چالیس احادیث مبارکہ مکمل حوالوں کے ساتھ درج کی

ہیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث کی کیا تاویل کی جائے گی؟ تو اس کی تاویل یہ ہے کہ دیگر مواقع پر آپ دعاء میں ہاتھ اُٹھاتے تو تھے لیکن اس حد تک بلند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگے یا اس کی تاویل یہ کی جائے کہ ہوسکتا ہے انہوں نے نہ دیکھا ہو لیکن اور صحابہ کرام نے دیکھا ہو کہ حضور ﷺ نے اکثر اوقات دعاء کے وقت ہاتھ اُٹھائے ہیں۔

اور قاعدہ شرعیہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلے میں ایک قول اثبات کا ہو اور ایک نفی کا تو اثبات کو ترجیح دی جائے گی اور یہاں تو نفی کا قول کرنے والے ایک ہیں اور اثبات کا قول ایک جماعت کثیر کا ہے، (صحیح مسلم بشرح الامام ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی المتوفی ۶۷۶ھ، ج ۴، ص ۲۵۲۴ کتاب صلوٰۃ الاستسقاء)''۔

علامہ شہاب الدین احمد بن علی ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

قَالَ النَّوَوِیُ: قَالَ الْعُلَمَاءُ اَلسُّنَّۃُ فِیْ کُلِّ دُعَآءٍ لِرَفْعِ الْبَلَآءِ اَنْ یَّرْفَعَ یَدَیْہِ جَاعِلاً ظُھُوْرَ کَفَّیْہِ اِلَی السَّمَآءِ وَاِذَا دَعَا بِسُؤَالِ شَیْءٍ وَ تَحْصِیْلِہٖ اَنْ یَّجْعَلَ کَفَّیْہِ اِلَی السَّمَآءِ انتھی، وَقَالَ غَیْرُہٗ اَلْحِکْمَۃُ فِی الْاِشَارَۃِ لِظُھُوْرِ الْکَفَّیْنِ فِی الْاِسْتِسْقَاءِ دُوْنَ غَیْرِہٖ لِلتَّفَاؤُلِ بِتَقَلُّبِ الْحَالِ ظَھْرًا لِبَطْنٍ کَمَا قِیْلَ فِیْ تَحْوِیْلِ الرِّدَاءِ اَوْھُوَ اِشَارَۃٌ اِلٰی صِفَۃِ الْمَسْئُوْلِ وَ ھُوَ نُزُوْلُ السَّحَابِ اِلَی الْاَرْضِ۔

''امام نووی نے کہا ہے: علماء کہتے ہیں کہ دعاء میں سنت طریقہ یہ ہے کہ جو دعاء کسی مصیبت کو دور کرنے کے لیے کی جائے اس میں دونوں ہاتھ بلند کیے جائیں اور ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف رکھی جائے، اور جب کسی نیک مقصد کے حصول کی دعاء کی جائے تب بھی ہاتھ اُٹھائے جائیں اور ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف رکھا جائے، اور دوسرے علماء نے کہا ہے کہ دعاء استسقاء میں بطور خاص ہاتھوں کی پشت کو آسمان کی طرف کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ہتھیلی کی جگہ پشت کو (اوپر کرکے) تبدیلیٔ حال سے نیک فال لینا ہے جیسا کہ اس موقع پر چادر کو پلٹ کر اوپر کا حصہ نیچے کیا جاتا ہے، یا اس طریقے سے جو چیز مانگی جارہی ہے اس کی ہیئت کی طرف اشارہ مقصود ہے (یعنی اے اللہ! جس طرح میری ہتھیلیوں کا رخ زمین کی طرف ہے اسی طرح تو اپنی قدرت سے) زمین پر

بارش نازل فرما، (فتح الباری ج ۳، ص ۲۱۲، مکتبہ دار الفکر، کتاب الاستسقاء)''۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاء میں بالعموم ہاتھوں کو بلند کرنا سنت ہے۔ نماز استسقاء یا دعاء دفعِ شر میں ہتھیلیوں کی پشت آسمان کی طرف بھی کر سکتے ہیں، حصول خیر و برکت اور دیگر مواقع پر ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف رکھنا چاہیے۔ دعاء استسقاء میں بھی دونوں اعتبارات ہو سکتے ہیں۔ ایک دفع شر کا یعنی قحط اور خشک سالی کا دور ہونا اور ایک حصول منفعت کا یعنی باران رحمت کا نزول اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ دعاء دفعِ شر میں ہتھیلیوں کی پشت کو جو آسمان کی طرف کرتے ہیں، یہ تبدیلی حال کے لیے نیک فال کے طور پر ہے، ہاتھ اتنے زیادہ بلند کرنا کہ بغلیں نظر آئیں، یہ بھی مستحب ہے۔ باقی چونکہ الفاظ حدیث میں ہاتھوں کو ملا کر رکھنے کی کہیں ممانعت وارد نہیں ہوئی اس لیے دعا کے وقت ہاتھوں کو ملا کر (خواہ کسی بھی انداز سے ہوں) بھی رکھ سکتے ہیں لیکن ہاتھوں کو کھلا رکھنا سنت سے زیادہ قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

نماز میں کوئی سورت دوبارہ پڑھنا

سوال: نماز میں کوئی بھی سورت دوبارہ پڑھ لی جائے، یعنی بھول کر تو اس کی تلافی کیسے ہوگی؟

(محمد شاہد اعجاز، کراچی)

جواب: نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔

سوال: نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت یاد نہ آ رہی ہو تو کیا نماز توڑ کر دوبارہ پڑھیں؟

جواب: نماز مکمل کر کے سجدۂ سہو کرلیں، نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

مسبوق اپنی بقیہ نماز کس طرح ادا کرے؟

سوال: ایک شخص نے امام کی اقتداء کی اور آخری قعدے میں امام کے ساتھ آ کر شامل ہوا، اب امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ اپنی بقیہ نماز کس طرح پڑھے، الٹی ترتیب سے یا سیدھی ترتیب سے؟ (م-الف-ع، کراچی)

جواب: جس مقتدی کی نماز کی ابتدائی ایک رکعت یا اس سے زائد نماز رہ گئی ہو اور وہ دوران نماز امام کے ساتھ آ کر شامل ہوا، اسے فقہی اصطلاح میں مسبوق کہتے ہیں۔ آپ نے جو صورت سوال میں بیان کی ہے، اس کی رو سے وہ اپنی نماز صحیح ترتیب کے ساتھ ابتدا سے پڑھے گا، یعنی

کھڑے ہو کر ثناء پڑھے پھر اعوذ باللہ، پھر بسم اللہ اور پھر حسب ترتیب پہلی دو رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملائے گا اور آخری دو رکعت میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھے گا اور اس طرح اپنی نماز مکمل کرے گا۔ اگر چار رکعت والی نماز میں درمیان والے قعدے میں یا تیسری رکعت میں حالت قیام میں یا رکوع میں امام کے ساتھ ملا ہے تو وہ بعد میں اٹھ کر اپنی ابتدائی دو رکعت پڑھے جس میں ثناء (سبحانک اللّٰھم) اور تعوذ وتسمیہ (اعوذ باللّٰہ، بسم اللّٰہ) کے بعد سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورت بھی ملائی جاتی ہے۔ اگر چوتھی رکعت میں امام کے ساتھ ملا ہے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ایک رکعت ثناء، تعوذ، تسمیہ اور فاتحہ مع سورت کے ساتھ پڑھے گا اور اس طرح اس کی اپنی دو رکعت ہو جائیں گی۔ اس کے بعد درمیانی قعدہ کرے گا، پھر اٹھ کر ایک رکعت فاتحہ مع سورت پڑھے گا اور آخری رکعت میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھے گا۔ اگر وہ دوسری رکعت میں امام کے ساتھ شامل ہوا تو آخر میں اٹھ کر ایک رکعت ثناء، تعوذ، تسمیہ اور فاتحہ سورت کے ساتھ پڑھ کر نماز مکمل کر کے سلام پھیر دے گا۔

نوافل تہجد کی جگہ قضاء پڑھنا

سوال: ایک شخص کے ذمے قضاء نمازیں ہیں، لیکن اب وہ با قاعدہ تہجد گزار بھی ہے، تو اگر وہ نوافل تہجد کی جگہ قضاء نمازیں پڑھتا رہے تو کیا اسے تہجد کا ثواب ملے گا؟

(بہار احمد مشتاق۔ دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: جب تک کسی کے ذمے قضاء نمازیں رہتی ہوں، اسے نوافل پر فرائض و واجبات کی قضاء کو ترجیح دینی چاہئے، کیونکہ زندگی کی گارنٹی کسی کے پاس نہیں ہے کہ کل آنے والا دن اسے نصیب ہوگا یا نہیں۔ نوافل کا اجر وثواب اور برکات اپنی جگہ مسلم ہیں، لیکن نوافل نہ پڑھنے پر آخرت میں مسئولیت نہیں ہوگی، جبکہ فرائض و واجبات کی آخرت میں جواب دہی لازمی ہے۔ لہٰذا تہجد کے نوافل کی جگہ وہ قضاء نمازیں پڑھنی چاہئیں جو کسی کے ذمے باقی ہیں۔ امام احمد رضا خان قادری نے فتاویٰ رضویہ میں متعدد حوالہ جات کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طویل وصیت نقل کی ہے جو انہوں نے عالم نزع میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کی، اس طویل وصیت کے آخر میں فرمایا "جان لو! جب تک فرائض ادا نہ کر دیئے جائیں، نوافل قبول نہیں ہوں گے۔"

اسی طرح انہوں نے فتوح الغیب مؤلفہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''اگر کوئی شخص فرائض کو چھوڑ کر سنت و نفل میں مشغول ہوگا تو یہ (بارگاہِ الٰہی میں) قبول نہیں ہوں گے اور وہ خوار ہوگا'' اسی طرح انہوں نے عوارف المعارف کے حوالے سے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ''ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ جب تک فرائض ادا نہ کیے جائیں، اللہ تعالیٰ نوافل کو بھی قبول نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے فرماتا ہے کہ تمہاری مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو قرض تو ادا نہیں کرتا اور تحفے بانٹتا پھرتا ہے۔'' باقی جو شخص رات کے پچھلے پہر اپنی راحت و نیند کو قربان کر کے اٹھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے، خواہ وہ گزشتہ فرائض کی قضاء ہی کیوں نہ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں ہے کہ وہ اسے ''قیام الیل'' اور ''تہجد'' کا ثواب عطا فرمائے لیکن یہ کوئی ضابطہ شرعیہ نہیں ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کی رحمت تو اپنے بندوں پر برسنے کا بہانہ ڈھونڈتی ہے۔

وضو اور نماز کے باطل ہونے کا غلط مسئلہ

سوال: ایک معروف ہفت روزہ جریدہ (اخبار جہاں) کی ۱۶ تا ۲۲ اپریل ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں ''کتاب وسنت کی روشنی میں'' کے عنوان کے تحت ایک سائل نے پوچھا کہ: وضو میں لوگ جب سر کا مسح کرنے لگتے ہیں تو ہاتھ بھگو کر پہلے اسے چومتے ہیں اور پھر سر کا مسح کرتے ہیں۔ کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ اس طرح مسح نہیں ہوتا جو وضو کے فرائض میں سے ہے اور جب ایک فرض چھوٹ گیا تو وضو نہ ہوا اور بغیر وضو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، اس طرح نماز نہیں ہوگی' کیا مفتی صاحب کا یہ جواب درست ہے؟

(عنایت اللہ۔ آرام باغ، کراچی)

جواب: مفتی صاحب کا یہ جواب درست نہیں ہے۔ اگرچہ ہاتھ تر کرنے کے بعد سر کا مسح کرنے سے پہلے ہاتھوں کا چومنا ثابت نہیں ہے لیکن اگر کسی نے لاعلمی کی بناء پر ایسا کر لیا تو سر کا مسح شرعاً صحیح ہو جائے گا اور چونکہ کوئی فرض ترک نہیں ہوا اس لئے وضو بھی صحیح ادا ہو گیا اور اس وضو سے نماز بھی صحیح ادا ہو جائے گی۔

سفر کی قضاء حضر میں اور حضر کی قضاء سفر میں

سوال: دوران سفر نمازیں رہ گئی ہوں اور واپس گھر آ کر ان کی قضاء پڑھنا چاہے تو قصر پڑھے یعنی چار فرض کی جگہ دو یا پوری پڑھے گا؟ (بہار احمد مشتاق، کراچی)

جواب: قضاء میں حالتِ ادا کا اعتبار نہیں بلکہ حالتِ قضاء کا اعتبار ہے۔ لٰہذا سفر کی قضاء گھر پر آ کر پڑھی جائے تو قصر ہی پڑھے گا اور گھر پر اقامت کے دوران قضاء شدہ نمازیں سفر میں پڑھنا چاہے تو ان کی قضاء پوری پڑھے گا۔

کیا توبہ کے بعد بھی قضائے عمری پڑھنا ضروری ہے؟

سوال: سورۂ توبہ آیت :۱۱ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''اگر یہ لوگ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہو جائیں گے۔'' اگر کاہلی اور سستی کی وجہ سے کسی شخص کی پندرہ بیس سال کی نمازیں قضاء ہوگئی ہوں لیکن اب وہ شخص صدقِ دل سے توبہ کر کے گزشتہ تیس سال سے باقاعدگی کے ساتھ باجماعت نماز ادا کر رہا ہے، تو کیا صدقِ دل سے توبہ کے بعد بھی قضاء عمری پڑھنا ضروری ہے؟ (بہار احمد مشتاق۔ گلشن مصطفیٰ۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: یہ آیت یہود، منافقین اور کفارِ مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ اگر وہ صدقِ دل سے کفر و نفاق سے توبہ کر کے مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں اور اسلام پر مکمل طریقے سے کاربند ہیں تو وہ اسلامی برادری کے رکن بن چکے ہیں اور انہیں وہی تحفظات حاصل ہوں گے جو دیگر مسلمانوں کو حاصل ہیں، ان کے تاریک، گمراہ کن اور مسلمانوں سے بغض و عناد پر مبنی ماضی کے پیش نظر ان کے ساتھ نہ کوئی امتیازی سلوک کیا جائے گا اور نہ ہی انتقامی کارروائی کی جائے گی کیونکہ ''اسلام ماضی کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔'' چنانچہ اگلی آیت میں فرمایا ''اور اگر یہ لوگ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین میں طعنہ زنی کریں تو کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو، بلاشبہ ان کی قسموں کو کوئی اعتبار نہیں، تاکہ وہ کفر سے باز آ جائیں۔'' اس کے برعکس مسلمان جب ماضی کے گناہوں سے صدقِ دل سے توبہ کرے گا تو توبہ کی صحت کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شریعت نے جن گناہوں کی تلافی کی جو صورتیں مقرر کر رکھی ہیں، ان پر بھی عمل کرے۔ مثلاً قسم کھا کر توڑ دی ہے تو اس کا کفارہ ادا کرے، کسی کا حق غصب کیا ہے تو اسے واپس کرے، زکوٰۃ ادا

نہیں کی تو ماضی کی تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے اور جو نمازیں قضاء ہو چکی ہیں تو ان کی قضاء پڑھے اور اپنی تقصیرِ قضاء پر اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگے۔

صلوٰۃ التسبیح باجماعت پڑھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ صلوٰۃ التسبیح باجماعت کے لئے باقاعدہ اعلان کرنا اور اشتہار شائع کرنا ازروئے شرع درست ہے یا نہیں؟ دلائل کی روشنی میں مسئلہ ہذا کی وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں"۔ (الطاف حسین۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی)

جواب: صورتِ مسئولہ میں صلوٰۃ التسبیح باجماعت کے لئے باقاعدہ اعلان کرنا اور اشتہارات شائع کرنا "تداعی" ہے، اور نوافل باجماعت بالتداعی اگر دائما یعنی ہمیشہ ہو تو فقہاء نے اسے مکروہ لکھا ہے اور اگر دائما نہ ہو بلکہ سال میں ایک یا دو مرتبہ ہوں تو یہ بہت سے علماء متقدمین سے ثابت ہے جن میں حضرت لقمان بن عامر، خالد بن معدان اور امام بخاری کے استاذ اسحاق بن راہویہ وغیرہم رحم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شامل ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز "فتاویٰ رضویہ" میں لکھتے ہیں "بہت اکابرین سے جماعت نوافل بالتداعی ثابت ہے اور عوام فعلِ خیر سے منع نہ کئے جائیں گے اور نہ نوافل سے، علمائے ملت وحکمائے ملت نے ایسی ممانعت سے منع کیا ہے۔" آگے ایک اور مقام پر "حدیقہ ندیہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "اور اس قبیل سے "صلوٰۃ الرغائب" اور "صلوٰۃ لیلۃ القدر" وغیرہ باجماعت ادائیگی کو منع کرنا ہے اگرچہ علماء نے اس کی کراہت صراحت فرمائی ہے لیکن عوام کی دلچسپی کم تر ہونے کی وجہ سے اس کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔ نفل نماز باجماعت کے جواز پر علمائے متاخرین کی تصانیف موجود ہیں اور عوام کو نماز کی طرف راغب کرنا متنفر کرنے سے بہتر ہے"۔

نمازِ عید کا خطبہ سننا

سوال: نمازِ عید کے بعد جو دو خطبے دیئے جاتے ہیں، ان کے سننے کا شرعی حکم کیا ہے؟ بعض لوگ خطبہ سننے کے بجائے اٹھ کر چلے جاتے ہیں (عبداللہ۔ گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب: نمازِ عید کے بعد دو خطبے پڑھنا اور ان کا سننا رسول اللہ ﷺ کی سنت مقدسہ ہے اور

اتنی عظیم برکتوں اور سعادتوں کے دن اجر وثواب کے طلبگاروں کو نماز کے بعد باادب بیٹھ کر خطبہ سننا چاہئے۔

تارک الصلوٰۃ کا حکم

سوال: جو لوگ نمازِ جمعہ ادا نہیں کرتے اور پانچ وقت کی نمازیں نہیں پڑھتے، ان کے لئے کیا حکم ہے؟ (محمد شاہد اعجاز، کراچی)

جواب: اس سلسلے میں چند آیات اور احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ۝

(المدثر: ۴۲ تا ۴۷)

" (قیامت کے دن اہل جنت، جہنمیوں سے پوچھیں گے) تمہیں کیا چیز جہنم میں لے جانے کا باعث بنی؟" وہ (جواباً) کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے۔ اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ بیہودہ لوگوں کے ساتھ بیہودہ مشغلوں میں گم رہتے تھے۔ اور ہم روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا"۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (البقرہ: ۴۵۔۴۶)

" اور (اللہ کی) مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعے سے اور بیشک نماز ضرور دشوار محسوس ہوتی ہے، مگر (رب کی طرف) جھکنے والوں پر شاق نہیں ہے۔ (یہ وہ لوگ ہیں) جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (الماعون: ۴۔۵)

" پس افسوس (اور خرابی) ہے ان نمازیوں کیلئے جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں"۔

۱۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بندے اور کفر کے درمیان (حدِ فاصل) ترکِ نماز ہے"۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)

۲-عبداللہ بن شفیق کہتے ہیں کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ جس عمل کے ترک کو کفر (کے قریب تر) سمجھتے تھے وہ نماز ہے۔'' (مشکوٰۃ بحوالہ جامع ترمذی)

۳-حضرت ابو جعد ضمری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس نے سستی اور کاہلی کی بنا پر مسلسل تین جمعے چھوڑ دیئے، اللہ تعالیٰ (سزا کے طور پر) اس کے دل پر مہر لگا دے گا (یعنی وہ اپنی اس سرکشی کی پاداش میں قبول حق کی استعداد سے محروم ہو جائے گا)۔

(مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابن ماجہ)

۴-حضرت عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ لوگ جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں، ورنہ اللہ ان کے دلوں پر (شقاوت کی) مہر لگا دے گا اور وہ غافلوں میں سے ہو جائیں گے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)

ایک دکاندار یا کاروبار سے وابستہ مختلف افراد کا باری باری مختلف مساجد میں نمازِ جمعہ پڑھنا

سوال: ایک دکان میں ہم کئی افراد کام کرتے ہیں، مساجد میں نمازِ جمعہ کے اوقات مختلف ہوتے ہیں کہیں ایک بجے کہیں ڈیڑھ بجے، کہیں دو بجے اور کہیں ڈھائی بجے کیا ایسا کرنا جائز ہے کہ ہم دکان بند نہ کریں اور باری باری ایک ایک کر کے مختلف مساجد میں نمازِ جمعہ پڑھ لیں، اس طرح سب کی نماز بھی ادا ہو جاتی ہے اور کاروبار بھی چلتا رہتا ہے دکان بالکل بند نہیں کرنی پڑتی اور کیا نمازِ جمعہ کی دعاءِ ثانی کے بعد دوبارہ کاروبار شروع کر سکتے ہیں؟ (خرم عبداللہ، کراچی)

جواب: ضابطے کی رو سے تو آپ کا یہ عمل درست ہوگا اور یہ فریضۂ جمعہ سے عہدہ برآ ہونے اور کاروبار کو بدستور جاری رکھنے کا ایک حیلہ ہوگا اس کی ضرورت غیر مسلم ممالک میں پڑسکتی ہے جہاں نمازِ جمعہ کے لئے باضابطہ کاروبار بند نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے، وہاں رخصت کی حد تک تو یہ حیلہ درست ہوگا البتہ عزیمت کے خلاف ہوگا کیونکہ آپ میں سے ہر ایک نے اللہ تعالیٰ کے حکم ''سعی الی ذکر اللہ'' پر تو باری باری عمل کیا لیکن ''اور ہر قسم کا لین دین چھوڑ دو'' کے حکمِ الٰہی پر کلی عمل نہیں کیا بلکہ بالواسطہ طور پر آپ کا کاروبار جاری رہا یہ اس حیلہ سے مشابہ ہے جو بنی اسرائیل نے ''یوم السبت'' (ہفتے کے دن) مچھلی کے شکار کی ممانعت سے بچنے کے لئے اختیار کیا تھا کہ یا تو گھروں

میں تالاب بنالئے اوران میں مچھلی لاکر ڈال دیتے اور ہفتے کے روز انہیں پکڑ کر کھانے لگے اور یا دریاؤں سے گھروں تک نالیاں کھود دیں جن کے ذریعے مچھلیاں خود بخود گھروں کے تالابوں تک آجاتیں اور پکڑ کر کھالیتے یہاں بھی صورت یہ بنی کہ کاروبار بھی جاری رہا اور جمعہ کا ثواب بھی کمالیا یعنی ''ہم خرما و ہم ثواب''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ:۱۰)

''پس جب نمازِ جمعہ ادا کر چکو تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو''۔

وہی کاروبار جو نمازِ جمعہ میں رکاوٹ بننے کی وجہ سے حرام تھا اب فریضہ جمعہ کی ادائیگی کے بعد اللہ کا فضل قرار پایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی ہے، تاہم یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ اباحت کے لئے ہے۔

نوافل بیٹھ کر پڑھنا

سوال: بعض لوگ تندرست و توانا ہوتے ہوئے نوافل بیٹھ کر پڑھتے ہیں، کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ کیا دونوں صورتوں (یعنی کھڑے ہو کر نماز پڑھنے اور بیٹھ کر نماز پڑھنے) میں ثواب یکساں ہے۔ بعض لوگ عشاء کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ عشاء کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھتے تھے، اس لئے ان نوافل کا بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے؟

(انور شمیم اعوان۔ قیوم آباد، کراچی)

جواب: جو شخص نماز میں قیام پر قادر ہے، اس کے لئے فرض نماز بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے اگر بلا عذر بیٹھ کر پڑھے گا تو نماز ادا نہیں ہوگی۔ درمختار میں ہے جو نمازیں فرض کے ساتھ ملحق ہیں (یعنی حکماً) ان کا بھی بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے جیسے نوافل کی نذر مانی ہو تو واجب ہو جاتے ہیں، اور صحیح ترین قول کے مطابق فجر کی دو سنتوں کا بھی یہی حکم ہے کہ بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے، کیونکہ بعض فقہا فجر کی سنتوں کے وجوب کے قائل ہیں، لیکن جو فقہا فجر کی ان دو رکعت کے سنت ہونے کے قائل ہیں۔ وہ بھی جانب وجوب کی رعایت کرتے ہوئے اسی بات کے قائل ہیں کہ فجر کی سنتیں بلا عذر بیٹھ کر نہیں پڑھنی چاہیں بعض فقہا سنت فجر پر قیاس کرتے ہوئے نماز تراویح

بھی بلاعذر بیٹھ کر پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ لیکن علامہ قاضی خان نے کہا ہے کہ چونکہ نمازِ تراویح کی تاکید سنتِ فجر سے کم ہے، اس لئے قول صحیح یہ ہے کہ نمازِ تراویح بلاعذر بھی بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں اسی طرح باقی سنتیں اور نوافل بھی بلاعذر بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں سوائے سنت فجر کے کہ ان کی تاکید دیگر سنتوں کے بہ نسبت زیادہ آئی ہے، لہٰذا یہ واجب کے قریب ہیں اور ان کا بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے، لیکن بلاعذر بیٹھ کر پڑھنے والے کو کھڑے ہو کر پڑھنے والے کے مقابلے میں آدھا ثواب ملے گا، البتہ اگر فرض یا واجب یا سنت یا نفل کوئی بھی نماز عذر کی بناء پر بیٹھ کر پڑھی تو ثواب میں کمی نہیں ہوگی، انشاء اللہ العزیز۔

عشاء کی نماز میں وتر کے بعد کے دو نوافل کا حکم بھی وہی ہے، جو دوسرے نوافل کا ہے یعنی بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا جائز تو ہے لیکن ثواب میں کمی ہوگی۔ جو لوگ عشاء کے وتر کے بعد دو رکعت نفل اس لئے بیٹھ کر پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ایسا کرنا ثابت ہے اور اسے زیادہ باعث ثواب سمجھتے ہیں تو ان کی یہ سوچ اور یہ طرزِ عمل درست نہیں ہے، علامہ یحیٰ بن شرف الدین نووی شارح صحیح مسلم اور دیگر علماء نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا عشاء کے وتروں کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنا آپ کی خصوصیت ہے اور اس سے آپ کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی تھی، دوسرے لوگوں کا اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں حدیث ہے: "حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سنی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا آدھا اجر ہوتا ہے، ایک دن میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا میں نے ہاتھ آپ کے سرِ اقدس پر رکھا، آپ نے فرمایا، اے عبداللہ بن عمر! کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے بتایا گیا کہ آپ نے فرمایا ہے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا آدھا اجر ہوتا ہے، حالانکہ آپ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا، ہاں لیکن میں تم جیسا کب ہوں۔ (رقم الحدیث: ۱۶۱۲)"

سورۂ فاتحہ کی آیت کا چھوٹ جانا؟

سوال: اگر امام سے نماز میں دوران قرأت سورۂ فاتحہ کی کوئی آیت بھول سے رہ جائے تو کیا نماز صحیح ادا ہو جائے گی، (مستقیم، پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی)۔

جواب : سورۂ فاتحہ مکمل نماز میں پڑھنا واجب ہے، لہٰذا کوئی ایک کلمہ بھی پڑھنے سے رہ جائے تو سجدۂ سہو لازم آئے گا اور اگر نماز کے اندر سجدۂ سہو نہ کیا تو نماز کا اعادہ لازم آئے گا۔

نماز باجماعت میں دعاءِ قنوت کا رہ جانا

سوال: باجماعت وتر کی ادائیگی کے دوران اگر کسی سے دعاءِ قنوت رہ جائے تو کیا اکیلے سجدۂ سہو کرسکتا ہے، (زیتون میمن۔کلفٹن)۔

جواب: باجماعت وتر کی ادائیگی کے دوران اگر امام دعاءِ قنوت پڑھنا بھول جائے اور تکبیر کہتے ہوئے سیدھا رکوع میں چلا جائے تو امام اور اس کی متابعت میں سب مقتدی بھی سجدۂ سہو ادا کریں گے اور نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔ اگر امام کی اقتداء کے دوران صرف مقتدی دعاءِ قنوت پڑھنا بھول جائے تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے، نہ وہ جماعت کے اندر ادا کرے گا اور نہ اکیلے، انشاءاللہ جماعت کی برکت سے اس کی نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

بیت اللہ کی طرف سجدہ کرنے اور حجرِ اسود کو بوسہ دینے پر صیہونیوں کا اعتراض

سوال: عرض یہ ہے کہ آج کل صیہونی قوتوں خصوصاً ہندوؤں کی جانب سے یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے۔ مسلمان دوسروں کو تو بت پرستی سے روکتے ہیں، پتھر کے خداؤں کی پوجا کرنے سے منع کرتے ہیں، مگر خود پتھر کی ایک عمارت (خانۂ کعبہ) کو سجدہ کرتے ہیں، اس طرح تو مسلمان خود بھی بت پرستی کرتے ہیں (العیاذ باللہ)، ایک اور شوشہ یہ بھی چھوڑا جارہا ہے کہ بتوں کو بوسہ دینے کی مخالفت کرنے والے مسلمان خود ایک پتھر کو بوسہ دیتے ہیں اور بت پرستی کرتے ہیں (العیاذ باللہ) نیز اس طرح کے کئی اور فضول، بکواس اور گھٹیا حربے استعمال کر کے مسلمان قوم کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کی جارہی ہے گو کہ ہم لوگ ان لغو باتوں پر دھیان نہیں دیتے اور اپنی طرف سے ان کافروں کو منہ توڑ جواب دیتے ہیں مگر دوسروں کو مطمئن کرنے کے لئے علمی جواب ضروری ہے۔
(محمد احسن سمیع۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی)

جواب: مشرک بتوں کو سجدہ کرتے ہیں اور بت ہی ان کے معبود اور مسجود ہوتے ہیں، جبکہ مسلمان بیت اللہ کو سجدہ نہیں کرتے۔ کعبہ مسلمانوں کا معبود اور مسجود نہیں ہے نہ ہی مسلمانوں کا یہ

عقیدہ ہے کہ بیت اللہ یا خانہ کعبہ ایسا مقام یا جگہ ہے جہاں معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ قیام پذیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ زمان و مکان کے اندر محدود یا مقید ہونا یہ عالمِ اجسام اور مادی دنیا کی صفات ہیں، اللہ کی ذات اس سے بلند تر ہے، چنانچہ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں تو قرآن نے منکرین کے اعتراضات کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ (البقرہ:۱۴۲)

"اب بیوقوف لوگ یہ کہیں گے کہ مسلمانوں کو ان کے سابقہ قبلے سے کس چیز نے پھیر دیا؟ (اے رسول!) آپ فرما دیجئے کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے ہیں"۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۗ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ (البقرہ:۱۱۵)

"اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، تو جہاں کہیں تم (قبلے کی طرف) منہ کرو، وہیں اللہ (کی رحمت تمہاری طرف) متوجہ ہے"۔

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرہ:۱۷۷)

"(اصل) نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق و مغرب کی جانب پھیر لو، بلکہ (اصل) نیکی اس شخص کی ہے جو اللہ، قیامت کے دن، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور انبیاء پر ایمان لائے اور مال کی محبت کے باوجود رشتے داروں، یتیموں، ناداروں، مسافروں، سائلین (اور قرض میں پھنسے ہوئے یا غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں کی) گلوخلاصی کے لئے (اللہ کی رضا کی خاطر) مال دے اور نماز قائم کرے زکوٰۃ دے، اور اپنے کئے

ہوئے عہد کو پورا کرنے والے ہوں اور حالتِ تکلیف و سختی میں کافروں سے لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہوں، یہی وہ لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ثابت ہوئے اور (درحقیقت) یہی لوگ متقی ہیں''۔

تو کعبہ ہمارا مسجود نہیں بلکہ جہتِ سجدہ ہے۔ہم کعبے کو نہیں، بلکہ جانبِ کعبہ سجدہ کرتے ہیں، عبادت کعبہ کی نہیں کرتے بلکہ ربِ کعبہ کی کرتے ہیں، اگر سجدہ کعبے کو ہوتا تو صرف اس کے سامنے ہی ہوتا جیسے بت پرست مشرک بت کے سامنے جھک کر اسے سجدہ کرتے ہیں، سینکڑوں ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے سے، جبکہ درمیان میں ہزاروں رکاوٹیں اور حجابات حائل ہوتے ہیں کعبے کو سجدہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے سے ہر نمازی کا ایسے زاویے پر کھڑا ہونا کہ نوے درجے کا خطِ مستقیم بنتے ہوئے کعبہ عین اس کی پیشانی کے سامنے واقع ہو رہا ہو اگر ناممکن نہیں تو مشکل ترین امر ضرور ہے، اس لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ نمازی اپنی طرف سے پوری ذہنی و فکری کوشش صرف کرکے یا کسی صاحب علم سے پوچھ کر قبلے کا تعین کرکے نماز پڑھ لے، اس کو اصطلاحِ فقہ میں ''تحری'' کہتے ہیں۔اگر انتہائی کوشش کے باوجود فی الواقع اس کا رخ قبلے سے ہٹ گیا ہو اور یہ انحراف ۴۵ درجے تک ہو جائے تب بھی نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

باقی رہا یہ سوال کہ اس میں باری تعالیٰ کی کیا حکمت ہے کہ بیت اللہ کی جانب رخ کرکے عبادت کا حکم فرمایا جبکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علم تو ہر جہت اور جگہ کو محیط ہے۔تو اس کی حکمت جو میری ناقص عقل میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو تمام روئے زمین کے مسلمانوں کا مرکزِ عبادت اور جہتِ نماز بنا کر ایک بے مثال وحدت قائم فرمادی، اور خانہ کعبہ کو اپنی برکات اور انوار و تجلیات کا مرکز و محور بنادیا تاکہ وہ اس کی برکات سے فیض یاب ہوسکیں اور اسے مسلمانوں کا شعار اور امتیازی نشان بنادیا، چنانچہ حدیث پاک میں ہے: ''حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو ہماری طرح نماز پڑھے اور (نماز میں) ہمارے قبلے کی جانب رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، تو وہ شخص مسلم ہے، پس اللہ تعالیٰ کے (عطا کردہ) عہد امان کو نہ توڑو (یعنی اس کی جان، مال اور آبرو کی حرمت کو پامال نہ کرو)، (مشکوٰۃ، بحوالہ صحیح بخاری)''۔

حجرِ اسود کو بوسہ دینے کی بابت یہ حدیث ملاحظہ فرمایئے: ''عبداللہ بن سرجس بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجرِ اسود کو بوسہ دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے، بخدا

میں تجھے بوسہ دے رہا ہوں، حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، تو (اپنی ذات سے) نہ نفع دیتا ہے نہ نقصان اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۲۹۶۵)''۔ جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جنت سے حجرِ اسود کو اتارا گیا تو یہ دودھ سے زیادہ سفید تھا، لیکن بنی آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کردیا۔ تو حجرِ اسود کو، حصول خیر و برکت کے لئے اور سنت رسول ﷺ کی اتباع میں بوسہ دیا جاتا ہے۔ محض بوسہ دینا کسی بھی مذہب میں عبادت نہیں ہے۔ کبھی تعظیم و توقیر کے طور پر بوسہ دیا جاتا ہے جیسے حجرِ اسود کو کبھی حصولِ برکت کے لئے بوسہ دیا جاتا ہے جیسے بزرگوں اور والدین کی دست بوسی اور قدم بوسی اور آثارِ صالحین کو بوسہ دینا۔ کبھی اظہارِ شفقت و محبت کے طور پر بوسہ دیا جاتا ہے جیسے بزرگ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ حجرِ اسود اپنی ذات سے فیض رساں ہے، ذاتی کمالات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں، مخلوق میں جو بھی کمال ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور تخلیق سے ہے۔

مسجد اور اس سے ملحقہ مدرسے کو دانستہ بم سے اڑانے والوں کا شرعی حکم

سوال: اہل سنت کی ایک جامع مسجد پر بعض دوسرے مکتبۂ فکر کے لوگ قبضہ کرنا چاہتے تھے اس ناپاک مہم میں ناکامی کے بعد انہوں نے مسجد اور اس سے ملحقہ مدرسے کو بم سے اڑا دیا۔ ازراہِ کرم شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ایسے لوگوں کا جو مسجد کو شہید کردیں اور اس پر ناپاک قبضہ جمانے کی سازشیں کریں کیا حکم ہے؟ ایسے لوگوں کے ساتھ تعلقات میل جول شادی بیاہ کی کیا حیثیت ہوگی۔ یہ واضح رہے کہ مذکورہ جامع مسجد علاقہ کی واحد جامع مسجد ہے۔

(قاری محمد سیف اللہ۔ نیریاں شریف آزاد کشمیر)

جواب: سورۃ التوبہ آیات ۱۷-۱۸ میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا

مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ (التوبہ:۱۷-۱۸)

''مشرکوں کا یہ وتیرہ ہی نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں حالانکہ وہ خود اپنی ذات پر کفر کے گواہ ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جن کے عمل ضائع ہو گئے اور ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور انہوں نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی اور اللہ کے سوا کسی سے خائف نہیں ہوئے تو وہ لوگ اس کے قریب ہیں کہ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں''۔

اور سورۃ البقرہ آیت:۱۱۴ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا

''اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کے مقدس نام کے ذکر سے روکا اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کی''۔

''عمارۃ المسجد'' سے مراد مسجدیں تعمیر بھی کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اقامتِ صلوٰۃ کے ذریعے انہیں آباد بھی کرنا ہے اور قرآن نے بتایا کہ یہ مومنین صادقین کا شعار ہے نہ کہ مشرکین کفار کا، اور قرآن نے یہ بھی بتایا کہ مساجد میں اللہ کے ذکر سے روکنے والے اور انہیں ویران کرنے والے شقی اور ظالم ترین لوگ ہیں۔

مساجد کو ویران کرنے کی کئی صورتیں ہیں:

۱) یہ کہ مسجد کی عمارت تو قائم و دائم رہے لیکن ذاکرین اور نمازیوں کو اس میں ذکر و عبادت سے روک دیا جائے، جیسے مشرکین مکہ کا وتیرہ تھا اور بیعتِ رضوان کے موقع پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ میں آنے، عمرہ ادا کرنے اور عبادت و ذکرِ الٰہی سے روک دیا تھا۔

۲) امام قرطبی مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک صورت یہ بیان کی ہے کہ بدنیتی سے کسی مسجد کے متصل یا قریب ترین دوسری مسجد محض اس لئے بنائی جائے کہ وہ مسجد ویران اور غیر آباد ہو جائے اور ذاکرین، مصلّیان سے خالی ہو جائے جیسے ''منافقین مدینہ'' نے مسجد ضرار بنائی تھی۔

۳) یہ کہ سرے سے مسجد کو خدانخواستہ شہید کر دیا جائے اور مسمار کر دیا جائے، یہ ظالم ترین اور شقی القلب لوگوں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ جیسے نصاریٰ نے بخت نصر بابی مشرک کے ساتھ مل کر یہود کی عداوت میں ''بیت المقدس'' کو مسمار کرایا تھا اور اسے مردار خانے اور کوڑے اور گندگی کے ڈھیر

میں تبدیل کر دیا تھا۔ العیاذ باللہ! اسی طرح ماضی قریب میں ہندوستان میں ہندوؤں نے بابری مسجد کو شہید کیا، کشمیر میں درگاہ حضرت بل کو شہید کیا، یہود نے بیت المقدس کو آگ لگانے کی مذموم کوشش کی اور اب حال ہی میں استفتاء میں درج صورتحال کے مطابق آزاد کشمیر کے علاقہ ڈنہ پونچھی میر خان میں مسجد کو بم سے اڑا دیا۔

ایک اسلامی مملکت میں ایسے واقعات کا رونما ہونا انتہائی سنگین، اندوہناک اور المناک حادثہ ہے، یہ شعائر اللہ کی صریح توہین ہے، اور اگر متعلقہ حکومت نے ایسے لوگوں کی نشاندہی کر کے انہیں گرفتار کر کے قرار واقعی سزا نہ دی تو وہ بھی عند اللہ مسئول ہوں گے۔ یہ فعل حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ قرآن کی وعید اس پر شاہد ہے چونکہ ان لوگوں نے ''علی رؤس الاشہاد'' یعنی علانیہ طور پر یہ جرم قبیح کیا ہے اس لئے جن لوگوں نے مسلمانوں کی مسجد کو شہید کیا ہے ان پر ضروری ہے کہ توبہ کریں اور توبہ کی شرط یہ ہے کہ:

(۱) اظہارِ ندامت کیا جائے۔

(۲) آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزمِ مصمم کیا جائے۔

(۳) جو کچھ کیا ہے اس کا تدارک اور تلافی کی جائے، اس لئے ان لوگوں کی توبہ اس وقت صحیح ہوگی جب یہ لوگ اس مسجد کو پہلے کی طرح بنا دیں ورنہ صرف زبانی اظہارِ ندامت سے ان کی توبہ نہیں ہوگی اور جب تک یہ لوگ درج بالا شرائط کے مطابق توبہ نہ کریں مسلمان ان سے میل جول اور کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ فَتَمَسَّكُمُ ٱلنَّارُ (ہود: ۱۱۳)

''اور تم ظالموں سے میل جول نہ رکھو ورنہ تم کو بھی آگ جلائے گی''۔

یعنی قرآن نے تو ان کو ظالم کہا ہے اور دعائے قنوت میں ہے:

''جو تیری نافرمانی کرتا ہے ہم اس سے ترک تعلق کرتے ہیں۔'' یہ حکم اس صورت میں ہے جب انہوں نے گناہ سمجھ کر یہ قبیح کام کیا اور اگر اس کو جائز اور حلال سمجھ کر کیا ہے تو پھر ان کا ایمان جاتا رہا اور وہ مرتد ہو گئے اور ان کا نکاح باطل ہو گیا اور ان پر اس قبیح فعل سے براءت کا اظہار کر کے تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح لازم ہے۔

قرآن اور تلاوتِ قرآن کے آداب

سوال: آج تقریباً ہر اخبار، رسالے اور کتاب میں آیاتِ قرآنی درج ہوتی ہیں، ماشاءاللہ تعلیم القرآن اور حفظ القرآن کا ذوق بھی فروغ پا رہا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا ادب اٹھتا جا رہا ہے، اس لئے وہ روحانیت اور برکت پیدا نہیں ہوتی جو تعظیم قرآن کا تقاضا ہے، ازراہِ کرم اپنے کالم میں قرآن اور تلاوتِ قرآن کے آداب پر روشنی ڈالیں، شاید کسی کے دل میں بات اتر جائے، (مولانا علی عمران صدیقی۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: قرآن، کلام ربانی اور انسانیت کے لئے تا ابد صحیفۂ ہدایت ہے۔ لیکن یہ محض ایک قانون کی کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ کتابِ الٰہی انتہائی مقدس و محترم ہے۔ اسی لئے اللہ جل شانہٗ نے تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ تلاوت قرآن کو بھی ایک مستقل فریضۂ نبوت قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۲)

"اللہ وہ ہے جس نے اُمّی لوگوں کے درمیان انہی میں سے ایک عظیم رسول کو مبعوث فرمایا، جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، اور ان (کے قلوب) کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

اور فرمایا:

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (المزمل:۴)

"اور قرآن کو ٹھہراؤ کے ساتھ پڑھئے"۔

اس لئے تلاوتِ قرآن ایک مستقل سعادت و عبادت ہے۔ جب کوئی مومن قرآن مجید کی تلاوت کا ارادہ کرے تو اپنے منہ کو ہر قسم کی بدبو (پان، نسوار، تمباکو، لہسن و پیاز وغیرہ کے اثرات) سے پاک کر کے کسی پاک و صاف جگہ باوضو، باادب قبلہ رو بیٹھ کر تلاوت کرے، ہو سکے تو خوشبو بھی استعمال کرے، اگرچہ بے وضو تلاوت کرنا جائز ہے لیکن خلاف اولیٰ ہے۔ اگر تنہا ہو تو اونچی آواز سے تلاوت کرے، لیکن اگر مسجد میں اور لوگ بھی ہوں جو نماز، تلاوت اور اوراد و اذکار میں

مشغول ہوں یا گھر پر دنیوی کام کاج میں مشغول ہوں تو پھر آہستہ پڑھے، اجتماعی قرآن خوانی ہو رہی ہو تو بھی آہستہ پڑھیں۔ تلاوتِ قرآن کے دوران ادھر ادھر نہ دیکھے بلکہ مصحف شریف پر نظر رکھے، کیونکہ قرآن کو دیکھنا بھی عبادت ہے، یہی وجہ ہے کہ دیکھ کر پڑھنے کا اجر زبانی پڑھنے سے زیادہ ہے، بے وضو قرآن کو چھونا نہیں چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ:۷۹)

''اس کو پاکیزہ افراد ہی چھوتے ہیں''۔

حائض ونفاس والی عورت اور جنبی مرد (یعنی جن پر غسل واجب ہے یا جو ابھی پاک نہیں ہوئے) کے لئے قرآن پاک کو چھونا اور پڑھنا منع ہے، حائض عورت اگر معلمہ ہے تو چھوئے بغیر قرآن کے کلمات کو روانی کے بجائے الگ الگ کر کے بچوں کو پڑھائے۔ حائض اور جنبی قرآن کی کوئی آیت بطور دعا پڑھ سکتے ہیں، جیسے شکر کے موقع پر کوئی کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اسی طرح ان کے لئے کلماتِ تسبیح تہلیل، تحمید، تکبیر اور درود شریف پڑھنا جائز ہے۔ استنجا خانے، اٹیچڈ باتھ روم اور کسی بھی بے توقیر جگہ پر قرآن پڑھنا خلافِ ادب ہے۔ تلاوت شروع کرنے سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھے۔ اگر کوئی عورت مستحاضہ ہے (یعنی اس کا خون جاری رہتا ہے) یا کسی کو پیشاب کے قطرے ٹپکتے رہنے یا دائمی نکسیر یا کسی زخم سے خون یا پیپ رستے رہنے یا مسلسل غلبۂ ریاح کی شکایت ہے تو ایسے لوگ شرعاً معذور ہیں، یہ لوگ ایک نماز کے وقت کے لئے جب وضو کریں تو دوسری نماز کا وقت داخل ہونے تک ان شکایات کے جاری رہنے کے باوجود مسلسل نماز پڑھ سکتے ہیں اور تلاوت کر سکتے ہیں۔

قصداً قرآن کی توہین کفر ہے، لیکن اگر غیر ارادی طور پر غلطی سے یا بے خیالی میں قرآن مجید گر جائے تو اس کا کوئی مالی کفارہ نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں، اللہ معاف فرمانے والا ہے۔ قرآن کی طرف پاؤں کر کے بیٹھنا یا سونا خلافِ ادب ہے لیکن اگر قرآن قدموں کی جانب کسی الماری میں بند ہے یا بالائی طاق پر ہے تو کوئی جرم نہیں ہے۔ قرآن کو ترتیبِ مصحف کے مطابق پڑھنا چاہئے، خلافِ ترتیب پڑھنا منع ہے، لیکن اگر نماز میں بھول کر پڑھ لیں تو سجدۂ سہو نہیں ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنا سنت ومستحب ہے، البتہ اگر تلاوت ہو رہی ہو تو اس کا سننا واجب ہے۔ اگر متعدد کتب ہوں تو سب سے اوپر قرآن مجید، پھر تفسیر، پھر حدیث، پھر سیرت وفقہ

اور دوسری کتب نیچے رکھیں۔

نماز کے اندر قرأت میں غلطی کا مسئلہ

سوال: ایک امام صاحب مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے، انہوں نے ''سورۃ القارعہ'' کی قرأت شروع کی، جب فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ تک پہنچے تو اس کے بعد کی دو آیات بھول گئے اور ان سے آگے والی آیت فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ پڑھ لی۔ امام صاحب نے نماز مکمل کر کے سلام پھیر دیا، اور سجدہ سہو نہیں کیا۔ کیا نماز صحیح طور پر ادا ہوگئی، (محمد آصف۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: جی ہاں نماز صحیح طور پر ادا ہوگئی، کیونکہ مقدار واجب قرأت ادا ہوگئی، نہ کوئی اعراب کی غلطی ہوئی اور نہ ہی قرأت میں ایسے لفظوں کا اضافہ ہوا، جو قرآن کا حصہ نہ تھے۔ بس درمیان سے دو آیتیں رہ گئیں، باقی جو کچھ پڑھا وہ قرآن ہی ہے۔ فقہاء کرام نے قرأت میں ایسی غلطی، جس کی وجہ سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، کا ضابطہ یہ بیان کیا ہے کہ بھولنے کے بجائے اگر وہ دانستہ طور پر اس طرح پڑھے تو کفر لازم آجائے۔

فتاویٰ عالمگیری جلد نمبر 1، صفحہ نمبر 81 پر قراءت کی چند فاحش غلطیوں کا بطور مثال ذکر کرنے کے بعد لکھا:

وما اشبہ ذالک مما لہ لو تعمد بہ یکفر اذا قرأ خطأ فسدت صلوتہ فی قول المتقدمین۔

''اور ان جیسی غلطیاں کہ اگر وہ قصداً اس طرح پڑھتا تو اس کی تکفیر لازم آتی، اگر ان کو غلطی سے پڑھ لے تو متقدمین فقہاء کرام کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو جائے گی''۔

آگے چل کر لکھا: ''اور متقدمین کا فسادِ نماز (اور اعادۂ نماز) کے بارے میں یہ قول زیادہ احتیاط پر مبنی ہے''۔ یہی فقہی ضابطہ ''فتاویٰ شامی''، ''فتاویٰ خانیہ'' اور دیگر کتب فقہ میں بھی مذکور ہے۔ اس کے برعکس متاخرین فقہاء کرام نے کہا کہ چونکہ عام مسلمانوں سے اِعراب کی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں، وہ اِعراب یا الفاظ کی ایسی غلطیوں پر اکثر مطلع بھی نہیں ہوتے، اور اگر اعراب کی غلطیوں پر مطلع ہو جائیں تو معنیٰ کے فاسد ہونے کا انہیں علم نہیں ہوتا اس لیے عمومِ بلویٰ (یعنی لوگوں کے کثرت سے اس میں مبتلا ہونے) کی وجہ سے نماز ادا ہو جاتی ہے۔ تاہم جب نماز کے

فاسد ہونے کی وجہ معلوم ہو جائے تو احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نماز کا دہرانا ہی بہتر ہے۔

مستحب پر دوام

سوال: بعض لوگ عبادات میں مستحبات پر اتنا التزام کرتے ہیں، اتنا زور دیتے ہیں اور اتنا اہتمام ودوام کرتے ہیں کہ لگتا ہے انہیں فرض یا واجب کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ کیا ان لوگوں کا یہ رویہ اور طرزِ عمل درست ہے، (سید عمران علی، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)۔

جواب: ہر معقول شخص اپنے لباس، وضع قطع، رہن سہن، اکل وشرب اور بود و باش میں ترتیب، تزئین اور تحسین کو پسند کرتا ہے اور یہ فطرتِ سلیم کا تقاضا بھی ہے، بشرطیکہ یہ وجوہِ تحسین وتزئین شریعت کے دائرے میں ہوں اور اللہ جل شانہٗ اور اس کے رسول ﷺ کی مقررہ حدود کے اندر ہوں۔ اسی طرح عبادات اور اعمال دینیہ میں بھی بعض امور وجوہِ تحسین میں شمار ہوتے ہیں، انہیں آداب ومستحبات کہا جاتا ہے اور ان کا درجہ فرائض، واجبات اور سنن کے بعد آتا ہے۔ ان کے اہتمام سے عبادت کی اعلیٰ معیار پر تکمیل ہوتی ہے اور اس میں روحانی اور معنوی حسن پیدا ہوتا ہے، مثلاً آپ نماز پڑھیں تو حالتِ قیام میں نگاہیں مقام سجدہ پر مرکوز رکھیں، لباس اور بدن کے ساتھ نہ کھیلیں، اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضوری کا تصور طاری کریں تاکہ دل میں خشیتِ الٰہی پیدا ہو اور ذہن نماز سے کسی اور چیز کی طرف منتقل ہی نہ ہو۔ نماز کے انتظار میں باادب صف بستہ ہو کر بیٹھیں اور جب اقامت کہی جائے تو ''حی علی الصلوۃ، حی علی الفلاح'' پر کھڑے ہو جائیں۔ اگر بھوک کی شدید خواہش یا پیشاب کی حاجت ستا رہی ہے تو ان حاجات کی تکمیل کر کے نماز شروع کریں، بشرطیکہ وقت میں گنجائش ہو تاکہ نماز میں یکسوئی نصیب ہو، وغیرہ۔

مستحب کے معنی ہیں ''پسندیدہ بات''، ''دل پسند چیز''، ایک روایت میں آیا ہے کہ: ''(صحیح العقیدہ وسلیم الفطرت) ''مسلمان جس چیز کو پسندیدہ اور اچھی سمجھیں، اسے اللہ تعالیٰ بھی پسند فرماتا ہے۔'' اعمالِ حسنہ میں دوام وہمیشگی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، حدیث پاک میں ہے: ''جن اعمال کو دوام اور پابندی کے ساتھ کیا جائے، وہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں، خواہ وہ مقدار میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔'' لہٰذا اگر کوئی شخص یا افراد عبادات واعمال اور اطوارِ حیات میں آداب ومستحبات کا اہتمام والتزام کرتے ہیں اور انہیں ہمیشہ پابندی کے ساتھ کرتے ہیں، تو یہ روش ایسی ہے، جس کی تحسین

(Appreciation) کی جانی چاہئے تا کہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب ہو، نہ کہ اسے نشانہ بنایا جائے، بشرطیکہ کوئی اسے فرض و واجب سمجھ کر نہ کر رہا ہو۔

البتہ اگر کوئی شخص ''آداب و مستحبات'' میں کسی امرِ مستحب پر اپنے کسی عذر، مصروفیت یا مجبوری کی بناء پر عمل نہیں کرتا، تو ترکِ مستحب پر اسے ملامت نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ترکِ مستحب پر ملامت کرنا، اسے فرض یا واجب قرار دینے کے مترادف ہے اور یہ ہمارا منصب نہیں، شارع کا منصب ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ کوئی شخص کسی امر مستحب کو حقیر سمجھ کر نہ چھوڑے، یہ روش قلبی شقاوت کا مظہر ہوگی، کم ہمتی سے چھوڑنا الگ بات ہے۔ بہرکیف اسلام ایک متوازن اور معتدل دین ہے، ہمیں افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال و توازن پر کاربند رہنا چاہئے، یہی عادت اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

مسجد نبوی ﷺ میں چالیس نمازوں کی فضیلت

سوال: ایک حدیث نبوی کا مفہوم مشہور ہے کہ جس نے میری مسجد میں چالیس نمازیں ادا کیں، اس پر میری شفاعت واجب ہے، اس حدیث کا حوالہ بیان فرمائیں''۔

(عبدالحیٔ انصاری، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: حضرت امام احمد بن حنبل نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس بن مالک سے مندرجہ ذیل حدیث بیان فرمائی ہے:

عن انس بن مالک عن النبی ﷺ انه قال من صلی فی مسجدی اربعین صلوٰۃ لا یفوته صلوٰۃ کتبت له براء ۃ من النار ونجاۃ من العذاب و بریٔ من النفاق.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے میری مسجد میں چالیس نمازیں (اس تسلسل کے ساتھ) پڑھیں کہ اس کی ایک بھی نماز فوت نہ ہوئی ہو، تو اس کے لیے جہنم سے آزادی، عذاب سے نجات اور نفاق سے براءت (کا پروانہ) لکھ دیا جائے گا''۔ (مسند امام احمد بن حنبل، ج ۳، ص ۱۵۵)

اس حدیث مبارک کی رو سے مسجد نبوی میں چالیس نمازیں مسلسل پڑھنے کا بڑا اجر ہے اور

اس کے لیے نار جہنم سے براءت، عذاب سے نجات اور نفاق سے براءت کی ضمانت ہے۔
اور چالیس کے عدد میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض برکات ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من رجل مسلم یموت فیقوم علی جنازته اربعون رجلا لا یشرکون باللہ شیأ الا شفعهم اللہ فیه۔

جب کوئی مسلمان وفات پا جائے اور اس کی نماز جنازہ میں ایسے چالیس افراد شریک ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوں تو اللہ تعالیٰ اس (میت) کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرمالے گا"۔

(صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ، باب المشی بالجنازۃ والصلوٰۃ علیہا)

امام یحیٰی بن شرف الدین نووی نے "اربعین النوویہ" میں حضرات علی، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابوالدرداء، ابن عمر، ابن عباس، انس بن مالک، ابوہریرہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم سے کئی طریقوں سے، مختلف قسم کی روایات میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من حفظ علیٰ امتی اربعین حدیثا من امر دینها بعثه اللہ یوم القیمة فی زمرة الفقهاء و العلماء، و فی روایة "بعثه اللہ فقیها عالماً" و فی روایة ابی الدرداء: و کنت له یوم القیمة شافعا و شهیدا، و فی روایة ابن مسعود: قیل لهٗ اد خل من ای ابواب الجنة شئت۔

"جو میری امت کے لیے اس کے دینی امور سے متعلق چالیس حدیثیں یاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے فقہاء و علماء کی جماعت میں اُٹھائے گا، ایک روایت میں ہے اللہ تعالیٰ اسے فقیہ عالم اٹھائے گا، ابوالدرداء کی روایت میں ہے: میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کرنے والا اور گواہ ہوں گا اور ابن مسعود کی روایت میں ہے: اس سے کہا جائے گا تم جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جاؤ، وغیرہ"۔
یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے، لیکن فضائل اعمال میں ضعیف احادیث بھی معتبر ہوتی ہیں۔

سلام پڑھنے کی منت

سوال: زید نے منت مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں ایک لاکھ مرتبہ سلام پڑھوں گا، اب

کام ہو جانے کے بعد زید نے پڑھا کہ ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' صرف اتنا پڑھ کر زید اپنی منت سے بری ہو جائے گا یا نہیں۔ جیسے زید کہے کہ میں تین مرتبہ سبحان اللہ کہتا ہوں، تو یہ تین مرتبہ ہوگا یا ایک مرتبہ۔ (محمد علی قادری، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: شرعاً کسی بندۂ مومن کا ایک ایسی عبادتِ مقصودہ (جیسے نماز، صدقہ وغیرہ) کو اپنے اوپر لازم کرنا، جسے شارع نے اس پر بطور (فرض یا واجب) لازم نہیں کیا، نذر کہلاتا ہے۔ نذر کی مشروعیت اور اس کا لزوم قرآن وسنت سے ثابت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ جس چیز یا بات کی نذر مانی جارہی ہے اس کی جنس سے کوئی عبادت شارع کی طرف سے فرض یا واجب ہو، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔ شرعاً اگرچہ نذر کا پورا کرنا واجب ہے لیکن نذر ماننا پسندیدہ اور مستحسن بات نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے:

عَنْ ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال: لا تنذِروا فان النذر لا يغنی من القدر شيئاً و انما يستخرج به من البخيل۔

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''نذر مت مانا کرو، کیونکہ نذر تقدیر کو ٹال نہیں سکتی، یہ صرف بخیل سے مال نکالنے کا ذریعہ ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۴۱۲۸)

اس حدیث مبارک کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شرعاً نذر ماننا منع ہے اور معصیت ہے بلکہ اس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، مثلاً

(ا) یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح کا معاملہ کرنا بندگی کے شایانِ شان نہیں ہے کہ بندہ اپنے خالق و مالک سے یہ کہے کہ اے اللہ! اگر میرا یہ کام بن گیا تو اتنے نوافل پڑھوں گا یا اتنا صدقہ دوں گا یا اتنے روزے رکھوں گا، اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ خدانخواستہ کام نہ بنا تو میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا۔ یہ اندازِ فکر مقامِ بندگی کو زیب نہیں دیتا بلکہ کمالِ بندگی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے جو عملِ خیر اپنے رب کے حضور نذرانۂ بندگی کے طور پر پیش کر سکتا ہے، کرلے اور پھر اس عملِ خیر کے صدقے، وسیلے اور برکت سے اپنی حاجت روائی کے لیے اللہ سے دعاء مانگے۔ یہ طرزِ عمل نذر ماننے کے بہ نسبت اعلیٰ و اولیٰ ہے۔

(ب) یہ کہ یہ اعتقاد نہ رکھے کہ نذر اللہ کی تقدیر کو بدل دے گی، بلکہ اسے بھی ''تقدیرِ معلق'' کے طور

پرتابع تقدیر سمجھے اور جس طرح دنیا میں ظاہری طور پر ہم نتائج کی نسبت اسباب کی طرف کرتے ہیں کیونکہ یہ عالمِ اسباب ہے، مثلاً فلاں طبیب یا فلاں دوا سے مجھے شفاء ملی، لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اسباب تو ایک ظاہری وسیلہ ہیں ورنہ معاملات و امور کے وجود میں آنے میں مؤثر بالذات اللہ کی مشیت ہے، یہی عقیدہ نذر کے بارے میں بھی ہونا چاہئے۔

(ج) یہ کہ یہ نذر ماننے کے بعد اس کے پورا نہ کرنے میں سستی اور غفلت و کوتاہی پر وعید ہے۔

رسول اللہ ﷺ پر سلام چونکہ تشہد (یعنی نماز میں التحیات) کا جزء لازم ہونے کی بنا پر واجب ہے اور فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ آیتِ درود (سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۵۶) کی رو سے کم از کم ایک بار زندگی میں صلوٰۃ و سلام پڑھنا فرض ہے، لہٰذا اس کی نذر ماننا بھی جائز ہے اور اس کی تعمیل واجب ہے۔

لیکن ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' پڑھنے سے صرف ایک بار سلام شمار ہوگا۔ ایک لاکھ بار نہیں، جیسے کوئی یہ کہے کہ ''سبحان الله مائة مرة'' (یعنی سو بار سبحان اللہ) تو ایک بار سبحان اللہ کہنے کا ثواب ملے گا۔ علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

ولو نذران يصلي على النبي صلى الله عليه وسلم كل يوم كذا لزمه و قيل لا۔

''اور اگر کسی نے نذر مانی کہ وہ ہر روز نبی ﷺ پر اتنی بار درود پڑھے گا (یعنی تعداد معین کی)، تو اس پر اس نذر کو پورا کرنا لازم ہے اور ایک قول یہ ہے کہ لازم نہیں''۔

یعنی قولِ مختار یہی ہے کہ درود و سلام کی نذر کا پورا کرنا لازم ہے اور عدمِ لزوم کا قول ضعیف اور غیر مختار ہے، تاہم اس کی توجیہ میں علامہ ابن عابدین شامی، حموی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

(و قيل لا) لعل وجهه اشتراط كون الفرض قطعياً۔

''یعنی اسی نذر کے پورا کرنے کا عدمِ لزوم ان کے نزدیک ہوگا جن کے نزدیک نذر کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کی جنس سے کوئی عبادت فرض قطعی ہو، (لیکن مختار یہ ہے کہ اس کی جنس سے کوئی عبادتِ مقصودہ فرض یا واجب ہو)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد ۵ صفحہ ۴۱۶، طبع جدید)

نماز باجماعت کی صف بندی میں بچوں کا مقام

سوال: آپ کے اس مفید اور علمی صفحے کے ذریعے میں آپ کی توجہ دو اہم مسائل کی طرف

دلانا چاہتا ہوں ۔ پہلا یہ کہ آج کل کی بزرگ نسل کو اپنی نئی نسل یا پود سے یوں تو بہت ساری شکایات ہیں لیکن بڑی شکایت یہ ہے کہ نئی نسل اپنے دین سے بیگانہ ہے اور مساجد ویران رہتی ہیں لیکن ہم نے کبھی ان کی وجوہات جاننے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی ہے وہ یہ کہ ہم بڑوں کا رویہ اس معاملے میں ٹھیک نہیں ہے۔ خاص طور پر جمعے کے دن بچے سب سے پہلے نہا دھو کر تیار ہو کر مسجد میں آجاتے ہیں بڑے لوگ عام طور پر وقت کے وقت پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ جماعت کھڑی ہونے کے وقت امام صاحب خاص طور پر یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ تمام بچے پچھلی صف میں چلے جائیں تو عام طور پر ہمارے جیسے چھوٹے علاقے کی چھوٹی مسجد کی آخری صف دراصل مسجد کے باہر ہوتی ہے، اس اعلان پر لوگ فوری طور پر عمل کرتے ہیں اور گرمی ہو یا سردی بچوں کو اگلی صفوں سے نکال کر پیچھے کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بچے جو بڑی خوشی خوشی نماز پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں ۔ عام نمازوں میں بھی یہ ہوتا ہے کہ بچے جو کہ بڑے نمازیوں کی صف چھوڑ کر ان سے پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں بعد میں آنے والے بڑے ان کو نیت بندھی حالت میں کھسکاتے ہوئے پیچھے پہنچا دیتے ہیں جس سے میرے خیال میں ان کے دل و دماغ پر مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے بارے میں کوئی زیادہ اچھا اثر نہیں پڑتا۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ بڑے نمازی وقت سے پہلے خاص طور پر جمعے کے دن پہنچنے کی کوشش کریں اور جب جماعت کھڑی ہو تو چھوٹے بچوں کو صفوں کے دائیں بائیں کھڑا کیا جائے نہ کہ سب سے پیچھے یا مسجد سے باہر۔ آپ مجھے اور دوسرے قارئین کو یہ بتلائیے کہ ہمارا مذہب ہمارا دین جو کہ آسانیاں پہنچانے والا اور انتہا پسندی سے روکنے والا مذہب ہے وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے''۔

(ایس۔این اقبال، سرجانی ٹاؤن۔کراچی)

جواب: عام کتبِ فقہ میں نماز کی صفوں کی ترتیب اس طرح درج ہے:

ویصف الرجال ثم الصبیان ثم النساء لقولہ علیہ السلام لیلینی منکم اولوالاحلام والنھیٰ۔

''اور پہلے مردوں کی صفیں ہوں پھر بچوں کی اور پھر عورتوں کی' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا

فرمان ہے: (جماعت میں) میرے قریب بالغ اور عقلمند ہونے چاہئیں"۔
(ہدایہ اولین صفحہ ۱۰۳)

درمختار میں ہے:

(الرجال) ظاهره یعم العبید (ثم الصبیان) ظاهره تعددهم، فلو واحدا دخل الصف۔

"(نماز کی صفوں کی ترتیب میں پہلے) مرد ہوں گے، بظاہر یہ غلاموں کو بھی شامل ہے، پھر بچے، بظاہر یہ اس صورت میں ہے کہ ان کی تعداد زیادہ ہو، اور اگر ایک ہی بچہ ہو تو (مردوں کی) صف میں شامل ہو جائے گا"۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"البحر الرائق میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرمایا: اور اسی طرح اگر مقتدی صرف ایک مرد اور ایک بچہ ہوں تو وہ دونوں امام کے پیچھے اکٹھے صف بنا کے کھڑے ہوں گے، کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اور یتیم نے آپ کے پیچھے صف بنائی اور بڑھیا ہمارے پیچھے تھیں، اور ایک بچے کا مسئلہ ایک عورت کے مسئلے سے مختلف ہے، کیونکہ عورتیں ایک ہوں یا زیادہ حدیث مذکور کی بناء پر بہر صورت پیچھے الگ صف میں کھڑی ہوں گی"۔

(ردالمحتار جلد نمبر ۲ صفحہ ۲۷۰۔۲۶۹۔ داراحیاء التراث العربی بیروت)

حدیث پاک کی روشنی میں پہلی صف میں امام کے پیچھے وسطِ صف میں ایسے عاقل و بالغ اور متشرع افراد ہونے چاہئیں جو کسی ہنگامی صورت میں امام کی نیابت کر سکیں۔ باقی ترجیحی ترتیب تو یہی ہے کہ پہلے مردوں کی صفیں ہوں اور پھر بچوں کی، لیکن مذکورہ بالا فقہی عبارت سے ظاہر ہے کہ بوقتِ ضرورت جب کہ اگلی صفیں نامکمل ہوں تو بچے بڑوں کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اگر اگلی صفیں نامکمل تھیں اور بچے درمیان میں آ کر شامل ہو گئے تو بعد میں انہیں نکال کر پیچھے بھیجنا مروت کے خلاف ہے۔

آج کل عام طور پر مشاہدے میں آیا ہے کہ بچوں کو بالکل الگ تھلگ کر کے آخری صف میں کھڑا کر دیا جائے تو وہ دورانِ نماز شرارتیں کرتے ہیں اور اس طرح سارے نمازیوں کی یکسوئی اور حضورِ قلبی میں خلل واقع ہوتا ہے، اگر انہیں بڑوں کے درمیان کھڑا کیا جائے تو زیادہ باادب ہو کر

پڑھتے ہیں اور بڑوں سے سیکھتے بھی ہیں۔ اور جب بچے نیت باندھ کر آگے کی صف میں کھڑے ہو جائیں تو انہیں گھسیٹ کر پیچھے کرنا آدابِ نماز کے منافی ہے اور اگر اس کا سینہ قبلے سے پھر گیا یا وہ چل کر پیچھے آیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ لیکن یہاں ایسے بچے مراد ہیں جو باشعور ہوں، نماز اور مسجد کے آداب کو سمجھتے ہوں۔

بعض لوگ ایسے کم عمر اور ناسمجھ شرارتی بچوں کو اپنے ساتھ مسجد میں لے آتے ہیں، جو مسجد میں اِدھر اُدھر دوڑتے ہیں، نمازیوں کے آگے سے بے دھڑک گزرتے ہیں، شور مچاتے ہیں، کبھی جماعت کے دوران رونے لگ جاتے ہیں، کبھی پیشاب بھی کر لیتے ہیں اور آج کل مساجد میں بالعموم قالینیں بچھی ہوتی ہیں، جن کو پاک کرنا کافی دشوار ہوتا ہے، تو ایسے بچوں کو مسجد میں لانا ہی شرعاً منع ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

جنبوا مساجدكم صبيانكم و مجانينكم و بيعكم وشرائكم و رفعَ اصواتكم وسلَّ سيوفكم واقامة حدودكم و جمروها في الجمع واجعلوا على ابوابها المطاهرة۔

''اپنی مسجدوں کو (ناسمجھ) بچوں، پاگلوں، لین دین کے معاملات، شور و شغب، لڑائی جھگڑے اور (مساجد کے اندر) حدودِ شرعی کے قیام سے بچا کر رکھو، اور جمعہ کے دن انہیں کسی خوشبودار چیز کی دھونی دو اور ان کے دروازوں پر (پانی کے) ایسے برتن رکھ دیا کرو (جن کے ذریعے صفائی کی جا سکے''۔ (ابن ماجہ رقم الحدیث ۷۵۰/۳)

درمختار میں ہے:

ويحرم ادخال صبيان و مجانين حيث غلب تنجيسهم، والا فيكره۔

''اور بچوں اور فاترالعقل لوگوں کا مسجد میں داخل کرنا حرام ہے کیونکہ اکثر وہ ناپاک ہوتے ہیں، اور اگر ناپاک نہ ہوں تو مکروہِ تنزیہی ہے''۔

(فتاویٰ شامی ج ۲ ص ۳۷۱، داراحیاء التراث العربی)

یہاں حرام سے مراد مکروہِ تحریمی ہے۔ ہمیں بچوں کے معاملے میں افراط و تفریط سے بچنا چاہئے، ناسمجھ اور شعورِ آدابِ مسجد سے عاری کم عمر بچوں کو مسجد میں لے کر نہیں آنا چاہئے اور باشعور و باادب بچوں کی حوصلہ شکنی بھی نہیں کرنی چاہئے، اگر وہ صفوں کے درمیان پہلے سے موجود

ہیں تو انہیں گھسیٹ کر پیچھے نہیں کرنا چاہئے، یہ مروت اور بزرگانہ شفقت کے خلاف ہے، وہ بڑوں کے درمیان کھڑے ہوں گے تو باادب رہیں گے اور بڑوں سے سیکھیں گے۔

صلوٰۃِ قصر کا مسئلہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ:

ہم لوگ کراچی کے مستقل رہائش پذیر ہیں۔ روزگار کے سلسلے میں تقریباً ۱۰۰ میل کی مسافت پر دیوان فاروق موٹرز کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ ہماری چھٹی کا سیٹ اپ کچھ اس طرح ہے کہ ہم پیر کی صبح کراچی سے آتے ہیں اور ہفتہ کی دوپہر واپس کراچی آجاتے ہیں۔ کراچی میں ہمارا قیام تقریباً ایک روز کا ہوتا ہے، باقی چھ دن ہم مستقل طور پر دیوان سٹی میں ہی رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہم دیوان موٹر کمپنی میں مستقل ملازم ہیں۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال سے جاری ہے۔

آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ ہم پر نماز قصر فرض ہے یا پوری نماز فرض ہے؟

دوسرا یہ کہ ہم کراچی میں قصر ادا کریں یا دیوان سٹی میں یا دونوں جگہ مکمل نماز ادا کریں؟

اکثر علماء سے ہم نے یہ مسئلہ معلوم کیا ہے، کچھ کی رائے میں ہم مسافر ہیں کچھ کی رائے میں مقیم۔ واضح کیا جائے کہ ہم مسافر ہیں یا مقیم؟

ملازمت مستقل ہے اور کمپنی کی طرف سے اتوار کی چھٹی ہوتی ہے، ہم لوگ گھر چلے آتے ہیں پھر پیر کو واپس چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اتوار کو بھی کام کے لئے روک لیتے ہیں؟

(سائل: محمد شاہد اعوان ہزاروی اینڈ دیوان سٹی ورکرز، سجاول۔ ضلع ٹھٹھہ)۔

جواب: کراچی تو آپ لوگوں کا وطنِ اصلی ہے، لہٰذا آپ جب بھی کراچی میں ہوں گے، پوری نماز پڑھیں گے، خواہ کراچی میں آپ کا قیام کم وقت کے لئے ہو یا زیادہ وقت کے لئے۔ باقی دیوان سٹی (یعنی دیوان فاروق موٹر کمپنی) کراچی سے سو میل کی مسافت پر ہے، اور کم از کم مسافت سفر، جس پر نماز میں قصر کرنا واجب ہے، ۶۱ میل ۲ فرلانگ ۲۰ گز یا ۹۸٫۷۳۴ کلومیٹر ہے، لہٰذا دیوان سٹی کے لئے جب آپ سفر کریں گے تو قصر پڑھیں گے، اور جب تک کسی مقام پر بندہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ عرصے کے لئے قیام کی نیت نہ کرے، شرعاً مسافر ہی رہے گا، مقیم نہیں ہوگا۔ چونکہ آپ لوگ ہفتے میں چھ دن دیوان سٹی میں قیام کرتے ہیں، لہٰذا اس عرصے میں

آپ مسافر ہی رہتے ہیں اور آپ کو نماز قصر ہی پڑھنی ہوگی، کبھی کبھی مالکان کی طرف سے اتوار کو رد کے جانے سے سفر کا شرعی حکم تبدیل نہیں ہوگا۔

احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''نوکری ملازمت ہے اس میں قصد استدامت ہوتا ہے تو جو جہاں نوکر ہو کر رہنا اختیار کرے مقیم ہو جائے گا۔ اگر چہ بالخصوص پندرہ دن کی نیت نہ ہو **لان نیة الاستدامة فوق ذلک** (کیونکہ استدامت نیت سے فوقیت رکھتی ہے)

ہاں اگر مدتِ سفر سے یہاں نوکر ہو کر آیا اور معلوم ہے کہ پندرہ دن ٹھہرنا ہوگا تو البتہ مقیم نہ ہوگا، جب اس دوسری جگہ سے فارغ ہو کر آئے گا اور یہاں ملازمانہ قیام کرے گا اس وقت سے مقیم ہوگا۔

کما قال فی ردالمحتار فی واقعة عیسی بن ابان رحمہ اللّٰہ تعالیٰ ان نیة الاقامة لم تعمل عملها الا بعد رجوعه لوجود خمسة عشر یوما بلانیة خروج فی اثنائها بخلاف ماقبل خروجه الی عرفات لانه لما کان عازما علی الخروج قبل تمام نصف شهر لایصیر مقیما۔

جیسا کہ ردالمحتار میں شیخ عیسیٰ بن ابان رحمہ اللہ تعالیٰ کے واقعہ میں ہے کہ نیت اقامت مؤثر نہیں مگر رجوع کے بعد، کیونکہ پندرہ دنوں کی نیت ہے اور اس میں نکلنے کی نیت بھی نہیں بخلاف عرفات کی طرف نکلنے سے پہلے کے کیونکہ جب نصف ماہ کے اتمام سے پہلے نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ مقیم نہیں ہوگا۔

اور جبکہ ایک جگہ نوکر ہو کر رہے اور پندرہ دن کے اندر وہاں سے دوسری جگہ جانا معلوم نہ ہو تو صرف احتمال قاطع اقامت نہ ہوگا ورنہ کوئی وطن اقامت نہ ہو سکے اور اپنے وطن سے مدت سفر پر جو لاکھوں آدمی نوکر ہوتے اور برسوں وہاں رہتے ہیں کبھی مقیم نہ ہوں کہ بدلی یا کسی کام پر بھیجے جانے کا احتمال ہر وقت ہے، (فتاوٰی رضویہ، ج ۸ ص ۲۶۵۔ ۲۶۳ رضا فاؤنڈیشن۔ لاہور)۔

امام احمد قادری نے لکھا کہ ''نوکری ملازمت ہے، اس میں قصد استدامت (لمبے عرصے کیلئے ٹھہرنا) ہوتا ہے، تو جہاں نوکر ہو کر رہنا اختیار کرے، مقیم ہو جائے گا، اگر چہ بالخصوص پندرہ دن کی نیت نہ ہو، کیونکہ کسی جگہ لمبے عرصے تک رہنے کی نیت بالخصوص پندرہ دن قیام کی نیت سے فوقیت رکھتی ہے۔'' اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کسی مقام پر ملازم ہو کر ٹھہر جاتا ہے

تو بظاہر اس کا لمبے عرصے کے لئے ٹھہرنے کا ارادہ ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ لمبے عرصے کے لئے ٹھہرنے کی نیت محض پندرہ دن قیام کی نیت سے زیادہ مؤثر ہے۔

لیکن سائل کے استفتاء میں صورت حال مختلف ہے، انہیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ اختتامِ ہفتہ وہ کراچی واپس آجائیں گے، یہاں ابتداءً ہی استدامت (لمبے عرصے کے لئے ٹھہرنے) کی نیت نہیں ہے، لہٰذا یہ لوگ شروع ہی سے مسافر ہیں اور قصر پڑھیں گے، ان کے بقول صرف یہ احتمال ہے کہ کبھی مالکان اتوار کے لئے بھی کام پر روک لیتے ہیں، تو امام احمد رضا قادری نے لکھا کہ: ''اور جب کہ ایک جگہ نوکر ہو کر رہے اور پندرہ دن کے اندر وہاں سے دوسری جگہ جانا معلوم نہ ہو، صرف احتمال قاطعِ اقامت نہ ہوگا''۔ یعنی جب کسی جگہ ملازمت اختیار کر لی ہے اور بظاہر لمبے عرصے رہنے کا ارادہ ہے تو صرف اس احتمال سے حکم اقامت ختم نہیں ہوگا کہ پندرہ دن کے اندر وہاں سے جا بھی سکتے ہیں۔ اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جب پہلے سے معلوم ہے کہ اختتام ہفتہ کراچی جانا ہے تو شروع ہی سے مسافر ہے اور قصر پڑھے گا، اور محض یہ احتمال کہ کارخانے کے مالکان اتوار کو روک بھی لیتے ہیں، اس سے حکمِ سفر وقصر اور عدمِ اقامت ختم نہیں ہوگا اور یہ لوگ ''دیوان سٹی'' میں قصر ہی پڑھیں گے۔

سنتوں کی قضا

سوال: اگر عذر یا کوتاہی کی بناء پر کسی وقت کی نماز رہ جائے تو اس وقت کی قضا پڑھتے وقت سنتوں کی قضا بھی پڑھی جائے گی یا نہیں، اور اگر کسی کی فجر کی نماز قضا ہو جائے تو صرف فرض کی قضا پڑھے یا سنتوں کی بھی، (فیصل ندیم احمد قادری، شاہ فیصل کالونی)۔

جواب: سنتوں کی قضا لازم نہیں ہے، اگر خدانخواستہ مثلاً کسی شخص کی ظہر یا عصر یا مغرب کی نماز رہ گئی ہے تو وہ اب صرف فرض کی قضا کرے گا، سنتوں کی نہیں۔ تاہم فجر کی دو سنتیں باقی اوقات کی سنتوں کے مقابلے میں زیادہ مؤکد ہیں، اس لئے بعض نے انہیں واجب کے قریب قرار دیا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی فجر کی نماز رہ گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسی دن زوال سے پہلے قضا پڑھ لیتا ہے تو فرض اور سنت فجر دونوں کی قضا کرے، لیکن اگر تنگیٔ وقت یا جماعت چلے جانے کے خوف سے فرض پڑھ لئے تھے اور سنتیں رہ گئی تھیں تو اب صرف سنتوں کی قضا نہیں کرے گا۔

درمختار میں ہے:

(وتقضیٰ) اذا فاتت معه، بخلاف البواقی۔

''اور فجر کی سنتوں کی قضا پڑھی جائے گی جبکہ فرضوں کے ساتھ فوت ہو جائیں، بخلاف باقی سنتوں کے (کہ ان کی قضا لازم نہیں ہے)''

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(وتقضی) ای الی قبیل الزوال، قوله "معه" تنازعه "تقضیٰ وفاتت" فلا تقضیٰ الامعه حیث فات وقتها، واما اذا فاتت وحدها فلا تقضیٰ، ولا تقضیٰ قبل الطلوع ولا بعد الزوال ولو تبعا علی الصحیح۔

''یعنی اگر فجر کی قضا زوال سے پہلے پہلے پڑھی جائے تو سنتوں کی قضا بھی پڑھی جائے گی، ''تقضیٰ'' اور ''فاتت'' دونوں افعال کا ''معہ'' کے ساتھ تعلق ہے، یعنی فجر کی سنتوں کی قضا نہیں ہے، مگر جبکہ (اسی دن زوال سے پہلے) فرضوں کے ساتھ پڑھے جائیں تو قضا ہے، کیونکہ ان کا وقت فوت ہو چکا ہے، لیکن اگر تنگی وقت یا جماعت کے چھوٹ جانے کے خوف سے فجر کے فرض پڑھ لیے گیے ہوں اور) صرف سنتیں رہ گئی ہوں تو ان کی قضا نہیں ہے، نہ طلوع سے پہلے اور نہ ہی زوال کے بعد، تو صحیح قول کے مطابق (زوال کے بعد) فرضوں کی متابعت میں بھی سنتوں کی قضا نہیں ہے، (ردالمحتار، جلد ۲، ص ۹۵ ۳دار حیاء التراث العربی)''۔ (بقیہ جواب صفحہ 415 پر)

مرضِ ریاح میں نماز کی ادائیگی

سوال: ریح خارج ہونے کے سبب اگر وضو زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے تو نماز کیسے پڑھیں؟

(لئیق، جیکب لائن۔ کراچی)

جواب: اگر یہ شکایت کبھی کبھار پیدا ہو تو ہر بار تازہ وضو کر کے نماز پڑھیں، نماز کے دوران ہو جائے تو فوراً نماز چھوڑ کر چلے جائیں اور تازہ وضو کر کے اسی پر بنا کر کے نماز مکمل کر لیں یا ازسرنو پڑھ لیں۔ لیکن غلبۂ ریاح یا کثرتِ ریاح کا عارضہ اتنا شدید ہو کہ ایک وقت کی نماز پڑھنا بھی دشوار ہو جائے اور ایسا مسلسل یا بار بار ہوتا ہو تو یہ ایک بیماری ہے اور ایسا شخص شرعاً معذور ہے۔ اسے چاہئے کہ ایک فرض نماز کے وقت کے لئے تازہ وضو کر لے اور اس وضو سے اس وقت کے

اندر جتنی فرض یا نفل نمازیں چاہے پڑھ سکتا ہے اور تلاوت بھی کرسکتا ہے، خواہ ریح خارج ہوتی رہے، بس نئے وقت کی نماز کے لئے تازہ وضو کرنا پڑے گا، یہی حکم اس کا ہے جسے مسلسل پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا زخم سے خون یا پیپ رستی ہو۔

قرآن کی تلاوت کے دوران 'ن' آجائے تو کس طرح پڑھیں

سوال : قرآن مجید کی تلاوت کے دوران بعض جگہ چھوٹا سا ''ن'' لکھا ہوتا ہے، اسے کس طرح پڑھا جائے، جیسے سورۂ ''هُمَزة'' میں وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۨالَّذِي۔

(مسز سرور مظہر۔ ڈیفنس فیز II)

جواب: اگر ''هُمَزة،، پر وقف کریں تو ''اَلَّذِیْ'' پڑھیں گے، اور اگر ملا کر پڑھیں وقف نہ کریں تو ''ن'' پڑھیں گے، یعنی لُّمَزَةِ ۨالَّذِي۔

عورتوں کی جماعت

سوال: اگر عورتیں مل کر جماعت کا اہتمام کریں اور ایک عورت ان کی امامت کرے، تو کیا اس طرح خواتین کا باجماعت تراویح پڑھنا جائز ہے،

(نسیم ناصر، گلشن اقبال۔ عبدالروف، کلفٹن۔ سلطانہ بیگم، کلفٹن۔ محمد طیب، ناظم آباد)

جواب: مردوں کے لئے عورت کا امام بننا بالاجماع باطل ہے۔ عورت کا عورتوں کی امامت کرنے کے بارے میں یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک جائز نہیں ہے، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے نزدیک جائز ہے، فقہ حنفی میں مکروہ تحریمی ہے۔ بعض احادیث مبارکہ میں عورت کی امامت کا تذکرہ ملتا ہے۔ سنن ابی داؤد، سنن کبریٰ بیہقی اور المستدرک للحاکم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام ورقہ انصاریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر پر امامت کی اجازت دی تھی اور ان کے لئے ایک بوڑھے شخص کو مؤذن مقرر کیا تھا۔ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ چلو شہیدہ کے پاس جائیں اور ان کی زیارت کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ بشارت پوری ہوئی اور عہدِ خلافت فاروقی میں ان کے مُدبّر (جسے مالک یہ کہہ دے کہ تو میری موت کے بعد آزاد ہے) غلام اور باندی نے انہیں شہید کردیا۔ فقہاءِ احناف میں سے علامہ کمال الدین ابن ہمام نے فتح القدیر میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ احادیث کی توجیہ بھی کی ہے۔

ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کے لئے عورت کی امامت زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی ہے۔ تاہم اگر کہیں ایسا ہو کہ عورتیں عورت کو امام بنالیں تو امام بننے والی خاتون صف کے درمیان میں کھڑی ہو۔

سجدۂ تلاوت بھول جائیں تو؟

سوال: سجدۂ تلاوت بھول جائیں تو کس طرح اور کب ادا کیا جائے۔

(فیروز سلطانہ۔ناظم آباد)

جواب: اگر نماز کے اندر بھول گئے ہیں اور بروقت ادا نہیں کیا تو نماز کے اندر یاد آنے پر ادا کر دیں اور سجدۂ سہو بھی کریں، اگر نماز کے اندر یاد نہیں آیا اور نماز سے فارغ ہو گئے تو نماز ادا ہو گئی اور نماز کے اندر بھولے ہوئے سجدۂ سہو کی قضا خارج نماز نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔ اگر خارج نماز تلاوت کے دوران آیت آ گئی اور بروقت سجدہ ادا نہیں کیا تو بعد میں یاد آنے پر ادا کرلیں، مکروہ اوقات کے علاوہ۔

ایک جگہ پنج وقتہ نماز ادا کی جارہی تھی، اب قریب مسجد بن گئی تو؟

سوال: ایک جگہ پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کی جاتی رہی ہے، قریب مستقل مسجد بن گئی ہے، تو اب سابقہ جگہ کا کیا حکم ہے؟ (محمد حسن۔لیمارکیٹ)

جواب: اگر وہ باقاعدہ مسجد نہیں بنائی گئی تھی بلکہ محض جائے نماز کے طور پر استعمال کی جارہی تھی تو مسجد میں منتقل ہونے کے بعد یہ جگہ کسی بھی مقصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے، اور اگر بانی نے اسے باقاعدہ مسجد بنایا تھا اور اسے اس جگہ پر مالکانہ تصرف کا حق حاصل تھا، تو اب وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، اس کی حیثیت تبدیل نہیں کی جاسکتی، بشرطیکہ جائز طور پر اسے مسجد کیلئے وقف کیا گیا ہو۔

نماز میں قصر، وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت کے مسائل

سوال: میں اپنے شوہر کے ساتھ ایبٹ آباد میں مقیم ہوں اور ہم دونوں ڈاکٹر ہیں اور گورنمنٹ سروس میں ہیں، میرے شوہر کے والدین لاہور کی ایک مضافاتی بستی میں مقیم ہیں اور میرے شوہر کی ولادت اور انٹر تک تعلیم بھی وہیں پر ہوئی ہے، اب ہم دونوں میاں بیوی نے ایبٹ آباد کو ذہنی، فکری اور عملی طور پر مستقل وطن کے طور پر اختیار کرلیا ہے، لیکن ابھی تک ہمارا وہاں پر کوئی

مکان یا غیر منقولہ جائیداد یعنی پلاٹ وغیرہ نہیں ہے، ہم اپنے بچوں کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب عطا ہوں گے تو اپنا مکان بھی بنالیں گے، تاہم، ہم دونوں میاں بیوی نے لاہور کو اپنا وطنِ اصلی ہونے کے تصور کو ترک کر دیا ہے، بلکہ یہ کوشش ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب مہیا ہونے اور حالات سازگار ہونے پر میرے سسرال والے سب کے سب مانسہرہ ہزارہ منتقل ہو جائیں گے۔ میرے والدین پشاور میں مستقل طور پر مقیم ہیں، والد صاحب کا مقام پیدائش اور آبائی گھر، والدہ صاحبہ (یعنی میری دادی) وغیرہ مانسہرہ کے ایک گاؤں میں مقیم ہیں، کبھی میں چھٹی پر والدین کے ہاں پشاور چلی جاتی ہوں، کبھی والد صاحب کے آبائی گاؤں جاتی ہوں اور کبھی ہم سسرال سے ملنے لاہور چلے جاتے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں فقہی احکام اور نماز قصر کے اعتبار سے ایبٹ آباد ہمارا ''وطنِ اصلی'' قرار پائے گا یا ''وطنِ اقامت''؟۔ ہم کبھی مختصر قیام کے لئے اپنے شوہر کے والدین کے ہاں لاہور جائیں جو کہ میرے شوہر کی جائے پیدائش اور بدستور آبائی گھر ہے، یا ہم میرے آبائی گھر پشاور جائیں، جو کہ میرے شوہر کا سسرالی گھر بھی ہے، یا کبھی ہم مانسہرہ میں میرے والد صاحب کے آبائی گھر جائیں تو ہمارے لئے یہ تینوں مقامات ''وطنِ اصلی'' کے حکم میں ہوں گے اور ہم ان مقامات پر مدتِ قیام سے قطع نظر پوری نماز پڑھیں گے یا اب یہ ''وطنِ اصلی'' نہیں رہے اور پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں قصر نماز پڑھیں گے۔ اور کیا ایبٹ آباد ہمارا وطنِ اصلی ہے یا وطنِ اقامت؟۔ بعض علماء کرام سے سنا ہے کہ مقام پیدائش یا جہاں والدین مستقل طور پر سکونت پذیر ہوں، ہمیشہ ''وطنِ اصلی'' ہی کے حکم میں رہتے ہیں، اسی طرح جب کوئی شخص سسرال میں جائے گا، تو اس کا حکم ''وطنِ اصلی'' کا ہے اور وہاں وہ پوری نماز پڑھے گا، اور جہاں ملازمت کی غرض سے مقیم ہے، وہ ''وطنِ اقامت'' قرار پائے گا اور قصر یا پوری نماز پڑھنے کے لئے مدتِ قیام کا اعتبار ہوگا، (ڈاکٹر روبینہ شاہین۔ ایبٹ آباد)

جواب: آپ کا سوال یقیناً کافی پیچیدہ ہے، میرے خیال میں ''وطنِ اصلی'' اور ''وطنِ اقامت'' کی فقہی تعریفات کے اطلاق میں بعض حضرات کو مغالطہ ہو جاتا ہے، اس لئے سب سے پہلے میں نمازِ قصر کے مسئلے پر ''اوطان'' (یعنی وطنِ اصلی و اقامت) کی فقہی تعریفات مستند ''کتب فتاویٰ'' سے نقل کروں گا اور آخر میں آپ کے سوالات کے جوابات عرض کروں گا۔

علامہ علاء الدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

(الوطن الاصلی) هو موطن ولادته او تاهله او توطنه۔

''کسی شخص کا وطنِ اصلی اس کی جائے ولادت ہے یا جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے یا جسے وہ اپنے وطن کے طور پر اختیار کر لے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قوله: (الوطن الاصلی) ویسمی بالاهلی و وطن الفطرة عن القهستانی، قوله: (او تاهله) ای تزوجه۔

''وطن اصلی'' کو ''وطنِ اصلی'' اور وطنِ اہلی'' اور ''وطن الفطرۃ'' بھی کہا جاتا ہے، اور تاھل کے معنی ہیں: شادی کرنا''۔

اس کے بعد لکھتے ہیں: ''شرح المنیہ'' میں ہے: اور اگر کسی شخص نے کسی شہر میں شادی کر لی اور اس نے وہاں اقامت کی نیت نہیں کی، تو ایک قول یہ ہے کہ وہ مقیم نہیں بنے گا اور ایک قول یہ ہے کہ مقیم بن جائے گا، اور یہ قول زیادہ مناسب ہے، اور اگر اس کی دو شہروں میں دو بیویاں ہوں، تو وہ ان میں سے جس شہر میں بھی داخل ہو، (داخل ہوتے ہی) مقیم ہو جائے گا، اور اگر کسی ایک مقام پر اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے تو اب وہ اس کا وطنِ اصلی نہیں رہے گا، خواہ وہاں پر اس کے مکانات اور غیر منقولہ جائیداد بھی ہو، کیونکہ اعتبار مکان کا نہیں بیوی بچوں کا ہے، جیسے اگر وہ کسی مقام پر شادی کر کے رہنے لگتا ہے، حالانکہ وہاں اس کا مکان وغیرہ نہیں ہے، تو بھی وہ اس کا وطنِ اصلی ہی کہلائے گا، ایک قول یہ ہے کہ بیوی کی وفات کے بعد بھی وہاں اس کا وطنِ اصلی ہی رہے گا، اور توطن (یعنی کسی مقام کو بطور وطن اختیار کرنے) کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص وہاں مستقل قیام کا ارادہ کر لے اور وہاں سے اس کا کہیں اور منتقل ہونے کا ارادہ نہ ہو، اگرچہ وہاں اس نے شادی نہ کی ہو۔ اگر کسی ایسے مقام پر اس کے والدین مقیم ہیں جو اس کی جائے ولادت نہیں ہے اور وہ بالغ ہے (یعنی اب حکماً ماں باپ کے تابع نہیں ہے) اور اس نے وہاں شادی بھی نہیں کی، تو وہ اس کا وطن نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہاں وہ مستقل رہنے کا پختہ ارادہ کر لے اور اپنے پہلے وطنِ اصلی کو خیرباد کہہ دے، یہ مسئلہ ''شرح المنیہ'' سے ماخوذ ہے۔

(ردالمحتار، ج ۲، ص ۵۳۶، ۵۳۵، طبع جدید)

فتاویٰ عالمگیری ج ا ص ۱۴۲ پر ہے:

عبارة عامة المشائخ ان الاوطان ثلثة، وطن اصلی وهو مولدالرجل اوالبلد الذی تأهل به و وطن سفر و قدسمی وطن اقامة و هوالبلد الذی ینوی المسافر الاقامة فیه خمسة عشر یوما او اکثر و وطن سکنی وهو البلد الذی ینوی الاقامة فیه دون خمسة عشر یوما، و عبارة عامة المحققین من مشائخنا ان الوطن وطنان، وطن اصلی و وطن اقامة ولم یعتبروا وطن السکنی وطنا وهو الصحیح هکذا فی الکفایة.

عام علماء کی عبارت یہ ہے کہ وطن تین قسم کے ہیں، ایک وطنِ اصلی اور یہ اس کی جائے پیدائش یا وہ مقام ہے جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے، اور دوسرا وطنِ سفر اور اسے وطنِ اقامت بھی کہا جاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت کے لئے رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور تیسرا وطنِ سکنیٰ ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن سے کم مدت کے لئے ٹھہرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور ہمارے علماء میں سے عام محققین کا کہنا یہ ہے کہ وطن کی دو ہی قسمیں ہیں، وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت، اور وہ ''وطنِ سکنیٰ'' کا اعتبار نہیں کرتے اور یہی قول صحیح ہے، اور کفایہ میں بھی اسی طرح ہے''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم البحرالرائق ج ۲ ص ۱۳۶ پر لکھتے ہیں:

والوطن الاصلی هو وطن الانسان فی بلدته او بلدة اخری اتخذها دارا او توطن بها مع اهله و ولده ولیس من قصده الارتحال عنها بل التعیش بها

''اور وطنِ اصلی، انسان کا وہ وطن ہے، جسے اس نے اپنا گھر بنالیا ہو یا وہ وہاں پر اپنے بیوی، بچوں کے ساتھ رہ رہا ہو اور اس کا وہاں سے منتقل ہونے کا ارادہ نہ ہو بلکہ (مستقل طور پر) وہاں رہنے کا ارادہ ہو''۔

آ گے چل کر لکھتے ہیں: وطنِ اصلی اپنی مثل (یعنی وطنِ اصلی) سے ہی باطل ہوتا ہے، نہ کہ کسی

اور سے، اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ کسی مقام کو بطور وطنِ (اصلی) اختیار کر لے اور اس کے بیوی بچے وہاں منتقل ہو جائیں، تو اب پہلا وطن، وطنِ اصلی نہیں رہے گا، یہاں تک کہ اگر پھر کبھی وہاں جائے تو مسافر کی حیثیت سے نماز پڑھے گا، یہ جو ہم نے پہلے وطنِ اصلی سے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل ہونے کی قید لگائی ہے، اس لئے کہ اگر اس سے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل نہیں ہوا، لیکن اس نے کسی اور مقام پر بھی شادی کر کے وہاں اپنے اہل کے ساتھ قیام اختیار کر لیا ہے، تو اس صورت میں پہلا اور دوسرا دونوں کا حکم وطنِ اصلی کا ہی ہوگا اور دونوں مقام پر پوری نماز پڑھے گا، آگے چل کر لکھتے ہیں: ''محیط میں کہا اگر کسی شخص کی ایک بیوی بصرہ میں ہیں اور دوسری کوفہ میں، اور بصرہ میں بیوی کا انتقال ہو گیا، حالانکہ ابھی وہاں اس کا مکان زمین وغیرہ باقی ہے، تو ایک قول یہ ہے کہ اب بصرہ وطنِ اصلی نہیں رہے گا، کیونکہ وہ وہاں اپنے بیوی بچوں کے سبب وطنِ اصلی کے حکم میں تھا نہ کہ غیر منقولہ جائیداد کی وجہ سے، آپ غور تو کریں، اگر وہ کسی مقام پر بیوی بچوں کے ساتھ رہائش اختیار کرتا ہے، حالانکہ وہاں اس کی کوئی غیر منقولہ جائیداد نہیں ہے، تو وہ اس کا وطنِ اصلی بن جائے گا''۔

ان مستند ''کتبِ فقہ وفتاویٰ'' کے حوالہ جات اور تفصیلی عبارات نقل کرنے کے بعد جو مفہوم اور خلاصہ نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ ''توطن'' یعنی کسی مقام کو وطنِ اصلی کے طور پر اختیار کرنے کے لئے یہ لازمی شرط نہیں ہے کہ وہاں اس شخص کے زیر ملکیت مکان یا غیر منقولہ جائیداد ضرور ہو، کیونکہ ان چیزوں کا حصول مالی وسعت پر موقوف ہے، اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ وہ مقام اس کی جائے پیدائش ہو، بلکہ اپنی نیت، عمل اور ارادے سے کسی مقام پر مستقل طور پر قیام کرنے سے وہ مقام ''وطنِ اصلی'' بن جاتا ہے اور اسی کو ''کتب فقہ وفتاویٰ'' میں ''توطن'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ جائے ولادت کا ہمیشہ ''وطنِ اصلی'' رہنا ضروری نہیں ہے، خواہ والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں وہاں پر مقیم ہوں، یا والدین کا انتقال ہو چکا ہو لیکن وہاں اس کی مملوکہ یا موروثی جائیداد و غیر منقولہ (یعنی زمین و مکانات) ہو۔ عاقل و بالغ ہونے کے بعد جب کسی نے اپنے مولد یا موروثی مقام کے علاوہ کسی دوسرے مقام کو مستقل وطن کے طور پر اختیار کر کے وہاں اقامت اختیار کر لی اور اپنی نیت اور ارادے میں اور عملاً بھی پہلے ''وطنِ اصلی'' کو ترک کر دیا تو اب یہ دوسرا وطن ہی وطنِ اصلی ہے، پہلا وطن، وطنِ اصلی نہیں رہا، ''البحر الرائق'' کی عبارت سے

یہی مترشح ہوتا ہے۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مکمل و مدلل (جلد چہارم) میں سوالات نمبر ۲۱۹۸ اور ۲۱۹۹ کے جوابات میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔ اسی طرح ''تا ھل'' کے معنی محض شادی کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس مقام پر اہل وعیال کے ساتھ رہنے کے ہیں، لہٰذا اگر اس نے اپنے سسرالی گھر یا مقام کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش کے لئے اختیار کرلیا ہے تو وہ ''وطنِ اصلی'' کے حکم میں ہوگا اور وہ وہاں جب بھی جائے گا، خواہ ایک دن کے لئے سہی، پوری نماز پڑھے گا، لیکن جب کوئی شخص اپنے سسرالی گھر یا مقام پر اپنے بچوں کے ساتھ مقیم نہیں ہے تو محض خسر کا گھر ہونا، وطنِ اصلی کے حکم میں نہیں ہے، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل ومکمل (جلد چہارم) میں سوال نمبر ۲۲۵۴ کے جواب میں یہی موقف اختیار کیا گیا ہے۔ تاہم اس مقام پر یہ لکھا ہے کہ اگر کسی مقام پر نماز کامل یا قصر پڑھنے میں اشتباہ ہوجائے تو احتیاطاً پوری پڑھ لے، جبکہ فتاویٰ شامی میں اس طرح کے اشتباہ کے موقع پر فرمایا ہے:

لانه اجتمع فی هذه الصلوٰة ما یوجب الاربع وما یمنع فرجحنا ما یوجب الاربع احتیاطاً۔

''کیونکہ اس نماز میں ایسے دو اسباب یا دو صورتیں جمع ہوگئی ہیں جن میں سے ایک تکمیلِ نماز کو واجب کرتی ہے اور دوسری اس کیلئے مانع ہے، تو ہم نے احتیاطاً اس صورت کو ترجیح دی ہے جو (قصر کے بجائے) تکمیلِ نماز کو واجب کرتی ہے''۔

(فتاویٰ شامی، باب صلوٰۃ المسافر تحت قولہ قاصدا، ج ا، ص ۷۳۳)

لہٰذا میری رائے میں چونکہ آپ لوگوں نے ایبٹ آباد کو وطنِ اصلی کے طور پر نیت وارادے اور عمل سے اختیار کرلیا ہے، لہٰذا اب وہ آپ کا ''وطنِ اصلی'' ہے اور آپ وہاں ہر صورت میں پوری نماز پڑھیں گے۔ اور آپ کے شوہر نے اپنے آبائی مقام لاہور کی وطنیت کو مستقل طور پر ترک کرلیا ہے اور وہ اب عاقل وبالغ ہیں اور ماں باپ کے تابع نہیں ہیں، تو آپ کے والدین اور آپ کے شوہر کے خسر کا مستقل قیام تو ضرور ہے لیکن آپ کے شوہر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں مستقل طور پر مقیم نہیں ہیں، لہٰذا وہاں آپ لوگ پندرہ دن سے کم مدتِ اقامت کی صورت میں قصر پڑھیں گے۔ اسی طرح آپ کے والد کا آبائی مقام بھی آپ کا ''وطنِ اصلی'' نہیں رہا۔

میری گذارش ہے کہ اگر یہ سطور اہلِ فتویٰ علماء کی نظر سے گذریں اور وہ ان کا مطالعہ کرنے کی

زحمت گوارا فرمائیں تو میرے اس مؤقف سے اتفاق یا اختلاف دونوں صورتوں میں اپنی آراء اور دلائل سے مطلع فرمائیں، غلطی پر آگاہ ہونے کی صورت میں میں اپنے موقف سے رجوع کرنے میں ادنیٰ تأمل بھی نہیں کروں گا، اللہ تعالیٰ مجھے حق کی حقانیت پر آگاہی نصیب فرمائے اور اس کی اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور باطل کے بطلان پر آگاہی عطا فرمائے اور اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرمائے اور رائے اور فکر میں کجی سے محفوظ فرمائے۔

☆☆☆.........☆☆☆.........☆☆☆

كتاب الجنائز

اپنے یا احباب کیلئے زندگی میں قبر تیار کرنا

سوال: کیا کوئی شخص اپنے یا اپنے احباب کے لئے زندگی ہی میں قبر تیار کر سکتا ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت یا ممانعت تو نہیں ہے؟ (حنیف۔کورنگی)

جواب: جی ہاں زندگی میں قبر تیار کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''جس نے اپنے لئے زندگی ہی میں قبر کھودی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اسے اس پر اجر ملے گا''۔ ممکن ہے اجر کی حکمت یہ ہو کہ اسے موت کی یاد آتی رہے گی۔ باقی اس کا اسی قبر میں دفن ہونا یا کرنا شرعاً ضروری نہیں ہے، اور قرآن مجید میں ہے:

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (لقمان: ۳۴)

''کسی کو خبر نہیں کہ اس کی موت کس زمین پر آئے گی۔

تدفین کے بعد میت کا قبر سے نکالنا

سوال: کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ کن وجوہات کی وجہ سے آپ میت کو قبر سے نکال کے دوسرے قبرستان میں دفنا سکتے ہیں۔ ہمارا واقعہ یہ ہے کہ ہمارے عزیز ڈھائی مہینے پہلے لندن کے قبرستان میں دفنائے گئے اور ہم نے ان کو وہاں سے نکالنا ہے۔

(۱) مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائی بھی دفن ہیں۔ ہمارے علم میں یہ نہیں تھا۔

(۲) قبرستان کے یہودی مالک وہاں پہ خصوصی دھیان نہیں دیتے اور وہ جگہ ویران لگتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہاں کا مالک یہودی ہے۔

(۳) ہماری گزارش کرنے کے باوجود یہودی مالک اپنے کتوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور نعوذ باللہ ہمارے عزیز کی قبر کے پاس ہم نے ان کی ناپاکی دیکھی تھی۔

(۴) ہم نے یہودیوں کے ساتھ کوئی بھی کاغذات پہ دستخط نہیں کیے اور وہ اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں لازمی قبر پکی کرنی ہے اور اگر ہم ایک مسلمان بھائی کی قبر کو پکی کرنے کا حکم دیتے ہیں تو یہودیوں کو اس بات کے بھی پیسے چاہیے۔

(۵) اگر کل کوئی ہمارے عزیز کی قبر کے پتھر کو توڑ دے تو وہ اس کی ذمہ داری نہیں اُٹھائیں گے اور

الٹا ہم سے پیسے مانگیں گے۔

(۶) تقریباً کوئی ایک سال پہلے اس قبرستان میں رات کے وقت وہاں کچھ لوگوں نے نعوذ باللہ قبروں کے پتھروں کو توڑ دیا تھا۔ کل رات بھی انہوں نے قبرستان کے گیٹ کو تالا نہیں لگایا۔

(۷) مرحوم کے چار چھوٹے بچے ہیں جو اپنے والد صاحب کے لیے قبرستان جا کر دعا مانگنے گئے۔ ان بچوں کے لیے وہ ماحول اور یہودی لوگ ٹھیک نہیں۔

(۸) ہم نے میت کو دفناتے وقت امانت نہیں کی تھی۔ (محمد کلیم......انگلینڈ)

جواب: صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ میت کو قبر میں دفنانے کے بعد بغیر ضرورتِ شرعیہ کے قبر سے نکالنا حرام ہے۔

شرعی ضرورت سے مراد وہ امور ہیں جن کی ادائیگی کا تعلق حقوق العباد سے ہو۔ جیسے بغیر اجازت کے کسی کی زمین میں میت کو دفن کر دیا گیا ہو یا دفن کرتے وقت کسی کی کوئی قیمتی چیز قبر میں گر گئی ہو تو ان صورتوں میں قبر کو کھولنا جائز ہے۔

(فتاویٰ شامی، جلد ۳ ص ۱۳۲، بدائع الصنائع، جلد ۲ ص ۳۵۷، شرح صحیح مسلم، جلد ۲ ص ۸۱۰)

سوال میں جو صورت حال بیان کی گئی ہے اس میں کسی بھی صورت کو ''شرعی ضرورت'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ:

(۱) مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کا دفن ہونا۔ (۲) مالک قبرستان کا یہودی ہونا

(۳) اُس کا اپنے کتوں کو کھلا چھوڑ دینا اور کتوں کا ناپاکی پھیلانا

(۴) مالکان کے ساتھ کاغذات پر دستخط کا نہ کرنا۔ (۵) کسی کا قبروں کے پتھروں کو توڑنا

(۶) مرحوم کی اولاد کا قبر پر جا کر دعا نہ مانگ سکنا۔ (۷) میت کو دفناتے وقت امانت نہ کرنا۔

ان میں سے کوئی بھی امر ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد پر قبر کو کھولنے اور اس سے مردے کو نکالنے کی اجازت دی جا سکے۔

میت کو کسی جگہ اماناً دفن کرنے کے بعد بھی قبر سے نکالنا حرام ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد ۴/ ۱۱۶)۔

نیز قبر پر جا کر دعا مانگنا ضروری نہیں ہے، گھر سے بھی دعاء، ایصال ثواب اور فاتحہ وغیرہ کی جا سکتی ہے۔ نیز قبر کو پختہ کرنے کی بھی شرعاً ممانعت ہے۔

نمازِ جنازہ کا سلام ہاتھ باندھے ہوئے پھیرے یا ہاتھ چھوڑ کر

سوال: اکثر دیکھا گیا ہے کہ نمازِ جنازہ کے اختتام پر بعض لوگ چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھے ہوئے دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں اور پھر دونوں ہاتھ کھولتے ہیں جبکہ بعض لوگ دائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے دایاں ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں اور بائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے بایاں ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں، اور اس کے برعکس بعض لوگ نمازِ جنازہ کی چوتھی تکبیر کہہ کر دونوں ہاتھ کھول دیتے ہیں اور پھر دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں، ان میں سے کون سا طریقہ درست ہے، دلیل کے ساتھ جواب دیجئے۔ (مولانا منور احمد۔ ملیر......محمد ناصر خان چشتی۔ گلشن اقبال)

جواب: امام اہل سنت مولانا احمد رضا خان قادری قدس سرہ العزیز سے یہی سوال ان الفاظ میں دریافت کیا گیا کہ: ''نماز جنازہ میں سلام ہاتھ چھوڑنے کے بعد پھیرنا چاہئے یا قبل ہاتھ چھوڑنے کے، افضل کیا ہے؟''، تو آپ نے جواب دیا: ''ہاتھ باندھنا سنت اس قیام کی ہے جس کے لیے قرار ہو، کمافی الدر المختار وغیرہ من الاسفار (یعنی درمختار وغیرہ کتابوں میں ہے)، سلام وقتِ خروج ہے، اس وقت ہاتھ باندھنے کی طرف کوئی داعی نہیں، تو ظاہر یہی ہے کہ تکبیرِ چہارم کے بعد ہاتھ چھوڑ دیا جائے۔'' اس کے بعد اس مسئلے کے بارے میں ان سے ''بہار شریعت'' کے حوالے سے سوال کیا گیا تو جواب کے آخری حصے میں آپ لکھتے ہیں: ''ظاہر ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد نہ قیام ذی قرار ہے نہ اس میں کوئی ذکر مسنون، تو ہاتھ باندھے رہنے کی کوئی وجہ نہیں، تکبیر رابع (چوتھی) کے بعد خروج عن الصلوۃ کا وقت ہے اور خروج کے لیے اعتماد کسی مذہب میں نہیں،

(فتاویٰ رضویہ جلد نہم صفحہ ۱۹۴، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

امام احمد رضا قادری کے بیان کیے ہوئے اصول کی تائید درمختار اور ردالمحتار کی اس عبارت سے ہوتی ہے:

(ولیس بین تکبیراته ذکر مسنون)ولذا یرسل یدیه: ای فی اثناء التکبیرات ویضعهما بعد الثالثة کما فی "شرح المنیة" لان الوضع سنة قیام طویل فیه ذکر مسنون۔

''اور عیدین کی زائد تکبیروں کے درمیان ذکر مسنون نہیں ہے، لہٰذا اپنے دونوں ہاتھوں کو

چھوڑ دے، یعنی عیدین کی زائد تکبیرات کے درمیان دونوں ہاتھوں کو چھوڑ دے اور (پہلی رکعت میں) تیسری تکبیر کے بعد باندھ لے، جیسا کہ ''شرح المنیہ'' میں ہے، کیونکہ ہاتھ باندھنا اس طویل قیام کی سنت ہے جس میں کوئی مسنون ذکر ہو''۔

(فتاویٰ شامی، جلد ۳، صفحہ ۵۴۔ ۵۳۔ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، لبنان)

یہاں تو اصول بیان ہوا، خلاصۃ الفتاویٰ مع مجموعۃ الفتاویٰ مؤلفہ امام طاہر بن عبدالرشید بخاری متوفی ۵۴۲ھ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، جلد ۱، صفحہ ۲۲۵ پر صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ درج ہے، ملاحظہ کیجئے۔

ولایعقد بعد تکبیر الرابع لانه لا یبقیٰ ذکر مسنون حتی یعقد فالصحیح انه یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین هکذا فی الذخیرة۔

''اور (نماز جنازہ کی) چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ نہ باندھے، کیونکہ اب کوئی ذکر مسنون باقی نہیں رہا کہ بدستور ہاتھ باندھے رکھے، پس صحیح یہی ہے کہ (نماز جنازہ کی چوتھی تکبیر کے بعد) دونوں ہاتھ کھول دے اور دونوں جانب سلام پھیرے، ''ذخیرہ'' میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح درج ہے''۔

متعدد جنازے ایک ساتھ کیسے پڑھے جائیں؟

سوال: اگر ایک وقت میں کئی جنازے جمع ہوں، جن میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل ہوں۔ تو کیا ان کی نمازِ جنازہ ایک ساتھ پڑھی جاسکتی ہے؟ اگر پڑھی جاسکتی ہے تو ان کے لئے کون سی دعا پڑھی جائے گی؟ (غلام مرشد۔ سندھوئی، آزاد کشمیر)

جواب: علامہ ابن عابدین شامی، فتاوی شامی (ردالمحتار ج ۳ ص ۱۱۹۔ ۱۱۸ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ) میں لکھتے ہیں: ''اگر ایک وقت میں کئی جنازے جمع ہوجائیں تو ہر ایک کی نمازِ جنازہ اکٹھے پڑھنے کی بجائے الگ الگ پڑھنا افضل ہے، اور الگ الگ پڑھنے کی صورت میں ان کے ظاہری حالات کے اعتبار سے جو افضل ہو اس کی نماز پہلے پڑھی جائے اور پھر اسی طرح حسب درجہ بدرجہ سب کی پڑھی جائے۔ لیکن اگر سب اموات کی نمازِ جنازہ بیک وقت پڑھنا چاہیں تو یہ بھی جائز ہے، اگر متعدد جنازے بیک وقت ایک ساتھ پڑھنے کا ارادہ ہو تو اموات کو جنازہ پڑھنے کے

لئے رکھنے کی دو صورتیں ہیں:

۱) یہ کہ اموات کو شمالاً جنوباً ایک لمبی صف میں رکھ دیں اور امام اس میت کے سامنے کھڑا ہو، جو ان سے تقویٰ کے اعتبار سے سب سے افضل ہے اور ظاہر ہے کہ امام اور مقتدی تمام موجود اموات کا جنازہ پڑھنے کی نیت کریں گے۔

۲) دوسری صورت یہ ہے کہ جنازے شرقاً غرباً امام کے سامنے ایک لائن میں رکھ دیے جائیں اور امام کے سب سے قریب وہ میت ہو جو سب سے افضل ہے، اس کے بعد درجہ بدرجہ اموات کے جنازے رکھے جائیں، یہ صورت نسبتاً بہتر ہے، اسی طرح متعدد اموات ہونے کی صورت میں امام کے قریب پہلے بالغ مردوں کے جنازے ہوں، پھر بچوں کے، پھر خنثیٰ کے (اگر کوئی ہو)، پھر بالغہ عورت اور پھر قریب البلوغ لڑکیوں کے۔ یہی صورت مسئلہ علامہ زین العابدین ابن نجیم نے البحر الرائق میں ج ۲ ص ۱۸۷، پر، علامہ احمد بن محمد الطحطاوی نے حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۵۹۲ پر اور شیخ حسن بن عمار نے نور الایضاح میں ص ۱۲۵ پر تحریر کی ہے۔ علامہ طحطاوی نے مزید یہ مسئلہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ نمازِ جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد جو بالغ میت کی دعا ہے وہ ویسے بھی صیغہ جمع کے ساتھ ہے، لہٰذا اگر اموات ایک سے زائد ہوں تو سب ہی کو یہ دعا شامل ہو جاتی ہے، البتہ اگر متعدد اموات میں چھوٹے بچے بھی ہوں تو بالغ کی دعا کے بعد بچے یا بچی والی دعا بھی پڑھ لینی چاہئے، اگر بچے دو ہوں تو ضمیر "ہ" یا "ھا" کے بجائے "ھما" اور اگر دو سے زیادہ ہوں تو جمع کی ضمیر "ھم" پڑھ لیں لیکن اگر صرف بالغ ہی کی دعا پڑھ کر سلام پھیر دیا، تب بھی سب کا جنازہ صحیح ادا ہو جائے گا۔

دعاء بعد الجنازہ

سوال: ہمارے علاقے میں بعض لوگ عوام کو علی الاعلان یہ کہہ کر گمراہ کرتے ہیں کہ آپ لوگ نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے ہاتھ اُٹھا کر جو دعاء مغفرت کرتے ہیں اس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں اگر ہے تو ہمیں ثبوت پیش کریں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں دلائل کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں، نیز جو لوگ علی الاعلان اسے ناجائز کہہ کر عوام کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے، (مولانا نصیر اللہ نقشبندی، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)۔

جواب: اس سوال کا براہ راست جواب سننے سے پہلے ایک دو اصولی باتیں سمجھ لیجئے۔ اسلام اور دنیا کے ہر نظامِ قانون اور اصولِ قانون کا ایک بنیادی مسلمہ یہ ہے کہ اشیاء و امور میں اصل اباحت (یعنی جائز ہونا) ہے، لہٰذا کہیں بھی قوانین کی تشکیل میں مباحات (جائز امور) کا احاطہ نہیں کیا جاتا بلکہ ہر شعبے کے محرمات، ممنوعات اور مکروہات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ دیگر امور جائز ہیں، مثلاً جن خواتین سے نکاح شرعاً حرام ہے، قرآن نے ان کو سورۃ النسآء آیات ۲۲ تا ۲۵ میں تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا ہے اور پھر فرمایا:

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ (النساء: ۲۴)

''اور ان (مذکورہ محرمات) کے علاوہ باقی سب عورتوں کے ساتھ تمہارا نکاح جائز ہے''۔

اسی طرح قرآن نے سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۷۳ اور سورۃ النحل آیت نمبر ۱۱۵ میں ماکولات میں سے محرمات (مردار، ذبح کے وقت بہنے والا خون، خنزیر اور جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے) کا ذکر فرمایا، احادیث میں اس پر درندے، شکاری پرندے اور گدھے کا اضافہ فرمایا گیا، بعض دیگر جانوروں کو قیاس و اجتہاد کے ذریعے فقہاء امت نے مکروہ تحریمی قرار دیا، ان کے علاوہ دیگر لاتعداد جانور جو حلال ہیں، کتاب و سنت اور ائمۂ مجتہدین نے ان کا تفصیل سے احاطہ نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کرنا عملاً ممکن ہے، ہماری عملی زندگی میں اس کی مثال یہ ہے کہ جس سڑک پر دائیں یا بائیں مڑنا منع ہو، یا جس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانا منع ہو ٹریفک کا عملہ وہاں مخصوص ممانعت کا نشان لگا دیتا ہے، باقی جس جس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانا ممنوع نہیں ہے، وہاں کوئی مخصوص نشان نہیں لگایا جاتا، ممانعت کا نشان نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانے کی عام اجازت ہے بعینہٖ یہی اصول احکامِ شریعت کا ہے، حدیث شریف میں ہے:

عن سلمان قال: سئل رسول اللہ ﷺ عن اشیاء فقال: الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرمہ اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مما قد عفیٰ عنہ فلا تتکلفوا۔

''حضرت سلمان سے روایت ہے کہ بعض اشیاء (کی حلت و حرمت) کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (شرعی حکم) دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دے دیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی

کتاب میں حرام قرار دے دیا ہے اور جس کے بارے میں (کتاب وسنت میں) سکوت فرمایا گیا تو وہ معاف ہے۔ (یعنی جائز و حلال ہے) لہٰذا خواہ مخواہ اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈالو"۔ (سنن ابن ماجہ، ص ۲۴۹، سنن ترمذی، ص ۲۱۹)

اس حدیث سے کتب تفاسیر وفقہ میں اس مفہوم پر استدلال کیا گیا ہے۔

سنن بیہقی صفحہ ۱۲، جلد نمبر ۱۰، پر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع ہے:

وما سكت عنه فهو عافية فاقبلوا من الله العافية فان الله لم يكن نسيأ ثم قرأ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا۔

"جس چیز (کی حرمت کے بیان) سے قرآن نے سکوت کیا وہ معاف ہے (یعنی جائز ہے) تو اللہ کی طرف سے معافی (یا جواز کی رعایت) کو (خوش دلی سے) قبول کرو کیونکہ اللہ بھولنے والا نہیں، پھر آپ نے (سورہ مریم کی آیت نمبر ۶۴) تلاوت فرمائی (جس کا معنی یہ ہے کہ) اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں"۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

المختار ان الاصل عند الجمهور من الحنفية والشافعية الاباحة.

"قول مختار یہ ہے کہ جمہور حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک (امور واشیاء میں) اصل اباحت (جائز ہونا) ہے"۔ (جلد ۱، صفحہ ۹۸)

لہٰذا اگر کوئی شخص، کسی خاص موقع ومقام کے لیے یا علی الاطلاق کسی چیز کی حرمت یا کراہت کا مدعی ہے تو بارِ ثبوت اس پر ہے کہ وہ عدمِ جواز کی شرعی دلیل پیش کرے، نہ کہ فریق مخالف (قائل جواز) سے دلیل طلب کرے۔

دوسرا اصولی مسئلہ یہ کہ فی نفسہٖ دعاء اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی محبوب اور پسندیدہ فعل ہے، مقاماتِ نجاست وکراہت کے علاوہ دعا کے لیے نہ کسی وقت کی پابندی ہے نہ کسی خاص لب ولہجے اور زبان کی، یہ الگ بات ہے کہ مسنون دعاؤں کی برکات زیادہ ہیں۔ بندے کی دعا اللہ تعالیٰ کو اتنی مرغوب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث مبارکہ میں فرمایا:

أكثر الدُّعَآء

"کثرت سے دعا کیا کرو"۔ (المستدرک، کتاب الدعاء ج ۱ ص ۵۲۹)

الدعاء مخ العبادة۔

دعاء عبادت کا مغز ہے۔(مشکوٰۃ، کتاب الدعوات)''۔

لا یرد القدر الا الدعاء۔

دعا تقدیر کو ٹال دیتی ہے''۔(مشکوٰۃ، کتاب الدعوات)

سَلُوا اللّٰہ من فضلہٖ فان اللّٰہ یحب ان یسال۔

''اللہ سے اس کے فضل کا سوال کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ کوئی اس سے سوال کرے''۔(مشکوٰۃ، کتاب الدعوات)

اور وفات یافتہ اہلِ ایمان کے لیے دعا کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ جل شانہ نے فرمایا:

وَ الَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ

''اور جو ان کے بعد آئے وہ (اللہ کی بارگاہ میں) عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! تو ہمیں بخش دے اور ہمارے ان دینی بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں مومنوں کے لیے کینہ نہ رکھ، اے ہمارے رب! تو بہت مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے''۔(الحشر:۱۰)

اس آیت کا سیاق و سباق (مورد) تو خاص ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اور اپنے اسلاف و سابقین اہلِ ایمان کے لیے دعاء مغفرت کو اہلِ ایمان کا شعار قرار دیا گیا ہے۔ اب اس دعاء مغفرت کے لیے کسی وقت خاص کا تعین نہیں ہے، کسی شخص کی زندگی میں بھی اس کے لیے دعاء مغفرت کی جا سکتی ہے، موت کے بعد نمازِ جنازہ سے پہلے بھی کی جا سکتی ہے اور بعد میں بھی کی جا سکتی ہے بطورِ خاص بعد نمازِ جنازہ ممانعت کی کسی کے پاس کوئی دلیل ہو تو پیش کرے۔ مندرجہ بالا آیت کے تحت علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''متعدد حضرات نے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے کہ بلاشبہ دعاء میت کو فائدہ دیتی ہے اور اس کی دلیل کے طور پر اس آیت کو پیش کیا ہے''۔(شرح الصدور صفحہ ۱۲۷)

رہا یہ سوال کہ آیا دعا بعد نمازِ جنازہ کے لیے کوئی دلیل مثبت بھی ہے؟ تو حدیث شریف میں حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت ہے:

اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء.

''جب تم میت پر نماز پڑھ چکو تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے دعا کرو۔''(سنن ابی داؤد طبع مجیدی ۲/۱۰۰، سنن بیہقی طبع حیدر آباد ۴/۴۰، سنن ابن ماجہ اصح المطابع ص ۱۰۹)

اس حدیث میں نماز جنازہ پڑھنے کے فوراً بعد دعا کا ذکر ہے کیونکہ اصولِ فقہ میں یہ طے ہے ''ف'' ''تعقیب علی الفور'' کے لیے آتی ہے، یہ اس کے حقیقی معنی ہیں اور کسی عقلی، عادی یا شرعی ل کے بغیر حقیقی معنی سے عدول جائز نہیں ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کے فوراً بعد ت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا مانگو۔

م علاؤالدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

ولنا: ما روی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی جنازۃ فلما فرغ،جاء عمر و معہ قوم، فأراد ان یصلی ثانیاً فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الصلوٰۃ علی الجنازۃ لاتعاد" ولکن اُدعُ للمیت واستغفر لہ و ھذا نص فی الباب، وروی ان ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھم فاتتھما صلوۃ علی الجنازۃ فلما حضرا ما زادا علی الاستغفار لہ وروی عن عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ: انہ فاتتہ الصلاۃ علی جنازۃ عمر رضی اللہ عنہ، فلما حضر قال: ان سبقتمونی بالجنازۃ فلا تسبقونی بالدعاء لہ.

''(یہ مسئلہ کہ نمازِ جنازہ کی تکرار نہیں ہے) اس میں ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھائی جب حضور جنازہ پڑھا کر فارغ ہو چکے تو اس وقت حضرت عمر کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو حضور نے (انہیں تکرارِ جنازہ سے روکتے ہوئے) فرمایا: نمازِ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جائے گی لیکن میت کے لیے دعا کرو اور اس کے لیے استغفار کرو، یہ اس باب میں (کہ نمازِ جنازہ کی تکرار نہیں) نص ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ایک نمازِ جنازہ نکل گئی (یعنی وہ دیر سے پہنچے) پس جب وہ میت کے پاس آئے تو صرف دعاء مغفرت پر اکتفا کی، اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام سے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ نکل گئی۔ جب وہ آئے تو انہوں نے (جنازے پر موجود حاضرین سے) کہا کہ اگر چہ تم لوگ مجھ سے نمازِ جنازہ میں پہل کر چکے ہو لیکن دعا میں مجھ سے پہل نہ کرو (یعنی دعا میں مجھے بھی شریک ہونے دو)''۔

(بدائع الصنائع جلد ۳، ص ۳۳۸ دار الکتب العلمیہ بیروت

ان احادیثِ مبارکہ سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ عہدِ رسالت و عہدِ صحابہ میں نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا کا معمول تھا۔ مبسوط سرخسی میں بھی یہ روایات موجود ہیں۔ ''دعاء بعد الجنازہ'' کے ثبوت کا مسئلہ ہم نے دلائل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، ہم اس کے فرض واجب یا سنت قرار دینے کے مدعی نہیں ہیں بلکہ جواز اور استحباب کے مدعی ہیں کہ جتنے زیادہ مواقع پر اور جتنی زائد بار میت کے لیے دعا کی جائے وہ اس کے لیے مفید ہے اور خود دعا کرنے والے کے لیے بھی وسیلۂ اجر ہے، لیکن اگر کوئی شخص بطورِ خاص نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا مغفرت و ایصالِ ثواب کو خلافِ سنت یا بدعت قرار دیتا ہے تو وہ عدمِ جواز کی دلیل پیش کرے۔ اصولاً بارِ ثبوت اس کے ذمے ہے کہ کہاں اور کب رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ اس کے برعکس روایات و آثار سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ جلد ثالث صفحہ ۳۳۱ پر ہے:

عن عمیر بن سعید قال صلیت مع علی یزید بن المکفف فکبر علیہ اربعاثم مشی حتی اتاہ وقال: اللھم عبدک و ابن عبدک نزل بک الیوم فاغفرلہ ذنبہ و وسع علیہ مدخلہ فانا لا نعلم منہ الا خیرا وانت اعلم بہ

''عمیر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کے ساتھ یزید بن مکفف کی نماز جنازہ پڑھی، انہوں نے ان پر (جنازے کی) چار تکبیرات پڑھیں، پھر چلے یہاں تک کہ میت کے قریب آگئے اور عرض کیا: اے اللہ! (یہ) تیرا بندہ ہے اور تیرے بندے کا فرزند ہے آج تیرے حضور حاضر ہے تو تو اس کے گناہوں کو معاف فرما، اس کی قبر کو اس کے لیے وسیع فرما، ہم اس کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتے اور تو اس (کے حال) کو بہتر جانتا ہے''۔

كتاب الزكوٰة

زکوٰۃ

اہمیت، فضیلت، مسائل

توحید و رسالت کی شہادت اور نماز کے بعد زکوٰۃ اسلام کا تیسرا بنیادی رکن ہے۔ یہ خالص مالی عبادت ہے جو تمام انبیائے کرام اور رسلِ عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شریعتوں کا لازمی جز رہی ہے۔ جس طرح انسان کو جسمانی امراض اور عوارض لاحق ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی اور اخلاقی امراض بھی لاحق ہوتے ہیں، ان میں بہت نمایاں اخلاقی بیماری، حب مال اور کثرتِ مال کی خواہش ہے، جس کے نتیجے میں انسان کے دل میں تکبر، حرص، بخل، ہوس اور خودغرضی کی صفاتِ رذیلہ پیدا ہوتی ہیں۔ عربی میں مال کو مال کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اس کی طرف قلبِ انسانی بہت جلد مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے فرمایا:

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ (التغابن: ۱۵)

"تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے آزمائش ہیں"۔

ان اخلاقی امراض کے ازالے کے لئے اللہ جل شانہٗ نے عبادتِ زکوٰۃ فرض کی ہے، چنانچہ فرمایا:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ

"(اے حبیب!) آپ مومنوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) لیجئے تاکہ اس کے ذریعے آپ ان کے ظاہر و باطن کو پاک و صاف کریں"۔ (التوبہ: ۱۰۳)

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (الیل: ۱۷۔۱۸)

"اور آتش دوزخ سے وہ نہایت متقی بندہ دور رکھا جائے گا، جو اپنا مال اس لئے (اللہ کی راہ میں) دیتا ہے کہ (اس کا قلب) پاک ہو جائے۔"

زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لئے قرآنی وعیدیں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ

لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: ۱۸۰)

''اور جو لوگ اس مال میں، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انہیں عطا فرمایا ہے، بخل کرتے ہیں (اور اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے)، وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ ایسا مال ان کے حق میں خیر ہے بلکہ یہ ان کے لئے شر ہے اور عنقریب (قیامت کے دن) ان کے گلے میں بخل سے جمع کئے ہوئے مال کا طوق پہنایا جائے گا''۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (توبہ: ۳۵-۳۴)

''اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے تو (اے نبی!) انہیں اس دن کے دردناک عذاب کی وعید سنایئے جب ان کے اپنے جمع کئے ہوئے مال کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور پھر اس سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا) یہ ہے اس مال کا انجام جسے تم نے (بے پناہ چاہت سے) جمع کیا تھا، تو اب اپنے (اُس) مال کا مزہ چکھو جو تم (دنیا میں بخل سے) جمع کیا کرتے تھے''۔

انسان کی جان و مال بلکہ ہر چیز کا مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، انسان کی طرف مال و دولت اور اشیاء کی ملکیت مجازاً ہوتی ہے، انسان کو شریعت کی مقررہ حدود کے اندر اپنی جان و مال پر تصرف کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ شرعی قیود مال کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر ہر جہت سے عائد ہوتی ہیں، حلال و حرام اور کسبِ مال و صرفِ مال کے شرعی احکام اسی مقصد کے لئے ہیں اور قیامت کے دن اسی کی باز پرس ہوگی۔ انسان بعض اوقات اپنی بیوی بچوں اور اہل و عیال کی جائز و ناجائز فرمائشوں اور خواہشات کی تکمیل کی خاطر ان شرعی احکام کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور پھر ایک دن داعیِ اجل کو لبیک کہنا پڑتا ہے، سارا جمع شدہ مال دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ مال پر وارث دادِ عیش دیتے ہیں اور حساب قبر میں مردے کو دینا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُۙ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (التکاثر:۲-۱)

''تمہیں کثرت مال کی خواہش نے (آخرت کی جواب دہی سے) غافل کردیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں میں جاکر (اس کا انجام) دیکھ لوگے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (الحشر:۱۸)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو اس امر کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ اس نے کل (آخرت) کے لئے کیا آگے بھیجا ہے''۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ (البقرہ:۲۵۴)

''اے ایمان والو! ہمارے دیئے گئے مال میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، اس یوم (جزا) کی آمد سے قبل، جبکہ (دولت کے بل پر) نہ نیکیوں کو خریدا جاسکے گا، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ ہی سفارش چلے گی''۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کتنی رحیم وکریم ہے کہ وہ خود اپنے بندے کو مال ودولت سے نوازتا ہے اور پھر امتحان کے طور پر اس سے فرماتا ہے:

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَیْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ...... (المزمل:۲۰)

''اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض حسن دو اور جو بھی عمل خیر تم (زکوٰۃ وصدقات کی صورت میں اپنی عاقبت کے لئے) آگے بھیجو گے، تو اسے اللہ کی بارگاہ میں (بدرجہا) بہتر اور بہت بڑے اجر کی صورت میں پاؤ گے''۔

لہٰذا قرآن مجید کی ان آیات مقدسہ کی تعلیم یہ ہے کہ بندۂ مومن کو اپنی کمائی میں سے اپنا حصہ نکال کر اللہ تعالیٰ کی امان وحفاظت میں دینا چاہئے، امام رازی سے کسی نے پوچھا کہ اگر کوئی چاہے کہ اس کا سارا مال اس کے ساتھ قبر میں جائے تو اس کی خواہش کی تکمیل کیسے ممکن ہے؟ انہوں نے فرمایا: ''وہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کردے، وہ سارا کا سارا اجر کثیر کی صورت میں اسے مل

جائے گا۔ ایک حدیث پاک میں ہے کہ ایک بار کاشانۂ نبوت میں ایک بکری ذبح کی گئی، حضور اکرم ﷺ شام کو گھر واپس تشریف لائے تو آپ نے دریافت فرمایا کچھ بچا ہے؟ گھر والوں نے عرض کیا، ایک دست بچا ہے، باقی خرچ ہو گیا، یعنی اللہ کے نام پر صدقہ کر دیا ہے، آپ نے فرمایا اس طرح نہ کہو، بلکہ یوں کہو جو اللہ کے نام پر دے دیا وہ بچ گیا ہے، (یعنی آخرت کے لئے) اور جو گھر والوں کے لئے بچا ہے وہ خرچ ہو گیا ہے"۔

☆......☆......☆......☆......☆

زکوٰۃ کی تشخیص، ادائیگی اور مصارف کے پیچیدہ مسائل

زکوٰۃ کا مفہوم

لغت میں زکوٰۃ کا معنی پاکیزگی، نمو، اضافہ اور برکت ہے۔ مال اور دولت سے انسان میں حرص، بخل، تکبر، تمرد اور فسق و فجور کی صفاتِ رذیلہ پیدا ہوتی ہیں۔ مالی عبادات کے طور پر اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض کی ہے تاکہ انفاق فی سبیل اللہ سے ان اخلاقی امراض کا ازالہ ہو اور انسان میں قناعت، جود و سخا، انکسار اور تقویٰ و حسنِ عمل کی اعلیٰ صفات پیدا ہوں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ان کے اموال سے زکوٰۃ وصول کر کے ان (کے قلب و ذہن) کا تزکیہ کیجئے" (سورۂ توبہ) قرآن کی رو سے زکوٰۃ ادا کر کے مالدار، مفلس و نادار پر احسان نہیں کرتا بلکہ وہ حقدار کو اس کا حق لوٹاتا ہے جو مال و دولت عطا کرنے والے ربِ کریم نے اس کے مال میں شامل کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات:۱۹)

"اور ان (مالداروں) کے مال میں سائل اور مال سے محروم لوگوں کا حق ہے"۔

گویا قرآن مجید کا پیغام یہ ہے کہ جو شخص استطاعت کے باوجود زکوٰۃ ادا نہیں کرتا وہ حق تلفی کرنے والا، ظالم اور غاصب ہے، کیونکہ وہ نادار کے حق کو لوٹانے سے عملاً منکر ہے۔

وجوبِ زکوٰۃ

مالدار پر زکوٰۃ فرض ہونے کی شرائط یہ ہیں: اسلام، عاقل ہونا، بالغ ہونا، نصاب شرعی کا مالک ہونا (یعنی صاحبِ نصاب ہونا) اور نصاب پر پورا ایک قمری سال گزر جانا۔

نصابِ زکوٰۃ

اس سے مراد وہ کم از کم مالیت ہے، جس کا مالک ہونے سے مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے اور

نصابِ شرعی کی مقدار یہ ہے 612.36 گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم، یا مالِ تجارت جو اس کی حاجتِ اصلیہ سے زائد ہو، یا 87.48 گرام سونا یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم یا مالِ تجارت جو اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہو۔ آج کل چاندی اور سونے کے نصاب کی مالیت میں تقریباً ایک اور سات کی نسبت ہے۔ فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر اموال متفرق ہوں (یعنی کچھ سونا اور کچھ چاندی اور دیگر اموال) یا صرف چاندی، تو چاندی ہی کے نصاب کا اعتبار ہوگا تا کہ ناداروں کو فائدہ ہو۔

حولانِ حول کا مفہوم

وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ضروری ہے کہ مال پر سال گزر جائے، اسے فقہی اصطلاح میں ''حولانِ حول'' کہتے ہیں۔ شریعت کی رو سے جس دن کوئی بالغ مسلمان مرد یا عورت زندگی میں پہلی بار مندرجہ بالا تفصیل کے مطابق کم از کم نصاب کا مالک ہو جائے تو اسلامی کیلنڈر کی اسی تاریخ سے وہ ''صاحبِ نصاب'' قرار پاتا ہے۔ لیکن اس پر اسی دن سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس نصاب پر اس کی ملکیت میں پورا ایک قمری سال گزر نہ جائے، تاہم یہ امر پیش نظر رہے کہ سال بھر کے دوران ''صاحبِ نصاب'' کی ملکیت میں کم از کم نصاب کا رہنا ضروری ہے، ہر مال پر (خواہ وہ نقد رقم ہو یا سونا چاندی کی صورت میں ہو یا صنعت و تجارت کا مال ہو) سال گزرنا زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے لازمی نہیں ہے، اگر مال کے ہر جز پر سال گزرنے کی شرط کو لازمی قرار دیا جائے تو تاجر حضرات کے لئے زکوٰۃ کا حساب نکالنا (Assessment) تقریباً ناممکن العمل ہو جائے، کیونکہ مال کی آمد و خرچ کا سلسلہ روز جاری رہتا ہے، بلکہ تنخواہ دار آدمی بھی ہر ماہ کی تنخواہ سے کچھ پس انداز کرتا ہے لہٰذا مال کے ہر حصے کی مدت الگ ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں زکوٰۃ کی تشخیص کی مقررہ تاریخ سے چند دن قبل بھی اگر مال، ''صاحبِ نصاب'' کی ملکیت میں آ جائے تو اسے پہلے سے موجودہ مال میں شامل کر کے کل مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

اموالِ تجارت پر زکوٰۃ

مسلمان تاجر کی ملکیت میں جو بھی مال ہے، یعنی نقد رقم، بینک اکاؤنٹ، بانڈز، ڈیپازٹس، سونا چاندی اور مالِ تجارت وغیرہ، سب کی مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی غرض سے سونا،

چاندی اور مالِ تجارت کی وہ قیمت معتبر ہے جو وجوبِ زکوٰۃ کے وقت ہوگی، یعنی قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہے۔ لہٰذا احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان تاجر کو وجوبِ زکوٰۃ کی مقررہ تاریخ پر اپنے مالِ تجارت کی محتاط اسٹاک چیکنگ اور قدر (Valuation) یعنی صحیح قیمت کا تعین کرنا چاہئے۔

صنعت کاروں کی تشخیص

وہ کارخانہ جو پیداواری مقاصد کے لئے استعمال ہو رہا ہے، اس کی زمین، عمارت، متعلقہ تنصیبات اور مشینری کی قیمت پر جو صنعتی پیداواری مقاصد میں استعمال ہو رہی ہے، زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ البتہ مسلمان صنعت کار کو اپنے دیگر تمام اموال کے ساتھ کارخانے میں موجود خام مال تیار یا مال اور مارکیٹ میں کریڈٹ پر دیئے ہوئے تمام مال کی بھی زکوٰۃ کرنی ہوگی۔

تشخیصِ زکوٰۃ کے وقت واجب الادا قرض کا مسئلہ

تاجر حضرات کا اکثر مارکیٹ میں لین دین جاری رہتا ہے، کسی سے کچھ لینا ہے اور کسی کو کچھ دینا ہے، تجارت سے ہٹ کر بعض اوقات لوگوں کا شخصی لین دین بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا تشخیص زکوٰۃ کے وقت واجب الوصول رقم کو اپنی مالیت میں جمع کر کے اس سے واجب الادا رقم کو منہا کر دیا جائے۔ اس کے بعد جو مجموعی مالیت بنے گی اس پر زکوٰۃ دی جائے گی۔

طویل میعادی قرض اور صنعتی قرض کا مسئلہ

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کا قرض، بعض صنعتی اور تجارتی قرضوں کی ادائیگی فی الفور لازم نہیں ہوتی بلکہ وہ پانچ، دس، پندرہ سال یا اس سے بھی زائد مدت پر محیط ہوتے ہیں، ماہانہ یا سالانہ اقساط واجب الادا ہوتی ہیں۔ فوری ادائیگی کا نہ قرض خواہ مطالبہ کرتا ہے اور نہ مقروض فرد فوری طور پر قرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی ملکیت میں رقم ہونے کے باوجود مقررہ اقساط سے زیادہ ادا نہیں کرتا، ورنہ یہ سوال زیرِ بحث آنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ایسے قرضوں کے بارے میں ہمارے فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ یہ وجوبِ زکوٰۃ اور ادائیگی میں مانع نہیں ہیں۔ اس کی ایک مثال فقہاء نے بیوی کے مہر مؤجل کی دی ہے کہ بیوی مطالبہ نہیں کرتی اور شوہر کا عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سرِ دست ادا نہیں کرنا چاہتا، لہٰذا شوہر تشخیص زکوٰۃ کے وقت ایسے دین مہر کو اپنی کل مالیت سے منہا نہ کرے۔ میعادی قرضوں کی نوعیت

بھی اس سے مختلف نہیں ہے، اسی طرح طویل المدتی صنعتی قرضوں کا معاملہ ہے، ایک طرف تو ان قرضوں کے مقابل اتنی یا اس سے زیادہ مالیت کے اثاثے موجود ہوتے ہیں، صنعت بیمار قرار پاتی ہے۔ لیکن صنعت کار کی مالی صحت پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوتے، اس کے بنگلے، ذاتی اثاثے، جائیدادیں، کاریں، غیر ملکی مہنگے سفر پوری شان کے ساتھ قائم و دائم رہتے ہیں۔ ان کے اور ان کے اہل و عیال کی بود و باش اور رہن سہن انتہائی تمول کی سطح پر نظر آتے ہیں۔ کچھ ہمارے ملکی قوانین، انکم ٹیکس وغیرہ کے پیچیدہ قوانین، بیوروکریسی کے بے کراں صوابدیدی اور انضباطی اختیارات، ایسی وجوہ ہیں کہ کالے دھن اور سفید دھن کا مسئلہ آج تک حل نہیں ہو پایا۔ ہمارے اہل ثروت اور صنعت کاروں کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ معاملہ شفاف رکھنا چاہئے اور طویل المدتی قرضوں کو منہا کئے بغیر اپنی پوری مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے تاکہ کل قیامت کے دن اپنے ہی جمع کردہ مال سے نہ داغے جائیں۔

مکان، دکان، فلیٹس اور پلاٹوں پر زکوٰۃ

ذاتی استعمال کا مکان زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے، اسی طرح ذاتی مکان کے لئے خریدا ہوا پلاٹ بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ مکان، یا پلاٹ یا دکانیں، فلیٹس جو کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں، ان کی سالانہ آمدنی وضع مصارف کے بعد مالکِ جائیداد کی مجموعی سالانہ آمدنی میں جمع ہوگی اور تمام ذرائع آمدن سے سال کے اختتام پر جو رقم پس انداز ہوگی، اس سب پر زکوٰۃ ہے۔ ایسے مکانات، پلاٹس، دکانیں یا فلیٹس جو کاروباری اور تجارتی مقاصد کے لئے ہیں، یعنی نفع کمانے کی غرض سے، ان سب کی مالیت پر زکوٰۃ ہے، اور اس میں قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہے بلکہ موجودہ قیمت کا اعتبار ہوگا۔ بطور انویسٹمنٹ پلاٹس اور جائیدادیں خریدنے والوں کے لئے یہ سب سے زیادہ قابل توجہ مسئلہ ہے۔ کرائے پر دیئے ہوئے مکان، دکان، فلیٹس وغیرہ کے ڈیپازٹ کی جو رقم جائیداد کے مالک کے پاس بطور زرِ ضمانت جمع ہے، اس کی زکوٰۃ رقم کا اصل مالک (کرایہ دار) ادا کرے گا، اسی طرح تاجر حضرات اور ایجنسی ہولڈرز کی جو رقوم بطور ضمانت (Security Depositis) کسی ادارے یا فرم کے پاس جمع ہیں اور قابلِ واپسی ہیں، اس رقم کی زکوٰۃ بھی اصل مالک یعنی (Depositer) کو ادا کرنی ہوگی۔

اگر صاحب نصاب کے قرض کی رقم پھنسی ہوئی ہے اور مقروض نادہندہ ہے لیکن اس کی واپسی کی آس قائم ہے تو اس کی زکوٰۃ دے دینی چاہیے، اگر نہ دی تو ملنے پر گزشتہ ساری مدت کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔ البتہ قرض کی ڈوبی ہوئی رقم کی زکوٰۃ اگر نہ دی تو وہ جواب دِہ نہیں ہوگا۔

استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ

سونا اور چاندی از روئے شریعت خلقی طور پر (In Born) مال ہیں، لہٰذا یہ کسی بھی ہیئت (Form,Shape) میں ہوں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ مثلاً برتن، مالیاتی سکے (Coins) سونے یا چاندی کی ڈلی (GoldBullion) استعمال کے زیورات وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے موٹے اور بھاری کنگن (Grasping) تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم ان کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ اس نے عرض کیا: نہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: تو کیا تم اس بات پر خوش ہوگی کہ اللہ تعالیٰ (زکوٰۃ نہ دینے کی بناء پر) ان کنگنوں کے عوض قیامت کے دن تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟ یہ (وعیدِ عذاب) سنتے ہی اس نے وہ کنگن اتار کر رسول اللہ ﷺ کو دے دیئے اور عرض کیا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں صدقہ ہیں، (سنن ابی داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی)''۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں سونے کے ''اوضاح'' (ایک خاص زیور کا نام ہے) پہنتی تھی، میں نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! کیا یہ بھی اس کنز میں شامل ہے (جس پر سورۃ توبہ آیت: ۳۴۔۳۵ میں عذاب جہنم کی وعید آئی ہے)؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جو سونے کے زیورات اتنی مقدار کو پہنچ جائیں کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور پھر ان کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو ان پر کنز کا اطلاق نہیں ہوتا''۔

(سنن ابی داؤد، مؤطا امام مالک)

ان احادیث مبارکہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ استعمال کے زیورات پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، کیونکہ دونوں خواتین نے سونے کے زیورات پہن رکھے تھے۔

اگر سونا یا چاندی مخلوط (Mixed) ہو اور کسی اور چیز کی ملاوٹ اس میں ہو تو غالب جز کا اعتبار

ہوگا، یعنی اگر شے مخلوط میں غالب مقدار سونا ہے تو اسے سونا قرار دے کر ان کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی ورنہ نہیں، البتہ ہیرے اور دوسرے قیمتی پتھر مثلاً زمرد، عقیق، یاقوت وغیرہ اگر تجارت کے لئے ہیں تو ان پر زکوٰۃ ہے، ذاتی استعمال میں ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

بچوں کی شادی کے لئے مختص زیورات پر زکوٰۃ

اگر صاحب نصاب نے اپنے بالغ بیٹوں یا بیٹیوں کی شادی کے لئے زیورات بنوا کر رکھے ہوئے ہیں، تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے اولاد کو اس کا مالک بنا دیا ہے، دوسری یہ کہ بدستور اس کی ملک میں ہیں، جو بھی صورت ہو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

حج کے لئے جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ

اگر کسی نے حج کے لئے رقم جمع کر رکھی ہے اور نیت یہ ہے کہ اس رقم کو حج پر صرف کرے گا تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر حکومت کے پاس اس مد میں جمع کرا دیئے ہیں تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے۔

پھنسا ہوا قرض زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہوتا

اگر مقروض نادہندہ اور نادار ہے تب بھی پھنسی ہوئی رقم کے لئے یہ نیت کر لینا کہ وہ زکوٰۃ میں عنداللہ محسوب ہو جائے، ایسی نیت کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، جب تک کہ ابتداءً نادار کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت نہ کی جائے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اب اسے زکوٰۃ کی رقم دے دے اور مقروض اس رقم کا مالک بن کر ادائے قرض میں اسے واپس کردے، یہ شرعاً جائز ہے لیکن یہ آزادانہ تصرف ہوگا، زکوٰۃ دیتے وقت یہ شرط عائد نہیں کی جاسکتی۔ نیز فقہائے کرام نے ادائے زکوٰۃ میں اس امر کو مستحسن قرار دیا ہے کہ زیادہ فقراء کو فائدہ پہنچایا جائے۔ لہٰذا کسی ایک مستحق کو زکوٰۃ کی بھاری رقم دے دینا جائز تو ہے لیکن شرعاً پسندیدہ امر نہیں ہے۔

زکوٰۃ کہاں صَرف کی جائے؟

امام بخاری نے ایک طویل حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ''زکوٰۃ ان (مسلمانوں) کے مالداروں سے لے کر ان کے غریبوں کو لوٹا دی جائے۔'' اس حدیث کی روشنی میں فقہائے کرام نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ مال زکوٰۃ کو خرچ کرنے میں افضل یہ ہے کہ جس مقام

پر زکوٰۃ وصول کی جائے، وہیں کے فقراء اور ناداروں پر صَرف کی جائے، البتہ مندرجہ ذیل صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: (۱) یہ کہ اس مقام پر کوئی مستحق نہ ہو جیسے امریکا، یورپ یا بعض متمول مسلم ممالک میں ایسا ممکن ہے (۲) یا زکوٰۃ ادا کرنے والے کے مستحق قریبی رشتہ دار کسی دوسرے مقام پر رہتے ہوں۔ (۳) یا کسی جگہ کے مسلمان بہت زیادہ نادار اور ضرورت مند ہوں تو ان صورتوں میں دوسرے مقامات پر بھی زکوٰۃ کی رقوم بھیجی جاسکتی ہیں لیکن مقامی مستحقین کو بالکل نظر انداز کر کے دوسرے مقامات پر زکوٰۃ کی رقوم بھیجنا شرعاً قابل ترجیح اور پسندیدہ امر نہیں ہے، اگرچہ ایسا کرنے سے اصولی طور پر زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ کا سب سے اہم شعبہ

قرآن نے فرضیتِ زکوٰۃ کو توضاحت کے ساتھ متعدد مقامات پر بیان کیا ہے، لیکن نصابِ زکوٰۃ، شرائطِ وجوبِ زکوٰۃ اور شرحِ زکوٰۃ کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ یہ تمام تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں، البتہ جس شعبۂ زکوٰۃ کو قرآن نے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ مصارفِ زکوٰۃ کا شعبہ ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ آیت: ۶۰ میں ان آٹھ مصارف کی تصریح کر دی گئی ہے جن پر زکوٰۃ صَرف کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) فقراء (۲) مساکین (۳) عاملینِ زکوٰۃ (۴) مؤلفۃ القلوب (۵) جن کو طوقِ غلامی سے آزاد کرنا مقصود ہو (۶) جو بارِ قرض تلے دبے ہوئے ہوں یا ان پر کوئی تاوان آپڑا ہو (۷) جنہوں نے کل وقتی اپنے آپ کو دین کی نصرت و حفاظت کے لئے وقف کر رکھا ہو (۸) ایسے مسافر جن کا گھر سے رابطہ منقطع ہو چکا ہو۔

سنن ابوداؤد کی ایک طویل حدیث میں زیاد بن حارث صدائی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ عنایت فرمایئے! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوٰۃ کے معاملے کو کسی نبی یا غیر نبی کی مرضی پر نہیں چھوڑا بلکہ خود ہی فیصلہ فرما دیا ہے اور اس کی آٹھ اقسام بیان کی ہیں، اگر تم ان میں سے کسی قسم کے تحت حقدار بنتے ہو تو میں زکوٰۃ میں سے تم کو دے دوں گا (ورنہ نہیں)۔ لہٰذا زکوٰۃ نکالنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل مستحقین تک پہنچانا اور جائز شرعی مصارف پر صَرف کرنا بھی لازم ہے ورنہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ ہمارے معاشرے میں جمع وصرفِ زکوٰۃ کی بعض صورتیں رائج ہیں جو

شرعا درست نہیں ہیں۔

مدارس تعلیم القرآن

بعض جگہ مقامی طور پر مساجد میں یا بعض دینی، تبلیغی اور رفاہی تنظیموں کے تحت مکاتب تعلیم القرآن کا ایک نیٹ ورک قائم کیا گیا ہے، ان مدارس و مکاتب میں ان مقامی لوگوں کے بچے حفظ و ناظرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو زکوٰۃ یا فطرہ ان اداروں کو دیتے ہیں، ان مدارس و مکاتب کے معلمین کے مشاہرے ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ، فدیہ، فدیہ صوم، نذر، کفارہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ ایسے مصرف کے لئے زکوٰۃ لینا اور دینا جائز نہیں، کیونکہ یہ خود اپنی زکوٰۃ سے استفادہ کی بالواسطہ صورت ہے۔ البتہ وہ دینی مدارس و جامعات جن میں مستحق اقامتی طلبا دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ زکوٰۃ، فطرہ و صدقات واجبہ کا بہترین مصرف ہیں۔

کمیونٹیز اور برادریوں کے رفاہی فنڈ

بعض کمیونٹیز، برادریوں، مخصوص خاندانی یا علاقائی وحدت کے لوگوں نے اپنی کمیونٹی یا برادری کے افراد کے لئے رفاہی فنڈ قائم کر رکھے ہیں، فاؤنڈیشن یا ٹرسٹ کی صورت میں، اس فنڈ میں زکوٰۃ، فطرہ اور چرم قربانی وغیرہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ اس فنڈ سے برادری یا کمیونٹی کے افراد کو آسان شرائط پر قرض دیئے جاتے ہیں۔ خرچ کرتے وقت مستحق زکوٰۃ کے شرعی معیار کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، یہ طریقہ کار شرعا درست نہیں ہے۔ اول تو زکوٰۃ جب تک مستحق تک نہیں پہنچے گی محض برادری کے فنڈ میں جمع ہونے سے ادا نہیں ہوگی۔ دوم یہ کہ فطرہ و زکوٰۃ کی رقم جب تک الگ مد میں رکھ کر تملیک کے شرعی اصول کے مطابق مستحق فرد کو ادا نہیں کی جائے گی، ادا نہیں ہوگی۔ مندرجہ بالا مقاصد بلاشبہ لائق تحسین ہیں، لیکن ان کے لئے صدقاتِ واجبہ یعنی زکوٰۃ، فطرہ اور فدیہ وغیرہ سے الگ نفلی صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی عمومی رقوم اور عطیات وغیرہ پر مشتمل ''ویلفیئر فنڈ'' قائم کرنا چاہئے۔ جس کے صَرف پر زکوٰۃ، فطرہ والی پابندیاں عائد نہیں ہوں گی۔

مساجد کی تعمیر و مصارف پر زکوٰۃ خرچ کرنا

مساجد کی تعمیر اور مصارف جاریہ پر زکوٰۃ و فطرہ کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض لوگ ان مقاصد کے لئے حیلہ کا سہارا لیتے ہیں، یہ حیلہ کا غلط استعمال ہے اور اس سے منشائے شریعت کو

باطل کرنا مقصود ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۲۶ پر لکھتے ہیں:
کسی خفیہ طریقہ سے مقصود حاصل کرنے کو حیلہ کہتے ہیں، علما کے نزدیک اس کی کئی اقسام ہیں:
(۱) اگر جائز طریقے سے کسی کا حق (خواہ اللہ کا حق ہو جیسے زکوٰۃ یا بندے کا حق) باطل کیا جائے یا کسی باطل (مثلاً سود، رشوت، پگڑی وغیرہ) کو حاصل کیا جائے تو یہ حیلہ حرام ہے۔
(۲) اگر جائز طریقے سے کسی حق کو حاصل کیا جائے یا کسی ظلم یا باطل کو دفع کیا جائے تو حیلہ مستحب یا واجب ہے۔
(۳) اگر جائز طریقے سے کسی ضرر سے محفوظ رہا جائے تو یہ حیلہ مباح ہے۔
(۴) اگر جائز طریقے سے کسی مستحب کو ترک کرنے کا حیلہ کیا جائے تو یہ مکروہ ہے۔

ہسپتالوں میں زکوٰۃ سے نادار مریضوں کا علاج

رفاہی ادارے جو مریضوں کے علاج کے لئے زکوٰۃ کی رقم جمع کرتے ہیں، وہ اگر حدودِ شرع میں رہ کر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی چند صورتیں یہ ہیں:
(۱) جو دوا نادار مستحق زکوٰۃ کی ملک میں دے دی جائے گی وہ جائز ہے۔
(۲) ڈاکٹر کی فیس، بیڈ کے کرائے، ایکسرے، میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ پر جو خرچ آئے، وہ مریض خود ادا کرے اور استحقاق کے تعین کے بعد شعبۂ زکوٰۃ سے مریض کو ان مصارف کے عوض کل یا گنجائش کے تناسب سے جتنی رقم دی جاسکتی ہے، دے دی جائے۔
(۳) زکوٰۃ و فطرہ یعنی صدقاتِ واجبہ کی رقم صرف مستحق مریضوں کو دی جائے، غیر مسلم نادار مریضوں کے لئے الگ سے "ویلفیئر فنڈ" قائم کیا جائے جو عطیات پر مشتمل ہو۔
(۴) چند سال پیشتر جب مرکزی زکوٰۃ کونسل کے ایک رکن نے ایک رفاہی ادارے کا معائنہ کیا تھا تو انہوں نے زکوٰۃ کے حوالے سے بہت سے ناقص پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی تھی۔

جامعات کے مستحق طلبہ کی اعانت

کالجوں اور جامعات میں زیرِ تعلیم مستحق طلبہ کی اعانت کی جاسکتی ہے، اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انہیں زکوٰۃ کی مد سے براہِ راست رقم دی جائے اور وہ متعلقہ ادارے کی فیس خود ادا کریں۔ انہیں ذاتی استعمال کے لئے بطورِ ملکیت کتابیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ البتہ زکوٰۃ کی رقم سے لیبارٹری

کے آلات، کمپیوٹرز، لائبریری کے لئے کتب نہیں خریدی جاسکتیں کیونکہ زکوٰۃ محض کسی چیز کو مباح قرار دینے یا اس پر تصرف کا موقع دینے سے ادا نہیں ہوتی۔ البتہ جس طالب علم کی اعانت مالِ زکوٰۃ سے کی گئی ہو اس سے ان اشیاء یا لائبریریز، لیبارٹری، ہاسٹل وغیرہ کے استعمال کی فیس وصول کی جاسکتی ہے۔

محض رقم الگ کردینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی

محض اپنے پاس سے زکوٰۃ کی نیت سے رقم الگ کر کے رکھ لینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی تاوقتیکہ وہ مستحقین تک پہنچا نہ دی جائے، لہٰذا اگر زکوٰۃ کی نیت سے رقم اپنے پاس الگ کر کے رکھ دی ہو اور خدانخواستہ وہ تلف ہو جائے یا چوری ہو جائے تو زکوٰۃ اب بھی ادا کرنا لازم ہے، اس طرح وہ بری الذمہ نہیں ہوگا۔

دورانِ سال زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی

اگر دورانِ سال کوئی صاحبِ نصاب تھوڑی تھوڑی رقم وقتاً فوقتاً زکوٰۃ کی نیت سے مستحقین کو ادا کرتا رہا ہے تو سال کے اختتام پر، تشخیصِ زکوٰۃ کے بعد پہلے سے ادا شدہ رقم کو وضع کر کے باقی رقم ادا کرے، اسی طرح مجموعی واجب الاداز کوٰۃ کی رقم بالاقساط بھی ادا کرسکتا ہے۔

زکوٰۃ فنڈ سے قرضِ حسن

حال ہی میں ہمارے پاس ایک سے زیادہ استفسار آئے ہیں کہ بعض برادریوں (Communities) کی فلاحی انجمنیں (Welfare Associations) ہیں، وہ برادریوں کے اہلِ ثروت افراد سے زکوٰۃ، فطرہ اور فدیہ کی رقم جمع کر کے اس میں سے برادری کے نادار اور مستحق افراد کی مدد کرتے ہیں، یہ ایک مستحسن امر ہے اور شرعاً درست ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کرتے ہیں کہ اس زکوٰۃ فنڈ سے ضرورت مند افراد کو قرضِ حسن کے طور دیتے ہیں اور پھر ان سے آسان اقساط میں وصول کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا جاری (Regenerating) فنڈ بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، زکوٰۃ کی ادائیگی سے بری الذمہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ مستحق زکوٰۃ کو اس کا مالک بنادیں اور ان کو اختیار ہو کہ اپنی آزادانہ مرضی سے جیسے چاہیں تصرف کریں، انجمنوں (Associations) کے ذمہ داران صرف زکوٰۃ کے لئے اہلِ ثروت کے

وکیل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس ذمہ داری کو شرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔ ایسی انجمنوں کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ وہ صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فدیہ، فطرہ، نذر اور کفارہ کی رقوم) سے الگ عطیات اور نفلی صدقہ وخیرات پر مشتمل ایک رفاہی فنڈ (Welfare Fund) قائم کریں جس سے ضرورت مندوں کو بلا سود قرضے جاری کریں اور ادائیگی کے لئے انہیں حسبِ حال رعایت دیں اور اگر کوئی نادار قرض کی واپسی کے قابل نہ ہو تو اسے معاف کر دیں۔ یہ اپنی جگہ ایک بہت بڑی نیکی اور اجر کا کام ہے۔

زکوٰۃ فنڈ کا انویسٹمنٹ

بعض انجمنیں زکوٰۃ کی رقوم کو قومی بچت کی اسکیموں میں لگا کر سرمایہ کاری کرتی ہیں، اور ان سے جو سود حاصل ہوتا ہے اس سے ناداروں کی اعانت کرتی ہیں، یہ عمل بھی شرعاً ناجائز ہے، اس سے زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوتی اور سود لینے کا وبال الگ ہے، ایسے لوگ گنہگار ہیں، اگر زکوٰۃ دینے والوں کی منشا بھی اس میں شامل ہے تو وہ بھی گنہگار ہوں گے اور ان کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوگی۔

اپنے اصول وفروع کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا

قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔ تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ) کو زکوٰۃ دینے سے ادا نہیں ہوگی۔ یہی حکم صدقۂ فطر، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے، بہو یا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر کی اپنی بیوی کی کسی سابقہ شوہر کی اولاد کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ البتہ بہن بھائی بشرطِ استحقاق ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

ہر فرد مسئول ہے

اسلامی عبادات خواہ بدنی ہوں (جیسے نماز اور حج وغیرہ) یا مالی (جیسے زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ وغیرہ) ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرداً فرداً عائد ہوتی ہیں۔ خاندان پر بحیثیتِ مجموعی عائد نہیں ہوتیں۔ لہٰذا والدین اور اولاد، شوہر اور بیوی میں سے جو بھی ''صاحبِ نصاب'' ہوگا، اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور اسے اپنے مال میں سے ادا کرنی ہوگی۔ ہاں البتہ اگر شوہر بیوی کی طرف سے یا

اولاد والدین کی طرف سے ان کی مرضی اور اجازت سے زکوٰۃ ادا کریں تو ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ کی شرح اور حکمتِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کی شرح سونا، چاندی، نقد رقوم، شیئرز، بینک ڈیپازٹس، بانڈز، اموالِ تجارت وغیرہ پر ڈھائی فیصد ہے، جو فرض کے درجے میں ہے، مطلوب کامل اور آئیڈیل نہیں ہے۔ آئیڈیل تو یہ ہے کہ انسان زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد باقی حلال اور طیب مال میں سے بھی ناداروں اور حاجت مندوں کی مدد کرے۔ ضرورت مند، قرابت داروں کی اعانت کرے۔ صدقاتِ نافلہ، عطیات اور صدقاتِ جاریہ کے کاموں میں صَرف کرے، دولت کا بندہ بن کر نہ رہ جائے، دولت کو اللہ کی بندگی میں خرچ کرے۔

تنگیٔ رزق، بارِ قرض سے سبکدوش ہونے کا وظیفہ

سوال: آج کل میں معاش اور روزگار کی تنگی کا شکار ہوں، قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں اور ادائیگی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی، کوئی ایسا وظیفہ بتایئے جس کی برکت سے بارِ قرض سے نجات مل جائے اور رزق میں کشادگی آئے۔ (عبدالرحمٰن، کیماڑی، کراچی)

جواب: امام احمد رضا قادری نے لکھا ہے کہ قرض اور تنگیٔ رزق سے نجات کے لیے مندرجہ ذیل وظیفہ پڑھیں، ہر نماز کے بعد گیارہ مرتبہ اور صبح و شام سو سو بار، اول و آخر درود شریف پڑھیں، لکھتے ہیں: ''اس دعا کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تجھ پر مثل پہاڑ کے بھی قرض ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی ادائیگی کے اسباب پیدا فرما دے گا۔ دعا کے کلماتِ مبارکہ یہ ہیں:

اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَ اَغْنِنِيْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ۔

''اے اللہ! مجھے حلال رزق اس قدر عطا فرما کہ حرام کی حاجت ہی نہ رہے اور اپنے فضل و کرم سے اتنا عطا فرما کہ غیر کا احتیاج نہ رہے''۔

اسی طرح آپ سے پوچھا گیا کہ آمدنی کی قلت ہے اور اہل و عیال کی کثرت سے سخت دشواری ہے، آپ نے فرمایا کہ بعد نمازِ عشاء قبلہ رو ہو کر باوضو، ننگے سر ایسی جگہ کہ جہاں سر اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو، یہاں تک کہ سر پر ٹوپی بھی نہ ہو، روزانہ پانچ سو بار

"یَا مُسَبِّبَ الْاَسْبَابِ" پڑھے اول و آخر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھے۔
(نوٹ: خواتین سرڈھانپ کر ایسی جگہ بیٹھ کر پڑھیں جہاں پردے کا بھی اہتمام ہو) ان وظائف کے ساتھ حسبِ توفیق و استطاعت جدوجہد اور سعی و عمل میں بھی مشغول رہیں، انشاء اللہ العزیز مشکل سے نجات کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور مقدر ہوگی۔

شوہر مقروض ہو اور بیوی کے پاس سونا ہو

سوال: میں بچوں کی شادی پر دو لاکھ کا مقروض ہوں، میری بیوی کے پاس اگر مقدارِ نصاب یا اس سے زیادہ سونا ہے تو زکوٰۃ کی ادائیگی کس کے ذمے ہے، (شاہ نواز بنگش۔ پی این ایس بہادر)

جواب: شرعاً ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد و عورت اپنے اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہیں، احکام شرعیہ میں خاندان بطور ایک یونٹ کے نہیں ہوتا بلکہ ہر ہر فرد اپنی اپنی ذات کے لئے مسئول ہوتا ہے۔ آپ مقروض ہیں تو آپ پر زکوٰۃ نہیں۔ آپ کی بیوی کے پاس بقدرِ نصاب، یعنی ساڑھے سات تولے (۸۷،۴۸ گرام) یا اس سے زائد سونا موجود ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اگر نقد رقم ادائیگی زکوٰۃ کے لئے نہیں ہے تو اسی سونے کا چالیسواں یعنی (۲ ۱/۲) ڈھائی فیصد وزن کاٹ کر دے۔

زکوٰۃ کا نصاب

سوال: سونے کے لئے زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟
(غازی خان شارع فیصل۔ ہلال احمد۔ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی)

جواب: سونے کیلئے زکوٰۃ کا نصاب ساڑھے سات تولے یعنی ۸۷،۴۸ گرام ہے، بشرطیکہ صرف سونا ہو اور کوئی دوسرا مال چاندی یا نقد رقم یا مال تجارت ملکیت میں نہ ہو، اگر اموال متفرق ہوں تو پھر چاندی کا نصاب معتبر ہوگا۔ یعنی ساڑھے باون تولے یا ۶۱۲،۳۶ گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت بازاری قیمت۔

زکوٰۃ بینک کے منافع یا اصل رقم پر دی جائے

سوال: زکوٰۃ بینک کے منافع یا اصل رقم پر ادا کی جائے، حکومتی بچت اسکیموں میں جمع رقم کا منافع ششماہی ملتا ہے، زکوٰۃ کیسے ادا ہوگی؟ اگر اصل رقم پر ہی گزر اوقات ہے تو کیا پھر بھی اس پر زکوٰۃ

ہے، متفرق مال پر کس طرح زکوٰۃ دی جائے، کاروباری منافع پر بھی زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

(ہلال احمد۔ سوسائٹی)

جواب: بینک یا حکومت کی بچت اسکیموں میں جمع اصل رقم پر زکوٰۃ واجب ہے، بینک انٹرسٹ تو سود ہے، جو شرعاً حرام ہے اور زکوٰۃ تو طیب مال پر واجب ہے، کاروباری منافع جائز ہے اور اس پر زکوٰۃ واجب ہے، تاریخ تشخیص زکوٰۃ پر مختلف مدات میں جتنا بھی مال ہو، مثلاً تنخواہ کی آمدنی (اگر ہے)، کرائے کی آمدنی (اگر ہے)، مال تجارت (اگر ہے)، بینک یا اسکیموں میں جمع شدہ اصل رقوم، کاروبار میں لگا ہوا مال مع منافع، کسی پر قرض ہے تو، اور زیورات وغیرہ، الغرض تمام ذرائع سے جو مال سال کے آخر میں بچ جاتا ہے اور جمع رہتا ہے، اس سب پر زکوٰۃ ہے ڈھائی فیصد کی شرح سے۔ کل مالیت کو چالیس پر تقسیم کردیں زکوٰۃ نکل آئے گی۔

بیٹی کی زکوٰۃ کی رقم سے انکم ٹیکس میں چھوٹ حاصل کرنا

سوال: میری بیٹی انگلینڈ میں رہتی ہے، وہ زکوٰۃ کی رقم بھیجتی ہے، جسے میں اپنے نام سے جمع کرا دیتا ہوں، پھر زکوٰۃ دے کر اپنے نام سے رسید بنوالیتا ہوں اور اس کی بناء پر انکم ٹیکس میں چھوٹ حاصل کرتا ہوں، کیا یہ شرعاً درست ہے؟ (زاہد عثمانی۔ ناظم آباد)۔

جواب: آپ کی بیٹی کا آپ کو ادائیگی زکوٰۃ کے لئے وکیل بنانا درست ہے۔ لیکن آپ کا اس رقم زکوٰۃ کو اپنی زکوٰۃ دکھا کر اس کے ذریعے انکم ٹیکس سے REBATE یعنی چھوٹ لینا درست نہیں ہے، یہ غلط بیانی ہے اور اسلام میں جائز نہیں ہے، کیونکہ اس REBATE کا استحقاق آپ کو تب حاصل ہوتا ہے جب آپ نے اپنی زکوٰۃ ادا کی ہو نہ کہ کسی اور کی، خواہ بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔

بنوہاشم کے لئے بنوہاشم کی زکوٰۃ

سوال: ہمارا تعلق بنوہاشم سے ہے یعنی ہم حضرت عباس بن عبدالمطلب کی اولاد ہیں، کیا ہم اپنی زکوٰۃ اپنے نادار رشتہ داروں کو دے سکتے ہیں، (نیاز الدین عباسی، گلشن اقبال)

جواب: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہمارے لئے صدقہ جائز نہیں ہے''۔ ائمہ اربعہ کے نزدیک بنوہاشم کے لئے زکوٰۃ جائز نہیں ہے۔ بنوہاشم میں آلِ علی، آلِ عباس، آلِ جعفر، آلِ عقیل اور آلِ حارث بن عبدالمطلب شامل ہیں۔ بنوہاشم کی اپنی زکوٰۃ بھی بنوہاشم کے لئے جائز

نہیں ہے۔ تاہم جو سادات یا بنی ہاشم ضرورت مند ہوں بنو ہاشم اور غیر بنو ہاشم سب کو چاہئے کہ اعزاز واکرام کے ساتھ ان کو ہدیہ اور نفلی صدقہ دیں اور رسول اللہ ﷺ سے نسبی قرابت کی وجہ سے ان کا احترام کریں اور حبِّ رسول کا ثبوت دیں۔

سید کی غیر سیدہ بیوی کو زکوٰۃ دینا

سوال: اگر شوہر سید ہو اور اس کی بیوی غیر سیدہ، تو کیا بیوی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

(نسیم عبداللہ۔ ڈیفنس)

جواب: جی ہاں دی جاسکتی ہے، اس کے بعد وہ اس مال کی مالک ہے جیسے چاہے خرچ کرے۔

بیوی اور بہو کے سونے کی زکوٰۃ

سوال: بیوی اور بہو کے سونے کی زکوٰۃ ایک ساتھ ادا کی جاسکتی ہے، (محمد نواز۔ بزنس ایونیو)

جواب: شرعاً ہر عاقل و بالغ مرد و عورت اپنے اپنے دینی فرائض (مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ) کے لئے جوابدہ ہے۔ بیوی شوہر کو اور بہو سسر کو اپنی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے وکیل بناسکتی ہیں، یا وہ خود ان کی اجازت سے ادا کرسکتے ہیں۔

بہن کو زکوٰۃ دینا

سوال: میری بہن کے شوہر معذور ہیں، ان کا ذاتی مکان بھی نہیں ہے، تو کیا انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ (نوید احمد۔ ناظم آباد)۔

جواب: اگر شرعاً بہن یا بہنوئی مستحق زکوٰۃ ہوں اور صاحب نصاب نہ ہوں تو انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

کیا دو سال کی زکوٰۃ اکٹھے دی جاسکتی ہے

سوال: کیا دو سالوں کی زکوٰۃ اکٹھی کر کے ایک صاحب کو دی جاسکتی ہے؟

(نوید احمد، ناظم آباد)

جواب: دینی فریضے کا بروقت ادا کرنا افضل ہے، تاہم اگر گزشتہ سال کی زکوٰۃ کسی کے ذمے باقی ہے تو اسے رواں سال کی زکوٰۃ کے ساتھ ملا کر دیا جاسکتا ہے، کسی ایک فرد کو زکوٰۃ کی بڑی رقم

دینا اگرچہ مستحسن نہیں ہے لیکن دینے سے ادا ہو جائے گی۔

صدقات کے فنڈ سے قرضِ حسن

سوال: پاکستان بھر میں ایک برادری جو اپنی برادری کے غریب، نادار، بے سہارا، بیوہ، یتیم اور بیماروں کی فلاح و بہبود کے لیے برادری کے مخیر حضرات سے زکوٰۃ، خیرات، صدقات، قربانی کی کھالیں و نقد عطیات وصول کرتی ہے اور شعبۂ امداد کے ذریعے برادری کے لوگوں کی مالی مدد کرتی ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کریں کہ اس فنڈ (شعبۂ امداد) سے برادری کے کسی شخص کو قرضِ حسن دیا جاسکتا ہے تاکہ وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر کے اپنی آمدنی بڑھا سکے اور اپنے خاندان کی کفالت آسانی سے کر سکے اور ماہانہ ادائیگی کرتا رہے۔ (محمد یاسین ملک، کراچی)

جواب: صدقات کی دو قسمیں ہیں، ایک صدقاتِ واجبہ ہیں، جیسے زکوٰۃ، فطرہ، نذر، کفارات اور فدیہ کی رقوم، ان کے آٹھ مصارف اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ آیت نمبر ۶۰ میں متعین کر کے بتا دیے ہیں، لہٰذا یہ رقوم مالکانہ بنیاد پر ان مستحقین کو دے دی جائیں اگر برادری کے اندر ایسے مستحقین موجود ہوں تو انہیں دیں، ورنہ صدقات دینے والوں کی اجازت سے برادری سے باہر کے ضرورتمندوں اور ناداروں کی مدد کریں، ان صدقاتِ واجبہ کا کھاتہ (Head of Account) اور مصارف کا ریکارڈ الگ ہونا چاہیے۔ دوسری قسم کے صدقات نفلی ہیں جن میں عام خیرات کی رقم اور عطیات شامل ہیں، ان میں سے "قرضِ حسنہ" کا شعبہ قائم کر سکتے ہیں، بشرطیکہ عطیہ وخیرات دینے والے اس کی اجازت دیں۔

زیورات پر زکوٰۃ جبکہ نقد رقم نہ ہو

سوال: ہماری مالی حیثیت کمزور ہے، ہم پر زیورات کی ڈھائی ہزار روپے زکوٰۃ واجب الادا ہوتی ہے، جو ہم سال بھر تھوڑا تھوڑا کر کے بھی بمشکل ادا کر پاتے ہیں کہ نئے سال کی زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ اب بتائیں کہ اس حال میں ہمارا مال اور کھانا پینا حرام ہے؟ نیز یہ کہ اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ (م۔الف۔ع، کراچی)

جواب: سونا یا چاندی زیورات کی شکل یا کسی بھی شکل میں اگر بقدرِ نصاب ہے تو اس پر زکوٰۃ بہر حال فرض ہے۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے، اس کی رو سے آپ زکوٰۃ ادا کر رہے ہیں،

اگرچہ اقساط میں اور قدرے تاخیر سے، زکوٰۃ کی ادائیگی میں شریعت نے یہ رخصت رکھی ہے کہ وقت سے پہلے بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ اقساط میں بھی ادا کی جاسکتی ہے اور یکمشت بھی ادا کی جاسکتی ہے، بروقت ادا کرنا افضل ہے کیونکہ کسی کو نہیں معلوم کہ کل کا دن زندگی میں آئے گا یا نہیں آئے گا۔ تاہم وقتِ وجوب کے بعد کی ادا کردہ زکوٰۃ بھی عنداللہ ادا ہی شمار ہوتی ہے۔ زکوٰۃ میں قضاء کا تصور نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کا مال اور کھانا پینا حلال ہے، متفکر نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ سے رزق کی کشادگی اور وسعت کے لئے دعاء کرتے رہیں اور مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد اول وآخر درود شریف پڑھ کر یہ دعاء قرآنی پڑھیں:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًاۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ

(الطلاق: ۳-۲)

اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے مشکل اور تنگی سے نکلنے کی راہِ نجات مقدر فرمادیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا فرمادیتا ہے جو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتی''۔

اور سوبار ''یَامُسَبِّبَ الْاَسْبَاب'' پڑھا کریں۔

سونا اور چاندی جب کم ازکم مقدارِ نصاب کی مالیت کی ہیں ان پر زکوٰۃ فرض ہے اگر نقد رقم نہیں تو اس میں سے چالیسواں حصہ نکال کردینا ہوگا۔ باقی شریعت نے زکوٰۃ ''مال نامی'' پر فرض کی ہے، یعنی ایسا مال جس میں اگر انسان کاروبار وغیرہ کے ذریعے چاہے تو نمو کی صلاحیت موجود ہے ورنہ خانہ داری کے سامان، سواری کی چیز یا آلاتِ کسب پر زکوٰۃ نہیں ہے نہ ہی مکان کی مالیت پر زکوٰۃ ہے۔

اگر عیدالفطر کے دن صدقۂ فطر نہ ادا کرسکا ہوتو؟

سوال: میری آمدنی بہت کم ہے اور گزارہ مشکل سے ہوتا ہے، عیدالفطر کے دن یعنی یکم شوال المکرم کو میرے پاس ضرورت سے زائد اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ میں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا فطرہ ادا کرسکتا، کیا اب مجھ پر اس کی قضاء واجب ہے اور مجھے بعد میں ادا کرنا ضروری ہے،

(عبداللہ۔ لانڈھی، کراچی)

جواب: یکم شوال المکرم یعنی عیدالفطر کو، جن صاحب کی مِلک میں ضرورت سے زائد بقدر

نصابِ زکوٰۃ فاضل رقم موجود ہو، ان پر اپنے اور اپنے زیرِ کفالت افراد کا فطرہ ادا کرنا واجب ہے۔فطرے کے وجوب کے لئے نصاب پر سال گزرنا یا سال بھر "صاحب نصاب" رہنا شرط نہیں ہے، یہی صورتِ حال قربانی کے وجوب کی ہے، جبکہ اس کے برعکس "فرضیتِ زکوٰۃ" کے لئے سال بھر "صاحبِ نصاب" رہنا شرط ہے۔اگر آپ کے پاس عیدالفطر کے دن یعنی یکم شوال المکرّم کو وقتی ضرورت سے زائد کم از کم نصاب زکوٰۃ کے برابر رقم نہیں تھی، تو آپ پر صدقہء فطر واجب ہی نہیں ہوا، لہٰذا اس کی کوئی قضاء بھی آپ کے ذمے نہیں ہے۔البتہ اگر آپ اس دن "صاحبِ نصاب" ہوتے اور فطرہ ادا نہ کیا ہوتا تو جب تک آپ ادا نہ کرتے آپ سے اس کا وجوب ساقط نہ ہوتا۔اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دین میں آسانی رکھی ہے اور بندے کو کسی ایسی جسمانی یا مالی ذمہ داری کے لئے مکلّف (جوابدہ) نہیں ٹھہرایا، جس کا ادا کرنا اس کے بس میں نہ ہو۔

☆***☆ ***☆***☆***☆

كتاب الصوم

تراویح کی رکعات کتنی ہیں؟

سوال: تراویح کی رکعات آٹھ ہیں یا بیس، دلائل سے بتائیں۔؟ (مہر۔ بلوچ کالونی)

جواب: جہاں تک آٹھ رکعات کا حضور ﷺ سے بطورِ تراویح ثابت کرنے کا دعویٰ ہے، یہ باطل ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں حدیث ہے: "اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز (تہجد) رمضان وغیر رمضان میں تیرہ رکعات ہوتی تھیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ گیارہ، تیرہ اور پندرہ رکعات مع وتر کے بارے میں جو احادیث ہیں وہ تہجد پر محمول ہیں، جو رمضان وغیر رمضان دونوں کے بارے میں ہیں، ان سے تراویح کا ثبوت درست نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس بات پر اجماع ہے کہ تراویح کی رکعات کی تعداد بیس ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ اور مؤطا امام مالک کی روایات میں مع وتر ۲۳ رکعات کا ثبوت موجود ہے، اسی طرح سنن کبریٰ للبیہقی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ میں متعدد روایات ۲۰ تراویح کے ثبوت میں موجود ہیں۔ حافظ ابوبکر کی السنن الکبریٰ اور سنن ترمذی میں بھی ۲۰ رکعات تراویح کا ثبوت موجود ہے۔

کیا تراویح بیٹھ کر پڑھی جاسکتی ہیں

سوال: کیا نماز تراویح بیٹھ کر پڑھی جاسکتی ہے؟ (مسز سرور مظہر۔ ڈیفنس فیز II)

جواب: جی ہاں پڑھی جاسکتی ہے، لیکن کھڑے ہوکر پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے، البتہ اگر کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھی جائے تو ثواب میں کمی نہیں ہوگی۔

چار چار رکعات کی نیت کے ساتھ 'تراویح' پڑھنا

سوال: کیا تراویح کی نماز دو دو رکعت پڑھنے کے بجائے ایک نیت کے ساتھ چار چار رکعات کرکے پڑھی جاسکتی ہیں۔ (نسیم عبداللہ۔ ڈیفنس)

جواب: جی ہاں، پڑھی جاسکتی ہیں، البتہ دوگانہ کرکے پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے۔

پانچ روزہ تراویح

سوال: آج کل یہ عام رواج ہے کہ لوگ پانچ روزہ، چھ روزہ اور دس روزہ تراویح ختمِ قرآن کا اہتمام کرتے ہیں، کیا یہ طریقہ درست ہے"۔ (محمد شریف، گلشن اقبال، حمید قریشی۔ گلشن اقبال)

جواب: اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ بیرون مسجد، پارکس، مکانات وغیرہ میں جو جماعت کا اہتمام ہوتا ہے، اس میں نماز با جماعت تو یقیناً ادا ہوگی لیکن مسجد کا ثواب نہیں ملے گا۔ اگر پانچ روزہ یا دس روزہ تراویح ختم قرآن سے لوگ یہ سمجھ لیں کہ بس ایک قرآن ختم ہوگیا، اب تراویح سے بھی فارغ، تو یہ طرزِ عمل اور سوچ بالکل غلط ہے، تراویح پورے ماہِ رمضان کی سنت ہے، لہٰذا جن لوگوں کا ختم قرآن ستائیسویں کو ہوتا ہے، ان کو بھی چاہئے کہ بقیہ دنوں کی تراویح باقاعدگی سے پڑھیں۔

روزے کی حالت میں سر پر مہندی اور خوشبو لگانا

سوال: کیا روزے کے دوران سر پر تیل، مہندی یا خوشبو لگانا جائز ہے؟ (شازیہ۔ جمشید روڈ)

جواب: جی ہاں لگا سکتے ہیں، اس سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

مسنون دعاءِ افطار کب پڑھی جائے؟

سوال: عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ افطار کے وقت پہلے مسنون دعاء افطار پڑھتے ہیں، پھر افطار کرتے ہیں، جبکہ کھانے کی دعاء کھانے کے بعد پڑھی جاتی ہے، ازراہِ کرم بتایئے کہ صحیح طریقہ کیا ہے؟ (محمد ناصر خان چشتی۔ گلشن اقبال...... محمد اعظم۔ مظفر آباد، آزاد کشمیر)

جواب: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب روزہ کھول لیتے تو فرماتے: پیاس چلی گئی، رگیں تر ہوگئیں، اور انشاء اللہ اجر ثابت ہوگیا ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)۔" دوسری حدیث میں ہے: معاذ بن زہرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب افطار فرمالیتے تو یہ دعاء پڑھتے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ۔

"اے اللہ! میں نے تیری رضا کے لئے روزہ رکھا اور تیرے ہی عطا کردہ پر افطار کیا"۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

حدیث مبارک کے الفاظ بالکل واضح ہیں کہ افطار سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ

اظہارِ بندگی اور تشکرِ نعمتِ باری تعالیٰ کے لئے یہ دعاء فرماتے۔ امام احمد رضا خان قادری فتاویٰ رضویہ میں لکھتے ہیں کہ ملا علی القاری شارح مشکوٰۃ نے بھی یہی لکھا کہ حضور ﷺ افطار کے بعد یہ دعاء مانگتے تھے، اور ابن المبارک نے تو واضح طور پر لکھا ہے کہ ''اَیْ قَرَأَ بَعْدَ الْاِفْطَارِ'' یعنی آپ افطار کے بعد یہ دعاء پڑھتے تھے۔ اور اگر کوئی شخص اس دعاء کو ''قبل افطار'' پر محمول کرتا ہے تو وہ بلاضرورت حدیث میں تاویل کرتا ہے، یعنی اس صورت میں کلماتِ حدیث ''اِذَا اَفْطَرَ'' کے معنی یہ کرنا پڑیں گے کہ ''اَیْ اِذَا اَرَادَ الْاِفْطَارَ'' یعنی جب آپ افطار کا ارادہ فرماتے، اور بلاضرورت حدیث پاک میں اپنی من پسند تاویل کرنا درست نہیں ہے۔

کیا دس سالہ بچی پر روزہ فرض ہے؟

سوال: کیا دس سالہ بچی پر روزہ فرض ہے؟ (فائزہ۔ گلشن اقبال)

جواب: جی نہیں، دس سالہ بچی پر روزہ فرض نہیں ہے، البتہ وہ شوق سے نفلی روزہ رکھ سکتی ہے۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر علاماتِ بلوغ ظاہر ہو جائیں تو اس پر بلوغت کا حکم لگایا جائے گا اور اس پر احکامِ شرعیہ فرض ہو جائیں گے، اور کم از کم نو سال کی عمر میں بلوغت ممکن ہے، اگر علامات ظاہر نہ ہوں تو پندرہ سال پورے ہونے پر بالغ تصور کیا جائے گا۔

ڈاکٹر کا ٹیوبلائزیشن کے ذریعے بچوں کی ولادت کا آپریشن کرنا

سوال: میں ڈاکٹر ہوں، ٹیوبلائزیشن کے ذریعے ہمیں ڈیلیوری کرانا پڑتی ہے، ستر کھلتا ہے، کیا ایسے آپریشن سے میرے روزے پر اثر پڑے گا، طبی عمل کے ذریعے بچوں کی تولید بند کرنا شرعاً کیسا ہے؟ (عائشہ دانش۔ کارساز)

جواب: یہ اطمینان کی بات ہے کہ خواتین کے علاج اور آپریشن کے لئے خواتین ڈاکٹر موجود ہیں، نفسانی حظ و شہوت کے لئے ستر کو دیکھنا اور چھونا حرام ہے، علاج کے لئے جائز ہے اور اس سے ڈاکٹر کے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ انسانیت کی خدمت ہے۔ جب فطری طریقے سے کسی حاملہ خاتون کے ہاں زچگی نہ ہو سکتی ہو یا زچہ و بچہ کے لئے اس میں خطرہ ہو تو ٹیوبلائزیشن کے ذریعے ڈیلیوری کرانا جائز ہے۔ اگر کوئی خدا ترس مسلمان ڈاکٹر یہ کہے کہ مزید بچے پیدا ہونے سے عورت کی صحت یا زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو مصنوعی طریقے سے عمل تولید کی بندش جائز

ہے اور شوہر کی رضامندی ہو تو بہرصورت جائز ہے۔

روزے کی حالت میں اگربتی سلگانا

سوال: کیا روزے دار جہاں بیٹھے ہوں، وہاں اگربتی سلگانا جائز ہے؟

(محمد ناصر خان چشتی...... گلشن اقبال، کراچی)

جواب: جائز ہے، لیکن اگربتی سلگا کر اسے دانستہ ناک کے قریب لے جا کر اس کا دھواں ناک کے اندر کھینچے تو دھواں اندر جانے کی صورت میں روزہ فاسد ہو جائے گا اور قضا لازم آئے گی۔

روزے میں INHALER کا استعمال

سوال: کیا روزے میں INHALER کا استعمال جائز ہے اور اس سے روزے پر اثر پڑے گا یا نہیں، (فائزہ۔ گلشن اقبال)۔

جواب: ڈاکٹر صاحبان سے ہم نے اس سلسلے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق سانس کے مریض کے پھیپھڑے سکڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں سانس لینے میں تکلیف اور دشواری محسوس ہوتی ہے۔ ان ہیلر کے ذریعے ایسے کیمیکلز گیس یا مائع بوندوں کی شکل میں ان کے پھیپھڑوں میں پہنچتے ہیں جن کی بناء پر ان کے پھیپھڑے (LUNGS) کھل جاتے ہیں اور وہ دوبارہ آسانی سے سانس لینے لگتا ہے، تو چونکہ مریض کے بدن کے اندر ایک مادی چیز جاتی ہے لہٰذا اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اور اگر مرض اس درجے کا ہے کہ پورے روزے کا وقت ان ھیلر کے استعمال کے بغیر مریض کے لئے گزارنا مشکل ہے تو پھر وہ معذور ہے، بر بنائے عذر و بیماری روزہ نہ رکھے اور فدیہ ادا کرے۔

روزے کی حالت میں آنکھ میں سرمہ لگانا یا دوا کے ڈراپ ڈالنا

سوال: روزے کی حالت میں کیا سرمہ لگا سکتے ہیں، یا آنکھ میں دوا کے قطرے ڈالے جا سکتے ہیں، اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا یا نہیں۔ (طارق۔ لانڈھی)

جواب: روزے کی حالت میں سرمہ لگانے کی اجازت تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ البتہ دوا کے قطرے ڈالنے کے بارے میں علماء کی دو آراء ہیں اور یہ اختلاف آراء اس بات پر مبنی ہے کہ آنکھ سے حلق کی طرف کوئی نالی یا سوراخ ہے یا نہیں۔ جدید

طبی تحقیق یہ ہے کہ آنکھ سے حلق کی طرف نالی (ROUTE) ہے، لہٰذا ہم اس رائے سے متفق ہیں کہ آنکھ میں دوا کے قطرے ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔

روزے کی حالت میں لپ اسٹک لگانا

سوال: روزے کی حالت میں لپ اسٹک لگانا کیسا ہے، کیا اس کے ذرات پیٹ میں جانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟ (کمال اشرف۔ کلفٹن)

جواب: ویسے تو لپ اسٹک مفسدِ صوم نہیں ہے، لیکن اگر ہونٹوں پر زبان پھیرنے کی عادت ہے اور اس سے لپ اسٹک کے ذرات پیٹ میں چلے جاتے ہیں تو روزہ ٹوٹ جائے گا، لہٰذا احتیاط بہتر ہے۔

معتکف خاتون کا اپنے لئے کھانا خود تیار کرنا؟

سوال: میں تنہا خاتون اپنے گھر میں رہتی ہوں، گھر پر میری خدمت کیلئے اور کوئی بھی نہیں ہے، میں چاہتی ہوں کہ اپنے گھر میں اعتکاف پر بیٹھ جاؤں، اور کسی رشتے دار کو تکلیف دینے کے بجائے اپنا کھانا خود تیار کرلوں، کیا اس طرح میرا اعتکاف ہوجائے گا۔ (آفرین فاطمہ۔ گلشن اقبال)

جواب: آپ اس طرح اعتکاف پر بیٹھ سکتی ہیں، اپنے گھر پر ایک جگہ متعین کر کے، صرف کھانا پکانے کے لئے ضرورتاً کچن میں جائیں اور کھانا اٹھا کر اپنی جائے اعتکاف پر لاکر کھائیں اور باقی معمولات میں احکامِ اعتکاف کی پابندی کریں۔

روزے میں سحری کے بعد اگر غسل واجب ہوجائے تو روزہ رہے گا؟

سوال: رمضان المبارک میں سحری کے بعد روزے کی حالت میں احتلام ہوگیا اور غسل واجب ہوگیا، تو کیا روزہ قائم رہے گا، (مستقیم، پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی)

جواب: جی ہاں روزہ بدستور قائم رہے گا، جتنی جلد ہوسکے غسل واجب ادا کر کے پاک ہوجائیں تاکہ کسی وقت کی نماز قضا نہ ہوجائے۔

بیوی ''بائی پاس آپریشن'' کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتی

سوال: بیوی کا ''بائی پاس آپریشن'' ہوا ہے، جس کی بناء پر روزہ نہیں رکھ سکتی، کتنا فدیہ ہوگا۔ (حفیظ الرحمٰن۔ سوسائٹی)

جواب: اگر بیوی کا ''بائی پاس'' آپریشن ہوا ہے اور کوئی خدا ترس دین دار ڈاکٹر یہ مشورہ دیتا ہے کہ روزہ رکھنے سے مریض کا مرض بڑھنے کا اندیشہ ہے تو روزہ چھوڑ دیں اور فدیہ دیں، ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلانا ہے، یا اس کے مساوی نقد رقم دے دیں، کم از کم تیس (30) روپے یومیہ کے حساب سے۔

سحری میں اذان شروع ہونے کے بعد کھانا اور پینا

سوال: سحری کے وقت اگر آنکھ دیر سے کھلے اور جب انسان اٹھے تو اذان ہو رہی ہو تو کیا اس وقت جلدی جلدی کچھ کھا پی سکتے ہیں، اس سے روزے پر اثر پڑے گا یا نہیں۔

(ثریا پروین۔ نارتھ ناظم آباد، مسز سلیم۔ گلشن اقبال)

جواب: روزہ، ایک محدود وقت کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے عبادت کی نیت سے، کھانے، پینے اور جنسی عمل سے رک جانے کا نام ہے۔ لہٰذا جوں ہی صبح صادق شروع ہوئی، جس کا وقت انتہائے سحر کے عنوان سے آج کل ریڈیو، ٹیلی وژن، مختلف اداروں کے مطبوعہ نقشہ جات، اخبارات اور مساجد سے مشتہر ہو جاتا ہے، اور اذانِ فجر سحری کا وقت ختم ہونے پر ہی شروع ہوتی ہے۔ لہٰذا اس وقت کھانا پینا منع ہے اور اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا اور اس کی قضا لازم ہوگی۔ آپ سحری ختم ہونے کے چند منٹ بعد کھائیں یا چند گھنٹے بعد، آپ نے شریعت کی بندش کو توڑ دیا تو روزہ نہ رہا۔ ایسی صورت میں بغیر کچھ کھائے پیے روزے کی نیت کر لیا کریں۔

کوئی شخص دوسرے ملک سے رمضان کے روزے رکھ کر آئے تو اب تکمیل کس حساب سے کرے

سوال: کوئی شخص مثلاً سعودی عرب سے روزہ رکھ کر آئے، جہاں رمضان المبارک ایک دن پہلے شروع ہوا تھا، وہاں کے حساب سے رمضان کے ایام ختم ہو گئے ہیں، لیکن یہاں پاکستان میں رمضان کا آخری دن چل رہا ہے، تو اب وہ کیا کرے، جہاں اور جس ملک میں رمضان المبارک شروع کیا تھا، اس کے حساب کے مطابق رمضان کی تکمیل کرے یا جہاں اب پہنچا ہے، اس کے حساب سے رمضان کی تکمیل کرے۔ (مولانا غلام دستگیر افغانی...... آگرہ تاج کالونی)

جواب: اس سلسلے میں ہمارے سامنے دو نصوص حدیث ہیں، ایک یہ کہ ''الصَّومُ یَومَ

يَصُوْمُوْنَ وَالفِطْرُ يَوْمَ يُفْطِرُوْنَ ''یعنی تم جس مقام پر ہو اس کے مطابق روزہ رکھو یا عید مناؤ، یعنی ان کی پیروی کرو، لہٰذا اگر تمہارے تیس روزے پورے بھی ہوگئے ہیں، تب بھی اس مقام والوں کو ساتھ دو، اس مقام کی اتباع میں آپ کے لئے ابھی رمضان جاری ہے۔

دوسرا یہ کہ ماہ رمضان زیادہ سے زیادہ تیس دن کا ہوتا ہے، اگر آپ کے تیس روزے پورے ہوگئے ہیں تو آپ یہاں اب 31 واں دن کا روزہ نہ رکھیں، جبکہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ...... ''پس تم میں سے جو اس ماہ رمضان کو پائے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے روزے رکھے'' والی آیت قرآنی کی رو سے آپ اس مقام پر رمضان کو پا رہے تھے، لہٰذا آپ پر لازم ہے کہ روزہ رکھیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ آپ کے لئے یہ رمضان 31 دن کا متحقق ہوگا، آپ کے مخصوص حالات کی بناء پر۔

اور اگر آپ یہاں سے روزۂ رمضان کا آغاز کر کے سعودی عرب جائیں اور وہاں بالفرض 29 دیں رمضان کو چاند نظر آئے گا، جبکہ آپ کے ابھی اٹھائیس روزے ہوئے کیونکہ پاکستان میں رمضان ایک دن پیچھے شروع ہوا تھا، تو اب کے پاس دو راستے ہیں ''الصَّوْمُ يَوْمَ يَصُوْمُوْنَ وَالفِطْرُ يَوْمَ يُفْطِرُوْنَ'' پر عمل کرتے ہوئے روزہ نہ رکھیں اور بعد میں ایک دن کی قضا رکھیں، کیونکہ رمضان المبارک 29 دن سے کم کا نہیں ہوتا۔ یا ''اَكْمِلُوا الْعِدَّةَ'' پر عمل کرتے ہوئے ان کے ساتھ عید نہ منائیں اور اپنے روزے مکمل کرلیں۔

رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو بعد نماز تراویح مخصوص سورتیں پڑھنا

سوال: ہمارے علاقے میں گاؤں کی مساجد میں بعض جگہ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح میں ختمِ قرآن ہوتا ہے اور بعض جگہ چھوٹی سورتیں پڑھی جاتی ہیں لیکن ستائیسویں شب کو تعین کے ساتھ نمازِ تراویح کے بعد سورۂ روم اور سورۂ عنکبوت پڑھی جاتی ہے، کیا یہ درست ہے؟

(سید ذاکر شاہ۔ بٹگرام، ہزارہ)

جواب: کسی عملِ خیر کو کسی خاص وقت، دن اور تاریخ کے ساتھ اس نظریے کے ساتھ متعین کر کے ادا کرنا کہ اس کا اجر و ثواب اس تعین کے ساتھ مشروط ہے یا یہ تعین اجرِ زائد کا سبب ہے

اسے تعینِ شرعی کہتے ہیں، اور دلیل شرعی کے بغیر ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ شارع کا منصب ہے جیسے فرضی روزوں کے لئے رمضان المبارک کا تعین، قربانی کے لئے ۱۰ تا ۱۲ ذوالحجہ، حج کے لئے وقوفِ عرفہ اور ۹ ذوالحجہ، رمی جمرات کے لئے ۱۰ تا ۱۳ ذوالحجہ وغیرہ۔ بعض مواقع کے لئے بعض سورتوں کا تذکرہ احادیث مبارکہ میں آتا ہے مثلاً

(۱) رسول اللہ ﷺ رات کو سونے سے پہلے ''الم تنزیل'' اور تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ پڑھا کرتے تھے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہر رات کو سورۃ الواقعہ پڑھتا رہے وہ کبھی فقر و فاقہ اور تنگدستی کا شکار نہیں ہوگا۔

(۳) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص جمعہ کے دن ''سورۃ الکہف'' پڑھے دو جمعوں کے درمیان (مدت کے برابر) اس کے لئے وسیلہ نور ہوگی (یہ نور اس کے قلب کو روشن کرے گا یا اس کی قبر یا حشر کی ظلمتوں میں نور ہوگا) وغیرہ۔

یوں تو قرآن مجید کی ہر سورت مقدس اور مبارک ہے اور کسی بھی دن اور کسی بھی تاریخ کو اس کا پڑھنا باعثِ برکت ہے (بشرطیکہ کوئی اور شرعی مانع نہ ہو) اور رمضان المبارک میں تو نفل عبادت کا ثواب دیگر ایام کے فرائض کے برابر ہوتا ہے، لہٰذا اگر کچھ لوگ ستائیسویں شب کو ''سورۃ الروم'' اور ''سورۃ العنکبوت'' پڑھتے ہیں یا حسبِ توفیق اور بھی سورتیں پڑھیں تو بلاشبہ یہ اجر و ثواب اور سعادت کی بات ہے لیکن تعینِ شرعی کی نیت سے پڑھنا درست نہیں ہے۔

تعین شرعی سے مراد ہے کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ خاص اس رات کو یہ سورتیں پڑھنے کا حکم دیا ہے یا یہ کہ اس دن دوسری سورتوں کے مقابلے میں ان کا زیادہ ثواب ہے یا یہ کہ یہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خاص معمول تھا درست نہیں ہے۔

روزے کی حالت میں خون دینا

سوال : روزے کی حالت میں ٹیسٹ کے لئے خون دینا کیسا ہے؟ کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟ (محمد طیب، ناظم آباد)

جواب : روزے کی حالت میں ٹیسٹ کے لئے خون نکالنا مفسدِ صوم نہیں ہے، روزہ صحیح رہتا

ہے، کیونکہ حدیث پاک میں ہے: ''الفطر مما دخل لیس مما خرج''، بدن میں کوئی چیز جانے سے روزہ ٹوٹتا ہے نہ کہ خارج ہونے سے۔

حاملہ عورت کو الٹی آجائے تو کیا روزہ توڑ دے

سوال: میں حاملہ ہوں، روزہ رکھنے کے بعد اُلٹی آگئی، تو کیا روزہ قائم رہا؟

(جویریہ عمران۔ گلشن اقبال)

جواب: اُلٹی آنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ البتہ اگر حاملہ عورت کی صحت کمزور ہو اور روزہ رکھنے سے زچہ و بچہ کی صحت کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو اور کوئی خدا ترس دین دار ڈاکٹر یہ مشورہ دے کہ روزہ نہ رکھو تو اس صورت میں وہ روزہ چھوڑ سکتی ہیں لیکن بعد میں اتنے دنوں کی قضا کرنی پڑے گی۔ اگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صحت اچھی ہے تو روزہ رکھتی رہیں۔

رمضان المبارک میں عشاء کی نماز تنہا پڑھنے والا، وتر جماعت کے ساتھ پڑھے یا تنہا؟

سوال: رمضان المبارک میں ایسے مواقع اکثر پیش آتے رہتے ہیں کہ ایک شخص نمازِ عشاء کے لئے مسجد میں پہنچا تو فرض کی جماعت ختم ہو چکی ہوتی ہے، اب وہ بامرِ مجبوری فرض اور سنت مؤکدہ تنہا ادا کر کے تراویح کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال میں وہ وتر باجماعت یا تنہا پڑھے۔؟ (اکرام اللہ۔ بلدیہ ٹاؤن، کراچی)

جواب: اس مسئلے میں ہمارے فقہاء کرام کی دو آراء ہیں، ایک یہ کہ ماہِ رمضان المبارک میں فرض نماز جماعت کے ساتھ نہ بھی پڑھی ہو تو اس کا وتر جماعت کے ساتھ پڑھنا بلا کراہت جائز ہے، اور دلائل کے اعتبار سے یہی نظریہ راجح ہے، جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ ''فرضِ عشاء'' جماعت کے ساتھ نہ پڑھے ہوں، تو وتر بھی جماعت کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ تنہا پڑھے، دلائل کے اعتبار سے یہ نظریہ مرجوح ہے۔

فقہاءِ کرام میں یہ اختلاف آراء ایک اور اختلاف پر مبنی ہے، وہ یہ کہ آیا رمضان المبارک میں وتر کی جماعت، ''فرضِ عشاء'' کی جماعت کے تابع ہے یا تراویح کی جماعت کے۔ قول صحیح یہ ہے کہ فی نفسہ نماز وتر تو فرض عشاء کے تابع ہے، لیکن وتر کی جماعت کا مسنون ہونا تراویح کی

جماعت کے مسنون ہونے کے تابع ہے، کیونکہ اگر وتر کی جماعت عشاء کی جماعت کے تابع ہوتی تو وتر سارا سال جماعت کے ساتھ مسنون ہوتے، اس لئے کہ عشاء کی نماز میں جماعت سارا سال واجب ہے، جبکہ وتر تو صرف رمضان المبارک میں جماعت کے ساتھ مسنون ہیں، پس ثابت ہوا کہ وتر کی جماعت کا مسنون ہونا تراویح کی جماعت کے مسنون ہونے کے تابع ہے۔

علامہ محمود قاضی خان اوزجندی لکھتے ہیں:

اِخْتَلَفُوْا اَنَّ اَدَاءَ الْوِتْرِ فِیْ رَمَضَانَ بِالْجَمَاعَةِ اَفْضَلُ اَمِ الْاَدَاءُ فِیْ مَنْزِلِهٖ وَحْدَهٗ اَلصَّحِیْحُ اَنَّ الْجَمَاعَةَ اَفْضَلُ لِاَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ کَانَ یَؤُمُّهُمْ فِی الْوِتْرِ وَلِاَنَّهٗ لَمَّا جَازَ الْاَدَاءُ بِالْجَمَاعَةِ کَانَتِ الْجَمَاعَةُ اَفْضَلُ اِعْتِبَاراً بِالْمَکْتُوْبَةِ۔

''اس بات میں اختلاف ہے کہ رمضان میں وتر با جماعت ادا کرنا افضل ہے یا تنہا گھر میں پڑھنا، صحیح یہ ہے کہ جماعت افضل ہے، کیونکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ صحابہ کو وتر جماعت کے ساتھ پڑھاتے تھے، اور یہ بات اس لئے بھی درست ہے کہ جب وتر کو جماعت کے ساتھ پڑھنا جائز ہے تو پھر فرض پر قیاس کرتے ہوئے (یہی کہنا چاہئے کہ وتر میں بھی) جماعت ہی افضل ہے''۔

(فتاویٰ قاضی خان برحاشیہ عالمگیری ج ۱ ص ۲۴۴ مطبوعہ کبری بولاق مصر)

علامہ کمال الدین ابن ہمام نے فتح القدیر ج ۱ ص ۴۱۰-۴۰۹ پر اس مسئلے کی بحث کی ہے، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''علامہ قاضی خان کی مذکورہ بالا عبارت کو نقل کرنے کے بعد ''صاحب نہایہ'' نے فرمایا کہ ہمارے علماء کا مختار یہ ہے کہ وتر بغیر جماعت کے پڑھے جائیں۔'' اس پر کلام کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام تطبیق فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ (رمضان المبارک میں) وتر کا با جماعت پڑھنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، پھر اس کے تسلسل کو ترک کرنے کا سبب وہی ہے جو جماعت تراویح کا ہے، پھر خلفاء راشدین سے بھی وتر کی جماعت اور تعامل ثابت ہے، اس حقیقت کے پیش نظر علامہ قاضی خان کے قول کا محمل یہ ہے کہ اگر وتر عشاء کے اول وقت میں پڑھنے ہوں تو با جماعت پڑھنا افضل ہے اور اگر رات کے آخری حصے میں پڑھنے ہوں تو تنہا پڑھنا افضل ہے، جیسا کہ حضرت عمر کا

قول ہے: ''رات کے جس حصے میں تم سو جاتے ہو، اس میں نماز پڑھنا افضل ہے'' اور رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی معروف ہے کہ رات کو تمہاری آخری نماز وتر ہونی چاہئے تو اسے مؤخر کر کے پڑھو، جیسا کہ علماء عاملین اور سلف صالحین کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ وتر کو آخرِ شب تہجد کے ساتھ پڑھتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس وقت جماعت کا اہتمام دشوار ہے۔ علامہ ابن ہمام کے اس قول کو نقل کر کے جن فقہاء نے (آخرِ شب کی استثنائی صورت کے علاوہ) وتر کی جماعت کی افضلیت پر استدلال کیا ہے، ان میں علامہ زین الدین ابن نجیم، علامہ حسن بن عمار شرنبلالی، علامہ ابراہیم اور علامہ عبدالحلیم کے اسماء گرامی نمایاں ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

اَلَّذِیْ یَظْهَرُ اَنَّ جَمَاعَةَ الْوِتْرِ تَبَعٌ لِجَمَاعَةِ التَّرَاوِیْحِ وَاِنْ كَانَ الْوِتْرُ نَفْسُهٗ اَصْلًا فِیْ ذَاتِهٖ لِاَنَّ سُنَّةَ الْجَمَاعَةِ فِی الْوِتْرِ اِنَّمَا عُرِفَتْ بِالْاَثَرِ تَابِعَةً لِلتَّرَاوِیْحِ۔

''جو بات میرے نزدیک بالکل عیاں ہے وہ یہ ہے کہ: وتر کی جماعت، تراویح کی جماعت کے تابع ہے، (یہاں بات جماعت وتر کی ہو رہی ہے ورنہ) فی نفسہ اپنی مشروعیت کے اعتبار سے تو وتر کی نماز بذاتِ خود اصل ہے (یعنی کسی کے تابع نہیں ہے، مگر یہاں بات جماعتِ وتر کی ہو رہی ہے) اور وتر کی جماعت کا سنت ہونا، آثار کی روشنی میں تراویح کے تابع ہے''۔ (رد المحتار، ج ۱، ص ۶۶۳)

اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ رمضان المبارک میں وتر کی جماعت، تراویح کے تابع ہے، تو واضح ہوگیا کہ رمضان میں اگر عشاء کے فرض تنہا پڑھے ہوں اور تراویح جماعت کے ساتھ پڑھی ہو تو پھر وتر کی نماز تراویح کے ساتھ بلا کراہت پڑھ سکتا ہے۔

مولانا عبدالحلیم لکھتے ہیں:

اِذِ الْاِیْتَارُ بِالْجَمَاعَةِ فِیْ رَمَضَانَ سُنَّةٌ كَمَا اَنَّهَا سُنَّةٌ فِی التَّرَاوِیْحِ۔

''رمضان میں وتر جماعت کے ساتھ پڑھنا سنت ہے، جیسا کہ تراویح میں جماعت سنت ہے''۔ (حاشیۃ الدرر ص ۸۴)

علامہ ابراہیم حلبی منیۃ المصلی کی شرح کبیر (غنیۃ المستملی) میں لکھتے ہیں:

قَالَ اَبُوْ يُوْسُفَ الْبَانِي: اِذَا صَلّٰى مَعَ الْاِمَامِ شَيْأً مِّنَ التَّرَاوِيْحِ يُصَلِّيَ مَعَهُ الْوِتْرَ وَكَذَا اِذَا لَمْ يُدْرِكْ مَعَهُ شَيْأً مِّنْهَا وَكَذَا اِذَا صَلَّى التَّرَاوِيْحَ مَعَ غَيْرِهٖ لَهٗ اَنْ يُّصَلِّيَ الْوِتْرَ مَعَهٗ وَهُوَالصَّحِيْحُ، ذَكَرَهٗ اَبُوالّلَيْثِ وَكَذَا قَالَ ظَهِيْرُ الدِّيْنِ الْمَرغِيْنَانِيْ لَوْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَحْدَهٗ فَلَهٗ اَنْ يُّصَلِّيَ التَّرَاوِيْحَ مَعَ الْاِمَامِ وَهُوَالصَّحِيْحُ۔

''ابو یوسف البانی کہتے ہیں کہ: اگر امام کے ساتھ کچھ تراویح پڑھ لی ہیں تو اس کے ساتھ وتر پڑھ سکتا ہے، اور اگر امام کے ساتھ کچھ بھی نہ پڑھا ہو (نہ فرض، نہ تراویح)، اسی طرح اگر کسی اور کے ساتھ تراویح پڑھی ہوں تو وہ امام کے ساتھ وتر پڑھ سکتا ہے۔ اور یہی صحیح ہے، اس مسئلے کو ابواللیث نے ذکر کیا ہے، اور علامہ ظہیر الدین مرغینانی نے بھی یہی کہا ہے، اور اگر عشاء کے فرض تنہا پڑھے ہوں، تب بھی وہ امام کے ساتھ تراویح پڑھ سکتا ہے، یہی قول صحیح ہے''۔ (غنیۃ المستملی ص۳۹۱ مطبوعہ مطبع مجتبائی)

علامہ ابراہیم حلبی منیۃ المصلی کی شرح کبیر کے بعد منیہ کی شرح صغیر میں یہ مسئلہ مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

وَاِذَا لَمْ يُصَلِّ الْفَرْضَ مَعَ الْاِمَامِ قِيْلَ لَا يَتْبَعُهٗ فِي التَّرَاوِيْحِ وَلَا فِي الْوِتْرِ وَكَذَا اِذَا لَمْ يُصَلِّ مَعَهُ التَّرَاوِيْحَ لَايَتْبَعُهٗ فِي الْوِتْرِ وَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ يَجُوْزُ اَنْ يَّتْبَعَهٗ فِيْ ذٰلِكَ كُلِّهٖ.

''اور جب امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے گئے ہوں تو کہا گیا ہے کہ پھر امام کی اقتداء میں نہ تراویح پڑھے نہ وتر، اسی طرح اگر امام کی اقتداء میں تراویح نہ پڑھی ہوں تو اس کی اقتداء میں وتر نہ پڑھے، اور صحیح قول یہ ہے کہ جب امام کے ساتھ فرض یا تراویح نہ پڑھی ہوں تو وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے، اسی طرح اگر امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں تو تراویح جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے''۔ (شرح صغیر (صغیری) ص ۲۱۰)

علامہ احمد بن محمد الطحطاوی لکھتے ہیں:

لِاَنَّ الْمُنْفَرِدَ لَوْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَحْدَهٗ فَلَهٗ اَنْ يُّصَلِّيَ التَّرَاوِيْحَ مَعَ الْاِمَامِ...... اِلٰى قَوْلِهٖ...... قَضِيَّةَ التَّعْلِيْلِ فِي الْمَسْئَلَةِ السَّابِقَةِ بِقَوْلِهِمْ

لِاَنَّهَا تَبَعٌ لِلتَّرَاوِیْحِ وَلَا لِلْعِشَاءِ عِنْدَالْاِمَامِ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اِنْتَهٰی۔

”کیونکہ اگر کوئی شخص عشاء کی نماز تنہا پڑھے تو اس کے لئے تراویح امام کے ساتھ پڑھنا جائز ہے.... آگے چل کر لکھتے ہیں...... گزشتہ مسئلے میں بیان کردہ علت کا یہی تقاضا ہے، جس میں انہوں نے کہا ہے کہ (رمضان میں) امام کے نزدیک وتر کی جماعت نہ جماعت عشاء کے تابع ہے اور نہ ہی جماعت تراویح کے“۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج۱ ص ۲۹۷)

اس عبارت کا مستفاد یہ ہے کہ رمضان میں اگرچہ فی نفسہٖ ”جماعتِ وتر“ کا مسنون ہونا، ”جماعتِ تراویح“ کے مسنون ہونے کے تابع ہے، یعنی چونکہ رمضان میں تراویح باجماعت پڑھنا سنت ہے، لہٰذا وتر بھی باجماعت پڑھنا سنت ہے، لیکن وتر کا عملاً باجماعت پڑھنا، نہ جماعتِ عشاء کے تابع ہے اور نہ جماعتِ تراویح کے، لہٰذا اگر کسی نے فرض عشاء یا تراویح میں سے کوئی بھی باجماعت نہ پڑھے ہوں، وہ وتر باجماعت پڑھ سکتا ہے۔

ملاخسرو فرماتے ہیں:

ولا یصلی الوتر (بجماعة خارج رمضان) للاجماع ولا یصلی التطوع بجماعة الا قیام رمضان و عن شمس الائمة الکردری ان التطوع بالجماعة انما یکره اذا کان علی سبیل التداعی اما لو اقتدی واحد بواحد او اثنان بواحد لا یکره.

”رمضان کے علاوہ وتر باجماعت نہ پڑھے اس پر اجماع ہے اور تراویح کے سوا نفل باجماعت نہ پڑھے، شمس الائمہ کردری سے منقول ہے کہ نوافل کی جماعت اس وقت مکروہ ہے جب لوگوں کو اس کی دعوت دی جائے اگر ایک کی اقتداء میں ایک یا ایک کی اقتداء میں دو آدمی نفل پڑھ لیں تو مکروہ نہیں ہے“۔

(درر الحکام فی شرح غرر الحکام ج۱ ص ۱۲۰)

اس عبارت کا مستفاد یہ ہے کہ غیر رمضان میں وتر باجماعت پڑھنا جائز ہے مگر مکروہ ہے، اس سے زیادہ واضح طور پر علامہ علائی نے لکھا ہے:

وَلَا يُصَلِّی الْوِتْرَ وَلَا التَّطَوُّعَ خَارِجَ رَمَضَانَ اَیْ یَکْرَہُ ذٰلِکَ۔

''وتر اور نوافل رمضان کے علاوہ جماعت سے نہ پڑھے جائیں، یعنی جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے''۔(درمختار علی ھامش الرد ج۱، ص ۶۶۳)

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے طویل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر رمضان میں وتر اگر کبھی با جماعت پڑھ لئے جائیں تو یہ مباح ہے۔ امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ منسور بن مخرمہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نے رات گئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تدفین کی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے وتر نہیں پڑھے اور پڑھنے کھڑے ہو گئے، ہم نے بھی ان کی اقتداء میں صف باندھ لی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہم کو تین رکعات پڑھائیں اور صرف آخر میں سلام پھیرا۔

الغرض غیر رمضان میں کبھی کبھار وتر با جماعت پڑھ لینا مباح، غیر مکروہ یا غیر مستحب یا زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی ہے، البتہ اسے معمول بنالینا بدعتِ مکروہہ ہوگا۔

(نوٹ:- جو حضرات اس مسئلے کو مزید تفصیل کے ساتھ سمجھنا اور مطالعہ کرنا چاہتے ہوں، وہ شرح صحیح مسلم، مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی ج ۲، ص ۵۰۲ تا ۵۰۹ کا مطالعہ کریں)

روزے میں سرمہ لگانے کے جواز پر ایک دلچسپ اور مفید علمی بحث جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں بعض فقہی مسائل پر نظرِ ثانی کی ضرورت

ہمارے قدیم فقہاءِ کرام نے ظن غالب کی بناء پر بعض امور کے مفسدِ صوم ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں رائے قائم کر کے حکم صادر کیا تھا۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ ان کی رائے یہ تھی کہ کان سے معدے کی طرف حلق کے راستے ایک منفذ' نالی یا سوراخ ہے۔ اب جدید طبی تحقیق نے عین الیقین سے بتادیا کہ کان سے معدے کی طرف کوئی سوراخ نہیں ہے، لہٰذا اب اس پر فقہاء عصر کا اجماع ہوتا جارہا ہے کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ الحمدللہ ہم لوگ اور حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری اس مسئلے کی نشاندہی میں سبقت کا شرف رکھتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے قدیم فقہاءِ کرام کی رائے یہ تھی کہ چونکہ آنکھ میں حلق کی جانب

کوئی سوراخ یا منفذ نہیں ہے، اس لئے آنکھ میں دوا ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، ہمارے معاصر فقہاء میں سے غالب اکثریت ابھی تک اسی رائے پر قائم ہے۔ اب چونکہ طبی طور پر عین الیقین کی حد تک یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آنکھ میں حلق کی طرف سوراخ یا نالی موجود ہے، اس لئے اب اہل فتویٰ کو یہ فتویٰ دینا چاہئے کہ آنکھ میں دوا ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

ہمارے اجلّہ فقہاء عصر علامہ غلام رسول سعیدی اور علامہ مفتی محمد ابراہیم قادری کی یہی رائے ہے اور انہی کی تحقیقات سے استفادہ کر کے ہم نے تین سال قبل قومی اخبارات و جرائد میں ان مسائل کی جانب فقہاء عصر کو متوجہ کیا تھا اور ان سے جدید تحقیق کی روشنی میں اس مسئلے کے بارے میں اپنی قدیم رائے پر نظر ثانی کی درخواست کی تھی۔ ان مسائل جدیدہ میں سے کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جانے کی بابت علماء دیوبند میں سے دارالعلوم کراچی کے مفتیانِ کرام کا نظرِ ثانی شدہ فتویٰ باقاعدہ دستخطوں کے ساتھ آچکا ہے، جس کی ہم نے ''مجلس فقہ اسلامی'' کی جانب سے تحسین کی ہے اور انہیں بعض دیگر مسائل پر نظر ثانی کرنے اور غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

ہم نے آنکھ میں دوا ٹپکانے کے مسئلے میں لکھا تھا کہ سرمہ لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے روزے کی حالت میں سرمہ لگانے کی اجازت دی ہے، لہٰذا خلافِ قیاس استحساناً سرمہ لگانے کو مفسدِ صوم نہیں قرار دیا جائے گا۔ اس پر کوئی محترم اشرف صاحب ہیں، جنہوں نے حضرت مفتی محمد رفیق حسنی صاحب نائب رئیس مجلس فقہ اسلامی کی خدمت میں ہمارا اور حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب کا موقف ارسال کر کے ''سرمے کے مفسد صوم ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں'' ان سے محاکمہ کرنے کی درخواست کی ہے، ''مفتی صاحب نے اپنا موقف واضح کرنے کے لئے یہ مسئلہ مجھے ارسال فرمایا ہے۔ اس مسئلے پر اپنے تفصیلی معروضات پیش کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ہمارے اور حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب کے درمیان اصل متفق علیہ ہے، لہٰذا اختلافِ رائے اصول میں نہیں ہے بلکہ اس کے اطلاق میں ہے، جو اصل ہمارے درمیان متفق علیہ ہے، وہ یہ ہے کہ آنکھ اور حلق کے درمیان منفذ ہے، حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری ہمارے معاصر علماء و فقہاء کرام اور اہل فتویٰ میں سے دقتِ نظر کے حامل ہیں، جزئیات پر اصول کے اطلاق و انطباق میں ان کی نظر عمیق ہے۔

جزئیات کے استنباط و استخراج، مماثل جزئیات میں علتِ مشترکہ کی بناء پر ایک حکم دوسری

کے لئے ثابت کرنے اور جدید دور میں پیش آمدہ مسائل کا فقہی و شرعی حل تلاش کرنے میں مجتہدانہ بصیرت کے حامل ہیں۔ موجودہ دور میں ایسے وسیع المطالعہ، متصلّب فی الدین اور روشن خیال علماء کا وجود اہلسنّت کے لئے غنیمت اور وقیع علمی سرمایہ ہے۔ ہم اسے علمی دیانت کا لازمی تقاضا سمجھتے ہیں کہ زیرِ بحث مسئلے پر حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب کا موقف ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ پیش کر دیا جائے تاکہ اہلِ علم کو محاکمہ کرنے میں آسانی ہو۔

چنانچہ مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''اختتام بحث سے قبل اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا روزہ کی حالت میں سرمہ ڈالنا یا اس کا حکم فرمانا ثابت نہیں اور اس سلسلے میں مروی تمام احادیث ضعیف ہیں۔ اس قسم کی متعدد احادیث اور ان کی اسناد پر مفصل جزم کے لئے فتح القدیر ص ۷۲، ج ۲، مطبوعہ مصر اور مرقات شرح مشکوٰۃ، ص ۵۰۵، ص ۵۰۶، ج ۴، مطبوعہ المکتبہ التجاریہ، مکہ مکرمہ ملاحظہ ہو۔ یہاں صرف ایک حدیث اور پھر اس کی فنی حیثیت پر امام ابوعیسیٰ ترمذی علیہ الرحمۃ کا کلام نقل کیا جاتا ہے۔

ترمذی شریف باب ماجاء فی الکحل للصائم میں حضرت انس بن مالک سے روایت ہے:

جاء رجل الی النبی ﷺ قال اشتکت عینی افاکتحل وانا صائم قال نعم وفی الباب عن ابی رافع قال ابوعیسٰی حدیث انس حدیث اسنادہ لیس بالقوی ولا یصح عن النبی ﷺ فی ھذا الباب شیٔ و ابو عاتکۃ یضعف و اختلف اھل العلم فی الکحل للصائم فکرھہ بعضھم وھو قول سفیان و ابن المبارک و احمد و اسحٰق و رخص بعض اھل العلم فی الکحل للصائم۔

''ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا میری آنکھیں دکھتی ہیں کیا میں روزہ رکھتے ہوئے سرمہ لگا سکتا ہوں فرمایا ہاں (امام ابوعیسیٰ ترمذی فرماتے ہیں) اس باب میں ابورافع سے بھی روایت ہے اور حدیث انس (جس کا ابھی ذکر ہوا) کی سند قوی نہیں اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث صحت کے ساتھ ثابت نہیں اور ابو عاتکہ (جو حدیث انس کے راوی ہیں) کو ضعیف مانا جاتا ہے اور اہل علم نے روزہ کی

حالت میں سرمہ لگانے میں اختلاف کیا ہے بعض اسے مکروہ کہتے ہیں حضرت سفیان ثوری، ابن المبارک، امام احمد اور اسحٰق کا یہی قول ہے اور بعض اہل علم نے روزہ دار کو سرمہ لگانے میں رخصت دی ہے"۔

الغرض "اکتحال فی الصوم" کے جواز میں وارد احادیث ضعیف ہیں۔ بلکہ روزہ کی حالت میں سرمہ ڈالنے کی ممانعت پر بھی بعض ضعیف احادیث موجود ہیں، چنانچہ سنن ابی داوٗد میں حضرت معبد بن ہوذہ سے روایت ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے سوتے وقت مشک ملے ہوئے اثمد (سرمہ کی ایک قسم) لگانے کا حکم فرمایا اور یہ بھی ارشاد فرمایا لیتقه الصائم یعنی "روزہ دار اس سے بچے"۔

اسی حدیث سے قاضی ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ (یہ دونوں تابعی ہیں اور حضرت امام اعظم کے معاصر ہیں) نے یہ استدلال کیا ہے کہ سرمہ لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ عون المعبود شرح سنن ابی داوٗد میں ہے: وقد استدل لهذا الحديث ابن شبرمة و ابن ابی ليلى وقالا ان الكحل يفسد الصوم، ص ۲۸۳، ج ۲، طبع بیروت۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ روزہ میں سرمہ لگانے کی احادیث اگرچہ ضعیف ہیں مگر احادیثِ ضعیفہ کا مجموعہ قابلِ استدلال ہوتا ہے جیسا کہ امام ابن الہمام اور علامہ علی قاری نے اس کی تصریح فرمائی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجموعہ کی قوت مسلم ہے مگر یہ حدیث صحیح "الفطر مما دخل" کے معارض ہیں اور احناف تعارض کے وقت "محرم" کو "مبیح" پر ترجیح دیتے ہیں چونکہ "الفطر مما دخل" سے روزہ کی حالت میں سرمہ لگانے کی حرمت ظاہر ہوتی ہے اور اکتحال فی الصوم کی احادیث سے سرمہ ڈالنے کا جواز نکلتا ہے لہٰذا الفطر مما دخل کی روایات اکتحال فی الصوم کی روایات پر راجح قرار پائیں گی۔

نیز الفطر مما دخل کی روایت ضابطہ کلیہ بیان کر رہی ہے اور اکتحال فی الصوم کی روایات اس ضابطہ کلیہ کے خلاف ایک امر جزئی (آنکھ میں سرمہ ڈالنا) بیان کر رہی ہیں اور احناف ایسی صورت میں اس روایت کو قبول کرتے ہیں جو ضابطہ کلیہ بیان کر رہی ہو۔

(خلاصہ تذکرۃ المحدثین بحوالہ عمدۃ القاری، ص ۷۹)

پھر الفطر مما دخل کی روایت مؤید بالقیاس ہے اور اکتحال فی الصوم کی روایات مؤید

بالقیاس نہیں بلکہ مخالفِ قیاس ہیں اس لئے بھی الفطر مما دخل کی حدیث راجح ہونی چاہئے۔
مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ جب دو حدیثوں میں تعارض ہو تو مُحَرِّم کو مُبِیح پر ترجیح دی جاتی ہے، لیکن ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ''اَلْاِفْطَارُ مِمَّا دَخَلَ'' یا ''اَلصَّوْمُ مِمَّا دَخَلَ'' والی حدیث کو، ترمذی کی روزے میں سرمہ لگانے کی اجازت والی حدیث پر، ترجیح حاصل ہے۔ کیونکہ ''اَلْاِفْطَارُ مِمَّا دَخَلَ'' والی حدیث، جو انہوں نے فتح القدیر، ص ۷۲، ج ۲ کے حوالے سے لکھی ہے، یہ مسند ابویعلیٰ کی حدیث نمبر ۴۶۰۲ ہے اور فتح القدیر میں بھی یہ مسند ابویعلیٰ ہی کے حوالے سے لکھی گئی ہے اور امام کمال الدین ابن ہمام نے اس حدیث کو درج کرنے کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ: وَلِجَهَالَةِ الْمَوْلَاةِ لَمْ يُثْبِتْهُ بَعْضُ اَهْلِ الْحَدِيْثِ یعنی'' باندی کے مجہول ہونے کی وجہ سے بعض ماہرین علم حدیث کے نزدیک یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔'' اس جملے کو حضرت مفتی محمد ابراہیم نے نقل نہیں فرمایا کہ یہ حدیث غیر ثابت ہے اور لائقِ استدلال نہیں، نیز مسند ابویعلیٰ کے شارح اور محقق نے اس حدیث کی سند پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: سلمٰی کے مجہول ہونے کی وجہ سے اس کی سند ضعیف ہے۔ (حاشیہ مسند ابویعلیٰ ج ۸ ص ۷۶) اور حافظ الہیثمی نے اس حدیث کو درج کر کے لکھا ہے: ''وَفِيْهِ مَنْ لَّمْ اَعْرِفْ'' یعنی'' اس میں ایک راوی ایسا ہے جسے میں نہیں جانتا۔'' (مجمع الزوائد ج ۳ ص ۱۶۷)

ان تمام حوالہ جات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور دیگر اسانید سے اس کو روایت کر کے اس کی تقویت بھی نہیں کی گئی، لہٰذا اس حدیث میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ یہ جامع ترمذی کی اس حدیث سے معارض، ہو سکے جو دیگر اسانید سے تقویت یافتہ ہے۔

یہ اصل جو بیان کیا گیا ہے کہ مُبِیح اور مُحَرِّم میں تعارض کے وقت ''مُحَرِّم'' کو ''مُبِیح'' پر ترجیح ہوتی ہے، یہ اس وقت ہے جب دونوں حدیثیں ایک ہی درجہ کی ہوں، لیکن جو حدیث ''مُبِیح'' ہے، وہ صحاح ستہ کی ہے اور دیگر متعدد اسانید سے اس کی تائید و تقویت ہے، اور جو حدیث'' محرم '' ہے، وہ غیر صحاح ستہ کی ہے اور اس کی ضعیف سند کی کسی دوسری سند سے تائید بھی نہیں ہے، لہٰذا ان دونوں میں تعارض ہی نہیں ہے، چہ جائے کہ ایک دوسری پر راجح ہو۔ نیز مفتی صاحب کا اسے حدیث صحیح قرار دینا فنی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔
مفتی صاحب نے ''اَلْاِفْطَارُ مِمَّا دَخَلَ'' (یعنی روزہ ان چیزوں سے ٹوٹتا ہے جو بدن کے

اندر داخل ہوں) والی جو حدیث پیش کی ہے، وہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عکرمہ (جو تابعی ہیں) کے اقوال ہیں اور ان کی فنی حیثیت یہ ہے کہ ان کو امام بخاری نے تعلیقاً بغیر سند کے درج کیا ہے۔ (صحیح البخاری ج ۱ ص ۲۶۰)'' جیسا کہ علامہ عینی نے لکھا ہے: ''هٰذَانِ التَّعْلِيقَانِ۔(عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۴۷)

اور اہل علم سے مخفی نہیں کہ امام بخاری کی تعلیقات میں ہر قسم کی روایات ہیں اور صحیح بخاری میں درج ہونے سے وہ لازماً صحیح نہیں قرار پاتیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ روزے میں سرمہ لگانے کی اجازت، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، اور ''الصَّوْمُ مِمَّا دَخَلَ'' یہ صحابی اور تابعی کے اقوال ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بہر حال صحابی اور تابعی کے اقوال پر راجح ہے۔ لہٰذا یہ بھی ایک درجے کی احادیث نہیں ہیں اور ان میں بھی تعارض نہیں ہے، اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان میں سے مُحَرِّم، مُبِیح پر راجح ہے، کیونکہ ترجیح اس وقت دی جاتی ہے جب دونوں ایک ہی درجے کی احادیث ہوں۔

مفتی صاحب نے سنن ابی داؤد کی حدیث نمبر ۲۳۷۷ کا حوالہ دیا ہے جو یہ ہے:

عن عبدالرحمن بن النعمان بن معبد بن هوذة عن ابيه عن جده عن النبی ﷺ انه امر بالاثمد المروح عندالنوم وقال: ليتقه الصائم.

''حضرت معبد بن ہوذہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے سوتے وقت مشک ملا ہوا سرمہ لگانے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ روزے دار اس سے بچے''۔

اس حدیث کے تحت امام ابوداؤد نے لکھا ہے کہ یہ حدیث ''منکر'' ہے، واضح رہے کہ حدیث ''منکر'' اسے کہتے ہیں جو حدیث معروف کے مقابلے میں ہو اور معروف حدیث یہ ہے:

عن انس بن مالک، قال: جاء رجل الی النبی ﷺ فقال: اشتکت عینی، افأکتحل وأنا صائم؟ قال: نعم.

''حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری آنکھیں دکھ رہی ہیں، کیا میں سرمہ لگا سکتا ہوں جبکہ میں روزے سے ہوں، آپ نے فرمایا: ہاں''۔ (جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۷۲۶)

لہٰذا یہ جامع ترمذی کی حدیث معروف کے معارض نہیں ہو سکتی۔

حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری نے ''اَلْاِفْطَارُ مِمَّا دَخَلَ'' کو ضابطۂ کلیہ قرار دیا ہے، حالانکہ یہ ''عام مخصوص عنہ البعض'' ہے، کیونکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ناک میں پانی ڈالنے اور کلی کرنے کی اجازت دی ہے اور وہ بھی ''مِمَّا دَخَلَ'' کے عموم میں شامل ہے۔

اور جوفِ معدہ یا جوفِ دماغ تک پہنچنے کے ''مفطر'' ہونے کا ذکر کسی حدیث میں نہیں ہے، یہ ہمارے فقہاء کرام کی تصریح ہے۔ اور ''عام مخصوص عنہ البعض'' ظنی ہوتا ہے اور اس سے کسی کلیہ پر استدلال کرنا یا اس کو ضابطۂ کلیہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، علاوہ ازیں یہ ایک صحابی یا تابعی کا قول ہے اور وہ حدیث رسول سے متصادم ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور برسبیلِ تنزل اگر اسے ضابطۂ کلیہ مان بھی لیا جائے، تب بھی رسول اللہ ﷺ سے سرمہ لگانے کی اجازت اس ضابطۂ کلیہ سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ آپ شارع ہیں۔ علاوہ ازیں جس طرح ایک صحابی اور ایک تابعی حضرت ابن عباس اور حضرت عکرمہ سے ''اَلصَّوْمُ مِمَّا دَخَلَ'' منقول ہے، جس کی بنیاد پر حضرت مفتی صاحب نے روزے میں سرمہ لگانے کو ''مفطر'' (روزہ ٹوٹنے کا سبب) قرار دیا ہے، اسی طرح سے ایک صحابی اور ایک تابعی حضرت انس اور حضرت اعمش سے عبارۃ النص سے روزے میں سرمہ لگانے کے ''غیر مفطر'' ہونے کی تصریح ہے، وہ روایات درج ذیل ہیں:

عن انس بن مالک انه کان یکتحل وھو صائم۔

''حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ وہ روزے کی حالت میں سرمہ لگایا کرتے تھے''۔ (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: ۲۳۷۸)

عن الاعمش قال: مارأیت احدا من اصحابنا یکرہ الکحل للصائم وکان ابراھیم یرخص ان یکتحل الصائم بالمصبر۔

''حضرت اعمش نے فرمایا کہ میں نے اپنے اصحاب میں سے کسی کو نہیں دیکھا جو روزے دار کے لئے سرمہ لگانے کو مکروہ سمجھتا ہو اور ابراہیم روزے دار کو مصبر کا سرمہ لگانے کی اجازت دیا کرتے تھے''۔ (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: ۲۳۷۹)

حضرت ابن عباس اور عکرمہ کے اقوال سے ''اشارۃ النص'' کے طور پر روزے میں سرمہ لگانے کی ممانعت ثابت ہے اور اس کے مقابلے میں حضرت انس اور اعمش سے روزے میں سرمہ لگانے کے ''غیر مفطر'' ہونے کی تصریح ہے۔ اگر ان اقوال کو آپس میں متعارض بھی قرار دیا جائے

تو جامع ترمذی میں جو روزے میں سرمہ لگانے کی اجازت کا ذکر ہے، وہ تعارض سے خالی ہے اور اس کا کوئی مزاحم نہیں ہے۔

امید ہے حضرت علامہ مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب ان سطور کا مطالعہ فرمانے کے بعد اپنے موقف پر یا تو نظر ثانی فرمائیں گے اور یا ہماری ان گزارشات کی توجیہ فرمائیں گے۔

ایک ہی ملک میں روزہ اور عید الگ الگ کیوں ہوتے ہیں؟

سوال: اکثر ہمارے ملک کے بعض علاقوں میں باقی ملک کے مقابلے میں روزہ اور عید الگ الگ ہوتے ہیں، ایسا کیوں ہے، (بیر رحمٰن آفریدی۔ بلدیہ ٹاؤن)۔

جواب: حکومت نے اسی لئے رویتِ ہلال کا ملک گیر نظام قائم کیا ہے۔ اب تمام مکاتب فکر کے جید اور ثقہ علماء کرام پر مشتمل "مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان" ہے، اس کی اعانت کے لئے ملک کے تمام صوبائی، ڈویژنل، ڈسٹرکٹ اور سب ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز پر زونل رویت ہلال کمیٹیاں موجود ہیں۔ جب حکومت نے ایک ادارہ قائم کر کے اس کو اختیار تفویض کر دیا ہو تو اس کے متوازی اور مقابل، علماء کو پرائیویٹ کمیٹیاں قائم نہیں کرنی چاہئیں بلکہ اس کمیٹی کی معاونت کرنی چاہئے اور اس کے نظام کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ پورے ملک میں ایک ساتھ رمضان کا آغاز ہو اور ایک ساتھ عید منائی جائے۔ اور الحمد للہ اس سال اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پورے ملک میں ایک ساتھ رمضان شروع ہوا ہے اور گزشتہ سال بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ دعا کریں کہ عید الفطر بھی پوری قوم ایک ساتھ منائے۔

اسلامک ایجوکیشن انٹرنیشنل برطانیہ کی جانب سے رویتِ ہلال کے مسئلے پر استفسار

بصد ادب گزارش یہ ہے کہ اسلامی مہینوں کی ابتداء اور انتہا نئے چاند کے دیکھنے پر منحصر ہے۔ تاجدارِ کائنات ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک دنیا بھر کے مسلمانوں کا اسی پر عمل رہا ہے۔ سعودی عرب دونوں عیدوں، حج اور رمضان کا اعلان کرتے وقت دعویٰ کرتا ہے وہاں پر بہت سارے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا ہے جب کہ ابزرویٹری کی معلومات کے مطابق چاند کا انسانی آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کے وہ اسلامی ملک جہاں

آنکھوں سے دیکھنے کا پورا اہتمام ہوتا ہے وہاں بھی یہ سارے دن ایک دن بعد شروع ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اہلِ حدیث، دیوبند، عرب اور اہلِ سنت کی ایک بہت بڑی تعداد ان کی پیروی میں ان مقدس دنوں کا اعلان کر دیتی ہے۔ اہل سنت کا ایک طبقہ اور چند دوسرے افراد اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا رمضان کی ابتداء اور دونوں عیدیں ایک دن نہیں ہو پاتیں اور ہر شہر میں دو اور کبھی تین عیدیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح عرب ریاستیں بھی سعودی عرب کی پیروی میں نئے اسلامی مہینے کی ابتداء کا اعلان کر دیتی ہیں۔ سعودی عرب کی پیروی میں اس سال کئی عرب ملکوں نے عید الفطر کا اعلان کیا۔

مثلاً اس بار 4 دسمبر 2002 ابزرویٹری کے مطابق پوری دنیا میں کہیں بھی چاند نظر آنے کا امکان نہیں تھا۔ لندن میں 4 دسمبر 2002 کو سورج 3:54 پر غروب ہوا اور چاند غروب 3:56 پر ہوا۔ سعودی عرب ہمارے مشرق میں ہے اگر وہاں پر چاند نظر آئے تو مغرب میں چاند نظر آنا یقینی ہے مگر سعودی عرب نے 5 دسمبر کی عید کا اعلان کیا ہے۔ میری گزارش یہ ہے۔

ا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سعودی عرب کے اس اعلان کو صحیح مان لیا جائے اور اس کے مطابق عید کا اعلان کر کے یہ ذمہ داری ان پر ڈال دی جائے کیونکہ وہ مسلمان ملک ہے اور مسلمان کے بارے بدظنی نہیں کرنی چاہئے۔

عام تاثر یہ ہے کہ سعودی عرب میں شرعی شہادت کے تحت اعلان ہوتا ہے حالانکہ ان کے ہاں نئے چاند کی پیدائش پر نئے مہینے کا اعلان ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت میں روانہ کر رہا ہوں۔ شہادت وہ لیتے ہیں لیکن اس کی تحقیق نہیں کرتے۔ کسی جگہ کا کوئی شخص بھی اگر وہاں کے امام کو یہ بتائے کہ میں چاند دیکھا ہے تو وہ مرکزی رویت ہلال کو اطلاع دے دیتا ہے اور اسی گواہی کی بنا پر نئے مہینے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

2۔ کیا ابزرویٹری کی معلومات پر اعتماد صحیح ہے کہ اس اعتماد کی وجہ سے ایک مسلمان ملک کی رویت کے اعلان کو نہ مانا جائے۔

3۔ اسلامی مہینوں کی ابتداء پہلے کرنے والے اپنے تحفظ میں ایک نیا موقف متعارف کرا رہے ہیں۔ اور وہ ہے چاند کے موجود ہونے ان کی وضاحت کے مطابق رؤیت، علم کے معنی میں ہے اور چاند سے مراد مطلق چاند ہے۔ لہٰذا نیا چاند اگر سورج کے غروب ہونے کے بعد چند لمحات کے لئے

بھی موجود رہے تو اگلا دن نئے مہینہ کا پہلا دن ہوگا۔ بلکہ اہل سنت کی ایک معروف شخصیت کی جانب سے اس میں مزید وسعت آرہی ہے۔ان کی دعویٰ ہے کہ: ”اگر رات 12 بجے تک بھی چاند کی پیدائش ہو جائے تو اگلا دن پہلا ہوگا۔ یہ استحسان ضرورت ہے اور ضرورت مسلمانوں کی اتحاد ہے۔رویت، علم کے معنی میں ہے اور چاند سے مطلق چاند مراد ہے چاہے وہ نظر آنے کے قابل ہو یا نہ ہو جب کہ اس موقف کو صرف ان کے اداروں نے اپنایا ہے۔ان کے علاوہ ایک بھی مسجد نے نہیں اپنایا۔ کیا صرف چاند کی پیدائش یا سورج غروب ہونے کے بعد چاند کے وجود کی بنیاد پر اسلامی مہینے کی ابتداء کرنا صحیح ہے؟

کیا زمانہ رسالت سے لے کر آج تک کسی عالم دین نے رویت اور ہلال کا یہ معنی لیا ہے؟ اگر لیا ہے تو اس کی طرف راہنمائی کی جائے۔ کیا امت کے اتحاد کے لئے اور لوگوں کی بے چینی کو دور کرنے کے لئے اس معنیٰ کو لینے کی کوئی معمولی سی گنجائش ہے؟ یہ بات ذہن میں رہے کہ اس افتراق سے اسلام کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے اور کفار کی جانب سے تعلیمی اداروں میں خاص طور پر اور ہر سطح پر عام طور پر نوجوانوں نسل کو دین سے متنفر کیا جارہا ہے اور وہ متنفر ہورہے ہیں۔

4۔عید الاضحیٰ کے موقعہ پر یہ ایک وزنی اعتراض ہوتا ہے کہ کیا سعودی عرب لاکھوں اہل اسلام کا فریضۂ حج فاسد کر رہے ہیں۔مخالفین کے پاس یہ ایک مضبوط عوامی دلیل ہوتی ہے کہ حج کے دوسرے دن عید الاضحیٰ ہوتی ہے اور یہ منوانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ سعودی عرب اکثر اعلان غلط کرتا ہے۔احقر العباد بھی اس ضمن میں سخت الجھن میں ہے کہ کیا واقعتاً حج فاسد ہورہا ہے کیونکہ ہمارے نظریہ کے مطابق وقوف عرفہ 9 کی بجائے 8 ذی الحجہ کو ہورہا ہے۔ ہر سال پوری دنیائے اسلام سے بڑے بڑے علماء حج پر آتے ہیں تو اس مسئلہ کو کیوں نہیں اٹھاتے؟ اس خاموشی کی بنیاد کیا ہے؟ یہ مسئلہ تو حکومتی سطح پر بھی اٹھایا جاسکتا ہے، کبھی کسی نے اشارتاً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

ہمارے چند علماء کرام نے یہ تو وضاحتیں اپنی کتابوں میں لکھی ہیں کہ اگر ایک آدمی پاکستان سے سعودی عرب جائے۔ پاکستان میں روزہ ہو اور وہاں عید ہو تو وہ کیا کرے یا کوئی آدمی سعودی عرب سے عید کے دن چلے اور پاکستان میں روزہ ہو تو کیا کرے یہ نہیں لکھا کہ سعودی عرب کا اعلان غلط ہوتا ہے۔ممکن ہے کہ آپ کی وضاحت کے بعد اس مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے اگر ایسا ہوا تو یقیناً ساری امت آپ کو دعائیں دے گی وگرنہ عند اللہ تو بہر صورت آپ کو اجر عظیم سے نوازا

جائے گا۔

آپ سے گزارش ہے کہ اپنا جواب آسان ترین الفاظ میں لکھیں تا کہ عام لوگ اس کو سمجھ سکیں۔ میری آپ سے یہ بھی گزارش ہوگی کہ اپنے جواب میں کسی شخصیت یا کسی جماعت پر ذاتی تنقید نہ کریں کیونکہ اس سے مزید الجھاؤ پیدا ہوگا۔

مجھے اس بات کا مکمل احساس ہے کہ ان ساری گزارشات کی توضیحات پر آپ کا کافی وقت صرف ہوگا اور آپ کی دینی و مسلکی مصروفیات و معمولات میں رکاوٹ ہوگی، لیکن واللہ اس مسئلہ کی بنیاد پر مسلمانوں کا وقار نہ صرف مجروح ہو رہا ہے بلکہ نفرتوں میں تبدیل ہو رہا ہے۔ آپ کی راہنمائی مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس گزارش کی اہمیت کے پیش نظر اس سلسلہ میں ضرور رہنمائی فرمائیں گے اور جس قدر جلد ممکن ہو اپنی تحقیق سے نوازیں گے۔

نوٹ: آپ کی معلومات اور اپنی تشویش کے ثبوت کیلئے بعض دستاویزات کے اقتباسات بھی منسلک ہیں،

(خادم العلم والعلماء ساجد الہاشمی)

160-162, Grey Street, Burnley, Lancashire,

BB10 1PX, England

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب

قرآن وحدیث میں چاند کے بارے میں جو نصوص ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ چاند ساکن اور جامد نہیں ہے بلکہ متحرک ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (الرحمٰن:5)

''سورج اور چاند (اپنی گردش میں) ایک حساب اور ضابطے کے پابند ہیں''۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسین:38-40)

''اور سورج اپنی قرارگاہ (محور و مدار) پر رواں دواں ہے، یہ ایک غالب علیم ہستی کا طے کردہ (نظام) ہے، اور چاند کیلئے ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں، یہاں تک کہ لوٹ پھر کر وہ کھجور کی پرانی شاخ کی مانند ہو جاتا ہے، نہ سورج کی مجال کہ وہ (چلتے چلتے) چاند کو جا پکڑے، اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے، اور ہر ایک (اپنے) مدار میں تیر رہا ہے''۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ (ابراہیم:34)

''اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مطیع کر دیا کہ وہ مسلسل رواں دواں رہیں''۔

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ چاند اللہ تعالیٰ کے حکم سے متحرک ہے، اس کا مدار و محور اور منزلیں مقرر ہیں، اس کا یہ سفر خودسری کا نہیں ہے اور نہ ہی بے ہنگم ہے، بلکہ ایک سسٹم، ڈسپلن اور نظام کے تابع ہے۔

یہ آیات مبارکہ آیاتِ تشریع تو نہیں ہیں بلکہ آیاتِ تکوین اور تذکیر موعظت ہیں، لیکن بہر کیف ان سے یہ منشائے ربانی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ چاند کا محور و مدار، حرکت و رفتار اور منازل قادر مطلق کی جانب سے متعین ہیں اور اس تقدیر الٰہی سے کسی کو سر مو انحراف کی مجال نہیں ہے۔ اور موجودہ دور میں سائنسی علوم اور آلات کے ذریعے انسان نے تیقن یا کم از کم ظنِ غالب کی حد تک اس علم کو حاصل کر لیا ہے اور فقہاء اسلام نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ مسائل و احکام شرعیہ کے استنباط و اخراج اور اطلاق میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین کی آراء سے استفادہ کرنا چاہئے، اس کی دو مثالیں پیش خدمت ہیں:

ا) فقہائے احناف نے اس مسئلہ پر امکانی بحث کی ہے کہ احلیل ذکر سے پانی یا مائع داخل کر دیا جائے تو روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟۔ امام اعظم ابوحنیفہ کا قول یہ ہے کہ روزہ فاسد نہیں ہوگا، امام ابو یوسف کا قول یہ ہے کہ روزہ فاسد ہو جائے گا اور امام محمد مضطرب الخیال ہیں یعنی کوئی حتمی اور قطعی رائے قائم نہیں کر پائے، یہ اختلاف اس امر پر مبنی ہے کہ آیا ''احلیلِ ذکر'' اور جوفِ معدہ کے درمیان منفذ (یعنی کوئی روٹ یا نالی) ہے یا نہیں۔

امام اعظم کا خیال یہ تھا کہ منفذ نہیں ہے بلکہ درمیان میں مثانہ ہے اور پیشاب اس سے مترشح ہو کر آتا ہے اور امام ابو یوسف کا خیال تھا کہ منفذ ہے اور ان دونوں ائمہ کا اس مسئلے میں اختلاف (

یعنی ایک کے نزدیک اس عمل سے روزے کا نہ ٹوٹنا اور دوسرے کے نزدیک ٹوٹ جانا) اسی اختلاف پر مبنی ہے۔امام محمد نے پہلے امام اعظم کے قول سے اتفاق کیا، پھر امام ابو یوسف کے قول کی جانب ان کی رائے مائل ہوئی، اور آخر عمر میں توقف فرمالیا، یعنی کوئی قطع رائے قائم نہ کر سکے، کیونکہ اصولی طور پر یہ اختلاف فقہی نہیں ہے، فقہی اصول تینوں ائمہ احناف کے درمیان متفق علیہ ہے، بلکہ یہ مسئلہ ''علم تشریح الاعضاء''(ANOTOMY) کا ہے، یعنی ماہرین طب نے طے کرنا ہے۔اور اس وقت تک ''علم تشریح الاعضاء'' نے اس حد تک ترقی نہیں کی تھی، جس مقام پر آج ہے، (ملخصاً البنایہ فی شرح الہدایہ، جلد نمبر ۳، ص ۶۸۵۔ ۲۸۴، دار الفکر۔ بیروت)

(۲) اسی طرح ہمارے قدیم فقہاء کا خیال تھا کہ کان سے جوفِ دماغ تک منفذ ہے، لہذا انہوں نے مسئلہ مستنبط کیا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، لیکن اب ماہرین علم تشریح الاعضاء (Anatomist) نے بتایا کہ کان سے جوفِ معدہ یا دماغ تک کوئی منفذ (Route) نہیں ہے، میں تقریباً تین سال سے اس مسئلے پر اخبارات و رسائل میں لکھ رہا ہوں کہ اس قدیم مسئلے کی تصحیح ہونی چاہئے۔گزشتہ سال دار العلوم کراچی کے علماء نے الحمد للہ بالاتفاق اسے تسلیم کرلیا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔لہٰذا ہمیں ''رویتِ ہلال'' کے مسئلے پر بھی ماہرین موسمیات وفلکیات کے علم سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے، لیکن اس کی حدود کیا ہوں، یہ آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیے گا، پہلے رسول اللہ ﷺ کے یہ صریح ارشادات ملاحظہ کیجئے:

لاتصوموا حتی تروا الهلال ولا تفطروا حتی تروه

''جب تک چاند نہ دیکھ لو، روزہ نہ رکھو (یعنی آغازِ رمضان نہ کرو) اور (شوال کا) چاند دیکھے بغیر روزۂ (رمضان) نہ چھوڑو''۔

لاتصوموا حتی تروا الهلال ولاتفطروا حتی تروه فان غم علیکم فاقدروا له۔

''اور (رمضان کا) چاند دیکھے بغیر روزہ (رمضان) شروع نہ کرو اور (شوال کا) چاند دیکھے بغیر (رمضان کا) روزہ نہ چھوڑو، اگر مطلع ابر آلود ہو (اور چاند نظر نہ آئے) تو تیس کا مہینہ پورا کرو''۔

صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غم علیکم فاکملوا عدۃ شعبان

ثلاثین۔

''(رمضان کا چاند) دیکھ کر روزۂ (رمضان) شروع کرو اور (شوال کا) چاند دیکھ کر اختتامِ رمضان کرو، اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو جائے تو شعبان کے تیس دن پورے کرو، (مشکوٰۃ المصابیح باب رؤیۃ الہلال)''۔

یہ احادیثِ مبارکہ رویتِ ہلال کے بارے میں ''تشریعی نصوص'' ہیں اور ہم شرعاً ان پر عمل کے مکلف ہیں، لہٰذا ہر قمری مہینے کا آغاز ''رویتِ ہلال'' پر ہی مبنی ہوگا، محض ماہرینِ فلکیات کی رائے پر فیصلہ نہیں ہوگا، تاہم ''شہادتِ رویت'' کے ردّ و قبول میں ان کی رائے سے استفادہ کیا جائے گا، کیونکہ علی الاطلاق کوئی بھی شہادت حجت لازمہ و ملزمہ نہیں ہوتی۔

چاند تو مطلع و مدار پر ہر وقت موجود ہے، لیکن قمری ماہ کی 29 تاریخ کو اگلے ماہ کا چاند نظر آنے یا نہ آنے کے حوالے سے ماہرینِ فلکیات کے معیاراتِ امکانِ رویت کے اعتبار سے متعین ہیں، قمری مہینے کی 29 تاریخ کو چاند کا ظہور و نمود اگر ہے تو اسے اصطلاحاً پیدائش (Birth) سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ چاند ویسے تو ہمیشہ موجود رہتا ہے، معدوم کبھی نہیں ہوتا، لیکن زیرِ بحث مسئلہ اس کے مطلع پر ظہور و نمود سے متعلق ہے۔ لیکن بعض اوقات (Birth Of Moon) کے باوجود امکانِ رویت (Visibility) نہیں ہوتا، اس کے لئے چاند کی عمر، درجہ، غروبِ آفتاب کے بعد اس کی مدتِ حیات، زاویہ وغیرہ، کئی Parameters ہیں۔ ان کی روشنی میں کبھی ''امکانِ رویت'' بالکل نہیں ہوتا، کبھی بالکل نمایاں اور واضح ہوتا ہے اور کبھی خفیف سا ہوتا ہے کہ نظر آ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

میں بحیثیت چیئرمین مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان اور ہمارے اراکین جب امکانِ رویت بالکل نہ ہو اور شہادت آ جائے تو اسے دقتِ نظر سے پرکھتے ہیں اور بالآخر وہ خود ہی رجوع کر لیتا ہے، جب امکانِ رویت خفیف یا خفیف ترین ہو تو بھی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور الحمدللہ گزشتہ دو سالوں سے پاکستان میں یہ مسئلہ متفقہ طور پر حل ہو رہا ہے اور عیدین یا اعیادِ متعددہ کی روایت دم توڑ رہی ہے، بس اس میں تھوڑی سی استقامت اور عزیمت کی ضرورت ہے۔ یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں گزشتہ پچیس سال سے کسی نہ کسی حیثیت سے ''رویت ہلال'' کے نظام سے متعلق رہا ہوں، ہمیں محکمۂ موسمیات سپارکو اور بعض اوقات نیوی کے ماہرین کی خدمات میسر ہوتی ہیں، لیکن آج تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ باہر کھلی آنکھ (Naked Eye) چاند نظر

نہ آیا ہو اور صرف دوربین سے نظر آیا ہو، چاند جب مطلع پر قابل دید (Visible) ہوتا ہے تو دوربین سے بھی نظر آتا ہے اور کھلی آنکھ سے بھی نظر آتا ہے۔

یو۔کے استفتاء میں جو یہ مسئلہ اٹھایا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ''رویت'' سے مراد علم ہے اور جب سائنسی یا کسی اور ذریعے سے علم حاصل ہو جائے تو قضاء شرعی کے لئے اس پر اکتفاء کر لیا جائے۔اس سلسلہ میں گذارش یہ ہے کہ یہ رائے ''اصولِ دین'' سے ناواقفی پر مبنی ہے، اصولِ فقہ کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کے حقیقی معنیٰ متروک یا متعذر نہ ہوں، اسے حقیقت پر ہی محمول کیا جائے گا۔ اور الحمدللہ! حدیث مبارک ''صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته'' میں ''رویت'' کا حقیقی معنیٰ قرنِ اوّل سے آج تک معمول بہ بھی ہے، اور قابل عمل بھی ہے اور اس پر عمل کرنے میں کوئی تعذر بھی نہیں ہے، لہٰذا حقیقی معنیٰ سے عدول کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے اور ثبوت رویت کے لئے ''قضاء شرعی'' کا مدار رویت پر ہی ہوگا۔

استفتاء واستفسار کا ایک نکتہ یہ ہے کہ رصدگاہوں (Observatories) اور ماہرین فلکیات کے اعتبار سے سعودی عرب کے اعلانات رمضان المبارک اور حج کے بارے میں گذشتہ کئی مواقع پر غلط اور خلاف واقع ہوئے ہیں، یہ بات فی نفسہ درست ہے، گذشتہ دو سال سے تو سائنسی اعتبار سے ایسے مواقع بھی آئے کہ پورے عالم میں یا اکثر عالم میں آغازِ رمضان وعیدالفطر اور یوم الحج ایک ساتھ متوقع تھا، لیکن اس کے برعکس وہاں سے فیصلے کا اعلان ہوا اور اس پر عملدرآمد بھی ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ ''شہادتوں'' کے ردّ وقبول میں احتیاط سے کام نہ لیتے ہوں اور جدید ذرائع علم کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہوں، ہم ان کی نیت پر تو شبہ نہیں کرتے، کیونکہ ہم ''ظنوا المؤمنین خیرا'' کے مکلف ہیں۔تاہم جو شخص، اشخاص اور ادارے بدنیتی یا دانستہ تساہل کا ارتکاب کریں گے تو وہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں گے۔لیکن اس فیصلے پر جو عامۃ المسلمین عمل کریں گے، وہ اپنی عبادات کے لئے انشاء اللہ اجرِ آخرت سے محروم نہیں رہیں گے۔کیونکہ قضاء قاضی اپنی حدود میں نافذ اور مؤثر ہوتی ہے، اور سعودی عرب کی رویت ہلال کمیٹی وہاں کی حکومت کی جانب سے ان کے اپنے ملک کے لئے مامور ہے، پورے عالم اسلام یا عالم پر حکمرانی کے لئے وہ حکومت خود مختار و مجاز نہیں ہے تو اس کا قائم کردہ ایک ذیلی ادارہ کیسے مجاز ہو سکتا ہے۔جہاں تک واقع اور حقیقت کے خلاف قضاء قاضی کے مؤثر اور نافذ ہونے کا تعلق ہے تو شیخ

الاسلام علامہ برہان الدین المرغینانی لکھتے ہیں:

ومن رأى هلال الفطر وحده ولم يفطر احتياطاً وفى الصوم الاحتياط فى الايجاب

''اور اگر کسی شخص نے تنہا ہلال عید (یعنی شوال کا چاند) دیکھا (اور اس کی شہادت قاضی نے قبول نہیں کی) تو وہ خود بھی احتیاطاً روزہ رکھے اور ہلال رمضان میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اتباع امام کو واجب قرار دے''۔

(ہدایہ اولین: ج ا ص ۱۹۶، مطبوعہ محمد علی کارخانہ کتب، کراچی)

اور علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(رأى) مكلف (هلال) رمضان او الفطر و رد قوله بدليل شرعى صام مطلقاً وجوباً، وقيل ندباً

''اور اگر ایک عاقل و بالغ مسلمان نے رمضان یا شوال کا چاند دیکھا اور (قاضی نے) دلیل شرعی سے اس کا قول رد کر دیا تو (اتباع قاضی میں) اس پر مطلقاً (یعنی ہلال رمضان ہو یا ہلال عید) روزہ رکھنا واجب ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ مستحب ہے''۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین ہاشمی لکھتے ہیں:

لوصام رائى هلال رمضان واكمل العدة لم يفطر الا مع الامام لقوله عليه السلام صومكم يوم يصومون وفطركم يوم يفطرون (رواه الترمذى وغيره)۔

''اگر کسی شخص نے ہلال رمضان دیکھ کر رمضان شروع کیا اور اس (کے روزوں) کی گنتی (تمیں) پوری ہوگئی، (مگر امام کے حکم پر ہلال عید کا اعلان نہیں ہوا) تو وہ امام کے بغیر تنہا روزۂ رمضان نہ چھوڑے (یعنی عید نہ منائے) کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے: جس دن (اتباع امام میں) قوم کا روزہ ہو تو تم بھی روزہ رکھو اور جس دن (اتباع امام میں) قوم عید منائے اور روزہ چھوڑ دے تو تم بھی ایسا ہی کرو''۔

البتہ علامہ شامی نے بدائع الصنائع کے حوالے سے لکھا ہے کہ علماء محققین کا قول یہ ہے کہ اپنے مشاہدے کے برعکس امام کی اتباع واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، آگے چل کر ''مبسوط'' کے

حوالے سے لکھتے ہیں کہ بصورتِ رمضان واجب ہے اور بصورتِ عید اتباع امام مستحب ہے۔
(ردالمختار: ج ۳ ص ۳۱۵۔ ۳۱۴ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی)
جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے، اس میں خطاء اجتہادی پر مبنی قاضی کا فیصلہ ظاہراً نافذ تو ہو جاتا ہے، لیکن یہ فیصلہ حقیقتِ واقعہ کو تبدیل نہیں کرتا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

انکم تختصمون الی ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجته من بعض فاقضی له علی نحو مما اسمع منه فمن قطعت له من حق اخیه شیاً فانما اقطع له به قطعة من النار۔

''تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو دوسرے کے بہ نسبت زیادہ موثر دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی مہارت رکھتا ہو اور اس سماعت کے اعتبار سے (بالفرض) میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، تو جس شخص کو میں اس کے بھائی کے حق میں سے (خلافِ حقیقت) کچھ دے دوں تو (وہ چیز اس کے لئے جائز نہیں ہے بلکہ اسے سمجھنا چاہئے کہ) میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۳۵۹)

اب ہم اس تفصیلی اور مدلل بحث کے بعد آپ کے سوالات کا ترتیب وار جواب خلاصہ کلام کے طور پر دے رہے ہیں اس میں بعض امور کا تکرار ناگزیر ہے اس لئے اس سے طبیعت پر بار محسوس نہیں کیجئے گا۔

1- سعودی عرب کا اعلان رویت مملکت سعودی عرب میں نافذ العمل ہے، دوسرے ممالک ان کی رویت کا تحقیقی جائزہ لے کر کہ آیا ان کا فیصلہ شرعی قواعد و ضوابط کے مطابق ان کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں، ان کے فیصلہ کو قبول یا رد کر سکتے ہیں۔

2- آبزرویٹری کی وہ معلومات جو بدیہی ہیں، ان سے رویتِ ہلال میں استفادہ ممکن ہے۔ اگر چاند افق پر موجود ہو اور چاند نظر نہ آئے تو فیصلہ حساب پر نہیں بلکہ رویت پر ہوگا- تاہم چاند افق پر موجود نہ ہو اور رویت کی شہادت آ جائے تو اس پر دقت نظر سے غور کرنا چاہئے، کیونکہ اس صورت میں آنکھیں بند کر کے شہادت قبول کرنے سے امتِ مسلمہ کی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ پاکستان کی رویت ہلال کمیٹی اس شہادت کو قبول نہیں کرتی جو واقع کے خلاف ہو، یعنی چاند افق پر موجود ہی نہ

ہواور رویت کی شہادت آجائے تو اس شہادت کو قاضی کے شرح صدر کے منافی سمجھ کر تسلیم نہیں کیا جاتا، کیونکہ کوئی بھی شہادت علی الاطلاق حجت لازمہ وملزمہ نہیں ہوتی۔ چاند کا نظر آنا اگر بہت مشکل ہو لیکن موجود ہو تو اس وقت شہادتوں پر فنی قواعد کی روشنی میں بھرپور جرح سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ آیا واقعی دعویٰ کرنے والے نے چاند دیکھا ہے یا اس کو سہو ہوا ہے (سہو کی نظیریں آثار صحابہ میں موجود ہیں)، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے چاند دیکھا ہے تو اس کو پھر تسلیم کیا جاتا ہے ورنہ نہیں۔ سوال کے دوسرے حصے کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر پہلے سوال کا جواب معلوم ہو تو اس سے فائدہ اٹھا کر نہ تو اس مسلمان ملک کے ساتھ الجھے، نہ ہی ان کا فیصلہ اپنے اوپر لاگو کرنا ضروری ہے۔

3۔ یہ تجویز ہرگز قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ شرعاً رات غروبِ آفتاب سے شروع ہوتی ہے، اس لئے جو چاند غروب آفتاب سے پہلے دیکھے وہ معتبر نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ چاند کے نظر آنے کے لئے Birth Of Moon کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کی اتنی عمر ہونی چاہئے جس سے یہ نظر آنے کے قابل (Visible) ہو جائے۔ پس رات کے 12 بجے Birth Of Moon پر چاند کے حکم کا فیصلہ ہونے لگے تو اس سے اصل رویت سے یقیناً ایک دن کا فرق پڑ جائے گا کیونکہ ماہرین فن کے نزدیک چاند کو نظر آنے کے لئے تقریباً 17 گھنٹے کی عمر درکار ہوتی ہے جبکہ غروب آفتاب اور رات کے 12 بجے میں اوسطاً 6 گھنٹے کا فصل ہوتا ہے۔ اس طرح 17 اور 6 گھنٹے مل کر 23 بن جاتے ہیں جو کہ تقریباً ایک دن کے برابر ہے۔ امت کا اتحاد بہت ضروری ہے، لیکن جب خلافِ حقیقت امر پر اتحاد ممکن ہی نہیں تو ایسے اتحاد کی کوشش مزید انتشار کا باعث ہوگا۔ جہاں تک مذکورہ موقف کا دوسرا دعویٰ ہے تو اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے:

صوموا لرویته وافطروا لرؤیته فان غم علیکم فاکملوا عدة شعبان ثلثین

''یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو اور اگر آپ کے سامنے آڑ (غم) ہو جائے تو پھر شعبان کے تیس دن پورے کرو''۔

اب آپ ﷺ کے دور میں علم فلکیات وموسمیات میں انسان کے پاس وہ علم، تجربہ، مشاہدہ اور آلات نہیں تھے جو آج دستیاب ہیں، لہٰذا یہ ادعاء بالکل باطل ہے کہ حدیث شریف میں

''رویت''علم کے معنیٰ میں ہے، جبکہ آج کل کے حالات میں چاند کے علم میں ''غُمّ'' ممکن نہیں۔ کیونکہ اب چاند کا ایک سیکنڈ کی غلطی کے بغیر ٹھیک ٹھیک (Accurate) حساب مرتب ہو چکا ہے، لیکن ہم جدید علوم، تجربے، مشاہدے اور آلات کی مدد سے منشائے کتاب وسنّت کو صحت کے اعلیٰ معیار پر حاصل کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں، لیکن اسے باطل کرنے کی جسارت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔لہٰذا یہ قطعی طور پر طے ہے کہ رویت سے مراد ''رویت علمی''نہیں''بلکہ ''رویت بصری''ہے، کیونکہ اصول فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کے معنیٰ حقیقی متروک یا متعذر نہ ہوں ،تو حقیقت پر ہی عمل ہوگا اور الحمدللہ! حدیث مبارک......صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته...... میں رویت کا حقیقی معنیٰ قرنِ اوّل سے آج تک معمول بہ بھی ہے، قابل عمل بھی ہے اور اس پر عمل کرنے میں کوئی تعذر بھی نہیں، لہٰذا معنیٰ حقیقی سے عدول کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لئے ثبوت رویت کے لئے قضاء شرعی کا مدار رویت عینی پر ہی ہوگا۔

اگلے سوال کا جواب بھی اس میں آگیا کہ صرف چاند کی پیدائش یا سورج غروب ہونے کے وقت چاند کا وجود فیصلہ کن نہیں بلکہ چاند کی رویت ضروری امر ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق کسی مشہور محقق نے رویت ہلال کا یہ مفہوم نہیں لیا جس کا اس سوال میں ذکر ہے، امت کے اتحاد پر پہلے بات ہو چکی ہے۔امت مسلمہ کا اتحاد غیر منطقی بنیادوں پر ممکن ہی نہیں اس لئے اس کی کوشش فضول اور تضیع اوقات کا باعث ہے۔

ہم ایک اسلامی ملک کے شہری تو ہیں لیکن سعودی اتھارٹیز اور اداروں کے سامنے ہماری جانب سے بعض مسائل اٹھانے میں کچھ دشواریاں حائل ہیں، حکومتی سطح پر بعض مصلحتیں بھی رکاوٹ بن جاتی ہیں، سفارتی حساسیت (Diplomatic Sensitivity) اور تیل پیدا کرنے والے اسلامی ممالک کا اپنی وافر دولت پر زعم بھی ایک وجہ بے اعتنائی ہے۔لیکن آپ مغرب میں ہیں، مغرب سے اٹھنے والی آواز پر وہ کان ضرور دھرتے ہیں کیونکہ ان کی سلطنت واقتدار کی بقاء ان کی مرہون منت ہے۔لہٰذا آپ علماء اور ماہرین فلکیات کا ایک وفد مرتب کر کے پہلے جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے ثقہ علماء، میں اس مسئلے پر اجماع کلی یا اکثری (Consensus)، جیسا بھی حالات کے تحت ممکن ہو، پیدا کرنے کی کوشش کریں، پھر دیگر ممالک ایشیاء، افریقہ وعالم عرب سے آئے ہوئے مسلمانوں کو اس میں شریک کریں۔اس کے بعد ایک وقیع وفد ترتیب دے کر سعودی سفیر

سے ملاقات کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کریں اوران کے توسط سے اس مسئلے پر اپنے افکار وخیالات سے سعودی وزارت خارجہ، وزارت اوقاف ومذہبی امور تک پہنچائیں اور آخری مرحلے میں سعودی علماء، ماہرین فلکیات وموسمیات اور سیاسی قیادت سے براہِ راست مذاکرات کریں۔ یہ تمام عمل بلاشبہ بڑا صبر آزما اور جہد مسلسل وسعی پیہم کا متقاضی ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ بالآخر یہ ثمر آور اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان اور زونل رویت ہلال کمیٹیوں میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء شامل ہیں اور پورا ملک اس کے فیصلے کو تسلیم کرتا ہے، آپ بھی ایسی کمیٹی تشکیل دے سکتے ہیں۔

عیدالفطر خوشی اور شکر کا دن ہے

عید کا تاریخی پس منظر، عظمت اور فلسفہ

روح کی لطافت، قلب کے تزکیہ، بدن ولباس کی طہارت اور مجموعی شخصیت کی نفاست کے ساتھ بصد عجز وانکسار وبغایت خشوع وخضوع تمام مسلمانوں کا اسلامی اتحاد واخوت کے جذبے سے سرشار ہوکر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ بندگی اور نذرانہ شکر بجالانے کا نام عید ہے۔

لفظ عید کے معنی اور وجہ تسمیہ

عید کا لفظ عود سے ماخوذ ہے جس کے معنی لوٹنا ہے۔ چونکہ یہ دن مسلمانوں پر بار بار لوٹ کر آتا ہے، اس لئے اس کو عید کہتے ہیں (بحوالہ لسان العرب مصنف علامہ ابن منظور افریقی) ابن العربی نے کہا کہ عید کو "عید" اس لئے کہتے ہیں کہ یہ دن ہر سال مسرت کے ایک نئے تصور کے ساتھ لوٹ کر آتا ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ مسرت اور خوشی کے دن کو عید، نیک شگون کے طور پر کہا جاتا ہے تاکہ یہ دن ہماری زندگی میں بار بار لوٹ کر آئے، جس طرح "قافلہ" کے معنی ہیں "لوٹ کر آنے والا" اہل عرب قافلہ کو بھی نیک شگون کے طور پر قافلہ کہتے ہیں، گویا اس کے پیچھے یہ آرزو اور تمنا کارفرما ہوتی ہے کہ جس مقصد کے لئے جارہا ہے، اس میں کامیاب وکامران ہوکر عافیت اور سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر واپس آجائے۔ چونکہ رب تبارک وتعالیٰ اس دن اپنے مقبول اور عبادت گزار بندوں پر اپنی اَن گنت نعمتیں اور برکتیں لوٹاتا ہے اس لئے اسے عید کہتے ہیں۔

عید، انسانی فطرت کا تقاضہ

سال میں چند ایام جشن، تہوار اور عید کے طور پر دنیا کی تمام اقوام وملل اور مذاہب میں منائے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر قوم، مذہب وملت کے لوگ اپنے ایام عید کو اپنے اپنے عقائد، تصورات، روایات اور ثقافتی اقدار کے مطابق مناتے ہیں، لیکن اس سے یہ حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے کہ تصورِ عید انسانی فطرت کا تقاضہ اور انسانیت کی ایک قدر مشترک ہے۔ مسلمان قوم چونکہ اپنی فطرت، عقائد ونظریات اور ملی اقدار کے لحاظ سے دنیا کی تمام اقوام سے منفرد وممتاز ہے۔ اس لئے اس کا عید منانے کا انداز بھی سب سے نرالا ہے، بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

اور اقوام کی عید محافل ناؤ نوش ورقص وسرود بپا کرنے، دنیا کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھو جانے، مادر پدر آزاد ہو کر بدمستیوں میں ڈوب جانے، تمام اخلاقی اقدار کو تج دینے، نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کو فروغ دینے اور ''آج یا پھر کبھی نہیں'' کے مصداق ہوسِ نفس کا اسیر بن جانے کا نام ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں روح کی لطافت، قلب کے تزکیے، بدن ولباس کی طہارت اور مجموعی شخصیت کی نفاست کے ساتھ بصد عجز وانکسار وخشوع وخضوع تمام مسلمانوں کے اسلامی اتحاد واخوت کے جذبے سے سرشار ہو کر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ بندگی اور نذرانۂ شکر بجالانے کا نام عید ہے۔

قرآن مجید میں ذکرِ عید

قرآن مجید میں سورۂ مائدہ آیت: ۱۱۴ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دعاء کے حوالے سے عید کا ذکر موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَآ أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنْكَ ۖ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ

''عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے اللہ! ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار دے (اور اس طرح اس کے اترنے کا دن) ہمارے لئے اور

ہمارے اگلوں، پچھلوں کے لئے (بطور) عید (یادگار) قرار پائے اور تیری طرف سے
ایک نشانی ہو اور ہمیں رزق عطا فرما اور تو بہترین رزق عطا فرمانے والا ہے"۔

اس سے اگلی آیت میں ارشاد خداوندی ہے:

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ (المائدہ:115)

"اللہ نے فرمایا کہ میں یہ (خوان) تم پر اتار تو دیتا ہوں مگر اس کے بعد تم میں سے جو کفر کرے تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا جو سارے جہانوں میں اور کسی کو نہ دیا ہو"۔

رہا یہ سوال کہ دعائے عیسیٰ علیہ السلام کے نتیجے میں ان کی قوم پر یہ خوان اترا یا نہیں، قرآن نے اس سلسلے میں سکوت اختیار فرمایا ہے، البتہ تفاسیر میں دونوں طرح کی روایات موجود ہیں۔ ہمارے زیر بحث موضوع سے جو بات متعلق ہے وہ یہ ہے کسی قوم کے مسرت کے دن کا قرآن نے عید کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور جو دن کسی قوم کے لئے اللہ کی کسی خصوصی نعمت کے نزول کا دن ہو، وہ اس دن کو اپنا یوم عید کہہ سکتی ہے۔

عیدِ میلادِ مصطفیٰ کا ثبوت ایک لطیفہ پیرائے میں

مفسر قرآن مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ نے قرآن مجید کے اپنے تفسیری حاشیے "خزائن العرفان" میں اس مقام پر ایک لطیف نکتہ آفرینی کی ہے۔ وہ یہ کہ جب اللہ کی خصوصی نعمت کے نزول کا دن عید قرار پا سکتا ہے اور قرآن ایک طرح سے اس کی توثیق کر رہا ہے تو اگر امت محمد ﷺ اللہ کی نعمتِ عظمیٰ محمد ﷺ کی ولادت باسعادت کے دن کو ایک عید کے طور پر منائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے۔

اسلام میں عید کا آغاز

خالص اسلامی فکر اور دینی مزاج کے مطابق اسلامی تمدن، معاشرت اور اجتماعی زندگی کا آغاز ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں عیدین کا مبارک سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کا تذکرہ سنن ابی داؤد کی مندرجہ ذیل حدیث میں ملتا ہے۔ "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اہل مدینہ دو دن بطورِ تہوار منایا کرتے تھے جن

میں وہ کھیل تماشے کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا "یہ دو دن جو تم مناتے ہو، ان کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے؟" (یعنی ان تہواروں کی اصلیت اور تاریخی پس منظر کیا ہے؟) انہوں نے عرض کیا کہ ہم عہدِ جاہلیت میں (یعنی اسلام سے پہلے) یہ تہوار اسی طرح منایا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دونوں تہواروں کے بدلے میں تمہارے لئے ان سے بہتر دو دن مقرر فرما دیئے ہیں، یوم (عید) الاضحیٰ اور یوم (عید) الفطر۔"

غالباً وہ تہوار جو اہلِ مدینہ اسلام سے پہلے عہدِ جاہلیت میں عید کے طور پر منایا کرتے تھے وہ "نوروز" اور "مہرجان" کے ایام تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ تہوار منانے سے منع فرما دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلے میں اپنے خصوصی انعام و اکرام کے طور پر عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے مبارک ایام مسلمانوں کو عطا فرمائے ہیں۔

عید کے ایام کو مقرر کرنے کی حکمت

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیوں نہیں کر دیا کہ نوروز اور مہرجان کے انہی تہواروں کی اصلاح فرما دیتے اور ان میں جو رسوم شرعی اعتبار سے منکرات کے زمرے میں آ سکتی تھیں، ان کی ممانعت فرما دیتے اور اظہارِ مسرت کی جو جائز صورتیں تھیں وہ اختیار کرنے کی اجازت دے دیتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں اللہ کی حکمت کارفرما تھی۔ دراصل ہر چیز کا ایک مزاج اور پس منظر ہوتا ہے۔ آپ لاکھ کوشش کریں کسی چیز کو اس کے تخلیقی مزاج اور تاریخی پس منظر سے جدا نہیں کر سکتے، لہٰذا جس چیز کی اساس کسی شر پر رکھی گئی ہو اس کی کانٹ چھانٹ اور بناؤ سنگھار سے کوئی خیر پر مبنی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا اور اسلام تو آیا ہی اس لئے ہے کہ کفر اور بدی کے اثرات کو مٹایا جائے۔ معلوم ہوا کہ اسلامی معتقدات اور خالص دینی فکر اور شرعی مزاج کا تقاضہ یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق تمام جاہلی رسوم اور کافرانہ شعائر سے یکسر ختم کر دیا جائے تاکہ عہدِ جاہلیت کی تمام علامات سے کٹ کر ان میں صحیح دینی فکر پیدا ہو سکے۔

چونکہ اسلام دینِ فطرت ہے اس لئے اس نے جہاں اپنے ماننے والوں کو لادینی نظریات سے محفوظ رکھا وہاں ان کے صحیح جبلی اور فطری تقاضوں کی آبیاری بھی کی، عید منانا انسانی فطرت کا

تقاضہ تھا لہٰذا مسلمانوں کو ایک کی بجائے عیدین کی دوہری نعمت عطا فرمائی۔

یوم عید کے مستحبات

عید کے دن یہ امور مستحب ہیں:

☆ حجامت بنوانا ☆ ناخن تراشنا ☆ غسل کرنا ☆ مسواک کرنا ☆ خوشبو لگانا ☆ اچھے صاف ستھرے یا دستیاب ہوں تو نئے کپڑے پہننا ☆ صبح کی نماز مسجد میں پڑھ کر عید گاہ چلے جانا۔

عید گاہ جاتے وقت راستہ تبدیل کرنا

سنت یہ ہے کہ جس راستے سے عید گاہ جائے، نماز پڑھ کر اس راستے کے بجائے دوسرے راستے سے گھر واپس جائے۔ بخاری شریف میں حدیث ہے:

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عید کے دن نبی اکرم ﷺ (عید گاہ آتے جاتے میں) راستہ تبدیل کرتے تھے۔''

اس کی متعدد حکمتیں ہو سکتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: دونوں راستے نمازی کی عبادت اور ذکر پر گواہی دیں، دونوں راستوں پر اسلامی شعار کا اظہار ہو اور دونوں راستوں پر بے نمازیوں اور اللہ کی عبادت سے غافل رہنے والوں کو اپنے عمل سے یاد خدا کی طرف مائل کیا جائے۔

ون وے ٹریفک کا نظریہ

اس کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک راستے سے جانے اور دوسرے راستے سے واپس آنے سے آنے جانے والوں کے لئے سہولت ہو، اژدہام اور بھیڑ میں کمی واقع ہو اور گزرگاہ تنگ نہ ہو۔ ہم بجا طور پر دنیا والوں کے سامنے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے جدید تمدن، معاشرت اور شہری زندگی کے مسائل کو اپنی تعلیمات کے ذریعے نہایت سہل انداز میں حل فرمایا ہے اور یہ کہ One Way Traffic کے اصولوں کے بانی ہمارے پیارے نبی ﷺ ہیں۔

عید نہ منانا

قوموں کی زندگی میں المیے، حوادث اور مصائب پیش آتے رہتے ہیں اور بدقسمتی سے گزشتہ

برسوں سے اس طرح کے المناک واقعات ہماری روزمرہ زندگی کا ایک معمول بن چکے ہیں۔
ایسے حوادث کے پیش نظر اکثر اوقات بعض افراد یا حلقوں کی جانب سے یہ سننے میں آتا ہے کہ اس سال ہم عید نہیں منائیں گے۔ اس طرح کے بیانات کے پیچھے یقیناً نیک نیتی' حب الوطنی، اخوت اسلامی اور انسانیت دوستی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہوگا، لیکن سوال یہ ہے کہ عید نہ منانے کا مطلب کیا ہے؟ یہ کوئی جشن یا تہوار تو ہے نہیں، یہ تو عبادت اور سنتِ مصطفیٰ ﷺ ہے، اخوتِ اسلامی اور اتحادِ امت کا مظاہرہ ہے، جمعیتِ قومِ مسلم کا ایک حسین منظر ہے، اللہ کی بارگاہ میں دوگانہ نمازِ عید کی ادائیگی کا نام ہے۔ شرافت، متانت اور نفاست ایسی انسانی خصوصیات کا مظہر ہے۔ ان میں سے کوئی چیز اور کوئی بات ایسی نہیں جو عسر و یسر اور رنج و راحت ہر حال میں منائے جانے کے قابل نہ ہو۔ باقی رہا لہو و لعب میں مشغولیت، رقص و سرود کی محافل برپا کرنا، ناؤ نوش اور محرماتِ شرعیہ کا ارتکاب اور ہوس نفس کی تسکین کے سامان بہم پہنچانا، یہ ایسے امور ہیں جن کا اسلامی تصورِ عید سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو ایک مسلمان کو نہ صرف عید کے مقدس موقع پر بلکہ زندگی کے ماہ و سال کے ہر لمحہ و لحظہ میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں بلکہ ان محرمات و منکراتِ شرعیہ کو چھوڑنا ہی ایک مومن کامل کی حقیقی عید ہے اور ایسی عید اللہ تعالیٰ ہر بندۂ مومن کو نصیب فرمائے۔

{☆......☆......☆☆☆......☆......☆}

کتاب الحج

قرض لے کر حج کرنا

سوال: اگر کوئی مسلمان (مرد یا عورت) عمرہ یا حج کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے پاس اس کے سفر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مکمل رقم نہیں ہے، جبکہ وہ عمرہ/حج کرنے کی استطاعت رکھتا ہے، تو کیا وہ بغیر کسی سود وغیرہ کے قرض رقم حاصل کر کے کسی ادارے یا وسیلے سے وقتی طور پر عمرہ یا حج ادا کر سکتا ہے اور عمرہ/حج کی ادائیگی کے بعد یکمشت یا اقساط میں وہ لیا ہوا قرض ادا کر سکتا ہے۔

(عبدالمعید خان، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: حج کی شرائطِ وجوب میں سے ایک استطاعت ہے، اسے فتاویٰ عالمگیری نے ان کلمات سے تعبیر کیا ہے:

وَمِنهَا الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ

''اور ان (شرائطِ وجوب) میں سے ایک زادِراہ اور سواری پر قدرت ہے''۔

اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

و تفسير ملك الزاد والراحلة ان يكون لهٗ مالٌ فاضلٌ عن حاجته وهوماسوىٰ مَسكنهٖ و لبسه و خدمه واثاث بيته و ما يبلغه الىٰ مكة ذاهبا وجائيا راكبا لا ماشيا و سوى ما يقضي به ديونه ويمسك لنفقة عياله و مرمة مسكنه و نحوه الى وقت انصرافه، كذا في محيط السرخسي۔

''اور زادراہ اور سواری کا مالک ہونے کی تفسیر یہ ہے کہ اس کے پاس حاجت (اصلیہ) سے زیادہ مال ہو، یعنی رہائش گاہ، لباس، خدام (اگر ہوں)، گھر کے ساز و سامان سے زائد اتنا مال جو اسے سواری پر نہ کہ پیدل مکہ تک آنے جانے کے لیے کافی ہو اور گھر واپسی تک قرض کی ادائیگی (اگر کوئی ہو) اہل وعیال کے نان نفقہ اور مکان کی مرمت کی ضروریات سے بھی فاضل ہو، محیط سرخسی میں اس طرح ہے''۔

(عالمگیری جلد نمبر ۱ صفحہ ۲۱۷)

لہٰذا کوئی مسلمان اس امر کا مکلف نہیں ہے کہ قرض لے کر فریضۂ حج ادا کرے اور اگر اس کے پاس حاجاتِ اصلیہ سے فاضل اتنا مال نہیں ہے کہ مصارفِ سفرِ حج برداشت کر سکے تو شرعاً اس پر حج فرض نہیں ہے لیکن اگر کوئی مسلمان "صاحب استطاعت" نہ ہونے کے باوجود قرض لے کر یا کسی بھی طریقے سے حج ادا کر لیتا ہے تو اس کا فریضۂ حج یعنی "حجۃ الاسلام" ادا ہو جائے گا۔ فتاویٰ عالمگیری ۱/۲۱۷ پر ہے:

الفقير اذا حج ماشيا ثم ايسر لا حج عليه هكذا في فتاوى قاضي خان

"فقیر نے جب پیدل حج کر لیا ہو، پھر مالدار ہو جائے تو اب اس پر (دوبارہ) حج کی ادائیگی فرض نہیں ہے"۔

فتاویٰ شامی ۳/۴۰۶ مطبوعہ "داراحیاء التراث العربی" بیروت میں ہے:

تنبيه! الفقير الآفاقي اذا وصل الىٰ ميقات فهو كالمكي.

تنبیہ: فقیر آفاقی (یعنی جو حدودِ میقاتِ حج سے باہر کا رہنے والا ہے) جب میقاتِ حج پر پہنچ جائے تو وہ مکی کی طرح ہے (یعنی اب اس کے لیے صرف سواری اور زادِ راہ کی استطاعت ہی شرط ہے)۔

درمختار میں ہے:

لو لم يحج حتى اتلف ماله' وسعه ان يستقرض و يحج.

"اگر (کسی شخص پر حج فرض ہو گیا تھا، لیکن) اس نے حج نہ کیا یہاں تک کہ اس کا مال ضائع ہو گیا تو اس کے لیے اس امر کی گنجائش ہے کہ قرض لے کر حج کرے"۔

اس پر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ مختار یہ ہے کہ اس کا ظنِ غالب یہ ہو کہ وہ کوشش کر کے قرض ادا کر سکے گا تو قرض لے کر حج کرے"۔ (فتاویٰ شامی ۳/۴۰۳)

آپ کے سوال میں تضاد ہے، ایک طرف تو آپ لکھتے ہیں کہ وہ حج و عمرہ کی استطاعت رکھتا ہے، دوسری جانب آپ لکھتے ہیں کہ اس کے پاس پوری رقم نہیں ہے تو اس لحاظ سے وہ صاحب استطاعت نہ ہوا۔ تاہم اگر اس نے قرض لے کر حج ادا کر لیا تو اس کا فریضۂ حج ادا ہو جائے گا، اسی طرح قرض لے کر عمرہ ادا کرنے میں بھی کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ استطاعت وجوبِ حج کے لیے شرط ہے، جواز کے لیے شرط نہیں ہے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے حج پر بھیجنا

سوال: ایک مسئلہ معلوم کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ چند افراد ہی کس 1000 روپے جمع کر کے قرعہ اندازی کے ذریعے کسی ایک یا چند افراد کو حج کی سعادت کے لئے بھیجا جائے اور اس عمل کو "حج ٹوکن اسکیم" کا نام دیا جائے کیا شریعت مطہرہ کی روشنی میں یہ عمل جائز ہے۔ علمی تحقیقی جواب دے کر ہماری راہنمائی فرمائیں۔ (چوہدری خالد ستار..... نارتھ ناظم آباد۔ کراچی)

جواب: اگر یہ لوگ یہ کام لاٹری کے طور پر نہیں بلکہ سعادت اور عبادت کے طور پر اور حصول اجر وثواب کے لیے ایسا کریں۔ اور نیت یہ ہو کہ یہ رقم انہوں نے حج یا عمرہ کے لیے ھبہ کر دی ہے اور سب نے ایک شخص کو اپنا وکیل بنالیا ہے کہ وہ اس رقم کو اس نیک مصرف پر صرف کرے۔ اور قرعہ اندازی کے ذریعے کسی ایسے شخص کو حج یا عمرے کے لئے دے دے جو خود اس کی استطاعت نہیں رکھتا، اور اگر کچھ ایسے صالح اور دیندار نادار لوگوں کے نام بھی اس قرعہ اندازی میں شامل کر دیں، جنہوں نے خود اس پول میں حصہ نہیں ڈالا یا ہر ایک پر ایک معین رقم لازم کرنے کے بجائے اس کی گنجائش اور استطاعت پر چھوڑ دیں تو یہ مزید حسن نیت کا مظہر ہوگا۔ یہ لاٹری سے مختلف چیز ہے۔ لاٹری میں تو ایک کو سب رقم مل جاتی ہے اور باقی لوگوں کے حصے میں خسر الدنیا والآخرۃ یعنی دنیا و آخرت کا خسارہ رہ جاتا ہے۔ اور جس کو سب رقم مل جاتی ہے، گناہ سب کے ساتھ اس کے حصے میں بھی آتا ہے۔ جبکہ سوال میں مذکورہ صورت میں اجرِ آخرت بقدرِ حصہ سب کو ملے گا۔ اور یہ سعادت وعبادت حج جس خوش نصیب کے حصے میں بھی آئے اس کے اجر میں انشاء اللہ العزیز سب شریک ہوں گے۔

ایام حج میں اگر عورت کے مخصوص ایام شروع ہو جائیں؟

سوال: اگر ایام حج میں عورت کے ایام شروع ہو جائیں اور اس کی واپسی کا شیڈول پہلے سے طے ہو اور تاریخ روانگی کو مؤخر کرنا اس کے بس میں نہ ہو تو پھر طواف زیارت کس طرح ادا کرے گی، کیونکہ حیض ونفاس اور جنابت کی حالت میں حرم میں داخل ہونا منع ہے۔

(عائشہ.....اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: ہاں یہ درست ہے کہ حیض ونفاس اور جنابت کی حالت میں حرم میں داخل ہونا اور

طواف کرنا منع ہے اور طوافِ زیارت حج کا رکن ہے اور فرض ہے۔ اور بارہ ذوالحجہ تک طواف زیارت کرنا ضروری ہے، اگر بارہ ذوالحجہ تک طواف زیارت نہ کیا تو تاخیر کی بناء پر دم لازم آئے گا، دم اس صورت میں لازم آئے گا کہ جب تاخیر کا سبب بندے کی اپنی کوتاہی یعنی ''تقصیر من جہت العباد'' ہو۔ اور اگر تاخیر میں بندے کی کوتاہی کا کوئی دخل نہ ہو بلکہ قدرت کی طرف سے ہو تو دم لازم نہیں آئے گا، جیسے عورت کے لئے حیض کا شروع ہو جانا۔ طواف زیارت ادا کئے بغیر میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حلال نہیں ہوں گے۔ اگر عورت کا حیض ایامِ حج میں شروع ہو جائے اور واپسی کے طے شدہ فلائٹ شیڈول کی وجہ سے اس کی روانگی لازمی ہو اور اس میں ردوبدل کی گنجائش نہ ہو تو وہ حالتِ حیض میں طواف کرلے اور حرم میں ایک بدنہ (اونٹ یا گائے) دے دے اس طرح وہ حلال ہو جائے گی اور امید ہے کہ عذر و مجبوری کی بناء پر اللہ تعالیٰ حالتِ حیض میں طوافِ زیارت کی تقصیر کو معاف فرمائے گا۔

احرام باندھتے وقت عورت اگر حالتِ حیض میں ہو تو کیا کرے؟

سوال: اپنے میقات سے احرام باندھتے وقت یا مکۂ مکرمہ سے ۸ر ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھتے وقت عورت حالتِ حیض میں ہو تو کیا کرے؟ (عائشہ، اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: عورت غسل کر کے احرام باندھ لے، نیت کر کے تلبیہ پڑھ لے تو وہ ''مُحرِمہ'' ہو جائے گی، احرام کے لئے نفل نہیں پڑھے گی۔ باقی حالتِ حیض میں وہ حج کے تمام اعمال ادا کرے گی، تلبیہ، تسبیح، اذکار و درود بھی پڑھ سکتی ہے۔ وقوفِ عرفہ، قیامِ مزدلفہ و منیٰ، رمی جمار اور قربانی وغیرہ تمام اعمال کرتی رہے گی، البتہ طواف، نماز اور تلاوت نہیں کرے گی۔

پانچ سال کے بچے کو عمرے پر لے جانا

سوال: پانچ سال کے بچے کو عمرے پر لے جانا کیسا ہے، کیا باقاعدہ احرام باندھنا پڑے گا، اگر اس کا احرام نہ باندھا تو کیا دم دینا پڑے گا؟ (کامران۔ دارالامان سوسائٹی)

جواب: صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ مقام روحاء میں ایک عورت نے اپنے بچے کو اٹھا کر پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! کیا اس کا بھی حج ہو جائے گا، آپ نے فرمایا: ہاں اور تم کو بھی اجر ملے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کا حج

ہو جائے گا۔ لیکن ائمہ کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ نفلی حج ہوگا اور بالغ ہونے کے بعد بصورتِ استطاعت اس پر جو "حجۃ الاسلام" فرض ہوگا، یہ اس کا بدل نہیں ہے اور اس سے وہ ساقط نہیں ہوگا، نیز جنایت پر بچے کے مال میں سے دم بھی نہیں ہوگا۔ پانچ سال کا بچہ مکلف نہیں ہے، نہ اس پر احرام لازم ہے اور نہ ترکِ احرام سے کوئی دم۔

آخری عشرے میں عمرے کی ادائیگی اور ابتداء شوال میں واپسی

سوال: بھائی آخری عشرے میں عمرے پر جارہے ہیں اور آٹھ شوال المکرم کو واپسی ہوگی، کیا اس طرح ان پہ حج فرض ہو جائے گا۔ (نورالدین جنیدی۔ ایف بی ایریا)

جواب: شوال المکرم سے موسم حج شروع ہو جاتا ہے، اگر ان کے پاس پورے حج سیزن کے لئے مصارف ہیں اور موسم حج تک مزید قیام ممکن ہو سکتا ہے، قانون کی حدود میں رہتے ہوئے، تو ضرور حج کر کے واپس آئیں۔ لیکن اگر اس کے پاس ادائیگی حج کے لئے رقم نہیں ہے، یا اسے قانونی قیام کی اجازت مزید نہیں مل سکتی، اگر وہ مزید وہاں رہے گا تو خلاف قانون ٹھہرے گا، اسے جیل میں ڈالا جاسکتا ہے، جبری خروج کرایا جاسکتا ہے، اس کی عزتِ نفس مجروح ہو سکتی ہے، تو وہ معذور ہے، واپس چلا آئے۔ اسلام میں قرآن کا ارشاد ہے:

"اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔

عمرے کا احرام باندھا ہوا ہے فلائٹ پر سیٹ نہیں ملی

سوال: ایک شخص گھر سے عمرے کا احرام باندھ کر ایئرپورٹ گیا، وہاں جا کر جہاز پر سیٹ نہیں ملی، بورڈنگ کارڈ نہیں ملا اور احرام کھولنا پڑا تو اس پہ کیا ہے۔ (نہال احمد۔ گلشن اقبال)

جواب: بہتر تو یہ ہے کہ وہ جہاز کی سیٹ ملنے تک حالتِ احرام میں رہے، گھر چلا آئے اور سیٹ کنفرم ہونے پر روانہ ہو جائے۔ اگر احرام کھول دیا تو اس پر دم واجب ہے۔ اور عازمین حج و عمرہ کے لئے مشورہ یہ ہے کہ وہ گھر سے غسل کر کے لباس احرام پہن کر چلے جائیں، جب سیٹ کنفرم ہو جائے اور بورڈنگ مل جائے تو دو رکعت نفل پڑھ لیں۔ اور جب فلائٹ روانہ ہو جائے تو نیت باندھ لیں اور تلبیہ پڑھ لیں۔ ورنہ بصورتِ دیگر واپس آجائیں اور نارمل لباس پہن لیں، چونکہ وہ مُحرم نہیں ہوئے تھے، اس لئے ان پہ دم واجب نہیں ہوگا۔

کتاب الاضاحی

(قربانی کے مسائل)

اگر ایامِ قربانی میں قربانی نہ کی ہو؟

سوال: ایسا مالدار شخص جس پر شرعاً قربانی واجب ہے اگر ایامِ قربانی میں قربانی نہ کر سکے تو کیا بعد میں کر سکتا ہے؟ (محمد عرفان المانی۔ پاکستان چوک، کراچی)

جواب: قربانی ان عبادات میں سے ہے جن کے لئے شریعت نے دن مقرر کر رکھے ہیں جیسے حج کا رکنِ اعظم وقوفِ عرفہ صرف ۹ رذوالحجہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قربانی کے لئے ۱۰ رذوالحجہ کی صبح صادق سے ۱۲ رذوالحجہ کے غروبِ آفتاب تک کا وقت مقرر ہے، جہاں نمازِ عید ہوتی ہے وہاں ۱۰ رذوالحجہ کو نمازِ عید سے قبل قربانی ادا نہیں ہوگی، ۱۰۔۱۱ اور ۱۱۔۱۲ کی درمیانی راتوں میں قربانی کی تو واجب ادا ہو جائے گا لیکن رات کو ذبح کرنا مکروہ ہے۔ ۱۰ رذوالحجہ سے پہلے اور ۱۲ رذوالحجہ کے بعد قربانی کی تو ادا نہیں ہوگی اور صاحبِ نصاب کے ذمے سے واجب ساقط نہیں ہوگا۔ تاہم اگر کسی نے بدقسمتی سے استطاعت کے باوجود ایامِ قربانی میں قربانی نہیں کی تو قربانی کے دن گزرنے کے بعد وہ رقم صدقہ کر دے، اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ ایامِ قربانی میں کوئی شخص قربانی کرنے کے بجائے رقم صدقہ کر دے تو کیا قربانی کا اجر ملے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہ تو قربانی کا اجر ملے گا اور نہ ہی قربانی کا واجب ساقط ہوگا۔ البتہ جس قدر رقم صدقہ کی اس کا ثواب مل جائے گا اور واجب قربانی ترک کرنے کا گناہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

> "ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایامِ قربانی میں انسان کا کوئی بھی نیک عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک جانور کا خون بہانے (یعنی قربانی) سے زیادہ محبوب نہیں ہے اور یہ قربانی کا جانور قیامت کے دن (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت آئے گا اور یہ کہ ذبح کے وقت (قربانی کے جانور کا بہنے والا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مرتبۂ قبولیت کو پا لیتا ہے، تو (اے مومنو!) خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔"
>
> (مشکوٰۃ بحوالہ جامع ترمذی، [illegible])

خصی جانور کی قربانی کا حکم

سوال: بعض حضرات کہتے ہیں کہ چونکہ عیب دار جانور کی قربانی شرعاً جائز نہیں ہے اور نر جانور کا خصی ہونا ایک نقص اور عیب ہے لہٰذا خصی جانور کی قربانی جائز نہیں، اس بارے میں شرعی حکم بیان کیجئے؟ (سید عمیر الحسن برنی۔ دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: بلاشبہ قربانی کے جانور کا عیب سے پاک ہونا شرعاً ضروری ہے اور عیب دار جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ مثلاً جس کے تھن کٹے ہوئے ہوں، سینگ جڑ سے ٹوٹے ہوئے ہوں، کان تہائی سے زائد کٹا ہوا ہو، لنگڑا ہو، کانا ہو وغیرہ۔ عیب سے مراد وہ عیب ہے جو تاجروں کے نزدیک عیب شمار ہوتا ہو اور قیمت میں کمی کا باعث ہو۔ خصی ہونا، تاجروں کے نزدیک عیب نہیں ہے بلکہ خصی جانور کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اور سنت سے بھی خصی جانور کی قربانی ثابت ہے۔ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قربانی کے دن رسول اللہ ﷺ نے دو خوبصورت سینگوں والے خصی مینڈھے ذبح فرمائے۔'' البتہ جو شخص افزائش نسل کے لئے حلال نر جانور خریدنا چاہتا ہے تو اس کے نزدیک اس کا خصی ہونا ضرور عیب ہوگا۔

سات سے کم افراد گائے کی قربانی میں مساوی طور پر شریک ہو سکتے ہیں؟

سوال: کیا ایک گائے میں سات سے کم افراد شریک ہو کر قربانی کر سکتے ہیں اور یہ شرعاً جائز ہے؟ (حبیب الرحمٰن، آزاد کشمیر)

جواب: قربانی اصولی طور پر ''اراق الدم'' یعنی خون بہانے اور جانور کو عبادت کی نیت سے اللہ کے نام پر قربان کرنے کا نام ہے، اور یہی قربانی دراصل عبادت ہے، اب ''اراق الدم''، یعنی جانور کا خون بہانا جو درحقیقت اس کی جان تلف کرنا ہے، یہ ایک جان ایک اکائی (Unit) ہے۔ اور اس کی تجزی (یعنی اجزاء میں تقسیم) نہیں ہو سکتی، لیکن چونکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گائے میں سات حصوں کی اجازت دے دی ہے اور شارع مختار ہیں، اس لئے استحساناً خلاف قیاس گائے کی قربانی سات افراد کی جانب سے جائز ہے بشرطیکہ سب کی نیت عبادت اور ''تقرب من اللہ'' کی ہو۔ اور جب گائے یا اونٹ میں سات افراد کی شرکت مساویانہ طور پر جائز ہے تو سات سے کم افراد (مثلاً چھ، پانچ، چار، تین، دو) کی بطریق اولیٰ جائز ہے، بشرطیکہ سب کا حصہ مساوی ہو۔

البتہ سات سے زائد افراد (مثلاً آٹھ یا نو) کی ایک گائے میں شرکت جائز نہیں ہے۔ ایک آدمی اپنی طرف سے ایک مکمل گائے کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔

حلال جانور کے ممنوع اجزاء

سوال: ایسا حلال جانور جسے شریعت کے مطابق ذبح کیا گیا ہو کیا اس کے بعض اجزاء ایسے بھی ہیں جنہیں کھانا شرعاً منع ہے، بعض لوگ بڑے شوق سے پکا کر کھاتے ہیں؟

(سید ذاکر شاہ، بگرام)

جواب: شریعت کے مطابق ذبح کیے ہوئے حلال جانور کے مندرجہ ذیل اجزا کھانا منع ہے۔ دم مسفوح (ذبح کے وقت بہنے والا خون) ذکر، گائے، بکری یعنی مادہ جانور کے پیشاب کی جگہ، خصیتین (کپورے)، دبر (پاخانے کی جگہ)، مثانہ، حرام مغز، اوجھڑی اور آنتیں ان میں دم مسفوح حرام قطعی ہے اور باقی مکروہ ہیں۔

دمِ مسفوح سے کیا مراد ہے؟

سوال: اپنے سوال و جواب کے کالم میں آپ نے ''دمِ مسفوح'' لکھا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ (عبداللہ۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: ''سَفح'' اور ''سَفوح'' کے معنی ہیں: ''خون یا آنسو بہانا'' اور ''دم مسفوح'' کے معنی ہیں: ''وہ خون جو جانور کی ذبح کے وقت تیزی سے بہہ کر نکلتا ہے'' یہ بہنے والا خون قرآن کی رو سے حرام قطعی ہے اور حرام ہونے کی بنا پر ناپاک بھی ہے۔ بعد میں ذبح شدہ جانور کی ہڈیوں اور گوشت پر جو خون لگا ہوتا ہے، اگر وہ جسم یا کپڑے پر لگ جائے تو وہ نجس اور حرام نہیں ہے، اس سے نماز پڑھ لی جائے تو جائز ہوگی۔ لیکن طبعی نفاست اور نماز کی تقدیس کا تقاضا یہ ہے کہ لباس معنوی اعتبار سے بھی پاک ہو اور ظاہری اعتبار سے بھی پاک صاف ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا (لباس) زینت زیب تن کیا کرو، (الاعراف: ۳۱)'' لہٰذا نماز کے لئے لباس صاف وشفاف کے ساتھ ساتھ باوقار بھی ہونا چاہئے۔

☆......☆......☆......☆......☆

کتاب النکاح

کیا یہ نکاح جائز ہے؟

سوال: ایک شخص کی شادی اس کی تایازاد بہن سے ہوئی ہے جبکہ لڑکی کی ماں اس کے والد محترم کی سگی بھانجی ہیں، کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ کزن کی بیٹی ہونے کے ناطے وہ رشتے میں اس شخص کی بھتیجی ہوتی ہے، کیا یہ رشتہ جائز ہے (م-ر-، اسلام آباد)۔

جواب: صورتِ مسؤلہ میں اگر اس شخص کا تایا محض رشتے کا یا دور پار کا تایا نہیں ہے بلکہ اس کے والد کا واقعی بھائی ہے تو اس کے والد کی بھانجی، تایا کی بھی بھانجی ہوگی اور دونوں کی آپس میں شادی جائز نہیں ہے کیونکہ ماموں کے ساتھ نکاح ناجائز ہے۔ باقی چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہن بھائیوں کا جب آپس میں براہِ راست نکاح جائز ہے تو اولاد در اولاد کا بہ طریقِ اولیٰ جائز ہوگا بشرطیکہ کوئی اور حرمتِ نکاح کا سبب نہ ہو۔

غیر کتابیہ کافرہ عورت سے نکاح

سوال: حضرت محترم! سائل کو ایک شرعی مسئلہ کے سلسلے میں آپ کی رہنمائی درکار ہے مسئلہ یہ ہے کہ ایک عاقل و بالغ شخص جو کہ باہوش و حواس جانتے بوجھتے ایک غیر مسلم عورت، جو کہ اہل کتاب میں بھی شمار نہ ہوتی ہو، سے ایک غیر وطن میں وہاں کے قانون کے مطابق شادی کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ رہتا ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے آیا وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ میل جول رکھنا کیسا ہے جب کہ وہ اس حرکت کو گناہ نہ سمجھتا ہو، اور پاکستان میں والدین اور 2 بیویاں جو موجود حیات ہیں کے علم میں بھی یہ بات نہ لائے اور محض مالی منفعت حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے تو از روئے شرع وسنت ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟

آپ حضرت سے درخواست ہے کہ جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

(حافظ محمد شاہد شریف۔ جامع مسجد علیمیہ نارتھ ناظم آباد)

جواب: غیر کتابیہ (یعنی وہ کافرہ عورت جو یہودی یا نصرانی نہ ہو) کافرہ عورت سے نکاح قطعی حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ (البقرہ:۲۲۱)

''اور شرک کرنے والی عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں،
شرعاً ایسا نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص ایسے نکاح کے بعد مشرکہ یا کافرہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار رہا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حرام کو حلال جان کر کر رہا ہے تو یہ صریح کفر ہے اور قرآن کا انکار ہے، اور اگر وہ اس فعلِ قبیح کا ارتکاب اسے حرام سمجھتے ہوئے کر رہا ہے تو یہ صریح فسق و فجور ہے، گناہ اور زنا کی زندگی ہے اور گناہِ کبیرہ ہے، ایسے شخص کو فوراً اللہ تعالیٰ سے توبہ کر کے اس معصیت کو ترک کر دینا چاہئے۔ بہر کیف دونوں صورتوں میں جب تک وہ توبہ نہ کرے، اس کے ساتھ میل جول رکھنا شرعاً منع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ہود: ۱۱۳)

''اور ظالموں کی طرف میلان (قلب) نہ رکھو، ورنہ تمہیں (جہنم کی) آگ چھوئے گی''
اس نکاح کے عدمِ جواز کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ اس شخص کے نکاح میں پہلے سے ایک یا دو بیویاں موجود ہیں یا نہیں ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب سے ڈرنا چاہئے۔

دلہن کا پالکی میں بٹھا کر لے جانا

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں ہمارے علاقہ میں جب کسی کی بیٹی یا بہن کی شادی ہوتی ہے تو نکاح کے بعد اس کے والدین یا بھائی اپنی بیٹی یا بہن کو رخصت کرتے وقت مکمل طور پر باپردہ کر کے ایک پالکی میں بٹھاتے ہیں اور پالکی کے اوپر بھی پردہ ڈالتے ہیں اور پھر انتہائی عزت و احترام کے ساتھ پالکی کو اٹھا کر دلہن کو شوہر کے گھر چھوڑ کر آتے ہیں۔ اس سے ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری بیٹی یا بہن نے اپنی زندگی کے بیس یا پچیس سال کم و بیش اپنے والدین کے گھر میں باعزت طور پر گزارے ہیں آج اس کے احباب باعزت طور پر اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر رخصت کر رہے ہیں یہ روایت ہمارے علاقہ میں برسوں سے چل رہی ہے۔
اب ہمارے علاقہ میں کچھ ایسے لوگ آئے ہیں جن کا تعلق تبلیغی جماعت سے ہے ان کا کہنا ہے کہ اس طرح لڑکی کو پالکی میں بٹھا کر رخصت کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے اور یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن و سنت میں اور حضور ﷺ کے زمانے میں کہیں سے بھی ثابت نہیں ہے۔ قرآن کریم کی روشنی میں فتویٰ صادر فرما کر تحریر فرمائیں کہ اس طریقے سے لڑکی کو پالکی میں بٹھا کر رخصتی کرنا شرعاً

جائز ہے یا نہیں؟ (سردار کامران اقبال، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)

جواب: نکاح کے بعد ماں باپ کے گھر سے دلہن کو شوہر کے گھر لے جاتے ہیں، اسے ہمارے ہاں عرف عام میں ''رخصتی'' کہتے ہیں۔ اسے پیدل بھی لے جاسکتے ہیں، گھوڑے یا کسی جانور پر سوار کر کے بھی لے جاسکتے ہیں، پالکی میں بٹھا کر بھی لے جاسکتے ہیں اور آج کل کار وغیرہ میں بٹھا کر لے جاتے ہیں، یہ سب طریقے درست ہیں، اور شرعاً ان میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بس صرف اتنا لازم ہے کہ ستر و حجاب شرعی کا اہتمام کیا جائے اور اس کا بدن کسی غیر محرم مرد سے مس نہ کرے۔ دلہن کو پالکی میں بٹھا کر لے جانے کو حرام کہنا، جبکہ اس پالکی کو مرد کندھوں پر اٹھائے ہوں، غلط ہے، کسی بات کو حرام قرار دینے کے لئے دلیل شرعی کی ضرورت ہوتی ہے، ہر ایک کو خود شارع نہیں بننا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اگر پالکی پر بٹھانا ثابت نہیں ہے تو کاروں پر بٹھا کر لے جانا کہاں سے ثابت ہے، کیا یہ بھی حرام ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (التوبہ: ۳۱)

''انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور راہبوں کو اپنا خدا بنا لیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انہیں فقط یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک خدا کی عبادت کریں، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، وہ ان کے بنائے شریکوں سے پاک ہے''۔

''حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت میری گردن میں سونے کی صلیب تھی، آپ نے فرمایا: اے عدی! اس بت کو اتار پھینکو، میں نے آپ سے اس آیت کے متعلق پوچھا (یعنی سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۱)، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اپنے علماء کی عبادت تو نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کر دیتے تو وہ اس کو حلال کہتے اور جب وہ کسی چیز کو حرام کر دیتے تو وہ اس کو حرام کہتے''۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۳۰۹۵)

اسی مفہوم پر مشتمل حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں امام قرطبی مالکی نے اسی آیت کے تحت درج کی ہے۔

قرآن مجید کی مذکورہ آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی مذہبی پیشوا کو حلال وحرام کی اتھارٹی بنا دینا اور یہ درجہ دینا کہ وہ جس چیز کو حرام کہیں اسے بلا دلیل شرعی حرام مان لیا جائے اور جسے وہ حلال کہیں اس کو دلیل شرع کے خلاف حلال مان لیا جائے، تو یہ درجۂ اُلوھیت دینے کے مترادف ہے۔ علاوہ ازیں یہ مسلمہ فقہی اصول ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے اور جو شخص کسی چیز کی حرمت شرعی کا دعویدار ہو، اس پر لازم ہے کہ اس کے لئے شرعی دلیل پیش کرے۔ جو لوگ دلیلِ شرعی کے بغیر کسی چیز کو حرام قرار دیتے ہیں، انہیں اللہ کا خوف کرنا چاہئے۔

بھابھی اور چچی محرم نہیں

سوال: بھابھی اور چچی کے ساتھ ایک گھر میں رہنا، سلام وکلام کرنا یعنی ہاتھ ملانا، گاڑی میں ایک سیٹ پر سفر کرنا از روئے شریعت کیسا ہے؟ (سید ذاکر شاہ۔ بٹگرام)

جواب: کوئی شخص اپنی بھابھی اور چچی کے لئے محرم نہیں بنتا سوائے اس کے کہ کوئی اور ایسا رشتہ ہو کہ وہ ان کا محرم بن جائے مثلاً چچی، خالہ بھی ہے یا بھابھی رضاعی بہن ہے، یا چچی کے ساتھ رضاعت کا رشتہ ہے یا چچی ساس بھی ہے وغیرہ، لہٰذا ایسی بھابھی اور چچی جن کے آپ کسی اور رشتے کے حوالے سے محرم نہیں بنتے ان کے ساتھ بے تکلف میل جول جائز نہیں ہے شرعاً وہ اجنبی عورت کے حکم میں ہیں، اگر مجبوری یا مشترکہ خاندانی نظام کے تحت کسی ایک مکان میں رہ رہے ہیں تب بھی ان کے ساتھ تنہا ایک کمرے میں نہ رہیں وہ خواتین اپنے دیور یا جیٹھ یا شوہر کے بھتیجے کے سامنے حجابِ شرعی کے بغیر نہ آئیں نہ ہی ان کے ساتھ ہاتھ ملا کر سلام کریں، ایسا شخص مشترکہ گھر میں داخل ہو جہاں ایسی عورتیں بھی رہتی ہیں جن کے لئے وہ محرم نہیں ہے تو وہ دروازہ کھٹکھٹائے اور اجازت لئے بغیر اندر نہ جائے اتنا موقع اپنی آمد کی اطلاع دینے کے بعد دے کہ وہ ضروری پردہ کرلیں البتہ زبانی سلام وکلام آج کل بلوائے عام کی وجہ سے ضرورتاً مباح ہے۔ لیکن ضابطۂ شرعیہ یہی ہے کہ مرد غیر محرم عورت کو سلام نہ کرے مصافحہ تو بہت دور کی بات ہے۔

اور عورت کو بھی بلا ضرورت اجنبی شخص سے گفتگو کرنا پڑے تو لہجہ لوچ دار، ملائم اور پرکشش نہ ہو بلکہ نسبتاً سخت ہو۔ گاڑی، ٹرین یا جہاز میں ایک ساتھ سفر کی نوبت آجائے تو بہتر یہ ہے کہ بھابھی اور چچی کے ساتھ نہ بیٹھے بلکہ انہیں کسی محرم کے ساتھ بٹھائے یا دوسری عورتوں کے ساتھ

بٹھائے ویسے خواتین کے لئے محرم یا شوہر کی رفاقت کے بغیر 98 رکلومیٹر سے زیادہ کا سفر شرعاً جائز نہیں ہے۔

بیوی کا شوہر سے یہ کہنا کہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں

سوال: بیوی اگر شوہر سے یہ بولے کہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں، اور کچھ دیر بعد راضی ہو جائے تو نکاح ٹوٹ تو نہیں جاتا۔ (طاہرہ، کراچی)

جواب: اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نکاح بدستور قائم رہتا ہے۔

مسئلہ رضاعت

سوال: دو حقیقی بہنیں ہیں، ان کی دو بیٹیوں نے ایک دوسرے کی ماں کا دودھ پیا ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں حقیقی بہنوں کی اور اولاد بھی ہے۔ ان دو دودھ شریک بہنوں کے علاوہ دو بہنوں کی باقی اولاد نے اپنی ماں کے علاوہ کسی اور کا دودھ نہیں پیا۔ کیا ان کی باقی اولاد یعنی ایک بہن کے بیٹے اور دوسری بہن کی بیٹی کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے؟ (سہیل عمر۔ دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب: رضاعت (دودھ شریک) رشتہ دو طرفہ متعدی نہیں ہوتا بلکہ جانب واحد سے متعدی ہوتا ہے۔ یعنی جس بچی یا بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے اس پر رضاعی ماں باپ کی ساری اولاد حرام ہے، جبکہ رضاعی ماں باپ کی اولاد پر صرف یہ بچہ یا بچی حرام ہے، جس نے دودھ پیا ہے، اس کے باقی بہن بھائی حرام نہیں ہیں۔ (بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو) اب صورتِ مسؤلہ میں جن دو بچیوں نے اپنی اپنی خالہ کا دودھ پیا ہے، ان کی خالہ ان کی رضاعی ماں بن گئی ہے اور ان دونوں بچیوں میں سے ہر ایک کا خالہ زاد بھائی سے نکاح حرام ہے، کیونکہ وہ اس کا دودھ شریک بھائی ہوگا۔ لیکن ان دونوں حقیقی بہنوں کی بقیہ اولاد کا، جنہوں نے اپنی خالہ کا دودھ نہیں پیا، آپس میں نکاح ہو سکتا ہے، بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو۔

ماں کو رضاعت پر مجبور کرنا

سوال: کیا ماں کو رضاعت پر مجبور کیا جا سکتا ہے یا اس کی منشا پر ہے؟ (محمد الیاس۔ لانڈھی، کراچی)

جواب: دودھ ماں کا ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے بچے کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ درمختار میں ہے (ولیس لہ ذالک) یعنی الاجبار بنوعیہ (مع زوجة الحرة) یعنی مرد اپنی آزاد

بیوی کو نہ دودھ چھڑانے پر مجبور کر سکتا ہے اور نہ ہی دودھ پلانے پر۔ ہاں اگر بچے کی ہلاکت کا خطرہ ہو اور متبادل انتظام نہ ہو تو ماں کو رضاعت و حضانت یعنی بچے کو دودھ پلانے اور اس کی نگہداشت پر مجبور کیا جائے گا اور اگر وہ بدستور اپنے شوہر (یعنی اس بچے کے باپ) کے نکاح میں ہے تو وہ رضاعت و حضانت کی اجرت کا الگ مطالبہ نہیں کرے گی اور نہ ہی اس کا مطالبہ منظور ہوگا، کیونکہ اس کا نان نفقہ ویسے بھی شوہر کے ذمے ہے۔

حرمت رضاعت کا ایک پیچیدہ مسئلہ

کوئٹہ سے مولانا فتح محمد صاحب زید مجدہ نے مندرجہ ذیل سوال و جواب تصویب اور تصدیق کے لئے ارسال فرمایا۔ سوال اور مولانا فتح محمد صاحب کی طرف سے تصویب کے لئے ارسال کردہ جواب ان کی اپنی عبارت میں ملاحظہ ہو:

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ عبدالرحیم کی دو بیویاں (مسماۃ حور بی بی اور مسماۃ جمال خاتون) ہیں۔ محمد اسماعیل نے مدت رضاعت میں مسماۃ حور بی بی کا دودھ پیا تھا۔ اب دریافت یہ کرنا ہے کہ محمد اسماعیل کے بیٹے مسمٰی محمد امین کا اپنے والد کی رضاعی ماں کی سوکن مسماۃ جمال خاتون کی بیٹی مسماۃ اشرف خاتون سے نکاح شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا با لبرھان اجر کم الرحمٰن۔ (المستفتی)۔

الجواب ماہوالصواب: محمد امین اپنے والد کی رضاعی ماں کی سوکن کی بیٹی مسماۃ اشرف خاتون سے نکاح ازروئے شرع کر سکتا ہے کیونکہ جب اس کے باپ محمد اسماعیل کے لئے مسماۃ اشرف خاتون سے نکاح جائز ہے تو بیٹے کے لئے کس طرح ناجائز ہوگا۔ کما فی ردالمحتار فی باب الرضاعة قوله (وعمة ابن) فيه الصور الثلاث ايضاً بان يكون كل منهما رضاعيا كان رضع صبى من زوجتك ورضع ايضاً من زوجة رجل آخر له اخت فهٰذه الاخت عمة ابنك من الرضاع اوالاوّل رضاعيا فقط بان يكون ذالك الرضيع ابنك من النسب اوالثانى فقط بان يكون ابنك من الرضاع له عمة من النسب بخلاف مالو كان كل منهما من النسب فان العمة لاتحل لك لانها اختك۔

هذا ماظهر لی فی هذا الباب واللہ اعلم بالصواب (الفقیر الحاج فتح محمد باروزئی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا فتح محمد صاحب نے ایک باپ کی وجہ سے رضیع کی عمہ کو دو باپ کی وجہ سے عمہ ابن پر قیاس فرما کر غلطی کی۔ چونکہ مولانا فتح محمد صاحب کے جواب کی تصویب نہیں ہو سکتی اور مولانا کا جواب غلط تھا، صورت مسئولہ کا صحیح جواب اور مولانا کے جواب کی تردید فوراً ہو سکتی تھی، لیکن جب مولانا نے ہوٹل سے فون پر فرمایا کہ میرے جواب کی تصدیق بڑے بڑے علماء کر چکے ہیں تو میں نے آپ سے کچھ وقت لے کر قدرے تفصیلی جواب بذریعہ ڈاک ارسال کرنے کا وعدہ کر لیا، تاکہ اس تفصیل سے مولانا اور ان کے مصدقین کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ چنانچہ میری طرف سے مذکورہ صورت کا صحیح جواب یہ ہے کہ:

صورتِ مسئولہ میں محمد امین کا اپنے والد محمد اسماعیل کی رضاعی ماں (حور بی بی) کی سوکن (جمال خاتون) کی بیٹی (اشرف خاتون) سے نکاح نہیں ہو سکتا کیونکہ اشرف خاتون محمد اسماعیل کی رضاعی بہن اور اس کے بیٹے محمد امین کی رضاعی پھوپھی بنتی ہے، لہٰذا محمد اسماعیل اپنی رضاعی بہن سے اور نہ اس کا بیٹا محمد امین اپنی رضاعی پھوپھی سے نکاح کر سکتا ہے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے: ویحرم من الرضاع مایحرم من النسب یعنی "رضاع کی وجہ سے ہر وہ رشتہ حرام ہے جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتا ہے"۔ لہٰذا جس طرح نسبی بہن اور نسبی پھوپھی سے نکاح نہیں ہو سکتا، اسی طرح رضاعی بہن اور رضاعی پھوپھی سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔ اگر کہا جائے کہ اشرف خاتون محمد اسماعیل کی رضاعی بہن اور محمد امین کی رضاعی پھوپھی کس طرح بنتی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ رضیع کے لئے مرضعہ جس طرح رضاعی ماں ہوتی ہے، اسی طرح مرضعہ کا شوہر رضیع کا رضاعی باپ ہوتا ہے، لہٰذا مرضعہ کے شوہر کی اولاد چاہے وہ مرضعہ سے ہو یا مرضعہ کی سوکنوں سے ہو، رضیع کے لئے رضاعی بہن اور بھائی ہونے کی وجہ سے حرام ہو جائے گی اور جس طرح نسبی بہنیں اور نسبی پھوپھیاں عینی، علاتی اور اخیافی ہوتی ہیں اسی طرح رضاعی بہنیں اور رضاعی پھوپھیاں بھی عینی، علاتی اور اخیافی ہوتی ہیں اور تینوں قسم کی بہنوں اور پھوپھیوں کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہوتا۔ لہٰذا محمد اسماعیل کے لئے اشرف خاتون رضاعی علاتی بہن ہوگی اور محمد امین کے لئے رضاعی علاتی پھوپھی ہوگی، دونوں باپ بیٹے کا اشرف خاتون کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہوگا۔

ویثبت ابوۃ زوج مرضعة اذا کان لبنها منه کما سیجیئ (باب الرضاع)۔ علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں : یعنی اللبن الذی نزل من المرء ة بسبب ولادتها من رجل زوج وسید یتعلق به التحریم بین المرضعة وبین ذالک الرجل بان یکون ابا للرضیع فلاتحل له ان کانت صبیة لانه ابوها ولا لاخوته لانهم اعمامها ولا لابائه لانهم اجدادها ولالاعمامه لانهم اعمام الاب ولا لاولاده وان کانوا من غیر المرضعة لانهم اخوتها لابیها ولا لابناء اولاده لان الصبیة عمتهم۔ ۳۔۴۳۰ مکتبه بیروت

لہٰذا محمد امین اور محمد اسماعیل میں سے کسی کا اشرف خاتون سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ مولانا فتح محمد باروزئی صاحب نے ردالمحتار کی جس عبارت سے استدلال فرمایا ہے، مولانا اس کو سمجھ نہیں سکے، صرف لفظ ''عمۃ ابن'' اور علامہ شامی کی طرف سے توضیح کے ظاہر کو دیکھ کر محمد اسماعیل کے لئے رضاعی بہن کے ساتھ اور محمد امین کے لئے رضاعی پھوپھی کے ساتھ نکاح جائز ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون)

توضیح یہ ہے کہ رضاع کے ابواب میں وہ متعدد صورتیں جن میں نسب اور رضاع میں فرق ہوتا ہے، ان صورتوں میں ''عمۃ ابن'' بھی ہے، ان کی توضیح کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ مثال ایسی صورتوں کے ساتھ دی جائے جس میں مخاطب یعنی نکاح کرنے والے کا مضاف سے مراد عورت سے نکاح جائز ہو سکے۔ جس طرح علامہ شامی نے لفظ ''عمۃ ابن'' میں تین صورتیں بیان فرمائی ہیں، ہر صورت میں ''عمۃ'' سے مراد مخاطب کے لئے ''عمۃ'' نہ بہن رضاعی بنتی ہے اور نہ پھوپھی رضاعی اور نکاح جائز ہوتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ''عمۃ'' اور ''ابن'' دونوں رضاعی ہوں اور ''عمۃ'' کے ساتھ مخاطب کا نکاح جائز ہو، وہ اس طرح کہ کسی اجنبی لڑکے نے مخاطب کی بیوی کا مدتِ رضاع میں دودھ پیا، مخاطب موصوف لڑکے کا رضاعی باپ ہوگا اور اس کی بیوی رضاعی ماں ہوگی، پھر اسی لڑکے نے دوسرے مرد کی بیوی کا دودھ پیا جس کی ایک نسبی بہن بھی تھی تو دوسرا مرد بھی موصوف لڑکے کے لئے رضاعی باپ اور اس کی بیوی ماں ہوگی اور اس کی بہن موصوف لڑکے کی رضاعی پھوپھی ہوگی لیکن لڑکے کی یہ پھوپھی لڑکے کے پہلے باپ رضاعی کے لئے نہ رضاعی بہن بنتی ہے اور نہ رضاعی پھوپھی، لہٰذا لڑکے کے پہلے رضاعی باپ کا بیٹے کی اس رضاعی پھوپھی

سے نکاح جائز ہوگا، لیکن صورت مسئولہ میں تو محمد اسماعیل کے لئے اشرف خاتون رضاعی بہن بنتی ہے تو محمد اسماعیل کا اس کے ساتھ نکاح یا اس لڑکے کا نکاح کس طرح ہوسکتا ہے، لہٰذا ''عمۃ ابن'' کی اس صورت پر قیاس غلط ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ صرف ''عمۃ'' رضاعی ہو لیکن ''ابن'' نسبی ہو، اس کی مثال یہ ہے کہ یہی لڑکا مثلاً پہلے شخص کا نسبی بیٹا ہو لیکن دوسرے مرد کی بیوی کا دودھ پینے کی وجہ سے اس کا رضاعی بیٹا بن گیا۔ دوسرے مرد کی مذکورہ بہن لڑکے کے لئے رضاعی پھوپھی ہے، لڑکے کا نکاح تو اس کے ساتھ جائز نہیں ہوگا لیکن اس کے نسبی باپ کا بیٹے کی مذکورہ پھوپھی سے نکاح جائز ہوگا کیونکہ لڑکے کے نسبی والد کے لئے مذکورہ ''عمۃ'' اجنبیہ ہے، نہ رضاعی بہن بنتی ہے اور نہ رضاعی پھوپھی، کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ

از جانب شیر دہ ہمہ خویش شوند واز جانب شیر خوار زوجان وفروع

لہٰذا محمد اسماعیل اور محمد امین والی صورت کو اس صورت پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ''عمۃ'' محمد امین اختِ محمد اسماعیل ہے، لہٰذا اشرف خاتون سے دونوں کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ فقط ''ابن'' رضاعی ہو لیکن ''عمۃ'' نسبی ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی اجنبی لڑکے نے مخاطب کی بیوی کا دودھ کا پیا، لیکن اس کے اپنے نسبی باپ کی ایک بہن ہے، یہ سگی بہن لڑکے کے باپ کے لئے تو ''عمۃ نسبی'' ہوگی لیکن اس لڑکے کے رضاعی باپ کے لئے نہ بہن بنتی ہے نہ عمۃ۔ لہٰذا موصوف لڑکے کے باپ کے لئے ''عمۃ ابن'' کے ساتھ نکاح جائز ہوگا۔ اس صورت پر بھی محمد اسماعیل اور محمد امین والی صورت کو قیاس کرنا غلط ہے، جیسا کہ واضح ہے، اور اگر ''عمۃ ابن'' میں ''ابن'' مخاطب کا ''نسبی ابن'' ہو اور ''عمۃ'' اس ''ابن'' کی ''نسبی عمۃ'' ہو تو مخاطب کا ''عمۃ ابن'' کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہوگا کیونکہ یہ ''عمۃ'' مخاطب کی نسبی بہن ہوگی۔ یہ ردالمحتار کی اس عبارت کی وضاحت تھی جس عبارت سے مولانا کو غلطی لگی۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جس طرح ''ابن نسبی'' کی ''عمۃ نسبی'' مرد کے لئے ''اخت نسبی'' ہونے کی وجہ سے حرام ہوتی، اسی طرح مرد کے لئے ''ابن نسبی'' کی ''عمۃ رضاعی'' بھی اس وقت حرام ہوتی ہے جب وہ ''عمۃ'' مرد کے لئے ''اخت رضاعی'' بن رہی ہو، جیسے محمد اسماعیل اور محمد امین والی صورت میں ہے۔ مولانا سے اور ان کے مصدقین سے گذارش ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے مذکورہ غلطی سے رجوع فرمالیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مولانا فتح محمد کا یہ جملہ بھی صحیح نہیں ہے کہ " جب باپ محمد اسماعیل کے لئے مسماۃ اشرف خاتون سے نکاح جائز ہے تو بیٹے کے لئے کس طرح ناجائز ہوگا"۔ مولانا فتاویٰ شامی سے جن تین مفروضہ صورتوں سے استدلال فرما رہے ہیں، ان تینوں صورتوں میں عمہ ابن کے ساتھ بیٹے کا نکاح جائز نہیں، لیکن باپ کا نکاح جائز ہے، تو مولانا کی مذکورہ عبارت بھی غلط ہوگئی۔

محمد رفیق الحسنی عفی عنہ

جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، گلستان جوہر بلاک ۱۵ کراچی

۱۱/اکتوبر ۲۰۰۰ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قاعدہ یہ ہے کہ جو رشتے نسب سے حرام ہوتے ہیں، وہ رضاعت سے بھی حرام ہوتے ہیں، لیکن فقہاء کرام نے ان میں سے اکیس صورتوں کو مستثنیٰ کیا ہے، جن سے وہ رشتے نسباً تو حرام ہوتے ہیں، لیکن رضاعاً حرام نہیں ہیں۔ ان میں سے کسی شخص کی اپنے رضاعی بیٹے کی پھوپھی سے نکاح کے جواز کی تین صورتیں ہیں، جن کو علامہ شامی نے ذکر کیا ہے۔ علامہ فتح محمد باروزئی نے اپنے موقف پر شامی کے تین جزئیوں سے استدلال کیا ہے، جن کی عبارت انہوں نے اپنے جواب میں پیش کی ہے، لیکن ان جزئیوں سے ان کا موقف ثابت نہیں ہوتا۔

مسئلے کی وضاحت کے لئے ہم علامہ شامی کی ذکر کردہ تین صورتوں کا اور صورت مسئولہ کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے مسئلے کو سمجھنا انتہائی آسان ہو جائے گا، انشاء اللہ العزیز!

پہلا جزئیہ یہ ہے کہ کسی شخص کا رضاعی بیٹا ہو جو کسی دوسرے کا بھی رضاعی بیٹا ہو اور اس دوسرے شخص کی بہن بھی ہو جو اس مشترک رضاعی بیٹے کی رضاعی پھوپھی ہوگی، تو وہ اس شخص کے لئے حلال ہوگی، جب کہ کسی شخص کے بیٹے کی نسبی پھوپھی اس شخص کے لئے حلال نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اس کی بہن ہے، اس کی صورت یوں بنے گی۔

(ایک شخص) زید	(دوسرا شخص) بکر	ہند (بکر کی بہن)
کلثوم (زید کی بیوی)	زرینہ (بکر کی بیوی)	
خالد	(زید اور بکر دونوں کا رضاعی بیٹا)	

خالد نے کلثوم اور زرینہ دونوں کا دودھ پیا ہے، لہٰذا وہ زید اور بکر دونوں کا رضاعی بیٹا ہوا، ا

زید و بکر دونوں اس کے رضاعی باپ ہوئے۔

اب اس صورت میں ہند، خالد کی رضاعی پھوپھی ہے اور زید کا ہند (یعنی اپنے رضاعی بیٹے کی رضاعی پھوپھی) سے نکاح ہو سکتا ہے۔

دوسرا جزئیہ یہ ہے کہ کسی شخص کا نسبی بیٹا ہو اور وہ کسی دوسرے شخص کا رضاعی بیٹا بھی ہو اور اس دوسرے شخص کی ایک بہن بھی ہو، جو اس مشترک (یعنی ایک کے حقیقی اور دوسرے کے رضاعی) بیٹے کی رضاعی پھوپھی ہے، وہ اس شخص کے لئے حلال ہے، جب کہ کسی شخص کے بیٹے کی نسبی پھوپھی اس پر حلال نہیں ہوتی، اس کی صورت یوں بنے گی۔

(ایک شخص) زید　　(دوسرا شخص) بکر　　ہند (بکر کی بہن)

خالد (اس کا نسبی بیٹا)　　زرینہ (بکر کی بیوی)

(خالد نے زرینہ کا دودھ پیا)

خالد، زید کا نسبی بیٹا ہے اور ہند، خالد کی رضاعی پھوپھی ہے اور زید کا ہند (یعنی اپنے نسبی بیٹے کی رضاعی پھوپھی) سے نکاح جائز ہے، کیونکہ زید کا براہِ راست ہند سے حرمتِ نکاح کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص کا ایک نسبی بیٹا ہو اور اس (باپ) کی ایک بہن بھی ہو، اور اس بیٹے نے کسی دوسری عورت کا دودھ پیا ہو، تو اس (رضاعی ماں) کا شوہر اس کا رضاعی باپ بن جائے گا، اب اس رضاعی باپ کے لئے اپنے اس رضاعی بیٹے کی نسبی پھوپھی سے نکاح جائز ہے، اس کی صورت یوں بنے گی۔

(ایک شخص) زید　　ہند (زید کی بہن)　　بکر (خالد کا رضاعی باپ)

خالد (زید کا نسبی بیٹا)　　زرینہ (بکر کی بیوی)

(خالد نے زرینہ کا دودھ پیا)

اس صورت میں بکر کا اپنے رضاعی بیٹے خالد کی نسبی پھوپھی ہند سے نکاح جائز ہے، کیونکہ بکر کا ہند سے ایسا کوئی رشتہ نہیں جو حرمتِ نکاح کا سبب بنے۔ علامہ شامی کی ذکر کردہ ان تینوں جائز صورتوں کے برعکس صورت مسئولہ کا نقشہ کچھ یوں بنتا ہے:

عبدالرحیم

حور بی بی (عبدالرحیم کی پہلی بیوی)　　　　جمال خاتون (عبدالرحیم کی دوسری بیوی)

اسماعیل (عبدالرحیم کا رضاعی بیٹا ہے کیونکہ اس نے حور بی بی کا دودھ پیا ہے)

اشرف خاتون (عبدالرحیم و جمال خاتون کی بیٹی)

محمد امین (محمد اسماعیل کا بیٹا)　(محمد امین کی علاتی رضاعی پھوپھی)

اس صورت میں اشرف خاتون سے نہ تو اسماعیل کا نکاح جائز ہے، کیونکہ وہ اس کی علاتی (باپ شریک) رضاعی بہن ہے اور نہ ہی محمد امین (فرزند اسماعیل) کا نکاح جائز ہے، کیونکہ وہ اس کی علاتی رضاعی پھوپھی ہے۔ کیونکہ محمد امین کے لئے اشرف خاتون کا رضاعی پھوپھی ہونا ایک ہی رضاعی باپ کے سبب سے ہے، جب کہ علامہ شامی کے مذکورہ جزئیات میں جس پھوپھی (عمۃ الابن) کا استثناء کیا گیا ہے، اس کا جواز دو باپوں (ایک رضاعی اور ایک نسبی یا ایک نسبی اور دوسرا رضاعی) کی وجہ سے ہے، نیز علامہ فتح محمد باروزئی کا یہ کہنا بداہتہً باطل ہے کہ جب محمد اسماعیل کے لئے مسماۃ اشرف خاتون سے نکاح جائز ہے تو بیٹے کے لئے کس طرح ناجائز ہوگا؟۔ یہ اس لئے باطل ہے کہ اشرف خاتون محمد اسماعیل کی علاتی رضاعی بہن ہے اور علاتی رضاعی بہن سے نکاح نسباً بھی حرام ہے اور رضاعاً بھی۔ حضرت علامہ مفتی محمد رفیق الحسنی صاحب کا جواب بھی بالکل درست اور صائب ہے، لیکن وہ بہت زیادہ فنی، اصطلاحی اور مغلق عبارات پر مشتمل ہے، اس لئے ہم نے تفہیم کے لئے اس کو آسان اور سہل انداز میں پیش کر دیا ہے تا کہ علامہ فتح محمد باروزئی اور دیگر اہل علم پر اصل جواب واضح ہو جائے اور ان کے لئے رجوع الی الحق میں دشواری نہ ہو، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نوٹ: یہ علامہ فتح محمد باروزئی کے بڑے پن اور عالم حق ہونے کی دلیل ہے کہ انہوں نے ہمارا جواب پڑھنے کے بعد اپنے فتوے سے رجوع بھی کیا اور ہمیں تشکر کا خط بھی لکھا۔

منگنی کے بعد لڑکے اور لڑکی کا آپس میں بلا تکلف بے حجاب ملاقاتیں کرنا

سوال: لڑکا لڑکی کی منگنی ہونے کی صورت میں اکثر دیکھا گیا ہے لڑکا اور لڑکی اکیلے باہر گھومتے

ہیں آیا منگنی والی لڑکی کا اپنے منگیتر کے ساتھ بے پردہ باہر جانا جائز ہے یا نہیں اس کو حرام مانا جائے گا یا نہیں؟ (عبدالمجید رضوی۔فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: منگنی وعدۂ نکاح ہے، نکاح نہیں ہے۔لہٰذا منگنی کے بعد بھی، جب تک کہ باقاعدہ نکاح نہ ہوا ہو، لڑکی، لڑکے کے لئے بدستور اجنبی رہتی ہے جیسا کہ کوئی بھی دوسری غیر محرم بالغہ لڑکی۔لہٰذا قبل از نکاح لڑکے لڑکی کا بلا تکلف اور حجابِ شرعی کے بغیر آپس میں ملنا، خلوت میں رہنا اور گھومنا پھرنا قطعاً جائز نہیں ہے، ممنوع ہے۔

جہیز و بری کے سامان کی ملکیت کا مسئلہ

سوال: مفتی صاحب! گذارش یہ ہے کہ میں ایک بیوہ خاتون ہوں اور میرا نام عرشی ناز (زوجہ شیخ وجاہت حسین مرحوم) ہے۔میری شادی کے پانچ مہینے کے بعد میرے شوہر وجاہت حسین وفات پا گئے اللہ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔میں اپنے شوہر کے انتقال کے وقت حالتِ حمل کی کیفیت میں تھی۔اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام علی وجاہت ہے۔

(۱) گذارش یہ ہے کہ جہیز، بری اور تحفے تحائف کے سلسلہ میں فتویٰ عنایت فرمائیں کہ شریعتِ محمدی ﷺ کی رو سے یہ حق کس کا بنتا ہے۔

(۲) میرے شوہر وجاہت حسین مرحوم نے ترکہ میں ایک عدد فلیٹ، ایک عدد کار اور ایک عدد موٹر سائیکل چھوڑی ہے، عرض ہے کہ وجاہت حسین مرحوم کی وراثت میں ان کے ماں باپ جو کہ الحمدللہ حیات ہیں اللہ ان کو زندگی دے۔بیوہ اور بیٹا علی وجاہت اس ترکہ کی کل قیمت میں شریعتِ محمدیہ ﷺ کی روشنی میں کیا حصہ پائیں گے۔مرحوم کے کل ۴ وارث ہیں ان سب کے حصوں کا تعین فرما دیں، تفصیل سے فتویٰ عنایت فرمائیں۔ممنون و متشکر فرمائیں۔

(۳) میرے مرحوم شوہر نے بیٹے کی ڈیلیوری کے سلسلے میں اپنی زندگی میں مبلغ ۵۴۰۰۰ (چون ہزار روپے) دیئے تھے جو کہ میرے پرس میں ہی سسرال میں موجود ہیں۔شرعی نقطۂ نظر سے اس کی حیثیت بھی تحریر فرمائیں، (عرشی ناز، مکان نمبر L-248 سیکٹر 5-C/4۔نارتھ کراچی)۔

جواب: شادی کے موقع پر دلہن کو اس کے والدین کی جانب سے جو زیورات، سامان، لباس اور اشیاء دی جاتی ہیں۔خواہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ......وہ دلہن کی ملکیت ہوتی ہیں، اس میں شوہر

یا اس کے خاندان والوں کا کوئی حق نہیں ہوتا، اور اگر کبھی قضاء الٰہی سے اس کا انتقال ہو جائے تو وہ اس کے ترکہ میں شامل ہوں گی اور شریعت کے قانونِ وراثت کے مطابق اس کے ورثاء میں تقسیم ہوں گی، فتاویٰ درمختار، ج ۱، ص ۲۳۱ مطبع مجتبائی دہلی میں ہے:

کل احدیعلم ان الجهاز ملک المرأة لاحق لاحد فيه.

''ہر شخص جانتا ہے کہ جہیز عورت کی ملکیت ہوتا ہے، اس میں کسی اور کا کوئی حق نہیں ہوتا''۔

اور فتاویٰ ردالمحتار جلد نمبر ۲، صفحہ نمبر ۲۳۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی میں ہے:

کل احد يعلم ان الجهاز للمرأة وانه اذا طلقها تأخذه كله و اذا ماتت يورث عنها.

''ہر شخص جانتا ہے کہ جہیز عورت کی ملکیت ہوتا ہے، اور جب شوہر اس کو طلاق دے دے تو وہ تمام جہیز لے لے گی، اور جب اس عورت کا انتقال ہو جائے تو وہ جہیز بطور ترکہ اس کے وارثوں کو ملے گا''۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''جہیز ہمارے بلاد کے عرفِ عام شائع سے خاص ملک زوجہ ہوتا ہے جس میں شوہر کا کچھ حق نہیں، طلاق ہوئی تو کل لے گئی اور مر گئی تو اسی کے ورثاء پر تقسیم ہوگا''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج ۱۲، ص ۲۰۲، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

شادی کے موقعے پر دلہن کو سسرال والوں کی جانب سے جو زیورات، لباس، سامان اور تحائف وغیرہ ملتے ہیں، اسے عرف عام میں ''بری'' کہا جاتا ہے۔ بری کے سامان کی ملکیت و استحقاق کا مسئلہ ہمارے معاشرے میں نارمل حالات میں اٹھتا ہی نہیں ہے، اگر عائلی و ازدواجی زندگی خوشگوار ہے، باہم محبت ہے، سب معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں تو اس طرح کے سوالات خواب وخیال میں بھی نہیں آتے چہ جائے کہ عملی زندگی میں ان کو چھیڑا جائے۔ تاہم ان کی ممکنہ صورتیں اور ان کے احکام درج ذیل ہیں:

(۱) یہ کہ کسی علاقے، کمیونٹی یا برادری میں یہ معروف اور طے شدہ اصول ہو کہ بری کا سامان شوہر یا اس کے خاندان کی ملکیت ہوتا ہے، تو عرف بھی نصِ شرع کی طرح ہوتا ہے اور اسی پر معاملات کا

فیصلہ ہوگا اور عورت کے لئے محض تصرف و استعمال کی اجازت ہی سمجھی جائے گی اور طلاق کی صورت میں وہ سامان شوہر کا ہوگا اور اس کی وفات کی صورت میں وہ اس کے ترکے میں شمار ہوگا۔

(۲) شادی کے موقع پر باقاعدہ تحریری طور پر یا زبانی طے کرلیا جائے کہ بری کا سامان کس کی ملکیت ہوگا تو بعد میں اسی کے مطابق عمل ہوگا اور بہتر یہی ہے کہ شادی کے موقع پر نکاح نامے میں یہ درج کرادیا جائے کہ بری کے زیورات اور سامان کس کی ملکیت ہوں گے تاکہ بعد میں خدانخواستہ طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت میں تنازع نہ پیدا ہو۔

(۳) شادی کے موقع پر یہ سامان دلہن کو ہبہ (GIFT) کردیا گیا ہو، لیکن بعد میں زوجین میں اختلافات رونما ہونے کی بناء پر نیت میں فتور آجائے۔ ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

العائد فی هبته کالعائد فی قینه۔

''ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کرکے دوبارہ اسے چاٹ لے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۶۲)

مثل الذی ی رجع فی صدقته کمثل الکلب یقیء ثم یعود فی قینه فیاکله۔

''جو شخص صدقہ کرکے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۵۸)

امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں:

''دلہن کا گہنا جوڑا جو بری میں جاتا ہے، اگر نصاً یا عرفاً اس میں بھی تملیک ہوتی ہو، جیسے شکر، میوہ، عطر پھلیل وغیرہ میں مطلقاً ہوتی ہے، تو وہ بھی قبضۂ منکوحہ، ملکِ منکوحہ ہوگا، ہمارے یہاں شرفاء کا عرفِ ظاہر یہی ہے، ولہٰذا بعد رخصت اس کے واپس لینے کو سخت معیوب و موجبِ مطعونی جانتے ہیں، اور اگر لے لیں تو طعنہ زن یہی کہتے ہیں کہ دے کر پھیر لیا یا صرف دکھانے کو دیا تھا، جب دلہن آئی چھین لیا، یعنی یہ ان کی رسمِ معہود (UNDERSTANDABLE MARITAL CUSTOM) کے خلاف ہے، اس صورت میں تو اس کے لئے بعینہ وہی

احکام ہوں گے جو دولہا کے جوڑے میں گذرے کہ بعد ہلاک دلہن سے تاوان لینے کا اصلاً اختیار نہیں، جیسے شکر، میوہ کا تاوان بٹنے کے بعد نہیں مل سکتا، اگرچہ ہنوز کھانے میں نہ آیا ہو......
آگے چل کر لکھتے ہیں...... ہاں جہاں عرف تملیک نہ ہو بلکہ صرف پہنانے کے لئے بھیجا جاتا اور بنانے والوں ہی کی ملک سمجھا جاتا ہو، وہاں دلہن کی ملک نہیں، ایک عاریت ہے کہ بحالتِ بقاجس سے رجوع ہر وقت جائز وحلال''۔ (فتاویٰ رضویہ، ج ۱۲، ص ۲۰۸، رضا فاؤنڈیشن۔ لاہور)

میری دانست میں ہمارے یہاں بھی معزز خاندانوں اور شرفا کا معمول اور عرف یہی ہے کہ بری کا سامان وزیورات وغیرہ دلہن کو بطورِ ملک دیئے جاتے ہیں اور وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہتی ہے، تاہم جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، اگر کسی خاندان، برادری، کمیونٹی یا علاقے کا رواج اور عرف یہی ہے کہ بری کے زیورات اور سامان دلہن کو عاریتاً محض استعمال کے لئے دیئے جاتے ہیں نہ کہ ملکیت کے طور پر، تو وہ اپنے عرف پر ان کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔

(۲) اگر متوفی کے ورثاء کی تعداد وہی ہے جو سوال میں مذکور ہے تو ان امور کی ادائیگی کے بعد جو تقسیم ترکہ پر شرعاً مقدم ہیں، یعنی مصارفِ تجہیز و تکفین، میت کے ذمہ اگر کسی کا کوئی قرض ہو تو اس کی ادائیگی اور اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو کل ترکے کے ایک تہائی مقدار تک مؤثر ہوگی، بقیہ ترکہ کی تقسیم حسب ذیل ہوگی، کل ترکہ ۲۴ حصوں پر منقسم ہوگا اور ان میں سے میت کے والد کو چار حصے، والدہ کو چار حصے، بیوہ کو تین حصے اور بقیہ تیرہ حصے بیٹے کو ملیں گے۔

(۳) شوہر نے اپنی زندگی میں جو چوّن ہزار روپے کی رقم بیوی کو ڈیلیوری کے مصارف کے لئے اس کی ملکیت میں دے دی تھی، وہ اسے ڈیلیوری اور اس کے مابعد اپنے اور بچے کے علاج معالجے پر خرچ کرے۔

چونکہ سائلہ عرشی ناز اپنے شوہر کی وفات کے وقت حاملہ تھیں، اس لئے ان کی عدت وضعِ حمل تک تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ (الطلاق: ۴)

''حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے یعنی بچہ پیدا ہو جائے''۔

اصولی طور پر مطلقہ یا بیوہ عورت کو عدت اپنے سابق شوہر کے گھر پر ہی گزارنی چاہیے بشرطیکہ

کوئی عذرِ شرعی مانع نہ ہو، متوفی شوہر نے اگر اپنی زندگی میں اپنی بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو تو اس کے ترکے کی ورثاء پر تقسیم سے پہلے دیگر قرض کی رقوم کی طرح دین مہر کو بھی وضع کیا جائے گا۔ سوال میں شوہر کی جن اشیاء کا ذکر ہے (مثلاً فلیٹ، کار اور موٹر سائیکل)، یہ سب اور ان کے علاوہ وہ جو بھی مال چھوڑ کر مرا ہے (مثلاً رقم، بینک بیلنس وغیرہ)، وہ سب بھی ترکے میں شامل ہے۔ اگر سائلہ نے کسی شرعی مانع اور عذر کے بغیر عدت شوہر کے گھر پر نہیں گزاری تو وہ گنہگار ہے، اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے اور معافی مانگے، لیکن اس سے اس کے اور اس کے بچے کے حقوقِ وراثت متاثر نہیں ہوں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نکاح کے وقت ولدیت میں سوتیلے باپ کا نام لینا نکاح نامے میں سوتیلے باپ کا نام لکھنا، ایسے نکاح کا شرعی حکم

سوال: گذشتہ چند سال پہلے ایک نکاح انجام پایا نکاح کے وقت یعنی نکاح جو پڑھایا گیا اور نکاح نامہ جو لکھا گیا اس میں لڑکی کی اصل ولدیت نہیں لکھی گئی لڑکی کے اصل والد فوت ہو چکے تھے لڑکی کی ماں نے دوسرا نکاح کیا بچے چھوٹے تھے۔ بچوں کی پرورش سوتیلے باپ نے کی۔ لاعلمی کے سبب نکاح کے وقت ولدیت میں سوتیلے باپ کا نام درج کروایا گیا۔ اس مسئلہ پر شرعی حکم کیا ہے۔ (مشکور حسین قادری، ۱۵/۷۵۴ دستگیر کالونی، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)۔

جواب: اس مسئلے کا جواب جاننے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ قرآن و حدیث میں کسی شخص کا اپنے آپ کو بیٹے یا بیٹی کی حیثیت سے حقیقی باپ کے علاوہ غیر کی طرف (خواہ سوتیلا باپ ہو، مربی ہو، یا اس نے اسے گود لیا ہو اور لے پالک بنایا ہو) منسوب کرنا ممنوع اور حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۚ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ (الاحزاب: ۴)

''اور اس (اللہ تعالیٰ) نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا، یہ سب تمہاری اپنی خود ساختہ باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ حق (بات) ارشاد فرماتا ہے اور وہ راہِ راست کی طرف رہنمائی فرماتا ہے''۔

اور فرمایا:

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ (الاحزاب: ۵)

''ان (لے پالکوں) کو ان کے (حقیقی) باپوں کے ناموں سے پکارو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی سب سے زیادہ انصاف کی بات ہے''۔

حدیث پاک میں اس پر شدید وعید آئی ہے:

عن سعد رضی اللہ عنه قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: مَنِ ادَّعیٰ اِلٰی غیر ابیه وھو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام۔

''حضرت سعد بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: جس نے اپنے آپ کو اپنے حقیقی باپ کے علاوہ غیر کی طرف منسوب کیا (یعنی غیر باپ کو اپنا باپ قرار دیا)، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا حقیقی باپ نہیں ہے تو جنت اس پر حرام ہے''۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۶۷۶۶)

جیسا کہ آپ نے سوال میں درج کیا ہے، ہمارے معاشرے میں ایسی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ نعمتِ اولاد سے بعض محروم لوگ کسی بچے کو گود لے لیتے ہیں، اسے لے پالک اور متبنّیٰ بناتے ہیں اور شریعت سے ناواقفی کی بناء پر تعلیمی اور دیگر تمام دستاویزات میں حقیقی باپ کے بجائے اپنا نام لکھوا دیتے ہیں اور اپنے آپ کو حقیقی باپ اور اسے حقیقی اولاد کا درجہ دے دیتے ہیں، اسے اپنا وارثِ شرعی سمجھتے ہیں، شرعاً یہ درست نہیں ہے۔ بلکہ اگر بالفرض لے پالک بچی ہے اور اس کے اور اس مربی باپ کے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے کہ وہ اس کے بچی کے محرم بنتے ہوں، جیسے چچا، ماموں وغیرہ اور یہ بچی بالغہ ہو جاتی ہے تو شرعاً ستر و حجاب کے احکام نافذ ہوں گے۔

اس تمہید کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ نکاح کی صحت کے لئے لڑکے اور لڑکی (یعنی دولہا و دلہن) کا ایک دوسرے کے لئے اور گواہانِ نکاح کے لئے شخصی طور پر معیّن ہونا ضروری ہے۔

فتاویٰ درمختار میں ہے:

ولا المنکوحة مجهولة

''اور منکوحہ مجہولہ نہیں ہونی چاہئے''۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''اگر ایک شخص کی دو بیٹیاں ہیں اور اس نے کسی تعین کے بغیر ایک بیٹی کا نکاح کیا (یعنی کسی سے کہا کہ میں نے اپنی بیٹی تمہارے نکاح میں دی) تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے، لیکن اگر اس کی ان دو بیٹیوں میں سے ایک پہلے سے شادی شدہ ہے، تو اس نکاح کے لئے غیر شادی شدہ از خود متعین ہو جائے گی (اور نکاح صحیح ہو جائے گا)، جیسا کہ ''بزازیہ'' اور ''نہر'' میں ہے، اسی طرح اگر ایک کسی سبب سے اس پر ویسے ہی حرام ہے (مثلاً وہ اس شخص کی رضاعی بہن ہے تو دوسری نکاح کے لئے متعین ہو جائے گی) آگے چل کر وہ لکھتے ہیں..... میں کہتا ہوں: اس عبارت کا ظاہر یہ ہے کہ اگر مقدماتِ نکاح ایک معینہ لڑکی پر جاری ہوئے (مثلاً لڑکی کی طرف اشارہ کر کے باپ نے کہا کہ میں نے اپنی یہ لڑکی تیرے نکاح میں دی) اور وہ گواہوں کے نزدیک بھی ممتاز ہوگئی تو نکاح صحیح ہے''۔ (ردالمحتار: جلد ۴ ص ۶۶، داراحیاء التراث العربی)

آگے چل کر پھر درمختار میں ہے:

''(نکاح کے وقت) لڑکی کے وکیل نے لڑکی کے باپ کا نام غلط لیا اور وہ لڑکی ذاتی طور پر وہاں موجود بھی نہیں ہے تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''یہ دونوں مسئلوں کی طرف راجع ہے، یعنی اگر وہ لڑکی بذاتِ خود موجود ہو اور اس کی طرف تعیین کیلئے اشارہ بھی کر دیا گیا ہے، لیکن اس کا یا اس کے باپ کا نام لینے میں غلطی ہوگئی، تو یہ صحت نکاح کے لئے مضر نہیں ہے، اس لئے کہ اشارہ حِسّیہ سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے، وہ نام لینے کی معرفت سے زیادہ قوی ہے''۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۷۹۔۷۸)

فتاوٰی عالمگیری میں ہے:

''اور فتاویٰ ابو اللیث میں ہے: ایک شخص نے لوگوں سے (عورت کا نام لئے بغیر) کہا: تم گواہ ہو جاؤ، میں نے اس عورت کا، جو اس گھر کے اندر ہے، نکاح (فلاں سے) کر دیا، تو اس عورت نے (اندر سے) کہا: مجھے قبول ہے، اور گواہوں نے اس کی بات سنی حالانکہ اسے شخصی طور پر دیکھا نہیں، تو اگر گھر میں صرف وہی ایک عورت موجود تھی تو نکاح صحیح ہے (کیونکہ وہ عورت شخصی طور پر متعین ہے) اور اگر گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور عورت بھی تھی تو پھر یہ نکاح جائز نہیں ہے

(کیونکہ اب وہ شخصی طور پر متعین نہیں ہے)''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد ۱، ص ۲۶۸، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

مولانا مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی متعدد سوالات کے جواب میں لکھا:

''نسب کا دارومدار ولدیت پر ہوتا ہے، اس لئے ہر جگہ جو حقیقی باپ ہے، اس کا نام لکھنا چاہئے تھا دستاویزات میں جو سوتیلے باپ کا نام لکھا، وہ غلط ہے۔ حدیث میں باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی نسبت کرنا سخت ممنوع ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے، اس سے توبہ کرنی چاہئے۔ نکاح کی صحت کے لیے دونوں کا ایک دوسرے کے نزدیک متعارف ہونا شرط ہے۔ لہٰذا لڑکی سے جب وکالت حاصل کی جائے گی اور وکیل خاص شوہر کو بتائے گا، تو لڑکی جس نام سے مشہور ہے اور پہچانی جاتی ہے، اس نام سے بتائے گا اور سوتیلے باپ کی نسبت سے مشہور ہے تو اس نام کی طرف نسبت کر کے ایجاب کر سکتے ہیں، پھر بھی مناسب یہ ہے کہ اس کی سوتیلی بیٹی بتا کر تعارف کروا دیا جائے اور اگر اپنے اصل باپ کی نسبت سے مشہور ہے تو اس کا نام لے کر قبول کر لیا جائے۔ نکاح نامہ میں اصل باپ کا نام لکھا جائے اور سوتیلے باپ کی پرورش کردہ بیٹی لکھ دیا جائے''۔

ایک اور موقع پر ان سے دریافت کیا گیا کہ لڑکے نے اپنی دنیوی اغراض (یعنی ہندوستانی تھا مگر پاکستانی قومیت حاصل کرنے) کے لئے تمام دستاویزات میں باپ کے بجائے چچا کا نام لکھا، اب نکاح کے وقت مجبوری ہے کہ اگر اصل باپ کا نام لکھتا ہے تو دستاویزات (پاسپورٹ، شناختی کارڈ، تعلیمی اسناد وغیرہ) میں تضاد ہوتا ہے اور بہت سے معاملات میں قانونی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ تو اب کیا کرے۔ وہ جواب دیتے ہیں:

''اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف بیٹے ہونے کی نسبت کرنا حرام ہے۔ حدیث میں اس کے بارے میں لعنت آئی ہے۔ نکاح میں لڑکی سے وکالت حاصل کرتے وقت، لڑکے کا تعین ضروری ہے۔ اگر لڑکا اسی طرح جانا پہچانا جاتا ہے کہ چچا کو باپ ہونے کے اعتبار سے لوگ جانتے ہیں، تو وکالت صحیح ہو جائے گی اور نکاح بھی صحیح ہو جائے گا۔ اور اگر لڑکی یا لڑکے کے گھر والے اس کے حقیقی باپ کے اعتبار سے جانتے ہیں اور چچا کا بیٹا نہیں سمجھتے، تو پھر وکالت چچا کا بیٹا بتا کر حاصل کرنا صحیح نہیں ہوگی اور جب وکالت صحیح نہیں ہوگی، تو نکاح بھی نہیں ہوگا۔''

اسی طرح کے ایک اور سوال کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

''(۲) نکاح صحیح ہونے کے لیے شوہر اور بیوی کے نام اس طرح لئے جائیں گے، جس طرح وہ پہچانے جاتے ہیں اور معروف ہیں، تاکہ وہ معین ہو جائیں۔ لڑکا جب مشہور اس طرح سے ہے کہ سوتیلے باپ کا بیٹا بتا کر لوگ پہچانتے ہیں اور اس کے حقیقی باپ کو کوئی پہچانتا نہیں ہے تو لڑکی سے وکالت حاصل کرتے وقت سوتیلے باپ کا نام لے کر وکالت حاصل کی جائے تاکہ وہ معین ہو جائے۔ اس صورت میں نکاح نامہ پر یہ لکھنا مناسب ہوگا کہ وکالت میں حقیقی باپ کا نام لکھنے کے بعد یہ لکھ دیں معروف ولد فلاں۔ یعنی سوتیلے باپ کی طرف نسبت کر دیں''۔

ایک اور سوال میں جب ان سے دریافت کیا گیا کہ کسی لڑکی کی پرورش ماموں نے کی اور پھر ہر جگہ ولدیت کے ریکارڈ میں اپنا نام لکھ دیا اور شادی کے موقع پر لڑکی سے اجازت بھی اس کے ماموں کی ولدیت کی نسبت سے لی گئی، حالانکہ ایک گواہ کو اصل صورت حال بھی معلوم تھی کہ اس کا حقیقی والد فلاں ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں:

''قبول کرنے کے لیے شوہر چونکہ خود ہوتا ہے، وہ خود قبول کرتا ہے، اس لئے شوہر کے نام لینے یا اس کے والد کے نام لینے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے لڑکی سے وکالت کے لیے شوہر کو معین کر کے وکالت لینا ضروری ہے۔ لہٰذا شوہر اگر ماموں کا بیٹا ہونے سے مشہور ہے اور لوگ اس کا بیٹا سمجھتے ہیں اور لڑکی سے ماموں کا لڑکا بتا کر وکالت حاصل کی گئی ہے تو یہ وکالت صحیح ہوگئی۔ اور وکیل نے اسی کے ساتھ نکاح کر دیا تو یہ نکاح صحیح ہوگیا۔ اور اگر لڑکی شوہر کو ماموں کا بیٹا ہونے کے اعتبار سے نہیں جانتی تھی نیز شوہر اس طرح مشہور بھی نہ تھا بلکہ اپنے حقیقی باپ کی طرف نسبت سے مشہور تھا اور وکالت ماموں کی طرف نسبت کرنے کے ساتھ حاصل کی گئی تو جس سے نکاح کرنے کے لیے لڑکی نے وکیل مقرر کیا، وکیل نے اس کے ساتھ نکاح نہ کیا، تو یہ نکاح فضولی ہوا تھا۔

نکاح فضولی امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس وقت صحیح ہو جاتا ہے، جب لڑکی رخصت ہو کر شوہر کے پاس چلی گئی اور اس نے نکاح کو رد نہیں کیا تھا، تو یہ نکاح رخصتی کی صورت میں ہو جاتا ہے۔ یہ نکاح کا حکم ہے۔ مگر حدیث میں اس شخص پر سخت مذمت آئی ہے کہ جو اپنے حقیقی باپ کے بجائے دوسرے شخص کی طرف نسبت کرے''۔

(سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب من ادعی الیٰ غیر ابیہ، صفحہ ۱۸۷، قدیمی کتب خانہ کراچی)

لہٰذا زید گناہ گار ہے، اس کو توبہ کرنی چاہیے۔ (وقار الفتاویٰ جلد سوم۔ ص ۴۰ تا ۴۲)''

ان تمام تفصیلات کی روشنی میں صورت مسئولہ میں اگر لڑکی دولہا، وکیل اور گواہوں کے نزدیک متعین تھی اور اسی ولدیت کے ساتھ معروف تھی تو نکاح صحیح ہو گیا، لیکن اپنے آپ کو حقیقی والد کے بجائے دوسرے کی طرف منسوب کرنے سے جو قرآن و حدیث کی خلاف ورزی لازم آتی ہے، اس کا گناہ رہے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔ مزید یہ کہ بلاضرورت اس گناہ پر اصرار، استمرار اور دوام بھی نہیں کرنا چاہئے۔ آج کل نئے قوانین میں اس امر کی گنجائش ہے کہ آدمی عدالت کے روبرو پیش ہو کر اپنی صحیح ولدیت کا اقرار کر کے اس پر عدالت سے توثیق کرائے اور پھر اسے تمام ممکنہ ذرائع سے مشتہر کر کے اپنی تمام تعلیمی اسناد اور قانونی دستاویزات میں ولدیت کی تصحیح کرائے اور سابقہ اسناد و دستاویزات کو منسوخ کرا کے نئی تصحیح شدہ دستاویزات و اسناد حاصل کرے۔ بعض لوگ جو لے پالک اور متبنّٰی ہیں، یا ان کے مربّی اور سوتیلے باپ صحیح شرعی مسئلہ معلوم ہونے کے باوجود دنیا میں اپنی آبرو اور شان قائم رکھنے یا وراثت پانے کی امید پر اصل حقیقت پر بدستور پردہ ڈالے رکھتے ہیں، حالانکہ مومن کو اُخروی نجات کی زیادہ فکر کرنی چاہئے اور اصل وارثوں کی حق تلفی کا سبب نہیں بننا چاہئے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

مَنِ اقتطع شبرا من الارض طوقه الله اياه يومَ القيٰمة من سبع ارضين۔

''جس شخص نے ایک بالشت زمین بھی ظلماً لی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات طبقوں تک کی اس زمین کو (اس کے گلے میں) طوق بنا کر ڈالے گا''۔

(صحیح مسلم: رقم الحدیث: ۴۰۲۰)

ہاں کسی کو اگر اپنے لے پالک سے محبت ہے، لگاؤ ہے، وہ اس پر شفقت کرنا چاہتا ہے، اس کی مدد کرنا چاہتا ہے، تو اپنی زندگی میں جتنا چاہے، مال و جائیداد اسے ہبہ کر سکتا ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت و رکاوٹ نہیں ہے۔ البتہ اسے ساری جائیداد دے کر حقیقی وارثوں کو (اگر کوئی ہوں) محروم کرنا، قطع رحمی ہے اور عملاً اللہ تعالیٰ کے قانون وراثت کو باطل کرنا ہے۔

شوہر کے انتقال کی خبر سننے کے بعد عدت گزار کر عورت کا دوسرا نکاح کرنا اور پھر پہلے شوہر کی واپسی

سوال: ایک شادی شدہ مرد جنگ کے دوران شدید زخمی ہو جاتا ہے اور سال دو سال تک اس کی کوئی خبر نہ ملنے پر سرکاری طور پر اس کی موت کی تصدیق کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی بیوی کسی دوسرے مرد سے شادی کر لیتی ہے۔ لیکن شادی کے کچھ عرصے بعد پہلا شوہر سلامت واپس آ جاتا ہے۔ اب ایسی صورت کے لئے حکمِ شرعی کیا ہے، شوہرِ اول کا نکاح باقی ہے یا شوہرِ ثانی کا نکاح شرعی طور پر بدستور قائم رہے گا؟ (زاہد اور عادل، مانسہرہ)۔

جواب: محض شدید زخمی ہونے یا لاپتہ ہونے سے عورت کا نکاح از خود ختم نہیں ہوتا، لیکن جب سرکاری طور پر اس کے شوہر کی وفات کی تصدیق کر دی گئی تو اب عورت ''تاریخِ تصدیقِ وفات'' سے عدتِ وفات (یعنی ۱۳۰ دن) گزارنے کے بعد نکاح سے آزاد ہے اور اپنی مرضی سے اس کا دوسرا نکاح صحیح ہے۔ لیکن اگر اس عقدِ ثانی کے کچھ عرصے بعد شوہر اول رضائے الٰہی سے صحیح سلامت واپس آ جاتا ہے تو اب اس عورت کے ساتھ اس کا عقدِ اول بدستور باقی اور قائم رہنے کا حکم دیا جائے گا۔ علامہ ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ لکھتے ہیں:

''اور جب عورت کو اس کے شوہر کی وفات کی خبر دے دی گئی اور اس نے عدت (وفات) گزار کر نکاح (ثانی) کر لیا اور اس کے ہاں بچہ بھی پیدا ہو گیا، پھر اچانک اس کا شوہر اول (صحیح سلامت) واپس آ گیا تو وہ (شرعاً) اسی کی بیوی ہے، کیونکہ وہ اس کے نکاح میں تھی اور نکاح پر ایسے اسباب لاحق نہیں ہوئے جو رشتۂ نکاح کو توڑنے کا باعث ہوں، لیکن جب تک شوہر ثانی کی عدت نہ گزار لے وہ (شوہر اول) اس سے قربت نہ اختیار کرے''۔ (بدائع الصنائع ج ۴ ص ۴۹۰)

اب رہا یہ سوال کہ شوہر ثانی کے ہاں اس عورت کا جو بچہ پیدا ہوا اس کا نسب کس کی طرف منسوب ہوگا؟ تو اس سلسلے میں علامہ کاسانی حنفی لکھتے ہیں: ''رہا بچے (کے سلسلۂ نسب) کا مسئلہ تو اس میں ائمہ کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) امام ابوحنیفہ کہتے ہیں: وہ پہلے کا ہے

(۲) اور امام ابو یوسف کہتے ہیں: اگر شوہرِ ثانی سے وطی کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ پیدا ہوا تو وہ شوہرِ اول کی طرف منسوب ہوگا اور اگر وہ بچہ چھ ماہ یا اس سے زائد عرصہ کے بعد پیدا ہوا تو اس کا نسب شوہر ثانی کی طرف منسوب ہوگا۔

(۳) امام محمد کہتے ہیں: اگر بچہ شوہرِ ثانی کی وطی کے دو سال کے اندر پیدا ہوا تو وہ شوہرِ اول کا ہے اور اگر دو سال کے بعد پیدا ہوا تو اس کا نسب شوہرِ ثانی کی طرف منسوب ہوگا"۔

(بدائع الصنائع ج ۴ ص ۴۹۱)

اس کے بعد علامہ کاسانی نے تینوں ائمہ کے دلائل کا ذکر کیا ہے، جن میں سے عقلی اعتبار سے امام ابو یوسف کا قول قوی معلوم ہوتا ہے کہ اگر شوہر ثانی کی وطی سے چھ ماہ کے اندر عورت کا بچہ پیدا ہوا تو اس کا نسب پہلے شوہر کے ساتھ متعلق ہوگا، کیونکہ چھ ماہ سے کم مدت میں کامل و تمام بچے کی ولادت متصور نہیں ہوتی، اور چھ ماہ یا اس کے بعد بچہ پیدا ہوا تو وہ شوہر ثانی کا ہوگا، کیونکہ یہ نکاح ثانی وطی بالشبہ کی مانند ہے، اور امام اعظم ابو حنیفہ کا قول رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں قوی معلوم ہوتا ہے کہ: "بچہ کا نسب اس سے متعلق ہے جس کے لئے (اس کی ماں) فراش ہے (یعنی نکاح صحیح کے ساتھ اس کی منکوحہ بیوی ہے) اور زانی کے لئے پتھر ہے (یعنی سوائے محرومی کے کچھ نہیں ہے)"۔

دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ امام اعظم کے قول کو زنا پر محمول کریں گے اور امام ابو یوسف کو قول "وطی بالشبہ" پر۔

☆☆☆......☆......☆......☆......☆☆☆

كتاب الطلاق

کورٹ میرج کے نتیجے میں رخصتی سے قبل طلاق کا حکم

سوال: روزنامہ جنگ کراچی ۴ رجنوری ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' کے زیرعنوان ایک صاحب نے مفتی صاحب سے دریافت کیا کہ ان کی صاحبزادی نے جو میڈیکل کالج کی طالبہ ہے، اپنے کالج کے ایک لڑکے کے ساتھ کورٹ میرج کرلی، بعد میں لڑکے نے اپنے والد کی فہمائش پر تین مرتبہ طلاق لکھ کر دے دی، ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی، اب لڑکا اور لڑکی اس رشتے کو دوبارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر لڑکا تین مرتبہ طلاق لکھ کر دے تو کیا طلاق واقع ہوجاتی ہے اور اس لڑکے کا دوبارہ اس لڑکی کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے، اگر ہوسکتا ہے تو کن شرائط پر؟ مفتی نظام الدین شامزئی صاحب نے جواب میں لکھا: ''رخصتی سے قبل طلاق دی جائے تو بھی ہوجاتی ہے، البتہ رخصتی سے قبل ہونے والی طلاق، ایک طلاق بائن شمار ہوتی ہے۔ اس لئے اگر یہ لڑکا اور لڑکی دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو شرعی و اخلاقی ضابطوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دوبارہ نکاح بھی کرسکتے ہیں۔'' ہمارے ہاں اس مسئلے پر بحث ہورہی ہے، ازراہ کرم رہنمائی فرمائیں کہ کیا یہ جواب بالکل درست ہے؟

(قاری محمد حنیف طیب، خطیب جامع مسجد رحمانیہ۔ گوہرآباد، کراچی)

جواب: ہماری رائے میں مفتی صاحب کا جواب مجمل ہے اور سوال میں درج صورت مسئولہ کے تمام پہلوؤں پر مشتمل نہیں ہے، اس اجمال کی وجہ سے لوگ اس جواب کو تمام ممکنہ صورتوں پر قیاس کرسکتے ہیں، حالانکہ حلال وحرام کے مسئلے میں احتیاط ازحد ضروری ہے۔ ہمارے معاشرے میں نوجوان نسل کی مخلوط تعلیم، دفاتر اور اداروں میں مرد وزن کا بلاحجاب میل جول اور ایک ہی جگہ ایک ہی جیسے حالات میں رفیق کار یا افسر وماتحت کی حیثیت سے اکٹھے کام کرنا اور عام زندگی میں آزادانہ میل ملاپ کے مواقع عام ہیں اور نہ صرف یہ کہ انہیں معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ فیشن، تجددپسندی اور لبرل ازم کا لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ ان حالات میں ایسے حوادث وواقعات کا رونما ہونا حالات اور ماحول کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔

مزید یہ کہ ''رخصتی'' کی اصطلاح جو ہمارے معاشرے میں رائج ہے، اس کا عرف عام میں

معنی یہ ہے کہ دلہن کو نکاح کے بعد باقاعدہ والدین کے گھر سے رخصت کر کے شوہر کے گھر لے جایا جاتا ہے، حالانکہ شرعاً نکاح کے ساتھ ہی وہ اس کی منکوحہ بیوی ہو جاتی ہے اور ان کے میل ملاپ پر از روئے شرع کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ لہٰذا کورٹ میرج کے بعد اگر ''زوجین'' میں ''خلوتِ صحیحہ'' قائم ہو جاتی ہے (یعنی تنہائی میں باہمی ملاپ کا ایسا موقع جس میں ازدواجی عمل میں کوئی مانع نہ ہو) تو مباشرت ہوئی یا نہ، عرفی معنی میں رخصتی عمل میں آئی ہو یا نہ، تو یہی ''خلوتِ صحیحہ'' شرعاً رخصتی کے قائم مقام ہے۔ اور موجودہ معاشرے میں جہاں لڑکی گھر سے باہر جا کر باقاعدہ نکاح یا کورٹ میرج کر سکتی ہے تو اسے ''خلوتِ صحیحہ'' کے مواقع بھی میسر آ سکتے ہیں۔ لہٰذا زوجین سے معلوم کر لیا جائے، اگر ان کے درمیان خلوت صحیحہ ہوگئی ہے تو وہ حکماً رخصتی ہی کے قائم مقام ہے اور ایسی صورت میں تین طلاق، خواہ تین جدا جملوں میں، باری باری بول کر یا لکھ کر دی ہوں، باہم جمع ہو کر مؤثر ہو جائیں گی اور ان پر بائن کا حکم نہیں لگے گا بلکہ مغلظہ شمار ہوں گی۔ اور اگر زوجین کے درمیان ''خلوتِ صحیحہ'' نہیں ہوئی، لیکن شوہر نے ایک ہی جملے میں تین طلاق بول کر یا لکھ کر دے دی ہیں تو وہ تینوں مؤثر ہوں گی، ان پر بائن کا اطلاق نہیں ہوگا اور ''تحلیل شرعی'' کے بغیر دونوں میں عقد ثانی نہیں ہو سکتا۔

مفتی صاحب نے جو ''طلاق بائن'' کا حکم لگا کر دونوں کے درمیان عقد ثانی کے جواز کا حکم بیان کیا ہے، وہ صرف اس صورت میں ہے کہ نکاح کے بعد زوجین میں ''خلوتِ صحیحہ'' نہ ہوئی ہو اور شوہر نے تین جملے الگ الگ بول کر یا لکھ کر تین طلاقیں دی ہوں کہ میں نے تمہیں (یا اپنی بیوی فلاں کو) طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی۔ تو اس صورت میں پہلی طلاق مؤثر ہو کر بائن ہو جائے گی اور دوسری دو لغو ہو جائیں گی اور دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ عدت کے اندر یا عدت کے بعد بھی نکاح کر سکتے ہیں اور آئندہ شوہر کے پاس صرف دو طلاق کا حق باقی رہے گا، خدانخواستہ آئندہ اس نے دو طلاق دے دیں تو یہ دو پہلی کے ساتھ جمع ہو کر مغلظہ ہو جائیں گی اور بیوی اس پر حرام ہو جائے گی۔

شوہر کا طلاق سے انکار، دیانت وقضا کا فرق

سوال: ایک اخبار کی جمعہ ۱۷ اگست کی اشاعت میں ایک مستفتی عاشق حسین صاحب نے مفتی

نظام الدین شامزئی صاحب سے دریافت کیا: ''میاں بیوی کے درمیان کسی بات پر تکرار ہوئی اور خاوند نے غصے میں اپنی بیوی سے تین چار مرتبہ کہا کہ میں نے تم کو طلاق دی، تم اپنے میکے چلی جاؤ، شام کو بھی یہی الفاظ دہرائے، اب شوہر کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو میکے جانے کو کہا تھا، طلاق نہیں دی، جبکہ عورت نے قرآن پر حلف اٹھایا کہ اس کے شوہر نے طلاق دی ہے۔ ان دونوں کے درمیان اس گفتگو کا کوئی گواہ بھی نہیں۔ کیا یہ طلاق واقع ہو چکی ہے؟'' مفتی نظام الدین شامزئی صاحب نے جواب دیا: ''تین طلاقیں واقع ہو گئیں۔ شوہر کے قول کا اعتبار نہیں۔ دونوں علیحدگی اختیار کر لیں۔'' ایک مولانا صاحب نے مفتی صاحب کے جواب پر اپنے تحفظ کا اظہار کیا ہے۔ ازراہِ کرم شریعتِ مطہرہ اور فقہ حنفی کی روشنی میں اس کا جواب تحریر فرمائیں''۔

(سعید الرحمٰن۔ نکیال، آزاد کشمیر)

جواب: اس مسئلے کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے چند امور کا جاننا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک دیانت اور دوسرا قضا ہے۔ ''دیانت'' سے مراد یہ ہے کہ معاملے کی اصل حقیقت کیا ہے، کیونکہ ظاہراً کوئی شخص جھوٹ بھی بولے، حقیقت حال اسے معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا ''دیانت'' سے مراد ہے: ''بندے اور رب کے درمیان معاملہ۔'' لہٰذا اگر کوئی شخص جھوٹی قسم کھا کر کوئی مفاد حاصل کر لیتا ہے یا کسی کے حق کو روک لیتا ہے یا اپنی ذات سے کسی ضرر کو دفع کر لیتا ہے، تو یہ محض دفع الوقتی ہے اور خود غرضی اور مفاد پرستی ہے۔ آخرت میں فیصلہ، اللہ تعالیٰ کی عدالت میں، حقیقت حال پر ہوگا اور اگر وہ حقیقتاً طلاق دے چکا ہے، مگر گواہ نہ ہونے اور حلفاً انکار کرنے کے بعد بیوی کو اپنے نکاح میں روک لیتا ہے تو بقیہ عمر حرام کی زندگی گزارے گا اور آخرت میں اس کی سزا پائے گا۔

''قضا'' سے مراد ہے کہ حاکم یا قاضی کی عدالت میں جب کوئی مقدمہ آتا ہے تو قاضی اصولِ عدل اور مقدمے کے جو شواہد اور قرائن اس کے سامنے ریکارڈ پر موجود ہیں، ان کی روشنی میں فیصلے کرے گا۔ اس میں بعض اوقات فیصلہ خلافِ واقعہ بھی ہو سکتا ہے، مثلاً کوئی شخص قسم کھا کر اپنے حق کا انکار کر دیتا ہے اور مدعی کے پاس ثبوتِ حق کے لئے گواہ نہیں ہیں یا کوئی مدعی جھوٹے گواہ پیش کر کے اپنے حق میں فیصلہ کرا دیتا ہے تو اس کا اخروی وبال قاضی یا حاکم پر نہیں آئے گا، بشرطیکہ اس نے اپنی پوری ذہنی اور فکری قوت و اہلیت کو صرف کر کے، عدل کے تمام تقاضوں کو پورا کر کے حق تک پہنچنے کی ہر ممکن سعی کی ہو، لیکن حقیقت حال کے اعتبار سے اس میں ناکام رہا ہو۔ ایسی صورتحال کے

بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات واضح ہیں، مثلاً آپ نے فرمایا: ہم ظاہر حال کے مطابق یعنی معاملے کے تمام شواہد وقرائن کو دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں اور باطن (یعنی حقیقتِ حال) کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں (یعنی آخرت میں اصل اور حق پر فیصلہ ہوگا، لہٰذا حیلہ اور مکروفریب یا اثرورسوخ سے کسی کا حق مارنے والے یا حرام کا ارتکاب کرنے والے اپنے ہولناک انجام کے لئے تیار رہیں) رسول اللہ ﷺ کو معاملات کے باطن اور اسرار کا علم اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ غیبی علم سے ہو جاتا تھا، لیکن دیگر کسی حاکم یا قاضی کے لئے تو ایسا نہیں ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے عدل کا ایک عمومی اصول بیان فرمایا۔

حدیث میں ہے: ''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میرے پاس مقدمے لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو دوسرے کے بہ نسبت زیادہ زورِ بیان سے پیش کرے اور میں (ظاہری شواہد کی بناء پر) اس سماعت کے اعتبار سے بالفرض اس کے حق میں فیصلہ دے دوں، (حالانکہ وہ حق پر نہ ہو) سو جس شخص کو میں اس کے بھائی کا حق دے دوں، اس کو نہ لے، کیونکہ میں اس کو آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۳۵۹)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حقائق اور معاملات کے باطن پر مطلع فرما دیا تھا، لیکن یہ بات بھی رسول اللہ ﷺ نے ایک عمومی ضابطۂ عدل کے طور پر بیان فرمائی تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ قاضی یا حاکم مقدمے کے قرائن وشواہد کی بنا پر جو فیصلہ کرتا ہے اور اجتہاد کرتا ہے، اگر اس سے حق تک پہنچنے میں خطا ہو جائے تو اگرچہ ظاہراً اور قانوناً اس کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا، لیکن قاضی کا یہ غلط فیصلہ حقیقتِ حال کو تبدیل نہیں کرتا، ممکن ہے دنیا میں کوئی شخص چند دن عیش وعشرت کے گزار لے، مگر آخرت میں فیصلہ صرف اور صرف حق پر ہوگا اور دنیا کی اس عارضی لذت پر وہ آخرت میں سزا کا حق دار ہوگا۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب آتے ہیں اصل مسئلے کی طرف، مفتی نظام الدین شامزئی صاحب کا فتویٰ درست نہیں ہے، شاید انہوں نے مسئلے پر پوری توجہ نہیں فرمائی، امید ہے وہ مطلع ہونے پر ضرور اپنے فتوے سے رجوع کریں گے۔ اسلامی نظامِ عدل کا اصل الاصول، جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا، وہ یہ ہے کہ: ''کسی دعوے کا بارِ ثبوت مدعی پر ہے (گواہ پیش کرنا اس کی

ذمہ داری ہے)اور اگر مدعی کے پاس گواہ نہیں ہیں تو مدعیٰ علیہ کو (دعوے سے انکار کی صورت میں) قسم دی جائے گی"۔

مدعی کی قسم کا اعتبار نہیں ہے۔لہذا یہاں چونکہ مدعیہ (بیوی) کے پاس (ثبوتِ دعویٰ کے لئے) گواہ نہیں ہیں، کیونکہ اس کے بقول شوہر نے جب طلاق دی تو پاس کوئی بھی نہیں تھا اور شوہر طلاق دینے سے منکر ہے،تو اب شوہر کو قسم دی جائے گی،اور اگر وہ عدالت میں یا مفتی کے سامنے قسم کھا کر کہہ دیتا ہے کہ میں نے ہرگز طلاق نہیں دی تو بیوی کا دعوائے طلاق قضاء رد ہو جائے گا اور وہ بدستور اس کی بیوی رہے گی۔اور دنیا کی کسی بھی عدالت میں مدعی کے دعوائے محض پر (یعنی جسے وہ عدالت میں شواہد سے ثابت نہ کر سکے،نہ ویسے اور نہ ہی اسے قسم دلا کر) اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیا جاتا۔لیکن یہ فیصلہ دنیوی اعتبار سے نافذ ہونے کے باوجود،عنداللہ حقیقتِ حال کو تبدیل نہیں کرتا،اگر عنداللہ بیوی سچی ہے اور شوہر انکار میں جھوٹا ہے تو اس کی زندگی حرام میں گزرے گی اور وہ آخرت میں سزا کا مستحق ہوگا۔ہماری کتب فتاویٰ میں یہی لکھا ہے جو میں نے وضاحت اور تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیا ہے۔ہمارے فقہاءِ کرام نے اس سلسلے میں ایک مسئلہ اور تحریر فرمایا ہے کہ اگر عورت کو پورا یقین ہو کہ شوہر نے اس کو تین طلاقیں دی ہیں،لیکن اس کے پاس گواہ نہیں ہیں اور شوہر حلف اٹھا کر انکار کر رہا ہے،تو اگر چہ قضاء اور قانوناً نکاح قائم ہے،لیکن اگر وہ کسی تدبیر یا خلع کے ذریعے گلو خلاصی کرا سکتی ہے تو ضرور ایسا کرے۔

تفویضِ طلاق

سوال: کیا طلاق کا حق شرعاً بیوی کو تفویض کیا جا سکتا ہے؟، یہ تفویض محدود ہوگی یا غیر محدود، مشروط ہوگی یا غیر مشروط،تفصیل سے تحریر کیجئے۔(ام کلثوم ،گلشن اقبال ،کراچی)

جواب: طلاق،اصالتاً اور بالذات شوہر کا حق ہے اور وہ جب چاہے،اسے استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن شوہر یہ" حق طلاق" بیوی کو تفویض بھی کر سکتا ہے،خواہ نکاح کے وقت کرے یا بعد میں کسی وقت،اگر شوہر اپنی بیوی سے یہ کہے کہ تو جب چاہے یا جب کبھی چاہے یا جس وقت چاہے یا جس وقت بھی چاہے،اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے،تو یہ حقِ تفویضِ طلاق دائمی اور موقت ہوگا،جب تک وہ اس شوہر کے نکاح میں ہے،اس حق کو استعمال کر سکتی ہے۔البتہ اگر بیوی کسی خاص موقع پر

باہمی تکرار کے دوران شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اور وہ جواباً کہے کہ: ''تم اپنے آپ کو طلاق دے دو''، یا یہ کہے کہ ''تمہارا معاملہ تمہارے اختیار میں ہے''، یا یہ کہ ''تم اپنا فیصلہ خود کرلو وغیرہ اور یہ کلمات طلاق کی نیت سے کہے تو اگر بیوی اسی مجلس میں یہ حق استعمال کرلے، یعنی یوں کہے کہ ''میں نے اپنے آپ کو طلاق دی''، ''میں نے اپنے نفس کا خود فیصلہ کرلیا'' وغیرہ تو طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر اس مجلس میں یہ حق استعمال نہ کیا تو بعد میں اسے یہ حق حاصل نہیں رہے گا۔

عدالتی طلاق

سوال: عدالتی طلاق اور شرعی طلاق میں کیا فرق ہے؟ (عطیہ۔ ناظم آباد)

جواب: عدالت کے ذریعے جج یا قاضی زوجین کے درمیان جو تفریق (SEPARATION) کرتے ہیں، وہ طلاق نہیں کہلاتی، وہ نکاح کا فسخ (DISSOLUTION OF MARRIAGE) کرنا کہلاتا ہے۔ ہماری عدالتیں جو عدالتی تنسیخ نکاح پر خلع کا اطلاق کرتی ہیں، یہ بھی درست نہیں ہے، کیونکہ خلع فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے، بیوی اپنے مہر یا مالی حق سے دستبردار ہوتی ہے اور اس کے عوض شوہر اسے طلاق دیتا ہے جو طلاق بائن ہوتی ہے۔ عدالت اپنے اختیار سے شوہر کی مرضی کے خلاف نکاح کو فسخ کرتی ہے۔ اگر اس عدالتی فسخ نکاح میں شرعی حدود کو ملحوظ رکھا گیا ہے تو یہ شریعت کے مطابق ہے، ورنہ نہیں۔

ارادۂ طلاق، طلاق نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ مورخہ ۱۶ رمارچ ۲۰۰۱ء بروز جمعہ ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' (روزنامہ جنگ کراچی) میں درج ذیل سوال شائع ہوا ہے: ''زید کی شادی زینب سے ہوئی، پھر زید نے فاطمہ سے نکاح کرنے کی کوشش کی مگر فاطمہ نے یہ شرط رکھی کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے۔ زید نے جھوٹ کے طور پر فاطمہ سے کہا کہ میں نے پہلی بیوی کے لئے طلاق لکھ کر رکھ دی ہے جبکہ اس نے لکھ کر نہیں رکھی اور زید نے فاطمہ سے کہا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا، میری طرف سے مطمئن ہوجاؤ، میں اس کو طلاق دے دوں گا اور آپ سمجھ لیں کہ میں نے اس کو طلاق دے دی۔ یہ الفاظ زید نے کئی مرتبہ دہرائے۔ شریعت زید کے ان الفاظ کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ کیا ان الفاظ سے اس کی پہلی بیوی کو طلاق

واقع ہوگئی یا نہیں؟''

ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی صاحب نے اس کے جواب میں لکھا کہ طلاق واقع ہوگئی چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''صورت مسئولہ میں زید نے کئی مرتبہ اپنی بیوی کے بارے میں یہ الفاظ کہے کہ ''میں نے اس کو طلاق دے دی'' لہٰذا زید کی بیوی پر تین طلاق واقع ہو چکی ہیں اور وہ زید پر حرمت مغلظہ کے ساتھ حرام ہو چکی ہے اب رجوع کی کوئی صورت نہیں اور بغیر تحلیل شرعی کے زید اور زینب کا آپس میں نکاح بھی نہیں ہوسکتا۔'' (روزنامہ ''جنگ'' کراچی)

صورت مسئولہ میں ازروئے شریعت کیا واقعی طلاق واقع ہو چکی ہے؟ برائے مہربانی جلد از جلد جواب عنایت فرما کر ممنون و ماجور ہوں۔ (کامران قریشی۔ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی صاحب کا جواب درست نہیں ہے، غالباً انہوں نے سرسری انداز میں جواب دے دیا ہے اور مسئلے کی باریکی پر توجہ نہیں فرمائی۔ شوہر کا یہ کہنا کہ: ''میں اس کو طلاق دے دوں گا''، یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے، اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ طلاق انشاءات میں سے ہے یعنی شوہر واضح طور پر ارادۂ طلاق سے کہے کہ: میں تمہیں طلاق دیتا ہوں (بصیغۂ حال) یا ''میں نے تمہیں طلاق دی'' (بصیغۂ ماضی)۔ اور شوہر کا یہ کہنا کہ: ''آپ سمجھ لیں کہ میں نے اس کو طلاق دے دی''، اس سے بھی طلاق واقع نہیں ہوتی کیونکہ یہ انشاء طلاق نہیں ہے۔ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز سے ایک طویل استفتاء میں دریافت کیا گیا کہ شوہر نے لکھا: ''اس خط کو بطور طلاق نامہ کے تصور فرمائیں''، انہوں نے جواب دیا: ''صالح ایقاع طلاق نہیں کہ بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں'' کے صاف یہ معنی کہ حقیقت میں ''طلاق نامہ'' نہیں، آگے انہوں نے فتاویٰ قاضی خان کی عبارت سے استدلال کیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ: '' (ترجمہ) ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا: مجھے طلاق دے دو، شوہر نے کہا: سمجھو دے دی (دادہ انگار او کردہ انگار)، طلاق واقع نہیں ہوئی، خواہ اس نے نیت بھی کی ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے عربی زبان میں کہا ہو: ''احسبی انت طالق'' (یعنی سمجھو کہ تمہیں طلاق دے دی)، خواہ اس نے یہ الفاظ کہے ہوں اور طلاق کی نیت بھی کی ہو''۔

(فتاویٰ قاضی خان، کتاب الطلاق، ج ۱ ص ۳۱۰ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ، فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۶۳۱

مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

طلاق ثلاثہ کا مسئلہ

سوال: آپ سے ازدواجی زندگی کے ایک مسئلے کے متعلق معلوم کرنا ہے میری شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں میرے دو لڑکے ہیں، ایک لڑکا 7 سال کا ہے اور دوسرا لڑکا 4 سال کا ہے۔ میرے شوہر غصے کے بہت تیز ہیں، میں نے ہمیشہ ہر معاملے میں ان کے ساتھ صبر و تحمل کے ساتھ وقت گذارا ہے۔ میں اپنے شوہر کا ساتھ دینے کے لئے اسکول میں ٹیچر کے طور پر پڑھا رہی تھی لیکن کچھ دنوں سے ان کے ذہن میں میرے متعلق شکوک و شبہات آرہے ہیں جس کی وجہ سے میں نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی ،لیکن پھر بھی سکون نہیں تھا۔ تقریباً 15 ردن پہلے ہفتہ کی رات کو 2:50 کے وقت میں سو رہی تھی، میرے شوہر نے مجھے پکڑ کر اٹھایا اور مختلف الزامات لگا کر کہا میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، تقریباً 8 ر مرتبہ انہوں نے طلاق کا لفظ استعمال کیا اور جب میں بہت رونے لگی تو کہنے لگے کہ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا اور میں قرآن پاک اٹھانے کو تیار ہوں، مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ میں نے طلاق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں، کیونکہ میرے شوہر اس بات سے انکاری ہیں کہ انہوں نے طلاق کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اللہ اور رسول ﷺ کے مطابق آپ یہ بتائیں کہ یہ طلاق واقع ہوئی کہ نہیں۔ میں اس سلسلہ میں بہت پریشان ہوں، اپنی والدہ کے گھر آگئی ہوں۔ میرے شوہر مجھے بہت تنگ کر رہے ہیں۔ آپ کتاب و سنت کی روشنی میں میرا مسئلہ حل کریں۔ (فرحین عظیم رضوی، R-618 بلاک 14 ایف بی ایریا کراچی)

جواب: جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے، خواہ ارادتاً سنجیدگی سے دے یا بطورِ مذاق دے، کوئی گواہ ہو یا نہ ہو، عنداللہ طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ثلث جدھن جد وھزلھن جد النکاح والطلاق والرجعۃ.

''تین چیزیں ایسی ہیں (کہ وہ ہر بہر طور نافذ اور مؤثر ہوتی ہیں) سنجیدگی سے کہی جائیں تب بھی اور مذاق میں کہی جائیں تب بھی، یعنی نکاح، طلاق اور رجعت''۔

(ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

اگر کوئی شوہر تین طلاقیں دے کر منکر ہو جاتا ہے اور طلاق کے وقت کوئی گواہ موجود نہیں تھے

اوراس کے بعد بدستوراسی مطلقہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا ہے تو یہ شرعاً حرام اور زنا کی زندگی ہے، کیونکہ خلق کو تو دھوکا دیا جاسکتا ہے، خالق کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔

صورتِ مسئولہ میں سائلہ طلاقِ ثلاثہ کی مدعیہ ہے اور شوہر منکر ہے اور مدعیہ کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے گواہ نہیں ہیں، وہ اسے قائل کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور آخرت کے عذاب سے ڈرو، اگر انہیں خوف خدا آجائے تو شریعت پر عمل کریں، اور اگر خدانخواستہ وہ بدستور انکار پر ڈٹے رہیں تو شوہر کے انکار اور گواہوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قضاءً حرمت اور تفریق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، لہٰذا بظاہر حکماً نکاح قائم رہے گا۔ اگر سائلہ کو کامل یقین ہے کہ تین طلاقیں دے دی گئی ہیں تو جب تک اس کے بس میں ہے، اسے اپنے نفس پر قابو نہ دے، اور اگر وہ عاجز و بے بس ہوجائے تو عنداللہ گناہگار نہیں ہوگی۔

طلاق کا مسئلہ

سوال: میرے شوہر نے پہلے مجھ کو ایک مرتبہ طلاق دے دی اس کے بعد جب میں قاری صاحب سے اس مسئلے کے بارے میں معلوم کرنے گئی تو انہوں نے کہا کہ اپنے شوہر کو بھیج دیں تاکہ میں ان سے بھی معلوم کرلوں دو دن کے بعد جب میں نے ان سے کہا کہ آپ کو قاری صاحب نے یاد کیا ہے تو غصے میں آگئے اور کہا کہ تم ان ہی چکروں میں پڑی رہو تم کیا چاہتی ہو جو باقی طلاق ہے وہ بھی دے دوں میں تم کو بہت جلد طلاق دے دوں گا، میں نے کہا کہ میں نے تو صرف آپ سے یہ کہا ہے کہ قاری صاحب نے آپ کو بلایا ہے پھر کہا کہ جاآب تو میں نے ہزار مرتبہ دے دیا لاکھ مرتبہ دے دیا جاآب تو ہوگیا پھر دو یا پانچ منٹ کے بعد کہا کہ میں نے تم کو طلاق نہیں دیا ہے میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی...... صورت مسئولہ میں طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اور کتنی واقع ہوئیں۔

(ایک خاتون معرفت مولانا علی عمران صدیقی، خطیب مسجد بیت السجود۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: پہلی مرتبہ آپ کے شوہر نے آپ کو ایک طلاق دی جو واقع ہوگئی، اس میں انہیں رجوع کا حق حاصل تھا، آپ دونوں اس کے بعد بدستور میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے تو رجوع ہوگیا۔ بعد میں مذاکرۂ طلاق کے موقع پر کہا کہ: ''جاآب تو میں نے ہزار مرتبہ دے دیا، لاکھ

مرتبہ دے دیا، جا اب تو ہو گیا''۔ تو اس سے بقیہ دو طلاق بھی واقع ہو گئیں۔ اب آپ دونوں کا ازدواجی تعلق ختم ہو گیا ہے۔ حدیث پاک میں ہے طلاق، نکاح اور عتاق (یعنی غلام کو آزاد کرنا، جب تک غلامی کا رواج تھا) کے الفاظ سنجیدگی سے کہے جائیں یا مذاق کے طور پر، بہر صورت نافذ العمل اور موثر ہو جاتے ہیں، بعد میں نادم ہونے یا واپس لینے سے واپس یا غیر موثر نہیں ہوتے، اسی لئے حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ: ''مباح کاموں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ کام طلاق ہے'' یہ ایسے ہی ہے جیسے بندوق یا ریوالور کا ٹریگر سنجیدگی سے دبایا جائے یا محض مذاق کے طور پر، اگر اس میں گولی ہے تو چل جائے گی اور جس نشانے پر لگے گی، اسے ضرب لگے گی۔ اردو زبان میں غیظ و غضب اور غصے کے اظہار کے لئے لفظ طلاق کے علاوہ اور بہت سے الفاظ ہیں، یہ لوگوں کی کم علمی، نادانی اور جہالت ہے کہ انہیں اظہارِ مردانگی کے لئے صرف لفظ طلاق ہی یاد رہتا ہے، غصہ تو ویسے بھی شرعاً ناپسندیدہ ہے، اس لئے حدیث پاک میں ہے کہ غصہ آئے تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہوا ہو تو لیٹ جائے۔ غصے سے مغلوب ہو جانا یہ محض نفسِ امارہ کی اطاعت ہے، اللہ تعالیٰ غصہ ضبط کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

لکھ کر دینا ''طاق دیا ہوں''

سوال: میں نے بقائمی ہوش و حواس اپنی بیوی کو لکھ کر دیا'' طاق دیا ہوں، طاق دیا ہوں، طاق دیا ہوں''۔ ایک مفتی صاحب نے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ'' لفظ طلاق بولنے میں عالم جاہل سب برابر ہیں، لہٰذا بیوی پر تین طلاق واقع ہو گئیں، اور وہ بحرمتِ صریحہ مغلظہ حرام ہو گئی اور اب اس کے ساتھ تحلیل شرعی کے بغیر نکاح جائز نہیں ہے۔'' دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ فتویٰ درست ہے یا شریعت میں دونوں کے دوبارہ ملاپ کی گنجائش ہے؟ (منظور حسین۔ عزیز آباد، کراچی)

جواب: مفتی صاحب کا یہ فتویٰ درست نہیں ہے۔ اپنی بیوی کو تین مرتبہ'' طاق دیا ہوں'' کہنے یا لکھنے سے طلاق واقع ہی نہیں ہوئی اور وہ بدستور آپ کے نکاح میں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ ج ۱ ص ۳۵۷ پر ہے'' اور اگر (لفظ طلاق میں سے) صرف ل کو حذف کر کے کہا کہ: '' تجھے طاق ہے'' تو طلاق واقع نہیں ہو گی، خواہ اس نے نیت بھی کی ہو اور اگر کہا: تجھے طاق ہے تو کچھ واقع نہیں ہو گا، خواہ نیت بھی کی ہو، کیونکہ عرب میں کلام کے آخری حرف کو حذف کرنا عادت

ہے، اور فقیہ ابوالقاسم نے کہا: اگر کوئی عجمی شخص فارسی میں آخری حرف کو حذف کر کے (طلا) کہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی، خواہ نیت بھی کی ہو، کیونکہ لفظ کے آخری حرف کو حذف کرنے کی عجم میں عادت ہی نہیں ہے۔

کسی شرط کے ساتھ معلق کی گئی طلاق سے کیسے نجات حاصل کی جائے؟

سوال: آپ کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو یہ الفاظ ادا کر دیے ہیں کہ ''اگر تمہاری والدہ میری غیر موجودگی میں میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں آئی تو تمہیں تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔'' برائے مہربانی اس سلسلے کا حل تحریر فرمادیں تاکہ میری بیوی کی والدہ میرے گھر آسکے۔ (ع۔ن، کراچی)

جواب: موجودہ صورتحال میں اگر آپ کی بیوی کی والدہ (ساس) آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی عدم موجودگی میں آپ کے گھر آئیں تو ان پر تین طلاق واقع ہو جائیں گی۔

اگر آپ اس مصیبت سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔ تو یہ تدبیر کریں کہ اپنی بیوی کو ایک طلاق رجعی دے دیں اور دورانِ عدت ان سے عملاً یا قولاً رجوع نہ کریں، عدت گزرتے ہی یہ طلاق بائن ہو جائے گی۔ عدت وہ آپ ہی کے مکان پر گزاریں گی اور اگر آپ نے اب تک ان کا مہر ادا نہیں کیا تو مہر بھی آپ کو ادا کرنا ہوگا۔ عدت گزرنے کے بعد آپ کی ساس آپ کی عدم موجودگی میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے گھر آجائیں۔

چونکہ اس وقت آپ کی بیوی آپ کے نکاح سے خارج ہوں گی اس لئے یہ شرط غیر موثر ہو جائے گی۔ بعدازاں آپ دونوں باہمی رضامندی سے عقدِ ثانی کر سکتے ہیں اس عقد کے لئے آپ کو مہر بھی باہمی رضامندی سے مقرر کرنا ہوگا، اس عقدِ ثانی کے بعد آپ کی ساس آپ کی موجودگی یا غیر موجودگی میں بلا روک ٹوک آپ کے گھر آسکتی ہیں۔ لیکن اب آئندہ کے لئے آپ کے پاس صرف دو طلاق کا حق باقی رہے گا۔

عدالتی خلع کا شرعی حکم

سوال: زید کی بیوی نے خلع حاصل کرنے کے لئے زید کو عدالت کے ذریعے نوٹس بھیجا، لیکن زید نے کوئی جواب نہ دیا، آخرکار عدالت نے عورت کو خلع دے دیا اب زید اور اس کی بیوی جس

نے خلع لے رکھا ہے دوبارہ ازدواجی تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں کیا حلالہ شرعی کے بغیر دوبارہ ازدواجی تعلقات قائم ہو سکتے ہیں؟ (احسان احمد۔ شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

جواب: عدالت اپنے اختیار سے جس نکاح کو فسخ کرتی ہے اسے فقۂ اسلامی میں ''فسخِ نکاح'' یا ''تنسیخِ نکاح'' کہا جاتا ہے۔ خلع ''رشتۂ ازدواج کے اس انقطاع کو کہتے ہیں جو زوجین اپنی رضا مندی سے کرتے ہیں اس میں شوہر مالی بدل کے عوض طلاق پر راضی ہوتا ہے، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ بیوی شوہر سے یہ کہے کہ میں اپنے مہر کے مطالبے سے کلی یا جزوی طور پر دستبردار ہوتی ہوں، میری گلو خلاصی کردو، اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے پاس سے کوئی مالی معاوضہ ادا کرے۔ اس کا ذکر قرآنِ مجید میں اس طرح ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ

(البقرہ:۲۲۹)

''اور تمہارے لئے اس (مہر یا حصہ) سے کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے جو تم ان کو دے چکے ہو۔ مگر جب دونوں فریقوں کو یہ خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، سو (اے مسلمانو) اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ یہ دونوں اللہ کی حدود قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت نے (اپنی گلو خلاصی کے لئے) جو بدل خلع دیا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے''۔

عدالتی فسخ نکاح ہو یا زوجین کی باہمی رضامندی سے مالی بدل کے مقابل خلع، یہ دونوں ایک طلاق بائن کے حکم ہیں بشرطیکہ ان میں تین طلاق کے الفاظ صریح استعمال نہ کئے گئے ہوں، اور دونوں صورتوں میں وہ باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں اور ایسی صورت میں آئندہ شوہر کے پاس صرف دو طلاق کا حق باقی رہے گا اور کسی بھی وقت خدانخواستہ شوہر نے دوبارہ حق طلاق استعمال کیا تو یہ پہلی طلاق بائن اس کے ساتھ جمع ہو کر موثر ہو جائے گی۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ شریعت میں جہاں بھی سابق زوجین کے لئے عقدِ ثانی کی گنجائش رکھی گئی ہے وہاں مہر کا تعین اور ادائیگی ازسرِ نو ہوگی باقی ہم فیملی کورٹس کے فیصلوں کے بارے میں کوئی عمومی حکم یا رائے نہیں دیتے جب تک مقدمے کی ساری کارروائی کا مطالعہ نہ کرلیں اور جن وجوہِ قانونی پر فیصلہ صادر کیا گیا ہے اس کا انفرادی کیس کے طور پر مطالعہ نہ کرلیں کیونکہ وجوہ و اسباب

اور دلائل و شواہد مقدمات میں مختلف ہوتے ہیں۔ ہمارے مشاہدے میں ہے کہ ماتحت فیملی کورٹس کے بعض جج تنسیخ نکاح کے مقدمات میں فقہی اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے بلکہ وہ کماحقہ ان سے واقف بھی نہیں ہوتے۔

خاتون کا نکاح ہوا، رخصتی نہیں ہوئی اور اسے طلاق ہوگئی یا شوہر کا انتقال ہوگیا، عدت و مہر کے احکام

سوال: ایک خاتون کا نکاح ہوا ابھی رخصتی نہیں ہوئی کہ اسے طلاق ہوگئی یا شوہر کا انتقال ہوگیا تو اس کی عدت اور مہر کے شرعی احکام کیا ہوں گے، (اکرام اللہ۔ دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب: کسی خاتون کا نکاح ہوا اور رخصتی سے پہلے ہی طلاق ہوگئی تو وہ نصف مہر کی حقدار ہوگی اور اس پر کوئی عدت لازم نہیں ہے، وہ طلاق ہوتے ہی آزاد ہے اور اپنی آزادانہ مرضی سے کہیں بھی نکاح کرسکتی ہے، اور اگر اس کے شوہر کا قضاءِ الٰہی سے انتقال ہوگیا ہے تو وہ پورے مہر کی حقدار ہوگی اور اسے عدت وفات گزارنی ہوگی، قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (البقرہ: ۲۳۴)

"اور جو لوگ تم میں سے وفات پاجائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن تک روکے رکھیں"۔

درمختار میں ہے:

اَلنِّكَاحُ يَتَأَكَّدُ عِنْدَ وَطْئٍ اَوْ خَلْوَةٍ صَحَّتْ اَوْ مَوْتِ اَحَدِهِمَا

"وطی یا خلوت صحیحہ یا زوجین میں کسی ایک کی وفات سے نکاح موکد ہوجاتا ہے"۔

رخصت سے محض "رخصتِ عرفی" ہی مراد نہیں ہے بلکہ زوجین کے درمیان اگر ایسی تنہائی (Privacy) قائم ہوجائے جس میں عمل ازدواج میں رکاوٹ نہ ہو تو اسے خلوتِ صحیحہ کہتے ہیں اور یہ رخصت ہی کے قائم مقام ہے۔ شوہر کی وفات کی صورت میں رخصتی نہ ہونے کے باوجود بیوی پر چار ماہ دس دن عدت وفات گزارنا لازم ہے اور عورت پورے مہر اور ایامِ عدت کے نان نفقہ اور وراثت کی بھی حقدار ہوگی۔ اسی طرح اگر رخصتی سے قبل بیوی کا انتقال ہوگیا تو اس کا پورا مہر شوہر

کے ذمہ ہے اور وہ اس خاتون کے ترکے میں شامل ہوگا، اور اسی طرح مرد بھی اس کے ترکے میں سے وراثت پائے گا۔

طلاق نامے پر جعلی یا فرضی دستخط سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال: (خلاصہ) میری بیٹی سسرال کے ہاں سے ناراض ہوکر میرے گھر آ گئی۔ چند روز بعد ہمیں رجسٹرڈ ڈاک سے ''طلاق نامہ'' موصول ہوا، جب اس سلسلے میں ہم نے اپنی بیٹی کے شوہر سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے حلفیہ بیان کیا کہ میں نے طلاق ہرگز ہرگز نہیں دی، ہمارے کہنے پر، اسٹامپ پیپر پر ایک حلفیہ اقرار نامہ لکھ کر دیا کہ میں نے اپنی بیوی کو کبھی طلاق نہیں دی، وہ بدستور میری بیوی ہے اور یہ طلاق نامہ جعلی ہے، یہ کسی نے فتنہ انگیزی کی ہے، ان کے شناختی کارڈ اور دیگر دستاویزات پر جو ان کے دستخط ثبت ہیں، وہ اس طلاق نامے والے دستخط سے بالکل مختلف ہیں۔ اب میرے شوہر کے والد صاحب کا مطالبہ ہے کہ فتویٰ لا کر دو کہ طلاق واقع نہیں ہوئی اور نکاح باقی ہے، لہٰذا آپ بتائیں کہ شرعی حکم کیا ہے؟ (م۔ن۔ص، دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ شوہر اپنے حلفیہ بیان میں طلاق دینے یا مذکورہ طلاق نامے پر دستخط کرنے سے منکر ہے اور زبانی یا تحریری طلاق کا کوئی گواہ بھی نہیں ہے، اس لئے طلاق واقع نہیں ہوئی اور طلاق نامے پر دستخط کا بدلا ہوا ہونا بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ اس کا بیان درست ہے، لہٰذا شرعاً ان کا نکاح حسبِ سابق قائم ہے اور وہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ البتہ بالفرض کوئی شخص شوہر کے اصلی دستخط کے ہم شکل دستخط کر بھی لیتا اور صورت مسئولہ یہی ہوتی جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ تب بھی طلاق واقع نہ ہوتی، کیونکہ خط، خط کے مشابہ ہوسکتا ہے۔ جعلی دستاویزات و طلاق نامے تحریر کر کے، فتنہ انگیزی کر کے، شر و فساد برپا کر کے یا جادو ٹونے کر کے میاں بیوی میں تفریق کی کوشش کرنا، یہ ناپاک شیطانی کام ہے، اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا خوف کرنا چاہئے اور اس طرح کے شیطانی کاموں کے اخروی عذاب اور وبال سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ ایسے لوگوں کو فرصت ملے تو سورۂ بقرہ آیت: ۱۰۲ کا ترجمہ اور اس کی تفسیر پڑھ لیں۔

کیا ماں کے کہنے پر شرعاً بیوی کو طلاق دینا ضروری ہے؟

سوال: اسلام میں ماں کا کیا مقام ہے اس کے کہنے پر بیٹا اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے یا طلاق دے

سکتا ہے۔اس بات کا پس منظر کیا ہے اور کس نوعیت اور نوبت پر ایسا کرنا جائز ہے۔کیونکہ حالات یہ ہیں کہ ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے حتیٰ کہ بیرون ملک ملازمت بھی چھوڑ کر پاکستان واپس آ گیا ہوں صرف اس وجہ سے کہ میاں بیوی ساتھ رہیں۔میری والدہ نے میری بیوی کی ذاتی ڈائری ہماری غیر موجودگی میں پڑھ لی اور اس کے بعد سے تو انہیں بالکل برداشت نہیں ہوا اور جھگڑا کرنے کے بعد بیوی کو اس کے ماں باپ کے گھر بھیج دیا ہے۔میری بیوی کی ڈائری لکھنے کی عادت پرانی ہے اور اس نے میرے گھر والوں کے ساتھ جو روزمرہ ہونے والی باتیں ہیں، وہ سب تحریر کرتی رہتی تھی جس میں گھر والوں کا سلوک اور ان کا رویہ شامل ہے، یہ باتیں وہ مجھے بھی بتاتی رہتی تھی۔میری والدہ اس پر اٹل ہیں کہ وہ میری بیوی کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتیں اور کہتی ہیں تم چاہو تو اس کے ساتھ رہو اور تم بھی چلے جاؤ۔جبکہ میری والدہ مجھے اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کر رہی ہیں اور وہ یہ کہتی ہیں کہ یہ میری طرف سے فائنل ہے۔جبکہ میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا اور میں اپنی بیوی سے یہ وعدہ بھی کر چکا ہوں کہ میں اس کو ہرگز طلاق نہیں دوں گا۔مہربانی فرما کر اسلامی فقہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا تفصیلی حل بیان فرمائیں نیز ہم دونوں کے حق میں بہتری کی دعا بھی فرمائیں۔

(فرمان عزیز c-4 بومیاوالا زبلاک نمبر 2 گلستان جوہر کراچی نزد کراچی یونیورسٹی)

جواب: بلاشبہ اسلام میں والدین کا بڑا مقام اور مرتبہ ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (لقمان: ۱۴۔۱۵)

''کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو، (تم سب کو) میری ہی طرف لوٹنا ہے، اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک ٹھہرا جس کا تجھے کچھ علم نہیں، تو (اس مطالبہ معصیت میں) ان کی اطاعت ہرگز نہ کرو، (لیکن اس کے باوجود) دنیا میں ان سے حسن سلوک کرتے رہو''۔

اس آیت میں اولاد کو پابند کیا گیا ہے کہ اگر بدقسمتی سے کسی کے والدین اس پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے لئے دباؤ ڈالیں، تو معصیت الٰہی میں تو ان کی اطاعت لازم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اولاد کو دنیوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، یعنی

مشرک والدین کے ساتھ بھی دنیا میں حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔غور کا مقام ہے کہ جب مشرک والدین کے ساتھ بدسلوکی سے منع کیا گیا ہے تو مومن والدین کی تکریم وتعظیم اوراطاعت کس درجہ شریعت کو مطلوب ہوگی۔

رسول الله ﷺ کے ارشادات گرامی ہیں:

عن ابی هريرة قال :قال رجل يا رسول الله !من احق بحسن صحابتی ،قال :امک ،قال: ثم من ؟ ،قال امک ،قال ثم من؟:،قال امک، قال ثم من؟، قال ابوک، (الصحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۹۷۱،مسلم، رقم الحدیث:۲۵۴۸ مشکوٰۃ :رقم الحدیث، ۴۹۱۱)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول الله ﷺ!میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟،آپ نے فرمایا: تمہاری ماں،اس نے عرض کیا: پھر کون؟،فرمایا: تمہاری ماں ،اس نے عرض کیا: پھر کون؟،فرمایا: تمہاری ماں،اس نے (چوتھی بار) دریافت کیا: پھر کون؟،فرمایا: تمہارے باپ''۔

عن ابی هريرة قال:قال رسول الله ﷺ: رغم انفهٗ رغم انفهٗ رغم انفهٗ، قيل: من يا رسول اللّٰه! قال من ادرک والديه عند الكبر احدهما او كلاهما ثم لم يدخل الجنة ،(مسلم رقم الحديث: ۲۵۵۱، مشكوٰة،رقم الحديث: ۴۹۱۲)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول الله ﷺ نے فرمایا: وہ شخص ذلیل ورسوا ہوا، وہ شخص ذلیل ورسوا ہوا، وہ شخص ذلیل ورسوا ہوا،عرض کیا گیا: کون یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم)؟،آپ نے فرمایا: جس نے اپنے ماں باپ دونوں یا کسی ایک کو بڑھاپے میں پایا اور پھر (ان کی خدمت کر کے) دخول جنت کا حق دار نہ بن سکا''۔

عن عبد الله بن عمرو قال :قال رسول الله ﷺ: رضى الرب فى رضى الوالدين وسخط الرب في سخط الوالدين

(ترمذی،رقم الحدیث:۱۸۹۹ مشکوٰۃ،رقم الحدیث:۴۹۲۷)۔

''عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ماں باپ کی رضا میں رب کی رضا اور ماں باپ کی ناراضگی رب تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے''۔

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: من اصبح مطيعا لله في والديه اصبح له بابان مفتوحان من الجنة وان كان واحدا فواحدًا ومن اصبح عاصيا لله في والديه اصبح له بابا ن مفتوحان من النار وان كان واحد فواحدا ،قال رجل :وان ظلماه؟،قال وان ظلماه ان ظلماه ،وان ظلماهٗ (مشكوٰة:رقم الحديث : ۴۹۴۳،البيهقي في الشعب ،رقم الحديث : ۷۹۱۶)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ والدین کی فرماں برداری کے بارے میں اللہ کا حکم ماننے والا ہو تو اس کیلئے جنت کے دو دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی حیات ہے، تو اس کے لئے جنت کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اور جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ اطاعت والدین کے بارے میں اللہ کا حکم نہ مان رہا ہو تو اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی زندہ ہے تو اس کے لئے جہنم کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اس شخص نے عرض کیا اگر چہ وہ (دونوں) ظلم کریں؟، آپ ﷺ فرمایا: اگر چہ وہ ظلم کریں، اگر چہ وہ ظلم کریں، اگر چہ وہ ظلم کریں''۔

عن ابی امامة قا ل رجل: يا رسول الله: ما حق الوالدين علٰى ولدهما؟ قال هما جنتک ونارک، (ابن ماجه، رقم الحديث: ۳۶۶۲ مشكوٰة، رقم الحديث: ۴۹۴۱)

''حضرت ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! والدین کا اولاد پر کیا حق ہے؟، آپ نے فرمایا: وہ (اطاعت کی صورت میں) تمہاری جنت ہیں، اور (نافرمانی کی صورت میں) تمہاری دوزخ ہیں''۔

عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قال: ما من ولد بار ينظر الى والديه نظرة رحمة الا كتب الله بكل نظرة حجة مبرورة، قالوا؛ او ان نظر

كل يوم مائه مرة، قال: نعم الله اكبر او اطيب، (مشكوة، رقم الحديث: ۴۹۴۴، البيهقي في الشعب، رقم الحديث: ۷۸۵۹)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بھی نیک اولاد اپنے ماں باپ کے چہرے کی طرف رحمت (ومحبت) سے ایک نظر دیکھ لے، تو اللہ تعالیٰ (اس کے نامہ اعمال میں) ایک حج مقبول کا ثواب لکھ دیتا ہے، (صحابہ کرام نے) عرض کیا: اگر وہ ہر روز سو بار دیکھے تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں اللہ سب سے بڑا ہے اور (اس کی ذات) بہت پاک ہے، (یعنی اس کے خزانوں میں کیا کمی ہے اور اس کا فیضان کرم بھی فراواں ہے)''۔

ان آیات مبارکہ واحادیث کریمہ سے یہ امر تو ثابت ہوتا ہے کہ والدین اولاد پر ظلم وزیادتی بھی کریں تو اولاد کو ان کے ظلم وزیادتی کا جواب دینے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ انہیں سراپا اطاعت ونیاز بنے رہنا چاہیے، جھڑکنا تو در کنار، انہیں اف تک کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ والدین کو اولاد پر ظلم وزیادتی کا کھلا لائسنس دیا جارہا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب حضرت نعمان بن بشیر کے والد حضرت بشیر نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے اپنے بیٹے نعمان کو ایک غلام ہبہ کیا ہے، آپ اس پر گواہ بن جایئے، تو آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: کیا تم نے اپنی دیگر اولاد کو بھی اسی طرح ہبہ کیا ہے، انہوں نے عرض کیا: نہیں، تو آپ نے فرمایا: ''فانی لا اشهد علی جور'' تو میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا آپ نے فرمایا: لا تشهدنی علی جور: مجھے ظلم پر گواہ نہ بناؤ۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۷۰:۴۰۷۲)۔ اس حدیث میں باپ کی طرف سے اولاد کے درمیان عدم مساوات کے سلوک کو ظلم قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۙ﴿۸﴾ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ اور جب (قیامت میں) زندہ درگور کی گئی (لڑکی) سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں قتل کی گئی، (التکویر: ۸،۹)''۔ یعنی ماں باپ کو اپنے ناروا ظلم کا حساب دینا پڑے گا۔

اب آتے ہیں زیر بحث مسئلہ کی جانب کہ آیا ازروئے شریعت بیٹے پر لازم ہے کہ والدین کے حکم پر اپنی بیوی کو طلاق دیدے، تو اولاً گزارش یہ ہے کہ طلاق اگرچہ ناگزیر صورت حال میں ایک مشروع ومباح امر ہے، لیکن یہ تمام مباح امور میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن ابن عمران النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ابغض الحلال الی اللہ تعالیٰ الطلاق (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۲۱۷۸)

"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (تمام) حلال امور میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے ناپسندیدہ امر طلاق ہے"۔

عن معاذ بن جبل قال :قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا خلق اللہ شیئاً علیٰ وجہ الارض ابغض الیہ من الطلاق

(رواہ الدارقطنی، رقم الحدیث:۳۹۳۹)

"حضرت معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ ہو"۔

عن ثوبان قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ایما امرأۃ سألت زوجہا طلاقاً فی غیر ما بأسٍ فحرامٌ علیہا رائحۃ الجنۃ، (ترمذی، رقم الحدیث: ۱۱۸۷، ابو داؤد، رقم الحدیث: ۲۲۲۱، ابن ماجہ ۲۱۴۴)

"حضرت ثوبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو عورت بغیر کسی ناگزیر مجبوری (اور ناقابل برداشت صورت حال) کے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے"۔ (نوٹ: ناگزیر صورت حال سے مراد ایسے حالات کا رونما ہو جانا جن کے تحت حدود شرع کے اندر رہتے ہوئے زوجین کا آپس میں نباہ ممکن نہ رہے"۔

رسول اللہ ﷺ نے صرف باپ کو یہ حق دیا ہے کہ اس کے مطالبے پر بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دیدے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

عن ابن عمر قال:کانت تحتی امرأۃ اُحبہا وکان ابی یکرھہا، فامرنی ابی ان اطلقہا فابیتُ، فذکر ذالک للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یا عبداللہ بن عمر اطلق امرأتک، (ابوداؤد، کتاب

الادب، باب فی بر الوالدین ،رقم الحدیث: ۱۱۸ ، ابن ماجه، کتاب الطلاق ،باب یامره ابوه بطلاق امرأته، رقم الحدیث ۲۰۸۸)

'' حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک بیوی تھی جس سے میں (بے انتہا) محبت کرتا تھا، تو میرے باپ نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے طلاق دے دوں ، میں نے (تعمیل ارشاد سے) انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے اس بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما)! اپنی بیوی کو طلاق دے دو''۔

اس حدیث کی شرح میں امام حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ لکھتے ہیں:

پہلا شخص جس نے اپنے بیٹے کو طلاق کا حکم دیا، حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام تھے، روایت صحیح میں ہے کہ جب وہ اپنے بیٹے اسماعیل اور ان کی ماں (یعنی اپنی بیوی ہاجرہ) کو (مکہ مکرمہ میں زمزم کے نزدیک دوحہ کے مقام پر چھوڑ کر چلے گئے، تو چند سال تک وہ رکے رہے، پھر انہوں نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے اپنے ان پسماندگان کا حال معلوم کرنے کی اجازت مانگی، وہ اپنی (بیوی) ام اسماعیل کے پاس آئے تو پتا چلا کہ وہ انتقال کر چکی ہیں اور اسماعیل نے شادی کر لی ہے لیکن وہ اس وقت اپنے مکان پر موجود نہیں تھے، تو آپ نے ان کی بیوی سے ان کا حال دریافت کیا تو اس نے ملامت کی (یعنی تنگئی حالات کا شکوہ کیا)، اس پر آپ نے فرمایا: جب اسماعیل آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دو، پھر جب اسماعیل علیہ السلام آئے تو ان کی بیوی نے سارا ماجرا سنا دیا، حضرت اسماعیل نے (بیوی سے) فرمایا: وہ میرے باپ تھے اور انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں، لہٰذا اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ، انہوں نے ان کی گفتگو کا حوالہ دیا اور فرمایا: ان کا نمونہ عمل اتباع کیلئے کافی ہے، اور بیٹے کے اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک میں سے ایک یہ ہے: جس چیز کو باپ ناپسند کرے، (چاہیے کہ) اسے بیٹا بھی ناپسند کرے، خواہ وہ اس کی پسندیدہ چیز (ہی کیوں نہ) ہو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس چیز کو اس کا باپ پسند کرے، وہ بھی اسے پسند کرے، خواہ اس سے پہلے (طبعی طور پر) وہ اس کو ناپسند ہی (کیوں نہ) ہو، ظاہر بات ہے کہ (بہر صورت باپ کی تعمیل ارشاد کا) یہ حکم اس صورت میں ہے کہ (یہ امر یقینی ہو کہ) باپ

(دینی) بصیرت کا حامل ہے، لیکن اگر صورت حال اس کے برعکس ہے (یعنی باپ دینی بصیرت کا حامل نہیں ہے) تو باپ کی رضا کیلئے بیوی کو طلاق دینا (واجب نہیں بلکہ) پہلے مرحلے میں صرف مستحب ہے، کیونکہ امورِ حق میں باپ کی اطاعت (درحقیقت) اللہ ہی کی اطاعت ہے اور اس کے ساتھ نیکی اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے، اور اگر بیوی کی شوہر کے ساتھ (طبعی) موافقت ہی نہیں ہے تو (باپ کے حکم پر) اسے چھوڑ دینا مستحب ہے، کیونکہ زوجیت کے معنی ہی شوہر اور اس کی اولاد کی نگہداشت، کیا تو نے حضرت جابر کے اس قول پر غور نہیں کیا کہ جب نبی ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تو نے کنواری لڑکی سے شادی کی ہے یا ثیب سے، (ثیب سے مراد ایسی مطلقہ یا بیوہ عورت جو اس سے پہلے شوہر کے تجربے سے گذر چکی ہے)۔ تو انہوں نے عرض کیا: ثیب سے شادی کی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے کنواری لڑکی سے شادی کیوں نہ کی کہ تم دونوں ایک دوسرے سے (وفورِ محبت میں خوش طبعی، ہنسی مذاق اور) چھیڑ خوانی کرتے، حضرت جابر نے عرض کیا: میرے (چھوٹے چھوٹے) نو بہن بھائی ہیں، تو مجھے یہ مناسب نہ لگا کہ اپنی جیسی (ناتجربہ کار بیوی IMMATURE) بیاہ لے کر آؤں، میں نے تو یہ سوچ کر (ثیب عورت سے نکاح کیا کہ) وہ ان کی صحیح نگہداشت (اور تربیت) کر سکے''۔ (عارضۃ الاحوذی ج ۵، ص ۱۳۴)

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت نے باپ کے حکم پر بیٹے کو بیوی کے طلاق دینے کا جو وجوبی حکم دیا ہے، وہ دینی مصلحت پر مبنی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ باپ کے مزاج پر دین داری کا غلبہ ہو اور دینی مصلحتوں کا صحیح ادراک رکھتا ہو، اس پر نفسانی خواہشات، ہیجانی کیفیت، انتقامی جذبے اور غیظ و غضب کا غلبہ نہ ہو بلکہ وہ متحمل مزاج ہو، اور ہمارے سامنے دو مثالیں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام تو ابو الانبیاء، اولوالعزم رسول، ملت ابراہیم کے مؤسس، وحی ربانی اور فطرت سلیم کے حامل تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ''مُحَدَّثِ خیر الامم''، ''مُلہم من اللہ'' اور ''موفَّق من اللہ'' تھے بعض اوقات منشائے وحی ربانی کو ان کی فطرت سلیم نزول وحی سے پہلے ہی سمجھ لیتی تھی، چنانچہ ایسی آیات قرآنی، جن کے منشاء کا انہوں نے نزول وحی پہلے ہی ادراک کر لیا تھا، کو مُوَفِّقاتِ عمر کہا جاتا ہے۔ آج کل عام طور پر ہم میں اصابتِ فکر، مزاج میں توازن و اعتدال، منشائے شریعت معلوم ہونے پر اس کے سامنے سپر انداز (SURRENDER) ہونے کا رجحان اور مغلوب الغضب نہ ہونے کا تناسب

کتنا ہے ہم سب جانتے ہیں، لہٰذا موجودہ حالات میں اگر باپ بیٹے کو حکم دے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو، تو بیٹے کو چاہیے کہ ٹھنڈے دل سے شرحِ صدر کے ساتھ باپ کی فرمائش پر غور کرے، اگر ان کے فرمان کی وجوہِ شرعی موجود ہیں تو کھلے ذہن کے ساتھ نہ صرف ان کے حکم کی تعمیل کرے بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت عبداللہ بن عمر کی طرح اسے اپنی سعادت سمجھے۔ اور اگر اس پر یہ امر واضح ہو کہ باپ کا حکم شرعی مصلحت کے تابع نہیں بلکہ اس پر نفسیات کا غلبہ ہے، ظلم اور صریح ناانصافی کا باعث ہے، تو اس پر اس کی تعمیل واجب نہیں ہے۔ تاہم باپ کا احترام قائم رکھے اور تمام جائز امور میں ان کی فرماں برداری جاری رکھے اور نہایت نرمی اور تواضع کے ساتھ انہیں اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کرے، شاید کسی مرحلے پر اللہ تعالیٰ ان کے ذہن کو قبول حق پر آمادہ فرمالے۔ کیونکہ شریعت کے جو عمومی احکام ہیں، وہ یہ ہیں کہ:

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ:۲)

''نیکی اور تقوے کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو''۔

لا طاعة فی معصیة اللہ ،انما الطاعة فی المعروف (صحیح مسلم، رقم الحدیث:۱۸۴۰)

''یعنی کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے (خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بڑا ہو)، جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، لزومِ اطاعت تو بس صرف نیک کاموں میں ہے''۔

ماں کے حکم پر بیوی کو طلاق دینے کے بارے میں کوئی حدیثِ صحیح موجود نہیں ہے، ایک حدیثِ ضعیف اس سلسلے میں مذکور ہے جس پر فنی بحث آگے آرہی ہے، اگر اس سے استدلال کر کے کوئی ماں کے لئے یہ حکم ثابت بھی کرے تو وہ بھی مصلحتِ دینی اور بصیرتِ دینی پر ہی محمول ہوگا۔ اگر ماں کے لیے یہ حکم علی الاطلاق مان لیا جائے تو نہ جانے صبح سے شام تک کتنے بستے بساتے گھر اجڑ جاتے، ساس بہو کا بیر تو ضرب المثل ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماں کی تکریم کو بیان کرنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے، اس سلسلے میں قرآن کی آیات مقدسہ اور احادیث کریمہ بہت ہیں۔

البتہ یہ سوال کہ جب حدیث پاک میں ماں کا حق باپ سے تین درجے زیادہ بتایا گیا ہے تو جو حق باپ کو حاصل ہے، وہ ماں کو کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلے کا تعلق عقل سے نہیں ہے، کتاب وسنت کے صریح احکام سے ہے، اور کوئی شرعی حکم ہمارے لئے ماورائے عقل تو ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی حکمت کو نہ سمجھ سکیں، خلاف عقل ہرگز نہیں۔ آپ سوچیں کہ شریعت نے بچے کی پرورش ونگہداشت کا حق تو ماں کو دیا ہے، لیکن نابالغ بیٹی کے نکاح کا اختیار صرف باپ کو دیا ہے، اس صورت میں کہ جب آپ دونوں میاں بیوی باہم محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرتے ہیں، حدودِ شرع کی پاس داری کرتے ہیں تو محض ماں کی خواہش پر آپ پر اپنی بیوی کو طلاق دینا لازم نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر کسی خاص مسئلے میں ماں کی رائے کی وجوہِ شرعی ہوں، تو ان پر ضرور غور کرنا چاہیے، اور جب ماں کی رائے مصلحت شرعی کے موافق ہو جائے تو ان کی تعمیل ارشاد میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر آپ کی والدہ مطالبہ کرتی ہیں کہ بیوی کو الگ رکھو، تو ان کی اس فرمائش پر ضرور عمل کریں تاوقتیکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور وہ آپ کی بیوی کو خوش دلی سے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

آپ نے بیوی سے جو یہ وعدہ کیا ہے کہ میں تمہیں ہرگز طلاق نہیں دوں گا، یہ وعدہ، چونکہ منشائے شریعت کے مطابق ہے، اس لیے اس کا پورا کرنا لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (الاسراء: ۳۴)

"اور عہد کو پورا کرو، بیشک (قیامت کے دن) عہد کے بارے میں (لازمی) باز پرس ہوگی"۔

آپ کے گھر والوں کا آپ کی بیوی کی ڈائری کو خفیہ طور پر پڑھنا درست نہیں ہے، شریعت نے دوسروں کے ذاتی امور اور اَسرار کی کھوج لگانے سے منع فرمایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا (الحجرات: ۱۲)

"اے اہل ایمان! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو، بلاشبہ بعض بدگمانیاں گناہ کا سبب بنتی

ہیں اور (دوسروں کے ذاتی امور کی) ٹوہ میں نہ لگا کرو"۔

حدیث پاک میں ہے:

عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تحسسو اولا تجسسو ا

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۶۰۷۷، مسلم، رقم الحدیث: ۲۵۶۰، مشکوٰۃ، رقم الحدیث ۵۰۲۸)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بدگمانیوں سے بچا کرو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور (دوسروں کے پوشیدہ احوال کی) ٹوہ میں نہ لگ جاؤ اور ان کی جاسوسی نہ کرو"۔

مندرجہ بالا سطور میں، جو کچھ میں نے لکھا، اس کے بارے میں اکابر علماء کرام شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم العالی، مفتی محمد رفیق حسنی صاحب اور مفتی محمد یوسف بندیالوی سے استصواب کیا، تو انہوں نے میری رائے اور اخذ کردہ نتیجے سے اتفاق کیا کہ دور حاضر میں بہو کے بارے میں والدین کی رائے بالعموم کسی دینی مصلحت پر مبنی نہیں ہوتی، نہ ہی ان میں وہ شفقت پدری ہوتی ہے جس کی اولین ترجیح دینی اصلاح ہو، بلکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بہو سے نفرت سارے محرکات نفسانی ہوتے ہیں، اگر کوئی بہو نماز بالکل نہ پڑھے، روزہ نہ رکھے، دین دار نہ ہو، تو اس سے اس بنیاد پر کوئی گلہ شکوہ نہیں ہوتا۔

تاہم اعلیحضرت عظیم البرکت امام احمد رضا قادری قدس سرہم العزیز کا ارشاد عالی اس سے مختلف ہے، وہ لکھتے ہیں:

آیت کا وہ حکم اور احادیث کے یہ ارشادات انہی وجہین حل وبغض پر ہیں، اگر عورت پر کوئی شبہ ہو یا وہ عاصیہ ہو یا نماز نہ پڑھتی ہو یا بوڑھی ہوگئی ہو اور اسے قسم بین النساء سے بچنا ہو تو ان سب صورتوں میں طلاق بلا کراہت جائز ومباح ہے بلکہ بعض صورتوں میں مستحب۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر عورت نماز نہ پڑھے اور یہ ادائے مہر پر قادر نہ بھی ہو جب بھی طلاق دے دینی چاہیے کہ:

"اللہ تعالیٰ کے ہاں پیشی میں بیوی کا مہر شوہر کے گلے میں پڑا ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ بے نماز عورت سے معاشرت جاری رکھے، جیسا کہ خانیہ، غنیہ وغیرہما میں ہے"۔

نوٹ: اس مقام پر "فتاویٰ رضویہ" کی تحقیق وتخریج کرنے والے مولانا نذیر احمد نے لکھا ہے:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول عبارت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

لان القی اللہ وصداقها بذمتی خیر من ان اعاشر امراۃ لا تصلی

بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہوتی ہے، جیسے اس کو اس کے ماں باپ عورت کو طلاق دینے کا حکم دیں اور نہ دینے میں ان کی ایذا اور ناراضی ہو، واجب ہے کہ طلاق دے دے، اگرچہ عورت کا قصور نہ ہو: ''لان العقوق حرام والاجتناب عن الحرام واجب'' (کیونکہ نافرمانی حرام ہے اور حرام سے بچنا واجب ہے)''۔

حدیث میں فرمایا:

''وان امراک ان تخرج من اهلک ومالک فاخرج، (اگر والدین بیوی اور مال سے علیحدگی کا حکم دیں تو ایسا ہی کرو)۔ (الترغیب والترہیب، مصطفیٰ البابی مصرا/ ۳۸۳)۔

نوٹ: فتاویٰ رضویہ کے محقق نے اس حدیث کا مزید حوالہ السنن الکبریٰ ۷/ ۳۰۴، سے دیا ہے، (فتاویٰ رضویہ، رضا فاؤنڈیشن لاہور ج ۱۲ ص ۳۳۲۔۳۳۱)۔

اس حدیث پر ہم نے غور کیا، حافظ نور الدین الھیثمی کی مجمع الزوائد میں حدیث کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں:

''ولا تعقن والدیک وان امراک ان تخرج من اهلک ومالک''۔ اس کے تحت حافظ ہیثمی لکھتے ہیں:

رواه احمد والطبرانی فی الکبیر، رجال احمد ثقات الا ان عبدالرحمٰن بن جبیر بن مفیر لم یسمع من معاذ، واسناد الطبرانی متصل وفیه: عمر وبن الناقد القرشی، وهو کذاب (۳۹۱/۴، دار الفکر بیروت)۔

یعنی امام احمد کی سند میں انقطاع ہے، کیونکہ عبد الرحمٰن بن جبیر کا معاذ سے سماع ثابت نہیں ہے، اور طبرانی کی سند تو متصل ہے لیکن اس میں ایک راوی عمرو بن ناقد کذاب ہے، جب کہ ''مجمع الزوائد'' کے محقق عبداللہ محمد الدرویش نے لکھا ہے کہ امام احمد کی سند میں اسماعیل بن عیاش ضعیف ہے، تو اس طرح اس میں دو علتیں ہوگئیں، اور طبرانی کی ''المعجم الکبیر'' میں یہ الفاظ سرے سے ہیں ہی نہیں۔ (۸۳/۲۰، حدیث نمبر ۱۵۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

الترغیب والترہیب کی حدیث نمبر ۸۰۹ میں الفاظ یوں ہیں:

ولا تعص والدیک وان امراک ان تتخلیٰ من اهلک ودنیاک فتخله

''اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو اور اگر وہ تجھے حکم دیں کہ اپنے اہل اور اپنی دنیا سے علیحدگی اختیار کر و تو کرلو''۔

اس کے تحت بھی مؤلف امام حافظ زکی الدین المنذر متوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں یزید بن سنان الھروی ہے، کتاب کے محقق کے مطابق اکثر ماہرین رجال نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، (۱/۴۳۸)۔

لہٰذا اس حدیث سے استدلال روایتاً اور درایتاً دونوں طرح سے صحیح نہیں ہے، روایتاً تو اس لئے کہ یا تو سند متصل نہیں ہے اور یا اس میں بعض راوی ضعیف و کذاب ہیں، اور درایتاً اس لئے کہ بے قصور کو سزا دینا از روئے قرآن منع ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ؗ

''اور کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل کا دامن چھوڑ دو، عدل کرو، یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے''۔ (المائدہ: ۲)

اور حدیث پاک کی رو سے جب طلاق عند اللہ مبغوض فعل ہے، تو اگر چہ وہ بلا جوازِ شرعی بھی نافذ ہو جائے گی لیکن شرعاً ناپسندیدہ ہوگی، اور محظورِ شرعی سے بچنا عقوق والدین کے ضمن میں نہیں آتا۔ ہاں، ہم یہ صراحت کے ساتھ تحریر کر چکے ہیں کہ والدین کا حکم جوازِ شرعی و مصلحتِ شرعی پر مبنی ہو تو اس کی تعمیل کو اپنے لیے سعادت سمجھنا چاہیے۔

ہم نے پوری شرح وسط کے ساتھ احقاق حق کر دیا ہے، اس کے باوجود اگر کوئی صاحب اسی موقف پر رہیں کہ ہر حال میں والدین کے کہنے پر بیوی کو طلاق دینا واجب ہے، خواہ بیوی بے قصور ہو تو وہ اپنی رائے پر عمل کرنے میں آزاد ہے۔

☆☆☆..........☆☆☆..........☆☆☆

کتاب الفرائض

اولاد کے درمیان ہبہ میں مساوات

سوال: عرض ہے کہ میں نے اپنا مکان بیچا، ایک لاکھ پچانوے ہزار کا۔ میری پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے، ان میں سے ہر ایک کو کتنا حصہ آئے گا، (ظہور محمد۔ دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب: آپ اپنی زندگی میں، اپنے مال میں سے کسی کو بلا معاوضہ کچھ دینا چاہیں، خواہ وہ شخص آپ کا قرابت دار ہو یا اجنبی، اسے شرعاً وراثت یا ترکہ نہیں کہتے، بلکہ اسے ہبہ، ہدیہ، تبرّع اور فضل واحسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ چونکہ الحمد للہ بقیدِ حیات ہیں اور دعا ہے اللہ جل شانہٗ آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔ اولاد کے درمیان ترکے کی تقسیم کا قرآنی اصول تو یہ ہے کہ: ''لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دگنا حصہ ملے گا''۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اولاد کو کچھ مال ہبہ کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ سب کو برابر حصہ دے۔ ارشادِ رسول ہے: ''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ ان کے بیٹے (نعمان) کو ہبہ کردیں، میرے والد نے ایک سال تک یہ معاملہ ملتوی رکھا، پھر انہیں اس کا خیال آیا، میری والدہ نے کہا: میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ تم میرے بیٹے کے ھبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ کرلو، میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے، اور اس وقت میں نوعمر لڑکا تھا، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ بنالوں، جو میں نے اپنے اس لڑکے کو ھبہ کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ (ﷺ) نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اتنا حصہ دیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی نہیں، آپ (ﷺ) نے فرمایا: تو پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۷۰)''۔ اسی موضوع پر صحیح مسلم کی حدیث نمبر ۴۰۶۹ کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو! اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو''۔ حدیث نمبر ۴۰۷۳ میں فرمایا: ''(جاؤ) میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بناؤ'' پھر فرمایا: ''کیا تمہیں یہ بات اچھی لگتی ہے کہ (تمہارے سب بیٹے) تمہارے

ساتھ حسن سلوک میں ایک جیسا رویہ اختیار کریں" اس نے عرض کیا: "کیوں نہیں" آپ (ﷺ) نے فرمایا: "پھر تم بھی ایسا نہ کرو (یعنی عدم مساوات نہ کرو)۔"

انسان اپنی زندگی میں اپنے مال میں سے جس کو جتنا حصہ دینا چاہے، دے سکتا ہے، اسے اپنے مال پر تصرف کا پورا اختیار ہے۔ لیکن مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں کسی شخص کو اپنی اولاد کے درمیان ہبہ اور عطیہ کے طور پر مال تقسیم کرنے میں سب کے ساتھ مساوی برتاؤ کرنا چاہئے۔ حتیٰ کہ بیٹے اور بیٹی میں بھی فرق نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن یہ "مساوات بین الاولاد" کا حکم واجب کے درجے میں نہیں ہے بلکہ مستحب ہے اور کسی ایک کو زیادہ دینا مکروہ تنزیہی ہے۔ صحیح مسلم کے شارح امام نووی نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان کہ 'اس پر کسی اور کو گواہ بناؤ' اس بات کی دلیل ہے کہ "عدم مساوات" حرام اور باطل نہیں ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کیسے فرما دیتے کہ: 'اس پر کسی اور کو گواہ بناؤ'۔ امام ابو یوسف، امام مالک اور امام احمد کا قول یہ ہے کہ وراثت کی طرح ھبہ میں بھی لڑکے کو لڑکی سے دگنا دینا چاہئے۔ اگر ماں باپ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو، اس کی مالی کمزوری، دماغی کمزوری، جسمانی نقص یا بہت زیادہ خدمت گزار ہونے کی وجہ سے تلافی (Compensation) کے طور پر کچھ زیادہ دینا چاہیں اور اس پر باقی اولاد کو خوش دلی سے راضی کرلیں، تو پھر یہ بالاتفاق جائز ہے۔ سوال میں یہ درج نہیں ہے کہ آپ کے اور حقدار ورثاء یا قرابت دار بھی ہیں یا نہیں، جیسے ماں باپ، بیوی وغیرہ اور یہ کہ آپ ان کو بھی کچھ دینا چاہتے ہیں یا نہیں، اپنے لئے بھی کچھ پس انداز کرنا چاہتے ہیں یا نہیں، اور یہ کہ آپ کے پاس کچھ اور مال بھی ہے یا نہیں، ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر رقم تقسیم کریں، شرعی حکم آپ کو بتا دیا ہے۔

وراثت کے متفرق مسائل

سوال: (۱) میرا بیٹا مشیت ایزدی سے دو سال ہوئے انتقال کر گیا شادی نہیں ہوئی تھی اس کی پنشن کمپنی کے قانون کے مطابق ایک چھوٹی رقم بطور والد مجھے ملتی ہے۔ میری اہلیہ کا نام شامل نہیں کیا گیا ہے، مجھے پانچ سال تک بشرط زندگی ملتی رہے گی بعد میں بند ہو جائے گی، مرحوم کی کچھ رقم بھی مجھے ملی ہے اس میں سے آدھی رقم اب تک خرچ کر چکا ہوں میرے پانچ بیٹے ہیں۔ دو شادی شدہ ہیں۔ چھ بیٹیوں میں سے صرف دو کی شادی ہو چکی ہیں۔ بہ مجبوری حصولِ رشتہ چار گھر میں

ہیں، پانچوں بھائی اور دونوں بہنوں نے مرحوم کی رقم نہ لینے کا عہد کیا ہے ان سب کا کہنا ہے کہ چار بہنوں کی شادیوں میں خرچ کی جائے، اس درمیان میں ماہانہ رقم کفالت کی مد میں خرچ ہو رہی ہے۔ قانونِ وراثت کے تحت کیا والد کا اس کی میراث میں پورا حق ہے کہ وہ جس طرح چاہے خرچ کرے کسی کو کم کسی کو زیادہ دے یا مرحوم کی وقتاً فوقتاً نصیحت کے مطابق بقیہ رقم (چار بہنوں میں مساوی تقسیم کردی جائے شرعاً کیا حکم ہے۔

سوال: (۲) بینک کے مقابلہ میں NIT وغیرہ کے شیئر لینے بہتر ہے یا نہیں گھر میں رقم رکھی نہیں جاسکتی ہے اور زیادہ خرچ ہوتی رہے گی، واضح رہے کہ مرحوم بیٹا دورانِ زندگی اپنی پوری تنخواہ اکر مجھے (والد کو) دیا کرتا تھا۔

سوال: (۳) سسر صاحب نے میری بیوی کو اپنی جائیداد (مکان وغیرہ) کے حصہ سے دست بردار ہونے کا تحریراً عندیہ دے رکھا ہے، ان کی دوسری بیوی سے چھ بیٹے بیٹیاں ہیں جبکہ میری بیوی پہلی سے اکیلی ہیں۔ سسر صاحب حیات ہیں، کیا یہ عمل شرعاً جائز ہے یا نہیں؟۔ انتقال کے بعد کیا یہ تحریر کالعدم نہیں ہوسکتی ہے اور جائیداد میراث کے قانون کے تحت تقسیم کی جائے۔

سوال: (۴) گیارہ بچوں میں دو ایک کی خواہش ہے کہ میں اپنا مکان اپنی زندگی میں فروخت کرکے سب کے حصے تقسیم کردوں کسی کا اصرار نہیں ہے، اگر میں ایسا کرتا ہوں تو وہ سب کرایہ کے مکان میں رہیں گے اپنا مکان کبھی بھی نہیں بنواسکتے، رقم بہت ہی قلیل ہونے کی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے، ابھی تو وہ میرے ہی مکان میں رہتے ہیں۔

سوال: (۵) میری بیوہ بھتیجی نے اپنے شوہر کے حکم و رضامندی سے غیر شخص (جو رشتہ دار نہیں اس) کی ایک بچی کو متبنیٰ بنالیا ہے (گود لے رکھا ہے)، وہ درجہ نہم میں پڑھتی ہے، اس بچی نے ماں باپ کو تقریباً چھوڑ رکھا ہے، کبھی سال میں ایک دو دفعہ ماں یا والد (غریب ہیں) دیکھنے آجاتے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ کیا بیوہ اس لے پالک بچی کی تعلیم ڈاکٹر تک شرعاً کرسکتی ہے معہ کفالت کے اخراجات وغیرہ، جبکہ بیوہ کے چچازاد بھائی یا اور رشتہ دار (قریبی) کے ایک یا دو بچوں کو لے پالک لے سکتی ہے مالی حالت بہتر ہے مگر پہلے والی لے پالک بچی کی موجودگی میں ممکن نہیں ہے۔

(ایس اے سلام ...... ناظم آباد، کراچی)

جواب: (۱) آپ کے فوت شدہ بیٹے کا ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا، کل چھ حصے ہوں

گے، ان میں باپ کو پانچ حصے ملیں گے اور ماں کو ایک حصہ، بہن بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ کمپنی کی طرف سے آپ کے لیے پانچ سال تک جو پنشن منظور کی گئی ہے، اگر وہ کمپنی اپنی طرف سے فضل و احسان کے طور پر دیتی ہے اور اپنے قانون کے مطابق صرف باپ ہی کو دیتی ہے، یہ بیٹے کا استحقاق نہیں تھا تو آپ ہی اس کے حق دار ہیں، اور اگر یہ بیٹے کا استحقاق تھا، شرائطِ ملازمت میں سے تھا اور اس کی حیثیت مرحوم کے ترکے اور وراثت کی ہے تو پھر آپ اور آپ کی اہلیہ میں پانچ اور ایک کے تناسب سے شرعاً تقسیم ہوگی۔ یہی حکم اس رقم کا ہے جو کمپنی نے یکمشت آپ کو دی ہے، اگر یہ آپ کے بیٹے کا استحقاق اور ترکہ ہے تو اسی طرح آپ اور آپ کی بیوی (یعنی مرحوم کے ماں باپ) میں پانچ اور ایک کے تناسب سے تقسیم ہوگا اور بہن بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور اگر یہ آپ کے بیٹے کا استحقاق، یکے از شرائط ملازمت اور ترکہ نہیں ہے بلکہ کمپنی رضا کارانہ طور پر حسنِ سلوک اور فضل واحسان کے طور پر اپنے قانون کے مطابق صرف باپ کو دیتی ہے تو پھر یہ آپ کا حق ہے۔ اب چونکہ مرحوم کے بہن بھائیوں کا شرعاً ترکے میں حصہ نہیں ہے، تو آپ خود مختار ہیں، اس رقم میں جیسا چاہیں تصرف کریں۔

جواب: (۲) ہماری معلومات کے مطابق این آئی ٹی (N.I.T) کا کاروبار بھی مکمل طور پر غیر سودی (Intrest free) نہیں ہے اس لیے بینک ڈیپازٹس اور اس کا حکم شرعاً ایک ہی ہے۔

جواب: (۳) آپ کی بیوی کے حق میں آپ کے سسر (یعنی ان کے والد کی تحریر) وصیت کے درجے میں ہے، اور شرعاً وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے، البتہ اگر وہ زندگی میں مکان یا کوئی چیز اپنی بیٹی کو ہبہ (Gift) کر کے باقاعدہ قبضہ دے دیں اور مالک بنا دیں تو وہ جائیداد ان کی ملکیت ہو جائے گی لیکن شرعاً مستحب امر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرنا چاہے تو تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، تاہم اگر کسی مساوات کا لحاظ کیے بغیر اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو کچھ ہبہ کر دیا تو شرعاً یہ عمل مکروہ ہونے کے باوجود نافذ ہو جائے گا۔ البتہ اگر کوئی مکان یا جائیداد آپ کی بیوی کی ماں (آپ کی مرحومہ ساس) کے نام پر تھی (یعنی ان کی ملک تھی) تو آپ کی بیوی اس میں شرعاً نصف کی حق دار ہے۔

جواب: (۴) آپ زندگی میں اپنی جائیداد کے مالک ہیں، آپ کو حق ہے اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں، آپ کی زندگی میں آپ کی اولاد نہ آپ سے تقسیم جائیداد کا مطالبہ کر سکتی ہے،

نہ آپ کو اس پر مجبور کر سکتی ہے، کیونکہ زندگی میں کوئی اپنی اولاد کو کچھ دینا چاہے تو یہ ہبہ کہلاتا ہے اور یہ دینے والے کی مرضی پر موقوف ہے، البتہ اگر اولاد کو ہبہ کرنا ہو شرعاً تمام اولاد میں مساوات کا سلوک مستحب ہے، ہاں اگر کوئی بہن بھائی خوش دلی سے رضا کارانہ طور پر اپنا حق دوسروں کے لیے چھوڑنا چاہیں تو وہ ترکے میں بھی ایسا کر سکتے ہیں، یہ تو ایثار ہے اور مستحسن امر ہے۔

جواب: (۵) اگر کوئی شخص کسی بچے کی کفالت اور نگہداشت رضا کارانہ طور پر اپنے ذمے لیتا ہے تو یہ ایک عملِ خیر ہے اور اگر زیرِ کفالت بچہ نادار ہے تو بہت بڑے اجر و ثواب کی بات ہے۔ اور اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے مالی استطاعت اور توفیق دی ہے تو ایک سے زائد بچوں کی کفالت بھی کر سکتا ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ متبنیٰ یا لے پالک کا حکم نسبی اولاد کا نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ

''اور اس (اللہ) نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا، یہ تمہارے اپنے مونہوں کی بات ہے اور اللہ حق فرماتا ہے اور وہی (سیدھی) راہ دکھاتا ہے ان (لے پالکوں) کو ان کے باپ ہی کی نسبت سے پکارا کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی انصاف کی بات ہے''۔ (الاحزاب: ۴، ۵)

''تفسیر الجامع لاحکام القرآن'' میں امام ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی نے جلد نمبر ۱۴، صفحہ ۱۲۱ پر انہی آیات کی تفسیر میں مندرجہ ذیل حدیث نقل کی ہے:

عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ وَ اَبِيْ بَكْرَةَ كِلَاهُمَا قَالَ: وَ سَمِعَتْهُ اُذُنَايَ وَوَعَاهُ قَلْبِيْ مُحَمَّدًا ﷺ يَقُوْلُ: ''مَنِ ادَّعٰى اِلٰى غَيْرِ اَبِيْهِ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهُ غَيْرُ اَبِيْهِ فَالْجَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ''۔

''حضرت سعد بن ابی وقاص اور ابو بکرہ رضی اللہ عنہما دونوں بیان کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے کانوں سے سنا اور دل میں اس بات کو محفوظ رکھا کہ حضرت محمد ﷺ فرما رہے تھے۔ جس نے اپنے آپ کو اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف منسوب کیا (یعنی اسے اپنا باپ کہا) حالانکہ وہ جانتا ہے کہ درحقیقت وہ اس کا باپ نہیں ہے تو جنت

اس پر حرام ہے''۔(صحیح بخاری کتاب المناقب،صحیح مسلم کتاب الایمان)

لہٰذا لے پالک یا متبنّٰی کا حکم حقیقی اولاد کا نہیں ہے، نہ ہی وہ اپنے مربی کے وارث بنتے ہیں بلکہ ترکہ شریعت کے احکام کے مطابق اصلی اور حقیقی وارثوں میں تقسیم ہوگا۔البتہ اگر کوئی شخص اپنے پروردہ منہ بولے بیٹی یا بیٹے کو اپنی زندگی میں کوئی مال یا جائیداد ہبہ کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

ترکے کے مسائل

سوال: مؤدبانہ گذارش یہ ہے کہ فدوی راشد حسین جو کہ مکان نمبر H-144/4 سیکٹر 2-C لائنز ایریا جیک لائن میں رہائش پذیر ہے۔مجھ کو ایک مسئلہ درپیش ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

جس مکان میں والدہ، راشد حسین اور بیوی رہتے ہیں، دو چھوٹے کمروں پر مشتمل ہے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد بھائی نے حصہ لینے کا دعویٰ کردیا۔اس مکان کو میں نے دوبارہ سے مسمار کرکے تعمیر کروایا جس پر تقریباً پچاس ہزار روپے لاگت آئی، اس لاگت میں کسی بھائی یا بہن کا کوئی حصہ نہیں، والد صاحب کے انتقال کا خرچہ، دو بہنوں کی شادی، اپنی شادی، والدہ کی بیماری کا شروع سے ابھی تک مجھ کو ہی خرچہ برداشت کرنا پڑا۔والد صاحب کے نام مکان ہے، ان کے حصے داروں کی تعداد سات ہے۔والدہ تین بھائی تین بہنیں (تمام شادی شدہ)۔

میرے سوالات

(۱) ناظم صاحب کو دی ہوئی درخواست اور مندرجہ بالا مسئلہ کی روشنی میں اس کو فروخت کرسکتا ہوں۔مجھ کو تعمیر کے پچاس ہزار روپے مل سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) مکان میں پچاس ہزار روپے لگائے اس کو ہٹا کر حصہ ہوگا یا نہیں۔

(۳) مندرجہ بالا اخراجات تقریباً ۲ لاکھ ۴۲ ہزار روپے میں سے کتنا کون حصے دار بنے گا؟

(۴) راشد حسین اپنی مرضی سے مکان کو مسمار کرسکتے ہیں اس کی اجازت ہے۔پھر فروخت ہونے کے بعد جو بھی حصہ آئے یعنی زمین کی قیمت۔

(۵) اس مکان کو راشد حسین کرائے پر دے سکتے ہیں یا نہیں۔

(راشد حسین......بلاک نمبر H-144/4،نزد جھگی سیکٹر 2-C، جیکب لائن لائنز ایریا)

جواب: آپ کے والد مرحوم کا ترکہ بعد ادائیگی حقوق متقدمہ علی الارث (یعنی وہ امور

جن کی ادائیگی ترکے کی تقسیم سے پہلے ضروری ہے) کے بعد کل 72 حصص میں منقسم ہوگا اور ہر وارث کو حسبِ ذیل شرح سے حصہ ملے گا۔

مرحوم کی بیوی (یعنی آپ کی والدہ) کا حصہ =9/72

ہر بیٹے کا حصہ = 14/72، تین بیٹوں کا مجموعی حصہ =42/72

ہر بیٹی کا حصہ = 7/72، تین بیٹیوں کا مجموعی حصہ =21/72

آپ نے والد کی جھگی اگر تمام ورثاء کی مرضی سے گرائی تھی تو فبہا، ورنہ اس وقت اس اسٹرکچر کی جو مالیت تھی، وہ آپ پر آئے گی۔ آپ نے جھگی یا والد کے متروکہ مکان پر جو رقم لگائی ہے، جائیداد کے ماہرین اور منصفین موجودہ مکان کی جو قیمت لگائیں، اس میں سے اپنے پچاس ہزار روپے وضع کرلیں، باقی والد کا ترکہ ہے جو مندرجہ بالا شرح کے مطابق آپ سمیت سب وارثوں میں تقسیم ہوگا۔

آپ نے بہنوں کی شادی پر جو رقم خرچ کی ہے، اگر تمام ورثاء نے آپ کو اس کا اختیار دیا تھا اور ان مصارف کا بوجھ برابر یا کسی خاص تناسب سے اپنے ذمہ لینے کا وعدہ کیا تھا تو وہ ان سے آپ وصول کرسکتے ہیں، اور اگر ایسا نہیں ہے تو آپ خود ان مصارف کے ذمہ دار ہیں، یا دیگر ورثاء چاہیں تو حسب منشا رضا کارانہ طور پر اس میں جتنا حصہ ڈالنا چاہیں ڈال سکتے ہیں۔

والدہ کی جو آپ نے خدمت کی ہے یہ آپ کی سعادت ہے اور اس پر آپ عنداللہ ماجور ہوں گے، دیگر وارث بھی رضا کارانہ طور پر اس میں آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہیں تو ان کے لیے بھی سعادت کی بات ہوگی۔ اور اگر انہوں نے پہلے آپ کو اختیار دیا تھا کہ ہم سب کی طرف سے ماں کا علاج کرو تو وہ اس عہد کے شرعاً پابند ہوں گے۔

مسئلۂ وراثت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک خاتون کے خاوند کا انتقال ہوگیا، مذکورہ شخص کا ایک بھائی، ایک بہن اور والدہ بقید حیات ہیں۔ مرحوم کے نام پر ایک پلاٹ ہے اور ایک کارخانہ ہے جس میں دونوں بھائی شریک ہیں۔ مرحوم کے بھائی کا اپنا مکان موجود ہے، مرحوم کی والدہ بھی الگ مکان میں رہتی ہیں اور مرحوم کی بہن بھی شادی شدہ ہیں اور اپنے

مکان میں رہتی ہیں، مرحوم کی کوئی اولاد نہیں ہے۔صورت مذکورہ میں بیوہ مرحوم کی تمام وراثت کی اکیلی حقدار ہوں گی یا اور بھی افراد مثلاً بھائی بہن وغیرہ شریک ہوں گے اگر اور بھی لوگ شریک ہوں گے تو بیوہ کا حصہ کتنا ہوگا۔ زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ازروئے شریعت جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماموں وماجور ہوں، (عبدالجبار۔اورنگی، کراچی)۔

جواب: صورت مسئولہ میں ان امور کی ادائیگی کے بعد جو تقسیم وراثت پر مقدم ہوتے ہیں، مرحوم کا ترکہ اس کے مذکورہ شرعی وارثوں میں حسب ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا۔کل ترکہ ۳۶ حصص میں تقسیم ہوگا اور ورثاء کے حصے مندرجہ ذیل ہوں گے:

والدہ=۶ حصے بیوی=۹ حصے بھائی=۱۴ حصے بہن=۷ حصے کل=۳۶

ورثہ کی تقسیم

سوال: ایک عدد مکان جس کی قیمت ۶ لاکھ روپے ہے، کس طرح تقسیم ہوں گے۔ ورثا ۴ بھائی، ایک بہن اور والدہ۔قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمادیں، شکریہ۔

(انصار احمد، کراچی

جواب: میت کے ترکہ میں سے دیگر حقوق ضروریہ لازمہ، جو تقسیم ترکہ پر مقدم ہوتے ہیں، ک ادائیگی کے بعد بقیہ ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔کل ترکہ ۵۴ حصوں پر منقسم ہوگا اور ا میں سے ورثاء کے حصے اس تناسب سے ہوں گے:

والدہ......۹ حصے چار بھائی......۴۰ حصے (فی کس ۱۰ حصے) ایک بہن......۵ حصے

مسئلۂ وراثت

سوال: میری اہلیہ کا انتقال ہوگیا ہے ان کا حق مہر ۲۵ ہزار روپے تھا، نہ میں نے ان کی زندگ میں ادا کیا اور نہ ہی اس نے معاف کیا تھا۔اب میں اس کے بارے میں فکر مند ہوں، اس ک ادائیگی کی شرعی صورت کیا ہوگی، مرحومہ کے ورثاء میں میرے علاوہ، ان کی والدہ زندہ ہیں ا ہمارے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے؟ (مسعود الرحمٰن۔دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب: یہ دَینِ مہر، آپ کے ذمے بیوی کا قرض ہے اور یہ مجموعی ترکے میں شامل ہوگا۔ ان کی ملکیت میں وفات کے وقت نقد، زیورات اور مالِ منقولہ وغیر منقولہ جو کچھ بھی ہو، ان کا تر

ہے اور یہ دین مہر بھی اسی ترکے کا حصہ ہے۔ اور ان کا ترکہ ان کے شرعی ورثاء میں (مصارفِ تجہیز و تکفین و تدفین، وضع کرنے، ان کے ذمے اگر قرض ہو تو اس کی ادائیگی، اگر انہوں نے کوئی وصیت کی ہو تو کل ترکے کی تہائی مالیت تک اس کے نفاذ کے بعد جو کچھ بچے گا) حسب ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا۔ کل ترکہ 120 حصوں میں تقسیم ہوگا اور ہر ایک وارث کا حصہ حسب ذیل ہوگا:

والدہ = 20 شوہر = 15، دو بیٹے = 68 (فی کس 34) بیٹی = 17

وارث کون ہیں؟

سوال: میں غیر شادی شدہ خاتون ہوں، میرے بھائی بہن بھی ہیں اور ایک فوت شدہ بھائی اور ایک فوت شدہ بہن کی اولاد یعنی بھتیجے بھتیجیاں اور بھانجے بھانجیاں بھی ہیں، تو شرعی وارث کون ہوں گے، (شاہدہ خاتون۔ نارتھ ناظم آباد)۔

جواب: آپ کی وفات کے وقت جو بہن بھائی زندہ ہوں گے، وہ وارث ہوں گے، بھائی کو بہن سے دوگنا ملے گا۔ بھتیجے بھانجے وغیرہ محروم رہیں گے، کیونکہ قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے۔ البتہ اگر آپ اپنی زندگی میں اپنے مرحوم بھائی اور مرحومہ بہن کی اولاد کو کچھ ہبہ کرنا چاہیں تو کرسکتی ہیں اور وفات سے پہلے ان کے حق میں کل ترکے کے ایک تہائی حصے تک کی وصیت بھی کرسکتی ہیں۔

مسئلۂ وراثت

سوال: مؤدبانہ عرض ہے کہ میرے والدین وفات پاچکے ہیں انہوں نے اپنی زندگی میں کچھ رقم ادھار دی تھی، جواب مجھے ملے گی، وہ رقم تقریباً ۷۹ ہزار ہے۔ اس لئے التماس ہے کہ اس رقم کی تقسیم کے بارے میں میری مدد فرمائیں اور اس رقم میں سے کچھ رقم میں اپنے والدین کے صدقہ جاریہ کے لئے بھی دینا چاہتی ہوں۔ برائے کرم آپ میرا یہ کام جلد از جلد کردیں تاکہ میں اپنے فرائض پورے کرسکوں، (رخسانہ زبیر، فائیو اسٹار کمپلیکس بلاک نمبر ۲ گلشن اقبال۔ کراچی)۔

جواب: سوال میں مذکورہ رقم باپ کی ہو یا ماں کی، یہ ان کا ترکہ ہے اور ان کے بقیہ ترکے یعنی مالِ وراثت میں شامل ہوکر ان کے شرعی وارثوں میں اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوگا، کوئی ایک وارث دوسرے ورثاء کی رضامندی کے بغیر یک طرفہ طور پر اس رقم کو ایصال ثواب

کے لئے صدقہ جاریہ میں نہیں لگا سکتا، صرف اپنا حصہ لگا سکتا ہے، یا ان وارثوں کا جو خوش دلی سے اس پر راضی ہوں، ہاں اگر سب ورثاء باہمی رضامندی سے اس رقم کو اپنے ماں باپ کے ایصال ثواب کیلئے صدقۂ جاریہ میں لگانا چاہیں تو جائز ہے، یہ ان کی سعادت مندی ہے، انہیں بھی ثواب ملے گا اور ان کے مرحوم والدین کو بھی ثواب ملے گا۔

مسئلۂ وراثت

سوال: عرض یہ ہے کہ میرے والدین کی وفات ہوچکی ہے، انہوں نے کچھ رقم ورثے میں چھوڑی ہے جس کی تقسیم کرنی ہے، وہ رقم تقریباً ۳لاکھ ۲۵ ہزار ہے اور ہم تین بہنیں اور دو بھائی ہیں یہ رقم ان سب میں تقسیم کرنی ہے آپ سے گزارش ہے کہ قانونی اور شرعی لحاظ سے اس کی تقسیم میں میری مدد فرمائیں۔ (رخسانہ زبیر FL-2 فائیو اسٹار کمپلیکس بلاک نمبر ۲ گلشن اقبال، کراچی)

ہم پانچ بہن بھائی ہیں جن کے نام یہ ہیں

تین بیٹیاں : (۱)فہمیدہ بیگم (۲)شاہانہ تبسم (۳)رخسانہ تبسم

دو بیٹے : (۴)پرویز خلیل (۵)جاوید خلیل

جواب: اگر ورثاء کی تعداد یہی ہے جو سوال میں مذکور ہے تو ترکہ کی تقسیم سے قبل کے جملہ ضروری امور نمٹانے (یعنی مصارف تجہیز و تکفین، متوفی کے ذمہ اگر کوئی قرض ہو تو اس کی ادائیگی اور اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو ایک تہائی ترکے کی حد تک اس کے نفاذ) کے بعد ترکے کی تقسیم یوں ہوگی کہ ترکے کے کل سات حصے ہوں گے، ان میں سے ہر بیٹے کو دو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔

ورثہ کی تقسیم

سوال: ورثہ کی تقسیم میں ہماری رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ والدہ مرحومہ کی ملکیت میں ایک الاٹ شدہ مکان ہے جس میں والدہ کے ساتھ ہم دونوں بھائی رہائش پذیر تھے، والدہ مرحومہ کے صرف ہم دو ہی بیٹے تھے۔ بڑے بھائی کی شادی والدہ مرحومہ کی حیات ہی میں ہوچکی تھی، جبکہ میری شادی والدہ کی وفات کے بعد ہوئی - میری شادی کے بعد گھریلو حالات کی شراکت کے سبب مجھے یہ مکان چھوڑ کر کرایہ کے مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ بڑے بھائی صاحب اپنے بیوی بچوں

کے ساتھ اسی مکان پر قابض و متصرف رہے۔ والدہ مرحومہ کی حیات ہی میں، میں نے اس مکان میں اپنی ذاتی کمائی سے ایک کمرہ بنوایا تھا، میرے وہاں سے نکل جانے کے بعد بھائی نے بھی ایک کمرہ اور بنوایا ہے۔ بھائی کا انتقال حال ہی میں یعنی فروری 2003ء میں ہوا ہے، ان کی پہلی بیوی جس سے علیحدگی (طلاق) ہو چکی ہے، سے چھ بچے، ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں۔ دوسری بیوی کی پہلے شوہر سے ایک بیٹی ہے جس کی شادی ہو چکی ہے۔

کافی عرصہ پہلے والدہ کی وفات کے بعد محلے کے چند بزرگوں کی موجودگی میں طے پایا تھا کہ دونوں بھائیوں کے نام مکان منتقل کر دیا جائے، کیونکہ اس مکان کے دو ہی وارث ہیں، اس سلسلہ میں ضروری قانونی کارروائی بھی کر لی گئی تھی لیکن یہ کام پوارنہ ہو سکا۔

محترم! شریعت کی رو سے بتائیں کہ والدہ مرحومہ کے مکان کی ملکیت کی تقسیم کس طرح ہوگی کیونکہ بھائی کی اولاد کا مطالبہ ہے کہ ہمارا حصہ ہمیں دیا جائے جب کہ بھائی صاحب مرحوم کی بیوہ ابھی اسی گھر میں عدت گزار رہی ہیں۔ (محمد غفران، 345/16، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: بر تقدیرِ صدقِ سائل وانحصارِ ورثاء در مذکورین وبعد ادائیگی حقوق متقدمہ علی الارث (یعنی مصارفِ تجہیز وتکفین، مرحومہ کے ذمہ قرض اگر کوئی ہو تو اس کی ادائیگی اور اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے پر اس کے نفاذ کے بعد) بقیہ ترکہ کے کل 16 حصص کیے جائیں گے اور ورثاء میں حسب ذیل تناسب سے تقسیم ہوں گے۔

بیٹا (سائل محمد غفران)	=	8 حصے
بڑے بیٹے کی زوجۂ ثانی جو اس کی وفات کے وقت نکاح میں تھی	=	1 حصہ
بڑے بیٹے کا بیٹا یعنی مرحومہ کا پوتا	=	2 حصے
بڑے بیٹے کی پانچ بیٹیاں یعنی مرحومہ کی پوتیاں (ہر بیٹی کو ایک حصہ ملے گا)	=	5 حصے
کل حصص	=	16 حصے

بڑے بیٹے کی سابقہ مطلقہ بیوی اور دوسری بیوی کی پہلے شوہر سے بیٹی کو ترکے میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ سائل (محمد غفران) اور ان کے بڑے بھائی نے مکان میں ایک ایک کمرے کا اضافہ کیا ہے، اگر ان دونوں کمروں کے سٹرکچر کی مالیت برابر ہو تو تناسب یہی رہے گا، ورنہ منصفین سے فیصلہ کرا دیں۔ مرحومہ کے وفات شدہ بڑے بیٹے کی بیوہ عدت اسی مکان میں

گذاریں گی، اس کے بعد وہ اس مکان میں سولہویں (1/16) حصے کی حقدار ہیں اور اگر ان کے مرحوم شوہر کا اس مکان میں نصف حصے کے علاوہ اور بھی کوئی ترکہ ہے (منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کی صورت میں) تو وہ اس میں سے بھی آٹھویں حصے (1/8) کی حقدار ہیں، اگر اس وارث بیوہ کا مہر ان کے مرحوم شوہر نے اپنی زندگی میں ادا کردیا تھا تو فبہا، ورنہ مرحوم کے ترکے کی تقسیم سے پہلے ان کے ترکے میں سے بیوہ کا دینِ مہر بھی ادا کرنا ہوگا۔

عقدِ ثانی سے سابق شوہر کے ترکے میں بیوہ کا حق وراثت ساقط نہیں ہوتا

سوال: میری شادی شدہ بیٹی رضوانہ محسن کے شوہر کا ۱۴؍اپریل ۱۹۹۷ء کو انتقال ہوا، سابق شوہر سے اس کے بچے بھی ہیں، اپریل ۱۹۹۸ء میں میری بیوہ بیٹی نے عقدِ ثانی کرلیا، ابھی تک اسے سابق شوہر کے ترکہ سے حصہ نہیں ملا، اب ان کے سابق شوہر کے گھر والے (یعنی سابق سسرالی رشتہ دار) کہتے ہیں کہ چونکہ اس نے عقدِ ثانی کرلیا ہے، اس لئے اب وہ متوفی شوہر کے ترکے سے وراثت کی حق دار نہیں رہی اور اسے اب مرحوم کی منقولہ وغیر منقولہ متروکہ جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا۔ ازراہِ کرم شریعت مطہرہ کی روشنی میں بتائیں کہ کیا بیوہ عقدِ ثانی کرنے سے سابق شوہر کے ترکے سے محروم ہوجاتی ہے، (فہمیدہ رحیم والدہ رضوانہ محسن، معمار پلازہ، گلشن اقبال)۔

جواب: آپ کی بیٹی رضوانہ محسن کا اپنے سابق شوہر کے ترکے میں آٹھواں حصہ ہے۔ عقدِ ثانی سے اس کا سابق شوہر کے ترکے میں حق وراثت متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ بدستور قائم رہتا ہے جب تک کہ اسے ادا نہ کردیا جائے۔ یہاں تک کہ اگر خدانخواستہ اپنے مرحوم و متوفی شوہر کے ترکے سے حصہ پائے بغیر کسی بیوہ کا انتقال ہوجائے تو یہ حق وراثت اس کے ورثاء کو منتقل ہوجائے گا اور وہ اس کے جائز دعویدار ہوں گے اور اگر اس دنیا میں کسی نے کسی کا حق غصب کرلیا تو اسے آخرت میں اس کا حساب دینا ہوگا۔ "حقوق العباد" کا مسئلہ اتنا سنگین ہے کہ شہید سے بھی اس کی بازپرس ہوگی۔ حدیث مبارک میں ہے:

> "حضرت ابوقتادہ بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ فضیلتِ جہاد پر خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہوکر دریافت کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! مجھے بتائیے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں لڑتے لڑتے شہید ہوجاؤں تو کیا میرے

سارے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں، اگر تم صبر و استقلال اور اخلاص کے ساتھ دشمن کو پیٹھ دکھائے بغیر (میدان جہاد میں) پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہو جاؤ (تو تمہارے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے)، مگر کسی کا قرض اگر تمہارے ذمہ ہے تو وہ معاف نہیں ہوگا، جبریل امین نے مجھے اس مسئلے میں یہی کہا ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الجہاد)۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں شہادت سوائے قرض کے ہر گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے''۔ (مشکوٰۃ، کتاب الجہاد)

اور جو لوگ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے بے نیاز ہو کر دوسروں کا مال ہڑپ کر لیتے ہیں، انہیں مندرجہ ذیل حدیث پاک پڑھ کر عبرت حاصل کرنی چاہیے اور اپنی عاقبت و آخرت کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم جانتے ہو کہ (سب سے بڑا) مفلس کون ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہمارے نزدیک تو جس کے پاس مال و دولتِ دنیا نہ ہو، وہی (سب سے بڑا) مفلس ہے، آپ نے فرمایا: (نہیں) میری امت کا (سب سے بڑا) مفلس وہ ہوگا، جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ کا ذخیرۂ عمل لے کر آئے گا، لیکن اس نے (اس دنیا میں) کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بدکاری کی تہمت لگائی ہوگی، کسی کا (ناحق) مال کھایا ہوگا، کسی کا خونِ (ناحق) بہایا ہوگا، کسی کو (ظلماً) مارا پیٹا ہوگا، تو ان سب (مظلومین اور حق داروں) کو ایک ایک کر کے اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی، اگر ان ساری حق تلفیوں اور مظالم کے عوض اس کی نیکیاں کم پڑ جائیں گی، تو ان کے گناہ لے کر اس کے کھاتے میں ڈال دیئے جائیں گے، اور پھر (انجامِ کار) اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، (مشکوٰۃ باب الظلم بحوالہ صحیح مسلم)''

مسئلۂ وراثت

سوال: میں مسماۃ شہناز بیگم زوجہ محمد طاہر (مرحوم) سکنہ مکان نمبر ۹۳-۳ آر بلاک نمبر ۱۵ دستگیر کالونی فیڈرل بی ایریا کراچی میں رہتی ہوں۔ عرض کرتی ہوں کہ میرے شوہر محمد طاہر کا انتقال مورخہ ۱۶-۱۲-۷۶ کو کراچی میں ہوا تھا۔ میرے شوہر نے ۱۲۰ مربع گز کا پلاٹ تعمیر شدہ چھوڑا

ہے۔ وراثت حق ہر ایک کا کتنا ہے۔ جبکہ وارثوں میں ایک بیوی (شہناز بیگم) دو بیٹیاں، ایک بہن، ایک چچا، دو پھوپھیاں ہیں۔ میرے شوہر کا نہ کوئی بھائی ہے اور نہ ہی والدین حیات ہیں۔ میں شہناز بیگم زوجہ محمد طاہر (مرحوم) ایک بے سہارا عورت ہوں میرا ایک بھائی ہے جو ہماری کفالت کرتا ہے اس کے علاوہ ہمارا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے۔ برائے مہربانی آپ قرآن و سنت کی روشنی میں وراثت کا حق تجویز فرمائیں"۔

(شہناز بیگم زوجہ محمد طاہر (مرحوم) ۳۹۳۔ آر بلاک نمبر ۱۵ دستگیر کالونی۔ کراچی)

جواب: اگر سائلہ کے بیان کردہ واقعات درست ہیں اور متوفی کے شرعی وارث وہی ہیں جو سوال میں بیان کئے گئے ہیں، تو تقسیم ترکہ سے پہلے کے ضروری مالی حقوق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ حسبِ ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ ترکہ کل ۲۴ حصوں میں منقسم ہوگا اور ہر وارث کا حصہ درج ذیل ہوگا۔

بیوہ	=	3 حصے	(یعنی 1/8 حصہ)
دو بیٹیاں	=	16 حصے	(یعنی 2/3 حصے) ہر ایک بیٹی کو آٹھ آٹھ حصے ملیں گے
بہن	=	5 حصے	(بقایا حصے بہن کو ملیں گے)

چچا اور پھوپھیاں محروم رہیں گے۔

مسئلہ وراثت

سوال: ایک شخص جو انتقال کر گئے اور اس نے تین بیٹے، تین بیٹیاں اور ایک بیوہ چھوڑے ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں مذکور ورثاء کو کتنے کتنے حصے ملیں گے۔ کیا شریعت میں یہ ضروری ہے کہ ان افراد کو بتایا جائے کہ کل ترکہ کتنا ہے۔ (سائل محمد ادریس قادری۔ کراچی)

جواب: متوفی کے ترکہ میں سے مصارفِ تجہیز و تکفین وضع کرنے اور اگر اس کے ذمے کسی کا قرض ہے تو اس کی ادائیگی کرنے کے بعد بقایا ترکے کے ایک تہائی حصے پر اس کی وصیت جاری ہوگی (اگر کی ہو)۔ اس کے بعد جو ترکہ بچے گا وہ اس کی وفات کے وقت موجودہ ورثاء میں حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ ترکہ کے کل 72 حصے ہوں گے اور ہر وارث کا حصہ مندرجہ ذیل ہوگا:
بیوہ = 9 حصے، تین بیٹے = 42 حصے (ہر بیٹے کو 14 حصے ملیں گے)، تین بیٹیاں = 21 حصے (ہر بیٹی کو

7 حصے ملیں گے)

چونکہ ترکہ میں تمام ورثاء کا حق ہے، اس لئے ہر ایک کو معلوم ہونا چاہئے کہ کل ترکہ کتنا ہے اور ازروئے شریعت اس کا حصہ کتنا ہے۔

فوت شدہ قرض خواہ کی رقم کو وارثوں کی مرضی کے بغیر ایصالِ ثواب میں لگانا

سوال: میں نے اپنی رشتہ دار خاتون سے ۲ لاکھ روپے قرض لئے، لیکن قرض کی ادائیگی سے پہلے ہی مذکورہ خاتون کا انتقال ہوگیا۔ مذکورہ خاتون کے قریبی وارثوں میں صرف ایک لڑکا اور لڑکی ہیں، دونوں بالغ ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں مذکورہ رقم میں سے ایک لاکھ روپے مرحومہ کے نام پر کسی خیراتی ادارے کو دے دوں اور باقی ایک لاکھ روپے دونوں بہن بھائی میں تقسیم کردوں۔ کیا ایسا کرنا ازروئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟۔ اگر نہیں تو پھر یہ مذکورہ رقم دونوں بھائی، بہن میں کس تناسب سے تقسیم کروں اور ان دونوں میں سے ہر ایک کا کتنا حصہ ہوگا۔ یہ دونوں بہن بھائی مجھ سے رقم کا تقاضہ کر رہے ہیں؟

نوٹ:- یہ رقم میں نے مرحومہ خاتون سے تین مہینے کے لئے نفع ونقصان کی شراکت پر کاروبار کے لئے لی تھی، (افتخار اللہ۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب: آپ نے مرحومہ خاتون سے جو ۲ لاکھ روپے قرض لئے تھے، اب وہ ان کا ترکہ ہے، چونکہ یہ رقم آپ نے نفع ونقصان میں شراکت کی بنیاد پر لی تھی جسے اصطلاح شریعت میں مضاربت کہتے ہیں تو اب تک آپ نے جو نفع کمایا ہے، اور اس منافع میں ان کا جو حصہ طے تھا، وہ بھی ان کی رقم میں جمع ہوکر ان کے مجموعی ترکے میں شامل ہوگا۔ آپ کی یہ خواہش کہ ''آپ مرحومہ کی رقم میں سے (ایصالِ ثواب کے لئے) ایک لاکھ روپے کسی خیراتی ادارے کو دے دیں''، اس کا شرعاً آپ کو کوئی اختیار نہیں ہے، یہ اردو محاورے کے مطابق ''حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ'' والی بات ہوگی۔ یہ سارا مال اب مرحومہ کا ترکہ ہے اور اس کے وارثوں کا حق ہے دوسروں کے مال میں تصرف کرنے کا آپ کو قطعاً اختیار نہیں ہے، باقی سوال میں درج صورتحال اگر درست ہے اور مرحومہ خاتون کے شرعی ورثاء صرف دو ہی ہیں یعنی ان کا صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی، ان کے

علاوہ اس کی وفات کے وقت اگر ان کے والدین اور شوہر حیات نہیں تھے، بلکہ اس سے پہلے وفات پا چکے تھے تو مرحومہ کے مجموعی ترکے میں سے (جس میں آپ کے پاس موجود ۲ لاکھ روپے بھی شامل ہیں) دو حصے بیٹے کو ملیں گے اور ایک حصہ بیٹی کو ملے گا۔ آپ کے سوال میں ایک تضاد بھی ہے شروع میں آپ نے لکھا ہے آپ نے دو لاکھ روپے مرحومہ سے قرض لئے تھے، اگر آپ کے بیان کا یہ حصہ درست ہے تو وہ ۲ لاکھ روپے مرحومہ کا ترکہ اور اس کے وارثوں کا حق ہے۔ سوال کے آخر میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے وہ رقم کاروبار کے لئے نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر لی تھی، جسے شرعاً مضاربت کہتے ہیں۔ اگر آپ کے بیان کا پہلا حصہ غلط ہے اور یہ حصہ درست ہے تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آپ دونوں کے درمیان نفع میں شراکت کا تناسب کیا طے پایا تھا، جو بھی حقیقی صورتحال ہو، عنداللہ آپ بہتر جانتے ہیں کہ آپ کو اس تجارت میں کتنا نفع ہوا، اس نفع کی رقم میں سے مرحومہ کا طے شدہ حصہ ان کی اس اصل رقم میں جمع کر کے آپ کو اس کے وارثوں کو دینا ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ آپ کو تجارت میں کچھ نقصان ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہی کے تصور اور شرعی دیانت و امانت کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے کل رقم (۲ لاکھ روپے) میں سے وہ نقصان وضع کر کے باقی واجب الادا رقم اس کے وارثوں کو دے دیں۔

فاتحہ کس کے مال سے دی جائے؟

سوال: میت کے ایصالِ ثواب کی غرض سے جو کھانا وغیرہ تیار کیا جاتا ہے، وہ کس کے مال سے دیا جانا چاہئے، آیا میت کے ترکہ سے دیا جائے یا ورثاء اپنے مال میں سے دیں؟

(عمران اشرف۔ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: اگر میت نے اپنی موت سے پہلے اپنے ایصالِ ثواب یا صدقۂ جاریہ کے لئے کوئی وصیت کی ہے تو یہ اس کی وصیت کے مطابق اس کے ترکے میں سے دیا جائے گا، لیکن اگر اس کی وصیت کی مقدار اس کے ایک تہائی ترکے سے زیادہ ہو تو اسے تہائی تک محدود رکھا جائے گا۔ اگر کوئی وارث یا چند ورثاء عاقل و بالغ ہیں اور میت کی ایک تہائی سے زائد وصیت کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے مال میں سے یا میت کے ترکے میں سے انہیں جو حصہ ملے گا، اس میں سے ایسا کر سکتے ہیں۔ کسی نابالغ وارث کے حصے پر کسی کو کوئی تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اور اگر میت

نے موت سے پہلے اپنے ایصالِ ثواب یا صدقہء جاریہ کے لئے کوئی وصیت نہیں کی، لیکن ورثاء
مالی ایصالِ ثواب کرنا چاہتے ہیں تو عاقل و بالغ ورثاء اپنے مال میں سے یا ترکے میں سے انہیں جو
حصہ ملے گا وہ اس میں سے ایسا کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، لیکن نابالغ وارث کے حصے میں کوئی
تصرف نہیں کرسکتے۔ وصیت کے بغیر میت کے ترکے میں جو تصرفات لازمی طور پر کرنے ضروری
ہیں اور جس سے نابالغ وارثوں کا حصہ بھی مستثنیٰ نہیں ہے، وہ صرف دو طرح کے مصارف ہیں،
ایک کفن دفن کے مصارف اور دوسرا اس کے ذمے اگر کسی کا کوئی قرض ہو تو اس کا ادا کرنا ضروری
ہے۔ امام شافعی کے نزدیک میت کے ترکے میں سے حقوق العباد کی طرح حقوق اللہ کے مالی
واجبات بھی وضع کرنے لازمی ہیں، لیکن امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک حقوق اللہ کے مالی واجبات
(مثلاً زکوٰۃ کے بقایا جات، صدقہء فطر کے واجبات، فدیہء صوم کے واجبات اور کفارات کے
واجبات وغیرہ) لازماً وضع نہیں ہوں گے بلکہ اگر اس نے وصیت کی ہے تو ایک تہائی ترکے کی حد
تک وہ مؤثر ہوگی۔ اگر حقوق اللہ کے واجبات وصیت کی صورت میں ایک تہائی ترکے سے زیادہ
بنتے ہیں تو عاقل و بالغ ورثاء، رضاکارانہ طور پر اپنے مال میں سے یا ترکے کے حصے میں سے ادا
کرسکتے ہیں، لیکن نابالغ وارثوں کے حصے میں سے یہ تصرف نہیں ہوگا، یہی مسئلہ بصورتِ وصیت یا
عدمِ وصیت فرض حجِ بدل کا ہے۔

مسئلہ وراثت

سوال: جناب عالی میرے والد نے انتقال کے وقت ایک کوارٹر چھوڑا تھا اس کوارٹر کو فروخت کرنے کے بعد ہم کو ۲ لاکھ ۸۲ ہزار روپے کی رقم حاصل ہوئی ہے۔ اس رقم کے وارثوں میں ہماری ایک بیوہ ماں اور ۲ لڑکے ۳ لڑکیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک لڑکی کا انتقال ہمارے والد کی موجودگی میں ہوگیا تھا۔ لیکن ان کی اولاد موجود ہے برائے مہربانی ہماری رہنمائی فرمائیں کہ کس کے حصے میں کتنی رقم بنتی ہے۔ ہماری والدہ کی خواہش ہے کہ میں اپنی زندگی میں تمام اولادوں کو ان کا حصہ دے دوں برائے مہربانی اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں قرآن وسنت کے مطابق ہماری رہنمائی فرمائیں، (عمران الحق، نیو کراچی)۔

جواب: شرعی اصول یہ ہے کہ کسی شخص کے انتقال کے بعد اگر اس نے کوئی ترکہ چھوڑا ہے تو اس میں سے سب سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین کے مصارف وضع کئے جائیں گے، اس کے

بعد اس کے ذمے اگر کسی کا قرض ہے تو وہ ادا کیا جائے گا، اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کر رکھی ہو تو بقیہ ترکے کی ایک تہائی تک وہ شرعاً مؤثر اور نافذ العمل ہوگی، لیکن اس میں بھی یہ امر ملحوظ رہے کہ وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد ترکہ موجود ورثاء میں تقسیم ہوگا، موجود ورثاء سے مراد یہ ہے کہ جو شرعی وارث متوفی شخص کی وفات کے وقت بقیدِ حیات ہوں، اب صورتِ مسؤلہ میں آپ کے والد مرحوم کا ترکہ حسبِ ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ ترکہ کے کل حصص ۱۲۰ ہوں گے۔ ان میں سے:

زوجہ (یعنی آپ کی والدہ) = ۱۵ حصے، ۶ بیٹے (فی کس ۱۴ حصے) کل = ۸۴ حصے، ۳ بیٹیاں (فی کس ۷ حصے) کل = ۲۱ حصے

جو بیٹی مرحوم کی زندگی میں وفات پا چکی تھی اس کی اولاد وراثت سے محروم رہے گی لیکن بقیہ ورثاء اگر تبرع اور فضل و احسان کے طور پر اپنی مرحومہ بہن کی اولاد کو کچھ دے دیں تو یہ بڑے اجر و ثواب اور صلۂ رحمی کی بات ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (النساء:8)

''اور جب (ترکہ کی) تقسیم کے موقع پر (غیر وارث) رشتے دار اور یتیم اور محتاج آ جائیں تو انہیں (بھی) اس میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو''۔

اس آیت میں قرآن نے وجوباً تو نہیں بلکہ ایک مندوب و مستحب امر کے طور پر یہ تعلیم دی ہے کہ ایسے موقع پر ان لوگوں کی دلداری کے لئے جو شرعاً وارث نہیں بنتے، کچھ نہ کچھ مدد کر دی جائے تو یہ ایک اعلیٰ اخلاقی قدر ہوگی، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ تقسیمِ وراثت کا عمل شروع کرنے سے پہلے تمام ورثاء رضاکارانہ طور پر اور باہمی اتفاق رائے سے ان کے لئے کچھ مال الگ کر دیں، دوسری یہ کہ تقسیم کے بعد ہر ایک وارث اپنے حصے میں سے حسبِ توفیق ان لوگوں کی کچھ نہ کچھ مدد کرے، لیکن تبرع و احسان کا یہ حکم بالغ ورثاء کے لئے ہے۔ نابالغ وارث کے حصے میں سے کسی کو ایسے تصرف کا اختیار نہیں ہے۔

مسئلۂ وراثت

سوال: ایک صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، ان کے پسماندگان میں ایک بیوہ، دو بیٹے اور تین

بیٹیاں ہیں، جن میں سے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں شادی شدہ ہیں، لہٰذا اس صورت میں ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی، (بیوہ غلام حسین۔ دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب: صورتِ مسئولہ میں متوفی کے ترکے سے (۱) مصارفِ تجہیز و تکفین وضع کرنے (۲) ادائیگی قرض (اگر کوئی ہو) (۳) ایک تہائی ترکے کی حد تک نفاذِ وصیت (اگر کی ہو) کے بعد جو ترکہ بچے گا، وہ مندرجہ ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا۔ کل ترکہ کے ۸ حصے کیے جائیں گے۔ ان میں سے بیوہ کو ایک حصہ، دو بیٹوں کو چار حصے (فی کس دو حصے) اور تین بیٹیوں کو تین حصے (فی کس ایک حصہ) ملیں گے۔ وراثت کی تقسیم میں اولاد میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے اعتبار سے کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔

مسئلۂ وصیت

سوال: اگر کسی شخص نے مرنے سے پہلے یہ وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرے ورثے میں سے "۳۳" فیصد اللہ کی راہ خرچ کرنا کیا اس کی وصیت میں کمی یا زیادتی جائز ہے یا نہیں یا ۳۳ فیصد ہی دینا پڑے گا، (محمد ادریس قادری۔ کراچی)۔

جواب: اگر کسی نے وصیت کی ہو کہ میری موت کے بعد میرے ترکے میں سے ایک مقررہ رقم یا حصہ یا معینہ چیز فلاں کارِ خیر میں صرف کرنا یا فلاں شخص کو دے دینا۔ تو کل ترکے کی ایک تہائی مالیت (۳/۱ یا ۳، ۳۳ فیصد) تک اس پر عمل کرنا اور اسے نافذ کرنا واجب ہے۔ اگر وصیت کی مالیت کل ترکے کی ایک تہائی کے برابر یا اس سے کم ہو تو پوری نافذ ہو جائے گی، ایک تہائی سے زیادہ ہو تو ایک تہائی تک موثر ہوگی اور باقی لغو ہو جائے گی۔ ہاں اگر تمام وارث متفقہ طور پر اسے نافذ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، ورنہ جو وارث راضی ہو صرف اس کے حصے سے ادا ہوگی، نابالغ وارثوں کے حصے سے ادا نہ ہوگی، اگر وصیت کسی ایسے شخص کے حق میں کی ہے جو خود بھی وارث بن رہا ہو، تو اس کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

لا وَصِیَّۃَ لِوارث

"وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے"۔

مسئلہ امانت

سوال: عرض یہ ہے کہ بندہ جدہ میں کپڑے کی تجارت کرتا ہے، کراچی سے مال لے جا کر جدہ فروخت کرتا ہے، ہوا یہ کہ بندے نے اپنے عزیز کو دس ہزار ریال اپنے دوست سے دلوائے اور کہا کہ یہ رقم ''ٹی۔ٹی'' یا ''حوالے'' کے ذریعے دبئی بھیج کر والد کو پاکستان میں حوالہ کردے، میں پاکستان میں تمہارے والد سے وصول کرلوں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ میرے دوست آصف اقبال نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ رقم اپنے تایا کے ہاتھ روانہ کردی۔ لیکن جب وہ شخص پاکستان آیا تو اس نے کہا کہ وہ رقم مجھ سے گم ہوگئی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آصف اقبال یہ کہتا ہے کہ یہ نقصان مجھ پر نہیں آتا، بلکہ محمد انیس یونس (یعنی سائل) پر عائد ہوتا ہے۔ جبکہ میں نے یہ رقم اپنے دوست کو جو دبئی میں رہتا ہے، بھیجنے کے لئے کہا تھا، تاکہ اس کے حوالے کرکے پاکستان میں آصف کے والد اقبال لالا سے وصول کرلیتا۔ ازروئے شریعت بتائیں کہ اس نقصان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے، یہ میرا نقصان ہے یا میرے دوست آصف اقبال کا، جس نے میری ہدایت کے برعکس کام کیا''۔ (محمد انیس یونس قادری، صدیق آباد، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)

جواب: اگر معاملے کے حقائق و واقعات یہی ہیں جو بیان کیے گئے ہیں، تو آصف اقبال پر لازم ہے کہ وہ ضائع ہونے والی رقم آپ کو ادا کرے، خواہ وہ یہ رقم اپنے تایا سے وصول کرکے ادا کرے یا اپنے پاس سے ادا کرے، کیونکہ آپ (محمد انیس) نے آصف اقبال کو یہ کہہ کر رقم کا ذمہ دار بنایا تھا کہ وہ T.T یا حوالے کے ذریعے اس رقم کو براستہ دوبئ اپنے والد کو کراچی (پاکستان) بھیج دے، لیکن آصف اقبال نے محمد انیس کی ہدایت کی خلاف ورزی کی اور محمد انیس کی مرضی کے خلاف طریقہ اختیار کرکے رقم ارسال کی، لہٰذا آصف اقبال اس رقم کے نقصان کے لئے ذمہ دار اور مسئول ہوگا، حضرت صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

کسی نے ایک شخص کو مثلاً ایک ہزار روپے دیئے کہ فلاں شخص کو جو فلاں شہر میں ہے دے دینا، اس نے دوسرے شخص کو دے دیئے کہ تم فلاں کو دے دینا، اور راستہ میں روپے ضائع ہوگئے، تو دیکھیں گے کہ اگر دینے والا مر گیا ہے تو مُودِع (یعنی جس کو تفویض امانت کی ذمہ داری سونپی تھی) پر تاوان نہیں ہے کہ یہ وصی ہے، اور اگر دینے والا زندہ ہے تو تاوان ہے کہ وہ وکیل ہے، ہاں اگر وہ

شخص جس کو روپے دیئے ہیں، وہ اس (دینے والے) کی عیال میں ہے تو ضامن نہیں ہے۔
(بہارِ شریعت جزء: ۱۴۔ ص: ۳۸۔ موضحاً)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

دفع الٰی رجل الف درهم وقال ادفعها الٰی فلان بالریّ فمات الدافع فدفع المودع المال الٰی رجل لیدفعه الٰی فلان بالریّ فاخذفی الطریق لایضمن المودع لانه وصی المیت، فلوکان الدافع حیاضمن المودع لانه وکیل، الاان یکون الآخر فی عیاله فلایضمن حینئذٍ "خانیه"۔

''ایک شخص نے ایک (دوسرے) شخص کو (مثلاً) ایک ہزار روپے دیئے کہ ''رے'' کے مقام پر فلاں شخص کو دے دینا، (بعد میں) دینے والا وفات پا گیا، پھر اس شخص نے (جسے امانت پہنچانے کی ذمہ داری تفویض ہوئی تھی) وہ مال ایک اور شخص کو دے دیا تاکہ وہ ''رے'' کے مقام پر متعلقہ شخص کو پہنچا دے، وہ راستے میں لٹ گیا، تو وہ مُودع (نقصان کا) ضامن نہیں ہوگا، کیونکہ اب وہ میت کا وصی ہے، اگر دافع (اصل دینے والا) زندہ ہے تو مُودَع ضامن ہے، کیونکہ وہ وکیل ہے، سوائے اس کے کہ وہ دوسرا (یعنی مودع) اس رقم دینے والے کے عیال میں سے ہے تو پھر وہ ضامن نہیں ہوگا'' ''بزازیہ''۔ (ردالمحتار ج ۸۔ ص ۴۰۶)

بعینہٖ یہی مسئلہ فتاویٰ عالمگیری ج ۴ ص ۳۵۳ پر فتاویٰ قاضی خان کے حوالہ سے درج ہے۔

میں (بیوہ) آپ سے مدد اور تعاون کی طلب گار

سوال: میری عمر ۳۲ سال ہے اور میرے ۶ بچے ہیں سب سے بڑے بچے کی عمر ۹ سال ہے اور سب سے چھوٹے بچے کی عمر ایک سال ہے۔ میرا خاوند محمد حنیف عمر ۳۵ سال مورخہ ۲۰ دسمبر ۲۰۰۰ء کو شارع نور جہاں تھانے کی حدود میں عبداللہ کالج اور نارتھ ناظم آباد تقریباً ڈھائی بجے دن نامعلوم گاڑی کی ٹکر سے ہلاک ہوگیا ہے جس کی ایف۔ آئی۔ آر نمبر ۲۰۰۰/۱۷۱ بتاریخ ۲۰۰۰-۱۲-۲۰ تھانے میں درج ہے۔ (کاپی منسلک ہے) دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے اب تک میرے شوہر کے قاتل نہیں پکڑے جاسکے اور نہ ہی مجھے کہیں سے کسی قسم کا کوئی معاوضہ ملا۔ معاوضے کے مقدمے کے لیے مختلف وکلاء سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ کیونکہ مارنے

والے نامعلوم ہیں اس لیے معاوضے کا دعویٰ کس کے خلاف ہوگا؟ مجھ بیوہ پر جو چھ معصوم بچوں کی کفالت کررہی ہے یہ جواب بہت ہی قیامت کے طور پر ٹوٹ پڑا ہے! جناب محترم جناب عالی آپ سے مؤدبانہ میری درخواست ہے کہ جب اسلامی جزیات کا اصول ہے کہ کوئی بھی قتل بغیر ہرجانے کے نہیں جائے گا تو اس صورت میں جبکہ مارنے والے قاتل نہ پکڑے جائیں یا نامعلوم ہوں تو کیا حکومت کی ذمہ داری نہیں کہ وہ اپنے بیت المال سے کسی شہری کے قتل کا معاوضہ اس کے لواحقین کو دے۔

دوئم یہ کہ اگر حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے تو معاوضے کے تعین کے لیے کیا اصول متعین ہوں گے اور معاوضے کی رقم کس حد تک دی جاسکتی ہے اگر مناسب تحریر اور حوالوں سے اس پر روشنی ڈالی جائے تو مجھ بیوہ اور یتیم بچوں پر احسان عظیم ہوگا کیونکہ آپ کا جواب ہی ہمارے لیے امید کی آخری کرن ہوگی جس کا مثبت ہونے کی صورت میں ہمیں مزید کارروائی کرنے کا حق حاصل ہوگا،

آمنہ حنیف (بیوہ محمد حنیف) فیڈرل بی ایریا، کراچی

جواب: آپ کے شوہر کی ہلاکت ''قتل بالسبب'' کے تحت آتی ہے۔ چنانچہ علامہ غلام رسول سعیدی شرح صحیح مسلم جلد چہارم، صفحات ۶۷۷۔۶۷۶ پر المبسوط سرخسی، جلد ۲۶، صفحہ ۶۸ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قتل بالسبب: علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ جو قتل عمد ہے نہ خطا نہ قائم مقام خطا (یعنی قتل بالسبب) وہ یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص راستہ میں کنواں کھودے یا راستہ میں پتھر وغیرہ رکھ دے اور کوئی شخص کنوئیں میں گر کر ہلاک ہوجائے یا پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرے اور مرجائے۔ یہ شخص قتل کرنے کا مرتکب نہیں ہے کیونکہ اس نے مقتول پر کوئی فعل واقع نہیں کیا، اس کا فعل تو زمین کے ساتھ متصل تھا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ عمد، شبہ عمد، خطا یا قائم مقام خطاء قتل کی کسی قسم کا مرتکب نہیں ہے بلکہ اس کے ایک سبب سے قتل ہوا ہے جو سبب متعدی ہے پس ہم اس کے عصبات پر دیت واجب کرتے ہیں تاکہ انسانی جان رائیگاں جانے سے بچ جائے اور اس شخص پر نہ کفارہ واجب ہوگا اور نہ وہ مقتول کی وراثت سے محروم ہوگا۔ حسب ذیل صورتیں بھی قتل بالسبب میں داخل ہیں:

۱۔ کوئی شخص کسی جانور کو ہانک کر لے جارہا ہو اور وہ جانور کسی شخص کو ہلاک کردے۔

۲۔ کوئی شخص تیز رفتار گاڑی چلائے اور اس کی جھپٹ میں آکر کوئی شخص ہلاک ہوجائے۔

۳۔کوئی اناڑی شخص گاڑی چلائے اوراس کی گاڑی کے نیچے کوئی آ کر ہلاک ہو جائے۔

۴۔کوئی شخص نشہ میں آ کر گاڑی چلائے اوراس کی گاڑی کے نیچے آ کر کوئی شخص مر جائے۔''

اب مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے شوہر کے قاتل کا پتا نہیں ہے جس کی گاڑی کی ٹکر سے ان کا انتقال ہوا ہے، اگر قاتل کا پتا ہوتا تو دیت اس کی عاقلہ یعنی عصبہ وارثوں پر عائد ہوتی، یہ مسئلے کی شرعی نوعیت ہے، ورنہ ہمارے معاشرے میں اسلام کی مکمل حکمرانی نہ ہونے کی وجہ سے عاقلہ کا تصور اب مفقود ہے۔موجودہ صورت میں جب کہ قاتل کا پتا نہ ہو، بلاشبہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمان کا خون رائیگاں نہ جائے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ''کتاب القسامہ والمحاربین والدیات'' میں احادیث نمبر ۴۲۲۹ تا ۴۲۳۶ میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ عبداللہ بن سہل بن زید اور محیصہ بن مسعود بن زید (دو چچازاد بھائی) یہود کے علاقے خیبر میں گئے اور کسی وجہ سے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے، پھر محیصہ کو عبداللہ کی لاش (Dead Body) ملی، انہیں کسی نے قتل کردیا تھا، محیصہ نے اپنے چچازاد بھائی عبداللہ کو دفن کردیا۔ پھر محیصہ، حویصہ (مقتول کے چچازاد) اور عبدالرحمٰن بن سہل (مقتول کے بھائی) نے یہ مقدمہ رسول اکرم ﷺ کے حضور پیش کیا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمہارے پچاس آدمی قسم کھائیں گے کہ فلاں شخص ہمارے بھائی کا قاتل ہے تاکہ قاتل تمہارے حوالے کردیا جائے، انہوں نے عرض کیا: ''جس واقعے کو ہم نے دیکھا نہیں، اس بارے میں ہم کیسے قسم کھا سکتے ہیں۔'' اس پر حضور نے فرمایا: ''پھر (اس بستی کے) پچاس یہودی تمہارے سامنے (اس کی بات کی) قسم کھا کر (کہ نہ ہم نے عبداللہ کو قتل کیا ہے اور نہ ہی ہمیں قاتل کے بارے میں کچھ علم ہے) اپنی براءت ثابت کرلیں گے۔'' اس پر مدعیان نے عرض کیا: (یارسول اللہ!) کفار کی قسموں کا کیا اعتبار؟، چنانچہ آخرکار رسول اللہ ﷺ نے خود دیت ادا فرمادی، حدیث مبارک کے الفاظ یہ ہیں:

فلما رأی رسول اللہ ﷺ ذالک اعطیٰ عقلہ.

''جب رسول اللہ ﷺ نے یہ صورت حال دیکھی تو خود مقتول کی دیت ادا فرمادی''۔

دوسری روایت میں ہے:

فَوَدَاہ رسول اللہ ﷺ مِنْ قِبَلِہ

''تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی جانب سے دیت ادا فرمادی''۔

تیسری روایت میں ہے:

فکرہ رسول اللہ ﷺ ان یطلِ دمَہ فوداہ مائۃ ابل من الصدقۃ۔

"تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے خون کا رائیگاں ہونا گوارانہ فرمایا اور صدقہ کے اونٹوں میں سے سو اونٹ دے کر اس کی دیت ادا فرمادی"۔

یہاں "قسامت" کا مسئلہ زیر بحث نہیں ہے، صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ جب ایک مقتول کا شہادت یا اعتراف جرم کے ذریعے قصاص بھی نہ لیا جاسکا اور دیت کی بھی کوئی صورت نہ نکلی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ ایک مسلمان کا خون رائیگاں ہو جائے، لہٰذا آپ نے بیت المال سے دیت ادا فرمادی۔ چنانچہ علامہ عبدالقادر عودہ اپنی تصنیف "التشریع الجنائی الاسلامی" الجزء الثانی صفحات ۳۲۷، ۳۲۸ پر لکھتے ہیں:

الاصل فی القسامۃ انہا شرعت لحفظ الدماء وصیانتہا فالشریعۃ الاسلامیۃ تحرص اشد الحرص علی حفظ الدماء وصیانتہا وعدم اھدارھا ولما کان القتل کان یکثر وکان یقل قیام الشھادۃ علیہ لأن القاتل یتحری بالقتل مواضع الخلوات جعلت القسامۃ حتی لا یفلت المجرمون من العقاب و حتی تحفظ الدماء و تصان۔(بدایۃ المجتہد ۲/۳۵۸)

ولقد کان من حرص الشریعۃ علی حیاطۃ الدماء مما دعا احمد إلی القول بأن من مات من زحام الجمعۃ أو فی الطواف فدیتہ فی بیت المال وبمثل ھذا قال اسحاق وقال عمر وعلی، فان سعیدا یروی عن ابراھیم أن رجلا قتل فی زحام الناس بعرفۃ فجاء أھلہ إلی عمر فقال بَیِّنَتُکُمْ علی من قتلہ فقال علی یا أمیر المؤمنین لا یطل دم امریء مسلم إن علمت قاتلہ والا فاعطہ دیتہ من بیت المال وقال الحسن والزھری فیمن مات من الزحام دیتہ علی من حضرت لان قتلہ حصل منہم (المغنی ج۱۰ ص۹۔۱۰)و لعل فی حدیث الرسول ﷺ الذی قرر القسامۃ مایؤید ھذا النظر ففی روایۃ متفق علیہا أن رسول اللہ ﷺ قال لہم تاتون بالبینۃ علی من قتلہ فقالوا مالنا من بینۃ قال فتحلفون قالوا لا نرضی بایمان الیہود فکرہ رسول اللہ ﷺ أن یطل دمہ فودا بمائۃ من ابل

لصدقة (نیل الاوطار: ج ۶ ص ۳۱۲)۔

"قسامت میں اصل یہ ہے کہ انسانی جان کی حفاظت کے لئے مشروع ہوئی ہے، کیونکہ شریعت انسانی جانکی حفاظت اور اس کے رائیگاں نہ ہونے کی شدت سے خواہش مند ہے، اور چونکہ قتل کے واقعات کثیر تھے اور ان پر شہادت کا قائم ہونا بہت کم تھا، کیونکہ قاتل قتل کرنے کے لئے ایسی جگہوں کو تلاش کرتا تھا جہاں اسے کوئی نہ دیکھ سکے، تو قسامت کا قانون وضع کیا گیا تا کہ مجرم سزا سے نہ بچ سکیں، اور انسانی جانیں محفوظ رہیں"۔ (بدایۃ المجتہد: ج ۲ ص ۳۲۱)

اور انسانی جانوں کی حفاظت کے لئے شریعت کا تقاضا ہی تھا کہ امام احمد کو یہ کہنا پڑا کہ جو شخص جمعہ کے موقع پر یا دوران طواف اژدحام میں کچل کر مر گیا ہو تو اس کی دیت بیت المال پر ہے، اور ایسا ہی قول امام اسحاق، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے روایت ہے، کیونکہ سعید نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص عرفہ کی بھیڑ میں کچلا گیا اس کے ورثاء نے حضرت عمر کے پاس آ کر شکایت کی، حضرت عمر نے فرمایا: تم اس کے قاتلین کے خلاف گواہ لاؤ۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے امیر المومنین مسلمان کا خون رائیگاں نہیں جاتا اگر آپ کو اس کے قاتل کا علم ہے تو فبہا ورنہ بیت المال سے اس کی دیت ادا کیجئے۔ اور حسن اور زہری نے کہا جو شخص بھیڑ میں کچلا جائے، اس کی دیت حاضرین پر ہے، کیونکہ انہی کی وجہ سے وہ قتل ہوا ہے، اور حدیث قسامت میں بھی اس نظریے کی تائید ہے۔ کیونکہ متفق علیہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا کہ قاتل کے خلاف گواہ پیش کرو۔ عرض کیا: ہمارے پاس تو کوئی گواہ نہیں ہے، آپ نے فرمایا تو تم یہود کو قسمیں دلاؤ گے؟ انہوں نے عرض کیا: ہمیں یہود کی قسموں پر اعتبار نہیں ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو ناپسند کیا کہ مقتول کا خون رائیگاں چلا جائے تو آپ نے صدقے کے اونٹوں سے سو اونٹ دیت کے طور پر دیئے"۔

لہٰذا آپ عدالت سے رجوع کریں یا ارباب اقتدار سے اپیل کریں کہ وہ سرکاری خزانے یا بیت المال سے آپ کے شوہر کی دیت ادا کریں۔ قتل خطا کی دیت ایک ہزار دینار جو 4.374 کلو گرام سونے کے برابر ہے یا دس ہزار درہم جو 30.618 کلوگرام چاندی کے برابر ہے۔

باپ کا اولاد کے درمیان مساوات کا رویہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین مندرجہ ذیل چار سوالوں کے بارے میں، قرآن کریم، حدیث

اور فقہ حنفی کی روشنی میں جوابات زیرِ قلم فرمایئے:

سوال: (۱) کیا ایک باپ کو اپنی زندگی میں اس کا اختیار ہے کہ اپنی جائیداد کی تقسیم میں اپنے بیٹوں، بیٹیوں اور بیویوں میں امتیاز برتے کسی کو زیادہ حصہ کسی کو کم اور کسی کو بالکل محروم کر کے ناانصافی کرے، اور دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اپنی اولاد میں فتنہ وفساد کی ایک بڑی بنیاد ڈالے۔

سوال: (۲) کیا کوئی باپ اپنی زندگی میں اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کو عاق کر کے مکمل طور پر جائیداد کے حصے سے محروم کرسکتا ہے؟ والد کے مرنے کے بعد عاق کیا ہوا بیٹا دوسرے بھائیوں سے حصہ لینے کا حقدار ہے، اگر وہ فتنہ وفساد اور جان کے خطرے کا باعث بن جاتا ہے تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟

سوال: (۳) کیا اسلام میں صرف اولاد پر ماں باپ کے ہر حکم کی تعمیل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ماں باپ پر اپنی اولاد کے بارے میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، کیا کوئی باپ اپنی تمام اولاد یا کسی ایک کے ساتھ غلاموں جیسا حقیر سلوک یا برتاؤ کرسکتا ہے، اسلام نے اس کی کہاں تک اجازت دی ہے۔

سوال: (۴) کیا ایک باپ اپنی جائیداد کے علاوہ اپنے ایک بیٹے کی محنت سے کمائی ہوئی جائیداد کو بھی ہڑپ کر کے اپنے دوسرے بیٹوں میں تقسیم کرسکتا ہے اگر کوئی باپ ایسے عمل کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کی آخرت میں کیا سزا ہوگی، (محمد علی۔ میٹروول، کراچی)۔

جواب: (۱) اپنی زندگی میں والد یا والدہ اپنی جائیداد اور مال میں سے اولاد کو جو کچھ دینا چاہیں، وہ ترکہ یا وراثت نہیں کہلاتا بلکہ "ھبہ" کہلاتا ہے۔ ھبہ کرنے میں وہ مختار ہیں، ان پر کوئی شرعی لزوم یا پابندی نہیں ہے، البتہ شریعت میں یہ ہدایت ضرور ملتی ہے کہ اگر والدین میں سے کوئی اپنی اولاد کو ھبہ کرنا چاہے تو وہ اولاد کے درمیان مساوات کرے۔ چند احادیث مبارکہ ملاحظہ کیجئے:

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ اَنَّ اُمَّهُ بِنْتَ رَوَاحَةَ سَئَلَتْ اَبَاهُ بَعْضَ الْمَوْهِبَةِ مِنْ مَّالِهِ لِابْنِهَا فَالْتَوٰى بِهَا سَنَةً ثُمَّ بَدَا لَهُ فَقَالَتْ لَا اَرْضٰى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى مَا وَهَبْتَ لِابْنِيْ فَاَخَذَ اَبِيْ بِيَدِيْ وَاَنَا يَوْمَئِذٍ غُلَامٌ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ: اِنَّ اُمَّ هٰذَا بِنْتَ رَوَاحَةَ اَعْجَبَهَا اَنْ اُشْهِدَكَ عَلَى الَّذِيْ وَهَبْتُ لِابْنِهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَا بَشِيْرُ اَلَكَ وَلَدٌ سِوٰى هٰذَا، قَالَ نَعَمْ، قَالَ اَكُلَّهُمْ وَهَبْتَ لَهٗ

مِثْلَ هٰذَا۔ قَالَ لَا، قَالَ فَلَا تُشْهِدْنِی اِذًا فَاِنِّیْ لَا اَشْهَدُ عَلٰی جَوْرٍ۔

''حضرت نعمان بن بشیر بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد (یعنی اپنے شوہر) سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ ان کے بیٹے (یعنی حضرت نعمان) کو ہبہ کریں، میرے والد ایک سال تک اس معاملے کو ٹالتے رہے، پھر انہیں اس کا خیال آیا، تو میری والدہ نے کہا: میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ آپ میرے بیٹے کے ہبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ بنالیں، تو میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے اور میں اس وقت نوعمر لڑکا تھا، تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ بنالوں جو میں نے اپنے اس بیٹے کو ھبہ کی ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا: اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے تو انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، حضور نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اس جیسا ھبہ دیا ہے، انہوں نے عرض کیا: نہیں، آپ نے فرمایا:
تو پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا''۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۰۷۰)

قَالَ: اتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا فِیْ اَوْلَادِکُمْ۔

''حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو''۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۰۶۹)

قَالَ: فَاِنِّیْ لَا اَشْهَدُ اِلَّا عَلٰی حَقٍّ۔

''حضور ﷺ نے فرمایا: کیونکہ میں حق کے سوا کسی اور چیز پر گواہ نہیں بنتا''۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۰۷۵)

قَالَ: فَاَشْهِدْ عَلٰی هٰذَا غَیْرِیْ۔

''حضور ﷺ نے فرمایا: پھر اس پر میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بناؤ''۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۰۷۳)

ان احادیث کریمہ کی روشنی میں فقہاء احناف کا مذہب یہ ہے کہ اگرچہ اولاد کے درمیان غیر مساویانہ ھبہ قانوناً نافذ العمل ہو جائے گا، لیکن یہ شرعاً ناپسندیدہ اور مکروہ عمل ہے اور حضور ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا، جبکہ بعض دیگر ائمہ کے نزدیک ایسا غیر مساویانہ ھبہ باطل ہے اور اس سے

رجوع واجب ہے۔

جواب: (۲) اولاد کی جانب سے والدین کی نافرمانی بہت بڑی شقاوت، بدبختی اور گناہِ کبیرہ ہے اور آخرت میں یہ عذاب کا باعث ہے۔ لیکن والدین کی جانب سے اولاد کو "عاق" کرنے کے یہ معنی مراد لینا کہ "وہ وراثت سے محروم ہو جائے"، یہ شرعاً معتبر نہیں ہے، اور ایسا اعلان کرنے کے باوجود کوئی اولاد اپنے والدین کی وراثت سے محروم نہیں ہوتی۔ وراثت یا ترکہ اس مال یا جائیداد کو کہتے ہیں جو بندہ دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ کر وفات پا جائے۔ اس کی وفات کے بعد وہ ترکہ اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے، کسی بندے کو اس میں ردوبدل کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

جواب: (۳) صحیح مسلم حدیث نمبر: ۴۰۷۳ میں ہے کہ حضور ﷺ نے اولاد کے درمیان ہبہ میں مساوات کی تعلیم وترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

اَیَسُرُّکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا اِلَیْکَ فِی الْبِرِّ سَوَآءً قَالَ بَلٰی، قَالَ فَلَا اِذًا۔

"(رسول اللہ ﷺ نے حضرت بشیر سے فرمایا:) کیا تمہیں یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تمہارے ساتھ حسنِ سلوک میں تمام اولاد کا رویہ یکساں ہو (اور وہ سب تمہارے تابعدار ہوں)، انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں، (اس پر) آپ نے فرمایا: تو پھر تم بھی اولاد میں عدمِ مساوات کا برتاؤ نہ کرو۔"

اس حدیث پاک کی رو سے والدین کو نفیس اور احسن پیرائے میں یہ تعلیم دی گئی کہ وہ اولاد میں مساوات برتیں، سب کے ساتھ یکساں طور پر مودت، محبت، شفقت، تبرع واحسان اور صلہ رحمی کا برتاؤ کریں۔ اگر خدانخواستہ کسی اولاد کے ساتھ اس کے والدین کا رویہ ظلم وزیادتی کا ہو، تب بھی اولاد کو ہمیشہ اطاعت شعار اور پیکرِ وفا بن کر رہنا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے تو یہاں تک اطاعتِ والدین کی تاکید فرمائی ہے کہ:

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ (العنکبوت:۸)

"اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے، اور (اے مخاطب!) اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرا جس کا تجھے علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مان"۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (لقمان:١٥)

''اور اگر وہ (والدین) تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے کچھ علم نہیں، تو ان کی اطاعت نہ کرنا اور (اس کے باوجود) دنیوی امور میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ''۔

ان آیاتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی کے والدین کافر یا مشرک بھی ہوں تو ان امور میں تو ان کی اطاعت لازم نہیں ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، لیکن عام معاملاتِ دنیا اور معاشرت میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک پھر بھی لازم ہے۔ البتہ اگر کسی کے ماں باپ اولاد پر ظلم و زیادتی کرتے ہوں تو قرآن و حدیث میں ان کے ظلم کو ظلم ہی کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (التکویر:٨،٩)

''اور جب (دنیا میں) زندہ درگور کی جانے والی بچی سے پوچھا جائے گا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں مار ڈالا گیا''۔

ظاہر ہے جب مظلوم مقتولہ بچی سے پوچھا جائے گا اور اس کی دادرسی ہوگی تو اس کے قاتل والدین سے باز پرس بھی ہوگی اور انہیں ان کے کیے کی سزا بھی ملے گی۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَصْبَحَ مُطِيْعاً لِلّٰهِ فِىْ وَالِدَيْهِ اَصْبَحَ لَهٗ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ الْجَنَّةِ وَاِنْ كَانَ وَاحِداً فَوَاحِداً وَمَنْ اَصْبَحَ عَاصِياً لِلّٰهِ فِىْ وَالِدَيْهِ اَصْبَحَ لَهٗ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ النَّارِ، اِنْ كَانَ وَاحِداً فَوَاحِداً قَالَ رَجُلٌ: وَاِنْ ظَلَمَاهُ، قَالَ وَاِنْ ظَلَمَاهُ، وَاِنْ ظَلَمَاهُ وَاِنْ ظَلَمَاهُ۔

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اس حال میں صبح کی کہ والدین (کی فرمانبرداری) کے بارے میں اللہ کے حکم کو ماننے والا ہو تو اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے ہوں گے، اور اگر (ماں باپ میں سے کسی) ایک کا اطاعت گزار ہو تو جنت کا ایک دروازہ اس کے لئے کھلا ہوگا، اور جس نے اس حال میں صبح کی کہ والدین (کی اطاعت) کے بارے میں اللہ کا نافرمان ہو، تو اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے رہیں

گے اور اگر (ماں باپ میں سے) ایک کا نافرمان ہوا تو ایک دروازہ کھلا رہے گا، ایک شخص نے عرض کیا: (یارسول اللہ!) اگر وہ (ماں باپ) دونوں اس پر ظلم کریں (تو بھی ان کی نافرمانی پر وعید صادق ہوگی)، آپ نے (تین بار) فرمایا: اور (ہاں) اگر وہ دونوں اس پر ظلم کریں (تب بھی اس کے لئے یہی سزا ہے)"۔ (مشکوٰۃ باب البر والصلۃ)

اس حدیث مبارک سے دو باتیں ثابت ہوئیں، ایک یہ کہ اولاد کو والدین کے ظلم وزیادتی کا بدلہ ظلم وزیادتی یا نافرمانی کی صورت میں دینا جائز نہیں ہے، دوسری یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے والدین کے ظلم کو تین بار اپنے کلمات مبارکہ دہرا کر ظلم ہی کہا ہے، اور ظلم ایسا گناہ ہے جو باعث عذاب ہے۔

جواب: (۴) شریعت کی رو سے جب انسان عاقل وبالغ ہوجاتا ہے تو وہ اپنے نفع ونقصان کا خود ذمہ دار ہے، اپنے افعال کے لئے خود جوابدہ ہے اور اپنے مال کا خود مالک ہے، کسی دوسرے کو اس کے مال میں ناروا تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے، خواہ اس کا والد ہی کیوں نہ ہو، ماں باپ کو بھی شرعاً یہ حق نہیں کہ ایک بیٹے کا مال اس کی رضامندی کے بغیر دوسری اولاد کے درمیان تقسیم کردیں یا تلف کردیں یا حیلہ وتدبیر سے اسے ہڑپ کرلیں۔ البتہ شریعت نے ماں باپ کو یہ حق دیا ہے کہ اپنی جائز ضروریات کے لئے اپنی اولاد کے مال میں سے لیں اور وہ اپنی جائز ضروریات کے لئے اولاد کی رضامندی اور اجازت کے بغیر بھی لے سکتے ہیں،

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: اَتٰى اَعْرَابِيٌّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: اِنَّ اَبِيْ يُرِيْدُ اَنْ يُّجْتَاحَ مَالِيْ، قَالَ اَنْتَ وَمَالُكَ لِوَالِدِكَ، اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ، وَاِنَّ اَمْوَالَ اَوْلَادِكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ، فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا۔

"حضرت شعیب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: بیشک میرا باپ میرے مال کو تباہ وبرباد کرنا چاہتا ہے، آپ نے فرمایا: تو اور تیرا مال، تیرے والد کا ہے، بلاشبہ سب سے پاکیزہ مال جو تم کھاتے ہو، وہ تمہاری اپنی کمائی کا مال ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری اولاد کا مال (بھی) تمہاری کمائی (کا مال) ہے پس اسے خوشگوار (سمجھ کر) کھاؤ"۔

(مسند امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۶۳۴ ـ ۶۳۳)

کتاب البیوع

گاہک کو ''آخری دام'' بتا کر پھر تخفیف کرنا

سوال: ہم دکان پر اشیاء بیچتے ہیں۔ لوگوں کی عادت سی ہوگئی ہے کہ ایک دام پر یقین نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہوتا ہے کہ آخری دام بتاؤ مثلاً دکاندار نے کہا کہ اس سوٹ کے آخری دام اٹھارہ سو روپے ہیں۔ گاہک سے بحث کر کے اور پھر تخفیف کر کے سولہ سو روپے میں دینا پڑا کیا یہ جھوٹ شمار ہوگا اور ہمارے نامۂ اعمال میں اس کا کوئی گناہ لکھا جائے گا؟ یا ہمارے لئے شرعاً کچھ چھوٹ ہے۔ (خرم عبداللہ، کراچی)

جواب: ایک تو اشیاء کو فروخت کرنے اور گاہک کو یقین دلانے کے لئے قسمیں نہیں کھانی چاہئیں کیونکہ اگر قسم جھوٹی ہے تو گناہِ کبیرہ ہے، اور اگر سچی بھی ہو تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیع میں بکثرت قسمیں کھانے سے بچو! کیونکہ اس سے مال تو بک جاتا ہے لیکن اس سے برکت مٹ جاتی ہے۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۱۴) دوسرا غلط بیانی سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے مومن کا تقدیر پر ایمانِ کامل ہونا چاہئے ایک روایت میں ہے کہ ''جس طرح موت بندے کے تعاقب میں ہوتی ہے اسی طرح مقررہ رزق بھی اس کی تلاش میں رہتا ہے'' تو بندے کی جستجو، سعی اور تمنا یہ ہونی چاہئے کہ '' رزق مقدور حرام کے بجائے حلال ذریعے سے ملے۔'' اسی طرح خلافِ واقعہ یہ بات کبھی نہیں کہنی چاہئے کہ یہ چیز میں نے اتنے میں خریدی ہے بلکہ ٹرانسپورٹیشن، دکان کا کرایہ، ملازمین کی تنخواہ وغیرہ کے مصارف اور حکومت کا ٹیکس ملا کر یوں کہنا چاہئے کہ یہ چیز مجھے اتنے میں پڑی ہے اور جب کسی چیز کو فروخت کرنے کے موقع پر آپ کے ذہن میں یہ ہے کہ ابھی مزید رعایت اور قیمت میں تخفیف کی گنجائش ہے تو پھر یہ نہ کہا کریں کہ یہ آخری اور قطعی دام ہیں کیونکہ آپ کا اعتماد مجروح ہوگا آپ کے قول پر گاہک کا اعتماد نہیں رہے گا، لیکن اگر خدانخواستہ ہماری معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے زوال کے باعث یہ چلن عام ہے کہ آخری دام بھی حقیقت میں آخری نہیں ہوتے۔ بلکہ کہنے والے کے ذہن میں گنجائش ہوتی ہے تو پھر ایسا قول کرتے وقت ذہن میں یہ نیت کرنی چاہئے کہ گفتگو اور سودا کاری کے اس مرحلے پر یہ آخری دام ہیں اس سے بات نہ بن سکی تو اگلے مرحلے پر رعایت مزید کروں گا اسے ''توریہ'' ''تعریض'' اور ''ایہام'' کہتے

ہیں اور یہ صریح جھوٹ سے بچنے کا حیلہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بیشک تعریض میں جھوٹ سے بچنے کی گنجائش ہے۔''

قسطوں پر اشیاء کی خریداری

سوال: کیا قسطوں پر اشیاء کی خرید وفروخت جائز ہے؟

جواب: مختلف افراد، کمپنیاں اور ادارے نئی الیکٹرانک اشیاء کی اقساط پر فروخت کا کاروبار کرتے ہیں، فریقین میں قیمت، جو ظاہر ہے رائج الوقت مارکیٹ ویلیو سے زیادہ ہوتی ہے، طے ہو جاتی ہے اور یہ بھی طے ہو جاتا ہے کہ ماہانہ اقساط کی رقم کیا ہوگی اور ادائیگی کتنی مدت میں ہوگی اور ''مسلم فیہ یا مبیع (SOLD ITEM) خریدار کے حوالے کر کے اس کی ملک میں دے دیا جاتا ہے، تو یہ عقد شرعاً صحیح ہے، بشرطیکہ اس میں یہ شرط شامل نہ ہو کہ اگر خدانخواستہ مقررہ مدت میں اقساط کی ادائیگی میں تاخیر ہوگئی تو ادائیگی کی اضافی مدت کے عوض قیمت میں کسی خاص شرح سے کوئی اضافہ ہوگا۔ اور اگر تاخیری مدت کی عوض قیمت میں اضافہ کردیا تو یہ سود ہے اور حرام ہے۔ فی نفسہٖ حدودِ شرع کے اندر اقساط کی بیع جائز ہے۔

تیس سال پہلے کی ایڈوانس رقم اب کتنی وصول کرے

سوال: آج سے تیس سال پہلے کسی نے دکان کرائے پر لی، مالکِ دکان نے ایڈوانس کے طور پر ۲۰ ہزار روپے لئے، جن کی اس وقت بہت زیادہ قیمت تھی۔ اب مالکِ دکان، کرایہ داروں کو دکان سے نکلنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ تو کیا وہ ۲۰ ہزار روپے ہی واپس کرے گا، اس طرح تو کرایہ داروں کا بہت نقصان ہوگا۔ تیس سال پہلے ۲۰ ہزار روپے میں چار پانچ کمرے بن جاتے تھے، آج تو ایک بھی نہیں بن سکتا؟ (م۔ الف۔ ع، کراچی)۔

جواب: مالک دکان سوال میں مذکور صورت میں کرائے داروں کو ۲۰ ہزار روپے ہی دینے کا پابند ہے، یعنی ان کے ایڈوانس کی اصل رقم، روپے کی قدر بلاشبہ بہت کم ہوچکی ہے، جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے لیکن کرایہ داروں کو اصل رقم ہی ملے گی، کوئی بھی اضافہ سود شمار ہوگا۔ اس طرح کے مالی نقصانات سے تحفظ کے لئے بہتر یہ ہے کہ کسی مستحکم کرنسی مثلاً یو ایس ڈالر یا اسٹرلنگ پاؤنڈ پر معاہدہ کیا کریں، آج کل تو غیر ملکی کرنسی کا لین دین قانوناً بھی جائز ہے۔

ایڈوانس دے کر مال نہ اٹھانا

سوال: اگر کسی سے ایڈوانس رقم لے کر کوئی چیز تیار کی جائے مثلاً (کپڑا تیار کیا جائے) بعد میں وہ مال اٹھانے سے انکار کردے اور یہ کہے کہ یہ مال میں نہیں اٹھاؤں گا۔ کیا اس صورت میں ایڈوانس واپس دینا ہوگا یا نہیں۔ اگر ایڈوانس واپس دیں تو مال تیار کرنے والے کو نقصان ہوگا۔ جبکہ آج کے دور کے مطابق ایڈوانس واپس نہیں دیا جاتا۔ شریعتِ مطہرہ کے مطابق اس کا حکم کیا ہوگا۔
(محمد ادریس قادری۔ کراچی)

جواب: ایڈوانس دے کر بک کیا ہوا مال نہ لینے کی صورت میں ان کے ایڈوانس کی رقم بلا معاوضہ روک لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ انہیں شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً اپنا کیا ہوا وعدہ وفا کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ (الاسراء: ۳۴)

''اور عہد پورا کرو بے شک عہد کے بارے میں (قیامت میں) پرسش ہوگی''۔

میری رائے یہ ہے جن صاحب نے ایڈوانس رقم دے کر مال بک کرایا بائع نے رقم خرچ کر کے وہ مال تیار کرایا اور اب سودا منسوخ کرنے کی صورت میں بلاشبہ بائع کا نقصان ہوگا۔ خریدار کو تبرعاً بائع کے نقصان کی تلافی کرنی چاہئے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔

''لاضرر ولا ضرار'' ''یعنی نہ تو کوئی مسلمان یک طرفہ طور پر دوسرے کو نقصان پہنچائے اور نہ ہی دو مسلمان ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں (یہ سمجھ کر یہ ادلے کا بدلہ تو جائز ہے)''۔
(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۳۴۰)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من ضار اضر اللہ به و من شاق شق اللہ علیه ''یعنی جس نے دوسرے کو نقصان پہنچایا، اللہ تعالیٰ اس کو اس کے نقصان کی سزا دے گا اور جس نے دوسرے کو مشقت میں ڈالا، اس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ اس کو مشقت میں ڈالے گا''۔
(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۳۴۲)

اس تلافی کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس شعبہ کے کسی دیانت دار ماہر کو حکم (ثالث) مقرر کرلیں وہ مارکیٹ کے حساب سے نقصان کا تعین کرے اور وہ خریدار جس نے سودا منسوخ

کر کے دوسرے کو نقصان پہنچایا ہے، فضل و احسان اور تبرع کر کے رضا کارانہ طور پر ایڈوانس کی کل رقم میں سے نقصان کے مساوی رقم بائع کو دے دے، اس کا رویہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے عین مطابق ہوگا۔

کیا ''نیوتا'' یا ''عذر'' پر سود کا اطلاق ہوسکتا ہے؟

سوال: ہمارے علاقے میں، بلکہ تقریباً پورے ملک میں، لوگ شادی یا فوتیدگی کے موقع پر صاحب معاملہ سے نقد رقم کی صورت میں تعاون کرتے ہیں، اسے بالترتیب ''نندرہ (نیوتا)'' یا ''عذر'' کہتے ہیں، یہ ایک وقتی تعاون کی صورت ہوتی ہے جو صاحبِ معاملہ کے لئے وقتی طور پر معاملہ نمٹانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے، اس میں کسی سود یا کمی بیشی کا کوئی تصور لین دین والوں کے ذہن میں نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسا کوئی تذکرہ یا روایت ہے۔ حال ہی میں ہمارے علاقے کی جامع مسجد عثمانیہ کے خطیب محمد یوسف صاحب نے اسے سود قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ سودی لین دین ماں کے ساتھ زنا کے برابر ہے اور مطلقاً حرام ہے، لہٰذا یہ رسم بند کی جائے، ازراہِ کرم شرعی حکم بیان کیجئے۔

(محمد شمیم ہاشمی قریشی، تحصیل دادھاراڈھوک گلی۔ ڈاکخانہ چھ موڑ۔ تحصیل مری، ضلع راولپنڈی)

جواب: بادیٔ النظر میں تو خوشی یا غمی کے مواقع پر نندرہ (نیوتا) یا عذر کے طور پر برادری کے لوگ اور دوست احباب جو تعاون کرتے ہیں، یہ بطور تبرع اور ہدیے کے ہوتا ہے، قرض کا تو قرض خواہ مطالبہ بھی کرسکتا ہے، جبکہ ہمارے مشاہدے میں نہیں آیا کہ کسی نے کسی سے اس حوالے سے مطالبہ کیا ہو یا نہ دینے پر اسے ملامت کیا ہو۔

ایک دوسرے کو ہدایا دینے کی رسول اللہ ﷺ نے ترغیب دی ہے اور فرمایا:

تهادوا فان الهدية تذهب الضغائن۔

''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو کیونکہ ہدایا کے لین دین سے (دلوں کا) کینہ و بغض دور ہوتا ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

تهادوا تحابوا۔

''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو تا کہ باہم محبت پیدا ہو''۔ (رواہ البخاری فی الادب المفرد، والنسائی فی الکنی والبیہقی فی شعب الایمان)

لہٰذا نیوتا (نندرہ) یا عذر کے لین دین میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض کسی برادری کے رسم و رواج میں یہ قرض شمار ہوتا ہو تو زیادتی مشروط (Conditional) یا معہود (Understood) کے بغیر قرض کے لین دین میں شرعاً کوئی خرابی نہیں ہے۔ اور اگر قرض میں زیادتی نہ تو مشروط ہو، کہ پہلے سے ایک معین اضافے کی شرط لگا دی ہو، اور نہ ہی معہود ہو، کہ تحریراً یا زبانی طور پر کسی معین اضافی رقم کا کوئی تذکرہ یا تصور قرض دینے یا لینے والے کے ذہن میں یا برادری کے تعامل رسم و رواج میں نہیں ہے، لیکن کوئی شخص تبرعاً اور فضل و احسان کے طور پر رضا کارانہ طور پر قرض خواہ کو قرض کی واپسی کے وقت کچھ زائد رقم دے دیتا ہے تو اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ سنن ابوداؤد حدیث نمبر: ۳۳۴۷ میں ہے: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرا نبی کریم ﷺ پر کچھ قرض تھا، تو آپ ﷺ نے وہ ادا فرمایا اور کچھ زیادہ بھی عنایت فرمایا۔''

''قرض حَسَن'' کی تعریف

سوال: ''قرض حَسَن'' کسی حاجت مند کو دینا اور ''قرض حسن'' اللہ تبارک وتعالیٰ کو دینا، اس کی Definition کیا ہے؟ کیا حاجت مند کو دینے کے بعد واپس لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(عبداللہ۔ دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں:

وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (المائدہ: ۱۲)

''اور اللہ نے فرمایا: بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی نصرت و تعظیم کرتے رہے اور اللہ کو ''قرضِ حسن'' دیا تو میں ضرور تم سے تمہارے گناہوں کو مٹا دوں گا اور میں ضرور تمہیں

ایسے باغات میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں''۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ (الحدید:۱۸)

''بلاشبہ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جنہوں نے اللہ کو ''قرضِ حَسَن'' دیا، ان کے لئے ان کی نیکیوں کو دگنا کیا جائے گا اور ان کے لئے عزت کا اجر ہے''۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِیْمٌ (التغابن:۱۷)

''اگر تم اللہ کو'' قرضِ حَسَن'' دو، تو وہ اسے تمہارے لئے دگنا کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ نہایت قدر دان بہت علم والا ہے''۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً

''کون ہے وہ شخص جو اللہ کو قرضِ حَسَن دے تو اللہ اسے بڑھا کر اس کے لئے کئی گنا کر دے''۔ (البقرہ:۲۴۵)

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل:۲۰)

''اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو'' قرض حَسَن'' دو''۔

اللہ تعالیٰ کو'' قرض حَسَن'' دینے سے کیا مراد ہے؟ آیئے چند جلیل القدر ائمہ تفسیر کی تشریحات ملاحظہ فرمایئے:

(۱) اللہ کو قرض حَسَن دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے نیک کاموں میں اخلاص اور خوشدلی کے ساتھ اپنا مال خرچ کرنا۔ (تفسیر بیضاوی ص ۷۴۱)

امام المفسرین امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: '' قرض حسن'' سے مراد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل کرنے کے لئے اس کی اطاعت کے کاموں میں مال خرچ کرو، وہ دگنا اجر عطا فرمائے گا، کیونکہ وہ بڑا قدر دان ہے، اپنی ذات سے قربت حاصل کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے، وہ بڑے حلم والا (بردبار) ہے، سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا، وہ بخشنے والا ہے، تمہیں بخش دے گا، بعض اہلِ علم کے نزدیک '' قرض حسن'' اللہ کی راہ میں حلال اور طیب مال خرچ کرنا ہے،

اور بعض کے نزدیک اس سے مراد خوش دلی سے خرچ کرنا ہے، درحقیقت انسان کے پاس مال و جان کی صورت میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی کا ہے، اسی کا دیا ہوا ہے، وہ جب چاہے سلب فرما لے، اس کے باوجود وہ بندوں سے یہ کہے کہ مجھے قرض دو، تو یہ ''انفاق فی سبیل اللہ'' پر برانگیختہ کرنے کے لئے ایک اثر انگیز اور لطف و کرم سے معمور پیرایہ بیان ہے، (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۵۵۷)''۔

بندوں کو قرضِ حَسن دینے سے مراد یہ ہے کسی ضرورت مند کو محض رضاء الٰہی کے لئے، کسی خوف، طمع اور صلے کی تمنا کے بغیر اپنے مال میں سے دے دینا، اور اگر وہ مقروض ادائیگی پر قادر نہ ہو تو اسے معاف کر دینا یا کم از کم مہلت دے دینا۔

چنانچہ صحیح مسلم کی حدیث ہے: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم سے پہلی امتوں کا واقعہ ہے کہ فرشتوں نے ایک شخص کی روح سے ملاقات کی اور پوچھا: ''کیا تم نے کوئی نیک کام کیا ہے؟، اس نے کہا: نہیں، فرشتوں نے کہا: یاد کرو، اس نے کہا: میں لوگوں کو قرض دیتا تھا اور اپنے نوکروں سے کہتا تھا کہ مفلس کو مہلت دینا اور مالدار سے درگزر کرنا۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: ''اس سے درگزر کرو۔''

دوسری حدیث میں ہے: حضرت حذیفہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک بندہ لایا گیا، جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: تم نے دنیا میں کیا عمل کیا؟ راوی بیان کرتے ہیں حالانکہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہیں سکتے، اس شخص نے کہا: اے میرے رب تو نے مجھے مال عطا فرمایا تھا اور میری عادت درگزر کرنے کی تھی، میں مالدار پر آسانی کرتا اور تنگ دست کو مہلت دیتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں تمہاری بہ نسبت اس بات کا زیادہ حقدار ہوں کہ درگزر کروں (یعنی معاف کر دوں)، (سوائے فرشتو!) میرے اس بندے کو معاف کر دو''۔

ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں مقروض کو مہلت دینا واجب ہے اور اس کے قرض کو معاف کر دینا مستحب ہے، خواہ پورا قرض معاف کیا جائے یا اس کا کچھ حصہ معاف کیا جائے، ان احادیث کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی نیک کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے، ہوسکتا ہے اسی کی وجہ سے نجات ہو جائے، اسی طرح کسی گناہ اور برے کام کو بھی معمولی نہیں سمجھنا چاہئے، کیا پتہ اسی پر گرفت ہو جائے۔

تنگ دست مقروض کو مہلت دینے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ

''اور اگر (مقروض) تنگ دست ہے تو اسے اس کی فراخ دستی تک مہلت دو اور (قرض معاف کر کے) تمہارا صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے''۔ (البقرہ: ۲۸۰)

اس سلسلے میں ایک ایمان افروز واقعہ ملاحظہ فرمایئے: امام احمد رضا خان قادری سے ایک صاحب نے دریافت کیا: ''حضور میرے کچھ روپے ایک صاحب پر ہیں، وہ نہیں دیتے''، انہوں نے جواباً فرمایا: اس زمانہ میں قرض دینا اور یہ خیال کرنا کہ وصول ہو جائے گا، ایک مشکل خیال ہے، میرے پندرہ سو روپے لوگوں پر قرض ہیں، جب قرض دیا، یہ خیال کر لیا کہ دے دیا تو خیر، ورنہ طلب نہ کروں گا، جن صاحبوں نے قرض لیا، دینے کا نام نہ لیا، پھر خود ہی فرمایا: جب یوں قرض دیتا ہوں تو ہبہ کیوں نہیں کر دیتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا: جب کسی کا دوسرے پر قرض ہو اور اس کی میعاد گزر جائے، تو ہر روز اسی قدر روپیہ کی خیرات کا ثواب ملتا ہے، جتنا قرض ہے، اس ثوابِ عظیم کے لئے میں نے قرض دیئے، ہبہ نہ کئے کہ پندرہ سو روپے روز میں کہاں سے خیرات کرتا؟----

☆☆☆......☆......☆☆☆

سیرت

حضور ﷺ کو بکریاں چرانے والا کہنا

سوال: گذارش ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ''بکریاں چرانے والا'' کلمات پر مشتمل جو اشعار ہیں، ان کو محافل میں پڑھنا کیسا ہے، جیسا کہ اس شعر میں ہے:

اے حلیمہ بھید یہ کھلا نہیں　　یہ مقام چون و چراں نہیں

تو خدا سے پوچھ وہ کون تھے　　تیری بکریاں جو چرا گئے

ازراہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں، (نواب الدین، فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بہت سے کاموں اور پیشوں کو، جنہیں عام طور پر لوگ کمتر سمجھتے ہیں، عزت بخشنے کے لئے اور محنت کو مرتبۂ کمال عطا کرنے کے لئے یہ کام کئے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن ابی هریرة رضی الله عنه عن النبی ﷺ قال: مابعث اللّٰه نبیاً الا رعی الغَنَم، فقال الصحابة: وانتَ؟ فقال: نعم، کنت ارعاها علی قراریط لاهل مکة.

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ نے جو بھی نبی مبعوث فرمایا ہے، اس نے بکریاں چرائی ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: (یا رسول اللہ ﷺ!) اور آپ نے بھی؟، آپ ﷺ نے فرمایا: میں اجرت پر (قراریط کے عوض) مکہ والوں کی بکریاں چراتا تھا، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 2262)''۔

عن عمرة قالت: قیل لعائشة: ما ذا کان یعمل رسول الله ﷺ فی بیته؟ قالت: کان بشراً من البشر، یفلی ثوبه ویحلب شاته ویخدم نفسه

''حضرت عمرہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں کیا کام کیا کرتے تھے؟، حضرت عائشہ نے فرمایا: وہ ایک بشر تھے، آپ اپنے کپڑوں کو صاف کرتے تھے، اپنی بکریاں کا دودھ دوہتے تھے اور اپنے ذاتی کام خود انجام دیتے تھے''۔

(شمائل ترمذی، رقم الحدیث: 343)

عن عائشة قالت کان رسو ل الله ﷺ یخصف نعله وتخیط ثوبهٗ ویعمل فی بیته

کما یعمل احدکم فی بیتہ

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے جوتے خود مرمت فرماتے تھے، اور اپنے کپڑے سیتے تھے اور جس طرح تم لوگ اپنے گھر میں کام کرتے ہو، آپ ﷺ بھی کرتے تھے، (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)''۔

ان احادیث مبارکہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بکریاں چرائیں، جوتے سیئے، کپڑے سیئے، گھریلو کام کاج میں اہل خانہ کا ہاتھ بٹایا اور اسی طرح ان پیشوں کو اپنی نسبت سے عزت وعظمت عطا کی۔ لیکن اگر کوئی ان کاموں کی نسبت سے یہ کہے کہ آپ چرواہے تھے، موچی تھے، درزی تھے، وغیرہ تو امر واقع ہونے کے باجود اسے گستاخی اور بے ادبی تصور کیا جائے گا، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی اللہ تعالیٰ کو خالق خنزیر وخالق شیطان کہے، حالانکہ وہ ان دونوں کا خالق ہے، مگر اسے مقام الوھیت کی توہین پر محمول کیا جائے گا، عظمت الوہیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے خالق ارض وسماء، خالق کون ومکاں، رب العٰلمین، رب محمد ﷺ اور رب کعبہ کہہ کر پکارا جائے۔

جہاں تک مندرجہ بالا شعر کا تعلق ہے، تو یہ عین حدیث کے مطابق ہے اور اس میں مقام رسالت کی توہین کا کوئی پہلو نہیں، بس امر واقعہ کا بیان ہے، کیونکہ روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے بچپن یا لڑکپن کی عمر میں بکریاں چرائی ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کے نبی یا فرشتہ ہونے کی بحث

سوال: آپ نے ''ایکسپریس'' کے تفہیم المسائل میں حضرت خضر علیہ السلام کے نبی ہونے کا قول کیا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے فرزند اسماعیل علیہ السلام کو امرِ باری تعالیٰ کی تعمیل میں ذبح کرنے کے لئے نہ صرف آمادہ ہوجانا، بلکہ باپ بیٹے (جو دونوں نبی اور رسول تھے) دونوں کا ارشادِ باری تعالیٰ کی تعمیل میں اس مرحلے تک چلے جانا کہ صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کی رگِ جان کا کٹنا اور ذبح ہونا ہی باقی رہ گیا تھا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ (الصافات:۱۰۳)

''تو جب وہ دونوں (اللہ کے حکم کے سامنے) جھک گئے اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا''۔

اس سے آپ نے یہ استدلال کیا تھا کہ نبی بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تکوینی امر انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا محض اس بناء پر کہ حضرت خضر علیہ السلام نے تکوینی امر کے تحت قصاصِ شرعی کے بغیر ایک لڑکے کو ارتکاب جرم سے پہلے ہی قتل کر ڈالا تھا، ان کو جماعتِ انبیاء سے خارج کرنے کے لئے کافی وشافی دلیل نہیں ہے۔ اس استدلال پر میرا اشکال یہ ہے کہ نبی کے ہاتھوں غیر تشریعی تکوینی امر کی تکمیل نہیں کرائی جاتی، بلکہ اس سے پہلے انہیں روک دیا جاتا ہے۔ جبکہ فرشتے کے ہاتھوں تکوینی امر کی تکمیل کرادی جاتی ہے، جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا لڑکے کو قتل کر دینا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ذبحِ اسماعیل سے روک دینا۔ اس اشکال کا جواب دیجئے۔

(عبداللہ المسلم۔ محمد زبیر سلیمان بن ہارون مغل۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

نوٹ:- یہ سوال آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، تحریر کے بعض حصے سوال سے غیر متعلق ہیں اور بعض حصے سوال سے متعلق ہیں، میں نے سوال سے متعلق حصے کا خلاصہ مندرجہ بالا سطور میں تحریر کیا ہے، پورے خط کے نقل کرنے کی اس کالم میں گنجائش نہیں ہے۔

جواب: قارئین کرام کی سہولت اور فہمِ مسئلہ کے لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ دو اصطلاحات کی تشریح کردوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر عاقل و بالغ شخص کے لئے اپنے انبیاء کرام و رسل عظام کے ذریعے جو احکام نازل فرمائے ہیں، اور جن پر عمل کرنے یا نہ کرنے سے دنیوی و اخروی اعتبار سے جزا وسزا کے احکام مرتب ہوتے ہیں، انہیں تشریعی احکام کہا جاتا ہے، یہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور فرد اور معاشرے سے متعلق ہیں، یہ احکام بندے اور رب تعالیٰ کے باہمی تعلق (یعنی عبد اور معبود) کے حوالے سے بھی ہیں اور بندوں کے مابین تعلق کے حوالے سے بھی ہیں، ان کی تنفیذ کے لئے دنیا میں بھی نظامِ عدل اور نظامِ جزا وسزا قائم ہوتا ہے اور آخرت میں بھی ہوگا۔ ان پر عمل کرنے کا ہر عاقل و بالغ مکلف ہے، ذمہ دار ہے، جوابدہ ہے، اس لحاظ سے وہ مجبور ہے، لیکن اس کے اختیار کو ساقط کر کے بالجبر تعمیل پر مجبور نہیں کیا گیا، بلکہ اپنی صوابدید اور اختیارِ تمیزی سے چونکہ وہ ان احکام پر عمل کرتا ہے یا اپنے اختیار اور آزادیٔ عمل سے انہیں رد کرتا ہے، اس لئے اس اعتبار سے وہ مختار ہے، اور چونکہ احکامِ الٰہی کے لئے اس کا رد کرنا یا قبول کرنا، عمل کرنا یا عمل نہ کرنا، فرمانبرداری کرنا یا نافرمان ہونا، اس کی آزادانہ مرضی اور اختیار سے ہوتا ہے، اس لئے جزا وسزا کا دنیوی و اخروی نظام تقاضائے عدل کے عین مطابق ہے اور ہر

عقل سلیم اسے قبول کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے اور ممالک جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر انداز کر کے اپنے لئے خود ساختہ آئینی و قانونی نظام بنا رکھے ہیں، دنیا میں ان کے ہاں بھی جزا و سزا کا نظام موجود ہے۔

''تکوینی امور'' یا ''تکوینی نظام'' سے مراد انسان کی ذات اور کائنات سے متعلق وہ امور ہیں، جو انسان کے اختیار اور مرضی سے ماوراء، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت سے وجود میں آتے ہیں، اور یہ انفس و آفاق میں جاری و ساری ہیں۔ مثلاً بارش کا برسنا یا نہ برسنا، آندھی، طوفان اور سیلابوں کا آنا، بیماری یا تندرستی، خوبصورتی و بدصورتی، کامل الخلقت اور ناقص الخلقت ہونا، مارنا یا جلانا یعنی موت و زندگی کے فیصلے وغیرہ، میرے عرض کرنے کا مدعا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تکوینی امر نبی کے ہاتھ سے بھی صادر ہوسکتا ہے یا نبی کو بھی اس کا حکم دیا جاسکتا ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم دینا اور باپ بیٹا (یعنی حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام جو دونوں نبی تھے) کا اس کی تعمیل کے لئے برضاء و رغبت تیار ہونا، کیونکہ یہ ایک تکوینی امر تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو معاذ اللہ! کسی قصاص میں یا تشریعی ضابطے کے تحت ذبح کرنے کے لئے نہیں کہا گیا تھا، کیونکہ باپ بیٹا دونوں نبی تھے اور معصوم تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت اسماعیل علیہ السلام نے یہ سوال نہیں کیا کہ کیوں کر یا کس جرم کی پاداش میں ذبح کا حکم دیا جارہا ہے؟ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ دونوں انبیاء کرام جانتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی امر ہے اور ان پر اس کی تعمیل تسلیم و رضا کے ساتھ واجب ہے، باقی رہا ذبح سے پہلے روک دینا اور اچانک فدیہ کے طور پر مینڈھے کا نمودار ہونا، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و رضا کا مسئلہ ہے۔ ایک تکوینی امر کی تعمیل کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسماعیل علیہ السلام کا آمادہ ہونا اور حضرت خضر علیہ السلام کا ایک تکوینی امر کے تحت بظاہر بے قصور لڑکے کو قتل کر دینا یکساں امر ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کے نبی ہونے کے منافی نہیں ہے۔

قرآن ہی سے میرا دوسرا استدلال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے بشری شکل میں آتے ہیں اور وہ ان کے لئے مہمان نوازی کی خاطر بچھڑے کا گوشت بھون کر لاتے ہیں اور اپنے مہمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، مگر چونکہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے فرشتے تھے، اس لئے انہوں نے کھانے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھائے، جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک

خلاف فطرت غیر معمولی بات سمجھا اور فطری طور پر ان کی دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ ایسا کیوں ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾ (ہود:۶۹۔۷۰)

''اور بیشک ہمارے فرشتے (بشری صورت میں) ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے، انہوں نے کہا: (اے ابراہیم آپ پر) سلام ہو، ابراہیم نے فرمایا: تم پر بھی سلام ہو، تو انہوں نے کچھ دیر نہ کی کہ وہ بھنا ہوا بچھڑا لے آئے، پھر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے تک نہیں بڑھتے تو ابراہیم نے ان کو اجنبی سمجھا اور اپنے دل میں ان سے کچھ خوف محسوس کیا، وہ بولے آپ ڈریں نہیں، بیشک ہم لوط کے (منکر) لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں''۔

ان آیات میں ہے کہ فرشتے بشری شکل میں آئے لیکن انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، یعنی انسانی خوراک کھانا، نوعِ ملائک میں نہیں ہے۔ جبکہ اس کے برعکس سورۃ الکھف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی رفاقتِ سفر کا تذکرہ متعدد آیات میں ہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ''علم لدنی'' یا ''علم اسرار الٰہی'' سیکھنے کے لئے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ چلتے ہیں، اس سفر کے دوران ایک مرحلہ آتا ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

فَانْطَلَقَا ٙ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾ (الکھف:۷۷)

''پھر وہ دونوں (آگے) چلے، یہاں تک کہ جب وہ دونوں ایک بستی والوں کے پاس پہنچے تو (حقِ ضیافت میں) ان سے کھانا طلب فرمایا، تو انہوں نے ان کی مہمان نوازی سے (صاف) انکار کر دیا، پھر (وہاں سے چلتے وقت) اس بستی میں انہوں نے ایک دیوار پائی جو گرنے والی تھی تو (ہمارے اس بندے نے) اسے سیدھا کر دیا، موسیٰ نے

فرمایا: اگر آپ چاہتے تو اس پر (ان سے کچھ) مزدوری لے لیتے''۔

اب آپ اس آیت کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے، اس میں تثنیہ کے صیغے کے ساتھ دو مقامات پر فرمایا کہ: (۱) ان دونوں نے کھانا طلب کیا اسْتَطْعَمَآ (۲) تو انہوں نے ان دونوں کی مہمان نوازی سے (صاف) انکار کردیا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا۔

قرآن کے صریح الفاظ میں حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام دونوں کے کھانا طلب کرنے کا ذکر ہے اور یہ بھی ہے کہ بستی والوں نے ان دونوں کی مہمان نوازی سے انکار کیا۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ 'سورۂ ھود' میں بشری شکل میں آئے فرشتوں کا کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا، اس امر کی طرف واضح اشارہ ہے کہ فرشتے کھانا نہیں کھاتے اور 'سورۃ الکہف' میں حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر کھانا طلب کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام فرشتہ نہیں تھے، بلکہ بشر تھے اور نبی تھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کے ہاتھ سے بھی تکوینی امر کا صدور ہوسکتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حوالے سے مذکور ہوا۔ ان دونوں رسل عظام کی طرف سے ارادۂ تعمیل بھی اللہ کے حکم سے تھا اور تکمیل (یعنی عین ذبح) سے پہلے رک جانا یہ بھی اللہ کے حکم سے تھا۔

میرے موقف (یعنی حضرت خضر علیہ السلام کے بشر اور نبی ہونے) کے حق میں جو دلائل تھے، وہ میں نے ذکر کردیئے ہیں، اگر کسی کے ذہن کو اپیل کریں تو الحمدللہ۔ اگر کوئی اپنے دلائل کی بناء پر اس موقف سے اختلاف کرے تو یہ اس کا حق ہے، کیونکہ قرآن و حدیث میں حضرت خضر علیہ السلام کے فرشتہ، نبی یا ولی ہونے کے بارے میں کوئی صریح، واضح اور قطعی نص نہیں ہے، لہذا اشارۃ النص، دلالت النص اور اقتضاء النص سے اجتہاد کرکے کوئی رائے قائم کرنی پڑے گی۔ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے، اس لئے اس کے بارے میں علماء امت میں اختلاف رائے ہے اور رہا ہے ایسے اجتہادی مسائل میں دلائل کی بنیاد پر اختلاف رائے ممکن ہے اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عنداللہ تمام آراء جو باہم مختلف ہوں، سب کی سب درست نہیں ہوسکتیں، بلکہ حق وصواب ان میں صرف ایک ہی ہوگی۔ دعا ہے اللہ جل شانہ ہمیں حق وصواب کو پانے اور اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امام اعظم کی کنیت ''ابو حنیفہ'' کی حکمت

سوال: شخصیت کی پہچان والد کے اسم گرامی سے ہوتی ہے، لیکن امام اعظم کی شخصیت اپنی دختر بی بی حنیفہ کے نام سے کیوں مشہور ہوئی، یہ سوال کسی غیر مقلد نے کیا ہے۔

(محسن شیرازی، کراچی)

جواب: ''کنیت'' کا مطلب ہے کسی کا باپ یا بیٹا ہونے کی نسبت سے نام رکھنا، کبھی یہ نام حقیقی باپ یا بیٹے کی نسبت سے رکھا جاتا ہے جیسے ابن خطاب یا ابن عمرو غیرہ۔ اور کبھی ابوت (باپ ہونے) کی نسبت کسی چیز کے ساتھ قائم کر کے کنیت رکھ دی جاتی ہے اس سے باپ ہونا مراد نہیں ہوتا بلکہ بالعموم یا کسی خاص موقع پر اس چیز کے ساتھ تعلق کی جانب اشارہ مقصود ہوتا ہے، جیسے حضرت ابو ہریرہ (جن کا اصل نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن تھا، لیکن وہ کنیت کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے) ابو ہریرہ کے معنی ہیں ''بلی کا باپ'' اس کنیت کے مشہور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بلی پالتے تھے اور بلی سے پیار کرتے تھے۔ ایک خاص موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر والوں سے ناراض ہو کر مسجد میں جا کر کچے فرش پر لیٹ گئے اور پسینے کی وجہ سے ان کے بدن کے ساتھ مٹی چپک گئی تو حضور اکرم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ''قُمْ يَا اَبَا تُرَاب'' (اے مٹی کے باپ کھڑے ہو جاؤ)، چونکہ رسول اللہ ﷺ نے پیار سے یہ کلمہ ارشاد فرمایا تھا، اس لیے ان کی یہ کنیت مشہور ہو گئی، ورنہ ان کی اصل کنیت ابوالحسن تھی۔ حضرت ابو بکر صدیق کا بھی بکر نام کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اہل عرب ماہر و بہادر جنگجو کو ''ابن الحرب'' یا ''اخو الحرب'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ کبھی نیک فال کے طور پر اوصاف جمیلہ کی نسبت سے کنیت رکھ دی جاتی ہے، جیسے ابوالخیر، ابوالمکارم، ابوالمعالی، ابوالبرکات، ابوالحسنات، ابوالنور وغیرہ، حضور کے چچا عبدالعزیٰ کی کنیت اس لیے ابولہب (شعلے کا باپ) مشہور ہوئی کیونکہ ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔ اسی طرح امام اعظم نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی کسی بیٹی کا نام حنیفہ نہیں تھا، بلکہ ''حنیف'' کے معنی ہیں تمام باطل ادیان کو چھوڑ کر دین حق اسلام کی طرف رجوع کرنے والا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ إِبْرٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (آل عمران: ٦٧)

''ابراہیم نہ یہودی تھے نہ ہی نصرانی بلکہ وہ ہر باطل سے جدا رہ کر حق کی طرف مائل ہونے والے (حنیف) مسلمان تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے''۔

اس معنی کی مناسبت سے امام اعظم کی کنیت ''ابوحنیفہ'' مشہور ہوئی۔

☆☆☆......☆•••☆......☆☆☆

حلال و حرام

جائز و ناجائز

غیر صحابی کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" کہنا یا لکھنا؟

سوال: صحابۂ کرام کے علاوہ کسی ولی یا بزرگ، تابعی، ائمہ دین کے اسماء گرامی کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" لکھنا آیا شرعاً جائز ہے یا یہ لقب صحابہ کرام کے ساتھ خاص ہے۔

(محمد جیلانی، نارتھ کراچی)

جواب: عرفِ عام میں چونکہ صحابہ کرام کے اسماء گرامی کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" بولا اور لکھا جاتا ہے بلکہ تقریباً اس کا التزام کیا جاتا ہے، اس لئے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید یہ صحابہ کرام کا لقب خاص ہے، لیکن یہ نظریہ درست نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں اس کا اطلاق مومنین صالحین کے لئے عام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (المائدہ:۱۱۹)

"(روز قیامت) اللہ فرمائے گا: یہ ہے وہ دن جس میں سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا، ان کے لئے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ابد تک رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے"۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (التوبہ:۱۰۰)

"اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے (یعنی) سب سے پہلے ایمان لانے والے اور جنہوں نے نیک کاموں میں ان کی پیروی کی، اللہ ان (سب) سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لئے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ابد تک ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے"۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآئَهُمْ اَوْ اَبْنَآئَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

''(اے حبیب!) جولوگ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، آپ ان کو (ایسا ہرگز) نہ پائیں گے کہ وہ ان لوگوں سے محبت کریں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے عداوت رکھی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے یا بھائی (بہن) یا قریبی رشتہ دار، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں (اللہ نے) ایمان ثبت فرمادیا اور اپنی طرف کی روح سے ان کی مدد فرمائی اور وہ انہیں (ایسے) باغات میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہ لوگ اللہ کی (خاص) جماعت ہیں۔ (لوگو!) خبردار ہوجاؤ (خاصان) باری تعالیٰ کی جماعت ہی فلاح پانے والے لوگ ہیں''۔ (الحشر: ۲۲)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۞ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۞ (البینہ: ۷-۸)

''یقیناً جولوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے، وہی ساری مخلوق میں بہتر ہیں، ان کی جزا ان کے رب کے پاس ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (اور) وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ (اللہ کی طرف سے) یہ (اعزاز وانعام) ہر اس (شخص) کے لئے ہے جو اپنے رب سے خائف رہا''۔

''رضی اللہ عنہ'' کے معنی ہیں، اللہ ان سے راضی ہوا اور ''رضوا عنہ'' کے معنی ہیں، وہ اللہ سے راضی ہوئے، یعنی اللہ تعالیٰ سے معاملہ طے ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رضامندی کی سند پیشگی طور پر ہی عطا فرمادی اور وہ بھی دل وجان سے ہر حال میں، خواہ عُسر ہو یا یُسر، اپنے اللہ سے

راضی ہو چکے، اس کی تقدیر پر راضی ہیں۔ اوپر قرآن مجید کی چار آیات مبارکہ کے حوالہ جات مع ترجمہ آپ نے ملاحظہ فرمالئے کہ "رضی اللہ عنہ" کا اطلاق ان مقامات پر (یعنی آیات ۱: ۳: ۴) جملہ مومنین صالحین پر کیا گیا ہے اور ان میں سے صحابہ کرام کی تخصیص کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔ البتہ بلاشبہ یہ امر مسلّم ہے کہ جملہ صحابہؑ کرام رضی اللہ عنہم اس کا اولین مصداق ہیں اور آیت ۲ میں صحابہ کرام مہاجرین وانصار بلکہ ان میں سے بھی سبقت واوّلیت کا شرف حاصل کرنے والوں کا ذکر کرنے کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا جنہوں نے (بعد میں) ان کی "اتباع بالاحسان" کی ہے اور پھر مجموعی طور پر سب کو "رضی اللہ عنہم" کے اعزاز سے نوازا۔

اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ چلئے مان لیا کہ قرآن مجید میں اس لقب کا اطلاق مومنین صالحین پر عام ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے کوئی دلیلِ تخصیص نہیں ہے لیکن کیا سلفِ صالحین سے غیر صحابی پر اس کا اطلاق ثابت ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ صحیح بخاری کے بعد حدیث کی مسلمہ طور پر صحیح ترین کتاب صحیح مسلم کا آغاز ان کلمات سے ہوتا ہے:

"قال ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیری رضی اللہ عنہ" یعنی "ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری رضی اللہ عنہ نے کہا" اور امام مسلم بن حجاج قشیری کا سالِ ولادت ۲۰۶ھ ہے اور تاریخ وصال ۲۴ رجب ۲۶۱ھ ہے اور وہ نہ تو صحابی تھے اور نہ ہی تابعی، زیادہ سے زیادہ "تبع تابعی" تھے۔

کیا "۷۸۶" لکھنا صحیح ہے

سوال: ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی کے 25 نومبر تا یکم دسمبر 2002ء کے شمارے میں "آپ کے مسائل کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں" کے عنوان کے تحت ایک شخص محمد عمر فاروق (جیکب آباد) نے سوال کیا کہ: "بسم اللہ کے طور پر خطوط وغیرہ پر جو 786 لکھا جاتا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کیجئے کہ کیا یہ صحیح ہے؟"۔

جواب: عام طور پر خطوط، دستاویزات اور تحریروں وغیرہ میں بسم اللہ کے بجائے ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے کہ ان کاغذات کے زمین پر گرنے سے بسم اللہ کے پاکیزہ حروف کی بے ادبی ہوتی ہے، ان کو بے ادبی سے بچانے کے لئے ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے جب کہ اسلامی تعلیم واضح طور پر یہ ہے

کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرنا چاہئے جو کام اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع نہ کیا جائے، اس میں برکت نہیں ہوتی اور وہ پایہ تکمیل تک بھی نہیں پہنچتا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کا نام لینا صحیح ہے، فرض کیجئے کسی کے نام کے اعداد کا مجموعہ ۴۲۰ ہو اور کوئی اسے نام کے بجائے مسٹر ۴۲۰ کہہ کر پکارے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا، اسی طرح بسم اللہ کی بجائے ۷۸۶ کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ بسم اللہ کے اعداد ۷۸۶ نہیں بنتے، قمری حروف کی صورت میں ال لگا کر پڑھا جاتا ہے جب کہ شمسی حروف کے ساتھ ال لکھا تو جاتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا۔ الرحمٰن اور الرحیم میں قمری حروف کی صورت میں بسم اللہ کے اعداد کا مجموعہ ۱۱۸۸ بنتا ہے اور شمسی حروف کی صورت میں اس کا مجموعہ ۷۲۶ بنتا ہے یعنی کسی بھی صورت میں یہ مجموعہ ۷۸۶ نہیں بنتا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ۷۸۶ ہے کیا؟ غالب امکان یہ ہے کہ ۷۸۶ ہندوؤں کے بھگوان ہری کرشنا کے نام کے حروف کا مجموعہ ہے، حروف ابجد کے حساب سے اسی کے یہ اعداد نکلتے ہیں، برصغیر پاک و ہند کے مسلمان سیکڑوں برس تک ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے رہے ہیں، وہ ۷۸۶ استعمال کرتے ہوں گے، اس کی تشریح انہوں نے مسلمانوں کے سامنے غلط انداز میں کی ہوگی اور انہوں نے اس کو صحیح سمجھ کر ۷۸۶ کا استعمال شروع کر دیا۔ بسم اللہ کے لئے اس طرح کے اعداد کا استعمال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ناراضی کو دعوت دینے کے مترادف ہے، اس لئے ان اعداد کے استعمال سے مکمل طور پر اجتناب کرنا چاہئے"۔

مذکورہ بالا جواب میں مفتی صاحب نے اسے بالکل غلط اور باطل قرار دیا ہے اور اس کا رشتہ ہندومت سے جوڑ دیا ہے اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے اعداد کا مجموعہ قمری حروف کے حساب سے 1186 بنتا ہے اور شمسی حروف کے حساب سے 726 بنتا ہے، 786 تو کسی صورت میں نہیں بنتا، اس جواب کو پڑھ کر بہت سے لوگ تشویش میں مبتلا ہیں کیونکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بزرگان دین اسے اپنی تحریروں، خطوط اور تعویذات میں استعمال کرتے رہے ہیں اور اب بھی یہ روایت جاری ہے، لہٰذا گذارش ہے کہ شریعت مطہرہ کی روشنی میں اس مسئلے کو حل کیجئے، تاکہ ہم جیسے لوگوں کا اضطراب رفع ہو۔ (آثار اللہ، لیاقت آباد)۔

جواب: سب سے پہلے تو یہ اطمینان کر لیجئے کہ 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' کے اعداد کا مجموعہ ابجد کے حساب سے 786 ہی بنتا ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

بسم = 102 ...... اللہ = 66 ...... الرحمٰن = 329 ...... الرحیم = 289 ...... میزان = 786

قاعدہ یہ ہے کہ جو حروف مکتوب ہوتے ہیں ان کے اعداد کا حساب لگایا جاتا ہے، خواہ وہ شمسی ہوں یا قمری، تشدید کی صورت میں بھی چونکہ مکتوب ایک ہی حرف ہوتا ہے لہٰذا اس کے اعداد کو جمع کرلیا جاتا ہے، لفظ اللہ اور الرحمٰن پر کھڑی زبر بصورت حرف نہیں ہے بلکہ بصورت حرکت ہے، لہٰذا اس کا عدد بھی حساب میں نہیں آئے گا۔ ہمارے ہاں ایک المیہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی علم یا فن کا ماہر ہو یا نہ ہو، اس میں ٹانگ ضرور اڑاتا ہے، اور نہ صرف ماہرانہ رائے دیتا ہے بلکہ اپنی رائے کو حرف آخر سمجھتا ہے اور حجت قاطع قرار دیتا ہے اور اس معاملے میں سب سے زیادہ مظلوم اسلام اور شریعت ہے، بقول شاعر

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　　اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

ابجد کے اصول کا عربی اصطلاحی نام "جُمَل" یا "جُمَّل" ہے۔

مفتی صاحب نے دوسری مغالطہ آرائی یا خود ساختہ اجتہاد یہ کیا ہے کہ 786 کے اعداد کو ہندوؤں کے بھگوان "ہری کرشنا" کے اعداد کا مجموعہ قرار دے کر اس سے ظاہر کیا ہے کہ یہ ایک مشرکانہ کلمہ ہے۔ اس سلسلہ میں گذارش یہ ہے کہ "ہری کرشنا"، سنسکرت کا لفظ ہے، نہ کہ عربی کا، اور "جمل" کا حساب عربی کا ہے اور اردو میں بعینہ عربی کے حروف مستعمل ہونے کی وجہ سے اسے اردو میں بھی اختیار کرلیا جاتا ہے، کیونکہ اردو کے اصل مآخذ عربی اور فارسی ہیں، سنسکرت میں تو جمل کے حساب کو جاری کرنے والے مفتی حسام اللہ شریفی صاحب پہلے فرد ہیں۔ اعتبار تو اسی رسم الخط کا ہوتا ہے، جس کا وہ کلمہ یا حرف ہے، سنسکرت کی تو ابجد (Alphabetic)، ان کا رسم الخط اور تلفظ بالکل جدا ہے، کسی ماہر سنسکرت سے "ہری کرشنا" لکھوا کر دیکھ لیجئے، اس کے بعض حروف کے مشابہ بحساب جمل ابجد کا کوئی بھی حرف نہیں ہے۔ حضرت مفتی محمد شریف الحق امجدی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول بہت ہی کھینچ تان کر اعداد کو جوڑ بھی لیا جائے (یعنی سنسکرت کے ہری کرشنا کے اصل حروف) تو زیادہ سے زیادہ 436 بنتے ہیں، لیکن اگر کسی کو خواہ مخواہ مسلمانوں کا ہندومت سے رشتہ جوڑنے یا اس سے متاثر قرار دینے کا شوق ہو تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ

ع　　بریں عقل و دانش بباید گریست

اب دیکھئے سنسکرت کے حروف تہجی بھ، پ، ٹ، ٹھ، جھ، چھ، دھا، ڈ، ڈھا، کھا، گ، گھا وغیرہ

عربی میں کہاں ہیں، اور جن ہندی یا سنسکرت کے الفاظ میں یہ حروف تہجی استعمال ہوں گے، ان کے اعداد کا حساب مفتی صاحب موصوف کیسے کریں گے، یا ان کے ''جمل'' کے نئے قواعد وضع کریں گے، کیا مفتی صاحب ناقابل تردید دلائل سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ سنسکرت یا ہندومت میں جمل کا حساب رائج تھا۔

ہمارا یہ موقف کہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے لئے 786 کا عدد اہل علم کے ہاں استعمال ہوتا رہا ہے، تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ اس وقت میرے سامنے ایک ''علم المیراث'' کا رسالہ ہے، جس کا نام ہے، ''مفید الوارثین مکمل'' اور یہ نام بھی ''جمل'' کے حساب سے رکھا گیا ہے، یعنی رسالے کا سنِ طباعت بھی 1349ھ ہے اور کتاب کے مذکورہ بالا نام کے اعداد کا مجموعہ بھی 1349 بنتا ہے، یہ رسالہ دارالاشاعت دیوبند، ضلع سہارنپور سے شائع ہوا ہے اور اس کے مصنف دارالعلوم کے ایک بزرگ نامی گرامی مدرس سید اصغر حسین ہیں، وہ کتاب کے صفحہ نمبر 232 پر لکھتے ہیں:

''ایک طویل کاغذ لے کر اس کی پیشانی پر ''ھوالباقی'' یا ''بسم اللہ'' لکھو، یا بسم اللہ کے اعداد 786 لکھو، وغیرہ۔

امام احمد رضا خان قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کے نام بھی ''جمل'' کے حساب سے اعداد کے مطابق ہیں۔

باقی یہ امر مسلم ہے کہ ہر نیک اور اہم کام کا آغاز ''بسم اللہ'' سے کرنا چاہیے۔ اگر وہ کام کوئی اچھی تحریر، تصنیف یا خط کتابت ہے تو اس کے شروع میں بھی ''بسم اللہ'' لکھنا مسنون، مستحب اور مستحسن امر ہے، اس سے اس کام میں بھی برکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس تحریر میں بھی برکت ہوتی ہے، لیکن کسی تحریر یا خط کتابت کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اس وقت لکھا جائے جب یہ ظن غالب یا کم از کم ''مخاطب'' اور ''مکتوب الیہ'' کے بارے میں حسنِ ظن ہو کہ وہ اس کا ادب واحترام ملحوظ رکھیں گے، اسے قدموں کے نیچے یا کسی ڈسٹ بن اور کوڑے دان میں نہیں پھینکیں گے اور اگر خدانخواستہ بے ادبی کا گمان یا یقین ہو تو پھر خط کتابت یا تحریر کے شروع میں بسم اللہ ہرگز نہ لکھی جائے بلکہ خط کتابت یا تحریر شروع کرنے سے پہلے زبانی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لے اور پھر لکھنا شروع کر دے۔ ہمارے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کفار کی بستی میں جانا ہو اور یقین

یا ظن غالب ہو کہ قرآن مجید لے کر جائیں گے اور وہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اس کی بے حرمتی کریں گے تو پھر ایسی صورت حال میں قرآن مجید ساتھ لے کر نہ جائیں۔

یہ عقیدہ یا نظریہ کسی کا نہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے یا پڑھنے کے بجائے 786 کا عدد لکھا جائے یا پڑھ لیا جائے تو بسم اللہ کا ثواب ملے گا، کیونکہ یہ عقیدہ اختیار کرنے سے سنت بسم اللہ کا ترک لازم آئے گا، جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہو گا کہ جب 786 بسم اللہ کا متبادل یا اس کے قائم مقام نہیں ہے تو لکھنے کا کیا فائدہ؟ آپ کو معلوم ہے کہ بعض کوڈ ورڈز (Code Words) یا اشاراتی الفاظ یا نشانات ہوتے ہیں، جو مسلح افواج سیکورٹی انجینئر اور بعض سراغ رسانی کے اداروں یا شعبہ جات میں استعمال ہوتے ہیں اور اس شعبہ سے وابستہ افراد کا ذہن ان کے سنتے ہی یا ان پر نظر پڑتے ہی ان معانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جن کے لئے انہیں وضع کیا گیا ہے۔ تو اگر خط یا تحریر کے شروع میں 786 کا عدد لکھا ہو اور اس پر نظر پڑتے ہی قاری کا ذہن بسم اللہ کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ فوراً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لے۔ تو یہ بھی بہت بڑا فائدہ ہے، بے ادبی سے بھی بچ گئے اور سنتِ بسم اللہ کا اجر بھی پا لیا۔ یہ تو طے ہے کہ 786 کا لکھنا کسی کے نزدیک بھی واجب یا سنت کے درجے میں نہیں ہے اور اس کے ترک سے کوئی شرعی خرابی لازم نہیں آتی، لیکن اگر اس پر نظر پڑتے ہی بندے کا ذہن متوجہ ہو جائے اور وہ بسم اللہ پڑھ لے تو یہ اس جہت سے ایک مستحسن امر ہو گا۔

یہ مسئلہ کہ اعداد میں کوئی تاثیر ہے یا نہیں؟ میری نظر میں اس کے لئے کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔ لیکن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سمیت دیگر متعدد مسلمہ اکابر امت تعویزات میں ان کا استعمال کرتے رہے ہیں اور ہمارا ان سب اکابر امت کے بارے میں حسنِ ظن ہے کہ یہ کسی خلافِ شرع امر پر مجتمع نہیں ہو سکتے اور حضور ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ

''میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔ (الحدیث)''۔

توارث و تواتر کے ساتھ اکابر و صلحاء امت کا عمل یہ بتاتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ عمل مجرب ہے۔

ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ جمل یا ابجد یا حروف کے اعداد کا تصور مسلمانوں میں کب سے

متعارف تھا، تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ مسلمان عہدِ رسالت میں بھی اس سے آشنا تھے، چنانچہ علامہ قاضی ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شیرازی متوفی 685 نے اپنی معرکۃ الاراء تفسیر انوار التنزیل میں الم کی بحث میں یہ حدیث نقل کی ہے:

اوالی مدد اقوام واٰجالٍ بحساب الجمل کما قاله ابوالعالية ممسکا بما روی انه علیه الصلوٰة والسلام لما اتاه الیهود تلی علیهم الٓم البقره، فحسبوه وقالوا کیف ندخل فی دین مدته احدی وسبعون سنة؟ فتبسم رسول الله ﷺ، فقالوا: هل غیره، فقال: الٓمٓصٓ، الٓر، الٓمٓر۔ وغیره، فقالوا: خلطت علینا فلاندری بایها ناخذ

"یا بعض سورتوں کے شروع میں مذکوران حروف مقطعات سے بحساب جمل بعض قوموں کی بقا کی معیاد کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ابوالعالیہ نے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے، کہ جب یہود آپ کے پاس آئے تو آپ نے انہیں "الٓم، البقرہ" پڑھ کر سنائی تو انہوں نے حساب لگایا اور کہا کہ "ہم ایسے دین میں کیسے دخل ہوں، جس کی کل مدت ہی 71 سال ہے"۔ تو رسول اللہ ﷺ یہ سن کر مسکرائے، تو اس پر یہود نے پوچھا: "کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے"؟، پھر آپ نے الٓمٓصٓ، الٓر، الٓمٓر وغیرہ دیگر ایسی آیات پڑھ کر سنائیں تو انہوں نے کہا: آپ نے معاملہ ہم پر مشتبہ کر دیا، اب ہمیں سمجھ نہیں آرہا کہ ہم ان میں سے کسے بنیاد بنا کر حساب لگائیں"۔

اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ: "رسول اللہ ﷺ کا یہود کے اس استدلال کو رد نہ کرنا (یعنی جمل کا حساب لگانا) اور اسے ثابت وقائم رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے نزدیک اصولی طور پر حساب لگانا خلاف شرع نہیں ہے"۔ گویا یہ حدیثِ تقریری ہے۔ ہمیں اصل کتبِ حدیث میں یہ حدیث نہیں ملی، لیکن بیضاوی کے محشی شیخ حبیب الرحمٰن کاندھلوی نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے اسے تاریخ البخاری میں روایت کیا ہے۔ اس پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جمل کا حساب تو اپنی اصل کے اعتبار سے عربی نہیں ہے، لیکن بعض اوقات غیر عربی کوئی چیز جب اہل عرب میں متعارف ومشہور ہو جائے، تو اسے قبول کر کے عربیت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ کئی عربی الفاظ (جیسے مشکوٰۃ، انجیل، قسطاس) کو معرب کر کے عربی میں

داخل کر دیا گیا ہے اور قرآن نے انہیں استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے:

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (یوسف:2)

''ہم نے اسے (قرآن کو) عربی میں نازل کیا ہے''۔

وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ (النحل:103)

''اور یہ واضح عربی زبان ہے''۔

مصنوعی طریقے سے شوہر کا تولیدی جرثومہ (Sperm) اپنی بیوی کے رحم میں پہنچانے کا جواز

سوال: مؤدبانہ عرض یہ ہے کہ ایک صاحب جن کی شادی کو ساڑھے دس سال کا عرصہ گذر چکا ہے اور شادی کے دوسرے ہی سال معلوم ہو گیا تھا کہ ان صاحب میں اسپرم کاؤنٹ کم ہے۔ میاں بیوی دونوں صبر شکر کر کے بیٹھ گئے تھے کہ جو اللہ کی مرضی! کیونکہ ٹیسٹ ٹیوب قطعاً حرام ہے اب مسئلہ یہ ہے کہ ابھی ایک جگہ معلوم ہوا ہے کہ مرد اگر نارمل طریقے سے اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے مگر اس کے مادۂ تولید میں اتنی طاقت ہے کہ اگر وہ کسی طرح عورت کے رحم میں چلا جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو اولاد سے نواز سکتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر شوہر کا مادۂ تولید عورت کے جسم میں رکھ دیا جائے تو کیا اس طریقے سے اولاد کے لیے کوشش کرنا جائز ہے یا نہیں۔

(عرفان احمد معرفت قاری محمد صدیق۔ مسجد خلفائے راشدین گلشن اقبال کراچی)

جواب: جہاں تک کسی عورت کے رحم میں اس کے شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد کا مادۂ منویہ یعنی تولیدی جرثومہ (Sperms) انجکشن یا کسی بھی مصنوعی طریقے سے پہنچانے کا تعلق ہے تو یہ از روئے حدیث ممنوع و حرام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

عَنْ رُوَيفع بن ثابت الانصاری قَالَ: قام فينا رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول يوم حنين قال: لا يحل لامرئ يؤمن بالله واليوم الآخر ان يسقى مآءه زرعَ غيره.

''حضرت رویفع بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں تمہیں وہ حدیث بیان کر رہا ہوں جو میں نے یوم حنین کو رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی، آپ نے فرمایا: جو شخص بھی اللہ تعالیٰ

اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا پانی غیر کی کھیتی میں ڈالے۔ (سنن ابی داؤد، جلد ۱، صفحہ ۲۹۳)

البتہ سوال میں جس صورت مسئلہ کا حکم دریافت کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کمزوری یا نقص کے سبب شوہر اپنے مادۂ منویہ کو عملِ تزویج کے ذریعے بیوی کے رحم میں پہنچانے پر قادر نہیں ہے اور بعض اوقات بیوی کے رحم کی ساخت میں کسی نقص اور خرابی کے باعث اس میں شوہر کا مادۂ منویہ پہنچ نہیں پاتا۔ ان دونوں صورتوں میں شرعاً مرد کا مادۂ منویہ (یعنی تولیدی جرثومہ) مصنوعی طریقے سے اس کی اپنی بیوی کے رحم میں پہنچانا جائز ہے، لیکن شرعی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی کے رحم میں اس کے شوہر کا تولیدی جرثومہ (Sperms) پہنچانے کے لیے لیڈی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی جائیں، کیونکہ عورت کی فرج کو غیر مرد کے سامنے کھولنا حرام ہے اور اس عمل سے اگر تقدیر الٰہی سے بچہ پیدا ہو جائے تو وہ صحیح النسب اور ثابت النسب ہوگا۔ سائنسی اور طبی اعتبار سے تو اس عمل کا امکان اور وقوع بیسویں صدی کے آخر میں ظاہر ہوا ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث صفحات 935 تا 948 ٹیسٹ ٹیوب بے بی اور مصنوعی تولید کے عنوان کے تحت اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

فقہاء اسلام نے اس کو جائز قرار دیا ہے کہ بغیر مجامعت کے مرد کے پانی کو عورت کی اندامِ نہانی میں پہنچا دیا جائے، جس سے عورت حاملہ ہو جائے۔ یہ عمل اگرچہ نادر ہے لیکن اس سے نسب ثابت ہو جائے گا اور یہ بعینہٖ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا جزئیہ ہے اللہ تعالیٰ ہمارے فقہاء پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، انہوں نے اب سے کئی سو برس پہلے ایسے اصول اور قواعد بیان کر دیے جس سے کئی سو برس بعد پیش آنے والے مسائل حل ہو گئے۔ علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

وما قيل لا يلزم من ثبوت النسب منه وطؤه لان الحبل قد يكون باد خال الماء الفرج دون جماع فنادر۔

''اور یہ جو کہا گیا ہے کہ کسی شخص سے ثبوتِ نسب سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس نے جماع بھی کیا ہو، کیونکہ بغیر جماع کے بھی عورت کی اندام نہانی میں نطفہ پہنچانے سے عورت حاملہ ہو جاتی ہے، تو یہ نادر الوقوع ہے''۔ (فتح القدیر جلد ۴، صفحہ ۱۷۱)

علامہ زین الدین ابن نجیم نے البحر الرائق جلد ۴، صفحہ ۱۶۹ پر اور علامہ شبلی نے حاشیۃ الشبلی علی تبیین الحقائق جلد ۳، صفحہ ۳۹ پر بھی بعینہٖ یہی لکھا ہے، عالم گیری میں ہے:

وان كان الزوج مجبوبا ولم تعلم بحاله فجاءَ ت بولد فادعاه وا ثبت القاضى نسبه ثم علمت بحاله و طلبت الفرقة فلها لان الولد لزمه بغير جماع كذا فى المحيط.

''اگر شوہر کا آلۂ تناسل کٹا ہوا ہو اور عورت کو اس کا پتا نہ ہو اور اس کو بچہ ہو جائے اور خاوند اس بچے کا دعویٰ کرے اور قاضی اس سے نسب ثابت کر دے پھر عورت کو اس کے حال کا علم ہو اور وہ علیحدگی طلب کرے تو اس کے لیے جائز ہے، کیونکہ بچہ اس سے بغیر جماع کے پیدا ہو گیا''۔ (فتاویٰ عالم گیری، جلد ۱، صفحہ ۵۲۵)

جس شخص کا آلۂ تناسل کٹا ہوا ہو وہ جماع نہیں کر سکتا ایسے شوہر کا نطفہ بغیر جماع کے کسی اور ذریعہ سے عورت کی اندام نہانی میں پہنچے گا اور بچہ پیدا ہو جائے گا اور اس کا نسب عورت کے شوہر سے ثابت ہو گا اور چونکہ وہ شخص جماع نہیں کر سکتا اس لیے فقہاء نے عورت کو علیحدگی کے مطالبہ کی اجازت دے دی ہے۔

بہر حال البحر المحیط اور عالم گیری کی عبارت سے بھی یہ واضح ہو گیا کہ اگر شوہر نے بغیر جماع کے اپنا نطفہ عورت کی اندامِ نہانی میں پہنچا دیا اور بچہ ہو گیا تو اس کا شوہر سے نسب ثابت ہو جائے گا۔ علامہ شمس الدین سرخسی، المبسوط (جلد ۵، صفحہ ۱۰۴)، علامہ علاؤ الدین الحصکفی، الدر المختار علی الرد (جلد ۲، صفحہ ۸۱۷) اور علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی (رد المحتار جلد ۲، صفحہ ۸۱۷) نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

وقد قيل ان المراة تحمل من غير وطأ بان يدخل ماء الرجل فى فرجها، بعضلها او بعضل غيرها.

''ایک قول ہے کہ عورت بغیر وطی اور جماع کے بھی حاملہ ہو جاتی ہے بایں طور کہ مرد کا پانی عورت کے اندامِ نہانی میں داخل کیا جائے۔ خواہ عورت خود داخل کرے یا کوئی اور۔
(المغنی مع الشرح الکبیر ۱/۱۸۷)

فقہ جعفریہ کے ممتاز عالم شیخ روح اللہ خمینی نے بھی اپنی توضیح المسائل صفحات ۴۵۳-۴۵۲ پر اسے جائز قرار دیا ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ صحیح النسب ہوگا۔

فاتحہ کا طریقہ

سوال: فاتحہ سے کیا مراد ہے؟ فاتحہ کا طریقہ کیا ہے؟ کیا فاتحہ دینے کے لئے سامنے کھانے کا رکھنا ضروری ہے؟ (محمد انصر قیوم عباسی۔ دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت کا نام سورۂ فاتحہ ہے۔ اس سورۃ کے اور بھی متعدد نام ہیں: مثلاً ام الکتاب، فاتحۃ القرآن، السبع المثانی، الوافیہ، الشفاء، سورۃ الصلوٰۃ، سورۃ الدعاء وغیرہ۔ عرف عام میں فاتحہ سے مراد ہے میت کی روح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے کلام اللہ یا الحمد و درود اور کلماتِ طیبات کی تلاوت کرنا۔ چونکہ فاتحہ میں بالعموم سورۃ فاتحہ ضرور پڑھی جاتی ہے، اس لئے اس ''دعاء ایصالِ ثواب'' کو فاتحہ کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے، خواہ یہ تلاوتِ قرآن پر مشتمل ہو یا کلماتِ طیبات اور درود پاک پر مشتمل ہو یا میت کے ایصالِ ثواب کی خاطر فقراء کے لئے کھانا تیار کیا گیا ہو یا ان سب چیزوں کا مجموعہ ہو، اس کو اردو زبان میں فاتحہ دلانا/ دلوانا یا فاتحہ دینا یا فاتحہ پڑھنا کہا جاتا ہے۔ بعض بزرگوں کا معمول رہا ہے کہ فاتحہ میں ختمِ قرآن مجید کے بعد سورۂ فاتحہ، آیت الکرسی، سورۃ الاخلاص (تین، پانچ، سات یا گیارہ مرتبہ حسب توفیق) سورۃ الفلق، سورۃ الناس، سورۃ البقرہ کی ابتدائی پانچ اور آخری دو آیات اور درود پاک و تسبیحات و اذکار وغیرہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کی دعا کی جاتی ہے اور اگر ختمِ قرآن کی فرصت نہ ملے تو باقی چیزوں پر اکتفا کر لیا جاتا ہے۔ فاتحہ دینے یا دلانے کے لئے کھانے کا سامنے رکھنا ضروری نہیں ہے، لیکن اگر رکھ لیا جائے تو اس کی ممانعت بھی نہیں ہے۔

امریکہ میں ایک مسلم مذبح کے متعلق مسائل

سوال: (۱) امریکہ کے ایک شہر میں ایک فلسطینی مسلمان، ایک مذبح کا مالک ہے جس میں عام امریکی مذابح کے مطابق نہ سؤر کا گوشت ہوتا ہے اور نہ ہی مشینی ذبیحے کا گوشت ہوتا ہے۔ اس مذبح میں صرف گائے، بکرے اور دنبے کا گوشت دستیاب ہوتا ہے۔ مذبح کے مالک کا ایک مسلمان ملازم ہے جو شریعت کے مطابق جانوروں کو ذبح کرتا ہے، اسے ایک وقت میں کثیر تعداد میں حلال

جانور ذبح کرنے ہوتے ہیں، لہٰذا ذبح کے وقت عجلت میں کبھی تو چاروں رگیں کاٹ دیتا ہے اور کبھی صرف تین یا دو رگیں بھی کٹ جاتی ہیں۔

ازراہِ کرم یہ بتایئے کہ شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ذبح کے وقت شرعاً حلال ہونے کے لئے جانور کی گردن کی کتنی رگیں کاٹنا ضروری ہیں، اور یہ بھی تحریر کریں کہ شرعاً مذکورہ بالا طریقے سے ذبح شدہ جانوروں کا گوشت کھانا اور اس کی خرید و فروخت مسلمانوں کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

سوال: (۲) یہ بھی بتایئے کہ آیا شرعاً ''شرائطِ بیع و شراء'' اور ''حلتِ شرعی'' کے لئے خریدار کا دوکاندار سے یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ آیا تم سنی ہو یا وہابی، اور میلاد شریف و صلوٰۃ و سلام کے قائل ہو یا نہیں؟ جلد جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(مولانا) محمد بابر رحمانی قادری ڈیلس، امریکہ)

جواب: (۱) الحمدللہ! یہ امر باعثِ مسرت و اطمینان ہے کہ ایک سیکولر نظام پر مبنی غیر مسلم ملک میں مسلمانوں کو یہ سہولت میسر ہے کہ مسلمانوں کے اپنے مذابح (SlaughterHouses) موجود ہیں، جہاں مالک بھی مسلمان ہے اور ذابح (Slaughterer) بھی مسلمان ہے اور شرعی ذبیحے کا اہتمام بھی ہے۔ حلال جانور کے ذبیحے (Slaughtered Animal) کے شرعاً حلال ہونے کے لئے اس کی گردن کی چاروں رگوں یا کم از کم تین رگوں (یعنی اکثر) کا کٹ جانا ضروری ہے، فتاویٰ عالمگیری ج ۴ ص ۲۸۷ پر ہے:

> والعروق التی تقطع فی الذکاۃ اربعۃ ، الحلقوم: هو مجری النفس، والمرئ: هو مجری الطعام، والودجان: وهما عرقان فی جانبی الرقبة یجری فیهما الدم: فان قطع کل الاربعة حلت الذبیحة وان قطع اکثرها فکذالک عند ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ، وقالا: لا بد من قطع الحلقوم والمرئ واحد الودجین، والصحیح قول ابی حنیفة لما ان للاکثر حکم الکل، کذا فی المضمرات

''وہ رگیں جو ذبح کے وقت کاٹی جاتی ہیں، چار ہیں: (۱) حلقوم: یہ سانس کی نالی ہے، (۲) مری: یہ خوراک کی نالی ہے، (۳، ۴) ودجان: یہ گردن کے دائیں و بائیں جانب خون کی دو نالیاں ہیں، اگر (ذبح کے وقت) یہ چاروں رگیں کٹ گئیں تو ذبیحہ

(بالاتفاق) حلال ہے، اور اگر اکثر رگیں کٹ جائیں، تب بھی امام ابوحنیفہ کے نزدیک حلال ہے، اور امام ابویوسف وامام محمد کہتے ہیں: حلقوم، مریٰ اور ودجان میں کسی ایک کا کٹنا ضروری ہے، اور (دراصل) امام ابوحنیفہ ہی کا قول صحیح ہے، کیونکہ اکثر کل کے حکم ہوتا ہے اور مضمرات میں بھی یہ مسئلہ یونہی بیان کیا گیا ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وحلّ المذبوح بقطع ای ثلاث منها اذ للاکثر حکم الکل۔

''اور مذبوح جانوران (چار) میں سے کسی بھی تین کے کٹ جانے سے حلال ہوجاتا ہے، کیونکہ اکثر کل کا حکم رکھتی ہیں۔ (درمختار ج ۵ ص ۲۰۷ مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ)

صورتِ مسئولہ میں جب یقین یا ظنِ غالب ہو کہ اکثر رگیں کٹ جاتی ہیں تو اس مذبح کا ذبیحہ حلال ہے، کیونکہ یقین شک سے زائل نہیں ہوتا۔ اور ویسے بھی مسلمانوں کو ایک دوسرے کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لینا چاہئے۔

جواب: (۲) ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور اس کا ظاہر حال اس کی تصدیق کرتا ہے، تو یہ کافی ہے، الا یہ کہ کسی کا کفر وارتداد دلائل وقرائن سے ثابت ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (المائدہ:۱۰۱)

''اے ایمان والو! ایسی باتوں کی بابت نہ پوچھو کہ اگر وہ تمہارے لئے ظاہر کردی جائیں تو تمہیں بری لگیں''۔

رسول اللہ ﷺ نے احادیث مبارکہ میں بدگمانی، تجسس اور تحسس سے منع فرمایا ہے، ارشاد نبوی ہے:

عن عائشة انهم قالوا: یارسول الله(ﷺ) ان قوماً حدیثو عهد بجاهلیة یا تونا بلحمان، لاندری أذکروا اسم الله ام لم یذکروا، أناکل منها، فقال رسول الله ﷺ، سموا الله وکلوا

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! کچھ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، وہ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں، ہم کو معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے (اس جانور پر ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا ہے یا

نہیں، کیا ہم اس گوشت کو کھالیا کریں؟، آپ نے فرمایا: بسم اللہ پڑھو اور کھاؤ"۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۰۵۷-۵۵۰۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۱۷۴)

ذابح کا مسلمان ہونا یا اہل کتاب سے ہونا شرط ہے، لیکن گوشت فروخت کرنے والے کے لئے اسلام شرط نہیں ہے۔ ذابح یا قصاب یا دکاندار کے عقائد و نظریات کی اتنی مفصل تحقیقات تو پاکستان یا کسی دوسرے اسلامی ملک میں بھی لوگ نہیں کرتے، غلبہ ظن اور حسنِ ظن سے کام لیتے ہیں، چہ جائے کہ غیر مسلم ممالک میں یہ معیارات قائم کیے جائیں۔

ھذا ماعندی، فقط واللہ تعالیٰ ورسولہٗ اعلم بالصواب

منّت کی چادریں اور تالے

سوال: اکثر لوگ مزار پر چادر چڑھانے کی منت مانتے ہیں اور دیکھنے میں آیا ہے کہ مزار کے مخصوص حصوں میں منت کے بے شمار تالے لگے ہوتے ہیں جن کے بارے میں بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان تالوں کے لگانے سے کام پورا ہو جاتا ہے، کام پورا ہونے کے بعد تالے کو کھول دیتے ہیں، اور بہت سے لوگ منّت کی مخصوص ڈوریاں (جو مزارات پر عام فروخت ہوتی ہیں) باندھتے ہیں۔ اور آج کل منت کا یہ نیا طریقہ چلا ہے کہ مزارات پر منت کی مخصوص روٹیاں فروخت ہوتی ہیں جن کے بارے میں بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان روٹیوں کو ایک ہفتے تک گھر میں رکھنا باعثِ برکت ہے۔ کیا ان سب امور کی منت ماننا جائز ہے یا ناجائز۔
(حافظ محمد جمشید ہاشمی ...... مظفر گڑھ، پنجاب)

جواب: انسان جس کام کی منت مان کر اس کو اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے، اس کو نذر کہتے ہیں، نذر کی مشروعیت اور جواز قرآن سے ثابت ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۚ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (آل عمران: 35)

"جب عمران کی بیوی نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے میں اس کی تیرے لیے منت مانتی ہوں، تو (اسے) میری جانب سے قبول فرما، بیشک تو بہت ہی سننے والا خوب جاننے والا ہے"۔

اسی طرح قرآن میں نذر پورا کرنے کا بھی حکم ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ (الحج:29)

''اوران پر لازم ہے کہ وہ اپنی نذروں کو پورا کریں''۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر نذر اطاعت اور امورِ خیر کی ہو، جیسے مالی صدقہ یا روزہ وغیرہ، تو اس کا پورا کرنا لازم ہے، اور معصیت اور گناہ کی ہو تو اس کا پورا کرنا لازم نہیں ہے بلکہ اس کا نہ کرنا شرعاً لازم ہے۔ فرمانِ رسول ہے:

من نذر ان يطيع الله فليُطعه و من نذران يعصيه فلا يعصه۔

''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نذر مانی، وہ اس عبادت کو ضرور کرے، اور جس شخص نے گناہ کرنے کی نذر مانی وہ اس گناہ کو نہ کرے''۔ (صحیح بخاری، جلد ۲، صفحہ ۹۹۱)

اگر کوئی شخص معصیت کی نذر مانتا ہے مثلاً خدانخواستہ یہ کہے کہ اللہ کے لیے مجھ پر شراب پینا واجب ہے، تو یہ نذر باطل اور حرام ہے اور اس پر اجماع ہے اور شرعاً اس کا ترکِ واجب اور اس پر عمل کرنا حرام ہے، البتہ معصیت کی نذر پر بتقاضائے شریعت عمل نہ کرنے کی صورت میں قسم کا کفارہ لازم آئے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کا فرمان ہے:

لانذر فی معصية و كفارته كفارة يمين۔

''معصیت کی نذر ماننا جائز نہیں ہے اور اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے''۔

(سنن کبریٰ، ج ۱۰، ص ۷۰)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کا یہی مسلک ہے۔ غالباً نذر اور قسم میں معنیٰ مشترک یہ ہے کہ دونوں کے ذریعے بندہ ایک ایسی چیز کو اپنے اوپر لازم کرتا ہے جو شریعت نے اس پر لازم نہیں کی، اور معصیت کی قسم کا بھی یہی حکم ہے کہ اس پر عمل نہ کرے اور اس کا کفارہ ادا کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

من حلف علی يمين فرأى غيرها خيرا منها فليكفر عن يمينه وليفعل الذی هو خير۔

''جو کسی بات کی قسم کھائے، پھر اس پر واضح ہو کہ (شرعاً) ترکِ قسم میں خیر ہے تو اسے

چاہئے کہ کفارہ ادا کرے (یعنی قسم کو توڑ دے) اور وہ کام کرے جس میں خیر ہے"۔
(صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

شرعاً نذر کے صحیح ہونے کی چند شرائط ہیں:

۱۔ جس چیز کی نذر مانی ہے اس کی جنس سے شرعاً کوئی عبادت واجب ہو، جیسے نوافل کی نذر، روزے کی نذر، حج کی نذر، صدقے کی نذر وغیرہ۔

۲۔ جس چیز کی نذر مانی ہے وہ عبادتِ مقصودہ ہو، دوسری عبادت کا وسیلہ نہ ہو، جیسے وضو اور سجدۂ تلاوت۔

۳۔ جس چیز کی نذر مانی ہے، وہ فی نفسہٖ معصیت نہ ہو، جیسے کسی ایسے جانور کے صدقہ کرنے کی نذر مانے جو دوسرے کی ملکیت ہے۔

۴۔ جس عبادت کی نذر مانی ہے وہ فی نفسہٖ فرض یا واجب نہ ہو، جیسے کسی وقت معین کی فرض نماز یا زکوٰۃ یا حج فرض کی نذر ماننا کیونکہ ان امور کو تو ویسے ہی شریعت نے فرض قرار دیا ہے۔

۵۔ جس عبادت کی نذر مانی ہے وہ امر محال نہ ہو، جیسے کوئی شخص کہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ نے میرا فلاں کام کر دیا تو میں گزشتہ کل میں روزہ رکھوں گا"۔

نذر ایک امر تعبدی ہے، یعنی یہ عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ کے تقرب اور رضا کے لیے کی جاتی ہے لہٰذا نذر صرف اللہ کے لیے ماننا جائز ہے، غیر اللہ کے نام کی نذر ماننا جائز نہیں ہے۔

اب آیئے سوال میں دریافت کردہ مسائل کی طرف مزار پر چادر چڑھانے کی نذر مطلقاً ماننا درست نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی امر تعبدی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی جنس سے کوئی عبادتِ مقصودہ واجب ہے، اسی طرح مزار پر تالے لگانے اور کھولنے کی نذر بھی باطل ہے، اسی طرح مزار سے مخصوص روٹیاں خریدنے اور کچھ دن گھر پر رکھنے کے بعد واپس مزار پر جا کر بیچنے کی نذر بھی باطل ہے، عوام کو ایسی جاہلانہ نذریں ماننے سے روکنا چاہئے اور علماء کو اپنے خطباتِ جمعہ میں اصلاحی تقریریں کرنی چاہئیں۔ ذیل میں ہم فقہاء اُمت اور کتب فتاویٰ کی وہ عبارات نقل کر رہے ہیں جن میں اس طرح کی نذریں ماننے کا حکمِ شرعی بتایا گیا ہے اور ان میں جو جواز کی صورت ہے وہ بھی بیان کر دی گئی ہے۔ علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

"اکثر عوام فوت شدہ لوگوں کی نذر مانتے ہیں اور اولیاء اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے

لیے ان کے مزارات پر روپے پیسے، موم بتیاں اور تیل لے جاتے ہیں یہ نذر بالا جماع باطل اور حرام ہے جب تک ان چیزوں کو فقراء پر خرچ کرنے کا قصد نہ کیا جائے"۔

علامہ ابن عابدین شامی حنفی اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں:

"جو شخص اولیاء اللہ کی نذر اس طرح مانتا ہے: "اے سیدی! اگر میرا گم شدہ شخص لوٹ آیا یا میرا بیمار تندرست ہو گیا یا میری حاجت پوری ہو گئی تو میں آپ کو اتنا سونا، چاندی یا کھانا یا موم بتیاں یا تیل دوں گا، یہ نذر بالا جماع باطل اور حرام ہے اور اس پر متعدد دلائل ہیں: پہلی دلیل یہ ہے کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور مخلوق کی نذر جائز نہیں ہے کیونکہ نذر عبادت ہے اور مخلوق کی عبادت جائز نہیں ہے، دوسری دلیل یہ ہے کہ جس کی نذر مانی ہے وہ میت ہے اور میت کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا، تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر نذر ماننے والے کا یہ گمان ہے کہ اشیاء میں اللہ تعالیٰ نہیں میت کا تصرف ہے تو اس کا یہ اعتقاد کفر ہے۔ اس کی اصلاح کی یہ صورت ہے کہ نذر ماننے والا اللہ کی نذر مانے اور کہے اے اللہ اگر میرا مریض شفایاب ہو گیا، یا میرا گم شدہ شخص واپس آ گیا یا میری حاجت پوری ہو گئی تو میں تیری نذر مانتا ہوں کہ میں (مثلاً) سیدہ نفیسہ یا امام شافعی، یا امام لیث کے مزار پر بیٹھنے والے فقراء کو کھانا کھلاؤں گا یا ان کی مساجد کے لیے چٹائیاں لے جاؤں گا یا ان مساجد کے لیے تیل یا روپے، پیسے لے جاؤں گا۔ نذر اللہ عزوجل کی ہو اور اولیاء کرام کا ذکر صرف نذر کا مصرف متعین کرنے کے لیے ہو، اور جو فقراء اولیاء اللہ کے مزارات یا مساجد پر اس امید سے بیٹھے ہوتے ہیں ان پر اس نذر کو خرچ کیا جائے۔ اس نذر کو غنی، عہدہ دار اور سادات پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے اور شریعت میں نذر کو اغنیاء پر صرف کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ مخلوق کی نذر حرام ہے اور منعقد نہیں ہوتی اور نہ ہی مزارات کے خادموں کے لیے اس نذر کا لینا جائز ہے الا یہ کہ وہ فقراء ہوں اور ان کے اہل و عیال کسب سے عاجز ہوں"۔

(رد المحتار علی الدر المختار، ج ۳، ص ۳۸۰۔۳۷۹ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان)

ملا نظام الدین حنفی (مرتب فتاویٰ عالمگیری) نے ذکر کیا ہے:

"اکثر عوام اس طرح نذر مانتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ کے مزارات پر جاتے ہیں اور ان کے مزار کی چادر اُٹھا کر کہتے ہیں: اے سیدی فلاں بزرگ! اگر میری حاجت پوری ہو گئی تو مثلاً آپ کو اتنا سونا دوں گا" یہ نذر بالا جماع باطل ہے۔ ہاں اگر یہ کہے کہ اے اللہ! میں تیری نذر مانتا ہوں کہ اگر مثلاً

میرا بیٹا شفاء یاب ہوگیا تو میں مثلاً سیدہ نفیسہ کے دربار پر بیٹھنے والے فقراء کو کھانا کھلاؤں گا یا ان کی مسجد کے لیے چٹائیاں اور روشنی کے لیے موم بتیاں دوں گا یا مسجد کے منتظم کو خرچ کے لیے پیسے دوں گا۔ یہ نذر اللہ تعالیٰ کی ہو اور شیخ کا ذکر صرف نذر کے مستحقین کے محل کو متعین کرنے کے لیے ہو تو یہ جائز ہے۔ لیکن اس نذر کو غیر فقراء پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے، کسی ذی علم عالم پر اور نہ شیخ کے خدام اور حاضرین پر الا یہ کہ وہ فقراء ہوں۔ پس اولیاء اللہ کے مزارات پر ان کا تقرب حاصل کرنے کے لیے جو پیسے چڑھائے جاتے ہیں وہ بالاجماع حرام ہیں جب تک ان پیسوں کو زندہ فقراء پر خرچ کرنے کا قصد نہ کیا جائے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور اکثر لوگ اس غلط کام میں مبتلا ہیں۔ النہر الفائق اور البحر الرائق میں اسی طرح لکھا ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری، ج ۱ص ۲۱۶ مطبوعہ مصر)

البتہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے فتاویٰ عزیزی ج ۱ص ۹۵ پر فتاویٰ عالمگیری کی عبارت لکھ کر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارے ہاں عرفِ عام میں جو لوگ بزرگانِ دین کی نذر کے نام سے صدقات وخیرات کرتے رہتے ہیں، وہ دراصل ایصالِ ثواب ہے جو شرعاً جائز اور مستحسن امر ہے، یہ وہ شرعی وفقہی نذر نہیں ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے۔ ایسا صدقہ وخیرات کرنے والے کی نیت یہ ہوتی ہے کہ تصدق اللہ کے نام پر ہے اس کا مصرف فقراء ہیں اور ایصالِ ثواب اس بزرگ کے لیے ہے۔ لیکن اگر کسی کی نیت یہ ہے کہ بزرگ کے نام کی نذر ہے، اس کا تقرب مقصود ہے تو یہ بلاشبہ باطل اور حرام ہے، اور اگر کوئی غیر اللہ کو اشیاء اور امور میں "متصرف بالذات" مانتا ہے تو یہ کفر ہے۔

ربیع الاول میں چراغاں

سوال: ربیع الاول کا مہینہ آتے ہی شہر کراچی میں جگہ جگہ بجلی کے قمقموں سے چراغاں کیا جاتا ہے ۹۰ فیصد یہ چراغاں بجلی کی چوری سے کیا جاتا ہے۔ رات تو رات دن میں بھی قمقمے روشن ہوتے ہیں۔ آپ اس مسئلہ پر کیا فرماتے ہیں، (سید محمد اسامہ۔ گلبرگ، کراچی)۔

جواب: موجودہ دور میں جلوس نکالنا اور چراغاں کرنا، اظہار مسرت اور دین کی شوکت کے اظہار کے معروف ومروج طریقے ہیں۔ جیسے جلوسِ میلاد النبی ﷺ، یومِ شوکتِ اسلام کے

نام پر جلوس، جلوسِ عظمتِ صحابہ وغیرہ اسی طرح شادی، نکاح ودیگر تقریبات میں اظہارِ مسرت کے لئے بھی چراغاں کیا جاتا ہے۔ اور مومن کی نگاہ میں آمدِ مصطفیٰ ﷺ، ولادتِ مصطفیٰ ﷺ اور بعثتِ مصطفیٰ ﷺ سے بڑھ کر کسی دینی خوشی اور سعادت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا میلاد النبی ﷺ کا جلوس اور چراغاں جائز اور مستحب امور ہیں۔

کے ای ایس سی یا واپڈا کے پولوں سے ڈائریکٹ بجلی بلا اجازت لینے پر شرعی وفقہی چوری کا اطلاق تو درست نہیں ہے کیونکہ سرقہ (چوری) کی فقہی تعریف یہ ہے کہ ایسا مال جسے مالک نے حفاظت سے رکھا ہو اور اس کی حفاظت کا انتظام کیا ہو۔ اسے مالک کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر لے لینا۔ اب ظاہر ہے کہ بجلی کے پول اور تاریں کھلی ہوتی ہیں۔ مال محفوظ نہیں ہے اور متعلقہ ادارے ایسے استعمال سے غافل نہیں ہوتے، تاہم یہ درست ہے کہ بلا اجازت ڈائریکٹ کنکشن لے لینا غیر قانونی، غیر شرعی اور لائق تعزیر جرم ہے۔ لہٰذا اہلِ عقیدت ومحبت کو چاہئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے اپنی عقیدت ومحبت کے اظہار میں حدودِ شرعی کی پاسداری کریں اور متعلقہ اداروں کو چاہئے کہ وہ ایسے مواقع پر مناسب معاوضہ وصول کر کے عارضی کنکشن کا کوئی قانونی طریقہ وضع کریں۔ دن میں قمقموں کا روشن کرنا اسراف ہے۔

خون سے فاتحہ لکھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں جو فتاویٰ شامی میں موجود ہے کہ خون اور پیشاب کے ساتھ (اگر یقین ہو کہ اس سے شفاء ملے گی) سورۂ فاتحہ لکھنا جائز ہے۔ کیا یہ صحیح ہے اور علامہ شامی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ بہت سے غیر مقلد حضرات اس مسئلے کو احناف کے خلاف پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، (حافظ آثار اللہ ہزاروی، لیاقت آباد)

جواب: اصل مسئلے پر گفتگو کرنے سے پہلے فقہ اسلامی کی چند اصولی باتیں سمجھ لیجئے۔ ایک شدید مجبوری کی صورتِ حال ہوتی ہے، جسے حالتِ ''اضطرار'' کہتے ہیں، یعنی جب انسان کے پاس بقاءِ جان کے لئے کوئی حلال چیز دستیاب نہ ہو، البتہ حرام چیز دستیاب ہو، اور اگر وہ اس موقع پر جان بچانے کے لئے حرام چیز استعمال نہیں کرتا تو اس کی جان کے تلف ہونے اور ہلاکت کا اندیشہ ہے ایسی ''صورتِ اضطرار'' میں حکم ہے کہ حرام چیز کھا کر جان بچالے اور اس کے لئے اصولِ فقہ میں

ایک قاعدہ وضع ہوا ہے کہ "الضرورۃ تبیح المحظورات" یعنی ضرورتِ شدیدہ کی بناء پر ممنوعات مباح ہو جاتی ہیں" لیکن اس "اباحتِ محظورات" کو بھی بلا روک ٹوک نہیں چھوڑا بلکہ اس پر بندش عائد کر دی گئی ہے کہ: "الضرورۃ تتقدر بالضرورۃ" یعنی بر بناء ضرورت حرام چیز کے استعمال کا جواز "دفعِ ضرر" اور خطرۂ ہلاکت" تک محدود رہے گا، لذتِ نفس اور خواہش نفسانی کی تکمیل کے لئے حدودِ شرع کو پامال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ قرآن مجید میں اس مسئلے کو اطلاق انداز (APPLIED FORM) میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (البقرہ: ۱۷۳)

" یقیناً تم پر مردار، (ذبح کے وقت بہنے والا) خون، خنزیر کا گوشت اور اس جانور کا کھانا، جس پر ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، حرام قرار دیا گیا ہے، (البتہ) جو (بھوک و پیاس کی شدت سے) بیتاب ہو جائے تو اس پر (بقدرِ ضرورت ان اشیاء کے کھانے میں) کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ وہ نافرمان اور حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو، بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے"۔

(۲) سورۃ المائدہ آیت نمبر ۳ میں متعدد محرماتِ قطعیہ (مردار، ذبح کے وقت بہنے والا خون، لحمِ خنزیر، غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ، گلا گھٹنے سے مرا ہوا جانور، چوٹ کھا کر مرا ہوا، بلندی سے گر کر مرا ہوا، دوسرے جانور کا سینگ لگنے سے مرا ہوا، جسے کسی درندے نے مار کھایا ہو، جو بتوں کے استھانوں پر ذبح کیا گیا ہو، فال کے تیروں سے قسمت کا حال معلوم کرنا یا جوا بازی کرنا) کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ ۙ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

" تو جو شخص بھوک و پیاس کی شدت سے بے قابو ہو کر (محض بقاء جان کیلئے) کوئی حرام چیز کھا پی لے، اس حال میں کہ گناہ کی طرف میلانِ قلبی بالکل نہ ہو، تو بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا مہربان ہے"۔

(۳۔۴) اسی مضمون کو سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۱۹ اور سورۃ النحل، آیت نمبر ۱۱۵ میں بھی

بیان کیا گیا ہے۔

دوسری صورت ''حالتِ اکراہ'' ہے، یعنی یہ کہ انسان کفار کے چنگل میں پھنس جائے اور وہ اسے مجبور کریں کہ ''کلمۂ کفر'' کہو ورنہ تجھے جان سے مار دیں گے اور ایسے ظاہری قرائن بھی موجود ہوں کہ اگر ان کے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کر لیں گے اور ظاہری اسباب کے تحت وہ اس کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (النحل:۱۰۶)

''جو اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کرے (تو اس کا حکم آگے آ رہا ہے)، مگر جسے (قتل کی دھمکی دے کر ''کلمۂ کفر'' کہنے پر) مجبور کر دیا گیا ہو (تو اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں) درآں حالیکہ اس کا دل ایمان پر (بالکل) مطمئن ہے، لیکن (اس کے برعکس) جو شخص قلبی رضامندی سے کفر اختیار کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے''۔

ان آیات قرآنی کی روشنی میں ''حالتِ اضطرار'' میں قلبی نفرت و کراہت کے ساتھ محض جان بچانے کی حد تک حرام چیز کو استعمال کرنے کی اجازت ہے اور فقہی اعتبار سے اس رخصتِ شرعی پر عمل کرنا ضروری ہے، اور ''حالتِ اکراہ'' میں کم ہمت شخص کو جان بچانے کے لئے محض زبانی حد تک ''کلمۂ کفر'' کہنے کی رخصت و اجازت ہے، بشرطیکہ ایمان اس کے قلب میں مستحکم ہو، لیکن اگر کوئی صاحبِ عزم، باہمت، ذی حمیت اور دینی اعتبار سے متصلب مومن ہے اور اپنے ایمان کے تحفظ کے لئے ہر تکلیف کو برداشت کرنے حتیٰ کہ اپنی جان قربان کرنے کا بھی حوصلہ رکھتا ہے تو اس کے لئے ''درجۂ عزیمت'' یہ ہے کہ جان دے دے اور کلمۂ کفر زبان پر نہ لائے تا کہ اس کی میت زبانِ حال سے اس شعر کی تصویر ہو۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اب اس سیاق و سباق میں کہ قرآن ''حالتِ اضطرار'' و ''حالتِ اکراہ'' کے احکام بیان کر رہا ہے، کوئی شخص روحِ قرآنی و منشاء ربانی کو نہ سمجھے اور یہ پھبتی کسے کہ قرآن نے حرام کھانے پینے اور کلمۂ کفر کہنے کی اجازت دی ہے تو اسے خباثتِ نفس اور فکری ضلالت کے سوا اور کیا نام دیا

جاسکتا ہے۔ انہی قرآنی اصولوں سے استفادہ کرتے ہوئے فقہاء امت نے کتبِ فقہ میں ''تداوی بالحرام'' (یعنی حرام چیز سے علاج کرنے) کے عنوانات قائم کئے ہیں اور اپنی مجتہدانہ بصیرت سے ان کے احکام بیان کئے ہیں۔ اسی عنوان کے تحت علامہ ابنِ عابدین شامی نے اپنی کتاب ''ردالمحتار'' میں طویل فقہی بحث کی ہے اور وہ عبارت نقل کی ہے جس کا حوالہ دے کر مستفتی نے سوال دریافت کیا ہے۔ چنانچہ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ فتاویٰ رضویہ ج ۱۰، ص ۱۱۲ پر ایسے ہی ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فتاویٰ قاضی خان کی عبارت ذیل نقل کرتے ہیں:

الذی رعف فلا یرقأ دمه فاراد ان یکتب بدمه علیٰ جبهته شیئا من القرآن قال ابوبکر الاسکاف رحمه اللّٰه تعالیٰ یجوز، قیل لو کتب بالبول قال لو کان فیه شفاء لاباس به، قیل لو کتب علیٰ جلد میتة قال ان کان فیه شفاء جاز و عن ابی نصر بن سلام رحمه اللّٰه تعالیٰ معنی قوله علیه الصلوٰة والسلام: ان اللّٰه لم یجعل شفاء کم فی ماحرم علیکم، انما قال ذالک فی الاشیاء التی لایکون فیه شفاء و اما اذا کان فیها شفاء فلا بأس به، قال الا تری ان العطشان یحل له شرب الخمر حالة الاضطرار۔

''کسی کی نکسیر پھوٹ گئی اور اس کا خون کسی طور پر نہیں رکتا، تو اس نے ارادہ کیا کہ (علاج کی غرض سے) اپنے خون سے اپنی پیشانی پر قرآن کے کوئی کلمات لکھے، (تو کیا یہ جائز ہے؟) ابوبکر اسکاف نے کہا: جائز ہے، سائل نے پوچھا: اگر پیشاب سے لکھے؟ تو انہوں نے فرمایا: اگر اس میں شفاء کا علم (یقینی) ہے تو کوئی حرج نہیں، سائل نے پوچھا: اگر مردار کی کھال پر لکھے تو؟ انہوں نے فرمایا: اگر اس میں شفاء ہے تو جائز ہے، اور ابونصر بن سلام کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد ''کہ اللہ نے تمہارے لئے حرام چیزوں میں شفاء نہیں رکھی'' ان چیزوں کے بارے میں فرمایا، جن میں شفاء نہیں ہے اور جن محرمات میں شفاء ہے تو ان کے (بقدرِ ضرورت) استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے، انہوں نے فرمایا: تم غور نہیں کرتے کہ (ازروئے قرآن) حالتِ اضطرار میں پیاسے کے لئے (جان بچانے کی حد تک) شراب پینا جائز ہے''۔

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ بحث ''تداوی بالحرام'' (یعنی حرام اشیاء سے علاج) کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں ہے، اور آج کل تو تقریباً ہومیو پیتھک کی تمام دواؤں، ایلو پیتھک کی بیشتر دواؤں بالخصوص مُسکّن دواؤں میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے، نیز یہ کہ ''تعویذ'' اور آیات قرآنیہ وکلماتِ طیبات کا دم بھی بعض جسمانی وروحانی امراض کے من جملہ اسبابِ شفاء میں سے ایک ہے اور احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے۔

امام احمد رضا قادری فتاویٰ قاضی خان کی مُحوّلہ بالا عبارت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فقیہ موصوف کا حکم تین شرطوں کے ساتھ مشروط ہے: اول یہ کہ جان جانے کا خوف ہو، جس کی طرف ''حالتِ اضطرار'' کے کلمات سے اشارہ کیا گیا ہے، کیونکہ خون کے نہ رکنے اور مسلسل جاری رہنے سے موت واقع ہو سکتی ہے، دوم یہ کہ اس تدبیر سے اسے شفاء ہو جانا بھی معلوم ہو، اس کی طرف ''لو کان فیه شفاء'' (یعنی اگر اس میں شفاء ہے) کے الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے، اور ردالمحتار میں ہے: ''قد علم انه لو کتب ینقطع'' یعنی اسے یقین کی حد تک معلوم ہے کہ اگر وہ اپنے خون سے اپنی پیشانی پر فاتحہ لکھے گا تو خون رک جائے گا۔ سوم یہ کہ اس کے سوا کوئی اور تدبیر شفاء اسے معلوم نہ ہو، یہ چیز ردالمحتار کی اس عبارت سے عیاں ہے کہ:

فی النهایة عن الذخیرة یجوز ان علم فیه شفاء ولم یعلم دواء اٰخر۔

''''نہایہ'' میں ''ذخیرہ'' کے حوالے سے منقول ہے کہ یہ تب جائز ہے کہ اس (تدبیرِ علاج) میں شفاء کا علم یقینی ہے اور اس کے متبادل کوئی دوسری دوا اس کے علم میں نہ ہو''۔

ہم نے سطورِ بالا میں امام احمد رضا کی طویل بحث کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

ہم نے کتبِ فقہ وفتاویٰ کی عبارات کا جس قدر مطالعہ کیا ہے، ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ''تداوی بالحرام'' صرف اضطرار کی صورت میں یعنی محض جان بچانے کے لئے جائز ہے، جب کہ فتاویٰ قاضی خان وردالمحتار کی عبارات ان سطور میں آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔ ان کتب میں مثال بھی ایسی ہی دی ہے کہ خون جاری ہو جائے اور کسی طرح رکنے نہ پائے، خواہ یہ کسی بیرونی زخم کے نتیجے میں ہو یا بدن کے اندر کسی داخلی سبب سے ہو۔ جدید میڈیکل سائنس بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ کسی زخمی یا مریض شخص کے بدن سے کثیر مقدار میں خون بہنے سے موت واقع ہو سکتی ہے، جہاں تک روزمرہ عام امراض کا تعلق ہے جن سے جان کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا اور جن کا عام دستیاب ادویہ اور

ذریعوں سے علاج ہوسکتا ہے، ان کے لئے ''تداوی بالحرام'' جائز نہیں ہے، اور کتب فتاویٰ میں عام ممانعت کے احکام انہیں سے متعلق ہیں، چنانچہ درمختار میں ہے:

وظاهر المذهب المنع

''یعنی ظاہر مذہب فقہ حنفی یہ ہے کہ حرام اشیاء سے علاج منع ہے''۔

البحر الرائق میں ہے:

لایجوز التداوی بالمحرم فی ظاهر المذهب

''یعنی مذہبِ حنفی ظاہر الروایہ میں حرام چیز سے علاج کرنا جائز نہیں ہے''۔

درمختار کتاب الحظر والاباحۃ میں ہے:

وجاز الحقنة للتداوی بطاهر لا بنجس وكذا كل تداو لایجوز الا بطاهر۔

''دوا کی غرض سے حقنہ پاک چیز سے جائز ہے، ناپاک سے نہیں، اسی طرح کوئی علاج ناپاک چیز سے جائز نہیں ہے''۔

عالمگیری میں ہے:

تكره ابوال الابل ولحم الفرس للتداوی كذا فی الجامع الصغير

''اونٹ کا پیشاب اور گھوڑے کا گوشت دوا کے لئے بھی منع ہے امام محمد کی ''الجامع الصغیر'' میں یہ مسئلہ ایسا ہی درج ہے''۔

قال له الطبيب الحاذق علتك لا ترتفع الا باكل...... اوالحية اودواء يحل فيه الحية، لايحل اكله۔

''یعنی اگر کوئی ماہر حکیم یہ کہے کہ تیرا مرض ساہی یا سانپ کھانے سے یا ایسی دوا کھانے سے جائے گا جس میں سانپ ملا ہوا ہو، تو اس دوا کا کھانا حلال نہیں ہے''۔

تكره البان الاتان للمرض وغيره وكذلك لحومها وكذلك التداوی حرام۔

''گدھی کا دودھ اور گوشت مرض میں بغرض علاج استعمال کرنا مکروہ تحریمی ہے اور اسی طرح حرام اشیاء سے علاج حرام ہے''۔ (بحوالہ فتاویٰ قاضی خان)

لایجوز ان یداوی بالخمر جرحا او دبردابة ولا ان یسقی ذمیا ولا ان یسقی صبیا للتداوی والوبال علیٰ من سقاه۔

''شراب سے کسی انسانی زخم یا جانور کی زخمی پیٹھ کا علاج جائز نہیں ہے، اور شراب کافر کو بھی پلانا جائز نہیں، اور دوا کے لئے بچے کو بھی پلانا ناجائز ہے، اور بچے کو پلانے کا وبال پلانے والے پر ہوگا''۔

اب موجودہ زمانے میں خون روکنے کے متبادل جدید، مجرب اور انتہائی موثر طُرُقِ علاج موجود، معلوم اور دستیاب ہیں، اس لئے فقہاء کرام کی ان شرائط کے تحت تو اب حالتِ اضطرار میں اس طریقے کو اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں ہے اور وہ فقہاء کرام اس دور میں موجود ہوتے تو خود بھی اپنی شرائط کے تحت اس کے قطعی ناجائز ہونے کا قول کرتے۔ لہٰذا اب کسی شخص کا ان عبارات پر حرف زنی کرنا دیدہ ودانستہ بدنیتی، شرارت وخباثتِ نفس اور سادہ لوح مسلمانوں کو ان جلیل القدر فقہاء سے بدظن کرنا ہے اور یہ ہرگز دین کی خدمت نہیں ہے بلکہ دین کے خلاف فتنہ انگیزی ہے۔

چونکہ اصل بحث لوٹ کر پھر تعویذ کے مسئلے پر آئے گی، اس لئے اب ہم نفسِ مسئلہ پر بھی گفتگو کریں گے اور علامہ ابنِ عابدین شامی کی جو توجیہ امام احمد رضا قادری نے کی ہے، اس سے استفادہ کرتے ہوئے عام قارئین کی سہولتِ فہم کے لئے اس کو سہل انداز میں بیان کریں گے اور آخر میں اس بحث کا تتمہ بیان کریں گے۔

تعویذ لکھتے وقت یہ چیز ملحوظ رکھنی چاہئے کہ پاک چیز سے تعویذ لکھا جائے، کسی ناپاک چیز سے تعویذ لکھنا جائز نہیں ہے، بعض لوگ مرغ کے خون سے تعویذ لکھتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے، ہر جاندار کا ذبح کے وقت بہنے والا خون ناپاک ہے، اور ناپاک چیز کے ساتھ قرآن مجید کی آیات اور اللہ تعالیٰ کے اسماء لکھنا جائز نہیں ہے، یہ مسئلہ مسلّمہ اور متفق علیہ ہے۔ لیکن علامہ ابن عابدین شامی کی مندرجہ بالا عبارت بظاہر اس کے خلاف ہے اور بعض غیر مقلدین اسے پروپیگنڈے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور استعمال کرتے رہتے ہیں، حالانکہ ان کے اکابر علماء سے بھی ایسی باتوں کا صدور ہوا ہے، چنانچہ ''فتاویٰ اہلحدیث'' میں جناب عبداللہ امرتسری روپڑی صاحب ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''قضیب گاؤ'' (یعنی بیل کا آلۂ تناسل) حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے مگر یہ مذہب صحیح نہیں ہے

بلکہ ماکول اللحم (یعنی جن جانوروں کا گوشت حلال ہے) کا گوبر پیشاب تک پاک اور حلال ہے"۔ (فتاویٰ اہلحدیث ج ۲ ص ۵۶۶) اسی فتاویٰ کی جلد اول صفحہ ۲۴۰ پر "منی" کے پاک ہونے کا بھی قول ہے۔

اب اگر کوئی کسی غیر مقلد سے کہے کہ حضور آیئے! ہم آپ کی دعوت کرتے ہیں، بیل کے آلۂ تناسل کے تکے، گائے کے گوبر کے حلوے اور گائے کے پیشاب کے شربت پر مشتمل خصوصی خوانِ نعمت (SPECIAL MENU) آپ کی تواضع کے لئے چنا جائے گا، تو وہ یقیناً اس پر چیں بہ جبیں ہوں گے اور اسے اپنی توہین پر محمول کریں گے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے اکابر نے مسائل کے تتبع میں جو بعض جزئیات، وقوع کے طور پر نہیں بلکہ کہیں امکان اور کہیں فرضِ محال کی تقدیر پر تحریر کردی ہیں، تو انہیں پروپیگنڈے کے لئے استعمال نہ کیا جائے ممکن ہو تو اس کی بہتر تاویل کردی جائے، ورنہ سکوت اختیار کیا جائے، ان باتوں کا ذکر کر کے عامۃ الناس کو دین سے تنفر کرنے کے لئے استعمال نہ کیا جائے، ہر بات کا اپنا محل ہوتا ہے، مخصوص سیاق وسباق ہوتا ہے، تاویلات وتوجیہات ہوتی ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی بڑے عالم یا فقیہ کی کسی بات کی قابل قبول توجیہ وتاویل نہ ہو سکے تو زلّت (غیر ارادی لغزش یا اجتہادی خطاء) تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے، ہم انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے علاوہ کسی اور کی عصمت کے قائل نہیں ہیں۔

اب آیئے! علامہ ابن عابدین شامی کی محولہ عبارت ملاحظہ کریں:

> اختاره صاحب الهداية في التجنيس فقال: لو رعف فكتب الفاتحة بالدم على جبهته وانفه جاز للاستشفاء بالبول ايضا ان علم فيه شفاء لكن لم ينقل و هذا لان الحرمة ساقطة عند الاستشفاء كحل الخمر والميتة للعطشان والجائع آه من البحر۔

"ناپاک چیزوں سے علاج کرنا جائز ہے، صاحب ہدایہ نے "تجنیس" میں یہی اختیار کیا ہے، انہوں نے کہا: اگر کسی آدمی کی نکسیر پھوٹ گئی اور اس نے خون کی ساتھ اپنی ناک اور پیشانی پر سورہ فاتحہ کو لکھ دیا تو یہ طلبِ شفاء کے لئے جائز ہے، اور اگر یقین ہو کہ پیشاب کے ساتھ لکھنے سے شفاء ہوگی تو پیشاب کے ساتھ لکھنا بھی جائز ہے، لیکن یہ منقول نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ طلبِ شفاء کی وجہ سے حرمت ساقط ہو جاتی ہے،

جیسے بھوکے اور پیاسے کے لئے مردار کھانا اور شراب پینا حرام نہیں ہے"۔

(ردالمحتار، ج ا، ص ۲۵ ۳، داراحیاء التراث العربی)

امام احمد رضا قادری اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"اگر اللہ تعالیٰ نظر غائر، دقت شناس نصیب فرمائے تو عندالتحقیق اس کلامِ علماء کا مرجع و مآل صاف ممانعت ہے نہ کہ تجویز و اجازت، کہ وہ شرط فرماتے ہیں کہ جب اس سے شفاء ہو جانا معلوم ہو حالانکہ اس علم کا کوئی ذریعہ نہیں، اگر علم بمعنی یقین لیجئے جب تو ظاہر کہ تعین تو ظاہر و واضح و مجرب و معقول الاثر دواؤں میں بھی نہیں، نہایتِ کار ظن ہے، اسی ردالمحتار میں ہے:

قد علمت ان قول الاطباء لایحصل به العلم

"لیکن آپ کو معلوم ہے کہ قول اطباء سے علم (یقینی) حاصل نہیں ہوتا"۔

اگر ظن کو بھی شامل کیجئے تو یہ غایت درجہ از قبیل رقیہ ہوگا (یعنی دم، تعویذ وغیرہ، راقم) نہ از قبیل معالجاتِ واضحہ طبیہ، اور علماء تصریح فرماتے ہیں کہ ایسے معالجات سے شفاء معلوم ہونا درکنار، مظنون بھی نہیں، صرف موہوم ہے۔

اسی عالمگیری میں فصول عمادی سے ہے:

الاسباب المزیلة للضرر تنقسم الیٰ مقطوع به کالماء للعطش والخبز للجوع، ومظنون کالفصد و الحجامة و شرب المسهل و سائر ابواب الطب یعنی معالجة البرودة بالحرارة والحرارة بالبرودة وهی الاسباب الظاهرة وموهوم کالکی والرقیة۔

"وہ اسباب جو ضرر کو دور کرتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک قطعی (یقینی) جیسے پیاس کے ازالے کے لئے پانی اور بھوک کے ازالے کے لئے روٹی، اور دوسری ظنی، جیسے پچھنا اور سینگی لگانا، دست آور دوا کا پینا اور (اس طرح کے) باقی ابواب طب جیسے ٹھنڈک کا علاج گرمی سے اور گرمی کا علاج ٹھنڈک سے، یہ (سب تو) ظاہری اسباب ہیں اور (کچھ دوسرے) موہوم ہیں، جیسے داغنا اور تعویذ، دم وغیرہ"۔

تو دیکھو علماء نے تصریح فرمائی کہ یہ لکھنا جب جائز ہوگا کہ اس سے شفاء معلوم ہو اور ساتھ یہ بھی تصریح فرمائی کہ اس سے شفاء معلوم نہیں۔ تو کیا حاصل یہ نکلا کہ یہ لکھنا جائز ہے، یا یہ کہ ہرگز

جائز نہیں۔

صحیح حدیث میں ہے حضور اقدس ﷺ سے دربارۂ رمل سوال ہوا، ارشاد فرمایا:

کان نبی من الانبیاء یخط فمن وافق خطه فذاک۔ رواه مسلم فی صحیحه واحمد و ابوداؤد و النسائی عن معاویة بن الحکم رضی الله عنه۔

"ایک نبی خط کھینچا کرتے تھے، تو جن کی لکیریں ان کے خطوط سے مواقف ہوں تو ٹھیک ہے۔"

اب اس حدیث سے ٹھہرا دینا کہ نبی کریم ﷺ نے رمل پھینکنے کی اجازت دی ہے، غلط ہے، حالانکہ حدیث صراحتاً مفید ممانعت ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ نے اس کا جواز موافقت خط انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم سے مشروط فرمایا اور وہ معلوم نہیں، تو جواز بھی نہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کتاب الصلوٰۃ باب تحریم الکلام میں زیرِ حدیثِ مذکور فرماتے ہیں:

معناه من وافق خطه فهو مباح له ولکن لا طریق لنا الی العلم الیقینی بالموافقة فلایباح والمقصود انه حرام، لانه لایباح الابیقین الموافقة و لیس لنا یقین بها

"اس کا معنی یہ ہے کہ جس کا خط اس نبی کے خط کے موافق ہو جائے، وہ مباح ہے، لیکن چونکہ ہمارے پاس اس موافقت کے علمِ یقینی کو حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں، تو رمل جائز نہیں اور مقصود یہ ہے کہ وہ حرام ہے، کیونکہ موافقتِ نبی کے علم یقینی کے بغیر اباحت (جواز) ثابت ہو نہیں سکتی اور علم یقینی ہمارے پاس ہے ہی نہیں"۔

یعنی مقصود تحریم رمل ہے کہ اباحت بشرط موافقت ہے اور وہ نامعلوم تو اباحت (جواز) معدوم۔

علامہ ملا علی القاری شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

حاصله ان فی هذا الزمان حراما لان الموافقة معدومة اوموهومة۔

"یعنی حاصل کلام یہ ہے کہ اس زمانے میں (رمل) حرام ہے کیونکہ (علمِ یقینی نہ ہونے کے سبب) موافقت یا تو بالکل ہی معدوم ہے اور یا اس کا امکان وہم کے درجے میں ہے"۔

اسی مفہوم پر مشتمل اعلیٰ حضرت نے امام ابنِ حجر کا بھی حوالہ دیا ہے۔

(فتاویٰ رضویہ، ج ۱۰، ص ۱۱۳، مکتبہ رضویہ۔کراچی)

امام احمد رضا قادری کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی ''بر تقدیر فرضِ محال'' کسی بات کی کسی شق پر یا کسی مسئلے کے کسی جزئیے کو بیان کر دیا جاتا ہے، یہ اہلِ علم کا ایک طریقہ ہے، یا ''تعلیق بالمحال'' کے طور پر کبھی کسی بات کو محالِ عادی یا محالِ عقلی پر محمول کر کے اس کے عدمِ جواز یا عدمِ امکان کو بیان کر دیا جاتا ہے، اور خود قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں ایسی مثالیں بکثرت ملیں گی۔قرآن نے تو ''تعددِ الٰھۃ'' کے محالِ عقلی ہونے کو بھی اس طرح عقلی انداز میں بیان کیا ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء: ۲۲)

اگر اس زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہوتا تو ان دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا''۔

محض بیانیہ انداز میں نہیں فرمایا کہ شریکِ باری تعالیٰ عقلاً محال ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے ولد کی نسبت کے محال ہونے کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿٨١﴾ (الزخرف: ۸۱)

''(اے حبیب!) آپ کہہ دیجئے کہ اگر (بفرضِ محال) ذاتِ رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے میں (اس کی) عبادت کرتا''۔

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی زبانی (معاذ اللہ!) اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ہونے کے امکان کو بیان نہیں کیا بلکہ اس کے محال ہونے کو بیان کیا ہے۔

اسی طرح علامہ ابنِ عابدین شامی نے بھی (معاذ اللہ!) پیشاب یا خون سے آیتِ قرآن لکھنے کے عدمِ جواز کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ کسی کے پاس بھی علمِ یقینی نہیں ہے کہ اس سے شفاء نصیب ہو جائے گی، لہٰذا یہ علی الاطلاق ناجائز ہے۔

اس کے باوجود ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ کاش ہمارے اَجلّہ فقہاء کرام اور علامہ ابنِ عابدین شامی ''علاج بالحرام'' کا مسئلہ بیان کرنے کے لئے دیگر مثالوں کے ذکر پر ہی اکتفاء کر لیتے اور اس میں خون وغیرہ سے فاتحہ لکھنے کا ذکر ہی نہ کرتے۔

رہا یہ سوال کہ علامہ شامی کا حکم کیا ہے؟ تو وہ ہمارے مقتدا ہیں، پیشوا ہیں، امتِ مسلمہ اور فقہاء

امت آج بھی ان کے خوشہ چین ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ہم نے امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ان کی زیرِ بحث عبارت کی توجیہات وتاویلات درج کردی ہیں، وہ اس کا کافی وشافی جواب ہے۔تاہم اگر کسی عظیم فقیہ سے خطاء اجتہادی بھی سرزد ہوجائے تو اس سے اس کے ایمان، تقویٰ اور جلالتِ علمی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔اس سلسلے میں علامہ غلام رسول سعیدی کے یہ الفاظ ہم سب کی عقیدت کے ترجمان ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ خون یا پیشاب کے ساتھ فاتحہ لکھنے والے کا ایمان خطرے میں ہے، اگر (بفرضِ محال) کسی آدمی کو روزِ روشن سے زیادہ یقین ہو کہ اس عمل سے اس کو شفاء مل جائے گی، تب بھی اس کا مرجانا اس سے بہتر ہے کہ وہ خون یا پیشاب کے ساتھ سورہ فاتحہ لکھنے کی جرأت کرے، اللہ تعالیٰ ان فقہاء کو معاف فرمائے، بال کی کھال نکالنے اور جزئیات مستنبط کرنے کی عادت کی وجہ سے ان سے یہ ناپسندیدہ قول سرزد ہوگیا، ورنہ ان کے دلوں میں قرآن مجید کی عزت وحرمت بہت زیادہ تھی، ان کی تو ساری زندگی قرآن وحدیث کو سمجھنے سمجھانے اور ان کی ناموس کے تحفظ میں

گزری ہے، (شرح صحیح مسلم، ج ۶،ص ۷۵۵)فقط واللہ تعالیٰ ورسولہ اعلم بالصواب۔

رجب کے کونڈے

سوال: کیا رجب کے کونڈے جائز ہیں؟ بعض لوگ بڑے التزام کے ساتھ ان کا اہتمام کرتے ہیں؟ (منور احمد۔ملیر، کراچی)

جواب: فی نفسہٖ فاتحہ اور ایصالِ ثواب کسی بھی بزرگ شخصیت کے لئے یا عام مسلمانوں کے لئے (خواہ مرد ہو یا عورت، زندہ ہوں یا وفات پاچکے ہوں) ہر وقت اور ہر جگہ جائز ہے، سوائے اس کے کہ کسی اور وجہ سے اس کی شرعی ممانعت نہ ہو، مثلاً مکروہ اوقات میں ایصالِ ثواب کے لئے نوافل پڑھنا یا عیدین کے ایام میں ایصالِ ثواب کی نیت سے روزے رکھنا وغیرہ، عام طور پر کونڈوں کی فاتحہ امام جعفر صادق کے نام پر دی جاتی ہے اور یہ ۲۲رجب المرجب کو دی جاتی ہے۔اگرچہ ۲۲رجب نہ تو امام جعفر صادق کی تاریخِ ولادت ہے اور نہ ہی تاریخِ وفات، لیکن تاریخِ ولادت ووصال کے علاوہ بھی ایصالِ ثواب کے لئے فاتحہ دی جاسکتی ہے۔ ہاں البتہ اگر

عقیدہ یہ ہو کہ:

(۱) ۲۲؍رجب سے پہلے یا بعد میں یہ فاتحہ نہیں دی جاسکتی بس اسی دن اور تاریخ میں اہتمام لازمی ہے۔

(۲) ایک خاص مقام پر کونڈے یا کھانا رکھ کر فاتحہ دی جاسکتی ہے۔ دوسری جگہ پر نہیں یا خاص کونڈوں کے علاوہ کسی اور حلال چیز پر فاتحہ نہیں دی جاسکتی، تو ایسا تعین دلیلِ شرعی کے بغیر ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ تعینِ شرعی جس میں کسی خاص وقت، دن، تاریخ، جگہ اور چیز کے التزام پر حصولِ اجر وثواب کو موقوف قرار دیا جائے، صرف شارع کا حق ہے۔

باقی امام جعفر صادق اہل بیتِ اطہار سے ہیں، ہمارے مقتدا ہیں اور ان کے ایصالِ ثواب کے لئے بشمول ۲۲؍رجب کسی بھی دن فاتحہ جائز ہے۔ ایک اور مسئلے کی وضاحت بھی ضروری ہے وہ یہ کہ تعینِ شرعی کے بغیر سہولت کے لئے فاتحہ کا دن مقرر کرنا اسی طرح جائز ہے جیسے ہم اپنی دنیوی اور سماجی تقریبات کے لئے ایام کا تعین کرتے ہیں۔ جیسے شادی' نکاح' ولیمہ وغیرہ، اسی طرح بزرگانِ دین کے ایامِ وصال کو اعراس اور ایصالِ ثواب کے لئے مقرر کردیتے ہیں تاکہ سب لوگوں کو علم ہوجائے۔ دینی کاموں میں ختم قرآن اور دینی مدارس کے دستارِ فضیلت اور تقسیمِ اسناد کے جلسے وغیرہ ہیں۔ امام احمد رضا خان قادری نے اپنے رسالہ اتیان الارواح میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دیگر حوالہ جات کے ساتھ لکھا ہے کہ اموات کی ارواح ہر شب جمعہ و روزِ عید و عاشورہ و شب برات کے مواقع پر اپنے مکانات پر آتی ہیں اور غمگین آواز میں صدا دیتی ہیں کہ اے میرے آل و اولاد اور قرابتدارو! میرے ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ دے کر مجھ پر مہربانی کرو۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۴ ص ۲۳۱)۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ ان میں بعض روایات ضعیف ہیں لیکن سب ضعیف نہیں ہے۔

نوٹ: امام جعفر صادق کی تاریخ وصال کی بابت مشہور قول یہ ہے کہ ماہ شوال میں ہے اور ایک قول کی رو سے ۱۵؍رجب ہے۔ (بحوالہ جلاء العیون ملا باقر مجلسی)

اجتماعی قرآن خوانی

سوال: ایک اخبار میں سائل نے مفتی صاحب سے سوال پوچھا کہ: ''لوگوں کو باقاعدہ دعوت

دے کر اجتماعی قرآن خوانی کرنا کیسا ہے؟'' مفتی صاحب نے جواب لکھا کہ'' ایصالِ ثواب کی غرض سے دعوت دے کر لوگوں کو جمع کر کے قرآن خوانی کرانا درست نہیں۔'' ہمارے معاشرے اور خاص طور پر کراچی شہر میں یہ عام معمول ہے کہ اجتماعی قرآن خوانی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ حصولِ ثواب وخیر وبرکت کے لئے بھی، ایصالِ ثواب کے لئے بھی۔ تواب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عامۃ المسلمین کا یہ طرزِ عمل شرعاً جائز اور درست ہے؟ جیسا کہ عامۃ المسلمین ایسا سمجھ کر کرتے ہیں، یا درست نہیں، جیسا کہ مفتی صاحب نے لکھا ہے۔ ازراہِ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں تا کہ لوگوں کا اضطراب دور ہو اور ان کی تشفی ہو سکے؟

(سید نذیر احمد شاہ (خطیب جامع مسجد ابوبکر) میٹروول III گلشن اقبال، کراچی)

جواب: ایصالِ ثواب، حصولِ ثواب اور خیر وبرکت کے لئے اجتماعی طور پر قرآن خوانی کرنا، دعا کا اہتمام کرنا شرعاً درست ہے۔ کارِ خیر کے لئے لوگوں کو دعوت دینا باعثِ سعادت اور موجبِ خیر وبرکت ہے۔ تبلیغی اجتماعات، میلاد النبی ﷺ کے اجتماعات، ختمِ قرآن، افتتاحِ درسِ حدیث اور ختمِ بخاری کے اجتماعات جو تمام مکاتبِ فکر کے لوگ باقاعدہ دعوت دے کر منعقد کرتے ہیں، اس کے لئے اشتہارات چھاپے جاتے ہیں اور اخبارات میں اعلانات شائع ہوتے ہیں، یہ سب اور قرآن خوانی یا درسِ قرآن کے لئے اجتماع بالکل جائز اور درست ہے۔ ان امورِ خیر کے لئے دن، مقام اور وقت کا تعین سہولت کی غرض سے ہوتا ہے۔ یہ تعینِ عرفی ہے، تعین شرعی نہیں ہے۔ تعین شرعی سے مراد یہ ہے کہ کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اس خاص وقت، مقام، دن اور تاریخ کو یہ کام کرنا باعثِ اجر وثواب ہے اور اس سے قبل یا بعد یا دوسرے وقت اور مقام پر ایسا کرنا باعثِ اجر نہیں ہے۔ یہ تعینِ شرعی ہے اور ایسی تعین صرف شارع کا اختیار ہے جیسے وقوفِ عرفہ کے لئے ۹ ذوالحجہ، ایامِ نحر یا ایامِ عید وغیرہ۔

اب چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سہولت کے لئے دینی اجتماعات منعقد ہو سکتے ہیں خواہ یہ دعوتِ اجتماع تبلیغ کے لئے ہو یا قرآن خوانی کے لئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ وعظ ونصیحت کے ایام مقرر کرنے میں ہمارا خیال رکھا کرتے تھے کیونکہ جو چیز ہمارے لئے تنگی کا باعث ہو، وہ آپ ﷺ کو پسند نہیں تھی۔ (صحیح بخاری، ج ۱ ص ۱۶)

حضرت ابووائل کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کو ہمیں وعظ فرمایا کرتے تھے تو ایک شخص نے ان سے عرض کیا: اے ابوعبدالرحمٰن! میری خواہش ہے کہ آپ ہمیں روزانہ وعظ فرماتے انہوں نے جواباً فرمایا: ''میرے لئے تمہاری اس خواہش کی تکمیل وتعمیل سے یہ امر مانع ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ (روزانہ مجالسِ وعظ منعقد کرکے) تمہارے اکتاہٹ اور طبیعت کے اچاٹ ہونے کا سبب بنوں۔ میں وعظ ونصیحت کے معاملے میں تمہارا اسی طرح خیال رکھتا ہوں (اور اعتدال سے کام لیتا ہوں)، جس طرح نبی کریم ﷺ ہمارا خیال رکھا کرتے تھے، تا کہ ہمارے لئے تنگی کا باعث نہ بنے۔ (صحیح بخاری ج ا ص ۱۶)

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مجالسِ وعظ وتذکیر ہوں یا مجالسِ قرآن خوانی ان کے انعقاد میں عام لوگوں کی طبائع، احوال اور مصروفیات ومشاغل کا لحاظ رکھنا چاہئے تا کہ لوگوں پر بار نہ رہے اور ان کی طبیعتوں میں کارِ خیر سے اکتاہٹ، تنگی اور بےزاری پیدا نہ ہو۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خواتین نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ مرد حضرات نے آپ سے فیض پانے میں ہم پر غلبہ حاصل کرلیا ہے، لہٰذا آپ ازراہِ کرم ہمارے لئے ایک خاص دن مقرر فرمادیجئے (جس میں مرد نہ ہوں اور ہم آپ سے فیض حاصل کریں)، آپ ﷺ نے ان سے ایک دن مقرر کرنے کا وعدہ فرمالیا، اس دن آپ ان (خواتین صحابیات) کو وعظ فرماتے اور احکام شرعی بیان فرماتے، انہی وعظ کے دوران آپ نے ان سے فرمایا: ''جس خاتون کے تین بچے اس سے پہلے (یعنی بچپن میں) وفات پاگئے تو وہ اس کے لئے نارِ جہنم سے نجات کا وسیلہ بن جائیں گے۔ ایک صحابیہ نے عرض کیا (یارسول اللہ ﷺ) اگر کسی کے دو بچے وفات پاگئے ہوں، آپ نے فرمایا (ہاں) دو بچے بھی نارِ جہنم سے نجات کا وسیلہ بن جائیں گے (یعنی اگر مائیں اپنے ان بچوں کی وفات کے غم اور صدمہ فراق کو صبر وشکر سے برداشت کرلیں)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مجلس وعظ ہو یا قرآن خوانی کا اجتماع، شرکاء سامعین کی سہولت کے لئے دعوت دینا اور اس کے لئے اجتماعی اہتمام کرنا جائز اور کارِ ثواب ہے۔

قبر بیٹھ جائے تو کیا کریں؟

سوال: بعض اوقات زمین نرم ہونے کی وجہ سے، بارش کا پانی جذب ہوجانے کی وجہ سے یا کسی

بھی سبب سے قبر بیٹھ جاتی ہے، ایسی صورتحال میں کیا کیا جائے، میت کو نکال کر دوسری جگہ دفن کریں یا اگر مٹی ڈال دیں تو قبر کا نشان تک باقی نہیں رہتا، (عبداللہ خان۔ کورنگی، کراچی)

جواب: میت کی تدفین کے بعد قبر کھودنے کو فقہاء احناف نے ممنوع و حرام قرار دیا ہے، چند فقہی حوالے ملاحظہ فرمائیے: تدفین کے بعد میت کو قبر سے نکالنا نہیں چاہیے، ہاں اگر زمین غصب شدہ ہے یا اسے کسی نے شفعہ کر کے حاصل کر لیا ہے تو مالک زمین کے مطالبے پر میت کو وہاں سے منتقل کرنا جائز ہوگا، (فتاویٰ عالمگیری ج ا ص ١٦٧)

میت کو دفن کرنے سے پہلے (جہاں چاہیں) منتقل کر سکتے ہیں، لیکن اسے دفن کرنے کے بعد مطلقاً منتقل کرنے کی اجازت نہیں ہے، (فتاویٰ شامی ج ٣ ص ١٣٧، داراحیاء التراث العربی بیروت)

علامہ حسن بن عمار شرنبلالی لکھتے ہیں: ''اور میت کو دفن کرنے کے بعد منتقل کرنا جائز نہیں ہے، سوائے اس صورت کے کہ دوسرے کی غصب شدہ زمین میں دفن ہو (اور وہ اپنی زمین کو خالی کرنے کا مطالبہ کرے)''۔

اس کی شرح میں علامہ طحطاوی لکھتے ہیں: ''مضمرات میں ہے کہ دفن کرنے کے بعد میت کے منتقل کرنے کی تین صورتیں ہیں: ایک صورت میں بالاتفاق منتقل کرنا جائز ہے اور وہ یہ کہ میت کو غصب شدہ زمین میں دفن کر دیا گیا ہو اور زمین کا مالک اپنی زمین کے انخلاء کا مطالبہ کرے یا غصب شدہ کپڑے کا کفن میت کو پہنا دیا گیا ہو اور مالک کپڑے کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ دوسری صورت میں بالاتفاق ناجائز ہے، مثلاً یہ کہ ماں کہے مجھے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھنا ہے، لہٰذا قبر کو کھود دو یا اسے یہاں سے نکال کر فلاں قبرستان میں دفن کرو۔ تیسری صورت یہ ہے کہ قبر میں پانی داخل ہو جائے ایک قول کی رو سے اس صورت میں میت کا منتقل کرنا جائز ہے، کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ صالح بن عبیداللہ کو تین بار کسی نے خواب میں دیکھا، وہ کہہ رہے تھے، مجھے میری قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن کرو، مجھے پانی آنے سے تکلیف ہو رہی ہے، پھر قبر کو کھود کر دیکھا گیا تو ان کے ایک پہلو کو پانی پہنچ چکا تھا، اس پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کی قبر کو منتقل کرنے کا فتویٰ دیا۔ فقیہ ابوجعفر کہتے ہیں کہ ایسی صورتحال میں قبر کو منتقل کرنا جائز ہے، لیکن پھر انہوں نے اپنی اس رائے سے رجوع کر لیا اور قبر کی منتقلی سے وہ منع کرتے تھے، (طحطاوی علی مراقی الفلاح ص ٦١٥، مکتبہ عباس احمد الباز، مکہ مکرمہ)۔

علامہ کاسانی حنفی بدائع الصنائع ج ۲ ص ۳۵۷ میں لکھتے ہیں: ''قبر کا کھودنا حرام ہے۔''
علامہ زین الدین ابن نجیم نے البحرالرائق (ج ۲ ص ۱۹۵ مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ) میں اس قول کو نقل کیا ہے جو ان کی تائید کی دلیل ہے۔ لہٰذا ائمہ کرام کے ان اقوال کی روشنی میں نہ تو تدفین کے بعد قبر کو کھودنا جائز ہے اور نہ ہی میت کو قبر سے منتقل کرنا۔ ہاں اگر خدانخواستہ کسی کی قبر بیٹھ جائے تو قبر کو کھولے بغیر باہر اور اطراف سے اسے ٹھیک کر کے بنا دیں۔ میت عالم برزخ میں، جس حال میں بھی ہے یا اس پر جو بھی تغیرات رونما ہوئے ہیں، اس کے حال پر پردہ پڑا رہے گا، یہ بات بھی جواز کی حد تک ہے، ایسا کرنا ضروری بھی نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۷ پر ہے: ''میت بوسیدہ ہو کر مٹی بن گئی ہو تو دوسری میت کو اس کی قبر میں دفن کرنا جائز ہے، اسی طرح اس جگہ پر کاشت کرنا اور اس پر تعمیر بھی جائز ہے، تبیین الحقائق میں اسی طرح ہے۔'' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عامۃ المسلمین کی قبور یا ان کے آثار اور نشاناتِ قبر کو ہر حال میں باقی رکھنا شریعت کی رو سے ضروری نہیں ہے۔

غیر آلِ ابوبکر صدیق کا اپنے نام کے ساتھ صدیقی لکھنا

سوال: ایک شخص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد یعنی سلسلۂ نسب میں سے نہیں ہے اور وہ اپنے نام کے ساتھ ''صدیقی'' لکھتا ہے، کیا اس کا یہ عمل شرعاً درست ہے؟

(محمد الیاس۔ گرین ٹاؤن، کراچی)

جواب: لفظ ''صدیقی'' میں ''ی'' نسبت کی ہے یعنی اس کے معنی ہیں ''ایسا شخص جو صدیق کی طرف منسوب ہے'' اور یوں تو لغتِ عرب میں ''صدیق'' کے معنی ہیں ''نہایت سچا'' لیکن ''صدیق'' حضرت ابوبکر بن عثمان رضی اللہ عنہما کا لقب بھی تھا جو بارگاہِ رسالت سے انہیں عطا ہوا تھا اور یہ بات حدِ شہرت و تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ عرفِ عام میں ''آلِ ابی بکر'' کو ''صدیقی'' کہا جاتا ہے یا وہ اپنے آپ کو ''صدیقی'' کہتے اور کہلاتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ بر بنائے محبت بھی ''یائے نسبتی'' لگا کر اپنے آپ کو کسی بزرگ شخصیت یا سلسلے کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، جیسے قادری، چشتی، نقشبندی وغیرہ یا پاکستان میں قادیانی اپنے آپ کو ''احمدی'' کہلاتے ہیں۔ اسی طرح ایران میں ''بہائی'' ہیں۔ کوئی ایسا شخص جو ''آلِ ابی بکر'' میں سے نہیں ہے اگر یہ تاثر دینے کے لئے یا اس

ادعاء کی بناپراپنے آپ کو''صدیقی'' لکھتا ہے کہ لوگ اسے ''آلِ ابی بکر'' میں سے سمجھیں اور اس نسبت کی بناپراس کی تکریم کریں تو یہ مکروہِ تحریمی ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''جس شخص نے قصداً اپنا سلسلۂ نسب اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا تو اس پر جنت حرام ہے۔''(صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۴۳۲۷، سننِ ابی داوٗد، رقم الحدیث: ۵۱۱۳، سننِ ابنِ ماجہ، رقم الحدیث: ۲۶۱۰، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۶۵)

یہ بڑی وعید ہے، محض دنیوی تکریم واعزاز کے لالچ میں اپنی نسبت میں ردوبدل کرنے والوں کو آخرت کے عذاب اور جنت سے محرومی کی وعید سے ہزار بار ڈرنا چاہئے۔البتہ اگرکوئی شخص محض اظہارِ محبت کے لئے اپنے آپ کوصدیقی لکھتایا کہلاتا ہےاور''نسبِ ابی بکر'' کی طرف نسبت کا ادعانہیں کرتا تو یہ جائز ہے،لیکن بہتر یہ ہے کہ پھروہ اپنے صحیح نسب کے اظہار کے لئے کوئی اورنسبت بھی لگالے یااپنے حلقہ ٔاثراور حلقہ ٔاحباب میں وقتاًفوقتاًاپنے صحیح نسب کا ذکرکردیا کرے تاکہ لوگ اوران کے ملنے جلنے والے انہیں''آلِ ابی بکر''میں سے نہ سمجھیں۔

جس کا کوئی پیر نہ ہو، کیا اس کا پیر شیطان ہوتا ہے؟

سوال: ایک مولانا صاحب کا کہنا ہے:''جس کا کوئی پیرنہیں ہوتا،اس کا پیرشیطان ہوتا ہے۔'' اس قول کے بارے میں آپ کی کیارائے ہے۔(عبداللہ......دستگیرکالونی،کراچی)

جواب: اعلیٰ حضرت امام احمدرضا قادری سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص پیر ماننے کولازمی قرار دیتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ:

مَنْ لاشیخ له فی الدنیا فشیخه الشیطان فی الآخرة۔

''جس شخص کا دنیامیں کوئی شیخ نہیں ہے،اس کا آخرت میں شیطان شیخ ہوگا''۔

یعنی(معاذاللہ!)اس کاحشرگروہِ شیطان میں ہوگا۔وہ یہ حدیث بھی بیان کرتا ہے کہ:

الشیخ فی قومه کالنبی فی الامة۔

''یعنی شیخ(پیر)کااپنی قوم میں وہی مقام ہے جونبی کاامت میں ہوتا ہے''۔

اس کے برعکس دوسراشخص کہتا ہے کہ میں کسی شخص سے بیعت نہیں ہوں اورنماز پڑھتا ہوں، روزہ رکھتاہوں، احکامِ شرعِ شریف اورکلام مجید کواور جوعلماءِدین فرماتے ہیں برحق جانتاہوں،

لیکن کسی پیر فقیر کا مرید نہیں ہوں اور نہ مرید ہونے کو برا کہتا ہوں، تو کیا اس شخص کی کوئی عبادت بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں ہے، مرید نہ ہونے کی بنا پر ساری عبادت اکارت گئی اور اس کا حشر کیا شیطان کے ساتھ ہوگا، وغیرہ۔"

نوٹ: یہ سوال کتاب "بیعت وخلافت" تصنیف امام احمد رضا قادری مطبوعہ مکتبہ مہریہ رضویہ ڈسکہ صفحات ۲۷۔۲۶ پر درج ہے، سوال کافی طویل ہے، یہاں خلاصہ درج کیا گیا ہے۔

اسی طرح "فتاویٰ افریقہ" تصنیف امام احمد رضا قادری صفحہ نمبر ۱۳۸ پر دو سوالات (۸۳، ۸۴) کو یکجا کر کے یوں درج کیا گیا ہے:

"اگر زید کا پیر و مرشد نہ ہو تو وہ فلاح پائے گا یا نہیں اور اس کا پیر و مرشد شیطان ہوگا یا نہیں، کیونکہ تمہارا رب عزوجل حکم فرماتا ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (المائدہ:۳۵)

اے مومنو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔"

ان سوالات کا جواب جو امام احمد رضا قادری نے دیا ہے، اس کا خلاصہ اور ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں، وہ مرشد کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں، ایک مرشدِ عام اور دوسرا مرشدِ خاص، وہ لکھتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ اپنی تصنیف "عوارف المعارف" میں فرماتے ہیں: میں نے اکثر مشائخ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "جس نے کسی فلاح یافتہ شخص کی زیارت نہ کی، وہ فلاح نہیں پائے گا۔" اسی طرح عوارف المعارف میں حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: "جس کا کوئی پیر نہیں اس کا امام شیطان ہے۔"، امام ابوالقاسم قشیری نے بھی اپنی کتاب میں حضرت بایزید بسطامی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ الغرض یہ حدیث نہیں ہے بلکہ بزرگانِ دین کے اقوال ہیں اور یہ اقوال جن میں بظاہر مرشد سے وابستگی ضروری ہے اس سے "مرشدِ عام" مراد ہے اور اس کی وضاحت وہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"عام ہادی کلام اللہ و کلام ائمہ شریعت و طریقت، کلام علماء اہلِ ظاہر و باطن ہے، اسی سلسلہ صحیحہ پر کہ عوام کا ہادی کلام علماء، علماء کا رہنما کلامِ ائمہ، ائمہ کا مرشد کلام رسول، رسول کا پیشوا کلام اللہ (بیعت وخلافت صفحہ ۲۷)۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''سنی صحیح العقیدہ کہ ائمہ ہدیٰ کو مانتا، تقلیدِ ائمہ ضروری جانتا، اولیائے کرام کا سچا معتقد، تمام عقائد میں راہِ حق پر مستقیم، وہ ہرگز بے پیر نہیں، وہ چاروں مرشدان پاک یعنی کلامِ خدا و رسول و ائمہ و علماء ظاہر و باطن اس کے پیر ہیں، بلکہ اگر اسی حالت پر ہے تو مثل اور لاکھوں مسلمانانِ اہلسنت کے اس کا ہاتھ شریعت مطہرہ کے ہاتھ میں ہے، اگرچہ بظاہر کسی خاص بندۂ خدا کے دست مبارک پر شرف بیعت سے مشرف نہ ہوا''۔

چند سطور کے بعد مزید لکھتے ہیں:

''ہزاروں علما و صلحا گزرے کہ بظاہر اس خاص طریقۂ بیعت میں ان کا انسلاک (منسلک ہونا، وابستہ ہونا) ثابت نہیں کیا، کیا معاذ اللہ! انہیں ان سخت احکام کا مصداق کہا جاسکتا ہے؟ اور جو منسلک بھی ہوئے، کیا سب ہوش سنبھالتے ہی منسلک ہو گئے تھے، حاشا بلکہ بہت اس وقت جب کہ علم ظاہر میں پایۂ عالیہ امامت تک پہنچ چکے تھے، کیا اس وقت تک عیاذاً باللہ ان احکام کے مستحق تھے؟ یہ جہالتِ فاضحہ (رسوا کن) بلکہ ضلالتِ واضحہ ہے، والعیاذ باللہ تعالیٰ''۔ (بیعت وخلافت صفحہ ۲۹)

فتاویٰ افریقہ صفحہ نمبر ۱۳۹ پر لکھتے ہیں:

''فاقول و باللہ التوفیق، فلاح دو قسم ہے، اول انجام کار رستگاری (نجات)، اگرچہ معاذ اللہ! سبقتِ عذاب کے بعد ہو (یعنی ممکن ہے کچھ گناہوں کی سزا پانے کے بعد جہنم سے رہائی ملے)، یہ عقیدہ اہل سنت میں ہر مسلمان کے لیے لازم اور کسی بیعت و مریدی پر موقوف نہیں، اس کے واسطے صرف نبی کو مرشد بس ہے، بلکہ ابتداء اسلام میں کسی دور دراز پہاڑ یا گمنام ٹاپو کے رہنے والے غافل جن کو نبوت کی خبر ہی نہ پہنچی اور دنیا سے صرف توحید پر گئے بالآخر ان کے لیے بھی یہ فلاح ثابت، ...... (اس کے بعد انہوں نے شفاعتِ کبریٰ اور شفاعتِ کاملہ وکلی والی احادیث و روایات درج کی ہیں جن کی رو سے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے طفیل ہر مومن جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا بلکہ ہر موحد آخرکار جنت میں جائے گا)۔ الغرض اولیاء کرام اور بزرگانِ دین کے قول کہ ''جس کا کوئی پیر نہ ہو اس کا پیر شیطان ہے'' کو اس معنی میں لینا، کہ معروف معنوں میں ہر مسلمان کے لیے کسی پیر کے ہاتھ پر بیعت کرنا لازم اور واجب ہے اور اس کے بغیر فلاحِ دینوی و نجاتِ اخروی ممکن ہی نہیں

ہے، بالکل غلط توجیہ وتاویل ہے، اوراس توجیہ کوامام احمد رضا قادری نے جہالت وضلالت سے تعبیر کیا ہے، اورایسی سوچ اورفکر سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔

امام احمد رضا قادری سے سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا کہ: ''شیخ اپنی قوم میں ایسا ہے جیسا کہ نبی اپنی امت میں'' اس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ ابن حبان نے کتاب الضعفاء اور دیلمی نے مسند الفردوس (جلد ۲، صفحہ نمبر ۳۷۷) میں حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا، اگرچہ امام ابن حجر عسقلانی اوران سے پہلے ابن تیمیہ نے اسے موضوع اورامام سخاوی نے باطل کہا ہے، (ابن حبان میں کتاب الضعفاء میں اسے موضوع کہا ہے اورابن جوزی نے اپنی موضوعات میں باطل کہا ہے۔ راقم) لیکن امام احمد رضا قادری علامہ سیوطی کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مگر صحیح امام جلیل جلال سیوطی سے ظاہر کہ وہ صرف ضعیف ہے، نہ باطل وموضوع نہیں، انہوں نے یہ حدیث دووجہ سے جامع صغیر میں روایت کی۔

حیث قال الشیخ فی اھلہ کالنبی فی امتہ الخلیل فی مشیختہ و ابن النجار عن ابی رافع الشیخ فی بیتہ کالنبی فی قومہ حب (ای ابن حبان) فی الضعفاء و الشیرازی فی الالقاب عن ابن عمر۔

''جیسے فرمایا کہ شیخ اپنے اہل یعنی اپنی قوم میں ایسے ہے جیسا کہ نبی اپنی امت میں، اورابن النجار نے ابورافع سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ شیخ اپنے گھر میں ایسے ہے جیسے نبی اپنی قوم میں، اسے ابن حبان نے الضعفاء میں اورشیرازی نے الالقاب میں ابن عمر سے روایت کیا ہے''۔

اورخطبۂ کتاب میں وعدہ فرمایا ہے کہ اس حدیث میں کوئی موضوع نہیں لاؤں گا۔

(بیعت وخلافت صفحہ ۳۰)

آگے چل کر لکھتے ہیں: ''مگر اس سے اس قدر ثابت کہ ہادیانِ راہِ خدا کی اطاعت لازم ہے، اس میں کلام ہے، اس کے لیے خود آیت کریمہ کافی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اے ایمان والو!'' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی اوران کی جو تم

میں سے صاحب امر ہیں''۔(النساء:۵۹)

قولِ اصح وارجح پر''اولی الامر'' سے مراد علماءِ دین ہیں کہ علماءِ شریعت وطریقت دونوں کو شامل ہے،اس سے زیادہ اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نے بیعت ظاہری کسی کے ہاتھ پر نہ کی، وہ گمراہ ہے،ہرگز مفادِ حدیث نہیں ہے،یہ افتراء وتہمت یا جہل وسفاہت ہے،والعیاذ باللہ تعالیٰ۔
(خلافت وبیعت صفحہ نمبر ۳۰)

اس کے علاوہ معروف معنوں میں بیعت کی برکات کیا ہیں؟،فلاحِ ظاہری و باطنی سے کیا مراد ہے،بیعت کی اقسام کیا ہیں،شیخ طریقت کن اوصاف کا حامل ہونا چاہئے،فلاح کی اقسام وغیرہ،اس موضوع پر امام احمد رضا قادری نے فتاویٰ افریقہ میں صفحات ۱۳۸ تا ۱۶۰ پر تفصیل سے بحث کی ہے،اہلِ ذوق اس کا مطالعہ فرمائیں۔

قرآن مجید کی تلاوت کے آداب

سوال: قرآن مجید کی تلاوت کے آداب کیا ہیں؟ آیا بے وضو یا حالت جنابت میں قرآن مجید پڑھ سکتے ہیں،یا بے وضو قرآن مجید کا چھونا جائز ہے۔(زاہد اللہ......مانسہرہ)

جواب: قرآن مجید کی تلاوت کسی پاک جگہ پر باوضو اور قبلہ رو بیٹھ کر کرنا مستحب ہے،اگر کسی نے سگریٹ،تمباکو،پیاز،لہسن،یا بدبودار چیز استعمال کی تو ادب کا تقاضا یہ ہے کہ باقاعدہ مسواک یا پیسٹ وغیرہ سے منہ صاف کر کے تلاوت کرے۔مسجد میں تلاوت کرنا افضل واولیٰ ہے۔اگرچہ قرآن مجید کو چھوئے بغیر بے وضو پڑھنا جائز ہے تاہم یہ خلافِ اولیٰ ہے۔حالتِ جنابت (یعنی اس حالت میں جس میں شرعاً غسل واجب ہوتا ہے) اور عورت کے لیے حالتِ حیض میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا بھی منع ہے اور چھونا بھی منع ہے،البتہ قرآن مجید کے کلمات بطور دعاء،تسبیح،تحمید، تہلیل اور تشکر پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ تلاوت کا قصد نہ ہو۔اگر کسی کو غلبۂ ریاح کی شکایت ہو، پیشاب کے قطرے نہ رکتے ہوں،زخم سے مسلسل پیپ یا خون رستا ہو،عورت کا بیماری کے سبب خون نہ رکتا ہو جسے استحاضہ کہتے ہیں تو ان معذوریوں کے سبب اس کے لیے یہ کافی ہے کہ ایک نماز کا وقت داخل ہونے پر تازہ وضو کر لے اور اس نماز کے وقت کے اختتام تک جتنی نمازیں (ادا، قضا،نوافل وغیرہ) چاہیں پڑھ سکتے ہیں،اور اسی طرح جب تک اور جتنی چاہیں تلاوت بھی کر سکتے

ہیں اور جب نئی نماز کا وقت داخل ہو تو تازہ وضو کرلیں۔

قرآن مجید کی تلاوت کن مواقع اور مقامات پر منع ہے

سوال: قرآن مجید کی تلاوت کن مواقع اور مقامات پر منع ہے، ذرا تفصیل سے تحریر کریں، (زاہد اللہ، مانسہرہ)۔

جواب: قرآن مجید کی تلاوت بعض احوال میں منع ہے، نماز کے رکوع، سجود اور تشہد میں قرآن پڑھنا منع ہے، (اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ اس پر سجدۂ سہو واجب ہے)۔ امام کی اقتداء میں حالتِ قیام میں جب محلِ قراءت ہوتا ہے، مقتدی کے لیے قراءت مکروہ ہے، خواہ نماز سری ہو یا جہری۔ اونگھتے ہوئے اور خطبہ جمعہ کے دوران مقتدیوں کے لیے قرأت مکروہ ہے، طواف بیت اللہ کے دوران قرآن مجید پڑھنا امام مالک کے نزدیک مکروہ ہے اور جمہور علماء کے نزدیک جائز ہے۔ نماز کی دوسری رکعت میں پہلی رکعت سے بہت زیادہ مقدار میں قرآن پڑھنا منع ہے۔ ایک دو آیات کی زیادتی ہو تو حرج نہیں۔ امام کے لیے نماز میں اتنی طویل قرأت کرنا جو مقتدیوں کے لیے دشوار ہو، یہ بھی مکروہ ہے یا کسی ایک سورت کو معین کرلینا اور دوسری کو نا جائز سمجھنا یہ بھی مکروہ ہے۔ بیت الخلاء اور حمام میں، کسی کوڑے کے ڈھیر پر قرآن مجید کی تلاوت کرنا خلافِ ادب ہے اور مکروہ ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ ﷺ الا انی نهیت ان اقرأ القرآن راکعا اوساجداً فاما الرکوع فعظموا فیه الرب و اما السجود فاجتهدوا فی الدعاء فقمِنٌ ان یستجاب لکم.

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سنو! مجھے حالت رکوع وسجدہ میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، پس رکوع میں رب تبارک وتعالیٰ کی تعظیم کرو اور سجدوں میں دعا پر زور دو (فرائض میں تسبیح مسنون ''سبحان ربی الاعلیٰ'' پر اکتفا کریں اور نوافل میں مسنون عربی دعائیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔) یہ (مقام سجدہ) اس لائق ہے کہ تمہاری دعاء (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) مقبول ہو''۔ (مشکوۃ باب الرکوع)

وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا صلی احدکم للناس فلیخفف فان فیھم السقیم والضعیف والکبیر واذا صلی احدکم لنفسہ فلیطول ماشاء۔

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کی امامت کرنے تو (مقدار قراءت میں) تخفیف کرے کیونکہ ان میں (یعنی جماعت میں) کچھ لوگ بیمار ہوتے ہیں، کچھ ضعیف اور کچھ بڑی عمر کے، جب کوئی شخص تنہا اپنی نماز پڑھے تو پھر جتنی چاہے طویل پڑھے"۔

(مشکوۃ باب ماعلی الامام)

مکروہ اوقات میں قرآن مجید کی تلاوت

سوال: کیا مکروہ اوقات میں قرآن مجید کی تلاوت کی جا سکتی ہے؟

(غازی خان۔شارع فیصل)

جواب: مکروہ اوقات میں بہتر یہ ہے کہ ذکر، تسبیحات و درود شریف میں مشغول رہیں، تاہم ان اوقات میں تلاوت کر سکتا ہے اور ان اوقات میں تلاوت کے دوران آیت سجدہ آ جائے تو اس وقت سجدۂ تلاوت کر سکتا ہے، البتہ اگر اسے مؤخر کر کے صحیح وقت میں کرے تو زیادہ بہتر ہے۔

نوجوان لڑکوں کا گھٹنوں سے اوپر والی نیکر پہن کر گھومنا

سوال: آج کل کچھ نوجوان نیکر (یعنی گھٹنوں سے اوپر) پہن کر گھومتے ہیں جس سے سترِ عورت (شرم گاہ) نظر آ جاتی ہے آیا یہ لباس شریعت میں جائز ہے یا حرام ہے۔ ایسے مسلم نوجوانوں کے لئے شریعت نے کوئی سزا مقرر کی ہے یا نہیں؟ (عبدالمجید رضوی۔فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: مرد کے لئے ناف سے لے کر گھٹنے تک بدن کا حصہ عورت (یعنی شرمگاہ) ہے اور اس کا ہمیشہ پردے میں رکھنا واجب ہے۔ لہٰذا اگر بالغ لڑکے ایسا شارٹ کٹ نیکر یا چڈا پہنتے ہیں جن سے رانیں یا ناف سے نیچے بدن کا حصہ برہنہ رہ جاتا ہو تو یہ مکروہِ تحریمی ہے۔ ایسے لاأبالی نوجوانوں کو سمجھانا چاہئے کہ وہ ایسا لباس پہنیں جو سترِ شرعی کے لئے کافی ہو اور اگر وہ سمجھانے سے باز نہ آئیں تو حاکمِ مجاز انہیں تعزیراً سزا دے سکتا ہے اور اس کی مقدار حاکم کی صوابدید پر منحصر ہے۔

نومسلم بالغ کا ختنہ

سوال: ایک شخص نے قبولِ اسلام کیا۔اس کا نکاح بھی میں نے ہی پڑھایا۔اب عرض یہ ہے کہ اس کا ختنہ ہوگا یا نہیں اگر ہو تو اس کی صورت کیا ہوگی اور اگر نہیں تو شرط یا احتیاط کیا ہوگی؟

(مولانا خضر الاسلام نقشبندی، نیو کراچی)

جواب: چونکہ سترِ عورت شرعاً واجب ہے، اور ختنہ کرانا سنت ہے، اور کسی اور سے ختنہ کرانے کی صورت میں کشفِ عورت لازمی ہے جو کہ ترکِ واجب ہے، لہٰذا بہتر ہے کہ ختنہ نہ کرائیں اور اگر کوئی شخص صاحبِ عزیمت ہے اور خود اپنی ختنہ کی ہمت بھی رکھتا ہے اور طریقہ بھی اسے آتا ہے، اس طرح کہ اس کی جان کو خطرہ لاحق نہ ہو تو پھر خود اپنی ختنہ کر سکتا ہے۔اگر اتفاق سے کسی نومسلم کی بیوی نرس یا ڈاکٹر ہو اور وہ ختنہ کرنا جانتی ہو تو اپنے شوہر کا ختنہ کر سکتی ہے۔

ماں باپ کی قدم بوسی

سوال: کیا زندہ ماں باپ کی قدم بوسی جائز ہے۔نیز اگر وہ فوت ہو گئے ہوں تو قبر چومنا کیسا ہے؟ (محمد الیاس۔لیبر کالونی لانڈھی، کراچی)

جواب: زندہ ماں باپ کی قدم بوسی جائز ہے۔حضرت زارع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں اور وہ وفد عبدالقیس میں شامل تھے کہ جب ہم مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو ہم (فرطِ شوق میں) اپنی سواریوں سے آگے بڑھنے لگے اور ہم رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دینے لگے۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

یہ بزرگوں کے پاؤں چومنے کے جواز پر حدیثِ تقریری ہے، کیونکہ اگر ان لوگوں کا یہ عمل خلافِ شرع ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس سے منع فرماتے۔چنانچہ اسی حدیث کے تحت علامہ نووی نے لکھا کہ کسی بزرگ کے زہد و اتقاء، علم و شرف اور دینداری کی خاطر تکریماً اس کے پاؤں چومنا جائز ہے۔(طیبی بحوالہ حاشیہ مشکوٰۃ)

درمختار میں ہے کہ دیندار حاکم اور سلطانِ عادل کی دست بوسی میں کوئی حرج نہیں ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور عالم کو پیشانی کی چومنا بہت ہی عمدہ بات ہے۔اس کی شرح میں آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں: حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے کہ:

"ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز دکھایئے جس سے میرے یقین میں اضافہ ہو۔ آپ نے فرمایا: اس درخت کے پاس جاؤ اور اسے بلاؤ۔ وہ شخص اس درخت کے پاس گیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ تجھے بلارہے ہیں۔ درخت (اپنی جڑوں سمیت اکھڑ کر) چلا آیا اور نبی کریم ﷺ کو سلام کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: لوٹ جاؤ تو وہ لوٹ کر (اپنی جگہ پر) واپس چلا گیا۔ راوی کہتے ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے اس نے آپ کی پیشانی مبارک چومی اور قدم بوسی کی۔ آپ نے فرمایا: اگر میں کسی کو (غیر اللہ کے آگے) سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو (سب سے پہلے) بیوی کو اجازت دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے"۔ (فتاویٰ شامی طبع جدید ج۹ ص ۴۶۷)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ماں باپ کی قبر کو بوسہ دینے میں کوئی حرج نہیں، (عالمگیری۔ باب زیارۃ القبور)"۔ شامی نے خلاصۃ الحقائق کے حوالے سے لکھا ہے کہ: "تواضع کے طور پر ماں کے قدم کو چوم سکتے ہیں" لہٰذا اکراماً و احتراماً و تواضعاً ماں باپ کی قدم بوسی جائز ہے۔ قبر کو بوسہ دینا بھی اصولاً جائز ہے لیکن اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ "عوام الناس کو بزرگان دین کی قبر کا بوسہ دینے سے منع کرنا ہی احوط ہے اور ظاہر ہے والدین کی قبور کے بوسے سے منع بھی اس احتیاط میں شامل ہے"۔

اگر پیدائش کے موقع پر بچے کا عقیقہ نہ کیا جاسکا ہو تو بعد میں کیا جاسکتا ہے

سوال: ایک قومی اخبار (روزنامہ جنگ کراچی) کی حالیہ اشاعت (21 دسمبر 2001ء) میں مفتی نظام الدین شامزی صاحب سے ایک سائل نے دریافت کیا کہ: (۱) "اگر کسی کی اولاد کا بچپن میں انتقال ہوجائے اور والدین نے اس کا عقیقہ نہ کیا ہو، تو کیا مرنے کے بعد ان کا عقیقہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں، اور اگر عقیقہ واجب الادا ہے، تو اب اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ مفتی صاحب نے جواب دیا: "عقیقہ کے مستحب ایام، ولادت سے ساتواں، چودھواں اور اکیسواں دن ہے، اس کے بعد عقیقہ نہ مسنون ہے نہ ثابت ہے۔ اس لئے جو اولاد بڑی ہوچکی ہو یا ان کا انتقال ہوچکا ہو، ان کا عقیقہ کرنا شرعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا، البتہ مطلق صدقے کے نام سے ویسے کچھ دینا چاہیں تو اچھی بات ہے"...... کیا یہ جواب درست ہے یا نہیں، اگر درست نہیں تو عقیقہ کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے۔ (محمد ناصر خان چشتی...... تحصیل و ضلع ٹانک، صوبہ سرحد)

جواب: ''عقیقہ'' کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ سَمُرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْغُلَامُ مُرْتَهَنٌ بِعَقِيْقَتِهٖ يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ وَيُسَمّٰى وَيُحْلَقُ رَأْسُهٗ.

''حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لڑکا اپنے عقیقہ کے بدلے میں گروی ہے، ولادت کے ساتویں دن اس کی طرف سے ذبح کیا جائے اور اس کا نام رکھا جائے اور اس کا سر مونڈا جائے''۔ (جامع ترمذی ج۱ ص ۱۸۳)

عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرِ الضَّبِّيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَعَ الْغُلَامِ عَقِيْقَةٌ فَاَهْرِيْقُوْا عَنْهُ دَمًا وَاَمِيْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰى.

''حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے، اس کی طرف سے خون بہاؤ (یعنی جانور ذبح کرو) اور اس سے گندگی کو دور کرو''۔ (صحیح بخاری ج۲ ص ۸۲۲)

عَنْ اُمِّ كُرْزٍ اَنَّهَا سَأَلَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْعَقِيْقَةِ فَقَالَ: عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ وَاحِدَةٌ لَا يَضُرُّكُمْ ذُكْرَانًا كُنَّ اَمْ اِنَاثًا.

''حضرت ام کرز رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عقیقہ کے متعلق سوال کیا، آپ نے فرمایا: لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری (ذبح کرو)، اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ نر ہو یا مادہ''۔

(جامع ترمذی ج۱ ص ۱۸۳)

ان احادیث مبارکہ کی رو سے بچے کی پیدائش پر عقیقہ کرنا سنت اور مستحب ہے، یہ نعمتِ اولاد کا بارگاہِ الٰہی میں تشکر بھی ہے اور آفات وبلّیات سے تحفظ کے لئے تصدق بھی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

بَادِرُوْا بِالصَّدَقَةِ فَاِنَّ الْبَلَاءَ لَا يَتَخَطَّاهَا.

''صدقہ دینے میں سبقت کرو، کیونکہ مصیبت اس سے تجاوز نہیں کرسکتی''۔ (مشکوٰۃ)

اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ.

''صدقہ (آتشِ) گناہ کو اس طرح مٹا دیتا ہے، جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے''۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ۔

''بے شک صدقہ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور بری موت (یعنی انجام بد) کو دور کرتا ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

سنت یہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد ''تحنیک'' (گھٹی پلائی جائے)، یعنی کوئی بزرگ اور صالح شخص کھجور یا کوئی میٹھی چیز چبا کر اس کا شیرہ بچے کے تالو یا زبان پر رکھے تاکہ نیک فال کے طور پر سب سے پہلے کوئی متبرک اور شیریں چیز اس کے حلق میں جائے۔ اس کے بعد پیدائش کے ساتویں دن اس کا نام رکھا جائے اور اس کے بال مونڈ کر ان کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کی جائے۔ پیدائش والے دن سے آئندہ ہفتے ایک دن پہلے ساتواں دن ہو جاتا ہے۔ اگر بعینہٖ ساتویں دن کسی وجہ سے عقیقہ نہ کیا ہو، تو چودھویں، اکیسویں یا اس کے بعد بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ساتویں دن سے تقدیم و تاخیر بھی جائز ہے:

قَالَ فِی السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ اِذَا اَرَادَ اَنْ يُّعَقَّ عَنِ الْوَلَدِ يَذْبَحُ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَيْنِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةً وَلَوْ ذَبَحَ عَنِ الْغُلَامِ شَاةً جَازَ لِاَنَّ النَّبِیَّ ﷺ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَبْشًا كَبْشًا، وَلَوْ قَدَّمَ الذَّبْحَ قَبْلَ يَوْمِ السَّابِعِ اَوْ اَخَّرَ عَنْهُ جَازَ اِلَّا اَنَّ يَوْمَ السَّابِعِ اَفْضَلُ وَالْمُسْتَحَبُّ اَنْ يُّفَصِّلَ لَحْمَهَا وَلَا يَكْسِرُ عَظْمَهَا تَفَاؤُلًا بِسَلَامَةِ اَعْضَاءِ الْوَلَدِ وَيُطْعِمُ وَيَتَصَدَّقُ۔

''السراج الوہاج، میں فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنی اولاد کا عقیقہ کرنا چاہے تو لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرے، اگر لڑکے کی طرف سے ایک بکری ذبح کی تب بھی جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے ایک ایک مینڈھے کا عقیقہ کیا، اگر عقیقہ ساتویں دن سے پہلے کر دے یا ساتویں دن کے بعد کرے تب بھی جائز ہے، مگر ساتویں دن کرنا افضل ہے، بچے کے اعضاء کی سلامتی کے لئے نیک فال کے طور پر مستحب یہ ہے کہ گوشت ہڈیوں سے الگ کر دیا جائے اور ہڈیوں کو نہ توڑا جائے، خود بھی کھائے، دوسروں کو بھی کھلائے اور صدقہ بھی کرے''۔

اسی میں ہے:

وَحُكْمُهَا كَاَحْكَامِ الْاُضْحِيَةِ

کہ عقیقہ کے احکام قربانی کے احکام کی طرح ہیں، (العقود الدریہ، کتاب الذبائح، ارگ بازار، قندھار افغانستان 232-233/2، بحوالہ فتاویٰ رضویہ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن 586-587/20)

اس سے معلوم ہوا کہ عقیقہ اور قربانی کے جانور کے احکام یکساں ہیں، یعنی بکرا، دنبہ ایک سال کا، گائے دو سال کی، اونٹ پانچ سال کا یا جسے عرف عام میں دو دانت کا کہا جاتا ہے۔ عقیقہ کے گوشت اور کھال کا بھی وہی حکم ہے جو قربانی کے گوشت اور کھال کا ہے، عقیقہ کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے، والدین اور اعزاء واقرباء بھی کھا سکتے ہیں اور صدقہ بھی کرنا چاہئے۔ ساتویں، چودھویں اور اکیسویں دن کی شرط استحبابی ہے، وجوب کے طور پر نہیں ہے۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''عقیقہ ساتویں دن افضل ہے، نہ ہو سکے تو چودھویں، ورنہ اکیسویں، ورنہ زندگی بھر جب کبھی ہو، وقت دن کا ہو، رات کو ذبح کرنا مکروہ ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، 586/20 لاہور)

صدر الشریعہ مولانا امجد علی لکھتے ہیں: ''عقیقہ کے لئے ساتواں دن بہتر ہے اور ساتویں دن نہ کر سکیں تو جب چاہیں کر سکتے ہیں، سنت ادا ہو جائے گی، بعض نے کہا کہ ساتویں یا چودھویں یا اکیسویں دن یعنی سات دن کا لحاظ رکھا جائے، یہ بہتر ہے اور یاد نہ رہے تو یہ کرے کہ جس دن بچہ پیدا ہو، اس دن کو یاد رکھیں، اس سے ایک دن پہلے والا دن جب آجائے تو وہ ساتواں ہوگا، مثلاً جمعہ کو پیدا ہوا تو جمعرات ساتواں دن ہے اور سنیچر کو پیدا ہو تو ساتواں دن جمعہ ہوگا، پہلی صورت میں جس جمعرات کو اور دوسری صورت میں جس جمعہ کو عقیقہ کرے گا، اس میں ساتویں دن کا حساب ضرور آئے گا''۔ (بہار شریعت 95/15، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور)

علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ عَقَّ عَنْ نَفْسِهٖ بَعْدَ النُّبُوَّةِ مَعَ اَنَّهٗ قَدْ وَرَدَ اَنَّ جَدَّهٗ عَبْدُالْمُطَّلِبِ عَقَّ عَنْهُ فِیْ سَابِعِ وِلَادَتِهٖ، وَالْعَقِیْقَةُ لَا تُعَادُ مَرَّةً ثَانِیَةً فَیُحْمَلُ ذَالِکَ عَلٰی اَنَّ الَّذِیْ فَعَلَهُ النَّبِیُّ اِظْهَارًا لِلشُّکْرِ عَلٰی اِیْجَادِ اللّٰهِ اِیَّاهُ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ وَتَشْرِیْعٌ لِاُمَّتِهٖ کَمَا کَانَ یُصَلِّیْ عَلٰی نَفْسِهٖ۔

''حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اعلانِ نبوت کے بعد اپنی جانب سے عقیقہ کیا، حالانکہ یہ روایت بھی ہے کہ آپ کے دادا عبد المطلب نے آپ کی ولادت کے ساتویں دن آپ

کی جانب سے عقیقہ کرلیا تھا، عقیقہ تو دوبارہ نہیں کیا جاتا، اسے اس پر بھی محمول کرسکتے ہیں کہ حضور رحمتہ للعلمین ﷺ نے اپنی ولادت باسعادت کے تشکر کے طور پر اور امت کے لئے حکم شرعی وضع کرنے کی خاطر یہ صدقہ دیا ہو، جیسا کہ آپ اپنے اوپر تعلیم امت کے لئے درود بھیجتے تھے"۔
(الحاوی للفتاوئ، 196/1)

یہ بات ہم نے اس بحث کے شروع ہی میں عرض کردی ہے کہ عقیقہ بھی فی نفسہٖ نعمتِ اولاد کا تشکر ہے اور ردِ بلاء کے لئے صدقہ ہے اور دعاء عقیقہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو درج ذیل ہے:

اَللّٰهُمَّ هٰذِهٖ عَقِيْقَةُ اِبْنِيْ فُلَانٍ دَمُهَا بِدَمِهٖ وَلَحْمُهَا بِلَحْمِهٖ وَعَظْمُهَا بِعَظْمِهٖ وَجِلْدُهَا بِجِلْدِهٖ وَشَعْرُهَا بِشَعْرِهٖ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا فِدَاءً لِاِبْنِيْ مِنَ النَّارِ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔

"اے اللہ! یہ (ذبیحہ) میرے فلاں بیٹے کا عقیقہ ہے، اس کا خون اس کے خون (دَم' حدیث وفقہ میں جان کے معنی میں بھی آیا ہے)، اس کا گوشت اس کے گوشت، اس کی ہڈی اس کی ہڈی، اس کی جلد اس کی جلد اور اس کے بال اس کے بال کے بدلے میں (صدقہ ردِ بلا) ہیں، اے اللہ! تو اس (ذبیحے) کو میرے بیٹے کے لئے نارِ جہنم سے نجات کا فدیہ بنادے اور بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے"۔

اس دُعا میں لڑکے یا لڑکی کا نام مع ولدیت لے کر بھی دعا کرسکتے ہیں۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر بچے کی پیدائش کے ساتویں دن کسی مجبوری یا کوتاہی کی بناء پر عقیقہ نہ کیا ہو تو بعد میں کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے، پیدائش کا ساتواں دن افضل ہے، مگر تقدیم وتاخیر بھی جائز ہے۔ مفتی شامزئی صاحب نے جو عقیقہ کے جواز کو ساتویں، چودھویں اور اکیسویں دن تک محدود رکھا ہے اور اس کے بعد اس کے سنت یا جائز ہونے کی نفی کردی ہے، وہ کسی دلیل شرعی کے بغیر ہے، اور اصولِ شرع کے مطابق امام احمد رضا قادری اور مولانا امجد علی کا جو موقف ہم نے ذکر کیا ہے، درست ہے۔ علامہ سیوطی نے اگرچہ اعلانِ نبوت کے حضور ﷺ کے خود اپنا عقیقہ کرنے کی روایت کی توجیہہ کی ہے، وہ درست ہے، لیکن حضرت انس کی روایت میں "صدقہ تشکر" پر عقیقہ کا اطلاق ہمارے موقف کی حقانیت کی دلیل ہے۔

معروف فقیہ مولانا نور اللہ بصیر پوری اس سوال کے جواب میں کہ اگر بچے کی پیدائش کے

ساتویں دن عقیقہ نہ کیا ہو تو آیا بعد میں کر سکتے ہیں؟ لکھتے ہیں:

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا سید عالم ﷺ نے: مع الغلام عقیقة فاهر یقوا عنه دما و امیطوا عنه الاذی "لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے، پس بہاؤ اس کی طرف سے خون اور دور کرو اس سے تکلیف (بخاری، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی)۔ پس اس حدیث شریف میں مطلقاً خون بہانے کا استحبابی امر ہے، بلا قید سابع (ساتویں دن)۔

اس قسم کی احادیث مطلقہ بکثرت ہیں اور بعض احادیث میں جو قید سابع موجود ہے، وہ استحبابا فی الاستحباب ہے، پس اگر ایک استحباب فوت ہو جائے یعنی سابع (ساتواں دن) گزر جائے تو دوسرا (یعنی نفسِ عقیقہ) کیوں ترک کیا جائے، آگے چل کر وہ علامہ شامی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اعلانِ نبوت کے بعد اپنا عقیقہ ادا کیا (عقود الدریہ فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ)۔' پھر وہ علامہ ابن حجر کی کتاب العباب (جو شوافع کے نزدیک معتبر ہے) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وقت عقیقہ پیدا ہونے سے لے کر بالغ ہونے تک ہے، ساتویں دن عقیقہ کرنا سنت ہے اور جو بالغ ہوا اور اس کا عقیقہ نہ ہوا ہو تو مسنون ہے کہ خود کرے اور پھر اس پر خود عملِ رسالت سے استدلال کیا ہے۔

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ جو ساتویں (یا بقول بعض چودھویں اور اکیسویں دن) کے بعد عقیقہ کے عدمِ جواز کے قائل ہیں، وہ بتائیں کہ ان کی کیا دلیل ہے۔

(فتاویٰ نوریہ ج ۳ ص ۳۹۴-۳۹۳)

V.C.D کیا ہے اور کیا یہ دینی معلومات اور تبلیغ کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے؟

آواز اور تصویر کو محفوظ کرنے کے لئے کیمرہ استعمال ہوتا ہے اور وقت ضرورت اس کو دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

کیمرے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

پہلی قسم وہ ہے جس میں تصویر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ موجود رہتی ہے اور یہ تصویر مستقل ہوتی ہے۔ سارے غیر متحرک کیمرے اور 35mm کی فلم میکر متحرک کیمرے اس ضمن میں آتے

ہیں۔ ان میں نیگیٹو بنتا ہے جس سے واضح پوزیٹو تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ ان کو دیکھنے کے لئے کسی پلیئر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ تصویریں مستقل ہوتی ہیں اس لئے علماء کرام نے ان کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ متفق علیہ ہے اور ہر مکتبہ فکر میں اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔

دوسری قسم کے کیمرے وہ ہوتے ہیں جس میں عکس کا گراف ہوتا ہے، تصویر نہیں ہوتی۔ اس کو دیکھنے کے لئے وڈیو پلیئر یا کمپیوٹر کی ضرورت ہوتی ہے، یہ کیسٹ یا V.C.D کی صورت میں محفوظ ہوتا ہے، یہ گراموفون کے ریکارڈ یا Audio-tape کی جدید شکل بھی کہلائی جاسکتی ہے، جس میں آواز کے ساتھ تصویر بھی گراف کی صورت میں موجود ہوتی ہے۔ چونکہ ہم نماز کی V.C.D بنانا چاہتے ہیں اس لئے اس کے کام کرنے کا طریقہ ذرا وضاحت چاہتا ہے۔

کیمرے انسانی آنکھوں ہی کی طرح کام کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص ہمارے سامنے آتا ہے تو روشنی کی شعاعیں اس شخص سے ٹکرا کر آنکھوں میں جاتی ہیں اور اس شخص کی ہو بہو تصویر آنکھ کے پردے پر بن جاتی ہے۔ آنکھ کا کام یہ ہے کہ اس تصویر کو بجلی کے کرنٹ میں تبدیل کر دیتی ہے اور آنکھ کی نسوں کے ذریعے دماغ کے پچھلے حصے میں چلی جاتی ہے، دماغ بجلی کے کرنٹ کو ایک خاکہ یا عکس بناتا ہے۔ دماغ کے اس حصے میں کوئی تصویر نہیں بنتی ہے بلکہ یہ خاکہ یادداشت میں محفوظ ہو جاتا ہے اور آئندہ جب بھی وہ شخص دوبارہ نظر آتا ہے تو اس موہوم خاکہ اور اس نظر آنے والے شخص کا موازنہ کر کے ہم اس شخص کو پہچان جاتے ہیں۔

اب آیئے V.C.D یا V.C.R کے کیمرے کا کام کرنے کا طریقہ معلوم کرتے ہیں۔ ان کیمروں میں نیگیٹو کے بجائے ایک فیتہ مسلسل چلتا رہتا ہے اور فریم کی صورت میں عکس ریکارڈ کرتا ہے۔ اور کسی بھی متحرک یا غیر متحرک شے کا عکس ریکارڈ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک سیکنڈ میں کم سے کم دس (10) فریم ریکارڈ ہوں اور یہ فریم بھی تصویر کی صورت میں ریکارڈ نہیں ہوتے۔ بلکہ ایک گراف کی صورت میں ریکارڈ ہوتے ہیں اور یہ گراف ایک (Head) سوئی سے ریکارڈ ہوتے ہیں۔ جب یہ ریکارڈ ہو جاتے ہیں تو دیکھنے کے لئے پلیئر میں یہ سوئی مختلف سمت میں کچھ کام کر کے اس گراف کو عکس میں تبدیل کر دیتی ہے اور یہ عکس بھی مستقل نہیں ہوتا بلکہ ہر سیکنڈ میں دس (10) سے بیس (20) فریم آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ فرض کریں کہ صرف ایک فریم اسی اعتبار سے پلیئر پر چلے تو انسانی آنکھ اس کو دیکھنے سے قاصر رہے گی۔ کیونکہ وہ عکس ایک لمحے کے

بیسویں حصے میں ظاہر ہوگا اور ختم ہو جائے گا اس لئے وہ عکس مستقل نہیں ہوتا۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غیر متحرک کیمرے سے جو تصویر (جس کا نیگیٹو بھی بنتا ہے) بنتی ہے وہ مستقل ہوتی ہے اور لیکن V.C.D کے کیمرے سے جو عکس بنتا ہے وہ غیر مستقل ہوتا ہے۔ تصویر تو بلاشبہ حرام ہے۔ لیکن اس عکس کو بھی (جس کو دھوپ میں ایک سائے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے) کیا ہم حرام قرار دیں گے۔ یہ جدید ٹیکنالوجی کا مسئلہ ہے جسے ہمارے علمائے کرام کو حل کرنا ہے۔ ہم اس ٹیکنالوجی سے لاتعلق نہیں رہ سکتے کیونکہ آج افغانستان میں جو بمباری ہوئی ہے اس میں یہ ٹیکنالوجی استعمال ہوئی ہے۔ ریڈار میں بھی یہی ٹیکنالوجی استعمال ہوتی ہے۔ رہا اس کا غیر ضروری اور غیر شرعی استعمال، تو یہ تو اس کے استعمال کرنے والے پر ہے۔ آج ہر گلی میں وڈیو کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں اور آبادی کی ایک کثیر تعداد اس پر ہمارے دشمن کی عریاں فلمیں دیکھتی ہے۔ تو کیا ان کو نماز نہیں سکھلائی جاسکتی ہے؟

دوسرا سوال بھی قابل غور ہے کہ پاسپورٹ پر جو غیر متحرک کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر چسپاں ہوتی ہیں اس کے لئے علمائے کرام یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ ہے تو یہ حرام لیکن عالمی ضرورتوں کے تحت یہ گوارہ کی جاسکتی ہے۔ اگر ایک حرام چیز کو ضرورت کے تحت ہم قبول کرسکتے ہیں تو دینی تبلیغ کے لئے V.C.D بھی قبول کرنے میں کیا حرج ہے۔ کیا علماء کرام اس کے لئے اجتہاد نہیں کرسکتے۔ اب کچھ اعتراضات جو ہمارے خیال میں کئے جاسکتے ہیں:

۱) وہ چیز جو عام طور پر غیر شرعی چیزوں کے لئے استعمال ہوتی ہو، اس کو ترک کر دینا چاہئے۔ لیکن اگر ایک شخص اگر نیت کرتے وقت استقبال قبلہ کا خیال نہیں کرتا تو کیا ہم اس کو سکھلائیں گے یا اس کو کہیں گے تمہاری نماز نہیں ہوتی یا تمہارا نماز پڑھنا ہی فضول ہے۔ V.C.D. کا غیر شرعی استعمال روکنے کے لئے ہر شخص کو مقدور بھر کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم کو دینی علوم بھی نہیں سکھلانے چاہئیں۔

۲) ایک تکنیکی سوال جو کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ کمپیوٹر پر فلم روکی بھی جاسکتی ہے۔ اگر Pause کا بٹن دبا دیا جائے تو یہ ممکن ہے۔ لیکن پھر بھی یہ غیر مستقل ہی رہے گی۔ کیونکہ اس بٹن کو دوبارہ دبا دینے سے وہ فریم پھر چلائے گا اور یہی عمل کمپیوٹر کو بند کر کے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

۳) تیسرا عمل یہ ہوسکتا ہے کہ اس کا پرنٹ آؤٹ بھی نکالا جاسکتا ہے جو مستقل ہوگا لیکن

جاندار چیز کے لئے یہ عمل کیا ہی کیوں جائے۔ جب ہم یہ جانتے ہیں کہ مستقل تصویر حرام ہے۔

ہمارے ذہن میں جو سوالات آئے ہیں اپنی مقدور بھر کوشش کر کے اس کا جواب دے دیا ہے۔ امید ہے کہ علماء کرام مطمئن ہو جائیں گے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دین اس مسئلہ سے متعلق کہ اگر نماز کی ادائیگی سکھلانے کے لئے V.C.D بنائی جائے اور غیر تجارتی بنیاد پر لوگوں کو فراہم کی جائے تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ اپنی نماز کی اصلاح کر لیں تو کیا یہ V.C.D بنانا جائز ہے۔ شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں اس سوال کا جواب عنایت فرمائیں، (سائل: ڈاکٹر حسن علی، ماڈل کالونی۔ کراچی)۔

جواب: آپ کی تحریر سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے یہ ہے کہ V.C.D پر کسی چیز کی تصویر منقش یا مرتسم نہیں ہوتی، بلکہ یہ شعاعیں ہوتی ہیں جسے کمپیوٹر یا وڈیو پر منتقل کر کے صورت کی شبیہ بنائی جاتی ہے اور اسے بھی استقرار نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ ایک حالت میں ساکن وساکت رکھا جا سکتا ہے، لیکن ماؤس (Mouse) یا بٹن دبانے سے وہ فنا ہو جائے گی یا کمپیوٹر بند کرنے سے بھی وہ فنا ہو جائے گی۔ آپ کی تحقیق کے مطابق اسے دھوپ میں کسی جاندار یا انسان کے سائے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، جو سورج کی روشنی کی راہ میں حائل انسان یا کسی دوسرے جاندار کے ہٹنے سے فنا ہو جاتا ہے اور اسے استقرار نہیں ہوتا۔ سائے پر کسی نے بھی آج تک تصویر کا حکم نہیں لگایا، اسی طرح V.C.D کی غیر مستقر لہروں یا شعاعوں کو بھی تصویر قرار نہیں دیا جا سکتا، خواہ کمپیوٹر اسکرین پر وہ صورت اور آواز دونوں کی صورت میں نمودار ہوں۔

لہٰذا ہماری رائے میں آپ کی بیان کردہ فنی تحقیق کے مطابق V.C.D کا استعمال، نماز کی عملی تربیت کے لئے جائز ہے، اسے دوسرے تبلیغی مقاصد کے لئے، مثلاً تلاوت، نعت، وعظ و تقریر یا اسلام پر وارد کئے جانے والے باطل اعتراضات کے رد کے لئے اسے استعمال کیا جا سکتا ہے اور جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے کمپیوٹر اسکرین پر کسی انسان یا جاندار کی تصویر کو روک کر اس کا پرنٹ نکالنا ناجائز ہوگا۔ اسی طرح V.C.D کے ذریعے کمپیوٹر اسکرین پر فواحش و منکرات پر مبنی ایسے پروگرام، جن میں بے حیائی ہو، بے حجابی ہو، شہوت پرستی، نفسانی اور جنسی تلذذ ہو، بے ہودگی اور لغویات ہوں، دیکھنا ناجائز ممنوع ہوگا اور ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا۔

☆☆☆......***......☆☆☆

متفرق

اللہ تعالیٰ رحیم ہے تو اپنے بندوں کو آگ میں کیوں ڈالے گا؟

سوال: جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے تو اپنے بندوں کو آگ میں کیوں ڈالے گا۔ (محمد اقبال۔ ملیر)۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اگر تم شکر گزار بن جاؤ اور ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا، بلاشبہ اللہ شکر قبول کرنے والا بڑے علم والا ہے۔ (النساء: ۱۴۷)''۔

لوگ اللہ کے بندے تو بنیں یہاں تو کوئی عزیر کا بندہ ہے، کوئی مسیح کا بندہ ہے، میری مراد یہود و نصاریٰ سے ہے، کوئی لات و منات کا بندہ ہے، کوئی رام اور لکشمن کا بندہ ہے، لوگوں نے اپنے اپنے معبود بنا رکھے ہیں، اور نہیں تو قرآن کے مطابق بعض خواہشاتِ نفس کے پجاری بن گئے ہیں، بقول غالب

ع کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

تو جو سچ مچ اللہ کا بندہ بن جائے اللہ تعالیٰ اسے عذاب جہنم میں کبھی نہیں ڈالے گا، جنت اس کے استقبال کے لئے حاضر ہے، حور و غلمان جنت اور انعاماتِ الٰہیہ اس کی منتظر ہیں۔ ماں کے پیار کو تو خالق کے پیارے سے کوئی حقیقی نسبت ہو ہی نہیں سکتی۔

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کئے، ان میں سے ننانوے اپنے لئے روک لئے اور صرف ایک حصہ (یعنی ایک فیصد) زمین پر اتارا، اسی ایک فیصد جزءِ رحمت کا فیضان ہے کہ مخلوق ایک دوسرے پر شفقت کرتی ہے یہاں تک کہ گھوڑا چلتے ہوئے اپنے قدم کو اٹھا لیتا ہے کہ کہیں اس کا بچہ کچلا نہ جائے''۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۶۰۰۰)

گم شدہ چیز کے ملنے کے لئے دعاء

سوال: آدمی کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول جائے یا کوئی چیز گم ہو جائے تو واپس ملنے کے لئے کیا دعا کرے۔ (مسز عائشہ)۔

جواب: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ یا اِنَّہٗ عَلٰی رَجْعِہٖ لَقَادِرٌ بکثرت پڑھتے رہیں، انشاء اللہ

مل جائے گی۔ شیخ احمد کبیر رفاعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء منقول ہے:

"یَا جَامِعَ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْهِ رُدَّ عَلَیَّ ضَالَّتِیْ"

"اے روزِ قیامت کے لئے لوگوں کو جمع کرنے والے خالق و مالک میری گمشدہ چیز مجھے لوٹا دے"۔

برصغیر کے کس عالم نے سب سے زیادہ فتاویٰ لکھے ہیں

سوال: سب سے زیادہ شرعی مسائل برصغیر کے کس عالم نے تحریر کئے ہیں؟

(محمد سعید۔ گلشن اقبال)

جواب: میری معلومات کے مطابق امام احمد رضا قادری فاضل بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتاویٰ سب سے زیادہ ہیں، جو پہلے بڑے سائز کی ۱۲ ضخیم مجلدات پر مشتمل تھے، اب انہیں باقاعدہ حوالہ جات اور عربی عبارات کے تراجم کے ساتھ رضا فاؤنڈیشن لاہور ۲۷ جلدوں میں شائع کر رہی ہے۔

برسی پر کھانا پکا کر تقسیم کرنا

سوال: کیا کسی کی برسی پر کھانا پکا کر تقسیم کرنا ضروری ہے؟ (ثریا پروین۔ نارتھ ناظم آباد)

جواب: ایسا کرنا ضروری نہیں ہے، ضروری واجب کے معنی میں ہوتا ہے کہ آپ نہ کریں تو گنہگار ہوں گی۔ ہاں البتہ ایصالِ ثواب شرعاً جائز و مستحسن اور قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ وہ برسی والے دن بھی کر سکتے ہیں اور اس سے پہلے یا بعد میں بھی، اور کھانا پکا کر غریبوں کو کھلانا اس کی ایک صورت ہے، دوسری صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں، مثلاً غریبوں کی مالی اعانت کرنا، مساجد دینی مدارس کی اعانت کرنا، رفاہِ عامہ کے کام کرنا، جیسے کنواں کھود کر وقف کر دینا جہاں پانی کی قلت ہو۔

رزق میں برکت کیلئے دعاء

سوال: رزق میں برکت کے لئے کیا دعاء کی جائے؟

(مسز عائشہ شعیب بھومبل ...... گلشن اقبال)

جواب: اس کے لئے کئی دعائیں اور وظائف ہیں، جو قرآن و حدیث اور سلف صالحین

سے ثابت ہیں۔ سب سے بہترین وظیفہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کثرت سے استغفار کرنا ہے، سورۂ نوح آیت نمبر ۱۰ میں حضرت نوح علیہ السلام کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "تو میں نے کہا: اپنے رب سے مغفرت کی دعاء کرو، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر موسلا دھار بارش نازل فرمائے گا، اور (کثیر) مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا، اور تمہارے لئے باغات اگائے گا اور تمہارے لئے نہریں بنائے گا"۔

تفسیر مظہری میں "سورۃ الطلاق" کی آیت نمبر ۲ کے تحت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ: "روزانہ پانچ سو بار "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" پڑھے اور اس کے اول و آخر سو سو مرتبہ درود شریف پڑھے" یا امام احمد رضا قادری نے لکھا ہے کہ "بعد نمازِ عشاء کھلے آسمان تلے ننگے سر باوضو قبلہ رو بیٹھ کر پانچ سو بار "یَا مُسَبِّبَ الْاَسْبَاب" پڑھے اور اول و آخر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھے، خواتین سر ڈھانک کر اور باپردہ جگہ بیٹھ کر پڑھیں، یا ہر نماز کے بعد گیارہ گیارہ مرتبہ اور صبح و شام سو سو مرتبہ اول و آخر درود شریف کے ساتھ یہ دعاء پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اكْفِنِىْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَ اَغْنِنِىْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ

"اے اللہ! تو مجھے رزق حلال اتنا وافر عطا فرما کہ حرام کی طلب بالکل نہ رہے اور تو مجھے اپنے فضل و کرم سے خود اتنا عطا فرما کہ تیرے غیر سے بے نیاز ہو جاؤں"۔

کھانے اور پھل وغیرہ پر فاتحہ

سوال: ہم لوگ کھانا اور پھل سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے، بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور ایسے کھانے کھانا جائز نہیں سمجھتے، ہم لوگ مذہبی تہواروں کے موقع پر لوگوں کے گھروں میں کھانا بھیجتے ہیں، یہ کیسا ہے۔ (مسز شعیب، بھوسبل۔ گلشن اقبال)۔

جواب: کھانے سامنے رکھ کر فاتحہ دینا ضروری بھی نہیں ہے، اور اس کی شریعت میں ممانعت بھی نہیں ہے، کھانا سامنے نہ ہو تب بھی فاتحہ دی جاسکتی ہے۔ فاتحہ میں کیا ہے ایک تو کھانا ہے جو حلال ہے اور طیب ہے، دوسرا اس پر قرآن کی چند سورتیں یا آیات پڑھی گئی ہیں، وہ بھی ثواب اور برکت کا کام ہے، تیسرا ایصال ثواب ہے جو شرعاً جائز ہے بلکہ حدیث شریف میں اس کا جواز

موجود ہے، اب جو صاحب اس کے کھانے کو ناجائز کہتے یا سمجھتے ہیں تو وہ بتائیں کہ عدمِ جواز کی شرعی وجہ کیا ہے۔

خوشی کے مواقع پر ایک دوسرے کو ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کی ترغیب حدیث شریف میں آئی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو تاکہ تم میں باہم محبت پیدا ہو'' ایصالِ ثواب کا کھانا فقراء و مساکین کو دیا کریں، تبرک کا کھانا دوست احباب کو بھی دے سکتے ہیں۔

بند دکان میں بلی مرگئی

سوال: میں اپنی دکان بند کر رہا تھا کہ لاعلمی میں بلی اندر بند ہوگئی اور کسی کو پتا نہیں چل سکا، بعد میں دکان کھول کر دیکھا تو وہ مری ہوئی برآمد ہوئی، اس کا کوئی کفارہ ہے؟

(حفیظ الرحمٰن۔ سوسائٹی)

جواب: بلی کے دکان کے اندر بند کرنے میں آپ کے کسی ارادے یا کوتاہی کا کوئی دخل نہیں ہے، نہ ہی آپ کے علم میں تھا کہ غلطی سے بلی دکان میں بند ہوگئی ہے کہ آپ اس کے نکالنے کا اہتمام کرتے اور سستی کرنے پر قصوروار ٹھہرتے۔ بس اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہیں۔ استغفار ویسے بھی نزولِ برکت کا ذریعہ ہے۔

شوہر والدین سے ملنے نہیں دیتے

سوال: میرے شوہر والدین سے ملنے نہیں دیتے، اگر میں ان کی اجازت کے بغیر والدین سے ملوں تو کیا یہ ان کی حکم عدولی ہوگی، (ڈاکٹر بشریٰ۔ گلستان جوہر)۔

جواب: آپ کے شوہر کا آپ کو والدین کی ملاقات سے منع کرنا، یہ قطع رحمی کا سبب ہے، گناہ ہے، انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرنا چاہئے، آپ انہیں نرمی سے قائل کرتی رہیں اور ''یَامُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ'' پڑھتی رہیں۔ امید ہے اللہ تعالیٰ ان کے دل میں رحم کا جذبہ ڈال دے گا، حتی الامکان ان کی حکم عدولی نہ کریں۔

کبوتروں کو دانہ ڈالنا

سوال: بعض لوگ حرمینِ طیبین میں کبوتروں کے لئے دانہ ڈالتے ہیں، اسے کبوتر اور پرندے چگتے رہتے ہیں، چیونٹیاں بھی اپنے بلوں میں لے کر جاتی ہیں، کیا یہ عملِ خیر ہے اور اس پر اجر ملے

گا بعض لوگ اسے اناج کا ضیاع کہتے ہیں یا بےادبی پر محمول کرتے ہیں؟ شرعی حکم بیان کیجئے،

(نعیم الرحمٰن، بنگرام)

جواب: صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی مسلمان پودا لگاتا ہے یا اناج کاشت کرتا ہے، اس سے کوئی درندہ، پرندہ یا کوئی اور جاندار کھاتا ہے، تو اس کے لئے اس میں اجر ہے۔ اور ایک روایت میں فرمایا کہ یہ اس کے لئے صدقہ ہے۔ اس حدیثِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کے کسی عملِ خیر یا محنت کے ثمرہ سے اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق کو غیر ارادی طور پر بھی فائدہ پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ اسے اجر سے محروم نہیں فرماتا اور یہ نیکی اس کے لئے صدقہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا اس حدیثِ پاک کی روشنی میں چرند، پرند، حشرات الارض اور دیگر جانداروں کے لئے چارہ یا اناج ڈالنا نیک عمل ہے۔

حرمین طیبین میں اگر کوئی ایسی کھلی جگہ ہو جو عام گزرگاہ نہ ہو تو وہاں حسبِ ضرورت جانوروں کے لئے اناج ڈالنا بلاشبہ کارِ ثواب ہے، لیکن مشاہدے میں یہ آیا ہے کہ اکثر لوگ عام گزرگاہ پر اناج ڈالتے ہیں، پرندوں کو چگنے کا وقت کم ہی ملتا ہے، اناج ضرورت سے زیادہ ڈالا جاتا ہے، لوگوں کے پاؤں کے ساتھ لگ کر حرم کے اندر تک پہنچتا ہے اور کئی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، جن میں اناج کا ضیاع، بےحرمتی اور حرم پاک کی آلودگی سب شامل ہیں، لہٰذا زیادہ بہتر اور شرعی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کھلی جگہ پر جو عام گزرگاہ نہ ہو یہ اناج پرندوں کے لئے ڈالا جائے اور ضیاع واضح طور پر نظر آئے تو اس رقم کو کسی دوسرے کارِ خیر میں لگا دیں۔

دعوتِ دین کا اسلوب

سوال: ایک بہت مسئلہ اہم مسئلہ درپیش ہے، وہ یہ کہ کراچی کے ایک علاقے سابقہ کراچی ایسٹ کی ایک مسجد کے ایک بزرگ نمازی اکثر مسجد میں اس بات پر جھگڑا کر چکے ہیں کہ بغیر داڑھی والا نمازی اگلی صفوں میں کھڑا ہو کر نماز نہ پڑھے، بلکہ پچھلی صفوں میں نماز پڑھے اور دوسرے یہ کہ داڑھی کٹوانا اور زنا کرنا ایک برابر ہے اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ ان دونوں مسائل کو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیے۔ شکریہ

(ایس این اقبال، سرجانی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: دین کے بارے میں غیور و جسور ہونا، دینی حمیت رکھنا، دینی اقدار کی پامالی پر افسردہ ہونا اور مومنوں کے اصلاحِ احوال کے لئے حریص ہونا بہت اچھی بات ہے، مگر قرآن مجید نے جو دعوتِ دین کا حکیمانہ اسلوب بتایا ہے، دین کے داعی اور مبلغ کو اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ (النحل:۱۲۵)

"(اے حبیب: لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلائیے: اور احسن طریقے سے ان پر حجت قائم کیجئے، بے شک آپ کا رب انہیں خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹک گئے اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی خوب جانتا ہے"۔

اس آیت میں دعوتِ دین کے تین اسلوب بیان کئے گئے ہیں:

ایک دعوت بالحکمت: اس کے متعدد معانی میں سے ایک یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے فساد اور خرابی کی بناء پر اختیار کرنے سے منع کرنا یا کسی چیز کو اس کے عمدہ اور مفید نتائج کی وجہ سے اختیار کرنے کی تلقین کرنا، یعنی علم اور عقل سے افعال اور اشیاء کی حسن وقبح کو جاننا اور ثابت کرنا۔

دوسرا موعظۂ حسنہ: اس سے مراد اچھے اجر کی نوید سنا کر عملِ خیر کی ترغیب دینا اور عذاب کی وعید سنا کر عملِ شر سے بچنے کی تلقین کرنا۔

تیسرا جدالِ احسن: کسی شخص کا دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے اور اپنی علمی برتری منوانے کے لئے دوسرے سے بحث وتمحیص کرنا جدل محض ہے، اور حق کی حقانیت اور باطل کے بطلان کو ثابت کرنے کیلئے دلنشیں اور مؤثر انداز میں دلائل دینا "جدالِ احسن" ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن کعب بن مالک قال: قال رسول اللہ ﷺ: من طلب العلم لیجاری بہ العلماء اولیماری بہ السفہاء اویصرف بہ وجوہ الناس الیہ ادخلہ اللہ النار۔

"کعب بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو علم اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اس کے ذریعے علماء سے مقابلہ کرے یا جاہلوں سے (اپنی علمی برتری ثابت

کرنے کیلئے) بحث ومناظرہ کرے یا اس لئے کہ لوگوں کا رخ اپنی جانب پھیر دے تو اللہ اسے جہنم میں داخل کرے گا"۔ (مشکوٰۃ کتاب العلم بحوالہ ترمذی)

لہٰذا دین دار بزرگوں کو لعن طعن اور ڈانٹ ڈپٹ کا وتیرہ اختیار کرنے کے بجائے پیار ومحبت اور ترغیب وترہیب کا انداز اپنانا چاہیے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن انس عن النبی ﷺ قال: یَسِّرُوا ولا تُعَسِّرُوا وبَشِّرُوا ولا تنفّروا۔

"حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (دین کو) آسان کرکے پیش کرو، مشکل کرکے پیش نہ کرو، اور (لوگوں کو رحمت الٰہی کی) بشارت دو انہیں متنفر نہ کرو"۔ (صحیح بخاری کتاب العلم، رقم الحدیث: ٦٨)

نماز باجماعت میں پہلی صف میں امام کے قریب ترجیحی طور پر ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو ضرورت کے وقت امام کی نیابت کرسکیں، باقی لوگ جس ترتیب سے آئیں گے اسی ترتیب سے صف بندی کرکے نماز باجماعت میں شامل ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے داڑھی بڑھانے کا حکم فرمایا ہے، لہٰذا داڑھی رکھنا واجب ہے اور اسے کٹوانا مکروہ تحریمی ہے، اور ایسا کرنے والا فاسق ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ داڑھی کٹوانے اور زنا کرنے کی قباحت اور حرمت ایک ہی درجے کی ہے، غلط ہے، زِنا حرامِ قطعی ہے اور اس کی حرمت کا انکار کفر صریح ہے۔

☆☆☆..........☆•••☆••☆..........☆☆☆

صوفیائے نقشبندیہ کے ہاں اعضاء انسانی کے ذکر کا تصور موجود ہے جسے ذکر خفی کہتے ہیں۔

میں نے اس سوال کا مندرجہ بالا جواب اپنی فہم کے مطابق دے دیا تھا۔ بعد میں علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز کی ایک تحریر نظر سے گزری، جو بظاہر میرے جواب کی مؤید ہے، وہ درج ذیل ہے: ''جلوہ ہائے حقیقت محمدیہ کے ناپاک اور خبیث چیزوں میں پائے جانے کی وجہ سے اگر آپ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں حضور کی توہین ہے تو ذرا اس امر پر غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں پندرہویں پارے میں ارشاد فرماتا ہے: وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ۔ اور تسبیح کے متعلق علمائے اعلام ومفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ تسبیح حقیقی ہے جیسا کہ مفرداتِ امام راغب مطبوعہ، ص:220 پر مرقوم ہے۔ فذلک یقتضی ان یکون تسبیحا علی الحقیقة یعنی دلائل وقرائن کا تقاضا یہ ہے کہ آیۂ کریمہ میں تسبیح حقیقت پر محمول ہو یعنی تسبیح قولی مراد لی جائے اور صرف امام راغب ہی نہیں بلکہ علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ تفسیر روح المعانی پارہ 15، ص:79 پر تسبیح قولی حقیقی پر احادیث وآثار کثیرہ نقل فرما کر لکھتے ہیں: الی مالا یکاد ویحصی من الاخبار والآثار و ھی بمجموعھا متعارضة فی الدلالة علی ان التسبیح قال کما لا یخفیٰ و ھو مذھب الصوفیة۔ یعنی بے شمار احادیث اور آثار مجموعی قوت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ جس تسبیح کا ذکر فرما رہا ہے وہ ''تسبیح قالی'' ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور یہی صوفیہ کا مذہب ہے، اس کے بعد ص:80 پر فرماتے ہیں: ولعل الاولیٰ فیه ان یلتزم حمل التسبیح علی ما ھو الا عم من الحالی والقالی ویثبت کلا النوعین لکل شیء۔ یعنی اولیٰ یہ ہے کہ یہاں تسبیح سے عام تسبیح مراد لی جائے جو حالی اور قالی دونوں کو شامل ہو اور دونوں قسم کی تسبیح ہر شے کے لیے ثابت کی جائے۔ ان عبارات سے یہ بات روز روشن کی ثابت ہے کہ عالم کا ہر ذرہ (خواہ پاک ہو یا ناپاک، خبیث ہو یا طیب) حالی اور قالی تسبیح حقیقی میں مصروف ہے اب صرف اتنی بات غور طلب ہے کہ یہ تسبیح ناپاک اور خبیث چیزوں میں پائے جانے کی وجہ سے کہیں ناپاک تو نہیں ہوگئی، اگر تسبیح خداوندی ہر ناپاک اور خبیث چیز میں پائی جاسکتی ہے تو جلوہ ہائے حقیقت محمدیہ کا پایا جانا کیوں قابل اعتراض ہے، نجاست جس قسم کی ہوتی ہے اسی قسم کی اشیاء میں اثر کرتی ہے، دیکھیے مشرکین نجس ہیں، لیکن اگر کوئی مشرک اپنا صاف ستھرا ہاتھ پانی میں ڈال دے تو وہ پانی ناپاک نہ ہوگا، حالانکہ شرک ناپاک۔

ہے۔ اس پانی کے ناپاک نہ ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ پانی اس عالم اجسام کی قسم سے ہے اور مشرک کی نجاست محض اعتقادی ہے، امور اعتقادیہ عالم اجسام کی قسم سے نہیں، لہٰذا یہ نجاست پانی میں اثر نہیں کر سکتی، بخلاف جسمانی نجاست کے کہ وہ اشیاء جسمانیہ کو متاثر کرے گی۔ رسول اللہ ﷺ کی حقیقت عالم امر بلکہ اس سے بھی بالاتر ہے اور یہ نجاست وخباثت کے آثار صورِ جسمانیہ سے متعلق ہیں جو عالم خلق کی چیز ہے۔ اب بتائیے کہ شرک کی اعتقادی نجاست پانی کو ناپاک نہیں کر سکتی تو نجاستیں حضور کے نور کو کس طرح ناپاک کر سکتی ہیں؟ آفتاب و ماہتاب، شعاع بصری اور چراغ کی روشنی رات دن نجس اور ناپاک چیزوں پر پڑتی ہے مگر ناپاک نہیں ہوتی، آپ اندازہ کیجئے کہ جو نجاست مذکورہ روشنی اور اس کی شعاعوں کو ناپاک نہیں کر سکتی، وہ حضور ﷺ کے نورانی جلوؤں کو کیونکر ناپاک کر سکے گی؟ جس طرح یہ نجاست اپنی ہی نوع کی چیزوں کو متاثر کر سکتی ہے، اسی طرح اس کا ازالہ بھی ایسی ہی ہم جنس اشیاء سے ہو سکتا ہے۔

اعتقادی نجاست پانی سے دور نہیں ہو سکتی، خواہ تمام دنیا کے سمندر مشرک کو پاک کرنے کے لیے صرف کر دیے جائیں، لیکن وہ پاک نہ ہوگا، اس کی پاکی کلمہ طیبہ کی تصدیق پر موقوف ہے، اگر وہ سچے دل سے ایک مرتبہ کلمہ طیبہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' پڑھ لے، تو جو نجاست دنیا کے پانیوں سے دور نہیں ہو سکتی وہ ایک آن میں زائل ہو سکتی ہے۔ اب اگر کوئی بے وقوف اس کلمہ طیبہ کو جسمانی نجاست کے ازالہ کے لیے استعمال کرے اور ناپاک جسم یا نجس کپڑے پر کلمہ شریف پڑھ کر پھونکنا شروع کر دے اور یہ خیال کرے کہ یہ کلمہ تو ایسا ہے کہ سات سمندروں سے جو چیز پاک نہ ہو سکے وہ اس سے پاک ہو جاتی ہے، یہ ماشہ بھر نجاست اس کے سامنے کیا حقیقت رکھ سکتی ہے، تو کیا اس بے وقوف کا خیال صحیح ہوگا؟ یقیناً نہیں۔ اس جسمانی نجاست کے لیے بہرصورت اسے پانی ہی استعمال کرنا پڑے گا۔ جو اس عالم اجسام کی چیز ہے۔ معلوم ہوا کہ عالم شہادت کی نجاستیں اسی عالم شہادت کی اشیاء کو متاثر کر سکتی ہیں اور جو نجاستیں جسمانیت سے الگ ہیں، ان کا اثر جسمانیات پر نہیں ہو سکتا پاکی اور ناپاکی کے اس فلسفے کو ذہن میں رکھ کر اگر آپ حاظر و ناظر کے مسئلہ کو سوچیں تو کوئی الجھن آپ کے ذہن میں باقی نہ رہے''۔ آگے چل کر انہوں نے لکھا: '' خلاصہ کلام یہ ہے کہ دنیا کی ناپاک اور خبیث چیزیں ہوں، جہنم کے طبقات ہوں یا کفار و مشرکین کی ذوات، اس بات کو ماننا پڑے گا کہ ان سب چیزوں میں خدا کی شان جلال و کمال اور اس کی صفت وقدرت کے کمال کے

وہ نمونے پائے جاتے ہیں جو کھلی ہوئی آیات اور روشن نشانیاں ہیں، جب ان خباثت ونجاست کے اثرات جلوہ ہائے جلال وجمال خداوندی پر اثر انداز نہیں ہو سکتے ،تو حقیقت محمدیہ کے جلوے بھی تو جمالِ خداوندی ہی کے جلوے ہیں، ان کو یہ چیزیں کیسے متاثر کر سکتی ہیں؟ (مقالاتِ کاظمی، جلد:3،ص126 تا128)''۔

اس کے بعد علامہ غلام رسول سعیدی کی مندرجہ ذیل تحریر نظر سے گزری، وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کو بندروں اور خنزیروں کا خالق کہنا ممنوع ہے: الزمر:62-61 میں فرمایا: اور اللہ متقین کو ان کی کامیابی کے سبب سے عذاب سے نجات دے گا، ان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ ہی غمگین ہوں گے، اللہ ہر چیز کا خالق اور ہر چیز کا نگہبان ہے'۔ اس آیت سے پہلی آیت میں مشرکین مکذبین کی وعید کا ذکر تھا اور اس آیت میں مؤمنین اور مصدقین کے وعدہ کا ذکر ہے۔ اس میں ان کے لیے بشارت ہے کہ ان کو کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی آفات سے محفوظ رہیں گے''۔

الزمر 62 میں فرمایا: ''اللہ ہر چیز کا خالق ہے''۔

اللہ تعالیٰ کی حمد میں یہ کہنا صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے وہ گندگی، کیڑے مکوڑوں اور بندروں اور خنزیروں کا خالق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف حسن اور اچھائی کی تخلیق کی نسبت کرنا صحیح ہے اور برائی کی تخلیق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں ہے۔ ہماری کتب عقائد میں اسی طرح مذکور ہے۔ علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی 791ھ لکھتے ہیں:

''یقال انه خالق الکل ولا یقال خالق القاذورات والقردة والخنازیر۔ یہ کہا جائے گا کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ گندگیوں، بندروں اور خنزیروں کا خالق ہے۔ (شرح المقاصد، ج:4،ص:275، ایران، 1409ھ)''۔ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی 816ھ لکھتے ہیں:

''انما لا یطلق لفظ الشریر علیه کما لا یطلق لفظ خالق القردة والخنازیر مع کونه خالقالهما۔ اللہ تعالیٰ پر لفظ شریر کا اطلاق نہیں کیا جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ پر یہ اطلاق نہیں کیا جائے گا کہ وہ بندروں اور خنزیروں کا خالق ہے، حالانکہ وہ ان کا خالق ہے، (شرح

المواقف، ج:8، ص:63، مطبوعہ: ایران)''۔ علامہ قاسم بن قطلوبغا حنفی متوفی 881ھ لکھتے ہیں: ''ولا یصح ان یقال خالق القاذورات و خالق القردة والخنازیر مع کونها مخلوقة له اتفاقا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ وہ گندگیوں، بندروں اور خنزیروں کا خالق ہے، حالانکہ بالاتفاق یہ تمام چیزیں اسی کی مخلوق ہیں، (المسامرۃ شرح المسایرہ، ص:127، دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مکران)''۔ امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ خالق الاجسام ہے اس کو کیڑے مکوڑوں اور بندروں کا خالق کہنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس قسم کے الفاظ سے اس کی تنزیہ واجب ہے، (تفسیر کبیر، ج:5، ص 417، دار احیاء التراث العربی، بیروت 1415ھ)''۔

یہ کہنا کفر ہے کہ میری آنتیں ''قل ھو اللہ'' پڑھ رہی ہیں اور دیگر کفریہ محاورے:

بعض لوگ شدید بھوک کا اظہار کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں: ''میری آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں''، یہ کلمہ کفریہ ہے کیونکہ آنتوں میں فضلہ اور براز ہوتا ہے اور یہ نجس چیز ہے اور نجس چیز کی طرف اللہ کے کلام کی نسبت کرنا کفر ہے۔ ملا علی قاری متوفی 1014ھ لکھتے ہیں:

من قال لا خرطبخ القدر بقل هو الله احد کُفِرَ۔ جس نے دوسرے شخص سے کہا: ''پتیلی نے قل ھو اللہ احد سے کھانا پکایا''، اس شخص کی تکفیر کی جائے گی۔ علامہ حسن بن منصور ابن جندی متوفی 592ھ لکھتے ہیں:

''جس شخص نے مذاق سے یا استہزاء سے یا تخفیف کرتے ہوئے کلمہ کفر کہا، وہ سب کے نزدیک کافر ہو جائے گا خواہ اس کا اعتقاد اس کلمہ کفر کے برخلاف ہو، (فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ، ج3، ص:577، البحر الرائق ج5، ص:120، المحیط البرہانی ج5، ص:562)''۔

بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ ہر چیز خدا کی حمد اور تسبیح کرتی ہے، قرآن مجید میں ہے: ''وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ''۔ ہر چیز اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے، بنی اسرائیل:44)۔ اور ہر چیز کے عموم میں آنتیں بھی داخل ہیں، سو ان کا قل ھو اللہ پڑھنا بھی جائز ہونا چاہیے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز کے عموم میں تو لید اور پیشاب بھی داخل ہے تو کیا ان کی طرف بھی حمد اور تسبیح کی نسبت کی جائے؟ اس لیے اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ ہر چیز جو طاہر اور طیب ہو اور

مبتذل نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح کرتی ہے، فقہاء نے ہانڈی و دیگچی کی طرف بھی قل ھو اللہ پڑھنے کی نسبت کرنے کو کفر قرار دیا ہے، حالانکہ ہانڈی نجس ہے اور نہ نجاست کا محل ہے اور آنتیں نجاست کا محل ہیں، تو ان کی طرف "قل ھو اللہ" پڑھنے کی نسبت کرنا بہ طریق اولیٰ کفر ہوگا، اسی طرح یہ محاورات بھی کفریہ ہیں: فلاں نے فلاں کو صلوٰتیں سنائیں۔ اس میں گالم گلوچ اور فحش کلام پر صلوٰۃ کا اطلاق ہے، اسی طرح یہ محاورہ بھی کفریہ ہے: نمازیں بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑ گئے، اس میں روزوں سے بیزاری کا اظہار ہے، (تبیان القرآن، جلد:10، ص:289-288)"۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو اجمالی طور پر کہنا ہے کہ اللہ خالق کل شیءٍ" یعنی اللہ ہر چیز کا خالق ہے"، اس عموم میں بلاشبہ طیب و طاہر اور خبیث و نجس ہر طرح کی مخلوق شامل ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر و شر ہر چیز کا خالق ہے، لیکن بطور خاص اسے "خالق خنزیر" کہنا فی نفسہٖ معنوی اعتبار سے درست ہونے کے باوجود خلافِ ادبِ بارگاہِ الوہیت جل وعلا ہے۔ اسی طرح وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ "یعنی ہر چیز (اپنی نوع اور حال کے مطابق) اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح بیان کر رہی ہے، (بنی اسرائیل:44)"، یہ بھی اپنے عموم کے اعتبار سے تمام مخلوقات کی تسبیحات و اذکار کو شامل ہے، لیکن بطور خاص کہنا کہ: "آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں" بھی فی نفسہٖ معنوی طور پر درست ہونے کے باوجود آدابِ بارگاہِ الوہیت جل علا کے خلاف ہے اور کلمہ کفر ہے، لہٰذا میں اپنے سابقہ فتوے سے رجوع کرتا ہوں اور قائل سے بھی کہتا ہوں کہ توبہ کرے اور تجدید ایمان کرے اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی دانستہ و نادانستہ تقصیرات کو معاف فرمائے۔

قرآن مجید نے ہمیں ذاتِ باری تعالیٰ کا یہی ادب سکھایا ہے، چند آیات مبارکہ ملاحظہ ہوں:

۱۔ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ

ترجمہ: تمہیں جو بھلائی پہنچتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور تمہیں جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی ذات کے سبب ہے، (النساء:79)"۔

2۔ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۙ﴿۷۸﴾ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ۙ﴿۷۹﴾ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۪ۙ﴿۸۰﴾ (الشعراء)

"(اللہ) وہ ہے، جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی مجھے راہ راست پر چلاتا ہے، اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور وہی ہے جب میں بیمار ہوتا ہوں، تو مجھے شفا دیتا ہے"۔

درحقیقت بیماری بھی اللہ کی طرف سے ہے اور شفا بھی اسی کی عطا ہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مرض (جو کہ نقص و عیب ہے) کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی اور شفا (جو کمال ہے) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی۔

3۔ اَمَّا السَّفِیۡنَۃُ فَکَانَتۡ لِمَسٰکِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ فِی الۡبَحۡرِ فَاَرَدۡتُّ اَنۡ اَعِیۡبَہَا وَ کَانَ وَرَآءَہُمۡ مَّلِکٌ یَّاۡخُذُ کُلَّ سَفِیۡنَۃٍ غَصۡبًا ﴿۷۹﴾

اور کشتی جو تھی، وہ مسکین بندوں کی تھی، جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے تھے، تو میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار کردوں، اور ان کے پیچھے ایک (ظالم) بادشاہ تھا، جو ہر (عمدہ) کشتی کو غصب کر لیتا تھا، (الکہف: 79)''۔ اسی سورت کی آیت نمبر 82 میں فرمایا:

4۔ وَ اَمَّا الۡجِدَارُ فَکَانَ لِغُلٰمَیۡنِ یَتِیۡمَیۡنِ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ وَ کَانَ تَحۡتَہٗ کَنۡزٌ لَّہُمَا وَ کَانَ اَبُوۡہُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّکَ اَنۡ یَّبۡلُغَاۤ اَشُدَّہُمَا وَ یَسۡتَخۡرِجَا کَنۡزَہُمَا ٭ۖ رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ ۚ وَ مَا فَعَلۡتُہٗ عَنۡ اَمۡرِیۡ ؕ۔

ترجمہ: دیوار جو تھی، وہ شہر میں دو یتیم لڑکوں کی (ملکیت) تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ (دفن) تھا اور ان کا باپ (مرد) صالح تھا، تو تمہارے رب نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ کر اپنا خزانہ نکال لیں، (ان کے ساتھ یہ حسن سلوک) تمہارے رب کی رحمت کے سبب سے ہے، اور میں نے (یہ سب کچھ) اپنی مرضی سے نہیں کیا''۔ حضرت خضر علیہ السلام نے مسکین مزدوروں کی کشتی کو عیب دار بنانے کی نسبت اپنی طرف کی (کیونکہ یہ ایک نقص ہے) اور دو یتیم لڑکوں کی دیوار کی تعمیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی (جو ایک خوبی ہے) حالانکہ انہوں نے خود بتا دیا کہ یہ دونوں کام انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام دیئے۔

غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی نور اللہ مرقدہم نے جو لکھا وہ دراصل تحقیقی انداز میں نہیں بلکہ الزامی انداز میں ہے، یعنی جو معاندین رسول اللہ ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کے منکر ہیں اور طرح طرح کے موانع وارد کرتے ہیں اور تعریضات کرتے ہیں، تو اس طرح کے موانع اور تعریضات تو پھر اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اپنے علم اور قدرت کے اعتبار سے ہر جگہ موجود ہونے پر بھی وارد ہو سکتے ہیں، تو ''فما ھو جوابکم فھو جوابنا'' یعنی تم شان الوہیت کی تنزیہہ و تقدیس کے شایانِ شان جو جواب دو گے، اس کا اطلاق شانِ رسالت کی تقدیس پر ہوگا۔

نوٹ: اگر فجر کے فرض وقت پر ادا کر دیے ہوں اور صرف سنتیں رہ گئی ہوں، اُس دن طلوع آفتاب کے بیس منٹ بعد اور زوال سے پہلے ان سنتوں کی قضا پڑھ لینا امام محمد کے نزدیک مستحب ہے، کوئی نہ پڑھے تو اس پر کوئی ملامت نہیں ہے، شیخین کے نزدیک مستحب تو نہیں ہے، لیکن کوئی پڑھ لے تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجم

ادارہ ضیاء المصنفین

بھیرہ شریف کی زیر نگرانی

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کا

تفسیر درمنثور 6 جلد

زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاھور

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

کی زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی مؤثر تصنیف

تفسیر سورۃ النسآء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم تفسیر، اندازِ بیان مؤثر و دلکش
قدیم و جدید اہم تفاسیر کا نچوڑ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

جلد سوم

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور • کراچی • پاکستان

إن هذا العلم دين فانظروا عمن تأخذون دينكم (مسلم)
بے شک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل
جلد سوم

روزمرہ زندگی کے قدیم وجدید فقہی، علمی اور عقلی مسائل کا اسلامی حل

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی - پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد سوم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
تصحیح	مولانا فیصل ندیم احمد قادری (ایم اے، ایل ایل بی، بی ایڈ)
طبع بار	ہفتم، اکتوبر 2011ء
	ہشتم، دسمبر 2012ء
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ6
قیمت	-/450 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں نے ضیاء القرآن پبلی کیشنز
کی شائع کردہ کتاب
تفہیم المسائل جلد سوم
تالیف وتصنیف
پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب
کے پروف پوری توجہ سے پڑھے ہیں، میرے علم کے مطابق اس کتاب میں درج قرآنی آیات کے الفاظ اور اعراب غلطیوں سے مبرا ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

فقط

حافظ محمد ابراھیم فیضی

گذارش احوال واقعی

تفہیم المسائل کے سوالات وجوابات اولاً روزنامہ ایکسپریس کے جمعہ کے ایڈیشن میں شائع ہوتے ہیں، اس سلسلے میں ہمیں بعض ناخوشگوار تجربات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، مثلاً: (1) عربی عبارات حذف کرنی پڑتی ہیں، جبکہ کتاب کی تدوین کے وقت یہ عبارات دوبارہ شامل کرنی ہوتی ہیں، اس طرح دہری مشقت حصے میں آتی ہے اور اس طرح بعض اوقات ترتیب میں ردوبدل ہوجاتا ہے۔(2) بعض اوقات اخبار والے کوئی عبارت حذف کردیتے ہیں، چونکہ یہ ان کا شعبہ نہیں ہے، بس اپنی عقل ودانش کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں، اس لئے عبارت کا تسلسل اور ربط مجروح ہوجاتا ہے اور ہمیں دوبارہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ (3) کبھی ان کی پالیسی حارج ہوجاتی ہے، وغیرہ۔ اسی بنا پر ''تفہیم المسائل'' کی جلدسوم کی ''اشاعتِ اوّل'' کے بعد میں نے اس پرنظرِ ثانی کا فیصلہ کیا۔ اس کارِ خیر میں ہمارے دارالعلوم کے استاذِ حدیث اور انتہائی فاضل مدرس علامہ احمد علی سعیدی زیدمجدہم نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے پوری کتاب کو حرفاً حرفاً پڑھا اور مفید حذف واضافات کئے، جسے میں نے من وعن قبول کیا۔ اسی طرح ممتاز مصنف اور صاحبِ طرز ادیب وخطیب علامہ محمد اعظم سعیدی زیدمجدہم نے بھی ایک نظر اسے عجلت میں پڑھا اور ان کے مفید مشوروں کے نتیجے میں بعض مقامات پرابہام واِجمال کورفع کرنے میں مدد ملی میں ان دونوں حضرات کا تہ دل سے شکرگزار ہوں اور دعا گو ہوں کہ جعل اللّٰہ سعیہم مشکوراً۔ میری خواہش ہے کہ یہ کتاب ہماری ناچیز استعداد واستطاعت کے مطابق ممکنہ حدتک اغلاط سے مبّرا ہو، سلیس اور عام فہم ہو اور علمی سقم سے پاک ہو۔ اس کے باوجود غلطی کے احتمال کی قطعی نفی کا دعویٰ تعلّی کے مترادف ہوگا۔ تمام اہلِ علم سے گذارش ہے کہ کسی لفظی یا معنوی غلطی یا خطا پر مُطّلع ہوں تو ''تعاونوا علی البر والتقویٰ'' اور ''الدین النصیحہ'' کے جذبے کے تحت ضرور مطلع فرمائیں، میں متشکر وممنون ہوں گا۔ کتاب کو بار بار کمپوزنگ اور تصحیح کے مراحل سے گذرنا پڑا، اس سلسلے میں عزیزِ محترم یاسر رحمان کی محنتِ شاقّہ کی میں دل سے قدر کرتا ہوں اور ان کے لئے دعا گو ہوں۔

بندۂ عاجز

منیب الرحمن

☆انتساب☆

میں اپنی اس ناچیز علمی کاوش کو اپنے
جدامجد حضرت قبلہ قاضی عبداللہ رحمہ اللہ تعالیٰ ونور اللہ مرقدہٗ
کے نام منسوب کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں،
جو دینی علوم کے عالم کامل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ ورع
وتقویٰ بھی تھے اور اس خطے میں اپنے عہد کے امام الصرف تھے۔

10، جولائی 2006ء

العبد الضعیف
منیب الرحمن

مضمون صفحہ نمبر

حدیثِ دل 15

کتاب العقائد 19

اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنا 21

عصمتِ آدم علیہ السلام 23

غیر صحابی کو "رضی اللہ عنہ" کہنے کا جواز 32

کتاب الطہارت 37

موجودہ زمانے میں ناپاکی کے مسائل میں درھم کی مقدار کتنی ہے؟ 39

ناک میں پانی نہ ڈالنے اور کلی کے بغیر وضو کا حکم 39

کتاب الصلوٰۃ 41

دعاء اذان سے پہلے درود شریف 43

اذان سے قبل یا بعد با آواز بلند درود وسلام پڑھنا 44

رسول اللہ ﷺ کے بذات خود اذان دینے کا ثبوت 47

معذور پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے 50

نماز کے دونوں سجدوں کی شرعی حیثیت 51

فاسق امامت کا اہل نہیں 53

نماز کے اندر قراءت میں غلطی پر امام کو لقمہ دینا 55

فرسٹ فلور پر نماز باجماعت کا حکم اور گراؤنڈ فلور پر نمازیوں کا جماعت میں شامل ہونا 60

معذور کیلئے اشارے سے رکوع وسجود کرنا 61

معذور کیلئے اشارے سے رکوع وسجود کرنا 63

قعدۂ اولیٰ بھول کر کھڑا ہو جانا 63

مسجد میں لڑائی جھگڑے اور شور وشغب کا حکم	67
ایک مسجد میں تراویح کی دو جماعتیں	68
نماز قصر کی بابت ایک مفتی صاحب کا فتویٰ	69
نمازِ قصر میں سفر کی شرعی مقدار	72
سرکاری زمین پر بغیر لیز یا الاٹمنٹ مسجد کی تعمیر اور شرعی حیثیت	73
درود وسلام اور اذان کے درمیان اعلان کرنے کا حکم	75
قضاءِ عمری پڑھے جانے کے لیے کونسا وقت موزوں ہے	81
مسبوق کی نماز میں سہو	82
پہلی صف کے فضائل	83
بیٹھ کر نماز پڑھانے والے امام کی اقتداء	86
کتاب الجنائز	91
امامت نمازِ جنازہ کا سب سے زیادہ حق دار کون؟	93
جنازہ اٹھاتے اور لے جاتے وقت بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھنا	96
ماں کے انتقال کے بعد بچے کی نگہداشت وتربیت کا اولین حق کس کو حاصل ہے؟	106
نمازِ جنازہ کی شرعی حیثیت	107
میت کی باقیات کو نکلوا کر دوسری زمین میں منتقل کرنے کا حکم	109
سانحۂ گھوٹکی میں جاں بحق ہونے والوں کی اجتماعی وامامنا تدفین	113
سانحۂ گھوٹکی میں غیر مسلم کی نمازِ جنازہ	117
دعاء بعد الجنازہ	118
دعا بعد الجنازہ ضرب مومن کے مفتی محمد کا جواب اور ہمارا جواب الجواب	125
کتاب الزکوٰۃ	153
مسائلِ زکوٰۃ	155

مسئلہ زکوٰۃ	157
مسئلہ زکوٰۃ	157
زکوٰۃ، فطرہ، صدقات واجبہ اور قربانی کی کھال کے مصارف	160
کتاب الصوم	161
اعتکاف رمضان المبارک	163
معتکف کا محراب مسجد میں جانا	163
حالت اعتکاف میں غسل مسنون کا مسئلہ	164
مسجد کے اندر رہتے ہوئے معتکف کا ٹونٹی پر ہاتھ دھونا	164
کتاب الحج	165
حج کا بیان	167
استطاعت	167
عمرہ ادا کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا	169
خواتین کا محرم کے بغیر حج	170
روانگیٔ حج سے پہلے اگر ماہواری کا خون آجائے تو کیا کرنا چاہئے؟	172
عمرہ ادا کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا، بھائی کو نفلی عمرہ کرانا جائز ہے۔	
بھائی سے قطع تعلق کرنا	172
خواتین کیلئے حج وعمرے کی شرائط	175
والد کا حجِ بدل پہلے یا اپنا فریضۂ حج؟	177
فریضۂ حج سے بریٔ الذمہ ہونے کے لئے حجِ بدل کے شرائط	182
کتاب النکاح	185
حرمتِ نکاح	187
مہر مؤجل یا معجّل کا حکم	187
شوہر کے کلمات کفر کہنے سے نکاح باطل ہوجاتا ہے	188
عقد ثانی کیلئے پہلی بیوی کی اجازت کا مسئلہ	195

نکاح پر نکاح کا شرعی حکم 196
مہر موَجل یا معجل کی شرعی حیثیت 206
جہیز و بری کے سامان کی ملکیت کا مسئلہ اور ایام عدت کا نفقہ 211
بیوی کا الگ جائے رہائش کا حق 213
مہر کا معاہدہ اور مہر کی رقم میں اختلاف 215
لے پالک کے نکاح کے وقت ولدیت کا مسئلہ 226
لاوارث بچے کی ولدیت کا مسئلہ 236
عقدِ نکاح کے بعد رخصتی میں تاخیر وازدواجی حیثیت 238
زوجِ معنت 238
سوتیلی بیٹی سے نکاح 246

کتاب الطلاق

249
تحریری طلاق اور نفقہ 251
طلاق رجعی 251
ایک طلاق تصور ہوگی 253
مسئلہ طلاق 257
مسئلہ طلاق وحقوق ازدواج 259
مسئلہ دو طلاق رجعی 261
مسئلہ تفویض طلاق 262
عدالتیں ''فسخ نکاح'' اور ''خلع'' میں فرق کریں 267
بیوی کو محض اذیت دینے کی خاطر لٹکائے رکھنا 274
دو طلاق کے بعد رجوع 276
محض ارادۂ طلاق سے طلاق واقع نہیں ہوتی 277
تین طلاق کا مسئلہ 278

تحریری طلاق کا حکم 280

طلاق نامہ پر شوہر کے جعلی دستخط 282

حالتِ حمل میں نفاذِ طلاق 284

جائز شرعی وجوہ کی بنا پر عورت عدالت سے فسخِ نکاح کی استدعا کرسکتی ہے 287

عدت کے احکام 289

طلاق کے کاغذ پر مکان کے کاغذ کہہ کر دھوکے سے دستخط لینا 293

ایلاء 295

الفاظِ صریح یا کنایہ کا تعین 298

دو طلاق کا حکم 299

تعلیقِ طلاق 300

نکاح سے پہلے طلاق مؤثر نہیں ہوتی 302

کتاب العدت 307

دورانِ عدت ملک سے باہر جانے کی اجازت؟ 309

عدت کے دوران بیوہ کو سسرال والے گھر سے نکالتے ہیں 312

کتاب الرضاع 315

مسئلہ رضاعت 317

شک سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی 317

رضاعی بھتیجی سے نکاح جائز نہیں 319

رضاعت کا مرضعہ کے اقرار یا گواہوں سے ہوگا 321

مسئلہ رضاعت 322

کتاب الفرائض 325

والدین کی نافرمانی کا وبال اور اولاد کو عاق کرنے کی شرعی حیثیت 327

مسئلہ وراثت و ہبہ 335

مسئلہ ہبہ	336
مرحومہ بیوی کے ترکے کا مسئلہ	337
تقسیم ترکہ (دو بیوی، تین بیٹے، تین بیٹیاں)	338
مسئلہ وراثت	339
تقسیم وراثت کا مطالبہ کرنا	340
بیوہ کی شادی سے اس کا حق وراثت باطل نہیں ہوتا	342
دفتر کے واجبات میں ورثاء کا حق	342
تقسیم ترکہ یا ہبہ؟	345
اولاد کو ہبہ کرنا	346
مسئلہ وراثت	349
مناسخہ	351
غیر مسلم ہونے کے شک کی بناء پر وراثت میں حصے کا حکم	352
تقسیم ترکہ	353
تقسیم ترکہ	354
ترکہ میں نواسے اور نواسیوں کو حصہ ملے گا یا نہیں؟	355
تقسیم ترکہ	356
تقسیم ترکہ	357
لے پالک بیٹی کا شرعاً کوئی حصہ نہیں	357
تقسیم وراثت وہبہ	358
تقسیم ترکہ (بیوہ، تین بیٹے، تین بیٹیاں)	359
دادی اور پھوپھیاں محروم رہیں گی	360
تقسیم وراثت	361
تقسیم ترکہ (بیوہ، چار بیٹے، ایک بیٹی)	362
وراثت میں حق تلفی کا عذاب	362

تقسیم ترکہ وہبہ 363
مسئلۂ ہبہ 366
مسئلۂ وراثت وہبہ 367
مسئلہ وراثت 367
زندگی میں والد نے جو کچھ دیا ترکے سے منہا نہیں ہوگا 368
مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت 369
مسئلہ وراثت 372
مسئلہ وراثت 373
وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں 373
تقسیم وراثت 375
بیٹے کا باپ سے تقسیم وراثت کا مطالبہ 376
مسئلہ وراثت 377
حلال وحرام .... جائز وناجائز 379
حالت جنابت میں قرآن کی تلاوت 381
سورۃ الرحمٰن کی آیت کا جواب دینا 382
مسجد میں تلاوت قرآن اور درس وعظ میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال 383
مسجد کے ملبے کا استعمال 387
مزارات پر حاضری 390
فاتحہ کا مفہوم، طریقہ، مروّجہ فاتحہ کی شرعی حیثیت 394
شادی کی قسم کھانا 405
بلاضرورت قسم کھانے کا حکم 406
عورت کا غیر محرم کے ساتھ مشترکہ خاندان میں رہنا 407
ہندوستان سے مسلمانوں کی کمپنی کے درآمد شدہ حلال ذبیحہ کا حکم 410

پینشن اور پراویڈنٹ فنڈ میں حکومت کی طرف سے اضافی رقم 411

مسجد کے چندے پرحق الخدمت کی ادائیگی 412

متفرق 417

کیاعصری علوم کے ماہرین بھی قرآن وحدیث میں بیان کردہ فضیلتِ علم کے حق دار ہیں؟ 419

مقررہ تعداد میں اوراد ووظائف اور تسبیحات واذکار کی حکمت 425

حفظ کے بچوں کیلئے سجدۂ تلاوت کا مسئلہ اور تلاوت کا ایصالِ ثواب 431

ہلالِ رمضان، یوم النحر وعاشورہ کی تعیین کیلئے 436

قیاسات وتخمینی ضابطوں کی شرعی حیثیت 436

کھانے کے آداب اور مسنون طریقہ 441

حدِ قذف 451

خود کو غیر مسلم ظاہر کرنے کا حکم 455

'امانت رکھنے اور واپس کرنے کا حکم 457

بوسیدہ اور ناقص قرآنی نسخہ جات اور اوراقِ قرآنی کا مسئلہ 460

بیع اور برطانیہ کا قانون 464

قرآن وسنت کی روشنی میں ''تحفظِ خواتین بل'' کی شرعی حیثیت 466

قتلِ ناحق 483

قتلِ ناحق کا شرعی حکم 485

مفتی منیب الرحمٰن
صدر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان
مہتمم: دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حوالہ نمبر ________
مورخہ ________

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رحمۃ للعٰلمین، سیدنا ومولانا محمدٍوّعلیٰ اٰلہ الطیبین الطاھرین وعلیٰ صحابتہ الصدیقین الکاملین، وعلیٰ اولیاءِ امتہ وعلماءِ ملتہ من الفقھاء المجتھدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

﴿حدیثِ دل﴾

الحمدللہ علیٰ احسانہ ''تفہیم المسائل'' کے عنوان سے ہم نے روزنامہ ''ایکسپریس'' کی اشاعتِ جمعہ کے دینی صفحے پر سوال وجواب کا جوسلسلہ شروع کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے قبولِ عام عطا فرمایا، ملک اور بیرونِ ملک دینی ذوق رکھنے والے قارئین کرام نے اس کی تحسین فرمائی۔ بعد میں ہم نے اس کی افادیت کے پیشِ نظر احباب کی خواہش پر کتابی شکل میں تفہیم المسائل جلد اول ودوم کے نام سے شائع کیا اور قلیل مدت میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوگئے، ہم اللہ تعالیٰ کے اس بے پایاں کرم اور اہلِ علم وقارئین کرام کی حوصلہ افزائی پر متشکر وممنون ہیں۔

اب تفہیم المسائل جلد سوم پیشِ خدمت ہے، اس میں بعض نئے مفید اور دلچسپ مسائل

مرکزی دفتر
تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان
Ph: 042-4237490, Fax: 042-4237289
رابطہ دفتر
دارالعلوم نعیمیہ
بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی
Ph: 92 21 63 4050 Fax: 92 21 6370003
www.naeemia.com mufti@naeemia.com

ہیں، اس امر کا اندازہ آپ کو فہرست پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہو جائے گا، ہمیں امید ہے ان شاء اللہ العزیز قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔

ہم نے سلسلہ تفہیم المسائل کی اشاعت کی ذمہ داری اہلسنت کے انتہائی مؤقر و ممتاز اشاعتی ادارے ''ضیاء القرآن پبلی کیشنز'' کو تفویض کی ہے۔ یہ ادارہ محسنِ اہلسنت منبع کرم حضرت علامہ جسٹس پیر کرم شاہ الازہری قدس سرہم العزیز کی باقیاتِ صالحات میں سے ہے، اور یہ ''وہ شجرۂ طیبہ ہے'' جس کی مہک و بہار میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ادارے کے منتظم اعلیٰ صاحبزادہ حفیظ البرکات شاہ صاحب زید مجدہٗ گفتار و کردار، نفاستِ طبع، متوازن و متواضع مزاج، طبیعت میں ٹھہراؤ اور وقار و تمکنت میں ''اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ'' کے مصداق، اپنے والد گرامی کا عکس ہیں، یہ حضرت قبلہ پیر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا فیضانِ نظر اور حسنِ تربیت ہے، بقول علامہ محمد اقبال ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے جس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

اللہ کرے وہ اسی روش پر ہمیشہ قائم و دائم رہیں اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں۔

مشاغل کثیرہ کے سبب بعض اوقات ہم روزنامہ ایکسپریس میں اپنا ہفتہ وار کالم تسلسل کے ساتھ اور بلا ناغہ جاری نہیں رکھ سکے، قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ ال تعالیٰ ہمیں مصروفیت کار سے ایسی فراغت عطا فرمائے کہ اس مشن کو تسلسل اور تندہی ـ جاری رکھ سکیں۔

ہم پیش آمدہ دینی مسائل کے حل کیلئے شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم کی تف تبیان القرآن اور شرح صحیح مسلم سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں اور براہ راست بھی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ان کا وجود اہلسنت و جماعت کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ انہوں نے تحریری میدان میں جو علمی شاہکار تخلیق کیے ہیں، مجھے امید ہے وہ آئندہ صد بلکہ ہزاریوں تک مطلع علم پر آفتاب نصف النہار کی طرح ضوفگن رہیں گے، جبکہ ان محض نفسانیت کی بنا پر بغض و حسد رکھنے والے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے

تلے دفن ہو جائیں گے، ارشاد باری تعالیٰ حق اور سچ ہے:

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۚ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾ (الرعد:17)۔

(ترجمہ) ''یعنی جھاگ تو بے فائدہ ہونے کی وجہ سے زائل ہو جاتا ہے، لیکن جو چیز انسانیت کیلئے نفع رساں ہوتی ہے، (اللہ تعالیٰ کی توفیق سے) وہ زمین میں قرار ودوام پاتی ہے''۔ آپ بھی ہمارے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل علامہ محترم کو اپنی تمام تر جسمانی، فکری، علمی اور عقلی قوٰی کی سلامتی کے ساتھ تادیر اپنے دین متین کی خدمت کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

میں اہلسنّت وجماعت کو یہ خوشخبری سنانا بھی اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ مصنفاتِ علامہ سعیدی، شرح صحیح مسلم اور تبیان القرآن کو ہمارے عہد کے دو ممتاز اکابر علماء اہلسنّت، علامہ عبدالحکیم شرف قادری اور علامہ محمد اشرف سیالوی مد اللہ ظلہما العالی نے مسلکِ اہلسنّت وجماعت کے لئے مستند ومتفق علیہا قرار دیا ہے، یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ دونوں اکابر ہمارے مسلک کے لئے حجت واستناد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں اکابر نے مذکورہ بالا کتب کی عبارات میں جن مقامات پر حذف، ترمیم وتبدّل یا تصحیح واضافے کا مشورہ دیا، علامہ صاحب نے بہ طیبِ خاطر اسے قبول فرمایا اور اب ان کتب کے آئندہ ایڈیشن اسی کے مطابق آرہے ہیں۔ اہل علم کے لئے ایک ایماں افروز نوید یہ بھی ہے کہ علامہ صاحب نے ''نعمۃ الباری'' کے نام سے شرح صحیح بخاری کی تصنیف کا آغاز کردیا ہے، امید ہے کہ یہ ایک منفرد وممتاز شرح حدیث ہوگی اور اس کا انداز شرح صحیح مسلم سے مختلف ہوگا۔

ممکن ہے مجھ سے کسی مسئلے کے تفہم یا تفہیم میں خطا ہوگئی ہو، اگر کوئی صاحب علم میری کسی خطا پر مطلع ہوں تو ازراہِ کرم اصلاح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، میں ہمیشہ ان کا ممنون رہوں گا۔

مفتی عبدالرزاق نقشبندی دارالافتاء میں میرے معاون ہیں اور اس کتاب میں درج

مسائل کی ترتیب وتخریج میں بھی ان کا تعاون شامل رہا ہے، میں ان کا شکرگزار ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے اور انہیں اپنی خصوصی توفیق وکرم سے نوازے۔

جلد سوم کی اشاعت سے پہلے میں نے حضرت علامہ مفتی محمد الیاس رضوی زید مجدہم سے خصوصی گذارش کی کہ وہ اس کتاب کے مسودے کا تفصیلاً اور بنظرِ عمیق مطالعہ فرمائیں، نفسِ عبارت اور ترتیب وتبویب میں جہاں اصلاح کی ضرورت محسوس ہو، بلاتردد وہاں اصلاح فرمائیں۔ میں حضرت مفتی صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میری درخواست کو قبول فرمایا اور اپنے قیمتی وقت کے کچھ لمحات مجھے عنایت فرمائے۔ مفتی صاحب کی فقہی جزیات پر اچھی نظر ہے، افتاء کا ملکہ بھی ہے اور مسائل کا استحضار بھی، اللہ عزوجل شانہٗ سے دعا ہے ان کے علم، عمر، ورع اور دینی خدمات میں مزید برکتیں عطا فرمائے۔

میں مولانا محمد ابراہیم فیضی کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اِن منتشر ومتنوع مسائل کی ترتیب وتدوین اور تبویب میں تعاون فرمایا اور تصحیح کی ذمہ داری کو بھی احسن طریقے سے نبھایا۔ اسی طرح ان فتاویٰ کا ریکارڈ محفوظ رکھنے میں مولانا محمد نصیر اللہ نقشبندی کا تعاون بھی شامل رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو ماجور فرمائے۔

ان شاء اللہ العزیز! ''تفہیم المسائل'' کی آئندہ مجلدات بھی آتی رہیں گی۔ میں بہ صد عجز ونیاز و بہ غایتِ خلوص اللہ جل شانہ، سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہِ بےکس پناہ میں ملتجی ہوں کہ وہ اپنے حبیبِ کریم علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہ الوف التحیۃ والتسلیم کے طفیل اس سعیِ ناتمام کو اپنی بارگاہِ عالی میں مقبول وماجور فرمائے اور اہلِ علم، اربابِ فکر ونظر اور دینی مطالعے کا ذوق رکھنے والے قارئین کی نظر میں اسے وقعت وتکریم عطا فرمائے۔ آمین۔

7 اگست 2006ء

بندۂ عاجز
منیب الرحمٰن
مہتمم دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

﴿کتابُ العقائد﴾

اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنا

سوال:1

زید کا ایک دوست ہے جس کا نام محبوب ہے زید اور محبوب میں اکثر مذاق ہوتا ہے، محبوب کا قد بھی چھوٹا ہے اور کھاتا پیتا بھی بہت زیادہ ہے تو زید نے مذاق میں محبوب کو بولا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محبوب! تو جتنا کھالے تیرا قد نہیں بڑھے گا اتنا ہی رہے گا، تو وہاں ایک اور صاحب تھے تو انہوں نے زید سے کہا: کلمہ پڑھو اور تجدید نکاح بھی کرنا جب گھر جاؤ گے ابھی نکاح ٹوٹ گیا ہے، کلمہ تو زید نے اسی وقت پڑھ لیا اب اس مسئلے کا شرعی حل ارشاد فرمائیں تاکہ زید کی پریشانی دور ہو سکے، کہ واقعی ان الفاظ کے کہنے سے نکاح ٹوٹ گیا ہے، کہ نہیں؟ اور ایمان بھی جاتا رہا کہ نہیں؟ وضاحت فرمائیں، (محمد شوکت، ناظم آباد)۔

جواب:

سوال میں مذکور یہ جملہ کہ'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محبوب! تو جتنا کھالے، تیرا قد نہیں بڑھے گا، اتنا ہی رہے گا'' کلمۂ کفر ہے، خواہ اس جملے سے اس کی نیت کفر کی ہو یا نہ ہو، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف دانستہ ایسا کلام منسوب کیا ہے، جو اس نے ارشاد نہیں فرمایا۔ لہٰذا ان کلمات کا قائل مسمّی زید ان کفریہ کلمات کے کہنے کی بنا پر کافر ہو گیا۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

"وفی الفتح من هزل بلفظ کفر ارتد وان لم یعتقده للاستخفاف فهو ککفر العناد"۔

ترجمہ: ''اور جس شخص نے مذاق میں کفریہ کلمہ کہا تو وہ مرتد ہو جائے گا، خواہ وہ اس کلمۂ کفر کا عقیدہ نہ بھی رکھتا ہو (یعنی اس نے وہ کلمۂ کفر قصداً نہیں کہا اور نہ ہی وہ ایسا عقیدہ رکھتا ہے، بلکہ محض بطور مذاق کہا ہے)، کیونکہ اس میں شانِ الوہیت کا ذکر بہ انداز حقارت ہے، یہ ایسا

ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص بر بنائے سرکشی کلمۂ کفر کہے"۔
اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:
"قلت ویظهر من هذا ان ما كان دليل الاستخفاف يكفر به وان لم يقصد الاستخفاف الخ"۔
ترجمہ ومفہوم: میں کہتا ہوں کہ (علامہ کمال الدین ابن ہمام صاحب فتح القدیر کی) اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس کے کلام سے شانِ الوہیت کی اہانت ہو، اس کی تکفیر کردی جائے گی، خواہ ایسے کلمات بول کر وہ اہانت کا ارادہ نہ بھی کرے، یعنی ایسے امور میں حکم ظاہر حال پر لگے گا۔ ورنہ لوگ روزمرہ کی گفتگو میں ذات باری تعالیٰ کو اپنی گپ شپ کا موضوع بنانے کی جسارت کرنے لگیں گے، جبکہ یہ مقامِ ادب ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3 ص:310 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔ علامہ ابن عابدین شامی کی اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں ازراہِ مذاق، بلا نیت اور غیر ارادی طور پر بھی توہین آمیز کلمات استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ شانِ الوہیت کو نشانۂ مذاق بنانے کی کسی طور پر بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اور اس کلام میں مزید فساد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے کلام کی نسبت کی گئی ہے جو اس نے ارشاد نہیں فرمایا، تو یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کذب وافتراء ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۱﴾
ترجمہ: "اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے، جس نے جھوٹ بول کر اللہ پر بہتان باندھا یا اس کی آیتوں کو جھٹلایا، بیشک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے"، (الانعام:21)۔
لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مذکورہ قول کے قائل سے کفر سرزد ہوا اور اس کا ایمان جاتا رہا، لہٰذا اس پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح فرض ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

عصمتِ آدم علیہ السلام

سوال:2

کیا فرماتے ہیں علمائے دینِ متین ومفتیانِ کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی اپنی بیان کردہ تفسیر بنام فہم القران کیسٹ نمبر ا سورۃ البقرہ میں آیت نمبر ۳۳ تا ۳۸ میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق کہتی ہیں: اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں آنے سے پہلے دنیا کی تمام چیزوں سے مانوس کردیا سب چیزوں کے نام سکھادیئے، پہلا علم دنیا کی چیزوں کا علم تھا۔'' اس علم کو لے کر حضرت آدم علیہ السلام شیطان کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکے''۔لہٰذا جب ان کو جنت میں بھیجا گیا تو شیطان ان کو بہکانے لگا اور ان کو جنت سے نکلوادیا جب وہ جنت سے نکلے تو اس کے بعد ان کو دنیا میں بھیجا گیا، بھیجنا تو پہلے بھی تھا مگر وہ شعر ہے، بڑے بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے: تو وہ عزت سے نکلنا تھا لیکن یہاں اللہ کی ناراضگی کے ساتھ نکلے۔کیا حضرت آدم علیہ السلام جو کہ اللہ کے نبی اور ابوالبشر ہیں ان کے متعلق یہ کہنا جائز ہے کیا یہ توہینِ رُسل نہیں ہے؟، (اسماء منیر، عالمہ اسلامک یونیورسٹی، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کی برأت کئی مقامات پر فرمائی۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۔

ترجمہ:'' اور بے شک اس سے پہلے ہم نے آدم سے عہد لیا تھا (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائیں) تو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا قصد نہ پایا''۔(طٰہٰ:115)۔

قرآن میں ایک سے زائد مقامات پر اس کا تذکرہ ہے کہ اس (شیطان) نے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کر حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو اپنے اخلاص کا یقین دلایا، اور انہیں یہ باور کرایا کہ اس سے انہیں حیاتِ ابدی حاصل ہوگی، (ملاحظہ ہو الاعراف:20,21)۔

جب ابلیس لعین سے حضرت آدم علیہ السلام کا مکالمہ ہوا اور ان کے دل میں اس کو کھانے کا

شوق پیدا ہوا تو فرطِ شوق میں وہ یہ بھول گئے کہ اس سے کھانے کی ممانعت تحریماً تھی اور انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا کہ یہ ممانعت تنزیہاً تھی، اس لئے آپ کا اس درخت سے کھانا اجتہادی خطا اور نسیان پر مبنی تھا، اور اجتہادی خطا اور نسیان گناہ نہیں ہے۔ لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر کوئی حرف نہیں آیا، اور ان کا توبہ و استغفار کرنا، ان کی تواضع اور انکسار ہے، اور ان کی ندامت اور شرمندگی اس وجہ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس ممانعت کو کیوں بھول گئے، اس کو یاد کیوں نہیں رکھا؟۔

ہر چند کہ بھول چوک سے بچے رہنا انسان کی قدرت اور اختیار میں نہیں ہے، لیکن اپنے بلند مقام کے اعتبار سے وہ یہ سمجھے تھے کہ ایک آن کیلئے اللہ تعالیٰ کے حکم کو یاد نہ رکھنا یا کسی چیز کے شوق سے اس قدر مغلوب ہونا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یاد نہ رہے، یہ بھی تقصیر ہے اور وہ اسی بنا پر ندامت اور شرمندگی سے روتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ اور استغفار کرتے رہے، تاہم آپ کا یہ فعل گناہ نہیں تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کا حکم دینا، ان کے حق میں سزا نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے مقصد تخلیق کی تکمیل ہے، کیونکہ ان کو زمین پر خلافتِ الٰہی کیلئے پیدا کیا گیا تھا کہ آپ زمین پر اللہ کے خلیفہ اور نائب بنیں، اور یہ نہ کہا جائے کہ اس معرکے میں ابلیس کامیاب ہو گیا اور آپ ناکام ہو گئے، کیونکہ ابلیس تو جنت میں صرف آپ کا عارضی قیام برداشت نہیں کر رہا تھا اور آپ زمین پر اس لئے آئے کہ زمین پر اپنی اولاد میں سے اپنے پیروکاروں کو قیامت کے دن دائمی طور پر اپنے ساتھ لے کر جنت میں جائیں۔ سو آپ اپنی بے شمار اولاد کے ساتھ دوام اور ہمیشگی کے لئے جنت میں جائیں گے اور ابلیس اپنے پیروکاروں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں جائے گا سو اس معرکے میں حضرت آدم علیہ السلام ہی کامیاب رہے، اور ابلیس خائب و خاسر ہوا۔

وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۝ (طٰہٰ: 121-122)

ترجمہ: ''اور آدم سے اپنے رب کا حکم بجالانے میں (نسیاناً) فروگزاشت ہوئی تو (جنت کی

سکونت کی راہ سے) بے راہ ہوگئے ٥ پھر ان کے رب نے انہیں برگزیدہ فرمالیا تو ان پر رجوع برحمت ہوا اور (عزت وعظمت کے بلند درجات کی طرف) انہیں راہ دکھائی''۔

امام لغت اسماعیل بن حماد الجوہری'' الصحاح'' میں لفظِ غویٰ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ غویٰ کا معنی صرف گمراہ ہونا نہیں جس طرح ہم عام طور پر خیال کرتے ہیں، بلکہ اہل زبان اسے دو معنوں میں استعمال کرتے ہیں (1) گمراہ ہونا، (2) حصولِ مقصد میں ناکام ہونا، "الغی، الضلال و الخیبة ایضاً"، (الصحاح)۔ اس تحقیق کی روشنی میں ہم یہاں، یہی دوسرا معنیٰ مراد لیں گے، کیونکہ یہی یہاں مناسب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں عَصٰی اٰدَم کے الفاظ کیوں استعمال کئے گئے، اس کا صحیح جواب "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْن" (نیک لوگوں کی نیکیاں بسا اوقات مقربین بارگاہِ الٰہی کی سیئات شمار کی جاتی ہیں) ہے۔ خطا اور نسیان پر اگرچہ انسان سے مواخذہ نہیں ہوگا اور انسان عذاب کا مستحق نہیں قرار پائے گا لیکن خواص کا معاملہ اور ہے، ان سے ترکِ اولیٰ پر بھی مواخذہ ہوتا ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

سمعنا ابا ھریرۃ قال:قال رسول اللہ ﷺ: "احتجّ آدم وموسیٰ علیھما السلام عند ربھما۔ فحج آدم موسیٰ۔قال موسیٰ: انت آدم الّذی خلقک اللہ بیدہ، ونفخ فیک من روحہ،واسجد لک ملائکتہ،واسکنک فی جنتہ، ثمّ اھبطت النّاس بخطیئتک الی الارض؟، فقال آدم :انت موسیٰ الّذی اصطفاک اللہ برسالاتہ وبکلامہ، و اعطاک الالواح فیھا تبیان کلّ شیءٍ، وقرّبک نجیاً، فبکم وجدت اللہ کتب التوراۃ قبل ان اخلق ؟ قال موسیٰ: باربعین عاماً۔ قال آدم: فھل وجدت فیھا: **وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى**؟ [طٰہٰ: ۱۲۱]۔ قال: نعم: قال:افتلو مُنیی علی ان عملت عملاً کتبہ اللہ علیّ ان اعملہ قبل ان یخلقنی باربعین سنۃ؟"۔ قال رسول اللہ ﷺ: "فحج آدمُ موسیٰ"۔

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا اپنے رب کے سامنے مباحثہ ہوا، پس حضرت آدم، موسیٰ پر غالب آگئے، حضرت موسیٰ نے کہا: آپ وہ آدم ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور آپ میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی اور فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور آپ کو اپنی جنت میں رکھا، پھر آپ نے اپنی خطا سے لوگوں کو زمین پر اتار دیا؟ حضرت آدم نے کہا: آپ وہ موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور اپنے کلام سے فضیلت دی اور آپ کو الواح عطا کیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا، اور آپ کو قریب کر کے سرگوشی کی، آپ یہ بتائیے کہ میری تخلیق سے کتنا عرصہ پہلے اللہ تعالیٰ نے تورات کو لکھا تھا؟ حضرت موسیٰ نے کہا: چالیس سال پہلے! حضرت آدم نے کہا: کیا آپ نے تورات میں یہ لکھا ہوا پایا تھا ”وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ﴿۱۲۱﴾“، (طٰہٰ: ۱۲۱) حضرت موسیٰ نے کہا: ہاں! حضرت آدم نے کہا: تو کیا آپ مجھے اس کام پر ملامت کر رہے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے میرے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے لکھ دیا تھا؟ پھر حضرت آدم، حضرت موسیٰ پر غالب آگئے“، (صحیح مسلم، رقم الحدیث 6620)۔

”جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمالی اور ان کی مغفرت فرمادی تو ان سے ملامت زائل ہوگئی، اور اب ان کو جو ملامت کرے گا، وہ شرعاً مغلوب ہوگا“۔

(تبیان القرآن جلد 7 صفحہ 494)

اس تشریح کی روشنی میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز، صاحب وجاہت اور اس کے منتخب بندے ہوتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾۔

ترجمہ: ”اور وہ (موسیٰ) اللہ تعالیٰ کے نزدیک وجاہت (ووقار) والے تھے“ (الاحزاب: 69)

(2) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

ترجمہ: ''وہ دنیا وآخرت (دونوں) میں عزت (ووقار) کے حامل تھے''، (آل عمران:45)۔

(3) وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔

ترجمہ: ''عزت تو صرف اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کے لئے ہے''، (المنافقون:8)

(4) وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ۔

ترجمہ: ''اور بے شک وہ (سب انبیاء) ہماری بارگاہ میں ضرور برگزیدہ پسندیدہ بندوں میں سے ہیں''، (ص:47)۔

(5) خاتم الانبیاء ﷺ کے بارے میں فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

ترجمہ: ''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے''، (الانبیاء:107)۔

(6) وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔

ترجمہ: ''اور ہم نے آپ کیلئے آپ کا ذکر بلند کردیا''، (الانشراح:4) وغیرھا الآیات الکریمۃ۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے محبوب، برگزیدہ، پسندیدہ، منتخب، بارگاہِ الٰہی میں وجاہت اور عزت واکرام کے حامل ہوتے ہیں، قرآن نے کاتبینِ وحی ''فرشتوں کو بھی كِرَامًا كَاتِبِيْنَ (یعنی معزز لکھنے والے، الانفطار:11) اور بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ (یعنی ایسے کاتبوں کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے جو نہایت بزرگی والے بہت نیک ہیں، عبس:15,16) فرمایا۔

لہٰذا فرحت ہاشمی کا لب ولہجہ مقام نبوت اور عظمتِ آدم کی بابت گستاخانہ، توہین آمیز، بے ادبی اور ناپاک جسارت کا حامل ہے اور ان کے خبثِ باطن کا آئینہ دار ہے کہ آدم علیہ السلام کو شیطان کے مقابلے میں ناکام اور بے آبرو کہا۔

حضرت آدم علیہ السلام تو اللہ کے نبی تھے، عام اہل اللہ کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ۔

ترجمہ: ''بیشک میرے خاص بندوں پر تیرا حکم نہیں چلے گا''، (الحجر:42)۔

(2) اور شیطان نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی ناکامی اور عجز کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٣٩﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٤٠﴾
ترجمہ: ''اور میں ضرور ان سب کو گمراہ کردوں گا، سوا ان میں سے تیرے ان بندوں کے جو اصحاب اخلاص ہیں''، (الحجر:39,40)۔
اللہ تعالیٰ تو قرآن مجید میں جابجا اپنے عباد مقربین کیلئے فوز و فلاح اور بشارت کے کلمات ارشاد فرماتا ہے، مثلاً:
(الف) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥﴾
(وہی لوگ کامیاب و کامران ہیں)، (البقرۃ:5)۔
(ب) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١﴾
(مومن فلاح پاگئے)، (المومنون:1)۔
(ج) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿١٤﴾
(جس نے نفس کو باطل سے پاک رکھا، وہ کامیاب رہا)، (الاعلیٰ:14)۔
(د) لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۔
ان کے لئے دنیا و آخرت کی زندگی میں (کامیابی اور اجرِ عظیم کی) بشارت ہے، (یونس:64)
وغیرھا من الآیات الکریمۃ۔
اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی اور عالم انسانیت و جملہ انبیاء کرام کے جدِّ اعلیٰ کو شیطان کے مقابلے میں ناکام قرار دیں، وہ تو انہیں معزز قرار دے اور یہ ان پر ع ''بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے''، کی پھبتی کسیں۔ اللہ کے نبی کو ناکام اور ''بڑے بے آبرو'' کہنے والے مسلمانوں کے دلوں میں عزت و وقار کی جگہ کیسے بنا سکتے ہیں، ان سے بچ کر رہنا ہی بہتر ہے۔

عصمت آدم علیہ السلام سے متعلق مسئلے کی بابت محترمہ فرخ چوہدری و اُمِ جویریہ کے شکایت آمیز خطوط اور ان کا جواب

(1) محترم مفتی منیب الرحمٰن صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

روزنامہ ایکسپریس 11 مارچ میں تفہیم المسائل کے کالم میں آپ کا جواب بنام اسماء منیر اسلامک یونیورسٹی (شاید اپنے ادارے کا پورا نام لکھنا بھول گئی ہیں) پڑھا، رائے کا اظہار کرنے میں تاخیر کیلئے معذرت مگر ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا''۔ کیونکہ میرے نزدیک صرف فریقِ اول کی بات سن کر بغیر فریقِ ثانی سے رجوع کئے، بغیر عذر طلب کئے نہ صرف اس طرح کا جواب دینا، بلکہ ذاتی Comments لکھنا، اسلامی طریقہ سے متصادم ہے، میں نے یہ جاننے کی غرض سے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟، خود تحقیق کا ارادہ کیا اور مذکورہ کیسٹ لے کر قرآن مجید میں جہاں جہاں آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، مثلاً:

☆ البقرۃ: 37-31 ☆ آل عمران: 59-33

☆ المائدہ: 27 ☆ الاعراف: 11,19,26,27,31,35,172

☆ الاسراء: 70-61 ☆ الکہف: 50

☆ مریم: 58 ☆ طٰہٰ: 115,116,117,120,121

ان تمام آیات کو سنا ہے، کسی میں بھی کوئی ایسی بات یا اشارہ نہیں ملتا، جس سے گستاخی کا احتمال ہو، جہاں تک شعر کا ذکر جو اسماء منیر صاحبہ نے کیا ہے تو وہ بات کا وقفہ دے کر تمثیلی انداز سے بات کی گئی ہے، اور پھر اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے، اس سے یہ کہیں نہیں ظاہر ہوتا ہے کہ کہنے والے کی بدنیتی شامل ہے اور مفتی صاحب! نیتوں کا حال تو ویسے بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا، لیکن ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ کے بارے میں آپ کی رائے جان کر روحانی اذیت ہوئی کہ اتنے بڑے عالمِ دین کے یہ ریمارکس بغیر تحقیق کے!!!!! اللہ سبحانہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرماتے ہوئے ہمیں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں سے رجوع کرنے کی توفیق دیتے ہوئے ہم سب کا دین و دنیا کے ہر معاملہ میں حامی و ناصر ہو (آمین)، دعا گو! ام جویریہ۔

(2) محترم مفتی منیب الرحمٰن صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

روزنامہ ایکسپریس اسلام آباد، بتاریخ 11، مارچ کے کالم ''تفہیم المسائل'' میں اسماء

منیر صاحبہ عالمہ اسلامک یونیورسٹی کے پوچھے گئے سوال کے جواب میں نقطۂ نظر جاننے کا موقع ملا۔اس حوالے سے چند باتیں عرض خدمت ہیں۔

جہاں تک توہین رسل کی بات ہے،تو اس میں کسی بھی شک وشبہ کی گنجائش بھی نہیں کہ (ان انبیاء کرام علیہ السلام) کے درجے تو کمال کے ہیں، ان کی شان میں گستاخی کرنا تو دور کی بات ،ایسی سوچ رکھنا، پھیلانا بھی کسی بھی مسلمان کے دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا ثبوت کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔

میں 1994ء سے ڈاکٹر فرحت ہاشمی کو باقاعدگی سے سن رہی ہوں، ان کے دروس میں اللہ کی عظمت ومحبت، انبیاء کرام علیہم السلام کے عالی درجات، نبی کریم ﷺ کی اتباع ومحبت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت کیساتھ ساتھ اسلافِ امت رحمہ اللہ تعالیٰ کے عظیم کارناموں اور ان کے احترام کے بارے میں سنا بھی اور محسوس بھی کیا، الحمدللہ!۔

محترم جناب! آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ Voice Media اور Print Media کسی بھی بات کو لوگوں تک پہنچانے کیلئے دو مختلف میڈیم ہیں اور ایک میڈیم دوسرے میڈیم کی سو فیصد ترجمانی نہیں کرسکتا ، کیونکہ آواز کی دنیا میں لب ولہجہ، آواز کا زیروبند، لہجے کی ٹون اور وقفہ سکتہ وغیرہ، بات کہنے والے مفہوم کو واضح کرتا ہے اور قرآن مجید کے رموز واوقاف کا علم اس کی دلیل بھی ہے، جبکہ دوسری طرف تحریر کی دنیا میں یہ سب ناپید ہونے کی وجہ سے بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے اور بات کرنے والے کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کرتی ہے۔

اگر آپ انبیاء کرام کی شان کے بارے میں ڈاکٹر صاحبہ کے خیالات جاننا چاہتے ہیں تو (سورۂ آل عمران:33 پر اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ ٥، ترجمہ: بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور اولاد ابراہیم کو) کی تفسیر سن لیں اور ایک فیصلہ پھر بھی دے دیں کہ درست کیا ہے اور غلط کیا؟ ، کیونکہ اس طرح کے یک طرفہ فیصلوں سے عوامی ہنگامے تو برپا ہوسکتے ہیں، جو کہ بہت آسان کام ہے، مگر انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے، اس کیلئے علماء دین کو چاہئے کہ سنتِ رسول ﷺ کے طریقۂ اصلاح پر عمل کریں، جو بھی

بات کریں، اس میں اسلامی اخلاق جھلکتا ہو۔ علمی دلائل (نصوص) کی روشنی ہو نہ کہ صرف دلی کیفیات ابل پڑ رہی ہوں۔ جس چیز کے بارے میں جواب مانگا گیا ہو جواب دینے سے پہلے اس پر تحقیق کریں اور تفقہ تدبر اور تفکر سے کام لیتے ہوئے معاملہ کی تہہ تک پہنچ کر جواب دیں، یہ طریقہ امتِ محمدیہ پر ایک بڑا احسان ہوگا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا طریقہ یہ نہ تھا اور ہمیں تو آپ ﷺ ہی کی اتباع کا حکم ہے۔ اسوۂ کامل ایک ہی ذات ہے، جس کی پیروی ہم سے مطلوب و مقصود ہے۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو آپ سننا چاہیں، تو آپ کو ڈاکٹر صاحبہ کی چند کیسٹیں بھجوا سکتی ہوں تاکہ آپ خود سن کر فیصلہ کریں کہ درست کیا ہے اور غلط کیا ہے؟۔

جواب:

محترمہ ہم سے ایک معین عبارت کے متعلق شرعی مسئلہ دریافت کیا گیا تھا، جو ہم نے تحریر کر دیا۔ آپ نے اس عبارت کی بابت یہ نہیں لکھا کہ: فرحت ہاشمی صاحبہ نے یہ الفاظ نہیں کہے یا ناقلہ نے انہیں غلط نقل کر دیا، گویا آپ نے ان کلمات کو "Disown" نہیں کیا۔ تو ان کلمات کی بابت میرا جواب وہی ہے جو دلائل کے ساتھ روزنامہ ایکسپریس کے کالم ''تفہیم المسائل'' میں جمعۃ المبارک 11، مارچ کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔ اگر نادانستہ طور پر جوشِ خطابت میں یا سبقتِ لسانی سے یہ کلمات زبان سے نکل گئے ہیں، تو کسی خیر خواہ کے متوجہ کرنے پر ان سے رجوع کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے، اس طرح خطا کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ سنتِ آدم علیہ السلام میں ہے کہ جب ربّ کریم نے ان کی خطاء اجتہادی پر انہیں متوجہ فرمایا تو انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں نہایت ادب سے عرض کیا!

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

ترجمہ: ''اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے''، (الاعراف:23)۔

ہاں! غلطی پر ڈٹ جانا اور اس کا جواز پیش کرنا، اسے Justify کرنا، یہ ابلیس کا طریقہ

ہے۔آپ کی غیرت ایمانی کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ ناموسِ آدم اور عصمت آدم کی وکیلہ بن جاتیں اور اپنی ممدوحہ کو ان کی غلطی پر متوجہ کر کے انہیں اس سے رجوع کا مشورہ دیتیں، یہ آپ کیلئے اور ان کیلئے باعث سعادت ہوتا۔لیکن تحفظ ناموس آدم علیہ السلام کے بجائے آپ فرحت ہاشمی کی وکالت فرما رہی ہیں، یہ اچھی علامت نہیں ہے، آپ بتائیں کہ آپ کے سامنے طیب وطاہر اور صاف وشفاف دودھ کی بالٹی بھری ہوئی ہو اور کوئی آپ کی نگاہوں کے سامنے اس میں چند قطرے ناپاکی کے ڈال دے تو پھر آپ کی نزاکتِ طبع وذوقِ نفیس اس دودھ کو پینا گوارا کرے گا، خود ہی فیصلہ کرلیجئے۔

مقام الوہیت جلّ وعلا اور مقامِ رسالت ﷺ کے بارے میں ماضی میں بعض نامور علماء نے غیر محتاط کلمات استعمال کئے، انہیں جب متوجہ کیا گیا، تو انہوں نے اور ان کے غالی معتقدین نے ان سے رجوع کرنے کے بجائے توجیہات، تاویلات اور دلیل ومنطق کا سہارا لیا، جس کے نتیجے میں امت میں تفریق پیدا ہوئی۔ اگر وہ ان سے رجوع کر لیتے اور اپنے موقف کو زیادہ بہتر انداز میں بیان کرتے تو ان کیلئے، ان کے معتقدین کیلئے اور پوری امت کیلئے خیر کا موجب ہوتا۔اب آپ نے بھی تاویل کا سہارا لیا ہے کہ گفتگو میں سکتہ کر کے تمثیلی انداز میں کہا گیا ہے، تو میری پیاری بہنو! ہمیں نبی کی شان میں یہ اندازِ تمثیل اور یہ تاویل قبول نہیں ہے۔ اردو زبان میں اتنی مفلسی نہیں ہے، بیانِ مدعا کیلئے مقامِ نبوت کے شایانِ شان پیرایۂ بیان اختیار کیا جاسکتا ہے۔ممکن ہے آپ کو اپنے اور اپنی ممدوحہ کے علم پر ناز ہو مگر ہم بھی دین کے طالب علم ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو الحمد للہ! بتوفیقِ الٰہی سمجھتے ہیں۔

غیر صحابی کو ''رضی اللہ عنہ'' کہنے کا جواز

سوال:3

جناب عالی! عرصہ دراز سے یہ اجماع علماء اہلسنت رہا ہے کہ نبی ورسول اور پیغمبر حضرات کے ناموں کے ساتھ ''علیہ السلام'' اور حضور اکرم کے لئے '' ﷺ''، صحابہ کے ناموں کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' اور اولیاء کرام کے ساتھ ''رحمۃ اللہ علیہ'' اس کے علاوہ

علماء ہوں یا عام آدمی نیک مومن کے ساتھ عفی عنہ کی ڈگری/اصطلاح استعمال کرتے ہیں مگر آج کل کچھ حضرات اس مخصوص دینی طریقے کو نظر انداز کرتے ہوئے رافضیوں کے طرز کو اپنا کر ایک جز میں تبدیلی کر رہے ہیں کہ ولی وعالم دین اور عام نیک مومن کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' استعمال کر رہے ہیں اور اس کے ثبوت میں گیارہواں پارہ (قرآن مجید کنزالایمان) کا حوالہ دیتے ہیں، مگر مستند اور جامع تاریخ کے حوالے سے یہ بات فیصلہ کن ہے کہ نبیوں، رسولوں، پیغمبروں اور صحابہ کی ڈگری/اصطلاح حتمی وتصدیقی اور ثبوت کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے، مگر اولیاء اور مومن کی ڈگری دعائی معنوں میں استعمال ہوتی ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن کی یہ آیات اصل میں صحابہ ہی کے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ تقریباً 25 یا 30 سال قبل کی تحریر کردہ دینی کتب اور خاص کر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلی (رحمۃ اللہ علیہ) کی تحریر میں کسی اولیاء کے لئے رضی اللہ عنہ کی اصطلاح کا استعمال نہیں ہوا ہے شکریہ (مرزا محمد عارف بیگ النور، R-855/19 الیف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

عرفِ عام میں چونکہ صحابہ کرام کے اسماء گرامی کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' بولا اور لکھا جاتا ہے بلکہ تقریباً اس کا التزام کیا جاتا ہے، اس لئے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید یہ صحابہ کرام کا لقب خاص ہے، لیکن یہ نظریہ درست نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں اس کا اطلاق مومنین صالحین کے لئے عام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔

ترجمہ: ''اور مہاجرین اور انصار میں سے (نیکی میں) سبقت کرنے والے اور سب سے پہلے ایمان لانے والے اور جن مسلمانوں نے نیکی میں ان کی اتباع کی اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے''، (التوبہ:100)۔

اس آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مہاجرین وانصار صحابہ کرام کے ساتھ ان کی ''اتباع بالاحسان'' کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا (یعنی رضی اللہ عنہ) کے اعزاز سے نوازا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ ؕ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ

ترجمہ: ''یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہی کل مخلوق میں بہتر ہیں، ان کا ثواب ان کے رب کے پاس (ہمیشہ) رہنے کے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (وہ) ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے''، (القرآن، البینہ:8)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ''رضی اللہ عنہ'' کے اعزاز واکرامِ ربانی کا مصداق عام مومنین صالحین بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۹﴾

ترجمہ: ''(روزِ قیامت) اللہ فرمائے گا: یہ ہے وہ دن جس میں سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا، ان کے لئے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ابد تک رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے''، (المائدہ:۱۱۹)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رضاءِ الٰہی کا انعام اور بندے کا تقدیرِ الٰہی پر راضی برضاءِ رب اور صابر وشاکر رہنا ''صادقین'' کا وصف ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شرفِ صحابیت کے ساتھ ساتھ ''حاملینِ ایمان وعمل اور خیر البریہ'' اور ''صادقینِ کاملین'' کا مصداق ''اَولیٰ و''اَولیٰ'' صحابۂ کرام ہی ہیں اور ان کے اتباع میں امت کے دیگر اولیاء، صلحاء، علماء وعاملین ''مخلِصین فی اللّٰہ'' و ''مخلَصین من اللّٰہ'' ہیں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویستحب الترضی للصحابة) وکذا من اختلف فی نبوته کذی القرنین ولقمان، وقیل : یقال صلی اللہ علی الانبیاء وعلیه وسلم کما فی شرح المقدمة للقرمانی۔(والترحم للتابعین ومن بعدهم من العلماء والعباد وسائرالاخیار، وکذا یجوز عکسه) الترحم للصحابة والترضی للتابعین ومن بعدهم(علی الراجح) ذکره القرمانی۔ وقال "الزیلعی": الاولی ان یدعو للصحابة بالترضی وللتابعین بالرحمة ولمن بعدهم بالمغفرة والتجاوز۔

ترجمہ:''اورصحابہ کے لئے'' رضی اللہ عنہ'' کہنا مستحب ہے،اوراسی طرح ان شخصیات کیلئے جن کی نبوت میں اختلاف ہے،جیسے ذوالقرنین ولقمان (یعنی چوں کہ ان کی نبوت کا تذکرہ قرآن یا کسی حدیث صریح میں نہیں ہے،اس لئے بعض نے انہیں انبیاء میں شمار کیا ہے اور بعض نے حکماء وصلحاء میں) اور ایک قول کے مطابق'' صلی اللہ علی الانبیاء وعلیہ وسلم'' کہا جائے،جیسا کہ قرمانی کے شرح مقدمہ میں ہے،اور(اسی طرح) راجح قول کے مطابق ''رحمۃ اللہ علیہ'' تابعین اور بعد کے علماء،عباد(صالحین)اور بقیہ اہلِ خیر کے لئے مستحب ہے،اوراسی طرح اس کا عکس بھی جائز ہے،(یعنی کسی صحابی کے نام کے ساتھ'' رحمۃ اللہ علیہ'' بھی کہہ سکتے ہیں اور کسی تابعی یا بعد کے عبدِ صالح کے لئے'' رضی اللہ عنہ'' بھی کہہ سکتے ہیں)اسے قرمانی نے ذکر کیا۔'' زیلعی'' نے کہا:بہتر یہ ہے کہ صحابہ کے ساتھ رضی اللہ عنہ، تابعین کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ اور بعد والوں کے لئے "غفر اللہ لهم اور عفااللہ عنهم" کہا جائے''،(ردالمحتار علی الدر المختار: جلد نمبر 10،ص:402،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی،بیروت)

یہ کلمات (یعنی "رضی اللہ عنه" ، "رحمة اللہ علیه" یا "رَحِمَه اللہ تعالیٰ" ، "غفرَاللہ لهٗ" ، "غُفِرَلهٗ" ، "عَفَااللہ عنه" ، "عُفِیَ عنه" کلماتِ دعا ہیں،'' ڈگریاں'' نہیں ہیں،اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے محبوب بندوں کے لئے اعزازات وانعامات ہیں۔اورکلماتِ دعا کیلئے امر یا ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال ہوتا ہے کہ یہ تیقن (یعنی کسی امر کے یقینی طور پر واقع ہونے) پر دلالت کرتے ہیں،یہی کیفیت عقود ومعاملات (نکاح،

طلاق اور بیع وغیرہ کی ہے)۔ اور چونکہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے عباد ''مُکَرَّمِین'' و ''مُقَرَّبِین'' کو ان اعزازات سے نوازا ہے، اس لئے ہمیں اس کی عطا پر یقینِ کامل ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ (الجاثیہ: ۱۹)، يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ (الاعراف: ۱۹۶)، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ (البقرہ: ۱۵۳) اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (البقرہ: ۱۹۶)، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ (النحل ۱۲۸)، وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ (العنکبوت ۶۹)، اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ: ۲۵۷)، وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (المنافقون ۸)،

وغیرھا من الایات الکریمہ۔

یہ ضرور ہے کہ یہ ایک عرف بن گیا ہے کہ صحابی کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' لکھا جاتا ہے، لیکن آپ نے جو لکھا ہے کہ اس پر اہلسنّت وجماعت کا اجماع ہو چکا ہے کہ یہ صحابۂ کرام کے ساتھ خاص ہے، یہ درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جب اپنے اس اعزاز وانعام کو ''متبعین بالاحسان'' اور ''مؤمنین صالحین'' کے لئے بھی عام رکھا ہے، تو بندے کی کیا مجال کہ نعمتِ باری تعالیٰ کی تخصیص وتائید اپنی جانب سے کردے۔

آپ کا یہ قول بھی درست نہیں ہے کہ اعلیٰحضرت امام احمد رضا خان قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے غیر صحابی کے لئے ''رضی اللہ عنہ'' کہیں نہیں لکھا، اعلیٰ حضرت نے حضور غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی کے نام کے ساتھ کئی مقامات پر ''رضی اللہ عنہ'' لکھا ہے۔

(ملاحظہ ہو فتاویٰ رضویہ، جلد 26، صفحات: 569,597 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اور صحیح مسلم کے شروع ہی میں ہے:

قال الامام ابو الحسین مسلم بن الحجاج رضی اللّٰه عنه: بعون اللّٰه نبتدی وایاہ نستکفی وما توفیقنا الا باللہ جل جلالہ، (صحیح مسلم جلد اول صفحہ 26 مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)۔ امام مسلم نہ تو صحابی تھے اور نہ تابعی، اسی طرح غوث الاعظم بھی دورِ صحابیت، تابعیت وتبع تابعیت سے بہت مؤخر ہیں۔

﴿کتاب الطہارت﴾

موجودہ زمانے میں ناپاکی کے مسائل میں درہم کی مقدار کتنی ہے؟

سوال: 4

موجودہ زمانے میں ناپاکی کے مسائل میں درہم کی مقدار کتنی ہے؟۔
(مولانا سید محمد اعجاز الدین سہروردی امام وخطیب جامع مسجد بغدادی، تین ہٹی، کراچی)

جواب:

صدر الشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ مصنف ''بہارِ شریعت'' اپنی کتاب بہارِ شریعت میں درہم کی مقدار یوں بیان فرماتے ہیں: کہ ہتھیلی کی گہرائی کے برابر یعنی ہتھیلی خوب پھیلا کر ہموار رکھیں اور اس پر آہستہ سے اتنا پانی ڈالیں کہ اس سے زیادہ پانی نہ رک سکے، اب پانی کا جتنا پھیلاؤ ہے اتنا بڑا درہم سمجھا جائے گا اور اس کی مقدار تقریباً یہاں کے روپے کے برابر ہے، (یعنی وہ روپیہ جو قیامِ پاکستان سے پہلے رائج تھا، راقم)، (بہارِ شریعت ج:۱،ص:۱۱۳، مطبوعہ مکتبہ رضویہ آرام باغ، کراچی)۔

ناک میں پانی نہ ڈالنے اور کلی کے بغیر وضو کا حکم

سوال:5

گرمی کی وجہ سے جسم پر پانی بہایا لیکن ناک میں پانی نہیں چڑھایا اور کلی بھی نہیں کی تو کیا وضو ہو جائے گا؟، (مولانا سید محمد اعجاز الدین سہروردی امام وخطیب جامع مسجد بغدادی، تین ہٹی، کراچی)۔

جواب:

اگر وہ حالت جنابت یعنی ایسی حالت میں نہیں ہے کہ اس پر غسل واجب ہو بلکہ صرف محدث یعنی بے وضو ہے تو پورے جسم پر پانی بہانے سے پاک ہو جائے گا اور اس نے وضو کئے بغیر نماز پڑھی تو ادا ہو جائے گی، لیکن چونکہ کلی نہ کر کے اور ناک میں پانی نہ ڈال کر اس نے سنتِ وضو کو ترک کیا ہے، اس لئے اسے اجر کامل نہیں ملے گا اور اس طرزِ عمل کو بطور

عادت اختیار کرنے پر گنہگار ہوگا۔مزید یہ کہ اس نے محض ٹھنڈک حاصل کرنے کیلئے پانی بہایا ہے نہ کہ ازالۂ حدث اور حصول طہارت کیلئے ،لہٰذا فقہی طور پر اور تکمیلِ ضابطہ کی حد تک وہ باوضو ہوجائے گا،لیکن اس پر اسے اجرِ کامل نہیں ملے گا۔اس لئے کہ نیت نہ کرنے پر وہ تارکِ مستحب ہے۔

اور اگر وہ حالت جنابت میں ہے تو بدستور ناپاک رہے گا،کیونکہ غسل جنابت کیلئے مبالغے کے ساتھ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے اور ترک فرض سے اس کی جنابت زائل نہیں ہوگی۔

دکتور وہبہ زحیلی ،فقه الاسلامی وادلته ،جلد اول ،ص ۲۲۶ پر وضو کیلئے نیت کے فرض یا سنت ہونے پر اختلاف ائمہ کا ذکر کرنے کے بعد اس کا ثمرہ لکھتے ہیں:

ویترتب علی قولهم بعدم فرضیة النیة:صحةوضوء المتبرد اوالمنغمس فی الماء للسباحة اوللنظافة اولانقاذ غریق ونحوذالک ۔

ترجمہ:'' ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وضو کیلئے نیت کے فرض ہونے اور احناف کے نزدیک مستحب ہونے کا ثمرہ یہ مرتب ہوگا کہ اگر کسی نے محض ٹھنڈک حاصل کرنے کیلئے پورے بدن پر پانی بہایا یا کسی نے تیراکی یا صفائی کیلئے پانی میں غوطہ لگایا یا پانی میں ڈوبتے کسی شخص کو بچانے کیلئے پانی میں چھلانگ لگائی یا کسی اور ایسی صورت میں اس نے پورے بدن پر پانی بہادیا تو فقہی اعتبار سے وضو ہوجائے گا ،لہٰذا اس وضو سے اس کا نماز پڑھنا درست ہوگا۔لیکن ازالۂ حدث اور حصول عبادت کی نیت نہ کرنے پر وہ تارک مستحب ہوگا اور اجر کامل سے محروم رہے گا''۔

﴿کتابُ الصّلوة﴾

دعاءاذان سے پہلے درود شریف

سوال:6

اذان ختم ہونے کے بعد جو دعاء پڑھی جاتی ہے تو اس سے پہلے درود شریف پڑھنے کا کیا حکم ہے، کیونکہ ٹی وی میں پہلے دعا آتی ہے،اس کے بعد درود شریف دکھاتے ہیں،وضاحت کریں،(عمران نذیر بفرزون،کراچی)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے:

عن عبداللہ بن عمر وبن العاص رضی اللہ عنہما ،انہ سمع النبی ﷺ یقول اذاسمعتم المؤذن فقولوا مثل ما یقول ،ثم صلوا علی فانہ من صلی علی صلاۃً صلی اللہ علیہ بہا عشراً ،ثم سلوا اللّٰہ لی الوسیلۃ فانہا منزلۃ فی الجنۃ لا ینبغی الا لعبد من عباد اللہ ،وارجو ان اکون انا ھو ،فمن سال لی الوسیلۃ حلت علیہ الشفاعۃ ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سنو تو جیسے کلمات وہ کہتا ہے، ویسے ہی کہو(یعنی کلماتِ اذان کو دہراؤ)، پھر تم مجھ پر درود پڑھو، کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا، پھر میرے لیے جنت میں مقام وسیلہ (نمایاں مقام) کی دعاء کرو، کیونکہ یہ جنت میں ایک ایسا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے صرف ایک (خاص) بندے کو عطا فرمائے گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بندہ میں ہی ہوں، تو جو (مومن) میرے لئے مقام وسیلہ کی دعاء مانگے گا، اس کی شفاعت مجھ پر لازم ہے''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:۳۸۴)

اس حدیث مبارک کی رو سے اذان کے کلمات مبارکہ دہرانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے

پیارے حبیب ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے جنت میں نمایاں ترین مقام یعنی مقامِ وسیلہ کی دعا مانگی جائے اور جو شخص رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرتا ہے، تو وہ آخرت میں شفاعتِ مصطفیٰ ﷺ کا حق دار بن جاتا ہے۔ پاکستان ٹیلیویژن پر اذان کے بعد پہلے دعاء اذان پڑھی جاتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے جنت میں نمایاں مقام، مقام وسیلہ کی دعاء بھی شامل ہے اور اس کے بعد درود شریف پڑھا جاتا ہے، یہ حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ کی ارشاد فرمائی ہوئی ترتیب کے مطابق نہیں ہے، اگرچہ درود شریف فی نفسہٖ کسی وقت بھی پڑھا جاسکتا ہے اور دعاء اذان کے بعد پڑھنے کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے، لیکن افضل یہی ہے کہ ارشاد رسول کی مکمل اتباع کی جائے۔

اذان سے قبل یا بعد با آواز بلند درود وسلام پڑھنا

سوال:7

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان سے پہلے یا اذان کے بعد با آواز بلند درود وسلام پڑھنا جائز ہے یا نہیں، جواب عنایت فرمائیں، (محمد ندیم قریشی، مکان نمبر 701/14 فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب:

فعل مامور بہ کی دو قسمیں ہیں: ایک مطلق عن الوقت، دوسری مقید بالوقت۔

فعل مأمور بہ سے مراد وہ عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جس کے کرنے کا حکم دیا ہے جیسے نماز، روزہ وغیرہ، اور مطلق عن الوقت کا مطلب یہ ہے کہ شارع نے اس کی ادائیگی کے لیے کوئی وقت مقرر نہ کیا ہو، اور مقید بالوقت کا مطلب یہ ہے کہ شارع نے اس کی ادائیگی کا کوئی خاص وقت مقرر کیا ہو جیسے پانچ وقتہ نمازیں اور فرض روزے، بشرطیکہ اداء ہوں، جن عبادات کی ادائیگی کا شارع نے وقت مقرر کیا ہے ان کو انہی اوقات میں ادا کرنا ضروری ہے، اور جو عبادات مطلق عن الوقت ہیں ان کی ادائیگی کے لیے مکلّف اپنے اجتہاد سے

کوئی بھی وقت مقرر کر سکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد چونکہ درود شریف فعل ماموربہ ''مطلق عن الوقت'' ہے، لہٰذا ہر پڑھنے والا اسے اپنی سہولت کے مطابق کسی بھی وقت پڑھ سکتا ہے اور دلائلِ شرعیہ سے ثابت ہے کہ نفلی عبادات کے لیے اپنے اجتہاد سے کوئی بھی وقت معین کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ تعیین عرفی ہوتی ہے، تعیین شرعی کی طرح نہیں جسے شارع نے مقرر کیا ہے اور مکلّف اس کا پابند ہے اور اسی پر اجرِ کامل موقوف ہے۔ دیکھیے ازروئے شرع نفلی روزہ ہر دن رکھا جا سکتا ہے، لیکن حضور ﷺ ہمیشہ پیر کے دن روزہ رکھا کرتے تھے، اسی طرح حضور ﷺ ہر ہفتے کے دن مسجد قباء کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور آپ کی اتباع میں حضرت عبداللہ بن عمر بھی ہر ہفتے کو مسجد قباء جایا کرتے تھے، جبکہ مسجد قباء کی زیارت ایک نفلی عبادت ہے، جسے ہر روز کیا جا سکتا ہے لیکن حضور ﷺ نے ہفتے کے دن کو اس کی زیارت کے لیے خاص کر لیا تھا، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

کان النبی ﷺ یأتی مسجد قباء کل سبت ماشیا او راکبا و کان عبد اللہ بن عمر یفعلہ۔

ترجمہ: ''حضور ﷺ ہر ہفتے کے دن مسجد قباء پیدل یا سواری پر جایا کرتے تھے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر بھی ہر ہفتہ کے دن مسجد قباء کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے''، (رقم الحدیث: 1193)۔

نفلی عبادات میں اپنے اجتہاد سے وقت معین کرنے پر دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے وضو کرنے کے بعد نفل پڑھنے کو مقرر کر لیا تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے استفسار بھی نہیں کیا تھا، دریافت حال کے بعد حضور ﷺ نے ان کے اس عمل کی تحسین فرمائی، اور امت کے لیے رہنمائی فرمائی کہ نفلی عبادات کے لیے اپنے اجتہاد سے وقت معین کرنا جائز ہے، چنانچہ امام بخاری اپنی صحیح میں روایت کرتے ہیں:

عن ابی ھریرۃ ان النبی ﷺ قال لبلال عند صلوٰۃ الفجر یا بلال حدثنی بارجیٰ عملٍ عَمِلتَہٗ فی الاسلام فانی سَمِعت دُفَّ نعلیک بین یدَیَّ فی الجنۃ قال ما عملت عملا ارجیٰ عندی انی لم اطھر طھورا فی ساعۃ لیل او نھار الا صلیت بذٰلک الطھور ما کتب لی ان اصلی۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرتِ بلال سے صبح کی نماز کے وقت پوچھا اے بلال تم نے اسلام میں ایسا کون سا عمل کیا ہے، جس کے اجر کی تمہیں بہت زیادہ توقع ہے، کیونکہ میں نے جنت میں اپنے آگے تمہارے چلنے کی آہٹ سنی، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اس سے زیادہ میرے نزدیک کوئی عمل لائق قبولیت نہیں کہ میں دن یا رات میں جب بھی وضو کرتا ہوں تو اس وضوء سے حسبِ توفیق واستطاعت (نفلی) نماز پڑھ لیتا ہوں''، (رقم الحدیث: 1149)۔

نوافل کے لیے شرعاً کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے، لیکن حضرت بلال نے ہر وضوء کے بعد ثبوت واعتقادِ وجوب کے بغیر نوافل پڑھنے کا التزام کرلیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عدمِ انکار کی وجہ سے یہ جائز قرار پایا، اسی طرح صلوٰۃ وسلام پڑھنے کے لیے شرعاً کوئی وقت مقرر نہیں ہے کیونکہ آیت درود میں علی الاطلاق والعموم حضور کی ذات پر درود وسلام پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا اگر اذان کے اول یا آخر وقت میں درود وسلام پڑھنے کو اختیار کر لیا جائے، تو ازروئے شرع اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنے والا عنداللہ ماجور ہوگا، تاہم اگر کوئی شخص اذان کے بعد دعاءِ اذان پڑھنے سے پہلے درود پاک پڑھنا اپنا شعار بنالے، تو یہ حدیث کے بھی مطابق ہے، جیسا کہ صفحہ نمبر 40 پر حدیث مذکور ہوئی۔

تاہم اتنی گذارش ہے کہ درود شریف اور صلوٰۃ وسلام اذان سے پہلے پڑھا جائے یا بعد میں، درود اور اذان کے درمیان ایک آدھ منٹ کا وقفہ کرلیا جائے تاکہ جزءِ اذان ہونے کا اشتباہ نہ ہو اور بعض مخالفین اس کو غلط مفہوم پر محمول کر کے لوگوں کو بہکا نہ سکیں، فقط واللہ ورسولہٗ اعلم بالصواب۔

رسول اللہ ﷺ کے بذاتِ خود اذان دینے کا ثبوت

سوال:8

نماز کیلئے اذان مشروع ہے، حدیث پاک میں اس کی تعلیم فرمائی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو اذان کے کلمات تعلیم فرمائے اور اذان کا حکم فرمایا، لیکن کیا رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اذان دی؟، اگر اس کا جواب اثبات میں ہے، تو دلیل سے ثابت کیجئے،

(محمد انس محبوب، بٹگرام، ہزارہ)۔

جواب:

رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود اور بہ نفسِ نفیس بھی اذان دی ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

وفی "الضیاء" انه علیه الصلوة والسلام اذّن فی سفر بنفسه واقام وصلّی الظهر وقد حققناه فی الخزائن۔

ترجمہ: ''اور'' الضیاء'' میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سفر میں بذاتِ خود اذان دی، اقامت فرمائی اور ظہر کی نماز پڑھائی، اس مسئلے کو ہم نے'' خزائن'' میں تحقیق سے بیان کیا ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد:2 ص:66-65، داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ومما یکثر السؤال عنه: هل باشر النبی ﷺ الاذان بنفسه؟ وقد اخرج "الترمذی" انه علیه الصلوة والسلام اذّن فی سفر وصلی باصحابه"، (رقم الحدیث: 205)، وجزم به النووی وقواه (وقال:هذا حدیث حسن صحیح) ولکن وجد فی "مسند احمد" من هذا الوجه "فامر بلالا فاذّن، (463/3 وهو حدیث صحیح)، فعلم ان فی روایة الترمذی اختصارا ـ وان معنی قوله، اذّن: امر بلالاً، کما یقال: اعطی الخلیفة العالم الفلانی کذا۔ وانما باشر العطاء غیره۔

ترجمہ: ''اور یہ جو اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ آیا رسول اللہ ﷺ نے بذات خود اذان دی ہے؟، (تو اس کا جواب یہ ہے کہ) امام ترمذی نے حدیث بیان کی اور اسے حسن صحیح قرار دیا کہ نبی ﷺ نے ایک سفر میں خود اذان دی اور اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی، (رقم الحدیث: 205)، امام نووی نے اس روایت پر جزم کرتے ہوئے اسے قوی قرار دیا، لیکن مسند امام احمد میں روایت یوں ہے کہ: ''حضور نے بلال کو حکم فرمایا: اور انہوں نے اذان دی''، (463/3 وھو حدیث صحیح)، پس معلوم ہوا ترمذی کی روایت میں اختصار ہے اور امام ترمذی کی روایت میں ''اَذَّنَ'' (یعنی آپ نے اذان دی) کے معنی یہ ہیں کہ: ''آپ نے بلال کو اذان دینے کا حکم فرمایا''، جیسے محاورتاً کہا جاتا ہے کہ: خلیفہ نے فلاں عالم کو اتنی رقم دی، حالانکہ (خلیفہ براہِ راست نہیں دیتا، بلکہ اس کے حکم پر) دوسرا شخص (یعنی اس کا کوئی عامل) دیتا ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد: 2 ص: 66-65، داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ شامی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے خود اذان نہیں دی بلکہ ''اَذَّنَ'' کے معنی ہیں: حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم فرمایا۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے علامہ شامی کی اس توجیہ سے اختلاف کیا اور فرمایا: اس پر میں نے ردالمحتار پر اپنے حاشیہ ''جدُّ الممتار'' میں لکھا ہے:

"سیاتی فی صفۃ الصلوٰۃ عن تحفۃ الامام ابن حجر المکی انہ ﷺ اذّن مرۃً فی سفرٍ فقال فی تشھدہٖ "اشھد انی رسول اللّٰہ" وقد اشار ابن حجر الیٰ صحتہٖ، وھذا نص مفسّر لایقبل التاویل وبہ یتقوی تقویۃ الامام النووی رحمہ اللّٰہ تعالیٰ"۔

ترجمہ: ''عنقریب (اسی فتاویٰ شامی میں) ''صفات نماز'' کے تحت ذکر تشہد میں تحفہ امام ابن حجر مکی سے آرہا ہے کہ نبی ﷺ نے ایک دفعہ سفر میں اذان دی تھی (دورانِ اذان "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کے بجائے) کلمات تشہد یوں کہے: "اَشْھَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ" (یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں)، اور ابن حجر نے اس کی صحت کی طرف

اشارہ کیا اور یہ ''نصِ مُفسّر'' ہے، جس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس سے امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو تقویت ملتی ہے''، (فتاویٰ رضویہ جلد 5 ص:375-374 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے خود علامہ شامی سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سفر میں اذان دی ہے۔ اس مقام پر علامہ شامی دراصل علامہ علاؤالدین حصکفی کے اس موقف پر بحث کررہے ہیں کہ نماز میں حالت تشہد میں رسول اللہ ﷺ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے ''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' کی جگہ ''اَشْهَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' پڑھا کرتے تھے، اس پر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ:

''رافعی نے شافعیہ سے یہ قول نقل کیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی نے، اس موضوع پر احادیث کی تخریج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے، کیونکہ نماز میں "اشهد ان محمدا عبدهٗ ورسولهٗ" ہی تواتر سے ثابت ہے، آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ: ''تحفہ'' میں ہے کہ اگر اس سے ''تشہد نماز'' نہیں بلکہ ''تشہد اذان'' مراد ہے تو یہ صحیح ہے،'' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ سفر میں اذان دی اور ''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کی جگہ ''اَشْهَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' (یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں) کے کلمات فرمائے''، (ردالمحتار علی الدر المختار ج:2 ص:194-193 دار احیاء التراث العربی بیروت)۔

شیخ عبدالقادر رافعی مفتی دیارِ مصریہ ''التحریر المختار'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

روی عقبة بن عامر قال: كنت مع رسول الله ﷺ فی سفر فلما زالت الشمس اذن بنفسه واقام وصلی الظهر وقال السيوطی ظفرت بحديث اخر مرسل اخرجه سعيد بن منصور فی سننه قال: اذن رسول الله ﷺ مرة فقال: حی علی الفلاح وهذه لايقبل التاويل۔

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھا،

جب ظہر کا وقت ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے خود ظہر کی اذان و اقامت کہی اور علامہ سیوطی نے فرمایا: مجھے اس موضوع پر ایک اور حدیث مرسل مل گئی جس کو سعید بن منصور نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اور بار اذان دی اور فرمایا:"حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ"، علامہ رافعی فرماتے ہیں کہ ان حدیثوں میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے''،
(تقریرات رافعی ج:1 ص:47 بحوالہ شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی 1072/1)۔

معذور پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے

سوال:9

درج ذیل دو سوالوں کے جواب مطلوب ہیں، امید ہے کہ آپ میری رہنمائی کریں گے۔شکریہ

1۔میری عمر 84 سال کے قریب ہے، میں عرصہ 4 سال سے ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوں کہ رکوع وسجود نہیں کر سکتا، کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز ادا کرتا ہوں، چار سال سے میری نماز جمعہ وعیدین قضا ہو رہی ہے، اخباری معلومات کے مطابق میں ہر جمعہ کی نماز کے عوض ظہر کی قضا ادا کرتا ہوں، ظہر قضا سے کیا مراد ہے، جمعہ کے روز جب دن ڈھل جائے یعنی ظہر کا وقت قضا ہو جائے تب مجھے ظہر کی فرض وسنت ادا کرنی چاہیے یا جمعہ کی نماز کا وقت رہتے ہوئے مجھے ظہر کی نماز قضا کی نیت کر کے ادا کرنا چاہیے، میں عرصہ سے جمعہ کا وقت رہتے ہوئے نماز ظہر قضا کی نیت کر کے ادا کر رہا ہوں، میں نیت اس طرح کرتا ہوں۔"یا اللہ میں نیت کرتا ہوں چار رکعت فرض (یا سنت) نماز ظہر قضا بالعوض جمعہ ادا کرنے کی" برائے مہربانی مجھے ظہر قضا پڑھنے کا طریقہ بتائیں۔

2۔میری اہلیہ کی والدہ کا انتقال ان کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا، وہ ان کے نام قربانی کرنا چاہتی ہیں مگر والدہ مرحومہ کا نام سہو کر گئی ہیں، نیت کس طرح کی جائے، واضح رہے کہ ان کے والد مرحوم نے دوسری شادی بھی کر لی تھی، (محمد کفیل، کراچی)۔

جواب:

عورتوں، بچوں اور معذوروں پر جمعہ واجب نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے:

عن طارق بن شهاب رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ الجمعة حق واجب علیٰ کل مسلم فی جماعة الا علیٰ اربعة :عبد مملوک، او امرأة، او صبی او مریض ۔

ترجمہ:'' طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعہ حق شرع ہے اور ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ واجب ہے، سوائے چار قسم کے لوگوں کے، غلام یا عورت، یا بچہ، یا بیمار''، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:۱۰۶۷)۔

لہٰذا معذوری و بیماری کی بناء پر آپ پر جمعہ واجب ہی نہیں ہے، آپ ظہر کا وقت داخل ہونے سے معمول کے مطابق ظہر کی نماز پڑھیں گے، یعنی نمازِ جمعہ ہو جانے کے بعد، ورنہ مکروہ ہے، اور یہ نماز ادا ہوگی، قضا نہ ہوگی، ان شاء اللہ آپ کے ثواب میں کوئی کمی بھی نہیں آئے گی، جمعہ صرف با جماعت واجب ہے، تنہا پڑھیں، جمعہ رہ جانے کی صورت میں تندرست آدمی بھی ظہر ہی کی نماز پڑھے گا۔

جواب:

آپ کی اہلیہ محترمہ کو اگر اپنی والدہ کا نام معلوم نہیں ہے اور وہ ان کی طرف سے نفلی قربانی کرنا چاہتی ہیں تو ذبح کے بعد اس طرح دعا مانگیں: '' اے اللہ! اسے میری ماں کی جانب سے قبول فرما''۔ اگر لفظاً یہ کلمات نہ کہہ سکیں تو نیت ہی کافی ہے۔

نماز کے دونوں سجدوں کی شرعی حیثیت

سوال:10

نماز کی ہر رکعت میں دونوں سجدوں کی شرعی حیثیت کیا ہے، آیا یہ دونوں فرض ہیں یا دونوں واجب، یا پہلا فرض ہے اور دوسرا واجب یا سنت؟، (مولانا سید محمد اعجاز الدین سہروردی امام وخطیب جامع مسجد بغدادی، تین ہٹی، کراچی)۔

جواب:

نماز کی ہر رکعت میں دونوں سجدے فرض ہیں۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرائضِ نماز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "ومنها السجود"، یعنی فرائض نماز میں دو سجدے بھی ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ ایک سجدے سے فرضیتِ سجدہ تمام کیوں نہیں ہو جاتی اور دوسرا سجدہ کیوں فرض قرار دیا گیا تو اس کے بارے میں علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"وتکراره تعبد ثابت بالسنة کعدد الرکعات"۔ یعنی سجدے کا بطورِ فرض تکرار امر تعبدی ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کی سنتِ تشریعی ہے اور آپ کے تعامل سے ثابت ہے، جیسا کہ نماز کی رکعات کی تعداد امر تعبدی ہے، یہ ایسا امر نہیں کہ عقل سے ان کی تعداد متعین کی جا سکے۔ (نوٹ: واضح رہے کہ یہاں سنت سے مراد وہ سنتِ اصطلاحی فقہی نہیں ہے جو فرض اور واجب کے مقابل ہے اور ان کی قسم ہے بلکہ اس سے بحیثیتِ شارع مجاز رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے جو فرض اور واجب کو بھی محیط ہے اور نماز کے بارے میں تو خود رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "صلّوا کما رأیتمونی اصلی" یعنی جیسے تم مجھے نماز پڑھتا دیکھو ویسے ہی نماز پڑھو کیونکہ میرا عمل واجب الاتباع اور شریعت میں حجت ہے)۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"(وتکراره تعبد) ای وتکرار السجود امر تعبدی ای لم یعقل معناه علیٰ قول اکثر المشائخ تحقیقا للابتلاء وقیل ثنی ترغیماً للشیطان حیث لم یسجد مرة فنحن نسجد مرتین، وتمامه فی البحر"۔

مفہوم: "نماز کی ایک رکعت میں سجدے کا تکرار امر تعبدی ہے (یعنی شارع کے حکم اور دائمی مستمر عمل پر موقوف ہے)، اکثر علماء کے نزدیک یہ عقل سے سمجھ میں آنے یا مقرر کرنے کی بات نہیں ہے، اور اسے ماورائے عقل اس لئے رکھا گیا ہے تاکہ بندے کی آزمائش ہو کہ آیا جس بات کی حکمت اس کی عقلِ نارسا میں نہ آئے، وہ اسے شارع کے حکم پر غیر مشروط طور

پرتسلیم کرتا ہے یا نہیں ؟،اور ایک قول یہ ہے کہ دوسجدے شیطان کو رسوا کرنے کے لئے مشروع ہوئے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم پر آدم علیہ السلام کو ایک سجدہ کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور ہم اللہ کی بارگاہ میں اس کے حکم اور اس کے رسول ﷺ کی سنت تشریعی کی اتباع میں ایک رکعت میں دوسجدے کرتے ہیں ، یہ پوری بحث علامہ زین الدین ابن نجیم نے البحر الرائق میں کی ہے"،(ردالمحتار علی الدر المختار ج ۲ ص ۱۱۹-۱۲۰ ،دارالاحیاء التراث العربی ،بیروت)۔

فاسق امامت کا اہل نہیں

سوال:11

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص جو کہ سادہ لوح اوران پڑھ ہے۔دھوکے سے اس کی بہن کو زمین کے وراثتی حصہ سے اس طرح محروم کرتا ہے کہ بہن سے اس کا حصہ اپنے نام کروالیتا ہے اور جب بہن کو پتہ چلتا ہے کہ میرے بھائی نے دھوکا دے کر میرے حصہ کی زمین اپنے نام کروالی ہے،تو وہ ادھر اُدھر فریاد کرتی ہے۔اور بھائی اقرار بھی کرتا ہے کہ میں نے ایسا کیا ہے، جاؤ جو کچھ کرنا ہے کرلو۔ تو ایسے شخص کیلئے کیا حکم ہے اور اگر ایسا شخص امامت نماز کی کروائے ،تو اس کی امامت میں نماز پڑھنا جائز ہوگی یا کہ نہیں؟،(سائلہ مریم بی بی)۔

جواب:

قانون اسلام کی رو سے ناجائز طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانا ناجائز اور حرام ہے،قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

ترجمہ:"آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ"،(النساء:29)۔

حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے کہ حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے ایک بالشت زمین بھی ظلماً لی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات طبقوں تک کی اس زمین کو(اس کے گلے میں)طوق بنا کر ڈال

دے گا، (شرح صحیح مسلم ج:4 ص:445)۔
شریعت مطہرہ کی رو سے ہر وارث کا حصہ متعین ہے، کسی وارث کیلئے جائز نہیں کہ وہ جبراً دوسرے وارث کے حصے پر قبضہ کرلے۔ صورتِ مسئولہ عنہا میں اگر سوال مبنی بر حقیقت ہے، تو مسئول عنہ اپنی بہن کی زمین پر ناجائز قبضے کی وجہ سے گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہے اور سوال میں خط کشیدہ الفاظ سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گناہِ کبیرہ پر مصر یعنی اصرار بھی کرتا ہے۔ ایسی صورت میں مذکور فی السوال شخص فاسق ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، تاوقتیکہ اپنے اس گناہِ عظیم سے توبہ نہ کرلے۔
فتاویٰ شامی جلد:1 صفحہ:477 پر ہے:
بِخِلَافِ الْفَاسِقِ فَاِنَّہٗ اسْتَظْھَرَ فِیْ شَرْحِ الْمُنِیْرِ اَنَّھَا تَحْرِیْمَۃٌ لِقَوْلِھِمْ اَنَّ فِیْ تَقْدِیْمِہٖ لِلْاِمَامَۃِ تَعْظِیْمُہٗ وَ قَدْ وَجَبَ عَلَیْنَا اِھَانَتُہٗ بَلْ عِنْدَ مَا لِکٍ وَرِوَایَۃٌ عَنْ اَحْمَدَ لَاتَصِحُّ الصَّلٰوۃُ خَلْفَہٗ۔
اس عبارت کا مفہوم یہ ہے: ''شرح المنیر'' میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ فاسق کا امام بنانا حرام ہے کہ فاسق کی امامت مکروہِ تحریمی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ اسے امام بنانے سے اس کی تعظیم لازم آتی ہے اور ہم پر اس کی اہانت واجب ہے، بلکہ امام مالک اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک اس کے پیچھے نماز جائز ہی نہیں ہے''۔
علامہ سعیدی لکھتے ہیں:
''یہ حکم اس فسق پر ہے جو قطعی الثبوت اور غیر مؤوّل ہے، جیسے قتل، چوری، زنا، ظلماً کسی کا مال یا جائیداد ہڑپ کرنا وغیرہ، البتہ جس کا فسق مؤوّل (یعنی جس میں تاویل وتوجیہ کی شرعاً گنجائش ہو) اور ظنی ہو، اس کی اقتدا میں نماز مکروہِ تنزیہی ہے، (شرح صحیح مسلم جلد:2 ص:306 ملخصاً)۔
اگر کوئی فاسق شخص جبراً امام بن جائے یا بنا دیا جائے، تو اس صورت میں، اس کی اقتدا میں جمعہ پڑھنا جائز ہے، جبکہ کسی شہر یا کسی بستی میں صرف ایک جگہ جمعہ ہوتا ہو، لیکن اگر دوسرے مقامات پر بھی جمعہ ہو رہا ہے، جہاں عالم، قاری، متقی اور متشرع امام موجود ہیں، تو پھر اس

فاسق کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

علامہ شرنبلالی لکھتے ہیں:

"وَكُرِهَ إِمَامَةُ الْفَاسِقِ الْعَالِمِ لِعَدَمِ اِهْتِمَامِهِ بِالدِّيْنِ فَتَجِبُ اِهَانَتُهُ شَرْعاً فَلَا يُعَظَّمُ بِتَقْدِيْمِهِ لِلْاِمَامَةِ وَاِذَا تَعَذَّرَ مَنْعُهُ يَنْتَقِلُ عَنْهُ اِلٰى غَيْرِ مَسْجِدِهِ لِلْجُمُعَةِ وَغَيْرِهَا وَاِنْ لَّمْ يُقِمِ الْجُمُعَةَ اِلَّا هُوَ تُصَلّٰى مَعَهُ"۔

ترجمہ: "فاسق عالم کی امامت مکروہ (تحریمی) ہے، کیونکہ وہ دین کا اہتمام نہیں کرتا، اس لئے اس کی اہانت شرعاً واجب ہے، لہٰذا اس کو امام بنا کر اس کی تعظیم نہ کی جائے، اگر اس کو مسجد سے ہٹانا دشوار ہو، تو جمعہ اور دیگر نمازوں کیلئے کسی اور مسجد میں چلا جائے اور اگر صرف وہی جمعہ پڑھاتا ہو، تو پڑھ لے"، (مراقی الفلاح علی ہامش طحطاوی ص:181 مصر)۔

نماز کے اندر قراءت میں غلطی پر امام کو لقمہ دینا

شریعت مطہرہ اور فقہ حنفی کی روشنی میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات درکار ہیں:

سوال:12

یہ کہ ایک امام نے مقدار واجب کے مطابق قراءت کر لی اور اس کے بعد بھول گیا، تو مقتدی لقمہ دے یا نہ دے۔

سوال:13

اگر مقتدی نے لقمہ دے دیا تو کیا یہ بلا ضرورت تلقین و تلقن کے زمرے میں آتا ہے اور مقتدی کی نماز پر اثر پڑتا ہے؟ اور اگر امام لقمہ لے تو اس کی نماز پر اثر پڑے گا؟۔

سوال:14

اگر مقدار واجب کے پڑھنے کے بعد امام کسی سورت کی طرف منتقل ہو جائے تو کیا نماز پر اثر پڑے گا، (سید حسین سعید، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

نماز میں امام بھول جائے تو اسے یاد دلانے یا متوجہ کرنے یا غلطی کی تصحیح کرنے کو

اردو میں ''لقمہ'' دینا کہتے ہیں، فقہ کی اصطلاح میں اسے ''تعلیم وتعلم'' یا ''تلقین وتلقن'' کہتے ہیں (یعنی مقتدی کا امام کو بتلانا یا لقمہ دینا اور امام کا اسے قبول کرنا)۔ اگرچہ مقتدی یہ کام ''اللہ اکبر'' کہہ کر یا ''الحمدللہ'' کہہ کر یا ''سبحان اللہ'' کہہ کر انجام دیتا ہے، جو کلمات تسبیح ہیں اور منافیِ نماز نہیں ہیں، نہ ہی یہ اس کلام کے زمرے میں آتے ہیں جس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، اسی لئے حدیث میں اسے ''سبحۃ'' کہا گیا ہے اور فقہ میں اسے ''فتحۃ'' بھی کہتے ہیں، لیکن چونکہ یہ معنیً کلام ہے، کیونکہ مقتدی ان کلمات کے ذریعے اپنے امام کو گویا یہ بتا رہا ہے کہ: امام صاحب! آپ سے غلطی ہو گئی ہے، تصحیح کر لیجئے۔ اسی لئے اسے ضرورت کی حد تک جائز رکھا گیا ہے اور بلاضرورت مقتدی کا لقمہ دینا اس کی نماز کو فاسد کر دیتا ہے اور امام کا، اس سے لقمہ لینا، امام کی نماز کو فاسد کر دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں پوری جماعت کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

اس کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے کہ اگر امام کی اصلاح نہ کی گئی تو نماز فاسد ہو جائے گی، یعنی نماز کو فساد سے بچانے کیلئے لقمہ دینے اور لینے کی اجازت دی گئی ہے، بلاضرورت نہیں۔ لیکن قراءت کی غلطی پر امام کو متنبہ کرنا اور امام کی اصلاح کرنا یا امام کو لقمہ دینا، اس ضابطے سے مستثنیٰ ہے، جیسے بقدر واجب تلاوت ہو چکی ہے اور ضرورت باقی نہیں، تب بھی امام کو لقمہ دیا جا سکتا ہے۔ اور اگر امام نے بہ قدر واجب تلاوت کر لی ہو، مگر وہ مسنون مقدار یا اس سے زائد تلاوت کر رہا ہے اور اس دوران اس سے ایسی غلطی ہو گئی ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کی جائے تو فسادِ معنی کی وجہ سے وہ نماز فاسد ہو سکتی ہے، تب تو وہاں ضرورت بھی موجود ہے، لیکن اگر معنی میں فساد واقع نہ ہو رہا ہو اور امام متشابہ کی وجہ سے کسی اور سورت میں منتقل ہو گیا ہے، تب بھی لقمہ دیا جا سکتا ہے۔ اسی ضابطے کے تحت نمازِ تراویح کی طویل قراءت میں امام کو بار بار لقمہ دیا بھی جا سکتا ہے اور امام لقمہ لے بھی سکتا ہے، خواہ امام کی غلطی ایسی ہو کہ نماز فاسد نہ ہو رہی ہو، تب بھی لقمہ دینا اور لینا درست ہے۔ اور اس مسئلے میں فرض، واجب اور تراویح کی جماعت کا یکساں حکم ہے۔

ایک اور صورت مسئلہ یہ ہے، جہاں فسادِ نماز کا خطرہ تو نہیں ہے، لیکن امام کو لقمہ دیا جا سکتا ہے اور امام کے لقمہ لینے سے مقتدی اور امام کسی کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ اور وہ صورت یہ ہے کہ امام پہلے قعدہ پر بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہونے لگا ہے، مگر وہ ایسی ہیئت میں ہے کہ وہ بیٹھنے کے قریب ہے، اس موقع پر مقتدی لقمہ دے دیتا ہے اور امام اس کا لقمہ لیتے ہوئے بیٹھ جاتا ہے تو امام اور مقتدی کسی کی نماز فاسد نہیں ہوگی، حالانکہ اس موقع پر اگر امام کو لقمہ نہ بھی دیا جاتا تو فسادِ نماز کا اندیشہ نہیں تھا، کیونکہ آخر میں سجدۂ سہو سے اس کی تلافی ہو سکتی تھی، اس صورتِ مسئلہ کو امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 3 ص:645، مطبوعہ دارالعلوم امجدیہ، کراچی)۔

اس تمہید کی روشنی میں دریافت کیے گئے سوال کا مدلّل و مفصّل جواب درج ذیل ہے:

''اگر امام بھول جائے تو شریعت مطہرہ اور فقہ حنفی کی روشنی میں اسے لقمہ دینا چاہیے، امام اور مقتدی دونوں کی نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا''۔

خلاصۃ الفتاویٰ مع مجموعۃ الفتاویٰ میں ہے:

وان قرأ الامام قدرما یجوزبه الصلوٰة الا انه اذا توقف ولم ینتقل الی آیة اخریٰ حتی فتح المقتدی اختلفوا فیه والاصح انه لاتفسدصلوة المقتدی وان اخذ الامام بفتحه لا تفسد صلوتهم۔

ترجمہ: ''اگر امام نے بقدر واجب قراءت کی اور پھر ٹھہر گیا اور دوسری آیت کی طرف منتقل نہیں ہوا اور مقتدی نے لقمہ دیا اس میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوئی اور اگر امام نے لقمہ لے لیا تو (امام و مقتدی) سب کی نماز فاسد نہیں ہوگی''۔

چند سطور آگے لکھتے ہیں:

وفی الجامع الصغیر للصدرالشهید لوقرأ قدر مایجوزبه الصلوة قالوا ینبغی ان تفسد صلوتهٗ وصلوتهم ان اخذالامام والفتوی علی انهٗ لاتفسد بکل حال۔

ترجمہ: ''اور صدرالشہید نے الجامع الصغیر میں لکھا ہے کہ بقدر واجب قراءت کی (اور پھر لقمہ

دیا) تو کہا گیا ہے کہ مقتدی کی نماز فاسد ہوجائے گی اور باقی نمازیوں کی بھی اگرامام نے لقمہ لے لیا۔ اور فتویٰ اس پر ہے کہ کسی بھی حال میں نماز فاسد نہیں ہوگی''،(خلاصۃ الفتاویٰ صفحہ:۱۲۱ جلدنمبر۱ قاضی خان صفحہ:۶۷ جلدنمبر۱)۔

اسی طرح ابوداؤد میں ہے:

عن عبداللہ بن عمران النبی ﷺ صلی صلوۃ فقرأ فیھا فلبس علیہ فلما انصرف قال لِاُبَیّ: اصلیت معنا؟، قال نعم ، قال فما منعک؟

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے نماز پڑھائی تو قراءت میں اشتباہ ہوا، جب فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟، انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، فرمایا: تو تمہیں کس چیز نے (لقمہ دینے سے) روکا''،(ابوداؤد، باب الفتح علی الامام فی الصلوٰۃ، رقم الحدیث:904)۔

اسی طرح فتاویٰ درمختار میں ہے:

(بخلاف فتحہ علی امامہ) فانہ لایفسد (مطلقا)لفاتح أواخذ بکل حال۔

ترجمہ:''اپنے امام کو لقمہ دینا تو اس سے مطلقاً کسی بھی حال میں لقمہ دینے والے اور لینے والے کی نماز فاسد نہیں ہوگی''۔

"مطلقًا بکل حال" کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں:

ای سواءً قرء الامام قدر ما تجوزبہ الصلاۃ ام لا ، انتقل الی ایۃ اخری ام لا، تکرر الفتح ام لا، ھو الاصح ۔

ترجمہ:''یعنی چاہے امام نے بقدر واجب قراءت کی ہے یا نہیں، دوسری آیت کی طرف منتقل ہوا ہے یا نہیں، لقمہ میں تکرار کی ہے یا نہیں، صحیح ترین بات یہی ہے (کہ بہرصورت نماز فاسد نہیں ہوگی)''،(فتاویٰ شامی، جلد۲، صفحہ:۳۲۹، داراحیاء التراث العربی)۔

اسی طرح اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی، فتاویٰ رضویہ باب مفسدات الصلوٰۃ میں فرماتے ہیں:

''امام جب نماز یا قراءت میں غلطی کرے تو اسے بتانا، لقمہ دینا مطلقاً جائز ہے، خواہ نماز فرض ہو یا واجب یا تراویح یا نفل، اور اس میں سجدۂ سہو کی بھی کچھ حاجت نہیں، ہاں اگر بھولا اور تین بار ''سُبْحٰنَ اللہ'' کہنے کی دیر چپکا کھڑا رہا، تو سجدۂ سہو آئے گا۔ جس نے لقمہ دینے کے سبب نیت توڑ دی، اس نے محض جہالت برتی اور مبتلائے حرام ہوا کہ بے سبب نیت توڑ دینا حرام ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔

پھر فرماتے ہیں:

''امام کو لقمہ دینا ہر نماز میں جائز ہے، جمعہ ہو یا کوئی نماز، بلکہ اگر اس نے ایسی غلطی کی جس سے نماز فاسد ہوگی تو لقمہ دینا فرض ہے، نہ دے گا اور اس کی تصحیح نہ ہوگی تو سب کی نماز جاتی رہے گی اور لقمہ دینے سے سجدۂ سہو نہیں آتا''۔

اسی طرح فتاویٰ رضویہ جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر: ۲۷۴، مسئلہ نمبر ۲۶۸ میں اعلیٰ حضرت سے دریافت کیا گیا کہ:

''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام مغرب میں رکوع ''لَقَدْ صَدَقَ اللہُ رَسُوْلَهٗ'' پڑھ رہا تھا، جب ''فِی الْاِنْجِیْلِ'' تک پڑھ لیا، آیت پارہ: ۲۲ کا متشابہ لگا، اس کے بعد یہ آیت: ''اِنَّمَا یُرِیْدُ اللہُ لِیُذْهِبَ'' تک پڑھی۔ پھر جب یاد آیا اسے چھوڑ کر مقام اصل سے شروع کیا اور نماز ختم کی اور سجدۂ سہو نہ کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں، بینوا توجروا''۔

اس سوال کے جواب میں اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ:

''نماز ہوگئی اور سجدۂ سہو کی بھی حاجت نہ تھی اگر بقدر ادائے رکن سوچتا نہ رہا ہو، ہاں اگر بھولا اور سوچنے میں اتنی دیر خاموش رہا، جس میں کوئی رکن نماز کا ادا ہوسکتا ہے، تو سجدۂ سہو لازم آیا کما فی الدر المختار وغیرہ (جیسا کہ درمختار وغیرہ میں ہے) اگر نہ کیا تو نماز جب بھی ہوگئی مگر ناقص ہوئی، پھیرنا واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔

فرسٹ فلور پر نماز باجماعت کا حکم اور گراؤنڈ فلور پر نمازیوں کا جماعت میں شامل ہونا

سوال:15

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ پہلے مسجد میں پنج وقتہ نماز باجماعت گراؤنڈ فلور پر ہورہی تھی؟، اب فرسٹ فلور بن چکا ہے اور انتظامیہ کی خواہش ہے کہ پنج وقتہ نماز فرسٹ فلور پر پڑھی جائے۔ گراؤنڈ فلور کی مسجدیت ختم نہیں کی جارہی کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟، نیز اگر امام فرسٹ فلور پر امامت کرا رہا ہو تو بعض مقتدی گراؤنڈ فلور پر اس کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ جمعہ کے روز جب مسجد مکمل طور پر بھر جاتی ہے، کیا اس موقعہ پر بھی ایسا ہوسکتا ہے کہ امام فرسٹ فلور پر کھڑا ہو اور گراؤنڈ فلور پر بھی مقتدی اس کی اقتداء میں نماز پڑھیں یا پھر اس موقع پر امام کو گراؤنڈ فلور پر کھڑا ہونا ضروری ہے، (محمد رفیق لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

مسجد کی عمارت بجمیع اجزائہ مسجد کہلاتی ہے اور مسجد کے جمیع اجزاء کا حکم یکساں ہے، جس طرح نیچے مسجد کے اندر نماز صحیح اور مشروع ہے، اسی طرح فرسٹ فلور پر بھی نماز باجماعت جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مسجد ہی ہے، لہٰذا صورۃ مسئولہ میں فرسٹ فلور پر نماز باجماعت پڑھنے میں ازروئے شرع کوئی حرج نہیں ہے، البتہ فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے فقط امام کا اونچی جگہ کھڑا ہونا مکروہِ تنزیہی ہے، لیکن اگر امام کے ساتھ کچھ مقتدی بھی اوپر کھڑے ہوں اور باقی امام سے نیچے ہوں تو ایسی صورت میں بلاکراہت نماز جائز ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

یکرہ ان یکون الامام وحدہ علی الدکان وکذا القلب۔۔۔وان کان بعض القوم معہ فالاصح انہ لایکرہ الخ ۔۔(فتاوی عالمگیری جلد1ص:108)۔

صورت مسئولہ میں جو لوگ نیچے امام کی اقتداء میں کھڑے ہوں گے، اگر ان کو امام کے

انتقالات یعنی رکوع اور سجدہ میں جانے کا اس طرح تشہد میں بیٹھنے کا اور سلام پھیرنے کا کسی ذریعہ سے خواہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے یا مکبرین کے ذریعے علم ہو جاتا ہے، تو نیچے کھڑے ہو کر ان کا اقتداء کرنا درست ہے اور اگر ان کو امام کے انتقالات کا علم نہیں ہوتا تو پھر ان کا امام کی اقتداء کرنا، اس صورت میں صحیح نہیں، نماز جائز نہیں ہوگی۔

معذور کیلئے اشارے سے رکوع وسجود کرنا

سوال:16

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے تقریباً ایک سال پہلے مسجد میں دو کرسیاں نمازیوں کے استعمال کیلئے دی تھیں، اب وہ ان کرسیوں کو مسجد سے لے گئے اور ان کی جگہ مسجد میں نئی دو کرسیاں رکھ دیں اور پرانی کرسیاں کسی دوسری مسجد میں دے دیں۔ ان کا یہ عمل انتظامیہ کو بعد میں معلوم ہوا، کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟، کیا ایک چیز کسی مسجد کو ھبہ کر دینے کے بعد اس کو دوسری مسجد میں دینا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟، (رحمت اللہ قادری، جامع مسجد القمر، شاہ فیصل کالونی نمبر 3)۔

سوال:17

آپ یہ بتائیں کہ آج کل مساجد میں نماز کیلئے ایسی کرسیاں رکھی جاتی ہیں جن کے آگے سجدہ کرنے کیلئے پھٹہ (تختہ) لگا ہوتا ہے، کیا اس تختے پر سجدہ کرنا جائز ہے، قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، (رحمت اللہ قادری، جامع مسجد القمر، شاہ فیصل کالونی نمبر 3)۔

جواب:

شریعتِ اسلامیہ کی رو سے ایک آباد مسجد کا سامان دوسری مسجد میں نہیں لگا سکتے، البتہ اگر کوئی چیز پرانی ہو کر قابلِ استعمال نہ رہے تو وقف کنندہ یعنی وہ شخص جس نے وہ سامان خرید کر مسجد کے مصالح کیلئے وقف کر دیا تھا، وہ سامان بیچ کر یا کہیں صدقہ کر کے دوسرا نیا سامان مسجد کیلئے خرید کر وقف کر دے تو شرعاً ایسا کرنا درست ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

بواری المسجد اذاخلقت فصارت لاینتفع بھا فارادالذی بسطھاأن یأخذ ھا ویتصدق بھا اویشتری مکانھا اخری فلہ ذلک الخ۔

ترجمہ: ''مسجد کی چٹائی جب پرانی ہوکر استعمال کے قابل نہ رہے، دینے والا اگر وہ چٹائی لے کر اور اس کو صدقہ کر کے یا اس کی جگہ دوسری چٹائی خرید کر دے تو یہ جائز ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد دوم، صفحہ نمبر 458)۔

صورت مسئولہ میں اگر وہ کرسیاں پرانی ہونے کی وجہ سے قابلِ استعمال نہیں تھیں، تو دوسری مسجد میں ان کا صدقہ کی نیت سے دینا درست تھا۔ جبکہ دینے والے نے دوسری دونئ کرسیاں بھی خرید کر مسجد کیلئے وقف کردیں۔

جواب:

اگر کوئی شخص بیماری کی وجہ سے زمین پر سجدہ کرنے سے قاصر ہو تو اس کیلئے حکم یہ ہے کہ وہ اشارے سے رکوع اور سجدہ کرے، کسی چیز پر سر رکھ کر سجدہ کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وان تعذرا) لیس تعذرھما شرطابل تعذرالسجود کاف (لاالقیام اومأ قاعدا ریجعل سجودہ اخفض من رکوعہ) لزوما (ولایرفع الیٰ وجھہ شیئا یسجد علیہ) فانہ یکرہ تحریما۔

ترجمہ: ''اور اگر نمازی کیلئے رکوع وسجدہ کرنا دشوار ہو جائے، دونوں کا دشوار ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ صرف سجدے کا متعذر ہونا ہی کافی ہے، تو بیٹھے ہوئے اشارے سے رکوع وسجدہ کرے اور اشارہ کرتے وقت لازماً سجدے کیلئے رکوع کے بہ نسبت زیادہ جھکے، اور (زمین سے) اپنے چہرے تک کوئی چیز اٹھا کر اس پر سجدہ نہ کرے، کیونکہ ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2، ص:495 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

آج کل بعض مساجد میں یہ رواج پڑ گیا ہے کہ کرسی رکھی ہوتی ہے اور اس کے آگے سجدے

کیلئے ٹیبل نما تختی لگی ہوتی ہے، اور ایسے نمازی جو کسی معذوری کی بنا پر سجدہ نہیں کر سکتے، وہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں اور بیٹھے بٹھائے اس تختی پر سر جما کر سجدہ کر لیتے ہیں، یہ طریقہ درست نہیں ہے، بلکہ مکروہ تحریمی ہے۔ معذور نمازی کو چاہئے کہ بیٹھ کر نماز پڑھے، اگر زمین پر بیٹھنا اس کیلئے دشوار ہے، تو کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے، البتہ رکوع وسجود اشارے سے کرے، رکوع کیلئے مناسب حد تک جھکے اور سجدے کیلئے اس سے زیادہ جھکے، اسی کو اشارے سے رکوع وسجدہ کرنا کہتے ہیں، کسی میز یا تختہ یا بینچ پر سر رکھ کر سجدہ نہ کرے، یہ مکروہِ تحریمی ہے۔

معذور کیلئے اشارے سے رکوع وسجود کرنا

سوال:18

میری کمر میں تکلیف ہے، ڈاکٹر نے بیلٹ باندھنے کو بتایا ہے، بیلٹ اتار کر درد میں اضافہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے میں بیلٹ باندھتا ہوں اور سجدہ زمین پر نہیں کر پاتا۔ آپ میری رہنمائی فرمائیں، میں نماز میں سجدہ لکڑی کی ٹیبل رکھ کر ادا کر سکتا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آمین، (الحاج غلام قادر النور سوسائٹی، کراچی)۔

نوٹ: جواب وہی ہے جو گذشتہ سوال کے ضمن میں مذکور ہوا۔

قعدۂ اولیٰ بھول کر کھڑا ہو جانا

سوال:19

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ: اگر امام دو رکعات پڑھانے کے بعد بغیر تشہد تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہو جائے پھر مقتدیوں کے لقمہ دینے پر پھر تشہد کی طرف لوٹ آئے، تو ایسی صورت میں سجدۂ سہو کے ساتھ نماز ہو جائے گی یا دوبارہ لوٹانی ہوگی؟، (کیپٹن زوّار حسین عباسی، اسلام آباد)۔

جواب:

قعدۂ اولیٰ واجب ہے اور واجب کے بھول کر چھوٹ جانے سے سجدۂ سہو واجب ہو جاتا ہے۔ اور سجدۂ سہو سے نماز ہو جائے گی۔ قعدۂ اولیٰ بھول جانے کی صورت میں یاد

آنے پر جب تک سیدھا کھڑا نہ ہو واپس لوٹ آئے اور سجدۂ سہو بھی واجب نہیں، لیکن اگر سیدھا کھڑا ہو گیا تو واپس نہ لوٹے اور آخر میں سجدۂ سہو کر لے، نماز ہو جائے گی، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(سها عن القعود ا لأو ل من الفرض) ولو عملياً ، أما النفل فيعود مالم يقيد بالسجدة (ثم تذكّره عاد اليه)وتَشهّد ، ولا سهو عليه في الأصحّ (مالم يستقِم قائمًا) في ظاهر المذهب ، وهو الأصحُ ـ فتح (والّا)أي وان استقام قائمًا (لا) يعود لاشتغاله بفرض القيام (وسجد للسهو) لترك الواجب (فلو عاد الى القعود)بعد ذلك (تفسد صلاته)

ترجمہ: ''(اگر) (فرض نماز کا قعدۂ اولیٰ بھول گیا) اگر چہ وہ فرضِ عملی ہو، رہا نمازِ نفل کا مسئلہ تو جب تک رکعت کا سجدہ نہیں کیا تو لوٹ آئے، (پھر اگر یاد آیا تو تشہد کی طرف لوٹ آئے) اور تشہد پڑھے، اور صحیح قول یہ ہے کہ اس پر سجدۂ سہو نہیں (جب تک وہ سیدھا کھڑا نہیں ہوا) ظاہر مذہب کے مطابق یہی صحیح ترین ہے۔ ''فتح القدیر'' (اور اگر) سیدھا کھڑا ہو جائے تو (نہیں لوٹے گا) کیونکہ اب وہ (رکن) قیام کے فرض میں مشغول ہو گیا ہے، (اور آخر میں سجدۂ سہو کرے گا) واجب کے ترک ہونے کی بنا پر، (پس اب اگر وہ قعدہ کی طرف لوٹا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص:478,479، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''ایک شخص نمازِ فرض یا وتر میں پہلا قعدہ بھول کر کھڑا ہو گیا یا کھڑا ہونے لگا تو اس صورت میں کیا حکم ہے لوٹ آئے یا نہ لوٹے؟ اور اگر کھڑا ہو گیا یا کھڑا ہونے کے قریب تھا اُس کے بعد لوٹ آیا تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ اگر ہو جائے گی تو سجدۂ سہو واجب ہو گا یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا:

اگر ابھی قعود سے قریب ہے کہ نیچے کا آدھا بدن ہنوز سیدھا نہ ہونے پایا جب تو بالاتفاق لوٹ آئے اور مذہب اَصَحّ میں اُس پر سجدۂ سہو نہیں اور اگر قیام سے قریب ہو گیا یعنی بدن کا

نصف زیریں سیدھا اور پیٹھ میں خم باقی ہے تو بھی مذہب اَصَح واَرْجَح میں پلٹ آنے ہی کا حکم ہے مگر اب اُس پر سجدۂ سہو واجب، اور اگر سیدھا کھڑا ہو گیا تو پلٹنے کا اصلاً حکم نہیں بلکہ ختمِ نماز پر سجدۂ سہو کرلے پھر بھی اگر پلٹ آیا بہت برا کیا گنا ہگار رہوا، یہاں تک کہ حکم ہے کہ فوراً کھڑا ہو جائے، اور امام ایسا کرے تو مقتدی اُس کی پیروی نہ کریں کھڑے رہیں یہاں تک کہ وہ پھر قیام میں آئے، مگر مذہب اَصَح میں نمازیوں بھی نہ جائے گی صرف سجدۂ سہو لازم رہے گا۔ فی تنویر الابصار والد رالمختار وردالمحتار (سها عن القعود ا لأول من الفرض) ولو عمليًا، أما النفل فيعود مالم يقيد بالسجدة (ثم تذكره عاد اليه) وتشهد، ولا سهو عليه فى الأصح (مالم يستقم قائمًا) فى ظاهر المذهب، وهو الأصح ـ فتح يعنى اذا عاد قبل ان يستقيم قائمًا وكان الى القعود اقرب فانه لاسجود عليه فى الاصح وعليه الاكثر ،اما اذا عاد وهو الى القيام اقرب فعليه سجود السهو كما فى نورِ الايضاحِ وشرحِه بلا حكايةِ خلافٍ فيه وصَحَّحَ اعتبارُ ذلك فى الفتح بما فى الكافى اِنِ استوىٰ النِّصْفُ الاَسفَلُ وظَهرُهٗ بعدُ مُنْحَنٍ فهو اَقربُ الى القعودِ واِنِ استقامَ قائمًا لايعودُ وسجد للسهو فلو عاد الى القعود لاتفسد لكنه يكون مُسِيْئًا اى يأثم كما فى الفتح فلو كان اما مالا يعود معه القوم تحقيقاً للمخالفة ويلزمه القيام للحال شرح المنية عن القنية۔ ويسجد لتاخير الواجب وهو الحق بحر۔

ترجمہ: ”تنویر الابصار، ردالمحتار اور درمختار میں ہے کہ (اگر فرض کا قعدہ اول بھول گیا) اگرچہ وہ فرض عملی ہو، رہا معاملہ نفل کا تو لوٹ آئے جب تک رکعت کا سجدہ نہیں کیا (پھر اسے یاد آیا تو اس کیطرف لوٹ آئے) اور تشہد پڑھے اور اصح قول کے مطابق اس پر سجدہ سہو نہیں (جب تک وہ سیدھا کھڑا نہیں ہوا) ظاہر مذہب کے مطابق، اور یہی اصح ہے فتح۔ یعنی سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے لوٹا حالانکہ قعود کے قریب تھا تو اب اصح قول کے مطابق اس پر سجدۂ سہو نہیں، اور اکثریت کی یہی رائے ہے، اور اگر لوٹا لیکن قیام کے قریب تھا تو اس

پر سجدۂ سہولازم ہوجائے گا جیسا کہ نورالایضاح اور اس کی شرح میں اسے بلااختلاف ذکر کیا ہے اور کافی کی اس عبارت کو فتح میں صحیح اعتبار کیا ہے کہ اگر نصف اسفل سیدھا مگر پشت ابھی ٹیڑھی تھی تو نمازی قیام کے قریب، اور اگر برابر نہیں تو نمازی قعود کے قریب ہوگا، اور اگر کھڑا ہوگیا نہ لوٹا تو سجدۂ سہو کرے اور اگر اب بھی واپس لوٹ آتا ہے تو نماز فاسد نہ ہوگی البتہ گناہگار ہوگا جیسا کہ فتح میں ہے، اگر وہ امام ہے اور کھڑا ہوکر واپس لوٹے تو مقتدی اس کی موافقت میں واپس نہ لوٹیں تاکہ مخالفت ظاہر کریں تو اس امام پر اس وقت قیام لازم ہے، شرح المنیہ میں قنیہ سے ہے اور تاخیر واجب کی وجہ سے سجدۂ سہو کرے، اور یہی حق ہے بحر، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8 ص: 181,182 مطبوعہ: رضافاؤنڈیشن، لاہور)''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر دوسری رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ کے لئے بیٹھنے کے بجائے تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہوگیا ہے تو قعود (تشہد) کی طرف نہیں لوٹے گا، اور سجدۂ سہو سے نماز درست ہوجائے گی، اور اگر ابھی سیدھا کھڑا نہیں ہوا اور قعود کے قریب ہے تو بیٹھ جائے اور اس صورت میں سجدۂ سہو نہیں کرے گا۔ اگر منفرد یا امام سیدھا کھڑے ہونے کے بعد خود یاد آنے پر تشہد کی طرف لوٹ آئیں، تو علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولو عاد الى القعود تفسد صلوته على الصحيح كذا فى التبيين۔

ترجمہ: ''اور اگر (دوسری رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ کے لئے بیٹھنے کے بجائے تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہونے کے بعد) قعدے کے لئے لوٹ آیا تو صحیح قول کے مطابق نماز فاسد ہوجائے گی، ''تبیین'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج: 1، ص: 127، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

لیکن سطور بالا میں امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے علامہ علاؤالدین حصکفی اور علامہ ابن عابدین شامی رحمہما اللہ تعالیٰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر منفرد یا امام سیدھا کھڑے ہونے کے بعد خود یاد آنے پر (قعدۂ اولیٰ کے لئے) لوٹ آئیں تو نماز فاسد نہیں ہوگی، لیکن وہ گناہگار ہوں گے اور تاخیر فرض یا ترک واجب کی بنا پر سجدۂ سہولازم آئے گا۔ لیکن یہ اس

صورت میں ہے کہ بیٹھنے پر فوراً لوٹ کر کھڑا نہ ہو جائے اور تین تسبیح کی مقدار تاخیر ہو جائے۔
اگر امام مقتدی کے یاددلانے پر کھڑا ہونے کے بعد قعدۂ اولیٰ (جسے وہ بھول کر کھڑا ہوگیا تھا) کی طرف لوٹ آیا تو اس صورت میں امام اور مقتدی سب کی نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ یہ تلقین (مقتدی کا اپنے امام کو غلطی پر مطلع کرنے کے لئے لقمہ دینا) اور تلقُّن (یعنی امام کا لقمہ لینا) بلاضرورت ہے اور یہ فسادِ صلوٰۃ کا سبب ہے، اس کے تفصیلی دلائل ہم سوال نمبر:13، ص:54 کے جواب میں تحریر کر چکے ہیں، وہاں پر ملاحظہ فرمائیں۔

مسجد میں لڑائی جھگڑے اور شوروشغب کا حکم

سوال:20

ہماری ایک خاندانی مسجد ہے، جسے میرے والد نے بنایا اور وہی اس کے متولی اور امام رہے، ان کے بعد میں امامت کرتا رہا، میں نے چند دنوں کیلئے عارضی طور پر ایک شخص کو امام مقرر کیا، جب میں دوبارہ امامت کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے گیا اور نماز جمعہ کے وقت مصلّٰی پر امامت کیلئے کھڑا ہوا تو اس امام نے، جسے میں نے معزول کر دیا تھا، مجھے زبردستی مصلّٰی سے کھینچا، نماز پڑھنے سے روکا، گالی گلوچ اور ہاتھا پائی پر اتر آیا، مسجد میں شوروشغب کیا، ایسے شخص کیلئے شرعاً کیا حکم ہے؟، (مولانا عزیز الرحمٰن بالاکوٹ، ہزارہ)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برتقدیرِ صدق بیانِ سائل، جن لوگوں نے سائل اور ان کے ساتھیوں پر مسجد میں حملہ کیا، مسجد کا تقدس پامال کیا اور سائل اور ان کے ساتھیوں کو جمعہ کی نماز سے روکا، وہ حرام فعل کے مرتکب ہوئے۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ط
ترجمہ: ''اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی مساجد میں اس کے نام کے ذکر سے منع کرے اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے''۔ (القرآن، سورۃ البقرۃ:114)

اورفرمایا: اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡہٰی ﴿۹﴾ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی ﴿۱۰﴾

ترجمہ:''کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے، جو بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے''۔ یہ آیت کریمہ ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔(القرآن،سورۃ العلق:10-9)

اسی طرح دشمن رسول ولید بن مغیرہ کے بارے میں فرمایا:

مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ مُعۡتَدٍ اَثِیۡمٍ ﴿۱۲﴾

ترجمہ:''بھلائی سے روکنے والا حد سے بڑھنے والا گنہگار''۔(القرآن،سورۃ القلم:12)۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

اپنی مساجد کو بچوں سے(جنہیں مسجد کے ادب واحترام کا شعور نہ ہو)،اور فاتر العقل لوگوں سے، اور شریر لوگوں سے،اور خرید وفروخت کے معاملات اور باہمی جھگڑوں سے محفوظ رکھو''۔(سنن ابن ماجہ: حدیث نمبر:570)

کتاب وسنت کی روشنی میں مسجد میں لڑائی جھگڑا کرنا اور شور وشغب کرنا، مسجد کی حرمت کو پامال کرنا ہے،اسی طرح سے ایذائے مسلم بھی حرام ہے،جس کا یہ لوگ سبب بنے ہیں۔لہٰذا ان لوگوں کو مسجد کی بے حرمتی کرنے،عبادت میں حائل ہونے اور ایذائے مسلم کے سبب اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہیے اور جن لوگوں کو جسمانی یا ذہنی اذیت پہنچائی ہے،ان سے معافی مانگنی چاہیے،فقط واللہ اعلم بالصواب۔

ایک مسجد میں تراویح کی دو جماعتیں

سوال:21

جناب مفتی صاحب:ایک ہی وقت میں کسی مسجد میں پہلی منزل اور تیسری منزل میں تراویح کی دو جماعتیں الگ الگ امام کی اقتداء میں کرانا،ازروئے شریعت درست ہیں یا نہیں؟،تیسری منزل میں تراویح کی جماعت بغیر مائیک کے،مدرسہ کے طلباء اور ان کی یادداشت اور مہارت کیلئے تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے،پہلی منزل میں جگہ کم پڑنے کی وجہ سے بعض مقتدی حضرات بھی شریک ہوتے ہیں،(عبیداللہ ہزاروی)۔

جواب:

اصولی طور پر جماعت کثیر اور اتحاد و جمعیت میں برکت زیادہ ہے، اسی طرح امامت کا زیادہ حق دار وہ ہے جو بالترتیب ان صفات کا حامل ہو، یعنی سب سے پہلے اَعْلَمُ (جو شخص حاضرین میں سب سے زیادہ علم والا ہو)، پھر اَقْرَأُ (جو شخص قرأت میں سب سے زیادہ ماہر ہو) اور پھر اَوْرَع وَ اَتْقٰی (جو شخص سب سے زیادہ متقی ہو)۔ لیکن اگر کسی مسجد یا محلے میں امام پہلے سے مقرر ہے اور وہ امامت کی ضروری شرائط پر پورا اترتا ہے، تو وہی سب سے زیادہ حق دار ہے۔

آج کل چونکہ حفاظ کرام ماشاء اللہ کثیر تعداد میں ہیں اور نمازِ تراویح میں قرآن مجید سنانا، حفظ قرآن کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے، اسی بناء پر حفاظ کرام کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں قرآن سنانے کا موقع ملے۔

تفرقہ اور تشتت و افتراق کیلئے تو ایک مسجد میں دوسری جماعت کا اہتمام کرنا منع ہے، لیکن نیک نیتی سے کسی حافظِ قرآن کو سنانے کا موقع دینے کیلئے دوسری یا تیسری منزل پر تراویح کی الگ جماعت کرانا جائز ہے، بشرطیکہ دونوں حفاظ و ائمہ کی آوازیں ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں بلکہ اپنی اپنی جماعت تک محدود رہیں اور نماز پڑھنے والوں کی نماز میں خلل بھی واقع نہ ہو اور مسجد کی انتظامیہ سے اس کی اجازت بھی لے لی گئی ہو۔

نماز قصر کی بابت ایک مفتی صاحب کا فتویٰ

سوال:22

ایک مشہور اخبار میں ایک مفتی صاحب سے سوال کیا گیا، سوال یہ ہے:

میں اپنے شہر سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت 110 کلومیٹر کے فاصلے پر سرکاری ملازم ہوں ملازمت کی بناء پر یہاں بہرصورت رہنا پڑتا ہے، مگر میں اپنی سہولت اور چند مجبوریوں کے باعث یہاں مستقل قیام نہیں کرسکتا، اتوار کی چھٹی کا دن گھر پر گزار کر پیر کے دن ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتا ہوں اور پھر ہفتہ کی شام اپنے شہر چلا جاتا ہوں۔ ملازمت کے مقام پر ہفتہ یا چھ دن

قیام کرتا ہوں، اس صورت میں فرض نماز مکمل ادا کروں یا قصر ادا کروں، شریعت کا اس صورت میں کیا حکم ہے؟۔ مفتی نظام الدین شامزئی صاحب نے یہ جواب دیا: اپنے شہر سے ایک سو دس کلومیٹر کے فاصلے پر اگر 15 دن یا اس سے زیادہ اقامت کی نیت سے سکونت اختیار کرلی، اپنا کچھ ساز و سامان بھی وہاں ہو تو پھر جب بھی بسلسلۂ ملازمت اس شہر میں آئیں گے، مقیم ہی شمار ہوں گے اور نماز پوری ادا کرنا ہوگی، یہاں تک کہ یہاں سے ملازمت ختم ہو جائے اور دوسری جگہ منتقلی ہو جائے، (عالم گیری 139/1 البحر 132/2 شامی 133/2)، بعض احباب نے کہا ہے کہ یہ جواب درست نہیں ہے براہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ کیا یہ جواب صحیح ہے؟، (حافظ محمد قدرت اللہ نقشبندی، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

مفتی صاحب کا یہ جواب درست نہیں ہے، خواہ ایک بار کسی مقام پر پندرہ دن اقامت کی نیت کر کے قیام بھی کرلیا ہو اور کچھ ساز و سامان بھی وہاں رکھ چھوڑا ہو، تب بھی جب وہاں سے سفر کر کے وطنِ اصلی یا کسی دوسرے وطنِ اقامت میں منتقل ہوگا تو یہ وطنِ اقامت باطل ہو جائے گا اور اس کے بعد جب بھی وہاں 15 دن سے کم مدت کیلئے اقامت کرے گا تو قصر پڑھے گا، یہ مشہور فقہی ضابطہ ہے کہ وطنِ اصلی، وطنِ اقامت کو باطل کر دیتا ہے اور ایک وطنِ اقامت دوسرے وطنِ اقامت کو باطل کر دیتا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری: جلد 1 ص: 143 پر ہے: "وَوَطَنُ الْاِقَامَةِ يَبْطُلُ بِوَطَنِ الْاِقَامَةِ وَبِاِنْشَاءِ السَّفَرِ وَ بِالْوَطَنِ الْاَصْلِيِّ، هٰكَذَا فِي التَّبْيِيْنِ"۔

ترجمہ: "ایک وطنِ اقامت دوسرے وطنِ اقامت سے باطل ہو جاتا ہے، اسی طرح وہاں سے سفر کرنے سے باطل ہو جاتا ہے اور وطنِ اصلی سے بھی باطل ہو جاتا ہے"۔

مفتی شامزئی صاحب نے فتاویٰ عالمگیری اور فتاویٰ شامی کا حوالہ دیا ہے، ان دونوں میں مفتی صاحب کے موقف کے برعکس ہے، چنانچہ عالمگیری 143/1 پر ہے:

"وَلَوِانْتَقَلَ بِاَهْلِهٖ وَ مَتَاعِهٖ اِلٰى بَلَدٍ وَبَقِيَ لَهٗ دُوْرٌ وَعِقَارٌ فِي الْاَوَّلِ قِيْلَ بَقِيَ الْاَوَّلُ

وَطَنًا لَهٗ وَاِلَیْهِ اَشَارَ مُحَمَّدٌ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فِی الْکِتَابِ کَذَا فِی الزَّاهِدِیْ"۔

ترجمہ: "اگر کوئی شخص اپنے اہل وعیال اور ساز وسامان کے ساتھ ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوگیا، لیکن پہلے شہر میں اس کے مکانات اور غیر منقولہ جائیداد بدستور ہے تو ایک قول کے مطابق پہلے شہر کے ساتھ اس کا وطنیت کا تعلق قائم رہے گا اور اسی کی جانب امام محمد نے اشارہ کیا ہے، زاہدی میں اسی طرح ہے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی مقام پر اپنے اہل وعیال اور ساز وسامان کے ساتھ رہ رہا تھا اور بعد میں وہاں سے اپنے اہل وعیال اور ساز وسامان سمیت منتقل ہو جائے لیکن وہاں اس کے مکانات اور غیر منقولہ جائیداد بدستور موجود ہو تو ایک قول کے مطابق اس کی وطنیت قائم رہے گی اور وہاں وہ جب بھی آئے گا تو پوری نماز پڑھے گا، یہ بھی ایک قول ضعیف ہے۔ لیکن سائل نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے وہ مختلف ہے، اس نے اہل وعیال کے ساتھ وہاں قیام نہیں کیا، محض ایک آدھ سوٹ کیس یا ایک دو جوڑے رکھ چھوڑے ہوں تو اس کا یہ حکم نہیں ہے، لہٰذا جب بھی اس کا قیام پندرہ دن سے کم ہوگا، وہ قصر ہی پڑھے گا، خواہ ایک آدھ بار پندرہ دن قیام کر بھی لیا ہو تو صرف اسی موقع پر پوری نماز پڑھے گا، ایسی ہی ایک صورت جو عالمگیری میں امام محمد کے حوالے سے بیان کی گئی ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی پیش آئی تھی، وہ حج کو آئے تو انہوں نے قصر نہ پڑھی بلکہ پوری نماز پڑھی۔ لوگوں نے اس بناء پر ان پر طعن کیا، تو انہوں نے جواب دیا:

هٰؤُلَاءِ قَالُوْا اُتِمُّ الصَّلٰوةَ فِی السَّفَرِ وَکَانَتْ لَاتُتَمُّ اَلَا وَاِنِّیْ قَدِمْتُ بَلَدًا فِیْهِ اَهْلِیْ فَاَتْمَمْتُ لِهٰذَا۔

ترجمہ: "یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں سفر میں پوری نماز پڑھتا ہوں، حالانکہ سفر میں تو قصر پڑھی جاتی ہے، بات یہ ہے کہ میں ایک ایسے شہر میں آیا ہوں، جہاں میری بیوی ہے اس لئے میں نے پوری نماز پڑھی"، (سیر اعلام النبلاء، دار الفکر بیروت:2-597/1)۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جہاں اہل وعیال کے ساتھ رہ رہا ہو، خواہ ایک سے زیادہ بیویاں

متفرق مقامات پر رہتی ہوں تو وہاں وہ پوری نماز پڑھے گا، چونکہ لوگوں کے علم میں نہیں ہوگا کہ حضرت عثمان نے وہاں شادی کرلی ہے اور ان کی ایک بیوی وہاں مقیم ہے، اس لئے انہوں نے طعن کیا اور حضرت عثمان نے اپنی پوزیشن واضح فرمائی۔

نمازِ قصر میں سفر کی شرعی مقدار

سوال:23

مکرمی جناب میری رہائش فیڈرل بی ایریا، کراچی میں ہے اور بسلسلہ نوکری نوری آباد جاتا ہو جو کہ کراچی سے 92 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میں عموماً دو دن نوری آباد میں رکتا ہوں اور تیسرے دن شام میں واپس آجاتا ہوں، اس صورتحال میں کیا میں اپنی نماز قصر کروں یا مکمل نماز ادا کروں؟، کیونکہ ہمارے ادارے کے ایک صاحب نے کراچی کے ایک عالم سے فتویٰ لیا تھا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ کیونکہ آپ کا قیام 15 روز سے کم کا ہوتا ہے، اس لئے آپ نماز قصر کریں گے، لیکن ہمارے ادارے کے دوسرے صاحب نے حیدرآباد کے ایک مولانا صاحب سے فتویٰ لیا تو انہوں نے فرمایا کہ کیونکہ آپ کو ادارے میں رہائش کی سہولت ہے اور آپ مستقل نوکری پر ہیں، اس لئے آپ کی ملازمت کی جگہ آپ کی رہائش تصور کی جائیگی۔ اس لئے آپ کو مکمل نماز ادا کرنی ہوگی۔ برائے مہربانی آپ اس بارے میں فیصلہ دیں کہ ہم آیا نماز مکمل ادا کریں یا قصر کریں۔

(حامد بشیر، R-474 بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

کم از کم مسافتِ سفر ''جس کا سفر شروع کرنے سے ''قصر'' واجب ہوجاتی ہے، وہ مقدارِ سفر ہے، جو انسان اوسط رفتار سے یا اونٹ کی متوسط رفتار سے اپنی طبعی ضروریات ولوازمات (اس سے مراد مناسب آرام، کھانے اور دیگر حاجات کی تکمیل ہے) اور شرعی فرائض (یعنی نمازوں) کی ادائیگی کے ساتھ تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ

ساتھ مسافت کے پیمانے بھی بدلتے گئے اور پھر مسافت کو پہلے انگریزی میلوں اور بعد میں کلومیٹر سے ناپا جانے لگا، لہٰذا عہدِ حاضر کے علماء نے مسافتِ قصر کا اندازہ انگریزی میلوں سے قائم کیا۔فقہاء کرام کے اقوال میں مفتیٰ بہٖ قول اٹھارہ فرسخ ہے اور اٹھارہ فرسخ چوّن میل شرعی ہیں، جو ایک لاکھ آٹھ ہزار گز یعنی اِکسٹھ انگریزی میل دو فرلانگ بیس گز ہیں اور یہ اٹھانوے اعشاریہ سات تین چار (98.734) کلومیٹر کے برابر ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ثم اختلفوا فقیل احدوعشرون، وقیل ثمانیة عشر، وقیل خمسة عشر، والفتویٰ علی الثانی لانه الاوسط۔

ترجمہ: ''بعض فقہاء نے اکیس فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اٹھارہ فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے پندرہ فرسخ قرار دیا ہے اور مفتیٰ بہٖ اٹھارہ فرسخ کا قول ہے''۔(درمختار: جلد نمبر 2 ص: 526 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)

لہٰذا مفتیٰ بہٖ قول کے مطابق تقریباً اٹھانوے (98) کلومیٹر کی مسافت کے بعد ہی سفر شرعی اور قصر کے احکام لاگو ہوں گے اور صورتِ مسئولہ میں سائل چونکہ 92 کلومیٹر کی مسافت طے کرتا ہے، لہٰذا نماز قصر نہیں کی جائے گی، بلکہ مکمل نماز ادا کریں گے۔

سرکاری زمین پر بغیر لیز یا الاٹمنٹ مسجد کی تعمیر اور شرعی حیثیت

سوال:24

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ قیام پاکستان کے بعد بہت سی سرکاری کالونیوں میں سرکاری ملازمین نے ضرورت کے تحت سرکاری زمین پر کئی مساجد تعمیر کیں، کیونکہ گورنمنٹ نے ان کالونیوں میں مساجد تعمیر نہیں کی تھی اور نہ ہی مساجد کیلئے جگہیں وقف کی تھیں، ان ہی سرکاری کالونیوں میں جہانگیر روڈ ایسٹ، جہانگیر روڈ ویسٹ، کلیٹن کوارٹرز، مارٹن کوارٹرز، پاکستان کوارٹرز وغیرہ شامل ہیں، یہاں پر سرکاری ملازمین نے کئی مساجد تعمیر کیں، جن میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جامع مسجد مبارک مارٹن کوارٹرز ۲۔ سنہری جامع مسجد مارٹن کوارٹرز
۳۔ جامع موتی مسجد کلیٹن کوارٹرز ۴۔ جامع بغدادی مسجد مارٹن کوارٹرز
۵۔ جامع مسجد عثمانیہ جہانگیر روڈ ۶۔ جامع مسجد زکریا جہانگیر روڈ ایسٹ وغیرہ وغیرہ۔
بعد ازیں ان مساجد میں سے چند کو گورنمنٹ نے اپنے نقشوں اور لے آؤٹ پلان میں تو مساجد کی حیثیت سے تسلیم کیا، لیکن مساجد انتظامیہ کی درخواست دینے پر بھی گورنمنٹ کے کسی محکمے نے ان مساجد کو لیز یا الاٹمنٹ وغیرہ جاری نہیں کیے، جبکہ یہ مساجد گورنمنٹ رجسٹرڈ ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ہیں، دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ شرعی اعتبار سے ان مساجد کی کیا حیثیت ہے؟۔ (سید محمد رضوان حسن سہروردی)۔

جواب:

مسجد ہونے کے لئے وقف ہونا شرط ہے، اگرچہ انہی الفاظ سے کہ ''میں نے اسے مسجد کر دیا'' اس سے بھی وقف ہو جائے گا۔
علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویزول ملکه عن المسجد والمصلی) بالفعل و (بقوله جعلته مسجداً)
ترجمہ: ''کسی شخص کے یہ کہنے سے کہ میں نے زمین کے اس حصے کو مسجد بنادیا ہے یا عملاً اس میں نماز پڑھی جارہی ہے، وہ زمین اس کی ملکیت سے نکل جائے گی، (ردالمحتار جلد 6 ص:426 داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:
''جب وہ مکان عام مسلمین کے ہمیشہ نماز پڑھنے کے لئے بنایا اسے کسی محدود مدت سے مقید نہ کیا کہ مہینے دو مہینے یا سال دو سال اس میں نماز کی اجازت دیتے ہیں اور اس میں نماز حتیٰ کہ جمعہ وعیدین تک ہوتے ہیں تو اس کے مسجد ہونے میں کیا شک ہے، ------
آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: خالی زمین نماز کے لئے وقف کی جائے وہ بھی مسجد ہو جائے گی اگرچہ یہ نہ کہا ہو اسے مسجد کیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 16 ص:281 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

وقف کے درست ہونے کے لئے اس کی شہرت ہونا کافی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: تقبل فیه بالشهرة الیٰ ان قال حفظاًللأوقاف القديمة عن الاستهلاک ۔ ترجمہ: ''یعنی عامۃ الناس میں مشہور ہونا کہ یہ وقف کی جگہ ہے، یہ بھی شرعاً ایک مقبول شہادت ہے۔۔۔آگے چل کر فرمایا: اصول اس لئے مقرر ہوا تاکہ پرانے اوقاف کو (جن کی کوئی دستاویزی شہادت یا ریکارڈ یا ان افراد کی شہادت جن کے سامنے وقف کیا گیا) ضائع ہونے سے بچایا جاسکے، (درمختار، جلد 6 صفحہ: 484 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)۔

اگر سائل کا بیان درست ہے کہ حکومت نے ابتدائی طور پر تو اپنی بعض سوسائٹیوں اور کالونیوں میں مساجد کے لئے مقامات مختص نہیں کئے تھے، اگر ایسا ہوا ہوتا، تو یہ خود ریاست کی جانب سے باقاعدہ قانونی وقف ہوجاتا، لیکن بعد میں ان کالونیوں کے رہائشی لوگوں نے اپنی ضرورت کے تحت سرکاری زمینوں پر مسجدیں بنادیں، حکومت نے نہ صرف یہ کہ کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ بعدازاں ان مساجد کو اپنے نقشوں اور لے آؤٹ پلان میں بحیثیتِ مسجد تسلیم کرلیا ہے تو ان کی مسجدیت میں کوئی شک وشبہ نہیں، لیز یا الاٹمنٹ قانونی کارروائی کا حصہ ہیں، شرعاً ان مساجد میں نماز جائز ودرست ہے اور ان مساجد کو اب کسی ضرورت کے تحت شہید کرنا یا ان کی حیثیت کو ختم کرنا درست نہیں ہے۔

درودوسلام اور اذان کے درمیان اعلان کرنے کا حکم

سوال:25

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید کہتا ہے درودوسلام اور اذان کے درمیان یہ اعلان کیجئے (اذان کا احترام کرتے ہوئے گفتگو اور کام کاج روک کر اذان کا جواب دیجئے اور ڈھیروں نیکیاں کمایئے)۔اس اعلان کے بعد اذان دیجئے اور زید اس اعلان کو سختی سے کرنے کا حکم دیتا ہے، برائے مہربانی اس مسئلے کا حل قرآن و حدیث کی روشنی میں عنایت فرمایئے، (محمد اشرف، سیکٹر 5-A-1 نارتھ کراچی)۔

جواب:

اذان کا اصل مقصد مسلمانوں کو نماز کے وقت کی اطلاع دینا اور با جماعت نماز کی دعوت دینا ہے، اذان سننے کے بعد مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نماز کی تیاری کر کے مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں، ایسا کرنا ''اجابتِ فعلی'' کہلاتا ہے، یعنی عملی طور پر اذان کا جواب دینا۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ آیا زبان سے اذان کا جواب دینا، جسے ''اجابتِ قولی'' کہا جاتا ہے، واجب ہے یا نہیں؟، اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک ''اجابتِ قولی'' مستحب ہے اور بعض کے نزدیک واجب ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

اذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما یقول المؤذن۔

ترجمہ: ''جب تم اذان (کے کلمات) سنو تو تم بھی مؤذن کی طرح کلماتِ اذان کہو''۔ (رقم الحدیث:208)

اس حدیث میں ''قولوا'' امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے بشرطیکہ وجوب کے خلاف کوئی قرینہ نہ ہو، اور ''اجابتِ قولی'' مراد لینے پر دلیل "قولوا مثل مایقول المؤذن" کے الفاظ ہیں، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ''اجابتِ قولی'' بھی واجب ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ''اَشِعَّۃُ اللّمعات'' جلد اول صفحہ 311 پر لکھتے ہیں:

اجابتِ مؤذن واجب است کہ اگر چند کس اذان گویند حرمت مر اول رااست واگر از جوانب اذان بشنود واجب است اجابت مؤذن مسجد خود را۔

ترجمہ: ''مؤذن کی اذان کا جواب دینا واجب ہے اگر کسی مسجد میں ایک سے زیادہ مؤذن ہوں تو جواب پہلی اذان کا واجب ہوگا، اگر اطراف سے ایک سے زائد اذانیں سنیں تو اپنی مسجد کی اذان کا جواب دینا واجب ہوگا''۔ علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

لکن ظاہر الامر فی قولہ ﷺ اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل مایقول الوجوب اذلا تظہر قرینۃ تصرفہ عنہ، بل ربما یظہر استنکار ترکہ لأنہ یشبہ عدم الالتفات

اِلیه والتشاغل عنه۔وفی التحفة ینبغی أن لا یتکلم ولا یشتغل بشیٔ حال الاذان أوالاقامة۔ وفی النهایة: تجب علیهم الاجابة لقوله ﷺ "اربع من الجفاء، ومن جملتها: ومن سمع الاذانَ والاقامةَ ولم یُجب"۔ وهو غیر صریح فی اِجابة اللسان، اذ یجوز کون المراد الاجابة بالاتیان الی الصلاة ، والا لکان جواب الاقامة واجبًا، ولم نعلم فیه عنهم الا انه مستحَبٌّ واللّٰہ اعلم۔

ترجمہ: ''بظاہر رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد'' کہ جب تم مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سنو تو تم بھی وہی کلمات کہو جو مؤذن کہتا ہے''، سے مراد وجوب ہے، کیونکہ ایسا کوئی ظاہری قرینہ نہیں جس کے باعث امر کے حقیقی معنیٰ (وجوب) سے عدول کیا جائے، بلکہ بسا اوقات اس (اجابت) کے ترک پر نکیر آئی ہے، کیونکہ یہ اس حکم کی جانب عدمِ توجہ اور اس سے روگردانی کے مشابہ ہوتا ہے، اور ''تحفہ'' میں ہے: (اذان سننے والے کو) چاہیے کہ وہ اذان واقامت کے وقت نہ گفتگو کرے اور نہ ہی کوئی اور کام کرے، اور ''نہایہ'' میں ہے: (اذان سننے والوں پر) اذان کا جواب دینا واجب ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: چار چیزیں جفا کی دلیل ہیں، ان میں سے ایک یہ کہ کوئی شخص اذان واقامت سنے اور جواب نہ دے اور یہ حکمِ وجوب (اذان کا) قولی جواب دینے کے بارے میں واضح نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ اس اجابت سے مراد یہ ہو کہ (اذان سن کر) نماز کی طرف آنا واجب ہے، ورنہ تو جوابِ اقامت بھی واجب ہو جائے گا، حالانکہ ہم اس کے بارے میں (فقہاء امت سے) یہی جانتے ہیں کہ اقامت (کا قولی) جواب مستحب ہے، واللہ اعلم''۔

(فتح القدیر، جلد اول ص: 254 مطبوعہ مرکز اہلسنت برکاتِ رضا، گجرات، انڈیا)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویجب) وجوبًا وقال الحلوانی نُدبًا والواجب الاجابة بالقدم (من سمع الاذان) ولوجنبًا لاحائضاًونفساء وسامع خطبةوفی صلاة جنازة وجماع، ومستراح واکل وتعلیم علم وتعلُّمه بخلاف قرآن۔

ترجمہ: ''اور جو شخص اذان سنے اس پر اس کا جواب دینا واجب ہے اور حلوانی نے کہا کہ یہ مستحب ہے اور جو چیز واجب ہے، وہ نماز کے لئے عملاً چل پڑنا ہے، اور جو شخص اذان سنے، اگر چہ وہ جنبی ہو اس پر جواب دینا واجب ہے، (البتہ) حیض ونفاس والی عورت اور خطبہ سننے والے شخص اور اس شخص پر جو نمازِ جنازہ یا جماع میں مشغول ہے یا جو قضائے حاجت کر رہا ہے یا جو کھانے اور پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہے، (ان سب پر اذان کا زبانی جواب دینا واجب نہیں ہے)، بخلاف تلاوتِ قرآن کے (یعنی قرآن پڑھنے والے شخص پر اذان کا زبانی جواب دینا واجب ہے)''، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد2ص:60دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

درمختار کی مذکورہ عبارت سے ثابت ہوا کہ اجابت قولی کے بارے میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک مستحب ہے اور بعض کے نزدیک واجب ہے، لہٰذا اس کو فقط مستحب کہنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ علامہ علاؤالدین حصکفی نے اجابتِ اذان کے بارے میں علامہ حلوانی کا قول نقل کیا ہے کہ اذان کا زبانی جواب دینا مستحب ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: اگر ایک شخص اذان سنتے وقت پہلے ہی مسجد میں موجود ہے، تو اس پر اجابت واجب نہیں ہے، ہاں! البتہ اگر وہ خارجِ مسجد ہے تو وہ نماز کیلئے چل پڑے یعنی عمل کی صورت میں جواب دے، اور اگر اس نے زبانی جواب تو دیا، لیکن عملاً نماز کیلئے نہ گیا تو یہ تعمیلِ امر نہیں ہے، اور یہ اس پر مبنی ہے کہ اذان کا جو جواب شرعاً مطلوب ہے، وہ عملی ہے، جیسا کہ حلوانی کا قول ہے اور اسی پر یہ تفریع بھی ہے کہ (اذان سننے والا) اگر تلاوت میں مشغول ہے، تو قراءت اسی مقام پر موقوف کردے اور اذان کا جواب دے، اگر یہ اذان اس کی اپنی مسجد کی ہے تو اس پر جواب دینا واجب نہیں، کیونکہ اس کی وہاں پر موجودگی خود جواب ہے، اور یہ ساری گفتگو حلوانی کے قول پر متفرع ہے، لیکن ہمارے نزدیک وہ تلاوت موقوف کرے اور مطلقاً زبانی جواب دے۔ آگے چل کر علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

والظاھر وجوبھا باللسان لظاھر الامر فی حدیث: "اذا سمعتم المؤذن فقولوا

مثل ما یقول" کما بسط فی "البحر"، وأقرّہ المصنف،وقوّاہ فی "النہر" ناقلاً عن "المحیط"وغیرہ،

ترجمہ:" ظاہر یہ ہے کہ اذان کا زبانی جواب دینا واجب ہے، کیونکہ اس حدیث میں امر واضح ہے کہ:" جب تم مؤذن کو اذان دیتے سنو! تو وہی کلمات کہو جو مؤذن کہتا ہے"،جیسا کہ" البحر الرائق" میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور مصنف نے اسے قائم رکھا ہے اور" النہر" میں محیط وغیرہ کا حوالہ نقل کرتے ہوئے اسے تقویت دی ہے"، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2 ص: 63-64 داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

فتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش ہندیہ، جلد اوّل صفحہ 79 پر ہے:

ومن سمع الاذان فعلیہ ان یجیب ۔۔۔قال شمس الائمۃ الحلوانی رَحِمَہُ اللّٰہ تعالیٰ تکلم الناس فی الاجابۃ قال بعضھم ھوالاجابۃ بالقدم لا باللسان حتی لواجاب باللسان ولم یمش الی المسجد لایکون مجیباً

ترجمہ:" اور جو شخص اذان سنے اس پر لازم ہے کہ اس کا جواب دے، شمس الائمہ حلوانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ فقہاء نے" اجابتِ اذان" کے بارے میں کلام کیا ہے، بعض نے کہا کہ اس سے اداءِ نماز کی جانب عملی پیش رفت مراد ہے نہ کہ محض زبانی جواب دینا، یہاں تک کہ اگر زبان سے تو جواب دیا، لیکن اداءِ نماز کیلئے مسجد کی طرف نہ گیا تو (دراصل) وہ مجیب (جواب دینے والا) نہیں ہوگا"۔

قاضی خان کی مذکورہ عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ اجابتِ لسانی کے حکم میں اختلاف ہے، لہٰذا اجابتِ لسانی کو فقط مستحب کہنا صحیح نہیں کیونکہ بعض ائمہ اس کے وجوب کے بھی قائل ہیں، صاحب بہارِ شریعت حضرت مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

جو اذان کے وقت باتوں میں مشغول رہے، اس پر معاذ اللہ خاتمہ برا ہونے کا خوف ہے۔ (بہارِ شریعت: حصہ سوم، صفحہ: 127)۔ نیز اسی صفحہ پر آگے لکھتے ہیں:" راستے پر چل رہا تھا کہ اذان کی آواز آئی تو اتنی دیر کھڑا ہو جائے، سنے اور جواب دے"، (بحوالہ عالمگیری و بزازیہ)

مولانا امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کے کلام سے بھی "اجابتِ قولی" کا وجوب مستفاد
ہے۔اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اذان کا جواب دینا امر مشروع ہے، اس کی اص
روح اور حقیقی و کامل اجابت یہی ہے کہ بندہ اذان سن کر نماز کے لئے چل پڑے اور اس
کسی کا اختلاف نہیں ہے۔لیکن احادیث مبارکہ میں "اجابتِ قولی" یعنی کلماتِ اذان سن
دہرانے کا حکم اور ترغیب موجود ہے اور اس پر بشارت و وعد بھی ہے، تاہم اس پر فقہاء کی
آراء ہیں، ایک یہ کہ حدیث مبارک میں کلمہ امر:"فقولوا مثل ما یقول المؤذن (
ویسا کہو جیسے مؤذن کہتا ہے)"، سے مستفاد یہ ہے کہ کلماتِ اذان کو دہرانا یا قولی جواب د
واجب ہے، کیونکہ جب تک کسی کلمے کے حقیقی معنی سے عدول کیلئے کوئی قرینہ صارفہ نہ
اسے حقیقت پر ہی محمول کیا جائے۔

اذان کی اجابتِ قولی یعنی کلمات اذان کو دہرانے کے امر مشروع کو جب ہم واجب قر
دے رہے ہیں تو عامۃ المسلمین کو اس کی دعوت دینا یا ترغیب دینا ایک امر لازم ہے۔خصو
اس دور میں جب کہ اذان کے کلمات کا زبانی جواب دینے سے لوگ سخت غافل ہیں اور عو
کی اکثریت اس حکم سے غفلت برت رہی ہے، اس لئے اس دور میں لوگوں کو اس حکم پر عم
کرنے کی ترغیب دینا احیاءِ سنت کے قبیل سے ہے اور اس پر متنبہ کرنے کے لئے اعلا
کرنے پر از روئے حدیث ماجور ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ اور اس پر کسی کی مخالفت کرنا درس
نہیں ہے۔لیکن چونکہ یہ تعامل امت میں توارث کے ساتھ نہیں ہوتا رہا، اس لئے بعض لوگ
"کلمۃُ الحق أرید بھا الباطل" (یعنی کوئی بات فی نفسہٖ تو حق ہو، لیکن اسے قائل باط
مقصد کے لئے استعمال کرے) کے مصداق اہلسنت و جماعت کے خلاف پروپیگنڈا کر
ہیں کہ یہ لوگ آئے دن نئی بدعات رائج کرتے رہتے ہیں۔اور اہلسنت و جماعت
بارے میں خالی الذہن لوگوں کے ذہنوں میں ایک طرح کی بدگمانی، تشکیک یا اعراض
کیفیت پیدا کر دیتے ہیں، اس لئے اگر لوگوں کو کوئی شخص اذان سے پہلے "اجابتِ اذا
کی ترغیب دینا چاہے تو اذان اور ان ترغیبی کلمات کے درمیان چند منٹ کا وقفہ کر لے تا

ان کے اذان کا جزءِ لازم بننے کا تاثر پیدا نہ ہو۔ اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ ائمہ وخطباء دروس وخطاباتِ جمعہ میں وقتاً فوقتاً اس کی ترغیب دیتے رہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ اگر کہیں اذان سے پہلے لاؤڈ اسپیکر پر کوئی مؤذن یہ ترغیبی کلمات نہیں کہتا تو کوئی شخص اس پر طعن نہ کرے اور اسے ملامت نہ کرے، کیونکہ اس خاص مقام پر حدیث میں اس کی تاکید نہیں آئی ہے بلکہ وقتاً فوقتاً علماء کو یہ مسائل بیان کرتے رہنا چاہئیں۔

قضاءِ عمری پڑھے جانے کے لیے کونسا وقت موزوں ہے

سوال:26

کیا فجر کی سنت پڑھنے کے بعد اگر فرض نماز کی جماعت میں وقت ہے، قضائے عمری پڑھی جاسکتی ہے۔ کیا عصر کی فرض نماز کے بعد قضائے عمری پڑھی جاسکتی ہے۔
(سائل محمد علی بلاک 13.C گلشنِ اقبال، کراچی)

جواب:

صرف تین اوقات، جو مکروہ تحریمی ہیں، ان میں قضاء نمازیں نہیں پڑھنی چاہئیں یعنی طلوعِ آفتاب (آفتاب کی پہلی کرن نمودار ہونے سے 20 منٹ تک) غروبِ آفتاب (یعنی غروبِ آفتاب سے پہلے کے 20 منٹ) اور ضحوۂ کبریٰ (زوال سے پہلے کا وقت)، لیکن اگر سستی کاہلی یا بشری کمزوری کے تحت اس دن عصر کی نماز کامل وقت میں نہیں پڑھ سکا، تو غروب سے پہلے کے آخری 20 منٹ میں بھی پڑھ لے، جو وقتِ مکروہ ہے، کیونکہ مطلقاً قضا کرنے سے وقتِ ناقص میں ادائیگی بہتر ہے، لیکن اس وقت میں کوئی اور نماز نہیں پڑھی جائے گی۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اور فرض کی قضاء فرض، واجب کی واجب اور سنت کی سنت پھر قضاء کے لئے کوئی وقت معین نہیں بلکہ تمام عمر کسی بھی وقت ادا کی جاسکتی ہے سوائے تین وقتوں کے طلوعِ آفتاب کے وقت، زوال کے وقت، اور غروبِ آفتاب کے وقت پس ان اوقات میں کوئی نماز جائز نہیں، اسی طرح ''البحر الرائق'' میں ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 121 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

لہٰذا فجر کے فرضوں سے پہلے اور بعد بھی اسی طرح عصر کے فرضوں کے بعد بھی قضا نمازیں پڑھنا بلا کراہت جائز ہیں البتہ نمازِ عصر کے وقتِ مکروہ میں اگر قضا نماز پڑھی جائے تو وہ نماز ادا نہیں ہوگی جب کہ عصر کی وقتی نماز اس وقتِ مکروہ میں کراہت کے ساتھ ادا ہو جائے گی۔

مسبوق کی نماز میں سہو

سوال:27

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص امام کے ساتھ قعدۂ اولیٰ میں مل جائے تو وہ اگلی دو رکعتوں میں قعدۂ اولیٰ کرے گا یا نہیں اگر کسی نے نہیں کیا تو وہ سجدۂ سہو کرے گا یا اس کی نماز ہو جائے گی، وضاحت فرمائیں، (سید صفی اللہ، گڑھی نواب سید، بٹگرام)۔

جواب:

اس مقتدی کے لئے کہ جو امام کے ساتھ قعدۂ اولیٰ میں شامل ہوا تھا اس کے بعد امام بقیہ دو رکعت پڑھنے کے لئے کھڑا ہوگا اور اخیر میں قعدۂ اخیرہ کرے گا جو کہ اس مسبوق (یعنی نماز کا ابتدائی حصہ ایک رکعت یا اس سے زائد نکلنے کے بعد وسطِ نماز میں امام کے ساتھ شامل ہو) مقتدی کا قعدۂ اولیٰ کہلائے گا اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق اپنی بقیہ نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوگا تو دو رکعت بقیہ پڑھنے کے بعد وہ مسبوق مقتدی قعدۂ اخیرہ کرے گا اور سلام پھیرے گا، تو چونکہ مقتدی امام کے تابع ہے سوال سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ سوال ظہر، عصر اور عشاء کی نماز سے متعلق ہے، امام کے قعدۂ اخیرہ، (جو دراصل مقتدی کا قعدۂ اولیٰ ہے) میں اگر مقتدی غلطی سے، خطاءً یا سہواً تشہد (التحیات) کے بعد درود شریف اور دعا بھی پڑھ لے تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے، باجماعت نماز میں امام سے ترکِ واجب ہو جائے تو امام کے ساتھ سب مقتدی سجدۂ سہو کریں گے، لیکن دورانِ اقتداء مقتدی سے ترکِ واجب ہو جائے (مثلاً دعاء قنوت نہ پڑھ سکا) تو جماعت کی برکت سے مقتدی سے سجدۂ سہو (یعنی ترکِ واجب) معاف ہو جاتا ہے۔ مسبوق مقتدی اٹھ کر جب

بقیہ دو رکعات پڑھے گا تو یہ ان دو رکعات میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورت بھی ملائے گا، کیونکہ یہ اس کی پہلی دو رکعات ہیں، جو رہ گئی ہیں۔ اور دو رکعتیں پڑھنے کے بعد آخر میں قعدہ بیٹھے گا اور یہ قعدہ اخیرہ چونکہ فرض ہے لہٰذا اگر کوئی شخص قعدہ چھوڑ دے تو اس کی نماز نہیں ہوگی کیونکہ فرض کے چھوڑنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر مغرب اور نمازِ وتر میں (ماہِ رمضان میں) جس مسبوق مقتدی کی پہلی دو رکعات رہ گئی ہوں، تو وہ کھڑے ہو کر سورت کے ساتھ ایک رکعت پڑھے گا اور اب اس کی اپنی دو رکعات ہو جائیں گی، لہٰذا اس پر تشہد کے لئے بیٹھنا اور پوری التحیات پڑھنا واجب ہے، لیکن اگر وہ اس مقام پر نہیں بیٹھتا اور اس سے یہ واجب ترک ہو جاتا ہے، تو قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس ترکِ واجب پر سجدۂ سہو لازم آنا چاہئے، لیکن فقہاء نے کہا ہے کہ خلافِ قیاس اس سے سجدۂ سہو لازم نہیں آئے گا، وہ سجدۂ سہو کئے بغیر نماز مکمل کر کے سلام پھیر دے تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، اس صورتِ مسئلہ کو امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فتاویٰ رضویہ جلد 3 صفحہ 392 مطبوعہ دار العلوم امجدیہ کراچی میں بیان فرمایا ہے۔

پہلی صف کے فضائل

سوال: 28

مسجد کی پہلی صف میں بیٹھنے کے کیا فضائل ہیں؟ کیا بعد میں آنے والا پہلی صف میں بیٹھ جائے اور جو پہلے سے آیا ہے وہ پیچھے بیٹھا رہے تو کیا بعد میں آنے والے کو پہلی صف میں بیٹھنے کی وجہ سے وہی ثواب ملے گا جو پہلی صف میں بیٹھنے والے کو ملتا ہے، (حافظ محمد جمشید مظفر گڑھ)۔

جواب:

پہلی صف کے فضائل احادیث کریمہ میں اس طرح سے وارد ہوئے ہیں:

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور فرماتے ہیں کہ اگر لوگ جانتے کہ اذان اور صف اول میں کیا (اجر و ثواب) ہے پھر بغیر قرعہ ڈالے نہ پاتے تو اس پر قرعہ اندازی

کرتے''،(صحیح بخاری رقم الحدیث:615)۔

''ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمیشہ صفِ اوّل سے لوگ پیچھے ہوتے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے مؤخر کرکے نار میں ڈال دے گا''۔(ابوداؤد، رقم الحدیث:679)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرویہ ہے وہ فرماتے ہیں: صفِ مقدم کو پورا کرو پھر اس کو جو اس کے بعد ہو اگر کچھ کمی ہو تو پچھلی میں ہو''،(ابوداؤد رقم الحدیث:671)۔

''مسند احمد وطبرانی میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ اللہ اور اس کے فرشتے صف اول پر درود بھیجتے ہیں، لوگوں نے عرض کی اور دوسری صف پر؟ فرمایا اللہ اور فرشتے صف اول پر درود بھیجتے ہیں، لوگوں نے عرض کی اور دوسری پر؟ فرمایا اور دوسری پر اور فرمایا صفوں کو برابر کرو اور مونڈھوں کو مقابل کرو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم ہوجاؤ اور کشادگیوں کو بند کرو کہ شیطان بھیڑ کے بچے کی طرح تمہارے درمیان داخل ہو جاتا ہے''،(مشکوٰۃ بحوالہ احمد)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

مردوں کی پہلی صف کہ امام سے قریب ہے دوسری سے افضل ہے اور دوسری تیسری سے افضل ہے، وعلیٰ ھذا القیاس۔

مقتدی کے لیے افضل جگہ یہ ہے کہ امام سے قریب ہو اور دونوں طرف برابر ہوں تو دہنی طرف افضل ہے، لیکن اگر بائیں جانب افراد کم ہوں تو پھر تسویۂ صفوف (صفوں کو برابر رکھنا) کے لئے بائیں جانب کھڑے ہونے کا ثواب زیادہ ہوگا۔

پہلی صف میں جگہ ہے اور پچھلی صف بھر گئی ہے تو اس کو چیر کر جائے اور اس خالی جگہ میں کھڑا ہو، اس کے لیے حدیث میں فرمایا جو صف میں کشادگی دیکھ کر اس کو بند کردے اس کے لیے مغفرت ہوجائے گی،(عالمگیری جلد اول، ص:89 مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

پہلی صف میں بیٹھنے کے بے شمار فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں اور کسی بھی مجلس میں

بیٹھنے کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ اس طرح سے بیٹھا جائے کہ بعد میں آنے والوں کو تکلیف نہ ہو اور پیچھے آنے والوں کو بیٹھے ہوئے لوگوں کی گردنیں پھلانگنا نہ پڑیں۔ رہا نفس ثواب کا مسئلہ تو احادیث میں جو ثواب بیان کیا گیا ہے وہ ترتیبِ صفوف کے اعتبار سے ہے بعد میں آنے والا بھی اوّل صف میں بیٹھنے کی وجہ سے اس ثواب کا حق دار ہوگا۔

سنن ترمذی میں ابواب الجمعہ کے تحت ایک حدیث وارد ہوئی ہے:

ترجمہ: ''حضرت سہیل بن معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگے، وہ اپنے لئے جہنم کی طرف پل بنا رہا ہے''، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 513، دارالکتب العلمیہ، بیروت)۔

اسی مفہوم کی حدیث سنن ابی داؤد میں مذکور ہے، (رقم الحدیث: 1111، مؤسستہ الریان المکتبۃ المکیہ، ج:2 ص:112)۔

اگر آگے کی صفیں مکمل ہیں اور ان میں خلا نہیں ہے، تو پیچھے سے کسی شخص کا گردنیں پھلانگ کر اور اپنے لئے امتیازی حیثیت کا تقاضا یا خواہش کرنا، ان احادیث میں بیان کی گئی وعید کا مصداق ہے۔ تاہم ایک شخص بعد میں آتا ہے لیکن دیکھتا ہے کہ پہلی صفوں میں بیٹھے ہوئے یا کھڑے نمازی صفوں میں خلا چھوڑے ہوئے ہیں اور باوجود متوجہ کرنے کے وہ آگے بڑھ کر اس خلا کو پُر نہیں کرتے تو پھر پچھلی صفوں کو چیر کر آگے آنے والا جو آگے کی صفوں میں خلا کو پُر کرنا چاہتا ہے، اپنے اخلاصِ نیت، تمسک بالسنۃ اور تعامل بالسنۃ کی وجہ سے گنہ گار نہیں ہوگا بلکہ ماجور ہوگا، کیونکہ آگے کی صفوں میں خلا چھوڑ کر بیٹھنے والوں نے کوتاہی، سستی، سنت پر عمل پیرا ہونے میں عدم رغبت کی وجہ سے خود اپنے احترام اور تقدس کو پامال کیا ہے، اگر صف بندی ہو جائے اور اس کے بعد مقتدی کو نظر آئے کہ اس کے آگے صف میں ایک آدمی کی جگہ ہے اور خلا ہے تو نماز کے اندر رہتے ہوئے اور ہاتھ باندھے ہوئے چل کر اگلی صف کے خلا کو پر کرے، لیکن صرف ایک صف تک جائے، زیادہ صفوف کو عبور نہ کرے، کیونکہ یہ عملِ کثیر ہو جائے گا، اس مسئلے کو علامہ ابن عابدین شامی ''ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2

ص:268,269، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی میں بیان کیا ہے۔

بیٹھ کر نماز پڑھانے والے امام کی اقتداء

سوال: 29

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب اس وقت عارضۂ قلب، شوگر، گردے کی تکلیف میں مبتلا ہیں، رمضان کی آمد ہے کیا ہم ان سے اس طرح تراویح پڑھوائیں کہ وہ بیٹھے ہوں اور ہم پیچھے کھڑے ہو کر سماعت کریں؟، (حافظ سلیم محمود، گلشنِ فاروق D/3-7 نارتھ کراچی)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ویصح اقتداء القائم بالقاعد الذی یرکع ویسجد لااقتداء الراکع والساجد بالمومی ھکذا فی فتاویٰ قاضیخان ویؤم الاحدب القائم کما یؤم القاعد کذا فی الذخیرۃ وھکذا فی الخانیۃ۔

ترجمہ: ''اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والا، بیٹھ کر پڑھنے والے کی اقتداء کرسکتا ہے جبکہ وہ (نماز پڑھانے والا) رکوع وسجود کرسکتا ہو اور جو رکوع وسجود اشارے کے ساتھ کرتا ہو اس کی اقتداء درست نہیں، فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، اور کوزہ پشت (کبڑا آدمی) کی امامت درست ہے جیسے کہ بیٹھ کر پڑھنے والے کی اقتداء درست ہے، ''الذخیرۃ'' اور ''خانیہ'' میں اسی طرح ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:85 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وقائم بقاعد) یرکع ویسجد، لأنہ ﷺ صلی آخر صلاتہ قاعداً وھم قیام وأبوبکر یبلغھم تکبیرہ۔

ترجمہ: ''اور کھڑے ہو کر پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر پڑھنے والے کے پیچھے درست ہے جبکہ وہ رکوع وسجود کرتا ہو، اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آخری نماز بیٹھ کر پڑھائی اور

صحابہ آپ کی اقتداء میں کھڑے ہوکر نماز پڑھ رہے تھے، اور حضرتِ ابو بکر مکبّر کے فرائض انجام دے رہے تھے'' (یعنی حضور ﷺ کی تکبیراتِ انتقالات کو بہ آوازِ بلند تمام مقتدیوں تک پہنچا رہے تھے)۔

علامہ شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

وهذا عندهما خلافاًلمحمد۔ وقيد القاعد بكونه يركع ويسجد، لأنه لو كان مومياًلم يجز اتفاقاً۔ والخلاف أيضاً فيما عداالنفل،أما فيه فيجوز اتفاقاًولو في التراويح في الأصح، كما في "البحر"۔

ترجمہ: ''اور بیٹھ کر نماز پڑھانے والے کی اقتداء امام اعظم ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک جائز ہے، اس میں امام محمد کا اختلاف ہے، اور بیٹھ کر پڑھانے والے امام کے ساتھ یہ قید لگائی کہ وہ رکوع وسجود کرتا ہو، یہ اس لئے کہ اگر وہ رکوع وسجود کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور اشارے سے رکوع وسجود کرتا ہو تو اس کی اقتداء میں نماز بالاتفاق جائز نہیں ہے، امام محمد کا اختلاف صرف فرض اور واجب میں ہے، نفل میں بالاتفاق اقتدا جائز ہے، خواہ تراویح کی جماعت ہی کیوں نہ ہو، صحیح ترین روایت کے مطابق تراویح کی جماعت بھی بیٹھ کر پڑھنے والے امام کے پیچھے بالاتفاق جائز ہے، جیسا کہ علامہ زین الدین ابن نجیم نے ''البحر الرائق'' میں لکھا ہے''، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2 ص: 290 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

عن جابر قال: صلىٰ بنا رسول الله ﷺ، وابوبكرخلفه۔ فاذا كبررسول الله ﷺ كبر ابوبكرليسمعنا ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوکر آپ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے اور باقی صحابہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے تکبیرات سن کر نماز پڑھ رہے تھے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 904 مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ)۔

عن عائشة قالت: أمررسول الله ﷺ ابا بكرٍ أن يصلي بالناس في مرضه، فكان يصلي بهم۔ قال عروة: فوجد رسول الله ﷺ في نفسه خفة، فخرج فاذا ابوبكريؤم

الناس، فلما رآه ابوبکراستاخر، فأشارالیه: أن کما انت۔ فجلس رسول اللہ ﷺ حذاء ابی بکر الی جنبه، فکان ابو بکر یصلی بصلاۃ رسول اللہ ﷺ والناس یصلون بصلاۃ ابی بکر۔

ترجمہ:'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اپنے مرض میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، لہٰذا وہ انہیں نمازیں پڑھاتے رہے عروہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ افاقہ محسوس کیا، تو تشریف لائے اور حضرت ابوبکر لوگوں کی امامت کررہے تھے، جب حضرت ابوبکر نے آپ کو دیکھا، تو پیچھے ہٹنے لگے آپ نے اشارہ فرمایا کہ اپنی جگہ پر رہو، پس رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر کے پہلو میں بیٹھ گئے، پس حضرت ابوبکر تو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:683 مطبوعہ مکتبۃ العصریہ، بیروت)۔

مندرجہ بالا احادیث وحوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض اور تراویح کی نماز اگر امام بیٹھ کر پڑھائے، تو اس کی اقتداء میں نماز جائز ہے، بشرطیکہ وہ رکوع وسجود کرسکتا ہو۔

عن عبداللہ بن عمرو قال: حدثت ان رسول اللہ ﷺ قال: "صلاۃ الرجل قاعدا نصف الصلاۃ" قال: فاتیته فوجدته یصلّی جالساً۔فوضعت یدی علی رأسه فقال مالک یا عبداللہ بن عمرو؟قلت: حدّثت یا رسول اللہ ﷺ أنک قلت: "صلاۃ الرّجل قاعداً علی نصف الصلاۃ"وأنت تصلّی قاعداً! قال: "أجل۔ ولکنّی لست کأحد منکم"۔

ترجمہ:'' حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سنی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ کر نماز پڑھنے کا آدھا اجر ہوتا ہے، ایک دن میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا میں نے اپنا ہاتھ آپ کے سر اقدس پر رکھا، آپ نے فرمایا: اے عبداللہ بن عمرو کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کا اجر آدھا ہوتا ہے،

حالانکہ آپ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں! آپ نے فرمایا: ہاں، لیکن میں تم جیسا کب ہوں''،

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:1684 مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، ابوداؤد، رقم الحدیث:947 مطبوعہ مؤسسۃ الریان، بیروت)۔

جمہور ائمہ کے نزدیک سنن مؤکدہ اور ہر قسم کے نفل قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر پڑھنا جائز ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ پہلے بیٹھ کر نماز پڑھنا شروع کرے اور پھر کھڑا ہو جائے یا پہلے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا شروع کرے اور پھر بیٹھ جائے۔ البتہ صبح کی دو رکعت سنت مؤکدہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، اس کو قیام پر قدرت کے باوصف بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی شخص قیام نہیں کرسکتا اور عذر کی وجہ سے سنن اور نوافل بیٹھ کر پڑھتا ہے تو اس کے ثواب میں کمی نہیں ہوگی اور اگر قیام پر قدرت کے باوجود سنن اور نوافل بیٹھ کر پڑھتا ہے تو اس کو آدھا ثواب ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے جو بیٹھ کر نفل پڑھے تھے یہ آپ کی خصوصیت تھی، علامہ نووی اور دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ آپ قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھیں، تو آپ کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی بعض لوگ اس پر قیاس کر کے عشاء کی نماز میں وتر کے بعد عمداً بیٹھ کر نفل پڑھتے ہیں اگر چہ یہ عمل جائز ہے، لیکن اس میں نصف ثواب ہے، تاہم فرائض میں اگر قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھے گا، تو نماز نہیں ہوگی کیونکہ فرائض میں قیام فرض ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد دوم، صفحہ:452، مطبوعہ فرید بک اسٹال، لاہور)۔

کتاب الجنائز

امامت نمازِ جنازہ کا سب سے زیادہ حق دار کون؟

سوال:30

نمازِ جنازہ کی امامت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟، امام محلہ یا میت کا ولی اقرب، اگر میت نے کسی کے بارے میں وصیت کی کہ یہ میری نمازِ جنازہ پڑھائے تو اس کی رعایت جائز ہے یا فقہی ترتیبِ اولویت کو ملحوظ رکھا جائے گا، فقہ حنفی کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں۔ (عبداللہ، والتھم اسٹو، لندن، انگلینڈ)۔

جواب:

علامہ علاء الدین حصکفی اپنے فتاویٰ الدر المختار میں لکھتے ہیں:

(ویقدم فی الصلاۃ علیہ السلطان) ان حضر (أو نائبہ) وھو امیر المصر (ثم القاضی) ثم صاحب الشرط ثم خلیفۃ القاضی (ثم امام الحی) فیہ ایھام، وذلک أن تقدیم الولاۃ واجب وتقدیم امام الحی مندوب، فقط۔

"اگر خلیفۂ وقت موجود ہے تو نمازِ جنازہ کی امامت کیلئے اسے مقدم کیا جائے گا یا اس کے نائب کو یعنی اس شہر کا امیر، پھر قاضی کو، پھر امیرِ لشکر کو، پھر قاضی کا نائب، پھر امام الحی (یعنی اس بستی یا محلے کے امام) کو، اس میں ایہام ہے، اور یہ اس لئے کہ میت کے اولیاء کی تقدیم واجب ہے، اور "امام الحی" کی تقدیم (یعنی امام بنانا) بشرطیکہ وہ ولی سے افضل ہو مستحب ہے"، (جلد:3، صفحہ:112)۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وھو امام المسجد الخاص بالمحلۃ، وانما کان اولی، لأن المیت رضی بالصلاۃ خلفہ فی حال حیاتہ، فینبغی ان یصلی علیہ بعد وفاتہ، قال فی "شرح المنیۃ": فعلیٰ ھذا لو علم انہ کان غیر راض بہ حال حیاتہ ینبغی أن لا یستحب تقدیمہ۔ قلت: ھذا مسلم ان کان عدم رضاہ بہ لوجہ صحیح، والا فلا۔ تأمل۔

"امام الحی" سے مراد ان لوگوں کا امام ہے، اور وہ خاص طور پر اس محلے کی مسجد کا امام ہے،

اوراس کوامامت کیلئے ''اولیٰ'' قرار دینے کا سبب یہ ہے کہ وہ متوفی اپنی زندگی میں اس کے پیچھے نماز پڑھنے پر راضی تھا،تو مناسب یہی ہے کہ وہی اس کی نماز جنازہ پڑھائے،''شرح المنیہ'' میں کہا: اس اصول کی بنا پر اگر معلوم ہو کہ اپنی زندگی میں وہ اس سے راضی نہیں تھا،تو اس کو امامت کیلئے آگے کرنا مستحب نہیں رہے گا، میں (ابن عابدین شامی) کہتا ہوں کہ یہ بات اس صورت میں تسلیم کی جائے گی، جب (یہ معلوم ہو کہ) حینِ حیات میں ''امام الحی'' سے متوفی کی ناراضگی کا سبب کسی جائز (شرعی) وجہ کی بنا پر ہو، ورنہ نہیں (یعنی پھر امام الحی ہی امامت جنازہ کا زیادہ حق دار ہے)، اس مسئلے (کی حکمت مستورہ) پر غور کرو، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:3 ،صفحہ:112 ،داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

فتاویٰ عالمگیری جلد:1 ،ص:163 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ میں ہے:

ذکرالحسن عن أبی حنیفة رحمه الله تعالیٰ أن الامام الاعظم وهوالخلیفة اولیٰ ان حضر، فان لم یحضر فامام المصر، فان لم یحضرفالقاضی، فان لم یحضر فصاحب الشرط ،فان لم یحضرفامام الحی، فان لم یحضر فالاقرب من ذوی قرابته وبهذه الروایة اخذ کثیر من مشائخنا رحمهم الله کذا فی "الکفایة" و"النهایة" و"معراج الدرایة" و"العنایة"۔

ترجمہ:''حسن نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت کیا کہ (امامت جنازہ کا سب سے زیادہ حق دار) بالترتیب خلیفہ ہے اگر وہ موجود ہے، اگر وہ موجود نہ ہوتو امام شہر، اگر وہ بھی نہ ہوتو قاضی، اگر وہ بھی نہ ہوتو صاحب الشرط اور اگر وہ بھی نہ ہوتو ''امام الحی'' اور اگر وہ بھی نہ ہوتو ولی اقرب، ہمارے (احناف کے) اکثر مشائخ نے اسی روایت سے (استحقاقِ امامتِ جنازہ کا) یہ مسئلہ اخذ کیا ہے، ''کفایہ''، ''نہایہ''، ''معراج الدرایہ'' اور ''عنایہ'' میں اسی طرح ہے''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے دریافت کیا گیا:

''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ میت اگرچہ بالغ ہو یا نابالغ ہو اس کے

جنازے میں ولی داخل نہیں ہوا تو اس کا جنازہ ہوا یا نہیں؟"

آپ نے جواب دیا:

"نماز ہوگئی مگر جو نماز جنازہ بے اجازت ولی پڑھی جائے ولی کو اختیار ہے کہ دوبارہ پڑھے۔ مگر جو پہلے پڑھ چکے ہیں وہ دوبارہ نہیں پڑھ سکتے۔ پھر یہ بھی اس صورت میں ہے کہ پہلی نماز کسی ایسے نے پڑھی، جس پر ولی کو ترجیح تھی، ورنہ اگر مثلاً بادشاہِ اسلام یا قاضی شرع یا امامِ حی نے نماز پڑھادی تو ولی کو اعادہ کا اختیار نہیں کہ وہ اس بات میں ولی سے مقدم ہیں۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:9، صفحہ:183-182 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

صدر الشریعہ علامہ مفتی امجد علی اعظمی مصنفِ "بہارِ شریعت" قدس سرہ العزیز استحقاق امامتِ جنازہ سے متعلق اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

"مگر جب کہ نمازِ جنازہ کے وقت امام جمعہ حاضر ہو، تو ولی یا امام الحی سے زیادہ حق اسی امام جمعہ کا ہے اور ایسے وقت کہ ولی سے افضل و احق موجود ہے تو ولی کو یہ نہ چاہئے کہ دوسرے سے پڑھوائے یا خود پڑھادے، بلکہ وہی امامِ جمعہ پڑھائے۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: امامِ جمعہ کو ولی سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں، ضرورت جب ہوتی کہ یہ خود صاحبِ حق نہ ہوتا اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امامِ جمعہ ولی پر مقدم ہے اور امامِ جمعہ پڑھادے گا تو ولی نماز کا اعادہ نہیں کر سکتا"۔

ان سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی شخص حالتِ زندگی میں امامِ موصوف پر ناراض ہو اور بعد وفات کسی اور شخص سے نماز پڑھوانے کی وصیت کرے تو وصیت جاری ہوگی یا نہیں؟، اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

"امام سے ناراض ہونا اگر کسی ایسی خرابی کے باعث تھا، جو امام میں تھی، تو امام کو ولی پر ترجیح نہیں کہ امام کی ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ جب اس شخص نے اپنی زندگی میں اسے امام بنایا اور اس پر راضی رہا تو بعد موت، نمازِ جنازہ کا بھی وہی امام ہوگا۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: اور اگر امام پر ناراضگی بلا وجہ شرعی ہو اس ناراضگی کا کچھ اثر نہیں۔

ردالمحتار میں عبارت ''غنیۃ'' کے بعد فرمایا:

قلت: ھذا مسلم ان کان عدم رضاہ بہ لوجہ صحیح، والا فلا۔

نمازِ جنازہ کی وصیت باطل ہے، یعنی صاحبِ حق کے سوا دوسرے کو نماز پڑھانے کی وصیت کر گیا تو اس وصیت سے حق دار کا حق نہ جائیگا، درمختار میں ہے:

والفتویٰ علیٰ بطلان الوصیۃ بغسلہٖ والصلوٰۃ علیہ۔

ترجمہ: یعنی فتویٰ اسی پر ہے کہ میت کو غسل دینے اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے بارے میں اس کی وصیت باطل ہے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد:1، ص:309 مکتبۂ رضویہ، کراچی)۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: عزاہ فی الھندیۃ الی المضمرات ای لواوصی بان یصلی علیہ غیرمن لہ حق التقدم اوبان یغسلہ فلان لایلزم تنفیذ وصیۃ ولایبطل حق الولی بذالک۔

ترجمہ: '' اسے فتاویٰ '' ہندیہ'' میں مضمرات کی طرف منسوب کیا، یعنی اگر کسی شخص نے اپنی نمازِ جنازہ پڑھانے کی بابت کسی ایسے شخص کے امام بنانے کی وصیت کی، جسے شرعاً ''تقدم فی الامامت '' کا حق حاصل نہیں ہے یا یہ وصیت کی کہ اسے فلاں شخص غسل دے تو وصیت کا نافذ کرنا لازم نہیں ہے اور اس (وصیت) کی بناء پر اس سلسلے میں ولی کا حق باطل نہیں ہوگا (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد3، ص:115 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت

اور ظاہر ہے کہ جب وصیت کی بناء پر ولی کا حق باطل نہیں ہوگا تو اسی طرح اور افراد، جنہیں ''تقدم فی الامامت'' کا شرعی حق حاصل ہے، (جیسے امام محلہ) وہ بھی باطل نہیں ہوگا، بلکہ قائم و ثابت رہے گا اور اس ضمن میں وصیت غیر مؤثر ہوجائے گی، (جلد:3، ص:115 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

جنازہ اٹھاتے اور لے جاتے وقت بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھنا

سوال: 31

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ

اُٹھاتے اور لے جاتے وقت کلمۂ شہادت کو باآوازِ بلند پڑھنا کیسا ہے؟، برائے مہربانی تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں، (کلیم اللہ ضلع سدھنوتی، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اس مسئلے کے بارے میں ہمارا حتمی، مختار اور دوٹوک جواب یہ ہے کہ موجودہ حالات میں نمازِ جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے بلند آواز سے کلمۂ شہادت، کلمۂ طیبہ، قراءت، درود و اذکار اور تسبیحات کا بلند آواز سے پڑھنا نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن ہے، دلائل کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ لیکن چونکہ اس مسئلے میں فقہاء کرام اور اسلافِ صالحین کی دو آراء ہیں، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ پہلے دونوں آراء اور ان کے دلائل ذکر کردیے جائیں تاکہ بحث ناصحانہ اور مصلحانہ انداز میں ہو، محض مناظرہ بازی، حجت بازی اور فریقِ مخالف پر برتری حاصل کرنے کا شوق اَنا پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اگر ہر فریق کا موقف، ان کے اپنے الفاظ میں دیانتداری سے بیان کردیا جائے تو خالی الذہن اور قبولِ حق پر آمادہ قاری کو مثبت نتیجے تک پہنچنے اور محاکمہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم اس مسئلے کے بارے میں سب سے پہلے فقہاء کرام کے اقوال پیش کررہے ہیں، اس کے بعد ان کی عِلّت و حکمت پر بحث ہوگی اور پھر حرفِ آخر کے طور پر نفسِ مسئلہ پر بحث ہوگی۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

اور کب اما مھا (کرہ) کما کرہ فیھا رفع صوتٍ بذکر او قراءۃ "فتح"۔

ترجمہ: ''جنازہ کے آگے سوار ہوکر چلنا مکروہ ہے، جیسے جنازے کے ساتھ (چلتے ہوئے) بلند آواز سے ذکر یا قراءت مکروہ ہے، بحوالہ ''فتح القدیر'''۔

اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(قولہ کما کرہ) قیل تحریماً، وقیل تنزیھا کما فی "البحر" عن "الغایہ"، وفیہ عنھا: وینبغی لمن تبع الجنازۃ اَنْ یُطیل الصَّمْتَ، وفیہ عن "الظھیریۃ" فان اراد

ان یذکر اللّٰہ تعالیٰ یذکرہ فی نفسہٖ ، لقولہٖ تعالیٰ "انہ لا یحب المعتدین (الاعراف:55)" ای الجاھرین بالدعاء، وعن ابراھیم انہ کان یکرہ ان یقول الرجل وھو یمشی معھا :استغفروالہ غفراللّٰہ لکم،قلت واذا کان ھذا فی الدعاء والذکر فما ظنک بالغناء الحادث فی ھذا الزمان؟

ترجمہ:''{جیسا کہ (جنازہ کے ساتھ) بلند آواز سے ذکر وقراءت مکروہ ہے}ایک قول یہ ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ تنزیہی ہے،جیسا کہ''البحرالرائق''میں ''الغایہ'' کے حوالے سے مذکور ہے اور اسی میں مزید یہ بھی ہے کہ:''جو شخص جنازے کے ساتھ چلے،اسے طویل خاموشی اختیار کرنی چاہئے اور اسی میں''الظہیریہ''کے حوالے سے ہے: اگر وہ اللہ کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو دل میں کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیشک وہ حد سے تجاوز کرنے والوں (یعنی بلند آواز سے دعا کرنے والوں) کو پسند نہیں فرماتا، (الاعراف:55)''۔اور ابراہیم سے روایت ہے کہ:''وہ اس بات کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے یہ کہے: اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے،اس میت کے لئے مغفرت کی دعا کرو''،میں (علامہ شامی) کہتا ہوں: جب (جنازہ کے ساتھ) بلند آواز سے دعا اور ذکر مکروہ ہے،تو اس دور میں جو گانے اور نغمے پڑھنے کا رواج ہے، اندازہ لگاؤ،اس کی ممانعت کس درجے کی ہوگی؟ ،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد:3ص:128،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

اس مقام پر حاشیہ میں لکھا ہے: امام نووی''الاذکار''مع''الفتوحات الربانیہ''(183/4) میں بیان کرتے ہیں:

ترجمہ:''جان لو کہ یہ بات مختار اور درست ہے اور اسی پر سلف ﷭ عمل پیرا رہے کہ: جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے خاموش رہنا چاہئے ،نہ تو ذکر وقراءت اور نہ ہی کسی اور مقصد کیلئے آواز بلند کرے ،اور اس کی حکمتیں (بالکل) ظاہر ہیں ،وہ یہ کہ یہ (سکوت) قرار دل کا باعث ہے،اس کے سبب ذہن جنازے سے متعلق امور کی جانب مکمل طور پر متوجہ رہتا ہے اور اس

موقع پر یہی چیز مطلوب بھی ہے، یہی بات حق ہے اور مخالفین کی کثرت سے کوئی دھوکہ نہ کھائے، ابوعلی فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ نے کہا ہے جس کا مفہوم یہ ہے: راہِ ہدایت کو لازم پکڑو، راہِ ہدایت پر چلنے والوں کی قلت تمہارے لئے ضرر رساں نہیں ہے اور گمراہی کی راہوں سے بچتے رہو اور ہلاکت کی راہوں پر چلنے والوں کی کثرت تمہارے لئے نقصان دہ نہیں ہے، پھر "ابن عباد" کے اس قول کی طرف انہوں نے اشارہ کیا: یہ جو جاہل قراءِ دمشق وغیرہ نے طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ گا، گا کر قراءت کرتے ہیں اور کلام کو اپنے موضوع سے خارج کر دیتے ہیں تو یہ بالا جماع حرام ہے"۔

امام احمد رضا قادری نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی ہے، ملاحظہ ہو: "فتاویٰ رضویہ جلد نہم صفحات 139 تا 158 رضا فاؤنڈیشن، لاہور"۔

ہم یہاں اس بحث کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں اور اس کے اہم پہلوؤں کی نشاندہی کر رہے ہیں:

(1) وہ فرماتے ہیں کہ جنازے کے ساتھ طویل خاموشی اختیار کئے رکھنا، فی نفسہٖ نہ مقصود ہے نہ شریعت کا مطلوب، نہ ہی یہ حکمتِ شرعیہ ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"اس میں حکمت یہ تھی کہ صَمت (سکوت) فی نفسہٖ کوئی شے مطلوب نہیں، کہ قولِ خیر، "عدمِ قولِ مُطلَق" سے قطعاً افضل ہے، لہٰذا ارشاد ہوا:

"ان لا یزال لسانک رطبا من ذکر اللّٰہ"۔

ترجمہ: "تمہاری زبان ذکرِ الٰہی سے مسلسل سرشار رہنی چاہئے، (ترمذی: ابواب الدعوات، امین کمپنی، 173/2)۔ اگلے شرائع نے اسے (یعنی محض گفتگو نہ کرنے کو) صوم میں رکھا تھا، ہماری شریعتِ غَرّاء (روشن شریعت) نے اسے منسوخ کر دیا، مجوس کے یہاں وقتِ اَکل، صَمت (یعنی کھانے کے وقت خاموشی) ہے، ہماری شریعت میں مکروہ، لازم الاحتراز ہے۔

اس ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ اگر جنازے کے ساتھ مکمل خاموشی کے ساتھ چلنے کی بابت فقہاء کرام کی عبارات سے کسی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "سکوتِ محض" بجائے خود عبادت ہے، تو یہ سوچ باطل ہے، اسلام میں بلاشبہ فحش کلامی کے مقابل خاموشی کو ترجیح دی گئی ہے، لیکن محض

خاموشی کوئی مستحسن اور قابلِ مدح وستائش چیز نہیں ہے اور نہ ہی شریعت کا آئیڈیل یا مطلوبِ کامل ہے۔

(2) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ''سکوتِ محض'' کسی بھی درجے میں مطلوبِ شریعت نہیں ہے، تو ہمارے فقہاء کرام نے جنازے کے ساتھ خاموش رہ کر چلنے پر اتنا زور کیوں دیا اور بلند آواز سے ذکر وقراءت کو مکروہ (خواہ تنزیہی ہی سہی) کیوں قرار دیا؟، تو امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں:

''یہاں بھی اس کا منشا عوارض ہی ہیں، قلب ہمراہیان کا مُشوّش ہونا، یادِ موت سے دوسری طرف توجہ کرنا، انصاف کیجئے تو یہ حکم اس زمانِ خیر کے لئے تھا، جب ہمراہیانِ جنازہ تصورِ موت میں ایسے غرق ہوتے تھے کہ گویا میت ان میں سے ہر ایک کا اپنا جگر پارہ ہے، بلکہ گویا خود ہی مَیّت ہیں، ہمیں کو جنازہ پر لئے جاتے ہیں اور اب قبر میں رکھیں گے، لہٰذا علماء نے سکوتِ محض کو پسند کیا تھا کہ کلام اگرچہ ذکر ہی ہو، اگرچہ آہستہ ہو، اس تصور سے (کہ بغایت نافع اور مفید اور برسوں کے زنگ دل سے دھو دینے والا ہے) روکے یا کم از کم دل بٹ تو جائے گا، تو اس وقت محض خاموشی ہی مناسب تر ہے، ورنہ حاش لِلّٰہ! ذکرِ خدا اور رسول کسی وقت منع نہیں ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

''کان رسول اللہ ﷺ یذکر اللہ تعالیٰ علیٰ کل احیانہٖ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ ہمہ وقت اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے''، (صحیح مسلم، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ)

امام احمد رضا قادری کی اس تشریح کا ماحصل یہ ہے کہ ہمارے فقہاء کرام نے جنازے کے ساتھ چلنے میں سکوت کو اس لئے ترجیح دی تھی کہ موت اور قبر کے تصور میں لوگوں کے دل ڈوبے رہیں، کسی کی بلند آواز سے کہیں ان کی توجہ بٹ نہ جائے، موت، قبر اور آخرت کی جوابدہی کا تصور اس قدر غالب ہو کہ وہ محسوس کریں گویا ان کا اپنا جنازہ جارہا ہے اور قبر انہی کے لئے تیار کی گئی ہے، اس مفہوم کو انہوں نے شیخ شعرانی قدس اللہ سرہ العزیز کی کتاب ''العہود المحمدیہ'' کے حوالے سے بھی بیان کیا ہے کہ اسلاف صالحین جنازے کے ساتھ چلتے

ہوئے کلام بالکل نہیں کرتے تھے، سوائے اس کے جو حدیث میں وارد ہوا ہے، یہاں تک کہ اجنبی شخص ان سب کو حُزن و ملال میں ڈوبا ہوا دیکھ کر اندازہ ہی نہیں لگا سکتا تھا کہ ان میں میت کا سب سے زیادہ قریبی عزیز کون ہے؟۔

(3) اس کے بعد امام احمد رضا قادری بیان کرتے ہیں کہ اب موجودہ دور میں جنازہ کے ساتھ چلنے والے لوگوں کی وہ کیفیت ہرگز نہیں ہے، نہ یادِ موت کا غلبہ، نہ احوالِ برزخ وقبر کا خوف اور نہ آخرت کی فکر دامن گیر ہوتی ہے، جیسے آج کل لوگ جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے گپیں لگاتے ہیں، ہنسی مذاق کرتے ہیں، حالاتِ حاضرہ اور سیاست دوراں پر تبصرے ہوتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اب زمانہ منقلب ہوا، لوگ جنازہ کے ساتھ اور دفن کے وقت اور قبروں پر بیٹھ کر لغویات و فضولیات اور دنیوی تذکروں بلکہ خندہ ولہو میں مشغول ہوتے ہیں، تو انہیں ذکر خدا جل وعلا ورسول ﷺ کی طرف مشغول کرنا عینِ صَواب وکارِ ثواب ہے''۔

اسی بات کو علامہ شعرانی اپنی کتاب ''العھود المحمدیہ'' میں لکھتے ہیں:

محلے یا بستی کے عالم کو چاہئے کہ جنازے کے ساتھ جانے والوں کو تعلیم دیں کہ وہ اس دوران لغو باتوں اور ایسی باتوں کے ذکر سے اجتناب کریں کہ فلاں شخص حاکم بنا، فلاں اقتدار سے معزول ہوا، فلاں بڑا تاجر سفر پر گیا یا واپس آیا وغیرہ۔ یعنی اب خواہ لوگوں کو جہری ذکر سے روک بھی دیا جائے تو حالتِ سکوت میں بھی، کیفیتِ عبرت اور یادِ موت و برزخ وآخرت تو بالکل مفقود ہے، بلکہ لغویات وفضولیات میں مشغول رہتے ہیں۔ تو جس ۔ مطلوبِ خیر کو پانے کیلئے فقہاء کرام نے جنازے کے ساتھ خاموشی سے چلنے پر زور دیا تھا، یہاں تک کہ بلند آواز سے ذکر وقراءت تک کو مکروہ قرار دیا تھا، وہ مراد ومطلوب حاصل نہ ہوسکا۔ لہٰذا اب بلند آواز سے ذکر کی اجازت دے دینی چاہئے کہ اس سے مطلوب کامل اگر حاصل نہ بھی ہوسکا، تو کچھ نہ کچھ خیر تو حصے میں ضرور آئے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''بالجملہ بجائے صَمت (خاموشی) اقامتِ جہر بالذکر (بلند آواز سے ذکر کرنا)، تحصیل مقصود

کے لئے تبدیلِ ذریعہ، بمصلحتِ حالیہ نہ کہ تفویتِ مقصود (مقصود کو فوت کرنا)، جاہل وہ جو خموشی کو مقصودِ اصل جانے، مطلوب ذکر ہے، جب خموشی میں، اور اب جہر بالذکر میں"۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"تو یہاں یہ کہ ذکر اعظم مطلوبات سے تھا اور منع ایک وجہ بعید کیلئے کہ ذریعہ مقصود میں مخل نہ ہو اور وہ ذریعہ ہی نہ رہا، بلکہ منعکس ہوگیا، تو وہ منع اگرچہ تنزیہی ہو، اس کا باقی رہنا فقاہت سے کس قدر دور بلکہ عقل سے مہجور ہے"۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جنازے کے ساتھ خاموشی سے چلنے اور ذکر بالجہر سے اجتناب کی شرعی مصلحت، یعنی قلب پر موت اور مابعد الموت کے احوال کا طاری ہونا، اب حاصل نہیں ہورہی، بلکہ اس کے برعکس ہورہا ہے، لہٰذا اب ذکر بالجہر دورِ حاضر میں جائز ہے کہ کم از کم دوسروں کے متوجہ کرنے پر لوگ غفلت کی کیفیت سے نکل آئیں گے اور سِرّی یا جہری ذکر میں مشغول ہوجائیں گے اور بر سبیلِ تنزل لغویات سے بچ جائیں گے۔

چنانچہ امام احمد رضا لکھتے ہیں:

"اطبائے روحانی نے جہر بالذکر کی اجازت دی کہ وہ اَوقَع فی النفوس (دلوں میں بہت زیادہ اثر کرنے والا) وادفَع للوساوِس (وسوسوں کو دور کرنے والا)، واَنفَع للناس (لوگوں کیلئے بہت زیادہ نفع بخش) ہے، ذاکرین کی زبانوں اور سامعین کے کانوں کو مشغول کرتا اور غافلین کو جگا کر، لغویات سے باز رکھ کر، ذکر وسماع کی طرف لاتا ہے اور یہ سمجھ لینا کہ مسلمان ایسے ہوگئے ہیں کہ باوجود قرع وقوت قرع وتکرر (یعنی بار بار جھنجھوڑنے اور متوجہ کرنے پر) بھی متاثر نہ ہوں گے، جہل وسوءِ ظن (بدگمانی) ہے، تو اب ذکر جہر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے افراد سے ہے، جس سے منع عکس ونقیضِ مقصودِ شرع (یعنی مقاصد شرع کے منافی) ہے"۔

پھر آپ علامہ عبدالوہاب شعرانی قُدِّسَ سِرُّہٗ کا موقف ان کی کتاب "العہود المحمدیہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''سیدی علی الخواص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ جب جنازے کے ساتھ چلنے والوں کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ جنازہ میں لغویات سے باز نہیں آئیں گے اور دنیا کی باتوں میں مشغول رہیں گے، تو پھر انہیں حکم دینا چاہئے کہ وہ (کلمۂ مبارکہ) "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھیں کہ اسے پڑھنا، اس کے ترک سے افضل ہے اور کسی فقیہ کو بغیر نص (قرآن و حدیث) یا اِجماع (کی دلیل) اس سے منع نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ مسلمانوں کو شارع کی جانب سے "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھنے کا اذنِ عام ہے، الٰہی اس دل کے اندھے پن سے تعجب ہے جو اس طریقے کے عمل سے روکتا ہے''

(فتاویٰ رضویہ، جلد:9،ص:152 مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''

اسی طرح آپ نے آیاتِ قرآنی کے حوالہ جات سے ثابت کیا کہ کثرتِ ذکرِ الٰہی قرآن کا مطلوب ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''اللہ عزوجل کا ذکر اصل مقصود و اَجَلِّ مقاصد و مغز جملہ عبادات ہے:

(1) اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ ۝

ترجمہ: ''میرے ذکر کیلئے نماز پڑھو''، (طٰہٰ:14)۔

(2) يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔

ترجمہ: ''وہ کھڑے، بیٹھے اور کروٹوں کے بل لیٹے (ہر حال میں) اللہ کا ذکر کرتے ہیں، (آل عمران:191)۔ بلا کسی قید کے کثرتِ ذکر کا حکم فرمایا:

(3) وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: ''کثرت سے اللہ کا ذکر کرو تا کہ تم فلاح پاؤ''، (الجمعہ:10)۔

حدیث پاک میں فرمایا:

اکثر واذکر اللہ حتی یقولوا انہ مجنون۔ ترجمہ: ''اللہ کا اس کثرت سے ذکر کرو کہ (لوگ) کہیں یہ تو (اللہ کا) دیوانہ ہے''، (مسند احمد:71,86/3)۔

امام احمد رضا لکھتے ہیں: ذکر کیلئے اَنحاء (اقسام) کثیرہ ہیں: قلبی، لسانی، خفی، جلی، تلاوت،

ثناء، درود، دعا، عبادات، وطاعات، باوصفِ اطلاق (یعنی مطلقاً حکمِ ذکر سے) بعض أنحاء سے خصوصیت ہوتی ہے، مَحلِ جنازہ مقامِ تفکر ہے کہ ذکرِ قلبی ہے، تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ الثقلین۔

ترجمہ: ایک لمحے کا تفکر انسانوں اور جنوں کی عبادت سے بہتر ہے (اور ایک روایت میں ہے ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے)۔ ولہٰذا فقہاء نے ذکرِ خفی کو ذکرِ لسانی پر ترجیح دی، ورنہ ذکر پر تفضیل محال ہوتی، ولذکر اللہ اکبر، اس نحو (قسم) کے ذکر کیلئے خاموشی بہتر ہوتی ہے، ولہٰذا فقہاء نے "ینبغی ان یطیل الصمت" (یعنی طویل خاموشی اختیار کرنی چاہئے) فرمایا، (فتاویٰ رضویہ، جلد:9،ص:152 مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

امام احمد رضا قادری امام عبدالوہاب شعرانی کی کتاب ''عہود المشائخ'' اور ''حدیقہ مبارکہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''ہم اپنے دوستوں کو کسی ایسی چیز سے روکنے کی اجازت نہ دیں گے، جو مسلمانوں نے اللہ کی بارگاہ میں تقرب کیلئے ایجاد کی ہو اور اسے اچھا جانتے ہوں، جیسا کہ بارہا اس کی تقریر اسی کتاب عہود میں گزر چکی ہے، خصوصا وہ چیز جس کا تعلق اب اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول سے ہو، جیسے لوگوں کا جنازے کے آگے "لا الٰہ الا اللہ محمّد رسول اللّٰہ" پڑھنا یا کسی کا اس کے آگے قرآن پڑھنا اور اس طرح کے کلمات (خیر)، اسے جو حرام کہے وہ شریعت کی فہم سے قاصر ہے، اس لئے کہ ہر وہ چیز جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود نہ تھی، (ضروری نہیں کہ) بری ہو، امام نووی نے تو اسے ترجیح دی کہ کلام صرف خلافِ اولیٰ میں ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد:9،ص، 154، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے عہد حاضر میں جنازہ کے ساتھ چلنے والوں کو سکوت اختیار کرنے کا جو حکم فقہاء نے دیا تھا اور بلند آواز سے ذکر وتلاوت ودرود کو مکروہ قرار دیا تھا، اب اس کی حکمت اور علّتِ غائی مفقود ہوگئی ہے، بلکہ اس کا اثر الٹا پڑ رہا ہے کہ لوگ گپ شپ اور لغو باتوں میں مشغول رہتے ہیں، لہٰذا اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنازے کے ساتھ بلند آواز

سے ذکر کرنے کی کراہت، ان وجوہ و دلائل کی بنا پر اُٹھ گئی ہے، پس اب جنازہ کے ساتھ اونچی آواز سے کلمۂ شہادت، کلمۂ طیبہ، قراءتِ قرآن یا درود واذکار یا کلماتِ حمد و نعت پڑھنے کی اباحت و جواز کا قول کرنا چاہیے، اور اگر اس سے غافل قلوب ذکر اور یادِ موت و برزخ و آخرت کی جانب مبذول ہو جائیں، تو پھر اسے مستحسن سمجھنا چاہیے۔

لیکن اس کے باوجود اگر کوئی کہے کہ فقہاء نے جو (بر سبیلِ تنزل) کراہتِ تنزیہی کا قول کیا ہے، اس کا کیا جواب ہوگا، تو امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں: خادمِ فقہ جانتا ہے، تحصیلِ مقصود کیلئے بعض مکروہات سے کراہت زائل ہو جاتی ہے، جیسے نماز میں آنکھیں بند کرنا مکروہ ہے اور اگر (کسی کو) خشوع یونہی حاصل ہوتا ہے، تو آنکھیں بند کرنا ہی اولیٰ ہے۔

كما فى الدرالمختار كره---- (و تغميض عينيه) لِلنَّهْيِ الا لكمال الخشوع وفى ردالمحتاربان خاف فوتَ الخشوع بسبب روية ما يفرق الخاطر فلا يكره قال بعض العلماء وانه الاولىٰ وليس ببعيد "حلية" و"بحر" ، اقول ولعل التحقيق ان بخشية فوات الخشوع تزول الكراهة و بتحققه يحصل الاستحباب

ترجمہ: ''جیسا کہ درمختار میں ہے: نماز میں آنکھیں بند کرنا مکروہ ہے، کیونکہ اس کی ممانعت آئی ہے، لیکن اگر کمالِ خشوع کیلئے ہو، تو مکروہ نہیں، ردالمحتار میں ہے: اس طرح کہ طبیعت کو منتشر کرنے والی چیزیں دیکھنے کے سبب خشوع فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو مکروہ نہیں، بلکہ بعض علماء نے فرمایا کہ اولیٰ ہے اور یہ کوئی بعید بات نہیں، (بحوالہ) ''حلیہ'' و ''بحر''، میں کہتا ہوں شاید تحقیق یہ ہے کہ خشوع فوت ہونے کے اندیشے سے کراہت زائل ہو جاتی ہے اور آنکھ بند کر لینے پر خشوع متحقق ہو جانے سے استحباب حاصل ہو جاتا ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد:9، ص:156، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک وقت تھا کہ لفظاً نیتِ نماز کو بدعت کہا گیا تھا، کیونکہ اصل میں نیت دل کے ارادے (اور حضوریِ قلب) کا نام ہے اور سنت سے لفظی نیتِ نماز ثابت بھی نہیں ہے، لیکن متأخرین فقہاءِ کرام نے جب دیکھا کہ لوگوں میں اب وہ یکسوئی اور

حضوریٔ قلب باقی نہیں رہی تو لفظاً نیتِ نماز کو مستحب قرار دیا، بالکل یہی صورتِ حال جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے جہری ذکر کی ہے۔

ماں کے انتقال کے بعد بچے کی نگہداشت وتربیت کا اولین حق کس کو حاصل ہے؟

سوال:32

عظمیٰ شیخ عامر کا ایک سال قبل ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو چکا ہے، اس کے دو بیٹے عزیز الحق اور عباد الحق کی عمر بالترتیب ڈھائی سال اور ساڑھے چار سال ہے۔ بچوں کے والد محمد عامر، انہیں اپنی تربیت وتحویل میں رکھنا چاہتے ہیں، جبکہ عظمیٰ شیخ عامر (مرحومہ) کی والدہ صاحبہ یعنی بچوں کی نانی صاحبہ دونوں بچوں پر حق ملکیت بتاتی ہیں اور سٹی کورٹ میں بچوں کے حصول کیلئے مقدمہ قائم کیا ہوا ہے، لہٰذا ازراہِ کرم ان بچوں کے حق نگہداشت کا شرعی حکم بیان فرمائیں، عین نوازش ہوگی، (شیخ عامر، کراچی)۔

جواب:

انسان اللہ تعالیٰ کی آزاد مخلوق ہے، اس کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے، کسی کو حق ملکیت جتانے یا اس کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے، البتہ شریعت کی رو سے بچے کی نگہداشت وتربیت کا حق ہے، جسے ''حق حضانت'' کہتے ہیں، اور اس کی ترتیب یہ ہے، اس میں اولین حق بچے کی نسبی ماں کا ہے، اس کے بعد نانی کا ہے۔

چنانچہ علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ثم) ای بعد الام بان ماتت اولم تقبل اواسقطت حقهااو تزوجت باجنبی(ام الام)

ترجمہ: ''اگر ماں کا انتقال ہو جائے یا وہ اس ذمہ داری کو قبول نہ کرے یا وہ خود ہی (اپنی رضا مندی سے) اپنے حق سے دستبردار ہو جائے، یا اس نے کسی اجنبی شخص سے شادی کرلی ہو تو پھر ماں کے بعد یہ حق بچے کی نانی کا ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:5، ص:211,212 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

پس قانونِ شریعت کی رو سے ماں کے انتقال کے بعد نابالغ بچوں کی پرورش کا حق نانی کو حاصل ہے، اگر نانی نواسوں کی تربیت قبول کرتی ہے تو اسے دوسروں پر ترجیح دینی چاہیے۔ لہٰذا اگر نانی کے ہاں بچوں کی پرورش کی صورت میں کسی دینی یا دنیاوی ضرر کا اندیشہ نہ ہو تو نانی کے شرعی حق تقدم کا خیال رکھتے ہوئے، بچوں کو ان کی پرورش میں دے دینا چاہیے، البتہ یہ حق سات سال تک ہے اس کے بعد والد بچے کو لے سکتا ہے۔ ھذاما عندی والحق عند ربی۔

نمازِ جنازہ کی شرعی حیثیت

سوال:33

نمازِ جنازہ کا حکم قرآنِ مجید میں ہے، یا نہیں، اگر ہے؟ تو کس مقام پر اور کونسی آیت میں ہے، اور یہ حکم کب نازل ہوا۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں،

(قاری محمد زمان چشتی، امام وخطیب جامع مسجد مصطفیٰ بلاک 14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اور جو ان (منافقین) میں سے مر جائے تو آپ ان میں سے کسی کی نمازِ جنازہ کبھی نہ پڑھیں اور نہ (کبھی) اس کی قبر پر کھڑے ہوں، بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے ساتھ کفر کیا اور یہ نافرمانی کی حالت میں مرے''، (التوبہ: 84)۔

اس آیت سے دلالت النص کے طور پر مومن کی میت پر نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم معلوم ہوتا ہے، چنانچہ علامہ قرطبی اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں لکھتے ہیں:

یہ آیت کفار پر نمازِ جنازہ پڑھنے کی ممانعت میں نص ہے، لیکن اس میں مومنوں پر نمازِ جنازہ پڑھنے کے وجوب کی براہِ راست دلیل نہیں ہے، اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا اس سے

مومنوں پر نمازِ جنازہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے، اس مسئلے میں دو قول ہیں، ایک قول کے مطابق اس سے نمازِ جنازہ کے وجوب پر استدلال کیا جاسکتا ہے، کیونکہ قرآن نے کافروں کی نمازِ جنازہ سے ممانعت کی علت ان کے کفر کو بتایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر کیا"، تو جب (وجہ ممانعت یعنی) کفر زائل ہوجائے تو نمازِ جنازہ واجب ہوجائے گی، اس کی دوسری مثال قرآن میں یوں ہے کہ:

كَلَّآ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ۝

ترجمہ: "حق یہ ہے کہ بے شک وہ کفار اس دن اپنے رب کے دیدار سے ضرور محروم ہوں گے"، (المطففین:15)۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ غیر کفار یعنی مومن روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے دیدار سے سرفراز ہوں گے۔ جو لوگ آیات الاحکام میں مفہوم مخالف یعنی دلیل خطاب کے قائل ہیں، وہ اس آیت سے نمازِ جنازہ کے وجوب پر استدلال کرتے ہیں، اس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ ؕ اور آپ ان کیلئے دعا فرمائیں، بے شک آپ کی دعا ان کیلئے (باعث) تسکین ہے، (التوبہ:103)۔

علامہ قرطبی اپنی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے منجملہ دیگر معانی کے ایک معنی یہ بھی بیان کرتے ہیں: "ومنہ الصلوۃ علی الجنائز" یعنی آیت میں صلوٰۃ کا ایک معنی میت کی نمازِ جنازہ پڑھنا ہے۔

احادیثِ صحیحہ مشہورہ، تعامل رسول، تعامل صحابہ، تعامل امت اور اجماع امت سے نمازِ جنازہ کا وجوب ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام وصحابیات کا جنازہ پڑھنے اور فضائلِ جنازہ میں متعدد احادیث ہیں۔ صحیح مسلم کتاب الجنائز میں صیغۂ امر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان اخالکم قدمات فقوموا فصلوا علیہ۔

ترجمہ: "بے شک تمہارے ایک (دینی) بھائی (اصحمہ نجاشی) کا انتقال ہوگیا، پس کھڑے

ہو جاؤ اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھو"۔
فقہی اعتبار سے میت پر نمازِ جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے اور اس کا انکار کفر ہے، کیونکہ "اجماعِ امت" مسلمہ طور پر اصولِ شرعیہ اور دلائلِ قطعیہ میں سے ہے اور "نمازِ جنازہ" کی فرضیت پر تو بلا استثناء خیر القرون (یعنی وہ دور جس کے خیر ہونے کی شہادت رسول اللہ ﷺ نے دی) اور سلف سے لے کر خلف تک سب کا اجماعِ قطعی ہے۔
علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:
(والصلوٰۃ علیہ) صفتھا (فرض کفایۃ) بالا جماع فیکفر منکرھا لانہ انکر الاجماع۔
اور میت پر نمازِ جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے، اور یہ اجماعِ امت سے ثابت ہے تو جو اس کی فرضیت کا انکار کرے، اس کی تکفیر کی جائے گی، کیونکہ اس نے اجماع کا انکار کیا۔
"بالاجماع" کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں کہ بعض عبارات میں جو نمازِ جنازہ کے واجب ہونے کا ذکر ہے، وہاں واجب، فرض کے معنی میں ہے، (فتاویٰ شامی ج3 ص97)۔
ایک اور حدیث میں بھی صیغۂ امر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:
"صلوا علیٰ کل برٍّ وفاجرٍ"۔
ترجمہ: ہر نیکوکار اور گنہگار کی نمازِ جنازہ پڑھو، (سنن دارقطنی ج2 ص57 رقم الحدیث:10)۔

میت کی باقیات کو نکلوا کر دوسری زمین میں منتقل کرنے کا حکم

سوال:34

عرض ہے کہ میرے والد کا انتقال 14 مارچ 2001ء کو ہوا تھا اور عزیز آباد قبرستان میں تدفین ہوئی۔ مسئلہ یہ ہے کہ حکومت لیاری ایکسپریس وے بنا رہی ہے، تعمیری مراحل میں پلر بناتے ہوئے قبرستان سے ملحق مکانات اور کچھ قبریں اس کی زد میں آرہی ہیں، جنہیں بلڈوز کر دیا جائے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ والد صاحب کی قبر کو کھدائی کروا کر باقیات نکلوا کر دوسری زمین (اندرونِ قبرستان) منتقل کروالوں۔ کیا شرعاً یہ کام درست و جائز ہے؟ برائے

مہربانی جلد جواب عنایت فرمائیں کیونکہ اس Project پر عنقریب کام شروع ہونے والا ہے۔(سید نجم علی، مکان نمبر 1025/9 دستگیر سوسائٹی فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

حدیث مبارک میں ہے:

عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "لأن یجلس احدکم علی جمرۃ فتحرق ثیابہ حتی تخلص الی جلدۃ خیرلہ من أن یجلس علی قبر"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس سے کہ قبر پر بیٹھے''، (ابوداؤد، رقم الحدیث: 3220، مطبوعہ مؤسسۃ الریان بیروت)۔

عن عقبۃ بن عامر، قال: قال رسول اللہ ﷺ: لأن امشی علی جمرۃ أو سیف، أو اخصف نعلی برجلی، أحبّ الیّ من ان امشی علی قبر مسلم۔ وما أبالی اوسط القبور قضیت حاجتی، أو وسط السوق"۔

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے زیادہ پسند ہے آگ یا تلوار پر چلنا یا پاؤں سے جوتے پر پیوند لگانا، بہ نسبت اس کے کہ قبرِ مسلم پر چلوں، اور مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ قبر کے وسط میں میری حاجت پوری ہوتی ہے یا بازار کے درمیان''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1568، مطبوعہ دارالفکر بیروت)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

لانھم نصوا علی أن المرور فی سکۃ حادثۃ فیھا حرام۔

ترجمہ: ''علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ قبرستان کے اندر نو پیدا راستے پر چلنا حرام ہے''۔

(ردالمحتار جلد 1 صفحہ: 482، داراحیاء التراث العربی بیروت)

میت کو دفن کرنے کے بعد پھر قبر کو کھودنا جائز نہیں مگر جب کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو مثلاً زمین مغصوب میں دفن کیا گیا یا دفن کے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں

قبر کھودنے کی اجازت ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(لا یخرج منه)بعد اهالة التراب(الا) لحق آدمی،(کأن تکون الارض مغصوبة أو أخذت بشفعة)و یخیرالمالک بین اخراجه ومساواته بالأرض ۔

ترجمہ:"(میت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا) مٹی ڈال دینے کے بعد (مگر) کسی انسان کے حق کی وجہ سے، مثلاً (زمین غصب کی ہو یا شفعہ کی وجہ سے لی گئی ہو) اور مالک کو اختیار ہوگا کہ مردے کو نکال دے یا قبر زمین کے برابر کردے"، (ردالمحتار جلد 3 صفحہ 135,136، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: "اور اگر وہ کسی کا مملوک نہیں ہے بلکہ وقف ہے تو وقف میں دست اندازی کا کسی کو حق نہیں (الوقف لا یملک) وقف کسی آدمی کی ملکیت نہیں ہوتا"، (فتاویٰ رضویہ جلد 9 ص:384 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولا یجوز تغییر الوقف عن هیئته۔

ترجمہ:"وقف کی ہیئت بدلنا جائز نہیں"، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: مسلمانوں کا عام قبرستان وقف ہوتا ہے اور اس میں سوائے دفن کے اور تصرف کی اجازت نہیں اسے تجارت گاہ بنانا یا اس پر کھیت کرنا سب حرام ہے، اشباہ وغیرہا میں ہے:

شرط الواقف کنص الشارع فی وجوب العمل به۔

ترجمہ:"واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص کی مثل ہے"۔

(الفن الثانی، جلد 1 ص:305 ادارۃ القرآن کراچی)

اور مسلمان کی قبر کو کھودنا تو نہایت سخت شدید جرم ہے، اسلامی سلطنت ہو تو ایسا شخص سخت تعزیر کا مستحق ہے یہاں تک کہ سلطانِ اسلام کی اگر رائے ہو تو جو ایسی حرکت کا مرتکب ہوا

کرتا ہوا اسے سزائے قتل دے سکتا ہے، جو شخص ناحق پر اس کی تائید کرتے ہیں سب اسی کی طرح مرتکب جرم ومستحق سزا ہیں۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گناہ اور ظلم پر تعاون مت کرو، (القرآن، المائدہ:2)۔

حدیث میں ہے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

من مشى مع ظالم ليعينه وهو يعلم انه ظالم فقد خلع من عنقه رقبة الاسلام۔

ترجمہ: ''جو دانستہ کسی ظالم کی مدد کو چلے اس نے اپنی گردن سے اسلام کی رسی نکال دی''۔

(فتاویٰ رضویہ جلد16 ص:540 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مراقی الفلاح میں ہے:

(ولا يجوز نقله) اي: الميت (بعد دفنه) بأن أهيل عليه التراب، وأما قبله فيخرج (بالاجماع) بين أئمتنا طالت مدّة دفنه أو قصرت، للنهي عن نبشه، والنّبش حرام حقاً لله تعالى۔

ترجمہ: ''اور میت کا منتقل کرنا دفن کرنے کے بعد جائز نہیں ہے، اور اس پر مٹی ڈالے جانے سے قبل بالاجماع نکالا جاسکتا ہے، اور ہمارے ائمہ کرام، دفن کو طویل عرصہ گزرا ہو یا قلیل، نبشہ (انتقالِ میت) سے منع کرتے ہیں اس لئے کہ نبشہ، حق اللہ ہونے کے باعث حرام ہے''، (مراقی الفلاح جلد2 صفحہ 265,266 مکتبہ غوثیہ کراچی)۔

انتقالِ قبر سے متعلق ایک سوال کے جواب میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: صورتِ مذکورہ میں نبش حرام، حرام، سخت حرام، اور میت کی اشد توہین وہتک سرِّ ربّ العالمین ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد9 ص:405 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

مذکورہ دلائل وبراہین کی روشنی میں چند امور واضح ہوتے ہیں: (1) قبورِ مسلمین کی تعظیم لازم ہے، (2) قبرستان کو راستہ بنانا حرام ہے، (3) مسلمانوں کا قبرستان وقف ہے، وقف کی تغییر ناجائز ہے، (4) بلاضرورتِ شرعی قبر کا کھولنا ناجائز ہے، (5) نبشہ (انتقالِ میت)

حرام ہے۔ اربابِ اختیار کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں کہ وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے قبور کو چھوڑ کر متبادل راستہ اختیار کریں۔ تاہم اگر متعلقہ محکموں کے لوگ قبولِ حق پر آمادہ نہ ہوں اور حکومتی طاقت کے بل پر قبروں کو بلڈوز کرنے پر تلے بیٹھے ہوں، تو جس قبر کے مسمار کرنے سے کسی میت کی باقیات برآمد ہوں تو انہیں احترام کے ساتھ دوسری محفوظ جگہ دفن کردیں۔ لیکن محض اس خدشے کی بنا پر کہ قبر کو بلڈوز کردیا جائے گا، پیشگی قبر کو کھودنا اور میت یا باقیاتِ میت کو منتقل کرنا درست نہیں ہے۔

سانحۂ گھوٹکی میں جاں بحق ہونے والوں کی اجتماعی وامانتاً تدفین

سوال:35

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ گزشتہ دنوں پاکستان میں گھوٹکی کے مقام پر جو ٹرینوں کا حادثہ ہوا اور اس میں سیکڑوں افراد ہلاک ہوئے جن کی شناخت بھی ممکن نہیں، حکومتِ پاکستان کی جانب سے ہلاک ہونے والے لاوارث اشخاص کی لاشوں کو اجتماعی قبر میں امانتاً دفن کردیا گیا ہے۔ کیا شرعی طور پر اس طرح دفن کرنا درست ہے؟ اور اگر کسی میت کے ورثاء آجاتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں تو کیا قبر کھود کر لاش کو نکالا جاسکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں، (محمد شعیب، سیکٹر D-3/7 نارتھ کراچی)۔

جواب:

اضطرار کی حالت میں ایک قبر میں ایک سے زائد مردوں کو دفن کیا جاسکتا ہے، مثلاً قبرستان میں جگہ نہ ہو، زمین قیمتاً دستیاب ہو لیکن قیمت ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو، زمین ہو لیکن مالک اجازت نہ دے یا ہنگامی صورتِ حال ہو جیسے غزوۂ احد میں درپیش تھی وغیرہ۔ عام حالات میں جب کہ قبرستان میں جگہ موجود ہو، زمین کی قیمت ادا کرنے کی استطاعت ہو، یا کوئی صاحبِ خیر بلا معاوضہ زمین دے دے، تو ایسی صورتِ حال میں ایک قبر میں ایک سے زائد میتوں کا دفن کرنا درست نہیں ہے، گھوٹکی کے حادثے میں چونکہ محکمہ ریلوے اور حکومت کی حیثیت نامعلوم میتوں کے اولیاء کی تھی، اور حکومت کو قبروں کے لئے

جگہ حاصل کرنا دشوار نہیں ہے، اس لئے اجتماعی قبر میں تمام مُردوں کو دفن کرنا درست نہیں تھا اور شرعاً یہ نامناسب ہوا، لیکن چونکہ اب تدفین ہوچکی ہے اور امانتاً دفن کرنے کا تصور غیر شرعی ہے، اس لئے دفن شدہ میتوں کو دوبارہ دفن کرنے کے لئے نکالنا درست نہیں ہے، سطورِ ذیل میں ہم شرعی دلائل وحوالہ جات کے ساتھ مسئلے کو واضح کریں گے۔

عن عبدالرحمن بن کعب بن مالک: أنّ جابر بن عبدالله رضی الله عنهما أخبره: أنّ رسول الله ﷺ كان يجمع بين الرجلين من قتلى أحد في ثوب واحد، ثمّ يقول: "أيهم أكثر أخذاً للقرآن "؟فاذا أُشير له الى أحد قدّمه فى اللحد، وقال:" أنا شهيد على هؤلاءِ يوم القيامة "۔وأمر بدفنهم بدمائهم، ولم يصلّ عليهم ،ولم يغسلوا۔

ترجمہ:'' عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک سے روایت ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: شہیدانِ احد میں سے دو دو حضرات کو رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑے میں جمع فرمایا۔ پھر دریافت فرماتے کہ'' ان میں سے قرآن مجید کس کو زیادہ یاد تھا'' جب کسی ایک کی جانب اشارہ کردیا جاتا تو آپ لحد میں پہلے اسے رکھواتے اور فرمایا کہ: قیامت کے روز میں ان سب پر گواہ ہوں، اور حکم فرمایا کہ: انہیں اسی طرح خون آلودہ دفن کردیا جائے، نیز نہ ان پر نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور نہ ان کو غسل دیا گیا''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:4079)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا يدفن اثنان أوثلاثة فى قبر واحد الا عندالحاجة فيوضع الرجل مما يلى القبلة ثم خلفه الغلام ثم خلفه الخنثیٰ ثم خلفه المرأة ويجعل بين كل ميتين حاجز من التراب كذا فى محيط السرخسى۔

ترجمہ:'' اور دو یا تین افراد کو ایک قبر میں دفن نہ کیا جائے مگر ضرورت کے وقت (مثلاً قبرستان میں مردوں کی تعداد کے برابر جگہ نہیں ہے اور اردگرد جو زمینیں ہیں ان کے مالکان اپنی زمین میں تدفین کی اجازت نہیں دیتے لیکن اگر ضرورت کی بناء پر ایسا کرنا پڑے تو) مرد کی میت کو

قبلہ کی جانب آگے رکھا جائے، پھر اس کے بعد لڑکے کی میت کو رکھا جائے، پھر اس کے بعد خنثیٰ کی میت کو رکھا جائے، پھر اس کے بعد عورت کی میت کو رکھا جائے اور ہر دو میتوں کے درمیان مٹی کی ایک حدِ فاصل قائم کر دی جائے (تاکہ کوئی بھی دو میتیں ایک دوسرے سے مس نہ ہوں)، محیط سرخسی میں اسی طرح ہے"، (عالمگیری جلد 1 ص:166 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

والکراھۃ فیھامن وجوہ عدم اللحد ودفن الجماعۃ فی قبر واحد بلا ضرورۃ، واختلاط الرجال بالنساء بلا حاجز۔

ترجمہ: "اور جماعت کا ایک قبر میں دفن کرنا بلا ضرورت جائز نہیں، اور بغیر کسی حدِ فاصل کے مردوں اور عورتوں کی میتوں کو ملا کر دفن کرنا جائز نہیں"، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص: 129 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

مذکورہ حدیث اور فقہاء کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ دو یا تین افراد کی اجتماعی تدفین کی بھی اس وقت اجازت ہے کہ جب اس کی ضرورت ہو، وسائل اور اسباب میسر نہ ہوں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(لا یخرج منہ)بعد اھالۃ التراب(الا) لحق آدمی،(کأن تکون الارض مغصوبۃ أو أخذت بشفعۃ)و یخیرالمالک بین اخراجہ ومساواتہ بالأرض۔

ترجمہ: "(میت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا) مٹی ڈال دینے کے بعد (مگر) کسی انسان کے حق کی وجہ سے، مثلاً (زمین غصب کی ہو یا شفعہ کی وجہ سے لی گئی ہو) اور مالک کو اختیار ہوگا کہ مردے کو نکال دے یا قبر زمین کے برابر کر دے"، (ردالمحتار جلد 3 صفحہ 135,136، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

"اور مسلمان کی قبر کو کھودنا تو نہایت سخت شدید جرم ہے، اسلامی سلطنت ہو تو ایسا شخص سخت تعزیر کا مستحق ہے یہاں تک کہ سلطانِ اسلام کی اگر رائے ہو تو جو ایسی حرکت کا مرتکب ہوا

کرتا ہوا سے سزائے قتل دے سکتا ہے، جو شخص ناحق پر اس کی تائید کرتے ہیں سب اسی کی طرح مرتکب جرم و مستحق سزا ہیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ : وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گناہ اور ظلم پر تعاون مت کرو، (القرآن، المائدہ:2)۔

حدیث میں ہے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

من مشى مع ظالم ليعينه وهو يعلم انه ظالم فقد خلع من عنقه ربقة الاسلام۔

ترجمہ:''جو دانستہ کسی ظالم کی مدد کو چلے اس نے اپنی گردن سے اسلام کی رسی نکال دی۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:540 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مراقی الفلاح میں ہے:

(ولا يجوز نقله) اى:الميت(بعد دفنه)بأن أهيل عليه التراب، وأما قبله فيخرج (بالاجماع) بين أئمتنا طالت مدّة دفنه أو قصرت،للنهى عن نبشه، والنّبش حرام حقاً لله تعالىٰ۔

ترجمہ:''اور میت کا منتقل کرنا دفن کرنے کے بعد جائز نہیں ہے، اور اس پر مٹی ڈالے جانے سے قبل بالاجماع نکالا جاسکتا ہے، اور ہمارے ائمہ کرام، دفن کو طویل عرصہ گزرا ہو یا قلیل، نبش (انتقالِ میت) سے منع کرتے ہیں اس لئے کہ نبش، حق اللہ ہونے کے باعث حرام ہے''، (مراقی الفلاح جلد 2 صفحہ 265,266 مکتبہ غوثیہ کراچی)۔

انتقالِ قبر سے متعلق ایک سوال کے جواب میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: صورتِ مذکورہ میں نبش حرام، حرام، سخت حرام، اور میت کی اشد توہین وہتک سرّ ربّ العالمین ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 9 ص:405 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ: جو سفر میں مرتے ہیں ان کو ویسے ہی دفن کردیتے ہیں لیکن امانت رکھتے ہیں، ایک مقررہ مدت کے بعد یہاں سے نکال کر مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب اور اس کے برعکس لے جاتے ہیں، یہ فعل جائز ہے یا ناجائز؟۔

آپ نے جواب میں فرمایا:
''یہ حرام ہے، دفن کے بعد کھولنا جائز نہیں، اور دور مسافت تک لے جانا بھی روا نہیں۔ اور خدائے برتر خوب جاننے والا ہے''، (فتاویٰ رضویہ جلد 9 ص:406 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

سانحۂ گھوٹکی میں غیر مسلم کی نمازِ جنازہ

سوال:36

گزشتہ دنوں ایکسپریس کے کالم ''تفہیم المسائل'' میں سانحۂ گھوٹکی کے ہلاک شدگان کی اجتماعی امانتاً تدفین سے متعلق سوال و جواب نظر سے گزرا، اسے پڑھ کر اور حالات کو دیکھنے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس میں ہلاک ہونے والے لوگوں میں یقیناً غیر مسلم (مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ) بھی ہوں گے۔ اور ان تمام ہلاک شدگان کی نمازِ جنازہ اور تدفین وغیرہ مسلمانوں کی طرح کی گئی، آیا یہ عمل شرعاً درست ہے؟، (مرزا عمران بیگ، کراچی)۔

جواب:

آپ کا یہ کہنا کہ یقیناً غیر مسلم بھی تھے، درست نہیں ہے، آپ کے پاس اس یقین کا کون سا ذریعہ ہے، ہم جب ٹرین یا بس میں سفر کرتے ہیں، تو عام مشاہدہ یہی ہے کہ بالعموم سب لوگ مسلمان ہوتے ہیں، لیکن اگر بفرضِ محال کوئی غیر مسلم تھا بھی، تو نمازِ جنازہ پڑھنے والوں نے مسلمان اموات کی نیت کی تھی اور دعاء جنازہ بھی مسلمان اموات کے لئے ہے، جب مسلمان یہ دعا پڑھتا ہے کہ: "اللھم اغفرلحینا ومیتنا وشاھدنا وغائبنا وصغیرنا وکبیرنا وذکرنا وانثنا"۔

ترجمہ: ''اے اللہ! ہمارے زندوں کو، ہمارے وفات پانے والوں کو، ہمارے موجودین کو، ہمارے غائبین کو، ہمارے چھوٹوں کو اور ہمارے بڑوں کو، ہمارے مَردوں کو اور ہماری عورتوں کو بخش دے''۔ اس میں صراحتاً مسلمانوں ہی کے لئے دعائے مغفرت کی نیت ہے اور اگر خدانخواستہ کسی کافر یا مشرک کی میت ان اموات میں لاعلمی میں رکھ دی گئی ہو، تو وہ

جنازہ پڑھنے والوں کا مقصود ہی نہیں ہے۔البتہ اگر قطعی طور پر معلوم ہو کہ میت غیر مسلم کی ہے اور کوئی اس کی نمازِ جنازہ پڑھتا ہے اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے تو وہ قرآن کی صریح آیات بیّنات کا منکر ہے، جن میں کافر و مشرک کے لئے جہنم کی ابدی و دائمی سزا کی وعید سنائی گئی ہے، اگر یہ انکار بربنائے عقیدہ ہے تو کفر ہے، اور تجدید ایمان و تجدید نکاح لازم ہے۔

دعاء بعد الجنازہ

سوال:37

ہمارے علاقے میں بعض لوگ عوام کو علی الاعلان یہ کہہ کر گمراہ کرتے ہیں کہ آپ لوگ نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے ہاتھ اُٹھا کر جو دعاء مغفرت کرتے ہیں اس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں اگر ہے تو ہمیں ثبوت پیش کریں۔قرآن وسنت کی روشنی میں دلائل کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں، نیز جو لوگ علی الاعلان اسے ناجائز کہہ کر عوام کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے؟، (مولانا محمد نصیر اللہ نقشبندی، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اس سوال کا براہ راست جواب سننے سے پہلے ایک دو اصولی باتیں سمجھ لیجئے۔
اسلام اور دنیا کے ہر نظامِ قانون اور اصولِ قانون کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اشیاء و امور میں اصل اباحت (یعنی جائز ہونا) ہے، لہٰذا کہیں بھی قوانین کی تشکیل میں مباحات (جائز امور) کا احاطہ نہیں کیا جاتا بلکہ ہر شعبے کے محرمات، ممنوعات اور مکروہات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ دیگر امور جائز ہیں، مثلاً جن خواتین سے نکاح شرعاً حرام ہے، قرآن نے ان کو سورۃ النسآء آیات ۲۲ تا ۲۵ میں تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا ہے اور پھر فرمایا:

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ۔ (النساء: ۲۴)

ترجمہ: اوران (مذکورہ محرمات) کے علاوہ باقی سب عورتوں کے ساتھ تمہارا نکاح جائز ہے۔
اسی طرح قرآن نے سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۷۳ اور سورۃ النحل آیت نمبر ۱۱۵ میں ماکولات میں سے محرمات (مردار، ذبح کے وقت بہنے والا خون، خنزیر اور جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے) کا ذکر فرمایا، احادیث میں اس پر درندے، شکاری پرندے اور گدھے کا اضافہ فرمایا گیا، بعض دیگر جانوروں کو قیاس واجتہاد کے ذریعے فقہاء امت نے مکروہ تحریمی قرار دیا، ان کے علاوہ دیگر لاتعداد جانور جو حلال ہیں، کتاب وسنت اور ائمۂ مجتہدین نے ان کا تفصیل سے احاطہ نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کرنا عملاً ممکن ہے، ہماری عملی زندگی میں اس کی مثال یہ ہے کہ جس سڑک پر دائیں یا بائیں مڑنا منع ہو، یا جس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانا منع ہو ٹریفک کا عملہ وہاں مخصوص ممانعت کا نشان لگا دیتا ہے، باقی جس جس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانا ممنوع نہیں ہے، وہاں کوئی مخصوص نشان نہیں لگایا جاتا، ممانعت کا نشان نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانے کی عام اجازت ہے بعینہٖ یہی اصول احکامِ شریعت کا ہے۔
حدیث شریف میں ہے:
عن سلمان قال: سئل رسول اللہ ﷺ عن اشیاء فقال: الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرّمہ اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مماقد عفیٰ عنہ فلا تتکلفوا۔
ترجمہ: ’’حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بعض اشیاء (کی حلت وحرمت) کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے (شرعی حکم) دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دے دیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دے دیا ہے اور جس کے بارے میں (کتاب وسنت میں) سکوت فرمایا گیا تو وہ معاف ہے (یعنی جائز وحلال ہے)، لہٰذا خواہ مخواہ اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈالو‘‘، (سنن ابن ماجہ، ص۲۴۹، سنن ترمذی، ص۲۱۹)۔

اس حدیث سے کتبِ تفاسیر وفقہ میں اس مفہوم پر استدلال کیا گیا ہے۔
سنن بیہقی صفحہ ۱۲، جلد نمبر ۱۰، پر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع ہے:
وما سكت عنه فهو عافية فاقبلوا من الله العافية فان الله لم يكن نَسِياً ثم قرأ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيّاً۔
ترجمہ: ''جس چیز (کی حرمت کے بیان) سے قرآن نے سکوت کیا وہ معاف ہے (یعنی جائز ہے)، تو اللہ کی طرف سے معافی (یا جواز کی رعایت) کو (خوش دلی سے) قبول کرو، کیونکہ اللہ بھولنے والا نہیں، پھر آپ نے (سورہ مریم کی آیت نمبر ۶۴) تلاوت فرمائی (جس کا معنی یہ ہے کہ) اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں''۔
فتاویٰ شامی میں ہے:
المختار ان الاصل عند الجمهور من الحنفية و الشافعية الاباحة۔
ترجمہ: ''قول مختار یہ ہے کہ جمہور حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک (امور واشیاء میں) اصل اباحت (جائز ہونا) ہے''، (جلد ۱، صفحہ ۹۸)۔
لہٰذا اگر کوئی شخص، کسی خاص موقع ومقام کے لیے یا علی الاطلاق، کسی چیز کی حرمت یا کراہت کا مدعی ہے تو بارِ ثبوت اس پر ہے کہ وہ عدمِ جواز کی شرعی دلیل پیش کرے، نہ کہ فریقِ مخالف (قائلِ جواز) سے دلیل طلب کرے۔
دوسرا اصولی مسئلہ یہ کہ فی نفسہٖ دعاء اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی محبوب اور پسندیدہ فعل ہے، مقاماتِ نجاست وکراہت کے علاوہ دعا کے لیے نہ کسی وقت کی پابندی ہے، نہ کسی خاص لب ولہجے اور زبان کی، یہ الگ بات ہے کہ مسنون دعاؤں کی برکات زیادہ ہیں۔ بندے کی دعا اللہ تعالیٰ کو اتنی مرغوب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث مبارکہ میں فرمایا:
أكثروا الدُّعَاء۔ ''کثرت سے دعا کیا کرو''۔ (المستدرک، کتاب الدعاء ج ۱ ص ۵۲۹)
الدعاء مخ العبادة۔ ''دعاء عبادت کا مغز ہے''۔ (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات)
لايرد القدر الاالدعاء۔ ''دعا تقدیر کو ٹال دیتی ہے''۔ (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات)

سَلُوا اللّٰہ من فضلہٖ فان اللّٰہ یحب ان یسال۔

ترجمہ: ”اللہ سے اس کے فضل کا سوال کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ کوئی اس سے سوال کرے“، (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات)۔

اور وفات یافتہ اہلِ ایمان کے لیے دعا کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ جل شانہ نے فرمایا:

وَ الَّذِیۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَ لِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ وَ لَا تَجۡعَلۡ فِیۡ قُلُوۡبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّکَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: ”اور جو ان کے بعد آئے وہ (اللہ کی بارگاہ میں) عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! تو ہمیں بخش دے اور ہمارے ان (دینی) بھائیوں کو بھی، جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں مومنوں کے لیے کینہ نہ رکھ، اے ہمارے رب! تو بہت مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے“، (الحشر:۱۰)

اس آیت کا سیاق وسباق (مورد) تو خاص ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اور اپنے اسلاف و سابقین اہلِ ایمان کے لیے دعاء مغفرت کو اہلِ ایمان کا شعار قرار دیا گیا ہے۔ اب اس دعاء مغفرت کے لیے کسی وقت خاص کا تعین نہیں ہے، کسی شخص کی زندگی میں بھی اس کے لیے دعاء مغفرت کی جا سکتی ہے، موت کے بعد نمازِ جنازہ سے پہلے بھی کی جا سکتی ہے اور بعد میں بھی کی جا سکتی ہے، بطورِ خاص بعد نمازِ جنازہ دعا کی ممانعت کی کسی کے پاس کوئی دلیل ہو تو پیش کرے۔ مندرجہ بالا آیت کے تحت علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

”متعدد حضرات نے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے کہ بلاشبہ دعاء میت کو فائدہ دیتی ہے اور اس کی دلیل کے طور پر اس آیت کو پیش کیا ہے“، (شرح الصدور صفحہ ۱۳۷)۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی ”وَاِلیٰ رَبِّکَ فَارۡغَبۡ“ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اخرجہٗ ابن جریر وغیرہ من طرق عن ابن عباس انہ قال ای اذا فرغت من الصلوٰۃ فانصب فی الدعاء۔

ترجمہ: ”ابن جریر نے کئی طُرق سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا

ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب نماز سے فارغ ہو تو دعا میں مشغول ہو جاؤ''، (تفسیر روح المعانی ج۳۰ص ۱۷۲)۔

رہا یہ سوال کہ آیا دعا بعد نمازِ جنازہ کے لیے کوئی دلیل مثبت بھی ہے؟ تو حدیث شریف میں حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعا روایت ہے:

اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء۔

ترجمہ: ''جب تم میت پر نماز پڑھ چکو تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے دعا کرو''۔

(سنن ابی داؤد طبع مجیدی ۲/ ۱۰۰، سنن بیہقی طبع حیدرآباد ۴/ ۴۰، سنن ابن ماجہ اصح المطابع ص ۱۰۹)

اس حدیث میں نمازِ جنازہ پڑھنے کے فوراً بعد دعا کا ذکر ہے کیونکہ اصولِ فقہ میں یہ طے ہے کہ ''ف'' ''تعقیب علی الفور'' کے لیے آتی ہے، یہ اس کے حقیقی معنی ہیں اور کسی عقلی، عادی یا شرعی دلیل کے بغیر حقیقی معنی سے عدول جائز نہیں ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کے فوراً بعد میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا مانگو۔

امام علاؤ الدین ابو بکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

ولنا: ماروی ان النبی صلی الله علیه وسلم صلی علی جنازة فلما فرغ،جاء عمرو معه قوم، فأرادان یصلی ثانیاً فقال له النبی صلی الله علیه وسلم: الصلوٰة علی الجنازة لاتعاد" ولکن اُدعُ للمیت واستغفرله و هذا نص فی الباب، وروی ان ابن عباس و ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهم فاتتهما صلوة علی الجنازة فلما حضرا ما زادا علی الاستغفار له وروی عن عبدالله بن سلام رضی الله عنه: انه فاتته الصلاة علی جنازة عمر رضی الله عنه، فلما حضر قال: ان سبقتمونی بالجنازة فلا تسبقونی بالدعاء له ۔

(''یہ مسئلہ کہ نماز جنازہ کی تکرار نہیں ہے) اس میں ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھائی جب حضور جنازہ پڑھا کر فارغ ہو چکے تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو حضور نے

(انہیں تکرارِ جنازہ سے روکتے ہوئے) فرمایا: نمازِ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جائے گی، لیکن میت کے لیے دعا کرو اور اس کے لیے استغفار کرو، یہ اس باب میں (کہ نمازِ جنازہ کی تکرار نہیں) نص ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ایک نمازِ جنازہ نکل گئی (یعنی وہ دیر سے پہنچے)، پس جب وہ میت کے پاس آئے تو صرف دعاء مغفرت پر اکتفا کی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ نکل گئی، جب وہ آئے تو انہوں نے (جنازے پر موجود حاضرین سے) کہا کہ اگرچہ تم لوگ مجھ سے نمازِ جنازہ میں پہل کر چکے ہو لیکن دعا میں مجھ سے پہل نہ کرو (یعنی دعا میں مجھے بھی شریک ہونے دو)''، (بدائع الصنائع جلد ۲، ص ۳۸، دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

مصنف ابن ابی شیبہ جلد ثالث صفحہ ۳۳۱ پر ہے:

عن عمیر بن سعید قال صلیت مع علی علی یزید بن المکفف فکبر علیه اربعاثم مشی حتی اتاه وقال: اللهم عبدک و ابن عبدک نزل بک الیوم فاغفرله ذنبه و وسع علیه مدخله فانا لا نعلم منه الا خیرا وانت اعلم به۔

ترجمہ: ''عمیر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یزید بن مکفف کی نماز جنازہ پڑھی، انہوں نے ان پر (جنازے کی) چار تکبیرات پڑھیں، پھر چلے یہاں تک کہ میت کے قریب آ گئے اور عرض کیا: اے اللہ! (یہ) تیرا بندہ ہے اور تیرے بندے کا فرزند ہے آج تیرے حضور حاضر ہے تو اس کے گناہوں کو معاف فرما، اس کی قبر کو اس کے لیے وسیع فرما، ہم اس کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتے اور تو اس (کے حال) کو بہتر جانتا ہے''۔

ان احادیثِ مبارکہ سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ عہدِ رسالت و عہدِ صحابہ میں نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا کا معمول تھا۔ مبسوط سرخسی میں بھی یہ روایات موجود ہیں۔

''دعاء بعد الجنازہ'' کے ثبوت کا مسئلہ ہم نے دلائل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، ہم اس کے

فرض، واجب یا سنت قرار دینے کے مدعی نہیں ہیں بلکہ جواز اور استحباب کے مدعی ہیں کہ جتنے زیادہ مواقع پر اور جتنی زائد بار میت کے لیے دعا کی جائے وہ اس کے لیے مفید ہے اور خود دعا کرنے والے کے لیے بھی وسیلۂ اجر ہے، لیکن اگر کوئی شخص بطورِ خاص نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعاء مغفرت وایصالِ ثواب کو خلافِ سنت یا بدعت قرار دیتا ہے تو وہ عدمِ جواز کی دلیل پیش کرے۔ اصولاً بارِ ثبوت اس کے ذمے ہے کہ کہاں اور کب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔ اس کے برعکس روایات وآثار سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ بعض مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ ایک خاص مسلک کے ائمہ، خطباء وعلماء نمازِ جنازہ پڑھانے کے بعد اصرار کرتے ہیں کہ بعجلت تمام جنازہ اٹھالیا جائے تاکہ کوئی اس موقع پر دعا نہ کرلے یا دعا کیلئے نہ کہہ دے، اور اپنے اس فعل کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ جنازہ خود دعا ہے، جنازہ تو عبادتِ مشروعہ ہے، فرض کفایہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ثناء، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود، میت کے لیے دعا اور تکبیرات اربعہ پر مشتمل ہے، دعاء محض نہیں ہے بلکہ عبادتِ کاملہ ہے، جیسا کہ متعدد احادیث کریمہ سے ثابت ہے، دعا چونکہ اللہ تعالیٰ کے حضور بندے کے اعترافِ عجز ونیاز، بے بسی وبے کسی اور اس کی ذات پر اعتمادِ کلی کا قولی وفعلی مظہر ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے، بلکہ بندے سے مطلوب ہے، خیرِ محض ہے، لہٰذا اگر کوئی اپنے عقیدے ونظریے کے تحت دعا نہیں کرتا تو نہ کرے، دوسروں کے لیے "مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ" (خیر سے بہ صد اصرار روکنے والا) نہ بنے، کیونکہ یہ قرآن مجید کی سورۃ القلم آیت نمبر 12 میں ایک بہت بڑے دشمنِ رسول کی بیان کردہ متعدد صفاتِ ذمیمہ میں سے ایک ہے۔ لہٰذا جو لوگ میت کے لیے ایصالِ ثواب یا دعا کرنا چاہتے ہیں ان کا راستہ نہ روکیں، ہاں کسی حدیث مبارک میں دعا بعد الجنازہ کی ممانعت وارد ہوئی ہوتی تو آپ ضرور حجت کرتے، مگر ایسا نہیں ہے، اور اگر فریقِ مخالف کا ادّعاء یہ ہے کہ ایسی روایت موجود ہے تو هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ: اپنی دلیل پیش کرو، (البقرہ:۱۱۱)۔

دعا بعد الجنازہ

ضربِ مومن کے مفتی محمد کا جواب اور ہمارا جواب الجواب

پس منظر:

ہم نے ''روزنامہ ایکسپریس'' کے جمعۃ المبارک 23، جولائی 2000ء کے ایڈیشن میں اپنے کالم ''تفہیم المسائل'' میں ایک سائل کے جواب میں ''دعا بعد الجنازہ'' کے جواز پر لکھا تھا، جو بعد میں ہماری فتاویٰ کی کتاب ''تفہیم المسائل'' جلد دوم میں بھی چھپا۔ اہلسنت کے نزدیک نماز جنازہ کا سلام پھیرنے اور تکمیل نماز کے کچھ دیر بعد صفیں توڑ کر اجتماعی دعا کرنا جائز اور مستحسن امر ہے اور احادیث مبارکہ، آثار صحابہ اور فقہاء امت سے اس کا جواز ثابت ہے۔ مذکورہ فتویٰ کے پانچ سال بعد حال ہی میں ''ضربِ مومن'' کے جمعہ 27، مئی 2005ء کے ایڈیشن میں مفتی محمد صاحب کے قلم سے ''آپ کے مسائل کا حل'' کے عنوان کے تحت ہمارے اس فتویٰ کا رد چھپا ہے۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب کو اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کے ہم مسلک سائل نے انہیں ایک استفتاء ارسال کیا اور اس میں لکھا کہ:

''ہمارے گاؤں میں جب کوئی فوت ہو جائے تو اس کی تدفین کے وقت وہ بدعات اختیار کی جاتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان بدعات سے روکتا ہے، تو پورا گاؤں اس کی مخالفت کرتا ہے، مگر پھر بھی کچھ نوجوان ان بدعات کی مخالفت کرتے رہے اور ان بدعات کو روکنے کے لئے آواز بلند کرتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے گاؤں سے بہت سی بدعات اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل سے ختم ہو گئیں''۔

''مگر افسوس روزنامہ ایکسپریس کی جمعہ 23/07/2000 کی اشاعت میں کسی صاحب نے ''دعا بعد الجنائز'' کے بارے میں سوال کیا۔ اس سوال کا جواب پڑھ کر لوگ اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ جنازے کی نماز کے بعد دعا سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ ہے۔''

آگے چل کر سائل نے لکھا ہے: ''اب ان لوگوں کو جواب دینے کے لئے ہمارے پاس کوئی

معقول جواب نہیں۔مہربانی کر کے ہماری اس سلسلے میں مدد فرمائیں ورنہ ہمارے گاؤں کے نوجوانوں نے جو محنت کی ہے،وہ سب ضائع ہو جائے گی''،(شاہنواز بلوچ۔گڈاپ ملیر،کراچی)۔

چنانچہ پانچ سال کے وقفے سے ہمارے اس فتویٰ کا جواب تحریر کرنے پر مفتی محمد صاحب نے پورا زورِ علم وقلم صرف کیا،ایسا لگتا ہے کہ ان کے نزدیک دین کا واحد حل طلب مسئلہ یہی ایک رہ گیا تھا،بس یہی اصل الاصول اور روحِ دین ہے،کیونکہ ان حضرات کا شعار اول واولیٰ یہی ہے کہ اہل سنت وجماعت پر شرک وبدعت کا لیبل چسپاں کر دیا جائے۔مفتی صاحب نے حسب عادت اس مسئلہ میں بھی مغالطہ آفرینی،خلط مبحث،عبارات میں قطع وبرید اور دور از کار تاویلات کا سہارا لیا ہے،جیسا کہ ہمیشہ سے اس نوع کے تمام مسائل میں ان کے ہم مسلک علماء کا پسندیدہ طریق رہا ہے۔

لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ ہم از سر نو اصل مسئلہ کی وضاحت اور اس کی شرعی حیثیت کو دلائل وبراہین کے ساتھ بیان کریں اور اس کے بعد ان کے قابلِ ذکر دلائل کا ردو ابطال کریں۔اور جہاں کہیں فقہی عبارات میں تلبیس وتدلیس اور من پسند تاویلات کر کے ان کا غلط اطلاق کیا گیا ہے،اس کی نشاندہی کر کے اصل مسئلے کو از سر نو روشن دلائل اور حجت قاطعہ کے ساتھ بیان کریں،اور یہ بھی ضروری قرار پایا کہ ''اباحت اصلیہ'' اور ''بدعت'' کی تعریف واطلاق کے مسئلے میں مفتی صاحب کی مغالطہ آفرینی کو بے نقاب کریں۔آئندہ سطور میں ہم واضح دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کریں گے کہ ضربِ مومن کے مفتی صاحب کا نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کو بدعت قرار دینا قطعاً بے بنیاد،باطل اور مردود ہے،ہم ان کے اس جواب کا اپنی ترتیب سے تجزیہ کریں گے۔پہلے ہم نمازِ جنازہ کے بعد صفیں توڑ کر(یعنی فرض نماز کی تکمیل کے بعد اس کی ہیئت کو بدل کر)اجتماعی دعا کے متعلق اپنا موقف پیش کریں گے،پھر اس کے بعد اختصار کے ساتھ از سرِ نو دلائل پیش کریں گے۔اور ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے صورت مذکورہ بالا میں نماز جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرنے کو ناجائز اور بدعت ثابت کرنے کے لئے فقہاء کی جو غیر متعلق عبارات پیش کی ہیں،ان کی نشاندہی کریں

گے،اور یہ ثابت کریں گے کہ یہ عبارات ہمارے موقف سے یا تو متعلق ہی نہیں اور اگر ہیں تو متصادم نہیں ہیں۔ پھر اباحتِ اصلیہ اور بدعت کے مسئلے میں ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے جو مغالطہ آفرینی کی ہے، اس کا تجزیہ کریں گے، فنقول و باللّٰہ التوفیق۔

نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کے مسئلے میں اہلسنت کا موقف اور مروّجہ طریقہ:

اہلسنت کے نزدیک نمازِ جنازہ پڑھنے کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے، فرض یا واجب نہیں ہے اور ہم نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا نہ کرنے والوں کو نہ ہدفِ ملامت بناتے ہیں نہ ان کو روکتے اور ٹوکتے ہیں، البتہ ایک مکتبۂ فکر کے علماء جو اس مستحب عمل کو بغیر کسی دلیل کے ناجائز، حرام اور بدعتِ سیۂ کہتے ہیں، جیسا کہ ضربِ مؤمن کے ''مفتی'' نے ایسا ہی کیا اور کہا ہے، تو ہم ان لوگوں کا رّد اور ابطال کرتے ہیں۔

ہم نے جو یہ کہا ہے کہ یہ لوگ بغیر کسی دلیل کے اس کو ناجائز اور حرام کہتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کرنے کے عمل کی حرمت پر نہ تو یہ لوگ قرآن مجید کی کوئی خصوصی آیت پیش کرتے ہیں اور نہ کسی حدیثِ متواتر سے استدلال کرتے ہیں، کیونکہ کسی چیز کو حرام قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی کوئی دلیل پیش کی جائے جس کا ثبوت بھی قطعی ہو اور اس عمل کی ممانعت پر دلالت بھی قطعی ہو، اس کے بغیر کسی چیز کا حرام یا ناجائز ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ کہیں کہ ہماری اس سے مراد یہ ہے کہ یہ مخصوص عمل، مکروہِ تحریمی ہے، تو اس کے لیے بھی ایسی دلیل ضروری ہے کہ جس کا یا تو ثبوتِ قطعی ہو یا اس کی ممانعت پر دلالتِ قطعی ہو۔ اور اگر وہ کہیں کہ ہماری مراد یہ ہے کہ یہ مخصوص عمل، مکروہِ تنزیہی ہے، تو اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اس کی ممانعت کے اوپر کوئی مخصوص دلیل پیش کریں۔

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی متوفی ۹۷۰ھ لکھتے ہیں:

ولا یلزم من ترک المستحب ثبوت الکراھۃ اذ لا بُدّ لھا من دلیل خاص۔

ترجمہ: ''ترکِ مستحب سے کراہت کا ثبوت لازم نہیں آتا کیونکہ اس کے لیے خصوصی دلیل

ضروری ہے''، (البحر الرائق جلد دوم صفحہ 163 ،مطبوعہ المطبعۃ العربیہ، لاہور)۔

علامہ ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(ردالمحتار علی الدر المختار جلد دوم صفحہ 367 ،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

سو جب تک مبتدعین دیو بند خصوصیت کے ساتھ نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے کے بعد اجتماعی دعا کی ممانعت پر قرآن مجید کی کوئی آیت، حدیثِ متواتر یا حدیثِ مشہور یا کم از کم خبرِ واحد ہی پیش نہ کریں، اس کی ممانعت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔

نمازِ جنازہ کے بعد مروّجہ دعا کا طریقہ:

اہلسنّت کے یہاں یہ طریقہ رائج ہے کہ نمازِ جنازہ میں امام کے سلام پھیرنے کے بعد صفیں توڑ لیتے ہیں اور ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ اور تین مرتبہ سورۂ اخلاص کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کے بعد امام اس میت کے لیے ایصالِ ثواب اور مغفرت کی دعا کرتا ہے اور نمازی اس پر آمین کہتے ہیں، تمام شہروں اور دیہاتوں میں یہی معروف طریقہ ہے اور نمازِ جنازہ کے متصلاً بعد دعا نہیں کرتے۔

نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کے ثبوت پر اختصار کے ساتھ عمومی دلائل:

(۱) اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً

ترجمہ: ''دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑا کر اور آہستہ''، (سورۃ الاعراف:55)۔

(2) ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ

ترجمہ: ''مجھ سے دعا کرو میں (ضرور) قبول کروں گا''، (المؤمن:60)۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ: من لم يسئل الله يغضب عليه۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ سے دعا نہ کرے اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے''، (سنن ترمذی رقم الحدیث:3433)۔

عن سلمان قال قال رسول الله ﷺ: ان ربكم حَيٌّ كريم يستحي من عبده اذا رفع يديه اليه ان يردهما صفراً۔

ترجمہ: ''حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارا رب حیادار کریم ہے، جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ ان کو خالی لوٹانے سے حیا فرماتا ہے''، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث 1488، سنن ترمذی رقم الحدیث: 3627)۔

عن عبد اللّٰہ بن عمر قال:قال رسول اللّٰہ ﷺ :ان اسرع الدعاء اجابۃً دعوۃ غائب لغائب ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کی عدمِ موجودگی میں اس کے حق میں کی جانے والی دعا (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) بہت جلد قبول ہوتی ہے''، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 1533، سنن ترمذی رقم الحدیث 1980)۔

قرآن مجید کی ان آیات اور احادیثِ مذکورہ میں مطلقاً اللہ سے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس میں کسی وقت خاص کی قید نہیں ہے، جس وقت بھی اللہ سے دعا کی جائے خواہ اجتماعی ہو، خواہ انفرادی، اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ وہ دعا قبول ہوگی، سو نمازِ جنازہ پڑھنے کے کچھ وقفے کے بعد صفیں توڑ کر جب دعا کی جائے گی تو وہ بھی قرآن وحدیث میں مذکور دعا کے عام حکم پر عمل ہوگا۔

اور اگر منکرین یہ کہیں کہ یہ بتاؤ کہ خصوصیت کے ساتھ نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد دعا کرنے کا قرآن وحدیث میں کہاں حکم ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عموم اور اطلاق کا قاعدہ یہی ہے کہ وہ اپنے تمام افراد کو شامل ہوتا ہے ورنہ عموم اور اطلاق کا کوئی معنیٰ ہی نہیں رہے گا، الّا یہ کہ کسی خاص وقت یا مقام کے لئے خصوصی ممانعت ہو یا اس کا سبب موجود ہو، جیسے بیت الخلا یا ناپاک مقام پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا۔ اور یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص دن کے دس بجے نوافل پڑھ رہا ہے تو دوسرا شخص اس سے کہے: ''تمہارا یہ نفل پڑھنا ناجائز اور حرام ہے ورنہ تم دکھاؤ کہ قرآن وحدیث میں دن کے دس بجے نفل پڑھنے کا کہاں حکم ہے؟'' یا اسی طرح کوئی شخص منگل کے روز نفلی روزہ رکھے تو دوسرا شخص اس سے کہے: ''تمہارا یہ منگل کے دن روزہ رکھنا ناجائز ہے، ورنہ تم دکھاؤ کہ قرآن وحدیث میں منگل کے دن نفلی روزہ رکھنے کا کہاں حکم

ہے؟''، اور اسی طرح کوئی شخص زید کو سو روپے نفلی صدقہ دے تو دوسرا شخص یہ کہے: ''تمہارا یہ عمل ناجائز ہے ورنہ تم دکھاؤ کہ قرآن وحدیث میں زید کو سو روپے نفلی صدقہ دینے کا کہاں حکم ہے؟''، یا اسی طرح کوئی شخص 1425ھ میں نفلی حج کرے تو دوسرا شخص اس سے کہے کہ'' تمہارا یہ نفلی حج ناجائز ہے ورنہ تم دکھاؤ کہ قرآن وحدیث میں 1425ھ میں نفلی حج کرنے کا کہاں حکم دیا ہے؟''، تو ایسے شخص کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ یہ فاتر العقل ہے، جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مطلقاً نفلی نماز، نفلی روزے، نفلی صدقے اور نفلی حج کا حکم دے دیا ہے، تو یہ اطلاق اور عموم ان مخصوص صورتوں کی نفلی عبادات کو بھی شامل ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اطلاق اور عموم کے ساتھ دعا کرنے کا حکم دیا ہے تو یہ حکم ہر وقت اور ہر جگہ دعا کرنے کو شامل ہے اور ہر صورت میں دعا کرنے کو شامل ہے، حتیٰ کہ نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے کے بعد جو صفیں توڑ کر دعا کی جاتی ہے، اس کو بھی شامل ہے۔

نیز ہم یہ کہتے ہیں کہ نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے اور حدیث میں ہے کہ'' فرائض کے بعد دعا جلد قبول ہوتی ہے''، حدیث شریف میں ہے:

"عن ابی امامة قیل یا رسول اللہ ایّ الدعاء اسمع قال جوف اللیل الآخر ودبر الصلوٰة المکتوبات"

ترجمہ:'' حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کس وقت دعا جلد قبول ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: رات کے آخری حصہ میں اور فرائض کے بعد''، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 3499)۔

اور مکتوبات یعنی فرائض کے عموم میں نمازِ جنازہ بھی شامل ہے، کیونکہ اصالتاً تو نمازِ جنازہ پڑھنا ہر مسلمان پر فرضِ عین ہے، لیکن چند مسلمانوں کے نمازِ جنازہ پڑھ لینے سے باقیوں سے اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، اس لئے اسے فرضِ کفایہ کہتے ہیں، بہر حال مکتوبات کا عموم نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے، تاہم نمازِ جنازہ پڑھنے کے کچھ دیر بعد صفیں توڑ کر اجتماعی دعا کرنے کے ثبوت میں ہم خصوصی احادیث بھی پیش کر رہے ہیں۔

نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد صفیں توڑ کر اجتماعی دعا کرنے کے ثبوت میں خصوصی احادیث اورآثار:

(1)عن ابی هریرة قال:سمعت رسول الله ﷺ یقول اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم میت کی نماز (جنازہ) پڑھ چکو تو پھر اس کے لیے اخلاص سے دعا کرو''،(سنن ابی داؤد رقم الحدیث:3119،سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:1497)۔

اس حدیث میں فاخلصوا پر''فا''ہے، یہ حرفِ عطف ہے اور یہ''فا''،''تعقیب علی الفور'' (یعنی اس کے ماقبل جس عمل یا بات کا تذکرہ ہو، اس کے فوراً بعد وہ کام کرنا جو''فا''کے بعد مذکور ہے) کے لیے آتی ہے، اس کا مطلب ہے کہ میت پر نمازِ جنازہ پڑھنے کے فوراً بعد اس کے لئے اخلاص سے دعا کرو۔

ضربِ مؤمن کے''مفتی صاحب''نے اس حدیث سے استدلال پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس حدیث میں مذکور دعا سے نمازِ جنازہ کے اندر پڑھی جانے والی دعا مراد ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب مذکور کو یہ بھی معلوم نہیں کہ معطوف اور معطوف علیہ مغائر ہوتے ہیں، لہٰذا اس سے مراد وہ دعا ہے جو نمازِ جنازہ میں پڑھی جانے والی دعا کے مغائر ہے اور اس کے بعد ہے، کیونکہ فاء تعقیب کے لئے آتی ہے۔

نیز مفتی صاحب مذکور نے اپنے استدلال کی تقویت میں ملا علی قاری کی یہ عبارت لکھی ہے:

ولا یدعوا للمیت بعد صلوٰة الجنازة لانه یشبه الزیادة فی صلوٰة الجنازة۔

ترجمہ:''اور نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا نہ کرے، کیونکہ یہ نماز جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے''،(مرقات المفاتیح،جلد4صفحہ170)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ معروف ومروّج دعا سلام پھیرنے کے بعد صفیں توڑ کر اور تلاوتِ قرآن کر کے مانگی جاتی ہے، اگر یہ دعا نمازِ جنازہ کے متصل بعد

مانگی جاتی تب تو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ نمازِ جنازہ میں کوئی عمل بڑھا دیا گیا ہے، لیکن جب دعا نمازِ جنازہ پوری ہونے کے کچھ دیر بعد مانگی جائے گی، تو اس سے کیسے یہ شبہ پیدا ہوگا کہ یہ عمل نمازِ جنازہ میں اضافہ کے مشابہ ہے، اس کی مزید وضاحت آرہی ہے، اس سلسلے میں دوسری حدیث یہ ہے:

"عن عبد اللّٰه بن ابی اوفی وکان من اصحاب الشجرة، فماتت ابنة له وکان یمشی جنازتها علی بغلة خلفها ، فجعل النساء یبکین ،فقال: لا ترثین ،فان رسول الله ﷺ نهیٰ عن المراثی، فتفیض احدٰکن من عبرتها ماشاء ت ،ثم کبر علیها اربعاً ،ثم قام بعد الرابعة قدر ما بین التکبیرتین یدعوا ،ثم قال: کان رسول الله ﷺ یصنع فی الجنازة هکذا "۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما جو'' اصحابِ شجرہ'' (یعنی شرکاء بیعتِ رضوان میں سے ہیں، جو حدیبیہ کے مقام پر ہوئی تھی اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کی سند قرآن میں عطا فرمائی ہے) وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی بیٹی فوت ہوگئی، وہ اس کے جنازہ میں خچر پر سوار ہوکر جارہے تھے کہ عورتوں نے رونا شروع کردیا، حضرت عبداللہ نے کہا کہ تم مرثیہ مت پڑھو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مرثیہ پڑھنے سے منع فرمایا ہے، تم میں سے کوئی عورت اپنی آنکھ سے جس قدر چاہے آنسو بہائے ، پھر انہوں نے جنازہ پر چار تکبیریں پڑھیں، پھر اتنا وقفہ کیا جتنا دو تکبیروں کے درمیان وقفہ ہوتا ہے اور اس وقفہ میں دعا کرتے رہے، پھر کہا رسول اللہ ﷺ نمازِ جنازہ میں اسی طرح کرتے تھے''۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1503، مسند احمد جلد 4 صفحہ 356 قدیم، مسندِ احمد جلد 31 صفحہ 480، رقم الحدیث: 19140، موسسۃ الرسالہ بیروت 1420، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: 6404، مسند الحمیدی رقم الحدیث: 718، مصنف ابن ابی شیبہ جلد 3 صفحہ 303، المعجم الصغیر رقم الحدیث: 268، المستدرک ج 1 صفحہ 359-360، سنن بیہقی جلد 4 صفحہ 43-42)''۔

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ حضرت ابنِ ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ نے چوتھی تکبیر کے بعد دعا

کی اور نمازِ جنازہ کے اندر جو دعا کی جاتی ہے، وہ تیسری تکبیر کے بعد کی جاتی ہے۔ اور حضرت ابن ابی اوفیٰ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ بھی اسی طرح کرتے تھے، تو یہ نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنے کا واضح ثبوت ہے، باقی رہا یہ کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام پڑھا جاتا ہے اور اس حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ راوی سلام کا ذکر کرنا بھول گیا ہو یا اس نے یہ سوچ کر اس کا ذکر ترک کردیا کہ یہ تو ویسے ہی معروف اور مشہور ہے، نمازِ جنازہ کے بعد دعا کے ثبوت میں یہ حدیث بھی اس کی مثل ہے:

یزید بن رکانہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب میت پر نمازِ جنازہ پڑھتے تو چار تکبیریں پڑھتے، پھر یہ دعا کرتے اے اللہ! تیرا بندہ اور تیری بندی کا بیٹا تیری رحمت کا محتاج ہے، اور تو اس کو عذاب دینے سے غنی ہے، پس اگر یہ نیک ہے تو، تو اس کی نیکی میں اضافہ فرما، اور اگر یہ برا ہے تو، تو اس کی برائی سے درگزر فرما، پھر جو اللہ چاہتا آپ اس کے لیے وہ دعا کرتے، (المعجم الکبیر ج 22 ص 249، رقم الحدیث: 647)۔

حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کی سند میں ایک راوی یعقوب بن حمید ہے، اس کے بارے میں کلام کیا گیا ہے، (مجمع الزوائد ج 4 ص 34)۔

اس حدیث میں بھی چار تکبیروں کے بعد دعا کا ذکر ہے، اس لیے اس دعا سے مراد بھی وہ دعا ہے جو نمازِ جنازہ کے بعد کی جاتی ہے، کیونکہ جو دعا نمازِ جنازہ کے اندر پڑھی جاتی ہے، وہ تین تکبیروں کے بعد پڑھی جاتی ہے، اور اس حدیث میں اور اس سے پہلی حدیث میں یہ تصریح ہے کہ یہ دعا چار تکبیروں کے بعد کی گئی ہے۔ اور اگر کوئی مخالف اس پر اصرار کرے کہ چار تکبیروں کے بعد یہ دعا نمازِ جنازہ کے اندر پڑھی گئی تھی اور اس کے بعد سلام پھیرا گیا تو لازماً سلام سے پہلے بھی ایک تکبیر پڑھی جائے گی اور اس طرح نمازِ جنازہ میں پانچ تکبیریں ہو جائیں گی اور یہ اجماع کے خلاف ہے، رہا یہ کہ ان دونوں حدیثوں میں چار تکبیروں کے بعد سلام کا ذکر نہیں ہے تو ہوسکتا ہے کہ راوی نے اس کا ذکر اس لیے نہ کیا ہو کہ چار تکبیروں کے بعد سلام کا پڑھنا مسلمانوں میں بالکل ظاہر اور معروف تھا اس لیے اس نے اس کا ذکر

نہیں کیا، بہر حال چار تکبیروں کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا دعا کرنا ہمارے مطلوب پر بہت واضح دلیل ہے۔

اور یہ حدیث بھی ہمارے مطلوب پر بہت واضح اور صریح دلیل ہے:

"عن جبیر بن نفیر سمعهٗ یقول سمعت عوف بن مالک یقول صلیٰ رسول اللہ ﷺ علیٰ جنازۃ فحفظت من دعائہ وھو یقول اللھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه واکرم نزله ووسّع مدخلهٗ واغسله بالماءِ والثلج والبردِ ونقّہ من الخطایا کما نقّیت الثوب الابیض من الدنس وابدله دارا خیرا من دارہٖ واھلا خیرا من اھلہٖ وزوجا خیرا من زوجہٖ وادخله الجنة واعذہ من عذاب القبر ومن عذاب النار قال حتیٰ تمنیت ان اکون ذالک المیت"۔

ترجمہ: "حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازے کی نماز پڑھی، میں نے اس جنازے میں آپ کی دعا کے الفاظ یاد رکھے، وہ یہ ہیں:

ترجمہ: اے اللہ اس کی مغفرت فرما، اس پر رحم فرما، اس کو عافیت میں رکھ اور اس کو معاف فرما، اس کی عزت کے ساتھ مہمان نوازی فرما، اس کی قبر کو وسیع کر، اس (کے گناہوں) کو پانی، برف اور اولوں سے دھو ڈال، اس کو گناہوں سے اس طرح صاف کر دے جس طرح تو سفید کپڑے کو میل سے صاف فرما دیتا ہے، اس کے (دنیوی) گھر کے بدلہ میں اس سے بہتر (آخرت کا) گھر عطا فرما، اس کے (دنیوی) گھر والوں کے بدلہ میں (اسے آخرت میں) بہتر گھر والے عطا فرما، اس کی (دنیوی) بیوی کے بدلے میں (جنت میں) اس سے بہتر بیوی عطا فرما، اس کو جنت میں داخل فرما، اس کو عذابِ قبر اور عذابِ نار سے محفوظ رکھ، حضرت عوف کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے یہ تمنا کی کہ کاش وہ مرنے والا میں ہوتا (تاکہ یہ دعا مجھے مل جاتی)"، (صحیح مسلم رقم الحدیث:963، سنن ترمذی رقم الحدیث:1045، سنن نسائی رقم الحدیث:1984)۔

پھر نماز جنازہ کے اندر جو دعا ہو اس کو سرّاً (آہستہ) پڑھا جاتا ہے، اور اس دعا کو حضرت

عوف بن مالک نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر یاد کیا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ دعا جہراً کی تھی اور جہراً دعا نمازِ جنازہ کے بعد کیجاتی ہے، لہٰذا یہ وہ دعا ہے جو نمازِ جنازہ کے بعد کی گئی، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ محدثین نے اس دعا کو نمازِ جنازہ میں پڑھی جانے والی دعا کے باب میں ذکر کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ یہ وہ دعا ہے جو نمازِ جنازہ کے اندر پڑھی جاتی ہے، بلکہ حضرتِ عوف بن مالک کا اس دعا کو رسول اللہ ﷺ سے سن کر یاد کرنا اس پر ظاہر اور واضح قرینہ ہے کہ یہ دعا نمازِ جنازہ کے بعد کی گئی تھی۔ اور محدثین کا اس دعا کو نمازِ جنازہ کے اندر پر محمول کرنا صرف ان کی رائے ہے، رسول اللہ ﷺ نے تو ان کو نہیں فرمایا تھا کہ تم اس حدیث کو اس باب میں درج کرو۔

نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنے کے ثبوت میں احادیث کا ذکر کرنے کے بعد اب ہم آثارِ صحابہ کا ذکر کر رہے ہیں:

امام ابوبکر عبداللہ بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عن عمير بن سعيد قال صليت مع علي علي يزيد بن المكفف فكبر عليه اربعا ثم مشى حتى اتاه فقال اللهم عبد ک ابن عبدک نزل بک اليوم فاغفرله ذنبه ووسع عليه مدخله ثم مشى حتى اتاه وقال اللهم عبدک ابن عبدک نزل بک اليوم فاغفرله ذنبه ووسع عليه مدخله فانا لا نعلم منه الا خيرا وانت اعلم به۔

ترجمہ: ''عمیر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یزید بن المکفف کی نماز جنازہ پڑھی، انہوں نے اس پر چار تکبیریں پڑھیں، پھر کچھ چلے حتیٰ کہ جنازہ کے پاس آئے اور یہ دعا کی اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے اور تیرے بندے کا بیٹا ہے آج اس پر موت طاری ہوئی ہے تو اس کے گناہ کو بخش دے اور اس کی قبر کو کشادہ کردے، پھر کچھ چل کر اس کے پاس آئے اور دعا کی اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے اور تیرے بندے کا بیٹا ہے، آج اس پر موت طاری ہوئی ہے، تو اس کے گناہ کو بخش دے اور اس کی قبر کو کشادہ کردے،

کیونکہ ہم کو اس کے متعلق خیر کے سوا اور کچھ علم نہیں ہے، اور اس کا خوب علم تجھ کو ہی ہے"۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج3 ص331،مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی،1406ھ)

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی متوفی 483ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک نمازِ جنازہ رہ گئی، جب وہ اس جنازہ پر آئے تو انہوں نے میت پر صرف استغفار کیا، اور حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ رہ گئی، جب وہ ان کے جنازہ پر آئے تو کہا: اگر تم نے نمازِ جنازہ پڑھنے میں مجھ پر سبقت کر لی ہے تو ان کے لیے دعا کرنے میں تو مجھ پر سبقت نہ کرو، (المبسوط ج ۲ ص ۱۰۷، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۱ھ)۔

امام علاء الدین ابو بکر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ لکھتے ہیں:

ہماری دلیل یہ روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھائی، جب آپ نمازِ جنازہ پڑھ چکے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور یہ ارادہ کیا کہ ان پر نمازِ جنازہ پڑھیں تو نبی ﷺ نے فرمایا نمازِ جنازہ دو بار نہیں پڑھی جاتی، لیکن تم میت کے لیے دعا کرو اور استغفار کرو، اور یہ حدیث اس باب میں نص (صریح) ہے، اور روایت ہے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ایک جنازہ کی نماز رہ گئی، جب وہ آئے تو انہوں نے میت کے لیے صرف استغفار کیا، اور حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ رہ گئی جب وہ آئے تو انہوں نے کہا: اگر تم نے ان کی نمازِ جنازہ میں مجھ پر سبقت کر لی ہے تو ان کے لیے دعا کرنے میں مجھ پر سبقت نہ کرو۔

(بدائع الصنائع ج ۲ ص ۳۳۸، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

علامہ محمود بن احمد البخاری المتوفی ۶۱۶ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نمازِ جنازہ دو بار نہیں پڑھی جاتی لیکن تم میت کے لیے دعا کرو اور استغفار کرو"۔

(المحیط البرہانی ج ۲ ص ۳۳۳، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۴ھ)۔

حضرت ابن عمر اور ابن عباس سے جو ایک جنازے کی نماز رہ گئی اور حضرت عبد اللہ بن سلام

سے جو حضرت عمر کی نمازِ جنازہ رہ گئی اور انہوں نے یہ کہا کہ اگرچہ تم نے نمازِ جنازہ میں مجھ پر سبقت کرلی ہے لیکن تم دعا میں مجھ پر سبقت نہ کرنا، ضربِ مؤمن کے مفتی مذکور نے اس کی توجیہ میں یہ کہا ہے کہ اس سے کیسے ثابت ہوگیا کہ جو لوگ نمازِ جنازہ میں شریک ہیں وہ نمازِ جنازہ کے اختتام پر اجتماعی حالت میں دعا کریں، نیز ان آثار میں یہ بھی مذکور نہیں کہ یہ حضرات نمازِ جنازہ کے کتنی دیر بعد تشریف لائے، دفن سے پہلے یا دفن کے بعد، پھر اسی دن یا کچھ دنوں کے بعد؟ تو ان کی اس دعا سے جس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کب ہوئی؟ نمازِ جنازہ کے متصل بعد کی جانے والی دعا کے اثبات پر استدلال کیسے صحیح ہوگا (الخ)۔

ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ مروجہ دعا نمازِ جنازہ کے متصل بعد نہیں کی جاتی، بلکہ صفیں توڑ کر کچھ دیر کے بعد کی جاتی ہے، اس لئے مفتی مذکور کا نمازِ جنازہ کے متصل بعد کہنا بالکل بے سود ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حضرات کچھ دنوں کے بعد نہیں آئے تھے بلکہ نمازِ جنازہ پڑھنے ہی کے لیے آئے تھے لیکن ان کو کچھ تاخیر ہوگئی، اس وجہ سے وہ نمازِ جنازہ میں شریک نہیں ہوسکے تو انہوں نے پہنچنے پر کہا کہ تم نے اگرچہ نمازِ جنازہ میں ہم پر سبقت کرلی ہے تو دعاء میں ہم سے پہل نہ کرنا یعنی سب مل کر اجتماعی دعا کریں گے اور یہ ہمارے موقف پر واضح دلیل ہے، اور مفتی مذکور کا اس میں کچھ دنوں کے بعد کا احتمال نکالنا دفع وقتی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ان احادیث اور آثار سے یہ واضح ہوگیا کہ نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں معمول اور مشروع تھا، اس تفصیل اور تحقیق کے بعد ہم فقہاء کی ان عبارات کی تنقیح کرنا چاہتے ہیں جن سے مخالفین نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنے کے عدمِ جواز پر استدلال کرتے ہیں۔

نمازِ جنازہ کے بعد دعا سے ممانعت کے دلائل اور ان کے جوابات:

ملا علی بن سلطان محمد القاری متوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا نہ کرے کیونکہ اس سے نمازِ جنازہ میں زیادتی کا شبہ پیدا

ہوتا ہے، (مرقات المفاتیح ج ۴ ص ۱۷۰، مکتبہ حقانیہ پشاور)۔
ہم نے نمازِ جنازہ کے بعد دعا کو احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ سے ثابت کیا ہے اور ملا علی قاری کی یہ عبارت نہ قرآن کی آیت ہے نہ حدیث ہے نہ اثرِ صحابی ہے، تو اس میں اتنی قوت کہاں سے آ گئی کہ یہ احادیثِ صحیحہ کے مزاحم ہو سکے، تاہم اس کی توجیہ یہ ہے کہ ملا علی قاری نے نمازِ جنازہ کے بعد دعا کو اس لیے منع کیا ہے کہ اس سے نمازِ جنازہ میں زیادتی کا شبہ پیدا ہوتا ہے، اور زیادتی کا شبہ اس وقت ہوگا جب سلام پھیرنے کے بعد اسی طرح صفیں قائم رہیں، اور لوگ اسی طرح اپنی جگہوں پر ہاتھ باندھے کھڑے رہیں پھر اسی حال میں میت کے لیے دعا کریں، تو یہ شبہ ہوگا کہ یہ دعا بھی نمازِ جنازہ کا جز ہے، لیکن جب سلام پھیرنے کے بعد صفیں ٹوٹ جائیں اور لوگ منتشر ہو کر جنازہ کے گرد جمع ہوں اور ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر میت کے لیے ایصالِ ثواب کریں اور ہاتھ اٹھا کر میت کے لیے دعا کریں تو پھر کوئی عقل وخرد سے عاری شخص ہی ہوگا جو یہ سمجھے گا کہ یہ دعا نمازِ جنازہ کا جز ہے۔ ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے اس مفہوم کی جو دوسری فقہی عبارات پیش کی ہیں، ان کا بھی بعینہٖ یہی جواب ہے، اسی طرح بعض فقہاء نے یہ کہا ہے کہ ظاہر الروایۃ میں ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد دعا نہ کرے اور نوادر میں ہے یہ دعا جائز ہے۔
علامہ محمود بن احمد البخاری متوفی ۶۱۶ھ لکھتے ہیں: ''نمازِ جنازہ کے بعد کوئی شخص دعا کے لیے کھڑا نہ ہو کیونکہ وہ ایک مرتبہ دعا کر چکا ہے اور نمازِ جنازہ کا اکثر حصہ دعا ہے اور نوادر کی روایت میں ہے کہ یہ دعا جائز ہے''، (المحیط البرہانی ج ۲ ص ۳۳۸، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۴ھ)

علامہ زین الدین ابن نجیم متوفی ۹۷۰ھ لکھتے ہیں: ''نمازِ جنازہ میں سلام پھیرنے کے بعد دعا نہ کرے، اسی طرح خلاصۃ الفتاویٰ (ج ۱ ص ۲۲۵) میں ہے اور امام فضلی نے کہا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے''۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۸۳، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ)
علامہ سراج الدین عمر بن ابراہیم ابن نجیم حنفی متوفی ۱۰۰۵ھ لکھتے ہیں:

''نمازِ جنازہ میں سلام پھیرنے کے بعد کوئی دعا نہ کرے یہ ظاہر مذہب ہے اور بعض مشائخ نے کہا ہے کہ یہ دعا کرے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً، اور بعض نے کہا یہ دعا کرے: اللّٰھم لاتحرمنا اجرہ و لا تفتنا بعدہ و اغفرلنا و لہ، اور بعض نے کہا یہ دعا کرے: ربنا لاتزغ قلوبنا الی آخرہ ،(النہر الفائق ج ا ص ۳۹۴، قدیمی کتب خانہ کراچی)۔

علامہ ابراہیم حلبی متوفی ۹۵۶ھ اور علامہ شیخ زادہ داماد آفندی متوفی ۱۰۷۸ھ نے بھی اسی طرح لکھا ہے،(غنیۃ المستملی ص۵۸۵-۵۸۶، سہیل اکیڈمی لاہور، مجمع الانھر ج ص ۲۷۱، مکتبہ غفاریہ کوئٹہ)

فقہاء کی ان عبارات سے واضح ہوا کہ اگر نمازِ جنازہ کے سلام پھیرنے کے متصل بعد وہیں کھڑے کھڑے صفیں توڑے بغیر میت کے لیے دعا کی تو یہ ظاہر الروایہ میں ممنوع ہے لیکن نوادر کی عبارات میں، امام فضلی اور دیگر متاخرین کی عبارات میں مذکور ہے کہ اس کیفیت سے بھی نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا جائز ہے۔ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے جو نمازِ جنازہ کے متصل بعد اجتماعی دعا کو بدعت، ناجائز اور حرام کہا ہے، تو ہم عاجز بندوں کے علاوہ حضرت امام محمد اور یہ دیگر متاخرین اکابر امت رحمہم اللہ تعالیٰ بھی ان کے اس فتویٰ کی زد میں آرہے ہیں اور جوانہوں نے ہمیں کوسا ہے، وہ سب امام محمد اور ان فقہاء کی طرف بھی راجع ہورہا ہے۔

اور اگر نمازِ جنازہ کے بعد صفیں توڑ کر میت کے لیے دعا کی جائے جیسا کہ مروجہ طریقہ ہے تو پھر یہ کسی کے اعتبار سے بھی ممنوع نہیں ہے اور اس کے جواز اور استحسان میں کوئی کلام نہیں ہے۔مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ نے نمازِ جنازہ کے بعد دعا کی ممانعت میں لکھا ہے:

سوال: (۳۰۷) نمازِ جنازہ کے بعد جماعت کے ساتھ وہیں ٹھہر کر دعا کرنا کیسا ہے؟

جواب: درست نہیں، لمافی البزازیہ لا یقوم بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانہ دعامرۃ لان اکثرھادعاءٌ۔

ترجمہ: ''کیونکہ بزازیہ میں ہے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے کھڑا نہ ہو، کیونکہ ایک مرتبہ دعا کر چکا ہے، کیونکہ جنازہ کا اکثر حصہ دعا ہے''، (بزازیہ علی ھامش العالمگیریہ ص۹۰، ج۴)،

(فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۲ (امداد المفتین کامل) ص ۴۴۴، دار الاشاعت کراچی، ۱۹۷۷ء)۔

دراصل بزازیہ کی یہ عبارت عالم گیری ج ۴ ص ۸۰ کے حاشیے پر ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:
نمازِ جنازہ کے بعد دعا کے لئے کھڑا نہ رہے، کیونکہ وہ ایک مرتبہ دعا کر چکا ہے اور نمازِ جنازہ کا اکثر حصہ دعا پر مشتمل ہے۔ اس ممانعت کا بھی وہی محمل ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد اسی جگہ سلام پھیرے اور صفیں توڑے بغیر دعا کرے، صفیں توڑنے اور لوگوں کے منتشر ہونے کے بعد ممانعت نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فصل کئے بغیر اسی جگہ دعا کرے، تو اس سے نمازِ جنازہ میں زیادتی کا شبہ ہوگا۔

نمازِ جنازہ کے متصل بعد اسی حال میں میت کے لئے مزید دعا کی ممانعت کی نظیر وہ احادیث ہیں، جن میں فرض نماز کے متصل بعد بغیر فصل کئے ہوئے نفل نماز پڑھنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے:

نافع بن جبیر نے ایک شخص کو سائب کے پاس بھیجا اور ان سے اس چیز کے بارے میں دریافت کیا جس کو حضرت معاویہ نے ایک شہر میں دیکھا تھا، سائب نے کہا ہاں میں نے ان کے ساتھ المقصورۃ میں جمعہ پڑھا تھا، جب امام نے سلام پھیرا تو میں اسی جگہ کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگا، حضرت معاویہ نے مجھے بلا کر فرمایا: تم نے جو کیا دوبارہ ایسا نہ کرنا جب تم جمعہ کی نماز پڑھ لو تو اس وقت تک دوسری نماز نہ پڑھو، حتیٰ کہ تم کسی سے بات کر لو، یا وہاں سے چلے جاؤ، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی طرح کرنے کا حکم دیا ہے کہ نماز کو دوسری نماز کے ساتھ نہ ملایا جائے، حتیٰ کہ ہم کسی سے بات کر لیں یا اس جگہ سے چلے جائیں۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۸۸۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۱۲۹)

نمازِ جنازہ میں اصل چیز میت کے لئے دعا ہے سو نمازِ جنازہ کی دعا کے بعد بغیر فصل کے دوسری دعا نہ کی جائے ہاں کسی سے باتیں کر کے یا اس جگہ سے فصل کر کے دوبارہ دعا کی جائے تو پھر جائز ہے، جیسے فرض نماز کے بعد فصل کر کے نفل نماز پڑھنا جائز ہے اور متصلاً پڑھنا ممنوع ہے۔

اسی طرح امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:
ازرق بن قیس بیان کرتے ہیں کہ ہم کو ایک امام نے نماز پڑھائی جس کی کنیت ابورمثہ تھی اس نے کہا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس نماز کی مثل نماز پڑھی تھی اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پہلی صف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں جانب تھے، اور ایک شخص نماز میں پہلی تکبیر کے ساتھ موجود تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں جانب اور بائیں جانب سلام پھیرا، حتی کہ ہم نے آپ کے رخساروں کی سفیدی دیکھی۔ پھر جس شخص نے پہلی تکبیر کے ساتھ نماز پڑھی تھی وہ اٹھ کر فوراً دو رکعت نماز پڑھنے لگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی طرف لپکے اور اس کے دونوں کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا، پھر کہا بیٹھ جاؤ کیونکہ سابقہ اہل کتاب صرف اس وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں کہ وہ اپنی نمازوں میں فصل نہیں کرتے تھے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھا کر حضرت عمر کو دیکھا اور فرمایا: ''اے ابن الخطاب! اللہ تم کو صواب پر برقرار رکھے''، (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۰۰۷)۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ فرض نماز اور نفل نماز میں فصل ہونا چاہیے خواہ کوئی بات کر لی جائے یا جگہ بدل لی جائے، اور نماز جنازہ کے متصل بعد اگر اسی جگہ دوبارہ میت کے لئے دعا کی جائے تو وہ بھی اسی حکم میں ہے، لہٰذا جن فقہاء نے نماز جنازہ کے متصل میت کے لئے دعا کرنے سے منع کیا ہے، اس کی بھی یہی وجہ ہے اور یہ وجہ بھی ہے کہ اس سے نماز جنازہ میں زیادتی کا شبہ ہوگا، اور جب سلام پھیرنے، صفیں ٹوٹنے اور نمازیوں کے جگہ بدلنے کے بعد دعا کی جائے گی تو پھر نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا بہر حال مستحسن ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند کے مفتی اول مفتی عزیز الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:
سوال (۳۱۳۴): بعد نماز جنازہ قبل دفن چند مصلیوں (نمازیوں) کا ایصال ثواب کے لئے سورہ فاتحہ ایک بار اور سورہ اخلاص تین بار آہستہ آواز سے پڑھنا یا کسی نیک آدمی کا دونوں ہاتھ اٹھا کر مختصر دعا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں۔
جواب: اس میں کچھ حرج نہیں ہے، لیکن اس کو رسم کر لینا اور التزام کرنا مثل واجبات کے

اس کو بدعت بنادے گا، (فتاویٰ دار العلوم دیو بند مدلل مکمل ج ۵ ص ۴۳۵۔ ۴۳۴، دار الاشاعت کراچی)
اس فتویٰ سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کے بعد کچھ فصل کر کے دعا کرنا جائز ہے بلکہ مستحب اور مسنون ہے، مثل واجبات کے التزام کرنا ہمارے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے، لیکن مثل واجبات کے التزام کا معنی یہ ہے کہ نہ کرنے والے کو ملامت کیا جائے اور اس کی مذمت کی جائے اور اس کو کبھی ترک نہ کیا جائے اور کبھی ترک ہو جائے تو اس کی قضاء کی جائے اور اہل سنت اس طرح نہیں کرتے۔

ضرب مومن کے مفتی صاحب نے اس بات کو کافی زور دے کر کہا ہے کہ نماز جنازہ میں سلام سے پہلے خود دعا مذکور ہے، جو اللھم اغفرلحینا الخ۔۔ پڑھی جاتی ہے، اب اگر سلام پھیرنے کے بعد بھی دعا پڑھی جائے تو یہ محض تکرار ہوگا، اس لئے نمازِ جنازہ میں سلام پھیرنے کے بعد دعا نہیں مانگنی چاہیے، اس کا جواب یہ۔ ہے کہ پانچوں فرض نمازوں میں بھی سلام پھیرنے سے پہلے رب اجعلنی الخ یا انی ظلمت الخ دعا پڑھی جاتی ہیں جبکہ تمام مساجد میں پانچوں فرض نمازوں میں سلام پھیرنے کے بعد بھی اجتماعی دعا کی جاتی ہے۔ سو ضربِ مومن کے مفتی کو چاہیے کہ وہ اپنے مکتب فکر کی مساجد میں فرض نمازوں میں سلام پھیرنے کے بعد اجتماعی دعا کرنے سے منع کریں، حالانکہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرض نمازوں میں سلام پھیرنے کے بعد اجتماعی دعا فرماتے تھے۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب کی حوالہ جات میں تحریف اور خیانت:

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے اباحتِ اصلیہ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:
یہ قاعدہ کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے، فقہاء کرام اور علمِ اصول کے ماہرین کے ہاں اتفاقی نہیں بلکہ علماء کرام کی ایک کثیر تعداد کا قول یہ ہے کہ ہر چیز میں اصل توقف ہے، جب تک کسی جانب پر دلیل قائم نہ ہو، اسے جائز یا ناجائز نہیں کہا جا سکتا، شیخ ابو منصور ماتریدی، عام محدثین اور اشعریہ سب کا یہی مذہب ہے، (شامیہ: ۴/۱۶۱)۔

"علیٰ ماھو المنصور من أن الاصل فی الاشیاء التوقف"

مذہب منصور یہ ہے کہ اشیاء میں اصل توقف ہے، (درمختار: ۱/۱۰۵)۔

"أن الصحیح من مذهب اهل السنة أن الاصل فی الاشیاء التوقف"،

اہل سنت کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اشیاء میں اصل توقف ہے، (حوالۂ بالا: ۴/۱۶۱)۔

ضربِ مومن کے مفتی نے جو محولہ بالا عبارت نقل کی ہے، وہ علامہ شامی کی ردالمحتار میں نہیں ہے بلکہ علامہ علاؤالدین حصکفی کی عبارت ہے، جو درمختار میں ہے، جبکہ انہوں نے شامی کا حوالہ دیا ہے، علامہ شامی درمختار کی اس عبارت کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اقول: وصرح فی "التحریر" بان المختارأن الاصل الاباحة عندالجمهور من الحنفية والشافعية اھ۔وتبعه تلميذه العلامة قاسم، وجرى عليه فی "الهداية" من فصل الحداد: وفی "الخانيه" من اوائل الحظروالاباحة ۔ وقال فی "شرح التحرير" وهو قول معتزلة البصرة وكثير من الشافعية واكثرالحنفية لا سيما العراقين، قالوا: واليه اشار محمد فيمن هدد بالقتل على اكل الميتة أو شرب الخمرفلم يفعل حتى قتل بقوله: خفت أن يكون آثما، لأن اكل الميتة وشرب الخمر لم يحرما الا بالنهی عنهما، فجعل الاباحة اصلا والحرمة بعارض النهی اھ۔ ونقل ايضا انه قول اكثر اصحابنا واصحاب الشافعی الشيخ اكمل الدين فی "شرح اصول البزدوی" وبه علم أن قول الشارح فی باب استيلاء الكفار أن الاباحة رأی المعتزلة: فيه نظر، فتدبر۔

ترجمہ: میں کہتا ہوں "التحریر" میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ جمہور احناف اور شوافع کے نزدیک مختار یہ ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اور علامہ ابن ہمام کے شاگرد علامہ قاسم نے اس کی اتباع کی ہے۔ اور "الودایہ" کی فصل الحداد میں بھی یہی ذکر ہے اور فتاویٰ قاضی خان کے "الحظر والاباحۃ" کے اوائل میں بھی یہی ہے، اور تحریر کی شرح میں مذکور ہے کہ یہ بصرے کے معتزلہ اور اکثر شوافع اور اکثر احناف، خاص طور پر عراقیین کا قول ہے اور امام محمد نے بھی اسی پر یہ مسئلہ متفرع کیا ہے کہ جس آدمی نے کسی کو یہ دھمکی دی کہ تم مردار کھاؤ یا شراب پیو

ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گا، اس شخص نے ایسا نہیں کیا حتیٰ کہ دھمکی دینے والے نے اس کو قتل کردیا، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے یہ خطرہ ہے کہ وہ شخص گناہ گار ہوگا کیونکہ مردار کھانا اور شراب پینا صرف قرآن کی ممانعت کی وجہ سے حرام ہیں، پس امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اباحت کو اصل قرار دیا اور کہا کہ تحریم ممانعت کے عارض ہونے کی وجہ سے ہے، شرح اصولِ بزدوی میں بھی یہی لکھا ہے کہ:

''اباحت کا اصل ہونا ہمارے اکثر اصحاب اور شافعی کے اکثر اصحاب کا قول ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شارح یعنی علامہ حصکفی نے استیلاء الکفار کے باب میں جو یہ لکھا ہے کہ اباحت معتزلہ کی رائے ہے، اس پر اعتراض ہے، ہمیں اس میں غور کرنا چاہئے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد ا ص:۱۹۹، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے جو کہا ہے کہ اباحتِ اصلیہ کا قاعدہ عبادات میں جاری نہیں ہوتا، اس سے مراد اگر یہ ہے کہ اس قاعدے سے کسی فرض عبادت کو ایجاد نہیں کیا جاسکتا، تو یہ صحیح ہے اور علامہ شاطبی کی جو عبارت مفتی صاحب مذکور نے نقل کی ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد فرض عبادت ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اباحتِ اصلیہ کے قاعدے سے اگر کوئی شخص پانچ نمازوں کے علاوہ چھٹی نماز کو ایجاد کرے تو بالاتفاق جائز نہیں ہے، کیونکہ علماء کی عبارات میں مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے، اور جب علامہ شاطبی نے چھٹی نماز ایجاد کرنے پر گفتگو کی ہے، تو اس سے واضح ہوگیا کہ وہ اباحتِ اصلیہ کے قاعدہ کو فرائض میں جاری کرنے سے منع کررہے ہیں نہ کہ نوافل میں، لہٰذا اس قاعدے سے کسی فرض عبادت کو ایجاد کرنا جائز نہیں ہے، لیکن نوافل میں اس قاعدے کے جاری ہونے میں کوئی امر مانع نہیں ہے اور ہم بتا چکے ہیں کہ نماز جنازہ پڑھنے کے بعد صفیں توڑ کر کچھ وقفے سے دعا کرنا، نفلی دعا کے عموم میں آتا ہے، لہٰذا اباحتِ اصلیہ سے بھی اس کے جواز پر استدلال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تاہم اصل دلیل یہ نہیں ہے بلکہ یہ دلیل بالتبع ذکر کی گئی ہے اصل دلائل وہی ہیں، جن کو ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں، نیز ضربِ مومن کے مفتی

صاحب کا اباحتِ اصلیہ کے قاعدے کو ورودِ شرع سے پہلے کے ساتھ خاص کرنا اور ورودِ شرع کے بعد صرف اموال کے ساتھ خاص کرنا، یہ بھی باطل ہے، کیونکہ علامہ شامی نے جو امام محمد سے یہ نقل کیا ہے کہ:

''کسی شخص نے دوسرے کو یہ دھمکی دی کہ تم مردار کھاؤ یا شراب پیو ورنہ میں تم کو قتل کردوں گا اور اس نے نہ شراب پی نہ مردار کھایا اور دھمکی دینے والے نے اس کو قتل کردیا تو امام محمد نے فرمایا: وہ شخص گنہگار ہوگا، کیونکہ جان بچانے کی خاطر اس کے لئے یہ مباح تھا کہ شراب پی کر اور مردار کھا کر اپنی جان بچالیتا۔ اور امام محمد نے یہ استدلال اباحت اصلیہ سے کیا ہے اور یہ جزئیہ ورودِ شرع کے بعد کا ہے اور اموال سے متعلق نہیں ہے، لہٰذا مفتیِ مذکور کا اس قاعدے کو ورودِ شرع سے پہلے کے ساتھ خاص کرنا یا ورودِ شرع کے بعد اموال کے ساتھ خاص کرنا قطعاً باطل ہوگیا۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب کا تجاہلِ عارفانہ:

[ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف یہ منسوب کیا ہے کہ حضرت ابن عمر نے دعا میں سینے سے اوپر ہاتھ اٹھانے کو بدعت قرار دیا ہے اور یہ حدیث نقل کی ہے، حدیث کا متن یہ ہے، جس کا ہم ترجمہ لکھ رہے ہیں:

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ تمہارا دعا میں سینے سے اوپر ہاتھ اٹھانا بدعت ہے، رسول اللہ ﷺ نے سینے سے اوپر ہاتھ نہیں اٹھائے''، (مسند احمد جلد ۲ ص:۶۱)

ضربِ مومن کے مفتی صاحب کی جہالت یہ ہے کہ انہوں نے اس حدیث کی سند پر غور نہیں کیا، علامہ شعیب الأرنؤوط نے اس حدیث کی تحقیق میں لکھا کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے، حضرت ابن عمر کے اس قول کو بشر بن حرب الأزدی نے روایت کیا ہے، اس کو ابن معین اور ابوزرعۃ اور نسائی اور ابوحاتم نے ضعیف قرار دیا اور امام بخاری نے کہا کہ علی بن المدینی نے اس کو ضعیف قرار دیا، امام احمد نے کہا: یہ حدیث میں قوی نہیں ہے۔

(حاشیہ مسند احمد جلد ۹ ص: ۲۰۲ رقم الحدیث: ۵۲۶۴ مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۴۱۶ ھ)

علاوہ ازیں یہ ضعیف حدیث احادیثِ صحیحہ کے خلاف ہے، اس لئے یہ حدیث منکر بھی ہے،
ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے لکھا کہ:
اس سے واضح ہوا کہ سائل اور اس جیسے جتنے لوگ بھی یہ دعا کرتے ہیں، وہ اسے لازم سمجھتے ہیں، نہ کرنے والے کو گمراہ کہتے ہیں اور مختلف برے القاب سے یاد کرتے ہیں، ان سارے امور کے باوجود مسلکہ فتویٰ میں (مفتی صاحب) نے اس کو جائز ہی کہا ہے، ایسے مفتیوں پر یہ قول سو فیصد صادق ہے، من جهل باهل زمانه فهو جاهلٌ۔
اس عبارت میں ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے نہ صرف خود اپنی جہالت کو ظاہر کیا ہے بلکہ اپنے کذاب اور مفتری ہونے کا بھی ثبوت دیا، کیونکہ ہم نے اپنے فتویٰ میں یہ نہیں لکھا تھا کہ نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرنا لازم ہے، نہ ہم نے دعا نہ کرنے والوں کو گمراہ کہا تھا یا ان کا کسی برے لقب سے ذکر کیا تھا؛ البتہ ہم نے ان لوگوں کا رد کیا ہے، جو بغیر شرعی دلیل کے نمازِ جنازہ کے کچھ وقفے بعد صفیں توڑ کر اجتماعی دعا کرنے کو ناجائز، حرام اور بدعت کہتے ہیں۔ ہم نے یہ کہا تھا کہ مسند احمد کی یہ حدیث، درج ذیل احادیثِ صحیحہ کے بھی خلاف ہے، اس لئے یہ حدیث منکر ہے۔
اب ہم چند احادیثِ صحیحہ پیش کررہے ہیں:
''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے، حتیٰ کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی''، (صحیح بخاری رقم الحدیث: ۱۰۳۰، صحیح مسلم باب الاستسقاء، جلد ۵ (۸۹۵) ۲۰۴۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۷۴۸)۔
''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے اپنا اور حضرت ابوعامر کا ماجرا عرض کیا اور یہ بتایا کہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ سے کہنا کہ میرے لئے مغفرت کی دعا کریں۔ آپ نے پانی منگوایا وضو کیا اور دونوں ہاتھ بلند کئے اور یہ دعا کی کہ اے اللہ! اپنے بندے ابوعامر کی مغفرت فرما۔ میں نے نبی ﷺ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی اور آپ نے کہا: اے اللہ! قیامت کے دن اس کو اپنی کثیر مخلوق پر فضیلت عطا فرما،

میں نے عرض کیا: اور میرے لئے بھی مغفرت کی دعا کیجئے، آپ نے فرمایا: اے اللہ! عبداللہ بن قیس کے گناہوں کو معاف فرما اور اس کو قیامت کے دن عزت کی جگہ میں داخل کردے''، (بخاری رقم الحدیث: ۴۳۲۳، صحیح مسلم باب فضائل صحابہ: ۱۶۵ (۲۴۹۸) ۲۶۸۹، سنن کبریٰ للبیہقی جلد ۵ رقم الحدیث: ۸۷۸۱)۔

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اخلاص اس طرح ہے، آپ نے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کیا اور یہ دعا ہے، آپ نے دونوں ہاتھ کندھوں تک بلند کئے اور یہ ابتہال ہے، پھر آپ نے اور زیادہ ہاتھ بلند کئے''۔

(کتاب الدعاء للطبرانی رقم الحدیث: ۲۰۸)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ دعا میں دونوں ہاتھ بلند کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دیتی تھی''(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۲۷۱، مسند البزار رقم الحدیث: ۷۱۴۳، مجمع الزوائد جلد ۱۰، ص: ۱۶۸)۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب کی بدعت کی تعریف میں تحریف:

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے لکھا ہے: ''عبادات کے متعلق اصل قاعدہ یہ ہے کہ جو عبادت جس طریقے سے ثابت ہو، وہ جائز ہوگی اور جو چیز بطورِ عبادت رسول اللہ ﷺ، صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت نہ ہو وہ عبادت نہیں ہوگی اور اس کا بطورِ عبادت انجام دینا بھی جائز نہ ہوگا، بعض اوقات کوئی چیز بطورِ عبادت تو ثابت ہوتی ہے، لیکن اس کے لئے خاص جگہ یا وقت یا کیفیت کی تعیین کا ثبوت نہیں ہوتا۔ تو ایسی عبادت کے لئے اپنی طرف سے ان چیزوں کی تعیین وتخصیص بھی ناجائز ہوگی، کسی غیر ثابت چیز کو بطورِ عبادت انجام دینے یا کسی ثابت شدہ عبادت میں اپنی طرف سے کیفیات واوقات کی تعیین وتخصیص کو شریعت کی اصطلاح میں بدعت کہتے ہیں جو باجماعِ امت حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، چنانچہ علامہ ابو اسحاق شاطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

لایصح ان یقال فی ما یتعبد به : أنه مختلف فيه علی قولین: هل هو علی

المنع ام علی الاباحۃ ۔۔ لأن التعبدیات انما وضع الشارع، فلا یقال فی صلوٰۃ سادسۃ مثلا انہا علی الاباحۃ ، فللمکلف وضعہا علی احد القولین ، لیتعبدبہا اللّٰہ، لأنہ باطل باطلاق"،(الاعتصام: ۱۰۳/ ۱)

ترجمہ:''عبادات کے متعلق یہ کہنا درست نہیں کہ ان کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ اصل کے اعتبار سے (دلیل آنے سے پہلے) ممنوع ہیں یا مباح، کیونکہ عبادات کو شارع (اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ) ہی نے مقرر کیا ہے (اور جو شریعت میں ثابت نہ ہو وہ عبادت نہ ہوگی بلکہ ناجائز وحرام کام ہوگا)، فرض کیجئے کہ اگر کوئی شخص چھٹی نماز ایجاد کرے تو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ''اصل اباحت ہے'' کے اصول سے اس کے لئے یہ کام جائز ہے اور اس کو اس طرح ایجاد کا حق ہے بلکہ اس کا یہ فعل مطلقاً باطل (اور شرعی رو سے قطعاً ناقابلِ اعتبار) ہے''۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے بدعت کی تعریف میں حضراتِ صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کی مخالفت کو بھی شامل کرلیا ہے، حالانکہ صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین غیر معصوم ہیں اور شارع نہیں ہیں، سوان کے افعال یا احوال کی مخالفت کو بدعت قرار دینا غلط ہے، شارع صرف نبی ﷺ ہیں، تو آپ ﷺ کے قول وفعل کی مخالفت تو بدعت ہے، لیکن صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین کے اقوال کی مخالفت بدعت نہیں ہے، دیکھئے!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جنبی کو جب پانی نہ ملے تو اس کے لیے تیمم کو جائز نہیں کہتے تھے (صحیح البخاری: ۳۴۶-۳۴۷) جبکہ پوری امت کے نزدیک جنبی کے لئے بھی تیمم کرنا جائز ہے، تو کیا اس مسئلہ میں حضرت عمر وحضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی مخالفت کرنے کی وجہ سے پوری امت بدعتی ہوگی؟

اسی طرح حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما ایامِ حج میں عمرہ کرنے سے منع کرتے تھے (صحیح البخاری: ۱۵۶۳، سنن ترمذی ۸۲۴) جبکہ پوری امت کے نزدیک ایامِ حج میں عمرہ کرنا جائز ہے اور ایامِ حج میں پوری امت عمرہ کرتی ہے، تو کیا حضرت عمر اور حضرت عثمان

رضی اللہ عنہما کی مخالفت کرنے کی وجہ سے پوری امت بدعتی ہوگی؟
اسی طرح حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس بات کا انکار کرتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے (صحیح مسلم: ۱۷۷)، جب کہ امت کی اکثریت کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے تو کیا امت کی اکثریت اس عقیدے کی وجہ سے بدعتی ہوگی؟
اسی طرح کئی مسائل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دوسرے صحابہ سے اختلاف تھا اور خود صحابہ کا بھی آپس میں مسائل میں اختلاف تھا، مثلاً تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین کرنے میں، آمین بالجہر میں، خون نکلنے سے وضو ٹوٹنے میں اور ایسے بہت سارے مسائل ہیں، تو ایک دوسرے کی مخالفت کی وجہ سے یہ صحابہ کرام بدعتی ہوگئے؟، اسی طرح تابعین کے درمیان بھی بے شمار مسائل میں اختلاف رہا ہے، تو کیا وہ بھی ایک دوسرے کی مخالفت کرنے کی وجہ سے بدعتی ہوئے؟۔
نیز ضربِ مؤمن کے مفتی صاحب نے ائمہ مجتہدین کی مخالفت کو بھی بدعت قرار دیا ہے جب کہ اکثر مسائل میں ائمہ مجتہدین کا ایک دوسرے سے اختلاف ہوتا ہے، اسی طرح ان کے مقلدین کا بھی دوسرے ائمہ مجتہدین سے اختلاف ہوتا ہے، تو ضربِ مومن کے مفتی صاحب کی اس تعریف کی بناء پر لازم آئے گا کہ پوری امت بدعتی ہو اور حرام اور گناہِ کبیرہ کی مرتکب ہو، العیاذ باللہ۔
نیز ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے اپنی خود ساختہ بدعت کی تعریف کی تائید میں علامہ ابو اسحاق شاطبی کی جو عبارت نقل کی ہے، اس میں بھی صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کی مخالفت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ عبادات صرف شارع کے مقرر کرنے سے ثابت ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ شارع صرف نبی ﷺ ہیں، صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین شارع نہیں ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ جمہور محققین نے بدعت کی تعریف میں صرف رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنے کو بدعت کہا ہے، علامہ سید محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز متوفی ۱۲۵۲ھ بدعت کی تعریف میں لکھتے ہیں:

بانها ما احدث علی خلاف الحق المتلقیٰ عن رسول اللہ ﷺ: من علم أو عمل

أوحال بنوع شبهة واستحسان، وجعل ديناً قويماً وصراطاً مستقيماً اه۔

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ سے جو برحق چیز منقول ہے، خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل ہو یا حال ہو، اس کے خلاف جس کام کو کسی قیاسِ خفی یا شبہ کی بناء پر ایجاد کیا جائے اور اس کو صحیح دین اور صراطِ مستقیم بنا لیا جائے، وہ بدعتِ سیئہ ہے“، (ردالمحتار علی الدر المختار: جلد ۲، ص: ۲۵۶، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ سید احمد طحطاوی حنفی متوفی ۱۲۳۲ھ نے بھی بعینہٖ بدعت کی یہی تعریف لکھی ہے۔

(حاشیہ الطحطاوی علی الدر المختار جلد ا، ص: ۲۴۳، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت ۱۳۹۵ھ)

علامہ حسن بن عمار شرنبلالی متوفی ۱۰۶۹ھ نے بھی بعینہٖ بدعت کی یہی تعریف لکھی ہے، (مراقی الفلاح، ص ۱۸۱، مطبوعہ مصطفی البابی مصر ۱۳۵۶ھ)۔

اور علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے:

البدعة بدعتان : بدعة هدى وبدعة ضلال ، فما كان فيه خلاف ما امرالله به ورسوله ﷺ فهو فی حیّزالذم والانکار۔

ترجمہ: ”بدعت کی دو قسمیں ہیں، بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ، جو کام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے احکام کے خلاف ہو، وہ مذموم اور ممنوع ہے“، (النہایۃ جلد ا ص: ۱۰۶ مطبوعہ مؤسسہ اسماعیلیان قم الطبعۃ الرابعہ ۱۳۶۴ھ)۔

علامہ طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ نے بھی بدعت کی اسی طرح دو قسمیں بیان کی ہیں، (مجمع بحار الانوار جلد ا ص: ۸۰ مطبوعہ مطبع نولکشور ہند)۔

علامہ جمال الدین ابن منظور متوفی ۷۱۱ھ نے بھی علامہ ابن اثیر کی مذکور الصدر پوری عبارت نقل کی ہے، (لسان العرب ج ۸ ص: ۶ مطبوعہ نشر ادب الحوزہ قم ایران ۱۴۰۵ھ)۔

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں: البدعة اصلها ما احدث على غير مثال سابق وتطلق فی الشرع علی مقابل السنة فتكون مذمومة۔

ترجمہ: ”لغت میں بدعت اس کام کو کہتے ہیں، جس کی پہلے کوئی مثال نہ ہو اور اصطلاحِ

شرع میں سنت کے مقابلے میں بدعت کا اطلاق ہوتا ہے، اس لئے یہ مذموم ہے"۔(فتح الباری جلد ۴ ص: ۷۸۲ مطبوعہ دار الفکر ۱۴۲۰ھ)۔

شیخ محمد بن علی شوکانی نے بھی حافظ ابن حجر کی اس عبارت کو نیل الاوطار (جلد ۳ ص: ۳۲۵ مطبوعہ مکتبۃ الکلیات الازہریہ طبعہ جدیدہ ۱۳۹۸ھ) میں نقل کیا ہے۔

ان کثیر عبارات سے یہ واضح ہوگیا کہ تمام مستند اور محقق علماء نے بدعت کی تعریف میں صرف رسول اللہ ﷺ کی مخالفت یا سنت کی مخالفت کا ذکر کیا ہے اور کسی نے بھی صحابۂ کرام، تابعین اور ائمہ مجتہدین کی مخالفت کو بدعت نہیں کہا، یہ صرف ضربِ مومن کے "مفتی" کی خودساختہ اور سینہ زاد رائے ہے اور یہ ان تمام دلائل سے باطل ہے، جو ہم نے اوپر ذکر کئے۔

نوٹ: علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے جو بدعت کی تعریف کی ہے، اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ کوئی عملِ خیر جو اپنی موجودہ ہیئت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے منقول یا ثابت نہیں ہے، لیکن اس کا منشا سنت میں موجود ہے، تو اسے بدعت (ضالّہ یا سیئہ) نہیں کہا جائے گا، مثلاً باجماعت نمازِ تراویح کا اہتمام اور ان میں قرآن مجید کی منزل کا پڑھنا، قرآن مجید کا ترتیب توقیفی کے مطابق مصحفِ مقدس میں جمع کرنا اور پھر اسے صرف ایک لغت قریش پر عام کرنا وغیرہ۔ اسی طرح جو چیز یا عملِ خیر اپنی موجودہ ہیئت کے ساتھ عہدِ خلافت راشدہ یا عہدِ صحابہ میں موجود نہیں تھا، لیکن اس کا منشا سنت میں موجود تھا، تو اسے بدعت (ضالّہ یا سیئہ) نہیں کہا جائے گا، جیسے مساجد میں محراب و مینار، ان تمام علوم کی ایجاد و تدوین (مثلاً صرف، نحو، معانی، بلاغت، بیان اور بدیع وغیرہ)، جن پر فہم قرآن و سنت کا مدار ہے، احادیث کی تنقیح اور ان کی صحیح، حسن، خبر متواتر، مشہور، خبر واحد، ضعیف، منکر، شاذ، معلّل وغیرہ میں تقسیم اور علم اسماء الرجال کی تدوین و ارتقاء وغیرہ، موجودہ انداز میں مدارس، دینی لٹریچر اور تبلیغی جماعتوں کا قیام، تداعی کے ساتھ تبلیغی اجتماعات کا قیام، فرقِ باطلہ ضالّہ کا رد، مدارس کے سالانہ، صد سالہ ڈیڑھ سو سالہ اجتماعات و جلسہ ہائے دستار بندی افتتاح بخاری و ختم بخاری و دیگر دروس کا اہتمام و اعلان وغیرہ۔

ضربِ مومن کے مفتی صاحب نے علامہ حلبی کی عبارت لکھی ہے کہ:

"قال الحلبی فی شرح المنیة :"وما یفعل بعد الصلوٰة فمکروہ، لأن الجهال یعتقدونها سنة اوواجبة ، وکل مباح یؤدی الی هذا فمکروہ۔"

علامہ حلبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ نمازوں کے بعد جو لوگ سجدۂ شکر کرتے ہیں، تو یہ مکروہ ہے، اس لئے کہ جاہل لوگ اس اجتماعی ہیئت کو سنت یا ضروری سمجھتے ہیں اور ہر مباح چیز جب اس کو سنت یا لازمی چیز کا درجہ دیا جائے، وہ مکروہ بن جاتی ہے۔ (ص:۶۱۷)

اس کا جواب یہ ہے:

علامہ حلبی کی یہ عبارت ہمارے خلاف نہیں ہے، کیونکہ ہم نمازِ جنازہ کا سلام پھیرنے اور صفیں توڑنے کے کچھ وقفے بعد اجتماعی دعا کرنے کو صرف مباح نہیں کہتے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابۂ کرام کا طریقہ کہتے ہیں، جیسا کہ ہم باحوالہ اس کو ثابت کر چکے ہیں، اور اس بناء پر ہم اس کو مستحب عمل کہتے ہیں اور علامہ حلبی کی یہ عبارت صرف مباح عمل کے متعلق ہے، لہٰذا یہ ہمارے خلاف نہیں ہے۔

ہم نے چن چن کر ضربِ مومن کے مفتی صاحب کے تمام اعتراضات کے جوابات لکھ دیئے ہیں اور ضربِ مومن کے مفتی صاحب کے تمام شبہات کا ازالۂ تامہ کر دیا ہے اور آفتاب سے زیادہ اس حقیقت کو روشن اور تابندہ کر دیا ہے کہ نمازِ جنازہ کا سلام پھیرنے کے بعد صفیں توڑ کر کچھ وقفے سے میت کے لئے ایصالِ ثواب کرنا اور اس کی مغفرت کی اجتماعی دعا کرنا جائز اور مستحسن ہے، بلکہ امام محمد کی کتب نوادر کے مطابق فقہاء متاخرین نے لکھا ہے کہ نماز جنازہ کے متصل بعد دعا کرنا جائز ہے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے باحوالہ بیان کر چکے ہیں، ہم اس کو فرض یا واجب یا لازم نہیں کہتے، بلکہ ہم اس کو مستحب کہتے ہیں۔ اور جو لوگ یہ اجتماعی دعا نہیں کرتے، ہم ان کو ملامت نہیں کرتے اور نہ برا کہتے ہیں، البتہ جو لوگ بغیر شرعی دلائل کے اس مستحب کام کو بدعت، ناجائز اور حرام کہتے ہیں، ان کا ردِ بلیغ کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے اپنے اس جواب میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

﴿كتاب الزكوة﴾

مسائلِ زکوٰۃ

سوال:38

ایسی جائیداد جس کی کرایہ کی آمدن سے ذاتی اخراجات پورے کیے جائیں۔اس کے بارے میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے، جبکہ کئی مرتبہ کچھ حصہ خالی بھی پڑا رہتا ہے،(میاں ظفر حسین f2, Clifton View, E3 Evenu Town)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں ایسی جائیداد (یعنی مکان یا دکان وغیرہ) جو کرائے پر دی ہوئی ہے، خواہ کبھی خالی بھی رہ جاتی ہو، اس کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔البتہ اس کے کرائے سے جو آمدنی ہورہی ہے، وہ آپ کی مجموعی آمدنی میں جمع ہوجائے گی، اور دورانِ سال تمام ذرائع سے جو آمدنی آپ کو حاصل ہوتی ہے، اور اس میں سے آپ کے اخراجات ہوتے رہتے ہیں، اختتام سال پر جس دن آپ اپنی زکوٰۃ کا حساب نکالیں گے، تمام ذرائع کی آمدنی سے جو مجموعی رقم بچ رہے گی، اس پر آپ کو زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔ہمارے ہاں تشخیص زکوٰۃ کے بارے میں ایک غلط تصور ذہنوں میں راسخ ہے کہ آمدنی یا جمع شدہ مال کی ہر ہر مد کے بارے میں الگ الگ سوال پوچھا جاتا ہے، یہ درست نہیں ہے۔کرایہ مکان، دکان، گودام، دکان وکاروبار، کارخانہ، انوسمنٹ کی نیت سے لئے ہوئے پلاٹس اور سونا، چاندی کے زیورات وغیرہ کی مالیت سمیت تمام ذرائع آمدن کو یکجا کر کے مجموعی مالیت نکالنا ہوتی ہے، سال کے دوران جو اخراجات ہوتے ہیں، وہ خود ہی منہا ہوجاتے ہیں، کیونکہ زکوٰۃ سال کے اختتام پر جو بچت ہے، اس پر ہوتی ہے۔

سوال:39

مندرجہ بالا کے علاوہ خالی پلاٹ جو کاروباری نقطہ نظر سے خریدے اور فروخت کیے جاتے ہیں۔ان کے بارے میں زکوٰۃ کا تعین کس طرح کیا جائے؟

جواب:

ان کی جو موجودہ ممکنہ قیمت فروخت ہے، اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔

سوال:40

میرا ارادہ آبائی گاؤں میں ذاتی زمین پر دینی مدرسہ قائم کرنے کا ہے۔ کیا اس کی تعمیر میں ذاتی یا کسی عزیز، دوست کی زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے؟، کیا کسی دینی مدرسہ کی تعمیر و توسیع میں زکوٰۃ کی رقم ادا کی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

مدرسہ کی تعمیر پر براہِ راست زکوٰۃ کی رقم استعمال کرنا درست نہیں، اور اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، ہاں کسی نادار مستحق زکوٰۃ شخص کو زکوٰۃ کی رقم دے دی ہو، اور اس کا مالک بننے کے بعد اپنی آزادانہ مرضی سے اسے ان کاموں پر خرچ کرنا چاہے، تو کرسکتا ہے۔
زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے، تملیک کا مطلب یہ ہے کہ مستحق زکوٰۃ کو مال زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے اور جہاں تملیک کی شرط نہ پائی جائے وہاں زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ زکوٰۃ کی رقم سے مسجد یا مدرسہ یا ان کے علاوہ کوئی ادارہ خواہ یتیم خانہ ہو یا ہسپتال شرط تملیک کے فقدان کی وجہ سے ناجائز ہے۔ اگر تعمیر مسجد یا مدرسہ کی ضرورت ہو اور تعمیری اخراجات کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو تو حیلہ کر کے زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے مسجد اور مدرسہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ حیلہ کی صورت یہ ہے کہ کسی مستحق کو زکوٰۃ یا فطرے کی رقم دے دی جائے اور وہ اپنے قبضے میں لینے کے بعد اپنی رضا و رغبت سے فقیر وہ رقم تعمیر مسجد یا مدرسہ کیلئے دے دے۔ پھر اس رقم سے مسجد اور مدرسہ تعمیر کرنا درست ہوگا۔

درمختار جلد دوم ص 12 پر ہے:

وحیلة التکفین بها التصدق علی فقیر ثم هو یکفن فیکون الثواب لهما و کذا فی تعمیر المسجد الخ۔

مسئلہ زکوٰۃ

سوال:41

مجھے آپ سے زکوٰۃ کے بارے میں ایک مسئلے کا حل درکار ہے، مفتی صاحب میری مالی حالت صحیح نہیں ہے اور گھر میں کوئی زیور وغیرہ بھی نہیں ہے اور میں 30,000/ روپے کا مقروض ہوں۔ میری بچی ایک ادارے میں قرآن پاک حفظ کر رہی ہے، اور اس ادارے کی ماہانہ فیس ایک ہزار روپے ہے، جو کہ مجھے ادا کرنا ہوتی ہے، لہٰذا کیا میں زکوٰۃ لے سکتا ہوں یا نہیں؟، (فرید خان، گاؤں شرینگل ضلع دیر صوبہ سرحد)۔

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ کے پاس ضروریاتِ زندگی سے 612ء36 گرام چاندی کی مروجہ قیمت کے برابر بھی رقم فاضل نہیں ہے، تو آپ مستحقِ زکوٰۃ ہیں اور آپ کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور آپ زکوٰۃ لے سکتے ہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مسئلہ زکوٰۃ

سوال:42

میرے دو بڑے مسئلے ہیں جن کی وجہ سے میری گھریلو زندگی بہت متاثر ہے گھر میں اکثر ناچاقی رہتی ہے۔ میری شادی کو اس ماہ 15 سال ہو جائیں گے لیکن میں نے آج تک اپنے زیور کی زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے میرے پاس دونوں طرف سے ملا کر 40-35 تولے سونا ہے۔ شروع میں ہمارے حالات ایسے نہیں تھے کہ ہم زکوٰۃ ادا کرتے، میرے شوہر کی اُس وقت ساڑھے تین ہزار روپے تنخواہ تھی۔ میں نے اپنے شوہر سے دو، تین بار کہا کہ آپ ہر ماہ مجھے (جتنی سہولت ہو) زکوٰۃ کے نام کے پیسے دے دیا کریں، سال کے آخر میں جتنی کمی ہوگی ہم کوئی زیور بیچ کر ادا کر دیں گے لیکن وہ نہیں مانتے۔ ان کے والدین بھی ساتھ ہی تھے لیکن والد اچھا کماتے تھے۔ دس سال تک ہمارے حالات ٹھیک نہیں رہے گذشتہ 5 سالوں سے اللہ کا بہت کرم ہے اس کا شکر ہے کہ حالات بہتر ہیں، لیکن میرے شوہر کہتے ہیں

کہ میں گذشتہ 10 سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کروں گا، وہ مجھ پر فرض نہیں ہے، نہ میرا جیب خرچ دیتے ہیں، نہ ہی میرا کوئی ذریعۂ آمدنی ہے، میں کہاں سے زکوٰۃ ادا کروں، اگر ہر سال زیور بیچتی رہی تو بچیوں کیلئے کیا رکھوں گی۔ برائے مہربانی شرعاً بتائیں کہ میرے اور میرے شوہر کے لئے کیا حکم ہے؟، (عالیہ، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ**

ترجمہ: ''(اے حبیب ﷺ!) آپ مومنوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) لیجئے تاکہ اس کے ذریعے آپ ان کے ظاہر و باطن کو پاک وصاف کریں''، (التوبہ:103)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی مال ہی میں سے ہوگی، اگر نقد رقم موجود نہ ہو تو سونے، چاندی ہی میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

حدیث مبارک ہے:عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ان امراة اتت رسول الله ﷺ، ومعها ابنة لها، وفي يدِ ابنتها مسكتان غليظتان من ذهب،فقال لها: اتُعطين زكاة هذا ؟ قالت: لا ،قال: "ايَسُرُّكِ ان يسورك الله بهما يوم القيمة سوارين من نار ؟ قال: فخلعتهما فالقتهما الى النبي ﷺ وقالت: هما لله ولرسوله"۔

ترجمہ: ''عمرو بن شعیب اپنے والد عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے موٹے اور بھاری کنگن تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم ان کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ اس نے عرض کیا ''نہیں'' حضور ﷺ نے فرمایا ''تو کیا تم اس بات پر خوش ہوگی کہ اللہ تعالیٰ (زکوٰۃ نہ دینے کی بناء پر) ان کنگنوں کے عوض قیامت کے دن تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟ یہ (وعید عذاب) سنتے ہی اس نے وہ کنگن اتار کر رسول اللہ ﷺ کو دے دیئے اور عرض کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ

کے لئے ہیں (یعنی یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں صدقہ ہیں)۔

(سنن ابی داؤد، جلد ۲، رقم الحدیث ۱۵۵۸، مطبوعہ موسسہ الریان، بیروت)

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال بڑھتا ہے، یہ خیال کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال گھٹتا ہے، نرا ضعفِ ایمان ہے، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ ترجمہ: اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، (البقرہ: ۲۷۶)۔

بعض درختوں میں کچھ اجزائے فاسدہ اس قسم کے پیدا ہو جاتے ہیں کہ پیڑ کی اٹھان کو روک دیتے ہیں، احمق نادان انھیں نہ تراشے گا کہ میرے پیڑ سے اتنا کم ہو جائے گا، پر عاقل ہوشمند تو جانتا ہے کہ ان کے چھانٹنے سے یہ نونہال لہلہا کر درخت بنے گا ورنہ یوں ہی مرجھا کر رہ جائے گا، یہی حساب زکوٰتی مال کا ہے۔ حدیث میں حضور پرنور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں،''ما خالطت الصدقة اومال الزكوٰة مالا الّا افسدته۔ رواه البزار والبيهقى عن ام المومنين الصديقة رضى الله تعالىٰ عنها۔ ترجمہ: زکوٰۃ کا مال جس مال میں ملا ہوگا اسے تباہ و برباد کر دے گا اسے بزار اور بیہقی نے ام المومنین الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا، (فتاویٰ رضویہ جلد 10 ص: 172، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)

جو مقدار سونے کی آپ نے بیان کی، آپ پر اس کی زکوٰۃ فرض ہے، اگر زکوٰۃ کی ادائیگی کا کوئی دوسرا ذریعہ آپ کے پاس نہیں تھا تو آپ اسی سونے میں سے چالیسواں حصہ (1/40 یا 2.5 فیصد) زکوٰۃ ادا کرتی رہتیں۔ قرآن کے صریح حکم کا مطلب یہ ہے کہ جو مال (سونے، چاندی، نقد یا مالِ تجارت کی صورت میں) آپ کے پاس ہے، ہر اسلامی قمری سال کے اختتام پر اس میں سے زکوٰۃ ادا کریں، یعنی اس سونے کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دیں، نقد رقم کی صورت میں زکوٰۃ ادا کرنا ضروری نہیں ہے، نقد رقم کی صورت میں ادائیگی تو ہم اپنی سہولت کیلئے کرتے ہیں، کیونکہ ہم سونے یا زیور کو اسی شکل میں باقی رکھنا چاہتے ہیں، لہٰذا گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بدستور آپ پر واجب الادا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اگر آپ

کے پاس اور کوئی نقد رقم ان برسوں میں فاضل نہیں بچی تو آپ زکوٰۃ کا حساب اس طرح کریں گے کہ مثلاً سونا 100 گرام ہے تو سال اول کے اختتام پر 2.5 گرام زکوٰۃ لازم ہوگئی، اب اگلے سال 97.5 گرام کی زکوٰۃ آپ کے ذمہ ہے، اسی طرح سے سال بہ سال کا حساب ہوگا۔ بچیوں کیلئے زکوٰۃ روک کر بچانا آپ پر شرعاً لازم نہیں ہے، اگر سونے کی ملکیت آپ کے نام ہے، تو زکوٰۃ بھی آپ کے ذمہ ہے، شوہر پر لازم نہیں، وہ اس سلسلہ میں آپ سے تعاون کریں تو ان کی مہربانی ہے، اور خوشگوار عائلی زندگی کا مدار باہمی مروت اور فضل واحسان پر ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ احسان کا برتاؤ کریں اور جن بچیوں کیلئے آپ سونا بچا کر رکھنا چاہتی ہیں، وہ ان کی بھی اولاد ہے، لیکن جس سونے کی زکوٰۃ دنیا میں ادا نہ کی گئی ہو تو اس کے بارے میں قرآن وحدیث میں سخت وعید ہے کہ اسے آگ میں گرم کر کے اس سے داغا جائے گا۔

زکوٰۃ، فطرہ، صدقات واجبہ اور قربانی کی کھال کے مصارف

سوال:43

زکوٰۃ، فطرہ، صدقات واجبہ اور قربانی کی کھالیں ایسے مدرسہ میں جس کی تعمیر ہو رہی ہے۔ فی الحال اس میں محلے کے بچے پڑھ کر گھر چلے جاتے ہیں البتہ اس میں باقاعدہ اقامتی طلبہ رکھنے کا ارادہ ہے۔ جن کے تمام اخراجات کا مدرسہ ذمہ دار ہوگا۔ ایسے مدرسہ میں زکوٰۃ، فطرہ، صدقات واجبہ اور قربانی کی کھالیں دی جاسکتی ہیں، (علی زمان، اورنگی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے تملیک فقیر شرط ہے جہاں تملیک نہ پائی جائے وہاں زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ تملیک کا مطلب یہ ہے کہ، مستحق زکوٰۃ کو مال زکوٰۃ کا مالک بنایا جائے عالمگیری جلد اول'' صفحہ ۱۷۷'' پر ہے۔ ولا یجوز أن یبنی بالزکاۃ المسجد و کذا القنا طرو السقایات.......... و کل مالا تملیک فیہ الخ۔

صورت مسئولہ عنہا میں زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم مذکورہ مدرسے میں نہیں لگ سکتی۔

﴿کتاب الصّوم﴾

اعتکاف رمضان المبارک

سوال :44

دوران اعتکاف معتکف کا بلاضرورت مسجد سے باہر نکلنا منع ہے، کیا یہ درست ہے کہ وضو خانہ، غسل خانہ، استنجا خانہ مسجد کی حدود میں شمار نہیں ہوتے ؟، (عبدالرزاق، کوئٹہ)۔

جواب:

وضو خانہ اور استنجا خانہ اگر مسجد سے متصل ہوں تو وہ فنائے مسجد میں داخل ہوں گے۔ اور فنائے مسجد کا بھی وہی حکم ہے، جو مسجد کا ہے۔ اگر معتکف فنائے مسجد میں چلا جائے، تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

والفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد الخ۔

ترجمہ: "فنائے مسجد، مسجد کے تابع ہوتی ہے اور اس کا حکم مسجد کے حکم میں ہے"، (فتاویٰ عالمگیری جلد دوم ص462)۔

معتکف کا محراب مسجد میں جانا

سوال :45

پنجاب، بلوچستان، سرحد وغیرہ میں سردی کافی پڑتی ہے اور دیہات میں کئی مساجد کا محراب آگے بڑھا ہوتا ہے اور اس کے دائیں بائیں کچھ حصہ خالی ہوتا ہے۔ سردی سے بچاؤ کی خاطر معتکف جو تنہا ہوتا ہے اس اگلے حصہ میں محراب کے برابر بستر لگا دیتا ہے، کیا ایسی حالت میں اعتکاف صحیح ادا ہو جائے گا، (عبدالرزاق، کوئٹہ)۔

جواب:

مسجد بجمیع اجزائہٖ مسجد ہے اور محراب بھی مسجد کا حصہ ہے لہٰذا محراب میں جانے سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح محراب کے دائیں بائیں جو حصہ خالی ہے، وہ بھی مسجد کا حصہ ہونے کی وجہ سے مسجد کے حکم میں ہے، لہٰذا وہاں لیٹنے سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔

حالت اعتکاف میں غسل مسنون کا مسئلہ

سوال:46

دس دن اعتکاف کے دوران جمعۃ المبارک بھی آتا ہے، کیا جمعہ کیلئے غسل (اگرچہ واجب نہ ہو) کیا جاسکتا ہے؟، (عبدالرزاق، کوئٹہ)۔

جواب:

معتکف کیلئے غسل جنابت کے علاوہ غسل کیلئے مسجد یا فنائے مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ شرعی ضرورت نہیں ہے، اور معتکف یا تو شرعی ضرورت کیلئے مسجد سے نکل سکتا ہے، جیسے وضو کرنا، غسل واجب ادا کرنا یا طبعی ضرورت جیسے قضائے حاجت کیلئے جانا۔

مسجد کے اندر رہتے ہوئے معتکف کا ٹوٹی پر ہاتھ دھونا

سوال:47

کھانا/ افطار و سحری کے بعد اگر باوضو ہیں۔ کیا وضو کی جگہ جا کر ہاتھ دھو سکتے ہیں اور کلی کر سکتے ہیں یا ایک پاؤں ممکن ہو تو مسجد کے اندر رہنا لازم ہے؟ (عبدالرزاق، کوئٹہ)۔

جواب:

مسجد کے اندر کھڑے یا بیٹھے ہوئے وضو خانے کی ٹوٹی سے ہاتھ دھونا یا کلی کرنا جائز ہے، بشرطیکہ مسجد سے باہر نہ جائے، واللہ اعلم بالصواب۔

﴿کتابُ الحج﴾

حج کا بیان

سوال:48

حج کن لوگوں پر فرض ہے؟،(یاسر رحمٰن،نکیال آزاد کشمیر)۔

جواب:

حج، ہر اُس عاقل و بالغ مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، جو اس کے ادا کرنے کی کامل استطاعت رکھتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۷﴾

ترجمہ:" اور بیت اللہ کا حج کرنا ان لوگوں پر اللہ کا حق ہے جو اس کے راستہ کی استطاعت رکھتے ہوں اور جس نے (اس فریضۂ ربانی کا قولاً یا عملاً) انکار کیا تو بلا شبہ اللہ سب جہانوں سے بے نیاز ہے"، (آل عمران:۹۷)۔ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

من لم یمنعه من الحج حاجة ظاهرة او سلطان جائراو مرض حابس فمات فلم یحج فلیمت ان شاء یهودیااو نصرانیا۔

ترجمہ:" جس کو کسی ظاہری حاجت یا ظالم حاکم یا سفر سے رکاوٹ بننے والی بیماری نے حج سے نہ روکا ہو، اور (عذرِ شرعی نہ ہونے کے باوجود) وہ حج کئے بغیر وفات پا گیا ہو، تو (اس کی مرضی) چاہے یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے"۔

یہ وعید شدید وعید کے کلمات ہیں، یعنی عملاً اس میں اور کسی یہودی یا نصرانی میں کیا فرق ہے۔

استطاعت

سوال:49

استطاعت سے کیا مراد ہے؟۔

جواب:

اگر کسی عاقل وبالغ مسلمان مرد و عورت کی ملک میں اپنی حاجات اصلیہ (مثلاً رہائش کیلئے مکان مع بنیادی ضروریات، سواری، اگر وہ کسی پیشے سے وابستہ ہے تو اس کی ضرورت کے آلات اور ایامِ حج کے دوران اس کے زیرِ کفالت افراد کا نفقہ وغیرہ) کے علاوہ اتنا فاضل مال موجود ہے کہ وہ اس کی جائے اقامت سے حرمین طیبین روانگی اور واپسی تک کے مصارفِ سفر اور مدتِ حج کیلئے خوراک ورہائش اور سواری وغیرہ کیلئے کافی ہے، تو اس پر حج فرض ہے۔ شرعی طور پر یہ استطاعت ایامِ حج میں وجوبِ حج کیلئے معتبر ہے، لیکن چونکہ آج کل حکومت بہت پہلے حج کے لئے درخواستیں اور تمام مصارف پر مشتمل رقوم جمع کراتی ہے، لہٰذا اب اُس وقت یہ استطاعت وجوب حج کیلئے معتبر ہوگی۔

اگر کوئی عاقل وبالغ مسلمان مرد یا عورت صاحبِ استطاعت ہے، لیکن وہ بعض موذی امراض یا جسمانی نقص کی وجہ سے (جیسے بینائی سے محرومی، کسی ایک یا دو ٹانگوں سے محروم ہونا یا دیگر امراضِ شدیدہ جن کی بناء پر) وہ سفر کے قابل نہیں ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنی زندگی میں اپنا حج بدل کرائے یا موت سے پہلے اس کی وصیت کرے، ورنہ عنداللہ جواب دہ ہوگا۔ فقہ حنفی کی رو سے عورت کیلئے استطاعت اور وجوبِ حج کی دیگر شرائط وہی ہیں جو مردوں کیلئے ہیں، لیکن ایک شرط زائد ہے اور وہ شوہر یا محرم (نسب، رضاعت یا مصاہرت کے رشتے سے ایسا قریبی مرد رشتہ دار جس سے نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہو) کی رفاقت کا میسر ہونا۔ اگر عورت صاحبِ استطاعت ہے لیکن اسے شوہر یا محرم کی رفاقتِ حج میسر نہیں ہے تو اس پر حج کی فوری ادائیگی فرض نہیں ہے۔ اس پر فقہاء نے بحث کی ہے کہ اگر استطاعت والی عورت کو زندگی بھر حج کی ادائیگی کیلئے شوہر یا محرم کی رفاقت میسر نہیں آتی تو آیا اس پر فرض حج بدل کی وصیت لازم ہے؟، اس سلسلے میں راجح اور مختار قول یہ ہے کہ اس پر حج بدل کی وصیت لازم ہے، کیونکہ شوہر اور محرم کی رفاقت نفسِ وجوبِ حج کی شرط نہیں ہے بلکہ "وجوبِ ادا" کی شرط ہے۔ اس مسئلے پر بھی فقہاء نے بحث کی ہے کہ اگر اس کے پاس اتنا

اضل مال موجود ہے کہ وہ شوہر یا محرم کے مصارفِ حج ادا کر سکتی ہے تو آیا اس پر لازم ہے کہ ایسا کرے؟ مختار قول یہ ہے کہ اس پر شرعاً ایسا کرنا لازم نہیں ہے، لیکن اگر وہ ان کو ان کی رضی کے برعکس جانے پر مجبور کرے تو ان کا خرچ دینا ہوگا۔ اگر ایامِ حج میں عورت عدتِ طلاق یا عدتِ وفات میں ہے تو اس سال اس پر حج فرض نہیں ہے، اگر چلی گئی تو حج تو ادا ہو جائے گا لیکن شرعی حکم کی خلاف ورزی پر گناہ گار ہوگی۔

عمرہ ادا کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا

سوال: 50

جناب آپ سے عمرے کے بارے میں معلوم کرنا ہے، میرے پاس اتنے پیسے ہیں جن سے میں عمرہ کر سکتا ہوں، آگے امید بھی نہیں کہ ساری عمر میرے پاس حج کے لیے پیسے جمع ہوں، مجھے روضۂ رسول ﷺ دیکھنے کا بہت شوق ہے، ایک حاجی صاحب نے مجھے بتایا ہے، کہ اگر آپ عمرہ کریں گے تو اسی سال آپ کو حج بھی کرنا ہوگا جس سال آپ نے عمرہ کیا ہو، اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے، ارشاد فرمائیں، (رستم خان، گاؤں کانگڑہ ڈاکخانہ کانگڑہ کالونی تحصیل و ضلع ہری پور، ہزارہ)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے اگر آپ کو عمرہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے تو آپ عمرہ ادا کر لیجئے اور یہ سعادت حاصل کیجئے، لوگوں کا یہ گمان یا مفروضہ بالکل غلط ہے کہ عمرہ ادا کرنے سے اسی سال حج ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے، حج کی فرضیت کی شرط ''استطاعت'' ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ: ''اور بیت اللہ کا حج کرنا ان لوگوں پر اللہ کا حق ہے جو اس کے راستہ کی استطاعت رکھتے ہوں اور جس نے (اس فریضۂ ربانی کا قولاً یا عملاً) انکار کیا تو بلاشبہ اللہ سب جہانوں

سے بے نیاز ہے''،(آل عمران:٩٧)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عن علی قال قال رسول اللّٰہ ﷺ من ملک زاداً وراحلةً الیٰ بیت اللّٰہ ول
یحج فلا علیہ ان یموت یھودیا او نصرانیا ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جوشخص بیت اللہ تک پہنچنے کیلئے زادِ راہ (یعنی مصارف سفر) اور سواری کا مالک ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔

(ترمذی، کتاب الحج، رقم الحدیث:١٢

باقی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناامید نہ ہوں، بلکہ حرمین طیبین میں جا کر دعاء کریں کہ اللہ تعا مجھے حج کا موقع نصیب فرمائے اور قبولیت دعاء کی بھی امید رکھیں ۔ بلکہ بیت اللہ سے واپسی کے موقع پر الوداع کہتے وقت جو مستحسن دعائیں تعلیم فرمائی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

اللھم لا تجعل ھذہ الزیارة اخرالزیارات ۔

''اے اللہ! ازراہِ کرم میری اس حاضری اور زیارت بیت اللہ کو آخری حاضری نہ بنانا''۔
یعنی مجھے زندگی میں بار بار زیارت حرمین طیبین کی حاضری کی سعادت نصیب فرما۔

خواتین کا محرم کے بغیر حج

سوال :51
کسی خاتون کو حج اور عمرہ کیلئے محرم کا ساتھ لے جانا کن شرعی احکامات کے تح ضروری ہے؟، (کامران خان، کراچی)۔

جواب:
خواتین کے لئے فرضیت حج کی جو شرائط ہیں، وہ وہی ہیں جو مردوں کیلئے ہیں، مسلمان، عاقل و بالغ اور صاحب استطاعت ہونا، یعنی مصارف سفر برداشت کرنے کی

استطاعت رکھنا اور اگر اس کی کفالت میں اہل وعیال ہیں تو حج کی روانگی سے لے کر واپس گھر پہنچنے تک ان کی ضروریات کیلئے بھی رقم موجود ہو۔ عورت کیلئے ایک شرط زائد ہے کہ اسے سفر حج کے دوران اپنے شوہر یا کسی محرم کی رفاقت میسر ہو۔ محرم سے مراد نسب، رضاعت (دودھ شریک کا رشتہ) یا مصاہرت (IN LAWS) کے رشتے سے ایسے قریبی رشتہ دار ہیں، جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرام ہو، جیسے باپ، چچا، ماموں، بیٹا، بھتیجا، بھانجا، داماد، خسر، دودھ کے رشتے سے بھائی، باپ وغیرہ۔

یہ شرط محض سفر حج کیلئے نہیں ہے بلکہ مطلقاً ہر اس سفر کیلئے ہے جو قدیم ذرائع سفر کے اعتبار سے تین دن کی مسافت پر محیط ہے اور جس کی مقدار 61 میل 240 گز یا 98٫734 کلومیٹر ہے، لہٰذا اگر کوئی خاتون اس سے کم مسافت سے حج کیلئے جائے، مثلاً جدہ، مکۃ المکرمہ یا دیگر قریبی مقامات سے، تو وہ تنہا بھی حج کر سکتی ہے، جیسے کسی اور مقصد کیلئے تنہا کم مسافت کا سفر کر سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: عن ابن عمر؛ ان رسول اللہ ﷺ قال: "لاتسافر المراۃ ثلاثا، الا ومعھا ذو محرم"۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت بغیر محرم کے تین دن کا سفر نہ کرے"، (صحیح مسلم، حدیث نمبر: 3200)۔

شوہر یا محرم کی رفاقت کے بغیر براہِ راست سفرِ حج کی ممانعت کا حکم بھی حدیث میں ہے:

عن ابن عباس قال: قال النبی ﷺ لاتحجن امراۃ الا ومعھا ذو محرم۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت بغیر محرم کے ہرگز حج نہ کرے"، (سنن دارقطنی، جلد 2 ص: 223 مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)۔

فقہاء امت میں سے امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت، امام احمد بن حنبل کا یہ مسلک ہے کہ عورت کسی بھی صورت میں محرم یا شوہر کی رفاقت کے بغیر سفر حج پر نہیں جا سکتی۔ امام مالک بن انس کے نزدیک وہ عورتوں کی جماعت کے ساتھ اگر اپنے آپ کو محفوظ تصور کرے تو فرض حج پر

جاسکتی ہے، نفلی حج پر نہیں اور امام محمد بن ادریس شافعی کے نزدیک اگر عورت خود کو محفوظ تصور کرے تو عورتوں کی جماعت کے ساتھ مطلقاً حج پر جاسکتی ہے، خواہ فرض ہو یا نفل۔

روانگیٔ حج سے پہلے اگر ماہواری کا خون آجائے تو کیا کرنا چاہئے

سوال: 52

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی خاتون کو جو کہ حج پر جانے کے لئے تیاری کر رہی ہے اگر روانگی سے پہلے ماہواری کا خون آجائے تو وہ کیا کریگی، آیا وہ احرام باندھ سکتی ہے یا نہیں؟، (مولانا زاہد اللہ عادل، جامع مسجد اقصیٰ الیف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے حیض ونفاس احرام سے مانع نہیں ہیں۔ ایسی عورت کو چاہئے کہ احرام باندھنے سے پہلے نہا لے اور احرام باندھ لے اور حج کے لئے روانہ ہوجائے۔

فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 222 پر ہے:

واذا اراد الاحرام اغتسل أو توضأ والغسل افضل الا ان هذا لغسل للتنظيف حتى تؤمر به الحائض كذا فى الهداية ويستحب فى حق النفسآء والصبى الخ۔

عمرہ ادا کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا، بھائی کو نفلی عمرہ کرانا جائز ہے۔

بھائی سے قطع تعلق کرنا

سوال: 53

میری عمر تقریباً چالیس سال ہے۔ غیر شادی شدہ ہوں گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ والدین حیات نہیں ہیں۔ بڑے بھائی کے ساتھ رہتی ہوں، جنھوں نے ہماری پرورش، تعلیم اور دیگر اخراجات اٹھائے۔ ملازمت کے بعد میں بھی حتی الامکان مالی اور گھریلو کام میں تعاون کی کوشش کرتی ہوں، دو بھائی اور دو بھتیجے ہیں ایک کی عمر ۲۰ سال

(زیرِ تعلیم) اور دوسرے کی نو (۹) ماہ ہے، ان کے علاوہ میرے اور کوئی محرم (چچا، ماموں، وغیرہ) نہیں ہیں۔ اس سال ۲۰۰۸ء میں الحمدللہ حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے، بڑے بھائی کے ساتھ۔ اب میرے چھوٹے بھائی جو گورنمنٹ ملازم (تنخواہ 6 ہزار) ہیں، عمرہ کرنے جارہے ہیں۔ میں بھی اپنے خرچے پر ان کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ کچھ سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔ صحیحین میں ہے: آپ ﷺ نے فرمایا! ''ایک عمرے کے بعد دوسرا عمرہ کرنا درمیان کے گناہوں کے لئے کفارہ ہے'' یہ حکم حج کے ایام کے عمرے کے بارے میں ہے یا عام دنوں کے، کیا یہ صرف مردوں اور شادی شدہ عورتوں کے بارے میں ہے۔ یا غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی استطاعت رکھنے پر ایک سے زائد بار عمرے کے لیے جاسکتی ہیں۔ عمرہ نفلی عبادت ہے یا سنت ہے۔ ۱۔ کیا حج ادا کرنے کے بعد غیر شادی شدہ لڑکی عمرہ نہیں کرسکتی؟، کیوں کہ آئندہ بہ ظاہر دونوں کے جانے کے کوئی امکان نہیں اور میری شادی کا بھی ابھی کوئی سلسلہ یا امکان نہیں۔ ۲۔ کیا میں یا کوئی اور ثواب کی نیت سے بھائی کے عمرے کے اخراجات میں مالی تعاون کرسکتے ہیں؟۔

۳۔ کیا بھائی کے اوپر جو صاحب نصاب نہیں عمرہ ادا کرنے کے بعد حج فرض یا لازم ہوجائے گا؟، کیا وہ ابھی عمرہ کرسکتے ہیں؟

۴۔ چھوٹے بھائی کی شادی کو تین سال ہوگئے، کچھ گھریلو حالات کے سبب چھوٹے بھائی کو شادی کے ایک سال بعد علیحدہ کردیا کہ ان کی دیکھ بھال اور ذمہ داری اٹھانے کا بڑے بھائی کا کوئی شرعی اور معاشرتی فرض نہیں (بڑے بھائی کا کہنا تھا)؟۔

۵۔ اب صورتحال یہ ہے کہ میرے بڑے بھائی، میرے چھوٹے بھائی کے گھر زیادہ جانا اور ان کے گھر رہنا پسند نہیں کرتے (کہ وہ علیحدہ کیوں ہوئے، حالانکہ یہ شرعی حق ہے) وہ لوگ (چھوٹے بھائی) ہمارے گھر آتے ہیں، شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے۔

۶۔ کیا بڑے بھائی کو یہ حق ہے کہ وہ مجھے اپنے سگے بھائی کے گھر جانے سے صرف اس وجہ سے روکیں کہ وہ علیحدہ کیوں ہوئے؟، کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا میرے ساتھ حق تلفی

ہے؟،(حفصہ بی بی، کراچی)۔

جواب:

کسی غیر شادی شدہ خاتون پر حج سے پہلے اور حج کے بعد عمرہ ادا کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، بشرطیکہ اسے محرم کی رفاقت میسر ہو، اسی طرح غیر شادی شدہ لڑکیاں ایک سے زائد عمرے بھی ادا کرسکتی ہے۔

(۲) کوئی بھی شخص کسی بھی شخص کو حصولِ اجر وثواب کے لئے عمرہ کراسکتا ہے، حج بھی کراسکتا ہے، ان کے درمیان قرابت کا رشتہ ہو تب بھی، نہ ہو تب بھی۔

(۳) جو شخص حج کرنے کی مالی استطاعت نہیں رکھتا، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے محض عمرہ ادا کرلے، تو محض عمرہ ادا کرنے سے اس پر حج فرض نہیں ہوجاتا، تاوقتیکہ وہ حج کی مالی استطاعت کا مالک ہوجائے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن سلیمان بن عامر قال قال رسول اللہ ﷺ : الصدقة علی المسکین صدقة وھی علی ذی الرحم ثنتان صدقة و صلة۔

ترجمہ: ''حضرت سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (عام) مسکین پر صدقہ کرنا، ایک صدقہ ہے (یعنی ایک نیکی ہے) اور قرابت دار (مسکین) پر یہی صدقہ کرنا دہری نیکی ہے، یعنی (ایک تو) صدقہ کی نیکی اور (دوسری) صلۂ رحمی کی''، (مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور سنن دارمی، ص:171)۔

(۴) چھوٹا بھائی عاقل وبالغ ہو تو اس کی کفالت کی ذمہ داری بڑے بھائی پر نہیں ہے، ہاں اگر ایک بھائی ضرورت مند ہو اور دوسرا اس کی بقدر ضرورت اعانت کرے تو وہ دہرے اجر کا مستحق ہوگا، ایک انفاق فی سبیل اللہ اور دوسرا صلۂ رحمی کا۔

(۵) دو بھائیوں کا الگ رہنا کوئی معیوب بات نہیں ہے، مگر قطع تعلق کرنا ''قطع رحمی'' ہے اور یہ شریعت میں منع ہے، مصروفیات کی بناء پر کم ملنا اور بات ہے اور جان بوجھ کر قطع تعلق کرنا جدا بات ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

(1) عن جبیر بن مطعم قال: قال رسول اللہ ﷺ لا یدخل الجنۃ قاطعٌ۔

ترجمہ: "حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قطعِ رحمی کرنے والا (یعنی قرابت کے رشتے کو توڑنے والا) جنت میں داخل نہیں ہوگا"۔

(مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری وصحیح مسلم، ص:419)

(2) عن عائشۃ ان رسول اللہ ﷺ قال: لایکون لمسلمٍ ان یھجر مسلماً فوق ثلاثۃٍ فاذا لقیہٗ سلّمہ علیہ ثلاث مراتٍ کل ذلک لا یردّ علیہ فقد باء باثمہٖ۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے قطعِ تعلق کرے، لہٰذا جب وہ اس سے ملے تو اسے (یکے بعد دیگرے) تین بار سلام کرے، (اور اگر) ہر بار (دوسرا بھائی سلام کا) جواب نہ دے، تو (سلام کرنے والا بریُ الذمہ ہو جائے گا اور) اب آئندہ جاری رہنے والے قطعِ تعلق کا سارے کا سارا گناہ اسی پر ہوگا (جس نے تین بار سلام کا جواب نہیں دیا)"، (مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابوداؤد، ص:428)۔

(۲) بڑے بھائی کا بہن پر چھوٹے بھائی سے ملنے پر پابندی عائد کرنا یا اس کے باعث ناراض ہونا، ناجائز بات ہے، انہیں اس روش کو ترک کر دینا چاہیے، کیونکہ اس طرح کا اصرار یا پابندی لگانا، رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی صریح خلاف ورزی ہے اور دوسرے کو گناہ پر ابھارنا یا مجبور کرنا ہے۔

خواتین کیلئے حج وعمرے کی شرائط

سوال:54

آپ سے ایک گزارش ہے کہ میں اور میری فیملی عمرے کیلئے جانا چاہتے ہیں، میرے ہمراہ میری والدہ، میری بیوی اور میرا ایک بچہ جو 6 سال کا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے ساتھ میری ساس اور میری سالی بھی جانا چاہتے ہیں، کیونکہ نہ تو میرے سسر زندہ ہیں

اور نہ ہی ان کا کوئی بیٹا ہے،(اعجاز، 441/15 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

خواتین کیلئے حج وعمرے کی وہی شرائط ہیں، جو مردوں کیلئے ہیں، ہاں!ایک شر
زائد ہے کہ اسے سفرِ حج کے دوران اپنے شوہر یا کسی محرم کی رفاقت میسر ہو۔محرم سے م
نسب، رضاعت (دودھ شریک کا رشتہ) یا مصاہرت کے رشتے سے ایسے قریبی رشتہ د
ہیں، جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرام ہو، جیسے باپ، چچا، ماموں، بی
بھتیجا، بھانجا، داماد، خسر اور دودھ کے رشتے سے بھائی، باپ وغیرہ۔

امام علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:

واما الذی یخص النساء فشرطان:احدھما:ان یکون معھا زوجھااو محرم ل
فان لم یوجد احدھمالا یجب علیھا الحج۔

ترجمہ: اور عورتوں کے لئے دو شرطیں خاص ہیں، ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کا شو
یا اس کا محرم اس کے ساتھ ہو، پس اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو نہ پائے تو اس پ
واجب نہیں، دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ثم صفة المحرم أن یکون ممن لایجوز له نکاحھاعلی التابید اما بالقرابة
الرضاع أو الصھریة لأن الحرمة المؤ بدة تزیل التھمة فی الخلو
ولھذاقالوا:ان المحرم اذا لم یکن مامونا علیه لم یجز أن تسافر معه۔

ترجمہ: ''محرم وہ شخص ہے جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکاح حرام ہو، خواہ حرمتِ نکا
رشتۂ قرابت کی وجہ سے ہو یا رشتۂ رضاعت کی وجہ سے ہو یا رشتۂ سسرالی کی وجہ سے
کیونکہ دائمی حرمت سے خلوت میں تہمت کا اندیشہ زائل ہو جاتا ہے، اسی لئے فقہاء کرام نے
کہا ہے کہ اگر محرم بھی قابلِ اعتماد نہ ہو (یعنی اس سے آبرو محفوظ نہ ہو) تو اس کے ساتھ ک
عورت کا سفر پر جانا جائز نہیں ہے''، (بدائع الصنائع، جز ثانی، صفحہ 187، 188 مطبوعہ مرکز اہل سن
برکات رضا، گجرات، ہند) آپ کی ساس صاحبہ آپ کے ہمراہ حج یا عمرے کے سفر پر جا سکتی ہیں

کیونکہ آپ ان کے محرم ہیں، لیکن آپ اپنی خواہر نسبتی (سالی) کے محرم نہیں ہیں، اس لئے ان کا آپ کے ساتھ عمرے یا حج پر جانا درست نہیں ہے، محرمات نکاح کے بیان میں قرآن مجید کے ارشاد "وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ"، ترجمہ: [اور (تم پر حرام کیا گیا ہے) یہ کہ تم دو بہنوں کو (نکاح میں) جمع کرو، النساء: 23] کے تحت اگر چہ سالی کے ساتھ نکاح حرام ہے، لیکن یہ حرمت دائمی نہیں ہے، اگر خدانخواستہ بیوی کا انتقال ہو جائے یا کوئی بدقسمتی سے اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو عدت گزرنے کے بعد سالی سے نکاح کر سکتا ہے۔

والد کا حجِ بدل پہلے یا اپنا فریضۂ حج؟

سوال: 55

میرے والد محترم کا چار ماہ قبل انتقال ہو چکا ہے اور وہ اپنی زندگی میں حج نہیں کر سکے تھے، میں اس سال اپنی والدہ کے ساتھ حج پر جانا چاہ رہا ہوں، دریافت یہ کرنا ہے کہ میں پہلے اپنے والدِ مرحوم کا حج ادا کروں یا پہلے اپنا حج ادا کروں؟۔ برائے مہربانی قرآن و سنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں، (جاوید سعید خان، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

عبادات کی تین قسمیں ہیں:

1۔ خالص بدنی عبادات (جیسے نماز اور روزہ)، ان میں نیابت یا قائم مقامی جائز نہیں، ہر مکلّف (عاقل و بالغ) کو بذاتِ خود ادا کرنی لازمی ہیں۔ حدیثِ مبارک میں ہے:

عن مالک انّ عبداللّٰہ بن عمر کان یُسئلُ ھل یصوم احد عن احد او یصلّی احد عن احد فیقول لا یصوم احد عن احد ولا یصلّی احد عن احد۔

ترجمہ: "امام مالک بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا کوئی کسی کی جانب سے روزہ رکھے یا کوئی کسی کی جانب سے نماز ادا کرے، تو وہ جواب دیتے کہ کوئی کسی کی جانب سے روزہ نہ رکھے اور نہ کوئی کسی کی جانب سے نماز ادا کرے"، (موطا امام مالک رقم الحدیث: 688 باب النذر فی الصیام، والصیام عن المیت)۔

عن عائشة، أن النبی ﷺ قال: "من مات وعلیه صیام صام عنه ولیّه۔"

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کا انتقال ہوگیا اور اس پر رمضان کے روزے ہیں تو اس کا ولی ان روزوں کو ادا کرے"۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 2392 مطبوعہ مؤسسۃ الریان، بیروت)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے وفات شدہ عزیز کے ذمہ روزے باقی ہوں اور اس نے وصیت کی ہو تو ایک تہائی ترکہ میں سے قضا روزوں کا فدیہ ادا کیا جائے اور اگر اس نے وصیت نہ کی ہو، تو اس کی اولاد یا ورثاء تبرعاً اپنے مال میں سے فدیہ ادا کریں، یہ حکم وجوبی نہیں ہے، استحبابی ہے۔

2۔ خالص مالی عبادات (جیسے زکوٰۃ، فطرہ، قربانی اور نذر وغیرہ)، ان میں نیابت بالاتفاق جائز ہے۔

3۔ مرکب عبادت یعنی ایسی عبادت جس کی دونوں حیثیتیں ہیں، مالی بھی اور بدنی بھی (جیسے عبادتِ حج)، اس میں اگر مکلّف خود ادا کرنے کی جسمانی قدرت رکھتا ہے، تو اسے خود ادا کرنا لازمی ہے ورنہ کسی کو اپنا نائب مقرر کرسکتا ہے، لیکن یہ شرط فرض حج کے لئے ہے، کوئی کسی کی طرف سے نفلی حج کرنا چاہے یا کسی سے کرانا چاہے، تو کسی شرط یا استثناء کے بغیر کر سکتا ہے، خواہ جس کی طرف سے کیا جا رہا ہے یا کرایا جا رہا ہے، وہ زندہ ہے یا وفات پا چکا ہے، اس نے اجازت دی ہو یا نہ دی ہو، وہ خود جسمانی طور پر قدرت رکھتا ہو یا مریض و معذور ہو، کوئی شخص اپنے زندہ یا مرحوم والدین یا عزیز و اقارب کی طرف سے خود بھی حج کرسکتا ہے اور کسی کو بھی کراسکتا ہے، الغرض فرض کے مقابلے میں نفلی عبادت میں زیادہ وسعت اور سہولت ہوتی ہے، اس طرح ان عبادات کا ایصالِ ثواب بھی کرسکتا ہے۔

ایصالِ ثواب کیلئے جو حجِ بدل یا عمرہ کیا جائے، یہ نفلی عبادت ہے، والدین زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں، انہوں نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، ان کے ایصالِ ثواب کے لئے آپ خود بھی حج اور عمرہ کر سکتے ہیں اور کسی اور کو بھی چاہیں تو بھیج سکتے ہیں، جس کے ایصالِ ثواب کیلئے حج

یا عمرہ کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ از راہِ کرم اسے بھی اجر عطا فرمائے گا، کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا، جو بھیجنے والا ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ان شاء اللہ العزیز اجر پائے گا۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کے بیان کے مطابق آپ کے والد صاحب زندگی میں حج نہیں کرسکے، آپ نے یہ نہیں لکھا کہ ان پر شرعاً حج فرض ہو چکا تھا یا نہیں، یعنی حج کی مالی استطاعت انہیں حاصل تھی یا نہیں؟، بہر صورت انہوں نے زندگی میں نہ حج کیا اور نہ اس کی وصیت کی، اس صورت میں آپ ان کی طرف سے جو حج کریں گے، یہ نفلی حج ہوگا، آپ اگر صاحبِ استطاعت ہیں تو آپ کے لئے بہتر یہ ہے کہ پہلے اپنا فریضۂ حج ادا کریں، اس کے دوران آپ والد صاحب کے ایصالِ ثواب کے لئے نفلی طواف اور عمرے جتنے اللہ تعالیٰ توفیق دے کرسکتے ہیں، اس کے بعد اگر آپ کے والد صاحب نے صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود حج نہیں کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مزید توفیق دی ہے تو والد صاحب کی طرف سے حجِ بدل ادا کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ان کی تقصیر کو معاف فرمائے اور آپ کے اس حجِ بدل کو ان کے فریضۂ حج کے طور پر قبول فرمائے۔

فتاویٰ درمختار میں ہے:

(بخلاف ما لو اھل بحج عن ابویه أو غیرھما) من الاجانب حال کونه (متبرعاً فعین) بعد ذلک جاز لانه متبرع بالثواب ، فله جعله لاحدھما أولھما۔وفی الحدیث "من حج عن ابویه فقد قضی عنه حجته و کان له فضل عشر حجج، وبعث من الأبرار"۔

ترجمہ: "بخلاف اس کے کہ اگر اپنے ماں باپ کی طرف سے حج کیا یا ان کے علاوہ کسی اجنبی کی طرف سے (بطور نفل کے)، اور بعد میں (ثواب کو) کسی ایک کیلئے متعین کردیا تو جائز ہے، کیونکہ وہ نفلی ثواب بخشنا چاہتا ہے، تو اس کو حق حاصل ہے کہ کسی ایک کو ثواب بخش دے یا دونوں کو، اور حدیث میں ہے: جس نے اپنے ماں باپ کی طرف سے حج کیا، تو اس کا اپنا حج (فرض) بھی ادا ہو گیا اور اسے دس حج کا مزید ثواب ملے گا، اور وہ (قیامت کے دن)

نیکوکاروں میں اٹھایا جائے گا''،(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4،ص:29-26مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے طویل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1۔اگراولاد نے ماں باپ کی طرف سے نفلی حج کیا(یعنی والدین کے ذمہ فریضۂ حج باقی نہ تھا، یا انہوں نے وصیت نہیں کی تھی)،تو یہ بالکل جائز اور درست ہے، والدین کو بھی ثواب ملے گا اور مندرجہ بالا حدیث کی رو سے حج کرنے والے کو دس گنا ثواب ملے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا:

ولا اشکال فی ذالک اذا کان متنفلاً عنهما، فان کان علیٰ احدهما حج الفرض واوصی به لا یسقط عنه بتبرع الوارث عنه بمال نفسه، وان لم یوص به فتبرع الوارث عنه بالاحجاج اوالحج بنفسه، قال ابوحنیفة: یجزیه ان شاء اللّٰہ تعالیٰ الخ۔

ترجمہ:''اگر کوئی والدین کی طرف سے نفلی حج کررہا ہےتو اس کا ثواب ان کو پہنچنے یا ان کی طرف سے ادا ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ہاں،اگران(والدین)میں سے کسی کے ذمے حج فرض تھا اور اس نے اس کی وصیت کی تھی،تو وارث کی طرف سے نفلی طور پر اپنے مال سے ادا کرنے میں ان کا فرض حج ساقط نہیں ہوگا۔اور اگر اس نے وصیت تو نہیں کی، لیکن وارث نے ازخود اس کی طرف سے کسی سے حج کرالیا یا خود کرلیا،تو امام اعظم فرماتے ہیں کہ ان شاء اللہ اس سے اس کا فرض ادا ہوجائے گا''،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4ص:27-26 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عن ابن عباس: ان امراة جاء ت الی النبی ﷺ فقالت : ان امی نذرت ان تحج، فما تت قبل ان تحج ، افاحج عنها؟ قال: "نعم، حجی عنها، ارایت لو کان علی امک دین اکنت قاضیة"۔ قالت: نعم، فقال:"فاقضوا اللّٰہ الذی له،

فان الله احق بالوفاء"۔

ترجمہ:" حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا: (یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم!) میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی اور وہ حج کرنے سے پہلے فوت ہوگئی، کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟، آپ نے فرمایا: ہاں! اس کی طرف سے حج کرو، یہ بتاؤ کہ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم ادا کرتیں؟، اس نے کہا: ہاں!، آپ نے فرمایا: پھر اللہ کا قرض بھی ادا کرو، کیونکہ وہ ادا کیے جانے کا زیادہ حق دار ہے"، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 7315 مطبوعہ مکتبہ العصریہ بیروت)۔

آگے چل کر علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قال في "الفتح": ولا اشكال في ذلك اذا كان متنفلا عنهما؛ لأن غاية حال المتنفل ان يجعل ثواب عمله لغيره وهو صحيح۔ اما وقوع عمله عن فرض الغير بغير أمره فهو مشكل۔ والجواب ما مرّ في كلام الشارح من ان الوارث اذا حج او أحج عن مورثه جاز لوجود الأمر دلالة: اي فكأنه مأمور من جهته بذلك، وعليه فتقع الاعمال عن الميت لا عن العامل۔ فقوله في "الفتح": ومبناه على ان نيته لهما تلغو الخ، مخصوص بما اذا لم يكن عليهما فرض لم يوصيا به الخ۔

فتح القدیر میں (علامہ کمال الدین ابن ہمام نے) فرمایا: اگر کوئی اپنے ماں باپ کی طرف سے نفلی حج کرتا ہے، تو ان کی طرف سے ادا ہوگئے (یعنی ان کو ثواب پہنچے گا) اس میں کوئی اشکال نہیں ہے، کیونکہ نفلی عبادت کرنے والا زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے کہ وہ اپنے عمل کا ثواب دوسرے کو پہنچاتا ہے اور یہ صحیح ہے، لیکن رہا یہ سوال کہ آیا اس کا عمل دوسرے کے حکم کے بغیر اس کے فرض کی جگہ ہوسکتا ہے؟، تو یہ ایک مشکل مسئلہ ہے، اور جواب وہی ہے، جو کلام شارح میں گزرا کہ وارث اپنے مورث کی طرف سے (اس کی وصیت یا امر کے بغیر اپنے مال سے) حج کرے یا کسی اور سے کرائے، یہ جائز ہے، کیونکہ یہاں دلالۃً امر موجود ہے، یعنی گویا وہ

اس جہت سے مامور ہے، اور اسی توجیہ کے تحت اعمالِ حج میت کی طرف سے واقع ہوں گے، عامل کی طرف سے نہیں اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ صاحب فتح القدیر کا یہ قول کہ: ان (والدین) کی طرف سے (اسقاطِ فریضۂ حج) کی نیت لغو ہے الخ''، یہ اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے کہ جب ان دونوں پر حج فرض تھا ہی نہیں، جس کی بنا پر انہوں نے وصیت بھی نہیں کی، الخ''، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 4 ص:27 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

فریضۂ حج سے بریٔ الذمہ ہونے کے لئے حجِ بدل کے شرائط

سوال:56

ایک شخص پر حج فرض ہے، وہ معذوری یا مرض کی وجہ سے بذاتِ خود حج نہیں کر سکا اور اس نے کسی کو نامزد کیا کہ وہ اس کی طرف سے حجِ بدل ادا کرے یا اپنی وفات سے پہلے وصیت کی کہ فلاں شخص اس کی طرف سے حجِ بدل ادا کرے، تو اس حجِ بدل کا، جو فرض کو ساقط کرنے یا فرض سے بری الذمہ ہونے کے لئے کیا جائے، کیا حکم ہے؟، (محمد عتیق الرحمٰن سیال، ساقی کوثر انسٹی ٹیوٹس، شہداد پور، سانگھڑ)

جواب:

''حجِ بدل''، یعنی بطور نائب یا قائم مقام کے دوسرے کی طرف سے حجِ فرض ادا کرنا کہ اس کے ذمہ سے عنداللہ فرض ساقط ہو جائے، اس کی شرائط یہ ہیں:

(۱) جس کی طرف سے حج کیا جائے، حج کرنے سے پہلے اس پر حج فرض ہو، اگر فقیر نے حج کرادیا پھر غنی ہوا، اس پر خود دوبارہ حج کرنا فرض ہوگا۔

(۲) جس کی طرف سے حجِ بدل ادا کیا جا رہا ہے، وہ نائب کے وقوفِ عرفہ کرنے سے پہلے خود ادا سے عاجز ہو، اگر استطاعت کے باوجود حج کرایا، پھر عاجز ہو گیا، اس پر از سرِ نو حج کرانا لازم ہوگا۔

(۳) صاحب استطاعت کا عجز اگر عارضی ہے، اور ظاہری علامات وقرائن سے اس کے زائل ہونے کا ظن غالب ہے، مثلاً کوئی عارضی قابلِ علاج مرض یا معذوری یا کسی حاکم یا

رہزنوں اور لوٹ مار کرنے والوں کا رکاوٹ بن جانا، تو شرط ہے کہ یہ عذر ''تادمِ مرگ'' قائم رہے، اگر بعد ادائے حجِ بدل خود قادر ہوا، تو اس پر دوبارہ خود ادا کرنا فرض ہوگا بخلاف اس عُجز کے کہ قابلِ زوال نہیں، جیسے نابینا ہونا، اگر اس نے اپنا حجِ بدل ادا کرادیا اور بعد میں اگر بطورِ خرقِ عادت وہ عُجز زائل بھی ہوجائے، تو بہر حال اعادہ ضروری نہیں۔

(۴)　حجِ بدل کرنے والا، جس کی طرف سے حج کر رہا ہے، صرف اس ایک کی طرف سے تنہا حج کی نیت کرے، مثلاً میں نے فلاں کی طرف سے احرام باندھا یا اے اللہ! میں فلاں کی طرف سے تیری بارگاہ میں حاضر ہوں، اگر اس کی طرف سے نیت نہ کی یا دو حج کی نیت کی یعنی ایک اُس کی طرف سے اور ایک اپنی طرف سے یا دو مختلف شخصوں کی طرف سے نیت کی، مثلاً ایک اُس شخص کی جانب سے اور دوسری کسی اور کی جانب سے تو کافی نہ ہوگا۔

(۵)　پانچواں یہ حجِ بدل جس کی طرف سے حج کر رہا ہے، اگر اس کے حکم سے نہ کرے، بلکہ از خود تبرعاً کرے تو اسقاطِ فرض کیلئے یہ حج کافی نہ ہوگا، ہاں اگر وارث اپنے مورث کی طرف سے حج کرے یا کرائے، تو اس سے متوفّی کا فریضۂ حج ساقط ہوجائے گا، کیونکہ یہ اس کے قائم مقام ہے۔

(۶)　مصارف آمد و رفت اور حج کے تمام مصارف یا اکثر مال حج کرانے والے کی طرف سے ہو۔

(۷)　اگر حجِ بدل کرانے والے کی زندگی میں ادا کیا جا رہا ہے، تو جسے اس نے امر کیا وہی حج کرے، دوسرے سے کرادے تو ادا نہیں ہوگا، اور اگر حج کرانے والے کی وفات کے بعد ہے، تو مامور (جس کو حج کرانے کا حکم دیا) دوسرے کو بھی اپنے قائم مقام کرسکتا ہے، اگرچہ میت نے اس کا نام لے کر وصیت کی ہو کہ فلاں میری طرف سے حج کرے، ہاں! اگر صراحتاً اس نے منع کردیا تھا کہ وہی کرے نہ دوسرا، تو اب دوسرا کافی نہیں۔

(۸)　حجِ بدل کرنے والا اکثر راستہ سواری پر طے کرے، اگر باوجود سواری کے پیدل حج کرے گا، اسے چاہئے کہ نفقہ واپس کردے، کیونکہ اس حج سے بھیجنے والے کا فریضۂ حج

ساقط نہیں ہوگا۔

(۹)　حج کرانے والا اگر اہلِ آفاق سے ہو یعنی حدودِ حرم وحِل اور میقات سے باہر کا رہنے والا ہے، تولازم ہے کہ اس کی طرف سے حجِ آفاقی کیا جائے، اگر جسے حج کیلئے بھیجا گیا ہے، اس نے عمرے کا احرام باندھا، پھر عمرہ ادا کرنے کے بعد موسمِ حج میں حرم سے احرامِ حج باندھا، اس کی طرف سے (یعنی بھیجنے والے کی طرف سے یہ) حج نہ ہوگا کہ یہ حج مکی ہوا نہ آفاقی، ہاں! اگر حج کے موقع پر میقات سے باہر نکل کر احرامِ حج میقات سے باندھے تو جائز ہے کہ حج آفاقی ہوا نہ مکی۔

(۱۰)　مخالفت نہ کرے، مثلاً تنہا حج کے لئے امر کیا تھا، اس نے قِران یا تمتّع کیا تو نفقہ واپس کرے، کیونکہ آمر کے حکم کی خلاف ورزی کی بنا پر اس سے فریضۂ حج ساقط نہیں ہوگا۔

(۱۱)　حجِ بدل کرنے والا ''حجِ صحیح'' اس بار ادا کرے، غیر عاقل، بچے یا مجنون کا حج کافی نہیں، ہاں مراہق (یعنی جو بلوغت کی عمر کے قریب ہے، جیسے بارہ سال کی عمر والا) کا کافی ہے، یونہی اگر اس نے ''حجِ فاسد'' کردیا کافی نہ ہوگا، اگرچہ قضا بھی کرے۔ بیس شرطیں ''المنسک المتقسط مع ارشاد الساری، باب الحج عن الغیر، صفحہ: ۲۹۲، مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت'' میں سے انہیں گیارہ میں آگئیں۔

(نوٹ): یہ فتویٰ مسئلہ نمبر **283** کے جواب میں، فتاویٰ رضویہ جلد **10** ص: **659-660** مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور سے نقل کیا گیا ہے، صرف قارئین کی سہولت کے لئے عبارت کو آسان اور عام فہم بنایا گیا ہے، اصل مفہوم وہی ہے جو امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت کا ہے، تاہم کہیں قاری کو اسے اصل سے مطابقت معلوم نہ ہو تو اسے ہماری کوتاہی پر محمول کریں۔

کتابُ النکاح

حرمتِ نکاح

سوال:57

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ایک آدمی حسن گل جس کی دو بیویاں (ھندہ، زینب) ہیں، جن سے دو بیٹے (ہندہ سے خان بہادر اور زینب سے عبدالقیوم) پیدا ہوئے۔ حسن گل کا دوسرا بھائی سمندر خان ہے، جس کی بیوی کا نام خائستہ جان ہے، خائستہ جان سے سمندر خان کے دو بیٹے (۱) شیر جنگ (۲) تاج محمد اور ایک بیٹی انور جان ہے۔ سمندر خان کی وفات کے بعد خائستہ جان نے سمندر خان کے بھتیجے عبدالقیوم سے نکاح کرلیا، جس سے تین بیٹے (۱) علی وارث (۲) فقیر محمد (۳) بنارس، ہیں۔ سوال دریافت طلب یہ ہے کہ "خان بہادر کی لڑکی علیف جان کا نکاح عبدالقیوم کے بیٹے فقیر محمد کے بیٹے سے ازروئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟، (خان بہادر ضلع مانسہرہ تحصیل اوگی گاؤں کیارہ)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں جن دو مرد و عورت کے مابین حلّتِ نکاح کی بابت دریافت کیا گیا ہے، یہ نکاح جائز ہے، بشرطیکہ کوئی اور سببِ حرمت نہ ہو۔

مہر مؤجل یا معجّل کا حکم

سوال: 58

حضرت حق مہر کے بارے میں وضاحت چاہتا ہوں کہ مہر معجّل اور غیر معجّل حق مہر میں کیا فرق ہے کیا دونوں قسم کے حق مہر معاف کرائے جاسکتے ہیں یا صرف مہر معجّل معاف کرایا جاسکتا ہے یا غیر معجّل، حق مہر ادا نہ کرنے کی صورت میں کیا گناہ لازم آتا ہے قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں، (محمد کاشف، رجب علی، کورنگی، کراچی)۔

جواب :

مہر عورت کا حق ہے، جب عقد نکاح کے وقت عورت کی طرف سے یہ شرط عائد

کی گئی ہو کہ اس کی فوری ادائیگی لازم ہے تو اسے عرف عام میں مہر معجّل کہتے ہیں، اس کی فوری ادائیگی لازم ہے، اور مہر معجّل کی صورت میں عورت اپنی قربت یا مباشرت سے پہلے مہر کی ادائیگی کا مطالبہ کرسکتی ہے، مہر مؤجل اسے کہتے ہیں جس کی فوری ادائیگی عقد نکاح کے وقت لازمی نہ قرار دی گئی ہو، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ادائیگی کے لئے مدت مقرر کر دی گئی ہو اور دوسری یہ کہ غیر معینہ مدت کے لئے رعایت دی گئی ہو، تاہم اگر مہلت ادائیگی کو غیر معین چھوڑا گیا ہے، تب بھی خدانخواستہ شوہر کی وفات کی صورت میں اس دین مہر کی ادائیگی شوہر کے ترکے سے تقسیم وراثت سے پہلے لازم ہوگی اور بصورت طلاق بھی ادائیگی لازمی ہو جائے گی۔

مہر کسی بھی قسم کا ہو بہر کیف اس کی ادائیگی جلد یا بدیر لازم ہے، ہاں البتہ مہر معجّل ہو یا مؤجل عورت اپنی آزادانہ مرضی سے جب چاہے کلی یا جزوی طور پر معاف کرسکتی ہے، لیکن جبر کر کے معاف کرانا ظلم ہے اور یہ حق تلفی کے مترادف ہے، اگر مہر مؤجل ہو اور خدانخواستہ عورت کی وفات ہو جائے تب بھی شوہر پر مہر کی ادائیگی لازم ہے اور وہ دینِ مہر اب اس کے ترکہ میں شامل ہوگا اور اس کے ورثاء کا حق ہوگا۔

شوہر کے کلماتِ کفر کہنے سے نکاح باطل ہو جاتا ہے

سوال:59

میں ایک مظلوم و مجبور سائلہ ہوں ۔ والدین نے برضا و رغبت میری شادی لاہور کے ایک شخص سے کر دی جو کہ پہلے سے ہمارا عزیز تھا۔ بعد از رخصتی اس نے مجھ سے گفتگو کے دوران یہ کہا کہ میں کسی عاشق رسول ﷺ کو نہیں مانتا، جب میں خدا اور رسول ﷺ کو نہیں مانتا تو کسی اور کو کیا مانوں گا؟ اس نے یہ بھی کہا کہ میرے گھر میں ''نماز شماز'' نہیں ہوتی، ہم دنیا دار ہیں۔ پھر وہ رخصتی کے بعد تا ایں دم میرے ساتھ فعل شنیع یعنی فعل قوم لوط کرتا رہا، وہ ازدواجی تعلق جو شریعت میں جائز اور مشروع ہے، نہیں کیا۔ میں جب زخمی اور خوفزدہ ہو گئی تو اس نے کہا کہ ابھی سے ڈر گئی ہو؟۔ پھر گھر والے مجھے شادی کے

36 گھنٹوں کے اندر اندر اپنے عزیزوں کے ہاں لے آئے اور پھر وہاں سے کراچی لے آئے۔ اب اس واقعہ کی بناء پر درج ذیل سوالوں کا جواب اسلام کی روشنی میں دیں تاکہ ہم گمراہی سے بچ جائیں اور ہدایت پائیں۔ ہم آپ کے ممنون ومشکور ہوں گے۔

سوال: 60

کیا وہ شخص اس بیان کے بعد مسلمان رہا ہے یا نہیں؟ اور پہلے سوال کی دوسری شق یہ ہے کہ اب اس سے نکاح قائم ہے یا ٹوٹ چکا ہے؟۔

سوال:61

اب اس کے بعد اس سے ملاقات تنہائی اور حصول اولاد کا عمل زنا کے زمرے میں آئے گا؟۔

سوال:62

اگر برادری کے بڑے لوگ مل کر یہ کہیں یا وہ خود یہ کہے کہ مولویوں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ خیر ہے کچھ نہیں ہوا؟ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں؟ لہٰذا تم چھوڑو سب باتیں اور بچی کو بھیج دو۔ جب اللہ معاف کرتا ہے تو بندے کون ہوتے ہیں؟ کیا ایسی باتوں میں آکر بچی کو واپس وہاں بھیجنا صحیح ہے یا ہرگز نہیں بھیجنا چاہیے؟۔

سوال:63

اس کے اس فعل کے بعد اس سے خلع لینا میرا شرعی اور قانونی حق ہے یا نہیں؟۔

سوال:64

اگر وہ یہ کہے میں ان "فتووں شتووں" کو نہیں مانتا؟ بس تم میری بیوی ہو اور میں تمہارا خاوند ہوں؟ تو تنسیخ نکاح کی صورت کیا ہوگی؟

سوال:65

اگر وہ معافی مانگے بغیر توبہ کیے یا توبہ کے ساتھ اور پھر یہ بھی کہے کہ میں نے ایسا کچھ کہا ہی نہیں؟ بات کر بھی جائے منکر بھی ہو جائے تو کل کلاں اس کی توبہ پر بھی اعتبار کی کیا

صورت ہوگی؟۔

سوال: 66

میرے والدین مجھے اسی کے ساتھ ہی دوبارہ بسانا چاہیں تو اسلام کی روشنی میں اس کی کیا صورت ہوگی؟ اللہ تعالیٰ آپ علماء کا سایہ ہم سب پر سلامت رکھے۔آمین

(ایک مظلومہ و مجبور سائلہ معرفت عتیق علی، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

(۱) اس کا یہ قول کہ ''میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نہیں مانتا تو کسی اور کو کیا مانوں گا؟'' اور اس کا یہ قول کہ ''میرے گھر میں ''نماز شماز نہیں ہوتی''، یہ کفر صریح کے کلمات ہیں اور اس میں نہ صرف اللہ اور رسول کا انکار ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے ایک اہم رکن نماز کا بھی نہ صرف انکار ہے بلکہ اس کی توہین بھی ہے۔لہٰذا یہ کلمات ادا کرنے سے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوگیا اور اس ارتداد کی بناء پر ان دونوں کا نکاح باطل ہوگیا۔

(۲) جب نکاح باطل ہوگیا تو ان کی آپس میں قربت اور ازدواجی تعلق حرام ہے، تاوقتیکہ وہ اعلانیہ توبہ کرے اور پھر باہمی رضامندی سے وہ تجدید نکاح کریں۔

(۳) برادری کے لوگوں کا حقائق جاننے اور سننے کے بعد یہ کہنا کہ: ''اس سے کچھ نہیں ہوتا،'' یا مولوی کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا' رضا علی الکفر ہے اور کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، جن لوگوں نے کفر صریح کے کلمات کو جاننے کے بعد یہ کہا ہے، وہ بھی توبہ کریں اور تجدید نکاح کریں۔

(۴) جب نکاح خود ہی باطل ہوگیا تو خلع لینے کا کیا سوال؟۔خلع تو اس سے لیا جاتا ہے، جس سے رشتۂ ازدواج بدستور قائم ہے، یہ پوزیشن تو دیانتاً اور عنداللہ ہے۔لیکن قضاءً گلو خلاصی کیلئے اسے عدالت میں جانا پڑے گا۔برادری کا دینی فریضہ یہ ہے کہ یا تو اس شخص سے اعلانیہ توبہ کرا کے تجدید نکاح کرائیں اور یا اس سے طلاق صریح دلوائیں تاکہ اس خاتون کیلئے اپنی من پسند زندگی گذارنے میں کوئی قانونی یا سماجی رکاوٹ باقی نہ رہے اور وہ اس عمل پر عنداللہ ماجور ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ: اور تم نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، اور (حدود الٰہی کو توڑنے میں) اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے، (المائدہ:۲)۔

(۲) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۗ۔

ترجمہ: ''تم (سب امتوں میں) بہترین امت ہو، (تمہارا شعار یہ ہے کہ) تم سب بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''، (آل عمران:۱۱۰)۔

کسی برادری، پنچایت اور کمیونٹی کے ذمہ داران اور اکابر کا اصل دینی فریضہ یہ ہے کہ اپنی حدود میں منکرات کا سدباب کریں، اپنا پورا وزن معروف اور خیر کے پلڑے میں ڈالیں، نہ کہ شر اور منکر کو تحفظ دیں، ایسے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی اس وعید سے ڈرنا چاہیے، جو حدیث ذیل میں ہے:

"عن جابر قال: قال رسول اللہ ﷺ اوحی اللہ عزوجل الی جبرئیل ان اقلب مدینۃ کذا و کذا باھلھا ،فقال: یارب ان فیھم عبدک فلانا لم یعصک طرفۃ عین. قال :فقال: اقلبھا علیہ و علیھم فان وجھہ لم لم یتمعّر فیّ ساعۃ قطّ "۔

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل نے جبرائیل کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو اس کے رہنے والوں سمیت الٹ دو، جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے پروردگار: اس بستی والوں میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے، جس نے (زندگی میں کبھی) پلک جھپکنے کی مقدار بھی تیری نافرمانی نہیں کی، (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: (اس کے جواب میں) اللہ عزوجل نے فرمایا: (ہاں) اس پارسا شخص سمیت اس بستی کو الٹ دو، کیونکہ میری حدود شرع کو پامال ہوتے دیکھ کر اس کی غیرت ایمانی کبھی بیدار نہ

ہوئی اور میری خاطر اس کے چہرے پر کبھی ایک لمحے کیلئے بھی غیظ وغضب اور ناراضی کے اثرات ظاہر نہ ہوئے''، (البیہقی فی شعب الایمان، رقم الحدیث ۷۵۸۷)۔

(۵) گذشتہ سطور سے واضح ہوگیا کہ شوہر کا مطلقاً یہ کہنا کہ: ''میں فتووں شتووں کو نہیں مانتا''، حق کو رد کرنے، حق پر اپنی انا کو ترجیح دینے اور اس کی تمرد وسرکشی اور فکری غوایت وضلالت کی دلیل ہے، اسے اتنی باغیانہ جسارت کے ساتھ انکارِ حق پر اللہ کے عذاب اور ہولناک انجام سے ڈرنا چاہیے۔ مفتی تو حکم شرع بیان کرتا ہے، اور کسی قطعی دلیل کے بغیر اس کے فتوے کو رد کرنا حق سے اباوانکار ہے، شرعاً تو نکاح بہرحال قائم نہیں رہا۔

(۶-۷) اگر ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ قبولِ حق کی توفیق دے، اسے حق کی جانب رجوع کی سعادت نصیب فرمائے اور وہ صدقِ دل سے اپنی کفریہ بات سے توبہ کر کے تجدیدِ ایمان کرلے، تو اس سے عام مسلمانوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔ کیونکہ غیب کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، ہم کسی کی نیت، قلبی کیفیت، باطن اور مستقبل کی بابت پیشگی فیصلہ صادر نہیں کر سکتے، شرعی احکام کا اطلاق ظاہر پر ہوتا ہے، ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم ہے کہ:

''ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث"۔

ترجمہ: ''بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے'' اور مشہور مقولہ ہے: ''ظنوا المؤمنین خیرا''، ''یعنی مومنوں کے بارے میں حسن ظن رکھا کرو''، ہاں اگر وہ بار بار توبہ کرنے اور تجدیدِ ایمان کے بعد پھر کفریہ کلمات کہتا ہے تو ایسا شخص زندیق ہے، آئندہ اس سے قطعِ تعلق لازم ہے، تاہم قولِ راجح کے مطابق اس کے لئے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔

باقی رہا آپ کا یہ سوال کہ اعلانِ توبہ کے بعد اس کی تجدیدِ نکاح کی پیشکش قبول کرلینی چاہیے یا نہیں؟، تو اس بارے میں رسول اللہ ﷺ فرمان ہے: ''عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ: لا یُلدغ المومن من جُحرو احد مرتین'' ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۶۱۳۳، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۲۹۸،

ابوداؤد:۴۸۶۲،ابن ماجہ:۴۱۸۹،مسند احمد:ج ۲ص ۳۷۹)

اور کسی مردِ دانا کا مشہور مقولہ ہے:

"من جرب المجرب فقد حلت به الندامة"۔

ترجمہ: جس نے آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزمایا تو اسے شرمندگی اٹھانی ہوگی"۔اس لئے یہ بہتر ہے کہ دوبارہ اس سے معاملہ کرنے سے بچا جائے۔

شوہر کے کلمہ کفر کہنے سے نکاح باطل ہوجاتا ہے،شوہر کفرِ صریح کا ارتکاب کرے تو نکاح باطل ہوجاتا ہے،بیوی کے ساتھ عمل معکوس اگرچہ حرام ہے،لیکن اس سے نکاح باطل نہیں ہوتا۔

نوٹ:فعل قوم لوط حرام ہے،یہ غیر انسانی اور غیر فطری ہے،عمل قوم لوط انتہائی شنیع وقبیح اور حرام فعل ہے،اس کی سنگینی اور شدت جاننا چاہیں تو یہ احادیث ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قال: من وجد تموه يعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول به"۔

ترجمہ:"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جسے قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ،تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو"،(سنن ابن ماجہ،رقم الحدیث:۲۵۶۱،سنن ترمذی،رقم الحدیث:۱۴۵۶)۔

نوٹ:واضح رہے کہ انہیں اس وعید کا مصداق تب ہوگا،جب وہ برضا ورغبت اس گناہ کبیرہ میں شریک ہو،لیکن اگر اسے (جان یا عضو کے تلف کرنے کی دھمکی دے کر) اس پر مجبور کیا گیا ہو،تو وہ معذور ہے،کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"ان الله تجاوز عن امتی الخطأ والنسيان وما استُكرِ هوا عليه"۔

ترجمہ:اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطاء،نسیان اور اس عمل کی اخروی جواب دہی سے صرف نظر فرمالیا ہے،جس پر اسے (جان یا عضو تلف کرنے کی دھمکی دے کر) مجبور کردیا گیا ہو،(ابن ماجہ،رقم الحدیث:۲۰۴۳)۔

(۲) "عن ابی هريرة عن النبی ﷺ فی الذی يعمل عمل قوم لوط ،قال:

ارجموا الا علیٰ والا سفل ارجموا جمیعا"۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس شخص کے بارے میں جو قوم لوط کا عمل کرتا ہے، فرمایا: فاعل ومفعول دونوں کو سنگسار کردو، (ایسے) سب لوگوں کو سنگسار کردو، (ابنِ ماجہ، رقم الحدیث:۲۵۶۱)۔

(۳)" عن جابر بن عبد الله، قال: قال رسول الله ﷺ ان اخوف ما اخاف علیٰ امتی عمل قوم لوط "۔

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے اپنی امت پر امورِ حرام میں سے سب سے زیادہ جس گناہ میں مبتلا ہونے کا خوف ہے، وہ قوم لوط کا عمل ہے، (ابنِ ماجہ، رقم الحدیث:۲۵۶۳)۔

(۴) عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: لا ینظراللّٰہ الیٰ رجل اتیٰ رجلا او امرأۃ فی دبر۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ عزوجل اس مرد کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرماتا، جو مرد سے جنسی خواہش پوری کرے یا عورت سے عملِ معکوس کرے''، (سنن الترمذی، رقم الحدیث:۱۱۶۵، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث:۴۱۹۱)۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ عملِ قوم لوط کی یہ سزا بطورِ تعزیر اور اس سے بھی زیادہ وعید کے طور پر ہے، یہ زنا کی سزا کی طرح حد نہیں ہے، لہٰذا حاکم وقاضی کی صوابدید پر موقوف ہے کہ اپنے عہد اور حالات کے تقاضے کے تحت اس کی کیا سزا مقرر کرے۔ نیز خدانخواستہ کوئی شخص کسی کو اس جرم میں مبتلا دیکھے تو شخصی طور پر اسے سزا دینے کا حق نہیں ہے، یہ صرف اور صرف حاکم اور قاضی کا حق ہے کہ وہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر سزا تجویز کرے۔

اپنی منکوحہ بیوی سے عملِ قوم لوط کرنا اگرچہ حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، شوہر جبر واکراہ سے ایسا کرے تو صرف وہ مجرم ہے اور اگر بیوی بھی اس پر رضامند ہے، تو وہ بھی برابر کی مجرم ہے، لیکن اس سے ان کا نکاح باطل نہیں ہوگا۔

حدودِ شرعی کے علاوہ جن کی سزا شارع نے قطعی طور پر مقرر کردی ہے، باقی جرائم میں حاکم یا قاضی کو مصلحتاً اور سیاستاً تعزیر کے طور پر کسی جرم کی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ سزا مقرر کرنے کا حق ہے اور احادیث رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں حاکم یا قاضی بطور تعزیر قومِ لوط کی زیادہ سے زیادہ سزا یعنی سزائے موت بھی دے سکتا ہے۔

عقد ثانی کیلئے پہلی بیوی کی اجازت کا مسئلہ

سوال: 67

ایک شخص جو کہ شادی شدہ ہے اور بیوی سے بچے بھی ہیں وہ شخص اپنی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسرا نکاح کر لیتا ہے۔ پہلی بیوی کا مطالبہ ہے کہ دوسری بیوی کو طلاق دے دو، تو جناب دریافت طلب یہ ہے کہ:

(۱) کیا دوسرا نکاح کرنے کے لیے پہلی بیوی کی اجازت ضروری ہے؟

(۲) پہلی بیوی کا مطالبہ کہ دوسری کو طلاق دو کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، (طاہر قاسم، کراچی)

جواب:

شرعاً دوسرا نکاح کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ بشرطیکہ شوہر دونوں ازواج کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، دونوں کے درمیان عدل و مساوات قائم کرے، یعنی دونوں کو ایک معیار کی رہائش، ایک ہی معیار کی خوراک اور مصارف زندگی فراہم کرے اور دونوں میں ایام کی تقسیم بھی برابر برابر کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً"

یعنی اگر تمہیں خدشہ ہو کہ ایک سے زیادہ ازواج کے درمیان تم عدل قائم نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔ شرعاً، قیامِ عدل و مساوات کی شرط کے ساتھ، عقد ثانی کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور اس کے لیے پہلی بیوی کی اجازت لازمی اور ضروری شرط نہیں ہے، اگر کوئی قانونی رکاوٹ ہو تو اس کے لیے وکیل سے رجوع کرنا مناسب ہوگا، نہ پہلی بیوی ہی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ شوہر کو مجبور کرے کہ دوسری بیوی کو طلاق دے دو، اسی طرح دوسری بیوی

کے لئے بھی ایسا مطالبہ کرنا شرعاً ناجائز ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی نفسانیت اور انانیت سے بالاتر ہو کر حدودِ شرع کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے، (آمین) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

نکاح پر نکاح کا شرعی حکم

سوال: 68

امریکہ میں رہنے والی ایک مسلمان لڑکی نے ایک دوسرے مسلمان لڑکے کو شادی کی پیشکش کی۔ تقریباً چار ماہ تک وہ لڑکی اور اس کی ماں، لڑکے سے اصرار کرتے رہے کہ وہ جلد از جلد شادی کا انتظام کرے۔ اس اصرار کیلئے لڑکی اور اس کی ماں دوسرے شہر سے لڑکے کو راضی کرنے کیلئے آیا کرتے تھے۔ لڑکے نے بالآخر چار ماہ بعد 9 نومبر 1997ء کو منگنی کا انتظام کیا۔ تقریب میں بیس کے قریب رشتہ داروں اور دوستوں نے شرکت کی۔

منگنی کے بعد لڑکے نے شادی کی نیت سے پاکستان جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور پاکستان آ بھی گیا۔ لیکن لڑکی کچھ کاموں کا عذر کر کے اس کے ساتھ نہیں آئی۔ کچھ عرصے کے بعد لڑکی بھی پاکستان پہنچ گئی، اور 5 اپریل 1998ء کو لاہور میں دونوں کا نکاح ہو گیا۔

ابھی حال ہی میں لڑکی نے اپنے شوہر پر انکشاف کیا کہ ''ہمارا نکاح نہیں ہوا تھا، کیونکہ میں نے جب تم سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی اور منگنی کی تقریب ہوئی تھی، تو اس وقت میں کسی اور شخص کی منکوحہ تھی۔ لہٰذا اب ہمیں نئے سرے سے نکاح کرنا چاہیے''۔

تحقیق کرنے پر یہ صورت حال سامنے آئی کہ جب لڑکا پاکستان آ گیا تھا اور لڑکی اس وقت تک امریکہ ہی میں تھی، اس دوران 14 جنوری 1998ء ہی کو اس لڑکی نے پہلے شوہر سے منصوبہ بندی کے تحت کچھ جواز بنا کر طلاق حاصل کی تھی۔ گویا طلاق کے 80 دن بعد 81 ویں دن اس کا نکاح دوسرے شوہر سے ہو گیا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ دونوں شوہر، ''لڑکی کے نکاح میں ہونے کے باوجود دوسرے نکاح کے ارادے اور کوشش'' سے قطعی بے خبر تھے اور اس کے علاوہ لڑکی کی یہ دوسری کوشش اور تیسری شادی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بالارادہ کیا گیا تھا۔

یہاں امریکہ میں لڑکی کی طرف سے طلاق کے مطالبے پر لڑکے کو ایک بھاری رقم لڑکی کو ادا کرنا پڑتی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شادی پیسے کی خاطر کی گئی تھی۔
لڑکی متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے، جبکہ لڑکا مالدار طبقے سے متعلق ہے۔لڑکی لڑکے سے عمر میں تقریباً آٹھ یا نو سال چھوٹی ہے۔
مندرجہ بالا صورت حال کے پیش نظر اسلامی شریعت کی روشنی میں درج ذیل سوالات کے باحوالہ جوابات مطلوب ہیں۔

1....... کیا ایک شادی شدہ عورت کسی غیر لڑکے کو نکاح کا پیغام دے سکتی ہے؟

2.......اس مخصوص صورتِ حال میں منگنی کی تقریب کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

3....... حلالہ کی صورت میں جو طلاق پہلے سے منصوبہ بندی کر کے حاصل کی جاتی ہے، ہمارے علم کے مطابق علماء نے اس کو جائز نہیں بتایا ہے۔تو کیا مذکورہ صورت میں منصوبہ بندی کے تحت ارادہ اور کوشش کے ذریعے طلاق حاصل کرنا اور دوسرے شخص سے نکاح کرنا بھی اس زمرے میں نہیں آئے گا؟

4....... کیا عدت کی مدت پوری کئے بغیر 81 ویں دن نیا نکاح کر لینا جائز ہے؟، کیا اس صورت میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے؟

5....... کیا تیسرے نکاح کی خواہش اور اس کو حتی الامکان منعقد کر لینے کی کوشش اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ پیشہ وارانہ سا رویہ اختیار کیا گیا ہے؟

واضح رہے کہ عورت کی عادت ماہواری میں اس طرح تھی کہ دو مہینہ اس کو مسلسل ماہواری آتی تھی اور دو مہینہ پاک رہتی تھی، (سائل کمال، کراچی)۔

جواب:

جب کسی شخص نے نکاح کا پیغام دیا ہو، تو اس پر دوسرے شخص کو نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا یخطب الرجل علی خطبة اخیه۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص اپنے (دینی) بھائی کے پیغامِ نکاح کے اوپر پیغام نہ دے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1413,1412، ابن ماجہ رقم الحدیث: 1868)۔

خِطبہ کے معنی ہیں: ''منگنی کرنا یا نکاح کا پیغام دینا''۔ جب صرف پیغامِ نکاح پر دوسرا پیغام بھیجنا ناپسندیدہ ہے، یعنی جب تک فریقین کا معاملہ زیرِ غور ہو، اور پیغامِ نکاح کے ردّ و قبول کا فیصلہ نہ ہوا ہو، اس وقت تک کسی فریق ثالث کی طرف سے نکاح کا پیغام دینے کو رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، چنانچہ صحیح مسلم کی احادیث میں ''اِلَّا اَنْ یَّأْذَنَ لَهٗ'' اور ''حَتّٰی یَذَرَ'' یعنی پہلا پیغامِ نکاح دینے والا دوسرے شخص سے خود کہہ دے کہ مجھے منع کر دیا گیا ہے، آپ اپنے لئے کوشش کر سکتے ہیں یا خود ہی ارادہ ترک کر دے، تو جب تک کوئی خاتون شوہر سے طلاق یا اس کی وفات کی صورت میں عدت گزار کر نکاح کی پابندیوں سے مکمل طور پر آزاد نہ ہو جائے، کسی دوسرے مرد کیلئے اسے نکاح کا پیغام دینا کیسے جائز ہوگا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب پیغامِ نکاح پر پیغام دینا حدیث میں صراحۃً منع ہے، تو شادی شدہ عورت کا کسی غیر مرد کو نکاح کا پیغام دینا بطریقِ اولیٰ سخت حرام اور قبیح امر ہے۔ ہمارے یہاں جو منگنی کی مخصوص تقریب کی جاتی ہے، اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ البتہ نکاح کا پیغام منظور کرنے کے بعد عزیزوں کے سامنے علانیہ اظہار کرنا تاکہ تمام لوگوں کو پتا چل جائے کہ اس لڑکی کا نکاح فلاں لڑکے کے ساتھ کیا جائے گا، مستحسن امر ہے۔ نیز یاد رہے کہ منگنی نکاح نہیں بلکہ ''وعدۂ نکاح'' ہے۔ صورت مسئولہ میں جو لوگ منگنی کی اس تقریب میں شریک تھے، اگر ان کے علم میں یہ بات تھی کہ لڑکی شادی شدہ ہے، تو سب لوگ حرام کے مرتکب ہوئے، ان تمام لوگوں کو سچے دل سے توبہ کرنی چاہیے۔ سائل نے زیرِ بحث مسئلہ کو حلالہ کے مشابہ قرار دیا ہے، اُس کا اِس صورت پر تطبیق اور اطلاق کیا ہے، یہ درست نہیں ہے، کیونکہ صورتِ مسئولہ میں اس جیسی کوئی صورتِ حال نہیں ہے۔ اگر کسی عورت کا شوہر اس پر شدید ظلم کرے، ضربِ شدید کی حد تک مار پیٹ کرے، نان نفقہ نہ

دے، حقوقِ زوجیت ادا نہ کرے، یہاں تک کہ اس کیلئے حدودِ شرع میں رہتے ہوئے ازدواجی زندگی گزارنا عملاً ناممکن بنادیا جائے، ایسے شوہر کو فقہی اصطلاح میں ''زوجِ متعنِت'' کہتے ہیں، تو ایسی صورت میں عورت کا اپنے شوہر سے طلاق یا خلع کا مطالبہ کرنا شرعاً درست ہے، ورنہ سازگار حالات میں عورت کی جانب سے طلاق کا مطالبہ کرنا یا بلا سبب شوہر کا ازخود طلاق دینا شرعاً انتہائی ناپسندیدہ اور قبیح امر ہے، اور اس فعل کی ممانعت اور قباحت اس صورت میں اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے، جب بیوی یا شوہر اسے طلبِ زر کا ذریعہ بنالیں، یہ اگرچہ حقیقۃً تو نہیں لیکن صورتاً جنسی کاروبار کی شکل اختیار کرلیتا ہے، جیسا کہ صورت مسئولہ میں بیان کیا گیا ہے۔

طلاق کے شرعاً انتہائی ناپسندیدہ ہونے پر چند احادیثِ مبارکہ ملاحظہ ہوں:

عن ابن عمران النبی ﷺ قال ابغض الحلال الی اللہ الطلاق ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال امور میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے۔

(ابن ماجہ رقم الحدیث:2018، ابوداؤد رقم الحدیث:2171-2170)

عن معاذ بن جبل قال قال رسول اللہ ﷺ یا معاذ ما خلق اللہ شیئًا علی وجہ الارض احب الیہ من العتاق ولا خلق اللہ شیئاً علی وجہ الارض ابغض الیہ من الطلاق۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے روئے زمین پر غلام آزاد کرنے سے زیادہ محبوب چیز کوئی پیدا نہیں فرمائی اور طلاق سے زیادہ قابلِ نفرت کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی''، (مشکوۃ رقم الحدیث:3294 سنن الدارقطنی ج 4 ص 35)۔

ان احادیث کریمہ سے معلوم ہوا کہ طلاق انتہائی ناپسندیدہ اور رب تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے۔ نیز باقاعدہ منصوبہ بندی کرکے یا بلاوجہ اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنے والی

عورتوں کومنافقات فرمایااورفرمایا کہ جنت کی خوشبوان پرحرام ہے،حدیث پاک میں ہے:

عن ثوبان عن النبی ﷺ قال المختلعات هن المنافقات ۔

ترجمہ:''ثوبان بیان کرتے ہیں کہ(بلاجواز)خلع حاصل کرنے والی عورتیں منافق ہیں''۔

(الترمذی رقم الحدیث:1186،مشکوۃ رقم الحدیث:3290،نسائی رقم الحدیث:3461)

ان احادیث میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ ایک ہی مفہوم بیان کیا گیا ہےاورمختلعات ومنتزعات کے کلمات استعمال کئے گئے ہیں،جن کے معنی محدثین نے یہ بیان کئے ہیں: ایسی حد درجہ نافرمان عورتیں جو بلا جواز ہرصورت میں اپنے شوہر سے خلع ،طلاق اورگلو خلاصی کامطالبہ کریں۔

عن ثوبان عن رسول الله ﷺ قال ایما امرأة سألت زوجها طلاقا من غیر بأس فحرام علیها رائحة الجنة ۔

ترجمہ:''ثوبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جوکوئی عورت اپنے شوہر سے(کسی شرعی جواز اورحرج کے بغیر) طلاق کا مطالبہ کرے،تواس پر جنت کی خوشبوحرام ہے''،(ابوداؤدرقم الحدیث: 2221،ابن ماجہ رقم الحدیث:2055)۔

ان روایات کی روشنی میں معلوم ہوا کہ بیوی کابلاوجہ اپنے شوہر سے طلاق لینا،جنت کی خوشبو سے محروم ہونے کا باعث ہے،اورصورت مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہےتو عورت کامحض مالی منفعت کیلئے نکاح جیسے مقدس رشتے اورطلاق جیسے عنداللہ مبغوض اورقبیح امرکو کاروباراورلذت کوشی کاذریعہ بنانا حرام ہے،بلاوجہ باربارطلاق لےکرنئی جگہ شادی کرنا احکام الٰہیہ کی صریح مخالفت ہے،اس پر سچے دل سےتوبہ کرنا فرض ہے۔عدت کی مدت پوری کیے بغیرکسی دوسری جگہ نکاح کرنا ناجائز وحرام ہے،ان دونوں میں فی الفورتفریق کرانی چاہیےاوراگرنہ مانیں توان کے ساتھ میل جول،کھاناپیناترک کردیناضروری ہے۔

جولوگ اس نکاح میں شریک ہوئے اگرانھیں اس بات کاعلم تھا کہ لڑکی شادی شدہ تھی اور اب طلاق لےکرعدت کی مدت پوری کیے بغیر دوسرا نکاح کررہی ہےتوان سب لوگوں پر

توبہ لازم ہے نیز لڑکی اور اس کی ماں صورت مسئولہ میں اس گناہ میں برابر کی شریک ہیں لہٰذا انہیں سچے دل سے توبہ کرنی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ۔

ترجمہ: ''اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض روکے رکھیں''، (القرآن، البقرہ:228)۔

وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ۔

ترجمہ: ''اور (ابھی ان سے) عقدِ نکاح کی بات پکی نہ کرو، یہاں تک کہ مقررہ عدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے''، (القرآن، البقرہ:235)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

والمعنی لا تعزموا علی عقدة النکاح فی زمان العدة (حتی یبلغ الکتاب اجله) یرید تمام العدة والکتاب هنا هو الحد الذی جعل والقدر الذی رسم من المدة، حرم الله تعالیٰ عقد النکاح فی العدة بقوله تعالیٰ و لا تعزموا عقدة النکاح فی زمان العدة ۔وهذا من المحکم المجمع علی تاویله ان بلوغ اجله انقضاء العدة وقال الثوری والکوفیون والشافعی ، یفرق بینهما ولا یتابد التحریم بل یفسخ بینهما ثم تعتد منه ثم یکون خاطبا من الخطاب۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ دورانِ عدت عقدِ نکاح کی بات پختہ نہ کرو۔۔۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرما کر " وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ" عدت کے اندر عقدِ نکاح کو حرام قرار دیا ہے اور اس کا یہ مفہوم قطعی اور اجماعی ہے کہ ''بلوغِ اَجَل'' سے مراد عدت کا گزر جانا ہے، امام ثوری، حنفیہ اور شافعیہ نے کہا ہے: ان دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی اور یہ حرمت ابدی نہیں ہے، بلکہ وہ نکاح فسخ کردیا جائے گا، پھر وہ عورت عدت گزارے گی، پھر وہ شخص چاہے تو اسے نکاح کا پیغام دے، (احکام القرآن للقرطبی ج:3 ص:194,193,192)۔

علامہ ابوبکر جصاص اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قوله تعالیٰ (و لا تعزموا عقدة النكاح)معناه ولاتعقدوه ولا تعزموا عليه ان تعقدوه فی العدة (حتى يبلغ الكتاب اجله)يعنى به انقضاء العدة ۔
ولاخلاف بين الفقهاء ان من عقد على امرأة نكاحا وهی فی عدة من غير ان النكاح فاسد ۔ فقال ابوحنيفة و ابو يوسف ومحمد وزفر عليهم الرحمة يفرق بينهما ولها مهر مثلها فاذا انقضت عدتها من الاول تزوجها الآخر ا ن شاء وهو قول الثوری والشافعی عليهما الرحمة ۔

"(مفہومِ عبارت):اس کے معنی یہ ہیں کہ مطلّقہ عورت کی عدت جب تک گزر نہ جائے، اس سے نکاح کرنا اوریا نکاح کی بات پکی کرنا ممنوع ہے،اوراس مسئلے میں فقہاء میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کسی شخص نے کسی عورت سے اس حال میں نکاح کیا کہ وہ اپنے سابق شوہر کی عدت کے اندر تھی،تو یہ نکاح فاسد ہے۔امام ابوحنیفہ،امام ابو یوسف،امام محمد،امام زفر رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا:(ایسے نکاح کی صورت میں)ان دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی اورعورت مہرِ مثل کی حق دار ہوگی،اور جب پہلے شوہر کی دی ہوئی طلاق کی عدت ختم ہوجائے،تو اگر دوسرا چاہے تو اس سے نکاح کرسکتا ہے،امام شافعی اورامام ثوری علیہما الرحمہ کا بھی یہی قول ہے"، (احکام القرآن للجصاص: ج1ص:425)۔

امام محمد بن حسن شیبانی فرماتے ہیں:

اخبرنا مالک اخبرنا ابن شهاب عن سعيد بن المسيب وسليمٰن بن يسار انهما حدثا ان ابنة طلحة بن عبيد الله كانت تحت رشيد الثقفی فطلقها فنكحت فی عدتها ابا سعيد ابن منبة او الجلاس بن منبة فضربها عمر وضرب زوجها بالمخفقة ضربات وفرق بينهما وقال عمر ايتما امرأة نكحت فی عدتها فان كان زوجها الذی تزوجها لم يدخل بها ثم اعتدت بقية عدتها من الاول ثم كان خاطبا من الخطاب وان كان قد دخل بها فرق بينهما ثم اعتدت بقية عدتها من الاول ثم اعتد تعدتها من الاخر ثم لم ينكحها ابدا ۔

(مفہوم عبارت): ''امام مالک نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا کہ طلحہ بن عبیداللہ کی بیٹی رشید ثقفی کے نکاح میں تھی، تو ان سے (طلاق کے بعد) عدت کے اندر ہی ابوسعید بن منبہ یا جلاس نے نکاح کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو ضربِ خفیف کے ساتھ تأدیباً مارا اور فرمایا: جو کوئی عورت (طلاق کے بعد) اپنے سابقہ شوہر کی عدت کے دوران نکاح کرے گی، اس صورت میں اگر اس شوہر (زوجِ ثانی) نے اس سے مباشرت نہ کی ہو، تو وہ اپنے سابق شوہر کی عدت پوری کرے گی، پھر یہ دوسرا شوہر چاہے تو اس سے نکاح کرے یا پیغامِ نکاح دے، (یعنی دورانِ عدت کیا جانے والا نکاح کالعدم ہے) اور اگر اس دوسرے شوہر نے اس سے مباشرت کرلی ہو تو ان کے درمیان تفریق کردی جائے گی، پھر وہ پہلے شوہر کی بقیہ عدت گزارے گی اور اس کے بعد دوسرے شوہر کی عدت گزارے گی اور اس شخص کو چاہیے کہ اس عورت سے کبھی نکاح نہ کرے''، (مؤطا امام محمد ص:250، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب، کراچی)۔

عن مجاهد قال رجع عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه فی التی تتزوج فی عدتها الی قول علی بن ابی طالب وذلک ان عمر قال اذدخل بها فرق بینهما ولم یجتمعا ابدا واخذ صداقها فجعل فی بیت المال فقال علی کرم الله تعالیٰ وجهه لها صداقها بما استحل من فرجها فاذا انقصت عدتها من الاول تزوجها الاخر ان شاء فرجع عمر الی قول علی بن ابی طالب ـ وقال محمد وبهذا ناخذ وهو قول ابی حنیفة والعامة من فقها ئنا ـ

(مفہومِ عبارت): ''مجاہد نے کہا کہ اس مسئلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے، اپنے اس قول سے (کہ دوسرے شوہر کی مباشرت کی صورت میں ان کے درمیان تفریق کردی جائے گی اور اس عورت کا مہر بیت المال میں جمع کردیا جائے گا اور پھر ان دونوں کے درمیان کبھی نکاح نہیں ہوسکے گا) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کی طرف رجوع کرلیا کہ وہ عورت تفریق کے بعد مہر کی حقدار ہوگی، کیونکہ شوہر نے اس سے حلال جان کر مباشرت کی، اور جب پہلے

شوہر کی عدت گزر جائے تو دوسرا شوہر چاہے تو نکاح کر سکتا ہے، امام محمد نے کہا کہ ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ہمارے عام فقہاء کا یہی قول ہے"۔(الموطاامام محمد ص:251)۔

محمد قال اخبرنا ابو حنیفة عن حماد عن ابراهیم عن علی بن ابی طالب انه قال فی المرأة تتزوج فی عدتها قال یفرق بینهما وبین زوجها الاخر ولها الصداق منه بما استحل من فرجها وتستکمل ما بقی من عدتها من الاول وتعتد من الاخر عدة مستقلة ثم یتزوجها الاخر ان شاء قال محمد وبهذا ناخذ الا انا نقول تستکمل عدتها من الاول وتحتسب بما مضی من ذلک من عدة الاخر الی استکمالها عدة الاول وتعتد ما بقی من عدة الاخر۔

(مفہومِ عبارت): "امام محمد کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہ عورت جس نے سابق شوہر کی عدت کے دوران دوسرا نکاح کرلیا ہو، تو ان دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی، اور وہ مہر کی (بھی) حقدار ہوگی، کیونکہ اس دوسرے شوہر نے حلال جان کر اس سے مباشرت کی، پھر وہ پہلے شوہر کی عدت پوری کرے گی اور اس کے بعد دوسرے شوہر کی عدت مستقلاً پوری کرے گی، پھر اگر دوسرا شوہر چاہے تو اس سے نکاح کر سکتا ہے، امام محمد کہتے ہیں: یہی ہمارا مسلک ہے، مگر ہم کہتے ہیں کہ وہ پہلے کی عدت کو پورا کرے گی اور اس تفریق کی تاریخ سے پہلی بقیہ عدت اور دوسری عدت ایک ساتھ شروع ہوں گی، گویا دونوں عدتوں میں تداخل ہوگا، یعنی پہلی عدت کی بقیہ مدت، دوسری عدت کی ابتدائی مدت شمار ہوگی"۔

(کتاب الآثار لامام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بروایت امام محمد علیہ الرحمۃ ص:256، اعلاء السنن: ج:11ص:134)

واتفقوا علی ان النکاح لا یجوز فی العدة کانت عدة حیض او عدة حمل او عدة اشهر. وقال ابوحنیفة والشافعی والثوری یفرق بینهما واذا انقضت العدة بینهما فلا باس فی تزویجه ایاها مرة ثانیة۔

مفہومِ عبارت: "اس مسئلے پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ عدت کے اندر نکاح جائز نہیں ہے، خواہ وہ

عدت حیض ہو یا عدت حمل ہو یا (آئسہ اور بیوہ غیر حاملہ ہونے کی صورت میں) مہینوں کے شمار کے اعتبار سے عدت ہو۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام ثوری نے کہا کہ ان دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی، اور پھر عدت گزرنے کے بعد وہ شخص اس عورت سے حسب منشا دوبارہ نکاح کرسکتا ہے"۔ (الفصل الحادی عشر فی مانع العدۃ، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ج:2ص:35)۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(اذا وطئت المعتدة بشبهة وجبت عدة اخرى وتدا خلتا وعليها ان تتم) العدة (الثانية ان تمت الاولى) وكذا لو بالاشهر۔

ترجمہ: "معتدہ (یعنی جو عورت ایام عدت میں ہے) کے ساتھ وطی بالشبہ (یعنی جسے وہ اپنی دانست میں جائز سمجھیں) کرلی گئی ہو، تو (پہلی عدت کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اس پر) دوسری عدت پوری کرنا بھی لازم ہے، اور ان دونوں میں تداخل ہوگا (یعنی پہلی عدت کی بقیہ مدت اور دوسری عدت ایک ساتھ شروع ہوں گی)، خواہ عدتِ حیض ہو یا عدتِ ایام (غیر حائض ہونے کی صورت میں) یا عدت وفات یا عدت وضع حمل"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار ج:5ص:159، مطلب فی وطئی المعتدة بشبهة، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدقِ سائل، عورت نے سابق شوہر سے طلاق کے 81ویں دن نکاح کیا، جو اس کی عدت کے ایام تھے، کیونکہ وہ مستحاضہ ہے اور اس کی عدت تین ماہ ہوتی ہے، 10 دن حیض کے باقی 20 دن پاکی کے، لہٰذا عدت کے ایام پورے 90 نوے دن ہوں گے، عدت کے دوران جو نکاح ہوا وہ فاسد اور کالعدم ہے، جیسا کہ آیات و روایات اور فقہاء کرام کے اقوال سے ظاہر و باہر ہے۔ دورانِ عدت نکاح تو درکنار، نکاح کا پیغام دینا بھی سخت حرام ہے۔ عورت، اس کی ماں اور جو لوگ، یہ ساری حقیقت معلوم ہونے کے باوجود نکاح میں شریک ہوئے، سب پر توبہ لازم ہے۔ لیکن چونکہ زوجِ ثانی کو اس بات کا علم نہیں تھا، لہٰذا اس پر کوئی گناہ اور الزام نہیں، تاہم دونوں کے درمیان فوری طور پر تفریق کردی جائے گی، اگر عورت کے ساتھ زوج ثانی نے عمل زوجیت (Sexual

Intercourse) کرلیا ہوتو عورت پر پہلی عدت کی تکمیل کے ساتھ ساتھ دوسری عدت بھی لازم ہے، اگر مہر مقرر ہوا تھا تو عورت اس مہر کی حقدار ہے، جبکہ وہ مَہر مثل سے کم ہو، ورنہ وہ مہر مثل کی حقدار ہوگی، پہلی عدت کی بقیہ مدت اور دوسری عدت، دونوں ایک ساتھ شروع ہوں گی۔ اگر دورانِ عدت نکاح کی صورت میں زوجِ ثانی نے عورت سے مباشرت نہیں کی، تو صرف پہلی عدت کی تکمیل لازم ہے اور عورت مہر کی حقدار بھی نہیں ہے، دونوں صورتوں میں تکمیل عدت کے بعد وہ دونوں باہمی رضامندی سے آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اگر مسئلہ معلوم ہونے کے بعد وہ علیحدگی اختیار نہ کریں، تو مسلمانوں پر ان کا مقاطعہ (Social Boycott) لازم ہے۔

چونکہ صورت مسئولہ میں عورت حائض نہیں ہے، اور اگر وہ حاملہ بھی نہیں ہے، اور زوجِ ثانی کے ساتھ مباشرت ہو چکی ہے، تو تفریق کی تاریخ سے نوے دن کی عدت اس پر لازم ہے۔ اور عورت اور اس کی ماں پر صدقِ دل سے توبہ کرنا لازم ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے صریح احکام سے بغاوت اور ان کے استخفاف و استہزاء پر انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور عاقبت کی بربادی کیلئے تیار رہنا چاہیے، انہوں نے ایسا کر کے ناپاک جسارت کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دی ہے، نعوذ باللہ من ذالک۔

اگر عورت واقعی سچے دل سے توبہ کرلے تو جدائی کے دن سے تین ماہ کامل عدت گزارنے کے بعد زوجِ ثانی سے نکاح کر سکتی ہے۔ عورت اور اس کی ماں کو چاہیے کہ ایسی قبیح حرکات اور لالچ سے سچی توبہ کریں اور احکام الٰہیہ کا تمسخر کر کے غضب الٰہی کو دعوت نہ دیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مہر مؤجل یا معجل کی شرعی حیثیت

سوال:69

مندرجہ ذیل دو مسئلوں کا حل مطلوب ہے۔

(1) کیا مہر مؤجل میں قبل از مباشرت عورت کو مہر میں سے کچھ حصہ دینا ضروری ہوتا ہے یا

کہ نہیں؟۔

(2) کیا مہر کی مؤجل اور معجّل میں تقسیم حضور ﷺ کے زمانے سے ہے یا آپ کے زمانے کے بعد شروع ہوئی؟، دلائل کی روشنی میں فتویٰ دے کر عنداللہ ماجور ہوں، (محمد سرفراز، نکیال آزاد کشمیر)۔

جواب:

قرآن وحدیث میں مہر کے لئے صَداق، صِداق صُدقہ اور اُجور کے الفاظ آئے ہیں، ان الفاظ کا مادہ اور ماخذ ''صدق'' ہے۔ ملاعلی القاری مرقات شرح مشکوٰۃ شریف میں اس کی وجہ تسمیہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مہر کو ان الفاظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عورت کی جانب شوہر کے میلان کی صداقت کی دلیل اور علامت ہوتا ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کے کسی بھی مذہب میں نکاح کے ساتھ مہر مقرر نہیں کیا گیا۔ اسلام نے مہر عورت کی تکریم کی علامت کے طور پر مشروع کیا ہے، کیونکہ ایک اجنبی عورت جو نکاح سے پہلے حرام ہوتی ہے، عقدِ نکاح کے نتیجے میں شوہر پر حلال ہوجاتی ہے۔ مہر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر خاوند عورت کو طلاق دے دے تو دوسری جگہ نکاح ہونے تک یا گذر اوقات کا کوئی معاشی ذریعہ مقرر ہونے تک اس کے پاس اتنی رقم ہو جس سے وہ اپنی کفالت کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مردوں کو سخت تاکید کی ہے کہ وہ عورتوں کو ان کا مہر ادا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً''(القرآن)

ترجمہ: ''جن عورتوں سے (بذریعہ نکاح) تم فائدہ اٹھا چکے ہو، تو ان کا مقررہ مہر ادا کردو''۔

فقہاءِ کرام نے اصولِ شرع سے استنباط کرتے ہوئے نکاح میں مہر مقرر کرنے کی تین قسمیں بیان کی ہیں: (1) مہر معجّل (2) مہر مؤجل (3) مہر مؤخر

مہر معجّل: اس مہر کو کہتے ہیں جو رخصتی سے قبل دینا قرار پایا ہو، اس صورت میں عورت کو اختیار ہے کہ جب تک اسے مکمل وصول نہ کرلے، شوہر کے یہاں نہ جائے اور اس نہ جانے سے وہ نفقہ سے محروم نہ ہوگی۔ جو مہر معجّل ٹھہرا وہ ہمیشہ معجّل ہی رہے گا جب تک عورت اپنی رضا سے

اسے مؤجل نہ کردے، حتیٰ کہ کئی سال تک عورت کا مطالبہ نہ کرنا اس کے حق میں فرق نہیں لاتا۔ وہ جب اور جس وقت چاہے اپنے مہر معجّل کا مطالبہ کرسکتی ہے اور جب تک نہ ملے تو وہ اپنے نفس کو شوہر سے روک سکتی ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ولها منعه من الوطئی) ودواعیه (والسفربهاولو بعد وطئی وخلوة رضیتهما)

ترجمہ: ''بیوی کو مہر معجّل کل یا بعض جتنا بیان ہوا یا عرف میں جتنی مقدار معجّل ہوتی ہے وصول کرنے کے لئے خاوند کو وطی اور اس کے لئے دواعی سے منع کرنے کا حق ہے اگرچہ زوجہ کی رضامندی سے پہلے وطی یا خلوت ہوچکی ہو، (ردالمحتار، جلد:2، ص:35)''۔

مہر مؤجل: وہ مہر ہے جس کی ادائیگی کے لئے اجل یعنی ایک میعاد قرار پائی ہو، مثلاً سال بھر بعد یا دس برس بعد، میعاد جب تک پوری نہ ہوجائے تو عورت کو مطالبے کا اختیار نہیں، میعاد پوری ہونے کے بعد مطالبہ کرسکے گی اور میعاد آنے پر اگر شوہر دینے میں تاخیر کرے تو اس کے لئے اپنے نفس کو نہیں روک سکتی خصوصاً جبکہ رخصتی ہوچکی ہو۔

شرح جامع صغیر علامہ قاضی خاں میں ہے: ترجمہ: اگر مہر مؤجل ہو تو مقررہ مدت ختم ہونے سے قبل یا بعد بیوی کو منع کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور فتاویٰ شامی میں ہے: (ترجمہ) بحر میں فتح سے ہے: یہ جب ہے کہ مقررہ مدت پوری ہونے سے قبل دخول کی شرط نہ لگائی گئی ہو اور اگر یہ شرط لگائی گئی ہو اور بیوی کی رضامندی سے دخول ہوچکا ہو تو پھر بالاتفاق اس کو منع کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس پر اعلیٰ حضرت لکھتے ہیں:

ترجمہ: اور ہمارے علاقہ کا عرف یہ ہے کہ مہر کا حصہ ادا کرنے سے قبل دخول ہوتا ہے، تو معروف مشروط کی طرح ہوتا ہے اس لئے ہمارے علاقہ میں بالاجماع بیوی کو منع کا حق نہیں ہوگا، (جدالممتار)۔

مہر مؤخر: اس مہر کو کہتے ہیں جو نہ تو رخصتی سے پہلے دینا قرار پایا ہو، نہ اس کی ادائیگی کیلئے میعاد مقرر ہوئی ہو، اس کا مطالبہ موت یا طلاق سے قبل نہیں ہوسکتا، نہ اس کے لئے کسی وقت

اپنے نفس کو روک سکتی ہے۔ مختصر الوقایہ میں ہے: (ترجمہ) معجل یا مؤجل مہر کو بیان کیا گیا ہو تو بہتر ورنہ عرف میں جو مراد ہو وہی ٹھہرے گا۔ اس کی شرح میں ہے: (ترجمہ) یہی مختار ہے کیونکہ متاخرین نے مہر کو عرف پر مبنی قرار دیا ہے۔ فتاوٰی عالمگیری میں ہے: (ترجمہ) اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مہر کے لئے مدت مقرر کی جاسکتی ہے مثلاً مہینہ یا سال وغیرہ، یہ صحیح ہے اور اگر مدت معلوم نہ ہو تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے، بعض نے فرمایا: صحیح ہے ،اور یہی اصح ہے کیونکہ انتہا معلوم ہے کہ وہ طلاق ہے یا موت ہے۔

فتاوٰی شامی میں ہے:

ترجمہ: ''مہر مؤخر میں بیوی کو مطالبے کا حق موت یا طلاق کے بعد ہی ہوتا ہے، نکاح کے وقت سے مطالبہ کرنے کا حق نہیں''۔

ہمارے یہاں عرف میں مؤجل سے مراد مہر مؤخر ہوتا ہے کیونکہ مہر مؤجل میں مدت کی تعیین ہوتی ہے اور مدت کی تعیین کوئی بھی نہیں کرتا۔ اس لئے اس مہر کے مطالبے کا حق عورت کو شوہر کے موت یا طلاق دینے پر ہی ہے، اس سے پہلے وہ مطالبہ نہیں کرسکتی۔ مہر مؤجل، جس میں مدت معلوم ہو یا مہر مؤخر کی صورت میں شوہر پر وطی سے پہلے مکمل مہر یا کچھ حصہ دینا واجب نہیں ہوتا، نہ ہی مہر ادا کئے بغیر وطی حرام ہوتی ہے۔ البتہ ہمارے فقہاء نے لکھا ہے: کچھ حصہ اگر شوہر بیوی کو خوش کرنے کے لئے اپنی مرضی سے دے دے تو یہ اس کے لئے مستحب ہے۔

علامہ کمال الدین محمد بن عبدالواحد بن ہمام لکھتے ہیں:

پسندیدہ امر یہ ہے کہ دخول سے پہلے کچھ دے دیا جائے اور بغیر دیے بھی دخول جائز ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں ایک عورت کو اس کے خاوند کے کچھ دینے سے پہلے اس کے پاس کچھ بھیج دوں،

(سنن ابی داؤد حدیث: 2128 سنن بیہقی ج:7 ص:253)۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو دخول سے پہلے کچھ دینا مستحب ہے، واجب نہیں تاکہ عورت کا

دل دخول کے وقت خوش ہو اور اس کی تالیف قلب ہو، (فتح القدیر:ج:3،ص:306 مطبوعہ مرکز اہلسنت برکات رضا، ہند)۔

دکتور وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

فقہاء نے ادائیگی مہر کیلئے مدت مقرر کرنے کو جائز قرار دیا ہے، حنفیہ نے کہا: مہر کا معجّل ہونا یا مؤجل ہونا درست ہے، خواہ سارے کا سارا مؤجل ہو یا اس کا کچھ حصہ، اور ادائیگی کی میعاد قریب ہو یا دور، یا یہ قرار دیا ہو کہ دو میعادوں میں سے جو قریب ہو (وہ مراد ہے)، جیسے طلاق یا وفات، اسلامی ممالک میں ان امور میں عرف اور عادت پر عمل ہوگا، بشرطیکہ یہ میعاد جہالت فاحشہ پر مشتمل نہ ہو، جیسے شوہر یوں کہے کہ میں نے ایک ہزار درہم مہر کے عوض تم سے نکاح کیا، جب مجھے آسانی ہوگی ادا کردوں گا یا جب ہوائیں چلیں گی یا جب بارش برسے گی وغیرہ، تو ایسی میعاد مقرر کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ جہالت فاحشہ ہے۔ اور جب مہر کی بالاقساط ادائیگی پر صراحت کے ساتھ (فریقین کا) اتفاق ہوجائے، تو اس پر عمل (لازمی) ہوگا، کیونکہ (فریقین کا) اتفاق صراحت کی مانند ہے اور عرف دلالت کے قبیل سے ہے اور صریح دلالت سے زیادہ قوی ہے۔ اور جب مہر کے معجّل یا مؤجل ہونے پر کوئی اتفاق نہ ہوا ہو تو پھر مقامی عرف کا اعتبار ہوگا، کیونکہ جو چیز عرفاً معروف (ومعہود) ہو وہ مشروط ہی کی طرح ہوتی ہے۔

اور اگر مہر کے معجّل یا مؤجل ہونے کے بارے میں مقامی طور پر کوئی عرف طے شدہ نہ ہو تو عورت فوری طور پر مہر کی حقدار ہوگی، کیونکہ مسکوت (یعنی جس کے بارے میں عقد کے وقت سکوت اختیار کیا ہو) کا حکم معجّل ہی کا ہے، کیونکہ اصل اور قاعدہ یہی ہے کہ عقد کے پورا ہوتے ہی مہر لازم ہوجاتا ہے۔

کیونکہ ہر عقد کا اثر لازم ہے، اور جب صراحتاً یا عرفاً کوئی میعاد مقرر نہ ہو تو اصل پر عمل ہوگا، کیونکہ (بنیادی طور پر) نکاح مبادلے کا عقد ہے تو (لازماً) جانبین سے مساوات کا تقاضا کرتا ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد نمبر:7 ص:248-247)۔

جہیز و بری کے سامان کی ملکیت کا مسئلہ اور ایام عدّت کا نفقہ

سوال:70

بوقت نکاح اور اس کے بعد شوہر بیوی کو جو زیور، کپڑے اور دیگر ذاتی استعمال کی اشیاء دیتا ہے، تین طلاقوں کی صورت میں مذکورہ اشیاء کیا واپس لے سکتا ہے؟۔

(احتشام الحق، کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں معلوم ہو کہ شادی کے موقعے پر دلہن کو شوہر یا سسرال والوں کی جانب سے جو زیورات، لباس، سامان اور تحائف وغیرہ ملتے ہیں، اسے عرف عام میں ''بری'' کہا جاتا ہے۔ بری کے سامان کی ملکیت و استحقاق کا مسئلہ ہمارے معاشرے میں نارمل حالات میں اٹھتا ہی نہیں ہے، اگر عائلی و ازدواجی زندگی خوشگوار ہے، باہم محبت ہے، سب معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں تو اس طرح کے سوالات خواب و خیال میں بھی نہیں آتے چہ جائے کہ عملی زندگی میں ان کو چھیڑا جائے۔ تاہم ان کی ممکنہ صورتیں اور ان کے احکام درج ذیل ہیں:

(۱) یہ کہ کسی علاقے، کمیونٹی یا برادری میں یہ معروف اور طے شدہ اصول ہو کہ بری کا سامان شوہر یا اس کے خاندان کی ملکیت ہوتا ہے، تو عرف بھی نصِ شرع کی طرح ہوتا ہے اور اسی پر معاملات کا فیصلہ ہوگا اور عورت کے لئے محض تصرف و استعمال کی اجازت ہی سمجھی جائے گی اور طلاق کی صورت میں وہ سامان شوہر کا ہوگا اور اس کی وفات کی صورت میں وہ اس کے ترکے میں شمار ہوگا۔

(۲) شادی کے موقع پر باقاعدہ تحریری طور پر یا زبانی طے کر لیا جائے کہ بری کا سامان کس کی ملکیت ہوگا تو بعد میں اسی کے مطابق عمل ہوگا اور بہتر یہی ہے کہ شادی کے موقع پر نکاح نامے میں یہ درج کرا دیا جائے کہ بری کے زیورات اور سامان کس کی ملکیت ہوں گے تاکہ بعد میں خدانخواستہ طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت میں تنازع نہ پیدا ہو۔

(۳) شادی کے موقع پر یہ سامان دلہن کو ہبہ (GIFT) کردیا گیا ہو، لیکن بعد میں زوجین میں اختلافات رونما ہونے کی بناء پر نیت میں فتور آجائے تو ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

(۱) العائد فی ھبتہ کالعائد فی قیئہ۔

''ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کرکے دوبارہ اسے چاٹ لے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:4062)۔

(۲) مثل الذی یرجع فی صدقتہ کمثل الکلب یقیٔ ثم یعود فی قیئہ فیاکلہ۔

''جو شخص صدقہ کرکے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:4058)۔

امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں:

''دلہن کا گہنا جوڑا جو بری میں جاتا ہے، اگر نصاً یا عرفاً اس میں بھی تملیک ہوتی ہو، جیسے شکر، میوہ، عطر پھلیل وغیرہ میں مطلقاً ہوتی ہے، تو وہ بھی قبضہ منکوحہ، ملکِ منکوحہ ہوگا، ہمارے یہاں شرفاء کا عرف ظاہر یہی ہے، ولہٰذا بعد رخصت اس کے واپس لینے کو سخت معیوب و موجب مطعونی جانتے ہیں، اور اگر لے لیں تو طعنہ زن یہی کہتے ہیں کہ دے کر پھیر لیا یا صرف دکھانے کو دیا تھا، جب دلہن آئی چھین لیا، یعنی یہ ان کی رسمِ معہود کے خلاف ہے، اس صورت میں تو اس کے لئے بعینہٖ وہی احکام ہوں گے جو دولہا کے جوڑے میں گزرے کہ بعد ہلاک دلہن سے تاوان لینے کا اصلاً اختیار نہیں، جیسے شکر، میوہ کا تاوان بٹنے کے بعد نہیں مل سکتا، اگرچہ ہنوز کھانے میں نہ آیا ہو......

آگے چل کر لکھتے ہیں...... ہاں جہاں عرف تملیک نہ ہو بلکہ صرف پہنانے کے لئے بھیجا جاتا اور پہنانے والوں ہی کی ملک سمجھا جاتا ہو، وہاں دلہن کی ملک نہیں، ایک عاریت ہے کہ بحالتِ بقا جس سے رجوع ہر وقت جائز و حلال''، (فتاویٰ رضویہ، ج ۱۲، ص ۲۰۸، رضا

فاؤنڈیشن، لاہور)۔ میری دانست میں ہمارے یہاں بھی معزز خاندانوں اور شرفا کا معمول اور عرف یہی ہے کہ بری کا سامان وزیورات وغیرہ دلہن کو بطورِ ملک دیئے جاتے ہیں اور وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہتی ہے، تاہم جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، اگر کسی خاندان، برادری، کمیونٹی یا علاقے کا رواج اور عرف یہی ہے کہ بری کے زیورات اور سامان دلہن کو عاریتاً محض استعمال کے لئے دیئے جاتے ہیں نہ کہ ملکیت کے طور پر، تو وہ اپنے عرف پر ان کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

بیوی کا الگ جائے رہائش کا حق

سوال:71

کیا از روئے شریعت بیوی کو الگ مکان یا جائے رہائش کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، اگر شوہر صاحبِ حیثیت ہو تو کیا کرے، اور اگر وہ کسی مشترک فیملی کے ساتھ رہائش پذیر ہے اور بیوی کو الگ مکان دینے کی استطاعت نہیں رکھتا، تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟
(مولانا نصیر اللہ نقشبندی، آزاد کشمیر)

جواب:

بیوی کے نان نفقہ اور رہائش یعنی مصارف ضروریہ کی فراہمی شوہر کی ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ؕ

"اور والد کے ذمے ان (دودھ پلانے والی ماؤں) کی خوراک اور لباس دستور کے موافق لازم ہے"، (البقرہ:233)۔

(۲) لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ

ترجمہ: "کشادہ روزگار والا اپنی حیثیت کے مطابق (اپنی بیوی کو) نفقہ دے اور جس پر روزی تنگ کر دی گئی ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال میں سے (اپنی حیثیت کے مطابق

بیوی کو) نفقہ دے، اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی بساط سے بڑھ کر کسی بات کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا''، (الطلاق:7)۔

(۳) اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ

ترجمہ: ''(اپنی حیثیت کے مطابق) عورتوں کو وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو اور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ''، (الطلاق:6)۔

ان آیات کے تحت علامہ قرطبی مالکی اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ قاضی شوہر کی حیثیت اور بیوی اور بچے کی ضرورت کی مناسبت سے نفقے کی مقدار مقرر کرے گا۔

علامہ برہان الدین المرغینانی ''الہدایہ'' میں باب النفقہ کے تحت لکھتے ہیں:

(ویفرض لها علی الزوج النفقة اذا کان موسر ونفقة خادمها)۔

''اگر شوہر مالدار ہے تو اس پر بیوی کا نفقہ اور اس کے خادم کا نفقہ بھی واجب ہے''، وہ مزید لکھتے ہیں:

(وعلی الزوج ان یسکنهافی دار مفردة لیس فیها احد من اهله الاانْ تختار ذالک)لان السکنیٰ من کفایتها فتجب لها کالنفقة وقد اوجبه اللّٰه تعالیٰ مقروناً بالنفقةواذاو جب حقا لها لیس له ان یترک غیرها فیه لانها تتضرر فیه فانها لا تأمن علی متاعها ویمنعها ذالک من المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع الا ان تختار لانها رضیت بانتقاص حقها۔

شوہر پر لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی کو الگ گھر میں رکھے، جہاں اس کے گھر والوں میں سے کوئی نہ رہتا ہو، ہاں اگر بیوی کو ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تو پھر دوسروں کے ساتھ رکھنا بھی درست ہے، کیونکہ ''جائے رہائش'' بیوی کی ضروریات میں سے ہے تو اس کا یہ حق اس طرح واجب ہے جیسے نفقہ، اللہ تعالیٰ نے اس کے وجوب کا حکم نفقہ کے وجوب کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور جب الگ ''جائے رہائش'' بیوی کے حق کے طور پر واجب ہے تو اس پر دوسروں کو اپنے ساتھ ٹھہرانا لازم نہیں ہے، کیونکہ یہ اس کے لئے باعث تکلیف ہوسکتا ہے

اور اس کا سامان بھی اس طرح محفوظ نہیں رہے گا، اور شوہر کے ساتھ بلا تکلف میل جول میں بھی (مشترکہ رہائش) رکاوٹ بنے گی اور وہ آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے لطف نہیں اٹھا سکیں گے، ہاں اگر وہ خود ایسی صورت حال پر راضی ہے تو درست ہے کیونکہ اس نے خود ہی اپنا حق باطل کردیا''۔

علامہ محمود احمد نسفی کنز الدقائق میں ''باب النفقہ'' کے تحت لکھتے ہیں: ''بیوی کا نفقہ اور لباس دونوں کے حالات کی مناسبت سے شوہر پر لازم ہے''۔ النہر الفائق شرح کنز الدقائق جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۵۰۴ پر ہے: ''شوہر پر وجوب نفقہ کا جو صریح حکم شرعی ہے وہ گھر خوراک و لباس اور نقد ضروریات سب پر مشتمل ہے''۔ اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شوہر پر بیوی کا نفقہ واجب ہے اور نفقہ کی اصطلاح خوراک، لباس اور جائے رہائش سب کو شامل ہے۔ نفقہ کا معیار مقرر کرتے وقت شوہر پر اس کی مالی حیثیت سے زیادہ معیار کا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، عربی میں ''دار'' مکان کو کہتے ہیں اور ایک ''دار'' میں کئی ''بیت'' ہوسکتے ہیں۔ عورت ایک مشترکہ ''دار'' میں الگ ''بیت'' کا مطالبہ کرسکتی ہے، جس کا الگ دروازہ ہو اور جہاں اس کا سامان محفوظ ہو اور جسے وہ اپنی حسب منشاء کھول سکے اور بند کرسکے، جہاں کسی اور کا عمل دخل نہ ہو اور جہاں میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کے قیام اور بے تکلف میل جول میں کوئی حسی یا طبعی رکاوٹ نہ ہو، الگ گھر کے ساتھ ساتھ اس کے متعلقات (باورچی خانہ و بیت الخلاء) بھی الگ ہونا ضروری ہیں یا نہیں یہ حالات پر منحصر ہے۔ اگر شوہر مالدار ہے تو بیوی الگ مکان کا مطالبہ بھی کرسکتی ہے، علامہ ابن عابدین شامی نے اپنے فتاویٰ ردالمحتار میں یہ تمام امور تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

مہر کا معاہدہ اور مہر کی رقم میں اختلاف

سوال:72

میں مسمی افتخار احمد ولد سلیم خان، ساکن ھڈہ، جیل روڈ، کوئٹہ آپ کی خدمت میں مندرجہ ذیل تفصیل پیش کررہا ہوں، جس کی روشنی میں اٹھائے گئے سوالات پر آگاہی فرمائیں

اورفتویٰ صادرفرمائیں تاکہ اللہ اوراس کے رسول ﷺ کے سامنے مجھے کسی قسم کی شرمندگی نہ ہواور مجھ سے کسی بھی قسم کی کوئی کوتاہی نہ ہواور حقدار کواس کا پوراپورا حق ملے، آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی۔

تفصیل نمبر ا: مؤرخہ 17-06-1993 کے حوالے سے ایک ایگریمنٹ یااقرارنامہ بنوایا گیا، جس پر میری زوجہ مسماۃ مسرت نور دختر نورمحمد کے بھائی مسمی ارشدخان نے دستخط کئے اور میرے جعلی دستخط کرکے اپنے جاننے والے دوگواہان بناکر دستخط کرواکرا ایگریمنٹ یا اقرارنامہ رکھ لیا۔ جس میں شادی سے متعلق مختلف شرائط درج تھیں۔

مؤرخہ 18-06-1993 کونکاح کی رسم قرار پائی۔ نکاح نامہ کے شرائط میں ایگریمنٹ یا اقرار نامہ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ ایگریمنٹ میں لکھی گئی حق مہر کی رقم 50,000/روپے (پچاس ہزار روپے) تھی جبکہ نکاح نامے میں حق مہر کی رقم -/5000 روپے (پانچ ہزار روپے) لکھی گئی تھی۔ ایگریمنٹ/اقرارنامے کی کاپی منسلک ہے۔ نکاح نامے (مؤرخہ 18-06-1993)، میں لڑکی کے والد اور لڑکی کے دستخط موجود ہیں، لیکن لڑکی کے بھائی جس نے ایگریمنٹ/اقرار نامہ تیار کیا اس کے کہیں بھی اور کسی بھی حیثیت سے دستخط نہیں ہیں۔ نکاح نامے کی کاپی منسلک ہے، مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں درج ذیل سوال پیش خدمت ہیں۔

سوال:73

اگرلڑکی یااس کے والد نے ایگریمنٹ/اقرارنامہ پر دستخط نہ کئے ہوں بلکہ صرف اس کے بھائی نے دستخط کئے ہیں تو ایسی صورت میں ایسے ایگریمنٹ/اقرارنامے کی شرعی طور پر کیا حیثیت ہوگی۔

سوال:74

کیالڑکی اوراس کے والد کی موجودگی میں لڑکی کا بھائی یک طرفہ طور پرلڑکے سے کوئی معاہدہ یااقرارنامہ کرنے کا مجاز ہے، اس کی شرعی حیثیت کیاہوگی جبکہ لڑکے نے نکاح نامے میں بھی کوئی کردار ادانہیں کیا، (یہاں مندرجہ بالا لڑکے سے مرادلڑکی کا بھائی ارشد

خان ہے)۔

سوال:75

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اگریمنٹ پر لڑکی کے شوہر نے دستخط کیے تھے، تو ایسی صورت میں اگریمنٹ / اقرارنامے کی شرعی حیثیت کیا ہوگی، جس میں لڑکی نے خود دستخط نہ کیے ہوں اور نہ ہی لڑکی کے والد نے۔

تفصیل نمبر ۲: لڑکی اپنے شوہر سے علیحدہ ہوکر اس بنیاد پر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی کہ لڑکے نے اس کو اس کی بڑی بیٹی جو لڑکے کی پہلی بیوی سے ہے، جس کی عمر اس وقت تقریباً 12 سال تھی، کی موجودگی میں طلاق دے دی ہے۔ لڑکی کے والد نے ایک مفتی صاحب کو بتلایا کہ لڑکے نے میری بیٹی کو بہ ہوش وحواس تین بار طلاق دے دی ہے، جس پر مفتی صاحب نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ لڑکی کو طلاق مغلظہ واقع ہوگئی اور اب لڑکی بغیر حلالہ کے لڑکے پر حرام ہوگئی، فتویٰ منسلک ہے۔

لڑکی نے اس فتوے کی بنیاد پر فیملی کورٹ میں نان نفقہ، حق مہر اور جہیز کے سامان کا کیس داخل کیا۔ فیملی کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ واضح کیا کہ طلاق کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا، کیونکہ فریقین نے اس پر نہ کوئی گواہی پیش کی ہے۔ اور نہ ہی لڑکے نے طلاق کو قبول کیا ہے۔

دیگر اگریمنٹ / اقرارنامہ کی رو سے اس میں درج حق مہر کی رقم -/50,000 روپے (پچاس ہزار روپے) کو اس بنیاد پر ختم کردیا گیا کہ چونکہ نکاح نامہ میں -/5000 روپے (پانچ ہزار روپے) لکھے گئے، لہٰذا حق مہر -/5000 روپے (پانچ ہزار روپے) تسلیم کیا جائے گا۔ لڑکے نے جواب دعویٰ میں کہا کہ -/5000 روپے حق مہر اس کے والد نے بوقت نکاح لڑکی کے والد کو ادا کردیئے تھے۔ لیکن فیملی کورٹ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ -/5000 روپے لڑکی کو دینا ضروری ہیں لہٰذا اس کے والد کو دیئے گئے -/5000 روپے حق مہر کی مد میں تسلیم نہیں کیے جاسکتے۔

اگریمنٹ کی شرائط میں یہ لکھا تھا کہ لڑکے کے دیئے گئے -/80,000 روپے کے

زیورات لڑکی کی ملکیت تصور ہوں گے۔ ایگریمنٹ میں جہیز سے متعلق جو لڑکے نے دیا کچھ نہیں لکھا تھا، لیکن فیملی کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ قرار دیا کہ چونکہ لڑکے نے لڑکی کو مار پیٹ کر نکال دیا ہے لہٰذا لڑکی کو وہ سامان بھی واپس کیا جائے جو لڑکے نے دیا تھا اور وہ سامان بھی واپس کیا جائے، جو لڑکی خود جہیز میں لائی تھی۔ فیملی کورٹ نے یہ بھی لکھا کہ جہیز میں جو برتن تھے، ان کی حیثیت دس سالہ شادی کے دوران استعمال کی وجہ سے ختم ہوگئی لہٰذا وہ واپس نہ دیے جائیں، لیکن اس کے علاوہ لڑکے کا دیا گیا عام سامان اسی مالیت میں دیا جائے، جس مالیت کا لڑکی نے اپنے کیس میں لکھا تھا۔ جبکہ وہ سامان بھی دس سال سے زائد استعمال میں رہا ہے۔ فیملی کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ بھی لکھا کہ چونکہ لڑکی لڑکے کی مار پیٹ کی وجہ سے اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی، لہٰذا جب تک طلاق کا مسئلہ طے نہ ہوجائے تب تک لڑکا لڑکی کو -/1000 روپے ماہوار کے حساب سے جو کہ ایگریمنٹ/اقرارنامے میں لکھا گیا تھا ادا کرے گا۔ اقرارنامہ کی کاپی منسلک ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں درج سوال پیش خدمت ہیں۔

سوال:76

اگر طلاق کا مسئلہ واضح نہ ہوا ہو تو ایسی صورت میں یہ حکم جاری کیا جاسکتا ہے کہ لڑکا لڑکی کو جہیز کا تمام سامان جو کہ لڑکی جہیز میں لائی تھی یا لڑکے نے جہیز میں دیا تھا واپس کیا جائے، شرع کیا کہتی ہے۔

سوال:77

جیسا کہ ایگریمنٹ/اقرارنامے کی حیثیت پہلے واضح کی جاچکی ہے اس کی روشنی میں -/80,000 روپے کے لڑکی کو لڑکے کی جانب سے دیے گئے زیورات لڑکی کو ملنا چاہئیں، شرع کیا کہتی ہے۔

سوال: 78

اگر طلاق کا مسئلہ طے نہ ہوا ہو تو کیا لڑکی کو نان نفقہ کی مد میں /1000 روپے

ماہانہ دینے کا فیملی کورٹ کے حکم پرلڑکا پابند ہے، شرع کیا کہتی ہے۔

سوال:79

اگرلڑکا واضح طور پر حلف اٹھا کر یہ کہہ رہا ہو کہ اس نے لڑکی کو طلاق نہیں دی ہے تو اس کی اس بات کی شرعی کیا حیثیت ہے۔

سوال: 80

اگر وہ بچی جو کہ 12 رسال کی تھی جس کو گواہ کی حیثیت کسی نے نہیں دی اور نہ ہی عدالت میں بلوایا گیا، وہ بھی یہ کہے کہ اس کے والد نے اس کی دوسری ماں کو اس کی موجودگی میں طلاق نہیں دی ہے تو ایسی صورت میں لڑکی کے لگائے گئے الزام پر کہ اس کو طلاق دے دی گئی تھی، شرع کیا کہتی ہے۔

سوال:81

اگر یہ واضح ہو جائے کہ لڑکے نے لڑکی کو طلاق نہیں دی ہے اور پھر بھی لڑکی اپنے شوہر کے گھر واپس آنے پر راضی نہ ہو اور نہ ہی خلع کا حق استعمال کرے ایسی صورت میں لڑکے کو شرعاً کیا کرنا چاہیے۔

سوال:82

اگرلڑکی خود اپنی مرضی سے علیحدگی چاہے تو لڑکے پر دونوں طرف کے جہیز سے متعلق اور حق مہر سے متعلق اور نان نفقہ سے متعلق کیا کیا پابندیاں شرعاً لازم ہوں گی۔

سوال:83

اگر یمنٹ کی رو سے حق مہر -/50,000 روپے کی اور نکاح نامے کے مطابق -/5000 روپے حق مہر کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی اور کس حق مہر کی رقم کو شرعی طور پر درست تسلیم کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا مقدمہ ہائی کورٹ کی دورکنی بنچ کے سامنے آئینی پٹیشن کی شکل میں زیرِ سماعت ہے، جس میں 19 رتاریخ مقرر ہے، جس میں دونوں فریقین کو سنا جائے گا، یہ پٹیشن لڑکے

کی طرف سے دائر کی گئی ہے، لہٰذا مندرجہ بالا سوالات اس معزز عدالت میں جواباً پیش کیے جائیں گے ،لہٰذا اس کی شرعی حیثیت اور فتویٰ کی شکل میں جوابات اس پٹیشن میں نہایت معاون اور مددگار ثابت ہوں گے اور معزز جج کو اس پٹیشن پر فیصلہ کرنے میں نہایت آسانی ہوگی ،لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ اس کا فتویٰ اور شرعی حیثیت دلائل کے ساتھ عنایت فرمائیں ،آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی ۔میرا پتہ حسب ذیل ہے۔

(افتخار احمد، معرفت سلیم جنرل اسٹور، جیل روڈ، ہدہ، کوئٹہ)

جواب:

شریعت اسلامیہ کی رو سے عاقلہ بالغہ عورت پر کسی کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہے، ایسی عورت اپنے معاملات میں خودمختار ہے ،صورۃ مسئولہ میں اگر مذکورہ خاتون کے بھائی نے ایگریمنٹ کی کارروائی اور مہر کا تعین اپنی طرف سے کیا ہے تو وہ معتبر نہیں ہے، اگر مذکورہ کارروائی عورت کی رضا اور اجازت سے کی گئی ہے اور مہر کی مقدار میں عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ اختلاف ہے تو عورت کو زیادتی مہر کا دعویٰ گواہوں سے ثابت کرنا پڑے گا، گواہی کا نصاب ازروئے شرع دو عادل مرد ہیں اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو ثقہ عورتیں ہیں، محض دستاویزات حجت نہیں ہیں۔

فتاویٰ قاضی خان جلد دوم ص ۳۷۰ پر ہے:

رجل ادعیٰ علیٰ رجل مالا فأنکرالمدعی علیه فاخرج المدعی خطا باقرار المدعی علیه بذلک المال وقال هذا خط المدعیٰ علیه فأنکر المدعی علیه ان یکون خطه فاستکتب فکتب و کان بین الخطین مشابهة ظاهرة اختلفوا فیه وقال بعضهم لا یقضی هو الصحیح۔

ترجمہ:''ایک شخص نے دوسرے شخص پر مال کا دعویٰ کیا، تو ''مدعیٰ علیہ'' نے اس دعوے کا انکار کردیا، تو اس پر مدعی نے ایک تحریر نکالی، جس میں ''مدعیٰ علیہ'' کی جانب سے اس مال کا اقرار درج تھا اور اس نے کہا کہ یہ مدعیٰ علیہ کی تحریر ہے تو ''مدعیٰ علیہ'' نے اس تحریر کا انکار

کردیا، پھر اس (مدعیٰ علیہ) کو لکھوایا تو اس نے لکھا، بظاہر دونوں تحریروں میں مشابہت تھی، (علماء کا) اس مسئلے میں اختلاف پیدا ہوا، اور بعض نے کہا کہ (محض تحریر کی بناء پر مدعی کے حق میں) فیصلہ نہیں دیا جاسکتا، اور یہی بات صحیح ہے''۔

فتاویٰ شامی جلد چہارم ص ۳۵۴ پر ہے:

وبھذا عرف ان قولھم فیما اذا ادعی رجل مالا واخرج بالمال خطا وادّعی انه خط المدعی علیه فانکر کون الخط خطه فاستکتب فکتب وکان بین الخطین مشابھة ظاھرة تدل علیٰ انھما خط کاتب واحد اختلف فیه المشائخ والصحیح انه لا یقضی بذٰلک۔

ترجمہ: ''اس سے معلوم ہوا کہ فقہاء کا یہ قول کہ: ایک شخص نے (دوسرے شخص پر) مال کا دعویٰ کیا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں تحریر پیش کی اور دعویٰ کیا کہ یہ خود ''مدعیٰ علیہ'' کی تحریر ہے، لیکن ''مدعیٰ علیہ'' نے اسے اپنی تحریر تسلیم کرنے سے انکار کردیا، تو اس (مدعیٰ علیہ) کو تحریر لکھوائی گئی اور اس نے تحریر لکھی، اور دونوں تحریروں میں بظاہر ایسی مشابہت تھی کہ لگتا تھا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی تحریریں ہیں، اس مسئلے میں مشائخ کا اختلاف ہے اور صحیح قول یہی ہے کہ محض اس تحریر کی بناء پر مدعی کے حق میں (ثبوت دعویٰ کا) فیصلہ نہیں کیا جائے گا''۔ فتاویٰ رضویہ جلد ہفتم ص ۳۵۷ پر ہے (مطبوعہ قدیم):

جواب:

حکم اللہ اور رسول کے لیے ہے، جل جلالہ و صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان الحکم الا للّٰہ، جب ہندہ منکر ہے تو شہادۃ عادلہ شرعیہ دو مرد یا ایک مرد و دو عورت ثقہ درکار ہے، فقط دستاویز اگرچہ خود ہندہ کے دستخط بقلم خود اس پر لکھے ہوئے یا اہلکار رجسٹری کی تحریر کہ میرے سامنے اقرار کیا اصلاً کافی نہیں۔ فتاویٰ امام قاضی خان میں ہے:

القاضی انما یقضی بالحجة والحجة ھی البینة اوالا قرار اماالصک فلا یصلح حجة۔

ترجمہ: ''قاضی حجت کی بناء پر مدعی کے حق میں فیصلہ کرے گا اور حجت یا تو گواہ ہیں یا خود مدعیٰ علیہ کا اقرار، محض تحریر حجت نہیں بن سکتی''۔

الاشباہ والنظائر ص ۱۱۶ پر ہے:

لا یعتمد علیٰ الخط ولا یعمل بہ ۔الخ

ترجمہ: ''محض تحریر پر نہ اعتماد کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے حجت مان کر ثبوتِ دعویٰ کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے''۔

ان مذکورہ بالا فقہی حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ تحریری دستاویزات گواہوں کے بغیر حجت نہیں ہیں، صورۃِ مسئولہ عنہا میں اگر عورت زیادتی مہر کی دعویدار ہے، تو شرعی نصاب شہادت کے مطابق وہ اپنا دعویٰ ثابت کردے تو اس کا دعویٰ معتبر ہوگا، اگر عورت گواہ پیش کرنے سے قاصر ہو اور مرد گواہ پیش کرے تو مرد کا دعویٰ معتبر مانا جائے گا اگر کسی کے پاس بھی گواہ نہ ہوں تو مرد کے ذمے مہر مثل واجب ہوگا۔

فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص ۳۱۹ پر ہے:

اذا اختلف الزوجان فی قدر المهر حال قیام النکاح عند ابی حنیفة ومحمدرحمهما الله تعالیٰ یحکم مهر المثل فان شهد لاحدهما کان القول قوله مع الیمین علیٰ دعویٰ الاخر ۔الخ ۔

2۔ شریعت اسلامیہ کے احکام کے مطابق حدود وقصاص کے علاوہ دیگر معاملات میں نصاب شہادۃ دو عادل مرد یا ایک مرد اور دو ثقہ عورتیں ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ، الآیۃ ۔ (البقرہ:۲۸۲)

ترجمہ: ''اور دو گواہ بنالو اپنے مردوں میں سے پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں''۔

فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے اولاد کی گواہی والدین کے حق میں اسی طرح والدین کی اولاد کے حق میں حجت نہیں ہے، فتاویٰ عالمگیری جلد سوم ص ۴۷۹ پر ہے:

لا تجوز شهادة الوالدين لولدهما وولد ولدهما وان سفلوا ولا شهادة الولد لوالديه واجداده وجداته وان علوا۔الخ

ترجمہ:"اور والدین کی گواہی اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے حق میں جائز نہیں ہے، اور اسی طرح اولاد کی گواہی اپنے باپ اور دادا دادیوں کے حق میں جائز نہیں ہے"۔

اس تمہید کے بعد صورۃ مسئولہ میں عورت طلاق کی دعویدار ہے اور مرد طلاق کا منکر ہے، قانون شریعت کی رو سے عورت کو چاہیے کہ نصابِ شہادت کے مطابق اپنا دعویٰ ثابت کردے جبکہ عورت کے پاس صرف ایک گواہ ہے، اور وہ بچی جو گواہ کے طور پر پیش کی جارہی ہے، وہ مدعیٰ علیہ یعنی شوہر کی فروع میں سے ہے اور یہ شہادۃ کئی وجوہ سے مردود ہے، ایک تو اس لیے کہ نصاب شہادت مکمل نہیں ہے اور دوسرا اس لیے کہ وہ گواہ مدعیٰ علیہ کے فروع میں سے ہے بالفرض اگر نصاب شہادت مکمل ہوتا تو بھی چونکہ فروع اپنے اصول کے حق میں گواہی نہیں دے سکتی اس لیے یہ شہادت حجت نہ ہوتی، اور تیسرا اس لیے کہ بقول سائل وہ بچی انکار کررہی ہے، اگر عورت کے پاس اور گواہ نہیں ہیں تو مرد سے قسم لی جائے گی، اگر مرد قسم کھالے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی ہے تو نکاح علیٰ حالہٖ قائم ہے، صورۃِ مسئولہ میں شوہر نے حلفیہ بیان لکھا ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی ہے لہٰذا شوہر کے حلف یعنی قسم کھانے کا اعتبار کرکے عدم وقوع طلاق کا فتویٰ جاری کیا جاتا ہے، شوہر اگر جھوٹی قسم کھالے تو وبال اسی پر ہوگا، اگر عورت اپنے دعویٰ میں سچی ہے تو اسے چاہیے کہ مرد کو اپنے اوپر قدرت نہ دے، تاہم قضاءً نکاح بحال ہے۔

3۔ اگر عورت مرد کی طرف سے کسی ایذاء رسانی کے بغیر مرد کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو اور مرد کے حقوق کا خیال نہ رکھے ایسی عورت فقہاء کرام کی اصطلاح میں "ناشزہ" یعنی نافرمان کہلاتی ہے، اور ایسی عورت کا نان نفقہ، رہائش علاج معالجہ وغیرہ شوہر کے ذمے لازم نہیں ہے جب تک کہ وہ مرد کے ساتھ رہنے پہ آمادہ نہ ہوجائے، عالمگیری جلد اول ص ۵۴۵ پر ہے: وان نشزت فلا نفقة لها حتى تعود الىٰ منزله الخ۔

ترجمہ: ''اگر عورت نافرمان ہو تو جب تک وہ واپس گھر لوٹ کر نہ آجائے۔اس کا نان نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں ہے''۔

صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ فی السوال خاتون بغیر کسی تکلیف اور عذر کے اپنے شوہر کے گھر سے چلی گئی ہے تو وہ خرچے کی مستحق نہیں ہے، اگر شوہر اس پر جسمانی تشدد کرتا تھا یا اس کے دیگر حقوق کا خیال نہیں رکھتا تھا تو اس میں مرد قصوروار ہے اور ایسی صورت میں شوہر کے ذمے عورت کا خرچہ لازم ہے اور شوہر کو چاہیے کہ اپنا رویہ بدل لے اور بیوی کو حسنِ سلوک سے رکھے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا تُمۡسِكُوهُنَّ ضِرَارٗا لِّتَعۡتَدُواْۚ وَمَن يَفۡعَلۡ ذَٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهُۥۚ، الآیہ

ترجمہ: ''اور انہیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکو کہ تم (ان پر) زیادتی کرنے لگو اور جس نے ایسا کیا تو بے شک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا''، (البقرہ ۲۳۱)۔

مرد عورت کو اس کے والدین کے ہاں جانے سے نہیں روک سکتا، یہ صلۂ رحمی کے خلاف ہے، اگر والدین بیمار ہوں تو ان کی خدمت بھی کر سکتی ہے۔

(ولا یمنعها من الخروج الیٰ الوالدین) فی کل جمعة ان لم یقدرا علیٰ اتیانها علیٰ ما اختاره فی الاختیار ولو ابوها زمنا مثلا فاحتاجها فعلیها تعاهده الخ۔

ترجمہ: ''اور شوہر بیوی کو ان کے والدین کے پاس جانے سے نہیں روکے گا، ہفتے میں ایک بار جب کہ اس کے والدین اس کے پاس نہ آسکتے ہوں جیسا کہ اختیار میں ہے اور اگر لڑکی کا والد اپاہج ہو اور اس کو لڑکی کی خدمت کی ضرورت ہو تو لڑکی پر اس کی تیمارداری کرنا واجب ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:5،ص:257، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''

3۔شادی کے موقع پر مرد کی طرف سے عورت کو جو زیور اور تحائف دیے جاتے ہیں، اگر شوہر نے محض استعمال کے لیے دیے ہیں تو عورت کی ملکیت ثابت نہ ہوگی، علیحدگی کی صورت میں وہ زیورات واپس لے سکتا ہے، اگر مرد نے وہ زیورات عورت کے ملک کر دیے ہیں تو عورت کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور اب مرد واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

صورتِ مسؤلہ میں اگر مرد نے وہ زیورات عورت کے ملک کردیے ہیں اور عورت کے پاس ثبوت ہے تو وہ زیورات عورت کے ملک متصور ہوں گے اور مرد واپس نہیں لے سکتا۔

عالمگیری جلد اول ص ۳۲۷ پر ہے:

واذا بعث الیٰ اهلِ زوجته اشیآء عند زفافها منها دیباج فلما زفت الیه اراد ان یسترد من المرأة الدیباج لیس له ذلک اذ بعث الیها علیٰ جهة التملیک ۔

ترجمہ: ''اور جب اپنی بیوی کے گھر والوں کے ہاں کچھ چیزیں شب زفاف کیلئے بھیجی ہوں، اس میں ریشمی لباس بھی شامل ہے، تو شب زفاف کے بعد اس نے چاہا کہ ریشمی چادر یا لباس واپس لے لے۔ تو اب اسے یہ حق نہیں ہے، جبکہ یہ (چیزیں) تملیک کے ارادے سے بھیجی تھیں''۔

اگر مرد کی طرف سے تملیک یعنی عورت کی ملکیت میں دینے کی تصریح نہ ہو لیکن اگر اس علاقے یا برادری میں عرف یہی ہو کہ زیورات وغیرہ جو شادی کے موقع پر دیے جاتے ہیں، وہ محض استعمال کے لیے نہیں دیے جاتے، بلکہ بطور تملیک دیے جاتے ہیں، تو بھی عورت کی ملکیت ثابت ہو جائے گی۔

فتاویٰ شامی جلد دوم ص ۳٦٤ پر ہے:

قلت ومن ذلک ما یبعثه الیها قبل الزفاف فی الاعیاد والمواسم من نحو ثیاب وحلی وکذا ما یعطیها من ذلک اومن دراهم اودنانیر صبیحة لیلة العرس ویسمیٰ فی العرف صبحة فان کل ذلک تعرف فی زماننا کونه هدیة لامن المهر ولا سیما المسمی صبحة الخ ۔

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں اور ان میں سے وہ اشیاء بھی ہیں، جو رخصتی سے پہلے عیدین یا دیگر مواقع پر لڑکی کے ہاں بھیجی جاتی ہیں، جیسے لباس، زیور وغیرہ، اسی طرح شب زفاف کو جو درہم و دینار (یعنی نقد رقم) وغیرہ دلہن کو دیے جاتے ہیں، جنہیں عرف میں ''صبحہ'' کہتے ہیں، ہمارے زمانے میں یہ سب ہدیہ سمجھی جاتی ہیں، مہر کا حصہ نہیں، اسی لئے ان کا نام الگ

سے "صحیح" ہے، هذا ما عندی فی هذا الباب والحق عند ربی عزوجل۔

لے پالک کے نکاح کے وقت ولدیت کا مسئلہ

گزارش ہے کہ عرصہ 24 سال پہلے میرے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی، بچی کی پیدائش سے قبل میں اس بات کا فیصلہ کر چکا تھا کہ جو بھی اولاد ہوگی میں اُسے اپنی بڑی بہن (جو کہ عرصہ 8 سال سے لاولد تھیں اور اُن کے ہاں اولاد کی کوئی امید نہیں تھی) کو گود دوں گا۔ سو ایسا ہی ہوا اور اس بچی کی پیدائش کے بعد میں نے یہ اپنی بہن کو گود دے دی۔ اس وقت اس معاملے کے شرعی پہلو اور قانونی مسائل سے میں واقف نہیں تھا۔ اپنے بہنوئی کے اصرار پر میں نے اس بچی کا برتھ سرٹیفکیٹ منہ بولے والد کے نام پر بنوا دیا تاکہ اس کے تعلیمی معاملات میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مفتی صاحب! مسئلہ یہ ہے کہ خاندان والوں کو تو اس بات کا علم تھا کہ یہ بچی میری بہن کی نہیں بلکہ میری اولاد ہے، مگر میری بہن نے اپنے حلقۂ احباب اور اڑوس پڑوس میں ہمیشہ اس بات کو چھپائے رکھا کہ یہ بچی ان کی حقیقی اولاد نہیں ہے۔ اس سال دسمبر میں میری بیٹی کی شادی ہے اور یہ بات انہوں نے بچی کے سسرال سے بھی چھپائی ہے۔

عرصہ 12 سال سے میرے اپنی بہن سے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔ ہماری بیٹی کے دل و دماغ میں اس کے منہ بولے والدین نے یہ بات نقش کر دی ہے کہ تمہارے ماں باپ کو بیٹیوں سے نفرت تھی، اسی لئے انہوں نے تمہیں ہمارے حوالے کر دیا۔ جبکہ حقیقتاً میری نیت صرف یہ تھی کہ میری بہن جو اولاد سے مایوس ہو چکی تھیں، ان کی ممتا کی تسکین ہو جائے اور ان کے بڑھاپے کا سہارا ہو۔ مفتی صاحب! اس معاملے پر میرے چند سوالات کے قرآن وسنت کی روشنی میں جوابات دے کر ممنون فرمائیں۔

سوال:84

کیا ہم نے اولاد دے کر گناہ کیا ہے؟، کیونکہ کسی نے ہم سے کہا کہ "جس کو اللہ نے محروم رکھا، اُسے دینے والے تم کون ہوتے ہو"، اس بات نے ہمیں خلش میں مبتلا کر رکھا ہے کہ شاید ہم سے گناہ ہوا ہے۔

سوال:85

لے پالک اولاد کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، تفصیلی جواب عنایت کریں۔

سوال: 86

ہماری بیٹی کے نکاح میں شرعاً اس کا ولی کون ہے؟۔

سوال:87

لڑکی کے نکاح نامے میں کس کی ولدیت درج کی جائے، حقیقی باپ کی یا منہ بولے باپ کی؟۔

سوال: 89

کیا صرف ایجاب وقبول میں لڑکی کے حقیقی والد کا نام لے لیں تو کافی ہوگا؟۔

سوال:90

بچی کے سسرال والوں سے کیا یہ بات چھپائی جاسکتی ہے، خصوصاً اس کے شوہر سے کہ اس کے اصل والدین کون ہیں؟۔

سوال: 91

یہ بات چھپانے سے ہماری بیٹی کا نکاح جائز ہوگا؟۔

سوال:92

غلط ولدیت کے ساتھ پڑھائے جانے والے نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔

سوال:93

غلط ولدیت کے ساتھ ہونے والے نکاح میں شریک رشتہ داروں، خصوصاً چچا اور پھوپھی کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟۔

سوال:94

اگر ایسے نکاح کی حیثیت مشکوک ہے، تو اس صورت میں حقیقی والدین کے کیا حقوق اور فرائض ہیں؟۔

سوال:95

ہماری بیٹی عاقل وبالغ ہے اور اپنے حقیقی والدین سے واقف بھی، ایسی صورت میں کیا خود اس پر بھی اپنے نکاح کے حوالے سے کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟۔

سوال:96

نکاح کے حوالے سے منہ بولے والدین پر کیا شرعی اور اخلاقی فرائض عائد ہوتے ہیں؟۔

سوال:97

کیا بچی کے ولی کے علم میں لائے بغیر کوئی دوسرا اس کی شادی کرسکتا ہے؟، نیز کیا منہ بولا باپ یعنی پھوپھا ولی ہوسکتا ہے اور نکاح کی اجازت دے سکتا ہے؟۔

سوال:98

کیا اولاد دینے کے بعد اس پر سے ہمارے سارے حقوق ختم ہوگئے؟، کیونکہ میری بہن یہ کہتی ہیں کہ ''بیٹی دے دی اب اُسے بھول جاؤ''۔

سوال:99

ہماری بیٹی ہمارا ذکر نفرت سے اور بدتمیزی سے کرتی ہے، سلام سے گریز کرتی ہے، کیا وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ اس کے ماں باپ نے اس کے ساتھ زیادتی کی اس لئے وہ کسی بھلائی کے مستحق نہیں؟۔

سوال:100

میری بہن بہنوئی اس مسئلے کے بارے میں موجود واضح قرآنی آیات اور احادیث کے منکر ہیں اور ان پر عمل کرنے سے گریزاں ہیں، ان کے بارے میں شریعت کی کیا رائے ہے؟ ان سب سوالوں کے تفصیلی جواب دے کر شکریے کا موقع دیں، نیز براہِ مہربانی متبنّٰی کے بارے میں قرآن میں موجود آیات کی نشاندہی بھی فرمادیجئے۔

(میر احمد علی، کراچی)

جواب:

عربی زبان میں جو اپنا نسب اپنے حقیقی باپ کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کرے، اسے ''دَعِی'' کہتے ہیں اور اس کی جمع ''ادعیاء'' ہے، عرف عام میں اسے ''لے پالک''، ''متبنّٰی'' یا "Adopted Child" کہتے ہیں۔ اسلام کی رو سے اپنے نسب کو اپنے حقیقی باپ کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کرنا حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِهٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔیْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ یَهْدِی السَّبِیْلَ ۝ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْ ؕ وَ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝

ترجمہ: ''اور اس (اللہ) نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی) بیٹا نہیں بنایا، یہ تمہاری خودساختہ باتیں ہیں، اور اللہ حق (بات) ارشاد فرماتا ہے اور وہ راہِ (حق) کی طرف رہنمائی فرماتا ہے، ان (لے پالکوں) کو ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت سے پکارو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی بات انصاف پر مبنی ہے، پس اگر تمہیں ان کے (حقیقی) باپ معلوم نہ ہوں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں، اور تم نے غیرارادی طور پر کوئی بات کہہ دی ہو تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں، لیکن جو بات تم نے قصداً کہی ہو، وہ (بہرحال گناہ ہے) اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے''، (الاحزاب:4,5)۔

حدیث پاک میں ہے: عن سعد رضی اللّٰہ عنه قال: سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول: مَنِ ادَّعیٰ اِلٰی غیر ابیه وھو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام۔

ترجمہ: ''حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے (اپنا نسب) اپنے (حقیقی) باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا،

حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا (حقیقی) باپ نہیں ہے، تو جنت اس پر حرام ہے" (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6766)۔

"حضرت ابوعثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس روایت کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا: میں نے اس ارشاد رسول ﷺ کو براہِ راست اپنے دونوں کانوں سے سنا اور میرے ذہن نے اس بات کو محفوظ رکھا"، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6768)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اپنے باپوں سے اعراض نہ کرو، جس نے اپنے باپ سے منہ موڑا، تو یہ کفر ہے"، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6768)

بچے کی کفالت کرنا، نگہداشت کرنا بلاشبہ ایک نیک عمل ہے اور جو رضاءِ الٰہی کیلئے ایسا کرے گا، اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے اجر ملے گا۔ ہمارے ہاں عرفِ عام میں اپنے کسی عزیز یا کسی اجنبی شخص یا لاوارث بچے کو گود لیا جائے تو، اسے لے پالک یا متبنّٰی کہتے ہیں، اس کا حکم حقیقی بیٹے یا بیٹی کا نہیں ہوتا۔

یہاں تک کہ اگر اس بچے یا بچی کے مُربّی والدین کے درمیان نسب یا رضاعت کے حوالے سے حرمتِ نکاح کا کوئی رشتہ پہلے سے موجود نہیں ہے، تو یہ لڑکا جب بالغ ہو جائے گا، تو اس کی مُربّیہ ماں اور اس کے درمیان شرعی حجاب لازم ہوگا۔ اسی طرح سے اگر وہ لے پالک بچی ہے تو اس کے بالغہ ہونے کے بعد اس کے اور اس کے مُربّی باپ کے درمیان شرعی حجاب لازم ہوگا۔ فقہ حنفی کی رو سے بالغ مرد یا بالغہ عورت اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہیں نکاح کر سکتے ہیں، یعنی نکاح کیلئے ان کی رضامندی ضروری ہے، ان کی مرضی کے خلاف جبر واکراہ سے ان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ لیکن والد یا ولی کے توسط سے ہو تو یہ طریقہ زیادہ شریفانہ، عفت، حیا اور عزت وآبرو کا مظہر ہے۔ البتہ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی اپنے ولی کی رضامندی کے بغیر غیر کفو میں نکاح کرنا چاہے تو ولی کو اس پر اعتراض کا حق ہے۔

بیٹی کا اپنے والدین سے نفرت کرنا یا اپنے نسب سے انکار کرنا، نہایت معیوب اور بڑی بدنصیبی کی بات ہے، انہیں اپنے والدین اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے۔

حدیث پاک میں ہے:

عن عبداللہ بن عمرو قال : قال رسول اللہ ﷺ ! رضی الربّ فی رضی الوالدین وسخط الربّ فی سخط الوالدین۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: والدین کی رضا میں رب کی رضا ہے اور والدین کی ناراضی میں رب کی ناراضی ہے''،

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

اس تمہید کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ نکاح کی صحت کے لئے لڑکے اور لڑکی (یعنی دولہا ودلہن) کا ایک دوسرے کے لئے اور گواہانِ نکاح کے لئے شخصی طور پر معیّن ہونا ضروری ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

"ولاالمنکوحة مجهولة"

ترجمہ: ''اور منکوحہ مجہولہ (یعنی نامعلوم اور غیر معروف) نہیں ہونی چاہئے''۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فلو زوج بنته منه وله بنتان لا یصح الا اذا کانت احداهما متزوجة فینصرف الی الفارغة کمافی البزازیه نهر،وفی معناه ما اذا کانت احداهما محرمة علیه فیتراجع الخ۔

ترجمہ: ''اگر ایک شخص کی دو بیٹیاں ہیں اور اس نے کسی تعین کے بغیر ایک بیٹی کا نکاح کیا (یعنی کسی سے کہا کہ میں نے اپنی بیٹی تمہارے نکاح میں دی) تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے، لیکن اگر اس کی ان دو بیٹیوں میں سے ایک پہلے سے شادی شدہ ہے، تو اس نکاح کے لئے غیر شادی شدہ ازخود متعین ہو جائے گی (اور نکاح صحیح ہو جائے گا)، جیسا کہ ''بزازیہ'' اور ''نہر'' میں ہے۔ اسی طرح اگر ایک کسی سبب سے اس پر ویسے ہی حرام ہے (مثلاً وہ اس شخص کی رضاعی بہن ہے تو دوسری نکاح کے لئے متعین ہو جائے گی) الخ۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

قلت وظاهره انها لوجرت المقدمات علی معینة وتمیزت عندالشهود ایضا

يصح العقد۔
ترجمہ: ''میں کہتا ہوں: اس عبارت کا ظاہر یہ ہے کہ اگر مقدماتِ نکاح ایک معینہ لڑکی پر جاری ہوئے (مثلاً لڑکی کی طرف اشارہ کرکے باپ نے کہا کہ: ''میں نے اپنی یہ لڑکی تیرے نکاح میں دی'') اور وہ گواہوں کے نزدیک بھی ممتاز ہوگئی تو نکاح صحیح ہے''،

(ردالمحتار: جلد 4 ص66، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

آگے چل کر پھر درمختار میں ہے:

(غلط وكيلها بالنكاح فى اسم ابيها لغير حضورها لم يصح)۔
ترجمہ: ''(نکاح کے وقت) لڑکی کے وکیل نے لڑکی کے باپ کا نام غلط لیا اور وہ لڑکی ذاتی طور پر وہاں موجود بھی نہیں ہے تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے''۔
اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

راجع الى المسئلتين اى فانها لو كانت مشارا اليها وغلط فى اسم ابيها اواسمهالا يضر بان تعريف الاشارة الحسية اقوىٰ من التسمية۔
ترجمہ: ''یہ دونوں مسئلوں کی طرف راجع ہے، یعنی اگر وہ لڑکی بذاتِ خود موجود ہو اور اس کی طرف تعیین کیلئے اشارہ بھی کردیا گیا ہے، لیکن اس کا یا اس کے باپ کا نام لینے میں غلطی ہوگئی، تو یہ صحت نکاح کے لئے مضر نہیں ہے، اس لئے کہ اشارۂ حِسّیہ سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے، وہ نام لینے کی معرفت سے زیادہ قوی ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4 ص:78,79، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔
علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وفى فتاوىٰ ابى الليث رجل قال لقوم اشهدوا انى تزوجت هذه المرأة التى فى هذالبيت فقالت المرأة قبلت فسمع الشهود مقالتها ولو ير واشخصها فان كانت فى هذالبيت وحدها جازا لنكاح وان كانت فى البيت معها اخرىٰ لايجوز۔
ترجمہ: ''اور فتاویٰ ابواللیث میں ہے: ایک شخص نے لوگوں سے (عورت کا نام لئے بغیر)

کہا: تم گواہ ہو جاؤ، میں نے اس عورت کا، جو اس گھر کے اندر ہے، نکاح (فلاں سے) کردیا، تو اس عورت نے (اندر سے) کہا: مجھے قبول ہے، اور گواہوں نے اس کی بات سنی حالانکہ اسے شخصی طور پر دیکھا نہیں، تو اگر گھر میں صرف وہی ایک عورت موجود تھی، تو نکاح صحیح ہے (کیونکہ وہ عورت شخصی طور پر متعین ہے)، اور اگر گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور عورت بھی تھی تو پھر یہ نکاح جائز نہیں ہے، (کیونکہ اب وہ شخصی طور پر متعین نہیں ہے)''،

(فتاویٰ عالمگیری جلد ۱ ص ۲۶۸، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

مولانا مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی متعدد سوالات کے جواب میں لکھا:
''نسب کا دارومدار ولدیت پر ہوتا ہے، اس لئے ہر جگہ جو حقیقی باپ ہے، اس کا نام لکھنا چاہئے تھا دستاویزات میں جو سوتیلے باپ کا نام لکھا، وہ غلط ہے۔ حدیث میں باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف نسبت کرنا سخت ممنوع ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے، اس سے توبہ کرنی چاہئے۔ نکاح کی صحت کے لیے دونوں کا ایک دوسرے کے نزدیک متعارف ہونا شرط ہے، لہٰذا لڑکی سے جب وکالت حاصل کی جائے گی اور وکیل خاص شوہر کو بتائے گا، تو لڑکی جس نام سے مشہور ہے اور پہچانی جاتی ہے، اس نام سے بتائے گا اور سوتیلے باپ کی نسبت سے مشہور ہے تو اس نام کی طرف نسبت کرکے ایجاب کرسکتے ہیں، پھر بھی مناسب یہ ہے کہ اس کی سوتیلی بیٹی بتا کر تعارف کروادیا جائے اور اگر اپنے اصل باپ کی نسبت سے مشہور ہے تو اس کا نام لے کر قبول کرلیا جائے۔ نکاح نامہ میں اصل باپ کا نام لکھا جائے اور سوتیلے باپ کی پرورش کردہ بیٹی لکھ دیا جائے''۔

نوٹ: قرآن کی اصطلاح میں پرورش کردہ بیٹی کو ''ربیبہ'' کہا گیا ہے، لہٰذا ''ربیبۂ فلاں'' (مربی کا نام) کہہ سکتے ہیں اور لکھ سکتے ہیں۔

ایک اور موقع پر ان سے دریافت کیا گیا کہ لڑکے نے اپنی دنیوی اغراض (لڑکا ہندوستانی تھا مگر پاکستانی قومیت حاصل کرنے) کے لئے تمام دستاویزات میں باپ کے بجائے چچا کا نام لکھا، اب نکاح کے وقت مجبوری ہے کہ اگر اصل باپ کا نام لکھتا ہے تو دستاویزات

(پاسپورٹ، شناختی کارڈ، تعلیمی اسناد وغیرہ) میں تضاد ہوتا ہے اور بہت سے معاملات میں قانونی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔تو اب کیا کرے۔ وہ جواب دیتے ہیں:

''اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف بیٹے ہونے کی نسبت کرنا حرام ہے۔حدیث میں اس کے بارے میں لعنت آئی ہے۔نکاح میں لڑکی سے وکالت حاصل کرتے وقت، لڑکے کا تعین ضروری ہے۔اگر لڑکا اسی طرح جانا پہچانا جاتا ہے کہ چچا کو باپ ہونے کے اعتبار سے لوگ جانتے ہیں، تو وکالت صحیح ہوجائے گی اور نکاح بھی صحیح ہوجائے گا۔اور اگر لڑکی یا لڑکے کے گھر والے اس کو حقیقی باپ کے اعتبار سے جانتے ہیں اور چچا کا بیٹا نہیں سمجھتے، تو پھر وکالت چچا کا بیٹا بتا کر حاصل کرنا صحیح نہیں ہوگی اور جب وکالت صحیح نہیں ہوگی، تو نکاح بھی نہیں ہوگا''۔

اسی طرح کے ایک اور سوال کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

''(۲) نکاح صحیح ہونے کے لیے شوہر اور بیوی کے نام اس طرح لئے جائیں گے، جس طرح وہ پہچانے جاتے ہیں اور معروف ہیں، تا کہ وہ معین ہوجائیں۔لڑکا جب مشہور اس طرح سے ہے کہ سوتیلے باپ کا بیٹا بتا کر لوگ پہچانتے ہیں اور اس کے حقیقی باپ کو کوئی پہچانتا نہیں ہے تو لڑکی سے وکالت حاصل کرتے وقت سوتیلے باپ کا نام لے کر وکالت حاصل کی جائے تا کہ وہ معین ہوجائے۔اس صورت میں نکاح نامہ پر یہ لکھنا مناسب ہوگا کہ وکالت میں حقیقی باپ کا نام لکھنے کے بعد یہ لکھ دیں: ''معروف ولد فلاں''، یعنی سوتیلے باپ کی طرف نسبت کردیں''۔

ایک اور سوال میں جب ان سے دریافت کیا گیا کہ کسی لڑکی کی پرورش ماموں نے کی اور پھر ہر جگہ ولدیت کے ریکارڈ میں اپنا نام لکھ دیا اور شادی کے موقع پر لڑکی سے اجازت بھی اس کے ماموں کی ولدیت کی نسبت سے لی گئی، حالانکہ ایک گواہ کو اصل صورت حال بھی معلوم تھی کہ اس کا حقیقی والد فلاں ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں:

''قبول کرنے کے لیے شوہر چونکہ خود ہوتا ہے، وہ خود قبول کرتا ہے، اس لئے شوہر کے نام

لینے یا اس کے والد کے نام لینے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے، لڑکی سے وکالت کے لیے شوہر کو معین کر کے وکالت لینا ضروری ہے۔ لہٰذا شوہر اگر ماموں کا بیٹا ہونے سے مشہور ہے اور لوگ اس کا بیٹا سمجھتے ہیں اور لڑکی سے ماموں کا لڑکا بتا کر وکالت حاصل کی گئی ہے تو یہ وکالت صحیح ہوگئی۔ اور وکیل نے اسی کے ساتھ نکاح کر دیا تو یہ نکاح صحیح ہوگیا۔ اور اگر لڑکی شوہر کو ماموں کا بیٹا ہونے کے اعتبار سے نہیں جانتی تھی نیز شوہر اس طرح مشہور بھی نہ تھا بلکہ اپنے حقیقی باپ کی طرف نسبت سے مشہور تھا اور وکالت ماموں کی طرف نسبت کرنے کے ساتھ حاصل کی گئی تو جس سے نکاح کرنے کے لیے لڑکی نے وکیل مقرر کیا، وکیل نے اس کے ساتھ نکاح نہ کیا، تو یہ نکاح فضولی ہوا تھا۔

آپ کے بیشتر سوالات کے جوابات مندرجہ بالا تفصیل میں آچکے ہیں، آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے استفتاء کا اصل مُحرِک تلاشِ حق سے زیادہ باہمی ناچاقی و رنجش ہے، جو دونوں خاندانوں کے درمیان پیدا ہو چکی ہے، کوشش کریں کہ کسی طرح باہم مل بیٹھ کر اس رنجش کا ازالہ کریں۔

تاہم بقیہ سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں: بہن کی دلداری کیلئے بچی کو ان کی گود میں دے دینا اور بچی کی پرورش کرنا، شرعاً کوئی معیوب بات نہیں ہے بس اتنا خیال رکھنا ضروری ہے کہ "بیانِ نسب" اور بلوغت کے بعد حجاب کے معاملے میں شرعی احکام ملحوظ رہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ: "جس کو اللہ نے محروم رکھا اس کو دینے والے تم کون ہوتے ہو؟"، یہ بالکل غلط اور باطل سوچ ہے، اللہ تعالیٰ تقدیر کی حکمتوں کو خود بہتر جانتا ہے اولاد اور مال و دولت کی نعمت بطور انعام و جزا ہوتی ہے اور کبھی بطورِ امتحان۔ اس طرح کی سوچ منفی ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

ترجمہ: "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے رزق میں سے کچھ

(اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، تو کافر اہل ایمان سے کہتے ہیں کہ کیا ہم اسے کھلائیں، جسے اللہ چاہتا تو (خود ہی) رزق عطا کردیتا، تم تو صریح گمراہی میں ہو"، (یٰسین:47)۔
لہٰذا کسی کے لاولد ہونے یا مسکین ہونے کا اس طرح تمسخر نہیں اڑانا چاہیے۔
بیٹی کے نکاح میں شرعاً ولی اس کا باپ ہوتا ہے، لہٰذا فقہ حنفی کی رو سے اگر لڑکی ولی کی رضامندی کے بغیر اپنے کفو میں نکاح کرلے تو وہ منعقد ہوجاتا ہے اگرچہ اس کا یہ عمل شرعاً ناپسندیدہ ہے۔
"مُرَبّی" کا بیٹی کو اس کے حقیقی ماں باپ سے برگشتہ کرنا یا والدین کی نافرمانی پر اس کی حوصلہ افزائی کرنا یہ "قطعِ رحمی" (یعنی قرابت کے رشتے کو توڑنا) پر ابھارنا یا اس میں اعانت کرنا ہے اور یہ فعل حرام ہے، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔
نکاح کے وقت ایجاب وقبول کے موقع پر حقیقی والد کا نام لیا جائے تو صحتِ نکاح کیلئے کافی ہے، باقی تفصیلات اوپر درج ہے۔
نکاح نامہ میں حقیقی والد کا نام درج کرنا ہی صحیح ہے، اس کے آگے "ربیبہ فلاں" لکھ دیں، تعلیمی اسناد میں ولدیت کی تصحیح قانونی ذرائع سے کی جائے حقیقی والدین کے حقوق کبھی معطل ومنسوخ نہیں ہوتے، ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔

لاوارث بچے کی ولدیت کا مسئلہ

سوال: 101

مسئلہ یہ ہے کہ میرے گھر والوں کو اسپتال سے ایک بچی ملی، بچی کی ماں، بچی کے پیدا ہوتے ہی فوت ہوگئی۔ بچی کی نانی نے وہ بچی ہم لوگوں کے حوالے کردی۔ اب بچی ماشاءاللہ اٹھارہ (18) سال کی ہوگئی ہے، ہم لوگ اس کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔
اب نکاح کے فارم پر ولدیت کس کی لکھی جائے، کیونکہ ہم لوگ اصل باپ کے نام سے ناواقف ہیں اور یہ بات بھی پرانی ہوگئی ہے۔ اس صورت میں کیا بچی، جس کے پاس پلی، بڑھی ہے، آیا اس کا نام لکھا جائے یا قرآن وحدیث کے مطابق جو صحیح طریقہ ہے، رہنمائی فرمادیں کہ بچی کی ولدیت کیا لکھی جائے، آپ کی بہت مہربانی ہوگی، (محمد اسرافیل)۔

جواب:

شریعت اسلامیہ کی رو سے کسی لے پالک بچے کو حقیقی بیٹا یا بیٹی سمجھنا اور اپنے آپ کو اس کا والد قرار دینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، لے پالک بچے کو اس کے حقیقی والد کی طرف منسوب کرنا چاہیے، اگر بچے کے والدین کا کچھ علم نہ ہو تو بھی دوسرا کوئی ان کو اپنی طرف منسوب نہیں کرسکتا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ

ترجمہ: ''اگر تمہیں علم نہ ہو ان کے باپوں کا تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں''، (الاحزاب:5)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم فرمایا کہ اگر تمہیں لے پالک بچوں کے حقیقی باپوں کا علم نہ ہو تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، انہیں بھائی یا دوست کہہ کر پکارو۔

چونکہ آج کل دستاویزات (جن میں پیدائش کا سرٹیفکیٹ، تعلیمی اسناد، جائیداد کے دستاویزات، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ) میں ولدیت کا اندراج قانونی ضرورت بن گیا ہے، اس لئے اگر کسی بچے کا والد معلوم نہ ہو تو اس کو ابن عبداللہ لکھ لیا کریں، اس میں معنیٰ کی رعایت ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہوگا، بہر حال اللہ کا بندہ تو ہوگا، اس طرح وہ بچہ عار اور رسوائی سے بچ جائے گا، اور ''سترِ عورت'' یعنی کسی کے عیب پر پردہ ڈالنا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت پسندیدہ امر ہے۔

حدیث پاک میں ہے: عن ابی هريرة رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ من ستر مسلما ستره اللّٰہ فی الدنيا و الآخرة۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے مسلمان کا پردہ رکھا، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے عیوب پر پردہ فرمائے گا''، (ابن ماجہ رقم الحدیث:2544)۔

عقدِ نکاح کے بعد رخصتی میں تاخیر وازدواجی حیثیت

سوال:102

گزارش یہ ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کا نکاح 1996 میں کیا تھا، لیکن ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی ہے، رخصتی میں رکاوٹ لڑکے والوں کی طرف سے ہے، لڑکے کا ملنا ہے اور گھر پر آنا جانا ہے۔ آپ سے یہ معلوم کرنا تھا کہ شرعی طور پر نکاح ہے یا ختم ہوگیا ہے، فقط والسلام، (محمد فرید، 483/15 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں چونکہ شرعی طور پر نکاح ہوا ہے لہٰذا وہ آپس میں میاں بیوی ہیں اور شرعی اعتبار سے ان کے ملنے جلنے یا ازدواجی تعلق قائم کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، نیز ان کا نکاح قائم ہے، جب تک خدانخواستہ شوہر طلاق نہ دے یا دونوں باہمی رضامندی سے خلع پر آمادہ نہ ہوں یا عدالت کے ذریعے نکاح فسخ نہ کیا گیا ہو، محض طویل مدت گزر جانے سے ازخود نکاح ختم نہیں ہوتا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

زوجِ متعنت

سوال:103

آپ سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل حالات و واقعات کے تحت قرآن، سنت وشریعت کی روشنی میں فتویٰ ارشاد فرمائیں۔

ا۔ میری شادی پہلی جنوری 1993ء کو ہوئی۔

۲۔ شادی کے دس دن بعد میرا شوہر سعودی عرب چلا گیا۔ اور سعودی عرب بلانے کا وعدہ کرگیا۔

۳۔ میرا رشتہ میرے شوہر کے منہ بولے ماں باپ نے مانگا اور میری شادی انہیں لوگ کے گھر سے ہوئی اور میں رخصت ہوکر انہی کے گھر گئی، میرے شوہر کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔

۴۔ شادی کے بعد میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ آپ کا اپنا گھر نہیں ہے اور آپ کے

والدین کہاں ہیں۔ میرے شوہر نے اس کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا اور کہا کہ وقت آنے پر سب معلوم ہو جائے گا۔

۵۔ میرا شوہر سعودی عرب جانے کے بعد نہ مجھے کوئی خرچ بھیجتا تھا اور نہ کوئی رابطہ رکھتا تھا اور نہ میرے خطوط کا کوئی جواب دیتا تھا۔

۶۔ پھر وہ چار سال بعد اپریل 1997ء میں ایک ماہ کی چھٹی پر آیا اور چھٹی گزار کر پھر بلانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے دو مرتبہ ٹیلیفون پر ایک یا دو منٹ بات کی اور بلانے کا وعدہ کرتا رہا۔

۷۔ پھر ٹیلی فون بھی نہیں آیا اور نہ کوئی خرچ بھیجا اور سارے رابطے ختم ہو گئے۔ نہ خط کا جواب نہ فون نہ خرچ سب بند۔

۸۔ ایک ماہ کی چھٹی کے درمیان جب آیا تھا تو میں نے شکایتیں کی اور خرچ مانگا تو جواب دیا کہ گھر میں رہ رہی ہو کھا پی رہی ہو۔ اور تمہارا کیا خرچ ہے۔

۹۔ میں شادی کے بعد سے جون 2002ء تک اپنے منہ بولے ساس و سسر کے ساتھ اس امید پر رہتی رہی اور تکلیفیں برداشت کرتی رہی کہ شاید اب حالات میں بہتری آجائے۔ لیکن میں مایوس ہو کر اپنے بھائی کے گھر آ گئی۔

۱۰۔ میرا بھائی شدید بیمار تھا ایک ماہ بعد جولائی 2002ء میں اس کا انتقال ہو گیا، میں پھر اپنے سسرال واپس نہیں گئی، میرے پاس شوہر کا نہ کوئی پتا ہے اور نہ کوئی رابطہ۔ میں جب اپنے ساس سسر سے اس کا پتا مانگتی ہوں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے پاس بھی اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ اور نہ اس سے کوئی رابطہ ہے، پرانا پتا جو اس کا تھا اب وہ وہاں نہیں رہتا۔ اب میں بڑی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہوں، میرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ سلائی وغیرہ کر کے اپنا گزارا کرتی ہوں، میرے ساتھ بوڑھی ماں بھی ہے، میں اب دوسری شادی کرنا چاہتی ہوں، برائے مہربانی میری رہنمائی فرمائیں، (انیس فاطمہ، R-126 سن لے آرکیڈ منصورہ گوٹھ، کراچی)۔

جواب:

شریعت اسلامیہ میں بیوی کا نان نفقہ (یعنی بنیادی حاجات جو جائے رہائش، لباس وخوراک وغیرہ پر مشتمل ہیں) شوہر کے ذمہ ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ

ترجمہ: ''گنجائش والے کو چاہیے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچہ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہو تو وہ اسی میں سے (حسب حیثیت) خرچہ دے جو اللہ نے اسے دیا ہے، اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اس نے اسے عطا کر رکھا ہے''، (الطلاق:7)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ مالدار اور تنگدست میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق اپنی بیوی کو نفقہ دے''، (روح المعانی ج15 ص207)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ

ترجمہ: ''اپنی بیویوں کو وہاں رکھو، جہاں اپنی حیثیت کے مطابق تم خود رہتے ہو، اور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ''، (الطلاق:6)۔

علامہ محمود آلوسی روح المعانی جلد نمبر 15 صفحہ نمبر 206 پر لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے یوں پڑھا ہے کہ جہاں تم خود رہتے ہو وہاں اپنی بیویوں کو رکھو اور اپنی مالی حیثیت کے مطابق انہیں نفقہ دو''۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث خطبۂ حجۃ الوداع کی بابت مذکور ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''عورتوں کا شوہروں پر یہ حق ہے کہ دستور کے مطابق انہیں نفقہ دیں''۔

علامہ محمود آلوسی روح المعانی جلد نمبر 15 صفحات 206,205 پر "اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ

سَکَنْتُمْ"کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
من تبعیض کے لئے ہے، یعنی اپنے رہائشی مکان کے کسی حصے میں اپنی بیوی کو رہائش دو"۔
اور "ولا تضآرو ھن"کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
"کہ رہائش میں انہیں تکلیف نہ دو"۔
اور "لتضیقوا علیھن" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
"یوں کہ مکان یا مکان میں بیوی کے لئے مخصوص رہائشی حصے کو کسی دوسرے استعمال میں لاکر، یا اس کے ساتھ ایسے افراد کو ٹھہرا کر، جن کے ساتھ وہ رہنا نہیں چاہتی (ایسے طریقوں سے)، اسے تکلیف پہنچا کر گھر سے نکلنے پر مجبور کردیا جائے قرآن کی رو سے منع ہے"۔
شریعت کی رو سے شوہر پر اپنی حیثیت کے مطابق بیوی کو جائے رہائش دینا لازم ہے، اگر وہ اتنی مالی استطاعت رکھتا ہے کہ اسے علیحدہ مکان میں رکھ سکے تو ایسا ہی کرے اور اگر اس کی مالی حیثیت بیوی کو علیحدہ مکان دینے کی متحمل نہیں ہے تو پھر بھی بیوی کا یہ حق ہے کہ مشترکہ فیملی مکان میں اس کے لئے علیحدہ کمرہ یا حصہ مختص ہونا چاہیے، جس میں دوسروں کا عمل دخل نہ ہو، اور اس علیحدہ حصے یا کمرے کے ساتھ باورچی خانہ، بیت الخلاء اور لازمی ضروریات کا اہتمام بھی ہو اور ایسی سہولت ہو کہ وہ اپنے علیحدہ حصے یا کمرے کو بند کرسکے۔
ہماری عائلی عدالتیں (Family Courts) وافر دینی علم نہ ہونے یا کسی قانونی سقم کے سبب فسخِ نکاح کو "خلع" قرار دیتی ہیں اور اپنے فیصلوں میں لکھتی ہیں کہ "بربنائے خلع نکاح فسخ کیا جاتا ہے" حالانکہ وہ وجوہ جن کی بناء پر جج یا قاضی مُجاز دیانت داری سے سمجھتا ہے کہ اب زوجین کا حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے ازدواجی زندگی گزارنا عملاً ممکن نہیں رہا اور شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ بھی نہیں ہے تو سربراہِ مملکت کی طرف سے تفویض کردہ اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے وہ نکاح کو فسخ (Dissolve) کردیتا ہے، ان وجوہ اور شواہد (Evidences) کو ریکارڈ پر لاتا ہے جو اس کی فہم کے مطابق "فسخِ نکاح" کا سبب بنتی ہیں، اور اسی تاریخ سے عورت کی عدت شروع ہوجاتی ہے اور عدت گزرنے کے بعد وہ عورت اپنی

آزادانہ مرضی سے کہیں پر بھی عقد کرسکتی ہے، جبکہ کوئی مانع شرعی نہ ہو، یہ خلع نہیں ہے بلکہ عدالتی ''فسخِ نکاح'' ہے، اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے کر آزاد بھی نہ کرنا چاہتا ہو، اس کے تمام جائز حقوق ادا کرتے ہوئے اسے رکھنا بھی نہ چاہتا ہو، بس وہ مردم آزار ہے، اسے اذیت دینا چاہتا ہے اور اس کی زندگی کو جہنم بنانا چاہتا ہے۔

یہ ''فسخِ نکاح'' ایک طلاق بائن کے حکم میں ہے، اس کے بعد اگر دونوں فریق چاہیں اور دوبارہ حالات سازگار ہو جائیں تو وہ عدت کے اندر یا عدت کے گزرنے کے بعد عقدِ ثانی کرسکتے ہیں۔ وہ وجوہ، جن کی بناء پر مختلف ائمہ کرام کے مسالک میں قاضی مُجاز یا جج کیلئے ''فسخ نکاح'' کی گنجائش نکل سکتی ہے یا ایسی مصیبت زدہ بیوی کیلئے ایسی رخصت و رعایت موجود ہے کہ انتہائی اذیت ناک صورت حال سے اس کو نجات مل جائے، بشرطیکہ ان قرائن و شواہد کی بناء پر قاضی کو ظنِ غالب یا یقین ہو جائے، یہ ہیں:

(ا) شوہر بیوی کو نان نفقہ نہ دیتا ہو، ظالمانہ انداز میں بے انتہا مار پیٹ کرتا ہو، اس کے حقوقِ زوجیت ادا نہ کرتا ہو اور اسے مُعلّق حالت (Hung Position) میں روکے رکھنا چاہتا ہو، یعنی نہ تو اسے بیوی کے طور پر رکھے اور نہ طلاق دے کر آزاد کرے۔

(ب) عورت جوان ہے اور شوہر ایسے مُوذی مرض میں مبتلا ہے کہ حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قادر نہیں ہے یا وہ اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتا اور عورت کے اس حال میں رہنے سے اس کے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(ج) عورت جوان ہے اور شوہر کو دس، پندرہ، بیس سال یا عمر قید کی سزا ہوگئی ہے اور عورت کیلئے اپنے نفس پر قابو پانا دشوار ہے، اس کے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(نوٹ: اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان نے جیل قوانین پر نظرثانی کرتے ہوئے حکومت پاکستان کو سفارش کی ہے کہ طویل المدت شادی شدہ قیدیوں کو ہر چار ماہ بعد ایک دو ہفتے کیلئے یا تو پیرول (Parole) پر رہا کر کے اسے اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے کا موقع دیا جائے، اگر اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، ورنہ جیل خانوں میں ایک ایک کمرے کے کوارٹر مع

لوازمات تعمیر کیے جائیں، جہاں چار چار ماہ بعد ہفتے دس دن کیلئے قیدی کی بیوی آکر اس کے ساتھ رہ سکے)۔

پولیس اور انتظامیہ چونکہ عدالت کے تابع ہے، اس لئے عدالت انتظامیہ کو پابند کرے، اور اس کے لئے قوانین کو زیادہ واضح اور سخت تر بنایا جاسکتا ہے، کہ شوہر کو ہر صورت میں اصالتاً یا وکالتاً عدالت کے سامنے پیش کرے، بشرطیکہ وہ ملک کے اندر موجود ہے۔ تاکہ "قضا علی الغائب" (Ex-Party Decree) یعنی یک طرفہ فیصلے کی نوبت نہ آئے۔ اگر قاضی اس نتیجے پر پہنچے کہ زوجین کا حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے اب گزارہ ممکن نہیں تو وہ "فسخِ نکاح" سے پہلے شوہر کو اللہ تعالیٰ کا خوف دلا کر طلاق پر آمادہ کرے اور اگر وہ کسی طور پر بھی طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو پھر عدالتی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے نکاح کو فسخ کردے اور تمام دلائل، قرائن اور شہادتوں کو تفصیل کی ساتھ ریکارڈ پر لائے تاکہ فیصلے میں کوئی ابہام نہ رہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث میں "زوجِ مُتَعَنِّت" (یعنی ایسا شوہر جو حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے بیوی کے حقوق بھی ادا نہ کرے، اس کے لئے جینا دشوار کردے اور اسے قیدِ نکاح سے آزاد بھی نہ کرے) کے مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بناء پر جب قاضیِ مُجاز یا عدالت نکاح کو فسخ کرے تو یہ "طلاقِ بائن" کے درجے میں ہے، اس کے نتیجے میں "فسخِ نکاح" کے بعد زوجین عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے تجدیدِ نکاح کرسکتے ہیں اور بیوی کی رضامندی نہ ہو تو وہ عدت کے بعد اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، کما مر سابقاً۔ آج کل بالعموم عائلی عدالتوں کے "فسخِ نکاح" کے فیصلوں میں سقم رہ جاتا ہے، بعض فیصلے مبہم ہوتے ہیں، وجوہِ فسخ قطعی، واضح اور بیّن نہیں ہوتیں، لہٰذا شرعی طور پر ان کی توثیق دشوار ہوتی ہے۔

بعض مقدمات میں عدالتیں بجائے اس کے کہ انتظامیہ کو مجبور کریں کہ شوہر کو عدالت میں اصالتاً یا وکالتاً حاضر کرے تاکہ یا تو وہ بیوی کے عائد کردہ الزامات کو قبول کرے یا دلائل و شواہد کے ساتھ رد کرے تاکہ عدالت اس پوزیشن میں ہو کہ مدعیہ و مدعیٰ علیہ کے بیانات، قرائن و

شواہد اور حقائق وواقعات کی روشنی میں ان الزامات کی تصدیق یا تردید کر سکے، عدالتیں شوہر کے غیاب (Absence) میں یک طرفہ فیصلہ (Ex - Party Decree) صادر کر دیتی ہیں، عام حالات میں یہ درست نہیں ہے، سوائے اس کے کہ شوہر ملک سے باہر ہے یا لا پتا ہے، جسے فقہی اصطلاح میں ''مفقود الخبر'' کہتے ہیں، اس کا معاملہ تفصیلی بحث کا متقاضی ہے۔ ایسے یک طرفہ فیصلوں کی توثیق میں ہمیں دشواری ہوتی ہے، ایسے معاملات میں مدعیٰ علیہ کو اصالتاً یا وکالتاً عدالت میں حاضر کرنا پولیس کیلئے لازمی قرار دیا جائے اور اس کے لئے ضروری ہو تو متعلقہ قانون میں ترمیم یا اضافہ کیا جائے، عدالت کی طلبی کے باوجود حاضر نہ ہونے کو قابلِ دست اندازیِ پولیس قرار دیا جائے اور اس کیلئے جرمانہ یا سزا بھی تجویز کی جاسکتی ہے۔

گزشتہ دنوں میں ڈاکٹر ہما میر کے مقدمہ ''فسخ نکاح'' میں اس کے شوہر نے پیش ہو کر اپنا مُدلَّل دفاع کیا اور عدالت نے بجا طور پر ڈاکٹر ہما میر کا دعوائے خلع مسترد کر دیا، بعد میں دونوں میں نباہ نہ ہو سکا اور شوہر نے اسے طلاق دے دی، یہ عدالت کے صحیح طرزِ عمل اور صائب فیصلے کا نتیجہ ہے کہ شرعی حل نکل آیا۔ آپ کے مسئلے میں اگر آپ کا بیان درست ہے تو عدالت کا فیصلہ از روئے شرع درست نہیں ہے، لیکن اگر حقائق اس کے برعکس ہوں تو مفصل فیصلہ پڑھ کر ہی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے، تاہم اگر آپ شرح صدر سے محسوس کرتے ہیں کہ بیوی کے رویہ کی وجہ سے آپ دونوں میں اب شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے نباہ ممکن نہیں ہے تو اسے ایک طلاق رجعی دے دیں، اس صورت میں باعزت واپسی کا راستہ بھی کھلا رہے گا، اور آپ کی سابقہ بیوی گناہ میں مبتلا ہونے سے بھی بچ جائیں گی، اور آپ نیک نیتی پر اللہ تعالیٰ سے اجر پائیں گے۔

مزید یہ کہ ہماری عائلی عدالتیں، عدالتی اختیارات کے تحت ''فسخ نکاح'' کو جو ''خلع'' قرار دیتی ہیں، یہ قطعاً درست نہیں ہے، کیونکہ خلع تو فریقین کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ اور اس کا ذکر قرآن مجید میں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ: ’’ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کیلئے) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور تمھارے لئے حلال نہیں کہ تم نے جو کچھ (مہر) عورتوں کو دیا ہے، اس میں سے کچھ واپس کرلو، مگر جب دونوں کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان پر کچھ گناہ نہیں، اس میں جو عورت نے (شوہر سے خلاصی پانے کا) بدلہ دیا۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، تو ان سے آگے نہ بڑھو، اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں، تو وہی ظالم ہیں‘‘، (بقرہ:229)۔

اس آیت کی رو سے اگر زوجین کیلئے حدود شرع کے اندر رہتے ہوئے ازدواجی زندگی کا جاری رکھنا ممکن نہ رہے اور شوہر ویسے بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو، تو بیوی یہ راستہ اختیار کرسکتی ہے کہ شوہر سے لیا ہوا مہر اسے واپس کر کے یا مطالبۂ مہر سے دستبردار ہو کر یا کوئی مالی معاوضہ دے کر اپنی گلو خلاصی کرالے، اگر شوہر یہ پیشکش قبول کر کے اسے مال کے عوض طلاق دے دے تو اسے شرعاً ’’خلع‘‘ کہتے ہیں اور یہ طلاقِ بائن کے حکم میں ہے، یہ باہمی رضامندی پر موقوف ہے۔

اس خلع کے بعد زوجین اگر چاہیں تو عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے عقدِ ثانی کرسکتے ہیں، ورنہ عدت گزرنے کے بعد خلع یافتہ عورت اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔ عدالت یہ کرسکتی ہے بلکہ اسے ایسا کرنا چاہیے کہ زوجین کو آمنے سامنے بٹھا کر انہیں خلع پر آمادہ کرے، حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی سے ڈرائے، اور اگر وہ آمادہ ہو جائیں تو اپنی نگرانی میں خلع کرا کے اس کی توثیق کردے، مگر یہ ’’فسخ نکاح‘‘ کی

ڈگری نہیں کہلائے گی بلکہ ''خلع'' کہلائے گا، جسے عدالتی توثیق حاصل ہوگی۔
اسی طرح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اگر زوجین کے درمیان اختلافات زیادہ بڑھ جائیں تو دونوں کے خاندانوں سے ایک ایک بزرگ یا زیرک ودانا اور اصلاح پسند نمائندہ چن کران دونوں کو حَکَم مقرر کیا جائے تاکہ وہ مسئلے کو سلجھا سکیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝ (النسا:35)

ترجمہ: ''اور اگر تمہیں ان دونوں (میاں بیوی) کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو تو شوہر کے خاندان سے ایک حَکَم مقرر کرو اور (اسی طرح) بیوی کے خاندان میں سے ایک حَکَم (منصف، ثالث) لے لو، اگر وہ دونوں اصلاح کا ارادہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت (کی صورت) مقدر فرمالے گا، بے شک اللہ خوب جاننے والا خبر رکھنے والا ہے''۔
یہ کام بھی عدالت اپنی نگرانی میں کر کے اجر کی حق دار بن سکتی ہے۔
اگر سائلہ کا بیان درست ہے کہ وہ (شوہر) اخراجات اور نان نفقہ ادا نہیں کر رہا ہے اور منہ بولے ماں باپ کے پاس رکھا ہوا ہے اور ازدواجی حقوق بھی ادا نہیں کر رہا، یہاں تک کہ برسوں سے بیوی کے ساتھ کوئی رابطہ بھی نہیں تو ایسا شوہر ''زوجِ مُتَعَنِّت'' کہلاتا ہے، اور بیوی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حقائق وشواہد کی روشنی میں عدالت سے نکاح فسخ کرائے، جہاں تک شوہر کے منہ بولے ماں باپ کا تعلق ہے، اگر اس منہ بولے باپ اور خاتون کے درمیان حرمت کا کوئی اور رشتہ نہیں تو حجابِ شرعی کے بغیر اس کا ان کے ساتھ بے حجاب و بے تکلف میل جول اور رہن سہن بھی جائز نہیں۔

سوتیلی بیٹی سے نکاح

سوال:104

میں سید شارق بخاری ولد سید معید بخاری نے ایک بیوہ عورت سے نکاح کیا،

قربت کے تعلقات بھی رہے، کچھ عرصے بعد اس عورت کی حقیقت سامنے آئی کہ وہ ایک بدچلن عورت ہے، اس کی بدچلنی اور بے حیائی نے میرا جینا حرام کردیا اور میں نے تنگ آکر اس کو طلاق دے دی، اس عورت کے پہلے شوہر سے پانچ بچے ہیں، ان میں سے ایک لڑکی اسماء ولد محمد اسلام (مرحوم) ہے جس سے میں نے اس کی رضا مندی سے نکاح کرلیا، چونکہ وہ لڑکی اس عورت کے پہلے شوہر سے ہے اور میں اس عورت کو طلاق (ثانوی اور شرعی) طور پر دے چکا ہوں، اس لئے یہ جواب عنایت فرمادیں کہ اس عورت کے پہلے شوہر کی بیٹی سے میرا یہ نکاح جائز ہے؟، (سید شارق علی بخاری ولد سید معید بخاری)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ٘ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ٘۔

ترجمہ: ''اور تمہاری ان بیویوں کی (کسی سابق شوہر سے) بیٹیاں جن سے تم صحبت کرچکے ہو اور اگر تم نے ان بیویوں سے صحبت نہ کی ہو تو (ان کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں) تم پر کوئی گناہ نہیں''، (النساء: ۲۳)۔

وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے ان کی اسباب کے اعتبار سے نو اقسام ہیں جن میں سے ایک سبب حرمتِ مصاہرت ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: حرم بالمصاهرة (بنت زوجته الموطوءة) ترجمہ: رشتۂ مصاہرت (سسرالی رشتہ) زوجۂ موطوءہ کی بیٹی حرام قرار دی گئی ہے۔ اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أی سواء كانت فی حجره:ای كنفه ونفقته اولا ،وذكر الحجر فی الآية خرج مخرج العادة أو ذكر للتشنيع عليهم كما فی "البحر"واحترز بالموطوءة عن غيرها ،فلا تحرم بنتها بمجرد العقد۔

ترجمہ: ''یعنی خواہ وہ اس کی گود میں ہو، یعنی اس کی نگہداشت اور نفقہ کی ذمہ داری اپنے ذمے

لے رکھی ہو یا نہ۔ آیت میں حجر (گود) کا ذکر عادت کے طور پر ہے کہ بالعموم ایسا ہوتا ہے، یا اس کا ذکر عار دلانے کے لئے ہو جیسا کہ "البحر الرائق" میں ہے، اور موطوءہ (مدخولہ) کی قید غیر موطوءہ سے احتراز کے لئے ہے تو محض عقد کی بناء پر اس عورت کی کسی سابقہ شوہر سے بیٹی اس شوہر پر حرام نہیں ہوگی (بشرطیکہ مباشرت سے قبل اس نے اسے طلاق دے دی ہو)"، (ردالمحتار جلد 4 ص 83، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)"۔ مذکورہ صورت میں چونکہ پہلی بیوی سے آپ نے ازدواجی تعلقات قائم کئے، لہٰذا حرمتِ مصاہرت کے سبب اس عورت کی بیٹی سے آپ کا نکاح جائز نہیں، آپ پر لازم ہے کہ اس سے فوراً علیحدگی اختیار کریں اور توبہ کریں۔

﴿ کتابُ الطلاق ﴾

تحریری طلاق اور نفقہ

سوال:105

شوہر نے بیوی کو اس کے میکے بھیج دیا اور تقریباً دو ماہ کے بعد تحریراً تین طلاقیں بھیج دیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ طلاق سے قبل دو ماہ اور عدّت کے زمانے کا نان نفقہ کیا شوہر کے ذمہ ہے؟، اور کیا عورت اس کی حقدار ہے؟،(آفتاب احمد، N-3822، بلاک I، میٹروول III، کراچی)۔

جواب:

طلاق کے بعد ایامِ عدّت کا نان نفقہ اس کی مالی حیثیت کے مطابق شوہر کے ذمہ ہے۔ اصولی طور پر معتدہ عورت کو عدت شوہر کے مکان میں گزارنی چاہیے، لیکن چونکہ استفتاء میں درج صورتِ حال کے مطابق شوہر نے طلاق سے دو ماہ قبل ہی اسے والدین کے گھر بھیج دیا، اس لیے اپنے والدین کے گھر عدت گزارنا اس کی مجبوری ہے۔ اگر عورت نے طلاق سے قبل کے دو ماہ کے نفقے کا مطالبہ بروقت کیا ہو، تو یہ اس کا حق ہے۔

مسئلہ طلاق رجعی

سوال:106

محترم مفتی صاحب! میری گذارش ہے کہ میرے شوہر نے مجھے فون پر باقاعدہ طور پر ایک طلاق دی۔ الفاظ: "میرا اور میرے والد کا نام لے کر کہا کہ میں فلانہ بنت فلاں کو ایک طلاق دیتا ہوں"۔ میری گذارش ہے کہ آپ مجھے تفصیل سے بتایئے کہ شرعی طور پر میرے لیے کیا حکم ہے، جبکہ طلاق کو اب تین مہینے ہوگئے ہیں،(ام ایمن بفرزون، R-21 15A2/نارتھ کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں آپ کے شوہر نے آپ کو ایک طلاق رجعی دی ہے، اس کے

بعد عدت کے اندر شوہر کو رجوع کا حق حاصل تھا، رجوع زبانی بھی ہوسکتا ہے کہ شوہر بیوی سے کہے کہ میں نے طلاق سے رجوع کیا اور عملاً بھی کہ آپس میں ازدواجی تعلق قائم کر لیں۔ اگر طلاق رجعی کے بعد شوہر نے عدت کے اندر رجوع نہ کیا ہو تو عدت گزرنے کے بعد وہ طلاق بائن ہو جاتی ہے، اور پھر عورت آزاد ہوتی ہے اپنی مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے، لیکن وہ باہمی رضامندی سے سابق شوہر کے ساتھ بھی عقد ثانی کر سکتی ہے، ایسی صورت میں شوہر کے پاس آئندہ صرف دو طلاق کا حق رہے گا، اور مزید طلاقوں کے ساتھ جمع ہونے کے لئے یہ پہلی طلاق بدستور مؤثر رہے گی۔ جس عورت کو حیض آتا ہے اس کی عدت تین حیض ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ

اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض گزرنے تک روکے رکھیں، (البقرہ:228)۔

اور وہ عورت جسے حیض نہ آتا ہو، اس کی عدت تین ماہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ۔

اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اگر تمہیں شبہ ہو (ان کی عدت کیا ہوگی) تو ان کی عدت تین مہینے ہے، اور وہ عورتیں جنہیں سرے سے حیض آیا ہی نہیں ہے، (ان کی عدت بھی تین مہینے ہے)، (الطلاق:4)۔

آپ کے سوال میں درج نہیں ہے کہ آپ کے شوہر نے عدت کے اندر رجوع کرلیا ہے یا نہیں؟، اگر کرلیا ہے تو یہ ان کا استحقاق ہے اور نکاح بدستور قائم ہے، اگر نہیں کیا اور عدت باقی ہے تو اب بھی کر سکتے ہیں، اور اگر خوانخواستہ عدت گزر چکی ہے تو آپ لوگوں کا رشتہ نکاح باقی نہیں رہا، آپ حسب منشا جہاں چاہیں نکاح کیلئے آزاد ہیں، اور اپنے سابق شوہر سے بھی عقد ثانی کر سکتی ہیں، لیکن اب آئندہ آپ کے شوہر کے پاس صرف دو طلاق کا حق باقی رہے گا۔

ایک طلاق تصور ہوگی

سوال:107

منسلکہ تحریر میرے سمدھی اور میری بیوی کے سگے پھوپھا کی ہے جو میری بیٹی اور ان کے بیٹے کے مابین ازدواجی اختلافات کی وجہ سے تحریر کی گئی تاکہ ان کے (یعنی سمیعہ اور وقار حسن کے) مابین کوئی تنازعہ جنم نہ لینے پائے۔ یہ تحریر بقول آفریدی خان ایک تنبیہ کے طور پر تحریر کی گئی ہے اور اس سے طلاق دینا مقصود نہیں لیکن بعد ازاں اس کا رخ طلاق کی جانب بدل دیا گیا (خداوند تعالیٰ دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے اور وہ بہترین انتقام لینے والا ہے)۔

1) مذکورہ مسئلہ میں جیسا کہ آفریدی خان صاحب نے اپنی تحریر کی پشت پر لکھا ہے کہ 16/6 کو سمیعہ گھر چھوڑ کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی لیکن انہوں نے یہ تحریر نہیں کیا کہ ان کے اکسانے پر وقار حسن سمیعہ کو 15/6 کی شب اپنے گھر لے گیا اور تمام رات تشدد کرتا رہا یہاں تک کہ صبح 4 بجے محلے کے لوگوں نے شور و غل کی آواز سنی اس تشدد کے بعد صبح میری غیر موجودگی میں میری بیٹی میرے گھر آئی، اس طرح تشدد کے بعد اگر کوئی لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر چلی جائے تو آیا اس پر طلاق واقع ہو جاتی ہے؟

یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ عام حالات میں گھر کو چھوڑنے سے ایک طلاق رجعی واقع ہو گئی لیکن آیا جبر و تشدد کی صورت میں بھی یہ طلاق واقع ہو سکتی ہے؟

2) جیسا کہ تحریر سے ثابت ہے کہ تمام دستخط یکطرفہ ہیں اور لڑکی کی جانب سے کسی فرد کے دستخط موجود نہیں، آیا اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ تحریر قابل قبول اور قابلِ عمل بھی ہے جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس تحریر کے بعد بجائے اتفاق اور اتحاد کے تشدد کا راستہ کھل گیا۔

3) اگر یہ تحریر قابلِ عمل ہے تو اس کی رو سے کتنی طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور آیا اس میں رجوع کی گنجائش موجود ہے یا نہیں؟ یہاں یہ بات واضح کر دی جائے کہ اس تحریر کے بعد یہ پہلا جھگڑا ہے جیسا کہ آفریدی خان صاحب نے بھی اپنی تحریر کی پشت پر یہ بات واضح طور پر لکھی ہے۔

4) آفریدی خان صاحب کے ذہن میں یہ بات ہے کہ 16/6 کے بعد تقریباً تین ماہ گزر چکے ہیں کسی نے رجوع نہیں کیا تو اس طرح دو یا تین حیض گزرنے کے بعد دوسری طلاق ازخود واقع ہوگئی ہے اس بات کی وضاحت ضروری ہے۔

5) یہ تحریر لڑکے کے والد نے لکھی ہے جب کہ تمام دوسرے افراد نے اس پر دستخط کیے ہیں۔ اس صورت میں جب کہ زبان سے لفظ طلاق کا برملا ذکر نہ کیا جائے، طلاق واقع ہوجاتی ہے؟، (عبدالقیوم والدِ سمیعہ، مکان نمبر: 21/12، 36/B، لانڈھی، کراچی)۔

نوٹ: شوہر وقار حسن کی تحریر مندرجہ ذیل عبارت پر مشتمل ہے:

''ہم دونوں وقار حسن اور سمیعہ بحیثیت خاوند اور بیوی اقرار کرتے ہیں کہ ہم ہر طرح سے باہم اتفاق اتحاد اور اپنی بساط کے مطابق زندگی گزاریں گے۔ اگر کوئی کسی قسم کا تنازعہ ہمارے درمیان پیدا ہو تو باہم طے کر کے صلح کریں گے۔ سمیعہ بطور بیوی خاوند وقار کی تابع فرمان ہوگی اور وقار بحیثیت خاوند اپنی بیوی کی حیا اور نان نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔ اگر بیوی بضد ہوگئی اور خاوند کی مرضی سے باہر ہوئی تو یہ کاروائی ایک طلاق تصور ہوگی اور اسی تناسب سے دوسری بار بھی ہوگی۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ خداوند کریم کے احکامات کے مطابق ازدواجی زندگی گزارنے کے جو اصول ہیں اور قناعت اور صبر کے احکام ہیں ہم ہر حالت میں پورا کریں گے۔ بطور قبولیت ہم اپنے دستخط کردیتے ہیں اور پابند ہیں۔''

نوٹ: استفتاء پر گواہان کے دستخط بھی ثبت ہیں۔

دستخط — وقار حسن ولد آفریدی خان

دستخط — سمیعہ بنت عبدالقیوم

(B-69 کاظم آباد، ماڈل کالونی، گواہی کی تاریخ: 5 جنوری 2003ء)۔

اس کے بعد ایک اور قلمی تحریر، جس کے نیچے'' آفریدی'' کے دستخط ہیں، کے الفاظ یہ ہیں:

7 جون 2003 سے 4 جولائی 2003 تک کراچی میں رہا۔

16 جون 2003 کو صبح وقار کے گھر سے سمیعہ بغیر اطلاع دیئے غائب ہوگئی، مالک مکان

نے لاعلمی کا اظہار کیا۔دو گھنٹے کی تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے،اس کے گھر لڑکی چھوڑ کر واپس آ گیا۔22 جون 2003ء کو سامان واپس لا کر مکان مالک مکان کے حوالے کر دیا۔

جواب:

صورت مسئولہ میں خاوند وقار حسن کی تحریر میں یہ جملہ:''اگر بیوی بضد ہوگی اور خاوند کی مرضی سے باہر ہوگی تو یہ کارروائی ایک طلاق تصور ہوگی اور اسی تناسب سے دوسری بار بھی ہوگی''،قابل توجہ ہے اور اسی پر طلاق کے واقع ہونے یا نہ ہونے کا مدار ہے۔

اس تحریر میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس میں''خاوند کی مرضی''کو متعین نہیں کیا گیا، بلکہ اسے مبہم رکھا گیا تاوقتیکہ وہ پہلے سے کسی خاص معاملے میں اپنی مرضی متعین کر کے بیوی کو اس سے آگاہ نہ کردے،مثلاً وہ یہ کہے کہ'' آئندہ تم میری اجازت کے بغیر اپنے والدین کے گھر نہیں جاؤ گی''،جبکہ تحریر میں صراحتاً یا اشارتاً کوئی ایسا مفہوم مستفاد نہیں ہوتا،جبکہ ''تعلیق بالطلاق''تو کسی امر متعین،معلوم اور متحقق پر ہوتی ہے۔

دوسری بات قابل توجہ تحریر کے یہ الفاظ ہیں کہ:''تو یہ کارروائی ایک طلاق تصور ہوگی اور اسی تناسب سے دوسری بار بھی ہوگی''۔یہ الفاظ''انشاء طلاق''کے نہیں ہیں،کیونکہ طلاق،انشاء یعنی قصداً طلاق کو واقع کرنے سے ہوتی ہے،یعنی شوہر یہ کہے کہ مثلاً:تجھے طلاق ہے یا تجھے طلاق دی یا تجھے طلاق دیتا ہوں یا مستقبل میں کسی امر کے ساتھ معلق کر کے کہے کہ تجھے طلاق ہوگی وغیرہ۔لہٰذا ان کلمات سے طلاق واقع نہیں ہوئی،کیونکہ طلاق تصور ہوگی کے معنی ہیں:''سمجھی جائے گی''۔

امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سوال کیا گیا:''شوہر نے لکھا:اس خط کو بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں''،اعلیحضرت قدس سرہم العزیز نے جواب دیا:

''صالح ایقاع طلاق نہیں کہ''بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں''کے صاف یہ معنی کہ حقیقت میں ''طلاق نامہ''نہیں۔فتاویٰ امام قاضی خان میں ہے:

"امرأة قالت لزوجها:مرا طلاق ده ، فقال الزوج:داده انگار لا يقع وان نوى كانه قال لها با لعربية احسبى انك طالق وان قال ذلك لا يقع وان نوى"
ترجمہ:بیوی نے خاوند کو کہا:'' مجھے طلاق دے''،خاوند نے جواب دیا:''تو دی ہوئی یا کی ہوئی خیال کرلے''تو طلاق نہ ہوگی اگرچہ طلاق کی نیت کی ہو،کیونکہ عربی میں اس کا معنی یوں ہے''تو گمان کرلے کہ تو طلاق والی ہے''اور اگر یوں بالفاظ عربی کہا تو طلاق نہ ہوگی چاہے طلاق کی نیت کی ہو،(فتاویٰ قاضی خان،کتاب الطلاق،جلد ا،ص ۳۱۰ مطبوعہ نولکشور،لکھنؤ)۔
(فتاویٰ رضویہ جلد ۱۲،ص ۱۶۳ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

اسی مقام پر ہے:
"لو قيل لرجل اطلقتَ امرأتك فقال عَدّ ها مطلّقة اواِحسبها مطلّقة لا تُطلّق امرأته"۔
ترجمہ:ایک شخص سے سوال کیا گیا کہ:'' کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے؟''تو اس نے جواب میں کہا:''تو اس کو طلاق دی ہوئی شمار کرلے یا تو اسے مطلقہ سمجھ لے''،تو بیوی کو طلاق نہ ہوگی،(فتاویٰ قاضی خان،کتاب الطلاق،جلد ا،ص ۲۱۳ مطبوعہ نولکشور،لکھنؤ)۔
علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:
"داده انگلو" او "كرده انگار" لا يقع وان نوى، ولو قال لها بعدما طلبت الطلاق"۔
ترجمہ:'' دی ہوئی سمجھ''یا'' کی ہوئی سمجھ''،(ان کلمات سے) طلاق واقع نہیں ہوگی،خواہ اس نے طلاق کی نیت بھی کی ہو اور (تب بھی نہیں) اگر اس نے بیوی کے مطالبۂ طلاق کے بعد یہ الفاظ کہے ہوں''،(فتاویٰ عالمگیری جلد ا،ص ۳۸۰ مطبوعہ دارالاشاعت العربیہ قندھار)۔
ہمارے پاس کچھ عرصہ قبل ایک استفتاء آیا تھا کہ:ایک شخص نے تین سے زائد بار اپنی بیوی سے کہا:''اگر تم نے پان کھایا تو میری طرف سے طلاق سمجھو''۔دارالعلوم کراچی کے جناب مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب نے اپنے وقوعِ طلاق کے فتوے سے رجوع کرکے مجھ

سے اتفاق کیا تھا کہ ان کلمات سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔
اسی طرح امداد الفتاویٰ جلد ۲، ص ۴۹۹ میں ایک استفتاء درج ہے جس میں تحریر ہے: آخر لوگوں نے کہا: تم اس قدر مارتے ہو، اگر وہ موافق نہیں ہے تو اس کو طلاق دے، تو اس (شوہر) نے کہا: ''تم لوگ ایسا ہی سمجھو''۔ اس کا جواب امداد الفتاویٰ میں فتاویٰ عالمگیری کا حوالہ دینے کے بعد یوں درج ہے: ''اور یہ الفاظ کہ: ''تم لوگ ایسے ہی سمجھو'' ترجمہ ''دادہ انگار'' کا معلوم ہوتا ہے، اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔
لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ''یہ کارروائی ایک طلاق پر تصور ہوگی'' کے معنی یہی ہوں گے کہ ''طلاق سمجھی جائے گی'' یا ''اسے طلاق سمجھا جائے'' لہٰذا اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی اور وقار حسن اور سمعیہ بدستور میاں بیوی ہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

مسئلہ طلاق

سوال:108

میرا مسئلہ درج ذیل ہے، براہِ کرم اس مسئلہ پر فتویٰ جاری کریں، عین نوازش ہوگی۔ ''شوہر نے بیوی سے دو بار یہ الفاظ کہے کہ: ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''، اور پھر پندرہ دن تک شوہر حقِ زوجیت ادا کرتا رہا اور پھر بیوی دو ماہ تک پاکستان سے باہر رہ کر آئی اور ایک ہفتہ تک شوہر کے ساتھ رہنے کے بعد علیحدہ رہتی ہے۔ اور دو ماہ بعد شوہر نے کہا کہ تم میری طرف سے آزاد ہو اور اب تم میرے نکاح میں نہیں ہو۔

سوالات یہ ہیں کہ آیا شرعی لحاظ سے:
(1) تمام طلاقیں واقع ہوگئی ہیں؟
(2) نکاح برقرار ہے یا نہیں؟
(3) تیسری طلاق کے جو الفاظ شوہر نے کہے، وہ طلاق کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں؟
(4) آیا اب بیوی شوہر کے ساتھ رہ سکتی ہے یا نہیں؟، (خواجہ شجاعت اللہ، مکان نمبر A-433 بلاک ایل نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں خط کشیدہ الفاظ سے دو رجعی طلاقیں واقع ہوگئیں اور طلاق رجعی میں جب تک عدت باقی ہے، شوہر رجوع کرسکتا ہے۔ اور عورت کی رضامندی اس میں شرط نہیں ہے، فتاویٰ عالمگیری ج:1 ص:470 پر ہے:

واذا طلق الرجل امراته تطليقة رجعيةً او تطليقتين فلهٗ ان يرا جعها فی عدتها رضيت بذلک او لم ترضَ۔

ترجمہ: ''اور جب شوہر اپنی بیوی کو ایک یا دو رجعی طلاقیں دے دے، تو اسے عدت کے اندر رجوع کا اختیار ہے، خواہ عورت اس رجوع پر راضی ہو یا نہ ہو''۔

پھر شوہر نے دو طلاق رجعی دینے کے بعد رجوع کیا اور آئندہ وہ صرف ایک طلاق کا مالک تھا۔ جب شوہر نے اپنی بیوی سے کہا: ''تم میری طرف سے آزاد ہو''، ان الفاظ سے طلاق کا واقع ہونا شوہر کی نیت پر موقوف ہے، اگر شوہر کی نیت طلاق دینے کی ہو، تو طلاق واقع ہوجائے گی، ورنہ نہیں، فتاویٰ عالمگیری جلد 1 صفحہ 374 پر ہے: ''وَلَوْ قَالَ اَعْتَقْتُکِ طُلِّقَتْ بِالنِّيَّةِ''۔

ترجمہ: ''اور اگر (شوہر نے اپنی بیوی سے) کہا: ''میں نے تمہیں آزاد کیا''، تو اگر اس نے یہ کلمات طلاق کی نیت سے کہے تو طلاق واقع ہوجائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

ترجمہ: ''(وہ) طلاق (جس کے بعد شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے، زیادہ سے زیادہ) دو بار ہے، پھر (یا تو عدت کے اندر) حسن سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کیلئے) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے''، (البقرہ:229)۔

لیکن صورت مسئولہ میں شوہر کا یہ کہنا کہ: ''تم میری طرف سے آزاد ہو'' اور اس کے بعد والا جملہ کہ: ''اور اب تم میرے نکاح میں نہیں ہو''، شوہر کی نیتِ طلاق پر قرینہ ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں خاتون کو مذکورہ جملہ سے ایک اور طلاق واقع ہوگئی اور یہ پہلی دو طلاقوں کے ساتھ

مل کر کل تین طلاقیں واقع ہوگئیں۔
اب یہ خاتون اپنے شوہر کیلئے بالکل حرام ہوگئی، اوراب وہ تین حیض عدت گزارنے کے بعد سابق شوہر کے سوا کسی کے ساتھ بھی اپنے نکاح کے بارے میں آزاد ہے اور جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔ سابق شوہر کے ساتھ اب وہ نہیں رہ سکتی، اگر شوہر نے اس سے پہلے اس کا مہر ادا نہیں کیا تھا، تو وہ پورے مہر اور ایامِ عدت کے نان نفقہ کی حق دار ہے۔

مسئلہ طلاق وحقوق ازدواج

سوال:109

عالی جناب! میں مسمی افتخار احمد والدہ ماجدہ نسیم اختر سکنہ بلاک نمبر 1 فلیٹ نمبر C،6 الکرم اسکوائر فیڈرل کیپٹل ایریا، کراچی میں رہائش پذیر ہوں۔ عالی جناب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے دو شادیاں کی ہیں، دوسری شادی کے بعد سے میری پہلی شریکِ حیات نے مجھے تنگ کرنا شروع کردیا، پہلی سے میرے گھر میں پانچ بچوں نے جنم لیا۔ اور دوسری سے تین بچے ہیں۔ گھریلو ناچاقی کی وجہ سے میں نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی تھی، لیکن بچوں کی وجہ سے لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم حلالہ کرلو۔ اس طرح تمہیں بیوی بچے دوبارہ مل جائیں گے۔ لیکن حلالہ کرنے سے پہلے میں نے اپنی بیوی کے سامنے یہ قسم اُٹھائی تھی۔ کیونکہ مجھے میری پہلی بیوی نے یہ کہا تھا کہ اگر تم میرے سامنے قرآن اُٹھا کر پہلے یہ قسم کھاؤ کہ میں دوسری بیوی کو چھوڑ دوں گا، تو میں حلالہ کرنے کو تیار ہوں۔ لہٰذا میں نے اس کے سامنے قرآن اُٹھا کر یہ قسم کھائی کہ میں اُسے چھوڑ دوں گا۔ اب چھ ماہ پہلے حلالہ کرلیا اور نہ ہی دوسری بیوی کو بھی چھوڑا، کیونکہ میں اپنی دوسری بیوی کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا ہوں اور دونوں کو رکھنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا اب میں مسئلہ آپ کے زیرِ گوش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ سے اس کا صحیح حل اسلام کے نقطۂ نظر سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اب میں کیا کروں، جو قسم میں نے اُٹھائی ہے، اس کا مجھے کیا کفارہ ادا کرنا پڑے گا، کچھ لوگوں نے مجھے کہا ہے کہ اس طرح سے قسم کھا کر اور حلالہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، یہ حلال نہیں حرام ہے۔ لہٰذا آج کل میں ذہنی

طور پر کافی پریشان ہوں اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ کس کو رکھوں اور کس کو چھوڑوں۔ خدا کیلئے مجھے اس ذہنی پریشانی سے چھٹکارا دلایئے اور کوئی حل نکالیئے میں آپ کا بے حد ممنون و متشکر رہوں گا۔

جواب:

آپ کو پہلی بیوی کے ساتھ عقدِ ثانی کیلئے دوسری بیوی کو طلاق دینے کا وعدہ نہیں کرنا چاہئے تھا، اور نہ ہی ایسی قسم کھانی چاہئے تھی، کیونکہ مباح امور میں طلاق اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ آپ اپنی دوسری بیوی کو بدستور نکاح میں رکھیں اور قسم کا کفارہ ادا کریں، جو یہ ہے: 10 مساکین کو اپنے اوسط معیار کے مطابق دو وقت کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس فراہم کرنا اور اگر یہ نہ کرسکیں تو تین دن کے روزے رکھنا، کفارۂ قسم کا یہ حکم سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 89 میں مذکور ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾

ترجمہ: ''اللہ تمہاری بے مقصد قسموں پر تمہاری گرفت نہ فرمائے گا، لیکن تمہارا مواخذہ کرے گا تمہاری پکی قسموں پر، تو ایسی قسم کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا دینا ہے درمیانی قسم کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان مسکینوں کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا، تو جو (ان میں سے کچھ) نہ پائے تو تین دن کے روزے (رکھے)، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھاؤ (اور اسے توڑ بیٹھو) اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ''۔

ہر ایسی قسم کو، جس پر قائم رہنا اسے پورا کرنا خلافِ شرع ہو، توڑ دینا چاہئے اور اس کا کفارہ ادا کر دینا چاہئے اور وہ کام کرنا چاہئے جو شریعت کی رو سے مستحسن اور پسندیدہ ہے، حدیث

پاک میں ہے:

عن عبدالرحمن بن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ : واذا حلفت علىٰ يمين فرأيتَ غيرها خيراً منها فكفر عن يمينك واتِ الذى هو خير۔

ترجمہ: ''حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ (ایک طویل حدیث میں) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اور جب تو کسی بات کی قسم کھائے پھر تجھے معلوم ہو کہ اس کے برعکس بات میں خیر ہے، تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو اور وہ کام کرو، جس میں (اللہ کے نزدیک) خیر ہے''، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین)۔ پہلی بیوی کے ساتھ جو آپ نے عقدِ ثانی کیا ہے، وہ درست ہے۔ اب دونوں بیویوں کو نکاح میں رکھیں، دونوں بیویوں اور اولاد کے حقوق ادا کریں۔ دونوں بیویوں کے درمیان شرعاً عدل اور مساوات کا برتاؤ کرنا چاہیے، یعنی نان نفقہ، رہن سہن کی سہولتیں دونوں کو اپنی حیثیت کے مطابق برابر دیں اور دونوں کے درمیان دنوں کی تقسیم بھی برابر کریں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک سے زائد ازواج کے درمیان عدل کا حکم فرمایا ہے۔

مسئلہ دو طلاقِ رجعی

سوال:110

گذارش یہ ہے کہ میری چھوٹی بہن کو اس کے شوہر نے شارجہ سے فون پر دو مرتبہ یہ الفاظ کہ ''میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں'' کہے، جو کہ میری بہن نے بھی سنے اور میرے بیٹے فیضان الدین نے بھی سنے، جو کہ اس وقت شارجہ میں موجود تھا۔ میری بہن حاملہ ہے اور اپریل کے پہلے ہفتے میں اس کے یہاں بچے کی ولادت متوقع ہے۔ اب اس کے شوہر نے اس کو اپنے گھر واپس بلالیا ہے، مگر وہ خود شارجہ میں ہے۔ یہ سارا واقعہ اندازاً 5 یا 16 اکتوبر کا ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس کا شوہر کس طرح اور کس وقت اس کے ساتھ رجوع کرے، برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیجیے، (ایک بہن، کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں، اگر سائلہ کا بیان درست ہے تو، دورجعی طلاقیں واقع ہوگئیں، چونکہ مطلقہ بیوی حاملہ ہیں، اس لئے ان کی عدت وضعِ حمل (یعنی بچہ پیدا ہونے) تک ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔

ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضعِ حمل ہے''، (الطلاق:4)۔

چونکہ ابھی ''وضعِ حمل'' نہیں ہوا اس لئے عدت باقی ہے، عدت کے اندر شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے، وہ زبانی یہ کہہ کر رجوع کر سکتے ہیں کہ ''میں نے رجوع کیا'' اور عمل سے بھی رجوع کر سکتے ہیں، کہ اس سے بیوی کی طرح برتاؤ کریں، بوس وکنار یا عملِ زوجیت ادا کرنا وغیرہ، مگر مکروہ ہے الّا یہ کہ مجنون ہو۔ تاہم رجوع کی صورت میں اب شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی ہے، آئندہ اگر خدانخواستہ شوہر نے ایک طلاق دے دی تو ماضی کی یہ دو طلاقیں، اس کے ساتھ جمع ہونے کیلئے مؤثر رہیں گی، اور اس طرح سے تین طلاق مغلظہ ہوجائیں گی، اس لئے شوہر کو آئندہ کے لئے انتہائی محتاط رہنا ہوگا۔ شوہر کا اپنی بیوی کی حیثیت سے گھر بلانا، اگر رجوع کی نیت سے ہے تو اس سے بھی رجوع ہو جائے گا۔

مسئلہ تفویض طلاق

سوال:111

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ ذی احترام دریں مسئلہ کہ زینب کی شادی علی سے ہوئی، تو نکاح سے قبل طرفین کے اولیاء کے مابین عرفِ عام کے مطابق چند شرائط طے ہوئیں، جن میں ایک اہم شرط یہ تھی کہ علی اپنا حقِ طلاق زینب کو تفویض کردے گا۔ پھر بوقتِ نکاح، نکاح فارم میں یہ تحریر کیا گیا کہ ''دولہا نے طلاق کا حق دلہن کو تفویض کردیا ہے''۔

چند ماہ بعد نااتفاقی کی صورت میں زینب اپنے والدین کے گھر آگئی، زینب کے والد نے اپنی بیٹی سے یہ لکھوایا کہ ''میں اپنے والد کو طلاق کا حق تفویض کرتی ہوں وہ میری طرف سے

حقِ طلاق استعمال کر سکتے ہیں''،چنانچہ زینب کے والد نے اپنی بیٹی کے ولی اور وکیل کی حیثیت سے علی کو ایک طلاق تحریری بھجوادی،چار مہینے بعد پھر دوسری طلاق بھی تحریری بھجوادی،عدت کی مدت ختم ہو چکی تھی کہ علی کے اولیاء نے پھر سے صلح کی کوششیں شروع کر دیں اور علی کے معتبر ترین ولی نے کہا کہ میں نے مفتی صاحب (نامعلوم) سے معلوم کرلیا ہے ابھی طلاق بائنہ واقع نہیں ہوئی مگر سائل متذبذب ہے لہٰذا مفصل فتویٰ تحریر فرمائیں کہ

(۱) تفویض طلاق کی عرفِ عام میں کیا حیثیت ہے؟ عرفِ عام کے مطابق مکمل اختیارِ طلاق کی منتقلی ہے یا یہ قابلِ واپسی ہبہ ہے یا نا قابلِ واپسی عطیہ وتحفہ؟

(۲) کیا لڑکی طلاق مفوضہ کا اختیار خود استعمال کرسکتی ہے یا اپنے ولی ووکیل کو بھی تفویض کرسکتی ہے؟۔

(۳) کیا وکیل اس اختیار کو استعمال کرسکتا ہے اور وکیل کی طرف سے دی گئی دونوں طلاقیں مؤثر ہوگئیں؟ یہاں یہ بھی واضح ہو کہ علی نے نکاح فارم چھپایا ہوا ہے اور نکاح خواں کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتاتا، تفصیلی جواب سے سرفراز فرمائیں،(فداء المصطفیٰ، جامعہ باب القرآن،کراچی)۔

جواب:

یہ مسئلہ تفویض طلاق کا ہے،کوئی شخص اپنی بیوی کو''اختیار طلاق'' صرف اس صورت میں تفویض کرسکتا ہے، جب وہ اس کے عقدِ نکاح میں آچکی ہو یا کم ازکم وہ اپنے آپ کو شوہر کے عقدِ نکاح میں دے دے یعنی اپنی طرف سے خیارِ طلاق کی شرط کے ساتھ پہلے ایجاب کرے اور شوہر اس شرط کے ساتھ اسے قبول کرے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

"رَجُل تَزَوَّجَ امرأةً علی انها طالق اوعلی ان امرها فی الطلاق بیدها، ذکر محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ فی الجامع انه یجوز النکاح،والطلاق باطل ولا یکون الامر بیدها وقال الفقیه ابو اللیث رحمه اللّٰه تعالیٰ هذا اذا بدأ الزوج فقال

تزوجتکِ علی انک طالق، وان ابتدأت المرأة فقالت زوجت نفسی منک علی انی طالق او علی ان یکون الامر بیدی اطلق نفسی کلماشئتُ، فقال الزوج قبلت، جازالنکاح،ویقع الطلاق ویکون الامربیدھا۔"

ترجمہ:''ایک شخص نے ایک عورت سے اس شرط پرنکاح کیا کہ:اسے طلاق ہے یااسے خودکو طلاق دینے کااختیار ہے،''تو امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے''الجامع''میں فرمایا ہے کہ نکاح جائز ہے اور طلاق باطل ہے اور اس صورت میں اس عورت کیلئے خودکو طلاق دینے کا اختیار حاصل نہیں رہے گا،اور فقیہ ابواللیث رحمہ اللہ تعالیٰ نے (امام محمد کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے) فرمایا کہ یہ(یعنی طلاق اورخیارنفس کا غیر مؤثر ہونا) تب ہے جب شوہر کی جانب سے ایجاب میں پہل ہواوروہ یوں کہے کہ:میں نے اس شرط پرتم سے نکاح کیا کہ تجھے طلاق ہے،اوراگر(صورت حال یہ ہوکہ)عورت کی جانب سے ایجاب میں پہل ہو اور وہ کلمات ایجاب یوں ادا کرے کہ: میں نے اس شرط پرتجھ سے اپنا نکاح کیا کہ مجھے طلاق ہے،یا یہ کہ مجھے اپنے نفس کاخیار رہے گا کہ میں جب کبھی بھی چاہوں اپنے آپ کو طلاق دے دوں،اورشوہر نے جواباً کہا:اس شرط کے ساتھ مجھے نکاح قبول ہے،تو یہ نکاح جائز ہوگااور پہلی صورت میں طلاق فوراً واقع ہوجائے گی اوردوسری صورت میں عورت کوخود کوطلاق دینے کااختیارحاصل رہے گا''،(فتاویٰ عالمگیری جلدنمبر1ص:273مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)۔

عالمگیری کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اگرتفویض طلاق کی شرط کے ساتھ شوہرعقدنکاح میں پہل کرے اورایجاب کرے اور بالفرض یوں کہے کہ:میں نے تجھ سے مقررہ مہر کے عوض اس شرط کے ساتھ نکاح کیا کہ تجھے خودکوطلاق دینے کااختیارہمیشہ رہے گا(یعنی جب بھی توچاہے اسے استعمال کرسکتی ہے)اورعورت قبول کرلے تو یہ تفویضِ طلاق مؤثرنہیں ہے،کیونکہ تفویض طلاق یعنی ایجاب کے وقت نہ وہ اس کے عقدِنکاح میں ہےاورنہ ہی اس نے اپنے آپ کونکاح میں دیاہے،لہٰذا جوعورت ابھی عقدنکاح میں آئی ہی نہیں اورشوہرکوخود اس پرطلاق کاحق حاصل ہواہی نہیں،تواس کی تفویض طلاق (Delegation of the

Power's of Talaq) کے کیا معنی؟۔تاہم اگر عورت قبول کرلیتی ہے تو یہ نکاح اس لئے صحیح ہوگا کہ اصلاً یہ نکاح درست ہے،زوجین انشاءِ نکاح کے اہل ہیں اور انہوں نے دو گواہوں کے سامنے ایجاب قبول کیا ہے،لہٰذا ابتداءً اس نکاح کے باطل ہونے کا کوئی سبب نہیں ہے،اور قاعدہ یہ ہے کہ جو عقد اصلاً درست ہو لیکن اس میں کسی امر خارج یا شرط فاسد کی وجہ سے فساد پیدا ہو گیا تو وہ شرط از خود کالعدم ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر عورت پہلے سے نکاح میں ہے یا وہ ایجاب میں پہل کر کے خود کو "خیارِ طلاق" کی مطلق یا مقید شرط کے ساتھ شوہر کے نکاح میں دے دیتی ہے اور شوہر اسے اس شرط کے ساتھ قبول کر لیتا ہے تو یہ نکاح بھی صحیح ہے اور تفویضِ طلاق کا اختیار بھی مؤثر ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا ہی ایک مسئلہ پیش کیا گیا،جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ مشروط نکاح کیا کہ اگر میں فلاں شرط پوری نہ کروں تو تجھے خود کو تین طلاق دینے کا اختیار ہوگا،اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں: اگر الفاظِ شرط کہ زید نے کہے،یہی ہیں جو سوال میں مذکور ہوئے،تو اس میں چار صورتیں ہیں:

<u>اول:</u> یہ لفظ زید نے پیش از نکاح کہے اگر چہ اسی وقت معاً نکاح کر لیا۔

<u>دوم:</u> خاص ایجاب وقبول میں یہ شرط کی اور ابتدائے ایجاب اس شرط کے ساتھ جانبِ زید سے تھی یعنی زید نے کہا میں تجھے اپنے نکاح میں لایا اس شرط پر کہ اگر تجھ کو چھ مہینے تک الخ، زینب نے کہا میں نے قبول کیا۔

<u>سوم:</u> شرط خود عقد میں تھی اور ابتدائے ایجاب زینب کی طرف سے،مثلاً زینب یا اس کے وکیل نے کہا میں نے اپنے نفس یا اپنی مؤکلہ زینب بنت فلاں بن فلاں کو تیرے نکاح میں دیا اس شرط پر کہ اگر تو چھ مہینے تک الخ،زید نے کہا میں نے قبول کیا،یا زینب خواہ وکیل نے کہا: میں نے اپنے نفس یا مؤکلہ مذکورہ کو تیرے نکاح میں دے دیا،زید نے کہا میں نے قبول کیا،اس شرط پر کہ اگر میں تجھ کو چھ مہینے تک الخ۔

<u>چہارم:</u> یہ شرط بعد تحقق ایجاب وقبول کی۔

پہلی دوصورتوں میں سرے سے یہ تفویض طلاق (یعنی زینب کو بشرط مذکور طلاق کا اختیار دینا
ہی) صحیح نہ ہوئی، اگر بالفرض زید چھ برس بے نفقہ و بے خبر گیری چھوڑے اور زینب سو بار
اپنے نفس کو طلاق دے، طلاق واقع نہ ہوئی، کیونکہ تفویض کا انحصار ملکیت یا اس کی طرف
نسبت پر ہے جو کہ یہاں موجود نہیں ہے، اور پچھلی دو صورتوں (یعنی تیسری اور چوتھی
صورت) میں تفویض صحیح ہوگئی۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر نکاح خوان نے عقدِ نکاح کے بعد شوہر سے ''تفویضِ طلاق
کے اختیار کا اقرار کرایا تھا، یا لڑکی نے براہ راست یا اپنے وکیل کے توسط سے تفویضِ طلاق
کی شرط کے ساتھ ابتداء ایجاب کیا ہو اور شوہر نے اس مشروط ایجاب کو من وعن قبول کیا ہو
تو یہ تفویضِ طلاق مؤثر ہے اور اس کا نکاح نامہ میں اندراج قانوناً و شرعاً درست ہے۔

لیکن مندرجہ بالا دو صورتوں میں سے کسی ایک کے بغیر ہی نکاح خواں یا رجسٹرار نے نکاح
نامے کے کالم نمبر ۱۸ میں لکھ دیا کہ شوہر نے بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے، تو یہ تحریر
شرعاً مؤثر نہیں ہے، محض شوہر کے نکاح نامے پر دستخط سے یہ تفویض طلاق مؤثر نہیں ہوگی
تاوقتیکہ مذکورہ بالا صورت میں سے کسی ایک صورت کے مطابق اس نے عورت کے ملک
نکاح میں آنے کے بعد اس شرط کو قبول نہ کیا ہو۔

اگر تفویضِ طلاق دائمی اور غیر مشروط ہے، مثلاً شوہر کہے کہ تو جب کبھی بھی چاہے اپنے
آپ کو طلاق دے سکتی ہے یا تفویضِ طلاق کی نیت سے کہے کہ تو جب کبھی بھی چاہے، تیرا
معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے یا تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے، تو وہ جب چاہے یہ اختیار
استعمال کر سکتی ہے۔

اور اگر یہ تفویضِ طلاق کا اختیار کسی شرط کے ساتھ مشروط ہے مثلاً شوہر کہے کہ: ''اگر میں
نے تجھے کبھی مارا یا اگر میں نے تجھے ماہانہ خرچہ مقررہ تاریخ تک نہ دیا یا اگر میں نے تمہارے
ہوتے ہوئے دوسرا نکاح کیا تو تو اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے یا طلاق کی نیت سے یہ
کہے کہ پھر تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، یا تجھے اپنے نفس پر اختیار رہے گا، تو پہلی بار جب

عورت کو ان امور کے وقوع کا علم ہو تو وہ یہ حقِ طلاق اسی مجلس میں استعمال کرسکتی ہے، اس مجلس کے اندر جہاں اسے علم ہوا ہے اگر اس نے یہ حق استعمال نہ کیا تو اختتامِ مجلس کے بعد یہ حق باطل ہو جائے گا۔

ہمارے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ: حسبِ تفصیل بالا اگر بیوی کے پاس خیارِ طلاق مشروط اور مقید ہے تو جس مجلس میں پہلی بار اسے علم ہوا، اس میں اگر اس نے استعمال کرلیا ہو تو فبہا ورنہ اختتام مجلس کے بعد وہ باطل قرار پائے گا۔ اور اگر بیوی کے پاس "خیارِ طلاق" غیر مشروط، غیر مقید اور مطلق ہے تو وہ جب چاہے اسے بذاتِ خود بھی استعمال کرسکتی ہے اور اپنے وکیل کے ذریعے بھی استعمال کرسکتی ہے۔

شوہر تفویضِ طلاق کا حق دے کر نہ واپس لے سکتا ہے اور نہ اسے باطل کرسکتا ہے، ہاں البتہ اگر کسی کو طلاق دینے کیلئے اپنا وکیل بنایا ہے جسے توکیل بالطلاق کہتے ہیں، تو قبل از نفاذ اس حق کو واپس لے سکتا ہے اور اسے باطل قرار دے سکتا ہے۔ ہمارے نکاح خواں اور رجسٹرار حضرات کو چاہیے کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلے نکاح، طلاق، تفویضِ طلاق اور دیگر مسائل کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ بعد میں زوجین کیلئے معاشرتی مسائل اور تعبیر وتشریح کی پیچیدگیاں پیدا نہ ہوں، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینلز کو بھی ان مسائل میں عوام کو تعلیم دینے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

عدالتیں "فسخِ نکاح" اور "خلع" میں فرق کریں

سوال:112

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو تقریباً تین سال ہو چکے ہیں کچھ اختلافات کی وجہ سے میری بیوی ناراض ہو کر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی ہے اور عدالت میں خلع کا دعویٰ دائر کیا اور عدالت نے خلع کا فیصلہ صادر فرمایا اور میری بیوی کو خلع دے دیا اب میری بیوی کی دوسری جگہ شادی کی جا رہی ہے از روئے قرآن وحدیث یہ خلع درست ہے یا نہیں؟ جب کہ میں نے ابھی تک اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ اور میں اب بھی اس کو اپنی بیوی مانتا

ہوں،قرآن وحدیث کی روشنی میں بھرپور طریقے سے وضاحت کریں تاکہ ہم کسی بڑے گناہ
سے بچ سکیں شکریہ،(دلاور علی شاہ، میٹروول سائٹ کراچی)۔

جواب:

آج کل ہمارے معاشرے میں بدقسمتی سے طلاق، خلع اور فسخ نکاح
(Dissolution of Marriage) کے واقعات عام ہیں اور ماضی کے مقابلے میں اس
کے تناسب میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔اس کی متعدد معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی وجوہ
ہوسکتی ہیں، ان من جملہ وجوہ میں سے تحمل اور برداشت کا فقدان (Non-Tolarence)
بے انتہا مہنگائی، ضروریات زندگی کا عام آدمی کی دسترس سے باہر ہونا، بے روزگاری، نوجوان
لڑکے اور لڑکیوں میں تعلیم کا تفاوت، معاشرے کی انتہائی امارت اور انتہائی غربت میں تقسیم
اور متوسط طبقے (Middle Class) کا غیر محسوس انداز میں تحلیل ہوتے چلے جانا، غیر
اسلامی وغیر شرعی رسوم کی یلغار، عام زندگی میں اور بالخصوص الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا کے
ذریعے نمود ونمائش اور معاشی برتری کا غیر معمولی اظہار، نچلے طبقات میں احساس محرومی ک
ابھرتا ہوا احساس اور ایک انتقامی جذبے کا ذہنوں میں پیوست ہونا، اور اس پر مستزاد دینی تعلیم
وتربیت اور دینی ماحول ومزاج کا فقدان ہے، کیونکہ دین اور تعلیمات نبوی ﷺ سے ہ
انسان میں قناعت، شکرِ نعمت، حقوق کی پاس داری، حفظِ مراتب اور اکرامِ انسانیت کے
فضائل پیدا ہوتے ہیں، ورنہ مندرجہ بالا عوامل کی کوکھ سے مختلف نفسیاتی عوارض، اخلاقی
مفاسد اور سماجی مسائل جنم لیتے ہیں، کم ہمت لوگ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو برباد کر
ہیں اور دینی تربیت سے عاری نسبتاً جری اور شرّی لوگ اپنے ساتھ ساتھ پورے معاشرے
امن وسکون غارت کرتے ہیں اور انسانی جان ومال اور آبرو کی حرمت کو پامال کرتے ہیں۔
ہمارے مبلغین مغربی معاشرے کے انتشار (Disintegeration) اور اخلاقی تنزل
بڑا چرچا کرتے ہیں، میری دانست میں ہمیں دوسروں کے عیوب تلاش کرکے اپنے اند
مصنوعی تفاخر پیدا کرنے کے بجائے اپنی داخلی کمزوریوں کی اصلاح اور اخلاقی تربیت

زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔
ہماری عائلی عدالتیں (Family Courts) وافر دینی علم نہ ہونے یا کسی قانونی سقم کے سبب فسخِ نکاح کو ''خلع'' قرار دیتی ہیں اور اپنے فیصلوں میں لکھتی ہیں کہ ''بر بنائے خلع نکاح فسخ کیا جاتا ہے'' حالانکہ وہ وجوہ جن کی بناء پر جج یا قاضی مُجاز دیانت داری سے سمجھتا ہے کہ اب زوجین کا حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے ازدواجی زندگی گزارنا عملاً ممکن نہیں رہا اور شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ بھی نہیں ہے تو سربراہِ مملکت کی طرف سے تفویض کردہ اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے وہ نکاح کو فسخ (Dissolve) کر دیتا ہے، ان وجوہ اور شواہد (Evidences) کو ریکارڈ پر لاتا ہے جو اس کی فہم کے مطابق ''فسخِ نکاح'' کا سبب بنتے ہیں، اور اسی تاریخ سے عورت کی عدت شروع ہو جاتی ہے اور عدت گزرنے کے بعد وہ عورت اپنی آزادانہ مرضی سے کہیں پر بھی عقد کر سکتی ہے، یہ خلع نہیں ہے بلکہ عدالتی ''فسخِ نکاح'' ہے، اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے کر آزاد بھی نہ کرنا چاہتا ہو، اس کے تمام جائز حقوق ادا کرتے ہوئے اسے رکھنا بھی نہ چاہتا ہو، بس وہ مردم آزار ہے، اسے اذیت دینا چاہتا ہے اور اس کی زندگی کو جہنم بنانا چاہتا ہے۔
یہ ''فسخِ نکاح'' ایک طلاق بائن کے حکم میں ہے، اس کے بعد اگر دونوں فریق چاہیں اور دوبارہ حالات سازگار ہو جائیں تو وہ عدت کے اندر یا عدت کے گزرنے کے بعد عقدِ ثانی کر سکتے ہیں۔ وہ وجوہ، جن کی بناء پر مختلف ائمہ کرام کے مسالک میں قاضی مُجاز یا جج کیلئے ''فسخِ نکاح'' کی گنجائش نکل سکتی ہے یا ایسی مصیبت زدہ بیوی کیلئے ایسی رخصت و رعایت موجود ہے کہ انتہائی اذیت ناک صورت حال سے اس کو نجات مل جائے، بشرطیکہ ان قرائن و شواہد کی بناء پر قاضی کو ظنِ غالب یا یقین ہو جائے، یہ ہیں:
(۱) شوہر بیوی کو نان نفقہ نہ دیتا ہو، ظالمانہ انداز میں بے انتہا مار پیٹ کرتا ہو، اس کے حقوقِ زوجیت ادا نہ کرتا ہو اور اسے مُعلّق حالت (Hung Position) میں روکے رکھنا چاہتا ہو، یعنی نہ تو اسے بیوی کے طور پر رکھے اور نہ طلاق دے کر آزاد کرے۔

(ب) عورت جوان ہے اور شوہر ایسے مُوذی مرض میں مبتلا ہے کہ حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قادر نہیں ہے یا وہ اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتا اور عورت کے اس صورتِ حال کی بنا پر گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(ج) عورت جوان ہے اور شوہر کو دس، پندرہ، بیس سال یا عمر قید کی سزا ہوگئی ہے اور عورت کیلئے اپنے نفس پر قابو پانا دشوار ہے، اس کے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(نوٹ: اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان نے جیل قوانین پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے حکومت پاکستان کو سفارش کی ہے کہ طویل المدت شادی شدہ قیدیوں کو ہر چار ماہ بعد ایک دو ہفتے کیلئے یا تو پیرول (Parole) پر رہا کر کے اسے اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے کا موقع دیا جائے اگر اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، ورنہ جیل خانوں میں ایک ایک کمرے کے کوارٹر مع لوازمات تعمیر کیے جائیں، جہاں چار چار ماہ بعد ہفتے دس دن کیلئے قیدی کی بیوی آکر اس کے ساتھ رہ سکے)۔

پولیس اور انتظامیہ چونکہ عدالت کے تابع ہے، اس لئے عدالت انتظامیہ کو پابند کرے، اور اس کیلئے قوانین کو زیادہ واضح اور سخت تر بنایا جاسکتا ہے، کہ شوہر کو ہر صورت میں اصالتاً یا وکالتاً عدالت کے سامنے پیش کرے، بشرطیکہ وہ ملک کے اندر موجود ہے۔ تاکہ "قضا علی الغائب" (Ex-Party Decree) یعنی یک طرفہ فیصلے کی نوبت نہ آئے۔ اگر قاضی اس نتیجے پر پہنچے کہ زوجین کا حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے اب گزارہ ممکن نہیں تو وہ "فسخ نکاح" سے پہلے شوہر کو اللہ تعالیٰ کا خوف دلا کر طلاق پر آمادہ کرے اور اگر وہ کسی طور پر بھی طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو پھر عدالتی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے نکاح کو فسخ کردے اور تمام دلائل، قرائن اور شہادتوں کو تفصیل کی ساتھ ریکارڈ پر لائے تاکہ فیصلے میں کوئی ابہام نہ رہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث میں "زوجِ مُتَعَنِّت" (یعنی ایسا شوہر جو حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے بیوی کے حقوق بھی ادا نہ کرے، اس کے لئے جینا دشوار کردے اور اسے قیدِ نکاح سے آزاد بھی نہ کرے) کے مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بناء پر جب قاضی مُجاز یا عدالت نکاح کو فسخ کرے تو یہ ''طلاق بائن'' کے درجے میں ہے، اس کے نتیجے میں ''فسخ نکاح'' کے بعد زوجین عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے تجدیدِ نکاح کر سکتے ہیں اور بیوی کی رضامندی نہ ہو تو وہ عدت کے بعد اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔آج کل بالعموم عائلی عدالتوں کے ''فسخ نکاح'' کے فیصلوں میں سقم رہ جاتا ہے، بعض فیصلے مبہم ہوتے ہیں، وجوہِ فسخ قطعی، واضح اور بیّن نہیں ہوتیں، لہٰذا شرعی طور پر ان کی توثیق دشوار ہوتی ہے۔

بعض مقدمات میں عدالتیں بجائے اس کے کہ انتظامیہ کو مجبور کریں کہ شوہر کو عدالت میں اصالتاً یا وکالتاً حاضر کرے تاکہ یا تو وہ بیوی کے عائد کردہ الزامات کو قبول کرے یا دلائل و شواہد کے ساتھ رد کرے تاکہ عدالت اس پوزیشن میں ہو کہ مدعیہ و مدعیٰ علیہ کے بیانات، قرائن و شواہد اور حقائق وواقعات کی روشنی میں ان الزامات کی تصدیق یا تردید کر سکے، عدالتیں شوہر کے غیاب (Absence) میں یک طرفہ فیصلہ (Ex - Party Decree) صادر کر دیتی ہیں، عام حالات میں یہ درست نہیں ہے، سوائے اس کے کہ شوہر ملک سے باہر ہے یا لاپتہ ہے، جسے فقہی اصطلاح میں ''مفقود الخبر'' کہتے ہیں، اس کا معاملہ تفصیلی بحث کا متقاضی ہے۔ایسے یک طرفہ فیصلوں کی توثیق میں ہمیں دشواری ہوتی ہے، ایسے معاملات میں مدعیٰ علیہ کو اصالتاً یا وکالتاً عدالت میں حاضر کرنا پولیس کیلئے لازمی قرار دیا جائے اور اس کے لئے ضروری ہو تو متعلقہ قانون میں ترمیم یا اضافہ کیا جائے، عدالت کی طلبی کے باوجود حاضر نہ ہونے کو قابلِ دست اندازیِ پولیس قرار دیا جائے اور اس کیلئے جرمانہ یا سزا بھی تجویز کی جاسکتی ہے۔

حالیہ دنوں میں ڈاکٹر ہمامیر کے مقدمۂ ''فسخ نکاح'' میں اس کے شوہر نے پیش ہو کر اپنا مُدلّل دفاع کیا اور عدالت نے بجا طور پر ڈاکٹر ہمامیر کا دعوائے خلع مسترد کر دیا، بعد میں دونوں میں نباہ نہ ہو سکا اور شوہر نے اسے طلاق دے دی، یہ عدالت کے صحیح طرزِ عمل اور صائب فیصلے کا نتیجہ ہے کہ شرعی حل نکل آیا۔

آپ کے مسئلے میں اگر آپ کا بیان درست ہے تو عدالت کا فیصلہ از روئے شرع درست نہیں ہے، لیکن اگر حقائق اس کے برعکس ہوں تو مفصل فیصلہ پڑھ کر ہی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے، تاہم اگر آپ شرح صدر سے محسوس کرتے ہیں کہ بیوی کے رویہ کی وجہ سے آپ دونوں میں اب شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے نباہ ممکن نہیں ہے تو اسے ایک طلاق رجعی دے دیں، اس صورت میں باعزت واپسی کا راستہ بھی کھلا رہے گا، اور آپ کی سابقہ بیوی گناہ میں مبتلا ہونے سے بھی بچ جائیں گی، اور آپ نیک نیتی پر اللہ تعالیٰ سے اجر پائیں گے۔

مزید یہ کہ ہماری عائلی عدالتیں، عدالتی اختیارات کے تحت ''فسخ نکاح'' کو جو ''خلع'' قرار دیتی ہیں، یہ قطعاً درست نہیں ہے، کیونکہ خلع تو فریقین کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے اور اس کا ذکر قرآن مجید میں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: ''طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کیلئے) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور تمھارے لئے حلال نہیں کہ تم نے جو کچھ (مہر) عورتوں کو دیا ہے، اس میں سے کچھ واپس کرلو، مگر جب دونوں کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان پر کچھ گناہ نہیں اس میں جو عورت نے (شوہر سے خلاصی پانے کا) بدلہ دیا۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، تو ان سے آگے نہ بڑھو، اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں تو وہی ظالم ہیں''، (البقرہ:229)۔

اس آیت کی رو سے اگر زوجین کیلئے حدود شرع کے اندر رہتے ہوئے ازدواجی زندگی کو جاری رکھنا ممکن نہ رہے اور شوہر ویسے بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو، تو بیوی یہ راستہ اختیار

کرسکتی ہے کہ شوہر سے لیا ہوا مہر اسے واپس کر کے یا مطالبۂ مہر سے دستبردار ہو کر یا کوئی مالی معاوضہ دے کر اپنی گلو خلاصی کرالے، اگر شوہر یہ پیشکش قبول کر کے اسے مال کے عوض طلاق دے دے تو اسے شرعاً ''خلع'' کہتے ہیں اور یہ طلاقِ بائن کے حکم میں ہے، یہ باہمی رضامندی پر موقوف ہے۔

اس خلع کے بعد زوجین اگر چاہیں تو عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے عقدِ ثانی کر سکتے ہیں، ورنہ عدت گزرنے کے بعد خلع یافتہ عورت اپنی آزادانہ مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ عدالت یہ کرسکتی ہے بلکہ اسے ایسا کرنا چاہیے کہ زوجین کو آمنے سامنے بٹھا کر انہیں خلع پر آمادہ کرے، حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی سے ڈرائے، اور اگر وہ آمادہ ہو جائیں تو اپنی نگرانی میں خلع کرا کے اس کی توثیق کر دے، مگر یہ ''فسخ نکاح'' کی ڈگری نہیں کہلائے گی بلکہ ''خلع'' کہلائے گا، جسے عدالتی توثیق حاصل ہوگی۔

اسی طرح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اگر زوجین کے درمیان اختلافات زیادہ بڑھ جائیں تو دونوں کے خاندانوں سے ایک ایک بزرگ یا زیرک و دانا اور اصلاح پسند نمائندہ چن کر ان دونوں کو حَکَم مقرر کیا جائے تا کہ وہ مسئلے کو سلجھا سکیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝

ترجمہ: ''اور اگر تمہیں ان دونوں (میاں بیوی) کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو تو شوہر کے خاندان سے ایک حَکَم مقرر کرو اور (اسی طرح) بیوی کے خاندان میں سے ایک حَکَم (منصف، ثالث) لے لو، اگر وہ دونوں اصلاح کا ارادہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت (کی صورت) مقدر فرما لے گا، بے شک اللہ خوب جاننے والا خبر رکھنے والا ہے''، (النسآ:35)۔

یہ کام بھی عدالت اپنی نگرانی میں کر کے اجر کی حق دار بن سکتی ہے۔

بیوی کو محض اذیت دینے کی خاطر لٹکائے رکھنا

سوال:113

میری (شہلہ) شادی کو چار سال ہوئے اور دو سال ہوئے میرے شوہر (شفیق) نے مجھے میرے میکے چھوڑ دیا اور دو سال سے مجھ سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھا۔ اور مجھے 7 محرم 1425ھ 28 فروری 2004ء کو ٹیلی فون کر کے شفیق صاحب نے کہا کہ شہلہ میں نے تمہیں ایک طلاق دی۔ اس کے بعد شفیق نے میری خالہ کے گھر فون کر کے بھی بتایا کہ میں نے شہلہ کو ایک طلاق دے دی ہے۔

(1) آیا جو ایک طلاق دی گئی کیا یہ واقع ہوگئی ہے یا نہیں اور ہوگئی ہے تو عدت کی مدت کیا ہے اور کتنی ہوگی۔

(2) اس دو سال کے عرصہ میں شفیق نے مجھ سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھا اور نہ ہی میرا اور میرے بیٹے کا خرچہ دیا، ابھی تک۔

(3) اس مدت میں اگر شوہر رجوع نہیں کرتا تو بقیہ دو طلاق کا اطلاق کیسے ہوگا۔

(4) جبکہ شفیق کا کہنا ہے کہ شہلہ کو بقیہ دو طلاق نہیں دوں گا اور لٹکائے رکھوں گا اور جہیز اور بیٹا بھی نہیں دوں گا، ایسی صورت میں عدت گزر جانے کے بعد اپنی ضد کی وجہ سے بقیہ دو طلاق نہ دے تو مجھے دین میں کیا حق حاصل ہے، (شہلہ، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب :(1)

صورت مسئولہ میں سائلہ کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ مسمّی شفیق نے جب سائلہ کو فون پر کہا کہ ''میں نے تمہیں ایک طلاق دی''، تو سائلہ پر ایک طلاق واقع ہوگئی اور جس وقت شوہر نے مذکورہ جملہ کہا تھا، اس وقت سے مکمل تین ماہواری گزرنے تک سائلہ عدّت میں رہے گی، بشرطیکہ حمل نہ ہو اور اگر حمل ہو تو جب بچہ پیدا ہوگا اس وقت عدت ختم ہوگی۔ عدّت کی جو مدّت بیان کی گئی ہے اس کے اندر اگر شوہر اپنی طلاق سے رجوع نہیں کرے گا تو یہ طلاق بائن ہوجائے گی اور سائلہ مسماۃ شہلہ اس کے

نکاح سے خارج ہوجائے گی اور شرعاً اپنی آزادانہ مرضی سے سابق شوہر یا کسی بھی مسلمان مرد کے ساتھ نکاح کرنے کی مجاز ہوگی، جبکہ کوئی مانع شرعی نہ ہو۔

(2) گذشتہ دوسال کے عرصے کا، اور اگر شوہر طلاق سے رجوع نہیں کرتا تو ایامِ عدّت کا بھی، بیوی اور بچے کا نان نفقہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق شوہر کے ذمہ واجب الادا ہے۔

(3) اور اگر شوہر مذکورہ مدّت کے دوران رجوع کر لیتا ہے تو سائلہ اپنے شوہر کے نکاح میں برقرار رہے گی اور آئندہ شوہر کو صرف دو طلاق دینے کا حق حاصل رہے گا، اور رجوع کرنے کی صورت میں اگر آئندہ شوہر نے خدانخواستہ دو طلاقیں اور دے دیں، تو اس پہلی طلاق کے ساتھ جمع ہوکر تین طلاقیں ہوجائیں گی اور بیوی شوہر پر مکمل طور پر حرام ہوگی۔

لیکن اگر عدّت کے اندر شوہر رجوع نہیں کرتا، تو عدّت گزرتے ہی یہ ایک طلاق بائن ہوجائے گی اور بیوی شوہر کے عقد سے بالکل نکل جائے گی اور پھر وہ اپنی پسند سے جہاں چاہے شادی کرسکتی ہے۔ بیوی کے نکاح سے مکمل طور پر خارج ہونے کیلئے تین طلاقیں لازمی نہیں ہیں، ایک طلاقِ بائن سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ جب تک شوہر پوری تین طلاقیں نہ دے دے، عدّت گزرنے کے باوجود بیوی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، غلط ہے۔ ہمارے ہاں ''عائلی قوانین'' کے تحت کونسلر یا ناظم یونین کونسل کو جو مصالحتی رول تفویض کیا گیا ہے، انہیں بھی یہ مسئلہ معلوم ہونا چاہیے اور اگر صرف ایک طلاقِ بائن دی گئی ہو تو وہ اس کی بھی توثیق کردیا کریں۔

(4) شوہر کا یہ کہنا کہ: ''میں بیوی کو بقیہ دو طلاق نہیں دوں گا، جہیز اور بیٹا بھی نہیں دوں گا اور اسے لٹکائے رکھوں گا''، اس کے مردم آزار، خوفِ خدا سے عاری اور اذیت پسند ہونے کی دلیل ہے، ایسے شوہر کو فقہی اصطلاح میں ''زوجِ معنّت'' کہتے ہیں، قرآن مجید کی سورۃ النساء میں بیوی کو اذیت دینے کی خاطر لٹکائے رکھنے سے منع فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ شوہر نہ تو مکمل حقوق ادا کرکے اسے بیوی کی طرح رکھے اور نہ ہی اسے طلاق دے کر آزاد کرے، یہ اللہ کے حکم کی صریح نافرمانی ہے۔

ایسی صورت میں بیوی کو چاہیے کہ وہ عائلی عدالت سے رجوع کرے اور اپنے موقف کو دلائل سے ثابت کرے اور عائلی عدالت کے جج کو چاہیے کہ ایسے شوہر کو، اگر وہ رضا کارانہ طور پر عدالت میں حاضر نہ ہو تو، ناقابلِ ضمانت گرفتاری کے وارنٹ جاری کرکے عدالت میں طلب کرے، اور اگر اسے ظنِ غالب یا یقین ہوجائے کہ بیوی کے الزامات درست ہیں اور شوہر متعنّت ہے اور وہ نہ بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے اور نہ ہی اس کی گلوخلاصی کرتا ہے، تو پھر وہ ''فسخِ نکاح'' کی ڈگری جاری کرسکتا ہے اور ایسی ڈگری شرعاً مؤثر ہوگی۔ عدالت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بیوی اور بچے کا گذشتہ عرصے اور ایامِ عدت کا نان نفقہ اور مہر شوہر سے وصول کرکے بیوی کو دلائے۔ بچے کی حضانت (یعنی پرورش اور نگہداشت) کا حق ماں کو حاصل ہے اور طلاق مؤثر ہونے یا فسخِ نکاح کی صورت میں بھی وہ مصارف کی حق دار ہے، جب تک بچہ باشعور اور سمجھ دار نہ ہوجائے لڑکے کے لئے اس کی مدت سات سال ہے، یا وہ دوسری شادی نہ کرلے، البتہ باپ کو بیٹے کے ساتھ ملنے جلنے کا حق حاصل رہے گا، اس حق سے باپ کو محروم کرنا قطعِ رحمی ہے۔ شوہر کو اپنی بیوی کے جہیز کا مال ضبط کرنے اور غصب کرنے کا حق نہیں ہے۔

دو طلاق کے بعد رجوع

سوال:114

گزارش یہ ہے کہ ایک شوہر نے اپنی بیوی کو 9-3-2004 کو تحریری طور پر اپنے دستخط کے ساتھ ایک طلاق بھیجی۔ اس کے بعد 19-3-2004 کو اسی شکل میں دوسری طلاق بھیج دی۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا یہ عورت دوبارہ اس شوہر کے ساتھ کس طرح رہ سکتی ہے؟، جبکہ اس کا شوہر اب اس کو ساتھ لے جانے پر بضد ہے، جواب دے کر مشکور فرمائیں، (طیبہ، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برتقدیر صدقِ سائلہ شوہر نے اپنی بیوی کو دو رجعی طلاقیں دیکے

بعد دیگرے دے دی ہیں، پہلی طلاق کی تاریخ سے عدّت شروع ہوگئی ہے،اور عدّت تین حیض کا گزرنا ہے،تاہم شوہر کواب بھی عدّت کے اندر رجوع کا حق حاصل ہےاوراب اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی ہے،آئندہ اگر اس نے دورانِ عدّت یا رجوع کے بعد ایک طلاق دی تو پہلی دو کے ساتھ جمع ہوکر تین طلاقیں مغلظہ ہوجائیں گی اور بیوی شوہر پر حرام ہوجائے گی۔اگر شوہر دورانِ عدّت رجوع نہیں کرتا تو عدّت گزرتے ہی یہ دونوں طلاقیں بائن ہوجائیں گی،اور میاں بیوی کے درمیان رشتۂ نکاح ختم ہوجائے گااوراب وہ عورت اپنی مرضی سے سابق شوہر کے ساتھ یا کسی سے بھی نکاح کرنے کیلئے آزاد ہے،البتہ اگر وہ پھر سابق شوہر سے نکاح کرتی ہےتو اب اس کے شوہر کے پاس آئندہ صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا،اور آخری طلاق کے ساتھ جمع ہونے کے لئے پہلی دو طلاقیں بدستور مؤثر رہیں گی۔شوہر کے رجوع نہ کرنے کی صورت میں انقطاعِ عدّت پر بیوی کا مہر بھی شوہر کے ذمہ ادا کرنا لازم ہوگا،اگر پہلے سے ادا نہیں کیا۔اور ایامِ عدّت کا نفقہ بھی،اور عقدِ ثانی کی صورت میں دوبارہ مہر کا تعین بھی لازمی ہوگا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ۔

ترجمہ:”طلاق (جس کے بعد شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے،زیادہ سے زیادہ) دوبار ہے، پھر(عدّت کے اندر) حسنِ سلوک کے ساتھ(بیوی کو نکاح میں) روک لینا ہے یا(عدّت پوری کرنے کیلئے) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے“،(البقرہ:228)۔

محض ارادۂ طلاق سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال:115

میں رضوان احمد نجمی ولد سید محی الدین (مرحوم) سابقہ اسپلائے علامہ اقبال گورنمنٹ کالج،اسٹار گیٹ کراچی،آپ سے چند شرعی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

سر! میرے اور میری زوجہ کے درمیان اکثر وبیشتر گھریلو ناچاقیاں ہوتی رہتی ہیں،اس دوران میں نے اپنی بیوی کو تنبیہ کرنے کی نیت سے یہ جملہ ادا کیا کہ”میں تمہیں طلاق دے

دونگا'' میں نے یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، ایسی صورت میں کیا طلاق واقع ہوگی یا نہیں، سر میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے، خدا شاہد ہے کہ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ میں طلاق دے دوں گا، یہ نہیں کہا کہ طلاق دیتا ہوں یا دے دی یا دے رہا ہوں، فقط دعاؤں کا طالب، (رضوان احمد نجمی، کراچی)۔

جواب:

اگر صورت مسئلہ وہی ہے جو سوال میں بیان کی گئی ہے اور شوہر کا بیان حقیقت کے مطابق ہے، یعنی اس نے اپنی بیوی سے فقط یہ کہا ہے کہ'' میں تمہیں طلاق دے دوں گا''، تو یہ ارادۂ طلاق ہے، انشاء طلاق نہیں ہے۔ اور اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی، اور وہ خاتون بدستور اس کے نکاح میں ہے، تاہم شوہر کو تنبیہ کیلئے طلاق کے علاوہ کوئی اور مناسب کلمات استعمال کرنے چاہئیں، اسی طرح غصے کے اظہار کے اور شائستہ طریقے بھی ہیں، طلاق مباح امور میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔
فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

تین طلاق کا مسئلہ

سوال:116

حضور! آپ دامت برکاتہم العالیہ کے قیمتی ترین لمحات میں سے چند انمول گھڑیاں حاصل کرنے کی سعی کر رہا ہوں، آپ کی محققانہ رائے فتویٰ کی صورت میں عطا ہونا مقصود ہے۔ صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ صفدر محمود نے اپنی زوجہ فرحت پروین کو حالتِ غصہ میں اس طرح طلاق دی'' میری طرف سے تمہیں طلاق ہے۔ طلاق۔ طلاق'' صفدر محمود سے جب دریافت کیا گیا کہ بیوی کی موجودگی میں کہ'' طلاق، طلاق'' سے کیا مراد تھی آیا تاکیداً بولی گئیں یا انہیں بھی دوسری اور تیسری شمار کیا۔ جواباً صفدر محمود صاحب نے بتایا کہ طلاق۔ طلاق سے اس نے دوسری اور تیسری مراد لی تھی۔ حضور! قرآن وسنت کی روشنی میں یہ ارشاد فرمائیں کہ آیا تین طلاقیں واقع ہوگئیں، یا نہیں، جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں۔ (محمد بابر رحمانی القادری

نورانی، ساکن ۔ڈیلکس، امریکہ)

جواب:

فقہاءِ کرام کی تصریحات کی رو سے طلاق میں نسبت شرط ہے، جس طلاق میں نسبت صریحی یا معنوی نہ ہو وہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔

فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ 348 پر ہے: (واما رکنه) فقوله أنت طالق ونحوه۔

ترجمہ: اور طلاق کا رکن وہ (شوہر) کا قول انت طالق اور اس کی مثل (دوسرے الفاظِ طلاق) ہیں، نسبت طلاق یہ ہے کہ طلاق دیتے وقت شوہر بیوی کی زوجیت کا اظہار کرے یا نام کی تصریح کرے مثلاً یوں کہے: ''میری بیوی کو طلاق ہے یا نام لے کر کہے: ''ہند کو طلاق ہے''۔ اگر نسبت صریح لفظوں میں نہ ہو بلکہ شوہر کی نیت طلاق دینے کی ہو تو بھی طلاق واقع ہو جائے گی، فتاویٰ شامی جلد چہارم صفحہ 338 پر ہے:

ولایلزم کون الاضافة صریحة فی کلامه ۔۔۔۔لو قال: طالق، فقیل له من عنیت؟، فقال: "أمرأتی"، طلقت امرأتهٗ ۔

ترجمہ: اور شوہر کے کلام میں نسبت کا صریح لفظوں میں (مذکور) ہونا ضروری نہیں ہے اگر شوہر کہے: ''طالق''، پس اس سے کہا جائے کہ آپ کی نیت کس کو طلاق دینے کی ہے؟، وہ کہے: ''اپنی بیوی کو''، تو اس کی بیوی کو طلاق واقع ہو جائے گی۔

فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ 382 پر ہے: سکران هربت منه امرأته فتبعها ولم یظفر بها فقال بالفارسیة ۔ "بسه طلاق"، ان قال:" عنیت امرأتی"، یقع الخ۔

ترجمہ: ''نشے میں مبتلا کسی شخص کی بیوی بھاگ گئی اور وہ اس کے پیچھے چل پڑا، لیکن اس کو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا، پھر اس نے فارسی میں کہا ''سہ طلاق'' یعنی تین طلاقیں، اگر وہ کہے: ''میری نیت اپنی بیوی کو طلاق دینے کی تھی''، تو (اس کی بیوی کو) طلاق واقع ہو جائے گی''۔ اس تمہید کے بعد صورۃ مسئولہ عنہا میں مذکورہ فی السوال خاتون مسماۃ فرحت پروین کو تین طلاقیں واقع ہو گئیں، کیونکہ لفظ'' طلاق، طلاق'' میں اگر چہ صراحتاً عورت کی

طرف نسبت نہیں ہے، لیکن چونکہ بر تقدیر صدق بیان سائل شوہر نے ان الفاظ سے دوسری اور تیسری طلاق مراد لی ہے، لہٰذا کل تین طلاقیں ہوئیں، اندریں مسئلہ عدت گزارنے کے بعد عورت اپنے نکاح کے بارے میں آزاد ہے اپنی رضا و رغبت سے جس مرد کے ساتھ عقد نکاح کرنا چاہے، کرسکتی ہے، تحلیلِ شرعی کے بغیر سابق شوہر کے عقدِ نکاح میں نہیں آسکتی۔

تحریری طلاق کا حکم

سوال:117

رشید خان اور منیرہ بیگم کا باہمی رضامندی اور دونوں کے والدین کی اجازت سے نکاح منعقد ہوا، کچھ عرصے کے بعد لڑکے کے والدین ناراض ہو گئے اور بیٹے کو طلاق دینے پر آمادہ کرلیا، طلاق نامہ لکھوا کر لائے اور لڑکے کو کہا کہ اس پر دستخط کردو، لڑکے نے کسی جبر کے بغیر طلاق نامے پر دستخط کر دیے، طلاق نامہ میں تین مرتبہ لکھا ہوا تھا کہ: ''میں اپنی بیوی منیرہ کو طلاق دیتا ہوں''، طلاق نامہ اردو میں تھا اور شوہر اردو لکھ پڑھ سکتا ہے، اور شوہر اب بھی اس بات کا اقرار کرتا ہے، بعد میں انہوں نے طلاق نامہ پھاڑ دیا اور لڑکی (یعنی بیوی) کو ارسال نہیں کیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طرح سے طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں، دین مبین اور فقہ حنفی کی روشنی میں جواب تحریر کیجئے، (محمد فاروق، A-105/7 موسیٰ کالونی، کراچی).

جواب:

صورت مسئولہ میں، اگر سائل کا بیان درست ہے کہ باپ ''طلاق نامہ'' لکھوا کر لایا اور بیٹے سے کہا کہ اس پر دستخط کرو، بیٹے نے دستخط کر دیے، بیٹا اردو لکھنا پڑھنا جانتا ہے، اسے معلوم بھی ہے کہ یہ ''طلاق نامہ'' ہے، یعنی اس تحریر کی رو سے وہ نام لے کر اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے، اس سے طلاق واقع ہوگئی، کیوں کہ ہمارے عرف، قانون اور رواج میں مسلّمہ طور پر کسی تحریر پر دستخط کرنے کے معنی اسے قبول کرنا اور مؤثر قرار دینا ہے، جبکہ یہاں پر کوئی جبر و اکراہ بھی نہیں ہے۔ امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ سے ایک طویل

سوال دریافت کیا گیا، جس میں منجملہ دیگر تفصیلات کے درج ہے:

''پنچایت نے یہ فیصلہ کیا کہ مسمّی زید اپنی بیوی مسماۃ ہندہ کو مبلغ ساڑھے سات روپے ماہوار دیا کرے، جس کا ایک کاغذ بھی لکھا گیا، بایں مضمون کہ ''اگر زید مذکور اپنی بیوی مسماۃ ہندہ مذکورہ کو رقم مجوزہ نہ دے گا تو ہندہ کو طلاق واقع ہو جائے گی''، جو بغرض دھمکی پنچایت نے لکھوایا تھا، نہ کہ طلاق کی نیت سے، زید نے نہ کاغذ لکھنے کو کہا اپنی زبان سے اور نہ اپنے قلم سے کاغذ لکھا، باوجودیکہ زید خود خواندہ شخص ہے اور کاغذ پر دستخط زید نے برادری کے خوف سے کیے ہیں، خود راضی نہ تھا، (تا آخر)''۔

آپ نے جواب دیا:

''صریح الفاظ میں نیت کی حاجت نہیں ہوتی، خود لکھنا اور دوسرے سے لکھتے ہوئے کو سن کر اس پر دستخط کرنا یکساں ہے اور خوف برادری کہ حد اکراہ تک نہ ہو، کوئی عذر نہیں، اگر تحریر میں یہ تھا کہ آج سے اس قدر ماہوار یعنی ماہ بماہ دیا کرے، اور ایک مہینہ گزر گیا اور اس نے نہ دیا تو ایک طلاق رجعی ہوگی، عدت کے اندر اسے رجوع کا اختیار ہے، اگر پہلے کبھی دو طلاقیں نہ دے چکا ہو۔ ورنہ تین طلاقیں ہوگئیں''، (فتاویٰ رضویہ، جلد نمبر 12، صفحہ نمبر 452-451 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

صدر الشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی ایک مسئلے میں لکھا ہے:

''بیان سائل سے معلوم ہوا کہ ''کاتب طلاق نامہ'' نے لکھنے کے بعد پڑھ کر شوہر کو سنایا اور شوہر نے سن کر نشان (انگوٹھا) لگایا، لہٰذا صورت مسئولہ میں طلاق واقع ہوگئی''۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: رجل استکتب من رجل آخر الیٰ امرأته کتابا بطلاقھا وقرء ہ علی الزوج فاخذہٗ وطواہ وختم و کتب فی عنوانه وبعث به الیٰ امراته فاتٰھا الکتاب واقرالزوج انه کتابه فان الطلاق یقع علیھا۔

ترجمہ: ''ایک شخص نے دوسرے شخص سے اپنی بیوی کے نام طلاق نامہ لکھوایا، اور اس نے شوہر کو پڑھ کر سنایا، پھر شوہر نے اسے لیا، اسے بند کیا اور اس پر مہر لگائی (یعنی دستخط یا انگوٹھا

لگایا) اور بیوی کا پتا لکھ کر اسے بھیج دیا، بیوی کو وہ تحریر ملی اور شوہر نے (بھی) اقرار کیا کہ یہ اس کی تحریر ہے، تو طلاق واقع ہو جائے گی''، (فتاویٰ امجدیہ، جلددوم، صفحہ:167)۔

نوٹ: یہ مسئلہ بعینہٖ فتاویٰ تاتارخانیہ جلد: 3، صفحہ: 370، فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، صفحہ: 379 اور فتاویٰ شامی، جلد: 2، صفحہ: 365 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ میں درج ہے، فتاویٰ تاتارخانیہ میں آگے چل کر لکھا ہے: وکذالک کل کتاب لم یکتبہ بخطہٖ ولم یُملہ بنفسہٖ لایقع بہ الطلاق اذا لم یقر انہٗ کتابہٗ۔

ترجمہ: ''اسی طرح ہر وہ خط، جسے اس نے خود نہ لکھا ہو اور نہ اسے لکھوایا ہو اور وہ اسے خود لکھنے، لکھوانے یا کسی کے لکھے ہوئے کو برضامندی قبول کرنے کا اقرار بھی نہیں کرتا، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی''، (جلد:3، صفحہ:380)۔

لیکن ظاہر ہے کہ زیرِ بحث مسئلے میں شوہر طلاق نامے پر دستخط کا خود اقرار کر رہا ہے، اس لیے یہ تحریر مؤثر ہے اور تین طلاقیں واقع ہوگئیں۔

طلاق نامہ پر شوہر کے جعلی دستخط

سوال:118

جناب قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ خاندانی اختلافات کی وجہ سے بیوی روٹھ کر اپنے میکے دوسرے شہر بیٹھی ہو اور شوہر کا اپنی بیوی کو طلاق دینے کا کوئی ارادہ نہ ہو اور شوہر کے علم میں لائے بغیر اس کے قریبی عزیز لڑکی کو طلاق کے کاغذات شوہر کے جعلی دستخط کر کے بھجوا دیں تو کیا ایسی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی؟، جبکہ یہ کاروائی شوہر کے علم میں لائے بغیر کی گئی ہو اور اس کے دستخط بھی نہ ہوں۔

جناب مفتی صاحب! میرا دوسرا سوال بھی پہلے سوال سے منسلک ہے اور وہ یہ کہ شوہر نے اپنی بیوی اور اس کی والدہ کو اعتماد میں لیا اور ان دونوں کو یقین دلایا کہ یہ جو طلاق آپ کے گھر بھیجی گئی تھی وہ جعلی ہے، اور اس میں میری مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے اور پھر بیوی اپنے شوہر کے پاس آ کر رہنے لگتی ہے۔ کوئی ایک ہفتہ گزرتا ہے کہ لڑکی کی والدہ کا اپنے داماد (لڑکی کے

شوہر) سے جھگڑا ہو جاتا ہے، وہ غصے میں آ کر کہتی ہے کہ جو طلاق تم لوگوں نے ہمارے گھر بھجوائی تھی، وہ صحیح تھی، وہ تمہاری مرضی سے بھجوائی گئی تھی۔ لہٰذا اب تم ہماری بیٹی کیلئے اجنبی ہو، اب تمہارے راستے الگ اور ہمارے راستے الگ ہیں، مفتی صاحب! قرآن وسنت کی روشنی میں مجھے بتایئے کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہئے، (سید امجد علی، **743** سیکٹر **5A-4** نارتھ کراچی)

جواب:(1)

صورت مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو اس (شوہر) کے علم میں لائے بغیر اور اس (شوہر) کے ارادے کے بغیر اس کی بیوی کو جو طلاق نامہ ارسال کر دیا گیا اور اسے موصول بھی ہو گیا، اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، امام احمد رضا خان قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: کوئی تحریر بے ''شہادت یا اقرارِ کاتب'' مسلّم نہیں ہو سکتی، اگرچہ خط اسی کا معلوم ہوتا ہو، علماء فرماتے ہیں:

الخط یشبه الخط و الخاتم یشبه الخاتم کما فی الهندیة و غیرها۔

ترجمہ: ''خط دوسرے خط اور مہر دوسری مہر کے مشابہ ہوتی ہے، جیسا کہ ''ہندیہ'' وغیرہ میں ہے''، (فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:415 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: و کذا کل کتاب لم یکتبه بخطه و لم یمله بنفسه لا یقع الطلاق مالم یقر انه کتابه۔

ترجمہ: ''اسی طرح ہر وہ خط جسے اس نے خود نہ لکھا ہو اور نہ اسے کسی سے لکھوایا ہو اور وہ اسے اپنی تحریر تسلیم کرنے کا اقرار بھی نہیں کرتا، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی''، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:4، ص:337 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

جواب: (2)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''اگر شوہر اس تحریر کا اقرار کرتا ہے تو ثبوتِ طلاق ظاہر ہے اور اگر منکر ہے تو ہرگز معتبر نہیں، جب تک حجتِ شرعیہ قائم نہ ہو''،

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: بحالتِ اختلاف، طلاق کا ثبوت گواہوں سے ہوگا اور دو گواہ عادل شرعی شہادت بروجہ شرعی ادا کریں کہ اس شخص نے اپنی زوجہ کو طلاق دی، طلاق ثابت ہو جائے گی، پھر اگر شوہر نفی کے گواہ دے گا یا اس بات کے کہ مطلقہ بعد طلاق اس سے بولی کچھ اصلاً مسموع نہ ہوگا، ہاں! اگر عورت گواہ بروجہ شرعی نہ دے سکے تو شوہر پر حلف رکھا جائے گا اگر حلف سے کہہ دے گا کہ اس نے طلاق نہ دی، طلاق ثابت نہ ہوگی اور اگر حاکم شرعی کے سامنے حلف سے انکار کرے گا تو طلاق ثابت مانی جائے گی، (فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:453,445 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

حالتِ حمل میں نفاذِ طلاق

سوال:119

مفتی صاحب! میں رفعت جہاں بنت خلیل احمد آپ سے معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میں چار ماہ کی حاملہ ہوں اور میرے شوہر نے وکیل کے ذریعے تین طلاقیں لکھ کر بھیجی ہیں، لہٰذا یہ طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟۔

سوال:120

اور اگر ہوئی ہے تو مفتی صاحب وہ اپنی ذمہ داری سے انکار کر رہا ہے، کوئی خرچہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ آپ شریعت کی روشنی میں خرچے کے بارے میں اسے لکھ کر اس کی ذمہ داری کے بارے میں بتائیں، مہربانی ہوگی، کیونکہ میں ایک یتیم لڑکی ہوں؟۔

سوال:121

وہ شخص مجھ سے پہلے بھی دو شادیاں کر چکا ہے اور ایک کے بارے میں مجھے علم تھا، جسے اس نے 26 سال بعد طلاق دی۔ اور دوسری کو ایک سال بعد، دوسری کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا۔ اسے شادیاں کرنے کا شوق ہے، شراب پیتے ہیں؟۔

سوال:122

نکاح سے پہلے ایک وعدہ لکھ کر دیا تھا کہ -/500000 روپے نکاح کی صورت

میں ادا کروں گا، لیکن وہ بھی ادا نہیں کیے اور اپنی ساری ذمہ داری سے انکار کر رہا ہے؟۔
مہربانی کر کے مجھ یتیم پر شریعت کی رو سے خرچہ دلوانے کی مہربانی کریں، کیونکہ وہ شخص
ماربل فیکٹری کا مالک ہے اور عورتوں سے کھیلنا جانتا ہے، مجھ سے بہت نازیبا باتیں کرتا تھا،
شکریہ، (رفعت جہاں بنت خلیل احمد)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کے شوہر نے جو طلاق مغلظہ آپ کو دی ہے، وہ شرعاً
واقع ہو چکی ہے اور موثر ہو چکی ہے، اب آپ دونوں کے درمیان تحلیلِ شرعی کے بغیر دوبارہ
نکاح نہیں ہو سکتا۔ حاملہ بیوی کو طلاق دینا اگرچہ انتہائی نامناسب، سنگدلی اور بے رحمی کی
دلیل ہے، لیکن طلاق بہرحال واقع ہو جاتی ہے، حاملہ عورت کی عدت وضعِ حمل تک ہے،
اللہ تعالیٰ ارشاد ہے: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ۔
ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت (کی انتہا) ان کا وضعِ حمل ہے''، (الطلاق:4)۔ چونکہ وضعِ
حمل تک آپ عدت میں رہیں گی، اس لیے ان ایامِ عدت کا نان نفقہ آپ کے شوہر کے
ذمہ ہے اور وضعِ حمل کے بعد جب تک آپ دوسری شادی نہیں کرتیں، اس وقت تک آپ کا
اور آپ کے بچے کا نان نفقہ (جب تک وہ بچہ اپنی بقاء و نگہداشت کیلئے ماں کا محتاج ہے، یعنی
ایامِ شیر خوارگی)، آپ کے شوہر کے ذمے ہے، اور یہ نان نفقہ وہ اپنے مالی معیار کے مطابق
دینے کا پابند ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ۔ (البقرۃ:233)
ترجمہ: ''اور جس کا بچہ ہے، اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے''۔
علامہ علاؤالدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

تربية الولد(تثبت للام)النسبية۔

ترجمہ: ''حقِ حضانت (نگہداشت کا حق) نسبی ماں کو حاصل ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 5
ص:203 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

اور آگے لکھتے ہیں:

(وتستحق)الحاضنة(اجرة الحضانة اذا لم تكن منكوحة ولا معتدة) لابيه۔

ترجمہ:''اور بچے کی پرورش کرنے والی عورت پرورش کرنے کی اجرت کی حقدار ہے بشرطیکہ (وہ بچے کے باپ) کی منکوحہ نہ ہو اور نہ ہی باپ کی مطلقہ معتدہ ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد5 ص:203 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فعلى هذا يجب على الأب ثلاثة: اجرة الرضاع ، واجرة الحضانة، ونفقة الولد۔ ومثله فى الشرنبلالية۔

ترجمہ:''پس اس سے باپ پر تین باتیں واجب ہوتی ہیں، دودھ پلانے کی اجرت، پرورش کی اجرت اور بچے کا خرچہ اور اسی کی مثل شرنبلالی نے لکھا ہے''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد5 ص:210 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

ماں اگر شعور کی عمر کو پہنچنے تک بچے کی نگہداشت کا مطالبہ کرے تو یہ اس کا حق ہے اور بچے کے والد کو یہ ماننا چاہئے۔ جب تک ماں دوسری شادی نہ کرے۔ شوہر (ملک مخدوم احمد صاحب) نے اپنی بیوی سے جو پانچ لاکھ کی جائیداد دینے کا وعدہ کیا تھا، وہ اسے پورا کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝۳۴۔ (بنی اسرائیل:34)

ترجمہ:''اور عہد کو پورا کرو، بیشک عہد کے بارے میں قیامت میں جواب طلبی ہوگی''۔

اور حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وعدہ کرکے اس کی خلاف ورزی کرنا منافق کی نشانی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ان کے انکار کی صورت میں آپ اس جائیداد کا قانونی مطالبہ کرسکتی ہیں یا نہیں، اس کیلئے کسی ماہرِ قانون یا عدالت سے رجوع کیجئے، ماں کو طلاق ہونے کے باوجود بچہ باپ کا جائز، قانونی اور شرعی وارث ہوگا۔

جائز شرعی وجوہ کی بنا پر عورت عدالت سے فسخِ نکاح کی استدعا کر سکتی ہے

سوال:123

میری شادی کو بارہ سال ہو گئے ہیں، ان بارہ سالوں میں ہمارے تعلقات اچھے نہیں رہے، آٹھ سال پہلے لڑائی کے دوران انہوں نے غصے میں تین دفعہ" طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی" کہہ دیا۔ اس واقعے کا کوئی گواہ نہیں ہے، اس کے بعد وہ اس سے مکر گئے، میرے گھر والے منع کرتے رہے کہ ان کے پاس نہ جاؤ، اس وقت میرے دونوں بچے چھوٹے تھے، طلاق کے بعد ایک بچہ اور ہوا۔ پانچ سال سے میرے شوہر لندن میں ہیں، اس دوران تین مرتبہ وہ کراچی آئے لیکن میرے ساتھ رویہ مناسب نہیں تھا، اب ان کا آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں جب سے عمرہ کر کے آئی ہوں، میرا دل نہیں مانتا کہ ان کے ساتھ رہوں، میں نے جتنے دن ان کے ساتھ گزارے، بہت مشکل سے گزارے۔

اللہ تعالیٰ میری اس غلطی کو معاف فرمائے۔ میرے اور میرے شوہر کے لئے کیا حکم ہے؟

(شاہینہ، اشرف پلازہ فیز 3/2 - L ،14/B شادمان نمبر 1 نارتھ کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں سائلہ کے بیان کے مطابق کہ" اس کے شوہر نے تین دفعہ طلاق دی اور طلاق سے انکاری ہے اور اس واقعے کا کوئی گواہ بھی نہیں ہے،" اس صورت میں شوہر کے بیان کا اعتبار کیا جائے گا اگر وہ حلفیہ کہتا ہے کہ اس نے طلاق نہیں دی تو طلاق ثابت نہ ہوگی، امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

" بحالتِ اختلاف، طلاق کا ثبوت گواہوں سے ہوگا اور دو گواہ عادل شرعی شہادت بروجہ شرعی ادا کریں کہ اس شخص نے اپنی زوجہ کو طلاق دی، طلاق ثابت ہو جائے گی، پھر اگر شوہر نفی کے گواہ دے گا یا اس بات کے کہ مطلقہ بعد طلاق اس سے بولی کچھ اصلاً مسموع نہ ہوگا، ہاں! اگر عورت گواہ بروجہ شرعی نہ دے سکے تو شوہر پر حلف رکھا جائے گا اگر حلف سے کہہ دے گا کہ اس نے طلاق نہ دی، طلاق ثابت نہ ہوگی اور اگر حاکم شرعی کے سامنے حلف سے

انکار کرے گا تو طلاق ثابت مانی جائے گی''۔(فتاویٰ رضویہ جلد: 12 صفحہ 453 ،مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

اگر شوہر تین طلاقیں دے کر منکر ہو جاتا ہے اور طلاق کے وقت گواہ موجود نہیں تھے اور اس کے بعد بدستور اسی مطلقہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا ہے تو یہ شرعاً حرام اور زنا کی زندگی ہے، کیونکہ خلق کو تو دھوکہ دیا جاسکتا ہے، خالق کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔

مذکورہ صورت میں سائلہ تین طلاق کی مدعیہ ہے اور شوہر اس سے منکر ہے اور مدعیہ کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کوئی گواہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں بیوی کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کو قائل کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کے عذاب سے ڈرو، اور وہ تین طلاق جو آپ زبانی دے کر منکر ہو گئے ہیں، ان کا اقرار کرلیں اور لکھ کر دے دیں، اگر انہیں خوفِ خدا آجائے تو شریعت پر عمل کریں۔ اور اگر خدانخواستہ وہ بدستور انکار پر ڈٹے رہیں تو ان کے انکار اور گواہوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قضاءً حرمت اور تفریق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، لہٰذا بظاہر حکماً نکاح قائم رہے گا، اگرچہ دیانتاً اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں جوابدہی کے اعتبار سے وہ نکاح باقی نہیں ہے، دنیا میں احکامِ شرعی کا اطلاق ظاہرِ حال، قرائن اور شہادتوں یا اقرار وانکار پر ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقتِ حال کے مطابق فیصلے ہوں گے، یعنی ظاہر حال کے مطابق دنیوی عدالتوں سے جو فیصلے جاری ہوتے ہیں اور نافذ ہو جاتے ہیں، وہ حقیقت حال کو تبدیل نہیں کرتے۔

حدیثِ مبارک ہے:

عن ام سلمة قالت: قال رسول الله ﷺ "انکم تختصمون الیّ، ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجته من بعض ، فاقضی له علیٰ نحو مما اسمع منه، فمن قطعت له من حق اخیه شیئاً، فلا یاخذه؛ فانما اقطع له به قطعة من النار"۔

ترجمہ:'' حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس مقدمات لے کر آتے ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو

دوسرے کی بہ نسبت زیادہ دلائل کے ساتھ پیش کرے، اور سماعت کے اعتبار سے میں بالفرض اس کے حق میں فیصلہ کردوں، سو جس شخص کو میں اس کے بھائی کا حق دے دوں وہ اس کو نہ لے، کیونکہ میں اس کو آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:4393 مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکۃ المکرمۃ)۔

اگر آپ کو کامل یقین ہے کہ شوہر آپ کو تین طلاق دے چکا ہے تو ان حالات میں آپ کے لئے جائز شرعی اور قانونی راستہ یہ ہے کہ آپ عدالت سے رجوع کریں اور عدالت کے ذریعے فسخ نکاح کرائیں، چونکہ جائز شرعی وجوہ موجود ہیں، اس لئے یہ فسخِ نکاح شرعاً وقانوناً معتبر ہوگا۔ تین طلاق کے بعد اگرچہ آپ دونوں کا ازدواجی رشتے کو جاری رکھنا حرام تھا، لیکن بہرحال بچہ ثابت النسب ہوگا اور اپنے باپ کا وارث ہوگا۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولو طلقها ثلاثاثمّ تزوجهاقبل أن تنكح زوجًا غيره فجاء ت منه بولد ولايعلمان بفساد النكاح فالنسب ثابت وان كان يعلمان بفساد النكاح يثبت النسب أيضاًعند أبي حنيفةرحمة الله تعالىٰ كذا في التاتار خانيه۔

ترجمہ: ''اگر (شوہر نے) اپنی بیوی کو تین طلاق دیں، پھر تحلیل شرعی کے بغیر اس سے عقدِ ثانی کرلیا، اور دونوں کو فسادِ نکاح کا علم نہیں تھا، اور اس کے نتیجے میں اس عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اس بچے کا نسب ثابت ہے، اور اگر انہوں نے فسادِ نکاح کا علم ہونے کے باوجود (یعنی طلاقِ مغلظہ کے بعد تحلیل شرعی کے بغیر) عقدِ ثانی کیا ہو، تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بچے کا نسب پھر بھی ثابت ہوجائے گا، فتاویٰ تاتارخانیہ میں (تجنیسِ ناصری سے) ایسے ہی نقل کیا ہے''، (فتاویٰ عالمگیری، جلد1،ص:540، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

عدت کے احکام

سوال:124

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں ہماری بہن جو کہ

2.1.04 کو بیوہ ہو چکی ہے اور بے اولاد ہے اس کے سسرال نے تکمیل عدت سے پہلے گھر سے نکال دیا ہے۔ بہن کا مرحوم شوہر فوج میں ملازم تھا مرحوم شوہر کی وصیت (تحریری) تھی کہ میرے بعد تمام اقسام کی رقومات کی واحد حق دار میری بیوی ہوگی، آرمی کے قوانین کے مطابق تمام واجبات بیوہ کو ملے اسی طرح سرکاری پینشن کمیوٹیشن اور سرکاری ملازمین کی طرف سے جمع شدہ رقم جو ڈی ایس ایف، گروپ انشورنس کی رقم، یہ سب رقومات بھی مرحوم کی تحریری وصیت کے مطابق بیوہ کو ملی ہیں اب چند سوال کا جواب درکار ہے:

۱: یہ کہ بیوہ کو عدت پوری ہونے سے پہلے ہی زبردستی گھر سے نکال دینا درست عمل ہے؟ جب کہ ایسا ہی ہوا ہے۔

۲: بیوہ عورت کی بہن کو بھی (جو کہ اس کے دوسرے بھائی کے نکاح میں ہے) زبردستی گھر سے نکال دیا ہے۔

۳: بیوہ کے مرحوم شوہر کی وصیت اور آرمی قوانین کے تحت ملنے والے تمام فنڈز پر مرحوم شوہر کے والدین کا کوئی حق ہے؟ یا نہیں اگر ہے تو کتنا؟

۴: مرحوم کے چھ بھائی اور پانچ بہنیں ہیں کیا ان کا بھی کوئی حق ہے؟

۵: مرحوم شوہر کے والدین حیات ہیں جن کی ملکیت میں ایک بڑے پلاٹ پر مشترکہ گھر بمع ساز وسامان (جس میں بیوہ کا بھی سامان ہے) اور 132 ایکڑ زمین بھی (مرحوم کے) والدین کے نام ہے اس طرح پیچھے صوبہ سرحد میں زمین اور جائداد ہے ان تمام جائدادوں میں مرحوم کی بیوہ کا حق ہے یا کہ نہیں؟

۶: بیوہ بہن کے ہاں بچی پیدا ہوئی تھی جو کہ انتقال کر گئی تاہم اس نے اپنی نند یعنی مرحوم شوہر کی بہن کا بچہ گود لیا ہے؟، بیوہ اب شادی نہیں کرنا چاہتی کیا مرحوم شوہر کے تمام سرکاری واجبات کی واحد حق دار بیوہ ہے یا کہ شوہر کے والدین بھی کچھ حق رکھتے ہیں؟ جبکہ آرمی قانون کے مطابق سب کچھ بیوہ کو ہی ملے گا۔

۷: درج بالا سرکاری واجبات کے علاوہ بیوہ کے لیے کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے کیونکہ مرحوم

کے والدین نے اس کو دو کپڑوں میں گھر سے باہر نکال دیا ہے؟
۸: بیوہ کے ساتھ سسرالیوں کا طرزِ عمل نہایت خراب ہے جو کہ ہر قسم کے حقوق سے محروم کرنے پر تلے ہوئے ہیں کیا ان کا ایسا کرنا درست عمل ہے؟
برائے مہربانی مندرجہ امور پر شرعی فتویٰ جاری فرمایا جائے آپ کی عین نوازش ہوگی۔
(محمد سبحان دین خٹک (S.S.P(Asf))، B.302 کریسنٹ ویو بلاک 13 گلستان جوہر کراچی)

جواب:

شریعت کی رو سے متوفّٰی عنہا، یعنی وہ عورت جس کا شوہر فوت ہوگیا ہو اور اسی طرح مطلّقہ یعنی طلاق یافتہ عورت، دونوں کیلئے حکم یہ ہے کہ وہ شوہر کی وفات یا طلاق کے وقت جس مکان میں رہ رہی تھیں، اسی گھر میں عدت پوری کریں، بشرطیکہ وہاں عدت گزارنے میں کسی قسم کی تنگی نہ ہو، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

علی المعتدة ان تعتد فی المنزل الذی یضاف الیھا بالسکنٰی حال وقوع الفرقة والموت۔

ترجمہ: ''عدت گزارنے والی عورت پر لازم ہے کہ وہ اس گھر میں عدت گزارے جہاں پر وہ طلاق یا شوہر کی وفات کے وقت رہ رہی تھی''، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:535 مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

لہٰذا صورت مسئولہ میں بھی خاتون کو شوہر کے گھر عدت گزارنی چاہیے، ہاں! اگر سسرال والے رہنے نہیں دے رہے تو وہ سخت گنہگار ہیں اور اس مجبوری کے پیش نظر بیوی اپنے والدین کے ہاں عدت گزار سکتی ہے۔

سرکاری ملازم کو دورانِ ملازمت وفات کی صورت میں جو رقوم حکومت کی طرف سے ملتی ہیں، ہماری معلومات کے مطابق وہ درج ذیل ہیں:

(1) جی پی فنڈ کی رقم جو دورانِ ملازمت اس کی تنخواہ سے کاٹ کر جمع کی جاتی رہی ہے۔

(2) Commutation کی رقم جو ریٹائرمنٹ کے وقت ملازم کی تنخواہ کے ایک حصے کے عوض حکومت کی مقررہ شرح سے ضرب دے کر نقد دی جاتی ہے۔

(3) پینشن

(4) گروپ انشورنس کی رقم۔

(5)Benovolent Fund کی رقم جو متوفی ملازمین کے پسماندگان کو بصورت اعانت دی جاتی ہے۔ان میں سے جی۔پی فنڈ اور کمیوٹیشن کی رقم ملازم کا استحقاق ہے،یعنی حکومت اگر روک لے تو ملازم یا اس کے ورثاء عدالت کے ذریعے اسے حاصل کر سکتے ہیں۔اگر اس رقم کی قانونی پوزیشن وہی ہے،جو ہم نے بیان کی ہے تو ہماری رائے میں اس کا حکم متوفی کے ترکے کا ہے،اور یہ ورثاء میں اسلام کے اصول وراثت کے مطابق تقسیم ہوگی اور لاولد شوہر کے کل ترکے میں بیوی کا حصہ چوتھا (یعنی 1/4) ہوتا ہے۔اور اگر یہ از روئے قانون متوفی سرکاری ملازم کا استحقاق نہیں ہے،یعنی حکومت کی جانب سے یہ رقم روکے جانے کی صورت میں وہ عدالت کے ذریعے اسے حاصل نہیں کر سکتا،تو پھر یہ حکومت کی طرف سے تبرع اور فضل واحسان ہوگا اور وہ اپنے قانون کے مطابق بیوہ ہی کو دینا چاہتی ہے تو دے سکتی ہے اور اس صورت میں اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔

متوفی،سرکاری ملازم کی بیوہ یا نابالغ بچوں کو جو پنشن دی جاتی ہے،وہ حکومت کی طرف سے تبرع اور فضل واحسان ہے،اگر حکومت اپنے قوانین کے تحت صرف بیوہ کو دینا چاہتی ہے،تو پھر یہ بیوہ کا حق ہوگا،اور اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔

لائف انشورنس ویسے اسلام کے مطابق نہیں ہے اور ملازم کی جو رقم تنخواہ سے کاٹ کر اس فنڈ میں جمع کی جاتی رہی ہے،اس پر ملازم کا استحقاق اس لیے نہیں ہے کہ بصورت حیات ریٹائرمنٹ کی صورت میں اسے کچھ بھی نہیں ملتا،نہ اپنی جمع شدہ رقم اور نہ ہی گروپ انشورنس کی مجموعی رقم،لہٰذا یہ بھی حکومت کی طرف سے تبرع ہی ہے،اگر وہ اپنے قانون کے مطابق بیوہ کو دینا چاہتی ہے تو دے سکتی ہے،اس میں شرعاً شوہر کی وصیت کا اعتبار اس لیے نہیں ہے کہ بیوہ وارث ہے اور وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔

اسی طرح Benovolent Fund کی رقم بھی ملازم کا استحقاق نہیں ہے،کیونکہ حکومت نہ تو اپنے سرکاری ملازمین کو وہ جمع شدہ رقم واپس کرتی ہے اور نہ وہ قانون کی مدد سے اسے

حاصل کر سکتے ہیں، اگر چہ حکومت کا یہ قانون خلافِ شرع ہے، جب حکومت ملازم کی تنخواہ سے یہ رقم کاٹتی ہے تو ریٹائرمنٹ پر یہ رقم بصورتِ حیات اور بصورتِ وفات اس کے ورثاء کو لازماً ملنی چاہیے۔ لہٰذا حکومت متوفّی ملازم کی بیوہ کو اس مد سے کچھ دینا چاہے تو یہ بھی فضل واحسان ہوگا اور اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔

نند کا بچہ جو گود لیا ہے، وہ شرعاً نہ متوفّی (یعنی اپنے ماموں) کا وارث ہے اور نہ ہی متوفّی کی بیوہ (یعنی اپنی ممانی) کا، اور بالغ ہونے کے بعد وہ اپنی ممانی کا محرم بھی نہیں رہے گا، بشرطیکہ اس رشتے کے علاوہ کوئی اور وجہ حرمت نہ ہو، البتہ وہ اپنے مال سے اس کی پرورش اور تعلیم پر بھی خرچ کر سکتی ہے اور اس کے نام کچھ مال ہبہ کرنا چاہے تو وہ بھی کر سکتی ہے، لیکن بالغ ہونے کے بعد اس سے شرعی پردہ لازم ہوگا۔

متوفی کے والدین یا بہن بھائیوں کے مال میں اس کی بیوہ کا کوئی حق نہیں ہے، البتہ متوفی کا جو اپنا ترکہ ہے، بعد ادائے ''حقوق متقدمہ علی الارث'' اور بصورت ''انحصارِ ورثاء در مذکورین'' متوفّی کا ترکہ 12 حصوں پر منقسم ہوگا اور اس کی تقسیم حسب ذیل ہوگی : والد: 7 حصے، والدہ: 2 حصے، بیوہ: 3 حصے اور بہن بھائی ترکے سے محروم رہیں گے۔

طلاق کے کاغذ پر مکان کے کاغذ کہہ کر دھوکے سے دستخط لینا

سوال:125

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ہم دو بھائی ہیں، ہمارے والدین کا ایک مکان ہے جس کے دو حصے کر کے، ایک حصہ مجھے اور ایک میرے بھائی کو دے دیا، میرے والدین نے میرے حصے کو فروخت کر کے وہ رقم میرے سالے کو دی، جس سے اس نے ایک مکان میرے بچوں کے نام پر خریدا، اس بات کا مجھے بعد میں علم ہوا (لیکن مجھے اس بات کا ابھی تک صحیح طور پر نہیں معلوم کہ مکان واقعی بچوں کے نام ہے یا میری بیوی کے نام ہے) میری بیوی مسماۃ سلیمہ بیگم سے مکان کے سلسلے میں میرا جھگڑا چل رہا تھا، میں کہتا تھا کہ مکان فروخت کر دو لیکن وہ منع کرتی تھی، اس بات پر کئی مرتبہ جھگڑا ہوا

اور میری بیوی 5 ماہ قبل اپنے میکے چلی گئی۔ میرے سسرال سے ایک شخص آیا، اس نے ایک تحریر مجھے دی اور میں نے اس کاغذ کو پڑھا نہیں، کاغذات انگریزی زبان میں تحریر تھے، کیونکہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس پر طلاق نامہ اور تین طلاقیں لکھی ہوئی تھیں، اس شخص نے کہا کہ مکان کے کاغذ ہیں تمہارے دستخط کروانے ہیں، میں نے دستخط کر دیئے۔ میری طلاق دینے کی کوئی نیت نہیں تھی اور نہ اس واقعے کا کوئی گواہ ہی ہے۔ انہوں نے جعل سازی سے دستخط کروا کر علیحدگی کر لی ہے۔ از روئے شریعت بتایئے کہ طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟، (مشتاق، سیکٹر 5-E، مکان 9 نارتھ کراچی)۔

جواب:

علامہ شامی لکھتے ہیں: قال فی "الهداية" والفرق يبتنى على الاصل الذى ذكرناه فى النكاح لمحمد رحمه الله تعالى، وهو أن الاشارة مع التسمية اذا اجتمعا ، ففى مختلفى الجنس يتعلق العقد با لمسمّٰى ويبطل لانعدامه، الخ ------------(الى ان قال): قال فى "البحر" والاصل المذكور متفق عليه هنا، ويجرى فى سائر العقود من النكاح والاجازة والصلح عن دم العمد والخلع والعتق على مال۔

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ عقود و معاملات میں جس چیز کا عقد ہو رہا ہے، اس کا معین ہونا ضروری ہے، اور تعین دو طرح سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ اس کی طرف اشارہ کر کے بتایا جائے کہ یہ فلاں چیز ہے، اسے ''مشارٌ الیہ'' کہا جائے گا، دوسرا یہ کہ اس کا نام لے کر اسے متعین کیا جائے، اسے ''مُسمّٰی'' کہا جائے گا۔ اگر دونوں چیزیں ایک ہی جنس کی ہوں، تو ''مشارٌ الیہ'' کا اعتبار ہوگا اور اگر دونوں مختلف جنس کی ہوں، تو ''مُسمّٰی'' کا اعتبار ہوگا۔ اب زیرِ بحث مسئلہ میں مُسمّٰی ''مکان کے کاغذات'' ہیں اور مشارٌ الیہ ''طلاق نامہ'' ہے، اور دونوں کی جنس مختلف ہے۔ اور جب مشارٌ الیہ اور مُسمّٰی دو مختلف الجنس چیزیں ہوں تو تسمیہ کا اعتبار ہوگا، یعنی عقد اس چیز سے متعلق ہوگا، جس کا نام لیا گیا ہے۔ اور نام مکان کے

کاغذات کا لیا گیا تھا، جو حقیقت کے خلاف ہے، کیونکہ حقیقت میں تو یہ ''طلاق نامہ'' تھا، پس یہ عقد باطل ہے اور دستاویز دستخط کے باوجود کالعدم ہیں، کیونکہ یہ کام دھوکہ دہی سے کیا گیا ہے، لہٰذا طلاق نہیں ہوئی اور آپ کی بیوی بدستور آپ کے نکاح میں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 7 ص:174 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

یہ جواب اس صورت میں ہے کہ آپ کا بیان درست ہے اور آپ واقعی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہیں اور جو لوگ طلاق کے مدعی ہیں، ان کے پاس اس بات کے گواہ نہ ہوں کہ آپ سے تحریر پر دستخط کراتے وقت آپ کو اصل صورتِ حال بتائی گئی تھی، اور آپ حلفیہ اقرار کریں کہ آپ کا بیان درست ہے اور دھوکے سے آپ سے تحریر پر دستخط کرائے گئے ہیں۔

اسی سے مماثل ایک سوال کے جواب میں (کہ میاں بیوی کے درمیان ناچاقی کی صورت میں شوہر سے کہا گیا کہ یہ صلح نامہ ہے، اس پر انگوٹھا لگادو اور اس نے لگادیا، بعد میں پتا چلا کہ یہ طلاق نامہ تھا اور شوہر طلاق دینے کیلئے ہرگز تیار نہیں تھا) مفتی محمد نور اللہ صاحب بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''اگر صورتِ سوال صحیح و درست ہے تو بلا شک وشبہ در یب طلاق واقع نہیں ہوئی، دھوکہ دینے والے اور صلح کا نام لے کر انگوٹھہ لگوانے والے سخت گنہ گار اور فریب کار، مستوجب نار ہیں، ان پر لازم کہ توبہ کریں اور ایسے سخت جرموں سے بچیں اور وہ نکاحِ ثانی جو کسی غیر سے کیا گیا ہے بالکل ناجائز و ناروا و حرام ہے۔

(فتاویٰ نوریہ، جلد 3 صفحہ 109 مطبوعہ انجمن حزب الرحمٰن بصیر پور، اوکاڑہ)

ایلاء

سوال:126

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کی ذیل میں کہ ہم میاں بیوی میں جھگڑا ہوا، جس پر میری بیوی نے کہا کہ'' آپ بستر پر نہیں لیٹیں گے اور نہ میرے پاس آئیں گے۔ جواباً میں نے غصہ میں یہ الفاظ کہے،'' تم حرام ہو میرے اوپر زندگی بھر کے لئے''۔ لیکن دل میں نیت ان سے ساری زندگی ازدواجی (قربت) تعلق قائم نہ رکھنے کی تھی، میری

نیت اس میں طلاق کی نہیں تھی ، (عامر ملک ، B-223 بلاک 6 گلشنِ اقبال ، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآبِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

ترجمہ: ’’جولوگ اپنی عورتوں سے مباشرت نہ کرنے کی قسم کھالیتے ہیں ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے اگر انہوں نے (اس مدت میں) رجوع کرلیا تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے اور اگر انہوں نے طلاق ہی کا ارادہ کرلیا ہے تو بے شک اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے‘‘، (البقرہ: آیت: 226,227)۔

اس آیت کریمہ کی رو سے شوہر کا اپنی بیوی کو قسم کھا کر یہ کہنا کہ میں چار ماہ تک (یا دائمی طور پر) تم سے ازدواجی تعلق قائم نہیں کروں گا ، یہ ’’ایلاء‘‘ ہے۔ اگر وہ اپنی قسم پر قائم رہتا ہے تو اس سے ایک طلاقِ بائن واقع ہو جاتی ہے اور قسم توڑ کر چار ماہ کے اندر بیوی سے رجوع کر لیتا ہے تو نکاح قائم رہتا ہے اور قسم کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے، جو یہ ہے: دس مساکین کو اپنے اوسط معیار کے مطابق دووقت کا کھانا کھلانا، یا لباس فراہم کرنا ہے اور اگر یہ نہ کرسکے تو تین روزے رکھنا ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(هو الحلف على ترك قربانها) ۔

ترجمہ: اپنی بیوی سے ازدواجی قربت ختم کرنے کی قسم کھانا ایلا ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

(وحكمه وقوع طلقة بائنة ان برّولم يطاء)۔

ترجمہ: اور اس کا حکم یہ ہے اگر وہ اپنی قسم پر پورا اترا اور وطی نہ کی تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی،

مزید لکھتے ہیں:

(قال لامراته انت علی حرام ایلاء ان نوی التحریم اولم ینو شیئاً) ۔
ترجمہ: شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم مجھ پر حرام ہو، یہ "ایلاء" ہے، اگرچہ حرام قرار دینے کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔
اور آگے مزید لکھتے ہیں:

(وتطلیقة بائنة)ان نوی الطلاق وثلاث ان نواھا،ویفتیٰ بانّہ طلاق بائن وان لم ینوہ لغلبة العرف۔
ترجمہ: (اور طلاقِ بائن واقع ہوگی) اگر طلاق کی نیت کی ہو اور اگر تین طلاق کی نیت کی تو تین واقع ہوں گی، اور فتویٰ اسی پر ہے کہ طلاقِ بائن واقع ہوگی اگرچہ نیت نہ کی ہو، کیونکہ غالب عرف یہی ہے۔اس کی تشریح میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

قولہ (وان لم ینوہ)ھذا فی القضاء،واما فی الدیانةفلا یقع مالم ینو۔
ترجمہ: (اور خواہ اس نے نیت نہ کی ہو، طلاق واقع ہوجائے گی) یہ قضاءً ہے (یعنی قضاءً اس پر طلاق کا حکم لگایا جائے گا، لیکن جہاں تک دیانت کا تعلق ہے یعنی بندے اور رب کا معاملہ ہے تو جب تک نیت نہ کی ہو، طلاق واقع نہ ہوگی) اور دیانتاً واقع نہیں ہوگی جب تک نیت نہ کرے، پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

قلت: الظاھر انہ اذا لم ینو شیئا اصلاً یقع دیانة ایضاً۔
ترجمہ: "میں کہتا ہوں کہ (شوہر نے اپنی بیوی کو یہ کلمات، کہ تو مجھ پر ہمیشہ کیلئے حرام ہے، کہتے ہوئے) کسی چیز کی نیت نہ کی ہو تو دیانتاً بھی طلاق واقع ہوجائے گی"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد5،ص:48,50,61,62، مطبوعہ داراحیاءالتراث العربی بیروت)

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر شوہر چار ماہ کے اندر بیوی سے قربت قائم کر کے قسم کا کفارہ ادا کردے تو نکاح بدستور قائم رہے گا، ورنہ ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی۔

الفاظِ صریح یا کنایہ کا تعین

سوال:127

میں آپ سے اپنے مسئلے کے بارے میں شریعت کی روشنی میں حل چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کو تقریباً دو سال قبل کہا کہ ''میں نے تمہیں طلاق دی''، اس کے بعد رجوع کرلیا۔ آج سے چار ماہ قبل ہمارا جھگڑا ہوا، بیوی اپنے میکے جا کر بیٹھ گئی۔ ایک ماہ بعد میں اسے لینے گیا تو میرے سالے نے کہا کہ آپ ان کو سال ڈیڑھ سال یہیں چھوڑ دیں، ان کی عقل ٹھکانے آجائے گی تو پھر آپ لے جانا، میں نے غصے میں کہا کہ ''میری طرف سے فارغ ہے اور جب فیصلہ لینا ہو تو مجھے بتادیں''۔ اس وقت میری بیوی اور سالے موجود تھے، لیکن میری نیت طلاق دینے کی نہیں تھی کہ میں ان کو اپنے نکاح سے فارغ کردوں۔ ازراہِ کرم شریعت کے حوالے سے وضاحت فرمائیں، (مسعود احمد، A-69 سراج کالونی ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں سائل کے بیان کے مطابق دو سال قبل ایک طلاق رجعی دے کر اس نے رجوع کرلیا، تو یہ رجوع شرعاً درست تھا۔ اب اس کے پاس صرف دو طلاق کا اختیار باقی تھا، جب بھی دے گا پہلی طلاق کے ساتھ مل کر موثر ہوں گی، اس کے بعد شوہر کا غصے کی حالت میں یہ کلمات کہنا کہ ''میری طرف سے فارغ ہے اور جب فیصلہ لینا ہو تو مجھے بتادیں''۔

''میری طرف سے فارغ ہے'' یہ طلاق صریح کا کلمہ نہیں ہے بلکہ کنایات میں سے ہے اور بحالتِ غصہ اس سے ''طلاق بائن'' مراد لی جاسکتی ہے، لیکن شوہر نے چونکہ یہ کلمات ''انشاء طلاق'' کے طور پر نہیں کہے بلکہ اسے بیوی کی مرضی پر موقوف کیا ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ ''جب فیصلہ لینا ہو مجھے بتادیں''، یعنی علی الاطلاق تفویض طلاق بھی نہیں ہے، اس لئے اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی اور ان کا رشتۂ نکاح بدستور قائم ہے۔

دو طلاق کا حکم

سوال:128

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میری عمر تقریباً 58 سال ہے، میری بیوی کی عمر 52 سال ہے اور ہمارے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، میں بیروزگار ہوں بچوں کی شادی کے مسائل اور بیٹے بھی تا حال برسر روزگار نہیں ہیں، بڑی پریشانی اور مصائب کا سامنا ہے جس کے باعث مقروض بھی ہو گیا ہوں۔ چند روز قبل بعد نمازِ مغرب ہم سب بیٹھے T-V پروگرام دیکھ رہے تھے، ڈرامے کے ایک کردار کو دیکھ کر میں نے کہا یہ محترمہ بالکل آپ کی امی کی طرح کردار ادا کر رہی ہیں، یہ الفاظ سن کر میری بیوی (جو کہ ڈرائنگ روم میں نماز پڑھ رہی تھی) شدید ناراض ہوتے ہوئے انتہائی اشتعال انگیز گفتگو کی اور مجھ پر تہمتیں لگائیں، نتیجے کے طور پر میں نے بھی غصے میں اپنے بچوں کی موجودگی میں ٹیبل پر رکھے ہوئے سپارے و پنج سورے کو ہاتھ میں لے کر یہ کہا ''میں نے تمہیں طلاق دی، طلاق دی''۔ اس کے بعد گھر میں خاموشی طاری ہو گئی، ہم میاں بیوی کو اپنے اس ردِعمل پر شدید ندامت ہوئی، ہم نے اپنے الفاظ ایک دوسرے سے واپس لئے اور معافی تلافی کی، اللہ تعالیٰ سے اپنی غلطی پر شرمندہ ہیں اور معافی کے طلب گار ہیں، از روئے شرع ہمارے نکاح کو برقرار رکھنے اور رجوع کرنے کیلئے آپ کے جواب کے منتظر ہیں،

(شیخ عبداللطیف، R-40 پائنیر فاؤنٹین ا گلشن اقبال)

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

ترجمہ: ''طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے''، (البقرہ 229)۔

اگر سائل کا بیان درست ہے اور واقعی اس نے دو طلاق دی ہیں، تو یہ دو طلاق رجعی واقع

ہوگئیں، وہ چاہے تو عدت کے اندر یک طرفہ طور پر عقدِ ثانی کے بغیر رجوع کرسکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کرلے تو بھی رجوع ہوجائے گا مگر فعل سے رجعت کرنا مکروہ ہے الا یہ کہ مجنون ہو۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا اور عدت گزرگئی تو وہ عورت اب آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ بھی عقدِ ثانی کرسکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کرسکتی ہے، اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقدِ ثانی کیا تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور اگر خدانخواستہ اس نے ایک اور طلاق دے دی تو وہ ان پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہوکر تین طلاقیں ہوجائیں گی اور وہ عورت اس پر حرام ہوجائے گی۔

تعلیقِ طلاق

حسبِ ذیل سوالات کا جواب از روئے شریعت قرآن وسنت عنایت فرمائیں:

سوال:129

(ش) اور مختار احمد کی شادی کو تقریباً عرصہ بارہ تیرہ سال ہوگئے ہیں اور یہ دو بچیوں اور ایک بچے کے ماں باپ ہیں۔ گھریلو جھگڑوں کی بنا پر (ش) ضلع مظفر گڑھ سے اپنا سسرال چھوڑ کر اپنے میکے آگئی، عرصہ تقریباً چار پانچ سال سے وہ دونوں بھیرہ میں رہ رہے ہیں۔ کبھی میاں بیوی مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگتے ہیں، پھر جھگڑا ہوتا ہے پھر اپنے میکے آجاتے ہیں۔ لڑکی (ش) اپنے ماں باپ کے پاس آتی ہے، تو لڑکا مختار احمد بھی اپنے سسرال میں رہنے لگتا ہے۔ متعدد بار ایسا ہوا۔

اب آتے ہیں سوال کی طرف لڑکی (ش) طلاق مانگتی ہے اور (مختار احمد) طلاق دیتا نہیں ہے۔ (ش) نے اپنے خاوند مختار احمد کے خلاف جج فیملی کورٹ بھلوال (سرگودھا) میں بابت تنسیخِ نکاح خرچہ نان نفقہ دلا پانے کا دعویٰ دائر کردیا۔ (ش) کی اس کے بھائیوں، والدہ اور عزیز واقارب نے منت سماجت کی کہ وہ عدالت سے مقدمہ واپس لے لے۔ لیکن (ش) اپنی بات پر بضد رہی۔

طے یہ پایا کہ اس شرط پر مختار احمد طلاق دے کہ ''اگر میری بیوی شمیم اختر عدالت سے مقدمہ اٹھالے، تو میری طرف سے اس کو طلاق''، یہ جملہ مختار احمد نے صرف ایک بار کہا، مؤرخہ 20-05-2005 کو شمیم اختر نے عدالت سے اپنا مقدمہ اٹھالیا، لیکن مختار احمد دوبارہ اور سہ بارہ طلاق دینے سے انکاری ہے اور بھیرہ سے روپوش ہے۔

(1) کیا (ش) کو ایک طلاق ہوئی ہے یا نہیں؟

(2) رجوع کی گنجائش ہے یا نہیں؟

(3) ایک ماہ تک رجوع نہ کرے، تو دوسری طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں؟، اسی طرح اگلے ماہ بھی رجوع نہ کرے، تو کیا تیسری طلاق واقع ہوجائے گی؟، اور اس کے بعد رجوع کی گنجائش ہے یا نہیں؟

(4) اگر تین طلاق واقع ہوجاتی ہیں، تو عدت کے بعد کسی اور سے نکاح کرنے کا لڑکی کو حق ہے یا نہیں؟ یا اپنے پہلے مرد سے نکاحِ ثانی کرسکتی ہے یا نہیں؟

(عبدالرحمٰن نسیم، کاشانہ رؤف مفتیان سٹریٹ بھیرہ شریف، تحصیل بھلوال، ضلع سرگودھا، پنجاب)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برتقدیرِ صدقِ سائل مختار احمد نے طلاق کو اپنی بیوی شمیم اختر کے عدالت سے مقدمہ واپس لینے پر معلق کیا، اور بیوی نے 20-5-2005 کو مقدمہ واپس لے لیا، تو ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی اور اسی تاریخ سے عدت شروع ہوگئی، لیکن عدت کے اندر شوہر کو یک طرفہ طور پر رجوع کا حق حاصل ہے، خواہ وہ زبان سے کہے کہ میں نے رجوع کیا، یا عملاً رجوع کرلے۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہیں کرتا تو عدت گزرنے کے بعد یہ طلاق بائن ہوجائے گی اور اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی، اور شمیم اختر اب کسی کے ساتھ بھی نکاح کے لئے آزاد ہوگی۔ لیکن عدت گزرنے کے بعد بھی دونوں چاہیں تو باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں، اور دوبارہ نکاح کی صورت میں بھی یہ ایک طلاق آئندہ خدانخواستہ شوہر کے طلاق دینے کی صورت میں نئی

طلاق کے ساتھ جمع ہونے کیلئے مؤثر رہے گی۔ باقی شوہر مختار احمد کو دوسری اور تیسری طلاق دینے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نکاح سے پہلے طلاق مؤثر نہیں ہوتی

سوال:130

کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے والد سے کہا کہ اگر میں آپ کے ساتھ رہوں یا آپ کے گھر میں رہوں یا آپ کی دولت پر شادی کروں، تو میرے اوپر میری بیوی طلاق ہے۔ واضح رہے کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی، تو کیا اب اس قول کے بعد اگر میں اپنے والد کے سرمائے سے شادی کروں اور ان کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہوں، تو کیا میرے نکاح پر کوئی اثر پڑے گا؟، براہِ کرم اس مسئلہ کی وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں، (حبیب حسین، ضلع مانسہرہ)۔

جواب:

طلاق کو کسی شرط پر معلق کرتے وقت اگر طلاق کی نسبت ملک یا سببِ ملک کی طرف کی گئی ہے، تو وجودِ شرط کے وقت طلاق واقع ہو جائے گی، جیسے اپنی منکوحہ بیوی سے کہے کہ اگر میں اپنے والد کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہوں، تو تجھے طلاق ہے یا اگر میں اپنے والد کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہوں تو جس عورت سے بھی میں نکاح کروں، اسے طلاق ہے، تو ان دو صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی، لیکن اگر طلاق کی نسبت ملک (یعنی باقاعدہ منکوحہ بیوی) یا سببِ ملک (جس خاتون سے جب بھی نکاح ہوگا یا کروں گا) نہ ہو تو کلام لغو ہو جائے گا اور طلاق واقع نہیں ہوگی، یہاں سوال میں آپ نے درج کیا ہے: ''میں نے اپنے والد سے کہا: کہ اگر میں آپ کے ساتھ رہوں یا آپ کے گھر میں رہوں یا آپ کی دولت پر شادی کروں، تو میرے اوپر میری بیوی طلاق ہے، واضح رہے کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی''۔ چونکہ اس تعلیق کے وقت نہ تو آپ کی منکوحہ بیوی موجود ہے اور نہ ہی آپ نے اس تعلیقِ طلاق کو مستقبل میں شرطِ نکاح (سببِ ملک) کے ساتھ مشروط کیا ہے،

یہ تعلیق لغو ہے، آپ مستقبل میں اگر اپنے والد کے سرمائے سے شادی کریں گے یا شادی کے بعد ان کے ساتھ ان کے مکان میں رہیں گے، تو آپ کی ہونے والی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوگی، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

فلغا قوله لاجنبية ان زرت زيداً فانت طالق فنكحها فزارت)۔

ترجمہ: ''کسی شخص کا اجنبی عورت سے یہ کہنا کہ اگر تو زید سے ملے، تو تجھے طلاق ہے، پھر (بعد میں) اس شخص نے اس (اجنبیہ) عورت سے نکاح کیا اور وہ عورت پھر زید سے ملی، (تو طلاق واقع نہیں ہوگی) یعنی یہ قول لغو ہو جائے گا، کیونکہ تعلیقِ طلاق کے وقت وہ اجنبیہ عورت اس شخص کے نکاح میں نہیں تھی اور نہ ہی شرط کو سببِ ملک کے ساتھ معلق کیا''۔

(درمختار جلد 4 ص: 449 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

صدرالشریعہ مولانا امجد علی لکھتے ہیں:

کسی اجنبیہ سے کہا: اگر تو فلاں کے گھر گئی، تو تجھ پر طلاق پھر اس سے نکاح کیا اور وہ عورت اس کے یہاں گئی، تو طلاق نہ ہوئی یا کہا، جو عورت میرے ساتھ سوئے، اسے طلاق ہے پھر نکاح کیا اور ساتھ سوئی، طلاق نہ ہوئی۔ یوں ہی اگر والدین سے کہا: کہ اگر تم میرا نکاح کرو گے، تو اسے طلاق پھر والدین نے اس کے بے کہے نکاح کر دیا، طلاق واقع نہ ہوگی، یوں ہی اگر طلاق ثبوتِ ملک یا زوالِ ملک کے مقارن ہو تو کلام لغو ہے، طلاق نہ ہوگی، مثلاً تجھ پر طلاق ہے، تیرے نکاح کے ساتھ یا میری یا تیری موت کے ساتھ، (بہارِ شریعت جلد اول ص: 611، مکتبۂ رضویہ آرام باغ، کراچی)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا تصح اضافة الطلاق الا ان يكون الحالف مالكا اويضيفه الى ملك والاضافة الى سبب الملك كالتزوج كالاضافة الى الملك فان قال لا جنبية ان دخلت الدار فانت طالق ثم نكحها فدخلت الدار لم تطلق كذا فى الكافى۔

ترجمہ: ''اور طلاق کی نسبت تب مؤثر ہوتی ہے، جب قسم کھانے والا مالک ہو یا ملک کی

طرف نسبت کرے، اور سبب ملک کی طرف نسبت بھی ملک کی طرف نسبت کی مانند ہے، جیسے کہ نکاح کرنے کی نسبت (کیونکہ نکاح سبب ملک ہے، جیسے کہے کہ اگر میں تم سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے)، پس اگر کسی اجنبی عورت سے کہا کہ اگر تو گھر میں داخل ہوئی، تو تجھے طلاق ہے (تو اب تعلیقِ طلاق کے وقت وہ اس کی ملک یعنی نکاح میں نہیں ہے اور سبب ملک یعنی نکاح کے ساتھ شرط کو معلق بھی نہیں کیا)، پھر اس کے بعد اس اجنبیہ عورت سے نکاح کیا اور وہ اس کے بعد اس گھر میں داخل ہوئی، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، ''کافی'' میں اسی طرح ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص:420 مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

باقی آپ کو والدین کو اپنا مقابل یا حریف سمجھ کر ان سے اس انداز میں بات نہیں کرنی چاہئے، یہ انتہائی شقاوت اور بدنصیبی کی بات ہے، نہ ان کی دل آزاری ہی کرنی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

ترجمہ: ''اللہ کے سوا کسی کی تم عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہنا''، (البقرۃ:83)۔

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

ترجمہ: ''اور آپ کا رب حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا''، (بنی اسرائیل:23)۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا

ترجمہ: ''اور اگر وہ تجھ پر یہ دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک قرار دے جس کا تجھے علم نہیں ہے تو ان کی اطاعت نہ کرنا اور (اس کے باوجود) دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک کرنا''، (لقمان:15)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر خدانخواستہ کسی کے ماں باپ اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کریں، تو ایسے امور میں تو ان کی اطاعت نہیں ہے، جس سے خالق تبارک وتعالیٰ کی معصیت لازم آتی ہو، لیکن اس کے باوجود دنیوی امور میں ان سے حسنِ سلوک کرنا لازمی ہے۔

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ من اصبح مطیعا للّٰہ فی والدیہ اصبح لہ بابان مفتوحان من الجنۃ وان کان واحدا فواحداً ومن اصبح عاصیاً للّٰہ فی والدیہ اصبح لہ بابان مفتوحان من النار ان کان واحداً فواحداً قال رجل: وان ظلماہ قال: وان ظلماہ وان ظلماہ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جس شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے اپنے والدین کا فرماں بردار ہے تو اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اگر ماں باپ میں سے ایک موجود ہے تو ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اور جس نے اس حال میں صبح کی کہ وہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی کرکے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کررہا ہے، تو اس کیلئے جہنم کے دو دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور اگر ماں باپ میں سے ایک ہی موجود ہے تو اس کے لئے جہنم کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے، ایک شخص نے عرض کیا: (یارسول اللہ ﷺ!) اگرچہ اس شخص کے ماں باپ اس پر ظلم کریں (تب بھی ان کا یہی مقام ہے)، آپ نے تین بار فرمایا: ہاں! اگرچہ وہ اس پر ظلم کریں، تب بھی جائز امور میں ان کی فرماں برداری اولاد پر لازم ہے''، (مشکوٰۃ بحوالہ البیہقی فی الشعب باب فی برّ الوالدین رقم الحدیث:7916)

عن عبداللّٰہ بن عمرو قال: قال رسول الله ﷺ رضی الرب فی رضی الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رب کی رضا والد کی رضا میں ہے، اور رب کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث:1899)

عن ابی ھریرۃ قال : قال رسول اللّٰہ ﷺ رغم انفُہ ثم رغم انفُہ ثم رغم انفُہ قیل من یا رسول اللّٰہ قال: من ادرک والدیہ عندالکبر احدھما اوکلیھما ثم لم یدخل الجنۃ

ترجمہ:'' حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس کی ناک خاک آلود ہو(یعنی وہ ذلیل اور رسوا ہو)، عرض کیا گیا: کون یارسول اللہ؟ فرمایا: جو اپنے ماں باپ دونوں یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پائے اور پھر (ان کی اطاعت کرکے) جنت کا حق دار نہ بن سکے''، (صحیح مسلم رقم الحدیث:6391)۔

عن عبدالرحمن بن ابی بکرۃ،عن ابیہ قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ:"ألا أخبرکم بأکبرالکبائرقالوا: بلیٰ یارسول اللہ،قال:" الاشراک باللّٰہ، وعقوق الوالدین۔

ترجمہ:'' حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہما اپنے والد سے بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں سب سے بڑے کبیرہ گناہوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟، صحابہ نے عرض کیا : کیوں نہیں، یا رسول اللہ!(ضرور بتایئے) آپ نے فرمایا: (بڑے کبیرہ گناہوں میں سے ایک) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور (دوسرا) والدین کی نافرمانی ہے''، (صحیح بخاری رقم الحدیث:6273)۔

نوٹ: اس سے ملتی جلتی اور احادیث بھی دیگر راویوں کی سند سے امام بخاری نے روایت فرمائی ہیں، (رقم الحدیث:5976,6870,6871,6919,6920)۔

لہٰذا آپ پر لازم ہے کہ والدین کے ساتھ اپنا رویہ درست رکھیں، ان کی اطاعت اور فرماں برداری کو اپنا شعار بنائیں اور والدین کی نافرمانی کے دنیوی واخروی وبال سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ تاہم آپ کی بیان کردہ صورت مسئلہ اگر درست ہے، تو آپ کے والد صاحب کے سرمائے سے شادی کرنے یا شادی کے بعد ان کے گھر پر رہنے سے آپ کے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

﴿کتابُ العدت﴾

دورانِ عدت ملک سے باہر جانے کی اجازت؟

سوال:131

میرے شوہر کا انتقال 27 نومبر 2004ء کو ہوا، میری عدت 10 اپریل 2005ء کو ختم ہورہی ہے، اس وقت میں اپنے بھائی کے گھر رہ رہی ہوں۔ میرا ایک بیٹا ہے جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لندن میں رہتا ہے۔
میرا ارادہ مستقل لندن میں رہنے کا ہے، میرے پاسپورٹ کی مدت جون، 2005ء اور ویزے کے مدت مارچ، 2005ء میں ختم ہورہی ہے، میرے بیٹے نے مجھے بتایا ہے کہ برطانیہ میں 30، مارچ 2005ء سے ویزے کا نیا قانون لاگو ہورہا ہے، جس میں زیادہ پابندیاں عائد ہوں گی۔ 15، مارچ 2005ء تک پرانے قانون کے تحت ویزا بڑھانے کی درخواست دی جاسکتی ہے، اس کے بعد دی جانیوالی درخواستوں میں نئے قانون کا اطلاق ہوگا، جس میں ویزا ملنے کے امکانات کم ہیں۔ کیونکہ میں اکیلی نہیں رہ سکتی، اس لئے چاہتی ہوں کہ عدت ختم ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کے پاس چلی جاؤں، اگر ویزا ختم ہونے کے بعد جانا چاہوں تو عین ممکن ہے کہ پاکستان سے مجھے دوبارہ ویزا نہ ملے، اگر ایسا ہوا تو میرے پاس کوئی متبادل نہیں ہوگا، آجکل کے حالات میں اکیلی عورت کا گھر میں رہنا، ہر قسم کے حادثات کو دعوت دینا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر کیا میں عدت ختم ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کے پاس جاسکتی ہوں، (تسنیم فخر، A-99 بلاک 12 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں عدت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٣٤﴾
ترجمہ: اور جو لوگ تم میں سے وفات پاجائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں انتظار

میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو کوئی حرج نہیں تم پر اس بات میں جو دستور (شرع) کے موافق وہ اپنے حق میں کریں، (البقرہ:234)

عورت کو زمانہ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے، ہاں! اگر عدت موت کی ہو اور اس کے پاس کھانے کو نہ ہو، بغیر گھر سے نکلے کام نہ چل سکے گا یا نقصان پہنچے گا تو اس ضرورت سے اس کے لئے جاسکتی ہے اور رات اسی گھر میں گزارے اور بغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(و معتدة موت تخرج فی الجدیدین ، وتبیت) اکثر اللیل (فی منزلها) لان نفقتها علیها، فتحتاج للخروج۔

ترجمہ: ''اور جو عورت عدت وفات گزار رہی ہو وہ بوقت ضرورت دن یا رات میں نکل سکتی ہے، لیکن رات کا اکثر حصہ گھر میں گزارے، اس لئے کہ وہ اپنے اخراجات کی ذمہ دار خود ہے پس وہ اس کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہے''، (درمختار جلد 5 صفحہ 180، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:

وأماالمتوفی عنها زوجها فلا تخرج لیلاً، ولا باس بان تخرج نهاراًفی حوائجها لانهاتحتاج الی الخروج بالنهار لاکتساب ماتنفقه لأنه لا نفقة لها من الزوج المتوفی بل نفقتها علیهافتحتاج الی الخروج لتحصیل النفقة۔

ترجمہ: ''پس وفات پا گیا ہو جس عورت کا شوہر وہ رات میں نہ نکلے، اور اپنی ضروریات کیلئے دن کے وقت نکلنے میں حرج نہیں اس لئے کہ وہ محتاج ہے دن کے وقت نکلنے کی تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، کیونکہ اس کا نفقہ اس کے متوفی شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس پر ہے پس وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے''، (بدائع الصنائع جلد 3 ص:299، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، ہند)۔

عن ابن عباس رضی الله عنهما قال :قال النبی ﷺ:" لا تسافر المرأة الاّ مع

ذی محرم،ولا یدخل علیھا رجل الّاومعھا محرم " فقال رجل: یا رسول الله ﷺ انّی اریدان اخرج فی جیش کذاو کذا،وامراتی ترید الحج؟فقال اخرج معھا۔"

ترجمہ:''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:عورت سفر نہ کرے مگر اپنے کسی محرم کے ساتھ اور اس کے پاس گھر میں کوئی داخل نہ ہو مگر اس کے محرم کے ساتھ۔ایک شخص عرض گزار ہوا کہ یارسول اللہ ﷺ!میں فلاں لشکر کے ساتھ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور میری بیوی حج کے لئے جانا چاہتی ہے؟فرمایا کہ اس(اپنی بیوی) کے ساتھ جاؤ''،(صحیح بخاری،رقم الحدیث1862 المکتبۃ العصریہ،بیروت)۔

عورت کا بغیر محرم سفر کرنا ناجائز ہے،نیز عدت کے دنوں میں سفر بدرجہ اولیٰ نہیں کیا جاسکتا، علامہ کمال الدین ابن الہمام لکھتے ہیں:

(مات عنھازوجھا فی مصر فانھا لاتخرج حتیٰ تعتد ثمّ تخرج ان کان لھا محرم)۔

ترجمہ:''اگر اس کا شوہر شہر میں فوت ہوجائے پس وہ نہ نکلے یہاں تک کہ عدت مکمل کرے پھر نکلے اگر اس کے ساتھ محرم ہو''،(فتح القدیر جلد 4،ص: 312,313 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا،گجرات،ہند)۔

بظاہر اس مسئلے کی رو سے ایسا کوئی عذر قائم نہیں ہورہا کہ محترمہ سفر کو نکلیں مذکورہ بالا دلائل سے یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ بغیر محرم سفر کرنا شریعت کے خلاف ہے،اور رہی ویزا پالیسی!یہ دنیاوی معاملات میں شامل ہے۔ہاں!یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے بیٹے کو پاکستان بلائیں اور انقضائے عدت کے بعد آپ سفر کے لئے روانہ ہوجائیں۔

ایام عدّت یامدتِ عدّت کی پابندی شرعی ضرورت ہے جب کہ برطانیہ کے ویزے کا حصول یا اس کی تجدید یا اس کی مدت میں اضافہ شرعی ضرورت نہیں ہے لہٰذا اس بنا پر ہم ازروئے شریعت تکمیل عدّت سے پہلے سفر کی اجازت نہیں دے سکتے۔اگر کوئی شخص اپنی دنیوی

ضرورتوں کے تحت حدودِ شرع سے تجاوز کرنا چاہتا ہے تو یہ اس شخص کا اپنا فیصلہ ہے، اس کا مفتی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن وسنت میں طے شدہ یا منصوص امور میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہوتی۔

آپ نے سوال میں یہ تو لکھا ہے کہ 15، مارچ تک برطانیہ کے سابقہ امیگریشن قوانین بحال رہیں گے، لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ پاکستان میں رہتے ہوئے، اگر آپ ویزے میں توسیع کی درخواست دیں تو آیا قانون میں اس کی اجازت ہے یا نہیں؟۔ اگر پاکستان میں رہتے ہوئے ویزے کی مدت میں توسیع کی درخواست دی جاسکتی ہو تو پھر آپ کے لئے کوئی مجبوری نہیں ہے۔

عدت کے دوران بیوہ کو سسرال والے گھر سے نکالتے ہیں

سوال:132

میری بہن کے شوہر کا انتقال تقریباً دو مہینے پہلے ہوا ہے اور ابھی وہ عدت میں ہے مگر اس کے سسرال والے اس پر بہت ظلم کرتے ہیں مثلاً مارنا، کھانا نہ دینا، اکثر ان کو گھر سے باہر بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا تو اپنی ماں کے گھر پر مگر دو بچوں کو رکھتے ہیں اور تین بچے ان کے ساتھ بھیجتے ہیں یہ ساری بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کیا ہم اس کو عدت کے دوران اپنے گھر لا سکتے ہیں یا نہیں، ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام کیا کہتا ہے، اس میں آپ ہماری رہنمائی فرمائیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، (رفیق، فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ

ترجمہ: ''تم انہیں (عدت میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں''، (الطلاق:1)۔

عورت کے لئے عدت اسی مکان میں واجب ہے جو بوقتِ وفاتِ شوہر اس کی جائے سکونت

ہے۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(طلقت) أو مات وهی زائرة(فی غیر مسکنهاعادت الیه فوراً) لوجوبه علیها (وتعتدان) أی معتدة (فی بیت وجبت فیه)ولا یخرجان منه (الّا أن تخرج، أو ینهدم المنزل أوتخاف) انهدامه، أو (تلف مالها،أو لاتجد کراء البیت) و نحو ذالک من الضرورات،فتخرج لأقرب موضع الیه۔

ترجمہ:'' عورت کوطلاق دی گئی یا اس کا شوہر وفات پا گیااور وہ اپنے گھر کے علاوہ کہیں اور گئی ہوئی تھی ،تو اسے چاہئے کہ فوراً اپنے گھر لوٹ آئے ، کیونکہ یہ اس پر واجب ہے، بیوی عدتِ طلاق گزار رہی ہو یا عدتِ وفات، ان دونوں کو چاہئے کہ اسی گھر میں عدت گزاریں جہاں پر عدت گزارنا، ان پر واجب ہے،سوائے اس کے کہ انہیں (اس گھر سے) نکال دیا جائے یا مکان گر جائے یا اس کے گرنے کا خدشہ ہو یا اس کا مال تلف ہونے کا خطرہ ہو یا (مکان کرائے کا ہونے کی صورت میں) کرایہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو، ان جیسی صورتوں (یا مجبوریوں) کی بناء پر اس کے لئے جائز ہے کہ وہاں سے نکل کر اس سے قریب ترین جگہ پر عدت گزارے''، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 5 ص:180 داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

لہٰذا آپ کی معتدہ بہن پر شرعاً لازم ہے کہ وہ اپنی عدت وفات اسی مکان میں پوری کرے، لیکن جو لوگ اس کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں کہ اسے گھر سے نکال کر بٹھا دیتے ہیں ان کا یہ عمل غیر شرعی اور احکاماتِ الٰہیہ کی کھلی خلاف ورزی ہے، برادری و محلے کے شرفاء کو چاہئے کہ انہیں ان کے اس غیر شرعی عمل پر غیرت دلائیں اور سمجھائیں کہ معتدہ کو کم از کم عدت کے ایام اس گھر میں گزارنے دیں، آپ کی بہن جس مکان میں رہ رہی تھیں، اگر وہ ان کے شوہر کی ملکیت ہے تو اس پر ان کا اور ان کے بچوں کا حق وراثت بھی ہے، اسی طرح چھوٹے بچوں کی پرورش ونگہداشت شرعاً وقانوناً ماں کا حق ہے، لہٰذا سسرال والوں کا، ان کے بعض بچوں کو جدا کرنا قطع رحمی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن محمد بن جبیر بن مطعم،عن أبیه قال :قال رسول الله ﷺ : "لایدخل

الجنة قاطع"۔قال ابن أبی عمر:قال سفیان:یعنی قاطع رحم۔
ترجمہ:محمد بن جبیر بن مطعم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا،ابن ابی عمر فرماتے ہیں: کہ سفیان نے فرمایا:
یعنی رشتے توڑنے والا،(سنن ترمذی رقم الحدیث:1909،مطبوعہ دارالکتب علمیہ بیروت)۔
صلۂ رحمی سے متعلق رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:
عن أبی هريرة قال : أبصرالأقرع بن حابس النبی ﷺ وهو يقبل الحسن۔
قال ابن أبی عمر الحسين أو الحسن۔فقال : انّ لی من الولدعشرة، ما قبلت
أحداً منهم فقال رسول الله ﷺ: اِنَّه مَن لا يَرحَمُ لا يُرحَمُ"۔
ترجمہ:'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اقرع بن حابس نے دیکھا کہ رسول اللہ
ﷺ حضرت حسن کو چوم رہے ہیں (ابن ابی عمر فرماتے ہیں کہ حسین یا حسن تھے)۔اس
نے کہا: میرے دس بچے ہیں، میں ان میں سے کسی ایک کو بھی بوسہ نہیں دیتا،پس رسول اللہ
ﷺ نے فرمایا: جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا''،(سنن ترمذی رقم الحدیث:1911)۔
تاہم اگر سوال میں درج آپ کا بیان درست ہے،تو سسرال والوں کے شر واذیت سے
بچانے کے لئے آپ اپنی بہن کو دورانِ عدت بھی عدت گزارنے کے لئے اپنے گھر
لا سکتے ہیں۔

﴿کتابُ الرضاع﴾

مسئلہ رضاعت

سوال:133

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ زید نے اپنے چچا عمر کے ساتھ (زینب) اپنی دادی کا دودھ پیا ہے اور عمر نے زید کے ساتھ اپنی بھابھی (والدۂ زید) ہند کا دودھ پیا ہے، اب زید کا چھوٹا بھائی ہے حسن اور عمر کی بیٹی ہے فاطمہ، حسن، فاطمہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے، لہٰذا قرآن وسنت کی روشنی میں یہ ظاہر فرمائیں کہ حسن کا عقد نکاح فاطمہ کے ساتھ از روئے شریعت مطہرہ جائز ہے یا کہ نہیں؟ (گلزار احمد، اورنگی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ عنہا میں چونکہ عمر نے اپنی بھابھی یعنی زید اور حسن کی والدہ کا بھی دودھ پیا ہے، لہٰذا عمر، زید اور حسن کا چچا ہونے کے علاوہ رضاعی بھائی بھی ہوا اور شریعت اسلامیہ کی رو سے، نسب کی وجہ سے جو رشتے حرام ہیں، وہ رضاعی یعنی دودھ کے رشتے میں بھی حرام ہوتے ہیں۔ چونکہ نسبی بھتیجی سے از روئے شرع نکاح حرام ہے، لہٰذا رضاعی بھتیجی سے بھی نکاح حرام ہوگا۔ اس تمہید کے بعد صورۃ مسئولہ میں عمر کی بیٹی مسماۃ فاطمہ کا عقد نکاح حسن کے ساتھ ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ فاطمہ حسن کی رضاعی بھتیجی ہے۔

شک سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی

سوال:134

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا، اس سے پہلے میری ایک بیٹی ہے۔ میرے بھائی کے گھر میرے بیٹے کی پیدائش کے ایک ماہ بعد بیٹا پیدا ہوا۔ بھائی نے اپنے بیٹے کی ختنہ کروائی اور ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ اس تقریب میں، میں نے بھی شرکت کی اور بھی رشتہ دار وہاں موجود تھے۔ اسی

دوران بھائی کا بچہ رونے لگا، میں نے کہا اس کی امی کو جگاؤ تاکہ بچے کو دودھ پلائے، میرے بھائی کے سسر نے کہا کہ اسے سونے دو (یعنی بچے کی ماں کو)۔ اور تم اپنا دودھ پلا دو، مجھے ان کی اس بات پر غصہ آیا اور میں نے اپنے بھتیجے کو اپنے دودھ سے لگایا۔ اسی دوران فوراً ہی میری والدہ نے بچے کو میری گود سے چھین لیا اور کہا یہ کیا کر رہی ہو۔ اب اس کے منہ میں دودھ کے قطرے گئے یا نہیں، مجھے علم نہیں، کیونکہ فوراً ہی میری والدہ نے بچے کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ اور اب میرے بھائی میری بیٹی سے اپنے بیٹے کی شادی کرانا چاہتے ہیں۔

نوٹ: جب میں نے اپنے بھائی کے لڑکے کو دودھ سے لگایا، تو میری گود میں میرا اپنا بیٹا تھا۔ ان دونوں سے پہلے میری لڑکی ہے، جس کا رشتہ میرے بھائی مانگ رہے ہیں اپنے بھائی کو رشتہ دوں یا نہ دوں، اس کا حل بتا دیں، (منیر بیگ، محمود 3/1199 شاہ فیصل کالونی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں چونکہ سائلہ کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ آیا دودھ کا قطرہ بچے کے منہ میں گیا یا نہیں۔ اگر یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی اور مذکورہ لڑکے اور لڑکی کا رشتہ از روئے شرع جائز ہے۔ البتہ اگر از راہِ احتیاط بچا جائے تو بہتر ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

المرأة اذا جعلت ثديها فی فم الصبی ولا تعرف امص اللبن ام لافقی القضآء لاتثبت الحرمة بالشک وفی الاحتیاط تثبت۔

ترجمہ: ''عورت جب اپنا پستان بچے کے منہ دے دے، اور اسے یہ پتا نہ چلے کہ بچے نے دودھ چوسا یا نہیں، تو قضاءً تو حرمتِ (رضاعت) ثابت نہیں ہوگی، اور اگر کوئی تقوے اور احتیاط (شرعی) پر عمل کرنا چاہے تو اجتناب کرے امکان ثبوت موجود ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 344 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

الاشباہ والنظائر ص: 34 میں ہے:

لو ادخلت المرأة حلمة ثديها فی فم رضيعة ووقع الشک فی وصول اللبن الیٰ

جو فیھا لم تحرم لان فی المانع شکاالخ۔
ترجمہ:''اگر دودھ پلانے والی عورت نے اپنا پستان دودھ پینے والے بچے کے منہ میں دیا، لیکن اس بات میں شک واقع ہوگیا کہ دودھ بچے کے پیٹ تک پہنچا یا نہیں، تو حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی، کیونکہ شک سے حکم قطعی ثابت نہیں ہوتا''، واللہ اعلم بالصواب۔

رضاعی بھتیجی سے نکاح جائز نہیں

سوال:135

میری والدہ نے میرے چچا کو میری بڑی بہن کے ساتھ دودھ پلایا ہے، کیا میرا نکاح، میرے اس چچا کی لڑکی کے ساتھ جائز ہے یا نہیں؟ میں اپنی بڑی بہن سے نویں نمبر پر ہوں اور میرے چچا کی یہ لڑکی پانچویں نمبر پر ہے۔شریعت کی رو سے مسئلہ کو تفصیل سے مدلل بیان فرمائیں،(محمد اکرم، بلاک F موسیٰ کالونی کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ

ترجمہ:''اور تمہاری مائیں، جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں (تم پر حرام کی گئیں)''، (النساء، آیت23)۔

۱۔عن عائشة قالت : قال لی رسول اللہ ﷺ:"یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة"۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:3505، مکتبہ نزار مصطفی الباز، مکۃ المکرمۃ)

۲۔عن ابن عباس قال : قیل للنبی ﷺ: الا تتزوّج ابنة حمزة؟، قال : "انھا ابنة اخی من الرضاعة۔"

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے عرض کی گئی کہ آپ حضرت حمزہ کی صاحبزادی سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟، ارشاد فرمایا:''وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5100، مکتبۃ العصریہ، بیروت)۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ عالمگیری میں لکھتے ہیں:

"یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع واصو لھما وفروعھما من النسب والرضاع جمیعاً حتیٰ ان المرضعۃ لو ولدت من ھذاالرجل او غیرہ قبل ھذاالارضاع اوبعدہ اوارضعت رضیعاًاو ولد لھذا الرجل من غیرھذہ المراۃ قبل ھذاالارضاع اوبعدہ او ارضعت امراۃ من لبنہ رضیعا فالکل اخوۃ الرضیع واخواتہ واولادھم اولاداخوتہ اواخواتہ واخوالرجل عمہ واختہ عمتہ واخوالمرضعۃ خالہ واختھا خالتہ وکذا فی الجد والجدۃ۔

ترجمہ:''دودھ پینے والے پراس کے رضاعی ماں باپ اوران کے تمام اصول اورفروع حرام ہوجاتے ہیں، خواہ وہ نسباً اصول وفروع ہوں یارضاعاً حتی کہ اگردودھ پلانے والی کے ہاں اس کے موجودہ شوہر سے یاکسی اورشوہر سے کوئی اولاد ہو، خواہ دودھ پلانے سے پہلے یا دودھ پلانے کے بعد ہو یاوہ کسی اور بچے کودودھ پلائے یادودھ پلانے والی کے شوہر کی کسی اور بیوی سے اولاد ہو، خواہ اس کودودھ پلانے سے پہلے یابعد، تو یہ سب دودھ پینے والے کے بھائی اور بہن اوران کی اولاد اس کے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہیں، دودھ پلانے والی کے شوہر کا بھائی اس کا چچا ہے اوراس کی بہن اس کی پھوپھی ہے اوردودھ پلانے والی کا بھائی اس کا ماموں ہے اور بہن اس کی خالہ ہے، اسی طرح دادا، دادی اور نانا، نانی کے رشتے ہیں''، (فتاویٰ عالمگیری، جلداول، ص:343 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کا چچا، آپ کا رضاعی بھائی ہے اوراس کی لڑکی، آپ کی رضاعی بھتیجی ہے، لہٰذا اس سے آپ کا نکاح شرعی طور پرجائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

رضاعت کا ثبوت مرضعہ کے اقرار سے گواہوں سے ہوگا

سوال:136

میرا نام قاسمہ ہے میرے چار بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں، میری بہن جوشن آراء کے دو بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔ میری بیٹی کہکشاں کی پیدائش کے بعد میری طبیعت خراب رہی اور مجھے یہ شک ہے کہ شاید اس دوران میری بچی نے میری مرحومہ بہن جوشن آراء کا دودھ پیا ہو، لیکن میں نے دیکھا نہیں ہے اور نہ میری مرحومہ بہن نے کبھی بتایا اور نہ ہی کوئی رشتے دار اس کی گواہی دے رہا ہے کہ واقعی میری بیٹی نے میری بہن کا دودھ پیا ہے، میں چاہتی ہوں کہ اپنی بیٹی کہکشاں کی شادی اپنی مرحومہ بہن جوشن آراء کے بڑے بیٹے اعجاز کے ساتھ کردوں۔ جناب سے قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ درکار ہے کہ کیا کہکشاں اور اعجاز کی شادی ہوسکتی ہے یا نہیں؟، (قاسمہ، مکان نمبر R-191 سیکٹر 15-A/5 نارتھ کراچی)۔

جواب:

رضاعت کا ثبوت دودھ پلانے والی کے اقرار سے ہوگا یا گواہانِ شرعیہ سے ہوگا۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: الرضاع یظھر باحد أمرین أحدھما الاقرار والثانی البینة کذا فی البدائع۔

ترجمہ: ''رضاعت دو طریقوں سے ثابت ہوگی، ایک یہ ہے کہ مرضعہ (دودھ پلانے والی) خود اقرار کرے، دوسرا یہ کہ اس پر شرعی گواہ ہوں''، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 صفحہ 347، مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

چونکہ اقرار اور گواہی دونوں یہاں مفقود ہیں اور محض شک وشبہ پایا جاتا ہے کہ جوشن آراء مرحومہ نے دودھ پلایا ہے یا نہیں؟، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

لا تثبت الحرمة بالشک۔

ترجمہ: ''شک سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی''، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 صفحہ 344 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ اجتناب کیا جائے ،لیکن اگر احتیاط پر عمل نہ کیا اور نکاح کر دیا تو نکاح کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔

مسئلہ رضاعت

سوال:137

ہندہ کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی اور اس نے دو سال مکمل بچے کو دودھ پلایا اس کے بعد تقریباً ایک سال نو ماہ بعد زینب کے یہاں بچی کی ولادت ہوئی، اور اس بچی کو لا کر ہندہ کی گود میں ڈال دیا اور کہا کہ اس کو دودھ پلا دو کہ شرط پوری ہو جائے جب ہندہ سے پوچھا کہ بچی کو دودھ پلاتے وقت کیا چھاتی میں دودھ تھا تو ہندہ نے جواب دیا کہ میں نے اپنے بچے کو تقریباً ایک سال نو ماہ پہلے دودھ چھڑا دیا تھا اب چھاتی میں کیا دودھ ہوگا۔
دریافت یہ کرنا ہے کہ رضاعت ثابت ہے یا نہیں؟۔
(مولانا ضیاء الرحمٰن صابری، جامع مسجد ابراہیم بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

مذکورہ استفتاء میں ہندہ کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بچے کو دو سال کامل دودھ پلایا پھر ایک سال نو ماہ مزید گزرنے کے بعد اس نے زینب کی بچی کو دودھ پلایا لیکن اسے یہ یقین نہیں کہ پستان میں دودھ تھا یا نہیں؟، چونکہ اس بات کا یقین نہیں پایا جاتا کہ دودھ کا قطرہ بچے کے منہ میں گیا یا نہیں، تو رضاعت وحرمت کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔
درمختار میں ہے:
فلو التقم الحلمة ولم یدرأدخل اللبن فی حلقه ام لا لم یحرم ،لان فی المانع شکاً۔"ولوالجیة"۔
ترجمہ: "پس اگر دودھ پلانے والی عورت نے پستان بچے کے منہ میں دیا، لیکن یہ پتا نہیں چلا کہ آیا دودھ بچے کے حلق میں گیا یا نہیں، تو حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی، اس لئے کہ شک سے حکم قطعی ثابت نہیں ہوتا"۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

و فی "الفتح ": لو أدخلت الحلمة فی فم الصّبی وشکت فی الارتضاع لا تثبت الحرمة بالشک۔

ترجمہ: "اور فتح القدیر میں ہے: اگر دودھ پلانے والی ماں نے بچے کے منہ میں پستان داخل کیا اور شک ہوگیا کہ دودھ پیا ہے یا نہیں، شک سے حرمت ثابت نہیں ہوتی"،

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4 صفحہ 296، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

المرأة اذا جعلت ثدیها فی فم الصبی و لا تعرف أمص اللبن أم لا ففی القضاء لا تثبت الحرمة با لشک و فی الاحتیاط تثبت ۔

ترجمہ: "عورت جب اپنا پستان بچے کے منہ میں دے دے، اور اسے یہ پتہ نہ چلے کہ بچے نے دودھ چوسا یا نہیں، تو قضاءً تو حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی، اور اگر کوئی تقویٰ اور احتیاط (شرعی) پر عمل کرنا چاہے تو اجتناب کرے (کیونکہ امکان ثبوت موجود ہے)"،

(عالمگیری، جلد اول ص: 344 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

﴿کتاب الفرائض﴾

والدین کی نافرمانی کا وبال اور اولاد کو عاق کرنے کی شرعی حیثیت

سوال: 138

میری بڑی بیٹی میری اور اپنی ماں کی نافرمان ہے، لہٰذا میں اسے عاق کرتا ہوں اور اس کے کسی معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، اور نہ ہی اس کے کسی لین دین کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے، عاق کرنے کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

1۔سب سے پہلے اپنے گھر والوں کے ساتھ سرکشی کا رویہ اختیار کیا خصوصاً چھوٹے بھائی سے ہر روز لڑنا جھگڑنا اور ناخونوں سے چہرہ زخمی کرنا ایک معمول بنالیا تھا جو شخص دخل دیتا گالیاں کھاتا۔

2۔شادی کے بعد ساس، سسر، شوہر اور اس کے اہل خانہ سے ہر وقت ہنگامہ آرائی کرنا۔ چھوٹوں اور بڑوں کا لحاظ کئے بغیر انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کرنا ایک بہت ہی مشکل مرحلہ بن گیا۔باوجود اس حقیقت کے ہم سب لوگوں نے بارہا مداخلت کر کے معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کی مگر کوئی بات کارگر نہیں ہوئی آخر کار سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا اور بچی رکھ لی۔چار ماہ بعد لڑکے کی پیدائش ہوئی جو اس کے ساتھ ہے۔

3۔اس کے بعد نانا اور نانی کو گالیاں اور کوسنے دینے شروع کئے ہر وقت ان کی قبروں میں کیڑے پڑنے کی بددعا دینی شروع کی اور ساتھ یہ کہ جو بھی نازیبا الفاظ کہہ سکتی تھی روزانہ فون کر کے کہتی تھی یہاں تک کہ ان لوگوں نے اپنی بیٹی کے گھر آنا جانا ترک کر دیا۔میرے سسر اپنی بیٹی سے ملنے اچانک 28دسمبر 2000ء کو آئے اور چند منٹوں بعد واپس جانے لگے پیر پھسلنے سے گرے اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی چونکہ ذیابیطس کے مریض ہونے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئے تھے 30دسمبر 2000ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

4۔میری والدہ یعنی دادی کو خبیث بڑھیا کہتی تھی والدہ نے سن لیا اسی وقت میرے یہاں سے چلی گئیں اور تقریباً دس سال سے میرے گھر نہیں آئیں ہم لوگوں کے اصرار پر ہمیشہ

خاموشی سے بات کو ٹال دیتی ہیں۔اس کی وجہ سے میری والدہ کسی قیمت پر میرے گھر آنے پر راضی نہیں ہوتیں۔

5۔میری بیوی کی والدہ اس کی حرکتوں کی وجہ سے ہر روز صدمے سے دوچار ہوتی رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی ذیابیطس کی مریض ہو کر انتہائی کمزور ہوگئیں اور شوگر متعدد اوقات میں 580 سے لے کر 605 تک پہنچ جاتی ہے جس کی بنا پر میری بیوی کی ماں کو بار بار کوسنے دیتی ہے کہ اتنی شوگر ہونے کے باوجود یہ بڑھیا مرتی نہیں ہے کہ مجھے صبر آجائے۔

6۔اپنے بیٹے پر بھی بے انتہا ظلم وتشدد کرتی تھی اس دوران کئی مرتبہ افرادِ خانہ کو مداخلت کرنی پڑی تھی جس کے صلہ میں ناشائستہ اور انتہائی تکالیف دہ الفاظ سننے کو ملتے تھے،کئی مرتبہ تو اپنی ماں کو دھکا دیا دو مرتبہ ماں دھکے سے زمین پر گری کافی چوٹیں آئیں اور کندھا کافی زخمی ہوا جو کہ شوگر کی مریضہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک پوری طرح کام نہیں کرتا۔کئی مرتبہ یہ سوچا گیا کہ انسدادِ بے رحمی والوں کو اطلاع دی جائے مگر کچھ مجبوریوں کی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔

7۔سب سے آخر میں میری باری بھی آگئی۔چونکہ میں دل کا مریض ہوں اور روڈ ایکسیڈنٹ ہونے کی وجہ سے ضعیفی میں اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا ہے، بیٹی کی غلط بات کی وجہ سے اور باپ ہونے کے ناطے ٹوک دیتا تھا۔ پہلے تو صرف زبان سے مجھے برا بھلا کہتی تھی اس کے بعد میری خرابی صحت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دو مرتبہ میری پٹائی کردی۔پہلی بار تو ناخنوں سے میرا چہرہ زخمی کیا۔میرا چشمہ توڑ دیا اور گریبان پھاڑ دیا اتفاقاً میرا چھوٹا داماد آگیا اور اس نے مجھے بچایا۔دوسری مرتبہ چپلوں سے میری پٹائی کی اور میں اپنی کمزوری کی وجہ سے اپنا دفاع بھی نہیں کرسکا۔آج جب میں تفصیلات لکھ رہا تھا اسی دوران بلاوجہ گھر کی ملازمہ کی پٹائی کردی اور دھمکی دی کہ میں تجھے جلا کر مار ڈالوں گی،شریف اور غریب ملازمہ ہم لوگوں کے سمجھانے کی وجہ سے خاموش رہی۔اب جبکہ حالات بالکل قابو سے باہر ہوگئے ہیں اس لئے مجھے یہ عاق نامہ تفصیل کے ساتھ لکھنا پڑا،اسی عاق نامہ کے ذریعہ اپنے عزیزوں،رشتہ داروں اور قریبی دوستوں کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ میرے مرنے پر میری بڑی بیٹی اور اس کے بیٹے کو

میرے جنازے میں اور میرے لئے کسی بھی ایصال ثواب کی مجلس / محفل میں ہرگز ہرگز شریک نہ ہونے دیا جائے۔ جو شخص / اشخاص حالات کی تفصیل کو جانتے ہوئے، میری بیٹی اور نواسے کو شرکت سے نہ روکے گا تو وہ شخص یا اشخاص اللہ رب العزت کے سامنے روز قیامت میرا مجرم تصور کیا جائے گا۔ تحریر لکھ دی ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

☆ اوپر دی ہوئی تفصیلات کی روشنی میں اس تمام سلسلے کی شرعی نوعیت کیا ہے؟۔

☆ کیا اس کو اوپر دی ہوئی وجوہات کی بناء پر ہر قسم کی وراثت سے محروم کیا جاسکتا ہے؟۔

(سید فاروق احمد، A.333 بلاک نمبر 5 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

والدین کی نافرمانی اور ان کی ایذا رسانی انتہائی شقاوت، بدنصیبی، دنیا میں رسوائی اور عاقبت کی بربادی کا باعث ہے، حدیث مبارک میں ہے: عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ: ایک نوجوان قریب المرگ ہے، اسے کلمہ " لا الہ الا اللہ" کی تلقین کی جارہی ہے، لیکن کلمہ طیبہ اس کی زبان پر جاری نہیں ہو پارہا، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا وہ اپنی زندگی میں کلمہ طیبہ نہیں پڑھتا تھا؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں، وہ پڑھتا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا تو اب موت کے وقت اس کی زبان پر کلمہ جاری ہونے سے کیا چیز مانع ہوگئی ہے؟ صحابی بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ اٹھ کر وہاں تشریف لے گئے اور ہم بھی آپ کے ہمراہ گئے، یہاں تک کہ ہم سب اس قریب المرگ نوجوان کے پاس پہنچ گئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نوجوان! کلمہ "لا الہ الا اللہ" پڑھو، اس نے عرض کیا: میری زبان پر کلمہ جاری نہیں ہو پارہا، حضور ﷺ نے دریافت فرمایا: کیوں؟، اس نے عرض کیا: اپنی ماں کی نافرمانی کے سبب، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا وہ زندہ ہے؟، اس نے عرض کیا: ہاں وہ زندہ ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کی ماں کو بلاؤ، وہ حاضر ہوئیں، آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کیا یہ تمہارا بیٹا ہے؟، اس نے عرض کیا: جی

ہاں!، آپ نے فرمایا: بتاؤ، اگر آگ بھڑکا دی جائے اور تم سے کہا جائے کہ اگر تم اس کی شفاعت نہیں کروگی تو اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا، اس نے عرض کیا: تب میں ضرور اس کی شفاعت کروں گی، تو حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کو گواہ بنا کر کہو اور ہم بھی گواہ بنتے ہیں کہ تم اس سے راضی ہوگئی ہو، اس نے عرض کیا: (یارسول اللہ ﷺ) میں اپنے بیٹے سے راضی ہوگئی، پھر آپ ﷺ نے اس نوجوان سے فرمایا: کلمہ "لا الہ الا اللہ" پڑھو، تو اس نے (آسانی سے) کلمہ طیبہ پڑھ لیا، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ جل شانہ کا شکر ہے کہ اس نے میری وجہ سے اس نوجوان کو نارِ جہنم سے بچالیا۔

یہ روایت شرح الصدور، طبرانی اور بیہقی کی شعب الایمان میں مذکور ہے اور علامہ ابن حجر عسقلانی کی ''زواجر'' میں بھی مذکور ہے۔

علامہ ابن حجر نے اس واقعے کی مزید تفصیلات بیان کی ہیں، کہ اس نوجوان کا نام علقمہ تھا، یہ صوم وصلوٰۃ کا پابند، نہایت عبادت گزار اور صدقات دینے کا عادی تھا، یہ جب شدید بیمار پڑ گئے تو ان کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ کو ان کی تشویشناک حالت کی اطلاع دی کہ میرے شوہر نزع کی حالت میں ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ بلال، عمار اور صہیب رضی اللہ عنہم کو بھیجا، وہ آئے اور جب اسے حالت نزع میں پایا تو اسے کلمہ "لا الہ الا اللہ" کی تلقین کرنے لگے، لیکن کلمہ پاک اس کی زبان پر جاری نہیں ہو پا رہا تھا، تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع دی۔

آپ نے دریافت فرمایا:

کیا اس کے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے، آپ کو بتایا گیا کہ اس کی بوڑھی ماں زندہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی ماں کو پیغام بھیجا کہ آپ چل کر آسکتی ہوں تو فبھا ورنہ اپنے گھر پر میرا انتظار کریں، جب اس خاتون کے پاس رسول اللہ ﷺ کا قاصد آیا اور اسے صورت حال کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا: آپ پر میری جان قربان ہو، میں خود حاضر خدمت ہوں گی، وہ لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی اور سلام عرض کیا،

حضور ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: اے علقمہ کی ماں: مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ، اگر جھوٹ بولوگی تو میرے پاس وحی ربانی آجائے گی، پھر فرمایا ''تمہارے بیٹے کے معاملات کیسے تھے''۔؟اس نے عرض کیا! یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)، وہ بکثرت نماز پڑھتا تھا، روزے رکھتا تھا، صدقات دیتا تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا:
تمہارے ساتھ اس کا معاملہ کیسا تھا؟، اس نے عرض کیا: میں اس سے ناراض ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا! کیوں؟ اس نے عرض کیا: یہ اپنی بیوی کو مجھ پر ترجیح دیتا تھا اور میری نافرمانی کرتا تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! علقمہ کی ماں کی ناراضی کے سبب اس کی زبان پر (حالت نزع میں) کلمہ طیبہ جاری نہیں ہو پارہا۔
پھر آپ ﷺ نے حکم فرمایا: بلال! جاؤ اور بہت سی لکڑیاں جمع کرو، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ ان سے کیا کریں گے۔؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اسے آگ میں جلاؤں گا۔ تو علقمہ کی ماں نے عرض کیا! یارسول اللہ! یہ میرا بیٹا ہے، میں اپنے سامنے اپنے بیٹے کو آگ میں جلتا ہوا برداشت نہیں کرپاؤں گی۔
تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ام علقمہ: اللہ کا عذاب تو اس سے بدرجہا زیادہ سخت اور دائمی ہے، اگر تو چاہتی ہے کہ اللہ جل شانہ اسے معاف فرمادے تو تو اس سے راضی ہوجا۔ تو اس بوڑھی ماں نے عرض کیا! یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم): میں اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام موجود مسلمانوں کو گواہ بنا کر اقرار کرتی ہوں کہ میں اپنے بیٹے علقمہ سے راضی ہوچکی ہوں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے بلال سے فرمایا کہ جاکر دیکھو اب علقمہ کی زبان پر کلمہ جاری ہوچکا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ام علقمہ نے اس کو دل سے معاف نہ کیا ہو بلکہ میری دل داری کی خاطر کہہ دیا ہو۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں گئے تو انہوں نے اندر سے علقمہ کو کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے سنا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہاں پر موجود لوگوں کو بتایا کہ علقمہ کی ماں کی ناراضی کے سبب اس کی زبان پر کلمہ جاری نہیں ہو پارہا تھا، اب ماں کے راضی ہونے پر جاری ہوگیا، پھر اسی دن علقمہ کا وصال ہوگیا، پھر حضور

ﷺ نے اس کے غسل وکفن کا حکم فرمایا، اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کی تدفین کے موقع پر تشریف لائے اور اس کی قبر کے کنارے پر کھڑے ہو کر فرمایا: اے گروہ مہاجرین وانصار! جس نے اپنی بیوی کو اپنی ماں پر فضیلت دی، اس پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور لوگوں کی لعنت ہے، اس کی کوئی فرض اور نفل عبادت قبول نہیں ہوگی۔ سوائے اس کے کہ وہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں توبہ کرے اور پھر اس کے بعد ماں سے حسن سلوک کرے اور ہمیشہ ماں کی رضا کا طلب گار رہے کیونکہ ماں کی رضا میں اللہ کی رضا، اور ماں کی ناراضی میں اللہ کی ناراضی ہے، (فتاویٰ قاسمیہ جلد اول ص ۲۸۲ تا ۲۸۳ مرتبہ مخدوم عبدالواحد سیوستانی)۔

اس تفصیلی روایت سے آپ بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ماں باپ کو ناراض کرنا شریعت کی نظر میں کتنا سنگین جرم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں جو ہم کہتے ہیں کہ وہ سب صادق تھے، عادل تھے، متقی تھے، مومن مخلص تھے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان میں کسی سے کبھی بھی بہ تقاضائے بشری کوئی خطا سرزد ہی نہ ہوئی ہو، بلکہ ہمارا ایمان واعتقاد یہ ہے کہ اگر ان میں سے کبھی کسی سے بہ تقاضائے بشری کوئی خطا سرزد ہو بھی گئی ہو تو فیضانِ صحبتِ نبوت سے ان کو توبہ نصوح وتوبہ صادقہ کی توفیق نصیب ہو جاتی تھی، اور حضور ﷺ کا کسی مومن صادق کی نماز جنازہ پڑھا لینا اور اس کیلئے دعائے مغفرت کرنا اس کی مغفرت کا سب سے بڑا وسیلہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے!

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ: ''آپ ان کے مالوں سے زکوۃ لیجئے جس کے ذریعے آپ انہیں پاک کریں گے اور ان کے باطن کو صاف کریں گے اور آپ ان کیلئے دعا کیجئے، بیشک آپ کی دعا ان کیلئے باعث تسکین ہے اور اللہ تعالیٰ بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے''، (التوبہ: ۱۰۳)۔

والدین کی نافرمانی کے بارے میں مزید احادیث ملاحظہ کیجئے:

۱۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین

آدمیوں کا اللہ تعالیٰ کوئی فرض قبول کرے گا نہ نفل، ماں باپ کا نافرمان، احسان جتانے والا اور تقدیر کو جھٹلانے والا، (کتاب السنۃ)۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، (ناحق کسی کو) قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا، (صحیح بخاری)۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین شخصوں پر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائے گا، (ایک) ماں باپ کا نافرمان، (دوسرا) عادی شرابی اور (تیسرا) کوئی چیز دے کر احسان جتانے والا، (نسائی رقم الحدیث:)۔

۴۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا: ''اس شخص کی ناک خاک آلود ہوگئی (یعنی وہ ذلیل اور رسوا ہوگیا)، عرض کیا گیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)! کون شخص؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص جو اپنے ماں باپ دونوں یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے میں پائے اور پھر (ان کی خدمت واطاعت کرکے) جنت میں داخلے کا حق دار نہ بنے، (صحیح مسلم رقم الحدیث:)۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: والد کی رضا میں رب کی رضا ہے اور والد کی ناراضی رب کی ناراضی کا سبب ہے، (ترمذی رقم الحدیث:)

ماں باپ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا

ترجمہ: انہیں اف تک نہ کہو اور انہیں جھڑکو نہیں، (بنی اسرائیل: ۲۳)۔

قرآن وسنت کے ان واضح ارشادات کی روشنی میں، آپ کی بیٹی کو دنیا وعاقبت برباد کرنے سے ڈرنا چاہیے۔ اپنے ماں باپ سے معافی مانگنی چاہیے اور ماں باپ کا اطاعت گزار بن کر رہنا چاہیے۔

ہر عاقل وبالغ شخص اپنے ہر قول وفعل کا ذمہ دار ہے۔ شریعت کی رو سے بھی اور قانون کی نظر میں بھی، لہٰذا آپ پر اپنی بالغ اولاد کے کسی فعل یا لین دین کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

جہاں تک اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا سوال ہے تو اس کا اختیار شرعاً والدین کو نہیں ہے، کیونکہ وراثت یا ترکہ اس مال کو کہتے ہیں جو کوئی شخص چھوڑ کر مرجاتا ہے۔ اس متروکہ مال میں مرنے والے کو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال پر وصیت کے ذریعے تصرف کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ وہ وفات سے پہلے اپنی زندگی میں ایسی وصیت کرچکا ہو، لیکن وصیت میں بھی یہ شرط ہے کہ وارث کے حق میں وہ معتبر ومؤثر نہیں ہوتی۔ باقی متروکہ مال پر وراثت کے احکام قرآن کا ثابت شدہ قانون ہے اور اس کے رد کرنے یا اس میں ردوبدل کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے، کسی ایک وارث کے حق میں بھی وصیت کو اس لئے ناقابل اعتبار اور غیر مؤثر قرار دیا گیا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے مقررہ نظام وراثت میں تبدیلی واقع ہوسکتی ہے۔ اسی طرح کوئی کسی کو اپنے جنازے میں شرکت سے منع کرنے کی وصیت کرلے تو یہ قابل عمل نہیں ہے اور باطل ہے، کیونکہ جنازہ میت کیلئے دعائے مغفرت ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، جسے شریعت نے مشروع کیا ہے۔ حکم شرع سے روکنا معصیت ہے اور معصیت میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے۔ لہٰذا میت کے ورثاء پر لازم نہیں ہے کہ وہ ایسی وصیت پر عمل کریں۔ حدیث پاک میں ہے: لا طاعة لمخلوق فی معصیة اللہ۔ ترجمہ: کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے، جس پر عمل پیرا ہونے سے اللہ تعالیٰ کی معصیت لازم آئے۔

اسی طرح کسی کیلئے دعائے مغفرت یا ایصال ثواب کوئی بھی کرسکتا ہے، بلکہ شریعت نے بتایا ہے کہ اگر کسی کے آپ پر حقوق ہیں: مثلاً آپ نے کسی کی غیبت کی ہے اور وہ شخص وفات پاچکا ہے اور اب اس سے معافی مانگنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اس کی تلافی کی ایک ممکنہ صورت یہ ہے کہ آپ اس کیلئے دعائے مغفرت کریں۔ قرآن مجید کی رو سے "مناع للخیر" (یعنی خیر سے روکنے والا) ہونا ایک مذموم صفت ہے، دنیوی زندگی میں ہر ایک کیلئے دعائے ہدایت کرسکتے ہیں اور کرنی چاہیے اور ہر زندہ یا فوت شدہ مومن کے لئے دعائے مغفرت کرسکتے ہیں بلکہ قرآن میں اسے اہل ایمان کے وصفِ کمال کے طور پر بیان

کیا گیا ہے، البتہ جس کے بارے میں قرائنِ ظاہری سے یقین ہو کہ اس کی موت کفر پر واقع ہوئی ہے، تو اس کیلئے دعائے مغفرت کرنا منع ہے۔

والدین کو ہمیشہ اپنی گمراہ اولاد کیلئے دعائے ہدایت کرنی چاہیے اور ان کیلئے بددعا ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ حدیث پاک میں ہے: اپنی اولاد کیلئے بددعا نہ کرو۔

اولاد میں سے کسی کو اپنے ماں باپ سے ان کی زندگی میں یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ اپنے مال یا جائیداد یا وراثت میں سے ہمیں حصہ دو۔ ہر عاقل و بالغ زندہ شخص کو اپنے مال پر شرعی حدود میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ اور جب تک کوئی شخص زندہ ہے، اس کا مال اس کی ملکیت ہے، ترکہ یا وراثت نہیں ہے کہ کوئی وارث بن کر اس میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرے۔

مسئلہ وراثت و ہبہ

سوال:139

ہم پانچ بہن بھائی ہیں، والدہ حیات ہیں، والد کے انتقال کو 4 سال گزر چکے ہیں، تین بہنیں کنواری ہیں، ایک والدہ اور دو بھائی ہیں۔ والد کی چھوڑی ہوئی جائداد میں ایک مکان ہے، ایک دکان ہے، اور ایک گاڑی ہے۔ والد اپنی زندگی میں والدہ اور تینوں بہنوں کے نام ایک ایک پلاٹ اسی اسی گز کا لے کر دے چکے ہیں، یہ پلاٹ ان لوگوں کے نام پر ہیں۔ بتائیے کہ والد کی وراثت کیسے تقسیم ہوگی اور والد مرحوم نے اپنی زندگی میں ہماری والدہ اور تینوں بہنوں کے نام جو پلاٹ لئے تھے، ان کا کیا حکم ہے، کیا وہ بھی ترکہ میں شامل ہیں، (محمد جاوید ولد خورشید احمد مکان نمبر 1672/15 دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں (ا) اگر سائل کا بیان درست ہے۔

(ب) اور ورثاء یہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، تو مصارف تجہیز و تکفین وضع کرنے، قرض کی ادائیگی (اگر کوئی ہو) اور زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک نفاذ وصیت کے بعد

(اگر متوفّٰی نے کی ہو)۔ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ترکے کے کل آٹھ حصے ہوں گے اور ہر ایک وارث کا حصہ مندرجہ ذیل ہوگا۔

بیوہ:1/8 ،دو بیٹے:4/8،(فی کس2/8)،تین بیٹیاں:3/8(فی کس1/8)۔شرعاً کوئی اپنی زندگی میں اولاد کو ہبہ دینا چاہے تو اسے سب کو مساوی حصہ دینا چاہیے،لیکن اگر مساوات کا لحاظ کئے بغیر کسی کو دے دیا تو وہ شرعاً ناپسندیدہ امر ہونے کے باوجود نافذ ہو جائے گا،لہٰذا متوفّٰی نے اپنی بیوی کو اپنی زندگی میں جو پلاٹ ہبہ کر کے اس کا مالک بنادیا تھا،وہ بلاکراہت جائز ہے،اور دونوں بیٹوں کو محروم رکھ کر اپنی تینوں بیٹیوں کو جو پلاٹ ہبہ کر کے ان کا مالک بنا دیا تھا،وہ بھی اب ان کی مالک ہیں،اگر چہ متوفّٰی کا یہ عمل شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے، لیکن یہ نافذ العمل ہو جاتا ہے۔

مسئلہ ہبہ

سوال:140

میری گزارش ہے کہ میرے شوہر حیات ہیں اور میری چار بیٹیاں ہیں اور دو بیٹے ہیں میں جس مکان میں رہتی ہوں یہ میرا اپنا ہے یعنی مجھے یہ اپنے میکے سے ملا اور اس کی تعمیر میں کچھ حصہ میرے شوہر کا بھی شامل ہے۔میرے دونوں بیٹے شادی شدہ ہیں لیکن میں ان کی کمائی میں سے کچھ نہیں لیتی میں یہ مکان بیچنا چاہتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اولاد کو ان کا حصہ دے دوں اور اپنا حصہ رکھ لوں تاکہ ہماری گزر بسر ہو سکے میں دوسرا گھر خرید سکتی ہوں یا رقم بینک میں بھی رکھ سکتی ہوں شرعی طور پر یہ تقسیم کس طرح سے ہوگی۔

مکان:120 گز ☆ لڑکیاں:چار لڑکے:دو،ہم میاں بیوی

(ولی النساء،R,21/15A2بفرزون،نارتھ کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں محترمہ ولی النساء صاحبہ اپنے مکان کی مالکہ ہیں،جب چاہیں اسے فروخت کر سکتی ہیں،شوہر نے مکان پر جو رقم خرچ کی ہے،اگر انہوں نے وہ رقم بطور

فضل واحسان کے دی تھی تو عنداللہ ماجور ہوں گے۔اور اگر انہوں نے وہ رقم قرض کے طور پر خرچ کی تھی،تو اسے واپس لے سکتے ہیں اور انہیں اس کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ مکان بیچنے کے بعد محترمہ اپنے لئے جتنی رقم پس انداز کر کے رکھنا چاہیں رکھ سکتی ہیں،وہ کل رقم بھی رکھ سکتی ہیں،یا اپنی مرضی کے مطابق جتنا حصہ رکھنا چاہیں رکھ سکتی ہیں،کیونکہ انہیں اپنے مال پر شرعاً اور قانوناً تصرف کا پورا حق حاصل ہے۔رقم کا جو حصہ وہ اولاد میں تقسیم کرنا چاہیں،یہ بطور وراثت کے نہیں ہوگا،کیونکہ ترکہ اور وراثت وہ مال کہلاتا ہے،جو آدمی کی وفات کے پیچھے رہ جائے۔زندگی میں کوئی اپنی اولاد کے درمیان کچھ مال تقسیم کرنا چاہے تو وہ ہبہ کہلاتا ہے،اور ہبہ کے لئے شرعاً مستحسن اور پسندیدہ امر یہ ہے کہ تمام اولاد بیٹوں اور بیٹیوں کو مساوی حصہ دیا جائے۔ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ (النساء:11) یعنی یہ کہ بیٹے کو بیٹی کے مقابلے میں دُگنا حصہ ملتا ہے،اس اصول کا اطلاق ترکے پر ہوتا ہے،ہبہ پر نہیں ہوتا۔

مرحومہ بیوی کے ترکے کا مسئلہ

سوال:141

محترمی درج ذیل مسئلہ میں قرآن و احادیثِ نبوی کی روشنی میں آپ سے رہنمائی کی درخواست ہے۔واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ مسمی غفران ولد عبدالسبحان کی شادی بتاریخ 16 فروری 2002ء حیدرآباد میں جناب مقبول احمد صاحب کی صاحبزادی سے انجام پائی۔مذکورہ خاتون کئی ماہ کی علالت کے بعد مورخہ 16 مارچ 2002ء کو لیاقت نیشنل ہسپتال میں انتقال کر گئیں۔انتقال کے بعد مقبول احمد صاحب یعنی خاتون مذکور کے والد، میت کراچی میں اپنے گھر لے گئے اور آخری رسوم وہیں پر ادا کی گئیں۔انتقال کے وقت مرحومہ غفران کی زوجیت میں تھیں۔مرحومہ کی کوئی اولاد نہیں ہے اور اسی طرح مہر کی رقم بھی ادا نہیں ہوئی ہے۔

سوال:142

(1) لڑکی کو جہیز میں ملنے والے سامان کا وارث اور حق دار کون ہے؟۔(2) مہر

کی رقم کے متعلق کیا ہدایت ہے، یعنی اب مہر کی رقم کن افراد کو ادا کی جائے؟۔(3) مزید کوئی کام از روئے شریعتِ محمد یہ کرنا ضروری ہو تو اس سلسلے میں بھی رہنمائی فرمائیں۔ (4) مرحومہ کے ورثاء کون کون لوگ ہوں گے اور وراثت میں کتنے کتنے حصے کے حق دار ہوں گے؟،(محمد صالحین)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں مسمّٰی محمد غفران نے اگر اپنی بیوی کا مہر ان کی زندگی میں ادا نہیں کیا ہے، تو یہ دین مہر اس کے شوہر کے ذمہ قرض ہے، اس کی ادائیگی ان پر لازم ہے اور یہ وفات شدہ بیوی کے ترکے میں شامل ہے، اسی طرح جہیز کا مال بھی مرحومہ کا ترکہ ہے۔ چونکہ مرحومہ کی کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے ان کے کل ترکے میں سے (بشمول مہر کی رقم وجہیز کے) ان کے شوہر کو نصف ملے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ

ترجمہ:''اور تمہاری بیویاں جو مال چھوڑ کر وفات پا جائیں، تو اس میں سے تمہیں آدھا مال ملے گا، اگر ان (بیویوں) کی اولاد نہیں ہے''،(النساء:12)۔ بقیہ نصف ترکہ مرحومہ کے دوسرے ورثاء کو شریعت کے مقررہ تناسب کے مطابق ملے گا، چونکہ سوال میں دوسرے وارثوں کا ذکر نہیں ہے، اس لئے ان کے حصے درج نہیں کئے جاسکتے۔ ورثاء کا تعین مفتی کا کام نہیں ہے، ان کے شرعی حصص کو بیان کرنا مفتی کا کام ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

تقسیمِ ترکہ

(دو بیوی، تین بیٹے، تین بیٹیاں)

سوال:143

مرحوم مالدار شخص تھے، مرحوم کی دو بیویاں ہیں، ایک بیوی سے بچے نہیں ہیں اور دوسری بیوی کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ برائے مہربانی ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا، تحریر فرما کر ثواب دارین حاصل کریں،(بی بی روحانہ، ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

نوٹ: تقسیم وراثت سے پہلے ایک جامع اصول سمجھ لیجئے کہ کسی بھی شخص کی وفات کے وقت جو مال وجائیداد اس کی ملک میں ہوتا ہے، وہ اس کا ورثہ، ترکہ یا مال متروکہ کہلاتا ہے۔ ترکے کی ورثاء میں تقسیم سے قبل، اس میں تین قسم کے مصارف کا منہا کرنا ضروری ہے، (1) مصارف تجہیز وتکفین وتدفین، (2) متوفی کے ذمہ اگر کوئی قرض ہے تو اس کی ادائیگی، (3) اگر متوفی نے اپنی وفات سے پہلے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک اس کی تنفیذ، اس کے بعد، اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، تو ترکہ ورثاء میں حسب ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا:

مرحوم کی ہر بیوی کا حصہ =9/144،	دو بیویوں کا مجموعی حصہ =18/144
ہر بیٹے کا حصہ =28/144،	تین بیٹوں کا مجموعی حصہ =84/144
ہر بیٹی کا حصہ =14/144،	تین بیٹیوں کا مجموعی حصہ =42/144

مسئلۂ وراثت

سوال:144

میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے، ان کے ورثاء میں تین افراد یعنی مرحوم کی بیوہ (میری والدہ) ایک بیٹا (یعنی میں) ایک بیٹی (یعنی میری بہن) ہیں، والدہ میرے ساتھ ہی رہتی ہیں، بیٹی شادی شدہ ہے۔ مرحوم کا کل ترکہ 60000 روپے ہے۔ برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں بتائیں کہ ہمارے درمیان یہ کس طرح تقسیم ہوگا؟، (عثمان فاروقی، R-14/9 دستگیر سوسائٹی، کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء یہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور تقسیم سے قبل کے لازمی حقوق کی ادائیگی (یعنی مصارف تجہیز وتکفین و تدفین، متوفی کے ذمہ اگر کوئی قرض تھا تو اس کی ادائیگی اور اگر اس نے کوئی وصیت کر رکھی

تھی، تو تہائی ترکے کی حد تک اس کی تنفیذ) کے بعد بقیہ ترکہ 24 حصوں میں تقسیم ہوگا۔ بیوہ کو 3 حصے، بیٹی کو 7 حصے اور بیٹے کو 14 حصے ملیں گے۔

تقسیم وراثت کا مطالبہ کرنا

سوال:145

میرا نام ریحانہ پروین بنت محمد ہاشم خان ہے اور والدہ کا نام انوری بیگم ہے۔
مسئلہ: میرے والد صاحب حیات ہیں، انہوں نے اپنی جائیداد فروخت کر دی ہے، جس سے ان کو کل رقم 1 کروڑ 80 لاکھ ملے ہیں، اس رقم کی تقسیم قرآن وسنت کی روشنی میں کس طرح ہونی چاہیے، ہم چھ بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ والدہ بھی حیات ہیں اور ہمارے والد صاحب کا کاروبار بھی ٹھیک ہے۔
نوٹ: ہم سب بہنیں اچھے حالات میں نہیں ہیں۔ ہم اپنا حصہ طلب کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنا حصہ لینا چاہیے۔ اور کس حساب سے لینا چاہیے۔ اور ہمارے والد صاحب کا اس مسئلے میں کیا حصہ بنتا ہے۔ اور ہمارے والد صاحب کو اس رقم کو ہم سب بہن بھائیوں میں کس طرح تقسیم کرنی چاہیے۔ مہربانی فرما کر (ہم 6 بہنوں کا حق کیا ہونا چاہیے۔) بیان فرمائیں،
(ریحانہ پروین، مکان نمبر 472 بلاک 2 ایف بی ایریا، عزیز آباد، کراچی)۔

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔
نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارک ہے:
حدثنی النعمان بن بشیر اَنَّ اُمَّہٗ بنتَ رواحۃَ سألت اباہ بعضَ الموھوبۃ من

مالہ لابنھا،فالتویٰ بھا سنۃً ،ثمّ بدا لہ۔فقا لت: لا ارضی حتّٰی تُشھدَ رسول اللہ ﷺ علیٰ ماوھبتَ لابنی، فاخذ ابی بیدی، وانا یومئِذٍ غلام، فاتیٰ رسول اللہ ﷺ فقال: یارسول اللہ ﷺ! انّ اُمّ ھذا، بنتَ رواحۃَ، اَعجبھا ان اُشھِدک علی الذی وَھبتُ لابنھا، فقال رسولُ اللہ ﷺ:"یا بشیرُ! اَ لکَ ولدٌ سویٰ ھذا؟" قال: نعم، فقال: اکلّھم وھبت لہ مثل ھذا؟ قال: لا۔ قال: فلا تشھدنی اِذن، فانّی لا اشھدُ علیٰ جورٍ".

ترجمہ:'' نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ ان کے بیٹے (حضرت نعمان) کو ہبہ کر دیں، میرے والد نے ایک سال تک یہ معاملہ ملتوی رکھا، پھر انہیں اس کا خیال آیا، میری والدہ نے کہا میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ تم میرے بیٹے کے ہبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ کرلو، میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے۔اس وقت میں نوعمر لڑکا تھا، انہوں نے کہا! یارسول اللہ ﷺ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ کرلوں، جو میں نے اپنے اس لڑکے کو ہبہ کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟، انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اتنا ہی مال ہبہ کیا ہے؟، انہوں نے کہا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:4104، جلد:7، مطبوعہ نزار مصطفیٰ الباز الریاض، مکۃ المکرمۃ)

مذکورہ حدیث سے واضح ہوا کہ جب کوئی شخص اپنی حیات میں اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے تو تمام اولاد کے درمیان مساوات کو روا رکھے۔تاہم باپ کی زندگی میں اولاد کو اس سے یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی وراثت تقسیم کردیں، کیونکہ ابھی تو ماشاء اللہ وہ حیات ہیں، اوران کا مال ترکہ تو ان کے انتقال پر بنے گا، اُس وقت جو شرعی ورثاء موجود ہوں گے، وہ حسب احکامِ شریعت اپنے اپنے حصے کے حق دار ہوں گے۔

بیوہ کی شادی سے اس کا حق وراثت باطل نہیں ہوتا

سوال:146

گزارش یہ ہے کہ میرے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے اس کی عدت میں نے پوری کر لی میرے والدین میری دوسری شادی کرانا چاہتے ہیں، میرے مرحوم شوہر سے کوئی اولاد نہیں ہوئی میرا ترکہ اس وقت برقرار ہے کہ نہیں صلاح الدین کی دوسری شادی نہیں ہوئی تھی اور فقط میں ہی ایک بیوہ تھی وہ لاولد فوت ہوئے تھے،(شاہدہ صلاح الدین R-913 بلاک نمبر ۱۵ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

بر تقدیر صدق سائلہ وصورت مسئولہ مساۃ شاہدہ صلاح الدین اپنے متوفی شوہر، جوکہ لاولد فوت ہوئے، کے ترکے میں سے ایک چوتھائی کی حق دار ہے، عدت وفات گزرنے کے بعد وہ کہیں بھی اپنی مرضی سے شادی کرسکتی ہے، اور شادی کی صورت میں بھی اس کا حق وراثت باطل نہیں ہوگا بلکہ قائم رہے گا، اسی طرح اگر شوہر نے اپنی زندگی میں اس کا مہر ادا نہیں کیا تھا، تو تقسیم ترکہ سے پہلے وہ اپنا دین مہر، قرض کی دیگر واجب الادا رقوم کی طرح وصولی کی حق دار ہوگی۔

اصول وراثت یہ ہے کہ کسی مورِث کے انتقال کے بعد جب ایک مرتبہ کسی وارث کا حق وراثت شرعاً ثابت ہوجائے، خواہ جملہ ترکہ سے بذریعہ تقسیم الگ کرکے اس پر اس وارث کا قبضہ ہوچکا ہو یا نہ ہو، وہ حق باطل نہیں ہوتا۔ حق وراثت کے تعین اور اثبات کے بعد خدانخواستہ اگر کسی وارث کا انتقال ہوجائے تب بھی اس کا حق باطل نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، جسے علم المیراث میں مناسخہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دفتر کے واجبات میں ورثاء کا حق

سوال:147

شریعت کے مطابق رقوم/ بقایا جات کی ادائیگی کے لئے فتویٰ درکار ہے۔

مسئلہ: میرے شوہر محمد اجمل صبیح (مرحوم) کراچی ثانوی تعلیمی بورڈ آفس میں بحیثیت کلرک ملازمت کرتے تھے، دورانِ ملازمت ان کے انتقال کے بعد جو واجبات ادارے کی جانب سے ملنے ہیں، ان پر مرحوم کی اہلیہ (میرا)، دونوں لڑکوں اور ان کی والدہ کا کتنا حق ہے اور شرعی طور پر اس رقم کی تقسیم کس طرح ہوگی۔

تفصیل:

میری شادی ۱۹۹۶ء میں ہوئی تھی اور شوہر کا انتقال ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ میرے دو بیٹے ہیں جن کی عمریں پانچ سال اور ڈھائی سال ہیں۔ میری ساس بیوہ ہیں سسر گورنمنٹ ڈیپارٹمنٹ میں تھے ان کا ریٹائرمنٹ اور میری شادی کے بعد انتقال ہوا تھا، اس کے علاوہ میرے شوہر کی دو شادی شدہ بہنیں ہیں جو اپنی ماں (میری ساس) کے ساتھ رہتی ہیں ایک بینک آفیسر اور دوسری انشورنس کا کام کرتی ہے، ہماری رہائش ایک لگژری فلیٹ میں تھی سسر کے انتقال کے بعد تمام بینک بیلنس، فلیٹ اور کمرشل پلاٹ تمام ساس کے نام ہے۔ دوسری بیٹی کی شادی سے قبل مجھے اور میرے شوہر کو گھر سے نکال دیا تھا، میرے شوہر انا پرست تھے گھر سے بے دخلی کے وقت انھوں نے یہ کہا تھا کہ اب ہمارا آپ کی دولت اور پراپرٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ شادی کے کچھ ماہ بعد آفس میں (Nomination Form) میں مجھے اور میری ساس کو آدھے آدھے کا وارث بنایا تھا جب حالات بگڑے اور گھر سے نکالا گیا تو میرے شوہر نے کہا تھا کہ میں تمھارا اور دونوں بچوں کا نام ڈلوا دوں گا لیکن قدرت نے انہیں اس کا موقع نہیں دیا، شوہر کے سوئم والے دن میری ساس اور نندوں نے دور اندیشی کے پیش نظر مجھے اور دونوں بچوں کو میری بیوہ ماں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے بھیج دیا اور اب تک کوئی تعلق نہیں رکھا۔ میرے بچوں کا میرے سوا کوئی سہارا نہیں میں ہی ان کی واحد کفیل ہوں۔ ادارے سے انشورنس کی کچھ رقم ملی تھی جس کا نصف حصہ میری ساس نے بغیر ہچکچاہٹ کے خود آفس سے لے لیا اب فنڈ کی کچھ رقم ملنی ہے (فنڈ سے پہلے ہی میرے شوہر نے نند کی شادی کے لئے ایک لاکھ روپے نکالے تھے) اس وجہ سے وہ بھی کم ہے۔ لہٰذا

موجودہ حالات کی روشنی میں مجھے شرعی لحاظ سے فتویٰ درکار ہے تاکہ میں ادارے سے مزید ملنے والی رقم خالصتاً بچوں کے بہتر مستقبل کے لئے لے سکوں۔ برائے مہربانی مجھے شرعی فتویٰ دیں جس سے واضح ہو کہ شوہر کی وراثت میں بیوہ اور یتیم بچوں کا کیا حق ہے۔ آپ کا دیا ہوا مشورہ میرے لئے قابلِ احترام ہوگا، (بیوہ محمد اجمل صبیح الدین، کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدق سائلہ وبعد ادائیگی حقوق متقدمہ علی الارث آپ کے شوہر کا ترکہ حسب ذیل طریقے سے تقسیم ہوگا۔ ترکہ کے کل 48 حصے ہوں گے اور ان میں سے ان کی والدہ کو آٹھ حصے، بیوہ کو 6 حصے اور ہر ایک بیٹے کو فی کس سترہ سترہ حصے (یعنی دونوں کو مجموعی طور پر 34 حصے) ملیں گے۔ ثانوی تعلیمی بورڈ سے آپ کے مرحوم شوہر کے ورثاء کو جو رقم ملنی ہے، اگر وہ ان کا حق ہے تو انہوں نے آپ کے اور اپنی والدہ کے نام جو نصف نصف کی وصیت کی ہے وہ باطل ہے اور شرعاً غیر مؤثر ہے، کیونکہ آپ دونوں مرحوم کے وارث ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''لا وصیۃ لوارث'' یعنی وارث کے حق میں وصیت (بالفرض اگر کسی نے کی بھی ہو تو) معتبر نہیں ہے اور ترکے کی تقسیم احکام شریعت کے مطابق ہوگی۔ اور اگر وہ رقم آپ کے شوہر کا حق نہیں ہے بلکہ مذکورہ ادارے کی جانب سے تبرع اور فضل واحسان ہے تو پھر وہ اپنے قواعد وضوابط کے مطابق جسے چاہیں، اسے دے سکتے ہیں۔

آپ کے سسر صاحب نے اپنی زندگی میں اپنی بیوی کے نام جو جائیداد ہبہ کر دی تھی، اگر وہ ہبہ مکمل ہو گیا تھا اور اس پر آپ کی ساس کا قبضہ ہو گیا تھا، تو وہ مؤثر ہے اور وہ اس کی مالکہ ہیں، اور جب قضائے الٰہی سے آپ کی ساس کا انتقال ہو جائے گا، تو ان کا ترکہ ان کے اس وقت موجود ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا، لیکن ان کے کسی ایک بیٹے کے بھی ہوتے ہوئے آپ کے بچے ان کے وارث نہیں بن سکیں گے۔ کیونکہ ''علم المیراث'' کا ایک مسلمہ ضابطہ ہے کہ: ''قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے''۔ لہٰذا دادی کو

چاہئے کہ اپنی زندگی میں اپنے یتیم پوتوں کو کچھ نہ کچھ ھبہ کردیں یا اتنی مالیت کا ہبہ کردیں جتنا بصورتِ حیات ان بچوں کے والد کو ان کے ترکے میں سے ملتا یا ان کیلئے کچھ وصیت کر جائیں، یہ صلۂ رحمی اور اجر کی بات ہوگی، اور اگر دادی کو یہ توفیق نہ ہو تو بعد والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝۸

ترجمہ: ''اور جب (ترکہ کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتے دار، یتیم اور محتاج آجائیں تو انہیں (بھی) اس میں سے کچھ دے دو اور (اگر اپنے طبعی بخل کی وجہ سے کچھ دے نہ سکو تو (کم از کم) ان سے اچھی بات کہو''، (النساء:8)۔

تقسیم ترکہ یا ہبہ؟

سوال:148

شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں درج ذیل مسئلے کا حل عنایت فرمائیں۔ میرا نام حسیب الدین بن وحید الدین ہے میں لیاقت آباد کا رہنے والا ہوں، میرے پاس ساڑھے سات لاکھ روپے کی مالیت ہے، میرے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، ایک بیوی ہے جو کہ ان بچوں کی سگی ماں نہیں ہے اور بچے ان کو ماں مانتے بھی نہیں، اب میں ان پیسوں کو اپنی زندگی میں اپنی اولاد پر اور بیوی پر تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ کیا میں ایسا کرسکتا ہوں؟ ۲۔ اس مال میں سب کے حصے کیا بنتے ہیں؟

۳۔ کیا میں اپنی بیوی کو اس کے حصے سے زیادہ دے سکتا ہوں یا اس حصے کے بدلے میں کوئی گھر دے سکتا ہوں؟ بینوا و توجروا، (حسیب الدین بن وحید الدین، لیاقت آباد نمبر ۴)۔

جواب:

آپ اپنے مال میں سے اپنے لئے جتنا حصہ رکھنا چاہیں، رکھ سکتے ہیں اور اپنی بیوی کو بھی حسب منشا جتنا چاہیں دے سکتے ہیں، نقد بھی دے سکتے ہیں، مکان بھی اس کے نام

کر سکتے ہیں، لیکن یہ تقسیمِ ترکہ یا تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گا، بلکہ ''ھبہ'' کہلائے گا۔ کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ سوال: 145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

اولاد کو ہبہ کرنا

سوال: 149

میں اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے درمیان تقسیم وراثت کا مسئلہ معلوم کرنا چاہتا ہوں، میری دو بیویاں تھیں، دونوں کا انتقال ہو چکا ہے، پہلی بیوی سے میری اولاد ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں (ان میں سے بڑی بیٹی بیوہ ہے) اور دوسری بیوی سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے، یہ بیٹی مریضہ ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

۱۔ کسی ایک اولاد کو مکان فروخت کر سکتا ہوں۔

۲۔ کسی ایک اولاد کو مکان گفٹ (تحفہ) کر سکتا ہوں، جس کا میں جائز حق سمجھتا ہوں۔

۳۔ زندگی میں حصہ لگانا چاہوں تو تقسیم کس طرح ہوگی۔ اپنے لیے کتنی رقم مختص کر سکتا ہوں، اولاد میں کسی (بڑے بیٹے) نے میری اور میرے زیر کفالت افراد کی بہت زیادہ خدمت اور خرچ کیا ہو تو کیا میں کل لاگت میں سے اس کے حصہ کے علاوہ زیادہ رقم دے سکتا ہوں۔

۴۔ کوئی اولاد مجھ سے اپنے حصہ کا تقاضہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

۵۔ مکان کی تعمیر (خصوصاً بالائی منزل میں بڑے بیٹے اور بڑی بیٹی (بیوہ) کا پیسہ لگا ہوا ہے، کل لاگت میں سے صرف اتنی ہی رقم مہیا ہو کر تقسیم ہوگی یا مہنگائی کے لحاظ سے کچھ زیادہ رقم مہیا کر سکتے ہیں۔

۶۔ بندہ کی وفات کے بعد تقسیم کار کیا ہوتا ہے؟

(شمس الاسلام، R-171/18، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کل یا بعض حصہ اپنی اولاد کو ھبہ کرنا چاہے تو شریعت کا حکم ہے کہ بیٹوں اور بیٹیوں سب کو برابر دے، اگر کسی ایک کو زیادہ دے گا تو یہ نافذ تو ہو جائے گا لیکن شرعاً یہ ناپسندیدہ امر ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اسے ''جور'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ جیسا کہ سوال: 145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

اسی باب کی حدیث نمبر 4073 میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد منقول ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

اکل بنیک قد نحلت مثل مانحلت النعمان قال لا قال ایسرک ان یکونو ا الیک فی البر سوآءً قال بلیٰ قال فلا اذاً۔

ترجمہ: '' کیا تم نے اپنے ہر بیٹے کو اتنا دیا ہے جتنا نعمان کو دیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں! آپ نے فرمایا کیا تمہیں یہ اچھا نہیں لگتا کہ تمہارے ساتھ نیکی کرنے میں تمہاری سب اولاد برابر ہو؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! آپ نے فرمایا پھر ایسا مت کرو، (یعنی اولاد کو ہبہ کرتے وقت ان میں تفاوت نہ کرو)''۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا کسی خاص وجہ سے باپ اولاد میں سے کسی ایک کو ہبہ میں زیادہ حصہ دے سکتا ہے؟۔ خاص وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کسی ایک کی دین داری دوسروں سے زیادہ ہو، کوئی ایک والدین کا خدمت گزار اور وفادار زیادہ ہو یا کوئی ایک معذوری یا کسی اور سبب سے معاشی اعتبار سے دوسرے کے مقابلے میں کمتر ہو۔

فتاویٰ عالمگیری، جلد ۴، صفحہ ۳۹۱ مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ میں ہے:

ولو وھب رجل شیئًا لاولادہ فی الصحۃ وأراد تفضیل بعض علی البعض فی ذلک لارواية لهذا في الاصل عن أصحابنا وروی عن أبی حنیفۃ رحمہ اللہ

تعالیٰ أنه لابأس به اذا کان التفضیل لزیادة فضل له فی الدین وان کانا سواء یکره وروی المعلی عن أبی یوسف رحمه اللّٰه تعالیٰ انه لابأس به اذا لم یقصد به الاضراروان قصدبه الاضرارسوی بینهم یعطی الابنة مثل مایعطی للابن وعلیه الفتوی هکذا فی فتاوی قاضیخان وهوالمختار کذافی الظهیریة ۔

ترجمہ: اگرکوئی اپنی صحت کے عالم میں اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے اور اس میں بعض کو بعض پر ترجیح دینا چاہے، ہمارے اصحاب سے اصل (یعنی مبسوط) میں اس کی بابت کوئی روایت منقول نہیں ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ سبب ترجیح اس کی دین داری میں فضیلت ہو، اور اگر دونوں (یا سب) دین داری میں برابر ہوں تو پھر کسی کو ترجیح دینا مکروہ ہے۔ اور المعلیٰ نے ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہ ہو، اور اگر کسی کو نقصان پہنچانا مقصود ہے تو پھر سب کو مساوی دے، بیٹی کو وہی دے جو بیٹے کو دیتا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے اور فتاویٰ قاضی خان میں بھی اسی طرح ہے اور یہی مختار ہے اور ظہیریہ میں اسی طرح ہے"۔

فتاوٰی عالمگیری کی اس عبارت کی رو سے جب ہبہ کرتے وقت دین داری اور تقویٰ کی بناء پر اولاد میں سے کسی ایک کو ترجیح دی جاسکتی ہے تو کسی کی معذوری یا معاشی بدحالی (مثلاً کثیرالاولاد اور قلیل الوسائل ہے) کی بنا پر بھی ترجیح کی گنجائش ہونی چاہیے اور اسی طرح اولاد میں سے جو ماں باپ کا بہت زیادہ فرماں بردار اور خدمت گزار ہے یا جو خود بھی ماں باپ پر زیادہ خرچ کرتا ہے، اس کیلئے بھی ترجیح کی گنجائش ہونی چاہیے۔ لیکن محض جنس یا صنف کی بناء پر ترجیح بہرحال مکروہ ہے۔

ہاں اولاد کو مکان فروخت کرسکتے ہیں، اس میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے۔ زندگی میں اگر کوئی شخص اپنی جائیداد اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو ایسا کرسکتا ہے لیکن اولاد میں مساوات ضروری ہے کیونکہ یہ ہبہ ہے، تقسیم وراثت نہیں۔ اپنے لئے جتنا حصہ یا مال چاہے

وہ رکھ سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے۔ جب وہ کل مال اپنی ملکیت اور تصرف میں رکھ سکتا ہے تو بعض حصے پر کوئی تحدید کیسے کر سکتا ہے۔

والدین کی زندگی میں اولاد کو اپنا حصۂ وراثت طلب کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر کسی بیٹے کا پیسہ آپ کے مکان میں خرچ ہوا ہے تو آپ اسے واپس دے سکتے ہیں۔ ترکہ یا وراثت انسان کے مرنے کے بعد تقسیم ہوتا ہے، پیشگی طور پر کسے معلوم ہے کہ کون پہلے مرے گا اور کون بعد میں اور کون کس کا وارث بنے گا؟۔ ترکے یا ورثے کا سوال کسی کی موت کے بعد اٹھتا ہے، نہ کہ اس کی زندگی میں۔

بندے کی وفات کے بعد اس کے ترکے میں سب سے پہلے اس کی تجہیز وتکفین کے مصارف کیے جائیں گے، اس کے بعد اگر اس کے ذمے کوئی قرض ہے تو وہ ادا کیا جائے گا، اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہوگی تو بقیہ ترکے کے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی تک مؤثر اور نافذ العمل ہوگی، بشرطیکہ وہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو، کیونکہ وارث کے حق میں شرعاً وصیت معتبر نہیں ہے۔ اگر وصیت کی مقدار بقیہ ترکے کی ایک تہائی سے زیادہ ہے، تو تہائی سے زیادہ مقدار کا نفاذ بالغ ورثاء کی مرضی پر موقوف ہے، وہ سب یا ان میں سے بعض رضا کارانہ طور پر اس زائد مقدار وصیت کو پورا کرنا چاہیں تو اپنے حصے میں سے کر سکتے ہیں، مگر نابالغ ورثاء کے حصے میں سے کسی بھی صورت میں نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ اگر ورثاء میت کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ یا مالی صدقہ اس ترکہ میں سے کرنا چاہیں تو بالغ ورثاء صرف اپنے حصے سے کر سکتے ہیں، نابالغ ورثاء کے حصے پر انہیں اس تصرف کی بھی اجازت نہیں ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مسئلہ وراثت

سوال:150

میرے ابو صاحب جائیداد تھے، جس میں مکان، فلیٹ اور دکان ہیں۔ فلیٹ اور دکان میرے والد نے اپنی زندگی میں بیٹوں کے نام کر دیئے تھے، مکان والدہ کے نام ہے

مکان میں اس وقت چار بھائی رہائش پذیر ہیں، ایک اپنا حصہ لے کر الگ ہوگیا ہے، فلیٹ اور دکان کا کرایہ آتا ہے۔ میری شادی کے گیارہ ماہ بعد والد کا انتقال ہوگیا، اس وقت میرے پانچوں بھائی پڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ مجھے میرا حصہ دے دیں تاکہ میں الگ گھر لے لوں، امی نے کہا کہ میں تمہارا حصہ ضرور دوں گی لیکن ابھی نہیں دے سکتی، ابھی مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں، سب لڑکے پڑھ رہے ہیں، پھر ان کی شادیاں کرنا ہے" لیکن تمہارا حصہ ضرور دوں گی" آئے دن جھگڑے ہونے لگے اس مسئلے کو دس سال ہوگئے ہیں۔ میری امی بہت بیمار رہتی ہیں اور میری ہمت نہیں ہوتی کہ اپنے حصے کا ذکر کروں، وہ نہیں دے سکتیں اور پریشان ہوجاتی ہیں، ان کے چہرے کی پریشانی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی، برائے مہربانی اس مسئلے کا حل بتائیں اور میرے، میرے شوہر اور میری امی کے لئے کیا حکم ہے؟، (عالیہ، کراچی)۔

جواب:

آپ کے والد مرحوم نے اپنی زندگی میں جو دکان اور فلیٹ اپنے بیٹوں کے نا[م] کردیئے تھے اور اس پر انہوں نے قبضہ کرلیا تھا، تو یہ "ہبہ" کہلاتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے بموجب اگر کوئی شخص اپنی اولاد کو ہبہ کرنا چاہے، تو اسے ساری اولاد یہاں تک ک[ہ] بیٹوں اور بیٹیوں میں مساوات برتنی چاہئے، آپ کے والد کا آپ کو اس مساویانہ رویے سے محروم رکھنا، اگرچہ ارشادِ نبوی کے خلاف ہے، لیکن بہر حال قانوناً یہ ہبہ نافذ ہوجاتا ہے۔
اس کے علاوہ آپ کے والد نے اپنی وفات کے وقت اگر کوئی ترکہ چھوڑا ہو، منقولہ یا غ[یر] منقولہ جائیداد کی صورت میں، تو اس میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے تمام ضروری امور [کی] ادائیگی کے بعد اگر ان کے ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو آپ کا حصہ 7/88، آ[پ] کی والدہ یعنی مرحوم کی زوجہ کا 11/88 اور پانچ بیٹوں کا 70/88 (فی کس 14/88) ہے۔ آپ کی تحریر کے مطابق مکان چونکہ آپ کی والدہ کی ملکیت ہے، اس لئے جب تک [وہ بقیدِ] حیات ہیں، اس میں سے آپ کو حصہ وراثت کے مطالبے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، کیونکہ وراث[ت]

کسی کی وفات کے بعد تقسیم ہوتی ہے، زندگی میں اولاد کو جو کچھ دیا جائے، وہ ''ہبہ'' کہلاتا ہے، اور اس میں اولاد کے درمیان مساوات کا حضور ﷺ نے حکم فرمایا ہے، اور عدمِ مساوات کو ناپسند فرمایا ہے۔ آپ کے شوہر کا آپ کے والدین کی جائیداد یا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس لئے ان کا لڑنا جھگڑنا یا مطالبہ ''خلافِ شرع'' ہے۔

مناسخہ

سوال:151

جناب مفتی صاحب! ہم آپ سے ایک مسئلہ کا حل قرآن وسنت یعنی شرعی نقطۂ نظر سے جاننا چاہتے ہیں۔ ہماری والدہ صاحبہ مرحومہ صابرہ کا انتقال 1996ء میں ہوا، ان کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں ایک گھر نارتھ کراچی میں ہے اور مرحومہ نے ایک پلاٹ U.P نارتھ کراچی میں اپنے نام پر خریدا تھا اور H.B.F.C سے لون لے کر اس مکان کی تعمیر کروائی تھی اور انہوں نے اپنی کمیٹیاں ڈال کر اس مکان کا لون اتارا پھر وہ مکان فروخت کر کے والدہ مرحومہ نے مذکورہ گھر اپنے نام پر خریدا۔ وفات کے بعد والدہ مرحومہ نے پیچھے وارثوں میں شوہر عبدالرحمٰن راٹھور جن کا بعد میں 2000ء میں انتقال ہو گیا اور پھر والدہ مرحومہ کے وارثوں میں صرف (سگی حقیقی) تین بیٹیاں (۱) فرزانہ (۲) ثمینہ (۳) شائستہ۔ تین بیٹے (۱) بشیر راٹھور (۲) حنیف راٹھور (۳) عرفان راٹھور۔ علاوہ ازیں والدِ مرحوم کی پہلی بیوی (جن کا انتقال ہو چکا ہے) کی اولادیں ہیں، جن میں دو بیٹیاں (۱) محمودہ (۲) فیروزہ، دو بیٹے (۱) عارف راٹھور (۲) حشمت راٹھور لواحقین چھوڑے ہیں۔

برائے مہربانی ہمیں یہ بتایا جائے کہ مرحومہ والدہ کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں سوتیلے بچوں کا بھی حصہ ہوگا یا نہیں اور کن کن وارثوں کا کتنا کتنا حصہ بنتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک جامع فتویٰ ہمیں جاری کیا جائے، (محمد بشیر راٹھور، L-1159 مسلم ٹاؤن نارتھ کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء یہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور تقسیم سے قبل کے لازمی حقوق کی ادائیگی (یعنی مصارف تجہیز و تکفین و تدفین، متوفی کے ذمہ اگر کوئی قرض تھا تو اس کی ادائیگی اور اگر اس نے کوئی وصیت کر رکھی تھی، تو تہائی ترکے کی حد تک اس کی تنفیذ) کے بعد بقیہ ترکہ 180 حصص میں، تمام ورثاء میں درج ذیل طریقے پر منقسم ہوگا۔

۱۔ بشیر راٹھور 36 حصے　　۲۔ حنیف راٹھور 36 حصے
۳۔ عرفان راٹھور 36 حصے　　۴۔ فرزانہ 18 حصے
۵۔ ثمینہ 18 حصے　　۶۔ شائستہ 18 حصے
۷۔ حشمت راٹھور 6 حصے　　۸۔ عارف راٹھور 6 حصے
۹۔ محمودہ 3 حصے　　۱۰۔ فیروزہ 3 حصے

صابرہ مرحومہ کا ترکہ ان کے شوہر عبدالرحمٰن راٹھور اور ان کے تینوں بیٹے (۱) بشیر راٹھور (۲) حنیف راٹھور (۳) عرفان راٹھور اور تینوں بیٹیاں (۱) فرزانہ (۲) ثمینہ (۳) شائستہ کے درمیان تقسیم ہوگا۔ پھر مرحوم عبدالرحمٰن راٹھور کو جو ترکہ ان کی بیوی صابرہ مرحومہ سے ملا، وہ ان کی تمام اولاد یعنی پانچوں بیٹے اور پانچوں بیٹیاں (جن میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ان کی پہلی بیوی سے ہیں) کے درمیان تقسیم ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔

غیر مسلم ہونے کے شک کی بنا پر وراثت میں حصے کا حکم

سوال:152

دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ میرے چچا کراچی سے 1970ء میں انگلینڈ آئے تھے، جب میں 1986ء میں انگلینڈ آیا تو میرے چچا نے اپنی فیملی سے متعارف کرایا اور مجھے بتایا کہ ان کی بیوی نے اسلام قبول کرلیا تھا، اور ان کے چار بچوں کے نام بھی اسلامی ہیں۔ ان کا انتقال 1998ء میں ہوا، مگر ان کے انتقال سے پہلے ان کی فیملی کی علیحدگی ہوگئی

تھی (طلاق نہیں دی تھی) ان کی وفات کے بعد ہم نے لسٹر مسجد سے نکاح نامہ لیا۔ بچوں نے اپنا نام اسلامی رکھا ہوا ہے جو ان کے والد نے انہیں دیا تھا۔ پریشانی یہ ہے کہ اگر بچے ان کے مذہب کی پیروی نہیں کرتے تو کیا وہ ترکے کے وارث ہوں گے؟۔

(آفتاب صدیقی، Old Trafford Manchester 32 Ayres Road)

جواب:

جیسا کہ آپ نے سوال میں تحریر کیا ہے کہ آپ کے چچا نے نکاح سے پہلے اپنی بیوی کو مشرف بہ اسلام کیا اور پھر اس سے نکاح کیا، اور نکاح بھی شرعی طریقے سے ہوا، مسجد میں عالمِ دین سے ان کا نکاح کرایا اور ان کے بچوں کے نام بھی اب تک اسلامی ہیں۔ بدعملی اور بے عملی تو بدقسمتی سے بہت سے مسلمانوں میں ہے، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ خدانخواستہ آپ کے چچا کی اولاد مرتد ہو چکی ہے، دین اسلام کو ترک کر کے عیسائیت یا کسی اور مذہب کو عقیدتاً قبول کر چکی ہے، وہ اپنے وفات شدہ باپ کے وارث ہوں گے اور اس کے ترکے میں سے حصہ پائیں گے، اگر مرحوم نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی تھی تو وہ بھی وراثت میں اپنا حصہ پائے گی۔

تقسیمِ ترکہ

سوال:153

میں والدین کی جائیداد کی تقسیم کیلئے شریعت محمدی ﷺ کے مطابق آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں، میری والدہ مرحومہ عائشہ بی بی زوجہ شیخ عبدالرب مرحوم کا مکان R-1650 بلاک 18 فیڈرل بی ایریا، کراچی، جس کی کل ملکیت مبلغ انیس لاکھ -/19,00000 طے پائی ہے، کاغذات کی تکمیل کیلئے مبلغ پچاس ہزار -/50,000 طے پائے ہیں، اصل رقم مبلغ ساڑھے اٹھارہ لاکھ -/1850,000 ہے۔ مجھے شرعاً بتایا جائے کہ بہن اور بھائیوں کا حصہ اس رقم میں سے کتنا ہے، ہم تین بہنیں اور تین بھائی ہیں۔

تین بھائی	تین بہنیں
۱۔ شیخ عبدالرزاق ولد شیخ عبدالرب (مرحوم)	۱۔ رضیہ ناز زوجہ محمد ہارون خان
۲۔ شیخ سلیم اختر ولد شیخ عبدالرب (مرحوم)	۲۔ رقیہ بیگم زوجہ محمد جاوید
۳۔ شیخ مختار احمد ولد شیخ عبدالرب (مرحوم)	۳۔ پروین کوثر زوجہ انور خان

(شیخ عبدالرزاق، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکے، کے نو (9) حصے ہوں گے، ان میں سے ہر بیٹے کو دو حصے (یعنی 2/9) اور ہر بیٹی کو ایک حصہ (یعنی 1/9) ملے گا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

تقسیمِ ترکہ

سوال:154

عرض یہ ہے کہ میرے والد مرحوم کا مکان میرے بھائیوں نے سوا، بیس لاکھ روپے میں فروخت کیا، سوا لاکھ روپے اخراجات میں صرف ہوئے باقی 19 لاکھ روپے بچے۔ ورثاء میں ہم تین بھائی اور پانچ بہنیں اور ہماری والدہ ہیں۔ والد صاحب پر کوئی قرضہ نہیں اور نہ ہی کوئی وصیت کی ہے۔ برائے مہربانی شرعی طور پر اس ترکے کی تقسیم بیان فرمائیں، (زاہدہ بانو، مکان نمبر A-168 سیکٹر 15/A-5، بفرزون، نارتھ کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی

تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر کوئی متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکے، کے 88 حصے ہوں گے، ان میں سے بیوہ کو 11/88، تین بیٹوں کو 42/88 (یعنی فی کس 14/88) اور 5 بیٹیوں کو 35/88 (یعنی فی کس 7/88) حصے ملیں گے۔

ترکہ میں نواسے اور نواسیوں کو حصہ ملے گا یا نہیں؟

سوال:155

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کی ذیل میں کہ ایک شخص کا انتقال ہوا، ورثاء میں مرحوم کا ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں، جن میں سے ایک بیٹی کا انتقال مرحوم کے انتقال سے پہلے ہو چکا ہے تو جو ترکہ مذکورہ شخص چھوڑ گیا ہے، اس میں سے فوت شدہ بیٹی کی اولاد (نواسے، نواسیاں) کو بھی کچھ حصہ ملے گا یا صرف مرحوم کے ایک بیٹے اور تین بیٹیوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا، (عزیز الحق لانڈھی، کراچی)۔

جواب:

برتقدیرِ صدقِ سائل وبصورتِ انحصارِ ورثاء در مذکورین بعد ادائیگی حقوق متقدمہ علی الارث مرحوم کا ترکہ اس کے موجودہ ورثاء (یعنی ایک بیٹے اور تین بیٹیوں) کے درمیان تقسیم ہوگا، ترکہ کل پانچ حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے بیٹے کو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ ملے گا، متوفی کی جس بیٹی کا ان کی زندگی میں انتقال ہو گیا تھا، قانونِ وراثت کے "اصولِ حَجب" (یعنی یہ کہ قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے یا اس کے حصے میں کمی واقع ہو جاتی ہے) کے تحت اسے ترکے میں سے حصہ نہیں ملے گا، لہٰذا اس کی اولاد محروم رہے گی۔ قرآنِ مجید نے اسے واجب کا درجہ تو نہیں دیا، مگر تبرُّع، فضل واحسان اور استحباب کا درجہ ضرور دیا ہے کہ ایسے یتیم، مسکین اور قرابت دار، جو از روئے احکامِ وراثت ترکے میں حصے دار نہیں ہیں، اگر تقسیمِ ترکہ کے وقت آ جائیں تو ان کی دلداری کے لئے انہیں بھی کچھ نہ کچھ دے دینا چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝

ترجمہ: ”اور جب (ترکہ کی) تقسیم کے موقع پر (غیر وارث) رشتے دار اور یتیم اور محتاج آجائیں تو انہیں (بھی) اس میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو ٥ اور وہ لوگ (جو وراثت میں حصے دار ہیں یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ اپنی موت کے وقت اپنے پیچھے کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ گئے ہوتے تو انہیں (ان کے بارے میں کیا کیا) خدشات ہوتے، تو انہیں چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں“، (النساء:9-8)۔

لہٰذا اگر متوفی کے ورثاء سب کے سب یا بعض خدا ترس افراد آمادہ ہوں تو اپنی مرحومہ بہن کی اولاد کو تقسیم ترکہ کے وقت کچھ نہ کچھ حسب توفیق دے دیں، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

تقسیم ترکہ

سوال:156

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ حاجی ہاشم صاحب کا انتقال 1971ء میں ہوا، جن کا ترکہ ایک مکان تھا، مرحوم کی زوجہ حاجیانی حوابائی کا انتقال 1996ء میں ہوا ان کے ترکے میں بھی ایک مکان ہے۔ مرحومین (حاجی ہاشم صاحب اور حاجیانی حوابائی) کے ورثاء میں ان کی اولاد پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہیں، ایک بیٹے کا انتقال 1994ء میں ہوا (اس کی کوئی اولاد نہیں ہے) اب ورثاء میں چار بیٹے اور ایک بیٹی موجود ہیں۔ ازروئے شریعت ان تمام ورثاء کے حصوں کی وضاحت فرمائیں۔

(عبدالقادر، S-B/2، بلاک 13/D-2 گلشن اقبال

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارف تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی

تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر کوئی متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکے، کے 9 حصے ہوں گے، ہر بیٹے کو دو حصے اور بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔

تقسیم ترکہ

سوال:157

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ متوفی غلام رسول کی تقریباً تین یا چار لاکھ کی جائیداد ہے ورثاء میں دو بیٹے، چار بیٹیاں، دو بیویاں (ایک بیوی غلام بی کا انتقال شوہر کے انتقال کے بعد ہوا، جس سے مرحوم کا ایک بیٹا مشتاق ہے) ہیں۔ اس وقت ورثاء میں مرحوم کی ایک بیوہ نیازی بیگم اور اس کی چار بیٹیاں، ایک بیٹا اور پہلی بیوی (جس کا انتقال ہوگیا) کا ایک بیٹا ہے۔ اب اس جائیداد میں سے کس طرح حصے ہوں گے، جن کا انتقال ہوگیا کیا ان کے بھی حصے ہوں گے؟،

(نیازی بیگم، C/47 سیکٹر 5-M نازیہ اسکوائر نارتھ کراچی)

جواب:

اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 128 حصوں پر منقسم ہوگا، جس میں سے زوجہ (نیازی بیگم) کو 8 حصے، زوجۂ متوفیہ غلام بی بی کے بیٹے کو 36 حصے، دوسرے بیٹے کو 28 حصے اور چار بیٹیوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے) ملیں گے۔

لے پالک بیٹی کا شرعاً کوئی حصہ نہیں

سوال:158

ہمارے والد کا انتقال ہوگیا ہے ورثاء میں دو بیویاں ہیں، پہلی بیوی کا نام صغرہ

بیگم اور دوسری کا نام نسیم بیگم ہے۔ مرحوم کی پہلی بیوی بے اولاد ہیں، جبکہ دوسری بیوی سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، جو کہ سب شادی شدہ ہیں، مرحوم کی پہلی بیوی کی ایک لے پالک بیٹی ہے کیا مرحوم کے ترکے میں اس کا بھی کوئی حصہ ہے؟ کل ترکہ کتنے حصوں پر تقسیم ہوگا،
(صغرہ بیگم، 673/2 عزیز آباد، کراچی)

جواب:

اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکے، کے 16 حصے ہوں گے۔ 2 حصے دونوں بیویوں کو (ہر بیوی کو ایک حصہ) ملے گا، دو بیٹوں کے 8 حصے (فی کس 4 حصے) اور تین بیٹیوں کے 6 حصے (فی کس 2 حصے) ملیں گے۔ لے پالک بیٹی کا شرعاً کوئی حصہ نہیں۔

تقسیمِ وراثت وہبہ

سوال: 159

باپ اپنی زندگی میں اپنی ملکیت میں سے اپنی اولاد کو جو 5 بیٹوں اور 3 بیٹیوں پر مشتمل ہیں، حصہ دے تب وہ کتنا ہوگا؟، خود باپ کا حصہ کتنا ہوگا؟، بچوں کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے؟۔

سوال: 160

باپ کے انتقال کے بعد باپ کی ملکیت میں بیٹی کا کتنا حصہ ہوگا اور بیٹے کا کتنا ہوگا؟، اور بچوں کی والدہ کا حصہ کتنا ہوگا؟۔
(نوٹ: بیوی، 5 بیٹے اور 8 بیٹیاں ہیں)۔ (رضوان احمد خان، بلاک نمبر 6 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے، لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ "ہبہ" کہلائے گا اور "ہبہ" میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ سوال: 145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

جواب:

کسی بھی شخص کے انتقال کے بعد اس کے ترکے میں سے چار حقوق کا ترتیب وار ادا کیا جانا لازم ہے، (1) میت کی تجہیز وتکفین وتدفین، (2) قرض کی ادائیگی (اگر کچھ ہو)، (3) اگر میت نے کوئی وصیت کی ہو تو تہائی ترکے کی حد تک اس وصیت کا پورا کیا جانا (4) بقیہ ترکے کو اس کے ورثاء میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کرنا۔

اگر باپ کی وفات کے بعد ورثاء یہی رہے جو سوال میں مذکور ہیں تو تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 144 حصص میں منقسم ہوگا، اس میں سے بیوہ کو 18 حصے، پانچ بیٹوں کو 70 حصے (فی کس 14 حصے) اور 8 بیٹیوں کو 56 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے۔ لیکن یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ کس کی وفات پہلے ہوگی اور کس کی بعد میں۔ اس لئے کسی فوت شدہ شخص کی وفات کے وقت جو ورثاء زندہ موجود ہوتے ہیں، ان میں ترکہ احکام شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے، پیشگی فیصلہ کوئی نہیں کرسکتا۔

تقسیمِ ترکہ

(بیوہ، تین بیٹے، تین بیٹیاں)

سوال: 161

ہمارے والد صاحب کے انتقال کو تقریباً 9 ماہ ہو چکے ہیں، ان کا ترکہ تقریباً چار

کروڑ نقدی وجائیداد کی صورت میں موجود ہے، ورثاء میں مرحوم کی زوجہ اور تین بیٹے، تین
بیٹیاں موجود ہیں، ہر ایک کا ترکے میں کتنا حصہ ہوگا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کی
وضاحت فرمائیں، (رخسانہ بیگم، R-120/18 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور
ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض
اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی
ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ۷۲ حصوں میں منقسم ہوگا۔
بیوہ کو ۹ حصے، تین بیٹوں کو ۴۲ حصے (فی کس ۱۴ حصے)، تین بیٹیوں کو ۲۱ حصے (فی کس
۷ حصے) ملیں گے۔

دادی اور پھوپھیاں محروم رہیں گی

سوال:162

میرے دو بیٹے غیر شادی شدہ (1) نورالانوار نظامی (2) غلام دستگیر نظامی تھے
جنہیں اپنے والد مرحوم سے ورثے میں زمین (چک 36-37/2RA اوکاڑہ) ملی تھی،
نورالانوار نظامی کو 123 کنال 2 مرلہ، غلام دستگیر نظامی کو بھی 123 کنال 2 مرلہ زمین ملی
تھی، غلام دستگیر نظامی کا انتقال 3 جون 1995ء کو ہوا، ورثاء میں والدہ (سیدہ کاملہ بانو)
ایک بھائی نورالانوار نظامی، دادی، پانچ چچا اور تین پھوپھیاں تھیں۔اس کے بعد نورالانوار
نظامی کا انتقال 22 مارچ 2005ء کو ہوگیا، ورثاء میں والدہ (سیدہ کاملہ بانو) دادی، پانچ
چچا، تین پھوپھیاں موجود ہیں، میرے دونوں مرحوم بیٹوں کی مذکورہ بالا اراضی ورثاء میں
کس طرح تقسیم ہوگی، براہِ کرم فتویٰ صادر فرمائیے، نوازش ہوگی، (سیدہ کاملہ بانو
B-488 Sector 11-A، نارتھ کراچی)۔

جواب:

اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ اس طور پر تقسیم ہوگا کہ مرحوم غلام دستگیر نظامی کی اراضی کے تین حصے ہوں گے ایک حصہ والدہ کو اور دو حصے مرحوم کے بھائی نورالانوار نظامی کو ملیں گے، دادی، چچا اور پھوپھیاں محروم رہیں گی۔ پھر مرحوم نورالانوار نظامی کے ترکے کے 15 حصے ہوں گے، والدہ کو 5 حصے اور چچاؤں کو 10 حصے (فی کس 2 حصے) ملیں گے، دادی اور پھوپھیاں محروم رہیں گی۔

تقسیمِ وراثت

سوال:163

گزارش یہ ہے کہ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے، والد صاحب نے سولہ لاکھ روپے کا مکان بیچا تھا، میری چھ بہنیں ہیں اور میں ایک بھائی ہوں، ہم کل سات بہن بھائی ہیں ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی، (محمد سلیم، 307/8 عزیز آباد، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 8 حصوں میں تقسیم ہوگا، مرحوم کے بیٹے (یعنی آپ) کو دو حصے اور بیٹیوں کو چھ حصے (فی کس 1 حصہ) ملیں گے۔

تقسیمِ ترکہ

(بیوہ،4بیٹے،1بیٹی)

سوال:164

کیافرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص کا انتقال ہوااس نے اپنے ورثاء میں چار بیٹے ،ایک بیٹی اورایک بیوی چھوڑی ہیں،قرآن وحدیث اوراصولوں کی روشنی میں بیان فرمائیں کہ ہرایک کوکتنا حصہ ملے گا،(محمد سعید انصاری،لطیف آباد،حیدرآباد)

جواب:

اگرسائل کا بیان درست ہےاورورثاء وہی ہیں، جوسوال میں مذکور ہیں اورترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین،ادائگی قرض اگرکچھ ہو،اورتہائی ترکے کی حدتک تنفیذِ وصیت اگرمتوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 72 حصص میں منقسم ہوگا، بیوہ کو9 حصے، چار بیٹوں کو 56 حصے(فی کس 14 حصے)اور بیٹی کو7 حصےملیں گے۔

وراثت میں حق تلفی کاعذاب

سوال:165

دریافت یہ کرنا ہے کہ اگرکوئی شخص اپنی تمام جائیدادا پنی بیوی کے نام کردے، اوراسی کے نام سے خریدے،جبکہ اس کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں بھی ہیں،اس صورت میں کیااس نے اپنی وراثت کی درست تقسیم کی،اس کے مرنے کے بعداُس پراولاد کی حق تلفی کا عذاب ہوگا یانہیں؟(شریف الرحمٰن نقشبندی، 94/5 سیکٹر G-11 نیو کراچی)۔

جواب:

ہرشخص کواپنے مال کا زندگی میں اختیار ہے چاہےکل خرچ کر ڈالے یا باقی رکھے،مگراس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک وارث کودینا تا کہ دوسرے ورثاء محروم ہوجائیں ناجائزاور باعثِ گناہ ہے،بلاوجہ شرعی وارث کومحروم کرنے پرسخت وعید آئی

ہے۔حدیث مبارک میں فرمایا:

عن أنس بن مالک،قال:قال رسول اللہﷺ:"من فرّ من میراث وارثه،قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة"۔

ترجمہ:''جوشخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہِ فرار اختیار کرے،اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی میراث جنت سے قطع کردے گا''،(سنن ابن ماجہ،رقم الحدیث:2703 مطبوعہ دارالفکر بیروت)۔

مگر کوئی شخص اپنی زندگی اور صحت میں جو کچھ کسی کو''ہبہ'' کرے اور اس کا قبضہ بھی دے دے اور موہوب لہٗ اس پر قبضہ کرلے تو شرعاً وقانوناً وہ ہبہ صحیح اور مؤثر ہوگا،اگرچہ شرعی ورثاء کو محروم کردینے کا وبال اس پر رہے گا،جیساکہ حدیث سے ظاہر ہے،ہبہ صحیح ہوگا،ورثاء کو واپس لینے کا کوئی حق نہ ہوگا لیکن اگر ہبہ صحیح نہ ہوتو وہ مال حقِ وارث ہے اور تمام ورثاء میں اس کی تقسیم اسلام کے قانونِ وراثت کے مطابق ہوگی۔

تقسیمِ ترکہ وہبہ

نوٹ:چونکہ ایک ہی استفتاء میں چار سوالات کئے گئے ہیں،اس لئے ہم ترتیب وار سوال درج کرکے اس کے آگے اس کا جواب درج کررہے ہیں۔

(محمد رفیق انصاری،R-607 Sec 11-C/1,North Karachi)

چند سوال پیش خدمت ہیں قرآن وسنت کی روشنی میں برائے مہربانی میری رہنمائی فرمائیں، کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ:

سوال: 166

والدمحترم اپنی حیات میں اپنی جائیداد کی تقسیم کرنا چاہتے ہیں (تقریباً جائیداد کی رقم پچاس لاکھ روپے ہے) تو شرعی حکم کیا ہے؟،ورثاء میں ایک زوجہ،پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں،اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی،وہ اپنے مال کا

مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے، لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ "ہبہ" کہلائے گا اور "ہبہ" میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ سوال: 145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

سوال: 167

جو مکان جائیداد میں شامل ہے، اس کی قیمت موجودہ قیمتِ فروخت کے حساب سے لگائی جائے گی یا جس قیمت پر دس سال پہلے خریدا گیا تھا، وہ قیمت لگائی جائے گی؟

جواب:

جائیداد میں شامل مکان کی تقسیم اس کی موجودہ قیمت کے مطابق کی جائے گی۔

سوال: 168

اگر والدِ محترم قانونِ وراثت کے اصول کے مطابق تقسیم کریں، تو اس میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں، ایسا کرسکتے ہیں یا نہیں؟۔

جواب:

یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ کسی بھی شخص کی زندگی میں ترکہ "قانونِ وراثت" کے اصول پر تقسیم نہیں ہوتا کیونکہ زندگی میں تو مال اس کی ملک ہے، وہ اس کا مالک ومختار ہے، جیسے چاہے تصرف کرے، صاحب جائیداد کے وفات پاتے ہی وہ مال "ترکہ" ہوجاتا ہے، یعنی ایسا مال جسے وہ چھوڑ کر مرا۔ چونکہ اسلامی قانونِ وراثت کا اطلاق ونفاذ ترکہ چھوڑ کر مرنے والے کی وفات کے بعد ہوتا ہے، لہٰذا بوقتِ وفات جو اقارب موجود ہوتے ہیں، وہ قرابت کے ترجیحی اصولوں کے مطابق اس متوفّٰی کے وارث بنتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے کہ کس کی وفات پہلے ہوگی اور کس کی بعد میں۔ اس لئے کسی شخص کی زندگی میں اس کے ترکہ یا ورثاء کا تعین نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ترکہ اس کی وفات کے بعد احکامِ شریعت کے

مطابق تقسیم ہوتا ہے، پیشگی فیصلہ کوئی نہیں کرسکتا اور ترکہ کی تقسیم میں ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' (لڑکے کے لئے دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے ارشادِ قرآنی کے تحت متوفّی کے بیٹے کو بیٹی سے دگنا حصہ ملتا ہے، لیکن زندگی میں اولاد کو ہبہ کرنے کی صورت میں شریعت نے اولاد کے درمیان مساوات کو پسندیدہ قرار دیا ہے، اولاد کے علاوہ دیگر جس کو جتنا چاہیں، دے سکتے ہیں۔

سوال:169

والد صاحب کے ساتھ بھائی اور بہنوئی کاروبار میں شامل ہیں، کافی عرصہ پہلے ایک مکان خریدا اور اس مکان میں بیٹی اور داماد کو شفٹ کردیا تھا اور ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ یہ مکان بیٹی کا ہے، یعنی بیٹی کو دے دیا اور وقتاً فوقتاً اس مکان کی مرمت کے زمرے میں خاصا روپیا خرچ کرتے رہے اور اپنے کاروبار میں سے بیٹی اور داماد کے تمام اخراجات پورے کرتے ہیں، اس صورت میں یہ مکان تقسیم میں شامل ہوگا یا نہیں؟، اور اگر یہ مکان تقسیم میں شامل نہ ہو تو باقی جائیداد کی تقسیم میں ان کا کیا حصہ ہوگا؟، یا حصہ نہیں ہوگا؟۔

(محمد رفیق انصاری، R-607 Sec 11-C/1, North Karachi)

جواب:

بیٹی اور داماد کو جو مکان انہوں نے دیا اور ساتھ ہی اسے اس کا مالک بھی بنادیا، تو اب یہ مکان اس بیٹی کی ملکیت ہے، والد کے ترکے یا جائیداد میں اُسے شامل نہیں کیا جائے گا، نیز جو کچھ رقم وغیرہ وہ اپنی بیٹی داماد کو اپنی خوشی سے دیتے ہیں، اس سے ان کے شرعی حصے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، جب بھی ترکہ تقسیم ہوگا انہیں اپنے حصے کے مطابق پورا حصہ دیا جائے گا۔ یہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ اولاد کے درمیان ہبہ میں عدمِ مساوات شرعاً ناپسندیدہ امر ہے لیکن نافذ ہوجاتا ہے۔ نیز آپ نے سوال میں یہ بھی درج کیا ہے کہ بہنوئی آپ کے والد صاحب کے ساتھ کاروبار میں شریک ہیں، اگر ایسا ہے اور انہوں نے ان کی خدمات کے معاوضہ کے طور پر ان کو مکان لے کردیا ہو تو، یہ درست اور جائز ہے۔

مسئلۂ ہبہ

سوال:170

میرے پاس ایک مکان اور نقدی موجود ہے اور کچھ رقم کاروباری حوالے سے ایک پارٹی کے پاس ہے، ابھی ایک سال نہیں ہوا، دسمبر 2005 میں حساب ہوگا۔زندگی میں طریقہ تقسیم کیا ہے اور مرنے کے بعد کیا طریقہ ہوگا۔اولاد میں 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں، جبکہ زوجہ کا انتقال ہو چکا ہے،(محمد احسان قریشی، شکارپور کالونی، کراچی)۔

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے، لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔جیسا کہ سوال:145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

اگر باپ کی وفات کے بعد ورثاء یہی رہے جو سوال میں مذکور ہیں تو تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 6 حصوں میں منقسم ہوگا، اس میں سے دو بیٹوں کو 4 حصے (فی کس 2 حصے) اور 2 بیٹیوں کو 2 حصے (فی کس 1 حصہ) ملیں گے۔لیکن یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ کس کی وفات پہلے ہوگی اور کس کی بعد میں۔اس لئے کسی وفات یافتہ شخص کی وفات کے وقت جو ورثاء زندہ موجود ہوتے ہیں، ان میں ترکہ احکام شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے، پیشگی فیصلہ کوئی نہیں کرسکتا۔تقسیم کے وقت جو ترکہ موجود ہوتا ہے وہی موجودہ ورثاء میں شرعی اصول کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے اور جو رقم کاروبار میں لگائی ہوئی ہے، وہ بھی اصل مع منافع مجموعی ترکہ میں شامل ہوگی۔

مسئلۂ وراثت وہبہ

سوال:172

میرے والد نے اپنی زندگی میں میرے نام پر گھر لیا، کاغذات بھی میرے نام سے بنوائے اور میرے حوالے کردیئے یعنی مکان مکمل طور پر میری ملکیت میں تھا اور ہے۔ اور سب بھائی بہنوں اور ماں سے تازندگی یہی کہا کہ یہ گھر رضوان احمد خان کا ہے، پھر کچھ سال کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اب مجھے پوچھنا یہ ہے کہ گھر جو کہ میرے نام پر ہے، میرے والد صاحب کے ترکے میں آئے گا یا نہیں؟، (رضوان احمد خان، بلاک نمبر 6 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برتقدیرِ صدقِ سائل، اگر ان کے والد نے مکان ان کے نام پر لیا تھا، کاغذات میں اندراج بھی انہی کے نام پر ہوا اور اس پر ان کا قبضہ بھی مکمل رہا، تو یہ ہبہ مکمل ہوگیا اور اب وہ مکان انہی (رضوان احمد) کی مِلک میں رہے گا، ان کے والد کے ترکہ میں شامل نہیں ہوگا۔ اگرچہ شرعاً مستحسن اور پسندیدہ امر یہ ہے کہ اولاد کے درمیان ہبہ میں مساوات برتی جائے، الّا یہ کہ کسی خاص ترجیحی سبب سے کسی کو کچھ زائد دے دیا جائے، مثلاً اس کی دین داری کی وجہ سے یا کسی معذوری کے سبب، یا کاروبار وغیرہ میں اس کی خدمات کے عوض وغیرہ، مگر اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ دیگر اولاد کی رضامندی حاصل کرلی جائے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مسئلۂ وراثت

سوال: 173

ہم سب کا سوال آپ سے یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، کچھ رقم والد صاحب نے ترکہ میں چھوڑی ہے، ورثاء میں بیوہ، چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

بیٹے	بیٹیاں
(1)سید جاوید اشرف	(1)سیدہ ناہید اشرف
(2)سید آصف اشرف	(2)سیدہ مہ جبین اشرف
(3)سید عارفین اشرف	(3)سیدہ یاسمین اشرف
(4)سید عامر اشرف	☆مرحوم کی بیوہ عفت آرا

شریعت کے مطابق ان ورثاء کے حصوں کی وضاحت فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

(سید عارفین اشرف، B.307 ڈیسنٹ آرکیڈ بلاک 7 گلستانِ جوہر، کراچی)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارف تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 88 حصوں پر تقسیم ہوگا، جس میں مرحوم کی زوجہ کو 11 حصے، چار بیٹوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے)، تین بیٹیوں کو 21 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے۔

زندگی میں والد نے جو کچھ دیا، ترکے سے منہا نہیں ہوگا

سوال:174

ہم اپنے والد صاحب کے ترکے کی تقسیم کا فتویٰ 12 جون 2005ء کو آپ سے لے چکے ہیں۔ اب مزید معلوم یہ کرنا ہے کہ: ہمارے والد صاحب اپنی زندگی میں جو کچھ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو رقم یا دیگر ضروریاتِ زندگی کی مد میں دیتے رہے ہیں کیا اسے ترکے میں سے منہا کیا جائے گا؟ نیز کیا وہ ورثاء مرحوم کے انتقال کے بعد وراثت میں حصے کے حق دار ہوں گے؟ مہربانی فرما کر اس کی وضاحت فرمائیں۔

(سید عارفین اشرف، B-307 ڈیسنٹ آرکیڈ بلاک 7، گلستانِ جوہر، کراچی)

جواب:

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ سوال: 145 کے جواب میں مسلم شریف کی بیان کردہ حدیث میں گزرا۔

آپ کے والد نے جو کچھ اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو ''ہبہ'' کیا وہ اب ان کی ملکیت میں شمار نہیں ہوگا اور تقسیمِ ترکہ کے وقت اس رقم یا جائیداد کو ترکے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ تقسیمِ ترکہ کے وقت مرحوم کے جو ورثاء زندہ ہوں ان سب کو ترکے میں شامل کیا جائے گا۔

مختصر یہ کہ آپ کے والد اپنی زندگی میں جو کچھ اپنی اولاد کو کسی بھی مد میں دیتے رہے، وہ ان کی ملکیت اور ان کے ترکے سے خارج ہو گیا، لہٰذا جب میراث تقسیم کی جائے گی، تو جتنا مال وفات کے وقت ان کی ملکیت میں ہوگا، وہی تقسیم کیا جائے گا۔ اور جو ورثاء ان کی وفات کے وقت موجود ہوں گے، وہ اس کے حق دار ہیں، ہر ایک وارث کو قانونِ وراثت کے شرعی اصول کے مطابق اس کا حصہ دیا جائے گا۔ اور جو کچھ والد اپنی زندگی میں دے چکے ہیں، اسے شمار نہیں کیا جائے گا۔

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت

سوال:175

ایک شخص نے ایک کتابیہ (عیسائی) عورت سے شادی کی، اس سے اس کی اولاد ہوئی۔ پھر اس (شوہر) کا انتقال ہو گیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(1) کیا وہ عیسائی عورت اپنے شوہر کی وارث بنے گی؟

(2) اور اس کی اولاد نے اگر عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے، تو کیا وہ وارث بن پائیں گے؟

(3) اگر بچے نابالغ ہیں، تو کیا وہ وارث بنیں گے؟۔(ایم عتیق الرحمٰن، کراچی)۔

جواب:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن اسامة بن زيد ان النبی ﷺ قال: لايرث المسلم الكافر ولايرث الكافر المسلم:

ترجمہ: ''حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے، نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے''، (صحیح مسلم رقم الحدیث:4028، ابی داؤد رقم الحدیث:2901)۔

اس حدیث کے تحت علامہ نووی لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور جمہور صحابہ اور فقہاء، تابعین اور بعد کے علماء کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا، (شرح مسلم للنووی، جلد2ص:34،نور محمد اصح المطابع)۔

میراث سے محروم کرنے والے چار اسباب ہیں، ایک سبب دین کا اختلاف ہے، یعنی مسلمان کافر اور کافر مسلمان کا وارث نہ ہوگا۔

عن عمروبن شعيب ، عن ابيه ، عن جده عبدالله بن عمروقال: قال رسول الله ﷺ: لايتوارث اهل ملتين شتیٰ۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور دادا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو مختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے''، (شرح مسلم للنووی، جلد2ص:34،نور محمد اصح المطابع)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

واختلاف الدين ايضا يمنع الارث والمرادبه الاختلاف بين الاسلام والكفرواما اختلاف ملل الكفاركالنصرانية واليهودية والمجوسية وعبدة

الوثن فلا یمنع الارث حتی یجری التوارث بین الیھودی والنصرانی والمجوسی واختلاف الدارین یمنع الارث کذا فی التبیین۔ولکن ھذا الحکم فی حق اھل الکفرلافی حق المسلمین۔

ترجمہ:”اوردین کا اختلاف بھی مانع ارث ہے،اوراس سے مراد اسلام اورکفر کے درمیان اختلاف ہےاور جب اختلاف کفارقوموں کے درمیان ہو،جیسا کہ نصرانی اور یہودی اور مجوسی اور بت پرست،تو پھروہ وراثت سے مانع نہیں ہوگا(یعنی یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں)۔یہاں تک کہ یہودی اورنصرانی اور مجوسی کے درمیان وراثت جاری ہوگی اوردار کا مختلف ہونا(یعنی دارالاسلام ودارالحرب) مانعِ وراثت ہے، جیسا کہ تبیین میں بیان کیا گیا ہےاور یہ حکم اہل کفر کے حق میں ہے نہ کہ مسلمان کے حق میں“،(عالمگیری جلد6ص:454مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(واختلاف الدین)واسلاماً و کفراً۔

ترجمہ:”(اوردین کا مختلف ہونا)مانعِ وراثت ہےیعنی کہ اسلام اورکفر کا اختلاف“۔

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قید بہ لأنّ الکفار یتوارثون فیما بینھم وان اختلف مللھم عندنا،لأنّ الکفر کلہ ملۃ واحدۃ۔

ترجمہ:”یہ قیداس لئے لگائی گئی ہے کہ ہمارے نزدیک کفارایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں اگرچہ ان کا تعلق مختلف ملتوں سے ہو،اس لئے کہ تمام کفرملّتِ واحدہ ہے“۔

(ردالمحتارعلی الدرالمختارجلد10ص:418،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی،بیروت)

اس مسلمہ شرعی اصول کے تحت کتابیہ عورت(خواہ نصرانی ہو یایہودی)اپنے متوفّی مسلمان شوہر کی وارث نہیں بن سکتی۔مسلمان شوہراور کتابیہ عورت کی اولاد اگر نابالغ ہےتو وہ دین میں”خیرالابوین“کے تابع ہے،یعنی انہیں مسلمان تصور کرتے ہوئے ان کے مسلمان باپ

کی وراثت میں حصہ دیا جائے اور اگر وہ بالغ ہیں تو مسلمان ہونے کی صورت میں اپنے باپ کے وارث بنیں گے، لیکن اگر خدانخواستہ بالغ ہونے کے بعد وہ نصرانی یا یہودی بن گئے ہیں، تو مسلمان باپ کی وراثت سے محروم رہیں گے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والولدیتبع خیر الأبوین دیناً)ان اتّحدت الدار ولو حکماً، بان کانَ الصغیر فی دارنا والأب ثمة۔

ترجمہ: ''اور اولاد دین میں خیرالابوین (یعنی ماں باپ میں سے جس کا دین بہتر ہو، جیسے ایک یہودی یا نصرانی ہے اور دوسرا مسلم، تو نابالغ اولاد مسلم متصور ہوگی، اور اگر ایک نصرانی ہے اور دوسرا مجوسی یا مشرک، تو نابالغ اولاد نصرانی متصور ہوگی) کے تابع ہوتی ہے، اگر دار ایک ہی ہو، خواہ حکماً ہی سہی، جیسے نابالغ اولاد دارالاسلام میں ہے اور باپ بھی وہیں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:4 ص:276 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مسئلہ وراثت

سوال:176

ایک عدد کارخانہ، جس کی مالیت تیس لاکھ روپے ہے اور ایک عدد گودام، جس کی مالیت سترہ لاکھ روپے ہے۔ مرحوم کے ورثاء میں دو بھائی چار بہنیں ہیں، شرعی اعتبار سے ان کے حصے کیا ہوں گے، شرعی حساب سے بتادیں، عین نوازش ہوگی، (صلاح الدین، C-115/6 عائشہ منزل، فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارف تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 8 حصوں میں منقسم ہوگا۔ دو بیٹوں کو چار

حصے (فی کس 2/8) اور چار بیٹیوں کو چار حصے (فی کس 1/8) ملیں گے۔

مسئلہ وراثت

سوال:177

ہمارے والد صاحب نے سنگل اسٹوری پر تین کمرے چھوڑے تھے اور دوسری منزل پر میں نے اپنی رقم سے تین کمرے بنوائے ہیں۔ہم دو بھائی تھے ایک کا انتقال ہوگیا ہے اور چھ بہنیں تھیں (جن میں سے دو کا انتقال ہوگیا ہے) موجودہ ورثاء ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں،شرعی طور پر ہر ایک کا حصہ کتنا بنتا ہے؟

نوٹ: بھائی اور دونوں بہنوں کا انتقال والد صاحب کی زندگی میں ہوا تھا۔

(محمد اسحاق،3/425 لیاقت آباد کراچی)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کچھ ہو، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 6 حصص میں منقسم ہوگا، بیٹے کو 2 حصے اور چار بیٹیوں کو 4 حصے (فی کس ایک حصہ) ملے گا اور جو کمرے آپ نے اپنی رقم سے بنوائے ہیں وہ رقم اس میں سے منہا کرلی جائے گی۔

وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں

سوال:178

ہمارے والد عبدالوحید کا انتقال 19 اگست 2004ء کو ہوا اور والد عبدالوحید نے انتقال سے پہلے انہوں نے زبانی ہم سب سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر کہا، ہم سب ان کی اولاد اور ان کی زوجہ ان کی زبانی بات، جو انہوں نے کہی، ہم سب اس پر متفق ہیں، تاکہ مرحوم عالم ارواح میں پُرسکون رہے۔وہ باتیں زبانی مرحوم عبدالوحید صاحب کی یہ تھیں۔

۱۔ مکان نمبر C-111 کورنگی نمبر 6مرحوم کی چاروں صاحبزادیوں (صفیہ۔ شاہدہ۔عابدہ۔زاہدہ) کا ہے۔

۲۔ مکان نمبر515/15دستگیر فیڈرل بی ایریا،مرحوم کے چاروں صاحبزادوں (عبدالمجید،عبدالحمید،عبدالودود،عبدالغفار) کا ہے،اس کے علاوہ صدر کی دکانیں بھی ہیں۔ والد صاحب نے عرصہ بیس سال قبل ایک دوکان بڑے بیٹے کے نام کردی تھی، اس پر دوسرے بھائیوں کواعتراض ہے،جس پر والد سے احتجاج کیا،لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ عرصہ اٹھائیس سال سے بڑا بیٹا کام کررہا ہے،اوراسی کے ہاتھ میں دوکان کی چابی ہے۔

۳۔ ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ اوراسپیشل سیونگ سرٹیفکیٹ بھی مرحوم کے نام سے ہیں، جوکہ انہوں نے بینک میںNominate بچوں کوکردیا ہےاورکہا کہ جس کے نام ہے، وہی لے گا،اس کے علاوہ کوئی نہیں لے گا۔

تمام ورثاءوالدصاحب کے فیصلے پرراضی ہیں،لیکن ایک بھائی اورایک بہن کا کہنا یہ ہے کہ ازروئے شرع تمام ترکے میں سے جوحصہ بنتا ہے،دیاجائے،(عبدالمجید،515/15ایف بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برتقدیرِصدقِ سائل،متوفّٰی نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے نام جو جائیداد ہبہ کرنے کا کہا، اگر انہوں نے اپنی زندگی میں انہیں اس جائیداد کی ملکیت اور قبضہ منتقل نہیں کیا تو ہبہ مکمل نہیں ہوااوروہ جائیداد بدستوران کی ملکیت رہی۔اب زیادہ سے زیادہ والد کی خواہش وصیت کے درجے میں ہےاورشرعاًوارث کے حق میں وصیت معتبرنہیں ہے،رسول اللہ ﷺ کاارشادہے:

"سمعت أبا أمامة،قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: انّ الله قد أعطى كل ذى حقّ حقّه فلا وصية لوارث"

ترجمہ:"ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشادفرمارہے تھے:

بیشک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے''۔ (سنن ابی داؤد رقم الحدیث 2862، مؤسستہ الریان، بیروت)
لہٰذا ترکہ تمام ورثاء کے درمیان از روئے شرع تقسیم ہوگا۔ اور وہ اس طرح کہ ترکہ کل 96 حصوں پر منقسم ہوگا، ان میں سے بیوہ کو 12 حصے، 4 بیٹوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے) اور 4 بیٹیوں کو 28 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے۔ جو دوکان وہ اپنی زندگی میں اپنے بڑے بیٹے کو ہبہ کر کے ان کی ملک کر چکے تھے اور قبضہ بھی دے دیا تھا، تو وہ ہبہ مکمل ہوگیا اور وہ دوکان اب اس بیٹے کی ملکیت رہے گی، اگرچہ شرعاً والد کا یہ فعل ناپسندیدہ ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اولاد کے درمیان ہبہ کرنے میں مساوات کا حکم دیا ہے اور عدمِ مساوات کو ناپسند فرمایا ہے، تاہم قانوناً ایسا ہبہ مؤثر اور نافذ العمل ہو جائے گا۔
بینک ڈیپازٹ، ڈیفنس سرٹیفکیٹ اور سیونگ سرٹیفکیٹ کی رقم مجموعی ترکے میں شامل ہوگی اور مذکورہ بالا تناسب سے تقسیم ہوگی۔ اس میں بیٹوں یا بیٹیوں کی نامزدگی وصیت کے درجے میں ہے اور جیسا کہ حدیث پاک کے حوالے سے بتایا گیا ہے، وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔

تقسیمِ وراثت

سوال:179

میرے والد محترم کا انتقال 1989ء میں ہوگیا تھا، والد صاحب نے ورثہ میں -/80,000 روپے جو کہ ایک مکان میں ایڈوانس تھے۔ اور کچھ رقم نقد چھوڑی تھی جو کہ زیرِ تعمیر مسجد میں دے دی گئی تھی۔ مکان کے ایڈوانس کے -/80,000 روپے تمام ورثاء نے راضی برضا والدہ کے لئے چھوڑ دیئے۔ والد کے انتقال کے وقت یہ ورثاء تھے، (1) بیوہ (2) دو بہنیں (3) پانچ بھائی (4) مرحوم کی ہمشیرہ۔
اب دریافت مسئلہ یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ورثاء اپنا حق چھوڑ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو وراثت کس طرح تقسیم ہوگی؟ (محمد اخلاق قادری، جمن شاہ کا پڑ حیدر آباد)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارف تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 96 حصوں میں منقسم ہوگا۔

بیوہ کو 12 حصے، پانچ بیٹوں کو 70 حصے (فی کس 14 حصے)، دو بیٹیوں کو 14 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے، مرحوم کی ہمشیرہ محروم رہے گی۔ تمام ورثاء اگر باہمی رضامندی سے والدہ کے حق میں اپنے اپنے حصے سے دست بردار ہونا چاہیں تو وہ ایسا کرسکتے ہیں اور یہ ان کی سعادت مندی ہوگی البتہ اگر بعض ورثاء رضا کارانہ طور پر اپنی والدہ کے حق میں اپنے حصے سے دستبردار ہونے کے لئے آمادہ ہیں اور بعض اپنا حصہ لینا چاہتے ہیں، تو جو اپنا حصہ لینا چاہے، وہ لے سکتا ہے، اسی طرح جو رقم وہ باہمی رضامندی اور اتفاق رائے سے والد صاحب کے ایصالِ ثواب کے لئے تعمیر مسجد کے لئے دے چکے ہیں، وہ درست ہے۔

بیٹے کا باپ سے تقسیمِ وراثت کا مطالبہ

سوال:180

میں نے ایک مکان بوسیدہ حالت میں خریدا جو میری ملکیت ہے اور اس کے بعد اس مکان میں میرے تین بیٹوں نے رقم لگا کر اسے بنایا۔ میرے سات بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں جن میں سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی شادی شدہ ہیں باقی سب غیر شادی شدہ ہیں۔ تیسرے نمبر پر جو بیٹا ہے اس کا مطالبہ ہے کہ اسے اس مکان میں سے حصہ دیا جائے، شرع کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ آیا اسے اس مکان میں سے کتنا حصہ دیں، (محمد سلیم، 81/6 سیکٹر F-5 نیو کراچی)۔

جواب:

کسی بھی شخص کی زندگی میں اس کا مال وجائیداد تقسیم نہیں ہوتی، اور نہ اس سے

بطور وراثت اس کی تقسیم ہی کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے، وہ اپنے مال میں مختار ہے، جس طرح سے چاہے، اسے خرچ کرے۔

صورت مذکورہ میں مکان جو آپ کی ملکیت ہے، اس کی تقسیم کا مطالبہ کرنے کا کسی بیٹے کو کوئی حق نہیں، ہاں اگر وہ بیٹے جنہوں نے مکان میں رقم لگائی ہے، اگر اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کریں، تو ان کو وہ رقم دے دی جائے۔ جب تک ماں باپ یا کوئی بھی مورث زندہ ہے، کسی وارث کا اس کے مال پر نہ کوئی استحقاق ہے اور نہ ہی کوئی وارث بطور وراثت اپنے حصے کا مطالبہ کرسکتا ہے، کسی شخص کا مال ترکہ تب بنتا ہے، جب اس کا انتقال ہوجائے، اس وقت جو وارث زندہ ہوں گے، شریعت کے احکامِ وراثت کے مطابق ترکہ میں سے اپنا اپنا حصہ پائیں گے، پیشگی طور پر کسے معلوم ہے کہ کون پہلے مرتا ہے اور کون بعد میں، کون وارث بنتا ہے اور کون مورث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والا)۔ اپنی زندگی میں کوئی شخص اپنے مال میں حسبِ منشا تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے: جسے جو کچھ دینا چاہے دے سکتا ہے، البتہ اولاد کو کوئی شخص اپنی زندگی میں ہبہ دینا چاہے تو لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر دے، شرعاً مستحسن یہ ہے کہ اولاد کے درمیان "ہبہ" کرنے میں مساوات برتی جائے۔

مسئلہ وراثت

سوال: 181

ہمارے والدین کا انتقال ہو چکا ہے ورثاء میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں جائیداد کی تقسیم شرعی طور پر ان ورثاء کے درمیان کس طرح ہوگی۔ وضاحت فرمائیں۔

(محمد اکرام الرب، R-896/4 فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارف تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو) شرعی ترجیحات

کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 12 حصوں پر تقسیم ہوگا چار بیٹوں کو 8 حصے (فی کس 2 حصے) چار بیٹیوں کو 4 حصے (فی کس 1 حصہ) ملیں گے۔

﴿حلال و حرام﴾

﴿جائزوناجائز﴾

حالت جنابت میں قرآن کی تلاوت

سوال:182

کیا جنابت کی حالت میں قرآن مجید کی تلاوت جائز ہے؟ اگر بہ حالت مجبوری غسل نہ کرسکیں، (آصف خلیل بہادر آباد کراچی)۔

جواب:

جنابت اور حیض ونفاس کی حالت میں قرآن مجید کی تلاوت جائز نہیں ہے، ''جنابت'' سے مراد وہ حالت ہے، جس میں انسان پر غسل واجب ہوتا ہے اور نفاس سے مراد وہ ایام ہیں جن میں بچے کی پیدائش کے بعد ماں کے رحم سے خون جاری رہتا ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت ممکنہ طور پر چالیس دن ہے اور کم سے کم مدت متعین نہیں ہے، جنبی اور حائض زبان سے تلفظ کے بغیر دل میں قرآن مجید کو پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح جنبی اور حائض تسبیح (سبحان اللہ کہنا) تہلیل (لا الہ الا اللہ کہنا) تحمید (الحمد للہ کہنا)، تکبیر (اللہ اکبر کہنا)، ترجیع (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کہنا)، درود شریف اور دیگر اذکار وتسبیحات پڑھ سکتے ہیں، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ بطور تلاوت کے پڑھنا منع ہے مگر اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت پر اظہار تشکر کے طور پر پڑھ سکتے ہیں، اسی طرح مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ بھی پڑھ سکتے ہیں، بے وضو اگرچہ تلاوت کرنا جائز ہے لیکن تقاضائے ادب یہ ہے کہ پاک جگہ پر باوضو قبلہ رو بیٹھ کر تلاوت کی جائے اور تلاوت سے پہلے خوشبو کا استعمال اور منہ سے بدبو (اگر کچی پیاز، لہسن کھانے یا تمباکو سے ہو) کا ازالہ مسواک یا پیسٹ سے کرنا مستحب ہے، اگر عذر شرعی کی بناء پر غسل نہ کرسکیں تو تیمم کر کے نماز بھی پڑھ سکتے ہیں اور تلاوت بھی کرسکتے ہیں۔

سورۂ الرحمٰن کی آیت کا جواب دینا

سوال:183

ہماری اسلامیات کی میڈم نے بتایا ہے کہ جب سورۂ الرحمٰن کی تلاوت کریں اور یہ آیت پڑھیں: '' فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ''، تو اس کا جواب دینے سے زیادہ ثواب ملتا ہے، کیا یہ درست ہے؟، (افشاں بیگ، کراچی)۔

جواب:

یہ آیت سورۂ الرحمٰن میں اکتیس مرتبہ آئی ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

'' سو (اے گروہِ جن و اِنس) تم دونوں (گروہ) اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟''۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی متوفی 1270ھ اپنی تفسیر '' روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی'' مطبوعہ داراحیاء التراثِ العربی بیروت، جلد 27، صفحہ 104 پر، بزار، ابنِ جریر، ابنِ منذر، دارقطنی، ابنِ مردویہ اور حافظ ابوبکر علی بن احمد الخطیب کی تاریخِ بغداد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

حدیث صحیح میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے سامنے سورۂ الرحمٰن کی تلاوت فرمائی تو وہ چپ رہے، اس پر آپ نے فرمایا: کیا بات ہے کہ جب میں اللہ کے قول '' فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ'' پر آیا تو جنات نے اپنے رب کو تم سے بہتر جواب دیا، انہوں نے اس کے جواب میں یہ عرض کیا: ''لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِعَمِکَ رَبَّنَا نُکَذِّبُ فَلَکَ الْحَمْدُ''، یعنی اے ہمارے پروردگار! ہم تیری نعمتوں میں سے کسی چیز کو نہیں جھٹلاتے، تمام تعریف کا حقدار تو ہی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جناتِ مومنین کے جواب کو پسند فرمایا اور صحابۂ کرام کو اس کی ترغیب فرمائی، لہٰذا اس آیت کا ان کلمات سے جواب دینا اجر وثواب کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کا اقرار واعتراف ہے۔ اور اس جواب سے یہ

تأثر بھی ملتا ہے کہ قرآن کسی بہرے، گونگے اور غافل یا سنگدل سے مخاطب نہیں ہے، بلکہ ایسے مومن سے مخاطِب ہے جو قرآن کو غافل رہ کر نہیں پڑھتا، بلکہ اس کے دل و دماغ پر قرآن اثر انداز ہوتا ہے، وہ قرآن کے پیغام کو سنتا ہے، سمجھتا ہے، قبول کرتا ہے اور جہاں عملاً یا قولاً جواب دینا ہو، وہاں جواب دیتا ہے، یعنی اس کا سماع ''سماعِ مطلق'' نہیں بلکہ ''سماعِ قبول'' ہے اور بندے کا یہ ایمان ہونا چاہیے کہ جب وہ اعترافِ نعمت کرے گا تو اللہ تعالیٰ مزید نعمتوں کا نزول فرمائے گا، کیونکہ اس کا وعدہ ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ

ترجمہ: ''اگر تم (میری نعمتوں کا) شکر ادا کرو گے تو میں ضرور بالضرور تم پر فیضانِ نعمت (اور) زیادہ کروں گا''، (ابراہیم:7)۔

مسجد میں تلاوتِ قرآن اور درس و وعظ میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال

سوال:184

عرض یہ ہے کہ ہماری مسجد ''جامع مسجد القمر'' گنجان آبادی میں ہے، الحمدللہ! مسجد میں پنج وقتہ اذان، نماز، جمعۃ المبارک کی تقریر، ماہانہ محفلِ گیارہویں شریف (تقریباً ایک سے دو گھنٹے) ماہانہ درسِ قرآن (تقریباً ایک گھنٹے کا) اس کے علاوہ مختلف اوقات میں مختلف پروگرام اس طرح منعقد ہوتے ہیں کہ نہ صرف مسجد کے اندر کا مائیک کھلا ہوتا ہے، بلکہ باہر کے ''ہارن'' بھی چل رہے ہوتے ہیں، جس کی آواز خاصی دور تک کے گھروں میں بہت تیز جاتی ہے۔ اکثر لوگ باہر کے تیز ہارنوں پر اعتراض بھی کرتے ہیں، (محض مجبوری کے سبب)۔ ہماری ارکانِ کمیٹی نے متفقہ فیصلے سے یہ ارادہ کیا ہے کہ اذان، نماز، جمعۃ المبارک کی تقریر اور دیگر پروگراموں کے صرف اعلان کے علاوہ ہم باہر کے ہارن نہ کھولیں۔ بلکہ صرف مسجد کے اندر کے اسپیکروں کو استعمال کریں، ہمارا یہ عمل از روئے شرع اور حکمت کیسا ہوگا۔ اس پر ان احباب کو کس طرح قائل کیا جا سکتا ہے، جو محض جذباتیت کا شکار ہو کر باہر کے ہارن کھولنے پر مجبور کرتے ہیں، امید ہے ایسی رہنمائی فرمائیں گے، جو باعث حق و

تسکین ہو، (اراکین کمیٹی جامع مسجد القمر ٹرسٹ، شاہ فیصل کالونی نمبر 3، کراچی)۔

جواب:

ہمارے نزدیک فی نفسہٖ نماز باجماعت میں ضرورت کے تحت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جائز ہے، مگر ایک فقہی اصول ہے کہ "الضرورۃ تتقدر بالضرورۃ" یعنی ضرورت کی بناپر اباحت دائرۂ ضرورت کے اندر رہنی چاہیے۔

نماز کے اندر تلاوت کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا۔

ترجمہ:''اورآپ نماز میں نہ بہت بلند آواز سے قرآن پڑھیں اور نہ بہت پست آواز سے، اوران دونوں (انتہاؤں) کے درمیان (معتدل) انداز اختیار کریں''، (بنی اسرائیل:110)۔

آدابِ قراءتِ قرآن کی بابت ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔

ترجمہ:''اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

(الاعراف:204)

علامہ ابن عابدین شامی ''ردالمحتار علی الدرالمختار'' جلد نمبر 2، صفحہ نمبر 237، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی میں "فروع فی القراء ۃ خارج الصلوٰۃ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"(قوله:يجب الاستماع للقراء ة مطلقاً) أى فى الصلاة وخارجها، لأن الآية وإن كانت واردة فى الصلاة على ما مر .فالعبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب، ثم هذا حيث لا عذر؛ ولذاقال فى "القنية" : صبىّ يقرأ فى البيت وأهله مشغولون بالعمل يعذرون فى ترك الاستماع إن افتتحوا العمل قبل القراء ة والا فلا، وكذا قراء ة الفقه عند قراء ة القرآن۔ وفى "الفتح" عن "الخلاصة": رجل يكتب الفقه وبجنبه رجل يقرأ القرآن فلا يمكنه استماع القرآن فالاثم على القارئ، وعلى هذا لو قرأ على السّطح والناس نيام يأثم اه:

أی لأنه یکون سبباً لاعراضهم عن استماعه، أو لأنه یؤذیهم بایقاظهم۔ تأمل"۔
ترجمہ: "(قراءت کو مطلقاً توجہ سے سننا) نماز کے اندر اور خارج نماز میں واجب ہے، کیونکہ آیت (وجوبِ استماع) اگرچہ نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ یہ بحث پہلے بھی آچکی ہے، لیکن (احکام شرعیہ کا اصول یہ ہے کہ) اعتبار "عمومِ لفظ" کا ہوتا ہے نہ کہ "سببِ خاص" کا، پھر یہ (حکمِ وجوبِ استماع) تب ہے جب کوئی عذر نہ ہو، اسی لئے "القنیہ" میں ہے: ایک بچہ گھر میں قرآن پڑھ رہا ہے اور گھر والے کام میں مشغول ہیں تو (مصروفیت کے سبب) قراءت کو توجہ سے سننے کے بارے میں وہ معذور ہیں، یہ حکم تب ہے کہ وہ پہلے سے کام میں مشغول ہوں ورنہ نہیں (یعنی پھر انہیں توجہ سے قراءت سننی چاہئے)، اسی طرح قراءتِ قرآن کے وقت فقہ کی کتاب پڑھنے کا مسئلہ ہے، اور "فتح القدیر" میں "خلاصہ" کے حوالے سے ہے: ایک شخص فقہ (کے مسائل) لکھ رہا ہے اور اس کے پہلو میں ایک شخص قرآن پڑھ رہا ہے، تو اب اس (مسائل فقہ لکھنے والے کیلئے) قراءت کا توجہ سے سننا (عملاً) ممکن نہیں ہے، تو (ایسی صورت میں) گناہ قرآن پڑھنے والے پر ہوگا، اسی طرح اگر اس نے چھت پر (چڑھ کر) قرآن پڑھا، جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہیں، تو وہ گناہ گار ہوگا، کیونکہ یہ (قاریٔ قرآن) ان کے قرآن سننے سے اِعراض کا سبب بن رہا ہے، یا یہ انہیں جگا کر (اور ان کے آرام میں مخل ہوکر) انہیں ایذا پہنچا رہا ہے"۔
قراءت کو سننا فرض ہے یا واجب؟، اس پر بھی فقہاء کرام نے بحث کی ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"وفی "شرح المنیة": والأصل أن الاستماع للقرآن فرض کفایة لأنه لاقامة حقه بأن یکون ملتفتاً الیه غیرمضیع وذلک یحصل با نصات البعض ؛ کما فی ردّ السّلام حین کان لرعایة حق المسلم کفی فیه البعض عن الکلّ الاّ أنه یجب علی القارئ احترامه بأن لایقرأه فی الأسواق ومواضع الاشتغال، فاذا قرأه فیها کان هوالمضیع لحرمته، فیکون الاثم علیه دوْن أهل الاشتغال دفعاً للحرج ،

وتمامه فی "طحطاوی"، ونقل "الحموی" عن أستاذه قاضی القضاة یحیی الشهیر بمنقاری زاده: أن له رسالة حقق فیها أن استماع القرآن فرض عین"۔

ترجمہ: ''شرح المنیہ'' میں ہے: اصل یہ ہے کہ قرآن کا سننا ''فرضِ کفایہ'' ہے، کیونکہ قرآن کے حق کو قائم رکھنے کا تقاضا ہے کہ اس کی جانب توجہ کی جائے اور اسے (بے توجہی کے سبب) ضائع نہ کیا جائے اور یہ مقصد بعض لوگوں کے سننے سے حاصل ہو جاتا ہے، جیسا کہ سلام کے جواب دینے کا مسئلہ ہے کہ یہ ''حقِ مسلم'' کی رعایت کے لیے ہے اور اس میں بعض کا جواب دینا سب کی طرف سے کافی ہے، لیکن (اس کے باوجود) خود قاری پر قرآن کا احترام واجب ہے، کہ بازاروں میں کام کاج کے مقامات پر نہ پڑھے، پس جب وہ ان مقامات پر پڑھے گا تو وہ خود قرآن کی حرمت کو ضائع کرنے والا ہوگا، اور گناہ کا وبال اس پر ہوگا جو اس کا سبب بن رہا ہے، نہ کہ ان لوگوں پر جو کام میں مشغول ہیں تاکہ (لوگوں کیلئے) دفعِ حرج ہو، اور پورا مسئلہ (تفصیل کے ساتھ) ''طحطاوی'' میں ہے اور ''حموی'' نے اپنے استاذ قاضی القضاۃ یحیٰ المعروف بہ ''منقاری زادہ'' سے روایت کیا ہے کہ ان کا ایک رسالہ ہے جس میں انہوں نے تحقیق کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ: ''قرآن کا سننا فرض عین ہے''، (رد المحتار علی الدر المختار ج 2 ص 237 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

لہٰذا خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خواہ داخلِ نماز قرآن پڑھا جائے یا خارجِ نماز، لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی رکھنی چاہئے کہ مسجد میں موجود نمازی یا حاضرین سن سکیں جو قصداً اس کارِ خیر اور حصولِ ثواب کیلئے مسجد میں حاضر ہیں۔ اور قراءتِ قرآن کے دوران لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی اونچی رکھنا کہ اہلِ محلہ اس آواز کو سننے پر مجبور ہوں اور ''حقِ استماع'' ادا نہ کر سکیں، اپنی کوتاہی، کاہلی یا بے توجہی کی بنا پر یا پہلے سے کسی کام میں مشغول رہنے کے سبب ایسا ہو، تو ایسی صورت میں قرآن کی بے ادبی اور اس سے اعراض کا سبب پڑھنے والے یا مسجد کے منتظمین ہوں گے۔ جو لوگ گانوں کے کیسٹس کی دکانوں یا ورائٹی شوز یا دیگر غیر شرعی مجالس کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ ان کو تو کوئی منع نہیں کرتا، تو یہ طرزِ استدلال درست نہیں ہے،

کسی کی غلطی یا کوتاہی دوسرے کیلئے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ مزید یہ کہ ان خرافات کا سننا نہ صرف یہ کہ واجب نہیں ہے بلکہ شرعاً ممنوع ہے اور ان سے اِعراض لازم ہے، لہٰذا کسی کی عدمِ توجہی وعدمِ سماع کا بے ادبی کا سبب بننا تو درکنار، اس کے لئے ثواب کا باعث ہوگا، تو اس بنا پر بھی یہ 'قیاس مع الفارق' ہے۔

البتہ جہاں تک مجالس درس ووعظ کا مسئلہ ہے تو عوامی افادیت کے پیش نظر ان کیلئے لاؤڈ اسپیکر کی آواز خارجِ مسجد اہل محلہ کیلئے اونچی رکھی جا سکتی ہے، بہت سی خواتین اور معذور لوگ جو مساجد یا مجالس وعظ میں نہیں آسکتے، درس ووعظ کی ان مجالس میں بیان کردہ مسائل کو کافی توجہ سے سنتے ہیں۔ اور وعظ وتقریر کو اگر کوئی توجہ سے نہ سن سکے یا نہ سننا چاہے تو یہ خلاف ادب بھی نہیں ہے، کیونکہ نہ اس پر سننا واجب ہے اور نہ اس کا ادب قرآن کی طرح لازم ہے، تاہم یہ سلسلہ بھی مناسب وقت تک جاری رہنا چاہئے نہ کہ رات بھر یا رات کا بیشتر حصہ کہ اس کے سبب لوگوں کی نیند متاثر ہو یا وہ نماز فجر کیلئے اٹھ نہ پائیں، اگر مجالس درس ووعظ کیلئے ہماری بیان کردہ رخصت کے استعمال میں غلو اور حدِ اعتدال سے تجاوز ہو تو یہ 'کلمة الحق ارید بها الباطل" کی مثل ہوگا اور اس کی تحسین ہرگز نہیں کی جا سکتی۔

مسجد کے ملبے کا استعمال

سوال:185

مسجد غوثیہ سیکٹر D-11 کراچی کی توسیع کی گئی ہے، دیواریں اور ستون وغیرہ توڑ کر دوبارہ نئے سرے سے تعمیر ہوئی۔ جو ملبہ توڑ پھوڑ میں نکلا (چونکہ یہ ملبہ قابل فروخت نہیں تھا)، وہ مسجد کے قریب مدرسے میں ڈال دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ: " یہ ملبہ مدرسے یا کسی گھر وغیرہ میں ڈالنا جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ ملبہ چونکہ مسجد کی دیواریں وغیرہ تھا۔ کیا اس کا اب بھی وہی حکم ہے کہ اس کا احترام واجب اور اس پر چلنا وغیرہ ناجائز ہو؟ حکم شریعت سے مطلع فرمائیں، (سائل، عبدالرحمٰن، سیکٹر D-11 نیو کراچی)۔

جواب:

مسجد کے ایسے ملبے کا، جو قابلِ فروخت نہیں ہے، مدرسے میں ڈالنا جائز ہے،

فتاویٰ سراجیہ جلد نمبر 4 کتاب الوقف میں ہے:

حشیش المسجد اذا طرح فی ایام الربیع عن المسجد قالوا: ان لم یکن له قیمة لابأس بطرحه ، واذا طرح فمن اخذه کان له ان یصنع به ماشاء وان کان متقوما لا یجوز طرحه ـ

ترجمہ: ''مسجد کی خشک گھاس جب موسم بہار میں مسجد سے باہر پھینک دی جائے، تو فقہاء نے کہا ہے کہ اگر اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، تو پھینکنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جو کوئی لے لے، اسی کی ہے، وہ اس سے جو چاہے کرے، اور اگر اس ملبے یا ان اشیاء کی کوئی قیمت ہے، تو ان کا پھینکنا جائز نہیں ہے''۔

فتاویٰ تاتارخانیہ جلد نمبر 5 ص:850 پر ہے:

وفی المنتقی: بواری المسجد اذا خلقت فصارت لا ینتفع بها فاراد الذی بسطها أن یأخذها ویتصدق بها ویشتری مکانها فله ذلک ، وان کان هو غائبا فاراد أهل المحلة أن یأخذوا البواری فتصدقوا بها ما خلقت، لم یکن لهم ذلک ان کان لها قیمة، وان لم یکن لها قیمة فلا بأس بذلک۔

ترجمہ: ''اور منتقی میں ہے: مسجد کی چٹائیاں وغیرہ جب اتنی پرانی ہوگئیں کہ ان سے اب فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ہے، انہیں بچھانے والے شخص نے چاہا کہ انہیں لے لے اور صدقہ کردے اور ان کی جگہ اور خرید لے، تو یہ اس کیلئے جائز ہے۔ اور اگر وہ موجود نہیں ہے، اور محلے والوں نے چاہا کہ وہ چٹائیوں کو لے لیں اور پرانی ہونے کے بعد صدقہ کردیں، تو ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے، بشرطیکہ ان کی کوئی قیمت ہے، اور اگر اب ان کی کوئی قیمت نہیں رہی تو پھر کوئی حرج نہیں ہے''۔

فتاویٰ تاتارخانیہ کی اس عبارت کی روشنی میں مسجد کا وہ ملبہ جس کی کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ آج

کل شہروں میں اس کے اٹھانے پر بھی پیسہ خرچ ہوتا ہے، اسے کوئی عام آدمی بھی لے سکتا ہے۔
اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے دریافت کیا گیا:
''علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ مسجد کا فرش اور لکڑیاں جو خراب ہوجاتی ہیں سوا مسجد کے اور کسی کام میں تصرف کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟، آخر کیا کرنا چاہئے، تحریر فرمائیں، فقط''۔
آپ نے جواب دیا:
''فرش جو خراب ہوجائے کہ مسجد کے کام کا نہ رہے، جس نے وہ فرش مسجد کو دیا تھا، وہ اس کا مالک ہوجائے گا، جو چاہے کرے اور اگر مسجد ہی کے مال سے تھا تو متولی بیچ کر مسجد کے جس کام میں چاہے لگادے اور مسجد کی لکڑیاں یعنی چوکھٹ کواڑ کڑی تختہ یہ بیچ کر خاص عمارت مسجد کے کام میں صرف ہو''، (فتاویٰ رضویہ، جلد ششم، ص:430، مطبوعہ مکتبہ رضویہ، کراچی)۔
صدر الشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ بہارِ شریعت جلد دہم، ص:112 (مطبوعہ شمس بک ایجنسی) پر لکھتے ہیں:
''مسجد کی چٹائی جائے نماز وغیرہ اگر بے کار ہوں اور اس مسجد کیلئے کارآمد نہ ہوں تو جس نے دیا ہے وہ جو چاہے کرے اسے اختیار ہے اور مسجد ویران ہوگئی کہ وہاں لوگ رہے نہیں تو اس کا سامان دوسری مسجد کو منتقل کردیا جائے بلکہ ایسی مسجد منہدم ہوجائے اور اندیشہ ہو کہ اس کا ملبہ (سامان) لوگ اٹھالے جائیں گے اور اپنے صرف میں لائیں گے تو اسے بھی دوسری مسجد کی طرف منتقل کردینا جائز ہے''، (درمختار، ردالمحتار)۔
علامہ ابن عابدین شامی نے ''ردالمحتار علی الدر المختار'' جلد نمبر 6 صفحہ نمبر 430 پر ''مطلب فی انقاض المسجد ونحوہ'' (یعنی مسجد کے ملبے اور شکستہ چیزوں کا بیان) کے عنوان کے تحت بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد کا ایسا ملبہ، بوسیدہ یا شکستہ اشیاء جن کی اس مسجد کو کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن وہ کسی اور مسجد کے کام آسکتی ہیں، تو ایسی اشیاء دوسری ضرورت مند مسجد کو دے دی جائیں، ورنہ ان اشیاء کو چور یا زور آور لوگ یا اوقاف کے نگران

ویسے ہی ہڑپ کرلیں گے۔ امام ابوشجاع نے بتایا کہ مجھ سے امیر نے اس طرح کی اشیاء کے دوسری جگہ استعمال کی اجازت کا فتویٰ دریافت کیا تو میں نے شرنبلالی کی متابعت میں منع کردیا، بعد میں مجھے بتایا گیا کہ بعض داداگیر لوگ اس مال کو ویسے ہی اٹھا کر لے گئے، تو مجھے اپنے فتویٰ پر ندامت ہوئی، پھر اب میں نے ''الذخیرہ'' میں دیکھا، صاحب ذخیرہ لکھتے ہیں: ''فتاویٰ نسفی'' میں ہے: شیخ الاسلام سے پوچھا گیا کہ ایک بستی کے لوگ اپنی مسجد کو ویران چھوڑ کر چلے گئے، بعض زورآور لوگ اس کی لکڑیوں (یعنی ملبے) پر قابض ہوگئے اور اسے اپنے گھروں کو لے گئے، تو کیا محلے کے کسی شخص کیلئے جائز ہے کہ وہ قاضی کی اجازت سے لکڑیاں بیچ ڈالے اور قیمت بعض مساجد پر یا اسی مسجد پر صرف کرے؟، تو انہوں نے جواب دیا: جی ہاں!۔

مزارات پر حاضری

سوال:186

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضری دینے والے زائرین مزاروں کو چومتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں، جو اپنی پیشانی اور ناک کو مزار کے ساتھ لگاتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے، براہِ کرم بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضری دینے کا صحیح اور مروّجہ طریقہ بیان کریں؟۔ (سائل سردار محمد حبیب اللہ شاہین، مرشد آباد، آزاد کشمیر)۔

جواب:

علامہ ابن عابدین "مطلب فی زیارۃ القبور" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''زیارۃ قبور میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ یہ مستحب ہے، جیسا کہ ''البحرالرائق'' میں ''المجتبیٰ'' کے حوالے سے ہے، (بلکہ) اس کی صراحت کردینی چاہئے۔ کیونکہ حدیث میں اس کا حکم ہے، جیسا کہ ''الامداد'' میں ہے، (حدیث یہ ہے: کنت نہیتکم عن زیارۃ القبور الافزوروھا، (ترجمہ): میں نے (ابتداء میں) تمہیں زیارتِ قبور سے روکا تھا، تو اب زیارت

قبور کیلئے جایا کرو(صحیح مسلم: 77-976،ترمذی: 1054)،اور ہر ہفتے قبرستان جانا چاہئے،جیسا کہ ''مختارات النوازل'' میں ہے،''شرح لباب المناسک'' میں فرمایا: سنو! جمعہ، ہفتہ، پیر اور جمعرات کے دن قبرستان جانا افضل ہے،افضل یہ ہے کہ جمعہ کے دن نمازِ صبح کے بعد باوضو آئے،تاکہ واپس جاکر نمازِ جمعہ مسجد نبوی میں پڑھ سکے۔پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"شرح اللباب للملا علی القاری" میں ہے: آداب زیارت کی بابت جو علماء نے بتایا، یہ ہے کہ زائر قبر کی پائنتی کی جانب سے آئے،سر کی جانب سے نہ آئے، کیونکہ اس سے صاحبِ قبر کی توجہ میں دشواری ہوتی ہے(کیونکہ قبر میں میت کو قبلہ رو لٹایا جاتا ہے)،جب کہ پائنتی کی جانب سے آنے والا میت کے سامنے ہوتا ہے،اگر اس میں آسانی ہو، ورنہ رسول اللہ ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات (یعنی المفلحون تک) میت کی سرہانے کی جانب پڑھیں اور آخری آیات (امن الرسول سے آخر تک) میت کے پیر کی جانب پڑھیں،اور آدابِ زیارت میں سے یہ بھی ہے کہ ''السلام علیکم'' کہے،''علیکم السلام'' نہ کہے،کیونکہ حدیث میں آیا ہے:''السلام علیکم دارقوم مومنین، وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون ، ونسأل اللہ لنا ولکم العافیة''، پھر آپ حالتِ قیام میں لمبی دعا فرماتے ،اگر بیٹھ کر دعا کرنا چاہے تو حسبِ مرتبہ میت کی زندگی میں اس کے سامنے جتنے فاصلے پر بیٹھتا تھا،اسی حساب سے بیٹھے۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

پھر''سورۂ یٰسین''پڑھے،اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اہلِ قبور کے عذاب میں تخفیف فرماتا ہے،اور پڑھنے والے کو ان سب اموات کے مجموعی ثواب کے برابر ثواب عطا فرماتا ہے، بحوالہ البحر الرائق،اور''شرح اللباب''میں ہے: جتنا قرآن بآسانی پڑھ سکتا ہے، پڑھے، سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات (یعنی ھم المفلحون تک)، آیۃ الکرسی، بقرہ:225،بقرہ:285،سورہ یٰسین،سورۃ الملک،سورۃ التکاثر،سورۃ الاخلاص بارہ یا دس یا سات یا تین مرتبہ،پھر کہے: اے اللہ! جو کچھ ہم نے تلاوت کیا اس کا ثواب اس صاحب قبر

اور جمیع اہل قبور (مومنین) کی (ارواح) کو پہنچا، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد:3 صفحات:142-141 داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''زیارتِ قبور کے افضل ایام چار ہیں، پیر جمعرات، جمعہ اور ہفتہ۔ جمعہ کے دن نماز کے بعد بہتر ہے، ہفتہ کے دن طلوعِ آفتاب تک جائے، جمعرات کے روز دن کے ابتدائی حصے میں اور ایک روایت دن کے آخری حصے کے بارے میں بھی ہے، اسی طرح مبارک راتوں میں جیسے شب برأت، مبارک ایام میں جیسے عشرۂ ذوالحجہ، عیدین، عاشورا اور دیگر مواقع پر، غرائب میں اسی طرح ہے''۔۔۔آگے چل کر لکھا ہے:

''ابوبکر بن ابی سعید سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: زیارتِ قبور کے موقع پر سات مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھنا مستحب ہے، مجھے یہ روایت پہنچی ہے: کہ جس نے ایصالِ ثواب کیلئے سات بار سورۂ اخلاص پڑھی، اگر یہ میت پہلے سے مغفرت یافتہ نہیں ہے تو اس کی مغفرت کردی جائے گی، اور اگر یہ میت پہلے سے مغفرت یافتہ ہے، تو اس پڑھنے والے کی مغفرت فرمادی جائے گی، اور ثواب میت کو ہبہ ہوگا، ذخیرہ میں اسی طرح ہے''۔۔۔۔۔۔ عالمگیری میں مزید لکھا ہے کہ۔قبر کو نہ چھوئے اور نہ اسے بوسہ دے، کیونکہ یہ نصاریٰ کا طریقہ ہے، ماں باپ کی قبر کو بوسہ دینے میں حرج نہیں ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد:5 ص:351-350 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''زیارت ہر وقت جائز ہے، مگر شب میں تنہا قبرستان نہ جانا چاہئے اور زیارت کا افضل وقت روز جمعہ بعد نماز صبح ہے''، (فتاویٰ رضویہ ج9 ص:523 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''مزارات شریفہ پر حاضر ہونے میں پائنتی کی طرف سے جائے اور کم از کم چار ہاتھ کے فاصلہ پر مواجہہ میں کھڑا ہو اور متوسط آواز سے باادب سلام عرض کرے السلام علیک

یاسیدی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'پھر درودِ غوثیہ تین بار، الحمد شریف ایک بار، آیۃ الکرسی ایک بار، سورۂ اخلاص سات بار، پھر درودِ غوثیہ سات بار، اور وقت فرصت دے تو سورۂ یٰسین اور سورۂ ملک بھی پڑھ کر اللہ عزوجل سے دعا کرے کہ الٰہی! اس قراءت پر مجھے اتنا ثواب دے، جو تیرے کرم کے قابل ہے، نہ اِتنا جو میرے عمل کے قابل ہے، اور اُسے میری طرف سے اس بندۂ مقبول کو نذر پہنچا۔ پھر اپنا جو مطلب جائز شرعی ہو اس کے لئے دعا کرے اور صاحب مزار کی روح کو اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ قرار دے، پھر اُسی طرح سلام کر کے واپس آئے۔ مزار کو نہ ہاتھ لگائے نہ بوسہ دے اور طواف بالاتفاق ناجائز ہے اور سجدہ حرام''، (فتاویٰ رضویہ جلد:9 صفحہ نمبر:523-522، رضا فاؤنڈیشن جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور)۔

امام احمد رضا قادری سے پیر و مرشد کے مزار کے طواف، مزار اور مزار کی چوکھٹ کو بوسہ دینے، آنکھوں سے لگانے اور مزار سے اُلٹے پاؤں واپس آنے کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے جواب دیا:

''مزار کا طواف کہ محض بہ نیتِ تعظیم کیا جائے ناجائز ہے کہ تعظیم بالطواف مخصوص بخانہ کعبہ ہے۔ مزار کو بوسہ دینا نہ چاہئے، علماء اس میں مختلف ہیں اور بہتر بچنا، اسی میں ادب زیادہ ہے۔ آستانہ بوسی میں حرج نہیں اور آنکھوں سے لگانا بھی جائز کہ اس سے شرع میں ممانعت نہ آئی، اور جس چیز کو شرع نے منع نہ فرمایا اس میں حرج نہیں۔ ہاں اگر اس میں اپنی یا دوسرے کی ایذاء کا اندیشہ ہو تو اس سے احتراز کیا جائے''، (فتاویٰ رضویہ جلد:9 صفحہ نمبر:528 رضا فاؤنڈیشن جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور)

امام احمد رضا قادری سے مزاراتِ اولیاءِ کرام کو چومنے یا شرک قرار دینے کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: فی الواقع بوسۂ قبر میں علماء مختلف ہیں، اور تحقیق یہ ہے کہ وہ ایک امر ہے جو دو چیزوں داعی (یعنی جو امر اس کے کرنے کا سبب بن رہا ہے) و مانع (یعنی وہ امر جو اس سے روکنے کا سبب بن رہا ہے) کے درمیان دائر، داعی محبت ہے اور مانع ادب، تو جسے غلبۂ محبت ہو اُس پر مواخذہ نہیں کہ اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت ہے۔ اور عوام کیلئے منع

ہی احوط ہے۔
خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر کسی درجے میں مزار کو بوسہ دینا بعض صورتوں میں بربنائے اختلافِ علماء جائز بھی تسلیم کرلیا جائے، تب بھی عوام کیلئے احتیاط اسی میں ہے کہ انہیں منع کیا جائے تاکہ آگے چل کر بات سجدے تک نہ پہنچ جائے، جو اگر بندگی کی نیت سے کیا جائے تو شرک ہے اور محض تعظیماً کیا جائے، تب بھی حرام ہے، بقول شاعر

مگس کو باغ میں گھسنے نہ دینا　　　کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

یعنی شہد کی مکھی باغ میں جائے گی، پھولوں کا رس چوسے گی، پھر اس سے شہد بنے گا اور اسی چھتے سے موم بھی بنتا ہے، موم سے شمع بنا کر جلائی جائے گی اور پھر پروانہ آکر اس پر نثار ہوگا اور اس کی جان جائے گی، یعنی امر ممنوع کے دواعی، اسباب اور مُحرِّکات(INLENTIVES) سے بھی بچنا چاہئے۔ مزار کی چوکھٹ کو چومنا مباح ہے، لہٰذا نہ اس کی ترغیب دی جائے اور نہ اس سے منع کیا جائے، کیونکہ حلال، حرام کا تعین شارع کا کام ہے۔

فاتحہ کا مفہوم، طریقہ، مروّجہ فاتحہ کی شرعی حیثیت

سوال:187

''فاتحہ'' سے کیا مراد ہے، مروّجہ فاتحہ کی شریعت میں اصل اور اس کا طریقۂ کار کیا ہے؟، (منوراحمد نعیمی۔ملیر، کراچی)۔

جواب:

فاتحہ کی اصل ایصالِ ثواب اور دعا ہے اور یہ دونوں امور کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور ان میں کسی کا اختلاف نہیں۔ پہلے اس بات کو سمجھ لیجئے کہ اسے ''فاتحہ'' کیوں کہتے ہیں؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اور بالعموم عامۃ المسلمین کے ہاں دعاء ایصالِ ثواب اور دعاءِ مغفرت میں سورۂ فاتحہ لازماً پڑھی جاتی ہے، یہ التزام شرعی نہیں بلکہ عرفی ہے، اور اس کے علاوہ اور بھی قرآنی سورتیں، رکوعات اور آیاتِ مبارکہ حسب توفیق پڑھی جاتی ہیں اور درود شریف بھی پڑھا جاتا ہے، تو گویا سورۂ فاتحہ، اس مجموعی فاتحہ کا جزء ہے اور بعض

اوقات جزء بول کر کل مراد لیا جاتا ہے۔جیسے قیام، قراءت، رکوع، یہ سب نماز کے اجزاء اور ارکان ہیں اور قرآن مجید میں کئی مقامات پر ان میں سے ایک رکن یا جزء بول کر مکمل نماز مراد لی گئی ہے، مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(1) حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

ترجمہ:''اور تمام نمازوں کی پابندی کرو اور (خصوصاً) درمیانی نماز، اور اللہ تعالیٰ کے حضور ادب سے قیام کرو''، (البقرہ:238)۔

اس آیت میں قیام سے مراد نماز کے اندر قیام ہے، مطلقاً کھڑا ہونا مراد نہیں ہے، یعنی نماز کے تمام ارکان (قیام، رکوع، سجود، تشہد وغیرہ) پر قیام کا اطلاق کیا گیا ہے۔

(2) يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ﴿۴﴾

ترجمہ:''اے چادر لپیٹنے والے (محبوب)! رات کو (نماز میں) قیام کریں مگر تھوڑا حصہ، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کردیں، یا اس سے کچھ زیادہ کردیں اور (حسب عادت) قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں''، (المزمّل:1تا4)۔

یہاں بھی قیام سے محض کھڑے ہوکر تلاوت کرنا مراد نہیں ہے بلکہ نماز کے اندر کھڑے ہوکر تلاوت کرنا مراد ہے۔

(3) اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ

ترجمہ:''بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ رات کو (نماز میں) قیام کرتے ہیں دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات، اور (کبھی) تہائی رات، اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ہیں، (ان کی) ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ ہوتی ہے، اور اللہ رات اور دن کا اندازہ فرماتا ہے، وہ جانتا ہے کہ (اے مسلمانو!) تم ہرگز اس کا احاطہ نہ کرسکو گے، پھر اس

نے (اپنی رحمت کے ساتھ) تم پر توجہ فرمائی، تو (نماز میں) جتنا تمہارے لئے آسان ہو (اتنا) قرآن پڑھ لیا کرو"، (المزمّل:20)۔
یہاں پر بھی رات کو قیام کر کے مطلقاً قرآن پڑھنا نہیں بلکہ نماز کے اندر تلاوت مراد ہے، یعنی قرآن وقراءت سے نماز کو تعبیر فرمایا۔
(4) وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ترجمہ: "اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو"۔

(البقرہ:43)

یہاں رکوع سے محض حالتِ رکوع میں جھکنا مراد نہیں ہے بلکہ پوری نماز اور حالتِ نماز میں رکوع مراد ہے، اسی لئے مفسرین کرام نے اس کی تفسیر میں فرمایا: صَلُّوْا مَعَ الْمُصَلِّيْنَ یعنی نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو، بعض مفسرین نے اس سے جماعت کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔
امام احمد رضا قادری قدس سرہم العزیز سے دریافت کیا گیا کہ نیاز اور فاتحہ میں کیا فرق ہے اور نیاز و فاتحہ دینے کا مستحب طریقہ کیا ہے اور یہ کہ جس کی نیاز یا فاتحہ دلائی جائے اس کو ثواب کس طرح پہنچائے اور سوائے اس کے اور مسلمانوں کو کس طرح ثواب پہنچایا جائے؟
آپ نے جواب میں فرمایا:
"مسلمانوں کو دنیا سے جانے کے بعد جو ثواب قرآن مجید کا تنہا یا کھانے وغیرہ کے ساتھ پہنچایا جائے، عرف میں اسے "فاتحہ" کہتے ہیں کہ اس میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اولیاء کرام کو جو ایصالِ ثواب کرتے ہیں، اسے تعظیماً "نذر و نیاز" کہتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ، آیت الکرسی اور تین بار یا سات بار یا گیارہ بار سورۂ اخلاص، اول و آخر تین بار یا زیادہ بار درود شریف پڑھیں، اس کے بعد دونوں ہاتھ اُٹھا کر عرض کریں کہ الٰہی! میرے اس پڑھنے اور ان چیزوں (کھانا، کپڑا جو بھی ہوں ان سب کو شامل کرلے) کے دینے پر جو ثواب مجھے عطا ہو، اسے میرے عمل کے لائق نہ دے، اپنے کرم کے لائق عطا فرما اور اسے میری طرف سے فلاں ولی اللہ مثلاً حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں نذر پہنچا، اور

ان کے آباءِ کرام ومشائخ عظام اور اولادِ امجاد ومریدین، میرے ماں باپ اور فلاں اور فلاں اور سیدنا آدم علیہ السلام سے روزِ قیامت تک جتنے مسلمان ہو گزرے یا موجود ہیں یا قیامت تک ہوں گے سب کو ثواب پہنچا، (احکام شریعت حصہ اول:67)۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ چند آیات، سورتوں یا صدقے کا ثواب جمیع مومنین کو کیسے پہنچ سکتا ہے اور اس سے سب کے سب کیسے فیض یاب ہو سکتے ہیں؟، تو جواباً گزارش ہے کہ سورج کا نور ایک مادّی نور اور حرارت ہے، اس سے ایک ہی وقت میں نصف کرۂ ارض فیض یاب ہوتا ہے، فرض کیجئے کہ ایک شخص اپنے پڑھنے کے لئے کسی کھلے مقام پر ایک ٹیوب لائٹ یا سرچ لائٹ لگاتا ہے، اور اس کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے لگتا ہے، اسی اثنا میں دو سو آدمی اور بھی آکر اس کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے لگتے ہیں، سب کو یکساں روشنی ملتی ہے، اور جس شخص نے محض اپنی ذاتی منفعت کیلئے وہ روشنی لگائی تھی، اس کے حصے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اگر وہ یہ نیت کر لیتا کہ میرے ساتھ اس روشنی کا فیض دیگر انسانوں کو بھی پہنچے تو اس کا یہ عمل محض حسنِ نیت اور اخلاص کے باعث عبادت بن جاتا، گویا اپنا مقصد بھی پورا ہوتا اور ثواب بھی پاتا، اسے کہتے ہیں: ہم خرما وہم ثواب۔

اور قرآن میں ہے: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ترجمہ: ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (یعنی منور فرمانے والا ہے)''، (النور:35)۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور بیک وقت آدھی زمین کو منور کرتا ہے، غور کا مقام ہے کہ اگر ایک مادی نور ایک ہی وقت میں اربوں انسانوں اور آدھی زمین کو منور کر سکتا ہے، تو اللہ کے کلام کے معنوی نور کا فیضان اور روحانی برکات ایک ہی وقت میں اربوں مومنوں اور ساری کائنات کو فیض یاب کیوں نہیں کر سکتیں؟، چنانچہ حدیث میں ہے: "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ اَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" (صحیح مسلم)۔

یعنی کلمہ ''سبحان اللہ'' اور "الحمد للہ" (کا نور) آسمانوں اور زمین کے درمیان تمام وسعتوں کو معمور کر دیتا ہے، یہ بڑی بدنصیبی ہوگی کہ ہم مادّی نور کے فیضِ عام کو تو مانیں، مگر

آیاتِ ربّانی، کلامِ باری تعالیٰ، تسبیحاتِ مقدّسہ اور درود شریف کے فیضِ عام کو نہ مانیں۔
اسی طرح اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:
''فاتحہ ایصالِ ثواب کا نام ہے، جو کچھ قرآن مجید، درود شریف سے ہوسکے پڑھ کر ثواب نذر کریں اور ہمارے خاندان کا معمول یہ ہے کہ سات بار درود غوثیہ پھر ایک بار الحمد شریف و آیت الکرسی، پھر سات بار سورۂ اخلاص اور پھر تین بار درود غوثیہ، درود غوثیہ یہ ہے:
"اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ مَعْدِنِ الْجُوْدِ وَ الْکَرَمِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ۔"
امام احمد رضا خان بریلوی سے دریافت کیا گیا کہ کیا فاتحہ کے لئے کھانے کا سامنے رکھنا یا اسے کپڑے سے ڈھانپ کر رکھنا یا دروازہ بند کر کے فاتحہ پڑھنا، کیا یہ امور فاتحہ کیلئے ضروری ہیں؟، آپ نے جواب دیا: ''فاتحہ ایصالِ ثواب کیلئے ہے، کھانے کا پیشِ نظر ہونا کچھ ضروری نہیں، اسی طرح حضرت خاتونِ جنت کی نیاز کا کھانا پردے میں رکھنا اور مردوں کو کھانے نہ دینا، یہ سب جہالت کی باتیں ہیں، جو لوگ اپنی طرف سے ان امور کو بلا ثبوت ضرورتِ شرعیہ قرار دیں، انہیں توبہ کرنی چاہیے، (ملخصاً از فتاویٰ رضویہ ج 4 ص 224 مطبوعہ مکتبہ رضویہ)۔
اسی طرح ایک مقام پر آپ نے فرمایا: کہ جس طرح شرعاً فاتحہ کے کھانے کا سامنے رکھنا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ایسا کرنے کی شریعت میں ممانعت بھی نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی ایسا نہ کرے تو اسے مجبور نہیں کرنا چاہیے، اور جو کوئی ایسا کرے تو اسے ملامت نہیں کرنا چاہیے، یہ ایک امر مباح ہے، شیخ اسماعیل دہلوی لکھتے ہیں:

(1) ''اگر کوئی شخص کوئی بکری گھر پالے تاکہ اس کا گوشت عمدہ ہو پھر اس کو ذبح کر کے اور پکا کر حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی فاتحہ پڑھ کر کھلائے تو کوئی خلل نہیں''۔
(زبدۃ النصائح / فتاویٰ رضویہ مع تخریج و ترجمہ عربی عبارات، جلد 9 ص 566)

(2) ''جب میت کو کوئی فائدہ پہنچانا منظور ہو کھانا کھلانے پر موقوف نہ رکھے اگر میسر ہو تو بہتر ہے ورنہ سورۂ فاتحہ و اخلاص کا ثواب بہترین ثواب ہے''، (صراط مستقیم ص 55 مطبوعہ

المکتبۃ السلفیہ لاہور / فتاویٰ رضویہ جلد 9 ص572)

(3) شاہ ولی اللہ اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں:
''حضرت رسالت پناہ ﷺ کے ایام وفات میں کچھ میسر نہ ہوا کہ آں حضرت کی نیاز کا کھانا پکایا جائے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے اور قند سیاہ (گڑ) پر فاتحہ کیا''۔

(انفاس العارفین ص106 مطبوعہ المعارف گنج بخش روڈ لاہور / فتاویٰ رضویہ ج9 ص574)

(4) الدر الثمین میں اسی واقعہ کو اس طرح لکھا ہے:
''بائیسویں حدیث، مجھے سیدی والد ماجد نے بتایا کہ حضور ﷺ کی نیاز کیلئے کچھ کھانا تیار کراتا تھا ایک سال کچھ کشائش نہ ہوئی کہ کھانا پکواؤں، صرف بھنے ہوئے چنے میسر آئے وہی میں نے لوگوں میں تقسیم کئے، میں نے حضور اقدس ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے یہ چنے موجود ہیں اور حضور مسرور و شاداں ہیں''۔

(الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین ص40 مطبوعہ کتب خانہ علویہ / فتاویٰ رضویہ ج9 ص574)

(5) ''تھوڑی شیرنی پر عموماً خواجگان چشت کے نام فاتحہ پڑھیں اور خدائے تعالیٰ سے حاجت طلب کریں، اسی طرح روز پڑھتے رہیں''۔

(الانتباہ فی سلاسل الاولیاء ص100 برقی پریس دہلی / فتاویٰ رضویہ ج9 ص575)

(6) شاہ عبدالعزیز محدثِ دہلوی لکھتے ہیں:
''حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ اور ان کی اولاد پاک کو تمام امت پیروں اور مرشدوں کی طرح مانتی ہے اور امور تکوینیہ ان سے وابستہ جانتی ہے اور ان کے نام فاتحہ و درود اور صدقات کا معمول ہے اور ایسے ہی تمام اولیاء اللہ کے ساتھ یہی معاملہ ہے''۔

(تحفہ اثنا عشریہ باب ہفتم ص214 مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور / فتاویٰ رضویہ ج9 ص576)

(7) مولوی خرم علی بلہوری لکھتے ہیں: ''حاضری حضرت عباس کی، صحنک حضرت فاطمہ کی، گیارہویں عبدالقادر جیلانی کی، مالیدہ شاہ مدار کا، سہ منی بوعلی قلندر کی، توشہ عبدالحق کا اگر منت نہیں صرف ان کی روحوں کو ثواب پہنچانا منظور ہے تو درست ہے۔ اس نیت سے

ہرگز منع نہیں اھ ملخصا''،(صیحۃ المسلمین ص41 چند شرکیہ رسمیں مطبوعہ سبحانی اکیڈمی لاہور/فتاویٰ رضویہ ج9 ص577)۔

(8) شیخ اسماعیل دہلوی لکھتے ہیں:

اسی طرح اگر گذشتہ اولیاء قدس اللہ اسرارھم کیلئے نذر کرے تو جائز ہے۔فرق اتنا ہے کہ وہ عالم دنیا سے عالم برزخ میں انتقال کر جانے کے سبب نقد و جنس اور طعام سے نفع اندوز نہیں ہو سکتے بلکہ صرف ان کا ثواب اللہ تعالیٰ ان کی ارواحِ پاک کو پہنچاتا ہے۔تو ان کے احوال بحالتِ حیات اور بعد وفات برابر ہیں،(زبدۃ النصائح/فتاویٰ رضویہ ج9 ص579)۔

(9) شاہ عبدالعزیز محدثِ دہلوی قرآن کی آیت "والقمر اذا اتسق" کے تحت لکھتے ہیں:

''وارد ہے کہ مردہ اس حالت میں کسی ڈوبنے والے کی طرح فریادرسی کا منتظر رہتا ہے اور اس وقت صدقے ،دعائیں اور فاتحہ اسے بہت کام آتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ لوگ موت سے ایک سال تک خصوصاً چالیس دن تک اسی طرح کی امداد میں بھرپور کوشش کرتے ہیں''،

(تفسیر عزیزی ص206 لال کنواں دہلی/فتاویٰ رضویہ ج9 ص206)

(10) شاہ رفیع الدین محدثِ دہلوی سے فاتحہ کے بارے میں سوال کیا گیا:

بزرگوں کی فاتحہ میں کھانوں کا خاص کرنا،مثلاً امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فاتحہ میں کھچڑا، شاہ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی فاتحہ میں توشہ وغیر ذلک،یوں ہی کھانے والوں کو خاص کرنا ان سب کا کیا حکم ہے؟

اس کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:

فاتحہ اور طعام بلاشبہ مستحسن ہیں،اور تخصیص جو مخصص(خاص کرنے والے) کا فعل ہے وہ اس کے اختیار میں ہے،ممانعت کا سبب نہیں ہوسکتا۔یہ خاص کر لینے کی مثالیں،سب عرف اور عادت کی قسم سے ہیں جو ابتدا میں خاص مصلحتوں اور خفی مناسبتوں کی وجہ سے رونما ہوئیں اور پھر رفتہ رفتہ عام ہو گئیں''،(فتاویٰ شاہ رفیع الدین/فتاویٰ رضویہ ج9 ص590)۔

(11) ملا علی قاری کی المسلک المتقسط میں ہے،اور اس کے حوالے سے ردالمحتار میں بھی نقل ہے کہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص سات بار یا تین بار جس قدر میسر ہو پڑھے پھر یہ

کہے کہ اے اللہ! ہم نے جو پڑھا اس کا ثواب فلاں کو یا ان سب کو پہنچا دے اھ ملخصاً۔
شامی ہی میں یہ بھی ہے کہ ہمارے علماء نے "باب الحج عن الغیر" میں صراحت فرمائی ہے کہ انسان اپنے عمل کا ثواب دوسرے کیلئے کرسکتا ہے۔ نماز ہو یا روزہ یا صدقہ یا کچھ اور ایسا ہی ہدایہ میں ہے الخ، (المسلک المتقسط فی المنسک المتقسط مع ارشاد الساری، فصل یستحب زیادۃ اھلی المصلی ص 334 مطبوعہ دارالکتاب العربیہ)، (ردالمحتار مطلب فی القرأت للمیت ج1 ص 605 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)، (فتاویٰ رضویہ ج9 ص602، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

(12) مسند احمد بن حنبل میں ہے: صوم یوم السبت لالک و لا علیک
(مسند احمد بن حنبل حدیث امرۃ رضی اللہ عنہا ج6 ص338 دارالفکر بیروت)

تعیین عرفی میں نہ ضرر ہے اور نہ مزید فائدہ۔
علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:
(13) حضرت ابن حجر مکی سے سوال ہوا اگر اہل مقبرہ کیلئے فاتحہ پڑھی تو اب ان کے درمیان تقسیم ہوگا یا ہر ایک کو اس کا پورا ثواب ملے گا؟
انہوں نے جواب دیا کہ ایک جماعت نے دوسری صورت پر فتویٰ دیا ہے اور وہی فضل ربانی کی وسعت کے شایاں ہے، (ردالمحتار، مطلب فی القراۃ للمیت ج1 ص605 داراحیاء التراث العربی بیروت)، (فتاویٰ رضویہ ج9 ص617)۔
یعنی سب کو پورا پورا اجر ملے گا اور پڑھنے والے کے اجر میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی، اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک بار شعبان کے آخری دن فضائل رمضان پر ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:
مَنْ فَطَّرَ صَائِماً کَانَ لَہٗ مَغْفِرَۃٌ لِذُنُوْبِہٖ وَعِتْقُ رَقَبَتِہٖ مِنَ النَّارِ وَکَانَ لَہٗ مِثْلُ اَجْرِہٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِہٖ شَیْءٌ"۔
ترجمہ: "جس نے کسی روزے دار کا روزہ افطار کرایا تو یہ اس کے لئے گناہوں کی مغفرت اور نار جہنم سے نجات ہوگی، اور اس کے لئے روزے دار کے ثواب میں کسی کمی کے بغیر

روزے دار کے برابر اجر ہوگا''،(مشکوٰۃ المصابیح: کتاب الصوم)۔

(14)　جو مقابر پر گزرے اور سورۂ اخلاص گیارہ بار پڑھ کر اس کا ثواب اموات کو بخشے بہ عدد تمام اموات کے ثواب پائے،(فتح القدیر عن علی باب الحج عن الغیر ج3ص65 مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)، (کنز العمال الرافعی عن علی حدیث:42596 مؤسسۃ الرسالہ بیروت ج 15ص655)، (ردالمحتار عن علی مطلب فی اهداء الثواب الاعمال للغیر ج 2ص 257 مصطفیٰ البابی مصر)، (فتاویٰ رضویہ ج9ص617)

باقی رہا یہ سوال کہ ایک آدمی کے کسی عمل کا ثواب دوسرے زندہ یا وفات پانے والے شخص کو کیسے مل سکتا ہے؟، تو جواباً عرض ہے کہ قرآن مجید میں بکثرت دوسروں کیلئے دعا کی ترغیب آئی ہے اور حدیث میں جن دعاؤں کی قبولیت کا ذکر سب سے زیادہ آیا ہے، ان میں ایک "اَلدُّعَاءُ بِظَهْرِ الْغَيْبِ" (یعنی کسی دینی بھائی کی عدم موجودگی میں اس کیلئے دعا کرنا) ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(1)　وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ؕ

(یعنی اے رسول) مومنوں کو فرما دیجئے (کہ تم اپنے ماں باپ کیلئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں دعاء کیا کرو) کہ اے میرے پروردگار: تو ان دونوں پر اسی طرح رحم فرما، جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے (شفقت و محبت سے) پالا تھا''،(الاسراء:24)۔

(2)　وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ

ترجمہ:''(مہاجرین و انصار صحابہ کرام کا مدح و ستائش کے انداز میں ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) اور جو ان کے بعد آئے وہ (بارگاہ خداوندی میں) عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ وفات پا چکے ہیں''،(الحشر:10)۔

اسی طرح حج بدل (فرض ہو یا نفل) اور ایصال ثواب کی نیت سے، کسی کی طرف سے عمرہ

کرنا یا کسی کے ایصالِ ثواب کیلئے مالی صدقہ دینا یا صدقۂ جاریہ کا اہتمام کرنا یہ تمام امور بلا اختلاف جائز ہیں۔ اور کثیر احادیث مبارکہ سے یہ امور ثابت ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ سَعْدَبْنَ عُبَادَۃَ تُوُفِّیَتْ اُمُّہٗ وَھُوَ غَائِبٌ عَنْھَا، فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اِنَّ اُمِّیْ تُوُفِّیَتْ وَاَنَا غَائِبٌ عَنْھَا اَیَنْفَعُھَا شَیْءٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ بِہٖ عَنْھَا، قَالَ: نَعَمْ قَالَ: اِنِّیْ اُشْھِدُکَ اَنَّ حَائِطِی الْمِخْرَافَ صَدَقَۃٌ عَلَیْھَا۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ان کی عدم موجودگی میں وفات پا گئیں، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں غائب تھا اور اسی اثنا میں میری والدہ فوت ہوگئیں، تو (اب) اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انہیں اس کا فائدہ پہنچے گا، آپ نے فرمایا: ہاں، انہوں نے عرض کیا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا پھلوں والا باغ اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کردیا“، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:2756,2762)۔

دوسری حدیث میں ہے: کہ حضرت سعد نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے، آپ نے فرمایا: پانی کا، تو انہوں نے کنواں کھودا اور کہا کہ یہ سعد کی ماں کے لئے (صدقۂ جاریہ) ہے، (صحیح بخاری ج1 ص386)۔

حنفیہ، مالکیہ، اور حنبلیہ اور غیر مقلدین (ملاحظہ ہو السراج الوہاج ج2 ص55 مؤلفہ نواب صدیق حسن خان بھوپالی) سب کے نزدیک حج و دیگر عبادات اور مالی صدقات کے ساتھ ساتھ دعا، تلاوت، اذکار و تسبیحات اور درود پاک کا ثواب دوسروں کو پہنچایا جاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الغافر:7)

ترجمہ: ”حاملین عرش اور اس کے گرد و نواح کے فرشتے اپنے رب کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور اہل ایمان کیلئے (اللہ تعالیٰ سے) بخشش کی دعا مانگتے ہیں“۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ

ترجمہ: "اور (اے حبیب!) آپ ان کیلئے استغفار کیجئے، بے شک آپ کی دعا و استغفار ان کیلئے طمانیت کا باعث ہے"، (التوبہ:103)۔

عن معقل بن یسار المزنی ان النبی ﷺ قال من قرء یس ابتغاء وجہ اللہ غفرلہ ما تقدم من ذنبہ فاقرؤھا عند موتاکم رواہ البیھقی فی شعب الایمان، (مشکوۃ شریف ص: 189)۔

عقلی اعتبار سے اگر کسی کو اشتباہ ہو کہ تسبیحات، درود یا تلاوت سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، تو ہمارا مشاہدہ ہے کہ گالی گلوچ اور خبیث کلمات سے انسان کو روحانی اذیت پہنچتی ہے بلکہ ایک عربی شاعر نے کہا ہے کہ:

جراحة السنان یلتام جراحة اللسان لایلتام

ترجمہ: "کہ تیر و نشتر کے لگائے زخم تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مندمل ہو جاتے ہیں، لیکن زبان کے لگائے زخم (یعنی عداوت، بغض اور نفرت پر مبنی کلمات کے اثرات) کبھی مندمل نہیں ہوتے"۔

تو بڑی حیرت اور تاسف کا مقام ہوگا کہ ہم کلام الٰہی، تقدیس، تسبیح و تمجید باری تعالیٰ کے کلمات اور درود پاک کی روحانی تاثیر کا انکار کردیں، گویا کلماتِ شیطانی کی تاثیر کو تو مانیں مگر رحمانی کلمات کی تاثیر کو نہ مانیں۔ احادیث مبارکہ میں تو سورۂ فاتحہ کے وسیلۂ شفاء ہونے، قرآنی سورتوں کی برکات، کلمات باری تعالیٰ کے رد بلا، وسیلۂ شفاء، نذر بد سے بچاؤ اور دیگر جسمانی و روحانی برکات کے ساتھ ساتھ آخرت میں وسیلۂ نجات و شفاعت کا ذکر موجود ہے، عذاب قبر میں تخفیف کا بھی ذکر ہے۔

امام ابوداؤد، سنن ابی داؤد (ج2 ص30) میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: "حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ قربانی کے دن نبی ﷺ نے دو سینگوں والے سرمئی خصی مینڈھے ذبح کیے، جب آپ نے ان کو قبلہ رخ کرایا تو یہ دعا پڑھی:

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفاً وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ، اِنَّ صَلَوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ، اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَلَکَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَّ اُمَّتِہٖ بِسْمِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ" پھر انہیں ذبح کیا۔

امام ابوداؤد کی ایک اور روایت میں ہے:

"اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَّمِنْ اُمَّۃِ مُحَمَّدٍ"، یعنی رسول اللہ ﷺ نے دو مینڈھے ذبح کئے، ان میں سے ایک اپنی طرف سے اور ایک اپنی پوری آل اور امت کی طرف سے، یہی ایصالِ ثواب ہے، ہاں یہ سوال کہ ایک قربانی تو ایک فرد کی جانب سے ہوتی ہے، پوری آلِ محمد اور امت کی جانب سے کیسے ہوسکتی ہے، تو یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔

شادی کی قسم کھانا

سوال:188

جناب عرض یہ ہے کہ آج سے 2 سال پہلے میری منگنی اپنے ماموں کے گھر سے ہوئی لیکن اب گھریلو مسئلے کی وجہ سے انہوں نے رشتہ سے انکار کردیا ہے، اور مجھے ایک اور لڑکی پسند ہے اور وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے اور اس نے قرآن کی قسم کھائی ہے کہ اگر اس کی شادی ہوئی تو صرف مجھ سے ہوگی اور میری بھی قسم ہے۔ دونوں کی قسم ہے کہ اگر ہماری شادی آپس میں نہ ہوئی تو ہم خودکشی کرلیں گے۔ جناب اب آپ اس مسئلہ کا حل بتائیں ہم کسی اور جگہ شادی کرسکتے ہیں یا نہیں اگر کرسکتے ہیں تو کیسے یا پھر قرآن پاک کی قسم کے بعد ہماری شادی صرف آپس میں ہی ہوسکتی ہے کسی اور سے نہیں کیونکہ دوسری جگہ شادی سے قسم روکتی ہے خودکشی بھی حرام ہے، جناب براہِ کرم اس مسئلے کا کوئی حل ضرور بتائیں تاکہ ہم کوئی غلط اقدام نہ اٹھائیں، میری عمر 24 سال ہے اور میں باربر کا کام کرتا ہوں اور روزنامہ ایکسپریس روز پڑھتا ہوں، حضور میں اب جواب کا انتظار کروں گا، (اعجاز حسین)۔

جواب:

منگنی وعدہ نکاح ہے، نکاح نہیں ہے، لہٰذا آپ کی منگیتر یا اس کے والد کو انکار کا حق حاصل ہے، آپ اور جس لڑکی نے باہم شادی کرنے کی قسم کھائی ہے، اگر دونوں کے والدین کی رضامندی سے آپ دونوں کی شادی ہوجاتی ہے تو فبھا، ورنہ شادی نہ ہوسکنے کی صورت میں آپ دونوں پر قسم کا کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا، جو یہ ہے اپنے اوسط خرچ کے درمیان دس مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس فراہم کرنا اور یہ نہ کرسکیں تو تین دن کے روزے رکھنا، باقی خودکشی حرام ہے اور حرام چیز کی قسم کھا کر اس پر عمل کرنا بھی حرام ہے اور یہ دائمی عذاب کا باعث ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

بلاضرورت قسم کھانے کا حکم

سوال:189

میرے شوہر نے مجھے فون پر ایک طلاق دی اور اس کے بعد فون ہی کے ذریعے رجوع کرلیا تھا، اور ہماری علیحدگی کو تقریباً تین سال کا عرصہ ہونے کو آیا ہے، اور کیونکہ میرے شوہر کی طبیعت میں شک موجود تھا / ہے، اس لئے پچھلی زندگی میں ہر بات کی وضاحت کے لئے اللہ یا قرآن کی قسم کو ضروری سمجھتے تھے، اس لئے آئندہ کی زندگی کو پُرسکون بنانے کے لیے میں اور میرے والد یہ چاہتے ہیں کہ میرے شوہر آکر قرآن کی قسم اٹھا کر یہ کہیں کہ آئندہ مجھ سے قسم نہ اٹھوائیں گے اور نہ ہی میرے گھر والوں سے تعلق منقطع کروائیں گے۔ جناب اعلیٰ کیا یہ شرعاً جائز ہے، فتویٰ جاری کیجئے۔ شکریہ

(اُم لیلیٰ A1-67 Al-Muslim Housing Society Scheme 33)

جواب:

اگرچہ مستقبل کے کسی ایسے کام کی یقین دہانی کیلئے، جس پر قائم رہنا شرعاً جائز ہے، قسم کھانا یا قسم لینا شرعاً جائز ہے لیکن شرعاً یہ پسندیدہ اور مستحسن امر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ

ترجمہ: ''اور اللہ کی ذات (اور مقدس نام) کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ''، (البقرہ: ۲۲۴)۔

قرآن مجید کی سورۃ القلم آیت نمبر 10 میں ایک دشمنِ رسول کے اوصافِ ذمیمہ کو بیان کیا گیا ہے، جن میں سے ایک ''حلاف'' (یعنی بکثرت قسمیں کھانے والا) ہے۔ تاہم اگر آپ نے اپنے شوہر کو مجوزہ قسم دیدی اور اس نے قسم کھالی تو یہ شرعاً جائز ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ

ترجمہ: ''اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو''، (المائدہ: ۸۹)۔

لیکن اگر خدانخواستہ وہ قسم توڑ دیتا ہے تو اسے قسم کا کفارہ دینا ہوگا، جو قرآن مجید کی سورۃ المائدہ: کی آیت 89 میں بیان کیا گیا ہے، یعنی اپنے اوسط معیار کے مطابق دس مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس فراہم کرنا، اور جو یہ نہ کر سکے تو وہ تین دن کے روزے رکھے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

عورت کا غیر محرم کے ساتھ مشترکہ خاندان میں رہنا

سوال:190

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مہنوں کی وفات کے بعد اس کی بیوہ نے علم دین سے نکاح کر لیا، مہنوں سے ایک بیٹا سلام دین اور علم دین سے محمد نور ہے، بعد ازاں علم دین کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ اپنے پہلے مرحوم شوہر کے بیٹے سلام دین کے ساتھ رہنے لگی۔ سلام دین کی شادی ہوئی مگر جلد طلاق ہوگئی اب نہ اس کی بیوی ہے نہ اولاد۔ محمد نور شادی کر کے اپنی جوان بیوی کو سلام دین کے پاس چھوڑ کر آزاد کشمیر سے کراچی نوکری پر چلا گیا کچھ عرصے بعد محمد نور کی والدہ بھی فوت ہوگئی مگر اس کی جوان بیوی جس کے تین بچے اور بچیاں بھی اسی گھر میں پیدا ہوئے، ابھی تک سلام دین کے ساتھ رہ رہی ہے۔ آیا محمد نور کی جوان بیوی، سلام دین (جس کا ماں کی طرف سے بھائی کا

رشتہ ہے) کے ساتھ رہ سکتی ہے۔قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب درکار ہے۔
(نذر حسین،F-75 اسٹاف ٹاؤن،کراچی یونیورسٹی)

جواب:

کوئی شخص اپنی بھابھی کے لئے محرم نہیں بنتا سوائے اس کے کہ کوئی اور ایسا رشتہ ہو جس سے وہ اس کا محرم بن جائے (مثلاً سلام دین نے اور محمد نور کی بیوی نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو اور اس طرح دونوں کے درمیان رضاعی بہن بھائی کا رشتہ قائم ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں سلام دین، محمد نور کی بیوی کا رضاعی بھائی ہوگا اور محرم ہوگا) لیکن وہ مرد رشتے دار جو کسی بھی حوالے سے محرم نہیں بنتے ان کے ساتھ بے تکلف میل جول جائز نہیں ہے شرعاً وہ اجنبی عورت کے حکم میں ہے۔

حدیث میں ہے :عن عقبة بن عامر أن رسول الله ﷺ قال: "ایاکم والدخول علی النساء" فقال رجل من الانصار:یا رسول الله افرأیت الحموقال الحمو الموت۔

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:(اجنبی)عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کرو،انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا:یارسول اللہ ﷺ! دیور کا کیا حکم ہے؟،فرمایا کہ دیور موت ہے''،(صحیح مسلم،رقم الحدیث 5570،جلد 9،مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکۃ المکرمۃ)۔

ایک اور حدیث میں ہے: لایخلون رجل بامرأة الاکان ثالثهما الشیطان۔
''کوئی مرد جب کسی (اجنبی) عورت کے ساتھ تنہا ہوتا ہے،تو ان میں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے''،(رواہ الترمذی عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رقم الحدیث 1171)۔

اور فرمایا:عن جابر،عن النبی ﷺ قال: لاتلجوا علی المغیبات فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم۔

ان عورتوں کے پاس نہ جاؤ،جن کے شوہر موجود نہ ہوں، کیونکہ شیطان تمہارے وجود میں اسی طرح سرایت کرتا ہے جیسے تمہاری رگوں میں خون تیرتا ہے،(ترمذی،رقم الحدیث 1172

دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

عن علی بن الحسین :کان النبیﷺ فی المسجد، وعنده ازواجه، فرحن، فقال لصفیة بنت حیی:"لاتعجلی حتیٰ أنصرف معک "۔ وکان بیتها فی دار أسامة، فخرج النبیﷺ معها،فلقیه رجلان من الانصار،فنظراالی النبیﷺ ثمّ أجازا، وقال لهما النبیﷺ: "تعالیا،انها صفیة بنت حیی "۔قالا:سبحان الله یارسول اللهﷺ،قال :"انّ الشیطان یجری من الانسان مجری الدم،وانّی خشیت أن یلقی فی أنفسکما شیئاً"۔

ترجمہ:علی بن حسین سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تھے اور آپ کی ازواجِ مطہرات آپ کے پاس تھیں،وہ جانے لگیں تو آپ نے حضرت صفیہ سے فرمایا:ٹھہروتا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں اور ان کا حجرہ حضرت اسامہ کے مکان میں تھا۔ نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ نکلے تو آپ کو انصار کے دو شخص ملے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا اور آگے نکل گئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا: ادھر آؤ، یہ صفیہ بنت حیی ہے (یعنی میری بیوی ہے)۔دونوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ : سبحان اللہ ! (یعنی آپ کی ذات کے بارے میں مومن کسی بدگمانی کا تصور بھی نہیں کرسکتا)،آپ نے فرمایا:شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح دوڑتا ہے تو مجھے خدشہ ہوا کہ مبادا وہ تمہارے دل میں کوئی وسوسہ (یا بدگمانی) ڈال دے،(صحیح بخاری،جلد2رقم الحدیث2038،مطبوعہ مکتبۃ العصریۃ،بیروت)۔

صورتِ مسئولہ میں سلام دین ولد مہنوں اور محمد نور ولد علم دین کی بیوی کے درمیان حرمتِ نکاح کا کوئی اور رشتہ نہیں ہے،سلام دین،محمد نور کا اخیافی (ماں کی طرف سے) بھائی ضرور ہے،لیکن اس کی بیوی اور سلام دین کے درمیان محرم ہونے کے کسی رشتے کا سوال میں تذکرہ نہیں ہے،لہٰذا محمد نور ولد علم دین کی بیوی کا سلام دین کے ساتھ اس طرح بے تکلف رہنا کہ ان کے خلوت میں ملنے کے مواقع ہوں، قطعاً جائز نہیں ہے، بلکہ محمد نور کی بیوی کا

سلام دین سے پردہ لازم ہے۔ ہمارے ہاں مشترکہ خاندانی نظام (JOINT FAMILY SYSTEM) میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہاں ایک خامی یہ ہے کہ شرعی حجاب، غیر محرم مرد سے اجتناب اور دونوں کے مابین خلوت سے کامل اجتناب کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے، بشری کمزوریوں کے تحت بعض اوقات اس صورتِ حال سے مفاسد جنم لیتے ہیں۔ شرعی احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ حقیقی بھائی (جسے عینی بھی کہا جاتا ہے) کی بیوی بھی اگر اپنے دیور یا جیٹھ کے ساتھ بعض مجبوریوں کے تحت ایک ہی مکان میں رہ رہی ہو، جسے عربی میں دار یا ہمارے ہاں عرف میں حویلی کہتے ہیں، اس میں بھی اس خاتون کا یونٹ یا حجرہ الگ ہونا چاہئے، جس میں غیر محرم لوگوں کے بے تکلف آنے جانے پر پابندی ہو، اور گھریلو کام کاج اور ضروریات کے لئے جب وہ خاتون اپنے ''بیت سُکنیٰ'' یا حجرے سے باہر آئے تو ستر وحجاب کے شرعی حکم کا مکمل اہتمام کرے، ضرورت کی حد تک بات کرے، بے تکلف میل جول، خوش گپیاں اور آمنے سامنے آنے سے اجتناب کرے۔

ہندوستان سے مسلمانوں کی کمپنی کے درآمد شدہ حلال ذبیحہ کا حکم

سوال:191

زید جو ایک مسلمان کاروباری ہے اور حلال گوشت کا کاروبار کرتا ہے، دوسرا شخص سلیم، زید کو حلال گوشت دینے کی پیشکش کرتا ہے، سلیم کا کہنا ہے کہ میں یہ حلال گوشت (بھینس کا بغیر ہڈی کا گوشت) کارٹن میں پیک انڈیا سے بذریعہ بحری جہاز منگواتا ہوں اور وہ گوشت دینے والی کمپنی بھی مسلمان کی ہے Allana Sons LTD ممبئی میں واقع ہے سلیم نے وہاں کی کمیٹی ''محکمہ شرعیہ شہادۃ ذبیح حلال'' کا سرٹیفکیٹ بھی دیا ہے اور یہ گوشت اس وقت کراچی کی مارکیٹوں میں فروخت بھی ہو رہا ہے اور اس کمپنی نے Working Process کی C-D بھی دی ہے معلوم یہ کرنا ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائی کی زبان پر یقین کرتے ہوئے کہ ''یہ حلال گوشت ہے'' اپنے کاروبار میں استعمال کر سکتے ہیں؟۔ (آصف قادری، لیاقت آباد نمبر 4 نزد اجمیری مسجد، کراچی)۔

جواب:

سوال میں جو تفصیل آپ نے درج کی ہے، اس کے مطابق آپ مسلمان بھائی کی زبان پر اعتماد کرسکتے ہیں، جبکہ کمپنی کا مالک بھی مسلمان ہے اور وہاں کے علماء نے اس کی توثیق بھی کردی ہے، لیکن اگر کاروبار بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے تو آپ عین الیقین کی حد تک اطمینان حاصل کرنے کے لئے پاکستان سے دو معتمد علماء کو وہاں بھیج دیں تاکہ وہ از اوّل تا آخر ذبح سے لے کر پیکنگ تک تمام Working Process کا مشاہدہ کرکے اس کے حلال ہونے کی تصدیق کریں، یا ہندوستان کے دو معتمد و مستند علماء کو بھی یہ ذمہ داری تفویض کی جاسکتی ہے اور ان کی دیانت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، ''محکمہ شرعیہ شہادہ ذبیح حلال'' کا ہمیں علم نہیں کہ یہ مسلمانوں کا غیر سرکاری ادارہ ہے یا حکومتِ ہندوستان کا قائم کردہ ہے، اس کے ارکان و ذمہ داران کون ہیں؟ سوال میں اس کی وضاحت نہیں ہے۔

پینشن اور پراویڈنٹ فنڈ میں حکومت کی طرف سے اضافی رقم

سوال:192

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ میں K-D-A میں ملازم تھا۔ 19 سال سروس کے بعد تقریباً 750 ملازمین کو گولڈن ہینڈ شیک دے کر فارغ کردیا گیا ہے۔ ہماری ماہانہ پینشن بھی مقرر کی ہے دورانِ سروس ہماری تنخواہ سے ماہانہ فنڈ کاٹا جاتا تھا۔ سروس سے فارغ کرتے وقت بالفرض ہمارے فنڈ میں پچاس ہزار روپے ہیں تو گورنمنٹ ہمیں ایک لاکھ دے گی۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ جو رقم ہمیں ملی ہے شرعی طور پر یہ کیسی ہے اور پینشن کے بارے میں کیا حکم ہے؟ مہربانی فرما کر مسئلہ حل فرمائیں؟، (محمد عرفان قادری)۔

جواب:

پینشن چونکہ حکومت تبرعاً اپنے ملازمین کو دیتی ہے، چونکہ یہ شرائط ملازمت میں سے ہے، اس لئے ملازم کا استحقاق بھی بن جاتا ہے، یہ جائز ہے، اس کا دینا اور لینا دونوں جائز ہیں، اسی طرح جن اداروں میں یہ اصول ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے جی پی فنڈ کی مد میں ماہانہ

جتنی رقم کاٹی جائے گی، اتنی رقم وہ ادارہ اپنی طرف سے تبرعاً اس فنڈ میں جمع کرے گا، جیسا کہ آپ نے سوال میں لکھا ہے: تو یہ اگر اس ادارے کی طرف سے بطور تبرّع اور فضل واحسان کے ہے، تب بھی درست ہے اور اگر شرائط ملازمت کا حصہ ہے، تب بھی درست ہے۔

مسجد کے چندے پر حق الخدمت کی ادائیگی

سوال:193

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں ایک قاری صاحب کہتے ہیں کہ میں جو مسجد اور مدرسہ کے لئے چندہ وغیرہ کرتا ہوں اس صورت میں چندہ کروں گا کہ اس چندے میں سے 15% کمیشن لوں گا، کیا اُن کو 15% کمیشن دینا صحیح ہے، جبکہ وہ قاری صاحب اس ادارے کے باقاعدہ تنخواہ دار ملازم ہیں، شرعی حکم صادر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں، (عبداللہ، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے مصارف صرف فقراء اور مساکین ہیں اور وہ لوگ جو زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور ہیں''، (التوبہ:60)۔

وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا کے تحت علامہ محمود آلوسی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں کہ:

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں امام (یعنی حاکم) صدقات کی وصول کرنے کے لئے مقرر کرتا ہے اور ''البحر الرائق'' میں ہے کہ ''عامل'' عشر جمع کرنے والے اور وصول کرنے کے لئے کوشش کرنے والے کو بھی شامل ہے، اور ''عاشر'' سے مراد وہ شخص ہے جسے امام (حاکم) تجارتی گزرگاہوں پر وہاں سے گزرنے والے تاجروں کے مال سے صدقہ لینے کے لئے مقرر کرتا ہے۔

''ساعی'' سے مراد وہ شخص ہے کہ جو مختلف علاقوں میں لوگوں کے پاس جا کر ان سے جنگل میں چرنے والے مویشیوں کی زکوٰۃ وصول کرے اور (عامل کو) وصول کردہ زکوٰۃ وصدقات

میں سے اتنا دیا جائے کہ آنے اور جانے کے زمانے میں ان کے اور ان کے کارکنوں کی ضرورت کے لئے کافی ہو، مگر اسے اتنا نہ دیا جائے کہ اس کی وصول کردہ زکوٰۃ وصدقات کے نصف سے زائد ہو جائے، (روح المعانی، جلد 10 ص: 121، دار احیاء التراث العربی)

وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا کا معنی اور اس کے شرعی احکام:

یعنی جو لوگ زکوٰۃ اور صدقات کو وصول کر کے لاتے ہیں ان کو ان کی محنت اور مشقت کے مطابق مالِ زکوٰۃ سے اُجرت دی جائے لیکن یہ اُجرت اتنی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ زکوٰۃ کی وصول کردہ تمام رقم یا اس کے نصف پر محیط ہو (عنایت القاضی ج ۴ ص ۵۸۷) اگر عامل کو اس مہم کے دوران کوئی شخص ذاتی طور پر کچھ ہدیہ اور تحفہ دے تو وہ اس کے لیے جائز نہیں ہے، وہ اس کو بھی وصول شدہ زکوٰۃ کی مد میں شامل کر دے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن ابی حمید الساعدی قال ان النبی ﷺ استعمل ابن اللتبية على صدقات بنی سلیم، فلما جاء الی رسول الله ﷺ وحاسبه قال هذا الذی لكم، وهذه هدية اهديت لی، فقال رسول الله ﷺ "فهلا جلست فی بیت ابیک وبیت امک حتی تاتیک هدیتک ان كنت صادقا" ثم قام رسول الله ﷺ فخطب الناس، وحمد الله واثنی علیه، ثم قال: "اما بعد، فانی استعمل رجالا منكم علی امور مما ولانی الله فیاتی احدكم فیقول: هذا لكم وهذه هدية اهديت لی، فهلا جلس فی بیتِ ابیه وبیت امه حتی تاتیه هدیته ان كان صادقا، فوالله، لا یاخذ احدكم منها شیئا، قال هشام بغیر حقه، الا جاء الله یحمله یوم القیامة الا فلا اعرفن ما جاء الله رجل ببعیر لهٗ رغاء او ببقرة لها خوار او شاة تیعر" ثم رفع یدیه حتی رایت بیاض ابطیه: "الا هل بلغت"۔

ترجمہ: "حضرت ابوحمید الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: نبی ﷺ نے ابن اللتبیہ کو بنو سلیم کے صدقات وصول کرنے کا عامل بنایا، جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ نے اس سے حساب لیا تو اس نے کہا: یہ وہ مال ہے جو آپ کے لیے دیا گیا ہے

اور یہ وہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو پھر ایسا کیوں نہ ہوا کہ تم اپنے باپ اور اپنی ماں کے گھر میں بیٹھے رہتے حتیٰ کہ تمہارے پاس یہ ہدیے آتے، پھر رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا: میں تم میں سے کسی شخص کو کسی ایسے کام پر عامل بناتا ہوں، جس کا اللہ نے مجھے ولی بنایا ہے، پھر تم میں سے کوئی شخص میرے پاس آ کر کہتا ہے: یہ حصہ آپ کے لئے ہے اور یہ حصہ مجھے ہدیہ کیا گیا ہے، پس وہ شخص کیوں نہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھا رہا حتیٰ کہ اس کے پاس ہدیہ آتا، اگر وہ سچا ہے، اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی اس مال میں سے جو چیز بھی ناحق لے گا، مگر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس چیز کو اس کے اوپر لاد دے گا، سنو! میں اس شخص کو قیامت کے دن ضرور پہچان لوں گا، جس کے اوپر اللہ بلبلاتا ہوا اونٹ لاد دے گا اور جس کے اوپر ڈکارتی ہوئی گائے لاد دے گا یا ممیاتی ہوئی بکری لاد دے گا، پھر آپ نے اپنے ہاتھ بلند کیے حتیٰ کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دیکھی، پھر آپ نے فرمایا: سنو! کیا میں نے (اللہ کا) پیغام پہنچا دیا ہے''، (صحیح البخاری، رقم الحدیث:۷۱۹۷، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۸۳۲)، (سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۲۹۴۶، سنن دارمی رقم الحدیث:۱۶۶۹)۔

عن عدی بن عمیرة الکندی۔قال:سمعت رسول اللہ ﷺ یقول:"من استعملناہ منکم علیٰ عمل، فکتمنامخیطاًفما فوقه،کان غلولاً یأتی به یوم القیامة" قال:فقام الیه رجل أسود، من الانصار؛کأنّی أنظر الیه۔ فقال:یارسول اللہ ﷺ! اقبل عنّی عملک۔ قال: "ومالک؟"قال:سمعتک تقول کذاو کذا۔قال:"وأنا أقوله الآن:من استعملناہ منکم علیٰ عمل،فلیجی بقلیله و کثیرہ،فما أوتی منه أخذ، وما نهی عنه انتهیٰ"۔

ترجمہ:''حضرت عدی بن عمیرہ کندی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم میں سے جس شخص نے ہمارے لیے کوئی عمل کیا پھر اس میں سے کوئی چیز چھپالی خواہ وہ سوئی ہو یا اس سے بھی کمتر چیز تو وہ خیانت ہے اور وہ قیامت کے دن اس چیز کو

لے کر آئے گا، تب ایک سیاہ فام انصاری اٹھا اور کہنے لگا، یارسول اللہ! اپنا عمل مجھ سے لے لیجئے، آپ نے پوچھا: کیوں؟ اس نے کہا: میں نے آپ کو اس اس طرح فرماتے سنا ہے، آپ نے فرمایا: میں نے یہ کہا ہے کہ جس کو ہم کوئی کام سونپیں تو وہ قلیل اور کثیر ہر چیز لے کر آئے، پھر اس کو جو دے دیا جائے وہ لے لے اور جو نہ دیا جائے وہ نہ لے"۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:: ۱۸۳۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۵۸۱)

علامہ علاؤالدین حصکفی مصارفِ زکوٰۃ کی بحث میں لکھتے ہیں:

(وعامل فیعطی)ولو غنیاً لاھاشمیاً،لأنه فرغ نفسه لهذا العمل۔

ترجمہ: "اور عامل کو اس مال میں سے دیا جائے گا اگرچہ وہ غنی ہو لیکن ہاشمی نہ ہو، اس لئے کہ اس نے اپنی ذات کو اس کام کے لئے فارغ کیا ہے۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں (بقدر عملہ) اس کے عمل کی مقدار (یعنی محنت) کے مطابق"، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص:257 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں کہ "عاملِ زکوٰۃ جسے حاکمِ اسلام نے ارباب اموال سے تحصیلِ زکوٰۃ پر مقرر کیا، وہ جب تحصیل کرے تو بحالتِ غنا بھی بقدر اپنے عمل کے لے سکتا ہے، اگر ہاشمی نہ ہو"۔ (فتاویٰ رضویہ: جلد 10، ص:110، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ عاملینِ زکوٰۃ وعشر (یعنی زکوٰۃ، صدقات اور عشر کی وصولیابی پر مامور افراد) کے لئے شریعت نے حق الخدمت کو جائز رکھا ہے اور یہ حق الخدمت اسے اس کی وصول شدہ زکوٰۃ وعشر میں سے دیا جاسکتا ہے اور قرآن مجید کی سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 60 میں جہاں مصارفِ زکوٰۃ وصدقات کی آٹھ مدات (Categories) کو بیان کیا گیا ہے، ان میں تیسری مد "عاملین زکوٰۃ" کی ہے، بشرطیکہ وہ عامل غیر سید ہو، فقہائے کرام نے مزید تصریح کی ہے کہ عاملِ زکوٰۃ خواہ غنی ہو، اسے اس کی وصول شدہ زکوٰۃ ہی سے حق الخدمت دیا جائے گا۔لیکن فقہائے کرام نے اس کی شرح متعین نہیں کی بلکہ حکومتِ اسلامیہ یا متعلقہ ادارے کی صوابدید پر چھوڑا ہے کہ اس کی محنت کے مطابق اسے حق الخدمت عطا کردیں،

لیکن یہ اجرت اس کی وصول شدہ زکوٰۃ کے نصف سے زائد نہ ہو، اور جب زکوٰۃ وعشر (یعنی صدقاتِ واجبہ) میں سے عامل یعنی کارکن کو اجرت دی جاسکتی ہے تو مسجد کے چندے میں سے (جو نفلی صدقہ یا عطیہ ہے) بطریق اولیٰ دی جاسکتی ہے۔

اب صورتِ مسئولہ میں اگر مسجد ومدرسہ کے لئے چندہ جمع کرنا قاری صاحب کے فرائضِ منصبی وشرائطِ ملازمت میں شامل ہے، تو ان کے لئے علیحدہ اجرت کا مطالبہ جائز نہیں ہے، اور اگر ایسا نہیں ہے یعنی ان کی منصبی ذمہ داری صرف تدریس، امامت وخطابت یا بطورِ مؤذن خدمات انجام دینا ہے، تو ان کے لئے اپنی اضافی خدمات (یعنی چندہ جمع کرنے) کا معاوضہ لینا جائز ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، حق الخدمت یا اجرت کار کی شرح کا تعین انتظامیہ کا اختیار ہے اور جو معاملہ فریقین کی رضامندی سے طے پائے، وہ جائز ہے۔ سلف صالحین وفقہائے کرام نے صرف یہ شرط عائد کی ہے کہ عامل کو اس کی جمع کردہ رقم کے نصف سے زائد اجرت نہ دی جائے۔

﴿متفرق﴾

کیا عصری علوم کے ماہرین بھی قرآن وحدیث میں بیان کردہ فضیلتِ علم کے حق دار ہیں؟

سوال:194

وہ آیات یا احادیث جن میں علم اور اہل علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے کیا یہ صرف علماء اور دینی علوم کے ساتھ ہی خاص ہے یا دنیاوی علوم کے ماہرین مثلاً ڈاکٹر، سائنس دان وغیرہ اور عصری علوم بھی شامل ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔
(محمد طاہر سرفراز، اندروٹھ نکیال آزاد کشمیر)

جواب:

علم فی نفسہٖ وجہِ فضیلت ہے، یہاں تک کہ سدھائے ہوئے اور تربیت یافتہ شکاری کتے اور عقاب کو اگر بسم اللہ پڑھ کر شکار پر چھوڑا جائے تو ان کا شکار حلال ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَیْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝

ترجمہ: ''(اے رسولِ مکرم! لوگ) آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کونسی چیزیں ہیں جو ان کے لئے حلال کی گئی ہیں، فرما دیجئے! تمہارے لئے پاک چیزیں حلال قرار دی گئی ہیں اور تم نے جو شکاری جانور سدھا لئے ہیں، درآں حالیکہ تم انہیں شکار کا طریقہ سکھانے والے ہو، تم انہیں اس طرح سکھاتے ہو، جس طرح تمہیں اللہ نے سکھایا ہے، سو اس شکار سے کھاؤ جس کو وہ (شکاری جانور) تمہارے لئے روک رکھیں اور (شکار پر چھوڑتے وقت) اس (شکاری جانور) پر تم اللہ کا نام لو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے''۔ (المائدہ:4)

یہاں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں کہ شکاری جانوروں کے شکار کے حلال ہونے کی فقہی شرائط اور

شرعی ضوابط کیا ہیں، بس اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ شکاری جانور کو شکار کیلئے سدھانے اور تربیت دینے پر اسے یہ امتیاز حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کا شکار شرعی شرائط کے ساتھ حلال ہے، یعنی علم علی الاطلاق باعث فضیلت ہے اور قرآن کی تو پہلی وحی ہی قراءت اور علم سے متعلق ہے، اولین وحی قرآنی پر مشتمل سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات ملاحظہ فرمالیجئے۔ پھر قرآن میں انسان کے ادوارِ تخلیق کا ذکر ہے، جو براہِ راست بیالوجی (Biology) سے متعلق ہے، نظام فلکی، شمس وقمر اور سیاروں کا ذکر ہے، جو فلکیات اور بالائی فضا (Astronomy) سے متعلق ہے، بادلوں کی تشکیل اور ہواؤں کی ترسیل کا ذکر ہے جو موسمیات (Metrology) کا علم ہے، تسخیر بحر کا ذکر ہے جو بحریات (Oceonology) کا علم ہے، پوروں کا ذکر ہے، جو دست شناسی (Palmistory) کا علم ہے، بحری حیات وحیوانات کا ذکر ہے، فولاد اور اس کے منافع کا بطور خاص تذکرہ ہے، جو دھات سازی یا حدیدیات (Metallurgy) کا علم ہے، سورۂ سبا آیت: 7 میں ایٹم (یعنی بنیادی غیر منقسم اکائی، جسے سائنسی زبان میں نیوٹرون اور پروٹون کہتے ہیں) کا اشارتاً ذکر ہے، شہد اور شہد کی مکھی، مکڑی اور اس کے جالے، مچھر، پرندوں، غرض ہر طرح کے ذی حیات جانوروں کا ذکر ہے، زراعت ونباتات کا ذکر، پہاڑوں یعنی جبلیات کا الگ سے ذکر ہے، سورۃ الرحمٰن کی آیت: 33 میں تسخیر خلا کے امکان کا بھی ذکر ہے، الغرض کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس کا قرآن وحدیث میں صراحتاً، اشارتاً یا کنایتاً ذکر نہ ہو۔

لہٰذا اپنی اپنی جگہ ہر شعبے کا علم اہمیت رکھتا ہے، البتہ یہ امر مسلم ہے کہ علوم میں باہم تفضیل (یعنی ایک علم کی دوسرے علم پر فضیلت) کی نسبت موجود ہے، بعض علوم عالیہ ہیں اور بعض آلیہ، بعض کا تعلق معاد سے ہے اور بعض کا ابتدا وارتقاء کائنات اور اس دنیا سے ہے، بعض کا تعلق حیات ظاہری سے ہے، بعض کا حیات برزخی سے اور بعض کا آخرت سے ہے۔ بعض کا تعلق ذات باری تعالیٰ، ذات رسول ﷺ، جملہ ایمانیات وعقائد اور عبادات سے ہے، بعض کا معاملات سے ہے، بعض کا حقوق اللہ اور بعض کا حقوق العباد سے ہے، پھر یہ بھی ایک مُسلّم

امر ہے کہ علم کی فضیلت کا مدار موضوع کی فضیلت پر ہے، لہٰذا جملہ دینی علوم (یعنی تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ واصول فقہ، علم العقائد والکلام اور وہ جملہ معاون علوم جو کتاب وسنت کو براہ راست سمجھنے کا وسیلہ بنتے ہیں) اعلیٰ ہیں اور ان کے مقابل عصری علوم (جن میں تمام سائنسز، ٹیکنالوجیز، حسابیات، نظمیات (Administration)، معاشیات، سماجیات، ادبیات، تاریخ وغیرہ تمام شعبے آجاتے ہیں) ادنیٰ ہیں، لیکن عصری علوم کا ادنیٰ ہونا، دینی علوم کے مقابل ہے، یعنی یہ ایک اضافی اصطلاح (Relative Term) ہے فی نفسہ اس سے کسی علم کی تنقیص ثابت کرنا مقصود نہیں۔ ہاں جو علوم کفر یا ضلالت ہیں، وہ باطل ہیں اور ان کا سیکھنا بھی باطل ہے۔

پھر علم، خواہ وہ قرآن وحدیث یا دیگر دینی علوم ہی کیوں نہ ہوں، ان میں یہ امر بھی معتبر ہے کہ انہیں کس مقصد کیلئے حاصل کیا جارہا ہے یا حاصل کیا گیا ہے،

حدیث پاک میں ہے:

"عن کعب بن مالک قال :قال رسول ﷺ :من طلب العلم لیجاری به العلماء او لیماری به السفهاء اویصرف به وجوه الناس الیه ادخله الله النار"

ترجمہ: "کعب بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو علم اس لئے حاصل کرے کہ اس کے بل پر علماء کے مقابل اپنی برتری قائم کرے یا نادان وکم عقل لوگوں پر بحث میں غالب آئے یا علم کے ذریعے لوگوں کو اپنی جانب مائل کرے (یعنی دنیوی منافع حاصل کرے)، تو اللہ اسے جہنم میں داخل کرے گا"، (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی وابن ماجۃ بروایۃ عبداللہ بن عمر)

"حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا: ایسا علم جسے صرف رضاءِ الٰہی کیلئے حاصل کرنا چاہیے، اسے کوئی شخص منافعِ دنیا پانے کے لئے حاصل کرے تو وہ قیامت میں جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا"، (مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ 35-34)۔

مشکوٰۃ شریف (صفحہ 470) میں جامع ترمذی کے حوالے سے علامات قیامت کا بیان ہے:

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب

قومی خزانے کو ذاتی دولت بنالیا جائے گا، امانت کو مال غنیمت سمجھ کر ہڑپ کرلیا جائے گا، زکوٰۃ کو تاوان سمجھ لیا جائے گا، اور دین سیکھا جائے گا مگر دین کے لئے نہیں (بلکہ دنیا کمانے کے لئے)، ایک شخص اپنی بیوی کی فرماں برداری کرے گا اور ماں کی نافرمانی کرے گا، اور اپنے دوست کو قریب رکھے گا اور اپنے باپ کو اپنے سے دور رکھے گا، مسجد میں شور وشغب ہوگا، قوم کا بدکار شخص ان کا سردار ہوگا، قوم کا سب سے کمینہ شخص ان کے معاملات کا مختار ہوگا، کسی شخص کی عزت (اس کے علم وکردار کی بنا پر نہیں بلکہ) اس کے شر سے بچنے کے لئے کی جائے گی، گانے بجانے والیوں اور آلات غنا کا دور دورہ ہوگا، شراب (عام) پی جائے گی، اس اُمّت کے بعد والے اپنے پہلوں پر لعن طعن کریں گے، تو ایسے دور میں سرخ ہواؤں، زلزلوں، زمین میں دھنس جانے، صورتوں کے مسخ ہونے، آسمانوں سے سنگباری ہونے، الغرض (قیامت کی) ایسی نشانیوں کا انتظار کرنا جو اس طرح پے درپے نازل ہوں گی، جیسے جواہرات کے کسی ہار کی لڑی ٹوٹ جائے اور اس کے ہیرے ایک ایک دانہ کرکے گرنے لگیں''۔

اس طویل حدیث میں علاماتِ قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ ''علم دین کو محض دنیا کمانے کے لئے حاصل کیا جائے گا''۔

لہٰذا علم دین اور دیگر امور خیر پر بھی اجر آخرت کا مدار اس پر ہے کہ بندے نے وہ عمل محض رضاءِ الٰہی، تقرّب الٰہی اور اجرِ آخرت کے لئے کیا ہو، ورنہ دنیوی اعتبار سے بظاہر نیک عمل پر بھی آخرت میں اجر کا حق دار نہیں ہوسکتا۔ اور اگر عمل بظاہر خالص دنیوی ہو، لیکن مقصود للّٰہیت اور رضاء الٰہی ہو تو اس پر بھی اجر ملے گا، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''انفاق فی سبیل اللہ'' کی کئی صورتیں ہیں ان میں سے سب سے بہترین صدقہ وہ ہے جو تو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے، (ریاض الصالحین بحوالہ صحیح مسلم)۔ ایک اور روایت میں فرمایا: ''وہ لقمہ جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو، اس پر بھی تمہیں اجر ملے گا''، (ریاض الصالحین، بحوالہ صحیحین، باب النفقۃ علی العیال)۔

اب آیئے ان علوم کی طرف جنہیں عصری علوم کہتے ہیں، یہ سائنسز، ٹیکنالوجیز، سوشل

سائنس، اقتصادیات، ادبیات، حسابیات اور نفسیات وغیرہ کے اتنے شعبے ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے، صرف میڈیکل سائنس یعنی علم الطب ہی کو لے لیجئے، آج کل یہ علم اتنا پھیل چکا ہے کہ جسدِ انسانی کے تقریباً ہر ہر عضو کے ماہرین الگ الگ ہیں۔ یہ علوم فی نفسہٖ مباح ہیں، ان میں سے بیشتر علوم میں کسی نہ کسی حوالے سے انسان کی فلاح ہے۔ اگر کوئی شخص ان علوم کو اس لئے حاصل کرتا ہے کہ ان سے دنیا کمائے، عیش وعشرت کرے، نفسانی شہوات وخواہشات کو پورا کرے، دوسرے انسانوں کا استحصال کرے تو یہ راستہ معصیت کا راستہ ہے۔

اگر کوئی شخص ان علوم کو اس لئے حاصل کرتا ہے کہ ان کے ذریعے حلال طریقے سے اپنی اور اپنے زیرِ کفالت افراد کے لئے حلال روزی کمائے، تو یہ نیک عمل ہے، وہ اس پر ماجور ہوگا۔ اگر ساتھ ساتھ اس کی نیت یہ بھی ہے کہ اپنے اس علم وفن یا ہنر سے انسانیت بالخصوص مسلمانوں کی خدمت کرے گا، تو یہ ایک طرح سے عبادت ہے۔

حیات وکائنات اور انفس وآفاق پر ماہرانہ نظر رکھنے والے مومن کا ایمان اللہ تعالیٰ کی قدرت وجلالت پر ہر اس شخص سے زیادہ راسخ ہوگا، جو ان علوم سے بے بہرہ ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(1) سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ

ترجمہ: ''ہم عنقریب انہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں گے آفاقِ (عالم) میں اور خود ان کی اپنی ذات میں، یہاں تک کہ ان پر خوب واضح ہو جائے گا کہ یقیناً وہی (قرآن) حق ہے''، (الشوریٰ:53)۔

(2) اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝

ترجمہ: ''سورج اور چاند ایک حساب (اور کنٹرول) کے تابع ہیں''، (الرحمٰن:5)۔

(3) وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اور سورج اپنے مستقر پر رواں دواں ہے، یہ مقررہ نظام ہے، ایک ایسی ہستی کا جو بڑے علم اور غلبے والی ہے، اور ہم نے چاند کیلئے منزلیں مقرر کر رکھیں ہیں یہاں تک کہ (آخرِ ماہ میں وہ) کھجور کی خشک شاخ کی طرح (باریک) ہو جاتا ہے، نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ (جاتے جاتے) چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے، (بس) ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہا ہے''، (یٰسین:38 تا40)۔

(4) اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

ترجمہ: ''بے شک زمین وآسمان کی تخلیق اور گردش لیل ونہار میں اہل عقل وخرد کیلئے (اللہ تعالیٰ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں''، (آل عمران:190)۔

ان آیات کو غور سے پڑھئے اور پھر سوچئے کہ اگر کوئی حیات وکائنات اور فلکیات کا ماہر صاحبِ ایمان جب کائنات اور خود انسانی ذات میں قدرت کی بے پایاں نشانیوں کا اپنے علم کی روشنی میں مشاہدہ ومطالعہ کرے گا، تو اس کا ایمان کتنا صادق، قوی اور راسخ ہوگا۔ اور ذرا سوچئے: اگر چاند پر اترنے والا پہلا خلانورد مسلمان ہوتا، اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں پرچم اسلام ہوتا تو کیا دنیا پر اسلام کی عظمت وسطوت کا نقش ثبت نہ ہوتا؟۔ آج ہم مغرب اور اہل مغرب سے کیوں مرعوب ہیں، محض ان کی سائنسی، فنی، صنعتی، تجارتی، حربی اور اقتصادی برتری کے باعث، اور اس کے حصول کا سبب عصری علوم پر ان کی مکمل دسترس اور غلبہ ہے۔

اگر وہ ان علوم کو اس نیت سے حاصل کرتا ہے کہ ان میں مرتبۂ کمال حاصل کر کے دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو غالب کرے اور باطل کو مغلوب کرے، اسلام کی عظمتِ رفتہ کو واپس لائے تو یہ بہت بڑی سعادت وعبادت ہے، اگر ایسا شخص عام زندگی میں دینی فرائض، واجبات اور سنن کا پابند ہے، مگر بقیہ وقت نیک نیتی کے ساتھ غلبۂ اسلام کے لئے علوم جدیدہ یا عصری علوم میں مہارت کے لئے صرف کرتا ہے تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو نفلی نمازیں پڑھنے والے، نفلی روزے رکھنے والوں سے زیادہ اجر عطا کرے۔

ضروریات دین کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض کفایہ ہے اور دین میں تَفَقُّہ اور مہارت تامہ پیدا کرنا، یہ امت پر فرض کفایہ ہے، بالکل اسی طرح دورِ حاضر کے ان تمام سائنسی وفنی علوم کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، جن کے بغیر قوموں کی مادّی ترقی عملاً ناممکن ہے اور جن میں مہارت کے باعث کفار ومشرکین اور یہود ونصاریٰ مسلمانوں پر غالب آچکے ہیں اور مسلمان اس وقت قعر مذلت میں گرے ہوئے ہیں، لمحہ موجود میں اسباب ظاہری اور زمینی حقائق کی رو سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اِدبار وتنزُّل کا یہ دور شاید کبھی ختم نہ ہو، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اسباب اس کی مشیت کے تابع ہیں، وہ مافوق الاسباب آنِ واحد میں چاہے تو کایا پلٹ دے، لیکن عروج وزوال اُمَم کے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک سنتِ جاریہ مُستَمِرّہ بھی ہے۔ لہٰذا میری ناقص فہم کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کے غلبے کے لئے عصری علوم کا حاصل کرنے والا علمی فضیلت کی تمام برکات وثمرات کا حق دار ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان کا درجہ دینی علوم کے بعد ہے۔

مقررہ تعداد میں اوراد ووظائف اور تسبیحات واذکار کی حکمت

سوال:195

بعض مواقع پر لوگ ایک خاص تعداد میں تسبیحات اور وظائف پڑھتے ہیں، کھجور کی گٹھلیوں یا دانوں پر پڑھتے ہیں یا تسبیح کا استعمال کرتے ہیں، اس تعداد کے تعین اور اس طریقۂ کار کی اصل کیا ہے اور اس کی حکمت کیا ہے، (محمد عتیق الرحمٰن شہداد پور، ضلع سانگھڑ)

جواب:

پہلے چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

(1) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من قال: "لَآ اِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" فی یوم مائۃ مرۃ کانت لہ عدل عشر رقاب وکتبت لہٗ مائۃ حسنۃٍ و محیت عنہ مائۃ سیئۃ وکانت لہ حرزًا من الشیطان یومہ ذلک حتی یمسی ولم یات احد بافضل مما جآء بہ الارجل

عمل اکثر منه۔ متفق علیه۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ایک دن میں سو بار''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' پڑھا تو اسے دس غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا، اور اس کے نامۂ اعمال میں سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کے سو گناہ معاف ہوں گے اور وہ اس دن شام تک شیطان کے شر سے محفوظ رہے گا اور کسی کا عمل اس سے افضل نہیں ہوگا، سوائے اس شخص کے جو اس سے بھی زیادہ عمل خیر کرے''، (مشکوٰۃ:201)۔

(2) عن ابی هریرة قال جاء ت فاطمة الی النبی ﷺ تسأله خادماً فقال الا ادلک علیٰ ما هو خیر من خادم تسبحین اللّٰه ثلثاً و ثلثین و تحمدین اللّٰه ثلثا و ثلثین و تکبرین اللّٰه اربعا و ثلثین عند کل صلوة و عند منامک۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک خادم کا سوال کیا، آپ نے فرمایا: میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو خادم سے بہتر ہے: ہر (فرض) نماز کے بعد اور سوتے وقت تینتیس بار ''سُبْحَانَ اللّٰهِ''، تینتیس بار ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' اور چونتیس بار ''اَللّٰهُ اَکْبَرُ'' پڑھا کرو''۔(مشکوٰۃ:209)

(3) عن ابی سعید قال قال رسول اللّٰه ﷺ من قال حین یاوی الیٰ فراشه: ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ'' ثَلٰثَ مَرَّاتٍ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ ذُنُوْبَهٗ و ان کانت مثل زبدالبحر او عدد رمل عالج او عدد ورق الشجر او عدد ایام الدنیا۔

ترجمہ:''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص (رات کو) بستر پر سوتے وقت تین بار یہ دعا پڑھے:'' اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ''، اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دے گا، خواہ وہ سمندر کی جھاگ یا کسی ریت والی وادی کی ریت یا درخت کے پتوں یا دنیا کے ایام کے برابر

ہوں''، (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی:211)۔

(4)عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من سبح اللہ فی دبر کل صلوۃ ثلثا و ثلثین وحمداللہ ثلثا و ثلثین و کبر اللہ ثلثا و ثلثین فتلک تسعۃوتسعون وقال تمام المائۃ لاالہ الااللہوحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمدوھو علی کل شیٔ قدیر غفرت خطا یاہ وان کانت مثل زبد البحر۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ہر(فرض) نماز کے بعد تینتیس بار''سُبْحَانَ اللّٰہِ''،تینتیس بار'' اَلْحَمْدُلِلّٰہِ'' اور تینتیس بار''اَللّٰہُ اَکْبَر'' پڑھا اور یہ (تسبیحات کی کل) تعداد 99 ہوجائے گی، اورفرمایا (ایک بار)''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَ لَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر'' پڑھنے سے (یہ تعداد) پوری 100 ہوجائے گی،تو اس کے سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے،خواہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں''، (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم:89)۔

(5) وعن عثمان بن ابی العاص انہ شکی الی رسول اللہ ﷺ وجعاً یجدہ فی جسدہٖ فقال لہ رسول اللہ ﷺ ضع یدک علی الذی یالم من جسدک وقل بسم اللہ ثلثا وقل سبع مرات:''اَعُوْذُ بِعِزَّۃِ اللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَآ اَجِدُ وَاُحَاذِرُ'' قال ففعلت فاذھب اللہ ماکان بی۔

ترجمہ:''حضرت عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے بدن میں درد کی شکایت کی تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: تمہارے جسم میں جہاں پر درد ہے، وہاں پر اپنا ہاتھ رکھواور (پھر) تین بار ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم'' پڑھو (اور اس کے بعد) سات بار یہ دعا پڑھو: ''اَعُوْذُ بِعِزَّۃِ اللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَآ اَجِدُ وَ اُحَاذِرُ'' (اس دعا کا ترجمہ یہ ہے:) ''میں ہر اس چیز کے شر سے، جو مجھے لاحق ہے یا جس کے لاحق ہونے کا مجھے اندیشہ ہے، اللہ تعالیٰ کی عزت (وجلال) اور اس کی قدرت کی پناہ میں آتا ہوں''، راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی

کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے درد سے نجات عطا فرمادی''، (مشکوۃ بحوالہ صحیح مسلم:134)۔

(6) وعن ابان بن عثمٰن قال سمعت ابی یقول قال رسول اللہ ﷺ ما من عبد یقول فی صباح کل یومٍ و مساءِ کل لیلةٍ باسم اللّٰہ الذی لا یضر مع اسمہٖ شیٔ فی الارض ولا فی السماء وھو السمیع العلیم ثلاث مرات فیضرہ شیٔ فکان ابان قد اصابہ طرف فالج فجعل الرجل ینظر الیہ فقال لہٗ ابان ما تنظر الی اما ان الحدیث کما حد ثتک ولکنی لم اقلہ یومئذ لیمضی اللّٰہ علی قدرہ رواہ الترمذی وابن ماجة وابو داؤد وفی روایة لم تصبہ فجاء ة بلاء حتی یصبح ومن قالھاحین یصبح لم تصبہ فجاء ة بلاء حتی یمسی۔

ترجمہ: ''حضرت ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص ہر روز صبح کے وقت اور ہر رات شام کو تین بار یہ دعا پڑھے گا تو اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکے گی، (وہ دعا یہ ہے) "بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم"، اس کے بعد (ایک موقع پر) حضرت ابان کو (جسم کے کسی حصے میں) فالج ہو گیا، تو ایک شخص (جس نے ان سے یہ حدیث سنی تھی، حیرت سے) انہیں (سوالیہ انداز میں) دیکھنے لگا، کہ گویا پوچھ رہا ہو کہ آپ نے تو یہ دعا پڑھ لی ہوگی، تو پھر آپ پر فالج کا یہ حملہ کیسے ہو گیا، تو حضرت ابان نے (اس کی آنکھوں میں سوال کی چمک محسوس کر کے) اس سے فرمایا کہ تم میری جانب (سوالیہ انداز میں) کیوں دیکھ رہے ہو؟، حدیث وہی ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے، لیکن چونکہ اللہ کی تقدیر میں اس خاص موقع پر اس بیماری نے مجھے لاحق ہونا تھا، اس لئے میں اس روز (بھول گیا اور) یہ دعا پڑھ نہ سکا''۔

(مشکوۃ بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد:209)

اس دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک سے، کہ جس کے اسم مقدس (کی برکات) شامل حال ہوں تو زمین و آسمان میں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی اور وہ خوب سننے

والا اورخوب جاننے والا ہے''۔

(7) وعن ثوبان قال قال رسول اللّٰہ ﷺ ما من عبد مسلم یقول اذا امسیٰ و اذا اصبح ثلثا رضیت باللّٰہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمدٍ نبیاً الا کان حقاً علی اللّٰہ ان یرضیہ یوم القیٰمۃ ۔

ترجمہ:''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان بندہ (ہرروز) صبح وشام کے وقت تین بار یہ دعا پڑھے گا، تو اللہ تعالیٰ کے ذمۂ کرم پر ہے کہ روزِ قیامت (اپنے) اس بندے کو راضی کردے (یعنی اسے اتنے عظیم اجر سے نواز دے گا کہ وہ سرور وشادمانی میں ڈوب جائے گا)، (وہ دعا یہ ہے): "رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْناً وَّ بِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا"۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد وترمذی:210)۔

دعا کا ترجمہ یہ ہے:''میں نے اللہ جَلَّ شانُہٗ کو رَبّ کی حیثیت سے، اسلام کو بطور دین کے اور حضرت محمد ﷺ کو بحیثیت نبی پسند کرلیا ہے''۔

(8) عن الحارث بن مسلم التمیمی عن ابیہ عن رسول اللّٰہ ﷺ انہٗ اسرالیہ فقال اذا انصرفت من صلوٰۃ المغرب فقل قبل ان تکلم احداً اللّٰھم اجرنی من النار سبع مراتٍ فانک اذا قلت ذٰلک ثم مت فی لیلتک کتب لک جواز منھا و اذا صلیت الصبح فقل کذٰلک فانک اذا مت فی یومک کتب لک جواز منھا۔

ترجمہ:''حضرت حارث بن مسلم تمیمی اپنے والد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے سرگوشی کرتے ہوئے فرمایا: جب تم مغرب اور صبح کی نماز سے فارغ ہوجاؤ تو کسی کے ساتھ گفتگو کرنے سے پہلے سات بار یہ دعا پڑھ لیا کرو، تو جب تم نے یہ دعا پڑھ لی ہو اور پھر اس رات یا اس دن کو قضاءِ الٰہی سے تمہاری موت واقع ہوجائے تو (اس دعا کی برکت سے) تمہارے لئے (نارِ جہنم سے) نجات مقدر کردی جائے گی، (وہ دعا یہ ہے): ''اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ'' یعنی اے اللہ! مجھے نارِ جہنم سے پناہ عطا فرما''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد:210)

الغرض مندرجہ بالا اوران جیسی متعدد احادیث مبارکہ میں بعض اوقات اور مواقع کیلئے تعداد کے تعین کے ساتھ کلمات دعا اور تسبیحات کا ذکر موجود ہے۔ چونکہ علم نبوت کا منبع و ماخذ ذات باری تعالیٰ اور وحی ربانی ہے، اس لئے تو یہ توقیفی امور ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ سے نقل اور سماع پر موقوف ہیں، جیسے قرآن مجید کی سورتوں کے اسماء مبارکہ، ترتیبِ مصحف مقدس وغیرہ، کلمات اذان کا تعین، تعداد اور ترتیب وغیرہ ہیں، اگر ان امور کی حکمت ہماری سمجھ میں خدانخواستہ نہ آئے تو یہ ہماری عقل کا نقص اور ہماری فہم کی نارسائی ہے، ہمیں پھر بھی ان کے حق وصواب اور صحیح ہونے پر یقین کامل رکھنا چاہیے۔

اہم غور وفکر کے نتیجے میں جو حکمت ہماری سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے: جس طرح جسمانی امراض انسان کو لاحق ہوتے ہیں اور طبیب جسمانی یعنی ڈاکٹر اور طبیب اپنے تجربے اور علمی مہارت سے ان امراض کے علاج کیلئے پرہیز، ورزش اور دوائیں ایک خاص مقدار کے ساتھ تجویز کرتے ہیں اور ان کے استعمال کے اوقات، طریقہ، مقدار اور مدت بتاتے ہیں اور مریض ان کے علم، تجربے اور مہارت پر اعتماد کر کے ان پر عمل کرتا ہے۔ حالانکہ مریض کی تو خواہش ہوتی ہے کہ کسی درد یا بیماری کے ازالہ کے لیے سات یا دس دن کا نسخہ جو تجویز کیا گیا ہے، کاش ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں وہ ساری دوا استعمال کر لیتا اور فوری شفا پالیتا، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا بلکہ بہت ممکن ہے ایسا کرنے سے مرض اور بڑھ جائے یا کوئی اور بیماری لاحق ہوجائے۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ طبیبِ روحانی و ایمانی ہیں اور آپ بہتر جانتے ہیں کہ کس روحانی مریض (خواہ وہ مرض اعتقادی ہو یا اخلاقی) کون سی روحانی غذا، کتنی مقدار میں اور کن اوقات میں دی جائے۔ فرق یہ ہے کہ جسمانی طبیب، ڈاکٹر ومعالج کی تشخیص وتجویز میں غلطی کا احتمال ہوسکتا ہے بلکہ ہوتا رہتا ہے، مگر طبیب کامل سید المرسلین ﷺ کی تشخیص، تجویز اور علاج میں خطا کا ہرگز کوئی احتمال نہیں ہے، بلکہ اس کا وہم بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کلمات ربانی، تسبیحاتِ مقدسہ، اوراد مبارکہ اور درودِ پاک کی روحانی تاثیر اور دنیوی واخروی

برکات اور وسیلۂ نجات ہونا مسلّم امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور ہم قرآن میں وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے''۔(بنی اسرائیل:83)۔

لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جن دنیوی و اُخروی مقاصدِ خیر کے لیے، برکات کے لیے، دفعِ بلیات کے لیے، ازالۂ امراض کے لیے، مکرِ شیطان و شرورِ نفس سے بچنے کے لیے، نارِ جہنم سے پناہ اور حصولِ جنت کے لیے خاص مواقع پر، خاص اوقات میں، ایک مقررہ تعداد میں جو اوراد و وظائف اور تسبیحات بتائی ہیں، ان پر پورے ایمان و یقین کے ساتھ جو عمل کرے گا، وہ ان شاء اللہ العزیز ضرور اس اجر و ثواب سے بہرہ ور ہوگا، جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے یا جس کی آپ نے بشارت دی ہے۔

اسی طرح کھجور کی گٹھلیوں، کسی اور پاک چیز کے دانوں یا تسبیح پر تعداد کا حساب کرنے کیلئے گنتی کرنا جائز ہے۔ مشکوٰۃ ''باب ثوابِ التسبیح'' میں ترمذی وابوداؤد کے حوالے سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک حدیث روایت کی گئی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک عورت کے ہاں گئے، تو اس خاتون کے سامنے کھجور کی گٹھلیاں یا کنکریاں رکھی ہوئی تھیں، جن پر وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں، آگے حدیث طویل ہے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ ملا علی القاری ''مرقاۃ المفاتیح'' میں لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کا اس خاتون کے اس عمل پر نکیر نہ فرمانا یعنی اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرنا، اس کے جواز کی دلیل ہے، اصطلاحِ محدثین میں اسے ''حدیثِ تقریری'' کہتے ہیں۔

حفظ کے بچوں کیلئے سجدۂ تلاوت کا مسئلہ اور تلاوت کا ایصالِ ثواب

برائے کرم مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات قرآن وسنت کی روشنی میں عنایت فرما کر راہنمائی فرمائیں۔

سوال:196

سجدۂ تلاوت کا طریقہ کیا ہے؟ اور سجدۂ تلاوت جو واجب ہے، حفظ کرنے والے بچوں اور اساتذہ کے لیے کیا حکم ہے، سارا دن بچے بہت ساری آیات سجدہ پڑھتے

اور استاد سنتے ہیں، مدارس میں سجدہ تلاوت نہیں کیا جاتا استاد شاگرد برابر ہیں۔طلباء قرآن خوانیوں پہ جاتے ہیں سجدہ تلاوت نہیں کرتے اس کا کیا حکم ہے۔(محمد محبوب رضا،معرفت مولانا قاری محمد صدیق، خطیب جامع مسجد خلفاء راشدین، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

سجدۂ تلاوت واجب ہے اس شخص پر جس پر نماز واجب ہے۔

جیسے فتاویٰ خانیہ میں ہے: سجدة التلاوة تجب علی من تجب علیه الصلوٰة اذا قرء اٰیة السجدة او سمعها۔

ترجمہ: ''سجدہ تلاوت اس شخص پر واجب ہوتا ہے جس پر نماز واجب ہے جبکہ اس نے آیت سجدہ پڑھی یا سنی ہو''، (فتاویٰ رضویہ ج ۸ ص ۲۲۴ جدید مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

اور فتاویٰ درمختار میں ہے:

(علی من کان) متعلق بیجب(اهلا لو جوب الصلوٰة) لانها من اجزائها ۔

ترجمہ: ''یعنی سجدۂ تلاوت اس پر واجب ہے، جو وجوب صلوٰۃ کا اہل ہے، کیونکہ یہ بھی نماز کا ایک جز ہے''، اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں کہ وجوبِ صلوٰۃ کی اہلیت کیلئے اسلام، عقل، بلوغ اور حیض ونفاس سے طہارت شرط ہے۔

اسی طرح علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وهی سجدة بین تکبیرتین) مسنونتین جهراً و بین قیامین مستحبین (بلا رفع ید و تشهدٍ و سلامٍ ، وفیهاتسبیح السجود) فی الاصح۔

ترجمہ: ''اور یہ (سجدۂ تلاوت) دو تکبیروں کے درمیان ایک سجدہ ہے، ان دو تکبیروں کا بلند آواز سے کہنا سنت ہے اور کھڑے ہو کر سجدے میں جانا اور واپس کھڑا ہونا مستحب ہے، اس میں نہ تو رفع یدین ہے اور نہ تشہد ہی ہے اور نہ سلام، اور اس میں صحیح ترین روایت کے مطابق سجدے کی تسبیح پڑھی جائے گی۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی ''فتح القدیر'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فرض نماز میں

تو "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلیٰ" ہی پڑھنا چاہیے، البتہ نوافل میں اور مسنون تسبیحات اور دعائیں بھی پڑھ سکتے ہیں، اسی طرح نماز کے باہر جو سجدۂ تلاوت ہے، اس میں بھی دیگر تسبیحات اور منقول دعائیں پڑھ سکتے ہے، اسی بات کو "الحلیۃ"، "البحر" اور "النھر" میں قائم رکھا ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد2، ص:507 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)۔

اس سے معلوم ہوا کہ خارجِ نماز سجدۂ تلاوت کیلئے مستحب یہ ہے کہ کھڑے ہو کر "اللّٰہ اکبر" کہہ کر سجدہ میں جائے اور تسبیحاتِ سجدہ و مسنون دعائیں حسبِ توفیق پڑھ لے اور "اللّٰہ اکبر" کہہ کر کھڑا ہو جائے، اس میں کوئی لفظی نیت، رفعِ یدین اور سلام وغیرہ نہیں ہیں، لیکن اگر بیٹھے بیٹھے بھی سجدۂ تلاوت کر لیا تو ادا ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں نابالغ بچوں پر آیت سجدہ پڑھنے یا سننے سے سجدہ واجب نہیں ہوتا، لیکن اساتذہ کو چاہیے کہ اس کی تاکید کرتے رہیں اور طلبہ کو اس کا طریقہ بھی بتائیں، تاکہ تربیت ہو اور عادت بنے۔

سائل کی یہ بات کہ مدارس میں سجدۂ تلاوت نہیں کیا جاتا، ایسی عمومی رائے قائم کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ بعض اساتذہ اس کا اہتمام کرتے ہیں، البتہ جو نہیں کرتے انہیں ضرور اس جانب توجہ کرنی چاہیے۔ ایک مجلس میں ایک ہی آیت سجدہ جتنی بار بھی پڑھی جائے اس سے صرف ایک بار سجدہ واجب ہوگا، جب مجلس تبدیل ہوگی جیسے کھڑا تھا بیٹھ گیا تو مجلس بدل گئی اور اسی طرح اس کا عکس، تو دوسرا سجدہ واجب ہوگا۔ اور یہ اس صورت میں ہے، جب ایک ہی آیت سجدہ ایک مجلس میں بار بار پڑھے یا سنے، لیکن مختلف آیاتِ سجود اگر ایک ہی مجلس میں سنے تو ہر آیت پر سجدہ واجب ہوگا، یعنی ایک مجلس میں چودہ مختلف آیاتِ سجود سنیں تو چودہ سجدے واجب ہوں گے۔

اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ خود بھی اس کا اہتمام کریں اور طلباء کو بھی اس کی تاکید کریں تاکہ اس میں کوتاہی نہ ہو، اور آیت سے مراد پوری آیتِ سجدہ ہے جیسا کہ شرح نقایہ میں ہے:

المراد بالاية تامة حتى لوقرأ اية السجدة كلها الا ا لحرف الذى فى اخرها

لایسجد الخ ۔

ترجمہ:'' آیت سے مراد پوری آیت ہے حتیٰ کہ کسی نے آیت سجدہ پڑھی مگر آخری حرف نہ پڑھا تو سجدہ لازم نہیں''، (بحوالہ فتاویٰ رضویہ ج ۸ ص ۲۲۴ جدید مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

لیکن محض سجدۂ تلاوت سے بچنے کیلئے ایسا کرنا بڑی بدنصیبی کی بات ہوگی۔سائل کی یہ بات بھی صحیح نہیں کہ طلباء قرآن خوانیوں میں جاتے ہیں اور سجدہ تلاوت نہیں کرتے، ایسا عمومی حکم لگانا صحیح نہیں، کیونکہ بعض طلباء اس کا اہتمام کرتے ہیں اور دیگر طلباء کو تنبیہ بھی کرتے ہیں، بہت ممکن ہے کہ گھر جا کر یہ لوگ سجدۂ تلاوت کر لیتے ہوں، بغیر ثبوت کے کسی کے بارے میں بدگمانی نہیں کرنی چاہئے.

صحیح بخاری میں حدیث ہے: ایاکم و الظن فان الظن اکذب الحدیث۔

ترجمہ:'' بدگمانی سے بچو! کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔''.

اور سنن ابن ماجہ میں ہے: ان الظن یخطئ و یصیب .

ترجمہ:'' بے شک گمان کبھی غلط ثابت ہوتا ہے اور کبھی درست بھی ہوتا ہے''۔یعنی بدگمانی سے احتیاط لازم ہے اور طلباء و اساتذہ کو تعلیم دینا اور اتباع واجب کی تاکید کرنا امرِ مستحب ہے اور اس پر اجر ملے گا۔عام طور پر قرآن خوانی میں (صاحب خانہ یا کوئی اور) خود ہی چودہ سجدے کر لیتے ہیں یہ بھی صحیح نہیں کہ اس سے ان کا (پڑھنے والوں یا سننے والوں) کا واجب ادا نہ ہوگا۔

سوال:197

مدارس میں دورانِ تعلیم دن بھر جو طلباء تلاوت قرآن پاک کرتے ہیں، یاد کرتے ہیں، استاد کو سناتے ہیں وہی تلاوت کیے ہوئے پارے ایصال ثواب کے لیے جمع کر کے تیس پاروں کا قرآن بنا کر دے دیئے جاتے ہیں، یہ سلسلہ ایصال ثواب کا ذریعہ بنتا ہے، جب کہ طلباء پڑھتے ہوئے صرف اپنے فائدے اور ضرورت کے لیے پڑھتے ہیں ایصال ثواب کی نیت نہیں ہوتی، اس بارے میں شرعا کیا حکم ہے۔ برائے کرم تفصیل سے وضاحت فرما

دیں، (محمد محبوب رضا، معرفت مولانا قاری محمد صدیق، خطیب جامع مسجد خلفاء راشدین، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

ایصالِ ثواب کے لیے یہ شرط نہیں کہ اس نے عمل ایصالِ ثواب ہی کی نیت سے کیا ہو۔ قرآن وسنت کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایصالِ ثواب کے لیے تین امور لازم ہیں ورنہ ایصالِ ثواب نہ ہوگا (1) عمل کرنے والا مسلمان ہو (2) جسے ایصالِ ثواب کیا جائے وہ مسلمان ہو (3) جس عمل کا ثواب پہنچا رہا ہے وہ نیک وجائز کام ہو اگر صدقہ وخیرات ہو تو حلال مال سے ہو، اگر ان امور سے کوئی چیز مفقود ہو تو ایصالِ ثواب نہیں ہوسکتا۔ سائل نے لکھا کہ طلباء اپنے فائدے کے لیے پڑھتے اور سناتے ہیں حالانکہ اس میں طلباء کی کیا تخصیص ہر شخص جو بھی عبادت کرتا ہے اس میں اس کا فائدہ ہوتا ہے۔

اگر خالص ایصالِ ثواب کی نیت سے پڑھا جائے یا ایصالِ ثواب (سائل والی صورت میں) کیا جائے اس سے خود کو بڑا زبردست فائدہ ہوتا ہے کہ تمام مرحومین کے برابر اسے ثواب ملتا ہے، اور پڑھنے والے کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! جو شخص قبرستان سے گزرے اور سورۂ اخلاص گیارہ بار پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو بخش دے اسے مردوں کی تعداد کے برابر ثواب دیا جائے گا۔ اسے دار قطنی، دیلمی اور سلفی نے امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کیا، (فتاویٰ رضویہ جلد 9 ص: 637، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ہمارے علماء نے ''حجِ بدل'' کے باب میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ انسان کیلئے یہ امر جائز ہے کہ وہ اپنے عمل کا ثواب دوسرے شخص کو ہدیہ کرے، جیسے نماز، روزہ یا صدقہ وغیرہ، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے۔ بلکہ فتاویٰ ''التاتارخانیۃ'' میں ''المحیط'' کے حوالے سے ہے: نفلی صدقہ کرنے والے کیلئے افضل یہ ہے کہ تمام مومنین ومومنات کی نیت کرے، کیونکہ اس طرح اس کا ثواب ان سب کو بھی پہنچے گا اور اس کے اجر میں کوئی کمی واقع

نہیں ہوگی، یہ اہلسنت و جماعت کا مذہب ہے"۔ آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں:

''اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ نفلی عبادت کرنے والا عبادت کرتے وقت ہی دوسرے کو ثواب پہنچانے کی نیت کرے یا ابتداء تو اپنی ذات کیلئے کرے، مگر بعد میں اس کا ثواب دوسرے کو پہنچادے، کیونکہ ایصالِ ثواب کے بارے میں فقہاء کا کلام مطلق ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 142 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

ہلالِ رمضان، یوم النحر و عاشورہ کی تعیین کیلئے قیاسات وتخمینی ضابطوں کی شرعی حیثیت

سوال: 198

اکثر عوام الناس کا یہ نظریہ ہے کہ جس دن عید الفطر پڑے اسی دن یومِ عاشورہ ہوگا اور کئی سالوں سے یہ دیکھنے میں بھی آرہا ہے کہ جس دن عید الفطر ہوئی ہے اسی دن یوم عاشورہ ہوا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ نظریہ قرآن وحدیث کی رو سے کہاں تک درست ہے؟ وضاحت فرمائیں۔ اس مرتبہ عید الفطر بدھ کو ہوئی تھی اور یومِ عاشورہ منگل کو ہوا تو لوگوں نے کہا کہ رمضان المبارک کے چاند میں مولویوں نے گڑبڑ کردی ہے کہ عید منگل کو پڑنی تھی مگر بدھ کو ہوئی کیونکہ عاشورہ منگل کو ہوا عید بھی منگل کو ہونی چاہیے تھی۔ برائے کرم وضاحت کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں، (محمد آصف قادری، جوڑیا بازار، کراچی)۔

جواب:

قمری مہینہ شروع ہونے میں شرعاً رویتِ ہلال (چاند دیکھنے) کا اعتبار ہے، قیاسات وقرائن پر اس کا مدار نہیں ہے، اسی طرح سائز کے اعتبار سے نہ چاند کے چھوٹے بڑے ہونے کا اعتبار ہے نہ اس امر کا اعتبار ہے کہ چاند مطلع پر کتنی دیر رہا۔ اسی طرح اس بات کا بھی اعتبار نہیں ہے کہ جس دن شوال المکرم کا چاند نظر آئے اسی دن محرم الحرام کی دس تاریخ ہوگی اور اگر اعلانِ رویت اس کے برعکس ہوا ہے تو یہ کہہ دیا جائے کہ ثابت ہوا کہ وہ اعلان غلط تھا۔

مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان میں تمام مسالک کے ثقہ ومستند علماء ہوتے ہیں اور وہ قیاسات، تخمینوں اور لوگوں کے تجربات پر نہیں بلکہ اصول شرع کی پاس داری کرکے فیصلہ کرتے ہیں۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان المبارک کا تذکرہ کیا پھر فرمایا: لَاتَصُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَاتُفْطِرُوْا حَتّٰی تَرَوْهُ فَإِنْ أُغْمِیَ عَلَيْكُمْ فَاقْدِرُوْا لَهٗ۔

ترجمہ: ”چاند دیکھے بغیر روزہ مت رکھو اور نہ چاند دیکھے بغیر عید کرو، اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو (روزوں کی) مدت پوری کرو“، (صحیح مسلم رقم الحدیث:2459)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ فَإِذَا رَأَيْتُمُ الْهِلَالَ فَصُوْمُوْا وَإِذَا رَأَيْتُمُوْهُ فَأَفْطِرُوْا فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدِرُوْا لَهٗ۔

ترجمہ: ”مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے، جب تم چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب چاند دیکھ لو تو عید کرو اور جب مطلع ابر آلود ہو تو مدت پوری کرو“، (صحیح مسلم رقم الحدیث:2464)۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ ابوالبختری بیان کرتے ہیں:

”خَرَجْنَا لِعُمْرَةَ فَلَمَّا نَزَلْنَا بِبَطْنِ نَخْلَةَ تَرَاءَ يْنَا الْهِلَالَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ:“ هُوَابْنُ ثَلٰثٍ۔“ وَّقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ :”هُوَابْنُ لَيْلَتَيْنِ۔“ قَالَ:”فَلَقِيْنَا ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا فَقُلْنَا:”إِنَّا رَأَيْنَا الْهِلَالَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَابْنُ ثَلٰثٍ وَّقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَابْنُ لَيْلَتَيْنِ ۔“فَقَالَ :”أَیَّ لَيْلَةٍ رَأَيْتُمُوْهُ؟“ قَالَ:” فَقُلْنَا لَيْلَةَ كَذَا وَكَذَا۔“فَقَالَ:”إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:”إِنَّ اللّٰهَ قَدْأَمَدَّهٗ لِرُؤْيَتِهٖ۔“ابوالبختری کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:” فَإِنْ أُغْمِیَ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ۔

ترجمہ: ''ہم عمرہ کیلئے گئے جب ہم وادیٔ نخلہ میں پہنچے تو ہم نے چاند دیکھنا شروع کیا، بعض لوگوں نے کہا: ''یہ تیسری رات کا چاند ہے۔'' اور بعض لوگوں نے کہا: ''یہ دوسری رات کا چاند ہے۔'' راوی کہتے ہیں: ''پھر ہماری حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ملاقات ہوئی اور ان سے ہم نے ذکر کیا کہ ہم نے چاند دیکھا ہے، بعض نے کہا یہ تیسری رات کا چاند ہے اور بعض نے کہا دوسری رات کا چاند ہے، انہوں نے کہا: ''تم نے کس رات کو چاند دیکھا؟'' ہم نے کہا: ''فلاں فلاں رات کو۔'' انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے دیکھنے کیلئے اسے بڑھا دیا، وہ حقیقت میں اسی رات کا چاند ہے جس رات تم نے دیکھا ہے۔'' ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ''اگر مطلع ابر آلود ہو تو گنتی (تیس دن) پوری کرو''، (صحیح مسلم رقم الحدیث:2488)۔

المعجم الکبیر للطبرانی میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

"مِنِ اقْتِرَابِ السَّاعَةِ اِنْتِفَاخُ الْاَهِلَّةِ"

ترجمہ: ''قربِ قیامت کی علامات سے ہے کہ ہلال پھولے ہوئے نکلیں گے''،

(رقم الحدیث:10451)

دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مِنِ اقْتِرَابِ السَّاعَةِ اَنْ يُرَى الْهِلَالُ قُبُلًا وَّيُقَالُ هُوَ اللَّيْلَتَيْنِ۔

ترجمہ: ''علاماتِ قیامت سے ہے کہ چاند بے تکلف نظر آئے گا اور کہا جائے گا کہ دو رات کا ہے''، (کنز العمال، بحوالہ طبرانی اوسط، رقم الحدیث:38470)۔

مشہور فقیہ وامام اہلِ سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز ان قیاسات اور تخمینوں کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ششم، قیاسات وقرائن مثلاً چاند بڑا تھا، روشن تھا، دیر تک رہا تو ضرور کل کا تھا، آج بیٹھ کر نکلا تو ضرور پندرھویں کا ہے، اٹھائیسویں کو نظر آیا تھا مہینہ تیس کا ہوگا، اٹھائیسویں کو بہت دیکھا نظر نہ آیا مہینہ انتیس کا ہوگا، یہ قیاسات تو حسابات کی وقعت بھی نہیں رکھتے، پھر ان

پر عمل محض جہل وزلل"۔

مزید لکھتے ہیں:

"ہفتم، کچھ اِستقرائی کچھ اِختراعی قاعدے، مثلاً رجب کی چوتھی رمضان کی پہلی ہوگی رمضان کی پہلی ذی الحجہ کی دسویں ہوگی۔ اگلے رمضان کی پانچویں اس رمضان کی پہلی ہوگی۔ چار مہینے برابر تیس تیس کے ہو چکے ہیں یہ ضرور انتیس کا۔ تین پے در پے انتیس کے ہوئے ہیں یہ ضرور تیس کا ہوگا۔ ان کا جواب اسی قدر میں ہے، "مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَامِنْ سُلْطَان" حق سبحانہٗ نے ان باتوں پر کوئی دلیل نہ اتاری۔

وجیز امام کردری میں ہے:

"شهررمضان جاء يوم الخميس لايضحي أيضافي يوم الخميس مالم يتحقق أنه يوم النحر،ومانقل عن علي رضي اللّٰه تعالىٰ عنه: أن يوم اول الصوم يوم النحرليس بتشريع كلي بل إخبارعن اتفاقي في هذه السنةوكذاماهوالرابع من رجب لايلزم أن يكون غرةرمضان بل قد يتفق۔"

ترجمہ: "رمضان کا مہینہ جمعرات کو شروع ہوا تو یومِ خمیس کو قربانی جائز نہ ہوگی جب تک اس بات کا ثبوت نہ ہو جائے کہ یہ قربانی کا دن ہے، اور یہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ روزے کا پہلا دن عید کا دن ہوتا ہے، یہ شریعت کا قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اس سال اتفاقاً ایسا ہو جانے کا بیان ہے۔ اسی طرح جو رجب کا چوتھا دن ہے لازم نہیں وہ رمضان کا پہلا دن ہو، ہاں کبھی ایسا اتفاقاً ہو جاتا ہے"۔

خزانۃ المفتیین میں فتاویٰ کبریٰ سے ہے:

"مايروى ان يوم نحركم يوم صومكم كان وقع ذلك العام بعينه دون الأبدلأن من اول يوم رمضان الى غرةذي الحجةثلاثةأشهرفلايوافق يوم النحريوم الصوم إلاأن يتم شهران من الثلثةوينقص الواحدفإذاتمت الشهور الثلثة أو شهران تقدم عليه فلايصح الإعتمادعلى هذا۔"

ترجمہ: ''یہ جو مروی ہے کہ تمہاری عید کا دن تمہارے روزے کا دن ہے، یہ ہمیشہ کیلئے نہیں بلکہ معین سال میں ایسا واقعہ ہوا تھا کیونکہ رمضان کے پہلے دن سے لے کر ذوالحجہ کے پہلے دن تک تین ماہ ہوتے تو یوم نحر اور یوم صوم میں موافقت نہیں ہو سکتی مگر اس صورت میں کہ جب ان تین ماہ میں دو کامل ہوں اور ایک ناقص، اب اگر تینوں ماہ کامل ہوتے ہیں تو اس سے تأخر ہوگا اور اگر تین یا دو ناقص ہو جاتے ہیں تو پھر اس پر تقدم ہوگا، لہٰذا اس پر اعتماد درست نہیں''، (فتاویٰ رضویہ مع تخریج و ترجمہ عربی عبارات، ج:10،ص:428تا430)۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: سیدنا امام جعفر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ''خامس رمضان الماضی اول رمضان الأتی'' گزشتہ رمضان کی پانچویں آئندہ رمضان کی پہلی ہے۔ بعض علماء نے کہا اس کا پچاس برس تک تجربہ ہوا، ٹھیک اترا۔ بعض معاصرین نے لکھا، ۱۲ برس سے میں بھی تجربہ کرتا اور درست پاتا ہوں۔ (اقول) میں کہتا ہوں، مگر فقیر نے ۱۲۹۷ھ سے اب تک کے ۹ رمضانوں میں خیال کیا چند ہی سال میں صاف فرق پڑ گیا۔ پانچ برس تک تو حساب ٹھیک تھا اور اس قاعدے کے مطابق رمضان ۱۳۰۱ھ کی پنجم روز یک شنبہ آئی، مگر ۱۳۰۲ھ بحساب تقویم یکم اسی دن مظنون تھی، مگر فقیر ۲۹ شعبان روز پنج شنبہ کو دیہات میں تھا، کشادہ جنگل، صاف مطلع، ابر، غبار، دخان کسی علت کا نام نہ نشان۔ میں اور میرے ساتھ اور مسلمان ہر چند غور کرتے رہے رویت نہ ہوئی، شبِ جمعہ کی خبر بھی نہ آئی، شنبہ کی عید قرار پائی۔

اب ۱۳۰۲ھ کا حساب تقویم اگر غلط بھی مانئے کہ مطلع صاف نہ تھا اور بحکم ہیأت یکم یک شنبہ بھی ممکن تھی، تو تصحیح قاعدہ کو اسی دن یکم رکھئے تو پنجم پنجشنبہ کی ٹھہرے گی۔ ۱۳۰۳ھ میں یکم بھی جمعرات کو ہونی چاہئے حالانکہ وہ بشہادت عین بھی غلط، اور بحکم ہیأت بھی ناممکن۔ لاجرم ماننا پڑے گا کہ ۱۳۰۳ھ میں ٹوٹ گیا۔ با این ہمہ اگر دائمہ بھی تو صرف ایک تجربہ ہے، نہ حکمِ شرعی جس پر احکامِ شرعیہ کی بنا ہو سکے، (ایضاً صفحہ نمبر:473,474)۔

الغرض اس طرح کے تجربات، قیاسات اور تخمینوں کا قمری سال کی تعیین وتحقیقِ شرعی اور

رویت کا فیصلہ واعلان کرنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ کتاب وسنت اور کتبِ فقہ میں ایسا کوئی ضابطہ مذکور نہیں ہے۔

کھانے کے آداب اور مسنون طریقہ

سوال:199

اسلام میں کھانا کھانے کے آداب کیا ہیں اور اس کا مسنون طریقہ کیا ہے؟، تفصیل سے بیان کریں، (عابدہ پروین، سرگودھا)۔

جواب:

(1) ہاتھ دھونا:

کھانے کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھولیں اور کلی کریں، اسے حدیث میں وضو سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیث میں ہے:

(I) ”عَنْ سَلْمَانَ قَالَ: قَرَأْتُ فِي التَّوْرَاةِ :إنَّ بَرَكَةَ الطَّعَامِ الْوُضُوْءُ قَبْلَه‘، فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: بَرَكَةُ الطَّعَامِ الْوُضُوْءُ قَبْلَه‘ وَالْوُضُوْءُ بَعْدَهٗ“۔

ترجمہ:”حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ کھانے کی برکت، کھانے سے پہلے وضو کرنا ہے، اس کا ذکر میں نے نبی ﷺ سے کیا، تو آپ نے فرمایا: کھانے کی برکت کھانے سے پہلے اور بعد میں وضو کرنا ہے، (یعنی ہاتھ دھونا اور کلی کرنا ہے)“، (سنن ابی داؤد، جلد:4 ص:284، رقم الحدیث:3755)۔

(II) ”قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّكْثِرَ اللّٰهُ خَيْرَ بَيْتِهٖ فَلْيَتَوَضَّأْ اِذَا حَضَرَ غَدَاءُهٗ وَاِذَا رُفِعَ“۔

ترجمہ:”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گھر میں خیر کی کثرت فرمائے تو اسے چاہیے کہ جب کھانا چنا جائے (تو اس وقت بھی) اور جب کھانا اُٹھالیا جائے تو (بھی) وضو کرے (یعنی ہاتھ دھولے اور کلی کرے)“۔(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3260)

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ کھانا کھانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونا اور کلی کرنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت میں اضافے کا باعث ہے اور طبی لحاظ سے صفائی کا ذریعہ ہے اور اس شخص کی طبعی اور فطری نفاست اور پاکیزگی کی دلیل ہے۔

(2) کھانے سے پہلے "بسم اللہ" پڑھنا:

حدیثِ پاک میں ہے:

"عَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:اِنَّ الشَّیْطَانَ یَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ اَنْ لَّا یُذْکَرِاسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ"۔

ترجمہ: "حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کھانے پر (شروع کرتے وقت) "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نہ پڑھی جائے، تو شیطان اُسے اپنے لئے حلال سمجھ لیتا ہے"، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الاطعمہ ص:363)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کھانا کھانے سے پہلے "بسم اللہ" نہ پڑھی جائے تو شیطان اس میں شریک ہو جاتا ہے اور اس میں برکت نہیں رہتی، چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے کہ:

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اور کھانے کے وقت اللہ عزوجل کا نام لے لے، تو شیطان اپنی ذریت سے کہتا ہے: (اب اس گھر میں) نہ تمہارا رات کا ٹھکانا ہے اور نہ ہی کھانا، لیکن جب کوئی شخص (رات کو) اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ عزوجل کا نام نہ لے، تو شیطان (اپنے چیلوں سے) کہتا ہے: تم نے رات کا کھانا اور ٹھکانا پالیا"، (مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد، رقم الحدیث:3759)۔

ہاں اگر کوئی کھانا کھاتے وقت (شروع میں) "بسم اللہ" پڑھنا بھول جائے تو جب یاد آجائے، پڑھ لے، برکت دوبارہ لوٹ آتی ہے۔

حدیثِ پاک میں ہے:

"عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : اِذَا اَکَلَ اَحَدُکُمْ فَلْیَذْکُرِاسْمَ اللّٰهِ فَاِنْ نَسِیَ

اَنْ یَّذْکُرَ اسْمَ اللّٰہِ فِیْ اَوَّلِہٖ فَلْیَقُلْ بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ"۔

ترجمہ:"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے اور شروع میں "بسم اللہ" پڑھنا بھول جائے تو جوں ہی اُسے یاد آئے (فوراً) "بسم اللہ" پڑھ لے اور یوں کہے: "بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ"۔

(ترمذی، نسائی، ابوداؤد، رقم الحدیث:3761)

ابن عساکر نے حضرت عقبہ بن عامر سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، وہ بیماری ہے اور اس میں برکت نہیں ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اگر ابھی دسترخوان نہ اٹھایا گیا ہو تو 'بسم اللہ' پڑھ کر کچھ کھالے اور دسترخوان اٹھالیا گیا ہو تو "بسم اللہ" پڑھ کر انگلیاں چاٹ لے۔

علامہ امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "بہارِ شریعت" جلد:16 صفحہ:597 پر دیلمی کے حوالے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب کوئی کھائے یا پیئے تو یہ پڑھے:"بِسْمِ اللّٰہِ وَ بِاللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ، یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ"، پھر اس کھانے سے کوئی بیماری نہیں ہوگی اور اگر اس میں زہر بھی ہے تو وہ اثر انداز نہیں ہوگا۔

(3) دائیں ہاتھ سے کھانا:

حدیث پاک میں ہے:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِذَا اَکَلَ اَحَدُکُمْ فَلْیَاْکُلْ بِیَمِیْنِہٖ وَاِذَاشَرِبَ فَلْیَشْرَبْ بِیَمِیْنِہٖ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ یَاْکُلُ بِشِمَالِہٖ وَیَشْرَبُ بِشِمَالِہٖ"۔

ترجمہ:"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو اسے چاہیے کہ اپنے دائیں ہاتھ سے کھائے اور جب پانی پیئے تو اپنے دائیں ہاتھ سے پیئے، کیونکہ شیطان اپنے بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے"، (مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، رقم الحدیث:3770)۔

علماء نے کہا ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھانا مستحب ہے، البتہ اگر کسی شخص کے دائیں ہاتھ میں کوئی عذر ہو کوئی مرض یا زخم ہو تو پھر بائیں ہاتھ سے کھانے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

(شرح صحیح مسلم ج:6 ص:246)

(4) تین انگلیوں سے کھانا اور انگلیاں چاٹنا:

حدیثِ پاک میں ہے: ابن النجار نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین انگلیوں سے کھانا انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے اور حکیم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تین انگلیوں سے کھاؤ کہ یہ سنت ہے اور پانچوں انگلیوں سے نہ کھاؤ کہ یہ اَعراب (گنواروں) کا طریقہ ہے، (بہارِ شریعت جلد:16 ص:597)۔

عن کعب بن مالک قال کان رسول ﷺ یا کل بثلثة اصابع ویلعق یده قبل ان یمسحها ۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تین انگلیوں سے کھاتے اور ہاتھ پونچھنے (دھونے) سے پہلے ہاتھ چاٹ لیتے، (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم:363)۔

عن جابر ان النبی ﷺ امر بلعق الاصابع والصحفة وقال انکم لا تدرون فی ایتها البرکة۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انگلیاں اور پیالہ (پلیٹ) چاٹنے کا حکم فرمایا اور فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم کہ کس میں برکت ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم ص:363)
یعنی ممکن ہے جو انگلیوں پر لگا ہے یا جو پلیٹ میں رہ گیا ہے اسی میں برکت ہو اور تم اس سے محروم رہ جاؤ، لہٰذا برکت کی محرومی سے بچنے کے لیے انگلیوں اور برتن کو چاٹنا بہتر ہے اور اطباء کے نزدیک یہ ہاضمہ کے لیے بھی مفید ہے۔

(5) اکٹھے ہو کر کھانے میں برکت ہے:

عَنْ وَحْشِيِّ بنِ حَرْبٍ اَنَّهُمْ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اِنَّا نَاْکُلُ وَلَا نَشْبَعُ قَالَ :

فَلَعَلَّكُمْ تَاْكُلُوْنَ مُتَفَرِّقِيْنَ قَالُوْا: نَعَمْ قَالَ فَاجْتَمِعُوْا عَلٰى طَعَامِكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ يُبَارَكْ لَكُمْ فِيْهِ۔

ترجمہ: ''حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ ہم کھاتے ہیں مگر پیٹ نہیں بھرتا، ارشاد فرمایا: شاید تم الگ الگ کھاتے ہو، انھوں نے عرض کیا: جی ہاں (ایسا ہی ہے)!، فرمایا: اکھٹے بیٹھ کر کھاؤ اور ''بسم اللہ'' پڑھو تمہارے لیے اس میں برکت ہوگی''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 3286)۔

حدیث پاک میں ہے:

كُلُوْا جَمِيْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا فَاِنَّ الْبَرَكَةَ مَعَ الْجَمَاعَةِ ۔

ترجمہ: ''تم اکھٹے بیٹھ کر کھاؤ، الگ الگ ہو کر نہ کھاؤ، کیونکہ برکت جماعت کے ساتھ ہے''، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث 3287)۔

(6) رزق کا احترام:

اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مکان میں تشریف لائے، روٹی کا ٹکڑا پڑا ہوا دیکھا، اس کو لے کر پونچھا پھر کھا لیا، اور فرمایا: عائشہ! اچھی چیز کا احترام کرو کہ یہ چیز (روٹی) جب کسی قوم سے بھاگی ہے تو لوٹ کر نہیں آئی، (یعنی اگر ناشکری کی وجہ سے کوئی رزق کی کشادگی سے محروم ہو جائے تو پھر آسانی سے یہ نعمت واپس نہیں آتی)، (ابن ماجہ بحوالہ بہار شریعت حصہ: 16 ص: 598)۔

حضرت عبداللہ بن اُم حرام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: روٹی کا احترام کرو کہ وہ آسمان و زمین کی برکات سے ہے۔ جو شخص دستر خوان پر گری ہوئی روٹی کو کھا لے گا، اس کی مغفرت ہو جائے گی، (طبرانی بحوالہ بہار شریعت حصہ: 16 ص: 598)۔

(7) کھانا ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے:

حاکم نے حضرت جابر سے اور ابوداؤد نے حضرت اسماء سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کھانے کو ٹھنڈا کر لیا کرو کہ گرم کھانے میں برکت نہیں ہے، (بہار شریعت

حصہ:16 ص:598)۔

اس سے مراد یہ ہے کہ کھانا اتنا گرم نہ ہو کہ زبان یا منہ جلے اور آدمی لذت اور سکون سے نہ کھا سکے یا ٹھنڈا کرنے کیلئے کھانے میں پھونک مارتا رہے جو طبی لحاظ سے بھی نقصان دہ ہے، ذوقِ سلیم اور نفاستِ طبع کے بھی منافی ہے اور از روئے حدیث بھی منع ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کھانے کی تازگی ختم ہو جائے اور اسے باسی کر کے کھایا جائے۔

(8) کھانے میں پھونک مارنے کی ممانعت:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کھانے اور پینے کی چیز میں پھونک نہیں مارتے تھے اور کھانے اور پینے کے برتن میں سانس بھی نہیں لیتے تھے''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:3288)۔

''دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھانے پینے کے برتن میں سانس لینے سے منع فرمایا ہے''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:3428)۔

جدید طب بھی اس حدیث کی تائید کرتی ہے کہ سانس لینے سے نقصان دہ جراثیم باہر آتے ہیں اور وہ دوبارہ کھانے پینے کی اشیاء میں شامل ہو کر معدے میں جا کر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

(9) اپنے سامنے سے کھانا چاہیے:

اگر چند افراد کسی ایک تھال، ٹرے، طباق یا برتن میں اکٹھے بیٹھ کر کھا رہے ہوں تو ان کیلئے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت یہ ہے:

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں بچہ تھا اور نبی اکرم ﷺ کی پرورش میں تھا اور کھانے کے دوران میرا ہاتھ برتن میں ادھر اُدھر گھومتا تھا، تو آپ نے فرمایا: بیٹے! ''بسم اللہ'' پڑھو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ (ابن ماجہ، رقم الحدیث:3267)

ہاں اگر کسی بڑی ٹرے میں کئی طرح کے کھانے رکھے ہوں تو مختلف جگہ سے اپنی پسند کی چیزیں لے سکتا ہے۔

(10) ٹیک لگا کر کھانے کی ممانعت:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی ٹیک لگا کر کھاتے نہیں دیکھا۔ (ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ)۔ یہ وضع اختیار کر کے کھانا اس لئے منع ہے کہ یہ کاہلی بھی ہے اور تکبر کی بھی علامت ہے۔

(11) کھانے میں عیب نکالنا منع ہے اگر کھانا پسند ہو تو کھالے، ورنہ چھوڑ دے:

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کھانے میں عیب نہیں نکالا، اگر کھانا پسند ہوتا کھالیتے ورنہ چھوڑ دیتے''، (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری مسلم)۔

کھانے میں عیب نکالنا، ایک طرح سے رزق کی بے توقیری ہے اور جس نے کھانا تیار کیا ہے، اس کی دل آزاری کا سبب بنتا ہے۔

(12) کھانے میں توازن واعتدال کا حکم:

''ایک شخص بہت زیادہ کھاتا تھا پھر وہ مسلمان ہو گیا تو کم کھانے لگا اس بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ کے سامنے کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمان ایک آنت سے کھاتا ہے اور کافر سات آنت سے کھاتا ہے''، (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری)۔

''حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ آدمی نے پیٹ سے زیادہ کوئی برتن نہیں بھرا، ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں، اگر زیادہ کھانا ضروری ہو تو (معدے کے تین حصے کر لے)، ایک تہائی خوراک کیلئے، ایک تہائی پانی کیلئے اور ایک تہائی ہوا اور سانس کیلئے (خالی) رکھے''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:3379)۔

(13) کھانا کھاتے وقت بیٹھنے کا طریقہ:

احادیث مبارکہ میں کھانا کھاتے وقت بیٹھنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، وہ یہ ہے:

(I) انسان سرین کے بل پر بیٹھے اور دونوں گھٹنے کھڑے رکھے، اسے عربی میں ''اِقعاء'' کہتے ہیں۔

(II) ایک طریقہ یہ ہے کہ بایاں پاؤں بچھادے اور داہنا پاؤں کھڑا رکھے۔ (بہارشریعت

ج:16 ص:605)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ بطریق ''اِقعاء'' بیٹھے ہوئے کھجوریں کھا رہے تھے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کیلئے بطریق اِقعاء (سرین کے بل بیٹھ کر گھٹنوں کو کھڑا کرنا) بیٹھنا سنت ہے، بعض احادیث میں ٹیک لگا کر بیٹھ کے کھانے سے منع کیا، بعض علماء نے اس حدیث کو آلتی پالتی (چارزانو) بیٹھ کر کھانے پر محمول کیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ دوزانو بیٹھ کر یا اکڑوں بیٹھ کر کھانا صحیح طریقہ ہے، (شرح صحیح مسلم ج6 ص302)۔

کھانے کے وقت بایاں پاؤں بچھادے اور دہنا کھڑا رکھے یا سرین پر بیٹھے اور دونوں گھٹنے کھڑے رکھے۔

(14) کھڑے ہو کر کھانے اور چل پھر کر کھانے کے متعلق تفصیل:

کھڑے ہو کر کھانا پینا حرام نہیں البتہ مکروہ ہے، چنانچہ علامہ غلام رسول سعیدی صاحب لکھتے ہیں: مستحب یہی ہے کہ بیٹھ کر کھانا پینا چاہئے کیوں کہ کسی حدیث میں نبی ﷺ نے کھڑے ہو کر کھانے پینے کا حکم نہیں دیا، کھڑے ہو کر کھانے پینے کے متعلق جس قدر احادیث ہیں سب میں نبی ﷺ کے فعل کا ذکر ہے اور جب آپ کے قول و فعل میں تعارض ہو تو ترجیح قول کو دی جاتی ہے اور کھڑے ہو کر کھانے پینے کی حدیث کو کراہت تنزیہی پر محمول کیا کہ نبی ﷺ نے اس ممانعت پر کوئی وعید نہیں بیان کی۔

باقی رہا یہ سوال کہ جب بیٹھ کر کھانا سنت و مستحب ہے تو رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر کھڑے ہو کر کیوں کھایا؟، تو جواباً گزارش یوں ہے کہ رسول اللہ ﷺ شارع تھے اور آپ بعض اوقات ''خلافِ اولیٰ'' کام بیانِ جواز کیلئے کرتے تھے اور یہ بحیثیتِ شارع آپ کے منصب کا تقاضا تھا اور اس پر آپ کو واجب کا اجر ملتا تھا، کیونکہ اگر آپ کے عمل سے اس کا جواز نہ ملتا تو عذر کے باوجود صحابۂ کرام اور صلحائے امت کو اس کے کرنے میں تردد ہوتا،

(شرح صحیح مسلم ج6 ص279)

(15) جوتے پہن کر اور میز کرسی پر کھانے پینے کا حکم:

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: کھانا کھاتے وقت جوتا اتار لینا سنت ہے، دارمی، طبرانی، ابویعلیٰ و حاکم بافادہ تصحیح، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جب کھانا کھانے بیٹھو تو جوتے اُتار لو، اس میں تمہارے پاؤں کیلئے راحت زیادہ ہے اور اچھی سنت ہے، شرعۃ الاسلام میں ہے کھاتے وقت جوتے اتارے، جوتا پہنے کھانا اگر اس عذر سے ہو کہ زمین پر بیٹھا کھا رہا ہے اور فرش نہیں جب تو صرف ایک سنت مستحبہ کا ترک ہے، اس کے لئے بہتر یہی تھا کہ جوتا اتارے اور اگر میز پر کھانا ہے اور یہ کرسی پر جوتا پہنے تو یہ وضع خاص نصاریٰ کی ہے، اس سے دور بھاگے اور رسول اللہ ﷺ کا وہ ارشاد یاد کرے من تشبہ بقوم فھو منھم یعنی جو کسی خاص مذہبی شعار میں کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے تو وہ انہیں میں سے ہے۔ رواہ احمد وابو یعلی والطبر انی فی الکبیر عن عمرو فی الا وسط عن حذیفہ رضی اللہ تعالی عنھما بسند حسن۔ (فتاوی افریقہ ص:53-52 بحوالہ شرح صحیح مسلم)۔

نوٹ: آج کل کرسی میز پر بیٹھ کر کھانا عام رواج ہو گیا ہے اور یہ نصاریٰ کا خاص مذہبی شعار نہیں ہے، لیکن کرسی میز پر بیٹھ کر کھانا اگرچہ خلافِ سنت و مستحب ہے اور بلاشبہ ناپسندیدہ امر ہے، لیکن اسے "تشبُّہ بالنصاری" کی وعید کا مصداق قرار دینا دین میں یُسر کا تقاضا نہیں ہے، تاہم بعض اکابر کا یہ شِعار رہا ہے کہ وہ تمسک وتعامل بالسنۃ پر لوگوں کو جمائے رکھنے کیلئے شدت فرماتے ہیں تاکہ سنت کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں قائم رہے۔

(16) کھانے کے بعد ہاتھ نہ دھونا اور ایسے ہی سو جانا منع ہے:

عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال: " اذا نام احدکم وفی یدہ ریح غمر فلم یغسل یدہ فا صابہ شئی فلا یلومن الا نفسہ"

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی سوئے اور اس کے ہاتھ میں چکنائی یا کوئی اور چیز ہو اس نے ہاتھ بھی نہ دھویا ہو تو

اس سے کوئی نقصان ہو تو وہ اپنے آپ کو ملامت کرے"۔

(17) اگر کوئی شخص کھانے کی دعوت دے اور بھوک ہو تو نفی نہ کرے:

عن اسماء بنتِ یزید قالت اتی النبی بطعام فعرض علینا فقلنا لا تشتھیه فقال لا تجمعن جوعاو کذبا۔

ترجمہ:" حضرت اسماء بنتِ یزید رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی ﷺ کے پاس کھانا لایا گیا تو آپ نے ہمیں دیا، ہم نے عرض کیا: ہمیں کھانے کی خواہش نہیں ہے، تو آپ نے فرمایا: تم بھوک اور جھوٹ کو جمع نہ کرو"، یعنی بعض لوگ کھانے کی خواہش اور بھوک کے باوجود اس کی نفی کر دیتے ہیں، یہ دہرا نقصان ہے، ایک تو بھوکے رہے اور دوسرا جھوٹ بولا۔

(18) کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا:

عن انس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه قال قال رسول اللّٰہ ﷺ: ان اللّٰہ تعالیٰ لیرضی عن العبد یأکل الاکلة فیحمده علیھا او یشرب شربة فیحمده علیھا۔

ترجمہ:" : حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہوتا ہے جو کوئی لقمہ کھائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور پانی کا گھونٹ پیئے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرے"، (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)۔

عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ الطاعم الشاکر کالصائم الصابر۔

ترجمہ:" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرنے والا اس روزے دار کی طرح ہے جو روزہ رکھ کر صبر کرے"، (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

کھانا کھانے کے بعد کی جو دعائیں احادیثِ مبارکہ میں مذکور ہیں، وہ یہ ہیں:

(I) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَ جَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3283)

(II) اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3284)

(III) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ غَيْرَ مُكْفِيٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبَّنَا۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5458)

حدِ قذف

سوال:200

کیا فرماتے ہیں کہ علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو عورتوں نے ایک مرد اور عورت پر یہ تہمت لگائی کہ فلاں لڑکی کے ساتھ ان کے غلط تعلقات ہیں، زنا کی بھی تہمت لگائی اور ماسوائے ان دو عورتوں کے اور کوئی گواہ نہیں۔ جبکہ جن پر تہمت لگائی گئی، دونوں قسمیہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس طرح نہیں کیا۔ لہٰذا یہ بتایا جائے کہ ان دونوں (تہمت زدگان) کیلئے کیا شرعی سزا ہے۔ اور ان تہمت لگانے والوں کے ثبوت نہ دینے پر ان کیلئے کیا سزا ہے، وضاحت فرمائیں، (خان بہادر، گاؤں کیارہ تحصیل اوگی ضلع مانسہرہ)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

1۔ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ: ’’اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں، پھر نہ لائیں چار گواہ تو انہیں اسی کوڑے مارو۔ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہی نافرمان ہیں‘‘، (النور:4)۔

2۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۲۳۔

ترجمہ: ’’بے شک جو لوگ پاک دامن بے خبر مسلمان عورتوں کو (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے‘‘، (النور:23)۔

حدیث مبارک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما: أن ھلال بن امية قذف امرأته عندالنبی ﷺ

بشریک بن سحماء، فقال النبی ﷺ: "البینة أو حدفی ظهرک" فقال: یارسول لله، اذا رأی احدنا علی امرأته رجلا، ینطلق یلتمس البینة؟ فجعل یقول : "البینة والا حد فی ظهرک"۔ فذکر حدیث اللعان۔

ترجمہ:" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہلال بن امیہ نے نبی ﷺ کے پاس اپنی بیوی پر شریک بن سحماء کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی، تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم گواہ پیش کرو، ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد قذف کے کوڑے لگائے جائیں گے، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! جب ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے اوپر کسی مرد کو دیکھے تو کیا وہ گواہوں کو تلاش کرنے جائے گا؟، آپ نے پھر یہی فرمایا کہ تم گواہوں کو پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر حدِ قذف لگائی جائے گی، پھر انہوں نے لعان کا واقعہ بیان کیا"، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 2671، مطبوعہ مکتبہ عصریہ، بیروت)۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: "مسلمان کو زنا کی تہمت بے ثبوت شرعی لگانے والا فاسق، مردود الشہادت، اسّی کوڑوں کا شرعاً سزاوار ہے، مزید لکھتے ہیں، خاص معائنہ کے چار گواہ مرد، ثقہ، متقی اور پرہیزگار درکار ہیں، بغیر اس کے جو اسے متہم بالزنا کرے گا، شرعاً اسّی کوڑوں کا مستحق ہوگا"، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 23، ص: 326,329، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

شریعت مطہرہ میں زنا کی تہمت لگانے والے پر لازم ہے کہ وہ چار گواہ مرد، ثقہ، متقی اور پرہیزگار پیش کرے، اسلامی حدود میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں ہے:

عن الزهری قال: مضت السنة من رسول الله ﷺ والخلیفتین من بعده لاتجوز شهادة النساء فی الحدود۔

ترجمہ:" زہری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی یہ سنت جاری رہی کہ حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں تھی"، (المصنف جلد 10، ص: 58، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی)۔

اگر وہ ایسا نہ کرے (یعنی شرعی شہادت پیش نہ کرے)، تو شرعاً اسّی کوڑوں کا سزاوار ہے،

لیکن یہ سزا صرف سلطانِ اسلام ہی جاری کرسکتا ہے، غیر سلطان کو اس کا اختیار نہیں، اور ہمیشہ کے لئے اس کی گواہی مردود ہوگی۔
اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تہمت لگانے والوں کیلئے حکم فرمایا کہ:
اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡا‌ ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝
ترجمہ: ''مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ کرلیں، اور اپنی اصلاح کریں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے''، (النور:5)۔
امام احمد رضا قدس سرہ العزیز مزید لکھتے ہیں: ''کہ صرف چارۂ کار یہ ہے کہ اسے برادری سے خارج کریں، مسلمان اس سے میل جول چھوڑ دیں، جب تک توبہ کریں، اگر توبہ کرے تو اللہ عزوجل قبول فرمانے والا ہے، خود آیۂ کریمۂ مذکورہ میں اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا کا استثناء ہے، مگر اس کی توبہ صرف یہی نہ ہوگی کہ اللہ عزوجل کے حضور تائب ہو بلکہ لازم ہوگا کہ عمرو سے اپنے قصور کی معافی مانگے کہ وہ نہ صرف حق اللہ بلکہ حق العبد میں بھی گرفتار ہے اور تنہائی میں توبہ کافی نہ ہوگی، اس نے مجمع میں گناہ کیا ہے، مجمع ہی میں توبہ کرے، حدیث میں ہے، نبی ﷺ فرماتے ہیں: اذاعلمت سیئة فاحدث عندھا توبة السربالسرو العلانیة بالعلانیة، ''جب تو کوئی گناہ کرے تو چھپے گناہ کی خفیہ اور برملا گناہ کی علانیہ توبہ کرو''، (فتاویٰ رضویہ، جلد:23، ص:324، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)۔
حدیث میں ہے: عن عقبة بن عامر أن رسول الله ﷺ قال: "ایاکم والدخول علی النساء" فقال رجل من الانصار: یا رسول اللّٰہ افرأیت الحمو قال الحمو الموت۔
''(اجنبی) عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کرو، انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! دیور کا کیا حکم ہے؟، فرمایا کہ دیور موت ہے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث 5570، جلد 9، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکة المکرمة)۔
ایک اور حدیث میں ہے:
لایخلون رجل بامرأة الاکان ثالثھما الشیطان۔

''کوئی مرد جب کسی (اجنبی) عورت کے ساتھ تنہا ہوتا ہے، تو ان میں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے''، (رواہ الترمذی عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رقم الحدیث: 1171)۔

اور فرمایا: عن جابر، عن النبی ﷺ قال: لاتلجوا علی المغیبات فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم۔

ان عورتوں کے پاس نہ جاؤ جن کے شوہر موجود نہ ہوں کیونکہ شیطان تمہارے وجود میں اسی طرح سرایت کرتا ہے جیسے تمہاری رگوں میں خون تیرتا ہے، (ترمذی، رقم الحدیث 1172 جلد 2 دارالکتب علمیہ بیروت)۔

مسلمان کو چاہئے کہ وہ مواضع تہمت اور مواقع تہمت سے ہمیشہ اجتناب کرے، اپنی عزت وآبرو کا تحفظ مومن کی شرعی ذمہ داری ہے، لہٰذا اجنبی مرد وزن ایسی تنہا جگہ میں جمع ہونے سے گریز کریں کہ جہاں اغواء شیطان اور شرور نفس کی بنا پر گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو یا دوسرے لوگ بدگمانی کی بنا پر ہدف تہمت بنا سکتے ہوں۔

ایک روایت میں ہے:

من سلک مسالک الظن اتہم ،ورواہ الخرائطی فی مکارم الاخلاق مرفوعاً بلفظ: من اقام نفسہ مقام التہم فلایلومن من اساء الظن بہ۔

ترجمہ: جو بدگمانیوں کی راہوں پر چلے گا، وہ ہدف تہمت بنے گا، اور مکارم اخلاق میں خرائطی نے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا کہ ''جو مقامِ تہمت پر ٹھہرا، تو پھر اسے چاہئے کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے خود انہیں موقع فراہم کیا)۔

علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی الجراحی نے مندرجہ بالا روایات کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ: اگرچہ ''اتقوا مواضع التہمۃ''، ترجمہ: (مقامات تہمت سے بچو!) کی روایت لفظاً ثابت نہیں ہے، لیکن مندرجہ بالا روایات کی بنا پر معنیً ثابت ہے، (کشف الخفاء ومزیل الالباس، جزء الاوّل صفحہ 44، مطبوعہ مکتبۃ الغزالی، دمشق)۔

مذکورہ بالا احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مرد وعورت کا کسی مقام پر تنہا جمع ہونا باعثِ فساد اور خلافِ شرع ہے، لہٰذا ایسے مواقع اور [illegible]ات سے بچنا ضروری ہے۔

خود کو غیر مسلم ظاہر کرنے کا حکم

سوال:201

علماء کیا فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان خاتون جو گزشتہ 20 سال سے امریکہ میں مقیم ہیں چار بچے ہیں اور نماز پڑھتی ہیں قرآن پڑھا ہوا ہے، دیگر مذاہب کی کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم بظاہر مسلمان نظر نہیں آتے، لباس، حلیہ، کردار، دھوکہ دہی، جھوٹ، وعدہ خلافی وغیرہ ہمارے کردار کا حصہ ہیں، لہٰذا جب میں کسی مسلم یا غیر مسلم سے ملتی ہوں تو یہ کہتی ہوں کہ ''میں ہندو ہوں''۔

(1) ان خاتون کا اس طرح کہنا کیا انہیں دائرہ اسلام سے خارج کرتا ہے۔

(2) کیا ان کو مسلمان ہونے کے لئے کلمہ پڑھنا ہوگا اور تجدیدِ نکاح کرنا ہوگا۔

(3) اس کا کفارہ کیا ہے، (محمد جمشید ہاشمی، تحصیل کوٹ ادو، ضلع مظفر گڑھ)۔

جواب:

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل کی سچائی سے ضروریاتِ دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت، کتبِ الٰہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریاتِ دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ باقی اعمالِ حسنہ ایمان کی فرع اور ثمرہ ہیں، ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں۔ جو شخص دل سے ضروریاتِ دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے۔ اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے۔ اعمالِ صالحہ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کا تارک اور محرمات کا مرتکب فاسق اور گنہگار ہے مگر دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی طرح جھوٹ بولنے والا شخص اور شراب پینے والا اور دوسری برائیوں کا مرتکب شخص گنہگار کہلائے گا۔ موصوفہ کا یہ سمجھنا غلط ہے کہ دھوکہ بازی، جھوٹ اور وعدہ خلافی اور ان جیسی اور برائیوں کی وجہ سے ہم

مسلمان نہیں رہتے لہٰذا نتیجتاً میں خود کو ہندو سمجھتی ہوں، ہاں! اگر وہ یہ کہتیں کہ ہم کامل مسلمان نہیں ہیں یا ہمارے قول وعمل میں تضاد ہے تو درست بات ہوتی۔

موصوفہ کو چاہیے کہ غیر مسلموں کی مذہبی کتابوں کے مطالعہ کرنے کے بجائے اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرے اپنے مذہب کو سمجھے اور علماء سے رہنمائی حاصل کرے اور اپنا دین وایمان محفوظ کرے۔ بدعمل مسلمان کو یا اپنی بدعملی کی وجہ سے خود کو کافر کہنے کی بجائے اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اصلاح کی طرف راغب کرنا چاہیے، اپنے کفر کا اقرار کفر ہے، لہٰذا جو شخص خود کو کسی غیر مسلم فرقے سے ظاہر کرے، وہ کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

ترجمہ: ”جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا سوا اس کے جس کو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، بلکہ وہ لوگ جو کھلے دل کے ساتھ کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے“، (النحل:106)۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ۔ (التوبہ:66)

ترجمہ: ”اب عذر نہ پیش کرو، بے شک تم اپنے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کر چکے ہو“۔

شرح فقہ اکبر میں ہے: وفی المحیط من قال فانا کافر او فاکفر ......قال ابوا لقاسم ھو کافر من ساعتہ۔

ترجمہ: ”اور محیط میں ہے کہ جو کہتا ہے کہ میں کافر ہوں یا میں کفر کروں گا، ابوالقاسم نے کہا: وہ اسی وقت کافر ہو گیا“، (شرح فقہ اکبر ص:183)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ومن یرضیٰ بکفر نفسہ فقد کفر۔

ترجمہ: اور جو شخص اپنے کفر پر راضی ہو جائے تو وہ کافر ہو جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری جلد دوم

ص:257،مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔
علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:
(ویکفر فیھما)لرضاہ بالکفر۔
ترجمہ:"کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے"،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد5 ص:393 داراحیاء التراث العربی،بیروت)۔
اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی تعظیم کرنا کفر ہے،موصوفہ کا خود کو ہندو کہلوانا اقرارِ کفر ہے مذکورہ بالا حوالہ جات کی رو سے اقرارِ کفر،بھی کفر ہے،لہٰذا موصوفہ پر تجدیدِ ایمان اور تجدید نکاح فرض ہے،واللہ ورسولہ اعلم۔

امانت رکھنے اور واپس کرنے کا حکم

سوال:202

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ زید نے عمر کو تین چیزیں دیں اور کہا دو چیزیں تم لے لو مگر ایک چیز میں تم سے ضرور لوں گا جب مجھے اس کی ضرورت پڑی،عمر نے کہا تم اس چیز کے بارے میں بے پرواہ رہو کہ میں تم سے دھوکہ نہیں کروں گا کیونکہ حدیث میں ہے دھوکہ دینے والا منافق ہے۔
لیکن جب زید کو اس چیز کی ضرورت پڑی جو کہ عمر کے پاس رکھوائی تھی تو عمر نے یہ کیا کہ اس چیز کے تین حصے کئے اور ایک حصہ زید کو دینے لگا،اس پر زید اور عمر کا جھگڑا ہو گیا عمر نے کہا کہ میں نے اپنا کہا پورا کیا ہے جبکہ زید نے کہا کہ تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے،بتایئے کہ حق بات کیا ہے اور ثواب دارین حاصل کیجیے،(زاہد اللہ عادل،بلند کوٹ،بٹگرام)۔

جواب:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے امانت کی حفاظت اور ادائیگی کا صراحۃً کئی مقامات پر حکم دیا ہے،چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا

بِالْعَدْلِ

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم امانت والوں کو ان کی امانتیں ادا کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو''، (النساء:58)۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۞

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی چیزوں میں خیانت مت کرو اور خیانت کرتے ہو تم اپنے پاس رکھی ہوئی امانتوں میں حالانکہ تم سب کچھ جانتے ہو''، (الانفال:27)۔

اس آیت سے ثابت ہوا امانت میں خیانت کرنا بہت بڑا جرم ہے، دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۞۔

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا''، (الانفال:58)۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی بھی امانت میں خیانت کرنے والا بدترین انسان ہے، ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

ترجمہ: ''جو کوئی خیانت کرے گا تو لے آئے گا (اپنے ہمراہ) خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن''، (اٰل عمران:161)۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ

ترجمہ: ''پس اگر تم میں سے ایک کو دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے، اسے چاہئے کہ وہ اس کی امانت ادا کردے اور اللہ سے ڈرے، جو اس کا رب ہے'' (البقرہ:283)۔

ان آیات میں امانت ادا کرنے کا حکم عام ہے، خواہ مذہب میں ہو، عقائد میں ہو، معاملات میں ہو یا عبادات میں ہو۔

عن ابی هريرة قال : قال رسول الله ﷺ: " أد الامانة الیٰ من ائتمنک، ولاتخن من خانک"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو تمہارے پاس امانت رکھے، اس کی امانت ادا کرو، اور جو تمہارے ساتھ خیانت کرے اس کے ساتھ خیانت نہ کرو''، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:3529)۔

عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال: "اية المنافق ثلاث اذا حدث كذب، واذا وعد اخلف، واذا اؤتمن خان"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور امانت اس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے''، (صحیح البخاری، رقم الحدیث:33)۔

عن عبدالله بن عمرو: ان النبی ﷺ قال: "اربع من كن فيه كان منافقاً خالصاً، ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها: اذا اؤتمن خان، واذا حدث كذب، واذا عاهد غدر، واذا خاصم فجر"۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: چار باتیں جس میں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک ہو تو اس میں نفاق کا ایک حصہ ہے، یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے۔ جب اسے امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب جھگڑے تو بیہودہ بکے''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:34)۔

صورتِ مسئولہ میں عمر پر لازم ہے کہ جو چیز اس کے پاس امانت رکھوائی گئی، اسے بعینہٖ زید کو واپس کر دے، کیونکہ برتقدیرِ صدقِ سائل معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز بعینہٖ عمر کے پاس موجود ہے، مگر وہ اسے پورا پورا واپس نہیں کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اس کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں، یہ درست نہیں ہے، انہیں امانت پوری کی پوری واپس کرنی چاہئے۔

بوسیدہ اور ناقص قرآنی نسخہ جات اور اوراقِ قرآنی کا مسئلہ

سوال:203

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ آج کل کثیر تعداد میں بڑے بڑے بوروں اور ڈبوں میں قرآن پاک کے بوسیدہ اوراق مختلف مقامات پر نظر آتے ہیں اور ممکنہ حد تک احتیاط کے باوجود بے حرمتی کا باعث بنتے ہیں، یہ مسئلہ خاصی حد تک اضطرابی نوعیت اختیار کرتا جا رہا ہے، جابجا مقامات پر اوراقِ مقدسہ کی بے حرمتی ہوتی نظر آتی ہے، اسی طرح مختلف اخبارات و جرائد، کیلنڈروں، دعوت ناموں پر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے اسماء مبارکہ یا آیات درج ہوتی ہیں، اور یہ ایک عام ابتلاء کی صورت ہے، قرآن وسنت کی روشنی میں ان اوراق کے درست طور پر محفوظ کرنے کا طریقہ بیان فرمائیں۔

(مولانا محمد نصیر اللہ نقشبندی، ناظم دار العلوم نعیمیہ، کراچی)۔

جواب:

بوسیدہ اوراقِ قرآنی و مصاحف جو کہ اس قابل نہ رہیں کہ ان سے تلاوت کی جاسکے اور ان کے ضائع ہونے یا بے حرمتی ہونے کا اندیشہ ہو، تو ایسے مصاحف کو کسی پاک صاف کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے کہ جہاں نہ کسی کا پاؤں پڑتا ہو اور وہ جگہ نجاست وغلاظت کے پہنچنے سے بھی محفوظ ہو، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

المصحف اذا صار خلقا لا يقرأ منه ويخاف أن يضيع يجعل في خرقة طاهرة ويدفن ودفنه أولى من وضعه موضعا يخاف أن يقع عليه النجاسة أونحو ذلک ويلحدله لانه لوشق ودفن يحتاج الى اهالة التراب عليه وفي ذلک نوع تحقيرالا اذا جعل فوقه سقف بحيث لايصل التراب اليه فهو حسن ايضا كذا في الغرائب۔

ترجمہ: ”جب مصحف بوسیدہ ہو جائے اور اسے پڑھا نہ جاسکے اور یہ اندیشہ ہو کہ وہ ضائع ہو جائے گا (اور بے ادبی ہونے لگے گی)، تو اسے کسی پاک کپڑے میں لپیٹ کر کسی محفوظ

جگہ دفن کردیا جائے اور اسے دفن کرنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت کسی ایسی جگہ رکھ دینے کے، جہاں اس پر گندگی پڑے اور آلودہ ہو جائے اور لاعلمی میں پاؤں کے نیچے روندا جانے لگے، نیز اس کی تدفین کے لئے صندوقچی قبر کے بجائے بغلی قبر بنائی جائے، اس لئے کہ اگر صندوق نما قبر بنائی گئی، تو دفن کرنے کے لئے اس پر مٹی ڈالنے کی ضرورت پیش آئے گی اور یہ عمل بھی ایک لحاظ سے بے ادبی والا ہے، ہاں اگر مصحف شریف کو (صندوق نما) قبر میں رکھ کر اوپر چھت بنادی جائے تا کہ اس تک مٹی نہ پہنچے تو پھر یہ صورت بھی بہتر ہے، اسی طرح فتاویٰ الغرائب میں مذکور ہے"، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص:323 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

مزید لکھتے ہیں المصحف اذا صار خلقا وتعذرت القراء ة منه لایحرق بالنار أشار الشیبانی الی هذا فی السیر الکبیر وبہ نأخذ کذا فی الذخیرة۔

ترجمہ: "جب مصحف پرانا اور بوسیدہ ہو جائے اور وہ پڑھے جانے کے لائق نہ رہے، تب بھی اسے آگ میں نہ جلایا جائے، چنانچہ امام محمد شیبانی نے "سیر کبیر" میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لہٰذا اسی کو ہم اختیار کرتے ہیں، کتاب ذخیرہ میں اسی طرح مذکور ہے"، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص:323 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

الکتاب التی لا ینتفع بها یمحی عنها اسم اللّٰه وملائکته ورسله ویحرق الباقی، ولا باس بان تلقی فی ماء جار کما هی أو تدفن وهو احسن کما فی الانبیاء۔

ترجمہ: "وہ کتابیں اور کاغذات جن سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، ان سے اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں کے مقدس نام مٹا کر باقی حصہ جلادیا جائے، اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ انہیں بہتے پانی میں ڈال دیا جائے یا دفن کردیا جائے اور یہ (دفن کرنا) زیادہ بہتر ہے، جیسا کہ انبیاء کے بارے میں ہے"، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 9 ص:518 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

(کمافی الانبیاء) کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

کذا فی غالب النسخ وفی بعضها کما فی "الاشباه"، لکن عبارة "المجتبی": والدفن احسن کما فی الانبیاء والاولیاء اذا ماتوا، وکذا جمیع الکتب اذا بلیت وخرجت عن الانتفاع بها اه : یعنی أن الدفن لیس فیه اخلال بالتعظیم، لأن افضل الناس یدفنون۔ وفی "الذخیرة": المصحف اذاصارخلقا وتعذر القراء ة منه لایحرق بالنار، الیه اشار محمدوبه ناخذ، ولایکره دفنه ، وینبغی أن یلف بخرقة طاهرة، ویلحدله، لأنه لو شق ودفن یحتاج الی اهالة التراب علیه وفی ذالک نوع تحقیر، الا اذا جعل فوقه سقف، وان شاء غسله بالماء أو وضعه فی موضع طاهر لاتصل الیه ید محدث ولا غبار ولاقذر تعظیما لکلام اللّٰه عزوجل اه۔

ترجمہ: ''کمافی الانبیاء'' (یعنی جیسا کہ انبیاءکرام کے اجسادِ مبارکہ کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ انہیں دفن کردیا جاتا ہے) اکثرنسخوں میں اسی طرح ہےاور بعض میں اس طرح ہے، جیسا کہ ''الاشباہ'' میں ہے، لیکن ''المجتبیٰ'' کی عبارت یوں ہے: اور (بوسیدہ اوراقِ قرآن کو) دفن کرنا بہتر ہے، جیسا کہ انبیاءکرام واولیاءعظام کے وصال کے بعدان کے اجسادِ مبارکہ کودفن کیا جاتا ہے، اسی طرح سب (دینی) کتب کامعاملہ ہے کہ جب وہ پرانی ہوجائیں اور فائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہیں، یعنی یہ کہ دفن کرنے سے تعظیم میں خلل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ عالم انسانیت کے افضل نفوس (انبیاءکرام واولیاءعظام، جن کی تعظیم واجب ہے) کودفن کیا جاتا ہے، اور ''الذخیرہ'' میں ہے: مصحف جب پرانا ہوجائے اوراس سے پڑھنادشوار ہوجائے، تو اسے آگ میں جلایا نہ جائے، اسی کی جانب امام محمد نے اشارہ کیا ہےاورہم اسی کواختیار کرتے ہیں، اوراس کا دفن کرنا مکروہ نہیں ہے، اور چاہئے کہ پاک کپڑے میں لپیٹ کر (دفن کیا جائے) اوراس کیلئے بغلی قبر (لحد) بنائی جائے، کیونکہ اگر زمین کوشق کرکے (یعنی اس میں گڑھا کھودکر) اس میں دفن کیا جائےتواس پرمٹی ڈالنےکی ضرورت پیش آئے گی اوراس میں

(یعنی براہِ راست اس پر مٹی ڈالنے میں) ایک طرح کی تحقیر ہے، الا یہ کہ اس پر (با قاعدہ) چھت بنا کر پھر اس پر مٹی ڈال دی جائے (تو پھر کوئی حرج نہیں)، اور اگر چاہیں تو ان بوسیدہ اوراق کی روشنائی کو پانی سے دھوڈالیں (اور اس غسالے کو کسی پاک جگہ بہالیں تاکہ وہ پاک زمین میں جذب ہوجائے)، یا اللہ عزوجل کے کلام کی تعظیم کی خاطر اسے کسی پاک جگہ پر اس طرح رکھ لیں کہ نہ تو کسی ناپاک شخص کے ہاتھ اس تک پہنچیں اور نہ ہی غبار اور گندگی پہنچے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 9 ص:519-518، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

ولایجوز لف شیٔ فی کاغذ فیه مکتوب من الفقه وفی الکلام الاولی أن لایفعل وفی کتب الطب یجوز ولو کان فیه اسم اللّٰه تعالیٰ أواسم النبی ﷺ یجوز محوه لیلف فیه شیٔ کذا فی القنیة۔ ولو محا لوحا کتب فیه القرآن واستعمله فی أمرالدنیا یجوز وقد وردالنهی عن محو اسم اللّٰه تعالیٰ بالبزاق کذا فی الغرائب۔

ترجمہ: ''کوئی ایسا کاغذ جس میں مسائلِ فقہ لکھے ہوں، تو اس میں کسی چیز کا لپیٹنا جائز نہیں ہے اور اگر کلامِ الٰہی لکھا ہو تو بہ طریقِ اولیٰ ایسا کرنا جائز نہیں ہے، ہاں! طب کی کتابوں میں ایسا کرنا جائز ہے۔ اور اگر کسی کاغذ میں اللہ تعالیٰ کا نام یا نبی ﷺ کا نام لکھا ہو تو اس مقصد کے تحت اس تحریر کو مٹانا جائز ہے کہ اس میں کوئی چیز لپیٹی جائے، ''قنیہ'' میں اسی طرح ہے۔ اور اگر ایسی تختی (یا بلیک بورڈ) جس میں قرآن لکھا ہوا سے مٹا دیا جائے اور اسے دنیاوی کاموں میں استعمال کیا جائے تو جائز ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کو تھوک کے ساتھ مٹانے کی ممانعت ہے، غرائب میں اسی طرح ہے''، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص:322، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر آسانی کے ساتھ یا کسی پاک کیمیکل کے ذریعے بوسیدہ اوراقِ قرآنی یا مصحفِ مقدس یا ایسے کاغذات جن پر اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور فرشتوں کے مقدس نام لکھے ہوں، کو دھو دیا جائے (Wash out) اور اس مائع یعنی غسالہ کو دریا میں بہا دیا جائے یا پاک زمین میں جذب کر دیا جائے یا مائع کو بھاپ بنا کر اُڑا دیا جائے اور سفوف کو پاک زمین میں دفن کر دیا جائے، تو اب اس سادہ کاغذ کو استعمال میں لا سکتے ہیں، اسے گودا

(Pulp) بنا کر اور اس میں مزید ضروری اجزاء ملا کر دوبارہ کاغذ بنانے میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، جسے Recycling یعنی کسی چیز کو دوبارہ کارآمد بنانے سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ کسی چیز کی ہیئت و ماہیت کے بدل جانے سے اس کے احکام بدل جاتے ہیں۔

حال ہی میں حکومتِ پنجاب نے قرآن بورڈ بنایا، جس میں یہ سارے مسائل زیرِ بحث آئے ہیں، علماء وسائنسی ماہرین اور صدر انجمن ناشرین قرآن پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی ہے، جو اس کام کے قابلِ عمل ہونے (Feasibility) کی رپورٹ دے گی، اس کے بعد کوئی حتمی فیصلہ ہوگا، کیونکہ خود قرآن مجید کی پرنٹنگ اور جلد سازی کے موقع پر بہت سے Double prints، Misprints اور جلد سازی کے موقع پر ناقص مطبوعہ اوراقِ قرآنی بھاری تعداد میں ہوتے ہیں، جن کا مسئلہ درپیش ہے کہ کیا کیا جائے؟۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ وفاقی سطح پر بھی اس طرح کا ''قرآن بورڈ'' بنایا جائے اور اس کی متابعت میں چاروں صوبوں میں ایسے بورڈ بنائے جائیں، لیکن قبل اس کے حکومت کی سطح پر کوئی ایسا قابلِ قبول حتمی شرعی و انتظامی حل منظوری کے مراحل طے کر کے عملی شکل اختیار کرے۔ بڑے بڑے صنعتکاروں اور اہلِ ثروت کو چاہئے کہ وہ بڑے شہروں سے بہت باہر غیر آباد علاقے میں چار دیواری کے اندر ایسی محفوظ اور پاک جگہیں بنائیں، جہاں ناقص اور بوسیدہ اوراقِ قرآنی کو محفوظ رکھا جاسکے، کیونکہ نہ اب ایسے بڑے کنوئیں کھودے جاسکتے ہیں، جہاں انہیں جمع کر کے رکھا جائے، نہ دریاؤں میں اتنا پانی ہے کہ ان میں بہادیا جائے، اور کراچی میں سمندر میں بھی نیٹی جیٹی کے پل سے جہاں بوسیدہ قرآنی نسخوں اور اوراق کو سمندر برد کردیا جاتا تھا، اب آبی آلودگی کے مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔

بیع اور برطانیہ کا قانون

سوال:204

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ برطانیہ میں ایک شخص نے کسی دوسرے شخص سے مکان خریدا اور اس کی پے منٹ بھی کردی، برطانوی قانون کے

مطابق مکان خریدنے کے تین سال تک وہ مکان خریدار نہ اپنے نام کرا سکتا ہے اور نہ کسی کو بیچ سکتا ہے۔ تین سال بعد اس کو مکان اپنے نام کرانے اور کسی دوسرے شخص کو فروخت کرنے کا اختیار ہوتا ہے، ابھی مکان خریدے دو سال کا عرصہ گزرا تھا کہ حکومتِ برطانیہ نے اس علاقے کے مکانات گرا کر، مکینوں کو دُگنی رقم دینے کا فیصلہ کیا ہے، چونکہ مکان پہلے شخص کے نام ہے لہٰذا حکومت کی طرف سے ملنے والی رقم اسی شخص کو ملے گی، اب وہ شخص جس نے مکان فروخت کیا تھا کہتا ہے کہ وہ قیمت میں رکھوں گا کیونکہ مکان ابھی میرے نام ہے جب کہ وہ مکان فروخت کر چکا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ اس رقم کا حق دار کون ہے؟، (عبداللطیف، لندن، یو۔ کے)۔

جواب:

شرعاً بیع کی تعریف یہ ہے کہ "مبادلة المال بالمال بالتراضی" یعنی باہمی رضامندی سے مال کا مال کے بدلے میں لین دین کرنا، جن میں سے ایک مبیع (Sold Item) اور ایک ثمن (Price) کہلاتا ہے، تو جب باہمی رضامندی سے سودا طے پائے اور بائع ثمن پر اور مشتری مبیع پر قبضہ کر لے تو شرعاً بیع مکمل ہو جاتی ہے۔ بیع کی دستاویز (Sale deed) کا تیار کرنا، اس کا حکومت کے متعلقہ ادارے میں اندراج (رجسٹریشن) کرانا یہ قانونی ضروریات ہیں، شرعی ضرورت نہیں، شرعاً تو یہ بیع مکمل ہے۔ ایک فقہی اصول یہ ہے کہ اگر بیع میں کوئی شرطِ فاسد شامل کر لی جائے جس کی بیع متقاضی نہیں ہے، تو وہ شرطِ فاسد باطل ہو جاتی ہے اور بیع اپنی اصل پر قائم رہتی ہے۔ لیکن جب کسی غیر مسلم ملک میں مسلمان کوئی عقد کریں تو ملکی قانون (Law of the land) کی تعمیل قانوناً لازم ہوتی ہے اور خواستہ ونخواستہ مؤثر ہوتی ہے اور فریقین معاہدہ کے لئے یہ ایک امر معہود فی الذہن وفی الخارج (Understood) کا درجہ رکھتا ہے۔ تو جب دو مسلمان آپس میں کوئی عقد کریں تو انہیں پیشگی طور پر یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہم ملکی قانون کے مقابل قانونِ شرعی کی پاسداری کریں گے اور ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچائیں گے، کیونکہ شریعت کے مسلّمہ اصولوں

میں سے ایک یہ ہے کہ: لَاضَرَرَوَلَاضِرَارَ (یعنی نہ ضرر اٹھائیں گے اور نہ دوسرے کو ضرر پہنچائیں گے)، اور یہ اصول رسول اللہ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ سے براہِ راست مستفاد ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا:

عن عُبادَةَ بنِ الصَّامِتِ أنَّ رسول الله ﷺقضیٰ اَن "لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ" ۔

ترجمہ: ''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (دو پڑوسیوں کے تنازعے میں) فیصلہ فرمایا: (اسلام میں) نہ نقصان اٹھایا جاتا ہے اور نہ کسی کو نقصان پہنچایا جاتا ہے''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:2340)۔

عن ابی صِرْمَةَ قال: قال رسول الله ﷺ: من ضارَّ اضرَّ الله بہٖ ومن شاقَّ شقَّ الله علیه۔

ترجمہ: ''حضرت ابوصرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی کو نقصان پہنچایا، (اس کی سزا کے طور پر) اللہ تعالیٰ اسے ضرر پہنچائے گا اور جس نے کسی پر سختی کی، اللہ تعالیٰ اس پر شدت فرمائے گا''، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:2342)۔

اگر پہلے سے یہ طے نہیں ہے تب بھی اگر وہ شریعت کی پاسداری کریں تو ان کے لئے سعادت کی بات ہے، لہٰذا بائع کو چاہئے کہ "وَلَاتَشْتَرُوْابِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا" کے مصداق عارضی دنیوی نفع کی خاطر اپنے عہد اور شرعاً طے شدہ و نافذ شدہ معاہدے کو نہ توڑیں، حکومت سے مروجہ قیمت وصول کرکے مشتری کو دے دیں، اگر حکومت کی جانب سے مکان کے انہدام (Demolishing) سے قبل مشتری کے نام مکان کے مالکانہ حقوق قانونی طور پر منتقل کرنے کی گنجائش ہو تو اسے اس کے نام منتقل کردیں۔ یہ ان کے لئے سعادت کی بات ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر یہ یقین کامل رکھنا چاہئے کہ وہ دنیا میں اسے اپنے کرم سے نوازے گا اور آخرت میں بھی اجر عطا فرمائے گا۔

قرآن وسنت کی روشنی میں ''تحفظِ خواتین بل'' کی شرعی حیثیت

سوال:205

پاکستانی پارلیمنٹ نے حقوقِ نسواں بل کے نام سے ایک بل منظور کیا ہے، جو

صدر پاکستان کے دستخط کے بعد رائج الوقت قانون بن جائے گا۔علماء کرام اس قانون کو خلافِ شرع قرار دیتے ہوئے اس پر سراپا احتجاج ہیں، جبکہ حکومت کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی بات شریعت کے خلاف نہیں، جبکہ علماء کا کہنا ہے کہ یہ قانون نہ صرف قرآن وسنت کے خلاف ہے بلکہ اس سے فحاشی کو فروغ ملے گا۔
ازراہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کیا علماء کا مؤقف صحیح ہے یا ذمہ دارانِ حکومتِ پاکستان کا؟، (محمد نصیر اللہ نقشبندی، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)۔

جواب:

پاکستان کی پارلیمنٹ نے جو تحفظ خواتین بل 2006ء منظور کیا ہے، وہ اپنے مقاصد، مابعد مرتّب ہونے والے اثرات ونتائج اور متن کے اعتبار سے قرآن وسنت اور مقاصد شریعت کے منافی ہے۔ چونکہ آئین پارلیمنٹ کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ قانون سازی قرآن وسنت کے مطابق ہو، لہٰذا یہ اصولی طور پر آئین کے بھی منافی ہے اور قراردادِ مقاصد کے بھی منافی ہے، جسے آئین کا مؤثر حصہ قرار دیا جاچکا ہے۔
ہماری رائے میں جو اُمور قرآن وسنت اور مقاصدِ شریعت کے منافی ہیں، وہ یہ ہیں۔
زنا بالجبر کا حد شرعی سے اخراج:
(1) قرآن وسنت کی رو سے زنا؛ ایک سنگین جرم ہے، اس کا مفہوم ہر شخص کے ذہن میں واضح ہے، لیکن قانونی تقاضوں کی تکمیل کے لیے اس کی باقاعدہ قانونی اور شرعی تعریف کردی گئی ہے اور یہ جرم اگر شرعی معیار (یعنی چار عینی گواہ یا مجرم کا اقرار واعتراف جرم) کے مطابق ثابت ہو جائے، تو ''موجب حد'' ہے اور اس پر حد شرعی نافذ ہوگی، جو غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:
ترجمہ: ''زانیہ عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر (حقیقت میں) ایمان لاتے ہو، تو تمہیں اللہ کے دین کی خاطر ان دونوں پر (حدِ شرعی نافذ کرنے میں) کسی نرمی (ورعایت) کا برتاؤ نہیں کرنا چاہئے''، (سورۃ النور: آیت 2)۔

اور شادی شدہ کے لیے اس فعلِ خبیث کی سزا رجم (سنگسار کرنا) ہے۔رجم کی سزا سورۃ المائدہ:43 سے اشارۃ النص کے طور پر اور احادیث مبارکہ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔رجم 53 احادیث مرفوعہ،14 احادیث مرسلہ،14 آثار تابعین اور 5 فتاوائے تابعین رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، جو حدِ تواتر کو پہنچ جاتا ہے، چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک مسلمان شادی شدہ شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں پر اس نے اعترافی بیان دیا کہ اس نے زنا کیا ہے، پھر اس نے چار بار اپنے اوپر اقرار جرم کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اسے رَجم (سنگسار) کردیا جائے''، (صحیح بخاری، کتاب الحدود جلد:4 ص:253 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

ہم اختصار کے پیشِ نظر تمام احادیث مبارکہ درج نہیں کررہے۔

موجب حد ہونے کے اعتبار سے زنا کی تقسیم خلاف شرع ہے:

اور اس حد کے بارے میں قرآن وسنت میں زنا بالرضا اور زنا بالجبر (RAPE) کی کوئی تقسیم نہیں ہے، بلکہ فرق صرف یہ ہوگا کہ زنا بالرضا میں فریقین پر حد جاری ہوگی، اور زنا بالجبر کی صورت میں، وہ فریق جس کا مجبور کردیا جانا پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے، اُسے باعزت بری کردیا جائے گا۔لہٰذا جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ، مَزنیہ بالجبر (RAPED VICTIM) کو بھی حدود آرڈیننس کے تحت زنا کا مجرم گردانا جاتا تھا، یہ صریح بہتان اور کذب وافتراء ہے، حدود آرڈیننس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے البتہ جبر کو عدالت میں ثابت کرنا ہوگا۔خود رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب زنا بالجبر کا مقدمہ پیش ہوا، تو آپ نے ''مَزنیہ بالجبر''(RAPED VICTIM) کو باعزت بری کردیا، ہم اختصار کی بنا پر حدیث درج نہیں کررہے۔

زنا بالجبر کی تعزیری سزا کی تخفیف کرکے اس میں صوبائی حکومت کو معافی کا اختیار بھی دیدیا گیا ہے:

جبکہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ ''تحفظِ خواتین بل'' میں زنا بالجبر کو حد سے نکال کر تعزیراتِ پاکستان کے تحت محض ایک تعزیری جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ امر پارلیمنٹ میں پیش کردہ بل میں ایکٹ نمبر 45، بابت 1860ء میں نئی دفعہ کی شمولیت کے تحت دفعہ نمبر 376، بعنوان ''زنا بالجبر کے لئے سزا'' میں موجود ہے، جو یہ ہے:

''جو کوئی زنا بالجبر کا ارتکاب کرتا ہے، اسے سزائے موت یا کسی ایک قسم کی سزائے قید، جو کم سے کم پانچ سال یا زیادہ سے زیادہ پچیس سال تک ہوسکتی ہے اور جرمانے کی سزا کا بھی مستوجب ہوگا''، (بحوالہ: روزنامہ جنگ، جمعرات 16 نومبر 2006ء)۔

مذکورہ بالا سزا، قرآن وسنت کے صریح منافی ہے، کیونکہ اس میں زنا بالجبر کی سزا، سزائے موت یا پانچ سے پچیس سال کی قید بمع جرمانہ رکھی گئی ہے، جبکہ قرآن وسنت میں ''زنا بالجبر'' اگر شرعی معیار کے مطابق ثابت ہوجائے، تو اس کی سزا شادی شدہ کے لئے متعین طور پر رجم ہے، اور غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے ہیں، (ملاحظہ ہو، سورۃ النور: 2)۔ اس سلسلے میں قرآن وسنت کے حوالے سے ہم اپنے موقف کو شروع میں ثابت کرچکے ہیں۔ زنا بالجبر کو مطلقاً حد سے نکال دینا، قرآن وسنت کا صریح انکار ہے۔

جو لوگ یہ پروپیگنڈہ کررہے تھے کہ زنا بالجبر شدید ترین جرم ہے، لہٰذا اس کی سزا بھی شدید ترین اور عبرتناک ہونی چاہیے۔ انہوں نے اس موجودہ پاس کردہ بل میں یہ سزا، سزائے موت یا پانچ تا پچیس سال قید بمع جرمانہ رکھ کر اسے جج کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے، یعنی اگر جج چاہے تو زنا بالجبر کے سنگین جرم کے مرتکب شخص کو صرف پانچ سال قید اور جرمانہ کی سزا دے کر بری کردے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود سے کھلی بغاوت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: ''اور جو اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھے (یعنی مخالفت کرے) تو وہی لوگ ظالم ہیں''، (سورۃ البقرۃ: آیت نمبر 229)۔

جب قانون میں زنا بالجبر کی سزا میں لچک رکھ دی گئی ہے، اور اسے جج کی صوابدید پر چھوڑ دیا

گیا ہے، تو دراصل یہ بااثر لوگوں کے لئے ایک رعایت کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ صوبائی حکومتوں کو اس کی معافی کا بھی اختیار دیدیا گیا ہے اور ظاہر ہے ایسے اختیارات صرف اور صرف بااثر لوگوں کے حق میں استعمال ہوتے ہیں، سزا صرف غریبوں کے لئے رہ جاتی ہے۔

پارلیمنٹ کے منظور کردہ اس بل میں زنا بالجبر کے سنگین جرم کے مرتکب شخص سے جرمانہ وصول کرنے کا ذکر بھی سطورِ بالا میں درج ہے، جو کہ قرآن وسنت کی صریح مخالفت ہے، چنانچہ حضرتِ ابوہریرہ اور حضرتِ خالد الجہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں:

''ایک شخص نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ ہمارے مابین کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ فرمائیں، اس کا فریق مخالف کھڑا ہوا اور یہ شخص، پہلے شخص سے زیادہ سمجھ دار تھا، کہنے لگا کہ اس نے سچ کہا، ہمارے مابین کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ فرمائیں اور مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت عطا فرمائیں، حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہو''، تو فریقِ ثانی نے کہا کہ میرا بیٹا اس کے اہل خانہ میں مزدوری کرتا تھا اور اُس نے اسکی بیوی سے زنا کرلیا، تو میں نے اس کے فدیہ کے طور پر ان کو سو بکریاں اور ایک غلام دیا، پھر میں نے اہلِ علم سے پوچھا، تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے پر سو کوڑوں کی سزا اور ایک سال کے لئے جلاوطنی ہے، اور اس کی بیوی پر سنگسار کرنے کی سزا ہے۔ پس حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے قسم ہے اس ذاتِ اقدس کی کہ جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں ضرور تمہارے درمیان کتاب اللہ کی روشنی ہی میں فیصلہ کروں گا، سو) بکریاں اور غلام تجھے واپس کردیئے جائیں گے اور تیرے بیٹے پر سو کوڑوں کی سزا اور جلاوطنی لازم ہے، (پھر آپ نے ایک قریب بیٹھے صحابی سے فرمایا) اے اُنَیس! صبح کو اس عورت کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو، اگر وہ اعتراف جرم کرے تو اسے رجم کردو، (راوی کہتا ہے کہ) اس عورت نے اعتراف جرم کرلیا، اور اسے رجم کردیا گیا''، (صحیح بخاری شریف، کتاب الحدود، جلد نمبر 4، صفحہ نمبر 264 رقم الحدیث: 6859، 6860،

مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)۔

اس حدیث مبارک سے ثابت ہوا کہ زنا ''موجب حد'' میں جسمانی سزا ہے، مالی جرمانہ نہیں۔

(2) قرآن وسنت کی روشنی میں حدِ زنا کے قیام کے لئے چار عینی گواہوں یا اقرار واعتراف کا پایا جانا ضروری ہے، جبکہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ خواتین بل میں زنا بالجبر کی سزا میں عینی گواہی کو قطعاً نظر انداز کردیا گیا ہے، اس امر کو پارلیمنٹ کے منظور کردہ بل کی دفعہ 376 کے متعلق ٹیبل نمبر 4 میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، یہ قرآن وسنت اور اسلام سے کھلی بغاوت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: ''اور جس نے غیر اسلامی قانون چاہا، تو (وہ) اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، (سورۂ آلِ عمران، آیت نمبر 85)''۔

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(1) ترجمہ: ''اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے موافق فیصلہ نہ کریں سو وہی لوگ کافر ہیں''، (سورۃ المائدہ:44)''۔

(2) ترجمہ: ''اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے موافق فیصلہ نہ کریں سو وہی لوگ ظالم ہیں، (سورۃ المائدہ:45)''۔

(3) ترجمہ: ''اور جو لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کریں سو وہی لوگ فاسق ہیں، (سورۃ المائدہ:47)''۔

ان آیات کریمہ کے مخاطب حکمران ہیں، کیوں کہ احکام الٰہی کو نافذ کرنا، فرد کی نہیں، اہل اقتدار کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ان آیاتِ مبارکہ میں اُن حکمرانوں کو جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں، بالترتیب کافر، ظالم اور فاسق قرار دیا گیا ہے۔ یعنی جو حکمران تساہل کی وجہ سے اللہ کے احکام کو نافذ نہ کریں، وہ فاسق ہیں اور جو تمرُّد اور سرکشی کے سبب اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ نہ کریں، وہ ظالم ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام کا سرے سے انکار کردیں، وہ کافر ہیں۔

رجم کی حد کو ختم کر دیا گیا ہے:

(3) پارلیمنٹ کے منظور کردہ تحفظِ خواتین بل کی ترمیم نمبر 14 میں آرڈیننس نمبر 7 مجریہ 1979ء کی دفعہ 6 اور 7 کو حذف کیا گیا ہے، چنانچہ منظور کردہ بل کی ترمیم نمبر 14 میں واضح طور پر موجود ہے کہ "زنا کا جرم (نفاذِ حدود) آرڈیننس 1979ء آرڈیننس نمبر 7، مجریہ 1979ء کی دفعات 6 اور 7 کو حذف کر دیا جائیگا۔ (بحوالہ: روزنامہ جنگ، ہفتہ 18 نومبر 2006ء)

اس ترمیم کے مطابق آرڈیننس نمبر 7، 1979ء کی دفعہ 6 کو کُلّی طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے، حالانکہ حدود آرڈیننس 1979ء کی دفعہ 6 میں زنا بالجبر کے لئے درج ذیل سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔

(الف) اگر مرد یا عورت محصن (یعنی شادی شدہ) ہے تو اس کو کسی جائے عام پر رجم (سنگسار) کر کے ہلاک کر دیا جائے گا۔

(ب) اگر مرد یا عورت محصن نہیں ہے (یعنی غیر شادی شدہ ہے) تو جائے عام پر کوڑوں کی سزا، جس کی تعداد سو 100 کوڑے ہوگی، دی جائے گی۔ اور کوئی دیگر سزا، جس میں سزائے موت بھی شامل ہے، دی جائے گی، جو کہ عدالت، حالاتِ مقدمہ کے مدِ نظر مناسب سمجھے، (نیو اسلامک لاز 1979، ص:61، منصور بک ہاؤس، لاہور)۔

حدود آرڈیننس کی دفعہ 6 میں موجود ان سزاؤں (یعنی الف اور ب) کو پڑھنے کے بعد ایک باشعور انسان اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اس دفعہ کو کلی طور پر منسوخ کرنے کا مقصد اس دفعہ میں موجود حدودِ الٰہی کو ختم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

(4) پارلیمنٹ کے منظور کردہ تحفظِ خواتین بل میں زنا بالرضا "موجب حد" کو قابلِ دست اندازیِ پولیس جرم سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس امر کو پارلیمنٹ کے منظور کردہ بل کے ٹیبل نمبر 8 میں دیکھا جا سکتا ہے۔ زنا بالرضا کو قابلِ دست اندازیِ پولیس جرم سے خارج کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ملزم کو پکڑ کر عدالت میں لانا، گواہوں کو پکڑ کر عدالت میں پیش کرنا اور موقع پر

موجود قرائن وشواہد کو جمع کرنے کی ذمہ داری سے حکومت دست بردار ہوگئی ہے اور مستغیث پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ وہ مقدمات جو براہِ راست جج کی عدالت میں دائر ہوتے ہیں، ہفتوں اور مہینوں ان کی سماعت کی نوبت نہیں آتی اور اس دوران میں قرائن وواقعات کی شہادت (CIRCUMTANCIAL EVIDENCE) تلف ہوجائے گی اور کسی بھی درجے میں ثبوتِ جرم کے لئے کچھ نہیں بچے گا۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ زنا بالرضاء میں پولیس کی کارکردگی کو ناقابل اعتبار گردانتے ہوئے مذکورہ بل میں اس جرم کو ناقابل دست اندازیٔ پولیس جرائم NON-COGNIZABLE CRIMES میں شامل کیا گیا ہے، جب کہ اسی بل کے تحت زنا بالجبر کو قابل دست اندازیٔ پولیس جرائم COGNIZABLE CRIMES میں داخل کیا گیا ہے، یہ امر انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ زنا بالرضاء جیسے جرم میں جس پولیس کو ناقابل اعتبار گردانہ گیا ہے، زنا بالجبر کی صورت میں اسی پولیس پر مکمل اعتماد کیا گیا ہے۔

جج کو حد میں تخفیف کا صوابدیدی اختیار دے کر حد کی روح کو ختم کردیا گیا ہے:

(5) پارلیمنٹ کے منظور کردہ بل میں زنا بالرضا کی سزا، محصن (یعنی شادی شدہ) ہونے کی صورت میں موت تک سنگسار کرنا اور اگر محصن نہ ہو، تو ایک سو کوڑوں تک کی سزا رکھی گئی ہے۔ اس امر کو قومی اسمبلی میں منظور کردہ بل کے ٹیبل نمبر 8 میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن وسنت کی رو سے غیر شادی شدہ زانی کے لئے متعین سزا، سو کوڑے ہے، جبکہ بل میں موجود غیر شادی شدہ کی سزا، سو کوڑے نہیں، بلکہ سو کوڑے تک بیان کی گئی ہے، جس سے یہ بات واضح ہے کہ جج سو کوڑوں سے کم کی سزا بھی دے سکتا ہے، مثلاً: پچاس کوڑے مار کر باعزت بری کردیا جائے، یہ قرآنی حکم میں صریح تحریف ہے۔

(6) پارلیمنٹ کے منظور کردہ تحفظِ خواتین بل میں آرڈیننس نمبر 7 مجریہ 1979ء کی دفعہ 3 کو حذف کیا گیا ہے، اس امر کو قومی اسمبلی کے منظور کردہ بل کی ترمیم نمبر 12 میں دیکھا جاسکتا ہے، جو یہ ہے: ''زنا کے جرم (نفاذِ حدود) آرڈیننس 1979ء (آرڈیننس نمبر

7 مجریہ 1979ء) کی دفعہ 3 کوحذف کردیا جائیگا''،(روزنامہ جنگ،18 نومبر،2006ء)۔
قوانین حدود کی تعبیر وتشریح میں قرآن وسنت کی بالادستی کی دفعہ کوختم کر کے اسے عام تعزیری جرائم کا درجہ دے دیا گیا ہے:
مذکورہ آرڈیننس کی دفعہ 3، کہ جس کوکلی طور پرحذف کیا گیا ہے وہ یہ ہے؛ '' آرڈیننس دیگر قوانین پر غالب ہوگا، یعنی آرڈیننس ہٰذا کے احکام کسی دیگر نافذ الوقت میں درج کسی امر کے باوصف مؤثر ہوں گے،(نیو اسلامک لاز،1979ء،ص:55،منصور بک ہاؤس،لاہور)۔
یہ دفعہ 3، کہ جس کوحذف کردیا گیا ہے، اس کے سبب حدود آرڈیننس کو ان جرائم سے متعلق دوسرے کسی بھی قانون پر بالادستی (OVER RIDING EFFECT) دی گئی تھی، اس کوختم کردیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں حدودِ الٰہی کی قانونی حیثیت (LEGAL STATUS) عام تعزیری قوانین کے برابر ہوجائیگی۔علماء کمیٹی نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ مجوزہ بل میں مندرجہ ذیل دفعہ شامل کردی جائے:
''اس قانون کی تعبیر وتشریح سے متعلق کسی بھی دوسرے قانون کے مقابلے میں قرآن وسنت کو بالادستی حاصل ہوگی''، اسے شامل نہیں کیا گیا۔
''جائز نکاح'' کی شرط ختم کر کے فحاشی اور قانون کے غلط استعمال کا راستہ کھول دیا گیا ہے:
(7) پارلیمنٹ کے منظور کردہ تحفظِ خواتین بل میں آرڈیننس نمبر 7 مجریہ 1979ء کی دفعہ 4 میں لفظِ ''جائز'' کوحذف کیا گیا ہے، اس امر کو پارلیمنٹ کے منظور کردہ بل کی ترمیم نمبر 13 میں دیکھا جاسکتا ہے، جو یہ ہے؛'' زنا کا جرم (نفاذِ حدود) آرڈیننس 1979ء(آرڈیننس نمبر 7 مجریہ 1979ء) میں دفعہ 4 میں لفظِ ''جائز طور پر'' اور مذکورہ دفعہ کے آخر میں تشریح کوحذف کردیا جائیگا، (روزنامہ جنگ، بروز ہفتہ،18 نومبر 2006ء)۔
حدود آرڈیننس کی مذکورہ دفعہ 4، جس سے لفظِ ''جائز'' کوختم کیا گیا ہے، وہ یہ ہے؛ ''ایک مرد اور ایک عورت زنا کے مرتکب کہلائیں گے۔اگر وہ باہمی جائز شادی کے بغیر بالارادہ مباشرت کریں، (نیو اسلامک لاز 1979ء، ص:55،منصور بک ہاؤس،لاہور)۔

مذکورہ بالا دفعہ میں لفظِ شادی کے ساتھ لفظِ جائز ہے اور اس مقام پر جائز شادی سے مراد وہ نکاح ہے جو شرعی تقاضوں کے مطابق ہو۔ جب اس سے لفظِ جائز کو ختم کردیا جائے گا، تو مطلق دعوائے نکاح ہی سزا سے بچنے کے لئے کافی ہوگا، چاہے وہ دعوائے نکاح شریعت کے معیار کے مطابق جائز ثابت نہ ہو، زبانی دعویٰ یا جعلی کاغذی کارروائی کی بنا پر بھی مجرم چھوٹ جائے گا۔

عاقلہ بالغہ کو ثبوت یا اقرار جرم کے باوجود حد و تعزیر سے نکال دیا گیا ہے:

(8) پارلیمنٹ کے منظور کردہ خواتین بل میں موجود ایکٹ 45، بابت 1860ء میں نئی دفعہ کی شمولیت کے تحت دفعہ 375، بعنوان زنا بالجبر کی شق پنجم میں یہ درج ہے کہ ''اس کی رضامندی سے یا اس کے بغیر، جبکہ وہ سولہ 16 سال سے کم عمر کی ہو، (بحوالہ: روزنامہ جنگ، بروز جمعرات، 16 نومبر، 2006ء)۔

مذکورہ دفعہ کے تحت سولہ 16 برس سے کم عمر (مثلاً: پندرہ 15 سال، 11 ماہ، 29 دن) کی عاقلہ بالغہ خاتون کے ساتھ اس کی رضامندی سے زنا کیا گیا ہو، تو مرد تو زنا بالجبر (RAPE) کا مرتکب قرار دے کر سزا دی جائے گی اور اپنی مرضی سے زنا کرنے والی عاقلہ بالغہ عورت کو ارتکاب و ثبوتِ جرم کے باوجود باعزت بری کردیا جائے گا اور وہ سزا سے مکمل طور پر محفوظ رہے گی، یہ قرآن و سنت اور شریعت کی صریح خلاف ورزی ہے اور اس سے فحاشی کو فروغ ملے گا، یہ وہی قانونی پوزیشن ہے جو اس وقت امریکہ اور یورپ میں ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فرماتا ہے کہ:

ترجمہ: ''اور جو اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی (قائم کردہ) حدود سے تجاوز کرے، تو اللہ تعالیٰ اسے (جہنم کی) آگ میں داخل کرے گا، جس میں (وہ) ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت کا عذاب ہے''، (سورۃ النساء آیت نمبر 14)۔

(9) حدود آرڈیننس کے تحت اگر کسی شخص کے خلاف زنا ''موجب حد'' کا الزام ہو اور مقدمے میں حد کی شرائط پوری نہ ہوں، لیکن فی الجملہ جرم ثابت ہو جائے تو اسے دفعہ 10

(3) کے تحت تعزیری سزا دی جاسکتی تھی، لیکن منظور کردہ بل کی رو سے ضابطہ فوجداری میں دفعہ 203 سی کا جو اضافہ کیا گیا ہے، اس کی شق نمبر 6 میں یہ لکھ دیا گیا ہے، کہ جو زنا ''موجب حد'' کے الزام سے بری ہو گیا ہو، اس کے خلاف فحاشی کا کوئی مقدمہ درج نہیں کرایا جاسکتا۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ کسی شخص کے خلاف عورت نے زنا بالجبر کا الزام عائد کیا ہو اور جبر کے ثبوت میں کوئی شک رہ جائے تو ملزم بری ہو جائے گا اور اس کے خلاف کسی فحاشی کی دفعہ کے تحت بھی کوئی کاروائی نہیں کی جاسکے گی۔

''اب یہاں یہ بات تو ثابت ہے کہ جرم ہوا ہے، اور مستغیثہ نے پولیس کے پاس زنا بالجبر (RAPE) کے مقدمے کا اندارج کرایا ہے، لیکن جبر ثابت نہیں ہو سکا، اس کی وجوہ دو ہو سکتی ہیں:

(1) مجرم بااثر تھا اور اس نے موقع اور قرائن کی شہادتوں کو اپنی طاقت واثر سے تلف کر دیا، ضائع کرا دیا، پولیس نے بااثر شخص کے خوف سے حقائق کو تلف کر دیا یا چھپا دیا یا مجرم اتنا جابر اور طاقت ور ہے کہ اس کے خوف سے کوئی گواہ عدالت میں گواہی دینے کی ہمت ہی نہیں کرسکتا، لہٰذا مندرجہ بالا شق کی رو سے وہ زنا بالجبر کے الزام سے تو باعزت بری ہو جائے گا اور پھر اس کے خلاف فحاشی کا مقدمہ بھی درج نہیں ہو سکے گا تاکہ اسے قطعاً کوئی سزا نہ مل سکے، ہماری پارلیمنٹ کے فاضل ممبران کی اس دانش مندی سے عورت کو'' مثالی تحفظ'' ملے گا، کسی نے سچ کہا ہے ع جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

(2) ابتداء جرم تو باہمی رضامندی سے ہوا تھا، لیکن عزت بچانے کے لئے RAPE کا دعویٰ کر دیا، اب چونکہ عورت کو ہر قسم کی سزا سے بچانا مقصود ہے، لہٰذا اس کی خاطر مرد کو بھی باعزت بری کر دیا گیا اور فحاشی (LEWDNESS) کے الزام میں جو کم تر سزا مجرمین کو مل سکتی تھی، اس قانون نے اس کے امکانات کو ختم کر دیا۔ اب اس سے فحاشی کو فروغ ملے گا۔

حدود آرڈیننس پر عمومی اعتراض اور اس کا جواب:

حدود آرڈیننس (1997ء) پر عام طور پر جو سب سے بڑا اعتراض ناقدین کی طرف سے کیا

جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آرڈیننس میں عورتوں پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ جب وہ زنا بالجبر کا استغاثہ لے کر تھانے جاتی ہے اور چار عینی شرعی گواہ پیش کرنے میں ناکام رہتی ہے، جس کا پیش کرنا اکثر تقریباً محال ہے، تو پولیس بجائے اس کی دادرسی کرنے کے اسے حدقذف کے تحت گرفتار کر کے قید میں ڈال دیتی ہے۔ جس کے باعث نہ صرف وہ حق اور انصاف سے محروم رہ جاتی ہے بلکہ پولیس اور قانون کے مزید ظلم کا شکار ہو جاتی ہے، اور اس کا اتنا پروپیگنڈا کیا گیا ہے کہ ہر ایک جو حدود آرڈیننس کی اصل دفعات سے واقف نہیں ہے وہ اسے سچ سمجھنے لگا ہے اور اس امر کو عورتوں پر صریح ظلم قرار دیتا ہے۔

اگر حقیقت حال معلوم نہ ہو تو بظاہر یہ اعتراض بہت معقول نظر آتا ہے جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، شریعت کورٹ کی تاریخ میں کوئی بھی ایک کیس ایسا موجود نہیں ہے جس میں مَزنیہ بالجبر (Rape Victim) کو صرف اس وجہ سے کوئی سزا دی گئی ہو، کہ وہ زنا بالجبر کے چار عینی گواہ پیش کرنے میں ناکام رہی ہے، اصل میں حدود آرڈیننس کے تحت ایسی کوئی سزا ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ حدود آرڈیننس میں چار عینی گواہوں کی ضرورت شرعی حد کے نفاذ کے لئے پڑتی ہے، جبکہ حدود آرڈیننس کی دفعہ 10(3) کے تحت چار عینی گواہ پیش نہ کرنے کی صورت میں ملزم کو تعزیری سزا دی جاسکتی ہے، اگر جرم کا ہونا ثابت ہو چا ہے ایک گواہی سے یا میڈیکل اور طبی رپورٹوں کی روشنی میں، یہی وجہ ہے کہ شریعت کورٹ میں اکثر زنا بالجبر کے ملزمان کو اسی دفعہ کے تحت تعزیراً سزائیں دی گئیں ہیں۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اس معاملے میں عورت کو زنا موجب حد کے تحت نہیں بلکہ حدقذف کے تحت سزائیں دی گئیں ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حدود آرڈیننس میں حدقذف کی دفعہ 3 کی استثناء 2 میں یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ اگر کوئی عورت زنا بالجبر کے استغاثہ کے ساتھ کسی قانونی ادارے سے رجوع کرتی ہے، اسے ہرگز سزا نہیں دی جاسکتی اگر وہ چار عینی گواہ پیش کرنے میں ناکام رہتی ہے، اب یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جانی چاہئے کہ حدود آرڈیننس میں عورتوں پر اس طرح کے ظلم کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے، اگر کسی عورت پر

اس طرح کا ظلم ہوا ہے تو یہ صرف اور صرف ہماری پولیس اور قانونی اداروں کے نظام میں موجود خرابیوں کے باعث ہے، اس کی اصلاح کرنا ہماری حکومت کی ذمہ داری ہے، نہ کہ علمائے کرام کی۔

''لعان'' میں عورت کو معلق چھوڑ دیا گیا ہے:

(10) قذف آرڈیننس کی دفعہ 14 میں قرآن کریم کے بیان کئے ہوئے لعان، یعنی اگر کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور چار گواہ پیش نہ کر سکے تو عورت کے مطالبے پر اسے لعان کی کاروائی میں قسمیں کھانی ہوں گی اور میاں بیوی کی قسموں کے بعد ان کے درمیان نکاح فسخ کر دیا جائیگا۔ قذف آرڈیننس میں کہا گیا ہے کہ اگر شوہر لعان کی کاروائی سے انکار کرے تو اسے اس وقت تک حراست میں رکھا جائے گا، جب تک وہ لعان پر آمادہ نہ ہو، منظور کردہ بل میں یہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر شوہر لعان پر آمادہ نہ ہو تو عورت بے بسی سے لٹکی رہے گی۔ نہ ہی اپنی بے گناہی لعان کے ذریعے ثابت کر سکے گی، اور نہ نکاح فسخ کرا سکے گی۔

یہ دفعہ اس لئے شامل کی گئی کہ سیکولر فلسفۂ قانون میں کسی شخص کو کسی جرم کے اقرار یا انکار پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، وہ عدالت کو کسی سوال کے جواب میں نہ ''ہاں'' اور نہ ہی ''نہ''، بلکہ کہہ دے کہ NO COMMENTS، تو عدالت اسے کچھ نہیں کہے گی، اس سیکولر فلسفۂ قانون کو اسلام کے قانونِ لعان پر بالادستی (OVER RIDING EFFECT) عطا کر دی گئی ہے۔

اعتراف زنا کے باوجود حد زنا کو ساقط کر دیا گیا ہے:

نیز قذف آرڈیننس کی دفعہ 14 کی ذیلی دفعہ چار میں کہا گیا تھا کہ ''وہ بیوی جو شوہر کے الزام کو سچا تسلیم کر چکی ہو، نفاذ حدود کے جرم زنا آرڈیننس 1979ء کے تحت جرم زنا مستوجب حد کی سزا دی جائے گی، (نیو اسلامک لاز، 1979ء، ص: 161 مطبوعہ منصور بک ہاؤس، لاہور)''۔

جب کہ موجودہ تحفظ خواتین بل میں اس دفعہ کو حذف کر دیا گیا ہے، اس کا اثر یہ مرتب ہوگا

کہ جو عورت زنا کا اعتراف کرلے اس پر حد زنا جاری نہیں ہوگی اور یہ قرآن وسنت کی صریح مخالفت ہے۔

تحفظِ خواتین بل کے اثرات ونتائج

1۔اگر یہ بل تمام مراحل طے کرکے خدانخواستہ قانون کا درجہ حاصل کرلیتا ہے،تو اسے ''قانونِ تحفظِ خواتین'' کے بجائے ''قانون برائے فروغِ فحاشی'' کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

2۔عملاً پاکستان قرآن وسنت کے صریح احکام اور پاکیزہ سماجی اقدار کے ماحول سے نکل کر مغرب کے بے غیرتی اور بے حمیتی اور فروغِ فحاشی کے ماحول میں چلا جائے گا۔

3۔جب قانون،زنا اور فحاشی کو روکنے میں ناکام رہے گا،بلکہ قانون کا علامتی خوف بھی اُٹھ جائے گا،تو پاکستان میں ''کاروکاری''،''غیرت کے نام پر قتل'' اور ماوراءِ عدالت انتقامی کاروائیوں کو فروغ ملے گا،کیونکہ پاکستانی معاشرہ بالعموم اور مسلمان بالخصوص اس بے غیرتی کو ہضم نہیں کرپائیں گے۔

4۔غیر شادی شدہ جوڑے،مغرب کی طرح اکٹھے رہنا چاہیں یا ہوٹل میں کمرہ بک کرکے سیاہ کاری کرنا چاہیں،تو انہیں قانون کا کوئی ڈر نہیں رہے گا۔

5۔صدر امریکا جارج واکر بش اور وزیر اعظم برطانیہ ٹونی بلیئر نے برملا اس قانون کی تحسین کی ہے،اسے روشن خیالی،آزادروی اور جدت پسندی کا مظہر قرار دیا ہے۔

ہم آپ سے گذارش کرتے ہیں کہ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ جس قانون کی تعریف و تحسین یہود ونصاریٰ کریں،امت مسلمہ پر ہر سو آگ برسانے والے بش اور ٹونی بلیئر کریں،کیا وہ قرآن وسنت کے مطابق ہوسکتا ہے؟،ان کی تحسین اس امر کی دلیل ہے کہ یہ مقاصد کفر کو پورا کررہا ہے،اور اس کے برعکس دین کا درد رکھنے والے تمام مسلمان اور علماء غمزدہ ہیں،رنجیدہ ہیں اور اس کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔

ہماری رائے میں پارلیمٹ کے منظور کردہ بل کو''تحفظ خواتین بل'' کا نام دینا،صریح مذاق ہے،اس میں خواتین کو غیر محفوظ تو کردیا گیا ہے،ان کو تحفظ عطا نہیں کیا گیا،یہ ایسا ہی ہے

جیسے آپ کسی کالے حبشی کا نام ''شمس الزمان'' یا ''نورالزمان'' رکھ دیں۔

ایک ٹیکنیکل اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ 1973ء کا دستور اسلامی ہے، اس پر علماء نے دستخط کئے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کیا، جب کہ حدود آرڈیننس 1979ء میں آیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ 1973ء کے آئین میں دو واضح تحدیدات (BINDINGS) تھیں:

(1) یہ کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔

(2) یہ کہ تمام موجودہ قوانین کو دس سال کے اندر اسلام کے مطابق ڈھال لیا جائے گا۔

تو اگر 1973ء کے آئین پر لفظاً اور معنیً عمل کیا گیا ہوتا، تو بھی 1983ء سے پہلے پہلے قوانین حدود اور قوانین قصاص کا نافذ کرنا لازمی، قانونی تقاضہ تھا۔

علماء کی تجاویز

تحفظ خواتین بل کے لئے ہم نے حکومت کو جو تجاویز پیش کی تھیں، وہ یہ ہیں: یہ کہ

1۔ خواتین کو وراثت سے محروم کرنے کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے، جاگیردار معاشرے میں اگر کسی خاتون کے لئے خاندان کے اندر متوازی رشتہ موجود نہ ہو تو اس کی ''قرآن سے شادی'' کردی جاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے اسے غیر شادی شدہ رہنے پر مجبور کردیا جاتا ہے، تاکہ اس کے ذریعے وراثت خاندان سے باہر نہ جائے۔

2۔ یہ کہ عاقلہ بالغہ عورت کی، اس کی مرضی کے خلاف جبراً شادی کرانے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے۔

3۔ یہ کہ زمانۂ جاہلیت کی طرح ''نکاحِ شغار''، جسے آج کل ''وٹہ سٹہ'' کہا جاتا ہے، اگر اس میں کسی بھی جانب سے عورت کی رضامندی نہ ہو یا ان کا مہر مقرر نہ کیا جائے بلکہ ایک شخص اپنی بہن کا نکاح اپنی بیوی کے بدل مہر میں کردے، اسے تعزیری جرم قرار دیا جائے۔

4۔ یہ کہ ایک وقت میں تین طلاق (طلاق مغلظہ) دینے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے تاکہ اس کی حوصلہ شکنی ہو، اور اس سلسلے میں شوہر کے ساتھ وثیقہ نویس، اوتھ کمشنر، نوٹری پبلک اور گواہوں کو بھی شریک جرم سمجھا جائے۔

5۔ یہ کہ ونی کی رسم کو تعزیری جرم قرار دیا جائے، جس میں قصاص کے مالی بدل کے طور پر قاتل کے خاندان کی چھوٹی بچیوں کا نکاح مقتول کے خاندان کے مردوں سے کردیا جاتا ہے اور بعض اوقات عمروں میں بے انتہا تفاوت ہوتا ہے، اس سے اسلام اور پاکستان کی بدنامی ہوتی ہے۔

6۔ کاروکاری، غیرت کے نام پر قتل اور ماورائے عدالت قتل ودیگر جرائم کا خاتمہ مقصود ہے، تو قانون میں متاثرینِ جرائم اور مظلومین کو تحفظ دیا جائے، عدل کو یقینی بنایا جائے اور قانون کی حکمرانی قائم کی جائے، ورنہ محض وعظ وتذکیر یا اسمبلیوں میں تقاریر سے ان جرائم کو روکا نہیں جاسکے گا اور موجودہ قانون نے ان جرائم کے امکانات میں اضافہ کردیا ہے۔

نوٹ: پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کے بارے میں ہماری یہ رائے خالص دینی اصولوں پر مبنی ہے، اس سے سیاست کا کوئی تعلق نہیں ہے، نہ ہی ہماری کسی جماعت سے سیاسی وابستگی ہے اور نہ ہی حال یا مستقبل میں کوئی سیاسی مقاصد ہیں۔ کوئی دلائل کی بنیاد پر ہماری کسی رائے سے اختلاف کرے تو یہ اس کا حق ہے، لیکن جس طرح ہر شعبۂ زندگی میں اس شعبے کے ماہرین رائے دینے کا حق رکھتے ہیں اور انہی کی رائے کو قابلِ توجہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح دین کو اتنا مظلوم نہ بنادیا جائے کہ قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے ماہرانہ علم کے بغیر ہر شخص اسلام پر اتھارٹی بننے کا دعویٰ کرے اور اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھے۔

نوٹ: اس فتوے کے منظرِ عام پر آنے کے بعد مؤرخہ 26 نومبر 2006ء کو پریس کلب، کراچی میں الیکٹرانک وپرنٹ میڈیا کی موجودگی میں 400 اکابر علمائے اہلسنت نے اس فتوے پر دستخط کیے اور اس کی مکمل تائید کا اعلان کیا۔ اس فتوے کو جو بھی شائع کرے (اصل یا اس کا انگریزی ترجمہ)، اس کی اخلاقی وشرعی ذمہ داری ہے کہ اس کا مکمل متن شائع کرے، کیونکہ نامکمل عبارت سے غلط مطلب بھی اخذ کیا جاسکتا ہے، اور اسے پروپیگنڈے یا دیگر مذموم مقاصد کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے، جبکہ ہم نے یہ کام اپنی دینی ذمہ داری سمجھ کر انجام دیا ہے۔

قتلِ ناحق

قتلِ ناحق کا شرعی حکم

سوال:206

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پاکستان میں متعدد مقامات (مساجد، امام بارگاہیں اور پبلک مقامات وغیرہ) پر اندھادھند فائرنگ کرکے یا بم بلاسٹ کرکے اجتماعی قتل کے واقعات ہوتے رہے ہیں، اسی طرح بعض اشخاص پر خصوصی ہدف بناکر حملے کیے جاتے رہے ہیں، جنہیں عرفِ عام میں (Target killing) کہا جاتا ہے، بعض علمی، سماجی، ملی اور قومی شخصیات بھی اس کا ہدف بنتی رہی ہیں۔ اب ایک عرصے سے فکری ونظریاتی طور پر سیکولر، لبرل اور اسلام کو ناپسند کرنے والے افراد اس کا سارا ملبہ اسلام پر ڈال رہے ہیں اور ان کی رائے میں یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہورہا ہے۔ اور اسلام کے نام پر جذباتی نوجوانوں کو ایسی کارروائیوں پر آمادہ کیا جاتا ہے اور ان کے ذہنوں میں یہ راسخ کردیا جاتا ہے کہ گویا یہ ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے، تو جب تک اس مسئلے کے بارے میں اسلام کے شرعی احکام کو واضح نہیں کیا جائے گا، موجودہ دور میں اس کا ذمہ دار اسلام اور علماءِ اسلام ہی کو گردانا جاتا رہے گا، لہٰذا ازراہِ کرم ایسی کارروائیوں کا شرعی حکم بیان فرمائیں تاکہ عام مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلامی تعلیمات کا حقیقی تصور واضح ہو،

(مولانا محمد نصیر اللہ نقشبندی، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)

جواب:

تمام مسلمان محفوظ الدم ہیں، فقہی اصطلاح میں اسے ''محفوظ الدم'' اور ''مصون الدم'' بھی کہتے ہیں، یعنی بغیر کسی وجہ شرعی کے ان کا خون بہانا حرام ہے اور وہ شرعی وجوہ، جن کے سبب کسی مسلمان کا خون مباح ہوجاتا ہے، یہ ہیں:

(الف) یہ کہ کوئی مسلمان العیاذ باللہ مرتد ہوجائے۔

(ب) کسی کو ناحق قتل کرے۔

(ج) شادی شدہ زانی ہو۔

ان وجوہات کے سوا مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے۔اور جو مسلمان ان وجوہ میں سے کسی ایک کا ارتکاب کرلے، تو وہ پھر ''محفوظ الدم'' نہیں رہتا، بلکہ ''مباح الدم'' ہوجاتا ہے، یعنی اس کی جان کی حرمت باقی نہیں رہتی، لیکن اس کے باوجود اس کو قصاص یا حدِ شرعی میں قتل کرنا عوام کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ اسلامی حکومت کا منصب اور اس کی ذمہ داری ہے، قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

ترجمہ: ''جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے اور (اللہ تعالیٰ نے) اس کیلئے عذابِ عظیم تیار کررکھا ہے''، (سورۃ النساء:93)۔

اس آیت کے تحت مومن کے قاتلِ عامد (یعنی دانستہ کسی ایسی جان کو ارادۂ قتل سے تلف کرنے والا، جسے شریعت نے حرام و محفوظ قرار دیا ہے) کو آخرت میں جہنم کی دائمی سزا، اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذابِ عظیم کا سزاوار قرار دیا گیا ہے۔ پھر اس پر مفسرین و فقہاء نے بحث کی ہے کہ آیا ''قتلِ عمد'' کا مرتکب ابدی اور دائمی جہنم کی سزا کا حق دار ہے یا اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے، کیونکہ اگر یہ حکم مطلق اور قطعی ہے تو بظاہر یہ قرآن کی اس آیت سے متعارض ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ شریک ٹھہرانے کو تو (ہرگز) معاف نہیں فرماتا اور اس کے علاوہ دیگر گناہوں کو جس کیلئے چاہے معاف فرمادیتا ہے''، (النساء:48)۔

تو اس استثناء کے عموم میں تو ''قتلِ عمد'' بھی آتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں آیات میں تطبیق کرتے ہوئے سورۂ النساء آیت نمبر 93 کی تفسیری بحث میں علامہ محمود آلوسی نے تفسیر ''روح المعانی'' میں لکھا ہے: اگر اس آیت کو اپنے ظاہری مفہوم پر قائم رکھا جائے تو پھر

مومن کے'' قاتلِ عامد'' سے مراد وہ قاتل ہوگا، جو اسے حلال سمجھ کر قتل کرے، تو پھر تو ایسے شخص کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے اور نہ یہ پھر محلِ نزاع ہی ہے (کہ وہ دائمی طور پر جہنمی ہی ہے)، انہوں نے مزید لکھا کہ عکرمہ، ابن جریج اور مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت میں ''متعمدًا'' کی تفسیر میں ''مستحلًا'' کی قید لگائی ہے یعنی جو حلال جان کر'' قتلِ عمد'' کا ارتکاب کرے''، (روح المعانی، جلد:5،ص:117 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

''عن عبداللّٰہ بن مسعود قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لایحل دم امرئ مسلم یشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وانی رسول اللّٰہ، الا باحدیٰ ثلث النفس بالنفس، والثیّب الزانی، والمارق لدینہ التارک للجماعۃ''

ترجمہ:'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جو مسلمان اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اس کی جان لینا سوائے تین وجوہ کے حلال نہیں ہے، (ایک) جان کے بدلے میں جان (یعنی اس نے ناحق کسی کو قتل کیا ہو اور قصاص میں اس کی جان لی جائے)، (دوسری) شادی شدہ زانی اور (تیسری) جماعت (کی متفق علیہ راہ) کو چھوڑ کر دین سے نکلنے والا (یعنی جو مرتد ہو جائے)''، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری وصحیح مسلم)۔

صحیح مسلم کتاب الایمان میں ہے:

عن عبداللّٰہ بن مسعود رضی اللّٰہ عنہ، قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ سباب المسلم فسوقٌ وقتالہٗ کفرٌ۔

ترجمہ:'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے''، (صحیح البخاری رقم الحدیث:48، صحیح مسلم، رقم الحدیث:64)۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف الدین نووی لکھتے ہیں:

ترجمہ:'' کسی کو ناحق قتل کرنے سے اہلِ حق کے نزدیک ایسا کفر لازم نہیں آتا، جس کے باعث وہ ملت اسلام سے خارج ہو جائے، جیسا کہ ہم نے متعدد مقامات پر پہلے بھی بیان کیا

ہے، سوائے اس کے کہ وہ قتلِ ناحق کو حلال سمجھ کر اس کا ارتکاب کرے، تو کہا گیا ہے کہ حدیث کی تاویل میں کئی اقوال ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ (اگر کفر کو اپنے حقیقی اصطلاحی معنی پر محمول کیا جائے تو) اس سے مراد وہ شخص ہے، جو حلال جان کر قتلِ ناحق کا ارتکاب کرے''، (شرح نووی، جلد:1، ص:54)۔

لہٰذا شرعی طور پر کسی ''محفوظ الدم'' مسلمان کی جان کو حلال جان کر یا اِسے کارِثواب اور ذریعۂ دخولِ جنت سمجھ کر (بغیر کسی شرعی جواز کے) قتل کرنا، تمام ائمہ کے نزدیک کفر ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ویقتل المسلم بالذمی''

ترجمہ: ''اور مسلمان کو ذمی (غیر حربی) کے بدلے میں قصاصاً قتل کیا جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری جلد نمبر 6 ص:3، مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک غیر مسلم (ذمی) کی جان و مال بھی محفوظ ہے اور اگر کسی مسلمان نے اس کو بغیر کسی وجہ شرعی کے قتل کر دیا تو وہ مسلمان بھی واجب القتل ہے، اور اس سے قصاص لیا جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان میں رہنے والے تمام ایسے پابندِ آئین و قانون غیر مسلم (جو پاکستان کے مستقل شہری ہیں یا بذریعہ ویزا آنے کی وجہ سے قانونی طور پر حکومت پاکستان کی امان میں ہیں اور جنہوں نے کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہیں کیا، جس سے وہ ''مباح الدم'' ہو گئے ہوں) کی جان و مال بھی محفوظ ہے اور ان کو کسی وجہ شرعی کے بغیر حلال جان کر یا کارِثواب سمجھ کر ناحق قتل کرنا حرام ہے اور شدید ترین گناہ ہے اور اس پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: الا من قتل نفساً معاهدةً له ذمة الله ورسوله فقد اخفر بذمة الله فلا يرح رائحة الجنة۔

ترجمہ: ''یاد رکھو جو شخص مسلمان ریاست کے کسی ایسے غیر مسلم کو قتل کرے، جس کا ریاست سے معاہدہ ہے اور اللہ اور اس کے رسول نے اس کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لی

ہے،تو وہ اللہ کی ذمہ داری کی بے حرمتی کرتا ہے، ایسا شخص جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا"۔
(ترمذی ابواب الدیات ج1،ص:391)

امام علی بن عمر دار قطنی متوفی 385ھ روایت کرتے ہیں:

عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قتل مسلماً بمعاهد، وقال: أنا أكرم من وفی بذمته
"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مسلمان کو ایک معاہد (جس کافر سے معاہدہ ہوا ہو) کے بدلے میں قتل کر دیا اور فرمایا: جو لوگ اپنے معاہدے کو پورا کرتے ہیں، میں ان میں سب سے بڑھ کر کریم ہوں"، (سنن دار قطنی ج3 رقم الحدیث:3232، سنن کبریٰ للبیہقی ج8،ص:30)۔

عن عبدالرحمن بن البیلمانی یرفعه: أن النبی ﷺ أقاد مسلماً قتل یهودیاً، وقال الرمادی: أقاد مسلماً بذمی، وقال: أنا أحق من اوفی بذمته۔
ترجمہ:"عبدالرحمٰن بن البیلمانی مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس مسلمان سے قصاص لیا، جس نے ایک یہودی کو قتل کر دیا تھا، رمادی نے کہا مسلمان سے ذمی کا قصاص لیا اور فرمایا: میں سب لوگوں کے مقابلے میں اس بات کا زیادہ حق دار ہوں کہ اپنے عہد کو پورا کروں"، (سنن دار قطنی، ج3، رقم الحدیث:3233)۔

عن عبدالرحمن بن البیلمانی قال: قتل رسول الله ﷺ رجلاً من أهل القبلة برجل من أهل الذمة، وقال أنا أحق من أوفی بذمته۔
ترجمہ:"عبدالرحمٰن بن البیلمانی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ذمی کے بدلے میں اہلِ قبلہ (یعنی مسلمانوں) کے ایک شخص کو قتل کر دیا اور فرمایا: میں سب لوگوں کے مقابلے میں اس بات کا زیادہ حق دار ہوں کہ اپنے عہد کو پورا کروں"، (سنن دار قطنی ج:3 رقم الحدیث:3234)۔

ہر چند کہ ان احادیث کی اسانید ضعیف ہیں، لیکن تعددِ اسانید کی وجہ سے یہ احادیث حسن لغیرہ ہیں اور لائق استدلال ہیں، جب کہ امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا استدلال قرآنِ

مجید سے ہے، اور یہ احادیث تائید کے مرتبہ میں ہیں۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "القصاص واجب بکل محقون الدم علی التابیداذا قتل عمدا کذا فی الھدایۃ"۔

ترجمہ: "جس جان کو شریعت نے ہمیشہ کیلئے محفوظ و محترم قرار دیا ہے، اسے عمداً قتل کردیا جائے، تو قصاص واجب ہے، ہدایہ میں اسی طرح ہے"، (فتاویٰ عالمگیری جلدنمبر 6 ص:3، مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)۔

لہٰذا جہاد سمجھ کر خودکش حملے کرنا، بمب بلاسٹ کرنا اور فائرنگ کرکے مساجد اور عوامی اجتماعات میں مسلمانوں کا قتلِ عام کرنا صرف حرام ہی نہیں ہے بلکہ حلال، جائز اور کار ثواب سمجھ کر یہ کام کرنا کفر صریح ہے۔ اور اگر وہ قتل کرنے کو شرعی طور پر حرام سمجھتے ہوئے مغلوب الغضب ہوکر ذاتی دشمنی کے تحت انتقام یا کسی اور نفسانی وجہ سے کسی مسلمان یا غیر مسلم شہری کو قتل کردے تو یہ گناہ کبیرہ ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

عن عبداللہ بن عمرو قال: قال رسول اللہ ﷺ: الکبائر الاشراک باللہ وعقوق الوالدین وقتل النفس والیمین الغموس۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، (ناحق) انسانی جان کو قتل کرنا اور (ماضی کے بارے میں قصداً) جھوٹی قسم کھانا (سب کے سب) کبیرہ گناہ ہیں"۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ، باب الکبائر)

یہ مسئلہ ہم نے پاکستان کے تناظر میں لکھا ہے، جہاں حاکم بھی مسلمان ہیں، عوام کی غالب اکثریت بھی مسلمان ہے اور ملک آئینی طور پر ایک اسلامی جمہوری مملکت ہے اور جہاں وقتاً فوقتاً افراد اور بعض صورتوں میں اجتماعات (عبادت گاہوں اور پبلک مقامات) پر قاتلانہ حملے ہوتے ہیں، بمب بلاسٹ کئے جاتے ہیں اور تاثر یہ دیا جاتا رہا ہے کہ اس کے پیچھے دینی

اور مذہبی محرکات کارفرما ہیں۔ اور بعض عناصر یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ دینی اور مذہبی رہنما یا تنظیمیں اپنے جذباتی کارکنوں کو اس قسم کی کارروائیوں پر ان کی ذہنی تطہیر (Brain washing) کرکے ان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہیں کہ وہ بمب بلاسٹ یا حملہ کر کے انسانوں کی جانیں لیں۔ انہیں آج کل عرفِ عام میں ''خودکش حملے'' (Suicidal Attacks) کہا جاتا ہے اور یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ یہ کارِ خیر اور جنت کا راستہ ہے اور یہ بات اسلام کی بدنامی کا باعث بنتی ہے، لہٰذا ہم نے اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہوئے شرعی حکم بیان کیا ہے، تاکہ اسلام کی پوزیشن واضح ہو جائے۔

البتہ وہ ممالک، جہاں غیر ملکی ظالمانہ اور جابرانہ قوتوں کا تسلط ہے اور کھلے میدان میں مظلوم اور مجبور عوام بے پناہ وسائل اور اسلحہ سے لیس ان غاصب طاقتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے یا جہاں مسلمانوں کو ان کے اپنے وطن میں ان کے مسلّمہ انسانی، قومی، دینی، ملّی اور ملکی حقوق سے محروم کر کے انہیں محکوم اور غلام قوم کی حیثیت سے رہنے پر مجبور کیا گیا ہے، ان کے معروضی حالات اور احکام کی نوعیت الگ ہے، کیونکہ مسلّمہ بین الاقوامی قوانین کے تحت اپنی وطنی، قومی، ملکی وملّی آزادی کیلئے غاصب وقابض قوتوں سے برسرِ پیکار ہونا کبھی بھی جرم نہیں گردانا گیا، امریکا اور افریقہ کے بیشتر ممالک کی جدوجہدِ آزادی اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی اس کی نمایاں مثال ہے۔ لہٰذا پاکستان اور ان مقبوضہ خطوں (جیسے کشمیر وفلسطین وغیرہ) کی معروضی صورتِ حال اور اس کے شرعی اور فقہی احکام کو باہم خلط ملط نہ کیا جائے۔

نوٹ: پاکستان کے تمام مکاتبِ فکر کے جید اور ممتاز علماءِ کرام نے اس فتویٰ کی تصدیق وتصویب کی اور اپنے توثیقی دستخط ثبت فرمائے، ان کے دستخطوں کی فوٹو اسٹیٹ نقل کتاب کے آخر میں منسلک ہے۔

تائید و توثیق و تصویب مفتیان عظام

نمبر شمار	اسمائے گرامی	مدرسہ / دار العلوم / جامعہ	مہر و توثیقی دستخط
1	علامہ مفتی محمد حسن حقانی	مہتمم، جامعہ انوار القرآن بلاک 5 گلشن اقبال، کراچی	محمد حسن حقانی
2	علامہ مفتی محمد رفیق حسنی	مہتمم، جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، گلستانِ جوہر بلاک 15، کراچی	[illegible]
3	علامہ مفتی غلام دستگیر افغانی	مہتمم، جامعہ ضیاء العلوم آگرہ تاج کالونی، کراچی	[illegible]
4	علامہ مفتی محمد اطہر نعیمی	مفتی دار الافتاء، دار العلوم نعیمیہ بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی	[illegible]
5	علامہ مفتی محمد اسماعیل قادری نورانی	جامعہ انوار القرآن بلاک 5 گلشن اقبال، کراچی	الجواب صحیح [illegible] دار الافتاء

6	علامہ مفتی محمد صدیق ہزاروی ازہری	استاذ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ، لاہور	[illegible]
7	علامہ مفتی محمد تنویر القادری	نائب مفتی جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ، لاہور	الجواب صحیح [illegible]
8	علامہ مفتی عبد المصطفیٰ ہزاروی	ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ، لاہور	الجواب صحیح [illegible]
9	علامہ مفتی محمد عبد الستار سعیدی	ناظم تعلیمات وشیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ، لاہور	[illegible]
10	علامہ مفتی نور الحق قادری	ایم۔این۔اے خیبر ایجنسی	Noor Ul Haq Qadri Member National Assembly of Pakistan (Khyber Agency)
11	علامہ مفتی اظہار اللہ	دار العلوم عربیہ بھام گلی اوگی ضلع مانسہرہ	[illegible]

نمبر	نام	عہدہ	دستخط
12	علامہ مفتی عمر فاروق	مفتی و مہتمم دار العلوم جامعہ اسلامیہ حنفیہ عثمان آباد چھتر، مانسہرہ	[illegible]
13	علامہ محمد مقصود احمد چشتی قادری	خطیب جامع مسجد داتا دربار، لاہور	[illegible] 16/5/2005
14	علامہ غلام رسول سعیدی صاحب	شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ، بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی	مفتی غلام رسول سعیدی [illegible]
15	علامہ مفتی صاحبزادہ ارشد سعید کاظمی	شیخ الحدیث انوار العلوم ملتان	[illegible]
16	علامہ مفتی غلام مصطفیٰ رضوی	مفتی انوار العلوم، ملتان	[illegible]
17	علامہ مفتی محمد ابو بکر صدیق عطاری	مفتی و شیخ الحدیث جامعہ المدینہ بلاک 15، گلستان جوہر، کراچی	[illegible]
18	علامہ مفتی ابو الخیر حسین الدین شاہ	مہتمم جامعہ رضویہ ضیاء العلوم ڈی بلاک سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی 840404-450404	[illegible]

19	علامہ مفتی محمد جان نعیمی	مہتمم دارالعلوم مجددیہ نعیمیہ ملیر، کراچی	المجیب فیما أجاب فمحق [illegible]
20	مفتی محمد خان قادری	جامع اسلامیہ، لاہور آتچیسن ہاؤسنگ اسکیم، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور	[illegible]
21	علامہ صاحبزادہ حامد رضا	مہتمم جامعہ حنفیہ دودروازہ سیالکوٹ، وزیراوقاف مذہبی امور آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر	الجواب ھو الموافق للحق والصواب صاحبزادہ حامد رضا وزیر اوقاف و مذہبی امور آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر
22	علامہ صاحبزادہ حبیب الرحمٰن محبوبی	مہتمم جامعہ حیات العلوم صفۃ الاسلام بریڈفورڈ، یو۔کے	[illegible]
23	علامہ مفتی غلام عباس قادری	ادارہ علوم اسلامی شانتی نگر بلاک 19 گلشن اقبال، کراچی	الجواب [illegible]

24	علامہ مفتی محمد حیات قادری	مہتمم جامعہ غوثیہ رضویہ قادریہ محلہ، ڈیرہ مراد جمالی، ضلع نصیر آباد	[signature]
25	علامہ مفتی فتح محمد باروزئی	مہتمم، جامعہ فیض العلوم نقشبندیہ غریب آباد، سبی، بلوچستان	[signature]
26	پروفیسر ڈاکٹر سید عبدالخالق پیرزادہ	رئیس مجمع الادیان العالم للدراسات الاسلامیۃ العلیا B-6 پراچہ مینشن، سبزی والی گلی برنس روڈ، کراچی پاکستان 0300-2548681-2627307	ڈاکٹر عبدالخالق پیرزادہ
27	مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی	مہتمم جامعہ نضرۃ العلوم B-10 ھرڈ ڈیوس روڈ گارڈن ویسٹ، کراچی	الحمد للہ الرحمن الرحیم وعلی رسولہ الکریم وآلہ وصحبہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم الجواب صحیح وصواب والمجیب نجیح ومثاب والعاقد نبیع ومطاع محمد الیاس الرضوی الاشرفی [signature and seal]

28	علامہ قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی	خطیب نیومیمن مسجد بولٹن مارکیٹ، کراچی	[signature]
29	الشیخ یوسف محمد ادریس الحسنی (غیرملکی)	استاذ کلیۃ الشریعۃ والأزہر فی لبنان استاذ الأزہر فی لبنان، بیروت	[signature]
30	الشیخ ھشام خلیفہ (غیرملکی)	امام و خطیب مسجد الامام الاوزاعی ،بیروت امین عام مجلس ائمہ المساجد، بیروت استاذ الدراسات العلیا فی	[signature]
31	مہدی ھادوی تہرانی (غیرملکی)	الحوزة العلمیة بقم رئیس لجنة الفقه الاسلامی والوضعی فی الجنة العلیا للعلوم الانسانیة فی وزارة العلوم والتکنولوجیا	[signature]
32	قاری روح اللہ مدنی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	خطیب اعلیٰ صوبہ سرحد دار القرآن الکریم خیبر روڈ پشاور 0333-9117228	[signature]

33	علامہ نصیب علی شاہ الھاشمی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	ایم۔این۔اے ورئیس جامعۃ المرکز الاسلامی پاکستان بنوں سرحد	[دستخط]
34	مفتی غلام الرحمٰن (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ پشاور کنوینر شریعت کمیٹی، حکومت سرحد	قتل ناحق کے بارے میں حضرت مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب زید مجدہم کا محررہ جواب درست ہے۔
35	مولانا انوار الحق حقانی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	خطیب مرکزی جامع مسجد کوئٹہ استاذ الحدیث جامع مطلع العلوم، کوئٹہ 0320-5907095	[دستخط] 4-5-05
36	علامہ محمد عبید اللہ اشرفی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ، لاہور	[دستخط]
37	علامہ مفتی محمد عثمان یار خان (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم جامعہ دار الخیر للعلوم اسلامیہ واللغۃ العربیہ گلستان جوہر، کراچی	[دستخط و مہر] دار الافتاء
38	مولانا محمد اسعد تھانوی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم جامعہ اشرفیہ سکھر	[دستخط] 9/5/2005

39	قاری اللہ داد (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم مدرسہ اسلامیہ فاروق اعظم خطیب مرکزی جامع مسجد الفاروق محمود آباد نمبر 6 کراچی نمبر 44	قاری اللہ داد مہتمم
40	مولانا محمد اسد دیوبندی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	رکن زونل رویت ہلال کمیٹی کراچی ممبر زکوٰۃ کونسل کراچی 0300-2475571-4015624	
41	قاری محمد حنیف جالندھری (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مہتمم خیر المدارس، ملتان	
42	علامہ ابوعمار زاھد الراشدی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ	
43	مولانا قاری بشیر احمد نقشبندی (دیوبندی مکتبۂ فکر)	رکن زونل رویت ہلال کمیٹی کراچی جنرل سکریٹری علامہ بنوری ٹرسٹ کراچی پاکستان 0333-3308375	

نمبر	نام	عہدہ / پتہ	دستخط
44	مولانا تنویر الحق تھانوی (دیوبندی مکتبہ فکر)	خطیب مرکزی جامع مسجد تھانوی جیکب آباد لائن بانی و مہتمم جامعہ احتشامیہ، کراچی	[illegible]
45	علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر (اہلِ تشیع)	ادارہ منہاج الحسین 301/H3 فیز2، جوہر ٹاؤن، لاہور	
46	مولانا سید محمد عون نقوی (اہلِ تشیع)	سربراہ ادارہ تبلیغ تعلیمات اسلامی پاکستان D-39 رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد 0300-8267261	
47	علامہ سید فخر الحسن کراروی (اہلِ تشیع)	دار العلوم جعفریہ پشاور	
48	مفتی کفایت حسن اوج (اہلِ تشیع)	رکن اسلامی نظریاتی کونسل آزاد جموں کشمیر	

49	مفتی اختر عباس (اہلِ تشیع)	خطیب جامع مرکزی مسجد اثنا عشری اسلام آباد 0300-5014572	
50	مفتی نیاز حسن نقوی (اہلِ تشیع)	جامع المنتظر، لاہور 0300-4132218	
51	علامہ یعقوب علی توسلی (اہلِ تشیع)	امامِ جمعہ توسلی روڈ مومن آباد، کوئٹہ 0300-3811984	
52	پروفیسر عبدالرحمٰن لدھیانوی (اہلحدیث)	خطیب جامع مسجد اہل حدیث جامع رحمانیہ، محمدی پارک، راجگڑھ، لاہور	
53	میاں نعیم الرحمٰن (اہلحدیث)	سکریٹری جنرل وفاق المدارس السلفیہ فیصل آباد مرکزی دفتر جمعیت اہلحدیث 111 ملتان روڈ، کراچی 0300-8446669, 042-7580579	

54	مولانا محمد یاسین ظفر (اہلحدیث)	مہتمم جامعہ سلفیہ فیصل آباد	
55	مولانا حافظ محمد سلفی (اہلِ حدیث مکتبۂ فکر)	مہتمم جامعہ ستاریہ اسلامیہ بلاک 6 گلشن اقبال، کراچی	حافظ محمد سلفی مہتمم جامعہ ستاریہ اسلامیہ
56	علامہ مفتی عبدالمالک (جماعتِ اسلامی)	مہتمم جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، لاہور ایم۔این۔اے، مانسہرہ	جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ
57	علامہ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن (جماعتِ اسلامی)	خطیب جامع مسجد مولانا عبدالعزیز مدرسہ دارالرشاد، پھاٹک چمن، کوئٹہ 0300-9383937	
58	علامہ محمد ابراہیم حنیف (جماعتِ اسلامی)	استاذ الحدیث جامعہ حنفیہ سعود آباد، کراچی 4504975-4506212	
59	مفتی عبدالودود (جماعتِ اسلامی)	نگراں جامعہ حنفیہ سعود آباد، کراچی	الجواب صحیح عبدالودود نگران دارالافتاء جامعہ حنفیہ سعود آباد کراچی

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین

بھیرہ شریف کی زیر نگرانی

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر در منثور / 6 جلد

زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

پروفیسر مفتی منیب الرحمن

کی زیور طبع سے آراستہ ہونے والی مؤثر تصنیف

تفسیر سورۃ النسآء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم تفسیر، اندازِ بیان مؤثر و دلکش
قدیم و جدید اہم تفاسیر کا نچوڑ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اِنَّ ھٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیمُ المسائل

پروفیسر مفتی منیب الرحمن

جلد چہارم

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور • کراچی • پاکستان

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (مسلم)

یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد چہارم

روزمرہ زندگی کے قدیم و جدید فقہی، علمی اور عقلی مسائل کا اسلامی حل

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی - پاکستان

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　　　　　　　　　　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- ❖ گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- ❖ گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- ❖ کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کرکے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ❖ ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- ❖ اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- ❖ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- ❖ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- ❖ عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- ❖ **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- ❖ اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　　　　　　　　　　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد چہارم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
تصحیح	مولانا حافظ محمد ابراہیم فیضی
	مولانا فیصل ندیم احمد قادری (ایم اے، ایل ایل بی، بی ایڈ)
طبع بار	سوم، فروری 2010ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ7
قیمت	-/375 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 32630411-32212011-021۔ فیکس:۔ 32210212-021

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

مضمون	صفحہ نمبر
انتساب	13
آغازِ تکلّم	15
﴿کتاب العقائد﴾	18
کلمۂ کفر	19
توہینِ نبی ﷺ	20
نبی کریم ﷺ کے والدین کے ایمان کے بارے میں	21
اہانتِ معاویہ	28
نومسلم کے ایمان کی غیر یقینی کیفیت	29
غیر مسلموں سے معاملات اور ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے طریقے سے عبادت کرنا	32
آثارِ قیامت میں ''تقاربِ زمانی'' کا مفہوم	38
زمانے کو برا کہنے کی ممانعت	41
﴿کتاب الطہارت﴾	45
غسل کے بعد وضو	47
بچے کی پیدائش کے بعد زچہ اور بچہ کا غسل	48
﴿کتاب الصلوٰۃ﴾	51
طلوعِ آفتاب سے پہلے نمازِ عید	53
تارکِ صلوٰۃ کا شرعی حکم	55
ظہر کے پہلے کی چار سنتیں چھوٹ جائیں تو کب پڑھے؟	59

جہاں زمین کے نیچے سیوریج لائن گزر رہی ہے، اس جگہ پر نماز پڑھنا 62
مسجد میں اپنے لئے اور دوسرے کے لئے جگہ مختص کرنا یا کپڑا رکھ کر محفوظ کرنا 63
نماز میں اقامت کہنے والے کا امام بننا یا امام کا خود ہی اقامت کہہ دینا 64
امام یا مؤذن کا غیر شادی شدہ ہونا 67
تراویح کی امامت کا استحقاق 68
جسمانی نقص سے امامت میں فرق 69
نابینا کی امامت 71
امام صاحب کی رہائش 73
نماز میں خلافِ ترتیب قراءت کا حکم 74
قراءت کی غلطی سے فسادِ نماز 77
قراءت میں متشابہ لگنا اور یاد آنے پر واپسی اسی جگہ سے پڑھنا 78
ریڈیو، ٹی وی پر آیت سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت کرنے کا حکم 79
مسجد میں جماعتِ ثانی 80
خواتین کے مخصوص ایام کی نمازوں کی قضا نہیں، صرف روزوں کی قضا ہے 84
نمازِ قصر میں وطن کی اصطلاح 86
اذانِ جمعہ اور نماز کی سعی 89
خطبۂ جمعہ کے دوران بیٹھنے کی ہیئت 93
نماز جمعہ کے بعد طویل دعا 97
کپڑا لٹکا کر چلنے یا گھسیٹے ہوئے چلنے کا حکم، نماز میں ''کفِ ثوب''، جرِ ثوب اور اسبالِ ازار'' کا حکم 100
تسبیحات فرض کے فوراً بعد پڑھی جائیں یا سُنن ونوافل کے بعد؟ 112

﴿کتاب المساجد﴾ 119
مسجد کی چھت پر بالغ طالبات کے مدرسے کا حکم 121
مسجد کے قیام کے بعد اس کی حیثیت کو تبدیل کرنا 125
منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں 127
مسجد کی بالائی منزل پر جماعت 129
فنائے مسجد کا حکم 130
چندہ جس مقصد کے لئے جمع کیا گیا ہے، اسے اس کے بجائے دوسرے
مصارف پر صرف کرنا 132
مسجد کا استعمال شدہ سامان کسی دوسری مسجد میں دینا 135
خزانچی کے گھر سے مسجد کی رقم کی چوری 136
مسجد اور مسلک 137
مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی کراہت اور عذر کی بنا پر جواز کی صورتیں 139
نامکمل وقف 144
﴿کتاب الجنائز﴾ 147
غسل میت سے پہلے ایصالِ ثواب یا قرآن خوانی 149
مصنوعی دانتوں کے ساتھ تدفین 150
پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت 153
جھوٹی قبر بنانا اور اس کی تعظیم کرنا 158
مردہ پیدا ہونے والے بچے کے کفن دفن کا طریقہ 159
﴿کتاب الزکوٰۃ﴾ 163
زکوٰۃ کی رقم سے قرض کی ادائی 165

زکوٰۃ کی رقم سے نادار کے قرض کی ادائی/زکوٰۃ کی رقم ھبہ یا قرض کہہ کر دینا	165
ادھار کی رقم سے زکوٰۃ کی ادائیگی	167
اسپتال کے لئے زکوٰۃ کی رقم سے آلاتِ طب کی خریداری	168
زکوٰۃ کی رقم سے مقامی بچوں کے لئے تعلیم القرآن کا مدرسہ چلانا	168
ترکے کی تقسیم سے پہلے کی مدت پر زکوٰۃ واجب نہیں	169
زکوٰۃ کی رقم سے ڈائلیسس مشین کی خریداری	172
مقامی مدارس میں زکوٰۃ اور نفلی صدقات کا استعمال	174
زکوٰۃ کی ادائیگی میں تملیک کی شرط	175
زکوٰۃ کا استحقاق	176
﴿کتاب الصوم﴾	179
دودھ پلانے والی ماں کے لئے روزے کا حکم	181
عذر کی بنا پر روزے چھوڑنا	183
غسل واجب ہو اور صبح صادق	183
﴿کتاب الحج﴾	187
فلسفہ ورودِ حج	189
قرعہ اندازی اسکیم پر حج	194
اسقاطِ فرض کے لئے حجِ بدل سے متعلق ایک اہم مسئلہ	196
حجِ قران میں جنایت پر صورت مسئلہ کے مطابق ایک دم یا ایک صدقہ لازم آئے گا یا دو دو	197
دم کی ادائیگی حدودِ حرم میں	199
احرام کی حالت میں دانت سے خون آنا یا بواسیر کا خون اور اس کا حکم	200

دورانِ حج ناپاکی 202
حج وعمرہ کے مسائل 203
عمرے کی ادائیگی کے لئے محرم 227
حج سے تمام گناہوں کا معاف ہوجانا 228

کتاب النکاح

231
حرمتِ رضاعت 233
ثبوتِ رضاعت 235
خالہ کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بھانجی سے نکاح حرام ہے 236
حرمتِ مصاہرت 239
حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں 244
شادی اور تقریبات پر فائرنگ اور آتش بازی 246
جبری نکاح کا حکم 248
جعلی نکاح نامے کی حیثیت 250
غیر رجسٹرڈ نکاح کی شرعی حیثیت 251
میاں بیوی کے ایک دوسرے پر الزامات لگانے سے ازخود نکاح باطل نہیں ہوتا 252
حرمتِ نکاح 258
حقیقی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح 259
لاعلمی میں بہن بھائی کا نکاح 260
تحلیلِ شرعی کے لئے زوجِ غیر کے ساتھ نکاحِ صحیح ضروری ہے 261
عنین کا حکم 264
حرمتِ مصاہرت زنا سے بھی ثابت ہوتی ہے 266

﴿کتاب الطلاق﴾

	271
''دلالتِ حال'' نسبت طلاق کے لئے کافی ہے	273
ازدواجی تعلقات میں کشیدگی اور طلاق	275
طلاقِ ثلاثہ کے بعد شوہرِ اول سے نکاح کا حکم	278
الفاظِ طلاق	279
مذاکرۂ طلاق	281
تین طلاق کا حکم	284
طلاق میں اضافت	287
بیوی کو مشروط طلاق دینا	290
خلع اور حقِ حضانت	291
طلاقِ بائن	293
''تم تو میری بیوی نہیں ہو''، الفاظِ طلاق نہیں	295
مسئلۂ طلاق	295
مشروط طلاق	297
طلاق معلق بالشرط	299
خلع	300
زوجِ مفقود الخبر	301
تحریری طلاق نامہ لڑکی کو نہ ملے تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے	306
طلاقِ مغلظہ کے بعد تعلقات	307
ثبوتِ طلاق کے طریقے	309
طلاقِ غیر مدخولہ	311

تحلیلِ شرعی کے لئے شخصِ غیر کی قید 312
طلاق ہوئی یا نہیں؟ 313
جبری طلاق کی ایک صورت 314
مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (1) 318
مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (2) 319
امام شافعی کے نزدیک تین طلاق کا حکم 321
انکارِ طلاق کی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے 322
طلاقِ مدہوش 326
فیملی کورٹس کے فاضل جج صاحبان کی خدمت میں مؤدبانہ گذارشات 328
ماں کا حقِ نگہداشت ساقط ہونے کی صورتیں 335
بچوں کی کفالت 338
کتاب العدت 341
عدت 343
کیا میں دورانِ عدتِ طلاق گھر سے باہر جا سکتی ہوں؟ 344
عدتِ وفات 345
مدتِ عدت 347
ازدواجی تعلقات نہ ہوں تب بھی عدت ضروری ہے 349
دورانِ عدت جنازے میں شرکت 350
کتاب الفرائض 353
ترکہ کی تقسیم 355
ایک یادداشتخاص کا دیگر ورثاء کی موجودگی میں تمام جائیداد پر قابض ہو جانا 358

لاوصیۃ لوارث	359
تقسیمِ ترکہ میں مقدم کون؟	361
تقسیمِ ترکہ اور برٹش لاء	365
لاولد چچا کے ترکے میں بھتیجے اور بھتیجیوں کا حقِ وراثت	367
لاولد پھوپھی کے ترکے میں مقدم سگے یا سوتیلے بھتیجے	369
مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت	370
تقسیمِ وراثت سے متعلق چند اہم اصولی امور کی وضاحت	373
شوہر اور بیوی کی مشترکہ کمائی سے بنائی ہوئی جائیداد اور تقسیمِ ترکہ	375
بیوی کا واجب الادا قرضہ کس کے ذمے ہوگا؟	376
زندگی میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی	377
کیا سوتیلا بیٹا اکیلا وارث بن سکتا ہے	377
ترکے کی تقسیم موجودہ قیمت کے مطابق	379
غیر وارث کو ترکے سے حصہ	379
تقسیمِ ترکہ	382
Inheritance	383
ترکے میں سوتیلی اولاد کا حصہ نہیں	384
پنشن ترکے میں شامل نہیں	384
مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے	386
﴿حلال وحرام، جائز وناجائز﴾	389
قتلِ خطا	391
قتلِ شبہِ عمد	394

غیر مسلم کا چیف جسٹس یا قائم مقام بننا	397
محافلِ میلاد کے بارے میں یہ کہنا کہ "اس میں حضور ﷺ تشریف لائے ہوئے ہیں اور اس میں وحدہٗ لاشریک بھی شریک ہوتا ہے"	400
خاتون مبلغہ کا غیر شرعی طرزِ عمل	406
مرد پر ریشم کا لباس حرام ہے	414
مالک کو بتائے بغیر بھی حقوق ادا کرنے سے انسان بری الذمہ ہو جاتا ہے	415
شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی	420
پرائز بانڈز اور شیئرز کا شرعی حکم	421
ٹریفک سگنل توڑنے کا شرعی حکم	422
کامرس یا اکاؤنٹنگ کی تعلیم میں سودی اندراج	423
بجلی کی چوری	423
انجکشن کے ذریعے جانوروں کی افزائشِ نسل کا جواز	426
روحانی علاج کی شرعی حیثیت	426
﴿متفرق﴾	429
والدین کی خدمت کے وسیلے سے دعا کرنے پر اجرِ آخرت باطل نہیں ہوتا	431
پرائیویٹ اسکولوں / کالجوں میں ایامِ تعطیلات کی فیس کا شرعی حکم قوم کا اصل مسئلہ طبقاتی نظامِ تعلیم ہے	433
استخارہ کا مفہوم، شرعی حیثیت اور استخارہ کے نام پر ماضی کے احوال بتانا	435
قیامِ تعظیمی کا شرعی حکم	440
نیاز کا مفہوم اور جواز	446
رجب کے کونڈے اور "تبارک" کی روٹیاں	448

قیامت کے دن اعمال کا وزن کس طرح ہوگا	452
ایصالِ ثواب کا کھانا اور صدقۂ جاریہ	457
یومِ میلاد النبی ﷺ کی صحیح تاریخ کا تعین	463
محافلِ میلاد میں مخلوط اجتماعات	469
تبرکات انبیاء کرام کا احترام	470
عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں	474
نمازِ تراویح کی امامت کا معیار	475
مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کی اشاعت	476

☆انتساب☆

میں اپنی اس ناچیز علمی کاوش کو اپنے ایک جدِّ اعلیٰ حضرت قبلہ قاضی عبدالرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ وقدس اللہ سرہ العزیز کے نام سے منسوب کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں، جو اپنے عہد کے ایک عالمِ اجل، جامع العلوم، صاحب ورع وتقویٰ اور ولی کامل تھے۔

6، نومبر 2007ء العبد الضعیف

منیب الرحمن

مفتی منیب الرحمٰن
صدر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان
مہتمم: دارالعلوم نعیمیہ کراچی

تنظیم المدارس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حوالہ نمبر ________
تاریخ ________

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علٰی رحمۃ للعٰلمین، سیدنا ومولانا محمدٍوّعلٰی اٰلہ الطیبین الطاھرین وعلٰی صحابتہ الصدیقین الکاملین، وعلٰی اولیاءِ امتہ وعلماءِ ملتہ من الفقہاء المجتہدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

آغازِ تکلم

تفہیم المسائل کی جلد چہارم پیشِ خدمت ہے۔ بنیادی طور پر یہ سوال وجواب روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہوتے رہے ہیں، کچھ ایسے سوال وجواب ہیں، جو اخبار میں شامل اشاعت نہ ہوسکے، وہ بھی اس جلد میں شامل ہیں۔ بعض اوقات ایک جیسے سوال مختلف سائلین کی جانب سے آتے ہیں، اس لئے نفسِ مسئلہ اور جواب میں درج مواد کا تکرار ہوجاتا ہے۔ اس مرتبہ میں نے کتاب کو مرتب کرنے کے بعد اشاعت سے پہلے نظرِ ثانی کے لئے اپنے دارالعلوم کے استاذِ حدیث وصدر مدرس علامہ احمد علی سعیدی صاحب زیدمجدھم کو دیا، انہوں نے کافی محنت سے پڑھا، جہاں ضروری عربی عبارات شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، وہ شامل کرائیں اور مکرّرات کو حذف کرایا۔ حتمی مراحل میں تصحیح کے لئے فاضل مصنّف وصاحب طرز ادیب علامہ محمد اعظم سعدی نے سرسری مطالعہ کیا اور جو فروگزاشت رہ گئی

مرکزی دفتر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان
رابطہ دفتر دارالعلوم نعیمیہ
بلاک 15 فیڈرل بی ایریا کراچی

ہیں، ان کی نشاندہی فرمائی۔ اس کتاب میں شامل مسائل کے حل میں میرے معاون مفتی عبدالرزاق نقشبندی زیدمجدہٗ کا علمی تعاون شامل حال رہا ہے۔ کمپوزنگ اور بار بار تصحیح میں عزیزم یاسر رحمٰن نے مسلسل محنت کی، میں ان تمام حضرات کا تہ دل سے ممنون ومتشکر ہوں۔ ہم تمام درپیش مسائل میں اپنے دارالعلوم کے شیخ الحدیث، امام المفسرین والمحدثین فی العصر علامہ غلام رسول سعیدی مدّظلہم سے مشاورت بھی کرتے رہتے ہیں اور تمام متعلقہ مقامات پر ''تبیان القرآن'' اور ''شرح صحیح مسلم'' سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ الحمدللہ علیٰ احسانہٖ علامہ صاحب کی ''نعمۃ الباری'' شرح صحیح بخاری کی چوتھی جلد پر کام ہورہا ہے اور ''کتاب الصِّیام'' کے نصف تک مکمل ہوچکی ہے۔ پہلی جلد جو'' کتاب التیمم ''پر مکمل ہوئی ہے، ان شاء اللہ العزیز عیدالاضحیٰ کے موقع پر طبع ہوکر مارکیٹ میں آجائے گی اور اہلِ علم ''شرح صحیح مسلم'' کے انداز سے ہٹ کر ایک منفرد طرز میں اسے پائیں گے۔ اللہ عزّوجلّ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ تمام تر علمی، فکری اور جسمانی قُویٰ کی سلامتی کے ساتھ انہیں اس عظیم کام کی تکمیل کی توفیق وسعادت نصیب فرمائے، ممکنہ طور پر یہ شرح بارہ مُجلّدات میں مکمل ہوگی۔ ہم نے اپنی بشری استطاعت کی حد تک اس کتاب کی لفظی ومعنوی صحت کی سعی کی ہے، لیکن ہماری سعی میں خطا اور لغزش کا امکان موجود ہے، بلکہ ہم جیسے کم علم اور خطاکار انسانوں سے ایسی خطاؤں کا وقوع بھی ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں کو معاف فرمائے۔ اہلِ علم سے گزارش ہے کہ ہماری کسی خطا پر آگاہ ہوں تو ضرور مُطّلع فرمائیں، ہم ان کے شکرگزار ہوں گے۔ دعا ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ اپنے حبیبِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل اس عاجزانہ سعی کو قبول فرمائے، اور اسے سابقہ مجلّدات کی طرح قبول عام عطا فرمائے، آمین بجاہِ سید المرسلین علیہ وعلیٰ الہٖ وصحبہٖ افضلُ الصَّلٰوۃِ والتَّسلیمات۔

العبد الضعیف

منیب الرحمٰن

﴿کتاب العقائد﴾

کلمۂ کفر

سوال:1

زید اور بکر میں کسی فقہی مسئلے کی وجہ سے بحث ہوئی اور جبکہ زید طالب علم ہے، اور زید نے کہا کہ فلاں مسئلے کے بارے میں فلاں فلاں علماء کرام وفقہاء عظام نے یہ یہ فرمایا ہے کہ جبکہ تمہاری بات ان کے خلاف جاتی ہے، تو اس پر بکر سے کچھ جواب نہ بنا اور بکر نے یہ کہا کہ "میں اپنے مرشد کے فرمان کے آگے (معاذ اللہ) تمام عالموں اور مفتیوں کے فتوؤں کو جوتے کی نوک پر اڑاتا ہوں"۔ آیا بکر کا یہ جو جملہ ہے کہ "میں ان کے فتوؤں کو جوتے کی نوک پر اڑاتا ہوں"۔ بکر کا یہ قول کہنا کیسا ہے، جواب عنایت فرمائیں۔

(محمد راحیل قادری، ملیر سٹی، کراچی)

جواب:

اللہ اور رسول کے علاوہ دوسرے کسی بھی شخص کا قول وعمل مطلقاً واجب العمل اور حجت نہیں ہے، کسی شخص کا اپنے پیر ومرشد یا استاد کا یا کسی دوسرے معظم شخص کے بارے میں یہ نظریہ رکھنا کہ ان کا فرمان میرے لئے مطلقاً واجب العمل ہے، غلو یعنی مبالغہ آرائی اور گمراہی ہے، متبع سنت عالم دین پیر ومرشد سے عقیدت رکھنا اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنا فعل مستحسن ہے، لیکن اس کے نتیجے میں علماء دین اور ان کے شرعی فتوؤں کی حقارت کرنا یہ کفر ہے۔ استفتاء میں مذکور خط کشیدہ الفاظ میں مذکور فی السوال شخص نے علم اور علماء کی بالقصد والا رادہ توہین کی ہے اور فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے شرعی فتاویٰ اور بغیر کسی دنیاوی عداوت کے علماء کی تذلیل وتحقیر کفر ہے، لہٰذا مذکورہ فی السوال شخص اپنے ان کفریہ الفاظ کی وجہ سے کافر ہوا، اس پر توبہ کر کے تجدید ایمان اگر شادی شدہ ہے، تو تجدید نکاح فرض ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

رجل عرض علیه خصمه فتوی الائمة فردها وقال چه بارنام فتوی آوردهٔ قیل

یکفر و کذا لولم یقل شیئاً ولکن القی الفتویٰ علی الارض وقال این چه شرع است۔

ترجمہ:''ایک شخص پر اس کے فریقِ مخالف نے ائمہ ٔفقہاءِ کرام کا فتویٰ پیش کیا، اس نے جواباً کہا کتنی بار فتویٰ کا نام لو گے، ایک قول کے مطابق وہ کافر ہو جائے گا، اسی طرح اگر اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن فتویٰ زمین پر پھینک دیا اور کہا کہ یہ کہاں کی شریعت ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:272، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

توہینِ نبی ﷺ

سوال :2

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیانِ شرع اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ'' میرے باپ کی بات کا درجہ میرے نزدیک نبی کی بات سے کم نہیں'، اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے اور اس کا مذکورہ جملہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟، (محمد قاسم، بہاول نگر)۔

جواب:

جس شخص نے یہ جملہ کہا العیاذ باللہ وہ کافر ہو گیا اور اس پر لازم ہے کہ وہ اس بات سے رجوع کرے اور دوبارہ کلمہ پڑھے اور اگر شادی شدہ ہے تو دوبارہ نکاح کرے، کیونکہ اس کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو نبی ﷺ کے برابر قرار دیتا ہے اور اس میں نبی ﷺ کا استخفاف ظاہر ہے اور اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ جب وہ اپنے باپ کی بات کو نبی ﷺ کی بات کے برابر سمجھتا ہے تو وہ اپنے باپ کو معاذ اللہ نبی ﷺ کے برابر سمجھتا ہے۔

نبی ﷺ کی بات کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

ترجمہ:''اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے، نہیں ہوتا ان کا فرمانا، مگر وحی جو (ان کی طرف) کی جاتی ہے، (النجم:3،4)''۔

آیت مبارک میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے قول کو اپنا قول فرمایا ہے۔ اور مذکورہ

شخص کا یہ جملہ کفریہ ہے، لہٰذا وہ اپنی بات سے رجوع کرے اور کلمہ پڑھے، شادی شدہ ہے، تو دوبارہ نکاح کرے، علامہ امجد علی اعظمی ایک سوال کے جواب میں درمختار کے حوالے سے لکھتے ہیں: ما یکون کفرا اتفاقا یبطل العمل والنکاح واولادہ اولاد زنا وما فیہ خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبۃ وتجدید النکاح -

ترجمہ: ''جس نے کفر پر اتفاق کیا اس کا عمل اور نکاح باطل ہو گیا اور اس کو توبہ واستغفار اور تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے بعد جو اولاد پیدا ہوگی وہ ولد الزناء ہوگی، (فتاویٰ امجدیہ جلد چہارم ص: 399 مکتبۂ رضویہ آرام باغ کراچی)''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کے ایمان کے بارے میں

سوال: 3

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ معاذ اللہ! رسول اللہ کے والدین کریمین جہنمی ہیں اور وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں مندرجہ ذیل دو حدیثیں پیش کرتے ہیں:

(1): ''حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ مُلَیکہ کے دو بیٹے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ہماری ماں شوہر کا احترام کرتی تھی، اولاد پر مہربان تھی، اور مہمان (کے ساتھ حسن سلوک کا بھی) ذکر کیا، سوائے اس کے کہ اس نے زمانۂ جاہلیت میں بچی کو زندہ درگور کر دیا تھا، (تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے) فرمایا: تم دونوں کی ماں جہنم میں ہے، وہ پلٹ کر جانے لگے اور ناگواری ان کے چہرے پر واضح نظر آ رہی تھی، پھر (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان دونوں کو واپس بُلوایا، وہ دونوں لوٹ کر آئے اور ان دونوں کے چہروں سے اس امید پر مسرت جھلکنے لگی کہ (شاید کوئی امید افزا) صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری ماں بھی تم دونوں کی ماں کے ساتھ ہے'' (آگے حدیث طویل ہے)، مسند احمد، رقم الحدیث: 3787)''۔

(2): ''حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے (وفات یافتہ) باپ کہاں ہیں؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جہنم میں، جب وہ لوٹ کر

(جانے لگا) تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا: ''بیشک میرا اور تمہارا باپ (دونوں) جہنم میں ہیں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 490)''۔ان احادیث کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کے ایمان کی بابت شرعی موقف واضح کیجیے، (علی حسن نقوی)۔

جواب:

یہ احادیث ان دونوں کتب احادیث میں موجود ہیں۔مسند احمد کے حاشیے پر اس حدیث کی متعدد توجیہات بیان کی گئی ہیں، جو یہ ہیں: (1) سند کے لحاظ سے یہ حدیث ضعیف ہے، اور حدیث ضعیف پر عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔اس کے ایک راوی عثمان بن عمیر کو، جس کی کنیت ابوالیقظان ہے، امام دارقطنی کے حوالے سے ذھبی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

امام ہیثمی نے ''المجمع'' میں اسے روایت کر کے تبصرہ کیا ہے کہ اسے امام احمد، امام بزار اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور ان سب کی اسناد میں عثمان بن عمیر ہے اور وہ ضعیف ہے۔ایک توجیہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ "امی مع امکما"، ''یعنی میری ماں تم دونوں کی ماں کے ساتھ ہے'' اس سے مراد یہ کہ دونوں عالم برزخ میں ہیں، یہ کلمات آپ نے ''توریہ'' کے طور پر فرمائے تاکہ سائل کو کم از کم وقتی طور پر ذہنی اذیت سے نجات مل جائے۔''توریہ'' سے مراد ایسا ذو معنی کلمہ استعمال کرنا جو ذو معانی کا حامل ہو، ایک معنی قریب جو متبادر الی الفہم ہو (یعنی فوراً سامع کے ذہن میں آجائے) اور دوسرا دور کا معنی ہو، قائل کی اصل مراد دور کا معنی ہو لیکن مخاطب قریب کا معنی مراد لے اور ایسا دین کی کسی حکمت کے تحت کرنا جائز ہے۔یا اس کی ایک توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ کے اَبَوین کی اس وقت تک بذریعہ وحی خبر نہیں دی گئی تھی، اور یہ مفہوم حدیث کے آخری کلمات سے مستفاد ہوتا ہے کہ ''میں نے ان کی بابت اپنے رب سے دریافت نہیں کیا'' یعنی اس وقت تک رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رب کے درمیان اس مسئلے میں مراجعت نہیں ہوئی، بعد میں ہوگئی اور آپ کو اپنے ابوین کریمین کا جنتی ہونا بذریعہ وحی بتا

دیا گیا۔

چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

عن انس بن مالک قال فخطب رسول اللّٰہ ﷺفقال:"انا محمد بن عبداللّٰہ بن عبدالمُطّلب بن ھاشم بن عبدمناف بن قُصَی بن کِلاب بن مُرّۃ بن کَعب بن لُؤی بن غالب بن فِھر بن مالک بن نَضربن کِنانۃبن خُزَیمۃ بن مُدرِکۃبن الیاس بن مُضَربن نَزار"۔ وَمَا افترق النّاس فرقتین الا جَعَلنی اللّٰہ فی خیرھمافاُخرِجتُ مِن بَین ابَوَین، فلم یُصِبنی شَیءٌ من عَھدالجاھِلیّۃ۔ وخَرَجتُ من نکاحٍ، ولم اُخرَج من سَفاحٍ، من لَّدُن آدمَ حَتّٰی اِنتھیتُ الیٰ ابی واُمّی فانا خیرکم نَفسا، وخیرکم اباً۔

ترجمہ:''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:''میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمُطلب بن ہاشم بن عبدمُناف ابن قُصَیّ بن کِلاب بن مُرَّۃ بن کعب ،بن لُؤی بن غالب بن فِہر بن مالک بن نَضر بن کِنانہ بن خُزَیمہ بن مُدرِکہ بن الیاس بن مُضَر بن نَزار ہوں۔ جب بھی لوگوں کے دوگروہ ہوئے ،مجھے اللہ تعالیٰ نے ان میں سے سب سے بہتر گروہ میں رکھا۔پس میرا اپنے ماں باپ سے ظہور ہوا تو مجھے زمانۂ جاہلیت کی بدکاریوں میں سے کسی چیز نے نہیں چھوا تھا اور میں نکاح کے ذریعہ پیدا ہوا اور میں بدکاری کے ذریعہ پیدا نہیں ہوا ،حتیٰ کہ حضرت آدم سے لے کر میں اپنے ماں باپ تک پہنچا، پس میں بھی تم سے خیر اور بہتر ہوں اور میرے باپ بھی تم سب سے خیر اور افضل ہیں،(دلائل النبوت للبیہقی ،جلد:1،ص:174,175 ،مطبوعہ:دارالکتب العلمیہ ،بیروت)''۔

عن علی ابن ابی طالب اَنّ النبی ﷺ قال خَرَجتُ مِن نکاحٍ ولم اُخرَ ج مِن سَفاحٍ مِن لَّدُنْ آدمَ اِلیٰ اَنْ وَلَدَنِی اَبِی وَاُمِّی، لَمْ یُصِبْنِی مِنْ سَفاحِ الْجَاھِلِیَّۃِ شَیٌٔ۔

ترجمہ:''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں نکاح سے

پیدا ہوا ہوں، میری ولادت ناجائز طریقے سے نہیں ہوئی، آدم علیہ السلام سے لیکر اس وقت تک جب کہ میرے والد اور والدہ نے مجھے جنا، مجھے زمانۂ جاہلیت کی کسی غلط چیز نے نہیں چھوا، (دلائل النبوت لابی نعیم، جلد: 1، ص: 11، بیروت)''۔

علامہ ابن جوزی متوفی 579ھ لکھتے ہیں:

عن ابن عباس قال قلتُ :یارسول اللہ ﷺ! اَینَ کُنتَ وآدمُ فِی الجنّة؟ قال: کُنتُ فِی صُلبِہٖ واُھبطَ الی الارض واَنَا فِی صُلبِہٖ، ورکِبتُ السفینة وفی صلب ابی نوح وقُذِفتُ فِی النّار فی صُلب ابی ابراھیم لم یَلتق لی اَبوان قَطُّ عَلی سَفَاحٍ لم یَزَل یَنقُلُنی من الاَصلاب الطَّاھِرَةِ الی الاَرحامِ النَقِیَّة مُھَذَّباً۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! تب آپ کہاں تھے؟، جب آدم علیہ السلام جنت میں تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: میں ان کی صُلب (پشت) میں تھا اور جس وقت انہیں زمین پر اتارا گیا اس وقت بھی میں ان کی صُلب میں تھا، اور مجھے اپنے باپ نوح کے صُلب میں کشتی میں سوار کیا گیا، اور مجھے اپنے باپ ابراہیم کی پشت میں آگ میں ڈالا گیا، اور میرے والدین کبھی بھی برائی پر نہیں ملے میں پاک اور طاہر پشتوں سے پاکیزہ رحموں میں منتقل ہوتا رہا ہوں''۔

(الوفا باحوال المصطفیٰ، جلد: 1، ص: 28، مطبوعہ: دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے اَبَوَین کریمین یعنی حضرت عبداللہ وآمنہ رضی اللہ عنہما سے لے کر حضرت آدم وحوا علیہما السلام تک آپ کے تمام آباء واجداد اور اُمّہات وجدات کے بارے میں امت کا اجماعِ اکثری اور علماءِ حق کا موقف یہ ہے:

1۔ ان میں سے بعض انبیاءِ کرام ورُسُلِ عظام علیہم الصلاۃ والسلام تھے۔

2۔ دیگر جنہوں نے کسی نبی یا رسول کے عہد، تعلیمات اور شریعت کے احکام کو صحیح اور غیر تحریف شدہ شکل میں پایا، وہ اس عہد کے مومنین کاملین تھے۔

3۔ دیگر جنہوں نے کسی نبی یا رسول کے عہد، تعلیمات اور شریعت کے احکام کو صحیح اور غیر

تحریف شدہ شکل میں نہیں پایا، بلکہ ایک نبی کے وصال فرمانے کے بعد جب طویل عرصہ گزر گیا، تو ان کی تعلیمات فراموش کردی گئیں یا ان میں تحریف کردی گئی اور مسخ کردیا گیا۔ اس دور کو زمانۂ فترۃِ وحی اور زمانۂ انقطاعِ وحی (Gap Period of Revealation) کہا جاتا ہے، ایسے دور میں لوگ تفصیلی شرعی احکام کے مُکلَّف نہیں ہوتے بلکہ دینِ فطرت اور توحید کے مکلف (Accountable) ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی (Existence of God) اور اَحدیّتِ باری تعالیٰ (ONENESSO of God) کے پابند ہوتے ہیں۔ امت کا اجماعِ اکثری اور علماءِ حق کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وہ آباء واجداد، جو زمانۂ ''فترۃِ وحی'' میں گزرے، ان میں سے کوئی بھی مشرک، کافر اور ملحد نہیں تھا، سب کے سب دینِ فطرت اور دینِ توحید پر قائم رہے۔ آپ ﷺ کے اجداد عالی نسب، حضرت کعب بن لُؤَیّ، حضرت قُصَیّ، حضرت عبدالمُطّلب، وغیرہم کے جو خطبات اور ارشادات تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں، وہ اس امر کا واضح ثبوت ہیں۔

4۔ رسول اللہ ﷺ کے آباء واجداد میں کوئی مشرک اس لئے بھی نہیں ہوسکتا کہ آپ کا فرمان ہے: لم ازل انقل من اصلاب الطاهرين الى الارحام الطاهرات والمشركون نَجَسٌ۔

ترجمہ: ''میرا (نورِ نبوت اور جوہرِ وجود ہر دور میں میرے آباء واجداد کی) پاک پشتوں سے (میری اُمّہات وجدّات کے) پاک رحموں میں منتقل ہوتا رہا اور مشرک تو ہوتے ہی ناپاک ہیں''۔ اور سورۂ توبہ آیت نمبر: 28 میں اللہ تعالیٰ کا بھی یہی ارشاد ہے کہ: ''اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ'' کہ مشرک تو ناپاک ہی ہوتے ہیں''۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے جو اپنے ان تمام آباء واجداد اور اُمّہات وجدّات کو طاہرین وطاہرات قرار دیا ہے اس سے دونوں طرح کی طہارت مراد ہے، ایک سَفاحت سے پاکیزگی کہ سب کا تعلق باقاعدہ نکاح سے قائم ہوا، غیر اخلاقی اور غیر شرعی طریقے سے نہیں، اور دوسرا شرک اور عقائدِ باطلہ سے پاکیزگی۔

5۔ پس جن آیات واحادیث میں آپ ﷺ کے باپ کے مشرک ہونے یا جہنم کے

عذاب میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے، ان مقامات پر آپ کے حقیقی والد مراد نہیں بلکہ مجازی باپ یعنی چچا مراد ہے، جیسے وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً۔ ترجمہ: ''اور (اے رسول! اس وقت کو یاد کیجئے) جب آپ کے (جدِ اعلیٰ) ابراہیم علیہ السلام نے اپنے (مجازی) باپ آزر سے کہا کہ آپ (اپنے خود ساختہ) بتوں کو خدا مان رہے ہیں، (الانعام:75)''۔ سوال میں جس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے، بر سبیل تسلیم اس کی بھی یہی تاویل کی جائے گی۔ اور عربی زبان میں چچا پر باپ (اَب) کا اطلاق کیا جاتا ہے، ہمارے ہاں اردو میں بھی ''تایا ابو'' وغیرہ کا استعمال عام ہے۔ اور حدیث مبارک میں بھی ہے: فَاِنَّمَا عَمُّ الرَّجُلِ صِنوُ ابیہ۔ ترجمہ: ''بیشک ایک شخص کا چچا اس کے باپ ہی کے مرتبے میں ہوتا ہے، (ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ، باب مناقب اہل البیت)''۔
المنجد میں صِنوٌ اور صَنوٌ کے معنیٰ ہیں: سگا بھائی، چچا یا ایک اصل سے پھوٹنے والی دو شاخیں۔ ماضی قریب کے ایک عالم مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی تصنیف قصص القرآن میں آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا حقیقی باپ قرار دیتے ہوئے استدلال کیا ہے کہ جب حقیقی معنیٰ مراد لیا جاسکتا ہو تو مجازی معنیٰ کی طرف عدول کرنے کی کیا ضرورت ہے اور کونسا قرینہ ہے؟۔ ہم کہتے ہیں کہ جب ہم نے عقلی ونقلی دلائل کی روشنی میں ایک اصول طے کرلیا ہے کہ حضور کے آباءِ کرام میں کوئی بھی کافر و مشرک نہیں گزرا تو یہی مجاز کی طرف عدول کا قرینہ بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام والدین کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مغفرت کی دعا کرتے ہیں، تو عرض کرتے ہیں: رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ۔ ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار! تو مجھے اور میرے والدین کو بخش دے''، (ابراہیم:41)''۔ ''اب'' کا اطلاق مجازاً چچا پر ہوسکتا ہے، لیکن ''والد'' کا اطلاق صرف حقیقی باپ پر ہی ہوسکتا ہے، جس کے نسب سے وہ پیدا ہوا ہے، چنانچہ علامہ قاضی ثناء اللہ مظہری لکھتے ہیں: فھذہ الایۃ تَدُلُّ عَلیٰ اَنَّ وَالِدَیْہ علیہ السلامُ کانا مسلمَین واِنَّما کَانَ آزَرُ عَمًّا لہٗ و کان اسمُ اَبِ ابراھیم تَارِخ ولاَجْلِ دَفْعِ تَوَھُّم آزرَ قال والِدَیَّ

یعنی مَنْ وَلَدَ انی حقیقةً ولم یَقُل اَبَوِیَّ لِاَنَّ الاَبَ یُطْلَق علی العَمِّ مَجازاً۔
ترجمہ: ''یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کے والدین مسلمان تھے اور آزر آپ کا چچا تھا اور آپ کے والد کا نام تارِخ تھا۔ اور اس وہم کو دور کرنے کے لئے کہ باپ سے مراد چچا ہے آپ نے دعا میں ''وَالِدَیَّ'' کا لفظ استعمال کیا، یعنی جنہوں نے مجھے حقیقت میں جنا ہے اور ''اَبَوَیَّ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا کیونکہ اب کا لفظ بطور مجاز چچا کے لئے بھی استعمال ہوتا رہتا ہے، (تفسیر مظہری)''۔ واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام چچا مومن نہیں تھے، ایک چچا عبدالعزیٰ ابولہب تو رئیس المشرکین تھا، بلکہ یہ واحد مشرک تھا جس کی مذمت میں قرآن مجید کی ایک مکمل سورت ''اَللَّھَبُ'' نازل ہوئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ''اَبَوین کریمین'' کو اللہ تعالیٰ کے دیئے اختیار سے زندہ کیا، ان پر ایمان (توحید ورسالت) کی دعوت پیش کی، انہوں نے اسلام قبول فرمالیا اور پھر ان کا ایمان پر وصال ہوا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: لیکن متاخرین میں علماء نے حضور ﷺ کے والدین کریمین، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام تک آپ کے تمام آباء واُمہات کا ایمان ثابت کیا ہے، اس اثبات کے لئے انہوں نے تین طریقے اختیار کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سب حضرات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے۔ دوسرا یہ کہ ان حضرات کو دعوتِ اسلام نہ پہنچی، بلکہ یہ حضرات زمانۂ فترۃ میں ہی انتقال کر چکے تھے، ان کو حضور ﷺ کی نبوت کا زمانہ نہ ملا۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے والدین کریمین کو خدا تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا سے آپ کے دستِ اقدس پر دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور وہ آپ پر ایمان لائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین کے زندہ کرنے کی حدیث اگرچہ اپنی حدذات میں ضعیف ہے، لیکن متعدد طریق سے اس کی تصحیح اور تحسین کردی گئی ہے اور یہ بات گویا متقدمین سے پوشیدہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت متاخرین علماء پر کھول دی۔ ''واللہ یختص برحمتہ من یشاء'' اس بارے میں رسائل تصنیف کئے اور دلائل سے اس مسئلے کا اثبات فرمایا، مخالفین کے شبہات کے جوابات دیئے۔ ان دلائل اور جوابات کو اگر یہاں نقل

کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ان کے رسائل میں دیکھ لیا جائے، واللہ اعلم"۔
(اشعۃ اللمعات، جلد: 1، ص: 718، مطبوعہ مطبع: تیج کمار، لکھنؤ)

علامہ غلام رسول سعیدی نے "تبیان القرآن" جلد سوم میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے، اہلِ ذوق اس کا مطالعہ فرمائیں۔

اہانتِ معاویہ

سوال:4

میں اسلامیات کی کتاب کا ایک صفحہ منسلک کر رہا ہوں جو saint josiph اسکول کے O-Level میں پڑھائی جارہی ہے۔اس میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں کئی گستاخیاں کی گئی ہیں۔آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں فتویٰ جاری کریں تاکہ مصنف، اسکول اور پبلشر کے خلاف مقدمہ قائم کیا جاسکے۔

نوٹ: انگلش عبارت کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

21 رمضان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو چالیس ہزار افراد کی رضامندی سے خلیفہ بنایا گیا۔لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نہیں بنانا چاہتے تھے انہوں نے جاسوس کوفہ بھیجے تاکہ وہاں کے حالات کا پتہ چل سکے۔حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا اور اپنی خلافت کا حق بتایا۔مگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مزید جاسوس بھیجے اور اس شخص کیلئے جو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو قتل کرے دو ہزار درہم اور اپنی بیٹی نکاح میں دینے کا انعام مقرر کیا۔

آخر میں ایک صلح نامہ ہوا جس کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ خون خرابے سے بچنے کیلئے وہ خلافت چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس بات سے تسلی نہ ہوئی اور وہ امام حسن رضی اللہ عنہ کو مارنا چاہتے تھے انہوں نے امام حسن رضی اللہ عنہ کی زوجہ سے کہا کہ اگر وہ حضرت امام حسن

رضی اللہ عنہ کوزہر دے تو وہ اس کو دو ہزار درہم، دس جوڑے کپڑے سونے کی کشیدہ کاری کئے ہوئے اور کوفہ کی زیتون کے تیل کی تمام پیداوار انعام میں دیں گے اور اس کا نکاح اپنے بیٹے سے کریں گے، (محمد سلیم خمیسہ، شہیدِ ملت روڈ، کراچی)۔

جواب:

استفتاء میں جس نصابی عبارت کی نشاندہی کی گئی ہے، یہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اہانت پر مشتمل ہے اور ان کے کردار کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، کاتبِ وحی ہیں ایسی عبارات کو نصابی کتب میں شامل کرنا قوم کی بچوں کے عقائد کو مسخ کرنے اور انہیں گمراہ کرنے کی سازش ہے، اس کے ذمہ داروں کو قومی اور دینی مجرم قرار دے کر ان کے خلاف مقدمات قائم کرنا چاہئیں۔
وفاقی وصوبائی وزارت تعلیم کیلئے ضروری ہے کہ ایسی نصابی کتاب کو فوراً منسوخ کرے، بازار میں موجود اس کے تمام نسخے ضبط کئے جائیں اور مصنف، تابع اور ناشر کے خلاف کاروائی کی جائے۔ صحابہ کرام ہماری تمام وراثت دینی کے امین ہیں، قرآن وسنت کی حقانیت وحجیت کا مدار صحابہ کرام کی صداقت، عدالت اور امانت کو تسلیم کیئے جانے پر ہے، ورنہ ہمارے پاس تمام دینی سرمایہ جس میں کتاب وسنت، عقائد وایمانیات، ارکان اسلام اور جملہ ضروریات وتفصیلات دین شامل ہیں، غیر مستند، غیر معتبر اور ناقابل اعتبار قرار پائے گا۔
صحابۂ کرام کو سب وشتم کرنا، ان کا استخفاف وتوہین کرنا حرام ہے، جمہور فقہائے امت کے نزدیک موجب کفر ہے اور ایسے شخص کی ضلالت، فسق وفجور اور مبتدع ہونے پر سب کا اتفاق ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نومسلم کے ایمان کی غیر یقینی کیفیت

سوال:5

(ا): اگر غیر مسلم کلمہ پڑھ کر پھر بھی غیر مسلم کے طور طریقوں کو نہ چھوڑے، اور دین کو نہ سیکھے۔ فرائض وواجبات کی ادائیگی کا پاس نہ رکھے۔ غرض اپنا چال چلن اور طور

طریقے نہ بدلے تو شرع میں کیا حکم ہے؟

سوال:6

کوئی غیر مسلم یوں کہتا ہے کہ میں کلمہ تو پڑھ لوں یا جیسے آپ بہتر سمجھتے ہیں (یعنی کلمہ پڑھا دیں یا نہ پڑھائیں)، یعنی غیر مسلم تذبذب کے ملے جلے جذبات رکھتا ہے؟ دلائل وبراہین قرآن وسنت کی روشنی میں اس عقدہ کو حل فرمادیں، (حافظ غلام فرید، کراچی)۔

جواب:

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل کی سچائی سے ضروریاتِ دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت، کتب الٰہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریاتِ دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے، اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے۔ دوسرے مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نومسلم کو احکامِ شرع کی تعلیم دیں فرائض وواجبات کی ادائیگی کی تعلیم وتلقین کریں پھر بھی اگر وہ اپنی غیر مسلمانہ روش ترک نہ کرے تو محض اس کا دعویٔ مسلمانی قابلِ قبول نہ ہوگا۔ اعمال صالحہ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کا تارک اور محرمات کا مرتکب فاسق اور گنہگار ہے مگر دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھا جائیگا۔ اسی طرح جھوٹ بولنے والا شخص اور شراب پینے والا اور دوسری برائیوں کا مرتکب شخص گنہگار کہلائے گا۔ بدعمل مسلمان کو یا اپنی بدعملی کی وجہ سے خود کو کافر کہنے کی بجائے اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اصلاح کی طرف راغب کرنا چاہیے، اپنے کفر کا اقرار کفر ہے، لہٰذا جو شخص خود کو کسی غیر مسلم فرقے سے ظاہر کرے، وہ کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

ترجمہ: ''جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا سوا، اس کے جس کو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ لوگ جو کھلے دل کے ساتھ کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے، (النحل:106)''۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ

ترجمہ: ''اب عذر نہ پیش کرو، بے شک تم اپنے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کر چکے ہو، (التوبہ:66)''۔وفی المحیط من قال فانا کافرا وفاکفر قال ابوالقاسم ھو کافر من ساعتہ۔

ترجمہ: ''اور محیط میں ہے کہ جو کہتا ہے کہ میں کافر ہوں یا میں کفر کروں گا، ابوالقاسم نے کہا: وہ اسی وقت کافر ہو گیا، (شرح فقہ اکبر ص ۱۸۳)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن یرضیٰ یکفر نفسہ فقد کفر

ترجمہ: ''اور جو شخص اپنے کفر پر راضی ہو جائے تو وہ کافر ہو جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: دوم، ص:۲۵۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (ویکفر فیھما) لرضاہ بالکفر۔

ترجمہ: ''کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 5 ص: 393 داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

مذکورہ بالا حوالہ جات کی رو سے اقرارِ کفر، بھی کفر ہے، تمام تصریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ دل کی سچائی سے تمام ضروریاتِ دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت، کتب الٰہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریاتِ دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے۔اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے اور بے یقینی کی سی کیفیت کے ساتھ یا کسی کی خوشی کی خاطر کلمہ پڑھ لینا ایمان نہیں،

واللہ اعلم۔

غیر مسلموں سے معاملات اور ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے طریقے سے عبادت کرنا

سوال:7

ایک مسلمان شخص اپنے کسی عیسائی دوست کی ترغیب پر ان کے معبد (گرجا) میں جاتا ہے اور ان کے ساتھ مل کر انہی جیسی عبادت کرتا ہے اور اس کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے ایمان پر قائم تھا محض ان کی دلجوئی کے لئے اُس نے ایسا کیا۔ آپ براہِ کرم وضاحت فرمائیں کہ کیا اسلامی نقطۂ نظر سے اس طرح کرنا جائز ہے؟ اور اس کا یہ عمل اس کے ایمان پر اثر انداز ہوگا کہ نہیں؟، (حافظ غلام مرتضیٰ سیالوی، ضلع اٹک)۔

جواب:

یہ مسئلہ نہایت اہم ہے، اس لئے ہم صورتِ مسئلہ سے ہٹ کر اسلام کا اصولی نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دینی امور میں غیر مسلموں، مبتدعین اور بے دین لوگوں سے تعلق کی دو صورتیں ہیں، ایک مداہنت ہے اور دوسری مدارات۔ مداہنت شرعاً ممنوع اور حرام ہے اور مدارات جائز بلکہ اس سے اگر دینی فائدہ ہوسکتا ہے تو شرعاً مطلوب ہے۔ پہلے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں:

(1) وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ ترجمہ: ''انہوں نے یہ چاہا کہ اگر آپ (دین کے معاملے میں) ان سے (بے جا) نرمی کریں، تو وہ بھی نرم ہو جائیں گے، (القلم:9)''۔

(2) وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝۔

ترجمہ: ''اور تم ان لوگوں سے میل جول نہ رکھو، جنہوں نے ظلم کیا ہے، ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی، اور اللہ کے سوا تمہارے کوئی مددگار نہیں ہوں گے، پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی، (ہود:113)''

یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ عَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ وَ قَدۡ کَفَرُوۡا بِمَا جَآءَکُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ۔

ترجمہ: ''اے ایمان والو! میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ وہ اس حق کا کفر کرتے ہیں، جو ان کے پاس آچکا ہے، (الممتحنہ:1)''۔

مداہنت کی تعریف:

مداہنت یہ ہے کہ کوئی مومن خلافِ شرع کوئی برائی دیکھے اور قدرت کے باوجود اس سے منع نہ کرے، روک ٹوک نہ کرے، اس رویے کے محرّکات کئی ہو سکتے ہیں، مثلاً (الف) دینی بے غیرتی اور بے حمیتی (ب) اس بات سے شرمائے کہ دوسرے اسے دقیانوسی اور قدامت پسند کہیں گے (ج) دنیوی مفاد اور طمع کے سبب کسی بااثر یا بااختیار شخص کی خلافِ شرع حمایت کی بنا پر ایسا کرے۔

مدارات کی تعریف:

مدارات یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آئے، بے جاسختی نہ برتے، کسی دینی حکمت یا مصلحت کے تحت نرمی سے پیش آئے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ظالم و جابر کے ناروا ظلم سے بچنے کے لئے اس سے الجھنے کے بجائے پہلو تہی اختیار کرے۔ ظاہر ہے یہ رخصت ان لوگوں کے لئے ہے جو اہلِ عزیمت واستقامت نہیں ہوتے، طبعاً کم ہمت ہوتے ہیں، اگرچہ دل سے برائی اور برے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ علامہ ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے مرقات ج:9، ص:331 پر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اَشِعَّةُ اللّمعات ج:4، ص:174 پر اپنے اپنے انداز میں یہ تعریفات بیان کی ہیں، ہم نے ان سے استفادہ کر کے آسان الفاظ میں بیان کردیا ہے۔

ایک چیز کافروں سے موالات یعنی دوستی اور محبت کا رشتہ قائم کرنا ہے، اس کی بھی قرآن مین ممانعت آئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ

ترجمہ: ''مومن (اپنے) مومن (اہلِ دین) کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں، (آل عمران:28)''۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ۔

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم ایمان والوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ، (آل عمران: 118)''۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ ۔

ترجمہ: ''اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ (مسلمانوں کے خلاف) ایک دوسرے کے حمایتی ہیں اور تم میں سے جو کوئی (مسلمانوں کو چھوڑ کر) انہیں دوست بنائے گا، تو وہ انہی میں سے ہوگا، (المائدہ:51)''۔

وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ

ترجمہ: ''اور ظالموں سے میل جول نہ رکھو ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ جلائے گی، (ہود: 113)''۔

غیر مسلموں کے ساتھ روزمرّہ کے معاملات

ایک صورت کفار کے ساتھ روزمرّہ معاملات کی ہے، جس میں ان کے ساتھ لین دین، تجارتی معاہدات، معاملات کرنا، اگر ایک دفتر یا ادارے میں کام کر رہے ہیں یا محلے میں رہ رہے ہیں، تو کسی، چاپلوسی اور خوشامد کے بغیر محض انسانی بنیادوں پر حسن اخلاق سے پیش آنا، وہ کسی مصیبت یا مشکل میں گرفتار ہوں تو ان کی مدد کرنا، بشرطیکہ وہ کوئی حرام یا شرعاً ممنوع کام نہیں ہے۔ اتفاقاً کوئی صورت پیش آگئی تو ایک ٹیبل یا ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھا لینا، بشرطیکہ اس دسترخوان پر کوئی حرام چیز نہ ہو، بعض اوقات بین المذاہب مکالمہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے مجلس کا انعقاد ناگزیر ہے۔ یہ رویّہ اسلام کے مفاد

میں نہیں ہے کہ غیر مسلم یہ سمجھیں کہ مسلمان ان سے بلا وجہ نفرت کرتے ہیں یا یہ لوگ مردم آزار اور انسانیت دشمن ہیں۔ اسی طرح اگر غیر مسلموں سے شرعی حدود کے اندر معاہدات، معاملات یا کاروبار کیا ہے تو مسلمان کو امانت و دیانت کے اعلیٰ معیار پر فائز ہونا چاہئے، ان کی کسی بھی خیانت، کِذب، بدعہدی، ملاوٹ اور بد معاملگی کی وجہ سے لوگ اسلام پر طعن کریں گے۔ علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

''اور مُعامَلتِ مجرَّدہ سوائے مرتدین کے ہر کافر سے جائز ہے جبکہ اس میں کوئی اعانت کفر یا معصیت نہ ہو نہ ہی اِضرارِ اسلام و شریعت (یعنی جس میں شریعت یا اسلام کا نقصان ہو)، ورنہ ایسی معاملت مسلم سے بھی حرام ہے چہ جائیکہ کافر سے، قال تعالیٰ: **وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ**۔ ترجمہ: ''گناہ و ظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''، (تبیان القرآن، جلد:11، ص:844)''۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''موالات و مجرد معاملت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، دنیوی معاملت جس سے دین پر ضرر نہ ہو سوا مرتدین کے کسی سے ممنوع نہیں، ذمّی (اسلامی ریاست کا غیر مسلم شہری) تو معاملت میں مثل مسلم ہے: لھم مالنا و علیھم ماعلینا۔ ان کے لئے وہی (حقوق) ہیں جو ہمارے لئے ہیں اور جو (فرائض) ان پر ہیں وہی ہم پر ہیں، (یعنی دنیاوی منافع میں ہماری طرح ان کو بھی حصہ دیا جائے گا اور دنیوی مواخذہ ان پر بھی وہی ہوگا جو ایک مسلمان پر کیا جائے گا)۔ اور غیر ذمی سے بھی خرید و فروخت، اجارہ و استیجار، ہبہ و استیہاب (یعنی ہبہ کا لین دین) بشروطہا (اپنی شرعی شرائط کے مطابق) جائز اور خریدنا مطلقاً ہر مال کا، کہ مسلمان کے حق میں متقوِّم ہو اور بیچنا ہر جائز چیز کا جس میں اعانتِ حرب (یعنی مسلمانوں کے خلاف جنگی مدد کرنا) اور اہانتِ اسلام نہ ہو، اسے نوکر رکھنا جس میں کوئی کام خلافِ شرع نہ ہو، اس کی جائز نوکری کرنا جس میں مسلم پر اس کا استعلا (یعنی اسے دینی امور میں بالا دستی دے دی جائے) نہ ہو، ایسے ہی امور میں اجرت پر اس سے کام لینا یا اس کا کام کرنا بمصلحت شرعی اسے ہدیہ دینا

جس میں کسی رسم کفر کا اعزاز نہ ہو، اس کا ہدیہ قبول کرنا جس سے دین پر اعتراض نہ ہو حتیٰ کہ کتابیہ سے نکاح کرنا بھی فی نفسہٖ حلال ہے، وہ صلح کی طرف جھکیں تو مصالحت کرنا مگر وہ صلح (منع ہے) جو حلال کو حرام کرے یا حرام کو حلال، یونہی ایک حد تک معاہدہ اور موادعت کرنا بھی اور جو جائز عہد کر لیا اس کی وفا فرض ہے اور غدر (دھوکہ دینا) حرام الیٰ غیر ذالک من الاحکام، (فتاویٰ رضویہ، ج:14، ص:420، 421 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

مسلمانوں کا غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں جا کر ان کے طریقے پر عبادت کرنا حرام ہے اور اگر وہ طریقہ اپنی وضع کے اعتبار سے کفر ہے جیسے بتوں کے سامنے سجدہ کرنا یا آگ کی پرستش کرنا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مجسمے کے آگے سجدہ کرنا تو یہ کفر ہے۔ اور اس میں یہ عذر مقبول نہیں ہوگا کہ دل میں ایمان ہے اور محض غیر مسلم کی دل داری کے لئے ایسا کیا ہے، شریعت کے احکام کا اطلاق ظاہر حال پر ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے ہندوؤں کے ساتھ مندر میں عبادت کئے جانے کی بابت سوال ہوا، آپ نے جواب میں لکھا:

الاشباہ والنظائر میں ہے: عبادۃ الصنم کفر ولا اعتبار بما فی قلبہ و کذا لو تزنر بزنار الیھود والنصاریٰ دخل کنیستھم اولم یدخل۔

ترجمہ: "بت کی پوجا کرنا کفر ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اسی طرح اگر کسی نے یہودیوں اور عیسائیوں کا زنار گلے میں باندھا (اس نے بھی کفر کیا)، خواہ وہ ان کے گرجوں (چرچ) میں داخل ہو یا نہ ہو، (۲) سائل یہ پوچھتا ہے کہ وہ حرکات ملعونہ جائز ہیں یا نہیں، یہ پوچھے کہ کفر ہے یا نہیں، ان کی عورتیں نکاح سے نکلیں یا نہیں ان حرکات سے، جامع الفصولین منح الروض الازہر میں ہے: من خرج الی السدۃ (قال القاری ای مجمع اھل الکفر) کفر لان فیہ اعلان الکفر و کانہ اعان علیہ۔

ترجمہ: "جو کوئی (دار الاسلام کو چھوڑ کر) کفار و مشرکین کے مجمع میں جائے (السّدۃ،

محدث وفقیہ ملا علی قاری نے فرمایا: اس کا معنی مجمع اہل کفر ہے) تو وہ کافر ہو گیا، کیونکہ اس میں کفر کا اعلان ہے، گویا وہ کفر پر ان کی امداد کر رہا ہے، وہ مزید لکھتے ہیں: کفر کے اہتمام میں شریک ہونا اور اس پر راضی ہونا کفر ہے، الرضا بالکفر کفر (کفر پر راضی ہونا کفر ہے) وہ لوگ اسلام سے نکل گئے اور انکی عورتیں ان کے نکاح سے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 21، ص:296، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: فی "التاتر خانیة": یکرہ للمسلم الدخول فی الْبِیْعَةِ وَالْکَنِیْسَةِ، وَاِنَّمَا یکرہ من حیث انه مَجْمَعُ الشیاطین لا من حیث انه لیس له حق الدخول قال فی "البحر" والظاهر انها تحریمیة لانها المرادة عنداطلاقهم، وقد افتیت بتعزیر مسلم لازم الکنیسةمع الیهود۔ فاذا حرمت دخول فالصلوٰۃ اولیٰ۔

ترجمہ: '' تاتارخانیہ میں ہے: یہودیوں کی عبادت گاہ اور عیسائیوں کے گرجے (چرچ) میں کسی مسلمان کا داخل ہونا مکروہ ہے اس لئے کہ وہ شیاطین کے جمع ہونے کی جگہ ہے اس لئے نہیں کہ وہاں داخل ہونے کا حق نہیں ہے '' بحر الرائق '' میں فرمایا ظاہر یہ ہے کہ کراہت سے مراد کراہتِ تحریمی ہے کیونکہ جب مطلقاً مکروہ بولا جائے، تو اس سے '' کراہتِ تحریمی '' مراد ہوتی ہے، (فقہاء کرام نے) ایسے مسلمان کو سزا دینے کا فتویٰ دیا ہے جو یہودیوں کے ساتھ ان کے معبد (گرجا) میں مستقل آتا جاتا رہتا ہو، پس جب وہاں داخل ہونا حرام قرار پایا، تو نماز پڑھنا بدرجۂ اولیٰ حرام ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2، ص:40، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔ البتہ یہود ونصاریٰ کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مکالمے کے لئے مسلمانوں کے رہنما ان کی عبادت گاہوں میں جائیں، مشترکہ عبادت مقصود نہ ہو بلکہ ان کے طریق عبادت کا مشاہدہ مقصود ہو، تو یہ مباح ہے۔ غیر مسلم ممالک میں بعض اوقات مسلمانوں رہنماؤں کو غیر مسلم مذہبی رہنماؤں کے ساتھ امن اور عدل کے مشترکہ مقاصد کے لئے بیٹھنا پڑتا ہے، اس کی رخصت ہے۔ اسی طرح اگر اہلِ مذاہب ساوی دنیا میں

ریاستی وگروہی ظلم اور جبر وتشدد کے خلاف بلاامتیاز مذہب انسانیت کے مفاد میں مشترکہ آواز بلند کریں، تو اس کی رخصت ہے۔

آثارِ قیامت میں ''تقارُبِ زمانی'' کا مفہوم

سوال:8

رسول اللہ ﷺ نے جو مختلف آثارِ قیامت بیان فرمائے ہیں، ان میں ایک یہ بیان کیا جاتا ہے کہ'' زمانے میں قربت ہو جائے گی'' اس سے کیا مراد ہے؟۔(محمد انس محبوب، ایبٹ آباد)

جواب:

یہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علاماتِ قیامت متعدد بیان فرمائی ہیں، جنہیں اصطلاحِ محدثین میں ''اَشراط الساعة'' کے عنوان کے تحت کتبِ احادیث میں جمع فرمایا ہے، انہی روایات میں ہے: عن انس بن مالک قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا تقوم الساعة حتّٰی یتقارب الزمان فتکون السنة کالشهر والشهر کالجمعه وتکون الجمعة کالیوم ویکون الیوم کالساعة وتکون الساعة کالضرمة۔

ترجمہ:'' حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ زمانہ باہم قریب ہو جائے گا، پھر سال مہینے کی طرح ہو جائے گا اور مہینہ ہفتے کی طرح، اور ہفتہ دن کی مانند اور دن ایک گھڑی کی مانند اور ایک گھڑی چنگاری کی مانند ہو جائے گی، (سنن الترمذی، رقم الحدیث:2332 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

'' تقارب زمانی'' کے حقیقی اور قطعی معنی کیا ہیں؟، یہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ ہی کو معلوم ہے، لیکن ہماری فہمِ ناقص میں جو معنی ومفہوم بظاہر مراد ہو سکتے ہیں، وہ یہ ہیں:

(1) یہ کہ زمانے سے برکت اٹھ جائے گی، اور مقاصدِ خیر کے لئے اس کی افادیت کم ہو جائے گی۔

(2) لوگ اپنے مشاغلِ دنیا اور لہو ولعب میں اس قدر مشغول ہو جائیں گے کہ اعمالِ خیر اور

فکرِ آخرت کے لئے ان کے پاس فرصت ہی نہیں ہوگی، ترغیباتِ دنیا میں مشغولیت، فراوانیِ تعیّشات، فواحش و منکرات کا عام ہونا اور خواہشاتِ نفس کے پیروکاروں کے لئے ان کا حصول آسان ہونا اور ان میں ہمہ وقتی انہماک، کثرتِ مال کی خواہش اور حصول، ان لذات میں انسان اتنا کھو جائے گا کہ اسے سال مہینوں میں، مہینے ہفتوں اور ہفتے دنوں میں اور دن لمحوں میں اور لمحے آگ کے شراروں تک گزرتے ہوئے محسوس ہوں گے، لیکن لذّتِ کام ودہن، ہوائے نفس اور جنسی شہوات کی پیاس بجھ نہیں پائے گی۔

(3) جس طرح رنج والم، دردوکرب اور آفت وبلا کے زمانے میں ایک ایک پَل کا گزرنا دشوار ہوجاتا ہے، لگتا ہے کہ وقت ٹھہر گیا ہے، ایک ایک گھڑی قیامت بن کر گزر رہی ہے، حالانکہ کمیت کے اعتبار سے شب وروز اور مہ وسال کے پیمانے وہی ہوتے ہیں، گردشِ لیل ونہار کا دورانیہ وہی رہتا ہے، لیکن مصیبت کا ایک ایک پَل بھاری ہوجاتا ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے وقت یا مکان کی مقدار اور ظرفیت تو وہی رہتی ہے، لیکن برکت سے کیفیتِ اجر اور مقدارِ اجر میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے۔

ذیل میں احادیث ملاحظہ کیجئے:

(1) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ فی الجماعۃ تضعف علیٰ صلوتہ فی بیتہ وفی سوقہ خمسا وعشرین ضعفا۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کے گھر یا بازار میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں باجماعت نماز پڑھنے کا ثواب پچیس گنا زیادہ ہے، (صحیح بخاری ومسلم)''۔

(2) عن عبد اللّٰہ بن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ: صلوٰۃ الجماعۃ تفضل صلوۃ الفذِ بسبع وعشرین درجۃ۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: باجماعت نماز کا ثواب انفرادی نماز سے ستائیس درجے زیادہ ہے، (صحیح بخاری ومسلم)''۔

(3)عن انس بن مالک قال : قال رسول اللہ ﷺ : صلوۃ الر جل فی بیتہ بصلوۃ وصلوتہ فی مسجد القبائل بخمس وعشرین صلوٰۃ وصلوتہ فی مسجد الذی یجمع فیہ بخمس مائۃ صلوٰۃ وصلوتہ فی المسجد الا قصیٰ بخمسین الف صلوۃ وصلوٰتہ فی مسجدی بخمسین الف صلوۃ وصلوتہ فی المسجد الحرام بمأۃ الف صلوٰۃ۔

ترجمہ:''انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کے گھر پر (فرض) نماز پڑھنے کا ثواب ایک نماز کے برابر ہے، اوراس کا اپنے (محلے یا) قبیلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب 25 نمازوں کے برابر ہے، اوراس جامع مسجد میں پڑھنے کا ثواب 500 نمازوں کے برابر ہے، اوراس کا مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اوراس کا مسجد الحرام میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، (ابن ماجہ)''۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عبادت ایک ہی ہے لیکن مقامات کے اعتبار سے اجر وثواب کے پیمانے بڑے ہوجاتے ہیں، اسے ہم برکت سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے: شب قدر کی فضیلت ایک ہزار مہینوں کے برابر ہے (سورۃ القدر:3)۔

تقارب زمانی کا ایک معنی یہ ہوسکتا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی کو کشادہ کر کے فرمایا: بعثت انا والساعۃ کھاتین وجمع بین اصبعیہ۔

ترجمہ:''میرے اور قیامت کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے، جیسے میری ان دو انگلیوں کے درمیان''، (سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث 4040 دارالفکر، بیروت)''۔

قرآن نے بھی فرمایا: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ترجمہ:''قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہوکر (دوٹکڑے) ہوگیا، (سورۃ القمر:1)''۔دراصل انگشت ہائے مبارک کا درمیانی فاصلہ اگرچہ کم ہے، لیکن آپ نے پورے کرۂ زمین کا نقشہ بنا ہوا دیکھا ہوگا جو چند فٹ کے کاغذ پر سما جاتا ہے، مگر اس میں نیچے اسکیل لکھا ہوتا ہے، کہ اس نقشے میں ایک انچ کی لکیر کئی ہز

ارمیٹر کو تعبیر کررہی ہے، ہوسکتا ہے کہ یہی کیفیت حضور ﷺ کی مبارک انگلیوں کے درمیانی فاصلے کی ہو۔(4) چونکہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم غیب سے معلوم تھا کہ ابتدائے تخلیق کائنات سے آپ کے عہد مبارک تک کتنا طویل عرصہ گزر چکا ہے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے کروڑ سال گزر چکے ہیں، ماہرین ارضیات اپنے علم طبیعات وارضیات کے مطابق بعض چیزوں کی عمر کروڑوں سال بتاتے رہتے ہیں، تو علم نبوت میں ان کروڑوں سال کے مقابلے میں قیام قیامت تک اتنی ہی مدت باقی ہو جسے آپ نے تقابل کرتے ہوئے دو انگلیوں کے درمیانی فاصلے سے تعبیر کیا، اور جوں جوں قیامت قریب ہوتی چلی جائے گی، کائنات کی عمر اپنی کل مدت تخلیق کے اعتبار سے اسی طرح گھٹی ہوئی نظر آئے گی۔

زمانے کو برا کہنے کی ممانعت

سوال :9

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ غلطی کرتے ہیں، گناہ کرتے ہیں، انہیں اس پر ٹوکا جائے تو یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ کیا کریں زمانہ ہی برا ہے، پہلے کہتے تھے ''چودھویں صدی ہے''، اب کہتے ہیں: ''پندرہویں صدی ہے'' یہ سب کچھ تو ہونا ہے، کیا یہ رویہ یا طرز عمل درست ہے؟ شریعت مطہرہ اور کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیجئے۔(نعیم الرحمن، کوہاٹ)۔

جواب :

یہ سوچ، یہ انداز فکر بالکل غلط اور باطل ہے، یہ وہی فریب نفس ہے اور اغواء نفس ہے جس سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں تعلیم امت کے لئے ارشاد فرمایا کرتے تھے: "نعوذ باللہ من شرور انفسنا "یعنی اے اللہ! ہم اپنے نفس کی شرارتوں اور فکری کجروی سے تیری پناہ میں آتے ہیں۔''زمانہ'' کیا ہے، گردش لیل ونہار کا نام ہے، مرور ایام کا نام ہے، دنوں، ہفتوں اور ماہ وسال کے گزرنے کا نام ہے، سورج وہی ہے، چاند وہی ہے، زمین وہی ہے، نظام قدرت بھی وہی ہے، لہٰذا زمانے کا کیا قصور، قصور

ہر شخص کا اپنا ہے، کوتاہی عمل ہر ایک کی اپنی ہے، اور ہر ایک اپنے عمل کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝۲۱۔

ترجمہ: ''ہر شخص اپنے اعمال کے عوض رہن ہے''، (الطور:21)۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ''، ترجمہ ''ہر شخص اپنے عمل کے بدلے رہن ہے''، (المدثر:38)۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا،

ترجمہ: ''بلا شبہ (قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی) سماعت بصارت اور فہم وادراک (کی ساری صلاحیتوں) کے بارے میں باز پرس ہوگی''، (بنی اسرائیل:36)۔

لہٰذا کسی شخص کا اپنی کوتاہی فکر وعمل کے لئے زمانے کو برا کہنا یا اسے جواز بنانا ہرگز درست نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال النبی ﷺ: '' قال اللہ: یؤذینی ابن آدم، یسبّ الد ھر وانا الد ھر، بیدی الامر، اقلب اللیل والنھا ر۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بنی آدم مجھے اذیت دیتا ہے، (وہ اس طرح کہ) وہ دہر (زمانے) کو گالی دیتا ہے، حالانکہ ''دہر'' تو میں ہوں، زمانے پر قبضہ واختیار میرا ہی ہے، گردش ولیل ونہار میں کرتا ہوں، (صحیح بخاری ومسلم رقم الحدیث 6181-7491)''۔ اس حدیث کی شرح میں علامہ یحییٰ بن شرف الدین نووی لکھتے ہیں: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: اناالدّھر (یعنی میں زمانہ ہوں) اور یہ اطلاق مجازی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ میں زمانے اور زمانے کے اندر پیدا ہونے والے حوادث وواقعات کا خالق ہوں، اس کا سبب یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کی عادت تھی کہ جب کوئی اندوہناک حادثہ ہوتا تو وہ زمانے کو برا کہتے تھے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: زمانے کو برا مت کہو، کیونکہ جن مصائب وحوادث کی بنا پر تم زمانے کو برا کہہ رہے ہو، وہ تمام حوادث اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، کیونکہ

وہی ہر چیز کا خالق ہے، (شرح صحیح مسلم للنووی ج 2 ص 237 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی)۔اس حدیث کی شرح میں علامہ امام حافظ بن احمد بن علی بن حجر عسقلانی لکھتے ہیں :ایک روایت میں یہ بھی ہے: ولا تقولوا خیبۃ الدھر ،یعنی یوں نہ کہو کہ ہائے زمانے کی محرومی، ناکامی، آگے چل کر وہ فرماتے ہیں: زمانے کو برا کہنے سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا رد ہے جو زمانے کو حوادث وآفات کا فاعل حقیقی یا مؤثر حقیقی مانتے ہیں، یہ نظریہ باطل ہے، کیونکہ فاعل حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہے، جب مصائب نازل کرنے والے کو برا کہو گے، تو یہ "برا کہنا" اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گا، لہٰذا اس حدیث کے ظاہری کلمات کی تین تاویلیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی زمانے میں ہونے والے جملہ امور کی تدبیر فرمانے والا ہے، دوسری یہ کہ: اللہ تعالیٰ ہی زمانے کا مالک ومختار ہے، تیسری یہ کہ: اللہ تعالیٰ ہی گردشِ لیل ونہار فرمانے والا ہے، اسی لئے ان کلمات کے بعد فرمایا: "بیدی اللیل والنھار "، شب وروز کا نظام میرے دست قدرت میں ہے، (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، ج:10، ص:565-564)"۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ۔

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ گردشِ لیل ونہار کا (نظام) فرماتا ہے، بلاشبہ اس میں اہل عقل وخرد کے لئے (بڑی) نصیحت ہے، (النور:44)"۔

﴿کتاب الطہارۃ﴾

غسل کے بعد وضو

سوال:10

پاک ہونے کے لئے غسل کا طریقہ کیا ہے؟ کیا غسل کرنے کے بعد وضو کرنا ضروری ہے؟، (عبدالجبار پردیسی، لانڈھی)۔

جواب:

آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غسلِ واجب کا طریقہ دریافت کررہے ہیں، ناپاکی یا جنابت کی حالت میں غسل کا طریقہ یہ ہے: پہلے دونوں ہاتھ گٹوں تک دھوئیں، بدن پر جہاں کہیں نجاست لگی ہو، اس کو دور کریں، پھر وضو کریں، پھر تین مرتبہ داہنے کندھے پر اور تین مرتبہ بائیں کندھے پر پانی بہائیں، پھر سر پر اور تمام بدن پر تین مرتبہ پانی بہائیں۔ اور اگر ایک ساتھ سارے بدن پر تین مرتبہ پانی بہادیا، جیسے آج کل شاور کے نیچے غسل کرتے ہیں، تو بھی درست ہے اور کسی نہر یا بڑے تالاب میں بھی غسل کرسکتے ہیں۔

عن عائشة رضی اللہعنها قالت کانت رسول اللہ ﷺ اذااغتسل من الجنابة دعابشئی نحو الحلاب فاخذ بکفه بدأبشق رأسه الایمن،ثم الایسر، ثم اخذ بکفیه فقال بهما علیٰ رأسه۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کا ارادہ کرتے، تو (دودھ دان کی قسم کا) ایک برتن منگواتے، پھر اس سے پانی لے کر پہلے سر کی دائیں جانب دھوتے، پھر بائیں جانب، پھر دونوں ہاتھوں سے پانی لے کر سر پر بہاتے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:710)''۔ غسلِ جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں اندر تک پانی ڈالنا فرض ہے، غسلِ طہارت اور غسلِ مسنون میں فرض نہیں، سنت ہے۔ غسل کرنے کے بعد نماز پڑھنے کے لئے وضو کی ضرورت نہیں رہتی، اگر غسل میں پورے بدن پر

پانی ڈالنے سے پہلے صحیح طریقے سے کلی کرلی ہے اور ناک میں پانی ڈال لیا ہے، تو اب غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہے، غسل کے لئے نیت کرنا سنت ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد زچہ اور بچہ کا غسل

سوال:11

کئی ایک گھرانوں میں جب بچے کی پیدائش ہوتی ہے، تو پیدائش کے وقت بچے کو غسل دینے کے بعد چالیس روز تک نہ ماں غسل کرتی ہے، اور نہ ہی بچے کو غسل دیا جاتا ہے، کیا یہ عمل صحیح ہے یا غلط؟، (برکت علی، گلشن اقبال، کراچی (معرفت دین ودانش، روزنامہ ایکسپریس)۔

جواب:

بچے کی پیدائش کے بعد ضرورت کے وقت اس بچے کو غسل دینے کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور یہ نظریہ غلط ہے کہ ایک مرتبہ غسل دینے کے بعد اسے دوبارہ غسل نہیں دے سکتے، سوائے اس کے کہ ڈاکٹر طبی طور پر غسل دینے کو اس کے لئے نقصان دہ قرار دے۔ بچے کی پیدائش کے بعد ماں (زچہ) کے رحم سے جو خون جاری ہوتا ہے، اس کو نفاس کہتے ہیں، شرعی اعتبار سے نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے، اگر چالیس دن تک اس کا خون جاری رہتا ہے، تو اس عرصے میں وہ شرعی طور پر ناپاک رہے گی، اور ان ایام میں وہ نماز نہیں پڑھے گی اور نہ ہی بعد میں اس پر ان نمازوں کی قضا ہے، اسی طرح اس کے لئے قرآن کو چھونا اور زبانی قرآن کی تلاوت کرنا بھی منع ہے، البتہ کلماتِ قرآن بطورِ ذکر، تسبیح و دعا پڑھ سکتی ہے۔ اگر خون چالیس دن کے بعد بھی جاری رہتا ہے، تو اب یہ ''نفاس'' نہیں ہے، بلکہ وہ غسل کرکے پاک ہوجائے اور نمازوں کا سلسلہ شروع کردے، ہاں اگر خون اتنی دیر بھی نہ رکتا ہو کہ ایک وقت کی نماز پڑھ لے، تو ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرکے نماز پڑھ لیا کریں (وضو سے پہلے خون آلود مقام دھولیں)، اور اس وقت کے اندر مزید جتنی قضا نمازیں، نوافل وغیرہ پڑھ سکتی ہوں، پڑھ لیں اور تلاوت بھی کرسکتی ہیں۔ شرعاً نفاس کی کم از کم کوئی مقرر مدت نہیں ہے، بس جس دن خون رک جائے، وہ غسل کرکے پاک ہولے اور نماز کا سلسلہ شروع کردے، اگر نہیں کرے گی، تو گنہگار ہوگی اور وہ نمازیں اس

کے ذمے قضا ہوں گی۔ تاہم جب تک نفاس کا سلسلہ جاری ہے، وہ شرعی پاکی کے لئے
تو غسل نہیں کرے گی، البتہ جسمانی میل پسینہ دور کرنے کے لئے، طبیعت کے تکدر اور
انقباض کو دور کرنا چاہے تو غسل کرسکتی ہے۔

﴿کتاب الصلوة﴾

طلوع آفتاب سے پہلے نمازِ عید

سوال:12

طلوع آفتاب ہونے پر کتنی دیر تک نماز پڑھنا مکروہ ہے؟ ایک دیوبندی امام نے نمازِ عید الاضحیٰ کی جماعت صبح سات بج کر پچیس منٹ پر کھڑی کر دی جبکہ اس روز طلوع آفتاب سات بج کر سترہ منٹ پر تھا۔ کیا ان کی نمازِ عید ہوگئی یا نہیں؟ نیز کورنگی میں واقع دارالعلوم کراچی کے نماز سے متعلق نظام الاوقات کے نقشے کے مطابق طلوع آفتاب کے بعد صرف دس منٹ تک نماز پڑھنا مکروہ ہے جبکہ ہم اہلسنت و جماعت کے یہاں طلوع آفتاب سے لے کر بیس منٹ تک مکروہ وقت ہے، جیسا کہ بہار شریعت وغیرہ کتب میں مذکور ہونے کے ساتھ ساتھ عمل بھی اسی پر ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ پر تفصیلی اور مدلل روشنی ڈالیں، (عبداللہ قادری، کراچی)۔

جواب:

اوقات مکروہہ (طلوع، غروب اور نصف النہار شرعی) ان تینوں وقتوں میں کوئی نماز نہ فرض نہ واجب نہ نفل نہ ادا نہ قضا یونہی سجدۂ تلاوت بھی جائز نہیں ہاں اگر اس دن کی نمازِ عصر ادا نہ کی ہو تو اگرچہ سورج غروب ہو رہا ہو تو بھی پڑھ لے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ثلاث ساعات لا تجوز فیها المکتوبة ولا صلاة الجنازة ولا سجدة التلاوة اذا طلعت الشمس حتی ترتفع وعند الانتصاف الی أن تزول وعند احمرارها الی أن تغیب الا عصر یومه ذالك فانه یجوز اداؤه عند الغروب هکذا فی فتاویٰ قاضی خان۔

ترجمہ: ”تین ساعتیں جن میں کسی قسم کی نماز، نمازِ جنازہ، سجدۂ تلاوت جائز نہیں، جب سورج طلوع ہونا شروع ہو یہاں تک کہ بلند ہو جائے اور نصف النہار شرعی سے نصف

النہار حقیقی یعنی آفتاب ڈھلنے تک ہے، آفتاب کے زرد ہونے سے غروب تک مگر یہ کہ اس دن کی نمازِ عصر غروب کے وقت بھی پڑھ لے، فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:54 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''جب سے آفتاب کی کرن چمکے اس وقت سے بیس منٹ گزرنے تک نماز ناجائز اور وقتِ کراہت ہوا، اور ادھر جب غروب کو بیس منٹ رہیں، بوقت کراہت آجائے گا، اور آج کی عصر کے سواء ہر نماز منع ہو جائے گی، (فتاویٰ رضویہ جلد:5، ص:138، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔ سائل کے مطابق مذکورہ دیو بندی امام نے سات بج کر پچیس منٹ پر عید کی نماز کھڑی کردی، یہ نماز مکروہ ہوئی، کیونکہ طلوعِ آفتاب اور نماز میں آٹھ منٹ کا وقفہ ہوا اور امام احمد رضا قادری کے نزدیک طلوعِ آفتاب کے کم از کم بیس منٹ بعد نماز پڑھنی چاہئے، اس سے پہلے پڑھی تو مکروہ ہوگی۔ دار العلوم کراچی کے نظام الاوقات کو بھی اگر صحیح مان لیا جائے، تو اس کی رو سے بھی طلوعِ آفتاب کے دس منٹ بعد تک نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور استفتاء میں درج صورتِ مسئلہ کے مطابق مذکورہ امام نے طلوعِ آفتاب کے آٹھ منٹ بعد نمازِ عید کی جماعت کھڑی کی، لہٰذا سب کی نماز مکروہ ہوئی اور اس کی ذمہ داری امام پر عائد ہوتی ہے۔ نمازِ عید سے متعلق علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ووقت صلاة العيدين من حين تبيض الشمس الى ان تزول كذافى السراجية وكذا فى التبيين۔ والافضل أن يعجل الاضحى ويؤخر الفطر كذا فى الخلاصه۔

ترجمہ: ''اور نمازِ عیدین کی ادائیگی جب سورج روشن ہو جائے، سے اس کے زوال (نصف النہار شرعی) تک ہے، ''سراجیہ'' اور ''تبیین'' میں اسی طرح ہے عید الاضحیٰ میں جلدی اور عید الفطر میں تاخیر کرنا افضل ہے، ''خلاصہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:150 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

طلوع سے مراد آفتاب کا کنارہ ظاہر ہونے سے اس وقت تک ہے کہ اس پر نگاہیں خیرہ

ہونے لگیں جس کی مقدار کنارہ چمکنے سے بیس منٹ تک ہے۔

تارکِ صلوٰۃ کا شرعی حکم

سوال:13

بے نمازی کے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ترک نماز کرنے والا کافر ہوجاتا ہے؟، (محمد عمیر، بلدیہ ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

نماز اسلام کا بنیادی رکن ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کو بیان کرتے ہوئے توحید ورسالت کی شہادت کے بعد نماز کا ذکر فرمایا۔قرآن میں ترکِ نماز پر بڑی وعید آئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾

(1) ترجمہ: ''پھران کے بعد ایسے ناخلف آئے، جنہوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشات کی پیروی کی، تو عنقریب وہ (جہنم کے گڑھے) غی میں جاگریں گے، (مریم:59)''

كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِيۡنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّاۤ اَصۡحٰبَ الۡيَمِيۡنِ ﴿۳۹﴾ فِىۡ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمۡ فِىۡ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوۡا لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّيۡنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمۡ نَكُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡكِيۡنَ ﴿۴۴﴾

(2) ترجمہ: ''ہر شخص اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہے، سوائے دائیں طرف والوں کے، وہ جنتوں میں (ہوں گے اور) مجرموں کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں گے، (پھر وہ مجرموں سے کہیں گے) کون سا جرم تمہارے دوزخ میں داخل ہونے کا سبب بنا؟، وہ کہیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، (المدثر:44-38)''۔

فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ﴿۴﴾ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ﴿۵﴾

(3) ترجمہ: ''سو ان نمازیوں کے لئے ہلاکت ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں،

(الماعون:5-4)''۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

(4) ترجمہ: '' بے شک منافق اپنے (زعم میں) اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں، درآں حالیکہ اللہ ان کو دھوکے کی سزا دینے والا ہے، اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی (اور بے دلی) سے اور وہ اللہ کا ذکر (تو) بہت ہی کم کرتے ہیں، (النساء:142)''۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: (هی فرض عین علی مکلف۔۔۔۔۔ویکفر جاحدها) لثبوتها بدلیل قطعی (وتارکها عمدا مجانة) أی تکاسلا فاسق (یحبس حتی یصلی) لانه یحبس لحق العبد فحق الحق احق۔ الخ

ترجمہ: '' ہر مکلف یعنی عاقل و بالغ پر نماز فرض عین ہے، اس کی فرضیت کا منکر کافر کیونکہ نماز کا ثبوت دلیل قطعی سے ہے اور جو قصداً چھوڑے، (اگرچہ ایک ہی وقت کی)، وہ فاسق ہے، (جو نماز نہ پڑھتا ہو) اسے قید کیا جائے گا، یہاں تک کہ (وہ توبہ کرے) اور نماز پڑھنے لگے، کیونکہ جب بندے کے حق کی وجہ سے قید کیا جاتا ہے تو اللہ کا حق اس کا زیادہ حقدار ہے کہ (اس کی نافرمانی پر) اسے قید کیا جائے۔

نمازی کے حکم کے بارے میں ائمہ کے اقوال نقل کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں:

(قوله وعندالشافعی یقتل) وکذا عند مالک واحمد وفی روایة عن احمد وهی المختارة عندجمهور اصحابه انه یقتل کفراوبسط ذالک فی الحلیة ۔

ترجمہ: '' صاحب درمختار کا قول کہ وعندا لشافعی یقتل یعنی امام شافعی کے نزدیک بے نمازی کو قتل کیا جائے گا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی مذہب امام احمد بن حنبل کا بھی ہے اور امام احمد بن حنبل سے ایک قول جو کہ ان کے اصحاب کے نزدیک قول مختار بھی ہے یہ منقول ہے کہ (بے نمازی کو) ان کے کافر ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور حلیہ میں میں اس مسئلے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2

ص:6,7 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی ترکِ نماز پر وعید آئی ہے:

(1)عن جابر قال:قال رسول اللہ ﷺ:بین العبد و بین الکفر ترک الصلوۃ ۔

ترجمہ:''بندے اور کفر کے درمیان فرق نماز کا ترک ہے،(مشکوٰۃ:بحوالہ صحیح مسلم)''۔

(2)عن عبداللّٰہ بن شقیق قال:کان اصحاب رسول اللہ ﷺ لا یرون شیئامن الاعمال ترکہ کفراغیر الصلوۃ ۔

ترجمہ:''عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نماز کے علاوہ کسی بھی عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے (یعنی اس کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے)،(مشکوٰۃ:بحوالہ ترمذی)''۔

(3)عن ابی الدرداء قال:اوصانی خلیلی ان لا تشرک باللّٰہ شیئا وان قطعت وحرقت ولاتترک صلوٰۃ مکتوبۃمتعمدا فمن ترکھا متعمدا فقد برأت منہ الذمۃ ولا تشرب الخمر فانھا مفتاح کل شر۔

ترجمہ:''ابوالدرداء بیان کرتے ہیں کہ: مجھے میرے (محبوب) دوست (رسول اللہ ﷺ) نے وصیت فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا خواہ تجھے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے اور جلا دیا جائے (یہ حکم عزیمت پر مبنی ہے، کم ہمت لوگوں کے لئے حالتِ اکراہ میں قرآن نے رخصت رکھی ہے) اور کسی فرض نماز کو جان بوجھ کر (ہرگز) نہ چھوڑنا، پس جس نے (فرض نماز کو) قصداً چھوڑا اس سے (اللہ اور رسول کا) ذمہ (یعنی عہد اور امان) اٹھ گیا اور شراب نہ پینا کیونکہ یہ ہر برائی کی کنجی ہے،(مشکوٰۃ: بحوالہ ابن ماجہ)''۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ:''اس امر پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ نماز ہر بالغ، عاقل، طاہر مسلمان پر فرض ہے، سوائے اس خاتون کے جو حالتِ حیض یا نفاس میں ہو یا جو شخص مجنون ہو یا بیہوشی کی

حالت میں ہو۔ یہ خالص بدنی عبادت ہے، اس میں نیابت قطعاً قبول نہیں کی جائے گی، لہٰذا کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے نماز پڑھنا صحیح نہیں جیسے کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے روزہ رکھنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار کرے، وہ کافر و مرتد ہے۔ کیونکہ نماز کی فرضیت قرآن، سنت اور اجماع کے قطعی دلائل سے ثابت ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اور جو شخص سستی اور کاہلی کی بنا پر نماز ترک کرے وہ فاسق اور گنہگار ہے۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: نماز کا ترک دنیوی اور اخروی عذاب کا باعث ہے، (اور اس مقام پر وہ ان قرآنی آیات واحادیث سے استدلال کرتے ہیں، جو ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں)۔۔۔ آگے چل کر ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: سستی کی بنا پر یا حقیر جانتے ہوئے نماز کو ترک کرنے کے احکام فقہاء کے نزدیک یہ ہیں:

حنفیہ کے نزدیک تارک الصلوٰۃ فاسق ہے، اسے قید کیا جائے گا اور تعزیری سزا دی جائے گی، یہاں تک وہ توبہ کرے اور نماز پڑھنا شروع کر دے یا قید خانے ہی میں اس کی موت واقع ہو جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب تارک صلوٰۃ کے بارے میں بہت سخت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: تارک صلوٰۃ کو بر بناء کفر قتل کر دیا جائے گا، شوکانی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور کہتے ہیں: حق یہ ہے کہ تارک صلوٰۃ کافر ہے اسے قتل کیا جائے گا اور بعض انواع کفر مغفرت اور استحقاق شفاعت سے مانع نہیں ہیں۔ بعض ائمہ کے نزدیک بلا عذر تارکِ صلوٰۃ سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا، اگر وہ توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا، اور مالکی اور شافعیہ کے نزدیک یہ قتل بطور حد ہوگا بر بناء کفر نہیں ہوگا یعنی اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے، ایسے شخص کی وفات کے بعد اسے غسل دیا جائے گا، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا، (الفقہ الاسلامی وادلتہ ص: 502 تا 505، دار الفکر، دمشق)''۔

تارکِ صلوٰۃ کے بارے میں سب سے نرم اور صائب موقف امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے اور وہ یہ کہ بلا عذر شرعی تارکِ صلوٰۃ فاسق و فاجر ہے، قابلِ تعزیر ہے، اسے قید کیا

جاسکتا ہے تاوقتیکہ وہ توبہ کرکے نماز پڑھنا شروع کردے،لیکن اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔
اس عنوان سے متعلق قرآن مجید کی آیات مبارکہ اور احادیث شریفہ کو یکجا کرکے دیکھا جائے
توامام اعظم کا موقف ہی صائب اور درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ
ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ اس (جرم) کو تو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا جائے اور اس سے کم تر جو بھی گناہ ہوں، جس کے لئے چاہے، اسے معاف فرمادیتا ہے، (النساء:48)''۔اس آیہ مبارکہ میں شرک کے سوا ہر گناہ کی مغفرت کی گنجائش موجود ہے، خواہ وہ کسی درجے کا ہو اور یہ مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔حدیث مبارکہ ہے: من قال لاالٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ ۔''یعنی جس شخص نے صدق دل سے کلمۂ طیبہ پڑھا وہ (آخر کار کسی نہ کسی مرحلے پر) جنت میں داخل ہوگا''۔وہ احادیث جن میں ترکِ نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے، انہیں نماز کی فرضیت کے انکار پر محمول کیا جائے گا، یعنی جو نماز کی فرضیت کا منکر ہوتے ہوئے نماز کا تارک ہو تو وہ بالاجماع کافر ہے، ایسا شخص ملتِ اسلام سے خارج ہے، البتہ جو شخص فرضیتِ نماز کا عقیدہ تو رکھتا ہے لیکن کوتاہی کی بنا پر نماز کا تارک ہے تو وہ ائمۂ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمھم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک فاسق ہے۔حدیث میں جو ترکِ نماز کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں اس سے مراد اعتقاداً ترک کرنا ہوگا، یعنی انکارِ فرضیت یا تارکِ صلوٰۃ کے ظاہر حال کو بیان کیا گیا ہے کہ عملاً اس میں اور ایک کافر میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

ظہر کی پہلے کی چار سنتیں چھوٹ جائیں تو کب پڑھے؟

سوال:14

ظہر کی چار سنتیں جو پہلے پڑھی جاتی ہیں، اگر وہ فرض ادا کرنے سے پہلے نہ پڑھ سکیں تو ان کی معافی ہے؟ یا پڑھا جائے گا۔اگر پڑھنی ہے تو کس طرح؟ جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں، (عبداللہ، کراچی)۔

جواب:

سنتیں بعض مؤکدہ ہیں جن کی ادا کرنے کے لئے شریعت میں تاکید فرمائی اور شارع علیہ السلام نے اس پر ہمیشگی اختیار فرمائی اور اس کے بے پناہ اجر وثواب کو بیان فرمایا:

عن أم حبيبة قالت : قال رسول الله ﷺ : "من صلّى قبل الظهر أربعاً وبعدها أربعاً حرمه الله على النار"۔

ترجمہ: ''ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ظہر سے پہلے چار اور بعد میں چار رکعتیں (ہمیشہ) پڑھے اللہ تعالیٰ اس کو آگ پر حرام فرمادے گا، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 427)''۔

عن عنبسة بن ابى سفيان قال: سمعت اختى أم حبيبة زوج النبى ﷺ تقول : سمعت رسول الله ﷺ يقول : "من حافظ على أربع ركعات قبل الظهر وأربع بعدها حرمه الله على النار "۔

ترجمہ: عنبسہ بن ابو سفیان فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی ہمشیرہ، زوجِ نبی ﷺ (ام حبیبہ) کو فرماتے ہوئے سنا کہ وہ بیان کرتی ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص ظہر سے پہلے چار رکعات اور ظہر کے بعد کی چار رکعات کی حفاظت کرے، اللہ تعالیٰ اس کو آگ پر حرام فرمادے گا، (سنن ترمذی رقم الحدیث: 428)''۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ علی القاری لکھتے ہیں: ''حدیث میں ظہر کے بعد جن سنتوں کا ذکر ہے ان میں سے دو سنت ہیں اور دو مستحب، لہٰذا افضل یہ ہے کہ یہ الگ الگ دوگانے کی شکل میں پڑھی جائیں، ظہر سے پہلے کی چار سنتوں کے برعکس کہ وہ ایک سلام کے ساتھ پڑھی جائیں گی، جہاں تک یہ سنتیں پڑھنے پر غیر معمولی اجر، (یعنی یہ کہ وہ شخص جہنم کی آگ پر حرام کی نوید کا مسئلہ) ہے، اس سے یا تو مراد یہ ہے کہ وہ دائمی طور پر جہنم میں نہیں رہے گا یا یہ کہ جو شخص سنتوں اور مستحبات کا اتنا اہتمام کرتا ہے، وہ فرائض وواجبات کا اس سے بھی زیادہ پابند ہوگا اور محرمات سے بھی اجتناب کرنے والا ہوگا، تو یقیناً جہنم سے محفوظ رہے گا،

(مرقات المفاتیح، ج:3،ص:113 مکتبۂ امدادیہ،ملتان)''۔

عن عائشة: ان النبی ﷺ کان اذالم یصل اربعاقبل الظهرصلاهن بعدہٗ۔

ترجمہ:''(امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ)حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جب ظہر سے پہلے کی چار سنتیں نہ پڑھی ہوتیں،تو انہیں بعد میں پڑھ لیتے،(سنن ترمذی رقم الحدیث:426ج:1،ص:319 دارالکتب العلمیہ،بیروت)''۔

سنتِ مؤکدہ کوسنن الہدیٰ بھی کہتے ہیں،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

والسنة نوعان : سنة الهدیٰ ، وترکها یوجب اساء ۃ وکراهیة کالجماعة والأذان والاقامة ونحوها۔

ترجمہ:''سنت کی دوقسم ہیں:(جس میں سے ایک)سنن الہدیٰ (سنتِ مؤکدہ) بھی ہے، اوران کا ترک کرنا،موجب گناہ اور باعثِ کراہیت ہے جیسے کہ جماعت،اذان واقامت اور(ان جیسے دیگر)امورکا ترک کرنا،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 1 ص:196 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی،بیروت)''۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وأما الاربع قبل الظهر اذا فاتته وحدها بان شرع فی صلاۃ الامام ولم یشتغل بالاربع فعامتهم علی أنه یقضیها بعد الفراغ من الظهر مادام الوقت باقیا وهوالصحیح هکذا فی المحیط۔ وفی الحقائق یقدّ م الرکعتین عندهما وقال محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ یقدّم الاربع وعلیه الفتوی کذا فی السراج الوهاج ۔

ترجمہ:''(جب ظہر کی جماعت کھڑی ہوجائے)اور(مقتدی کے)امام کے ساتھ(جماعت میں)شامل ہونے کی وجہ سے ظہر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جائیں،توعام فقہائے کرام کی رائے یہ ہے کہ جب تک وقت باقی ہے،(ظہر کے فرائض سے) فارغ ہونے کے بعد پڑھ لے،یہی صحیح ہے،''محیط'' میں اسی طرح ہے،اور''حقائق''میں ہے کہ شیخین (امام اعظم اور امام ابویوسف رحمہما اللہ تعالیٰ) کے نزدیک (بعدوالی) دورکعتیں پہلے پڑھے،(اور پھر ظہر کی پہلی چار سنتیں جوچھوٹ گئی ہیں،پڑھے)امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پہلے والی چار

(سنتیں) پہلے پڑھے (اور پھر بعد والی دو پڑھے) اور اسی پر فتویٰ ہے، ''السراج الوہاج'' میں اسی طرح ہے، (عالمگیری، ج:1، ص:112، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ظہر یا جمعے کے پہلے کی سنت فوت ہوگئی اور فرض پڑھ لئے تو اگر وقت باقی ہے، بعد فرض کے پڑھے، اور افضل یہ ہے کہ پچھلی سنتیں پڑھ کر ان کو پڑھے، (فتح القدیر)، (بہارِ شریعت ج:4، ص:101، ضیاء القرآن پبلیکشنز، کراچی)''۔

ظہر سے پہلے کی چھوٹی ہوئی چار سنتوں کو پچھلی دو سنتوں کے بعد پڑھنا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ پہلے والی چار تو اپنی جگہ سے ہٹ چکی ہیں، تو بعد والی دو تو اپنی جگہ پہ قائم رہنی چاہئیں، یہی شیخین کا مذہب ہے اور صاحب فتح القدیر کا مختار ہے۔

جہاں زمین کے نیچے سیوریج لائن گزر رہی ہے، اس جگہ پر نماز پڑھنا

سوال:15

ہمارے گھر میں فرش کے نیچے گٹر کا پائپ گزر رہا ہے۔ کیا اُس فرش پر نماز ہو جاتی ہے؟، (بخت ولی، راولپنڈی)۔

جواب:

نمازی کے بدن، اس کے کپڑے اور جائے نماز (جس جگہ نماز پڑھ رہا ہے) کا نجاستِ حقیقیہ قدرِ مانع سے پاک ہونا، نماز کی شرائط میں سے ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ولو كان رقيقاً وبسطه على موضع نجس ، ان صلح ساتراً للعورة تجوز الصلاة كما في "البحر "عن "الخلاصة"۔وفي "القنية": لو صلّى على زجاج يصف ماتحته قالوا جميعا يجوز ۔

ترجمہ: ''اگر نجس جگہ پر باریک کپڑا بچھا کر نماز پڑھی جو ستر کے کام میں آسکتا ہے (یعنی اس کے نیچے کی چیز نہ جھلکتی ہو) نماز ہوگئی، ''بحر الرائق'' میں ''خلاصہ'' سے اسی طرح منقول ہے۔

''قنیہ''میں ہے: اگر شیشہ پر نماز پڑھی اور اس کے نیچے نجاست ہے اگرچہ نمایاں ہو، نماز ہوگئی، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد2،ص:68 مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

مذکورہ صورت میں چونکہ پائپ فرش کے نیچے سے گزر رہا ہے اور نجاست پائپ کے اندر ہے اور خود پائپ بھی زمین میں دفن ہے اور نمازی نہ تو نجاست پر کھڑا ہے اور نہ ہی اس کے نجاست سے آلودہ ہونے کا کوئی خطرہ ہے، لہٰذا اس مقام پر نماز تو جائز ہے، لیکن اگر اس مقام پر پڑھنے سے طبیعت میں کراہت محسوس ہوتی ہے تو دوسری جگہ پڑھ لیں۔

مسجد میں اپنے لئے اور دوسرے کے لئے جگہ مختص کرنا یا کپڑا رکھ کر محفوظ کرنا

سوال:16

ایک نمازی مسجد میں اپنا رومال، تولیہ یا کوئی کپڑا اس لئے رکھے کہ دوسرے کو وہ جگہ ملے اور وہ آدمی ابھی مسجد میں نہیں ہے کہ جس کیلئے جگہ روک رہے ہیں یا اپنے لئے کسی جگہ کو مقرر کر لے کہ وہاں کسی کو نہ بیٹھنے دے، کیا ایسا کرنا درست ہے؟، (وقاص احمد، کراچی)

جواب:

نماز میں اپنے یا کسی دوسرے شخص کے لئے جگہ مخصوص کرنا مکروہ ہے، حدیث مبارکہ میں ہے:عن جعفربن عبدالله: أن تميم بن محمود اخبره، أن عبدالرحمن بن شبل اخبره، أن رسول الله ﷺ نهىٰ عن ثلاث: عن نقرة الغراب، وأفتراش السبع، وأن يوطن الرجل المقام للصلاة كمايوطن البعير۔

ترجمہ:'' عبدالرحمٰن بن شبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (نماز میں) تین باتوں سے منع فرمایا، کوے کی طرح ٹھونگ مارنا، (یعنی جلدی جلدی سجدہ کرنا کہ پیشانی زمین سے ٹکرائے اور مقدار سنت تین تسبیحات پڑھنے سے پہلے اُٹھ جائے) درندے کی طرح پاؤں بچھا کر بیٹھنا اور مسجد میں کوئی شخص جگہ مقرر کر لے جیسے اونٹ جگہ مقرر کر لیتا ہے، (سنن نسائی، رقم الحدیث:1111)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ویکرہ للانسان ان یخص بنفسہ مکانا فی المسجد یصلی فیہ کذا فی التتارخانیہ۔

ترجمہ: ''کسی شخص کا مسجد میں اپنے لئے کوئی جگہ خاص کر لینا کہ وہیں نماز پڑھے، مکروہ ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: اول، ص: 108، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

لہٰذا مسجد میں نہ کسی کا اپنے لئے پہلے سے جگہ مختص کرنا درست ہے اور نہ دوسرے کے لئے، اس سے اپنے لئے یا دوسرے کے لئے تَعَلّی (یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنے) کا تأثر پیدا ہوتا ہے اور نماز کے من جملہ مقاصد شرعیہ میں سے بندے میں، عجز وانکسار پیدا کرنا ہے اور اپنے نفس کے عُجب (غرور و تکبر) سے بچنا ہے، پھر مسجد ہی تو وہ مقام ہے جہاں انسانوں کے درمیان مساوات قائم ہوتی ہے، جیسے علامہ اقبال نے کہا:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ہاں اگر کوئی شخص پہلے سے مسجد میں صف میں بیٹھا ہوا ہے، اور کوئی صاحب علم، صاحب ورع وتقویٰ آجاتا ہے، اور وہ شخص اس کی دین داری، تقویٰ اور علم کی وجہ سے اس کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے، بشرطیکہ اس صاحب علم وتقویٰ کے دل میں ایسی خواہش نہ ہو کہ علم کی بنا پر اس کی تکریم کی جائے یا کوئی معذور و بیمار ہے اور اسے کنارے میں ٹیک لگا کر بیٹھنا ہے تو اس بنا پر کوئی اس کی رعایت کر کے جگہ چھوڑ دے تو یہ جائز اور مستحسن امر ہے اور محاسنِ اَخلاق میں سے ہے، ہاں کسی کی دنیوی وجاہت ومنصب یا دولت کی وجہ سے اسے تکریم دی جائے تو یہ شرعاً ناپسندیدہ امر ہے۔

نماز میں اقامت کہنے والے کا امام بننا یا امام کا خود ہی اقامت کہہ دینا

سوال:17

اگر مؤذن صاحب نے اقامت کہی اور امام صاحب کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے خود مصلے پر نماز پڑھانے آگئے تو کیا اس صورت میں مؤذن کی کہی گئی اقامت کافی ہوگی

یادوبارہ اقامت کہی جائے گی؟،(اراکین انتظامیہ جامع مسجد نورانی، لانڈھی 4 کراچی)۔

جواب:

اقامت درست اور کافی ہوگی، دوبارہ نہیں کہی جائے گی۔حدیث مبارک میں ہے :عن زیاد بن الحارث الصدائی، قال: کنت مع رسول اللہ ﷺ فی سفر۔فأمرنی فأذّنت۔ فأراد بلال ان یقیم ۔ فقال رسول اللہ ﷺ: "انّ أخا صداءٍ قد أذّن ۔ومن أذّن فھو یقیم"۔

ترجمہ:''زیاد بن حارث صدائی سے روایت ہے آپ نے فرمایا: ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے آپ ﷺ نے مجھے اذان کا حکم دیا۔پھر (اذان کے بعد) بلال نے ارادہ کیا کہ وہ اقامت کہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے بھائی صدائی نے اذان کہی پس جواذان کہے وہی اقامت کہے،(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:717)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

والاحسن أن یکون اماما فی الصلاۃ کذا فی معراج الدرایۃ ۔والافضل أن یکون المؤذن ھوالمقیم کذا فی الکافی۔ وان أذن رجل واقام آخر ان غاب الاول جاز من غیر کراھۃ وان کان حاضر او یلحقہ الوحشۃ باقامۃ غیر ہ یکرہ وان رضی بہ لا یکرہ عندنا کذا فی المحیط ۔

ترجمہ:''اور امام ہی اذان دے تو یہ بہت زیادہ بہتر ہے جیسا کہ'' معراج الدرایہ'' میں ہے،اور افضل یہ ہے کہ مؤذن ہی اقامت کہے'' کافی'' میں اسی طرح سے ہے۔اور اگر ایک شخص نے اذان کہی اور دوسرے نے اقامت کہی تو اگر پہلا شخص (جس نے اذان کہی) غائب ہے،تو بلا کراہت اقامت جائز ہے اور اگر وہ موجود ہے اور اس کی اجازت کے بغیر دوسرے شخص نے اقامت کہی اور مؤذن کو(دوسرے کا اقامت کہنا) ناگوار ہو تو پھر یہ مکروہ ہے،اور اگر وہ راضی ہے تو ہمارے نزدیک کوئی کراہت نہیں،'' محیط'' میں اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری، جلد:1،ص:54، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

اس مسئلے سے معلوم ہوا کہ جو شخص امامت کرائے وہ اقامت بھی کہہ سکتا ہے، عموماً لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر امام مصلّٰی پر نہ ہو تو اقامت نہیں کہی جائے گی یہ خیال باطل ہے، اقامت کے وقت امام کا مُصلّٰی پر ہونا نہ واجب ہے، نہ سنت نہ مستحب، امام مصلّٰی پر ہو یا نہ ہو، دونوں صورتیں برابر ہیں، بلکہ عہدِ رسالت میں یہی طریقہ رائج تھا کہ حضور اقدس ﷺ حجرے میں ہوتے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کی طرف نظریں جمائے رہتے، جب آپ حجرۂ انور سے نکلتے تو وہ اقامت شروع کردیتے، صحابہ بھی فوراً اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہوجاتے، آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کو اس عجلت کے طریقہ سے منع فرمایا، چنانچہ اس کے بعد جب آپ حجرۂ انور سے نکلتے، اقامت شروع ہوجاتی، آپ مصلّٰی پر تشریف لاتے اور جیسے جیسے آپ ﷺ صحابۂ کرام کی صفوں سے گزرتے، وہ کھڑے ہوتے جاتے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن ابی قتادة قال: قال رسول اللہ ﷺ : اذااُقیمت الصلوٰۃ فلاتقوموا حتی ترونی

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب نماز کے لئے اقامت کہی جائے تو جب تک تم (خود) مجھے دیکھ نہ لو، (عجلت میں) کھڑے نہ ہوا کرو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:604)''۔

جو مسئلہ دریافت کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آیا جس شخص نے جماعت کے لئے اقامت کہی ہو، وہ آگے بڑھ کر امامت بھی کرسکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں اقامت کہنے والا امامت کرسکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اقامت کہہ دی جاتی ہے مگر اقامت کہنے والے کے سوا کوئی امامت کا اہل نہیں ہے تو وہ آگے بڑھ کر امامت کرسکتا ہے یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ امام تو موجود ہوتا ہے مگر کوئی اقامت کہنے والا نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں امام اقامت کہہ سکتا ہے۔

نوٹ: جماعت کے قیام کے لئے جماعت سے پہلے اقامت کہی جاتی ہے، اسے حدیث وفقہ میں ''اقامت'' کہا جاتا ہے، اور یہ عنوان اس کلمے سے ماخوذ ہے: قدقامت الصلوٰۃ،

(نماز یعنی جماعت کھڑی ہوگئی ہے)۔
اقامت کے لفظی معنیٰ ہیں: ''کھڑا کرنا'' اور یہاں مراد ہے ''جماعت کا قائم کرنا''۔ ہمارے ہاں عرف عام میں لوگ اسے ''تکبیر'' کہتے ہیں، ''تکبیر'' کے معنیٰ ہیں ''اللہ اکبر'' کہنا یا اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کرنا۔ چونکہ اس کا پہلا کلمہ ''اللہ اکبر'' ہے، اسی لئے اسے تکبیر بھی کہہ دیتے ہیں۔

امام یا مؤذن کا غیر شادی شدہ ہونا

سوال:18

امامت یا مؤذن کے فرائض کی ادائیگی کے لئے کیا یہ شرط ضروری ہے کہ وہ شادی شدہ ہو۔ کیا امام کی غیر موجودگی میں مؤذن (جو کہ غیر شادی شدہ ہے) امامت کے فرائض انجام دے سکتا ہے؟، (حافظ معشوق علی سکندری، مؤذن جامع مسجد صدیقیہ D-5 نیو کراچی)۔

جواب:

شرائطِ امامت میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ امام شادی شدہ ہو، شرائطِ امامت چھ ہیں، اسلام، عاقل، بالغ، مرد ہونا، قراءت پر قادر ہونا، معذور نہ ہونا۔
امامِ معیّن ہی امامت کا زیادہ حق دار ہے اگر چہ حاضرین میں کوئی اس سے زیادہ علم اور زیادہ تجوید والا ہو، اور اگر امامِ معیّن کسی بناء پر موجود نہ ہو یا آنے میں تاخیر ہو جائے تو اس کی جگہ مؤذن نماز پڑھانے کا زیادہ اہل ہے کہ یہ اس کے فرائض میں شامل ہے، ہاں اگر کسی مسجد میں امامِ معیّن کے ساتھ نائب امام بھی علیحدہ سے مقرر ہو تو نماز پڑھانے کا اختیار اسے حاصل ہوگا لیکن اگر مؤذن ہی نائب امام ہے تو پھر نماز وہی پڑھائے۔ جس وقت امام یا مؤذن کا تقرر کیا جاتا ہے تو مسجد کمیٹی امام یا مؤذن سے متعلق معلومات جمع کرتی ہیں، تو اس وقت شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونا سب معلوم ہو جاتا ہے بعد میں اس بات کو عذر بنانا محض فتنہ انگیزی ہے، لیکن بہر حال غیر شادی شدہ ہونا امام یا مؤذن کو ان کے فرائض سے

علیحدہ کرنے کے لئے عذر نہیں ہے۔

تراویح کی امامت کا استحقاق

سوال :19

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ ایک مسجد کے امام صاحب حافظِ قرآن، قاری و عالمِ دین ہیں، مذکورہ امام کے ہوتے ہوئے انتظامیہ کے بعض افراد نے نمازِ تراویح کے لئے دوسرے حافظ کا انتظام کیا ہے جو صرف حافظ ہے، عالم وقاری نہیں، انتظامیہ کے ان افراد نے مذکورہ امام صاحب کو کہا کہ آپ کو اجازت ہے کہ کسی اور مسجد میں تراویح پڑھالیں۔ واضح ہو کہ مقررہ امام صاحب پر انتظامیہ یا کسی اور مقتدی کو کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ امام صاحب اور مقتدی صاحبان کی شدید خواہش ہے کہ وہ خود تراویح پڑھائیں۔

جس حافظ کو تراویح کے لئے مقرر کیا جارہا ہے وہ انتظامیہ کے کسی ممبر کا رشتے دار ہے۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ انتظامیہ کا یہ عمل شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا انتظامیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ تراویح پڑھانے کا جو حق مقررہ امام کو حاصل ہے، بغیر کسی شرعی وجہ کے کسی اور کو تفویض کردے؟ اس حافظ کے پیچھے جو عالم نہیں ہے رمضان میں نمازِ عشاء، وتر و تراویح پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں، (فخر عالم، مہاجرین مسجد بزرٹہ لائن کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئولہ میں امام معین (جو کہ عالم دین ہونے کے ساتھ قاری وحافظ بھی ہے) ہی نمازِ تراویح کی امامت کا زیادہ حقدار ہے، بلکہ افضل یہ ہے کہ وہی نمازِ تراویح پڑھائے، دوسرے کی اقتداء نہ کرے۔

علامہ نظام الدین تراویح کی بحث میں لکھتے ہیں:

ولو كان الفقيه قارئا فالافضل والاحسن ان يصلي بقرأة نفسه ولا يقتدى

بغیرہ کذا فی فتاویٰ قاضیخان ۔

ترجمہ:اور اگر(تراویح پڑھانے والا) عالم ہو تو افضل ہے بلکہ احسن یہی ہے کہ وہ خود پڑھائے دوسرے کی اقتداء نہ کرے فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:116 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔ جب امام خود حافظ قرآن ہے اور تراویح پڑھانے کا خواہش مند بھی ہے تو اسے کسی دوسری جگہ جا کر پڑھانے کی کیا ضرورت ہے اس بات کا وہ زیادہ حق دار ہے کہ خود اپنی مسجد میں تراویح پڑھائے ہاں ! اگر وہ بخوشی اجازت دے تو دوسرے شخص کو مقرر کیا جاسکتا ہے، انتظامیہ کے افراد کا ازخود فیصلہ کرنا جانبداری اور ناانصافی پر مبنی ہے انہیں چاہئے کہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کریں ، شرعی معاملات میں مداخلت انتظامیہ کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے اور اگر وہ انتظامی امور کے اہل نہ ہوں شرعی معاملات میں ضد اور ہٹ دھرمی اختیار کرتے ہوں تو ایسے لوگوں کو معزول کر دینا چاہئے اور ان کی جگہ نیک اور دین دار لوگوں کا انتخاب کرنا چاہئے ۔

جسمانی نقص سے امامت میں فرق

سوال:20

ہماری مسجد میں نئے پیش امام صاحب مقرر کئے گئے ہیں، جو کہ بہترین قاری عالم ومقرر ہیں، لیکن ان کے ایک پیر میں نقص ہے، یعنی تھوڑا لنگڑا کر چلتے ہیں، جو ایک واضح نقص ہے، لیکن سجدہ کی حالت میں ان کی انگلیاں زمین پر لگ جاتی ہیں ۔نمازی حضرات معترض ہیں کہ شرعی اعتبار سے ایسا شخص امامت نہیں کراسکتا ہے، اور اس کے پیچھے نماز میں کراہیت تو نہیں ہوگی، برائے مہربانی شریعت کی رو سے فتویٰ عنایت فرمائیں، (قدیر احمد انصاری، جنرل سکریٹری، جامع مسجد باب الاسلام)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:ولو کان لقدم الامام عوج وقام علی بعضھا یجوز وغیرہ اولی کذا فی التبیین ۔

ترجمہ: ''اگر امام کے پیر میں ٹیڑھا پن (ایسا نقص ہو) کہ پورا پاؤں زمین پر نہیں جما سکتا، تب بھی اس کی امامت جائز ہے، مگر (اس کے مقابلے میں) غیر معذور کی امامت بہتر ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:83 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال ہوا: ایک آدمی جس کے دونوں پاؤں کی انگلیاں نہیں ہیں، کیا وہ ان لوگوں کی امامت کر سکتا ہے؟، جن کے دونوں پاؤں درست ہوں۔

اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ''شریعت میں نماز کے احکام میں معذور اس کو کہتے ہیں، جس میں وضو توڑنے والی کوئی بات پائی جائے، اس طرح کہ وہ وضو کر کے نماز پڑھنے کا وقت بھی نہ پا سکے کہ وضو ٹوٹ جائے، مثلاً بار بار پیشاب کے قطروں کا آنا، ہر وقت ریح کا خارج ہونا یا بدن سے خون یا پیپ کا بہتے رہنا، اس کا حکم یہ ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے غیر معذور کی یا اس سے کم عذر والے کی نماز نہیں ہوتی، جیسا کہ بہارِ شریعت میں لکھا ہے۔

پیر کی انگلیاں کٹی ہونے کی وجہ سے اس قسم کا معذور نہیں ہے، وہ اپنے قدم زمین پر لگا کر نماز پڑھے گا تو اس کی نماز بھی ہو جائے گی اور اس کی امامت بھی صحیح ہے۔ انگلی موڑنے کا حکم اس کے لئے ہے، جس کے پیر میں انگلی ہو اور جس کے پاؤں میں انگلی ہی نہیں ہے، اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد دوم، ص:179، مطبوعہ بزم وقار الدین، کراچی)''۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مذکور امام کی اقتدا میں نماز جائز ہے، بقول سائل امام صاحب کے پاؤں کی انگلیاں زمین پر لگ جاتی ہیں، اگر خدانخواستہ ان کے پاؤں کی انگلیاں سرے سے نہ ہوتیں، اور پاؤں زمین پر لگ جاتا، تب بھی ان کی امامت درست ہوتی، یا انگلیاں سالم ہوتیں مگر ٹانگ کے لنگ کی وجہ سے پاؤں زمین پر لگ جاتا اور انگلیاں بربنائے عذر لگ جاتیں، تب بھی امامت درست ہوتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔

ترجمہ: ''اور اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی، (الحج:78)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن انس،عن النبی ﷺ قال :"یسّروا و لا تعسّروا و بشّروا و لا تنفّروا"۔
ترجمہ:حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:''(دین میں) آسانی پیدا کرو،دشواری نہیں اور (لوگوں کو رحمت باری کی) بشارت سناؤ،انہیں دین سے متنفر نہ کرو(صحیح البخاری رقم الحدیث:69 مطبوعہ مکتبۃ العصریہ،بیروت)''۔

نابینا کی امامت

سوال:21

کسی نابینا قاری وحافظِ قرآن امام کے پیچھے پنج وقتہ نماز اور نمازِ جمعہ ادا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟یعنی کیا نابینا کو امام بنانا جائز ہے؟،(حافظ قاری خلیق اللہ،نواب شاہ)۔

جواب:

امام ابوداؤد سجستانی اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

عن أنس ان النبی ﷺ استخلف ابن أم مکتوم یؤم الناس و ھو اعمیٰ۔
ترجمہ:''حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (غزوۂ تبوک کے موقع پر عبداللہ) ابن اُم مکتوم کو (مدینہ منورہ میں) اپنا خلیفہ بنایا تاکہ وہ لوگوں کی امامت کریں، حالانکہ وہ نابینا تھے،(سنن ابوداؤد،رقم الحدیث:595 المکتبۃ المکیہ،مکہ)''۔
اس کی شرح میں علامہ علی القاری الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:
''ابن الملک نے کہا نابینا کی امامت کی کراہت تب ہے جبکہ قوم میں اس کے مقابلے میں تندرست شخص اس سے بڑا عالم یا اس کے برابر درجے کا عالم موجود ہو،اور ابن حجر نے کہا کہ اس میں نابینا کی امامت کا جواز ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں،اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ بینا کی امامت اولیٰ ہے یا نابینا کی (جبکہ دونوں دستیاب ہوں)،(مرقاۃ المفاتیح، جلد:3،ص:84 مکتبۂ امدادیہ،ملتان)''۔
نابینا شخص اگر احتیاط برتتا ہے یعنی کپڑوں یا بدن پر کوئی چیز لگ جائے تو کسی بینا شخص کو دکھا کر اطمینان کر لیتا ہے کہ کہیں نجاست تو نہیں لگی؟،اور اگر نجاست لگ گئی ہو تو دھو لیتا ہے،ایسے

نابینا کی امامت جائز ہے، مگر مکروہِ تنزیہی ہے اور اگر وہ حاضرین میں مسائل نماز کا سب سے زیادہ جاننے والا ہے، تو اس کی امامت بلا کراہت جائز ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویکرہ) تنزیھاً(امامة اعمیٰ) ونحوہ الأ عشی۔"نھر "(الا ان یکون)ای غیرالفاسق (أعلم القوم) فھو اولیٰ ۔

ترجمہ:" نابینا اور ایسا شخص جسے رات کو نظر نہ آتا ہو، اس کی امامت مکروہ تنزیہی ہے (بحوالہٗ نحر) اور اگر یہ زیادہ صاحب علم ہو تو اس کی امامت بہتر ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد:2، ص:255 ,254 دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔ چونکہ علامہ حصکفی نے نابینا کا ذکر فاسق اور اَعرابی کے سیاق میں کیا ہے، اس لئے اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وحاصلہ ان قولہ "الا ان یکون أعلم القوم" خاص بالاعمیٰ ، اما غیرہ فلا تنتفی الکراھة بعلمہ۔

ترجمہ:" اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ (علامہ حصکفی کا یہ قول کہ)" اگر وہ پوری قوم سے زیادہ عالم ہو" (تو وہ نابینا امامت کا زیادہ حق دار ہے) نابینا کے ساتھ خاص ہے، جہاں تک غیرِ نابینا (کی امامت) کا تعلق ہے، تو علم کی بنا پر اس کی کراہت منتفی نہیں ہوگی۔۔۔۔۔۔اور آگے چل کر لکھتے ہیں: کہ اگر نابینا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عالم ہے تو استحقاقِ امامت کا معاملہ بالکل برعکس ہوگا (یعنی نابینا عالم ہی زیادہ حق دار ہوگا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار ج:2 ص:255 دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ اندھے کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی یا تحریمی یا نہیں اور یہ امامت کے واسطے سزاوار ہے یا نہیں، جواب میں وہ لکھتے ہیں: اندھا اگر تمام موجودین میں سب سے زیادہ مسائل کا جاننے والا نہ ہو اور اس کے سوا دوسرا صحیح القراءت، صحیح العقیدہ، غیر فاسق معلن حاضر جماعت ہے، تو اندھے کی امامت مکروہِ تنزیہی ہے، اور اگر وہی سب سے زیادہ علم نماز رکھتا ہے، تو اسی کی امامت افضل ہے،

(فتاویٰ رضویہ، جلد6 ص:520 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔
علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''نابینا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، جبکہ دوسرے لوگ مسائل طہارت ونماز میں اس سے زائد یا اس کے برابر ہوں، اور اگر سب سے زائد یہی علم رکھتا ہو، تو اس کی امامت میں اصلاً کراہت نہیں، بلکہ اس صورت میں اسی کو امام بنانا بہتر ہے۔ بحرالرائق میں ہے :قید کراھة امامة الاعمیٰ فی المحیط وغیرہ بان لا یکون افضل القوم فان کان افضلھم فھو اولیٰ ۔ مکروہ تنزیہی ناجائز نہیں ہوتا مگر اس سے بچنا بہتر، اور کرنا برا ہے مگر گناہ نہیں، (فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 107 مطبوعہ مکتبۂ رضویہ، آرام باغ، کراچی)''۔

امام صاحب کی رہائش

سوال:22

ہماری مسجد کے امام، صاحبِ حیثیت ہیں، پھر بھی مسجد میں رہائش اختیار کئے ہوئے ہیں، جبکہ وہ باآسانی رہائش اور دیگر ضروریات اپنے خرچے پر انجام دے سکتے ہیں، کیا ایسے امام کے پیچھے نماز ادا ہوجائے گی؟، (عبدالمجید بندھانوی، لیاقت آباد)۔

جواب:

اگر امام صاحب کے تقرر کے وقت ان کی شرائط ملازمت میں مکان کی سہولت بھی شامل تھی، جو آپ نے ان کو فراہم کی ہے، تو خواہ وہ صاحبِ حیثیت ہوں، ان کا مسجد کے مکان میں رہنا جائز ہے۔ امامت کا منصب چونکہ کل وقتی ہے، کسی بھی وقت امام کی خدمات کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اس لئے مساجد کے ساتھ عملے کے مکانات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہمارے ہاں عرف عام میں بھی اسے لازم وملزوم سمجھا جاتا ہے۔
فقیہ العصر علامہ محمد نور اللہ نعیمی (فتاویٰ نوریہ جلد 1 ص:184) لکھتے ہیں: ''تکمیل تعمیر کے بعد ضروریات مسجد میں سے امام اول نمبر میں ہے کیونکہ مسجد کی صرف ظاہری تعمیر کا کوئی اعتبار نہیں جب تک کہ اس کی معنوی اور حقیقی تعمیر نہ ہوتی کہ مسجد کے لئے روشنی پانی وغیرہ

کے وسیع تر انتظام سے امام کی ضروریات مقدم ہیں''، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

الذی یبدأ من ارتفاع الوقف عمارته شرط الواقف ام لاثم الیٰ ماھواقرب الی العمارة واعم للمصلحة کالامام للمسجد والمدرس للمدرسة یصرف الیھم بقدر کفایتھم ثم السراج والبسط کذلک الی اخر المصالح

ترجمہ: ''وقف قائم کرنے سے جس چیز کا آغاز ہوتا ہے، وہ اس کا تعمیر کرنا (اور آباد کرنا) ہے، خواہ واقف اس کی شرط لگائے یا نہ لگائے، پھر جو امر (مسجد کی) کی آبادکاری کے لئے ضروری ہے اور مصلحت ومفادِ وقف میں جو زیادہ شامل ہے، (وہ ضروری ہے)، جیسے مسجد کے لئے امام اور مدرسہ کے لئے مدرّس، ان پر ضرورت اور کفایت کے مطابق وقف کا مال خرچ کیا جائے (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:320)''۔ مسجد کے عطیات صدقات نافلہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کا مصرف بننے کے لئے امام کا نادار ہونا شرط نہیں ہے۔ زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، کفارات اور صدقاتِ واجبہ کا مصرف بننے کے لئے نادار ہونا شرط ہے۔

نماز میں خلافِ ترتیب قراءت کا حکم

سوال:23

امام صاحب نے عشاء کی نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ اعلیٰ کی آخری چار آیات کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں سورۂ اعلیٰ کی شروع کی تین آیات تلاوت کیں۔ نماز کے بعد چند لوگوں نے امام صاحب کو بتایا کہ آپ نے اس طرح نماز پڑھائی ہے، اس لئے دوبارہ نماز پڑھائیں مگر امام صاحب اور چند اور افراد نے نماز کو جائز قرار دیا۔ اور دوبارہ نماز نہیں پڑھائی۔ آپ سے التجا ہے کہ برائے کرم مجھے صحیح راہ دکھائیں، عین نوازش ہوگی، (محمد علی، ۹۸-۴ فیز ۱ اسٹریٹ نمبر ۶ ڈیفنس آفیسر ہاؤسنگ اسکیم۔ ملیر کینٹ کراچی)۔

جواب:

نماز میں قرآن ترتیب سے پڑھنا یعنی سورتوں میں ترتیب رکھنا واجب ہے اور یہ احکامِ قراءت میں سے ہے، احکامِ نماز سے نہیں، اگر قصداً خلافِ ترتیب پڑھا تو یہ مکروہِ تحریمی ہے لیکن نماز واجب الاعادہ نہیں ہوگی اور اگر بھولے سے پڑھا تو مکروہ بھی نہیں ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر غلطی سے ایک لفظ بھی خلافِ ترتیب زبان سے نکل گیا تو اسی کو پڑھے، اس کو چھوڑنا مکروہ ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

لا بأس أن یقرأ سورة ویعیدها فی الثانیةوان یقرء فی الاولیٰ من محل وفی الثانیة من آخر ولو من سورة ان کان بینهما آیتان فأکثر ۔ ویکره الفصل بسورة قصیرة وأن یقرأ منکوساً الّا اذا ختم فیقرأ من البقرة ۔ وفی "القنیة": قرأ فی الأولیٰ الکافرون وفی الثانیة ۔ ألم ترأوتبت۔ ثم ذکر یتم، وقیل یقطع ویبدأ ۔

ترجمہ: ''اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک رکعت میں کوئی سورت پڑھی اور پھر دوسری رکعت میں بھی اُسی کو پڑھا، یا پہلی رکعت میں ایک سورت کے ایک مقام سے تلاوت کی اور دوسری رکعت میں دوسرے مقام سے، اگر چہ ان دونوں کے درمیان دو آیات یا زیادہ کا فاصلہ ہو، اور درمیان سے ایک چھوٹی سورت کا چھوڑنا مکروہ ہے، اور سورت کا الٹا پڑھنا (یعنی دوسری رکعت میں ایسی سورت کا پڑھنا کہ جو ترتیب کے اعتبار سے پہلی رکعت میں پڑھی گئی سورت سے پہلے ہو) مکروہ ہے، مگر یہ کہ ختمِ قرآن میں پھر سورۂ بقرہ سے تلاوت کی جائے ۔ اور ''قنیہ'' میں ہے: پہلی رکعت میں سورۂ کافرون پڑھی اور دوسری رکعت میں سورۂ الم تر (الفیل) یا تبت (سورۂ لہب)، پھر (دورانِ تلاوت) یاد آیا، تو اسی سورت کو مکمل کرے، اور ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ اُسے چھوڑ دے اور پھر (ترتیب کے مطابق دوسری سورت) پڑھے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد:2،ص:238،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی)''۔

علامہ ابن عابدین شامی (وأن یقرأ منکوساً) کی تشریح میں لکھتے ہیں: بأن یقرأ فی الثانیة سورة أعلی مما قرأ فی الاولیٰ ، لأن ترتیب السور فی القراء ة من

واجبات التلاوۃ۔

ترجمہ: ''یعنی دوسری رکعت میں اُس سے پہلے والی سورت تلاوت کرنا، جو پہلی رکعت میں پڑھی تھی (مکروہ ہے)، اس لئے کہ قراءت میں سورتوں کا ترتیب سے پڑھنا واجباتِ تلاوت میں سے ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی مزید لکھتے ہیں:

أفاد ان التنکیس أو الفصل بالقصیرة انما یکرہ اذا کان عن قصد، فلو سھوا فلا کما فی "شرح المنیة"۔ واذا انتفت الکراھة فا عراضه عن التی شرع فیھا لاینبغی ۔ وفی" الخلاصة ":افتتح سورة وقصدسورةأخری فلما قرأ آیة أو آیتین أراد ان یترک تلک السورة ویفتتح التی أرادھا یکرہ ۔ وفی"الفتح":ولو کان : أی المقروء حرفاً واحدا۔

ترجمہ: ''اس عبارت سے یہ مستفاد ہوا ہے کہ قرآن کو الٹا پڑھنے اور درمیان سے ایک چھوٹی سورت چھوڑ کر پڑھنے کو جو مکروہ لکھا گیا ہے، مراد اس سے یہ ہے کہ ایسا قصداً کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر بھول کر ہو تو مکروہ نہیں، اسی طرح ''شرح منیہ'' میں ہے: جب (بھول کر) خلافِ ترتیب سہواً پڑھنے سے کراہت نہیں ہوتی، تو جس سورت کو (خلافِ ترتیب) شروع کر دیا ہے اسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے اور ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے کہ: کسی شخص کا ارادہ دوسری سورت پڑھنے کا تھا مگر اس نے کوئی اور سورت شروع کر دی اور ایک یا دو آیات پڑھنے کے بعد اگر وہ یہ چاہے کہ اُس سورت کو چھوڑ کر وہی سورت پڑھے جس کا (دل میں) ارادہ تھا، تو یہ مکروہ ہے اور ''فتح القدیر'' میں ہے: اگر چہ ایک حرف ہی پڑھا ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2، ص:239، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: امام نے پہلی رکعت میں "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" پڑھی اور دوسری میں ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ'' پڑھی اور آخر میں سجدۂ سہو کیا، اس مسئلہ کا حکم بیان فرمائیے، آپ نے جواب میں لکھا:

''اگر بھول کر ایسا کیا نماز میں حرج نہیں اور سجدہ سہو نہ چاہیے تھا اور قصداً ایسا کیا تو گناہ گار ہوگا، نماز ہوگئی، سجدۂ سہو اب بھی نہ چاہیے تھا، توبہ کرے، پہلی میں اگر سورۂ ناس پڑھی تھی تو اُسے لازم تھا کہ دوسری میں بھی سورۂ ناس ہی پڑھتا کہ فرض کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت پڑھنا صرف خلافِ اولیٰ ہے اور ترتیب اُلٹا کر پڑھنا حرام، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص:346، 347 مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام نے نماز میں ایک ہی سورت ''الاعلیٰ'' کی آیات بھول کر خلافِ ترتیب پڑھی ہیں، لہٰذا نماز بلاکراہت جائز ہے اور جماعت کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قراءت کی غلطی سے فسادِ نماز

سوال:24

نماز کے اندر دورانِ قراءت ''عَلی اَبَوَیکَ'' (سورۂ یوسف) کی جگہ ''عَلی اَبَوَیکِ ''پڑھ لے تو نماز ہوگی یا نہیں؟ زید نے دورانِ نماز اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (مجادلہ:19) کے بجائے ''اولئک حزب اللہ'' پڑھ لیتا ہے، آیا نماز میں کوئی خلل واقع ہوا یا نہیں، اور اگر امام دہرا کر دوبارہ صحیح پڑھ لے تو کیا نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، (یعقوب حنفی، نیا آباد کراچی)۔

جواب:

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر نماز میں قراءت کے دوران ایسی غلطی ہوئی ہو، جس سے معنی میں فساد لازم آتا ہو، تو نماز فاسد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ اِعراب کی ایسی غلطی، جس سے معنی میں فساد لازم نہیں آتا، اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اور اگر معنی میں اتنا تغیر ہو کہ اس کا اعتقاداً اور قصداً پڑھنا کفر ہو، تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اعادہ لازم ہوگا۔ لفظ اَبَوَیکَ (کاف پر زبر) مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے اور مؤنث کے لئے اَبَوَیکِ

(کاف کے نیچے زیر) استعمال ہوتا ہے، اس طرح پڑھنے سے نماز ادا ہو جائے گی، احتیاطاً دہرالی جائے تو بہتر ہے۔

سورہ مجادلہ کی آیت میں أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ کے بجائے اولئک حزب اللّٰہ پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی اور دہرانا واجب، اگر قصداً پڑھا تو کفر لازم ہوگا، ایسی صورت میں تجدیدِ ایمان اور تجدید نکاح ضروری ہے۔تاہم اگر بھول کر غلط پڑھنے کے بعد واپس دہرا کر صحیح پڑھ لیا تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔

مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا گیا کہ امام نے نماز کے اندر سورۃ الحشر کی آیت نمبر 20 میں "هُمُ الْفَائِزُونَ" کی جگہ "ھم الفاسقون" پڑھ لیا، لیکن اسی وقت آیت کو دوبارہ لوٹا کر صحیح کر لیا۔نماز ہوگئی یا نہیں؟

وہ جواب میں لکھتے ہیں: نماز میں دورانِ قراءت غلط پڑھنے کے بعد پھر لوٹا کر صحیح طور پر اسے پڑھا، تو یہ نماز ہو جائے گی۔ علامہ سید احمد طحطاوی متوفی 1230ھ نے حاشیہ الطحطاوی علی الدرالمختار میں لکھا: وفی المضمرات قرأفی الصلوٰۃ بخطأ فاحش ثم اعادوقرأ صحیحافصلوٰتہ جائزۃ۔

ترجمہ: ''اور مضمرات میں ہے کہ اگر کسی نے نماز میں فحش غلطی کی، پھر اسے لوٹا کر صحیح پڑھ لیا، تو اس کی نماز جائز ہے، (کتاب الصلوٰۃ، باب مایفسد الصلوٰۃ، جلد 1، ص: 267، المکتبۃ العربیہ، کوئٹہ)''۔

قراءت میں متشابہ لگنا اور یاد آنے پر واپسی اسی جگہ سے پڑھنا

سوال:25

ایک آدمی نے نماز شروع کی، اس نے سورہ فاتحہ کے بعد قراءت شروع کی، ایک سورت پڑھی درمیان میں بھول گیا اور اس سورت کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری سورت پڑھنا شروع کر دی، کیا اس صورت میں اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟، (بخت ولی، راولپنڈی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں نماز درست ہوگئی اور سجدہ سہو کی ضرورت نہیں تھی ،لیکن اگر دونوں سورتوں کے درمیان ایک رکن ادا کرنے کی مقدار تاخیر ہوئی ،تو سجدۂ سہو لازم ہوگا۔
امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: امام مغرب میں رکوع "لقد صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهٗ" پڑھ رہا تھا جب "فِی الا نجیل" تک پڑھ لیا، آیت پارہ 22 کا متشابہ لگا اُس کے بعد" اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ " تک پڑھی ،پھر جب یاد آیا اُسے چھوڑ کر مقامِ اصل سے شروع کیا اور نماز ختم کی اور سجدہ سہو نہ کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں ؟ ،آپ نے جواب میں لکھا: نماز ہوگئی اور سجدۂ سہو کی بھی حاجت نہ تھی اگر بقدر ادائے رکن سوچتا نہ رہا ہو، ہاں اگر بھولا اور سوچنے میں اتنی دیر خاموش رہا، جس میں کوئی رکن نماز کا ادا ہوسکتا ہے تو سجدۂ سہو لازم آیا" كما فى الدر المختار" وغیرہ۔اگر نہ کیا تو نماز جب بھی ہوگئی مگر ناقص ہوئی پھیرنا واجب ہے،(فتاویٰ رضویہ، جلد6،ص:274 ،رضا فاؤنڈیشن ،لاہور)''۔

ریڈیو، ٹی وی پر آیت سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت کرنے کا حکم

سوال:26

T.V یا Radio یا اس سے ملتے جلتے آلات میں بیانات چل رہے ہوں یا پھر تلاوت ہورہی ہو تو اگر دورانِ تلاوت آیتِ سجدہ آجائے ، یا حضور ﷺ کا اسم گرامی آئے تو کیا سجدہ کرنا یا درود شریف پڑھنا واجب ہے؟۔احتیاطی طور پڑھ لیتے ہیں لیکن مسئلے کے اعتبار سے وضاحت فرمائیں،(مولانا زاہد اللہ عادل، جامع مسجد اقصیٰ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (لا)تجب (بسماعهمن الصدى والطير) ومن كل تال حرفا، ولا بالتهجى اشباه۔
ترجمہ:'' آیت سجدہ کی گونج سننے یا پرندے (طوطے) کے آیت سجدہ بار بار دہرانے سے (اگر اسے پریکٹس کرادی گئی ہو) سجدۂ تلاوت لازم نہیں آتا۔اسی طرح کئی افراد آیتِ سجدہ

ایک ایک حرف (الگ الگ) پڑھیں تو سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، یا اس کے حروف جدا جدا کر کے پڑھے، تو اس کے سننے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے ''زیلعی'' وغیرہ کے حوالے سے پرندے سے اور بازگشت سے آیتِ سجدہ سننے پر سجدۂ تلاوت کے عدمِ وجوب کے قول کو راجح قرار دیا ہے جب کہ ایک ضعیف قول کے مطابق اس صورت میں بھی واجب ہے لیکن علامہ شامی عدمِ وجوب کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں: قلت والاکثر علی تصحیح الاوّل وبه جزم فی نورالایضاح۔ میں کہتا ہوں کہ پہلا یعنی عدمِ وجوب کا قول اکثر کے نزدیک صحیح ہے اور نورالایضاح میں بھی اس قول کو اختیار کیا گیا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:2، ص:509)۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ولاتجب اذاسمعهامن طیر هوالمختار۔ ترجمہ: ''اور (اگر) پرندے (مثلاً طوطے سے) آیت سجدہ سنی تو سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، (ج:1، ص:132)''۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر ریڈیو یا ٹی وی پر قاری براہِ راست (Live) تلاوت کر رہا ہے تو بالاتفاق سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہے، اگر ریکارڈنگ چل رہی ہے تو صحیح ترین قول یہ ہے کہ واجب نہیں ہے، اگرچہ بعض فقہاء کرام نے وجوب کا قول کیا ہے، لیکن جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے کہ اگر آپ متوجہ ہو کر تلاوت سن رہے ہیں اور آیتِ سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت کر لیتے ہیں تو اس کی افضلیت میں کوئی شک نہیں ہے، اسی طرح ریڈیو، ٹی وی پر رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک سن کر ہر بار درود پاک پڑھ لینا افضل ہے، ''عدمِ وجوب'' کا معنیٰ یہ ہے کہ نہ کرنے پر گنہگار نہیں ہوگا۔

مسجد میں جماعتِ ثانی

سوال: 27

ہم یہ دیکھتے چلے آئے ہیں کہ مسجد میں جماعت کے بعد دوسری جماعت کی جاتی ہے لیکن میں نے مسجد بلال ماڑی پور میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ مسجد میں دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے، وضاحت فرمائیے، (سید صفی اللہ شاہ، گڑھی نواب، بٹگرام)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں :المسجد اذا کان له امام معلوم و جماعة معلومة فی محلة فصلیٰ اهله فیه بالجماعة لا یباح تکرارها فیه باذان ثان اما اذا صلوا بغیر اذان یباح اجماعاً و کذا فی مسجد قارعة الطریق۔

ترجمہ: ''مسجد میں جب امام مقرر ہواور پابندی سے جماعت ہوتی ہواور وہاں کے رہنے والے با جماعت نماز پڑھتے ہوں تو ایسی مسجد میں اذانِ ثانی کے ساتھ جماعتِ ثانیہ جائز نہیں ہے البتہ جب وہ بغیر اذان کے جماعت سے نماز ادا کریں تو بالاتفاق دوسری جماعت جائز ہے جیسے شارعِ عام کی مسجد میں جائز ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:83 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

یکره تکرار الجماعة باذان واقامة فی مسجد محلةلا فی مسجدطریق أو مسجد لا امام له ولا موذن۔

ترجمہ: مسجد محلّہ میں اذان واقامت کے ساتھ دوسری جماعت مکروہ ہے مگر وہ مسجد جو شارع عام پر ہو یا جس مسجد میں امام ومؤذن مقرر نہ ہوں۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

یکره تکرارالجماعة فی مسجد محلة بأذان واقامة، الا اذا صلی بهما فیه اولا غیر اهله اواهله لکن بمخافتة الاذان ، ولو کرر اهله بدونهما او کان مسجد طریق جاز اجماعاً کما فی مسجد لیس له امام ولا موذن ویصلی الناس فیه فوجاً فوجاً ، فان الافضل ان یصلی کل فریق باذان واقامة علی حدة کما فی "امالی قاضیخان"اه۔

ترجمہ: ''مسجد محلّہ میں اذان واقامت کے ساتھ جماعت کی تکرار مکروہ ہے، مگر اس صورت میں کہ غیر محلّہ والوں نے وہاں اذان واقامت کے ساتھ اولاً جماعت کرائی ہو یا اہل محلّہ

نے آہستہ اذان دیکر جماعت کروائی ہو۔اور اگر اہل محلہ نے بغیر اذان و اقامت کے تکرار کی ، تو یہ بالاتفاق جائز ہے یا اگر مسجد شارع ہے تو بالاتفاق تکرار جماعت جائز ہے،جیسا کہ اس مسجد کا حکم ہے،جس کے لئے امام ومؤذن مقرر نہ ہواور لوگ اس میں گروہ درگروہ نماز ادا کرتے ہوں،تو وہاں افضل یہ ہے کہ ہر فریق اپنی اپنی اذان واقامت کے ساتھ الگ الگ نماز پڑھے،جیسا کہ''امالی قاضی خان''میں ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد دوم،ص:246-245،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی،بیروت)''۔

فقہائے احناف کا معتمد مذہب یہ ہے کہ دوسری جماعت اذان کے اعادہ کے ساتھ مکروہ ہے اور بلا اعادۂ اذان دوبارہ جماعت کرانے میں کوئی حرج نہیں جبکہ وہ جماعتِ ثانی جماعتِ اولیٰ کی ہیئت پر نہ ہو،علامہ ابنِ عابدین شامی لکھتے ہیں:

عن أبی یوسف أنه اذالم تکن الجماعةعلی الهیئة الأولی لا تکره، والاتکره، وهو الصحیح ،وبالعدول عن المحراب تختلف الهیئة۔

ترجمہ:امام ابو یوسف سے روایت ہے،جب جماعت پہلی ہیئت پر نہ ہو،تو مکروہ نہیں ورنہ مکروہ ہے یہی صحیح ہےاور محراب سے ہٹ کرادا کرنے سے ہیئت بدل جاتی ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار،جلد دوم،ص:246،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی،بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے" القطوف الدانیه لمن احسن الجماعة الثانیه" کے نام سے ایک ہی مسجد میں جماعتِ ثانیہ قائم کرنے کے مسئلے پر ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے،اس میں آپ نے تقریباً 12 ممکنہ صورتیں اوران کے احکام بیان فرمائے ہیں،ان میں آج کل کے حالات کی مناسبت سے چند اہم صورتیں یہ ہیں:

(1) جو مسجد شارع عام ،بس اسٹینڈ ،ریلوے اسٹیشن ،ایئر پورٹ،سرائے وغیرہ کی ہے، جہاں لوگوں کے قافلے آتے جاتے رہتے ہیں،نئی اذان واقامت کے ساتھ کسی کراہت کے بغیر تکرار جماعت جائز ہے۔

(2)ایک مسجد کسی محلے یا بستی کے لئے ہے،وہاں کچھ اجنبی لوگ یا مسافر اذان واقامت

کے ساتھ جماعت کر کے چلے گئے، تو اہل محلہ کے لئے دوبارہ اذان واقامت کے ساتھ جماعت کرانا جائز ہے، کیوں کہ اس مسجد میں اقامتِ جماعت انہی لوگوں کا حق ہے، جیسے اصولاً تو نماز جنازہ کی تکرار جائز نہیں ہے، لیکن اگر ولی کی اجازت کے بغیر دوسرے لوگوں نے نمازِ جنازہ پڑھ لی، تو ولی کو اعادہ کا حق ہے۔

(3) محلے یا بستی کی جماعت میں بعض اہل محلہ نے اذان کے بغیر جماعت کر لی، تو اب بھی وہاں اذان واقامت کے ساتھ تکرار جماعت جائز ہے۔

(4) محلے یا بستی کی مسجد میں کچھ لوگوں نے آہستہ اذان دے کر جماعت کرالی، تو اہل محلہ کا دوبارہ اذان واقامت کے ساتھ جماعت کرانا جائز ہے، کیوں کہ اذان کا اصل مقصد اعلانِ عام ہے، جو آہستہ اذان اول سے حاصل نہیں ہوا۔

(5) یا امام کسی دوسرے مسلک کا ہو، مثلاً شافعی، اور اس کے بارے میں ظن غالب یا یقین ہو کہ وہ بعض فقہی مسائل میں ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے کہ مسلک حنفی کے مطابق وضو نہیں ہوتا، مثلاً (الف) وہ پچھنا لگوانے کے بعد نماز کے لئے دوبارہ وضو نہیں کرتا (ب) جسم کی کسی عضو یا مقام سے خون نکل کر بہہ جانے سے دوبارہ وضو نہیں کرتا (ج) نماز کے اندر قہقہہ لگا کر ہنسنے سے نماز تو بالاتفاق فاسد ہو جاتی ہے، مگر شوافع کے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا، اور اب شافعی امام ایسی صورت میں احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نماز کے لئے وضو کا اعادہ نہیں کرتا (د) امام شافعی المسلک ہے اور وہ وضو کرتے وقت احتیاط پر عمل کرتے ہوئے چوتھائی سر یا اس سے زیادہ کا مسح نہیں کرتا بلکہ چند بالوں کے مسح پر اکتفا کرتا ہے، تو ان صورتوں میں چونکہ احناف کے نزدیک وضو یا ہوتا ہی نہیں ہے یا فاسد ہو جاتا ہے، لیکن اس سے نماز ادا نہیں کی جا سکتی، اب اگر کہیں صورت حال ایسی ہے کہ امام شافعی المسلک ہے اور یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے مقتدی سب کے سب یا اکثر حنفی ہیں اور وہ مندرجہ بالا مسائل میں احتیاط پر عمل نہیں کرتا، تو حنفی اپنی نماز کی حفاظت کے لئے جماعت ثانی کر سکتے ہیں۔

(6) پہلی جماعت میں امام ایسی قرأت کرتا ہے، جو موجب فسادِ نماز ہے۔

(7) ظن غالب یا یقین کی حد تک معلوم ہے کہ پہلی جماعت کا امام توہین الوہیت ورسالت کا مرتکب ہے۔

آخر میں لکھتے ہیں: '' اب محل نظر صرف ایک صورت رہی کہ مسجد محلہ میں اہل محلہ نے باذان واقامت بروجہ سنت امام موافق المذہب سالم العقیدہ، متقی مسائل داں، صحیح خواں کے ساتھ جماعت اولیٰ خالی عن الکراہت ادا کرلی، پھر باقی ماندہ لوگ آئے، انہیں دوبارہ اس مسجد میں جماعت قائم کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟، اور ہے تو بکراہت یا بے کراہت، اس بارے میں عین تحقیق وحق وثیق وحاصل انیق ونظر دقیق واثر توفیق یہ ہے کہ اس صورت میں تکرار جماعت باعادہ اذان ہمارے نزدیک ممنوع وبدعت ہے، یہی ہمارے امام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب مہذب وظاہر الروایہ ہے، متن متین مجمع البحرین وبحر الرائق علامہ زین میں ہے:

ولاتکررھا فی مسجد محلة باذان ثان۔

'' مسجد محلہ میں دوسری اذان کے ساتھ تکرار جماعت جائز نہیں، (البحرالرائق ،باب الامامۃ جلد: اول، ص: 346)''، (فتاویٰ رضویہ جلد: 7 ص: 125 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

خواتین کے مخصوص ایام کی نمازوں کی قضا نہیں، صرف روزوں کی قضا ہے

سوال: 28

میں نماز اور روزے جو عورتوں کی مجبوری کے باعث قضاء ہوتے ہیں ان کے بارے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ رمضان کے روزے قضاء ہوتے تو میں بعد میں پورے کر لیتی تھی اور نماز قضاء بھی ادا کرلیتی تھی، پھر بھی اگر کوئی کفارہ وغیرہ ہو تو بتادیں۔ آپ سے ایک مسئلہ یہ بھی میں نے سنا ہے کہ حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہوجاتے ہیں، میں نے 2002ء میں حج کیا جب سے لے کر آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں پوری پابندی کرتی ہوں نماز قضاء وغیرہ بھی ادا کرلیتی ہوں۔ آپ سے

گزارش ہے کہ میری راہنمائی فرمائیں اور کوئی کفارہ وغیرہ ادا کرنا ہے یا نہیں جو بھی بہتر ہے مشورہ عنایت فرمائیں، (والدہ محمد رئیس، 865/4 لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

عورتوں کا ایام مخصوصہ میں روزے رکھنا اور نماز پڑھنا حرام ہے ان دنوں میں نمازیں معاف ہیں ان کی قضاء بھی نہیں، روزوں کی قضاء اور دنوں میں فرض ہے۔

حدیثِ مبارک میں ہے:عن معاذة قالت :سألت عا ئشةفقلت :ما بال الحائض تقضي الصوم،ولا تقضي الصلاة؟ فقالت :أحر وريّة أنت؟قلت:لست بحر ورية، ولكني اسأل۔قالت كا ن يصيبنا ذلک ، فنؤمر بقضا ء الصو م،ولا نؤمر بقضا ء الصلاة۔

ترجمہ:''معاذہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ حائضہ عورت روزہ تو قضاء کرتی ہے نماز قضاء نہیں کرتی ،حضرت عائشہ نے پوچھا کیا تو حروریہ (خوارج میں سے) ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں حروریہ نہیں ہوں محض جاننا چاہتی ہوں، آپ نے فرمایا کہ حیض کے ایام میں ہمیں روزوں کی قضاء کا تو حکم دیا جاتا تھا لیکن نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا، (صحیح مسلم رقم الحدیث: 747)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(منها) ان يسقط عن الحا ئض والنفسا ء الصلا ة فلا تقضى هكذ افي الكفاية۔

ترجمہ:''(حیض ونفاس کے احکام میں ہے) کہ حیض اور نفاس والی عورت سے نماز ساقط ہو جائے گی اور اس پر اس کی قضاء بھی نہیں۔''کفایہ'' میں اسی طرح ہے،۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:(ومنها)ان يحر م عليهما الصو م فتقضيا نه هكذا في الكفاية۔

ترجمہ:''(حیض ونفاس کے احکام میں ہے) حیض ونفاس والی عورت پر (اس حال میں) روزے رکھنا حرام ہے، اور بعد میں وہ اس کی قضاء کرے گی'' کفایہ'' میں اسی طرح

ہے، (فتاوٰی عالمگیری جلد 1 ص:38 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔
حکم متفق علیہ ہے تمام مسلمانوں کا اسی پر اجماع ہے کہ حیض اور نفاس کی حالت میں عورت پر نماز اور روزہ واجب نہیں ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ اس پر روزہ کی قضاء واجب ہے اور نماز کی قضاء واجب نہیں ہے، ان میں فرق یہ ہے کہ نمازیں زیادہ ہیں اور دن میں بار بار پڑھی جاتی ہیں اس کے برعکس روزے صرف سال میں ایک بار واجب ہوتے ہیں، یہ حکمت ہمیں معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ نے ایامِ حیض ونفاس میں خواتین کے لئے تخفیف فرمادی اور ان ایام کی فوت شدہ نمازوں کی قضا واجب نہیں فرمائی۔ باقی احکامِ شرعیہ ''تعبدی'' ہوتے ہیں یعنی جیسے اور جس طرح شارع سے ثابت ہیں، انہیں قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا واجب ہے، اگر ان کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے تو یہ ہماری سعادت ہے اور اگر ہماری سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہماری عقل وفہم کی نارسائی ہے۔
آپ نے جو لکھا ہے کہ'' حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہو جاتے ہیں''، ادائیگیٔ حج کے لئے جانے سے قبل کبیرہ گناہوں کی توبہ کی جائے، فرائض کی ادائیگی مثلاً قضا نمازوں کی ادائیگی یا ادائیگی کا عزم، زکوٰۃ کی ادائیگی، حق العبد یعنی اگر کسی کا حق اس کے ذمے ہے، تو اس حق کی ادائیگی یا اس سے اس حق کو معاف کرائے۔

نمازِ قصر میں وطن کی اصطلاح

سوال:29

زید کراچی سے حیدرآباد اپنی فیکٹری میں روزانہ آتا جاتا ہے، وہاں تین نمازوں کا وقت آتا ہے، آیا زید ان نمازوں میں قصر کرے گا یا نہیں؟ نیز بعض علماء نے کہا ہے کہ زید فیکٹری کے قیام کے دوران قصر نہیں کرے گا کیونکہ یہ وطن ترزیق ہے، آیا وطنِ ترزیق کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟، (مولانا شبیر حسین، کراچی)۔

جواب:

کم از کم مسافتِ سفر'' جس کا سفر شروع کرنے سے ''قصر'' واجب ہو جاتی ہے،

وہ مقدارِ سفر ہے، جو انسان اوسط رفتار سے یا اونٹ کی متوسط رفتار سے اپنی طبعی ضروریات و لوازمات (اس سے مراد مناسب آرام، کھانے اور دیگر حاجات کی تکمیل ہے) اور شرعی فرائض (یعنی نمازوں) کی ادائیگی کے ساتھ تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ مسافت کے پیمانے بھی بدلتے گئے اور پھر مسافت کو پہلے انگریزی میلوں اور بعد میں کلومیٹر سے ناپا جانے لگا، لہٰذا عہدِ حاضر کے علماء نے مسافتِ قصر کا اندازہ انگریزی میلوں سے قائم کیا۔ فقہاء کرام کے اقوال میں مفتیٰ بہ قول اٹھارہ فرسخ ہے اور اٹھارہ فرسخ چوّن میل شرعی ہیں، جو ایک لاکھ آٹھ ہزار گز یعنی اِکسٹھ انگریزی میل دو فرلانگ بیس گز ہیں اور یہ اٹھانوے اعشاریہ سات تین چار (98.734) کلومیٹر کے برابر ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ثم اختلفوا فقیل احدوعشرون،وقیل ثمانیة عشر، وقیل خمسة عشر، والفتویٰ علی الثانی لانه الاوسط۔

ترجمہ: ''بعض فقہاء نے اکیس فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اٹھارہ فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے پندرہ فرسخ قرار دیا ہے اور مفتیٰ بہ اٹھارہ فرسخ کا قول ہے، (درمختار: جلد نمبر 2 ص:526 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)''۔

لہٰذا مفتیٰ بہ قول کے مطابق تقریباً اٹھانوے (98) کلومیٹر کی مسافت کے بعد ہی سفرِ شرعی اور قصر کے احکام لاگو ہوں گے۔

وطن کی دو قسمیں ہیں، وطنِ اصلی، وطنِ اقامت، علامہ علاء الدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

(الوطن الاصلی) ھو موطن ولادته او تاھله او توطنه۔

ترجمہ: ''کسی شخص کا وطنِ اصلی اس کی جائے ولادت ہے یا جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے یا جسے وہ اپنے وطن کے طور پر اختیار کر لے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قولہ: (الوطن الاصلی) ویسمی بالاھلی و وطن الفطرۃ ح عن القھستانی، قولہ: (او تاھلہ) ای تزوجہ۔

ترجمہ: ''وطنِ اصلی'' کو'' وطنِ اہلی'' اور'' وطن الفطرۃ'' بھی کہا جاتا ہے، اور قہستانی سے منقول ہے کہ (درمختار کی عبارت میں)'' او تاھلہ'' سے مراد شادی کرنا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:2، ص:535,536، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

عبارۃ عامۃ المشائخ ان الاوطان ثلثۃ، وطن اصلی وھو مولدالرجل اوالبلد الذی تأھل بہ و وطن سفر و قدسمی وطن اقامۃ و ھوالبلد الذی ینوی المسافر الاقامۃ فیہ خمسۃ عشر یوما او اکثر و وطن سکنی وھو البلد الذی ینوی الاقامۃ فیہ دون خمسۃ عشر یوما، و عبارۃ عامۃ المحققین من مشائخنا ان الوطن وطنان، وطن اصلی و وطن اقامۃ ولم یعتبروا وطن السکنی وطنا وھو الصحیح ھکذا فی الکفایۃ۔

ترجمہ:'' عام علماء کی عبارت یہ ہے کہ وطن تین قسم کے ہیں، ایک وطنِ اصلی اور یہ اس کی جائے پیدائش یا وہ مقام ہے جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے، اور دوسرا وطنِ سفر اور اسے وطنِ اقامت بھی کہا جاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت کے لئے رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور تیسرا وطنِ سکنیٰ ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن سے کم مدت کے لئے ٹھہرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور ہمارے علماء میں سے عام محققین کا کہنا یہ ہے کہ وطن کی صرف دو ہی قسمیں ہیں، وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت، اور وہ'' وطنِ سکنیٰ'' کا اعتبار نہیں کرتے اور یہی قول صحیح ہے، اور کفایہ میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری ج:1، ص:143 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ زید فیکٹری میں رہتے ہوئے جو نمازیں جماعت کے ساتھ مقیم امام کے ساتھ

ادا کرے گا انہیں پوری ادا کرے گا، اگر انفرادی طور پر پڑھے گا تو قصر کرے گا یعنی چار رکعتی نماز دو رکعت پڑھے گا، اور اسے چاہئے کہ حتی الامکان جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرے تاکہ جماعت کے اجر زائد کے ساتھ امام کی متابعت میں پوری نماز پڑھنے کا موقع ملے۔ وطنِ ترزیق، (یعنی جہاں انسان کا روزگار وابستہ ہو) کی الگ کوئی قسم اس معنی میں نہیں ہے کہ اس پر ''وطنِ اقامت'' سے ہٹ کر کسی خاص حکم کا اطلاق کیا جاتا ہو۔

اذانِ جمعہ اور نماز کی سعی

سوال:30

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! جب تمہیں نماز جمعہ کے لئے بلایا جائے تو کاروبارِ دنیا چھوڑ کر اس کے لئے سعی کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانو!۔ اس آیت مبارکہ کی رو سے نماز جمعہ کے لئے سعی واجب ہے، ہمارے ہاں جمعہ کے دن دو اذانیں دی جاتی ہیں، اس سے کون سی اذان مراد ہے، پہلی یا دوسری، کیا عہدِ رسالت میں بھی دو اذانیں دی جاتی تھیں۔ (یاسر رحمان، ضلع کوٹلی تحصیل نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۔

ترجمہ: ''اے اہلِ ایمان! جب جمعہ کے دن نماز (جمعہ) کے لئے اذان دی جائے، تو تم اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے اگر تم جانتے ہو، (الجمعہ:9)''۔

قرآن مجید کی ایک مکمل سورت یوم جمعہ کے نام سے منسوب ''سورۃ الجمعہ'' ہے، یہ دو رکوعات پر مشتمل ہے، اس کے دوسرے رکوع میں ''سعیِ جمعہ'' کا حکم ہے، ''سعی'' کی تفسیر میں چار اقوال ہیں: (1) دل سے نیت کرنا (2) نماز جمعہ کی تیاری کرنا یعنی غسل کرنا (3) اذان کی آواز پر لبیک کہنا (4) نماز کی طرف چل پڑنا، مگر بھاگتے ہوئے نہیں وقار

کے ساتھ۔

امام فخر الدین محمد بن عمر ضیاء الدین عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

''سعی'' کے معنی چل پڑنے کے ہیں، دوڑنے کے نہیں ہیں، نیت سے بھی سعی ہوتی ہے (یہ عمل قلب ہے)، اور کسی کام کی طرف متوجہ ہو جانے کا نام بھی ''سعی'' ہے، لیکن یہاں علماء کی ایک جماعت کے نزدیک ''سعی'' سے مراد عمل ہے، امام مالک اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔

سورۃ اللیل، آیت: 4 میں ہے: اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ﴿۴﴾، ''تمہارا عمل مختلف ہے''۔

اور رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے: ''جب تم نماز کی طرف آؤ، تو دوڑتے ہوئے نہ آؤ، بلکہ سکون (ووقار) کے ساتھ آؤ، اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے لئے تشریف لاتے، تو نرم روی سے تشریف لاتے، (تفسیر کبیر، ج:10 ص:542، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

ذکر اللہ کی تفسیر میں تین اقوال ہیں: (1) خطبہ میں امام کی نصیحت (2) نماز کا وقت (3) نماز۔ رہا یہ سوال کہ وہ کون سی اذان ہے، جس کے سننے کے بعد نماز جمعہ کے لئے سعی واجب ہو جاتی ہے، اور خرید وفروخت حرام ہو جاتی ہے؟۔

امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ انصاری قرطبی متوفی 1273ھ لکھتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں باقی نمازوں کی طرح جمعہ کے لئے بھی ایک ہی اذان دی جاتی تھی، اور یہ اذان اس وقت دی جاتی تھی جب رسول اللہ ﷺ منبر پر (خطبہ دینے کے لئے) بیٹھ جاتے تھے، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور کوفہ میں حضرت علی کے دور میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا، جب مدینہ منورہ میں آبادی زیادہ ہوگئی تو حضرت عثمان نے وقتِ زوال (یعنی ظہر کے وقت کی ابتدا) سے ایک اذان کا اضافہ فرما دیا، یہ اذان مقام ''زوراء'' پر ان کے مکان پر دی جاتی تھی، جو بازار میں تھا اور منارے کی طرح بلند تھا، لوگ (یہ پہلی اذان) سن کر چل پڑتے، پھر جب حضرت عثمان منبر پر بیٹھتے تو رسول اللہ ﷺ کے مؤذن (دوسری) اذان

دیتے اور آپ خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔آگے چل کر لکھتے ہیں علامہ ماوردی نے (حضرت عثمان کی اضافہ کردہ) اس اذانِ اول کو بدعت قرار دیا ہے،لیکن حضرت عثمان نے شہر کے پھیلاؤ اور آبادی کی کثرت کی بنا پر ایسا کیا تاکہ لوگ تیار ہو کر خطبہ کے لئے پہنچ سکیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں بازار میں مسجد کی طرف جانے کے لئے اعلان کرنے کا حکم دیا تھا،تاکہ لوگ کاروبار چھوڑ کر مسجد کی جانب چل پڑیں اور جوں ہی لوگ مسجد میں جمع ہوتے (تو خطبے کے وقت) اذان دلاتے تھے،(الجامع لاحکام القرآن، ج:18، ص:100،مکتبۃ الغزالی،دمشق)۔

نوٹ:عہدِ رسالت مآب ﷺ میں چونکہ مدینہ منورہ کی آبادی محدود تھی،اس لئے اذانِ خطبہ سنتے ہی لوگوں کا پہنچنا آسان تھا۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی متوفی:1270ھ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ترجمہ:''(کہ جب حضرت عثمان نے اذانِ اول کا اضافہ فرمایا) تو کسی نے آپ کو ملامت نہیں کیا،(یعنی اس سے ثابت ہوا کہ اس اذان اول کے اضافہ کو تمام صحابہ کرام نے تراویح کی جماعت کی طرح بدعتِ حسنہ تسلیم کرلیا تھا،کیونکہ اس کا مقصد،شریعت کی منشاء کا احسن وکامل طریقے سے حصول تھا)،روح المعانی،ج:28،ص:98،داراحیاء التراث العربی،بیروت)''۔

اسی مقام پر آگے چل کر علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک صحیح ترین یہ ہے کہ (جس اذان کو سننے پر) سعیِ جمعہ واجب ہوتی ہے،اس سے مراد اذانِ اول ہے،کیونکہ اس کا مقصد نماز جمعہ'' کی تیاری کا'' اعلان ہے''۔

علامہ محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی 1088ھ لکھتے ہیں:

"(ووجب السعی الیها وترک البیع)-------(بالاذان الاول)فی الاصحّ وان لم یکن فی زمن الرسول ﷺ بل فی زمن عثمان"۔

ترجمہ:''زیادہ صحیح یہ ہے کہ پہلی اذان کے بعد جمعہ کے لئے سعی کرنا واجب ہے،اگرچہ یہ

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی، حضرت عثمان کے زمانے میں شروع ہوئی"۔
اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

"وحاصله ان السعی نفسه فرض والواجب کونه فی وقت الاذان الاول"۔

ترجمہ:"اس (عبارت کا) حاصل یہ ہے کہ فی نفسہٖ "سعیِ جمعہ" فرض ہے اور اس کا وجوب اذانِ اول کے وقت سے شروع ہوتا ہے"، آگے چل کر لکھتے ہیں: قال فی " شرح المنیه):

واختلفوافی المراد بالاذان الاول:فقیل الاول باعتبار المشروعیة وهوالذی بین یدی المنبرلانه الذی کان اولافی زمنه علیه الصلاة والسلام وزمن ابی بکر وعمر حتیٰ احدث عثمان الاذان الثانی علی "الزوراء" حیث کثر الناس۔ والاصح انه الاول باعتبار الوقت ،وهوالذی یکون علی المنارة بعد الزوال "۔

"شرح المنیہ" میں کہا: فقہاء کا اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ اذانِ اوّل کونسی ہے، ایک قول یہ ہے کہ اس سے وہ اذان مراد ہے جو مشروعیت کے اعتبار سے اوّل ہے اور یہ وہ ہے جو منبر کے سامنے دی جاتی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں یہی اذانِ اول تھی، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب لوگو ں کی آبادی بڑھ گئی تو آپ نے مقام "زوراء" پر دوسری اذان شروع کرائی اور صحیح ترین قول یہ ہے کہ وقت کے اعتبار سے یہی (مقام زوراء والی اذان) اول ہے، جو زوال کے بعد منارہ پر دی جاتی تھی، (ردالمحتار، ج:3،ص:35، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ عہد رسالت ﷺ اور عہدِ شیخین (حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) میں جمعہ کے لئے ایک ہی اذان دی جاتی تھی جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت اس کے سامنے دی جاتی تھی ،اور اسی وقت سے جمعہ کے لئے سعی واجب ہو جاتی تھی اور خرید و فر وخت حرام ہو جاتی تھی۔ لیکن عہدِ عثمان رضی اللہ عنہ میں جب جمعے کے لئے ابتدائے وقت میں مقام "زوراء" پر پہلی اذان شروع ہوئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر نکیر یا اختلاف ثابت نہیں ہے، لہٰذا یہ بدعتِ حسنہ قرار پائی۔

(3)اس پر اب تعامل ہے اور اسی سے جمعہ کے لئے سعی کا وجوب اور کاروبار کا ترک واجب ہو جاتا ہے، آبادی کے پھیلاؤ اور لوگوں کی کثرت کی وجہ سے اگر اذان ثانی سے سعی کے وجوب اور کاروبار کے ترک کرنے کا قول کیا جائے تو اکثر صورتوں میں جمعہ کے خطبۂ واجب کا استماع (سننا) چھوٹ جاتا ہے اور بعض صورتوں میں نماز کی تکبیر تحریمہ یا ایک رکعت بھی چلی جاتی ہے۔اور حدیث پاک میں ہے کہ امام جب خطبے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے تو مسجد کے دروازے پر فرشتے جن نورانی رجسٹروں میں آنے والے نمازیوں کے اسماء ترتیب کے ساتھ لکھتے ہیں اور اسی ترتیب کے مطابق ان کے اجر کے درجات ہیں، وہ رجسٹر بند ہو جاتے ہیں اور دیر سے آنے والے نمازی نورانی رجسٹروں میں ناموں کے اندراج سے محروم رہ جاتے ہیں۔لہٰذا اگر چہ اذان ثانی کے ساتھ ''سعیِ جمعہ'' کے وجوب پر تو سب کا اتفاق ہے، لیکن ہمارے بعض فقہائے احناف نے اذان اول سے ''سعیِ جمعہ'' کے وجوب کے قول کو اَصَحّ (صحیح ترین) قرار دیا ہے، لوگوں کی سستی اور غفلت کو دیکھتے ہوئے عمل کے لئے یہی بہتر ہے، اگر چہ دوسرا قول بھی صحیح ہے۔

خطبۂ جمعہ کے دوران بیٹھنے کی ہیئت

سوال:31

خطبۂ جمعہ وعیدین میں پہلے خطبہ کے دوران ہاتھ باندھ کر بیٹھنا اور دوسرے خطبہ میں ہاتھ کھول کر (یعنی بحالتِ تشہد) بیٹھنا، شرعی اعتبار سے اس کی کیا حقیقت ہے؟، (حافظ غلام مرتضٰی سیالوی، ضلع اٹک)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: واذا شھد الرجل عندالخطبةان شاء جلس محتبیاً او متربصاً او کما تیسّر لانه لیس بصلاۃٍ عملاً وحقیقةً کذا فی المضمرات۔ ویستحب ان یقعد فیھا کما یقعد فی الصلاۃ کذا فی المعراج الدرایة۔

ترجمہ: ''جب کوئی شخص دورانِ خطبہ (مسجد میں) آئے تو (اسے رخصت ہے) چاہے تو

اکڑوں بیٹھے (یعنی اس طرح کہ ایک تہبند میں ہو اور دونوں گھٹنوں کو دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لیا ہوا ہو) یا آلتی پالتی مار کر (چار زانوں) بیٹھے یا جس ہیئت میں وہ آسانی محسوس کرے، کیونکہ خطبہ عملاً اور حقیقۃً نماز نہیں ہے، ''مضمرات'' میں اسی طرح ہے، اور مستحب یہ ہے کہ دورانِ خطبہ اسی طرح بیٹھے جیسے نماز میں (حالتِ تشہد) میں بیٹھتا ہے، ''معراج الدرایہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:148، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

بعض لوگ خطبۂ اولیٰ کو حالت تشہد میں ہاتھ باندھ کر بیٹھے ہوئے سنتے ہیں، یہ کہیں سے ثابت نہیں ہے۔ بس دونوں خطبوں کے دوران حالت تشہد میں بیٹھنا مستحب اور کسی بھی دوسری مناسب ہیئت پر بیٹھنا جائز ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ دو خطبوں کے درمیان امام ومقتدی بغیر ہاتھ اٹھائے یا ہاتھ اٹھا کر دعا کریں یا نہ کریں، تو امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

مختصراً بالجملہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دعائے مذکور خطیب کے لئے مطلقاً اور سامعین کے لئے بالاتفاق جائز، اور مذہبِ امام شافعی وقولِ امام ابی یوسف پر ان کے لئے زبان سے بھی قطعاً اجازت اور ارشادِ امام کی ایک تخریج پر مکروہ، دوسری پر جائز، ائمہ فتویٰ نے دونوں کی تصحیح کی، تو احد الصحیحین (یعنی دونوں صحیح روایتوں) پر دعائے مذکور امام ومقتدین سب کو دل وزبان ہر طرح سے باتفاق مذہبین حنفی وشافعی مطلقاً جائز ومشروع اور علماء تصریح فرماتے ہیں کہ جب ترجیح مختلف متکافی (برابر درجے کی ہو) ہو تو مکلّف کو اختیار ہے کہ ان میں سے جس پر چاہے عمل کرے، اصلاً محل اعتراض وانکار نہیں، بحر الرائق و درمختار میں ہے:

متیٰ کان فی المسئلة قولان مصححان جاز القضاء والافتاء باحدهما۔ ترجمہ: ''جب کسی خاص مسئلے میں دو ایسے قول ہوں جن میں سے ہر ایک کو صحیح قرار دیا گیا ہو، تو ان میں کسی بھی ایک کے جواز پر فیصلہ دینا اور فتویٰ دینا دونوں جائز ہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص:490، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

عیدین ونمازِ جمعہ میں خطبہ سننا واجب ہے، ہر وہ کام جو نماز میں منع ہے، دورانِ خطبہ بھی جائز

نہیں، سماعت کے لیے توجہ اور یکسوئی لازم ہے۔ امام مسلم اپنی صحیح میں حدیث نقل فرماتے ہیں: عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من توضأ فأحسن الوضوء ثمّ أتی الجمعة فاستمع وأنصت غفر له مابينه وبين الجمعة وزيادة ثلاثة أيام ومن مسّ الحصى فقد لغا ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے وضو کیا اور اچھی طرح سے وضو کیا، پھر جمعہ پڑھنے آیا اور خاموشی سے خطبہ سنا، اس جمعہ سے لے کر گزشتہ جمعہ تک کے اُس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، (اس کے علاوہ) مزید تین دن کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور فرمایا: جس شخص نے کنکریاں چھوئیں اس نے لغو کام کیا، ۔۔۔۔۔۔۔۔اس حدیث کی شرح میں علامہ یحیٰ بن شرف النووی لکھتے ہیں: قوله صلى الله عليه وسلم (ومن مس الحصا فقد لغا)فيه النهى عن مس الحصا وغيره من أنواع العبث فى حالة الخطبة وفيه اشارة الى اقبال القلب والجوارح على الخطبة ۔

ترجمہ: ''حضور ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے: اور جس نے کنکریوں کو چھوا، اس نے لغو کام کیا۔ اس فرمانِ رسول ﷺ میں اس طرف اشارہ ہے کہ خطبے کے دوران انسان اپنے قلب اور ظاہری حالت سے مکمل خطبے کی طرف متوجہ ہو، (صحیح مسلم بشرح الامام النووی، جلد2، الجزء السادس، ص:,147146 مطبوعہ: مکتبۃ الغزالی، دمشق)''۔

سماعِ خطبہ کے متعلق احادیث میں سخت تاکید وارد ہوئی ہے: عن ابن شهاب قال: أخبرنى سعيد بن المسيب: ان ابا هريرةأخبره : انّ رسول الله ﷺ قال: "اذا قلت لصاحبک يوم الجمعة أنصت ـ والامام يخطب ـ فقد لغوت "۔

ترجمہ: ''ابن شہاب فرماتے ہیں کہ سعید بن مسیب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب جمعہ کے دن خطبۂ جمعہ کے دوران تُو نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ: چپ رہو، تو تُو نے لغو کام کیا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:934)''۔

عن علی قال: قال رسول اللہ ﷺ : من قال لصاحبہ یوم الجمعة صہ فقد لغا ومن لغا فلیس فی جمعتہ تلک شئی۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے جمعے کے دن اپنے ساتھی سے کہا ''چپ رہو'' تو اُس نے لغو کام کیا اور جس نے لغو کام کیا اس کے لئے اس جمعہ میں کچھ اجر نہیں، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث)''۔

عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ ﷺ: من یتکلم یوم الجمعة والامام یخطب فھو کمثل الحمار یحمل اسفاراً والذی یقول لہ انصت لیس لہ جمعة۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جوشخص جمعہ کے دن اُس وقت کلام کرے، جب امام خطبہ دے رہا ہو، تو وہ اس گدھے کی مانند ہے، جس پر کتابیں لدی ہوں، اور جو اس سے کہے'' چپ ہوجا''، اس کا جمعہ نہیں، (مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، ص:230، مطبوعہ: دارالفکر، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے دورانِ خطبہ جمعہ بات کرنے یا کوئی عمل کرنے سے متعلق سوال ہوا، تو آپ نے جواب میں لکھا:

''عامۂ کتب مذہب میں صاف تصریح ہے کہ جو فعل نماز میں حرام ہے، خطبہ ہونے کی حالت میں بھی حرام ہے، خلاصہ وعالمگیریہ ومتن وشرح تنویر کی عبارات خزانۃ المفتین بعینہا عبارتِ خلاصہ ہے اور اسی سے بحر وحاشیۃ البحر للعلامۃ الشامی میں بہ نقل نہر ماثور، وجیز کردری میں ہے: مایحرم فی الصلوٰۃ یحرم فی الخطبة کالاکل والشرب حال الخطبة۔ ترجمہ:'' جو کچھ نماز میں حرام ہے، خطبہ میں بھی حرام ہے، مثلاً خطبہ کے دوران کھانا اور پینا''۔

شرح منیہ امام محمد ابن امیر الحاج حلبی میں ہے:

کما یکرہ الکلام بانواعہ یکرہ ما یجری مجراہ من کتابة ونحوھا مما یشغل من سماعھا حتی ان فی شرح الزاھدی ویکرہ لمستمع الخطبة مایکرہ فی الصلوٰۃ کالاکل والشرب والعبث والالتفات۔

ترجمہ:" جیسے ہر طرح کی گفتگو منع ہے ویسے ہی اس کے قائم مقام مثلاً کتابت وغیرہ جو خطبہ کے سماع میں خلل ڈالے حتیٰ کہ شرح الزاہدی میں ہے کہ خطبہ کے سامع کے لئے ہر وہ شے مکروہ ہے جو نماز میں مکروہ ہے مثلاً کھانا پینا، عَبث فعل اور کسی طرف متوجہ ہونا وغیرہ۔ اسی طرح علامہ سید احمد مصری نے حاشیۂ شرح نور الایضاح میں بحوالۂ شرح الکنز للعلامۃ عمر بن نجیم وشرح القدوری لمختار بن محمود سے نقل کیا، شرح نقایہ علامہ محمد قہستانی میں ہے: كما منع الكلام منع الاكل والشرب والعبث والالتفات والتخطى وغيرها مما منع فى الصلوٰة كما فى جلابى ۔ ترجمہ:" جس طرح (دورانِ خطبہ کلام منع ہے) اسی طرح کھانا پینا عَبث کام، کسی اور طرف متوجہ ہونا اور گردن پھلانگنا جو کہ نماز میں ممنوع ہیں جیسا کہ جلابی میں ہے۔ متن وشرح علامہ حسن شرنبلالی میں ہے: (كره لحاضر الخطبة الاكل والشرب) وقال الكمال يحرم (والعبث والالتفات) فيجتنب مايجتنبه فى الصلوٰة ۔ ترجمہ:" (خطبہ میں حاضر شخص کے لئے کھانا پینا مکروہ ہے) کمال نے کہا حرام ہے (بے فائدہ کام اور کسی اور طرف متوجہ ہونا) پس ہر شے سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے نماز میں اجتناب کیا جاتا ہے۔ غنیۃ شرح منیہ للعلامہ ابراہیم الحلبی میں ہے: الاستماع والانصات واجب عندنا وعند الجمهور حتى انه يكره قراءة القرآن ونحوها وردالسلام وتشميت العاطس وكذا الاكل والشرب وكل عمل۔

ترجمہ:" خطبہ سننا اور اس کی طرف متوجہ ہونا ہمارے اور جمہور علماء کے نزدیک واجب ہے حتیٰ کہ اس کے دوران قرأتِ قرآن وغیرہ، سلام کا جواب، چھینک کا جواب مکروہ ہے اور اسی طرح کھانا پینا اور ہر عمل کا یہی حکم ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 330,331، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

نمازِ جمعہ کے بعد طویل دعا

سوال:32

جمعہ کی نماز کے فوراً بعد کچھ لوگ سنتیں پڑھنے کھڑے ہوجاتے ہیں اور امام

صاحب دعا مانگ رہے ہوتے ہیں اور جو لوگ نمازِ جمعہ کے فوراً بعد نکلنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی رکاوٹ بنتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے کیا حکم ہے؟ نیز امام صاحب جو اتنی لمبی دعا کرتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟۔ (یاسر رحمان، ضلع کوٹلی تحصیل نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

وہ فرض نمازیں، جن کے بعد سنتیں ہیں، یعنی ظہر و جمعہ و مغرب وعشاء مختصر دعا کرنی چاہئے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ "بعد نمازِ جمعہ انحراف قبلہ یعنی دائیں یا بائیں مڑ کر مناجات کرنا جائز ہے یا نہیں"۔

آپ نے جواب میں تحریر فرمایا: "امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو مطلقاً سنت ہے اور اس کا ترک یعنی بعد سلام قبلہ رُو بیٹھا رہنا امام کے لئے بالاجماع مکروہ ہے، جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعا و مناجات بھی بالاجماع جائز ہے، مگر جس نماز کے بعد سنت ہے یعنی ظہر و جمعہ و مغرب وعشاء اس کے بعد طویل دعا خیر کسی کیلئے بہتر نہیں اور اگر کرے تو منع بھی نہیں، مگر اس قدر نہ ہو کہ مقتدیوں پر گراں گزرے، عادتِ مسلمین یوں جاری ہے کہ امام بعد سلام جب تک دعا سے فارغ نہ ہو مقتدی شریکِ دعا رہتے ہیں اور اس سے قبل اُسے چھوڑ کر نہیں اٹھتے اور یہ اگر چہ شرعاً واجب نہیں مگر حسنِ ادب سے ہے۔ اقول ویمکن الاستیناس له بقوله عزوجل "واذا کانوا معه علی امر جامع لم یذھبوا حتی یستأذنوه "فان فراغه من الدعاءِ یعد اذنامنه دلالة بذلک العرف جار۔

ترجمہ: "(میں کہتا ہوں) اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے استدلال ممکن ہے" اور جب وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی معاملہ میں جمع ہوتے ہیں، تو آپ کی اجازت کے بغیر جاتے نہیں"، کیونکہ دعا سے فراغت اذن ہی تصور ہوتا ہے اور اس پر عرف جاری ہے، تو ایسی حالت میں اتنی طویل دعا کہ بعض مقتدیوں پر ثقیل ہو بمطلقاً نہ کرنی چاہئے اگر چہ اس کے بعد سنت نہ ہو جیسے فجر و عصر، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص: 356 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ: "حدیث میں ہے حضور پُر نور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں:

ان لربکم فی ایام دھرکم نفحات ، فتعرضوا لہ لعلہ ان یصیبکم نفحۃ منھا فلا تشقون بعدھا ابدا۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر عن محمد بن مسلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ترجمہ:''بیشک تمہارے رب کی طرف سے تمہارے ایام زندگی میں کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں، جن میں رحمتِ باری تعالیٰ کے جھونکے آتے ہیں، تو انہیں پانے کی تدبیر کرو، شاید ان میں سے کوئی مبارک لمحہ تمہیں نصیب ہو جائے تو پھر کبھی بدبختی تمہارے پاس نہ آئے، اسے طبرانی نے کبیر میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

اور خود حدیث نے اُن اوقات میں سے ایک وقت ''اجتماعِ مسلمین'' کا نشان دیا کہ ایک گروہِ مسلمان جمع ہو کر دعا مانگے، کچھ عرض کریں، کچھ آمین کہیں، کتاب المستدرک علی البخاری ومسلم میں ہے:عن حبیب بن مسلمۃ الفھری رضی اللہ تعالیٰ عنہ وکان مستجاب الدعوات قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لایجتمع ملأ فیدعوا بعضھم الااجابھم اللہ۔

ترجمہ:''حبیب بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ مستجاب الدعوات تھے، فرماتے ہیں: میں نے حضور پرنور سید عالم ﷺ کو فرماتے سنا کہ جب بھی کوئی جماعتِ مسلمین جمع ہو اور ان میں سے بعض دعا کریں اور بعض آمین کہیں، تو اللہ عزوجل ان کی دعا قبول فرمائے گا۔

علماء نے مجمعِ مسلمین کو اوقاتِ قبولیتِ دعا میں شمار کیا ہے۔ حصن حصین میں ہے:واجتماع المسلمین یعنی مسلمانوں کا اجتماع اوقاتِ اجابت سے ہونا حدیثِ صحاحِ ستہ سے مستفاد ہے، علامہ علی القاری شرح میں فرماتے ہیں: ثم کل مایکون الاجتماع فیہ اکثر کالجمعۃ والعیدین وعرفۃ یتوقع فیہ رجاء الاجابۃ اظھر۔ یعنی جس قدر مجمع کثیر ہوگا جیسے جمعہ وعیدین وعرفات میں، اسی قدر قبولیت دعا کی امید بہت زیادہ ہوگی، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص:522,523 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

لہٰذا جہاں پہلے سے یہ امر معروف ومعتاد ہے کہ جمعہ کے بعد اجتماعی دعا ہوتی ہے، وہاں لوگوں کی اکثریت کا احترام کرنا چاہئے۔ آخر خطبہ جمعہ وعید کے وقت سنتیں یا نوافل پڑھنے

کی ممانعت بھی اسی احترام کے سبب مشروع ہے۔اور اگر دعا کرنے والوں کے درمیان سے کوئی شخص کسی ضرورت کے تحت اٹھ کر جانا چاہے،تو اس کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے، البتہ اگر سنتیں وہیں پڑھنی ہیں تو اختتامِ دعا کا انتظار کرلے۔

کپڑا لٹکا کر چلنے یا گھسیٹے ہوئے چلنے کا حکم
نماز میں ''کفِ ثوب، جرِ ثوب اور اسبالِ ازار'' کا حکم

محترم جناب مفتی صاحب روزنامہ ایکسپریس کی وساطت سے دو اہم مسائل پیش کرتا ہوں، جن کی معاشرے میں اصلاح کرنا فرضِ عین ہے۔

سوال:33

دورانِ نماز اور علاوہ نماز شلوار کو نیفے سے دوہرا اور پتلون پہنی ہو تو پائنچوں سے دہرا کرنا شرعی طور پر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیونکہ ٹخنوں کو ڈھانپنا دوزخ کی طرف لے جاتا ہے،اگر شلوار یا پتلون لمبی ہو تو کیا کیا جائے حالانکہ اس کی نیت میں تکبر بھی نہیں ہے ازراہِ کرم حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں،(حاجی عبدالشکور میر، راولپنڈی)۔

جواب:

نوٹ: اس مسئلے میں بعض حضرات بہت زیادہ شدّت کرتے ہیں اور دوسروں سے نفرت اور تعلّی کرتے ہیں،یعنی اپنے تقوے اور پارسائی کا زیادہ ہی کچھ اظہار کرتے ہیں، خالص شرعی و دینی مسئلے میں توازن اور راہِ اعتدال کو چھوڑ دیتے ہیں، اس کے نتیجے میں بعض لبرل مزاج کے لوگ اسلام اور اہل دین پر طعن کرتے ہیں کہ ان کا فہم اسلام فقط نماز میں شلوار و پائنچے کی لمبائی چیک کرنے تک ہے، گرد وپیش میں جو اور بڑی برائیاں، ظلم وتعدّی، استحصال، لوٹ کھسوٹ، ناجائز نفع خوری، رشوت خوری، حقوق انسانی کی پامالی، قتل وغارت اور دہشت گردی انہیں نظر نہیں آتی، نہ ہی وہ اِن قومی اور معاشرتی جرائم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، خاص طور وہ دعوت وتبلیغ کی جماعتیں جنہوں نے نماز کو اسلام کا ایک اساسی رکن سمجھنے کے بجائے کل دین سمجھ لیا ہے اور دین کے باقی شعبے ان کی دعوت وتبلیغ

توجیہات اور ترجیحات کا محور نہیں ہیں۔

لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا کہ ایک بار پھر اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو مع دلائل (احادیث وفقہ) تفصیل سے بیان کر دیا جائے، کسی شخص کو خود شارع بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، کسی معاملے میں جو صحیح دینی مسئلہ ہے وہ بیان کر دینا چاہئے، اپنی طرف سے کسی مسئلے کی شدت یا حرمت میں اضافہ درست نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک شلوار کو نیفے کی جانب اڑسنا، پتلون کے پائنچے کی تہیں بنا کر نیچے سے موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا، اسی طرح آستینوں کی تہیں بنا کر موڑنا یا جسے عرفِ عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ''تشمیر'' کہتے ہیں، تمام پر ''کفِ ثوب'' کا اطلاق ہوتا ہے اور احادیث کی رو سے ممنوع ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ، عن النبی ﷺ قال:"وما اسفل من الکعبین من الازار ففی النار"۔

ترجمہ:'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ازار کا جتنا حصہ ٹخنوں سے نیچے ہو وہ جہنم میں ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث:5787)''۔

عن ابی ھریرۃ: ان رسول اللّٰہ ﷺ قال: "لاینظر اللّٰہ یوم القیامۃ الی من جر ازارہ بطرا"۔

ترجمہ:'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف قیامت کے روز نظر بھی نہیں فرمائے گا، جو ازراہ تکبر اپنی ازار (تہبند) کو گھسیٹ کر چلتا ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث:5788)''۔

عن ابی ھریرۃ قال: بینما رجل یصلی مسبلاً ازارہ اذ قال لہ رسول اللّٰہ ﷺ: "اذھب فتوضا"، فذھب فتوضا فقال لہ رجل: یارسول اللّٰہ، مالک امرتہ ان یتوضا؟ قال: "انہ کان یصلی وھومسبل ازارہ، وان اللّٰہ جل ذکرہ لایقبل صلاۃ رجل مسبل ازارہ"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں ایک شخص تہبند لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا، نبی ﷺ نے اس سے فرمایا: جا کر وضو کرو، اس نے جا کر وضو کیا، ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے اس کو وضو کرنے کا حکم کیوں دیا؟ آپ نے فرمایا: یہ شخص تہبند لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا اور اللہ تعالیٰ تہبند لٹکانے والے کی نماز قبول نہیں کرتا، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث:638)''۔

تکبر کے بغیر یا اتفاقاً ٹخنے کے نیچے ازار لٹکنے کی رخصت کے متعلق احادیث:

عن سالم بن عبداللّٰه، عن ابیه رضی اللّٰه عنه، عن النبی ﷺ قال: "من جرثوبه خیلاء لم ینظر اللّٰه الیه یوم القیامة"۔ قال ابوبکر: یارسول اللّٰه ، ان احد شقی ازاری یسترخی، الا ان اتعاهد ذلک منه؟ فقال النبی ﷺ : "لست ممن یصنعه خیلاء"۔

ترجمہ: ''حضرت سالم بن عبداللہ اپنے والد حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو تکبر کے باعث کپڑا گھسیٹے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظر نہیں فرمائے گا۔ حضرت ابوبکر عرض گزار ہوئے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میری چادر کا ایک سرا غیر ارادی طور پر لٹک جاتا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ ہمہ وقت ادھر متوجہ رہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر کے باعث ایسا کرتے ہیں، (صحیح بخاری رقم الحدیث:5784)''۔

عن ابی بکرة رضی اللّٰه عنه قال: خسفت الشمس ونحن عندالنبی ﷺ، فقال یجرثوبه مستعجلا، حتی اتی المسجد، وثاب الناس فصلی رکعتین فجلی عنها، ثم اقبل علینا، وقال: "ان الشمس والقمر ایتان من ایات اللّٰه، فاذا رایتم منها شیئا فصلّوا، وادعوا اللّٰه حتی یکشفها"۔

ترجمہ: ''حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سورج کو گرہن لگا اور ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں موجود تھے کہ آپ جلدی سے کپڑا گھسیٹتے ہوئے اُٹھے یہاں تک کہ مسجد میں

پہنچ گئے اور لوگ بھی جمع ہو گئے تو آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، جب تم انہیں گہن لگا ہوا دیکھو تو نماز پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو، یہاں تک کہ وہ پورا نظر آنے لگے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5785)"۔

حدثنا شعبة قال: لقیت محارب بن دثار علی فرس، وهو یاتی مکانه الذی یقضی فیه، فسالته عن هذا الحدیث فحدثنی فقال: سمعت عبد الله بن عمرَرضی الله عنهما یقول : قال رسول اللهﷺ: "من جرّثوبهٗ مُخیّلة لم ینظرِالله الیه یومَ القیامة"۔ فقلت لمحارب: اذکرازاره؟ قال: ماخص ازاراً ولا قمیصا۔ تابعه جبلة بن سحیم، وزید بن اسلم، وزید بن عبدالله، عن ابن عمر، عن النبیﷺ۔وقال اللیث ، عن نافع، عن ابن عمر: مثله۔ وتابعه موسیٰ بن عقبة، وعمربن محمد، وقدامة بن موسی، عن سالم، عن ابن عمر، عن النبی ﷺ: "من جرثوبهٗ خیلاء"۔

ترجمہ: "شعبہ کا بیان ہے کہ میں مُحارب بن دثار (قاضی کوفہ) سے ملا جبکہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر عدالت کی طرف جارہے تھے، تو میں نے ان سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ازراہ تکبر کپڑا گھسیٹ کر چلے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظر نہیں فرمائے گا، میں نے مُحارب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے ازار کا ذکر کیا؟ فرمایا کہ ازار یا قمیص کی تخصیص نہیں کی۔ جبلہ بن سحیم زید بن اسلم اور زید بن عبداللہ، حضرت ابن عمر نے نبی کریم ﷺ سے اسی کی روایت کی ہے۔ موسیٰ بن عقبہ، عمر بن محمد، قدامہ بن موسیٰ، سالم، حضرت ابنِ عمر نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ جو اپنا کپڑا بطور تکبر گھسیٹ کر چلے گا، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 5791)"۔

عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: "من جرثوبة

خیلاء، لم ینظر اللّٰہ الیہ یوم القیامۃ"۔ فقال ابو بکر: ان احدشقی ثوبی یسترخی،الا ان اتعاھد ذلک منہ؟ فقال رسول اللّٰہ ﷺ: "انک لست تصنع ذلک خیلاء"۔ قال موسیٰ: فقلت لسالم: اذکرعبد اللّٰہ : من جرازارہ؟ قال لم اسمعہ ذکر الا ثوبہ۔

ترجمہ:'' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔ جوازراہِ تکبر کپڑا گھسیٹے گا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا۔ حضرت ابو بکر کہنے لگے کہ میرے کپڑے کا ایک کونہ عموماً لٹک جاتا ہے،لہٰذا اب میں احتیاط کیا کروں گا، پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم ایسا ازراہِ تکبر نہیں کرتے۔ موسیٰ بن عقبہ نے سالم سے دریافت کیا کہ کیا حضرت عبداللہ بن عمر نے'' من جرّازارہ'' (یعنی جو شخص اپنی تہبند کو گھسیٹے) کہا ہے؟ جواب دیا: میں نے یہ الفاظ نہیں سنے، بلکہ میں نے تو یہ سنا کہ انہوں نے'' ثوبہ'' (یعنی مطلقاً کپڑا گھسیٹے ہوئے چلنے کی بابت) کہا ہے(صحیح بخاری رقم الحدیث:3665)۔

عن ابن عباس قال: أُمر النبیﷺ أن یسجد علی سبعۃ، ونھی أن یکف شعرہ وثیابہ۔ قال ابو الربیع:علیٰ سبعۃ أعظم، ونھی أن یکف شعرہ وثیابہ، الکفّین والرکبتین والقدمین والجبھۃ۔

ترجمہ:'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات (اعضاء) پر سجدہ کرنے کا حکم دیا اور نماز کی حالت میں بال سنوارنے اور کپڑوں کو موڑنے سے منع کیا گیا ہے ،ابو الربیعہ کی روایت میں سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے اور بالوں کو سنوارنے اور کپڑوں کو سمیٹنے کی ممانعت کا ذکر ہے،وہ سات ہڈیاں یہ ہیں ،دو ہتھیلیاں،دو گھٹنے،دونوں قدم اور پیشانی،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:1076)۔

اس حدیث میں'' کفِ ثوب'' سے ممانعت کا حکم ہے۔ ہمارے نزدیک کپڑوں کو نیفے کی جانب اڑسنا، پتلون کے پائنچے کی تہیں بنا کر نیچے سے اوپر موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے

ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا سب اس کا مصداق بنتے ہیں، اسی طرح آستینوں کی تہیں بنا کر موڑنا یا جسے عرفِ عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ''تشمیر'' کہتے ہیں، اس پر بھی ''کفِ ثوب'' کا اطلاق ہوتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث مبارک اور دیگر احادیث کی روشنی کی رو سے ممنوع ہے۔

علامہ عینی لکھتے ہیں: من جرازاره من غیر قصد التخیُّل فانه لا باس به من غیر کراهة و کذالک یجوز لدفع ضرر یحصل له کان یکون تحت کعبیه جراح او حکة او نحو ذلک ان لم یغطها تؤذیه الهوام کالذباب و نحوه بالجلوس علیها و لا یجد مایسترها به الاازار ه او ردائه او قمیصه و هذا کما یجوز کشف العورة للتداوی و غیر ذلک۔

ترجمہ: ''جس شخص نے بغیر قصد تکبر کے تہبند ٹخنوں کے نیچے باندھا اس میں کوئی کراہت نہیں ہے نہ کوئی حرج ہے، اسی طرح کسی ضرر کو دور کرنے کے لئے بھی ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانا جائز ہے، مثلاً اس کے ٹخنوں کے نیچے کوئی زخم ہو یا خارش ہو یا اگر وہ ٹخنوں کو نہ ڈھانپے تو اس پر مکھیاں اور حشرات الارض کے بیٹھنے کا خطرہ ہو اور لمبی قمیص یا لمبا تہبند اور کوئی چیز ڈھانپنے کے لئے میسر نہ ہو۔

علامہ عینی مزید لکھتے ہیں: انه لا حرج علی من یجر ازاره بغیر قصد کما ذکرنا ه فان قلت روی ابن ابی شیبة عن ابن عمر انه کان یکره جر الازار علی کل حال قلت قال ابن بطال هو من تشدیداته و الا فقد روی هو حدیث الباب فلم یخف علیه الحکم۔

ترجمہ: '' حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو بکر نے اپنے تہبند کے ایک جانب پھسل جانے کا ذکر کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے، (یعنی تم پر اس وعید کا اطلاق نہیں ہوتا)، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کا تہبند بلا قصد پھسل جائے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یہ اعتراض ہو کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہر حال

میں تہبند لٹکانے کو مکروہ کہتے تھے، اس کے جواب میں علامہ ابن بطال نے کہا ہے کہ یہ حضرت ابن عمر کی تشدیدات (یعنی احتیاط کی بنا پر کسی مسئلے میں شدت کرنا) میں سے ہے ورنہ حضرت ابن عمر تو خود اس حدیث کے راوی ہیں ان سے یہ حکم کیسے مخفی ہوسکتا ہے، (عمدۃ القاری، جلد 21 ص:296 مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیر یہ، مصر)"۔

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری لکھتے ہیں: لدلالۃ ظواھر الاحادیث علیھا فان کان للخیلاء فھو ممنوع منع تحریم والا فمنع تنزیہ۔

ترجمہ: "بخاری کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تکبر کے ساتھ کپڑا لٹکا کر چلنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر تکبر کی نیت سے نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے، (مرقات، جلد 8 ص: 239 مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان)"۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: اگر کوئی شخص تکبُر، اِسراف اور طُغیان (سرکشی) کی نیت سے اپنے تہبند کو لمبا بناتا ہے اور اس کو گھسیٹتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف لطف وعنایت کی نظر نہیں فرمائے گا۔ اس قید سے معلوم ہوا کہ اگر تہبند اس طرح نہ ہو تو حرام نہیں ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے، اور اگر کوئی عذر ہو مثلاً سردی ہو یا کوئی بیماری ہو (مثلاً ٹخنے کے نیچے کوئی زخم ہو جس پر مکھیاں بیٹھتی ہوں ان سے زخم کو بچانے کے لئے ٹخنہ ڈھانپے) تو بالکل مکروہ نہیں ہے، (اشعۃ اللمعات، جلد 3 ص:536، 537 مطبوعہ: مطبع تیج کمار لکھنو)"۔

مزید لکھتے ہیں: حرام وہ صورت ہے جب کوئی شخص عُجب اور تکبُر سے کپڑا لٹکائے،۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: طعام اور لباس میں توسیع، اِسراف اور تکبر کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر مباح ہے، (اشعۃ اللمعات، جلد 3 ص:555، 555 مطبوعہ: مطبع تیج کمار لکھنو)"۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں: فی الخلاصۃ ان یکرہ کذا فی شرح مُنیۃ المصلّی ویدخل ایضاً فی کف الثوب تشمیر کمہ کما فی فتح القدیر

وظاهره الاطلاق وفی الخلاصة ومنية المصلی قيد الكراهة بان يكون رافعاً كميه الی المرفقين وظاهره انه لا يكره اذا كان يرفعها الی مادونها والظاهر الاطلاق لصدق كف الثوب علی الكل وذكر فی المجتبیٰ فی كراهية تشمية الكمين قولين ۔

ترجمہ: ''خلاصہ میں مذکور ہے کہ نمازی کا کپڑا موڑنا مکروہ ہے، اسی طرح ''شرح منیۃ المصلی'' میں ہے اور کپڑا موڑنے میں آستینوں کا اُڑسنا بھی شامل ہے اسی طرح ''فتح القدیر'' میں ہے اور یہ بظاہر مطلق ہے، لیکن ''خلاصہ'' اور ''منیۃ المصلی'' میں ہے کہ اگر آستینوں کو کہنیوں تک چڑھالیا تو مکروہ ہوگا اور کہنیوں سے کم تک آستین چڑھائی ہیں تو مکروہ نہیں ہوگا، لیکن تحقیق یہ ہے کہ ہر حال میں مکروہ ہوگا کیونکہ کپڑا موڑنے کا اطلاق ہر صورت پر آتا ہے اور ''مجتبیٰ'' میں آستین چڑھانے کی کراہت کے بارے میں دو قول ذکر کیے گئے ہیں، (یعنی ایک کراہت کا اور دوسرا عدمِ کراہت کا)، (البحر الرائق، جلد 2، ص: 24، مطبوعہ طبعہ علمیہ، مصر)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (و) كره (كفه) أی رفعه ولو لتراب كمشمر كم أو ذيل (وعبثه به) أی بثوبه۔

ترجمہ: ''اور کپڑے کا سمیٹنا یعنی اوپر اٹھانا مکروہ ہے، خواہ مٹی سے بچنے کے لئے ایسا کرے، جیسے آستین چڑھانا یا دامن کو اوپر اٹھانا اور کپڑے کے ساتھ کھیلنا۔''

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: أی كمالو دخل فی الصلاة وهو مشمّر كُمه أو ذيله، وأشار بذلك الی أن الكراهة لا تختص بالكف وهو فی الصلاة، كما افاده فی "شرح المنية"، لكن قال فی "القنية": واختلف فيمن صلی وقد شمر كميه لعمل كان يعمله قبل الصلاة أو هيئته ذلك ومنه مالو شمر للوضوء ثم عجل لادراك الركعة مع الامام ۔واذا دخل فی الصلاة كذلك وقلنا بالكراهة فهل الافضل إرخاءُ كميه فيها بعمل قليل أو تركهما؟

لم أرہ: والأظہر الأول بدلیل قولہ الآتی: "ولو سقطت قلنسوتہ فاعادتہا أفضل" تأمل۔

ترجمہ: ''یعنی جس طرح ایک شخص نماز میں داخل ہوتے وقت ہی آستین یا دامن چڑھائے ہوئے تھا، اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ کراہت صرف اس صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ نماز کے اندر آستین چڑھائے تو تب مکروہ ہے، جیسا کہ ''شرح المنیہ'' سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔ لیکن ''القنیہ'' میں کہا ہے کہ: ''اس امر میں اختلاف رائے ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اور وہ (نماز میں داخل ہونے سے) پہلے ہی کسی کام کی بناء پر آستین چڑھائے ہوئے تھا یا اس کی ہیئت ہی ایسے ہے۔'' اور انہی میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اس نے وضو کے لئے آستین چڑھائے، پھر امام کے ساتھ رکعت پانے کی خاطر عجلت کرے اور اسی حالت میں نماز میں داخل ہو جائے، تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اب نماز کے اندر عمل قلیل کے ذریعے آستینیں کھول دے یا اپنی حالت پر چھوڑ دے، میں نے کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں پایا، لیکن زیادہ واضح بات پہلے والی بات ہے (یعنی یہ کہ عمل قلیل سے کھول دے)، اس کی دلیل علامہ حصکفی کے اس قول سے ملتی ہے کہ: ''اگر نمازی کی ٹوپی گر جائے تو اٹھا کر سر پر رکھ لینا ہی افضل ہے، غور کیجئے''۔

آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ: وقید الکراہۃ فی "الخلاصۃ" و "المنیۃ" بأن یکون رافعاً کمیہ الی المرفقین ۔ وظاہرہ أنہ لا یکرہ الی مادونہما ۔ قال فی "البحر": والظاہر الاطلاق لصدق کف الثوب علی الکل ۔

ترجمہ: ''خلاصہ'' اور ''منیہ'' میں کراہت کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا ہے کہ آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی ہیں، اور اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ کہنیوں سے نیچے تک چڑھانا، باعث کراہت نہیں ہے، لیکن ''البحر الرائق'' میں لکھا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً آستینیں چڑھانا (کہنیوں سے نیچے ہو یا اوپر) کراہت کا سبب ہے کیونکہ ''کفِ ثوب'' تمام صورتوں پر صادق آتا ہے۔ (ردالمحتار جلد: 2، ص:350، مطبوعہ داراحیاء التراث

ذَاالجلالِ والاکرام" واما ما وَرَدَمِنَ الاحادیثِ فی الَاذْکار عقیب الصّلاۃِ فَلا دلالۃَ فیہ علی الْاِتیانِ بھاقبلَ السُّنَّۃِ، بل یُحمَلُ علیَ الاِتیانِ بھا بعدَھا، لأن السُّنَّۃَ مِنْ لواحقِ الفَریضۃِ وتوابِعِھا ومُکَمِّلاَ تِھا فلم تکُنْ أجنبیۃ عنھا، فما یفعل بعدھا یُطلق علیہِ أنہ عقیبَ الفریضۃ۔

ترجمہ:" (یعنی مقدار: اللّٰھم الخ) کیونکہ مسلم اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف "اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلاَمُ وَمِنْکَ السَّلاَمُ، تَبَارَکْتَ یَاذَاالْجَلاَلِ وَالْاِکْرَام" کی مقدار ہی بیٹھتے تھے، اور دیگر روایات میں جو نماز کے بعد اذکار کا ذکر ہے اس میں یہ دلالت نہیں کہ وہ اذکار سنتوں سے پہلے ہوتے تھے بلکہ (ان تسبیحات واوراد کے پڑھنے کو سنتوں کے بعد پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے)، کیونکہ سنتیں فرائض کے ساتھ لاحق ہوتی ہیں اور ان کے تابع ہوتی ہیں، اور ان (میں نادانستہ طور پر کوئی کمی رہ جائے تو اس کی) تکمیل کا سبب ہیں، لہٰذا یہ فرائض سے بالکل الگ کوئی چیز نہیں ہیں، لہٰذا جو تسبیحات ان سنتوں کے بعد پڑھی جائیں، ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ عمل فرضوں کے بعد ادا ہوا، ((ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2 ص: 218،219، دار احیاء التراث العربی، بیروت))"۔

وہ فرض نمازیں، جن کے بعد سُنتیں ہیں، (یعنی ظہر وجمعہ ومغرب وعشاء) ان نمازوں کے بعد دعا بھی مختصر کرنی چاہئے، امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال ہوا کہ "بعد نمازِ جمعہ انحراف قبلہ یعنی دائیں یا بائیں مڑکر مناجات کرنا جائز ہے یا نہیں"۔

آپ نے جواب میں تحریر فرمایا:" امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو مطلقاً سُنت ہے اور اس کا ترک یعنی بعدِ سلام قبلہ رُو بیٹھا رہنا امام کے لئے بالاجماع مکروہ ہے، جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعا ومناجات بھی بالاجماع جائز ہے، مگر جس نماز کے بعد سنت ہے یعنی ظہر وجمعہ ومغرب وعشاء اس کے بعد طویل تاخیر کسی کیلئے بہتر نہیں اور اگر کرے تو منع بھی نہیں، مگر اس قدر نہ ہو کہ مقتدیوں پر گراں گزرے، عادت مسلمین یوں

العربی، بیروت)۔

امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا'' آستینیں کہنی تک چڑھی ہوئی نماز پڑھنی مکروہ ہے یا نہیں؟'' جواب دیا: ''ضرور مکروہ اور سخت وشدید مکروہ ہے۔'' (فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص:311، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔

مفتی محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی لکھتے ہیں:

قوله من جرّ إزاره بَطَراً ای تکبراً وفرحاً وطغیاناً ویفهم ان جرّهٗ بغیرذالک لایکون حراما لکنه مکروہ کراهةً تنزیه۔

ترجمہ: '' رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ: جو شخص تکبر، نشاط اور سرکشی کی نیت سے اپنا کپڑا زمین پر گھسیٹ کر چلا، (حدیث مبارک کے ان الفاظ سے) یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا لباس گھسیٹے ہوئے زمین پر چلتا ہے، لیکن اس کی نیت تکبر وسرکشی کی نہیں ہے، تو اس کا یہ عمل حرام نہیں ہوتا، بلکہ مکروہِ تنزیہی ہوگا، (التعلیق الصبیح، ج:4، ص:383)''۔

''کفِ ثوب'' کو بیشتر فقہاء کرام نے مکروہِ تحریمی کہا ہے اور بقول علامہ ابن عابدین شامی جو کراہت کی نفی کرتے ہیں وہ کراہتِ تحریمی کی نفی کرتے ہیں، کراہتِ تنزیہی سب کے نزدیک ثابت ہے، (منحۃ الخالق حاشیہ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۴) اور اس حکم کراہت میں وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو شروع میں ذکر کردی گئی ہیں۔ نماز میں ہیئتِ لباس کے بارے میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ۔

ترجمہ: '' اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس (زینت) اختیار کیا کرو، (الاعراف:31)۔''

یعنی نماز باوقار لباس پہن کر پڑھنی چاہئے اور اوپر'' کفِ ثوب'' کی جتنی صورتیں بیان کی ہیں، یہ سب وقار کے منافی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ وضع اختیار کر کے کسی باوقار اور ذی وجاہت ہستی کے سامنے نہیں جاتا، چہ جائے کہ '' احکم الحاکمین'' کی بارگاہ میں حاضر ہو۔ اگر کوئی شخص ہاف کٹ آستین والی قمیص پہنے ہوئے ہے، یعنی ایسی قمیص جس کی آستین کی اصل وضع اور ساخت ہاف کٹ ہے، یعنی کہنیوں یا اس سے اوپر ہے، اس کو پہن کر نماز

جاری ہے کہ امام بعد سلام جب تک دعا سے فارغ نہ ہو مقتدی شریکِ دعا رہتے ہیں اور اس سے قبل اُسے چھوڑ کر نہیں اٹھتے اور یہ اگر چہ شرعاً واجب نہیں مگر حسنِ ادب سے ہے۔اقول ویمکن الاستیناس له بقوله عَزّوَجَلّ "واذا کانوا معهٗ علی امرٍ جامعٍ لَم یَذھَبُوا حَتّی یَستَاذِنُوهُ "فَاِنَّ فَرَاغَهٗ مِنَ الدُّعَاءِ یُعَدُّ اِذنامِنهُ دَلالةً بِذٰلِکَ العُرُف جار۔

ترجمہ:" (میں کہتا ہوں) اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے استدلال ممکن ہے" اور جب وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی معاملہ میں جمع ہوتے ہیں، تو آپ کی اجازت کے بغیر جاتے نہیں"، کیونکہ دعا سے فراغت اذن ہی تصور ہوتا ہے اور اس پر عرف جاری ہے، تو ایسی حالت میں اتنی طویل دعا کہ بعض مقتدیوں پر ثقیل ہو مطلقاً نہ کرنی چاہئے اگر چہ اس کے بعد سنت نہ ہو جیسے فجر وعصر، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص:356 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

فرض کے بعد اذکار کے بارے میں یہ دو احادیث بھی ملاحظہ ہوں: قال رسول اللہ ﷺ من قرأ اٰیة الکرسی دُبُرَ کل صلوٰة مکتوبة لم یمنعه من دخول الجنة الا الموت وزاد الطبرانی وقل ھواللہ احد۔

ترجمہ:" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی اس کے لئے جنت میں جانے سے موت کے سوا اور کوئی چیز رکاوٹ نہیں ہے۔اور طبرانی نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھنے کی زیادتی بھی روایت کی ہے، (سنن نسائی، رقم الحدیث:)"۔

عن عقبة بن عامر قال امرنی رسول اللہ ﷺ ان اقرأ المعوذات فی دبر کل صلوٰة۔

ترجمہ:" حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، (یہ سورتیں) پڑھا کروں، (سنن نسائی، رقم الحدیث:1335)"۔

ان پر بحث کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

پڑھی جائے تو مکروہ نہیں ہوگی، کیونکہ نماز میں پہنچوں تک آستینوں کا رکھنا ضروری نہیں ہے (یعنی قباحت اس میں ہے کہ اپنی ساخت میں قمیص پوری آستین والی ہو اور پھر خلافِ وضع آستین چڑھا کر نماز پڑھے)۔ عہدِ رسالت سے لے کر آج تک کے مسلمان احرام باندھ کر نماز پڑھتے ہیں اور احرام میں پوری کلائیاں ڈھکی ہوئی نہیں ہوتیں اور نہ انہیں ڈھکنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز نبی ﷺ اور متعدد صحابہ کرام نے ایک کپڑا اپنے جسم پر لپیٹ کر بھی نماز پڑھی ہے اور اس صورت میں پوری کلائیوں کا ڈھکنا متصور ہی نہیں ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی اس مسئلے پر مفصل بحث کرتے ہوئے اپنی تحقیقی بیان میں فرماتے ہیں: ہماری تحقیق یہ ہے کہ احادیث میں ''جرِ ثوب اور'' اِسبال اِزار'' کے الفاظ ہیں۔ ''جرِ ثوب'' کا معنی ہے کپڑا گھسیٹنا اور ''اِسبال الِازار'' کا معنی ہے تہبند کا ٹخنوں سے نیچے ہونا۔ اگر کوئی مرد جرِ ثوب کرے یعنی اس کا تہبند یا شلوار کا پائنچہ ٹخنوں سے بہت نیچا ہو حتیٰ کہ اس کے قدموں سے نیچے گھسٹ رہا ہو تو یہ بغیر تکبر کے بھی مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ اس میں بغیر کسی ضرورت اور بغیر کسی فائدہ کے کپڑے کو ضائع کرنا ہے، سو یہ اسراف کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب کپڑا قدموں کے نیچے زمین پر گھسٹتا رہے گا تو نجاست کے ساتھ آلودہ ہوگا اور کپڑے کو محلِ نجاست میں ڈالنا بھی مکروہِ تحریمی ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ مشابہت ہے، کیونکہ عہدِ رسالت میں عورتیں کپڑا گھسیٹ کر چلتی تھیں اور مردوں کے لئے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا بھی مکروہِ تحریمی ہے اس لئے اگر جرِ ثوب بغیر تکبر کے ہو پھر بھی مکروہِ تحریمی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر مالکی نے اس کو مذموم فرمایا ہے (تمہید جلد:3،ص:244)۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کو مکروہِ تحریمی فرمایا ہے، (فتح الباری ،جلد:10،ص:263)۔ اور اگر ''جرِ ثوب'' میں کپڑا گھسیٹنے کے ساتھ اظہارِ تکبر بھی ہو تو یہ شدید مکروہ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے، اور اگر ''اِسبالِ ازار'' ہو یعنی تہبند یا شلوار کا پائنچہ ٹخنوں کے نیچے ہو لیکن اس کے قد و قامت کے برابر ہو گھسٹ نہ رہا ہو تو اگر اس میں تکبر نہیں ہے صرف زینت کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ صرف

''امام ابن ہمام نے ان اذکار کی یہ تاویل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سنتیں پڑھنے کے بعد یہ اذکار پڑھا کرتے تھے اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ فرض کے بعد یہ اذکار پڑھتے تھے جیسا کہ صحیح مسلم کی (حدیث نمبر 1243) اور ابن حبان، نسائی اور طبرانی کی آیت الکرسی والی حدیث ہے علامہ ابن ہمام نے کہا سنتیں چونکہ فرض کے بعد پڑھی جاتی ہیں اس لیے جو ذکر سنتوں کے بعد ہوگا وہ فرض کے بعد ہی ہوگا۔ اس پر پھر اعتراض ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سنن اور نوافل گھر میں پڑھتے تھے پھر صحابہ کرام کو کیسے پتا چلا کہ رسول اللہ نماز کے بعد یہ ذکر کرتے تھے۔ مثلاً صحیح مسلم میں ہے: حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کا سلام پھیرنے کے بعد باآواز بلند پڑھتے تھے۔ لا الہ الااللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر لاحول ولاقوۃ الا باللہ لاالہ الااللہ ولا نعبد الاایاہ لہ النعمۃ ولہ الفضل ولہ الثناء الحسن لاالہ الااللہ مخلصین لہ الدین ولو کرہ الکافرون۔۔۔۔ تو امام ابن ہمام تاویل در تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے حجرہ کے باہر سے ذکر کی آواز سن لیتے تھے۔ اس تاویل سے قطع نظر ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کا ذہن اس اعتراض کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔۔۔ کہ صحابہ بھی تو اس وقت اپنے اپنے گھروں میں سنن اور نوافل پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ سنن ابن حبان میں جو روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اس کے جنت میں جانے کے لئے موت کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس روایت کے الفاظ ابن ہمام کی تاویل کا ساتھ نہیں دیتے۔ حضرت عائشہ نے جو روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللّٰھُمّ انت السلام کی مقدار تک بیٹھتے تھے یہ دوام واستمرار پر محمول نہیں ہے بعض اوقات آپ صرف اللّٰھم انتَ السلام ومنکَ السلام پڑھنے تک بیٹھتے اور بعض اوقات اس سے زیادہ مقدار تک بیٹھتے اور ذکر کرتے رہتے۔ امت کی سہولت کے لئے آپ نے نہ کسی ایک ذکر کو معین کیا نہ کسی ایک مقدار کو معین فرمایا، یہی توجیہ آپ کی

خلافِ اَولیٰ ہے اور اگر اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اور اکڑ اکڑ کر چلتا ہے اور اِتراتا ہے تو پھر یہ تکبر کی وجہ سے مکروہِ تحریمی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ حرمت کی علّت صرف تکبُّر ہے، اگر ایک مرد نصف پنڈلیوں تک تہبند باندھتا ہے اور اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے زیادہ متقی اور پرہیز گار سمجھتا ہے اور ان کو حقیر سمجھتا ہے تو یہ بھی مکروہِ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے، اس لئے حرمت میں اصل تکبُّر ہے۔

ہماری اس تحقیق کی تائید حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی 852ھ کی اس عبارت میں ہے: ''اگر کسی شخص کا لباس بغیر تکبر کے ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہو تو اس کا حال مختلف ہے اگر وہ کپڑا اس کے ٹخنوں کے نیچے لٹک رہا ہو لیکن وہ کپڑا پہننے والے کے قد اور اس کی قامت کے برابر ہو تو اس میں تحریم ظاہر نہیں ہوگی، خصوصاً جبکہ بلا قصد ایسا ہو (یعنی غیر ارادی طور پر تہبند یا شلوار پیٹ سے پھسل کر ٹخنوں سے نیچے لٹک گئی ہو)، جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے اس طرح واقع ہوا، اور اگر کپڑا پہننے والے کے قد وقامت سے زائد ہو تو اس سے منع کیا جائے گا کیونکہ اس میں اسراف ہے اور اس کو حرام کہا جائے گا، اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہوگا کہ اس میں عورتوں کی مشابہت ہے اور یہ پہلی وجہ سے زیادہ قوی وجہ ہے، کیونکہ امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کے لباس کی نوع کا لباس پہنتا ہے، اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہوگا کہ اس طرح کا لباس پہننے والا اس خدشے سے محفوظ نہیں ہوگا کہ اس کے لباس پر نجاست لگ جائے (کیونکہ اس کا لباس قدموں کے نیچے لٹک رہا ہے) اور اس ممانعت کی طرف اشارہ اس حدیث میں ہے جس کو امام ترمذی نے شمائل (رقم الحدیث: 121) میں اور امام نسائی نے سنن کبریٰ (رقم الحدیث: 9682,9683) میں حضرت عبید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں ایک تہبند باندھے ہوئے جا رہا تھا اور وہ تہبند زمین پر گھسٹ رہا تھا کہ اچانک ایک شخص نے کہا: اپنا کپڑا اوپر اٹھاؤ اس میں زیادہ صفائی اور زیادہ بقا ہے، میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نبی ﷺ تھے، میں نے کہا: یارسول اللہ! یہ تو ایک سیاہ

زندگی کے عام معمولات کے موافق ہے۔ بہر حال نمازی فرض نماز پڑھنے کے بعد آیت الکرسی پڑھے، تین مرتبہ استغفر اللّٰہ الذی لاالٰہ الاھو۔ پڑھے اور کلمہ شریف کا ذکر کرے، کیونکہ ان کے پڑھنے پر بہت اجر وثواب اور جنت کی بشارت ہے۔ نیز فرض کے بعد سنتیں پڑھنے میں اصل سنت یہ ہے کہ سنتیں گھر میں پڑھی جائیں۔ دیگر احادیث سے بھی یہ ثابت ہے کہ فرض اور سنن میں فاصلہ ہونا چاہئے، اس لیے افضل یہی ہے کہ ان اذکار کو فرض کے بعد پڑھا جائے۔ فرض نماز کے بعد اذکار کے سلسلہ میں اس حکایت پر بھی عمل کرنا چاہئے۔

ابن قیم جوزی سند ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں ابوبکر بن محمد بیان کرتے ہیں کہ میں ابوبکر بن مجاہد کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اچانک وہاں شبلی آگئے، تو ابوبکر بن مجاہد نے اٹھ کر ان سے معانقہ کیا اور ان کی آنکھوں کے درمیان (پیشانی پر) بوسہ دیا، میں نے ان سے کہا یا سیّدی آپ شبلی کی اس قدر تعظیم کر رہے ہیں، حالانکہ بشمول آپ کے تمام اہل بغداد کے خیال میں یہ دیوانہ ہے۔ ابوبکر بن مجاہد نے کہا میں نے شبلی کی اس طرح تعظیم کی ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعظیم کی تھی، کیونکہ میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی۔ آپ کی خدمت میں شبلی حاضر ہوا، آپ نے کھڑے ہو کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ شبلی کو کیوں سرفراز فرما رہے ہیں؟، آپ نے فرمایا، یہ ہر فرض کے بعد یہ آیت پڑھتا ہے۔ "لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ" (یعنی سورۂ توبہ کی آخری دو آیات)، اس کے بعد تین مرتبہ کہتا ہے "صلی اللہ علیک یا محمد"۔ بعد میں میری شبلی سے ملاقات ہوئی، میں نے اس سے پوچھا تم درود کس طرح پڑھتے ہو؟، انہوں نے اسی طرح بتایا، (شرح صحیح مسلم، جلد:2، ص:194، 195)"۔ جیسا کہ معلوم ہوا کہ جماعت فرض کے بعد سنتیں گھر پر پڑھنا افضل ہیں، تاہم مسجد میں بھی پڑھ سکتے ہیں، البتہ جماعت کے بعد مسجد میں دیر تک سُنَن ونوافل پڑھنے والے حضرات اس امر کا اہتمام ضرور کریں کہ مسجد سے باہر جانے والوں کے لئے راستہ موجود ہو اور انہیں نمازی کے آگے سے نہ گزرنا پڑے، اگر کہیں دیوار یا پلر ہے تو اسے سُترہ بنا کر کھڑے ہو جائیں۔ یہ بھی

اور سفید دھاریوں والا تہبند ہے (یعنی اس معمولی کپڑے میں تکبر کرنے کا کوئی معنی نہیں ہے)، آپ نے فرمایا: کیا تمہارے لئے میری شخصیت میں نمونہ نہیں ہے؟، میں نے دیکھا تو آپ نے آدھی پنڈلیوں تک تہبند باندھا ہوا تھا (مسند احمد جلد 5 ص: 364) اور اس وجہ سے بھی ممنوع ہے کہ کپڑا گھسیٹنے میں تکبر کی بدگمانی ہوتی ہے۔ قامت سے نیچے کپڑا لٹکانا کپڑا گھسیٹنے کو مستلزم ہے اور کپڑا گھسیٹنا تکبر کو مستلزم ہے خواہ پہننے والے نے تکبر کا قصد نہ کیا ہو اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، احمد بن منیع نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم تہبند کو گھسیٹنے سے بچو کیونکہ تہبند کو گھسیٹنا تکبر سے ہے، (فتح الباری جلد 10 ص: 263,264 مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)، (تبیان القرآن جلد 4، ص: 331, 330, 323, 322 مطبوعہ: فرید بک اسٹال، لاہور)''۔

تسبیحات فرض کے فوراً بعد پڑھی جائیں یا سُنَن ونوافل کے بعد؟

سوال:34

کیا فرض نماز کے فوراً بعد تسبیحات وغیرہ پڑھنا افضل ہے یا پہلے بقیہ نماز مکمل کرنا افضل ہے؟، کیونکہ کچھ نمازی فرض نماز کے بعد تسبیحات وغیرہ پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں اور بقیہ نماز بعد میں ادا کرتے ہیں، اس طرح اگلی صف میں بیٹھے ہوئے نمازی جو پہلے نماز مکمل کر لیتے ہیں انہیں، واپس اپنے کام پر جانے کی جلدی ہوتی ہے، اسطرح جلدی جا نہیں پاتے ہیں، (قاری محمد مختار یاقیانی، مدرس دارلعلوم نعیمیہ)۔

جواب:

نماز کے بعد تسبیحات واذکار کی فضیلت احادیث میں کثرت سے وارد ہوئیں ہیں: عن کعب بن عجرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "معقبات لایخیب قائلھن" یُسبح اللہ فی دُبرِ الصّلاۃ ثلاثاً وثلاثینَ، وَیُحَمِّدُہٗ ثلاثاً وثلاثینَ، ویُکَبِّرُہٗ أربعاً وثلاثینَ"۔

ترجمہ: کعب بن عجرہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کچھ کلمات (نماز

دیکھنے میں آیا ہے کہ فرائض کے بعد بعض نمازی جلدی سے آخری صف میں سنتوں یا نوافل کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نماز ختم کر کے باہر نکلنے والے نمازیوں کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا کہ وہ نماز کی حرمت کو پامال کر کے اس کے آگے سے گزریں، اسی طرح بعض نمازی پچھلی صفوں میں دروازوں کے عین سامنے سنتوں یا نوافل کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نمازی کے لئے پیچھے نکل کر جانے کا راستہ ہی نہیں رہتا، پس نمازیوں کو ان تمام امور کا خیال رکھنا چاہئے۔

کے بعد بلا فاصلہ کہنے کے ہیں) جن کا کہنے والا نامراد نہیں رہتا، (ان کلمات میں) نماز کے بعد تینتیس مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہنا، تینتیس مرتبہ ''الحمد للہ'' کہنا، چونتیس مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہنا، (سنن نسائی، رقم الحدیث:1348)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: یکرہ تاخیر السنۃ الا بقدر: اللّٰھم أنتَ السّلامُ الخ۔قال الحُلوانی :لابَأس بالفصل بالأوراد، واختارہ الکمال، قال الحلبی: ان أُرید بالکراھۃ التنزیھیۃ إرتفعَ الخلاف۔ قلتُ :وفی حفظی حَمْلُہٗ علی القلیلۃ، ویستحب أن یستغفر ثلاثاً ویقرأُ آیۃَالکرسِیّ والمُعَوِّذاتِ ویُسَبّحُ وَیُحَمّدُ وَیُکَبِّرُ ثلاثاً وثلاثین ؛ویُھَلّل تمامَ المائۃِ ویدعوا وَیختِمُ بسبحان ربک ۔

ترجمہ: ''سنتوں میں تاخیر ''اَللّٰھُمّ اَنتَ السَّلام'' (حدیث پاک میں روایت کردہ پورے کلمات یہ ہیں: اَللّٰھُمّ اَنتَ السَّلامُ وَمِنکَ السَّلَام، تَبارَکتَ یَا ذَاالْجَلالِ وَالْاِکْرَام) کی مقدار سے زیادہ مکروہ ہے۔حلوانی نے فرمایا: اذکار کے ساتھ فرائض وسنن میں فاصلے میں کوئی حرج نہیں، کمال نے اسی کو اختیار کیا ہے۔حلبی کہتے ہیں: کہ اگر کراہت سے کراہتِ تنزیہی مراد ہے تو اختلاف ختم ہوجاتا ہے۔(قلت میں کہتا ہوں) اور مجھے یہاں تک یاد ہے کہ یہ (تنزیہی) قلیل فصل پر محمول ہے، اور مستحب یہ ہے کہ تین مرتبہ استغفار پڑھے، آیۃ الکرسی اور مُعَوِّذات (سورۃ الفلق وسورۃ الناس) تلاوت کرے اور ''سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر'' تینتیس تینتیس مرتبہ پڑھے، اور سوویں مرتبہ ''لا اِلٰہَ اِلاّ اللّٰہ'' پڑھے، اس کے بعد دعا کرے اور اختتام ''سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾'' پر کرے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد2ص:218،219، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (اِلاّ بقدرِ اَللّٰھُمّ الخ)لِمَا رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَالتِرمذی عن عائشۃَ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھا قالت:''کان رسولُ اللّٰہ ﷺ لا یقعد اِلاّ بمقدار ما یقولُ: اَللّٰھُمّ انتَ السلامُ ومنکَ السَّلامُ ،تبارکت یَا

﴿كتاب المساجد﴾

مسجد کی چھت پر بالغ طالبات کے مدرسے کا حکم

سوال:35

اگر کوئی شخص مسجد کی چھت پر بالغ لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرے، اور اس میں بالغ ونابالغ لڑکیاں تعلیم حاصل کریں۔ سوال یہ ہے کہ آیا مسجد کی چھت کو ایسے مدرسہ کے لئے وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟، ازراہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما کر ثواب دارین حاصل کریں، (مولانا محمد بہرام خان نعیمی، جامع مسجد قادریہ، ملیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثریٰ) تک مسجد ہی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: قوله الى عنان السماء بفتح العين وكذا الىٰ تحت الثرىٰ كما فى البيرى عن الاستيجابى۔ ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے، جیسا کہ ''بیری'' میں ''استیجابی'' کے حوالے سے منقول ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 2، ص: 271-270، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وسطح المسجد له حكم المسجد كذافى الجوهرة النيره۔

ترجمہ: ''اور مسجد کی چھت مسجد ہی کے حکم میں ہے، ''جوہرہ نیرہ'' میں اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد: اول، ص:38، مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مسجد کی چھت پر مدرسے کا قیام، وقف میں تبدیلی کرنا ہے اور مسجد مکمل ہونے کے بعد اس کے مصرف میں تغییر کرنا جائز نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا يجوز تغيير الوقف عن هيئته۔

ترجمہ: '' وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490، مطبوعہ مکتبۂ

رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: اما لو تمت المسجدیۃ ثم اراد البناء منع۔

ترجمہ:''اگر کسی مسجد کی مسجدیت تمام ہو جائے پھر اگر اس میں مزید تعمیر کا ارادہ ہو (جس سے اس وقف کے مصرف میں تبدیلی ہوتی ہو) تو اسے روک دیا جائے گا، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 6 ص:428 داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

چونکہ مسجد کی چھت بھی مسجد ہی کے حکم میں ہے، اس لئے اس کی مسجدیت کا تبدیل کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، البتہ مسجد میں دینی درس وتدریس جائز ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

یجوز الدرس فی المسجد وان کا ن فیہ استعمال اللبود والبواری المسبلہ لاجل المسجد کذا فی القنیہ۔

ترجمہ:''اور مسجد میں درس وتدریس جائز ہے اگرچہ اس میں مسجد کی دریاں، نمدے جو مسجد کے لئے وقف ہیں، استعمال ہوں، ''قنیہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص:320 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

البتہ مسجد کے آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، بچوں کا شور نمازیوں کی نماز میں خلل انداز نہ ہو، ورنہ اوقات نماز میں درس وتدریس کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ بالغ طالبات کا مسجد کی چھت پر مدرسہ قائم کرنا بوجوہ درست نہیں ہے، ایک تو یہ کہ ایسی طالبات اور ان کی معلمات کے فطری طور پر ایام حیض بھی آتے ہیں، اور ان ایام میں عورت کا مطلقاً مسجد میں داخل ہونا منع ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ولا یحل للجنب والحائض والنفساء الوقوف علیہ۔

ترجمہ:''اور جنبی، اور حیض ونفاس والی عورت کا مسجد کی چھت پر ٹھہرنا جائز نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2، ص:370، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

درمختار محل مذکور: یحرم فیہ السوال ویکرہ الاعطاء وانشاد ضالّۃ وشعرِ الامافیہ

ذکر ورفع صوت بذکر الاللمتفقهة ويمنع منه كل مؤذولو بلسانه۔

ترجمہ: ''مسجد میں سوال کرنا حرام اور سائل کو مسجد میں دینا مکروہ ہے، اور اسی طرح گمشدہ چیز کا مسجد میں اعلان کرنا۔ اور ایسے اشعار پڑھنا جن میں ذکر نہ ہو، اور فقہ کی تعلیم وتعلم کے علاوہ آواز بلند کرنا مکروہ ہے، اور ہر ایذا دینے والے کو مسجد سے منع کیا جائیگا اگرچہ زبان سے ایذا پہنچاتا ہو۔'' اور اگر ایسے نہ ہوں تو انہیں مسجد میں غیر اوقات نماز میں پڑھانا مضائقہ نہیں رکھتا جب کہ معلم بلا تنخواہ محض لوجہ اللہ پڑھاتا ہو ورنہ ہرگز جائز نہیں اگرچہ جوان اور بوڑھے ہی پڑھیں کہ اب یہ اور پیشوں کی طرح دنیا کمانا ہے اور مسجد میں اس کی اجازت نہیں۔ فتاویٰ عالمگیری جلد:5،ص:122، ''لو جلس المعلم في المسجد والوراق يكتب فان كان المعلم يعلم للحسبة والوراق يكتب لنفسه فلاباس به لانه قربة وان كان بالاجرة يكره الاان يقع لهما الضرورة كذافي محيط السرخي''۔

ترجمہ: ''اگر معلم مسجد میں بیٹھ کر تعلیم دیتا ہے اور کاتب مسجد میں بیٹھ کر لکھتا ہے اگر تو معلم ثواب کی نیت سے ایسا کرتا ہے اور کاتب اپنے لئے لکھتا ہے نہ کہ اجرت پر تو حرج نہیں کیونکہ یہ قربت وعبادت ہے، اور اگر اجرت کے لئے ہے تو بلا ضرورت ایسا کرنا مکروہ ہے، امام سرخسی کی محیط میں بھی ایسا ہی ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد:5،ص:122)''، (فتاویٰ رضویہ جلد:16،ص:459،مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''مسجد کے اندر علمِ دین کی تعلیم جائز اور اس کے جواز پر قرآن وحدیث شاہد، قال اللہ تعالیٰ ومن اظلم ممن منع مسٰجداللّٰه ان يذكر فيها اسمه وسعىٰ فى خرابها ۔ حدیث میں ہے: خرج رسول اللّٰه ﷺ ونحن فى الصفة فقال ايكم يحب ان يغدو كل يوم الىٰ بطحان اوالعقيق فياتى بناقتين كوماوين فى غيراثم ولا قطع رحم فقلنا يارسول اللّٰه كلنا نحب ذالك قال افلا يغدو احدكم الى المسجد فيعلم او يقرأ ايتين من كتاب اللّٰه خير له من ناقتين وثلث خيرله من ثلث واربع خيرله من اربع ومن اعدادهن

من الابل رواہ مسلم عن عقبة بن عامر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه۔

ترجمہ:'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو مساجد میں ذکرِ الٰہی کو روکے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے، حدیث میں ہے: ترجمہ:'' رسول اللہ ﷺ (اپنے حجرۂ اقدس سے) نکلے اور ہم (اس وقت) صفہ میں تھے، تو آپ نے فرمایا: تم میں سے کون اس بات کو پسند کرے گا کہ ہر روز صبح بطحان یا عقیق کی طرف نکلے اور کسی گناہ یا قطعِ رحمی کے بغیر دو بلند کوہان والی اونٹنیاں لائے، تو ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! (بلاشبہ) ہم میں سے ہر ایک اس بات کو پسند کرے گا، (تو رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: تو تم میں سے ہر شخص (ہر روز) صبح کے وقت مسجد کی طرف کیوں نہیں نکل پڑتا، تاکہ وہ کتاب اللہ کی دو آیتیں پڑھائے یا پڑھے، یہ (عمل) اس کے لئے دو بلند کوہان والی اونٹنیوں سے بہتر ہے اور تین آیتوں کا پڑھنا پڑھانا تین اونٹنیوں سے اور چار آیتوں کا پڑھنا پڑھانا چار اونٹنیوں سے اور ان سے زیادہ آیتوں کا پڑھنا پڑھانا اتنی ہی تعداد کی اونٹنیوں سے بہتر ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1842 مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز المکۃ المکرمہ، اس حدیث کو امام مسلم نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے)''۔

فی نفسہٖ تعلیم سے مسجد کی کوئی بے حرمتی نہیں ہے، تعلیم کو احترام کے خلاف کہنا غلط ہے، البتہ اگر پڑھنے یا پڑھانے والے مسجد کی بے حرمتی کرتے ہوں تو ان کو اس سے منع کیا جائے اور روکا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 256 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)''۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: مسجد میں علم دین کی تعلیم جائز ہے، حضور اقدس ﷺ کے زمانہ پاک میں مسجد نبوی میں علم دین کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس وقت سے لے کر اب تک دونوں حرم محترم میں علم دین کی تعلیم بلا نکیر جاری ہے، حدیثوں سے اس کا جواز ثابت ہے، (فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 269 مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)''۔

خلاصہ یہ کہ فی نفسہٖ مسجد میں دینی درس وتدریس جائز ہے، لیکن مسجد کے آداب کو ملحوظ رکھنا

لازم ہے، اور جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں محیط سرخسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ضرورت کی بنا پر اجرت کے عوض بھی مسجد میں تدریس جائز ہے، لیکن بالغ طالبات کے لئے مسجد کی چھت پر درس وتدریس کا انتظام کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں کئی شرعی مفاسد کا احتمال ہے، اور مسجد کے وقف میں تبدیلی کر کے کسی بھی طرح کا مدرسہ قائم کرنا بہر صورت جائز نہیں ہے۔

مسجد کے قیام کے بعد اس کی حیثیت کو تبدیل کرنا

سوال:36

ہمارے ہاں ایک مسجد موسوم (اڈہ لاریاں والی مسجد) کی جدید تعمیر کی گئی۔ مسجد کا ڈیزائن اس طرح بنایا گیا کہ عینِ مسجد کو جائے وضو بنا دیا گیا ہے۔ اور مسجد کے کچھ حصے کو دکان بنا دیا گیا ہے۔ ازروئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟، (محمد جابر کھوڑ، ضلع اٹک)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں جیسا کہ سوال سے واضح ہوتا ہے کہ جس جگہ وضو خانہ بنایا گیا، وہ پہلے مسجد تھی، مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہی ہے اور اس کی مسجدیت کبھی باطل نہیں ہو سکتی۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثریٰ) تک مسجد ہی ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

قوله الى عنان السماء بفتح العين وكذا الىٰ تحت الثرىٰ كما فى البيرى عن الاستيجابى ۔

ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے ''بیری'' میں استیجابی سے اسی طرح منقول ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 2، ص: 371-370، مطبوعہ، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولا يجوز تغيير الوقف عن هيئته۔

ترجمہ: ''وقف کی وہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص: 490، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: جوزمین متعلق مسجد ہے وہ مسجد ہی کے کام میں لائی جاسکتی ہے اور اس کے بھی اس کام میں جس کیلئے واقف نے وقف کی، وقف کو اس کے مقصد سے بدلنا جائز نہیں، شرط الواقف کنص الشارع فی وجوب العمل بہ۔ (واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص کی مثل ہے)، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:546 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)''۔

فتاویٰ عالمگیری کتاب الوقف باب ۱۱ میں محیط امام شمس الائمہ سرخسی سے ہے:

قیم المسجد لایجوز له ان یبنی حوانیت فی حد المسجد اوفی فنائه لان المسجد اذا جعل حانوتاً ومسکنا تسقط حرمته وهذالایجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد، ترجمہ:''متولی کو مسجد کی حد یا مسجد کے فناء میں دکانیں بنانے کا کوئی اختیار نہیں، کیونکہ مسجد کو جب دکان یا رہائش گاہ بنادیا جائے، تو اس کا احترام ساقط ہوجاتا ہے، جو کہ ناجائز ہے۔ اور فنائے مسجد چونکہ مسجد کے تابع ہے لہٰذا اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو مسجد کا ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:352 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز مسجد کے نیچے دکان بنانے کے مجوزین کی اس دلیل (کہ مسجد کے اوپر امام کے لئے بالا خانہ بنانا جائز ہے) کے جواب میں لکھتے ہیں: صورت مستفسرہ میں وہ دکانیں قطعی حرام، اور وہ بالا خانہ بھی قطعی حرام، ہاں وقت بنائے مسجد قبل تمامِ مسجدیّت نیچے مسجد کے لئے دکانیں یا اوپر امام کے لئے بالا خانہ بانی بنائے اور اسکے بعد اسے مسجد کرے تو جائز ہے، اور اگر مسجد بنا کر بنانا چاہے اگر چہ مسجد کی دیوار کا صرف اسارا اس میں لے اور کہے میری پہلے سے یہ نیت تھی ہرگز قبول نہ کریں گے اور عمارت کو ڈھادیں گے، درمختار میں ہے: لو بنی فوقه بیتا للامام لا یضر لانه من المصالح اما لو تمت المسجدیة ثم اراد البناء منع ولوقال عنیتُ ذالک لم یُصَدِّق تاتارخانیه فاذا کان هذا فی الواقف فکیف بغیره فیجب هَدمه ولو علی

جدارالمسجد ولا یجوز اخذ الاجرة منه ولاان یجعل شیئا منه مستغلا ولا سکنی بزازیة۔

ترجمہ: "اگر واقف نے مسجد کے اوپر امام کے لئے حجرہ بنادیا، تو حرج نہیں کیونکہ وہ مصالح مسجد میں سے ہے، لیکن تمامِ مسجدیت کے بعد اگر وہ ایسا کرنا چاہے، تو اس کو منع کیا جائے گا، اگر وہ کہے کہ میرا شروع سے ارادہ تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی (تاتارخانیہ) جب خود واقف کا یہ حکم ہے تو کسی اور کو یہ اختیار کیسے ہوسکتا ہے لہٰذا ایسی عمارت کو گرانا واجب ہے اگرچہ صرف دیوار مسجد پر وہ استوار کی گئی ہو، اس کی اجرت لینا یا مسجد کا کوئی حصہ کرائے کے لئے یا رہائش کے لئے مقرر کرنا جائز نہیں (بزازیہ)، (فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:432,433 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ ایک جگہ کی مسجدیت متحقق ہوچکی تھی، اسے عین مسجد قرار دیا جاچکا تھا اور بطور مسجد ہی وہ زیرِ استعمال رہی، اس لئے اب اس کی مسجدیت کو باطل کرکے اس کی جگہ وضو خانہ یا دوکانیں بنانا درست نہیں ہے، البتہ اسے مسجد کا حصہ قائم رکھتے ہوئے اور آدابِ مسجد کو ملحوظ رکھتے ہوئے درس وتدریس کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

منبرِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیڑھیاں

سوال:37

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے منبر کی تین سیڑھیاں تھی لیکن ایک دفعہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم منبر پر چڑھتے تو تین مرتبہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے آمین کہا اس سے ظاہر ہورہا ہے کہ منبر کی سیڑھیاں چار تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چوتھی سیڑھی پر بیٹھے ہوں گے، (سید عالم شاہ، جامع مسجد مصطفیٰ اعظم نگر لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ردالمحتار میں ہے: منبرہ صلی اللہ علیہ وسلم کان ثلث درج غیرالمسماة بالمستراح۔

ترجمہ: حضور ﷺ کے مقدس منبر کے تین زینے اس تخت کے علاوہ تھے جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ حضور سید عالم ﷺ درجۂ بالا پر خطبہ فرمایا کرتے، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوسرے پر پڑھا، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے تیسرے پر، جب زمانہ ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آیا پھر اول پر خطبہ فرمایا سبب پوچھا گیا، فرمایا اگر دوسرے پر پڑھتا لوگ گمان کرتے کہ میں صدیق اکبر کا ہمسر ہوں اور تیسرے پر، تو وہم ہوتا کہ فاروقِ اعظم کے برابر ہوں، لہٰذا وہاں پڑھا جہاں یہ احتمال متصور ہی نہیں اصل سنت اول درجہ پر قیام ہے۔ وما فعله الصديق فكان تأدبا منه مع رسول الله ﷺ وما فعل الفاروق فكان تأدبا مع الصديق رضى الله تعالىٰ عنهما۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کے ادب کی بنا پر ایسا کیا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ادب کی خاطر۔ بلندیٔ منبر سے اصل مقصود یہ ہے کہ سب حاضرین خطیب کو دیکھیں اور اس کی آواز سنیں جہاں یہ حاجت بسبب کثرت حضار و دوری صفوف تین زینوں میں پوری نہ ہو تو زینے زیادہ کرنے کا خود ہی اختیار ہے اور بہتر عدد طاق کی مراعات فانّ الله وتر يحبّ الوتر (اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے) واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ جلد 8 ص: 343,344 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

محدّث بریلوی امام احمد رضا قادری قدس سرہم العزیز کی تحریر سے واضح ہے کہ منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں تین تھیں اور چوتھا تخت یا بیٹھنے کی جگہ تھی، خلیفہ اول و دوم نے ادب کو ملحوظ رکھا، حضرت ابوبکر منبر رسول پر اس جگہ بیٹھے، جہاں حضور ﷺ کے قدم مبارک ہوتے تھے اور پھر حضرت عمر حضرت ابوبکر کے قدموں کی جگہ بیٹھ گئے، یہ دونوں اکابر ادب واحترام کی وجہ سے اجر پائیں گے، تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان نے قیامت تک آنے والے خطباء حضرات کے لئے یُسر (آسانی) کو ملحوظ رکھا، اور وہ بھی اس اخلاص اور نیک نیتی کا اجر پائیں گے، منبر کی سیڑھیاں تین سے زائد پانچ یا سات بھی بنائی جاسکتی ہیں، طاق عدد بہتر ہے۔

جواب:

وقف یا ہبہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ واقف (وقف کرنے والا) وقتِ وقف اس شے کا مالک ہو، جسے وہ وقف کررہا ہے اگر وقتِ وقف مالک نہ تھا اور پھر مالک ہوگیا، جب بھی یہ وقف درست نہیں ہوگا۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ومنها الملک وقت الوقف ختی لو غصب ارضاً فوقفهاثم اشتراها من مالکهاودفع الثمن الیه أوصالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفاً کذا فی البحر الرائق۔

ترجمہ: ''(وقف کی شرائط میں سے) ایک شرط یہ بھی ہے کہ وقف کرتے وقت واقف اس شے کا مالک ہو یہاں تک کہ اگر کوئی (شخص کسی) زمین کو غصب کر کے وقف کردے پھر اس کے مالک سے اس زمین کو خرید لے اور قیمت مالک کو ادا کردے یا کچھ دینے پر مصالحت کرلی تو یہ وقف (درست) نہیں ہوسکتا، ''البحر الرائق'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:353 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

وقف کے لئے مخصوص الفاظ ہیں جن سے وقف صحیح ہوتا ہے، مثلاً میری یہ جائیداد صدقۂ موقوفہ ہے کہ ہمیشہ مساکین پر اس کی آمدنی صرف ہوتی رہے یا اللہ تعالیٰ کے لئے میں نے اسے وقف کیا۔ مسجد یا مدرسہ یا فلاں نیک کام پر میں نے وقف کیا یا فقراء پر وقف کیا۔ اس چیز کو میں نے اللہ کی راہ کے لئے کردیا۔ صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو یہ وقف نامکمل ہے محض فائل دینے سے وقف مکمل نہیں ہوتا، مدرسہ والوں کو چاہئے کہ آپ کی فائل واپس کردیں، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

﴿کتاب الجنائز﴾

غسلِ میت سے پہلے ایصالِ ثواب یا قرآن خوانی

سوال:46

اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور لوگ فوری طور پر قرآن خوانی کرنا چاہیں تو کیا اس کی اجازت ہے؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جب تک میت کو غسل نہ دیا جائے، قرآن خوانی کا آغاز نہیں کیا جاسکتا۔ ازراہِ کرم رہنمائی فرما دیجیے، (سید عابد علی، کراچی)۔

جواب:

فی نفسہٖ زندہ یا مردہ کسی بھی شخص کے لئے کسی بھی وقت میں ایصالِ ثواب یا دعائے مغفرت کی ممانعت نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا انتقال ہوگیا ہو تو غسل یا تدفین سے پہلے اس کے لئے دعائے مغفرت یا ایصالِ ثواب جائز ہے، اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ البتہ فقہاء کرام نے اس پر بحث کی ہے کہ میت سامنے رکھی ہو اور ابھی اسے غسل نہ دیا ہو تو اس کے سامنے اسی مقام پر تلاوت قرآن کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ فقہاء نے اس پر گفتگو کی ہے اور اس کی وجوہ پر بحث کی ہے۔ چنانچہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: بلکہ جن کے نزدیک موت سے بدن نجس ہو جاتا ہے اور غسل میت اُسے نجاستِ حقیقیہ سے تطہیر کے لئے رکھا گیا ہے، وہ قبل غسل میت کے پاس بیٹھ کر تلاوت کو منع کرتے ہیں جب تک اسے بالکل ڈھانک نہ دیا جائے کہ نجاستِ منکشفہ کا قرب ہوگا، تنویر میں ہے:

کرہ قرأۃالقرآن عندہ الی تمام غسلہ۔

ترجمہ: ''میت کو غسل دینے تک اس کے پاس قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے''۔ درمختار میں ہے:

عللہ الشرنبلالی فی امدادالفتاح تنزیھا للقرآن عن نجاسۃ المیت لتنجسہ بالموت قیل نجاسۃ خبث وقیل حدث وعلیہ فینبغی جوازھا کقراء ۃ المحدث

ترجمہ: امداد الفتاح میں علامہ شرنبلالی نے اس کی یہ علت بیان فرمائی کہ قرآن مجید کو میت کی

نجاست اور ناپاکی سے بچایا جائے، کیونکہ وہ (میت) موت کی وجہ سے ناپاک ہوجاتی ہے، پھر اس نجاست میں اختلاف ہے، چنانچہ بعض نے کہا کہ یہ نجاست خبث ہے جبکہ بعض کے نزدیک حدث ہے۔ لہٰذا اس بنیاد پر لازم ہے کہ میت کے پاس تلاوت قرآن مجید جائز ہو، جیسے بے وضو کا یاد سے قرآن پڑھنا۔

ردالمحتار میں ہے: وذکر ان محل الکراھة اذا کان قریبا منه اما اذا بعد عنه فلاکراھة قلت والظاھر ان ھذاایضا اذالم یکن المیت مسجی بثوب لیستر جمیع بدنه۔

ترجمہ: ''علامہ طحطاوی نے ذکر کیا کہ اس کراہت کا محل یہ ہے کہ جب (تلاوت کرنے والا) میت کے قریب بیٹھا ہو، لیکن جب وہ اس سے دور بیٹھا ہے، (اور قرآن مجید پڑھ رہا ہے) تو پھر کراہت نہ ہوگی، میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ کراہت بھی تب ہوگی جب میت کسی ایسے کپڑے سے جو اس کے سارے جسم کو چھپائے ڈھانپی ہوئی نہ ہو، (فتاویٰ رضویہ جلد: 23، ص: 454-453، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس بحث کا مستفاد یہ ہے کہ فی نفسہٖ غسل میت سے پہلے میت سے ہٹ کر دوسری جگہ بیٹھ کر میت کے لئے ایصالِ ثواب کرنے یا قرآن خوانی کی کوئی ممانعت نہیں ہے، ہاں اگر میت کے قریب بیٹھ کر تلاوت کریں اور میت کو کپڑے یا چادر سے ڈھانپ کر رکھ دیا گیا ہو، تب بھی حرج نہیں ہے، ہاں اگر میت کو کپڑے سے ڈھانپا ہوا نہیں ہے، کھلی ہے، تو اس میں فقہاء کرام کے دو اقوال ہیں، جو اسے بے وضو (محدث) پر محمول کرتے ہیں، ان کے نزدیک جائز ہے اور جو اسے خبث (نجاستِ حقیقی) پر محمول کرتے ہیں، ان کے نزدیک وہاں پر تلاوت مکروہ ہے۔

مصنوعی دانتوں کے ساتھ تدفین

سوال: 47

کسی شخص کے انتقال کے بعد تدفین کے وقت مصنوعی دانتوں (جو کہ فکس ہیں

اور نکالے نہیں جاسکتے)، کے ساتھ دفن کیا جاسکتا ہے، (جمال سیکٹر 3-7D، نارتھ کراچی)۔

جواب:

مسلمان میت کی تجہیز و تکفین، تدفین اور تدفین کے بعد اس کی قبر کی تکریم لازم ہے، کوئی ایسا عمل جس سے میت کو تکلیف ہو، نہ کیا جائے۔ مسلمان کی قبر کی تعظیم کا حکم احادیث مبارکہ میں جس قدر ہے اس سے مسلمان میت کی تعظیم و تکریم کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی عزت زندہ و مردہ برابر ہے۔ محقق علی الاطلاق رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ فتح القدیر، جلد:2، ص:102، (مکتبۂ نوریہ رضویہ سکھر) میں فرماتے ہیں: و توضیحہ الاتفاق علی انّ حرمۃالمسلم میتاً کحرمتہ حیاً۔ ترجمہ: اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت و حرمت زندہ مسلمان کی طرح ہے۔ (ت)۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں: کسر عظم المیت راداہ ککسرہ حیاً۔ رواہ امام احمد وابوداؤد وابن ماجہ باسناد حسن عن اُمّ المؤمنین عائشہ الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ ترجمہ: ''مردے کی ہڈی کو توڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا، اسے امام احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ نے بسندِ حسن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا''۔ یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، المیت یؤذیہ فی قبرہٖ ما یؤذیہ فی بیتہ۔ ترجمہ: ''سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: مردے کو قبر میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے گھر میں اسے اذیت ہوتی۔ علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں: افادان حرمۃ المؤمن بعد موتہٖ باقیۃ۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت بعد موت کے بھی ویسے ہی باقی ہے۔ سیدنا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اذی المؤمن فی موتہٖ کاذاہ فی حیاتہ رواہ ابی بکر بن ابی شیبۃ۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔ علماء فرماتے ہیں: المیت یتاذی بما یتاذی بہ الحی ۔ کذا فی ردّالمحتار

وغیرہ من معتمدات الاسفار۔

جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے، مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں، جیسا کہ ردالمحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے۔(ت) علامہ شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں امام علامہ ابوعمر یوسف بن عبدالبر سے نقل فرماتے ہیں: ازیں جا مستفاد میگردد کہ میت متألم میگردد بجمیع انچہ متالم میگردد بدان حی ولازم اینست کہمتلذ ذگردد بتمام انچہ متلذذ می شود بدان زندہ، انتہی۔ اس جگہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو درد پہنچتا ہے، ان تمام سے مردہ کو بھی الم پہنچتا ہے، اور یہ لازم ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو لذت حاصل ہو ان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، انتہی (ت)۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص:442-441، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا ''کاٹنا مرد کے بال بعد مرنے کے جائز ہے یا نہیں؟، اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

ناجائز ہے، فی الدر لایسرح شعرہ ای یکرہ تحریما ولا یقص ظفرہ الاالمکسور ولاشعرہ ولایختن ، وفی ردالمحتارعن النہرعن القنیۃ التزیین بعد موتہا و الامتشاط وقطع الشعر لایجوز ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ: ''درمختار میں ہے: میت کے بالوں میں کنگھا نہ کیا جائے یعنی یہ مکروہ تحریمی ہے، اور اس کے ناخن نہ تراشے جائیں، مگر وہ جو ٹوٹا ہوا ہے، نہ ہی بال تراشے جائیں، نہ ختنہ کیا جائے، ردالمحتار میں ''نہر'' سے، اس میں ''قنیہ'' سے منقول ہے، اس کے مرنے کے بعد زینت کرنا، کنگھا کرنا، بال کاٹنا ناجائز ہے، (فتاویٰ رضویہ ،جلد 9، ص:91-92، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نہ صرف میت کی تعظیم وتکریم لازم ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ قبور مسلمین کی تعظیم وادب کا بھی حکم ارشاد فرماتے ہیں، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ:''لأن یجلس احدکم علی جمرۃ

فتحرق ثیابه حتی تخلص الی جلدة خیرله من أن یجلس علی قبر"۔
ترجمہ:" ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:" تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس سے کہ قبر پر بیٹھے، (ابوداؤد، رقم الحدیث:3220، مطبوعہ مؤسسة الریان بیروت)"۔
عن عقبة بن عامر، قال: قال رسول الله ﷺ:لأن امشی علی جمرة أو سیف،أو اخصف نعلی برجلی، أحبّ الیّ من ان امشی علی قبر مسلم۔ وما أبالی اوسط القبور قضیت حاجتی، أو وسط السوق"
ترجمہ:" عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے زیادہ پسند ہے آگ یا تلوار پر چلنا یا پاؤں سے جوتے پر پیوند لگانا، بہ نسبت اس کے کہ قبرِ مسلم پر چلوں، اور مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ قبر کے وسط میں میری حاجت پوری ہوتی ہے یا بازار کے درمیان، (ابن ماجہ، رقم الحدیث:1568، مطبوعہ دار الفکر بیروت)"۔
صورتِ مسئولہ میں چونکہ مصنوعی دانت اس طور پر نصب کیے ہوئے ہیں جنہیں نکالا نہیں جاسکتا، اور انہیں نکالنے کی کوشش کرنا میت کو اذیت دینا ہے، اور میت کو اذیت دینا جائز نہیں ہے، لہٰذا مصنوعی دانتوں کے ساتھ میت کی تدفین جائز ہے۔

پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت

سوال: 48

کیا شریعت میں پوسٹ مارٹم کی اجازت ہے؟، اگر اجازت ہے تو قرآن پاک یا حدیث میں ہے اس کی کوئی مثال موجود ہے؟۔

سوال:49

کیا شہید کا پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا ہے؟، کیونکہ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ سر (چہرے) سے لے کر پیٹ تک اس کو کاٹتے ہیں، صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ گولی سے مرا ہے یا کسی چاقو سے یا گولی کتنی دور سے لگی ہے یا زخم کتنا گہرا ہے۔ اور اس کے بعد قانون میں

اتنا ہے کہ یہ میڈیکل رپورٹ صرف موت کا سبب جاننے کے لئے کی جاتی ہے، اور قانون میں صرف اس رپورٹ پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا یہ تو صرف گواہوں کی گواہی سے مشابہت کرنے کے لئے ہوتی ہے، کہ واقعی گواہان سچ بول رہے ہیں کورٹ میں۔

سوال:50

کیا کسی بھی آدمی (مردہ) کو قبر سے نکال کر اس کا پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا ہے، شریعت اجازت دیتی ہے؟ یہ سب اور آپ کو تو معلوم ہے کہ پاکستان میں میڈیکل رپورٹس کیسے دی جاتی ہیں، کیا اس کے باوجود بھی پوسٹ مارٹم کیا جاسکتا ہے؟۔ (منصور علی ایڈوکیٹ، ڈسٹرکٹ لاڑکانہ تحصیل میرو خان ولیج نیو ٹھارو ودھو)۔

جواب:

آپ کے سوالات کا جواب دینے سے پیشتر مسلمان میت کی حرمت سے متعلق ہم چند حوالے نقل کرتے ہیں: مسلمان میت کی تجہیز و تکفین، تدفین اور تدفین کے بعد اس کی قبر کی تکریم لازم ہے، کوئی ایسا عمل جس سے میت کو تکلیف ہو، نہ کیا جائے۔ مسلمان کی قبر کی تعظیم کا حکم احادیث مبارکہ میں جس قدر ہے اس سے مسلمان میت کی تعظیم و تکریم کا اندازہ ہوتا ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی عزت زندہ و مردہ برابر ہے۔ محقق علی الاطلاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فتح القدیر، (جلد:2، ص:102، مکتبۂ نوریہ رضویہ، سکھر) میں فرماتے ہیں: و توضیحه الاتفاق علی انّ حرمۃالمسلم میتاً کحرمته حیاً۔ ترجمہ: اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت و حرمت زندہ مسلمان کی طرح ہے۔ (ت)۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں: کسر عظم المیت واذاہ ککسرہ حیًا۔ رواہ امام احمد وابوداؤد و ابن ماجه باسناد حسن عن اُمّ المومنین عائشه الصدیقة رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

ترجمہ: ''مردے کی ہڈی کو توڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا،

اسے امام احمد وابوداؤدوابن ماجہ نے بسندِ حسن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا"۔ یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، المیت یؤذیه فی قبره ما یؤذیه فی بیته۔ ترجمہ: "سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: مردے کو قبر میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے گھر میں اسے اذیت ہوتی۔ علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں: افادان حرمة المؤمن بعد موته باقیة۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت بعد موت کے بھی ویسے ہی باقی ہے۔ سیدنا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اذی المؤمن فی موته کاذاه فی حیاته رواه ابی بکر بن ابی شیبة۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔ علماء فرماتے ہیں: المیت یتاذی بما یتاذی به الحی ۔کذا فی ردّالمحتار وغیره من معتمدات الاسفار۔

جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے، مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں، جیسا کہ ردالمحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے۔ (ت) علامہ شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں امام علامہ ابوعمر یوسف بن عبدالبر سے نقل فرماتے ہیں: ازیں جا مستفاد میگردد کہ میت متالم میگردد بجمیع انچہ متالم میگردد بدان حی ولازم ایںست کہ متلذذ گردد بتمام انچہ متلذذ می شود بدان زندہ، انتہی۔ اس جگہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو درد پہنچتا ہے، ان تمام سے مردہ کو بھی الم پہنچتا ہے، اور یہ لازم ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو لذت حاصل ہو ان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، انتہی (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 441-442، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا" کاٹنا مرد کے بال بعد مرنے کے جائز ہے یا نہیں؟، اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "ناجائز ہے، فی الدرلایسرح شعره ای یکره تحریما ولا یقص ظفره الاالمکسور ولاشعره ولایختن، وفی ردالمحتار عن النهرعن القنیة التزیین بعد موتها و الامتشاط وقطع الشعر لایجوز۔ واللہ

تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ: ''درمختار میں ہے: میت کے بالوں میں کنگھا نہ کیا جائے یعنی یہ مکروہ تحریمی ہے، اور اس کے ناخن نہ تراشے جائیں، مگر وہ جو ٹوٹا ہوا ہے، نہ ہی بال تراشے جائیں، نہ ختنہ کیا جائے، ردالمحتار میں ''نہر'' سے، اس میں ''قنیہ'' سے منقول ہے، اس کے مرنے کے بعد زینت کرنا، کنگھا کرنا، بال کاٹنا ناجائز ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص:92-91، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

نہ صرف میت کی تعظیم وتکریم لازم ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ قبور مسلمین کی تعظیم وادب کا بھی حکم ارشاد فرماتے ہیں، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عن ابی هريرة قال: قال رسول اللهﷺ:"لأن يجلس احدكم علی جمرة فتحرق ثيابه حتی تخلص الی جلدة خيرله من أن يجلس علی قبر"۔

ترجمہ: ''ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ کپڑے جلا کر چمڑے تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے اس سے کہ قبر پر بیٹھے، (ابوداؤد، رقم الحدیث:3220، مطبوعہ موسسۃ الریان بیروت)''۔

میت کے پوسٹ مارٹم کی ضرورت دو جگہ پیش آتی ہے، ایک ہے ضرورتِ تعلیم، اس کے لئے عام طور پر کسی لاوارث میت کو قبضے میں کرنے کے بعد میڈیکل کالج کے طلباء اس کے جسم پر آپریشن کی مشق کرتے ہیں اور اس کے جسم کے مختلف اعضاء پر طبّی نوعیت کے تجربات کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ سرجری کی مشق کے لئے جانوروں اور غیر مسلم اموات کو حاصل کرنا چاہئے اور مسلم اموات پر سرجری کی مشق کرنا جائز نہیں ہے اور غیر مسلم اموات کا حصول اس قدر دشوار نہیں ہوتا جس کی بنا پر مسلمان میت کی چیر پھاڑ کر کے اس کی بے حرمتی کی جائے۔

آج کل انسانی جان کو بچانے کے لئے سرجری اور آپریشن ایک ضروری طریقۂ علاج ہے پتہ یا مثانہ میں پتھری کی صورت میں آپریشن کے ذریعے پتھری کو باہر نکالا جاتا ہے، اگر گردہ

خراب ہوجائے تو اس کو آپریشن کر کے باہر نکال دیتے ہیں، بعض دفعہ عورت کے پیٹ میں بچہ آڑا یا ترچھا ہوتا ہے اور اگر آپریشن کے ذریعے ڈلیوری نہ کی جائے تو ماں اور بچہ دونوں مر جاتے ہیں، بعض دفعہ جسم کے کسی عضو میں کوئی ناسور ہوجاتا ہے اور باقی جسم کو اس کے زہر سے محفوظ رکھنے کے لئے اس عضو کو کاٹنا پڑتا ہے، بعض حادثات میں جسم کی مختلف ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں اس موقع پر ہڈی جوڑنے کے لئے آپریشن ناگزیر ہوتا ہے اسی طرح بم کے ٹکڑوں اور گولیوں کو جسم سے نکالنے کے لئے آپریشن کی ضرورت پڑتی ہے۔

پوسٹ مارٹم کی دوسری وجہ جو بالعموم پیش آتی ہے وہ ہے مقدمہ کی تحقیق اور کسی بے قصور مسلمان کو قتل کی سزا سے بچانے کا مسئلہ مثلاً ایک شخص کو پولیس نے پستول سمیت پکڑ لیا اور اس پر الزام ہے کہ اس نے اپنے پستول سے فلاں شخص کو گولی مار کر ہلاک کردیا ہے، جبکہ ملزم یہ کہتا ہے کہ میں نے اس پر گولی نہیں چلائی اور تمام شواہد اور قرائن ملزم کے خلاف ہیں، اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ مقتول کے جسم میں جو گولی ہے آیا وہ اس نمبر کی گولی ہے جو ملزم کے پستول میں ہے یا کوئی اور گولی ہے، اگر یہ ثابت ہوجائے کہ مقتول کے جسم میں ملزم کے پستول کی گولی ہے تو وہ قاتل ثابت ہوجائے گا اور اگر وہ گولی اس کے پستول کی نہیں ہے، تو وہ بری ہوجائے گا، ایسی صورت میں جبکہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے کسی بے قصور کی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو پوسٹ مارٹم کرنا صرف جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری ہے اور فقہاء اربعہ کے مذاہب میں اس کی تائید موجود ہے۔

مذکورہ بالا مسئلے کی تحقیق انتہائی مفصل انداز میں شیخ الحدیث حضرت علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے اپنی تصنیف شرح صحیح مسلم (جلد دوم، ص:823-830) میں کی ہے، جس کا خلاصہ ہم نے بیان کیا ہے۔ میت کو دفن کرنے کے بعد پھر قبر کو کھودنا جائز نہیں مگر جب کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو مثلاً زمین مغصوب میں دفن کیا گیا یا دفن کے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں قبر کھودنے کی اجازت ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

(لا يخرج منه) بعد اهالة التراب (الا) لحق آدمي، (كأن تكون الارض مغصوبة

أو أخذت بشفعة) و يخير المالک بين اخراجه و مساواته بالأرض۔
ترجمہ:"(میت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا) مٹی ڈال دینے کے بعد (مگر) کسی انسان کے حق کی وجہ سے، مثلاً (زمین غصب کی ہو یا شفعہ کی وجہ سے لی گئی ہو) اور مالک کو اختیار ہوگا کہ مردے کو نکال دے یا قبر زمین کے برابر کردے، (ردالمحتار جلد 3 صفحہ 135,136، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)"۔
تمام حوالہ جات کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے کسی بے قصور کی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو پوسٹ مارٹم کرنا صرف جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری ہے (کیونکہ جب مسلمان میت کی حرمت اس قدر ہے جیسا کہ ہم نے اس فتویٰ کی ابتداء میں بیان کی ہے تو زندہ کی بدرجۂ اولیٰ ہے) اور فقہاء اربعہ کے مذاہب میں اس کی تائید موجود ہے۔

جھوٹی قبر بنانا اور اس کی تعظیم کرنا

سوال:51

ایک ایسی جگہ جہاں کسی بزرگ وولی کی قبر نہ ہو اور نہ ہی وہاں کوئی دفن ہو، بس اتنا کہا جاتا ہو کہ یہاں کسی زمانے میں گذرتے ہوئے کسی قافلے کا ایک بچہ غائب ہو گیا تھا (یہ معلوم نہیں کہ یہ بچہ ہندو، سکھ یا عیسائی ہے، جن کا تھا) زندہ پیر کا نام دے کر عرس کرنا منتیں چڑھانا، صدقات دینا اور مقدس جان کر حاضری دینا، درختوں کا نہ کاٹنا، وہاں کی خاک کو شفایاب سمجھنا وغیرہ وغیرہ، جائز ہے یا ناجائز؟۔ اب یہ جگہ محکمۂ اوقاف کے پاس ہے عرس تو نہیں ہوتا، لیکن عورتوں اور مردوں کی حاضری جیسے معاملات جاری ہیں۔ اس صورتِ حال کو روکنا جائز ہے یا نہیں؟، (مولانا محمد جہانگیر صدیقی، علیمیہ مسجد، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

جھوٹی قبر بنا کر اس کی تعظیم کرنا ناجائز ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا "کسی ولی اللہ کا مزار شریف فرضی بنانا اور اس پر چادر وغیرہ چڑھانا، اور اس پر

فاتحہ پڑھنا اور اصل مزار کا سا ادب ولحاظ کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔
جواب میں لکھتے ہیں: فرضی مزار بنانا اور اس کے ساتھ اصل کا سا معاملہ کرنا ناجائز وبدعت ہے، مزید سوال ہوا کہ'' زید نے ایک قبر فرضی اور مصنوعی، جس کا پہلے سے کوئی وجود نہ تھا، بنوا کر یہ بات مشہور کی کہ اس قبر میں امروہہ کے زین العابدین تشریف لائے ہیں، مجھ کو خواب میں بشارت ہوئی ہے، ایسی روایاتِ کاذبہ سے اس قبر کی عظمت لوگوں کے سامنے بیان کر کے قبر پرستی کی طرف بلانے لگا حتیٰ کہ اس میں اس کو کامیابی ہونے لگی اور بہت سی مخلوق اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس قبر پر چادریں اور مرغ اور بکری اور مٹھائیاں، روپیہ اور پیسہ چڑھانے لگے، اور اپنی مرادیں اور منتیں اس قبر سے مانگنے لگے اور زید اس آمدنی سے متمتع ہوتا ہے، ایسے شخص کے واسطے شریعت کیا حکم لگاتی ہے''؟۔
آپ نے جواب دیا:'' قبر بلا مقبور (یعنی جس میں کوئی دفن نہ ہو) کی طرف بلانا اور اُس کے لئے وہ افعال کرانا گناہ ہے، اور جبکہ وہ اس پر مصر ہے اور باعلان اسے کر رہا ہے، تو فاسق معلن ہے اور فاسق معلن کو امام بنانا گناہ اور پھیرنی واجب۔ اس جلسۂ زیارتِ قبر بے مقبور میں شرکت جائز نہیں۔ زید کے اس معاملے سے جو خوش ہیں خصوصاً وہ جو مُمِد ومعاون ہیں، سب گناہ گار وفاسق ہیں، قال اللہ تعالیٰ: **ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان**، گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ بلکہ وہ بھی جو باوصفِ قدرت ساکت ہے، قال اللّٰہ تعالیٰ: کانوا لایتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ماکانوا یفعلون ۔ وہ برے کام سے ایک دوسرے کو روکتے نہ تھے، کیا ہی برا کام وہ کرتے تھے۔
ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: جھوٹا مزار بنانا اور اس کی تعظیم کرنا جائز نہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9 ص: 425، 426، 427 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

مردہ پیدا ہونے والے بچے کے کفن دفن، غسل دینے اور نام رکھنے کا مسئلہ

سوال:52

اگر کوئی بچہ مسلمان کے گھر مردہ حالت میں پیدا ہو تو ایسی صورت میں اس کی

تدفین کے بارے میں کیا حکم ہے کیا اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا یا کسی
الگ جگہ پر؟ اور اس کو غسل دینے اور نام رکھنے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟، (طارق
عزیز، دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

وہ بچہ جو ماں کے بطن سے مردہ حالت میں پیدا ہوا، یعنی دورانِ تولُّد یا بعد میں
اس نے کوئی آواز نہیں نکالی، کوئی حرکت نہیں کی، سانس نہیں لیا، زندگی کی کوئی علامت ظاہر
نہیں ہوئی، تو اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، غسل دینا بہتر ہے، اسے معمول کا
مسنون کفن دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بس پاک کپڑے میں لپیٹ کر مسلمانوں کے
قبرستان میں دفن کردیا جائے، مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ دیگر
قبور کی وجہ سے اس میت کے آثار کی بے حرمتی کی نوبت نہیں آئے گی۔ علامہ نظام الدین
لکھتے ہیں:

وان لم یستهل ادرج فی خرقة ولم یصل علیه ویغسل فی غیر ظاهر الروایة
وهو المختار کذا فی الهدایة۔

ترجمہ: "اور اگر بچہ (مردہ پیدا ہوا اور) کوئی آواز نہیں نکالی، تو اسے پاک کپڑے میں لپیٹ
کر دفن کردیا جائے اور اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، (فقہ حنفی کی ظاہر الروایہ میں ت
اسے غسل دینا ثابت نہیں ہے لیکن) غیر ظاہر الروایہ کی ایک روایت میں ہے کہ اسے غسل د
جائے گا، اور یہی (قول) مختار ہے اور "ہدایہ" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جل
1 ص:159، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والا) یستهل (غُسِّل ویُسمّی) عندالثانی وهوالاصح، فیُفتٰی به علیٰ خلاف
ظاهر الروایة اکرماً لبنی ادم کمافی "ملتقی البحار" واذا ستبان بعض خل
غُسِّل وحشر وهو المختار۔

ترجمہ:اور اگر بچہ پیدا ہونے پر آواز نہ نکالے تو دوسری روایت کے مطابق اسے غسل دیا جائے اور نام رکھا جائے ،یہی صحیح ترین ہے۔ اور بنی آدم کے اکرام کی خاطر ''ظاہرالروایۃ'' کے خلاف اسی پرفتویٰ دیا جائے گا،جیسا کہ ''ملتقی البحار'' میں ہے،ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد:3،ص:122)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ'' اکثر دیکھا گیا مرا ہوا بچہ کسی کے ہاں پیدا ہوتا ہے،اس کو ہانڈی میں رکھ کر گورستان سے علیحدہ دفن کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ پکا مسان (یعنی اس سے بدفالی مراد لیتے ہیں) ہے،اس سے اہل ہنود کی طرح بچتے ہیں،یہ کیونکر ہے؟۔

آپ نے جواب دیا:'' یہ شیطانی خیال ہے اسے مسلمانوں کے گورستان ہی میں دفن کریں، (فتاویٰ رضویہ،جلد9 ص:390،رضا فاؤنڈیشن،لاہور)''۔

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

مسلمان مرد یا عورت کا بچہ زندہ پیدا ہوا یعنی اکثر حصہ باہر ہونے کے وقت زندہ تھا،پھر مر گیا تو اس کو غسل وکفن دیں گے اور اس کی نماز پڑھیں گے ورنہ اسے ویسے ہی نہلا کر ایک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیں گے اس کیلئے غسل وکفن بطریقِ مسنون نہیں اور نماز بھی اس کی نہیں پڑھی جائے گی،(بہارِ شریعت،جلد اول،ص:335،336،مطبوعہ مکتبۂ امجدیہ،کراچی)''۔

کتاب الزکوٰۃ

زکوٰۃ کی رقم سے قرض کی ادائی

سوال:53

ایک شخص جو کہ قرض دار ہے اور بینک سے سود پر رقم قرض لی ہے گھر گروی ہے کچھ اور لوگوں کا پیسہ بھی دینا ہے جو کہ لاکھوں میں ہے، ضروریاتِ زندگی کی اشیاء گھر میں موجود ہیں۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی قریبی رشتے دار زکوٰۃ کی رقم سے اس کا قرضہ ادا کرنا چاہے تو کتنی رقم زکوٰۃ کی مد میں اسے دے سکتا ہے؟۔

سوال: 54

ایک شخص مختلف لوگوں سے قرض لیتا ہے اور پھر کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہو جاتا ہے اس کے گھر کے افراد وہ قرض چکانے کی استطاعت نہیں رکھتے کیا کوئی قریبی رشتہ دار یہ قرض زکوٰۃ کی رقم سے ادا کر سکتا ہے؟، (سعید غنی آرائیں، بلاک 5-E 62/10 نیو کراچی)۔

جواب:

ایسا قرض دار جس کے پاس ادائے قرض کے وسائل نہ ہوں اور قرض کی رقم اس کی موجودہ املاک سے زیادہ ہو اگر کوئی حسنِ سلوک کے طور پر اس کے قرض کی ادائیگی کرنا چاہے تو وہ اپنی استطاعت وصلاحیت کے مطابق کر سکتا ہے قرض کی رقم خواہ بینک کی ہو یا شخصی، قرض کے سلسلے میں برابر ہیں البتہ شخصی قرض میں سود نہیں ہونا چاہئے جبکہ بینک کے قرض میں سود دینا ہوتا ہے اس لئے یہ شخصی قرض سے بدتر ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے نادار کے قرض کی ادائی / زکوٰۃ کی رقم ھبہ یا قرض کہہ کر دینا

سوال:55

کیا زکوٰۃ کی رقم ایسے عزیز کو دی جا سکتی ہے، جو اپنی قلیل تنخواہ کی وجہ سے مقروض ہے اور اس کی لڑکی کی شادی طے ہوگئی ہے، مگر شادی کا خرچہ نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی

ہے، معلوم ہے کہ وہ شخص زکوٰۃ کی رقم لینے پر تیار نہیں ہوگا تو کیا اس کو بغیر بتائے، اس کے قریبی رشتہ دار زکوٰۃ کی رقم دے سکتے ہیں، کیا اس طرح زکوٰۃ کی ادائی ہو جائے گی؟،
(واجد حسین، A-286/1 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

زکوٰۃ کی صحیح ادائی کے لئے ضروری ہے کہ جسے زکوٰۃ دی جارہی ہے، وہ مستحق زکوٰۃ ہو، صاحب نصاب نہ ہو، سید نہ ہو، تو ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ مستحقِ زکوٰۃ وہ شخص ہے، جس کے پاس کم از کم نصاب کے مساوی بنیادی ضروریات سے فاضل مال موجود نہ ہو، نصابِ شرعی کی مقدار یہ ہے 612.36 گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم، یا مالِ تجارت جو اس کی بنیادی ضروریات سے زائد ہو۔ قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے اس کا قرض بھی ادا کیا جاسکتا ہے اور اسے یعنی مستحقِ زکوٰۃ شخص کو یہ بتائے بغیر بھی دی جاسکتی ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، جبکہ اندیشہ ہو کہ خودداری کی بنا پر نہیں لے گا، بلکہ ہبہ یا قرض کہہ کر بھی دی جاسکتی ہے اور دل میں یہ نیت ہو کہ واپس نہیں لوں گا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن أعطى مسكينًا دراهم وسماها هبةً أو قرضاً ونوى الزكاةُ فانها تُجزيه وهو الاصح هكذا في البحر الرائق ناقلاً عن المبتغى والقنية ۔

ترجمہ: ’’اور جو شخص کسی مسکین (مستحقِ زکوٰۃ شخص) کو کچھ درہم (زکوٰۃ کی مد میں) یہ کہہ کر دے کہ یہ ہبہ یا قرضہ ہے اور زکوٰۃ کی ادائی کی نیت کرلے تو یہ عمل ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی ہے اور یہی قول صحیح ترین ہے ’’بحر الرائق‘‘ میں ’’المبتغی‘‘ اور ’’قنیہ‘‘ سے اسی طرح منقول ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 171، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)‘‘۔

ادھار کی رقم سے زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال:56

میں نے زکوٰۃ کے پیسے رکھے تھے، جو ایک صاحب کو جو انتہائی مجبور تھے، ادھار میں دیدیئے، سوال یہ پوچھنا ہے کہ کیا زکوٰۃ میں سے رقم بطور ادھار دی جاسکتی ہے۔ کیا سال گزرنے کے بعد جب ادھار دی ہوئی رقم مل جائے، اس وقت زکوٰۃ دینے پر کوئی حرج تو نہیں؟، (محمد حامد علی، گلشن اقبال)۔

جواب:

اپنے مال میں سے زکوٰۃ کی رقم نکال کر اسے اپنے پاس الگ رکھنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، بلکہ اسے مستحق تک پہنچانا اور اسے اس کا مالک بنانا ضروری ہے، اور اگر اس رقم کو رکھے ہوئے سال گزر جاتا ہے، یا اسے آپ نے ادھار پر کسی کو دے رکھا ہے، تو آپ جب آئندہ سال کی زکوٰۃ ادا کریں گے، تو زکوٰۃ کی نیت سے الگ رکھی ہوئی یا کسی کو قرض دی ہوئی اس رقم پر بھی آپ کو زکوٰۃ ادا کرنی لازمی ہوگی۔ اور اگر آپ نے گذشتہ کئی سالوں سے اس رقم کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، تو مقدارِ واجب کو چھوڑ کر بقیہ رقم اگر نصاب کی مقدار کو پہنچتی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، مثلاً آپ کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور سال گذرنے پر ساڑھے بارہ ہزار روپے زکوٰۃ واجب ہوگئی اور اس سال آپ نے زکوٰۃ ادا نہیں کی تو آئندہ سال کی زکوٰۃ جب ادا کریں گے تو مقدارِ واجب یعنی ساڑھے بارہ ہزار کو چھوڑ کر بقیہ چار لاکھ ستاسی ہزار پانچ سو کی زکوٰۃ آپ پر واجب ہوگی۔ صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ کی نیت سے اپنے کل رقم میں سے جو پیسے آپ نے علیحدہ کیے اور پھر وہ رقم آپ نے دوسرے کو بطورِ قرض دے دی اب آپ آئندہ سال جب زکوٰۃ ادا کریں گے تو گذشتہ سال آپ کی رقم پر جتنی زکوٰۃ واجب تھی اس مقدارِ واجب کو چھوڑ کر بقیہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لہٰذا جو پیسے آپ نے قرض میں دیئے وہ کل رقم میں سے شمار نہیں ہونگے بلکہ قرض کی وصولیابی کے بعد گذشتہ سال کی زکوٰۃ کی مد میں ان کو خرچ کرنا واجب ہوگا۔

اسپتال کے لئے زکوٰۃ کی رقم سے آلاتِ طب کی خریداری

سوال:57

میرا ایک ہسپتال ہے اس میں غرباء، مساکین کا مفت علاج کیا جاتا ہے، آنکھوں کے علاج و آپریشن کا شعبہ بھی ہے۔ غیر مستحق افراد سے مناسب فیس اور خرچہ لیا جاتا ہے اس آمدنی سے بھی غرباء و مساکین کے علاج میں رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اب ہم ہسپتال میں آلات و مشینری وغیرہ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں خصوصاً شعبۂ امراضِ چشم میں۔ سوال یہ ہے کہ کیا زکوٰۃ کی رقم سے آلات و مشنری برائے ہسپتال خریدی جاسکتی ہیں؟۔ (اخلاق احمد، پشاور)

جواب:

محتاط صورت تو یہ ہے کہ آلات و مشینری زکوٰۃ کی رقم سے لے کر کسی بھی مستحقِ زکوٰۃ کی ملک کردی جائے اور وہ اسے آپ کے ہسپتال کو ھبہ کردے، پھر اسے آپ مستحق زکوٰۃ مریضوں، نصف فیس یا مکمل فیس دینے والے یا غیر مستحق زکوٰۃ مریضوں کے لئے بھی بلا فیس استعمال کرسکتے ہیں اور کسی سے پوری فیس بھی چارج کرسکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

زکوٰۃ کی رقم سے مقامی بچوں کے لئے تعلیم القرآن کا مدرسہ چلانا

سوال:58

میں اپنی سالانہ زکوٰۃ میں سے محلے کے دو مدرسے اس طرح چلاتا ہوں کہ محلے کے بچے پڑھنے کے لئے آتے ہیں، کوئی رہائشی یا مسافر طالب علم نہیں ہے۔ لڑکوں کو معلم قاری صاحب اور لڑکیوں کو معلّمہ قاریہ صاحبہ پڑھاتی ہیں۔ ان دونوں کا ماہانہ وظیفہ، مدرسے کے لئے ڈیسکیں، پنکھا اور دیگر اخراجات زکوٰۃ کی رقم سے ادا کرتا ہوں، گذشتہ دو سال سے اسی مذکورہ بالا طرز پر یہ دو مدارس میں چلا رہا ہوں، کیا میری ادا کردہ زکوٰۃ درست ہے؟۔ (حافظ فہیم احمد، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوٰۃ قرآن مجید کی سورۃ التوبہ :60 میں متعین فرمادیئے

ہیں اور وہ آٹھ مدات ہیں:

(1) فقراء (2) مساکین (3) عاملین زکوٰۃ (4) مؤلفۃ القلوب (5) جن کی گردن کسی بڑے مالی بار تلے دبی ہوئی ہو (6) جن پر کوئی بھاری تاوان آ گیا ہو، جس سے گلوخلاصی کی کوئی سبیل نہ ہو (7) جو اپنے آپ کو ہمہ وقتی اللہ کے دین کے لئے وقف کر چکے ہوں اور معاشی تگ ودو کے لئے انہیں وقت میسر نہ ہو (8) جو مسافر کسی ایسے مقام پر گھر گئے ہوں کہ قوت لایموت دستیاب نہ ہو اور گھر سے رابطہ اور مالی معاونت کا حصول ممکن نہ ہو۔ زکوٰۃ کا مال صرف اس پر صرف کیا جاسکتا ہے جو قرآن مجید میں بیان کردہ ان مدات میں سے کسی ایک کے تحت مستحق زکوٰۃ قرار پاتا ہو۔ وہ مقامی شہری بچے جو مدارس یا مکاتب تعلیم القرآن میں حفظ وناظرہ کی تعلیم پا رہے ہوتے ہیں اور جن کے والدین اور کفیل خود زکوٰۃ وصدقات ادا کرتے ہیں، ان پر بلاواسطہ یا بالواسطہ زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا درست نہیں ہے، بالواسطہ اس طرح کہ ان کے معلم ومدرس کو اس لئے زکوٰۃ کی رقم میں سے تنخواہ دی جائے کہ وہ ان بچوں کو پڑھاتا ہے۔ ہاں البتہ اگر ایسا کوئی مدرس فی نفسہٖ مستحق زکوٰۃ ہے تو اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، عام ازیں کہ وہ بچوں کو پڑھائے یا نہ پڑھائے، اگر اسے زکوٰۃ غیر مشروط طور پر استحقاق کی بنا پر دی جا رہی ہو اور وہ رضاکارانہ طور پر رضائے الٰہی کے لئے قرآن مجید کی تعلیم دے رہا ہو، اسے اس پر شرط یا لازم نہ قرار دیا گیا ہو تو درست ہے۔ البتہ اگر زیرِ تعلیم بچے بھی ایسے لوگوں کے ہیں، جو نادار اور مستحقِ زکوٰۃ ہیں، تو ادارے کا سربراہ زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل بن کر ان پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرسکتا ہے۔

ترکے کی تقسیم سے پہلے کی مدت پر زکوٰۃ واجب نہیں

سوال:59

ایک شخص کا قضاء الٰہی سے انتقال ہو گیا اور اس کی جائداد اس کے شرعی ورثاء میں 2 سال کے بعد تقسیم کی گئی آیا تقسیم کے بعد گذشتہ دو سالوں کی زکوٰۃ ان کے ذمے واجب الادا ہے یا نہیں؟ (منور صدیقی، ملیر کراچی)۔

جواب:

واضح رہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے بعض شرائط ہیں، جب یہ تمام شرائط پائی جائیں تو اس مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر ان میں سے کل یا بعض شرائط نہ پائی جائیں، تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک شرط "ملکِ تامّ" (Complete.Ownership) ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: (ومنها الملک التام) وهو ما اجتمع فيه الملک واليد واما اذا وجدفيه الملک دون اليد کا الصداق قبل القبض اووجد اليد دون الملک کملک المکاتب والمديون لاتجب فيه الزکوٰة کذافی السراج الوهاج۔

ترجمہ: "(اور وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک "ملکِ تامّ" ہے) اور (ملکِ تامّ) اسے کہتے ہیں کہ جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں پائے جائیں، لیکن جب ملکیت پائی جائے مگر قبضہ نہ پایا جائے، اس کی مثال (دینِ) مہر ہے، جو ابھی (بیوی کے) قبضے میں نہیں آیا، یا قبضہ پایا جائے مگر ملکیت نہ ہو، جیسے (عبدِ) مکاتَب یا مقروض کے قبضے میں مال کا ہونا (کہ اس میں ملکیت نہیں ہے)، تو ان دونوں صورتوں میں اس مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، "السراج الوهاج میں اسی طرح ہے"، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول: ص:172، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

اور ملک تام تب ہی ہوگا، جبکہ اصل یعنی "مالکِ مال"، مال پر قبضہ کرلے یا اس کا وکیل مال پر قبضہ کرلے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وقد مران المراد بالملک التام رقبة و يدا۔

ترجمہ: "اور تحقیق (پیچھے) گذر چکا ہے کہ (ملک) تام سے مراد یہ ہے کہ مملوک پر ملکیت بھی کامل ہو اور قبضہ بھی ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد: 3، ص: 168، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

اور وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مال نصاب حقیقۃً یا تقدیراً نامی ہو۔اور نامی ہونا یہ ہے کہ اس کو مالِ تجارت سے بڑھا سکے اور تجارت قبضہ سے پہلے ہو ہی نہیں سکتی۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:(ومنها كون النصاب ناميا) حقيقة بالتوالد و التناسل و التجارة أو تقديرا بان يتمكن من الاستمناء بكون المال في يده او في يد نائبه۔

ترجمہ:''وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک نصاب کا نامی (بڑھوتری کے قابل) ہونا ہے،حقیقت میں تو نمو (Growth) یہ ہے کہ توالد وتناسل (جیسے جانوروں کی افزائش نسل ہوتی ہے) یا تجارت کے ذریعے ہو،یا تقدیراً نمو ہو، کہ مال کا مالک اپنے مال میں نمو اور اضافے کی قدرت رکھتا ہو اور یہ تب ہو سکتا ہے جب مال اس کے (براہِ راست) یا اس کے نائب کے قبضے میں ہو، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 :،ص:174 ،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:وأماسائر الديون المقربهافهي علىٰ ثلاث مراتب عند ابى حنيفةرحمه الله تعالىٰ ضعيف وهو كل دين ملكه بغير فعله لابد لاعن شئى نحوالميراث او بفعله لابد لاعن شئى كالوصية اوبفعله بدلا عماليس بمال كالمهر وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والدية وبدل الكتابة لازكاة فيه عنده حتى يقبض نصابا ويحول عليه الحول۔

ترجمہ:''لیکن ایسے تمام قرضے جن کا اقرار کیا جا چکا ہو،امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے تین درجے ہیں، (ایک دین) ضعیف، یہ وہ دین ہے جس کا وہ اپنے کسی فعل کے بغیر مالک بن گیا ہو،اور وہ مال کسی چیز کے بدلے میں اسے نہ ملا ہو، جیسے مالِ وراثت، یا اس کے فعل سے تو ہو لیکن کسی چیز کے بدلے میں نہ ہو، جیسے وصیت یا اسکے فعل سے تو ہو لیکن کسی مال کے بدلے میں نہ ملا ہو، جیسے مہر، بدلِ خلع ،قتلِ عمد پر صلح کے عوض ملنے والا مال، دیت اور بدلِ کتابت، ایسے اموال میں امام اعظم کے نزدیک زکوٰۃ نہیں ہے، تاوقتیکہ کے وہ قبضے میں آجائے اور نصابِ زکوٰۃ کے برابر ہو اور اس پر سال گزر جائے

(بشرطیکہ وہ شخص پہلے سے صاحبِ نصاب نہ ہو)، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 : ص:174، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: کسی شخص کی وفات کے ساتھ ہی، اس کا مال ترکہ بن جاتا ہے اور حکماً اس مال کی ملکیت ورثاء کو منتقل ہوجاتی ہے، لیکن تقسیمِ وراثت سے پہلے ورثاء کا اس مال پر ''ملکِ تام'' (یعنی ملکیت مع قبضہ) نہیں ہوتا تاوقتیکہ تقسیمِ وراثت کے بعد وہ اس پر قبضہ کرلیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ترکے کی تقسیم سے پہلے سالوں کی زکوٰۃ اس مال پر واجب نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ کی رقم سے ڈائلیسس مشین کی خریداری

سوال :60

عرض یہ ہے کہ ہم عزیز طبہ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام فیڈرل ''بی'' ایریا میں ایک ڈائلیسس سینٹر چلارہے ہیں جہاں پر ناکارہ گردے کے مریضوں کا ڈائلیسس کیا جاتا ہے اور اس سے زیادہ تر زکوٰۃ کے مستحق لوگوں کا ڈائلیسس کیا جاتا ہے۔ جب کہ کچھ لوگ آدھے چارج یا پورے چارج دیتے ہیں ان کا بھی ڈائلیسس کیا جاتا ہے۔

ہمیں کچھ صاحبِ ثروت حضرات زکوٰۃ کی مد سے ڈائلیسس کی مشین دینا چاہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں کہ:

1۔ کیا زکوٰۃ فنڈ سے ڈائلیسس مشین لی جائے یا نہیں؟

2۔ اگر مشین لی جائے تو اس پر پورے یا آدھے چارج دینے والے مریضوں کا علاج کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟، اگر چارج دینے والوں کا علاج زکوٰۃ فنڈ سے لی ہوئی ڈائلیسس مشین سے نہیں کرسکتے تو برائے مہربانی شریعتِ اسلامیہ کے مطابق اسکا کوئی حل ہوسکتا ہے تاکہ عوام الناس کے فائدے کے لئے زکوٰۃ فنڈ سے خریدی ہوئی ڈائلیسس مشین استعمال ہوسکے، (احمد عبدالشکور منشی)۔

جواب:

محتاط صورت تو یہ ہے کہ ڈائلیسس مشین زکوٰۃ کی رقم سے لے کر کسی بھی مستحق کی ملک کر دی جائے اور وہ اسے آپ کے ڈائلیسس سنٹر کو ہبہ کر دے، پھر اسے آپ مستحق زکوٰۃ مریضوں، نصف فیس یا مکمل فیس دینے والے یا غیر مستحق زکوٰۃ مریضوں کے لئے بھی بلا فیس استعمال کر سکتے ہیں اور کسی سے پوری فیس بھی چارج کر سکتے ہیں۔

دوسری صورت بر سبیل تنزل یہ ہے کہ ائمہ احناف کے ہاں تو زکوٰۃ میں تملیک یعنی مستحق کو مالک بنانا شرط ہے لیکن اہلسنت کے دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تملیک شرط نہیں ہے۔ ہمارے مفسرین احناف میں سے علامہ خفاجی، علامہ شیخ زادہ، علامہ ابو سعود اور علامہ محمود آلوسی نے فقراء، مساکین، عاملین اور مؤلفۃ القلوب کے لئے تو تملیک کی شرط کو برقرار رکھا ہے لیکن مکاتب غلاموں کی آزادی، مقروض افراد یا کسی تاوان یا جرمانے میں پھنسے ہوئے افراد، مسافروں اور ان لوگوں کے لئے جو ہمہ وقت اللہ کے دین کے کسی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہیں، جیسے مجاہدین فی سبیل اللہ یا دینی طلبہ، لیکن مستحق زکوٰۃ ہیں، ان کے لئے تملیک کو شرط لازم قرار نہیں دیا بلکہ ان کے مصالح پر خرچ کر سکتے ہیں، پس اگر ڈائلیسس مشینیں زکوٰۃ فنڈ سے خریدی جائیں تو پھر ان مشینوں سے صرف مستحقین ہی استفادہ کر سکیں گے۔

علامہ قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی حنفی متوفی **1069** ھ سورۃ التوبہ آیت نمبر 60، جس میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کا بیان فرمایا ہے، اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: پہلے چار مصارف کے ساتھ ''لام'' اور آخری چار مصارف کے ساتھ ''فی'' ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ سے ان کا حصہ ادا کر کے ان کو ان حصوں کا مالک بنا دیا جائے۔ اور آخری چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ میں سے ان کے حصے کا مالک نہیں بنایا جائے گا، بلکہ ان کا حصہ ان کی فلاح اور ان کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا، مکاتب کا مال اس کے مالک کو دیا جائے گا اور مقروض کا مال (اس کے حصے کی زکوٰۃ) اس

کے قرض خواہ کو دیا جائے گا، اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنا بالکل واضح ہے، (عنایت القاضی جلد 4 ص:558، دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

چونکہ گردے کی بیماری ایک خطرناک مہلک بیماری ہے، جو جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے، مریض کی بقاء حیات کے لئے ڈائیلیسس طبی طور پر ناگزیر ہے، اس لئے ہم نے اس میں دوسرے ائمہ کے قول کو اس اصول کی بنیاد پر اختیار کیا ہے کہ: ''ضرورت ممنوعات کو بھی مباح کر دیتی ہے''۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی پیش نظر رہے کہ: ''ضرورت کی بناء پر دی جانے والی رخصت یا جواز کو اس کے دائرے میں محدود رکھنا چاہئے''۔ ہم نے اس مسئلے میں بعض حنفی مفسرین کے بیان کردہ یُسر (آسانی) والے قول کو نقل کیا ہے، لیکن فقہ حنفی کا مسلمہ اور مختار مسلک یہی ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے، لہٰذا ہماری بیان کردہ اس رخصت کو دوسرے مقامات یا مواقع کے لئے استعمال نہ کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

مقامی مدارس میں زکوٰۃ اور نفلی صدقات کا استعمال

سوال:61

مسجد میں ایک مدرسہ ہے اور اس مدرسہ میں بچے اور بچیاں فی سبیل اللہ قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اس مدرسے میں نہ مستقل رہائش کا انتظام ہے نہ قیام کا اور نہ طعام کا، اس مدرسے کے اخراجات جس میں مدرسے کی دیکھ بھال اور استاد کی تنخواہ وغیرہ شامل ہے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے درج ذیل میں سے کون سا پیسا استعمال کرنا درست ہے؟۔ چرم قربانی کے ذریعے جو رقم حاصل ہوتی ہے زکوٰۃ اور فطرہ سے حاصل ہونے والی رقم صدقات وخیرات اور ہدیہ سے حاصل ہونے والی رقم، قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر میری ذہنی تشفی فرمائیں۔ (عبدالرؤف تاجی، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

بعض جگہ مقامی طور پر مساجد میں یا بعض دینی، تبلیغی اور رفاہی تنظیموں کے تحت مکاتب تعلیم القرآن کا ایک نیٹ ورک قائم کیا گیا ہے، ان مدارس ومکاتب میں ان مقامی

لوگوں کے بچے حفظ وناظرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو زکوٰۃ یا فطرہ ان اداروں کو دیتے ہیں، ان مدارس ومکاتب کے معلمین کے مشاہرے ادا کرنے کے لیے زکوٰۃ، فدیہ، فدیہ صوم، نذر، کفارہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ ایسے مصرف کے لیے زکوٰۃ لینا اور دینا جائز نہیں، کیونکہ یہ خود اپنی زکوٰۃ سے استفادہ کی بالواسطہ صورت ہے۔

ایسے مدارس میں چرم قربانی کی مد میں حاصل شدہ رقم، عام خیرات یعنی نفلی صدقات اور عطیات کی رقوم صرف کی جاسکتی ہیں، اسی طرح کوئی نفلی طور پر ایصالِ ثواب کرنا چاہے تو وہ بھی کرسکتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

زکوٰۃ کی ادائیگی میں تملیک کی شرط

سوال:62

اس خط کے ذریعے ایک اہم مسئلے پر آپ کی رائے کا خواستگار ہوں امید ہے کہ اپنے قیمتی وقت سے چند لمحات نکال کر مجھے اپنی رائے سے مستفیض فرمائیں گے۔ میں نے بہت سال پہلے اپنے ہر بچے کے نام پر یا اس کے لئے اپنے نام پر قسطوں میں پلاٹ لئے تھے، نیت خالصتاً یہ تھی کہ یہ پلاٹ بچوں کے بڑے ہونے پر ان کے حوالے کردوں گا کہ اس پر مکان بنائیں یا اسے بیچ کر اس رقم سے کہیں اور مکان بنائیں یا حالات کے مطابق اس کا کوئی مصرف نکالیں، تین سوالات جو غور طلب ہیں وہ عرض کررہا ہوں۔

۱۔ جو پلاٹ بچوں کے نام پر ہی خریدے ہوئے ہیں اور ان کے نام پر ہی سرکاری طور پر رجسٹرڈ ہیں، کیا مجھے یا بچوں کو ان پر زکوٰۃ دینا پڑے گی؟۔

۲۔ جو پلاٹ میں نے اپنے نام پر خریدے تھے، لیکن بچوں کے لئے ہی خریدے تھے اور سرکاری طور پر ان کو ان کے نام رجسٹری کروادی گئی ہے، کیا اس پر مجھے یا بچوں کو ماضی یا مستقبل میں زکوٰۃ دینا ہے؟۔

۳۔ جو پلاٹ ابھی تک میرے نام ہی ہیں لیکن مناسب وقت پر بچوں کے نام کردیئے جائیں گے، تو کیا ان پر ماضی یا مستقبل میں زکوٰۃ لازم ہے؟، (پروفیسر مبشر کریم گورا،

E-131 فیز1 ڈیفنس، لاہور)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل جو پلاٹ آپ نے بچوں کے نام کر دیئے ہیں اور انہیں کے نام پر رجسٹرڈ ہیں اور نیت یہی ہے کہ وہ اس پر اپنا رہائشی مکان بنائیں، تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ آپ کی ملکیت سے یہ خارج ہو چکے ہیں اور بچوں کی ملکیت ہیں۔ بچوں کے بالغ ہونے کے بعد بھی ان کی نیت یہی ہے کہ وہ ان پر مکان بنائیں گے، تو ان پر ان کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ اگر ان کی نیت تبدیل ہوگئی اور ارادہ یہ ہوا کہ اسے بیچ دیں گے یا سرمایہ کاری کے طور پر رکھیں گے، تو اس کے بعد انہیں ان پلاٹوں کی مروجہ مارکیٹ قیمت کے مطابق زکوٰۃ دینی ہوگی۔ جن مزید پلاٹوں کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، جو خود آپ کے نام ہیں، اور جن کے بارے میں خود آپ نے لکھا ہے کہ مستقبل میں ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نیت ان پلاٹوں کے بارے میں فی الحال سرمایہ کاری کی نہیں ہے، لہٰذا اس صورت میں ان پلاٹوں کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فلایصیر للتجارہ مع التردد الا باالنیة۔

ترجمہ: ''کوئی مال نیت قطعیّہ کے بغیر تجارت کے لئے نہیں ہوگا، (فتاویٰ شامی، جلد:2، ص:10، مکتبہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)، واللہ اعلم بالصواب۔

زکوٰۃ کا استحقاق

سوال:63

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلے کی ذیل میں، کیا خالہ خالو، ماموں ممانی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟، (محمد رمیز، نارتھ کراچی)۔

جواب:

قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ

صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔ تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادادادی، نانانانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹابیٹی، پوتاپوتی، نواسانواسی وغیرہ) کوزکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، یہی حکم صدقۂ فطر، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے۔ خالہ، خالو، ماموں، ممانی، بہو یا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر کی اپنی بیوی کی کسی سابقہ شوہر کی اولاد (اگر صاحب نصاب نہ ہوں) کوزکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کوزکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ البتہ بہن بھائی بشرطِ استحقاق ایک دوسرے کوزکوٰۃ دے سکتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

﴿کتاب الصوم﴾

دودھ پلانے والی ماں کے لئے روزے کا حکم

سوال :64

میری بہو کی بچی کی عمر 3 ماہ ہے، پہلی بچی ہے، روزہ رکھنے سے بچی کی خوراک پوری نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی دوسرا دودھ پیتی ہے ماں کی صحت پہلے ہی کمزور ہے (100/60/80/60)BP رہتا ہے۔ رمضان المبارک کے بعد بھی روزوں کی قضا رکھنا مریضہ کے لئے مشکل ہے ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟۔ (حاجی سید محمد، مرشد آباد نیریاں شریف آزاد کشمیر)۔

جواب:

عن انس بن مالک، قال: رخّص رسول اللہ ﷺ للحبلی الّتی تخاف علی نفسها، أن تفطر وللمرضع الّتی تخاف علی ولدها۔

ترجمہ: "حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے، ایسی حاملہ عورت کو، جسے (روزہ رکھنے کی صورت میں) اپنی جان تلف ہونے کا اندیشہ ہو اور ایسی دودھ پلانے والی عورت کو کہ جسے (روزہ رکھنے کی صورت میں) اپنے بچے (کی جان) کا خوف ہو، (عذرِ شرعی کی بنا پر رمضان المبارک کا) روزہ چھوڑنے کی رخصت عطا فرمائی ہے، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:1668)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(أو حامل أو مرضع) أمّاً كانت أو ظئراً علی الظاهر (خافت بغلبة الظن علی نفسها أو ولدها)

ترجمہ: "یا حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت ہو، خواہ وہ بچے کی ماں ہو یا دودھ پلانے والی دائی، اسے اپنی یا بچے کی صحت کو نقصان پہنچنے کا غالب گمان ہو، ظاہر الروایہ کی رو سے، رمضان کا روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص:359 مطبوعہ

داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔
علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(ومنها حبل المرأة وارضاعها)الحامل والمرضع اذا خافتا على أنفسهما أو ولدهما أفطر تا وقضتا ولا كفارةعليهما كذا في الخلاصة۔

ترجمہ:''(اوران بعض معذوروں میں سے ایک حمل والی اور دوسری دودھ پلانے والی عورت ہے) حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو رمضان کا روزہ عذر کی بنا پر چھوڑنے کی رخصت ہے، جب کہ ان دونوں کو خوف ہو اپنی جان یا بچے کا تو وہ افطار کریں گی یعنی روزہ نہیں رکھیں گی اور (بعد میں) اس کی قضا کریں گی اور ان دونوں پر کفارہ نہیں ہے جیسا کہ خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:207 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

پس مرضعہ کو چاہئے کہ اگر اس وقت روزے نہیں رکھ سکتی تو بعد میں اگر صحت درست رہے تو ان کی قضا کرے اور اگر بعد کو بھی نہیں رکھ سکتی تو ان روزوں کا فدیہ ادا کرے۔
علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

بغلبة الظن بامارة او تجربة او باخبار طبيب حاذق مسلم مستور ۔

ترجمہ:''غلبۂ ظن، علامات، تجربہ یا مسلمان ماہر مستورالحال طبیب کے بتانے سے ثابت ہوگا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج3، ص:360-359، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''

اگر تندرست شخص کو روزہ رکھنے سے بیمار پڑنے کا خدشہ ہو تو ان کے لئے (رمضان میں) روزہ نہ رکھنا جائز ہے، اور جب وہ روزہ رکھنے پر قادر ہو تو اس کی لازماً قضا کریں، جو بہت عمر رسیدہ ہو یا جس کو ایسا مرض لاحق ہو جس سے شفا کی امید نہیں ہے (جیسے ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر) اور اس وجہ سے اس کو روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو اس کے لئے روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے اور اس پر ہر روزہ کے بدلے میں ایک مسکین کے طعام کا (تقریباً دو کلو گندم) فدیہ دینا لازم ہے، قرآن مجید میں ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ

ترجمہ:''اور جو لوگ روزہ کی بمشکل طاقت رکھتے ہوں، ان پر ایک مسکین کے طعام کا فدیہ

لازم ہے،(البقرۃ:184)''۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

(قوله العاجز عن الصوم)ای عجزا مستمرا کمایأتی اما لولم یقدر علیه لشدة الحر کان له ان یفطر ویقضیه فی الشتاء۔

ترجمہ:''اور جس شخص کو ایسا مرض لاحق ہو کہ جس سے شفا کی امید نہ ہو، جیسا کہ آگے آئے گا وہ (اس رخصت میں داخل ہے (اور) اگر کوئی شخص گرمی کی شدت کی وجہ سے روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو اسے گرمیوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور سردیوں میں ان کی قضا رکھ لے گا،(ردالمحتار علی الدرالمختار، ج 3،ص: 359،مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

عذر کی بنا پر روزے چھوڑنا

سوال: 65

سانس کے مریضوں کو وینٹولین کے پمپ استعمال کرنا پڑتے ہیں، ایسی صورت میں روزہ رکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟،(محمد اکبر، لیاقت آباد)۔

جواب:

اگر مریض اس اسٹیج پر ہے کہ پمپ کے استعمال کے بغیر مریض کا دن گزارنا مشکل ہے تو وہ معذور ہے، یہ آلہ استعمال کرے، روزہ چھوڑ دے، اور روزے کے بدلے میں فدیہ دے، کیونکہ اس آلے کے ذریعے ایک کیمیکل گیس یا سیال شکل میں انسان کے حلق سے اندر جاتا ہے، جس سے سکڑے ہوئے پھیپھڑے کھل جاتے ہیں اور تنفس یعنی سانس لینا آسان ہو جاتا ہے۔

غسل واجب ہو اور صبح صادق

سوال:66

ماہِ رمضان میں ایک شخص ایسے وقت بیدار ہوا کہ سحری کا وقت ختم ہونے میں

انتہائی قلیل وقت باقی ہے، اور اس پر غسلِ جنابت واجب ہے، تو ایسے میں وہ شخص کیا کرے؟ پہلے سحری کرے یا غسل؟ آیا حالتِ جنابت میں روزہ درست ہوگا یا نہیں؟۔

جواب:

قرآن مجید میں (ماہ رمضان میں) طلوع فجر تک کھانے پینے اور عملِ ازدواج کی اجازت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔

ترجمہ: ''پس اب (چاہوتو) اپنی بیویوں سے مباشرت کرو، اور طلب کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھا ہو، اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ (ممتاز ہوکر) ظاہر ہوجائے تمہارے لئے صبح کا سفید دھاگہ (رات کے) سیاہ دھاگے سے (یعنی صبح صادق شروع ہوجائے)، (البقرہ:187)''۔

جب طلوع فجر تک ازدواجی فعل میں مشغول رہنا جائز ہوا، تو حالتِ جنابت میں روزے کی نیت کرنا بھی جائز ہوگیا۔ صحیحین میں ام المؤمنین حضرت عائشہ اور ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: انّ رسول اللّٰه ﷺ كان يدركه الفجر، وهو جنب من أهله، ثم يغتسل ويصوم۔ ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ ازواج مطہرات سے قربت فرماتے اور (کبھی) حالتِ جنابت میں صبح صادق ہوجاتی، پھر آپ غسل فرماتے، اور روزہ رکھتے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1926)''۔

عن عائشة زوج النبی ﷺ قالت قد كان رسول اللّٰه ﷺ يدركه الفجر فی رمضان وهو جنب من غير حلم فيغتسل ويصوم۔

ترجمہ: ''ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ماہِ رمضان میں کبھی رسول اللہ ﷺ پر احتلام کے بغیر حالتِ جنابت میں صبح صادق آجاتی آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھتے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2486)''۔

عن عائشة رضی اللّٰه عنها انّ رجلاً جآء الی النبی ﷺ يستفتيه وهی تسمع

من ورآء الباب فقال یا رسول اللّٰہ ﷺ تدرکنی الصلوٰۃ وانا جنب فاصوم فقال رسول اللّٰہ ﷺ وانا تدرکنی الصلوٰۃ وانا جنب فاصوم فقال لست مثلنا یا رسول اللّٰہ قد غفر اللّٰہ لک ماتقدم من ذنبک وماتأخر فقال واللّٰہ انی لارجوا ان اکون اخشاکم للّٰہ واعلمکم بما اتقی۔

ترجمہ:"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک شخص مسئلہ معلوم کرنے آیا دراں حالیکہ وہ بھی دروازے کے پیچھے سے سن رہی تھیں، اس نے عرض کیا :یارسول اللہ ﷺ!(کبھی) حالتِ جنابت میں نماز فجر کا وقت آجاتا ہے، تو میں (اس وقت غسل کر کے پاک ہوتا ہوں) اور روزہ رکھتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کبھی حالت، جنابت میں مجھ پر بھی نماز فجر کا وقت آجاتا ہے، میں (غسل کر کے نماز پڑھتا ہوں) اور میں روزہ رکھ لیتا ہوں، اس نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہم آپ کی مثل کب ہیں! اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے ذنب کی قطعی مغفرت فرمادی ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: بخدا مجھے یہ یقین ہے کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خشیت رکھنے والا ہوں اور جن چیزوں سے بچنا چاہئے ان کا میں تم سب سے زیادہ عالم ہوں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2489)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن اصبح جنباً أو احتلم فی النہار لم یضرہ کذا فی محیط السرخسی۔

ترجمہ:"اور جس نے حالتِ جنابت میں صبح کی، یا دن میں احتلام ہوگیا تو یہ اس کے (روزے) کے لئے نقصان دہ نہیں، محیط سرخسی میں اسی طرح ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:200، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔ مذکورہ صورت میں چاہئے کہ پہلے اچھی طرح ہاتھ دھوکر، کلی وغیرہ کر کے سحری کرے اور بعد میں غسل کرے، پھر نماز پڑھے اور اس صورت میں اس کا روزہ درست ہوگا، لیکن لازم یہ ہے کہ غسل کرنے میں اتنی تاخیر نہ کرے کہ فرض نماز کا وقت جاتا رہے، اگر نماز قضا ہوگئی تو گنا ہگار ہوگا۔

﴿کتاب الحج﴾

فلسفہ وروحِ حج

اسلام کی کامل روح تو یہ ہے کہ بندۂ مؤمن کی زندگی مجسم عبادت بن جائے، اس کی چال ڈھال، رفتار وگفتار، نشست وبرخاست، انفرادی واجتماعی معاملات، حتیٰ کہ ہر شعبہ زندگی اور ہر لمحہ حیات میں اللہ تعالیٰ کی مکمل بندگی اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اطاعت کی جھلک نظر آئے۔ ہم نے جو زندگی کو دین اور دنیا کے نام سے دو خانوں میں تقسیم کردیا ہے اس دورنگی اور دوئی کا خاتمہ ہوجائے۔ اگر انسان زندگی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضاء اور اطاعت کے قالب میں ڈھال لے اور اس کا وجود اللہ کے بندوں کے لئے فیض رساں اور وسیلہ رحمت بن جائے تو اس کی معیشت، تجارت اور سیاست سب کچھ عبادت بن جائے گی۔ اور خوف خدا اور اخلاقی گرفت سے عاری زندگی جو انسانیت کے لئے باعث آزار بن گئی ہے، اس سے نجات مل جائے گی۔

لیکن اس عمومی اور جامع (Comprehensive) اور کامل (Perfect) تصورِ عبادت کے ساتھ اسلام نے رسمی عبادات (Rituals) کا ایک حکیمانہ اور مربوط نظام بھی عطا کیا ہے، جن کا حقیقی اور اعلیٰ مقصد بندہ مؤمن کے قلب میں اس جامع وکامل تصورِ عبادت کو ابھارنا ہے، یہ عبادات تین قسم پر مشتمل ہیں۔

(1) خالص بدنی عبادات: جیسے نماز اور روزہ، یہ بہرصورت ہر بندے کو خود ادا کرنی ہوتی ہیں اور ان میں نیابت (Assistance) کا کوئی تصور نہیں۔

(2) خالص مالی عبادت: جیسے زکوٰۃ فطرہ وغیرہ، ان میں نیابت چل جاتی ہے یعنی کوئی شخص دوسرے کا وکیل اور نمائندہ بن کی بھی ادا کرسکتا ہے۔

(3) مخلوط عبادت: یعنی جو بدنی بھی ہو اور مالی بھی، اس میں بھی اصل روح تو یہی ہے کہ بندہ خود ادا کرے لیکن اگر بربنائے معذوری ومجبوری خود نہ ادا کرسکتا ہو تو اس کی نیابت میں اس کی خواہش اور مصارف پر دوسرا قابل اعتماد آدمی بھی کرسکتا ہے، اسے ''حج بدل'' کہتے ہیں۔

حج کا معنی ومفہوم: لغت میں حج کے معنی ہیں، کسی قابلِ تعظیم چیز کا قصد کرنا، اور اصطلاحِ شریعت میں عبادت کی غرض سے بیت اللہ کے قصد کو حج کہتے ہیں، بشرطیکہ اس میں مقررہ ارکان، شرائط، فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کی ادائیگی کا پورا اہتمام کیا گیا ہو اور محرمات ومکروہات سے اجتناب کیا گیا ہو۔

حج کی اہمیت: حج کا سبب بیت اللہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیت اللہ کا حج کرنا لوگوں پر اللہ کا حق ہے، جو بھی وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، جامع ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سفر کے خرچ اور سواری پر قادر ہو، جس کے ذریعے وہ بیت اللہ تک پہنچ سکے اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے، تو عملاً اس سے کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے؟۔

امام بیہقی (Imam Baihaqi) نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص حج کے لئے زادِ راہ اور سواری کی ا ستطاعت رکھتا ہو، کوئی شدید مجبوری، معذوری، بیماری یا کوئی ظالم بادشاہ رکاوٹ نہ بنے اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس سے کیا غرض کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔

قرآن وحدیث کی یہ وعید شدید (Strong Threats of Punishment) پر شکوہ اور بے نیازانہ اندازِ تخاطب یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک حج کی اہمیت کیا ہے اور بلا عذر کسی تارکِ حج کا مقامِ اسلام کیا ہے؟ اور یہ کہ اس کا عمل یہود ونصاریٰ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے: اسلام دینِ فطرت ہے اس کی تعلیمات عقلِ سلیم (Sance) کے عین مطابق ہیں، اسلام کی کوئی بھی تعلیم عقل ودانش سے متصادم نہیں ہے، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی کوتاہ بینی، عقلِ نارسا اور فہم کی کمی کی بناء پر کسی امرِ الٰہی کی حکمت کو سمجھ نہیں پاتا لہٰذا اسے ہم ماورائے عقل (Beyond the Reach of Rationality) تو کہہ سکتے ہیں کہ خلافِ عقل (Contrary to the

(Rationality) ہرگز نہیں۔

حج ایک کیفیت اور جذب وجنون کا نام ہے: حج میں بھی انسان کو سوچ اور فکر وآگہی کے ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، انسان سوچتا ہے کہ طویل مسافتیں طے کر کے اور مشقتیں برداشت کر کے اطراف عالم کے مسلمانوں کو ایک مقام پر جمع کرنے میں آخر کیا راز پنہاں ہے؟ سب لوگوں کا اپنا روایتی لباس اتار کر دو چادریں پہنا دینے میں کیا مصلحت ہے؟، آخر اس میں کیا حکمت ہے کہ لاکھوں انسان دیوانہ وار پتھر کی ایک عمارت کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں، دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑ رہے ہیں، ایک خاص دن اور تاریخ کو ایک خاص مقام پر پورا شہر آباد ہوتا ہے اور شام کو اجڑ جاتا ہے لاکھوں لوگ پتھروں کے علامتی ستون پر کنکریاں برسا رہے ہیں، ایک خاص مقام پر ایک ہی دن لاکھوں لوگ جمع ہو کر لاکھوں جانوروں کی قربانی پیش کرتے ہیں، آخر کیوں؟۔

یہ سارے انداز یہ بتاتے ہیں کہ حج معمول کے شب وروز کا نام نہیں بلکہ معمول کی زندگی کو ترک کر کے مجاہدانہ انداز سے (Camp Life) گزارنے کا نام ہے، ایک محدود عرصے کے لئے لباس، رنگ، علاقیت، زبان اور نسب ونسل کے تمام امتیازات کو کلی طور پر ترک کر دینے کا نام ہے، یہ سب کچھ دراصل امام انبیاء، ابو الانبیاء، مرکز الملل، اولوالعزم رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اہلیہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی اداؤں کو اپنانے کا نام ہے، عالمی اسلامی اخوت، وحدت و اتحاد اور نظریاتی ہم آہنگی کے بھرپور مظاہرے کا نام ہے، اور اس عزم کے عملی اظہار کا نام ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے دین کا تقاضا ہوا تو ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹانے کا عزم رکھتے ہیں اور حج اسی عزم مصمم کے اظہار کا نام ہے، اور اگر یہ "روح حج ہمارے قلب وقالب میں صحیح معنوں میں اتر گئی تو ہم نے مقصد حیات پا لیا، ورنہ محض مشقت سفر کے سوا اور حکم الٰہی کی ظاہری تعمیل کے سوا ہمارے ہاتھ کچھ نہ آیا۔۔۔ایک دفعہ ایک حاجی، حج کر کے واپسی پر اللہ کے ایک محبوب ومقرب ولی سے ملنے

چلا گیا۔ اللہ کے اس ولی نے اس سے سفرِ حج کی تفصیلات پوچھیں تو اس نے ایک ایک کر کے مناسک حج بیان کرنے شروع کئے، اللہ کے ولی نے کہا کہ دوست یہ بتاؤ کہ جب پورے جذبے اور جوش و خروش کے ساتھ تم شیطان کو کنکریاں مار رہے تھے، تو کیا تم نے اس شیطان کو بھی سنگسار کیا تھا جو ''نفس امارہ'' کی شکل میں تمہارے وجود کے اندر آسن جمائے بیٹھا ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں ایسا تو نہیں ہوا۔ انہوں نے پوچھا کہ ''جب تم قربانی کے جانور کے گلے پر چھری چلا رہے تھے تو اس مرحلے پر کبھی تم نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح، میرے خالق و مالک کو میری جان کا نذرانہ بھی مطلوب ہوا تو میں اپنی جان و مال کی ہر قربانی دینِ اسلام کے لئے پیش کر دوں گا؟ اس نے کہا: ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا''، تو یہ سن کر اللہ کے نیک بندے نے کہا: ''پھر دوبارہ حج کرو تم نے در حقیقت حج کیا ہی نہیں۔ تو حج دراصل اس کیفیت عشق اور اللہ کی راہ میں اس وارفتگی اور جذب و جنوں کا نام ہے، جس کی روایت حضرت ابرہیم و اسماعیل علیہما السلام نے ڈالی ہے۔

کعبہ معبود نہیں، جہت عبادت ہے: جب ہم عین بیت اللہ کی چوکھٹ کے سامنے سجدہ کر رہے ہوں تب بھی بیت اللہ ہمارا مسجود و معبود نہیں ہوتا، مسجود و معبود تو صرف اور صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے، بیت اللہ تو صرف ''جہت سجدہ'' ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے غالباً اس میں حکمت یہ مستور رکھی ہے کہ کعبے کو اپنے انوار و تجلیات کا مرکز و مہبط (Focusing Point) بنا کر ہمیں اس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے اور اس کے گرد طواف کرنے کا حکم دیا تاکہ ہم پر کعبہ کی برکات کے طفیل اس کی رحمتوں، برکتوں اور انوار و تجلیات کا نزول ہو، دوسری حکمت یہ ہے کہ ہماری عبادت کے لئے مرکزیت، ایک نقطۂ ارتکاز توجہ (Point of concentration) ہو تاکہ ہم مختلف سمتوں کی جانب بھٹکنے سے محفوظ رہیں، اطراف عالم کے مسلمانوں میں ایک مثالی وحدت اور یک رنگی پیدا ہو جائے، چنانچہ رسول ﷺ نے اسی قبلے کو مومن کی شناخت اور پہچان کا وسیلہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، ہمارے قبلے کی جانب عبادت میں رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ ظاہری

علامات کے اعتبار سے مسلم ہے''۔
حج زندگی میں تبدیلی کا فیصلہ کن موڑ اور نقطہ آغاز: اسلام یہ چاہتا ہے کہ حج مومن کی زندگی میں تبدیلی لائے بلکہ چاہئے کہ یہ ایک فیصلہ کن موڑ (Turning Point) بن جائے، گناہوں کو ترک کر کے پاکیزہ زندگی گزارنے کا نقطہ آغاز ہو، بندہ اپنے رب سے شعوری طور پر ایک عہدو پیمان اور تجدید وفا کا عزم کر کے، صرف سلا ہوا لباس ہی نہ اتارے بلکہ وہ لباس معصیت جس میں سرتاپا جکڑا ہوا ہے اسے بھی اتار پھینکے، صرف دو سفید چادروں پر مشتمل اجلا لباس ہی نہ پہنے بلکہ ایمان وایقان اور کردار کو بھی اتنا ہی مُصفّٰی، مزکی اور مُنوّر بنادے، جس طرح اس نے وہ لباس پہنا ہے جو فطرت سے قریب تر، زیب وزینت اور بناؤ سنگھار کے تکلفات سے آزاد ہے، خود اپنے آپ، اپنی روح اور جسم کو بھی اسی فطرت سلیم کے سانچے میں ڈھال لے، جس پر خالق نے اسے پہلے روز تخلیق فرمایا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی (Adgerent of Mazdaism) بنادیتے ہیں''۔ یعنی حج کا لباس بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو گناہوں کی ان آلودگیوں سے دور کر کے جو معاشرے نے اس پر تھوپ دی ہیں اور فطرت سے قریب تر بلکہ عین مطابق ہو جائے اسی حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا: ''جس نے خالص اللہ کی رضا کے لئے حج کیا اور اس کے دوران نہ تو شہوت رانی (Abscentity) کی اور نہ ہی گناہ کیا تو وہ گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو کر لوٹے گا جیسے اپنی پیدائش کے دن گناہوں سے پاک تھا''۔ ایسے ہی کامل ومکمل حج کو رسول اللہ ﷺ نے حج مبرور (Accept into the Grace of Allah) قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''حج مبرور کی جزا جنت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی''۔ اور اگر ہم نے حج سے یہ مقصد حاصل نہ کیا تو گویا ہم نے حج کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں، ایسی بے رخ عبادات صرف صورتاً عبادات ہوتی ہیں، حقیقتاً نہیں جیسا کہ فرمان رسول ﷺ ہے: ''بہت سے روزے دار ایسے ہیں، جنہیں ان کے روزوں سے بھوک

کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے قائم اللیل (راتوں کو اٹھ کر عبادت کرنے والے) ایسے ہیں، جنہیں اپنی عبادتوں سے بیداری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا"۔

حج بنیادی طور پر مشقت کی عبادت ہے: حج بنیادی طور پر مشقت وکلفت (Hardship) کی عبادت ہے، حج کی یہ کیفیت آج سے ہزار سال پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے، ماضی میں سفر کی صعوبتیں، زادراہ کی دشواریاں، موسم کی ناگواریاں، سنگریزوں، نوکیلے پتھروں اور کانٹوں پر چلنا، پانی کی عدم دستیابی، وسائل کی کمی وغیرہ، آج مادی لحاظ سے تصورات و توقعات سے زیادہ راحتیں، آسائشیں بلکہ تعیشات موجود ہیں، لیکن مشقت کی روح آج بھی موجود ہے اس مشقت کا سب سے بڑا سبب انسانوں کا ہجوم، انسان کا آسائشوں اور تعیشات کا دلدادہ ہونا، محنت ومشقت کا عادی نہ ہونا، جذبہ ایثار وقربانی کا فقدان، صرف اپنی ذات اور اپنے مفادات کا اسیر ہونا وغیرہ، چنانچہ آج طواف، سعی اور رمی جمرات اور منٰی میں حادثات پہلے سے بدرجہا زائد ہوتے ہیں۔ حاجی جب حج سے واپس آتا ہے تو اس کے تجربات میں طرح طرح کے شکوہ، شکایات، معلمین کے ناروا سلوک کی حکایات اور اپنی اور سعودی حکومت کے عمال کی بدسلوکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا یہ طرز فکر وعمل اس لئے ہے کہ ہم ذہنی طور پر اس عمل کے لئے تیار ہو کر نہیں جاتے کہ ہم ایک سپاہی کی طرح "کیمپ لائف" میں جارہے ہیں ہمیں ایک بڑی مشقت کے عمل سے گزرنا ہے۔ راحت وآرام اور تعیش ہمارا مقصود ومطلوب نہیں ہے اگر ہم ایسی سوچ لے کر جائیں تو پھر ہر بڑی تکلیف ہمیں چھوٹی نظر آئے، اور ہمیں یہ احساس ہو کہ اتنا بڑا اجر اسی تکلیف ومشقت کا صلہ وانعام ہے۔ پھر ہم معلم وغیرہ کی شکایات پر وقت صرف کرنے کے بجائے زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکر وفکر میں گزاریں گے، اور کلفت کو اجر کا وسیلہ سمجھ کر اسے دل سے قبول کریں گے۔

قرعہ اندازی اسکیم پر حج

سوال:67

عرض یہ ہے کہ سوئی سدرن گیس کمپنی کے افسران اپنی مرضی سے ہر ماہ ایک مقررہ

رقم حج کنٹری بیوشن کے نام پر اپنی تنخواہ سے کٹواتے ہیں۔ ہر سال حج کی قرعہ اندازی ہوتی ہے، اور جس خوش نصیب کا نام قرعہ میں نکل آئے، اسے حج فنڈ سے حج پر بھیجا جاتا ہے۔ اس مرتبہ ایک ایسے افسر کا نام نکل آیا ہے، جو قادیانی ہے اور ہر ماہ ایک مقررہ رقم حج کنٹری بیوشن کے لئے اس کی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے (اور اس بارے میں ہمیں پہلے علم نہ تھا)۔ اس بارے میں شریعت اور قانون کیا کہتا ہے؟ کیا اس شخص کو حج کے لئے بھیج سکتے ہیں؟۔
کیا سعودی یا پاکستانی حکومت کی طرف سے ان کے حج کرنے پر کوئی قانونی پابندی ہے؟۔
کیا اس شخص کی رقم حج فنڈ میں شامل کی جاسکتی ہے۔ برائے مہربانی مسئلے کے حل کے جانب رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، (اشفاق احمد، سوئی سدرن گیس کمپنی لمیٹڈ، گلشن اقبال روڈ، کراچی)۔

جواب:

اگر یہ کنٹری بیوشن سب شرکاء کی طرف سے رضا کارانہ ہے، کسی افسر کے دباؤ یا کسی اور سبب سے نہیں ہے۔ اور سب شرکاء کی اجازت ہے کہ ان کی جمع شدہ رقم سے جس ترتیب سے قرعہ اندازی میں لوگوں کا نام نکلتا ہے، انہیں حج پر بھیج دیا جائے، تو کوئی حرج نہیں اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، ایسے امور، جن میں تمام شرکاء کا استحقاق برابر ہو، کا فیصلہ از روئے قرآن وحدیث قرعہ اندازی سے ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ

ترجمہ: ”اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ (قرعہ اندازی کے لئے) اپنے قلموں کو ڈالتے تھے کہ مریم کی کفالت ان میں سے کون کرے، (آل عمران: 44)“۔
البتہ قادیانی کو اس اسکیم میں شامل کرنا درست نہیں ہے، اگر ایسا کوئی شخص ہے تو اسے اسکیم سے الگ کردیا جائے اور اس کی رقم اسے واپس کردی جائے، کیونکہ قادیانی پاکستان میں آئینی طور پر اور شرعاً باجماع امت مرتد ہیں۔ وہ اگر سچ بول کر اپنے آپ کو غیر مسلم اور قادیانی لکھیں تو انہیں حج یا عمرے کا ویزا ہی نہیں مل سکتا، کیونکہ یہ سب مسلمانوں کے لئے

ہے، اور اگر وہ کتمانِ حق کر کے، دھوکہ دہی اور فریب سے پاسپورٹ اور حج کی درخواست فارم میں اپنے آپ کو مسلم لکھیں تو یہ کذب صریح اور دھوکہ دہی ہے۔ حج فارم، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ فارم سمیت تمام دستاویزات میں مسلمان کیلئے ختم نبوت کا اقرار اور قادیانی ولاہوری گروپ سے براءت کا حلفیہ اقرار نامہ لازمی ہے اور قادیانی اگر اپنے غیر مسلم ہونے کا اقرار کر کے پاسپورٹ بنائے، حج فارم بھرے، شناختی کارڈ فارم بھرے تو وہ شرعاً وقانوناً کسی بھی طریقے سے حج پر نہیں جاسکتا ہے اور اگر جھوٹا مسلم ہونے کا حلف نامہ بھرتا ہے تو صریح دغاباز ہے۔

اسقاطِ فرض کے لئے حجِ بدل سے متعلق ایک اہم مسئلہ

سوال:68

ایک شخص دوسرے کی طرف سے حج کرتا ہو، کیا وہ صرف حج افراد کا احرام باندھے گا یا کہ حج تمتع اور قران بھی کرسکتا ہے؟، حج اور عمرہ کے موضوع پر ایک کتاب ہے، جس کا نام ہے: "بیان مناسکِ حج وعمرہ"، اس کے صفحہ نمبر 39 پر لکھا ہوا ہے: "جو حضرات حجِ بدل کے لئے جارہے ہیں، وہ صرف حج افراد کا احرام باندھیں، دوسرا احرام نہ باندھیں، (یاسر رحمان، نکیال آزاد کشمیر)۔

جواب:

حجِ بدل کی منجملہ شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ حج کرنے والا، جس کی طرف سے حج کر رہا ہے، اگر اس نے صرف حج افراد کرنے کا کہا ہے، تو اس پر ضروری ہے کہ وہ حج قران یا تمتع کا احرام نہ باندھے، اگر باندھے گا، تو بھیجنے والے کا حج ادا نہ ہوگا۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

الرابع عشر: عدم المخالفة فلو أمره بالافراد فقرن أو تمتع ولو للميت لم يقع عنه ويضمن النفقة۔

ترجمہ: "حجِ بدل کی چودھویں شرط یہ ہے کہ جو شخص حجِ بدل پر مامور ہے، وہ اپنے آمر یعنی بھیجنے

والے کے حکم کی مخالفت نہ کرے، اگر اس نے اسے حج اِفراد کا حکم دیا ہے اور حجِ بدل پر مامور شخص نے "حجِ قِران" کیا یا "حجِ تمتُّع" کیا، خواہ وہ میت کی جانب سے ہو، تو وہ حج بھیجنے والے کی طرف سے واقع نہیں ہوگا، اور وہ حجِ بدل کرنے والا اس حج کے اخراجات کا خود ضامن ہوگا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:4،ص:18، داراحیاءالتراث العربی، بیروت)"

البتہ اگر ایک شخص نے کسی کو اپنی طرف سے عمرہ کرنے کے لئے بھیجا یا حج کے لئے بھیجا اور اس نے بھیجنے والے کی طرف سے پہلے عمرہ کر کے پھر اپنی طرف سے حج کیا یا بھیجنے والے کی طرف سے حج کرنے کے بعد پھر اپنی طرف سے عمرہ کیا، تو یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، جیسا کہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

ولو أمره بالعمرة فاعتمرثم حج عن نفسه اوباالحج فحج ثم اعتمر عن نفسه جاز الخ۔۔۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:4،ص:18، داراحیاءالتراث العربی، بیروت)"

لہٰذا اگر بھیجنے والا خود اجازت دے کہ میری طرف سے "حجِ تمتُّع" کرو یا "حجِ قِران" کرو تو پھر وہ مامور شخص اس کے حکم کی تعمیل میں حجِ تمتُّع یا حجِ قِران کر سکتا ہے، اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

حجِ قِران میں جنایت پر صورت مسئلہ کے مطابق ایک دم یا ایک صدقہ لازم آئے گا یا دو دو

سوال:69

کیا قارِن یعنی جو شخص اپنے میقات سے بیک وقت حج اور عمرے کا احرام باندھتا ہے اور پھر وہ احرام کے اندر رہتے ہوئے کسی ایسی جنایت کا ارتکاب کرتا ہے، جس سے دم لازم آتا ہے، تو کیا اس پر دو احرام کی وجہ سے دو دم لازم آئیں گے یا ایک ہی دم کافی ہوگا؟، اسی طرح ان امور میں جہاں بُدنہ یا صدقہ لازم آتا ہے، ایک ہی بُدنہ یا صدقہ کافی ہوگا یا دو دو لازم آئیں گے؟، (پروفیسر رضی الدین، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویجب دمان علی قارن حلق قبل ذبحہ) دم للقران ودم للتا خیرعلی "المذھب" کما حررہ المصنّف قال: وبہ اندفع ما تَوھّمہٗ بعضھم من جعل الدّمین للجنایۃ۔

ترجمہ: ''حج قِران کا احرام باندھنے والے نے اگر قربانی سے پہلے حلق کرلیا (یعنی بال منڈھا دیئے)، تو اس پر مذہب صحیح کے مطابق دودَم لازم آئیں گے، ایک دمِ قِران اور ایک ذبح کو حلق سے مؤخر کرنے کے باعث دم لازم آئے گا، جیسا کہ مصنف (علامہ تمرتاشی) نے لکھا ہے، انہوں نے فرمایا: اور اس سے بعض لوگوں کا یہ وہم دور ہوگیا، جنہوں نے دونوں دَم جنایت کے باعث لازم قرار دیئے ہیں''۔

اس کی تشریح میں کلام کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وعن الثانی بأن التضاعف علی القارن انما یکون فیما اذا ادخل نقصا فی احرام عمرتہ، والا فلا یجب الا دم واحد، ولھذا اذا افاض القارن قبل الامام اوطاف للزیارۃ جنبا اومحدثا لایلزمہ الا دم واحد لانہ لاتعلق للعمرۃ بالوقوف وطواف الزیارۃ۔

'' قارن پر دودم تب لازم آتے ہیں، جب اس کے عمرے کے احرام میں نقص لازم آیا ہو، ورنہ (عمرے کے بعد قارن پر بھی) صرف ایک ہی دم لازم آئے گا، لہٰذا جب قارن نے امام سے پہلے طواف افاضہ کیا یا بے وضو یا حالتِ جنابت میں طواف زیارت کیا، تو اس پر صرف ایک دم لازم آئے گا، کیونکہ عمرہ کا وقوف عرفہ اور طواف زیارت سے کوئی تعلق نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد3، ص:521، باب الجنایات، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

مسئلہ:''جہاں ایک دم یا صدقہ ہے قارن پر دو ہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10،ص:762، مطبوعہ رضافاؤنڈیشن، لاہور)''۔

''جہاں ایک دم یا صدقہ ہے، قارن پر دو ہیں، (عامۂ کتب)، (بہارِ شریعت، جلد ششم، ص:499 مکتبۂ رضویہ)''۔

علامہ شامی نے البحرالرائق کے حوالے سے جو تفصیلی بحث کی ہے، اس کی روشنی میں قارن نے اگر عمرے کی ادائیگی کے دوران یا اس سے پہلے کسی جنایت کا ارتکاب کیا ہو تو اس پر صورتِ مسئلہ کی نوعیت کے مطابق دو دم یا دو صدقے لازم آئیں گے، اور اگر عمرے کی ادائیگی کے بعد اس نے جنایت کا ارتکاب کیا ہو تو صرف ایک دم یا ایک صدقہ لازم آئے گا، جہاں تک دمِ قِران کا تعلق ہے، وہ اپنی جگہ ہے، اعلیٰحضرت اور صدرالشریعہ رحمہما اللہ تعالیٰ کی عبارات سے اگرچہ بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ قارن پر علی الاطلاق دو دم یا دو صدقے لازم آئیں گے، خواہ جنایت کا ارتکاب عمرے سے پہلے کیا ہو یا بعد میں، لیکن علامہ شامی کی مذکورہ وضاحت کی روشنی میں ان دونوں اکابر کے اقوال کو مطلق نہ سمجھا جائے بلکہ اس پر محمول کیا جائے کہ اگر جنایت کا ارتکاب عمرے کی ادائیگی سے پہلے یا عمرے کی ادائیگی کے دوران کیا ہو تو دو دم یا دو صدقے لازم آئیں گے، اور عمرے کی ادائیگی کے بعد ایک ہی دم یا ایک ہی صدقہ کافی ہوگا۔

دم کی ادائیگی حدودِ حرم میں

سوال:70

ہم لوگ ابھی عمرہ کر کے آئے ہیں، وہاں میرے شوہر نے عمرہ مکمل کرنے سے پہلے احرام اتار دیا تھا۔ وہ فالج کے مریض ہیں، کچھ رہائش کا مسئلہ ہو گیا تھا، اس لئے ہم انہیں فوراً سعی نہیں کرواسکے، انہوں نے گرمی کی وجہ سے احرام اتار دیا تھا، دوسرے دن دوبارہ مسجد عائشہ سے احرام باندھ کر دوبارہ عمرہ مکمل کروایا، اب ہمیں اس کا کتنا دم دینا ہوگا، اور یہ دم حدودِ حرم ہی میں دینا ہوگا یا یہاں بھی ادا ہو سکتا ہے، (ہدایت اللہ، النور سوسائٹی، کراچی)

جواب:

عمرے کی ادائیگی میں سعی کرنا واجب ہے اور واجب کے ترک پر دم دینا واجب ہو جاتا ہے اور دم میں ایک بکری یا بھیڑ دی جائے گی۔

جنایت کا دم زمین حرم پر دینا ضروری ہے، دوسری جگہ ادا نہیں ہوگا۔ اور اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، جب چاہے دے سکتا ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی متوفی ۱۰۸۸ھ نے الدر المختار میں لکھا:

ویتعین یوم النحر ای وقته وهو الایام الثلاثةلذبح المتعة و القران فقط فلم یجز قبله بل بعده وعلیه دم ویتعین الحرم لا منیٰ للکل۔

یعنی (قربانی کے لئے) متعین ہے یوم نحر اور اس کے لئے وقت صرف تین دن ہیں، واسطے تمتع اور قرآن والے کی قربانی کے۔ پس اس سے پہلے اور بعد جائز نہیں اور اگر کسی نے اس کے خلاف کیا تو اس پر ''دم'' ہے۔ اور دم زمین حرم میں کسی جگہ بھی دیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے ''منیٰ'' مخصوص نہیں۔

درمختار کی درج بالا عبارت کے لفظ ''فقط'' پر علامہ شامی نے لکھا: لا یتعین غیرهما فیها۔

ترجمہ: ''ان دونوں (متمتع و قارن) کے علاوہ ان اوقات میں ذبح کرنا ضروری نہیں ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 36-35 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

احرام کی حالت میں دانت سے خون آنا یا بواسیر کا خون اور اس کا حکم

سوال:71

احرام کی حالت میں دانت سے اور بواسیر کے مستے سے خون آنے پر کیا دم دینا پڑتا ہے یا نہیں؟۔

2۔ حج کی ادائیگی کے بعد خاندان اور برادری کے افراد کو مدعو کر کے انہیں کھانا کھلایا جاتا ہے کیا حج کا یہ کھانا کھلانا ضروری ہے؟۔

3۔ حج کے دن والد اور والدہ نے کمزور ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے فرد کو رقم دے کر یہ

فریضہ ادا کیا یہ صحیح یا اس پر دم دینا پڑے گا؟۔
4۔والدہ صاحبہ نے حج کے دن قربانی کی ادائیگی کے بعد اپنے بالوں کی ایک پور کاٹی تھی اور احرام کھول دیا ان پر کم بال کاٹنے پر دم ہوگا یا نہیں؟۔(سید محمد علی D/3 نارتھ، کراچی)۔

جواب:

احرام کی حالت میں خون نکلنے سے دم واجب نہیں ہوتا، منہ یا دانتوں سے خون نکلا اگر تھوک پر غالب ہے تو وضو ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں، غلبے کی شناخت یہ ہے کہ اگر تھوک کا رنگ سرخ ہو جائے تو خون غالب سمجھا جائے اور اگر زرد ہو تو مغلوب۔خون، پیپ یا زرد پانی جسم کے کسی بھی حصے سے نکل کر بہا اور بہنے میں ایسی جگہ پہنچنے کی صلاحیت تھی جس کا وضو یا غسل میں دھونا فرض ہے تو وضو جاتا رہا، مگر صرف چمکا یا ابھرا اور بہنے کی صلاحیت اس میں نہیں تو وضو نہیں ٹوٹے گا، اسی طرح مسواک یا انگلی سے دانت صاف کرتے ہوئے یا دانتوں سے کوئی چیز کاٹی اور اس پر خون کا اثر پایا گیا یا ناک میں انگلی ڈالی اور اس پر خون کی سرخی آگئی مگر وہ بہنے کے قابل نہیں تو وضو نہیں ٹوٹا، ان تمام صورتوں کے باوجود محرم پر احرام کی حالت میں خون آنے پر کوئی دم واجب نہیں ہوگا۔

2۔حاجی صاحبان کا خاندان اور برادری کے افراد کو مدعو کر کے کھانا کھلانا شرعاً ضروری نہیں ہے، اگر کوئی شخص حج کے بعد تشکرِ نعمت کے طور پر احباب کی دعوت کرتا ہے تو اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نہیں ہے بلکہ عنداللہ اجر پائے گا، اگر محض نمود و نمائش مقصود ہے، تو اجر آخرت سے محروم رہے گا، بہتر یہ ہے کہ دعوتوں میں امراء کے ساتھ نادار لوگوں کو بھی شریک کیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ولیمہ کے بارے میں فرمان ہے: عن ابی هريرة رضی اللّٰہعنه انه كان يقول :شر الطعام طعام الوليمة ،يد عى لهاالا غنيا ء ويترک الفقر اء ،ومن ترک الد عوة فقد عصى الله تعالىٰ ورسوله ﷺ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ بُرا کھانا ولیمہ کا کھانا ہے جس میں مالدار لوگ بلائے جاتے ہیں اور فقراء چھوڑ دیئے جاتے ہیں

اور جس نے دعوت کو ترک (یعنی بلاسبب انکار کر دیا) اس نے اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5177)''۔

3۔رمی میں نائب مقرر نہیں کر سکتے ضعف اور کمزوری اس کے لئے مانع نہیں، لہٰذا بوڑھے اور عورتیں آخری وقت میں جائیں رات میں رمی کرنا اگرچہ مکروہ ہے مگر عذر کی وجہ سے یہ کراہت باقی نہیں رہتی، رمی کسی وجہ سے نہ کر سکے تو دم دینا واجب ہے مگر ایک دن کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم اور صرف ایک جمرہ کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم اور تینوں دنوں کی رمی ترک ہونے سے بھی ایک دم لازم آئے گا، لہٰذا جب اگر ایسا عذر ہو جس کی وجہ سے رمی نہیں کر سکتا تو تیسرے دن دم دے گا اور یہ دم حدودِ حرم میں دینا ضروری ہے۔

4۔عورتیں اپنے بالوں میں سے ایک پور کے برابر بال لے کر کاٹ دیں، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: والتقصیر ان یا خذ الر جل والمر أة من رؤس الشعر ربع الر أس مقدار الانملہ کذا فی التبیین۔

ترجمہ: ''اور تقصیر یہ ہے کہ مرد اور عورت اپنے سر کے بال چوتھائی سر سے ایک پور کے برابر لے لیں ''تبیین'' میں اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 231 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

دورانِ حج ناپاکی

سوال: 72

اگر کسی عورت کو دورانِ حج حیض آجائے تو اس کیلئے کیا حکم ہے؟ (عادل، پشاور)

جواب:

اگر خاتون نے حج کا احرام باندھ لیا ہے، تو وہ مُحرِمہ ہے، یعنی احرام میں داخل ہو چکی ہے۔اب اگر دوران حج اسے حیض آجائے، تو وہ تمام مناسکِ حج معمول کے مطابق جاری رکھے گی، یعنی وقوفِ منیٰ، وقوفِ عرفات، وقوفِ مزدلفہ، رمیِ جمار (یعنی شیطانوں کو کنکریاں مارنا)، قربانی اور احرام سے باہر آنے کا عمل دیگر حجاج کرام کے ساتھ جاری رکھے

گی۔اس دوران وہ دعائیں کرسکتی ہے،مگر تلاوت نہیں کرسکتی اور نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔اسی طرح حیض سے فراغت تک طواف زیارت کو مؤخر کرے گی،حرم میں بھی نہیں جائے گی۔ اور چونکہ ''طوافِ زیارت'' میں تاخیر اس کی اپنی کسی بشری کوتاہی کی وجہ سے نہیں ہوئی، بلکہ یہ مانع یا ''عذرِ تاخیر'' اسے اللہ کی جانب سے پیش آیا ہے،اس لئے اس تاخیر کی بنا پر اس پر کوئی دم واجب نہیں ہوگا،لہٰذا جب وہ حیض سے پاک ہوجائے تو غسل کرکے پاک ہوجائے اور ''طوافِ زیارت'' کرلے۔

حج وعمرہ کے مسائل

حج وعمرہ اورزیارتِ روضہ ءرسول ﷺ کے متعلق چند اشکالات کے جواب قرآن وسنت وفقہ حنفی کی روشنی میں عطا فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ جزاک اللہ،(سید محمد طاہر الحسن،مکان نمبر R-48 11-C-3 نارتھ کراچی)۔

سوال:73

حرم کے رہنے والے عمرے کے لئے احرام کہاں سے باندھیں؟۔

جواب:

حدثنا همام وقال : اعتمر أربع عمر فی ذی القعدة ،الاّ الّتی أعتمر مع حجّته: عمرته من الحديبية ،ومن العام المقبل ،ومن الجعرانة حيث قسم غنائم حنين،وعمرة مع حجته۔

ترجمہ:''ہمام سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے چار عمرے کیے،سارے ذی القعدہ میں سوائے اس ایک کے جو اپنے حج کے ساتھ کیا۔ایک عمرہ حدیبیہ والا،ایک اگلے سال تیسرا جعرانہ سے جبکہ حنین کا مالِ غنیمت تقسیم کیا اور چوتھا عمرہ اپنے حج کے ساتھ،(صحیح بخاری رقم الحدیث: 1780)''۔

انّ عبدالرحمن بن ابی بکر رضی الله عنهما أخبره: أنّ النبی ﷺ امره أن يردف عائشة ويعمرها من التنعيم۔

ترجمہ: ''عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ عائشہ کو سواری کے پیچھے بٹھا کر تنعیم سے عمرہ کروالاؤ، (صحیح بخاری رقم الحدیث:1784)''۔

ردالمحتار میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں :(والتنعیم افضله) هوموضع قریب من مکة عند مسجد عائشه ، وهو اقرب موضع من الحل ای الاحرام منه للعمرة افضل من الاحرام لها من الجعرانة وغیرها من الحل عندنا، وان کان ﷺ احرم منها، لأمره علیه الصلاة والسلام عبدالرحمن بان یذهب باخته عائشة الی التنعیم لتحرم منه۔

ترجمہ: '' (تنعیم سے احرام باندھنا افضل ہے) یہ وہ جگہ ہے، جو مکہ سے انتہائی قریب مسجد عائشہ کے نزدیک ہے اور حِل سے قریب ترین جگہ ہے۔ یعنی عمرہ کے لئے تنعیم سے احرام باندھنا جعرانہ اور حِل کے دیگر مقامات سے ہمارے نزدیک افضل ہے، اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے جعرانہ سے بھی احرام باندھا ہے اور ہمارے اس موقف پر حجت نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث ہے کہ آپ نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو حکم دیا کہ وہ اپنی بہن (ام المؤمنین) عائشہ کو تنعیم لے جائیں تاکہ وہ وہاں احرام باندھیں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد3 ص:429 مطبوعہ [illegible] احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں اگرچہ مسجدِ عائشہ (تنعیم) اور جعرانہ دونوں جگہ سے عمرے کا احرام باندھا جاسکتا ہے، لیکن مقامِ تنعیم (مسجد عائشہ) سے باندھنا افضل ہے۔

سوال:74

کیا احرام کے لئے دو رکعت نفل ادا کرنا حدیث مبارک سے ثابت نہیں؟۔

جواب:

احرام کے لئے دو رکعت نفل پڑھنا سنت ہے اور حدیثِ مبارک سے ثابت ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

حدثنی خصیف بن عبدالرحمن الجزری، عن سعید بن جبیر، قال:قلت

لعبدالله بن عباس :ياأبا العباس،عجبت لاختلاف أصحاب رسول الله ﷺ في اهلال رسول الله ﷺ حين أوجب؟! فقال اني لأعلم الناس بذالک،انها انما كانت من رسول الله ﷺ حجة واحدة،فمن هناک اختلفوا۔خرج رسول الله ﷺحاجاً،فلماصلى في مسجده بذي الحليفة ركعتين أوجب في مجلسه،فأهلّ بالحج حين فرغ من ركعتين،فسمع ذالک منه اقوام فحفظته عنه،ثم ركب فلما استقلّت به ناقته أهلّ،وأدرک ذالک منه أقوام، وذالک أن الناس انما كانوا يأتون أرسالاً،فسمعوه حين استقلّت به ناقته يهلّ،فقالوا:انما أهلّ [رسول الله]حين استقلّت به ناقته،ثم مضى رسول الله ﷺفلماعلا على شرف البيداء أهلّ،وادرک ذالک منه أقوام فقالوا: انماأهلّ حين علا شرف البيداء۔[قال سعيد:] وايم الله لقد أوجب في مصلاه، وأهلّ حين استقلّت به ناقته، وأهلّ حين علا شرف البيداء۔ [قال سعيد:] فمن أخذ يقول عبدالله بن عباس أهلّ في مصلاّه اذا فرغ من ركعتين۔

ترجمہ:''خصیف بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ: ابوالعباس مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کا اس بات میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کس جگہ سے احرام باندھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اس مسئلے کو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی حج کیا ہے اور اسی وجہ سے اختلاف ہوا۔ جب رسول اللہ ﷺ حج کے لئے تشریف لے گئے تو آپ نے مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھی اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسی مجلس میں آپ نے تلبیہ کہہ کر احرام باندھ لیا اور کچھ لوگوں نے آپ سے یہ تلبیہ سنا اور اس کو یاد رکھا، پھر آپ اونٹنی پر سوار ہوئے، جب آپ اونٹنی پر صحیح طریقے سے بیٹھ گئے، تو آپ نے تلبیہ کہا اور کچھ لوگوں نے اس موقع پر آپ سے سنا، اور اس (اختلاف یا غلط فہمی) کا سبب یہ ہے کہ لوگ گروہ در گروہ آرہے تھے، اور (کچھ لوگوں نے)

اس وقت آپ سے تلبیہ سنا، جب آپ اونٹنی پر بیٹھ گئے تو انہوں نے (اپنے مشاہدے کے بنا پر) یہ کہا: رسول اللہ ﷺ جب اونٹنی پر بیٹھ گئے، تو آپ نے اس وقت تلبیہ پڑھی (یعنی احرام باندھا)، پھر جب آپ شرف البیداء پر پہنچے تو آپ نے تلبیہ پڑھی، اور کچھ لوگوں نے (پہلی بار) آپ سے اسی موقع پر تلبیہ سنی، تو انہوں نے یہ کہا کہ آپ نے شرف البیداء پر احرام کی نیت کی ہے اور (سعید نے کہا:) اللہ کی قسم آپ نے احرام کی نیت اس جگہ کی تھی جہاں آپ نے (دو رکعت) نماز پڑھی تھی اور پھر آپ نے اونٹنی پر سوار ہو کر بھی تلبیہ پڑھی اور شرف البیداء پر پہنچ کر بھی تلبیہ پڑھی۔ (سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ) جو شخص حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر عمل کرتا ہے وہ مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد احرام باندھے (اور تلبیہ پڑھے)، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 1768)''، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وصلّی ندباً)بعد ذالک (شفعاً)یعنی رکعتین فی غیر وقت مکروہ وتجزیہ المکتوبۃ۔

ترجمہ: اور لباسِ احرام پہننے کے بعد نماز پڑھنا مستحب ہے یعنی دو رکعت وقتِ غیر مکروہ میں، اور (اگر وہ فرض کا وقت ہے تو) فرض بھی اس مقصد کے لئے کافی ہے۔

علامہ شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

(ندبا)وفی الغایۃ انھا سنۃ ۔"نھر"۔وبہ جزم فی "البحر"و"السراج"۔قولہ:(بعد ذالک)ای بعد اللبس والتطیب ۔"بحر"قولہ:(یعنی رکعتین)یشیر الی ان الاولی التعبیر بھماکمافعل فی "الکنز"۔لان الشفع یشمل الاربع۔ قولہ: "وتجزیہ المکتوبہ" کذا فی "الزیلعی" و"الفتح" و"النھر" و "اللباب" وغیرھا وشبھوھا بتحیۃ المسجد۔۔ وفی"شرح اللباب" انہ قیاس مع الفارق لان صلاۃ الاحرام سنۃ مستقلۃ کصلاۃ الاستخارۃ وغیرھامما لا تنوب الفریضۃ منابھا، بخلاف تحیۃ المسجد وشکر الوضوء، فانہ لیس لھما صلاۃ علی حدۃ کما

حققه فی "فتاوی الحجة" ۔فتتأدی فی ضمن غیرھا ایضاً اه۔

ترجمہ: "(بطورنفل پڑھے) اور"الغایۃ" میں ہے کہ (بوقت احرام) دورکعت پڑھنا سنت ہے،اور"البحرالرائق" اور"السراج" میں اسی قول کوقطعی قراردیا ہے،علامہ حصکفی کے قول: (اس کے بعد) کا مطلب یہ ہے کہ لباسِ احرام پہننے اورخوشبو لگانے کے بعد، "البحرالرائق" میں ہے کہ علامہ حصکفی کے قول (یعنی دورکعت پڑھے) سے مراد یہ ہے کہ نمازِاحرام کوکم ازکم دورکعت سے تعبیرکرنا اولیٰ (بہتر) ہے،جیسا کہ "کنزالدقائق" میں کیا ہے،کیونکہ دورکعت چارکوبھی شامل ہے(یعنی اگراس وقت چار رکعات پڑھ لیں) توان کے ضمن میں دورکعات بطریقِ اولیٰ آجائیں گی (اورچاریازیادہ سے ممانعت مقصودنہیں ہے)،اورعلامہ حصکفی کا یہ کہنا کہ"اورفرض نماز کے ضمن میں بھی یہ دوگانہ احرام اداہوجائیں گی،جیسا کہ الزیلعی،فتح القدیر،النھر ،اللباب میں ہےاورانہوں نے اس (دوگانۂ احرام) کو(دوگانہ) تحیۃ المسجد سے تشبیہ دی ہے(جوتنگیِ وقت یاقیامِ جماعت کی صورت میں فرض کے ضمن میں بھی اداہوجاتی ہے)،اور"شرح اللباب" میں ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ نمازاستخارہ وغیرہ کی طرح نمازاحرام مستقل سنت ہے،توفرض نمازاس کے قائم مقام نہیں ہوسکتی،بخلاف تحیۃ المسجد اورتحیۃ الوضوء کہ ان کے لئے مستقل بالذات نمازِمسنون نہیں ہے،جیسا کہ"فتاویٰ الحجۃ" میں اس کی (خوب) تحقیق کی ہے کہ یہ نمازیں (تحیۃ المسجد اورتحیۃ الوضوء) دوسری نمازوں (فرض وغیرہ) کے ضمن میں بھی اداہوجاتی ہیں،(ردالمحتار علی درالمختار جلد3 ص432:داراحیاءالتراث العربی بیروت)"۔

سوال:75

کیاحجرِاسودکوبوسہ دینے یاچھونے کےوقت حصولِ برکت کی نیت کرنابدعت ہے؟

جواب:

استلامِ حجر اسودیعنی حجرِ اسود کو بوسہ دیتے وقت حصولِ خیروبرکت اورثواب کی نیت کرنابدعت نہیں بلکہ عین عبادت ہے کیونکہ حج وعمرہ کے ایک اہم رکن طواف بیت اللہ

کے موقع پر حجرِ اسود کو بوسہ دینا سنت ہے۔علامہ ابنِ عابدین شامی لکھتے ہیں:

من الاستلام فهو سنة بين كل شوطين كما في "غاية البيان" وذكر في "المحيط" و "الوالجية" ـأنه في الابتداء والانتهاء سنة ،وفيما بين ذلك أدب۔"بحر"۔ووفق في " شرح اللباب" بانه في الطرفين اكد مما بينهما۔

ترجمہ:''استلامِ حجر ہر دو چکروں کے درمیان سنت ہے،جیسا کہ'' غایۃ البیان'' میں ہے اور ''المحیط'' اور'' والوالجیۃ'' میں ہے کہ طواف بیت اللہ کی ابتدا اور انتہا کے موقع پر سنت اور درمیان کے چکروں میں آداب میں سے یعنی مستحب ہے،''البحر الرائق'' (میں بھی اسی طرح ہے)،اور'' شرح اللباب'' میں بھی اسی کے موافق کہا کہ طواف کی ابتدا وانتہا میں حجر اسود کا استلام زیادہ مؤکد ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار،جلد3،ص:453 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی،بیروت)''۔

تو جب حجرِ اسود کو بوسہ دینا عبادتِ حج وعمرہ کے ایک اہم رکن طواف بیت اللہ کے دوران ہر چکر کے موقع پر سنت یا کم از کم مستحب ہے،عبادت تو ثواب اور خیر برکت کے لئے ہوتی ہے،عبادت مشروع اور بدعت دو متضاد چیزیں ہیں،بعض لوگوں کو شاید اس حدیثِ مبارک سے غلط فہمی ہوئی ہے:

عن عبدالله بن سرجس قال: رأيت الأصلع (يعني عمر بن الخطاب) يقبل الحجر ويقول:والله انى لأقبلك، وانى اعلم انك حجر، وانك لا تضر ولا تنفع۔ ولو لا انى رأيت رسول الله ﷺ قبلك ما قبلتك۔

ترجمہ:''عبداللہ بن سرجس بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجرِ اسود کو بوسہ دے رہے تھے۔اور کہہ رہے تھے بخدا میں تجھے بوسہ دے رہا ہوں،حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے،تو نفع دیتا ہے نہ نقصان،اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا،تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا،(صحیح مسلم رقم الحدیث:3016)''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حجرِ اسود کو مخاطب کر کے یہ کہنا کہ: میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، تو نفع دیتا ہے نہ نقصان، اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا، تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا، اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حجرِ اسود یا کوئی بھی مخلوق اپنی ذات سے نفع یا ضرر رساں نہیں ہے، جس مخلوق میں جو بھی کمال ہے اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے اور یہ بات انہوں نے اس تناظر میں فرمائی کہ عہدِ جاہلیت میں لوگ پتھر کے بتوں کی عبادت کرتے تھے اور انہیں بالذات نفع دینے والا اور نقصان پہنچانے والا سمجھتے تھے، مزید یہ کہ وہ عقیدۂ توحید کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنا چاہتے تھے اور اعمال خیر و عبادات میں اتباعِ رسول کو اصلِ مقصود سمجھنے کے تصور کو لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے اور یہ بات عیاں ہے کہ جب حجرِ اسود کو بوسہ دینا، اتباعِ رسول ہے، تو رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں ثواب بھی ہے، خیر و برکت بھی ہے اور اتباعِ سنت اسی نیت سے کرنی چاہئے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات سنے تو انہوں نے فرمایا: نہیں! یہ نفع بھی دیتا ہے اور نقصان بھی دیتا ہے، حضرت عمر نے پوچھا! اس کا ثبوت کس سے ہے، حضرت علی نے کہا! قرآن مجید سے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

واذاخذ ربک من بنی ادم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلیٰ۔

ترجمہ: ”اور جب آپ کے رب نے بنو آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان کی جانوں پر اقرار کرایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، سب نے کہا، کیوں نہیں!“۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا اور ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان سے اقرار کرایا، اللہ ان کا رب ہے اور وہ اس کے بندے ہیں، اور ان سے اس کا عہد و پیمان لیا اور اس کو ایک کاغذ میں لکھ دیا اور پتھر کی دو آنکھیں اور ایک زبان تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: منہ کھول، اس نے منہ کھولا، اللہ تعالیٰ نے وہ کاغذ اس کے منہ میں ڈال دیا اور فرمایا: جو تجھ سے وفا کرے قیامت کے دن اس کی گواہی دینا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا

ہے، آپ نے فرمایا: قیامت کے دن حجرِ اسود کو لایا جائے گا اور جو شخص اس کی تعظیم کرے گا یہ قیامت کے دن اس کی گواہی دے گا، پس اے امیر المؤمنین یہ ضرر بھی دیتا ہے اور نفع بھی دیتا ہے، حضرت عمر نے کہا: میں اس بات سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں اس قوم میں رہوں، جس میں اے ابوالحسن تم نہ ہو، (شرح الموطا جلد 2، ص: 287 مطبوعہ مطبع خیریہ مصر بحوالہ شرح صحیح مسلم جلد 3 ص: 499-498 مطبوعہ فرید بک اسٹال، لاہور)"۔

سوال: 76

رمی جمرات کیلئے حجاج کرام مزدلفہ سے کنکریاں اپنے ہمراہ چن کر منیٰ لے جاتے ہیں کیا یہ مشروع ہے؟ یا حدودِ حرمِ پاک میں کہیں سے بھی چنی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے تینوں دن جمرات پر مارنے کے لئے کنکریاں یہیں سے لے لی جائیں یا کسی اور جگہ سے لی جائیں مگر نہ نجس جگہ کی ہوں اور نہ مسجد کی نہ جمرہ کے پاس کی۔ جمرہ کے پاس کی کنکریاں اٹھانا مکروہ ہے کہ وہاں وہی کنکریاں رہتی ہیں جو مقبول نہیں ہوتیں اور مردود ہو جاتی ہیں، اور جو مقبول ہو جاتی ہیں وہ اٹھالی جاتی ہیں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویکرہ) أخذھا (من عند الجمرة) لأنّھا مردود لحدیث" من قبلت حجته رفعت جمرته (و) یکرہ (أن یلتقط حجراً واحداً فیکسرہ سبعین حجراً صغیراً)۔

ترجمہ: اور جمرے کے پاس سے کنکریاں اٹھانا مکروہ ہے، اس لئے کہ وہ مردود ہوتی ہیں حدیث شریف میں ہے کہ "جس کا حج قبول ہو جاتا ہے اس کی کنکریاں اٹھالی جاتی ہیں"،

اس کی تشریح میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

وما ھی الّا کراھة تنزیه۔ "فتح"۔ أشار الی أنه یجوز أخذہ من أی موضع سواہ۔ وفی "اللباب": یستحب أن یرفع من مزدلفة سبع حصیات ویرمی بھا جمرة العقبة وان رفع من المزدلفة سبعین أو من الطریق فھو جائز، وقیل مستحب اھ۔

ترجمہ: ''جمرہ کے پاس سے کنکریاں اٹھانا مکروہ تنزیہی ہے ''فتح القدیر'' میں اسی طرح ہے۔ اور اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے مقام سے اٹھانا جائز ہے۔ اور ''اللباب'' میں ہے: مستحب ہے کہ جمرہ سے سات کنکریاں اٹھائی جائیں اور جمرۂ عقبہ پر رمی کی جائے، اور اگر مزدلفہ ہی سے یا کسی اور راستے سے 70 کنکریاں اٹھائی جائیں تو یہ جائز ہے اور بعض علماء نے مستحب فرمایا ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3 ص: 473، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

سوال:77

کیا تیسری رات بھی منیٰ میں گزارنا افضل ہے یا تیسرے دن (۱۲ ذی الحجہ) کو غروبِ آفتاب سے قبل منیٰ سے روانہ ہونا افضل ہے؟۔

جواب:

بارہویں کی رمی کر کے غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے اختیار ہے کہ مکہ روانہ ہو جائے یعنی اس کی رخصت ہے، یہ افضل نہیں ہے، مگر غروب کے بعد جانا معیوب ہے اب ایک دن اور ٹھہرے اور تیرہویں کو دوپہر ڈھلے رمی کر کے روانہ ہو یہی افضل ہے۔ تیرہویں کی صبح ہو گئی تو بغیر رمی کئے جانا جائز نہیں اگر جائے گا تو دم واجب ہو گا۔

سوال:78

اگر کوئی محرم بھول کر یا عدم علم کے سبب حالتِ احرام میں سلا ہوا کپڑا چند لمحوں کے لئے پہن لے یا سر کو ڈھانک لے یا خوشبو استعمال کر لے یا بال و ناخن تراش لے تو کیا دم واجب ہو گا؟۔

جواب:

جی ہاں! دم واجب ہو گا، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(الواجب دم علی محرم بالغ ولو ناسیاً) او جاھلاً او مکرھاً فیجب علی نائم غطی راسه(إن طیب عضواً)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(أو لبس مخیطاً)۔

او ستررأسه بمعتاد، اما بحمل اجانة اوعدل فلا شئ عليه يوما كاملا اوليلة كاملة، وفي الاقل صدقة ـ

ترجمہ:''ہر محرم بالغ پر (اگر اس نے ترکِ واجب کیا ہوتو) دم واجب ہوتا ہے، خواہ اس نے وہ عمل بھول کر کیا ہو یا لاعلمی میں کیا ہو، یا حالتِ مجبوری میں کیا ہو، تو اگر نیند کی حالت میں محرم نے سر ڈھانپ لیا، (یا کسی پورے عضو پر خوشبو لگائی)۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: یا ایسا سلا ہوا کپڑا پہنا، جیسے عادتاً پہنا جاتا ہے، لیکن اگر اسے چادر کے طور پر اوڑھ لیا یا اپنے کندھے پر رکھا، تو کوئی حرج نہیں، پورا دن یا پوری رات سر ڈھانپ لیا، جیسے عام طور پر ڈھانپا جاتا ہے، (تمام سر یا چوتھائی حصہ) تو دم لازم ہوگا، لیکن اگر پورے دن یا پوری رات سے کم وقت ڈھانپا، تو صدقہ دینا ہوگا، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص: 508، 511، 507 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

سوال:79

کیا طوافِ افاضہ، طوافِ زیارت دونوں ایک ہیں؟

جواب:

جی ہاں! دونوں ایک ہیں، علامہ شامی لکھتے ہیں:

(ثم طاف للزيارة) أى لفعل طواف الزيارة الذى هو ثانى ركنى الحج۔ قال في "السراج" ويسمى الافاضة وطواف يوم النحر وطواف المفروض۔

ترجمہ:''(پھر طواف زیارت کرنا) یعنی طوافِ زیارت کرنا حج کا دوسرا اہم رکن ہے اور ''السراج'' میں فرمایا: اس کا نام طوافِ افاضہ، طوافِ یوم النحر اور طوافِ فرض بھی ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار: جلد 3 ص:476 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

سوال:80

دس ذی الحجہ کے اعمال (رمی جمرۂ عقبہ، قربانی، حلق) میں ترتیب قائم نہ رہ سکے تو کیا کفارہ لازم آئے گا یا شریعت کی طرف سے تقدیم وتاخیر جائز ہے؟ نیز حج

بیت اللہ ناقص تو نہ ہوگا؟۔

جواب:

دس ذی الحجہ کے اعمالِ حج میں ترتیب لازم ہے، خلافِ ترتیب کرنے سے (یعنی تقدیم وتاخیر سے) دم لازم آتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے امید ہے کہ دم ادا کرنے سے حج ناقص نہیں رہے گا، علامہ ابوالحسن مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

''افعالِ حج کو ایک دوسرے پر مقدم کرنے کے حکم میں اختلاف ہے، جیسے سر منڈانے کو کنکریاں مارنے سے پہلے یا قربانی کو کنکریاں مارنے سے پہلے یا سر منڈانے کو قربانی سے پہلے کیا جائے، امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک یہ جائز ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ جو چیز فوت ہوگئی ہے اس کی تلافی قضا سے ہو جاتی ہے اور قضا کے ساتھ کوئی اور چیز لازم نہیں ہوتی، امام ابو حنیفہ کے نزدیک ترتیب کے خلاف کرنے سے دم لازم آتا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "من قدم نسکا علی نسک فعلیہ دم" جس شخص نے حج کے ایک فعل کو دوسرے پر مقدم کر دیا اس پر دم لازم ہے''۔

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ:

''امام ابو یوسف اور امام محمد کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ حجۃ الوداع میں کھڑے ہوئے تھے، ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ میں نے لاعلمی میں سر منڈالیا، آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، اب ذبح کرلو، ایک اور شخص نے کہا: میں نے لاعلمی میں کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کردی، آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، اب کنکریاں مار لو اور اس دن جس چیز کے بھی مقدم یا مؤخر کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے یہی فرمایا کہ اب کرلو کوئی حرج نہیں ہے، اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ حرج نہ ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ اس سے گناہ نہیں ہوگا اور حج فاسد نہیں ہوگا، یہ معنیٰ نہیں ہے کہ اس پر کوئی جزا یا فدیہ نہیں ہے، کیونکہ کہنے والے نے یہ کہا کہ میں نے لاعلمی میں یہ کام کیا ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ کام کرنے کے بعد اس پر منکشف ہوا کہ یہ تقدیم یا تاخیر ممنوع تھی، اسی وجہ سے اس نے

سوال کرنے سے پہلے اپنا عذر بیان کیا کہ میں نے لاعلمی کی بنا پر اس کو مقدم یا مؤخر کیا ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد کی طرف سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ سائل نے جب یہ دیکھا کہ اس کی ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ترتیب کے مخالف ہے اور اس نے یہ گمان کیا کہ یہ ترتیب معین ہے تو اس نے عذر پیش کر کے یہ سوال کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جواب میں حرج کی نفی کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ یہ ترتیب کرنا اس پر معین نہیں ہے بلکہ یہ ترتیب مسنون ہے نہ کہ واجب، حق یہ ہے کہ جس طرح یہ احتمال ہے اسی طرح یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ترتیب واجب ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کو جہل کی وجہ سے معذور قرار دیا ہو۔ آپ نے صحابہ کو افعالِ حج سیکھنے کا حکم دیا اور جہل کی وجہ سے ان کو معذور قرار دیا، کیونکہ یہ فرضیت حج کا ابتدائی دور تھا، اور جب اس معاملے میں یہ دونوں احتمال موجود ہیں تو احتیاطاً ترتیب کے وجوب کے قول پر عمل کرنا چاہئے اور اس سے امام ابو حنیفہ کی دلیل مضبوط ہوتی ہے اور ان کی تائید حضرت ابن مسعود کے اس قول سے ہوتی ہے: من قدم نسكا على نسك فعليه دم۔ (جس نے حج کی ایک عبادت کو دوسری پر مقدم کر دیا اس پر دم ہے) بلکہ یہ ایک مستقل دلیل ہے، ہدایہ کے بعض نسخوں میں حضرت ابن مسعود کی جگہ حضرت ابن عباس کا ذکر ہے اور یہ زیادہ معروف ہے۔ امام ابن ابی شیبہ نے یہ روایت ذکر کی ہے، ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: من قدم شيئا من حجه او اخره فليهرق دمًا۔

ترجمہ: ''جو شخص اپنے حج میں کسی عبادت کو مقدم یا مؤخر کر دے وہ ایک قربانی دے''۔ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مہاجر ہے جس کو ضعیف کہا گیا ہے۔ امام طحاوی نے یہ روایت ایک اور سند سے بیان کی ہے جس میں یہ ضعیف راوی نہیں ہے وہ سند یہ ہے: حدثنا ابن مرزوق۔ حدثنا الخصيب حدثنا وهيب عن ايوب عن سعيد بن جبير عن ابن عباس مثله۔ امام طحاوی کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان راویوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ''کوئی حرج نہیں اب کرلو'' اور یہ حدیث ان کے نزدیک اجازت اور اباحت پر محمول نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اس پر

محمول ہے کہ انھوں نے جہل اور لاعلمی کی وجہ سے بعض عبادات کو مقدم یا مؤخر کر دیا تھا، آپ نے ان کو معذور قرار دیا اور حج کی عبادات سیکھنے کا حکم دیا، علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ: امام ابوحنیفہ کے نظریہ پر اس آیت سے بھی استدلال ہے: فمن کان منکم مریضا او به اذی من راسه ففدیة ۔ "تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو وہ فدیہ دے"۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ جو شخص بیماری کے عذر کی بناء پر اپنے وقت سے پہلے سر منڈادے تو وہ فدیہ دے تو جب عذر کے باوجود وقت سے پہلے سر منڈانے پر فدیہ لازم آتا ہے، تو وقت سے پہلے بلا عذر سر منڈانے پر تو بطریقِ اولیٰ فدیہ لازم

(بقیہ صفحہ 477)

سوال: 81

بعض احباب حج وعمرہ کی نیت سے وطن سے حجاز مقدس روانہ ہوتے ہیں، مگر احرام کے بغیر میقات سے گزرتے ہیں، پہلے چند دن جدہ یا ریاض یا وہاں کے دیگر شہروں میں اپنے عزیز واقارب کے گھر قیام کر کے پھر ان کے ہمراہ احرام باندھ کر عمرہ یا حج کی ادائیگی کے لئے جاتے ہیں، کیا ان کا یہ عمل مناسک حج وعمرہ میں نقائص کا سبب تو نہیں بنتا، اس تناظر میں کیا ان پر دم واجب ہوگا؟

جواب:

مکہ معظمہ جانے کا ارادہ نہ ہو بلکہ میقات کے اندر (یعنی حِل میں، جو حدودِ حرم کے اختتام اور میقات کے درمیان کا علاقہ ہے) کسی اور جگہ مثلاً جدہ جانا چاہتا ہے تو اسے احرام کی ضرورت نہیں پھر وہاں سے اگر مکہ معظمہ جانا چاہے تو بغیر احرام جا سکتا ہے لہٰذا جو شخص حرم میں بغیر احرام جانا چاہتا ہے وہ یہ حیلہ کر سکتا ہے بشرطیکہ واقعی اس کا ارادہ پہلے مثلاً جدہ یا کسی اور مقام حِل میں جانے کا ہو، نیز مکہ معظمہ حج اور عمرہ کے ارادے سے نہ جانا ہو مثلاً تجارت کے لئے جدہ جاتا ہے اور وہاں سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ جانے کا ارادہ ہے اور اگر پہلے ہی سے مکہ معظمہ کا ارادہ ہے تو پھر بغیر احرام نہیں جانا چاہئے ۔ علامہ

علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(قصد دخول مكة) يعني الحرم (ولو لحاجة)غير الحج ،أما لو قصد موضعاً من الحل كخليص و جدة حل له مجاوزته بلا احرام،فاذا حل به التحق بأهله فله دخول مكة بلا احرام۔

ترجمہ:''حج کے علاوہ اپنی کسی ضرورت کے لئے مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا پھر ارادہ کیا، یا اگر حدودِ حِل میں کسی مقام پر جانے کا ارادہ کیا، جیسے خلیص یا جدہ، تو پھر اس کے لئے میقات سے احرام کے بغیر گذرنا جائز ہے، جب وہاں اتر کر اپنے گھر والوں سے مل جائے، تو اب وہ احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہوسکتا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3 ص:427 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

بہت سے آفاقی لوگ، جیسے اہل پاکستان، جن کے عزیز واقارب سعودی عرب میں جدہ یا کسی اور مقامِ حِل میں رہتے ہیں، جب حج یا عمرہ کیلئے جانا چاہتے ہیں، تو سہولت پسندی کی وجہ سے یہاں سے احرام باندھ کر نہیں جاتے ہیں، بلکہ پہلے جدہ یا کسی دوسرے مقام پر جاتے ہیں اور پھر وہاں سے اپنے عزیز واقارب کے ساتھ احرام باندھ کر جا کر عمرہ کر لیتے ہیں۔ ایسا کرنا ان کے لئے جائز ہے، افضل ہرگز نہیں ہے اور یقیناً اجر وثواب میں کمی کا بھی باعث ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ یہاں سے عمرے کی نیت سے سفر کر رہے ہیں تو بغیر احرام کے ان کا میقات سے گذرنا درست نہیں ہے۔ اور اگر وہ یہاں سے دوستوں عزیزوں کی ملاقات کی نیت سے جدہ یا کسی اور مقامِ حِل کا سفر کرتے ہیں، تو یہاں سے ان کا یہ سفر عبادات میں شمار نہیں ہوگا، تاہم اس سے ان پر دم واجب نہیں ہوگا، البتہ یہ اجر میں کمی کا باعث ہوگا۔ اس لئے ہمارے نزدیک افضل یہ ہے کہ وہ یہاں سے احرام باندھ کر روانہ ہوں تو ان کا یہ پورا سفر اور کل مصارف سفرِ عبادت میں شمار ہوں گے، اور خدانخواستہ کسی حادثۂ ناگہانی کا شکار ہوگئے تو روزِ حشر حالتِ احرام میں اٹھیں گے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

عن ابن عباس رضى الله عنهما قال: بينما رجل واقف مع رسول الله ﷺ

بعرفة،اذ وقع عن راحلته فوقصته ،أو قال فأ قعصته ،فقال رسول الله ﷺ: ''اغسلوه بماءٍ وسدر، وكفّنوه في ثوبين ،ولا تحنّطوه ،ولا تخمّروا رأسه ،فانّ الله يبعثه يوم القيامة ملبيا''۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:ایک آدمی عرفات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھڑا تھا کہ سواری سے گر پڑا جس نے اس کی گردن کچل دی یا وہ کچلا گیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:اسے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور دو کپڑوں کا کفن دو، اسے خوشبو نہ لگانا اور نہ اس کا سر چھپانا۔اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے اس حال میں اٹھائے گا کہ تلبیہ کہہ رہا ہوگا،(صحیح بخاری رقم الحدیث:1449)''۔

مزید یہ کہ اگر یہاں سے احرام باندھ کر عمرے یا حج کی نیت سے روانہ ہوئے ہیں اور درمیان میں ایک یا دو دن انہیں جدہ میں ٹھہرنا پڑے تو یہ سارا وقت بھی عبادت میں شمار ہوگا، احرام میں کوئی وزن تو نہیں اٹھانا،بس صرف احرام کی پابندیوں کا خیال رکھنا ہے۔

سوال:82

بعض حج گروپ اپنے گروپ کے افراد کو ۷، ذی الحجہ کو منیٰ اور ۸، ذی الحجہ کی شب کو عرفات میں قیام کراتے ہیں،بعض احباب کے استفسار پر یہ جواز پیش کرتے ہیں، اس عجلت سے ہم ٹریفک کے اژدھام اور سفر کے دیگر مصائب ومشکلات سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور ہر دو مقام پر جگہ بھی مناسب مل جاتی ہے، کیا ازروئے شرع ان کا یہ عمل حج کے اعمال میں نقائص کا سبب تو نہ بنے گا؟۔

جواب:

۷، ذی الحجہ کو بعد نمازِ ظہر امام خطبہ پڑھتا ہے اس خطبے کو سنے ، یوم الترویہ (۸، ذی الحجہ) کو آفتاب نکل آئے تو منیٰ کو روانہ ہو آفتاب نکلنے سے پہلے گیا تو بھی جائز مگر بعد میں جانا بہتر ہے زوال کے وقت بھی جا سکتا ہے مگر ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھے، رات منیٰ میں ٹھہرے فجر پڑھ کر عرفات روانہ ہو۔

(وخطب الامام اولیٰ خطب الحج الثلاث سابع ذی الحجة بعد الزّوال و) بعد (صلاة الظهر) وكره قبله (وعلم فيها المناسک فاذا صلّى بمكّة الفجر) يو م التروية (ثامن الشهر الى منى ومكث بها الى فجر عرفة ثمّ)بعد طلوع الشمس (راح الىٰ عرفات) علىٰ طريق ضب(و) عرفات (كلها موقف الّا بطن عرنة) (فبعد الزوال قبل) صلاة (الظهر خطب الامام)۔

ترجمہ:(اور امام خطبہ پڑھے گا ،ذی الحجہ کو بعد زوال اور بعد نمازِ ظہر)اس سے پہلے مکروہ ہے(اور مناسک حج سکھے پھر نمازِ فجر مکہ میں پڑھے ،۸ذی الحجہ کو منیٰ روانہ ہو اور فجر تک عرفہ میں ٹھہرے پھر بعد طلوع آفتاب عرفات کو چلے پورا عرفات موقف ہے سوائے بطن عرنہ کے پھر بعد زوال نمازِ ظہر سے پہلے امام خطبہ پڑھے گا ،(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3 ص:458, 459 ،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ،بیروت)''،علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

'' آج کل بعض مطوفوں نے یہ نکالی ہے کہ آٹھویں کو منیٰ میں نہیں ٹھہرتے سیدھے عرفات پہنچتے ہیں ان کی نہ مانے اور اس سنت عظیمہ کو ہرگز نہ چھوڑے ،(بہارِ شریعت جلد اول ، ص:478 مکتبۂ رضویہ آرام باغ ،کراچی)''۔ایک تو یہ ہے کہ کاہلی ،سہل پسندی اور سنت کو اہمیت نہ دیتے ہوئے قیامِ منیٰ کو ترک کردیا جائے ،یہ سوچ اور طرزِ عمل بلاشبہ اجروثواب میں کمی کا باعث بنے گا اور عبادت حج کے کامل واکمل ہونے میں مانع اور حارج ہوگا ،اگرچہ ادائے فرض ہوجائے گا ،لیکن عبادت کا اجرِ کامل اور مرتبۂ کمال کسی عبادت کے اندر فرض وواجب کے ساتھ سنن ومستحبات اور آداب کی کامل رعایت اور محرمات اور ممنوعات اور مکروہات سے اجتناب سے نصیب ہوتا ہے ،تاہم اگر بندہ اپنی طرف سے پوری جدوجہد کرے مگر ٹریفک میں پھنس جانے یا منیٰ میں جگہ نہ ملنے کے باعث قیام منیٰ نہ کرسکا ہو تو اللہ تعالیٰ نیتوں کا حال جاننے والا ہے ،لیکن چونکہ یہ سبب ترک سنت اللہ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ بندوں کی اپنی طرف سے ہے اسی لئے احتیاط پسند اور تقویٰ شعار علماء یہ کہتے ہیں کہ بندے کو حج کے اختتام پر حسب توفیق دم یا صدقہ دے دینا چاہئے تاکہ دانستہ یا نادانستہ

یا مجبوری ومشکلات کے باعث عبادت میں کچھ کمی رہ گئی ہوتو اس کی تلافی ہو جائے''۔

سوال:83

ایک کلمہ گو حضور ﷺ کی ذات مقدسہ کے بارے میں شفیع المذنبین کا عقیدہ رکھتے ہوئے، حضور ﷺ کی بارگاہ میں درخواست شفاعت پیش کرتا ہے، زید یہ کہتا ہے کہ اگر درخواست شفاعت پیش کی اور اس پر بھروسہ کیا تو باجماع امت کافر ہوگیا، نیز حضور ﷺ سے کس طرح کا سوال کرنا شرک ہے؟

جواب:

چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ماذونین کی شفاعت کا قرآن مجید میں خود ذکر فرمایا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام ورُسل عظام علیہم الصلاۃ والتسلیم، اولیاء کرام، مقرّبین ومکرّمین ومحبوبین رضی اللہ عنہم اجمعین حتیٰ کہ از روئے حدیث حافظ وعاملِ قرآن اور ناتمام پیدا شدہ بچے کی شفاعت بھی از روئے حدیث ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔

ترجمہ:''کس کی مجال ہے کہ اس کی بارگاہ میں شفاعت کرے، مگر جسے وہ خود اذنِ شفاعت دے دے، (البقرہ:255)''۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ ماذون الشفاعت ہیں اور احادیثِ مشہورہ سے آپ کی شفاعتِ کبریٰ ثابت ہے، اسی طرح سے بچے کی نمازِ جنازہ میں اسی ترتیب کے بعد جو بھی دعا پڑھی جاتی ہے، اس میں ہم سب پڑھتے ہیں:

اللھم اجعلہ لنا شافعا و مشفعا۔

ترجمہ:''اے اللہ اس بچے کو ہمارے لئے شفاعت کرنے والا اور مقبولِ شفاعت بنادے''۔

عن جابر؛ قال: سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول: "ان شفاعتی یوم القیامۃ لاھل الکبائر من امتی۔

ترجمہ:''حضرت جابر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری شفاعت قیامت کے دن میری امت کے گناہِ کبیرہ والوں کے لئے ہے،(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 4310)''۔

اسی طرح حدیث پاک میں ناتمام بچوں کے بارے میں آیا ہے کہ جب ان کے ماں باپ کو جہنمی قرار دیا جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے عطا کردہ اذن سے بطورِ خاص احتجاج کرے گا، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: أیّها السقط المراغم ربّه! أدخل أبویک الجنّة۔

ترجمہ:''اے اپنے رب سے جھگڑنے والے ناتمام بچے، جا اپنے ماں باپ کو جنت میں لے جا،(سنن ابنِ ماجہ رقم الحدیث: 1608 مطبوعہ دارالفکر بیروت)''۔

حافظِ قرآن کے بارے میں حدیث ہے:

عن علی قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: من قرأ القرآن واستظهره فاحلّ حلاله وحرّم حرامه ادخله اللّٰہ به الجنّة وشفّعه فی عشرة من اهل بیته کلهم قد وجبت له النار۔

ترجمہ: حضرت علی سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جس نے قرآن پڑھا اس کو یاد(حفظ) کیا، پس حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا اور اس کی شفاعت سے اس کے گھر والوں میں سے ایسے دس افراد جن پر جہنم لازم ہوگئی ہو جنت میں داخل فرمائے گا،(سنن ترمذی رقم الحدیث: 2905)''۔

عن عثمان ابن عفان قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: "یشفع یوم القیامة ثلاثة: الانبیاء ثم العلماء ثم الشهداء"۔

ترجمہ:''حضرت عثمان ابن عفان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تین جماعتیں شفاعت کریں گی، انبیاء پھر علماء پھر شہید لوگ،(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 4313''۔

سوال:84

زید یہ کہتا ہے کہ زیارت روضۃ النبی ﷺ مشروع نہیں، جن احادیث سے دلائل پیش کیے جاتے ہیں، وہ ضعیف یا موضوع ہیں و نیز زائرین کے لئے مسجد نبوی ﷺ کی زیارت مسنون ہے، خواہ قبل از حج ہو یا بعد از حج؟۔

جواب:

زیارتِ روضۃ النبی ﷺ کے ثبوت میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں وہ پیشِ خدمت ہیں:

عن ابنِ عمر قال قال رسول اللہ ﷺ من حج فزار قبری بعد وفاتی کانما زارنی فی حیاتی۔

ترجمہ:" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی گویا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ہے، (سنن دار قطنی جلد 2 ص:378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)"۔

اس حدیث کو امام بیہقی نے (السنن الکبریٰ جلد 2 ص:246 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)، حافظ الہیثمی نے (مجمع الزوائد جلد 4 ص:2 دار الکتب العربیہ بیروت)، علامہ علی متقی ہندی نے (کنز العمال جلد 5 ص:135 مؤسسۃ الرسالۃ بیروت)، اور حافظ دیلمی (فردوس الاخبار جلد 4 ص:72 دار الکتب العربیہ بیروت) نے بھی ذکر کیا ہے۔

عن حاطب قال: قال رسول اللہ ﷺ :من زار نی بعد موتی،فکانما زار نی فی حیاتی ومن مات باحد الحرمین بعث من الامنین یوم القیامۃ۔

ترجمہ:" حاطب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میرے وصال کے بعد میری زیارت کی اس نے گویا کہ میری زندگی میں میری زیارت کی اور جو شخص حرمین میں سے کسی جگہ فوت ہوا، وہ قیامت کے دن امن والوں میں سے اٹھے گا، (سنن دار قطنی جلد 2 ص:378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)"۔

اس حدیث کو علامہ علی متقی ہندی نے (کنز العمال جلد 5 ص:136 مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ بیروت) بھی ذکر کیا ہے:

عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ من زارقبری وجبت له شفاعتی۔

ترجمہ:" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی، (سنن دار قطنی جلد 2 ص:378 مطبوعہ دار نشر السنۃ ملتان)"۔

حافظ الہیثمی نے (کشف الاستار عن زوائد البزار ج 2 ص:57، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت) اس کو امام بزار کے حوالے سے ذکر کیا ہے:

عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺعلیه وسلم من حج البیت ولم یزرنی فقد جفانی۔

ترجمہ:" حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے بیت اللہ کا حج کیا اور میری زیارت کے لئے نہیں آیا، اس نے مجھ سے بے وفائی کی، (فردوس الاخبار ج:4 ص:71 مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت)"۔

اس حدیث کو علامہ علی متقی ہندی نے (کنز العمال جلد 5 ص:136 مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ بیروت) بھی ذکر کیا ہے۔

نوٹ: مندرجہ بالا حوالہ جات شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی جلد 3 صفحات 766 سے نقل کئے گئے ہیں، وہاں پر یہ بحث مفصل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ان روایات کے ضعف کا قول تو کیا گیا ہے، لیکن شیخ ابن تیمیہ اور ان کے متبعین کے سوا کسی نے انہیں موضوع قرار نہیں دیا، حج وعمرے کے موقع پر زیارت روضۂ رسول اکرم ﷺ کو کسی نے واجب نہیں قرار دیا، بلکہ یہ احادیث رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں مسنون و مستحب امر ہے، اور چونکہ بعض روایات میں ترک زیارت پر وعید بھی آئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے ساتھ جفا قرار دیا ہے تو اس کا سنت ہونا زیادہ مؤکد قریب بہ واجب

ہوجاتا ہے۔

کسی حدیث کو اگر ماہرینِ اسماء الرجال نے ضعیف قرار دیا ہو تو یہ ایک علمی اور فنی بحث ہے، اسے حدیث پر ترکِ عمل کا سہارا نہیں بنانا چاہیے، اور ویسے بھی علماء کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ ''فضائلِ اعمال میں ضعیف احادیث معتبر ہوتی ہیں''، اور کسی ایک موضوع پر متعدد ضعیف احادیث ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتی ہیں، اس کی ایک عملی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص آپ کو آکر ایک خبر سناتا ہے، آپ اسے زیادہ ثقہ اور معتمد نہیں سمجھتے، لیکن پھر مختلف جہات سے اس جیسے کئی افراد اپنے مشاہدے کی بناء پر وہی خبر سناتے ہیں تو آپ یقین کرلیں گے کہ یہ واقعہ ضرور ہوا ہوگا۔ اور ویسے بھی یہ بڑی جفا، شقاوت اور احسان فراموشی کی بات ہوگی کہ جس ذاتِ والا صفات، خاتم النبیین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے بیت اللہ کا عرفان ملا، عباداتِ حج وعمرہ نصیب ہوئیں، دولتِ ایمان ملی، نعمتِ قرآن ملی، ان کے قریب جاکر، سلام عرض کئے اور زیارت وحاضری کا شرف حاصل کئے بغیر بندہ واپس آجائے۔

ہم لوگ تو ویسے ہی گنہگار ہیں، عصیاں شعار ہیں، اپنی بداعمالیوں کے سبب خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے ہیں اور عبادت حج کا ایک مقصدِ جلیل تعمیلِ حکمِ باری تعالیٰ کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ہمارے گناہوں کی عفو ومغفرت کی کوئی صورت نکل آئے اور اس کی صورت اللہ جل شانہٗ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمائی ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝

ترجمہ: اور جب یہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے، تو یہ آپ کے پاس آجاتے، پھر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لئے استغفار کرتے، تو یہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، بے حد رحم فرمانے والا پاتے، (سورۃ النسآء، 64)''۔

بیشتر مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اس آیہ مبارکہ کی رو سے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

حیاتِ ظاہری میں گنہگارانِ امت کے لئے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اللہ تعالیٰ سے دعاء مغفرت کرنا اور رسول اللہ ﷺ کا ان کے لئے استغفار کرنا وسیلۂ مغفرت تھا، اسی طرح آپ کے وصال فرمانے کے بعد آپ کے روضۂ اقدس پر حاضری بھی وسیلۂ مغفرت ہے، چنانچہ حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی 774ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عاصیوں اور گنہگاروں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب ان سے خطا اور گناہ ہو جائے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور آپ کے پاس آکر استغفار کریں، پھر رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کریں کہ آپ بھی ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست کریں اور جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت مہربان پائیں گے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے ان میں الشیخ ابومنصور الصباغ بھی ہیں، انہوں نے اپنی کتاب الشامل میں عتبی کی یہ مشہور حکایت لکھی ہے کہ میں (رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد) نبی ﷺ کی قبر پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی نے آکر کہا السلام علیک یارسول اللہ، میں نے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد سنا ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ الآیہ اور میں آپ کے پاس آگیا ہوں اور اپنے گناہ پر اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اپنے رب کی بارگاہ میں آپ سے شفاعت طلب کرنے والا ہوں، پھر اس نے عربی کے دو شعر پڑھے، جن کا ترجمہ یہ ہے:

''اے وہ جو زمین کے مدفونین میں سب سے بہتر ہیں، جن کی خوشبو سے زمین اور ٹیلے خوشبودار ہو گئے۔

میری جان اس قبر پر فدا ہو جس میں آپ ساکن ہیں، اس میں عفو ہے اس میں سخاوت ہے اور لطف و کرم ہے''۔

پھر وہ اعرابی چلا گیا، عتبی بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر نیند غالب آگئی، میں نے خواب میں نبی ﷺ کی زیارت کی اور آپ نے فرمایا اے عتبی! اس اعرابی کے پاس جا کر اس کو خوشخبری دو

کہ اللہ نے اس کی مغفرت کردی ہے،(تفسیر ابن کثیر ج2 ص:329-328، الجامع لاحکام القرآن ج5 ص:265، البحر المحیط ج3 ص:694، مدارک التنزیل علی ہامش الخازن ج1 ص:399)۔

مفتی محمد شفیع متوفی 1396ھ لکھتے ہیں:

یہ آیت اگرچہ خاص واقعہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ نکل آیا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لیے دعاءِ مغفرت کردیں اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیاوی حیات کے زمانہ میں ہو سکتی تھی، اسی طرح آج بھی روضہ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے، اس کے بعد مفتی صاحب نے بھی عتبی کی مذکور الصدر حکایت بیان کی ہے،(معارف القرآن ج2 ص:460-459، مطبوعہ ادارۃ المعارف، کراچی)۔

معروف دیوبندی عالم شیخ محمد سرفراز گکھڑوی لکھتے ہیں:

عتبی کی حکایت اس میں مشہور ہے اور تمام مذاہب کے مصنفین نے مناسک کی کتابوں میں اور مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے اور سب نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے، اسی طرح دیگر متعدد علماء کرام نے قدیما وحدیثا اس کو نقل کیا ہے اور حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ مواہب میں بہ سند امام ابو منصور صباغ اور ابن النجار اور ابن عساکر اور ابن الجوزی رحمہم اللہ تعالیٰ نے محمد بن حرب ہلالی سے روایت کیا ہے کہ میں قبر مبارک کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت کر کے عرض کیا کہ یا خیر الرسل، اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک سچی کتاب نازل فرمائی جس میں ارشاد ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۝ اور میں آپ کے پاس اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوا اور اپنے رب کے حضور میں آپ کے وسیلہ سے شفاعت چاہتا ہوا آیا ہوں پھر دو شعر پڑھے۔ اور اس

محمد بن حرب کی وفات 228ھ میں ہوئی ہے، غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اس وقت نکیر منقول نہیں، پس حجت ہوگیا (نشر الطیب ص 254) اور حضرت مولانا نانوتوی یہ آیت کریمہ لکھ کر فرماتے ہیں: ''کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص نہیں، آپ کے ہم عصر ہوں یا بعد کے امتی ہوں، اور تخصیص ہو تو کیونکر ہو آپ کا وجود تربیت تمام امت کے لئے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے امتیوں کا آپ کی خدمت میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا جب ہی متصور ہے کہ قبر میں زندہ ہوں (آب حیات ص:40) اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی یہ سابق واقعہ ذکر کر کے آخر میں لکھتے ہیں: پس ثابت ہوا کہ اس آیت کریمہ کا حکم آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے، (اعلاء السنن ج10 ص:330)۔

ان اکابر کے بیان سے معلوم ہوا کہ قبر پر حاضر ہو کر شفاعت و مغفرت کی درخواست کرنا، قرآن کریم کی آیت کے عموم سے ثابت ہے، بلکہ امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس معنی میں صریح ہے (شفاء السقام ص:128) اور خیر القرون میں یہ کاروائی ہوئی مگر کسی نے انکار نہیں کیا جو اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل ہے، (تسکین الصدور ص:366-365، ملخصا، مطبوعہ ادارہ نصرت العلوم گوجرانوالہ)۔

نوٹ: یہ تمام حوالہ جات تفسیر تبیان القرآن مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی جلد 2 صفحات 714 تا 716 سے نقل کئے گئے ہیں، وہاں پر یہ بحث مفصل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ باری تعالیٰ سے طلب مغفرت کے لئے اور رسول اللہ ﷺ سے طلب شفاعت کے لئے روضۂ رسول اور ختم المرسلین کی بارگاہِ اقدس میں حاضری از سلف تا خلف متفق علیہ امر ہے اور رسول اللہ ﷺ اپنی حیات ظاہری کی طرح اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی ہمارے احوال و اعمال کا مشاہدہ فرماتے ہیں، اذنِ باری تعالیٰ سے ہماری نصرت اور دستگیری فرماتے ہیں اور بارگاہِ رب العلیٰ میں ہمارے لئے عفو ومغفرت اور شفاعت کا وسیلۂ کاملہ قطعیہ ہیں۔

عمرے کی ادائیگی کے لئے محرم

سوال:85

کوئی شخص اپنی ساس یا ساس کی والدہ (نانی ساس) کے ساتھ حج یا عمرے کی ادئیگی کے لئے جاسکتا ہے؟۔(حافظ سلیم محمود،R-772 سیکٹر 7-D/3 نارتھ کراچی)۔

جواب:

خواتین کیلئے حج وعمرے کی وہی شرائط ہیں، جو مردوں کیلئے ،ہاں!ایک شرط زائد ہے کہ اسے سفرِ حج کے دوران اپنے شوہر یا کسی محرم کی رفاقت میسر ہو۔محرم سے مرادنسب، رضاعت (دودھ شریک کا رشتہ) یا مصاہرت کے رشتے سے ایسے قریبی رشتہ دار ہیں، جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرام ہو، جیسے باپ، چچا، ماموں، بیٹا، بھتیجا، بھانجا، داماد، خسر اور دودھ کے رشتے سے بھائی، باپ وغیرہ۔

امام علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:

واما الذی یخص النساء فشرطان:احدھما:ان یکون معھا زوجھااو محرم لھا فان لم یوجد احدھمالا یجب علیھا الحج۔

ترجمہ:اورعورتوں کے لئے دوشرطیں خاص ہیں، ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کا شوہر یا اس کا محرم اسکے ساتھ ہو، پس اگران دونوں میں سے کسی ایک کو نہ پائے تو اس پر حج واجب نہیں، دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ثم صفة المحرم أن یکون ممن لایجوز له نکاحھاعلی التابید اما بالقرابة أو الرضاع أو الصھریة لأن الحرمة المؤ بدةتزیل التھمة فی الخلوة، ولھذا قالوا: ان المحرم اذا لم یکن مأموناً علیه لم یجز أن تسافر معه۔

ترجمہ:"محرم وہ شخص ہے جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکاح حرام ہو، خواہ حرمتِ نکاح رشتۂ قرابت کی وجہ سے ہو یا رشتۂ رضاعت کی وجہ سے ہو یا رشتۂ سسرالی کی وجہ سے (مثلاً داماد)، کیونکہ دائمی حرمت سے خلوت میں تہمت کا اندیشہ زائل ہو جاتا ہے، اسی لئے فقہاء

کرام نے کہا ہے کہ اگر محرم بھی قابلِ اعتماد نہ ہو (یعنی اس سے آبرو محفوظ نہ ہو) تو اس کے ساتھ بھی عورت کا سفر پر جانا جائز نہیں ہے، (بدائع الصنائع، جز ثانی، صفحہ 87، 188 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، ہند)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

(القسم الثانی المحرمات بالصھریة) وھی اربع فرق (الاولیٰ) امھات الزوجات و جداتھن من قبل الاب والام وان علون ۔

ترجمہ:" (دوسری قسم سسرالی رشتے سے محرمات کے بیان میں) اور وہ چار قسموں پر ہیں (ان میں سے ایک) بیوی یا بیویوں کی مائیں اور دادیاں، نانیاں، (خواہ وہ باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے) اگر چہ اوپر تک ہوں، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص 274 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔

لہٰذا داماد ساس یا ساس کی والدہ (نانی ساس) کے ہمراہ حج یا عمرے کے سفر پر جاسکتا ہے، کیونکہ وہ سسرالی رشتے کی بناء پر اس کا محرم ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

حج سے تمام گناہوں کا معاف ہوجانا

سوال: 86

آپ سے ایک مسئلہ یہ میں نے سنا ہے کہ حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہوجاتے ہیں، میں نے 2002ء میں حج کیا جب سے لے کر آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں پوری پابندی کرتی ہوں نماز قضاء وغیرہ بھی ادا کرلیتی ہوں، (عذرا جہاں، کورنگی)۔

جواب:

آپ نے جو لکھا ہے کہ" حج سے پہلے کے تمام گناہ بندے کے حج کرنے کے بعد معاف ہوجاتے ہیں"، ادائیگیٔ حج کے لئے جانے سے قبل کبیرہ گناہوں کی توبہ کی جائے، فرائض کی ادائیگی مثلاً قضا نمازوں کی ادائیگی یا ادائیگی کا عزم، زکوٰۃ کی ادائیگی، حق العبد

یعنی اگر کسی کا حق اس کے ذمے ہے، تو اس حق کی ادائیگی یا اس سے اس حق کو معاف کرائے۔ حدیث مبارک میں ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے حج کیا اور فحش کلام نہ کیا اور فسق نہ کیا تو گناہوں سے ایسا پاک ہو کر لوٹا جیسے اس دن پاک تھا جس دن اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، (صحیح بخاری و مسلم)۔ ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: عمرہ سے عمرہ تک ان گناہوں کا کفارہ ہے جو درمیان میں ہوئے اور حج مبرور کا ثواب جنت ہی ہے، (صحیح بخاری و مسلم)۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ بندے سے جو صغیرہ گناہ نادانستہ طور پر سرزد ہو جاتے ہیں اعمال صالحہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دیتا ہے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے: حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: پانچ نمازیں (ایک نماز سے دوسری نماز تک) اور جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک کفارہ ہے ان گناہوں کے لئے جو اس درمیان ہوئے جب کہ وہ گناہِ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو، (صحیح مسلم)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: بتاؤ تو کسی دروازے پر نہر ہو وہ اس میں ہر روز پانچ بار غسل کرے، کیا اس کے بعد بدن پر میل رہ جائے گا عرض کی نہیں اس کے بدن پر کوئی میل باقی نہیں رہے گا فرمایا: یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے اللہ تعالیٰ ان کے سبب خطاؤں کو محو (مٹا) فرما دیتا ہے، (صحیح بخاری و مسلم)۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: ایک صاحب آئے عرض کی یارسول اللہ ﷺ مجھ پر حد قائم فرمایئے آپ نے اس سے کوئی سوال نہ فرمایا اور نماز کا وقت آگیا پھر اس شخص نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی، رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ شخص پھر کھڑا ہو گیا اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ میں نے ایسا فعل کیا ہے کہ جس کے باعث مجھ پر حد واجب ہو گئی ہے تو مجھ پر حد قائم فرمایئے جو کتاب اللہ میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی اس عرض کی جی ہاں! آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے تیرے گناہ کو جو تیرے نزدیک موجب حد تھا

معاف فرمادیا، (بخاری ومسلم)۔

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ایک صاحب سے ایک گناہ صادر ہوا حاضر ہوکر عرض کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، ترجمہ: ''نماز قائم کرو دن کے دونوں کناروں اور رات کے کچھ حصے میں بیشک نیکیاں گناہوں کو دور کرتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لئے، (سورۃ ہود: 114)''۔

انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! کیا یہ خاص میرے لئے ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری تمام امت کے لئے، ایک روایت میں یہ بھی آیا آپ نے فرمایا: کہ میری امت سے جو بھی نیک عمل کرے، (صحیح بخاری ومسلم)۔

ان احادیث مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عبادات کی برکت سے صغیرہ اور غیر ارادی گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے کسی عذر شرعی کی بناء پر فرض ترک ہوگیا ہے تو وہ معذور ہے عذر اٹھ جانے کے بعد اسے ادا کرے۔ اگر بلا عذر شرعی محض کوتاہی یا سرکشی کی بناء پر مثلاً فرض نماز وقت پر نہیں پڑھی، یا رمضان میں روزہ بلا عذر شرعی ترک کردیا تو یہ عمل بجائے خود فسق اور کبیرہ گناہ ہے، ان قضاء شدہ نمازوں اور روزوں کی قضاء کرے اور بلا عذر قضاء کا جو گناہ کیا ہے، اس کی اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگے اور توبہ کرے، واللہ اعلم بالصواب۔

﴿ کتاب النکاح ﴾

حرمتِ رضاعت

سوال:87

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دین علماء کرام قرآن وسنت کی روشنی میں ازراہِ کرم جواب سے جلد از جلد مرحمت فرمائیں، کہ میرے ایک دوست کے بھائی محمد صالح شاہ اور اس کی کزن چچا کی بیٹی فاطمہ بنت رحیم شاہ کی شادی ان کے والدین طے کرنا چاہتے ہیں، مگر دونوں کے والدین یہ جانتے ہیں کہ محمد صالح شاہ نے اپنی چچی فاطمہ کی والدہ کا شیرخوارگی کی عمر میں دودھ پیا تھا۔ جہاں تک میری معلومات ہے کہ ان دونوں کا نکاح نہیں ہوسکتا جوکہ میں نے اپنے دوست کو بتایا تھا مگر اس نے کہا کہ کوئی شرعی فتویٰ ثبوت کے طور پر ہو، جو وہ والدین اور اپنے چچا کو دکھائے تاکہ کسی بھی غلطی اور گناہ سے بچا جاسکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا محمد صالح شاہ کے کسی بھی بھائی سے نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟، (محمد عباس ہاشمی اختر القادری رضوی، ڈاکخانہ ٹنڈو مٹھا خان تحصیل وضلع سانگھڑ)۔

جواب :

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ۔

ترجمہ: ’’اور تمہاری مائیں، جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں (تم پر حرام کی گئیں)، (النساء، آیت23)‘‘۔

ا۔عن عائشة قالت : قال لی رسول اللہ ﷺ:"یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة"۔

ترجمہ: ’’حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:3505، مکتبہ نزار مصطفی الباز، مکۃ المکرمۃ)‘‘۔

۲۔ عن ابن عباس قال : قیل للنبی ﷺ: الا تتزوّج ابنة حمزة؟، قال : "انها ابنة اخی من الرضاعة۔"

ترجمہ:''ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے عرض کی گئی کہ آپ حضرت حمزہ کی صاحبزادی سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے ؟ ،ارشاد فرمایا:'' وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے''،(صحیح بخاری، رقم الحدیث:5100،مکتبۃ العصریہ، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ عالمگیری میں لکھتے ہیں:

"یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع واصو لھما وفروعھما من النسب والرضاع جمیعاً حتیٰ ان المرضعة لو ولدت من ھذاالرجل او غیرہ قبل ھذاالارضاع اوبعدہ اوارضعت رضیعاًاو ولد لھذاالرجل من غیرھذہ المرأة قبل ھذاالارضاع اوٗبعدہ اوٗ ارضعت امراة من لبنه رضیعا فالکل اخوة الرضیع واخواته واولادھم اولاداخوته واخواته واخوالرجل عمه واخته عمته واخوالمرضعة خاله واختھا خالته و کذا فی الجد والجدة

ترجمہ:'' دودھ پینے والے پر اس کے رضاعی ماں باپ اور ان کے تمام اصول اور فروع حرام ہو جاتے ہیں ،خواہ وہ نسباً اصول وفروع ہوں یا رضاعاً حتیٰ کہ اگر دودھ پلانے والی کے ہاں اس کے موجودہ شوہر سے یا کسی اور شوہر سے کوئی اولاد ہو،خواہ دودھ پلانے سے پہلے ہوں یا دودھ پلانے کے بعد ہو یا وہ کسی اور بچے کو دودھ پلائے یا دودھ پلانے والی کے شوہر کی کسی اور بیوی سے اولاد ہو،خواہ اس کو دودھ پلانے سے پہلے یا بعد،تو یہ سب دودھ پینے والے کے بھائی اور بہن اور ان کی اولاد اس کے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہیں، دودھ پلانے والی کے شوہر کا بھائی اس کا چچا ہے اور اس کی بہن اس کی پھوپھی ہے اور دودھ پلانے والی کا بھائی اس کا ماموں ہے اور بہن اس کی خالہ ہے، اسی طرح دادا، دادی اور نانا، نانی کے رشتے ہیں''،(فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص:343 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

رضاعت(دودھ شریک) رشتہ دوطرفہ متعدی نہیں ہوتا بلکہ جانب واحد سے متعدی ہوتا

ہے، یعنی جس بچی یا بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے، اس پر رضائی ماں باپ کی ساری اولاد حرام ہے، جبکہ رضائی ماں باپ کی اولاد پر صرف یہ بچہ یا بچی حرام ہے، جس نے دودھ پیا ہے، اس کے باقی بہن بھائی حرام نہیں ہے (بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو)۔ لہٰذا فاطمہ بنت رحیم شاہ کی شادی محمد صالح شاہ کے دوسرے بھائیوں سے ہوسکتی ہے، رضاعت کا رشتہ صرف محمد صالح کے ساتھ قائم ہوا ہے، دوسرے بھائیوں کے ساتھ نہیں۔

ثبوتِ رضاعت

سوال:88

میری بیٹی آمنہ کا رشتہ میرے چچازاد بھائی کے بیٹے عامر شہزاد سے ہو رہا تھا، عامر شہزاد نے اپنی خالہ مریداں کا دودھ پیا ہے، جب میری بیٹی آمنہ چھ ماہ کی تھی تو میں اسے گاؤں لے گئی، وہاں ایک روز میں گھر میں کام کاج میں مصروف تھی کہ آمنہ رونے لگی مریداں نے اسے دودھ دینے کی غرض سے گود میں ڈال لیا اور کپڑا اٹھا ہی رہی تھی کہ میں وہاں آگئی اور اس پر غصہ کرنے لگی کہ میرے شوہر کی اجازت نہیں ہے، اس نے آمنہ کو میری گود میں دے دیا، جب میں نے اسے گود میں لیا تو خدا گواہ ہے کہ اس کا منہ سوکھا ہوا تھا، اس وقت آمنہ کی عمر ایک سال تھی اور مریداں کی بیٹی کی ساڑھے تین سال تھی، پھر تین سال قبل جب میں نے مریداں سے پوچھا کہ کیا تم نے میری بیٹی آمنہ کو دودھ پلایا ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ میں نے آمنہ کو دودھ پلایا ہے۔ اب جب رشتے کی بات چلی تو وہ کہتی ہے کہ میں نے آمنہ کو دودھ پلایا ہے اور اس بات پر کوئی گواہ بھی نہیں ہے، ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ کیا عامر شہزاد اور آمنہ اقبال کا آپس میں نکاح جائز ہے یا نہیں؟،

(غلام سکینہ، فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب:

رضاعت کا ثبوت دودھ پلانے والی کے اقرار سے ہوگا یا گواہانِ شرعیہ سے ہوگا۔ عالمگیری میں ہے:

الرضاع یظھر باحد أمرین أحدھما الاقرار والثانی البینة کذا فی البدائع ۔ ولایقبل فی الرضاع الا شھادة رجلین اورجل وامرأتین عدول کذا فی المحیط۔

ترجمہ: ''رضاعت دوطریقوں سے ثابت ہوگی، ایک یہ ہے کہ مرضعہ (دودھ پلانے والی) خود اقرار کرے، دوسرا یہ کہ اس پر شرعی گواہ ہوں، اور شہادت قبول نہیں کی جائے گی مگر یہ کہ دو عادل مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عادل عورتیں ہوں ''محیط'' میں اس طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 صفحہ 347، مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

صورت مسئولہ میں شہادت شرعیہ موجود نہیں ہے، مدعیہ کے بیان میں اضطراب پایا جاتا ہے، جس سے صورت حال مشکوک ہوگئی ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

لا تثبت الحرمة بالشک۔ ترجمہ: ''شک سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 صفحہ 344 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں عامر شہزاد اور آمنہ کا آپس میں نکاح جائز ہے، فقط واللہ اعلم الصواب۔

خالہ کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بھانجی سے نکاح حرام ہے

سوال:89

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ فاطمہ کی خالہ زید کے نکاح میں ہے۔ کیا فاطمہ بھی زید کے ساتھ نکاح کرسکتی ہے؟ اگر کرسکتی ہے تو کیسے اور نہیں کرسکتی تو کیسے، مہربانی فرما کر قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیلاً وضاحت فرمائیں، (محمد جان نعیمی ہزاروی، ضلع وتحصیل مانسہرہ)۔

جواب:

مُحرماتِ نکاح کی نو اقسام میں سے تیسری قسم ''جمع بین المحارم'' ہے، یعنی وہ عورتیں کہ ان میں اگر ایک کو مرد فرض کریں تو دوسری اس کے لئے حرام ہو، مثلاً ''دو بہنیں'' کہ ایک کو مرد فرض کریں، تو بھائی بہن کا رشتہ ہوا یا ''پھوپھی بھتیجی'' کہ پھوپھی کو مرد فرض

کریں، تو ''چچا اور بھتیجی'' کا رشتہ ہوا اور بھتیجی کو مرد فرض کریں، تو ''پھوپھی اور بھتیجے'' کا رشتہ یا ''خالہ بھانجی'' کہ خالہ کو مرد فرض کریں، تو ''ماموں اور بھانجی'' کا رشتہ ہوا اور بھانجی کو مرد فرض کریں، تو بھانجے اور خالہ کا رشتہ ہوا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: والاصل ان کل امرأتین لو صورنا احداھما من أی جانب ذکرالم یجزِ النکاح بینھما برضاع أو نسب لم یجز الجمع بینھما ھکذا فی المحیط۔

ترجمہ: ''اور قاعدہ یہ ہے کہ ایسی دو عورتیں جن میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو ان کا آپس میں نکاح جائز نہ ہو، نسب کے رشتے سے ہی خاص نہیں بلکہ رضاعی رشتے میں بھی دونوں کا جمع کرنا حرام ہے، ''محیط'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1 ص: 277، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

اللہ جل شانہٗ نے محرمات نکاح کے تفصیلی احکام میں ارشاد فرمایا: وان تجمع بین الاختین۔ (ترجمہ) ''اور کسی شخص کا (بیک وقت) اپنے نکاح میں دو بہنوں کا جمع کرنا بھی حرام ہے، (النساء)''۔ آیت میں اگرچہ صراحت کے ساتھ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا گیا ہے، لیکن مفسرین کرام اور فقہاء کرام کا اس پر اجماع ہے کہ ایسی ہر دو عورتوں کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، جن میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو ان دونوں میں حرمت کا رشتہ قائم ہو جائے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ: أنّ رسول اللہ ﷺ قال: "لایُجمع بین المرأۃ وعمّتھا، ولا بین المرأۃ وخالتھا"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بھتیجی اور اس کی پھوپھی'' کو اور ''بھانجی اور اس کی خالہ'' کو نکاح میں ایک ساتھ جمع نہ کیا جائے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5109)''۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ: أنّ رسول اللہ ﷺ نھیٰ عن اربع نسوۃ ان یّجمع بینھن "المرأۃ وعمّتھا" "والمرأۃ وخالتھا"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عورتوں کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے، ''بھتیجی اور اس کی پھوپھی'' اور ''بھانجی اور اس کی خالہ''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:3333)''۔

عن الزھری قال: حدثنی قبیصة بن ذؤیب: أنه سمع أبا ھریرة یقول: نھیٰ النبی ﷺ أن تنکح المرأة علی عمّتها، والمرأة علی خالتها۔ فنری خالة أبیها بتلک المنزلة۔

ترجمہ: ''زہری فرماتے ہیں کہ قبیصہ بن ذویب نے یہ حدیث بیان کی کہ انہوں نے ابو ہریرہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ''عورت اور اس کی پھوپھی'' کو ایک نکاح میں (جمع) کرنے سے منع فرمایا، اور اسی طرح ''عورت پر اس کی خالہ'' کو (جمع کرنے سے منع فرمایا)۔ (زہری کہتے ہیں) ہمارا خیال یہ ہے بیوی کے باپ کی خالہ کا بھی یہی حکم ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5110)''۔

عن ابی ھریرة، عن رسول اللہ ﷺ: "أنه نھیٰ أن تنکح المرأة علی عمّتها، أو خالتها"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ پھوپھی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھتیجی سے نکاح کیا جائے یا بھتیجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی پھوپھی کے ساتھ یا خالہ کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھانجی کے ساتھ یا بھانجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی خالہ سے نکاح کیا جائے، (سنن نسائی، رقم الحدیث:3290)''۔

مزید لکھتے ہیں: فان تزوج الاختین فی عقدة واحدة یفرق بینھما وبینه فان کان قبل الدخول فلا شئی لھما وان کان بعد الدخول یجب لکل واحدة منھما الاقل من مھر مثلھا او من المُسمّٰی کذا فی المضمرات ۔ وان تزوجھما فی عقدتین فنکاح الاخیرة فاسد ویجب علیه أن یفارقھا واذا علم القاضی بذلک یفرق بینھما فان فارقھا قبل الدخول لایثبت شئی من الاحکام وان

فارقها بعد الدخول فلها المهر ويجب الاقل من المسمى ومن مهر المثل وعليها العِدّةُ ويثبت النسب ويعتزل عن امرأته حتّٰی تنقضی عدة أختها كذا فی محيط السرخسی۔

ترجمہ: ''اگر دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کیا تو کسی سے بھی نکاح نہیں ہوا، فوراً دونوں کے درمیان علیحدگی کر دی جائے گی، اگر ازدواجی تعلق قائم ہونے سے پہلے ہی علیحدگی کی گئی تو کوئی مہر واجب نہ ہوا اور اگر اس کے بعد علیحدگی ہوئی، تو ان میں سے ہر ایک کو (اگر دونوں سے دخول ہوا ہو تو) ''مہرِ مثل'' اور ''مقرّر مہر'' میں سے جو کم ہو وہ دیا جائے گا، ''مضمرات'' میں اسی طرح ہے۔ اور اگر دونوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کیا ہو، تو جس سے بعد میں نکاح کیا، وہ فاسد ہوگا اور شوہر پر واجب ہے کہ اس سے فوراً علیحدگی اختیار کر لے، (اگر قاضی کو علم ہو جائے) تو وہ تفریق کر دے پس اگر مباشرت سے پہلے تفریق کی تو اس کے لئے کوئی حکم ثابت نہیں ہے، اور اگر مباشرت کے بعد تفریق ہوئی، تو اس کے لئے مہرِ مثل یا مقرر مہر میں سے جو کم ہو وہ دیا جائے گا، اور اس پر عدت لازم ہوگی، (بچہ پیدا ہو تو) ثابت النسب ہوگا، اور اپنی بیوی سے دور رہے گا جب تک اس کی بہن کی عدّت پوری نہ ہو جائے، ''محیط سرخسی'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 277، 278، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

صورتِ مذکورہ میں فاطمہ اور اس کی خالہ زید کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں، اور یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی قائم کردہ حدیں ہیں جن کی پابندی از حد ضروری ہے۔

حرمتِ مصاہرت

سوال:90

محترم مفتی صاحب! یہ سوال میری چھوٹی ہمشیرہ کا ہے، جو میں ان کے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ آپ اپنی علمی قابلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے شریعت محمدی کی روشنی میں اس کا جواب مرحمت فرمائیں گے۔ میری شادی میرے

تایازاد کزن سے فروری 2002 میں آج سے تقریباً چار سال پہلے ہوئی، سن 1994 میں ہماری منگنی ہوئی شادی سے تقریباً دوسال پہلے کی بات ہے، میں اور میرا بڑا بھائی اپنے تایا کے گھر میں رہ رہے تھے (پڑھائی کے سلسلے میں کیونکہ والدین سعودیہ میں رہتے تھے) میرے تایا مجھ سے اور میرے بڑے بھائی سے کافی پیار کرتے تھے، اکثر مجھ سے اپنی ٹانگیں دبواتے تھے، ایک دن وہ اخبار پڑھ رہے تھے، اور انہوں نے کہا کہ میری ٹانگیں دباؤ، جب میں ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی، تو انہوں نے پوچھا تمہارا پیٹ خراب ہے تو اپنی زبان دکھاؤ، تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کہا کہ اپنی زبان باہر نکالو اور ہاتھ لگا کر کہا کہ تمہاری زبان تو کافی نرم ہے، اور پھر انہوں نے زبان چوس لی، یہ عمل انہوں نے دوبارہ کیا، اللہ گواہ ہے کہ اس میں لکھا سب سچ ہے، اس بات سے میں بہت روئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد گھر میں کافی جھگڑا ہوا، تایا اس بات سے سرے سے ہی منکر ہو گئے، خاندان کے لوگ میری بات کو مانتے بھی تھے، لیکن تایا کے سامنے کہنے کی جرات نہ کر سکے، نہ ہی کسی نے اس بابت شریعت سے رجوع کرنے کے بات کی یا کوشش کی، تایا کیونکہ خاندان میں سب سے بڑے ہیں، اور ان کا خاندان میں کافی رعب و دبدبہ ہے، جس کی وجہ سے کوئی ان سے بحث نہیں کرتا، میرے بار بار منع کرنے کے باوجود خاندان کے بڑوں نے میری شادی تایا کے بیٹے کے ساتھ کردی، منگنی کے تقریباً 8 سال گزرنے کے بعد میرے دل میں تایازاد کے لئے پسندیدگی کے جذبات بھی تھے۔ ہماری شادی ہوئی، اس واقعہ کے بعد جو کہ بڑی مشکل سے ہوئی، شادی کے بعد اس گھر میں، مجھ پر ہروقت ایک خوف طاری رہتا تھا، شادی سے پہلے کا واقعہ میرے دماغ پر ہروقت سوار رہتا ہے اور مجھے انتہائی خوف محسوس ہوتا ہے، مختلف جھگڑے ہوئے۔

تایا کا بیان ہے کہ: ”بلکہ وہ لڑکی آئس کریم کھا رہی تھی، میں نے اس سے مانگی تو اس نے کہا کہ ختم ہوگئی ہے اور صرف میرے منہ میں باقی ہے، جو کہ میں نے (یعنی تایا نے) اپنے زبان کے ساتھ اٹھالی، اس وقت اس کی زبان بھی میرے منہ میں آگئی تھی، اور کہ اس میں

کسی قسم کی شہوت نہ تھی اور میں اس پر قرآن اٹھانے کو تیار ہوں"۔

اب اصل صورتحال (جوکہ میں نے سوال میں بیان کی ہے) کی روشنی میں، میں حلفاً کہتی ہوں کہ تایا کا یہ بیان مکمل طور پر جھوٹ ہے۔

میں اور میرے گھر والے اس مسئلہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں، اور ہم نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی تحریری فتوی نہیں لیا، اس لئے جناب سے گذارش ہے کہ شریعت کی روشنی میں تفصیل سے بتائیں کہ میری ہمشیرہ کے لئے کیا حکم ہے؟ تحریر فرمائیں، (حماد آصف، رجسٹرار آفس نیشنل الیکٹرک پاور ریگولیٹری اتھارٹی، سیکٹر G-5/2، اسلام آباد)۔

جواب:

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، جس میں ایک قسم حرمتِ مصاہرت ہے، مرد وعورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں، تو عورت کے اصول وفروع مرد پر حرام ہوجائیں گے۔ اور مرد کے اصول وفروع عورت پر حرام ہوجائیں گے۔ اس کو حرمتِ مصاہرۃ کہتے ہیں۔

اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وکما تثبت هذه الحرمة بالوطء تثبت بالمس والتقبيل والنظرالى الفرج بشهوة كذافى الذخيرة۔۔۔

ترجمہ: " حرمت مصاہرت، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرح شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ "ذخیرہ" میں ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں:

وكذا لوعضها بشهوة هكذا فى الخلاصه۔

ترجمہ: " اور اسی طرح اگر شہوت کے ساتھ دانت سے کاٹا ہو تو اس سے بھی حرمت ثابت ہوجائے گی، "خلاصہ" میں بھی اسی طرح ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 274-275، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: قال فى "الذخيرة": واذا قبلها اولمسها او نظرالى

فرجها ثم قال: لم یکن عن شهوة، ذکر الصدر الشهید انه فی القبلة یفتی بالحرمة، مالم یتبین انه بلا شهوة، وفی المس والنظر لا، الا ان تبین انه بشهوة لان الاصل فی التقبیل الشهوة، بخلاف المس والنظر،.......... ومنهم من فصل فی القبلة فقال: ان کانت علی الفم یفتی بالحرمة ، ولا یصدق انه بلاشهوة ، وان کانت علی الرأس اوالذقن اوالخد فلا الا اذا تبین انه بشهوة و کان الامام ظهیر الدین یفتی بالحرمة فی القبلة مطلقا، ویقول: لایصدق فی انه لم یکن بشهوة۔

ترجمہ: '''' ذخیرہ'' میں فرمایا: جب (کسی عورت کو) بوسہ دیا یا چھوایا اس کی شرمگاہ (فرج) کی طرف نظر کی، پھر کہتا ہے کہ یہ عمل شہوت سے نہیں تھا، صدرالشہید ذکر کرتے ہیں کہ بوسہ لینے میں حرمت کا فتویٰ دیا جائے گا، جب تک کہ یہ بالکل واضح نہ ہو کہ یہ بوسہ لینا شہوت کے بغیر تھا اور چھونے اور (شرمگاہ کی طرف) نظر کرنے پر حرمت کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا، سوائے اس صورت کے کہ (ان دونوں امور کا) شہوت کے ساتھ ہونا بالکل واضح ہو، کیونکہ بوسہ لینے میں اصل شہوت ہے اور دیکھنے میں ایسا نہیں ہے (یعنی اصل شہوت نہیں ہے)، بعض فقہاء نے بوسہ لینے میں بھی تفصیل بیان کی ہے اور فرمایا ہے کہ: اگر بوسہ منہ پر لیا ہو، تو فتویٰ حرمتِ مصاہرت پر ہے اور اس کا شہوت کےبغیر ہونا سچا نہیں جانا جائے گا، اور اگر بوسہ پیشانی پر لیا ہو یا ٹھوڑی پر یا رخسار پر تو حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی، جب تک کہ شہوت سے نہ ہو۔ اور امام ظہیرالدین بوسہ لینے میں مطلقاً حرمت کا فتویٰ دیتے ہیں، اور فرماتے ہیں: کہ اس کا بلاشہوت ہونے کا دعویٰ سچا نہیں مانا جائے گا۔

علامہ شامی آگے چل کر لکھتے ہیں:

وقال فی "الفیض": ولو قام الیها وعانقهامنتشرا اوقبلها وقال لم یکن عن شهوة لا یصدق، ولو قبل ولم تنتشر آلته وقال کان عن غیرشهوة یصدق، وقیل لا یصدق لو قبلها علی الفم، وبه یفتی اه۔

ترجمہ: '' اور '' فیض'' میں فرمایا: کہ اگر اٹھ کر اس عورت کی طرف بڑھا اور اس کو گلے لگایا،

اس حال میں کہ انتشارِ آلہ تھا یا بوسہ لیا اور کہتا ہے کہ شہوت سے نہیں تھا، تو اس کے قول کو نہیں مانا جائے گا۔ اور اگر اس نے بوسہ لیا اور انتشارِ آلہ نہیں ہوا اور وہ کہتا ہے کہ شہوت سے نہیں تھا تو اس کا قول معتبر مانا جائے گا اور بعض فقہاء نے فرمایا کہ اگر منہ پر بوسہ لیا ہے، تو اس کے بلاشہوت ہونے کے دعویٰ کی تصدیق نہیں کی جائے گی، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4 ص:90 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ویشترط أن تکون المرأة مشتهاة کذا فی التبیین، والفتویٰ علی أن بنت تسع محل الشهوة لا مادونها کذا فی معراج الدرایة وقال الفقیه ابواللیث مادون تسع سنین لاتکون مشتهاة وعلیه الفتویٰ کذا فی فتاوی قاضی خان۔

ترجمہ: "اور حرمت مصاہرت کے لئے شرط ہے کہ عورت مشتہاۃ ہو (یعنی وہ عمر اور جسمانی وضع کے اعتبار سے ایسی ہو کہ اسے دیکھ کر مرد کو جنسی شہوت آئے)، "تبیین"، میں اسی طرح ہے، اور فتویٰ اس پر ہے کہ نو سال کی عمر والی لڑکی محل شہوت ہے، اگر اس کی عمر اس سے کم ہو تو وہ محل شہوت نہیں ہے، "معراج الدرایہ" میں بھی اسی طرح ہے، اور فقیہ ابواللیث فرماتے ہیں کہ جو لڑکی نو سال سے کم عمر کی ہو، وہ مشتہاۃ نہیں ہے، (یعنی اس پر شہوت کی نظر ڈالنے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی)، اسی پر فتویٰ ہے، فتاویٰ قاضی خان میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:275-274، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

اب صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدقِ سائل لڑکی کے تایا اور خسر نے اس کی زبان چوسی اور خسر اس بات کا اقرار بھی کرتا ہے، اور منہ کا بوسہ لینے کی صورت میں مرد کا دعوائے عدمِ شہوت غیر معتبر ہے، جب کہ یہاں اس سے بھی بڑھ کر زبان بھی چوسی گئی ہے، جبکہ قرائن بھی اس حقیقت کے مؤید ہیں کہ اس شخص نے یہ عمل شہوت سے کیا ہے، اس لئے مذکورہ بالا لڑکی اور اس کے شوہر کے درمیان حرمت مصاہرت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور دونوں کا آپس میں نکاح شروع ہی سے ناجائز تھا، اس لئے دونوں کو فوراً علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔

حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں

سوال:91

ایک گھر میں تقریباً14 سال سے Joint Faimly رہتی ہے،ابھی پچھلے جمعہ اچانک بھابھی نے اپنے دیور (سائل) پر الزام لگایا کہ اس نے ان کے کمرے میں آکر (جہاں وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سورہی تھی) اُن کے رخسار پر بوسہ دیا ہے یہ بھابھی کا قول ہے،جبکہ دیور (سائل) کا قول یہ ہے کہ یہ سب ڈرائنگ روم میں سورہے تھے، میں اپنے کسی کام سے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ بھابھی کی قمیص حد سے زائد پیچھے سے اٹھی ہوئی ہے، میں اس کو ڈھانپنے کے لئے گیا،ان کا بیٹا بھی ساتھ سورہا تھا ڈھانپتے ہوئے اچانک میرا ہاتھ بھابھی کے چہرے پر لگ گیا جس سے وہ اٹھ گئیں اور انہوں نے غلط بات سمجھی۔

جواب طلب بات یہ ہے کہ آیا بھابھی کا قول معتبر ہوگا یا دیور کا؟ میری بیوی کے بقول بھابھی نے مجھ کو معاف کر دیا ہے لیکن بھائی اور بھابھی نے ترکِ کلام کیا ہوا ہے،میرے لئے شریعت کا کیا حکم ہے؟،(خالد احمد،بلاک6 گلشن اقبال،کراچی)۔

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وان ادعت الشھوۃ)فی تقبیلہ أو تقبیلھا ابنہ (وأنکرھا الرجل فھو مصدق)۔

ترجمہ:''اور اگر عورت نے دعویٰ کیا کہ مرد نے اس کو بشہوت چھوا،یا اس عورت نے اس کے بیٹے کو بشہوت چھوا اور مرد نے اس کا انکار کیا تو مرد کا قول معتبر مانا جائے گا،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد:4ص:92مطبوعہ داراحیاء التراث العربی،بیروت)۔''

حدیث میں ہے:عن عقبۃ بن عامر أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: "ایاکم والدخول علی النساء" فقال رجل من الانصار: یا رسول اللّٰہ افرأیت الحمو قال الحمو الموت،''(اجنبی)عورتوں کے پاس جانے سے اجتناب کرو،انصار میں سے ایک شخص

نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! دیور کا کیا حکم ہے؟، فرمایا کہ دیور موت ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث 5570، جلد9، مکتبہ نزارِ مصطفیٰ الباز مکۃ المکرمۃ)

عن علی بن الحسین: کان النبی ﷺ فی المسجد، وعندہ ازواجه، فرحن، فقال لصفية بنت حيي: "لاتعجلي حتّیٰ أنصرف معک". وکان بیتها فی دار أُسامة، فخرج النبی ﷺ معها، فلقیه رجلان من الانصار، فنظرا الی النبی ﷺ ثمّ أجازا، وقال لهما النبی ﷺ: "تعالیا، انها صفیة بنت حیی". قالا: سبحان الله یارسول الله ﷺ، قال: "انّ الشیطان یجری من الانسان مجری الدم، وانّی خشیت أن یلقی فی أنفسکما شیئاً".

ترجمہ: "علی بن حسین سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تھے اور آپ کی زوجہ مطہرہ آپ کے پاس تھیں، وہ جانے لگیں تو آپ نے حضرت صفیہ سے فرمایا: ٹھہرو تا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں اور ان کا حجرہ حضرت اسامہ کے مکان میں تھا۔ نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ نکلے تو آپ کو انصار کے دو شخص ملے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا اور آگے نکل گئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا: ادھر آؤ، یہ صفیہ بنت حیی ہے (یعنی میری بیوی ہے)۔ دونوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ: سبحان اللہ! (یعنی آپ کی ذات کے بارے میں مومن کسی بدگمانی کا تصور بھی نہیں کرسکتا) آپ نے فرمایا کہ شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح دوڑتا ہے تو مجھے خدشہ ہوا کہ مبادا وہ تمہارے دل میں کوئی وسوسہ ڈال دے، (صحیح بخاری، جلد2 رقم الحدیث 2038، مطبوعہ مکتبۃ العصریۃ، بیروت)۔

مسلمان کو چاہئے کہ وہ مواضع تہمت اور مواقع تہمت سے ہمیشہ اجتناب کرے، اپنی عزت وآبرو کا تحفظ مومن کی شرعی ذمہ داری ہے، کسی ایسے مقام پر جانا یا ٹھہرنا، جہاں دوسرے لوگ بدگمانی کی بنا پر ہدفِ تہمت بنا سکتے ہوں۔ ایک روایت میں ہے: من سلک مسالک الظن اتھم، ورواہ الخرائطی فی مکارم الاخلاق مرفوعاً بلفظ: من اقام نفسه مقام التھم فلایلومن من اساء الظن به۔

ترجمہ: جو بدگمانیوں کی راہوں پر چلے گا، وہ ہدف تہمت بنے گا، اور مکارم اخلاق میں خرائطی نے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا کہ" جو مقامِ تہمت پر ٹھہرا، تو پھر اسے چاہئے کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے خود انہیں موقع فراہم کیا)، علامہ اسماعیل بن محمد العملونی الجراحی نے مندرجہ بالا روایات کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ: اگرچہ "اتقوا مواضع التهمة"، ترجمہ: (مقامات تہمت سے بچو!) کی روایت لفظاً ثابت نہیں ہے، لیکن مندرجہ بالا روایات کی بنا پر معنیً ثابت ہے، (کشف الخفاء و مزیل الالباس، جز الاول، صفحہ 44، مطبوعہ مکتبۃ الغزالی، دمشق)۔

صورتِ مسئولہ میں حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوئی، آپ کی بھابھی نے آپ کو معاف کر کے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے اور چاہئے کہ ترکِ کلام نہ کریں اور دیور کے لئے لازم ہے کہ آئندہ محتاط رہے۔

شادی اور تقریبات پر فائرنگ اور آتش بازی

سوال:92

شادی کے موقع پر فائرنگ کرنا کیسا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مدلل ارشاد فرمائیں، (سلمان حسین، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

زمانہ قدیم سے ہی حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں میں طرزِ بود و باش، معاشرتی میل جول اور خوشی و غم کے جذبات و احساسات کے پیرایۂ اظہار کے طور طریقے بدلتے چلے آرہے ہیں، اس حوالے سے مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کی اپنی ایک ثقافت ہوتی ہے، جو اس قوم کی شناخت بھی ہوتی ہے اور ہر قوم خوشی کا اظہار زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی ثقافت کے مطابق کرتی رہی ہے، مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ رسوم و رواج اور ثقافتیں بھی بدلتی رہتی ہیں، کہیں سادگی کا عنصر نمایاں، تو کہیں اظہارِ ثقافت کی زیادہ سے زیادہ نمود و نمائش پائی جاتی ہے، اور وہ رسومات جب تک شریعت سے

متصادم نہ ہوں، شرعاً ان پر طعن نہیں کیا جاسکتا، اور ان رسومات کے مذموم ومحمود ہونے کا مدار نیت پر ہے جیسا کہ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: فی الواقع نکاح میں بغرضِ اعلان بندوقیں چھوڑنے کی ممانعت شرع میں کہیں ثابت نہیں۔ ہلالِ عید اور رمضان میں صدہا سال سے توپوں کے فائر کئے جاتے ہیں اس سے بھی اعلان ہی مقصود ہوتا ہے اس اعلان پر شرعاً عمل کا جزئیہ ردالمحتار میں مذکور ہے۔نیتِ ریا وتفاخر نہ فقط شادی کی بندوقوں بلکہ نماز کو حرام کردیتی ہے، رسم کا اعتبار جب تک کسی فسادِ عقیدہ پر مشتمل نہ ہو اصل رسم کے حکم میں رہتا ہے اگر رسم محمود ہے، محمود ہے، مذموم ہو مذموم ہے، مباح ہو مباح ہے، واللہ تعالیٰ اعلم ،(فتاویٰ رضویہ ،جلد 24،ص:119 ،رضا فاؤنڈیشن لاہور)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے شادیوں میں کی جانے والی مختلف رسومات مثلاً آتش بازی، بندوق اور گانا بجانا، لکڑی کھیلنا، نوشہ (دولہا) کو پالکی میں سوار کرنے سے متعلق سوال ہوا، آپ نے جواب میں فرمایا: نوشہ کو پالکی میں سوار کرنا مباح وجائز ہے لان من الرسوم العامۃ التی لا مضر فیھا من الشرع ،(اس لئے کہ یہ اُن عادی رسموں میں سے ہے شریعت میں جن پر کوئی طعن نہیں)اور لکڑی پھینکنا ، بندوقیں چھوڑنا اور اس قسم کے سب کھیل جائز ہیں جبکہ اپنے اور دوسرے کی مضرت کا اندیشہ نہ ہو، ایک اور سوال کہ'' اعلان کے لئے شادی میں بندوقیں چھوڑنا جائز ہے یا نہیں؟'' کے جواب میں لکھتے ہیں : جائز ہے۔اخرج الترمذی عن ام المؤمنین الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھا قالت قال رسول اللہ ﷺ اَعلنوا ھذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوہ علیہ بالدفوف وروی احمد بسند صحیح وابن حبان فی صحیحہ والطبرانی فی الکبیر وابو نعیم فی الحلیۃ والحاکم فی المستدرک عن عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنھما عن النبی ﷺ قال اَعلنوا النکاح ،واللہ تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ:'' امام ترمذی نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تخریج فرمائی کہ آپ نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو! نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا

کرو) اور مسجدوں میں نکاح کیا کرو اور اس کی تشہیر کے لئے دف بجایا کرو۔ امام احمد نے سند صحیح سے ابن حبان نے اپنی صحیح میں، طبرانی نے الکبیر میں، اور ابونعیم نے الحلیہ میں اور حاکم نے المستدرک میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے نبی کریم ﷺ سے روایت فرمائی کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نکاح کا اعلان کیا کرو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 277، 289، 290، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔ آج کل آتش بازی کی ممانعت کا قانون موجود ہے اور تقریبات کے موقع پر فائرنگ سے بعض اوقات حادثات بھی رونما ہو جاتے ہیں، اس لئے قانون کی پابندی بھی ضروری ہے اور فی نفسہٖ از روئے شرع پابندی کے جواز کے باوجود احتیاط پر عمل کرنا افضل ہے، اور اس حد تک آتش بازی اور فائرنگ جو اسراف کی حد میں داخل ہو جائے، بہر حال ممنوع ہے۔ آگ کا کھیل تو ویسے بھی مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔

جبری نکاح کا حکم

سوال:93

میری بیٹی رضوانہ جس کی شادی میری سالی کے بیٹے کے ساتھ ہوئی۔ دوسری طرف میری بیوی گردوں کی خرابی کی وجہ سے 2005ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئی، اس پر میری بیٹی کراچی آئی ہوئی تھی۔ چونکہ میری بیٹی امید سے تھی، میری بیٹی نے بڑے آپریشن سے بچے کو جنم دیا۔ اس کے تین ماہ بعد اس کے شوہر نے کہا کہ میری ماں نے بمع بیوی اور بچے اپنے پاس سیہون بلانے کو کہا ہے، اس پر میں نے اجازت دی کہ اپنے گھر سیہون جاؤ۔ اجازت دینے کے بعد چونکہ میری بیٹی آپریشن کی وجہ سے کمزور تھی۔ اس کے ساتھ اس سے تیسرے نمبر پر میری بیٹی ارم کو ساتھ روانہ کیا تاکہ بچے کو سنبھال سکے۔ واضح ہو کہ اس سے قبل میری بیٹی کی ساس نے میری دوسری بیٹی ارم کا رشتہ اپنے دوسرے بیٹے کے لئے مانگا تھا۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میری پہلی بیٹی مشکلات میں تھی۔ اس کا شوہر کچھ بھی نہیں کماتا۔ اور کچھ بھی جو تھوڑا بہت کماتا ہے۔ وہ ماں کو دے دیتا

ہے۔بجائے اپنی بیوی کو دینے کے۔جوکہ ازروئے شریعت محمدی ﷺ بیوی کا حق ہے۔ اور شوہر کا فرض ہے۔اس کا شوہر کوئی اخراجات میری بیٹی کے برداشت نہیں کرسکتا۔اسی وجہ سے دوسرے رشتے کے لئے میں نے انکار کر دیا۔اور اپنے تیسرے نمبر والی بیٹی کی منگنی کہیں اور کردی۔جس میں میرے داماد کی مرضی بھی شامل تھی۔بہرحال پہلی شادی شدہ بیٹی کے ساتھ بچے کی دیکھ بھال کے لئے اپنی تیسرے نمبر والی بیٹی کو بھیجا۔اس کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد جب ارم کراچی آئی۔تو اس نے بتایا کہ میرا زبردستی نکاح کروادیا اپنے بیٹے کے ساتھ اور ان کو معلوم تھا۔کہ ارم کسی اور کی امانت ہے۔حالانکہ میں اس رشتے کے لئے دو دفعہ منع کرچکا تھا۔ارم کے نکاح میں نہ میں شریک ہوا اور نہ ہی ہمارے رشتے داروں میں سے کوئی یہاں تک کہ میری شادی شدہ بیٹی جو کہ اسی گھر میں رہتی ہے۔اسے بھی پتہ نہ تھا۔اس پر میری تیسرے نمبر والی بیٹی نے کہا کہ مجھ سے زبردستی نکاح کروایا ہے۔میں اس وقت ہوش میں نہیں تھی۔مجھ پر جادو ہوا تھا۔اور میں اس رشتے سے خوش نہیں ہوں، جہاں میرے ماں باپ نے میری منگنی طے کی ہے، میں وہیں خوش ہوں۔میں وہاں خوش نہیں رہوں گی۔ اسباب یہ ہے کہ میری پہلی بیٹی وہاں بھوک سے مررہی ہے۔اس کے اخراجات پورے نہیں کرسکتا۔اس بنا پر اپنی دوسری بیٹی نہیں دینا چاہتا۔آپ سے گذارش ہے کہ شریعتِ محمدی ﷺ کے مطابق فتویٰ صادر فرمائیں کہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟۔(محمد نواز، ڈیفنس ویو، فیز II بنگلہ نمبر G-199 مدینہ اسٹاپ نذر ارم مسجد کراچی)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں فقہائے احناف کی تصریحات کے مطابق جبر کی حالت میں نکاح ہوجاتا ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ لکھتے ہیں:

اقول وبتقریری ھذا اندفع ماعسیٰ ان یتوھم من ان النکاح مما یستوی فیه الھزلِ والجدفلا یحتاج الی نیة وقصد متی لو تکلما بالایجاب والقبول ھازلین اومکرھین ینعقد۔

ترجمہ:''اقول (میں کہتا ہوں) میری اس تقریر سے اس شبہ کا ازالہ ہوگیا، جس میں کہا گیا کہ نکاح تو ان امور میں سے ہے، جن میں مذاق اور قصد برابر ہیں، لہٰذا اس میں قصد اور ارادہ کی ضرورت نہیں حتی کہ جب مرد وعورت نے ایجاب وقبول کے کلمات بول دیئے اگر چہ مذاق یا جبر سے کہے ہوں، تو نکاح ہو جائے گا، (فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۱ ص:128)''۔

مزید لکھتے ہیں:

نکاح اگر چہ جبر واکراہ سے بھی ہو جاتا ہے، فی الهندية الاصل ان تصرفات المکره کلها قولا منعقدة عندنا الا ان مايحتمل الفسخ منه کالبيع والاجارة يفسخ وما لايحتمل الفسخ منه کالطلاق والعتاق والنکاح والتدبير والاستيلاد والنذور فهو لازم کذا فی الکافی ا۔ھ

ترجمہ:''ہندیہ میں ہے قاعدہ یہ ہے کہ جس پر جبر کیا گیا ہو اس کے اس حالت کے تمام تصرفات نافذ العمل ہوں گے، ہاں وہ تصرفات جو فسخ کا احتمال رکھتے ہوں جیسے بیع اور اجارہ کہ یہ فسخ قرار پائیں گے، اور جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتے ،مثلاً طلاق، عتاق، نکاح، مدبّر بنانا، ام ولد بنانا اور نذر تو یہ امور لازم ہو جائیں گے، (فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۱ ص:203-202)''۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں نکاح منعقد ہوگیا۔

جعلی نکاح نامے کی حیثیت

سوال:94

ایک شخص نے کسی لڑکی سے جھوٹا اور جعلی نکاح نامہ تیار کرلیا ہے۔لڑکی اور اس کے والدین کو اس نکاح کا کوئی علم نہیں۔ازراہِ کرم یہ ارشاد فرمائیں کہ اس جھوٹے نکاح نامہ کی بنیاد پر شرعی نکاح ثابت ہوگا یا نہیں ہوگا؟ یعنی اس صورت میں ہمیں لڑکے سے طلاق لینا ضروری ہے؟ نکاح نامہ میں جو وکیل اور گواہان رکھے گئے ہیں۔وہ سب کے سب فرضی ہیں اور ہم لڑکی والے ان کو پہچانتے بھی نہیں۔

واضح رہے کہ لڑکی نے نکاح نامہ پر نہ دستخط کئے ہیں اور نہ ایجاب وقبول ہوا ہے، (پروفیسر

میر محمد سومرو، ساکن ہنگورجہ تحصیل سوبھودیرہ ضلع، خیرپور میرس)۔

جواب:

استفتاء میں مستفتی نے چند دعوے کئے ہیں:

(1) لڑکی کے ساتھ نکاح کے ثبوت کے لئے نکاح نامہ تو موجود ہے، لیکن جعلی ہے۔

(2) نکاح نامے میں دلہا و دلہن کے دستخط اور گواہوں کے نام اور دستخط موجود ہیں، لیکن مستفتی کا دعویٰ ہے کہ لڑکی کے دستخط فرضی اور جعلی ہیں اور گواہان بھی فرضی ہیں۔

(3) ایجاب وقبول ہوا ہی نہیں ہے۔

ہمارا منصب افتاء ہے، قضا نہیں ہے، ہمارا جواب اس مفروضے پر مبنی ہوتا ہے کہ استفتاء میں بیان کردہ بیان اور حقائق اگر درست ہیں، تو صورتِ مسئولہ کا شرعی جواب یہ ہے، باقی رہا یہ سوال کہ استفتاء میں بیان کردہ صورتِ مسئلہ آیا حقیقت پر مبنی ہے اور واقعہ کے مطابق ہے؟ قطعیت کے ساتھ اس کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔ پس اگر استفتاء میں بیان کردہ صورتِ مسئلہ درست ہے تو شرعاً نکاح منعقد ہی نہیں ہوا، لہٰذا طلاق کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ طلاق، اس نکاح کی قید سے آزاد کرنے کا نام ہے، جو شرعاً منعقد ہو چکا ہو، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

غیر رجسٹرڈ نکاح کی شرعی حیثیت

سوال:95

نیاز بی بی بنت شیر اکبر کا نکاح محمد حنیف ولد محمد اسلم خان کے ساتھ 4، اپریل 1997ء کو مصری خان ولد فضل الرحمٰن کی وکالت پر گواہان حاجی محمد نور ولد نواب اور محمد ایوب ولد نواب کے روبرو قاضی نکاح خواں نے پڑھایا۔ جس میں نیاز بی بی کے والد شیر اکبر اور ان کے ساتھ کئی قریبی رشتے دار بھی موجود تھے، اس نکاح کا اندراج رجسٹر میں نہیں کرایا، جو کہ ہمارے ہاں اکثر رخصتی پر یہ نکاح رجسٹرڈ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ بغیر رجسٹریشن نکاح ہوا یا نہیں؟ محمد حنیف کے طلاق دیئے بغیر نیاز بی بی دوسرے فریق سے نکاح کر سکتی ہے؟ (نصیر احمد الحسنی، اسلامک سینٹر، نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

نکاح ایجاب وقبول سے منعقد ہوتا ہے، نکاح کے شرعی طور پر منعقد ہونے کے لئے فارم پر کرنا یا رجسٹریشن کرانا شرط نہیں، البتہ یہ قانونی ضرورت بھی ہے اور دستاویزی ثبوت کی وجہ سے تنازعات کے حل میں مدد ملتی ہے، لہٰذا یہ مستحسن امر ہے اور ایسا کرنا بہتر ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: '' قاضی کا رجسٹر شرعاً کوئی شرطِ نکاح نہیں، رجسٹر آج سے نکلے ہیں، پہلے نکاح کیونکر ہوتے تھے، ہاں یادداشت کے لئے درج ہونا بہتر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد:21،ص:169، جلد:23،ص:193، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن،)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: النکاح ینعقد بالایجاب والقبول۔ ترجمہ: '' نکاح ایجاب وقبول سے منعقد ہوجاتا ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد1،ص:270، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

لہٰذا مذکورہ بالا گواہوں کی موجودگی میں محمد حنیف کا نکاح نیاز بی بی سے منعقد ہوگیا اور چونکہ نیاز بی بی کے والد بھی نکاح کے وقت موجود تھے، اس لئے بجا طور پر ولی کی رضا بھی اس میں شامل ہے۔ اور اب وہ اس کی پابند ہے، بغیر اس کے طلاق دیئے، یا اس کی زندگی میں اس کے نکاح میں رہتے ہوئے کسی اور شخص سے نکاح کرنا حرام ہے اور اگر نکاح کیا تو منعقد ہی نہیں ہوگا اور زنا کی مرتکب ہوگی۔

میاں بیوی کے ایک دوسرے پر الزامات لگانے سے ازخود نکاح باطل نہیں ہوتا

سوال:96

ایک دفعہ T.V پر میں نے کسی وکیل سے سنا کہ اگر میاں بیوی ایک دوسرے پر الزامات لگائیں اور اگرچہ وہ غلط ہوں یا صحیح، تو شرعی حیثیت سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ مجھے آپ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ کیا یہ درست ہے؟، (اسامہ بن سہیل، گلشن اقبال اصفہانی روڈ، کراچی)۔

جواب:

وکیل کا یہ بیان شرعاً غلط اور باطل ہے کہ اگر زوجین (میاں بیوی) ایک دوسرے

پر زنا کی تہمت لگائیں، تو اس امر سے قطع نظر کہ تہمت زنا فی الواقع صحیح ہے یا غلط، ان دونوں کا نکاح از خود (Automaticaly) ٹوٹ جائے گا، ایسا ہرگز نہیں ہے، وکیل صاحب کو شریعت کا علم نہیں ہے اور شرعی علم کے بغیر ایسے فتوے جاری نہیں کرنے چاہئیں۔ اگر شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے، یا اس کے نکاح میں رہتے ہوئے اس عورت کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے، اسے ولد الزنا کہے اور اسے اپنی صحیح النسب اولاد ماننے سے انکار کردے، اور پھر معاملہ قاضی کی عدالت میں پہنچ جائے تو قاضی عورت سے شوہر کے دعوے (یعنی الزامِ زنا) کی صداقت کے بارے میں پوچھے گا، اگر وہ اقرار کرے تو اس پر حدِ زنا جاری ہوگی، لیکن اگر وہ شوہر کے دعوے اور الزام کو رد کردیتی ہے اور اپنی عفت اور پاک دامنی کا دعویٰ کرتی ہے (ظاہر ہے کہ یہ اس صورت حال کی بابت ہے، جب شوہر کے پاس اپنی بیوی پر ثبوتِ زنا کے گواہ نہیں ہیں اور بیوی اعتراف جرم سے انکاری ہے)، تو قاضی ان دونوں کے درمیان ''لعان'' کرائے گا، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۞ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۞ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞

ترجمہ: ''اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں، اور ان کے پاس خود ان کے سوا اور کوئی گواہ نہ ہوں، تو ان میں سے کسی ایک شخص کی گواہی یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے کہ بے شک وہ (اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگانے میں) سچوں میں سے ہے ○ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو ○ اور عورت سے حدِ زنا اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بے شک وہ (یعنی اس کا خاوند) ضرور جھوٹوں میں سے ہے ○ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہو اگر وہ (خاوند) سچوں میں سے ہو ○ (النور: 6 تا 9)''۔ حدیث مبارک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما: أن ھلال بن امیة قذف امرأته عندالنبی ﷺ بشریک بن سحماء، فقال النبی ﷺ: "البینة أوحدٌ فی ظَھرک" فقال: یارسول اللّٰہ، اذا رأی احدنا علی امرأته رجلا، ینطلق یلتمس البینة؟ فجعل یقول : "البینة والا ؟حد فی ظھرک"۔ فذکرحدیث اللعان۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر شریک بن سحماء کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی (اور نبی ﷺ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا)،تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم گواہ پیش کرو، ورنہ تمہاری پیٹھ پر حدقذف کے کوڑے لگائے جائیں گے،اس نے کہا: یارسول ﷺ! جب ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی اجنبی شخص کو حالتِ گناہ میں دیکھے،تو کیا وہ گواہوں کوتلاش کرنے چل پڑے گا؟، آپ نے پھر یہی فرمایا کہ تم گواہوں کو پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر حدِ قذف لگائی جائے گی، پھر''لِعان'' کے احکام نازل ہوئے،(صحیح بخاری،جلدنمبر 2،رقم الحدیث:2671،مطبوعہ مکتبہ عصریہ،بیروت)''۔

امام مسلم حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لِعان جاری کرنے سے پہلے شوہر کو(ان الفاظ کے ساتھ)نصیحت وتذکیر فرمائی :انّ عذاب الد نیا اھون من عذاب الآخرة ،قال :لا والّذی بعثک بالحق ما کذبت علیھا، ثم دعاھافوعظھا وذکّرھا واخبرھا انّ عذاب الدنیا اھون من عذاب الآخرة۔

ترجمہ:''دنیا کی سزا(حدقذف) آخرت کے عذاب کے مقابلے میں معمولی ہے،اس شخص نے کہا:قسم اس ذات کی جس نے آپ کوحق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے اس پر جھوٹی تہمت نہیں لگائی ۔ پھر آپ نے اس عورت کو بلایا اوراس کو وعظ ونصیحت کی (یعنی عذاب آخرت سے ڈرایا)اورفرمایا: دنیا کی سزا(حدزنا) آخرت کے عذاب کے مقابلے میں بہت معمولی ہے،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:3676)''۔

لِعان کا طریقہ:شوہر قاضی کے سامنے چار باراللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہے گا کہ وہ (اپنی بیوی پر

زنا کا الزام لگانے میں) سچا ہے، اور پانچویں بار کہے گا کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، پھر بیوی چار مرتبہ قاضی کے سامنے قسم کھا کر یہ کہے گی کہ میرا شوہر مجھ پر زنا کا الزام لگانے میں جھوٹا ہے اور پانچویں بار کہے گی کہ اگر اس کا شوہر اس پر زنا کا الزام لگانے میں سچا ہو تو اس (عورت) پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو۔

لِعان کی چند شرطیں ہیں، ان کی بابت علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

لِعان کے لئے چند شرطیں ہیں:" (1) نکاح صحیح ہو، اگر اس عورت سے اس کا نکاح فاسد ہوا اور تہمت لگائی، تو لِعان نہیں (2) زوجیت قائم ہو، خواہ دخول ہوا ہو یا نہیں لہٰذا اگر تہمت لگانے کے بعد طلاق بائن دینے کے بعد تہمت لگائی یا زوجہ کے مرجانے کے بعد، تو لِعان نہیں اور اگر تہمت کے بعد رجعی طلاق دی یا رجعی طلاق کے بعد تہمت لگائی، تو لِعان ساقط نہیں (3) دونوں آزاد ہوں (4) دونوں عاقل ہوں (5) دونوں بالغ ہوں (6) دونوں مسلمان ہوں (7) دونوں ناطق ہوں یعنی ان میں کوئی گونگا نہ ہو (8) ان میں کسی پر حدِ قذف نہ لگائی گئی ہو (9) مرد نے اپنے اس قول پر گواہ نہ پیش کئے ہوں (10) عورت زنا سے انکار کرتی ہو اور اپنے کو پارسا کہتی ہو اِصطلاحِ شریعت میں پارسا اس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ وطی حرام نہ ہوئی ہو نہ وہ اس کے ساتھ مُتّہَم ہو لہٰذا طلاق بائن کی عدت میں اگر شوہر نے اس سے وطی کی اگر چہ وہ اپنی نادانی سے یہ سمجھتا تھا کہ اس سے حلال ہے تو عورت عفیفہ نہیں یوں ہی اگر نکاح فاسد کر کے اس سے وطی کی تو عفت جاتی رہی یا عورت کی اولاد ہے جس کے باپ کو یہاں کے لوگ نہ جانتے ہوں اگر چہ حقیقتاً وہ ولد الزنا نہیں ہے یہ صورت مُتّہَم ہونے کی ہے اس سے بھی عفت جاتی رہتی ہے اور اگر وطی عارضی سبب سے حرام ہو، مثلاً حیض ونفاس وغیرہ میں (جن میں وطی حرام ہے) وطی کی، تو اس سے عفت نہیں جاتی (11) صریح زنا کی تہمت لگائی ہو یا اس کی جو اولاد اس کے نکاح میں پیدا ہوئی اس کو یہ کہتا ہو کہ یہ میری نہیں یا جو بچہ عورت کا دوسرے شوہر سے ہے اس کو کہتا ہو کہ یہ اس کا نہیں (12) دارالاسلام میں یہ تہمت لگائی ہو (13) عورت قاضی کے پاس اس کا مطالبہ کرے (14) شوہر تہمت

لگانے کا اقرار کرتا ہو یا دو مرد گواہوں سے ثابت ہو۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ: اگر مسلمان مرد کی بیوی اہلِ کتاب میں سے ہے، تو اس پر لعان جاری نہیں ہوسکتا، (بہارشریعت جلد:1،ص:943,944،مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز)"۔

عن نافع: ان ابن عمررضی اللہ عنہما أخبرہ: ان رسول اللہ ﷺ فرق بین رجل وامراۃ قذفھا وأحلفھما۔

ترجمہ:"نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے والے مرد اور عورت دونوں کو قسم دلائی اور پھر ان کے درمیان تفریق فرمادی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5313)"۔

لعان کے بعد زوجین کے درمیان ازخود تفریق نہیں ہوتی بلکہ لعان کے بعد وہ عورت اس پر حرام ہوجائے گی، لیکن نکاح سے خارج نہیں ہوگی بلکہ لعان کے بعد حاکمِ اسلام یا قاضی ان کے درمیان تفریق کرے گا۔

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں :فذھب مالک والشافعی ومن تبعھما الی ان الفرقۃ تقع بنفس اللعان قال مالک وغالب اصحابہ بعد فراغ المراۃوقال الشافعی واتباعہ وسحنون من المالکیۃ بعد فراغ الزوج وقال الثوری وابوحنیفۃ واتباعھمالا تقع الفرقۃحتیٰ یوقعھا علیھما الحاکم وعن احمد روایتان۔

ترجمہ:"امام مالک، امام شافعی اور ان کے موافقین کا یہ نظریہ ہے کہ نفسِ لعان سے لعان کرنے والوں کے درمیان ازخود تفریق واقع ہوجاتی ہے، امام مالک اور ان کے اکثر اصحاب کا قول یہ ہے کہ عورت کے لعان سے فارغ ہونے کے بعد تفریق ہوجاتی ہے اور امام شافعی، اور ان کے پیروکارں اور امام مالک کے مقلدین میں سے سحنون کا قول یہ ہے کہ شوہر کے قسم سے فارغ ہونے کے بعد زوجین کے درمیان فرقت لازم ہوجاتی ہے، امام سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان دونوں کے متبعین کا قول ہے کہ نفسِ لعان سے تفریق نہیں ہوتی تاوقتیکہ (لعان کے بعد) قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کرے، اور امام

احمد بن حنبل کے اس مسئلے میں دو قول ہیں، (یعنی ایک قول کے مطابق احناف کے ساتھ ہیں اور دوسرے کے مطابق شوافع کے ساتھ)، (عمدۃ القاری جلد 20 ص: 295 ادارۃ الطباعۃ المنیر ،مصر)''۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: و حُرم وطؤھا بعد اللعان قبل التفریق ۔

ترجمہ:''اور لعان کے بعد اگر ابھی (دونوں کے درمیان) تفریق نہ ہوئی ہو تب بھی (شوہر کے لئے) اس عورت سے وطی حرام ہے، (اور ابن عابدین شامی نے محرکات واسباب وطی کو بھی حرمت میں شامل کیا ہے)، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد:5، ص:126، دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اس سے ثابت ہوا کہ لِعان طلاقِ بائن کے حکم میں ہے، بیوی اگر شوہر پر زنا کا الزام لگائے تو لعان جاری نہیں ہوگا اور نکاح قائم رہے گا، تاوقتیکہ شوہر طلاق نہ دے۔

لیکن امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں: قال سھل: حضرت ھذا عند رسول اللہ ﷺ، فمضت السنة بعد فی المتلاعنین ان یفرق بینھما، ثم لا یجتمعان ابدا۔

ترجمہ:''سہل کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اس (لِعان) کے موقع پر حاضر تھا، اس کے بعد (لعان کرنے والے زوجین کے بارے میں) یہ سنت جاری ہوگئی کہ ان کے درمیان تفریق کردی جائے، پھر وہ کبھی بھی (نکاح میں) جمع نہیں ہوں گے، (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 2244)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أی مادام حکمه باقیاً ، فلو خرجا أو احدھما عن أھلیة اللِعان له أن ینکحھا کما یأتی، وعلیه حمل الحدیث المذکور، ولا ینافیه قوله ابدا کمافی قوله تعالیٰ: اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝ (الکھف: 20)۔

ترجمہ:''یہ دائمی تفریق اس وقت تک مؤثر ہے، جب تک اس کا حکم باقی ہے، اگر وہ دونوں یا

ان میں سے ایک اہلیتِ لعان سے خارج ہوگیا (مثلاً شوہر اپنی بیوی پر زنا کے الزام سے رجوع کرلے تو اس پر حدقذف لگے گی) تو پھر لعان کے بعد بھی اس سابقہ بیوی سے نکاح کرسکتا ہے، (کیونکہ لعان کی بنا پر تفریق طلاق بائن کے حکم میں ہے اور طلاق بائن کے بعد باہمی رضامندی سے دونوں میں نکاح ہوسکتا ہے)، اور آگے چل کر شامی نے آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے کہ کلمہ "ابداً" ہمیشہ قطعی دائمی کے حکم میں نہیں ہوتا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:5،ص:119 داراحیاءاراث العربی، بیروت)"۔

حرمتِ نکاح

سوال:97

زید نے ایک مطلقہ عورت سے شادی کی اس عورت کی پہلے خاوند سے اولاد (لڑکی) ہے اور زید کی بھی (پہلی بیوی سے) اولاد ہے، اب زید (اپنی پہلی بیوی کے) بیٹے کا نکاح اس عورت کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے۔ آیا شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟، (قاری محمد زمان چشتی، مدرس: دارالعلوم نعیمیہ)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیان سائل یہ نکاح جائز ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: لاباس بان یتزوج الرجل امرأۃ ویتزوج ابنہ ابنتھا او امھا کذافی محیط السرخسی۔
ترجمہ: "کسی شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اس شخص کے لڑکے نے عورت کی لڑکی سے نکاح کیا جو اس عورت کے پہلے شوہر سے تو حرج نہیں، یونہی اگر لڑکے نے عورت کی ماں سے نکاح کیا جب بھی یہی حکم ہے (بشرطیکہ حرمتِ نکاح کی اور کوئی وجہ نہ ہو)، (فتاویٰ عالمگیری، جلد:1،ص:277، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔
مفتی محمد نوراللہ نعیمی ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: اگر صورتِ سوال صحیح اور واقعی ہے تو یہ نکاح کرنا یقیناً روا ہے، قرآن کریم میں ہے: واحل لکم ماوراء ذالکم، فتاویٰ عالمگیری، جلد:2،ص:6 میں محیط سرخسی سے ہے اور بحرالرائق، جلد:3،ص:98،

درمختار، شامی جلد:2،ص:383 میں بحرالرائق اور فتاویٰ خیریہ سے ہے: والنظم من الدر واما بنت زوجة ابيه او ابنه فحلال بحرالرائق میں اضافہ فرمایا: وقد تزوج محمد بن الحنفيه امرأة وزوج ابنه بنتها، سب عبارات کا حاصل یہ ہے کہ یہ نکاح کرنا حلال ہے اور اہل بیتِ کرام میں بھی ہوا، حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام محمد بن حنفیہ نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اسی عورت کی بیٹی کا نکاح اپنے بیٹے سے کرادیا اپنی بیوی کی لڑکی اپنے صاحبزادے کو نکاح کردی، (فتاویٰ نوریہ، جلد:2،ص:433، مطبوعہ: بصیر پور اوکاڑہ)''۔

حقیقی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح

سوال:98

ایک بچے نے ایک عورت کا دودھ پیا۔ اس بچے کے بڑے بھائی کا رشتہ اس عورت کی لڑکی سے آیا ہے کیا یہ شادی ہوسکتی ہے۔ برائے مہربانی اس بات کی شرعی تصدیق فرمادیجئے کہ یہ شادی جائز ہے یا نہیں؟، (تحسین، مکان نمبر 2-65 قصبہ موڑ، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل جس بچے نے عورت کا دودھ مدتِ رضاعت (یعنی ڈھائی سال کی عمر تک) پیا تو اس بچے کی رضاعت ثابت ہے اور اس عورت کی تمام اولاد خواہ وہ دودھ پلانے سے پہلے کی ہو یا بعد کی اس شوہر سے ہوں یا دوسرے شوہر سے وہ سب اس دودھ پینے والے کے لئے رضاعی بہن بھائی ہوگئے اور ان میں سے کسی کی شادی اس دودھ پینے والے سے نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے دوسرے بھائی بہن جنھوں نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا اس سے رضاعت کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے آپس میں نکاح جائز ہیں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وتحل اخت اخيه رضاعا)۔۔۔۔ كأن يكون لاخيه رضاعا اخت نسبا وبهما۔

ترجمہ:''حقیقی بھائی کی رضاعی بہن یا رضاعی بھائی کی حقیقی بہن یا رضاعی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح جائز ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار: جلد: 4،ص:301، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ: زید بکر کا چچا زاد بھائی ہے اور رضاعی بھی زید کے صرف ایک حقیقی چھوٹا بھائی ہے اور بکر کے ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن جو کہ حقیقی ہیں اور بکر کی بہن دونوں بھائیوں سے چھوٹی ہے تو زید کے چھوٹے بھائی کا نکاح بکر کی چھوٹی بہن سے جائز ہے یا نہیں؟، چونکہ زید اور بکر آپس میں رضاعی بھائی ہیں۔
جواب میں لکھتے ہیں: بکر نے اگر زید کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید اور اس کا بھائی بکر کے بھائی ہوئے نہ کہ خواہر بکر کے اور اگر زید نے بکر کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید خواہر بکر کا بھائی ہوا نہ کہ زید کا بھائی بہر حال زید کے بھائی اور بکر کی بہن میں نکاح جائز ہے لقولهم تحل اخت اخيه رضاعا (فقہاء کے قول کے مطابق بھائی کی رضاعی بہن حلال ہے)، واللہ تعالیٰ اعلم ،(فتاویٰ رضویہ ،جلد: 11،ص: 279،مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

لاعلمی میں بہن بھائی کا نکاح

سوال:99

کچھ دن پہلے ہمارے محلے میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے محلے میں ایک لڑکی کی شادی ہو کر آئی ،شادی کے چھ ماہ بعد ان دونوں کو پتہ چلا کہ وہ آپس میں بہن بھائی ہیں، جو تین سال کی عمر میں بچھڑ گئے تھے، یہ بات معلوم ہوتے ہی لڑکی نے خودکشی کر لی، جبکہ لڑکا دبئی چلا گیا اور وہیں شفٹ ہو گیا تا کہ یہاں شرمندگی نہ ہو۔ اب ایسے میں اسلام کیا کہتا ہے، کیا وہ لڑکا گنہگار ہے یا نہیں؟، (نبیل بھٹی، لاڑکانہ)۔

جواب:

صورت مذکورہ میں وہ لڑکا یا لڑکی شرعاً گناہ گار نہیں ہیں، اگر انہیں نکاح کے وقت

اس کا علم نہیں تھا، تاہم اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے رہیں، لڑکی کا خودکشی کرنا شرعاً فعل حرام ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عفو ومغفرت کی دعا کرتے رہنا چاہئے۔ البتہ اگر نکاح کرانے والوں اور شرکاءِ مجلس نکاح کو ان دونوں کے اس بھائی بہن کے رشتے کا علم تھا، اور انہوں نے اسے حلال جان کر کیا تو کفر ہے، توبہ کریں اور تجدیدِ ایمان وتجدیدِ نکاح کریں، اور اگر اسے حرام قطعی جانتے ہوئے کیا، تو وہ سب فاسق وفاجر ہیں، توبہ کریں اور اللہ کے غضب سے ڈریں۔ اور اگر نکاح کرانے والوں اور شرکاءِ مجلس نکاح کو بھی اس رشتے کا علم نہیں تھا، تو پھر وہ سب بھی عنداللہ معذور ہیں، بہرحال اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے رہیں اور معافی مانگتے رہیں۔ باقی نکاح کرنے والا بھائی چونکہ بہن کے رشتے سے لاعلم تھا، اس لئے معاشرے کو چاہئے کہ جو عنداللہ معذور ہو، اسے ملامت نہ کریں۔

تحلیلِ شرعی کے لئے زوجِ غیر کے ساتھ نکاحِ صحیح ضروری ہے

سوال:100

ایک لڑکی ''ک'' کا نکاح بنام ''الف'' سے ہوا۔ شادی کے تقریباً سات سال بعد اس کے خاوند نے ''ک'' اس کو تحریری طور پر تین طلاقیں دے دیں اور حق مہر وعدت کے تمام واجبات ادا کردیئے۔ ایک سال کے بعد دونوں میں مفاہمت کے امکانات پیدا ہوگئے اور ''تحلیلِ شرعی'' کے لئے راضی ہوگئے۔ جس کے لئے ایک شخص ''ش'' سے غیر مشروط طور پر نکاح کرلیا، نکاح لڑکی کے والد نے پڑھایا، صرف لڑکی کی والدہ موجود تھی اور کوئی گواہ نہیں تھا، اس شخص یعنی ''ش'' نے ازدواجی تعلقات بھی تین مرتبہ قائم کئے، لیکن اس نکاح کو پوشیدہ رکھا گیا اور ایک ماہ بعد اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ یا شرط، اس نے ''ک'' کو فون پر اس کے والد کے روبرو تین طلاق دے دیں اور لڑکی نے عدت بھی مکمل کرلی۔ اب لڑکی ''ک'' دوبارہ اپنے سابقہ شوہر ''الف'' سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔ اب دریافت یہ کرنا ہے کہ آیا تحلیلِ شرعی کے لئے کیا گیا نکاح درست ہوا یا نہیں؟ اور اب ''ک'' اپنے سابقہ شوہر ''الف'' سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟، (ایم یاسین عابد

قریشی، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب :

نکاح کا اعلانیہ طور پر ہونا، نکاح کے مستحبات میں سے ہے، اور دو گواہوں کی موجودگی میں ہونا شرائط نکاح میں سے ہے، جیسا کہ اعلانِ نکاح کے حکم میں حدیث مبارکہ میں ہے: عن عائشة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا قالت: قال رسول اللّٰہ ﷺ: اَعلِنوا هذا النكاح واجعلوه في المساجد واضربوه عليه بالدفوف۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو! نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو) اور مسجدوں میں نکاح کیا کرو اور اس کی تشہیر کے لئے دف بجایا کرو، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1089)''۔

نکاح کے منعقد اور صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ دو مسلمان گواہوں کے سامنے مجلسِ نکاح میں ایجاب وقبول کیا جائے، امام اعظم ابوحنیفہ، امام احمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے، اوران ائمہ ثلاثہ کی دلیل یہ حدیث ہے: عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال: البغايا اللاتي ينكحن انفسهن بغير بينة ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بدکار عورتیں وہ ہیں جو بغیر گواہوں کے اپنا نکاح کرتی ہیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1103)''۔

شیخ الاسلام برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی لکھتے ہیں: ولا ينعقد نكاح المسلمين الا بحضور شاهدين حرين عاقلين بالغين أو رجل وامرأتين۔

ترجمہ: ''مسلمانوں کا نکاح منعقد نہیں ہوتا جب تک وہاں دو آزاد عاقل وبالغ مسلمان مرد گواہ یا ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ موجود نہ ہوں''۔ اس کی شرح میں علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: أما اشتراط الشهادة فلقوله عليه السلام "لا نكاح الا بشهود"

ترجمہ: ''پس شہادت (گواہوں) کی شرط نبی کرم ﷺ کے اس قول کے مطابق لگائی گئی ہے کہ ''گوا. ں کے بغیر نکاح (منعقد) نہیں''، (فتح القدیر مع ہدایہ، جلد 3، ص:

190,191 مطبوعہ: مرکز اہلسنت برکات رضا، گجرات، ہند)''۔
علامہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: ہمیں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ ''لا نکاح الا بشھود۔ (گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا)'' اور ہمارے علماء (حنفیہ) اسی حدیث پر عمل کرتے ہیں اور امام مالک، ابن ابی لیلیٰ، اور عثمان بتی رحمہم اللہ یہ کہتے ہیں کہ نکاح میں گواہ شرط نہیں بلکہ اعلان شرط ہے حتیٰ کہ بچوں اور مجنونوں کے سامنے بھی نکاح کا اعلان کردیا تو نکاح درست ہوگا اور اگر گواہوں کو یہ حکم دیا کہ وہ گواہی ظاہر نہ کریں تو نکاح درست نہیں ہوگا، (المبسوط، جلد5،ص:31، مطبوعہ: دارالمعرفۃ، بیروت)''۔
صحتِ نکاح کے لئے گواہوں کا ہونا شرط ہے، یعنی دو آزاد عاقل و بالغ مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہے، اور مذکورہ صورت میں لڑکی کے والد نے نکاح پڑھایا اور گواہ کی صورت میں صرف ایک عورت (یعنی لڑکی کی والدہ) موجود تھی، گواہی کا نصاب مکمل نہیں، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: لان النکاح بغیر شھود فاسد لاباطل۔
ترجمہ: ''گواہوں کے بغیر نکاح فاسد ہے باطل نہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد26،ص:28، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔
سوال میں بیان کردہ صورت سے واضح ہے کہ دوسرا نکاح ''ش'' سے تحلیلِ شرعی کی غرض سے پڑھایا گیا اور تحلیل شرعی کی بابت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز درمختار (جلد 5 ص:34 تا 36، مطبوعہ بیروت) کی ایک عبارت کی تلخیص فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:
''درمختار میں ہے: لاینکح مطلقة بالثلاث ختی یطاھا غیرہ بنکاح نافذ خرج الفاسد والموقوف، ترجمہ: ''تین طلاقوں سے مُطلّقہ عورت سے دوبارہ اس وقت تک نکاح نہیں ہوسکتا، جب تک دوسرا خاوند (شرعی طور پر) نافذ (اور مؤثر وصحیح) نکاح کے ساتھ اس عورت سے جماع نہ کرلے، صحیح اور نافذ نکاح کی قید سے نکاح فاسد اور نکاح موقوف خارج ہوگیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد12،ص:423، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مذکورہ بالا میں جب نکاح صحیح طور پر منعقد ہی نہیں ہوا تو وہ عورت طلاق کا محل ہی نہیں بنی، لہٰذا طلاق کیسے مؤثر ہوگی؟، اور اس سے شوہرِ اوّل کے لئے حِلّت کیسے ثابت ہوگی؟۔ اس خاتون، اور اس کے ساتھ نکاحِ فاسد میں شریک شخص اور دیگر شرکاء معاملہ سب کو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔ اور ''تحلیلِ شرعی'' اب بھی از روئے قرآن ''زوجِ غیر'' کے ساتھ غیر مشروط نکاح اور پھر اس کا اپنی مرضی سے طلاق دینا اور عدت کا گزر جانا ضروری ہے۔

عنین کا حکم

سوال:101

12 مئی کو میرے چھوٹے بھائی نوید کی شادی ہوئی لیکن شادی کے بعد سے اب تک وہ اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات استوار نہیں کر سکا، لڑکی والوں کا کہنا ہے کہ اب لڑکی کی شادی لڑکے کے بڑے بھائی سے کر دی جائے اور وہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ لڑکی والے ہم کو وقت دیں تا کہ ہم اس کا علاج کرواسکیں لیکن لڑکی والے اس کے لئے تیار نہیں ہو رہے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس صورت میں کیا کرنا ہوگا؟ عدت سے متعلق کیا حکم ہے؟ اور کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟، (جاوید، اورنگی، کراچی)۔ میری بیٹی کی شادی 12 مئی کو ہوئی اور لڑکا حقِ زوجیت ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس صورت میں ہم اس کے بھائی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ آیا عدت کرنا ہوگی یا کوئی کفارہ ہوگا؟، (محمد شریف، اورنگی، کراچی)۔

جواب:

جو شخص اپنی بیوی کے ازدواجی حقوق ادا کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اسے اصطلاحِ فقہ میں ''عنین'' کہتے ہیں۔

عبدالرزاق عن معمر عن الزهری عن سعید بن المسیب قال: قضی عمر بن الخطاب رضی الله عنه فی الذی لایستطیع النساء ان یؤجل سنة، قال معمر: وبلغنی انه یؤجل سنة من یوم ترفع امرها۔

ترجمہ: امام عبدالرزاق اپنی سند کے ساتھ سعید بن میتب سے روایت فرماتے ہیں: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایسے شخص کے بارے میں کہ جو اپنی عورت پر (جماع کی) قدرت نہ رکھتا ہو، کے بارے میں فیصلہ فرماتے کہ اس کو ایک سال کی مدت دی جائے، معمر فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی کہ اس کو ایک سال کی مدت اس روز سے دی جائے گی کہ جس دن یہ معاملہ قاضی کے پاس پہنچا، (مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث:10720)''۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

عورت بے موت یا طلاق جدا نہیں ہوسکتی اگر چہ مرد نامرد ہو، ہاں چارۂ کار حاکم شرعی کے یہاں دعویٰ ہے، وہ اس ثبوت لینے کے بعد کہ مرد اس پر قادر نہ ہو، مرد کو ایک سال کی کامل مہلت دے کہ اپنا علاج کرے، اس سال میں عورت مرد سے جدا نہ رہے اگر سال گزر جائے، اور اب بھی قادر نہ ہو، عورت پھر دعویٰ کرے اور حاکم پھر ثبوت لینے کے بعد عورت سے پوچھے کہ تو اپنے شوہر کے پاس رہنا چاہتی ہے یا اپنے نفس کو اختیار کرتی ہے، اگر عورت فوراً بلا تاخیر کہہ دے کہ میں نے اپنے نفس کو اختیار کیا، تو حاکم ان میں تفریق وجدائی کر دے، یہ تفریق طلاق ہوگی، اور اب بعد عدت عورت دوسرے سے نکاح کر سکے گی ورنہ نہیں، یہ حکم عورت کی جانب ہے، رہا مرد، اسے حکمِ شریعت ہے کہ جب وہ عورت کا حق ادا نہیں کرسکتا تو اس پر فرض ہے کہ عورت کو طلاق دے دے، نہ دے گا تو گنہگار و مستحقِ عذاب ہوگا۔ واللہ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:488)''۔

سوال میں بیان کردہ واقعات اگر درست ہیں، تو شوہر کو چاہئے کہ اپنی بیوی کو فی الفور طلاق دے دے، ورنہ وہ گنہگار ہوگا اور مستحقِ عذاب ہوگا اور شوہر کے گھر والوں کو چاہئے کہ وہ اسے برضا ورغبت طلاق دینے پر آمادہ کریں، اگر وہ اس کے باوجود طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو پھر بیوی عدالت سے رجوع کرے اور عدالت شوہر کو ایک سال کا وقت دے، اگر وہ اس ایک سال کے دوران اپنی اہلیت مباشرت ثابت نہ کر سکے، تو عدالت نکاح فسخ کر دے گی اور عدت گزرنے کے بعد عورت آزاد ہوگی، جہاں چاہے اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔

ہمیں حرمتِ مصاہرت سے متعلق دو سوالات موصول ہوئے ترتیب وار پیشِ خدمت ہیں۔

حرمتِ مصاہرت زنا سے بھی ثابت ہوتی ہے

سوال:102

میں ایک رات جلسے میں شرکت کرنے کے بعد کافی دیر سے گھر آیا تو سب گھر والے سو چکے تھے، میں اپنے کمرے میں داخل ہوا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے لائٹ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ معمول کے مطابق میری چارپائی کے ساتھ بیوی کی چارپائی ہوتی ہے۔ مجھے کچھ خواہش ہوئی جس کی وجہ سے میں نے اپنا ہاتھ بیوی کی طرف بڑھایا اور میں نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا، بعد ازاں قمیص کے اندر بھی ہاتھ داخل کیا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ میری بیوی نہیں ہے۔ میں نے لائٹ لگائی تو فی الواقع وہ میری بیوی نہ تھی بلکہ میری ساس تھی جو بیوی کی جگہ لیٹی ہوئی تھی اور ساتھ میں میری بچی بھی سو رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے فوراً توبہ واستغفار کیا۔ میں نے حنفی علماء کرام سے اس مسئلے کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ تمہاری بیوی اب تم پر حرام ہے۔ خدارا آپ اس مسئلے کو مفصل ومدلل تحریر فرما کر میری پریشانی کا شافی حل بتایئے۔ میرے سب رشتے دار بڑے غصے میں ہیں، جو بھی حکم از روئے قرآن وحدیث ہے اس سے ہمیں اپنے فتویٰ کے ذریعے آگاہ فرمایئے، (محمد عبدالرحمٰن، بنوں، صوبہ سرحد)۔

جواب :

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، جس میں ایک قسم حرمتِ مصاہرت ہے، مرد وعورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں، تو عورت کے اصول وفروع مرد پر حرام ہو جائیں گے۔ اور مرد کے اصول وفروع عورت پر حرام ہو جائیں گے، اس کو حرمتِ مصاہرت کہتے ہیں۔ یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہوگی، اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَرَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۔

ترجمہ: ''(اور تم پر حرام کی گئی ہیں) تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، (النسآء:23)''۔

قرآن کریم نے ان عورتوں کو بھی حرام کیا ہے، جن کی ماں کے ساتھ نکاح کر کے یا بغیر نکاح وطی کر لی گئی ہو اور شہوت کے ساتھ چھونا بھی وطی کے حکم میں ہے، شہوت کے ساتھ چھونے سے بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے، اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وکما تثبت ھذہ الحرمۃ بالوطء تثبت بالمس والتقبیل والنظرالی الفرج بشھوۃ کذافی الذخیرۃ۔

ترجمہ: ''حرمت مصاہرت، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرح شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ''ذخیرہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:275-274، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (ولا فرق فیما ذکر) وبین اللمس والنظر بشھوۃ بین عمد ونسیان وخطاء واکراہ۔

ترجمہ: ''کسی عورت کو شہوت کے ساتھ چھوا، یا (شرمگاہ کو بنظرِ شہوت) دیکھا حرمت ثابت ہو جائے گی، اگرچہ یہ کام جان بوجھ کر کیا ہو، بھولے سے ہو، غلطی سے ہو یا زبردستی کرایا گیا ہو، ہر صورت میں حرمت ثابت ہو جائے گی، (ردالمحتار علی الدرالمختار، فصل فی المحرمات، جلد 2 ص:306 مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ثم لا فرق فی ثبوت الحرمۃ بالمس بین کونہ عامدا أو ناسیا أو مکرھا أو مخطئا کذا فی فتح القدیر۔

ترجمہ: ''پھر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا چھونا، خواہ (یہ فعل) جان بوجھ کر ہو، یا بھول کر ہو یا اس سے زبردستی کرایا گیا ہو یا غلطی سے ہوا ہو، ہر صورت حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جائے گی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:274، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

لٰہذا جب بیوی کی ماں کو شہوت سے چھولیا تو بیوی اسی وقت حرام ہوگئی اور بیوی کی ماں تو پہلے سے ہی حرام تھی، اب دونوں ماں بیٹی ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئیں کہ ان سے نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔ متارکہ کے بعد عورت کو اختیار ہے کہ اس شخص کے سوا جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے۔ متارکے کا طریقہ یہ ہے کہ شوہر دو گواہوں کے سامنے کہے "میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا وہ جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے"۔ متارکہ کے بعد عدت شروع ہوگی۔

سوال:103

میری خالہ دبئی سے آئی ہیں اور اپنی سگی بہن (میری والدہ) کے گھر پر ٹھہری ہیں۔ میری خالہ کی ایک بیٹی ہے، میری امی نے خالہ سے میرے بھائی کے لئے ان کی بیٹی کا رشتہ کرلیا نکاح کے چھ سات مہینے باقی تھے اسی دوران خالہ اور بھانجے میں صحبت (زنا) ہوگئی۔ لیکن بھائی اور خالہ نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا۔ خالہ بہت پرہیزگار اور پانچ وقتہ نمازی ہے۔ خالہ کی عمر 32 سال ہے اور بھائی کی عمر 18 سال ہے۔ ہمیں تو کچھ بھی نہیں پتا تھا سات مہینے بعد جب لڑکی کے ابو دبئی سے آئے تو ہم سب نے مل کر منگنی اور نکاح کردیا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی نکاح کے بعد لڑکی اور لڑکے کا آمنا سامنا تھا نکاح کے تین مہینے بعد لڑکا نے لڑکی سے صحبت کرلی۔ اسی دوران لڑکا اور لڑکی کی آپس میں لڑائی ہوگئی ماموں کے حوالے سے تو لڑکے نے غصے میں آکر کہا "میں تمہیں تین طلاقیں دیتا ہوں اگر تم ماموں کے سامنے گئی تو" طلاق دینے کے بعد کہا کہ تمہیں سمجھ میں آئی کہ میں نے کیا کہا تیسری دفعہ بھی یہی کہا۔ میری خالہ نے خالو کو میرے بھائی کے ساتھ زنا کی بات بتادی اور طلاق والی بات بھی بتادی، خالو نے غصے میں بیٹی کو ماموں کا سامنا کرادیا، کیا طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟، (ایک سائل، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ

وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ

ترجمہ: ” تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی (دودھ شریک) بہنیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، (النسآء:23)“۔

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، وہ اسباب جن کے سبب نکاح حرام ہے ان میں ایک قسم نسب ہے، محرماتِ نسبیہ میں مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں شامل ہیں، ان سے نکاح کرنا، صحبت کرنا اور کسی قسم کا کوئی بھی شہوانی عمل کرنا دائما حرام ہے۔

دوسرا سبب حرمتِ مصاہرت ہے، یعنی مرد وعورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں، تو عورت کے اصول وفروع مرد پر حرام ہو جائیں گے۔ اور مرد کے اصول وفروع عورت پر حرام ہو جائیں گے، اس کو حرمتِ مصاہرت کہتے ہیں۔ یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہوگی، اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ قرآن کریم نے ان عورتوں کو بھی حرام کیا ہے، جن کی ماں کے ساتھ نکاح کر کے یا بغیر نکاح وطی کر لی گئی ہو یا انہیں شہوت کے ساتھ چُھوا، شہوت کے ساتھ چھونے سے بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے، اس کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وکما تثبت هذه الحرمة بالوطی تثبت بالمس والتقبیل والنظرالی الفرج بشهوة کذافی الذخیره۔

ترجمہ: ” حرمت مصاہرت، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرف شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ” ذخیرہ “ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 275-274، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)“۔ اب صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدقِ سائل اس کے بھائی نے خالہ سے زنا کیا اور خالہ تو پہلے ہی حرام تھی اب اس کی اولاد بھی اس پر حرام ہو گئی، اور دونوں کا

آپس میں نکاح شروع ہی سے ناجائز تھا، نکاح منعقد ہی نہیں ہوا، تو طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یعنی جب وہ خاتون اس لڑکے کے لئے محلِ نکاح ہی نہیں بنتی، تو اس کے ساتھ نکاح ابتداءً ہی منعقد نہیں ہوسکتا۔ پس وہ محل طلاق ہی نہیں ہے، کیونکہ طلاق تو نکاح کی بندش کو اٹھانے کا نام ہے، لہٰذا دونوں کو فوراً علیحدگی اختیار کرلینی چاہیے، اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔

﴿کتاب الطلاق﴾

''دلالتِ حال'' نسبت طلاق کے لئے کافی ہے

سوال:104

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تجھے طلاق دے دوں گا اور پھر کہا طلاق، طلاق، طلاق، آیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (معرفت صاحبزادہ نور العارفین صدیقی، آشٹن، اولڈھم، یو۔ کے)۔

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق وقوع طلاق کے لئے نسبت شرط ہے اور نسبت یہ ہے کہ طلاق دیتے وقت شوہر اپنی بیوی کی زوجیت کا اظہار کرے، مثلاً یوں کہے کہ میری بیوی کو طلاق ہے یا بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے کہ اس کو طلاق ہے یا طلاق دیتے وقت بیوی کا نام ذکر کرے، جس طلاق میں نسبت نہ ہو وہ طلاق واقع نہیں ہوگی، البتہ نسبت کا صریح لفظوں میں پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ اگر شوہر کی نیت طلاق کی ہو، تو بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ولا یلزم کون الاضافة صریحة فی کلامه الخ

ترجمہ: '' کلام میں (بیوی کی طرف) نسبت کا صریح ہونا لازمی نہیں ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: لان دلالة الحال قائمة مقام النية الخ

ترجمہ: ''اس لئے کہ دلالتِ حال نیت کے قائم مقام ہے، (رد المحتار علی الدر المختار ج:4، ص:338، 339 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

نسبت معنوی کی بنا پر وقوع طلاق کی مثالیں کتب فقہ میں بکثرت موجود ہیں، شیخ الامام محمد بن محمد بن شہاب المعروف ابن بزاز کردری حنفی متوفی 827ھ لکھتے ہیں: قال لها بعد الخلع من ساعته هرسه هرسه اخاف وقوع الثلاث وان لم توجد الاضافة لانه سبق ذكر الطلاق۔

ترجمہ: ''(شوہر نے) بیوی سے خلع کے بعد اسی وقت کہا: ''تین کی تین''، (اس میں) اگرچہ (بیوی کی طرف) نسبت نہیں پائی گئی، (پھر بھی) تینوں طلاق واقع ہونے کا اندیشہ ہے، کیونکہ طلاق کا ذکر پہلے گزر چکا ہے''۔

اس کے بعد آگے چل کر لکھا: ''این زن کہ مراست بسہ'' لایقع وقال ابوبکر العیاض ان نویٰ یقع وقال الورشتنی رحمہ اللہ طلقت امرأتہ لانہ وجدت الاضافۃ فی اول الکلام۔

ترجمہ: ''(شوہر نے کہا:) یہ جو میری بیوی ہے (اس کو) تین طلاق واقع ہوں، (تو طلاق) واقع نہیں ہوگی، اور ابوبکر عیاض نے کہا: (اگر شوہر نے) نیت کی ہے تو واقع ہوگی اور ورشتنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا: اس کی بیوی کو طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ ابتدائے کلام میں نسبت ہے۔

اس سے پیشتر انہوں نے لکھا: وسئل احمد القلانسی عمن وکزا امرأتہ فقال "اینک یک" یقع طلاق ثم ذکر ثانیا وقال "اینک دو طلاق" وکذا فی الوکزۃ الثالثہ، قال تطلق ثلاثاً الخ۔

ترجمہ: ''احمد القلانسی سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو مکا مار کر کہا: ''اس کو ایک''، تو ایک طلاق واقع ہو جائے گی، پھر دوبارہ ذکر کیا اور کہا: ''اس کو دو طلاق''، اسی طرح تیسری بار مکا مار کر کہا: ''اسے تین طلاق''، تو (احمد القلانسی) نے کہا: (اس کی بیوی کو) تین طلاق واقع ہو جائیں گی، (فتاویٰ بزازیہ برحاشیہ فتاویٰ عالمگیری ج:4،ص:179،172 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری سے دریافت کیا گیا: محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا، اس کی والدہ نے کہا کہ اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سور کھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی، مظفر نے کہا کہ طلاق دیتے ہیں پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا: طلاق، طلاق، طلاق بغیر مخاطب کرنے کسی کو، اب شرعاً صورت مسئولہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق

پڑے گی یا نہیں؟۔

جواب میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''تین طلاقیں ہوگئیں، بے حلالہ اس کے نکاح میں نہیں آسکتی، (فتاویٰ رضویہ ج:12 ،ص359 ،مطبوعہ رضافاؤنڈیشن، لاہور)''۔

مولانا محمد امجد علی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک طویل سوال میں پوچھا گیا: ساس نے داماد سے کہا کہ یہ کمینہ پن ہے کوئی اپنی بیوی کو اس طرح نہیں مارتا ہے، تم یہاں سے نکل جاؤ، (شوہر نے) یہ سن کر کہا: طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا، اس وقت زید کی بیوی اپنے چچا کے مکان کے سائبان میں تھی الخ۔

اس کے جواب میں علامہ امجد علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

اگرچہ زید کے ان الفاظ میں اضافت نہیں ہے اور وقوعِ طلاق کے لئے اضافت ضروری ہے مگر چونکہ ساس کے جواب میں کہا تھا، لہٰذا زید کے الفاظ کے یہی معنیٰ متعین ہیں کہ تمہاری بیٹی کو طلاق الخ، (فتاویٰ امجدیہ، جلد: دوم، ص: 227، 228)۔

صورتِ مسئولہ میں شوہر کے کلام میں اگرچہ (بیوی کی طرف) نسبت صریحہ نہیں ہے، لیکن چونکہ پہلے شوہر نے طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، جیسا کہ خط کشیدہ الفاظ سے ظاہر ہے، لہٰذا اس قرینے کے پیشِ نظر صورتِ مسئولہ میں نسبت معنوی پائی گئی اور مذکورہ خاتون کو تین طلاقیں واقع ہوگئیں۔ متکلم کی ''دلالتِ حال'' نیت کے قائم مقام ہے اور یہاں ''دلالتِ حال''، الفاظِ طلاق کی ادائیگی سے پہلے، ارادۂ طلاق کا اظہار ہے۔

ازدواجی تعلقات میں کشیدگی اور طلاق

سوال :105

میرے خاوند نے دو سال پہلے مجھے ایک طلاق دی اس کے بعد ہم نے رجوع کر لیا، پھر چھ ماہ بعد انہوں نے مجھے دوسری طلاق دی اور پھر ہم نے رجوع کرلیا اس کے چار ماہ بعد ایک بار جب پاکستان سے میرے بھائی اور بہنوئی نے مجھے موبائل پر فون کیا اور میری ان سے بات ہوئی، جب میرے خاوند گھر آئے تو انہوں نے موبائل چیک کر کے پوچھا کہ

کیا آج تمہارا پاکستان سے فون آیا تھا، (میں یہ بتاتی چلوں کہ کچھ جھگڑوں کی وجہ سے دونوں خاندانوں کی بول چال بند تھی، میرے خاوند کو بالکل پسند نہیں کہ میں یا وہ فون کریں اور دوسرا یہ کہ وہ بہت شکی، اور وہمی طبیعت کے مالک ہیں) خیر جب میرے خاوند نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہاری بات ہوئی ہے تمہارے گھر والوں سے میں نے کہا کہ ہاں، انہوں نے کہا کہ کس کس سے ہوئی؟ میں نے کہا کہ بھائی، بہن، امی سے ہوئی (یہ میں نے جھوٹ کہا تھا جبکہ میری بات صرف بھائی اور بہنوئی سے ہوئی تھی) پھر انہوں نے کہا کہ کیا بہنوئی سے بھی ہوئی، میں نے بات نہ واضح کرتے ہوئے کہا کہ شاید ہوئی ہو، کیونکہ مجھے ان کی طبیعت کا اندازہ تھا، انہوں نے کہا ''اچھا اگر تو گل کیتی تے تو میری بیوی نہیں''۔ بقول میرے خاوند کے کہ یہ الفاظ میں نے طلاق کی نیت سے استعمال نہیں کئے۔ بلکہ میرے دل میں یہ تھا کہ بیویاں اپنے شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ اگر تم کو میری عزت کا خیال ہوا تو اگلی بار تم بات نہ کروگی۔ میں نے یہ مسئلہ جب Dues Bury England کے مفتی موسیٰ سے پوچھا! تو انہوں نے کہا کہ آپ کے شوہر سے بات کرنی پڑے گی کہ آیا ان کی نیت کیا تھی۔ پھر میرے خاوند نے کہا کہ اگر میں نے اس کو طلاق دینی ہوتی تو جس طرح پہلی دونوں بار طلاق کا لفظ استعمال کیا اب بھی کرتا۔ خیر مفتی صاحب نے اجماع کرکے کہا کہ طلاق نہیں ہوئی۔ مجھے کبھی کبھی شک پڑتا ہے کہ کیا معلوم اس وقت ان کی نیت کیا ہو۔ بہت پریشان رہتی ہوں۔ پر میرے خاوند بہت قسمیں اٹھاتے ہیں۔ اور مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ پھر اس کا اور اللہ کا معاملہ ہے، اگر وہ غلط بیانی کرتا ہے۔ آپ میری صحیح رہنمائی کریں۔ میرے شوہر نے مجھ پر بہت گندے الزامات اور بہتان لگائے ہیں، اپنے گھر والوں کے کہنے پر اس کی حمایت اور تائید میرے خاوند نے بھی کی۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، اب 4 ماہ سے میں نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کی ہوئی ہے، وہ بچوں سے ملنے آتے ہیں، پر نان نفقہ بالکل نہیں دیتے، کہتے ہیں کہ جب میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، تو تم کیوں الگ رہتی ہو، وہ کہتے ہیں کہ کبھی مجھ کو طلاق نہیں دیں گے۔ چاہے دوسری شادی بھی کرلیں۔ اپنے

خاوند کے بارے میں یہ بتاتی چلوں کہ دینی اعتبار سے نابلد ہیں اور جھوٹے اور لالچی انسان ہیں،(یاسمین، معرفت محمود احمد، مکان نمبر 558، گلی نمبر 16 مرگلہ، اسلام آباد)

جواب:

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی باہمی حسن سلوک اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ گزارنی چاہئے، ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع صرف نظر کرنی چاہیے، خاص کر شوہروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر تمہاری بیویاں تمہیں پسند نہ آئیں، تو صبر کا مظاہرہ کرو ممکن ہے کہ اس میں تمہارے لئے کوئی بہتری ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ۝ (النساء:19)۔
ترجمہ: ”پھر اگر وہ تمہیں پسند نہ آئیں، تو قریب ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ اس میں بھلائی رکھے، اس تمہید کے بعد صورت مسئولہ میں شوہر پہلے دو طلاقیں دے چکا ہے، از روئے شرع شوہر کو مزید صرف ایک طلاق دینے کا حق ہے، آئندہ کبھی اگر شوہر نے ایک طلاق دے دی، تو بیوی ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو جائے گی۔ استفتاء میں درج پنجابی کے خط کشیدہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، صحیح قول کے مطابق اگر شوہر ان الفاظ سے طلاق کی نیت کرتا تو بھی طلاق واقع نہ ہوتی۔ فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:386 پر ہے:

ولوقال "توزن من نتی" لایقع ان نوی وھو المختار
ترجمہ: ”اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے، تو میری بیوی نہیں ہے، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اگرچہ اس کی نیت طلاق کی ہو اور یہی مختار (مذہب) ہے“۔ لہٰذا نکاح باقی ہے، عورت اگر شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو بشرطیکہ شوہر کی طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو تو ایسی عورت کا خرچہ شوہر کے ذمہ لازم نہیں ہے، عالمگیری جلد 1 ص:545 پر ہے:

وان نشزت فلا نفقة لھا حتی تعود الیٰ منزلہ۔
ترجمہ: ”اگر عورت مرد کی نافرمانی کرے، تو مرد کے ذمہ اس کا خرچہ نہیں ہے، جب تک کہ

وہ واپس اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر میں نہ رہے"۔

طلاقِ ثلاثہ کے بعد شوہرِ اول سے نکاح کا حکم

سوال: 106

آپ نے 18 جون کے دین ودانش ایڈیشن میں ایک سائل کے جواب میں مسئلہ طلاق کے ذیل میں بیان فرمایا کہ تین طلاقوں کے بعد عورت سابقہ شوہر سے نکاح نہیں کرسکتی اس کے علاوہ کسی بھی مرد سے نکاح کے سلسلے میں آزاد ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اگر تینوں طلاقیں دینے کے بعد میاں بیوی اپنے فیصلے پر پشیماں ہوں، اور بچوں وغیرہ کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے دوبارہ گھر بسانا چاہیں، تو شریعت اس کا کوئی حل پیش کرتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے ضلع میں ایک واقعہ ہوا ہے کہ تین طلاقوں کی عدت گزرنے کے بعد اس عورت کا نکاح کسی نامعلوم مرد سے ہوا اور مباشرت کے بعد اس نے طلاق (تین بار) دے دی، اور اس کی عدت گزرنے کے بعد پھر پہلے مرد سے نکاح کردیا گیا، کیا قرآن وسنت میں ایسے کسی طریقے کی گنجائش موجود ہے یا نہیں؟، اگر نہیں تو ان لوگوں اور نکاح خواں کا یہ عمل کیسا ہے اور شریعت اس پر کیا حد لگاتی ہے۔ ایسا نکاح کرنے والے امام کے پیچھے نماز ہوگی یا نہیں اور مسجد میں اسے مستقل امام مقرر کیا جائے یا نہیں؟، برائے مہربانی جلد اخبار میں جواب سے نوازیں، (رشید احمد خان، دکان نمبر 147 پرانی لکڑ منڈی، منڈی بہاؤالدین)۔

جواب:

ہمارے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا ہوا ہے، یہ بات ہمارا خالق ومالک رب تبارک وتعالیٰ ہم سے بہتر جانتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء آیت نمبر 11 میں احکام وراثت بیان کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا
ترجمہ: "تمہارے باپ اور تمہارے بیٹوں میں سے کون تمہارے نفع کے اعتبار سے تمہارے زیادہ قریب ہے؟"۔
قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام قطعیت کے طور پر بیان کردیئے ہیں، ان میں ردوبدل

کا کسی کو اختیار نہیں ہے، طلاق کے حوالے سے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 229 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ
"طلاق کی وہ صورت جس میں شوہر کو طلاق کے بعد اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع کا حق حاصل ہے، وہ فقط دو (رجعی) طلاقیں ہیں، پھر (اس کے بعد اس کے پاس دو راستے ہیں) یا تو معروف طریقے سے (رجوع کر کے) اسے اپنے نکاح میں روکے رکھے یا بھلائی کے ساتھ اس کا راستہ کھلا چھوڑ دے"۔۔۔۔۔۔۔آگے چل کر فرمایا: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ
ترجمہ: "اگر وہ (دو طلاق رجعی کے بعد ایک) طلاق (اور دے دے) تو اب (تین طلاق کے بعد) وہ مطلقہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ وہ عورت اس (سابق شوہر) کے علاوہ کسی اور شوہر سے نکاح کر لے"، پھر اگر وہ (زوج ثانی اپنی مرضی سے) اسے طلاق دے دے، تو (اس عورت اور اس کے سابق شوہر) دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ اگر انہیں گمانِ (غالب) ہو کہ وہ (اب دوبارہ شروع ہونے والی اپنی ازدواجی زندگی میں) اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے، تو (عدتِ طلاق) گزرنے کے بعد لوٹ کر دوبارہ نکاح کر لیں۔ اس کے علاوہ ان کے رجوع کی حلال اور جائز ہونے کوئی صورت نہیں ہے۔

الفاظِ طلاق

سوال:107

میرے شوہر شاہنواز احمد خان نے گھریلو پریشانیوں سے تنگ آ کر غصہ کرتے ہوئے لفظِ طلاق استعمال کیا، جھگڑا اس وجہ سے شروع کیا کہ پانچ ہزار کا مطالبہ کیا یہ کہہ کر کہ میں چلا جاؤں گا اور تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا۔ میں نے کہا میرے دل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، اس پر کہا کہ میرے دل میں تو ہے۔ 2 جون 2006ء جمعہ کی رات تقریباً ساڑھے دس بجے غصہ کرتے ہوئے کہا کہ "میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں، میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں"، میں نے کہا کہ فرید بھائی کو فون کرتی ہوں (میرے چھوٹے جیٹھ

ہیں) اور بھائی صاحب (میرے بڑے جیٹھ خورشید) کو اس پر شاہنواز نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر فون کرنا، اگر دونوں بھائی آجاتے ہیں تو ان کے سامنے تین بار کہہ کر قصہ ختم کر دیتا ہوں کہ میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں اور اپنے کپڑے وغیرہ لے کر شکیل (میرے دیور) کے ہاں چلا جاؤں گا، پھر میں نے فون نہیں کیا۔ آیا مذکورہ صورت میں کتنی طلاق واقع ہوئی ہیں؟، (ریحانہ بیگم، ماریہ اپارٹمنٹ نارتھ کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیرِ صدق سائلہ اس کے شوہر کا یہ قول کہ "تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا" یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ طلاق انشاءآت میں سے ہے یعنی شوہر واضح طور پر (بصیغۂ حال) کہے کہ "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں"، یا بصیغۂ ماضی کہے "میں نے تمہیں طلاق دی"، لہٰذا مذکورہ الفاظ "تمہیں چھوڑ دوں گا تم نکاح کر لینا" سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

پھر سائلہ کے بیان کے مطابق 2 جون، 2006ء کی شب سائلہ کے شوہر نے دو مرتبہ کہا کہ "میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں" ان الفاظ سے دو طلاق صریحہ واقع ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ

ترجمہ: "طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، (البقرہ 229)"۔ شوہر چاہے تو عدت کے اندر یک طرفہ طور پر عقدِ ثانی کے بغیر رجوع کر سکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کر لے۔ اور اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ بھی عقدِ ثانی کر سکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کر سکتی ہے، اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقدِ ثانی کیا تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور اگر خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو وہ ان پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہو کر تین

طلاقیں ہو جائیں گی اور وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔ سائلہ کے بیان کے مطابق ''میں نے کہا کہ فرید بھائی کو فون کرتی ہوں (میرے چھوٹے جیٹھ ہیں) اور بھائی صاحب (میرے بڑے جیٹھ خورشید) کو اس پر شاہنواز نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر فون کرنا، اگر دونوں بھائی آجاتے ہیں تو ان کے سامنے تین بار کہہ کر قصہ ختم کر دیتا ہوں کہ میں ریحانہ کو طلاق دیتا ہوں اور اپنے کپڑے وغیرہ لے کر شکیل (میرے دیور) کے ہاں چلا جاؤں گا، پھر میں نے فون نہیں کیا'' چونکہ یہاں طلاق کو فون کرنے اور دونوں بھائیوں کے آنے پر معلق کیا تھا اور شرط نہیں پائی گئی لہٰذا اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، واللہ اعلم بالصواب۔

مذاکرۂ طلاق

سوال:108

میری شادی کو ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے جبکہ میری بیٹی تین ماہ کچھ دن کی ہے جب سے میری شادی ہوئی ہے گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہے، میرے بھائی اور بہنوں کے میری بیوی سے بہت اختلافات ہیں ابھی دو دن پہلے کی بات ہے صبح ناشتہ کے ٹائم گھر میں جھگڑا ہو گیا میری بھائی کہتے تھے کہ اس کو طلاق دے دو میں نے سب کو سمجھایا لیکن میری بات کسی نے نہ مانی میں اتنا غصہ کی حالت میں تھا کہ غصہ کی حالت میں کئی بار طلاق طلاق طلاق کہتا رہا جبکہ میں نے دل سے طلاق نہیں دی بلکہ معاملہ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے کہا جبکہ سن کر میری بیوی رونے لگی اور سب گھر والے بھی رونے لگے میں نے اپنی بیوی کو تھوڑی دیر بعد کہا کہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور میں اپنی بیوی اور بیٹی کو سسرال چھوڑ کر آیا اور میں نے اس سے وعدہ لیا کہ اس جھگڑے کا کسی سے ذکر نہیں کرو گی، میں تمہیں دو چار دن میں کرائے کا گھر لے کر چلا جاؤں گا بلکہ میں اپنی اس حرکت شیطانی پر بہت شرمندہ ہوں، (سہیل عمران، الکرم اسکوائر بلاک 4 لیاقت آباد، کراچی)۔

بیان زوجہ: میں مسماۃ خالدہ بنت ضیاء الحق حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ مورخہ 31 مئی

2006ء صبح کے وقت میرے اور میری نند کے درمیان گفتگو جھگڑے کی صورت اختیار کرگئی اور بات بڑھتے بڑھتے یہ ہوئی کے میرے دیور نے مجھے گالیاں دیتے ہوئے میرے شوہر سے یہ کہا کہ آپ اسے طلاق دے دیں ہم آپ کی دوسری شادی کردیں گے اور اس پر میرے شوہر نے ان کو ڈانٹا لیکن وہ بار بار طلاق دینے پر اصرار کرتا رہا، اس دوران انتہائی غصے میں میرے شوہر نے تین بار طلاق، طلاق، طلاق کہا نہ مجھے مخاطب کیا اور نہ ہی میرا یا اپنا نام لیا، (خالدہ بنت ضیاء الحق)۔

جواب:

طلاق میں اضافت کا پایا جانا ضروری ہے خواہ وہ اضافتِ لفظی ہو یا معنوی ہو یا کسی ایسے کلام کے جواب میں ہو جس میں اضافت مذکور تھی، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

اما وجود الاضافة فی اللفظ فاقول علی ثلثة انحاء ،الاول تحققها صریحاً فی کلام الزوج وهذا الذی ذکر الحلبی والطحاوی امثلته کقوله انت طالق او طلقتک او هذه او زینب او بنت زید او ام عمرواو اخت بکر او امرأتی طالق، الثانی تحققها فیه لاجل کونه جواباً لکلام تحققت فیه فتحقق فی الجواب ایضاًلان السوال معاد فی الجواب وهذا مافی الهندیة عن الخلاصة قالت طلاق بدست تو است،مرا طلاق کن فقال الزوج طلاق می کنم وکرر ثلثا طلقت ثلثا اھ۔

ترجمہ: ''یا لفظوں میں اضافت کا موجود ہونا فاقول (تو میں کہتا ہوں) یہ تین طرح ہوتی ہے: اول یہ کہ خاوند کے کلام میں صراحۃً پائی جائے وہ یہ ہے جس کی مثالیں علامہ حلبی اور علامہ طحاوی نے یہ ذکر کی ہیں، مثلاً تو طلاق والی ہے، میں نے تجھے طلاق دی (بیوی کو اشارہ کرتے ہوئے) اس کو، نام لے کر، زینب کو، زید کی بیٹی کو، عمرو کی ماں کو، بکر کی بہن کو، میری بیوی کو طلاق۔ دوسری صورت، یہ کہ طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے جواب میں ذکر کئے

جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اس کی مثالیں ہندیہ میں خلاصہ سے منقول ہیں، مثلاً بیوی کہے" طلاق تیرے ہاتھ میں ہے مجھے طلاق دے"۔ تو جواب میں خاوند کہے " میں نے طلاق دی" تین دفعہ تکرار کیا تو تین طلاقیں بیوی کو پڑیں گی اھ ت (فتاویٰ رضویہ جلد 12 ص: 344.345 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا اس کی والدہ نے کہا کہ اگر اپنی بی بی کو نہ چھوڑو گے تو تم سور کھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی، مظفر نے کہا طلاق دیتے ہیں، پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا طلاق طلاق طلاق، بغیر مخاطب کرنے کسی کو۔ اب شرعاً صورتِ مسئولہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟ جواب میں لکھتے ہیں:

" تین طلاقیں ہوگئیں، بے حلالہ اس کے نکاح میں نہیں آسکتی، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ جلد 12 ص: 360 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل اور حلفیہ اقرارِ زوجہ، صورتِ مسئولہ میں مذاکرۂ طلاق موجود ہے اور جیسا کہ بے اضافت طلاق کی صورتوں میں سے دوسری صورت یہ ہے کہ: طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے جواب میں ذکر کئے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے۔ آپ کے تحریری وزبانی بیان کے مطابق کہ" میرے بھائی کہتے تھے کہ اس کو طلاق دے دو میں نے سب کو سمجھایا لیکن میری بات کسی نے نہ مانی میں اتنا غصہ کی حالت میں تھا کہ غصہ کی حالت میں کئی بار طلاق طلاق طلاق کہتا رہا"، آپ کا لفظِ طلاق کہنا آپ کے بھائی کے کلام کے جواب میں تھا، اسی کو اصطلاحِ فقہاء میں مذاکرۂ طلاق کہتے ہیں، لہٰذا تین طلاق مغلظہ واقع ہوگئی ہیں۔

تین طلاق کا حکم

سوال:109

میں روبینہ انجم سبحانی بنت سبحان خان میری شادی محمد افسر سے 28 مارچ 1986ء کوانجام پائی ہم دونوں فقہ حنفی سے تعلق رکھتے ہیں،10 سال پہلے میرے شوہر نے غصے میں آکر ایک ہی نشست میں مجھے کئی بار یہ لفظ ادا کئے ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔اس واقعے کا کوئی گواہ نہیں ہے، پھر وہ مکتبۂ اہلِ حدیث سے فتویٰ لے آئے کہ تین طلاق سے ایک ہی طلاق واقع ہوئی ہے ہم پھر ساتھ رہنے لگے،اس کے بعد وہ مجھ پر تشدد کرتے اور کہیں آنے جانے بھی نہیں دیتے،تالے میں مجھے بند رکھتے ،اس واقعہ کے 7 سال بعد انہوں نے 5 مرد اور 7 خواتین کی موجودگی میں قبلہ رو ہوکر کلمہ پڑھا اور کہا'' میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔میرے چار بچے ہیں، بڑے بیٹے کی عمر 18 سال،12 سال کی ایک بیٹی،10 سال کا ایک بیٹا پھر 8 سال کی بیٹی، تین چھوٹے بچے میرے بغیر نہیں رہتے اور میرے ساتھ ہیں وہ (بچوں کے والد) کوئی خرچہ بھی نہیں دیتے اور تشدد کر کے بچے چھین کر لے جاتا ہے،قرآن وسنت کے حساب سے باپ پر بچوں کا خرچہ کیا بنتا ہے؟،(روبینہ انجم،روفی گرین سٹی بلاک 18 گلستانِ جوہر،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیر صدقِ سائلہ مذکورہ شخص نے اپنی منکوحہ کو دس سال قبل جو تین طلاق دیں وہ مؤثر ہیں اور دیانتاً طلاق اسی وقت واقع ہوگئی ہے اور باوجود فقہ حنفی سے تعلق رکھنے کے،غیر مقلدین سے فتویٰ لینا محض ہوائے نفس کی پیروی اور جہالت ہے اور اس کے بعد جتنا عرصہ ساتھ گزارا وہ سب حرام اور زنا میں شمار ہوگا،آپ نے لکھا ہے کہ پہلی بار جب آپ کے شوہر نے تین طلاقیں دیں،تو اس کے گواہ نہیں ہیں،عنداللہ طلاق واقع ہونے کے لئے گواہوں کی موجودگی ،لازم نہیں ہے،آپ کے بقول آپ کے شوہر مسلک اہل حدیث سے فتویٰ لے آئے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے ایک ہی طلاق واقع

ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی بار بھی تین طلاق دینے کا اقرار کرتے ہیں اور یہ اعتراف قضاء طلاق کے لئے مؤثر ہونے کے لئے کافی ہے۔ بچوں کی کفالت اور پرورش کا حق اوّلاً ماں کو حاصل ہے۔ علامہ علاوالدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

تربیة الولد (تثبت للام)۔ ترجمہ: ''حق حضانت (نگہداشت کا حق) نسبی ماں کو حاصل ہے، (جلد نمبر 5، ص:203 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)''۔ اگر مطلقہ ماں کی عدّت ختم ہو چکی ہو اور وہ بچے کی پرورش پر اجرت کا تقاضہ کرے تو اجرت دینا باپ کے ذمّے واجب ہے، البتہ اگر وہ عدّت میں ہو تو یا غیر مطلقہ ماں اجرت کا تقاضا کریں تو ایسی صورت میں وہ اجرت کا مطالبہ نہیں کرسکتیں۔ درمختار میں ہے:

(وتستحق) الحاضنة (اجرة الحضانة اذا لم تکن منکوحة ولا معتدة) لابیه۔

ترجمہ: ''بچے کی پرورش کرنے والی عورت پرورش کرنے کی اجرت کی مستحق ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ بچے کے باپ کی منکوحہ نہ ہو اور نہ ہی وہ بچے کے باپ کی مطلقہ معتدہ ہو، (جلد نمبر 5، ص:209 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)''۔

بالغ بیٹا آزاد ہے چاہے ماں کے ساتھ رہے یا باپ کے ساتھ، نابالغ بچوں کی نگہداشت کا حق ماں کو حاصل ہے اور ان کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے، نفقہ باپ کی مالی حیثیت کے مطابق طے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ

ترجمہ: ''اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کیا جائے گا، (البقرہ:233)''۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ

ترجمہ: ''گنجائش والے کو چاہئے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچہ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہو تو وہ اسی میں سے نفقہ دے جو اللہ نے اسے دیا اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی

کے مطابق جو اسے دیا ہے، (الطلاق:7)''۔
علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

فتستحق النفقة(بقدر حالهما)، به يفتٰى، ويخاطب بقدر وسعه والباقی دين الی الميسرة۔

ترجمہ:''خاوند پر دونوں کی حیثیت کے مطابق نفقہ واجب ہوگا، اسی پر فتویٰ دیا جائے گا، اور خاوند اپنی وسعت کے مطابق ادائیگی کا مکلف ہوگا اور جو رقم باقی رہ جائے، تو وہ اس کے ذمہ قرض ہوگا، جس کو اپنی سہولت سے ادا کرے گا''۔
علامہ ابن عابدین شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

قالفی "البحر" : واتفقوا علی وجوب نفقة الموسرين اذا كانا موسرين، علی نفقة المعسرين اذا كانا معسرين، وانما الاختلاف فيما اذا كان احدهما موسرا والآخرمعسرا، فعلی ظاهر الرواية الاعتبار لحال الرجل ، فان كان موسرا وهی معسرة فعليه نفقة الموسرين، وفی عكسه نفقة المعسرين۔ واما علی المفتی به فتجب نفقة الوسط فی المسألتين وهو فوق نفقة المعسرة ودون نفقة الموسرة۔

ترجمہ:''''بحر'' میں ہے: سب کا اتفاق ہے کہ اگر دونوں خوش حال ہیں، تو ان کے حال کے مطابق خاوند پر نفقہ واجب ہوگا، اور اگر دونوں تنگ دست ہیں، تو ان کے حال کے مطابق خاوند پر نفقہ ہوگا، اور اختلاف صرف اس صورت میں ہے، جب دونوں میں سے ایک امیر اور دوسرا غریب ہے، ظاہر روایت کے اعتبار سے مرد کے حال کا اعتبار ہوگا، پس اگر خاوند خوشحال ہو، اور زوجہ تنگ دست، تو ان پر خوشحالی کا نفقہ واجب ہوگا، اور اس کے برعکس ہو تو تنگ دستی کا نفقہ واجب ہوگا، اور مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ درمیانہ نفقہ دونوں مسئلوں میں واجب ہوگا، اور وہ یہ ہے کہ خوشحالی سے کم اور تنگ دستی سے زائد ہو''......آگے چل کر لکھتے ہیں:

ويؤيده قول "البدائع": حتی لوكان الرجل مفرطا فی اليسار ياكل خبز

الحواری ولحم الدجاج والمرأة مفرطة فی الفقر تأکل فی بیت اھلھا خبز الشعیر یطعمھا خبز الحنطة ولحم الشاة۔

ترجمہ: "''بدائع'' میں ہے: اگر خاوند انتہائی خوشحال ہونے کی بنا پر صاف باریک آٹا اور مرغ کا گوشت کھاتا ہے اور بیوی انتہائی تنگ دستی کی بنا پر اپنے گھر والوں کے ہاں جو کی روٹی کھاتی ہے، تو خاوند اسے گندم کی روٹی اور بکرے کا گوشت نفقہ کے طور پر کھانے کو دیگا''، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد5 ص:226-225 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یقدر نفقتھا بالدراھم والدنانیز علی أی سعر کانت بل یقدر بھا علی حسب اختلاف الاسعار غلا ورخصارعایة للجانبین کذافی البدائع۔

مفہوم: ''نفقہ کا تعین اشیاء ضرورت کی مروجہ قیمت سے صرف نظر کر کے (ایک مستقل معیار کے طور پر) درہم ودینار (روپوں) سے نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ہمیشہ اتنے ہی روپے دیئے جائیں، اس لئے کہ اشیاء ضرورت کی قیمتیں کم وبیش ہوتی رہتی ہیں) بلکہ (ہر دور میں) مہنگائی اور ارزانی کے اعتبار سے نفقہ کا تعین ہوگا تا کہ جانبین کی رعایت ملحوظ رہے۔ ارزانی وگرانی دونوں ادوار کے مصارف یکساں ں ہوسکتے، بلکہ گرانی میں اس کے لحاظ سے نفقہ کی مقدار بڑھائی جائے گی اور ارزانی میں کم کی جائے گی بدائع الصنائع میں بھی اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد1 ص:547 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

طلاق میں اضافت

سوال:110

میرا ایک مسئلہ ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی میں گھریلو بات پر لڑائی ہوئی۔ بہت ہی شدید غصے میں لڑائی اسقدر بڑھ گئی کہ ہم دونوں ہوش وحواس کھو چکے تھے، اور میں نے شدید غصے میں اسے دومرتبہ طلاق، طلاق کہا۔ نہ تو میں نے اپنی بیوی کا نام لیا اور نہ ہی یہ کہا کہ تجھے طلاق، اس طرح کی بات بالکل نہیں۔ صرف طلاق، طلاق کہا۔ میرے یہ الفاظ

کہنے سے پہلے ہم دونوں کے درمیان گالیاں چل رہی تھیں اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پہلے جب جھگڑا شروع ہوا تو اس وقت کہا تھا کہ مجھے علیحدگی چاہیے جس وقت طلاق کے لفظ کہے اس وقت بدکلامی ہو رہی تھی۔ اب ہم دونوں ہی بہت پریشان ہیں ہمارا ڈیڑھ سال کا بچہ ہے، براہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں ہمارے اس مسئلے کا حل بتائیں، (فیصل خان، بلاک 14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

طلاق میں اضافت ضروری ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

اما وجود الاضافة فی اللفظ فاقول علی ثلثة انحاء ،الاول تحققها صریحاً فی کلام الزوج وهذا الذی ذکر الحلبی والطحاوی امثلته کقوله انت طالق او طلقتک او هذه او زینب او بنت زید او ام عمرواو اخت بکر او امرأتی طالق، الثانی تحققها فیه لاجل کونه جواباً لکلام تحققت فیه فتحقق فی الجواب ایضاًلان السوال معاد فی الجواب وهذا مافی الهندیة عن الخلاصة قالت طلاق بدست تو است،مرا طلاق کن فقال الزوج طلاق می کنم و کرر ثلثا طلقت ثلثا۔

ترجمہ: ''یا لفظوں میں اضافت کا موجود ہونا فاقول (تو میں کہتا ہوں) یہ تین طرح ہوتی ہے: اول یہ کہ خاوند کے کلام میں صراحۃً پائی جائے اس کی صورت وہ ہے جو علامہ حلبی اور علامہ طحاوی نے ان الفاظ میں ذکر کی ہیں: مثلاً تو طلاق والی ہے، میں نے تجھے طلاق دی (یا بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اسے طلاق دی) یا بیوی کا نام لے کر کہا کہ (مثلاً اس کا نام زینب ہے) میں نے زینب کو طلاق دی، (یا اس کی کنیت کی نسبت سے کہا کہ) میں نے زید کی بیٹی کو یا عمرو کی ماں کو یا بکر کی بہن کو طلاق دی، یا یوں کہا میری بیوی کو طلاق۔ دوسری صورت یہ ہے کہ طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے جواب میں ذکر کیے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی، تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں

محقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اس کی مثالیں فتاویٰ عالمگیری میں خلاصہ سے منقول ہیں، مثلاً بیوی کہے ''طلاق تیرے اختیار میں ہے مجھے طلاق دے''، تو جو اب میں خاوند کہے ''میں نے طلاق دی'' تین دفعہ تکرار کیا تو تین طلاقیں بیوی کو پڑیں گی اھ ت (فتاویٰ رضویہ جلد 12 ص:344.345 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

محمد مظفر کا اپنی والدہ سے جھگڑا ہو رہا تھا تو اس کی والدہ نے کہا کہ: اگر اپنی بی بی کو نہ چھوڑ و گے تو تم سور کھاؤ، اسی طرح تین مرتبہ بولی، مظفر نے کہا طلاق دیتے ہیں، پھر اس نے بلا قصد غصہ کے ساتھ اپنی والدہ کے سامنے کہا طلاق طلاق طلاق، بغیر مخاطب کرنے کسی کو۔ اب شرعاً صورتِ مسئولہ میں مظفر کی بی بی پر طلاق پڑے گی یا نہیں؟

جواب میں لکھتے ہیں:

تین طلاقیں ہوگئیں، تحلیلِ شرعی کے بغیر اس کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ رضویہ جلد 12 ص:360 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)''۔

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل، چونکہ مذاکرۂ طلاق موجود ہے اور جیسا کہ بے اضافت طلاق کی صورتوں میں سے دوسری صورت یہ ہے کہ:

طلاق کے الفاظ کسی ایسے کلام کے جواب میں ذکر کیے جائیں جس میں اضافت مذکور تھی تو اس وجہ سے وہ اضافت جواباً طلاق کے الفاظ میں متحقق ہوگی، کیونکہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے، اسی کو اصطلاح فقہاء میں مذاکرۂ طلاق کہتے ہیں، لہٰذا دو طلاق واقع ہوگئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

ترجمہ: ''طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، (البقرہ229)''۔

شوہر چاہے تو عدت کے اندر یک طرفہ طور پر عقد ثانی کے بغیر رجوع کرسکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کرلے۔ اور اگر عدت کے اندر

رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ بھی عقدِ ثانی کر سکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کر سکتی ہے، اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقدِ ثانی کیا، تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، کیونکہ پہلے دی ہوئی طلاقیں رجوع کے باوجود آئندہ طلاق کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہتی ہیں، لہٰذا شوہر اول کے رجوع یا عقد ثانی کے بعد اگر خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو وہ ان پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہو کر تین طلاقیں ہو جائیں گی اور وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی، اسے انتہائی محتاط زندگی گذارنی ہوگی۔

بیوی کو مشروط طلاق دینا

سوال: 111

محمد اشرف نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے یہ الفاظ کہے ''اگر تم نے اپنے بھائی سے بات کی تو میری طرف سے تم کو طلاق ہوگی''۔ اس کے بعد وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے اور ایک سال سے بیوی کا بھائی اس سے ملتا بھی ہے اس کے گھر میں کھانا کھاتا اور رہتا بھی ہے، بہن جاہل ہے وہ ضد سے یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ محمد اشرف نے بیان دیا کہ ''میں نے اپنی بیوی سے کہا ہے کہ اگر تم نے اپنے بھائی سے بات کی تو میری طرف سے اس کو طلاق ہوگی''۔ اس بیان کے گواہ محمد اشرف کی ہمشیرہ اور ایک بہنوئی موجود ہیں۔ معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت دونوں میاں بیوی کی کیا حیثیت ہے کیا وہ دونوں میاں بیوی رہے ہیں یا نہیں؟، (محمد عربی فورمین، کوئٹہ)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور شوہر (محمد اشرف) نے اپنی بیوی کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ کلمات کہے ہیں اور وہ ان کلمات کا اقرار کرتا ہے، تو جب پہلی بار بیوی نے بھائی سے بات کی، تو اس پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی، اس کے بعد چونکہ وہ بدستور میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے، لہٰذا رجوع ہو گیا اور ان کا نکاح قائم ہے۔ آئندہ شوہر کے

پاس صرف دو طلاق کا اختیار باقی ہے، اگر شوہر منکر ہے اور مدعی کے پاس چونکہ ایک مرد اور ایک عورت گواہ ہے لہٰذا اس سے نصابِ شہادت پورا نہیں ہوتا، بصورتِ انکار شوہر کو قسم دی جائے گی، یہ مسئلہ قضا یعنی عدالتی ثبوت کے اعتبار سے ہے، عنداللہ حقیقتِ حال اور دیانت پر فیصلہ ہوتا ہے۔

خلع اور حقِ حضانت

سوال:112

میری بیٹی پانچ ماہ کی حاملہ ہے خلع ہونے کی صورت میں کیا بچے کی پیدائش سے پہلے اس کے ماں یا باپ کے پاس رہنے کا فیصلہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟۔ بچے کی ولادت کے بعد بچہ کتنے عرصے تک ماں کے پاس رہ سکتا ہے اور اس کے بعد شریعت کیا کہتی ہے، (سید ارشاد علی، 23-x- عثمان گارڈن بلاک 13، گلستان جوہر، کراچی)۔

جواب:

بچے کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش ونگہداشت کا حق بچے کی ماں کو حاصل ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

الحضانةللأم------ (ثم) أى عدم الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقها أو تزوجت بأجنبى (أم الأم) وان علت عند عدم أهلية القربىٰ (ثم أم الأب وان علت) بالشرط المذكور ،وأما أم ابى الأم فتؤخر عن أم الأب بل عن الخالة أيضاً۔

ترجمہ:" بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے--------آگے چل کر لکھتے ہیں:

ترجمہ:" ماں فوت ہوجائے یا بچے کو قبول نہ کرے یا اپنا حق حضانت ساقط کردے، یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کرلے جو بچے کے لئے اجنبی ہے، تو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق ہے یہ استحقاق بالترتیب اوپر تک جائے گا، اگر قریب والے میں پرورش کی اہلیت نہ ہو، پھر دادی کو اور مذکورہ کے ساتھ یہ سلسلہ اوپر تک جائے گا، پھر نانا کی ماں، دادی بلکہ خالہ

سے بھی مؤخر ہے۔
علامہ علاؤالدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

تربیت الولد(تثبت للام)النسبیة۔

ترجمہ:''حق حضانت (نگہداشت کا حق) نسبی ماں کو حاصل ہے،(جلدنمبر5،ص:203، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)''۔
علامہ علاؤالدین حصکفی لڑکے کے حقِ پرورش کے متعلق لکھتے ہیں:

(والحاضنة) أما أو غيرهما (أحق به) أى بالغلام حتى يستغنى عن النساء وقدر بسبع وبه يفتى لأنه الغالب۔

ترجمہ:''پرورش کرنے والی ماں ہوں یا کوئی اور اس کو یہ حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک لڑکا عورتوں کی نگرانی سے مستغنی نہ ہو جائے، جس کی مدت کا اندازہ سات سال لگایا گیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، کیونکہ اکثر صورتوں میں یہ ضرورت اسی عمر تک رہتی ہے۔
لڑکی کی پرورش کے بارے میں لکھتے ہیں:

(الأم والجدة) لأم أو لأب(احق بها) بالصغيرة (حتى تحيض) اى تبلغ (وغيرهما احق بها حتىٰ تشتهى) وقدر بتسع وبه يفتى۔

ترجمہ:''ماں اور نانی اور دادی لڑکی کے حیض آنے تک ان کی پرورش کا استحقاق رکھتی ہیں، (ان کی عدم موجودگی یا عدم دستیابی کی صورت میں) دوسری پرورش کرنے والی عورتوں کا استحقاق لڑکی کے مشتہاۃ (قریب البلوغ) ہونے تک ہے اور اس کی مدت کا اندازہ 9 سال لگایا گیا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5 ص:210 تا 216 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔
صورتِ مسئولہ میں بچے کی پیدائش کے بعد اگر لڑکا ہو تو سات سال، اور لڑکی ہو تو نو سال کی عمر تک ماں کے پاس رہیں گے اور اس کی پرورش کا خرچہ (جب تک وہ بچہ اپنی بقاء و نگہداشت کیلئے ماں کی محتاج ہے) بچے کے باپ کے ذمے ہے، اور یہ خرچہ وہ اپنے مالی

معیار کے مطابق دینے کا پابند ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

ترجمہ: ''اور جس کا بچہ ہے، اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے، (البقرۃ:233)''۔

(وتستحق) الحاضنة (اجرة الحضانة اذا لم تكن منكوحة ولا معتدة) لابيه۔

ترجمہ: ''بچے کی پرورش کرنے والی (ماں) اجرتِ حضانت کی حق دار ہے، بشرطیکہ نہ وہ کسی شخص کے نکاح میں ہو اور نہ ہی اس (زیرِ نگہداشت) بچے کے باپ کی عدت (طلاق) میں ہو، (جلد نمبر 5، ص:209 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)''۔

طلاقِ بائن

سوال :113

میرے شوہر نے مجھے دو مرتبہ یہ کہا کہ میں نے تجھے آزاد کیا، ابھی جب یہ مجھے چھوڑ کر گئے تو دوبارہ یہی الفاظ دہرائے وہ کہتا ہے کہ میں نے طلاق کے الفاظ استعمال نہیں کیے اس صورت میں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے برائے مہربانی آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ دے دیجیے، (شہلا ظفر، R-822 بلاک 14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولو قال اعتقتك طلقت بالنية كذا في معراج الدراية۔

ترجمہ: ''اور اگر (خاوند) نے اپنی بیوی سے کہا: ''میں نے تجھے آزاد کیا''، اگر (یہ کلمات ادا کرتے وقت) ان کی نیت طلاق کی تھی، تو ایک طلاق واقع ہو جائیگی، جیسا کہ معراج الدرایہ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:376 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

یہ طلاقِ بائن کا کلمہ ہے اور اس کا دارومدار نیت پر ہے، عام فقہی قاعدہ یہ ہے کہ بائن، بائن کو لاحق نہیں ہوتی ہے، لیکن اگر ثانی کو اوّل کی خبر بنانا ممکن ہو تو، ثانی سے اوّل ہی مراد ہوتی ہے، چونکہ شوہر نے ''میں نے تجھے آزاد کیا'' کا کلمہ دو مرتبہ متصلاً کہا ہے، اس لئے اس سے

ایک طلاق بائن واقع ہوگی، اس کے بعد جب دوبارہ آپ کو چھوڑ کر جاتے وقت یہی کلمہ اگر عدت کے اندر طلاق کی نیت سے کہا ہے، تو اس سے دوسری طلاقِ بائن واقع ہوجائے گی۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

اذا امکن جعله اخبارا عن الاول کانت بائن کانتِ بائنٌ بائنٌ اوابنتکِ بتطلیقة فلا یقع لانه اخبارٌ فلا ضرورة فی جعله انشاء بخلاف ابنتک باخری او انت طالق بائنٌ۔

ترجمہ: ''طلاق بائن کو (دوسری) بائن لاحق نہیں ہوتی، جبکہ دوسری کو پہلی کی حکایت وخبر قرار دینا درست ہو، جیسے شوہر یوں کہے، تو بائن ہے، بائن ہے یا یہ کہے کہ میں نے تجھے ایک طلاق بائن دی تو یہ دوسری بائن واقع نہیں ہوگی، کیونکہ یہ پہلی ہی کی حکایت وخبر ہے۔ تو اسے انشاء یعنی نئی طلاق قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر وہ کوئی ایسے کلمات کہہ دے، جنہیں پہلی کی خبر قرار دینا ممکن نہ ہو تو وہ دوسری طلاق شمار ہوگی، جیسے یوں کہے کہ: ''میں نے تجھے دوسری طلاق بائن دی، (ردالمحتار علی الدر المختار، ج 4 ص: 409-408، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لایلحق البائن البائن بان قال لها انت بائن ثم قال لها انت بائن لایقع الا طلقة واحدة بائنة لانهٗ یمکن جعله خبرا عن الاول.

ترجمہ: ''طلاق بائن، بائن کو لاحق نہیں ہوتی، مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے کہا تو بائن ہے، پھر اس سے کہا تو بائن ہے، تو اس سے ایک ہی طلاق بائن واقع ہوگی، کیونکہ دوسری کو پہلی کی حکایت وخبر قرار دینا ممکن ہے، (فتاویٰ عالمگیری ج 1 ص: 377 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''

اور اگر شوہر کی نیت طلاق کی نہیں، تو یہ کلمات لغو ہوں گے اور کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، لیکن اگر طلاق دیتے وقت شوہر کی نیت طلاق کی تھی، مگر بعد میں وہ منکر ہوگیا، تو قضاءً عدمِ وقوعِ طلاق کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

''تم تو میری بیوی نہیں ہو''، الفاظِ طلاق نہیں

سوال:114

میرے شوہر نے آج سے تقریباً آٹھ دس سال پہلے جھگڑے کے دوران غصے میں دو تین مرتبہ کہا ''تم تو میری بیوی نہیں ہو'' اس کے بعد میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ تمہارا میرا تعلق صحیح نہیں ہے، انہوں نے کہا: میں نے طلاق کی نیت سے نہیں کہا، آپ سے گزارش ہے کہ جلد میرے مسئلے کا حل کر دیجئے، کہ مجھے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟۔(ایک دینی بہن، معرفت علامہ جمیل احمد نعیمی)۔

جواب:

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی باہمی حسن سلوک اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ گزارنی چاہئے، ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع صرف نظر کرنی چاہئے، استفتاء میں درج خط کشیدہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، صحیح قول کے مطابق اگر شوہر ان الفاظ سے طلاق کی نیت کرتا تو بھی طلاق واقع نہ ہوتی۔

ولو قال "توزن من نتی" لا یقع ان نوی وھو المختار۔

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے، تو میری بیوی نہیں ہے، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، اگرچہ اس کی نیت طلاق کی ہو اور یہی مختار (مذہب) ہے''۔لہٰذا نکاح باقی ہے۔فتاوٰی عالمگیری جلد 1 ص:386 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

مسئلۂ طلاق

سوال :115

میرا مسئلہ کچھ یوں ہے کہ 7 سال قبل میرے اور شوہر کے بیچ جھگڑا ہو رہا تھا کہ اتنے میں میرے شوہر نے کہا: ''چپ ہو جاؤ ورنہ کچھ بول دوں گا''۔ بولوں ابھی'' طلاق''۔ پھر بولوں! چپ ہو جاؤ، میں نے ان کو چپ کرایا، ہمارے بیچ کوئی طلاق کی بات نہیں چل رہی تھی اور نہ میں نے ان سے بھی طلاق کا مطالبہ کیا۔ پھر انہوں نے قرآن اٹھایا اور کہا: کہ

میں یہ لفظ آئندہ نہیں بولوں گا۔ اس کے تین سال بعد میرے شوہر نے پھر لفظ ''طلاق'' کہا، جھگڑے کے دوران۔ تب بھی کوئی مطالبہ یا کوئی بات طلاق کی نہیں چل رہی تھی، پھر ان سے میں نے کہا کہ ہمارے بیچ نازک رشتہ ہے اور دو بار آپ بول چکے ہیں، تو انہوں نے پھر قرآن اٹھایا اور کہا کہ آئندہ یہ لفظ نہیں بولوں گا۔ میں نے یہی سمجھا کہ انہوں نے دو طلاقیں دیں یا دو بار بولا۔ اور ان کو سمجھایا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک طلاق کے بعد رجوع ہو جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔ بہر حال پھر انہوں نے کچھ مہینے قبل جھگڑے میں کہا کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ اب ہماری ۳ ہو گئی ہیں اور میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں، تو انہوں نے کہا کہ یہ دوسری بار ہے، اس کے بعد میں اپنی امی کے گھر آ گئی۔ پھر میری ان سے فون پر بات ہوئی اور انہوں نے کہا کہ ''میں نے دے دوں گا'' کہا تھا اور وہ اللہ کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں۔ بہر حال اب وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے صرف ایک طلاق دی ہے اور ہم اب بھی میاں بیوی ہیں۔ برائے مہربانی میرا مسئلہ قرآن وسنت کی روشنی میں حل کر دیجیے، تاکہ میں سکون سے رہ سکوں۔ میری آخرت اور دنیا دونوں سرخرو ہو سکیں۔ ایک بات یاد رہے کہ میں نے ان سے ان تینوں موقعوں پر طلاق کی بات یا مطالبہ نہیں کیا، اچانک غصے کی حالت میں وہ یہ نکال دیتے۔ اب وہ یہی کہتے ہیں کہ ایک طلاق ہوئی ہے۔ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب دیجیے کہ ہمارا نکاح باقی ہے یا نہیں یا کتنی طلاق واقع ہوئی ہیں۔

(بشریٰ بنت اقبال، A-492، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں متعدد احتمالات ہیں، جس کی وجہ سے علی التعیین ایک حکم بیان کرنا مشکل ہے، لہٰذا تمام احتمالات میں سے ہر ایک کا حکم حسب ذیل ہے:

پہلی مرتبہ شوہر نے یہ الفاظ کہے ''بولوں ابھی طلاق'' اور پھر کہا: ''پھر بولوں''، دوبارہ ''پھر بولوں'' کہنا اس بات کا قرینہ ہے کہ پہلی بار اس نے طلاق کی نیت کی ہے، لہٰذا ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی۔ تین سال کے بعد جب دوبارہ شوہر نے لفظ طلاق بولا، تو اس صورت میں

بھی اگر اس نے یہ لفظ اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے بولا ہے، تو ایک اور طلاقِ رجعی واقع ہوگئی۔ اور شوہر کا یہ کہنا ''ایک طلاق کے بعد رجوع ہو جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے'' بظاہر اس بات پر قرینہ ہے کہ مذکورہ لفظ طلاق بہ نیت طلاق زوجہ کہا ہے۔ لہٰذا مذکورہ خاتون کو ایک اور طلاقِ رجعی واقع ہوگئی۔ شوہر کا یہ کہنا کہ طلاقِ رجعی کے بعد رجوع کر لیا جائے، تو وہ طلاق کالعدم ہو جاتی ہے، درست نہیں ہے، بلکہ وہ آئندہ طلاقوں کے ساتھ جمع ہونے کے لئے بدستور مؤثر رہتی ہے، تاہم دو طلاقِ رجعی کے بعد شوہر کو پھر بھی رجوع کا حق حاصل رہتا ہے۔ شوہر نے جب تیسری بار ''میں تجھے طلاق دیتا ہوں'' کے الفاظ کہے تو اب یہ طلاق پچھلی دو طلاقوں کے ساتھ مل کر تین طلاقیں ہو جائیں گی۔ لیکن اگر شوہر کہتا ہے کہ میں نے ''طلاق دے دوں گا'' کے الفاظ کہے تھے، تو بیوی سے گواہ طلب کیے جائیں گے، اگر گواہوں سے ثابت ہو جائے تو تیسری طلاق کا حکم لگا دیا جائے گا اور بیوی شوہر کے لئے حرام ہو جائے گی ورنہ شوہر کے انکار کی صورت میں قسم کے ساتھ اس کا قول معتبر ہوگا اور اس صورت میں نکاح قائم رہے گا۔

مشروط طلاق

سوال:116

میں نے مختلف وجوہات کی بنا پر اپنے شوہر سید محمد طارق کو طلاق دینے کا نوٹس دیا تھا اور اس نوٹس کے جواب میں انہوں نے ایک خط تحریر کر کے روانہ کیا جس کی نقل منسلک ہے یہ خط مجھے 11 اگست 2006ء کو ملا۔ اس خط میں ایک طلاق کا ذکر ہے میں گذشتہ دو سال سے والدین کے ساتھ مقیم ہوں اور اس خط کے موصول ہونے کے بعد بھی اُس مقررہ تاریخ پر یا اس کے بعد شوہر کے گھر نہیں گئی اور تا حال والدین کے گھر میں رہ رہی ہوں، خط کی تحریر مندرجہ ذیل ہے:

ڈیئر ریشماں! السلام علیکم!

تم ایک طویل عرصے سے میکے میں بیٹھی ہو اور میرے بار بار بلانے پر بھی واپس نہ آئی اب

میں تم کو حتمی طور پر کہتا ہوں کہ 14 اگست 2006ء یومِ آزادی کے دن دوپہر بارہ بجے تک واپس آجاؤ ورنہ تم پر میری جانب سے پہلی طلاق نافذ ہوجائے گی اور اسی دن سے عدت شروع ہوجائے گی، دورانِ عدت جب اور جس وقت واپس آنا چاہو آسکتی ہو وہ رجوع سمجھا جائے گا، ورنہ عدت پوری ہونے پر تمہیں یہی طلاق بائن ہوجائے گی، خیر اندیش طارق۔

مہربانی فرما کر اس خط کی شرعی حیثیت پر فتویٰ صادر فرمائیں۔

ا۔ کتنی مدت تک مجھے انتظار کرنا ہوگا کہ طلاق مکمل ہوجائے؟

۲۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور نوکری کرتی ہوں لہٰذا اس مدت کے دوران تو کوئی عدت نہیں کیونکہ مجھے نوکری پر جانا ضروری ہے۔

۳۔ اگر خاص مدت کے بعد خود بخود طلاق ہوجاتی ہے تو میرے پاس تو کوئی تحریر نہیں ہے کہ مجھے مکمل طلاق ہوگئی ہے شوہر کی جانب سے مکمل طلاق کی تحریر کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟۔ (ریشماں صدیقی، A-33/9 دستگیر سوسائٹی فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر سائلہ ریشماں صدیقی کا بیان درست ہے، تو ان کے شوہر نے انہیں ایک مشروط طلاق دی تھی کہ اگر وہ 14، اگست 2006ء (یوم آزادی) کو 12 بجے دن تک واپس شوہر کے پاس چلی گئیں تو فبہا، ورنہ ایک طلاق واقع ہوجائے گی، اور وہ 14، اگست 2006ء کو 12 بجے دن تک واپس شوہر کے پاس نہیں گئیں، لہٰذا شرط کے مفقود ہونے پر یہ طلاق رجعی واقع ہوگئی۔ دوسری بات جو شوہر (طارق) نے خط میں اپنی بیوی (ریشماں صدیقی) کو لکھی، یہ ہے کہ: ''دورانِ عدّت جب اور جس وقت واپس آنا چاہو، آسکتی ہو، وہ رجوع سمجھا جائے گا، ورنہ عدّت پوری ہونے پر تمہیں یہی طلاق بائن ہوجائے گی''۔ سائلہ چونکہ 14، اگست 2006ء بارہ بجے دوپہر تک شوہر کے ہاں نہیں گئی، پس اس بنا پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی اور اسی تاریخ سے عدّت بھی شروع ہوگئی، عدّت شروع ہونے کے لئے کسی نیت یا خاص عمل کی ضرورت نہیں ہے، طلاق کے بعد عدّت

ازخود شروع ہوجاتی ہے۔ پھر دورانِ عدّت نہ تو شوہر نے رجوع کیا اور نہ ہی بیوی خود شوہر کے پاس گئی، کیونکہ شوہر نے دورانِ عدت اس کے واپس آجانے پر رجوع کو معلّق ومشروط کیا تھا۔ لہٰذا عدّت کے گزرتے ہی یہ طلاق بائن ہوگئی۔ اب یہ خاتون (ریشماں صدیقی) باہمی رضامندی سے اپنے سابق شوہر کے ساتھ بھی نکاح کرسکتی ہے اور کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھی۔ سابق شوہر کے ساتھ نکاح کی صورت میں خدانخواستہ اگر اس نے دوبارہ ایک یا دو طلاقیں دیں، تو تجدیدِ نکاح کے باوجود یہ پہلی طلاق ان کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہے گی، یعنی نکاحِ ثانی کے بعد اگر اس نے ایک طلاق دی، تو وہ اس پہلی طلاق کے ساتھ مل کر دو ہو جائیں گی اور اگر دو طلاقیں دیں تو وہ اس پہلی کے ساتھ مل کر تین ہوجائیں گی۔ شرعی تقاضوں کے مطابق شوہر کا یہ خط ثبوتِ طلاق کے لئے کافی ہے، قانونی کارروائی اور طلاق کی توثیق کے لئے یو۔سی ناظم سے رجوع کریں۔

طلاقِ معلّق بالشرط

سوال:117

گذشتہ چند ماہ سے گھریلو جھگڑے کی وجہ سے میری بیوی اپنے والدین کے گھر گئی ہوئی تھی، میں کئی مرتبہ لینے گیا لیکن بے سود رہا۔ فون پر بات ہوئی، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی بات پر مُصر رہی، میں نے کہا کہ طلاق لکھ کر بھیج دوں؟، پھر ماں باپ کے پاس بیٹھی رہو گی۔ اس نے جواباً کہا کہ میں پوری زندگی آپ کے ساتھ رہوں گی طلاق مجھے قطعاً نہیں چاہئے لیکن میری شرائط وہی ہیں۔ شرائط سے اس کی مراد یہ ہے کہ میں اس کے والدین اور بھائیوں کے ماتحت رہوں اور گھر میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ ہو۔ جب کوئی بات بنتی نظر نہیں آئی تو بقائمی ہوش وحواس اور طبیعت میں سختی کے ساتھ طلاق دینے کی نیت سے میں نے یہ الفاظ کہے ''تین قبول کر''، اس کے بعد (میں نے غالباً)'' طلاق قبول کرلو'' کے الفاظ کہے اور پھر میں نے فون بند کردیا۔ ان الفاظ کی ادائی کے دوران بھی وہ اپنی بات پر بضد رہی شاید میری بات پر توجہ بھی نہیں دی اور میرے کہے ہوئے الفاظ شاید اس

نے نہیں سنے اور میں نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ گھر آ کر میں نے اپنی بہنوں سے کہا کہ میں نے اسے فارغ کر دیا ہے، طلاق دے دی ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟، اگر ہوگئیں تو کتنی؟۔ (معرفت: سید مختار حسین شاہ، امام مسجد محلہ جدون آباد، ہری پور، ہزارہ صوبہ سرحد)۔

جواب:

شوہر کا اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے یہ کہنا کہ: ''تین قبول کر''۔ یہ طلاقِ کنایہ کے الفاظ ہیں اور چونکہ نیتِ طلاق موجود ہے، اس لئے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اب تحلیل شرعی کے بغیر عدّت کے اندر اور عدّت کے بعد دونوں کے درمیان نکاح نہیں ہوسکتا۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو قال لها: تؤ سه ده و نوى الطلاق، يقع۔ ترجمہ: ''شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے کہا: تجھے تین دیئے، تو طلاق واقع ہو جائے گی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد:1، ص:380)''۔

خلع

سوال:118

عرض ہے کہ میرے ایک قریبی عزیز کی بیٹی کا نکاح تقریباً ایک سال پہلے ہوا تھا اور ایک سال کے بعد رخصتی ہونا تھی لہٰذا گھریلو طور پر عورتوں میں کافی اختلافات پڑ گئے جس کی وجہ سے خلع تک نوبت آ گئی لہٰذا اب کوئی صورت بات بنتی نظر نہیں آ رہی لہٰذا آپ سے گذارش ہے کہ خلع کی صورت میں شرعی کیا پہلو ہیں؟۔ (حنیف شیخ بلالی، کراچی)۔

جواب:

خلع زوجین کی رضامندی سے ہوتا ہے، یعنی بیوی کچھ مال دے کر خلع حاصل کرے یا مطالبہ مہر سے دستبردار ہو جائے، اس سے طلاق بائن ہو جاتی ہے۔ مال کے بدلے نکاح زائل کرنے کو خلع کہتے ہیں۔ خلع میں عورت کا قبول کرنا شرط ہے اور اس کے الفاظ معین ہیں ان الفاظ کے علاوہ اور لفظوں سے خلع نہ ہوگا۔ خلع ایک طلاق بائن کے

درجے میں ہوتا ہے۔صورتِ مسئولہ میں اگر زوجین خلع پر رضامند ہوجاتے ہیں تو چونکہ رخصتی تاحال نہیں ہوئی اور عورت غیر مدخولہ ہے لہٰذا اس پر عدت نہیں ہے۔

زوجِ مفقود الخبر

سوال:119

میرے خاوند فاروق قیصر کوٹ لکھپت جیل لاہور میں بطور کانسٹیبل کام کرتے تھے۔1994 میں وہ صبح گھر سے اپنی ڈیوٹی پر گئے، گھر سے نکلتے ہی کچھ لوگوں نے انہیں اغوا کرلیا، شام تک میرے خاوند گھر واپس نہیں آئے، تو ہم نے ان کے آفس (جیل) سے معلوم کیا، تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس دن ڈیوٹی پر نہیں آئے۔ہم نے اس دن ہی ان کی اغوا کی رپورٹ متعلقہ تھانے میں درج کرادی تھی۔ پولیس نے بھی کافی عرصہ اس کسی کی تفتیش کی، مگر آج تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔آج ان کے اغوا کو گیارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔عرض یہ ہے کہ میں اس وقت سے اپنے ضعیف والدین کے ساتھ رہ رہی ہوں، میرے تین بچے ہیں، میرے والدین میری اور میرے بچوں کی اس دن سے کفالت کررہے ہیں۔میرے والدین کب تک میرا ساتھ دیں گے۔دراصل میں اپنا اب گھر بسانا چاہتی ہوں تاکہ باقی ماندہ زندگی باعزت اور شرعی طور پر گزرے۔میرے میکے والے بھی مجھے قبول نہیں کررہے ہیں۔اور نہ میری کفالت کرنے کو تیار ہیں۔ان تمام حالات کے مدنظر میں نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ میں اپنا گھر بسا سکوں۔ ان حالات کے تحت کیا میں دوسری شادی کرسکتی ہوں یا نہیں۔آپ سے درخواست ہے کہ میرے اس مسئلے کا حل بتایا جائے اور اس سلسلے میں ہماری شریعت کیا کہتی ہے، اور شریعت کی ہی روسے فتویٰ دیا جائے، (نسیم فاروق، مکان نمبر 586/16 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

خاوند کے لاپتہ (مفقود الخبر) ہونے کی صورت میں امام ابوحنیفہ کا موقف:

علامہ ابوالحسن مرغینانی لکھتے ہیں کہ:

واذاتم له مأة وعشرون سنة من يوم ولد حكمنا بموته وهذه رواية الحسن عن ابى حنيفةوفى ظاهر المذهب يقدر بموت الاقران وفى المروى عن ابى يوسف بمأة سنة وقدره بعضهم بتسعين والاقيس ان لا يقدر بشئى والارفق ان يقدر بتسعين واذا حكم بموته اعتدت امرأته عدة الوفات من ذالك الوقت وقسم ماله بين ورثة الموجودين۔

ترجمہ: ''امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جب مفقود (لاپتہ) کی زندگی کے ایک سوبیس سال پورے ہوجائیں گے تو اس کو مردہ قرار دیا جائے گا اور ظاہر مذہب یہ ہے کہ جب اس کے تمام معاصرین فوت ہوجائیں گے، تو اس کو مردہ قرار دیا جائے گا۔ امام ابویوسف سے نوے سال کی روایت ہے: بعض مشائخِ حنفیہ نے بھی 90 سال مقرر کئے ہیں، زیادہ قیاس یہ ہے کہ وقت مقرر نہ کیا جائے۔ اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ 90 سال مدت مقرر کی جائے اور جب اس کو مردہ قرار دے دیا جائے گا، تو اس کی بیوی عدتِ وفات گزارے گی اور اس کا ترکہ وارثوں میں تقسیم کردیا جائے گا، (ہدایہ اولین، ص:598، کتاب المفقود)''۔

امام ابوالحسن لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ لاپتا شخص کا نکاح یقین سے ثابت اور معروف ہے، اور غائب ہوجانا تفریق کو واجب نہیں کرتا اور اس کی موت مشکوک ہے اور یقین شک سے زائل نہیں ہوتا، اس لئے جب تک اتنی مدت نہ گذر جائے، جس میں اس کی موت کا یقین ہوجائے۔ اس وقت تک اس کو مردہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ اور عرف اور عادت میں ایک آدمی ایک سوبیس سال سے زیادہ نہیں رہتا یا اپنے تمام معاصرین کی موت کے بعد زندہ نہیں رہتا، اس لئے اس مدت کے گذرنے کے بعد اس کو مردہ فرض کرلیا جائے گا۔ علامہ ابن ہمام نے تخفیف کرکے اس مدت کو ستر سال قرار دیا ہے۔

امام ابوحنیفہ اور مشائخ حنفیہ کی عبارات کو بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس لاپتا شخص کی بیوی کو اس کی عمر کے ایک سوبیس سال یا تمام معاصرین کی موت تک یا ستر یا نوے سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس کا اتنا مال اور ترکہ موجود ہو، جس کو اس

کی بیوی ستر یا نوے سال تک بیٹھ کر کھا سکے۔

سنن دار قطنی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امرأة المفقود امرأته حتی یاتیها البیان "لاپتا شخص کی بیوی اس کی بیوی قرار پائے گی جب تک کہ کوئی وضاحت نہ آجائے یا کوئی خبر نہ آجائے"۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں، اس حدیث کی سند میں محمد بن شرجیل ایک ضعیف راوی ہے۔ ابو حاتم نے کہا یہ شخص حضرت مغیرہ کی طرف منکر اور باطل روایات منسوب کرتا ہے۔ ابن قطان نے کہا اس کا ایک راوی سوار بن معصوب متروکین میں مشہور ہے اور اس سلسلہ میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار اور اقاویل متعارض ہیں۔

خاوند کے لاپتا (مفقود الخبر) ہونے کی صورت میں امام مالک کا موقف:

علامہ ابن سحنون مالکی نے امام مالک سے پوچھا آیا مفقود کی بیوی امام مالک کے قول کے مطابق حاکم کی اجازت کے بغیر بھی چار سال عدت گذار سکتی ہے؟ امام مالک نے فرمایا: نہیں! امام مالک نے فرمایا: اگر مفقود کی بیوی بیس سال بھی انتظار کرتی رہے، اس کے بعد حاکم کے پاس اپنا مقدمہ پیش کرے تو حاکم اس میں غور و فکر کرے اور جس جگہ وہ شخص گیا تھا، وہاں اس کی تفتیش کرے اور جب اس کا پتا نہ چل سکے اور وہ مایوس ہو جائے تو پھر اس کو چار سال ٹھہرنے کا حکم دے۔ امام مالک سے پوچھا گیا کہ چار سال ٹھہرنے کے بعد چار ماہ دس دن عدت گذارنے کے لئے بھی حاکم کی اجازت ضروری ہے یا وہ یہ مدت از خود بھی گذار سکتی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہاں اس کی عدت وفات کے ساتھ حاکم کا کیا تعلق ہے؟،

سحنون از ابن القاسم از امام مالک از یحیٰ بن سعید از سعید بن مسیب روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا جس عورت کا شوہر لاپتا ہو جائے، وہ چار سال انتظار کرے پھر چار ماہ دس دن عدت وفات گذارے اس کے بعد وہ نکاح کے لئے حلال ہو جائے گی۔

۲ ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ کو مفتی المالکیہ شیخ الجامع الازہر نے گیارہ معاشرتی مسائل میں امام مالک کے مذہب کی نصوص پر مشتمل ایک فتویٰ جاری کیا، جس کی جامع ازہر کے تمام علماء نے

تصدیق کی ہے، جن میں حنفی علماء بھی شامل ہیں۔ اس فتویٰ کو مصر کی وزارتِ اوقاف نے فتاویٰ اسلامیہ میں شائع کیا ہے۔ اس فتویٰ سے پہلے علماء ازہر نے فقہ حنفی سے اس پر تصریحات پیش کی ہیں کہ ضرورت کے وقت دوسرے مذہب پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

صدرالافاضل علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ ''فتاویٰ امجدیہ'' کے حاشیے میں، جو یا تو ان کا اپنا املا کرایا ہوا ہے اور یا ان کے، تلمیذ رشید اور نائب خصوصی، مفتی اعظم ہند علامہ محمد شریف الحق امجدی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تحریر کردہ ہے: لیکن اگر شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی وجہ سے عورت دوسری شادی پر اتنی مجبور ہو جائے کہ دوسرا کوئی چارۂ کار نہ ہو حالتِ ملجیہ پیدا ہو جائے، تو مذہب امام مالک رضی اللہ عنہ پر عمل کرنے کی اجازت ہمارے علماء نے بھی دی ہے۔ خصوصاً اس دور پر فتن میں ہمارے علماء کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اس خصوص میں امام مالک رضی اللہ عنہ کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے، مگر اس خصوص میں چند باتیں قابلِ لحاظ ہیں، اول یہ کہ مذہب امام مالک رضی اللہ عنہ یہ نہیں کہ شوہر کے غائب ہونے کے دن سے چار سال گزار کر شوہر کی وفات کا حکم دیا جائے، بلکہ یومِ قضاء (یعنی جس دن قاضی لاپتا شوہر کی موت کا حکم لگائے) سے چار سال انتظار کرنا ضروری ہے، جیسا کہ فتاویٰ رضویہ ج۵، ص۵۰۰ پر کتاب مُدَوَّنہ کے حوالے سے مذکور ہے، دوسرے یہ کہ اس کے لئے قضائے قاضی شرط ہے، درمختار میں ہے: انما یحکم بموتہ بقضاء لانہ امر محتمل فمالم ینضم الیہ القضاء لایکون حجۃ۔

ترجمہ: شوہر کی موت کا حکم قضائے قاضی سے دیا جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو دوسری جہت (زندگی) کا بھی احتمال رکھتا ہے، تو جب تک اس کے ساتھ قاضی کا فیصلہ نہیں ملے گا، یہ حجت نہیں ہوگا، (جلد: ۳، ص: ۳۳۱، کتاب المفقود، نعمانیہ)''۔ اس زمانے میں جب کہ یہاں حاکم اسلام نہیں، علمائے بلد، جو مرجع فتویٰ ہوں، اس خصوص میں قاضی کے قائم مقام ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ امجدیہ دوم، ص: 91 مطبوعہ مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)''۔

مختصر یہ کہ انتہائی مجبوری کی حالت میں جب عورت کے لئے اپنے نفس پر قابو پانا دشوار ہو جائے، اسے خدشہ ہو کہ بشری کمزوری کی بناء پر وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گی، تو ایسے موقع پر امام مالک کے مذہب پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے یا قاضی فیصلہ دے سکتا ہے۔ شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث صفحات 1095 تا 1120 میں اس مسئلے پر مفصل و مدلل بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ آثارِ صحابہ بھی اس سلسلے میں موجود ہیں اور چونکہ امام اعظم ابوحنیفہ نے اثرِ صحابہ کو اپنی اجتہادی رائے پر ترجیح دی ہے، اس لئے التزاماً مذہب حنفی کے مطابق بھی کہا جا سکتا ہے اور جیسا کہ امام مالک کے قول سے ثابت ہے اور صدر الشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا کہ وہ عورت جس کا خاوند مفقود الخبر (لا پتا) ہے، جب عدالت سے رجوع کرے گی، تو قاضی اس کی تلاش کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے باوجود لا پتا رہنے پر اس کی وفات کا حکم دے گا اور اس وقت سے وہ عورت چار سال اور عدت وفات گزارنے کے بعد کسی دوسرے شخص سے عقد کر سکے گی۔

علامہ سعیدی نے اس امکانی صورت پر بھی بحث کی ہے کہ اگر ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد عورت کسی شخص سے نکاح کر لیتی ہے اور پھر تقدیرِ الٰہی سے وہ شخص واپس آ موجود ہوتا ہے تو کیا کیا جائے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''جب مفقود لوٹ آئے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ زندہ ہے اور ابھی دوسرے شخص نے اس سے مقاربت نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کو مفقود کے زندہ ہونے کا پہلے علم تھا تو اب یہ مفقود کی زوجہ ہے، خواہ عقد نکاح ہو چکا ہو، اور اگر دوسرے شوہر کو مفقود کی حیات کا علم تھا تو اس نے مقاربت کی ہو یا نہ کی ہو مفقود کے لوٹ آنے کے بعد وہ مفقود کی بیوی ہو گی، اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مفقود، دورانِ عدت فوت ہوا ہے یا عدت کے بعد دوسرے نکاح سے پہلے فوت ہوا ہے یا عقد کے بعد مقاربت سے پہلے فوت ہوا ہے تو وہ عورت مفقود کی وارث ہو سکتی ہے اور اگر مقاربت کے بعد فوت ہوا ہے تو وہ عورت مفقود کی وارث ہو سکتی ہے اور اگر مقاربت کے بعد فوت ہوا ہے درآں حالیکہ دوسرے شوہر کو اس کی حیات کا علم نہیں تھا تو اب یہ وارث نہیں ہو گی۔ (شرح صحیح مسلم جلد

ثالث ص:1107 مطبوعہ فرید بک اسٹال، لاہور)''۔

تحریری طلاق نامہ لڑکی کو نہ ملے تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے

سوال:120

میری بیوی اور میرے درمیان کچھ اختلافات ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے میری بیوی ناراض ہو کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی تھی، تقریباً عرصہ دس ماہ گذر جانے کے بعد میں نے کافی اثر ورسوخ استعمال کیا، لیکن کوئی مسئلہ حل نہ ہوا۔ اس کے بعد میں وکیل کے پاس چلا گیا، اپنا قصہ سنایا اور پھر اس کو طلاق کا نوٹس تیار کرنے کو کہا۔ وکیل نے تین طلاق کا نوٹس تیار کر دیا اور میں نے طلاق نوٹس کی ایک کاپی سسرال والوں کے پتہ پر بھیج دی۔ اور ایک کاپی یونین کونسل کے پتا پر روانہ کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد دونوں کاپیاں الگ الگ مجھے مل گئیں، جو وصول نہ ہوئی تھیں، اور نہ ہی ان پر دستخط موجود تھے، اس کے بعد میں نے ایک جرگہ بٹھایا اور پوچھا کہ آپ کو میری طرف سے طلاق کا نوٹس ملا کہ نہیں، جس پر سسرال والوں نے جواب دیا کہ نہیں ملا۔ اور میں نے طلاق کا نوٹس مورخہ 26 اپریل 2005ء کو دیا تھا اور ابھی تقریباً چھ ماہ ہو چکے ہیں۔

میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا طلاق ہو گئی ہے یا نہیں ہوئی؟ مہربانی فرما کر قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیا جائے، میرے دو بچے ہیں، اور میری بیوی بھی دوبارہ میرے ساتھ بخوشی زندگی گذارنا چاہتی ہے، کیا طلاق مؤثر ہے یا غیر مؤثر؟، (محمد یعقوب، تحصیل حاصل پور ضلع بہاولپور)۔

جواب:

کتب فتاویٰ میں یہ مسئلہ درج ہے کہ اگر کسی شخص نے کاتب یا وثیقہ نویس سے کہا کہ میری بیوی کے نام طلاق لکھ دو اور اس نے لکھ دی تو طلاق واقع ہو جائے گی، جیسا کہ فتاویٰ شامی میں ہے: ولو قال للکاتب: اکتب طلاق امراتی کان اقرارا بالطلاق وان لم یکتب۔

ترجمہ:''اور اگر اس (شوہر) نے کاتب سے کہا کہ میری بیوی کے نام طلاق لکھ دو تو یہ طلاق کا اقرار ہے، خواہ کاتب نے لکھا نہ ہو (تب بھی طلاق واقع ہو جائے گی)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج 4 ص: 337 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی)''۔

چونکہ آپ نے اپنی مرضی سے وثیقہ نویس سے اپنی بیوی کے نام تین طلاقیں لکھوائیں اور اس طلاق نامے پر دستخط کر دیئے، تو اسی وقت طلاق واقع ہوگئی، طلاق کے مؤثر ہونے کے لئے بیوی کو تحریری طلاق نامے کا ملنا ضروری نہیں ہے، جس وقت طلاق نامے پر دستخط ہوئے، اسی وقت سے عدت بھی شروع ہوگئی، اب آپ کا اپنی بیوی سے کوئی تعلق باقی نہیں ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

طلاقِ مغلظہ کے بعد تعلقات

سوال:121

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ ایک میرے قابلِ احترام بنام مولانا علامہ فتح محمد ولد نظام دین ساکن نئی آبادی کھرالہ تحصیل وضلع جہلم کے رہائشی نے دو شادیاں کی ہوئی ہیں، دوسری شادی 1982ء کو ہوئی تھی۔ اس عورت کو کچہری میں جا کر 50 روپے والے اسٹامپ پیپر پر لفظ طلاق۔طلاق۔طلاق لکھ کر (جس طلاق نامے کی فوٹو کاپی ساتھ ارسالِ خدمت ہے) طلاق دے دی اور بمطابق قانونِ پاکستان ایک طلاق نامہ جو کہ اصل تھا، مطلقہ بیوی کو ارسال کر دی۔ اب جس عورت کو طلاق دی گئی ہے، وہ عورت طلاق نامہ وصول کرنے سے انکاری ہے اور محترم طلاق دینے والے بزرگوار ماشاء اللہ دینِ خداوندی پر عبور حاصل ہے دونوں یہ کہتے ہیں کہ طلاق اگر وصول نہ کی جائے تو طلاق نہیں ہوتی اور یہ دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں اور ایک ہی جگہ پر رہائش پذیر ہیں۔

جناب عالی! اسلام کی روح سے ان قابلِ احترام بزرگوار کے بارے میں کیا حکم ہے اور اس طلاق شدہ عورت کے بارے میں کیا احکاماتِ خداوندی ہیں، جناب فتویٰ صادر فرمایا جائے

تاکہ باقی اس گھر میں رہنے والے فریق خدا کے غضب سے بچ سکیں، (شاہد محمود ولد مولانا فتح محمد، نئی آبادی کھرالہ تحصیل وضلع جہلم)۔

جواب:

ہمیں مذکورہ بالا استفتاء کے ساتھ شوہر کا اشامپ پیپر تحریری طلاق نامہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی منسلک کر کے ارسال کی گئی ہے جس پر شوہر فتح محمد صاحب اور دو گواہوں محمد ناصر اور حافظ سجاد حیدر کے دستخط بھی ثبت ہیں اور سید صفات احمد شاہ (اوتھ کمشنر) نے اپنے دستخطوں اور مہر کے ساتھ اس کی توثیق کی ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ شوہر نے اپنی بیوی کا نام لے کر تین دفعہ طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر طلاق دے دی ہے، اس لئے طلاق واقع ہوگئی۔ وقوع طلاق کے لئے بیوی کا طلاق نامے کو وصول کرنا ضروری نہیں ہے، بس جس وقت شوہر نے طلاق نامے پر دستخط کئے، طلاق اسی وقت سے مؤثر ہوگئی اور عدت بھی شروع ہوگئی اور طلاق مغلظہ ہونے کی بنا پر ان کا عدت کے اندر یا عدت کے بعد تحلیل شرعی کے بغیر آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا، تاہم یہ مطلقہ خاتون عدت اسی سابق مُطلّق شوہر کے مکان میں گذاریں گی، ایامِ عدت کا نفقہ بھی شوہر کے ذمے ہوگا، لیکن دورانِ عدت بھی اس طلاق دینے والے شوہر اور اس طلاق یافتہ عورت کا آپس میں معاملہ اجنبی والا ہوگا، ستر وحجاب کی پابندی ہوگی، الگ رہنا ہوگا۔ اس طلاقِ مغلظہ کے بعد ان کا آپس میں میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا حرام ہے، زنا کے زمرے میں آئے گا، انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے اور اس محلے یا بستی کے لوگوں کو انہیں اس پر متوجہ کرنا چاہئے، اگر وہ اس کے باوجود باز نہ آئیں تو ان کا سماجی مقاطعہ (Sociol Boycott) کرنا چاہئے، البتہ چونکہ مطلقہ خاتون اسی مُطلّق شوہر سے صاحب اولاد ہیں، ان کے پانچ جوان بچے ہیں، لہٰذا ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ اگر وہ یا ان کی اولاد مالی استطاعت رکھتے ہیں تو وہ اپنی اولاد کے ساتھ الگ مکان میں رہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: جو مقامِ تہمت پر ٹھہرا، تو پھر اسے چاہئے کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ

اس نے خود انہیں موقع فراہم کیا)، لیکن اگر ان کی اور ان کی اولاد کی اتنی مالی استطاعت نہیں ہے اور سابق طلاق دینے والے شوہر کا مکان اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ شرعی ستر وحجاب کی پابندی کو قائم رکھتے ہوئے اجنبی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں اور شوہر اپنی اولاد کی ماں ہونے کی حیثیت سے انہیں اس کی اجازت دیتا ہے، تو پھر وہ وہاں اپنی اولاد کے ساتھ رہ سکتی ہیں، لیکن یہ امر واضح رہے کہ شرعاً وہ ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ اجنبی رہیں گے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ثبوتِ طلاق کے طریقے

سوال:122

میرا نام اسماء بیگم ہے، میرے شوہر محمد حماد نے مختلف مواقع پر مجھے تین طلاقیں دیں ان الفاظ کے ساتھ "میں نے تمہیں طلاق دی" اور طلاق کا کوئی گواہ نہیں ہے، اب میرا شوہر مجھے اپنے ساتھ رہنے کے لئے کہتا ہے، اس بارے میں مجھے آپ اپنے فیصلے سے نوازیں، (اسماء بنت محمد امین شیخ، L-505، سیکٹر 5/B-2 نارتھ کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیر صدقِ سائلہ مذکورہ شخص نے اپنی منکوحہ کو جو تین طلاقیں دی ہیں، وہ مؤثر ہیں اور دیانتاً طلاق اسی وقت سے واقع ہوگئی اور آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے شوہر نے جو تین طلاقیں دی ہیں، تو اس پر کوئی گواہ نہیں ہے، عند اللہ طلاق واقع ہونے کے لئے گواہوں کی موجودگی، لازم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ۔

ترجمہ: "پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی دے دے، تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح

کرلے (اور خدانخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کرسکتی ہے)، (البقرۃ:230)''۔ وقوعِ طلاق کے بعد آپ کے شوہر کا آپ کو تحلیلِ شرعی کے بغیر رکھنے کا ارادہ، گناہ پر جسارت ہے اور ایک گونہ اس پر اپنے قلبی اطمینان کا اظہار ہے۔

لیکن قضاء یعنی دینوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت طلاق طلاق کی مُدَّعِیَہ ہے مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

عن عمرو بن شعیب، عن ابیه، عن جده: ان النبی ﷺ قال فی خطبته: "البیّنه علی المُدّعی وَالیمین علیٰ المدعی علیه"۔

ترجمہ: ''عمر ابن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:1339)''۔

یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اسے قسم دی جائے گی۔ اور اس طرح قضاء نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

طلاقِ غیر مدخولہ

سوال:123

میرا نکاح ۱۱/ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں فرقان احمد خان کے ساتھ ہوا تھا، میرا نام عائشہ حیدر خان ہے، فرقان احمد خان جوکہ میرے شوہر تھے، انہوں نے اپنی والدہ کے دباؤ میں آکر مجھے طلاق کا نوٹس بھجوادیا ہے، جس میں تین بار طلاق کا لکھا ہوا ہے، اور ان کے دستخط ہیں، میری رخصتی نہیں ہوئی تھی، میں اپنے گھر میں ہی ہوں اور وہ اپنے گھر میں اب آپ مجھے اس کا فتویٰ دے دیجئے کہ آیا میرا نکاح فرقان احمد خان سے دوبارہ ہوسکتا ہے؟ اور اس کی کیا مدت ہے؟ اور پرانا نکاح ابھی تک برقرار ہے یا نہیں؟ اور میں نے اپنے نکاح کا مہر بھی نہیں لیا ہے، اس صورت میں کیا طریقہ ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیجئے۔(عائشہ حیدر، R-770/16 ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب: علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اذاطلق الرجل امراته ثلاثا قبل الدخول بها وقعن علیها فان فرق الطلاق بانت باالاولیٰ ولم تقع الثانیة و الثالثة۔

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے پہلے تین طلاق دے دے تو وہ طلاق واقع ہوجاتی ہیں پس اگر علیحدہ علیحدہ الفاظ سے طلاق دی ہو تو پہلی طلاق سے طلاقِ بائن ہوجائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق واقع نہیں ہوگی، (عالمگیری جلد اول ص:373)''۔

صورت مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائلہ چونکہ ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی اور خلوت صحیحہ (دونوں میاں بیوی کا تنہائی میں جمع ہونا) بھی نہیں پایا گیا اور شوہر نے تین طلاق (منسلکہ طلاق نامہ میں) علیحدہ علیحدہ دی ہیں، لہٰذا پہلی طلاق سے ہی نکاح ختم ہوگیا اور دوسری دو طلاقیں واقع نہیں ہوں گی، اس لئے کہ غیر مدخولہ (جس کے ساتھ مباشرت نہ کی گئی ہو) کو طلاقِ رجعی نہیں ہوتی بلکہ ایک طلاق دینے سے بھی بائن ہوجاتی ہے اور طلاق بائن دینے کے بعد وہ عورت محلِ طلاق نہیں رہتی، اس لئے طلاق کے دوسرے الفاظ لغو ہوجاتے ہیں، اس صورت میں یہ شوہر دوبارہ نکاح کرسکتا ہے، عدت اور تحلیلِ شرعی کی ضرورت نہیں۔ اللہ

تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب:49)''

مگر پہلے والے نکاح میں جو مہر مقرر ہوا تھا، شوہر پر واجب ہے کہ آدھا مہر عورت کو ادا کرے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ۔

ترجمہ: '' اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ:237)''۔

تحلیلِ شرعی کے لئے شخصِ غیر کی قید

سوال: 124

میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے میں پھر اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اور حلالہ کرنا چاہتا ہوں حلالہ غیر مرد کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا میں اس وقت اس کے لئے غیر مرد ہوں کیا یہ کام میں خود کر سکتا ہوں؟، (انیس محمد، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ۔

ترجمہ: ''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دے دی، تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کر لے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کر لیں، (البقرۃ:230)''۔

تحلیلِ شرعی کے لئے آیت میں ''غیرہ''،''ہٗ'' ضمیر مذکر ہے، جس سے مراد زوجِ اوّل کے علاوہ دوسرا شخص ہے، آپ حلالے کے متعلق نہ سوچیں۔

حدیث مبارک میں ہے :عن عبداللّٰہ بن مسعود قال: لعن رسول اللّٰہ ﷺ المحلّل و المحلّل لہ۔

ترجمہ:'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے پر (بشرطِ تحلیل) رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی، (سنن ترمذی رقم الحدیث:1120)''

طلاق ہوئی یا نہیں؟

سوال :125

میرا میری بیوی سے جھگڑا ہو رہا تھا اس دوران اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے طلاق دے دو، میں نے جواب میں کہا کہ'' تجھے طلاق دوں گا، طلاق دوں گا، طلاق دوں گا''۔ میں حلفیہ کہنے کو تیار ہوں کہ میں نے یہی الفاظ کہے تھے، اور میں نے آئندہ کے لئے کہا تھا فی الحال میں نے طلاق نہیں دی، جبکہ میری بیوی کہتی ہے کہ اس نے مجھے طلاق دی ہے۔ آیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟، (عبدالرحیم، گلستانِ جوہر بلاک 13 کراچی)۔

جواب :

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل شوہر کے الفاظ'' تجھے طلاق دوں گا، طلاق دوں گا، طلاق دوں گا'' سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ چونکہ آپ کے ادا کردہ تمام الفاظ ارادۂ طلاق کو ظاہر کرتے ہیں اور ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ لہٰذا ان تمام الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ قضاء یعنی دینوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت طلاق کی مُدَّعِیَہ ہے، مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:عن عمرو بن شعیب ، عن ابیہ، عن

جدہ: ان النبی ﷺ قال فی خطبتہ : "البیّنہ علی المُدّعی والیمین علیٰ المدعی علیہ"۔

ترجمہ:'' عمر بن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:1339)''۔ یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اسے قسم دی جائے گی۔ اور اس طرح قضاءً نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

جبری طلاق کی ایک صورت

سوال:126

ہم نے اپنی بہن کا نکاح ایک جگہ کیا اور سوچا کہ رخصتی کچھ عرصے بعد کریں گے اس رشتے سے ہمارے اور لڑکے کے گھر والے سب خوش تھے، لیکن ہمارے کچھ رشتے دار جنہوں نے اس نکاح سے پہلے ہم سے بہن کا رشتہ مانگا تھا جو ہم نے کسی وجہ سے قبول نہ کیا ان لوگوں کو اس نکاح پر اعتراض تھا انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ یہ نکاح ٹوٹ جائے، لڑکی کو اغوا کرنے کی دھمکی بھی دی اور یہ بھی کہا کہ لڑکے کو قتل کردیں گے۔ ان لوگوں نے دس بارہ افراد کا ایک گروپ بنا کر لڑکے کو گھیر لیا اس وقت ان کے پاس ہتھیار بھی تھے جس کے دم پر انہوں نے لڑکے سے ایک سادہ کاغذ پر دستخط کروالیا اور کہا کہ اب منہ سے بھی بولو کہ میں نے طلاق دی۔ لڑکے نے انکار کردیا جس پر انہوں نے مار پیٹ شروع کردی آخرکار لڑکے

کے منہ سے بھی بلوالیا، طلاق کے الفاظ یہ تھے، (میں نے علی گوہر وگن کی بیٹی شازیہ کو طلاق، طلاق، طلاق دی)۔ کیونکہ وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر وہ نہ کہتا تو اسے واقعی قتل کر دیا جاتا۔ اب اس طلاق کو نہ تو لڑکا قبول کر رہا ہے اور نہ ہی لڑکی، معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ طلاق ہوئی یا نہیں؟، (وقار احمد وگن، D-33 پی ٹی سی ایل کالونی جناح ہسپتال)۔

جواب:

اصولی طور پر فقہ حنفی میں ''طلاق مکرَہ'' (یعنی جس سے جبراً طلاق دلائی گئی ہو) معتبر ہے، البتہ اگر ''اکراہ تام'' یا ''اکراہ مُلجی''ہو، یعنی ایسی ضربِ شدید جس میں جان یا عضو کے تلف ہونے کا حقیقی خطرہ ہو، جیسے آج کل بندوق کی نوک (Gun Point) پر دھمکی دی جاتی ہے، اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ اس دھمکی پر عمل کرلے گا، تو اسے ''اکراہ مُلجی'' یا ''اکراہِ تام'' کہتے ہیں۔ ایسے ''اکراہِ مُلجی'' کی صورت میں ہمارے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر جبر کر کے تحریراً طلاق لے لی جائے تو وہ مؤثر نہیں ہوگی، لیکن اگر جبر کر کے زبانی طلاق دلوادی جائے تو وہ مؤثر ہوجائے گی۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی "البحر "أن المراد الاکراہ علی التلفظ بالطلاق ، فلو أکرہ علی أن یکتبَ طلاقَ امرأته فکتب لا تُطلّق ، لأن الکتابة أقیمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا ، کذا فی "الخانیة" ولو أقر بالطلاق کاذباً أو هازلاً وقع قضاءً لا دیانة ۔

ترجمہ: ''اور ''البحرالرائق'' میں ہے کہ ''اکراہ'' سے مراد یہ ہے کہ لفظاً طلاق دینے پر مجبور کردیا گیا ہو، اگر (شوہر) کو مجبور کر دیا گیا ہو کہ اپنی بیوی کو طلاق لکھ دے، پھر اس نے (بامرمجبوری) لکھ دیا، تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ تحریر اس وقت طلاق لفظی کے قائم مقام ہوتی ہے، جب اس کی حاجت ہو اور یہاں اسے حاجت نہیں ہے، (کیوں کہ وہ خود اپنی مرضی سے طلاق نہیں دینا چاہتا)، ''خانیہ'' میں اسی طرح ہے، اور اگر شوہر نے (اپنی بیوی کو) جھوٹ کے طور پر یا بطورِ مذاق طلاق دینے کا اقرار کیا، تو طلاق قضاءً واقع ہوجائے

گی (یعنی اگر معاملہ عدالت میں گیا تو عدالت وقوع طلاق کا فیصلہ دے گی، کیوں کہ عدالتوں میں معاملات کا فیصلہ ظاہری قرائن وشواہد پر ہوتا ہے، نیتوں پر نہیں ہوتا، جب کہ عنداللہ نیت کا اعتبار ہوگا)، (مگر) دیانتاً نہیں ہوگی، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد:4،ص: 324 داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: کہ ایک شخص نے کسی کے جبر وظلم سے محض ناچار ومجبور ہوکر اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور طلاقنامہ لکھ دیا تو اس صورت میں طلاق پڑے گی یا نہیں؟۔

آپ نے جواب میں لکھا کہ: طلاق بخوشی دی جائے خواہ بجبر، واقع ہوجائے گی۔ نکاح شیشہ ہے اور طلاق سنگ، شیشہ پر پتھر خوشی سے پھینکے یا جبر سے یا خود ہاتھ سے چھٹ پڑے شیشہ ہر طرح ٹوٹ جائے گا، مگر یہ زبان سے الفاظ کہنے میں ہے، اگر کسی کے جبر واکراہ سے عورت کو خطرہ میں طلاق لکھی یا طلاق نامہ لکھ دیا اور زبان سے الفاظ طلاق نہ کہے تو طلاق نہ پڑے گی۔ تنویر الابصار میں ہے: ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو مکرَھا او مُخطئا وفی ردا لمحتار عن البحر ان المراد الاکراہ علی التلفظ بالطلاق، فلو أُکرہ علی أن یکتب طلاق امرأتہ فکتب لا تطلق، لأن الکتابة أقیمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة ھنا۔

ترجمہ: "ہر عاقل بالغ خاوند کی طلاق نافذ ہوجائے گی اگرچہ اسے مجبور کیا گیا ہو یا غلطی سے طلاق دے دی، اور ردالمحتار میں بحر سے منقول ہے کہ جبر سے مراد لفظ طلاق کہنے پر مجبور کیا گیا ہو، اور اگر اس کو اپنی بیوی کو طلاق لکھنے پر مجبور کیا گیا تو اس نے مجبور ہوکر لکھ دی تو طلاق نہ ہوگی، کیونکہ کتابت کو تلفظ کے قائم مقام محض حاجت کی بناء پر کیا گیا ہے اور یہاں خاوند کو حاجت نہیں ہے"۔ مگر یہ سب اس صورت میں جبکہ اکراہ شرعی ہو کہ اسے ضرر رسانی کا اندیشہ ہو اور وہ ایذا پر قادر ہو، صرف اس قدر کہ اس (مُکرِہ) نے اپنے سخت اصرار سے مجبور کردیا اور اس کے لحاظ پاس سے اسے لکھتے بنی، اکراہ کے لئے کافی نہیں، یوں لکھے گا تو

طلاق ہوجائے گی، کما لایخفی (جیسا کہ ظاہر ہے)،(فتاویٰ رضویہ جلد: 12، ص:385، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مسئولہ میں اگر شوہر نے جبر کی بنا پر صرف تحریری طلاق پر اکتفا کی ہوتی، تو طلاق واقع نہ ہوتی اوران کا نکاح بدستور قائم رہتا، لیکن چونکہ لفظاً بھی طلاق دے دی ہے، لہٰذا فقہ حنفی کی رو سے طلاق واقع ہوگئی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اذا طلق الرجلُ امراتہ ثلاثا قبل الدخول بھا وقعن علیھا فان فرق الطلاق بانت باالاولیٰ ولم تقع الثانیۃ و الثالثۃ۔

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے پہلے تین طلاق دے دے تو وہ طلاق واقع ہوجاتی ہیں پس اگر علیحدہ علیحدہ الفاظ سے طلاق دی ہو تو پہلی طلاق سے طلاقِ بائن ہوجائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق واقع نہیں ہوگی، (عالمگیری جلد اول ص:373)''۔

صورتِ مسئولہ میں منسلکہ تحریری ''طلاق نامہ'' کے مطابق تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اور زوجین میں حرمتِ مغلظہ قائم ہوچکی ہے اور رجعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور چونکہ رخصتی نہیں ہوئی اور زوجین میں خلوتِ صحیحہ نہیں ہوئی، اس لئے مطلقہ پر کوئی عدت نہیں ہے، وہ طلاق کے وقت سے ہی کہیں بھی نکاح کرنے کے لئے آزاد ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا۔

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب:49)''

اور مطلقہ اپنے سابق شوہر سے نصف مقررہ مہر کی بھی حقدار ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ۔

ترجمہ: ''اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ:237)''۔

مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (1)

سوال: 127

میرے لڑکے ذیشان مسعود ولد محمد مسعود نے اپنی بیوی طاہرہ ولد محمود کو طلاق کا نوٹس بھیجا جو کہ اس نے وصول کیا، نوٹس کے الفاظ یہ تھے:

''فریق اول (ذیشان مسعود ولد محمد مسعود) نے تین طلاقیں دو گواہوں کی موجودگی میں 27، اپریل 2006ء کو دی''۔

دونوں کا صرف نکاح ہوا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی ذیشان مسعود سسرال جاتے تھے تنہائی میں بھی بیٹھتے تھے مگر کوئی ملاپ یا ازدواجی تعلقات استوار نہیں ہوئے، کھلے کمرے میں بیٹھتے تھے جس میں گھر والوں کا گزر ہوتا تھا، مہر کی رقم پچیس ہزار روپے ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے آیا حق مہر ادا کیا جائے گا یا نہیں؟، (محمد مسعود، B.10/38 جوہر اسکوائر گلستان جوہر کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ بر صدق بیان سائل چونکہ شوہر نے ایک لفظ میں تین طلاقیں دی ہیں لہٰذا تین طلاق واقع ہوگئیں اور بغیر تحلیل شرعی کے دوبارہ ان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ سائل کے بیان کے مطابق چونکہ دونوں کے درمیان نہ تو ازدواجی تعلقات استوار ہوئے اور نہ ہی خلوت صحیحہ ہوئی لہٰذا شوہر پر نصف مہر کی ادائیگی لازم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ

ترجمہ: ''اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ:237)''۔

مطلقہ غیر مدخولہ کا مہر (2)

سوال: 128

میرا نام کنول رانی ہے، میرا نکاح شیخ ہمایوں سے 3، اپریل 2002ء کو ہوا لیکن رخصتی نہیں ہوئی اور ہمارے درمیان کسی قسم کے ازدواجی تعلقات استوار نہیں ہوئے۔ ایک بار ہمایوں نے غصے میں ہم سے کہا کہ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم جس سے چاہو شادی کرلو اور میرے والدین بھی میرے لئے لڑکیاں تلاش کر رہے ہیں اور جب ہم نے کہا کہ یہ لکھ کر دیں تو وہ مکر گئے اور کہنے لگے کہ چاہے کچھ بھی کرلو میں تمہیں لٹکا کر رکھوں گا مگر طلاق نہیں دوں گا، تب ہم نے اپنے مسئلے کے حل کے لئے کورٹ سے رجوع کیا، کورٹ نے 16 جولائی 2004ء کو خلع کے آرڈر جاری کردیئے، کورٹ سے جو خلع لی گئی ہے وہ کتنی مؤثر ہے؟، (کنول رانی، دستگیر، کراچی)۔

جواب:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو قال تزوجی ونوی الطلاق أو الثلاث صح وان لم ینو شیئاً لم یقع کذا فی العتابیۃ۔

ترجمہ: ''اگر شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو نکاح کرلے، ایک طلاق کی نیت سے یا تین طلاق کی نیت سے، تو صحیح یہ ہے کہ طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر طلاق کی نیت نہ ہو تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 376 مطبوعہ مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائلہ شوہر کے الفاظ'' چاہے کچھ بھی کرلو میں تمہیں لٹکا کر رکھوں گا مگر طلاق نہیں دوں گا'' سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ الفاظ بہ نیتِ طلاق نہیں کہے گئے، لہٰذا اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

قاضی مُجاز یا عدالت نکاح کو فسخ کرے تو یہ'' طلاقِ بائن'' کے درجے میں ہے، اس کے نتیجے میں ''فسخِ نکاح'' کے بعد زوجین عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے تجدیدِ نکاح کرسکتے ہیں اور بیوی کی رضامندی نہ ہو تو وہ عدت کے بعد اپنی آزادانہ

مرضی سے جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو، تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، (الاحزاب:49)''

ادائیگی مہر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ۔

ترجمہ: '' اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی، اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے، تو جو مقرر ہوا تھا، اس کا آدھا (واجب) ہے، (البقرۃ:237)''۔

خلع کورٹ کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ زوجین کی باہمی رضا مندی سے ہوتا ہے، جس میں بیوی اپنے مطالبہ مہر کے حق سے دستبردار ہوکر کہے کہ تم مجھے اس کے عوض طلاق دے دو اور شوہر اس کے مطالبے کو قبول کرتے ہوئے کہے کہ میں نے تمہیں خلع دیا، یہ خلع ہے اور طلاق بائن کے حکم میں ہے۔

عدالتی نکاح دراصل حاکم مجاز کی جانب سے فسخ نکاح ہے، اس کے لئے وجوہ شرعیہ کا ہونا ضروری ہے کہ شوہر بیوی کو طلاق دینے پر بھی آمادہ نہ ہو اور اسے مکمل حقوق کی ادائیگی کے ساتھ رکھے بھی نہیں، نان نفقہ نہ دے، ظلماً مارے پیٹے، حقوق زوجیت ادا نہ کرے اور معلق (Hung) رکھے، وغیرہ۔ لہٰذا عدالتی طلاق کے مؤثر ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اس سلسلے میں جج نے حدود شرعیہ اور احکام شرعیہ کو ملحوظ رکھا یا نہیں، صرف اتنی بات خلع کے جواز کا سبب نہیں بن سکتی کہ عورت یہ کہے کہ: میں اس شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

امام شافعی کے نزدیک تین طلاق کا حکم

سوال:129

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے شوہر نے مجھے ٹیلی فون پر تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہا کہ "میں نے تمہیں طلاق دی"، یہ الفاظ تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہے اب وہ اس بات پر مصر ہے کہ ہم رجوع کر سکتے ہیں۔ کیا اس کا رجوع کرنا صحیح ہے؟۔ واضح رہے کہ میرے شوہر کا مسلک شافعی ہے اور میں اہلسنت وجماعت سے تعلق رکھتی ہوں، برائے کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں، (سمیرا، M-C703 گرین ٹاؤن شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ اَنۡ يَّتَرَاجَعَآ**

ترجمہ: "پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی دے دے، تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کرلے (اور خدانخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کر سکتی ہے)۔ (البقرۃ: 230)"۔ اس کے علاوہ ان کے رجوع کی حلال اور جائز کوئی صورت نہیں ہے۔

علامہ یحییٰ بن شرف الدین نووی شافعی لکھتے ہیں:

وقد اختلف العلماء فیمن قال لامرأته انت طالق ثلثا فقال الشافعی ومالک وابو حنیفة احمد وجماهیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث۔

ترجمہ: "ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے تین طلاق (یا تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں)، تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، امام شافعی، امام مالک، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اجمعین اور جمہور علماء سلف وخلف کا رحمہم اللہ اجمعین کے نزدیک تین

طلاقیں واقع ہو جائیں گی ،(شرح صحیح مسلم للنووی جلد 1 ص 478 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی)''۔

صورتِ مسئولہ میں برصدق بیان سائلہ اس کے شوہر نے تقریباً سات یا آٹھ مرتبہ کہا کہ'' میں نے تمہیں طلاق دی''، تین بار کی ادائیگی سے طلاق مغلظہ واقع ہوگئیں اور باقی طلاقیں لغو ہوگئیں، بغیر تحلیل شرعی کے دونوں کا میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا ناجائز وحرام ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی تین طلاق سے عورت حرام ہو جاتی ہے اور بغیر تحلیل شرعی کے ان کے رجوع کی حلال اور جائز کوئی صورت نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

انکارِ طلاق کی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے

سوال:130

میرا نام افشاں انجم بنت سید رحمت علی ہے، میری شادی 20 سال قبل زبیر احمد بن قاضی معیز الدین سے ہوئی میرے تین بیٹے ہیں، میں پانچ سال سے لاہور میں مقیم ہوں اور میرے شوہر راولپنڈی میں ہوتے ہیں میں پانچ سال سے اپنے شوہر سے الگ رہ رہی ہوں اور بچے میرے ساتھ ہی لاہور میں ہیں جہاں وہ اپنی تعلیم مکمل کر رہے ہیں اور شوہر کوئی نان ونفقہ نہیں دے رہے ہیں ہمارے درمیان مستقل لڑائی جھگڑے رہتے تھے اور میرے شوہر ان جھگڑوں کے دوران طلاق کے الفاظ ادا کرتے رہتے تھے کبھی ایک بار اور کبھی دو بار بھی ادا کرتے کہ'' میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' اور پھر ایک دو دن کے اندر رجوع کر لیتے اور جب میں اعتراض کرتی کہ تم نے مجھے طلاق دے دی ہے تو قرآن پاک اٹھا کر کہتے کہ میں نے ایسا نہیں کہا اور ایک بار میرے شوہر نے مسجد کے امام صاحب کے سامنے قرآن پاک اٹھا کر کہا کہ میں نے طلاق کے الفاظ ادا نہیں کیے بلکہ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ دے دوں گا اور میرے پاس کوئی گواہ نہ ہوتے جو میری بات کی تصدیق کرتے اسی وجہ سے کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا۔ اب جبکہ مجھے اپنے شوہر سے الگ رہتے پانچ سال ہو رہے ہیں کبھی کبھی ان سے فون پر بات ہوتی ہے، ایک بار میں اور میرے بچے ان کو لینے گئے تھے تو شوہر نے

ہم سے جھگڑا شروع کیا اور وہاں پر موجود ایک مرد اور ایک عورت کے سامنے انہوں نے کہا کہ میں نے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی اور میرا نام لے کر انہوں نے یہ الفاظ ادا کیے تھے مگر جب ان سے پوچھا تو قسمیں کھانے لگے کہ وہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ پھر ہم یعنی میں اور بچے واپس لاہور آگئے۔ اب آپ مجھے بتایئے کہ کیا مجھے طلاق ہوگئی ہے اور اگر ہوگئی ہے تو مجھے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا مجھے اپنے مسئلے کیلئے فتویٰ چاہیے تاکہ میرے پاس ثبوت ہو اور اگر طلاق نہیں ہوئی ہے تو اس 5 سال کی علیحدگی کے بارے میں کیا حکم ہے، وہ کوئی خرچہ نہیں دیتے ہیں، اب بھی فون پر کبھی کبھی بات چیت ہوتی ہے، ان حالات میں مجھے کیا کرنے چاہیے برائے مہربانی مجھے تحریری طور پر جواب دے دیں، (افشاں انجم، نیو کالونی مصطفیٰ آباد، لاہور)۔

جواب:

صورت مسئولہ میں برتقدیر صدق سائلہ شوہر نے کئی مرتبہ طلاق کے یہ الفاظ ادا کیے ہیں کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اور تین مرتبہ ادا کیے جا چکے ہوں تو تین طلاقِ مغلظہ ہو جائیں گی اور رجوع کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، رجوع یا تجدید نکاح کا اختیار صرف دو طلاق تک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

ترجمہ: ”طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر (عدت میں) حسنِ سلوک کے ساتھ روک لینا ہے یا (عدت پوری کرنے کے بعد) احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، (البقرہ 229)“۔

تیسری طلاق دینے کے بعد بغیر تحلیلِ شرعی کے دونوں کا شوہر بیوی کی حیثیت سے رہنا حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ۔

ترجمہ: ”پھر اگر (شوہر اپنی بیوی کو دو طلاق دینے کے بعد) اسے تیسری طلاق بھی دے

دے، تو اب وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ (عدت گزارنے کے بعد) وہ (مطلقہ) عورت (اپنے سابق شوہر کے علاوہ) کسی اور مرد سے نکاح کرلے (اور خدانخواستہ ان کے درمیان نباہ نہ ہو اور وہ شوہر ثانی اسے طلاق دیدے، تو اب عدت گزارنے کے بعد وہ شوہر اول سے نکاح کرسکتی ہے)، (البقرۃ:230)''۔

قضاء یعنی دینوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو گواہ موجود ہوں، اور اگر عورت طلاق کی مُدَّعِیَہ ہے، مگر شوہر منکر ہے، تو عدالت اسے قسم دے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

عن عمرو بن شعیب، عن ابیه، عن جده: ان النبی ﷺ قال فی خطبته: "البیّنه علی المُدّعی والیمین علیٰ المدعی علیه"۔

ترجمہ: ''عمرو ابن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اسے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:1339)''۔

یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ دو عادل مرد بطور گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اسے قسم دی جائے گی، شوہر کی قسم کے بعد فیصلہ ہوگا اور اس طرح قضاءً نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، اور اس کی ساری زندگی گناہ میں گزرے گی۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''بحالتِ اختلاف، طلاق کا ثبوت گواہوں سے ہوگا اور دو گواہ عادل شرعی شہادت بروجہ شرعی ادا کریں کہ اس شخص نے اپنی زوجہ کو طلاق دی، طلاق ثابت ہو جائیگی، پھر اگر شوہر نفی

کے گواہ دے گا یا اس بات کے کہ مطلقہ بعد طلاق اس سے بولی کچھ اصلاً مسموع نہ ہوگا، ہاں! اگر عورت گواہ بروجہ شرعی نہ دے سکے تو شوہر پر حلف رکھا جائیگا اگر حلف سے کہہ دے گا کہ اس نے طلاق نہ دی، طلاق ثابت نہ ہوگی اور اگر حاکم شرعی کے سامنے حلف سے انکار کرے گا تو طلاق ثابت مانی جائیگی، (فتاویٰ رضویہ جلد: 12 صفحہ 453، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔ اگر شوہر تین طلاقیں دے کر منکر ہوجاتا ہے اور طلاق کے وقت کوئی گواہ موجود نہیں تھے اور اس کے بعد بدستور اسی مطلقہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا ہے تو یہ شرعاً حرام اور زنا کی زندگی ہے، کیونکہ خلق کو تو دھوکہ دیا جاسکتا ہے، خالق کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔ مذکورہ صورت میں سائلہ تین طلاق کی مدعیہ ہے اور شوہر اس سے منکر ہے اور بر بیانِ مدعیہ اس کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے دو عادل مرد گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے لیکن اس کے پاس مذکورہ نصاب مکمل نہیں، ایسی صورت میں بیوی کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کو قائل کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور آخرت کے عذاب سے ڈرو، اور وہ تین طلاق جو آپ زبانی دے کر منکر ہوگئے ہیں، ان کا اقرار کرلیں اور لکھ کر دے دیں، اگر انہیں خوفِ خدا آجائے تو شریعت پر عمل کریں۔ اور اگر خدانخواستہ وہ بدستور انکار پر ڈٹے رہیں تو ان کے انکار اور گواہوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قضاءً حرمت اور تفریق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، لہٰذا بظاہر حکماً نکاح قائم رہے گا، اگرچہ دیانتاً اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں جوابدہی کے اعتبار سے وہ نکاح باقی نہیں ہے، دنیا میں احکامِ شرعی کا اطلاق ظاہرِ حال، قرائن اور شہادتوں یا اقرار و انکار پر ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقتِ حال کے مطابق فیصلے ہوں گے، یعنی ظاہر حال کے مطابق دنیوی عدالتوں سے جو فیصلے جاری ہوتے ہیں اور نافذ ہوجاتے ہیں، وہ حقیقت حال کو تبدیل نہیں کرتے۔

اگر آپ کو کامل یقین ہے کہ شوہر آپ کو تین طلاق دے چکا ہے تو ان حالات میں آپ کے لئے جائز شرعی اور قانونی راستہ یہ ہے کہ آپ عدالت سے رجوع کریں اور عدالت کے ذریعے فسخ نکاح کرائیں، چونکہ جائز شرعی وجوہ موجود ہیں، اس لئے یہ فسخِ نکاح شرعاً و قانوناً

معتبر ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔

طلاقِ مدہوش

سوال:131

میرا نام ریحان حسین خان ہے میری بیوی کا نام شازیہ ہے ہماری شادی کو بارہ سال ہوگئے ہیں اور ہماری 3 بیٹیاں ہیں، پچھلے کئی سالوں سے مجھے دماغ کی ایک بیماری ہے جس کو ڈاکٹرز Panic Disorder کہتے ہیں اور ان دوروں (Attacks) کے درمیان مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں مر رہا ہوں اور یہ اٹیک ایک جنون کی طرح ہوتا ہے اور جتنی دیر اٹیک رہتا ہے، مجھے کچھ یاد نہیں رہتا اور مجھے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ میں نے کیا کیا، یا کیا کہا ہے جب بھی ہوتا ہے میرے گھر والے مجھے بتاتے ہیں کہ تم نے ایسا ایسا کیا تھا، پہلے یہ دورے زیادہ ہوتے تھے، لیکن علاج ہوتے رہنے کی وجہ سے ان میں کچھ کمی آئی ہے۔ میرا مستقل علاج آغا خان ہسپتال، کراچی میں ہو رہا ہے۔ 18، جون 2006ء اتوار کو میرے بھائی کے گھر رہنے گئیں ان کے ساتھ والدہ بھی تھیں رات کو مجھے بھی وہیں رکنے جانا تھا رات کو جب میں وہاں گیا تو میرا اپنی بیوی سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا اور میں وہاں سے اپنے گھر آگیا ڈاکٹرز نے مجھے ٹینشن لینے سے منع کیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اٹیک بڑھ جاتے ہیں، بہر حال جب میں گھر آگیا تو مجھے پھر اٹیک ہوا اس وقت میں اپنی بیوی کو فون کر رہا تھا اس کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں کیا ہوا! میں زمین پر پڑا ہوا تھا اور میرے چاروں طرف میری الٹیاں (قے) تھیں، صبح جب میں بیوی بچوں کو لینے گیا تو میری بیوی نے بتایا رات کو آپ نے فون کیا تھا اور فون پر مجھے طلاق دی، مگر مجھے کچھ بھی یاد نہیں، ہاں صرف اتنا یاد ہے کہ میں اپنی بیوی سے لڑ کر آیا تھا۔ اب ہم سب پریشان ہیں کہ اس کا شرعی مسئلہ کیا ہوگا؟، (ریحان حسین خان فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل اگر طلاق دینے والے کی طلاق دیتے

وقت وہی کیفیت تھی جیسا کہ سائل نے بیان کی ہے کہ وہ اس وقت دورے (Attack) کی حالت میں تھا تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔شرعاً درستگیٔ عقل شرط طلاق ہے اور اختلال عقل مانع طلاق ہے۔ہدایہ میں ہے: ولا یقع طلاق الصبی والمجنون والنائم لقوله علیه السلام کل طلاق جائز الّا طلاق الصبی والمجنون ولان الاهلیة بالعقل الممیّز وهماعدیما العقل والنائم عدیم الاختیار۔

ترجمہ:''اور بچے کی اور مجنوں (جنون والے) کی،اور سوئے ہوئے شخص کی طلاق واقع نہیں ہوگی،جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا قول ہے کہ ہر (طلاق دینے والے شخص کی) طلاق جائز (واقع) ہے مگر بچے کی اور مجنوں کی جائز نہیں ہے،اس لئے کہ یہ دونوں عقل سے تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دونوں میں عقل کا عنصر نہیں پایا جاتا اور سویا ہوا شخص (چونکہ) اختیار نہیں رکھتا،(ہدایہ اولین جلد 2 ص:338 مطبوعہ محمد علی کارخانہ اسلامی کتب کراچی)''۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یقع طلا ق الصبی وان کا ن یعقل والمجنو ن والنا ئم والمبر سم والمغمی علیه والمد هو ش هکذ ا فی فتح القدیر۔

ترجمہ:'' اور بچے (نابالغ) کی طلاق واقع نہیں ہوگی اگر چہ وہ عقل رکھتا ہو اور مجنوں کی اور سوئے ہوئے شخص کی،ذات الجنب (برسام) کے مریض کی طلاق،مغمی (بیمار جس پر بے ہوشی طاری ہو) مدہوش کی طلاق واقع نہیں ہوگی،فتح القدیر میں اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:353 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

اگر صورت مندرجہ بالا صحیح اور واقعی ہے اور سائل پر بوقت طلاق دورہ (Panic Attack) پڑا تھا اور اس نے اس حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دی تو وہ طلاق شرعاً لغو و باطل قرار دی جائے گی،یہ جواب صحت سوال و بیان مذکور پر مبنی ہے اور اگر سوال و بیان صحیح نہ ہوں تو جواب بھی یہ نہیں ہوگا۔

فیملی کورٹس کے فاضل جج صاحبان کی خدمت میں مؤدّبانہ گذارشات

آج کل بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ماضی کے مقابلے میں طلاق کی شرح ویسے بھی زیادہ ہوچکی ہے، اسی تناسب سے ''عدالتی فسخِ نکاح'' کی شرح میں بھی اضافہ ہوا ہے، جسے عرف عام میں ''خلع'' کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ شرعی ''خُلع'' نہیں ہے۔ شرعی خلع یہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۤئِكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ: ''اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ یہ دونوں (زوجین) اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، تو عورت نے جو بدلِ خلع دیا ہے (شوہر کے اسے لینے میں) تم دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے، یہ اللہ کی حدود ہیں، سوتم اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کرو۔ اور جنہوں نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا، تو وہی لوگ ظالم ہیں، (البقرہ:229)''۔ اس ارشاد باری تعالیٰ کی رو سے ''خلع'' یہ ہے کہ میاں بیوی اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ وہ ''حقوقِ زوجین'' کی بابت اللہ تعالیٰ کی مُقرَّرہ حدود کو قائم نہ رکھ پائیں گے، باہمی اعتماد نہ رہا یا نفرت پیدا ہوگئی یا کوئی اور داخلی یا خارجی سبب بن گیا اور شوہر یک طرفہ طور پر طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہے، تو پھر بیوی نے نکاح کے موقع پر جو ''حق مہر'' لیا ہے، وہ شوہر کو واپس کردے اور شوہر اس کے عوض اسے طلاق دے دے، یہ ''طلاق بائن'' ہوتی ہے، اس کے بعد شوہر کو عدت کے اندر بھی یک طرفہ رجوع کا حق نہیں رہتا، البتہ باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں، بشرطیکہ ایک ہی طلاق دی ہو۔ ''خلع'' قاضی کے یک طرفہ حکم سے نافذ نہیں ہوتا، اس پر زوجین کی رضامندی ضروری ہے اور قاضی کو چاہئے کہ ترغیب یا ترہیب (جس میں وہ تعزیراً حوالات میں بھی رکھ سکتا ہے) سے شوہر کو آمادہ کرے۔ فیملی کورٹس کے جج صاحبان عام طور پر شرعی حدود وقیود کی رعایت نہیں کرتے، بس صرف قانونی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اب لگتا ہے کہ اس سلسلے

میں ضابطۂ کار (Procedural Law) کو اور آسان بنا دیا گیا ہے اور بعض جج صاحبان چیمبر میں ہی بیٹھ کر نکاح کو فسخ (Dissolve) کر دیتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جس تیز رفتاری سے حکومت جدید روشن خیالی (Enlightened Moderation) اور آزاد خیالی (Liberalism) لانا چاہتی ہے، ہمارا معاشرہ اس کا ساتھ نہیں دے پا رہا۔ اس لئے آئے دن لوگ عدالت سے ''فسخ نکاح'' کی ڈگری (Decree) لے کر دارالافتاء میں آتے ہیں کہ یہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟، نہ صرف یہ کہ مفتی کے لئے ہر فیصلے کی تائید وتوثیق دشوار ہوتی ہے، بلکہ ''عدالتی ڈگری'' کے باوجود اسے معاشرہ بھی آنکھیں بند کر کے قبول کرنے لئے تیار نہیں ہوتا اور معاشرتی اخلاقی اقدار (Social Ehtical values) اور معاشرتی مزاحمت (Social Resistance) کی بھی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ بیشتر فیصلے ''قضا علی الغائب'' (IN ABSENTIA) ہوتے ہیں۔ چونکہ ہمارے ججز بھی ماشاء اللہ مسلمان ہیں اور انہیں یہ معلوم ہے کہ مجرّد دعویٰ ثبوت مقدِمہ کے لئے کافی نہیں ہوتا بلکہ ہر مقدمے میں مُدّعی سے اس کے دعوے کے حق میں ثبوت مانگا جاتا ہے، ''مُدّعیٰ علیہ'' (Respondent) کو اپنی صفائی اور وضاحت کا موقع دیا جاتا ہے کہ یا تو وہ اعتراف جرم (Confession) کرے اور یا اپنی براءت پیش کرے۔ آج کل بالعموم یہ ہو رہا ہے کہ ''مُدّعیٰ علیہ'' نہ تو اصالتاً (Personally) عدالت میں حاضر ہوتا ہے اور نہ ہی وکالتاً (Through Attorney)، اس کو عدالت کی جانب سے رسمی طور پر طلبی کا نوٹس (Summon) بھیج دیا جاتا ہے، بیلف چلا جاتا ہے، اس کے دروازے پر نوٹس چسپاں کر آتا ہے یا اخبارات میں اشتہار ''اطلاع عام بابت طلبی بہ عدالت فلاں'' دیدیا جاتا ہے۔ ججز، وکلاء اور عام لوگ کب اطلاع عام کے ان روزمرہ اشتہاروں کو پڑھتے ہیں یا وہ اخباران کی دسترس میں ہوتا ہے۔ جج کے منصب کو اتھارٹی اور قوت مملکت اور سربراہِ مملکت کی طرف سے حاصل ہوتی ہے،

لہٰذا جج پر لازم ہے کہ وہ حکومت یعنی پولیس کو پابند بنائے کہ وہ ''مُدّعیٰ علیہ'' کو عدالت میں پیش کرے، کیونکہ یہ محض دادرسی اور حق طلبی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ حلال وحرام کا بھی مسئلہ ہے۔ حالانکہ جب ہم معلوم کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ عام طور پر ''مُدّعیٰ علیہ'' اسی شہر یا ملک میں موجود ہوتا ہے، اس کا صحیح پتا بھی فریقِ مخالف کو معلوم ہوتا ہے۔ یہ استثنا صرف ان مقدمات میں معتبر ہوسکتا ہے، جہاں ''مُدّعیٰ علیہ'' یا تو بالکل لاپتا (مفقود الخبر) ہوتا ہے یا ملک سے باہر ہوتا ہے، تاہم وہاں بھی ممکنہ طور پر پاکستانی سفارت خانے کی مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ نیز جج کو اس بات کا پابند ہونا چاہئے کہ وہ ان وجوہ کو باقاعدہ قلمبند کرے، جن کی رو سے اس کے اطمینان اور شرحِ صدر اور پیش کردہ ثبوت وشواہد (Proof & Evidence) کے مطابق عورت کے لئے عملاً ممکن نہیں رہا کہ وہ شرعی حدود کو قائم رکھتے ہوئے رشتۂ ازدواج کو قائم رکھ سکے یا اس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، ہم ان میں سے بعض وجوہ کا تذکرہ آگے چل کر کریں گے۔ یہیں سے ''فسخِ نکاح'' (Dissoution) اور خُلع کے معاملات کو الگ کردینا چاہئے۔ ''فسخِ نکاح'' کے مقدّمے میں صرف اتنی بات کافی نہیں کہ عورت کہے کہ میں شوہر کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی، جب کہ اس کی معقول وجوہ موجود نہ ہوں۔ اگر خدانخواستہ قانون میں سقم ہے تو جج صاحبان کو پھر بھی شریعت کی رعایت، شرعی حدود وقیود، خوفِ خدا، فکرِ آخرت اور حلال وحرام کی نزاکت اور حساسیّت کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ بعض حضرات ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ قاضی (Judge) کو معقول وجوہ واسباب کے بغیر بھی ''فسخِ نکاح'' کا اختیار حاصل ہے، چنانچہ ارشادِ رسول اللہ ﷺ ہے:

عن ابن عباس: انّ امرأة ثابت بن قیس اتتہ النبی ﷺ فقالت: یارسول اللّٰہ، ثابت بن قیس، مااَعتِبُ علیہ فی خُلق ولادین، ولکنی اکرہ الکفر فی الاسلام، فقال رسول اللّٰہ ﷺ: اترُدِّین علیہ حدیقتہ قالت: نعم، قال

رسول اللہ ﷺ : اقبل الحدیقۃ وطلقھا تطلیقۃ۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! ثابت کے دین اور اخلاق کے بارے میں مجھے کوئی شکایت نہیں ہے، مگر یہ کہ میں اسلام میں رہتے ہوئے کفر (ناشکری اور شوہر کی نافرمانی) سے ڈرتی ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس کا وہ باغ (جو ثابت نے نکاح کے وقت مہر میں دیا تھا) واپس کردوگی، انہوں نے عرض کیا: جی ہاں: چنانچہ انہوں نے (مہر میں لیا ہوا) وہ (باغ) شوہر کو واپس کردیا، رسول اللہ ﷺ نے (ثابت سے) فرمایا: باغ قبول کرلو اور اسے ایک طلاق دے دو، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5273)''۔

صحیح بخاری میں اس سے اگلی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے (ثابت کو) طلاق کا حکم فرمایا اور ثابت نے طلاق دے دی، اس سے آگے ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ثابت کو حکم فرمایا تو انہوں نے بیوی سے (بذریعہ طلاق) علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ حدیث ''فسخِ نکاح'' سے متعلق نہیں ہے، یعنی یہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود بحیثیت حاکم وقاضی نکاح فسخ فرمایا بلکہ آپ نے بیوی کو مہر واپس کرنے اور شوہر کو طلاق دینے پر آمادہ فرمایا اور یہی خلع ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ ہمارے فیملی کورٹس کے جج فسخِ نکاح (Dissolution of Marriage) کو آخری اور ناگزیر امکانی صورت (Option) کے طور پر اختیار کریں۔ جج کی پہلی ترجیح مصالحت (Reconcilliation) ہونی چاہیے، دوسری ترجیح شوہر کو رضا کارانہ طلاق پر آمادہ کرنا اور تیسری دونوں کو خلع پر آمادہ کرنا ہونی چاہیے، کیونکہ اگرچہ شریعت نے انتہائی ناگزیر صورتِ حال میں زوجین میں طلاق یا تفریق کی گنجائش رکھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام حلال امور میں یہ سب سے زیادہ اس کے غضب کا باعث ہے، امام ابوداؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے

ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابغض الحلال الی اللّٰہ عزوجل الطلاق، ترجمہ: ''یعنی حلال امور میں اللہ عزوجل کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز طلاق ہے، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 2171)''۔ بابل کے مقام پر دو فرشتے ہاروت وماروت بنی اسرائیل کو بطورِ آزمائش جادو سکھاتے تھے اور قرآن مجید میں ان کے جادو سیکھنے کا جو سب سے مذموم پہلو بتایا، وہ یہ ہے کہ: فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ترجمہ: ''یعنی وہ لوگ دونوں فرشتوں سے اس (جادو) کو سیکھتے تھے، جس کے ذریعے مرد اور عورت میں علیحدگی کرادیں، (البقرہ:102)''۔ اس لئے جیسا کہ میں نے عرض کیا، فیملی کورٹس کے جج صاحبان کو زوجین میں علیحدگی (Separation) کا عدالتی اختیار انتہائی ناگواری کے ساتھ آخری ناگزیر و ناپسندیدہ ترجیح (Option) کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی ذات کا تعلق ہے، آپ کو ویسے بھی مومنوں پر ولایتِ تامّہ اور مکمل تصرف کا حق حاصل ہے، اس سے زیادہ جتنا کسی عام حاکم یا قاضی کو یا کسی وَلی اقرب کو حاصل ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ ترجمہ: ''نبی کو مومنوں پر اس سے زیادہ تصرف کا حق حاصل ہے، جتنا خود ان کو اپنی ذات پر ہے، (الاحزاب:6)''۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ بہر حال نافذ ہے اور آپ ﷺ وجوہ کو بتانے کے پابند نہیں ہیں، جبکہ عام جج، قاضی اور حاکم کی ولایت شرعی حدود وقیود کے ساتھ مشروط ہے۔ فقہِ حنفی میں ''عدالتی فسخِ نکاح'' کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور یہ تقریباً ناممکن العمل ہے، احتیاط میں یہ شدّت اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ یہ حلال وحرام کا مسئلہ ہے، تاہم دیگر ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک بعض حدود وقیود کے ساتھ اس کی گنجائش موجود ہے۔ اور فقہِ حنفی میں بھی یہ اصول مُسلّم ومختار ہے کہ ضرورت شدیدہ کی بنا پر فسخِ نکاح کے لئے دوسرے ائمۂ کرام کے قول پر فیصلہ دیا جاسکتا ہے، ان میں سے چند صورتیں یہ ہیں:

(1) شوہر بے انتہا مار پیٹ کرتا ہے، جسمانی و ذہنی اذیّت (Physical & Mental Torturing) میں مبتلا رکھتا ہے، نہ حقوق ادا کرتا ہے نہ طلاق دے کر گلو خلاصی کرتا ہے، بس اسے معلّق (Hung) رکھنا چاہتا ہے، تو ایسی صورت میں جج ثبوت وشواہد اور قرائنِ قطعیہ کی بنا پر ''فسخِ نکاح'' کا فیصلہ دے سکتا ہے، لیکن اسے وجوہ ریکارڈ پر لانی چاہئیں۔

(2) شوہر نان نفقہ نہیں دیتا اور بیوی کے پاس کفالت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: (الف) یہ کہ شوہر مالدار ہے مگر ظلماً نہیں دیتا، اگر اس کا مال ظاہر ہو تو جج حکومت کے ذریعے جبراً شوہر سے نان نفقہ یعنی مصارفِ ضروریہ دلائے یا اسے قید کر دے جب تک وہ خود رضا کارانہ طور پر دینے پر آمادہ نہ ہو۔ (ب) اور اگر شوہر مفلس اور نادار ہے اور بظاہر اس بات کے آثار بھی نہیں ہیں کہ وہ جلد بیوی کا نفقہ دینے کے قابل ہو جائے گا اور بیوی کے لئے کوئی متبادل ذریعہ بھی دستیاب نہیں ہے، نہ ہی کوئی اور کفیل ہے اور نفقہ سے عجز کی بنا پر بیوی کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں جج نکاح فسخ کر سکتا ہے اور اسے تفصیلی وجوہ فیصلے میں درج کرنی چاہئیں۔

(3) شوہر کسی مُوذی مرض میں مبتلا ہے، جیسے برص وجذام یا کینسر وغیرہ اور نکاح کے وقت بیوی کو معلوم نہیں تھا، اسے دھوکے میں رکھا گیا تھا، بعد میں اس پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی، اگر وہ اس کے باوجود رشتۂ ازدواج کو قائم رکھنا چاہے تو یہ اس کے لئے سعادت کی بات ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں اجر پائے گی، لیکن اگر وہ کسی طور پر بھی آمادہ نہ ہو تو جج نکاح فسخ کر سکتا ہے اور تفصیلی وجوہ اپنے فیصلے میں درج کرے۔

(4) شوہر کو خدانخواستہ طویل قید (جیسے پندرہ سال یا عمر قید) ہو گئی ہے اور بیوی جواں عمر ہے، اس کے لئے اپنے فطری جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے حدودِ شرع میں رہنا ممکن نہیں ہے اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے یا کوئی اس کا کفیل نہیں ہے اور وہ عدالت سے فسخِ نکاح کا مطالبہ کرتی ہے تو جج فسخ نکاح کا فیصلہ دے سکتا ہے۔

(5) شوہر بلا سبب و بلا عذر مرض وغیرہ مسلسل طویل عرصے تک حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرتا، تو جج تنبیہ کے بعد اور تنبیہ کے غیر مؤثر ہونے کے بعد نکاح فسخ کرسکتا ہے۔

(6) شوہر مجنون ہوگیا، مناسب وقت گزرنے پر بھی علاج سے صحت یاب نہ ہوسکا، اس کے جنون سے بیوی کے جسم وجاں کو خطرہ لاحق ہے یا وہ اب حقوقِ زوجیت کی ادائیگی اور بیوی کی کفالت کا اہل ہی نہیں رہا، تو جج نکاح فسخ کرسکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی خداترس ماہر ڈاکٹر یہ کہے کہ شوہر کی یہ کیفیت عارضی ہے اور مناسب وقت میں اسے افاقہ ہوجائے گا، تو ''فسخِ نکاح'' سے پہلے مناسب مہلت دینی چاہیے۔

(7) عنین (Impotent) شوہر اور مفقود الخبر یعنی لاپتا شوہر کے فسخِ نکاح کے مسائل تفصیل طلب ہیں، اس لئے ان پر کسی مناسب موقع پر الگ تفصیل سے بات ہوگی۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث (صفحات: 1094 تا 1121) میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور ''فسخِ نکاح'' کے بارے میں ائمہ اربعہ کے مسلک کو اصل مآخذ کے حوالہ جات کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کون کون سے مواقع ہیں جہاں دوسرے ائمہ کے قول پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں ''مجلس قضائے شرعیہ'' بہار، اکابرِ علماءِ اہلسنت نے قائم کی تھی اور انہوں نے ''فسخِ نکاح'' کے بارے میں کچھ اصول متفقہ طور پر طے کیے تھے، جن میں سے ''فسخِ نکاح'' کے بارے میں بعض متفقہ وجوہ کا تذکرہ مفتی عبدالواجد قادری نے ''فتاویٰ یورپ'' میں کیا ہے۔

آخر میں میری دردمندانہ گذارش ہے کہ اگر کوئی عورت خدانخواستہ خوفِ خدا سے عاری ہے، اس پر نفسانی خواہشات یا ہوسِ زر کا غلبہ ہے یا عشرتوں کی دلدادہ ہے اور کسی بھی جائز سبب کے بغیر شوہر کے ساتھ بہر صورت رہنے کے لئے تیار نہیں ہے، تو ایسی صورتِ حال میں شوہروں کو چاہیے کہ وہ رضا کارانہ طور پر خُلع پر آمادہ ہوجائیں یا یک طرفہ طور پر طلاق دے دیں، اس پر وہ عنداللہ اجر پائیں گے اور عورت فتنہ اور گناہ میں

مبتلا ہونے سے بچ جائے گی۔ اور اگر شوہر رضا کارانہ طور پر اس پر آمادہ نہ ہو تو عدالت مناسب دباؤ ڈال کر اس سے طلاق دلوائے۔

ماں کا حقِ نگہداشت ساقط ہونے کی صورتیں

سوال:132

منکہ مسمی شعیب یونس ولد محمد یونس کی شادی مسماۃ فارینہ بنت امان اللہ سے 11 اگست 2001ء کو ہوئی تھی۔ اس سے میرا ایک ساڑھے چار سالہ بیٹا محمد مصطفیٰ ہے۔ اس تمام عرصے میں میری بیوی کا رویہ مجھ سے کبھی محبت کا نہیں رہا اور اکثر اوقات وہ میکے میں رہنے کی خواہشمند رہتی جس پر کبھی کبھی ناراضی بھی ہوتی تھی ایک دن اچانک مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا اور اس روز میں نے اسے ایک ایسے موبائل فون پر کسی لڑکے کو SMS کرتے ہوئے پکڑا جو میں نے اسے نہیں دلایا تھا اور مجھ سے خفیہ رکھا ہوا تھا، رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ اس کے تعلقات دوسرے لڑکوں سے ہیں۔ اس موبائل پر تقریباً SMS750 آئے اور تقریباً 500 گئے، جس کی تفصیل پرنٹ کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ سب جاننے کے بعد میری غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ ایسی عورت کو اپنے ساتھ رکھوں مگر پھر بھی میں نے ہوش میں رہتے ہوئے اس کے والدین کو بلایا اور ساری صورت حال ان کے سامنے رکھی اور ایک طلاق دے کر ان کے ساتھ بھیج دیا اس پر اس کے والدین نے نہ کسی شرمندگی کا اظہار کیا اور نہ ہی معافی مانگی اور میرے بچے کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ میرا تعلق ایک دین دار گھرانے سے ہے، میں نے اس وقت ممتا کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کے خیال سے بچے کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی، مگر اس کی بے راہ روی اور غیر اخلاقی حرکات کو دیکھتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے بچے کو ساتھ رکھوں اور اس کی پرورش دینی ماحول میں کروں۔

محترم مفتی صاحب ان حالات میں آپ کا مشورہ اور فتویٰ درکار ہے تاکہ میں اپنے بچے کو اس گندے ماحول سے نکال کر اپنے پاس رکھوں اور اس کی تربیت دینی ماحول میں کرسکوں،

جب وہ میرے پاس تھا تو اسکول بھی جاتا تھا لیکن اس کی ماں نے چار ماہ سے اسے اسکول نہیں بھیجا، بچے کا مستقبل خراب ہو رہا ہے۔ برائے مہربانی بچے کی کفالت اور حصول کے لئے شرعی اور قانونی رہنمائی فرمائیں تاکہ بچے کا مستقبل محفوظ ہو اور وہ ایک دین دار انسان بن سکے، (محمد شعیب، C-205، پرنس ایونیو، گارڈن، کراچی)۔

جواب:

شرعاً بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہوتا ہے لیکن اگر ایسے اسباب پائے جائیں جو اس کے حق کو ساقط کر دیں، تو بچے کو اس کی پرورش میں نہیں دیا جائے گا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح أو بعد الفرقة الا م الا ان تكون مرتدة أو فاجر ة غير مامونة كذا في الكافي ـ

ترجمہ: ''نکاح قائم رہے یا (بذریعۂ طلاق) تفریق ہو جائے، (دونوں صورتوں میں) بچے کی پرورش کا سب سے زیادہ حق اس کی ماں کو کو حاصل ہے، لیکن اگر وہ مرتدہ ہو جائے یا (فسق و) فجور میں مبتلا ہو جائے، بچے کی صحیح نگہداشت نہ کرے تو (پھر اس کا حق ساقط ہو جاتا ہے)'' کافی'' میں بھی اسی طرح ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں: و كذا لو كانت سارقة أو مغنية أو نائحة فلا حق لها هكذا في النهر الفائق ـ

ترجمہ: ''اور اسی طرح اگر وہ (ماں) چور یا گانے والی یا نوحہ خوانی کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہے، تو اس کے لئے حقِ پرورش نہیں ہے، ''النھر الفائق'' میں اسی طرح مذکور ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1 ص: 541 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

''تربيت الولد(تثبت للام) النسبية (ولو بعد الفرقة الا أن تكون مرتدة أو فاجرة) فجوراً يضيع الولد به، كزنا وغناء وسرقة ونياحة كما في "البحر" و"النهر" بحثاً۔ قال المصنف: والذي يظهر العمل باطلاقهم كما هو مذهب الشافعي أن

الفاسقة بترک الصلاة لا حضانة لها ۔ وفی "القنية ":الأم أحق بالولد ولو سيئة السيرة معروفة بالفجور مالم يعقل ذلک (أو غير مأمونة) ذکره فی "المجتبیٰ " بأن تخرج کل وقت وتترک الولد ضائعاً۔

ترجمہ:'' بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے، اگر چہ زوجین کے درمیان جدائی واقع ہوگئی ہو، لیکن اگر وہ (ماں) مرتدہ ہوگئی ہے یا فاجرہ ہے اور فسق ایسا ہے، جس سے بچے کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، مثلاً زنا،، گانا بجانا، چوری ، اور نوحہ کرنا جیسا کہ ''البحرالرائق'' اور ''النہرالفائق'' کی بحث میں کہا گیا ہے مصنف کہتا ہے: بظاہر اس قول کے اطلاق پر عمل کریں گے جیسا کہ امام شافعی کا مذہب ہے کہ اگر فاسقہ ماں نماز کی تارکہ ہے، تو اسے بھی بچے کی پرورش کا حق نہیں رہتا، اور'' قنیۃ'' میں ہے: ماں بچے کی پرورش کی زیادہ حق دار ہے اگر چہ وہ اپنی سیرت وکردار میں برائی کے حوالے سے جانی جاتی ہو، بچہ اس وقت تک ماں کی پرورش میں رہے گا جب تک اسے اچھائی برائی کی تمیز نہ ہو (جب وہ باشعور ہوجائے تو اسے ماں سے علیحدہ کرلیں تاکہ ماں کو دیکھ کر اس کا کردار خراب نہ ہو) ایسے ہی اس عورت کی پرورش میں بھی نہیں دیا جائے گا، جس کے پاس بچہ غیر محفوظ ہو یعنی وہ ہر وقت بچے کو چھوڑ کر آزادانہ گھومتی پھرتی رہے، ''المجتبیٰ'' میں اسی طرح ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"والحاصل أنّ الحاضنة ان کانت فاسقة فسقاً يلزم منه ضياع الولد عندها سقط حقها ، والا فهی أحق به الی أن يعقل فينزع کالکتابية ۔

ترجمہ:'' اور حاصلِ کلام یہ ہے کہ پرورش کرنے والی (ماں) اگر فاسقہ ہے اور اس کے پاس رہنے سے بچے کے ضائع ہونے (یا اس کی عادات واطوار بگڑنے) کا اندیشہ ہے تو اس (ماں) کا حق پرورش ساقط ہوجائے گا، اور اگر فاسق نہ ہو تو بچے کے باشعور ہونے تک زیادہ حق دار وہی ہے، اس کے بعد اس سے لے لیا جائے گا، جیسے'' کتابیہ'' ماں کا حکم ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 5 ص:204,205 داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

آپ نے سوال میں جوصورت درج کی ہے، اس کی رو سے ایسی ماں کی سر پرستی اورنگہداشت میں بچے کے کردار کے متاثر ہونے کا خدشہ ہےاوراس نے بچے کواسکول سے بھی روک دیا ہے،لہٰذا آپ اس سے بچے کا مطالبہ کریں، اگر حوالے نہ کرے تو پنچائیت یا عدالت کے ذریعے حاصل کریں۔

بچوں کی کفالت

سوال:133

میرا بیٹا اختر محمود 15 نومبر 2006ءکوقضائے الٰہی سے انتقال کرگیا ہے،لواحقین میں درج ذیل افراد ہیں:

(1) بیوہ اختر محمود عمر25 سال (2) ایک بیٹی عمر4 سال

(3) ایک بیٹا عمر2 سال (4) والد (محمود احمد) عمر60 سال

ا۔وراثت کی تقسیم میں شرعی احکامات کی رُو سے ہرایک کوکس قدر حصہ ملے گا؟

۲۔مرحوم پر جوقرض ہےاس کی ادائیگی کے متعلق بھی شرعی فیصلے سے مطلع فرمائیں؟

۳۔بیوہ اگر نکاحِ ثانی کرتی ہےتو کیاان دونوں کمسن بچوں کی کفالت ان کے دادا کے ذمے ہوگی؟،(محمود احمد لطفی،502- سیکٹر5-B سرجانی ٹاؤن،کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفّٰی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین حقوق متعلق ہوتے ہیں:(1) ترکے سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کئے جاتے ہیں (2)اس کے بعد اس کے ذمہ اگرکسی کا قرض ہو،تواس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے(3)اس کے بعد اگراس نے کوئی وصیت کی ہوتو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حدتک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ وصیت کسی وارث شرعی کے حق میں نہ ہو،یہ تین امور تقسیم وراثت سے مقدم ہوتے ہیں،ان کومنہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ متوفی اختر محمود کی جائیداد منقولہ وغیرمنقولہ 72 حصوں میں منقسم ہوگی ،متوفّٰی کے

والد (محمود احمد) کو 12 حصے، بیوہ کو 9 حصے، بیٹے کو 34 حصے، بیٹی کو 17 حصے ملیں گے۔
جہاں تک بچوں کفالت اور حق حضانت (گود لینے اور پرورش) کا تعلق ہے، شرعاً اس کے استحقاق کی ترتیب درج ذیل ہے:
علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

تربیت الولد(تثبت للام)النسبیة(ثم)أی بعد الأم بأن ماتت او لم تقبل أو اسقطت حقها أو تزوجت بأجنبی (أم الأم وان علت) عند عدم أهلیة القربیٰ(ثم أم الأب وان علت) بالشرط المذکور ،وأما أم ابی الأم فتؤخر عن أم الأب بل عن الخالة أیضاً۔

ترجمہ: ''بچے کی پرورش کا حق نسبی ماں کو حاصل ہے---------آگے چل کر لکھتے ہیں: ترجمہ: ''ماں فوت ہوجائے یا بچے کو قبول نہ کرے یا اپنا حق حضانت ساقط کر دے، یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کرلے جو بچے کے لئے اجنبی ہے، تو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق ہے یہ استحقاق بالترتیب اوپر تک جائے گا، اگر قریب والے میں پرورش کی اہلیت نہ ہو، پھر دادی کو اور مذکورہ کے ساتھ یہ سلسلہ اوپر تک جائے گا، پھر نانا کی ماں، دادی بلکہ خالہ سے بھی مؤخر ہے۔

مزید لکھتے ہیں: والحاضنة أما أو غیرها(أحق به) أی بالغلام حتی یستغنی عن النساء وقدر بسبع وبه یفتی لأنه الغالب

ترجمہ: ''پرورش کرنے والی عورت خواہ وہ بچے کی ماں ہو یا کوئی اور اس کو یہ حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک لڑکا عورتوں کی نگرانی سے مستغنی نہ ہوجائے، جس کی مدت کا اندازہ سات سال لگایا گیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، کیونکہ اکثر صورتوں میں یہ ضرورت اسی عمر تک رہتی ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

(والأم والجدة) لأم أو لأب (احق بها)بالصغیرة (حتی تحیض وغیرهما احق

بها حتیٰ تشتهی) وقدر بتسع و به یفتی۔
ترجمہ:"ماں اور نانی اور دادی لڑکی کے حیض آنے تک ان کی پرورش کا استحقاق رکھتی ہیں، (ان کی عدم موجودگی یا عدم دستیابی کی صورت میں) دوسری پرورش کرنے والی عورتوں کا استحقاق لڑکی کے مشتہاۃ (قریب البلوغ) ہونے تک ہے اور اس کی مدت کا اندازہ 9 سال لگایا گیا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5 ص:210 تا 216 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

صورتِ مسئولہ میں دونوں بچے مذکورہ بالا عمر تک ماں کے پاس رہیں گے بشرطیکہ ماں کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح نہ کرے جو بچے کے لئے اجنبی ہے، اس کے بعد دادا کو ان کی کفالت کا حق حاصل ہوگا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بچوں کو ماں سے اس طرح جدا کر دیا جائے کہ اس سے ملنے تک نہ دیں یہ حرام اور سخت حرام ہے۔ حدیث مبارک میں ہے: عن ابی موسیٰ قال لعن رسول اللہ ﷺ من فرق بین الوالدة وولدها، وبین الاخی وبین اخیه۔

ترجمہ:"ابی موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی کہ جو ماں اور اس کے بچے میں جدائی پیدا کرے اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے جدا کرے، (سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث:2250)"۔

کتاب العدت

عدت

سوال:134

کیا عورت کو جو مہینہ آتا ہے وہ تین بار آجائے تو کیا عدت پوری ہو جاتی ہے؟،
(انیس محمد، مکان 4/887 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

جی ہاں! اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ ۔(البقرۃ:228)
ترجمہ: ''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں''۔

سوال:135

میری بیوی حلالے کے بعد بچوں کی وجہ سے عدت کرنا نہیں چاہتی، کیونکہ بچوں کو اسکول اور مدرسے چھوڑنا، گھر کا سامان لانا، بچوں کی بیماری اور گھر کے دیگر بہت سارے کام ہوتے ہیں اور یہ کام کرنے والا کوئی نہیں ہے، میرے چھ بچے ہیں کیا اس صورت میں عدت لازم ہے مہربانی فرما کر میری مشکل آسان فرمادیں، (انیس محمد، مکان 4/887 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

عدت کا پورا کرنا لازمی ہے اور دورانِ عدت اس کا اور بچوں کا نفقہ ادا کرنا آپ کے ذمے لازم ہے اور جو اعذار آپ نے پیش کیے ہیں وہ شرعاً نا قابلِ قبول ہیں۔
اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ ۔
ترجمہ: ''جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو، تو ان کی عدت کے وقت (سے پہلے طہر میں) انہیں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو، (الطلاق:1)''۔

کیا میں دورانِ عدتِ طلاق گھر سے باہر جا سکتی ہوں؟

سوال:136

مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کے چار ماہ بعد میں بہت بیمار ہوگئی اور اپنی والدہ کے گھر آگئی تھی، اس دوران میرا میرے شوہر سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا نہ ہی انہوں نے کسی قسم کا خرچہ دیا میرے والدین نے سارا خرچہ اٹھایا اب میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے تو جناب عدت کے بارے میں فرمائیے کہ میری عدت ہوگی، کتنے دن کی ہوگی؟، میں چونکہ ڈپریشن کی مریضہ بن گئی تھی تو ڈاکٹر نے مصروف رہنے کا کہا تھا اور پونے دو سال علاج بھی ہوا میں نے ابھی تین ماہ قبل ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا شروع کیا ہے۔کیا میں عدت کے دوران اسکول جا سکتی ہوں یا نہیں؟ اسکول میں پڑھانے سے میری دماغی حالت میں کافی بہتری آئی ہے ہم دونوں پونے دو سال سے جدا تھے، اولاد کا سلسلہ بھی کوئی نہیں ہوا، (فردوس جبیں، بلاک 1 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

ہر مطلقہ مدخول بہا پر عدت لازم ہے، شوہر سے جدائی کتنی ہی طویل مدت سے ہو طلاق کے بعد عدت ضروری ہے اور غیر حاملہ جسے حیض آتا ہو، اس کی عدت بعد از طلاق تین حیض پورے کرنے ہیں، قرآن مجید میں ہے: **وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ** (البقرۃ:228)

ترجمہ: ''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں''۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: **لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُیُوْتِهِنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ**۔ (الطلاق:1)

ترجمہ: تم انہیں (عدت میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں''۔

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: وفی الجامع الصغیر المطلقۃ تعتد فی بیت کانت قبل الفرقۃ فیہ ولا تخرج لیلاً ولا نہاراً فی العدۃ۔

ترجمہ: جامع صغیر میں ہے مطلقہ عورت اپنے گھر میں عدت گذارے گی، دورانِ عدت رات

ودن میں کسی وقت گھر سے نہیں نکلے گی، (جلد ثانی ص:119 مطبوعہ مکتبہ حبیبیہ، کوئٹہ)۔
علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: لا تخرج لیلاً ولا نهاراً سواء کان الطلاق ثلاثاً أو بائنا أو رجعيًا۔
ترجمہ: " رات ودن میں کسی بھی وقت (معتدہ) اس مکان سے جہاں وہ طلاق سے پہلے رہائش پذیر تھی نہیں نکلے گی، خواہ اسے تین طلاق دی گئی ہوں یا طلاق بائن یا طلاقِ رجعی، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص:534 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)"۔
صورتِ مذکورہ میں چونکہ آپ اپنے والد کی کفالت میں ہیں اور کوئی معاشی ضرورت یا مجبوری درپیش نہیں ہے اور ملازمت کرنا آپ کی معاشی مجبوری نہیں ہے، لہٰذا عدت کے ایام میں گھر سے نہ نکلیں، ڈپریشن وغیرہ کا عذر مسموع نہیں ہے۔

عدتِ وفات

سوال: 137

میرے شوہر محمد الطاف کا انتقال ۴ رفروری ۲۰۰۶ء کو ہوا ہے اور میرے پانچ بچے ہیں، جن میں سب سے بڑی بیٹی ۱۷ رسال کی، دوسری بیٹی ۱۵ رسال کی، بیٹا ۱۱ رسال کا اور دو چھوٹے جڑواں ڈیڑھ سال کے بچے ہیں۔ میرے شوہر کا جڑی بوٹیوں کا سپلائی کا کام ہے، اور ان کا تمام پیسہ کاروبار میں لگا ہوا ہے، میرے والد کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور میرا کوئی سگا بھائی بھی نہیں ہے۔ میں اس سلسلے میں بہت پریشان ہوں، اس لئے مجھے آپ سے یہ فتویٰ چاہئے کہ میں پردے میں رہ کر اپنے شوہر کے کاروبار کو چلا سکتی ہوں اور دکان پر کاروباری لوگوں سے بات چیت کر سکتی ہوں، فی الحال میرے ماموں زاد بھائی کاروبار کو سنبھال رہے ہیں، مگر وہ اس کاروبار کی پیچیدگیوں سے واقف نہیں ہیں جبکہ میں اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں کئی مرتبہ کاروبار سنبھال چکی ہوں اور کاروبار کی تمام باریک بینیوں سے واقف ہوں، اس لئے اگر اشد ضرورت پڑے تو پردے میں گھر میں یا باہر جا کر کاروبار سنبھال سکتی ہوں، کیونکہ میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میری جوان بیٹی کاروبار کے سلسلے میں غیر

مردوں کے سامنے جائے،آپ اس سلسلے میں فتویٰ دے کر میری رہنمائی کریں، (شہناز الطاف،D-120/A گلی نمبر۱،موسیٰ کالونی،فیڈرل بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں عدت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ترجمہ:اور جولوگ تم میں سے وفات پاجائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو کوئی حرج نہیں تم پر اس بات میں جو دستور (شرع) کے موافق وہ اپنے حق میں کریں،(البقرہ:234)۔

عورت کو زمانۂ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے،ہاں!اگر عدت موت کی ہو اور اس کے پاس کھانے کو نہ ہو،بغیر گھر سے نکلے کام نہ چل سکے گا یا نقصان پہنچے گا تو اس ضرورت سے اس کے لئے جاسکتی ہے اور رات اسی گھر میں گزارے اور بغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے۔

درمختار میں علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(ومعتدۃموت تخرج فی الجدیدین، وتبیت)اکثر اللیل(فی منزلها)لان نفقتها علیها، فتحتاج للخروج۔

ترجمہ:''اور جوعورت عدت وفات گزار رہی ہو وہ بوقت ضرورت دن یا رات میں نکل سکتی ہے،لیکن رات کا اکثر حصہ گھر میں گزارے،اس لئے کہ وہ اپنے اخراجات کی ذمہ دار خود ہے پس وہ اس کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہے،(درمختار جلد5 صفحہ 180،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی،بیروت)''۔

علامہ علاؤالدین ابی بکر بن مسعود لکھتے ہیں:واماالمتوفی عنها زوجها فلا تخرج لیلاً ولا باس بان تخرج نهاراًفی حوائجها لانهاتحتاج الی الخروج بالنهار لاکتساب ماتنفقه لأنه لا نفقة لها من الزوج المتوفی بل نفقتها علیهافتحتاج الی الخروج لتحصیل النفقة۔

ترجمہ:" پس وفات پا گیا ہو جس عورت کا شوہر وہ رات میں نہ نکلے، اور اپنی ضروریات کیلئے دن کے وقت نکلنے میں حرج نہیں اس لئے کہ وہ محتاج ہے دن کے وقت نکلنے کی تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، کیونکہ اس کا نفقہ اس کے متوفی شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس پر ہے پس وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، (بدائع الصنائع جلد 3 صفحہ 299، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، ہند)"۔

صورت مسئولہ میں فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق یہ واضح ہوتا ہے کہ معتدہ وفات اپنے اخراجات اور روزگار کے لئے دن کے وقت باپردہ باہر نکل سکتی ہے۔لہٰذا آپ کے لئے باپردہ ہو کر شوہر کے کام کی دیکھ بھال کے سلسلے میں نکلنا جائز ہے۔

مدتِ عدت

سوال:138

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ: ایک عورت کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ عورت حاملہ ہے، تو اس کی عدت کتنی ہو گی؟، نیز عدتِ طلاق اور عدتِ وفات کی مدت کتنی ہے؟، آیا عدت کے دوران عورت گھر سے باہر جاسکتی ہے؟، (زاہد اللہ، کراچی)

جواب:

عِدَّت (عین کی زیر کے ساتھ) کے لفظی معنیٰ ہیں: گنتی کرنا اور عُدت (عین کے پیش کے ساتھ) کے معنیٰ ہیں: کسی معاملے کی تیاری کرنا۔ اور اصطلاحی معنیٰ ہیں: نکاح ختم ہونے کے بعد ایک خاص مدّت تک عورت کا (عقدِ ثانی سے) رکے رہنا۔ اگر عورت کو شوہر نے طلاق دے دی ہے اور وہ طلاقِ مُغلَّظہ ہے، یا طلاق رجعی ہے، مگر عدت کے اندر رجوع نہیں کیا، تو اس مطلّقہ (طلاق یافتہ) عورت کو اگر حیض (Menses) آتا ہے، تو اس کی عدت تین حیض ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۔ ترجمہ:" اور طلاق یافتہ عورتوں پر لازم

ہے کہ وہ (کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے) اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں (البقرہ:228)''۔

حیض اور طہر (پاکی کے ایام) کا دورانیہ ہر عورت کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ اور اگر عورت کو حیض نہیں آتا، خواہ کسی طبعی یا طبّی سبب سے ہو یا کم عمر ہے اور حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا یا وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہوگئی ہیں، جب کہ فطری طور پر حیض کا سلسلہ موقوف ہوجاتا ہے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالّٰٓئِیۡ یَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِیۡضِ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ فَعِدَّتُہُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشۡہُرٍ ۙ وَّالّٰٓئِیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ ؕ۔ ترجمہ: ''اور تمہاری جو عورتیں حیض سے ناامید ہوچکی ہوں یا انہیں سرے سے حیض آتا ہی نہیں اور تمہیں اس امر میں شبہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہے؟) تو ان کی عدت تین ماہ ہے، (الطلاق:4)''۔

جو عورت طلاق کے وقت حالتِ حمل میں ہو، تو اس کی عدت وضعِ حمل (Delivery of the child) یعنی بچہ پیدا ہونے تک ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ اَجَلُہُنَّ اَنۡ یَّضَعۡنَ حَمۡلَہُنَّ ؕ۔ ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضعِ حمل ہے، (الطلاق:4)''۔ جن عورتوں کے شوہر وفات پاجائیں اور بیوہ رہ جائیں، تو ان کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِیۡنَ یُتَوَفَّوۡنَ مِنۡکُمۡ وَیَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا یَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ اَرۡبَعَۃَ اَشۡہُرٍ وَّعَشۡرًا ۚ۔ ترجمہ: ''اور تم میں سے جو لوگ وفات پاجائیں اور (اپنے پیچھے) بیویاں چھوڑ جائیں، تو وہ عورتیں (عقدِ ثانی سے پہلے) اپنے آپ کو چار ماہ دس دن تک روکے رکھیں، (البقرۃ:234)''۔ اگر عورت بیوہ ہوگئی ہے اور وہ حاملہ ہے، تو اس صورت میں اس کی عدت وضعِ حمل تک ہی رہے گی، چنانچہ عِدّتِ وفات کے تحت علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (و) العدۃ (للموت اربعۃ اشھر وعشر مطلقا) وطئت اولا ولو صغیرۃ او کتابیۃ تحت مسلم الا الحامل۔

ترجمہ: ''یعنی عِدّتِ وفات جو چار ماہ دس دن ہے یہ مطلقاً سب کے لئے ہے، خواہ اس سے

شوہر نے مباشرت کی ہو یا نہ کی ہو، خواہ نابالغہ ہو یا کوئی اہلِ کتاب عورت ہو جو کے کسی مسلمان کے نکاح میں تھی، سوائے حاملہ کے (کہ اس کی عِدّت شوہر کی وفات کی صورت میں وضعِ حمل ہی رہے گی)، ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:5،ص:150، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

عدت کی اصل حکمت "استبراءِ رحم" یعنی اس امر کا یقین کہ عورت حاملہ نہیں ہے، اس کے لئے مدت کا تعین وحی ربانی سے ہوا ہے، اسی لیئے مطلّقہ حاملہ کی عدت وضعِ حمل کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ شوہر کی وفات کی صورت میں ایک طرح سے سوگ بھی ہو جاتا ہے۔ اگر کسی عورت کا نکاح ہو گیا ہے، لیکن باقاعدہ رخصتی نہیں ہوئی یا میاں بیوی میں خَلوتِ صحیحہ قائم نہیں ہوئی، (خَلوتِ صحیحہ سے مراد دونوں کا تنہائی میں اس طرح سے جمع ہونا کہ ازدواجی تعلق میں کوئی طبعی مانع حائل نہ ہو) تو طلاق کی صورت میں اس عورت پر بالکل عدت نہیں ہے۔ اور وہ طلاق کے فوراً بعد کسی بھی شخص کے ساتھ اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔

ازدواجی تعلقات نہ ہوں تب بھی عدت ضروری ہے

سوال:139

تقریباً 11 سال پہلے میرے گھر لڑکے کی ولادت کے بعد سے میرے شوہر میرے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم رکھنے سے محروم ہیں، اس وجہ انہوں نے 15 دن قبل مجھے طلاق دے دی ہے، تین مرتبہ انہوں نے کہا کہ "میں نے تم کو طلاق دی"۔ تحریری طور پر بھی دینے کو تیار ہیں۔ کیا میں فوری طور پر نکاحِ ثانی کر سکتی ہوں؟ یا مجھے عدت گذارنا ہوگی اگر عدت گذارنی ہے تو کتنے دن؟، (شاہدہ رشید، R-1947/2 عزیز آباد، کراچی)۔

جواب:

ہر مطلقہ مدخول بہا پر عدت لازم ہے، شوہر سے جدائی کتنی ہی طویل مدت سے ہو طلاق کے بعد عدت ضروری ہے اور غیر حاملہ جسے حیض آتا ہو، اس کی عدت بعد از طلاق تین حیض پورے کرنے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرۃ:228)"۔

ترجمہ: "اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں"،
صورتِ مسئولہ میں عدت پوری کئے بغیر نکاح ثانی ہرگز نہیں کیا جاسکتا اور عدت طلاق دینے کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے اور اس کی مدت تین حیض کا گزرنا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

دورانِ عدت جنازے میں شرکت

سوال:140

میری والدہ عدت میں ہیں ان کی عمر 53 سال ہے ان کی عدت کے دوران میری چچی کے والد کی وفات ہوگئی اور بغیر کسی بڑے کے پوچھے تمام بہن بھائیوں کے منع کرنے کے باوجود وہاں چلی گئیں۔ مگر وہ پورے پردے میں تھیں برقع پہن کر نقاب لگا کر گئی تھیں اور رات دس بجے واپس لوٹی تھیں۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں میت کے بعد دس قدم بھی نہیں نکالے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر امی سے یہ غلطی سرزد ہوگئی ہے تو اس کا اگر کوئی کفارہ ہے تو بتادیں اور یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ عدت شوہر کے لئے تحفہ ہے اسمیں کیا صداقت ہے؟ اور عدت میں کیا شرعی کام کرنے چاہئیں؟، (عارفہ عباسی، دستگیر سوسائٹی F.B ایریا، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔

ترجمہ: تم انہیں (عدت میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود (بھی) نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں۔ (الطلاق:1)

عورت کے لئے عدت اسی مکان میں واجب ہے، جہاں وہ شوہر کی وفات کے وقت رہتی تھی۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(طلقت) أو مات وهي زائرة (في غير مسكنها عادت اليه فوراً) لوجوبه عليها

(وتعتدان) أی معتدۃ طلاق وموت (فی بیت وجبت فیہ) ولا یخرجان منہ (الّا أن تخرج،أو ینھدم المنزل أوتخاف) انھدامہ، أو (تلف مالھا، أو لاتجد کراء البیت) ونحو ذالک من الضرورات،فتخرج لأقرب موضع الیہ۔

ترجمہ:''عورت کوطلاق دی گئی یااس کاشوہروفات پا گیااوروہ اپنے گھر کے علاوہ کہیں اور گئی ہوئی تھی،تو اسے چاہئے کہ فوراً اپنے گھرلوٹ آئے،کیونکہ یہ اس پرواجب ہے،عورت عدتِ طلاق گزاررہی ہو یاعدتِ وفات،ان دونوں کوچاہئے کہ اسی گھرمیں عدت گزاریں جہاں پرعدت گزارنا،ان پرواجب ہواہے،سوائے اس کے کہ انہیں (اس گھرسے) نکال دیاجائے یامکان گرجائے یااس کے گرنے کا خدشہ ہو یااس کا مال تلف ہونے کا خطرہ ہو یا (مکان کرائے کا ہونے کی صورت میں کرایہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو) ان جیسی صورتوں (یا مجبوریوں) کی بناء پراس کے لئے جائز ہے کہ وہاں سے نکل کراس سے قریب ترین جگہ پرعدت گزارے،(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد5 ص:180 دار احیاء التراث العربی بیروت)۔''عورت کوزمانہ عدت میں گھرسے نکلنا حرام ہے،ہاں !اگرعدتِ وفات ہواوراس کے پاس کھانے کو نہ ہو،گھرسے نکلے بغیر گذر اوقات مشکل ہو،تووہ دن دن میں ان ناگزیرضرورتوں کے لئے نکل سکتی ہے،اور رات اسی گھرمیں گزارے اوربغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے۔

علامہ علاؤالدین ابی بکربن مسعودلکھتے ہیں:

وأما المتوفی عنھا زوجھا فلا تخرج لیلاً، ولا باس بان تخرج نھاراًفی حوائجھا لانھاتحتاج الی الخروج بالنھار لاکتساب ماتنفقہ لأنہ لا نفقۃ لھا من الزوج المتوفی بل نفقتھا علیھافتحتاج الی الخروج لتحصیل النفقۃ۔

ترجمہ:''ایسی عورت جوعدتِ وفات میں ہے،تووہ رات کوگھرسے (ہرگز) نہ نکلے،البتہ دن کے وقت اپنی ضروریات کے لئے نکل سکتی ہے،اس میں کوئی حرج نہیں ہے،کیونکہ اس لئے کہ وہ محتاج ہے دن کے وقت نکلنے کی تاکہ اپنا نفقہ حاصل کرے،کیونکہ اس کا نفقہ اسکے متوفی

شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس پر ہے پس وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے تا کہ اپنا نفقہ حاصل کرے، (بدائع الصنائع جلد 3 صفحہ 299، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، ہند)''۔

صورتِ مسئولہ میں نہ تو آپ کی والدہ نفقہ اور دیگر ضروریات کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہیں اور نہ ہی دورانِ عدت جنازے میں جانا ضرورتِ شرعی ہے، اور ضرورت وہ ہوا کرتی ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو جیسا کہ ابتداء میں بیان کیا گیا۔ عدت حکمِ شرعی ہے جس کی پابندی ضروری ہے، شرعی کام صرف عدت ہی میں نہیں بلکہ تمام زندگی کرنے چاہئیں، اور اس کے لئے ضروریاتِ دین کو سیکھئے اور مستند کتب کا مطالعہ کیجئے، واللہ اعلم بالصواب۔

﴿کتاب الفرائض﴾

ترکہ کی تقسیم

میرے چند سوالات کا اسلامی شریعت اور حدیثوں کے حوالے سے تحریری جواب عنایت فرمائیں۔

اگر کوئی شادی شدہ عورت جو کہ تین بچوں کی ماں ہو، اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں اپنے گھر میں کسی غیر مرد سے ناجائز تعلقات کی مرتکب ہوئی ہے، جس کی وجہ سے اس کے شوہر نے اس عورت کو طلاق دے کر اس کو گھر سے نکال دیا۔

سوال:141

1۔کیا اس عورت کے والد اس کو اپنی جائداد سے خارج کر سکتے ہیں؟۔

2۔کیا اس عورت کے والد اپنی زندگی میں اس عورت کو اپنی جائداد میں سے کچھ حصہ دے سکتے ہیں، صلہ رحمی کے طور پر؟۔

3۔والد صاحب کے پاس ایک عدد گھر اور ایک عدد فلیٹ بھی ہے، انہوں نے جب والدہ حیات تھیں تو باقاعدہ یہ کہہ دیا تھا کہ گھر بیٹے کا ہے اور فلیٹ بیٹی کا ہے اور گھر بیٹے کے نام کئے ہوئے اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں والد صاحب بیٹے کو گھر اور بیٹی کو فلیٹ دے سکتے ہیں، جبکہ دونوں کی قیمت میں دس گنا کا فرق ہے۔ اب والد صاحب کا مطالبہ ہے کہ جو گھر میں نے تم کو دیا تھا وہ مجھے واپس کر دو، (محمد فاروق عمران، A-10، کے ڈی اے سوسائٹی، کراچی)۔

جواب:

ہر عاقل و بالغ شخص اپنے ہر قول و فعل کا ذمہ دار ہے۔ شریعت کی رو سے بھی اور قانون کی نظر میں بھی، لہٰذا کسی شخص پر اپنی بالغ اولاد کے کسی فعل یا لین دین کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ جہاں تک اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا سوال ہے تو اس کا اختیار شرعاً والدین کو نہیں ہے، کیونکہ وراثت یا ترکہ اس مال کو کہتے ہیں جو کوئی شخص چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

اس متروکہ مال میں مرنے والے کو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال پر وصیت کے ذریعے تصرف کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ وہ وفات سے پہلے اپنی زندگی میں ایسی وصیت کر چکا ہو، لیکن وصیت میں بھی یہ شرط ہے کہ وارث کے حق میں وہ معتبر و مؤثر نہیں ہوتی۔ باقی متروکہ مال پر وراثت کے احکام قرآن کا ثابت شدہ قانون ہے اور اس کے رد کرنے یا اس میں ردوبدل کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے، کسی ایک وارث کے حق میں بھی وصیت کو اس لئے ناقابل اعتبار اور غیر مؤثر قرار دیا گیا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے مقررہ نظام وراثت میں تبدیلی واقع ہوسکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"سمعت أبا أمامة،سمعت رسول الله ﷺ يقول: انّ الله قد أعطى كل ذى حقّ حقّه فلا وصية لوارث"

ترجمہ: "ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ، مؤسسۃ الریان، بیروت)"۔

اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کا کسی ایک وارث کو دینا تاکہ دوسرے ورثاء محروم ہوجائیں ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلاوجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ حدیث مبارک میں فرمایا: عن أنس بن مالك،قال:قال رسول الله ﷺ:"من فرّ من ميراث وارثه،قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة"۔

ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہِ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کی میراث جنت سے قطع کردے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث 2703 مطبوعہ دارالفکر بیروت)

اولاد میں سے کسی کو اپنے ماں باپ سے ان کی زندگی میں یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ اپنے مال یا جائیداد یا وراثت میں سے ہمیں حصہ دو۔ ہر عاقل و بالغ زندہ شخص کو اپنے مال پر شرعی حدود میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ اور جب تک کوئی شخص زندہ ہے، اس کا

مال اس کی ملکیت ہے، ترکہ یا وراثت نہیں ہے کہ کوئی وارث بن کر اس میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرے۔

کسی شخص کی زندگی میں، اس کا ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتی، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ وہ تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، مگر یہ تقسیمِ وراثت نہیں کہلائے گی بلکہ ''ہبہ'' کہلائے گا اور ''ہبہ'' میں اولاد کے درمیان مساوات کی ترغیب دی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارک ہے:

حدثني النعمان بن بشير َانّ امّهٗ بنتَ رواحةَ سألت اباه بعضَ الموهوبة من ماله لابنها،فالتویٰ بها سنةً ،ثمّ بدا له۔فقالت: لا ارضٰی حتّٰی تُشهدَ رسول اللهﷺ علیٰ ماوهبتَ لابني، فاخذ ابي بيدي، وانا يومَئذٍ غلام، فاتیٰ رسول اللهﷺ فقال: يارسول اللهﷺ! انّ اُمّ هذا، بنتَ رواحةَ، اَعجبها ان اُشهِدك علی الذی وَهبتُ لابنها، فقال رسولُ اللهﷺ:"يا بشيرُا أ لكَ ولدٌ سویٰ هذا؟" قال: نعم، فقال: اكلّهم وهبت له مثل هذا؟ قال: لا۔ قال: فلا تشهدني اِذن، فانّي لا اشهدُ علیٰ جورٍ".

ترجمہ: ''نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ ان کے بیٹے (حضرت نعمان) کو ہبہ کردیں، میرے والد نے ایک سال تک یہ معاملہ ملتوی رکھا، پھر انہیں اس کا خیال آیا، میری والدہ نے کہا میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ تم میرے بیٹے کے ہبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ کرلو، میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے۔ اس وقت میں نوعمر لڑکا تھا، انہوں نے کہا! یارسول اللہ ﷺ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ کرلوں، جو میں نے اپنے اس لڑکے کو ہبہ کی ہے،

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟، انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اتنا ہی مال ھبہ کیا ہے؟، انھوں نے کہا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا"۔
(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4104، جلد: 7، مطبوعہ نزار مصطفیٰ الباز الریاض، مکۃ المکرمۃ)

مذکورہ حدیث سے واضح ہوا کہ جب کوئی شخص اپنی حیات میں اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرے تو تمام اولاد کے درمیان مساوات کو روا رکھے، لیکن اگر کوئی خاص شرعی وجہ موجود ہو تو اپنی اولاد میں کسی کو زیادہ بھی دے سکتا ہے مثلاً زیادہ فرماں بردار ہے یا معذور ہے تو دیگر ورثاء کی رضامندی سے اسے زیادہ دے سکتا ہے۔ تاہم باپ کی زندگی میں اولاد کو اس سے یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی وراثت تقسیم کردیں، کیونکہ ابھی تو ماشاء اللہ وہ حیات ہیں، اور ان کا مال ترکہ تو ان کے انتقال پر بنے گا، اُس وقت جو شرعی ورثاء موجود ہوں گے، وہ حسبِ احکامِ شریعت اپنے اپنے حصے کے حق دار ہوں گے۔

ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) العائد فی ھبتہ کالعائد فی قیئہ۔ "ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کرکے دوبارہ اسے چاٹ لے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۶۲)"۔

(۲) مثل الذی رجع فی صدقتہ کمثل الکلب یقیٔ ثم یعود فی قیئہ فیاکلہ۔
"جو شخص صدقہ کرکے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۵۸)"۔

ایک یا دو اشخاص کا دیگر ورثاء کی موجودگی میں تمام جائیداد پر قابض ہوجانا

سوال:142

عرض یہ ہے کہ میرے والدین کا انتقال ہوچکا ہے والد کا فیڈرل بی ایریا میں ڈبل اسٹوری مکان ہے، جس میں اوپر نیچے دو بھائی رہتے ہیں، ہم کل آٹھ بہن بھائی (تین

بھائی اور پانچ بہنیں) ہیں، باقی بھائی بہنوں کی خواہش ہے کہ انہیں ان کا حصہ دے دیا جائے جب بڑے بھائی سے میں نے کہا کہ تم ماں باپ کے مرنے کے بعد اس مکان میں ناجائز رہ رہے ہو اس میں سب کا حق ہے تو اس نے کہا کہ فتویٰ لے آؤ، آپ قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ دے دیں، (ارشد، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں، تو ترکے میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترتیب کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" (ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11) کے تحت تقسیم ہوگا۔ یہ درست ہے کہ ترکہ تمام ورثاء کے درمیان اصولِ وراثت کے قوانین کے مطابق جلد تقسیم ہو جانا چاہئے تھا اور اس ترکے میں تمام ورثاء کا حصہ ہے، کسی بھی وارث کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔ متوفی کے ترکے کے گیارہ حصے ہوں گے، ہر بھائی کو دو حصے اور ہر بہن کو ایک حصہ ملے گا۔ جب تمام ورثاء اپنے حصے کے طلبگار ہوں، تو کسی ایک یا دو ورثاء کا زبردستی دوسروں کے حصے پر غاصب وقابض بن کر رہنا درست نہیں ہے۔

لا وصیۃ لوارث

سوال:143

ایک سروے زمین جس کے سروے نمبر: 522,99,96,94 ہیں، جو تقریباً 122 ایکڑ رقبے پر واقع دیہہ ملھ تپودرسانو چھنو مراد میمن گوٹھ ضلع ملیر کراچی میں واقع ہیں۔ جس کا اصل مالک مرحوم حاجی روزو ولدیت حاجی انگارو مرحوم ہیں، حاجی روزو کے انتقال کے بعد تین بیٹے بنام، عبد، الیاس، یوسف اور چار بیٹیاں (بشمول حاجیانی مریم) ہیں۔ گورنمنٹ سندھ (ریونیو ڈپارٹمنٹ) کے مطابق پوری زمین صرف تین بیٹوں کے نام کر

دی گئی ہے اور بیٹیوں کو اپنے حق سے محروم رکھا گیا ہے اور ریکارڈ میں یہ لکھا گیا ہے کہ حاجی روزو نے اپنی زندگی میں پوری زمین صرف اپنے بیٹوں کے نام کردی ہے۔ اس کا ریکارڈ میں نہ کوئی گواہ ہے نہ ہی شہادت۔ ہمیں اس بات کا خدشہ ہے کہ ریکارڈ میں غلط اندراج کیا گیا ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے حاجیانی مریم جو حاجی روزو مرحوم کی حقیقی وارث ہے اس کا مندرجہ بالا سروے نمبر میں اس صورتِ حال میں حق بنتا ہے کہ نہیں؟، (عبداللہ میمن، 814, بلاک 16 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 10 حصوں میں منقسم ہوگا۔ تین بیٹوں کو 6 حصے (ہر ایک کو 2 حصے) چار بیٹیوں کو 4 حصے (ہر ایک کو ایک حصہ) ملیں گے، گورنمنٹ سندھ (ریونیو ڈپارٹمنٹ) کے مطابق کاغذات میں جن بیٹوں کو نامزد (Nominate) کیا ہے، محض نامزد کرنے سے وہ اس کے مالک نہیں اور اگر مرحوم نے اپنی زندگی میں بیٹوں کے نام کیا ہو تو شرعاً جائز نہیں اور اگر وصیت بھی کی ہو تو وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"سمعت أبا أمامة،سمعت رسول الله ﷺ يقول: انّ الله قد أعطى كل ذى حقّ حقّه فلا وصية لوارث"۔

ترجمہ: "ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمارہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ، مؤسسۃ الریان بیروت)"۔

اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کا کسی ایک وارث کو دینا تاکہ دوسرے ورثاء محروم ہوجائیں ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلا وجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ حدیث مبارک میں فرمایا: عن أنس بن مالک؛ قال: قال رسول الله ﷺ: "من فر من میراث وارثه، قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة"۔ ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہِ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کی میراث جنت سے قطع کردے گا، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2703 مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔

بہرحال صورتِ مسئولہ میں مرحوم روزو خان کا ترکہ اس کے تمام ورثاء میں اصولِ وراثت کے قوانین کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

تقسیمِ ترکہ میں مقدم کون؟

سوال: 144

چوہدری سردار خان کا انتقال 1939ء میں ہوا، ان کی اولاد اور پسماندگان میں متعدد ورثاء تھے، جن کو ایک نقشے کی صورت میں ہم نے ان سب کی تواریخ وفات کے ساتھ مرتب کرکے اس استفتاء کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ ان کے پوتے وحید اسلم کا 1986ء میں انتقال ہوا، متوفی وحید اسلم کے ورثاء میں ان کے تین حقیقی چچا، دو حقیقی پھوپھیاں اور چار سوتیلے چچا اور دو سوتیلی پھوپھیاں ہیں۔ لیکن وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات سے پہلے ان کے تینوں حقیقی چچا اور ایک حقیقی پھوپھی وفات پاچکی تھیں، ان کی وفات کے وقت ان کی چار سوتیلے (علاتی) چچا اور ایک حقیقی اور دو سوتیلی پھوپھیاں حیات تھیں۔ اسکے علاوہ حقیقی چچاؤں کی اولاد (یعنی چچازاد) کی اولاد بھی موجود تھی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کے والد کے نکاح میں دو بیویاں تھیں، وحید اسلم کی حقیقی والدہ ان سے پہلے 1948ء میں وفات پاچکی تھیں جبکہ ان کی سوتیلی والدہ رحیم جان نے وحید اسلم کے بعد 1989ء میں وفات پائی۔ ہم نے چوہدری سردار خان کے ورثاء کا مفصل نقشہ بھی منسلک کر دیا ہے، کتاب وسنت اور فقہ حنفی کی روشنی میں بتائیں کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کی وراثت

کے حقدار کون کون ہیں، اور کون سے ورثاء محروم رہیں گے؟۔ (محمد امجد ریٹائرڈ سیشن جج، ماڈل ٹاؤن، بہاول پور)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے، اور متوفی وحید اسلم کے ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں، اور وہ لاولد ہے، تو از روئے شرع سب سے پہلے اس کے ترکے سے اسکی تکفین وتدفین کے مصارف وضع کئے جائیں گے، اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا کوئی قرضہ تھا، تو وہ ادا کیا جائے گا، اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہوگی تو بقیہ ترکے کی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی حد تک وہ نافذ العمل ہوگی۔ بعد ازاں جو ترکہ بچے گا، شریعت کے قانون وراثت کے مطابق اس کے شرعی وارثوں میں تقسیم ہوگا، اس کا ترکہ چار حصوں پر منقسم ہوگا اور اس کے سوتیلے چچاؤں میں سے ہر ایک کو ایک ایک حصہ ملے گا (یعنی فی کس 1/4 حصہ)۔

ہمیں استفتاء میں چوہدری سردار خان کے ورثاء کا مفصل نقشہ فراہم کیا گیا ہے، لیکن اس میں جو جواب مطلوب ہے، وہ چوہدری سردار خان مرحوم کے پوتے وحید اسلم ولد محمد اسلم خان متوفی 1986ء کے ترکے سے متعلق ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کے حصہ میں جو موروثی مال آیا ہے وہ اس کے والد محمد اسلم خان ولد چوہدری محمد سردار خان متوفی 1984ء کا ترکہ ہے، ممکن ہے اس کا اپنا کوئی کمایا ہوا مال بھی ہو، تو وہ بھی اس کے مجموعی ترکے میں شامل ہوگا، البتہ محمد اسلم خان ولد چوہدری سردار خان کا جو ترکہ وحید اسلم کو منتقل ہوگا، اس میں سے ایک 1/8 حصہ محمد اسلم خان کی بیوہ رحیم جان متوفی 1989ء (جو کہ وحید اسلم کی سوتیلی والدہ ہیں) کو ملے گا، جو محمد اسلم کی وفات کے وقت حیات تھیں، چونکہ بعد میں یہ 1989ء میں وفات پاگئیں، اس لئے ان کا ترکہ ان کے اُن شرعی ورثاء کو منتقل ہوگا، جو اِن کی وفات کے وقت موجود تھے۔ وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت ان کے حقیقی چچا وفات پاچکے تھے، البتہ انکے چار سوتیلے چچا زندہ تھے، اور ان کی ایک حقیقی پھوپھی اور دو سوتیلی پھوپھیاں زندہ تھیں۔ حقیقی چچا اس لئے محروم ہوگئے کہ جو وارث، مورث (جس کی

وراثت تقسیم ہو رہی ہے) کی وفات سے پہلے فوت ہو گیا ہو، وہ اسکا وارث نہیں بنتا، حق وراثت ان لوگوں کیلئے ہوتا ہے جو مورِث (وفات یافتہ شخص) کی وفات کے وقت زندہ ہوں، وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت اس کی حقیقی پھوپھی جنت بی بی متوفی 1991ء، سوتیلی پھوپھی متوفی 2003ء اور شفیقہ بیگم (بدستور حیات) زندہ تھیں، لیکن یہ سب وراثت سے محروم رہیں گی، کیونکہ یہ پھوپھیاں ذوی الارحام بنتی ہیں اور چار سوتیلے چچا عصبات، اور اسلام کے قانون وراثت کا شرعی اصول یہ ہے کہ عصبات ورثاء کی موجودگی میں ذوی الارحام ورثاء ترکے سے محروم رہیں گے، اسی طرح وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات سے پہلے ان کے وفات یافتہ حقیقی چچاؤں کی اولاد بھی جو کہ وحید اسلم متوفی 1986ء کی وفات کے وقت بقید حیات تھے، ان کے ترکے سے محروم رہیں گے، کیونکہ اسلامی قانون وراثت کا مسلمہ اصول ہے کہ قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے، اور یہاں سوتیلے چچا ایک قرابت کے حامل ہونے کے باوجود حقیقی چچاؤں کی اولاد (یعنی ابنائے اعمام) کے ذو قرابتین ہونے کے باوجود ان کے قریب سے ہیں لہٰذا سارا ترکہ سوتیلے چچاؤں کو ملے گا اور حقیقی چچا زاد محروم رہیں گے۔ یہاں تک ہم نے مسئلے کا خلاصہ آسان الفاظ میں لکھ دیا ہے، اب سطور ذیل میں فنی بنیاد پر دلائل کے

ساتھ جواب ملاحظہ فرمایئے:

''بر تقدیر صدق بیانِ سائل صورۃ مستفسرہ میں مرحوم وحید اسلم کی وراثت چاروں سوتیلے چچاؤں کو ملے گی۔ اور بعد ادائے حقوق مترتبہ متقدمہ، تکفین وتجہیز اور ادائے قرض اور مال کے تیسرے حصہ سے تنفیذ وصیت، کل جائیداد کے چار حصے کئے جائیں گے اور ہر ایک سوتیلے چچا کو ایک ایک حصہ آئے گا۔ حقیقی چچاؤں کی اولاد حقیقی پھوپھی اور سوتیلی پھوپھیاں جو کہ مرحوم کے وفات کے وقت زندہ تھیں حقیقی چچاؤں کی مذکر اولاد تو اس لئے محروم ہوگی کہ عصبات اقرب اگرچہ اضعف ہو، ابعد کو محروم کر دیتا ہے اور یہاں اگرچہ سوتیلے چچا ذوات قرابتین نہیں اور حقیقی چچاؤں کی مذکر اولاد ذوات قرابتین ہیں لیکن سوتیلے چچے میت سے

اقرب ہونے کی وجہ سے حقیقی چچاؤں کی مذکر اولا کو محروم کردیں گے اور مرحوم کی حقیقی اور سوتیلی پھوپھیاں اور حقیقی چچاؤں کی مؤنث اولاد ذوی الارحام میں سے ہیں اور عصبات کے ہوتے ہوئے ذوی الارحام محرم ہوتے ہیں۔

درمختار میں ہے:

ثم جزء جده العم لا بوین ثم لا ب ثم ابنه لا بوین ثم لا ب۔

ترجمہ: میت کے دادا کی جز یعنی چچا حقیقی پھر سوتیلا چچا پھر حقیقی چچا کا بیٹا پھر سوتیلے چچا کا بیٹا (ص:547 مکتبہ ماجدیہ)

معلوم ہوا اگر حقیقی چچا ورثاء میں موجود نہ ہو تو سوتیلا چچا وارث ہوتا ہے اور حقیقی چچا کا بیٹا اس وقت وارث ہوگا جب سوتیلا چچا ورثاء میں موجود نہ ہوں یہ عبارت بعینہٖ صورت مسئولہ کا جواب ہے۔

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق کے متن میں ہے:

ثم الاعمام ثم اعمام الاب ثم اعمام الجد علی الترتیب۔

ترجمہ: پھر متوفی کے چچا پھر متوفی کے باپ کے چچا پھر دادا کے چچا ترتیب پر۔

شارح علیہ الرحمہ نے فرمایا:(قوله علی الترتیب)ای علی الترتیب الذی ذکرنا فی الاخوة وهو ان یقدم العم لاب وام علی العم لاب ثم العم لاب علی ولد العم لاب وام کذا یعمل فی اعمام الاب یقدم منهم ذو قرابتین عند الاستواء فی الدرجة وعندا لتفاوة فی الدرجة یقدم الاعلیٰ۔

ترجمہ:" (ماتن کا قول علی الترتیب)یعنی چچاؤں میں ترجیحات اسی ترتیب پر ہونگی ،جس ترتیب کو ہم نے بھائیوں میں ذکر کیا ،وہ یہ کہ حقیقی چچا سوتیلے چچا، سے مقدم ہوگا، پھر سوتیلا چچا حقیقی چچا کی اولاد سے مقدم ہوگا ،اسی طرح باپ کے چچاؤں میں ان میں سے دو قرابت والوں کو مقدم رکھا جائے گا جبکہ درجے میں مساوی ہوں اور درجے میں تفاوت کی صورت میں اقرب (Nearest) کو مقدم کیا جائے گا،(تبیین الحقائق جلد 6 ص:632،

بحرالرائق شرح کنزالدقائق جلد4ص:498 مکتبہ سعید ایچ،ایم کمپنی)"۔

نیز" البحرالرائق شرح کنزالدقائق میں ہے:واذااستویٰ ابنا ن فی درجۃ من االعصبات وفی احدھما قرا بۃ زا ئد ۃ فھی اولیٰ ،الا ان یکو ن الا خ اقرب الی المیت ،مثال القر ابۃ الزائدۃ اخ لا ب وام واخ لا ب،فالا خ من الا ب والام اولیٰ،ومثا ل السبق اخ لا ب وابن اخ لا ب وام، فالاخ اولیٰ لا نہ اسبق الی المیت۔

ترجمہ:" اگر عصبات میں دو بیٹے درجے میں مساوی ہوں،اوران میں سے ایک میں زائد قرابت ہو،تو زائد قرابت والا اولیٰ ہوگا،مگر یہ کہ بھائی میت کے زیادہ قریب ہو،قرابت زائدہ کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک حقیقی بھائی ہے اور ایک علاتی (باپ شریک) بھائی ہے،تو حقیقی بھائی،علاتی بھائی سے زیادہ قریب ہے،اور سبقت کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک علاتی بھائی ہے اور ایک حقیقی بھتیجا ہے،" تو علاتی بھائی حقیقی بھتیجے کی بہ نسبت میت سے زیادہ سبقت رکھتا ہے"،(ص:98جلد4)۔

درمختار کی عبارت:"ثم لا ب ثم ابنہ لا بو ین"اور" تبیین الحقائق"اور" البحرالرائق": "ثم العم لا ب علی ولد العم لا ب وام"۔

صورت مسئولہ کے جواب میں نص ہے،لہٰذا مرحوم وحید اسلم کی جائیداد چاروں سوتیلے چچاؤں میں برابر برابر تقسیم ہوگی اور باقی افراد محروم ہوں گے،واللہ اعلم بالصواب۔

تقسیم ترکہ اور برٹش لاء

سوال:145

برائے مہربانی قرآن اور حدیث کی روشنی میں فتویٰ عنایت فرمائیں۔ایک شخص چوہدری سردار خان،جس کا انتقال 1939ء میں ہوا۔اس کے سات بیٹے،چار بیٹیاں اور دو بیوہ تھیں۔جائیداد کا انتقال ان کی وفات کے بعد بیٹوں کے نام ہوگیا،اور اس جائیداد کو پچھلے ماہ 2006ء میں فروخت کیا گیا۔بیٹے کہتے ہیں کہ چونکہ اس وقت برٹش لاء تھا اور بیٹیوں اور بیوگان کو جائیداد میں حصہ نہیں ملتا تھا،اس لئے ان کا اس رقم میں کوئی حصہ نہیں

بنتا۔ جبکہ ہماری گذارش ہے کہ قرآن اور حدیث کا قانون جو سورۂ نساء میں ہے، اس کے مطابق فیصلہ ہونا چاہئے، برائے مہربانی آپ اس کے بارے میں فتویٰ عنایت فرمائیں اور جو اس پر عمل نہیں کرے گا آخرت میں اس کی کیا سزا ہوگی؟۔ (ندیم الحق، اسٹاف آفیسر ٹو چیئرمین PIA، اسلام آباد)۔

جواب:

از روئے شرع کسی بھی متوفّٰی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین امور کا خیال رکھنا ضروری ہے: (1) اس سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کئے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارثِ شرعی کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیم وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔
برٹش لاء سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا مقررہ قانون وراثت منسوخ نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ کا قانون سب پر غالب ہے اور مسلمانوں کو احکام الٰہی پر عمل کرنا چاہئے نہ کہ برٹش لاء پر، اگرچہ برطانوی دور میں ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء نافذ تھا، اور اسلام کا قانون وراثت قانوناً نافذ العمل تھا، لہٰذا یہ مؤقف سراسر باطل ہے۔
صورت مسئولہ میں متوفّٰی چوہدری سردار خان کا ترکہ کل 144 حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے دو بیوگان کو 18 حصے (یعنی فی کس 9/144 حصے)، سات بیٹوں کو 98 حصے (یعنی فی کس 14/144 حصے)، چار بیٹیوں کو 28 حصے (یعنی فی کس 7/144 حصے) ملیں گے۔ اگر کوئی کسی شخص کا حق غصب کرے گا، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کی وعید ہے:

"من اقتطع شبراً من الارض ظلماً، طوّقه الله ايّاه يوم القيامة من سبع ارضين"۔
ترجمہ: ''جو شخص کسی شخص کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا، تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:

4055)''۔اس کے بعد ان میں سے جو افراد وفات پا چکے ہیں، تو ان کا حصۂ وراثت ان کے وارثوں کو منتقل ہو جائے گا، تا آنکہ ان کے موجودہ حیات وارثوں تک پہنچے گا، تقسیم وراثت کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کسی مورث (ترکہ چھوڑ کر وفات پانے والا شخص) کے انتقال کے فوراً بعد اس کی وراثت تقسیم نہ کی گئی ہو اور پھر اس پر کافی عرصہ گزر چکا ہو، یہاں تک کہ اس دوران کچھ ورثاء وفات پا چکے ہوں تو انہیں زندہ فرض کر کے ان کا حصۂ وراثت ان کے نام پر منتقل ہوگا، اور پھر وہی حصہ مرحلہ بہ مرحلہ ان کے موجودہ حیات وارثوں تک پہنچ جائے گا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

لاولد چچا کے ترکے میں بھتیجے اور بھتیجیوں کا حقِ وراثت

سوال:146

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ش کی کوئی اولاد نہیں تھی، زوجہ کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور نہ ہی کوئی بھائی یا بہن ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے دو بھتیجوں کو کاروبار میں 50% کا حصہ دار قرار دیا۔ ش کا انتقال ہو چکا ہے اور دونوں بھتیجے دوسرے حصہ دار سے معاملات طے کر کے کاربار کو ختم کر رہے ہیں۔ اور دونوں بھائی ان کی جائیداد میں سے حصہ لے رہے ہیں جبکہ ان بھتیجوں کی 4 بہنیں بھی ہیں۔ ان بھتیجوں اور بھتیجیوں کی شادی بھی چچا نے کی ہے۔ کیا چچا کی اس وراثت میں بھتیجیاں حصہ لینے کی حقدار ہیں یا نہیں؟۔ براہِ کرم تفصیل سے قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمائیں، (کوثر پروین، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفّٰی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین امور کا خیال رکھنا ضروری ہے:(1) اس سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کیے جاتے ہیں (2) اس کے بعد اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو تو اس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے (3) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس

سے نافذ کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔

ایسا مُورِث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والا شخص) جو لاولد ہو، اس کے ماں باپ بھی اس سے پہلے وفات پاچکے ہوں، بیوی نہ ہو یا وفات پاچکی ہو، اسے قرآن کی اصطلاح میں ''کلالہ'' کہتے ہیں۔ اس کی وراثت کے احکام ''سورۃ النساء'' میں بیان کئے گئے ہیں۔

صورتِ مسئولہ میں اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو چونکہ متوفی کے ورثاء میں اس کے دو بھتیجے اور چار بھتیجیاں ہیں اور ذوی الفروض میں کوئی قرابت دار موجود نہیں، لہٰذا دونوں بھتیجے عصبہ بنیں گے اور کل ترکہ انہیں ملے گا، بھتیجیاں محروم رہیں گی۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: الحقوا الفرائض بأھلھا فما بقی فھو لاولیٰ رجل ذکر۔

ترجمہ: ''ذوی الفروض (یعنی وہ ورثاء جن کے حصے قرآن میں مقرر ہیں) کو ان کے مقررہ حصے دے دو، سو جو کچھ ان سے بچ رہے تو وہ قریب ترین مرد وارث کے لئے ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6735)''۔

علامہ ابن عابدین شامی بحوالہ ''سراجی'' لکھتے ہیں:

لا فرض لھا من الاناث واخوھا عصبۃ لا تصیر عصبۃ بأخیھا کالعم والعمۃ المال کلہ للعم دون العمۃ۔

ترجمہ: ''وہ عورتیں جن کا کوئی فرض حصہ مقرر نہیں اور ان کا بھائی عصبہ ہے تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ عصبہ نہیں بنیں گی، جیسا چچا اور پھوپھی کہ کل ترکہ چچا کو ملے گا نہ کہ پھوپھی کو، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:10، ص:429، دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اس کی شرح میں مفتی یار محمد قادری لکھتے ہیں: کذالک ابن العم یرث دون بنت العم وابن الاخ یرث دون بنت الاخ۔

ترجمہ: ''اوراسی طرح چچا کا بیٹا وارث بنے گا نہ کہ چچا کی بیٹی اوراسی طرح بھتیجا عصبہ بنے گا نہ کہ بھتیجی ، (مشکوٰۃ الحواشی فی شرح السراجی ،ص:60)''۔

لاولد پھوپھی کے ترکے میں مقدم سگے یا سوتیلے بھتیجے

سوال:147

ایک شخص فضل دین کا انتقال ہوا اوراس کی دو بیویاں تھیں ان دونوں کا انتقال فضل دین سے پہلے ہو چکا تھا۔ایک بیوی سے دو بیٹے اورایک بیٹی دوسری بیوی سے ایک بیٹا اورایک بیٹی ہیں۔دوسری بیوی سے جوایک بیٹی سید خانم ہیں ان کے شوہر کا انتقال پہلے ہو چکا تھا وہ لاولد تھیں۔میں سید خانم کا سگا بھتیجا ہوں ،اوراپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں، میری پھوپھی سید خانم کے سگے بھائی اوردوسوتیلے بھائیوں اورسوتیلی بہن کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا۔سید خانم کے سوتیلے بہن بھائیوں کی اولاد حیات ہے۔اب سوال یہ ہے کہ سید خانم کا ترکہ صرف مجھے (حقیقی بھتیجے) کو ملے گا یاان کے سوتیلے بھتیجوں اور بھتیجیوں کو بھی ملے گا،(محمد یوسف ،کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی متوفّٰی شخص کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل تین حقوق متعلق ہوتے ہیں(1)اس سے اس کے مصارف تکفین وتدفین وضع کیے جاتے ہیں(2)اس کے بعداس کے ذمہ اگرکسی کا قرض ہو،تواس میں سے اس کی ادائیگی کی جاتی ہے(3)اس کے بعد اگراس نے کوئی وصیت کی ہوتو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حدتک اس سے نافذ کیا جاتا ہے،بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارثِ شرعی کے حق میں نہ ہو،یہ تین امور تقسیم وراثت سے مقدم ہوتے ہیں،ان کومنہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔فضل دین کا ترکہ 8 حصوں میں منقسم ہوگا،اس میں سے ان کے تین بیٹوں کو 6 حصے (فی کس 2 حصے) اور 2 بیٹیوں کو 2 حصے (فی کس ایک حصہ) ملے گا،لہٰذا آپ کی پھوپھی سید خانم کا اپنے والد کے ترکے میں سے 1/8 حصہ بنے گا۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کی پھوپھی لاولد تھیں آپ کے بیان کے مطابق ان کے شوہر کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا اور آپ اپنی پھوپھی کے صرف ایک ہی حقیقی بھتیجے ہیں اور باقی ان کے سوتیلے (یعنی علاتی) بھتیجے بھانجیاں ہیں، لہٰذا آپ ان کے عصبہ وارث بنیں گے اور مرحومہ سید خانم کا پورا ترکہ آپ کو ملے گا، سراجی میں ہے: وابن الاخ لاب وام اولیٰ من ابن الاخ لاب۔ ترجمہ: ''یعنی حقیقی بھتیجا، علاتی (صرف باپ شریک) بھتیجے سے ترکہ پانے میں مقدم ہے''۔

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت

سوال:148

ایک شخص نے ایک کتابیہ (عیسائی) عورت سے شادی کی، اس سے اس کی اولاد ہوئی۔ پھر اس (شوہر) کا انتقال ہو گیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(1) کیا وہ عیسائی عورت اپنے شوہر کی وارث بنے گی؟۔

(2) اور اس کی اولاد نے اگر عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے، تو کیا وہ وارث بن پائیں گے؟۔

(3) اگر بچے نابالغ ہیں، تو کیا وہ وارث بنیں گے؟، (ایم عتیق الرحمٰن سیال)۔

جواب:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: عن اسامة بن زيد ان النبی ﷺ قال: لايرث المسلم الكافر ولا يرث الكافر المسلم:

ترجمہ: ''حضرت اسامہ بن زید بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے، نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے، (صحیح مسلم رقم الحدیث: **4028**، ابی داؤد رقم الحدیث: 2901)''۔

اس حدیث کے تحت علامہ نووی لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور جمہور صحابہ اور فقہاء، تابعین اور بعد کے علماء کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا، (شرح مسلم للنووی،

جلد2 ص:34،نور محمد اصح المطابع)''۔
میراث سے محروم کرنے والے چار اسباب ہیں، ایک سبب دین کا اختلاف ہے، یعنی میت اور وارث کا دین ایک دوسرے سے مختلف ہو۔
عن عمروبن شعیب ، عن ابیه ، عن جده عبدالله بن عمرو قال: قال رسول الله ﷺ: لایتوارث اهل ملتین شتیٰ۔
ترجمہ:''حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور دادا عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو مختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے،(سنن ابی داؤد رقم الحدیث:2903)''۔
علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:
واختلاف الدین ایضا یمنع الارث والمرادبه الاختلاف بین الاسلام والکفروا ما اختلاف ملل الکفار کالنصرانیة والیهودیة والمجوسیة وعبدة الوثن فلا یمنع الارث حتی یجری التوارث بین الیهودی والنصرانی والمجوسی واختلاف الدارین یمنع الارث کذا فی التبیین۔ولکن هذا الحکم فی حق اهل الکفرلافی حق المسلمین ۔
ترجمہ:''اور دین کا اختلاف بھی مانع ارث ہے، اور اس سے مراد اسلام اور کفر کے درمیان اختلاف ہے اور جب اختلاف کفار قوموں کے درمیان ہو، جیسا کہ نصرانی اور یہودی اور مجوسی اور بت پرست ، تو پھر وہ وراثت سے مانع نہیں ہوگا (یعنی یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں)۔ یہاں تک کہ یہودی اور نصرانی اور مجوسی کے درمیان وراثت جاری ہوگی اور دار کا مختلف ہونا (یعنی دارالاسلام و دارالحرب) مانع وراثت ہے، جیسا کہ تبیین میں بیان کیا گیا ہے اور یہ حکم اہل کفر کے حق میں ہے نہ کہ مسلمان کے حق میں،(عالمگیری جلد6 ص:454 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔
علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(واختلاف الدین) واسلاماً و کفراً۔

ترجمہ: ''(اور دین کا مختلف ہونا) مانعِ وراثت ہے یعنی کہ اسلام اور کفر کا اختلاف''۔

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قید به لأنّ الکفار یتوارثون فیما بینهم وان اختلف مللهم عندنا،لأنّ الکفر کله ملة واحدة۔

ترجمہ: ''یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ہمارے نزدیک کفار ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں اگرچہ ان کا تعلق مختلف ملتوں سے ہو، اس لئے کہ تمام کفر ملّتِ واحدہ ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 10 ص:418، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

اس مسلّمہ شرعی اصول کے تحت کتابیہ عورت (خواہ نصرانی ہو یا یہودی) اپنے متوفّی مسلمان شوہر کی وارث نہیں بن سکتی۔ مسلمان شوہر اور کتابیہ عورت کی اولاد اگر نابالغ ہے تو وہ دین میں ''خیرالابوین'' کے تابع ہے، یعنی انہیں مسلمان تصور کرتے ہوئے ان کے مسلمان باپ کی وراثت میں حصہ دیا جائے اور اگر وہ بالغ ہیں تو مسلمان ہونے کی صورت اپنے باپ کے وارث بنیں گے، لیکن اگر خدانخواستہ بالغ ہونے کے بعد وہ نصرانی یا یہودی بن گئے ہیں، تو مسلمان باپ کی وراثت سے محروم رہیں گے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والولدیتبع خیر الأبوین دیناً)ان اتّحدت الدار ولو حکماً، بان کان الصغیر فی دارنا والأب ثمة،

ترجمہ: ''اور اولاد دین میں خیرالابوین (یعنی ماں باپ میں سے جس کا دین بہتر ہو، جیسے ایک یہودی یا نصرانی ہے اور دوسرا مسلم، تو نابالغ اولاد مسلم متصور ہوگی، اگر ایک نصرانی ہے اور دوسرا مجوسی یا مشرک، تو نابالغ اولاد نصرانی متصور ہوگی) کے تابع ہوتی ہے، اگر دار ایک ہی ہو، خواہ حکماً ہی سہی، جیسے نابالغ اولاد دارالاسلام میں ہے اور باپ بھی وہیں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:4 ص:276 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

تقسیمِ وراثت سے متعلق چند اہم اصولی امور کی وضاحت

ہمیں روزنامہ ایکسپریس کی معرفت ترکے اور وراثت کے متعدد سوالات موصول ہوئے ہیں۔سوالات کا براہِ راست جواب دینے سے پہلے ہم چند امور کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں، جن کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، اور ہر ترکے کی تقسیم سے پہلے ان کا نفاذ ضروری ہے، ہم نے یہ وضاحت اس لئے مناسب سمجھی تاکہ وراثت کے ہر سوال کے جواب میں ان کا بار بار تکرار نہ ہو، وہ امور یہ ہیں: (1) کوئی شخص زندگی میں اپنا مال اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہے تو یہ تقسیم وراثت یا تقسیم ترکہ نہیں کہلائے گی بلکہ ہبہ (Gift) کہلائے گا، یہ ایک رضاکارانہ عمل ہے، اس لئے اس شخص کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ کتنا مال تقسیم کرے اور کتنا اپنے لئے پس انداز کرے۔(2) بیوی شوہر کو یا شوہر بیوی کو جتنا مال ہبہ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔(3) اولاد کو ہبہ کرنا ہو تو مستحسن اور مستحب امر یہ ہے کہ بیٹے بیٹیوں کو مساوی حصہ دیا جائے، امتیاز نہ برتا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اسے ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ (4)(الف) اگر اولاد میں سے کسی کو اس کی غیر معمولی خدمات کا لحاظ کر کے یا اس کی کسی ذہنی یا جسمانی پسماندگی کی بنا پر یا نسبتاً زیادہ ضرورت مند ہونے کے سبب یا دینی فضیلت کی بنا پر نسبتاً زیادہ دینے کا ارادہ ہو، تو دوسروں کو اعتماد میں لے لیا جائے، تو بہتر ہے۔ (ب) اگر اولاد میں سے کوئی آوارہ و بدکردار ہے، حرام کاری اور عیاشیوں میں مبتلا ہے، تو اسے ہبہ کے وقت محروم رکھا جا سکتا ہے یا اس کے حصے میں کمی کی جا سکتی ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا کہ: ایک شخص کی اولاد ایک لڑکے اور تین لڑکیوں پر مشتمل ہے، لڑکا بدچلن اور بدوضع ہے، اپنی بہنوں اور باپ کو نہایت اذیت اور تکلیف دیتا ہے، زید اسے عاق کرنا چاہتا ہے کہ وہ ترکے میں سے حصہ نہ پائے۔ آپ نے جواب دیا: ''عاق کرنا شرع میں کوئی چیز نہیں، نہ وہ اس کے سبب ترکے سے محروم ہو سکتے ہیں، ہاں اگر واقعی فاسق وآوارہ ہے تو یہ جائز ہے کہ اپنا سب مال بذریعہ وقف علی الاولاد یا بذریعہ بیع نامہ جدا جدا تقسیم کر کے قبضہ دے کر بذریعہ ہبہ نامہ اپنی بیٹیوں کے نام کر دے، یوں بیٹے کو آپ

ہی کچھ نہ پہنچے گا،(فتاویٰ رضویہ، جلد:26،ص:364،مطبوعہ: رضافاؤنڈیشن،لاہور)''۔
(5)اولاد کو ماں باپ کی زندگی میں تقسیم وراثت کے مطالبے کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ ''ترکہ''یا'' وراثت'' اسے کہتے ہیں، جو مال کوئی شخص اپنی موت کے بعد پیچھے چھوڑ جائے۔
(6)میت کے ترکے میں سب سے پہلے تین قسم کے مصارف ترجیح ذیل کے مطابق وضع کئے جانے لازمی ہیں:(الف) میت کی تکفین وتدفین کے مصارف، اگر کوئی ایک وارث رضا کارانہ طور پر اپنی طرف سے کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔(ب)اس کے بعد اگر میت کے ذمہ کسی کا کوئی قرضہ ہے، تو وہ ادا کیا جائے گا۔(ج)اگر وفات یافتہ شخص نے بیوی کا حق مہر اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا، نہ ہی بیوی نے اپنا مہر معاف کیا ہے، تو ترکہ میں سے بیوی کا دین مہر قرض کے طور پر ہی وضع کیا جائے گا۔(د) قرض کی منہائی کے بعد، اگر میت نے کوئی وصیت (امور خیر، صدقۂ جاریہ وغیرہ سے متعلق) کی ہے، تو اسے ترکے میں سے پورا کیا جائے گا، لیکن وصیت کی تنفیذ زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک ہوگی، اس سے زائد باطل(Invalid) قرار پائے گی۔البتہ اگر کوئی ایک یا بعض یا سب ورثاء بالغ ہیں اور وہ رضا کارانہ اپنے متوفیٰ باپ/ماں یا عزیز کی پوری وصیت نافذ کرنا چاہتے ہیں، جو تہائی ترکے سے زائد ہے، تو وہ ایسا کرسکتے ہیں اور اس پر یقیناً انہیں بھی اجر ملے گا۔(7) جہاں تک میت کے لئے ایصالِ ثواب کے مصارف کا تعلق ہے، تو اگر اس نے اپنی وفات سے پہلے ایسی کوئی وصیت کی ہے، تو وہ زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک نافذ العمل ہوگی۔
(8)اگر وصیت نہیں کی تو بالغ ورثاء اپنی طرف سے یا ترکے میں سے اپنے حصے سے کرنا چاہیں تو رضا کارانہ طور پر کرسکتے ہیں، انہیں بھی اس کا اجر ملے گا، کوئی وارث اس پر رضا مند نہ ہو تو اس کے حصے میں سے ایصالِ ثواب کے مصارف وضع نہیں کئے جاسکیں گے۔
(9)نابالغ ورثاء کے حصے میں سے ایصالِ ثواب کے مصارف وضع نہیں کئے جاسکیں گے۔

شوہر اور بیوی کی مشترکہ کمائی سے بنائی ہوئی جائیداد اور تقسیمِ ترکہ

سوال:149

ایک پلاٹ جو بیوی اور شوہر نے مشترکہ طور پر خریدا یعنی بیوی بھی فیکٹری میں کام کرتی تھی اور شوہر بھی۔ دونوں کی کمائی سے پلاٹ خریدا گیا اور شوہر نے وہ پلاٹ اپنی بیوی کے نام سے خریدا۔ بیوی کے انتقال کے بعد پلاٹ کا مالک کون ہوگا؟، جبکہ ورثاء میں اس کا شوہر اور ایک آٹھ سالہ بیٹا بھی ہے کیا بیوی کے والدین اور بھائی حصے دار یا دعوے دار بن سکتے ہیں،، جھگڑا کر کے پلاٹ پر زبردستی قبضہ کر سکتے ہیں؟۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو وفات یافتہ خاتون کا ترکہ 12 حصوں میں منقسم ہوگا، جس میں اس کے والد کو 2/12 حصے، والدہ کو 2/12 حصے، شوہر کو 3/12 حصے اور بقیہ 5/12 حصے بیٹے کو ملیں گے، اس کے بھائی محروم رہیں گے۔ پلاٹ کی خرید میں بیوی اور شوہر کے حصے کا تناسب وہی ہوگا، جو پلاٹ کی قیمت میں ان کے حصے کا تناسب تھا، اگر یہ پلاٹ شراکت کی نیت سے خریدا تھا۔ اور اگر شوہر نے اپنا حصہ بیوی کو ہبہ کر دیا تھا تو پھر پورے پلاٹ کی وہی مالکہ ہوگی اور اب وہ اس کے ترکے میں شامل ہوگا۔ بیوی کے والدین اس کے شرعی وارث ہیں، اس کے بیٹے کی موجودگی میں اس کے بھائی محروم رہیں گے، کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والے کے لئے بڑی وعید آئی ہے، حدیث پاک میں ہے:

”من اقتطع شبراً من الارض ظلماً ،طوّقه الله ايّاه يوم القيامة من سبع أرضين“۔

ترجمہ: ”جو شخص کسی شخص کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا، تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4055)“۔

بیوی کا واجب الادا قرضہ کس کے ذمے ہوگا؟

سوال:150

کسی شخص کی بیوی کے انتقال کے بعد اس کی بیوی پر واجب الادا قرض کی ادائی کون کرے گا۔ کیا شوہر اپنی جائیداد مکان وغیرہ فروخت کر کے بیوی کا قرضہ ادا کرے گا؟ ان سوالات کے تفصیلی جواب ایکسپریس میں عنایت فرمائیں، بڑی نوازش ہوگی، (محمد فاروق، ملت ٹاؤن، ملیر کراچی)۔

جواب:

متوفیہ کے ترکے سے اس کا قرض ادا کیا جائے گا، اگر شوہر نے اس کی زندگی میں اس کا مہر ادا نہیں کیا تھا، تو وہ شوہر کے ذمہ اس کا قرض ہے، وہ بھی اس کے ترکے میں شامل ہو جائے گا۔ اسے بھی اس کا قرض ادا کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، اگر متوفیہ کا ترکہ اس کے قرض کی ادائی کے لئے ناکافی ہو، تو اس کے شوہر اور دیگر ورثاء اگر تبرُّع واحسان کر کے اس کا قرض ادا کر دیں تو آخرت کے مواخذے سے اُسے نجات مل جائے گی اور ان لوگوں کو اس کا اجر بھی ملے گا، ورنہ قرض خواہوں سے درخواست کی جائے کہ رضاءِ الٰہی کے لئے اس کے ذمہ اپنا قرض معاف کر دیں یا کوئی اور صاحبِ خیر یہ قرض ادا کر دے، ورنہ حدیث پاک میں ہے:

عن ابی هريرة انّ رسول الله ﷺ قال اتدرون ماالمفلس قالوا المفلس فينا من لا درهم له ولامتاع فقال انّ المفلس من امتی يأتی يوم القيامة بصلوٰة وصيام وزكوٰة ويأتی قد شتم هذا وقذف هذا واكل مال هذا وسفک دم هذا وضرب هذا فيعطی هذا من حسناته وهذا من حسناته فان فنت حسناتهٗ قبل ان يقضی ماعليه اخذ من خطايا هم فطرحت عليه ثم طرح فی النار۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہ نے کہا: ہمارے نزدیک مفلس وہ شخص ہے جس کے

پاس درہم ہو نہ کوئی متاع ہو، آپ نے فرمایا: میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے گا اور اس شخص نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی تھی، کسی کو تہمت لگائی تھی، کسی کا مال کھایا تھا، کسی کا خون بہایا تھا، کسی کو مارا تھا، پھر اسے اس کی نیکیاں مل جائیں گی اور اس سے اس کی نیکیاں جائیں گی اور اگر ان کے حقوق پورے ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو ان کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے اور اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 6457)''۔

زندگی میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی

سوال:151

میرے سات بچے (چار بیٹے، تین بیٹیاں) ہیں، بڑے بیٹے اور تین بیٹیوں کی شادی کردی ہے۔ میرے پاس جائیداد کی صورت میں ایک مکان ہے شوہر بھی حیات ہیں۔ شرعی طور پر جائیداد کی تقسیم کس طرح ہوگی؟، (ثریا ناز، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

زندگی میں جائیداد کی تقسیم بطورِ ترکہ و میراث نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ دیا جاتا ہے وہ ہبہ کہلاتا ہے اور مستحسن و مستحب امر یہ ہے کہ بیٹے بیٹیوں کو مساوی حصہ دیا جائے، شوہر کو اپنی صوابدید پر جتنا چاہیں دی سکتی ہیں، اپنے لئے جو پس انداز کرنا چاہیں، یہ ان کا حق ہے، آپ کی وفات کے بعد یہ ترکہ شریعت کے مطابق تمام وارثوں میں تقسیم ہوگا۔

کیا سوتیلا بیٹا اکیلا وارث بن سکتا ہے

سوال:152

میرے والد صاحب نے پہلی شادی کی تو اس سے ہم تین بہنیں پیدا ہوئیں ہماری والدہ زندہ تھیں کہ والد صاحب نے دوسری شادی کرلی۔ دوسری بیوی کا ایک لڑکا تھا، جو اس کے پہلے خاوند سے تھا وہ بھی ہمارے والد صاحب نے ساتھ ہی لے لیا۔ بعد میں ہماری دوسری والدہ کے ہاں دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اس طرح ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔

ہمارے والد صاحب کے لئے تقسیم جائیداد کا طریقہ کیا ہے؟۔
اگر اولاد میں جائیداد کی تقسیم نہ کی جائے تو اس کے کیا احکام ہیں؟۔
کیا اولاد میں سے کسی کو جائیداد سے محروم کیا جاسکتا ہے؟۔
کیا کسی ایک شخص کو پندرہ سال پہلے ساری جائیداد کا وارث بنایا جاسکتا ہے؟ کہ وہ اکیلا استعمال کرتا رہے۔قرآن وحدیث کی روشنی میں مکمل وضاحت فرمائیں،(م۔ا، نارووال، پنجاب)''

جواب:

آپ نے سوال میں اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ آپ کے والد صاحب حیات ہیں یا وہ وفات پاچکے ہیں، اگر وہ بدستور حیات ہیں تو زندگی میں ان کا ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی واضح نہیں کہ آپ کی دوسری والدہ بدستور حیات ہیں یا نہیں؟۔کسی شخص پر لازم نہیں ہے کہ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اپنی اولاد پر تقسیم کرے، یہ اس کی اپنی صوابدید ہے، چاہے تو اولاد کو ہبہ کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ البتہ اولاد کے درمیان ھبہ میں رسول اللہ ﷺ نے مساوات کی ہدایت فرمائی ہے۔کسی شخص کی وفات کے بعد اس کا ترکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے، اس میں مرنے والے کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا، نہ ہی وہ کسی کو وراثت سے محروم کرسکتا ہے۔کسی شخص کی بیوی کا وہ بیٹا جو کسی سابق شوہر سے ہے، اس کا وارث نہیں بن سکتا، نہ منہ بولا بیٹا وارث بن سکتا ہے، البتہ وہ اپنی ماں کا وارث ہوگا۔سوال میں درج پانچ بیٹیوں کو والد کی وفات کی صورت میں ترکے کا 2/3 حصہ ملے گا، جس میں ہر ایک کا حصہ برابر برابر ہوگا، باقی دیگر ورثاء کا ہوگا۔اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک وارث کو دینا تاکہ دوسرے ورثا محروم ہوجائیں، ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلاوجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔حدیث مبارک میں ہے:

عن أنس بن مالک،قال:قال رسول اللہ ﷺ:''من فرّ من میراث وارثه،قطع اللہ میراثه من الجنة یوم القیامة'' ۔ترجمہ:جو شخص اپنے وارث کو (حق) میراث پانے سے فرار (کی صورتیں) اختیار کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت سے اس کی میراث منقطع

فرمادے گا،(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:2703 مطبوعہ دارالفکر بیروت)۔

ترکے کی تقسیم موجودہ قیمت کے مطابق

سوال:153

ہمارے والد صاحب مرحوم نے دوشادیاں کیں، دوسری شادی پہلی زوجہ کے انتقال کے بعد کی۔ پہلی زوجہ سے والد صاحب کا ایک بیٹا تھا۔ دوسری زوجہ کا انتقال والد صاحب کے انتقال کے بعد ہوا، دوسری زوجہ سے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں، لہٰذا مسئلہ یہ ہے کہ:

ا۔ والد صاحب کے مکان کی شرعی تقسیم کس طرح ہوگی۔

۲۔ مکان کی کون سی قیمت معتبر ہوگی، والد صاحب کے انتقال کے وقت کی یا حالیہ قیمت؟۔

مہربانی فرما کر تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں،(عامر عارفین شمسی، 1425/14 فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر کوئی متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 40 حصوں میں منقسم ہوگا، مرحوم کی پہلی زوجہ کے بیٹے کو 10 حصے، دوسری بیوی کے بیٹے کو 12 حصے اور تین بیٹیوں کو 18 حصے (ہر ایک کو 6 حصے) ملیں گے، مکان چونکہ اب فروخت کیا جائے گا لہٰذا جو قیمت مکان کی اب حاصل ہوگی اسے ورثاء کے درمیان اصولِ وراثت کے قوانین کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

غیر وارث کو ترکے سے حصہ

سوال:154

میرے والد صاحب شیخ محمد الیاس کا انتقال 28 جولائی 2006ء کو ہوگیا ہے۔

ان کے ورثاء جو حیات ہیں وہ ایک بیٹا شیخ عبدالخالق، تین بیٹیاں اور ایک بیوہ ہیں، جبکہ دو بیٹوں (محمد یونس اور عبدالمالک) اور ایک بیٹی نفیسہ کا انتقال 13 سے 20 سال پہلے ہو چکا ہے۔ مہربانی فرما کر تحریر فرمائیں کہ شرعی طور پر کس کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ جس اولاد کا والد کی زندگی میں انتقال ہو گیا ہے شرعی طور پر ان کے بیٹے یا بیٹیوں کا کوئی حصہ بنتا ہے یا نہیں؟، (عبدالخالق، F-153 بلاک 5 اسکیم 5 کلفٹن، کراچی)۔

جواب:

ازروئے شرع کسی بھی شخص کی وفات کے بعد جو ترکہ وہ چھوڑ جاتا ہے، اس میں تقسیم وراثت سے پہلے بالترتیب مندرجہ ذیل مصارف وضع کیے جاتے ہیں:
(1) مصارف تکفین وتدفین (2) اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض باقی ہے تو اس کو ادا کرنا (3) اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو ادائے قرض کے بعد جو ترکہ بچ رہے گا، اسکی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مقدار تک وصیت پر عمل درآمد ہوگا، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد، بقیہ ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ متوفی شیخ محمد الیاس کا ترکہ 40 حصوں میں منقسم ہوگا، بیوہ (محمد الیاس) کو 5 حصے، ایک بیٹا عبدالخالق کو 14 حصے، تین بیٹیوں کو 21 حصے (ہر ایک کو 7 حصے) ملیں گے۔

صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے اور متوفّٰی یا متوفاۃ کی براہ راست اپنی اولاد بیٹے اور بیٹیاں بوقت وفات زندہ ہیں، تو ان کی اُس بیٹے یا بیٹی کی اولاد (پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں)، جو مُورِث (ترکہ چھوڑ کر وفات پانے والے اپنے ماں یا باپ) کی وفات سے پہلے وفات پاچکی ہے، وراثت سے محروم رہے گی، کیونکہ تقسیمِ وراثت کا ایک مسلّمہ اصول ہے کہ: ''قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے''، اسے ''اصولِ حَجب'' بھی کہتے ہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کی وفات کے وقت اس کے والد بھی زندہ ہیں اور دادا بھی، تو والد کا رشتہ چونکہ میت سے قریب ترین ہے، اس لئے والد کو ترکے سے

حصہ ملے گا اور دادا محروم رہے گا، البتہ اگر ایسی صورت ہو جائے کہ کسی شخص کی وفات کے وقت اس کا دادا تو زندہ ہے لیکن والد پہلے وفات پا چکا ہے، اب ترکے کا جو حصہ بصورتِ حیات والد کو ملنا چاہیے تھا، وہ دادا کو ملے گا۔ یہی صورتِ حال میت کے بیٹے، بیٹیوں کی موجودگی میں پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی ہے۔

تاہم اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○

ترجمہ: ''اور جب (ترکے کی) تقسیم کے موقع پر قرابت دار، یتامیٰ اور مساکین آجائیں (جو شرعاً وارث نہیں بن سکتے)، تو انہیں بھی (رضا کارانہ طور پر) ترکے میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو، (النساء:8)''۔

قرآن کا یہ حکم ایجابی (Obligatory) تو نہیں ہے، استحبابی ہے، اس کی حیثیت مقاصد خیر کے لئے سفارش اور مشاورت کی ہے، لہٰذا جتنا حصہ ان یتیم نواسے نواسیوں کی والدہ کے حیات ہونے کی صورت میں انہیں ملنا چاہیے تھا، اگر تمام ورثاء اتفاق رائے سے اتنا یا اس سے کچھ کم تبرعاً اور استحساناً رضا کارانہ طور پر تقسیم ترکہ سے پہلے ان بچوں کو بطور ھبہ دیدیں تو یہ ایک مستحسن امر ہوگا، صلہ رحمی کا باعث ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہوگا، اور اس کا اجر انہیں ملے گا۔ قرآن مجید حکیمانہ انداز میں ارشاد فرماتا ہے:

وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ○

ترجمہ: ''اور لوگ (یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ (اپنی وفات) کے بعد (خدانخواستہ) کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ جاتے، تو انہیں ان کے (رُلنے اور بے یار و مددگار ہونے کا کتنا) خوف ہوتا، تو انہیں چاہیے کہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور درست بات کہیں، (النساء:9)''۔

تو قرآن نے بتایا کہ اپنے پسماندگان پر کسی ایسے مشکل مرحلے کا تصور کر کے غیر وارث نادار

اور کمزور رشتے داروں پر ترس کھا کر تقسیم وراثت کے وقت ان کی مدد کرلیا کرو۔

تقسیم ترکہ

سوال:155

میرے شوہر کا تین سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور ان کے ورثاء میں ایک بیوہ (یعنی میں) چار بیٹے، تین بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کے ترکے میں ایک دکان ہے اور ایک مکان جس میں ہم رہائش پذیر ہیں یہ مکان مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں آج سے تقریباً چالیس سال قبل میرے والد سے میرے ہی نام پر خرید کر مجھے ہبہ کر دیا تھا اور اس کے کاغذات میرے نام سے میرے پاس موجود ہیں اور اس مکان پر میرا قبضہ بھی ہے۔ دکان جو کہ میرے شوہر کے نام ہے اور اب بیٹے اس میں کاروبار کرتے ہیں۔ میرے بیٹوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں مکان اور دکان دونوں میں سے حصے دیئے جائیں۔ برائے مہربانی ہر ایک کے حصوں کی وضاحت فرمائیں، (توفیقا، 958/14 ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیان سائلہ چونکہ مکان ان کے شوہر نے انہیں ہبہ کر دیا تھا اور بعد ہبہ اس پر قبضہ بھی پایا گیا چونکہ ہبہ مکمل ہو گیا لہذا وہ مکان مرحوم کے ترکے میں شامل نہیں ہوگا۔ اور جب میراث تقسیم کی جائے گی، تو اس ہبہ کیے ہوئے مکان کو چھوڑ کر جتنا مال وفات کے وقت ان کی ملکیت میں ہوگا، وہی تقسیم کیا جائے گا۔ اور جو ورثاء ان کی وفات کے وقت موجود ہوں گے، وہ اس کے حق دار ہیں، ہر ایک وارث کو قانونِ وراثت کے شرعی اصول کے مطابق اس کا حصہ دیا جائے گا۔ اور جو کچھ مرحوم اپنی زندگی میں دے چکے ہیں، اسے شمار نہیں کیا جائے گا۔ اگر سائلہ کا بیان درست ہے اور مرحوم کے شرعی ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں، تو تقسیمِ وراثت سے قبل جو امور ضروری ہیں (یعنی مصارفِ تدفین، ادائیگی قرض (اگر کوئی ہو) ایک تہائی ترکے کی حد تک نفاذِ وصیت (اگر کی ہو)، ان کی تنفیذ کے بعد بقیہ ترکہ 88 حصوں میں تقسیم ہوگا۔ بیوہ کو 11 حصے، چار بیٹوں کو

56 حصے (فی کس 14 حصے) تین بیٹیوں کو 21 حصے (ہر ایک کو 7 حصے) ملیں گے۔

Inheritance

Q:156

Dear Mufti Saheb!

This is to request you to answer the following question for submission to a court outside Pakistan.

Mr S.K.S.Hassan died last year leaving behind him wife,a son and a daughter and no other legal heirs.What will be the share (in percentage)of his wife,son and daughter in his movable and immovable proparties according to shariah?.

K.M.Zubair,Supplements Editor,Dawn.

Ans:

If S.K.S.Hassan's legal heirs are the same as mentioned in the question, then after the payment of the basic liabilites, which are necessary before the division of all the inherited properties (movable and immovable) according to shariah, if the heirs are the same as stated in the question, the shairs of the heirs will be as under:

No: (1) Vidow.....12.5% (2) Son...... 58.33%

(3)Daughter....59.17%

ترکے میں سوتیلی اولاد کا حصہ نہیں

سوال:157

میرے والد صاحب نے میری والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی، میری سوتیلی والدہ کے پہلے شوہر سے چار بچے (دولڑکے، دولڑکیاں) ہیں، اوران سب کی شادیاں ہم نے کیں سوتیلی والدہ کا انتقال 1982ء میں ہوا، میری والدہ سے پانچ بیٹے، اور چار بیٹیاں ہیں۔ میرے والد کا انتقال 1992ء میں ہوا، والد کے انتقال کے بعد کیا ان چاروں کا میرے والد صاحب کے ترکے میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟ (معراج الدین، 68/10 لیاقت آباد کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدق بیان سائل بتنفیذ متقدمہ علی الارث مرحومین کا ترکہ ان کی اولاد کے درمیان اصول وراثت کے قوانین کے تحت تقسیم ہوگا، کل ترکہ 14، حصوں میں منقسم ہوگا۔ "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ" (ایک لڑکے کے لئے دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11) کے تحت پانچ بیٹوں کو دس حصے (فی کس دو حصے) چار بیٹیوں کو چار حصے (فی بیٹی ایک حصہ) ملیں گے۔ دوسری والدہ کی جو اولاد ان کے پہلے شوہر سے ہے اسے آپ کے والد کے ترکے میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

پنشن ترکے میں شامل نہیں

سوال:158

ایک شخص نے کل وراثت میں ایک مکمل مکان جس کی بالائی منزل پر دو کمرے ایک کچن اور غسل خانہ بھی تعمیر ہے، اس کے علاوہ ایک ماہانہ آمدنی کی پنشن چھوڑی ہے، وارثوں میں ایک بیٹا اور سات بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کی وصیت میں تحریر ہے کہ اوپر کی منزل جسے بیٹے نے مکمل طور پر اپنے خرچ پر تعمیر کروایا ہے، اسی وصیت میں بڑی بیٹی جس کی شادی نہیں ہوئی ہے اسکو مکان کا آدھا حصہ دینے کی وصیت کی ہے ایک اور تحریر جو صرف بیٹے کو

دی اور بیٹا اسکے اصل ہونے کا حلف اٹھا رہا ہے اسکے مطابق اوپر کی منزل کی قیمت بیٹے کوملنی چاہیئے اور نیچے کی منزل کی آدھی قیمت اس طرح تقسیم کی جائے کہ دو حصے بیٹے کو اور ایک حصہ ہر بیٹی کو دیا جائے، ماسوائے اس بیٹی کے جس کو نیچے کی منزل کا آدھا حصہ دیا جارہا ہے اسکے علاوہ باپ کی جو ماہانہ پنشن آتی ہے وہ بڑی بیٹی پہلے ہی اکیلے وصول کرتی ہے اور کوئی حصہ کسی بھائی یا بہن کو نہیں دیتی مکان کی قیمت اس وقت ایک کروڑ روپے ہے۔جس وقت تحریر لکھی گئی مکان کی قیمت پندرہ لاکھ روپے تھی جس کی تقسیم مرحوم نے اس طرح کی کہ بیٹے کو اوپر کی منزل کے دولاکھ ملنے چاہئیں ایک لاکھ ٹیکس، بل وغیرہ کی قیمت میں رکھے جائیں ۶ لاکھ روپے بڑی بیٹی کو دیئے جائیں باقی ۶ لاکھ روپے کے آٹھ حصے کئے جائیں دو حصے بیٹے کو یعنی ڈیڑھ لاکھ روپے اور ایک ایک حصہ چھ بیٹیوں کو یعنی ۷۵ ہزار روپے ہر بیٹی کو دیا جائے۔اب مکان کی قیمت ایک کروڑ روپے ہے۔بہنوں کا اصرار ہے کہ بیٹے کو اس قیمت کی تبدیلی کے حساب سے اوپر کی منزل کے پیسے نہ دیئے جائیں، مگر بڑی بیٹی کو موجودہ قیمت کے حساب سے مکان کا آدھا حصہ ضرور دیا جائے۔ براہِ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں وراثت کی تقسیم واضح فرمایئے، (سید حسن ندیم، 1E/10/10 ناظم آباد کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں، جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں سے تقسیم وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کسی صدقہ جاریہ یا غیر وارث کیلئے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 9 حصوں میں منقسم ہوگا۔ ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ''(ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11) کے تحت ایک بیٹے کو دو حصے اور سات بیٹیوں کو سات حصے (فی بیٹی ایک حصہ) ملیں گے، جیسا کہ مرحوم کے تحریر کردہ وصیت نامہ اور سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم نے وصیت نامہ میں اپنے ورثاء کو اپنی جائیداد کے مختلف حصوں میں نامزد (Nominate) کیا

ہے، محض نامزد کرنے سے وہ اس کے مالک نہیں بن جاتے اور ورثاء کے حق میں وہ وصیت معتبر نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "سمعت أبا أمامة،سمعت رسول الله ﷺ يقول: انّ الله قد أعطى كل ذى حقّ حقّه فلا وصية لوارث"

ترجمہ: ''ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے، (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862 مطبوعہ، مؤسسۃ الریان، بیروت)''۔

پنشن حکومت کی طرف سے تبرع ہے، یہ ترکہ نہیں ہے، لہٰذا حکومت اپنے قواعد وضوابط اور قانون کے مطابق ورثاء میں سے جسے چاہے دے سکتی ہے۔ بیٹے کا مکان کی بالائی منزل پر جو خرچ ہوا ہے۔ وہ اس کا حق ہے۔ اگر والد نے دولاکھ روپے اس کیلئے طے کر دیے تھے تو وہ ان کا حق دار ہے باقی ترکہ سب ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا، جس کی تفصیل اوپر درج کر دی ہے، البتہ تمام ورثاء باہمی رضامندی سے اپنے والد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے غیر شادی شدہ بہن کو تقسیم وراثت سے قبل مجموعی ترکے سے کچھ رقم نکال کر دینا چاہیں، تو اب وہ ایسا کر سکتے ہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے

سوال:159

میرے ایک دوست نوید جنہیں 22 ،جنوری 2006ء کو شہید کر دیا گیا، میں نے ان سے ایک لاکھ روپیہ بطور قرضہ لیا تھا منافع ہوا تو چند ماہ انہیں منافع سے حصہ بھی دیا مگر بعدہٗ منافع کا سلسلہ بند کر دیا، میرے دوست نوید نے مجھ سے رقم کی واپسی کا تقاضہ کیا تھا اور یہ کہ مجھے اپنی رہائش کے لئے فلیٹ خریدنا ہے رقم تیار رکھنا میں نے کسی وقت بھی وہ رقم تم سے واپس لینی ہے، وہ مع اپنی بیوی اور ایک ڈیڑھ سالہ بیٹی کے کرایہ کے فلیٹ میں رہائش

پذیر تھے اسکے علاوہ ان کے ہمراہ اور کوئی نہ رہتا تھا، خیر اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں فلیٹ بھی نہ خرید سکے اور نہ ہی میں ایک لاکھ کی رقم واپس کر سکا۔ میں ایک لاکھ کی رقم واپس کرنے کو تیار ہوں طریقہ کار کیا ہونا چاہیے، مرحوم کے ورثاء میں بیوہ، ایک بیٹی، ایک بیٹا (جو مرحوم کی شہادت کے تین ماہ بعد پیدا ہوا) مرحوم کی والدہ، 5 بھائی اور 5 بہنیں ہیں۔
دوسری صورت یہ ہے کہ مرحوم کے سسر مجھ سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ میں نے نوید مرحوم کو ایک لاکھ روپے بطور قرضہ دیئے تھے کہ اپنی سہولت کے مطابق جب چاہو واپس کر دینا انہوں نے مجھے اس قرضے کا ثبوت بھی دکھایا بینک سے ایک لاکھ روپے کا چیک نوید کے نام پر تھا بیوہ بھی اس قرضہ کی تائید کر رہی ہے۔ اس صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا یا سب سے افضل طریقہ میرے لئے کیا ہوگا؟ یہ بھی واضح رہے کہ بیوہ کی عدت پوری ہو چکی ہے اور بیوہ نے اپنے والدین کے گھر ہی عدت کے ایام پورے کئے اب مستقلاً وہیں رہ رہی ہیں، (محمد رحمت، دستگیر کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ مذکورہ میں مذکورہ قرض کی ایک لاکھ رقم مرحوم کے مجموعی ترکے میں شامل کی جائے گی، امور، متقدمہ علی الارث (مصارف تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی تھا، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد ترکے کے تہائی حصہ سے مرحوم کا قرض ادا کیا جائے گا اور اگر اس کے بعد بھی قرض باقی رہے تو دیگر ورثاء بطور فضل واحسان رضامندی سے اگر اپنے حصوں سے دست بردار ہوں تو انکے حصوں سے ادا کیا جائے گا، ترکہ کی تقسیم درج ذیل طریقے پر ہوگی۔
ادائیگی قرض کے بعد کل ترکے کے 24 حصے ہوں گے، مرحوم کی والدہ کو 6 حصے، بیوہ کو 3 حصے، ایک بیٹے کو 10 حصے اور بیٹی کو 5 حصے ملیں گے، مرحوم کے بہن بھائی محروم رہیں گے، واللہ اعلم بالصواب۔

حلال وحرام جائز وناجائز

قتلِ خطا

سوال:160

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ماں حالتِ خواب میں اپنے شیر خوار بچے کے اوپر آجائے جس کے دم گھٹنے سے بچہ مرجائے کیا ماں پر دیت وکفارہ ہے کیا یہ قتل قائم مقام خطا ہے۔نیز یہ قتل قائم مقام خطا ہے تو کیا یہ نوع صرف احناف کے مذہب میں ہے یا جمہور کا مسلک ہے اوراس کے دلائل قرآن وحدیث یا اجماع وقیاس سے کیا ہے؟،(ماجد خان، ضلع راولاکوٹ تحصیل عباس پور)۔

جواب:

آپ نے استفتاء میں جوصورت بیان کی ہے،احناف کے نزدیک یہ ''قتل قائم مقام خطا'' کی صورت بنتی ہے اور جمہور کے نزدیک یہ قتلِ خطا ہے،لیکن اس پر جوحکم مرتب ہوتا ہے،وہ ایک ہی ہے۔ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:القتل الخطاء کما عرفنا:ھو أن لا یقصد به الضرب ولا القتل،مثل لو سقط شخص علی غیرہ فقتله،أو رمی صیدا فاصاب انسانا،فھو نوع واحد عندالجمھور ونوعان عندا لحنفیه؛ لانھم یعتبرون حالة سقوط النائم علی غیرہ،مما جری مجری الخطأ۔

ترجمہ:''قتلِ خطا جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ ہے کہ نہ تو کسی شخص کو مارنے پیٹنے (Beating) کا ارادہ کیا جائے اور نہ جان سے مارڈالنے کا،اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص (غیر ارادی طور پر) دوسرے شخص پر گر پڑا اور اس طرح اس کی جان لے لی، یا ایک شکار کو نشانہ بنا کر تیر چلایا (یا گولی چلائی) اور وہ (اچانک) کسی انسان کو جالگا (اور اس طرح اس کی جان چلی گئی)،تو یہ جمہور فقہاء کے نزدیک ایک ہی قسم ہے،اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک قتلِ خطا کی دو قسمیں ہیں:(ایک خطاء فی القصد اور دوسری خطاء فی الفعل) کیونکہ وہ اسے اس صورت پر قیاس کرتے ہیں،جیسے ایک سویا ہوا شخص نیند کی حالت میں دوسرے شخص

پر گر جاتا ہے (اور اس طرح اس کی موت واقع ہوجاتی ہے) یہ قائم مقام خطا کی قسم سے ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد:6،ص:328،مطبوعہ: دارالفکر، دمشق)''۔

علامہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: ''علامہ ابوبکر رازی کی تعریف کے مطابق قتل قائم مقام خطا یہ ہے کہ مثلاً نیند میں کوئی شخص کسی پر گر پڑے اور اس کو قتل کردے یہ عمد ہے نہ خطا کیونکہ سونے والے شخص کا قصد (ارادہ) متصور نہیں ہے، لیکن اس کا کروٹ بدل کر کسی شخص پر گرنا اس شخص کی ہلاکت کا موجب ہے، اس کے عصبات پر دیت اور کفارہ واجب ہوگا، اور اگر وہ مقتول کا وارث تھا تو اس کی وراثت سے بھی محروم ہوگا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس نے کوئی کوتاہی کی ہو یا وہ نیند میں نہ ہو اور اس نے جلد میراث حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا ہو، (المبسوط، جلد:26،ص:68،مطبوعہ: دارالمعرفۃ، بیروت، بحوالہ شرح صحیح مسلم علامہ غلام رسول سعیدی، ج:4،ص:676 فرید بک اسٹال، لاہور)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وأما ماجری مجری الخطا فھو مثل النائم ینقلب علی رجل فیقتله فلیس ھذا بعمد ولاخطا کذا فی الکافی۔ وکمن سقط من سطح علی انسان فقتله أو سقط من یدہ لبنة أو خشبة وأصابت انساناً وقتلته أوکان علی دابة فوطئت دابته انساناً ھکذا فی المحیط ۔وحکمه حکم الخطا من سقوط القصاص ووجوب الدیة والکفارۃ وحرمان المیراث کذافی الجوھرۃ النیرہ ۔

ترجمہ: ''اور'' قتل قائم مقام خطا'' مثال اس کی یہ ہے کہ کسی سونے والے شخص پر کوئی شخص گرا، جس سے وہ (سونے والا شخص) ہلاک ہوگیا پس نہ یہ قتل عمد ہے اور نہ ہی قتلِ خطا، '' کافی'' میں بھی اسی طرح ہے ۔اسی طرح چھت سے کوئی شخص کسی انسان پر گرا اور اس طرح اسے ہلاک کردیا، یا ایک انسان کے ہاتھ سے اینٹ یا لکڑی گرگئی، اور وہ دوسرے شخص پر آ گئی اور اس کی ہلاکت واقع ہوگئی، یا وہ سواری پر تھا اور اس کے جانور نے کسی شخص کو روند ڈالا، '' محیط'' میں بھی اسی طرح سے ہے۔اور اس کا حکم بھی قتلِ خطا کے حکم کی طرح ہے،

کہ قصاص ساقط ہوجائے گا اور دیت اور کفارہ واجب ہوگا، اور قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا، ''جوہرۃ النیرہ'' میں اسی طرح مذکور ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد6، ص:3 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مفتی وقارالدین قادری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی سوال ہوا تو آپ نے جواب میں لکھا: قتل کی اقسام میں سے یہ قسم ''قائم مقام خطا'' ہے اس کی مثال یہ ہے کہ سوئے ہوئے شخص پر کوئی گرے اور وہ سونے والا مرجائے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ قاتل پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور قاتل کے عصبہ (ورثاء) پر دیت اور قاتل میراث سے بھی محروم ہوتا ہے۔ قتل کا گناہ نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ماں کو کفارہ دینا ہوگا اور وہ یہی ہے کہ دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے، (وقارالفتاویٰ، جلد سوم، ص:338، مطبوعہ بزمِ وقارالدین، کراچی)''۔

قتل خطا میں قاتل پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور قاتل کے عصبہ (ورثاء) پر دیت لازم ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ

ترجمہ: ''اور کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کرے سوائے اس کے کہ (اس سے) خطاء (یہ فعل سرزد ہوجائے)، (تو اس کا کفارہ) ایک مومن غلام کا آزاد کرنا ہے، (اور مزید یہ کہ) اس کے وارثوں کو دیت ادا کرنی ہے، سوائے اس کے کہ وہ معاف کردیں، (النساء:92)''۔

آیت کے اختتام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فمن لم یجد فصیام شہرین متتابعین توبۃ من اللہ۔

ترجمہ: ''یعنی جو شخص (بطورِ کفارہ آزاد کرنے کے لئے غلام) نہ پائے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قبولیتِ توبہ کے لئے دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔''

قتلِ شبہِ عمد

سوال: 161

مسمیٰ محمد فاروق نے کسی بات پر تنازع کرتے ہوئے غصہ میں آکر حاکم ولد محمد یوسف (مرحوم) کو ڈنڈے مار کر قتل کر دیا، اس کے بعد یہ مقدمہ عدالت میں پہنچا لیکن اس دوران قاتل اور مقتول کے ورثاء میں صلح ہوگئی اور مقتول کے ورثاء نے قاتل کو خون معاف کر دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ مقتول کا خون معاف کرنے کا کس وارث کو حق حاصل ہے۔
یاد رہے کہ مقتول غیر شادی شدہ تھا اور مقتول کا والد پہلے ہی انتقال کر چکا ہے اس وقت صرف مقتول کی ماں اور پانچ بھائی ہیں جو موجود ہیں کیا قاتل کو مقتول کی ماں خون معاف کر سکتی ہے یا نہیں ؟۔ برائے مہربانی تفصیل سے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں، (جھاڑو، ولد یوسف خان گوٹھ گداب ٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ سوال میں جو صورت قتل کی بیان کی گئی ہے اسے قتل شبہ عمد کہا جاتا ہے۔
شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:

واما شبه العمد فهو ماتعمد ت ضربه بالعصاالو السوط او الحجر اولید ۔
ترجمہ: ''شبہ عمد وہ قتل ہے جس میں لاٹھی، کوڑے، پتھر یا ہاتھ سے ضرب لگانے کا قصد کیا جائے، (المبسوط جلد:26 ص:60 مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت)''۔
قتل شبہ عمد میں قاتل گناہ گار ہوگا اور اس پر کفارہ واجب ہے ایک غلام آزاد کرے یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے اور اس کے بعد عاقلہ (عصبات) پر دیت مغلظہ یعنی سو اونٹ واجب ہے جس کو وہ تین سال میں ادا کریں گے۔ عاقلہ عصبات کو کہتے ہیں یعنی باپ کی طرف سے رشتے دار جو قاتل کی جانب سے مقتول کی دیت ادا کرتے ہیں۔
علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وشبه العمد أن يتعمد الضرب بماليس بسلاح ولا ماجرى مجرى السلاح عندأبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ وقال أبويوسف ومحمد رحمهماالله تعالىٰ اذا ضربه بحجر عظيم أوخشبة عظيمة فهو عمد وشبه العمدأن يتعمد ضربه بما لايقتل به غالباوالصحيح قول أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ كذا في المضمرات ☆ وموجبه على القولين الا ثم والكفارة وكفارته تحرير رقبة مؤمنة فان لم يجد فصيام شهرين متتابعين ودية مغلظة على العاقلة كذافي الكافي۔

ترجمہ:''اور امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک شبہ عمد یہ ہے کہ ایسی چیز سے مارنے کا قصد کرے جو اسلحہ (برائے قتل) نہ ہو اور نہ ہی اسلحہ کے قائم مقام ہو، اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جب وہ کسی بڑے پتھر کے ساتھ یا کسی بڑی لکڑی کے ساتھ مارے تو وہ بھی قتل عمد ہے اور ان کے نزدیک شبہ عمد یہ ہے کہ وہ کسی ایسی چیز سے مارنے کا قصد کرے جس سے عام طور پر قتل نہ کیا جاتا ہو، اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہی صحیح ہے، جیسا کہ مضمرات میں ہے۔ اور دونوں اقوال کے مطابق ''قتلِ شبہ عمد'' کے مرتکب پر گناہ اور کفارہ لازم آتا ہے اور اس قتل شبہ عمد کا کفارہ ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہے پس اگر وہ نہ پائے تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا ہوں گے اور قاتل کے عصبات پر دیت مغلظہ (سواونٹ) واجب ہے، کافی میں اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ عالمگیر جلد: 6 ص: 2.3 مکتبہ رُشیدیہ کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

عفو الولي عن القاتل افضل من الصلح ،والصلح افضل من القصاص وكذا عفوالمجروح۔لاتصح توبة القاتل حتى يسلم نفسه للقود۔

ترجمہ:''ولی مقتول کا قاتل کو معاف کر دینا صلح سے افضل ہے، صلح قصاص سے افضل ہے اور اسی طرح مجروح کا معاف کر دینا افضل ہے اور قاتل کی توبہ (عنداللہ) تب صحیح ہو گی جب وہ خود کو (ورثاء کے پاس) قصاص کے لئے پیش کرے، (ورنہ عنداللہ توبہ معتبر نہیں ہے)۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قوله (عفوالولی عن القاتل فضل) ویبرأالقاتل فی الدنیا عن الدیة والقود لانهما حق الوارث ۔بیری ۔قوله:(لاتصح توبة القاتل حتی یسلم نفسه للقود) أی لاتکفیہ التوبة وحدها۔ قال فی"تبیین المحارم واعلم ان توبة القاتل لاتکون بالاستغفار والندامة فقط بل یتوقف علی ارضاء اولیاء المقتول، فان کان القتل عمدالابدّ أن یمکنهم من القصاص منه ،فان شاؤ قتلوہ وان شاؤ عفوا عنه مجانا،فان عفواعنه کفته التوبه۔ اه ملخصا۔

ترجمہ:" (ولی کا قاتل کو معاف کر دینا افضل ہے) اور قاتل دنیا میں دیت اور قصاص سے بری ہو جائے گا کیونکہ یہ دونوں (دیت اور قصاص) وارث کا حق ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی کا یہ قول کہ: (قاتل کی توبہ اس وقت تک درست نہیں جب تک کہ وہ خود کو قصاص کے لئے پیش نہ کرے) یعنی صرف اس کا توبہ کر لینا کافی نہیں ہے۔ "تبیین المحارم" میں فرمایا: جاننا چاہئے کہ قاتل کی توبہ فقط اس کی ندامت اور طلب مغفرت سے (مکمل) نہیں ہوگی، بلکہ یہ مقتول کے ورثاء کی رضا مندی پر موقوف رہے گی، پس اگر اس نے قتل عمد کیا ہو تو (قبولیتِ توبہ کے لئے) ضروری ہے کہ اس مقتول کے ورثاء کو اپنے اوپر قصاص کی قدرت دے کہ اگر چاہیں تو اسے (قصاص میں) قتل کر دیں اور اگر وہ چاہیں تو اسے معاف کر دیں، پس اگر وہ اس کو معاف کر دیں تو اس کے لئے توبہ کافی ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد:10 ص:151 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)"۔

ولایت کے چار اسباب ہیں:

قرابت، ملک، ولا، امامت۔قرابت کی وجہ سے ولایت عصبہ بنفسہ کے لئے ہے یعنی وہ مرد جس کو اس سے قرابت کسی عورت کی وساطت سے نہ ہو یا وارث کے ذوی الفروض کے بعد جو ترکہ بچے، وہ سب لے لے، اور اگر ذوی الفروض نہ ہوں تو سارا مال یہی لے لے، ایسی قرابت والا ولی ہے، یہاں بھی وہی ترتیب ملحوظ ہے جو وراثت میں معتبر ہے یعنی سب سے

مقدم بیٹا، پھر پوتا، پھر پرپوتا اگر کوئی پشت کا فاصلہ ہو یہ نہ ہوں تو پھر باپ، دادا وغیرہم اگر چہ کئی پشت اوپر کا ہو، پھر حقیقی بھائی۔

شرعاً قاتل کو معاف کرنے کا حق اولیاءِ مقتول کا ہے اور صورتِ مسئولہ میں یہ حق اس کے بھائیوں کو حاصل ہے، یہ ''قتلِ شبہ عمد'' کا کیس ہے، اور ورثاء کی جانب سے معافی کے باوجود اس (قاتل) پر دو ماہ کے روزوں کا کفارہ ہے، اور معاف کرنے کے بعد قاتل سے دنیا میں مطالبہ نہیں ہوسکتا نہ قصاص لیا جاسکتا ہے اور نہ ہی دیت لی جاسکتی ہے، لیکن مواخذۂ اخروی سے بری نہیں ہوسکتا کیونکہ قتل ناحق میں تین حق اس کے ساتھ متعلق ہیں ایک حق اللہ، دوسرا حق مقتول، تیسرا حق ولی، ولیٔ مقتول کو اپنا حق معاف کرنے کا اختیار تھا سو اس نے معاف کردیا مگر حق اللہ اور حق مقتول بدستور باقی ہیں، ولی کے معاف کرنے سے وہ معاف نہیں ہوئے۔

غیر مسلم کا چیف جسٹس یا قائم مقام بننا

سوال:162

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک اسلامی حکومت میں کسی غیر مسلم (ہندو) کو چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) مقرر کرنا جائز ہے؟۔ (محمد شمیم خان فیڈرل بی ایریا، شوکت صدیقی، منور احمد نعیمی، ملیر کالونی، کراچی)۔

جواب:

اس مسئلے کی دو جہتیں ہیں، ایک خالص دستوری اور قانونی اور دوسری خالص اسلامی جہاں تک مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے دستور کا تعلق ہے، تو اسکی رو سے نظامِ مملکت میں صرف دو مناصب کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے، ایک صدر کا منصب اور دوسرا وزیرِ اعظم کا عہدہ، کیونکہ ان دونوں عہدوں کے حلف نامے میں، جو دستور پاکستان کے شیڈول میں دیا گیا ہے، مسلمان ہونا اور عقیدۂ ختمِ نبوت کا اقرار شامل ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور عہدے کے لئے (خواہ ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے جج ہوں یا چیف جسٹس

ہوں، مسلح افواج کے سربراہان ہوں یا گورنر، وزراء اعلیٰ اور وفاقی وصوبائی وزراء ہوں) مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، لہٰذا دستور پاکستان کی رُو سے کسی غیر مسلم کے چیف جسٹس آف پاکستان یا اس کا قائم مقام بننے کی گنجائش ہے، ماضی میں بھی جسٹس اے آر کارنیلیس، جو مذہبا عیسائی تھے، چیف جسٹس آف پاکستان رہ چکے ہیں۔ اگرچہ ہماری رائے میں یہ دستور کی روح کے منافی ہے، کیونکہ دستور پاکستان کی رُو سے کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بن سکتا اور کسی بھی قانون کو اس حوالے سے پاکستان کی سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جاسکتا ہے کہ یہ قرآن وسنت کے خلاف ہے اور اس کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کی تعبیر وتشریح حتمی اور قطعی متصور ہوگی، اب جج یا چیف جسٹس خود غیر مسلم ہے اور از روئے عقیدہ اس کا قرآن وسنت کی حقانیت پر یقین ہی نہیں ہے (کیونکہ اگر قرآن وسنت کی حقانیت پر اس کا یقین ہوتا تو اسلام قبول کر لیتا)، لہٰذا صرف اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ اسے قرآن وسنت سے آگاہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾

ترجمہ: ''اور اللہ کافروں کے لئے مسلمانوں کے خلاف (غلبہ کی) ہرگز کوئی سبیل نہیں بنائے گا، (النسآء:141)''۔

اس آیت سے فقہاء احناف نے جو مسائل اخذ کئے ہیں ان میں دو اہم باتیں یہ ہیں کہ: (1) کافر کو مسلمان کا قاضی (جج) بنانا جائز نہیں ہے۔ (2) کافر کو مسلمان کے لشکر کا امیر (سپہ سالار یا چیف آف اسٹاف یا کمانڈر انچیف) بنانا جائز نہیں ہے، الشیخ احمد بمعروف مُلّا جیون علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: جعله ذا عسكر و خدمته و رئيسا له غير جائز۔

ترجمہ: ''کافر کو مسلمان کے لشکر کا امیر (سپہ سالار یا چیف آف اسٹاف یا کمانڈر انچیف) بنانا جائز نہیں ہے، (التفسیرات احمدیہ ص:322,223 مکتبہ حقانیہ، پشاور)''۔

ملک العلماء علامہ علاء الدین ابی بکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں: واما بيان من يصلح للقضاء فنقول الصلاحية لها شرائط ۔ منها : العقل۔ ومنها :البلوغ ۔ ومنها:

الاسلام ۔ومنها :الحرية ۔ ومنها: البصر ۔ومنها: النطق ۔ومنها: السلامةعن حد القذف لما قلنا في الشهادة۔

ترجمہ:"ان شرائط کے بیان کے بارے میں جو اہلیتِ قضاء کے لئے ضروری ہیں، حسب ذیل ہیں: (1) عقل، (2) بلوغ، (3) اسلام، (4) حریت (آزاد ہونا)، (5) بصر (بینا ہونا)، (6) نطق، یعنی گویائی وگفتار کی صلاحیت رکھتا ہو، (7) اس شخص پر حد قذف نہ لگی ہو، (بدائع الصنائع جلد:7،ص:3، مرکز اہلسنت برکاتِ رضا، گجرات، ہند)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ان الكافر يجوز تقليده القضاء ليحكم بين أهل الذّمّة ذكره الزّيلعي في التّحكيم

ترجمہ:" (حاکمِ اسلام) اگر کسی غیر مسلم کو غیر مسلموں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کیلئے قاضی (جج) مقرر کرے، تو جائز ہے، اسے "زیلعی" نے بابِ تحکیم میں ذکر کیا ہے، (مگر مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا اُسے اختیار نہیں)، اس کی شرح میں ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (ليحكم بين أهل الذّمّة) أي حال كفره ، والا فقد علمت أن الكافر يصح توليته مطلقاً لكن لا يحكم الا اذا أسلم ۔

ترجمہ:" تاکہ (غیر مسلم قاضی) غیر مسلموں کے مقدمات کا فیصلہ کرے) یعنی جب تک وہ حالتِ کفر میں ہے، مگر یہ معلوم ہے کہ (دیگر امور میں) کافر کو حق ولایت مطلقاً حاصل ہے، لیکن جب تک وہ اسلام نہ لائے اسے منصبِ قضا تفویض نہیں ہوگا، مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں، ۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر آگے "مطلب في حكم القاضي الدُرزي والنّصراني " کے تحت بیان کرتے ہیں:

تنبیہ: ظهر من كلامهم حكم القاضي المنصوب في بلاد الدروز في القطر الشامي، ويكون درزياً ويكون نصرانياً فكل منهما لايصح حكمه على المسلمين، فان الدرزي لا ملة له كاالمنافق والزنديق وان سمى نفسه مسلماً ۔۔۔۔۔۔۔۔ والظاهر أنه يصح حكم الدرزي على النصراني وبالعكس ۔

ترجمہ: ''ان کے کلام سے ظاہر ہے کہ شام کے خطے میں دُرزی اور نصرانی (کو اگر) قاضی (مقرر کر دیا گیا ہو) تو ان کا مسلمانوں کے امور میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ دُرزی کا تو کوئی دین ہی نہیں ہوتا، جیسے منافق اور زندیق، اگرچہ وہ اپنے آپ کو (بظاہر) مسلمان کہے (اور آگے چل کر لکھا)، ظاہر یہ ہے کہ غیر مسلم کا ایک دوسرے کے لیے جج بنایا جانا درست ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار ج:8،ص:24 دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال ہوا کہ: مسائلِ شرعیہ عبادات میں غیر مسلم کے فیصلہ کی طرف رجوع کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے باوجودیکہ امیر شریعت موجود ہیں؟ جواب میں انہوں نے لکھا کہ: ''کفار کے پاس فیصلہ لے جانا ممنوع ہے، اللہ عزوجل فرماتا ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝۶۰، ترجمہ: ''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لائے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور ان (کتابوں) پر (ایمان لائے ہیں) جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ انہیں گمراہ کر کے بہت دور کی گمراہی میں ڈال دے، (النساء:60)، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ امجدیہ، جلد سوم، ص:246، مکتبہ رضویہ آرام باغ، کراچی)''۔

محافلِ میلاد کے بارے میں یہ کہنا کہ ''اس میں حضور ﷺ تشریف لائے ہوئے ہیں اور اس میں وحدہٗ لاشریک بھی شریک ہوتا ہے''

سوال:163

بارہ ربیع الاول کو جشن عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر ایک مقرر نے آقا ﷺ کی شان بیان کرتے ہوئے کہا ''آج کی اس محفل، اس جشن اور اس بزم کے جانِ محفل ذاتِ مصطفیٰ ﷺ ہیں اور شرکاءِ محفل میں خود خداوند کریم بھی شریک ہے۔ یہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ جو محفل بھی آقا ﷺ کے نام پر کی جائے آقا ﷺ اس میں شریک ہوتے ہیں اور جس محفل میں خدا کا حبیب ﷺ بھی خود شریک ہو اس میں وحدہٗ لاشریک بھی شریک ہوتا ہے''۔

اس پر ایک علامہ صاحب نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ خدا کی ذات شریک ہونے سے پاک ہے۔ لہٰذا یہ کفریہ کلمات ہیں۔ مقرر کو توبہ تائب ہونا چاہیے۔ براہِ کرم اس مسئلہ پر قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ وائمہ کی روشنی میں اپنے فتویٰ سے نوازیں، (ڈاکٹر محمد حامد رضا، ایم ڈی، رضا میڈیسن کمپنی مین بازار چشتیاں)۔

سوال:164

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مقرر نے اپنی تقریر کے دوران یہ جملہ کہا'' شرکاءِ محفل میں خود خداوند کریم بھی شریک ہے''۔ مقرر نے شریک ہونے کی تفصیل بیان نہیں کی۔ کہ اللہ تعالیٰ کس طرح شریک ہے۔ آپ سے دریافت کرنا ہے کہ:

(1) کیا اس جملہ پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے یا نہیں؟۔ (2) کیا ایسے جملوں کو عوام الناس میں استعمال کرنا چاہیے؟۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، (میاں طاہر حسین، چشتیاں شریف)۔

جواب :

نوٹ: اس موضوع پر ہمارے پاس چشتیاں، پنجاب سے دو الگ الگ استفسارات آئے، ہم نے دونوں درج کر دیئے ہیں۔ ایک مستفتی ڈاکٹر محمد حامد رضا نے تین مفتیانِ کرام (مفتی عبدالقیوم خان، جامعہ منہاج القرآن، لاہور، مفتی محمد تنویر القادری، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور اور ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری، جامعہ رضویہ، لاہور) کے جوابات بھی منسلک فرمائے ہیں۔ ان مفتیانِ کرام نے اس عبارت کی تاویل وتوجیہہ کر کے جواز کا قول کیا ہے۔ اس مسئلے میں ہمارا موقف درج ذیل ہے:

قرآن وحدیث میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اللہ جل شانہٗ اور مخلوق کے لئے ایک ہی صیغے کا اطلاق کیا گیا ہے، جیسے: (ا) اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ الخ (ب) فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُم (القرآن) (ج) اَنَا جَلِیْسُ عَبْدِیْ حِیْنَ یَذْکُرُنِیْ وَاَنَامَعَہٗ اِذَا دَعَانِیْ (الحدیث) (د) اَنَا عِنْدَ ظَنِّیْ عَبْدِیْ بِیْ اَنَا مَعَہٗ اِذَا ذَکَرَنِیْ، فَاِنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ نَفْسِہٖ ذَکَرْتُہٗ فِیْ نَفْسِیْ، وَمَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُہٗ ھَرْوَلَۃً، وَغَیْرُ ھَا مِنَ الْاٰیَاتِ الْکَرِیْمَۃِ وَالْاَحَادِیْثِ الْمُبَارَکَۃِ۔ میری عاجزانہ رائے میں ان اطلاقات کو انہی مقامات تک محدود رکھنا چاہئے، جیسے: فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہ ، یَوْمَ یُکشف عن ساق، یَدُاللّٰہ فوقَ اَیْدِیْھِمْ وغیرھا من الآیات الکریمہ ، ان مواقع پر یہ کہا جائے کہ ان سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے یا جو معنیٰ اس کی ذات کے شایان شان ہے۔ ہمارے لئے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اس پر مزید قیاسات کریں کہ یداللہ، وجہ اللہ ہوسکتا ہے تو "قدم اللہ" اور "رأس اللہ" کیوں نہیں ہوسکتا۔ ان اطلاقات کو ان کے محل تک محدود رکھا جائے۔ بلکہ ترجمہ کرتے وقت لکھ دیا جائے کہ اس کا حقیقی مفہوم جو اللہ کی مراد ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس کی تعیین کے ہم شرعاً مکلف نہیں ہیں، اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ ترجمہ کے موقع پر یہ لکھ دیا جائے: "جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے"۔ حقیقی مفہوم کی تعیین کے اعتبار سے ایسی احادیث وآیات کو متشابہات میں سے سمجھنا چاہئے اور اس کے درپے نہیں ہونا چاہئے۔ آج کل اکثر مقررین اور نعت خواں حضرات بڑی جرأت کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ: "اس محفل میں حضور تشریف لائے ہوئے ہیں"، ہمارا ایمان وعقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مبارک محافلِ میلاد میں ازراہِ لطف وکرم جب اور جہاں چاہیں تشریف لاسکتے ہیں اور "شمائم امدادیہ" میں مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہ درج کیا ہے، لیکن تعیین کے ساتھ یہ کہنا کہ: "ہماری اس محفل میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہوئے ہیں"، اگر غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر الجیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ یا مسلّمہ طور پر بلند مرتبہ اولیاء کاملین یہ دعویٰ فرمائیں، تو بجا ہے اور بارگاہِ الوہیت جل وعلا اور بارگاہِ رسالت میں تقرب کی وجہ سے

انہیں یہ مرتبہ ومقام حاصل ہے کہ وہ یقین کے ساتھ حضور انور ﷺ کی تشریف آوری کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، ہر ایرے غیرے کو اتنا بڑا دعویٰ کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ایسا دعویٰ یا تو غیب دانی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، اور بالذات علمِ غیب اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے یا جن مقرّب محبوب بندوں کو اپنے کرم سے وہ مطلع فرمادے یا وہ اپنے لئے عام لوگوں کی قوتِ مشاہدہ اور صاحبِ بصیرت وبصارت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ بہت بڑی خودستائی ہے جو اس کے لئے جائز نہیں ہے، اگر قرآن وحدیث میں ایسے کلمات (مثلاً لفظِ صلوٰۃ) آئے ہیں، جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور مومنین پر بیک وقت کیا گیا ہے، تب بھی ان کے معانی کا تعین ہر ایک کے اعتبار سے الگ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے وہی معنیٰ مراد ہوگا جو اس کی شان کے لائق ہے اور اشتراکِ لفظی کے باوجود اشتراکِ معنیٰ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آیتِ درود پر کلام کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

اس آیت میں اللہ اور فرشتوں کو ایک فعل میں شریک کیا ہے اور فرمایا ہے: اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود پڑھتے ہیں، اس آیت پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے غیر کو ایک فعل میں شریک کرنے سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے، حدیث میں ہے: حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے کہا جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پالی اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہو گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم برے خطیب ہو یوں کہو جس نے اللہ کی نافرمانی کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، وہ گمراہ ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عام لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر ایک ضمیر میں جمع کریں، کیونکہ اس سے سننے والوں کو یہ وہم ہوگا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کو برابر سمجھتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر الگ الگ صیغوں میں کیا جائے، البتہ اللہ تعالیٰ کسی حکم یا کسی قاعدے کا پابند نہیں ہے، وہ ایک صیغہ اور ایک ضمیر میں اللہ اور اس کے

غیر کا ذکر کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، ایک صیغہ میں دونوں کا ذکر کرنے کی مثال یہ آیت ہے اس میں فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ: اللہ اور اس کے فرشتے درود پڑھتے ہیں، اور ایک ضمیر میں دونوں کے ذکر کے مراد لینے کی مثال یہ آیت ہے: وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ۔ ترجمہ:" اور ان (منافقین کو) صرف یہ ناگوار ہوا کہ ان کو اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا، (التوبہ: 74)"۔ اس آیت میں" مِنْ فَضْلِهٖ" کی ضمیر واحد اللہ اور رسول دونوں کی طرف راجع ہے، اسی طرح یہ آیت ہے: وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ۔ ترجمہ:" اللہ اور اس کا رسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے، (التوبہ: 62)"۔ اس آیت میں یُّرْضُوْهُ کی ضمیر واحد اللہ اور اس کے رسول دونوں کی طرف راجع ہے۔ اسی طرح نبی ﷺ بھی اس قاعدہ کے پابند نہیں ہیں اور آپ نے بھی اللہ اور اس کے رسول کو ایک ضمیر میں فرمایا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس شخص میں تین خصلتیں ہوں وہ ایمان کی مٹھاس کو پالے گا، ایک یہ ہے کہ: ان یکون اللہ ورسولہ اَحَبَّ الیہ مما سواھما۔ ترجمہ:" اللہ اور اس کا رسول اس کو ان کے ماسوا زیادہ محبوب ہو، (صحیح البخاری: ، رقم الحدیث: 16)"۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ادب اور اس کی تعظیم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر دونوں کا ایک ضمیر میں ذکر کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اس قاعدہ کے پابند نہیں ہیں اور وہ ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے غیر کو بھی جمع کر دیتے ہیں، کیونکہ جب دوسرے لوگ ایک صیغہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کا ذکر کریں گے، تو ان کے متعلق یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کو ہم مرتبہ اور مساوی سمجھتے ہیں، اس لئے دونوں کا ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں ذکر کر رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اگر وہ ایک صیغہ یا ایک ضمیر میں دونوں کا ذکر کریں، تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، (تبیان القرآن، جلد: 9، ص: 532,533)"۔ محفل

میلا دالنبی ﷺ کے حوالے سے ہمارے خطباء کرام فرطِ محبت، جوشِ عقیدت اور عوام سے داد و تحسین پانے کے شوق میں بعض کلمات ارشاد فرمادیتے ہیں۔ جیسے سوال میں مذکور ہیں کہ: ''اس میں وحدہٗ لاشریک بھی شریک ہوتا ہے''، اگر چہ شرعاً اس کی تاویل وتوجیہ کی گنجائش ہے، جیسا کہ منسلکہ فتاویٰ میں مفتیانِ کرام نے فرمائی ہے، لیکن میری مؤدبانہ اور عاجزانہ رائے ہے کہ اس طرح کے اندازِ بیان سے اجتناب اولیٰ ہے، اللہ تعالیٰ کی اَحدِیّت اور تَنزِیہ کا جتنا پاس رکھا جاسکے، اتنا ہی افضل واولیٰ ہے۔ خاص طور پر آجکل بڑے خطباء کرام کی تقاریر کے کیسٹ عام ہوجاتے ہیں اور پھر علم سے عاری لوگ بھی ان کو اپنی مجالس میں دہراتے رہتے ہیں۔ تاویلات وتوجیہات کی تو ہر جگہ گنجائش رہتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔ ترجمہ: ''ہم اس کی (بندے کی) شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں، (ق:16)'' اور وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ۔ ترجمہ: ''تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ (اللہ تعالیٰ) تمہارے ساتھ ہوتا ہے، (الحدید:4)''۔ اب ان آیات کی روشنی میں کوئی شخص یہ کہے کہ میں جس مجلس میں بھی رہوں، اللہ تعالیٰ میرے ساتھ شریک ہوتا ہے، تو یہ انداز میرے نزدیک بارگاہِ الوہیت کے شایانِ شان نہیں ہے، اگر چہ توجیہ وتاویل کی گنجائش موجود ہے، کیونکہ یہاں بندے اور رب کے درمیان جس معیت کا ذکر ہے اس سے معیتِ جسمانی یا معیتِ مکانی مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم اور قدرت ہر چیز کو محیط ہے اور اسی معنیٰ میں معیت مراد ہے، بعض مُقرّبین کے لئے مَعِیّتِ خاصّہ مراد ہوسکتی ہے، اس سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کی خصوصی رحمتوں اور برکات کا بندے کے شاملِ حال رہنا ہے۔ باقی جن علامہ صاحب نے کہا ہے کہ: ''یہ کفریہ کلمات ہیں، مقرر کو توبہ تائب ہونا چاہئے''۔ یہ درست نہیں ہے اور بعض علماء کے نزدیک غیر کفر کو کفر قرار دینا بجائے خود مستلزم کفر ہوتا ہے۔ ہم نے اظہارِ رائے کے لئے یہ فتویٰ محترم مفتی محمد رفیق حسنی (جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، کراچی) کو پیش کیا، تو انہوں نے اپنی عبارتِ ذیل کے اضافے کے ساتھ اس کی تائید کی:

"حضرت مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے فتوے کی تائید کرتا ہوں بلکہ میرے نزدیک صورتِ مسئولہ کی عبارتیں اور اسی قسم کے عام مقررین اور نعت خوانوں کی عبارتیں کفر تو نہیں مگر عام مجالس میں بیان کرنا حرام ہیں بلکہ متشابہات آیات اور احادیث کا بغیر تاویل اور توضیح کے بھی عام مجالس میں بیان کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس قسم کے کلمات سے عوام کو جو پیغام پہنچتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تجسیم اور تمثیل جسمی کا ہوتا ہے چنانچہ ایسی تقریریں سننے والے میرے ایک طالبِ علم کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے جسم کا قائل ہو چکا ہے۔ اسی طرح شانِ رسالت بیان کرتے وقت یہ کہنا کہ" اللہ تعالیٰ جو لاشریک ہے وہ درود میں ہمارے ساتھ شریک ہے"، سے عوام کا یہ عقیدہ بنتا ہے شاید اللہ تعالیٰ ہماری طرح ہاتھ میں تسبیح لے کر" اللھم صل علی الخ یا الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللّٰہ" پڑھتا رہتا ہے جبکہ علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف صلاۃ کی نسبت ہو تو رحمت مراد ہوتی ہے۔ الغرض مذکورہ کلمات اگرچہ تاویل کی وجہ سے کفر نہیں ہیں مگر عوام کو پیغام پہنچانے اور ان کے عقیدوں کے فساد کے خطرے کے پیشِ نظر ناجائز ہیں آئندہ علماء کو یہ کلمات نہیں کہنا چاہئے، واللہ تعالیٰ اعلم"۔ اسی طرح محترم مفتی محمد اسماعیل نورانی (جامعہ انوار القرآن، کراچی) نے یہ تائیدی کلمات لکھے:" قبلہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب مدظلّہ نے جو جواب تحریر فرمایا ہے اور اس پر مفتی رفیق الحسنی دام ظلّہ نے جو اضافہ فرمایا ہے وہ بالکل برحق ہے۔ فی زمانہ مقررین اور واعظین کے مذکورہ جملوں کی سخت حوصلہ شکنی اور تردید کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جس طرح نعت خوانی کی فیلڈ میں جاہل اور چمکیلے نعت خوانوں نے نظریاتی طور پر اہل سنت کو نقصان پہنچایا ہے اسی طرح غالی قسم کے واعظین اور مقررین نے بھی اپنی بے بنیاد نکتہ آفرینیوں سے شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اللہ عزوجل ہدایت خیر عطا فرمائے"۔

خاتون مبلغہ کا غیر شرعی طرزِ عمل

سوال:165

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اہل سنت والجماعت

سے تعلق رکھنے والی ایک مقرر خاتون (جو تنظیم المدارس سے ملحق فوقانی درجے کے ایک ادارے کی مہتمم ہیں) نے اپنی تقاریر پر مشتمل کیسٹز کی سرعام فروخت شروع کررکھی ہے جن میں ترنم کے ساتھ نعتیہ اشعار بھی پڑھے گئے ہیں موصوفہ سے جب دریافت کیا گیا کہ کچھ عرصہ پہلے تو آپ اپنے اجتماع کے آس پاس بھی کسی مرد کی موجودگی پسند نہیں کرتی تھیں کہ انکے کانوں تک آواز نہ چلی جائے، اوراب آپ اپنی کیسٹیں ہر جگہ پہنچانے کے لئے کوشاں ومشتاق ہیں، تو ان کا جواب یہ تھا کہ یہ دورِ حاضر کی اہم ضرورت ہے میں فرحت ہاشمی (الہدیٰ سینٹر، اسلام آباد) کی کیسٹز کے توڑ کے لئے ایسا کررہی ہوں۔

ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا یہ عمل قانونِ شرع میں کس نظر سے دیکھا جائے گا؟ کیا فرحت ہاشمی کی باتوں کا جواب دینے کے لئے اہلِ سنت میں "مرد علماء" ناکافی تھے۔ برائے مہربانی پہلی فرصت میں اس پر مدلل فتویٰ تحریر فرماکر ارسال فرمائیں، کیونکہ اس سے مختلف مدارس سے تعلق رکھنے والی طالبات، معلمات ومنتظمات ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ بعض خوش الحان خواتین اپنی قراءت نعت وتقاریر پر مشتمل کیسٹز منظرِ عام پر لانے کے لئے تیار ہو رہی ہیں، یادرہے کہ مذکورہ خاتون تقاریر کے حوالے سے خواتین میں خاصی مقبول ہیں، اگر اس بات کا فوری نوٹس نہ لیا گیا، تو عنقریب مرد علماء کے خطابات سننے والے مفقود ہوجائیں گے۔ اور ہر جگہ اہل سنت کی خواتین کی کیسٹیں بجتی سنائی دیں گی، (سحر سیفی، جامعہ سیفیہ خراسانیہ لبنات الاسلام، مدینہ کالونی بھسہ روڈ بڑیلہ شریف، گجرات)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِىْ فِىْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾ (الاحزاب:32)

ترجمہ: "اگر اللہ سے ڈرتی ہو (اور یقیناً ڈرتی ہو) تو (پسِ پردہ مردوں سے بضرورت) بات کرنے میں (ایسا) نرم لہجہ اختیار نہ کرنا کہ جس کے دل میں (شہوانیت کا) روگ ہے وہ (اپنی خواہش نفس کی تکمیل کا) طمع کرنے لگے اور دستور کے مطابق (اچھی) بات کرنا"۔

عن یحی بن سعید ،عن عمرة عن عائشة رضی اللّٰہ عنہا قالت: لو ادرک رسول اللّٰہ ﷺ ماأحدث النساء لمنعھنّ ،کما منعت نساء بنی اسرائیل۔ قلت لعمرة:أو منعن ؟قالت:نعم۔

ترجمہ:'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ،فرماتی ہیں:اگر رسول اللہ ﷺ عورتوں کو اس حال پر پاتے،جو آپ کے بعد ہوا،تو آپ ان کو مسجد آنے سے منع فرمادیتے،جیسے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کردیا گیا تھا،یحیٰ کہتے ہیں کہ میں نے عَمرہ سے پوچھا! کیا بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا؟،انہوں نے کہا:ہاں!،(صحیح بخاری رقم الحدیث :869،سنن ابی دواؤ،رقم الحدیث:570)''۔

عن عبداللّٰہ ،عن النبی ﷺ قال:"صلاة المرأة فی بیتھا افضل من صلاتھا فی حجرتھا، وصلاتھا فی مخدعھا افضل من صلاتھا فی بیتھا"۔

ترجمہ:'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:عورت کا دالان میں نماز پڑھنا،صحن میں پڑھنے سے بہتر ہے اور کوٹھری میں دالان سے بہتر ہے،(سنن ابی دواؤ،رقم الحدیث:571)''۔

عن ابی موسی، عن النبی ﷺ قال: "کل عینٍ زانیة، والمرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فھی کذا و کذا۔ یعنی زانیة"۔

ترجمہ:'' حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:ہر آنکھ زنا کرنے والی ہے(یعنی جو اجنبی کی طرف شہوت بھری نظر سے دیکھے) اور بے شک عورت عطر لگا کر کھلی مجلس میں جائے تو ایسی اور ایسی ہے یعنی زانیہ ہے،یعنی وہ محرکات واسبابِ زنا اختیار کررہی ہے،جس کے باعث گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، (سنن ترمذی،رقم الحدیث:2786)''۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ
ترجمہ:اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اس زینت کا لوگوں کو علم

ہوجائے جوانہوں نے چھپا رکھی ہے"۔(القرآن،سورۃ النور:31)۔"

علامہ ابوبکر جصاص حنفی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ عورت کو اتنی بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کو اجنبی مرد سن لیں، کیونکہ پازیب کی آواز سے اس کی اپنی آواز زیادہ فتنہ انگیز ہے، اسی وجہ سے ہمارے فقہاء نے عورت کی اذان کو مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس میں آواز بلند کرنی پڑتی ہے اور عورت کو آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے،(احکامِ القرآن جلد 3 ص: 319 مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)۔"

علامہ شہاب الدین خفاجی حنفی لکھتے ہیں:

"علامہ ابن ہمام حنفی نے کہا ہے کہ نوازل میں تصریح ہے کہ عورت کی آواز عورت (واجب الستر) ہے اور اس پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عورت کا عورت سے قرآن مجید پڑھنا مستحب ہے کیونکہ عورت کی آواز عورت ہے،(فتح القدیر جلد 6 ص:374 مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر)"

علامہ ابوعبداللہ خطاب مالکی لکھتے ہیں:

"عورتوں کا آواز بلند کرنا مکروہ ہے، عورتوں کا اذان دینا، بلند آواز سے نماز پڑھنا اور بلند آواز سے حج میں تلبیہ (اللہم لبیک) کہنا سب مکروہ ہے، علامہ لخمی نے کہا ہے کہ عورتوں کی اذان ممنوع ہے کیونکہ عورت کی آواز عورت ہے، علامہ خطاب مالکی کہتے ہیں کہ علامہ ابن یونس اور علامہ ابن ناجی وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے کہ عورت کی آواز عورت ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ عورت کا آواز بلند کرنا عورت ہے، کیونکہ صحابہ کرام امہات المومنین اور دیگر صحابیات سے احادیث روایت کرتے تھے،(مواہب الجلیل جلد 1 ص:435 مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔"

امام رازی شافعی لکھتے ہیں:

أن المرأة منهية عن رفع صوتهابالكلام بحيث يسمع ذالک الأجانب اذ كان صو تها اقرب الى الفتنة من صوت خلخالها، ولذ الكـ كر هوا أذان النسا ء لا نه يحتاج فيه الى رفع الصوت والمرأة منهية عن ذالک۔

ترجمہ: ''عورت کو اتنی بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کو اجنبی مرد سن لیں، کیونکہ عورت کی اپنی آواز پازیب کی آواز سے زیادہ فتنہ انگیز ہے اسی وجہ سے عورت کو اذان دینے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اذان میں آواز بلند کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت کو آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے، (تفسیر کبیر جلد 8 ص: 367 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ بیضاوی شافعی لکھتے ہیں:

''پازیب کی آواز سنانے سے منع کرنا عورت کے آواز بلند کرنے کی ممانعت پر زیادہ دلالت کرتا ہے، انوار التنزیل علی ہامش عنایۃ القاضی جلد 6 ص: 374 مطبوعہ دار صادر، بیروت)''۔

جس طرح قرآن مجید میں عورت کے آواز بلند کرنے کی ممانعت بطور کنایہ اور مبالغہ ہے، سو اسی طرح حدیث میں بھی عورت کے آواز بلند کرنے کو کنایہ اور مبالغہ سے منع کیا ہے، امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ،عن النبی ﷺ قال: "التسبیح للرجال ، و التصفیق للنساء"۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (امام کو سہو پر مطلع کرنے لئے) مردوں کے لئے تسبیح (سبحان اللہ کہنا) اور عورتوں کے لئے تصفیق (یعنی دہنے ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی پشت پر مارنا) ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 1303)''۔

اسی کی مثل حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے (صحیح بخاری رقم الحدیث 1304 روایت ہے، اس حدیث کو امام مسلم اور امام ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام متوفی 681 ہجری لکھتے ہیں:

(ویکرہ الجمع بینھما) ای بین الاشارۃ والتسبیح (لأن باحدھما کفایۃ) وھذا فی حق الرجال، أما النساء فیصفقن یضربن بظھور أصابع الید الیمنی

علی صفحة الکف الیسری لما مر أن لھن التصفیق لأن فی صوتھن فتنة فلا یستحب لھن التسبیح ۔

ترجمہ: ”(اور تسبیح و تصفیق کا جمع کرنا مکروہ ہے) اور تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا مردوں کا حق ہے، رہا عورتوں کا معاملہ پس وہ تصفیق کریں دہنے ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی پشت پر ماریں، جیسا کہ گزرا کہ ان کے لئے تصفیق ہے اس لئے کہ ان کی آواز ”فتنہ“ ہے پس ان کے لئے تسبیح (یعنی سبحان اللہ کہنا) مستحب نہیں ہے، (فتح القدیر جلد 1 ص: 419 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکاتِ رضا، گجرات ہند)“۔

نماز میں امام کو متنبہ کرنے کے لئے بلند آواز سے سبحان اللہ کہا جاتا ہے اور چونکہ عورت کا نماز میں آواز بلند کرنا شرعاً ممنوع اور مذموم ہے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو سبحان اللہ کہنے کے بجائے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے کا حکم دیا ہے، علامہ بدرالدین عینی حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

شارع علیہ السلام نے عورت کے سبحان اللہ کہنے کو اس لئے مکروہ قرار دیا ہے کہ اس کی آواز فتنہ ہے اس لئے اس کو اذان، امامت، اور نماز میں بلند آواز کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے سے منع کیا جاتا ہے، (عمدۃ القاری جلد 7 ص: 279 مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر)“۔

علامہ علی قاری حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

عورت کو تصفیق (ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے) کا حکم اس لئے دیا کہ اس کی آواز عورت ہے، (مرقات جلد 3 ص: 10 مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان)“۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ قرآن مجید میں عورت کو زمین پر پیر مارنے سے منع کیا ہے تا کہ اس کی پازیب کی آواز سن کر اجنبی مرد اس کی طرف متوجہ نہ ہوں اور حدیث میں عورت کو نماز میں سبحان اللہ کہنے کے بجائے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مارنے کا حکم دیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عورت کا آواز کو بلند کرنا بھی ممنوع ہے، فقہاء احناف کے نزدیک عورت کی آواز عورت ہے، اور جس طرح ماسوائے ضرورت کے وہ اجنبیوں پر چہرہ ظاہر نہیں کرسکتی، اسی طرح وہ

بغیر ضرورت کے اجنبی مردوں پر اپنی آواز بھی ظاہر نہیں کر سکتی۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ "عورتوں کا بیانِ میلاد شریف آنحضرت ﷺ" زنانی محفل میں بآوازِ بلند نثر و نظم پڑھنا اور نظم خوش آوازی ولحن کے ساتھ پڑھنا اور مکان کے باہر سے ہمسایہ کے مردوں اور نامحرموں کا سننا، تو ایسا پڑھنا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ آپ نے جواب میں لکھا:

عورت کا خوش الحانی سے بآواز ایسا پڑھنا کہ نامحرموں کو اس کے نغمہ کی آواز جائے، حرام ہے۔ نوازل للامام فقیہ ابواللیث میں ہے:

نغمة المرأة عورة۔ ترجمہ: "عورت کا اونچی آواز سے شعر پڑھنا "عورت" یعنی محل ستر ہے"۔

کافی امام ابوالبرکات نسفی میں ہے: لا تلبی جهر الان صوتها عورة۔

ترجمہ: عورت بلند آواز سے (حج کی) تلبیہ نہ پڑھے اس لئے کہ اس کی آواز قابلِ ستر ہے۔

امام ابوالعباس قرطبی کی کتاب السماع پھر بحوالہ علامہ علی مقدسی امداد الفتاح علامہ شرنبلالی پھر ردالمحتار علامہ شامی میں ہے:

لا نجیزلهن رفع اصواتهن ولا تمطیطها ولا تلیینها و تقطیعها لما فی ذلک من استمالة الرجال الیهن و تحریک الشهوات منهم و من هذا لم یجز ان تؤذن المرأة ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

عورتوں کو اپنی آوازیں بلند کرنا، انہیں لمبا اور دراز کرنا، (لہجے کو) نرم (اور پرکشش) بنانا اور ان میں تقطیع کرنا (یعنی ایک ایک لفظ جدا کر کے تحلیلِ عروض کے مطابق پڑھنا)، ہم عورتوں کو ان باتوں کی اجازت نہیں دیتے، کیوں کہ ان کے سبب مردوں کا ان کی طرف میلان ہوتا ہے اور ان کے جنسی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں، اسی وجہ سے عورت کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اذان دے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ت) (فتاویٰ رضویہ ج 22، ص: 43-242 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

مصنف بہارِ شریعت علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ ''غنیۃ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:
''عورت کو عورت سے قرآن مجید پڑھنا غیر محرم نابینا سے پڑھنے سے بہتر ہے کہ اگرچہ وہ اسے دیکھتا نہیں مگر آواز تو سنتا ہے اور ''عورت کی آواز بھی عورت ہے''، یعنی غیر محرم کو بلا ضرورت سنانے کی اجازت نہیں (بہارِ شریعت جلد 1 ص: 207 مکتبۂ رضویہ آرام باغ روڈ کراچی)''۔

سوال میں جس خاتون مبلغہ کا تذکرہ ہے، آپ کے بقول شروع میں ان کا رویہ درست تھا، مگر پھر شاید نمود و نمائش کی خواہش غالب آگئی، اور فرحت ہاشمی صاحبہ کے غیر شرعی طرزِ عمل کو اپنے لئے جواز کی دلیل بنایا۔ یہ کہاں کا اصول ہے کہ برائی کا مقابلہ کرنے کے لئے خود برائی کا ارتکاب کیا جائے؟۔ دین کا مبلغ ہونے کے ناطے احکامِ شرع و دین کی پاسداری کرنا اولین فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝۔

ترجمہ: ''کیا لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو؟ اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تم نہیں سمجھتے؟، (القرآن، سورۃ البقرۃ: 44)''۔

موصوفہ کو چاہئے کہ احکامِ شرع کی پابندی کریں اور سستی و دنیاوی شہرت کے حصول اور خود نمائی کے لئے احکامِ شرع کی پامالی سے اجتناب کریں اور دین کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے بجائے خود کو دین میں ڈھالنے کی عادت بنائیں اور دین میں فتنے برپا نہ کریں۔

فرحت ہاشمی کی باتوں کا جواب دینے کے لئے علماء موجود ہیں اور الحمد للہ ہم نے ''عصمتِ آدم علیہ السلام'' سے متعلق فرحت ہاشمی کے گستاخانہ طرزِ عمل پر اس کا رد کیا ہے، فتویٰ کی نقل آپ کو ارسال کی جارہی ہے۔

(نوٹ): عصمتِ آدم علیہ السلام سے متعلق فتویٰ ''تفہیم المسائل جلد سوم'' میں شامل کیا جا چکا ہے۔

مرد پر ریشم کا لباس حرام ہے

سوال: 166

کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ہذا میں کہ مرد کو ریشم کا لباس حرام ہے، لیکن ایسا کپڑا جس میں تھوڑی بہت ملاوٹ ہو ریشم کی جیسا کہ چائنا کا بوسکی کپڑا۔ سوال یہ ہے کہ کتنی مقدار میں ریشم مکس ہو تو حرام ہے؟، (عبدالقیوم، نورانی مسجد، جہانگیر روڈ، کراچی)۔

جواب:

احادیثِ مبارکہ میں ریشم پہننے پر سخت وعید فرمائی ہے، حدیث پاک میں ہے:عن ثابت قال: سمعت ابن الزبیر یخطب یقول: قال محمد ﷺ: "من لبس الحریرفی الدنیا لن یلبسه فی الآخرة۔

ترجمہ:" حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ابن زبیر کو فرماتے ہوئے سنا: محمد ﷺ نے فرمایا: کہ جو دنیا میں ریشم پہنے آخرت میں وہ ہرگز ریشم نہیں پہنے گا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5833)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اس مسئلے پر احادیث نقل فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

لاتلبسوا الحریر فانه من لبسه فی الدنیا لم یلبسه فی الآخرة۔رواه الشیخان عن امیرالمؤمنین عمر والنسائی وابن حبان والحاکم وصححه عن ابی سعید الخدری والحاکم عن ابی هریرة وابن حبان عن عقبة بن عامر رضی الله تعالیٰ عنهم اجمعین۔

ترجمہ: ریشم نہ پہنو جو اسے دنیا میں پہنے گا آخرت میں نہ پہنے گا (اس کو بخاری ومسلم نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔نسائی، ابنِ حبان اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور ابن حبان نے حضرت عامر بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے

روایت کی، (صحیح بخاری باب لبس الحریر)۔
نسائی کی ایک روایت میں ہے فرماتے ہیں ﷺ: من لبسہ فی الدنیا لم یدخل الجنۃ، رواہ عن امیرالمؤمنین عمر رضی اللہ عنہ، ترجمہ: جو دنیا میں ریشم پہنے گا جنت میں نہ جائے گا، امام نسائی نے اس کو امیرالمومنین عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، (فتاویٰ رضویہ جلد 22 ص:156 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)''۔
فتاویٰ عالمگیری میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: یجب ان یعلم ان لبس الحریر وھوماکانت لحمتہ حریرا وسداہ حریراحرام علی الرجال فی جمیع الاحوال عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ۔
ترجمہ: ''امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک تمام حالتوں میں، اگر کپڑے کا تانا اور بانا ریشم کا ہو، تو وہ امام اعظم ابوحنیفہ (رضی اللہ عنہ) کے نزدیک تمام صورتوں میں مرد پر حرام ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 5 ص:330 مکتبۂ رشیدیہ کوئٹہ)''۔
صاحب بہارِ شریعت علامہ امجد علی رحمۃ اللہ علیہ عالمگیری کے حوالے سے لکھتے ہیں: تانا ریشم ہو اور بانا سوت مگر کپڑا اس طرح بنایا گیا ہے کہ ریشم ہی ریشم دکھائی دیتا ہے تو اس کا پہننا مکروہ ہے، (بہارِ شریعت جلد دوم ص:620 مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)۔

مالک کو بتائے بغیر بھی حقوق ادا کرنے سے انسان بری الذمہ ہوجاتا ہے

سوال:167

ایک شخص نے کسی ادارے میں کام کیا، وہاں سے کچھ مال چرالیا اور اسی ادارے میں نوکری کے دوران بھی پورا وقت نہیں دے پایا۔ مالک کو وقت نہ دینے کے بارے میں معلوم تھا، مگر وہ تنخواہ دے دیا کرتا تھا۔ اب وہ شخص اس ادارے کو ایک ایسی چیز دے رہا ہے، جس سے اس ادارے کو بھرپور فائدہ پہنچے گا، مثال کے طور پر اس شخص نے اس ادارے سے =/200000 دو لاکھ روپے کا مال غائب کیا اور وہ بہت توبہ بھی کرتا ہے اور اس ادارے کے سامنے اپنے اس گناہ کا اظہار کرے گا تو بہت رُسوائی کا سامنا ہوگا۔ اب جب کہ وہ شخص

اس ادارے کو اگر وہ جو چیز دینا چاہتا ہے، اس کے بدلے کوئی ایسے الفاظ کے ساتھ حیلۂ شرعی کرلے کہ اس کا یہ معاملہ عزت کے ساتھ حل ہوجائے۔
برائے مہربانی جتنا ممکن ہو آسان رہنمائی فرمائیں۔

سوال:168

گناہ کے سبب جن لوگوں کی رقم کھالی یا چرالی اب ان لوگوں سے معافی مانگنا چاہتا ہے، برائے مہربانی ان سے کس طرح معاف کروایا جائے یا معافی مانگی جائے کہ عزت بھی بنی رہے اور کام بھی ہوجائے اور وہ لوگ معاف بھی کرسکتے ہیں، برائے مہربانی کچھ ایسے الفاظ کا شرعی حیلہ بتائیں کہ اس سے کہا جائے اور وہ معاف کردیں، (محمد ندیم قادری، بلاک 6 لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ
ترجمہ: ''بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی بات پھیلے، ان کیلئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے، (النور:19)''۔
اگرچہ قرآن مجید میں ''فاحشہ'' اور ''فحشاء'' کا لفظ بطور استعارہ کے بالعموم زنا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، لیکن اس سے عام بے حیائی اور برائی اور اخلاقِ ذمیمہ بھی مراد ہیں، لہٰذا اس آیت کی رو سے گناہ، برائی، اور بدی کی اشاعت اور اظہارِ گناہ ازروئے قرآن معیوب اور ناپسندیدہ فعل ہے، یہی وجہ ہے کہ قومِ لوط کے جرم کی قبح و شناعت کو عیاں کرنے کیلئے قرآن نے فرمایا کہ: وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ
ترجمہ: ''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا، بے شک تم بے حیائی کا کام

کرتے ہو، جو تم سے پہلے جہان والوں میں سے کسی نے نہیں کیا، کیا تم (قانون فطرت کے خلاف) مردوں سے شہوت پوری کرتے ہو اور راہزنی کرتے ہو اور تم اپنی مجلسوں میں اعلانیہ برے کام کرتے ہو، (العنکبوت:28,29)''۔

ان آیات میں قومِ لوط کے اعمال بد کا یہ رخ اجاگر کیا کہ وہ منکر، بے حیائی اور بدی کو چھپا کر کرنے کے بجائے، اس کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور اس کو ذریعۂ تفاخر سمجھتے تھے، اور یہ کیفیت تب پیدا ہوتی ہے، جب کسی معاشرے میں اجتماعی ضمیر مر جاتا ہے، بدی کی قوتیں غالب آجاتی ہیں اور خیر کی قوتیں مغلوب ہو جاتی ہیں، یعنی بدی کا اعلان و اظہار اس کی شناعت و قباحت میں اضافے کا باعث ہے، شریعت کی اصل روح یہ ہے کہ ''بدی'' کو حتی الامکان مستور رکھا جائے، حدیث پاک میں ہے:

(1) عن یزیدبن نعیم عن ابیه ان ماعزاً اتی النبی ﷺ فاقرعندهٗ اربع مراتٍ فامربرجمه وقال لهزال لوسترتهٗ بثوبک کان خیرالک، قال ابن المنکدران هزالا امرماعزاً ان یاتی النبی ﷺ فیخبرهٗ۔

(ترجمہ): یزید بن نعیم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ماعز نے نبی ﷺ کے پاس حاضر ہو کر اپنے جرم (زنا) کا چار بار اعتراف کیا، تو آپ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا، اور آپ ﷺ نے ہزال سے فرمایا: کاش کہ تم نے اس کے جرم کی پردہ پوشی کی ہوتی یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا، ابن منکدر کہتے ہیں کہ ہزال نے ماعز کو کہا تھا کہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہو کر انہیں اپنے گناہ کے بارے میں بتائے، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:43784377، مطبوعہ مؤسسۃ الریان، بیروت)''۔

(2) عن عبداللّٰه بن صفوان عن ابیه انه نام فی المسجدو توسدرداءهٗ فاخذ من تحت راسه۔ فجاء بسارقه الی النبی ﷺ ۔ فامر به النبی ﷺ ان یقطع۔ فقال صفوان یا رسول اللّٰه! ،لم اردهذا، ردائی علیه صدقة، فقال رسول ﷺ "فهلا قبل ان تاتینی به"۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن صفوان نے اپنے والد (صفوان) سے روایت کیا کہ وہ مسجد میں اپنی چادر کا تکیہ بنا کر سوئے ہوئے تھے کہ (کسی شخص نے) ان کے سر کے نیچے سے (چادر چرالی)، تو وہ اپنے چور کو پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے، حضور نے (اعتراف جرم کے بعد) اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا، تو (اس موقع پر) صفوان نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرا ارادہ یہ نہیں تھا (کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے)، میری یہ چادر اس پر صدقہ ہے (یعنی اسے معاف کر دیجئے)، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تو تم نے مقدمہ میرے پاس لانے سے پہلے ایسا کیوں نہ کر دیا''، (سنن ابن ماجہ:2595)''۔

چونکہ ''حد شرعی'' کا مقدمہ جب قاضی کے سامنے پیش ہو جائے تو پھر اعتراف جرم یا گواہوں کے ذریعے جرم ثابت ہونے کے بعد مقدمہ واپس نہیں لیا جا سکتا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے حد نافذ فرما دی، لیکن آپ نے اس بات کو پسند فرمایا کہ مدعی، قاضی کی عدالت میں مرافعہ سے پہلے اپنے قصوروار اور ملزم کو معاف کر دے اور اس کی ستر پوشی کرے۔ بلکہ اسلام نے مسلمان کی ستر پوشی کو بہت بڑی نیکی قرار دیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(1) من ستر مسلما ستره الله یوم القیمه۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیوب کو (اپنی عفو و مغفرت اور رحمت میں) مستور فرمائے گا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:2442)''۔

(2) من رأی عورة اخیه فسترها کمن احیا موؤدة۔

ترجمہ: ''جس شخص نے اپنے (کسی دینی بھائی) کے عیب کو دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی، تو وہ (اللہ تعالیٰ کے ہاں) اس شخص کی مانند اجر پائے گا، جس نے کسی زندہ در گور بچی کو (نکال کر) اسے (نئی) زندگی عطا کر دی ہو، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث 4855)''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین و شریعت کی اصل روح یہ ہے کہ خطا کار کی پردہ پوشی کی جائے، الا یہ کہ کسی خاص صورت حال میں شریعت کا تقاضا اس کے برعکس ہو۔ اب صورت

مسئولہ میں چونکہ آپ پر اللہ کا کرم ہوا اور آپ نے ماضی کی معصیت کی زندگی کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور حقوق العباد کی جو حق تلفی آپ سے ہوئی ہے، آپ اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں، تو یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ''ستار العیوب'' ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں اور جتنا مال آپ نے ادارے یا افراد کا ناحق لیا ہے، اتنی مالیت آپ ان کو لوٹا دیں، اس طرح کہ وہ اس پر مالکانہ تصرف کرسکیں، خواہ آپ اسے عطیہ کا نام دیں، ہبہ کا نام دیں یا اعانت کہیں، جو بھی حالات کے تحت مناسب ہو، ان کو یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ آپ نے ان کا اتنا مال ناجائز طریقے سے لیا تھا۔ اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہیں کہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنے ظلِّ رحمت اور اپنے حبیب کریم ﷺ کے دامان رحمت میں پناہ عطا فرمائے اور دنیا و حشر میں رسوائی سے محفوظ فرمائے۔ اور ان افراد سے یہ کہیں کہ مجھے احساس ہے کہ دانستہ یا نادانستہ مجھ سے آپ کی حق تلفی ضرور ہوئی ہوگی، خواہ آپ کو یاد ہو یا نہ ہو، میری ان سب تقصیرات کو معاف فرمادیں تاکہ میں اپنے ضمیر کو مطمئن کرکے اور احساس گناہ کے بوجھ سے ہلکا ہوکر سفرِ حج پر روانہ ہوسکوں اور اللہ تعالیٰ کے اس اجر و ثواب کا یقینی امیدوار بن سکوں، جو رسول اللہ ﷺ نے حج مبرور کیلئے بیان فرمایا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: (ویبرأ بردھا ولو بغیر علم المالک) فی "البزازیة" غصب دراھم انسان من کیسه ثم ردھا فیه بلا علمه برئ۔

ترجمہ: ''اور (جس نے کسی کی کوئی چیز غصب کرلی ہو یا باطل طریقے سے لے لی ہو تو) اسے مالک کے علم میں لائے بغیر اسے لوٹا دینے سے وہ غاصب بری الذمہ ہوجائے گا، اور ''بزازیہ'' میں ہے کہ ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کی کچھ رقم، اس کے پرس سے نکال لی اور پھر اسے بتائے بغیر واپس رکھ دیا (یا اسے لوٹا دیا) تو وہ بری الذمہ ہوجائے گا، (ردالمحتار علی الدرالمختار: جلد:9، ص:219,220، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ولو ساله سلطان عن فاحشة وقعت منه سرا کزنا او شرب

فله ان يقول ما فعلته لان اظهارها فاحشة اخرى۔

ترجمہ: ''اگر حاکم کسی شخص سے اس کے جرم کے متعلق پوچھے، جو اس نے چھپا کر کیا ہے، جیسے شراب پینا یا زنا کرنا، تو اس کیلئے جائز ہے کہ وہ یہ کہے کہ یہ کام میں نے نہیں کیا، چونکہ بے حیائی کا اظہار بھی بے حیائی ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار: جلد:9،ص:525، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی

سوال: 169

والدہ کے انتقال کے بعد میرے چھوٹے بھائی طارق نے مجھ پر غلط قسم کے الزامات لگائے اور میرے بچوں سے تمام بات کی، مجھے بعد میں معلوم ہوا تو میں نے اس سے پوچھا اس بات پر میرے ساتھ مار پیٹ کی جھگڑا بڑھ گیا اس کی بیوی نے بھی میرے ساتھ تشدد کیا۔ جب میرے بیٹے عرفان کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھوا کر مجھ سے کہا کہ تم حلفیہ قسم کھاؤ کہ اب اپنے بھائیوں اور بہنوں سے واسطہ نہ رکھو گی، اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی۔ اب آپ شرع ،حدیث کی روشنی میں بتائیں کہ یہ قسم کیسے توڑی جائے گی؟، (جہاں آراء، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

آپ نے اپنے سوال میں لکھا ہے: ''جب میرے بیٹے عرفان کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھوا کر مجھ سے کہا کہ تم حلفیہ قسم کھاؤ کہ اب اپنے بھائیوں اور بہنوں سے واسطہ نہ رکھو گی، اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی''، اس میں آپ کے قسم کھانے کا کہیں ذکر نہیں ہے، اور ''اگر رکھو گی تو میرے مرے کا منہ دیکھو گی'' یہ شرعی قسم کے کلمات نہیں ہیں، لغو کلمات ہیں، اگرچہ بندۂ مومن کو اس طرح کے کلمات ادا نہیں کرنے چاہئیں۔ لہٰذا اگر آپ کا سوال درست ہے، حقیقت واقعہ کے مطابق ہے تو اس سے شرعاً قسم منعقد نہیں ہوئی، آپ اپنے بھائیوں سے مل سکتی ہیں، اس میں کوئی کفارہ عائد نہیں ہوتا، اور آپ کے

بیٹے کو بھی اپنے ماموں سے ملنا چاہئے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''لا یحلّ لرجلٍ أن یھجر أخاہ فوق ثلاث لیالٍ''۔
ترجمہ: ''مؤمن کیلئے یہ جائز نہیں کہ اپنے (دینی) بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق (Boycoh) کرے''، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6077)''۔
نیز آپ کے بھائی نے اگر غلط الزامات لگائے ہیں تو انہیں بھی آپ سے اور اللہ سے معافی مانگنی چاہئے۔

پرائز بانڈز اور شیئرز کا شرعی حکم

سوال: 170
کیا Shares اور Prize Bond کا رکھنا جائز ہے؟، (کامران، کراچی)۔

جواب:
جن اداروں / کمپنیز کے کاروبار میں سودی لین دین شامل ہے یا کسی حرام چیز کا کاروبار ہے، تو اس کے شراکتی حصص (Shares) رکھنا یا اس کا شراکت دار بننا جائز نہیں ہے، اور جن اداروں / کمپنیز کے کاروبار میں سودی لین دین شامل نہیں ہے یا وہ شرعی طور کسی ممنوع و حرام چیز کا کاروبار نہیں ہے، تو اس کا شراکت دار (Share Holder) بننا جائز ہے۔ انعامی بانڈز (Prize Bond) کی خرید و فروخت اور ان پر ملنے والا انعام جائز ہے، بانڈ پر درج قیمت (Face value) پر خرید و فروخت میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے، البتہ اس کی انعامی رقم کے جواز پر علماء کا اختلاف ہے، ہمارے علماء اہلسنت وجماعت کے نزدیک یہ انعامی رقم لینا جائز ہے، اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے، میں ماضی میں ایکسپریس کے صفحات پر اس موضوع پر قدرِ تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں، یہ اختلاف فقہی دلائل کی بنیاد پر ہے، یہ مسلکی نوعیت کا، اصولی یا اعتقادی اختلاف نہیں ہے۔ دورِ حاضر کے ایسے مسائل جو ''مجتہد فیہ'' ہیں، یعنی جن پر اس عہد کے اہلِ فتویٰ اور اہلِ علم نے دلائل شرعیہ کی روشنی میں جواز یا عدم جواز کا حکم لگانا ہوتا ہے، اور علماء کی فقہی آراء ان

بارے میں مختلف ہوتی ہیں، تو ایسی صورت میں عامۃ المسلمین کو میرا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ جن علماء کی فقاہت اور اجتہادی اہلیت پر انہیں زیادہ اعتماد ہو، ان کی رائے پر عمل کرلیا کریں، لیکن یہ ترجیح دیانت کی بنیاد پر ہو محض اتباعِ نفس میں نہ ہو۔

ٹریفک سگنل توڑنے کا شرعی حکم

سوال:171

ٹریفک سگنل جو کہ عوام کی بھلائی کے لئے بنایا گیا ایک قانون ہے اور عمومی طور پر اس کی پاسداری عوام میں نظر نہیں آرہی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا سگنل کا توڑنا گناہِ کبیرہ میں شمار ہوتا ہے؟ (کامران، کراچی)۔

جواب:

اسلام نے حلال وحرام کی حدود مقرر کردی ہیں، جن امور کی حرمت قرآن وسنت میں منصوص ہے، وہ قطعی ہیں ان کی حرمت پر اجماع ہوچکا ہے، ان کے بارے میں مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے باقی ایسے تمام امور جو اپنی اصل کے اعتبار سے تشریعی نہیں ہیں، ان کے بارے میں ہمارا مسلّمہ فقہی اصول ہے کہ: ''اشیاء میں اصل اباحت ہے'' تاوقتیکہ کسی دلیل شرعی سے اس کی حرمت ثابت نہ ہوجائے۔ ان مباح امور کا دائرہ کافی وسیع ہے، ان کے بارے میں حاکم وقت (اس کی حیثیت حاکمہ حالات وزمانہ کے اعتبار سے جو بھی ہو)، مقننہ (Legislature) یا پارلیمنٹ کو اجتماعی مفاد میں قانون سازی کا حق حاصل ہے، ''Traffic Signal'' یا یکطرفہ ٹریفک، دائیں یا بائیں مڑنے کی ممانعت یا پارکنگ کی ممانعت سب قوانین اسی کے ذیل میں آتے ہیں، حکومت عوامی مفاد اور انسانی زندگی کو نقصان یا ہلاکت سے بچانے کے لئے تعزیر بھی مقرر کرسکتی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: لان طاعة الامام فيماليس بمعصية واجبة ۔

''یعنی ایسے امور میں حاکم وقت کی اطاعت، جن میں ازروئے شریعت معصیت لازم نہ آتی ہو، واجب ہے، اور ترک واجب گناہ صغیرہ ہوتا ہے، مومن کو ویسے بھی عزت نفس کا پاس

رکھنا چاہئے"۔

کامرس یا اکاؤنٹنگ کی تعلیم میں سودی اندراج

سوال:172

کالجوں میں عام طور پر حساب وکتاب کے حوالے سے سود کا درج کرنا اور اس کو وصول کرنا وغیرہ وغیرہ سکھایا جاتا ہے، کیا اس کی لکھت پڑت جائز ہے حالانکہ یہ عمل صرف سکھانے کی حد تک ہوتا ہے؟ اور یہ بھی بتائیں کہ کیا اس کا سکھانا گناہ کے کس درجے میں ہوگا (کبیرہ/صغیرہ)؟، (کامران، کراچی)۔

جواب:

حصولِ علم کی حد تک یہ جائز ہے، کیونکہ کامرس، اکاؤنٹینگ اور آڈٹنگ کے نصابی وتربیتی کورسز کا یہ لازمی حصہ ہوتے ہیں، سودی کاروباری ادارے میں ملازمت جائز نہیں ہے۔

بجلی کی چوری

سوال: 173

آپ جانتے ہوں گے کہ عموماً حکومت کے محکموں کی نااہلی کی وجہ سے جیسا کہ بجلی کے بل جو کہ صارف کو بھیجے جاتے ہیں ان میں بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ بل بنا کر بھیج دیا جاتا ہے، جبکہ اس پر اتنا بل لازم نہیں ہوتا وہ صارف اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے بجلی کے میٹر میں کچھ کمی بیشی کرواتا ہے اگرچہ قانوناً یہ جرم ہے لیکن مجبوری میں ایسا کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟، ناجائز ہونے کی صورت میں صارف اس رقم کی ادائی کس طرح کرے جو کہ چوری کی تھی اور اس چوری کے دوران جتنی عبادات کی تھیں کیا وہ سب ثواب سے محروم ہوگئیں؟ یا ان کا لوٹانا واجب ہے؟، (کامران، کراچی)

جواب:

بجلی کے میٹر میں ردوبدل کرنا خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور یہ شرعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح بجلی کے محکمے کا میٹروں کو تیز کر کے صارفین سے زائد بل لینا، یہ بھی

خیانت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی صریح خلاف ورزی ہے کہ: لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ ترجمہ: ”آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ (النساء:29)“۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی کا ظلم ہمارے لئے ظلم کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، یہ شیطان کے بہکاوے اور تزویرات ہیں، جو انسان کے نفس کو گناہ پر آمادہ کرنے کے لئے ہوتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ﴿١٤﴾ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ﴿١٥﴾۔ ترجمہ: ”بلکہ انسان اپنے نفس (کے حسن وقبح اور خیر وشر) پر خوب آگاہ ہے، خواہ وہ (فریبِ نفس کے لئے) کتنے ہی عذر تراشتا رہے، (القیامۃ:15-14)“، اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے: إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿٤﴾ ترجمہ: ”ہر نفس اپنے اوپر نگہبان ہے، (الطارق:4)“۔ حدیث پاک میں ہے: عن النواس بن سمعان أن رجلاً سأل رسول الله ﷺ عن البر والاثم " فقال النبی ﷺ : "البرُّ حسن الخلق، والاثم ماحاک فی نفسک و کرهت أن يطلع عليه الناس "۔

ترجمہ: ”نواس بن سمعان بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ (کی پہچان) کی بابت دریافت کیا، تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے، اور برائی وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے (یعنی جس پر تمہارے دل میں چبھن اور کسک محسوس ہو) اور تجھے یہ بات ناگوار ہو کہ لوگوں کو اس کا پتہ چل جائے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:2389)“۔

حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو قبل اس کے کہ وہ اپنے دل کی بات کہتے، رسول اللہ ﷺ نے اس کے دل کا حال بیان کرتے ہوئے خود ہی فرمایا: کہ تم نیکی اور گناہ کی بابت پوچھنے آئے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، پھر آپ نے فرمایا: اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھو، نیکی وہ ہے، جس پر تمہارے دل کو اطمینان وقرار نصیب ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تمہیں دل میں تردُّد ہو (کہ کروں یا نہ کروں)، اگرچہ لوگ تمہیں

(اپنے من پسند) فتوے دیتے رہیں، (مسند احمد، جلد 4، ص:228)''۔

عبادات اور دعاؤں کی قبولیت پر محرمات کا اثر پڑتا ہے اور اس سلسلے میں احادیث موجود ہیں: عن ابن عمر، عن النبی ﷺ قال: "لا تقبل صلاۃ بغیر طھور، ولا صدقۃ من غلول "۔ ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) طہارت کے بغیر نماز مقبول نہیں اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:1)''۔

عن ابی ھریرۃ قال :قال رسول اللہ ﷺ : "ایھاالناس ! ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا۔ وان اللہ أمرالمؤمنین بما امربہ المرسلین۔فقال: ﴿یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ﴾وقال : ﴿یاایھا الذین امنو ا کلوا من طیبات مارزقنکم ﴾ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر ۔ یمد یدیہ الی السماء۔ یارب! یارب! ومطعمہ حرام ، ومشربہ حرام، وملبسہ حرام وغذی بالحرام ،۔ فانی یستجاب لذالک ؟۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! بے شک اللہ صرف پاک (صدقات کو) مقبول فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اسی بات کا حکم دیا ہے، جس کا حکم رسولوں کو دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے رسولو! پاکیزہ رزق میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو بیشک تم جو بھی عمل کرتے ہو، مجھے اس کا بخوبی علم ہے، (المؤمنون:51)''۔ پھر آپ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ غبار آلود ہے، بال پراگندہ ہیں، طویل سفر کر کے آیا ہے، اور اپنے ہاتھ دعا کے لئے آسمان کی طرف پھیلا کر پکارتا ہے: اے میرے پروردگار، اے میرے پروردگا! اور اس کا کھانا حرام کا ہے، پینا حرام سے ہے اور لباس حرام کا ہے اور اسے حرام ذرائع سے غذا دی جاتی ہے، تو کیسے اس کی دعا قبول ہو گی، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2308)''۔

انجکشن کے ذریعے جانوروں کی افزائشِ نسل کا جواز

سوال:174

جانوروں کی نسل بڑھانے کے لئے انجکشن لگانے والا طریقہ جائز ہے یا نہیں؟،
(اسد رؤف بلوچ، کراچی)۔

جواب:

جانوروں کی افزائشِ نسل (Breeding) کے لئے نَر جانور (Male Animal) کے مادّۂ منویہ (Semon) کے تولیدی جرثومے (Sperm) کو انجکشن کے ذریعے مادّہ جانور (Female Animal) کی بچہ دانی (Uterus) میں پہنچانا جائز ہے، اس کے نتیجے میں حلال جانوروں (بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، اونٹنی وغیرہ) کے جو بچے پیدا ہوتے ہیں، وہ بھی حلال ہوتے ہیں، ان کی قربانی بھی ہر قسم کی کراہت سے پاک ہے اور جائز ہے۔ احکامِ شرعیہ اور رشتۂ ازدواج اور عقدِ نکاح کی حِلّت (Permission) اور حُرمت (Prohibition) کے احکام کا تعلق انسانوں سے ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نعمتِ عقل عطا کر کے خیر و شر اور حلال و حرام میں تمیز کا ملکہ اور فطری استعداد اور جبلّت بھی عطا فرمائی ہے اور انبیاء کرام و رُسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور کتبِ سماوی کے ذریعے خارجی ہدایت کا بھی اہتمام فرمایا ہے، جانور احکام کے مکلّف نہیں ہیں۔

روحانی علاج کی شرعی حیثیت

سوال:175

روحانی علاج کا حکم قرآن پاک سے ثابت ہے۔تو قرآن پاک اور حدیث کی روشنی میں اور مستند کتابوں کے حوالوں سے روحانی علاج کا شرعی حکم کیا ہے؟۔

سوال:176

روحانی علاج جو کہ کلامِ الٰہی سے کرتے ہیں اور اس کا ہدیہ مبارک لیتے ہیں یہ جائز ہے؟ تو قرآن پاک اور حدیثوں کے حوالوں سے او مستند کتابوں کے حوالے سے فتویٰ

عنایت فرمائیں، تاکہ ہماری دینی اصلاح ہوجائے۔(صوفی محمد اقبال قادری چشتی ناصری جلالی، مکان 135/10 سیکٹر 11/D نیو کراچی)۔

جواب:

کسی کے لئے دعائے خیر، آیاتِ الٰہی یا کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنا یا اسمائے مبارکہ اور آیات لکھ کر تعویذ کی صورت میں باندھنا یا لٹکانا شرعاً جائز ہے۔امراض جس طرح جسمانی وطبعی ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی، اخلاقی اور اعتقادی بھی ہوتے ہیں، اس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے''شافی الامراض بالذات'' صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی مشیت کے بغیر شفاء کا ملنا ناممکن ہے، لیکن یہ عالم اسباب ہے اور ہم شرعاً اسباب کو اختیار کرنے کے مکلف ہیں یا یہ کہ اسباب کا اختیار کرنا جائز ہے۔جیسے بیماری کی صورت میں ہم ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں اور دواؤں کا استعمال کرتے ہیں، لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ طبیب کی تشخیص اور دوا کی تاثیر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔اسی طرح دعا، دم اور تعویذ وغیرہ ازالۂ مرض وشر کے روحانی اسباب ہیں جیسے دوا مادی سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

ترجمہ:''اور ہم قرآن میں ایسی چیز نازل فرماتے ہیں جو اہل ایمان کے لئے (وسیلہ) شفا ورحمت ہے اور ظالموں کے لئے تو صرف نقصان ہی میں اضافہ کررہا ہے۔(بنی اسرائیل:82)''۔

اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ قرآن اخلاقی اور اعتقادی امراض کے لئے شفا ہے، تاہم جمہور مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ آیات قرآنی پڑھ کر دم کرنے یا آیات واسمائے الٰہی کا تعویذ باندھنے سے اللہ تعالیٰ جسمانی امراض سے بھی شفا عطا فرماتا ہے۔بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد اور مسند احمد میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ابوسعید خدری نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا اور ایک شخص جو بچھو کے کاٹنے سے تڑ[illegible] نے اس پر بکریوں کا

ریوڑ معاوضہ بھی لیا۔لیکن صحابہ کا آپس میں اختلاف ہوگیا کہ آیا یہ اجرت، جسے آج کل کی اصطلاح میں نذرانہ کہتے ہیں، جائز ہے یا نہیں؟ لہٰذا انہوں نے توقف کیا اور مدینہ طیبہ پہنچ کر حضور ﷺ سے اس کا شرعی حکم دریافت کیا تو آپ نے نہ صرف اسے جائز قرار دیا بلکہ فرمایا کہ اس میں سے مجھے بھی دو۔ یہ بعض مواقع پر حضور ﷺ اس لئے کرتے تھے تاکہ صحابہ کرام کو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ آیات قرآنی اور کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنے (نظر بد یا موذی جانوروں کے ایذا یا جنات وغیرہ کے اثر یا مرگی کے دورے سے تحفظ کے) کا ثبوت و جواز متعدد احادیث مبارکہ اور رسول اللہ ﷺ کے اپنے عمل مبارک سے بھی ثابت ہے۔ لیکن یہ قرآن مجید کی ضمنی اور اضافی برکات ہیں۔ بنیادی طور پر قرآن مجید کتاب ہدایت اور ضابطہ عمل ہے جس پر ایمان بھی ضروری ہے اور اس کے احکام پر عمل بھی اور قرآن پاک کی اسی جہت کو غالب حیثیت حاصل ہے۔ جن احادیث مبارکہ میں تعویذ یا دم کی ممانعت آئی ہے وہ اس پر محمول ہے کہ (1) وہ دم یا منتر کلمات شرک و کفر یا کلمات ضلالت پر مشتمل ہو اور (2) یا یہ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کو فراموش کر کے محض اسباب کو موثر بالذات مانے۔ بلاشبہ موثر بالذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اسباب میں تاثیر اسی نے پیدا فرمائیں اور وہ جب چاہے اسے سلب فرما سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حوالہ جاتِ بالا سے روحانی علاج اور اس پر ہدیہ و نذرانہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

لام الہی سے ۔

ن پاک اور حدیثوں کے حوالوں سے

﴿متفرق﴾

والدین کی خدمت کے وسیلے سے دعا کرنے پر اجرِ آخرت باطل نہیں ہوتا

سوال:177

کسی نے بتایا تھا کہ والدین کی خدمت کا بہت اجر ہے۔سوال یہ ہے کہ'' اگر ہم اس خدمت کے واسطے سے دعا کریں، تو اس کا اجر کم تو نہیں ہوگا، کہ یہاں مل جائے تو آخرت میں اللہ کہے کہ اجر تو دنیا میں ہی لے لیا ہے، اب میرے پاس کیا لینے آئے ہو''۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں،(حماد خان، بذریعہ ای میل معرفت روزنامہ ایکسپریس)۔

جواب:

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔ ترجمہ:''اے ایمان والو! صبر ونماز (کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ کی) مدد طلب کرو، (البقرۃ:153)''۔اس ارشادِ باری تعالیٰ سے معلوم ہوا کہ اعمالِ خیر کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے استعانت کا وسیلہ بنایا جاسکتا ہے، آیت میں صبر اور نماز کا ذکر ہے اور بعض مفسرین کرام نے صبر سے روزہ مراد لیا ہے۔ظاہر ہے کہ وہی عمل خیر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول وماجور ہے جو دنیوی صلہ وستائش کی تمنا کئے بغیر محض اجرِ آخرت اور رضاءِ الٰہی کے لئے کیا جائے اور حدیثِ مبارک ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' یعنی اعمال (پر جو جزا مرتب ہوتی ہے اس کا) مدار (اس کی) نیت اور ارادے پر ہوتا ہے (جو اس عمل کا محرّک بنتی ہے)، سے بھی یہی مراد ہے۔اور اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۔ترجمہ:''اور انہیں فقط اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس حال میں کریں کہ اطاعت خالص اسی کی ذات کے لئے ہو، (البینۃ:5)''۔

حدیث پاک میں ہے: امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن ابی اوفیٰ

سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جسے اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کے کسی بندے سے کوئی حاجت درپیش ہو تو اسے چاہئے کہ وضو کرے اور نہایت اچھے طریقے سے وضو کرے، پھر دو رکعت نماز نفل (صلوٰۃ الحاجت) پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کی ثنا پڑھے، پھر نبی ﷺ پر درود پڑھے اور پھر یہ دعا پڑھے: لَآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، اَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ، وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ ،وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ، وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ، لَا تَدَعْ لِيْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ، وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ، وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًا اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ۔

ترجمہ: ''اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، بہت بُردبار نہایت کرم فرمانے والا ہے، اللہ (ہر عیب اور نقص سے) پاک ہے، عرش عظیم کا مالک ہے، تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، اے اللہ! میں تجھ سے (ان اعمالِ خیر کی توفیق چاہتا ہوں) جو تیری رحمت کا باعث ہوں، اور ایسے نیک پختہ ارادوں کا طلب گار ہوں جو تیری مغفرت کا سبب بنیں، اور تجھ سے تمام نیکیوں کی توفیق کا سوال کرتا ہوں اور ہر گناہ سے حفاظت کا طلبگار ہوں، (میرے) ہر گناہ کو بخش دے، ہر غم (اور رنج والم) میں کشادگی عطا فرما، اے سب سے بڑے رحم فرمانے والے! میری ہر اُس حاجت کو پورا فرما جو تیری رضا کا باعث ہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:479)''، اس حدیث کو امام ترمذی نے ضعیف قرار دیا ہے، لیکن فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیثیں بھی معتبر ہوتی ہیں۔ اسی طرح صحیح بخاری رقم الحدیث:2215 میں تین آدمیوں کے غار میں پھنس جانے کا ذکر ہے اور پھر وہ باہمی مشورے سے باری باری اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ان نیک اعمال کا ذکر کرتے ہیں، جو انہوں نے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کئے تھے، ان میں سے ایک شخص نے ماں باپ کی اس خدمت کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا، جو اس نے رضاءِ الٰہی کے لئے کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کے اعمالِ خیر کے وسیلے کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمایا اور وہ چٹان جس

نے ان کی غار کا دہانہ بند کر دیا تھا اور وہ اس میں پھنس کر رہ گئے تھے، آہستہ آہستہ سرکتی گئی اور آخر کار غار کا دہانہ کھل گیا اور وہ صحیح سلامت باہر نکل آئے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جو عملِ خیر انجام دیا جائے، اس کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے استعانت (مدد مانگنے) کا خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکم فرمایا ہے، یہ صیغۂ امر کے ساتھ ہے جو کم درجے میں استحباب کے معنیٰ میں ضرور ہے۔ اسی طرح قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کی ترغیب دی گئی ہے، کوئی بھی نیک عمل جو رضاءِ الٰہی کے لئے کیا گیا ہو، اس کے وسیلے سے دعا مانگنا، خواہ عذابِ آخرت سے نجات کی دعا ہو، یا کسی دنیوی مصیبت سے نجات کی، اس سے اس عملِ خیر کا اجرِ آخرت ضائع نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس کی امید قائم رکھنی چاہئے، اسی طرح آپ نے سوال میں جو والدین کی خدمت کی بابت دریافت کیا ہے، اگر اس کے وسیلے سے کسی دنیوی مصیبت کو ٹالنے کی دعا کی جائے، تو اس سے اس کا اجر باطل نہیں ہوتا بلکہ قائم رہتا ہے، بشرطیکہ والدین کی یہ خدمت کسی دنیوی طمع وغرض سے نہ کی ہو بلکہ صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لئے کی ہو۔

پرائیویٹ اسکولوں / کالجوں میں ایامِ تعطیلات کی فیس کا شرعی حکم
قوم کا اصل مسئلہ طبقاتی نظامِ تعلیم ہے

سوال: 178

کچھ عرصہ قبل نیو کراچی میں ایک مفتی صاحب حلال وحرام کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اسکولوں میں چونکہ ماہ جون اور جولائی میں تدریس نہیں ہوتی لہٰذا ان مہینوں کی فیس لینا اسکول والوں کے لئے جائز نہیں۔ مفتی صاحب کی تقریر نے اس علاقہ میں اسکول مالکان کے لئے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ قانون کے مطابق اسکولوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسٹاف کو جون اور جولائی کی تنخواہیں پوری پوری ادا کریں، مزید یہ کہ جو اسکول کرائے کی عمارتوں میں قائم ہیں انہیں ان مہینوں کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر جون، جولائی کی فیسیں وصول

نہیں کی جائیں تو اسٹاف کی تنخواہ اور دیگر اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟ جناب سے التماس ہے کہ اس مسئلے پر روشنی ڈالیں اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمائیں، (انتظامیہ نالج انگلش اسکول، 25/12 سیکٹر 5-E نیو کراچی)

جواب:

معاہدات وعقود بعض مشروط ہوتے ہیں اور یہ زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اس سے بعد میں کوئی تنازع پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسکول کی انتظامیہ کو چاہئے کہ داخلہ فارم کی شرائط میں واضح طور پر لکھ دے کہ طالب علم کو بارہ ماہ کی فیسیں پوری ادا کرنی ہونگی۔ سالانہ تعطیلات اس لئے نہیں ہوتیں کہ اسکول کی انتظامیہ یا اساتذہ پڑھانا نہیں چاہتے، بلکہ ان تعطیلات کا نظام حکومت کی طرف سے جبری ہوتا ہے اور یہ ایک عالمی روش ہے۔ اگر داخلہ فارم کے معاہدے میں لکھا نہ بھی ہو تب بھی یہ معہود (Under stood) ہوتا ہے اور فقہی قاعدہ ہے کہ "المعہود کالمشروط" یعنی یہ ایک ایسی شرط ہے جو فریقین کے ذہن میں بھی تقریباً طے شدہ ہے اور خارج میں بھی تعاملِ عام (General practice) اسی پر ہے۔ لہٰذا اسکولوں کے لئے ایامِ تعطیلات کی فیس لینا جائز ہے اور اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس تنازع کے حل کے لئے فریقین یہ بھی کر سکتے ہیں کہ سالانہ بارہ ماہ کی فیسوں کی جو مجموعی رقم بنتی ہے، اسے دس ماہانہ قسطوں میں تقسیم کر دیں اور اس طرح تعطیلات کے مہینوں کے بارے میں یہ نزاع پیدا ہی نہیں ہوگا۔ اور یہ بات بھی درست ہے کہ اسکول کی انتظامیہ کو اپنے عملے کو بارہ ماہ کی تنخواہ دینی ہوتی ہے، اور اسی طرح بلڈنگ کا کرایہ اور دیگر واجبات بھی ادا کرنے ہوتے ہیں، لہٰذا مفتی صاحب کا حقائق کو معلوم کئے بغیر اس پر حرمت کا فتویٰ لگانا درست نہیں ہے، البتہ ان اعلیٰ کیٹگری کے تعلیمی اداروں کے خلاف آواز اٹھانا درست ہے، جو غیر معمولی فیسیں اور مختلف عنوانات کے تحت دیگر رقوم بھی بٹورتے ہیں، جس کی وجہ سے تعلیم صنعت بن چکی ہے، بلکہ یہ سب سے کامیاب اور منافع بخش صنعت ہے، اور یہی سبب ہے کہ اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے صرف اُمراء، صنعت کاروں، اعلیٰ

مراتب کے بیوروکریٹ اور اہلِ ثروت کے بچوں کے لئے مختص ہوکر رہ گئے ہیں۔اور اس طرح تموّل وغربت پر مبنی یہ ایک طبقاتی نظام بن چکا ہے،جس میں دولت سے محروم طبقات استحقاق،اہلیت،محنت اور قابلیت کے باوجود وافر دولت نہ ہونے کے سبب مواقع سے محروم رہ جاتے ہیں،اولین مرحلے ہی میں حاکم ومحکوم کی منزلیں جدا ہو جاتی ہیں۔

استخارہ کا مفہوم،شرعی حیثیت اور استخارہ کے نام پر ماضی کے احوال بتانا

سوال:179

استخارہ کا معنی ومفہوم کیا ہے اور حدیث کی روشنی میں اس کا صحیح طریقہ کیا ہے،کیا ہر معاملے میں استخارہ کرنا ضروری ہے،کسی کام سے پہلے استخارہ نہ کرنے والا یا استخارہ کرنے کے بعد اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کر سکے،تو گنہگار تو نہیں ہوگا؟، (منور احمد نعیمی،ملیر کالونی،کراچی)۔

جواب:

استخارہ کے لفظی معنٰی ہیں: خیر طلب کرنا اور اس کے جامع معنٰی ہیں: وہ معاملہ جس کے نفع بخش یا نقصان دہ ہونے کا انسان اپنی عقل کی روشنی میں فیصلہ نہ کر سکے اور تردُّد میں مبتلا ہو جائے کہ اسے کروں یا نہ کروں،تو اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرے،اس کا تعلق ماضی کے معاملات سے نہیں ہے،مستقبل میں درپیش ایسے معاملات سے ہے،جن کو کرنا ہے۔ایسے تمام معاملات جن کا خیر ہونا،شریعت میں ثابت ہے،ان کے لئے استخارہ نہیں کیا جائے گا،جیسے نماز،روزہ،حج اور جہاد وغیرہ،فارسی کا مقولہ ہے ع درکارِ خیر حاجتِ استخارہ نیست۔ہاں البتہ کسی کارِ خیر کے لئے شریعت میں وقت مقرر نہیں ہے بلکہ توسُّع ہے،تو تعیینِ وقت کے لئے استخارہ کر سکتے ہیں۔بنیادی طور پر استخارہ مباح امور میں ہوتا ہے،جیسے نکاح اپنی اصل کے اعتبار سے مشروع ہے اور سنت ہے اور بعض اشخاص کے لئے ان کے بشری احوال کے مطابق واجب کے درجے میں ہے،لیکن نکاح کے لئے کس کا انتخاب کیا جائے، اس کے لئے اگر کوئی پیغام یا پیشکش آئے،تو اس کے لئے استخارہ کیا جا سکتا ہے،حدیث

پاک میں ہے:

عن جابر رضی اللّٰہ عنہ قال کان النبی ﷺ یعلمنا الاستخارۃ فی الامور کلھا کالسورۃ من القرآن اذاھم احدکم بالامر فلیرکع رکعتین من غیر الفریضۃ ثم یقول اللھم انی استخیرک بعلمک وأستقدرک بقدرتک وأسئلک من فضلک العظیم فانک تقدر ولااقدر، وتعلم ولااعلم، وانت علام الغیوب، اللھم ان کنت تعلم ان ھذاالامر خیر لی فی دینی ومعاشی وعاقبۃ امری۔او قال فی عاجل امری واٰجلہ۔ فاقدرہ لی وان کنت تعلم أن ھذاالامرشرلی فی دینی ومعاشی وعاقبۃ امری اوقال فی عاجل أمری واٰجلہ فاصرفہ عنی واصرفنی عنہ واقدرلی الخیر حیث کان ثم ارضنی بہ ویسمی حاجتہ۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ہمیں تمام امور میں ''استخارہ'' کی تعلیم فرماتے تھے، اس اہتمام کے ساتھ، جیسے قرآن کی کسی سورت کی تعلیم فرمایا کرتے تھے، (تو استخارہ یہ ہے کہ) جب تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے، تو اسے چاہئے کہ دو رکعت نفل پڑھے، پھر کہے: اے اللہ! میں تیرے علم کی روشنی میں خیر کی طرف رہنمائی چاہتا ہوں، اور تیری قدرت سے (حصولِ خیر کے لئے) قدرت کا طلبگار ہوں اور میں تیرے فضلِ عظیم سے سوال کرتا ہوں، کیونکہ تو قدرت والا اور میں عاجز و بے بس ہوں، اور تو (ہر معاملے کے انجام کو) جانتا ہے، اور میں کچھ بھی نہیں جانتا اور تو تمام غیبی امور کا بہت زیادہ جاننے والا ہے، اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ معاملہ (جو مجھے درپیش ہے)، میرے دین، میرے معاش اور انجامِ کار کے اعتبار سے، اور فوری اور دیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے بہتر ہے، تو تو اسے میرے لئے مقدر فرما۔ اور (اے اللہ!) اگر تو جانتا ہے کہ یہ معاملہ (جو مجھے درپیش ہے)، میرے دین، میرے معاش اور انجامِ کار کے اعتبار سے، فوری اور دیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے برا ہے، تو اسے مجھ سے دور کردے اور مجھے اس سے دور کردے، اور (اس کے بدلے میں) خیر جہاں بھی ہے، وہ میرے لئے

مقدر فرما، پھر اس پر میری طبیعت کو راضی کر دے (یعنی مجھے اس کے بارے میں قلبی اطمینان اور قرار و سکون نصیب ہو جائے کہ بس یہی میرے لئے خیر ہے)، اور "ہذا الامر" (یعنی یہ معاملہ) کے بجائے (چاہے تو) اپنی حاجت کا نام لے کر دعا کرے (جیسے شادی، کاروبار، کسی کے ساتھ شراکت وغیرہ، الغرض جو بھی مسئلہ درپیش ہو، اس کا نام لے)، (صحیح البخاری، جلد 4 ص: 2004، رقم الحدیث: 6382 مطبوعہ المکتبۃ العصریہ، بیروت)۔ اس حدیث کو امام مسلم کے سوا محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے، مثلاً امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام بیہقی وغیرھم۔

"علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ومنها ركعتاالاستخارة۔

اور ان مستحب نمازوں میں دو رکعت نماز استخارہ ہے، اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی الحلیة ویستحب افتتاح هذالدعاء وختمه بالحمدلة والصلوٰة وفی الاذکار انه یقرء فی الرکعة الاولیٰ الکافرون وفی الثانیة الاخلاص وعن ، بعض السلف انه یزید فی الاولی "وربک یخلق ما یشاء ویختارُ ط ماکان لهم الخیرة ط سبحٰن الله وتعلیٰ عما یشرکونo وربک یعلم ماتکن صدورهم وما یعلنون" وفی الثانیة وماکان لمؤمن ولامؤمنة۔الایه۔ وینبغی ان یکررها سبعاکما روی ابن السنی یاانس اذاهمت بأمر فاستخر ربک فیه سبع مرّات ثم انظر الی الذی سبق الیٰ قلبک فان الخیر فیه ولو تعذرت علیه الصلوٰة الستخارة باالدعاء ا ه ملخصاوفی شرح الشرعة المسموع من المشائخ انه ینبغی ان ینام علی طهارة مستقبل القبلةبعد قرا ء ة الدعاء المذکورفان رایٰ فی منامه بیاضا او خضرة فذالک الامر خیر وان رایٰ فیه سوادا أو خمرة فهو شر ینبغی ان یجتنب اه۔

اور "حلیہ" میں ہے اور اس دعاء استخارہ کی ابتدا اور آخر میں حمد و صلوٰۃ پڑھنا مستحب ہے، اور

''الاذکار'' میں ہے: پہلی رکعت میں سورۂ ''الکافرون'' پڑھے اور دوسری میں سورۂ ''اخلاص''،اور بعض بزرگوں سے روایت ہے کہ پہلی رکعت میں ''وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۗ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ (القصص:69-68) تک ان کلمات کا اضافہ کرے اور دوسری رکعت میں سورۂ احزاب، آیت:36 کا اضافہ کرے۔(اور اگر درپیش مسئلہ کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں قلبی اطمینان حاصل نہ ہوتو) سات دن تک مسلسل یہ نماز پڑھے، جیسا کہ ابن السّنی نے روایت کیا ہے: (ترجمہ:) ''اے انس:! جب تو کسی کام کا ارادہ کرے، تو اپنے رب سے اس میں سات بار رہنمائی کی دعا کرتا رہ، پھر غور و فکر کر کہ تیرے دل میں جو بات قرار پا گئی ہے (یعنی اس کام کا کرنا یا نہ کرنا)، بس خیر اسی میں ہے''، اور اگر اس کے لئے نماز پڑھنا دشوار ہو تو صرف دعا کر کے استخارہ کر لے، (یہ ''اذکار'' کی عبارت کا) خلاصہ ہے، اور ''شرح الشرحۃ'' میں ہے کہ (ہم نے اپنے) مشائخ سے سنا ہے کہ مذکورہ دعا پڑھنے کے بعد باوضو ہو کر قبلہ رو سو جائے، اگر اپنی خواب میں سفید یا ہرا رنگ دیکھے تو سمجھ لے کہ اس میں خیر ہے، (اور اس کام کو کر لے) اور اگر کالا یا سرخ رنگ دیکھے تو سمجھ لے کہ اس میں شر ہے، پھر اس کام سے اجتناب کرے، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد نمبر 2 صفحات 410-409 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حدیث پاک میں خواب میں کسی چیز کے نظر آنے یا نہ آنے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی خواب کا آنا ضروری ہے، یہ بزرگوں اور اہلِ خیر کے اپنے اپنے تجربات ہیں، لیکن اگر خواب نظر آجائے، تو اس سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مگر اصل چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرنے کے بعد جب دل کو کسی ایک جانب سکون وقرار نصیب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے اس کام کو کر لے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں کسی ناکامی کا سامان ہو، تو یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کو سمجھنے میں مجھ سے خطا ہو گئی ہے، اور یا یہ سمجھے کہ اگر

اس کے برعکس کیا ہوتا تو ممکن ہے کہ (خدانخواستہ) اس سے بڑی ناکامی یا نقصان کا سامنا کرنا پڑتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَسٰٓی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ۔

ترجمہ: ''ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے حق میں ناپسندیدہ سمجھو، (مگر) وہ (درحقیقت) تمہارے حق میں بہتر ہو اور (یہ بھی) ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے لئے پسندیدہ سمجھو (مگر درحقیقت) وہ تمہارے لئے بری ہو، (البقرۃ:216)''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک دعا کسی نازل شدہ مصیبت کے لئے بھی مفید ہے (کہ اگر وہ صبر وتحمل کا پیکر بن کر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتا رہے، تو اللہ تعالیٰ اس مشکل سے اسے نجات دے دے گا یا صبر وتحمل پر اسے اجر عظیم سے نوازے گا)، اور ان مصیبتوں کے لئے بھی دعا مفید ہے، جو ابھی نازل نہیں ہوئی ہیں (یہ دعا ان کے لئے ردِّ بلا کا سبب بن جائے گی)، سو اے اللہ کے بندو! دعا کو اپنا لازمی شعار بناؤ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی، ص:195)۔ صرف نبی کا خواب یا الہام ''حُجّتِ قطعیہ'' ہوتا ہے۔ اور غیر نبی کا خواب یا الہام ایک ظنّی امر ہے، لہٰذا اگر کسی نے کسی مسئلے میں استخارہ کرلیا اور کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کیا، تو اس سے گنہگار نہیں ہوگا، نہ ہی اس پر کوئی وبال آئے گا۔

''استخارہ'' کی روح یہ ہے کہ جس بندے کو کوئی مسئلہ درپیش ہے، وہ خود استخارہ کرے، کیونکہ جتنا درد، شکستگیِ دل، حضوریٔ قلب، تضرّع وعاجزی کسی شخص کو اپنے معاملے میں ہوسکتی ہے، دوسرے شخص کو نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں ہے: رب ذوالجلال فرماتا ہے: ترجمہ: میں ان کے پاس ہوتا ہوں، جو میری (خشیت ومحبت اور انکسار کی) وجہ سے شکستہ دل رہتے ہیں، (الاسرار المرفوعہ، رقم الحدیث:249، کشف الخفاء ج1 ص:232، الشفاء قاضی عیاض مالکی ج1 ص:78)''۔

جو شخص اپنے درپیش مسئلے میں پانچ سات بار عاجزی سے اپنے رب کے حضور التجا اور طلب خیر ودعا کے لئے ذہنی، فکری اور عملی طور پر آمادہ نہ ہو، وہ استخارے کی روح اور حقیقت کو سمجھا

ہی نہیں۔ باقی وہ لوگ جو استخارے کے نام پر ماضی کے احوال بتاتے ہیں کہ کسی پر کالا جادو ہوگیا ہے، سفلی عمل کردیا گیا ہے، چند سیکنڈ میں یہ تمام غیبی امور ان پر منکشف ہوجاتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں ان کا حل بھی نکل آتا ہے، اس کا مجھے علم نہیں ہے، اس سے لوگ توہم پرستی اور تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں، تقدیرِ الٰہی پر رضا جو مومن کا شعار ہونا چاہئے، اُس میں کمزوری واقع ہوتی ہے۔ پھر لوگ کسی مشکل صورتِ حال میں، جب انہیں کوئی فیصلہ کن راہ سجھائی نہ دے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے براہِ راست رجوع کرنے اور اس کے حبیبِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے توسُّل کے بجائے، اِس روش کو ترک کرکے، اِس طرح کے عاملوں سے رجوع کرتے ہیں۔ استخارہ تو مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرنے کا نام ہے۔

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ درپیش معاملات اور مباح امور میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لئے یا کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں استخارہ کرنا افضل اور مستحب ہے، لیکن یہ واجب نہیں ہے کہ نہ کرنے پر گنہگار ہوگا۔ اور ویسے کسی مسئلے کے بارے میں دستیاب معلومات اور قرائن وشواہد کی روشنی میں یا اہلِ فن واہلِ نظر اور اہل اللہ سے مشورہ کرنے کے بعد ذہن میں یہ امر واضح ہوجائے کہ یہ کام کرلینا چاہئے، تو اللہ پر توکل کرکے کرلے، اور اللہ تعالیٰ سے اس میں کامیابی اور سرخ رو ہونے کی دعا کرتا رہے۔

قیامِ تعظیمی کا شرعی حکم

سوال:180

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کسی محفل میں اگر کوئی بڑی عمر کا فرد یا بزرگ آجائے تو اپنی جگہ سے تعظیم کے طور پر اٹھنا نہیں چاہئے، کیا یہ ٹھیک ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اپنی مجلس میں تشریف لاتے تھے اور محفل میں موجود لوگ (صحابہ) تعظیما اٹھتے تھے تو نبی پاک ﷺ انہیں منع فرماتے تھے؟۔ (سید عابد علی، انچارج ڈی پی ڈپارٹمنٹ، روزنامہ ایکسپریس کراچی)

جواب:

اس موضوع پر گفتگو سے پہلے چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

عن سعد قال: سمعت أبا امامة قال: سمعت أبا سعيد الخدري رضي الله عنه يقول: نزل أهل قريظة على حكم سعد بن معاذ، فأرسل النبي ﷺ الى سعد فأتى على حمار، فلما دنا من المسجد قال للانصار: "قوموا الى سيّدكم ـ أو خيركم ـ فقال: "هؤلاءِ نزلوا على حكمك"۔فقال: تقتل مقاتلتهم، وتسبى ذراريهم، قال: "قضيت بحكم الله ـ وربّما قال: بحكم المَلِكِ"۔

ترجمہ: ''حضرت سعد فرماتے ہیں کہ میں نے ابو امامہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ: حضرت سعد بن معاذ کے حکم پر بنی قریظہ قلعہ سے نیچے اتر آئے تھے، پس نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد کو بلوایا، وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے کے لئے دراز گوش (گدھے) پر سوار ہو کر آئے، پس جب وہ مسجد کے قریب پہنچے، تو آپ نے انصار سے فرمایا: اپنے سردار یا اپنے بہترین فرد کے لئے (احتراماً) کھڑے ہو جاؤ۔ پھر آپ نے فرمایا: یہ لوگ تمہارے فیصلے پر قلعہ سے اتر آئے ہیں (اب ان کا فیصلہ کردو)، انہوں نے کہا: ان کے جو افراد لڑنے کے قابل ہیں، وہ قتل کردیئے جائیں اور ان کے اہل وعیال کو قیدی بنا لیا جائے۔ آپ نے فرمایا: تم نے حکمِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور کبھی آپ یہ فرماتے کہ یہ ایک بادشاہ (یا سردار) کے فیصلے کے مطابق ہے، (صحیح بخاری رقم الحدیث:4122، صحیح مسلم، رقم الحدیث:4515)''۔

امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ ایک طویل حدیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عن عائشة أم المؤمنين قالت: مارأيت احدا أشبه سمتًا ودلًّا وهديا برسول الله في قيامها وقعودها من فاطمة بنت رسول الله ﷺ۔ قالت وكانت :اذا دخلت على النبي ﷺ قام اليها فقبّلهاوأجلسها في مجلسه، وكان النبي ﷺ اذا دخل عليها قامت من مجلسها فقبّله وأجلسته في مجلسها(الحديث)۔

ترجمہ: ''ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ سے زیادہ کسی کو رسول اللہ ﷺ کی عاداتِ مبارکہ کے مشا نہیں دیکھا۔ جب حضرت فاطمہ نبی ﷺ کے پاس جاتیں، تو آپ ان کے لئے (از شفقت) کھڑے ہوجاتے، پھر ان کو بوسہ دیتے اور انہیں اپنی جگہ بٹھاتے، اور جب نبی ﷺ حضرت فاطمہ کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ (احتراماً) اپنی نشست سے کھڑی ہوجاتیں، پھر آپ کو بوسہ دیتیں اور آپ کو اپنی جگہ بٹھاتیں، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 3872، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 5175)''، اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے (الادب المفرد، ص: 204)۔

امام بخاری نے ''قیام الرجل لاخیہ'' کا باب قائم کیا ہے اور اس کے تحت حضرت سعد والی حدیث کے علاوہ مندرجہ ذیل حدیث بیان کی ہے:

امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن کعب کی روایت سے غزوۂ تبوک میں کعب بن مالک کی توبہ کی قبولیت کی تفصیلی حدیث بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں: واذن رسول اللہ ﷺ بتوبة اللہ علینا حین صلیٰ صلاۃ الفجر فتلقانی الناس فوجاً فوجاً یھنونی بالتوبة یقولون لتھنک توبۃ اللہ علیک حتی دخلت المسجد فاذا برسول اللہ ﷺ حولہ الناس فقام الیّ طلحة بن عبیداللہ یھرول حتی صافحنی وھنانی۔

ترجمہ: ''اور جب رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی تو ہماری توبہ کی قبولیت کا اعلان کیا، تو پھر صحابہ مجھے (قبولیتِ) توبہ پر فوج درفوج مبارک باد دینے لگے، وہ کہتے تھے اللہ کی بارگاہ میں تمہیں توبہ کی قبولیت مبارک ہو، یہاں تک کہ میں مسجد میں داخل ہوا، تو (منظر کچھ یوں تھا کہ) رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور آپ کے گرد صحابۂ کرام موجود تھے، اِس موقع پر طلحہ بن عبیداللہ کھڑے ہوئے دوڑ کر آئے، مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 4418، الادب المفرد، ص: 243)''۔

امام بیہقی لکھتے ہیں:

عن ابی ہریرۃ قال: کان رسول اللہ ﷺ فی المسجد یحدثنا فاذا قام قمناقیاماً حتی نراہ وقد دخل بعض بیوتِ ازواجہ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں ہم سے گفتگو فرمارہے تھے، پھر جب آپ کھڑے ہوئے تو ہم بھی (احتراماً) کھڑے ہوگئے، یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ آپ اپنی ایک زوجۂ مطہرہ کے گھر میں داخل ہوگئے، (المدخل الی السنن الکبریٰ للبیہقی، رقم الحدیث: 717، مکتبہ دار الخلفاء، کویت)''۔

قیامِ تعظیمی کے بارے میں اور بھی روایات ہیں، ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تعظیماً واحتراماً بزرگوں اور بڑوں کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے۔ اور صحابۂ کرام سے خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے لئے قیامِ تعظیمی ثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا بلکہ خود حضرتِ سعد کے لئے احتراماً صحابۂ کرام کو کھڑے ہونے کا حکم فرمایا۔ ہمارے ہاں قومی ترانے کے موقع پر سب کھڑے ہوجاتے ہیں، یہ بھی احترام کی ایک صورت ہے اور مسلّمہ بین الاقوامی اقدار میں سے ہے اور کسی مکتبۂ فکر کے کسی عالم نے اسے شرک وبدعت قرار نہیں دیا۔ قومی سیرت کانفرنس کے موقع پر جب صدرِ مملکت یا وزیرِ اعظم تشریف لاتے ہیں تو ہال میں موجود تمام مکاتبِ فکر کے جید علماء احتراماً کھڑے ہوجاتے ہیں اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ حال ہی میں سعودی عرب کے نائب وزیرِ مذہبی امور کراچی کے ایک مقامی ہوٹل میں ایک دعوت میں تشریف لائے تو دیوبندی واہلحدیث مکاتبِ فکر کے تمام علماء نے کھڑے ہوکر ان کا استقبال کیا اور مصافحہ ومعانقہ کیا۔

بعض روایات میں قیامِ تعظیمی سے منع فرمایا گیا ہے، لیکن یہ ممانعت علی الاطلاق نہیں ہے، ان کا محمل اور مصداق جدا ہے۔ ذیل میں ہم ان احادیث کو ذکر کر کے ان کے محامل بیان کریں گے۔

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں :عن ابی امامة قال: خرج علینا رسول الله ﷺ متوکئاً علیٰ عصیً، فقمنا الیه فقال: لاتقوموا کما تقوم الاعاجم یعظم بعضها بعضًا۔

ترجمہ:ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عصا پر ٹیک لگائے ہوئے ہمارے پاس تشریف لائے ،ہم آپ کے لئے کھڑے ہوگئے ،تو آپ نے فرمایا: عجمیوں کی طرح مت کھڑے ہو، جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے تعظیماً کھڑے ہوتے ہیں ،(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:5187)"۔

یہ حدیث اس درجے کی نہیں ہے، جو ہم نے قیامِ تعظیمی کے جائز و مستحب ہونے کے بارے میں ذکر کی ہیں ،جن میں رسول اللہ ﷺ سے قیام کا حکم ثابت ہے،خود آپ کا بھی قیام فرمانا ثابت ہے اور حضرتِ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابۂ کرام کا آپ کے لئے قیام ثابت ہے،جس میں آپ نے اس قیامِ تعظیمی پر کوئی نکیر نہیں فرمائی ،نہ کسی ناگواری کا اظہار فرمایا۔قیامِ تعظیمی کی ممانعت کی یہ حدیث ضعیف ہے،اس کی سند میں اضطراب ہے،اس کے راوی مجہول ہیں اور اس میں اُس قیام کی ممانعت ہے جو عجمیوں کی طرح ہو،جس میں ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا رہتا ہے اور باقی ہاتھ باندھے تعظیماً کھڑے رہتے ہیں۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں :عن جابر قال : اشتکی النبی ﷺ فصلینا وراء ہ وھو قاعد وابو بکر یسمع الناس تکبیرہ ، فالتفت علینا فرانا قیاماً فاشار الینا فصلینا بصلاته قعوداً فلما سلم قال ان کدتم لتفعلوا فعل فارس والروم یقومون علی ملوکھم وھو قعودھم فلا تفعلوا۔

ترجمہ:" حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ: نبی ﷺ بیمار ہوگئے ،آپ نے بیٹھ کر ہمیں نماز پڑھائی ،حضرت ابوبکر آپ کے مکبّر کے فرائض انجام دے رہے تھے (دورانِ نماز) آپ ہماری جانب متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ ہم سب (آپ کی اقتدا میں) کھڑے ہوکر پڑھ رہے ہیں،آپ نے ہمیں (بیٹھنے کا) اشارہ فرمایا، پھر ہم بیٹھ گئے، پھر ہم نے بیٹھ کر آپ کی

اقتدا میں نماز ادا کی، پھر جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا: مجھے خدشہ ہے کہ تم اہلِ روم اور فارس کی طرح کام کرنے لگو گے کہ ان کے بادشاہ بیٹھے رہتے ہیں اور وہ ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں، پس تم ایسا نہ کرو، (الادب المفرد، ص:144)''۔

ابتدا میں فرض نماز بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت تھی، یہ حدیث اسی سے متعلق ہے، بعد میں بلا عذر فرض نماز بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت منسوخ ہوگئی۔

قرآن وسنت سے کسی حکم کے اثبات کا عادلانہ طریقہ یہ ہے کہ اس حکم سے متعلق تمام آیات واحادیث کو پیشِ نظر رکھ کر نتیجہ اخذ کیا جائے، ایک ہی مسئلے کے بارے میں ثبوت وممانعت کے احکام میں اگر ممکن ہے تو تطبیق کی جائے، مواضع ثبوت کو الگ واضح کیا جائے اور مواضع منع کو الگ واضح کیا جائے، دونوں کی توجیہ اور محمل بیان کیا جائے یا اگر ایک منسوخ ہے اور دوسرا ناسخ تو دلائل سے واضح کیا جائے۔

ہماری رائے میں قیامِ تعظیمی کے جواز واستحباب اور ممانعت کی حدیثوں کو ہم یکجا کر کے دیکھتے ہیں تو مندرجہ ذیل قیامِ تعظیمی کی صورتیں جائز ہیں:

(1) مشائخ، اساتذہ، علمائے دین، والدین اور محسن ومربی کی تعظیم کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(2) کوئی شخص فی نفسہٖ تو قیامِ تعظیمی کے لائق نہیں ہے، لیکن کسی دینی مصلحت کے تحت بطور مدارات اس کے لئے قیام کرنا جائز ہے۔

(3) محض دنیوی مفاد کی خاطر بطور مداہنت وخوشامد کسی شخص کے لئے قیام تعظیمی مکروہ تحریمی ہے۔

(4) جو شخص سفر سے واپس آئے، اس کے استقبال کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(5) کسی شخص کو کوئی نعمت ملی ہو اس کو مبارک باد دینے کے لئے قیام کرنا مستحب ہے۔

(6) کسی شخص کو کوئی مصیبت پہنچی ہو تو اس کی تعزیت کے لئے قیام کرنا بھی مستحب ہے۔

(7) عہدِ رسالت کے عجمیوں کے طریق پر قیام کہ ایک شخص بادشاہ بن کر بیٹھا ہو اور

دوسرے مستقل ہاتھ باندھے کھڑے ہوں، ایسا قیام مکروہِ تحریمی ہے، کیونکہ یہ اکرام انسانیت کے منافی ہے۔

(8) جو شخص بطورِ تکبر اپنے لئے قیام کرائے یا اس کے تکبر میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کے لئے قیام کرنا مکروہ ہے۔

(9) اگر کوئی مجلسِ ذکر یا درس وتدریس جاری ہو تو کسی آنے والے بزرگ کے لئے اسے معطل نہیں کرنا چاہئے اور ایسے موقع پر قیام فی نفسہٖ اپنے جواز کے باوجود مناسب نہیں ہے۔

ان میں سے بعض اقسام کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے قاضی ابوالولید ابن الرشد مالکی کے حوالے سے بیان کیا ہے اور بعض اقسام کو علامہ بدرالدین عینی حنفی نے بیان کیا ہے اور ان تمام صورتوں کو علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد: خامس میں یکجا کیا ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نیاز کا مفہوم اور جواز

سوال: 181

نیاز کا مطلب اور مفہوم سمجھائیں اور کیا نیاز کا کرنا جائز ہے؟، (کامران، کراچی)

جواب:

سب سے پہلے معروف اردو لغات کے حوالے سے لفظ نیاز کے معنی ملاحظہ کیجئے:

نیاز: تبرُّک، تحفۂ درویشاں، نذر بھینٹ چڑھاوا، منت، التجا (فیروز اللغات) آرزو، غنا، میل، خواہش، اظہارِ محبت، عاجزی، مسکینی، انکسار، تحفۂ درویش، تبرُّک، درود فاتحہ، بھینٹ چڑھاوا، منت، التجا (فرہنگ آصفیہ جلد 4)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لغت میں نیاز کے متعدد معانی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ: ''بھینٹ چڑھاوا'' (یعنی وہ عمل جو اللہ تعالیٰ کے تقرُّب، رضا اور بندگی کے علاوہ کسی اور کے تقرُّب کے لئے کیا جائے، خواہ مالی صدقہ ہو یا قربانی) اس معنی میں اس کا استعمال غیر اللہ کے لئے جائز نہیں ہے، ہمارے ہاں عرف میں ''نیاز'' جن معانی میں استعمال ہوتا ہے،

وہ یہ ہیں: تبرُّک، درود فاتحہ وغیرہ مثلاً کہا جاتا ہے کہ: ''یہ گیارہویں شریف کی نیاز ہے''، یعنی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے ایصالِ ثواب اور فاتحہ کا کھانا ہے، اسے بزرگانِ دین کی نسبت سے تبرُّک بھی کہہ دیتے ہیں، اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، علم معانی کا مُسلَّمہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی ''ذو معنیٰ'' کلمہ ہے، تو اس کے معنی کا تعین قائل کے اعتبار سے ہوتا ہے، مثلاً کافر کہے کہ: ''انبت الربیع البقل'' موسم بہار نے سبزہ اگایا، یہ کلمہ اگر کافر کہے تو کلمۂ کفریہ ہوگا، اور اگر یہی کلمہ مومن کہے تو کلمۂ توحید ہوگا، کیونکہ مومن کا ایمان اس امر کی دلیل ہے کہ وہ حقیقت میں اگانے والا اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو مانتا ہے، بارش اور بہار کو سبب مانتا ہے، اس کو اسناد مجازی کہتے ہیں، جو روز مرہ گفتگو میں ہم استعمال کرتے رہتے ہیں، مثلاً کوئی شخص کہتا ہے کہ مجھے فلاں دوا سے شفا ملی، حالانکہ اس کا ایمان ہے کہ دوا وسیلۂ شفا ہے، اصل شفا دینے والا اللہ ہے۔

رجب کے کونڈے اور ''تبارک'' کی روٹیاں

سوال:182

(1) ہمارے ہاں بعض لوگ رجب کی بائیس تاریخ کو ''کونڈے'' (جو ایک خاص قسم کی سوجی، میدے اور دودھ کی میٹھی ٹکیہ ہوتی ہے) پکاتے ہیں، یہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے نام پر نیاز ہوتی ہے، ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ رات کو پکائے جاتے تھے اور ایک خاص جگہ بٹھا کر کھلائے جاتے تھے، انہیں باہر نہیں نکالا جاتا تھا، بعض جگہ اس موقع پر ''عجیب داستان'' کے نام سے ایک کتابچہ بھی پڑھا جاتا تھا، جس میں لکڑ ہارے کی منظوم داستان ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بعض لوگ اسے ناجائز اور حرام کہتے ہیں۔

(2) رجب ہی کے مہینے میں بعض لوگ میٹھی روٹیاں پکا کر بانٹتے ہیں، انہیں ''تبارک'' کی روٹیاں کہا جاتا ہے، غالباً ان پر سورۂ ''تبارک الذی'' (سورۃ الملک) پڑھ کر ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، (محمد شمیم خاں، عزیز آباد، کراچی)۔

جواب:

22 رجب نہ امام جعفر صادق کی تاریخ پیدائش ہے اور نہ تاریخ وصال، ان کی ولادت کے بارے میں دو اقوال ہیں: (1) مشہور قول یہ ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت 17 ربیع الاوّل 80ھ (2) ماہِ رجب، لیکن تاریخ مذکور نہیں ہے۔ اسی طرح وصال کے بارے میں بھی دو قول ہیں: زیادہ معروف ماہِ شوال 148ھ ہے اور ایک قول رجب کا بھی ہے، (جلاء العیون، ملا باقر مجلسی، ج:2،ص:693)۔ لہٰذا 22 رجب کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے کوئی خاص نسبت نہیں ہے، البتہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وصال 22 رجب 60ھ ہے۔ جہاں تک ایصالِ ثواب کا تعلق ہے، یہ فی نفسہٖ مشروع ہے، مستحسن امر ہے، قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور ایصالِ ثواب کے لئے خاص قسم کی ٹکیاں یا روٹیاں پکانا لازمی نہیں ہے، میٹھی ٹکیاں یا روٹیاں بھی ایصالِ ثواب کی نیت سے بانٹی جاسکتی ہیں یا فقراء کو کھلائی جاسکتی ہیں اور کوئی دوسری صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے، البتہ یہ شرط، کہ خاص جگہ پر ہی بٹھا کر کھلایا جائے، فاسد ہے۔ ''عجیب داستان'' کے نام سے جو کتاب پڑھی جاتی ہے، اس کی بھی کوئی اصل نہیں ہے، ہاں، اگر کوئی چیز اپنی اصل کے اعتبار سے خلافِ شرع ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ختم کردیا، حدیث پاک میں ہے: عن انس قدم النبی ﷺ المدینة ولهم یومان یلعبون فیهما، فقال ماهذا ن الیومان؟، قالوا کنا نلعب فیهما فی الجاهلیة، فقال رسول الله ﷺ: دابدلکم الله بهما خیرا منهما یوم الاضحی ویوم الفطر۔

ترجمہ: ''حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو (آپ نے دیکھا کہ) اہلِ مدینہ سال میں دو دن کھیل تماشے کیا کرتے تھے، آپ نے ان سے پوچھا: یہ کیسے دو دن ہیں؟، انہوں نے جواباً عرض کیا: ہم زمانۂ جاہلیت میں ان دنوں میں کھیل کود کیا کرتے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان دو دنوں کے بدلے میں تمہیں دو بہتر دن عطا فرمائے ہیں، اور وہ ہیں، عیدالاضحیٰ اور

عیدالفطر کے دن، (مشکوٰۃ بحوالہ: سنن ابی داؤد)۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سالانہ میلے ٹھیلے کے دو دنوں کو منع فرما دیا اور فرمایا کہ ان کے عوض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عیدین کے مبارک دن عطا فرمائے ہیں۔

اس کے برعکس ایک حدیث مبارک میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما انّ رسول اللّٰہ قَدِمَ المدینۃ، فوجد الیھودَ صیامًا یومَ عاشورآء، فقال لھم رسول اللّٰہ ﷺ: ماھذالیوم الذی تصومونہٗ؟، فقالوا: ھذا یومٌ عظیمٌ اَنجی اللّٰہ موسیٰ وقومَہٗ وغَرّقَ فرعونَ وقومَہٗ، فصامَہٗ موسیٰ شکراً، فنحن نَصُومہٗ فقال رسول اللّٰہ ﷺ! فنحن اَحَقُّ واَولیٰ بموسیٰ منکم، فصامہٗ رسولُ اللّٰہ ﷺ واَمَرَ بصیامہٖ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے، تو آپ نے دیکھا کہ مدینہ کے یہود یومِ عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں، آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تم اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟، تو انہوں نے جواب دیا: یہ وہ عظیم دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم (بنی اسرائیل) کو (فرعونیوں سے) نجات دی، اور فرعون اور اس کی قوم کو (سمندر میں) غرق کردیا، تو انہوں نے (اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کے) شکر کے طور پر عاشورہ کا روزہ رکھا، تو (ان کی اتباع میں) ہم بھی (اس دن کا) روزہ رکھتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم تمہارے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام (کی سنت کی اتباع) کے زیادہ حق دار ہیں اور ہم تمہاری بہ نسبت ان سے زیادہ قربت رکھتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے خود بھی یومِ عاشورہ کا روزہ رکھا اور صحابۂ کرام کو بھی اس کا حکم فرمایا، (صحیحین بحوالہ: مشکوٰۃ)۔ ایک اور حدیث مبارک ہے:

عن ابن عباس قال حِینَ صام رَسولُ اللّٰہ ﷺ عاشورآءَ واَمَرَ بصیامہٖ قالوا یارسول اللّٰہ: اِنَّہٗ یومٌ یُعَظِّمُہٗ الیھودُ والنصاریٰ فقال رسول اللّٰہ ﷺ لَئِن بَقِیتُ

اِلٰی قابلٍ لَاَصُوْمَنَّ التاسعَ ۔

ترجمہ: '' حضرت عبداللہ بن عباس ہی سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور اسے رکھنے کا حکم دیا تو (صحابۂ کرام نے) عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم: یہ ایک ایسا دن ہے جس کی یہود ونصاریٰ تعظیم کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں آئندہ سال حیات رہا تو ضرور (یومِ عاشورہ کے ساتھ) 9 محرم کو بھی روزہ رکھوں گا، (صحیح مسلم)۔اس کی رو سے علماء فرماتے ہیں کہ دو دن کا نفلی روزہ رکھنا افضل ہے یعنی 9،10 محرم الحرام یا 10، 11 محرم الحرام۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ فی نفسہٖ شرعاً یومِ عاشورہ کی تقدیس ثابت ہے اور نفلی روزہ بھی اپنی اصل کے اعتبار سے مستحسن ہے، اس لئے آپ نے اسے برقرار رکھا اور محض یہود و نصاریٰ سے مشابہت کی بنا پر اصلاً مشروع امر کو منع نہیں فرمایا، بلکہ ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے عاشورہ کے ساتھ ساتھ 9 محرم کے روزے کو بھی شامل فرمالیا۔

علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: '' رجب میں حضرت امام جعفر صادق کو ایصالِ ثواب کے لئے پوریوں کے کونڈے بھرے جاتے ہیں، یہ جائز ہیں، اس میں جگہ کی پابندی اور نیاز کو تقسیم نہ کرنے کی پابندی بے جا ہے۔اس موقع پر ایک کتاب '' عجیب داستان'' کے نام سے پڑھی جاتی ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ نہ پڑھی جائے، فاتحہ دلا کر ایصالِ ثواب کرنا جائز ہے''، (بہارِ شریعت، حصہ شانزدہم، ص:230، مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی)۔

مولانا مفتی محمد خلیل خان برکاتی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

'' ماہِ رجب میں امام جعفر صادق کو ایصالِ ثواب کے لئے کھیر پوری پکا کر کونڈے بھرے جاتے ہیں اور فاتحہ دلا کر لوگوں کو کھلاتے ہیں، یہ جائز ہے۔ اس میں ایک بات بڑی غلط رواج پاگئی ہے کہ جہاں کونڈے بھرے جاتے ہیں، وہیں کھائے جاتے ہیں، یہ ایک غلط حرکت ہے اور یہ غیر شرعی اور جاہلانہ رسم ہے۔اور یہ ایک کتاب '' عجیب داستان'' پڑھی جاتی

ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں یہ نہ پڑھی اور نہ ہی سنی جائے، فاتحہ دلا کر ایصالِ ثواب کریں۔
اللہ کے نیک بندوں کی کرامات برحق ہیں، (سنی بہشتی زیور، حصہ سوم، ص:318)''۔
مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے کونڈوں کی شرعی حیثیت کے حوالے سے سوال ہوا، آپ نے جواب میں لکھا: ''اہلسنت کے نزدیک جیسے ہر فاتحہ جائز ہے، اسی طرح کونڈوں کی فاتحہ بھی جائز ہے، لکڑہارے کی کہانی من گھڑت ہے۔ کھانے کی ہر چیز کے متعلق ادب سکھایا گیا ہے۔ حدیث میں فرمایا: ''دستر خوان پر جو گر جائے اسے اٹھا کر کھالو''۔ فاتحہ کے کھانے پر قرآن پڑھا جاتا ہے، اس لئے مسلمان اس کا زیادہ ادب کرتے ہیں، اسی وجہ سے لوگوں نے یہ شرط لگالی کہ وہیں بیٹھ کر کھالیں، باہر نہ لے جائیں اس شرط کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں، وہاں بھی کھا سکتے ہیں اور باہر بھی لے جاسکتے ہیں، (وقار الفتاویٰ، جلد: اوّل، ص:202، بزم وقار الدین، کراچی)''۔
جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا، 22 رجب المرجب 60ھ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وفات ہے، (دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی)۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ کے معاندین اور ان سے بغض رکھنے والوں نے ان کی وفات پر (معاذ اللہ) خوشی منانے کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا اور چونکہ وہ بنی امیہ کے اقتدار کا دور تھا، اس لئے اسے پوشیدہ رکھنے کے لئے گھر کے کسی خاص گوشے میں کھلایا جاتا تھا، لیکن ہمیں اس کا کوئی تاریخی حوالہ نہیں ملا۔ اسی طرح ''تبارک الذی'' یعنی سورۃ الملک میٹھی روٹیوں پر پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا شرعاً درست ہے، بشرطیکہ اپنی طرف سے کوئی خلافِ شرع امر اس میں شامل نہ کردیا گیا ہو، کیونکہ ایصالِ ثواب فی نفسہٖ ایک مشروع اور مستحسن امر ہے، خواہ کسی خاص بزرگ کو ایصالِ ثواب کیا جائے یا تمام مومنین و مومنات کی ارواح کو، بہر صورت درست ہے۔

قیامت کے دن اعمال کا وزن کس طرح ہوگا

سوال:183

قرآن مجید میں قیامت کے دن حساب و کتاب اور سوال و جواب کے موقع پر جزا و سزا کا فیصلہ کرنے انسان کے اعمال کے وزن کئے جانے کا ذکر ہے، سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ مادّہ وزن رکھتا ہے، وزن مادّی اشیاء اور جسمانی اشیاء کا ہوتا ہے، اعمال تو غیر مادی ہیں، اگر ان کا وزن ہونا ہے تو کس طرح ہوگا، اور اگر نہیں ہوتا تو پھر قرآنی آیات و احادیث کا کیا جواب اور کیا توجیہ ہوسکتی ہے، جو نقل و روایت کے بھی مطابق ہو اور عقل سلیم کے لئے بھی قابل قبول ہو، (حارث محبوب، بٹگرام)۔

جواب:

یہ درست ہے کہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ اسی بات کا ذکر ہے کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۝۔

(1) ترجمہ: ''اور آج (قیامت) کے دن (اعمال کا) وزن برحق ہے، سو جس کے (نیکیوں کا) پلڑے بھاری ہوئے، تو وہی کامیاب ہوں گے o اور جن کی نیکیوں کے پلڑے ہلکے ہوئے، تو وہی اپنے آپ کو خسارے میں ڈالنے والے ہیں، اس سبب کہ وہ ہماری آیتوں پر ظلم کرتے تھے، (الاعراف:9-8)''۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝۔

(2) ترجمہ: ''(اے رسول!) کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں بتادوں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہیں گے o یہ وہ لوگ ہیں جن کی

کوشش دنیا کی زندگی میں رائیگاں گئی، حالانکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں o یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کے روبرو (جوابدہی کے لئے) پیش ہونے کا انکار کیا، تو ان کے سب اعمال اکارت گئے، پس ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے، (الکہف:103-105)''۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝۔

(3) ترجمہ: ''اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو رکھیں گے، تو کسی شخص پر ظلم مطلقاً نہیں ہوگا، اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوا تو ہم اس کو (حساب کے لئے) لے آئیں گے، اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں، (الانبیاء:47)''۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۔

(4) ترجمہ: ''تو جس کی نیکیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے، وہ پسندیدہ زندگی میں رہیں گے o اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کا ٹھکانا ''ہاویہ'' ہوگا، (القارعہ:6-9)''۔

چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

سمعت عبداللّٰہبن عمروان العاص یقول: قال رسول اللّٰہ ﷺ: ((ان اللّٰہ سیخلص رجلا من امّتی علی رء وس الخلائق یوم القیامۃ فینشر علیہ تسعۃ وتسعین سجلا کل سجل مثل مدالبصر، ثم یقول: اتنکر من ھذاشیئا؟ اظلمک کتبتی الحافظون؟فیقول: لایاربّ فیقول: افلک عذر؟فیقول: لایارب فیقول: بلیٰ ان لک عندنا حسنۃ فانہ لاظلم علیک الیوم، فتخرج بطاقۃ فیھا اشھد ان لاالہ الااللّٰہواشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ فیقول: احضر وزنک، فیقول: یاربّ ماھذہ البطاقۃ مع ھذہ السجلات؟ فقال: انک لاتظلم،قال: فتوضع السجلات فی کفّۃوالبطاقۃ فی کفّۃ فطاشتِ السجلات

و ثقلت البطاقة فلا یثقل مع اسم اللّٰہ شئی))۔

ترجمہ:'' عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک شخص کو قیامت کے دن برسرعام پیش فرمائے گا، اس کے (اعمال کے) 99 رجسٹر اس کے سامنے پھیلا دیئے جائیں گے، ان میں سے ہر رجسٹر حدِ نظر تک (پھیلا ہوا) ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم ان (اعمال) میں سے کسی بات کا انکار کرتے ہو؟، کیا اعمال لکھنے والے میرے محافظ فرشتوں نے تم پر ظلم کیا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا، اے پروردگار! کوئی ظلم نہیں کیا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمہارے پاس کوئی عذر ہے؟، وہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! کوئی عذر نہیں، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: کیوں نہیں، ہمارے پاس تمہاری ایک نیکی (کی امانت) ہے، کیوں کہ تم پر آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، پھر ایک چٹ (Slip) نکالی جائے گی، اس میں (کلمۂ شہادت کے یہ الفاظ لکھے ہوں گے) اشھد ان لاالہ الااللّٰہ واشھد ان محمد اعبدہ ورسولہ، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: اپنے (اعمال کے) وزن کو دیکھو، وہ عرض کرے گا: اے پروردگار! کہاں اتنے (بڑے سائز کے 99) رجسٹر اور کہاں یہ ایک پرچی (Slip)، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا، (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: (ترازو کے) ایک پلڑے میں (وہ سب) رجسٹر رکھے جائیں گے اور ایک پلڑے میں (کلمۂ شہادت کی) پرچی، (سارے کے سارے) رجسٹر ہلکے پڑ جائیں گے اور یہ ایک پرچی بھاری ثابت ہوگی، اللہ تعالیٰ کے نام سے زیادہ وزنی تو کوئی چیز نہیں ہوسکتی، (سنن الترمذی، ج:3، رقم الحدیث:2639)''

(2) ترجمہ:'' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، تمام آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے، اور ان کے درمیان ہے، اور ان کے نیچے ہے، اگر تم ان کو لے کر آؤ اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دو اور کلمۂ شہادت کو دوسرے پلڑے میں رکھ دو، تو وہ پہلے پلڑے سے بھاری ہوگا، (المعجم الکبیر، ج:12، ص:254، رقم الحدیث:

13024، دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔

ان آیات واحادیث مبارکہ اور دیگر متعدد روایات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن بندوں کے اچھے اور برے اعمال کا وزن ہوگا، اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا اور بدکار بندوں کے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ: آج (قیامت) کے دن (اعمال کا وزن (کیا جانا) حق ہے، (الاعراف:9)''۔

اب رہا یہ سوال کہ اعمال کا وزن کیسے ہوگا، وزن تو ان چیزوں کا ہوتا ہے جو مادّی وجود رکھتی ہیں، جسم رکھتی ہیں، اعمال تو اعراض ہیں (عرض اسے کہتے ہیں، جس کا اپنا مستقل بالذات وجود نہ ہو، جس کا وجود کسی دوسرے کے ساتھ قائم ہو)، یہ اپنا جسمانی وجود نہیں رکھتے، تو ان کا وزن کس طرح ہوگا۔

اس سوال کے جواب میں چند گذارشات پیش خدمت ہیں:

(1) جب اللہ جل شانہ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہوگا، تو اس پر ہمارا ایمان کامل ہونا چاہئے، اس کی حقیقت ہماری سمجھ میں آجائے تو یہ ہماری فہم ودانش کی سعادت ہے اور اگر اس کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہماری عقل کی نارسائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد حق اور سچ ہے۔

بہت سی مادّی اشیا ایسی ہیں، جن کے ماپنے کے آلات یا علم انسان کے پاس نہیں تھا، مگر سائنسی علوم کی ترقی کے ساتھ انسان ان کی پیمائش یا طاقت کا معیار ومقدار مقرر کرنے پر قادر ہوگیا اور اس نے ان کے لئے پیمائش Measurement، وزن (Weighing) یا قوت (Power)، دباؤ (pressure) یا دھکیلنے کی صلاحیت (Thrust) کا اندازہ کرنے کے لئے آلات اور پیمانے وضع کرلئے۔

مثلاً ہوا کے دباؤ (Pressure) ماپنے کے آلے کو (Barometer) کہتے ہیں، زلزلے سے زمین میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اس کے لئے ریکٹر اسکیل (Rector

Scale) ایجاد ہوا، اس کی پیائش کے آلے اور ایٹم بم کے اندر جو دھماکے کی قوت ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے (Seismo meter) ایجاد ہوا، برقی رو (Current) کی مقدار اور طاقت کا اندازہ کرنے کے لئے مخصوص اکائی (volt) اور کلوواٹ (Kilowatt) اور میگاواٹ (Megawatt) کے پیمانے ایجاد ہوئے۔ روشنی کی استعداد کا اندازہ لگانے کا آلہ Light meter یا Exposure meter, اسی طرح پانی کے دباؤ کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے (Telemeter)
آلات اور پیمانے ایجاد ہوئے، اسی طاقت سے ڈیموں اور آبشاروں (Water sheds) سے جو بجلی پیدا کی جاتی ہے، اسے Hydroelectric Power کہتے ہیں۔ مائع کی کثافت (Density) یا ثقل (Gravity) کا اندازہ لگانے کے لئے Hydrometre ایجاد ہوا۔ اعصاب یا پٹھوں (Muscle) کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے (Ergometer) ایجاد ہوا۔
الغرض بہت سے ایسی مادّی اشیاء و موجودات تھیں، جن کا یا تو انسان کو علم نہیں تھا، اور اگر علم تھا تو ان کی پیمائش، مقدار، اور قوت کا اندازہ لگانے کے لیے آلات، پیمانے اور اوزان نہیں تھے، انسان کے علم نے ترقی کی اور ان اشیاء کے قطعی تخمینے لگانے کی استعداد حاصل کرلی۔
جب انسانی دماغ اتنی ترقی کرسکتا ہے تو اس سے انسانی دماغ کے پیدا کرنے والا خالق و مالک کے علم کی لامحدودیت اور محیطِ کل ہونے کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں، وہ معقولات (ractsAbst) یعنی محض معنوی اشیاء اور مجرّدات یعنی غیر مادّی اشیاء (Immaterial) کو وزن کرنے یا ان کا اندازہ لگانے کے لئے معیار یا پیمانہ مقرر فرمادے۔
(2) ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ ان اعمال کو کوئی جسمانی صورت عطا فرمادے اور ان کا وزن ہو، اعمال خیر کو خوبصورت اجسام میں متشکل کردیا جائے اور اعمال شر کو قبیح اجسام کی صورت میں متشکل فرمادے اور ان کا وزن کیا جائے۔
(3) بعض احادیث و روایات میں ہے کہ ان صحیفوں کا وزن ہوگا، جن میں اعمال لکھے

ہوئے ہوں گے، یعنی تحریری ریکارڈ کا وزن ہوگا، جسے حدیث مبارک میں ''سِجِل'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے، حالانکہ اس پر بھی عقلی خدشہ وارد ہوسکتا ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی کے گناہوں کے رجسٹر بہت زیادہ ہوں، تو وہ بھاری ثابت ہو جائیں، لیکن ایسا بھی تو ممکن ہے کہ ان کا وزن ضخامت کے اعتبار سے نہ ہو بلکہ مندرجات (Written Material) کی کیفیت و ماہیت کے اعتبار سے ہو۔

ایصالِ ثواب کا کھانا اور صدقۂ جاریہ

ہمیں چند سوالات مختلف موضوعات پر عبدالکریم حاجی انور سالویز لمبے، ملاوی، ساؤتھ افریقہ کی جانب سے موصول ہوئے ہم انہیں قارئین کی سہولت کی خاطر ترتیب وار بیان کرتے ہیں۔

سوال:184

ہمارے ٹاؤن (افریقہ، ملاوی) کے عوام سال میں دو یا تین مرتبہ نیاز کا کھانا پکاتے ہیں، اس میں بہت سارے پیسے خرچ ہوتے ہیں، اور کھانے والے لوگ تقریباً پیسے والے ہوتے ہیں، نیاز کا کھانا کھانے کے صحیح حقدار کون ہیں، ہم مالدار لوگ کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ پیسے مرحوم کے ثواب جاریہ کے لئے دوسرے دینی کاموں میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ بہتر اور افضل طریقہ ارشاد فرمائیں۔

جواب:

''ایصالِ ثواب'' کے معنی، کسی شخص کا اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو، یہ شرعاً جائز ہے بلکہ مستحسن امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝۔

(1) ترجمہ: ''حضرت موسیٰ نے التجا کی: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے، (الاعراف:151)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۝۔

(2) ترجمہ: ''(حضرت ابراہیم نے دعا کی) اے ہمارے رب! حساب (یعنی قیامت) کے دن میری، میرے والدین اور تمام اہلِ ایمان کی بخشش فرمانا، (ابراہیم: 41)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ۔

(3) ترجمہ: ''اے ہمارے رب: ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی (بھی مغفرت) فرما، جو ہم سے پہلے وفات پاچکے، (الحشر: 10)''۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔

(4) ترجمہ: ''(حضرت نوح نے دعا کی) اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما، (نوح: 28)''۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں: ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہ کی والدہ وفات پاگئیں اور وہ اپنی والدہ کی وفات کے وقت موجود نہیں تھے، انہوں نے عرض کیا: یارسول صلی اللہ علیک وسلم! میری والدہ کا میری عدم موجودگی میں انتقال ہوگیا، (اب) اگر میں ان کی طرف سے کوئی صدقہ کروں، تو آیا نہیں فائدہ پہنچے گا؟، (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: ہاں، (حضرت سعد نے) عرض کیا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا پھلوں والا باغ اپنی والدہ کے ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ کردیا، (صحیح بخاری، ج: 1، ص 186 مطبع اصح المطابع، کراچی)''۔

ایصالِ ثواب کا ذریعہ دعاءِ مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل وعمرہ، تلاوت، اذکار، درود پاک وغیرہ، اسی طرح کھانے کا وہ اہتمام ہے، جس کا اَعراس کے مواقع پر اہتمام کیا جاتا ہے۔

سوم، چہلم یا اَعراس کے مواقع پر اجتماعی قرآن خوانی کا اہتمام ہوتا ہے، بعض مقامات پر محافلِ وعظ ہوتی ہیں اور کھانے کا بھی اہتمام ہوتا ہے، بہ ظاہر کھانے کا یہ اہتمام نفلی صدقہ

ہے، تبرُّع ہے، اور نفلی صدقہ کے طور پر جو کھانا تیار کیا جائے، اس کا کھانا اصولی طور پر امراء اور فقراء سب کے لئے جائز ہے۔

بزرگانِ دین کے ایصالِ ثواب کے لئے اَعراس کے مواقع پر جو کھانا تیار ہوتا ہے، اسے ان بزرگوں کی نسبت کی وجہ سے ''تبرُّک'' کہا جاتا ہے، یہ بھی نفلی صدقہ ہے اور امراء اور فقراء دونوں اسے کھا سکتے ہیں۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: ''سوم کے چنوں، بتاشوں کا لینا کیسا ہے؟'' آپ نے جواب دیا: ''اور سوم کے چنے بتاشے بغرض مہمانی نہیں منگائے جاتے بلکہ ثواب پہنچانے کے قصد سے ہوتے ہیں، یہ اس حکم میں داخل نہیں، نہ میرے اس فتوے میں ان کی نسبت کچھ ذکر ہے، یہ الگ مالک نے محتاجوں کے دینے کے لئے منگائے اور یہی اس کی نیت ہے تو غنی کو ان کا لینا بھی ناجائز، اور اگر اس نے حاضرین کے لئے منگائے تو اگر غنی بھی لے لے گا تو گنہگار نہ ہوگا، اور یہاں بحکم عرف ورواج عام حکم یہی ہے کہ وہ خاص مساکین کے لئے نہیں ہوتے تو غنی کا بھی لینا جائز نہیں، اگرچہ احتراز زیادہ پسندیدہ ہے، اور اسی پر ہمیشہ سے اس فقیر کا عمل ہے''۔

اسی طرح ان سے پوچھا گیا: جو کھانا بہ نیتِ خاص برائے ایصالِ ثواب خواہ بزرگانِ دین سے ہوں یا عام مسلمان، پکوایا جائے تو اس کھانے کو اغنیا کھا سکتے ہیں؟۔ آپ نے جواب دیا: ''اغنیا بھی کھا سکتے ہیں، سوائے اس کھانے کے جو موت میں بھی بطور دعوت کیا جائے، وہ ممنوع وبدعت ہے''۔

اسی طرح امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا:

جو طعام بہ نیتِ ایصالِ ثواب بروح بزرگان تقسیم کیا جاتا ہے، اس کو اغنیا بھی کھا سکتے ہیں یا نہیں؟، عام اَمواتِ مومنین کے لئے جو کھانا وغیرہ دیا جاتا ہے، اس میں اور اس طعام میں جو انبیاءِ عظام اور اولیاءِ کرام کی ارواح کے لئے ہدیہ کیا جاتا ہے، کچھ ذاتی فرق ہے یا نہیں؟، برکت وعدم برکت کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں مصرف ایک ہوگا، یعنی صرف

فقراء کو دینا یا اغنیاء کے لئے بھی کھانا جائز ہوگا۔
آپ نے جواب میں لکھا: ’’طعام تین قسم ہے: ایک وہ کہ وہ عوام ایامِ موت میں بطورِ دعوت کرتے ہیں، یہ ناجائز وممنوع ہے، اغنیا کو اس کا کھانا جائز نہیں۔ دوسرے وہ طعام کہ اپنے اموات کو ایصالِ ثواب کے لئے بہ نیت تصدُّق کیا جاتا ہے، فقراء اس کے لئے اَحَق (زیادہ حق دار) ہیں، اغنیا کو نہ کھانا چاہئے۔ تیسرے وہ طعام کہ نذرِ ارواحِ طیبہ حضرات انبیاء واولیاء علیہم الصلوٰۃ والثناء کیا جاتا ہے اور فقراء واغنیاء سب کو بطورِ تبرُّک دیا جاتا ہے، یہ سب کو بلا تکلف روا ہے اور وہ ضرور باعث برکت ہے، برکت والوں کی طرف جو چیز نسبت کی جاتی ہے، اس میں برکت آجاتی ہے، مسلمان اس کھانے کی تعظیم کرتے ہیں اور وہ اس میں مُصیب ہیں‘‘۔
اسی طرح آپ نے سوم کے چنوں کے بارے میں فرمایا: ’’یہ چنے فقراء ہی کھائیں، غنی کو نہ چاہئے، بچہ یا بڑا، غنی بچوں کو ان کے والدین منع کریں‘‘۔
گیارہویں شریف کے بارے میں سائل کے جواب میں آپ نے لکھا:
’’گیارہویں شریف اپنے مرتبۂ فَردیت میں مستحب ہے، اور مرتبۂ اِطلاق میں کہ ایصالِ ثواب ہے، سنت، اور سنت سے مراد سنتِ رسول اللہ ﷺ اور یہ سنتِ قولیہ مستحبہ ہے، (فتاویٰ رضویہ، ج:9، صفحات: 605، 609، 610، 612، 614، 615، 672، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)‘‘۔
اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ: اپنی اصل کے اعتبار سے ایصالِ ثواب کی مشروعیت قرآن وسنت سے ثابت ہے، یہ سنت قولیہ مستحبہ ہے، بزرگانِ دین کے اَعراس کے مواقع پر قرآن خوانی، تلاوت، اذکار و درود شریف، مواعظِ حسنہ اور طعام کا انتظام، یہ سب ایصالِ ثواب کی جائز صورتیں ہیں۔ عام مومنین ومومنات کے سوم، چہلم یا برسی کے موقع پر دیگر ایصالِ ثواب کی جائز صورتوں کے علاوہ طعام کا انتظام بھی اسی میں شامل ہے، اگر اس میں نذر، فدیہ اور کفارات مالی شامل نہ ہوں، تو یہ طعام (خواہ یہ ایصالِ ثواب بزرگانِ دین کے نام پر

ہو یا عام مومنین ومومنات کے نام پر) نفلی صدقہ وخیرات ہے، جسے مالدار اور فقراء سب کے لئے کھانا جائز ہے۔ اگر نذر، فدیہ اور کفارۂ مالی کا کھانا ہو، تو یہ صرف فقراء ومساکین اور مستحقین زکوٰۃ کے لئے جائز ہے، مالدار لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ بزرگانِ دین کے اعراس مبارکہ یا دیگر مواقع پر جو کھانا تیار ہوتا ہے، وہ مالدار اور فقراء سب کے لئے جائز ہے، اسے بزرگانِ دین کی نسبت سے تبرّک بھی کہا جاتا ہے، یعنی اس میں نفلی ایصالِ ثواب کی نیت کے ساتھ ساتھ ان کی نسبت کی فضیلت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

عام مومنین ومومنات کے ایصالِ ثواب کے لئے سوم کے موقع پر جو چنے تقسیم کئے جاتے ہیں، یا کھانا وغیرہ نفلی صدقہ کے طور پر تیار کیا جاتا ہے، اس کا کھانا امراء کے لئے جائز ہے، لیکن امام احمد رضا قادری نے اسے پسندیدہ امر قرار نہیں دیا، اس لئے اوپر ہم نے ان کے جو فتاویٰ نقل کئے ہیں، ان میں امراء کے لئے بعض مقامات پر جواز کا قول ہے اور بعض مقامات پر ناپسندیدگی کا، لیکن ناجائز ہونے کا قول نہیں کیا۔ لیکن ہمارے ہاں جو یہ رسم پڑ گئی ہے کہ سوم، چہلم اور برسی کے موقع پر فوت شدہ مومنین ومومنات کے ایصالِ ثواب کے لئے جو اجتماعی کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اس میں لوگ اپنے احباب اور رشتہ داروں کو جمع کر لیتے ہیں، جو تقریباً سب کے سب غنی ہوتے ہیں اور فقراء کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے، تو اس طریقہ کار کی تو بہر صورت حوصلہ شکنی ہونی چاہئے، جب کہ ولیمہ جو کہ خالص خوشی کی تقریب ہے، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ شر الطعام طعام الولیمۃ یدعیٰ لھا الاغنیاء ویترک الفقراء۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ولیمہ کا بدترین کھانا وہ ہے کہ: جس میں (صرف) مالداروں کو دعوت دی جائے اور فقراء اور ناداروں کو چھوڑ دیا جائے، (بخاری، ج:3، رقم الحدیث: 5177 المکتبۃ العصریہ، بیروت)“۔

ولیمہ کے ایسے کھانے کے بارے میں، جس میں صرف مالدار لوگ شریک ہوں اور فقراء

ونادار لوگوں کو مکمل طور پر نظر انداز کردیا گیا ہو، رسول اللہ ﷺ نے وعید فرمائی اور اسے ''شَرُّ الطعام'' (بدترین کھانا) قرار دیا، تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کے ایسے کھانے جن میں فقراء کو ترجیح دینی چاہئے یا صرف فقراء ہی کو کھلا دیئے جائیں تو افضل ہے، ان میں فقراء کو بالکل محروم کردینا میرے نزدیک غیر مستحسن امر ہے اور مقاصدِ شرعیہ کے خلاف ہے۔

ایصالِ ثواب کی مندرجہ بالا صورتوں کے فی نفسہٖ جواز کے باوجود میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایصالِ ثواب میں بھی ''صدقاتِ جاریہ'' کو ترجیح دی جائے، یعنی مصارفِ ایصالِ ثواب کی ایسی صورتیں اختیار کی جائیں، جن کا فیضان اور اجروثواب تادیر جاری وساری رہے، اور جس کے ایصالِ ثواب کے لئے یہ برسی یا چہلم کے موقع پر یہ اہتمام کیا جارہا ہے، اس کے خیر کے کھاتے کھلے رہیں اور اجروثواب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان وفات پاجاتا ہے تو اس کے اعمالِ خیر کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے، سوائے تین صورتوں کے (جن کا اجروفیضان وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے)، یعنی صدقۂ جاریہ اور علم نافع (جس کا فیضان ان کے تلامذہ کے ذریعے بدستور جاری ہے)، اور نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی رہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:1376، دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

''صدقاتِ جاریہ'' کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً (ا) مسجد کی تعمیر (ب) دینی مدارس کی تعمیر (ج) علماء وحفاظِ قرآن کی تعلیم وتربیت وکفالت (د) پانی کا کنواں کھود کر وقف کردیا (ہ) خیراتی ہسپتال بنانا، دعوتی وتبلیغی دینی لٹریچر وغیرہ۔ اپنے اموات کے ایصالِ ثواب کے لئے ''صدقاتِ جاریہ'' کو ترجیح دینی چاہئے۔ اور صدقۂ جاریہ کی ایک پسندیدہ صورت ضرورت مند لوگوں کے لئے پانی کا انتظام ہے، حدیث پاک میں ہے:

ترجمہ: ''حضرت سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ!

اُمّ سعد (یعنی میری والدہ) وفات پاگئی ہیں، تو (ان کے ایصالِ ثواب کے لئے) کنواں کھدوا کر (وقف کردیا)، اور کہا: یہ اُمّ سعد کا کنواں ہے، (سنن ابی داؤد، ج:1، ص:236)''۔

حدیث پاک سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ بندے کی طرف تصدق کی نسبت ایصالِ ثواب کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ تعبُّد وتقرُّب (یعنی بندگی اور قرابت) کی نیت سے، جیسے فیصل مسجد، شاہ جہاں مسجد وغیرہ، جب کوئی صدقہ بزرگانِ دین کی طرف منسوب ہوتا ہے، تب بھی یہی مراد ہوتی ہے، جیسے گیارہویں شریف کا بکرا، یا میری قربانی، ان سب میں بندگی اللہ تعالیٰ کی مقصود ہوتی ہے اور بندوں کی طرف نسبت کا مقصد ایصالِ ثواب ہوتا ہے۔

یومِ میلاد النبی ﷺ کی صحیح تاریخ کا تعیّن

سوال:185

اللہ کے آخری نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟ کتبِ سیرت میں 12 ربیع الاول، 9 اور 8 ربیع الاول کی روایات موجود ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟، جبکہ علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ میں لکھا ہے ربیع الاول مذکور کی تاریخوں میں دوشنبہ کا دن 9 ربیع الاول کو پڑتا ہے، ان وجوہات کی بنا پر تاریخ ولادت 20 اپریل 571ء تھی، (سیرت النبی، جلد اول، ص:173 زاہد بشیر پرنٹر، لاہور)۔ مولانا الیاس کاندھلوی لکھتے ہیں: آپ ﷺ 8 ربیع الاول کو پیدا ہوئے، (سیرت النبی، جلد 1 ص:51)۔ قاضی سلمان منصور پوری رحمۃ للعالمین میں لکھتے ہیں: آپ کی ولادت 9 ربیع الاول کو ہوئی۔

مصر کے عالم محمود پاشا فلکی نے ریاضی کے ذریعہ یہ ثابت کردیا کہ آپ کی ولادت 9، ربیع الاول کو ہوئی۔ مفتی صاحب بعد کی دو کتابوں کے حوالے میرے پاس موجود نہیں، (محمد ذیشان اصغر، گوجرانوالہ)۔

جواب:

دین میں نقل وروایت اصل اور اساس ہے۔ عقلی استدلالات، سائنسی وفنی حسابات سے ہم استفادہ تو کرسکتے ہیں، لیکن اس کی بنیاد پر نقل وروایت کی ساری اساس کو

ردنہیں کر سکتے۔ اسی روش کی بنا پر ماضی قریب اور عہدِ حاضر کے متجدّدین نے، جو اہل مغرب سے ہمیشہ مرعوب رہتے ہیں اور مستشرقین کے پروپیگنڈے سے جلد متأثر ہو جاتے ہیں، معجزاتِ انبیاءِ کرام کا انکار کیا، واقعۂ اصحابِ فیل، معجزۂ شق القمر، معجزۂ معراج النبی ﷺ اور سابق انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات کی جو روایات امت میں تعامل وتوارث کے ساتھ مسلّمہ چلی آرہی ہیں، ان کی عقلی تاویلیں شروع کردیں۔ اسی طرح ختم المرسلین رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کا یومِ ولادت باسعادت پیر بارہ ربیع الاول کو ہونا، صدیوں سے امت میں مسلّم ہے، اسے ''تلقّی بالقبول'' حاصل ہے اسی پر تعامل و توارث چلا آرہا ہے، لہٰذا اس کے لئے از سرِ نو بحث وتمحیص کا سلسلہ شروع کرنا درست نہیں ہے۔ پھر یہ کوئی اعتقادی مسئلہ نہیں ہے کہ کسی نے اس معین دن کا انکار کردیا تو شرعی قباحت لازم آئے گی یا اس کے برعکس اپنی تحقیق کی بنا پر کوئی رائے قائم کردی تو اسکے محض اس رائے کے سبب فسادِ عقیدہ لازم آجائے گا۔ آپ ﷺ کے یومِ ولادت کا متبرک ومقدس ہونا مسلّم ہونا چاہئے، تعیین پر اعتقاد ویقین ضروریاتِ شرعیہ میں سے نہیں ہے۔ جدید سائنسی وفنی علوم کی بنا پر رائے قائم کرنے والے خود بھی آپس میں متفق نہیں ہیں اور یہ حقیقت آپ کے سوال میں بھی عیاں ہے، لہٰذا ان میں سے کسی ایک پر انحصار کر کے ہم نقل وروایت اور تعامل وتوارث پر مبنی متفقہ رائے کو بدل بھی دیں، تو اختلاف کسی نہ کسی صورت میں قائم رہے گا۔ پس اصل مبحث یہ نہیں ہے کہ تاریخ کونسی تھی، اصل مرکزِ عقیدت یومِ میلاد النبی ﷺ کی تقدیس، تعظیم اور حرمت ہے اور اہلِ عقیدت ومحبت کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہمارے عہدِ حاضر کے علماء میں سے جسٹس علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف ضیاء النبی میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی، اہلِ ذوق اس کی جلد دوم، صفحات 33 تا 39 پر تفصیل سے ملاحظہ فرمالیں۔ ہمارے ایک دوسرے دینی اسکالر پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے بھی اپنی تصنیف میلاد النبی میں اس پر بحث کی ہے۔ ہم ان دونوں اہلِ علم کی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے اختصار

کے ساتھ چند دلائل کا ذکر کررہے ہیں: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ فخرِ کائنات سرورِ دوعالم ﷺ کا یومِ میلاد دوشنبہ (پیر) کا دن تھا، اس پر بھی تمام علمائے امت کا اتفاق ہے کہ ربیع الاول کا بابرکت مہینہ تھا اور متقدمین و متأخرین کا اجماع اسی پر ہے کہ تاریخِ ولادت 12 ربیع الاول عام الفیل ہے۔ بقول قاضی سلمان منصور پوری مصنف ''رحمۃ للعالمین'' یہ 22 اپریل 571 عیسوی اور ہندی مہینوں کے حساب سے یکم جیٹھ 628 بکرمی بنتی ہے۔ معروف سیرت نگار علامہ محمد رضا مصری مصنف ''محمد رسول اللہ ﷺ'' اور محمد صادق ابراہیم عرجون کی تحقیق کے مطابق سنِ عیسوی کے حساب سے 20 اگست 570 عیسوی بنتی ہے۔ علم الہیئت کے ماہر محمود پاشا فلکی مصری اور بعض دیگر متاخرین کی تحقیق 9 ربیع الاول کے حق میں بھی ہے، مگر عالمِ اسلام میں قدیم زمانے سے اجماع 12 ربیع الاول پر ہی چلا آرہا ہے اس لئے قولِ مختار کا درجہ اسی کو حاصل ہے۔ اس حوالے سے ہم بعض ائمہ کی تحقیق بیان کرتے ہیں:

امام ابن اسحاق متوفٰی 151 ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرۃ لیلۃ مضت من شھر ربیع الاول۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ بروز 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی، (الوفا، ص:88)''۔

مشہور سیرت نگار علامہ ابن ہشام متوفٰی 213 ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرۃ لیلۃ خلت من شھر ربیع الاول عام الفیل۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ پیر کے دن 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے، (سیرت النبویہ، جلد 1، ص:158، مطبوعہ: دارالجیل، بیروت)''۔

معروف مفسر و مؤرخ امام ابن جریر طبری متوفٰی 310 ہجری لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرۃ لیلۃ مضت من شھر ربیع الاول۔

ترجمہ: ''رسول کریم ﷺ کی ولادتِ مبارکہ بروز پیر 12 ربیع الاول کو عام الفیل میں

ہوئی، (تاریخ الامم والملوک المعروف تاریخِ طبری، جلد 2،ص:125)"۔

علامہ ابن خلدون متوفی 808 ہجری جو علمِ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے امام مانے جاتے ہیں بلکہ فلسفۂ تاریخ کے موجد بھی ہیں، لکھتے ہیں: ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل لاثنتی عشرة لیلة خلت من ربیع الاول لا ربعین سنة من مَلک کسریٰ نوشیروان۔

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت عام الفیل کو ماہِ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ہوئی، نوشیرواں کی حکمرانی کا چالیسواں سال تھا، (التاریخ ابن خلدون، جلد 2،ص: 710، مطبوعہ: بیروت)"۔

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی متوفی 429 ہجری، جو علمِ سیاست اسلامیہ کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" علمِ سیاست کے طلباء کے لئے بہترین ماخذ ہے، اعلام النبوۃ میں تحریر فرماتے ہیں: لانه ولد بعد خمسین یوما من الفیل وبعد موت ابیه فی یوم الاثنین الثانی عشر من شهر ربیع الاول۔

ترجمہ: "واقعۂ اصحاب الفیل کے پچاس روز بعد اور آپ کے والد کے انتقال کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بروز پیر بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، (اعلام النبوۃ،ص:192)"۔

امام الحافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن یحییٰ بن سید الناس الشافعی الاندلسی متوفی 734 ہجری، لکھتے ہیں: ولد سیّدنا ونبیّنا محمد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرة لیلة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل قیل بعد الفیل بخمسین یوماً۔

ترجمہ: "ہمارے آقا اور ہمارے نبی محمد ﷺ پیر کے روز بارہ ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے، بعض نے کہا ہے کہ واقعۂ فیل کے پچاس روز بعد حضور کی ولادت ہوئی، (عیون الاثر، جلد 1،ص:26، مطبوعہ: دارالمعرفہ، بیروت)"۔

دورِ حاضر کے سیرت نگار محمد صادق ابراہیم عرجون، جو جامعہ ازہر مصر کے کلیہ "اصول الدین" کے مدیر رہے ہیں، اپنی تصنیف "محمد رسول اللہ" میں لکھتے ہیں: وقد صح من

طرق کثیرة انّ محمدا علیه السلام ولد یوم الاثنین لاثنتی عشرة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل فی زمن کسریٰ نوشیروان ویقول اصحاب التوفیقات التّاریخیة انّ ذالک یوافق الیوم المکمل للعشرین من شهر اغسطس سنہ ۵۷۰م بعد میلاد المسیح علیه السلام ۔

ترجمہ: ''بکثرت طُرقِ روایت سے یہ بات صحیح ثابت ہوچکی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ بروز دوشنبہ (پیر) بارہ ربیع الاول عام الفیل، کسریٰ نوشیرواں کے عہد حکومت میں تولد ہوئے، اور ایسے علماء، جو شمسی اور قمری تاریخوں کی آپس میں تطبیق کرتے ہیں، نے کہا ہے کہ اس دن شمسی تاریخ 20 اگست 570ء بنتی ہے، (محمد رسول اللہ، جلد 1، ص:102، مطبوعہ: دارالقلم، دمشق)''۔

اس موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے پیر محمد کرم شاہ الازہری ''ضیاء النبی ﷺ'' میں لکھتے ہیں: ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں یہی تاریخ روایت کی ہے، چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں: رواه ابن ابی شیبة فی مصنفه عن عفّان عن سعید بن میناء عن جابرٍ وابن عباس انّهما قالا ولد رسول الله ﷺ عام الفیل یوم الاثنین الثانی عشر من شهر ربیع الاول وفیه بُعثَ وفیه عُرِجَ به الی السمآء وفیه هاجر وفیه مات وهذا هو المشهور عند الجمهور والله اعلم بالصواب ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ عام الفیل روز دوشنبہ (پیر) بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، اسی روز آپ ﷺ کی بعثت ہوئی، اسی روز آپ کو معراج عطا ہوئی، اسی روز آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کی اور آپ ﷺ کے وصال مبارک کا دن بھی یہی ہے، جمہور امت کے نزدیک یہی تاریخ (بارہ ربیع الاول) مشہور ہے، واللہ اعلم بالصواب''۔

اس کے پہلے راوی ابوبکر بن ابی شیبہ ہیں ان کے بارے میں ابوزرعہ رازی متوفی 264 ہجری کہتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر حافظِ حدیث نہیں دیکھا۔ محدث

ابن حبان فرماتے ہیں ابو بکر عظیم حافظِ حدیث تھے۔ دوسرے راوی عفان ہیں ان کے بارے میں محدثین کی رائے ہے کہ عفان ایک بلند پایا امام، ثقہ اور صاحب ضبط واتقان ہیں۔ تیسرے راوی سعید بن میناء ہیں ان کا شمار بھی ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ یہ صحیح الاسناد روایت دو جلیل القدر صحابہ حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: برصغیر پاک وہند کے بعض سیرت نگاروں نے محمود پاشا فلکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ بارہ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں تھا بلکہ پیر کا دن نو ربیع الاول کو بنتا ہے، لہٰذا نو تاریخ صحیح ہے، لیکن دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ ان لوگوں کو محمود پاشا کے اصلی وطن کا بھی حتمی علم نہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اور قاضی سلمان منصور پوری نے محمود پاشا کو مصر کا باشندہ لکھا ہے، مفتی محمد شفیع صاحب انہیں مکّی لکھتے ہیں، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے انہیں قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجّم بتایا ہے۔ مجھے بڑی کوشش کے باوجود محمود پاشا فلکی کی کتاب یا رسالہ نہیں مل سکا، البتہ معلوم ہوا کہ پاشا فلکی کا اصل مقالہ فرانسیسی زبان میں تھا، جس کا ترجمہ سب سے پہلے احمد زکی آفندی نے ''نتائج الافہام'' کے نام سے عربی میں کیا، اس کو مولوی سید محی الدین خان جج ہائی کورٹ حیدر آباد نے اردو کا جامہ پہنایا اور 1898ء میں نولکشور پریس نے شائع کیا لیکن اب یہ ترجمہ نہیں ملتا۔ محمود پاشا فلکی نے اگر علم فلکیات کی مدد سے کچھ تحقیقات کی بھی ہیں، تو صحابۂ کرام، تابعین اور دیگر قُدَماء کی روایات کو جھٹلانے کے لئے ان پر انحصار کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ سائنسی علوم کی طرح فلکیات کی بھی کوئی بات قطعی نہیں ہوتی۔ محمود پاشا سے قبل بھی کچھ لوگوں نے علم نجوم کے حسابات سے یومِ ولادت معلوم کرنے کی کوشش کی، علامہ قسطلانی لکھتے ہیں: اہل زیچ (جنتریوں کا حساب نکالنے والے) کا اس قول پر اجماع ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو پیر کا دن تھا، اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی علوم نجوم اور ریاضی کے ذریعے حساب لگا کر تاریخ نکالے گا مختلف ہوگی۔ پس ہمیں قدیم سیرت

نگاروں، مُحدّثین، مفسّرین، تابعین اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی بات ماننا پڑے گی،
(ضیاء النبی ﷺ جلد دوم، ص: 33 تا 39، مطبوعہ: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)''۔

محافلِ میلاد میں مخلوط اجتماعات

سوال: 186

میلاد شریف وگیارہویں، مجالسِ وعظ وقرآن خوانی اور ایصالِ ثواب کی ایسی محافل، جہاں بے پردہ عورتیں اکثر حاضری دیتی ہیں، تو اس طرح کا نیاز پکانا، بہت سے پیسے خرچ کرنا، مالداروں کو کھلانا اور بے پردہ عورتوں کا مردوں کے ساتھ جمع ہونے کے بارے میں از روئے شرع کیا حکم ہے؟۔

جواب:

محافلِ ایصالِ ثواب ہوں، جیسے محافل میلاد شریف، گیارہویں شریف کی محفل، مجالس وعظ، قرآن خوانی کی محافل، اپنے اموات کی سوم، چہلم یا برسی کی محافل وغیرہ، یا شادی کی محافل ودیگر سماجی تقریبات، ان سب میں مرد وزن کا ایسا مخلوط اجتماع (Mixed ghathering)، جن میں خواتین غیر محرم مردوں کے ساتھ بے تکلف اور بے حجاب گھل مل جائیں، شریعت کی رو سے یہ جائز نہیں ہے، اور خاص طور پر وہ تقاریب یا اجتماعات جو نیک مقاصد کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں، ان میں شریعت کی پاسداری کا زیادہ اہتمام ہونا چاہئے۔

کس دور میں کس چیز کا اجر زیادہ ہے، میری سمجھ کے مطابق یہ ہر جگہ اور مقام کے اعتبار سے لوگوں کی مقامی ضروریات پر منحصر ہے، کہیں پانی کی فراہمی اشد ضرورت ہے، تو اس کا اجر زیادہ ہوگا، کہیں مسجد یا دینی مدرسے کے قیام کی زیادہ ضرورت ہے تو اس کا اجر زیادہ ہوگا، کہیں لوگ خوراک ولباس کے محتاج ہیں، تو اس کا اجر زیادہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
ترجمہ: ''وہ دشوار گزار گھاٹی میں کیوں نہ داخل ہوا، اور (اے انسان!) تجھے کیا خبر کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟، (لوگوں کی) گلو خلاصی کرانا، یا (شدید) بھوک کے دن کھانا کھلانا یا کسی ایسے یتیم

کو جو (تمہارا) رشتے دار بھی ہے، یا کسی ایسے مسکین کو (جو تنگ دستی کے مارے) خاک میں رل رہا ہے، (البلد:16-11)''۔

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کا زنا میں حصہ لکھ دیا ہے، وہ اسے بہر حال پائے گا، آنکھ کا زنا دیکھنا ہے، اور زبان کا زنا (فحش) گفتگو کرنا ہے، اور نفس (گناہ) کی تمنا کرتا ہے اور (مبتلائے) شہوت ہوتا ہے، اور شرم گاہ اس طرح سب کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب (یعنی بالآخران مبادی واسباب اور محرکات زنا کے مراحل سے گذرنے کے بعد انسان شہوت نفس سے مغلوب ہو کر زنا کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر لیتا ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نفس پر قابو پا کر بچ جاتا ہے)، (صحیح البخاری:4، رقم الحدیث: 6243، المکتبۃ العصریہ، بیروت)''۔

اس لئے احتیاط اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان زنا کے محرکات (Incentives) و اسباب سے ہمیشہ بچ کر رہے تاکہ غلبۂ شہوت سے مغلوب ہو کر اس گناہ میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے، اور مردوں اور عورتوں کے مخلوط بے پردہ اجتماعات گناہ کے مبادیات و محرکات ہی میں شمار کئے جائیں گے۔

تبرکات انبیاء کرام کا احترام

سوال:187

ہمارے شہر میں بارہ ربیع الاول کے دن رسول پاک ﷺ کے موئے مبارک کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ ایک مسجد میں موئے مبارکہ کی زیارت کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں عورتیں بھی بغیر پردہ زیارت کے لئے مسجد آتی ہیں، دوران زیارت نماز کا وقت ہو جاتا ہے، تو نماز بجائے مسجد کے ملحقہ مدرسہ میں ادا کی جاتی ہے، یہ سب باتیں کہاں تک صحیح ہیں؟۔

جواب:

انبیاء کرام کے آثار اور تبرکات کا احترام قرآن وسنت سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۲۴۸﴾

ترجمہ: ''اور ان کے نبی نے ان سے کہا: بیشک ان کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا، جس میں تمہارے رب کی طرف سے (تمہارے دلوں کا) سکون ہے، اور آل موسیٰ اور آل ہارون کے باقی ماندہ (تبرکات) ہیں، اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے، بلاشبہ اس میں تمہارے لئے ضرور ایک نشانی ہے، اگر تم مومن ہو، (بقرہ:248)''

رہا یہ سوال کہ اس تابوت یا صندوق میں کیا تھا، جسے اللہ کے نبی نے حضرت طالوت کی سلطنت کی نشانی اور رب کی طرف سبب باعث تسکین قرار دیا ہے، تو اس کے بارے میں کئی تفسیری اقوال ہیں، ان کے مطابق اس میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے عصا، الواحِ تورات کے ٹکڑے، ان کے کپڑے اور بعض روایات میں نعلین کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ۔

ترجمہ: '' (یعقوب علیہ السلام نے فرمایا) میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی، (یوسف:93)''۔

ان آیات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے تبرکات اور ان سے نسبت رکھنے والی اشیاء برکت وکامرانی کا باعث ہوتی ہیں۔

امام مسلم اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

'' حضرت اسماء بنت ابی بکر کے غلام عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت اسماء نے حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس بھیجا اور کہا یہ رسول اللہ ﷺ کا جبہ ہے، انہوں نے ایک طیالسی

کسروانی جبہ نکالا جس کی آستینوں اور گریبان پر ریشم کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے، حضرت اسماء نے کہا:

هذه كانت عند عائشة رضي الله عنها حتى قبضت فلماقبضت قبضتها و كان النبي ﷺ يلبسها فنحن نغسلها للمرضىٰ و نستشفي بها۔

یہ جبہ حضرت عائشہ کی وفات تک ان کے پاس تھا، اور جب ان کی وفات ہوئی تو پھر میں نے اس پر قبضہ کرلیا، نبی اکرم ﷺ اس جبہ کو پہنتے تھے، ہم اس جبہ کو دھو کر اس کا پانی بیماروں کو پلاتے تھے اور اس جبہ سے ان کے لئے شفا طلب کرتے تھے، (صحیح مسلم جلد:2، ص:190 مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، 1375ھ)''۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں: ترجمہ: ''خبیب بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر میں خبیب بن عدی کا ہونٹ کٹ کر لٹک گیا رسول اللہ ﷺ نے لعاب دہن لگا کر اس کو جوڑ دیا، (دلائل النبوت ج:3، ص:98-97، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر تبیان القرآن (ج:1، ص:929-928-930، فرید بک اسٹال لاہور) میں تبرکات انبیاء کے موضوع پر باحوالہ مفصل ومدلل بحث کی ہے۔

اس وقت دنیا میں کئی مقامات پر رسول اللہ ﷺ کے ''موئے مبارک'' کی موجودگی کا دعویٰ کیا جاتا ہے، ان کی زیارت بھی کرائی جاتی ہے، ہم اس مقدس نسبت کی تعظیم اور اکرام و احترام کرتے ہیں، لیکن ان دعووں کی تصویب وتوثیق کے ہمارے پاس کوئی قطعی شواہد نہیں ہیں، اس لئے قطعیت کے ساتھ نہ ہم نسبت کی نفی کرسکتے ہیں، نہ اثبات، لیکن نسبت کا احترام ہمارا عقیدہ بھی ہے اور عقیدت بھی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ بعض روایات کی رو سے انبیاء کرام علیہم السلام کی مجموعی تعداد کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، لیکن ہر مسلمان کے لئے تعیین شخصی کے ساتھ ان پچیس انبیاء کرام پر ایمان لانا فرضِ عین ہے کہ جن کے اسماء مبارکہ قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ

عَلَيْكَ ؕ۔

ترجمہ: ’’اور ہم نے آپ سے پہلے (بھی) رسول بھیجے، ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان کر فرما دیا اور ان میں سے بعض کا حال آپ پر بیان نہیں فرمایا، (المؤمن: 78)‘‘۔

لہٰذا ان معین ومشخص انبیاءِ کرام کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دیگر انبیاءِ کرام پر اجمالی طور پر ایمان لانا فرضِ عین ہے، یعنی ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو بھی مختلف ادوار میں نبی یا رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ سب حق پر تھے اور ان میں سے کسی کی بھی نبوت کا انکار کفر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۔

ترجمہ: ’’رسولِ (مکرم) ایمان لائے اس (کتاب) پر جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور (تمام) مومن بھی (اس کتاب پر ایمان لائے)، سب کے سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی (تمام) کتابوں پر اور اس کے (تمام) رسولوں پر، (وہ یہ کہتے ہیں کہ) ہم (ایمان لانے میں) اس کے (تمام) رسولوں کے درمیان کسی ایک کے بارے میں فرق نہیں کرتے، (کہ اس پر ایمان نہ لائیں)، (بقرہ:285)‘‘۔

لہٰذا موئے مبارک کی زیارت اور اس کا احترام واکرام باعث سعادت ہے، لیکن اس کے لئے انتظامیہ کی طرف سے مسجد میں جماعت کو موقوف کر دینا یا مسجد سے متصل دوسری عمارت میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ ’’نماز باجماعت‘‘ واجب ہے، مسجد میں جماعت مشروع ہے، جبکہ موئے مبارک کی زیارت ایک مستحب ومستحسن امر ہے، لو امرِ مستحب کی خاطر واجب کو ترک کرنا یا جماعت کو مسجد سے منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ موئے مبارک کی زیارت کا اہتمام مسجد کے متصل مدرسہ کی عمارت میں کیا جا سکتا ہے۔ اور نماز باجماعت کے وقت زیارت کو موقوف کر لینا چاہئے تاکہ لوگ باجماعت نماز پڑھیں، کیونکہ موئے مبارک کی زیارت کی مُحرِّک عقیدت ومحبت رسول ہے، اور اس عقیدت ومحبت کا تقاضا ہے

کہ نماز باجماعت کو ترجیح دی جائے، یا نماز کے اوقات کے علاوہ دیگر اوقات میں زیارت کا اہتمام کیا جائے، عورتوں کے لئے الگ اہتمام ہو اور ان پر لازم قرار دیا جائے کہ وہ باپردہ اور حجاب شرعی کے اندر رہتے ہوئے زیارت کے لئے آئیں۔

عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں

سوال:188

عوام کا یہ کہنا کہ ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں، کیسا ہے؟۔

جواب:

عوام کا یہ کہنا کہ: ''ہم سب اللہ کے سامنے غریب ہیں، کیسا ہے''؟۔ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ درست ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۔

ترجمہ: ''اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ ہی بے نیاز (ہر احتیاج سے پاک) ہے، سب خوبیوں والا ہے، (فاطر:15)''۔

اردو میں لفظ ''غریب''، مفلس ونادار کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، جبکہ کہ عربی میں اس کے معنیٰ ہیں اجنبی اور مسافر۔ اور مفلس، نادار اور محتاج کے معنیٰ میں لفظ ''فقیر'' اور ''مسکین'' آتے ہیں۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ ہم سب اللہ کے محتاج ہیں، اور اگر کوئی دنیوی اعتبار سے غنی اور مال دار بھی ہے تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے، وہ چاہے تو نواز دے اور چاہے تو سب کچھ سلب فرمادے، بندے کی کیا مجال۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

ترجمہ: ''(لوگو! آخر) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، حالانکہ آسمانوں اور زمینوں کا (حقیقی) وارث تو اللہ ہی ہے، (الحدید:10)''۔

نمازِ تراویح کی امامت کا معیار

سوال:189

ہمارے یہاں رمضان شریف میں اپنی سنی مسجدوں میں قرآن شریف کی تراویح ہوتی ہے، تراویح پڑھانے والے مدرسے کے طالب علم ہی ہوتے ہیں، جن کو قرآن صحیح یاد نہیں ہوتا اور تجوید بھی نہیں جانتے، سال میں اکثر اوقات نماز کی پابندی بھی نہیں کرتے، اور داڑھی بھی منڈھواتے ہیں، ان میں سے بعض کو تو نماز کے مسائل بھی نہیں آتے، ایسوں کو تراویح میں امام بنانا کیسا ہے؟ اور کیا ان کے پیچھے تراویح ہوجاتی ہے یا نہیں؟ کچھ لوگوں نے انتظامیہ مسجد سے بات کی، جواب میں کہا گیا کہ حافظوں کو پریکٹس کے لئے چانس دیتے ہیں، تو ایسا سسٹم چلانے میں گنہگار کون ہے؟ اور یہ سب کام ہمارے یہاں ایک مفتی صاحب کی زیرِ نگرانی ہو رہا ہے، جو حکمِ شرع ہو بیان فرمائیں۔

جواب:

متشرع ودین دار حافظ وقاری وعالم امام کی موجودگی میں ایسے افراد کو نمازِ تراویح کا امام بنانا ہرگز درست نہیں ہے، جو کہ:
(ا) نابالغ ہوں (ب) تلاوتِ قرآن میں ایسی غلطیاں کرتے ہوں جو فسادِ نماز کا باعث بنتی ہیں (ج) داڑھی منڈھواتے ہیں یا کٹواتے ہیں اور حدِ شرعی سے کم ہوتی ہے (د) یا رمضان المبارک سے قبل محض قرآن سنانے کے لئے داڑھی رکھ لیتے ہیں اور رمضان کے بعد منڈوا دیتے ہیں یا حدِ شرعی سے کم کردیتے ہیں، (کیوں کہ اس میں سنتِ رسول کا استخفاف ہے جس کے لئے بڑی وعید ہے) (ہ) یا سال بھر نماز کے تارک رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کو انتظامیہ کمیٹی یا بااثر لوگوں کی رضامندی کی خاطر شرعی حدود وقیود کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ انہیں چاہئے کہ حفاظ کرام کو وہ اتباعِ شریعت کی تلقین کریں اور جب تک وہ اتباعِ شریعت پر کاربند نہیں ہوتے، انہیں امام نہ بنائیں، بلکہ جماعت سے باہر ایک دوسرے قرآن کی منزل سنا کر اس کی حفاظت کریں۔

مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کی اشاعت

سوال:190

ہمارے یہاں مدرسے میں سال بھر کے بعد ایک سالانہ رپورٹ چھپواتے ہیں،جس میں کچھ اساتذہ اور طلبا کی تصاویر ہوتی ہیں،ایسی تصویریں جائز ہیں یا ناجائز؟۔

جواب:

مدرسے کی سالانہ رپورٹ میں تصاویر کا شائع کرنا درست نہیں ہے،اس سے اجتناب بہتر ہے، کیونکہ یہ ایسی ضروریات میں سے نہیں ہے،جن پر اس فقہی اصول کا اطلاق ہوتا ہے کہ:''الضرورۃ تبیح المحظورات''یعنی''ضرورتیں ممنوعات کو مباح کردیتی ہیں''۔البتہ ہم دینی،دعوتی وتبلیغی مقاصد کے لئے (Movies/video)فلم کے جواز کے قائل ہیں،بشرطیکہ ان میں دیگر ممنوعات ومحارم شامل نہ ہوں،مثلاً بے پردہ بے حجاب وبے تکلف مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات وغیرہ،بعض علماء(Vedeo/Movie) کے عدم جواز کے قائل ہیں،عوام جس عالم،فقیہ یا مفتی پر اعتماد کریں،اس کے فتوے پر عمل کریں۔

بقیہ صفحہ نمبر 215

آئے گا، (فتح القدیر جلد 3 ص:55 مطبوعہ مرکزِ اہلِ سنت برکاتِ رضا، گجرات، انڈیا)"۔

الغرض امام اعظم کے نزدیک رمی، قربانی (متمتع اور قارن کے لیے) اور حلق میں ترتیب واجب ہے، حج افراد والے پر چونکہ قربانی واجب نہیں ہے لہٰذا اس پر صرف دو امور (رمی اور حلق) میں ترتیب واجب ہے، البتہ طوافِ زیارت میں ترتیب واجب نہیں ہے، یہ خلافِ ترتیب (یعنی رمی، قربانی اور حلق سے پہلے) بھی کیا جا سکتا ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

فیجب فی یوم النحر اربعة اشیاء: الرمی، ثم الذبح لغیر المفرد، ثم الحلق، ثم الطواف، لکن لا شیء علی من طاف قبل الرمی والحلق، نعم یکره

ترجمہ: "پس نحر (قربانی) کے دن (یعنی دس ذی الحجہ کو) چار امور واجب ہیں: (1) رمی (یعنی بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا)، (2) غیر مفرد (یعنی حج قران اور حج تمتع کرنے والے کے لیے) ذبح یعنی قربانی کرنا، (3) اور حلق کرنا (یعنی سر منڈانا یا بال کاٹنا، (4) طوافِ زیارت کرنا (اسے طوافِ افاضہ بھی کہتے ہیں)، لیکن کسی نے رمی اور حلق سے پہلے طواف کر لیا، تو اس پر کوئی چیز (یعنی دم یا صدقہ) واجب نہیں ہے، ہاں! اس طرح کرنا مکروہ ہے---

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

والحاصل أن الطواف لا یجب ترتیبه علی شیء من الثلاثة، وانما یجب ترتیب الثلاثة: الرمی ثم الذبح ثم الحلق، لکن المفرد لا ذبح علیه فیجب علیه الترتیب بین الرمی والحلق فقط۔

ترجمہ: "اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ طوافِ زیارت کی ترتیب ان تینوں چیزوں میں سے کسی چیز پر بھی واجب نہیں ہے، ترتیب فقط ان چیزوں کے درمیان واجب ہے، یعنی پہلے "رمی" کرے، پھر "قربانی" کرے اور پھر "حلق یا قصر" کرے، لیکن مفرد (یعنی جس نے صرف حج کا احرام باندھا ہو) پر چونکہ قربانی نہیں ہے، لہٰذا اس کے لیے صرف دو چیزوں یعنی رمی اور حلق کے درمیان ترتیب واجب ہے، (ردالمحتار، جلد 3، ص:520، 521، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

کی زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی مؤثر تصنیف

تفسیرِ سورۃ النسآء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم تفسیر، اندازِ بیان مؤثر و دلکش

قدیم و جدید اہم تفاسیر کا نچوڑ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

پروفیسر مفتی منیب الرحمن

جلد پنجم

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور • کراچی • پاکستان

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (صحیح مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد پنجم

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی
پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد پنجم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
تصحیح	مولانا فیصل ندیم احمد قادری (ایم اے، ایل ایل بی، بی ایڈ)
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	اگست 2012ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ8
قیمت	-/450 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔فون: 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون: 37247350 فیکس: 37225085

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

مضمون صفحہ نمبر

انتساب
آغازِ تکلم
تاخیر ہوئی تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا 15
عقائد کے مسائل 17
گفتگو کے دوران لفظ ''خدانخواستہ'' استعمال کرنے کا حکم 19
نعت کے شعر میں بھول کر ایک مصرعے کی جگہ دوسرا مصرعہ پڑھنے کا حکم 25
غیر نبی پر مستقلاً درود وسلام بھیجنا 26
انگریزی میں رسول اللہ ﷺ کے نام کے ساتھ SAW لکھنا حرام ہے 34
انبیاءِ کرام وعبادِ صالحین کے وسیلے سے دعا 38
موئے مبارک کے آداب 43
کپڑے کے ڈیزائن میں اسمِ ''محمد'' ظاہر ہو تو اس کا شرعی حکم 48
طہارت کے مسائل 51
کنویں میں جانور کا گرنا 53
پانی کے کنویں میں گٹر کا پانی رس کر آنا اور اس سے پیدا شدہ مسائل 56
فٹ پاتھ پر وضو خانہ 60
عذر کے سبب وضو قائم نہ رہنے کی صورت میں عبادات کی ادائیگی کا حکم 61
بالغ کے ختنہ اور فالج زدہ شخص کے زیرِ ناف بال زائل کرنے کا حکم 65
نماز کے مسائل 73
اذان کے بعد ''تثویب'' (اعلانِ ثانی) کا جواز 75

دفتر میں اذان دیئے بغیر با جماعت نماز پڑھنے کا حکم	79
نائب امام کی موجودگی میں امامت کا استحقاق	80
امام کا ترکِ نماز	81
جماعت کے لئے اقامت کے موقع پر امام تکبیرِ تحریمہ کب کہے	82
امام کا دو رکعت یا چار رکعت والی نماز میں قعدۂ اخیرہ بھول کر کھڑا ہو جانا	85
نمازِ مغرب کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت کی تکرار	89
نماز میں خلافِ ترتیب قراءت کا حکم	90
قراءت میں تشابہ لگنا اور یاد آنے پر واپسی اسی جگہ سے پڑھنا	93
امام کے بارے میں مقتدیوں کی ناپسندیدگی کا شرعی حکم	94
عورت کا مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے باپردہ آنا	97
نماز میں عورت کے سجدہ کا طریقہ	102
عورت کی نماز کن امور میں مرد کی نماز سے جدا ہے	107
جاندار کی تصویر والا کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کا حکم	109
سجدۂ شکر کا شرعی جواز	110
بعد نمازِ عشاء با آوازِ بلند تلاوتِ قرآن مجید کرنا جبکہ لوگ نماز میں مشغول ہوں	114
نماز میں امام کی اتباع کب نہیں کی جائے گی	117
گاؤں میں جمعہ کا قیام	118
جماعت میں چھوٹی سورتوں کی تلاوت	120
مانعِ حمل ذرائع اختیار کرنے کا جواز	122
خطابت کی اہلیت اور خطیب کے فرائض	124
جنازہ گاہ میں نمازِ باجماعت کی ادائیگی	127

اذانِ مغرب اور جماعت کے درمیان وقفہ	128
دعا بعد الصلوٰۃ کی شرعی حیثیت	132
مغفرت وایصالِ ثواب کے لئے اجتماعی دعا	134
مسجد اور وقف کے مسائل	137
مسجد میں اسکرین لگا کر ٹیلیویژن کے دینی پروگرام چلانا	139
مسجد کے فنڈ سے مسجد کے عملے کو علاج معالجے کی سہولت دینا	143
عام گزرگاہ کو روک کر قرآن کی تعلیم دینا	144
مسجد کو ہبہ کئے گئے مکان کی فروخت	146
وقف کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا	148
ایک سے زائد متولیان کی حیثیت	150
مدرسے کے لئے وقف پلاٹ کی تبدیلی	152
میت اور جنازے کے مسائل	157
غسّال پر غسل یا وضو واجب ہے؟	159
کفن کا رنگ اور کپڑے کی کوالٹی	163
میت کا چبوترے پر رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا	165
قبرستان میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم	167
نمازِ جنازہ سے متعلق چند سوالات	168
مقتدی کا درمیان میں آکر نمازِ جنازہ میں شامل ہونا	169
نمازِ جنازہ کی چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ چھوڑ دے اور سلام پھیرے	171
خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ	172
خودکشی کرنے والے کو ایصالِ ثواب	174

خودکشی کی شرعی حیثیت 176
میت کو دفن کرنے کے بعد آیا ہاتھ دھونا ضروری ہے؟ 177
میت کی تدفین والے دن میت کے گھر کھانے کا اہتمام 178
قبر میں عہد نامہ رکھنا 179
لوگوں میں مشہور باتوں کا شرعی حکم 182
جمعرات کو ارواح اموات کا آنا 182
جنازہ قبرستان لے جاتے وقت میت کے پاؤں قبلے کی جانب ہونے کا حکم 188
میت کو دفن کرنے کے بعد قبر کھودنا جائز نہیں 190
ایصالِ ثواب اور چہلم کی رسوم میں غیر شرعی باتیں 193
چہلم میں تین چاند گزرنے کی شرعی حیثیت 195
زکوٰۃ کے مسائل 197
زکوٰۃ کی رقم مصارفِ مسجد میں استعمال نہیں کی جاسکتی 199
زکوٰۃ محض وکیل کو دینے سے ادا نہیں ہوتی 201
زکوٰۃ کے چند مسائل 203
مسجد کی تعمیر میں زکوٰۃ کا استعمال 208
روزے کے مسائل 211
سفر میں روزے کا شرعی حکم 213
دائمی عذر کے سبب روزہ نہ رکھنے والے پر فدیہ ہے، کفارہ نہیں 217
نمازِ تراویح سنتِ مؤکدہ ہے 218
رویت ہلال کے مسائل 225
مسئلہ رویت ہلال 227

اہلِ علم، اہلِ فکر ونظر اور اہلِ وطن کی خدمت میں چند گذارشات 241
سعودی عرب کے ساتھ رمضان و عیدین کیوں نہیں؟ 250

حج کے مسائل 275

نابینا شخص پر بذاتِ خود حج کرنا فرض نہیں ہے، اُسے حجِ بدل کرانا ہوگا 277
قرض پر عمرہ کی ادائیگی 279
دورانِ حج حلق یا قصر کا حکم 280
محرم کے بغیر ارکانِ حج کی ادائیگی 281
حاجی پر قربانی کا واجب ہونا 284

قربانی کے مسائل 287

دنیاداری کی خاطر قربانی کرنے اور نیاز کا حکم 289
بھینس نر یا مادہ کی قربانی جائز ہے 291
ایسے جانور کی قربانی جائز ہے جس کا سینگ نکال دیا گیا ہو 292
قربانی کی کھال کا مصرف 296
قربانی کے جانور کو خصی کرانے کا حکم 299
مشینی ذبیحے کا حکم 301
حلال ذبیحہ جانور کے مکروہ اجزا کا حدیث سے ثبوت 303
سیہہ (Hedgehog) کا شرعی حکم 305

نکاح کے مسائل 311

شادی کی رسم 313
مایوں، مہندی اور سہرابندی کی رسومات کی شرعی حیثیت 315
مہر مقررہ مقدار سے زیادہ ہوسکتا ہے؟ 316

مہر شرعی کیا ہے؟ 319
ایک شخص کے بیٹے کا اس کی مطلقہ کے دوسرے شوہر سے بیٹی سے نکاح 321
نکاحِ شغار یا وٹہ سٹہ 322
خطبۂ نکاح کے بغیر نکاح کا انعقاد 324
باپ کا بیٹے کی خواہر نسبتی (سالی) سے نکاح 325
بیٹی کے ساتھ بدفعلی کرنے سے بیوی حرام ہو جاتی ہے 326
بیوی کی بھتیجی کے ساتھ زنا سے نکاح باطل نہیں ہوتا 327
دو بیویوں کے درمیان باری مقرر کرنا 328
دوسری شادی کی بابت شرعی حکم اور مسائل 331
دو بیویوں کے درمیان ایام کی تقسیم 332
دوسری بیوی کو طلاق دلانے کے جتن کرنا 333
دوسری بیوی سے ملنے سے روکنا 334
شوہر کے فرائض 335
بیوی کے دائمی مریض ہونے کی صورت میں دوسری شادی کا حق 339
خلع کے بعد دوبارہ نکاح کا حکم 340
نکاح میں لڑکے اور لڑکی کی رضامندی ضروری ہے 341
نکاح پر نکاح کا حکم 343
باپ کی بیوی کی (سابق شوہر سے) بیٹی سے بیٹے کا نکاح 344
بالغہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا 345
بلوغت کے بعد نابالغ لڑکی کے نکاح کے فسخ کا مسئلہ 347
مسئلۂ خیارِ بلوغ کی وضاحت 348

نافرمان بیوی 351
خاتون کے پہلے شوہر سے اولاد کی کفالت دوسرے شوہر کی ذمہ داری نہیں ہے 354
برادری سے باہر نکاح کا حکم 359
شرعاً کفو کا معیار مرد کی جانب سے معتبر ہوتا ہے 361
رضاعت کا رشتہ صرف ایک طرف سے متعدی ہوتا ہے 362

طلاق کے مسائل

365
مرتہ علیحدگی کے بعد بیوی کو عدت کے اندر طلاق دے تو وہ مؤثر ہوگی 367
کورٹ میرج اور طلاق 369
طلاق کو شرط کے ساتھ معلق کرنا 372
میں نے تمہیں چھوڑ دیا، طلاقِ صریح ہے 374
جبری طلاق کا حکم 375
طلاقِ صریح، طلاقِ بائن کو لاحق ہو جاتی ہے 377
طلاق واقع ہو گئی 380
متفرق مواقع پر دی گئی طلاقیں مؤثر رہتی ہیں 382
تحریری طور پر تین طلاق کا حکم 384
الفاظ بدل کر طلاق دینا 386
''میری طرف سے بھی سمجھو چھٹی''، سے طلاق واقع نہیں ہوگی 387
تعلیم کے لئے طلاق کے الفاظ استعمال کرنا 389
یہ فسخِ نکاح شرعاً مؤثر نہیں 390
نشے میں طلاق کا حکم 391

عدت کے مسائل 395

عدت کب سے ہوگی؟ 397

ناشزہ (نافرمان) عورت نفقہ کی حق دار نہیں 397

طلاق کے بعد بیوی کو رہائش کا حق 399

خرید وفروخت کے مسائل 403

عقدِ مضاربت میں نفع کی مقدار مقرر کرنا فساد کا باعث ہے 405

نفلی خیراتی ٹرسٹ کی رقم کی شرعی سرمایہ کاری 406

اسلامی بینک کا منافع حلال ہے 408

سود سے حاصل کردہ رقم کی خیرات پر اجرِ آخرت کی نیت کا حکم 410

پراویڈنٹ فنڈ پر سود 412

پراویڈنٹ فنڈ میں ادارے کی جانب سے اضافی رقم سود نہیں 412

کیا انعامی بانڈز کا انعام سود میں شامل ہے؟ 414

ایک رفاہی ادارے کا کسی دوسرے رفاہی ادارے کو منفعت کے عوض قرض دینا 415

وراثت کے مسائل 417

شوہر کی وفات کے وقت جو عورت نکاح میں ہے، وارث بنے گی 419

مسلمان اور غیر مسلم میں باہمی وراثت کا مسئلہ 421

ترکے کی تقسیم اور صدقات جاریہ 424

سرکاری ملازم کی بیوہ بچوں کا عطیہ اور ورثاء کا استحقاق 426

ذوی الفروض، عصبات اور ذوی الارحام کے درمیان تقسیمِ ترکہ میں ترتیب 430

ہبہ میں ملی ہوئی جائیداد پر مالکانہ تصرُّف کا حق 432

وصیت کی تعریف اور اس کی مقدار، مُوصی کی زندگی میں وصیت نافذ نہیں ہوتی 433

زندگی میں وصیت سے رجوع کا حق ہے	435
غیر مملوکہ چیز کی وصیت	436
اولاد نہ ہونے کی صورت میں بیوی کے ترکے سے شوہر کو نصف حصہ لے گا	437
عینی اور اخیافی بہن بھائی کے درمیان ترکے کی تقسیم	439
مالی معاملات میں ابہام نہیں ہونا چاہیے	440
ترکے سے ضرورت کے وقت لی گئی رقم کی تقسیم	442
بیوی کے پہلے شوہر سے اولاد دوسرے خاوند کی وارث نہیں بنتی	443
حقیقی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی ساقط ہو جاتے ہیں	443
حلال وحرام کے مسائل	445
قرآنی آیات پر مشتمل تعویذ کا حکم	447
تعویذ پر قرآن عظیم و مصحف کریم کا قیاس نہیں ہو سکتا	448
لاؤڈ اسپیکر کی آواز بلا ضرورت بلند کرنا	450
عرس کی تقریبات میں محرمات، مکروہات اور بدعات کا ارتکاب	453
ایامِ عرس میں مزارات کو غسل دینے کے لئے دن مخصوص کرنے کا شرعی حکم	457
خواتین کا علماء سے مسائل دریافت کرنا	458
مکان کے دروازوں اور پیشانی پر قرآنی آیات لکھنا	461
درآمد کردہ کھاد کے استعمال کا جواز	463
کسی کو کافر کہنے کا حکم	465
دوسروں کو کافر کہنے والے کا حکم	471
ڈرائیور کا پیٹرول میں خیانت کرنا	473
بجلی کی چوری کا مسئلہ اور اس کا شرعی حکم	735

انتساب

میں اپنی اس ناچیز کاوش کو علم دوست اور دین دار قارئینِ کرام کے نام منسوب کرتا ہوں۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کی یلغار اور فحاشی وعریانی کے اس دور میں یہی وہ لوگ ہیں جن کی علم دوستی اور دین سے محبت کی بنا پر اسلامی لٹریچر طبع ہو رہا ہے اور دین کا پیغام دنیا تک پہنچ رہا ہے۔ ابلاغِ دین کا فریضہ جوامت پر فرض کفایہ ہے، اس سے عہدہ برا ہونے کا ایک مؤثر سبب ہمارے معاشرے کا یہی طبقہ ہے۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کے ذوقِ آگہی کو سلامت رکھے اور اس کی مہک کو اور وسعت عطا فرمائے، یہ اسی کی توفیق سے ممکن ہے۔

العبد الضعیف

منیب الرحمٰن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علی رحمۃ للعٰلمین، سیدنا ومولانا محمدٍ وعلی الہ الطیبین الطاہرین وعلی صحابتہ الصدیقین الکاملین، وعلی اولیاءِ امتہ وعلماءِ ملتہ من الفقہاء المجتہدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

تاخیر ہوئی تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

تفہیم المسائل جلد پنجم بہت پہلے مرتب ہو چکی تھی، لیکن ہمارے کسی کارکن کی غلطی سے یہ کمپیوٹر سے اڑ گئی یعنی Wash Out ہو گئی۔ اپنی ناتجربہ کاری کے باعث ہم نے اس کی Hard Copy محفوظ نہیں رکھی تھی، کمپیوٹر ہی پر اکتفا کیا اور ایک نئے تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ ہمارے اس شعبے کے کچھ ماہر دوستوں نے پیشکش کی کہ وہ جدید تکنیک کے ذریعے اسے کمپیوٹر کے بطن سے دوبارہ برآمد کرلیں گے، لیکن سعیِ بسیار کے باوجود ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ناچار ہمیں اسے دوبارہ مرتب کرنا پڑا اور اسی میں کافی وقت صرف ہوا۔

ہم نے اس جلد کی تصحیح اور اسے حوالوں سے مُدلّل کرنے کی اپنی بشری استطاعت کے مطابق سعی کی ہے، لیکن اس کے باوجود انسان کی کوئی کوشش امکانِ خطا سے مبرّا نہیں ہے۔ ہمارے علم دوست قارئین اور تنقیدی نظر رکھنے والے اہلِ علم مطالعہ کے دوران اس میں کوئی لفظی یا معنوی غلطی پائیں تو ازراہِ کرم ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں ان کی رائے سے اس کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔ ہم اپنی اصلاح کرنے والوں کی کسی بات کا برا نہیں مناتے بلکہ انہیں اپنا محسن سمجھتے ہیں۔ ہم ان کے شکرگزار ہوں گے اور ان کے لئے دعاگو رہیں گے۔

اس جلد کی ترتیب میں میرے نائب مفتی عبدالرزاق صاحب کا بہت بڑا حصہ (Contribution) ہے، میں ان کا شکرگزار ہوں اور ان کے علم میں اضافے کے لئے دعاگو ہوں۔ اس کتاب کو معنوی اغلاط سے امکانی حد تک پاک کرنے کے لئے میں نے دارالعلوم نعیمیہ کے صدر مدرس واستاذِ حدیث علامہ احمد علی سعیدی زید مجدہم اور

درجۂ تخصص فی الفقہ والافتاء کے استاذ گرامی مفتی محمد وسیم اختر ضیائی صاحب زید مجدہم کو اس جلد کے پروف کی خواندگی کی زحمت دی، انہوں نے کرم فرمایا اور اصلاح کے لئے مخلصانہ رہنمائی کی۔ میں ان دونوں اہلِ علم کا شکر گزار ہوں۔ یاسر رحمان صاحب نے بار بار اس کی کمپوزنگ کی اور ترتیب کو بہتر بنانے میں کاوش کی، میں ان کے لئے بھی دعا گو ہوں۔

عصرِ حاضر کے مایہ ناز مفسر، محدّث اور فقیہ شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ علامہ غلام رسول سعیدی مُدظلہم کی ذات گرامی اہلسنت وجماعت کے لئے سرمایۂ افتخار ہے، اہلسنت کی علمی شان ان کے دم سے قائم ہے، ان کی ذات اہلسنت کے لئے علمی اعتبار سے ایک ظِلِّ عاطفت ہے اور ڈھال بھی ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین ہے کہ ان کی مایۂ ناز تصانیف تفسیر تبیان القرآن، شرح صحیح مسلم اور نعمۃ الباری صدیوں تک مطلع علم پر ضوفشاں رہیں گی اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ان کی علمی جلالت ووقعت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہ تصانیف علمی انسائیکلو پیڈیا ہیں، ہم ان سے استفادہ کرتے رہتے ہیں اور اس جلد میں بھی ان کا فیضان اور حوالہ جات شامل ہیں۔ میری دعا ہے اللہ جلّ شانہٗ انہیں مختلف امراض وعوارض سے صحت کاملہ عطا فرمائے اور اپنی تمام تر علمی، فکری اور جسمانی قویٰ کی سلامتی کے ساتھ انہیں نعمۃ الباری کی تکمیل کی سعادت وتوفیق عطا فرمائے۔ یہ ہر علم دوست شخص کے دل کی آواز ہے۔

تفہیم المسائل جلد ششم کا مسودہ بھی الحمدللہ تیار ہے، اس کی تمبیض، تصحیح اور حتمی ترتیب کے مراحل باقی ہیں۔ جیسے ہی مجھے فرصت ملے گی ان شاء اللہ العزیز اس کی تکمیل کر کے اشاعت کا اہتمام کروں گا۔

آخر میں اللہ جل شانہٗ عزّ وجلّ کی بارگاہ میں بصد عجز و نیاز دست بدعا ہوں کہ وہ اپنے حبیب مکرم ﷺ کے طفیل اس سعی کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے اور اسے قبولِ عام عطا فرمائے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ افضل الصلوات والتسلیمات

طلبگارِ دعا

مفتی منیب الرحمٰن

عقائد کے مسائل

گفتگو کے دوران لفظ ''خدانخواستہ'' استعمال کرنے کا حکم

سوال:1

آپ کی توجہ لفظ ''خدانخواستہ'' یا ''اللہ نہ کرے'' کی جانب دلوانا چاہتا ہوں، آپ نے کبھی کبھی اس کا استعمال اپنے کالم میں کیا ہے۔ یہ عموماً کسی ناخوشگوار یا ناپسندیدہ واقعہ یا حادثہ سے حفاظت کے لئے مستعمل ہے۔ گویا ایسا واقعہ یا حادثہ کا ہونا یا ہو جانا خدا خواستہ ہے یعنی اس کی مرضی، رضا یا پسندیدگی سے ہوا ہے؟، یا اس کے ہونے کا محرک و فاعل اللہ تعالیٰ ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ ایسے ناپسندیدہ واقعات وحادثات کے محرک و فاعل، انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم انسان ہیں نہ کہ ذاتِ الٰہی۔ ''خدانخواستہ'' کے الفاظ میں بیشک کم مگر یہ معنیٰ پنہاں ہے کہ اگر ناپسندیدہ حادثہ یا واقعہ ہوا ہے تو (خدا خواستہ) یعنی اللہ کے چاہنے سے ہوا ہے اور اس کا فاعل ومحرک اُس کی ذاتِ کریمی ہے۔ اس طرح انسان کو جو انفرادی واجتماعی طور پر ایسے ناگوار وناپسندیدہ واقعات وحادثات کا سبب ہیں، بری الذمہ ٹھہرادیا جاتا ہے اور وجہ اللہ تعالیٰ بن جاتے ہیں۔ ''خدانخواستہ یا اللہ نہ کرے'' کی جگہ دوسرے دعائیہ الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہیں، جیسے معاذ اللہ! خاکم بدہن، اللہ ہمیں یا ہمارے ملک کو اپنی حفظ وامان اور نگاہِ لطف وکرم میں رکھے۔ اللہ نہ صرف رحمٰن ورحیم اور کریم ہے، بلکہ وہ تو اپنے جمالیاتی اور تخلیقی شاہکار انسان سے شدید محبت کرتا ہے، اس کی صفت ''اَلْوَدُوْد'' ہے۔ انسان اُس کی نگاہِ لطف وکرم کا مرکز ہے اور تمام کائنات وقرآن کریم کا محور بھی انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف حسین صفات کا مالک ہے (لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى) بلکہ سبحان بھی ہے یعنی وہ ہر طرح کے عیب ونقص، ضرورت وحاجت اور ناپسندیدہ وناگوار صفات وغیرہ سے پاک ومنزہ ہے۔ اُس نے خود ہی اپنے کو حسین صفات تک محدود کردیا ہے۔ اُس کی کوئی ایک صفت بھی دکھ، رنج، غم اور تکلیف دینے والی نہیں، اُس کی رحمت ومحبت اور شفقت واحسان کا موازنہ، ماں کی شفقت ورحمت سے کرنا اُس کے شایانِ شان نہیں، لہٰذا محتاط رہنا ہی بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں کج روی اور کج اندیشی سے

سخت ممانعت اور سزا کی وعید ہے، (الاعراف:180/7)

اسی طرح مسلمانوں کے معاشرے میں قسمت، مُقدّر اور تقدیر کے الفاظ کا استعمال بھی نامناسب ہے، میرا برا مقدر یا میری بری تقدیر وغیرہ کے الفاظ کہہ کر ذمے داری اپنے بجائے ربّ ورحمٰن پر ڈال دی جاتی ہے اور ابلیس کی طرح کا شِعار اختیار کرلیا جاتا ہے، حالانکہ ہمارے لئے نمونہ ہمارے آباء حضرت آدم وحوا علیہما السلام ہیں، جنہوں نے اپنی خطا کے جرم کا ارتکاب اپنے اوپر لیا۔ قسمت یا نصیب تو قانونِ مکافات عمل کا نتیجہ اور بدلہ ہے، انسان کے اپنے حسین یا بداعمال کا قصور اپنا ہوا اور ذمے داری دوسرے پر ڈالنا، کیا یہ ابلیسی روش نہیں ہے؟۔ اُس نے بھی تو یہی کیا اور کہا تھا۔ بہت اشد ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے بداعمال کے نتائج وعواقب اور خود اُن کے محرک وفاعل ہونے کا احساس کریں، نہ کہ اس کا محرک وفاعل اللہ تعالیٰ یا قسمت وتقدیر کو ٹھہرائیں، (لیفٹیننٹ کرنل عابد حسین عابد)۔

جواب:

آپ اپنے سوال کا براہِ راست جواب سمجھنے سے قبل اپنے سوال میں درج چند باتوں کی اصلاح فرمالیجئے:

(۱) آپ نے لکھا ہے: ''اللہ نہ صرف رحمٰن، رحیم اور کریم ہے، بلکہ وہ تو اپنے جمالیاتی اور تخلیقی شاہکار انسان سے شدید محبت کرتا ہے اس کی صفت ''اَلْوَدُوْد'' ہے۔ انسان اُس کی نگاہِ لطف وکرم کا مرکز ہے اور تمام کائنات وقرآن کریم کا محور بھی انسان ہے۔''

اللہ تعالیٰ صرف اپنے اطاعت گزار بندوں سے بلاشبہ شدید محبت فرماتا ہے اور یقیناً وہ ''اَلْوَدُوْد (نہایت محبت فرمانے والا)'' ہے، لیکن وہ اپنے نافرمان بندوں پر شدید غضب بھی فرماتا ہے، ملاحظہ فرمایئے: سورۂ بقرہ: 174، سورۂ آل عمران: 87 اور سورۃ النساء:93 اور دیگر آیاتِ مبارکہ۔

(۲) آپ نے لکھا ہے: ''اُس نے خود ہی اپنے کو حسین صفات تک محدود کردیا ہے''۔ ہمارے عقائد میں یہ بات مسلّم ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ اس کی قدرت واختیار میں نہیں

ہیں، جبکہ آپ کی تحریر سے صفات باری تعالیٰ کا مقدور ہونا لازم آتا ہے۔ یہ اگرچہ باریک ولطیف علمی مسئلہ ہے اور عام آدمیوں کے لئے اس کا سمجھنا دشوار ہے اور نہ ہی یہ عام آدمیوں کا موضوعِ بحث ہونا چاہئے، صرف اصلاح کی غرض سے یہ وضاحت کی گئی ہے

(۳) آپ نے لکھا ہے کہ: ''حالانکہ ہمارے لئے نمونہ ہمارے آباء حضرت آدم وحوا علیہما السلام ہیں، جنہوں نے اپنی خطا کے جرم کا ارتکاب اپنے اوپر لیا''۔ یہاں پر بھی اپنی اصلاح فرمالیجئے اور توبہ کیجئے، اللہ تعالیٰ کے کسی بھی نبی کی طرف ''جرم'' کی نسبت درست نہیں ہے۔ ہم محض سمجھنے اور سمجھانے کے لئے اسے ''خطاءِ اجتہادی'' سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک معروف اور کثیر الاستعمال اردو محاورہ ہے کہ اگر ہمیں مستقبل کے بارے میں کسی ناخوشگوار بات کے وقوع کا اندیشہ ہو تو ہم کہتے ہیں ''خدانخواستہ اگر یوں ہوگیا تو''۔ خواستن مشیت کے معنی میں ہے، ہمیں غیب کا علم تو نہیں ہے، نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس مسئلے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کیا ہے؟۔ یہ ایک دعائیہ کلمہ ہے کہ جس امر کے وقوع یا عدمِ وقوع کا ہمیں اندیشہ ہے اور ہمارے ناقص علم کے مطابق وہ صورت ہمارے حق میں خیر نہیں ہے، تو ہم دعا کے طور پر ''خدانخواستہ'' کا کلمہ اس کلام کے سابقے کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ اللہ کی مشیت اس طرح نہ ہو تو اچھا ہے، کیونکہ اس کی مشیت کا یہ تقاضا ہوا تو اس نے ہوکر ہی رہنا ہے کیونکہ: ''جو اللہ چاہتا ہے وہ لازماً ہوجاتا ہے اور جو وہ نہ چاہے تو اس کا وقوع ناممکن ہے''۔ اس کیلئے عربی میں کہتے ہیں: ''مَاشَآءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَالَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ''۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱)۔ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا ﴿۲۳﴾

ترجمہ: ''کسی چیز کے بارے میں ہرگز (مطلق طور پر) یہ نہ کہو کہ: میں کل یہ کام کروں گا، بلکہ (یوں کہو کہ) اگر اللہ چاہے گا (تو میں کل یہ کام کردوں گا)، (الکھف:23)

(۲) وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: ''اور تمہارا چاہنا (کیا حیثیت رکھتا ہے) مگر یہ کہ جہانوں کا پروردگار اللہ چاہے (تو

ویسا ہی ہو جائے گا)، (التکویر:29)''۔

(۳) وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ (سورۃ الدہر:30)

ترجمہ: ''اور تمہارا چاہنا کچھ نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے (وہی ہوگا)''۔

''خدانخواستہ'' کی طرح ''اللہ نہ کرے'' بھی دعائیہ کلمہ ہی ہے، حدیث پاک میں ہے:

مَنْ سَمِعَ رَجُلاً يَنْشُدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ لَا رَدَّهَا اللهُ عَلَيْكَ فَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا،

ترجمہ: ''جو کوئی مسجد میں کسی گمشدہ چیز کا اعلان کرے اسے سن کر کہو: ''لَا رَدَّهَا اللهُ عَلَيْكَ'' یعنی ''اللہ تعالیٰ تمہیں یہ چیز واپس نہ لوٹائے''، کیونکہ مسجدیں اس کام کے لئے تعمیر نہیں کی گئیں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:1162)''۔

اِس حدیثِ پاک میں ''لَا رَدَّهَا اللهُ عَلَيْكَ، یعنی اللہ اس گم شدہ چیز کو تمہیں واپس نہ لوٹائے''، کا کلمہ بددعا کے طور پر نہیں ہے بلکہ تنبیہ اور تہدید یعنی ڈراوے کے طور پر ہے کہ وہ شخص اس کام سے باز آجائے، مسجد کو اعلان اور تشہیر کے لئے استعمال نہ کرے، مسجد کا اصل مقصد تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکر وفکر ہے۔

واضح رہے کہ ''مشیت الٰہی'' اور ''رضائے الٰہی'' میں فرق ہے، مثلاً سرکش اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے بغاوت کرنے والی بعض امتوں پر عذابِ استیصال (یعنی ایسا عذاب جس میں جڑ سے اکھیڑ دیا جائے، نام ونشان مٹ جائے) اس طرح آیا کہ ان کا نام ونشان مٹ گیا، بستیاں تہ وبالا کردی گئیں، سنگ باری ہوئی، طوفان آئے، ایک چنگھاڑ (صَيْحَة) سے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، یہ مشیت الٰہی تھی، رضائے الٰہی نہیں۔ رضائے الٰہی تو یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے بن کر دنیا وآخرت میں اس کی رحمت کے حق دار بنتے۔ مشرکین، کفار، اللہ تعالیٰ کے احکام کے باغیوں، سرکشوں اور گنہگاروں کو سزا دینا مشیت الٰہی ہے، رضاءِ الٰہی نہیں ہے۔ یہ عقیدہ نہیں رکھنا چاہئے کہ تمام باطل، ناحق اور برے کام (معاذ اللہ!) اللہ تعالیٰ کی مشیت کے علی الرغم (برخلاف) ہورہے ہیں۔

ایمان مفصّل کے ان کلمات: ''وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی'' کا مطلب بھی یہی ہے، یعنی تقدیر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی مقدر ہوتی ہے، خواہ وہ (بظاہر) خیر کی صورت میں ہو یا شر کی صورت میں۔ ظاہر میں جو صورتِ خیر ہے، وہ اس کی رضا ہے اور جو صورت شر ہے وہ اس کی مشیت ہے۔ صورت شر کے ساتھ ظاہری طور پر کی قید اس لئے لگائی ہے کہ حقیقت میں باغی اور مجرم کو سزا دینا، شر نہیں ہے۔ اور اس پر انسانیت کی عقل عام (Common Sense) اور اجتماعی دانش (Collective Wisdom) کا اِجماع (Consensus) ہے، اسی لئے تو جرائم کے لئے سزاؤں کے قوانین بنائے جاتے ہیں، عدالتیں قائم ہیں، مجرموں پر تعزیرات نافذ ہوتی ہیں۔

آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سارے نام ہی حسین ہیں، لیکن آپ کا مطلقاً یہ کہنا کہ ''اُس کی کوئی ایک صفت بھی دکھ، رنج، غم اور تکلیف دینے والی نہیں''، درست نہیں ہے۔ اُن اسماءِ حُسنٰی میں یہ اسماءِ مبارکہ بھی ہیں: اَلْمُتَکَبِّرُ، اَلْجَبَّارُ، اَلْقَھَّار، اَلْمُمِیْتُ، اَلْمُنْتَقِم، اَلضَّارُ، یہ سب اسماءِ مبارکہ اُس کے شایانِ شان ہیں، ''متکبر'' ہونا بندے کے لئے عیب ہے، نقص ہے، اللہ تعالیٰ کی شان ہے، اسے سزاوار ہے، زیبا ہے۔ اللہ تعالیٰ ''جَبَّارُ'' ہے، وہ سرکشوں اور باغیوں پر جبر فرماتا ہے، وہ ''قَھَّار'' ہے، اُس نے باغی اُمتوں پر اپنا قہر و غضب نازل فرمایا، اسی طرح وہ ''مُنْتَقِم'' بھی ہے۔ تو ظاہری صورت میں جن پر عذاب آیا، جن کی اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی، جن کو اللہ تعالیٰ آخرت میں عذابِ جہنم میں مبتلا فرمائے گا، وہ اُن سب کو ظاہری صورت میں تکلیف، غم واندوہ اور رنج والم میں مبتلا کرنے والا ہے۔ اس لئے آپ کا یہ کہنا کہ: ''اُس کی کوئی ایک صفت بھی دکھ، رنج، غم اور تکلیف دینے والی نہیں''، درست نہیں ہے۔ اس کی صحیح تاویل یہ ہے کہ اپنے خالق و مالک کے باغیوں کو سزا دینا اور فرماں برداروں کو جزا دینا ایک اچھی قدر ہے۔ ورنہ اگر نیک و بد کو ایک لاٹھی سے ہانکا جائے تو اچھی قدریں کیسے پروان چڑھیں گی؟

قسمت، نصیب، مقدر اور تقدیر کے کلمات کے استعمال میں شرعاً کوئی خرابی نہیں ہے۔

''میری تقدیر بری ہے'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ ! اللہ تعالیٰ نے ظلم کیا ہے، سبب (Cause) بندے کا اپنا عمل ہے اور مُسَبَّب (Effect) یعنی عمل کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ اہلسنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے اور بندے اور اس کے افعال کا خالقِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، فعل کا صدور اس کی قدرت سے ہوتا ہے، اور انسان کو جزا و سزا اس کے اپنے اختیاری کسب (فعل) پر ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ، ترجمہ: ''اور اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا، (الصافات: 96)۔

قرآن نے یہی ادب بتایا ہے کہ بندہ نقص و عیب کو اپنی طرف منسوب کرے اور کمال کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف: مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ، ترجمہ: ''(اے مخاطب!) تم کو جو اچھائی پہنچتی ہے، سو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور تم کو جو برائی پہنچتی ہے، وہ تمہاری اپنی ذات کی وجہ سے ہے، (النساء: 79)''۔ نیکی اور بدی بندے کا فعل ہے، لیکن ادباً نیکی کو اللہ کی طرف منسوب کیا اور بدی کی نسبت بندے کی طرف کی، کیونکہ نیکی اور بدی کا فاعل اور کاسب بندہ ہے اور انسان اور اُس کے اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کے دعائیہ کلمات قرآن مجید میں مذکور ہیں:

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں ہے، تو (ہر عیب سے) پاک ہے، بے شک میں ہی زیادتی کرنے والوں میں سے تھا، (الانبیاء: 87)''۔ اس مقام پر حضرت یونس علیہ السلام نے سبحان (بے عیب ہونے) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی اور زیادتی کی نسبت اپنی طرف کی۔

آپ کی تحریر میں بیان کردہ عقائد قرآن و سنت اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، اس لئے آپ پر اس عقیدہ سے رجوع کرنا لازم ہے۔ آپ کا یہ جملہ کہ: ''یا اس کے ہونے کا مُحرِک و فاعل اللہ تعالیٰ ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں''۔

بظاہر یہ جملہ گمراہی پر مبنی ہے اور شاید یہ ارادتاً نہیں بلکہ اسلامی عقائد سے ناواقف

ہونے کی وجہ سے ہے۔ دراصل انسانی افعال (خواہ وہ اچھے ہوں یا برے) کا مُحرِّک انسان خود ہے، اس کا "نَفْسِ لَوَّامَہ (Consience)" اور "نفس مُطْمَئِنَّہ" خیر کے محرک ہیں اور "نفس اَمّارہ" شر کا محرک ہے، اس لئے اس پر جزا و سزا کا مدار ہے۔ باقی انسان اور اس کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ

"اللہ (ہی) ہے جو تمہارا اور تمہارے اعمال کا خالق ہے، (الصافات:96)"۔

تو انسان کے ہر فعل کا خالق تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، البتہ کاسب (یعنی کام کرنے والا) بندہ ہے اور "کسب" پر ہی ثواب وعقاب کا مدار ہے۔

نعت کے شعر میں بھول کر ایک مصرعے کی جگہ دوسرا مصرعہ پڑھنے کا حکم

سوال:2

ایک شخص نے کسی محفل میں اعلیٰ حضرت کی مناجات بھول کر اِس طرح پڑھی:

؎ یاالٰہی! نامۂ اعمال جب کھلنے لگیں　　دولتِ بیدار عشقِ مصطفیٰ کا ساتھ ہو

حالانکہ شعر کا دوسرا مصرعہ اس طرح تھا کہ: ع　عیب پوشِ خَلق ستار خطا کا ساتھ ہو

آیا اس میں کوئی گناہ کا ارتکاب تو نہیں ہوا جبکہ یہ شعر بھول کر پڑھا گیا تھا۔

(محمد عقیل عطاری، ایف۔ بی ایریا، کراچی)

جواب:

اس میں کسی گناہ کا ارتکاب نہیں ہوا اور نہ ہی معنی میں کوئی ایسی تبدیلی واقع ہوئی ہے، جس سے شانِ رسالت مآب ﷺ یا شانِ الوہیت جل وعلا میں اہانت کا دور کا بھی کوئی شائبہ پیدا ہوتا ہو۔ جو مصرعہ سہواً نعت خواں سے رہ گیا اور اس کی جگہ جو دوسرا مصرعہ پڑھا گیا ہے، دونوں سے مراد ذاتِ رسالت مآب ﷺ ہی ہے، لہٰذا کوئی بنیادی معنوی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ اس ساری مناجات کے ہر شعر کے مصرعۂ ثانیہ سے رسول اللہ ﷺ ہی کی

ذات بابرکات مراد ہے۔

غیر نبی پر مستقلاً درود وسلام بھیجنا

سوال:3

ایک مسجد میں رسول اللہ ﷺ پر سلام بھیجا جارہا تھا اور سلام کے اختتام پر یہ شعر پڑھا گیا: ؎ میں مُقلّد ہوں احمد رضا کا ریاض

اُس امامِ اہلسنت پہ لاکھوں سلام

محفل کے اختتام پر ایک نمازی نے اعتراض کیا کہ ایک محفل میں جب حضور ﷺ پر سلام بھیجا جارہا ہو تو اسی محفل میں کسی اور اللہ کے ولی پر ویسا ہی سلام نہیں بھیجا جاسکتا۔ اُس پر امام صاحب نے کہا کہ التحیات میں بھی حضور ﷺ پر سلام بھیجنے کے بعد اللہ کے نیک اور صالحین بندوں پر سلام بھیجتے ہیں، یعنی ''اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ'' پڑھتے ہیں، تو جب نماز میں حضور ﷺ پر سلام بھیجنے کے بعد اللہ کے نیک بندوں پر سلام بھیج سکتے ہیں، تو اسی طرح دوسری محافل میں بھی سلام بھیج سکتے ہیں۔ کیا اُس نمازی کا اعتراض کرنا صحیح ہے؟

(محمد صادق، کراچی)

جواب:

ایک سلام وہ ہے جو اہلِ اسلام کا شعار ہے اور اس میں مسلمانوں کی ایک دوسرے سے ملاقات کے موقع پر مسرّت کا اظہار ہے اور یہ ایک دوسرے کے لئے کلمۂ دعا بھی ہے اور خیر خواہی بھی۔ اِس سلام کا جواب دینا شریعت کی رُو سے واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۶۱

''پھر جب (ان میں سے) کسی گھر میں تم داخل ہو تو اپنوں پر سلام کرو (ملاقات کے وقت) اچھی دعا، اللہ کی طرف سے برکت والی پاکیزہ چیز ہے، اِسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے

آیتیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو، (سورۃ النور: 61)''۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۷

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو اور ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کرلو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو، (سورۃ النور: 27)''۔

وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ

ترجمہ: ''اور جب تمہیں کوئی سلام پیش کیا جائے تو تم اُن سے بہتر کلمات کے ساتھ سلام کر دیا (کم از کم) اُنہی الفاظ میں جواب دے دو، (سورۃ النساء: 86)''۔

اسی طرح قرآن مجید نے اہلِ جنت کے بارے میں فرمایا:

اُولٰٓىِٕكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ۝۷۵

ترجمہ: ''وہی لوگ ہیں جنہیں اُن کے صبر کے صلہ میں جنت کا بالا خانہ دیا جائے گا اور وہاں دعا اور سلام کے ساتھ اُن کا استقبال کیا جائے گا، (سورۃ الفرقان: 75)''۔

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰ (یونس: 10)

ترجمہ: ''جنت میں اُن کی دعا یہ ہے: ''اے اللہ! تیرے لئے پاکی ہے''، اور وہاں ان کی باہمی دعائے خیر سلام ہے اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' پر اُن کی دعا ختم ہوگی''۔

وَ اُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۝۲۳ (سورۂ ابراہیم: 23)

ترجمہ: ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک عمل کئے، وہ (جنت کے) باغات میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے وہاں (ملاقات کے وقت) ان کا دعائیہ کلمہ سلام ہوگا''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں مسلمانوں کے ایک دوسرے پر چھ عام حقوق بیان فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِذَا لَقِیْتَہٗ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ، ترجمہ: ''جب تم اپنے (مسلمان بھائی) سے ملو تو اُسے سلام کرو''۔ (صحیح مسلم، کتاب السلام، رقم الحدیث: 5616)

سوال میں جو مسئلہ زیر بحث ہے، یہ اُس اصطلاح سے متعلق ہے جو غائبانہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کہا جاتا ہے، یعنی جو تعظیم وتکریم کے طور پر اللہ تعالیٰ کے رسولوں، ملائکہ اور اُن کی متابعت میں اُس کے محبوب بندوں پر بھیجا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ اصالتاً اور بالذات صلوٰۃ وسلام اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام علیہم السلام اور ملائکہ کے ساتھ خاص ہے، البتہ اُن کی متابعت میں اہلِ بیتِ اطہار، صحابہ کرام، تابعینِ عظام، آئمہ کرام اور دیگر مُقربینِ بارگاہِ الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر بھی بھیجا جاسکتا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَلَا یُصَلّٰی عَلٰی غَیْرِ الْاَنْبِیَاءِ وَلَا غَیْرِ الْمَلَائِکَۃِ اِلَّا بِطَرِیْقِ التَّبَعِ،

ترجمہ: ''غیر انبیاء اور غیر ملائکہ پر درود نہ بھیجا جائے مگر اُن کی متابعت میں''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِاَنَّ فِی الصَّلَاۃِ مِنَ التَّعْظِیْمِ مَا لَیْسَ فِیْ غَیْرِھَا مِنَ الدَّعْوَاتِ، وَھِیَ زِیَادَۃُ الرَّحْمَۃِ وَالْقُرْبِ مِنَ اللہِ تَعَالٰی، وَلَا یَلِیْقُ ذٰلِکَ بِمَنْ یُّتَصَوَّرُ مِنْہُ الْخَطَایَا وَالذُّنُوْبُ اِلَّا تَبَعًا بِاَنْ یَّقُوْلَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلِّمْ۔ لِاَنَّ فِیْہِ تَعْظِیْمَ النَّبِیِّ ﷺ۔ زیلعی۔ وَاخْتُلِفَ ھَلْ تَحْرِیْمًا اَوْ تَنْزِیْھًا اَوْ خِلَافَ الْاَوْلٰی وَصَحَّحَ النَّوَوِیُّ فِی الْاَذْکَارِ الثَّانِیَ، لٰکِنْ فِیْ خُطْبَۃِ شَرْحِ الاشباہِ لِلْبِیْرِیْ مَنْ صَلّٰی عَلٰی غَیْرِھِمْ اَثِمَ وَکُرِہَ، وَھُوَ الصَّحِیْحُ، وَفِی الْمُسْتَصْفٰی وَحَدِیْثُ صَلَّی اللہُ عَلٰی آلِ اَبِیْ اَوْفٰی۔ اَلصَّلَاۃُ حَقُّہٗ فَلَہٗ اَنْ یُّصَلِّیَ عَلٰی غَیْرِہٖ اِبْتِدَاءً، اَمَّا لِغَیْرِہٖ فَلَا، وَاَمَّا السَّلَامُ فَنَقَلَ اللَّقَانِیُّ فِیْ شَرْحِ جَوْھَرَۃِ التَّوْحِیْدِ عَنِ الْاِمَامِ الْجُوَیْنِیْ اَنَّہٗ فِیْ مَعْنَی الصَّلَاۃِ، فَلَا یُسْتَعْمَلُ فِی الْغَائِبِ وَلَا یُفْرَدُ

بِہٖ غَیْرُ الْاَنْبِیَاءِ، فَلَا یُقَالُ عَلِیٌ علیہ السلام، وَسَوَاءٌ فِیْ ھٰذَا الْاَحْیَاءُ وَالْاَمْوَاتُ، اِلَّا فِی الْحَاضِرِ فَیُقَالُ اَلسَّلَامُ اَوْ سَلَامٌ عَلَیْکَ اَوْ عَلَیْکُمْ، وَھٰذَا مُجْمَعٌ عَلَیْہِ،

ترجمہ: ''اس کا سبب یہ ہے کہ دُرود میں (اِس درجے کی) تعظیم ہے جو دیگر دعاؤں میں نہیں ہے اور اِس میں رحمتِ باری تعالیٰ کی فراوانی ہے اور اللہ تعالیٰ کے زیادہ قُرب کا اظہار ہے، لہٰذا جن افراد سے خطا اور گناہ کا صدور مُتصور ہو اُن پر مستقلاً درود نہ بھیجا جائے، البتہ تبعاً بھیجا جاسکتا ہے کہ اِس طرح کہے: ''اللّٰھمّ صلّ علیٰ محمد وّاٰلہٖ وصحبہٖ وسلّم''، (ترجمہ: اے اللہ! محمد ﷺ اور اُن کی آل اور اصحاب پر درود وسلام نازل فرما) کیونکہ بِالتّبع دوسروں کو شامل کرنے میں بھی نبی کریم ﷺ ہی کی تعظیم ہے، (بحوالہ زیلعی)۔ اِس امر میں اختلاف ہے کہ آیا غیر نبی پر مستقلاً درود بھیجنا مکروہِ تحریمی ہے یا مکروہِ تنزیہی یا خلافِ اولیٰ؟ امام نووی نے ''الاذکار'' میں مکروہِ تنزیہی کے قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن ''علامہ بیری'' کی ''شرحِ الاشباہ'' میں لکھا ہے: جس نے (غیرِ نبی پر اصالتاً) درود بھیجا، وہ گناہ گار ہوا اور فعلِ مکروہ کا ارتکاب کیا اور یہی قول صحیح ہے۔ (امام ابنِ عابدین شامی اِس اعتراض کا، کہ غیرِ نبی پر اصالتاً درود بھیجنے کا ثبوت موجود ہے، جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:) ''المستصفیٰ'' میں اس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! (تو آلِ ابی اوفیٰ پر اپنی خصوصی رحمت نازل فرما'') یعنی یہاں غیرِ نبی پر مستقلاً درود بھیجا گیا ہے، اس کا جواب یہ ہے: کہ درود حقِ رسول ﷺ ہے، انہیں تو اختیار ہے کہ (کسی) غیر نبی (پر خصوصی کرم فرماتے ہوئے) مستقلاً درود بھیجیں، لیکن غیرِ نبی کو یہ اختیار نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک غیرِ نبی پر مستقلاً سلام بھیجنے کا تعلق ہے تو ''جوہرۃ التوحید'' میں ''علامہ لقانی'' نے ''امام جوینی'' کے حوالے سے لکھا: مستقلاً کسی پر سلام بھیجنا صلوٰۃ ہی کے معنی میں ہے، لہٰذا کسی بھی غائب پر مستقلاً سلام نہ بھیجا جائے اور نبی کے علاوہ کسی اور پر بالذات سلام نہ بھیجا جائے، پس ''علی علیہ السلام'' نہ کہا جائے، اِس حکم میں زندہ اور وفات پانے والے سب شامل ہیں، مگر کسی موجود شخص کو کہہ سکتے ہیں کہ ''السلام علیک'' یا ''سلام علیکم'' یا ''السلام علیکم''، یہ مسئلہ مُتفقہ ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

میں (ابنِ عابدین شامی) کہتا ہوں کہ: (خلاصۂ کلام) سلف صالحین کی زبان سے ''صلوٰۃ وسلام'' کا استعمال انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہے، جیسے ''عزّوجلّ'' کا استعمال اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ عزیز بھی ہیں اور جلیل بھی، ''لقانی'' نے کہا: قاضی عیاض کہتے ہیں کہ محققین کی یہی رائے ہے، مالک، سفیان اور کئی محققین اور متکلمین کا یہی مختار ہے کہ بالذات اور مستقلاً ''صلوٰۃ وسلام'' نبی کریم ﷺ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے مخصوص کرنا ضروری ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر مبارک ہو تو کلماتِ تسبیح وتقدیس وتکبیر بولے جاتے ہیں اور باقی صلحاء امت کے لئے ''رضی اللہ عنہ''، ''رحمہ اللہ تعالیٰ'' اور ''غفرہ اللہ تعالیٰ'' کے کلمات بولے جاتے ہیں، جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ''، اللہ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے، المائدہ: 9 اور الحشر: 10 میں ہے: رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ، (ترجمہ: ''(بعد میں آنے والے) اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں: اے پروردگار! ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ چلے گئے)''، نماز میں جو ''اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ'' منقول ہے، اس طرح کے امور اپنے مورد (یعنی جس مقام کے لئے مشروع ہوئے ہیں) میں بند ہوتے ہیں اور یہ سلام مستقلاً نہیں بلکہ بالتبع ہے، کیونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج اپنے اوپر سلام بھیجا اور صالحین است کا ذکر تبعاً ہے مستقلاً نہیں ہے (نوٹ: یہ علامہ شامی کی طویل بحث کا خلاصہ ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 10، ص: 400، 401، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ یحییٰ بن شرف النووی متوفی 676ھ لکھتے ہیں: قَالَ الشَّیْخُ اَبُوْ مُحَمَّدٍ الْجُوَیْنِیُّ مِنْ اَئِمَّةِ اَصْحَابِنَا اَلسَّلَامُ فِیْ مَعْنَی الصَّلَاةِ وَلَا یُفْرَدُ بِهٖ غَیْرُ الْاَنْبِیَاءِ لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَرَنَ بَیْنَهُمَا وَلَا یُفْرَدُ بِهٖ غَائِبٌ وَلَا یُقَالُ قَالَ فُلَانٌ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَاَمَّا الْمُخَاطَبَةُ بِهٖ لِحَیٍّ اَوْ مَیِّتٍ فَسُنَّةٌ فَیُقَالُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَوْ عَلَیْکَ اَوْ سَلَامٌ عَلَیْکَ اَوْ عَلَیْکُمْ،

ترجمہ: ''اصحابِ شافعیہ کے ایک امام شیخ محمد الجوینی نے کہا کہ: لفظ سلام بھی صلوٰۃ کے حکم میں ہے، اور غیرِ نبی پر تنہا سلام نہیں بھیجنا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (صلاۃ وسلام) دونوں کو یکجا کر کے ذکر فرمایا ہے، اور غیر موجود شخص پر بھی سلام نہیں بھیجنا چاہئے اور اس طرح نہ کہا جائے کہ ''فلاں علیہ السلام نے یہ بات کہی ہے''، البتہ زندہ اور فوت شدہ کو سلام کے ساتھ مخاطب کرنا سنت ہے، مثلاً: ''السلام علیکم'' کہنا یا ''علیک السلام'' یا ''سلام علیک'' اور ''سلام علیکم'' کہنا''۔ (شرح مسلم للنووی، جلد ثالث، جز سابع، ص:185، مکتبۂ غزالی، دمشق)

علامہ غلام رسول سعیدی غیر نبی پر سلام بھیجنے کے مسئلے پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے اختتام پر لکھتے ہیں: ''علامہ شہاب الدین خفاجی متوفی 1069ھ نسیم الریاض میں لکھتے ہیں: ''صحیح یہ ہے کہ غیر انبیاء پر صلوٰۃ بھیجنا مکروہ تنزیہی ہے، مکروہ تحریمی نہیں ہے، کیونکہ نبی ﷺ کے ساتھ صلوٰۃ اس طرح خاص ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ عزوجل خاص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صلوٰۃ کی طرح آپ کے ساتھ سلام بھی خاص ہے، اس لئے آپ کے علاوہ کسی کو ''علیہ السلام'' بھی نہ کہا جائے، جیسا کہ فقہاء نے تصریح کی ہے، اس لئے یہ بھی مکروہ تنزیہی ہے''۔

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب علامہ محمود آلوسی حنفی بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں: ''در منضود میں ہے کہ سلام، صلوٰۃ کی طرح ہے سوائے اس صورت کے جب حاضر یا غائب کی تحیت اور تعظیم مقصود ہو اور بعض علماء نے یہ فرق کیا ہے کہ سلام ہر مومن کے حق میں مشروع ہے، بخلاف صلوٰۃ کے۔ لیکن یہ بات مدعا کے خلاف ہے، اس لئے مقبول نہیں ہے۔ اور ''اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ'' سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اوّل تو وہ خاص مَورَد ہے، ثانیاً: وہ سلام بالتّبع ہے اور ہماری گفتگو سلام بالاستقلال میں ہے۔ اور بعض علماء نے یہ تحقیق کی ہے کہ جو سلام زندہ اور مردہ کو شامل ہے، یہ وہ سلام ہے جس سے تحیّت اور تعظیم کا قصد کیا جاتا ہے، جیسے ملاقات یا زیارتِ قبر کے وقت سلام کیا جاتا ہے، جو جوباً جواب کا مستحق ہوتا ہے، خواہ وجوب فرضی ہو

یا وجوب کفائی۔ اور جس سلام کے ساتھ دعا مقصود ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے سلامتی کا قصد ہو، یہ وہ ہے جو امت کی طرف سے حضور ﷺ کے لئے خاص ہے۔ لہٰذا آپ کے غیر پر یہ سلام صرف تبعاً کیا جا سکتا ہے۔ علامہ تقی الدین سبکی نے ''شِفاء الغرام'' میں اسی طرف اشارہ کیا ہے اور اب علیہ السلام، علیہ الصلوٰۃ کے حکم میں ہوگا یعنی ''علیہ السلام من اللہ تعالیٰ''۔ اور سلام میں وہی تعظیم ملحوظ ہوگی جو صلوٰۃ میں ہوتی ہے''۔

حرفِ مُدّعا: ''غیر نبی پر صلوٰۃ اور سلام کی بحث میں ہم نے جو دلائل ذکر کیے ہیں اور جو عبارات نقل کی ہیں، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر نبی پر صلوٰۃ بھیجنا مکروہ تنزیہی ہے اور غیر نبی پر سلام بھیجنے کی ممانعت اس سے کم درجہ کی ہے اور اس کو زیادہ سے زیادہ خلافِ اولیٰ کہا جا سکتا ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 2، ص: 1024)''۔

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال کیا گیا کہ: ''اگر کوئی شخص واعظ یا کسے باشد مگر سنی صحیح العقیدہ حنفی ہو، ایام محرم میں شہداء کربلا رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجالس میں، حالتِ قیام میں اختتامِ وعظ کے بعد اشعار و صلوٰۃ و سلام مضمونِ شہادت کے ساتھ اگر ایسا پڑھے کہ ''یا نبی سلام علیك''، ''یا حَسَن سلام علیك''، ''یا حسین سلام علیك''، ''صلوات اللہ علیکم''، ''پڑھے اور لوگوں سے پڑھائے تو حرام ہے یا مکروہ ہے یا جائز ہے؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''یہ طریقہ زمانہ سابق میں نہیں تھا کہ کتابوں میں اس کے جواز یا عدمِ جواز کا ذکر ہوتا اور سلف صالحین کے قول یا فعل سے اس کی تائید ہوتی۔ عامۂ مسلمین اور تمام بلادِ اسلامیہ میں یہ رواج ہے کہ محفلِ میلادِ اقدس میں بوقت ذکرِ ولادت قیام کیا جاتا ہے اور اس موقع پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں اور یہ محفل شریف کی خصوصیت اور امتیازی چیز سمجھی جاتی ہے، اگر دوسرے مواقع پر بھی یہ طریقہ برتا جائے، کبھی ذکرِ شہادت میں، کبھی گیارہویں کی مجلس میں اور اسی طرح بزرگانِ دین کے عرس و فاتحہ میں، تو مجلس میلاد شریف کی امتیازی کیفیت باقی نہ رہے گی۔ لہٰذا اس اختراع سے گریز کرنا چاہئے، ھذا ماعندی والعلم بالحق عند ربی''۔

اُن سے ایک اور سوال کیا گیا کہ: ''یا حسین علیہ السلام'' کہنا جائز ہے یا نہیں، اور ایسا لکھنا بھی کیسا ہے اور پکارنا کیسا ہے؟''۔

آپ نے جواب دیا: ''یہ سلام جو نام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، یہ سلام تحیت نہیں جو باہم ملاقات کے وقت کہا جاتا ہے یا کسی ذریعہ سے کہلایا جاتا ہے، بلکہ اس سے مقصود صاحب اسم کی تعظیم ہے۔ عرف اہل اسلام نے اس سلام کو انبیاء و ملائکہ کے ساتھ خاص کر دیا ہے، مثلاً: حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام۔ لہٰذا غیر نبی و مَلَک (فرشتے) کے نام کے ساتھ علیہ السلام نہیں کہنا چاہیے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد چہارم، ص: 243، 244)''۔

یہ اہلسنت و جماعت کا مختار مذہب ہے، فقہ جعفریہ اثنا عشری وغیرہ اس کے برعکس عقیدہ رکھتے ہیں اور اہلِ بیتِ اَطہار رضی اللہ عنہم کے اسماء مبارکہ کے ساتھ مستقلاً سلام کا استعمال کرتے ہیں، مثلاً: ''حضرت علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام، سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا'' وغیرہ۔

یہاں تک تو دینی ذوق رکھنے والوں کے لئے نفسِ مسئلہ کی تشریح کی گئی ہے کہ غیر نبی کے لئے اصالتاً صلاۃ یا سلام بھیجنے کا حکم کیا ہے؟ بالتبع غیرِ نبی پر صلوٰۃ یا سلام بھیجنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، جیسے ''اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللهِ الصّٰلِحِيْنَ ''۔

آپ نے سوال میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز پر جس سلام کا ذکر کیا ہے، وہ خود آپ کے بیان کے مطابق رسول اللہ ﷺ پر صلاۃ و سلام پڑھنے کے بعد اس کی متابعت میں پڑھا گیا، لہٰذا یہ جائز ہے۔ البتہ اگر صرف منقبت پڑھی جارہی ہو اور بالذات یعنی اصالتاً سلام بھیجا جائے، تو اس سے احتراز اولیٰ ہے، جیسے بعض حضرات شہداءِ کربلا رضی اللہ عنہم کی منقبت پڑھتے ہوئے یہ انداز اپناتے ہیں، ان کو چاہیے کہ ابتدا میں چند اشعار نبی کریم ﷺ پر سلام پڑھنے کے بعد شہداء کربلا رضی اللہ عنہم کی منقبت و سلام پڑھیں۔

انگریزی میں رسول اللہ ﷺ کے نام کے ساتھ SAW لکھنا حرام ہے

سوال:4

دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ عموماً انگلش لکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ کے نام کے ساتھ مکمل ''صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھنے کے بجائے مختصراً SAW لکھتے ہیں، مجموعی طور پر اِس لفظ کو پڑھا جائے تو اِس کا معنیٰ ہے: آری ہے۔ کیا اِس طرح لکھنا درست ہے؟

(منور احمد صدیقی، ملیر کراچی)

جواب:4

فقہائے کرام کا فتویٰ یہی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا نامِ مبارک لیا جائے یا لکھا جائے تو ساتھ ہی درود شریف یا کم از کم صلی اللہ علیہ وسلم ضرور لکھا یا پڑھا جائے، بلکہ بعض علماء کے نزدیک تو واجب ہے، علامہ ابن عابدین شامی ان مواقع کا بیان کرتے ہوئے جن میں درود شریف کا پڑھنا مستحب ہے، لکھتے ہیں:

قَولُه (وَمُستحبة فِی کلّ اَوقاتِ الاِمکان) أی حَیثُ لَا مَانِعَ ۔ وَنَصَّ الْعُلَمَاءُ عَلٰی اِستحبَابِهَا فِی مَوَاضِعَ یَومِ الْجُمُعَةِ، وَلَیْلَتِهَا، وَزِیدَ یَومُ السَّبتِ وَالأحدِ وَالخَمِیس، لِمَا وَرَدَ فِی کلٍّ مِن الثَّلَاثَةِ، وَعِندَ الصَّبَاحِ وَالْمَسَاءِ، وَعِندَ دخُولِ المسجدِ وَالخُرُوجِ منهُ، وَعِندَ زِیَارَةِ قَبرِهِ الشَّرِیفِ ﷺ، وَعِندَ الصَّفَا وَالْمَروَةِ، وَفِی خُطبَةِ الْجُمُعَةِ وَغَیرِهَا، عَقِبَ اجابَةِ الْمُؤذِنِ، وَعِندَ الاِقَامَةِ، وَاَوّلِ الدُّعاءِ وَاَوسَطِهِ وَآخِرِهٖ، وَعَقِبَ دُعاءِ القُنُوتِ، وَعِندَ الفَرَاغِ مِنَ التَّلبِیَةِ، وَعِندَ الاجْتِماعِ وَالافتِرَاقِ، وَعِندَ الوُضُوْءِ، وَعِندَ طَنِینِ الأُذُنِ، وَعِندَ نسیانِ الشَّیٔ، وَعِندَ الوَعظِ وَ نَشرِ العُلُومِ، وَعِندَ قِرأةِ الْحَدِیثِ ابتداءً وَانتِهَاءً، وَعِندَ کتابَةِ السؤالِ وَالفُتْیا، وَلِکلِّ مُصَنِّفٍ وَدَارِسٍ وَمُدَرِّسٍ وَخَطِیبٍ وَخَاطِبٍ وَمُتَزَوِّجٍ وَمُزَوِّجٍ، وَفِی الرَّسَائلِ وَبَینَ یَدَی السَّائرِ الأُمُورِ الْمُهِمَّةِ، وَعِندَ ذِکرِ اَوْ سَماعِ اِسمِهٖ ﷺ اَوْ کتَابَتِهٖ عِندَ مَن لَایَقُولُ بِوُجُوبِهَا،

ترجمہ: ''مصنف کا قول (ان مواقع پر جہاں تک ممکن ہو درود شریف پڑھنا مستحب ہے)

یعنی جہاں کوئی مانع نہ ہو، علماء نے کئی مواقع پر درود شریف پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں: جمعہ کے دن اور رات کے وقت، اور (بعض علماء نے) ہفتہ، اتوار اور جمعرات کے دن کا اضافہ کیا ہے، جیسا کہ ان میں سے ہر ایک دن کے بارے میں وارِد ہوا، اور صبح وشام کے وقت، اور مسجد میں داخل ہوتے اور مسجد سے باہر نکلتے وقت، اور قبرِ انور ﷺ کی زیارت کے وقت، اور صفا ومروہ کی سعی کرتے وقت، اور نمازِ جمعہ کے خطبہ اور دیگر خطبات میں، اور مؤذن کے کلماتِ اذان کا جواب دینے کے بعد، اور اقامت کے وقت اور دعا کے اول، درمیان اور آخر میں، اور دعاءِ قنوت کے بعد، اور تلبیہ (یعنی تلبیہ حج کے کلمات لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ) سے فراغت کے بعد، اور کسی جگہ جمع ہونے اور منتشر ہوتے وقت، اور وضو کے وقت، اور کان میں بھنبھناہٹ محسوس ہوتے وقت، اور جب کوئی شے کہیں رکھ کر بھول جائے، اور وعظ کہنے اور علوم کی اشاعت کرتے وقت، اور حدیث شریف پڑھتے وقت اول وآخر میں درود شریف کا پڑھنا، اور سوال وفتویٰ لکھتے وقت اور تصنیف اور تعلیم وتعلّم کے موقع پر، منگنی اور نکاح کا پیغام دیتے وقت، نکاح کرتے وقت یا کسی کا نکاح پڑھاتے وقت، اور خطوط کے شروع میں اور تمام اہم کاموں کے موقع پر اور رسول اللہ ﷺ کا اسمِ مبارک لینے یا اُس کے سننے یا اُس کے لکھنے کے وقت (بعض علماء ان تین مواقع پر درود شریف کے وجوب کے قائل ہیں) ان تمام مواقع پر درود شریف پڑھنا مستحب ہے۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 204)

لیکن ''صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ'' کو مختصر کر کے صرف ''ص'' یا ''صلعم'' لکھنا حرام ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

کلمۂ طیبہ شریف جب ورد کر کے پڑھا جائے تو اس میں ہر کلمہ پر جب نامِ نامی حضور اقدس صلعم کا آوے، درود پڑھنا چاہئے یا ایک مرتبہ جبکہ وہ جلسہ ختم کرے؟۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''جوابِ مسئلہ سے پہلے ایک بہت ضروری مسئلہ معلوم کیجئے، سوال میں نام پاک حضور اقدس ﷺ کے ساتھ بجائے ''صلی اللہ علیہ وسلم''، کے ''صلعم'' لکھا ہے۔

یہ جہالت آج کل بہت جلد بازوں میں رائج ہے، کوئی ''صلعم'' لکھتا ہے، کوئی ''عم'' کوئی، ''ؐ'' اور یہ سب بیہودہ و مکروہ وسخت ناپسند و موجبِ محرومیِ شدید ہے، اس سے بہت سخت احتراز چاہیے اگر تحریر میں ہزار جگہ نامِ پاک حضور اقدس ﷺ آئے، ہر جگہ پورا ''صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھا جائے، ہرگز ہرگز کہیں ''صلعم'' وغیرہ نہ ہو، علماء نے اس سے سخت ممانعت فرمائی ہے یہاں تک کہ بعض کتابوں میں تو بہت اشد حکم لکھ دیا ہے، علامہ طحطاوی حاشیۂ درمختار میں فرماتے ہیں:

وَيُكْرَهُ الرَّمْزُ بِالصَّلٰوةِ وَالتَّرَضِّيْ بِالْكِتَابَةِ بَلْ يُكْتَبُ ذٰلِكَ كُلُّهٗ بِكَمَالِهٖ وَفِيْ بَعْضِ الْمَوَاضِعِ مِنَ التَّتَارْخَانِيَةِ مَنْ كَتَبَ عليه السلام بِالْهَمْزَةِ وَالْمِيْمِ يُكَفَّرُ لِاَنَّهٗ تَخْفِيْفٌ وَتَخْفِيْفُ الْاَنْبِيَاءِ كُفْرٌ بِلَا شَكٍّ وَلَعَلَّهٗ اِنْ صَحَّ النَّقْلُ فَهُوَ مُقَيَّدٌ بِقَصْدٍ وَالْاَفَالظَّاهِرُ اَنَّهٗ لَيْسَ بِكُفْرٍ وَكَوْنُ لَازِمِ الْكُفْرِ كُفْرًا بَعْدَ تَسْلِيْمِ كَوْنِهٖ مَذْهَبًا مُخْتَارًا مَحَلُّهٗ اِذَا كَانَ اللُّزُوْمُ بَيِّنًا نِعَمِ الْاِحْتِيَاطُ فِي الْاِحْتِرَازِ عَنِ الْاِيْهَامِ وَالشُّبْهَةِ،

ترجمہ: ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کی جگہ اشارتاً ''ص'' یا ''رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' کی جگہ ''رض'' لکھنا مکروہ ہے، بلکہ اسے کامل طور پر لکھا پڑھا جائے، تاتارخانیہ میں بعض جگہ پر ہے جس نے درود وسلام ہمزہ (ء) اور میم (عم) کے ساتھ لکھا، اُس نے کفر کیا کیونکہ یہ عمل تخفیف ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بارگاہ میں یہ عمل بلاشبہ کفر ہے، اگر یہ قول صحت کے ساتھ منقول ہو تو یہ مقید ہوگا اس بات کے ساتھ کہ ایسا کرنے والا قصداً ایسا کرے، ورنہ ظاہر یہ ہے کہ وہ کافر نہیں، باقی لزومِ کفر سے کفر اس وقت ثابت ہوگا جب اسے مذہب مختار تسلیم کیا جائے اور اس کا محل وہ ہوتا ہے جہاں لزوم ظاہر ہو۔ البتہ احتیاط اس میں ہے کہ ایہام اور شبہ سے احتراز کیا جائے۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 221، 222، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری ایک اور جگہ لکھتے ہیں: حضور پُرنور سیدِ عالم ﷺ کے ذکرِ کریم کے ساتھ جس طرح زبان سے درود شریف پڑھنے کا حکم ہے:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَبَدًا (اے اللہ! آپ ﷺ پر اور

آپ کی آل پر اور آپ ﷺ کے صحابہ پر ہمیشہ ہمیشہ درود و سلام اور برکت نازل فرما)،
درود شریف کی جگہ فقط ''ص'' یا ''عم'' یا ''صلعم'' یا ''صللم'' کہنا ہرگز کافی نہیں بلکہ وہ الفاظ
بے معنی ہیں اور فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ میں داخل، کہ ظالموں نے
وہ بات جس کا انہیں حکم تھا ایک اور بات سے بدل ڈالی۔ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا
مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ، تو ہم نے آسمان سے اُن پر عذاب اتارا بدلہ اُن کی بے حکمی
کا، (البقرہ: 59)۔ یونہی تحریر میں 'اَلْقَلَمُ اَحَدُ اللِّسَانَیْن (قلم دو زبانوں میں سے ایک
ہے)''۔ بلکہ فتاویٰ تاتارخانیہ سے منقول ہے کہ اس میں اِس پر نہایت سخت حکم فرمایا اور
اسے معاذ اللہ تخفیفِ شانِ نبوت بتایا، طحطاوی علی الدر المختار میں ہے: یُحَافَظُ عَلٰی كِتَابَةِ
الصَّلٰوةِ وَالسَّلَامِ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا یُسْاَمُ مِنْ تَكْرَارِهٖ وَاِنْ لَّمْ یَكُنْ فِی الْاَصْلِ
وَیُصَلِّیْ بِلِسَانِهٖ اَیْضًا وَیُكْرَهُ الرَّمْزُ بِالصَّلٰوةِ وَالتَّرَضِّیْ بِالْكِتَابَةِ بَلْ یُكْتَبُ ذٰلِكَ كُلُّهٗ
بِكَمَالِهٖ وَفِیْ بَعْضِ الْمَوَاضِعِ مِنَ التَّتَارْخَانِیَةِ مَنْ كَتَبَ عَلَیْهِ السَّلَامُ بِالْهَمْزَةِ وَالْمِیْمِ
یَكْفُرُ لِاَنَّهٗ تَخْفِیْفٌ وَتَخْفِیْفُ الْاَنْبِیَاءِ كُفْرٌ بِلَا شَكٍّ وَلَعَلَّهٗ اِنْ صَحَّ النَّقْلُ فَهُوَ مُقَیَّدٌ
بِقَصْدٍ وَاِلَّا فَالظَّاهِرُ اَنَّهٗ لَیْسَ بِكُفْرٍ وَكَوْنُ لَازِمِ الْكُفْرِ كُفْرًا بَعْدَ تَسْلِیْمِ كَوْنِهٖ مَذْهَبًا
مُخْتَارًا مَحَلُّهٗ اِذَا كَانَ اللُّزُوْمُ بَیِّنًا نَعَمْ الْاِحْتِیَاطُ فِی الْاِحْتِرَازِ عَنِ الْاِیْهَامِ وَالشُّبْهَةِ،
ترجمہ: ''حضور ﷺ پر درود و سلام لکھنے کی محافظت کی جائے اور اس کی تکرار سے تنگ دل
نہ ہو، اگرچہ اصل میں نہ ہو اور اپنی زبان سے بھی درود پڑھے، درود یا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو
اشارتاً لکھنا مکروہ ہے، بلکہ پورا لکھنا چاہیے۔ تاتارخانیہ میں بعض مقامات پر ہے: جس نے
علیہ السلام ہمزہ (ء) اور میم (عم) سے لکھا، کافر ہو گیا، کیونکہ یہ تخفیف ہے اور انبیاء علیہم
السلام کی تخفیف بغیر کسی شک کے کفر ہے، اور یہ نقل اگر صحیح ہے تو شاید اس میں قصد کی قید
ضرور ہو گی ورنہ بظاہر یہ کفر نہیں ہے، ہاں احتیاط ایہام اور شبہ سے بچنے میں ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 30، ص: 663، 664، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مزید لکھتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے نامِ پاک کے ساتھ صلعم یا ص یا، ہمزہ (ء) میم (م) یا

صللم وغیرہا رموز لکھنا ممنوع اور سخت بے دولتی ہے۔امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: پہلا شخص جس نے ایسا اختصار کیا اس کا ہاتھ کاٹا گیا، درود پورا لکھنا لازم ہے،صلی اللہ علیہ وسلم۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 22،ص:692،رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

جس طرح عربی یا اردو میں اختصار کی نیت سے''ص'' یا ''صلعم'' لکھنا حرام ہے، اِسی طرح انگلش میں اختصار کے ساتھ صرف SAW لکھنا بھی حرام ہے، بلکہ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پورا لکھا جائے۔

''صلوٰۃ'' عربی زبان کا کلمہ ہے اور قرآن وحدیث کی اصطلاح ہے، کسی دوسری زبان میں ایسا متبادل کلمہ (Word) ملنا مشکل ہے جو اس کے مکمل معنی کا احاطہ کرسکے۔تاہم رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک کے ساتھ درود شریف کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے انگریزی میں Peace Be Upon Him لکھنے اور پڑھنے کا عرف رائج ہے اور اس پر کسی اہل علم نے تحفظ کا اظہار نہیں کیا، لہٰذا یہ جائز ہے۔افضل تو یہی ہے کہ انگریزی گفتگو اور تحریر کے درمیان رسول اکرم ﷺ کا اسمِ گرامی آنے پر ﷺ ہی پڑھا اور لکھا جائے، لیکن انگریزی میں ہی لکھنا ہو تو چونکہ یہ عرف میں درود پاک کے متبادل یا ہم معنی ہی سمجھا جاتا ہے تو پورے کلمات ہی لکھے جائیں، PBUH مُخفّف کرکے نہ لکھا جائے۔آپ نے لکھا ہے کہ SAW کے معنی'' آرا'' کے ہیں، لیکن ﷺ کی جگہ جو S.A.W لکھا جاتا ہے، یہ ایک لفظ نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر حرف تہجی (Alphabetic) الگ الگ لفظ کا مُخفّف (Abroviation) ہے، لہٰذا آپ کا قیاس درست نہیں ہے۔

انبیاءِ کرام وعبادِ صالحین کے وسیلے سے دعا

سوال:5

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس بارے میں کہ انبیاءِ کرام اور اولیاء کے وسیلے سے دعا کرنے، مدد طلب کرنے کا شرعی حکم کیا ہے، فرض، واجب، سنت مؤکدہ، سنت مستحبہ یا فقط

جائز ہے؟۔ اگر کوئی اللہ کی عطا سے، انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے مدد طلب کرنے کو جائز سمجھتا ہے، مگر مدد اللہ تعالیٰ کی ذات ہی سے طلب کرتا ہے، تو کیا ایسے شخص کو لعن طعن کرنا جائز ہے اور لعن طعن والوں کے لئے کیا حکم ہے؟۔

(سید سلیم شاہ عطاری، نارتھ ناظم آباد، بلاک B، کراچی)

استمدادِ غیر اللہ کی تکرار کرنا جائز ہے، جیسے ''یا غوث المدد'' 100 بار، ''یا عطار المدد'' روزانہ 10 بار نیز قصیدۂ غوثیہ ثواب کی نیت کے ساتھ پڑھنا جائز ہے؟۔ کیا سنتِ نبوی ﷺ کے بیان کردہ طریقے (صلوٰۃ الحاجت وغیرہ) سے ہٹ کر محض رات دن ''یا غوث المدد'' یا ''قصیدۂ غوثیہ'' کی تکرار درست ہے؟، (محمد اسلم موٹن، کراچی)۔

جواب:

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری نے بحوالہ محمد بن جزری انبیاء و اولیاء سے استعانت اور وسیلے کو امورِ مستحبہ میں شمار کیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور بزرگانِ دین کے وسیلہ سے دعا کرنے کی اصل ابنِ ماجہ کی یہ حدیث ہے:

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حُنَيْفٍ اَنَّ رَجُلًا ضَرِيْرَ الْبَصَرِ اَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ اُدْعُ اللهَ لِيْ اَنْ يُعَافِيَنِيْ، فَقَالَ: اِنْ شِئْتَ اَخَّرْتُ لَكَ وَهُوَ خَيْرٌ، وَاِنْ شِئْتَ دَعَوْتُ، فَقَالَ: اُدْعُهْ، فَاَمَرَهُ اَنْ يَتَوَضَّاَ فَيُحْسِنَ وُضُوْءَهٗ وَيُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ وَيَدْعُوَ بِهٰذَا الدُّعَاءِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِمُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ يَا مُحَمَّدُ اِنِّيْ قَدْ تَوَجَّهْتُ بِكَ اِلٰى رَبِّيْ فِيْ حَاجَتِيْ هٰذِهٖ لِتُقْضٰى، اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ۔

ترجمہ: ''حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کیا: آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری آنکھیں ٹھیک کردے، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں اس کام کو مؤخر کردوں اور یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر تم چاہو تو (ابھی) دعا کردوں، اُس نے کہا: آپ دعا کردیجئے،

آپ ﷺ نے فرمایا: تم اچھی طرح وضو کرو، دو رکعت نماز پڑھو، اس کے بعد یہ دعا کرو:
''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور محمد نبیٔ رحمت ﷺ کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اے محمد ﷺ! میں آپ ﷺ کے وسیلہ سے اس حاجت میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ میری یہ حاجت پوری ہو، اے اللہ! نبی ﷺ کو میرے لئے شفاعت کرنے والا بنادے''۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1385، سنن ترمذی، رقم الحدیث: 3578)

امام بیہقی نے اس روایت میں یہ اضافہ کیا ہے: قَالَ عُثْمَانُ فَوَاللّٰهِ مَا تَفَرَّقْنَا وَلَا طَالَ الْحَدِيْثُ حَتّٰى دَخَلَ الرَّجُلُ وَكَاَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ بِهٖ ضُرٌّ قَطُّ،

ترجمہ: ''حضرت عثمان بن حنیف نے کہا: بخدا ابھی ہم اس مجلس سے اٹھے بھی نہیں تھے اور نہ ابھی سلسلۂ گفتگو دراز ہوا تھا کہ وہ (نابینا) شخص اس حال میں داخل ہوا کہ اس کی آنکھ میں کوئی تکلیف نہیں تھی''۔ (دلائل النبوۃ، جلد 6، ص: 167، مطبوعہ: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

انبیاء علیہم السلام واولیاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ سے استمداد کے متعلق بے شمار احادیث اور کتب میں آئمۂ کرام کے دلائل کثرت سے موجود ہیں، جنہیں علامہ غلام رسول سعیدی مدّ ظلہم نے اپنی تصانیف (تبیان القرآن، شرح صحیح مسلم، توضیح البیان) میں انتہائی تفصیل سے لکھا ہے، علامہ صاحب شرح صحیح مسلم میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اپنا موقف لکھتے ہیں:
''انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے استمداد کے متعلق جو ہم نے احادیث اور فقہاء اسلام کی عبارات نقل کی ہیں، اس سے ہمارا صرف منشاء یہ ہے کہ عام مسلمان جو شدائد اور ابتلاء میں ''یارسول اللہ'' اور ''یاغوث'' کہہ کر پکارتے ہیں، ان کا یہ پکارنا شرک نہیں ہے۔ اس ندا کو شرک کہنا شدید ظلم اور زیادتی ہے، کیونکہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ اور حضرت غوث اعظم قدس سرہ کو بہر حال اللہ کی مخلوق اور اس کا مقرب بندہ گردانتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حقیقی کارساز صرف اللہ تعالیٰ ہے اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کا ہر فعل اور ہر تصرُّف اللہ تعالیٰ کے اذن، اُس کی مشیت اور اس کی دی ہوئی قدرت کے تابع ہے۔ انبیاء علیہم السلام

اور اولیاء کرام ہوں یا عام انسان، اس کائنات میں جس سے جو بھی فعل صادر ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت سے صادر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی انسان کو کسی شے پر ذرہ برابر قدرت نہیں ہے۔ اس اعتقاد کے ساتھ انبیاء علیہم السلام اور اولیاءِ کرام سے استمداد اور استغاثہ کرنا ہر چند کہ جائز ہے، لیکن افضل، احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ ہر حال میں اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے۔

امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمًا فَقَالَ يَاغُلَامُ اِنِّيْ اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ اِذَا سَاَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰهَ اِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن ایک سواری پر نبی ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تم کو چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں، تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہاری حفاظت کرے گا، تم اللہ کو یاد رکھو، تم اُسے (مصیبت کے وقت اپنی مدد کے لئے) موجود پاؤ گے، جب تم سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے سوال کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو اور جان لو کہ اگر تمام امت تم کو نفع پہنچانے کے لئے جمع ہو جائے تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔ اور اگر تمام لوگ تم کو نقصان پہنچانے کے لئے جمع ہو جائیں، تو تمہیں صرف وہی نقصان پہنچا سکتے ہیں، جسے اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لئے گئے ہیں اور صحیفے (یعنی وہ غیبی دستاویز جن میں بندے کی تقدیر کے معاملات لکھتے ہوتے ہیں) خشک ہو چکے ہیں، (جامع الترمذی، رقم الحدیث: 2516)''۔ یہ حدیث متعدد کتب حدیث میں موجود ہے، جن میں سے چند کے حوالہ جات درجِ ذیل ہیں:

☆امام ابو یعلیٰ، ''مسند ابو یعلیٰ'' (جلد 3، ص: 85,84، مطبوعہ بیروت)۔
☆امام ابن سنی، ''عمل الیوم واللیلۃ'' (ص: 136، مجلس الدائرۃ المعارف دکن، بھارت)
☆امام ابن عبد البر ''تمہید'' (جلد 4، ص: 111، مکتبۂ قدوسیہ، لاہور)۔

رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم اور تلقین کے پیشِ نظر مسلمانوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں اور اسی سے مدد چاہیں اور دعا میں مستحسن طریقہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے دعا مانگیں۔ زیادہ محفوظ اور زیادہ سلامتی اس میں ہے کہ وہ دعائیں مانگی جائیں جو قرآن اور احادیث میں مذکور ہیں تاکہ اِن دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سایہ فگن رہے، اگر کسی خاص حاجت میں دعا مانگنی ہو تو رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے مانگنی چاہئے۔

ہمارے فاضل معاصر علامہ محمد عبد الحکیم شرف رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''البتہ یہ ظاہر ہے کہ جب حقیقی حاجت روا، مشکل کشا اور کارساز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ اسی سے مانگا جائے اور اسی سے درخواست کی جائے اور انبیاء و اولیاء کا وسیلہ اس کی بارگاہ میں پیش کیا جائے، کیونکہ حقیقت، حقیقت ہے اور مجاز، مجاز ہے یا بارگاہِ انبیاء و اولیاء سے درخواست کی جائے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں وہ ہماری مشکل آسان فرمادے اور حاجتیں بَر لائے، اس طرح کسی کو غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہوگی اور اختلافات کی خلیج بھی زیادہ وسیع نہیں ہوگی، (ندائے یا رسول اللہ، ص: 12، مطبوعہ: مرکزی مجلس رضا، لاہور)''۔

خلاصہ یہ ہے کہ نداء غیر اللہ اعتقاد مذکور کے ساتھ ہر چند کہ جائز ہے، لیکن افضل، اولیٰ اور احسن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے، جیسا کہ حدیثِ مذکور کا تقاضا ہے''۔ (شرح صحیح مسلم، جلد 7، ص: 90,89، مطبوعہ: فرید بک اسٹال، لاہور)

الغرض ہمارے بعض دینی معمولات و معاملات ایسے ہیں جو مستحب یا مباح کے درجے میں ہیں، مخالفین کے ساتھ ان کے جواز یا عدمِ جواز پر بحث ہوتی ہے، لیکن اپنے دائرے میں ہم اعتقاداً تو نہیں کم از کم عملاً واجب کا درجہ دے دیتے ہیں، اگر کوئی اَحیاناً (یعنی کبھی

کبھی) چھوڑ بھی دے تو اسے ہدفِ طعن بناتے ہیں یا اس کے مسلک پر شبہ کرنے لگتے ہیں ، یہ طرزِ عمل ہمارے نزدیک درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست استمداد کرنے پر طعن کرنا، جبکہ خود رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جب تم نے مدد مانگنی ہو تو اللہ سے مانگو''، ایک شرعی طور پر جائز امر کو ''مکروہ تحریمی'' قرار دینا ہے، کیونکہ کم از کم مکروہ تحریمی یا ترکِ واجب پر ہی ملامت کیا جاسکتا ہے یا طعن و تشنیع کا ہدف بنایا جاسکتا ہے۔ اور کسی چیز کو واجب یا مکروہ تحریمی قرار دینا شارع علیہ السلام کا منصب ہے نہ کہ کسی اور کا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو اپنے رویے پر نادم اور تائب ہونا چاہئے اور اپنے آپ کو ملامت کرنا چاہئے۔ پھر جاہل عوام تو ظاہری معمولات پر تعامل کو دیکھ کر انہیں واجب سمجھنے لگتے ہیں، کیونکہ ہمارے ہاں صحیح دینی و تعلیمی تربیت کا انتظام نہیں ہے۔ اب بات ''یارسول اللہ ﷺ''، ''یاعلی'' اور ''یاغوث'' سے آگے بڑھ کر ''یاعطار المدد'' تک جا پہنچی ہے، اگر یہ تسلسل جاری رہا تو علم اور تقوے کے تمام معیارات سے قطع نظر کر کے ہر ایک اپنے پیر کو روزانہ المدد پکارنے کا عمل بطور وظیفہ شروع کردے گا، جو امور (جیسے صلوٰۃ الحاجت) رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں، دوسرے وظائف جائز ہونے کے باوجود افضلیت میں، اُن کے برابر نہیں ہوسکتے۔ ہماری رائے میں دینی حکمت، شرعی احتیاط اور مسلک کا مفاد اِس میں ہے کہ یہ سلسلہ موقوف کردینا چاہئے۔ اگر کسی کے نزدیک جائز بھی ہو تو ہر جائز کام کا کرنا ضروری نہیں ہے،

رسول اللہ ﷺ نے بنائے ابراہیم علیہ السلام پر تعمیرِ کعبہ کی خواہش کو اس کے مستحسن ہونے کے باوجود دینی حکمت کے تحت ترک فرمادیا تھا۔

موئے مبارک کے آداب

سوال: 6

رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک کو ایسے گھر میں رکھنا جہاں علانیہ طور پر غیر شرعی کام کیے جاتے ہوں، مثلاً کیبل پر فلمیں، موسیقی بلند آواز سے چلتی ہوں نیز موئے مبارک کے آداب کیا ہیں؟ ایک شخص لوگوں میں بکثرت موئے مبارک تقسیم کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ

موئے مبارک کو جن خوشبویات میں بساتے ہیں وہ آپ نہیں لگا سکتے میں خود ہی لگاؤں گا۔ اور خوشبو لگانے کے عوض وہ تین یا چار ہزار روپے طلب کرتا ہے، اِس سے دل میں شک پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اُس نے یہ کاروبار تو نہیں بنایا ہوا، اُس کا یہ عمل کیسا ہے؟ کیا موئے مبارک کی رسول اللہ ﷺ کی طرف محض نسبت کے دعوے کو قبول کرلیا جائے یا حضور اکرم ﷺ کے موئے مبارک کی کوئی پہچان ہے؟، اگر کوئی مالی منفعت یا شہرت کے لئے غلط بیانی کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟، (محمد تاشفین خان، گلشنِ معمار، کراچی)۔

جواب:

احکامِ شرع کی پابندی و پاسداری ہر مسلمان پر فرض ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں عموماً غفلت وکوتاہی برتتے ہوئے احکامِ شرع کو نظرانداز کردیا جاتا ہے، جن لوگوں کے گھروں کے سامنے مسجد ہوتی ہے، وہ مسجد کا تقدس جانتے ہیں لیکن اکثر اوقات اپنی خواہشات کی تسکین کی خاطر نظرانداز کردیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نیکی کی کوشش کرنا ہی چھوڑ دی جائے۔ ہر مسلمان کے گھر میں مصحفِ مُقدّس یعنی قرآن مجید کے نسخے موجود ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی وہاں بہت سے خلافِ شرع کام ہورہے ہوتے ہیں، تو اسے وجہ بنا کر ایسا تو نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن مجید کے نسخے ہی گھروں میں رکھنا چھوڑ دیئے جائیں۔ ہاں! ممکنہ حد تک تعظیم وتوقیر کا اہتمام لازم ہے اور ایسے لوگوں کے لئے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کے تبرُّکات سے سچی عقیدت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ احکام شرع اور سنّت مصطفیٰ ﷺ کی زیادہ پاس داری کریں۔

موئے مبارک کی تعظیم لازم ہے اور بے ادبی حرام، لہٰذا اگر گھر میں موئے مبارک موجود ہے تو اس کی تعظیم کا خاطر خواہ اہتمام کیا جائے۔ درحقیقت عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا تقاضا یہی ہے کہ تمام کائنات کی دولت بھی جمع ہوجائے تو رسول اکرم ﷺ کے موئے مبارک کا بدل قطعاً نہیں ہوسکتی۔

عَنِ ابْنِ سِیْرِیْنَ قَالَ: قُلْتُ لِعَبِیْدَةَ عِنْدَنَا مِنْ شَعَرِ النَّبِیِّ ﷺ أَصَبْنَاهُ مِنْ قِبَلِ أَنَسٍ أَوْ مِنْ قِبَلِ أَهْلِ أَنَسٍ۔ فَقَالَ لَأَنْ تَكُونَ عِنْدِي شَعْرَةٌ مِنْهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔

ترجمہ: ''حضرت ابن سیرین (تابعی) نے حضرت عبیدہ سے کہا: ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کے کچھ موئے مبارک ہیں، جو ہمیں حضرت انس یا حضرت انس رضی اللہ عنہ کے خاندان سے ملے ہیں، یہ سن کر عبیدہ نے کہا کہ میرے پاس ان بالوں میں سے ایک بال کا ہونا میرے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تر ہے'' (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 170)

اگر مذکورہ شخص غلط بیانی سے کام لیتا ہے تو یہ جھوٹ اُس کی اُخروی بربادی کا سبب بنے گا کہ حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

ترجمہ: ''جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنا لے''۔
(صحیح بخاری، کتاب العلم، رقم الحدیث: 110، 6197)

کتب احادیث و سیرت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جسمِ مبارک کا سایہ نہیں تھا، ابن مبارک اور ابنِ جوزی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا سایہ نہیں تھا۔ اس نشانی کو اہل عشق و محبت بیان کرتے ہیں کہ موئے مبارک کی شناخت بھی یہی ہے کہ اس کا بھی سایہ نہیں ہوتا۔ آج کل دنیا میں متعدد مقامات پر اس دعوے کے ساتھ کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا موئے مبارک ہے، زیارات کا سلسلہ جاری ہے۔
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے والد شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک رات نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو ملاقات سے مشرف فرمایا اور ازراہِ عنایت انہیں اپنے دو موئے مبارک بھی عنایت فرمائے، ایک مرتبہ شاہ صاحب نے وہ بال دکھائے، تین شخصوں نے اس بات کا انکار کیا کہ وہ حضور کے موئے

مبارک ہیں اور بحث چل پڑی، جب مناظرہ طوالت کو پہنچا تو وہ لوگ ہر دو موئے مبارک کو دھوپ میں لے گئے، اسی وقت ابر کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوا، حالانکہ اس وقت سورج خوب گرم تھا اور موسم ابر کا نہ تھا، تین میں سے ایک نے توبہ کر لی اور باقی دو کہنے لگے کہ اتفاقاً بادل آ گیا تھا، دوسری مرتبہ لے گئے اور دوسری بار بادل آ گیا دوسرا بھی تائب ہو گیا لیکن تیسرے نے کہا ممکن ہے یہ بھی اتفاق ہو، تیسری بار لے گئے تیسری بار ابر پھر ظاہر ہوا اور تیسرا منکر بھی تائب ہوا'' (انفاس العارفین، ص:40)

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں:

''و اہمیشہ ابر در وقت تمازت گرما بر ایشاں سایہ مے داشت۔ ترجمہ: ''اور ابر ہمیشہ گرمی کے وقت آپ کے اوپر سایہ کرتا تھا'' (تفسیر عزیزی، پارہ:30، ص:219)

تعظیم و تکریم موئے مبارک و تبرّکات رسول اللہ ﷺ پر ہمارا ایمان ہے، جو لوگ نسبتِ ذاتِ رسالت کی تقدیس پر ایمان رکھتے ہوئے عقیدت و محبت سے زیارت کرتے ہیں، وہ یقیناً ماجور ہوں گے۔ کوئی فریب دیتا ہے تو وہ اپنے عمل کا انجام دیکھ لے گا۔ خوشبو لگانے کے حوالے سے جو آپ نے لکھا ہے، لگتا یہی ہے کہ یہ ایک مُقدّس نسبت کو مالی منفعت کا ذریعہ بنانے کا حربہ ہے، ورنہ باوضو ہو کر کوئی مومن بھی خوشبو لگا سکتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز نے تبرّکات کی زیارت اور اس کی اسناد سے متعلق ایک استفتاء کا طویل جواب تحریر فرمایا، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''نبی ﷺ کے آثار و تبرکاتِ شریفہ کی تعظیم مسلمانوں کا فرضِ عظیم ہے، تابوتِ سکینہ جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، جس کی برکت سے بنی اسرائیل کافروں پر فتح پاتے تو اس تابوت میں انبیاء کے تبرکات موجود تھے، جس کی تصدیق قرآن مجید نے فرمائی۔ صحابۂ کرام و تابعین کرام اور آئمہ دین رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہمیشہ تبرّکاتِ شریفہ کی تعظیم اور ان سے برکت طلب کرتے آئے ہیں اور اس کے لئے کسی سند کی حاجت نہیں۔ شفاء شریف، مواہب لدنیہ اور مدارج شریف میں ہے:

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ کی تعظیم میں اُن تمام اشیاء کی تعظیم شامل ہے، جن کو نبی ﷺ سے کچھ تعلق ہے یا جسے نبی ﷺ نے چھوا ہو یا جو حضور ﷺ کے نامِ پاک سے مشہور ہو''۔
تعظیم کے لئے نہ یقین درکار ہے اور نہ کوئی خاص سند بلکہ صرف نام پاک سے اس شے کا مشہور ہونا کافی ہے اور اگر کوئی کذب بیانی سے کام لیتا ہے تو اللہ عزوجل کا فرمان:
وَاِنْ یَّكُ كَاذِبًا فَعَلَیْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ یَّكُ صَادِقًا یُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ (المومن:28)
ترجمہ: ''اور اگر بالفرض وہ غلط کہتے ہیں تو اُن کی غلط گوئی کا وبال اُن پر (ہی ہے) اور اگر وہ سچے ہیں تو تمہیں پہنچ جائے گا کچھ وہ جس کا تمہیں وعدہ دیتے ہیں''۔ (کنز الایمان)
یہ کہنا کہ اکثر لوگ مصنوعی تبرکات لئے پھرتے ہیں، اگر یہ بلا تعیینِ شخصی ہو اور کسی پر الزام یا بدگمانی مقصود نہ ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں، لیکن اگر بلا ثبوتِ شرعی کسی خاص کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ حکم لگائے کہ یہ مصنوعی تبرُّکات لئے پھرتا ہے، ناجائز، گناہ اور حرام ہے۔
تبرُّکاتِ شریفہ جس شخص کے پاس ہوں، اس شخص کا ان تبرُّکات کی زیارت کے عوض لوگوں سے کچھ طلب کرنا سخت معیوب ہے، جس کی احادیث مبارکہ میں وعید آئی ہے۔
دوسرا اس طرح رقوم بٹورنے سے دنیا کمانا ظاہر ہے اور وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (میری آیات (میں لفظی و معنوی تحریف کرکے اِن) کے بدلے میں کم قیمت نہ لو) کی قبیل میں داخل ہے۔ بغیر اس کے مانگے، زائرین کچھ دے دیں تو شریعتِ مطہرہ میں قاعدہ کلیہ یہ ہے: اَلْمَعْهُوْدُ عُرْفًا كَالْمَشْرُوْطِ لَفْظًا (عرفاً مقررہ چیز لفظاً مشروط کی طرح ہے)۔ اس کی صورت یہ بیان کی کہ اگر لوگ کچھ نہ دیں تب بھی، کم دیں یا زیادہ دیں ہر صورت میں زیارت کرانے والا خوشی وشادمانی کے ساتھ مسلمانوں کو زیارت کرائے، تنگ دلی اور تنگ نظری کا اظہار نہ کرے، کسی معاوضے اور نذرانے کی تمنا دل میں نہ رکھے، تو ایسی صورت میں زائرین و مُزَوِّر (یعنی زیارت کرنے والے اور زیارت کرانے والا) دونوں ثواب پائیں گے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد:21، ص:414 تا 419، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

کپڑے کے ڈیزائن میں اسمِ ''محمد'' ظاہر ہوتو اُس کا شرعی حکم

سوال:8

کمال سپننگ ملز میں کپڑا پرنٹ ہوا، جس پر اسمِ ''محمد'' ظاہر ہے، پرنٹ کا یہ ڈیزائن غیر ملکی کلائنٹ نے ہمیں فراہم کیا تھا، ہمارا تیار کردہ نہیں ہے، ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم سے کوتاہی ہوئی، ہم عہد کرتے ہیں کہ آئندہ کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی ڈیزائن ہو، ہم اس کا عمیق اور جامع جائزہ لئے بغیر پرنٹ نہیں کریں گے اور اگر کہیں کوئی اشتباہ ہوا تو کسی مستند مفتی و عالم سے مشاورت کریں گے اور ان کی ہدایت پر بلا چوں وچرا عمل کریں گے۔ ہم سے یہ کام نادانی اور تساہل و تغافل سے سرزد ہو گیا، جس کی یقین دہانی کے لئے ہم حلف نامہ اور کپڑا بھی ساتھ بھیج رہے ہیں، برائے کرم یہ تحریر فرمائیں کہ شرعاً اس کا کیا حل ہے؟

(احمد کمال، چیف ایگزیکٹو کمال سپننگ ملز، فیصل آباد)

حلف نامہ

ہم اللہ وحدہٗ لاشریک اور اس کی ذات و صفات کی قسم کھا کر اقرار کرتے ہیں کہ اس کپڑے میں جو لفظ ''محمد'' پرنٹ ہوا ہے، اس کا پہلے سے ہمیں کوئی علم نہیں تھا، اگر اس معاملے میں ہم نے کذب بیانی سے کام لیا ہو تو بروزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہ کام ہمارے ارادے سے تو نہیں، لیکن ہماری بشری کمزوری سے وقوع پذیر ہوا۔ ہم اس پر اللہ تعالیٰ کے حضور نادم ہیں اور صدقِ دل سے توبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے طفیل ہمیں معاف فرمائے اور اللہ جل شانہٗ کے رسول مکرم ﷺ سے بھی معافی کے خواستگار ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ آئندہ کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی آرڈر ہو، ہم تینوں پر مشتمل کمیٹی اسے پاس کرے گی اور اگر ڈیزائن میں ہمیں اشتباہ ہوا تو ہم کسی مستند مفتیٔ اہلسنت سے مشورہ لیں گے اور ان کے مشورے اور ہدایت پر عمل کریں گے۔

مُقِرّین وحالفین

احمد کمال | بلال رمضان | رفاقت علی
چیف ایگزیکٹو | جنرل منیجر ملز | جنرل منیجر مارکیٹنگ
مورخہ: 20 اگست 2008ء | | کمال سپننگ ملز فیصل آباد

جواب:

کمال سپننگ ملز، کھڑیاں والا، فیصل آباد کے پرنٹڈ کپڑے کا ایک نمونہ ہمیں دکھایا گیا، یہ کپڑا برآمد (Export) کے لئے آرڈر پر تیار کیا گیا ہے اور اس کا پرنٹ ڈیزائن ایکسپورٹ آرڈر کے لئے انہیں بیرونِ ملک کے کلائنٹ نے مہیا کیا تھا۔ اس ڈیزائن پر ختم المرسلین رحمۃ للعالمین سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ ﷺ کا اسمِ مبارک واضح طور پر پڑھا جاسکتا ہے۔ یہ اس ادارے کے مالکان اور متعلقہ شعبہ جات کے ذمہ داران کی انتہائی غیر ذمہ داری اور نااہلی کا ثبوت ہے۔ تاہم ادارے کے چیف ایگزیکٹو احمد کمال صاحب، جنرل منیجر ملز بلال رمضان صاحب اور جنرل منیجر مارکیٹنگ رفاقت علی صاحب نے ایک مشترکہ تحریری حلف نامہ ہمارے پاس جمع کرایا ہے کہ ان سے یہ کوتاہی نادانستہ طور پر ہوئی ہے اور وہ اسے بروقت سمجھ نہیں پائے، وہ اس پر اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے توبہ کرتے ہیں، اس کے رسول مکرم ﷺ سے معافی کی التجا کرتے ہیں اور ان کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کی قبولیت کی التجا کرتے ہیں اور عامۃ المسلمین سے بھی معافی کے خواستگار ہیں، کیونکہ یہ حساس دینی مسئلہ ہے اور کوئی بھی مسلمان عمداً، اشارۃً اور کنایۃً ایسی کسی بھی حرکت یا فعل کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ جس سے اشارۃً، کنایۃً یا تعریض، توریہ اور ایہام کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی اہانت کا کوئی امکان بعید ہو۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ ایسا کرنے والے کا ایمان سلامت نہیں رہتا۔ ہم انہیں ہدایت کرتے ہیں کہ جتنا کپڑا اس ڈیزائن پر پرنٹ ہوچکا ہے، اس سے کیمیکل کے ذریعے یہ سارا ڈیزائن زائل (Wash out) کردیں اور اس کیمیائی محلول (Liquid) کو کسی پاک جگہ پر زمین میں گڑھا بنا کر دفن کردیں۔ اس کے

بعد یہ لوگ اس کپڑے کو کسی بھی مقصد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، خواہ یہ تمام پرنٹ کیمیکل کے ذریعے مٹا کر بالکل سفید کر دیا جائے یا کوئی اور کلر کر دیا جائے، اس کے بعد وہ اِس پر کوئی اور ڈیزائن بھی پرنٹ کر سکتے ہیں، اسے اپنے ذاتی استعمال میں بھی لا سکتے ہیں اور برآمد بھی کر سکتے ہیں۔ علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

اَلْکُتُبُ الَّتِیْ لَایُنْتَفَعُ بِھَا یُمْحٰی عَنْھَا اِسْمُ اللّٰہِ وَمَلَآئِکَتِہٖ وَرُسُلُہٗ وَیُحْرَقُ الْبَاقِیْ

ترجمہ: ''ایسی (دینی) کتابیں جو قابلِ انتفاع نہ رہی ہوں، ان سے اسماءِ الٰہیہ، اسماءِ ملائکہ اور اسماءِ رُسُل علیہم السلام مٹا دیئے جائیں اور بقیہ اوراق جلا دیئے جائیں، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 9، ص: 518)''۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنْ شَآءَ غَسَلَہٗ بِالْمَآءِ، ترجمہ: ''اور اگر چاہے تو اوراقِ مصحف کو پانی سے دھو ڈالے (تاکہ تحریر مٹ جائے)، (ردالمحتار، جلد 9، ص: 519، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: ''حاصل البتہ قواعد بغدادی وابجد اور سب کتب غیر منتفع بھا (یعنی جو نفع اُٹھانے کے قابل نہ رہیں) ماورائے مصحف کریم کو جلا دینا بعد اسماءِ باری تعالیٰ اور اسمائے رُسُل وملائکہ علیہم السلام اجمعین کے جائز ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 339 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ہمارے نزدیک قرآن مجید کی طرح صاحبِ قرآن سیدالمرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ اقدس بھی مقدس ہے، مُعظّم ہے، مُکرّم اور محترم ہے، تو جس طرح بوسیدہ اوراق پر قرآن مجید کی تحریر کسی بھی کیمیائی عمل سے مٹا کر بچے ہوئے گودے (Pulp) کو کاغذ کی صورت میں ڈھال کر دوبارہ طباعت کے مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، اسی طرح اس کپڑے کے مذکورہ بالا پرنٹ کو کیمیائی طریقے سے مٹانے کے بعد اس کا استعمال جائز ہے۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ اور علامہ مفتی محمد رفیق حسنی صاحب نے بھی اس فتویٰ پر اپنے تائیدی وتوثیقی دستخط ثبت فرمائے۔

طہارت کے مسائل

کنویں میں جانور کا گرنا

سوال:9

اگر کنویں میں مرغی یا کبوتر یا چھپکلی گر جائے تو اس کے زندہ یا مردہ نکلنے یا پھول کر پھٹ جانے کی صورت میں کنویں کے پانی کے لیے کیا حکم ہوگا؟ نیز اگر وہ نجاست سے آلودہ ہے، تب کیا حکم ہے اور نہیں تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟

(مولانا زاہد اللہ عادل، اوگی، بلند کوٹ، مانسہرہ)

جواب:

مرغ، مرغی، بلی، چوہا، چھپکلی یا اور کوئی دَمَوِی (بہتے ہوئے خون والا) جانور کنویں میں گر جائے، مر کر پھول یا پھٹ جائے تو کنویں سے تمام پانی نکالا جائے گا اور اگر یہ جانور مرنے کے بعد کنویں میں گرا، تب بھی یہی حکم ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

حَیَوَانٌ دَمَوِیٌّ وَانْتَفَخَ أَوْ تَمَعَّطَ أَوْ تَفَسَّخَ وَلَوْ تَفَسُّخُهُ خَارِجَهَا ثُمَّ وَقَعَ فِیهَا یُنْزَحُ کُلُّ مَائِهَا الَّذِیْ کَانَ فِیهَا وَقْتَ الْوُقُوعِ،

ترجمہ: ''ایسا جانور (کنویں میں گرا) جس میں بہتا ہوا خون ہو، پھول گیا یا اس کے بال جدا ہو گئے یا پھٹ گیا، خواہ کنویں سے باہر پھٹا اور پھر کنویں میں گرا ہو، (ان تمام صورتوں میں) کنویں کا وہ سارا پانی نکالا جائے گا، جتنا پانی اس میں (جانور کے) گرنے کے وقت موجود تھا، (ردالمختار علی الدرالمختار، جلد 1، ص: 327، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

کبوتر، مرغی، بلی کو کنویں میں گر کر مرنے اور پھولنے پھٹنے سے پہلے نکال لیا تو چالیس سے ساٹھ ڈول پانی نکالا جائے گا۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

اِنْ مَّاتَ فِیهَا الدَّجَاجَةُ وَالسِّنَّوْرُ وَالْحَمَامَةُ وَنَحْوُهَا وَلَمْ یَکُنْ مُنْتَفِخًا وَلَا مُتَفَسِّخًا یُنْزَحُ أَرْبَعُوْنَ أَوْ خَمْسُوْنَ دَلْوًا هٰکَذَا فِی مُحِیطِ السَّرَخْسِیِّ وَهُوَ الْأَظْهَرُ کَذَا فِی الْهِدَایَةِ،

ترجمہ: ''اگر مرغی، بلی اور کبوتر یا اس کے مثل کوئی جانور کنویں میں گر کر مر جائے اور پھولا

یا پھٹا نہ ہو تو چالیس سے پچاس ڈول پانی نکالا جائے گا۔ محیط السرخسی میں بھی اسی طرح ہے اور یہی زیادہ واضح ہے، ہدایہ میں بھی اسی طرح ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص 19، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: "اگر چھپکلی کنویں میں گر کر مر جائے اور پھول جائے یا پھٹ جائے تو کس قدر پانی کنویں سے نکالا جائے گا"؟

آپ نے جواب میں لکھا:

"سب (یعنی تمام پانی نکالا جائے گا)، کہ اس میں دَم سائل (بہنے والا خون) ہوتا ہے۔

فتاویٰ امام اجل قاضی خان "فَصْلُ النَّجَاسَةِ الَّتِي تُصِيبُ الثَّوبَ" (کپڑے کو لگنے والی نجاست کی فصل) میں ہے: دَمُ الْحَلَمَةِ وَالْوَزَغَةِ يُفْسِدُ الثَّوبَ وَالْمَاءَ،

ترجمہ: "حلمہ (ایک قسم کا کیڑا جو چمڑے کو لگ جاتا ہے اور اسے خراب کر دیتا ہے) کا خون اور چھپکلی کا خون کپڑے اور پانی کو فاسد کر دیتا ہے"۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

دَمُ الْحَلَمَةِ وَالْوَزَغَةِ اِذَا كَانَ سَائِلاً كَذَا فِي الظَّهِيْرِيَّةِ فَاِذَا اَصَابَ الثَّوبَ اَكْثَرَ مِنْ قَدْرِ الدِّرْهَمِ يَمْنَعُ جَوَازَ الصَّلَاةِ كَذَا فِي الْمُحِيْطِ،

ترجمہ: "حلمہ کا خون اور چھپکلی کا خون نجس ہے، جب کہ وہ بہنے والا ہو، "ظہیریہ" میں اسی طرح ہے، پس جب (اس کا خون) کپڑے کو ایک درہم کی مقدار سے زیادہ لگ جائے تو نماز کے جواز سے مانع ہوگا، "محیط" میں بھی اسی طرح ہے"۔

اَقُوْلُ وَالتَّقْيِيْدُ بِالسَّيْلَانِ عَلَى الْمَعْهُوْدِ مِنْ اَصْلِنَا اِنَّ دَمَ كُلِّ دَمَوِيٍّ لَا يَنْجُسُ مِنْهُ اِلَّا سَائِلُهُ وَلِذَا لَا يَنْقُضُ دَمُ الْاِنْسَانِ وُضُوْءَهُ اِلَّا اِذَا كَانَ سَائِلاً۔

ترجمہ: "میں کہتا ہوں کہ خون کے ساتھ بہنے کی قید ہمارے مقررہ قاعدہ پر مبنی ہے کہ ہر خون والے (جانور) کا صرف بہنے والا خون نجس ہوتا ہے،، اسی لیے انسان کا خون (جب تک وہ اپنی جگہ پر ہے) وضو نہیں توڑتا، مگر اس وقت (توڑتا ہے) جب اپنی جگہ سے بہہ کر تجاوز کر

جائے۔فتح القدیر میں ہے:

دَمُ الْحَلَمَةِ وَالْاَوْزَاغِ نَجَسٌ۔

ترجمہ:"حلمہ (ایک قسم کا کیڑا) اور چھپکلی کا خون ناپاک ہے"۔

اَقُوْلُ فَقَدْ اَطْلَقُوْا، وَالْمُرَادُ دَمَوِیٌّ وَلَوْ شَكَّ فِی دَمَوِیَّتِهَا لَمَا سَاغَ لَهُمُ الْاِطْلَاقُ كَالْاِمَامِ فَقِیْهِ النَّفْسِ۔

ترجمہ:"میں کہتا ہوں: ان فقہاء نے مطلق چھپکلی کا ذکر کیا ہے، حالانکہ مراد خاص خون والی ہے۔اگر اس کے خون والی ہونے کے بارے میں شک ہوتا تو پھر ان کے لیے مطلق ذکر کرنے کی گنجائش نہ ہوتی، جیسا کہ امام فقیہ النفس نے فرمایا"۔فتاویٰ صاحب البحر الرائق میں ہے: سُئِلَ عَنْ دَمِ الْوَزْغِ هَلْ هُوَ طَاهِرٌ اَمْ نَجَسٌ اَجَابَ هُوَ نَجَسٌ

ترجمہ:"ان سے چھپکلی کے خون کے بارے میں پوچھا گیا کہ آیا وہ پاک ہے یا نجس؟ تو انہوں نے جواب دیا: وہ نجس ہے"۔

مراقی الفلاح میں ہے: سُؤْرُ سَوَاكِنِ الْبُیُوْتِ مِمَّا لَهُ دَمٌ سَائِلٌ كَالْحَیَّةِ وَالْوَزَغَةِ مَكْرُوْهٌ لِلُزُوْمِ طَوَافِهَا وَحرمة لحمها النجس۔

ترجمہ:"بہنے والے خون کے حامل، گھروں میں رہنے والے جانور، جیسے سانپ اور چھپکلی کا جوٹھا مکروہ ہے، اُن کے لازمی طور پر گھروں میں چلنے پھرنے اور ان کے ناپاک گوشت کی حرمت کی وجہ سے اِن کے جوٹھے کا یہ حکم ہے" (یعنی اگر چہ اِن کا گوشت ناپاک ہونے کی بناء پر حرام ہے، مگر چونکہ ان کے بکثرت گھروں میں چلنے پھرنے کی وجہ سے ان سے بچنا دشوار ہے اس لئے یُسر کی خاطر کراہت کا حکم لگایا گیا ہے)۔

درمختار میں ہے: سُؤْرُ الْوَزَغَةِ مَكْرُوْهٌ لِاَنَّ حُرْمَةَ لَحْمِهَا اَوْجَبَتْ نَجَاسَةَ سُؤْرِهَا لٰكِنَّهَا سَقَطَتْ لِعِلَّةِ الطَّوَافِ فَبَقِیَتِ الْكَرَاهَةُ

ترجمہ:"چھپکلی کا جوٹھا مکروہ ہے، کیونکہ اس کے گوشت کی حرمت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کا جوٹھا نجس قرار دیا جائے، لیکن نجاست کے حکم کو طواف کی علت کے سبب ساقط کر دیا گیا، پس

کراہت کا حکم باقی ہے"۔

غنیۃ ذوی الاحکام میں ہے: وَلِهٰذَا اِذَا مَاتَتْ فِي الْمَاءِ نَجَّسَتْهُ

ترجمہ: "اس لیے جب وہ پانی میں مرجائے تو پانی کو ناپاک کردے گی"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 3 ص: 277,276,275، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

آج کل کنوؤں سے پانی مشین کے ذریعے نکالا جاتا ہے، لہٰذا اگر تمام پانی نکالنا ہو تو کسی رسی یا بانس کے ذریعے پانی کی گہرائی ناپ لی جائے اور پھر نجاست نکالنے کے بعد اتنا ہی پانی نکال لیا جائے۔ ایسے کنویں جن کا پانی ٹوٹتا نہیں، تو نجاست گرنے کے وقت جتنا پانی تھا اتنا نکال دینے سے کنواں پاک ہوجائے گا۔ اگر پانی کی ایک مقررہ مقدار مثلاً بیس یا چالیس ڈول نکالنا ہو تو بذریعہ مشین ہی مطلوبہ مقدار میں ڈول بھر کر نکالے جائیں۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: "کنویں میں جب کوئی چیز گر جائے اور شرعِ مُطہّر کچھ ڈول نکالنے کا حکم دے جہاں متونِ متاخرین میں لفظ" دلوِ وسط "(درمیانہ ڈول) واقع ہوا، یعنی مثلاً چوہا گر کر مرجائے تو بیس ڈول متوسط نکالے جائیں، اس ڈول کے تعین میں بھی اقوال مختلف ہیں کہ سات تک پہنچے ہیں، مگر ظاہر الروایۃ، امام قاضی خان وصاحب محیط ومصنف اختیار ومؤلفِ ہدایہ وغیرہم اکابر علماء کا مختار یہی ہے کہ ہر کنویں کے لیے اسی کا ڈول معتبر ہوگا، جس سے اس کا پانی بھرا جاتا ہے۔ ہاں، اگر اس کنویں کا کوئی ڈول معین نہ ہو تو اس ڈول کا اعتبار کریں گے جس میں ایک صاع عدس یا ماش آجائیں۔ غنیۃ میں ہے: اَلدَّلْوُ الْوَسَطُ مَايَسَعُ صَاعًا مِنَ الْحَبِّ المعتدل

ترجمہ: "درمیانہ ڈول وہ ہے جس میں صاع برابر (دال وغیرہ کے) دانے آجائیں"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 3 ص: 261,262، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

پانی کے کنویں میں گٹر کا پانی رِس کر آنا اور اس سے پیدا شدہ مسائل

سوال: 10

مسئلہ کراچی کے عوام کا ہے کہ کراچی میں کنوؤں کے پانی (Well Water)

استعمال عام ہے،اور اسی کراچی میں جگہ جگہ گٹر اُبل رہے ہیں یا ان کا پانی رس رہا ہے جو بالآخر کنوؤں تک پہنچ رہا ہے،اور کنوؤں کے پانی کو ناپاک کر رہا ہے۔میں بذاتِ خود ایک مقامی لیبارٹری میں کام کرتا ہوں جس کی رپورٹ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ پانی میں گندہ پانی شامل ہو گیا ہے۔انہی معلومات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ سے سوال عرض کرتا ہوں کہ کراچی کے کنوؤں کا پانی شرعی اعتبار سے پینے،غسل اور وضو کے قابل ہے یا نہیں؟

(زاہد شاہ تیموری،فیڈرل بی ایریا،کراچی)

جواب:

پانی کا رنگ،ذائقہ اور بُو نجاست گرنے کی وجہ سے تبدیل ہو جائے یا وہ ماءِ مُستعمل (یعنی ایسا پانی جسے طہارت کے لئے استعمال کیا گیا ہے) ہو تو قابلِ استعمال (یعنی وضو اور غسل کے قابل) نہیں رہتا،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

بِئْرُالْمَاءِ اِذَاکَانَتْ بِقُرْبِ الْبِئْرِ النَّجِسَةِ فَهِیَ طَاهِرَةٌ مَالَمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ اَوْ لَوْنُهٗ اَوْ رِیْحُهٗ کَذَا فِی الظَّهِیْرِیَّةِ۔ وَلَا یُقَدَّرُ هٰذَا بِالذِّرْعَانِ حَتّٰی اِذَا کَانَ بَیْنَهُمَا عَشَرَةُ اَذْرُعٍ وَکَانَ یُوْجَدُ فِی الْبِئْرِ اَثَرُ الْبَالُوْعَةِ فَمَاءُ الْبِئْرِ نَجِسٌ وَاِنْ کَانَ بَیْنَهُمَا ذِرَاعٌ وَلَایُوْجَدُ اَثَرُ الْبَالُوْعَةِ فَمَاءُ الْبِئْرِ طَاهِرٌ کَذَا فِی الْمحیط وهو الصحیح هکذا فی محیط السرخسی۔

ترجمہ:''(پینے کے) پانی کا کنواں اگر نجاست کے گڑھے کے قریب ہے تو جب تک اس کے ذائقے،رنگ اور بُو میں تغیر نہ آجائے،وہ پاک ہے،''ظہیریہ'' میں اسی طرح ہے،اور ان دونوں کے درمیان فاصلے کی حد دو ہاتھ سے مقرر نہیں کی جائے گی یہاں تک کہ یہ حد دس ہاتھ تک ہو اور اگر کنویں میں (اتنے فاصلے کے باوجود) نجاست کا اثر پایا جاتا ہے تو اس کنویں کا پانی نجس ہے اور اگر ایک ہاتھ کے فاصلے پر بھی اس کنویں میں نجاست کا اثر نہیں پایا جاتا تو وہ پانی پاک ہے،''محیط'' میں اسی طرح ہے اور یہی صحیح ہے،''محیط السرخسی'' میں بھی اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد 1،ص:20،مطبوعہ:مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

کسی پاک چیز کے گرنے یا کافی عرصے تک محض پانی کے ٹھہرے رہنے کی وجہ سے اس کے

اَوصاف تبدیل ہوجائیں تو وہ پانی ناپاک یا ناقابلِ استعمال نہیں ہوتا، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''رنگ یا بُو یا مزہ اگر کسی پاک چیز کے گرنے یا زیادہ دیر ٹھہرنے سے بدلے تو پانی خراب نہیں ہوتا ہاں نجاست کی وجہ سے تغیر آجائے تو نجس ہوگا اگرچہ کتنا ہی کثیر کیوں نہ ہو''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 3 ص:250، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''کنویں کے قریب نجس چہ بچہ (گندی نالی یا گٹر) کا ہونا اُسے نجس کردیتا ہے بعض نے کہا پانچ ہاتھ سے کم تک بعض نے سات ہاتھ سے کم تک، اور صحیح یہ ہے کہ جتنی دور سے نجاست کا اثر ظاہر ہو، نجس کردے گا، اگرچہ تیس ہاتھ کے فاصلے سے، درمختار میں ہے:

اَلْبُعْدُ بَیْنَ الْبِئْرِ وَالْبَالُوْعَةِ بِقَدْرِ مَالَا یَظْهر للنجس اَثَرٌ

ترجمہ: ''کنویں اور نجس چہ بچہ کے درمیان اتنا فاصلہ ہو کہ نجاست کا اثر کنویں میں ظاہر نہ ہو''۔ ردالمحتار میں ہے: فی الخلاصة والخانیة: والتعویل علیه وصححه فی المحیط

ترجمہ: ''خلاصہ اور خانیہ کے حوالے سے ہے: اسی پر اعتماد ہے اور محیط میں اسی کو صحیح قرار دیا گیا ہے''۔ (بحرالرائق)

اُسی میں ہے: روایة خمسة اذرع وفی روایة سبعة والحاصل انه یختلف برخاوة الارض وصلابتها ومن قدرہ اعتبر حال ارضه۔

ترجمہ: ''اس میں پانچ ہاتھ اور سات ہاتھ کی روایتیں بھی ہیں، الحاصل یہ فاصلہ زمین کی نرمی اور سختی کے اعتبار سے مختلف ہوگا اور جس نے اس کی مقدار (ہاتھ کے ساتھ) بیان کی تو اس نے اپنی زمین کے حال کا اعتبار کیا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 3، ص: 287، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اگر گٹر یا سیوریج لائن درست حالت میں ہے اور اس سے پانی رِس (Leak) نہیں رہا، یا وہ اُبل (Over Flow) نہیں رہا تو کنویں کے اس کے قریب واقع ہونے میں

کوئی حرج نہیں ہے۔لیکن اگر گٹر لائن لیک ہے اور رِس رہی ہے یا گٹر بند (Choke) ہونے کی وجہ سے اُبل رہا ہے اور زمین کچی ہے اور کنواں اتنے فاصلے پر ہے کہ سیوریج لائن یا گٹر کا پانی رِس کر اس تک پہنچ جاتا ہے تو وہ ناپاک ہو جائے گا اور پھر وضو اور غسل کے قابل نہیں رہے گا۔امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتوے کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے لئے کنویں اور گٹر لائن کے درمیان مستقل طور پر کسی فاصلے کا تعین نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ ہر جگہ کی مٹی اور زمین کی ساخت پر منحصر ہے۔اور اگر لیبارٹری ٹیسٹ اور کیمیائی تجزیئے سے معلوم ہو جائے کہ گٹر کا ناپاک پانی کنویں میں آرہا ہے تو شرعاً اس کا اعتبار بھی کیا جاسکتا ہے۔لیکن اس بات کا بھی خیال رہے کہ بسا اوقات کنویں میں پانی کم ہونے کی وجہ سے بھی اس میں گاد یا بُو آجاتی ہے، لہٰذا جب تک اس بات کا یقین یا ظن غالب نہ ہو کہ اس میں نجاست ملی ہے، اس کنویں کو پاک مانا جائے گا۔ویسے یہ سٹی گورنمنٹ یا واٹر اینڈ سیوریج بورڈ یعنی مقامی حکومت (Local Govt) کی ذمہ داری ہے کہ سیوریج لائن سے پانی کے رساؤ (Leakage) کی مرمت کرے اور جہاں جہاں سیوریج لائن کے مین ہول (Main hole) ابل رہے ہیں، ان کی بہاؤ کی درستگی کا فوری انتظام کرے۔اور اس مقصد کے لئے اس محکمے کے پاس تعمیر و مرمت (Repair and maintenance) کا خصوصی بجٹ ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے امراض پھیلتے ہیں اور ان کے علاج کے مقابلے میں یہ احتیاطی اقدامات بہت سستے ہیں۔آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں کروڑوں کے بجٹ سے سڑکیں بنتی ہیں اور وہ واٹر لائن یا سیوریج لائن کے ابل جانے سے تباہ و برباد ہو جاتی ہیں، اور پھر ان پر پہلے سے زیادہ رقم قومی خزانے سے خرچ ہوتی ہے۔شریعت کے مقاصد میں ایک ''سدِ ذرائع'' بھی ہے، یعنی مَفاسِد اور خرابیوں کا راستہ روکنا۔موجودہ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ نے یہ بہتر اقدام کیا ہے کہ بعض اہم سڑکوں کی از سرِ نو تعمیر سے پہلے واٹر لائن اور سیوریج لائن اور ٹیلیفون لائن از سرِ نو ڈالی جارہی ہیں، اس سلسلے کو شہر کی تمام سڑکوں اور گلی کوچوں تک پھیلانے کی ضرورت ہے۔بعض مقامات پر دیکھنے میں آتا ہے کہ جھگیوں یا کچی

آبادیوں والے پانی کی لائن کو دانستہ لیک کر دیتے ہیں، اس مقام سے پانی لائن سے نکلتا رہتا ہے اور ایک گڑھے میں جمع ہوتا رہتا ہے، اس سے وہ لوگ پانی بھرتے بھی ہیں، ناپاک کپڑے بھی وہیں دھوتے ہیں اور غسلِ طہارت یا غسلِ جنابت بھی وہیں کرتے ہیں اور پانی کا یہ ضیاع 24 گھنٹے جاری رہتا ہے اور جب لائن میں پانی نہیں ہوتا تو یہ ناپاک پانی واپس لائن میں جاتا ہے۔ اگرچہ شرعاً بہنے والا پانی پاک ہے، لیکن جو لوگ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہوتے ہیں، ان کی طبیعت میں حکمُ روانقباض اور کراہت و ناگواری پیدا ہوتی ہے اور امراض بھی پھیلتے ہیں۔ لہٰذا سٹی گورنمنٹ اور واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے ذمہ داران کو چاہئے کہ اس سلسلے کو روکنے کے لئے مستقل نگرانی کا انتظام کریں اور اسے تعزیری جرم قرار دیں، لیکن اس سے پہلے ان مقامات پر ایسے لوگوں کے لئے پانی کی ایک ٹونٹی کا انتظام کریں اور اس بات کا بھی انتظام ہو کہ استعمال شدہ پانی سیوریج لائن میں جائے، نگرانی اور مرمت کے لئے سریع الحرکت فوج (Rapid Deployment Force) کے طرز پر ہمہ وقت متحرک عملہ ہو جس کے پاس فوری مرمت کے بھی وسائل و آلات ہوں تاکہ معلوم ہو کہ عوام کی بنیادی ضروریات کی فراہمی اور صحت کا تحفظ حکومت کی ترجیح اول ہے۔

فٹ پاتھ پر وضو خانہ

سوال: 11

مسجد غوثیہ لیاقت آباد کراچی کے بالکل سامنے ہسپتال کی عقبی دیوار سے ملحق تقریباً چار فٹ جگہ خالی پڑی ہے۔ یہ جگہ سرکاری ملکیت ہے۔ ہسپتال کے علاوہ اسی قطار کے دیگر مکانات کے مکینوں نے اپنے اپنے گھر کے سامنے کی جگہ کو گیلری بنا کر اپنے مصرف میں لے لیا ہے۔ لوگ اس خالی قطعہ اراضی کو فالتو اور بے کار جان کر کوڑا کرکٹ ڈال دیتے ہیں، کچھ مویشی بھی باندھے جانے لگے ہیں، جس کی وجہ سے مسجد کے سامنے گندگی اور غلاظت جمع ہو جاتی ہے۔ خدشہ ہے کہ اس طرح یہ جگہ مستقل کوڑا گھر بن جائے گی اور مستقل طور پر مسجد کے سامنے گندگی و غلاظت کا ڈھیر لگا رہے گا۔ اس مسئلے پر ہم نے اہلِ محلہ اور یو۔ سی ناظم

وغیرہ سے بھی بات کی ہے اور سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ ہمیں اس جگہ پر مسجد کے لئے وضوخانہ بنانے میں کوئی اعتراض نہیں، اب ہم معلوم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اِس جگہ پر مسجد کے لئے اضافی وضوخانہ بنایا جاسکتا ہے؟

مسجد	مکانات	مکانات	مکانات

سڑک سڑک

سڑک

خالی جگہ	گیلری	گیلری	گیلری
ہسپتال	مکانات	مکانات	مکانات

(سعید احمد قادری، مینجنگ ٹرسٹی غوثیہ مسجد، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے اور سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کے ذمہ داران آپ کو اجازت دے رہے ہیں تو آپ اس جگہ پر وضوخانہ بنا سکتے ہیں یا کسی اور مصرف میں بھی لا سکتے ہیں۔ لیکن بظاہر قانونی پوزیشن یہ معلوم ہوتی ہے کہ فٹ پاتھ کی جگہ وہ کسی کو قانونی طور پر الاٹ نہیں کر سکتے، لوگوں نے بھی گیلریاں بنا کر غیر قانونی تجاوز (Enchroachment) کیا ہے اور یہ بھی ایسا ہی تجاوز ہوگا، جس سے متعلقہ محکمے کے ذمہ دار لوگ صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر وضوخانہ بنانے سے بھی بظاہر آلودگی بڑھے گی، اس کے بجائے اگر ممکن ہو تو دار المطالعہ بنا لیا جائے یا کسی اور بہتر مصرف میں لایا جائے۔

عذر کے سبب وضو قائم نہ رہنے کی صورت میں عبادات کی ادائیگی کا حکم

سوال:12

ایسا شخص جس کا وضو کسی سبب قائم نہیں رہتا، طواف کرتے ہوئے اگر اُس کا وضو ٹوٹ جائے تو کیا وہ طواف اور سعی مکمل کر سکتا ہے؟۔ اسی طرح حرم شریف میں نمازِ جمعہ میں کافی دیر بیٹھنا پڑتا ہے، اس قدر ہجوم میں وہاں سے اٹھ کر وضوخانہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا، اگر نماز

شروع ہونے سے پہلے وضوٹوٹ جائے تو کیا اسی طرح نماز ادا کرلی جائے؟ دوبارہ وضو کرنے کی صورت میں بھی بیت اللہ یا مقامِ سعی تک پہنچنے کے دوران پھر وضوٹوٹنے کا امکان ہے۔

(محمد عبدالسمیع، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

ایسا شخص جس کو کوئی ایسی بیماری ہے جس سے وضو قائم نہ رہ سکے، مثلاً پیشاب کے قطرے آنے کا مرض، ریح (ہوا) خارج ہونا، دکھتی آنکھ سے پانی بہنا، پھوڑے یا ناسور سے رطوبت یا پیپ بہنا، کان، ناف، پستان سے بیماری کی وجہ سے پانی بہنا وغیرہ۔ فقہی اصطلاح میں ایسے شخص کو ''شرعی معذور'' کہا جاتا ہے، بشرطیکہ اس کا یہ عذر نماز کے پورے وقت کو اس طرح گھیر لے کہ اس عذر کے بغیر وہ فرض نماز بھی ادا نہ کر سکے۔ اتنی دیر تک اپنا وضو قائم رکھنے پر قادر نہ ہو کہ ایک وقت کی پوری نماز پڑھ لے، تو بار بار عذر لاحق ہونے کی وجہ سے اُسے شرعاً یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ ایک وقت کی نماز کے لئے تازہ وضو کرے اور اس میں اس عذر کی وجہ سے وضوٹوٹنے کے باوجود اُس وقت کے فرض، واجب، سنّت کے علاوہ قضا نماز، نوافل اور تلاوت، الغرض جو عبادات ادا کرنا چاہے، کرلے اور جب دوسری نماز کا وقت آئے تو پھر تازہ وضو کر کے اسی طرح پڑھے، البتہ ایسا شخص امامت نہیں کرسکتا۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اَلْمُسْتَحَاضَةُ وَمَنْ بِهٖ سَلَسُ الْبَوْلِ أَوْ اِسْتِطْلَاقُ الْبَطْنِ أَوْ اِنْفِلَاتُ الرِّيْحِ أَوْ رُعَافٌ دائمٌ أَو جُرحٌ لَایَرْقَأُ یَتَوَضَّؤُنَ لِوَقْتِ کُلِّ صَلَاۃٍ وَیُصَلُّوْنَ بِذٰلِكَ الْوُضُوْءِ فِی الْوَقْتِ مَاشَآؤُا مِنَ الْفَرَائِضِ وَالنَّوَافِلِ هٰکَذَا فِی الْبَحْرِ الرَّائِقِ۔

ترجمہ: ''مستحاضہ (یعنی وہ خاتون جسے سیلان الرحم کی بیماری لاحق ہے) اور جسے پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا مسلسل دست کی بیماری (DIARRHOEA) ہو یا ریح (یعنی ہوا) خارج ہوتی ہو یا دائمی نکسیر جاری ہو یا زخم جو مسلسل رستا رہتا ہو، تو ایسے معذور ہر نماز کے وقت کے لئے تازہ وضو کریں اور اُس وقت کے اندر فرائض ونوافل جس قدر چاہیں اُسی

وضو سے ادا کریں، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ہے،۔۔۔۔۔ مزید لکھتے ہیں:

وَيَبْطُلُ الْوُضُوْءِ عِنْدَ خُرُوْجِ وَقْتِ الْمَفْرُوْضَةِ بِالْحَدَثِ السَّابِقِ هٰكَذَا فِي الْهِدَايَةِ۔

ترجمہ: ''دائمی معذور کا وضو سابقہ حدث کی وجہ سے فرض نماز کا وقت نکل جانے سے ٹوٹ جاتا ہے، جیسا کہ ''هدایہ'' میں ہے''۔ یعنی اگلے وقت کی نماز کے لئے تازہ وضو کرنا ہوگا۔

لہٰذا اگر آپ معذورِ شرعی ہیں تو نماز کے وقت کے اندر اندر طواف وسعی مکمل کر سکتے ہیں اگرچہ دورانِ طواف وسعی وہ عذر پایا جائے۔ اگر دورانِ طواف ایک نماز کا وقت ختم ہو کر دوسری نماز کا وقت شروع ہو جائے تو اس کے بارے میں علامہ امجد علی اعظمی ''منسک'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''معذور طواف کر رہا ہے، چار پھیروں کے بعد وقتِ نماز جاتا رہا تو اب اسے حکم ہے کہ وضو کر کے طواف کرے کیونکہ وقت نماز خارج ہونے سے معذور کا وضو جاتا رہتا ہے اور بغیر وضو طواف حرام، اب وضو کرنے کے بعد جو باقی ہے، پورا کرے اور چار پھیروں سے پہلے وقت ختم ہو گیا، تب بھی وضو کر کے باقی کو پورا کرے اور افضل یہ ہے کہ نئے سرے سے کرے''۔ (بہارِ شریعت، جلد اول، ص:469، مکتبہ رضویہ، کراچی)

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ معذور شخص کے طواف کے دوران اُس نماز کا وقت نکل گیا تو وہ دوبارہ وضو کر کے طواف کے بقیہ پھیرے مکمل کرے گا، علامہ شیخ احمد طحطاوی متوفی 1231ھ معذور کے شرعی احکام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(وَمَنْ بِهٖ عُذْرٌ كَسَلَسِ بَوْلٍ أَوِاسْتِطْلَاقِ بطنٍ) وانفلاتِ ريح و رُعَافٍ دائم وجرح لا يرقأ ولا يمكن حبسه بحشو من غير مشقة ولا بجلوس فبهذا يتوضؤون (لوقت كل فرض) لا لكل فرض ولا نفل، لقوله ﷺ المستحاضة تتوضأ لوقت صلاة رواه سبط ابن الجوزي عن ابي حنيفة رحمه الله تعالى، فسائر ذوي الاعذار في حكم المستحاضة، فالدليل يشملهم (ويصلون به) أي بوضوئهم في الوقت، (ما شاؤوا من الفرائض) أداء للوقتية وقضاء لغيرها ولو لزم الذمة زمان الصحة (و) ما شاؤوا

من (النوافل) والواجبات کالوتر والعید وصلاۃ جنازۃ وطواف ومس مصحف۔

ترجمہ: ''جسے پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا دست کی بیماری ہو یا ریح خارج ہوتی ہو یا نکسیر جاری ہو یا زخم مسلسل رِستا رہتا ہو اور بغیر مشقت اسے روکنا ممکن نہ ہو اور نہ بیٹھ کر روک سکتا ہو تو ایسے عذر والے ہر نماز کے وقت میں ایک بار تازہ وضو کریں اور جب تک اس نماز کا وقت باقی ہے، فرائض ونوافل جس قدر چاہیں اُسی وضو سے ادا کریں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: ''مستحاضہ ہر نماز کے وقت میں تازہ وضو کرے''۔ اس حدیث کو سبط ابن جوزی نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کیا، پس تمام عذر والے مستحاضہ کے حکم میں ہیں، اور یہ دلیل سب کو شامل ہے اور وہ اُس وضو سے جس قدر چاہیں (فرض) نماز پڑھیں، وقت کی ادا یا قضا نماز اور اگر زمانۂ صحت کی کوئی نماز اُس کی قضا ہو گئی تھی تو وہ بھی ادا کر سکتا ہے، اس کے علاوہ جس قدر چاہے نوافل اور واجبات اسی وضو سے ادا کر سکتے ہیں، مثلاً وتر، عید کی نماز، نمازِ جنازہ اور طواف اور مُصحف (قرآن مجید) کو چھونا۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد اوّل، ص: 212، 213)

سعی کیلئے طہارت لازمی نہیں بلکہ مستحب ہے، علامہ مفتی امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں: ''مستحب یہ ہے کہ باوضو سعی کرے''۔ (بہارِ شریعت، حصہ ششم، جلد 1، ص: 435)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ معذور کے حج وعمرہ کی سعی کے بارے میں لکھتے ہیں:

وَاِنْ سَعٰی جُنُبًا اَوْ حائضًا اَوْ نَفَسًا فَسَعْیُہٗ صَحِیْحٌ، ترجمہ: ''اور اگر حیض ونفاس والی عورت اور جنبی شخص (یعنی جس پر غسل واجب ہو) سعی کریں تو (ان کا سعی کرنا) صحیح ہے (یعنی سعی کے لئے طہارت شرط نہیں)، (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص: 41، ص: 247)''۔

باقی رہا یہ سوال کہ جمعہ میں رَش کی وجہ سے وضو خانہ تک جانا ممکن نہیں اور اس دوران وضو ٹوٹ گیا تو کیا بغیر وضو نماز پڑھ سکتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اگر یہ معذورِ شرعی نہیں ہے تو اس پر وضو کے لئے جانا لازم ہے اور پلٹ کر وہیں واپس آنا ضروری نہیں بلکہ

جہاں جگہ ملے، نماز پڑھ لے اور اگر وضو کے دوران نمازِ جمعہ ختم ہوگئی تو اگر قریب کوئی اور مسجد ہے تو وہاں چلا جائے ورنہ ظہر کی نماز ادا کرے، بے وضو نماز ادا کرنا سخت حرام ہے اور اگر نماز کو حقیر جان کر ایسا کرے تو کفر ہے۔

بالغ کے ختنہ اور فالج زدہ شخص کے زیرِ ناف بال زائل کرنے کا حکم

سوال:13

چند سوالات پیشِ خدمت ہیں:

(1) سترِ عورت (شرمگاہ) کیا کسی حدیث یا کسی اور حکم سے اس کی صفائی کی حد مقرر ہے اور کیا دنوں کا بھی تعین ہے کہ کتنے دن بعد کی جاسکتی ہے اور کس حد تک کی جاسکتی ہے؟

(2) عورتوں کے لئے کیا حکم ہے کہ وہ کس چیز کے ذریعے صفائی کرسکتی ہیں بعض عورتیں اپنے سارے جسم کو بلیڈ یا کسی اور کریم سے صاف کرتی ہیں کیا سارے جسم کو بلیڈ یا کریم سے صاف کرنا جائز ہے؟

(3) اگر کوئی شخص فالج زدہ ہو جائے اور اپنے زیرِ ناف بالوں کی صفائی نہ کرسکتا ہو تو اب ان بالوں کو اپنے حال پر رہنے دے یا دوسرے شخص سے صفائی کرا سکتا ہے؟

(قاری مظہر محمود، ڈھوک فرمان، راولپنڈی)

جواب:

زیرِ ناف بالوں کو صاف کرنا سنت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱) اَلْفِطْرَةُ خَمْسٌ اَلْخِتَانُ، وَالِاسْتِحْدَادُ، وَقَصُّ الشَّارِبِ، وَتَقْلِيْمُ الْاَظْفَارِ، وَنَتْفُ الْاٰبَاطِ۔

ترجمہ: ''پانچ چیزیں فطرت سے ہیں (یعنی انبیائے سابقین علیہم السلام اور ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہیں): ختنہ کرنا، موئے زیرِ ناف مونڈنا، مونچھیں کم کرنا، ناخن ترشوانا اور بغل کے بال اکھیڑنا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5889، 5891)''۔

(۲) عَن انسِ بنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ انسٌ وُقِّتَ لَنَا فِي قَصِّ الشَّارِبِ وَتَقْلِيمِ الاَظْفَارِ وَنَتفِ الاِبِطِ وَحَلْقِ الْعَانَةِ اَن لَّا نَترُكَ اَكثَرَمِن اَربَعِينَ لَيلَةً۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مونچھیں اور بغل کے بال اکھاڑنے، ناخن کاٹنے اور موئے زیرِ ناف مونڈنے میں ہمارے لئے جو مدت مقرر کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ چالیس راتوں سے زیادہ نہ چھوڑیں یعنی چالیس دن کے اندر ان کاموں کو ضرور کر لیں''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث:598)

شاہ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: ''باید از چہل روز نہ گزرد و اگر کمتر از اں کنند افضل ست، و گفتہ اند کہ آنحضرت قص شارب و تقلیم اظفار در جمعہ می کرد، حلق عانہ در بست روز ونتف الابط در چہل روز''۔

ترجمہ: ''(ان کاموں کے لئے) چالیس دن سے زیادہ نہیں گزرنا چاہئے اور اگر اس سے کم میں کرے تو افضل ہے اور کہا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ مونچھ اور ناخن ہر جمعہ کو کاٹتے تھے اور ہر بیس دن پر موئے زیرِ ناف مونڈتے تھے اور ہر چالیس روز پر بغل کے بال اکھیڑتے تھے''۔ (اَشِعَّۃُ اللّمعات، جلد 3، ص:569)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

ویستحب حلق عانته وتنظیف بدنه بالاغتسال فی کل اُسبوع مرة والافضل یوم الجمعة، وجاز فی کل خمسة عشرة، وکره ترکه وراء الاربعین

ترجمہ: ''موئے زیرِ ناف دور کرنا، ہفتہ میں ایک مرتبہ غسل کر کے بدن کو صاف ستھرا رکھنا مستحب ہے اور افضل جمعہ کا دن ہے اور ہر پندرہ دن کے بعد کرنا بھی جائز ہے، چالیس دن سے زائد گزار دینا مکروہ ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

ویستحب حلق عانته قال فی الهندیة ویبتدئ من تحت السرة، ولو عالج بالنورة یجوز۔ کذا فی الغرائب۔ وفی الاشباه والسنة فی عانة المرأة نتف۔

ترجمہ: ''اور زیرِ ناف بالوں کا دور کرنا مستحب ہے، فتاویٰ ''ہندیہ'' میں کہا کہناف کے نیچے سے ابتدا کرے، اگرچہ نورہ (چونا یا بال دور کرنے کا پاؤڈر) استعمال کرے، جائز ہے۔ ''غرائب'' میں اسی طرح ہے، ''الاشباہ'' میں ہے: عورت کے لئے ان بالوں کو (مونڈنے کے بجائے) اکھیڑنا سنت ہے''۔۔۔ آگے چل کے (وکرہ ترکہ) کی تشریح میں لکھتے ہیں:

أی تحریما لقول المجتبیٰ ولاعذر فیما وراء الاربعین ویستحق الوعید

ترجمہ: ''(چالیس دن سے زائد گزرنا مکروہ ہے) یعنی مکروہِ تحریمی ہے، ''المجتبیٰ'' کے قول کے مطابق چالیس دن سے زائد ان بالوں (کو چھوڑنے میں) کوئی عذر (مقبول) نہیں ہے (بلکہ اس پر وہ حدیث میں بیان کی گئی) وعید کا مستحق ہے''۔ (درمختار، جلد 9، ص: 497)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ویحلق عانته وینظف بدنه بالاغتسال فی کل اسبوع مرة فان لم یفعل ففی کل خمسة عشر یوما ولا یعذر فی ترکه وراء الاربعین فالاسبوع هوالافضل والخمسة عشر الاوسط والاربعون الابعد ولاعذر فیما وراء الاربعین ویستحق الوعید کذافی القنية۔

ترجمہ: ''اور ہر ہفتے میں ایک بار اپنے زیرِ ناف بالوں کو مونڈے اور اپنے بدن کو غسل کرکے صاف کرے، اگر (ہفتے میں) ایسا نہ کر سکے تو ہر پندرہ دن میں (ضرور) کرے، اور چالیس دن سے زیادہ چھوڑنے پر کوئی عذر (مقبول) نہیں ہوگا، پس ایک ہفتے میں کرنا افضل ہے، پندرہ دن میں کرنا درمیانی مدت ہے اور چالیس دن زیادہ سے زیادہ مدت ہے، اور چالیس دن سے زیادہ ترک کرنے پر کوئی عذر مقبول نہیں ہوگا اور (اس پر) وہ وعید کا مستحق ہوگا، ''قنیہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 358،357)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: حلق وقصر ونتف وتنور یعنی مونڈنا، کترنا، اکھیڑنا، نورہ لگانا سب صورتیں جائز ہیں کہ مقصود اس موضع کا پاک کرنا ہے اور وہ سب طریقوں میں حاصل ہے۔

فِیْ صَحِیْحِ مُسْلِمِ ابْنِ الْحَجَّاجِ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: قَالَ: اَلْفِطْرَةُ خَمْسٌ اَوْخَمْسٌ مِنَ الْفِطْرَةِ اَلْخِتَانُ وَالْاِسْتِحْدَادُ وَتَقْلِیْمُ الْاَظْفَارُ وَنَتْفُ الْاِبْطِ وَقَصُّ الشَّارِبِ، قَالَ الشارح النووی واما الاستحداد فهو حلق العانة وهو سنة والمراد به نظافة ذلك الموضع۔ وبمثله قال الغزالی فی احیائه وغیرہ فی غیرہ۔

ترجمہ: ''صحیح مسلم ابن حجاج میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے حضور ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا امورِ فطرت پانچ ہیں، یا یوں فرمایا: پانچ کام فطرت سے ہیں: (1) ختنہ کرنا، (2) زیرِ ناف بال مونڈنا، (3) ناخن کاٹنا، (4) بغلوں کے بال اکھیڑنا، (5) مونچھیں کترنا۔ شارح صحیح مسلم امام نووی نے فرمایا: رہا ''استحداد''، تو وہ مقامِ ستر کے بال مونڈنے ہیں اور یہ عمل سنت ہے اور اس عمل سے اُس جگہ کی طہارت مقصود ہے، امام غزالی رحمہ اللہ نے ''اِحیاءِ علومِ الدین'' میں اور دوسرے علماء نے دیگر کتابوں میں اس طرح صراحت فرمائی ہے''۔

مگر مرد کے لئے کاٹنے، اکھیڑنے اور پاؤڈر لگانے کی بہ نسبت ان بالوں کا مونڈنا افضل ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ سے متعلق احادیث اور عام کتبِ فقہ میں اس خصلت کا ذکر بلفظ ''حلق''، ''استحداد'' وغیرہ آیا ہے۔

قال النووی: والافضل فیه الحلق ویجوز بالقص والنتف والنورة وفی الفتاویٰ الهندیة: الافضل ان یقلم اظفارہ ویحلق عانته

ترجمہ: ''امام نووی نے فرمایا کہ زیرِ ناف بالوں کو مونڈنا افضل ہے اور تراشنا، اکھیڑنا اور چونا وغیرہ لگانا بھی جائز ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ بہتر یہ ہے کہ ناخن کاٹے جائیں اور زیرِ ناف بال مونڈے جائیں۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے اس کے بعد مختلف فقہی حوالوں سے عورت کے لئے مونڈنے کے بجائے دیگر طریقوں سے بال صاف کرنے کو افضل قرار دیا

ہے''۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 22،ص:600،601،رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:

(1)غیر ضروری بالوں کے صاف کرنے کی افضل مدت ایک ہفتہ،اوسط پندرہ دن اور چالیس دن سے زائد گزر جائیں تو مکروہ (تحریمی) ہے۔

(2)عورتیں غیر ضروری بالوں کی صفائی نورہ (یعنی بال صاف کرنے کے پاؤڈر یا کریم) کے ساتھ کرسکتی ہیں، بلیڈ استعمال کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں،لیکن صنفِ نازک کے لئے ضرر کا اندیشہ ہے۔آج کل خواتین کے لئے بالوں کو صاف کرنے کی جو مختلف کریمیں دستیاب ہیں،ان کا استعمال جائز ہے۔

(3)عورتوں کے لئے سر کے بالوں اور ابرو کے علاوہ بدن کے دیگر بالوں کو صاف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے،چہرے کے بال بھی صاف کرسکتی ہیں۔

(4)مرد بھی چاہیں تو بدن کے دیگر غیر ضروری بالوں کو صاف کر سکتے ہیں،اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے،بشرطیکہ طبی لحاظ سے ان کے لئے مضر نہ ہو۔علامہ ابن عابدین شامی نے ابرو کے حدِ اعتدال سے زائد بال تراشنے کو مباح قرار دیا ہے،لمبی پلکوں کو بھی حسبِ خواہش تراشنے کی اجازت دی ہے، سینے اور پیٹھ کے بالوں کو بھی مونڈ سکتے ہیں، علامہ شامی نے اسے زیادہ سے زیادہ خلافِ ادب قرار دیا ہے،مرد کے لئے چہرے کے زائد بال صاف کرنا مباح ہے۔اسی طرح مرد وعورت دونوں ہاتھ، پاؤں اور پیٹ وغیرہ کے معیوب نظر آنے والے بال دور کرسکتے ہیں۔

(5)مرد کے لئے افضل مونڈنا ہے، پاؤڈر یا کریم بھی استعمال کرسکتا ہے یہ صرف خلافِ اولیٰ ہوگا۔

(6)مرد یا عورت فالج زدہ ہوں تو اگر ان کا ہاتھ حرکت کرسکتا ہے تو پاؤڈر یا کریم استعمال کر کے خود اپنے زیرِ ناف بالوں کی صفائی کر سکتے ہیں اور اگر زوجین میں سے ایک (شوہر یا بیوی) بالکل معذور ہے تو جو صحت مند ہے وہ دوسرے کے زیرِ ناف بال صاف کرسکتا ہے۔

اور یہ عمل کرتے وقت شرمگاہ پر نظر ڈالنے سے بچا جاسکتا ہے اور ہاتھ پر پلاسٹک وغیرہ چڑھا کر براہِ راست بدن کو چھونے سے بھی اجتناب کیا جاسکتا ہے، کیونکہ شرمگاہ پر پردہ ڈال کر نظر ڈالے بغیر یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ اگر فالج زدہ مرد یا عورت کے اپنے ہاتھ کو حرکت دی جاسکتی ہو تو اس مقصد کے لئے اُس کا اپنا ہاتھ استعمال کیا جائے۔ زوجین میں سے کوئی ایک دوسرے کی مدد کے لئے موجود نہ ہو، مثلاً عورت بیوہ ہوگئی ہو یا بیوی کا انتقال ہوگیا ہو یا کسی کی شادی ہی نہ ہوئی ہو اور فالج کا شکار ہوگیا ہو تو اجنبی شخص سے بھی یہ خدمت لی جاسکتی ہے، تاہم اگر بالغہ غیر شادی شدہ لڑکی فالج کا شکار ہوگئی ہو تو دوسری عورت سے یہ کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح علاج کی غرض سے ڈاکٹر کے سامنے مجبوری کے تحت اپنی شرمگاہ سے بقدرِ ضرورت پردہ ہٹاسکتے ہیں۔

اسی اصول کے تحت اگر کوئی بالغ شخص اسلام قبول کرے اور خود اپنا ختنہ نہ کرسکتا ہو تو ڈاکٹر سے ختنہ کرانے کے لئے اپنی شرمگاہ سے پردہ ہٹاسکتا ہے۔ علاج کے لئے کشفِ عورت شرعی اور طبعی ضرورت ہے اور ختنہ کے لئے ایسا کرنا شرعی ضرورت ہے۔

امام فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی فرغانی حنفی المعروف امام قاضی خان متوفی 295ھ لکھتے ہیں: امرأۃ اصابت قرحۃ فی موضع العورۃ لایحل للرجل أن ینظر الیھا، ولکن یعلّم أمرأۃ لتداویھا ،فان لم یجد أمرأۃً تتعلّم ذلک اذا علمت اخیف علیھا البلاء والوجع والھلاک فانہ یستر منھا کل شئی الّا موضع تلک القرحہ ثم یداویھا الرجل ویغض بصرہٗ الّا ان ذلک الموضع ☆ ولافرق فی ھذا بین ذوات المحارم وغیرھنّ لان النظر الی العورۃ لایحل بسبب المحرمیۃ ☆ وللقابلۃ ان تنظر الی فرج المرأۃ عند اخذ الولد لمکان الضرورۃ ☆ وکذالحجام ان ینظر الی فرج البالغ عند الختان

ترجمہ: ''ایک عورت کی شرمگاہ پر زخم لگ گیا تو مرد کو اُس کی طرف دیکھنا جائز نہیں ہے، بلکہ وہ کسی عورت کو اس کا علاج کرنا سکھائے، پس اگر وہ علاج سیکھنے کے لئے کوئی عورت نہ

پائیں اور اُس زخمی عورت کے مصیبت میں مبتلا ہونے یا (شدید) درد یا ہلاک ہونے کا خدشہ ہو تو مرد معالج اس زخمی جگہ کے علاوہ عورت کے باقی بدن پر پردہ ڈال دے اور پھر اُس کا علاج کرے اور اِس خاص جگہ کے علاوہ باقی جگہوں پر نظر ڈالنے سے نگاہیں پست رکھے ☆ اور اس مسئلے میں مرد مُعالج کے محرم یا غیر محرم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ شرمگاہ پر نظر ڈالنے کی رخصت علاج کی ضرورت کے تحت ہے نہ کہ محرم ہونے کی بنا پر ☆ اور دائی (مِڈوائف/گائنا کالوجسٹ) کو ضرورت کی بنا پر بچہ پکڑنے کے لئے زچہ (یعنی وہ عورت جس کا بچہ پیدا ہو رہا ہو) کی شرمگاہ کی طرف دیکھنے کی رخصت ہے ☆ اور اسی طرح ختنہ کرنے والے کے لئے ختنہ کرتے وقت بالغ کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا جائز ہے"۔

(فتاویٰ قاضی خان علی ہامش الہندیہ، جلد 3 ص:409، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

نوٹ: اس سے پہلے اگر میں نے کہیں اس کے برعکس لکھا ہے تو اس تحریر کو اُس سے رجوع سمجھا جائے۔

نماز کے مسائل

اذان کے بعد ''تثویب'' (اعلانِ ثانی) کا جواز

سوال: 14

بعض مساجد میں اذانِ فجر کے بعد اور نماز سے دس منٹ پہلے ''الصلوٰۃ، الصلوٰۃ'' کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ایک عالم کا کہنا ہے کہ ایسا کرنا اذان کی توہین ہے، کیا اذان کافی نہیں ہے؟، ایسا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تو انہوں نے اس سے منع فرمایا۔اس عمل کی شرعی حیثیت بیان فرمائیے۔(محمد نثار اعوان عطاری، اسلام آباد)

جواب:

اذان کے بعد اور جماعت سے قبل وقفے وقفے سے جماعت کی اطلاع دینے کے لئے جو اعلان کیا جاتا ہے، اُسے فقہی اصطلاح میں ''تثویب'' کہا جاتا ہے۔متاخرین فقہاء نے اسے مستحسن قرار دیا ہے، اس کے لئے کوئی خاص الفاظ متعین نہیں ہیں، بلکہ وہاں کے لوگوں نے جو الفاظ مقرر کر لئے ہوں، وہی جائز ہیں۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

والتثویب حسن عندالمتأخرین فی کل صلاۃ الا فی المغرب ھکذا فی شرح النقایۃ للشیخ أبی المکارم۔وھو رجوع المؤذن الی الاعلام بالصلاۃ بین الاذان والاقامۃ وتثویب کل بلدۃ علی ماتعارفوہ اما بالتنحنح أو بالصلاۃ الصلاۃ أو قامت قامت لانہ للمبالغۃ فی الاعلام وانما یحصل ذلک بما تعارفوہ کذا فی الکافی۔

ترجمہ: ''متاخرین فقہاء کے نزدیک سوائے نمازِ مغرب کے ہر اذان کے بعد (جماعت سے قبل) تثویب مستحسن ہے۔''شرح نقایہ'' میں شیخ ابوالمکارم سے منقول ہے کہ یہ مؤذن کی جانب سے نماز کے لئے اذان اور اقامت کے درمیان ایک بار پھر یاددہانی ہے۔ہر علاقے کی تثویب اسی طریقے پر ہوگی، جو وہاں متعارف ہے۔پس یہ عمل کھانسنے کے ساتھ یا ''الصلوٰۃ، الصلوٰۃ'' (نماز، نماز) پکار کر یا قامت قامت (یعنی تکرار کے ساتھ کہنا کہ جماعت کھڑی ہونے والی ہے) کہہ کر کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ یہ اعلان میں مبالغہ کے

لئے ہے اور یہ اُسی طریقے پر حاصل ہوگا جو وہاں متعارف ہے، جیسا کہ ''کافی'' میں بھی ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:56، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: اذان کے بعد صلوٰۃ کہنا، جس طرح یہاں رمضان المبارک میں معمول ہے جائز ہے، یا نہیں؟، آپ جواب میں لکھتے ہیں:

اسے فقہ میں ''تثویب'' کہتے ہیں، یعنی مسلمانوں کو نماز کی اطلاع اذان سے دے کر پھر دوبارہ اطلاع دینا اور وہ شہروں کے عرف پر ہے جہاں جس طرح اطلاع مکرر رائج ہو، وہی تثویب ہے، خواہ عام طور پر ہو، جیسے ''صلاۃ'' کہی جاتی ہے یا خاص طریقہ پر مثلاً کسی سے کہنا کہ اذان ہوگئی یا جماعت کھڑی ہوتی ہے یا امام آگئے یا کوئی قول یا فعل ایسا جس میں دوبارہ اطلاع دینا ہو، وہ سب تثویب ہے اور اس کا اور صلاۃ کا ایک حکم ہے، یعنی جائز، جس کی اجازت عامۂ کتب مذہب متون: مثل تنویر الابصار ووقایہ، نقایہ، غرر الاحکام، کنز الدقائق، غرر الاذکار، وافی، ملتقی، اصلاح، نور الایضاح۔

شروح: در مختار، ردالمحتار، طحطاوی، عنایہ، نہایہ، غُنیہ، شرح مُنیہ، صغیری، البحرالرائق، نہرالفائق، تبیین الحقائق، برجندی، قہستانی، دُرر، ابن ملک، کافی، مجتبیٰ، ایضاح، امداد الفتاویٰ، مراقی الفلاح، حاشیۂ مراقی للعلامۃ الطحطاوی۔

فتاویٰ: ظہیریہ، خانیہ، خلاصہ، خزانۃ المفتیین، جواہر اخلاطی، عالمگیری وغیرہا۔

مختصر الوقایہ میں ہے: التثویب حسن فی کل صلاۃ (تثویب ہر نماز کے لئے بہتر ہے)۔

متن علامہ غزنی تمرتاشی میں ہے: یُثَوَّبُ اِلا فی المغرب (مغرب کے علاوہ ہر نماز کے لئے تثویب کہی جائے)۔ شرح محقق علائی میں ہے: یثوب بین الاذان والاقامۃ فی الکل للکل بما تعارفوہ (اذان اور اقامت کے درمیان متعارف ومروجہ طریقہ پر تمام نمازوں میں ہر ایک کے لئے تثویب کہی جائے)۔ حاشیۂ آفندی محمد بن عابدین میں ہے:

قولہ یثوب، التثویب العود الی الاعلام بعد الاعلام، دُرَر، قولہ فی الکل ای کل الصلوات لظھور التوانی فی الامور الدینیۃ، قولہ بما تعارفوہ کتنحنح اوقامر قامر

او الصلاۃ الصلاۃ ولو احدث اعلاما مخالفا لذلک جاز، نہر عن المجتبیٰ

ترجمہ: ''ان کا قول: ''یثوّب'': تثویب اطلاع کے بعد اطلاع کو کہا جاتا ہے، دُرَر۔ قولہ فی الکل: یعنی تمام نمازوں میں کہنی چاہئے کیونکہ امور دینیہ کے بجالانے میں بہت سستی دکاہلی آچکی ہے۔ ان کا قول: ''بما تعارفوہ'': مثلاً کھانسنا یا نماز کھڑی ہوگئی نماز کھڑی ہوگئی یا نماز نماز، اگر کوئی اور طریقہ اس کے علاوہ اپنالیں، تب بھی جائز ہے، ''نہر'' نے مجتبیٰ سے نقل کیا ہے''۔

شرح الوافی للامام المصنف العلام حافظ الدین ابی البرکات النسفی میں ہے:

تثویب کل بلدۃ علی ما تعارفوہ لانہ للمبالغۃ فی الاعلام وانما یحصل ذلک بما تعارفوہ۔

ترجمہ: ''ہر شہر کی تثویب اسی طریقہ پر ہوگی جو وہاں متعارف ہے، کیونکہ یہ اعلان میں مبالغہ کے لئے ہے اور وہ متعارف ومشہور طریقہ سے حاصل ہوگا''۔ اور ماہِ رمضان المبارک سے اس کی تخصیص بے جا نہیں کہ لوگ افطار کے بعد کھانے پینے میں مشغول اور نفس آرام کی جانب مائل ہوتے ہیں، لہٰذا تنبیہ بعد تنبیہ مناسب ہوئی، جس طرح نبی کریم ﷺ نے اذانِ فجر میں ''الصلاۃ خیر من النوم'' مقرر کرنے کی اجازت عطا فرمائی، اخرجہ الطبرانی فی المعجم الکبیر عن سیدنا بلال رضی اللہ عنہ (طبرانی نے معجم کبیر میں سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے)۔ ہدایہ میں ہے: خص الفجر بہ لانہ وقت نوم وغفلۃ (وقت فجر کو مخصوص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ وقت نیند اور غفلت کا وقت ہوتا ہے)۔ بالجملہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر مسلمانوں میں نزاع ڈالی جائے اور فتنہ انگیزی کر کے تفریق جماعت کی راہ نکالی جائے، جو ایسا کرتا ہے سخت جاہل اور مقاصدِ شرع سے بالکل غافل ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 5، ص: 361 تا 363، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ ہمارے متاخرین فقہائے کرام نے لوگوں میں نمازِ باجماعت کے لئے سستی اور دنیاوی امور میں انہماک دیکھتے ہوئے ''تثویب'' یعنی اذان

کے بعد ایک اور اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے، جیسے سعودی عرب میں "مُطوِّع" مقرر ہیں جو اذان کے بعد کاروبار بند کراتے ہیں اور لوگوں کو نماز باجماعت کے لئے شدت سے سعی کی تلقین کرتے ہیں، یہ بھی "تثویب" ہی کا ایک طریقہ ہے۔ کسی نے اسے سنّتِ ثابتہ یا مستحب قرار نہیں دیا اور نہ ہی یہ حدیث سے ثابت ہے، جیسے نماز کی لفظی نیت حدیث سے ثابت نہیں ہے، اسی بنا پر بعض فقہائے کرام نے اسے بدعت قرار دیا ہے، لیکن متاخرین فقہاء نے توجہ کے اِرتکاز اور نیت کی حضوری کے لئے اسے مستحب و مستحسن قرار دیا ہے، لہٰذا اِسے نزاع کا سبب بنانا صحیح نہیں ہے، ویسے بھی مستحبات پر اتنی تاکید کرنا کہ لوگ اسے عملاً واجب سمجھنے لگیں، درست نہیں ہے۔ ایسے امور کے تعامل کو کبھی کبھی ترک بھی کر دینا چاہئے، تاکہ یہ الزام باطل ثابت ہو جائے کہ یہ لوگ مستحب و مستحسن امور کو واجب کا درجہ دیتے ہیں۔ شریعت کے مقاصد میں ایک "سدِّ ذرائع" بھی ہے، یعنی مَفاسِد اور خرابیوں کا راستہ روکنا۔

رسول پاک ﷺ نے بھی حکمتِ شرعی کے تحت اپنے بعض پسندیدہ امور کو ترک فرمایا ہے، مثال کے طور پر آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ بنائے قریش پر بنی ہوئی "کعبۃ اللہ" کی عمارت کو شہید کر دیں اور پھر اس میں "حطیم" کو شامل کر کے بنائے ابراہیم پر تعمیر کریں، لیکن آپ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

لَوْلَا حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْبَيْتَ وَلَجَعَلْتُهَا عَلٰى أَسَاسِ اِبْرَاهِيمَ فَاِنَّ قُرَيْشًا حِيْنَ بَنَتِ الْبَيْتَ اِسْتَقْصَرَتْ وَلَجَعَلْتُ لَهَا خَلْفًا۔

ترجمہ: "اگر تمہاری قوم نے نیا نیا کفر نہ چھوڑا ہوتا تو میں بیت اللہ کی عمارت کو منہدم کر کے اُسے ابراہیم علیہ السلام کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر تعمیر کرتا، کیونکہ قریش نے جب اس کو بنایا تو اس کو چھوٹا کر دیا اور میں اس کی پچھلی جانب بھی ایک دروازہ بناتا"۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3227)

اسی طرح بعض اوقات آپ ﷺ نے دینی مصلحت کی خاطر (بظاہر) "خلافِ اولیٰ" کام کیا، مثلاً قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حالتِ سفر میں رمضان المبارک کا روزہ نہ رکھنے کی

رخصت عطا فرمائی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا: وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ

ترجمہ: ''اگر تم (سفر کی حالت میں) روزہ رکھ لو تو یہ تمہارے لئے (اجر کے اعتبار سے) بہتر ہے، (البقرہ: 184)''۔

فتح مکہ کا سفر چونکہ جہاد کے لئے تھا اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرام روزے سے تھے، مگر یہ دینی ضرورت ہے کہ مجاہد کو تازہ دم اور توانا حالت میں ہونا چاہئے، چنانچہ جب آپ ﷺ نے مجاہدین میں کمزوری کے آثار دیکھے تو آپ ﷺ نے انہیں روزہ توڑنے کا حکم فرمایا، مگر انہیں روزہ توڑنے میں تردّد اس لئے ہوا کہ آپ ﷺ خود تو روزے سے ہیں۔ لہٰذا آپ نے خود برسرِ عام پانی پی کر روزہ افطار کیا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1948)۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (جہاد کے دوران) سفر میں روزہ رکھنا کوئی اعلیٰ درجے کی نیکی نہیں ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1946)۔ ہمارے نزدیک یہ عمل مومنوں کے لئے ''خلافِ اولیٰ'' ہے۔ لیکن رسول کریم ﷺ کے لئے کسی امر کی مشروعیت اور جواز کو اپنے عمل مبارک سے ثابت کرنے کے لئے واجب کے درجے میں تھا اور اس پر بھی آپ ﷺ ماجور ہوئے۔ میرے نزدیک موجودہ دور میں جب کہ ہر مسجد میں نمازِ باجماعت کے اوقات متعین ہیں، تقریباً ہر شخص کے پاس گھڑی موجود ہے تو ''تثویب'' کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی، لہٰذا کوئی حصول ثواب کے لئے کرنا چاہتا ہے تو اسے ٹوکا نہ جائے اور کوئی نہیں کرتا تو اسے ملامت نہ کیا

دفتر میں اذان دیئے بغیر باجماعت نماز پڑھنے کا حکم

سوال: 15

ہمارے دفتر میں ایک کمرہ نماز کے لئے مخصوص ہے، جہاں باجماعت نماز پڑھی جاتی ہے۔ قرب وجوار میں مساجد ہیں، جہاں سے اذان کی آواز آجاتی ہے۔ کیا ہمارے دفتر میں جماعت کے لئے اذان دینا ضروری ہے یا صرف اقامت کافی ہے؟

(سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

ایسی صورت میں اذان کہنا ضروری نہیں ہے، البتہ جماعت کے لئے اقامت کہی جائے گی، لیکن اگر اذان بھی کہہ لی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یکرہ ترکھما لمن یصلی فی المصر اذا وجد فی المحلة ولا فرق بین الواحد والجماعة هکذا فی التبیین والافضل أن یصلی بالاذان والاقامة کذا فی التمرتاشی واذالم یؤذن فی تلك المحلة یکرہ له ترکھما ولو ترك الاذان وحدہ لایکرہ کذا فی المحیط۔

ترجمہ: ''اُس شخص کے لئے اذان واقامت کا ترک کرنا مکروہ نہیں ہے جو شہر میں نماز پڑھتا ہے اور محلے کی مسجد میں اذان واقامت ہوتی ہے۔ اس مسئلے میں منفرد (تنہا نماز پڑھنے والا) اور جماعت میں کوئی فرق نہیں، ''تبیین'' میں بھی اسی طرح ہے اور افضل یہ ہے کہ اذان واقامت کے ساتھ نماز پڑھے جیسا کہ ''فتاویٰ تمرتاشی'' میں ہے اور اگر محلے (کی مسجد) میں اذان واقامت نہیں کہی جاتی تو اذان واقامت دونوں کا ترک کرنا مکروہ ہے اور اگر صرف اذان ترک کی تو مکروہ نہیں، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 54)

نائب امام کی موجودگی میں امامت کا استحقاق

سوال: 16

مسجد میں انتظامیہ کی جانب سے مقررہ امام موجود ہیں، اُن کی عدم موجودگی میں اُن کے نائب بھی موجود ہیں، جو مؤذن کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ایک روز امام صاحب کسی کام سے گئے تو اپنی جگہ اپنے بیٹے کو مقرر کر گئے۔ کیا یہ درست ہے؟، کیا انتظامیہ ان کے بیٹے کو نماز پڑھانے سے روکنے کا اختیار رکھتی ہے؟، (محمد سلیم شاہ، کراچی)۔

جواب:

امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا نائب کسی کو بھی مقرر کرے، لیکن اس شخص میں امامت کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں اور کراہت کی کوئی وجہ نہ ہو، صرفِ امام کا بیٹا ہونا امامت کے لئے کافی نہیں۔ جب مقرر کردہ نائب موجود ہے تو امام صاحب کا اپنے بیٹے کو اپنی جگہ امام

مقرر کرنا درست نہیں، اگر مقررہ امام موجود نہ ہو یا آنے میں تاخیر ہو جائے تو اس کی جگہ مؤذن نماز پڑھانے کا زیادہ اہل ہے، یہ اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ہاں! اگر کسی مسجد میں مقررہ امام کے ساتھ نائب امام بھی علیحدہ سے مقرر ہو تو نماز پڑھانے کا اختیار اسے حاصل ہوگا، لیکن اگر مؤذن ہی نائب امام ہے اور اس میں امامت کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں تو پھر نماز وہی پڑھائے۔

امام کا ترکِ نماز

سوال: 17

ہماری مسجد کے امام فجر کی نماز کے علاوہ باقی چاروں وقت کی نماز پڑھاتے ہیں۔ پہلے وہ کہتے تھے کہ میں فجر میں اُٹھ نہیں پاتا، اس لئے فجر کی نماز نہیں پڑھا سکتا۔ اب مسجد کی انتظامیہ تبدیل ہوگئی ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ میں السر کا مریض ہوں، اس لئے فجر کی نماز نہیں پڑھا سکتا۔ ہماری مسجد کے ایک معزز نمازی کا کہنا ہے کہ جو پانچوں وقت کی نماز نہیں پڑھا سکتا، وہ پیش امام نہیں ہو سکتا اور ہماری نماز بھی نہیں ہوتی، کیونکہ امام کا صاحبِ ترتیب ہونا ضروری ہے، رہنمائی فرمائیے، (محمد جمال خان، میر پور خاص)۔

جواب:

صورتِ مذکورہ میں امام صاحب کے دونوں عذر (نمازِ فجر کے لئے نہیں اٹھ سکتا اور میں السر کا مریض ہوں، اس لئے فجر نہیں پڑھا سکتا) قابلِ قبول نہیں ہیں۔ مرض کی بنا پر صرف نمازِ فجر ہی نہیں پڑھا سکتے یا دیگر نمازوں میں بھی یہ عذر قائم ہے؟، اگر محض غفلت اور سستی کے سبب نماز قضا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ﴿۴﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ﴿۵﴾ (الماعون)

ترجمہ: "سو ان نمازیوں کے لئے ہلاکت ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں"۔

جو شخص سستی اور کاہلی کی بنا پر نماز ترک کرے، وہ فاسق اور گنہگار ہے، لہٰذا مذکورہ امام صاحب اگر پنج وقتہ نماز کی پابندی کریں یا وہ نمازِ فجر باجماعت ادا کریں، خواہ کسی کی اقتدا

میں پڑھیں تو انہیں منصب امامت پر قائم رکھا جائے ورنہ معزول کر دیا جائے۔
مذکورہ نمازی کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ امام کا نماز باجماعت کی امامت کے لئے صاحبِ ترتیب ہونا شرط ہے۔ امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا: ''جس شخص کی نمازِ فجر قضا ہو، وہ نمازِ ظہر یا دیگر اوقات کی نمازوں میں امام ہوسکتا ہے؟''، آپ نے جواب میں لکھا: اگر امام صاحبِ ترتیب ہے تو جب تک قضائے فجر ادا نہ کر لے، ظہر کی امامت نہیں کر سکتا ورنہ کر سکتا ہے۔

جماعت کے لئے اقامت کے موقع پر امام تکبیر تحریمہ کب کہے؟

سوال:18

کتبِ فتاویٰ میں ایک مسئلہ درج ہے کہ ''جب مؤذن اقامت کہے، امام قد قامت الصلوٰۃ سے ذرا پہلے تکبیرِ تحریمہ کہہ لے اور مقتدی بھی نیت کر کے ہاتھ باندھ لیں، (فتاویٰ عالمگیری، جلد اوّل، ص: 57)''۔ وضاحت فرمائیں کہ کیا یہ مسئلہ صحیح ہے؟، کیا مؤذن تکبیر پڑھتا رہے اور امام و مقتدی ثناء پڑھیں؟

(مولانا قاری رب نواز فیضی، جامع مسجد فاروقیہ، نیو کراچی)

جواب:

مذکورہ مسئلے کی روشنی میں یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں:
ایک تو یہ کہ اِس مسئلہ پر عمل کے لئے تمام مقتدیوں کو ''حی علی الصلوٰۃ'' سے پہلے کھڑا ہونا پڑے گا، جبکہ ہمارے فقہاءِ احناف نے لکھا ہے کہ مسجد میں پہلے سے موجود مقتدیوں کو کھڑے ہو کر ''اقامت'' کا انتظار کرنا مکروہ ہے، وہ اقامت کے وقت بیٹھے رہیں اور ''حی علی الصلوٰۃ'' پر کھڑے ہوں۔
دوسرا یہ کہ امام تکبیر اولیٰ اقامت ختم ہونے کے بعد فوراً یا وقفے سے کہے اور ایسا کرنا بغیر کسی کراہت کے بالاتفاق جائز ہے۔ اقامت ختم ہونے کے بعد امام کے ''تکبیرِ اولیٰ'' کہنے میں تین فائدے ہیں:

اوّل: امام ومقتدی دونوں مؤذن کے کلماتِ اقامت (تکبیر) کا جواب دے سکیں گے، جو مستحب ہے۔

دوم: مؤذن اقامت سے فارغ ہوکر تکبیرِ اولیٰ پاسکے گا اور یوں وہ مستحب کے اجر کا حق دار بنے گا۔

سوم: مقتدی کراہت سے بچ کر صفیں سیدھی کرلیں گے۔

مؤذن کے "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ" کہنے پر امام کا "تکبیرِ تحریمہ" کہہ کر نماز شروع کردینا، طرفین (امام ابوحنیفہ اور امام محمد) کے نزدیک مستحب ہے، امام کے ایک مستحب پر عمل کرنے (یعنی قد قامت الصلوٰۃ سے پہلے تکبیرِ اولیٰ کہنے) سے خود امام اور تمام مقتدیوں کا دوسرے مستحبات کو ترک کرنا لازم آتا ہے کہ کوئی بھی اقامت کا جواب نہیں دے سکے گا اور نہ ہی مؤذن تکبیرِ اولیٰ پاسکے گا اور صفیں درست کرنے کے لئے "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ" سے پہلے کھڑے ہونا کراہت کا سبب بنے گا، تو مستحب پر عمل کے لئے کراہت کا حکم نہیں دیا جائے گا بلکہ اِس صورت میں مستحب کو چھوڑ دیا جائے گا۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وشروعُ الامام فی الصلاۃِ مُذ قیلَ قَد قَامتِ الصلاۃُ وَلو أَخَّرَ حتّٰی أتمّھا لَابأسَ بہٖ اِجماعًا۔ ترجمہ: "(اقامت کے وقت) جب "قَد قَامتِ الصلٰوۃ" کہا جائے تو امام نماز شروع کردے اور (تکبیرِ تحریمہ) مؤخر کرے یہاں تک کہ مؤذن اقامت سے فارغ ہوجائے تو اِس میں بالاتفاق کوئی حرج نہیں ہے"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص:156، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ زین الدین بن ابراہیم المعروف ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

وشروعُ الامام مُذ قیلَ قَد قَامتِ الصَّلاۃُ عندَ ابی حنیفۃَ ومحمدٍ وقالَ ابویوسفَ یَشرَعُ اِذا فرَغَ مِنَ الاقامۃِ مُحَافظۃً عَلٰی فضیلۃِ مُتابعۃِ المُؤذِّنِ واِعانۃً لِلمُؤذِّنِ عَلَی الشُّروعِ معہٗ، ۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: وفی الظھیریۃ وَلو أخَّرَ حتّٰی یَفرغَ المؤذنُ مِنَ الاقامۃِ لَابأسَ بِہٖ فی قولھم جمیعًا واللہ اعلم۔

ترجمہ: ''(اقامت کے وقت) جب ''قد قامتِ الصلوٰۃ'' کہا جائے، توامام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ تعالیٰ کے نزدیک امام کو نماز شروع کر دینا چاہئے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب مؤذّن اقامت سے فارغ ہو جائے تو امام نماز شروع کرے، اس طرح (اقامت کے کلمات دُہرانے میں) مؤذّن کی پیروی بھی ہوگی اور تکبیرِ اولیٰ میں امام کے ساتھ شامل ہونے پر اس کی مدد بھی ہوگی۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: ''ظہیریہ'' میں ہے: اگر (امام تکبیرِ تحریمہ) موخر کرے یہاں تک کہ مؤذّن اقامت سے فارغ ہو جائے تو اِس میں بالاتفاق کوئی حرج نہیں ہے''۔

(البحر الرائق، جلد 1، ص: 531، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤ الدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ ''آدابِ نماز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُن میں سے ایک یہ ہے:

(شروعُ الامام) فی الصلاۃِ (مُذ قیلِ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ) ولو اَخَّر حتّٰی أتمّھا لا بأسَ بِہٖ اِجْمَاعًا

ترجمہ: ''جب اقامت کے وقت ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ'' (بے شک نماز کھڑی ہوگئی) کہا جائے تو امام کا نماز شروع کرنا (آدابِ نماز میں سے) ہے اور اگر وہ نماز کو موخر کر دے (یعنی فوراً تکبیرِ تحریمہ کہہ کر نماز شروع نہ کرے) تو اِس پر آئمہ کا اجماع ہے کہ اِس میں کوئی حرج نہیں ہے''۔ اِس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِاَنَّ فیہ محافظۃً علیٰ فضیلۃِ المؤذّنِ واعانۃً لہٗ علَی الشروع معَ الامامِ لأن الخلاف فی الافضلیۃ فنفی الباس، ای الشدۃ۔

ترجمہ: ''کیونکہ اس میں مؤذّن کی فضیلت کی حفاظت ہوگی اور امام کے ساتھ نماز شروع کرنے میں اس کی مدد بھی ہوگی، کیونکہ (جماعت کب شروع ہو؟، اس کے بارے میں) اختلاف صرف اس میں ہے کہ افضل کیا ہے، اس لئے شارح نے شدت کی نفی کی ہے تو پھر مؤذّن کے ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ'' کہنے پر یا اقامت کے اختتام پر کسی بھی موقف میں

شدت نہیں ہونی چاہیے۔

آپ نے سوال میں فتاویٰ عالمگیری کا جو حوالہ دیا ہے، وہ درست ہے۔ دراصل یہاں اختلاف جواز یا عدمِ جواز کا نہیں ہے، اختلاف صرف اس میں ہے کہ افضل کیا ہے؟ آیا امام کا مؤذن کے ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ'' کہنے پر نماز شروع کر دینا یا اقامت (تکبیر) کے اختتام کے بعد فوراً یا قدرِ توقف کے بعد ''تکبیرِ اولیٰ'' کہنا افضل ہے، تو ہمارے نزدیک دوسری صورت پر عمل کرنا افضل ہے، کیونکہ اس میں امام اور مقتدی دونوں کلماتِ اقامت دُہرانے کا اجر بھی پالیں گے، جو مستحب ہے اور مؤذن بھی ''تکبیرِ اولیٰ'' کے وقت ہی امام کے ساتھ شامل ہونے کا اجر پا سکے گا۔ آج کل عرف بھی اسی کا ہے اور عرف سے ہٹ کر کام کرنے سے لوگوں میں فتنہ وفساد و بے چینی پھیلے گی۔

امام کا دو رکعت یا چار رکعت والی نماز میں قعدۂ اخیرہ بھول کر کھڑا ہو جانا

سوال:19

اگر امام دو رکعت والی نماز (نمازِ فجر یا تراویح) میں تیسری رکعت یا چار رکعت والی نماز میں پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے، مقتدی لقمہ دیں تو کیا اُسے بیٹھنا چاہیے یا نہیں؟، ہر دو صورت میں اُس کے لئے کیا حکم ہے؟۔ (صفی اللہ، بنگرام، مانسہرہ)

جواب:

دو رکعت والی نماز میں اگر تیسری رکعت کے لئے یا چار رکعت والی نماز میں پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا، تو جب تک اُس زائد رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو، واپس قعدے کی طرف لوٹ آئے اور سجدۂ سہو کر کے نماز مکمل کرے، لیکن نمازِ تراویح میں اگر امام دوسری رکعت میں بیٹھنا بھول گیا اور تیسری رکعت کا سجدہ بھی کر لیا تو اب چار رکعت پوری کرے، لیکن تراویح دو رکعتیں ہی شمار کی جائیں گی۔ اگر دو رکعت میں بیٹھ کر تیسری کے لئے اٹھا تھا تو تراویح چار شمار کی جائیں گی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَعَنْ اَبِی بَکْرِ الاسکاف انه سُئِلَ عَنْ رجلٍ قَامَ اِلَی الثَّالِثَةِ

فِی التَّرَاوِیحِ وَلَمْ یَقْعُدْ فِی الثَّانِیَةِ قَالَ اِنْ تذکَّرَ فِی الْقِیَامِ یَنْبَغِی اَنْ یَّعُودَ وَیقعدَ وَیُسَلِّمَ وَاِنْ تَذَکَّرَ بَعد مَاسجدَ لِلثَّالِثَةِ فان اضافَ اِلیهَا رکعةً اُخریٰ کانت ھذہ الاربع عن تسلیمة واحدة وان قعدَ فی الثانیةِ قدرَ التشھّدِ اِختلفوا فیہِ فَعَلیٰ قولِ الْعَامّةِ یجوزُ عَن تسلیمتینِ وَھُوَ الصَّحِیحُ ھٰکذا فِی فتاویٰ قاضی خان۔

ترجمہ: ''ابو بکر اسکاف سے سوال کیا گیا کہ تراویح کی دو رکعت نماز میں ایک شخص دوسری رکعت کے بعد قعدے میں بیٹھے بغیر تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا (تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟)، آپ نے فرمایا: اگر اسے قیام میں یاد آ گیا تو لوٹ آئے اور قعدہ مکمل کرے اور سلام پھیر دے۔ اور اگر تیسری رکعت کا سجدہ کرنے کے بعد یاد آیا تو اگر ایک اور رکعت کا اضافہ کر لیا تو اب یہ ایک سلام کے ساتھ چار رکعت ہو جائیں گی۔ اگر دوسری رکعت میں تشہد کی مقدار بیٹھ چکا تھا تو اس صورت میں اختلاف ہے، عام فقہاء کرام کے قول کے مطابق یہ دو سلاموں سے شمار ہوں گی (یعنی چار رکعت ادا ہو جائیں گی) اور یہی صحیح ہے، فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:118، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ العزیز سے سوال ہوا کہ ''قعدہ اخیرہ کے بعد گمان ہوا کہ یہ قعدۂ اولیٰ تھا، کھڑا ہو گیا اور (اگلی رکعت کے) سجدہ سے قبل یاد آ گیا تو اب سجدے سے لوٹ کر دوبارہ التحیات پڑھ کر سجدۂ سہو میں جائے یا ویسے ہی سجدہ کو چلا جائے''؟

آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''عود کر کے بیٹھنا چاہئے اور معاً سجدۂ سہو میں چلا جائے، دوبارہ التحیات نہ پڑھے: فی الدر المختار وَاِنْ قَعَدَ فِی الرابعةِ مثلاً قدرَ التشھُّدِ ثم قامَ عادَ وَسلّمَ وَلو سَلَّمَ قائماً صَحَّ۔

ترجمہ: ''درمختار میں ہے کہ اگر چوتھی رکعت میں مثلاً تشہد کی مقدار بیٹھ گیا پھر (بھول کر) کھڑا ہو تو لوٹ آئے اور سلام پھیر دے اگر کھڑے کھڑے سلام پھیر دے، تب بھی صحیح ہے۔

ردالمحتار میں ہے: قوله ثم قام ای ولم یسجد قوله عاد وسلم ای عاد للجلوس، وفیه اشارةٌ اِلیٰ اَنَّهٗ لَایُعِیْدُ التَّشھّدَ، وبه صرح فی البحر، قال فی الامداد والعودُ للتسلیم

جالسا سُنَّۃٌ لان السُّنَّۃَ التَّسلِیمُ جالساً۔

ترجمہ: ''ماتن کا قول: پھر کھڑا ہوا لیکن (ابھی پانچویں رکعت کا) سجدہ نہیں کیا، ماتن کا قول: ''لوٹے اور سلام کہے'' یعنی بیٹھنے کے لئے لوٹے (اور بیٹھ کر سلام پھیرے)، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تشہد نہ لوٹائے اور ''بحر'' میں اسی کی تصریح کی ہے۔

''امدادالفتاویٰ'' میں کہا: بیٹھ کر سلام پھیرنے کے لئے لوٹنا سنّت ہے کیونکہ بیٹھ کر سلام پھیرنا سنت ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص:183، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

علامہ امجد علی اعظمی ''غنیۃ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''چار رکعت والے فرض میں چوتھی رکعت کے بعد قعدہ نہ کیا تو جب تک پانچویں کا سجدہ نہ کیا ہو، بیٹھ جائے اور پانچویں کا سجدہ کرلیا یا فجر میں دوسری رکعت پر نہیں بیٹھا اور تیسری کا سجدہ کرلیا یا مغرب میں تیسری پر نہ بیٹھا اور چوتھی کا سجدہ کرلیا تو ان سب صورتوں میں فرض باطل ہوگئے، مغرب کے سوا اور نمازوں میں ایک رکعت اور ملالے''۔

(بہارِ شریعت، جلد اول، ص:192)

پس ایسی صورت میں امام کو چاہیے کہ دو رکعت والی نماز میں تیسری رکعت اور چار رکعت والی نماز میں پانچویں کا سجدہ کرنے سے پیشتر لوٹ آئے اور اگر نہ لوٹا اور اُس رکعت کا سجدہ بھی کرلیا تو ایک رکعت اور زائد پڑھے، اگر ایک رکعت اور نہ ملائی تو وہ نماز فاسد ہوجائے گی۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ردالمحتار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

لَو تطوَّعَ بِثلاثٍ بِقعدۃٍ واحدۃٍ کان ینبغی الجوازُ اعتبارا بِصلوٰۃِ الْمغربِ لکن الاصحُّ عَدَمُہٗ لانہ قد فسد ما اتصلت بہ القعدۃ وھو الرکعۃ الاخیرۃ، لان التنفل بالرکعۃ الواحدۃ غیر مشروع فیفسد ما قبلھا۔

ترجمہ: ''اگر کسی نے ایک قعدہ کے ساتھ تین نفل پڑھے تو (اصولاً) مغرب کی نماز پر قیاس کرتے ہوئے اسے جائز قرار دینا چاہیے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ نفل جائز نہیں ہیں کیونکہ اس کی آخری رکعت جس کے بعد قعدہ کیا ہے وہ فاسد ہوگئی کیونکہ وہ دو پر زائد ایک نفل رہ گئی جبکہ

ایک رکعت نفل جائز نہیں، لہٰذا اس آخری رکعت کے فساد سے پہلی دو رکعت بھی فاسد ہو جائیں گی۔ اور چار پڑھ لیں اور قعدۂ اولیٰ نہ کیا تو مُفتیٰ بہ مذہب پر یہ چاروں دو ہی رکعت کے قائم مقام گنی جائیں گی، باقی اور پڑھ لے"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص: 567، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

رہا مقتدی کے لقمہ دینے یا نہ دینے کا سوال، تو فقہاء لکھتے ہیں: چار چیزیں وہ ہیں کہ اگر امام کرے تو مقتدی اس کا ساتھ نہ دیں، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

واربعةُ اشیاءَ إذَا تَعَمّدَ الامامُ لَایُتابِعُہُ المقتدی۔۔۔۔۔ او قام الی الخامسة ساھیا کذا فی الوجیز الکردری۔ فان لم یقید الخامسة بالسجدة دعاد وسلم، سلم المقتدی معہ، وان قَیّدَ الخامسةِ بالسجدة سَلَّمَ المقتدی۔ وَلَوْلَم یَقْعُدِ الامامُ عَلَی الرابعةِ وقامَ إلی الخامسة ساھیًا وَتَشَھّدَ المقتدی وسَلَّم ثم قَیّدَ اَلامامُ الخامسةَ بِالسجدةِ فَسَدَتْ صَلَاتُھم کذا فی الخلاصة۔

ترجمہ: "چار چیزیں وہ ہیں کہ مقتدی اُن میں امام کی متابعت نہ کرے۔۔۔۔ (اُن میں سے ایک) امام بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے (تو مقتدی کھڑا نہ ہو) جیسا کہ "وجیز کردری" میں ہے۔ (مقتدی اُس کے لوٹنے کا انتظار کریں) پس اگر اُس نے پانچویں رکعت کا سجدہ نہیں کیا اور لوٹ آیا اور سلام پھیر دیا تو مقتدی بھی اُس کے ساتھ سلام پھیر دیں اور اگر امام نے پانچویں رکعت کا سجدہ کر لیا تو مقتدی تنہا سلام پھیر دیں۔ اور اگر امام نے چوتھی رکعت پر قعدہ نہیں کیا تھا اور بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا اور پانچویں رکعت کا سجدہ بھی کر لیا تو اب سب کی نماز فاسد ہو گئی، اگرچہ مقتدیوں نے تشہد پڑھ کر سلام پھیرا ہو، "خلاصة الفتاویٰ" میں اسی طرح ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 90، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

عبارت کا مفہوم: (چار رکعت والے فرض میں) امام بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا، پھر اگر اس صورت میں قعدہ اخیرہ کر چکا ہے تو مقتدی اس کے لوٹنے کا انتظار

کرے، اگر امام پانچویں رکعت کے سجدہ سے پہلے لوٹ آیا تو مقتدی اُس کا ساتھ دیں اُس کے ساتھ سجدۂ سہو کریں اور سلام پھیریں۔ اور اگر امام پانچویں رکعت کا سجدہ کرلے تو مقتدی تنہا سلام پھیر دیں۔ اگر چوتھی رکعت پر امام نے قعدۂ اخیرہ نہیں کیا تھا اور پانچویں رکعت کا سجدہ کرلیا تو امام اور مقتدی سب کی نماز فاسد ہو جائے گی، اگرچہ مقتدی نے تشہد پڑھ کر سلام پھیر لیا ہو۔

جب فسادِ نماز کا خدشہ ہو تو امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ العزیز لکھتے ہیں:

''امام کو لقمہ دینا ہر نماز میں جائز ہے، جمعہ ہو یا کوئی نماز، بلکہ اگر اس نے ایسی غلطی کی جس سے نماز فاسد ہوگی تو لقمہ دینا فرض ہے، نہ دے گا اور اس کی تصحیح نہ ہوگی تو سب کی نماز جاتی رہے گی اور لقمہ دینے سے سجدۂ سہو نہیں آتا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص: 289، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نمازِ مغرب کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت کی تکرار

سوال:20

ایک امام صاحب نے مغرب کی نماز میں الحمد شریف پڑھنے کے بعد ''سورۃ الفلق'' پوری پڑھی، دوسری رکعت میں الحمد شریف پڑھنے کے بعد ''سورۃ الناس'' شروع کی، مگر درمیان میں بھول گئے اور پھر ''سورۃ الفلق'' پڑھ کر حسبِ معمول دوسری رکعت مکمل کی۔ کیا اس صورت میں نماز صحیح ادا ہوگئی؟ جب امام صاحب سے مقتدی صاحبان نے پوچھا تو انہوں نے عشاء کی نماز میں یہ وضاحت کی کہ دوسری رکعت میں چار آیتیں پڑھ لی تھیں، اس لئے ہماری نماز ہوگئی۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں کہ آیا ہماری نماز ہوئی یا نہیں؟، (محمد کلیم خان، اورنگی، کراچی)۔

جواب:

سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد سورت کا ملانا واجب ہے جس کی کم از کم مقدار قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورت (یعنی سورۃ الکوثر) یا سب سے چھوٹی تین آیات جو کسی ایک

مقام پر متصل ہوں، یا کسی ایک طویل آیت کا ایک حصہ جو اس مقدار کے مساوی ہو، اس کی مقدار تعدادِ حروف کے اعتبار سے علامہ ابن عابدین شامی نے 30 حروف بتائی ہے اور امام احمد رضا قادری نے لکھے ہوئے حروف کی تعداد کے اعتبار سے 28 حروف اور تلفظ کئے جانے والے حروف کی تعداد کے اعتبار سے 25 حروف بتائی ہے۔ نماز میں قرآن مجید ترتیب سے پڑھنا واجب ہے اور یہ واجباتِ قراءت میں سے ہے، واجبات نماز سے نہیں ہے۔ اگر قصداً خلافِ ترتیب پڑھا تو یہ مکروہِ تحریمی ہے، لیکن نماز واجب الاعادہ نہیں ہوگی اور اگر بھولے سے پڑھا تو مکروہ بھی نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کو اُلٹا پڑھنا اور درمیان سے ایک چھوٹی سورت چھوڑ کر پڑھنا، یہ تب مکروہ ہے جب قصداً ایسا کرے، لیکن اگر بھول کر ایسا ہو گیا تو کراہت نہیں ہے جیسا کہ ''شرح منیہ'' میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2، ص:239، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

صورتِ مسؤلہ میں نماز ادا ہوگئی سجدہ سہو بھی واجب نہیں ہے چوں کہ سہواً (بھولے سے) خلاف ترتیب پڑھا گیا ہے، اس لئے کراہت بھی نہیں ہے۔ ویسے ہر نماز کے بعد یہ دُعا کر لینی چاہیے:

''یا اللہ! ہماری نماز میں دانستہ یا نادانستہ کوئی تقصیر ہوگئی ہو تو اسے معاف فرما اور ہماری نماز کو شرفِ قبول عطا کر کے اجر کامل عطا فرما، آمین''۔

نماز میں خلافِ ترتیب قراءت کا حکم

سوال:21

امام صاحب نے عشاء کی نماز کی پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد ''سورۃ الاعلیٰ'' کی آخری چار آیات کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں ''سورۃ الاعلیٰ'' کی شروع کی تین آیات کی تلاوت کی۔ نماز کے بعد چند لوگوں نے امام صاحب کو بتایا کہ آپ نے اس طرح نماز پڑھائی ہے، اس لئے دوبارہ نماز پڑھائیں مگر امام صاحب اور چند اور افراد نے نماز کو جائز

قرار دیا اور دوبارہ نماز نہیں پڑھائی۔آپ سے التجا ہے کہ براے کرم مجھے صحیح راہ دکھائیں، عین نوازش ہوگی، (محمد علی، فیز 1 اسٹریٹ نمبر 6، ڈیفنس آفیسر ہاؤسنگ اسکیم، کراچی)

جواب:

نماز میں قرآن ترتیب سے پڑھنا یعنی سورتوں میں ترتیب رکھنا واجب ہے اور یہ احکامِ قراءت میں سے ہے، احکامِ نماز سے نہیں۔اگر قصداً خلافِ ترتیب پڑھا تو یہ مکروہِ تحریمی ہے، لیکن نماز کا دُہرانا لازم نہیں ہوگا۔اگر بھولے سے خلافِ ترتیب پڑھا تو مکروہ بھی نہیں ہے۔قاعدہ یہ ہے کہ اگر غلطی سے ایک لفظ بھی خلافِ ترتیب زبان سے نکل گیا تو اسی کو پڑھے، اس کو چھوڑنا مکروہ ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

لا باس أَنْ يَقْرَأَ سُوْرَةً وَيُعِيدُهَا فى الثانيةِ، وَأَنْ يَقْرَأَ فِي الأُوْلَى مِنْ مَحَلٍّ وَفِي الثَّانِيَةِ مِنْ آخَرَ وَلَوْ مِنْ سُوْرَةٍ ان كان بينهما آيتان فاكثر، ويكره الفصل بسورة قصيرة وَأَنْ يَقْرَأَ مَنْكُوسًا إِلَّا إِذَا خَتَمَ فَيَقْرَأُ مِنَ الْبَقَرَةِ وَفِي الْقُنْيَةِ قَرَأَ فِي الْأُوْلَى الْكَافِرُوْنَ وفى الثانية أَلَمْ تَرَ أَوْ تَبَّتْ۔ ثُمَّ ذَكَرَ يَتِمُّ وَقِيلَ يَقْطَعُ وَيَبْدَأُ،

ترجمہ: ''ایک رکعت میں کوئی سورت پڑھی اور پھر دوسری رکعت میں بھی اُسی کو پڑھا، یا پہلی رکعت میں کوئی سورت ایک مقام سے تلاوت کی اور دوسری رکعت میں وہی سورت دوسرے مقام سے تلاوت کی، بشرطیکہ اِن دونوں مقامات کے درمیان دو آیات یا زیادہ کا فاصلہ ہو تو اِن دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں ہے۔(نماز کی ایک رکعت میں ایک سورت پڑھی اور دوسری میں دوسری سورت پڑھی تو اُن دونوں کے) درمیان ایک چھوٹی سورت کا چھوڑنا مکروہ ہے۔قرآن کو خلافِ ترتیب پڑھنا (یعنی دوسری رکعت میں ایسی سورت کا پڑھنا جو ترتیب کے اعتبار سے پہلی رکعت میں پڑھی گئی سورت سے پہلے ہو) مکروہ ہے، مگر یہ کہ ختمِ قرآن کے موقع پر پہلی رکعت میں ''سورۃ الناس'' کے بعد دوسری رکعت میں ''سورۂ بقرہ'' پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔اور ''قنیہ'' میں ہے: پہلی رکعت میں ''سورۃ الکافرون'' پڑھی اور دوسری رکعت میں ''سورۃ الفیل'' یا ''سورۃ اللہب'' پڑھی، پھر (دورانِ تلاوت) یاد آیا تو اسی

سورت کو مکمل کرے، اور ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ اُسے چھوڑ دے اور پھر (ترتیب کے مطابق دوسری سورت) پڑھے"۔

علامہ ابن عابدین شامی (وَأَنْ يَقْرَأَ مَنكوسًا) کی تشریح میں لکھتے ہیں:

بِأَنْ يَقْرَأَ فِي الثَّانِيَةِ سورةً اَعْلیٰ مِمَّا قَرَأَ فِي الاولیٰ ،لِأَنَّ تَرْتِيبَ السُّوَرِ فِي القراءة من واجبات التلاوةِ،

ترجمہ: "یعنی دوسری رکعت کے اندر پہلی رکعت میں پڑھی جانے والی سورت کے مقابلے میں ایسی سورت پڑھی جو ترتیب میں اُس سے مقدم ہے"، (اگرچہ اس طرح خلافِ ترتیب پڑھنا مکروہ ہے، لیکن نماز دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے)، کیونکہ قرآن کو ترتیب سے پڑھنا تلاوت کے واجبات میں سے ہے (نماز کے واجبات میں سے نہیں ہے)"۔

علامہ ابن عابدین شامی مزید لکھتے ہیں:

أَفَادَ أَنَّ التَّنكِيسَ أَوِ الْفَصْلَ بِالقصيرةِ إِنَّما يكره اذاكان عن قصدٍ، فلوسهواً فلا كما في شرح المُنية۔ وَإِذَاانتفتِ الكراهةُ فاعراضُهُ عَنِ الَّتِي شَرَعَ فِيها لاَيَنْبَغِي۔ وفي الخُلَاصةِ إِفتتحَ سورةً أُخْرٰى فلما قرأ آية أو آيتين أراد أَن يَّتْرُكَ تلكَ السورةَ ويفتتح التي أرادها يكره۔ وفي الفتح ولوكان أي المقروُ حرفا واحداً۔

ترجمہ: "اس عبارت سے معلوم ہوا ہے کہ قرآن کو الٹا پڑھنا یا درمیان سے ایک چھوٹی سورت چھوڑ کر پڑھنا صرف اس صورت میں مکروہ ہے، جب جان بوجھ کر ایسا کرے، لیکن اگر بھول کر اس طرح پڑھ لیا تو مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ "شرح منیہ" میں ہے: جب (بھول کر) خلافِ ترتیب پڑھنا مکروہ نہیں ہے تو جس سورت کو (خلافِ ترتیب) پڑھنا شروع کر دیا ہے اُسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ اور "خلاصۃ الفتاویٰ" میں ہے: ایک شخص نے ایک سورت پڑھنی شروع کی اور اُس کا ارادہ دوسری سورت پڑھنے کا تھا، پھر جب اُس نے ایک یا دو آیات پڑھ لیں تو اُس نے چاہا کہ اسے چھوڑ کر وہی سورت پڑھے، جس کا اُس نے ارادہ کیا ہوا تھا، تو یہ مکروہ ہے اور "فتح القدیر" میں ہے: اگرچہ ایک ہی حرف پڑھا

ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2، ص: 239، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''امام نے پہلی رکعت میں ''قل اعوذ برب الناس'' پڑھی اور دوسری میں ''قل اعوذ برب الفلق'' پڑھی اور آخر میں سجدۂ سہو کیا، اس مسئلہ کا حکم بیان فرمایئے''۔ آپ نے جواب میں لکھا:

''اگر بھول کر ایسا کیا نماز میں حرج نہیں اور سجدہ سہو نہ چاہئے تھا اور قصداً ایسا کیا تو گنا ہگار ہوگا، نماز ہوگئی، سجدۂ سہو اب بھی نہ چاہئے تھا، توبہ کرے، پہلی میں اگر ''سورۂ الناس'' پڑھی تھی تو اُسے لازم تھا کہ دوسری میں بھی ''سورۂ الناس'' ہی پڑھتا کہ فرض کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت پڑھنا صرف خلافِ اولیٰ ہے اور ترتیب اُلٹا کر پڑھنا حرام، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 346، 347، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام نے نماز میں ایک ہی سورت ''الاعلیٰ'' کی آیات بھول کر خلافِ ترتیب پڑھی ہیں، لہٰذا نماز بلاکراہت جائز ہے اور جماعت کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قراءت میں متشابہ لگنا اور یاد آنے پر پھر اسی جگہ سے پڑھنا

سوال: 22

ایک آدمی نے نماز شروع کی، اس نے سورۂ فاتحہ کے بعد قراءت شروع کی، ایک سورت پڑھی درمیان میں بھول گیا اور اس سورت کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری سورت پڑھنا شروع کردی، کیا اس صورت میں اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟۔ (بخت ولی، راولپنڈی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں نماز درست ہوگئی اور سجدہ سہو کی ضرورت نہیں تھی، لیکن اگر دونوں سورتوں کے درمیان ایک رکن ادا کرنے (یعنی تین مرتبہ سُبحَانَ رَبِّیَ العَظِیم کہنے) کی مقدار تاخیر ہوئی تو سجدۂ سہو لازم ہوگا۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''امام مغرب میں رکوع ''لقد

صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہٗ ’’ پڑھ رہا تھا جب ’’فِی الانجیل‘‘ تک پڑھ لیا، آیت پارہ 22 کا متشابہ لگا اُس کے بعد ’’اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ‘‘ تک پڑھی، پھر جب یاد آیا اُسے چھوڑ کر مقامِ اصل سے شروع کیا اور نماز ختم کی اور سجدہ سہو نہ کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں ؟، آپ نے جواب میں لکھا: نماز ہوگئی اور سجدۂ سہو کی بھی حاجت نہ تھی اگر بقدر ادائے رکن سوچتا نہ رہا ہو، ہاں اگر بھولا اور سوچنے میں اتنی دیر خاموش رہا، جس میں کوئی رکن نماز کا ادا ہو سکتا ہے توسجدۂ سہو لازم آیا’’ کمافی الدر المختار‘‘ وغیرہ۔ اگر نہ کیا تو نماز جب بھی ہوگئی مگر ناقص ہوئی پھیرنا واجب ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص:274، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)‘‘۔

امام کے بارے میں مقتدیوں کی ناپسندیدگی کا شرعی حکم

سوال:23

ایک شخص جو ایک مسجد کا امام بھی ہے اور اُس کے بارے میں مشہور ہے کہ لوگوں سے روپیہ لے کر جادو ٹونہ کرتا ہے۔ ایک دن دورانِ تقریر اُس نے رسول اکرم ﷺ کے والدین کی شان میں گستاخی کی اور یہ بھی کہا کہ حضور ﷺ کے دادا عبد المطلب جہنمی ہیں بلکہ جہنم کا ایندھن ہیں اور کفر پر مرے۔ اِس امام مسجد سے لوگ بیزار اور مُتنفّر ہیں اور اِس کی وجہ سے انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اِن حالات میں اِس شخص کا امامت کروانا کیسا ہے؟۔ کیا اُس کی تنخواہ حلال ہے؟، (محمد فرید قادری، قائد آباد، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے تو جادو ٹونے کا شرعی حکم یہ ہے کہ (1) اگر وہ کلمات کفر پر مشتمل ہے، تو کفر ہے، اگر کلماتِ فسق وفجور اور ضلالت پر مشتمل ہے، تو فسق ہے، اگر کوئی ان چیزوں کی تاثیرِ ذاتی پر یقین رکھتا ہے، تو یہ الحاد ہے۔ چونکہ عام طور پر جادو ٹونہ سے باطل مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں، مثلاً کسی کو روحانی یا جسمانی اذیت پہنچانا، میاں بیوی، باپ بیٹا، بھائی بہن یا دوستوں میں تفریق پیدا کرنا یا کسی کو مالی نقصان پہنچانا یا کسی اجنبی عورت کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانا مقصود ہوتا ہے۔ یہ تمام امور شرعاً ممنوع اور حرام ہیں اور جو شخص

اِس طرح کے جادوٹونے کرتا ہے،تو وہ امام بننے کا اہل نہیں ہے،البتہ اگر کلماتِ خیراور ایسے اَوراد و وظائف جو آیاتِ قرآنی ، اسمائے الٰہی یا درود پر مشتمل ہوں اور اُن سے کوئی ایسا مقصد حاصل کرنا مطلوب ہو جو شرعاً پسندیدہ ہے، جیسے:

(الف) میاں بیوی میں محبت پیدا کرنا (ب) باپ بیٹے ، بھائی بہن یا دوستوں میں محبت پیدا کرنا،تو ایسے روحانی عملیات میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اجداد کریمین کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ موَحد تھے ، دینِ فطرت پر تھے اور شرک سے بری تھے ،اُن کو مشرک قرار دینے والا شخص امامت کا اہل نہیں ہے۔

جادو کا اثر ختم کرنے کے لئے جادو سیکھنا فرض ہے (بشرطیکہ وہ کفریہ کلمات اور گمراہی کے کلمات پر مشتمل نہ ہو) اور میاں بیوی کے درمیان محبت پیدا کرنے کے لئے جادو سیکھنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ کفریہ کلمات یا گمراہی کے کلمات پر مشتمل نہ ہو اور نہ ہی اس میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے ،جس میں کلمات مقدسہ کی بے حرمتی ہو، تاہم اس فرض سے مراد فرضِ قطعی نہیں لینا چاہئے بلکہ فرضِ ظنّی لینا چاہئے ،جو واجب عملی کے درجے میں ہے، یہ بھی تب ہے کہ ان کے رَد کے لئے کوئی اور سبیل نہ ہو، ایک اسلامی ملک میں حکومت کو چاہئے کہ ایسے لوگوں کو کنٹرول کرنے کے لئے باقاعدہ قانون سازی کرے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی الذخیرۃ الناظر تعلُّمُہ فرضٌ لردِّ ساحرِاھلِ الحرب، وحرامٌ لِیُفَرِّقَ بہ بینَ المراۃِ وزوجِھا ،وجائزٌلِیُوَفِّقَ بینھما۔

ترجمہ:''اور''الذخیرۃ'' میں ہے: کفار کے مقابلے پر جادو کا اثر ختم کرنے کے لئے کسی روحانی عمل یا علم کا سیکھنا فرض ہے،اور میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کرنے کے لئے جادو سیکھنا حرام ہے اور اُن کے درمیان اُلفت ومحبت پیدا کرنے کے لئے سیکھنا جائز ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 1،ص:124،داراحیاالتراث العربی،بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ العزیز سے سوال کیا گیا: جس امام سے جماعت کے بعض آدمی ناراض ہوں اور بعض اس کی خوشامد کرتے ہوں تو ایسے کی اقتداء کرنا جائز ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب میں لکھا: ''(مقتدیوں کی) رنجیدگی (کی وجہ) دیکھی جائے گی، اگر اُس میں کسی قصورِ شرعی کی وجہ سے ہے، تو اُسے امام بنانا گناہ ہے اور بحکمِ حدیث اُس کی نماز مقبول نہ ہوگی: ثَلٰثَةٌ لَا تُرْفَعُ صَلَاتُهم فَوقَ آذانهم شبرًا الیٰ ان قال ﷺ وَمَن اَمَّ قومًا وَهُم لهٗ کارهون۔ ترجمہ: ''تین اشخاص کی نماز ان کے کانوں سے ایک بالشت برابر بھی بلند نہیں ہوتی، آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ (ان میں سے) ایک وہ شخص ہے، جو کسی قوم کی امامت کرے، حالانکہ وہ لوگ اُسے ناپسند کرتے ہوں''۔

(سنن ابن ماجہ، باب من ام قوماً وھم لہ کارھون، رقم الحدیث: 971)

اور اگر اُس میں کوئی قصورِ شرعی نہیں تو اُس کی امامت میں کوئی حرج نہیں اور اُن رنج رکھنے والوں پر وبال ہے، کما نصّ علیہ فی الدُّرِّ الْمُختار''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 575، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

یعنی اگر امام سے مقتدیوں کی ناراضگی کا سبب اس میں کوئی شرعی عیب ہے، تو وہ امامت کا اہل نہیں ہے۔ اگر مقتدیوں کی ناراضگی کا سبب اُن کا ذاتی عناد اور بغض وعداوت ہے یا امام کے کلمۂ حق کہنے کے سبب اُس سے ناراض ہیں تو اِس سے امام کی شرعی اہلیت بالکل متاثر نہیں ہوتی بلکہ اس کا وبال مقتدیوں پر ہوگا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ولو أمّ قوماً وھم لہٗ کارھون، ان) الکراھة (لفساد فیہ أو لأنّھم أحق بالامامة منہ کرہ) لہ ذلک تحریماً لحدیثِ أبی داؤد لایقبلُ اللہُ صَلاةَ من تَقَدَّمَ قوماً وھُمْ لہٗ کارھون (وإن ھو أحقُّ، لا) والکراھةُ علیھم۔

ترجمہ: ''اگر کسی شخص نے کسی ایسی قوم کی امامت کی جو اُسے ناپسند کرتے ہیں، تو اگر لوگوں کی ناپسندیدگی کا سبب امام میں کوئی شرعی یا اخلاقی خرابی ہے یا اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُن میں کوئی

شخص امام کے مقابلے میں امامت کا زیادہ اہل ہے تو سنن ابوداؤد کی حدیث کی رُو سے اُس کی امامت مکروہِ تحریمی ہے، وہ حدیث یہ ہے: ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ اُس شخص کی نماز قبول نہیں فرماتا، جو لوگوں کی ناپسندیدگی کے باوجود امامت کر رہا ہو''۔ اور اگر وہ امام ان لوگوں کے مقابلے میں (شرعی معیار کے مطابق) امامت کا زیادہ حق دار ہے تو اس کے امام بننے میں کوئی کراہت نہیں ہے، البتہ امام سے کسی شرعی جواز کے بغیر نفرت کرنا مقتدیوں کے لئے کراہت کا سبب ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 254، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

عورت کا مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے باپردہ آنا

سوال: 24

مسجد کی انتظامیہ کی طرف سے مسجد میں نمازِ جمعہ اور دیگر مذہبی اجتماعات میں خواتین کی شرکت کے لئے مسجد کے اوپر گیلری (دوسری منزل) میں باپردہ انتظام موجود ہو اور اُن کا راستہ بھی مردوں کے راستے سے جدا ہو تو خواتین مسجد میں نمازِ جمعہ اور دیگر اجتماعات میں شرکت کر سکتی ہیں اور یہ بھی فرمائیں کہ نمازِ جمعہ بھی امام کے پیچھے ادا کر سکتی ہیں؟

(شیخ غلام احمد امتیاز، شاہ فیصل کالونی، کراچی)

جواب:

ابتدائی دور میں عورتوں کو مسجد میں آنے، نمازِ باجماعت ادا کرنے کی اجازت تھی، اسی لئے حدیثِ پاک میں جماعت کی صفوں میں مرد اور عورت کی صف کے درمیان افضلیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ خَيْرُ صُفُوفِ الرِّجَالِ أَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا وَشَرُّهَا أَوَّلُهَا

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (نمازِ باجماعت میں اجر کے اعتبار سے) مردوں کی بہترین صف پہلی صف ہے اور بری صف آخری صف ہے (یعنی پہلی صف کی بہ نسبت اس کا اجر اور فضیلت کم ہے)۔ عورتوں کی

بہترین صف آخری صف ہے اور بری صف پہلی صف ہے (یعنی وہ صف جو مردوں کی صف کے متصل ہے، کیونکہ اس میں نفس کے بہکاوے یا توجہ بٹنے کا اندیشہ ہوسکتا ہے)''۔
(سُنَن ترمذی، رقم الحدیث:224)

علامہ علاؤالدین حصکفی صفوں کی ترتیب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الرجالُ ثُمَّ الصِّبیانُ، ثم الخناثی، ثم النساء ترجمہ:''(جماعت میں ترتیب کے اعتبار سے) پہلے مردوں کی صف، پھر بچوں کی پھر خنثیٰ اور پھر عورتوں کی صفیں بنائی جائیں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2،ص:270،دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔لیکن

عہدِ فاروقی میں خلیفہء دوم حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فسادِ زمانہ کے سبب عورتوں کے مسجد آنے پر پابندی لگادی تھی۔

عَنْ عَمْرَةَ، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ لَوْ اَدْرَكَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَا اَحْدَثَ النِّسَاءُ، لَمَنَعَهُنَّ كَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِي اِسْرَائِيلَ۔ قُلْتُ لِعَمْرَةَ اَوَمُنِعْنَ؟ قَالَتْ نَعَمْ۔

ترجمہ:''عمرہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اگر رسول اللہ ﷺ عورتوں کے اس بناؤ سنگھار کو دیکھ لیتے جو انہوں نے اب ایجاد کیا تو اُن کو (مسجد میں آنے سے) منع فرمادیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا۔ میں نے عمرہ سے پوچھا: کیا اُن کو منع کر دیا گیا تھا؟، انہوں نے فرمایا: ہاں''۔(صحیح بخاری، رقم الحدیث:869)

علامہ غلام رسول سعیدی (علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی 855ھ کے حوالے سے) لکھتے ہیں:''اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کے اس بناؤ سنگھار کو دیکھ لیتیں جو انہوں نے ہمارے زمانے میں ایجاد کرلیا ہے اور اپنی زیبائش اور نمائش میں غیر شرعی طریقے اور مذموم بدعات نکال لی ہیں، تو یقیناً اپنے موقف میں اور شدت اختیار فرماتیں''۔
(عمدۃ القاری، جلد 6،ص:227)

میں (علامہ غلام رسول سعیدی) کہتا ہوں: اگر علامہ عینی ہمارے زمانے کی فیشن زدہ

عورتوں کو دیکھ لیتے تو حیران رہ جاتے، اب اکثر عورتوں نے برقع لینا چھوڑ دیا ہے، سر کو دوپٹہ سے نہیں ڈھانپتیں، تنگ اور چست لباس پہنتی ہیں، بیوٹی پارلر میں جاکر جدید طریقوں سے میک اپ کراتی ہیں، مردوں کے ساتھ مخلوط اجتماعات میں شرکت کرتی ہیں، میراتھن دوڑ میں حصہ لیتی ہیں، بسنت میں پتنگ اڑاتی ہیں، ویلنٹائن ڈے مناتی ہیں، اس قسم کی آزاد منش عورتوں کے مسجد میں جانے کا تو خیر کوئی امکان ہی نہیں ہے، البتہ چند اللہ سے ڈرنے والی خواتین ضرور مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے یا رمضان کے مہینے میں تراویح کی نماز پڑھنے جاتی ہیں، جہاں اُن کی نماز کے لئے باپردہ جگہ بنائی جاتی ہے، سو جو خواتین پردہ کی حدود و قیود سے مسجدوں میں جائیں تاکہ وہ درسِ قرآن و حدیث، وعظ اور نصیحت سن سکیں تو میری رائے ہے کہ ان کو منع نہیں کرنا چاہئے، جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ایک قول میں اس کی گنجائش بھی ہے، (نعمۃ الباری، جلد 2، ص:798)"۔

علامہ زین الدین بن شہاب الدین ابن رجب حنبلی متوفی 795ھ لکھتے ہیں:

"مردوں کے ساتھ جماعت میں خواتین کے مسجد میں نماز پڑھنے کے مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف رہا ہے، بعض فقہاء نے اس کو ہر حال میں مکروہ کہا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھی یہی موقف ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: میں اس زمانہ میں عورتوں کے نکلنے کو مکروہ کہتا ہوں کیونکہ وہ فتنہ اور آزمائش ہیں۔ امام ابوحنیفہ سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ عیدین کے سوا گھروں سے نہ نکلیں۔ بعض فقہاء نے بوڑھی عورتوں کو نکلنے کی اجازت دی ہے اور جوان عورتوں کو منع کیا ہے، یہ امام مالک کا قول ہے اور ایک روایت کے مطابق امام شافعی، امام ابویوسف اور امام محمد کا قول ہے اور ہمارے اصحابِ حنبلیہ کا بھی یہی قول ہے"۔

(فتح الباری لابن رجب، جلد 5، ص:309، دار ابن الجوزیہ، ریاض)

مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمہ اللہ غسلِ جمعہ سے متعلق ایک حدیث کی شرح میں مرقاۃ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وَعَنْ ابنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا اسْتَاذَنَتْ اِمْرَاَۃُ اَحَدِکُمْ اِلَی الْمَسْجِدِ فَلَا

یَمْنَعْهَا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد میں آنے کی اجازت مانگے تو اسے منع نہ کرو، (بخاری و مسلم)۔

اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ''ظاہر ہے کہ یہ حکم اس وقت کے لئے تھا جب عورتوں کو مسجد میں حاضری کی اجازت تھی، عہدِ فاروقی سے اس کی ممانعت کردی گئی کیونکہ عورتوں میں فساد بہت آ گیا، اب فی زمانہ عورتوں کو باپردہ مسجدوں میں آنے اور علیحدہ بیٹھنے سے نہ روکا جائے، کیونکہ اب عورتیں سینماؤں، بازاروں میں جانے سے تو رکتی نہیں، مسجدوں میں آ کر کچھ دین کے احکام سن لیں گی، عہدِ فاروقی میں عورتوں کو مطلقاً گھر سے نکلنے کی ممانعت تھی''۔

ایک دوسری حدیث کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''یہاں صرف مرد کا ذکر ہوا ہے، کیونکہ نمازِ جمعہ صرف مردوں پر فرض ہے عورتوں پر نہیں۔ اور بعض احادیث میں عورتوں کا ذکر ہے، وہاں عبارت یہ ہے: مَنْ اَتَى الْجُمُعَةَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ اس لئے جمعہ میں عورتوں کا آنا بھی مستحب ہے مگر اب زمانہ خراب ہے عورتیں مسجدوں میں نہ آئیں'' (مرقاۃ)۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں سینماؤں، بازاروں، کھیل تماشوں، اسکولوں، کالجوں میں جائیں، صرف مسجد میں نہ جائیں، گھروں میں رہیں، بلاضرورتِ شرعیہ گھر سے باہر نہ نکلیں اسی لئے فقیر کا یہ فتویٰ ہے کہ اب عورتوں کو باپردہ مسجدوں میں آنے سے نہ روکو۔ اگر ہم انہیں روکیں گے تو یہ وہابیوں، مرزائیوں، دیوبندیوں کی مساجد میں پہنچتی ہیں جیسا کہ تجربہ ہوا، ان لوگوں نے عورتوں کے لئے بڑے بڑے انتظامات اپنی اپنی مسجدوں میں کئے ہوئے ہیں، عورتوں کو گمراہ کر کے ان کے خاوندوں اور بچوں کو بہکاتے ہیں، (مرآت شرح مشکوٰۃ، جلد دوم، ص: 170، 333)''۔

مزید لکھتے ہیں: ''اب فی زمانہ عورتوں کو باپردہ مسجدوں میں آنے اور علیحدہ بیٹھنے سے نہ روکا جائے، کیونکہ اب عورتیں سینماؤں، بازاروں میں جانے سے تو رُکتی نہیں، مسجدوں

میں آکر کچھ دین کے احکام سُن لیں گی"۔ (مرآت شرح مشکوٰۃ، جلد 2، ص: 158)

ہمارے فقہاء کرام کا عمومی موقف تو یہی ہے کہ اخلاقی تنزّل کی وجہ سے عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت نہ دی جائے، لیکن اس کا مقصد تو یہ ہے کہ جب مسجد میں نماز کے لئے آنے سے اِن خواتین کا روکنا شریعت کا منشا ہے، تو پھر یہ پابندی انہیں زندگی کے عام معمولات میں بھی اختیار کرنی چاہئے۔ لیکن اب چند دین دار خواتین کے علاوہ عام عورتیں تعلیم، روزگار، بازاروں، سماجی تقریبات اور روزمرہ معاملات میں بلا روک ٹوک شرعی حجاب کے بغیر گھومتی پھرتی رہتی ہیں، تو صرف مسجد یا بالخصوص دینی مجالس سے کیوں روکا جائے، جب کہ مسجد میں نماز کے لئے یا عورتوں کے لئے مخصوص تبلیغی اجتماعات میں آنے والی خواتین شرعی حجاب کے ساتھ آتی ہیں اور انہیں دینی مسائل سننے کا موقع بھی ملتا ہے۔

حضرت علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی رخصت دی ہے، لیکن یہ رخصت اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ خواتین کی نماز کی جگہ مکمل باپردہ ہو اور آمد و رفت کا راستہ مردوں سے علیحدہ ہو، ان پر یہ پابندی عائد ہو کہ بالکل ایسے چھوٹے بچوں کو لے کر نہ آئیں جنہیں مسجد، نماز اور دینی شعائر کے ادب واحترام کا شعور نہ ہو۔ آج کل مختلف مسالک کے لوگ عورتوں کے لئے خصوصی اجتماعات کا اہتمام کر رہے ہیں، ملک کے اندر اور باہر مخصوص ریڈیو چینلز اس مقصد کے لئے استعمال ہو رہے ہیں، مساجد میں بھی باجماعت نمازوں اور جمعہ اور دُروسِ قرآن وحدیث کے اجتماعات میں اُن کی باپردہ شرکت کا اہتمام ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دینی ذوق رکھنے والی اہلسنت کی خواتین کیلئے جب اپنے مسلک کے مطابق اس طرح کے انتظامات نہیں ہوتے تو وہ اُن مجالس میں جاتی ہیں اور علم کی کمی کی وجہ سے اُن کے عقائد ونظریات تبدیل ہو جاتے ہیں، اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور میں مساجد میں نمازِ جمعہ وتراویح اور دُروس کی مجلسوں میں شرعی حدود کی مکمل پاسداری کے ساتھ خواتین کی شرکت کا اہتمام اباحت وجواز کی حدود سے نکل کر ضرورت کے درجے میں داخل ہو گیا ہے۔ اس لئے میں اس کی تائید کرتا

ہوں اور علماء، فقہاء اور مفتیانِ عہد کو اس ضرورت کا احساس دلاتا رہتا ہوں، اَللّٰھُمَّ اَرِنِی الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنِی اِتِّبَاعَہٗ، اَللّٰھُمَّ اَرِنِی الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنِی اِجْتِنَابَہٗ۔

نماز میں عورت کے سجدہ کا طریقہ

سوال:25

نماز یا غیر نماز میں مردوں اور عورتوں کے سجدہ کرنے کا طریقہ جدا ہوتا ہے، جبکہ میری بیگم کہتی ہیں کہ ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے سرکار ﷺ نے کس طرح سجدہ کیا تھا، ہمیں اُسی طرح سجدہ کرنا چاہیے، یعنی وہ مردوں کی طرح سجدہ کرتی ہیں۔ مہربانی فرما کر عورتوں کے لئے نماز میں سجدے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟، بیان فرمایئے، نیز ایک ٹی وی چینل پر ایک عالم اکثر کہتے رہتے ہیں کہ عورت کی نماز کا طریقہ مرد ہی کی طرح ہے اور حدیث میں عورت کی نماز کی ہیئت الگ سے ذکر نہیں ہے، (محمود زبیری، کراچی)۔

جواب:

نماز میں عورتوں کے سجدہ کرنے اور بیٹھنے کا طریقہ وہیئت مردوں سے جدا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کی نماز کی ادائیگی کا جو طریقہ ارشاد فرمایا، اُس میں سجدہ کرنے کا طریقہ اور صورت مرد کے سجدہ کرنے کی ہیئت سے جدا ہے، جیسا کہ ذیل کی حدیث مبارک میں ارشاد فرمایا:

عَنْ یَزِیْدَ بْنِ اَبِیْ حَبِیْبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ مَرَّ عَلٰی اِمْرَاَتَیْنِ تُصَلِّیَانِ فَقَالَ اِذَا سَجَدْتُّمَا فَضُمَّا بَعْضَ اللَّحْمِ اِلَی الْاَرْضِ فَاِنَّ الْمَرْاَۃَ لَیْسَ فِیْ ذٰلِکَ کَالرَّجُلِ۔

ترجمہ: ''یزید بن ابی حبیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کے بعض حصے کو زمین سے لگایا کرو کیونکہ اس میں عورت مرد کی طرح نہیں ہے''۔

(مراسیل ابوداؤد، ص:8)

علامہ علی متقی بن حسام الدین برہان پوری متوفی 975ھ روایت فرماتے ہیں:

عَنْ ابْنِ عُمَرَ اِذَا جَلَسَتِ الْمَرْأَةُ فِي الصَّلٰوةِ وَضَعَتْ فَخِذَهَا عَلٰى فَخِذِهَا الْأُخْرٰى فَإِذَا سَجَدَتْ أَلْصَقَتْ بَطْنَهَا فِي فَخِذَيْهَا كَأَنَّ أَسْتَرَ مَا يَكُوْنُ لَهَا۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب عورت نماز میں بیٹھے تو اپنی ایک ران دوسری ران پر رکھ لے اور جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں کے ساتھ چمٹائے، اِس میں اُس کے ستر کی زیادہ رعایت ہے، (کنز العمال، جلد 7، ص: 549)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی عورتوں کی نماز میں سجدہ کی بابت لکھتے ہیں:

عورتوں کی نماز کے طریقہ کے متعلق احادیث اور آثار:

علقمہ، حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ انہوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے وائل بن حجر! جب تم نماز پڑھو تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے کانوں کے مقابل اٹھاؤ اور عورت اپنے ہاتھ اپنے سینہ کے مقابل اٹھائے''۔

(معجم کبیر، جلد 22، ص: 20، مجمع الزوائد، جلد 1، ص: 103)

خالد بن الحجاج بیان کرتے ہیں کہ عورتوں کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ نماز میں چارزانو (آلتی پالتی مارکر) بیٹھیں اور مردوں کی طرح سرین پر نہ بیٹھیں، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2799)

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نماز میں چارزانو بیٹھتی تھیں، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2800)۔اس حدیث میں جس صفیہ کا ذکر ہے، یہ ابو عبید کی بیٹی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی زوجہ ہیں۔

قتادہ نے کہا: عورت کو جس طرح آسانی ہو، اس طرح بیٹھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: 2803)

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ازواج نماز میں چارزانو بیٹھتی تھیں، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2805)۔

ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ میں نے عطا سے پوچھا: کیا عورت دو رکعت کے بعد اپنے بائیں کولہے پر بیٹھے؟ انہوں نے کہا: ہاں! وہ میرے نزدیک دائیں کولہے پر بیٹھنے کی بہ نسبت مستحسن ہے، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2791،2807، دار الکتب علمیہ، بیروت)۔

نماز میں عورت کے سجدہ کرنے کا طریقہ

حارث بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنے جسم کو سمیٹے اور اپنی رانوں کو (اپنے پیٹ کے ساتھ) ملائے۔
(مصنف ابن ابی شیبہ: 2793، مجلس علمی، بیروت)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عورت کی نماز کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: وہ اپنے اعضاء کو جمع کرے اور سمیٹے، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2794، مجلس علمی، بیروت)۔ ابراہیم نخعی نے کہا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنی رانوں کو ملائے اور اپنا پیٹ ان پر رکھے، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2795، مجلس علمی، بیروت)۔ ابراہیم نے کہا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو اپنی رانوں کے ساتھ ملائے اور اپنے کولہوں کو اوپر نہ اٹھائے اور اپنے پیٹ کو اپنی رانوں سے دور نہ رکھے، جس طرح مرد دور رکھتا ہے۔
(مصنف ابن ابی شیبہ: 2798، مجلس علمی، بیروت)

علامہ ابوالحسن بن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی متوفی 593ھ لکھتے ہیں: عورت اپنے بائیں کولہے پر بیٹھے اور اپنے دونوں پیروں کو دائیں جانب نکالے، اس میں اس کے لئے زیادہ ستر ہے، (ہدایہ مع فتح القدیر جلد 1 ص: 319 دارلکتب علمیہ، بیروت)۔

علامہ بدرالدین عینی حنفی اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں: کیونکہ ستر کے فرض کی رعایت کرنا (مردوں کی طرح) قعدے کے مسنون طریقے کی رعایت سے زیادہ بہتر ہے۔
(البنایہ فی شرح الہدایہ، جلد 2، ص: 305)

علامہ ابوبکر محمد بن احمد السرخسی متوفی 483ھ لکھتے ہیں: ''عورت سجدہ میں اپنے جسم کو سمیٹے اور اپنے پیٹ کو رانوں سے ملائے اور بازوؤں کو پہلوؤں سے ملائے، اسی طرح حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے عورتوں کے سجدہ کے طریقے میں مروی ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ عورت میں اصل ستر ہے، سو جو طریقہ عورت کے ستر کے زیادہ موافق ہو، وہ اولیٰ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت مستورہ ہے یعنی چھپائی جانے والی ہے''۔
(المبسوط، جلد 1، ص: 110، دارالکتب العلمیہ، بیروت)

علامہ محمود بن صدر الشریعہ متوفی 616ھ لکھتے ہیں: ''عورت قعدہ میں اس طرح بیٹھے، جس میں اس کیلئے زیادہ ستر ہو، (المحیط البرہانی، جلد 2 ص: 84، ادارۃ القرآن، کراچی)

علامہ عثمان بن علی زیلعی حنفی متوفی 743ھ لکھتے ہیں: عورت جھکے اور سجدہ میں اپنا پیٹ اپنی رانوں سے ملائے کیونکہ یزید بن ابی حبیب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سجدہ کرو تو اپنے گوشت کو ایک دوسرے سے ملاؤ کیونکہ عورت اس میں مرد کی طرح نہیں ہے۔

(تلخیص الحبیر، جلد 1 ص: 394، مراسیل ابوداؤد: 87، سنن بیہقی، جلد 2، ص: 223)

(مزید لکھتے ہیں:) عورت نماز کی دس چیزوں میں مرد کے خلاف ہے، عورت اپنے کندھوں تک ہاتھ اٹھائے گی اور اپنے سینہ کے نیچے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھے گی اور اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر گھٹنوں تک رکھے گی، سجدہ میں اپنی بغلوں کو ظاہر نہیں کرے گی، تشہد میں اپنے کولہے کے اوپر بیٹھے گی، رکوع میں اپنی انگلیوں کو متفرق نہیں رکھے گی، مردوں کی امامت نہیں کرے گی، ان کی جماعت مکروہ ہے اور ان کی امام ان کے وسط میں کھڑی ہوگی، (تبیین الحقائق، جلد 1، ص: 307)۔

نیز علامہ زیلعی حنفی متوفی 743ھ نے لکھا ہے: عورت تشہد میں اپنے کولہے پر بیٹھے کیونکہ اس کا زیادہ ستر اسی میں ہے، (تبیین الحقائق، جلد 1، ص: 313)۔

علامہ سید ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ نے الخزائن کے حوالہ سے چند مزید چیزوں کا اضافہ کیا ہے، جن میں عورت کی نماز کے احکام مردوں کے خلاف ہیں، انہوں نے کہا ہے: ''عورت کا مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز کے لئے جانا مکروہ ہے اور وہ جماعت میں مردوں کے پیچھے کھڑی ہوگی، عورت پر جمعہ فرض نہیں ہے، لیکن پڑھے گی تو جمعہ ادا ہو جائے گا، نہ عورت پر عید اور تکبیرات تشریق ہیں اور نہ اس پر صبح کی نماز سفیدی میں مستحب ہے، نہ وہ جہری نمازوں میں بلند آواز سے قرآن پڑھے کیونکہ عورت کی آواز بھی عورت ہے''۔ خلاصہ یہ ہے کہ نماز کے احکام میں عورت چھبیس (۲۶) چیزوں میں مرد کے احکام

کے خلاف ہے، البحر الرائق اور غنیۃ المستملی میں بھی اسی طرح مذکور ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 186، 187، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

(نعمۃ الباری شرح صحیح البخاری، جلد 2، ص: 754، 755)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

أما المرأۃ فتضم بطنھا الی فخذیھا وفی جمیع احوالھا، لأنه أستر لھا۔

ترجمہ: ''پس رہا عورت کا سجدہ تو وہ اپنے پیٹ کو رانوں سے ملائے اور بازوؤں کو پہلوؤں سے، اس میں اُس کے لئے زیادہ ستر ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد 1، ص: 707، دارالفکر، بیروت)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَالْمَرْأَۃُ لَاتُجَافِیْ فِی رکوعِھَا وسجودِھا وتَقْعُدُ علیٰ رِجْلَیھا وفی السَّجْدۃِ تَفْتَرِشُ بَطْنَھَا عَلیٰ فَخِذَیْھَا کذا فِی الخلاصۃ۔۔۔۔۔۔ وَاِن کَانَتْ اِمْرَأَۃً جلست علیٰ اِلْیتھا الیُسْریٰ وَأَخْرَجَتْ رِجْلَیھا مِنَ الْجَانِبِ الْاَیْمنِ کَذا فِی الھدایۃ۔

ترجمہ: ''عورت رکوع اور سجود میں اعضا جدا نہیں رکھے گی (رکوع میں اتنا جھکے کہ ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں) اور اپنے دونوں پاؤں پر بیٹھے اور سجدے میں اپنا پیٹ رانوں سے ملائے ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں اسی طرح ہے،۔۔۔۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: (سجدے میں) عورت دونوں پاؤں داہنی جانب نکال دے اور بائیں سرین پر بیٹھے، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص: 75، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مذکورہ اسکالر کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے، باطل ہے کہ حدیث میں عورت کی نماز کی الگ ہیئت کا ذکر نہیں ہے، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی روایات صحاحِ ستہ یا صحیح بخاری میں نہیں ہیں۔ اور یہ کوئی اصولِ شرعی نہیں ہے کہ احادیث صرف صحیح بخاری یا صحاحِ ستہ تک محدود ہیں۔ اور بھی کتب احادیث ہیں جن سے علماء امت استفادہ کرتے ہیں، چنانچہ آپ نے مراسیل ابی داؤد، سنن بیہقی، مصنفِ ابن ابی شیبہ اور کنزالعمال کے حوالہ جات پڑھے جو کتب

احادیث ہیں اور آئمہ و مجتہدین سبھی کے اجتہادات کا مدار بھی کتاب وسنت پر ہوتا ہے۔

عورت کی نماز کن امور میں مرد کی نماز سے جدا ہے

سوال:26

عورتوں کی نماز مردوں کی نماز سے کن کن امور میں مختلف ہے؟ وضاحت فرمائیں

(معاذ احمد، ملیر کراچی)

جواب:

عورتوں کی نماز بعض امور میں مرد کی نماز سے مختلف ہے، علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: وحررنا فی الخزائن انّها تخالف الرّجل فی خمسة وعشرین۔

ترجمہ: ''الخزائن'' میں ہم نے لکھا کہ (نماز کے احکام میں) عورت پچیس (۲۵) چیزوں میں مرد کے احکام کے خلاف ہے۔

اس کی شرح میں علامہ سید ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

وذالك حيث قال تنبيه ذكر الزيلعى انها تخلف الرجل فى عشر، وقد زدت أكثر من ضعفها ترفع يديها حذاء منكبيها، وَلَا تَخْرُجُ يَدَيْهَا مِنْ كُمَّيْهَا، وَتَضَعُ الْكَفَ عَلَى الْكَفِ تَحْتَ ثَدْيِهَا، وتنحنى فى الركوع قليلاً ولا تعتمد، ولا تفرج فيه أصابعها بل تضمها، وتضع يديها على ركبتيها، ولاتحنى ركبتيها، وتنضم فى ركوعها وسجودها، وتفترش ذراعيها، وتتورك فى التشهد وتضع فيه يديها تبلغ رؤوس أصابعها ركبتيها، وتضم فيه أصابعها، واذا نابها شیء فى صلاتها تصفق ولا تسبح، ولا تؤم الرجل، وتكره جماعتهن، ويقف الامام وسطهن، ويكره حضورها الجماعة، وتؤخر مع الرجال، ولا جمعة عليها، لكن تنعقد بها ولاعيد ولا تكبير تشريق، ولا يستحب ان تسفر بالفجر، ولا تجهر فى الجهرية، بل لو قيل بالفساد بجهرها لأمكن بناءً على ان صوتها عورة۔

ترجمہ: ''وہ امور جن میں عورتوں کی نماز کا طریقہ مردوں سے مختلف ہے،'' علامہ زیلعی'' نے

دس چیزوں کا ذکر کیا ہے اور (علامہ شامی بیان کرتے ہیں کہ) میں نے اضافہ کر کے ان مواقع کی تعداد گنے سے بھی زیادہ کر دی ہے اور وہ یہ ہیں:

عورت اپنے ہاتھ اپنے کندھوں تک ہاتھ اٹھائے گی، اور اپنے ہاتھوں کو چادر سے نہ نکالے، اپنے سینہ کے نیچے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھے، رکوع میں کم جھکے زیادہ نہ جھکے، گھٹنوں پر زور نہیں ڈالے گی۔ رکوع میں اپنی انگلیوں کو گھٹنے پر کشادہ نہ رکھے بلکہ ملا کر رکھے، رکوع میں اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر گھٹنوں تک رکھے، گھٹنوں کو خم (ٹیڑھا) نہ کرے، رکوع اور سجود میں گھٹنوں کو ملا کر رکھے، کلائیوں کو زمین پر بچھا دے، تشہد میں اپنے کولہے کے اوپر بیٹھے گی، تشہد میں اپنے ہاتھ اس طرح رکھے گی کہ اس کی انگلیوں کے سرے گھٹنوں تک پہنچ جائیں اور اس میں اپنی انگلیوں کو ملا کر رکھے گی، اور (عورت کو باجماعت نماز میں امام کو اصلاح نماز کے لئے متوجہ کرنا ہو یا کوئی ضرورت لاحق ہو، مثلاً کوئی آدمی سامنے سے گزر رہا ہے تو اسے متوجہ کرنے کے لئے) وہ تصفیق کرے (یعنی داہنے ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی پشت پر مارے) اور (بلند آواز سے) تسبیح یعنی سبحان اللہ نہ کہے، (عورت) مردوں کی امامت نہیں کرے گی، عورتوں کی جماعت مکروہ ہے اور (اگر عورتیں کہیں اپنی جماعت قائم کریں تو) اُن کی امام اُن کے وسط میں کھڑی ہوگی، عورت کا مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز کے لئے جانا مکروہ ہے اور وہ (اگر جماعت میں شامل ہو تو) مردوں کے پیچھے کھڑی ہوں گی، عورت پر جمعہ فرض نہیں ہے، لیکن (مرد کی امامت میں) عورتوں کی جماعت قائم ہو تو جمعہ ادا ہو جائے گا، عورت پر عید اور تکبیرات تشریق نہیں ہیں اور نہ اس پر صبح کی نماز سفیدی میں پڑھنا مستحب ہے، نہ وہ جہری نمازوں میں بلند آواز سے قرآن پڑھے بلکہ اگر عورت کے جہر کے ساتھ پڑھنے پر نماز کے فاسد ہونے کا قول کیا جائے، تو یہ اس بنا پر درست ہوگا کہ عورت کی آواز بھی عورت ہے۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 186، 187)

جاندار کی تصویر والا کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:27

کسی شخص نے ایسی شرٹ یا قمیص پہنی ہوئی ہو، جس پر جاندار کی تصویر بنی ہوئی ہے، تو کیا اُس شخص کی اپنی نماز ہو جائے گی؟ نیز اُس کے پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کی نماز کا کیا حکم ہے؟، (سید وسیم حسن، گودھرا، نیو کراچی)۔

جواب:

جس کپڑے پر کسی جاندار کی تصویر ہو اسے پہن کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (ولبس ثوب فیه تماثیل) ذی رُوح، وان یکون فوق رَأْسِهٖ اوبینَ یدیه او بحذائه یُمنة او یُسرة او محل سجودہٖ (تمثال) ولوفی وسادۃ منصوبة لامفروشة۔

ترجمہ: ''اور نمازی کو ایسے کپڑے پہننا مکروہ ہے، جس پر جاندار کی تصویر بنی ہو، اور اگر تصویر نمازی کے سر یعنی چھت پر ہو، یا سامنے ہو یا برابر دائیں یا بائیں یا سجدے کی جگہ پر ہو، سب کا حکم یہی ہے، خواہ کسی ایسے گاؤ تکیے پر ہو جو کھڑا کیا ہوا ہے، بچھا ہوا نہیں ہے،

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2، ص:359، 360)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ اگر کسی کپڑے پر تصویریں چھپی ہوئی ہوں، اُس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟، آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''کسی جاندار کی تصویر جس میں اُس کا چہرہ موجود ہو اور اتنی بڑی ہو کہ زمین پر رکھ کر کھڑے ہو کر دیکھیں تو اعضاء کی تفصیل ظاہر ہو، اس طرح کی تصویر جس کپڑے پر ہو اس کا پہننا، پہنانا یا بیچنا، خیرات کرنا سب ناجائز ہے اور اسے پہن کر نماز مکروہِ تحریمی ہے، جس کا دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔ ایسے کپڑے پر سے تصویر مٹا دی جائے یا اُس کا سر یا چہرہ بالکل محو کر دیا جائے۔ اُس کے بعد اس کا پہننا، پہنانا، بیچنا، خیرات کرنا، اُس میں نماز، سب جائز ہو جائے گا۔ اگر وہ ایسے پکے رنگ کی ہو کہ مٹ نہ سکے ڈھل نہ سکے تو ایسے ہی پکے رنگ کی سیاہی اُس

کے سر یا چہرے پر اس طرح لگادی جائے کہ تصویر کا اُتنا عضو محو ہوجائے، صرف یہ نہ ہو کہ اُتنے عضو کا رنگ سیاہ معلوم ہو کہ یہ محو منافیِ صورت نہ ہوگا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 24، ص: 567، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

تصویر خواہ قمیص یا شرٹ کے اگلے حصے پر بنی ہوئی ہو یا پشت پر بنی ہوئی ہو، مکروہ ہے۔ جو لوگ اُس کے پیچھے کھڑے ہیں اُن کی نماز بھی مکروہ تحریمی ہوگی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ویکرہ أن یصلی وبین یدیہ أو فوق رأسہ أو علی یمینہ أو علی یسارہ أو فی ثوبہ تصاویر وفی البساط روایتان والصحیح أنہ لایکرہ علی البساط اذالم یسجد علی التصاویر۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: وأشدھا کراھۃ أن تکون أمامَ الْمُصَلّی ثُمَّ فَوْقَ رَأْسِہٖ ثُمَّ یمینہٖ ثم یسارہٖ ثم خلفہٗ ھکذا فی الکافی

ترجمہ: ''جہاں نمازی کے آگے یا چھت پر یا برابر دائیں یا بائیں (جاندار کی تصویر بنی) ہو، یا نمازی کے کپڑے پر تصویریں ہوں تو نماز مکروہِ تحریمی ہے۔ (ایسا کپڑا جس پر تصویریں بنی ہوں تو) اُسے بچھا کر اُس پر نماز پڑھنے (کی کراہت کے بارے) میں دو روایتیں ہیں اور صحیح یہی ہے کہ اُس پر نماز مکروہ نہیں ہے بشرطیکہ سجدہ تصویروں پر نہ کرے۔۔۔۔۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: تصویر کے حوالے سے نماز کی شدید ترین کراہت کی ترتیب اس طرح ہے، سب سے زیادہ کراہت اس میں ہے کہ تصویر نمازی کے آگے ہو، پھر اس کے سر کے اوپر ہو، پھر اس کے دائیں جانب ہو، پھر اس کے بائیں جانب ہو، پھر اس کے پیچھے ہو، ''کافی'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 107، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

سجدۂ شکر کا شرعی جواز

سوال: 28

ایک معروف اخبار میں ایک مفتی صاحب سے سوال کیا گیا: ''سجدۂ شکر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہ کس طرح ادا کیا جاسکتا ہے؟''، تو مفتی صاحب نے جواب میں لکھا کہ ''سجدۂ شکر اکیلا نہیں ہوتا، کیوں کہ اکیلا سجدہ کوئی عبادت نہیں ہے۔ ہاں شکرانہ کے نوافل کے سجدوں کو

سجدۂ شکر کہا جاتا ہے''، آیا یہ درست ہے یا نہیں؟۔

(قاری محمد زمان چشتی، خطیب المصطفیٰ جامع مسجد، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی)

جواب:

مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اکیلا سجدہ کوئی عبادت نہیں ہے، درست نہیں ہے۔ سجدۂ تلاوت بھی اکیلا سجدہ ہے، واجب ہے اور عبادت کی نیت سے ادا کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے چند احادیث مبارکہ ملاحظہ ہوں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بُشِّرَ بِحَاجَةٍ فَخَرَّ سَاجِداً۔

(۱) انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی حاجت کے پورا ہونے کی بشارت دی گئی تو (سنتے ہی) آپ (رب تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے) سجدے میں چلے گئے، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1392)۔

عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ لَمَّا تَابَ اللهُ عَلَيهِ خَرَّ سَاجِدا۔

(۲) کعب بن مالک اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اُن (حضرت کعب رضی اللہ عنہ) کی توبہ قبول فرمائی تو وہ (رب تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے بے اختیار) سجدے میں چلے گئے، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1393)۔

عَنْ أَبِي بَكْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ اِذَا اَتَاهُ اَمْرٌ يَسُرُّهُ أَوْ يُسَرُّ بِهِ خَرَّ سَاجِداً شُكْراً لِلّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى۔

(۳) ابوبکرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی خوش خبری ملتی تو آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ ریز ہوجاتے، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1394)۔

''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب یمامہ فتح کرلیا تو آپ بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوگئے''۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، جلد: 2، ص 482-3)

''ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ''مُخدَج الید'' (ناقص ہاتھ والا شخص) لایا گیا تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا''۔ (المصنف، جلد: 2، ص 482-3)

(یہ امت میں فتنہ برپا کرنے والا شخص تھا، جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے خبر دی تھی)
امام احمد بن حنبل اور امام محمد بن ادریس الشافعی کے نزدیک سجدۂ شکر مستحب ہے۔
علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وقال ابویوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ هی قربة یثاب علیها وصورتها عندهما أن من تجددت عنده نعمة ظاهرة أو رزقه الله تعالیٰ ولدا أو مالا أو وجد ضالة أو اندفعت عنه نقمة أو شفی مریض له أو قدم له غائب یستحب له أن یسجد شکراً لِلّٰه تعالیٰ مستقبل القبلة یحمد الله فیها ویسبحه ثم یکبر أخریٰ فیرفع رأسه کما فی سجدة التلاوة کذا فی السراج الوهاج۔ قال فی الحجة ولایمنع العباد من سجدة الشکر لما فیها من الخضوع والتعبد وعلیه الفتویٰ کذا فی التتارخانیة۔

ترجمہ: ''امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک سجدۂ شکر اللہ تعالیٰ کی قربت کا ذریعہ ہے اور ان کے نزدیک اس پر اسے ثواب ملے گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جسے کوئی ظاہری نعمت عطا ہو یا اللہ تعالیٰ اسے نعمتِ اولاد یا نعمتِ مال دے یا اسے کوئی گمشدہ چیز مل جائے یا اس سے کوئی تکلیف دور ہو جائے یا اس کے کسی مریض کو شفا مل گئی یا اس کا کوئی گم شدہ بندہ سلامتی کے ساتھ واپس آ گیا، تو اُس کے لئے مستحب ہے کہ قبلے کی طرف رُخ کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ کرے، اُس (سجدے) میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح کے کلمات پڑھے، پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدے سے سر اٹھائے، جیسا کہ سجدۂ تلاوت میں ہوتا ہے، ''سراج الوہاج'' میں اسی طرح ہے۔ ''الحُجّہ'' میں فرمایا: بندوں کو سجدۂ شکر سے منع نہ کیا جائے کیونکہ اس میں انتہائی درجے کی عاجزی ہے اور یہ بندگی کا قرینہ ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ ''فتاویٰ تتارخانیہ'' میں اسی طرح ہے''۔ (عالمگیری، جلد: 1، ص: 135-6)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وسجدةُ الشکرِ مستحبةٌ، بهٖ یُفتی، لکنها تکره بعد الصلاة، لِأَنَّ الْجَهَلَةَ یعتقدونها سنة أو واجبة وکل مباح یؤدی الیه فمکروه۔

ترجمہ: ''سجدۂ شکر مستحب ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، لیکن نماز کے بعد (متصلاً) مکروہ ہے، کیونکہ جاہل لوگ اس کے سنت یا واجب ہونے کا اعتقاد کرنے لگیں گے اور ہر مباح امر جسے لوگ سنت یا واجب سمجھنے لگیں، مکروہ ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے تفصیلی بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے: اس مقام پر انہوں نے ''سراج الوہاج'' کی وہ عبارت (جس کے بارے میں عالمگیری کا حوالہ گزر چکا ہے) لکھ کر اسے ''مُفتیٰ بہٖ'' قرار دیا ہے اور یہ صاحبین کا قول ہے۔۔۔ آگے چل کر علامہ شامی ''حلیہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں: متعدد احادیثِ مبارکہ اور خلفائے راشدین سے سجدۂ شکر ثابت ہے اور فعلِ رسول ﷺ کو منسوخ قرار دینے کی بات بھی صحیح نہیں ہے، ''فروق الاشباہ'' میں ہے: سجدۂ شکر جائز ہے، واجب نہیں ہے، امام اعظم سے جو اس کا مشروع نہ ہونا روایت کیا گیا ہے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ واجب یا سنت نہیں ہے بلکہ مستحب ہے، البتہ نماز کے فوراً بعد مکروہ ہے تاکہ جاہل لوگ اسے واجب یا سنت نہ سمجھنے لگیں۔ علامہ ابن عابدین شامی مزید فرماتے ہیں:

وحاصله أن مالیس لها سبب لاتکره مالم یؤد فعلها الی اعتقاد الجهلة سنیتها کالتی یفعلها بعض الناس بعد الصلاة،

ترجمہ: ''اس تفصیلی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں کوئی سببِ کراہت نہ ہو، اُس فعل کو مکروہ قرار دینا درست نہیں ہے تاوقتیکہ جاہل لوگ اسے سنت سمجھنے لگیں، جیسے بعض لوگ نماز کے بعد کرتے ہیں، (ردالمحتار، جلد: 2، ص: 522,521)''۔

اگر کسی ایسے امر کے بارے میں جو حدیث سے ثابت ہے، امام اعظم کا قول عدمِ جواز یا کراہت کا ہو تو اس کی تاویل کی جائے گی یا یہ سمجھا جائے گا کہ امام اعظم تک وہ حدیث نہیں پہنچی، کیونکہ آپ کا ارشاد ہے: ''جب کسی مسئلے کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ اس کی بابت حدیثِ صحیح موجود ہے تو سمجھو کہ یہی میرا مذہب ہے''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: ''بندوں کو قرب الی اللہ کا مرتبہ

علاوہ نماز بھی ہوتا ہے؟۔آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:''ہاں!ہر سجدے میں رب کے قریب ہوتا ہے اور سجدے چار قسم کے ہیں:(۱)سجدۂ نماز(۲)سجدۂ تلاوت(۳)سجدۂ سہو،(۴)سجدۂ شکر''

اُن سے پھر دریافت کیا گیا:سجدۂ شکر مسنون ہے یا مستحب؟،آپ نے ارشاد فرمایا: سنّت مستحبہ ہے،جس وقت ابوجہل لعین کا سر کٹ کر سرکار میں آیا،سجدۂ شکر فرمایا۔

(الملفوظ مع وصایا شریف،ص:78،مطبوعہ:قادری کتاب گھر اسلامی مارکیٹ،بریلی)

علامہ غلام رسول سعیدی نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے،شرح صحیح مسلم،جلد:خامس، صفحات:570تا581ملاحظہ ہو۔

بعد نمازِ عشاء باآوازِ بلند تلاوتِ قرآن مجید کرنا جبکہ لوگ نماز میں مشغول ہوں

سوال:29

بعض مساجد میں معمول ہے کہ روزانہ بعد نمازِ عشاء سورۂ ملک تلاوت کی جاتی ہے۔ ایک شخص تلاوت کرتا ہے اور کچھ نمازی جو اپنی نماز پڑھ چکے ہوتے ہیں،سنتے ہیں۔لیکن بعض نمازی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو اپنی بقیہ نماز یا نوافل یا اگر دیر سے آئے ہوں تو اپنی فرض نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں،وہ تلاوتِ قرآن سن نہیں پاتے اور اُن کی نماز میں خلل بھی واقع ہوتا ہے۔اب اس صورت میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے،سورۂ ملک کی تلاوت جو بلند آواز سے کی جارہی ہے،وہ بند کرائی جائے یا دیگر نمازی اپنی نماز اور نوافل چھوڑ دیں اور تلاوتِ قرآن مجید سنیں؟،(محمد افتخار اللہ قادری،مانسہرہ)۔

جواب:

جب قرآن مجید پڑھا جائے تو خاموش رہنا اور غور سے سننا فرض ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ○

ترجمہ:''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے،(الاعراف:204)''۔

لیکن اگر کسی ایسی جگہ کہ جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہیں، وہاں کوئی شخص بلند آواز سے تلاوت کرتا ہے تو وہ تلاوت کرنے والا خود ہی گناہ گار ہوگا۔

علامہ ابن عابدین شامی "یجب الاستماع للقرأۃ مطلقًا" کی شرح میں لکھتے ہیں:

(یجب الاستماع للقرأۃ مطلقاً) ای فی الصلاۃ وخارجها، لأن الآیۃ وان کانت واردۃ فی الصلاۃ علی ما مر فالعبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب، ثم هذا حیث لا عذر ولذا فی القنیۃ صبی یقرأ فی البیت واهله مشغولون بالعمل یعذرون فی ترک الاستماع ان افتتحوا العمل قبل القراءۃ والا فلا، وکذا قرأۃ الفقه عند قرأۃ القرآن۔ وفی الفتح عن الخلاصۃ رجل یکتب الفقه وبجنبه رجل یقرأ القرآن فلا یمکنه استماع القرآن فالاثم علی القاری، وعلی هذا لو قرأ علی السطح والناس نیام یأثم ای لأنه سببا لاعراضهم عن استماعه، أو لأنه یؤذیهم بایقاظهم۔ تأمل۔

ترجمہ: "(قرآن مجید کا سننا مطلقاً واجب ہے) یعنی نماز اور خارجِ نماز دونوں حالت میں (قرآن سننا واجب ہے)، یہ آیت اگرچہ نماز کے متعلق وارد ہوئی ہے، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا ہے، لیکن اعتبار خصوصیت سبب کا نہیں، عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے اور یہ حکم اُس وقت ہے جب کوئی عذر نہ ہو جیسا کہ "قنیہ" میں مذکور ہے: گھر میں بچہ قرآن مجید پڑھ رہا ہو اور گھر والے کام کاج میں مصروف ہوں تو وہ نہ سننے میں معذور ہیں، بشرطیکہ انہوں نے اُس کے پڑھنے سے پہلے کام شروع کیا ہو، ورنہ وہ معذور نہیں ہوں گے۔ اور اسی طرح فقہ (کی کتاب) پڑھنے والے کے پاس قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کا حکم ہے اور "فتح القدیر" میں "خلاصۃ الفتاویٰ" کے حوالے سے منقول ہے: ایک شخص فقہی مسائل لکھ رہا ہے اور اس کے پاس کوئی شخص (بلند آواز سے) قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے اور اس کے لئے (اپنی علمی مصروفیت کی وجہ سے) توجہ کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کا سننا عملاً دشوار ہے، تو اس کا گناہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے پر ہوگا، اسی طرح لوگ سوئے ہوئے ہیں اور ایک شخص چھت پر بیٹھ کر (بلند آواز سے) تلاوت کرتا ہے، تو (لوگوں کے نہ

سننے کا) گناہ تلاوت کرنے والے پر ہوگا، کیونکہ لوگوں کے تلاوت قرآن کی طرف توجہ نہ کرنے کا سبب وہی شخص بن رہا ہے یا اس لئے کہ وہ انہیں جگا کر اذیت دے رہا ہے، اس مسئلے میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔۔ پھر آگے چل کر ''غنیۃ المستملی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

إنه يجب عَلى القَارِي احترامه بِأن لايقرأه في الاسواق ومواضعَ الاشتغال، فَإذَا قرأهُ فِيها كَان هو المُضيع لحرمته، فَيَكُون الاثم عليه دون أهل الاشتغال دفعاً لِلحرج

ترجمہ: ''قرآن کریم پڑھنے والے پر اس کا احترام واجب ہے اس طور پر کہ وہ بازاروں میں (بلند آواز سے) قرآن مجید نہ پڑھے اور ان مقامات پر بھی قرآن کریم نہ پڑھے جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں، کیونکہ جب کوئی شخص ان مقامات پر قرآن کی (بلند آواز سے) تلاوت کرے گا تو قرآن مجید کے احترام کو ضائع کرنے والا وہی بنے گا اور گناہ اسی پر ہوگا نہ کہ اپنے کام کاج میں مصروف لوگوں پر، (عام لوگوں) سے حرج کو دور کرنے کے لئے (یہی مسئلے کی بہتر توجیہ ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 237، 238، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''جمعہ کی اذان کے بعد بہت سے آدمی مسجد میں جمع ہو کر ''سورۂ کہف'' پڑھتے ہیں بلند آواز سے، اور بغیر پڑھے جو لوگ ہیں یعنی اَن پڑھ نمازی بھی ہوتے ہیں، وہ شوق سے سورۂ کہف سنتے ہیں اور بعض نمازی جو دیر سے آتے ہیں وہ نفل پڑھ کر سنتے ہیں، نفل پڑھنے والے کہتے ہیں کہ سورۂ کہف بلند آواز سے مت پڑھو، ہمارے نفل میں خرابی آتی ہے، نفل کا ثواب زیادہ ہے یا سورۂ کہف پڑھنے کا؟ آیا سورۂ کہف کو بلند آواز سے پڑھیں یا نہیں یا نفل نماز کو چھوڑ دیں''؟۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز جواب میں لکھتے ہیں: حدیث صحیح میں قرآن مجید با آواز ایسی جگہ پڑھنے سے جہاں لوگ نماز پڑھ رہے ہوں، ممانعت فرمائی ہے اور قرآن عظیم نے حکم فرمایا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے، کان لگا کر سنو اور چپ رہو،

(سورۂ اعراف:204)،تو ایسی جگہ جہر سے پڑھنا ممنوع اور دو یا زیادہ آدمیوں کا با آواز پڑھنا اور شدید ممنوع کہ مخالف حکمِ قرآن اور قرآن عظیم کی بے حرمتی ہے۔ ان لوگوں کو چاہئے کہ آہستہ پڑھیں اور نفل پڑھنے والے نفل سے نہیں روکے جا سکتے، نفل نماز مستحب، تلاوت سے افضل ہے کہ اُس میں تلاوت بھی ہے، رکوع و سجود بھی''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 6،ص:338، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

جو صورتِ مسئلہ آپ نے بیان کی ہے، مذکورہ بالا تفصیلی بحث و دلائل کی روشنی میں یہ طریقۂ کار درست نہیں ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ''سورۃ الملک'' کی تلاوت کرنے والا اور اس کے سامعین مسجد میں الگ کسی کونے میں بیٹھیں اور صرف اتنی بلند آواز سے پڑھیں جو اُن کے سننے والوں تک پہنچ جائے اور نوافل پڑھنے والوں کا ذہن منتشر نہ ہو۔ اور اگر مسجد بڑی ہے تو نوافل پڑھنے والے بھی ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر نوافل پڑھیں اور اس سے بھی زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ آج کل متفرق سورتیں چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں مطبوعہ ملتی ہیں، وہ تمام لوگ جو تلاوت کر سکتے ہیں، ایک طرف بیٹھ کر اپنی اپنی تلاوت کریں اور پھر اجتماعی دعا کرنی ہو تو کر لیں۔

نماز میں امام کی اتباع کب نہیں کی جائے گی

سوال:30

اگر امام دو رکعت والی نماز (نمازِ فجر یا تراویح) میں تیسری رکعت یا چار رکعت والی نماز میں پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے، کیا امام کی اتباع مقتدی کو کرنا چاہئے؟، یا مقتدی لقمہ دیں؟ اس مسئلے میں مقتدی کیلئے کیا حکم ہے؟، (محمد اعیان احمد، سیکٹر D-11، نارتھ کراچی)

جواب:

فقہاء لکھتے ہیں کہ چار چیزیں وہ ہیں کہ اگر امام کرے تو مقتدی اس کا ساتھ نہ دیں، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَاَربعةُ اَشیاءَ اذا تعمد الامام لایتابعه المقتدی۔۔۔۔او قام الی الخامسة

ساھیا کذا فی الوجیز الکردری۔ فان لم یقید الخامسة بالسجدة وعاد وسلم سلم المقتدی معه وان قید الخامسة بالسجدة سلم المقتدی۔ ولو لم یقعد الامام علی الرابعة وقام الی الخامسة ساھیا وتشھد المقتدی وسلم ثم قید الامام الخامسة بالسجدة فسدت صلاتھم کذا فی الخلاصة

ترجمہ: ''چار چیزیں وہ ہیں کہ مقتدی اس میں امام کی متابعت نہ کرے۔۔۔۔۔ اُن میں سے ایک یہ کہ امام قعدۂ اخیرہ کرنے کے بعد بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہوجائے (تو مقتدی کھڑا نہ ہو) جیسا کہ ''الوجیز الکردری'' میں ہے۔ (مقتدی اُس کے لوٹنے کا انتظار کریں)، پس اگر اُس نے پانچویں رکعت کا سجدہ نہیں کیا اور لوٹ آیا اور سلام پھیر دیا تو مقتدی بھی اُس کے ساتھ سلام پھیر دیں۔ اور اگر اُس نے پانچویں رکعت کا سجدہ کرلیا تو مقتدی تنہا سلام پھیر دیں (اس طرح مقتدی کی نماز صحیح طور پر ادا ہوجائے گی) اور اگر امام نے چوتھی رکعت پر قعدہ نہیں کیا تھا اور بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا اور پانچویں رکعت کا سجدہ بھی کرلیا تو اب سب کی نماز فاسد ہوگئی، اگرچہ مقتدیوں نے تشہد پڑھ کر سلام پھیرا ہو، کیونکہ مقتدی کی نماز کے صحیح ہونے کا مَدار امام کی نماز کے صحیح ہونے پر ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:90، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

جب فسادِ نماز کا خدشہ ہو تو امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ العزیز لکھتے ہیں: ''امام کو لقمہ دینا ہر نماز میں جائز ہے، جمعہ ہو یا کوئی نماز، بلکہ اگر اس نے ایسی غلطی کی جس سے نماز فاسد ہوگی تو لقمہ دینا فرض ہے، نہ دے گا اور اس کی تصحیح نہ ہوگی تو سب کی نماز جاتی رہے گی اور لقمہ دینے سے سجدۂ سہو نہیں آتا''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص:289، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

گاؤں میں جمعہ کا قیام

سوال:31

ایک گاؤں میں پچاس گھر ہیں، یہاں نمازِ جمعہ کا کیا حکم ہے؟، (حافظ سمیع اللہ، راولپنڈی)

جواب:

نمازِ جمعہ کی ادائیگی کیلئے احناف کے نزدیک چھ شرائط ہیں، جن میں سے ایک ''شہر'' ہونا ضروری ہے۔

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ قَالَ عَلِیٌّ لَا جُمُعَةَ وَلَا تَشْرِیْقَ وَلَا صَلٰوةَ فِطْرٍ وَلَا اَضْحٰی اِلَّا فِیْ مِصْرٍ جَامِعٍ اَوْ مَدِیْنَةٍ عَظِیْمَةٍ

ترجمہ: ''ابوعبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا: ''شہر اور بڑے قصبہ کے سوا جمعہ ہے نہ تشریق نہ عید الفطر نہ عید الاضحیٰ، (المصنف ابن ابی شیبہ، جلد 2، ص: 101)''۔

عَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ لَیْسَ عَلٰی اَھْلِ الْقُرٰی جُمُعَةٌ اِنَّمَا الْجُمَعُ عَلٰی اَھْلِ الْاَمْصَارِ

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''دیہات والوں پر جمعہ نہیں، جمعہ صرف شہر والوں پر ہے، (المصنف ابن ابی شیبہ، جلد 2، ص: 168)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فی التحفة عن ابی حنیفة أنه بلدة کبیرة فیها سکك وأسواق ولها رساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غیرہ یرجع الناس الیه فیما یقع من الحوادث، وھذا ھو الاصح

ترجمہ: '''' تحفہ'' میں امام ابوحنیفہ سے یہ روایت منقول ہے کہ شہر اس بڑی جگہ کو کہتے ہیں جہاں گلیاں اور بازار ہوں، مضافاتی علاقہ ہو اور اس میں ایک ایسا حاکم ہو جو اپنے اقتدار کے دبدبے (اور طاقت سے) اور اپنے (ذاتی) علم یا دوسرے کے علم سے (یعنی قاضی کے ذریعے) مظلوم کو ظالم سے انصاف دلا سکے، لوگ اپنے پیش آمدہ معاملات میں اس کی طرف رجوع کریں، یہی صحیح تعریف ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 7، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اس تعریف کے لحاظ سے شہر کے ثبوت کے لئے مندرجہ ذیل امور ضروری ہیں:

(1) اشیائے ضرورت کے لئے بازار اور دکانیں (2) قوتِ حاکمہ اور عالمِ دین۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں دیہات میں جمعہ قائم نہیں کیا جائے گا اور اگر پہلے سے ہو رہا ہو تو اسے بند بھی نہیں کیا جائے گا، بلکہ جمعہ پڑھنے کے بعد چار رکعت ظہر احتیاطی ادا کی جائیں۔

جماعت میں چھوٹی سورتوں کی تلاوت

سوال:32

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے امام حضرات نماز میں چھوٹی سورتوں کی آخری تین آیات کی قراءت کرتے ہیں، مثلاً سورۃ الضحیٰ اور سورۃ التین کی آخری تین آیات اور ایک امام صاحب نے سورۃ الحشر کی آخری ایک ہی آیت کی قرأت کی۔ کیا اس سے نماز ہو جاتی ہے؟، تفصیل سے آگاہ فرمائیں کہ کون سی سورتیں مکمل پڑھنی چاہئیں اور کون سی سورتوں کی کوئی بھی کم از کم تین آیات پڑھی جا سکتی ہیں؟، (امجد حسین، سرائے عالمگیر)۔

جواب:

نماز میں ''قرأتِ قرآن'' مطلقاً فرض ہے اور یہ سورۂ مزمل کی آیت نمبر: 4 اور آخری آیت سے مستفاد ہے، جو قیام اللیل (یعنی نوافلِ شب) کے سیاق و سباق میں ارشاد ہوا:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ اور فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ

ترجمہ: ''جتنی مقدارِ تلاوت تمہارے لئے آسان ہو پڑھ لیا کرو، (المزمل: 20)''۔

تعیین کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی قرأت واجب ہے، اسی طرح سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد ''ضمِ سورت'' یعنی سورت کے ملانے کو آئمۂ کرام نے واجب قرار دیا ہے، جس کی کم از کم مقدار قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورت (یعنی سورۃ الکوثر) یا سب سے چھوٹی تین آیات جو کسی ایک مقام پر متصل آئی ہوں، جیسے: ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ (المدثر: 21 تا 23) کے مساوی ہو یا کسی طویل آیت کا اتنا حصہ جو اس مقدار کے مساوی ہو، اس کی مقدار تعدادِ حروف کے اعتبار سے علامہ ابن عابدین شامی نے 30 حروف بتائی ہے اور امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے مکتوب الفاظ (Written Alphabets) کے اعتبار سے 28 حروف اور ملفوظ کلمات (Spoken

(Alphabets) کے اعتبار سے 25 حروف بتائی ہے۔

اس مسئلے کی مکمل تفصیل ہم تفہیم المسائل کی پہلی جلد میں بیان کر چکے ہیں، لہٰذا امام صاحب کی قراٗت درست ہے، لیکن واضح رہے کہ امام کا کسی ایک نماز یا ہر نماز کے لئے کسی ایک سورت کا متعین کر لینا کہ ہر نماز میں اسی سورت کی تلاوت کرتا رہے، درست نہیں ہے اور امام کو چاہئے کہ کم از کم مقدارِ فرض وواجب پر انحصار نہ کرے بلکہ نماز باجماعت میں سنّت رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرے، تاہم اتنی طویل تلاوت نہ کرے کہ جماعت میں شامل مقتدیوں پر گراں گزرے اور اس سے ان کے خشوع وخضوع اور حضوریٔ قلب میں فرق واقع ہو، حدیثِ پاک میں ہے:

(1) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ لِلنَّاسِ فَلْیُخَفِّفْ، فَاِنَّ مِنْهُمُ الضَّعِیْفَ وَالسَّقِیْمَ وَالْکَبِیْرَ، وَاِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ لِنَفْسِهٖ فَلْیُطَوِّلْ مَاشَاءَ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے (یعنی امامت کرے) تو اسے چاہئے کہ (مقدارِ قراءت میں) تخفیف کرے، کیونکہ اُن میں (جماعت میں شامل لوگوں میں) بعض لوگ کمزور ہوتے ہیں اور بعض بیمار یا بوڑھے ہوتے ہیں (یعنی زیادہ دیر تک نماز میں قیام اُن کے لئے دشوار ہوتا ہے) اور جب تم میں سے کوئی شخص تنہا نماز پڑھے تو وہ (اپنی استطاعت اور ذوق کے مطابق) جتنی چاہے، لمبی نماز پڑھے''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 703)

اَخْبَرَنِیْ اَبُوْمَسْعُوْدٍ اِنَّ رَجُلًا قَالَ وَاللهِ یَارَسُوْلَ اللهِ، اِنِّیْ لَاَتَاَخَّرُ عَنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ مِنْ اَجْلِ فُلَانٍ، مِمَّا یُطِیْلُ بِنَا، فَمَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فِیْ مَوْعِظَةٍ اَشَدَّ غَضَبًا مِنْهُ یَوْمَئِذٍ، ثُمَّ قَالَ اِنَّ مِنْکُمْ مُنَفِّرِیْنَ، فَاَیُّکُمْ مَاصَلّٰی بِالنَّاسِ فَلْیَتَجَوَّزْ، فَاِنَّ فِیْهِمُ الضَّعِیْفَ وَالْکَبِیْرَ وَذَا الْحَاجَةِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ

کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں فلاں شخص کی وجہ سے نمازِ فجر سے رہ جاتا ہوں کیونکہ وہ ہمیں طویل نماز پڑھاتے ہیں۔ حضرت ابو مسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اُس دن کے مقابلے میں کبھی وعظ و نصیحت کے موقع پر اتنا غضبناک نہیں دیکھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں کو (دین سے) متنفر کرنے والے ہو، پس تم میں سے جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے (یعنی امامت کرے) تو اسے چاہیے کہ (مقدارِ قراءت میں) تخفیف کرے کیونکہ ان میں (یعنی جماعت میں شامل لوگوں میں سے) بعض لوگ کمزور یا بوڑھے یا کام کاج والے ہوتے ہیں، (یعنی زیادہ دیر تک نماز میں قیام اُن کے لئے دشوار ہوتا ہے)''۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 702)

مانع حمل ذرائع اختیار کرنے کا جواز

سوال:33

ہمارے علاقے کی مسجد کے امام صاحب نے گذشتہ دنوں اپنی بیوی کی نس بندی کروا دی ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا اُن کا یہ عمل درست ہے اور ان کے پیچھے نماز درست ہوگی؟

(میاں عبدالرشید، راجوری، مقبوضہ کشمیر)

جواب:

زمانۂ قدیم میں امتناعِ حمل کے لئے ایک طریقہ ''عزل'' رائج تھا، امام غزالی نے اپنے زمانے کے حالات، ضروریات اور وسائل کے اعتبار سے عزل کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں: ایک صورت حرام، ایک بدعت اور تین صورتیں جائز قرار دی ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں منعِ حمل کے مختلف جدید ذرائع موجود ہیں، بہت سے نئے اسباب اور وسائل وجود میں آچکے ہیں، ضروریات اور تقاضے بڑھ گئے ہیں اور مسائل بھی زیادہ ہیں۔ ہمارے نزدیک امتناعِ حمل کے درج ذیل طریقے شرعاً جائز ہیں:

(1) کھانے والی گولیاں (Tablets)

(2) انجکشن (3) کیمیاوی اشیاء (Chemical Method) مثلاً فوم جیلی اور کریم

وغیرہ کا بیرونی استعمال

(4) کنڈومز (Condoms)　(5) ڈایافرام　(6) چھلہ (Loop)

(7) نل بندی (Tubal Ligation)

نل بندی (Tubal Ligation) کے عمل میں عورت کے بیضہ دان کی نالی (Fallopian Tube) کو کاٹ کر باندھ دیا جاتا ہے، یہ عمل صرف اس صورت میں جائز ہے جب کوئی ماہر مسلمان ڈاکٹر یہ کہے کہ بچہ پیدا ہونے یا مزید بچے پیدا ہونے سے عورت کی ہلاکت کا ظنِ غالب ہے یا یہ کہ عورت کے بچے آپریشن کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتے اور مزید آپریشن کرنے سے عورت کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، طبی اصطلاح میں ایسی عورت کو Caesarean کہتے ہیں، ان صورتوں میں نل بندی صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے، کسی طبی سبب کے بغیر یہ طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

ضبطِ تولید کا ایک طریقہ نس بندی (Vasec Tomy) ہے، جس میں مرد کی جن نالیوں سے تولیدی جرثومے (Sperm) گزرتے ہیں، ان نالیوں کو کاٹ کر باندھ دیا جاتا ہے، یہ طریقہ شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے، کیونکہ اس سے مرد بانجھ ہوجاتا ہے، اس کے مقابل عورت کی نل بندی کی جاتی ہے، جس کا حکم اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم نے شرح صحیح مسلم، جلد: 3، ص: 887 تا 891 میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے، جس میں مندرجہ بالا صورتوں کے علاوہ چند صورتیں اور بیان کی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ اگر سلسلۂ تولید کو قائم رکھنے سے عورت کے شدید بیمار ہونے کا خدشہ ہو تو ضبطِ تولید جائز ہے۔

۲۔ مسلسل پیدائش سے بچوں کی تربیت اور نگہداشت میں حرج کا خدشہ ہو تو وقفے سے پیدائش کے لئے ضبطِ تولید جائز ہے، کیونکہ جب گھر میں صرف ایک عورت ہو اور نو، دس ماہ بعد دوسرا بچہ آجائے تو اس کے لئے دونوں کو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔

۳۔ حمل اور وضع حمل کے وقفوں کے دوران بعض صورتوں میں زوجین اپنی جنسی خواہش

پوری نہیں کر سکتے، اس لئے اس مقصد کی خاطر حمل میں وقفہ کرنے کے لئے امتناع حمل کے جائز ذرائع استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

۴۔ اگر کوئی شخص عورت سے محبت کی وجہ سے اس کو ایامِ حمل، دردِ زہ اور زچگی کی تکالیف سے بچانا چاہتا ہو تو یہ جائز ہے۔

۵۔ عام طور پر بچوں کی مسلسل پیدائش سے عورت کا حسن و جمال کم یا ختم ہو جاتا ہے، اس لئے عورت کے حسن و جمال کو قائم رکھنے کیلئے امتناع حمل کے جائز طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

امام غزالی نے فرمایا ہے:

۶۔ زیادہ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی خاطر انسان کو آمدنی کے لئے زیادہ محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے، انسان دوہری تہری نوکریاں اور اوور ٹائم کرتا ہے اور بسا اوقات ناجائز وسیلوں کو بھی اختیار کرتا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو استطاعت سے زیادہ محنت و مشقت سے بچانے اور مالی بوجھ کم کرنے کے لئے یہ عمل جائز ہے، کیونکہ جس قدر آمدنی کے لئے مشقت کم ہوگی وہ اتنا ہی عبادت کے لئے فارغ ہوگا، امام غزالی نے بھی اس سبب کو جائز قرار دیا ہے۔ اس بحث میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہم نے اسلامی قانون کی ان حکمتوں کے تحت یہ رائے قائم کی ہے جو عدمِ حرج اور یُسر پر مبنی ہیں۔ اس بحث کو خالص مادہ پرستانہ اور لادینی سوچ سے الگ سمجھا جائے۔

مندرجہ بالا تحقیق کے مطابق اگر آپ کے امام صاحب نے امتناع حمل کی کوئی جائز صورت اختیار کی ہے تو اس سے ان کی اہلیتِ امامت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ تاہم یہ امر ملحوظ رہے کہ ان تمام صورتوں کا تعلق اسبابِ منع حمل سے ہے، اسقاطِ حمل (Abortion) سے نہیں ہے۔

خطابت کی اہلیت اور خطیب کے فرائض

سوال: 34

ہماری مسجد کے سابق خطیب صاحب جو مسجد کمیٹی کے صدر بھی تھے، کا انتقال ہو گیا،

اُن کی جگہ کمیٹی نے دوسرے خطیب کو مقرر کیا، جن کا کام صرف اور صرف نمازِ جمعہ سے قبل بیان کرنا ہے۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ خطیب صاحب بیان سے فارغ ہونے کے بعد امام مسجد کی اجازت کے بغیر زبردستی خطبہ دے کر نماز پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ خطیب صاحب کی اس حرکت سے تمام نمازی حضرات میں بھی ناراضگی پائی جاتی ہے۔ امامِ مسجد کی موجودگی میں امام مسجد سے پوچھے بغیر خطیب ہو یا امام مسجد کا پیر ہو یا کوئی اور بڑا عالم ہو، کیا اپنی مرضی سے نماز یا نمازِ جمعہ پڑھا سکتا ہے یا امام مسجد کی اجازت ضروری ہے؟

(ظہور احمد، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مسجد کمیٹی کو چاہیے کہ ایک ہی شخص کو نمازِ جمعہ کے لئے خطیب مقرر کرے، اگر وہ شخص اہل ہے اور اس میں امامت کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں اور کراہت کی کوئی شرعی وجہ بھی موجود نہیں ہے تو اسی کو نمازِ جمعہ کی امامت کے لئے مقرر کر دیں۔ اُس خطیب کے نماز پڑھانے پر لوگوں کی ناراضگی اگر کسی شرعی عذر کے سبب نہیں بلکہ محض ذاتی انا کے تحت ہے تو کوئی معنی نہیں رکھتی۔ صورتِ مسئولہ میں مسجد کمیٹی کو یہ طے کرنا ہے کہ انتظامیہ نے اُس شخص کو مکمل خطیب مقرر کیا ہے یا صرف نماز سے قبل بیان کے لئے مقرر کیا ہے۔ اگر خطیبِ جمعہ مقرر کیا تھا تو عرفِ عام میں نمازِ جمعہ پڑھانے کا بھی اُسے حق حاصل ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

اذن الامیر فی الخطبة اذن فی الجمعة واذنه فی الجمعة اذن فی الخطبة ولو قال اخطب لهم ولا تصل أجزأه أن يصلی بهم كذا فی الزاهدی۔

ترجمہ: ''امیر کا کسی شخص کو خطبہ کی اجازت دینا، نمازِ جمعہ (پڑھانے) کی اجازت دینا ہے، اور جمعہ کی اجازت دینا خطبہ کی اجازت دینا ہے۔ اگر اُس نے کہا ہو کہ لوگوں کو خطبہ دیں اور نماز (جمعہ) نہ پڑھائیں، تب بھی خطبے کی اجازت نماز پڑھانے کی اجازت کے لئے کافی ہے، ''زاہدی'' میں بھی اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد:1 ص:146، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وفی السراجیة لو صلی احدٌ بغیر اذن الخطیب لایجوز، الّا اذا اقتدی به من له ولایة الجمعة۔

ترجمہ: ''سراجیہ'' میں ہے: اگر خطیب کی اجازت کے بغیر کسی نے جمعہ پڑھایا تو جائز نہیں، سوائے اس صورت کے کہ جسے نمازِ جمعہ خود پڑھانے یا اُس کا امام مقرر کرنے کی ولایت حاصل ہے، وہ خود بھی اس شخص کی اقتدا میں نماز پڑھ رہا ہو (یعنی اس صورت میں اس کا امام بننا جائز ہوگا)۔ اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں کہ جسے امام و خطیب جمعہ مقرر کرنے کا اختیار ہے، اس کا خود کسی امام کی اقتداء میں جمعہ پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اُسے اس کی اجازت حاصل ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 12، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

البتہ اگر لوگوں کی اکثریت کسی شخص کی امامت پر کسی شرعی سبب کی بنا پر ناراض ہو تو اس کا امام یا خطیب مقرر کیا جانا درست نہیں ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلٰثَةٌ لَا تُقْبَلُ لَهُمْ صَلَاةٌ اَلرَّجُلُ يَؤُمُّ الْقَوْمَ وَهُمْ لَهٗ كَارِهُوْنَ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین اشخاص کی نماز قبول نہیں کی جاتی، (اُن میں سے) ایک وہ شخص ہے جو کسی قوم کی امامت کرے، حالانکہ وہ لوگ اُسے ناپسند کرتے ہوں، (سنن ابن ماجہ، باب من أم قومًا وهم له کارهون، رقم الحدیث: 970)''۔ البتہ اگر کسی شخص یا چند اشخاص کا کسی شخص کی امامت پر اختلاف محض ذاتی عناد اور انانیت کے سبب ہے تو شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

''جس امام سے جماعت کے بعض آدمی ناراض ہوں اور بعض اس کی خوشامد کرتے ہوں تو ایسے کی اقتدا کرنا جائز ہے یا نہیں؟''۔ آپ نے جواب میں لکھا:

''(مقتدیوں کی) رنجیدگی (کی وجہ) دیکھی جائے گی، اگر اُس میں کسی قصورِ شرعی کی وجہ

سے ہے تو اُسے امام بننا گناہ ہے اور بحکم حدیث اُس کی نماز مقبول نہ ہوگی: ثَلٰثَةٌ لَا تُرْفَعُ صَلَاتُھم فَوقَ آذانھم شبراً۔ اِلٰی اَن قَال ﷺ وَمَن اَمَّ قوماً وَھُم لَہٗ کارھون۔

ترجمہ: ''تین اشخاص کی نماز ان کے کانوں سے ایک بالشت برابر بھی بلند نہیں ہوتی، آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ (ان میں سے) ایک وہ شخص ہے جو کسی قوم کی امامت کرے حالانکہ وہ لوگ اُسے ناپسند کرتے ہوں، (سنن ابن ماجہ، باب من امّ قوماً وھم لہ کارھون، رقم الحدیث: 971)۔ اور اگر اُس میں کوئی قصور شرعی نہیں، تو اُس کی امامت میں کوئی حرج نہیں اور اُن رنج رکھنے والوں پر وبال ہے، کما نصّ علیہ فی الدُّرِ المُختار، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 575، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

صورتِ مسئولہ میں اگر مسجد کے متولی یا انتظامیہ اس خطیب کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہوگی کہ وہ اس کی امامت پر راضی ہیں۔

جنازہ گاہ میں نماز باجماعت کی ادائیگی

سوال:35

ایک مسجد کے ساتھ ہی نمازِ جنازہ کے لئے جگہ مقرر کی گئی ہے، جس میں نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا اس جنازہ گاہ میں نمازِ پنج گانہ کی جماعت کرا سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز اصل مسجد کی تعمیر کا کام بھی جاری ہے، تو کیا صرف عارضی طور پر نمازِ جنازہ والی جگہ پر نمازِ پنجگانہ کی جماعت کرائی جا سکتی ہے؟، (محمد سیف اللہ سعیدی، کورنگی کراچی)۔

جواب:

جو جگہ نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لئے مخصوص کی گئی ہے، اصلاً تو وہاں نمازِ جنازہ کی ادائیگی کی جانی چاہئے، اور وہاں نمازِ جنازہ کی ادائیگی میں شرعاً کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ باقی رہا پنج وقتہ نمازوں کی جماعت کا معاملہ تو اُس کے لئے مسجد موجود ہے اور جیسا کہ آپ نے اپنے سوال میں لکھا کہ مسجد میں تعمیری کام جاری ہے تو عارضی طور پر جنازہ گاہ میں نماز ادا کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ جگہ پاک ہو۔ لیکن بغیر عذر اصل مسجد کو ویران

کر کے دوسری جگہ جماعت قائم نہ کی جائے۔ مسجد سے باہر خواہ جنازہ گاہ ہو یا کھلا میدان اگر زمین خشک اور پاک ہے تو ضرورت کے وقت نماز فرداً فرداً اور باجماعت ادا کی جاسکتی ہے۔ پس صورت مسئولہ میں اگر تعمیر کی وجہ سے مسجد میں نماز باجماعت کے لئے جگہ نہیں ہے تو مسجد سے متصل جنازہ گاہ میں نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ مگر اس سے نماز تو ادا ہو جائے گی اور جماعت بھی صحیح ہوگی، لیکن مسجد کا ثواب نہیں ملے گا۔

اذانِ مغرب اور جماعت کے درمیان وقفہ

سوال :36

نمازِ مغرب میں اذانِ مغرب اور اقامت کے دوران کتنا وقفہ کیا جاسکتا ہے؟ کیا اذان کے فوراً بعد بغیر کسی تاخیر کے جماعت قائم کرنا لازم ہے اور تاخیر میں کوئی شرعی قباحت ہے؟، (محمد رمیز احمد، سیکٹر D-11، نارتھ کراچی)۔

جواب :

ہر نماز کی اذان واقامت (بشمول نمازِ مغرب) کے درمیان وقفہ کرنا مشروع ہے۔ لیکن آج کل اذانِ مغرب کے بعد وقفہ نہیں کیا جاتا اور فوراً اقامت کہہ دی جاتی ہے۔ ہر چند کہ نمازِ مغرب کا وقت دوسری نمازوں کے مقابلہ میں کم ہے، لیکن اتنا کم بھی نہیں جتنا عام لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور اس قدر حساس ہو گئے ہیں کہ اگر کبھی اتفاقاً کسی مسجد میں کچھ وقفہ (دو تین منٹ) کرلیا جائے تو اسے خلاف شرع سمجھا جاتا ہے اور بعض نمازی جذباتی انداز اختیار کرتے ہوئے شور مچانے لگتے ہیں اور یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ شریعت میں اس عمل کی گنجائش موجود ہے۔ اگرچہ اذان کے بعد نمازِ مغرب دوسری نمازوں کی بہ نسبت جلدی پڑھنا مستحب ہے، لیکن مغرب کا سارا وقت صحیح ہے، چند منٹ کی تاخیر ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی بنا پر رمضان المبارک میں نمازِ مغرب میں تقریباً دس منٹ یا کم وبیش کا وقفہ کیا جاتا ہے تاکہ لوگ گھر پر یا مساجد میں افطار کر کے جماعت میں شامل ہوسکیں۔ بعض صحابۂ کرام مغرب کی اذان کے بعد اور اقامت سے پہلے دو رکعت نفل پڑھتے

تھے، تاہم قلتِ وقت کوضرور مدِ نظر رکھتے تھے، حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں:

كَانَ الْمُؤَذِّنُ إِذَا أَذَّنَ، قَامَ نَاسٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ يَبْتَدِرُونَ السَّوَارِيَ، حَتَّى يَخْرُجَ النَّبِيُّ ﷺ وَهُمْ كَذَالِكَ، يُصَلُّونَ الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ الْمَغْرِبِ، وَلَمْ يَكُنْ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ شَيْءٌ۔

ترجمہ: ''جب مؤذن اذان سے فارغ ہوجاتا تو نبی کریم ﷺ کے صحابۂ کرام میں سے کچھ لوگ کھڑے ہوکر جلدی جلدی ستونوں کے قریب آجاتے، اتنے میں نبی کریم ﷺ تشریف لے آتے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اسی حال میں نمازِ مغرب سے پہلے دورکعت پڑھتے اور اذان اور اقامت کے درمیان اور کوئی چیز نہ ہوتی''۔
(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 625)

امام بخاری حضرت عبداللہ مزنی سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

صَلُّوا قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ، قَالَ فِي الثَّالِثَةِ لِمَنْ شَاءَ كَرَاهِيَةَ أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً

ترجمہ: ''نمازِ مغرب سے پہلے نماز (نفل) پڑھا کرو، تیسری مرتبہ فرمایا: جس کی مرضی ہو پڑھے، (اسے آپ ﷺ نے اختیاری اس لئے رکھا کہ) آپ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ لوگ اسے (یعنی مغرب کے فرض سے پہلے نفل پڑھنے کو) سنت نہ قرار دے دیں''۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 7368)

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنَّا بِالْمَدِينَةِ فَإِذَا أَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ لِصَلٰوةِ الْمَغْرِبِ ابْتَدَرُوا السَّوَارِيَ فَرَكَعُوا رَكْعَتَيْنِ حَتَّى أَنَّ الرَّجُلَ الْغَرِيبَ لَيَدْخُلُ الْمَسْجِدَ فَيَحْسِبُ أَنَّ الصَّلٰوةَ قَدْ صُلِّيَتْ مِنْ كَثْرَةِ مَنْ يُصَلِّيهِمَا۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں جب مؤذن مغرب کی اذان دیتا تو ہم لوگ ستونوں کی آڑ میں ہوکر دو رکعت نماز (نفل) پڑھ لیتے تھے، یہاں تک کہ اگر (اُس وقت) کوئی نیا آدمی مسجد میں آتا تو وہ زیادہ تعداد میں لوگوں کو نماز میں مشغول دیکھ کر یہ سمجھتا کہ شاید جماعت ہوچکی ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1936)

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''(مؤذن) اذان اور اقامت کے درمیان کچھ دیر کے لئے بیٹھے، سوائے نمازِ مغرب کے، یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ہے اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) نے فرمایا: مغرب میں بھی تھوڑی دیر بیٹھے، اس لئے کہ (اذان واقامت کے درمیان) فصل (جدائی) ضروری ہے اور وصل (دونوں کو ملانا) مکروہ ہے، اور محض معمولی سکتے سے فصل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تو کلماتِ اذان کے درمیان بھی ہوتا ہے۔ پس مؤذن اس طرح بیٹھے جس طرح خطیب دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھتا ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک (زیادہ) تاخیر بھی مکروہ ہے، لہٰذا کراہت سے بچنے کے لئے معمولی سی فصل کافی ہے، (ہدایہ اولین، جلد: 1 ص: 88 مکتبہ رحمانیہ، لاہور)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویجلس بینھما) بقدر مایحضر الملازمون مراعیاً لوقت الندب (الا فی المغرب) فیسکت قائما قدر ثلاثة آیات قصار، ویکرہ الوصل اجماعاً۔

ترجمہ: ''مؤذن اذان واقامت کے درمیان اتنی مقدار بیٹھے کہ لوگ اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہوکر مستحب وقت کی رعایت کرتے ہوئے جماعت کے لئے حاضر ہوسکیں سوائے نمازِ مغرب کے، پس اذان مغرب کے بعد مؤذِن تین چھوٹی آیات کی مقدار کھڑے ہوکر خاموش رہے اور اذان واقامت کو ملادینا (یعنی دونوں کے درمیان بالکل وقفہ نہ کرنا) بالاتفاق مکروہ ہے،۔۔۔ علامہ ابنِ عابدین شامی ''فَیَسْکُتُ قَائِماً'' کے تحت لکھتے ہیں:

ھذا عندہ، وعندھما یفصل بجلسة کجلسة الخطیب، والخلاف فی الافضلیة، فلو جلس لایکرہ عندہ۔

ترجمہ: ''یہ وقفہ (یعنی تین چھوٹی آیات کے برابر کھڑا رہنا) امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ہے اور صاحبین (امام محمد وامام ابویوسف رحمہما اللہ) کے نزدیک یہ ہے کہ مؤذن اتنی

مقدار بیٹھے، جس طرح خطیب دو خطبوں کے درمیان بیٹھتا ہے۔ اور اختلاف افضلیت میں ہے، پس اگر مؤذن بیٹھ گیا تو امام اعظم کے نزدیک بھی مکروہ نہیں ہوگا"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص:52، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

وقال ابو حنیفة ان الفصل بالسکتة اقرب الی التعجیل المستحب والمکان هنا مختلف، لأن السُّنّة أن یکون الاذان فی المنارة والاقامة فی المسجد، وکذا النغمة والهیئة بخلاف خطبتی الجمعة لاتحاد المکان والهیئة فلا یقع الفصل الا بالجلسة، وفی الخلاصة ولو فعل المؤذن کما قالا۔ لایکره عنده، ولو فعل کما قال، لایکره عندهما یعنی أن الاختلاف فی الافضلیة۔

ترجمہ: "امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اذان اور اقامت کے درمیان کچھ دیر) سکتہ کرنے سے نمازِ مغرب قائم کرنے میں عجلت کا مستحب ادا ہو جاتا ہے اور یہاں (اذان واقامت کی) جگہ مختلف ہے، کیونکہ سنت یہ ہے کہ اذان مینار پر ہو اور اقامت مسجد میں ہو۔ اور اسی طرح اذان کی ادائیگی کے طریقے اور ہیئت سے بھی دونوں میں وقفہ ہو جاتا ہے، جمعہ کے دو خطبوں کی صورتِ حال اس سے مختلف ہے، کیونکہ ان دونوں کے پڑھنے کا انداز بھی ایک ہے اور جگہ بھی ایک ہے، اس لئے درمیان میں بیٹھے بغیر ان دونوں کے درمیان فصل واقع نہیں ہو سکتا۔ "خلاصۃ الفتاویٰ" میں ہے: اگر مؤذن صاحبین کے قول پر عمل کر کے اذان ونماز کے درمیان تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائے تو امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک بھی مکروہ نہیں ہوگا اور اگر وہ امام صاحب کے قول پر عمل کر کے کچھ دیر کے لئے خاموش کھڑا رہے تو صاحبین کے نزدیک بھی اس صورت میں کراہت نہیں ہوگی، یعنی یہ اختلاف افضلیت میں ہے (دونوں صورتیں بلا کراہت جائز ہیں)"۔

(البحر الرائق، جلد 1، ص:454، مکتبۃ الرشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: "اذان اور اقامت کے درمیان وقفہ کرنا سنت ہے

،اذان کہتے ہی اِقامت کہہ دینا مکروہ ہے، مگر مغرب میں وقفہ تین چھوٹی آیتوں یا ایک بڑی آیت کے برابر ہو، (بہارِ شریعت، جلد اول، حصہ سوم، ص:175)''۔

اگر اذان کے بعد پہلے درود شریف پڑھ کر اذان کی مسنون دعا پڑھ لی جائے تو از خود اتنا وقفہ اور فصل ہو جاتا ہے بلکہ تین چھوٹی آیات سے قدرے زائد ہی ہوتا ہے اور اس میں اس حدیث کی اِتباع کی سعادت بھی نصیب ہو جائے گی اور کھڑے رہنے کے بجائے اطمینان سے بیٹھ کر بھی دعا کی جا سکتی ہے۔

دعا بعد الصلوٰۃ کی شرعی حیثیت

سوال:36

فرضوں کے بعد دعا مانگنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(محمد احمد ساجد، ریلوے روڈ، بصیر پور اوکاڑہ)

جواب:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن:60)

ترجمہ: ''(اے میرے بندو!) مجھ سے دعائیں مانگتے رہو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا''۔

اس میں کسی وقت کی قید نہیں لگائی، لہٰذا مسلمان ہر وقت دعا کر سکتا ہے، حصن حصین میں دعا کی قبولیت کے اوقات بتائے گئے ہیں، ان میں ایک وقت یہ بیان کیا:

بعد کل عمل صالح   یعنی ہر نیک کام کے بعد

نماز اعلیٰ درجے کی نیکی ہے، لہٰذا اس کے بعد دعا کرنا مستحسن ہے۔ الشیخ حسن بن علی شرنبلالی ''نور الایضاح'' میں لکھتے ہیں:

ویستحب للامام بعد سلامہٖ ان یتحوّل الی یسارہٖ لتطوع بعد الفرض وان یستقبل بعدہ الناس ویستغفرون اللہ ثلاثا ویقرؤن آیۃَ الکرسی والمُعوِّذات ویسبّحون اللہ ثلاثا وثلاثین ویحمّدونہٗ کذلک ویکبّرونہٗ کذلک ثم یقولون لاالہ الااللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ لہ الملکُ ولہ الحمدُ وھوعلیٰ کل شئٍ قدیر، ثم یدعون

لانفسھم وللمسلمین رافعی ایدیھم ثم یمسحون بھا وجوھھم فی آخرہ۔

ترجمہ: ''امام کیلئے مستحب ہے کہ فرض سے سلام پھیرنے کے بعد نوافل کیلئے بائیں جانب مڑ جائے، اس کے بعد لوگوں کی طرف منہ کرے، پھر اللہ سے استغفار کرے، آیۃ الکرسی، معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھے اور 33,33 مرتبہ ''سبحان اللہ''، ''الحمد للہ'' اور ''اللہ اکبر'' کا ورد کرے۔ پھر ''لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئ قدیر'' پڑھ کر اپنے لیے اور دیگر تمام مسلمانوں کیلئے ہاتھ اٹھا کر دعا کریں اور آخر میں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیں''۔

(کتاب الصلوٰۃ، فصل فی الاذکار الواردۃ بعد الفرض، ص:80 قدیمی کتب خانہ، کراچی)

صاحب مراقی الفلاح ''اَن یَستقبِلَ بعدہُ النّاس'' کے تحت لکھتے ہیں:

ای بعد التطوع وعقب الفرض ان لم یکن بعدہ نافلۃ

ترجمہ: ''امام کیلئے مستحب ہے کہ نوافل کے بعد اور فرائض کے بعد اگر نوافل نہ ہوں، تو لوگوں کی طرف منہ کرے''۔ آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

ثم یختمون بقولہ تعالیٰ سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ

ترجمہ: ''پھر اللہ تعالیٰ کے فرمان ''سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ'' پر دعا کو ختم کریں''۔ (کتاب الصلاۃ، فصل صفۃ الاذکار، ص:171 قدیمی کتب خانہ، کراچی)

دعا عبادت کی روح ہے، عبادت کا مغز اور نچوڑ ہے۔ نماز کے بعد دعائیں، تسبیحات واوراد اور بعض سورتوں کا پڑھنا احادیث سے ثابت ہے۔ اجتماعی دعا کا نہ ثبوت ہے نہ ہی ممانعت۔ تو پھر اپنی اصل کے اعتبار سے دعا انفرادی بھی کی جاسکتی ہے اور اجتماعی بھی، کیونکہ دعا کو اصل عبادت اور جوہر عبادت قرار دیا گیا ہے اور ایک حدیث مبارک میں دعا کو عین عبادت قرار دیا گیا ہے (اَلدُّعَاءُ ھُوَ الۡعِبَادَۃُ، سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2969) اور اس کی بہت زیادہ ترغیب دی گئی ہے، پھر نمازِ جمعہ کا خطبہ جو واجب ہے اور عیدین کا خطبہ جو سنت ہے، ان میں بھی اجتماعی دعا ثابت ہے۔ نمازِ تراویح کی جماعت تو عہدِ رسالت مآب ﷺ

اور عہدِ صدیقی کے بعد رائج ہوئی، اس میں حرمین طیبین کے آئمہ ختمِ قرآن کے موقع پر گڑگڑا کر نماز کے اندر دعا کرتے ہیں، یہ بھی تو رسول ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ثابت نہیں ہے، لیکن اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ دعا انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پر بہرصورت مستحسن و مستحب عمل ہے۔

مغفرت وایصالِ ثواب کے لئے اجتماعی دعا

سوال: 37

ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ میت کے لئے دعا کے لئے آنے والے حضرات قرآن شریف کی چند آیات یا ایک سورت پڑھ کر میت کی مغفرت کیلئے اجتماعی دعا کرتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تعزیت کے لئے گھر میں پہلے سے موجود کوئی قاری یا عالمِ دین یا کوئی بھی مسلمان تلاوت کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ جو عرصہ دراز سے جاری ہے، اس کو بعض حضرات منع کرتے ہیں، تو کیا اُن کا اسے منع کرنا درست ہے؟ (عبدالوکیل، چترال)

جواب:

مذکورہ صورت درحقیقت ایصالِ ثواب ہے، جو شرعاً جائز بلکہ مستحسن امر ہے۔ ''ایصالِ ثواب'' کے معنیٰ ہیں: کسی شخص کا اپنے کسی نیک کام کا ثواب دوسرے کو پہنچانا، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پاچکا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٥١﴾

(1) ترجمہ: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے التجا کی: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے، (الاعراف:151)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿٤١﴾

(2) ترجمہ: ''(حضرت ابراہیم نے دعا کی) اے ہمارے رب! حساب (یعنی قیامت) کے دن میری، میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرمانا، (ابراہیم:41)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ

(3) ترجمہ: ''اے ہمارے رب: ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی (بھی مغفرت) فرما، جو ہم سے پہلے وفات پاچکے (یا ایمان لانے میں ہم سے سبقت حاصل کر چکے ہیں)، (الحشر: 10)''۔

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

(4) ترجمہ: ''(حضرت نوح نے دعا کی) اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) مومن مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما، (نوح: 28)''۔

ایصالِ ثواب کا ذریعہ دعائے مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل وعمرہ، تلاوتِ قرآنِ پاک، اذکار، درود پاک وغیرہ۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

الاصل فی ھذا الباب أن الانسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة كان أو صوماً أو صدقة أو غيرها كالحج وقراءة القرآن والاذكار وزيارة قبور الانبياء عليهم الصلاة والسلام والشهداء والاولياء والصالحين وتكفين الموتى وجميع أنواع البر كذا في غاية السروجي شرح الهداية۔

ترجمہ: ''ایصالِ ثواب کے مسئلے میں اصل یہ ہے کہ انسان اپنے ہر نیک عمل کا ثواب دوسرے شخص کو پہنچا سکتا ہے، خواہ وہ نماز ہو یا روزہ ہو یا مالی صدقہ ہو یا کوئی اور نیک عمل، جیسے حج، قرآن مجید کی تلاوت، اذکار، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وشہداءِ کرام واولیاءِ کرام اور صالحین اُمت رحمہم اللہ تعالیٰ کی قبروں کی زیارت اور مُردوں کو کفن دینا اور دیگر تمام نیکی کے کام، اسی طرح ''غایۃ السروجی شرح ہدایہ'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 257، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

دعا عبادت کی روح ہے، عبادت کا مغز اور نچوڑ ہے اور ایک حدیث مبارک میں دعا کو

عین عبادت قرار دیا گیا ہے (اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ، سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2969)، کیونکہ بندہ اپنے آپ کو عاجز، محتاج اور بے کس و بے بس سمجھ کر اپنے خالق و مالک کو پکارتا ہے، اسی کا نام بندگی ہے۔ دعا انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پر بہر صورت مستحسن و مستحب عمل ہے، حرمین طیبین میں بھی ختمِ قرآن کے موقع پر نمازِ تراویح میں اور خطبات مبارکہ میں اجتماعی دعا کی جاتی ہے، تو جب یہ اجتماعی دعا نماز کے اندر جائز ہے تو نماز سے باہر اس کی ممانعت کیوں ہوگی۔ جو اجتماعی دعا کی ممانعت کا دعویٰ کرتا ہے، اُس پر لازم ہے کہ دلیل پیش کرے، اب تو تبلیغی اجتماع میں بھی اجتماعی دعا کی جاتی ہے اور لوگ بڑے اہتمام سے اس میں شرکت کے لئے جاتے ہیں، تو ایک خاص موقع اور مقام پر اس کے جواز اور باقی مواقع اور مقامات پر اس کی ممانعت کی کیا دلیل ہے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص خود شارع بننے کی کوشش کرے اور ''مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ'' (خیر کے کاموں سے بہت زیادہ روکنے والا) بننا چاہتا ہو۔

☆☆ ☆☆

مسجد اور وقف کے مسائل

مسجد میں اسکرین لگا کر ٹیلی ویژن کے دینی پروگرام چلانا

سوال: 38

ایک مذہبی تنظیم کے کارکنان رمضان المبارک کی 27ویں شب میں مسجد کے اندر پروجیکٹر لگا کر دینی بیان دکھانا چاہتے ہیں۔ کیا مسجد میں پروجیکٹر یا کمپیوٹر یا انٹرنیٹ کے ذریعے دینی بیانات دکھائے جاسکتے ہیں؟۔ کچھ مساجد میں نماز سے فراغت کے بعد باقاعدہ اعلان کیا جاتا ہے اور مسجد کے منبر پر کمپیوٹر رکھ کر بیانات کی سی ڈی چلائی جاتی ہے اور لوگ سنتے اور دیکھتے ہیں۔ اس طرح کی تبلیغ سے اور منبر رسول ﷺ پر کمپیوٹر رکھ کر یا مسجد کے اندر پروجیکٹر لگا کر مسجد و منبر کی توہین تو نہیں ہو رہی؟

(امیر ممتازی، جامع مسجد رحمانیہ، گوہر آباد، دستگیر، کراچی)

جواب:

مساجد میں انٹرنیٹ یا کیبل سے لنک کر کے ٹیلیویژن اسکرین نہ لگائے جائیں، یہ آدابِ مسجد کے منافی ہے اور اس سے مسجد میں انتشار اور فتنے کا اندیشہ ہے۔ مسجد میں سب نمازیوں کو اپنے اپنے انداز سے نوافل، تلاوت، ذکر واذکار اور درود وتسبیحات اور اَوراد پڑھنے کا حق حاصل ہے۔ اس سے کل یہ مقابلہ شروع ہو جائے گا کہ کسی اور عالم یا قائد کی تقریر بھی کلوز سرکٹ ٹیلیویژن کے ذریعے مسجد میں سنائی اور دکھائی جائے۔ رمضان المبارک میں کثیر تعداد میں معتکفین مساجد میں بیٹھتے ہیں، اعتکاف کی رُوح خلوت ہے، ان لوگوں کو اپنی عبادات یا قضا نمازیں پڑھنے سے محروم نہ کیا جائے۔ کسی بزرگ کے جو عقیدت مند ایسا کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے گھروں میں ایسا انتظام کر سکتے ہیں یا اجازت لے کر پارک میں کر سکتے ہیں، جو لوگ شوق اور عقیدت رکھتے ہیں، وہ وہاں جمع ہو جائیں گے۔ مذکورہ دینی تنظیم کی قیادت کو چاہیے کہ اپنے پُرجوش کارکنوں کو روکیں، نظم کا پابند کریں اور مساجدِ اہلسنت میں تنازعات پیدا نہ کریں۔ دعوتِ دین کو قرآن مجید نے حکمت کے ساتھ مشروط کیا ہے اور مقاصد شریعت میں "سَدِّ ذرائع" بھی ہے، یعنی ممکنہ شَر کا سَدِّ باب کرنا،

مُفاسِد اور خرابیوں کا راستہ روکنا۔ رسول پاک ﷺ نے بھی اسی دینی حکمت کے تحت اپنے بعض پسندیدہ امور کو ترک فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ بنائے قریش پر بنی ہوئی ''کعبۃ اللہ'' کی عمارت کو شہید کر دیں اور پھر اس میں ''حطیم'' کو شامل کر کے بنائے ابراہیم پر تعمیر کریں، اسلام کو حجاز میں غلبہ حاصل ہو چکا تھا اور آپ کے پاس مالی وسائل بھی تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: لَوْلَا حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْبَيْتَ وَلَجَعَلْتُهَا عَلَى أَسَاسِ إِبْرَاهِيمَ فَإِنَّ قُرَيْشًا حِيْنَ بَنَتِ الْبَيْتَ اِسْتَقْصَرَتْ وَلَجَعَلْتُ لَهَا خَلْفًا۔

ترجمہ: ''اگر تمہاری قوم نے نیا نیا کفر نہ چھوڑا ہوتا تو میں بیت اللہ کی عمارت کو منہدم کر دیتا اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر قائم کرتا، کیونکہ جب قریش نے اس کو بنایا تھا تو (وسائل کی کمی کے سبب ایک جانب سے) اس کو چھوٹا کر دیا تھا اور میں اس کی پچھلی جانب بھی ایک دروازہ بناتا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3227)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''پس ان امور میں ضابطۂ کلیہ واجبۃ الحفظ (یعنی ایسا ضابطہ وقانون شرعی جسے لازماً یاد رکھنا چاہئے) یہ ہے کہ فعل فرائض وترک مُحرَّمات (یعنی فرائض کو ادا کرنے اور حرام کاموں کے چھوڑنے) کو اِرضائے خَلق (لوگوں کی خوشنودی) پر مُقدَّم رکھے اور ان امور میں کسی کی مطلقاً پروا نہ کرے اور اِتیان مستحب (مستحب کو ادا کرنے) وترک غیر اولیٰ (غیر افضل کاموں کو چھوڑنے) پر مُداراتِ خَلق ومُراعاتِ قلوب (مخلوق کی دلداری) کو اہم جانے اور فتنہ ونفرت وایذا ووحشت کا باعث ہونے سے بہت بچے۔ اسی طرح جو عادات ورسوم خَلق میں جاری ہوں اور شرعِ مُطہّر سے اُن کی حرمت وشَناعت ثابت نہ ہو، اُن میں اپنے تَرَفُّع (بڑائی) وتنزُّہ (پاکبازی) کے لئے خلاف وجدائی نہ کرے کہ یہ سب امور اِیتلاف ومُوانست (لوگوں کے دلوں کو جوڑنے اور دین کی طرف مائل کرنے) کے معارض (خلاف) اور مرادِ محبوبِ شارع کے مناقض (خلاف) ہیں، ہاں! وہاں ہوشیار

وگوش دار (کان لگا کرسن) کہ یہ وہ نکتۂ جمیلہ وحکمتِ جلیلہ وکوچۂ سلامت وجادۂ کرامت ہے جس سے بہت زاہدانِ خشک واہلِ تکشف غافل وجاہل ہوتے ہیں، وہ اپنے زُعم میں محتاط ودین پرور بنتے ہیں اور فی الواقع مغزحکمت ومقصود شریعت سے دور پڑتے ہیں، خبردار ومُحکم گیر یہ چند سطروں میں علمِ غزیر (وافر علم) وباللہ التوفیق والیہ المصیر (یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے اور اسی کی طرف رجوع کرنا ہے)''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 4، ص: 528، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نوٹ: امام اہلسنت کی یہ عبارت نہایت دقیق ہے، عام اردوداں قاری کے لئے اس کا سمجھنا دشوار ہے، الفاظ واصطلاحات کافی مشکل ہیں، اس لئے ہم پہلے مشکل الفاظ کے معانی درج کریں گے اور اس کے بعد آسان عبارت میں اس کا مفہوم بیان کریں گے۔

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
واجبۃ الحفظ	جسے ضرور یادرکھنا چاہیے	فِعلِ فرائض	فرائض کا ادا کرنا
ترکِ مُحرّمات	حرام کاموں کو چھوڑنا	اِرضائے خَلق	مخلوق کی خوشنودی حاصل کرنا
اِتیانِ مُستحب	مستحب کو ادا کرنا	اَولیٰ	افضل، بہترین
ترکِ غیرِ اولیٰ	غیر افضل کام کو چھوڑنا	مُدارات خَلق	مخلوق کی دلداری
مراعاتِ قلوب	لوگوں کے جذبات کا خیال رکھنا	ایذا	اذیت دینا، تکلیف پہنچانا
رسومِ خلق	عوام کی رسمیں	شرعِ مُطہّر	پاکیزہ شریعت
شَناعت	عیب، برائی، قباحت	تَرَفُّع	اپنی برتری کا احساس
تَنَزُّہ	پاک دامنی کا دعویٰ کرنا	اِیتلاف	دلوں کو جوڑنا
مُوانست	باہم محبت کرنا	معارض	مقابل
مُناقض	ایک دوسرے کی ضد	گوش دار	کان لگا کرسن، توجہ سے سن
نکتہ	لطیف، باریک علمی بات	نکتۂ جمیلہ	خوبصورت نکتہ

حکمتِ جلیلہ	حکمت و دانائی کی بات	کوچۂ سلامت	سلامتی راستہ
جادۂ کرامت	عزت کا راستہ	اہلِ تکشّف	کشف کا دعویٰ کرنے والے، اس بات کا دعویٰ کرنے والے کہ وہ باطن پر نظر رکھتے ہیں
زُعم	غلط خیال	دین پرور	دین دار
محکم گیر	مضبوطی سے پکڑ	علم غزیر	وافر علم

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز کی اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے:

ان امور میں قاعدہ کلیہ جسے ضرور یاد رکھنا چاہئے یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی اور حرام کاموں سے بچنے کو مخلوق کی خوشنودی پر ترجیح دے اور ان امور میں کسی کی ناراضگی کی پروا نہ کرے، دینی حکمت کے تحت مخلوق کی دلداری اور ان کے جذبات کو مستحب کاموں پر ترجیح دے، یعنی لوگوں کی دلداری کی خاطر افضل کاموں کو چھوڑا جا سکتا ہے اور دینی مصلحت کے تحت بعض اوقات خلافِ اَولیٰ کام بھی کیا جا سکتا ہے۔ دین کے مبلغ کو لوگوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے سے گریز کرنا چاہئے، وہ لوگوں کے لئے اذیت اور دل آزاری کا سبب نہ بنے۔ اسی طرح لوگوں میں جو رسمیں اور طریقے جاری ہیں، اگر وہ شریعت کے خلاف نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں کوئی شرعی عیب ہے تو محض اپنی بڑائی ظاہر کرنے اور اپنی پاکدامنی ثابت کرنے کے لئے عام لوگوں سے ہٹ کر کوئی شعار اختیار نہ کرے، بلکہ لوگوں کے ساتھ ان رسوم میں شامل ہو۔ اگر وہ لوگوں کی عام روش سے ہٹ کر کوئی الگ راستہ اپناتا ہے تو یہ لوگوں کے دلوں کو دین کی طرف مائل کرنے کے مقصدِ خیر کے بالکل خلاف ہے۔ خبردار رہو، اس بات کو خوب توجہ سے سنو کہ یہ بہت خوبصورت باریک علمی نکتہ اور حکمت کی بات ہے اور دین کے معاملے میں سلامتی اور وقار کا راستہ ہے، جس سے بہت سے خشک مزاج زاہد اور باطنی کشف کا دعویٰ کرنے والے غافل اور جاہل ہوتے ہیں، وہ اپنے فاسد گمان میں بڑے دین دار بنتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ دین کی حکمت اور شریعت کے مقاصد سے

بہت دور ہوتے ہیں، اس حکیمانہ بات کو مضبوطی سے پکڑو، یہ چند سطریں ہیں، مگر اس میں علم کا بڑا خزانہ ہے۔

مسجد کے فنڈ سے مسجد کے عملے کو علاج معالجے کی سہولت دینا

سوال:39

مسجد کی رقم سے مسجد کے ملازمین (امام وخطیب، مؤذن، مدرس، خادم وغیرہ) کا علاج کیا جاسکتا ہے، نیز ان کی جائز ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مسجد کے فنڈ سے خرچ کیا جاسکتا ہے؟، (عابد علی دہلوی، صدر، جامع مسجد نورانی، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

مسجد کی جمع شدہ رقم مالِ وقف کہلاتی ہے، جو مصارفِ مسجد کے لئے استعمال کی جاتی ہے، جیسے مسجد کے عملے کا مشاہرہ اور مسجد کی دیگر ضروریات جو مسجد کے مفاد میں ہوں، تو ضرورت اور کفایت کے مطابق ان پر وقف کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ثُمَّ اِلیٰ مَاھُوَاَقرَبُ اِلَی الْعِمَارَۃِ وَاَعَمُّ لِلْمَصْلَحَۃِ کَالاِمَامِ لِلمسجدِ وَالْمُدَرِّسِ لِلْمَدْرَسَۃِ یُصْرَفُ اِلَیْھِمْ بِقَدْرِ کِفَایَتِھِم ثُمَّ السِّرَاجُ وَالْبُسُطُ کَذٰلِكَ اِلیٰ اٰخِرِ الْمَصَالِحِ، ھذا اذا لم یکن مُعَیّنا، فان کان الوقف مُعَیّنا علی شئی یصرف الیہ بعد عمارۃ البناء کذا فی الحاوی القدسی

ترجمہ: ''پھر وقف کے مال کو اُن امور پر ضرورت کے مطابق خرچ کیا جائے، جن سے مسجد کی زیادہ آباد کاری ہو اور مسجد کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہوں، جیسے مسجد کے لئے امام اور مدرسے کے لئے مُدَرِّس جن پر اس قدر رقم خرچ کی جائے جو ان کی ضروریات کے لئے کفایت کرے، پھر چراغ (یعنی روشنی) اور دریوں وچٹائیوں کا انتظام اور اسی طرح دوسری مفید چیزیں۔ وقف کے مال کو خرچ کرنے میں یہ (وسعت) اس صورت میں ہے کہ اس کا مصرف (واقف کی طرف سے) مُعَیَّن نہ ہو، لیکن اگر وقف کا مَصرف (واقف کی طرف سے) مُعَیَّن ہے تو عمارت کی تعمیر کے بعد اسی مصرف پر صرف کیا جائے گا'' الحاوی القدسی

میں اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:368، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مسجد کے عطیات صدقاتِ نافلہ ہوتے ہیں، لہٰذا اُن کا مصرف بننے کے لئے امام کا نادار ہونا شرط نہیں ہے۔ زکوٰۃ، فطر، فدیہ، کفارات اور صدقاتِ واجبہ کا مصرف بننے کے لئے نادار ہونا شرط ہے۔

آج کل مساجد کے لئے عوام سے جو چندے اور عطیات لئے جاتے ہیں، ان میں یہ امر معروف ہے کہ مسجد کے مصارفِ جاریہ جن میں مساجد کے (بجلی، گیس اور پانی وغیرہ کے) یوٹیلٹی بلز، ضرورت کے وقت رنگ روغن، دریاں، قالین، ٹیوب لائٹس، پنکھے، پانی وسیوریج کا انتظام اور مسجد کے عملے کی تنخواہیں اور مصارف سب شامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا انتظامیہ مسجد فنڈ سے امام یا دیگر عملے کی علاج کے لئے بھی اعانت کرسکتی ہے۔ مساجد کی انتظامیہ کے لئے بہتر صورت یہ ہے کہ وہ امام اور مسجد کے دیگر عملے کے ساتھ اجارہ کرتے وقت ان سہولتوں کو شامل کرلیں۔ البتہ جو رقم تعمیر یا کسی خاص مصرف کے لئے دی جائے یا لی جائے، اسے صرف اسی معیّن مصرف پر خرچ کرنا ضروری ہے۔

عام گزرگاہ کو روک کر قرآن کی تعلیم دینا

سوال:40

ہماری پانچ منزلہ بلڈنگ ہے جس میں 102 فلیٹ ہیں اور آنے جانے کے لئے دو سیڑھیاں ہیں، جن کے درمیان آنے جانے کا راستہ ہے۔ چند حضرات نے اُس راستے کو بند کرکے قرآن کی تعلیم دینے کا انتظام کیا ہے۔ ابتداءً پندرہ بیس منٹ تعلیم دیتے تھے، اب آہستہ آہستہ دو گھنٹے تعلیم دینا شروع کردی ہے اور اِس طرح لوگوں کی آمد ورفت کا راستہ بند ہوگیا ہے۔ لوگوں کو پریشان کرکے اور راستہ بند کرکے قرآن کی تعلیم دینا درست ہے؟۔

(محمد قاسم سلیمان، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

عام گزرگاہ اور راستے کو بند کرکے قرآن مجید کی تعلیم دینا نامناسب ہے، ایسے لوگوں

کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد مبارک ہے: ''کَلِمَةُ الْحَقِّ اُرِیْدَ بِهَا الْبَاطِلُ'' یعنی یہ بات اپنی جگہ حق ہے لیکن اس سے باطل معنی مراد لیا جا رہا ہے''۔ عام گزرگاہ پر سب کا حق برابر ہوتا ہے، جسے ''حقِ مُرُور'' (Right of Passage) کہتے ہیں۔ کثیر المنزلہ بلڈنگ کی سیڑھیوں کی حیثیت بھی عام گزرگاہ کی ہوتی ہے اور کسی کو اسے روکے رکھنے یا وہاں گھنٹوں جم کر بیٹھنے کا حق نہیں ہے۔ حدیث پاک میں شارع عام پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے:

عَنِ ابنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم نَهٰى اَنْ يُصَلّٰى فِي سَبْعَةِ مَوَاطِنَ فِي الْمَزْبَلَةِ، وَالْمَجْزَرَةِ، وَالْمَقْبَرَةِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ، وَفِي الْحَمَّامِ، وَفِي مَعَاطِنِ الْإِبِلِ، وَفَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ اللهِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات مقامات پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا: کوڑے خانہ، ذبح خانہ (Butchery)، قبرستان، عام گزرگاہ (شارع عام)، حمام، مویشی خانہ اور بیت اللہ کی چھت''۔

(سُنَن ترمذی، رقم الحدیث: 346)

ان میں سے بیت اللہ کی چھت پر نماز پڑھنے سے ممانعت کا سبب بیت اللہ کا ادب واحترام ہے، شارع عام پر نماز پڑھنے کی ممانعت کا سبب عام لوگوں کے لئے دشواری پیدا ہونا اور لوگوں کے آنے جانے کے حق (حقِ مُرُور) میں رکاوٹ بننا ہے، قبرستان میں اگر قبر کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی جائے (یعنی مقامِ سجدہ کے آگے قبر ہو) تو بت پرستی سے مشابہت کی بنا پر حرام ہے اور باقی مقامات پر ناپاکی کا احتمال ہے اور وہاں پر نماز پڑھنا نماز کی تقدیس کے منافی ہے۔ نمازِ جنازہ کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''تکرہ فی الشارع واراضی الناس کذا فی المضمرات''

ترجمہ: ''سڑک پر اور لوگوں کی زمین پر (بلا اجازت ومنظوری) نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج: 1، ص: 165، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

لہٰذا قرآن مجید کی تعلیم دینا یا دینی مسائل بتانا یقیناً اجر کی بات ہے، لیکن اس کے لئے عام گزرگاہ کو روک کر بیٹھنا درست نہیں ہے، جبکہ وہاں سے خواتین کو بھی اپنی ضروریات کے لئے گزرنا ہوتا ہے، اس کے لئے الگ باوقار جگہ کا انتظام کیا جائے۔

مسجد کو ہبہ کئے گئے مکان کی فروخت

سوال:42

ہمارے پاس مسجد کے مکانات ہیں، یہ مکان مسجد سے بالکل ہٹ کر ہیں، اُن میں سے ہم ایک مکان بیچنا چاہتے ہیں، کیونکہ ہم مسجد کی ضرورت کے تحت مسجد کے کچھ حصے کی ازسرنو تعمیر کرانا چاہتے ہیں اور ہمارے پاس فنڈ کی کمی ہے اور یہ مکان فروخت کر کے اس کمی کو پورا کر سکتے ہیں، یہ مکان ایک صاحب نے مسجد کے نام پر تحفتاً دیا تھا اور اب ان کا انتقال ہو چکا ہے اور ہم اس مکان کو مسجد کے نام پر لیز کرا چکے ہیں۔ کیا ہم اس مکان کو بیچ کر اس کی رقم مسجد کی تعمیر میں لگا سکتے ہیں؟، (انتظامیہ جامع مسجد محمدی، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

مذکورہ صورت میں یہ تعیّن کرنا ضروری ہے کہ مذکورہ مکانات مسجد کو ہبہ کئے گئے یا وقف، دونوں صورتوں میں احکام جدا ہوں گے، اگر مکانات وقف ہیں تو اُن کی بیع ناجائز ہے علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وفی الفتاویٰ النسفیة سئل عن أهل المحلة باعوا وقف المسجد لاجل عمارة المسجد قال لایجوز بامر القاضی وغیرہ کذا فی الذخیرة

ترجمہ: ''فتاویٰ نسفی میں ہے، آپ سے سوال کیا گیا کہ اہلِ محلہ مسجد کے وقف شدہ مال کو عمارت مسجد کے لئے فروخت کر سکتے ہیں، آپ نے فرمایا: قاضی یا کسی اور کے حکم سے (بھی) جائز نہیں ہے، ''ذخیرہ'' میں بھی اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:464، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

وقف کے متعلق حکم یہ ہے کہ اُسے نہ تو بیچا جاسکتا ہے نہ ھبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُس

میں وراثت جاری ہوتی ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فیلزم ولا یباع ولا یوھب ولا یورث کذا فی الھدایۃ۔

ترجمہ: ''پس (وقف) لازم ہوجاتا ہے، نہ تو اُسے بیچا جاسکتا ہے، نہ ھبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُس میں وارثت جاری ہوتی ہے، ہدایہ میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2 ص: 350، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال کیا گیا کہ ''کیا وقف شدہ جائیداد جو کہ کسی بھی مسجد میں واسطے ایصالِ ثواب کے واقف نے وقف کی ہو، بِک سکتی ہے یا نہیں اور کسی بھی متولی کو کبھی اس اوقاف کے بیچنے یا بیع کرنے کا حق ہے یا نہیں؟، جبکہ واقف نے اوقاف کو اس طرح وقف کیا ہو کہ اگر متولیِ مسجد اس بات کی ضرورت محسوس کرے کہ یہ جائیداد بیچ کر اِصراف مسجد میں لائے تو متولی مسجد کو اختیار ہے کہ بیچ دے، اس حالت کا کیا حکم ہے؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''جائیداد موقوفہ کی بیع نہیں ہوسکتی البتہ جائیداد موقوفہ کو دوسری جائیداد سے بدل سکتے ہیں جبکہ واقف نے وقف میں استبدال (تبادلے) کی شرط ذکر کردی ہو۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں: واقف نے اگر ان لفظوں سے وقف کیا ہے تو اس سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اسی جائیداد کی قیمت مسجد پر صرف کی جائے نہ یہ کہ اس کی آمدنی صرف ہو اور چیز باقی رہے اور یہ مسجد کے نام ہبہ یا تصدُّق ہوگا کہ متولی کے قبضہ کرلینے پر تمام ہوگا، فتاویٰ قاضی خان میں ہے: رجل تَصدَّق بدارہٖ علی المسجدِ اوعلی طریق المسلمین تکلّموا فیہ والفتویٰ علی انہ یجوز۔

ترجمہ: ''ایک شخص نے اپنا گھر مسجد پر صدقہ کیا یا مسلمانوں کے راستے کے لئے، علماء نے اس میں کلام کیا ہے (یعنی علماء کی آراء مختلف ہیں) اور فتویٰ اس پر ہے کہ اسے مسجد (کی ضروریات پر صرف کرنا) جائز ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: لوقال وھبتُ داری للمسجدِ او اعطیتُھا لہٗ صَحّ ویکونُ تملیکاً فیشرط التسلیمُ۔ تو اگر اس صورت میں داخل کرکے اسے بجائے وقف ہبہ تصور

کیا جائے تو اب یہ مسجد کی ایک چیز ہوگی۔ واہب کی شرط وغیرہ کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ حقیقۃً اگر مسجد کو ضرورت ہے تو متولی دیگر مسلمانوں سے رائے لے کر مسجد پر صرف کرلے اپنے آپ بغیر مشورہ مسجد کی اشیاء کو نہیں بیچنا چاہئے، مسجد کی چیزیں فروخت کرنے کے لئے اذنِ قاضی کی ضرورت ہے مگر چونکہ یہاں قاضی موجود نہیں، اہلُ الرائے اور سمجھدار اور قابل اطمینان مُتَدَیّن مسلمانوں سے رائے لے کر ایسا کرنا، امید ہے کہ کافی ہو اور اس کے مواخذہ سے بچ جائے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد سوم، ص: 28-30)''۔

اگر مذکورہ مکان واقف (وقف کرنے والوں) نے اس صراحت کے ساتھ مسجد کو تصدُّق یا ہبہ کئے ہوں کہ مسجد کے لئے جس طرح چاہیں صرف کریں، ضرورت ہو تو فروخت بھی کردیں تو ان کو فروخت بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر مطلقاً مسجد کے لئے وقف کئے ہوں تو ان کی بیع نہیں کی جاسکتی۔ آپ نے سوال میں لکھا ہے کہ جس مکان کو آپ بیچنا چاہتے ہیں وہ مکان دینے والے شخص نے مسجد کو تحفتاً دیا تھا تو مسجد کے ٹرسٹیوں کی منظوری سے یہ مکان مسجد پر تصدُّق یا ہبہ کہلائے گا اور اسے فروخت کر کے اِس کی رقم مسجد پر صرف کی جاسکتی ہے۔

وقف کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا

سوال:43

ایک مسلمان نے ایک پلاٹ اس نیت سے خریدا کہ اس پر دینی مدرسہ قائم کرے گا، کچھ دوستوں کو بھی گواہ کیا اور زبانی وقف بھی کیا۔ مدرسہ قائم ہوگیا، عرصہ 25 سال سے درس و تدریس، طلباء کی رہائش، تعمیری کام مسلمانوں کے عطیات، زکوٰۃ، صدقات اور چرمِ قربانی وغیرہ سے کئے جاتے رہے۔ اب شخصِ مذکور کے دل میں بے ایمانی پیدا ہوگئی اور مذکورہ مدرسہ کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ اسلامی شرعی نقطۂ نگاہ سے اس کی کیا حیثیت ہے؟۔

(احمد رضا سعیدی، استاذ شعبہ علوم اسلامی کراچی یونیورسٹی)

جواب:

کسی چیز کو ایک مرتبہ وقف کئے جانے کے بعد وقف سے رجوع درست نہیں۔ وقف

کرتے وقت وہ شے واقف کی مِلک ہے تو وقف صحیح ہوگیا اور وقف مکمل ہونے کے بعد یہ پلاٹ واقف (وقف کرنے والے) کی ملکیت سے خارج ہوگیا اور واقف کو بھی اُس میں تبدیلی کی اجازت نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یجوز تغییر الوقف عن ھیئتہ، ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں''۔

(فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

وقف کے معنی ہیں: ''کسی شے کو اپنی مِلک سے خارج کر کے خالص اللہ تعالیٰ کی مِلک کردینا'' کہ اُس کا نفع بندگانِ خدا کو ملتا رہے، وقف کو نہ تو باطل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُسے فروخت کیا جاسکتا ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: فیلزم ولا یُباعُ ولا یُوھبُ ولا یُورَثُ کذا فی الھدایۃ

ترجمہ: ''پس جب (وقف) لازم ہوجاتا ہے تو اُسے نہ تو بیچا جاسکتا ہے، نہ ھبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُس میں وراثت جاری ہوتی ہے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2 ص:350، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: فَاِذَا تَمَّ ولَزِمَ لَا یُمَلَّکُ ولا یُعَارُ ولا یُرھَنُ

ترجمہ: ''پس جب وقف تام (مکمل) ہوجائے تو نہ تو کسی کو اس کا مالک بنایا جاسکتا ہے، نہ اسے عاریتاً دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے رہن رکھا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (لایُمَلَّکُ) أی لایکون مملوکا لصاحبہ ولایُمَلَّکُ أی لایقبل التملیک لغیرہ بالبیع ونحوہ لاستحالۃ تملیک الخارج عن ملکہ ولا یعار، ولایرھن لاقتضائھما الملک۔

ترجمہ: ''(وہ کسی کی مِلک نہیں بنے گا) یعنی وقف کرنے والے کی ملکیت میں بھی نہیں رہے گا اور کسی دوسرے کو (بھی) خرید وفروخت وغیرہ سے اِس کا مالک نہیں بنایا جاسکے گا، کیونکہ جو چیز کسی کی اپنی مِلک سے نکل جائے، کسی دوسرے کو اس کا مالک بنانا ناممکن ہے، اسے عاریتاً بھی نہیں دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی رہن رکھا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں مِلک کا تقاضا

کرتی ہیں، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص: 421، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

وقف مکمل ہونے کے بعد اُسے تبدیل کرنا یا ختم کرنا جائز نہیں ہے اور شرعاً وقف میں تبدیلی کرنا حرام ہے اور تبدیلی کرنے والا سخت گناہ گار ہے۔ البتہ وقف کرنے والے کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ وہ مصارفِ وقف کا تعین کرے اور اس سلسلے میں اسلامی فقہ کا مسلّمہ اصول ہے: شرط الواقف کنَصِّ الشارع، "یعنی واقف کی مقررہ شرائط قرآن وسنت کی نَص کی طرح شرعاً مؤثر ہوتی ہیں"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص: 508، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

ایک سے زائد متولیان کی حیثیت

سوال: 44

متولی کسے کہتے ہیں اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، ایک ادارہ جس کی بنیاد رکھنے والے دو صاحبان ہوں اور ادارہ چلانے میں دونوں کی حیثیت برابر رہی ہو، ایک بطور مہتمم اور دوسرا بطور ناظمِ اعلیٰ تو متولی کسے مانا جائے گا؟

(احمد رضا سعیدی، استاذ شعبہ علوم اسلامی کراچی یونیورسٹی)

جواب:

واقف (وقف کرنے والے) یا قاضی کی جانب سے اوقاف کی نگرانی پر مامور شخص کو مُتولّی کہتے ہیں۔ مُتولّی ایسے کو مقرر کرنا چاہئے جو امانت دار ہو اور وقف کے کام کرنے پر قادر ہو، خواہ خود ہی کام کرے یا اپنے نائب سے کرائے، عاقل و بالغ ہونا بھی شرط ہے۔

علامہ امجد علی اعظمی مُتولّی کی صفات کے بارے میں لکھتے ہیں: مُتولّی ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جو کارِ تولیت کو بخوبی انجام دے سکے۔ دین دار اور متدیّن ہو، خائن نہ ہو، اگر اس کی خیانت ثابت ہو اور تولیت کا کام اچھی طرح انجام نہ دیتا ہو تو اسے معزول کر کے دوسر شخص متولی کیا جائے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد سوم، ص: 53)"۔

اگر مذکورہ شرائط واقف میں پائی جاتی ہوں تو واقف خود بھی مُتولّی بن سکتا ہے،

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (جعل) الواقف (الولایة لنفسه جاز) بالاجماع وکذا لو لم یشترط لاحد فالولایة له عند الثانی، وهو ظاهر المذهب "نهر"۔

ترجمہ: "واقف نے خود کو متولی مقرر کیا تو یہ بالاجماع جائز ہے اور اسی طرح اگر واقف نے کسی کو وقف کا منتظم (مُتولّی) مقرر کرنے کی شرط عائد نہ کی ہو تو امام ابویوسف کے نزدیک واقف ہی کے لئے ولایت ثابت ہوگی، یہی ظاہر مذہب ہے، بحوالہ النہر الفائق"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص: 451-452، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

جب مُتولّی دو شخص مقرر کیے گئے ہوں تو ان میں سے تنہا ایک شخص وقف میں کوئی تصرُّف نہیں کرسکتا، جتنے کام ہوں گے، دونوں کی مجموعی رائے سے انجام پائیں گے۔ اور اگر ان میں سے ایک نے کوئی کام کرلیا اور دوسرے نے اسے جائز قرار دیا یا ایک نے دوسرے کو وکیل مقرر کردیا اور اس نے اس کام کو انجام دیا تو جائز ہے کہ دونوں کی شرکت ہوگئی۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

واذا جعل الواقف الولایة الی اثنین أو صارت الولایة الی الوصی والمتولی لم یکن لاحدهما بیع غلة الوقف وینبغی علی قول أبی حنیفه رحمه الله تعالیٰ أن یکون له ذلك فان باع أحدهما وأجاز الآخر أو وکل أحدهما صاحبه به جاز وکذا فی الحاوی۔

ترجمہ: "جب واقف نے مُتولّی دو افراد کو بنایا ہو یا تولیت وصی اور متولی کے سپرد کی گئی ہو تو ان میں کسی کو اکیلے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ وقف کے غلے کو فروخت کردے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر مناسب ہے کہ اسے یہ حق حاصل ہو اور اگر ایک نے فروخت کیا اور دوسرے نے اسے درست قرار دیا یا ایک نے دوسرے کو اپنی طرف سے وکیل بنادیا ہو تو جائز ہے، "حاوی" میں اسی طرح ہے"۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 410، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ ایک سے زیادہ مُتولّی مقرر کرسکتے ہیں یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: متولی متعدد بھی ہوسکتے ہیں، وہ سب مل کر کام کریں گے ہر ایک مستقل نہ ہوگا۔ مزید سوال کیا گیا کہ جب واقفین میں اختلاف ہو،

بعض زید کو متولی کریں بعض عمرو کو تو اکثر کو ترجیح ہے یا اقل کو، اور برتقدیر مساوات کس کو اختیار نصب متولی کا ہے؟۔ آپ نے جواب میں لکھا: "ظاہر یہ ہے کہ صورتِ مذکورہ میں زید وعمرو دونوں متولی ہوجائیں گے اور مل کر کام کریں گے کہ نصبِ متولی کی ولایت واقف کو ہے۔ تنویر الابصار میں ہے: وِلَایَۃُ نَصب القَیِّم الی الواقف، "یعنی متولی مقرر کرنے کی ولایت واقف کو ہے۔ اور وہ سب واقف ہیں اور نصبِ متولی مُتجزّی نہیں (یعنی یہ اختیار ایک کل ہے یہ اجزاء میں نہیں ہوتا) تو ہر ایک کو اختیار کامل ہے تو دونوں متولی ہوجائیں گے"۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 16، ص:606، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

ادارے کے قواعد وضوابط (By Laws) پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں، آپ نے یہ واضح نہیں کیا کہ آیا یہ ادارہ ٹرسٹ (وقف) ہے یا انجمن (Association)۔ بہرصورت بورڈ آف ٹرسٹیز یا انجمن کے عہدیداران کا دائرۂ کار اور اختیارات رجسٹرڈ ٹرسٹ ڈیڈ یا ایسوسی ایشن کے میمورنڈم میں پہلے سے طے ہوتے ہیں اور اپنے دستوری میثاق کے اعتبار سے وہ سب اس کے پابند ہوتے ہیں۔ اس میں فرائض واختیارات کا پہلے سے تعین ہوتا ہے۔ عہدیداران کی اہلیت اوران کے تقرر ومعزولی (Appointment and Dismissal) کا طریقۂ کار بھی طے ہوتا ہے، لہٰذا سب اس کے پابند ہوتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ ادارے کے بانی دو ہیں، حالانکہ عام طور پر پوری ہیئت انتظامیہ (Establishment) ہوتی ہے، جو عہدیداران اور مجلسِ عاملہ پر مشتمل ہوتی ہے۔

مدرسے کے لئے وقف پلاٹ کی تبدیلی

سوال:45

عرصہ 25 سال قبل ایک پلاٹ ایک شخص نے ایک دینی مدرسے کے نام بذریعہ سائل وقف کردیا اور اس پر دینی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ پلاٹ کے چاروں اطراف موجود پلاٹ فروخت ہوگئے، جسکی وجہ سے مذکورہ پلاٹ کی گلی کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ پلاٹ بالکل بند ہوکر رہ گیا اور درس وتدریس کا سلسلہ بھی بند ہوگیا۔ سائل چاہتا ہے کہ مذکورہ پلاٹ فروخت کرکے

اس کے عوض کہیں دوسری جگہ پلاٹ خرید کر دینی درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا جائے۔
شرعی نقطۂ نظر سے وضاحت فرمائیں کہ کیا شرعاً یہ درست ہے؟۔
(احمد رضا سعیدی، استاذ شعبہ علوم اسلامی کراچی یونیورسٹی)

جواب:

اگر مذکورہ پلاٹ اُس شخص نے وقف کر دیا تھا تو اُسے فروخت کرنا جائز نہیں، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: فیلزم ولایباع ولایوھب ولایورث کذا فی الھدایۃ
ترجمہ: ''جب (وقف قائم ہوجائے) تو وہ لازم ہوجاتا ہے اسے نہ تو بیچا جاسکتا ہے، نہ ھبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں وراثت جاری ہوتی ہے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے''۔
(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2 ص: 350، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

ہاں! جبکہ واقف (وقف کرنے والے) نے وقف میں (کسی دوسری جائیداد کے عوض) تبدیل کرنے کی شرط ذکر کردی ہو تو اُسے دوسری جائیداد سے بدلا جاسکتا ہے، تبادلے کی شرطوں میں ایک شرط یہ ہے کہ جائیداد غیر منقولہ سے تبادلہ ہو، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: جاز شرط الاستبدال بہ أرضا أخریٰ
ترجمہ: ''(وقف میں) دوسری زمین کے ساتھ تبادلے کی شرط لگانا جائز ہے''۔
(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص: 457، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

آباد وقف کو بدلنے کی چار صورتیں فقہاء نے بیان کی ہیں، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (لایستبدل العامر الا فی أربع) الاولیٰ: لو شرطہ الواقف، الثانیۃ: اذا غصبہ غاصب وأجری علیہ الماء حتی صار بحراً فیضمن القیمۃ، ویشتری المتولی بھا أرضا بدلاً، الثالثۃ: أن یجحدہ الغاصب ولا بینۃ أی وأراد دفع القیمۃ فللمتولی أخذھا لیشتری بھا بدلاً۔ الرابعۃ: أن یرغب انسان فیہ ببدل أکثر غلۃ وأحسن صقعا، فیجوز علی قول أبی یوسف، وعلیہ الفتویٰ کما فی: فتاویٰ قارئ الھدایۃ قال صاحبُ النھر فی کتابہ: ''اجابۃ السائل'' قول قارئ الھدایۃ والعمل علی قول

ابی یوسف معارض مماقاله صدر الشریعة نحن لانفتی به

ترجمہ: ''(چار صورتوں کے علاوہ آباد وقف کو تبدیل کرنا جائز نہیں، ان چار صورتوں میں سے) پہلی صورت یہ ہے کہ خود واقف نے تبدیل کرنے کی شرط لگائی ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی غاصب نے اُسے غصب کر کے اس پر پانی جاری کر دیا یہاں تک کہ وہ وقف دریا بن جائے تو اس صورت میں غاصب قیمت کا تاوان دے گا اور متولی اس قیمت کے بدلے دوسری زمین خریدے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ غاصب (وقف کا) انکار کرتا ہے اور گواہ نہیں ہیں، یعنی غاصب زمین کی قیمت دینے پر آمادہ ہے تو متولی کو اختیار ہے کہ اس سے قیمت وصول کرلے تا کہ اس کے بدلے دوسری زمین خرید لے۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص وقف زمین کے بدلے میں ایسی زمین میں رغبت رکھتا ہے جو غلہ (یعنی پیداوار) کے اعتبار سے وقف زمین سے زیادہ پیداوار دیتی ہے اور محلِ وقوع کے اعتبار سے زیادہ خوبصورت ہے، تو امام ابو یوسف کے قول پر اسے تبدیل کرنا جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، جیسا کہ فتاویٰ ''قاری الہدایہ'' میں ہے۔ صاحبِ ''نہر'' نے اپنی کتاب ''اجابۃ السائل'' میں فرمایا: ''قاریٔ الہدایہ'' کا کہنا کہ عمل امام ابو یوسف کے قول پر ہے، صدر الشریعہ کے اس قول کے مخالف ہے، ہم اس پر فتویٰ نہیں دیتے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص: 460، مطبوعہ: دار احیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے وقف کو تبدیل کرنے کی شرائط کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے جواب میں لکھا:

قال العلامة البیری بعد نقله اقول وفی فتح القدیر الموجب الشرط او الضرورة ولا ضرورة فی هذا اذلا تجب الزیادة بل نبقیه کماکان، اقول ماقاله هذا المحقق هوالحق الصواب، کلام البیری وهذا ماحرره العلامة القنالی مافی ردالمحتار مختصراً، ورأتنی کتبت علی هامش قوله واجری علیه الماء حتی صار بحرا مانصه، اقول علی هذا لم یبق عمارا وفیه کلام، والصورة الرابعة سیأتی ان الحق

عدم جواز الاستبدال فیھا فلم یبق الاصورتان، بل لك ان تقول الثالثة ایضا خراب معنی وان لم یکن صورة فلك ان تقول ان العامر لایستبدل الابشرط کما ھو قضیة ماحقق المحقق فی الفتح حیث حصرہ فی الشرط اوضرورة خروجه من الانتفاع به وان شئت اوضحت فقلت ان الوقف مھما امکن الانتفاع به لم یجز استبداله الا بالشرط۔

ترجمہ:"علامہ بیری نے اس کو نقل کرنے کے بعد کہا: میں کہتا ہوں اور فتح القدیر میں ہے: استبدال (وقف کو تبدیل کرنے) کا موجب یا تو شرطِ استبدال ہے یا ضرورتِ استبدال، جبکہ یہاں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ وقف پر زیادتی واجب نہیں بلکہ ہم اس کو پہلی حالت پر باقی رکھیں گے۔ میں کہتا ہوں جو کچھ اس محقق نے کہا وہی حق اور درست ہے۔ کلام البیری اور یہ وہ ہے جس کو علامہ قنالی نے تحریر کیا ہے، مختصراً ردالمحتار میں ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے شامی کے قول "غاصب نے زمین وقف پر پانی بہایا یہاں تک کہ وہ دریا بن گئی" پر یوں حاشیہ لکھا کہ میں کہتا ہوں اس صورت میں وہ آباد نہ رہی حالانکہ کلام تو آباد زمین میں ہو رہا ہے اور عنقریب چوتھی صورت کے بارے میں آ رہا ہے کہ اس میں حق استبدال کا عدمِ جواز ہے، تو اب صرف دو ہی صورتیں باقی رہیں بلکہ تو کہہ سکتا ہے کہ تیسری صورت میں اگرچہ زمین میں صورتاً غیر آباد ہونا نہیں ہے لیکن معنیً غیر آباد ہونا ہے، لہٰذا (اے مخاطب!) تو کہہ سکتا ہے کہ آباد زمین کے وقف میں تبدیلی نہیں کی جائے گی، سوائے اس کے کہ واقف نے خود تبدیل کرنے کی شرط لگادی ہو، جیسا کہ فتح القدیر میں مذکور کلامِ محقق کا تقاضا ہے جہاں اس نے تبدیل کرنے کو شرط یا انتفاع سے خارج ہونے کی ضرورت میں منحصر کیا ہے اگر تو وضاحت کا طلبگار ہے تو میں کہتا ہوں کہ جب تک وقف سے انتفاع ممکن ہو بلا شرط اس کو تبدیل کرنا جائز نہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 16، ص: 269، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

امام ابویوسف کے نزدیک وقف زمین کے مقابل دوسری زمین محل وقوع کے اعتبار سے پہلی زمین سے زیادہ خوبصورت ہو تو وقف کا تبدیل کرنا جائز ہے یا جب اُس زمین سے

انتفاع ممکن نہ رہے تب واقف کی طرف سے تبدیل کرنے کی شرط کے بغیر بھی بدلنا جائز ہے۔
پس صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو چونکہ مذکورہ پلاٹ دینی مدرسے کے قیام کے لئے وقف کیا گیا تھا اور اب اردگرد کی زمین فروخت ہونے کی وجہ سے وہ پلاٹ محصور ہوگیا ہے اور آمدورفت کا راستہ نہ ہونے کی وجہ سے اس سے جو منفعت مطلوب تھی (یعنی مدرسے کا قیام اور اس میں درس وتدریس کا جاری رہنا) وہ عملاً ممکن نہیں رہا، اس لئے اس کا کسی دوسرے ایسے پلاٹ سے تبدیل کرنا جائز ہے، جہاں واقف کا مقصد پورا ہوسکتا ہے اور وہ قابلِ انتفاع ہو۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی بحث کا خلاصہ یہ لکھا ہے:
''ہاں جو وقف ویران اور خراب ہوجائے تو قاضی الشرع حاکم اسلام عالم عادل متدین خدا ترس کو بلاشرطِ واقف بلکہ باوصفِ منعِ واقف بھی اسے بیچ کر دوسری جائیداد اسی غرض کے لئے اس کے قائم مقام کردینے کی اجازت ہے۔۔۔۔، (فتاویٰ رضویہ، جلد:16،ص:271)''۔
لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سائل کے بیان کے مطابق اگر مذکورہ وقف پلاٹ بالکل محصور ہے تو ایسے محصور پلاٹ کو کوئی اور شخص کیوں خریدے گا؟ ہم نے اصولی مسئلہ بیان کردیا ہے، اس کا صحیح شرعی اطلاق صاحبِ معاملہ کی اپنی دیانت پر موقوف ہے اور ہر شخص اپنے ہر قول وفعل کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہے۔

میت اور جنازہ کے مسائل

کیا غسّال پر غسل یا وضو واجب ہے؟

سوال:46

کیا میت کو غسل دینے والے شخص پر غسل واجب یا فرض ہے؟

(محمد یوسف، گارڈن ٹاؤن، کراچی)

جواب:

سب سے پہلے چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللہ ﷺ مَنْ غَسَّلَ مَیِّتاً فَلْیَغْتَسِلْ،

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص میت کو غسل دے، اسے چاہئے کہ غسل کرے، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:1463)

(۲) عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ مِنْ غُسْلِہِ الْغُسْلُ، وَمِنْ حَمْلِہِ الْوُضُوْءُ، یَعْنِی الْمَیِّتَ،

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میت کو غسل دینے سے غسل لازم آتا ہے اور میت کو اٹھانے سے وضو لازم آتا ہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:995)''۔

اس کے تحت علامہ ترمذی لکھتے ہیں: میت کو غسل دینے والے کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے، بعض اصحاب رسول اور دیگر اہلِ علم کا قول ہے کہ جب کوئی کسی میت کو غسل دے تو اس پر غسل لازم ہے، اور امام مالک بن انس نے کہا: میت کو غسل دینے والے کے لئے غسل کرنا مستحب ہے اور میں اسے واجب نہیں سمجھتا، امام شافعی کا بھی یہی قول ہے اور امام احمد کا قول ہے: جس نے میت کو غسل دیا میرا خیال ہے کہ اس پر غسل واجب نہیں ہے، جہاں تک غسّال میت پر وضو واجب ہونے کی بات ہے، تو اس مسئلے میں بہت کم کلام کیا گیا ہے، امام اسحاق کا قول ہے کہ وضو ضروری ہے اور حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میت کو غسل دینے والے پر نہ تو غسل ہے نہ ہی وضو ہے، (سنن ترمذی، ص:304)۔

(۳) عَنْ عَائِشَۃَ اَنَّھَا حَدَّثَتْہُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَغْتَسِلُ مِنْ اَرْبَعٍ مِنَ الْجَنَابَۃِ،

وَيَوْمِ الْجُمُعَةِ، مِنَ الْحِجَامَةِ وَمِنْ غُسْلِ الْمَيِّتِ۔

ترجمہ: حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ چار چیزوں پر غسل فرمایا کرتے تھے، جنابت کی وجہ سے، جمعہ کے دن، فسد یا پچھنے لگانے سے اور غسلِ میت سے"۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:3152)

(۴) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ مَنْ غَسَّلَ الْمَيِّتَ فَلْيَغْتَسِلْ، وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّاءْ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو میت کو غسل دے تو اسے چاہئے کہ غسل کرے اور جو میت کو اٹھائے تو اسے چاہئے کہ وضو کرے"۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:3153)

اس حدیث کی شرح میں شیخ خلیل احمد سہارنپوری لکھتے ہیں:

قَالَ الخطابي: قلتُ لا اعلمُ أَحَدًا مِّنَ الْفُقَهَآءِ يُوْجِبُ الْاِغْتِسَالَ مِنْ غُسْلِ الميت ولا الوضوٴ من حمله ويشبه ان يكون الامر في ذلك على الاستحباب، وقد يحتمل أن يكون المعنى أن غاسل الميت لايكاد يأمن ان يصيبه نضح من رشاش المغسول، وربما كان على بدن الميت نجاسة، فاذا اصابه نضحه، وهو لا يعلم مكانه كان عليه غسل جميع البدن ليكون الماء قد أتى على الموضع الذي أصابه النجس من بدنه وقد قيل في معنى قوله فليتوضأ أي ليكن على وضوء ليتهيأ له الصلاة على الميت، والله اعلم

ترجمہ: "خطابی نے کہا: میں کسی ایک فقیہ کو بھی نہیں جانتا، جس نے محض میت کو غسل دینے والے پر غسل کو واجب قرار دیا ہو اور نہ ہی کسی ایسے فقیہ کو جانتا ہوں جس نے میت اٹھانے پر وضو کو واجب قرار دیا ہو، اس لئے ان احادیث میں امر استحباب پر مبنی ہے یا زیادہ سے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے کہ غسل دینے والا بعض اوقات میت کو غسل دیتے وقت اس کے غُسالہ (غسل دیتے وقت میت کے بدن سے بہنے والے پانی) کی چھینٹوں سے (بے

احتیاطی کی بنا پر) بچ نہیں پاتا اور بعض اوقات میت کے بدن پر نجاست ہوتی ہے، جب غسل دینے والے پر اس نجاست کی جگہ کے چھینٹے پہنچیں گے اور اسے اپنے جسم کی وہ جگہ بھی معلوم نہیں (کہ محض اسی جگہ کو دھولے)، تو اسے پھر سارے بدن کو دھونا پڑے گا، اور بعض (شارحینِ حدیث) نے حدیث کے ان الفاظ: ''جو میت کو اٹھائے، اسے چاہئے کہ وضو کرے'' کی تشریح یہ کی ہے کہ وہ پہلے سے باوضو رہے تاکہ نمازِ جنازہ پڑھنے کے لئے تیار رہے (اور جنازے کے وقت پھر وضو کے لئے بھاگ دوڑ نہ کرنی پڑے)، واللہ اعلم، اور حدیث کی سند میں بھی کلام کی گنجائش موجود ہے۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔۔ابوداؤد نے کہا:

امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا گیا کہ غسل میت سے غسل لازم آتا ہے یا نہیں؟ تو میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا، اس کے لئے وضو ہی کافی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک غسل ثابت نہیں ہے''۔ (بذل المجہود فی حل ابی داؤد جلد 14 ص: 128-129، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ محض غسلِ میت سے غسل دینے والے پر غسل واجب نہیں ہوتا اور نہ ہی میت کا جنازہ اٹھانے سے وضو لازم آتا ہے، ہاں اگر کسی نے میت کو غسل دیتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا اور اسے اندیشہ ہو کہ میت کا بدن ناپاک تھا اور اس کے چھینٹے اس کے بدن پر پڑ گئے ہوں گے، اگر ان ناپاک چھینٹوں کی جگہ معلوم ہو تو اس کا دھولینا کافی ہے، ورنہ احتیاطاً سارا بدن دھولے۔ لیکن اگر کسی نے احتیاط سے غسل دیا ہے، اس کے بدن یا لباس پر ناپاک چھینٹے نہیں پڑے تو اسے غسل کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح جنازہ اٹھانے سے وضو لازم نہیں آتا اور اگر پہلے سے باوضو ہے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، حدیث کا منشاء یہ ہے کہ جب نمازِ جنازہ کے لئے گھر سے میت کو اٹھا کر لے جانے کا وقت آئے تو پہلے سے وضو کر لے تاکہ بروقت جنازے میں شامل ہو سکے۔

معروف غیر مقلد عالم شیخ عبدالرحمٰن مبارک پوری متوفی 1352ھ ''تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی'' جلد نمبر 2 ص: 132 پر لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''امام ترمذی کا قول ہے، اصحابِ نبی ﷺ میں سے بعض اہل علم نے کہا: ''اِذَا غَسَّلَ مَيِّتًا فَعَلَيْهِ الْغُسْلُ''۔ یعنی میت کو نہلانے والے پر غسل واجب ہے، اور یہ حضرت علی وابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور انہوں نے اس باب کی حدیث اور اس کے ہم معنی روایات سے استدلال کیا ہے، کیونکہ اس کے ظاہری الفاظ ''غسالِ میت'' غسل کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور امام مالک بن انس کا قول ہے: میت کو نہلانے والے کے لئے غسل مستحب ہے اور میں اسے واجب نہیں سمجھتا، امام شافعی کا قول بھی اسی طرح ہے، امام احمد کا قول ہے: جو میت کو غسل دے، میرا نظریہ یہ ہے کہ اس پر غسل واجب نہیں ہے، ان سب نے اس باب کی حدیث سے استدلال کیا ہے، لیکن انہوں نے حدیث میں امر کو مستحب پر محمول کیا ہے، کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث مروی ہے: ''لَيْسَ عَلَيْكُمْ فِي غُسْلِ مَيِّتِكُمْ غُسْلٌ إِذَا غَسَّلْتُمُوْهُ، إِنَّ مَيِّتَكُمْ يَمُوْتُ طَاهِرًا وَلَيْسَ بِنَجِسٍ فَحَسْبُكُمْ أَنْ يَّغْسِلُوْا أَيْدِيَكُمْ'' یعنی تم پر میت کو غسل دینے سے غسل واجب نہیں ہوتا، بے شک تمہاری میت موت کے وقت پاک ہوتی ہے، ناپاک نہیں، تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے ہاتھ دھولو، اس حدیث کو امام بیہقی نے روایت کیا ہے اور حافظ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث اور امر بالغسل کی حدیث میں اس طرح تطبیق کی جائے کہ میت کو نہلانے والے کے لئے غسل کرنا مستحب ہے (اور امر استحباب پر محمول ہے) اور اگر امر کو وجوب ہی پر محمول کرنا ہو تو اس سے غُسل معروف نہیں بلکہ ہاتھ دھونا مراد ہے، جیسا کہ اس حدیث میں صراحت ہے، اور یہ موقف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کی رو سے بھی درست ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ہم میت کو غسل دیتے تھے، ہم میں کوئی غسل کر لیتا تھا اور کوئی نہیں کرتا تھا، حافظ نے تلخیص میں اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے''۔

اسی لئے فقہاءِ کرام نے احتیاط کی بنا پر لکھا ہے کہ میت کو غسل دینے والا اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر پہلے اسے استنجا کرا لے، اس کے جسم پر اگر ظاہری نجاست ہو تو اسے دھولے،

روئی سے منہ صاف کرلے، اور اس کے بعد میت کو دائیں کروٹ پر لٹا کر کم از کم تین بار پانی بہائے، پھر بائیں کروٹ پر لٹا کر تین بار پانی بہائے، پھر پورے بدن پر پانی بہائے اور اس عمل میں اگر اس نے احتیاط کی ہے، اپنے بدن کو چھینٹوں سے بچایا ہے تو اسے غسل کی ضرورت نہیں ہے، اگر معلوم ہو کہ خدانخواستہ میت پر غسل جنابت واجب تھا تو اس کو غسل دینے میں زیادہ احتیاط کرے۔ فراغت کے بعد احتیاطاً غسل یا وضو کرنا چاہے تو کرلے اور اگر نہ کرے تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

کفن کا رنگ اور کپڑے کی کوالٹی

سوال: 47

دلائل سے وضاحت فرمائیں کہ مرد اور عورت کے کفن کا رنگ کیسا ہو؟۔

(محمد سلطان حنفی، تحصیل وضلع کوٹلی، آزاد کشمیر)

جواب:

مرد ہو یا عورت سب کے لئے سفید کفن بہتر ہے، احادیث مبارکہ میں بھی سفید کفن کی تلقین کی گئی ہے:

عَنْ ابنِ عبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَلْبِسُوْا مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبِيَاضَ فَاِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ وَكَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سفید کپڑے پہنا کرو کیونکہ یہ تمہارے کپڑوں میں سے سب سے بہتر ہیں، اپنے مُردوں کو (سفید کپڑوں کا) کفن پہناؤ، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 996)''۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كُفِّنَ فِي ثَلَاثَةِ اَثْوَابٍ يَمَانِيَةٍ، بِيْضٍ سَحُوْلِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ، لَيْسَ فِيْهِنَّ قَمِيْصٌ وَلَا عِمَامَةٌ۔

ترجمہ: ''اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو تین سفید یمنی کپڑوں کا کفن دیا گیا، جو سُوت کے بنے ہوئے تھے اور اُن میں قمیص اور عمامہ

نہیں تھا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1264، سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 998)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَيَحْسُنُ الْكَفَنُ لِحَدِيثِ: ''حَسِّنُوا أَكْفَانَ الْمَوْتَىٰ فَإِنَّهُمْ يَتَزَاوَرُونَ فِيمَا بَيْنَهُمْ يَتَفَاخَرُونَ بِحُسْنِ أَكْفَانِهِمْ''۔

ترجمہ: ''اور کفن اچھا ہونا چاہئے، حدیث مبارک میں ہے: ''مُردوں کو اچھا کفن دو، کیونکہ وہ آپس میں ملتے ہیں اور اپنے اچھے کفن پر ایک دوسرے سے فخر و مسرت کا اظہار کرتے ہیں''۔

علامہ ابن عابدین شامی ''وَيحسن الْكَفن'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

بِأَنْ يُكَفَّنَ مِثْلَهُ، وهُوَ أَنْ يُنْظَرَ إِلَىٰ ثِيَابِهِ فِي حَيَاتِهِ لِلْجُمُعَةِ وَالْعِيدَيْنِ، وَفِي الْمَرْأَةِ مَا تَلْبَسُهُ لِزِيَارَةِ أَبَوَيْهَا، كذا في ''المعراج''۔

ترجمہ: ''کوئی شخص جس طرح کے کپڑے اپنی زندگی میں جمعہ اور عیدین کے موقع پر پہنتا تھا، اس طرح کے کپڑے کا (بعد از وفات) اُسے کفن پہنایا جائے، اسی طرح عورت جس طرح کے کپڑے پہن کر اپنے ماں باپ کی ملاقات کے لئے جایا کرتی تھی، (بعد از وفات کو الٹی کے اعتبار سے) اُسے اس طرح کے کپڑے کا کفن پہنایا جائے، ''معراج'' میں بھی اِسی طرح ہے''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص: 91,90، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ويجتنب الحريرَ والمزعفرَ كذا في الجوهرةِ النَّيِّرة ويكفن بكفن مثله وهو ان ينظر الى مثل ثيَابِه في الحَيَاةِ لِخُروج العيدين وفي المرأة ينظر الى ماتلبس اذا خرجت الى زيارة ابويها كذا في الزاهدي ۔ ولا بَأس بِالبُرودِ وَالكتّانِ وَالقصب وفِي حقِّ النساء بالحرير والابريسم والمعصفر والمزعفر ويكره للرجال ذالك وَأحبُّ الأكْفَانِ الثِّيَابُ البِيضُ هكذا فِي النهاية ۔ وَالْخَلَقُ وَالْجَدِيْدُ فِي التكفين سواءٌ كذا في ''جوهرة النَّيِّرة'' وكلُّ مَا يباحُ لِلرجال لبسه فِي حَالِ الحَيَاة يُبَاحُ تكفينه بعدالوفاة ومالا يُبَاحُ له لبسُهُ حالَ الحياةِ لايُبَاحُ تكفِينُهُ بعدَ الوفَاةِ كذا في شرح الطحاوي۔

ترجمہ: ''زعفران یا پیلے رنگ سے رنگے ہوئے کپڑے سے اجتناب کرے،''جوھرۃ النیّرۃ'' میں اسی طرح ہے، کوئی شخص جس طرح کے کپڑے اپنی زندگی میں جمعہ اور عیدین کے موقع پر پہنتا تھا، اس طرح کے کپڑے کا (بعد از وفات) اُسے کفن پہنایا جائے، اسی طرح عورت جس طرح کے کپڑے پہن کر اپنے ماں باپ کی ملاقات کے لئے جایا کرتی تھی، (بعد از وفات) اُسے اس طرح کے کپڑوں کا کفن پہنایا جائے، جیسا کہ ''زاہدی'' میں بھی ہے اور میت کو دھاری دار کپڑے کا کفن، یا اَلسی کے پودے سے تیار کئے جانے والے کپڑے کا کفن پہنانے میں حرج نہیں ہے۔ اور عورتوں کو ریشم اور زرد رنگ یا زعفرانی رنگ کے کپڑے کا کفن دینا جائز ہے اور مرد کے لئے مکروہ ہے اور سب سے زیادہ پسندیدہ سفید کپڑے کا کفن ہے، جیسا کہ ''نہایہ'' میں ہے اور کفن پرانے کپڑے کا ہو یا نئے کا، برابر ہے جیسا کہ ''جوھرۃ النیّرۃ'' میں ہے اور ہر وہ کپڑا جو مرد کو زندگی میں پہننا جائز ہے اُس کی وفات کے بعد اُس کپڑے کا کفن بھی اُس کے لئے جائز ہے اور جس کپڑے کا پہننا اُس کے لئے زندگی میں جائز نہیں، اُس کا کفن بھی نہیں دیا جاسکتا، ''شرح الطحاوی'' میں اِسی طرح ہے''۔ (فتاوی عالمگیری، جلد 1، ص: 161، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ (۱) میت کو سفید کپڑے کا کفن پہنانا افضل اور پسندیدہ ہے، لیکن اگر کبھی ایسے حالات ہوں کہ سفید کفن دستیاب نہ ہو تو دوسرے رنگوں کے کپڑے کا کفن بھی پہنایا جاسکتا ہے، البتہ مردوں کے لئے جو لباس زندگی میں منع ہے یعنی زرد رنگ، زعفرانی رنگ اور ریشمی کپڑے کا لباس منع ہے لیکن عورتوں کے لئے جائز ہے۔

(2) کپڑا نیا ہو یا استعمال شدہ اور پرانا اس کا کفن بنانا جائز ہے، بس صاف اور پاک ہونا چاہئے۔

میت کا چبوترے پر رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال: 48

اگر جنازہ دو فٹ اونچے ایک چبوترے پر رکھا ہوا ہو اور امام اور مقتدی نیچے کھڑے

ہوں تو نمازِ جنازہ ہو جائے گی یا نہیں؟۔(محمد صابر،116/3 سیکٹر D-11 نیو کراچی)۔

جواب:

جنازہ زمین پر رکھا ہو، ہاتھ پر اٹھایا ہوا ہو یا اونچے چبوترے پر ہو یا چار پائی یا مسہری پر رکھا ہو، خواہ اس کی بلندی کم ہو یا زیادہ، نمازِ جنازہ ہر صورت میں جائز ہے۔ نمازِ جنازہ کی شرائط میں ہے کہ جنازہ زمین پر رکھا ہو یا ہاتھوں پر ہو مگر قریب ہو۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وشرطها أيضاً حضورُهٗ (وَوَضْعُهٗ)

ترجمہ: ''نمازِ جنازہ کی شرائط میں سے ایک شرط میت کا موجود ہونا (اور زمین پر رکھا ہوا ہونا) ہے۔ اس کی شرح میں علامہ شامی لکھتے ہیں: أَىْ عَلَى الْأَرْضِ أَوعلى الايدى قريبًا منها

ترجمہ: ''یعنی جنازہ زمین پر رکھا ہوا ہو یا (اگر چھوٹے بچے کا جنازہ ہے تو) ہاتھوں پر ہو مگر قریب ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3،ص:98 ،مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ زید کہتا ہے اگر جنازہ کو ایسی چار پائی پر رکھ کر نماز پڑھی کہ جس کے پائے ایک بالشت سے کم تھے تب تو نماز ہوگئی ورنہ نہیں، اور ثبوت میں شامی اور کبیری پیش کر کے کہتا ہے کہ جنازہ مثل امام کے ہے جس طرح امام کا ایک بالشت سے اوپر کھڑا ہونا مفسدِ صلوٰۃ ہے، اسی طرح جنازہ کی مسہری کے پائے ایک بالشت سے زیادہ اونچے ہوں تو جنازہ جائز نہیں ہے، کیا یہ قول درست ہے، لہٰذا اگر جنازے کی مسہری کے پائے ایک بالشت سے زیادہ بلند ہوں تو نمازِ جنازہ فاسد ہو جائے گی یا ایک بالشت ہونا اولیٰ اور اس سے زائد مکروہ ہے یا مطلقاً خواہ جس قدر بھی پائے لمبے ہوں جائز ہے؟، آپ نے جواب میں لکھا:

''زید کے اقوال سب باطل و بے اصل ہیں، نہ پایوں کی بلندی شرعاً کسی حد پر مخصوص رکھی گئی ہے، نہ ایک بالشت بلندی میں کچھ اَولَوِیَّت (افضلیت)، نہ ایک بالشت یا ایک گز امام کی بلندی مفسدِ نماز، نہ ہر بات میں جنازہ مثل امام، یہ ہَوَساتِ عاطِلہ واَوہامِ باطلہ (یعنی باطل وہم اور بے کار باتیں) ہیں، جنازہ کا زمین پر رکھا ہونا ضرور شرط ہے اگرچہ

پائے کتنے ہی بلند ہوں اور امام کا بقدرِ امتیاز سب مقتدیوں سے اونچا ہونا صرف مکروہ ہے نہ کہ مفسدِ نماز، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص:190، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

قبرستان میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال:49

کیا قبرستان کے اندر نمازِ جنازہ ادا کی جاسکتی ہے؟ (ملک محمد نذیر، بفرزون، کراچی)

جواب:

قبر کو سامنے رکھ کر فرض نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے۔ قبر نمازی کے دائیں یا بائیں جانب ہو تو حرج نہیں ہے۔ لیکن نمازِ جنازہ پڑھتے وقت اگر قبر سامنے بھی ہو تو حرج نہیں ہے کہ نمازِ جنازہ دعا ہے، حقیقتاً نماز نہیں۔ بہتر صورت تو یہ ہے کہ اگر قبرستان میں نمازِ جنازہ کے لئے کوئی جگہ مختص ہو تو وہاں نمازِ جنازہ ادا کی جائے۔ اگر صفیں بنانے میں قبروں کی بے ادبی کا احتمال نہ ہو اور لوگ قبروں پر نہ چڑھیں تو کسی بھی جگہ نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے، بلکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی میت کو نماز جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو تو اُس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

امالو دُفِنَ بِلاغسل وَلَمْ یُھَلْ علیه التراب فَاِنَّهٗ یُخْرَجُ وَیُغْسَلُ وَیُصَلّٰی عَلَیْه۔ ''جوھرۃ''، قولهٗ (فَیُصَلّٰی عَلٰی قَبرِهٖ بِلا غُسْلٍ) ای قبل اَنْ یَّفْسَخَ۔

ترجمہ: ''پس اگر میت کو غسل کے بغیر دفن کر دیا گیا ہو تو جب تک اُس پر مٹی نہ ڈالی جائے، اُسے قبر سے نکال کر غسل دیا جائے گا اور نماز جنازہ پڑھی جائے گی، ''جوہرۃ النیرۃ'' (میں اسی طرح ہے)۔ اگر میت کو غسل کے بغیر دفن کیا گیا ہو، تو جب تک میت پھٹ نہ جائے، اس کی قبر پر نماز پڑھی جائے گی''۔ علامہ علاؤالدین حصکفی مزید لکھتے ہیں:

(وان دفن) واھیل علیه التراب (بغیر صلاۃ) او بھا بلا غسل او ممن لاولایۃ له (صلی علی قبرہ) استحساناً (مالم یغلب علی الظن تفسخه) من غیر تقدیر ھو الاصح،

ترجمہ: ''نمازِ جنازہ پڑھے بغیر میت کو دفن کر دیا گیا اور اُس پر مٹی ڈال دی گئی یا میت کو غسل

دیئے بغیر نمازِ جنازہ پڑھ لی گئی یا میت کے قریب ترین ولی (جسے نمازِ جنازہ پڑھنے کا ترجیحی حق حاصل تھا) کے علاوہ کسی دوسرے نے نماز جنازہ پڑھ لی (اور اس نے نمازِ جنازہ نہیں پڑھی) تو جب تک غالب گمان یہ ہے کہ میت پھٹی نہیں ہوگی، استحسان کے طور پر اس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، اس میں دنوں کی مقدار کا اعتبار نہیں ہے اور صحیح ترین قول بھی یہی ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 97، 117)"۔

پس اگر میت کو نمازِ جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو تو اس کی قبر کے اوپر بھی نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔ قبرستان میں نمازِ جنازہ پڑھنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ ایسی کشادہ جگہ ہو کہ قبروں کی حرمت کو پامال کئے بغیر صف بندی کی جاسکتی ہو۔ اور اگر قبرستان کی حدود میں یا اس کے متصل نمازِ جنازہ کے لئے کھلی جگہ دستیاب نہ ہو تو پھر نمازِ جنازہ وہاں نہ پڑھی جائے، سوائے ایک استثنائی صورت کے کہ میت کو جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو کیونکہ ایسی صورت میں تو اس کی قبر پر ہی نماز پڑھی جائے گی۔

نمازِ جنازہ سے متعلق چند سوالات

سوال:50

نمازِ جنازہ کے فرائض، واجبات یا ارکان کیا ہیں؟۔

(خورشید احمد یوسفی، R-941/15 دستگیر کالونی، کراچی)

جواب:

نمازِ جنازہ کے دو رکن ہیں، (۱) چار تکبیرات (۲) قیام

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ورکنها شیئان (التکبیرات) الأربع فالأولی رکن أیضا لاشرط فلذا لم یجز بناء أخری علیها (والقیام) فلم تجز قاعداً بلا عذر۔ (وسنتها) ثلاثة (التحمید، والثناء، والدعاء فیها) ذکرہ الزاهدی۔

ترجمہ: "نمازِ جنازہ میں دو رکن ہیں: (۱) چار تکبیرات (اللہ اکبر) کہنا، پہلی تکبیر بھی رکن ہے شرط نہیں، اس لئے اس پر دوسرے جنازے کی بنا درست نہیں ہے، (۲) قیام، شرعی عذر کے

بغیر بیٹھ کر نمازِ جنازہ جائز نہیں۔ نمازِ جنازہ میں سنتِ مؤکدہ تین ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کی حمد کرنا (۲) اللہ تعالیٰ کی ثناء کرنا (۳) میت کے لیے دعا کرنا، ''زاہدی'' نے اس کو ذکر کیا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

(التحميد، والثناء) كذا في ''البحر'' عن المحيط ومقتضى قولِ الشارح ثلاثةٌ أنّ الثناءَ غيرُ التحميد مع أنهٗ فيما يأتي فسّر الثناء بقوله سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ فَعُلِمَ أنَّ المرادَ بهما واحدٌ على ما يأتي بيانُهٗ، فكانَ عَليه أنْ يذكر الثالثَ الصلاة على النبي ﷺ

ترجمہ: ''جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ''محیط'' کے حوالے سے ہے، (بظاہر) شارح کے قول کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ثناء اور چیز ہے اور تحمید دوسری چیز، حالانکہ آئندہ سطور میں ثناء کی تفسیر یوں بیان کی ہے کہ ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ'' کہے، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں سے مراد ایک ہی چیز ہے، تو مناسب تھا کہ یوں ذکر کرتے کہ تیسری سنت نبی کریم ﷺ پر درود ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 99، 100)''۔ علامہ شامی کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کی سنتیں تین ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء، یعنی نمازِ جنازہ میں جو ثناء پڑھی جاتی ہے، اس میں حمد بھی شامل ہے۔ (۲) رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنا۔ (۳) میت اور تمام مسلمانوں کے لئے دعا کرنا۔

مقتدی کا درمیان میں آکر نمازِ جنازہ میں شامل ہونا

سوال: 51

اگر کوئی شخص نمازِ جنازہ میں درمیان میں آکر شامل ہو (یعنی مسبوق ہو) تو وہ باقی نماز کس طرح ادا کرے گا؟

جواب:

ایسا شخص جو نمازِ جنازہ میں بعض تکبیروں کے فوت ہو جانے کے بعد جماعت میں شامل ہو، مسبوق کہلاتا ہے۔ نمازِ جنازہ میں مسبوق کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ فوراً شامل نہ ہو

بلکہ جب امام اگلی تکبیر کہے تو یہ تکبیر کہہ کر جماعت میں شامل ہوجائے (اور یہ اس کی ''تکبیرِ تحریمہ'' ہوگی) اور اپنی فوت شدہ تکبیریں امام کے سلام پھیرنے کے بعد کہے۔
علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والمسبوق) ببعض التکبیراتِ لَا یُکَبِّرُ فی الحال بل (ینتظر) تکبیرَ (الامام لِیُکَبِّرَ مَعَہٗ) للأفتتاح لما مَرَّ أَنَّ کلَّ تکبیرۃٍ کرکعۃٍ، وَالمسبوقُ لا یبدأُ بما فَاتَہٗ۔

ترجمہ: ''مسبوق، یعنی جس کی نمازِ جنازہ کی ابتدائی کچھ تکبیریں فوت ہوگئی ہوں (اور اب وہ جماعت میں شامل ہونا چاہتا ہے)، تو فوراً تکبیر کہہ کر شامل نہ ہو بلکہ امام کی اگلی تکبیر کا انتظار کرے تاکہ (اپنی نماز کی پہلی تکبیر) امام کے ساتھ کہے، کیونکہ پہلے گزر چکا ہے کہ نمازِ جنازہ کی ہر تکبیر ایک رکعت کے مثل ہے اور مسبوق اپنی نماز اپنی فوت شدہ رکعتوں سے شروع نہیں کیا کرتا (یعنی مسبوق فوت شدہ رکعتیں امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کرتا ہے)۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: قَالَ اَبُوْ یُوْسُف یُکَبِّرُ حین یحضُر (کما لا ینتظر الحاضرُ فی حال التحریمۃِ) بل یکبر اتفاقاً للتحریمۃ، لأنّہ کالمُدرِکِ، ثُمّ یکبّرانِ ما فاتھما بعد الفراغ نَسَقاً (بلا دعاء اِن خَشِیا رفعَ المیت علی الأعناق۔

ترجمہ: ''امام ابویوسف رحمہ اللہ نے فرمایا: جب مقتدی حاضر ہو اُسی وقت تکبیر کہے، جس طرح نماز میں امام کے تکبیرِ تحریمہ کہنے کے وقت جو شخص موجود ہوتا ہے وہ انتظار نہیں کرتا بلکہ تکبیرِ تحریمہ امام کے ساتھ کہتا ہے تاکہ امام کے ساتھ تکبیرِ تحریمہ میں شامل ہو، کیونکہ وہ شخص مدرک کی مثل ہے (یعنی ایک شخص تکبیر تحریمہ کے وقت موجود ہے مگر امام کے ساتھ تکبیر نہیں کہی تو وہ امام کے دوسری تکبیر کہنے کا انتظار نہیں کرے گا)، پھر مسبوق اور موجود شخص امام کے سلام پھیرنے کے بعد نمازِ جنازہ میں پڑھی جانے والی دعا کے بغیر اپنی فوت شدہ تکبیریں کہیں، اگر انہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر وہ دعا میں مشغول ہوئے تو میت کو اٹھالیا جائے گا تو دعا کے بغیر ہی تکبیر کہہ دیں (اور سلام پھیر دیں)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:108، 109)

نمازِ جنازہ کی چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ چھوڑ دے اور سلام پھیرے

سوال:52

نمازِ جنازہ کی چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھے ہوئے سلام پھیرے یا چھوڑ کر؟۔

جواب:

کتبِ فتاویٰ میں یہی مسئلہ درج ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد بغیر کوئی دعا پڑھے سلام پھیرنا چاہئے، علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''چوتھی تکبیر کے بعد بغیر کوئی دعا پڑھے ہاتھ کھول کر سلام پھیر دے''۔

(بہارِ شریعت، حصہ چہارم، ص:333، مکتبہ رضویہ، کراچی)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ نمازِ جنازہ میں ہاتھ باندھے ہوئے سلام پھیرنا چاہئے یا ہاتھ چھوڑ کر، افضل کیا ہے؟ آپ نے جواب میں لکھا: ''ہاتھ باندھنا سُنّت اس قیام کی ہے جس کے لئے قرار ہو، جیسا کہ درمختار وغیرہ کتابوں میں ہے۔ سلام وقتِ خروج ہے، اُس وقت باندھے رکھنے کا کوئی سبب نہیں ہے، تو ظاہر یہی ہے کہ تکبیرِ چہارم کے بعد ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں ۔۔۔ان سے ایک اور سوال کیا گیا کہ ''بہارِ شریعت جلد ۴ میں ہے: چوتھی تکبیر کے بعد بغیر کوئی دعا پڑھے ہاتھ کھول کر سلام پھیرے (درمختار، ردالمحتار)، حالانکہ ان کتابوں میں ہاتھ کھولنے کا ذکر نہیں، سخت اضطراب ہے، رفع فرمائیے''۔امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز جواب میں لکھتے ہیں:

''جس روز آپ کا سوال آیا اتفاق سے اُس کے دوسرے دن (ہی) بریلی سے مولوی امجد علی صاحب میرے ملنے کے لئے یہاں آئے، میں نے اُن سے پوچھا، اُنہوں نے فرمایا: ''یہ مسئلہ طویل متعدد مسائل پر مشتمل ہے اور اس کے آخر میں، میں نے درمختار ورد المحتار وغیرہما لکھا ہے۔ وغیرہما سے یہاں میری مراد فتاویٰ رضویہ ہے، وہاں جو کچھ مذکور ہے اس کا بعض درمختار سے لیا گیا ہے اور بعض ردالمحتار سے، اور یہ مسئلہ فتاویٰ رضویہ سے''۔ظاہر ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد نہ قیامِ ذی قرار ہے، نہ اس میں کوئی ذکر مسنون، تو ہاتھ باندھے رہنے کی کوئی وجہ

نہیں۔ چوتھی تکبیر کے بعد نماز سے نکلنے کا وقت ہے اور نماز سے نکلنے کیلئے ہاتھ باندھے رکھنا کسی مذہب میں نہیں ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 194، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال کیا گیا کہ نمازِ جنازہ میں ہاتھ کھول کر سلام پھیرنا چاہیے یا باندھ کر، دونوں طرح جائز ہے یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا:

''ہاتھ کھول کر سلام پھیرنا چاہیے یہ خیال کہ تکبیرات میں ہاتھ باندھے رہنا مسنون ہے، لہٰذا سلام کے وقت بھی ہاتھ باندھے رہنا چاہیے، یہ خیال غلط ہے، وہاں ذکرِ طویل مسنون موجود ہے، اُس پر قیاس، قیاس مع الفارق ہے۔ فقہاءِ کرام نے ہاتھ باندھنے اور کھولنے کے لئے جو کلیہ ارشاد فرمایا ہے اس سے استدلال کی ہمیں حاجت نہیں جب کہ خاص اس بارے میں جزئیہ موجود ہے، ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے: ولا یعقد بعد التکبیر الرابع لانہ لایبقی ذکر مسنون حتی یعقد فالصحیح انہ یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین ھکذا فی الذخیرۃ

ترجمہ: چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ کر نہ رکھے، کیونکہ اب کوئی ذکرِ مسنون باقی نہیں رہا کہ ہاتھ باندھ کر رکھے جائیں، پس صحیح یہ ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ کھول دے اور دو سلام پھیرے، ذخیرہ میں اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد اول، ص: 317)''۔

مفتی نور اللہ نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''نمازِ جنازہ میں چوتھی تکبیر تک ہاتھ باندھے جائیں، بعد ازاں دونوں ہاتھ چھوڑ دے اور پھر دونوں سلام کہے، خلاصۃ الفتاویٰ صفحہ 225، جلد 1 میں ہے: فالصحیح انہ یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین ھکذا فی الذخیرۃ۔ (ترجمہ) صحیح یہ ہے کہ نمازِ جنازہ پڑھنے والا دونوں ہاتھ کھول دے پھر دونوں سلام کہے، اسی طرح ذخیرہ میں ہے، (فتاویٰ نوریہ، جلد 1، ص 275)

خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ

سوال: 53

اگر کوئی شخص خودکشی کرلے تو اُس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟

جواب:

خودکشی کرنے والے شخص کی بھی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ (ولو عمداً یُغَسَّلُ وَیُصَلّٰی عَلَیْهِ) بِهٖ یُفتی ، وان کان اعظمُ وزراً من قاتل غیرہٖ، ورجّح الکمالُ قولَ الثانی بِمَا فی مسلم ''انه علیه الصلاۃ والسّلام أُتِیَ برَجُلٍ قتلَ نفسَهُ فلم یُصَلِّ عَلَیْهِ''۔

ترجمہ: ''اور ایسا شخص، جس نے خودکشی کی ہو، اگر چہ جان بوجھ کر ایسا کیا ہو تو اُسے غسل دیا جائے گا اور اُس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی، اِسی پر فتویٰ ہے اگر چہ اس (خودکشی کرنے والے) کا گناہ اس شخص سے زیادہ ہے جس نے کسی دوسرے شخص سے لڑائی کی ہو (اور خود مارا گیا ہو یا دوسرے کو قتل کیا ہو)، اور علامہ کمال الدین ابن ہمام نے دوسرے (یعنی امام ابو یوسف کے) قول کو ترجیح دی، کیونکہ صحیح مسلم میں حدیث ہے: ''ایک خودکشی کرنے والے شخص کا جنازہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی''۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

اقول قد یقال لا دلالة فی الحدیث علی ذلک لأنه لیس فیه سوی انه علیه الصلاۃ والسلام لم یصلّ علیه ،فالظاهر انه امتنع زجراً لغیرہ عن مثل هذا الفعل، کما امتنع علی المدیون، ولا یلزم من ذلک عدم صلاۃ أحد علیه من الصحابة،

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں کہ: یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس حدیث میں اس امر پر کوئی دلالت نہیں کہ خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ اس میں صرف اتنی بات ہے کہ آپ ﷺ نے خود اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس کا جنازہ اس لئے نہیں پڑھا تا کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو اور کوئی خودکشی کی جسارت نہ کرے، جیسے آپ ﷺ نے خود مقروض کا جنازہ پڑھنے سے منع فرما دیا تھا (جس کی بنا پر اس کے قرض کی ادائیگی کی سبیل بن گئی)، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی صحابی نے بھی

اس کا جنازہ نہ پڑھا ہو، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 102)"۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کے عبرت آموز طرزِ عمل کی اتباع کرتے ہوئے کسی بڑے عالم کو خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھانی چاہئے، عام آئمہ حضرات پڑھا سکتے ہیں۔

علامہ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے لکھا ہے کہ "شوافع کا مفتیٰ بہٖ قول بھی یہی ہے کہ خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، (الفقہ الاسلامیہ واَدِلّتہٗ، جلد: 02، ص: 1509)"۔

خودکشی کرنے والے کو ایصالِ ثواب

سوال: 54

خودکشی کرنے والے کے لئے ایصالِ ثواب کر سکتے ہیں؟

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ اِس جرم کو تو معاف نہیں فرماتا کہ کوئی کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہرائے اور اس سے کم تر کسی بھی گناہ کو جس کیلئے چاہے معاف فرما دیتا ہے، (النساء: 116)

اس آیۂ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کسی کو نصیب ہو جائے، تو وہ جس کے لئے چاہے کفروشرک سے کم تر ہر گناہ کو معاف فرما دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۳﴾

ترجمہ: "(اے رسول ﷺ!) کہہ دیجئے! اے میرے بندو جو (اپنی بداعمالیوں کے سبب) اپنے اوپر ظلم کر چکے ہو، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے، (الزمر: 53)

صحیح بخاری حدیث نمبر: 3470 میں گزشتہ امتوں کے ایسے گناہگار شخص کا ذکر ہے جو سو قتل کر چکا تھا، لیکن جب اس نے صدقِ دل سے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اس کی مغفرت فرما دی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لوگ آخرت کی جوابدہی سے بے خوف ہو

کر گناہوں میں مبتلا ہو جائیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بشری کمزوری سے گناہ صادر ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت سے ہمیشہ کے لئے ناامید نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہر حال میں اس کی رحمت کا امیدوار ہونا چاہئے۔ اس لئے جب ہر گناہ گار کی مغفرت کی امید کی جاسکتی ہے تو خودکشی کرنے والے کو بھی ایصال ثواب کر سکتے ہیں اور اس کے لئے دعائے مغفرت کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ اُس کی مغفرت فرمادے اور اُس نے اپنی جان کو ہلاک کر کے جو فعلِ حرام کا ارتکاب کیا ہے، اللہ اُس کے اِس گناہ کو معاف فرمادے یا اُس کے عذاب میں تخفیف فرمادے۔

صحیح مسلم میں ایک طویل حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت طفیل بن عمرو دوسی بھی اپنی قوم کے ایک شخص کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ حضرت طفیل کا وہ ساتھی بیمار ہو گیا اور جب بیماری اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی تو اس نے ایک لمبے تیر کے پھل یا چھری سے اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹ ڈالے، جس کی وجہ سے اُس کے دونوں ہاتھوں سے خون بہنے لگا اور اسی سبب سے اُس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت طفیل نے اسے خواب میں اچھی حالت میں دیکھا، لیکن انہوں نے دیکھا کہ اُس کے دونوں ہاتھ کپڑے میں لپٹے ہوئے ہیں۔ حضرت طفیل نے پوچھا:

مَا صَنَعَ بِكَ رَبُّكَ؟، فَقَالَ غَفَرَ لِي بِهِجْرَتِي إِلَى نَبِيِّهِ ﷺ، فَقَالَ لَهُ مَا لِي أَرَاكَ مُغَطِّيًا يَدَيْكَ؟، قَالَ قِيلَ لِي لَنْ نُصْلِحَ مِنْكَ مَا أَفْسَدْتَ فَقَصَّهَا الطُّفَيْلُ عَلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ وَلِيَدَيْهِ فَاغْفِرْ۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟، اُس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کے سبب بخش دیا، حضرت طفیل نے پوچھا: تم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کیوں لپیٹ رکھا ہے؟، اُس نے کہا کہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) مجھے فرمایا گیا کہ جس چیز کو تم نے خود بگاڑا ہے، ہم اُسے ٹھیک نہیں کریں گے، حضرت طفیل نے یہ خواب رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا تو خواب سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ!

اس کے ہاتھوں کے قصور کو بھی معاف فرما دے''۔اس صحابی کی موت اس کے اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹنے کے سبب زیادہ خون بہ جانے (Bleeding) کی وجہ سے واقع ہوئی، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، رقم الحدیث:307)

خودکشی کی شرعی حیثیت

سوال:55

خودکشی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:

اسلام کی رو سے انسان اپنی جان کا مالک ومختار نہیں ہے، انسان کی جان اور اس کا وجود اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اسکی ودیعت وامانت ہے، انسان کو صرف اس جسم وجان کے تصرف واستعمال کا اختیار دیا ہے اور اس کیلئے شریعت نے حدود وقیود بھی مقرر فرمادی ہیں، اسی تصرفِ اختیاری پر جزا وسزا کا مدار ہے۔انسان چونکہ اپنے جسم وجاں کا مالک نہیں ہے، اس لئے اسے اپنی جان یا کسی عضو کو تلف کرنے، کاٹ پھینکنے یا فروخت کرنے کا اختیار نہیں ہے، یہ تمام افعال وتصرفات ممنوع اور حرام ہیں۔جان لینے اور تلف کرنے کا اختیار صرف اسی قادرِ مطلق اور خالق عزّ وجلّ کا ہے جس نے یہ جان تخلیق فرمائی ہے، وہ جب چاہے اپنی اس امانت کو واپس لے سکتا ہے، کسی کو مجالِ انکار نہیں ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(1) وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ

ترجمہ:''اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو،(البقرہ:195)''۔

(2) وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا

ترجمہ:''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بلاشبہ اللہ تم پر بڑا مہربان ہے(النساء:29)''۔

خودکشی گناہ کبیرہ ہے: اسلام میں خودکشی گناہ کبیرہ ہے اور اس کا مرتکب جہنم کا سزاوار ہوگا، دنیا میں تو وہ ایک مرتبہ اپنی جان تلف کرتا ہے، لیکن اس کی سزا کے طور پر اسے طویل

عرصے تک اور لاتعداد بار اس اذیت سے گزرنا پڑے گا، غور فرمایئے! اس کا انجام کتنا ہیبت ناک اور ہولناک ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيدَةٍ فَحَدِيدَتُهُ فِي يَدِهِ يَتَوَجَّأُ بِهَا فِي بَطْنِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا وَمَنْ شَرِبَ سَمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَحَسَّاهُ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا وَمَنْ تَرَدّٰى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَرَدّٰى فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی آہنی ہتھیار سے خودکشی کرے، تو (آخرت میں) وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ جہنم کی آگ میں (بطور سزا) دائمی طور پر یہ ہتھیار اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا، اور جو شخص زہر کھا کر خودکشی کرے گا، تو وہ جہنم میں ہمیشہ زہر کھاتا رہے گا، اور جو شخص کسی پہاڑ (یا بلند و بالا عمارت و مینار) سے گر کر یا چھلانگ لگا کر خودکشی کرے گا تو وہ (اس عمل کی سزا کے طور پر) ہمیشہ جہنم (کے گہرے گڑھوں) میں گرتا رہے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 296)''۔

نوٹ: خودکشی کی وعید کے سلسلے میں جواب 54 کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔

میت کو دفن کرنے کے بعد آیا ہاتھ دھونا ضروری ہیں؟

سوال: 56

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ میت دفن کر کے آتے ہیں تو گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے ہاتھ منہ دھلائے جاتے ہیں، شرعی طور پر کیا یہ درست ہے؟

(معلمات فاروقیہ تعلیم القرآن اکیڈمی، کراچی)

جواب:

شرعاً اس میں کوئی ممانعت بھی نہیں اور نہ ہی منہ ہاتھ دھونا لازم ہے۔ ہاں! اگر ہاتھ پر مٹی وغیرہ لگی ہو یا چہرہ گرد آلود ہو گیا ہو تو دھو لیا جائے۔ تدفین کے وقت جب قبر پر مٹی ڈالی جاتی ہے تو ہاتھ پر لگنے والی مٹی کو جھاڑ لیں یا دھو ڈالیں، دونوں باتیں جائز ہیں۔

میت کی تدفین والے دن میت کے گھر کھانے کا اہتمام

سوال:57

اگر کسی گھر میں میت ہوجائے تو کہتے ہیں کہ میت کو دفنانے کے فوراً بعد گھر میں کسی میٹھی چیز، سوجی وغیرہ پر دعا کروا کر بچوں کو کھلانا چاہیے، کیا یہ درست ہے؟

جواب:

چونکہ میت کے اہلِ خانہ غم سے دوچار ہوتے ہیں اور میت کی تکفین وتدفین میں بھی مشغول رہتے ہیں اور اس وقت کھانے پینے کا خیال نہیں رہتا، اس لئے میت کے رشتے داروں اور پڑوسیوں کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ میت کے اہل خانہ کے لئے ایک دن کے کھانے کا اہتمام کریں اور انہیں اصرار کر کے کھلائیں، کیونکہ ایسے وقت میں رسول اللہ ﷺ نے میت کے اہل خانہ کی دل جوئی کا حکم ارشاد فرمایا ہے:

عَنْ عَبْدِاللهِ بنِ جَعفَرَ قَالَ لَمَّا جَاءَ نَعْیُ جَعفَرَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ اِصْنَعُوا لِأَهْلِ جَعفَرَ طَعَاماً فَاِنَّهُ قَدْ جَاءَ هُمْ مَا یَشْغَلُهُمْ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ''غزوۂ موتہ'' سے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان پر ایسی مصیبت نازل ہوئی ہے کہ انہیں (کھانے کے اہتمام کا) ہوش نہیں ہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:998)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: حمل الطعام الیٰ صاحب المصیبة والاکل معهم فی الیوم الاول جائز لشغلهم بالجهاز وبعده یکره کذا فی التتارخانیة

ترجمہ: ''میت والوں کے گھر پہلے دن کھانا لے جانا اور اُن کے ساتھ ملکر کھانا جائز ہے، کیونکہ وہ میت کے کفن دفن میں مشغول رہتے ہیں اور اس کے بعد مکروہ ہے، جیسا کہ فتاویٰ ''تاتارخانیہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:344، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

ہاں! اگر کوئی عزیز، رشتے دار ایصالِ ثواب کی غرض سے ایسا کرنا چاہے تو درست

اور جائز ہے۔ ایصالِ ثواب مستحب اور مستحسن امر ہے، شرعاً واجب نہیں ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ کھانا یا جو کچھ بھی ایصالِ ثواب کیا جارہا ہے، وہ فقراء ومساکین کو دیا جائے۔ تعزیت کرنے والوں کے لئے بطورِ ضیافت کھانے کا اہتمام کرنا مکروہ ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے اس موضوع پر ایک رسالہ ''جَلِیُّ الصَّوتِ لِنَهْیِ الدَّعوَةِ اَمَامَ مَوت'' (کسی موت پر دعوت کی ممانعت کا واضح اعلان) لکھا، جس میں میّت کی طرف سے تعزیت کے لئے آنے والوں کی ضیافت کی کراہت وممانعت بیان کی گئی ہے۔ اس کی اہم باتیں درج ذیل ہیں:

''کشف الغطاء میں ہے: ترجمہ: ''تعزیت کرنے والوں کے لئے اہلِ میّت کا ضیافت کرنا اور کھانا پکانا باتفاق روایات مکروہ ہے، اس لئے کہ مصیبت میں مشغول ہونے کی وجہ سے اس کا اہتمام ان کے لئے دشوار ہے''۔ اسی میں ہے: ترجمہ: ''تو یہ جو رواج پڑ گیا ہے کہ تیسرے دن اہلِ میّت کا کھانا پکاتے ہیں اور اہلِ تعزیت اور دوستوں کو بانٹتے کھلاتے ہیں، ناجائز وممنوع ہے، ''خزانہ'' میں اس کی تصریح ہے۔ اس لئے کہ شرع میں ضیافت خوشی کے وقت رکھی گئی ہے مصیبت کے وقت نہیں اور یہی جمہور کے نزدیک مشہور ہے''۔

مزید لکھتے ہیں: میّت کے یہاں جو لوگ جمع ہوتے ہیں اور اُن کی دعوت کی جاتی ہے اُس کھانے کی تو ہر طرح ممانعت ہے اور بغیر دعوت کے جمعراتوں، چالیسویں، چھ ماہی، برسی میں جو بھاجی کی طرح اغنیاء کو بانٹا جاتا ہے، وہ بھی اگرچہ بے معنی ہے مگر اس کا کھانا منع نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ غنی نہ کھائے اور فقیر کو تو کچھ مضائقہ نہیں کہ وہی اس کے مستحق ہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 661 تا 673، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

قبر میں عہد نامہ رکھنا

سوال: 58

کیا مردے کے کفن میں عہد نامہ رکھ سکتے ہیں؟

جواب:

قبر میں عہد نامہ رکھنا ضروری نہیں ہے۔ہاں! جائز ضرور ہے، لیکن کفن میں یا سینے پر نہ رکھا جائے بلکہ قبلہ کی جانب قبر کی دیوار میں چہرہ کے مقابل طاق بنا کر اس میں رکھ دیا جائے، علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

کتب علی جبھۃ المیّت أو عمامتہ أو کفنہ عھد نامہ ترجی ان یغفر اللہ للمیّت۔

أوصی بعضھم ان یکتب فی جبھتہ وصدرہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ففعل، ثم رئی فی المنام فسئل فقال لما وضعت فی القبر جاءتنی ملائکۃ العذاب، فلما رأوا مکتوباً علی جبھتی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قالوا أمنتَ من عذاب اللہ۔

ترجمہ: ''میت کی پیشانی یا عمامہ یا کفن پر عہد نامہ لکھا گیا، اللہ تعالیٰ سے اس کی بخشش کی امید کی جاسکتی ہے۔ کسی شخص نے وصیت کی کہ میری پیشانی اور سینہ پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھ دینا، سو لکھ دی گئی۔ اس کے مرنے کے بعد کسی نے اس کو خواب میں دیکھ کر اس کا حال پوچھا، اس نے کہا: جب میں قبر میں رکھا گیا تو میرے پاس عذاب کے فرشتے آئے، جب انہوں نے میری پیشانی پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھی دیکھی تو انہوں نے کہا: تو اللہ کے عذاب سے محفوظ ہوا۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں محقق ابن حجر مکی شافعی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ترجمہ: محقق ابن حجر المکی الشافعی کے فتاویٰ میں ہے: ان سے کفن پر عہد نامہ لکھنے کی بابت پوچھا گیا، اس کے کلمات یہ ہیں:

''لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ، لہ الملک ولہ الحمد، لا الٰہ الا اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم'' (ایک روایت میں یہ کلمات بھی ہیں) ''اللّٰھم فاطرَ السمٰوٰت والارض عالمَ الغیب والشھادۃ الرحمٰن الرحیم، انی اعھد الیك فی ھذہ الحیٰوۃ الدنیا، انی اشھد انك انت اللہ لا الٰہ الا انت وَحدَك لا شریكَ لك وانَّ محمداً عبدُكَ ورسولُك ﷺ، فلا تکلنی الی نفسی تُقربنی من الشر وتُبعدنی من الخیر، وانا لا اَثِقُ الا

برحمتِکَ فاجعل لی عھداً أعندک توفنیہ یومَ القیامۃ انکَ لا تُخلِفُ المعیاد''۔

آیا کفن پر یہ کلمات لکھنے جائز ہیں اور اس کی کوئی اصل ہے؟ تو انہوں نے یہ جواب دیا: بعض علماء نے امام (حکیم) ترمذی کی کتاب ''نوادر الاصول'' سے جو کچھ نقل کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دعا کی اصل ہے اور فقیہ ''ابن عجیل'' اس کا حکم دیا کرتے تھے۔ پھر زکوٰۃ کے اونٹوں پر ''اللہ'' لکھنے کے جواز پر قیاس کرتے ہوئے، اس کے بھی جواز کا فتویٰ دیا اور بعض علما نے اسے برقرار رکھا۔ یہ بات محلِ نظر ہے، ''ابن الصلاح'' نے فتویٰ دیا ہے کہ کفن پر یٰس اور الکہف وغیرہ لکھنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ میت کے بدن سے پیپ نکلے اور بے ادبی ہو۔ یہ قیاس ممنوع ہے، کیونکہ اونٹوں پر لکھنے کا مقصد انہیں ممتاز کرنا ہے اور یہاں برکت حاصل کرنا ہے اور کفن پر لکھے ہوئے اسماءِ باری تعالیٰ باقی رہتے ہیں، لہٰذا ان کا نجاست سے آلودہ کرنا جائز نہیں ہے، یہ قول مردود ہے کہ ایسا کرنا (شرعاً) مطلوب ہے، کیونکہ اس طرح کے اقوال سے حجت کرنا مناسب نہیں، جب تک کہ نبی کریم ﷺ سے وہ صحیح طور پر ثابت نہ ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہے۔ ہم ''باب المیاہ'' سے پچھ پہلے فتح القدیر کے حوالے سے یہ بیان کرچکے ہیں کہ قرآن اور اللہ تعالیٰ کے اسماء کو دراہم، محرابوں، دیواروں اور فرش پر لکھنا مکروہ ہے۔ اور یہ کراہت محض احترام باقی رکھنے اور پاؤں سے روندے جانے یا اس کی مثل دیگر اہانت والے کاموں کے اندیشہ کی وجہ سے ہے، تو جب تک مجتہد سے ثابت نہ ہو یا اس بارے میں حدیث ثابت نہ ہو منع کرنا بہتر ہے، یہ غور کا مقام ہے۔ ہاں بعض حاشیہ نگاروں نے ''فوائد الشرجی'' سے نقل کیا ہے کہ میت کو غسل دینے کے بعد اور کفن پہنانے سے پہلے روشنائی کے بغیر انگشتِ شہادت سے میت کی پیشانی پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور سینے پر ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' لکھ دیا جائے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:03،ص:146-47)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی نے جو خواب کا ذکر فرمایا (کہ میت کی پیشانی اور سینہ پر بسم اللہ لکھنے سے اس کی بخشش ہوگئی)، شرعاً حجت نہیں بن سکتا کہ شرعی احکام کا مدار خواب پر نہیں ہوسکتا۔

حرفِ آخر: ہمیں دو انتہا پسندانہ رویوں کا سامنا ہے۔ ایک ان لوگوں کا رویہ ہے جو اپنے آپ کو حنفی کہلاتے ہیں، لیکن فقہِ حنفی میں جن چیزوں کا جواز ثابت ہے، ان سے انکار کرتے ہیں اور انہیں بدعت قرار دیتے ہیں۔ دوسرا رویہ ان لوگوں کا ہے جو ایسے امور کو جو محض اباحت وجواز کے درجے میں ہیں، عملاً واجب ولازم سمجھتے ہیں اور پھر اسے مسلکی اختلاف کی علامت بناتے ہیں اور شعارِ اہلسنت قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک حق ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے اور یہ قول راجح ہے کہ روشنائی کے بغیر میت کی پیشانی اور کفن پر انگشتِ شہادت سے خیر و برکت کے لئے اور عفو و مغفرتِ باری تعالیٰ کی امید پر یہ کلمات لکھ دیئے جائیں۔

لوگوں میں مشہور باتوں کا شرعی حکم

سوال:59

عورتوں کا قبرستان جانا اور قبرستان کی مٹی ہاتھ میں لے کر یہ کہنا کہ اب ہم مردوں کو نظر نہیں آئیں گی، اس کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب:

اس بات کی کوئی اصل نہیں ہے، یہ محض لوگوں کی خودساختہ باتیں ہیں۔ جن کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال:60

کہتے ہیں کہ جس جگہ مردے کو غسل دیا جائے اس جگہ پر چالیس دن روشنی رکھی جائے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:

اس بات کی بھی کوئی اصل نہیں ہے۔

جمعرات کو ارواحِ اموات کا آنا

سوال:61

اکثر گھروں میں جمعرات کو بطور خاص مُردوں کے لئے دعا کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے

کہ بروز جمعرات تمام روحیں یہ دیکھنے آتی ہیں کہ کیا اس کے لئے دعا کی گئی ہے یا نہیں؟ اس بات کی بھی وضاحت کر دیں کہ کیا یہ درست ہے؟

جواب:

اس مسئلے کا تعلق نہ تو عقائد سے ہے اور نہ ہی فقہی مسائل سے ہے۔ اس مسئلے سے قبل یہ جان لینا چاہئے کہ تمام روحوں کا مستقر کوئی ایک جگہ نہیں ہے، بلکہ اپنے اپنے مرتبے کے مطابق ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی روحیں مَلا اعلیٰ میں علیین میں ہیں اور ان میں بھی فرق مراتب ہے۔ شہداء کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے پوٹوں میں ہیں، بعض روحیں جنت کے دروازوں پر ہوں گی۔ حافظ ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ مومنوں کی روحیں علیین میں ہیں اور کافروں کی روحیں سجین میں ہیں۔ ہر روح کا جسم کے ساتھ ایک قسم کا تعلق ہے جو دنیوی تعلق سے مختلف ہے۔ اس تقریر سے تمام احادیث کا تعارض دور ہو جاتا ہے اور ارواح خواہ علیین میں ہوں یا سجین میں، ان کا اپنے جسموں کے ساتھ اتصال معنوی ہوتا ہے۔ اب اگر میت کو ایک قبر سے دوسری قبر میں منتقل کریں یا اس کے اجزاء منتشر ہو جائیں تب بھی روح کا اپنے جسم یا اس کے اجزاء اصلیہ سے اتصال باقی رہتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے ایک رسالہ "اِتْیَانُ الْاَرْوَاحِ لِدِیَارِھِم بَعْدَ الرَّوَاحِ" (روحوں کا وفات کے بعد اپنے گھر آنا) تحریر فرمایا، آپ لکھتے ہیں: شیخ الاسلام "کشف الغطاء عما لزم للموتیٰ علی الاحیاء" فصل ہشتم میں فرماتے ہیں:

در غرائب وخزانہ نقل کردہ کہ ارواح مومنین می آیند خانہ ہائے خود را، ہر شب جمعہ وروزِ عید وروزِ عاشورہ وشب برات، پس ایستادہ می شوند بیرون خانہائے خود وندا می کند ہر یکے بآواز بلند اندوہ گین اے اہل واولاد من ونزدیکانِ من مہربانی کنید برما بصدقہ۔

ترجمہ: "غرائب اور خزانہ میں منقول ہے کہ مومنین کی روحیں ہر شب جمعہ، روزِ عید، روزِ عاشورہ اور شب برات کو اپنے گھر کے باہر آ کر کھڑی رہتی ہیں اور ہر روح غمناک لہجے میں بلند آواز سے ندا کرتی ہے کہ اے میرے گھر والو! اے میری اولاد! اے میرے

قرابت دارو! صدقہ کر کے ہم پر مہربانی کرو"۔

ابن ابی الدنیا وبیہقی سعید بن مسیب رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی وعبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہما باہم ملے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر تم مجھ سے پہلے انتقال کرو تو مجھے خبر دینا کہ وہاں کیا پیش آیا، کہا: کیا زندے اور مردے بھی ملتے ہیں؟، کہا: نعم اما المومنون فان ارواحهم فی الجنة وهی تذهب حیث شاءت۔

ترجمہ: "ہاں مسلمانوں کی روحیں تو جنت میں ہوتی ہیں انہیں اختیار ہوتا ہے جہاں چاہیں، جائیں"۔

ابن المبارک کتاب الزہد وابوبکر ابن ابی الدنیا وابن مندہ سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: قال: ان ارواح المومنین فی برزخ من الارض تذهب حیث شاءت ونفس الکافر فی سجین

ترجمہ: "بیشک مسلمانوں کی روحیں زمین کے برزخ میں ہیں جہاں چاہتی ہیں، جاتی ہیں اور کافر کی روح سجین میں مُقیّد ہے"۔ ابن ابی الدنیا مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں: قال بلغنی ان ارواح المومنین مرسلة تذهب حیث شاءت

ترجمہ: "فرمایا: مجھے حدیث پہنچی ہے کہ مسلمانوں کی روحیں آزاد ہیں، جہاں چاہتی ہیں، جاتی ہیں"۔

دستور القضاۃ مستند صاحب مائۃ مسائل میں فتاویٰ امام نسفی ہے: ان ارواح المومنین یاتون فی کل لیلة الجمعة، ویوم الجمعة فیقومون بفناء بیوتهم ثم ینادی کل واحد منهم بصوت حزین یا اهلی ویا اولادی ویااقربائی اعطفوا علینا بالصدقة واذکرونا ولا تنسونا وارحمونا فی غربتنا۔

ترجمہ: "بے شک مسلمانوں کی روحیں ہر روز وشبِ جمعہ اپنے گھر آتی ہیں اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر دردناک آواز سے پکارتی ہیں کہ اے میرے گھر والو!، اے میرے بچو!، اے میرے عزیزو! ہم پر صدقہ سے مہربانی کرو، ہمیں یاد کرو بھول نہ جاؤ، ہماری پردیسی

میں ہم پر ترس کھاؤ''۔

نیز خزانۃ الروایات مستند صاحب مائۃ مسائل میں ہے: عن ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما اذا کان یوم عید او یوم جمعۃ او یوم عاشوراء ولیلۃ النصف من الشعبان تاتی ارواح الاموات ویقومون علی ابواب بیوتھم فیقولون هل من احد یذکرنا هل من احد یترحم علینا هل من احد یذکر غربتنا الحدیث۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے جب عید یا جمعہ یا عاشورے کا دن یا شب برات ہوتی ہے، اموات کی روحیں آکر اپنے گھروں کے دروازوں پر کھڑی ہوتی اور کہتی ہیں: کوئی ہے کہ ہمیں یاد کرے، کوئی ہے کہ ہم پر ترس کھائے، کوئی ہے کہ ہماری پردیسی ہونے کو یاد رکھے''۔

اسی طرح کنز العباد میں بھی کتاب الروضہ امام زندویسی سے منقول، یہ مسئلہ کہ نہ عقائد کا ہے نہ فقہ کے حلال وحرام کا۔ ایسی جگہ دو ایک سندیں بھی بس ہوتی نہ کہ اس قدر کثیر ووافر۔

امام جلالۃ الملۃ والدین سیوطی مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفاء زیر رثائے امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لم اجدہ فی شئی من کتب الاثر لکن صاحب اقتباس الانوار وابن الحاج فی مدخلہ ذکراہ فی ضمن حدیث طویل وکفی بذلک سنداً لمثلہ فانہ لیس مما یتعلق بالاحکام۔

ترجمہ: ''میں نے یہ حدیث کسی کتابِ حدیث میں نہ پائی، مگر صاحبِ اقتباس الانوار اور ابن الحاج نے ''مدخل'' میں اسے ایک حدیثِ طویل میں بے سند ذکر کیا۔ ایسی حدیث کی اتنی ہی سند کافی ہے کہ وہ کچھ احکام سے متعلق نہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، رسالہ ''اِتْیَانُ الْاَرْوَاحِ لِدِیَارِھِم بَعْدَ الرَّوَاحِ''، ص: 649 تا 659)

امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

''اور نیز اکثر کتب معتبرہ اہلسنت وجماعت، فقہ واحادیث وتفاسیر مثلاً دقائق الاخبار،

دارالحسان، دستور القضاۃ، فتاویٰ نسفیہ، الاشباہ والنظائر، روضۃ الریاحین، خزانۃ الروایات، عوارف المعارف، تذکرۃ الموتیٰ، فتاویٰ عزیزی، تفسیرِ عزیزی اور اشعۃ اللمعات میں ارواح کا آنا مسطور، (فتاویٰ رضویہ، جلد 14، ص:696)''۔

شیخ خلیل احمد انبیٹھوی نے لکھا ہے: ''اور بعد ان سب امور کے یہ سنو کہ یہ اعتقادیات میں داخل ہے کہ ارواح کا شبِ جمعہ کو گھر آنا اعتقاد کرے اور اعتقادیات میں قطعیات کا اعتبار ہوتا ہے، نہ ظنیاتِ صحاح کا، چہ جائے کہ ضِعاف اور موضوعات کا، پس سب قصہ طے ہوگیا، (البراہین القاطعہ علی الانوار الساطعۃ، ص:89)''۔

شیخ اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں: ''اگر ایسی ویسی کتاب میں لکھا ہوا دیکھو، تب بھی ایسا اعتقاد مت رکھنا، جس کتاب کو عالم سند نہ رکھیں، وہ بھروسے کی نہیں ہے''۔

(بہشتی زیور، جلد:06، ص:686، مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور)

بعض مبارک ایام میں ارواحِ موتیٰ کا آنا اگرچہ رسول اللہ ﷺ سے کسی صحیح یا ضعیف سند سے ثابت نہیں ہے، تاہم اثرِ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مستند و معتبر اکابرِ امت کی کتب سے ثابت ہے، یعنی ان اکابرِ امت نے ان روایات کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ نقل بھی کیا ہے۔ اثرِ صحابی کے بارے میں یہ حسنِ ظن ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک بات نقل کی ہے تو ضرور رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوگا۔ اصولِ فقہ میں یہ امر مسلّم ہے کہ کسی چیز کے بارے میں شرعی حیثیت سے جس درجے کا دعویٰ کیا جائے، اسی درجے کی دلیل طلب کی جانی چاہئے۔ ہر مسئلے کے لئے ''قطعیّ الثبوت اور قطعی الدلالۃ'' دلیل طلب کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ ایسی دلیل کا انکار تو کفر ہے۔ یہ امر بھی مسلّم ہے کہ فضائلِ اعمال میں ''ظنی الثبوت اور ظنیّ الدلالۃ'' دلیل ہی کافی سمجھی جاتی ہے، اکابر علماءِ دیوبند کے ہاں ایسی متعدد مثالیں ملیں گی، مولانا محمد زکریا نے فضائلِ اعمال میں ایسے کثیر حوالہ جات ذکر کئے ہیں۔ ''اتیانِ ارواح'' کا مسئلہ بھی اسی قبیل سے ہے، چنانچہ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''بالجملہ یہ مسئلہ نہ بابِ عقائد سے، نہ بابِ احکامِ حلال وحرام سے، اسے جتنا ماننا چاہئے،

اس کے لئے اتنی سندیں کافی ووافی ۔منکر اگر صرف انکارِ یقین کرے ،یعنی اس پر جزم ویقین نہیں ،تو ٹھیک ہے ۔اور عامّہ مسائلِ سِیَر ومغازی واخبار وفضائل ایسے ہی ہوتے ہیں ،اس کے باعث وہ مردود نہیں قرار پاسکتے ۔اور اگر دعوائے نفی کرے یعنی کہے: مجھے معلوم وثابت ہے کہ روحیں نہیں آتیں تو جھوٹا کذاب ہے ۔بالفرض ان روایات سے قطعِ نظر بھی ،تو غایت یہ کہ عدمِ ثبوت ہے نہ ثبوتِ عدم ،اور بے دلیل عدم محض تحکّم وستم ۔آنے کے بارے تو اتنی کتب وعلماء کی عبارات اور اتنی روایات بھی ہیں ،نفی وانکار کے لئے کون سی روایت ہے؟ ۔کس حدیث میں آیا کہ روحوں کا آنا باطل وغلط ہے؟ ،تو ادِّعائے بے دلیل محض باطل وذلیل"۔

"کیسی ہٹ دھرمی ہے کہ طرفِ مقابل پر روایاتِ موجودہ صرف بربنائے ضُعف مردود اور اپنی طرف روایت نام نہ نشان اور ادِّعائے نفی کا بلند نشان ۔روحوں کا آنا اگر بابِ عقائد سے ہے تو نفیاً واثباتاً ہر طرح اسی باب سے ہوگا (یعنی جس درجے کی دلیلِ اثبات ہے ،کم ازکم اسی درجے کی دلیلِ نفی پیش کردیجئے)۔اور دعوائے نفی کے لئے بھی دلیلِ قطعی درکار ہوگی (یعنی جب ثبوت کے لئے دلیلِ قطعی طلب کی جاتی ہے تو نفی کے لئے بھی ویسی ہی دلیل چاہئے)۔یا مسئلہ ایک طرف (یعنی طرفِ اثبات) سے بابِ عقائد میں ہے کہ صحاح (کی ضعیف احادیث) بھی مردود ،اور دوسری طرف (یعنی طرفِ نفی) سے ضروریاتِ (دین) میں (سے) ہے کہ اصلاً حاجتِ دلیل مفقود ،(فتاویٰ رضویہ ،جلد:9،ص:656)"

مسلکی خلافیات میں راہِ اعتدال یہ ہے کہ جس درجے کا دعویٰ ہو ،اسی درجے کی دلیل طلب کی جائے اور جو فریق کسی دعوے کا منکر ہو وہ اسی درجے کی دلیل پیش کرے ۔

لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ان باتوں کو مسلکی اختلاف کا سبب نہ بنایا جائے ،اگر کوئی ان کو تسلیم نہیں کرتا تو اس پر کوئی شرعی حکم عائد نہیں ہوگا ۔اگر کوئی شخص قوی دلائل اور صحیح احادیث کی بنا پر بالعموم یا علیٰ تقدیر التسلیم ان روایات کی تائید کی وجہ سے اپنے مرحومین اور مرحومات کو ان خاص مبارک ایام میں ایصالِ ثواب کرتا ہے تو یہ مستحب اور مستحسن عمل ہے اور اس کا انکار باطل ہے ،ہٹ دھرمی ہے اور محض عِناد ہے ۔ایصالِ ثواب میں تو بندہ اللہ تعالیٰ ہی کی بارگاہ

میں رجوع کرتا ہے، جو بندگی کا قرینہ ہے اور ایصالِ ثواب اپنی اصل کے اعتبار سے مستحسن ومطلوب ہے۔ البتہ ان روایات کو بنیاد بنا کر اگر کوئی شخص خلافِ شرع کام کرتا ہے یا اپنی طرف سے کوئی طریقہ وضع کرتا ہے، تو یہ یقیناً بدعتِ سیئہ ہے۔

جنازہ قبرستان لے جاتے وقت میّت کے پاؤں قبلے کی جانب ہونے کا حکم

سوال:62

زید فوت ہوگیا، اس کا گھر مغرب کی سمت واقع ہے، جبکہ قبرستان مشرق میں واقع ہے۔ تدفین کے لئے جب قبرستان جانے لگے تو اس کا سر قبرستان کی طرف رکھیں تو ٹانگیں مغرب یعنی جانبِ قبلہ ہوں گی اور اگر سر مغرب کی طرف رکھیں تو پاؤں قبرستان کی طرف جو معروف طریقے کے خلاف ہے۔ ایک دیہات کے لوگ اس مسئلے میں تذبذب کا شکار ہیں۔ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں یہ مسئلہ حل فرمائیں۔

(قاری محمد جمیل، خطیب مسجد الغازی، پاکستان رینجرز ہیڈکوارٹر، غازی روڈ لاہور، پنجاب)

جواب:

جنازہ قبرستان لے جانے کے لئے سنت طریقہ یہ ہے کہ میت کا سرہانا قبرستان کی جانب ہو یعنی اگر قبرستان جانبِ مشرق ہے تو میت کے پاؤں قبلہ کی جانب کئے جائیں، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وفی حالۃ المشی بالجنازۃ یقدم الرأس کذا فی المضمرات

ترجمہ: ''جنازہ لے چلنے میں میت کا سرہانا آگے ہونا چاہیے، جیسا کہ ''مضمرات'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:162، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

مفتی محمد نور اللہ نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا گیا کہ ''اگر قبرستان مشرق کی طرف ہو تو جنازے کے پیر قبلہ کی طرف کئے جائیں یا سامنے؟'' انہوں نے جواب میں لکھا: ''فقہائے کرام نے جنازہ اٹھانے کا جو طریقہ سنتِ کاملہ بیان فرمایا، وہ مستلزم ہے کہ اگر قبرستان جانبِ مشرق ہو تو پاؤں قبلہ کی طرف کئے جائیں، ہندیہ وغیرہا میں ہے: اما کمال السنۃ فلا یتحقق الا فی واحد الخ''۔ ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: سر آگے ہی

ہونا چاہیے، فتاویٰ عالمگیری ص: 83، جلد 1، البحر الرائق ص: 193، جلد 2، فتاویٰ برہنہ ص: 357 دفتر اول میں ہے: والنظم من الهندية وفي حالة المشي بالجنازة يقدم الراس كذا في المضمرات۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں: حضرت امام عالی مقام امامِ اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد اور خود ان کا اپنا معمول ہے جو ہماری کتابوں میں مفصل ہے، وہ یہ ہے کہ میت اٹھانے والا میت کی اگلی دائیں طرف پہلے اپنے دائیں شانے پر اٹھائے، پھر میت کی پچھلی دائیں طرف اپنے دائیں شانے پر اٹھائے، پھر اگلی بائیں طرف اپنے بائیں شانے پر، بعد ازاں پچھلی بائیں طرف اپنے بائیں شانے پر اٹھائے، فتاویٰ عالمگیری، صفحہ 83 جلد 1 میں ہے: واما كمال السنة فلا يتحقق الا في واحد وهو ان يبدأ الحامل بحمل يمين مقدم الجنازة كذا في التتارخانية فيحمله على عاتقه الايمن ثم المؤخر الايمن على عاتقه الايمن ثم المقدم الايسر على عاتقه الايسر هكذا في التبيين، ترجمہ: ''کمالِ سنت ایک ہی صورت میں متحقق ہوگی کہ جنازہ اٹھانے والا میت کی اگلی دائیں طرف اپنے دائیں شانے پر اٹھائے جیسا کہ'' تاتارخانیہ'' میں ہے، پھر میت کی پچھلی دائیں طرف اپنے دائیں شانے پر اٹھائے پھر اگلی بائیں طرف اپنے بائیں شانے پر اور پھر پچھلی بائیں طرف اپنے بائیں شانے پر اٹھائے، اسی طرح ''تبیین'' میں ہے۔ جامع صغیر صفحہ 21 میں ہے: قال محمد رحمه الله تعالى رأيت ابا حنيفة رضي الله تعالى عنه يصنع هذا ترجمہ: ''امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسی طرح کرتے دیکھا''۔ اور جب اس طریقے سے اٹھایا جائے تو سر قبرستان کی طرف ہی ہوگا۔ باقی رہا یہ وہم کہ قبرستان مشرق کی طرف ہو تو میت کے پاؤں کعبہ شریف کی طرف ہو جائیں گے تو وہ بالکل غلط ہے کیونکہ مریض اور میت کا ایسی صورت میں منہ قبلہ کی طرف سمجھا جاتا ہے۔ اگر کھڑا کر دیا جائے تو قبلہ رخ نظر آئے گا لہٰذا اس صورت میں قبلہ رُخ تصور کیا جائے گا اور کوئی حرج نہیں ہوگا، فتاویٰ عالمگیری صفحہ 81 جلد 1 میں ہے: الوضع طولا كما في حالة المرض اذا اراد الصلوٰة بايماء، ترجمہ: ''میت کو طولاً لمبائی میں رکھا

جائے گا، جیسے بیماری کی حالت میں جب مریض نہ کھڑے ہونے کی سکت رکھتا ہو اور نہ بیٹھنے کی، تو وہ اس طرح لیٹے لیٹے اشارے سے نماز پڑھے گا کہ اس کے پاؤں قبلہ رُو ہوں گے، (فتاویٰ نوریہ، جلد 1 ص: 713، 714، 716)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وان تعذر القعود أومأ بالرکوع والسجود مستلقیا علی ظھرہ وجعل رجلیه الی القبلة وینبغی أن یوضع تحت رأسه وسادة حتیٰ یکون شبیه القاعد لیتمکن من الایماء بالرکوع والسجود۔

ترجمہ: ''اگر میّت کے لئے بیٹھنا دشوار ہو، تو وہ پیٹھ کے بل چت لیٹ کر اشارے سے رکوع وسجود کرے گا اور اس کے دونوں پاؤں کا رُخ قبلے کی جانب ہوگا اور ایسے (معذور مریض) کے سر کے نیچے تکیہ رکھ لینا چاہیے تاکہ بیٹھے ہوئے شخص کے مشابہ ہو جائے (اور) اشارے سے رکوع وسجود کر سکے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 136، 137)''۔ تو جب عذر کی صورت میں زندہ معذور مریض کو نماز کے وقت پاؤں قبلے کی جانب رکھنے کی اجازت ہے، تو مُردے کے لئے ایسی اجازت میں ہرگز تردّد نہیں ہونا چاہیے۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے بھی اس مسئلے کی تائید فرمائی ہے۔

میّت کو دفن کرنے کے بعد قبر کھودنا جائز نہیں

سوال: 63

میرا نام رشید احمد عباسی ہے، میری دوسری والدہ کا ڈیڑھ سال قبل انتقال ہو گیا تھا، اُن سے میرے دو بھائی (محمد نجم، کریم احمد) ہیں، دونوں امام مسجد ہیں۔ چھ ماہ قبل مجھ سے انہوں نے تذکرہ کیا کہ والدہ کی قبر (6 نمبر قبرستان واقع نیو کراچی) پر پختہ مزار تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور کوئی صاحب ان کو اس مقصد کے لئے لاکھوں روپیہ عطیہ دینے کو تیار ہیں، ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ والد صاحب کی قبر جو کہ قریب ہی ہے اس کو بھی مزار کے احاطے میں شامل کرنا چاہتے ہیں، جبکہ والد کی وفات کو چوبیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، میں نے سختی سے منع کر دیا، جبکہ دوسرے بھائی اس معاملے میں بالکل خاموش رہے۔

یکم جون بروز پیر جبکہ میں شہر سے باہر تھا ان دونوں نے والدہ کی قبر کھول کر مسجد میں اعلان کردیا کہ معجزہ رونما ہوا ہے اور قبر ازخود کھل گئی ہے۔قبر پر لوگوں کا مجمع اکٹھا کرلیا اور قبر کی اندر کی مووی بھی بنوائی۔ایک ٹیلی ویژن چینل سے ان لوگوں کا رابطہ ہے اور دیگر لوگوں کا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے ٹی وی پر مووی دکھائی گئی۔جمعہ کے روز تفصیلات پمفلٹ (نقل منسلک ہے) کی صورت میں چھپوا کر مساجد میں تقسیم کروائی جو سراسر جھوٹ کا پلندہ ہے۔معلوم یہ کرنا ہے کہ اس طرح کسی خاتون کی قبر کھول کر اس کی مووی بنانا اور لوگوں کو دکھانا کیا اسلام میں اس کی اجازت ہے کہ مردے کی بے حرمتی کی جائے۔دراصل یہ دونوں بھائی مزار تعمیر کرکے آمدنی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔(رشید احمد عباسی، R-52، سیکٹر 5B/2 نارتھ کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اس بات سے قطع نظر کہ سوال میں مذکور مندرجات حقیقت پر مبنی ہیں یا نہیں؟، ہم اصلِ مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ شریعتِ مطہرہ میں میّت کی تدفین کے بعد اُس کی قبر کھولنا ناجائز وحرام ہے، کیونکہ تدفین کے بعد میت اللہ تعالیٰ کے سپرد کردی جاتی ہے اور وہی اس کے حال کو بہتر جانتا ہے اور تبدیلی احوال پر بھی اسی کو قدرت واختیار حاصل ہے۔میت کو دفن کرنے کے بعد پھر قبر کو کھودنا جائز نہیں، مگر جب کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو مثلاً کسی کو غصب شدہ زمین میں دفن کیا گیا یا دفن کے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں قبر کھودنے کی اجازت ہے۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (لا یخرج منه) بعد اهالة التراب (الا) لحق آدمی، (كأن تكون الارض مغصوبة أو أخذت بشفعة) ویخیر المالك بین اخراجه ومساواته بالأرض۔

ترجمہ: ”میت پر مٹی ڈال دینے کے بعد میت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا، سوائے اس کے کہ کسی انسان کا حق اس سے متعلق ہو، مثلاً غصب شدہ زمین میں دفن کیا گیا ہو یا حقِ شفعہ کی بنا پر کسی نے لے لی ہو، تو زمین کے مالک کو اختیار ہوگا کہ میت کو قبر سے نکلوادے یا زمین برابر کردے، (ردالمحتار جلد 3 صفحہ 135،136، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''مسلمان کی قبر کو کھودنا تو نہایت سخت شدید جرم ہے، اسلامی سلطنت ہو تو ایسا شخص سخت تعزیر کا مستحق ہے یہاں تک کہ سلطانِ اسلام کی اگر رائے ہو تو جو ایسی حرکت کا مرتکب ہوا کرتا ہو، اُسے سزائے قتل دے سکتا ہے، جو شخص ناحق پر اس کی تائید کرتے ہیں سب اسی کی طرح مرتکب جرم و مستحق سزا ہیں۔
قَالَ اللهُ تَعَالٰی: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ترجمہ: ''گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (القرآن، المائدہ:2)''۔
رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے: مَنْ مَشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُعِيْنَهٗ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَلَعَ مِنْ عُنُقِهٖ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ۔
ترجمہ: ''جو دانستہ کسی ظالم کی مدد کو چلے اس نے اپنی گردن سے اسلام کی رسی نکال دی''۔
(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:540 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مصنف بہارِ شریعت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ ''ایک بستی میں ہیضہ کی بیماری ہوگئی تو لوگوں نے کہا کہ یہاں کفن چور آ گیا ہے، اسی وجہ سے آدمی زیادہ مرتے ہیں چنانچہ لوگوں نے قبریں کھود کھود کر تین چار مردوں کی لاشوں کو جو پندرہ بیس روز کی مدفون تھیں، باہر نکالیں تو دیکھا گیا کہ ان کی لاشیں ویسی ہی تھیں، جیسی دفن کی گئی تھیں بلکہ اُس سے بھی زیادہ بدن فربہ اور حسین ہوگیا تھا، آپ نے جواب میں لکھا: میت کو دفن کرنے کے بعد پھر قبر کو کھودنا جائز نہیں، مگر جب کہ کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو، مثلاً: زمینِ مغصوب میں دفن کیا گیا یا دفن کرتے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں قبر کھودنے کی اجازت ہے اور اگر کسی آدمی کا حق اس کے ساتھ متعلق نہ ہو تو کھودنا جائز نہیں، یہاں تک کہ اگر بغیر غسل میت کو دفن کر دیا ہو تو نہلانے کے لئے اس کو قبر کھود کر نکالنا درست نہیں، درمختار میں ہے: لا یخرج منه بعد اهالة التراب الا لحق آدمی، کأن تکون الارض مغصوبة ردالمحتار میں ہے: قوله الا لحق آدمی احتراز عن حق الله تعالٰی کما اذا دفن بلا غسل او صلاة او وضع علی غیر یمینه او الی غیر القبلة فانه

لاینبش علیه بعد اهالة التراب کما مرّ، لہٰذا اس صورت میں جن لوگوں نے قبروں کو کھودا اُنہوں نے بہت ہی برا کیا۔

ایک اور سوال کہ میّت دفن کرتے وقت قبر پر تختے دیدیئے گئے، لیکن جب مٹی دی گئی تو اس کی وجہ سے قبر دھنس گئی۔ اب ایسی صورت میں قبر کو فوراً درست کرنے کے لئے میّت کو قبر سے باہر نکال سکتے ہیں یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: ''جب مٹی دے چکے تو اب میّت کو نکالنا جائز نہیں درمختار میں ہے: لایخرج منه بعد اهالة التراب الا لحق آدمی۔''

(فتاویٰ امجدیہ، جلد اول، صفحہ: 326، 327، مکتبۂ رضویہ، کراچی)

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ لوگوں کا قبر کھولنا ناجائز و حرام ہے اگر کسی سبب سے قبر کی سلیب ہٹ جائے یا قبر بیٹھ جائے، تب بھی قبر کھولنا جائز نہیں بلکہ اوپر ہی سے مٹی ڈال کر قبر کو پر کر دیا جائے، سلیب ہٹا کر قبر کھولنا قطعاً جائز نہیں ہے۔

ایصالِ ثواب اور چہلم کی رسوم میں غیر شرعی باتیں

سوال: 64

ہمارے علاقے میں جب کسی کا انتقال ہو جاتا ہے تو چالیس دن تک ہر روز رات کے وقت کھانا پکا کر اس پر فاتحہ دی جاتی ہے، جس میں میت کو ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے اور یہ شرط رکھی جاتی ہے کہ جس آدمی نے پہلے دن وہ کھانا (یعنی جس کھانے پر فاتحہ دی گئی ہے) کھایا تھا، اب چالیس روز تک وہی کھانا کھائے گا اور اس کے علاوہ کوئی اور شخص وہ کھانا (فاتحہ والا) نہیں کھا سکتا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے اور اگر نہیں تو جو اس شرط پر عمل کرتے ہیں ان کے لئے کیا حکم ہے؟۔ ہمارے علاقے میں کسی کی وفات کے بعد ''چہلم'' کیا جاتا ہے، جس کو ہماری زبان میں ''پنڈ ھارہ'' کہا جاتا ہے، اس کا طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ امیر وغریب کا امتیاز کیے بغیر مطلقاً دعوت کی جاتی ہے، جس میں لوگ آتے ہیں اور کھانا کھا کر واپس چلے جاتے ہیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ علاقے میں ''چہلم'' کے کھانے کی جو روٹین ہے اس کو مدِ نظر رکھا جائے، چاہے اس کے لئے قرض

ہی کیوں نہ لینا پڑے، آیا شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے اور جو شخص قرض لے کر ایصال ثواب کرے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟، (یاسر رحمٰن، نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اپنے کسی عمل خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو، ایصالِ ثواب کہلاتا ہے، اسی طرح دوسرے کو ثواب پہنچانے کے لئے مالی صدقہ وخیرات بھی کیا جاسکتا ہے اور دعاءِ مغفرت بھی کی جاسکتی ہے، یہ سب امور شریعت میں ثابت ہیں۔ کسی کے ایصالِ ثواب کے لئے چالیس دن تک یا اس سے کم یا زیادہ مدت کے لئے کسی مستحق کو کھلانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے اور کسی ایک مستحق کو مسلسل کھلانے میں بھی کوئی شرعی مانع نہیں ہے۔ لیکن یہ عقیدہ رکھنا کہ ایک معین فقیر ہی کو چالیس دن تک کھلانا باعث ثواب ہے، متفرق فقراء کو کھلانا کار ثواب نہیں ہے، یہ عقیدہ باطل ہے، کیونکہ جس چیز کو شارع نے معین نہیں کیا، اسے تعیین شرعی کا درجہ دینا باطل ہے۔ سوئم، چہلم، برسی پر ایصالِ ثواب کا کھانا فقراء کو کھلانا چاہیے وہی اس کے اصل مستحقین ہیں۔ اگر امرا کھالیں تو شرعاً منع بھی نہیں ہے کیونکہ یہ نفلی صدقہ ہے اور اس کا فقراء ومساکین پر تصدق افضل ہے واجب نہیں ہے۔ اپنے خوش حال رشتے داروں اور دوست واحباب کے لئے دعوت کا اہتمام کرنا بھی باعث اجر ہے، ان کے لئے ہدیہ اور ہبہ کی نیت سے کھلانا بہتر ہے، ایصالِ ثواب اس کا بھی ہوسکتا ہے۔ قرض لے کر ایصالِ ثواب کرلیا تو ثواب یقیناً ملے گا، لیکن شریعت نے جس امر کا مکلف نہیں کیا، اپنے آپ کو اُس کا مکلف بنانا اور خود کو زیر بار کرنا شرعاً پسندیدہ امر نہیں ہے۔ اسی سبب رسول اللہ ﷺ نے نذر ماننے کو پسند نہیں فرمایا، لیکن اگر کسی نے مان لی تو واجب ہوجائے گی اور اس کو پورا کرلیا تو اجر بھی ملے گا۔ اگر کسی علاقے میں ایصالِ ثواب تہذیب وثقافت کے طور پر کیا جائے یا محض رسم سمجھ کر کیا جائے، یا نہ کرنے والے کو ملامت کی جائے، خواہ وہ استطاعت نہ رکھتا ہو اور اسے مجبوراً قرض لے کر کرنا پڑے ورنہ طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے گا، تو یہ طرزِ عمل غیر شرعی ہے اور کسی مستحب امر کے نہ کرنے پر ملامت کرنا اسے واجب کا

درجہ دینا ہے اور یہ بدعت ہے، کسی امر کو واجب قرار دینا صرف شارع کا اختیار ہے۔

چہلم میں تین چاند گزرنے کی شرعی حیثیت

سوال:65

میری والدہ کا انتقال 29 شعبان 1430ھ کو ہو چکا ہے، اس کے مطابق چالیس روز 8 یا 9 شوال 1430ء کو ہوں گے۔ چالیسویں کی نیاز میں خاندان کے بزرگوں کا اصرار ہے کہ چہلم کی فاتحہ رمضان المبارک ہی کے مہینہ میں ہونی چاہئے کیونکہ شوال کا چاند انتقال کی تاریخ 29 شعبان سے تیسرا چاند ہوگا اور تیسرے چاند تک چہلم لے جانا بے شُبھ اور خطرناک ہوتا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں مناسب حل بیان فرمائیں۔ (عبدالوحید، F.B ایریا، کراچی)

جواب:

چہلم ایصالِ ثواب کے لئے ہوتا ہے، اس کے لئے کوئی خاص دن مقرر نہیں ہے کہ اُس دن سے پہلے یا اس کے بعد نہیں ہوسکتا۔ اپنی سہولت کے مطابق کوئی بھی دن مقرر کر سکتے ہیں یا کسی بھی دن کر سکتے ہیں۔ ایصالِ ثواب، دعاءِ مغفرت اور فاتحہ مستحب امور ہیں، شرعاً لازم اور ضروری نہیں ہیں۔ تیسرے چاند کے شروع ہونے کے بعد ایصالِ ثواب کی کوئی ممانعت نہیں ہے، نہ ہی اسے بے شُبھ، خطرناک یا نحس کہنا درست ہے۔ ایصالِ ثواب سال کے کسی بھی دن کر سکتے ہیں، کوئی ممانعت نہیں ہے۔ یہ خیر کا کام ہے، اس میں نحوست کا کوئی تصور نہیں ہے۔

زکوٰۃ کے مسائل

زکوٰۃ کی رقم مصارفِ مسجد میں استعمال نہیں کی جاسکتی

سوال:66

ہمارے علاقے کی مسجد کا بجلی کا بل تقریباً ایک لاکھ روپے تک پہنچ چکا ہے۔ اب مسجد کمیٹی کا کہنا ہے کہ اس بل کی ادائیگی زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم سے کی جاسکتی ہے۔ کیا شرعاً اس کی اجازت ہے کہ مسجد کا بل زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے جمع کرایا جاسکے؟۔

(محمد مہتاب عالم، اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب:

زکوٰۃ یا فطرے کی رقم تعمیر مسجد یا مصارفِ مسجد میں استعمال نہیں کی جاسکتی، اکثر مساجد کمیٹیاں ان مقاصد کے لئے حیلے کا سہارا لیتی ہیں، یہ حیلہ کا غلط استعمال ہے اور اس سے منشائے شریعت کو باطل کرنا مقصود ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ولا یجوز أن یبنی بالزکاۃ المسجد وکذا القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری النهار والحج والجهاد وکل ما لاتملیك فیه ولا یجوز أن یکفن بها میت ولا یقضی بها دین المیت کذا فی التبیین

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ کی رقم سے مسجد کی تعمیر جائز نہیں ہے، اسی طرح پلوں کی تعمیر، کنوؤں کی کھدائی، راستوں کی درستگی، نہروں کی کھدائی اور حج اور جہاد کے لئے (زکوٰۃ کی رقم کا براہِ راست استعمال) جائز نہیں ہے۔ (اسی طرح) ہر اُس کام کے لئے جس میں تملیک نہیں پائی جاتی (زکوٰۃ کی رقم کا استعمال) جائز نہیں ہے۔ (زکوٰۃ کی رقم کو) میت کے کفن دفن اور اُس کے قرض کی ادائیگی کے لئے (براہِ راست استعمال کرنا) جائز نہیں ہے، ''تبیین'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:188، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے خلافت فنڈ میں زکوٰۃ کی رقم دینے کے متعلق سوال کے جواب میں لکھا: ''زکوٰۃ مسجد میں دے تو ادا ہو نہیں سکتی، اسے خلافت فنڈ میں کیسے دیا جاسکتا ہے، زکوٰۃ کا رکن ''تملیک'' (یعنی فقیر کو مالک بنانا) ہے۔ درمختار میں ہے:

لا صرف الی مسجد لعدم التملیك وھو الرکن،

ترجمہ: ''کسی مسجد میں مالِ زکوٰۃ کو خرچ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں محتاج کو مالک نہیں بنایا جاتا، جبکہ تملیکِ فقیر زکوٰۃ کا رکن ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص:106)''۔

اس تفصیل کی روشنی میں مسجد کی بجلی کا بل زکوٰۃ وفطرہ کی رقم سے ادا نہیں کیا جاسکتا، اس طرح زکوٰۃ وفطرہ کی ادائیگی سے بری الذمہ نہیں ہوں گے اور عند اللہ مسجد کی انتظامیہ جواب دہ ہوگی۔ کراچی میں مساجد کی انتظامیہ مساجد میں قائم حفظ وناظرہ کے مدارس کے نام پر، جہاں اہلِ محلہ کے بچے پڑھتے ہیں، زکوٰۃ وفطرہ جمع کرتے ہیں، یہ بھی شرعاً درست نہیں ہے۔ زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کے مصارف اللہ جل شانہٗ نے قرآن مجید میں سورۂ توبہ آیت نمبر 60 میں بیان فرمادیئے ہیں، ان میں کمی بیشی کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بنِ مَسْلَمَۃَ (بِسَنَدِہٖ) اَنَّہٗ سَمِعَ زِیَادَ بْنِ حَارِثِ الصَّدَائِیِّ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَبَایَعْتُہٗ فَذَکَرَ حَدِیْثًا طَوِیْلًا، فَاَتَاہُ رَجُلًا فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَرْضَ بِحُکْمِ نَبِیٍّ وَّلَا غَیْرِہٖ حَتّٰی حَکَمَ فِیْھَا ھُوَ فَجَزَّاَھَا ثَمَانِیَۃَ اَجْزَاءٍ فَاِنْ کُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْاَجْزَاءِ اَعْطَیْتُكَ حَقَّكَ۔

ترجمہ: ''عبد اللہ بن مسلمہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ان کے شیخ الشیخ نے زیاد بن حارث صدائی کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا: ''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعتِ اسلام کی، پھر انہوں نے ایک طویل حدیث بیان کی اور اس دوران انہوں نے بیان کیا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ عنایت فرمایئے! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے فرمایا: (مصارفِ زکوٰۃ کے معاملے کو) اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے حکم پر نہیں چھوڑا (یعنی یہ صوابدیدی مسئلہ نہیں ہے)، بلکہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے (سورۂ توبہ:60 میں) خود ہی فیصلہ فرمادیا ہے اور اس کے آٹھ مصارف بیان کئے ہیں۔

پس اگر تم ان میں سے کسی مَصرَف کے تحت حق دار بنتے ہو تو (مالِ زکوٰۃ میں سے) تمہارا حق تمہیں دے دوں گا (ورنہ تمہیں نہیں دوں گا)، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 1627)"۔

نوٹ: ہمارے ایک فاضل مفتی صاحب نے عالمگیری کی اس عبارت کی طرف متوجہ کیا:

(والحيلة فيه أن يتصدق بها على فقير) ثم هو يكفن به الميت فيكون له ثواب الصدقة ولاهل الميت ثواب التكفين وكذلك في جمع أبواب البرالتي لايقع بها التمليك كعمارة المساجد وبناء القناطير

ترجمہ: "اور اس میں حیلے کی ایک صورت یہ ہے کہ (غنی) اپنی واجب زکوٰۃ فقیر کو صدقہ کرے، پھر وہ اسے اِن مصارف پر صرف کرنے کا حکم دے تو صدقہ دینے والے کو بھی اس صدقے کا ثواب ملے گا اور اس فقیر کو بھی مسجد اور پل بنانے کا ثواب ملے گا"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 392)

اُن کا مقصد یہ تھا کہ شریعت میں ان حیلوں کی گنجائش موجود ہے، میرا موقف یہ ہے کہ اصل مقصد شریعت یہ ہے کہ مالِ زکوٰۃ کو اس کے حقیقی مصرف پر خرچ کیا جائے اور شدید ضرورت کے بغیر اس اصول سے انحراف نہ کیا جائے، اسی لئے فقہاءِ کرام نے تملیک فقیر پر اس قدر زور دیا ہے۔ ناگزیر حالات یا مواقع پر حیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے، مگر اسے اگر عام اصول ورواج (General Practice) بنادیا جائے تو پھر یقیناً اس سے مقصدِ شریعت باطل ہوگا، جیسے آج کل کراچی میں بعض تنظیمیں، انجمنیں اور مساجد کی انتظامیہ کے لوگ رمضان المبارک میں محلے کے بچوں کے مکتب کے نام پر دھڑلے سے زکوٰۃ وفطرہ کی رقوم جمع کرتے ہیں اور پھر شرعی حدود وقیود کی رعایت کئے بغیر خرچ کرتے ہیں، اگر ایسا ہی ہوتا تو شارع علیہ الصلاۃ والسلام مساجد کو براہِ راست مصارفِ زکوٰۃ میں شامل فرمادیتے۔

زکوٰۃ محض وکیل کو دینے سے ادا نہیں ہوتی

سوال: 67

ایک شخص نے اپنی زکوٰۃ کی رقم ہر مہینے ایک بیوہ عورت کو پہنچانے کے لئے ایک قابل

بھروسا نوجوان کے سپرد کی اور وہ یہ سمجھتا رہا کہ مذکورہ رقم بیوہ تک پہنچ رہی ہوگی۔ کئی سال بعد اُس شخص کی بیوہ سے ملاقات ہوئی کسی بات پر یہ راز کھلا کہ چند ماہ تک تو یہ رقم اُسے ملی لیکن تقریباً پانچ چھ سال سے کوئی رقم نہیں ملی۔ جب اُس شخص نے نوجوان سے دریافت کیا تو اُس نے قبول کرلیا کہ ہاں میں نے کئی سال سے یہ گناہ یا بے ایمانی کی ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس گناہ کی سزا کیا ہے اور کفارہ یا تلافی کس طرح ہوگی؟۔

(محمد حسین، ہارون منزل، کراچی)

جواب:

صورتِ مسؤلہ میں مذکورہ نوجوان کی حیثیت زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے محض وکیل کی ہے، اُس پر لازم تھا کہ وکیل کی حیثیت سے بیوہ کو آپ کی زکوٰۃ پہنچاتا، جس میں وہ خیانت کا مرتکب ہوا۔ امانت میں قصداً خیانت سے متعلق قرآنِ مجید میں آیاتِ کریمہ اور احادیثِ مبارکہ بکثرت موجود ہیں اور آخرت میں عذاب کی وعیدیں بھی ہیں۔ مذکورہ شخص پر اس رقم کا تاوان دینا لازم ہے کہ وہ اُس شخص کو (جو زکوٰۃ کی رقم اُس کے سپرد کرتا تھا) تاوان (یعنی اتنی ہی رقم) ادا کرے اور وہ شخص پھر اپنی زکوٰۃ ادا کرے۔

جس عرصے کی زکوٰۃ اس نے مستحق بیوہ تک نہیں پہنچائی، وہ ادا نہیں ہوئی اور اب آپ کے ذمہ اس عرصے کی زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہے۔ البتہ آپ کے وکیل نوجوان نے جو قصداً خیانت کی ہے، اس پر وہ گنہگار ہے اور اس پر توبہ لازم ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ وہ ساری رقم آپ کو واپس لوٹائے۔ ایسے شخص کے لئے حدیث پاک میں وعید ہے:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے اس موضوع پر مندرجہ ذیل حدیث نقل فرمائی:

مَاخَالَطَتِ الصَّدَقَةَ اَوْ مَالَ الزَّكٰوةِ مَالًا اِلَّا اَفْسَدَتْهُ رواه البزاز والبيهقى عن ام المومنين الصديقه رضى الله تعالىٰ عنها

ترجمہ: ''بزاز اور بیہقی (شعب الایمان للبیہقی، فصل الاستعفاف عن المسئلۃ، رقم الحدیث: 3522) نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت بیان کی: صدقے

اور زکوٰۃ کا مال جس مال میں ملا ہوگا، اُسے تباہ و برباد کردے گا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص:172)''۔

اسی حدیث کی شرح میں علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''بعض آئمہ نے اس حدیث کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ زکوٰۃ واجب ہوئی اور ادا نہ کی اور اپنے مال میں ملائے رہا تو یہ حرام (یعنی فقراء و مساکین کا حق) اُس حلال کو ہلاک کردے گا۔ اور امام احمد نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ مال دار شخص مالِ زکوٰۃ لے تو یہ مالِ زکوٰۃ اس کے مال کو ہلاک کردے گا کہ زکوٰۃ فقیروں کیلئے ہے اور دونوں معنی صحیح ہیں، (بہارِ شریعت، جلد اوّل، ص:357)''۔

ہلاکت کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ وہ مال ہلاک ہوجائے گا اور دوسرا یہ کہ زکوٰۃ کے اختلاط سے اس مال میں برکت نہیں رہے گی۔

زکوٰۃ کے چند مسائل

میری بھانجی جو صاحبِ نصاب نہیں ہے، میں اُن کو زکوٰۃ کی رقم سے مکان یا پلاٹ دینا چاہتا ہوں، جس سے امید ہے کہ اُنہیں مستقبل میں رہنے کی جگہ کا مسئلہ نہیں ہوگا اور اگر اُس میں نہ بھی رہیں تو کرائے پر دے کر مالی فوائد حاصل کرسکتی ہیں۔ چند مسائل زکوٰۃ سے متعلق جاننا چاہتا ہوں جو میرے ساتھ دوسروں کی رہنمائی کا بھی ذریعہ بنیں گے۔

(دلاور خان، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)

سوال:68

1۔ کیا یہ بتائے بغیر کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، کسی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے زبان سے کہنا ضروری ہے یا محض نیت کافی ہے؟، کچھ لوگ ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی مروّت یا خودداری کے سبب لینے سے انکار کردیتے ہیں تو کیا اُنہیں زبردستی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

اگر کسی مستحق زکوٰۃ کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ خودداری کی بنا پر نہیں لے گا تو اُس

شخص کو یہ بتائے بغیر بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، بلکہ ھبہ یا قرض کہہ کر بھی دی جاسکتی ہے، جبکہ دل میں یہ نیت ہو کہ واپس نہیں لوں گا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کرلے تو یہ ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن أعطی مسکیناً دراھم وسماھا ھبۃً أو قرضًا ونوی الزکاۃ فانھا تُجزیہ وھو الاصح ھکذا فی البحر الرائق ناقلاً عن المبتغی والقنیۃ۔

ترجمہ: ''اور جو شخص کسی مسکین (مستحقِ زکوٰۃ شخص) کو کچھ دراہم (زکوٰۃ کی مد میں) یہ کہہ کر دے کہ یہ ہبہ یا قرضہ ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کرلے تو یہ عمل ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی ہے اور یہی قول صحیح ترین ہے ''البحر الرائق'' میں ''المبتغی'' اور ''قنیہ'' میں اسی طرح منقول ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 171، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

ایسے رشتے دار یا افراد جو زکوٰۃ کے مستحق ہوں، ان کو بتائے بغیر بھی زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں، بلکہ دل میں نیت اور ارادہ کافی ہے۔ رشتے دار اگر مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے، کیونکہ اس میں ادائے زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ صلۂ رحمی کا اجر بھی ملتا ہے اور اُن کی خودداری کو قائم رکھتے ہوئے زکوٰۃ کے بجائے ہبہ یا قرض کہہ کر بھی دے سکتے ہیں۔ زکوٰۃ کے مستحق رشتے دار کو مالک بنا کر مکان دیا جاسکتا ہے، اگرچہ سارا یا بیشتر مالِ زکوٰۃ کسی ایک فرد کو دینا پسندیدہ نہیں ہے، شریعت کا منشا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ضرورت مندوں کی کفالت ہوسکے۔

سوال:69

2۔ کیا میں یہ مکان یا پلاٹ (زکوٰۃ کی رقم سے) اِس شرط کے ساتھ کہ وہ اُسے نہ بیچیں، دے سکتا ہوں؟۔

جواب:

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک (مالک بنانا) شرط ہے، یعنی جس مستحق کو زکوٰۃ دی جارہی ہے، اُسے اُس مال پر تصرُّف کا مکمل اختیار حاصل ہونا چاہئے اور آپ کی مذکورہ شرط

سے مالکانہ تصرّف کا اختیار باطل ہو جاتا ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی زکوٰۃ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(هی) لغة الطهارة والنماء، وشرعاً (تمليك) خرج الاباحة، فلو اطعم يتيماً ناوياً الزكاة لايجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم، كما لو كساه بشرط أن يعقل القبض الا اذا حكم عليه بنفقتهم۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے لغوی معنیٰ ہیں: ''(مال کا) پاک ہونا اور (مال کا) بڑھنا''۔ زکوٰۃ کے شرعی معنی ہیں: ''فقیر کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنا دینا ہے''۔ تملیک کی قید سے محض مباح کر دینا (یعنی فقرا کو مالِ زکوٰۃ کے استعمال کی عام اجازت دینا) خارج ہو گیا، پس اگر کسی شخص نے نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کھانا کھلا دیا تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مگر جب وہی کھانا یتیم کے حوالے کر دیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، جیسے اگر ادائے زکوٰۃ کے لئے یتیم کو کپڑا پہنایا بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہو (تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی)، لیکن اگر حاکم نے اسے یتیم کو نان نفقہ دینے کا حکم دے دیا ہے تو اب یتیم پر خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی (بلکہ وہ یتیم کی کفالت کر کے اپنا فرض ادا کرے گا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 3، ص: 161)''۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ويشترط أن يكون الصرف (تمليكاً) لا اباحة كما مرّ (لا) يصرف (الى بناء) نحو (مسجد و) لاالى (كفن ميت وقضاء دينه)۔

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو مالک بنا دیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ (گذشتہ سطور میں) گزرا، زکوٰۃ مسجد وغیرہ کی تعمیر میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی میت کے کفن دفن اور اس کے قرض کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا ہوگی، (حوالہ مذکورہ، ص: 263)''۔

لیکن اگر میت کا کوئی وارث مستحقِ زکوٰۃ ہے اور کوئی شخص اسے زکوٰۃ کی رقم دے دیتا ہے اور وہ اس کا مالک بن کر اپنی مرضی سے میت کے کفن دفن اور قرض کی ادائیگی پر خرچ کرتا ہے تو جائز ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: الهبة والصدقة لايفسدان بالشرط الفاسد۔

ترجمہ: ''ہبہ اور صدقہ شرطِ فاسد سے باطل نہیں ہوتے''۔ یعنی اگر کسی شخص نے کسی کو کوئی چیز ہبہ کر دی ہے یا صدقے کے طور پر دے دی ہے اور وہ اس کے تصرف پر کوئی شرط بھی عائد کر دے مثلاً تم اسے بیچ نہیں سکو گے تو یہ شرط باطل ہو جائے گی اور ہبہ یا صدقہ کی ہوئی چیز پر قبضہ اور مِلک قائم ہونے کے بعد اسے ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہوگا۔

سوال:70

3۔ان پلاٹس یا مکان کی دیکھ بھال، مرمت، بجلی وغیرہ کے بل، ٹیکس کی ادائیگی زکوٰۃ کی رقم سے کی جاسکتی ہے؟۔اسی طرح مکان یا پلاٹس کو نام کرانے کے اخراجات، حکومتی ٹیکس کی ادائیگی یا کسی مرحلے پر رشوت دینا پڑے تو کیا زکوٰہ کی رقم سے دی جاسکتی ہے؟

جواب:

مذکورہ مدات یعنی مستحقِ زکوٰۃ کو دیئے گئے پلاٹ کی دیکھ بھال، مرمت، بجلی وغیرہ کے بلوں کی ادائیگی اور ٹیکسوں کو براہِ راست ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، البتہ اگر نادار کو زکوٰۃ کی رقم دے دی جائے اور وہ اپنی مرضی سے اسے ان مصارف پر خرچ کرے تو جائز ہے۔اسی طرح پلاٹ یا مکان کو مستحق کے نام منتقل کرنے کے اخراجات بھی براہِ راست کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، البتہ اگر مستحق کو رقم دے دی جائے اور وہ اپنی مرضی سے ان مصارف پر خرچ کرے تو جائز ہے۔رشوت کا لین دین شرعاً حرام ہے۔

سوال:71

4۔کیا مکان یا پلاٹ کے ساتھ ساتھ نقد رقم بھی دے سکتا ہوں؟۔

جواب:

اگر کوئی شخص کسی مستحق کو مکان یا پلاٹ کا مالک بنا دیتا ہے تو یہ چیزیں حاجتِ اصلیہ میں سے ہیں اور اِس پلاٹ یا مکان کا مالک بننے کے بعد بھی اُس شخص کے پاس کوئی اور مال نہیں ہے تو وہ پھر بھی مستحقِ زکوٰۃ ہے اور اسے زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔

سوال:72

5۔کیا میں اِس بھانجی کے علاوہ بھانجے، بھتیجے، بھتیجی بہن، بہنوئی وغیرہ کو بھی زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟۔

جواب:

یہ قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار اور مستحقِ زکوٰۃ ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے، کیونکہ اس میں ادائے زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ صلۂ رحمی کا بھی اجر ملتا ہے۔تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ) کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، یہی حکم صدقۂ فطر' فدیۂ نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے۔خالہ، خالو، ماموں، ممانی، بہو یا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر کی اپنی بیوی کی کسی سابق شوہر سے اولاد (اگر یہ لوگ صاحب نصاب نہ ہوں تو) ان سب کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔البتہ بہن بھائیوں میں سے کوئی مستحق ہے تو اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: والافضل فی الزکاۃ والفطر والنذر الصرف أولا الی الاخوۃ والاخوات ثم الی اولادھم ثم الی الاعمام والعمات ثم الی اولادھم ثم الی الاخوال والخالات ثم الی اولادھم ثم الی ذوی الارحام ثم الی الجیران ثم الی اھل حرفتہ ثم الی اھل مصرأو قریتہ کذا فی السراج الوھاج۔

ترجمہ:''زکوٰۃ، فطرہ اور نذر کی رقوم میں افضل یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے بہن بھائیوں، پھر ان کی اولاد، پھر چچاؤں اور پھپیوں، پھر ان کی اولاد، پھر خالاؤں اور ماموؤں، پھر ان کی اولاد، پھر ذوی الارحام (دور کے رشتہ داروں)، پھر پڑوسیوں، پھر اپنے پیشے کے افراد، پھر شہر یا بستی والوں کو دی جائے (بشرطیکہ یہ تمام لوگ نادار ہوں اور مستحقِ زکوٰۃ ہوں)، جیسا کہ''سراج الوہاج''میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:190، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

مسجد کی تعمیر میں زکوٰۃ کا استعمال

سوال:73

مسجد کی تعمیر وترقی میں زکوٰۃ، فطرہ، صدقہ وخیرات کی رقم استعمال ہوسکتی ہے یا نہیں؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حیلہ کر کے (کسی محتاج کو دے کر اس سے مسجد کے لئے عطیہ کرا کے) استعمال کر سکتے ہیں، اس حیلے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔

(صوفی محمد جمیل راجپوت، سیکٹر 34/2 کورنگی 3، کراچی)

جواب:

مسجد کی تعمیر وترقی صدقاتِ واجبہ (یعنی زکوٰۃ/فطرہ/فدیہ/کفارات اور نذر کی رقوم) کا مصرف نہیں ہے، مساجد کی انتظامیہ کا مساجد کے نام پر ان رقوم کا جمع کرنا درست نہیں ہے، شریعت نے انہیں اس بات کا مُکلّف نہیں بنایا کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ اور فطرے وغیرہ کی رقوم وصول کر کے مسجدیں تعمیر کریں، اس طرح زکوٰۃ وفطرہ کی ادائیگی نہیں ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہوں گے اور لوگوں کے صدقاتِ واجبہ کو باطل کرنے کا سبب بنیں گے۔

جو لوگ ان مقاصد کے لئے حیلہ کا سہارا لیتے ہیں، یہ حیلہ کا غلط استعمال ہے اور اس سے منشائے شریعت کو باطل کرنا مقصود ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: کسی خفیہ طریقہ سے مقصود حاصل کرنے کو حیلہ کہتے ہیں، علما کے نزدیک اس کی کئی اقسام ہیں:

(۱) اگر جائز طریقے سے کسی کا حق (خواہ اللہ کا حق ہو جیسے زکوٰۃ یا بندے کا حق) باطل کیا جائے یا کسی باطل مال (مثلاً سود، رشوت، غصب وغیرہ) کو حاصل کیا جائے تو یہ حیلہ حرام ہے۔(۲) اگر جائز طریقے سے کسی حق کو حاصل کیا جائے یا کسی ظلم یا باطل کو دفع کیا جائے تو حیلہ مستحب یا واجب ہے (۳) اگر جائز طریقے سے کسی ضرر سے محفوظ رہا جائے تو یہ حیلہ مباح ہے (۴) اگر جائز طریقے سے کسی مستحب کو ترک کرنے کا حیلہ کیا جائے تو یہ مکروہ ہے، (فتح الباری، جلد 12، ص:326)۔

پاکستان اسلامی مملکت ہے، یہاں دیہات، قصبوں اور پسماندہ بستیوں اور محلوں میں

بھی لوگ اپنے حلال مال اور عطیات سے مساجد بناتے رہتے ہیں اور ان کے مصارف برداشت کرتے ہیں، میرے نزدیک یہاں کسی ایسے حیلے کا جواز نہیں بنتا۔ اور مسلمان شرعاً اِس بات کے مکلف بھی نہیں کہ ساری کی ساری مسجدیں عالیشان اور حسین وجمیل ہوں۔ مساجد کی اصل آبادی اور رونقیں تو مُصَلِّیان، عابدین، ذاکرین، قارئینِ قرآن اور معتکفین سے ہوتی ہیں، مسلمانوں کو چاہیے کہ اس پر زور دیں اور یہ کام پیسہ خرچ کیے بغیر صرف ذوقِ عبادت سے انجام پاسکتا ہے۔

روزے کے مسائل

سفر میں روزے کا شرعی حکم

سوال:74

رمضانِ مبارک میں حالتِ سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے یا چھوڑنا اور سفر کی کم از کم مقدار یا مسافت کتنی ہے، جس کی بنا پر شرعاً روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے؟۔

(ڈاکٹر محمد افضل، نوشہرہ فیروز، سندھ)

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ

ترجمہ: ''اور (رمضان میں) جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو (عذر کی بنا پر روزہ چھوڑ سکتا ہے، مگر رمضان کے بعد چھوڑے ہوئے روزوں کی) گنتی دوسرے دنوں میں پورا کرلے، (البقرہ:185)''۔ حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا اَنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍو الْاَسْلَمِيَّ، قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ اَاَصُوْمُ فِي السَّفَرِ؟ وَكَانَ كَثِيْرَ الصِّيَامِ، فَقَالَ اِنْ شِئْتَ فَصُمْ، وَاِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ۔

ترجمہ: ''نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حمزہ بن عمرو اسلمی کثرت سے روزے رکھتے تھے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا: کیا میں سفر میں روزے رکھوں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: (تمہیں اختیار ہے) اگر چاہو تو روزہ رکھو اور چاہو تو چھوڑ دو (اور بعد میں قضا کرلینا)، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1943)

(۲) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ لِسِتَّ عَشْرَةَ مَضَتْ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ، فَمِنَّا مَنْ صَامَ، وَمِنَّا مَنْ اَفْطَرَ، فَلَمْ يَعِبِ الصَّائِمُ عَلَى الْمُفْطِرِ وَلَا الْمُفْطِرُ عَلَى الصَّائِمِ،

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم 16 رمضان کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کے لئے نکلے، ہم میں سے بعض نے روزہ رکھا اور بعض نے روزہ چھوڑ

دیا، تو کسی نے دوسرے کو ملامت نہیں کیا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2504)''۔

(۳) عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِي سَفَرٍ، فَرَاٰى زِحَامًا وَرَجُلًا قَدْ ظُلِّلَ عَلَيْهِ فَقَالَ مَا هٰذَا؟، قَالُوْا صَائِمٌ، فَقَالَ لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ،

ترجمہ: ''حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے (غالباً یہ فتح مکہ کا سفر تھا)، آپ ﷺ نے بھیڑ میں لوگوں کو ایک شخص پر سایہ کیے ہوئے دیکھا، تو فرمایا: یہ کیا ہے؟، صحابۂ کرام نے عرض کیا: یہ ایک روزے دار شخص ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: حالتِ سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1946)''۔

چونکہ یہ جہاد کا سفر تھا اور حالتِ جہاد میں مجاہد کا تازہ دم رہنا ضروری ہے، اس لئے اس خاص صورتِ حال میں حضور ﷺ نے روزہ چھوڑنے کو افضل قرار دیا۔

(۴) عَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي السَّفَرِ، فَمِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ فَنَزَلْنَا مَنْزِلًا فِي يَوْمٍ حَارٍّ، اَكْثَرُنَا ظِلًّا صَاحِبُ الْكِسَاءِ وَمِنَّا مَنْ يَّتَّقِي الشَّمْسَ بِيَدِهٖ، قَالَ فَسَقَطَ الصُّوَّامُوْنَ وَقَامَ الْمُفْطِرُوْنَ فَضَرَبُوا الْاَبْنِيَةَ وَسَقَوا الرِّكَابَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ الْيَوْمَ بِالْاَجْرِ،

ترجمہ: ''حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ ہم (رمضان کے دوران فتح مکہ کے سفر میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، تو ہم میں سے بعض نے روزہ رکھا اور بعض نے روزہ چھوڑ دیا، پھر ہم ایک دن شدید گرمی میں ایک مقام پر اترے، ہم میں سے اکثر نے اپنے اوپر چادر کا سایہ کر رکھا اور بعض اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو سورج کی تپش سے بچا رہے تھے، (راوی) بیان کرتے ہیں: پس روزے دار گرنے پڑنے لگے اور روزہ چھوڑنے والے (چاک وچوبند) کھڑے رہے، پس انہوں نے خیمے تانے اور مویشیوں کو پانی پلایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آج روزہ چھوڑنے والے اجر کمانے میں سبقت لے گئے''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:2512)'

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت میں سفر میں روزہ رکھنے کی رخصت ہے، سفر کی مشقت

برداشت کر کے روزہ رکھنا عزیمت ہے، لیکن سفرِ جہاد یا بعض خاص صورتوں میں، جہاں آدمی کا ہر وقت تازہ دم رہنا شرعاً ضروری ہو، وہاں روزہ چھوڑ دینے کا اجر زیادہ ہے۔ یعنی خاص حالات میں شرعی احکام کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔

سفر میں عُذر کی بنا پر روزہ چھوڑنے کے لئے شرعی سفر کی مقدار وہی ہے جو نماز کی قصر کیلئے ہے، یعنی اس کے گھر سے منزلِ مقصود تک پیدل چلنے کے اعتبار سے کم از کم تین دن کی مسافت ہو۔ کم از کم مسافتِ سفر جس کے سبب ''قصر'' واجب ہوتی ہے، وہ ہے جو انسان اپنی طبعی ضروریات ولوازمات (یعنی کھانا اور دوسری طبعی حاجات پوری کرنے) اور شرعی فرائض (یعنی نمازوں) کی ادائیگی کے ساتھ اپنی اوسط رفتار سے تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے۔ موجودہ دور میں مسافت کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ گذشتہ دور میں مسافت کو انگریزی میلوں اور بعد میں کلومیٹر سے ناپا جانے لگا، لہٰذا ماضیِ قریب کے علماء نے مسافتِ قصر کی مقدار انگریزی میلوں سے مقرر کی۔ فقہاءِ کرام کے اقوال میں مفتیٰ بہ قول اٹھارہ فرسخ ہے، ایک فرسخ تین شرعی میل کے برابر ہوتا ہے ایک شرعی میل 2000 گز کا ہوتا ہے۔ اور اٹھارہ فرسخ 54 شرعی میل کے برابر ہیں، جو ایک لاکھ آٹھ ہزار گز یعنی 61 انگریزی میل 2 فرلانگ 20 گز بنتے ہیں (واضح رہے کہ انگریزی میل 1760 گز کا ہوتا ہے)۔ اور موجودہ اعشاری پیمانے کے اعتبار سے یہ مسافت یہ 98 کلومیٹر 734 میٹر (یعنی 98.734 کلومیٹر) کے برابر ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ثم اختلفوا فقیل احد وعشرون، وقیل ثمانیة عشر، وقیل خمسة عشر، والفتویٰ علی الثانی لانه الاوسط

ترجمہ: ''(شرعی سفر کی مسافت کے بارے میں) فقہاءِ کرام کا اختلاف ہے (اور اس سلسلے میں تین اقوال ہیں) ایک قول 21 فرسخ کا ہے، دوسرا قول 18 فرسخ کا ہے اور تیسرا قول 15 فرسخ کا ہے، اور فتویٰ دوسرے قول پر ہے، کیوں کہ یہ اوسط قول ہے (یعنی مسافتِ شرعی 18 فرسخ ہے)، (درمختار: جلد نمبر 2 ص: 526 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)''۔

پس مفتیٰ بہ قول کے مطابق سفرِ شرعی کی کم از کم مسافت 98.734 کلومیٹر ہے، لہٰذا جب بھی کوئی شخص اپنے گھر سے کم از کم 98.734 کلومیٹر یا اس سے زیادہ مسافت کے سفر پر روانہ ہو تو وہ نماز قصر پڑھے اور اسے سفر کی بنا پر رمضانِ مبارک کا روزہ چھوڑنے کی بھی رخصت ہے، جس کی بعد میں قضا لازم ہوگی۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''سفر میں روزہ رکھنا کیسا ہے؟''، آپ نے جواب میں لکھا:

''جو اپنے گھر سے تین منزل کامل یا زیادہ کی راہ کا ارادہ کرکے چلے، خواہ کسی نیت اچھی یا بری سے جانا ہو، وہ جب تک مکان کو پلٹ کر نہ آئے یا بیچ میں کہیں ٹھہرنے کی جگہ پندرہ دن قیام کی نیت نہ کرلے، مسافر ہے۔ ایسے شخص کو جس دن کی صبح صادق مسافرت کے حال میں آئے اُس دن کا روزہ ناغہ کرنا اور پھر کبھی اس کی قضا رکھ لینا جائز ہے، پھر اگر روزہ اسے نقصان نہ کرے، نہ اُس کے رفیق کو اُس کے روزہ سے ایذا ہو، جب تو روزہ رکھنا ہی بہتر ہے ورنہ قضا کرنا بہتر ہے، فی الدر المختار: لمسافر سفرا شرعیا ولو بمعصیة الفطر، ویندب الصوم ان لم یضرہ فان شق علیه او علی رفیقه فالفطر افضل لموافقة الجماعة، ویجب علی مقیم اتمام صوم یوم من رمضان سافر فی ذلك الیوم۔

ترجمہ: ''درمختار میں ہے: وہ مسافر جس کا سفر، شرعی (مقدار کے برابر) ہو خواہ گناہ کی خاطر ہو، تو وہ روزہ چھوڑ سکتا ہے۔ اور اگر اسے روزہ تکلیف نہ دے تو روزہ رکھنا مستحب ہے اور اگر روزہ مشکل ہو یا اس کے ساتھی پر مشکل ہو تو پھر جماعت کی موافقت میں افطار افضل ہے۔ مقیم پر رمضان کے اُس روزے کا پورا کرنا لازم ہے جس دن اس نے سفر شروع کیا ہو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 348،347، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ رمضان کے دوران حالتِ سفر میں روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کے بارے میں مسافر کو اختیار ہے کہ اگر وہ اپنے لئے یا اپنے شریکِ سفر ساتھیوں کیلئے آسانی سمجھے، تو روزہ رکھ لے، ورنہ روزہ چھوڑ دے اور رمضان کے بعد قضا کرے۔ سفر کی شرعی مقدار 98.734 کلومیٹر ہے۔ البتہ اگر سفر جہاد کیلئے ہو یا کسی ایسے نیک مقصد کیلئے جس میں

مشقت زیادہ ہو اور آدمی کا چاک و چوبند رہنا ضروری ہو تو رمضان کا روزہ چھوڑنا افضل ہے۔

دائمی عذر کے سبب روزہ نہ رکھنے والے پر فدیہ ہے، کفارہ نہیں

سوال:75

میرا بائی پاس آپریشن ہوا ہے، روزے نہیں رکھ سکتا، سن رسیدگی اور کمزوری کی وجہ سے قضا بھی نہیں رکھ سکتا، کفارہ دینا چاہتا ہوں۔ روزوں کا کفارہ کیا ہے؟، یہ کفارہ کس کو دے سکتا ہوں؟۔ میری نگرانی میں ایک دینی مدرسہ ہے، جس میں گاؤں اور شہر کے بچے زیرِ تعلیم اور رہائش پذیر ہیں، مدرسے کے اخراجات میں خود برداشت کرتا ہوں، کیا اُن اخراجات میں میرا کفارہ ادا ہو جائے گا، یا کفارہ کی نیت کرنا ضروری ہے؟، یہ کفارہ اپنے دینی مدرسے کے بچوں پر خرچ کر سکتا ہوں؟، (سید محمد عارف شاہ، کوئٹہ)۔

جواب:

جو شخص انتہائی عمر رسیدہ ہو یا جس کو ایسا دائمی مرض (جیسے ذیابیطس وغیرہ) لاحق ہو، جس سے بظاہر شفا کی امید نہیں ہے اور ان وجوہ کے سبب وہ اپنے آپ کو روزہ رکھنے کے قابل نہیں پاتا، تو ایسا شخص شرعاً معذور قرار پاتا ہے اور اس کے لئے روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے۔ دائمی معذور کے لئے فدیہ ہے، کفارہ نہیں ہے۔ اس پر لازم ہے کہ ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلائے یا اپنے اوسط معیار کے مطابق ایک دن کے طعام کے لئے نقد رقم دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ ترجمہ: ''پس تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو (اور عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے) تو دوسرے دنوں میں (روزوں کی) تعداد پوری کرے، اور جن لوگوں پر روزہ رکھنا دشوار ہو (ان پر ایک روزے کا) فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے، پھر جو خوشی سے فدیے کی مقدار میں نیکی کے جذبے کے ساتھ اضافہ کرے، تو یہ اس کے لئے بہتر ہے اور روزہ رکھنا

تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم (اس کی حقیقت کو) جان لو، (البقرۃ:184)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وللشیخ الفانی العاجز عن الصوم الفطر ویفدی) وجوباً ولوفی اول الشهر وبلا تعدد فقیر

ترجمہ: "ایسا عمر رسیدہ شخص جو روزہ رکھنے سے عاجز ہو، اُسے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے، اور ہر روزے کا فدیہ اُس پر واجب ہے، خواہ مہینے کے ابتدا ہی میں دیدے اور فدیہ دینے میں فقراء کی (کوئی خاص) تعداد شرط نہیں ہے (یعنی ایک فقیر کو پورے مہینے کا بھی فدیہ دے سکتا ہے)"۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:365، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

زکوٰۃ، فطرہ، نذر، کفّارات اور فدیہ کی رقوم صدقاتِ واجبہ ہیں۔ اور ان کے آٹھ مصارف اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ آیت 60 میں بیان فرمائے ہیں۔ ایسے دینی مدارس جن میں مستحق اقامتی طلبہ دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ کی رقوم اور صدقاتِ واجبہ کا بہترین مصرف ہیں۔ محض آپ کا مدرسہ کے اخراجات برداشت کرنا، فدیہ کی ادائیگی کیلئے کافی نہیں بلکہ نیت ضروری ہے اور طالبِ علم کو اس کھانے کا مالک بنانا ہے۔ فدیہ کی رقم مستحق طلبہ کو براہِ راست بھی دی جاسکتی ہے اور تملیک کے بعد اُن پر خرچ بھی کی جاسکتی ہے۔

نمازِ تراویح سنّتِ مؤکدہ ہے

سوال:76

نمازِ تراویح باجماعت سنّت ہے یا رسمِ رمضان؟۔ ایک بالغ لڑکا جس کی عمر چودہ سال ہے، پہلے نوافل میں قرآن مجید سناچکا ہے، اب اگر وہ نمازِ تراویح کی امامت کرے تو کیا اس کی امامت جائز ہے، نیز کیا نابالغ حافظ کی امامت میں فرض اور تراویح پڑھنا درست ہے؟۔ (ڈاکٹر محمد افضل، بھریا سٹی ضلع نوشہروفیروز، سندھ)۔

جواب:

لڑکے میں جب بلوغت کی علامات پائی جائیں تو عمر جتنی بھی ہو اسے بالغ تصور کیا جائے گا، ہمارے فقہاءِ کرام نے احتلام، انزال اور اس سے کسی عورت کا حمل قرار

پانے کو علامتِ بلوغ قرار دیا ہے۔لیکن اگر بلوغ کی کوئی علامت نہ پائی جائے، تو پندرہ سال کی عمر مکمل ہونے پر اسے بالغ قرار دیا جائے گا۔اس پر اس حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے: ''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ اُحُد کے دن جب کہ ان کی عمر چودہ سال تھی، رسول اللہ ﷺ نے انہیں پیش کیا اور پھر انہیں (جہاد میں شرکت کی) اجازت نہ دی۔اور غزوۂ خندق کے روز جب کہ ان کی عمر پندرہ سال تھی انہیں پیش فرمایا اور انہیں (جہاد میں شرکت کی) اجازت عطا فرما دی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:4098)''۔

فقہاءِ کرام نے لکھا ہے کہ لڑکے کے لئے کم از کم ممکنہ عمرِ بلوغ بارہ سال ہے، بشرطیکہ اس میں علاماتِ بلوغ ظاہر ہو جائیں، ورنہ عمر کے پندرہ سال مکمل ہونے پر اسے بالغ تصور کیا جائے گا۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: (وادنیٰ مدتہ لہ اثنتا عشرۃ سنۃ ولھا تسع سنین) ھو المختار،

ترجمہ: ''اور (لڑکے کے لئے کم از کم ممکنہ عمرِ بلوغ) بارہ سال ہے اور لڑکی کے لئے نو سال ہے، یہی قولِ مختار ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:9،ص:185)''۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کے بیان کے مطابق لڑکا چودہ سال کا ہے اور بالغ ہے تو اگر آپ کا بیان درست ہے اور اس لڑکے میں بلوغ کی علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں اور اُس میں امامت کے لئے ممانعت کا کوئی اور سبب بھی نہیں پایا جاتا تو وہ فرائض اور تراویح دونوں کی امامت کر سکتا ہے، فرض اور تراویح دونوں کی امامت کا معیار ایک ہی ہے۔

نابالغ کی امامت کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وامامۃ الصبی العاقل فی التراویح والنوافل المطلقۃ تجوز عند بعضھم ولا تجوز عند عامتھم کذا فی محیط السرخسی،

ترجمہ: ''بعض علماء کے نزدیک ایسا بچہ جو سمجھ دار ہے، تراویح اور مطلق نوافل میں اس کی امامت جائز ہے اور عام فقہاء کے نزدیک جائز نہیں ہے، ''محیط السرخسی'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد1،ص:117، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا گیا کہ آیا نابالغ کی امامت میں تراویح
سنت اور نفل نماز پڑھنا جائز ہے، تو آپ نے جواب میں لکھا: ''بالغ کے امام کے لئے بالغ
ہونا شرط ہے، پھر آپ نے مندرجہ ذیل فقہی عبارات کے حوالے دیئے: (۱) وشروط
الامامة للرجال الاصحاء ستة اشیاء الاسلام والبلوغ والعقل والذکورة والقراءة
والسلامة من الاعذار،

ترجمہ: ''ذی عقل مردوں کی امامت کے لئے چھ چیزیں شرط ہیں: اسلام، بلوغ، عقل، مرد
ہونا، قراءت پر قادر ہونا اور معذور نہ ہونا، (ردالمحتار بحوالہ نور الایضاح)۔ لہٰذا نابالغ کے
پیچھے بالغ کی مطلقاً کوئی نماز نہ ہوگی،

(۲) ولایصح اقتداء رجل بصبي مطلقًا ولوفی جنازة ونفل علی الاصح ترجمہ: ''صحیح
ترین روایت کے مطابق بچے کے پیچھے مطلقاً مرد کی اقتدا جائز نہیں ہے، خواہ وہ جنازے کی
نماز ہو یا نفل، (درمختار)''۔ ہاں! تراویح وسنن ونوافل میں نابالغ اگر بالغ کی امامت کرے
تو مشائخِ بلخ اِسے جائز بتاتے ہیں، مگر مختار، اَصَح اور ظاہر الروایۃ یہی ہے کہ ناجائز ہے اور یہی
عام ائمہ کا قول ہے، اور یہ بات مسلّم ہے کہ ظاہر الروایہ سے عدول نہ کیا جائے گا۔

(۳) وعلی قول آئمة بلخ یصح الاقتداء بالصبیان فی التراویح والسنن المطلقة کذا
فی ''فتاویٰ قاضی خان''، المختار انه لایجوز فی الصلوات کلها کذا فی ''الهدایة''
وهو الاصح هکذا فی ''المحیط'' وهو قول العامة وهو ''ظاهر الروایة'' هکذا فی ''البحر
الرائق''،

ترجمہ: ''ائمہ بلخ کے قول کے مطابق تراویح اور سنتوں کی جماعت میں بچوں کی اقتداء جائز
ہے، ''فتاویٰ قاضی خان'' میں اسی طرح سے ہے، (لیکن فقہاء کا) مختار قول یہی ہے کہ تمام
نمازوں میں نابالغ کی اقتداء جائز نہیں ہے، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے، یہی قول صحیح ترین
ہے، ''محیط'' میں بھی اسی طرح ہے، عام فقہاء کا قول بھی یہی ہے اور (فقہِ حنفی) کی
''ظاہر الروایۃ'' یہی ہے اور ''البحر الرائق'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری)''۔

علامہ امجد علی اعظمی کے نزدیک نابالغ کی امامت کے عدمِ جواز کا قول صحیح ترین، مختار اور راجح ہے۔ تاہم انہوں نے تراویح، سُنَن اور نوافل میں نابالغ کی امامت کے جواز کے بارے میں فقہاءِ بلخ کا قول ذکر کر کے اسے ''ظاہر الروایۃ'' کے خلاف اور غیر مختار قرار دیا ہے۔

(فتاویٰ امجدیہ، جلد اول، ص: 117، مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی)

متشرع و دین دار حافظ وقاری و عالم امام کی موجودگی میں ایسے افراد کو نماز تراویح کا امام بنانا ہرگز درست نہیں ہے جو:

(ا) نابالغ ہوں (ب) تلاوت قرآن میں ایسی غلطیاں کرتے ہوں جو فساد نماز کا باعث بنتی ہیں (ج) داڑھی منڈھواتے ہیں یا کٹواتے ہیں اور حد شرعی سے کم ہوتی ہے (د) یا رمضان مبارک سے قبل محض قرآن سنانے کے لئے داڑھی رکھ لیتے ہیں اور رمضان کے بعد منڈوا دیتے ہیں یا کٹوا کر حد شرعی سے کم کر دیتے ہیں، (ہ) یا سال بھر نماز کے تارک رہتے ہیں۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: (والجماعة فيها سنة على الكفاية) في الاصح، ولو تركها اهل مسجد اثموا، لا لو ترك بعضهم، وكل ما شرع بجماعة فالمسجد فيه افضل

ترجمہ: ''صحیح ترین روایت کے مطابق تراویح کی جماعت ''سنت علی الکفایہ'' ہے، اگر کسی مسجد کے سب لوگ چھوڑ دیں تو گنہگار ہوں گے، اور اگر بعض چھوڑ دیں (تو مؤاخذہ نہیں ہوگا) اور ہر وہ نماز جو با جماعت مشروع ہو، اس کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے۔۔۔۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں کہ اس عبارت کا مفاد یہ ہے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے نمازِ تراویح ہر شخص کے لئے سنتِ مؤکدہ ہے، لہٰذا عذر کے بغیر کسی کے لئے اس کا چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ اس کے برعکس تراویح کی جماعت سنتِ کفایہ ہے، اگر سب لوگ چھوڑیں گے تو گنہگار ہوں گے، اگر بعض لوگ جماعت سے رہ جائیں اور اپنے گھر پر پڑھیں تو فضیلت کے تارک ہوں گے۔ اور اگر کوئی اپنے گھر پر با جماعت پڑھے تو مسجد کی جماعت کی فضیلت اسے نہیں ملے گی، ''المکتوبات'' میں اسی طرح ہے، جیسا کہ ''منیہ'' میں

ہے۔رہا یہ سوال کہ آیا کسی شہر کی ہر مسجد والوں کے لئے سنت کفایہ ہے یا صرف ایک مسجد کے لئے یا محلے کی صرف ایک مسجد کے لئے؟۔علامہ حصکفی کے کلام سے پہلا قول راجح معلوم ہوتا ہے، ''طبی'' نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے اور میرے نزدیک تیسرا قول راجح ہے۔علامہ شامی مزید لکھتے ہیں کہ اگر سب لوگ نمازِ تراویح گھر پر باجماعت پڑھیں تو اس سے مسجد میں تراویح کی جماعت کے سنت ہونے کا ترک لازم آئے گا اور سب گنہگار ہوں گے''۔(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:02،ص:431)

آج کل حفاظِ قرآن کثیر تعداد میں ہیں اور سب کیلئے مسجد میں امامتِ تراویح کے مواقع دستیاب نہیں ہیں۔اور ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ جو حافظِ قرآن چند سال مسلسل نمازِ تراویح میں منزل نہ سنائے تو اس کا حفظِ قرآن محفوظ نہیں رہتا اور قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد بھلانے کی حدیث پاک میں سخت وعید آئی ہے:

(۱) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عُرِضَتْ عَلَیَّ اُجُوْرُ اُمَّتِیْ حَتّٰی الْقَذَاةُ یُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ وَعُرِضَتْ عَلَیَّ ذُنُوْبُ اُمَّتِیْ فَلَمْ اَرَ ذَنْبًا اَعْظَمَ مِنْ سُوْرَةٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ اَوْ اٰیَةٍ اُوْتِیْهَا رَجُلٌ ثُمَّ نَسِیَهَا،

ترجمہ:''حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر میری امت کے نیکیاں پیش کی گئیں یہاں تک کہ کسی شخص نے مسجد سے کوئی کوڑا کرکٹ نکالا تھا (تو وہ بھی پیش کیا گیا)۔اور مجھ پر میری امت کے گناہ پیش کئے گئے تو سب سے بڑا گناہ جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ کسی شخص کو قرآن کی کوئی سورت یا آیت عطا کی گئی ہو (یعنی اس نے اُسے یاد کیا)، پھر اُسے بھلا دیا، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:2916)''۔

(۲) عَنْ سَعْدِ بْنِ عِبَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا مِنِ امْرِئٍ یَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ ثُمَّ یَنْسَاهُ اِلَّا لَقِیَ اللهَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَجْذَمَ،

ترجمہ:''سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص قرآن پڑھتا ہے، پھر (یاد کرنے کے بعد) اسے بھلا دیتا ہے، تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس طرح

ملے گا کہ جذام کے سبب اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہوگا، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:1469)"۔

ان احادیث مبارکہ کی رو سے قرآن مجید کے حفظ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اسے محفوظ رکھنا ضروری ہے اور بھلا دینا بدقسمتی کی بات ہے۔ لہٰذا افضل صورت تو یہی ہے کہ نمازِ تراویح کی جماعت مسجد میں ہی پڑھی جائے اور حفاظِ کرام اپنے گھروں پر نوافلِ شب یا تہجد میں گھر والوں کے ساتھ اپنی قرآن کی منزل پڑھ لیا کریں۔ اور اگر وہ صاحبِ عزیمت نہ ہوں تو پھر گھروں پر محدود پیمانے پر تراویح کی جماعت کا اہتمام کر لیا کریں تاکہ قرآن محفوظ رہے، اگرچہ یہ عمل مختار نہیں ہے، لیکن قرآن کی حفاظت بھی ضروری ہے۔

رؤیتِ ہلال کے مسائل

مسئلۂ رؤیتِ ہلال

رمضان المبارک، شوال المکرم اور ذوالحجہ کے مہینوں کے آغاز کے لئے رؤیت ہلال کا مسئلہ عالمی سطح پر انتہائی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ بلاشبہ ہر مسلمان کی یہ خواہش ہے اور ہونی چاہئے کہ دینی اعتبار سے یہ مُقدّس ایام پوری قوم ایک ساتھ منائے۔ اُن مسلم ممالک میں تو ایسا ہو بھی رہا ہے جہاں ملوکیت ہے یا اُن کی حکومتوں کا انتظامی تسلّط مستحکم ہے، جیسے سعودی عرب، مشرقِ وسطیٰ و دیگر عرب ممالک، انڈونیشیا، ملائشیا و افریقی ممالک وغیرہ، آج کل اسے .Writ of the Govt سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پاکستان یا اُن ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا، چنانچہ برطانیہ اور امریکا میں بھی کم از کم دو عیدیں اور بسا اوقات تین عیدیں ہو جاتی ہیں۔ امریکا میں دو بڑی تنظیمیں اسلامک کونسل آف نارتھ امریکا اور اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا میں سے ایک (جس پر عرب مسلمانوں کا غلبہ ہے) غیر مشروط طور پر سعودی عرب کی پیروی کرتے ہیں اور دوسرے سائنسی بنیاد پر تاریخ کا تعین کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاک وہند کے دینی وفقہی نظریات پر تصلّب کے ساتھ قائم رہنے والے علماء شرعی اصولوں کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ امریکا جیسے بہت بڑے وسیع وعریض غیر مسلم ملک میں جہاں مسلمانوں کی آبادی جغرافیائی اعتبار سے انتہائی حد تک منتشر ہے، ایسا اہتمام آسان نہیں ہے، اس لئے وہاں بالعموم تین عیدیں ہوتی ہیں۔ برطانیہ، امریکا اور یورپ کے ممالک تو سائنسی اعتبار سے جدید ترین ممالک ہیں، لیکن وہاں بھی یہ مسئلہ آسان نہیں ہے، جبکہ وہ پاکستان کی رویت ہلال کمیٹی کے زیرِ اثر نہیں ہیں کہ اِس پر الزام لگا کر اپنے فریبِ نفس کو تسکین دی جائے۔

دیگر مسلم ممالک میں یہ روِش بھی نہیں ہے کہ پوری قوم، بعض سیاسی رہنما اور پورا پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا ہاتھ دھو کر رویت ہلال کے مسئلے کے پیچھے پڑ جائے اور ہفتوں تک اس موضوع پر کالم، کارٹون، ٹیلی وژن مباحثے اور بیان بازی کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ شاید قومی انتشار کی واحد وجہ ایک دِن عید کا نہ ہونا ہے۔ یومِ پاکستان اور دیگر

قومی ایام تو پوری قوم ایک ساتھ مناتی ہے، تو پھر سوال یہ ہے کہ 63 سال گزرنے کے باوجود قومی وحدت کیوں قائم نہ ہو سکی؟۔

قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک پورے ملک میں ایک عید کی روایت میرے علم میں نہیں ہے، لیکن ہر سال انتہائی حیرت واستعجاب سے پوچھا جاتا ہے کہ اِس سال دو عیدیں کیسے ہو گئیں؟۔ سابق ادوار میں نسبتاً آسانی تھی کہ چیئرمین اور ارکینِ کمیٹی اعلان کرنے کے بعد گھر جا کر آرام سے سو جاتے تھے اور صرف سرکاری نشریاتی ادارے پی ٹی وی اور ریڈیو پاکستان تھے، ان سے رویتِ ہلال کمیٹی کا فیصلہ نشر ہو جاتا تھا، کوئی مخالفانہ خبر، فیصلہ یا تبصرہ نشر نہیں ہوتا تھا۔ صرف پشاور کی ڈیٹ لائن سے ایک لائن کی سرخی پر مشتمل خبر اخبارات میں چھپ جاتی تھی کہ مقامی علماء نے مطالبہ کیا ہے کہ چیئرمین کو برطرف کرو اور رویت ہلال کمیٹی کو تبدیل کرو، اس سے اگلے دن لوگ اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اب دسیوں پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینلز، ایف ایم ریڈیوز اور سینکڑوں اخبارات ہیں۔ ان سب کی ضرورت ''بریکنگ نیوز''، ''تازہ ترین''، ''فلیش نیوز'' اور انتشار کی ایسی خبریں ہیں، جن میں سسپنس ہو، تجسّس ہو اور عوامی دلچسپی کا مرچ مصالحہ ہو۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر پاکستانی کے پاس موبائل فون ہے۔ اب آئندہ کوئی بھی چیرمین بنے، یہ تمام آفتیں اس کے استقبال اور خبر گیری کے لئے موجود رہیں گی۔ مزید یہ کہ مذہبی معاملات پرائیویٹ سیکٹر میں ہیں، حکومت کی رِٹ (تحکّم) نہ ہے اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کے کوئی آثار ہیں، بلکہ بدقسمتی سے ہر آنے والے دن حالات میں مزید بگاڑ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ملک بتدریج مسلح گروہوں کے ہاتھوں یرغمال بنتا جا رہا ہے، حکمرانوں کے لئے اپنی سلامتی اور حفاظت ایک سوالیہ نشان ہے، قوم تو اللہ تعالیٰ اور مقدر کے رحم وکرم پر ہے۔ ایسے ماحول اور ایسے ملک میں کسی بھی امام یا خطیب کا یہ فطری حق ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جو چاہے اعلان کرے، جو چاہے اقدام کرے، حکومت کی قائم کردہ قضا کو رد کرے، اسے نہ آج کوئی روکنے والا ہے اور نہ مستقبل میں ایسے آثار نظر آ رہے ہیں۔ میڈیا کے لئے 99% فیصد

مسلمانوں کا ایک ساتھ عید منانا کوئی خبر نہیں ہے بلکہ چند افراد کا الگ عید پڑھنا یہ خبر ہے۔ اور جب انحراف واعتزال کا رویہ اپنانے والوں کی اس حد تک حوصلہ افزائی ہوگی تو مستقبل میں اس روش کو مزید فروغ ملے گا۔

جہاں تک عید الفطر کے چاند کے اعلان کا تعلق ہے تو ہماری قوم کو کسی پل قرار نہیں، جلدی اعلان ہو جائے تو مطالبہ ہوتا ہے کہ دیر تک انتظار کیوں نہیں کیا، اعلان میں معمولی تاخیر ہو جائے تو مطالبہ ہوتا ہے کہ انکوائری کی جائے تاخیر کیوں ہوئی؟۔ شرعاً رویت کے فیصلے اور اعلان کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے، جب قاضی اور مجلس قضا (جو زیرِ بحث مسئلے میں "مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان" ہے) کو اطمینان ہو جائے تو فیصلے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ منگل: 29، رمضان المبارک 1429ھ، مطابق: 30، ستمبر 2008ء کو مختلف مقامات سے شہادتیں آئیں، جن میں صوبۂ سرحد کے علاوہ پنجاب میں پنڈی گھیپ، جھنگ، بھکر، میلسی، بلوچستان سے چاغی اور کوئٹہ اور سندھ سے سکھر، بدین، تلہار اور دیگر مقامات ہیں۔ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان کے رکن شیعہ عالم دین علامہ قاضی نیاز حسین نقوی کو ان کے ثقہ علماء نے ڈی آئی خان اور بلتستان اور کچھ اور مقامات سے بھی رویت کی شہادت دی۔ تلہار کے گرد و پیش کی شہادتوں کو جب ٹیلی فون پر ہمارے ماہر فلکیات نے فنی بنیادوں پر درست قرار دیا، تو ہم نے وہاں کے عالم کو ذمہ داری تفویض کی کہ بالمشافہ تعدیل کر کے یہ بتائیں کہ آیا شرعی طور پر یہ شہادتیں قابلِ قبول ہیں اور آپ ان سے شرعاً بالکل مطمئن ہیں؟، کیونکہ یہ کروڑوں مسلمانوں کے روزے کا مسئلہ ہے۔ پھر انہوں نے تعدیل کر کے ان شہادتوں کو قابلِ قبول قرار دیا۔ دوسری طرف ماہرین عدمِ امکانِ رویت پر یکسو نہیں تھے، سپارکو کے ماہر غلام مرتضیٰ صاحب اور مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان کے ماہر رکن و عالم دین مولانا شبیر احمد کاکاخیل نے رائے دی کہ ہم امکانِ رویت کو علی الاطلاق مسترد نہیں کر سکتے، لہٰذا ان شہادتوں کو قبول کر کے رویت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان (جس میں تمام مکاتبِ فکر کے جید علماء شامل ہیں) نے

اتفاقِ رائے سے رویت کا فیصلہ کیا اور اس متفقہ اور حتمی فیصلے کا میڈیا پر ایک ہی وقت میں اعلان کیا گیا۔ یہاں میں یہ بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ برطانیہ سے ایک مستند عالم دین علامہ ظفر محمود فراشوی (جو "محقِق برطانیہ" کے نام سے معروف ہیں) نے مجھے فون کر کے بتایا کہ میں نے پہلے یہاں لوگوں کو بتادیا تھا کہ پاکستان میں رویت ہلال کے امکانات ففٹی ففٹی ہیں، بالکل معدوم نہیں ہیں، میری پچیس سالہ طویل تحقیق ہے اور میں کسی بھی فورم پر چیلنج سے ثابت کرسکتا ہوں۔ اس مرحلے پر میں یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ نئے چاند کی ولادت (Birth of Moon) کے ہونے یا نہ ہونے پر تو سائنسدانوں کا کلی اتفاق واجماع ہوتا ہے، لیکن امکانِ رویت (Visibility of Moon) جب خفیف یا اَخَف (Least Chance of Visibility) درجے میں ہو، تو ان کے معیارات میں اختلاف واقع ہوجاتا ہے، مثلاً ماضی میں ایک ماہر فلکیات صمد رضوی صاحب اور سپارکو وکراچی یونیورسٹی کے ماہرین فلکیات کی رائے میں بعض مواقع پر اختلاف رہا ہے، کیونکہ صمد رضوی صاحب سیدھا سادہ البیرونی کے فارمولے کے مطابق رائے دیتے ہیں اور دوسرے ماہرین جدید معیارات (Parameters) کے مطابق رائے دیتے ہیں۔ مکمل عدمِ امکانِ رویت اور صریح امکانِ رویت کے موقع پر ماہرین میں اختلاف کی نوبت نہیں آتی بلکہ خفیف اور اَخَف امکانِ رویت (Least Chance of Visibility) کے موقع پر اختلاف ہوجاتا ہے۔ تو ایسے موقع پر اگر ہم شہادتوں کو آنکھ بند کر کے علی الاطلاق رد کردیں تو پھر شرعی نظامِ رویت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور شہادتوں کا کردار عملاً معدوم ہوجاتا ہے۔ اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے اہلِ علم اور اہلِ فن کو اس پیچیدہ صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ ہم اس وقت مسئلۂ رویت میں دو انتہاؤں کے درمیان معلّق ہیں، ایک یہ ہے کہ جدید سائنسی معلومات مطلقاً قابلِ قبول نہیں، خواہ ماہرین فلکیات یہ کہیں کہ چاند کی ولادت بھی نہیں ہوئی، جب رویت کی شہادت آگئی ہے تو ہمارے لئے یہ شرعی حجت کافی ہے۔ دوسری طرف جدت پسند طبقے کا خیال یہ ہے کہ ملک میں شرعی نظامِ

رویت کی کوئی ضرورت نہیں، بس ماہرینِ فلکیات مستقل کیلنڈر بنا کردے دیں اور اُس کے مطابق رمضان کا آغاز ہو اور عید منائی جائے۔ سب کو پہلے سے معلوم ہوگا کہ رمضان کب شروع ہو رہا ہے اور عید کب ہوگی۔ لیکن اس حقیقت سے قطع نظر کہ شریعت کی رو سے مدار رویت بصری پر ہے، مستقل قمری کیلنڈر کا مشورہ دینے والے بھول جاتے ہیں کہ پاکستان میں مستقل سائنسی کیلنڈر کیسے نافذ کیا جائے گا، کس کس سے منوایا جائے گا اور کیسے منوایا جائے گا، جب کہ ہر مسجد کا خطیب اور ہر ادارے کا مفتی اپنی ذاتی حیثیت میں مفتیٔ اعظم پاکستان ہے اور اسے ملک کی قائم کردہ مجلس قضا کو رد کرنے اور اس کے متوازی فیصلہ کرنے کا مکمل استحقاق ہے، اس کی نظر میں ماہرین فلکیات کے کیلنڈر کی وُقعت ایک پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی پاکستان میں شامل علماء کو پھر بھی ایک حد تک احترام اور مقام ہے، بعض کی بحیثیتِ مجموعی (باستثناءِ چند) تمام حلقوں میں تکریم ہے اور دیگر کا اپنے اپنے مکتبۂ فکر میں ایک مسلمہ مقام اور مستند حیثیت ہے۔

میں نے بحیثیت چیئرمین، مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی پاکستان کے تمام ارکان کی حمایت اور اتفاقِ رائے سے گذشتہ نو برسوں میں کوشش کی ہے کہ ہم فیصلہ شرعی بنیاد پر کریں، مگر جدید سائنسی معلومات سے ہر ممکن استفادہ کریں، قرائن عقلیہ کے ساتھ مطابقت پیدا کریں تاکہ ہمارا یہ دعویٰ کہ اسلام دین فطرت ہے اور اس کا کوئی حکم ماوراءِ عقل تو ہو سکتا ہے خلافِ عقل ہرگز نہیں، زمینی حقائق کے مطابق بھی سچ ثابت ہو۔ اور جوں جوں انسانی علم ترقی کرے گا دینی احکام کی حکمتیں اور قدرت کے پوشیدہ راز اس پر منکشف ہوتے چلے جائیں گے اور اسلام کی حقانیت واضح ہوتی چلی جائے گی۔ میں اپیل کرتا ہوں کہ کسی صاحب علم کے پاس کوئی ایسا فارمولا ہو تو سامنے لائے، جس سے تمام سائنسی حقائق ومعلومات کو یکسر رد کر کے محض شہادت کو حجت مان کر رویت کا فیصلہ کرنے والے صوبہ سرحد کے بعض علماء اور ماہرینِ فلکیات بیک وقت مطمئن ہو جائیں اور کسی طرف سے اختلاف وعدمِ اطمینان کی کوئی آواز بلند نہ ہو، جبکہ ان کا دعویٰ ہوتا ہے کہ ہم حلفیہ گواہی لیتے ہیں اور

تمام گواہ متشرِّع بھی ہوتے ہیں۔ باہر بیٹھ کر تبصرہ کرنے والا تبصرہ نگار (Commentator) ہمیشہ کھلاڑی سے ماہر ہوتا ہے، اس کی غلطیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کرتا ہے، خواہ اس نے خود زندگی میں میدان میں اتر کر کوئی کارنامہ انجام نہ دیا ہو۔ شریعت نے قضا میں خطا کے احتمال کو کبھی رد نہیں کیا، ورنہ قاضی کو بھی نبی کی طرح معصوم ماننا پڑے گا، لیکن شریعت نے قضا کو بہر صورت مؤثر مانا ہے اور جدید فلسفۂ قانون بھی یہی ہے۔ ورنہ جب ماہرین کے نزدیک سعودی عرب کا فیصلہ رویتِ حقیقی اور صریح امکانِ رویت کے کسی بھی معیار پر پورا نہیں اترتا، تو اس کے تحت ادا کئے جانے والے امت کے تمام حج باطل قرار پائیں گے، فاعتبروا یا اولی الابصار۔ پاکستان میں کوئی بھی رویتِ ہلال کمیٹی تشکیل پائے اور کوئی بھی چیئرمین بنے، کسی نہ کسی گوشے سے ہدفِ طعن بننا اس کا مقدر رہے گا۔ لیکن قرآن وحدیث اور اسلام کا حکم حسنِ ظن کا ہے، بغیر ثبوت وشواہد کے سوءِ ظن کی اجازت نہیں ہے۔

میں اہلِ علم اور اہلِ فتویٰ سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا قاضی کو شہادتِ کاذبہ (False Witness) اور شہادتِ مُرتابہ (Doubtful Witness) کو رد کرنے کا اختیار نہیں ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر قضا کا ادارہ قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟۔ پھر تو ہر صورت میں گواہ علی الاطلاق (Absolute) حجت ہوجائے گا اور چاہئے کہ گواہ خود ہی فیصلے کا اعلان کردے، نہ قضا کی ضرورت، نہ عدالت کی اور نہ ہی گواہ کی جرح وتعدیل کی ضرورت ہے۔

عصرِ حاضر کے مایہ ناز مفسر، محدّث، فقیہ اور محقق علامہ غلام رسول سعیدی مُدظلہم نے اس مسئلے پر مفصل اور مدلل بحث کی ہے کہ حدیث اور فقہاءِ امت سے یہ ثابت ہے کہ قطعی قرائنِ عقلیہ کے خلاف شہادت شرعاً معتبر نہیں ہے اور ایسی شہادت کو قاضی رد کرسکتا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

قرائنِ عقلیہ اور شواہد کے خلاف شہادت کا غیر معتبر ہونا:

سائنسی علوم کے ذریعہ چاند کی رویت اور پہلی تاریخ کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے اور اس سے ہمیں شہادتوں کے پرکھنے کا بھی موقع ملتا ہے کہ یہ شہادت سچی ہے یا جھوٹی ہے، جب سائنسی آلات کے ذریعہ یہ معلوم ہو جائے کہ آج چاند کی تولید نہیں ہوئی ہے اور اس کی رویت ممکن نہیں ہے اور مطلع بالکل صاف ہو اور پورے ملک میں کہیں چاند نظر نہ آیا ہو اور ایسے میں چند آدمی یہ گواہی دے دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے تو ان کی گواہی جھوٹی ہوگی اور سائنسی تحقیقات کے خلاف ان کی گواہی کا شرعاً اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ قرائن اور شواہد کے خلاف جو گواہی دی جائے وہ شرعاً معتبر نہیں ہوتی۔

علامہ ابن قیم جوزیہ (متوفی 571ھ) نے اس مسئلے پر کافی بحث کی ہے اور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ عقلی شواہد اور دلائل کے خلاف گواہوں کی گواہی کا شرعاً اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ علامہ ابن قیم جوزیہ کی چند عبارات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ہمیشہ سے آئمہ اور خلفاء اس صورت میں چور کا ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ کرتے رہے ہیں جب اس شخص سے مال برآمد ہو جائے، جس پر چوری کا الزام ہو اور یہ قرینہ گواہوں اور اقرار سے زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ گواہوں میں صدق اور کذب کا احتمال ہے اور جب چور کے پاس سے مال برآمد ہو جائے تو یہ نص صریح ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔

(الطرق الحکمیہ، ص:2، دار الکتب العلمیہ، بیروت 1415ھ)

(۲) بہت سے قرائن اور علامتیں انکار قسم سے زیادہ قوی ہوتی ہیں تو ان کو معطل کرنا کس طرح جائز ہوگا، (الطرق الحکمیہ، ص:2)

(۳) اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گواہوں کے علاوہ دوسرے دلائل گواہی سے زیادہ قوی ہوتے ہیں، جیسے وہ حال جو صدقِ مدعی پر دلالت کرتا ہو کیونکہ وہ گواہ کی خبر سے زیادہ قوی دلیل ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ امام ابوداؤد اور دیگر آئمہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے خیبر کی طرف سفر کا ارادہ کیا، جب میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور میں نے عرض کیا کہ میرا خیبر کی طرف جانے کا ارادہ ہے، تو آپ ﷺ

نے فرمایا: جب تم میرے وکیل کے پاس جاؤ تو اس سے ۱۵ وسق کھجوریں لے لینا (ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع چار کلو تین سو گرام کا ہوتا ہے) اور جب وہ تم سے کوئی نشانی طلب کرے تو تم اپنا ہاتھ اپنے گلے پر رکھ دینا، (الحدیث)۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 3632، سنن بیہقی، ج: 6، ص: 80، مشکوٰۃ، رقم الحدیث: 2935)

اس میں یہ دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے علامات اور قرائن کو گواہی کے قائم مقام قرار دیا ہے، پس شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرائن، علامات اور دلائل احوال کو لغو قرار نہیں دیا بلکہ ان پر احکامِ شرع کو مرتب کیا، (الطرق الحکمیہ، ص: 10)۔

رسول اللہ ﷺ کے حرم محترم کا تہمت سے بری ہونا:

علامہ ابن قیم جوزیہ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کو رسول اللہ ﷺ کی اُمِ ولد کے ساتھ مُتہم کیا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: جاؤ اس کی گردن اڑا دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے تو وہ ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے ایک کنویں میں غسل کر رہا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: نکلو اور اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو نکالا، دیکھا تو اس کا عضو تناسل کٹا ہوا تھا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو قتل کرنے سے رک گئے اور نبی ﷺ کی خدمت میں جا کر یہ واقعہ عرض کیا اور کہا: یا رسول اللہ! اس کا عضو تناسل تو کٹا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جس اُمِ ولد کا ذکر ہے وہ حضرت ماریہ قبطیہ تھیں، جن سے رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تھے۔

(الطبقات الکبریٰ، ج: 8، ص: 172، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

علامہ یحیٰ بن شرف نووی متوفی 676ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''وہ شخص منافق تھا اور کسی وجہ سے قتل کا مستحق تھا، نبی کریم ﷺ نے اس کے نفاق یا کسی اور سبب سے اس کے قتل کا حکم دیا تھا نہ کہ زنا کے سبب سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سمجھ کر اس کے قتل سے رک گئے کہ آپ نے اس کے زنا کی وجہ سے اس کے قتل کا حکم دیا تھا اور ان کو

یقین ہو گیا تھا کہ اس نے زنا نہیں کیا ہے۔ (شرح مسلم للنووی، جلد: 2، ص: 368)''

میں کہتا ہوں کہ علامہ نووی اور دیگر شارحین کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے کہ آپ نے اس کے نفاق یا کسی اور سبب سے اس کے قتل کا حکم دیا تھا نہ کہ زنا کے سبب سے، کیونکہ اگر یہ وجہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوبارہ اس کے قتل کرنے کے لئے بھیجتے اور صحیح یہی ہے کہ اس شخص پر یہ تہمت تھی کہ اس نے حضرت ماریہ سے زنا کیا ہے اور آپ کے نزدیک یہ بات گواہوں سے ثابت ہو گئی تھی، اس لئے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کے قتل کرنے کے لئے بھیجا۔ قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفّٰی 544ھ، علامہ ابی مالکی متوفّٰی 828ھ اور علامہ سنوسی مالکی متوفّٰی 895ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''لوگوں نے اس شخص پر حضرت ماریہ قبطیہ کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی اور نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، اس تہمت کا بھی کوئی سبب ہونا چاہئے اور اس کو قتل کرنے کی بھی کوئی وجہ ہونی چاہئے، تہمت کی وجہ یہ ہے کہ وہ شخص قبطی تھا اور چونکہ حضرت ماریہ بھی قبطیہ تھیں اس لئے ہم جنس اور ہم زبان ہونے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے اور ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے تھے، اس وجہ سے لوگوں نے اس پر تہمت لگادی اور رہی اس کو قتل کرنے کی وجہ تو امام رازی نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث میں اس کو ساقط کر دیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے آپ کے نزدیک گواہوں سے یہ ثابت ہو گیا ہو کہ اس شخص نے حضرت ماریہ کے ساتھ زنا کیا ہے، اس لئے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اس کو قتل کر دیں۔ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا اس کا عضو کٹا ہوا ہے تو انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا اور پورے واقعہ میں حکمت یہ تھی کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ کا حرم اور آپ کی اُمِ ولد اس تہمت سے بری ہیں (جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر منافقوں نے حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کے ساتھ تہمت لگائی تھی حالانکہ حضرت صفوان رضی اللہ عنہ نے بعد میں بتایا کہ وہ نامرد ہیں اور اس فعل کے اہل ہی نہیں ہیں''۔ (صحیح البخاری، رقم: 4757، سنن ابوداود، رقم:

2138، سنن ابن ماجہ، رقم: 1970)

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے حقیقتاً اس کو قتل کرنے کا حکم نہ دیا ہو اور آپ ﷺ کو یہ علم ہو کہ اس کا آلہ تناسل کٹا ہوا ہے اور آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لئے اس کے قتل کا حکم دیا ہوتا کہ اس کا معاملہ منکشف ہو جائے اور آپ کے حرم سے تہمت دور ہو جائے اور یہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کی طرف وحی کی گئی ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو قتل نہیں کریں گے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اس شخص کا نااہل ہونا منکشف ہو جائے گا، جیسا کہ اس کنویں میں اس کو برہنہ دیکھنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر منکشف ہو گیا اور باوجود علم کے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لئے حکم دیا تھا تاکہ حضرت علی بھی اس چیز کو دیکھ لیں اور ان کے نزدیک بھی آپ کی حرم محترم حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی اس تہمت سے براءت ثابت ہو جائے۔

(اکمال المعلم بفوائد مسلم، جلد: 8، ص: 304، دارالوفائ، بیروت 1419ھ، اکمال اکمال المعلم، جلد: 9، ص: 217-216، معلم اکمال الاکمال علی ھامش شرح الابی، ج: 9، ص: 217-216، دارالکتب العلمیہ، بیروت، : 1415ھ)

قاضی عیاض مالکی کی شرح کی تائید امام محمد بن سعد متوفی 230ھ کی اس روایت میں ہے:

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ جو نبی کریم ﷺ کی کنیز تھیں، ان کے بالاخانے میں ایک قبطی آیا کرتا تھا، وہ ان کو پانی اور لکڑیاں لا کر دیتا تھا، لوگ اس کے متعلق چہ مگوئیاں کرنے لگے کہ ایک عجمی مرد عجمی عورت کے پاس آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ تک یہ بات پہنچی تو آپ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بھیجا، اس وقت وہ قبطی ایک کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا تھا، اس نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو وہ گھبرا گیا اور گھبراہٹ میں اس کا تہبند کھل کر گر گیا اور عریاں ہو گیا، حضرت علی نے دیکھا کہ اس کا آلہ تناسل کٹا ہوا تھا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس گئے اور آپ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی اور کہا: ''یارسول

اللہ ﷺ! جب آپ ہم میں سے کسی شخص کو کسی کام کا حکم دیں، پھر وہ شخص اس کام میں اس کے خلاف کوئی معاملہ دیکھے تو کیا وہ شخص آپ کے پاس (وہ کام کیے بغیر) واپس آجائے؟"۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں!، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ انہوں نے دیکھا کہ اس قبطی کا تو آلہ کٹا ہوا تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے ہاں حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: السلام علیک اے ابو ابراہیم! تب رسول اللہ ﷺ مطمئن ہو گئے (کہ حضرت ماریہ پاک دامن ہیں اور ان سے آپ ہی کے بیٹے کا تولد ہوا ہے)۔

(الطبقات الکبریٰ، جلد: 8، ص: 172، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ہر چند کہ مسلم کی روایت میں ہے کہ وہ قبطی کنویں میں نہا رہا تھا اور امام ابن سعد کی روایت میں ہے کہ وہ کھجور کے درخت پر تھا، لیکن بنیادی چیز میں دونوں روایتیں متحد ہیں کہ اس قبطی کی وجہ سے لوگوں نے حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کو متہم کیا تھا اور لوگوں نے اس کے خلاف نبی کریم ﷺ کے سامنے شہادت دی جیسا کہ شارحین نے ذکر کیا ہے اور اس وجہ سے نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اس کو قتل کر کے آئیں اور اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو برہنہ دیکھ لیا اور معلوم ہو گیا کہ اس کا آلہ کٹا ہوا ہے اور اس سے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی براءت ثابت ہو گئی۔

تاہم ان دونوں حدیثوں سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ جب کوئی شہادت قرائن اور شواہد کے خلاف ہو تو اس شہادت کا شرعاً اعتبار نہیں کیا جاتا، فقہاء اسلام بھی اس امر پر متفق ہیں کہ اگر گواہوں کی گواہی قرائن اور شواہد کے خلاف ہو تو اس کا شرعاً اعتبار نہیں ہوگا۔ فقہاء اسلام کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

قرائن عقلیہ اور شواہد کے خلاف شہادت کے غیر معتبر ہونے کے متعلق فقہاء اسلام کی تصریحات:

علامہ ابن قدامہ حنبلی (متوفی: 620ھ) نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا یہ موقف ہے کہ اگر چار گواہ یہ گواہی دیں کہ فلاں عورت نے زنا کیا لیکن بعد

میں معلوم ہوا کہ وہ عورت کنواری ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ اس طرح اگر چار گواہ یہ گواہی دیں کہ فلاں شخص نے زنا کیا ہے لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اس کا آلہ تناسل کٹا ہوا ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، (المغنی، ج:9،ص:71، دارالفکر، بیروت، 1405ھ)۔

فقہاءِ شافعیہ کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی الشافعی المتوفّٰی :450ھ لکھتے ہیں:

المزنی نے کہا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر چار آدمیوں نے کسی عورت کے خلاف زنا کی شہادت دی اور چار نیک عورتوں نے یہ بتایا کہ وہ کنواری ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، (الحاوی الکبیر، ج:7،ص:81، دارالفکر، بیروت 1414ھ)۔

علامہ یحیٰ بن شرف نواوی متوفّٰی :676ھ نے بھی اس طرح لکھا ہے۔

(روضۃ الطالبین، جلد:7،ص:315، دارالکتب العلمیہ، بیروت)

فقہاءِ احناف نے اپنی متعدد کتب میں یہ لکھا ہے کہ کسی عورت کے خلاف چار مردوں نے گواہی دی کہ اس نے زنا کیا ہے پھر بعد میں ثابت ہوگیا کہ وہ کنواری ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی مرد کے خلاف چار مردوں نے گواہی دی کہ اس نے زنا کیا ہے پھر بعد میں ثابت ہوا کہ اس کا آلہ تناسب کٹا ہوا ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، یہ تصریحات فقہاءِ احناف کی درج ذیل کتب میں مذکور ہیں۔

(المبسوط، جلد: 10،ص: 57، ہدایہ اوّلین، ص: 522، الفتاوٰی الولواجیہ، ج: 2 صفحہ: 239، المحیط البرھانی، ج: 5،ص: 146، فتح القدیر، جلد: 5،ص: 273، البحرالرائق، جلد: 5،ص: 22، تبیین الحقائق، جلد: 3،ص: 598، فتاوٰی شامی، جلد:4،ص:42، مجمع الانھر، جلد:2،ص:355، اعلاء السنن، جلد:11،ص:654، النہر الفائق، جلد: 3، ص: 145، البنایہ، جلد: 6،ص: 287، حاشیۃ الطحطاوی علی الدرالمختار، جلد:2،ص:400، عالمگیری، ج:2،ص:153)۔

فقہاءِ اسلام کی ان تصریحات سے واضح ہوگیا کہ جب کوئی شہادت قرائن عقلیہ اور

شواہد کے خلاف ہوتو اس کا شرعاً اعتبار نہیں ہوگا، اسی طرح اگر ماہرین فلکیات اور محکمہ موسمیات والے بتائیں کہ آج چاند کی پیدائش ہی نہیں ہوئی ہے یا اس کی رویت ممکن ہی نہیں ہے اور چند آدمی یہ گواہی دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے تو ان کی گواہی مردود ہوگی۔

اسی طرح اس مسئلے پر عقلی دلیل یہ ہے کہ:

اگر کسی مقتول کے پاس ایک شخص ہاتھ میں پستول لئے کھڑا ہوا اور دو شخص یہ گواہی دیں کہ اس نے اپنے پستول سے فائر کر کے اس کو ہلاک کیا ہے اور بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہ ہو کہ اس مقتول کے جسم سے جو گولی برآمد ہوئی ہے، وہ اس پستول کی نہیں ہے بلکہ کلاشنکوف کی گولی ہے اور اسلحے کا ماہر یہ رپورٹ دے کہ اس پستول سے گولی چلائی ہی نہیں گئی تو ان گواہوں کی گواہی جھوٹی قرار پائے گی اور اس شخص کو رہا کر دیا جائے گا۔

(تبیان القرآن، جلد:10،ص:524 تا 528)

چاند کی پیدائش (Birth Of Moon) کا مفہوم:

رویتِ ہلال کے مسئلے پر جب سائنسی اور فنی گفتگو ہوتی ہے تو چاند کی پیدائش ہوئی یا نہیں، یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ چاند کبھی معدوم نہیں ہوتا، ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ چاند کا سفر اپنے مدار (Lunar Orbit) پر جاری وساری رہتا ہے۔ چلتے چلتے ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں سورج چاند اور زمین ایک لائن میں نظر آتے ہیں، اسے علمِ فلکیات (Astronomy) کی اصطلاح میں چاند کی پیدائش (Birth Of Moon) یا اقتران (Conjunction) کہتے ہیں۔ یہ موقع سال کے مختلف قمری مہینوں میں چاند کی 28 یا 29 تاریخ کو دن یا رات میں کسی وقت بھی آسکتا ہے۔ اسی لئے قمری مہینہ کبھی 29 دن کا ہوتا ہے اور کبھی 30 دن کا۔ فی نفسہٖ ایک اقتران سے دوسرے اقتران تک 29.5 دن لگ جاتے ہیں۔ جب مقام اقتران سے سورج آگے بڑھتا ہے تو نئے مہینے کے اعتبار سے اس کے اوقات کا حساب شروع ہو جاتا ہے۔ اب اگلے دن غروبِ آفتاب کے وقت اس کے قابلِ رویت (Visible) ہونے یا نہ ہونے (Invisible) کے بارے میں

ماہرینِ فلکیات کے معیارات موجود ہیں، جو نیٹ پر ہر شخص مطالعہ کرسکتا ہے۔

اسلام حُسنِ ظن کا حکم دیتا ہے:

اسلام دوسرے مسلمان کے بارے میں حسنِ ظن کا حکم دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

ترجمہ: ''اے مومنو! بہت سے گمانوں سے اجتناب کرو، کیونکہ بعض گمان یقیناً گناہ ہوتے ہیں (اس سے سُوءِ ظن یعنی بدگمانی مراد ہے)، (الحجرات:12)''۔

حدیث پاک میں ہے: اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ،

ترجمہ: ''(مومنو!) بدگمانی سے بچتے رہو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6064)''۔ لہٰذا ثبوت وشواہد یا غالب قرائن کے بغیر کسی کے بارے میں بدگمانی کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

جہاں تک اس بدگمانی کا تعلق ہے کہ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان نے کسی دباؤ کے تحت فیصلہ کیا ہے، اس سے بڑا جھوٹ اور بہتان اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی صریح جھوٹ ہے کہ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان نے پہلے عدمِ رویت کا اعلان کیا اور پھر فیصلہ تبدیل کیا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان نے صرف ایک ہی حتمی اور قطعی اعلان کیا ہے اور سارا میڈیا اس کا گواہ ہے۔ الحمدللہ علیٰ احسانہٖ رویتِ ہلال کا مسئلہ ہو، دینی مدارس کی حریّتِ فکروعمل کے تحفظ کا مسئلہ ہو یا حدودِ الٰہی کی حمایت و پاسبانی کا مسئلہ ہو، میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہمیشہ اپنے ضمیر، صوابدید اور دینی بصیرت کے مطابق کلمۂ حق کہا ہے اور جب تک جان میں جان ہے، کہتا رہوں گا۔ میرے نزدیک دین کے مسئلے میں دباؤ قبول کر کے کوئی اعلان کرنا یا کروڑوں لوگوں کے روزوں جیسی مقدس عبادت کی ذمہ داری اپنے سر لینے سے مرجانا بہتر ہے۔ ایسے مواقع کے لئے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''زمین کا باطن تمہارے لئے زمین کے ظاہر سے بہتر ہے''، یعنی ایسے حالات میں زندگی سے موت بہتر ہے۔ میں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ میری چیرمَین

(Chairmanship) کے پورے دور میں وفاق کی سطح پر کبھی کسی نے رویتِ ہلال کے مسئلے میں کوئی مداخلت نہیں کی، نہ کوئی ڈائریکشن دی ہے، نہ ہی کوئی خواہش ظاہر کی ہے، حتیٰ کہ کبھی کسی نے کوئی رابطہ بھی قائم نہیں کیا۔ اس سال بھی جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں (یعنی 04، اکتوبر 2008ء)، اب تک کسی سرکاری اہل کار نے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔

اہلِ فکر ونظر اور اہلِ وطن کی خدمت میں چند گذارشات:

میں نہایت ادب واحترام اور دردِ دل کے ساتھ رویتِ ہلال کے مسئلے پر اہلِ علم، اہلِ فکر ونظر اور اہل وطن کی خدمت میں چند گذارشات پیش کرنا چاہتا ہوں، امید ہے کہ اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان پر توجہ فرمائیں گے۔

حکمتِ نظامِ شمس وقمر:

یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کے تحت چل رہی ہے، نظامِ شمس وقمر بھی اسی کا حصہ ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ۝

ترجمہ: "سورج اور چاند (قادرِ مطلق کے طے کردہ) ایک حساب کے مطابق چل رہے ہیں، (الرحمٰن: 5)"۔

(2) وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ۝ وَالۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰہُ مَنَازِلَ

ترجمہ: "اور سورج (اللہ کی طرف سے) اپنی مقررہ منزل کی جانب (مسلسل) محوِ سفر ہے، یہ بہت علم والی ایک غالب ہستی کا مقرر کیا ہوا نظم ہے اور ہم نے چاند کے لئے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں، (یٰس: 38،39)"۔

نظامِ شمس وقمر کی من جملہ حکمتوں میں سے کچھ یہ ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَہِلَّۃِ ؕ قُلۡ ہِیَ مَوَاقِیۡتُ لِلنَّاسِ وَالۡحَجِّ ؕ

ترجمہ: "لوگ آپ سے ہلال (پہلی تاریخ کے چاند) کے بارے میں دریافت کرتے

ہیں آپ کہیے، یہ لوگوں کے (دینی اور دنیوی) کاموں اور حج کے اوقات کی نشانیاں ہیں، (البقرۃ:189)"۔

(2) هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ

ترجمہ: "وہی ہے جس نے سورج کو روشنی دینے والا اور چاند کو روشن بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جان لو، (یونس:5)"۔

اسلام کی عبادات میں سے نماز کے اوقات اور روزے کے سحر وافطار کا تعلق نظامِ شمسی سے ہے اور ماہِ رمضان کے آغاز واختتام اور حج کا تعلق نظامِ قمری سے ہے۔ رمضان مبارک کے آغاز کا مدار "رویتِ ہلال" پر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَاِنْ اُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدِرُوْا لَهٗ

ترجمہ: "نئے چاند کو دیکھے بغیر رمضان کا آغاز نہ کرو اور نیا چاند دیکھے بغیر عید نہ مناؤ، اگر مطلع ابر آلود ہونے کی بنا پر (29 رمضان کو) چاند نظر نہ آئے، تو 30 کا مہینہ مکمل کرلو"۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1906، صحیح مسلم، رقم الحدیث:1080)

مستقل قمری کیلنڈر کا مسئلہ:

آج کل بعض جدّت پسند اہلِ علم یہ کہتے ہیں کہ رویت، علم کے معنیٰ میں ہے اور چونکہ موجودہ دور میں سائنسی اور فنی ذرائع علم سے چاند کی رویت کا ظنِ غالب ہوجاتا ہے، تو اس پر اعتماد کر کے مستقل اسلامی کیلنڈر بنالیا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ "رویت" کا حقیقی معنی آنکھ سے دیکھنا ہے اور اسے علم کے معنیٰ میں لینا مجاز ہے۔ اور اصولِ فقہ کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کا حقیقی معنی لینا دشوار نہ ہو تو اسے مَجاز پر محمول نہیں کریں گے۔ ہمارے نظامِ رویت کا مدار بنیادی طور پر رویتِ بصری پر ہے۔ لیکن اگر سائنسی اور فنی ذرائع سے ہمیں کسی چیز کا علمِ قطعی یا ظنِ غالب ہوجائے تو شرعاً اس سے استفادہ کرنے میں حرج نہیں ہے بلکہ کرنا چاہئے اور ہم بہت سے دینی معاملات میں ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ ہم

دینی مسائل کو شرعی اصولوں ہی کے مطابق حل کرتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا اطلاق کرنے میں قطعی سائنسی معلومات پر مدار رکھ سکتے ہیں، مثلاً ہمارے قدیم فقہاء کا خیال تھا کہ کان میں ایک راستہ یا نالی ہے جو معدے کی جانب جاتی ہے، لہٰذا انہوں نے یہ مسئلہ وضع کیا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر اب چونکہ علمِ تشریح الاعضاء (Anotomy) نے بہت ترقی کر لی ہے اور ہمیں قطعیت کے ساتھ معلوم ہو گیا ہے کہ کان میں کسی مائع (Liquid) چیز کے جانے کا کوئی منفذ (Route) نہیں ہے، لہٰذا اب عصرِ حاضر کے فقہاء نے اس مسئلے کو تبدیل کیا اور قرار دیا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اگرچہ بعض قدامت پسند علماء ابھی تک سابق تحقیق پر قائم ہیں اور یہ ہوتا رہتا ہے، جیسے لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھانے کے جواز کے مسئلے کو علماء کے درمیان قبولِ عام ملنے میں کافی وقت صرف ہوا اور اب غالب ترین اکثریت اسے تسلیم کر چکی ہے۔ اسی طرح قرائنِ عقلیہ، جو قطعی ہوں یا ظنِ غالب کے درجے میں ہوں، ان سے بھی قضا کے معاملات میں استفادہ کیا جاتا ہے اور فقہ میں اس کے شواہد (Evidences) بکثرت موجود ہیں۔ ہمارے ہاں چند منحرفین کو موجودہ نظام کا پابند بنانے میں حکومت ناکام ہے تو محض سائنٹفک نظام کا پابند نہیں کون سی اتھارٹی بنائے گی؟۔

نئے چاند کا چھوٹا بڑا ہونا:

نئی قمری تاریخ کے تعین کا مدار شرعاً اور سائنسی طور پر ہلال کے چھوٹا بڑا ہونے یا غروبِ آفتاب کے بعد مطلع پر اس کے موجود ہونے کی مقدارِ وقت سے نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے ہاں بعض اوقات اہلِ علم بھی کہہ دیتے ہیں کہ چاند کافی بڑا ہے اور کافی دیر تک مطلع پر موجود رہا، لگتا ہے کہ ایک دن پہلے کا ہے۔ یہ سوچ اور طرزِ فکر غیر شرعی اور غیر سائنسی ہے۔

حدیث پاک میں ہے: عن ابی البختری قال خرجنا للعمرة، فلما نزلنا ببطن نخلة قال تراء ینا الهلال، فقال بعض القوم هو ابن ثلاث، وقال بعض القوم هو ابن لیلتین، قال فلقینا ابن عباس فقلنا انا رأینا الهلال، فقال بعض القوم هو ابن

ثلاث۔ وقال بعض القوم هو ابن ليلتين۔ فقال اى ليلة رأيتموه؟ قال ليلة كذا وكذا۔ فقال انّ رسول الله ﷺ قال ان الله مده للرؤية، فهو لليلة رأيتموه،

ترجمہ: ''ابوالبختری بیان کرتے ہیں کہ ہم عمرے کے لئے گئے، جب ہم وادیٔ نخلہ میں پہنچے تو ہم نے چاند دیکھنا شروع کیا، بعض لوگوں نے کہا: ''یہ تیسری تاریخ کا چاند لگتا ہے'' اور بعض نے کہا: ''یہ دوسری تاریخ کا چاند لگتا ہے''۔ راوی بیان کرتے ہیں: پھر ہماری ملاقات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہوئی، تو ہم نے (قیاس کی بنیاد پر اختلاف کی) یہ صورتِ حال ان سے بیان کی، تو انہوں نے فرمایا: ''تم نے چاند کس رات کو دیکھا تھا''؟، ہم نے کہا: ''فلاں رات کو''، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے دیکھنے کے لئے اسے بڑھا دیا، درحقیقت یہ اسی رات کا چاند ہے، جس رات کو تم نے اسے دیکھا ہے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2418)''۔

یہ حدیث اس مسئلے میں شریعت کی اصل ہے کہ نئے چاند کا مدار رویت پر ہے، اس امر پر نہیں ہے کہ اس کا سائز چھوٹا ہے یا بڑا یا مطلع پر اس کے نظر آنے کا دورانیہ کم ہے یا زیادہ۔ اس لئے کسی عالم یا تعلیم یافتہ شخص کا نیا چاند دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ دو یا تین تاریخ کا لگتا ہے، یہ غیر شرعی اور غیر عالمانہ ہے۔ اسی طرح سائنسی حقیقت بھی یہی ہے، مثلاً کسی قمری مہینے کی 29 تاریخ گزرنے کے بعد شام کو نئے چاند کا غروبِ آفتاب کے فوراً بعد مطلع پر ظہور تو ہے مگر اس کا درجہ چار یا پانچ ہے، اس کی عمر 18 گھنٹے ہے اور مطلع پر اس کا ظہور پندرہ بیس منٹ ہے، تو اس صورت میں چاند مطلع پر تو موجود ہے لیکن اس کی رویت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا یہ قمری مہینہ 30 دن کا قرار پائے گا۔ اب اگلی شام کو اس چاند کی عمر 42 گھنٹے ہو جائے گی، مطلع پر اس کا درجہ 12 یا اس سے اوپر ہو جائے گا اور مطلع پر اس کا استقرار بھی نسبتاً زیادہ وقت کے لئے ہوگا، مثلاً پچاس منٹ اور اس کا حجم (Size) بھی بڑا ہوگا، لیکن یہ قطعیت کے ساتھ چاند کی پہلی تاریخ ہوگی۔ لہٰذا میری اہلِ علم اور اہلِ وطن سے اپیل ہے کہ توہمات کے حصار سے نکلیں اور حقیقت پسند بنیں۔

کیا کئی قمری مہینے مسلسل 29 دن یا 30 دن کے ہو سکتے ہیں؟

قرآن وسنت میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنے قمری مہینے مسلسل 30 دن کے ہو سکتے ہیں اور کتنے مسلسل 29 دن کے ہو سکتے ہیں۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے علامہ قطب الدین شیرازی مصنف تحفۂ شاہیہ وزیج الغ بیگی کے حوالے سے لکھا ہے کہ "زیادہ سے زیادہ مسلسل چار قمری مہینے 30 دن کے ہو سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مسلسل تین قمری مہینے ممکنہ طور پر 29 دن کے ہو سکتے ہیں"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 26، ص: 423، رضا فاؤنڈیشن)

امام احمد قسطلانی نے ارشاد الساری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے: "2 یا 3 قمری مہینے مسلسل 29 کے ہو سکتے ہیں، 4 ماہ سے زائد ناقص نہیں ہو سکتے، (جلد: 3، ص: 357)"۔
ایک ماہرِ فلکیات نے لکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلسل 5 قمری مہینے 29 دن کے ہو سکتے ہیں، لیکن یہ سب امکانات کی بات ہے، ان پر کسی شرعی فیصلے کا مدار نہیں ہے۔

شہادت کے ردّ وقبول کا اختیار قاضی کے پاس ہے:

شہادت کے ردّ وقبول کا اختیار قاضی کے پاس ہے، شریعت کا اصول بھی یہی ہے اور جدید دور کے قانونی ضوابط بھی یہی ہیں۔ شہادت علی الاطلاق حجت نہیں ہے، ورنہ شاہد خود قاضی بن جائے گا۔ گواہ کا کام قاضی کے سامنے گواہی دینا ہے، فیصلہ کرنا قاضی کا کام ہے۔
میں اس مسئلے کو ایک مثال سے واضح کروں گا، ایک مقدمۂ قتل میں مقتول کی لاش پڑی ہوئی ملی، جسے گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا، دو گواہوں نے عدالت میں حلفیہ گواہی دی کہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ فلاں شخص نے اپنے پستول سے گولی مار کر اسے ہلاک کیا ہے۔ مگر وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے یہ جرم نہیں کیا، جب لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو اس کے جسم سے "تھری ناٹ تھری" کی گولی نکلی اور اسلحے کے ماہر نے کہا کہ اس پستول سے کوئی گولی نہیں چلائی گئی، تو کیا محض دو عینی شاہدوں کی بنیاد پر عدالت قصاص میں اس شخص کی سزائے موت کا حکم صادر

کر دے گی، ہرگز نہیں۔ اگر شہادت علی الاطلاق حجت ہو اور جرح کے ذریعے اس کی صداقت کو جانچنے کا کوئی اعتبار نہ ہو تو پھر موجودہ نظام میں وکالت کے ادارے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، جس کا کام ہی جرح کر کے گواہ کے صدق یا کذب کو جانچنا ہوتا ہے۔ آئے دن ہماری اعلیٰ عدالتیں (بشمول پشاور ہائی کورٹ) قتل اور دیگر مقدمات میں حلفیہ شہادتوں کو رد کرتی ہیں اور ان کے خلاف فیصلے دیتی ہیں، لیکن کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ مسجد قاسم علی خان پشاور میں مولانا شہاب الدین پوپلزئی نے متوازی عدالت لگا کر ان شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ صادر فرما دیا ہو اور عدالت کے فیصلے کو اپنی یا گواہان کی توہین قرار دیا ہو۔

قضا ریاست کی طرف مفوض ہوتی ہے:

رویتِ ہلال کا فیصلہ ایک قضا ہے اور اس کے لئے ایک ادارہ، مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان، قائم کیا گیا ہے۔ قاضی کے تقرر کا اختیار اسلامی شریعت اور جدید نظامِ آئین وقانون میں بھی خلیفہ یا سربراہِ مملکت کو ہے، کسی شخص کو یہ اختیار نہیں کہ خود قاضی بن بیٹھے اور متوازی عدالت لگائے۔ پاکستان میں بھی (بشمول خیبر پختونخواہ) کسی مسئلے میں پاکستان کی ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے مقابلے میں متوازی عدالتیں نہیں لگائی جاتیں، یہاں تک کہ جب متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت کے حسبہ بل کو سپریم کورٹ نے خلافِ آئین قرار دیا تو اس فیصلے کا بھی ان کی طرف سے ناپسندیدگی کے باوجود احترام کیا گیا۔ اسی طرح چیف جسٹس کیس میں حکومت نے اپنی خواہش کے برعکس سپریم کورٹ فل بنچ کے فیصلے کو تسلیم کیا۔ لیکن صرف رویت ہلال کے مسئلے پر خیبر پختونخواہ میں چند علماء متوازی عدالتیں لگا کر شہادتیں قبول کرتے ہیں اور فیصلے صادر کرتے ہیں۔

یہ شرعی لوگوں کا غیر شرعی اقدام ہے اور یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے، ہر دور میں ان حضرات کا طرزِ عمل یہی رہا اور ہر دور میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان کے فیصلے سے ان چند حضرات نے اختلاف کیا اور اس سے مذہبی انتشار کو فروغ ملا اور مذہبی عناصر طعن وتشنیع کا نشانہ بنے۔ میرے نزدیک اس سلسلے میں متحدہ مجلسِ عمل کے سربراہ قاضی حسین احمد اور

جنرل سیکریٹری مولانا فضل الرحمٰن کہ وہ اس سلسلے کو کنٹرول کریں، کیونکہ متحدہ مجلس عمل کے قیام کا مقصد دینی قوتوں میں اتحادِ عمل اور اشتراکِ عمل کا فروغ تھا نہ کہ انتشار وافتراق۔

قضاءِ قاضی میں خطا واقع ہو، تب بھی وہ شرعاً وقانوناً مؤثر ہے:

اگر کوئی قاضی فیصلے میں دانستہ خیانت کرتا ہے تو وہ آخرت میں عند اللہ مسئول ہوگا، مگر فیصلہ بہر حال نافذ ہوگا۔ اور اگر اس سے فیصلے میں اجتہادی طور پر خطا واقع ہوجاتی ہے تو وہ آخرت میں بری ہے اور اسے ایک اجر بہر حال ملے گا اور اس کا فیصلہ ہر صورت میں مؤثر اور نافذ ہوگا۔ بشرطیکہ اس کا فیصلہ قرآن یا سنتِ مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔

حدیث پاک میں ہے: (۱) عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ يَكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِيْ لَهٗ عَلٰى نَحْوِ مِمَّا اَسْمَعُ مِنْهُ فَمَنْ قَطَعْتُ لَهٗ مِنْ حَقِّ اَخِيْهِ شَيْئًا فَلَا يَاْخُذْهُ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ بِهٖ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ،

ترجمہ: ''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس مقدمات لے کر آتے ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو مخالف فریق کے بہ نسبت (اپنے زورِ بیان کی وجہ سے) زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرے اور میں اس سے سنے ہوئے واقعات کی روشنی میں اس کے حق میں فیصلہ دے دوں، تو میں جس شخص کو اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ دے دوں تو وہ (اللہ کا خوف کرتے ہوئے) اسے نہ لے، بلکہ (وہ یہ سمجھے کہ) میں اسے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4364)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظاہراً قاضی کا فیصلہ نافذ ہوجاتا ہے۔ اور وہ بعض اوقات خلافِ حقیقت بھی ہوسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے باطنی امور کا علم بھی عطا فرمایا تھا، لیکن ہر قاضی کے لئے ایسا ممکن نہیں ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے تعلیم امت کے لئے فرمایا اگر حقوق العباد کے معاملے میں قاضی کوئی فیصلہ کردے اور مدعی یا مدعیٰ علیہ یہ جانتا

ہے کہ اس فیصلے کے نتیجے میں اسے عدالت نے جو حق دیا ہے، وہ عند اللہ اس کا حقدار نہیں ہے اور حقیقت اس کے برعکس ہے تو اسے آخرت کی جوابدہی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دنیا کی اس عارضی منفعت سے دستبردار ہو جانا چاہئے، ورنہ یہ اس کے لئے آگ کا ٹکڑا ہو گا یعنی ناحق دوسرے کا مال لینا آخرت کے عذاب کا باعث بن سکتا ہے۔

قاضی خطا سے معصوم نہیں ہوتا، وہ اس بات کا مکلف ہے کہ اپنی پوری علمی دیانت اور دستیاب حقائق وشواہد اور قرائن کی روشنی میں فیصلہ کرے، اس پر وہ عند اللہ ماجور ہو گا۔

(۲) عَنْ بُرَيْدَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ، وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ وَاثْنَانِ فِي النَّارِ، فَاَمَّا الَّذِيْ فِي الْجَنَّةِ فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضٰى بِهٖ، وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ قَضٰى لِلنَّاسِ عَلٰى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ۔

ترجمہ: ''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قاضیوں کی تین قسمیں ہیں، (ان میں سے) ایک جنت میں ہو گا اور دو جہنم میں ہوں گے۔ جنت میں وہ شخص ہو گا، جس نے حق کو صحیح طور پر جانا اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور جس شخص نے حق کو صحیح طور پر پہچانا مگر (جان بوجھ کر) ظلم پر مبنی فیصلہ کیا تو وہ جہنم میں ہو گا۔ اور جو شخص (قضا کا اہل نہیں ہے مگر وہ منصبِ قضا کو قبول کر کے) جہالت پر مبنی فیصلے دیتا ہے تو وہ جہنم میں ہو گا۔ (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 3573)''۔

(۳) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فَاِنِ اجْتَهَدْتَ فَاَصَبْتَ الْقَضَاءَ فَلَكَ عَشَرَةُ اُجُوْرٍ وَاِنِ اجْتَهَدْتَ فَاَخْطَاْتَ فَلَكَ اَجْرٌ وَاحِدٌ،

ترجمہ: ''عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر تو نے (منصبِ قضا پر فائز ہو کر فیصلہ کرنے کے لئے) اجتہاد کیا اور صحیح فیصلہ کیا تو تیرے لئے دس اجر ہیں اور اگر (تو نے اپنی دیانت کے مطابق حق کو معلوم کرنے کی) پوری کوشش کی، لیکن حق کو سمجھنے میں تجھ سے خطا ہو گئی تو (تب بھی) تیرے لئے ایک اجر ہے''۔ (مسند احمد، جلد 4، ص: 205)

ہمارے میڈیا کا طرزِ عمل:

ہمارے الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا کے طرزِ عمل میں بھی تضاد ہے۔ میڈیا کے معزز ذمہ داران اپنی رپورٹس اور تجزیاتی کالموں میں انتشار پر اظہارِ افسوس بھی کرتے ہیں، لیکن انتشار کی خبروں کو فروغ بھی دیتے ہیں اور کھل کر ان کی مذمت بھی نہیں کرتے۔ پاکستان واحد ملک ہے جہاں رویتِ ہلال کے مسئلے پر کارٹون بھی بنتے ہیں اور کالم بھی لکھے جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں اظہارِ رائے کی آزادی ہے، ورنہ دیگر مسلم ممالک میں یہ روش نہیں ہے۔ بہت سے فاضل کالم نگاروں کے کالم پڑھنے کو ملتے ہیں، جن میں وہ آغاز تو اس سے کریں گے کہ سائنس کا دور ہے، دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے اور ہم ابھی رویتِ ہلال کے مسئلے پر جھگڑ رہے ہیں، لیکن پھر رویتِ ہلال کے فیصلے کو سائنسی بنیاد پر دیکھنے کے بجائے روزانہ کالم نگاری کی ضرورت کے تحت نشانۂ تضحیک بناتے ہیں۔ چنانچہ کالم کا اختتام آغاز کے برعکس ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ اپنی ریاست کے بادشاہ ہوتے ہیں، اس لئے ہم ان کی خدمت میں یہی گذارش کر سکتے ہیں کہ ع　ہر چہ از دوست مے رسد نکوست

نوٹ: ہمارے ہاں بعض اوقات یہ مطالبہ سامنے آتا ہے کہ پاکستان میں رمضان مبارک اور عید الفطر کا فیصلہ سعودی عرب کے فیصلے کے تابع کر دیا جائے۔ یہ مطالبہ کرنے والے خیبر پختونخواہ کے وہ حکمران ہیں جو پشاور، مردان اور چارسدہ کی بعض پرائیویٹ رویت ہلال کمیٹیوں کو کنٹرول کرنے اور رویت ہلال کے حوالے سے مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان کا فیصلہ تسلیم کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ صوبہ سندھ کی رویتِ ہلال کمیٹی کے ایک معزز رکن مفتی سید صابر حسین صاحب نے ایک مقالہ لکھا ہے، جس کا عنوان ہے:

"سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کیوں نہیں؟"

میں ان کی اجازت سے اس مقالے کو اس مقام پر شاملِ اشاعت کر رہا ہوں تاکہ ہمارے نوجوان علماء اور عام قارئین کو اس مسئلے کے بارے میں صحیح معلومات دستیاب ہوں۔

سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کیوں نہیں؟

گذشتہ کئی سالوں سے مملکت خداداد پاکستان میں دو عیدوں کا مسئلہ انتہائی سنگین صورتِ حال اختیار کرتا جارہا ہے، جو آگے چل کر کسی بڑے فساد وشر کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اِسے دینی ومذہبی مسئلے سے ہٹا کر قومیت وعصبیت کا رنگ دینے کی گھناؤنی کوشش کی جارہی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر سابقہ ریکارڈ کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ عیدین اور رمضان المبارک کے چاند کے بارے میں اختلاف اکثریت کی رائے کے برخلاف پاکستان کے چند مخصوص علاقوں اور افراد کی جانب سے پیدا کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بالعموم پورے پاکستان اور بالخصوص اُن علاقے کے لوگوں کو دینی تہوار کے پرمسرت موقع پر انتہائی ذہنی کرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ سب سے اہم اور قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اس کی وجہ سے پوری دنیا میں نہ صرف مسلمانوں کو تضحیک وتمسخر کا نشانہ بنایا جاتا ہے بلکہ غیر مسلموں، نام نہاد مغرب زدہ اور مادیّت پرست لوگوں کو اِسلام پر کھل کر اعتراض کرنے کا بہترین موقع مل جاتا ہے۔

مملکتِ پاکستان جو پہلے ہی مختلف قسم کے داخلی وخارجی مسائل سے دوچار ہے، جن میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہے۔عوام الناس دہشت گردی، مہنگائی، غربت وافلاس، بے روزگاری، قتل وغارت گری، بدعنوانی اور دنیا میں پاکستان کی گرتی ہوئی ساکھ جیسے گھمبیر مسائل سے دوچار ہیں اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ اے کاش کہ اُن کے موجودہ مسائل کو حل کرنے والا کوئی مسیحا اُنہیں مل جائے۔لہٰذا اگر ان حالات میں رؤیت ہلال کے مسئلے کو بھی قومیت وعصبیت کا جامہ پہنا کر لوگوں کے مسائل میں مزید اضافہ کیا جائے اور اس کی بنیاد پر انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو پھر اس کے قبیح ودور رس نتائج کو سنبھالنا انتہائی مشکل ہوجائیگا۔اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دل کی اَتھاہ گہرائیوں سے دعا ہے کہ ہمارے ملک پر ایسا برا وقت کبھی نہ آئے اور اللہ رب العزّت پاکستان کو موجودہ گرداب سے نکال دے، (آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)۔

۔ اصل موضوع پر آنے سے پہلے قارئین کرام پر یہ واضح کرتا چلوں کہ حکومتِ پاکستان کی قائم کردہ صوبائی اور مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹیوں میں ملک کے تمام مسالک یعنی اہلسنت، دیوبندی، اہلِ حدیث اور اہلِ تشیع کے سرکردہ علماء حضرات کو شامل کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ کمیٹی کے ساتھ فنی ماہرین، جن میں محکمہ موسمیات، پاکستان نیوی اور سپارکو کے نمائندے فنی معاونت کے لئے موجود ہوتے ہیں، اور ان سب کی متفقہ رائے کی روشنی میں تمام ممبران کی موجودگی میں چیئرمین مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی چاند کی رؤیت یا عدمِ رؤیت کا اعلان کرتے ہیں۔ اس موقع پر ممبرانِ کمیٹی کے علاوہ میڈیا کے نمائندے بھی ایک بڑی تعداد میں موجود ہوتے ہیں، جو کمیٹی کی تقریباً کارروائی کی عکس بندی کر رہے ہوتے ہیں۔ راقم الحروف بھی گزشتہ سال سے صوبائی رؤیتِ ہلال کمیٹی، (صوبہ سندھ) میں رکن کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے، لہٰذا اِن تمام معاملات کا چشم دید گواہ بھی ہے۔ علاوہ ازیں کراچی میں موجود مسلکِ دیوبند کی معروف دینی درسگاہ جامعۃ الرشید میں قائم شعبۂ فلکیات کے سربراہ مولانا سلطان ہمیشہ چیئرمین مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی پاکستان کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں، معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ ان کے تقریباً پچاس مراکز قائم ہیں اور ان کی ماہانہ رپورٹس ان کے روزنامہ ''اسلام'' اور ہفت روزہ رسالے میں باقاعدگی سے شائع ہوتی ہیں۔ راقم الحروف نے کئی مرتبہ بچشمِ خود چیئرمین مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کو چاند کے حتمی اعلان سے قبل مزید تشفی کے لئے جامعۃ الرشید کے شعبۂ فلکیات کے ماہرین سے رابطہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ عمل محترم چیئرمین صاحب کی معاملہ فہمی، اعلیٰ ظرفی اور وسعتِ قلبی کا بین ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ جامعۃ الرشید کا شعبۂ فلکیات اپنی ویب سائیٹ پر ہر ماہ کے چاند کی رؤیت کے بارے میں اعداد وشمار کے ساتھ تفصیلی معلومات فراہم کرتا ہے۔ گزشتہ سالوں کے ریکارڈ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند کی رؤیت اور عدمِ رؤیت کے بارے میں مرکزی رؤیتِ ہلال کے سابقہ تمام اعلانات جامعۃ الرشید کی اِعلان کردہ تاریخ سے موافقت رکھتے ہیں۔ جبکہ مسجدِ قاسم علی خان کے علماء کا اعلانِ رؤیت

جامعۃ الرشید کی اعلان کردہ تاریخ سے عموماً ایک دن پہلے ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ چاند کی رؤیت یا عدمِ رؤیت کا اعلان شخصی رائے پر نہیں کیا جاتا، جیسا کہ بعض کم فہم اور عاقبت نااندیش لوگ کہتے ہیں بلکہ شہادتوں کو ہر اعتبار سے پرکھنے اور تمام ارکان، علماءِ کرام اور فنی ماہرین سے مشاورت کے بعد متفقہ طور پر کیا جاتا ہے۔

آج کل مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے ارکان درجِ ذیل ہیں:

(۱) پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن، چیئرمین (اہلِ سنت و جماعت)، مفتی محمد رفیق حسنی (اہلِ سنت و جماعت)، علامہ شبیر احمد اظہری (اہل سنت و جماعت)، مولانا شبیر احمد کاکاخیل (مسلکِ دیوبند و ماہرِ فلکیات)، مولانا عبدالخبیر آزاد (مسلکِ دیوبند)، مولانا عبیداللہ پنہور (مسلکِ دیوبند)، مولانا محمد عبدالقوی (مسلکِ دیوبند)، مولانا قاری روح اللہ مدنی (مسلکِ دیوبند)، میاں نعیم الرحمٰن (اہلحدیث مکتبۂ فکر) اور علامہ قاضی نیاز حسین نقوی (شیعہ اثناعشری)۔ مولانا انوار الحق حقانی، مولانا اخوند زادہ عبدالمبین شاہ بخاری، ایم ایم قریشی (ماہرفلکیات)، مولانا قاری عبدالرشید الازہری۔

جبکہ زونل رؤیت ہلال کمیٹی سندھ میں درجِ ذیل افراد شامل ہیں:

(۱) علامہ قاری رضاء المصطفیٰ، خطیب نیومیمن مسجد بولٹن مارکیٹ کراچی (اہلِ سنت و جماعت) (۲) مولانا بشیر احمد نقشبندی (مسلکِ دیوبند)، (۳) مولانا اسد دیوبندی (مسلکِ دیوبند) (۴) مولانا شاہ فیروز الدین رحمانی (اہلسنت و جماعت) (۵) مولانا حافظ محمد سلفی، جامعہ ستاریہ (اہلِ حدیث مکتبۂ فکر) (۶) راقم الحروف مفتی سید صابر حسین (اہلِ سنت و جماعت)، (۷) مولانا محمد صابر نورانی (اہلِ سنت و جماعت) (۸) علامہ سید علی کرار نقوی (شیعہ اثناعشری) (۹) محترم محمد ریاض، چیف میٹرلوجسٹ (نمائندہ محکمہ موسمیات پاکستان) (۱۰) محترم غلام مرتضیٰ، جنرل منیجر (نمائندہ پاکستان سپارکو Pakistan Space & Upper Atmosphere research Commission) (۱۱) جناب محمد توفیق، لیفٹیننٹ کمانڈر (نمائندہ پاکستان نیوی، ہائیڈرو گرافک ڈیپارٹمنٹ

(Hydrographic Department)

ذیل میں زونل رؤیت ہلال کمیٹی (صوبہ سندھ) اور مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے تمام ارکان کی دستخط شدہ پریس ریلیز کا عکس منسلک کیا جا رہا ہے:

ہمارے ہاں رمضان وعیدین کے چاند کے مسئلے کے حل کے لئے مختلف مکتبہ ہائے فکر کی جانب سے کئی حل پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ پاکستان میں رمضان، عیدین اور دوسرے مہینوں کو سعودی عرب کے ساتھ منسلک کر دیا جائے یعنی سعودی عرب کے اِعلان کے مطابق پاکستان میں بھی رمضان اور عیدین کی جائیں تا کہ پوری دنیا میں رمضان وعیدین کے حوالے سے مسلم اُمّہ کے درمیان یکسانیت و وحدت پیدا ہو جائے، جو ہر ایک دردِ دل رکھنے والے مسلمان کی دیرینہ خواہش ہے۔

ایسا ممکن ہے یا نہیں؟ اِس کا حتمی اور یقینی فیصلہ اکابر علماءِ کرام اور فلکیات کے ماہرین کریں گے۔ لیکن جہاں تک راقم الحروف کی رائے کا تعلق ہے، تو میری رائے میں ایسا ہونا چند وجوہ کی بنا پر عملاً ممکن نہیں کیونکہ سعودی عرب میں رؤیتِ ہلال کا موجودہ طریقۂ کار شرعی اور تکنیکی اِعتبار سے درست اور قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سعودی عرب کا بسا اوقات پاکستان کی قمری تاریخ سے ایک دن اور بعض اوقات دو دنوں کا فرق ہو جاتا ہے، جس پر ہر ذی شعور مسلمان سوچنے پر مجبور ہے کہ سائنسی عروج و ترقی کے اِس زمانہ میں ایک دن کا فرق تو کسی حد تک قابلِ فہم ہے لیکن دو دنوں کے فرق کو سمجھنا انتہائی مشکل اور مضحکہ خیز ہے۔ دو دِنوں کا فرق یہ ظاہر کرتا ہے کہ واقعتہً اُن کے طریقۂ کار میں خامی ہے، اور اس میں اِصلاح کی گنجائش موجود ہے کیونکہ فلکیاتی اِعداد و شمار اور جغرافیائی اِعتبار سے بھی یہ ناممکن ہے کہ سعودی عرب میں چاند نظر آ جائے اور اُس کے اگلے روز پاکستان میں چاند نظر نہ آئے۔ جغرافیہ اور فلکیات کے ماہرین کی رائے کے مطابق دنیا کے وہ خطے، جو مغرب کی جانب واقع ہیں، وہاں مشرقی علاقوں کی بہ نسبت سورج دیر سے غروب ہوتا ہے اور غروبِ شمس میں تاخیر کی وجہ سے چاند کی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ بھی

سائنسی حقیقت ہے کہ چاند کی عمر میں جتنا اضافہ ہوگا، اُس کا نظر آنا اتنا ہی یقینی ہوجاتا ہے۔
اب اگر محلِ وقوع کے اعتبار سے پاکستان اور سعودی عرب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پاکستان سعودی عرب کے مقابلے میں مشرق کی جانب واقع ہے، جس کی وجہ سے یہاں سعودیہ سے تقریباً دو گھنٹے پہلے سورج غروب ہوتا ہے لہٰذا پاکستان کا سعودیہ کی بہ نسبت مشرقی جانب ہونے کی وجہ سے یہ تو ممکن ہے کہ پاکستان میں چاند نظر نہ آئے اور سعودی عرب، جو مغرب کی جانب ہے، میں چاند نظر آجائے کیونکہ سعودی عرب میں غروبِ آفتاب کے وقت چاند کی عمر میں پاکستان کے مقابلے میں دو گھنٹے کا اضافہ ہوجاتا ہے اور اُس کا نظر آنا کسی حد تک ممکن ہوجاتا ہے (اگر دوسری شرائط پوری ہورہی ہوں، جن کا ذکر آگے آرہا ہے) لہٰذا اگر چاند سعودی عرب میں نظر آجائے تو اگلے دن اگر موسم ابر آلود نہ ہو تو چاند کی عمر میں مزید چوبیس گھنٹے کے اضافے کی وجہ سے پاکستان میں اس کا نظر آنا یقینی ہوتا ہے۔
لیکن اگلے دن پاکستان میں چاند نظر نہ آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سعودی عرب کے نظامِ رؤیت میں کہیں نہ کہیں کوئی بڑی خرابی موجود ہے۔ انٹرنیٹ پر دستیاب مواد اور مختلف ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ سعودی عرب کی عوام بھی اکثر و بیشتر اس طریقہ کار پر صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی ہے لیکن چونکہ وہاں شاہی حکم نامے کے تحت یہ سب کچھ ہوتا ہے، لہٰذا یہ آواز دبا دی جاتی ہے۔ اور تشویش میں مبتلا لوگوں کو ڈرا دھمکا کر خاموش رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ چاند کی رؤیت کے حوالے سے تحریر کردہ ایک تحقیقی مقالہ بعنوان ''سعودی رؤیت کے بارے میں ذاتی نوٹس Personal Notes on the Subject of Following Saudi Moon Sighting'' میں مقالہ نگار نے سعودی محکمہ قضا الاعلیٰ کے رئیس شیخ صالح الحیدان کے ایک دھمکی آمیز بیان، جو انہوں نے ''عکاظ'' نامی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا، کو درج کیا کہ ''میں تمام لوگوں کو اللہ کے تقویٰ اور سچائی کی وصیت کرتا ہوں، وہ ان معاملات میں دخل اندازی نہ کریں، جو ان کا میدان نہیں اور مجلس اس بات پر غور کررہی ہے کہ جو لوگ ہلال کے بارے میں اخبارات میں لکھتے ہیں، انہیں اس جرم پر ''سزا''

دی جائے۔ کیونکہ اس سے عدمِ واقفیت کی بنیاد پر عوام میں بہت انتشار ہوتا ہے''۔(انٹرنیٹ ایڈیشن، صفحہ نمبر ۲۰: مقالہ نگار سے رابطے کیلئے:globalpeace@gmail.com)۔

گویا رئیس محکمہ قضاء الاعلیٰ جہاں لوگوں کو خشیتِ الٰہی کا درس دے رہے ہیں، وہاں اس سے کوسوں دور جاتے ہوئے اہلِ علم کی ہر قسم کی تنقید کو قابلِ تعزیر قرار دیتے ہوئے مثبت تنقید کا دروازہ بھی بند کر رہے ہیں۔ گویا وہاں پر سرکاری سطح پر اعلانِ رؤیت کے خلاف بات کرنا یا علمی بحث کرنا جرم ہے۔ اور وہاں کی حکومت اس بات کی پابند نہیں ہے کہ رؤیت کی شرعی و فنی وجوہ کو ریکارڈ پر لائے۔ یہ سب کچھ تو صرف پاکستان میں ممکن ہے، لہٰذا اہلِ پاکستان کو اس نعمتِ آزادی پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی اُن کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ خالص دینی و شرعی مسئلے کو لطیفوں، مزاحیہ کارٹونوں اور غیر سنجیدہ سیاسی بحث و تمحیص کا موضوع نہ بنائیں۔ البتہ اگر اس موضوع پر اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز سنجیدہ انداز میں علمی و فنی بحث کریں تو اس سے عوام میں آگہی (Awareness) اور شعور پیدا ہوگا۔

دنیا بھر کے مسلم اور غیر مسلم ماہرینِ فلکیات اور ریاضی دان اس بات پر انتہائی حیران و ششدر رہتے ہیں کہ سعودی عرب کے اربابِ اقتدار کس ذہنیت کے حامل ہیں کہ چاند کے مطلع پر ممکنہ طور پر نظر نہ آنے کے باوجود بھی اسے بڑی آسانی سے دیکھ لیتے ہیں اور غیر حقیقی رؤیت کا اعلان بھی کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض عرب ممالک میں بھی اس حوالے سے تشویش پائی جاتی ہے، جن میں مراکش پیش پیش ہے، جہاں زیادہ تر رمضان و عیدین پاکستان کے مطابق ہوتی ہیں۔ انٹرنیٹ پر دستیاب معلومات کے مطابق گذشتہ سال بھی مراکش میں عید الفطر ۲۱ ستمبر ۲۰۰۹ بروز پیر کو منائی گئی ہے حالانکہ مراکش پاکستان سے وقت کے اعتبار سے پانچ گھنٹے اور سعودی عرب سے تین گھنٹے پیچھے ہے لہٰذا اگر سعودی عرب میں چاند نظر آجائے تو مراکش میں بدرجہ اولیٰ نظر آنا چاہئے کہ اُس وقت تک چاند کی عمر میں سعودی عرب کے مقابلے میں تقریباً تین گھنٹے اضافہ ہو چکا ہوتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہوتا، بلکہ سعودی عرب میں رؤیتِ ہلال کے اعلان کے باوجود مراکش والے چاند دیکھنے سے اکثر

محروم رہ جاتے ہیں حالانکہ وہاں چاند کو دیکھنے کے لئے پاکستان کی طرح ملکی سطح پر باقاعدہ ایک ادارہ قائم ہے جو علماءِ کرام اور ماہرینِ فلکیات وموسمیات پر مشتمل ہے۔ قارئین کی دلچسپی ومعلومات کے لئے دوبارہ یہ تحریر کرتا چلوں کہ ماہرینِ فلکیات کی آراء کے مطابق مغربی ممالک میں رؤیتِ ہلال مشرقی ممالک کی رؤیت سے پہلے ہوگی اور سعودی عرب جغرافیائی اعتبار سے دنیا کے مشرقی ممالک میں شامل ہے لہٰذا اگر سعودی عرب میں رؤیتِ ہلال ہوجائے تو یقینی طور پر (اگر مطلع ابر آلود نہ ہو) مغربی ممالک میں بھی ہونی چاہیے جبکہ مراکش میں (جس کا ذکر پہلے بھی آیا ہے) سعودی عرب کے کافی مغرب میں واقع ہونے کے باوجود (بلکہ مراکش کا تو ایک نام ہی "المغرب" ہے) اکثر اُس دن رؤیتِ ہلال نہیں ہوتی، جس دن سعودی عرب میں چاند کا اعلان کردیا جاتا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ امریکہ، کینیڈا اور ویسٹ انڈیز جہاں سعودی عرب کے آٹھ گھنٹے بعد سورج غروب ہوتا ہے، مطلع صاف ہونے کے باوجود اکثر چاند نظر نہیں آتا، انتہائی تعجب کی بات ہے اور اہلِ فکر ونظر کے لئے قابلِ غور بھی۔ پس یہ امر شرعی وسائنسی دونوں اعتبار سے غیر معقول ہے کہ سعودی عرب کے اعلانِ رؤیت کو پاکستان میں نافذ کیا جائے۔

قارئینِ کرام کو آگاہ کرتا چلوں کہ پشاور، مردان اور چارسدّہ پاکستان کے وہ علاقے ہیں، جہاں سے ہر سال چاند کے پہلے نظر آنے کا اعلان کردیا جاتا ہے اور اِن ہی علاقوں میں مرکزی اور رؤیتِ ہلال کمیٹی سے بالاتر ہوکر الگ کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا شہر جغرافیائی اِعتبار سے پاکستان کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں انتہائی مشرق کی جانب واقع ہیں۔ لہٰذا اُوپر بیان کردہ مسلمہ اُصول کے مطابق اگر اِن علاقوں میں چاند نظر آجاتا ہے، تو پھر پاکستان کے وہ علاقے، جو مغرب کی جانب واقع ہیں اور جہاں سورج مشرقی علاقوں کی بہ نسبت دیر میں غروب ہوتا ہے، وہاں اگر مطلع ابر آلود نہ ہو تو پھر یقینی طور پر وہاں چاند نظر آنا چاہیے۔ مگر مشاہدہ اور سابقہ ریکارڈ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلع صاف ہونے کے باوجود مغربی علاقوں کے لوگ اکثر وبیشتر محروم رہ جاتے ہیں۔ اِس پر ہر صاحبِ عقل

شخص سوچنے پر مجبور ہے کہ یقیناً دال میں کچھ کالا ہے۔اِس حوالے سے سندھ کے ساحلی علاقے کراچی اور بدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، کیونکہ ان علاقوں میں عام طور پر پاکستان کے مشرقی علاقے پشاور، مردان اور چارسدّہ کی بہ نسبت سورج آدھا گھنٹہ تاخیر سے غروب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے چاند کی عمر میں آدھا گھنٹہ اضافہ ہوجاتا ہے۔اور اُس کے نظر آنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ سعودی حکومت رؤیت کے معاملے میں غیر معمولی حساسیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔وہ نہ صرف اپنے ملک کے باشندوں کو بلکہ دنیا کے کسی دوسرے اسلامی ملک کے ماہرین کو ایک خالص دینی معاملے میں اپنا شریک بنانا گوارا نہیں کرتی اور نہ ہی اُن کی مہارت و تجربات سے فائدہ اُٹھانے کی روادار ہے۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کچھ ماہرین نے سعودیہ کے نظامِ رؤیت کو دیکھنے اور اُس کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔چنانچہ محترم خالد اِعجاز مفتی لکھتے ہیں ''سن ۱۹۷۹ عیسوی کے رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اِسلامی ملک ترکی کا پانچ افراد پر مشتمل ماہرین کا ایک وفد شوّال المکرم کے چاند کو دیکھنے کے لئے سعودی عرب آیا۔ اور اُس نے اُس وقت کے سعودی رئیس مجلسِ قضاء شیخ عبدالعزیز بن باز سے ملاقات کر کے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور ہدی یا شفا پہاڑ، جو کہ عرب کے بلند ترین پہاڑوں میں سے ہے پر چڑھ کر چاند کی رؤیت کی اجازت طلب کی تو انہوں نے یہ کہہ کر وفد کی خواہش کو رد کر دیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔بعد میں ۲۲ اگست ۱۹۷۹ کی شام سعودی حکومت نے یہ اِعلان کر دیا کہ ۲۳ اگست ۱۹۷۹ کو یکم شوّال المکرم ہے لہٰذا کل عید ہوگی۔وفد نے بعد میں اپنی جاری کردہ رپورٹ میں انکشاف کیا کہ اُس نے ۲۳ اگست کی شام شفاء پہاڑ پر چڑھ کر چاند کی رؤیت کی کوشش کی لیکن اُس دن بھی چاند نظر نہیں آیا حالانکہ اگر ۲۲ اگست کو چاند نکل چکا تھا تو ۲۳ اگست کو چاند دیر تک نظر آنا چاہئے تھا، (رؤیت ہلال۔مسئلہ اور حل، صفحہ نمبر ۱۱۰ تا ۱۱۲)۔''اِسی طرح ایک اور مقام پر مصنف رقمطراز ہیں:''سعودی عرب کی

شاہ سعود یونیورسٹی ریاض کے شعبہ طبیعات و نجوم کے عالم جناب این کردی نے اپنے ملک کے نظامِ رؤیتِ ہلال کے بارے میں انگریزی میں ایک مقالہ تحریر کیا جو'' دی آبزرویٹری The Observatory'' کے شمارہ اگست ۲۰۰۳ء کے صفحات ۲۱۹ اور ۲۲۲ پر شائع ہوا۔ یہ مقالہ ویب سائیٹ www.articles.adsabs.harward.edu پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اِس مقالے میں انہوں نے محکمۂ عدل کی جانب سے اعلان کردہ آغازِ رمضان کی تاریخوں کی ایک فہرست ترتیب دی ہے، جو مسلسل ۴۲ برسوں کا احاطہ کرتی ہے۔ انہوں نے درجِ ذیل پانچ مقامات کو اپنے مطالعہ کا محور بنایا، جہاں رؤیتِ ہلال کی شہادتوں کے زیادہ تر دعوے کئے گئے ہیں۔ یہ مقامات دوامی، سودیر، حریق، تبوک اور دمام ہیں۔'' آگے تحریر کرتے ہیں:'' اِن ۴۲ برسوں میں صرف دو تاریخیں ایسی ہیں، جن کی شام ماہرینِ فلکیات کے مطابق رؤیتِ ہلال ممکن تھی، پہلی ۲۶ جنوری ۱۹۶۳ء اور دوسری ۳۱ مئی ۱۹۸۴ء۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مؤخر الذکر مہینے کی درست رؤیت کو یوں غلط کر دیا گیا کہ اِس مہینے کے آخر میں ۲۸ رمضان المبارک (28 جون 1984ء) کی شام حیرت انگیز طور پر شوّال کا چاند دکھائی دیے جانے کا اعلان ہو گیا۔ جواز یہ قائم کیا گیا کہ غلطی کے باعث رمضان کے آغاز میں ایک روز کی تاخیر ہو گئی تھی، (رؤیت ہلال۔ مسئلہ اور حل۔ صفحہ نمبر ۱۳۰، ۱۳۱)''۔ دارالعلوم کراچی کے مفتی تقی عثمانی صاحب اِس حوالے سے سعودی عرب کی رؤیت کے طریقۂ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:'' سعودی عرب میں کئی مرتبہ چاند کی ولادت سے پہلے ہی شہادت کو معتبر ماننے کا جو واقعہ پیش آیا ہے، وہ احقر کی نظر میں محلِ نظر ہے اور متعدد سعودی علماء سے احقر نے گفتگو کی ہے، وہ بھی اِس معاملے میں پریشان نظر آئے، لیکن چونکہ مسئلے کا تعلق مجلسِ قضاء الاعلیٰ (ریاض) سے ہے، اِس لئے وہ بے بس تھے، (رؤیت ہلال۔ مسئلہ اور حل، بیک ٹائٹل)''۔ اسی طرح دارالعلوم دیوبند کے مفتی حبیب الرحمٰن برطانیہ میں سعودی عرب کے اعلانِ رؤیت کو بنیاد بنا کر عید وغیرہ کرنے کے حوالے سے پوچھے گئے ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:'' سہولت

پسندی میں پڑ کر سعودی عرب کے مطابق اپنے یہاں رمضان اور عید کا اعلان کرنا درست نہیں۔ اگر کوئی فتویٰ بھی اس طرح کا حاصل کرلیا گیا ہے تو یہ شرعی اُصول کے خلاف ہے۔ پھر سعودی رؤیت کا جو حال آپ نے تحریر فرمایا ہے، نیز اس کے مفاسد کی طرف جو توجہ دلائی ہے، اس کو پڑھنے کے بعد بھی آنکھ بند کر کے سعودیہ کی رؤیت پر اپنے یہاں فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ آپ پوری قوت کے ساتھ مراکش کی رؤیت کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کا رواج ڈالیں۔ یہی اقرب الی الصحۃ ہے''۔ یہ وہ فتویٰ ہے، جو ۱۸ صفر المظفر ۱۴۲۴ ہجری بمطابق ۲۰ اپریل ۲۰۰۳ عیسوی کو جاری ہوا اور اس کی تصدیق دوسرے کئی دوسرے مفتیوں کی جانب سے کی گئی۔ اسی طرح ملتان شہر کے معروف مدرسہ خیر المدارس کے مفتی عبدالستار صاحب اپنے ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں: ''انتہائی معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سعودیہ میں ۳۲ سال کا کیلنڈر گرین وچ کے مطابق مرتب کرلیا گیا ہے۔ اسی کے مطابق رمضان وعید کا اعلان ہوتا ہے، چاند دیکھ کر یا شہادتِ شرعیہ کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جاتا''۔ اسی طرح احسن الفتاویٰ میں سعودی عرب کی رؤیت کے بارے میں لکھا ہے کہ حکومتِ سعودیہ میں رؤیت ہلال کا فیصلہ مسلک حنفیہ کے خلاف ہونے کے علاوہ بداہت کے خلاف بھی ہوتا ہے، اس لئے پاکستان کے لئے حجت نہیں۔۔۔۔ صرف یہی فتاویٰ جات نہیں بلکہ اِس طرح کے کئی مشاہدات وتجربات اور اقوال سے اخبارات بھرے پڑے ہیں۔ اِن حقائق کی موجودگی میں کس طرح سعودی عرب کی اندھی تقلید کرتے ہوئے، اُن کے ساتھ رمضان وعیدین میں اتفاق ممکن ہے؟ کیا محض عقیدت کی بنیاد پر رمضان اور شوّال کے آغاز کو مقدم کر کے مسلمانوں کے ایک یا دو روزوں کو کوئی اپنے سر لے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ شریعت کے منشاء اور حکم کے عین مطابق نظر آنے والے چاند کو دیکھ کر روزہ رکھا جائے گا اور چاند کو دیکھ کر ہی عید منائی جائیگی۔ واضح رہے کہ درجِ بالا اقتباسات اُن لوگوں کے فتاویٰ سے لئے گئے ہیں، جنہیں پشاور اور مردان میں قبل از وقت چاند کا اعلان کرنے والے بھی اپنا پیشوا ومقتدیٰ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن شاید صرف اُن

مسائل میں اپنا پیشوا تسلیم کرتے ہیں، جن سے اُن کی نفسانی خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے۔

سعودی عرب کے ساتھ عید کے ممکن نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں قمری تاریخ کے تعین کے لئے جو اُمّ القریٰ کیلنڈر وضع کیا گیا ہے، وہ اِس لئے قابلِ اعتبار نہیں کہ پہلے اُس میں قمری مہینے کی ابتدا کرنے کے لئے چاند کی پیدائش کو اور پھر بعد میں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ چاند کی پیدائش اور مطلعِ افق پر اُس کے مطلق ٹھہراؤ (جسے وجودِ قمر کہا جاتا ہے) کو معیار بنایا گیا ہے، یعنی اِعلانِ رؤیت کے لئے دو شرائط عائد کی گئی ہیں: (۱) چاند کی پیدائش سورج کے غروب ہونے سے پہلے ہوئی ہو، (۲) غروبِ قمر آفتاب کے غروب ہونے کے بعد ہو یعنی سورج کے غروب ہوجانے کے بعد اُفق پر چاند کے مطلق ٹھہراؤ، خواہ چند منٹ ہی کیوں نہ ہو، کو معیار بنایا گیا ہے۔ چاند کی پیدائش سے مراد یہ ہے کہ چاند زمین کے گرد تقریباً ۲۹.۵ دن میں ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ اس چکر کے دوران ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ سورج چاند اور زمین ایک لکیر کی طرح ہوجاتے ہیں اور چاند زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے، سائنسی اعتبار سے یہ کیفیت ''چاند کی پیدائش یا نیا چاند'' کہلاتی ہے۔ اس وقت چاند پر گرنے والی سورج کی روشنی زمین پر نہیں پہنچتی ہے، جس کی وجہ سے دنیا کی طاقتور ترین ٹیلی سکوپ سے بھی چاند کو دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

اب اگر شرعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا دونوں شرائط کا مطلق لگانا درست نہیں ہے۔ پہلی شرط اس لئے درست نہیں کہ شرعی اعتبار سے پیدائشی نیا چاند اُس وقت تک ہلال نہیں بن سکتا، جب تک کہ اُسے کھلی آنکھوں سے دیکھ نہ لیا جائے۔ اور سائنسی اعتبار سے یہ تب ہی ممکن ہے جب چند اور عوامل کی موجودگی میں چاند کی عمر کم از کم بیس گھنٹے یا اُس سے زائد ہوجائے۔ جیسا کہ محترم خالد اعجاز مفتی اپنی کتاب ''رؤیت ہلال مسئلہ اور حل'' میں ''چاند کی عمر سے رویتِ ہلال معلوم کرنے کے نکات'' بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: (۱) بیس گھنٹے سے کم عمر کا چاند دکھائی نہیں دیتا۔ (۲) بیس سے تیس گھنٹوں کی عمر کا چاند کبھی دکھائی دے جاتا ہے، کبھی نہیں۔ اس کا انحصار متعدد فلکیاتی کیفیات پر ہوتا ہے۔ تیس گھنٹوں

سے زائد عمر کا چاند مطلع صاف ہونے کی صورت میں چند مستثنیات کو چھوڑ کر عموماً نظر آ جاتا ہے"۔۔۔(رؤیتِ ہلال: مسئلہ اور حل، صفحہ نمبر ۲۱۰)۔بعض ماہرینِ فلکیات کم از کم تیس گھنٹے چاند کی عمر کو رؤیت کے لئے شرط قرار دیتے ہیں۔لہٰذا درجِ بالا سائنسی حقائق کی روشنی میں چاند کو ہلال بننے کے لئے اپنی پیدائش کے بعد کبھی ایک دن اور کبھی ڈیڑھ دن بلکہ اِس سے بھی زیادہ درکار ہوتے ہیں۔لہٰذا چاند کی پیدائش اور قابلِ رؤیت ہونے میں کم از کم ایک دن یا اس سے زیادہ کا فرق لازمی ہے۔اور سعودی عرب نے جب تک چاند کی پیدائش (نیا چاند) کو قمری تاریخ کے لئے معیار بنائے رکھا، اُس وقت تک پاکستان کے ساتھ قمری مہینے کی ابتدا کرنے میں بعض دفعہ ایک دن اور کبھی دو دِنوں کا فرق سامنے آتا رہا، کیونکہ نئے چاند اور ہلال میں اتنا فرق کا آنا ممکن ہوتا ہے۔حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یہ ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی افطار کرو یعنی شوّال کا آغاز کرو اور عید الفطر مناؤ۔اب اگر سعودی عرب کی مطابقت کی جائے تو لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ روزے پہلے شروع ہو جائیں اور عید الفطر رمضان ہی میں منالی جائے، دونوں صورتوں میں متعدد شرعی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، جن کا ذکر کتابچے کی اخیر میں آرہا ہے۔

جہاں تک دوسری شرط یعنی سورج کے غروب ہو جانے کے بعد اُفق پر چاند کے مطلق ٹھہراؤ، خواہ چند منٹ ہی کیوں نہ ہو، کو معیار بنانے کا تعلق ہے، تو اِس حوالے سے عرض یہ ہے کہ یہ بھی سائنسی و شرعی اعتبار سے درست نہیں ہوگا۔کیونکہ چاند کی حقیقی رؤیت کے لئے جہاں اُس کی پیدائش کے بعد ایک مخصوص مدت کا گذر جانا شرط ہے بالکل اِسی طرح سورج کے غروب ہو جانے کے بعد چاند کا مطلعِ اُفق پر ایک مخصوص وقت ٹھہرا رہنا بھی ضروری ہے وگرنہ اُس کی رؤیت یعنی اسے دیکھنا مشکل ہو جائے گا۔ماہرین کے مطابق عام طور پر نیا چاند دوسرے عوامل کی موجودگی میں اُس وقت تک رویت کے قابل نہیں ہوتا، جب تک وہ سورج کے غروب ہو جانے کے بعد تقریباً پچاس منٹ یا اُس سے زائد وقت تک اُفق پر نہ رہے۔اس سے کم وقت میں اُس کے نظر آنے کا امکان نہیں ہوتا ہے البتہ اگر دیگر کیفیات

اپنے اپنے معیار سے کافی بلند ہوں تو مطلع غیر معمولی طور پر صاف ہونے کی صورت میں اس سے کم وقت میں بھی رؤیت ممکن ہوسکتی ہے مگر ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے، (تلخیص از رؤیت ہلال مسئلہ اور حل)۔ اسی طرح اگر چاند سورج سے پہلے غروب ہوجائے تو پھر اس کا نظر آنا ناممکن ہوجاتا ہے کیونکہ چاند اُفق کے نیچے جاچکا ہوتا ہے۔

مہینے کی ابتداء کرنے کے لئے چاند کی پیدائش کو معیار بنانے کی بجائے رؤیت یعنی دیکھنے کو معیار بنانے کا ثبوت قرآنِ مجید کی کئی آیاتِ کریمہ سے ملتا ہے۔ سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۸۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) لوگ آپ سے ہلالوں (ہلال کی جمع) کے بارے میں پوچھتے ہیں، تو آپ (اُن سے) کہہ دیجئے کہ یہ (ہلال) مقررہ اوقات ہیں، لوگوں کے لئے (معاملات وعبادات) اور حج کے تعین کے لئے''۔ مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں اُس ہلال کا ذکر ہے جو لوگوں کو نظر آئے اور نیا چاند پیدا ہوتے ہی نظر نہیں آتا بلکہ اُس کے نظر آنے کے لئے کچھ وقت کا گذر جانا بھی ضروری ہے۔ اِسی طرح چاند کے بارے میں مشہور حدیثِ مبارک میں بھی پیدائش کا ذکر نہیں ہے بلکہ ''رؤیت'' کے الفاظ آئے ہیں، جس کے معنیٰ ''دیکھنے'' کے ہیں۔ یہ دیکھنا خود سے بھی ہوسکتا ہے اور کسی شرعی شہادت کے ذریعے سے بھی۔

سعودی عرب میں رؤیت کے حوالے سے اِن بنیادی خرابیوں کا پتا اس سے بھی چلتا ہے کہ ایک دفعہ چاند کی تاریخ کے اعلان کئے جانے کے بعد اکثر و بیشتر تاریخوں میں کمی بیشی کی جاتی ہے۔ اِس حوالے سے ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۷ عیسوی کے ذوالحج کے مہینوں کے اِعلان اور بعد میں کئے جانے والے ردّوبدل کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اِس حوالے سے سعودی اخبار ''الوطن'' میں حمزہ المزنی نامی کالم نگار کا ایک مضمون انتہائی اہم ہے، جس میں ماہِ ذی الحج ۱۴۲۵ھ کے چاند کا پہلے اعلان کرتے ہوئے ۱۲ جنوری بروز بدھ یکم ذی الحج قرار دیا گیا۔ پھر کئی دنوں کے بعد اسّی سالہ دو بوڑھوں کی شہادت کو قبول کرتے ہوئے تاریخ کو پیچھے کردیا گیا اور یکم ذی الحج ۱۱ جنوری کو قرار دے دیا گیا۔ کنگ عبدالعزیز کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے ماہرین نے مجلس قضاء کے

اس فیصلے کو چیلنج کرتے ہوئے، اُن دونوں بوڑھوں کا انٹرویو لیا لیکن اُن سے مطمئن نہ ہو سکے۔ ماہرین کا اُن بوڑھوں کی رؤیت کو چیلنج کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جس دن کے بارے میں اُنہوں نے رؤیت کا اقرار کیا تھا، اُس دن غروبِ آفتاب کے وقت چاند کی عمر صرف ۳ گھنٹے تھی اور وہ سورج کے طلوع ہونے سے ۳ منٹ پہلے غروب ہو چکا تھا۔ کالم نگار حمزہ المزنی کا یہ مضمون ویب سائٹ www.alwatan.com.sa/2005-01-20/writers پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک سعودی عرب اور ہمارے ملک میں ناممکن دنوں میں شہادتوں کے آنے کا مسئلہ ہے، تو اس حوالے سے بھی چند اہم باتوں کو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

سعودی عرب میں عام طور پر رؤیتِ عامہ نہیں ہوتی ہے یعنی مطلع صاف ہونے کے باوجود صرف چند لوگ ہی چاند کو دیکھ پاتے ہیں، جبکہ فقہاءِ کرام نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اگر مطلع ابر آلود نہ ہو تو رمضان المبارک اور عیدین کے چاند کے ثبوت کے لئے رؤیتِ عامہ کا ہونا ضروری ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ ایک جمِ غفیر چاند کے دیکھنے کی شہادت دے صرف چند افراد کی شہادت معتبر نہیں ہوگی۔ جمِ غفیر کی شہادت کے علاوہ فقہاءِ کرام ایک شرط یہ بھی لگاتے ہیں کہ اُس دن چاند کے نظر آنے کا اِمکان بھی ہو۔

آسان لفظوں میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ چاند کی رؤیت اس وقت معتبر ہوگی جب اِس کی رؤیت پر کثرتِ شہادت اور اُس کے نظر آنے کا امکان بھی موجود ہو۔ اگر چاند کی رؤیت کی شہادت ایسے دنوں میں دی جائے، جن دنوں میں اُس کی پیدائش ہی نہ ہوئی ہو یا پیدائش تو ہو گئی ہو لیکن اُس کی عمر کے کم ہونے کی وجہ سے اُس کا منظر آنا ناممکن ہو، تو پھر شہادت معتبر نہ ہوگی۔

تبلیغی جماعت کے معتبر عالم مولانا انعام الحسن کاندھلوی لکھتے ہیں:

''حساب دان، جس تاریخ کو امکانِ رویت بتاتے ہیں اس دن سے پہلے اگر رویتِ ہلال کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور یہ جمہور کے تعامل کے بھی خلاف ہے۔'' (رؤیتِ ہلال: مسئلہ اور حل، بیک پیج)۔

درجِ بالا حقائق کے تناظر میں سعودی عرب کی رؤیتِ ہلال کے طریقۂ کار کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں کبھی بھی رؤیتِ عامہ نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک یا دو افراد کی شہادت پر اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ اعلان بھی اس اعتبار سے مشکوک ہے کہ ان لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ شہادتیں کہاں سے آئیں؟ کس نے لیں اور شہادت دینے والوں کی شرعی حیثیت مسلّم ہے یا نہیں؟ اس حوالے سے سعودی عرب میں رؤیتِ ہلال کی شہادت کو قبول کرنے والی چھ رکنی کمیٹی کے ایک رکن ڈاکٹر صالح کا بیان جو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا، بہت اہم ہے۔ روزنامہ جنگ لکھتا ہے کہ ''ڈاکٹر صالح اس چھ رکنی سرکاری سعودی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے رکن ہیں، جن کے ذمے چاند دیکھے جانے کی شہادتیں لینے کی ذمہ داری ہے۔ انہوں نے ۴، اکتوبر کو انٹرنیٹ پر اپنا بیان جاری کیا کہ ان کو کسی نے چاند دیکھنے کی اطلاع نہیں دی اور نہ ہی وہ اس فیصلے سے مطمئن ہیں۔ انہوں نے انٹرنیٹ پر اپنا موبائل فون نمبر بھی دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ پچھلے بیس سالوں سے سعودی حکمرانوں کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ رمضان اور عیدین کے ایام کے غلط فیصلوں کو نافذ نہ ہونے دیں لیکن مجلسِ اعلیٰ سے فیصلے صادر ہو جاتے ہیں،'' (روزنامہ جنگ لندن، ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۵)

سعودی عرب میں رؤیت کے حوالے سے انتہائی باخبر ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں پہلے شہادت دینے والوں کو شاہی حکم نامے کے تحت انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ احقر کی نظر میں یہ عنصر بھی غیر شرعی شہادت کا باعث بن سکتا ہے۔

پاکستان کے چند شہروں میں قبل از وقت رویت کی شہادت کا واقع پیش آتا ہے، اُن کے بارے میں بھی اخبارات وغیرہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ایسی خبریں بھی چھپی ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ بعض لوگ محض جلد بازی کی وجہ سے وقت سے پہلے چاند کی رؤیت کی جھوٹی شہادت دیتے تھے۔ اس بارے میں ایک واقعہ مفتی تقی عثمانی صاحب کے حوالے سے روزنامہ جنگ کے ۵، اکتوبر ۲۰۰۵ء کی لندن اشاعت میں چھپا، جسے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

''جسٹس مفتی تقی عثمانی نے ایک جگہ لکھا کہ انہوں نے ایک مولوی صاحب کو بیت اللہ پر زار وقطار روتے ہوئے دیکھا۔ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ حضرت جلد بازی کر کے وقت سے پہلے روزہ اور عید کرواتے رہے، اب رو رو کر خدا سے معافی مانگ رہے ہیں''

اسی طرح ماہنامہ ''الخیر'' ملتان کی اکتوبر ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں جناب بشیر نامی مضمون نگار نے ایک واقعہ یوں درج کیا ہے کہ ''احقر کے ہمسائے اچھے پکے تبلیغی اور ریلوے ملازم جناب ملک محی الدین لہڑی نے فرمایا کہ جماعت کے ایک ساتھی مقیم قریب سرحد نے روتے ہوئے بتایا کہ میں اور چند ساتھی رمضان اور عیدین کے چاند دیکھنے کی غلط شہادت دیتے تھے۔ چند غلط بہانوں اور تاویلات کا سہارا لے کر دل کو سمجھاتے اور ضمیر کو سلاتے تھے۔ اب توبہ و استغفار کیا ہے، دعا فرمادیں اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ بذریعہ خط یا ذاتی طور پر تصدیق کرا سکتے ہیں''۔

یہاں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک کے لوگ بھی سعودی عرب کے ساتھ چاند نہیں دیکھ پاتے بلکہ وہ محروم رہتے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو خیبر پختونخواہ کے چند علماء اور اُن کے متبعین نے رمضان المبارک و عیدین کے چاند کو اپنے لئے ایک نفسیاتی مسئلہ بنالیا ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے یہ تصور قائم کرلیا ہے کہ انہیں رمضان و عیدین سعودی عرب کے ساتھ ہی کرنی ہے۔ لہٰذا اکثر اوقات چاند کے نظر نہ آنے کے باوجود بھی انہیں چاند نظر آجاتا ہے۔ اِس دعوے کا بین ثبوت یہ ہے کہ وہاں کے لوگ ان مہینوں کے علاوہ دوسرے مہینوں میں مرکزی و زونل رؤیت کمیٹیوں کے اعلان کردہ تاریخ کے مطابق اپنے معاملات کرتے ہیں۔ اِس حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ گذشتہ سال پشاور، چارسدہ اور مردان کے کچھ علاقوں میں مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے اِعلان کے بجائے خود ساختہ رؤیت ہلال کمیٹی کے اعلان کے مطابق مورخہ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۹ء بروز اتوار عید کی گئی۔ حالانکہ اُس دن کسی بھی طور پر چاند کے نظر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پورے پاکستان کے ماہرین اِس غیر حقیقی

اِعلان پر حیران وششدر تھے۔ مسجد قاسم علی خان پر آنے والی اِن جھوٹی شہادتوں کی قلعی اُس وقت کھلی، جب اگلے ماہ ذی القعدہ کا چاند ۳۰ شوال المکرم کی شام نظر نہیں آیا بلکہ اگلے دن نظر آیا حالانکہ اُس دن مسجد قاسم علی خان سے کیے گئے اعلان کے مطابق ۳۱ شوال المکرم کی تاریخ تھی۔ اور یہ بات ہر خاص وعام جانتا ہے کہ ۳۱ دنوں پر مشتمل کوئی قمری مہینہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ واقعہ بھی سب کے لئے لمحۂ فکریہ ہے اور اُن علماء اور لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہے، جو چاند کو عزّتِ نفس اور مسلکی مسئلہ بنا کر حق کا ساتھ دینے کی بجائے باطل کی تائید کرتے ہیں یا پھر خاموشی اِختیار کر کے نہ صرف مجرمانہ کردار ادا کرتے ہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اُس ارشاد کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہیں کہ جس میں آپ ﷺ نے برائی کو روکنے کے طریقے ارشاد فرمائے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے جو کوئی کسی برے کام کو ہوتے ہوئے دیکھے تو اُسے چاہئے کہ وہ اُسے ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر زبان سے روکے اور اگر ایسا بھی نہیں کر سکتا تو پھر اُسے دل میں برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''، (اَربعین نووی، حدیث نمبر ۳۴)۔

خیبر پختونخواہ کے بعض علماء کی جانب سے کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اُنہوں نے رمضان و عید کے چاند کی رؤیت کے بارے میں حتمی طور پر پیشگی اِطلاع دیدی کہ فلاں تاریخ کو چاند نظر آجائیگا اور عید فلاں دن ہوگی۔ جیسا کہ حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک مضمون بنام ''صوبہ سرحد اور رؤیتِ ہلال'' میں لکھا کہ ''لوگ اطمینان سے رمضان المبارک کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہورہے تھے کہ یکایک معلوم ہوا کہ سرحد کے بعض علماء کا ایک اجلاس 21 رمضان المبارک مطابق 11 جون 85ء منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ چاند کی رؤیت ہو یا نہ ہو اٹھارہ جون کو تیس ماہ رمضان قرار دیا جائے اور انیس جون کو عید الفطر منائی جائے۔

یہ فیصلہ سراسر احکام شریعت کے خلاف ہے کیونکہ چاند انتیس کا بھی ہوسکتا ہے اور تیس کا بھی، انہیں کس نے بتایا کہ اس دفعہ چاند تیس کا ہوگا اور عید بروز بدھ 19 جون کو منائی جا

گی۔ ہوسکتا ہے کہ چاند انتیس کا ہوتا اور ایک روز قبل طلوع ہوتا اور ان کے حساب کے مطابق عید منگل کو منائی جاتی۔ دس دن قبل عید کا یہ تعین کم از کم شریعت اسلامیہ سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا''۔

(انٹرنیٹ ایڈیشن، http://www.urduweb.org/mehfil/showthreS.PHP)۔

رؤیت ہلال کے طریقۂ کار میں درجِ بالا بنیادی خرابیوں کی موجودگی میں سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کو منسلک کرنا اپنی عبادتوں اور خاص دنوں کے فیوض وبرکات کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اسلام میں رمضان المبارک اور عیدین وغیرہ محض تہوار نہیں ہے کہ غیر مسلموں کی طرح ان میں خوشیاں منالی جائیں اور بس بلکہ انہیں عبادت کا درجہ حاصل ہیں، جنہیں بجالانے کی صورت میں ثواب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ، جو حرمین شریفین کے ساتھ محض اِعتقادی اور جذباتی وابستگی کی وجہ سے سعودیہ کے ساتھ اِن ایامِ مبارکہ کو منسلک کرنے کے خواہش مند ہیں، وہ اِس پر غور کریں کہ چاند کا مسئلہ صرف جذباتی نہیں بلکہ اِس کا تعلق عبادات ومخصوص اوقات سے ہے، جو اپنے اندر بے انتہاء فوائد وبرکات رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر انہیں اپنے دنوں سے ہٹا کر آگے یا پیچھے کر دیا جائے تو یہ برکات حاصل نہیں ہوتیں۔ واضح رہے کہ اگرچہ تمام ایام اور مہینے اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے میں اِن میں کوئی فرق نہیں لیکن قرآنِ مجید اور احادیثِ نبوی ﷺ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فضائل کے اعتبار سے اِن ایام اور مہینوں میں فرق ہے یعنی بعض ایام کو دوسرے ایام پر اور بعض مہینوں کو دوسرے مہینوں پر درجہ اور فضیلت حاصل ہے۔ مثال کے طور پر جمعۃ المبارک کو ہفتے کے باقی چھ ایام پر باعتبارِ درجہ فضیلت حاصل ہے۔ اسی طرح رمضان المبارک کے مہینے کو دوسرے مہینوں پر فضیلت حاصل ہے۔ قرآن وحدیث اور بزرگانِ دین سے ماخوذ کچھ اوراد ووظائف کا بھی یہی معاملہ ہے کہ اُن کو مقررہ دنوں یا وقت پر کرنے کی صورت ہی میں فوائد وثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اگر سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین

کے انعقاد کو منسلک کیا جائے تو احقر کی نظر میں درج ذیل خرابیاں پیدا ہونگی۔
(۱) رمضان کی صورت میں اگر رؤیت کا اعلان پہلے کر دیا گیا تو پہلا روزہ شعبان کی آخری تاریخ میں واقع ہوگا۔ اَحناف کے نزدیک اسے ''یومِ شک'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس دن روزہ رکھنے کی ممانعت احادیثِ مبارکہ میں وارد ہے۔ واضح رہے کہ ہمارے ملک پاکستان میں اکثریت اَحناف کی ہے۔ اسی طرح یہ صریح حدیث کے بھی خلاف ہوگا کیونکہ حدیث مبارک میں رمضان کو پہلے شروع کرنے سے منع کیا گیا ہے۔
(۲) رمضان المبارک اگر ایک دن پہلے شروع کر دیا جائے تو اس کا اثر اس کے آخری عشرے میں واقع طاق راتوں پر پڑے گا۔ وہ اِس طرح کہ جن راتوں کو لوگ طاق رات سمجھ کر عبادت کر رہے ہونگے حقیقت میں وہ طاق نہیں بلکہ جفت راتیں ہونگی۔ اور قرآنِ مجید اور احادیثِ مبارکہ میں جس شب قدر کا تذکرہ ہے، وہ طاق راتوں میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا لازمی طور پر اعتکاف کرنے والے اور دوسرے لوگ شب قدر کی فضیلت اور برکات کو پانے سے محروم رہ جائینگے۔
(۳) اسی طرح اگر عید الفطر کا اعلان ایک روز پہلے کر دیا جائے تو اس سے ایک بہت بڑی خرابی یہ پیدا ہوگی کہ لوگ رمضان کے آخری دن میں روزہ رکھنے کی بجائے کھاپی رہے ہونگے۔ یہ ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ فرضیت کے اعتبار سے رمضان کا ہر روزہ ایک جیسی اہمیت اور فضیلت رکھتا ہے۔ اور حدیثِ مبارک میں ہے کہ رمضان کے ایک روزے کے کفارے میں کوئی شخص پوری زندگی بھی روزہ رکھے تو اِس کا کفارہ ادا نہیں ہوسکتا۔ ہائے افسوس! کہ ہمارے ملک کے کچھ نادان لوگ اِس حقیقت کو سمجھے بغیر محض لوگوں کی اندھی تقلید میں روزے کے دن عید الفطر منا لیتے ہیں۔ اور روزہ چھوڑنے کے گناہ میں شریک ہوجاتے ہیں۔
(۴) عید الفطر کے ایک روز پہلے ہونے کی صورت پر غور کیا جائے تو ایک اور خرابی معلوم ہوتی ہے کہ بعض لوگ حدیث مبارک پر عمل کرتے ہوئے عید کے دوسرے روز شوال المکرم

کے چھ روزوں میں سے پہلا روزہ رکھتے ہیں۔ اب اگر انہوں نے ایک دن پہلے عید کرلی تو اس صورت میں یہ ہوگا کہ انہوں نے عید کے روز شوال المکرم کا پہلا روزہ رکھ کر اس حدیث مبارک کی عملی مخالفت کی کہ جس میں عید کو ''یوم ِ ضیافت یعنی مہمان نوازی کا دن'' قرار دے کر روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس دن شیطان اپنے غم کے اظہار کے لئے روزہ رکھتا ہے۔ گویا یہ روزہ شیطان کی موافقت میں ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان ملعون ومردود کی پیروی سے محفوظ رکھے۔

(۵) اسی طرح ذی الحج کے چاند کا اعلان پہلے کردیا جائے تو مناسکِ حج اور قربانی کے دنوں کو اُن کے اصل دنوں سے ہٹا کر دوسرے دنوں میں کرنا لازم آئے گا اور پوری دنیا کے لاکھوں فرزندانِ توحید کا حج اور قربانی اپنے اصل دنوں سے ہٹنے کی وجہ سے شرفِ قبولیت نہیں پاسکے گی۔ کیونکہ حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ وقت سے پہلے کی جانے والی قربانی قبول نہیں ہوتی۔

(۶) قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے نافرمانیوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے اُن پر آنے والے عذاب کا تذکرہ بھی فرمایا ہے۔ یہودیوں کی جملہ نافرمانیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ دن ہفتہ کی تعظیم نہیں کرتے بلکہ اُس کی توہین وبے ادبی کرنے کے لئے مختلف قسم کے حیلے بہانے اختیار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نافرمانی کی وجہ سے اُن کی صورتوں کو مسخ کردیا۔ لہٰذا ہمیں بھی یہ سوچنا ہے کہ صرف خوش اعتقادی کی وجہ سے کہیں ہم بھی اس گناہ کے مرتکب نہ ہوجائیں۔ کیونکہ باوثوق ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ سعودیہ میں سالانہ تعطیلات کے تعین کی غرض سے بھی عید وحج کے ایام کو آگے پیچھے کردیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس عملِ قبیح سے محفوظ ومامون فرمائے، (آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)۔

آخیر میں سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کرنے کے خواہاں علماء حضرات اور عام لوگوں سے درمندانہ درخواست ہے کہ وہ درجِ بالا سطور کو پڑھنے کے بعد انتہائی تحمل

مزاجی کے ساتھ غور کریں کہ کیا سعودی عرب کے ساتھ رمضان و عیدین کر کے ہم اپنی عبادتوں کو ضائع نہیں کریں گے اور کیا ہمارا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب نہیں بنے گا؟۔ یقیناً ناراضی کا سبب بنے گا تو پھر ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں کس کا ساتھ دینا ہے؟ اگر واقعی سعودی عرب کے ساتھ عید منانے کے خواہش مند ہیں تو پھر اِن لوگوں پر لازم ہے کہ وہ سعودی حکمرانوں سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنے فیصلے زبردستی دوسروں پر مسلط کرنے کی بجائے پوری دنیا بالخصوص پاکستان کے مسلمانوں میں سعودیہ کے موجودہ نظامِ رؤیت کے بارے میں پائے جانے والے تحفظات (Reservations) کا تدارک کریں اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سعودی حکومت پوری دنیا کے ہر مکتبۂ فکر کے علماءِ کرام، ماہرینِ فلکیات وموسمیات کو اپنے نظامِ رؤیت کو عملی طور پر دیکھنے کا بھرپور موقع دیں اور اُن کو شرعی اور فنی ہر اعتبار سے مطمئن کریں۔ اگر سعودی حکومت ایسا کرنے پر راضی ہوجائے تو پھر ممکن ہے کہ علماءِ کرام سعودی عرب کے ساتھ عید کے انعقاد یا عدمِ انعقاد کے بارے میں شرعی اُصولوں کے تحت اپنی رائے دے سکیں۔

رؤیتِ ہلال کے شرعی ثبوت کے لئے فقہاءِ کرام کے بیان کردہ اُصول

(۱) شعبان المعظم کی ۲۹ تاریخ کی شام رمضان المبارک کے چاند دیکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ چاند نظر آجانے کی صورت میں اگلے دن رمضان المبارک کی ابتداء کردی جائے، دگرنہ شعبان المعظم کے ۳۰ دن پورے کر کے رمضان المبارک کا آغاز کیا جائے۔

(۲) اگر ۲۹ شعبان المعظم کو مطلع ابر آلودنہ ہو تو رمضان المبارک اور عید دونوں کے چاند کے نظر آنے کی شہادت جمِ غفیر یعنی ایک بڑی جماعت کے جانب سے دی گئی ہو۔ اگر چند افراد نے شہادت دی تو قاضی اُسے قبول نہیں کرے گا۔ جمِ غفیر کی تعداد کے بارے میں فقہاءِ کرام کی متعدد آراء ہیں۔ بعض کے نزدیک ۵۰۰ سو، بعض کے نزدیک ۱۰۰۰ جمِ غفیر ہے۔ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ سے مروی ہے کہ جمِ غفیر سے مراد کم از کم پچاس افراد ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قاضی کی صوابدید پر ہے کہ حالات وواقعات کو دیکھ کر جمِ غفیر ہونے

یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے۔ جیسا کہ درِّ مختار میں بھی یہی درج ہے۔

(۳) مطلع ابر آلود ہو، تو عید کے چاند کے شرعی ثبوت کے لئے ضروری ہے کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں قاضی کے روبرو شہادت دیں اور قاضی ہر اعتبار سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد اُن کی شہادت کو قبول بھی کرلے۔ لیکن اگر شہادت اِمکانِ رؤیت کے مسلمہ سائنسی اُصولوں کے قطعی خلاف ہو تو جرح کر کے اُسے ردّ کیا جاسکتا ہے۔ شہادت کا ردّ و قبول قاضی کا اختیار ہے۔

چاند کے متعلق چند ماثورہ دعائیں:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّار

ترجمہ: اے ہمارے ربّ تو نے یہ (سب کچھ) بیکار پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے لہٰذا ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا

اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الشَّهْرِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ الْقَدْرِ وَمِنْ سُوْءِ الْحَشْرِ

ترجمہ: اللہ سب سے بڑا ہے۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ ساری قوت و قدرت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اے اللہ! میں اس (نئے) مہینے میں تجھ سے خیر کا طالب ہوں۔ اور بری تقدیر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور اس بات سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن میں برے طریقے سے تیرے حضور جمع کیا جاؤں''۔

اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهُ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ وَالتَّوْفِيْقِ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى رَبِّیْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ

اے اللہ ہم پر اس چاند کو امن اور ایمان اور خیریت اور سلامتی والا کر دے اور (ہمیں) توفیق دے اُس عمل کی جو تجھے پسند اور مرغوب ہو۔ اے چاند! میرا اور تیرا ربّ اللہ ہے۔

تمت بالخیر

اِظہارِخیال!

حمد وثنا اور درود بر خیر الانام کے بعد فاضلِ نوجوان مفتی حافظ سید صابر حسین شاہ، ممبر زونل رؤیتِ ہلال کمیٹی (سندھ) کا تصنیف کردہ کتابچہ بنام ''سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کیوں نہیں؟'' کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا۔ مولانا اس سے پہلے بھی کئی اہم موضوعات پر کتب لکھ چکے ہیں۔ رؤیتِ ہلال کمیٹی سے منسلک ہونے کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ ایک ہی ملک میں دو تین عیدیں منائی جارہی ہیں تو انہوں نے فلکیات کے متعلق مطالعہ اور شرعی رؤیتِ ہلال کی حیثیت اور اس سے متعلقہ شرعی احکام کو محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے اس کتابچہ کو مرتب کیا۔ کتابچہ نہایت سلیس، عام فہم اور مدلّل ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ جو لوگ سعودی کے عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کے اِنعقاد کو ترجیح دیتے ہیں، مولانا نے انہی کے اسلاف کی تحریر سے انکارِ ردّ بلیغ فرمایا۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے مطالع مختلف ہیں اور دن رات میں کافی فرق ہے، لہٰذا اسی وجہ سے عید کا ایک ساتھ ہونا بھی بہت مشکل ہے۔ نیز شرعاً ایک ساتھ عید کرنا کوئی فرض، واجب یا مستحب نہیں ہے، جس پر اصرار کیا جائے۔ جب نماز کے اوقات مختلف ہیں، روزہ رکھنے اور کھولنے کے اوقات بھی مختلف ہیں جبکہ اس پر کوئی یہ نہیں کہتا کہ روزہ بھی سعودی عرب کے وقت کے مطابق کھولیں گے تو عید منانے میں اصرار کیوں؟ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت اور عقلِ سلیم عطا کرے۔ یہ کتابچہ یقیناً صائب الرّائے اور متلاشیانِ حق کیلئے مفید ہوگا۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی اس سعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے۔

(محمد اسماعیل غفرلہ، خادمِ دار الحدیث ودار الافتاء، دار العلوم امجدیہ کراچی)

اِظہارِخیال!

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَبْدَعَ الْاَفْلَاکَ وَالْاَرْضِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ کَانَ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ وَعَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ وَاَصْحَابِہِ الطَّاھِرِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

میں نے حضرت علامہ مولانا سید صابر حسین شاہ زید مجدہ الکریم مدرس دار العلوم امجدیہ کراچی کا

زیرِ نظر مقالہ "سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کیوں نہیں؟" اول سے آخر تک پڑھا۔ میں ان کی تائید کرتا ہوں۔ مولانا نے نہایت اِختصار کے ساتھ حقائق کا ذکر فرمایا ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین اتفاق کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ مولانا کی یہ کاوش سعودی عربیہ کے علماء کے لئے غور و فکر کی دعوت ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ اہلِ اسلام کو حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

محمد رفیق حسنی، رکن مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی پاکستان
شیخ الحدیث و مفتی جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، گلستانِ جوہر کراچی

حج کے مسائل

نابینا شخص پر بذاتِ خود حج کرنا فرض نہیں ہے، اُسے حجِ بدل کرانا ہوگا

سوال: 77

میں شمشاد علی کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ملازم ہوں، نابینا ہوں۔ میں اپنی والدہ مرحومہ کے حج بدل کے لئے اپنے بھانجے کو بھیج رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ میں اپنا بھی فریضۂ حج ادا کرلوں، مجھے دورانِ سفر مددگار کی ضرورت ہوگی اور بھانجے کے ساتھ جانے میں مجھے سہولت ہوگی۔ میرا سوال یہ ہے کہ میرے نابینا ہونے کی وجہ سے کیا مجھ پر حج فرض ہے یا نہیں؟ اگر فرض نہیں ہے لیکن میں پھر بھی جانا چاہوں تو کوئی شرعی مسئلہ تو نہیں۔

(2) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب میں پیشاب سے فارغ ہوکر باہر آجاتا ہوں تو اٹھنے یا بیٹھنے میں پیشاب میں ایک چکنا قطرہ آجاتا ہے، میں دوبارہ استنجا کرتا ہوں، سوال یہ ہے کہ اگر حالتِ احرام میں ایسا ہو تو کیا احرام دھونا پڑے گا یا دوسرا احرام باندھنا پڑے گا؟۔

شمشاد علی، لیاقت آباد، کراچی

جواب:

حج کے فرض ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ترجمہ: ''جو لوگ بیت اللہ تک سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، ان پر اللہ (کی عبادت) کے لئے بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے، (آل عمران: 97)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب علامہ ابوالحسن علی بن محمد حبیب ماوردی شافعی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

استطاعت میں تین قول ہیں: امام شافعی کے نزدیک استطاعت مال سے ہوتی ہے اور یہ سفر خرچ اور سواری ہے۔ امام مالک کے نزدیک استطاعت بدن کے ساتھ ہوتی ہے یعنی وہ شخص صحت مند اور تندرست ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک استطاعت مال اور بدن دونوں کے ساتھ مشروط ہے، (تبیان القرآن، جلد 2، ص: 278)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

والاعمیٰ اذا ملک الزاد والراحلة ان لم یجد قائدا لایلزمه الحج بنفسه فی قولهم، وهل یجب علیه حج بالمال؟، فعند ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ لایجب وعندهما یجب، وان وجد قائدا عند ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ لایجب الحج بنفسه وعن صاحبیه فیه روایتان کذا فی فتاویٰ قاضی خان۔۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: ولو تکلف هؤلاء الحج بأنفسهم سقط عنهم حتی صحوا بعد ذلك لایجب علیهم الاداء هکذا فی فتح القدیر،

ترجمہ: ''اور نابینا شخص اگر زادِ راہ اور سواری کی استطاعت تو رکھتا ہے، مگر کوئی اُسے لے کر جانے والا نہیں ہے، تو آئمۂ احناف کے قول کے مطابق اس پر بذاتِ خود حج کرنا فرض نہیں ہے۔ آیا اس پر اپنے مال سے حجِ (بدل) کرانا فرض ہے؟ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس پر حج (بدل کرانا) فرض نہیں ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس پر اپنے مال سے حجِ بدل کرانا واجب ہے۔ اگر اس کو قائد (ساتھ لے جانے والا) میسر ہو تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پھر بھی اس پر بذاتِ خود حج کرنا فرض نہیں ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس میں دو روایتیں ہیں، جیسا کہ ''فتاویٰ قاضی خان'' میں ہے۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: اگر اُن معذور افراد نے تکلیف اٹھا کر بذاتِ خود حج کر لیا تو اُن کے ذمے سے فرض ساقط ہو گیا، یہاں تک کہ اگر یہ معذور افراد بعد میں (اللہ تعالیٰ کے کرم سے) تندرست بھی ہو جائیں تو (چونکہ ان کا حجۃ الاسلام ادا ہو چکا ہے، اس لئے دوبارہ) ان پر حج ادا کرنا واجب نہیں ہے، جیسا کہ ''فتح القدیر'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 218، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''جس شخص کے پاس روپیہ واسطے خرچ حجِ بیت اللہ شریف موجود ہے، لیکن وہ شخص بوجہ پوری تندرستی نہ ہونے کے خود جانے سے معذور ہے تو اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس صورت سے ادا ہو سکتا

ہے کہ جس سے یہ شخص سبکدوش ہو؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''عذر اگر ایسا ہو کہ مانع سفر ہے مثلاً آنکھیں یا پاؤں نہیں اور اس عذر کے زوال کی کوئی امید نہیں تو اپنی طرف سے حج بدل کرادے اور اگر عذر مانع سفر نہیں تو خود جائے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص:709، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

آپ پر حج فرض ہے، مگر بذاتِ خود حج پر جانا فرض نہیں ہے، آپ کسی کو اپنی طرف سے ''حجِ بدل'' ادا کرنے کے لئے بھیج دیں اور بہتر یہ ہے کہ ایسے شخص کو بھیجیں جس نے اپنا فریضۂ حج پہلے ادا کرلیا ہو۔ اگر آپ اپنے بھانجے کے ساتھ سفر حج پر چلے گئے اور ان کی مدد سے ارکان حج ادا کردیئے تو اس صورت میں بھی آپ کا فریضۂ حج ادا ہو جائے گا۔

(2) اس طرح کا قطرہ ''مذی'' کہلاتا ہے، اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، دوبارہ کرنا ہوگا۔ احرام کا اتنا حصہ جو ناپاک ہوا، اس کا دھونا لازمی ہے، احرام تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔

قرض پر عمرہ کی ادائیگی

سوال:78

میں نے عمرہ کی ادائیگی کے لئے ایک ماہانہ بیسی ڈالی تھی جو مجھے ماہِ اگست 2009ء میں ملے گی۔ میرے ایک دوست جون 2009ء میں عمرے کی ادائیگی کے لئے جارہے ہیں اور مجھے اُن کے ساتھ جانے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔ اگر میں تین ماہ قبل کسی سے ادھار لے کر عمرہ ادا کرنے چلا جاؤں تو عمرہ ادا ہوگا یا نہیں؟۔ جبکہ تین ماہ بعد بیسی ملتے ہی میں قرض کی رقم ادا کردوں گا، (عبدالرؤف خان، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

عمرہ نفلی عبادت ہے، واجب نہیں ہے کہ نہ کرنے سے کوئی گنہگار قرار پائے یا آخرت میں مواخذہ ہو، تاہم اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دے تو عمرہ کرنا سعادت ہے اور رسول اکرم ﷺ کی سنت ہے۔ آپ اپنی سہولت کے مطابق قرض لے کر عمرے پر جاسکتے ہیں، بعد میں قرض کی ادائیگی کی جاسکتی ہے۔

دورانِ حج حلق یا قصر کا حکم

سوال:79

حج کے دوران جو بال کٹوائے جاتے ہیں، ان کی دلیل کیا ہے؟۔

(منور احمد، لیاقت مارکیٹ، ملیر کراچی)

جواب:

سر منڈانا اور بال کٹوانا اللہ تعالیٰ نے حج کرنے والوں کے وصف میں بیان فرمایا ہے:

لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ ۙ مُحَلِّقِيۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِيۡنَ ۙ لَا تَخَافُوۡنَ ؕ

ترجمہ:''(ایک وقت آئے گا کہ) تم ضرور بالضرور پرامن حالات میں ان شاء اللہ مسجدِ حرام میں داخل ہو گے، (اس طرح کہ) تم نے اپنے سروں کو منڈا رکھا ہو گا یا بال تراشے ہوئے ہوں گے، (الفتح:27)''۔

اس کی دلیل یہ آیت مبارکہ اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کا عمل ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنۡ عَبۡدِ اللّٰهِ ابۡنِ عُمَرَ حَلَقَ النَّبِیُّ ﷺ رَاۡسَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِنۡ اَصۡحَابِهٖ وَقَصَّرَ بَعۡضُهُمۡ

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ (حجۃ الوداع کے موقع پر) نبی ﷺ اور آپ کے بعض اصحاب نے سر منڈایا اور بعض صحابۂ کرام نے بال کٹوائے''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1729، صحیح مسلم، رقم الحدیث:3142)

(۲) عَنۡ عَبۡدِ اللّٰهِ ابۡنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فِیۡ حَجَّةِ الۡوَدَاعِ اَللّٰهُمَّ ارۡحَمِ الۡمُحَلِّقِيۡنَ، قَالُوۡا وَالۡمُقَصِّرِيۡنَ يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ اللّٰهُمَّ ارۡحَمِ الۡمُحَلِّقِيۡنَ، قَالُوۡا وَالۡمُقَصِّرِيۡنَ يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ اَللّٰهُمَّ ارۡحَمِ الۡمُحَلِّقِيۡنَ، قَالُوۡا وَالۡمُقَصِّرِيۡنَ يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ وَالۡمُقَصِّرِيۡنَ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا فرمائی: اے اللہ! سر منڈانے والوں پر رحم فرما، صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اور بال کٹوانے والوں کے لئے کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! سر منڈانے والوں پر رحم فرما، صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! بال کٹوانے والوں کے لئے کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! سر منڈانے والوں پر رحم فرما، تو صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! بال کٹوانے والوں کے لئے کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: (اے اللہ!) اور بال کٹوانے والوں پر بھی رحم فرما''۔
(صحیح بخاری، رقم الحدیث 1727)

عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بال منڈانے والوں کے لئے ایک یا دو بار اور ایک روایت میں تین بار دعا فرمائی اور کٹوانے والوں کے لئے ایک بار دعا فرمائی۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ حج اور عمرے کے احرام سے نکلنے کے لئے حلق (بال منڈانا) یا قصر (بال کٹوانا) واجب ہے، مگر بال منڈوانے کا اجر زیادہ ہے، کیونکہ اس کے لئے رسول اللہ ﷺ نے زیادہ مرتبہ دعا فرمائی۔

مَحرَم کے بغیر ارکانِ حج کی ادائیگی

سوال: 80

زید اپنے خاندان کے ساتھ حج پر روانہ ہوا، جس میں دو تعلیم یافتہ بیٹیاں بھی شامل تھیں، جن کا زید مَحرَم تھا۔ جانے سے قبل ان بیٹیوں نے حج کے بارے میں لٹریچر کا مطالعہ کیا اور تربیتی نشستوں میں شرکت کی۔ مکہ پہنچتے ہی وہ مَحرَم اور اس کی اجازت کے بغیر عمرہ، طواف اور نمازوں کے لئے جاتی رہیں۔ مکے میں قیام کے دوران وہ اپنے والدین جو اچھی طرح چل پھر سکتے تھے اور ان کا ایک بھائی جو ذرا کمزور تھا، ہجوم سے بچنے کے لئے اس کا ساتھ ضروری تھا، انہیں بھی ساتھ نہیں لے گئیں۔ دورانِ حج وہ اپنے والدین اور کمزور بھائی کو صبح مزدلفہ چھوڑ کر فجر کی نماز کے بعد منیٰ چلی گئیں، ساتھ ہی والدہ کا ایک خادم بھی لے

گئیں۔ یہ قربانی کا اہم دن تھا، والدین اور کمزور بھائی صبح تین بجے سے شام پانچ بجے تک بھوکے پیاسے بھٹکتے رہے۔ اسی شام دونوں لڑکیاں بغیر محرم کے طواف وزیارت کے لئے مکہ گئیں اور واپس آگئیں۔ دوسرے روز بھی بغیر محرم کے طوافِ وداع کے لئے چلی گئیں۔ دس تا پندرہ ذوالحجہ نہ تو والدین سے معذرت کی اور نہ ہی اپنی شکل دکھائی۔ مدینے میں بھی یہی رویہ اپنائے رکھا۔ مندرجہ بالا گزارشات پر فقہ حنفی بریلوی مسلک کے مطابق فتویٰ درکار ہے۔ کیا ان دونوں کا حج مقبول ہے؟، (آزاد بن حیدر، گلستانِ جوہر، کراچی)۔

جواب:

سوال میں بیان کردہ صورتِ حال کے مطابق مذکورہ خواتین نے اپنے گھر سے حرمین طیبین اور حج کا سفر مَحرم کے ساتھ کیا، لہٰذا ان کا اپنا حج شرعاً درست ہے۔ شریعت کے احکام کا اطلاق ظاہر پر ہوتا ہے اور ہم شریعت کے مطابق کسی عبادت کے صحیح یا باطل ہونے کا حکم ظاہری فقہی احکام کے مطابق لگاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عبادت کے قبول ہونے یا نہ ہونے کے سرٹیفکیٹ ہم جاری نہیں کرتے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلہ اخلاصِ عمل اور نیت پر ہوگا اور نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

امام مسلم ایک طویل حدیث میں غزوۂ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ جانے والوں کے حالات بیان کرتے ہوئے نقل فرماتے ہیں:

وَصَبَحَ رَسُوْلُ اللهِ قَادِمًا وَكَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ بَدَأَ بِالْمَسْجِدِ، فَرَكَعَ فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ، ثم جَلَسَ لِلنَّاسِ، فَلَمَّا فَعَلَ ذَالِكَ، جَاءَهُ الْمُخَلَّفُوْنَ فَطَفِقُوْا يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْهِ وَيَحْلِفُوْنَ لَهُ وكانوا بِضْعَةً وَّثَمَانِيْنَ رَجُلًا، فَقَبِلَ منهم رسولُ الله ﷺ عَلَانِيَتَهم وَبَايَعَهُمْ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمْ وَوَكَلَ سَرَائِرَهُمْ اِلَى اللهِ

ترجمہ: ''صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ (غزوۂ تبوک سے مدینہ منورہ) تشریف لائے، اور آپ (کا معمول یہ تھا کہ) جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو پہلے مسجد میں جاتے اور دو رکعت نماز (نفل) پڑھتے۔ پھر لوگوں کے احوال معلوم کرنے کے لئے بیٹھ جاتے، جب

آپ نے ایسا کیا، تو غزوۂ تبوک کے مُخلّفین (جہاد سے پیچھے رہ جانے والے) آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور (جہاد سے پیچھے رہ جانے پر) قسمیں کھا کر اپنے عذر پیش کرنے لگے، ان لوگوں کی تعداد اسّی سے کچھ زائد تھی، رسول اللہ ﷺ نے ظاہری اعتبار سے ان کے عذر قبول فرمالئے اور ان سے بیعت لے لی اور ان کے لئے استغفار کیا اور ان کے باطنی معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد فرما دیا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 6947)''۔

امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں:

عن ابی فراس قال خطب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فقال یا ایھا الناس! الا انما کنا نعرفکم اذ بین ظھرینا النبی ﷺ واذ ینزل الوحی واذ یُنَبِّئُنَا اللہُ من اخبارکم، الا وان النبی ﷺ قد انطلق وقد انقطع الوحی، وانما نعرفکم بما نقول لکم، مَنْ أظھرَ منکم خیراً ظَنَنَّا بہٖ خیراً واحببناہ علیہ، ومن أظھر منکم لنا شرا ظننا بہ شرا وابغضناہ علیہ، سرائرکم بینکم وبین ربکم

ترجمہ: ''ابوفراس بیان کرتے ہیں کہ (ایک بار) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے لوگو! سنو! ہم تمہاری (حقیقتِ حال) کو جان لیتے تھے، کیونکہ نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان موجود تھے اور نزولِ وحی کا سلسلہ جاری تھا اور اللہ تعالیٰ (رسول اللہ ﷺ پر وحی کے ذریعے) ہمیں تمہاری (پوشیدہ) خبریں بھی بتا دیتا تھا، (مگر) سنو! (اب) نبی ﷺ (دنیا سے) تشریف لے جا چکے ہیں اور وحیٔ (ربانی) کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے (اب ہم) تمہارے بارے میں وہی کہتے ہیں جو (ظاہری طور پر) جانتے ہیں۔ سو تم میں سے جس سے خیر ظاہر ہوتی ہے تو ہم اس کے بارے میں اچھا گمان کرتے ہیں اور اس بناء پر اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور تم میں سے جس سے شر کا ظہور ہوتا ہے، اس کے بارے میں ہم برا گمان کرتے ہیں اور اس پر ناراض ہوتے ہیں۔ تمہارے پوشیدہ امور کا فیصلہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ہوگا (کیونکہ وہی نیتوں اور سب کے پوشیدہ احوال کا جاننے والا ہے)، (مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 286)''۔

مکۂ مکرمہ میں مقیم ہونے کے بعد خواتین محرم کے بغیر طواف کرسکتی ہیں۔ منیٰ، مزدلفہ وعرفات میں ارکانِ حج بھی تنہا ادا کرسکتی ہیں، وہاں ہر مرحلے پر محرم کا ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ ان مقامات کے درمیان فاصلہ اتنی مقدارِ سفر سے کم ہے، جس کے لئے عورت کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ مکہ اور مدینہ منورہ اور مدینہ منورہ اور جدہ کے درمیان اور جدہ سے واپس اپنے گھر تک سفر کے لئے محرم کی رفاقت ضروری ہے۔

عَنِ ابنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللہ ﷺ قَالَ لَا تُسَافِرِ الْمَرْاَۃُ ثَلَاثًا اِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی عورت محرم کے بغیر تین دن کا سفر نہ کرے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3200)''۔

علماء نے ایسی مسافتِ سفر کی کم از کم مقدار جو عورت محرم کے بغیر نہیں کرسکتی، جدید پیمائش کے اعشاری نظام کے مطابق تقریباً 98 کلومیٹر بتائی ہے۔

والدین اور بھائی اگر ان خواتین کی خدمت کے محتاج تھے، تو اُن کی خدمت اِن کے لئے باعثِ سعادت تھی اور اس سے اُن کے اجر میں اضافہ ہوتا۔ اور حج و دیگر عبادات کی بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کی زیادہ امید کی جاسکتی ہے۔ اگر وہ یہ خدمت نہیں کرسکیں تو یہ ان کے لئے اجرِ کامل سے محرومی کا باعث ہے، لیکن شرعی اعتبار سے اُن کی اپنی عباداتِ حج، طواف وارکانِ حج کی صحتِ ادا سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے یا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا حج صحیح طور پر ادا نہیں ہوا۔

حاجی پر قربانی کا واجب ہونا

سوال: 81

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے ذیل میں کہ ایک شخص حج کرنے جاتا ہے تو وہاں پر قربانی کرتا ہے، کیا اُس کے گھر پر اُس کی طرف سے قربانی کرنا ضروری ہے؟ جبکہ وہ صاحبِ ثروت ہے، (محمد افتخار اللہ قادری، مانسہرہ، اوگی)۔

جواب:

ادائیگیٔ حج کے موقع پر رمی سے فارغ ہوکر جو قربانی کی جاتی ہے اور یہ صرف منیٰ میں ادا

کی جاسکتی ہے، یہ قربانی حج کا شکرانہ ہے۔ حجِ تمتُّع (یعنی کوئی شخص حج کے مہینوں میں عمرہ کرکے احرام کھول دے اور پھر ایامِ حج میں حج کا احرام باندھ کر حج مکمل کرلے) اور حجِ قِران (حج وعمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام باندھے) والے پر دو عبادتوں (حج وعمرہ) کے شکرانے کے طور پر واجب ہے، حجِ اِفراد (تنہا حج کا احرام باندھنے) والے پر قربانی واجب نہیں۔ یہ وہ قربانی نہیں ہے جو عیدالاضحیٰ کے موقع پر کی جاتی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: بعد الرمی (ذبح ان شاء) لانہ مفرد

ترجمہ: ''رمی کے بعد (حجِ اِفراد کرنے والا) اگر چاہے تو ذبح کرے (یعنی یہ قربانی اس کے لئے مستحب ہے) اس لئے کہ وہ فقط حج کرنے والا ہے، (اور صرف حج کرنے والے پر قربانی واجب نہیں)۔ علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: والذبح لہ افضل ویجب علی القارن والمتمتع ۔ وأما الاضحیۃ فان کان مسافراً فلایجب علیہ، والا کالمکی فتجب کمافی ''البحر''۔

ترجمہ: ''(مفرد یعنی صرف حج کرنے والے پر قربانی واجب نہیں ہے اگر کرلے تو) مفرد کا قربانی کرنا افضل ہے اور حجِ قِران اور حجِ تمتُّع کرنے والے پر واجب ہے۔ لیکن عام قربانی جو ہر صاحبِ استطاعت پر واجب ہے تو حج کرنے والا اگر مسافر ہے، تو اُس پر (مسافر ہونے کی وجہ سے) یہ قربانی واجب نہیں ہے اور اگر حاجی مکہ میں مقیم ہے تو مکی کی طرح اس پر بھی یہ قربانی واجب ہے، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 474، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

قربانی کے واجب ہونے کی شرائط میں ایک شرط مقیم ہونا بھی ہے یعنی مسافر پر قربانی واجب نہیں ہے اور مقیم مالدار پر واجب ہے، اگرچہ وہ حج کررہا ہو۔ لیکن اگر مسافر بھی قربانی کرے تو بطور نفل ثواب پائے گا، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (والاقامۃ) فالمسافر لاتجب علیہ، وان تطوع بہا أجزأتہ عنہا

ترجمہ: ''(قربانی کے واجب ہونے کی ایک شرط مقیم ہونا ہے) پس مسافر پر (قربانی)

واجب نہیں ہے اور اگر نفل کے طور پر کرلے تو ثواب پائے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: **فلا تجب علی حاج مسافر فأما أهل مكة فتلزمهم وان حجوا**

ترجمہ: ''مسافر حاجی پر قربانی واجب نہیں ہے، پس اگر مکہ کے رہنے والے حج کریں، تب بھی ان پر قربانی واجب ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 378، 382، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مکہ کے رہنے والے صاحبِ نصاب شخص پر قربانی واجب ہے اگرچہ وہ حج ادا کر رہا ہو، لیکن کسی دور دراز مقام سے حج کے لئے آنے والا چونکہ مسافر ہے، لہٰذا اس پر قربانی واجب نہیں ہے۔ پس اگر وہ مالدار ہونے کے باوجود قربانی نہ کرے، تو اسے اس کی رخصت ہے۔ اور اگر وہ کسی کو وکیل مقرر کردے اور اُس کی جانب سے وطن میں کوئی شخص قربانی کرے تو جائز ہے اور اس پر ثواب پائے گا۔ امامِ حرم کا ایک فتویٰ ہمارے پاس ہے، اس کی رُو سے منیٰ وعرفات اب شہر مکہ کا حصہ ہیں، کیونکہ شہر کی وہاں تک توسیع ہوچکی ہے، لہٰذا اگر کسی حاجی کا مکہ میں قیام (حج سے پہلے کے ایام، ایامِ حج اور بعد کے ایام ملاکر) پندرہ دن بنتے ہوں تو وہ مقیم ہے اور اس پر قربانی واجب ہے، کیونکہ ہر حاجی صاحبِ استطاعت ہوتا ہے۔ اور یہ قربانی حدودِ حرم میں کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اپنے وطن میں کسی کو وکیل بنا کر بھی کرسکتا ہے۔

قربانی کے مسائل

دنیاداری کی خاطر قربانی کرنے اور نیاز کا حکم

سوال:82

میری رہائش بیوی، ایک بیٹے اور دو بیٹیوں سمیت اپنے ذاتی مکان میں ہے۔ پنشن اور دیگر ذرائع سے تقریباً ماہانہ آمدنی 19,800/ روپے بنتی ہے، جبکہ میرے ذمے مندرجہ بالا رقم سے کہیں زیادہ قرض واجب الادا ہے اور مقروض ہونے کے باوجود بیوی بچوں کے اصرار اور دنیاداری کی وجہ سے قربانی اور ماہِ صفر کی حلیم کی نیاز کرتا رہا ہوں، جس کے لئے بسا اوقات قرض بھی لیتا رہا ہوں۔ ان حالات کی روشنی میں قربانی اور نیاز کی بابت میرے لئے شرعی احکامات کیا ہیں؟ اگر شرعاً یہ دونوں چیزیں مجھ پر واجب نہیں اور میری مرضی پر ہیں تو اگر میں یہ نہ کروں تو میرا یہ فعل گناہ میں تو داخل نہیں ہوگا؟۔

(عبدالخالق، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

آپ نے لکھا ہے: ''مقروض ہونے کے باوجود بیوی بچوں کے اصرار اور دنیاداری کی وجہ سے قربانی اور ماہِ صفر کی حلیم کی نیاز کرتا رہا ہوں''۔ آپ اگر عبادت اور حصولِ ثواب کی نیت سے نہیں بلکہ محض دنیاداری کی خاطر یہ امور انجام دیتے رہے ہیں تو آپ اجرِ آخرت کے حقدار نہیں ہیں، کیونکہ آخرت میں اجر وثواب اسی عمل پر ملے گا جو ثواب کی نیت سے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا جائے نہ کہ دنیاداری اور دکھاوے کے لئے، اسے ریاکاری کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾

ترجمہ: ''بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے، (الانعام:162)''۔

قربانی ہر صاحبِ نصاب بالغ مرد اور عورت پر واجب ہے۔ مقروض اگر قرض ادا کرنے کے بعد صاحبِ نصاب نہیں رہتا تو اُس پر قربانی واجب نہیں، علامہ نظام الدین

رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ولوکان علیه دین بحیث لو صرف فیه نقص نصابه لاتجب،
ترجمہ: ''اگراُس پر قرض ہے اور قرض کی ادائیگی کے بعد نصاب ناقص ہوجاتا ہے تو اُس پر قربانی واجب نہیں، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5،ص:294)''۔

جبکہ آپ کا کہنا ہے کہ ''ان امور کے لئے آپ قرض بھی لیتے رہے ہیں''، آپ پر تو بدرجۂ اولیٰ قربانی واجب نہیں۔ آپ کے لئے بہتر تو یہ ہے کہ پہلے قرض سے سبکدوش ہوں کیونکہ قرض کی ادائیگی واجب ہے جبکہ قربانی (آپ پر واجب نہ ہونے کے سبب) نفلی ہوگی لیکن اگر قرض لے کر عبادت کی نیت سے قربانی کردی تو ادا ہوجائے گی اور اس پر ثواب ملے گا۔

عاشورہ یا ماہِ صفر کے موقع پر حلیم یا نیاز کا اہتمام کرنا درحقیقت ایصالِ ثواب ہے جو جائز، مستحسن اور مستحب ہے، جس کے نہ کرنے پر آپ گناہ گار نہیں ہوں گے۔ نیاز کے معنی: تبرُّک، تحفۂ درویشاں، نذر بھینٹ چڑھاوا، منت، التجا (فیروز اللغات) آرزو، غنا، میل، خواہش، اظہارِ محبت، عاجزی، مسکینی، انکسار، تحفۂ درویش، تبرُّک، درود فاتحہ، بھینٹ چڑھاوا، منت، التجا (فرہنگ آصفیہ جلد 4)۔ اگر آپ مختصر طور پر اپنے وسائل کے مطابق گھر ہی میں نیاز کا اہتمام کریں تو بھی ثواب پائیں گے۔ یہ ''نیاز'' بنیادی طور پر ایصالِ ثواب ہے، اور اس پر نذر کا اطلاق عرفی ہے، یہ نذرِ شرعی نہیں ہے۔ لہٰذا بھینٹ یا چڑھاوا کے معنی میں ہرگز نہیں ہے۔ ایصالِ ثواب میں بھی تصدُّق اللہ تعالیٰ کے نام پر ہوتا ہے، صرف ثواب بندوں کو پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ شرعاً نذر اللہ جل شانہٗ کے نام پر ہی دی جاتی ہے، لیکن نذر ماننے کو رسول اللہ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔ حدیث پاک میں ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلنَّذْرُ لَا یُقَدِّمُ شَیْئًا وَلَا یُؤَخِّرُهُ۔ وَاِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِیْلِ۔

ترجمہ: ''نذر کسی چیز کو مقدم یا مؤخر نہیں کرتی، یہ صرف بخیل سے مال نکلوانے کا ذریعہ ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:4129)''۔

کیونکہ بندہ ایک ایسے امر کو اپنے اوپر لازم اور واجب قرار دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ یعنی شریعت نے اس پر واجب قرار نہیں دیا۔ لیکن جب کوئی نذر مان لے تو اس کے لئے حکمِ باری تعالیٰ یہ ہے: وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ ترجمہ: ''اور اپنی نذروں کو پورا کرو، (سورۃ الحج: 29)''۔ اور اگر پورا نہیں کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

بھینس نر یا مادہ کی قربانی جائز ہے

سوال: 83

بھینس نر یا مادہ دونوں کی قربانی کیا شریعت میں ثابت ہے؟ اگر ثبوت ہے تو ہماری رہنمائی فرمائیں، (شہریار، سیالکوٹ)۔

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق قربانی کے جانوروں کی چار اقسام ہیں: دنبہ، بکرا، اونٹ اور گائے (اِن کی جس قدر اقسام ہیں سب اِن میں) داخل ہیں۔

نر، مادہ، خصی اور غیر خصی سب کا ایک ہی حکم ہے، بھینس گائے میں شمار ہے اس کی بھی قربانی ہوسکتی ہے، علامہ حسن بن منصور اوزجندی لکھتے ہیں:

الاضحية تجوز من أربع من الحيوان الضان والمعز والبقر، والابل ذكورها وانائها وكذلك الجاموس لانه نوع من البقر الاهلي، ولايجوز البقر الوحشي۔

ترجمہ: ''چار قسم کے جانوروں کی قربانی جائز ہے: دنبہ، بکرا، گائے، اونٹ، نر اور مادہ (سب کا ایک حکم ہے) اور اسی طرح بھینس (نر و مادہ) کی قربانی بھی جائز ہے کیونکہ وہ پالتو گائے کی قسم میں سے ہے، وحشی (نیل) گائے کی قربانی جائز نہیں ہے''۔

(فتاویٰ قاضی خان علی ہامش ہندیہ، جلد 3، ص: 348)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: اِتَّفق العلماءُ علیٰ ان الاضحيةَ لاتصحُّ الاَّ مِن نَعم أبلٌ وبقرٌ (ومنها الجاموس) وغنم (ومنها المعز) بسائرِ انواعِها، فيشمل الذكر والانثىٰ والخصىَّ والفحلَ فلايجزئُ غيرُ النَّعَمِ من بقرِ الوحشىِّ وغيرِهٖ، والظباءِ وغيرها لقولهٖ

تعالیٰ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ (الحج 34) ولم ينكر عنه ﷺ ولا عن اصحابه التضحية بغيرها، ولأن التضحية عبادة تتعلق بالحيوان فتختص بالنعم كالزكاة

ترجمہ: ''اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ مویشیوں کے سوا (کسی اور جانور کی) قربانی جائز نہیں ہے (اور وہ یہ ہیں): اونٹ، گائے (اور بھینس بھی اسی میں شامل ہے)، بکری اپنی تمام اقسام کے ساتھ (یعنی دنبہ، بھیڑ وغیرہ)، تمام اقسام کے مذکر ومؤنث، خصی وнر (بھی اس میں شامل ہیں)، ان مویشیوں کے علاوہ نیل گائے اور ہرن وغیرہ کی قربانی جائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہر امت کے لئے ہم نے ایک قربانی مقرر کی تاکہ اس کے دیئے ہوئے بے زبانوں چوپایوں پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں، (الحج: 34)۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب سے ان مویشیوں کے علاوہ اور جانوروں کی قربانی منقول نہیں ہے۔ اور چونکہ قربانی ایسی عبادت ہے جو حیوان سے متعلق ہے، جیسے زکوٰۃ (مال سے متعلق ہے)، (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد: 04، ص: 20-2719)''۔

ایسے جانور کی قربانی جائز ہے جس کا سینگ نکال دیا گیا ہو

سوال: 84

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک جانور جس کے سینگ اُس کی خوبصورتی بڑھانے کے لئے کاٹے جاتے ہیں، سینگ جڑ سے نکالے جاتے ہیں اور دوبارہ سینگ نہیں نکلتے۔ اس تمام عمل سے جانور کی صحت اور تندرستی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور خوبصورتی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ جانوروں کے بیوپاری عموماً ایسا کرتے ہیں لیکن عوام اسے نہیں پہچان پاتے اور منڈی میں کئی کئی لاکھ روپے میں فروخت ہونے والے جانور اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جن کو خوبصورت بنانے کے لئے اُن کے سینگ نکال دیئے جاتے ہیں۔ کیا ایسے جانور کی قربانی جائز ہے؟، (محمد وسیم، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

قربانی کا جانور تمام ظاہری عیوب سے سلامت ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں فقہائے کرام نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ ہر وہ عیب جو کسی منفعت اور جمال کو بالکل ضائع کر دے، اس کی وجہ سے قربانی جائز نہیں ہے۔ اور جو عیب اس سے کم تر درجے کا ہو، اس کی وجہ سے قربانی ناجائز نہیں ہوتی۔ جس جانور کے پیدائشی سینگ نہ ہوں، یا سینگ اوپر سے ٹوٹا ہوا ہے، اُس کی قربانی جائز ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(ویضحی بالجماء) ھی التی لاقرن لھا خلقة، وکذا العظماء التی ذھب بعض قرنھا بالکسر أو غیرہ فان بلغ الکسر الی المخ لم یجز "قھستانی"۔ وفی "البدائع" ان بلغ الکسر المشاش لایجزء والمشاش رؤوس العظام مثل الرکبتین والمرفقین۔

ترجمہ: "(جماء کی قربانی جائز ہے) یہ وہ جانور ہے جس کے سینگ پیدائشی طور پر نہ ہوں اور اسی طرح عظماء (یعنی ایسا جانور جس کے سینگ کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا ہو) کی قربانی بھی جائز ہے اور اگر سینگ دماغ تک ٹوٹا ہو تو ناجائز ہے، "قہستانی" اور "بدائع" میں ہے اگر سینگ ہڈی کی جڑ تک ٹوٹا ہو تو اُس کی قربانی بھی ناجائز ہے اور مشاش ہڈی کی اصل ہے جیسے گھٹنے اور کہنیاں ہیں۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 391، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مفتی نوراللہ نعیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس مسئلے پر ایک طویل فتویٰ لکھا، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے::

مشائخِ عظام نے تو یہ تصریح بھی فرمادی کہ پیدائشی بے سینگ کی بہ نسبت ٹوٹے سینگ والا جانور بطریقِ اولیٰ جائز ہے (تبیین الحقائق جلد ۶ ص ۵، عینی علی الکنز ص: ۳۴۸، مجمع الانہر جلد ۲ ص ۵۱۹) طحاوی علی الدر جلد ۴ ص ۱۶۴ میں ہے: والنظم منه بل ھو اولیٰ منه، یعنی جماء جائز ہے تو شکستہ شاخ بطریقِ اولیٰ جائز ہے کہ اس میں سینگ کا کچھ تو نشان ہوتا ہے۔ پھر فقہائے کرام نے اس کی تعلیل وتوجیہ میں یہ فرمایا کہ قربانی کا مقصود اصلی یعنی گوشت سینگ سے متعلق نہیں تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مبسوط، ہدایہ، عینی، طحطاوی کے

انہی صفحات میں ہے: والنظم من المبسوط فلان مافات منها غير مقصود لان الاضحية من الابل افضل ولا قرن له۔

مزید لکھتے ہیں: فقہاء کرام نے یہ تصریح بھی فرمائی ہے کہ یہ جواز تب ہے کہ انکسار (سینگ کے ٹوٹ جانے کا اثر) دماغ تک نہ پہنچے ورنہ جائز نہیں۔ فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ مصریہ جلد ۶ ص ۲۹۳ میں ہے: والتی لاقرن لها من الاول يجوز فان انقطع او انكسر يجوز الا اذا بلغ الدماغ۔ خلاصۃ الفتاویٰ جلد ۴ ص ۳۲۰، کتاب الفقہ جلد ا ص ۵۹۵، فتاویٰ برہنہ جلد ا ص ۳۵۳، جامع الرموز ص ۴۵۷، شامی جلد ۵ ص ۲۸۲ میں ہے: ان بلغ الكسر المُخَّ لايجوز، لسان العرب جلد ۳ ص ۵۲، قاموس اور اس کی شرح تاج العروس جلد ۲ ص ۲۷۷، منجد ص ۳۵۰ میں ہے: والنظم من اللسان المُخَّ الذِی ماغُ حالانکہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ قرنِ داخل نصف سے زائد بھی کٹ جائے تب بھی کٹاؤ دماغ تک نہیں پہنچتا، البتہ اگر جڑ سے اکھڑ جائے چونکہ جڑ اور کھوپڑی کی اوپر کی ہڈی کا خِلقۃً اتصال ہے لہٰذا وہ کٹاؤ دماغ تک پہنچ سکتا ہے جو حقیقۃً اِنقلاعُ القرن یا اِستیصالُ القرن (یعنی سینگ کا جڑ سے اکھڑ جانا) ہے اور ایسے جانور کو مستأصلہ کہا جاتا ہے، جس کی ممانعت ایسی حدیث مرفوع ومسند میں آئی ہے کہ جس کی تصحیح حاکم نے فرمائی ہے قَرَّرَهُ الذهبِیُّ نَصاً وسكتَ عليه ابوداؤد ومعلومٌ اَنَّ سكوتَهٗ دليلُ الرِّضا (ابوداؤد جلد ۲ ص ۳۱)، مستدرک جلد ۴ ص ۲۲۵ میں ہے: النظم لابی داؤد انما نهی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم عن المُصفرةِ والمستَأصلةِ (الی ان قال) والمستاصلة التی يستأصل قرنها من اصله اور ہر صورت میں عدمِ جواز اس لئے نہیں کہ قرنِ داخل ٹوٹ گیا ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے اکھڑنے سے کھوپڑی ٹوٹ گئی اور جانور بیمار ہوگیا، جس کی بیماری بیّن ہے یا اس لئے کہ شدّتِ درد سے دُبلا ہو جائے گا تو خارج فی المقصود بن جائے گا۔

مزید لکھتے ہیں: روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکا ہے کہ قرنِ داخل کا انکسار مانع نہیں تو اس کی صرف بالائی طرف کا انکسار کیسے مانع بن سکتا ہے اور وہ "کالمرفقین والکتفین

والرکبتین'' بھی نہیں اور نہ ہی ایسا نرم کہ چبانے اور کھانے کے قابل ہو لہٰذا وہ مراد نہیں۔
البتہ قرنِ داخل کا حصۂ زیریں یعنی اس کی جڑ جو سَر کی کھوپڑی میں ہی پیوست ہے، مراد ہو سکتا ہے کہ وہ بھی رأس بمعنی طرف ہے اور وہی جڑ کھوپڑی کے لئے بمنزلہ رأس ہے کیونکہ کھوپڑی کا وہ حصہ جو قرن کے ساتھ مشترک ہے دائرہ نما خلا ہوتا ہے، کھوپڑی کی ہڈی ہر طرف سے وہیں آکر ختم ہو جاتی ہے اور اس کا ٹوٹنا سَر کی ہڈی کا ٹوٹنا ہے، جس سے انکسار دماغ تک پہنچ جاتا ہے اور وہی صورت پیدا ہو جاتی ہے جس کا ذکر عون المعبود میں گذرا اور اس کا مانع ہونا بھی اس لئے نہیں کہ وہ وہ انکسار القرن (یعنی سینگ کا ٹوٹ جانا) ہے بلکہ اس لئے کہ یہ انقلاع القرن (یعنی سینگ کا جڑ سے اکھڑ جانا) ہے اور انجراح الرأس (یعنی سر کا زخمی ہونا) ہے جو ایسا مرض ہے کہ مہلک بن سکتا ہے اور درد شدید کے باعث مقصود کو بھی نقصان پہنچا تا ہے، تو فقہائے کرام کی وہ مختلف عبارات جن میں ''بلوغ الی المخ او الدماغ او المشاش'' کا ذکر ہے، سب متفق المعنی بن گئیں اور مکسورۃ القرن (ٹوٹے ہوئے سینگ والا ہونا) کا عموم وشمول بھی برقرار رہا بلکہ ''بلوغ الی المخ'' وغیرہ فرمانا ہی اس عموم کو ظاہر کر رہا ہے، کیونکہ بلوغ الی المخ وغیرہ کی صورت میں کسر القرن مانع نہیں کہ وہ مرض مہلک یا نقصان دہ مقصود نہیں بلکہ مانع جواز انقلاع القرن یا انجراح الرأس ہے جو کسر القرن پر موقوف نہیں بلکہ صحیح وسالم پورے قرن کا قلع بھی یہ صورت پیدا کر دیتا ہے، تو ماہِ نیمروز ومہر نیمروز کی طرح نمایاں ہوا کہ کسر القرن مانع جواز نہیں اگرچہ قرن داخل سے ہی متعلق ہو۔
البتہ اس میں شک نہیں کہ کسر القرن ایک عیب یسیر (معمولی نقصان) ضرور ہے تو جس طرح اس قسم کے دوسرے چھوٹے عیبوں سے مبرّا (یعنی بے عیب) ہونا مستحب ہے اسی طرح اس سے بَری ہونا بھی مستحب ہے، شامی جلد ۵، ص: ۲۸۲ میں ہے: واعلم ان الکل لایخلو عن عیب والمستحب ان یکون سلیما عن العیوب الظاھرۃ فما جوز ھٰھنا جوز مع الکراھۃ، (فتاویٰ نوریہ، جلد 3، ص: 371 تا 380)''۔
امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا ''ایک راس عقیقے کے لئے

خریدی، اس کا سینگ ٹوٹ گیا، اب دوبارہ پھر نکل آیا، یہ راس قابلِ قربانی ہے یا نہیں؟،
آپ نے جواب میں لکھا: ''سینگ ٹوٹنا اس وقت قربانی سے مانع ہوتا ہے جبکہ سر کے اندر جڑ تک ٹوٹے، اگر اوپر کا حصہ ٹوٹ جائے تو مانع نہیں پھر اگر ایسا ہی ٹوٹا تھا کہ مانع ہوتا، مگر اب زخم بھر گیا، عیب جاتا رہا تو حرج نہیں لان المانع قد زال وھذا ظاھر۔

مزید لکھتے ہیں: قرن اوپر ہی کے حصے کو کہتے ہیں، جو ظاہر ہوتا ہے، وہ اگر کُل ٹوٹ گیا حرج نہیں ولہٰذا ہدایہ میں مکسورۃ القرن کو جائز فرمایا، ہاں! اگر اندر سے اس کی جڑ نکل آئی کہ سر میں جگہ خالی ہوگئی تو ناجائز ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص: 460،488)''۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر مذکورہ عمل سے جانور میں عیب ظاہر ہوگیا ہو یا اُس میں کمزوری ولاغری پیدا ہوگئی ہو یا دماغ تک جگہ خالی ہوئی ہو اور جانور کی جسمانی یا دماغی صحت متاثر ہوئی ہو تو قربانی جائز نہیں۔ لیکن اگر جانور میں کوئی عیب پیدا نہ ہوا ہو اور جیسا کہ آپ نے لکھا کہ جانور کی خوبصورتی میں اضافہ ہوجاتا ہے تو قربانی جائز ہے۔ لیکن ایسے جانور کی قربانی کے جواز کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ جانوروں کے ساتھ یہ عمل کیا جائے۔ ظاہری نظر میں بھی آدھا یا اس سے زیادہ ٹوٹا ہوا سینگ (اس سے قطع نظر کہ دانستہ ایسا کیا گیا ہو یا کسی اتفاقی حادثے کے نتیجے میں) عیب دار لگتا ہے اور اِس سے یقیناً جانور کی قیمت بھی کم ہوجاتی ہے، لیکن جو صورت آپ نے بیان کی ہے وہ ظاہری نظر میں بھی عیب بالکل نہیں لگتا، بلکہ بقول آپ کے جانور کے حسن اور قیمت میں اضافے کا باعث ہے، بشرطیکہ دماغ کے اندر کی جڑ نکل جانے سے سوراخ یا نقص نہ پیدا ہوگیا ہو، تو اس کے جواز میں تامل نہیں ہونا چاہئے۔

قربانی کی کھال کا مصرف

سوال: 85

ایک تنظیم جو تحفظِ ناموسِ رسالت کا کام کر رہی ہے اور مدارسِ دینیہ کو بھی چلا رہی ہے اور ورکرز کو چرمِ قربانی جمع کرنے پر کمیشن بھی دیتی ہے۔ کیا ایسی تنظیم کے لئے قربانی کی کھالیں لینا جائز ہے یا نہیں؟، (محمد صدیق راٹھور، کراچی)

جواب:

قربانی کی کھال صدقۂ نافلہ ہے اور ہر نیک کام میں خرچ کی جاسکتی ہے اِس میں مالک بنانا بھی شرط نہیں ہے، فقہاء نے لکھا کہ غنی (مالدار) کو بھی دے سکتے ہیں، لیکن دینا صحیح نہیں کیونکہ مقصدِ تصدُّق کے خلاف ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ قربانی کی کھال بیچ کر مسجد بنانا درست ہے یا نہیں؟ اور کوئی عمارت مثل مسافر خانہ نشست کی چوپال جس میں مسافر یا اپنے ہم قوم مقیم ہوسکیں، آپ نے جواب میں لکھا: مسجد یا لوجہ اللہ مسافر خانہ وغیرہ مسلمانوں کے آرام کی خاطر بنانا جس میں اجر ہو اور حصول اجر ہی کی نیت ہو، بالجملہ ہر اس نیک کام میں جو شرعاً قربت ہو، قربانی کی کھال صرف کرنا ہرگز ممنوع نہیں، رسول اللہ ﷺ نے اضحیہ کی نسبت جیسے "تصدقوا" فرمایا، صدقہ کرو، یونہی "وائتجروا" بھی ارشاد فرمایا، وہ کام کرو جس میں ثواب ہو، رواہ ابو داؤد عن نبیشۃ الھذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اسے ابوداؤد نے نبیشہ ہذلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا)۔ امام زیلعی شرح کنز میں فرماتے ہیں: لوباعھا بالدراھم لیتصدق بھا جاز لانہ قربۃ کالتصدق۔

ترجمہ: "اگر قربانی کی کھالوں کو دراہم کے بدلے فروخت کیا تاکہ دراہم کو صدقہ کرے تو جائز ہے کیونکہ یہ صدقہ کی طرح قربت ہے"۔ معلوم ہوا کہ عینِ تصدُّق لازم نہیں، بلکہ قربت (ثواب کی نیت) ہونا درکار ہے، تصدُّق بھی اسی لئے مطلوب ہوا کہ قربت ہے، تو قربت کی جو بھی صورت ہو، سب کی گنجائش ہے، ہاں! تمول (مال بنانے) کی نیت سے اپنے صرف میں لانے کو اس کے دام کرنا جائز نہیں"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص: 475-474، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: "چرمِ قربانی کو کارِ خیر میں صرف کرنا جائز ہے، دینی مدرسہ بھی امورِ خیر سے ہے، اس میں بھی صرف کرسکتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا: کلوا وادخروا وائتجروا اور مختار وغیرہ میں ہے: ویتصدق بجلدھا اویعمل منہ نحو غربال

وجراب ویبدله بما ینتفع به باقیا (ترجمہ: ''قربانی کی کھال کو صدقہ کرے یا اس سے چھلنی اور موزے وغیرہ بنائے یا کسی ایسی چیز سے تبدیل کردے جس کا نفع باقی رہے''۔ مسجد میں صرف کرنا بھی جائز ہے۔ مزید لکھتے ہیں: ''متولی یا مہتمم مدرسہ اگر مالدار ہو جب بھی اس کو دے سکتے ہیں کہ پوست (کھال) قربانی میں یہ شرط نہیں کہ فقراء ہی کو دیا جائے۔

(فتاویٰ امجدیہ، جلد سوم، ص:326)

مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''قربانی کی کھال کو صدقہ کرنا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے، ہر نیک کام میں خرچ کر سکتے ہیں اور مسجد کی ضروریات میں خرچ کرنا جائز ہے، عام طور پر جو قربانی مالک نصاب ہونے کی وجہ سے واجب ہوتی ہے، اس کی کھال کے بارے میں ہمارے فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بعینہٖ کھال کو اپنے کام میں بھی لا سکتا ہے یا گوشت کی طرح کسی مالدار اور غریب سب کو دے سکتا ہے، لہٰذا کھال اگر فقیر کو دے دی اور فقیر اسے بیچ کر رقم خرچ کر دے تو جائز ہے''۔ (وقار الفتاویٰ، جلد دوم، ص:479)

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ تنظیم کا قربانی کا کھال لینا جائز ہے۔ علامہ غلام رسول سعیدی نے ''شرح صحیح مسلم'' میں جلد 6، ص:154 تا 158 قربانی کی کھال کے مصارف اور مساجد ومدارس میں استعمال کے جواز پر تفصیلی دلائل تحریر فرمائے ہیں، اہلِ علم اس کا مطالعہ کریں۔ تاہم میرے نزدیک افضل یہ ہے کہ یہ رقم فقراء ومساکین پر صرف کی جائے اور اس سے دینی مدارس کی اعانت کی جائے۔ دینی کام رضا کارانہ طور پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور اجرِ آخرت کے لئے کرنا افضل ہے۔ تاہم قرآن مجید میں صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، کفارات ونذر وغیرہ) کے جہاں مصارف بیان کئے گئے ہیں، وہاں چوتھا مصرف ایسے کارکنان کو بھی بیان کیا ہے جو زکوٰۃ وصدقات کی وصولی پر مامور ہوں، انہیں ''عاملینِ زکوٰۃ'' سے تعبیر کیا ہے، لہٰذا شرعاً اس کا جواز موجود ہے۔ کسی کارِ خیر کی اجرت مطلقاً معیوب بات نہیں ہے۔ ریاست ومملکت اور حکومت کا سربراہ تنخواہ لیتا ہے، ہر سطح کے عادلین وقُضاۃِ کرام (Judges) کو بھی تنخواہ یا اجرت دی جاتی ہے۔ یہ سارے مناصب قابلِ احترام ہیں، محض

اس بات پر کوئی ان مناصب یا اہل منصب کو معیوب نہیں سمجھتا کہ وہ اجرت یا تنخواہ لیتے ہیں، بلکہ عنداللہ وعندالناس جو بات معیوب ہے، وہ یہ ہے کہ یہ لوگ امانت میں خیانت کریں، اختیارات کا ناجائز استعمال کریں، رشوت لیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کریں۔

قربانی کے جانور کو خصی کرانے کا حکم

سوال:86

حنفی مسلک کے مطابق قربانی کا جانور بالکل بے عیب ہونا چاہئے یعنی کچھ بھی کٹا پھٹا نہ ہو، صحیح سالم ہو پھر یہ جو جانور کو خصی کرایا جاتا ہے، یہ تو جانور کے ساتھ بڑا ظلم ہے، جس وقت جانور کی نسیں دبائی جاتی ہیں تو درد کی شدت سے جانور تڑپ اٹھتا ہے اور تکلیف کے مارے دو چار گھنٹے کھڑا رہنے کے قابل نہیں رہتا۔ اب یہ تکلیف جو صرف اپنے فائدے کے لئے جانور کو دی جاتی ہے، کیا شریعت میں جائز ہے؟ کیونکہ قربانی کے جانور کو یہ تکلیف صرف وزن بڑھانے اور خوبصورتی کے لئے دی جاتی ہے۔ (احترام صدیقی، ناظم آباد نمبر 4 کراچی)

جواب:

خصی جانور کی قربانی نہ صرف جائز بلکہ سنّت ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ ذَبَحَ النَّبِيُّ ﷺ يَوْمَ الذَّبْحِ كَبْشَيْنِ أَقْرَنَيْنِ أَمْلَحَيْنِ مُوجَئَيْنِ

ترجمہ: ”حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قربانی کے دن دو سفید وسیاہ رنگ کے سینگوں والے خصی مینڈھے ذبح کئے، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2788)“۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ نر جانور کا خصی ہونا، قربانی کے معاملے میں عیب نہیں ہے، بلکہ فقہاء نے اسے افضل قرار دیا ہے کیونکہ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔

بلاشبہ قربانی کے جانور کا عیب سے پاک ہونا شرعاً ضروری ہے اور عیب دار جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ مثلاً جس کے تھن کٹے ہوئے ہوں، سینگ جڑ سے ٹوٹے ہوئے ہوں، کان تہائی سے زائد کٹا ہوا ہو، لنگڑا ہو، کانا ہو وغیرہ۔ عیب سے مراد وہ عیب ہے جو

تاجروں کے نزدیک عیب شمار ہوتا ہو اور قیمت میں کمی کا باعث ہو۔ خصی ہونا، تاجروں کے نزدیک عیب نہیں ہے بلکہ خصی جانور کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اور سنت سے بھی خصی جانور کی قربانی ثابت ہے۔ البتہ جو شخص افزائش نسل کے لئے حلال نر جانور خریدنا چاہتا ہے تو اس کے نزدیک اس کا خصی ہونا ضرور عیب ہوگا۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''بکرے دو طرح خصی کئے جاتے ہیں، ایک یہ کہ رگیں کوٹ دی جائیں، اس میں کوئی عضو کم نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ آلت تراش کر پھینک دی جاتی ہے، اس صورت میں ایک عضو کم ہوگیا، آیا ایسے خصی کی بھی قربانی جائز ہے یا نہیں؟''، آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''جائز ہے کہ اس کی کمی سے اس جانور میں عیب نہیں آتا بلکہ وصف بڑھ جاتا ہے کہ خصی کا گوشت بہ نسبت فحل (آنڈو) کے زیادہ اچھا ہوتا ہے، فی الهندیة عن الخلاصة یجوز المجبوب العاجز عن الجماع (ترجمہ: ہندیہ میں خلاصہ سے منقول ہے کہ ذکر کٹا جو جفتی کے قابل نہ رہا وہ قربانی میں جائز ہے''، (فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص: 458، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

اگر جانور کو خصی کئے جانے کو آپ ظلم قرار دیتے ہیں تو پھر ذبح کرنا بھی شاید آپ کے نزدیک ظلم ہوگا۔ قصاب کی دکان سے جو لوگ گوشت خریدتے ہیں، وہ بھی خصی جانور کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ آنڈو (غیر خصی) جانور بعض اوقات اپنا پیشاب پینے کا عادی ہوتا ہے، جسے فقہ میں ''جَلّالہ'' کہتے ہیں اور اس سے اس کے گوشت میں بدبو آجاتی ہے، اس لئے فقہاءِ کرام نے کہا ہے کہ ''جلّالہ'' جانور کو ذبح کرنے سے پہلے اس طرح باندھ کر رکھا جائے کہ اپنا پیشاب نہ پی سکے، آپ کا کبھی ریوڑ کے پاس سے گزر ہو تو آپ آنڈو بکروں کی بدبو کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: **ویکرہ أکل لحوم الابل الجلالة وھی التی الاغلب من أکلھا النجاسة لانہ اذا کان غالب أکلھا النجاسة یتغیر لحمھا وینتن فیکرہ أکلہ کالطعام المنتن۔۔۔۔** مزید لکھتے ہیں: **عن محمد رحمہ اللہ تعالیٰ فی**

الناقة الجلالة والشاة الجلالة والبقرة الجلالة انما تكون جلالة ذاانتن وتغير لحمها ووجدت منه ريح منتنة فهي الجلالة حينئذ لايشرب لبنها ولايؤكل لحمها وبيعها وهبتها جائز،

ترجمہ: ''اور جلالہ اونٹ کا گوشت کھانا مکروہ ہے جبکہ غالب گمان یہ ہو کہ وہ نجاست کھاتے ہیں اس لئے کہ جب نجاست زیادہ کھاتے ہوں تو اُن کا گوشت متغیر اور بدبودار ہو جاتا ہے، پس بدبودار گوشت کا کھانا مکروہ ہے، جس طرح بدبودار کھانے کا استعمال مکروہ ہے۔

مزید لکھتے ہیں: امام محمد رحمہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ جلالہ اونٹنی، جلالہ بکری اور جلالہ گائے، اس وقت جلالہ شمار ہوں گی جب اُن کا گوشت بدبودار اور متغیر ہو اور اُن میں بدبو پائی جائے، پس وہ جلالہ ہے اُس کا دودھ نہیں پیا جاسکتا اور نہ ہی اُس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے، اُس کی فروخت اور ہبہ کرنا جائز ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:289، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''بکرا جو خصی نہیں ہوتا وہ اکثر پیشاب پینے کا عادی ہوتا ہے اور اس میں ایسی سخت بدبو پیدا ہو جاتی ہے کہ جس راستے سے گزرتا ہے وہ راستہ کچھ دیر کے لئے بدبودار ہو جاتا ہے اس کا حکم بھی وہی ہے، جو ''جلالہ'' کا ہے اگر اس کے گوشت سے بدبو دفع ہو گئی تو کھا سکتے ہیں ورنہ مکروہ و ممنوع ہے، (بہار شریعت، حصہ پانزدہم، ص:128)

مشینی ذبیحے کا حکم

سوال:87

کیا مشین سے ذبح کیا ہوا چکن کھانا مسلمانوں کے لئے جائز ہے؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ شفٹ شروع کرتے وقت مسلمان ذابح بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر مشین کا بٹن آن کرتا ہے، پھر ایک گھنٹہ میں تقریباً 8000 چکن ذبح ہوتے ہیں، (اشرف پٹیل، امریکا)۔

جواب:

اگر ذابح (ذبح کرنے والا) ہر مرغی یا جانور کے ذبح کرتے وقت ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہہ کر خواہ ہاتھ سے چھری پھیرے یا کسی آلے کے ذریعے چھری پھیرے، جائز ہے، لیکن

اگر یہ شرط نہ پائی جاتی ہو تو ایک وقت میں ایک ہی تکبیر کے ساتھ بہت سے جانوروں یا مرغیوں کا ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔ ذبح کے لئے چھری پھیرتے وقت "بسم اللہ اللہ اکبر" کہنا بھی لازمی شرط ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾، ترجمہ: "اگر تم اللہ کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو تو اس ذبیحہ سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، (الانعام :118)"۔ اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ

ترجمہ: "اور اس ذبیحہ سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، (الانعام:121)"۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن شرائط التسمية أن تكون التسمية من الذابح حتى لو سمّى غيرُهُ والذابح ساكتٌ وهو ذاكرٌ غيرُ ناسٍ لايحلُّ

ترجمہ: "ذبح کے وقت شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے والا خود "بسم اللہ اللہ اکبر" کہے، یہاں تک کہ اگر دوسرے شخص نے "بسم اللہ اللہ اکبر" پڑھا اور ذبح کرنے والا خاموش رہا حالانکہ اسے یاد ہے، وہ بھولا نہیں، تو وہ جانور حلال نہیں ہوگا۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5 ص:286، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ غلام رسول سعیدی مصری علماء کی جانب سے جاری کردہ ایک فتویٰ کے حوالے سے لکھتے ہیں: "اگر مدیر الآلہ (مشینی ذبیحہ کا آپریٹر) مسلمان ہو یا اہلِ کتاب سے ہو اور مشین میں چھری لگی ہو جس سے مذکور الصدر رگیں (ساری یا کم از کم تین) کٹ جائیں (اس جگہ یہ شرط بھی ہونی چاہئے کہ مدیر الآلہ ہر جانور کے ذبح کے وقت الگ الگ بسم اللہ پڑھے، سعیدی غفرلہ) تو اس برقی آلہ کو ذابح کے ہاتھ میں چھری کے قائم مقام قرار دیا جائے گا اور یہ ذبیحہ حلال ہوگا اور جب یہ شرائط پوری نہ ہوں تو ذبیحہ حلال نہیں ہوگا"۔

(شرح صحیح مسلم، جلد 6، ص:123)

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے، یہ طریقہ شرعاً درست نہیں ہے اور اس طرح ایک بار "بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر بٹن دبانے سے ایک گھنٹہ میں آٹھ ہزار جانور ذبح کرنے

سے یہ سارے جانور حلال نہیں ہوں گے۔

حلال ذبیحہ جانور کے مکروہ اجزا کا حدیث سے ثبوت

سوال:88

آپ نے قربانی کے فقہی مسائل کے پمفلٹ میں حلال جانور کے سات اعضاء کو مکروہ تحریمی لکھا ہے لیکن کسی حدیث کا حوالہ نہیں ہے لہٰذا آپ سے استدعا ہے کہ متذکرہ مسئلہ کا حل حدیث پاک کی روشنی میں بیان فرمائیں۔اس کے علاوہ کن اعضاء کے استعمال میں کراہت پائی جاتی ہے؟، (حافظ فقیر اللہ، صادق آباد)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُمْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَكْرَهُ مِنَ الشَّاةِ سَبْعًا الْمَرَارَةَ وَالْمَثَانَةَ وَالْحَيَاءَ وَالذَّكَرَ وَالْأُنْثَيَيْنِ وَالْغُدَّةَ وَالدَّمَ وَكَانَ أَحَبُّ الشَّاةِ إِلَيْهِ مُقَدَّمَهَا،

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ذبیحہ جانور کے سات اعضاء کو مکروہ فرماتے تھے، وہ سات یہ ہیں: مُرارہ (پِتّہ)، مثانہ، حیاء (شرم گاہ)، ذَکَر (عضو تناسل)، خُصیے، غدود اور ذبح کے وقت بہنے والا خون۔ اور آپ ﷺ کو بکری کے ذبیحہ کا اگلا حصہ (یعنی دستی اور گردن) پسند تھا''۔

(سُنن الکبریٰ للبیہقی، رقم الحدیث:19702، ج:12، مطبوعہ: دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حلال جانور کے جسم کے سات اعضاء کو حرام بتایا گیا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) دمِ مسفوح یعنی ذبح کے وقت بہتا ہوا خون (۲، ۳) نر و مادہ کی شرمگاہ (۴) خصیتین (کپورے) (۵) پیشاب کا مثانہ (۶) پِتّہ (۷) غدود، اس سے مراد حلال جانور کی جلد اور گوشت کے درمیان ابھرا ہوا سخت گوشت جو کسی بیماری کے سبب گلٹی (Tumor) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

واما بیان مایحرم أکله من اجزاء الحیوان سبعة الدم المسفوح والذکر

والانثییان والقبل والغدۃ والمثانۃ والمرارۃ کذا فی البدائع ۔

ترجمہ: ''حلال جانور کے ان اجزاء کا بیان جن کا کھانا حرام ہے، وہ سات ہیں: (ذبح کے وقت) بہنے والا خون، ذکر، خصیے، شرمگاہ، غدود، مثانہ اور پتہ، ''بدائع الصنائع'' میں بھی اسی طرح ہے (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:290، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

ان میں سے ''دمِ مسفوح'' حرامِ قطعی ہے کیونکہ یہ نصِ قرآنی سے ثابت ہے اور باقی چیزیں مکروہِ تحریمی ہیں۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ ''بدنِ ماکول اللحم'' (جس جانور کو ذبح کرکے گوشت کھانا شرعاً حلال ہے، اس کے بدن) میں کیا کیا چیزیں مکروہ ہیں''، آپ نے جواب میں مذکورہ حدیث کے حوالے سے لکھا: ''سات چیزیں تو حدیثوں میں شمار فرمائی گئیں: (۱) مرارہ یعنی پتہ (۲) مثانہ یعنی پھکنا (۳) حیا یعنی فرج (۴) ذکر (۵) انثیین (۶) غدہ (۷) دَم یعنی خونِ مسفوح۔ اس کے بعد آپ نے طبرانی کی ''المعجم الاوسط'' کی حدیث نمبر 9484 کا حوالہ دیا، جو عبداللہ بن عمرو اور ابن عدی سے روایت ہے اور ''سننِ بیہقی'' کی مذکورہ بالا حدیث کا حوالہ دیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص:234، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

قال الحنفیۃ لاتوکل سبعۃ اشیاء من اجزاء الحیوان الماکول وھی الدم المسفوح، والذکر، والانثییان، والقبل، والغدۃ، والمثانۃ والمرارۃ لقولہ عز شانہٗ ﴿ویحل لھم الطیّبات ویحرم علیھم الخبائث﴾ وھذہ الاشیاء السبعۃ مما تستخبثہ الطباع السلیمۃ۔ ''وروی عن مجاھد انہ قال کرہ رسولُ اللہِ ﷺ من الشاۃِ الذکر والانثیین، والقبل، والغُدّۃ، والمُرارۃ والمثانۃ والدمُ''۔ والمراد منہ کراھۃ التحریم بدلیل انہ جمع بین الاشیاء الستۃ وبین الدم فی الکراھۃ ودم المسفوح محرّم والمروی عن ابی حنیفۃ انہ قال: ''الدم حرامٌ واکرہ الستۃ''، اطلق اسم الحرام علی الدم المسفوح لأنہ ثبت بدلیلٍ مقطوع بہ وھو النص القرآنِ ''قُل لّآ

أَجِدُ فِي مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا ۔۔ الی قولہٖ تعالیٰ او دما مسفوحا،(الانعام:145)"
وسمّٰی ما سواہُ مکروھا لثبوتہٖ بدلیل ظنی،

ترجمہ:"احناف نے کہا ہے کہ حلال جانور کی سات چیزیں نہ کھائی جائیں، وہ یہ ہیں: ذبح کے وقت بہنے والا خون، ذَکَر، خُصیتین، شرمگاہ، غدہ، مثانہ اور پتہ، کیونکہ اللہ عزّوجلّ کا ارشاد ہے: ترجمہ:"اور ان کے لئے پاک چیزیں حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزیں حرام کرتے ہیں،(الاعراف:157)"۔ اور یہ سات اشیاء ایسی ہیں جنہیں پاکیزہ طبیعتیں ناپسند کرتی ہیں اور مجاہد سے روایت ہے، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے بکری سے ذَکَر، اُنثیین، قُبُل، غُدّہ، مُرارہ، مثانہ، دمِ مسفوح کو مکروہ قرار دیا، اس سے مراد مکروہِ تحریمی ہے، دلیل یہ ہے کہ انہوں نے چھ اشیاء اور دمِ مسفوح کو کراہت میں جمع کیا اور دمِ مسفوح حرامِ قطعی ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ذبح کے وقت بہنے والا خون حرامِ قطعی ہے اور بقیہ چھ چیزوں کو مکروہِ تحریمی کہا، دمِ مسفوح پر حرام کا اطلاق کیا، کیونکہ اس کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت ہے اور وہ نصِ قرآنی ہے، (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے): "آپ فرما دیجئے میں نہیں پاتا اس وحی میں جو میری طرف کی گئی ہے حرام کی ہوئی ۔۔ یہاں تک کہ فرمایا یا بہتا ہوا خون،(الانعام آیت نمبر:145)"، اور اس کے سوا باقی اشیاء کو مکروہ کہا، کیونکہ ان کی ممانعت دلیلِ ظنّی سے ثابت ہے۔

(اَلفِقهُ الاسلامی واَدِلَّتُهٗ' جلد 3، ص:79-2778)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اوجھڑی اور آنتوں کو محلِ نجاست ہونے کی بنا پر مکروہ قرار دیا ہے، اسی طرح آپ نے حرام مغز کو بھی مکروہ لکھا ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص:241)

سیہہ (Hedgehog) کا شرعی حکم

سوال:89

بکری کے سائز کا ایک خاردار جانور ہے، جس کے جسم پر لمبے لمبے کانٹے ہوتے ہیں،

جب یہ جانور جھرجھری لیتا ہے تو کانٹے جھڑتے ہیں اور کسی کو ضرر بھی پہنچا سکتے ہیں، اسے اردو میں "سیہہ" کہتے ہیں۔ یہ جانور مکئی کے بٹے، زمین پر اگنے والے پھل سبزیاں وغیرہ کھاتا ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے، یہ حلال ہے یا حرام؟ (نوید عباسی، گلیات، ہزارہ)۔

جواب:

اس جانور کو عربی میں "قُنْفُذ" (Hedgehog) کہتے ہیں، المنجد میں اس کے معنی یہ لکھے ہیں:

ایک خاردار جانور، بلی کے برابر، جس کے جسم پر تکلے کی طرح کانٹے ہوتے ہیں اور خطرہ کے وقت ان کو پھیلا کر ان میں چھپ جاتا ہے، مؤنث "قُنْفُذَۃٌ" ہے، اس کی کئی قسمیں ہیں۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِی نُمَیْلَۃَ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ ابْنِ عُمَرَ فَسُئِلَ عَنْ اَكْلِ الْقُنْفُذِ، فتلا (قُل لَّآ أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ) الآیۃ، قَالَ قَالَ شَیْخٌ عِنْدَہٗ سَمِعْتُ اَبَا هُرَیْرَۃَ یَقُوْلُ ذُکِرَ عِنْدَ النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ خَبِیْثَۃٌ مِنَ الْخَبَائِثِ، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ اِنْ كَانَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ هٰذَا فَهُوَ كَمَا قَالَ

ترجمہ: "ابونُمیلہ بیان کرتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس موجود تھا۔ اُن سے قُنْفُذ (کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں شرعی حکم) معلوم کیا گیا تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: قُل لَّآ أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّآ أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ۔

ترجمہ: "فرمادیجئے! میں نہیں پاتا اس وحی میں جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی حرام کی ہوئی چیز، جسے وہ کھاتا ہو، مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا (ذبح کے وقت رگوں سے) بہتا ہوا خون یا خنزیر کا گوشت، تو بے شک وہ نجاست ہے یا نافرمانی کے لئے ذبح کے وقت جس جانور پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے، (الانعام: 145)"۔ ابونُمیلہ کہتے ہیں اس وقت اُن کے پاس ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا: میں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو

یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس قُنفُذ کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ناپاک چیزوں میں سے ایک ہے''، تو ابن عمر نے کہا اگر یہ بات رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے تو پھر اس کا وہی حکم ہے جو آپ ﷺ نے فرمایا، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 3793)۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''حیوان کی اصل میں دو قسمیں ہیں، ایک قسم وہ جو سمندر میں رہتے ہیں، دوسری قسم وہ جو خشکی میں رہتے ہیں۔ جو جانور سمندر میں رہتے ہیں، تو تمام بحری جانوروں کا کھانا حرام ہے، مگر خاص طور پر مچھلی کا کھانا حلال ہے، سوائے اس کے جو پانی کی بالائی سطح پر رہتی ہے (حاشیہ میں لکھا ہے: یہ وہ ہے جو طبعی موت مر جائے اور الٹ کر اس کا پیٹ اوپر کو آ جائے، تو اگر اوپر سے نظر آئے تو وہ طافی (یعنی پانی کے اوپری سطح پر رہنے والا جانور) ہے یہ وہ طافی نہیں ہے، تو جیسا کہ درمختار میں ہے اس کا گوشت کھایا جائے گا)، وہ جانور جو خشکی میں رہتے ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جن میں بالکل خون نہیں ہوتا، دوسرے وہ جن میں (خون ہوتا تو ہے لیکن) بہنے والا خون نہیں اور تیسرے وہ جن میں بہنے والا خون ہوتا ہے۔ تو جن میں بالکل خون نہیں ہوتا، جیسے ٹڈی، بھڑ، مکھی، مکڑی، گبریلا، بچھو، طوطا اور ان کی مانند دوسرے جانوران کا کھانا حلال نہیں ہے، صرف ٹڈی اس سے مستثنیٰ ہے (کہ یہ حلال ہے)۔۔۔۔اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ مَالَيْسَ لَهٗ دَمٌ سَائِلٌ مِثْلُ الْحَيَّةِ وَالْوَزْغِ وَسَامِّ أبرص وجميعُ الْحَشَرَاتِ وهوام الارض من الفارِ والجرادِ والقنافذِ وَالْقَبِّ والْيَربوع وابنُ عرسٍ ونحوها، ولا خلاف في حرمة هذه الاشياءِ الا في الضب فانه حلالٌ عند الشافعي رحمه الله تعالى

ترجمہ: ''اسی طرح وہ جانور جن میں بہنے والا خون نہیں ہے جیسے سانپ، چھپکلی اور تمام حشرات اور خشکی پر رہنے والے چھوٹے جانور، جیسے چوہا، ٹڈی، سیہہ (Hedgehog)، گوہ، وہ چوہا جس کے اگلے پیر چھوٹے اور پچھلے پیر لمبے ہوں اور نیولا اور ان کی قسم کے جانور، تو ان کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سوائے گوہ کے کہ وہ امام

شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک حلال ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:289)

علامہ ابن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں:

وَالْقُنْفُذُ حَرَامٌ قَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ هُوَ حَرَامٌ وَكَرِهَهُ مَالِكٌ وَاَبُوْحنيفة وَرَخَّصَ فِيهِ الشَّافِعِيُّ وَاللَّيْثُ وَاَبُوْ ثَوْرٍ۔ وَلَنَا اَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ ذُكِرَ الْقُنْفُذُ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقَالَ هُوَ خَبِيْثٌ مِنَ الْخَبَائِثِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗد وَلِاَنَّهٗ يُشْبِهُ الْمُحَرَّمَاتِ وَيَاْكُلُ الْحَشَرَاتِ فَاَشْبَهَ الْجُرْذَ۔

ترجمہ: ''قُنفُذ حرام ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسے حرام قرار دیتے تھے اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، امام شافعی، ابو اللیث سمرقندی اور سفیان ثوری نے اس کے (استعمال کے بارے میں) رخصت دی ہے، ہماری دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ''قُنفُذ'' کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ناپاک چیزوں میں سے ایک ہے''۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا، (المغنی، جلد 9، ص:324، مطبوعہ: دار الفکر، بیروت)''۔

علامہ شیخ کمال الدین دمیری شافعی متوفی 808ھ لکھتے ہیں:

اَلقُنفُذ اَلبَرى مِنه، كُنيتهٗ ابوالشوك، وَالاُنثىٰ اُمّ دُلدُل، وَالجمع قَنافذ، وَيقال لَها العَساعس لكثرة ترددها بالليل ويقال للقنفذ أنقذ، وهو صنفان يكون بارض مصر قدر الفار ودلدل يكون بارض الشام والعراق فى قدر الكلب القلطى، والفرق بينهما كالفرق بين الجرد والفار، قالوا ان القنفذ اذا جاع يصعد الكرم منكسا فيقطع العناقيد ويرمى بها ثم ينزل فياكل منها ما اطاق، فان كان له فراخ تمرغ فى الباقى ليشتبك فى شوكه ويذهب به الى اولاده۔ وهو مولع باكل الافاعى ولا يتالم لها، واذا لدغته الحية اكل السعتر البرى فيبرا له خمسة اسنان فى فيه۔۔۔۔

الحكم قال الشافعى يحل اكل القنفذ لان العرب تستطيبه، وقد افتى ابن عمر باباحته وقال ابوحنيفة والامام احمد لايحل لما روى ابوداؤد۔۔۔۔ جاءت أم

حفید رضی اللہ تعالیٰ عنہا بقنفذ الی رسول اللہ ﷺ فوضعتہ بین یدیہ فنحاہ رسول اللہ ﷺ ولم یاکلہ۔

نوٹ: علامہ دمیری شافعی نے اس پر کافی تفصیلی گفتگو کی ہے، ہم نے اس کے ضروری حصے کا حوالہ دیا ہے، جس کا ترجمہ درج ذیل ہے :

ترجمہ: ''قُنفُذ خشکی کا جانور ہے، اس کی کنیت ابوالشوک (یعنی کانٹے دار، شوک کانٹے کو کہتے ہیں)، اس کی مؤنث کو ''اُمِ دُلدُل'' کہتے ہیں، اس کی جمع ''قنافذ'' ہے اور ''عَسَاکِس'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ رات کے وقت زیادہ گھومتی پھرتی ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں :

قنفذ: وہ (سیہہ) جو سرزمین مصر میں رہتی ہے، وہ چوہے کی مانند ہے اور ''دُلدُل'' (سیہی) جو شام اور عراق میں پائی جاتی ہے وہ کتے کی مانند ہوتی ہے، قُنفُذ کو جب بھوک لگتی ہے تو یہ انگور پر چڑھتی ہے اور اس کے خوشوں کو کاٹ کر نیچے پھینکتی ہے، ان میں سے جو کھانا ہو کھا لیتی ہے اور اگر اس کے بچے بھی ہیں تو باقی خوشوں کو اپنے کانٹوں سے ڈھانپ لیتی ہے اور پھر اپنے بچوں کو لا کر کھلاتی ہے، یہ سانپ کھانے کی شوقین ہے اور سانپ اسے تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ اور اگر اس کو سانپ کاٹ لے تو یہ ایک قسم کا پہاڑی پودینہ کھا لیتی ہے اور زہر کا اثر زائل ہو جاتا ہے، اس کے منہ میں پانچ دانت ہوتے ہیں۔۔ اس کے بعد اُنہوں نے کافی تفصیل لکھی ہے۔۔ آگے چل کر اس کا حکم بیان کیا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک اس کا کھانا حلال ہے، کیونکہ عرب اسے پسند کرتے تھے، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے مباح قرار دیا ہے (ابوداؤد کی ایک روایت جو پیچھے گزری، اس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کے برعکس منقول ہے، یعنی انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو تسلیم کر لیا تھا)۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہا اللہ کے نزدیک یہ حلال نہیں ہے اور انہوں نے سنن ابی داؤد کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

ہمارے استدلال کی بنیاد یہ بھی ہے کہ ام حُفید رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے پاس سیہہ لائیں اور اسے آپ کے سامنے رکھا تو آپ ﷺ نے اسے ایک طرف کر دیا اور نہیں کھایا

،(حیوٰۃ الحیوان، جز ثانی، ص:90 تا 92،)''۔یعنی رسول اللہ ﷺ کا اسے نوش نہ فرمانا اور ایک طرف کر دینا آپ ﷺ کی ناپسندیدگی کی دلیل ہے۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سیہہ حرام قطعی تو نہیں ہے، البتہ مکروہ تحریمی ہے۔ آئمۂ اربعہ رحمہم اللہ میں سے امام شافعی نے اس کے کھانے کو مباح قرار دیا ہے، ممکن ہے ان کی تاویل اور توجیہ یہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ کا ناپسندیدہ فرمانا آپ ﷺ کی طبعی نفاست کی وجہ سے تھا، لیکن چونکہ سنن ابی داؤد کی روایت میں آپ ﷺ نے اسے خبیث یعنی ناپاک فرمایا ہے، اس لئے مکروہ تحریمی کا قول ہی زیادہ صحیح اور صواب ہے۔

نکاح کے مسائل

شادی کی رسم

سوال:90

ہمارے ہاں یہ روایت ہے کہ نکاح کے وقت ایک شربت کا پیالہ رکھ لیا جاتا ہے، جب نکاح ہو جاتا ہے تو وہ پیالہ آدھا دولہا اور آدھا دلہن کو پلایا جاتا ہے، ہمارے ہاں کے بزرگ اس کو سنت قرار دیتے ہیں، قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں کہ شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟ (محمد اقبال، بخشی اسکوائر، عائشہ منزل، کراچی)

جواب:

اس عمل کے سنت ہونے کی کوئی دلیل ہماری نظروں سے نہیں گزری۔ اور ثبوت کے بغیر رسول اللہ ﷺ کی طرف کوئی قول یا فعل منسوب نہیں کرنا چاہیے، اس پر بڑی وعید آئی ہے، ارشادِ مبارک ہے: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ، ترجمہ: ''جو میری طرف دانستہ جھوٹی بات منسوب کرے، وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے،

(صحیح بخاری، رقم الحدیث :1291)

نبی مکرم ﷺ کے عقدِ مبارک کے موقع پر ایسا عمل ثابت ہے اور نہ ہی آپ ﷺ کی صاحبزادیوں کے نکاح کے موقع پر ایسا کوئی عمل کیا گیا۔ تاہم سیدۃ النساء حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح کی بابت حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں لکھا ہے:

''کہ نکاح ماہِ رجب 1 ہجری میں ہوا اور رخصتی غزوۂ بدر کے بعد 2 ہجری میں ہوئی۔ اُس وقت حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی عمر مبارک اٹھارہ سال تھی۔ شب زفاف کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دونوں کو کہلا بھیجا کہ میرے آنے سے پہلے کچھ نہ کرنا، حضور ﷺ تشریف لے گئے وضو فرمایا پھر پانی پر دم کیا اور ان دونوں پر چھڑک دیا، پھر دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيهِمَا وَبَارِكْ عَلَيْهِمَا وَبَارِكْ لَهُمَا فِي نَسْلِهِمَا

ترجمہ: ''اے اللہ! اِن دونوں میں برکت عطا فرما، اِن دونوں پر برکت نازل فرما اور ان (کی آنے والی) نسل میں بھی برکتیں عطا فرما، (الاصابہ، جلد 4، ص: 366)''۔ اگر کوئی

بزرگ دولہا اور دلہن کے لئے یہ عمل کرلے، تو اس میں شرعاً کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ یہ ایک مستحسن امر ہے اور رسولِ اکرم ﷺ کا عملِ مبارک ہے اور دعائیہ کلمات ہیں۔ زوجین خود بھی یہ دعا پڑھ کر اپنے آپ کو دم کر سکتے ہیں، خود پڑھنے کی صورت میں کلماتِ دعائیہ ہوں گے: اَللّٰھُمَّ بَارِکْ فِیْنَا وَبَارِکْ عَلَیْنَا وَبَارِکْ لَنَا فِیْ نَسْلِنَا۔

حدیث پاک میں ہے: (۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ اِذَا رَفَّأَ الْاِنْسَانَ اِذَا تَزَوَّجَ قَالَ بَارِکَ اللّٰہُ لَکَ، وَبَارَکَ عَلَیْکَ، وَجَمَعَ بَیْنَکُمَا فِی الْخَیْرِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کی شادی کے موقع پر مبارک باد دیتے تو یہ دعائیہ کلمات ارشاد فرماتے: (ترجمہ) اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے، تم پر برکت نازل فرمائے اور تمہیں خیر پر یکجا رکھے''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1094، ابوداؤد: 2130، ابن ماجہ: 1905)

(۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ لَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا اَتٰی اَھْلَہٗ قَالَ ''بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا''، فَاِنْ قَضَی اللّٰہُ بَیْنَھُمَا وَلَدًا لَمْ یَضُرَّہُ الشَّیْطَانُ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جب کوئی (قربت کے لئے) اپنی بیوی کے پاس آئے تو یہ دعا پڑھے: (ترجمہ) ''اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت سے، اے اللہ! ہمیں شیطان سے محفوظ فرما اور تو (جو نعمتِ اولاد) ہمیں عطا فرمائے، اسے بھی شیطان کے اثر سے محفوظ فرما''، (آپ ﷺ نے فرمایا) اگر اس قربت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ انہیں اولاد عطا فرمائے گا تو شیطان اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا''۔

(صحیح بخاری 5165، صحیح مسلم: 1434، ابوداؤد: 2161، سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1092)

مایوں، مہندی اور سہرابندی کی رسومات کی شرعی حیثیت

سوال: 91

رسمِ مایوں ومہندی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، کیا سہرا بندی جائز ہے؟، سہرا بندی میں کُلّہ یا عمامہ باندھنا چاہئے؟، (امیر ممتازی، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

مایوں اور مہندی کی شرعی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے، یہ معاشرتی رسوم ہیں۔ لیکن اگر ان میں خلافِ شرع باتیں شامل ہوں، مثلاً بے پردگی، گانا بجانا، مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول وغیرہ، تو ان محرمات کے سبب یہ حرام ہوں گی۔ نکاح کی حقیقت یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں لڑکا اور لڑکی براہِ راست یا وکیل کے ذریعے ایجاب وقبول کریں۔ گواہوں کی موجودگی اس لئے ضروری ہے تاکہ شادی کا اعلان ہوجائے، نکاح سے پہلے خطبہ سنت ہے۔ اس کے بعد شرعی حجاب کے ساتھ باوقار انداز میں رخصتی ہے اور شبِ زفاف کے بعد ولیمہ سنت ہے۔

شادی کے موقع پر پھولوں کا سہرا باندھنا جائز ہے۔ البتہ ایسا سہرا جس میں چہرہ چھپ جاتا ہے، اُس کی حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ چہرہ کھلا ہوا ہو تو ہار پہنے ہوئے آدمی باوقار لگتا ہے۔ بعض لوگ ان رسوم کو ہندوانہ کہتے ہیں، ہر ملک، قوم اور علاقے کی اپنی رسوم اور ثقافتی روایات ہوتی ہیں۔ اگر وہ کسی مخصوص مذہب کا شِعار نہ ہوں اور نہ ہی ان میں کوئی چیز خلافِ شرع ہو یعنی ان سے کسی سنت کا ترک یا کسی مکروہ کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو تو یہ باتیں مباح کے درجے میں ہوتی ہیں۔ اسی لئے سنتوں کو بھی ''سُنَنِ ہُدیٰ'' اور ''سُنَنِ زوائد'' میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سُنَنِ ہُدیٰ ایسے مشروع امور ہیں، جن کا رسول کریم ﷺ نے شارع کی حیثیت سے حکم فرمایا ہے یا عمل فرمایا ہے، خواہ یہ وجوب کے درجے میں ہوں یا سنت واستحباب کے درجے میں۔ ''سُنَنِ زوائد'' وہ امور ہیں جنہیں رسول پاک ﷺ نے عرب کے مخصوص حالات میں لباس، وضع یا رہن سہن کے انداز کے طور پر اختیار فرمایا۔

شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ ''الاصل فی الاشیاء الاباحۃ'' یعنی اشیاء میں اصل اباحت (جواز) ہے، علامہ ابن عابدین شامی نے اس موضوع پر ''کتاب الطہارۃ'' میں ایک باب ''مطلب، اَلْمختارُ أنَّ الاصل فی الاشیاءِ الاباحۃ'' قائم فرمایا، (یعنی مختار قول یہ ہے کہ اشیاء میں اصل جواز ہے تاوقتیکہ اس کی ممانعت شریعت سے ثابت ہو جائے)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 1، ص: 199)

لہٰذا قرآن وسنت میں جب تک کسی شے کی ممانعت نہ ہو اور اس کام کے کرنے میں کسی گناہ کا احتمال نہ ہو تو اس وقت تک وہ جائز ہے، ممانعت ہونے کے بعد وہ ناجائز ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''فَمَا أحَلَّ فَهُوَ حَلَالٌ، وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عفو، وَتَلَا قُلْ لَّآ أَجِدُ فِیْ مَآ أُوْحِیَ إِلَیَّ مُحَرَّمًا۔

ترجمہ: ''جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا، وہ حلال ہے اور جسے حرام قرار دیا، وہ حرام ہے۔ اور جس چیز کے بارے میں سکوت اختیار فرمایا، وہ معاف ہے اور یہ آیت تلاوت فرمائی: قُلْ لَّآ أَجِدُ فِیْ مَآ أُوْحِیَ إِلَیَّ مُحَرَّمًا، (الانعام: 145)۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 3794)

لہٰذا جب سہرے کی ممانعت قرآن وحدیث اور فقہ میں نہیں ہے تو اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نہیں۔ کُلّہ باندھنے میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں، عمامہ باندھنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ عمامے کو ٹوپی پر باندھنا چاہئے، کُلاہ پر بھی باندھا جا سکتا ہے۔ کوئی شخص اگر عمامے کو سنت سمجھ کر حصولِ ثواب کے لئے باندھے تو اسے اجر ملے گا۔ اور اگر محض فیشن کے طور پر باندھا جائے تو اس کی ممانعت تو نہیں ہے، لیکن اس پر وہ اجر کا حق دار نہیں رہے گا۔

مہر مقررہ مقدار سے زیادہ ہو سکتا ہے؟

سوال: 92

میرے شوہر نے 1977ء میں ایک عدد فلیٹ بطور مہر مکمل مالکانہ حقوق کے ساتھ مجھے

دیا تھا۔ اِس بات کے دو افراد گواہ بھی ہیں اور تحریری کاغذات بھی میرے پاس موجود ہیں، روزِ اوّل سے میں اسی میں رہائش پذیر ہوں۔ میرے شوہر کا انتقال 2004ء میں ہو گیا تھا۔ اب میرے شوہر کے رشتہ دار اس فلیٹ پر وراثت کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ:

(1) مہر کی ادائیگی کسی بھی شکل میں کی جاسکتی ہے؟۔

(2) دو گواہوں کی موجودگی میں مہر ادا کر دیا گیا، کیا محض زبانی طور پر اتنا کافی ہے؟۔

(3) نکاح نامہ میں جو مہر درج کیا گیا، کیا اُس مقدار سے بڑھا کر مہر دیا جاسکتا ہے؟۔

(سعیدہ الیاس، بلڈنگ 11، ڈیفنس، کراچی)

جواب:

قرآن وحدیث میں مہر کے لئے صَداق، صِداق، صَدُقہ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان الفاظ کا مادہ اور ماخذ ''صدق'' ہے۔ ملاعلی القاری مرقات شرح مشکوٰۃ شریف میں اس کی وجہ تسمیہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مہر کو ان الفاظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عورت کی جانب شوہر کے میلان کی صداقت کی دلیل اور علامت ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں ''اُجور'' کا لفظ بھی آیا ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کے کسی بھی مذہب میں نکاح کے ساتھ مہر مقرر نہیں کیا گیا۔ اسلام نے مہر عورت کی تکریم کی علامت کے طور پر مشروع کیا ہے، کیونکہ ایک اجنبی عورت جو نکاح سے پہلے حرام ہوتی ہے، عقدِ نکاح کے نتیجے میں شوہر پر حلال ہو جاتی ہے۔ مہر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر خاوند عورت کو طلاق دے دے تو دوسری جگہ نکاح ہونے تک یا گزر اوقات کا کوئی معاشی ذریعہ مقرر ہونے تک اس کے پاس اتنی رقم ہو جس سے وہ اپنی کفالت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مردوں کو سخت تاکید کی ہے کہ وہ عورتوں کو ان کا مہر ادا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً۔

ترجمہ: ''جن عورتوں سے (بذریعہ نکاح) تم فائدہ اٹھا چکے ہو، تو ان کا مقررہ مہر ادا کردو'' (النساء:24)

فقہاءِ کرام نے اصولِ شرع سے استنباط کرتے ہوئے نکاح میں مہر مقرر کرنے کی تین قسمیں بیان کی ہیں:(1) مہر معجّل (2) مہر مؤجل (3) مہر مؤخر

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ:''فقہاء نے مہر کو مؤخر کرنے کی اجازت دی ہے، احناف نے کہا کہ مہر کا معجّل ہونا بھی صحیح ہے (یعنی جس کو فوراً ادا کرنا لازم ہو)۔اور کل مہر یا اس کا بعض حصہ مؤخر بھی کرسکتے ہیں اور یہ تاخیر یا مہلت کم مدت کے لئے بھی ہوسکتی ہے اور زیادہ کے لئے بھی یا اسے طلاق یا وفات تک مؤخر بھی کیا جاسکتا ہے، جیسے کسی علاقے کا عرف یا رواج ہو۔البتہ ایسی تاخیر نہ ہو جس کی مدت مجہول ہو۔مہر قسط وار بھی وصول کیا جاسکتا ہے، اگر نکاح کے وقت مہر کی ادائیگی کا طریقہ طے نہ ہو تو اس علاقے کے عرف کا اعتبار ہوگا۔آج کل مہر عندالطلب (On Demand) بھی مقرر کیا جاتا ہے یہ بھی درست ہے، جہاں کوئی عرف نہ ہو وہاں فوری ادائیگی پر ہی محمول ہوگا، (خلاصہ، الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ،جلد:9،ص:6787)۔

شوہر اپنی مرضی سے مقررہ مہر سے زائد نقد رقم یا کوئی جائیداد یا زیور وغیرہ کی صورت میں اپنی بیوی کو''ہبہ (Gift)'' کرسکتا ہے۔اسے مہر میں شامل بھی کرسکتا ہے اور مہر کے علاوہ ہبہ بھی کرسکتا ہے۔اور شرعاً وہ عورت مہر کے طور پر دی گئی اس تمام مال کی مالک اور مختار ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا

ترجمہ:''اور (اپنی بیویوں) میں سے کسی ایک کو اگر تم بہت مال دے چکے ہو تو اس مال میں سے کچھ واپس نہ لو''، (النساء:20)۔

شرعاً دو عادل گواہوں کی موجودگی میں دیا گیا مہر ثابت ہوگا۔مذکورہ صورت میں مہر کی جو مقدار مقرر کی گئی تھی، اُس کے بدلے میں جو فلیٹ بیوی کو دیا، وہ بیوی کی ملکیت ہوگیا اور اس میں کسی وارث کا کوئی حصہ نہیں، علامہ نظام الدین علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

الزیادۃ فی المھر صحیحۃ حال قیام النکاح عند علمائنا الثلاثۃ کذا فی المحیط فاذا زادھا فی المھر بعد العقد لزمتہ الزیادۃ کذا فی السراج الوھاج ھذا اذا قبلت

المرأة الزيادة سواء كانت من جنس المهراولا۔

ترجمہ: "ہمارے تینوں آئمہ کے نزدیک نکاح کے وقت مقررہ مہر میں اضافہ کرنا صحیح ہے، جیسا کہ محیط میں ہے۔ اگر نکاح کے بعد شوہر نے عورت کے مہر میں اضافہ کیا ہو، تو اس کی ادائیگی شوہر پر لازم ہوگی، جیسا کہ "سراج الوہاج" میں ہے۔ یہ لزوم اس وقت ہے کہ جب عورت نے مہر میں زیادتی کو قبول کرلیا ہو، خواہ یہ اضافہ مقررہ مہر کی جنس سے ہو یا اس کی جنس کے علاوہ کوئی اور چیز ہو، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:312)"۔

مہر شرعی کیا ہے؟

سوال:93

لڑکی کا مہر کم سے کم سنّت محمدی میں کتنا ہے؟۔ آج کل کے دور میں کس مقدار سے تعین کریں؟، (خورشید احمد یوسفی، دستگیر، کراچی)۔

جواب:

حضور نبی مکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کا مہر بارہ سو اوقیہ یعنی پانچ سو درہم تھا جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے اور حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر چار ہزار درہم تھا جو نجاشی نے خود اپنی جانب سے ادا کئے تھے (ابوداؤد، رقم الحدیث: 2100) فقہاء کرام نے مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم یعنی 30.618 گرام چاندی یا اُس کی مساوی قیمت مقرر فرمائی ہے۔ امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی 297ھ لکھتے ہیں:

وَاخْتَلَفَ اَهْلُ الْعِلْمِ فِي الْمَهْرِ فَقَالَ بَعْضُ اَهْلِ الْعِلْمِ اَلْمَهْرُ عَلٰى مَا تَرَاضَوْا عَلَيْهِ، وَهُوَ قَوْلُ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ وَالشَّافِعِيِّ وَاَحْمَدَ وَاِسْحَاقَ، وَقَالَ مَالِكُ بْنُ اَنَسٍ لَا يَكُوْنُ الْمَهْرُ اَقَلَّ مِنْ رُبْعِ دِيْنَارٍ، وَقَالَ بَعْضُ اَهْلِ الْكُوْفَةِ لَا يَكُوْنُ الْمَهْرُ اَقَلَّ مِنْ عَشَرَةِ دَرَاهِمَ،

ترجمہ: "مہر کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف رہا ہے، بعض اہلِ علم فرماتے ہیں: مہر وہی ہے جو فریقین کی باہمی رضامندی سے طے پا جائے۔ اور یہ قول امام سفیان ثوری، امام شافعی اور امام احمد اور امام اسحاق کا ہے۔ امام مالک بن انس فرماتے ہیں: مہر چوتھائی دینار سے کم نہیں ہوتا اور

بعض اہلِ کوفہ (اس سے مراد احناف ہیں) کہتے ہیں کہ دس درہم سے کم مقدار میں مہر نہیں ہوتا، یعنی مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم (چاندی) ہے۔ (سُنن ترمذی، کتاب النکاح، ص: 191)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اَقَلُّ الْمَھْرِ عشرۃ دراھم،

ترجمہ: ''مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم ہے'' (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 302)۔

اگر زوجین موجودہ دور میں کم از کم مہر پر متفق ہوں تو اس کی مقدار 30.618 گرام چاندی یا اس کی مروجہ قیمت (Current Market Value) ہے۔

یہاں پر عام لوگوں کی ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ عام طور پر لوگ پوچھتے ہیں کہ شرعی مہر کیا ہے؟، یا یہ کہ شرعی مہر لکھ دیجئے، تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ مہر کی ہر وہ مقدار، مہرِ شرعی ہے جس پر نکاح کے وقت زوجین کا اتفاق ہو جائے، خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ، ایک ہزار روپے ہو یا ایک لاکھ روپے یا کم و بیش جو بھی چاہے مقرر کر سکتے ہیں۔ مہر کی زیادہ سے زیادہ حد شریعت نے مقرر نہیں کی، کیونکہ مہر کے تعیّن میں مختلف امور کو دیکھا جاتا ہے، دونوں کی مالی حیثیت، دونوں کی خاندانی حیثیت (Status) اور آج کل تعلیم بھی ایک بڑا فیصلہ کن عامل بن جاتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب خلیفۂ وقت نے بڑی مقدار میں مہر مقرر کرنے کی روش کو ناپسندیدہ قرار دیا اور اس کی کوئی حد مقرر کرنا چاہی تو ایک صحابیہ نے کھڑے ہو کر اعتراض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ایسی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ اسے فریقین کی مرضی اور حالات پر چھوڑ دیا ہے اور انہوں نے یہ آیت قرآنی اپنے موقف کے حق میں پیش کی: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ؕ

ترجمہ: ''اور اگر تم اپنی ایک بیوی کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو اور تم ان میں سے ایک کو ڈھیروں مال دے چکے ہو، تو اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، (النساء: 20)''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر سے نیچے اتر آئے اور فرمایا: میں نے تم کو

زیادہ مہر رکھنے سے منع کیا تھا، سنو! اب جو شخص جتنا چاہے مہر رکھ سکتا ہے۔
(سنن کبریٰ للبیہقی، جلد 7، ص:233)

ایک شخص کے بیٹے کا اس کی مطلّقہ کے دوسرے شوہر سے بیٹی سے نکاح

سوال:94

ایک شخص ''عبداللہ'' نے ''زینب'' نامی خاتون سے نکاح کیا، ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ پھر کسی وجہ سے اُس شخص مُسمّٰی ''عبداللہ'' نے اپنی زوجہ مسماۃ ''زینب'' کو طلاق دے دی۔ بعد ازاں اُس شخص مسمّٰی ''عبداللہ'' نے ایک اور خاتون مسماۃ ''مریم'' سے نکاح کر لیا اور دونوں سے ایک بیٹا ''ارشد'' پیدا ہو کر جوان ہوا۔ اسی طرح اُس مُطلّقہ خاتون مسماۃ ''زینب'' نے ایک اور شخص مُسمّٰی ''عبدالرحمٰن'' سے نکاح کر لیا اور ان کے ہاں ایک بیٹی ''رشیدہ'' پیدا ہوئی، اس صورت مسئلہ کو ایک نقشہ سے سمجھئے۔

عبداللہ (زوج) ☆ زینب، زوجۂ اُولیٰ (مُطلّقہ)، ان دونوں کی کوئی اولاد نہیں ہے۔

مریم، زوجۂ ثانیہ ☆ عبداللہ اور مریم سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ارشد ہے۔

عبدالرحمٰن (زوج) ☆ زینب (زوجہ)، عبدالرحمن اور زینب سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام رشیدہ ہے۔

کیا مذکورہ بالا نقشے کے مطابق ''ارشد'' اور ''رشیدہ'' کا آپس میں نکاح جائز ہے؟

(معاذ احمد، ملیر، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں شریعت کی رو سے ارشد اور رشیدہ کا آپس میں نکاح جائز ہے، کیونکہ حرمتِ نکاح کے اسباب میں سے یہاں کوئی سبب نہیں پایا جاتا۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لا بأس بان یتزوج الرجل امرأۃ ویتزوج ابنہ ابنتھا او اُمّھا کذا فی محیط السرخسی۔

ترجمہ: ''اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرے اور اُس کا وہ بیٹا

(جو اِس عورت کے بطن سے نہیں ہے)، اُس عورت کی ایسی بیٹی سے نکاح کرے (جو اُس کے سابق شوہر سے ہے) یا اُس کی ماں سے نکاح کرے۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 277)

نکاحِ شِغار یا وٹہ سٹہ

سوال: 95

زید و عمر دونوں دوست ہیں، زید کی بھی بیٹی ہے اور عمر کی بھی۔ زید، عمر کی بیٹی سے اور عمر، زید کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ شریعت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟۔ (محمد نعمان خان، کراچی)

جواب:

ایسا نکاح جس میں دو افراد یا دو خاندان ایک دوسرے کو رشتہ دیتے ہیں، ایک جانب کی لڑکی کا نکاح دوسرے جانب کے لڑکے سے منعقد کرلیا جاتا ہے، اس میں دونوں جانب سے لڑکیوں کا مہر مقرر نہیں ہوتا، بلکہ یہ نکاح بلا مہر ہوتا ہے اور عملاً ایک لڑکی دوسری کا بدلِ مہر بن جاتی ہے۔ ایسا نکاح زمانۂ جاہلیت یعنی قبل از اسلام رائج تھا اور اِسے ''نکاحِ شِغار'' کہا جاتا تھا۔ پاکستان کے بعض علاقوں میں اس سے ملتی جلتی اصطلاح ''وٹہ سٹہ'' ہے، اسلام نے اس رسم کو باطل قرار دیا ہے۔ لیکن یہ نکاح اپنی اصل کے اعتبار سے صحیح ہوتا ہے اور اس میں اصل کے اعتبار سے حرمت کا کوئی سبب نہیں ہوتا، فساد کا سبب صرف یہ ہے کہ عورت کو اس کے حق مہر سے محروم کر کے دوسری عورت کا بدل مہر بنا دیا جاتا ہے، اس لئے یہ شرط کالعدم ہو جائے گی۔ نکاح اگر ان عورتوں کی آزادنہ رضامندی سے گواہوں کی موجودگی میں ہو تو ایسا نکاح شرعاً جائز ہے اور اگر ان دونوں عورتوں کا مہر مقرر نہیں ہوا تو ہو مہرِ مثل کی حقدار ہوں گی۔ ''مہرِ مثل'' سے مراد یہ ہے کہ ان کے خاندان میں اِس حیثیت کی حامل خواتین کا عام طور پر جو مہر مقرر ہوتا ہے، وہ اس کی حقدار پائیں گی۔ اور اگر دونوں کا اپنا اپنا مہر مقرر ہوا ہے تو وہ اسی کی حقدار ہوں گی۔ ''نکاحِ شِغار'' کے متعلق چند احادیثِ مبارکہ ملاحظہ ہوں:

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ نَهٰى عَنِ الشِّغَارِ۔ وَالشِّغَارُ اَنْ يُزَوِّجَ الرَّجُلُ

اِبْنَتَهُ، عَلٰى أَنْ يُزَوِّجَهُ اِبْنَتَهُ، وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا صِدَاقٌ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے ''شِغار'' سے منع فرمایا ہے۔ شِغار یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی کا نکاح دوسرے شخص سے اس کی بیٹی کے عوض کر دے (یعنی وہ بھی اپنی بیٹی کا نکاح پہلے شخص سے کردے) اور ان دونوں نکاحوں میں مہر مقرر نہ ہو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3354)''۔

(۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنِ الشِّغَارِ، زاد ابن نمیر وَالشِّغَارُ: أن يقول الرجل للرجل زوجني ابنتك وأزوجك ابنتي، أو زوجني أختك وأزوجك أختي،

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ''شِغار'' سے منع فرمایا۔ ابن نمیر کی روایت میں ان کلمات کا اضافہ ہے: اور شغار یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے یہ کہے کہ تم اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کردو اور میں (اس کے عوض) اپنی بیٹی کا نکاح تم سے کردوں گا یا یہ کہ تم اپنی بہن کا نکاح مجھ سے کردو اور میں (اس کے عوض) اپنی بہن کا نکاح تم سے کردوں گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث 3358)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: علامہ بدرالدین عینی حنفی نے لکھا ہے: احناف کے نزدیک شِغار یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی یا بہن کا کسی شخص سے اس کی بیٹی یا بہن کے ساتھ اپنے نکاح کے عوض میں نکاح کرے اور ہر ایک کا عقد دوسرے عقد کے عوض میں ہو، یہ نکاح صحیح ہے اور اس میں مہر مثل واجب ہے۔ علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں: حدیث میں نکاح شِغار کی ممانعت ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بلا مہر نکاح کرنے اور ایک عورت کے حق زوجیت کو دوسری کا مہر قرار دینے سے منع فرمایا اور ہم بھی اس کو باطل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چیز شرعاً مہر نہیں ہے، پس یہ ایسا نکاح ہو گیا جس میں ایسی چیز کو مہر بنایا گیا ہے جو مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، جیسے کوئی شخص خمر یا خنزیر کو مہر مقرر کر کے نکاح کرلے تو ایسی صورت میں بالاتفاق نکاح ہو جائے گا اور خمر یا خنزیر کی جگہ مہر مثل دینا

واجب ہوگا، نکاحِ شِغار بھی اسی طرح ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 3:819)۔

خطبۂ نکاح کے بغیر نکاح کا انعقاد

سوال: 96

فاروق اور شازیہ دونوں عاقل وبالغ ہیں، ان کا نکاح ان کے اولیاء اور گواہوں کی موجودگی میں پڑھایا گیا مقرر کردہ مہر ادا کردیا گیا اور دیگر علاقائی رسوم بھی ادا کی گئیں، صرف نکاح کا خطبہ نہیں پڑھا گیا۔ کیا نکاح میں خطبہ پڑھنا شرط ہے؟ مذکورہ نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟، (محمد فاروق، ضلع مظفر آباد)۔

جواب:

مرد وعورت عاقل وبالغ کا نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول سے منعقد ہو جاتا ہے، خطبۂ نکاح، نکاح کے مستحبات میں سے ہے، ارکانِ نکاح میں سے نہیں، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں :

ویندب اعلانہ وتقدیم خطبة

ترجمہ: ''اور نکاح کا علانیہ ہونا اور اس سے پہلے خطبہ پڑھنا مستحب ہے۔۔۔۔ آگے چل کر انہوں نے لکھا:

وکونہ فی مسجد یوم جمعة بعاقد رشید وشھود عدول،

ترجمہ: ''کسی نیک شخص کا عادل گواہوں کی موجودگی میں جمعہ کے دن مسجد میں نکاح پڑھانا مستحب ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 57)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ مجلس میں نہ ذکر نکاح کا ہوا نہ خطبہ پڑھا گیا، نہ مہر کا ذکر ہوا، اب یہ نکاح ہوگا یا خطبہ یا کچھ نہیں؟۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''خطبہ پڑھا جانا یا ذکرِ مہر ہونا کچھ شرطِ نکاح نہیں، وہ مجلس اگر عقد کے لئے تھی، عقد ہوگیا اور اگر مجلسِ وعدہ تھی اور حاضرین نے اسے وعدہ ہی سمجھا تو وعدہ ہوا، نکاح نہ ہوا۔

فی الدر المختار ان المجلس للوعد فوعد وللعقد فعقد

ترجمہ: ''درمختار میں ہے کہ اگر یہ مجلس وعدہ (منگنی) کے لئے ہے تو منگنی ہے اور مجلس نکاح ہے تو نکاح ہوگا۔ نکاح بالفاظِ صریحہ میں نیت شرط نہیں، الفاظِ ایجاب وقبول ہونا اور دو شاہدوں (گواہوں) کا سمجھنا کہ یہ نکاح ہو رہا ہے، کافی ہے۔ ذکرِ مہر نہ ضروری نہ قرینہ اور خطبہ اگرچہ ضروری نہیں، مگر قرینہ نکاح ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص:259)''۔

لہٰذا اگر یہ مجلسِ نکاح تھی اور باقاعدہ ایجاب وقبول ہوا تو نکاح شرعاً منعقد ہوگیا، اگرچہ خطبۂ نکاح نہ پڑھا گیا ہو۔

باپ کا بیٹے کی خواہر نسبتی (سالی) سے نکاح

سوال:97

میرا ایک ساتھی اور اس کا بیٹا دو سگی بہنوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں، ان لڑکیوں سے پہلے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے، مہربانی فرما کر بتائیں کہ یہ دونوں (باپ بیٹا) اُن دونوں سگی بہنوں سے شادی کر سکتے ہیں یا نہیں؟۔

(محمد اقبال طاہر، فائبر ٹیکس لمیٹڈ C-11، سائٹ ایریا، کوٹری، ضلع جامشور)

جواب:

دو سگی بہنوں سے اس طرح کا نکاح جائز ہے کہ ایک باپ کے نکاح میں ہو اور دوسری بیٹے کے نکاح میں، جیسا کہ سوال میں دریافت کیا گیا ہے، بشرطیکہ وہ اس کی حقیقی ماں نہ ہو بلکہ سوتیلی ماں ہو، کیونکہ حقیقی ماں کی بہن تو خالہ ہوتی ہے اور خالہ کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ زید اپنی سوتیلی والدہ کی سگی ہمشیرہ سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب میں لکھا: سوتیلی ماں، ماں نہیں (تمہاری مائیں وہی ہیں جنہوں نے تمہیں جنم دیا ہے)، لہٰذا اس کی سگی بہن سے نکاح جائز ہے، (محرمات کے علاوہ عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں)، (فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص:452)''۔

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال کیا گیا کہ دو شخص زید وعمرو آپس میں باپ بیٹے ہیں، جو دو

حقیقی بہنوں ہندہ و بکرہ سے عقد کرنا چاہتے ہیں، ایسی صورت میں یہ دونوں عقد جائز ہیں یا نہیں؟۔آپ نے جواب میں لکھا:''اگر فقط اتنی بات ہے کہ دونوں بہنوں میں ایک زید کے نکاح میں آئے گی اور ایک عمرو کے، اور کوئی دوسری وجہ نہ ہو، جس سے حرمت ہوتی ہو، تو دونوں نکاح جائز ہیں،۔۔۔ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:''سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح جائز ہے، بیٹے کی سالی سے بھی نکاح جائز ہے(فتاویٰ امجدیہ، جلد دوم، ص:5961)''۔

بیٹی کے ساتھ بدفعلی کرنے سے بیوی حرام ہوجاتی ہے:

سوال:98

ایک شخص نے اپنی 13 سالہ بیٹی سے زنا کیا۔لوگ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے بیوی کو طلاق واقع ہوجاتی ہے، کیا یہ صحیح ہے؟، نیز اُس شخص کے لئے کیا حکم ہے؟۔

(منظور احمد، موسیٰ کالونی، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اُس کی بیوی اُس پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی، اُس پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے فوراً علیحدگی اختیار کرے، اس کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم رکھنا حرام ہے۔ زنا تو بہت برا فعل ہے، محض شہوت کے ساتھ چھونے پر بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں :

ولا فرق فیما ذکر بین اللمس والنظر بشھوۃ بین عمد ونسیان وخطا واکراہ، فلو أیقظ زوجتہٗ أو ایقظتہ ھی لجماعھا فمست یدہ بنتھا المشتھاۃ او یدھا ابنہ حرمت الأم ابداً۔ ''فتح''

ترجمہ:''اس سے حکمِ شرعی میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ چھوا یا شہوت سے دیکھا ہو، خواہ یہ فعل دانستہ ہو یا بھول کر، خطا سے ہو یا جبر کے تحت، ہر صورت میں حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے۔پس اگر اپنی بیوی کو جگایا یا بیوی نے شوہر کو قربت کیلئے جگایا اور اس دوران مرد کا ہاتھ بیٹی کو لگا جو بالغہ یا مراہقہ (قریب البلوغ) تھی یا بیوی کا ہاتھ بیٹے کو لگ گیا تو بیوی ہمیشہ کیلئے شوہر

پرحرام ہوجائے گی، ''فتح القدیر'' میں بھی اسی طرح ہے''۔(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص:90)

ایسا شخص انتہائی خبیث الفطرت ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نصیب فرمائے اور توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

بیوی کی بھتیجی کے ساتھ زنا سے نکاح باطل نہیں ہوتا

سوال:99

ایک شخص نے اپنی زوجہ کی سگی بھتیجی سے زنا کیا۔ ازروئے شرع اب اس کی زوجہ کے نکاح پر اس فعلِ شنیع کی وجہ سے کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ قرآن وسنّت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمادیں۔ (ہند، صدر ٹاؤن، کراچی)

جواب :

شریعت کی رُو سے زنا حرامِ قطعی ہے۔قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

ترجمہ: ''اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے''، (بنی اسرائیل:32)۔

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کے علاوہ دیگر کئی نصوصِ قرآنیہ اور روایات احادیث سے زنا کا حرام ہونا ثابت ہے، لہٰذا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے کہ وہ زنا کے ارتکاب سے بچے، اگر کسی سے یہ غلط کام سرزد ہوجائے تو اُس کو چاہئے کہ عذابِ آخرت سے بچنے کے لئے توبہ واستغفار کرے۔اس تمہید کے بعد فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے حرمتِ نکاح کے اسباب میں سے ایک سبب حرمتِ مصاہرت ہے یعنی سسرالی رشتہ۔حرمتِ مصاہرت رشتۂ نکاح سے بھی ثابت ہوتی ہے اور اسی طرح زنا اور اسبابِ زنا (جیسے شہوت سے بوس وکنار وغیرہ) سے بھی ثابت ہوجاتی ہے۔زنا یا اسبابِ زنا سے سات عورتیں حرام ہوجاتی ہیں: (۱) مزنیہ کی ماں (۲) دادی (۳) نانی (۴) بیٹی (۵) پوتی (۶) نواسی (۷) باپ کی مزنیہ (یعنی جس سے باپ نے زنا کیا ہو)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں :

فمن زنیٰ بامرأۃ حرمت علیه اُمّها وان علت وابنتها وان سفلت وکذا تحرم المزنی بها علی اٰباء الزانی واجدادہ وان علوا الخ،

ترجمہ:''جس شخص نے کسی عورت کے ساتھ زنا کیا، تو اس شخص پر اس عورت کی ماں (اوپر تک یعنی دادی، نانی وغیرہ) حرام ہے اور نیچے تک اس کی بیٹی بھی حرام ہے (یعنی پوتی، نواسی وغیرہ)، اسی طرح جس عورت سے زنا کیا ہو، وہ زانی کے باپ دادا (اوپر تک) حرام ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:274)''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ زانی مرد پر مزنیہ (یعنی جس عورت کے ساتھ زنا کیا گیا ہے) عورت کے اصول وفروع حرام ہو جاتے ہیں اور بھتیجی پھوپھی کے نہ اصول میں ہے اور نہ فروع میں ہے، بلکہ یہ پھوپھی کے باپ کی فروع میں سے ہے۔ لہٰذا بھتیجی کے ساتھ زنا کرنے سے نکاح پر اثر نہیں پڑے گا اور مذکورہ شخص کا اپنی بیوی کے ساتھ جو مزنیہ کی پھوپھی ہے، نکاح قائم ہے۔ جہاں تک زنا کی حرمت اور قبیح ترین کبیرہ گناہوں میں سے ہونے کا تعلق ہے، اس کی شدت میں کسی کمی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نظامِ شریعت نافذ ہو تو اقرارِ جرم یا گواہوں کے ذریعے عدالت میں جرم ثابت ہونے کی صورت میں زنا کی حد نافذ ہوگی، ورنہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے معافی کے لئے توبہ ہی کا راستہ ہے، جس کی قبولیت اس کے کرم پر موقوف ہے۔

دو بیویوں کے درمیان باری مقرر کرنا

سوال: 100

میرے بھائی نے چھ ماہ قبل دوسری شادی کر لی ہے اور اسی کے ساتھ رہتے ہیں۔ پہلی بیوی سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں اور حافظِ قرآن ہیں۔ میرے بھائی 15 دن یا مہینے بعد گھر آتے ہیں، گھر کا راشن، بچوں کی فیس، کپڑے وغیرہ لاتے ہیں۔ دو چار گھنٹے بیٹھتے ہیں، لڑتے جھگڑتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ جب سے دوسری شادی کی ہے حقِ زوجیت بھی

ادا نہیں کرتے۔ دوسری شادی کے بعد شوہر پر پہلی بیوی اور بچوں کے کیا حقوق اور ذمہ داری ہے؟، کیا پہلی بیوی سے نکاح قائم ہے؟۔ (سید زبیر علی، نارتھ کراچی)

جواب:

شرعاً دوسرا نکاح کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ شوہر دونوں بیویوں کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، دونوں کے درمیان عدل قائم کرے، یعنی دونوں کو ایک معیار کی رہائش، ایک ہی معیار کی خوراک اور مصارف زندگی فراہم کرے اور دونوں میں ایام کی تقسیم بھی برابر برابر کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

ترجمہ: ''یعنی اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم (ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان) عدل قائم نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، (النساء:3)۔

اس آیت میں دلیل ہے کہ جو شخص مالی اور جسمانی طور پر متعدد بیویاں رکھ سکتا ہو، وہ بشرط عدل وانصاف ایک سے زیادہ نکاح کرسکتا ہے، اور اگر وہ عدل انصاف کے تقاضے پورے نہ کرسکے، تو وہ صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ،عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ کَانَتْ لَهُ امرأتانِ فمالَ الٰی اِحدَاهُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَشِقُّه مائلٌ

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ (اُن کے درمیان عدل قائم نہ کرتا ہو بلکہ) ایک کی طرف مائل ہو تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ مائل (جھکا ہوا) ہوگا۔
(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2126)

(۲) اِذَا کَانَ عِنْدَ الرَّجُلِ امرَأَتَانِ فَلَم یَعْدِل بَیْنَهُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَشِقُّهُ سَاقِطٌ۔

ترجمہ: ''جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن کے درمیان عدل نہیں کرتا، تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ ساقط (بے کار) ہوگا''۔
(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1144، ابوداؤد:2132، سنن ابن ماجہ:1969)

ازدواجی تعلقات میں مساوات سے متعلق علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(یجب ان یعدل) ای ان لا یجور (فیه) ای فی القسم بالتسویة فی البیتوتة (وفی الملبوس والماکول) والصحبة (لا فی المجامعة) کالمحبة بل یستحب۔

ترجمہ: ''(جس کی ایک سے زائد بیویاں ہوں) اُس پر دونوں کے درمیان عدل کرنا واجب ہے یعنی کسی ایک پر ظلم نہ کرے، اس کی صورت یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ شب باشی اور لباس وطعام میں مساوات برتے، محبت کی طرح مباشرت میں بھی مساوات مستحب ہے (کیونکہ بعض امور کی جانب طبعی میلان میں انسان کا بس نہیں چلتا)۔۔۔۔۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں :

قَالَ فِی ''الفتح'': وَاعلَم ان ترك جماعِها مطلقًا لایَحِلُّ لهٗ، صرّح اصحابُنا بأنّ جماعَها احیانًا واجبٌ دیانةً، لایدخل تحت القضاء۔

ترجمہ: ''فتح القدیر'' میں ہے: کسی ایک بیوی سے مباشرت ترک کردینا جائز نہیں ہے، ہمارے اصحاب نے صراحت کی ہے کہ وقتاً فوقتاً ہر بیوی کے ساتھ مباشرت دیانتاً واجب ہے، لیکن قضاءً نہیں (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص:283-282)''۔

یہ بہر حال لازم ہے کہ وہ دونوں بیویوں کے ہاں رہنے کے لئے دن مقرر کرے اور ایام کی تقسیم برابر برابر رکھے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

ویقیم عند کل واحدة منهن یومًا ولیلةً لکن انما تلزمه التسویةُ فی اللیل، حتی لو جاء لِلاولٰی بعدَ الغروب وللثانیةِ بعدَ العشاء فقد تركَ القسم، ولایجامعها فی غیر نوبتها ولو نهارًا وکذا لایدخل علیها الّا لعیادتها ولو اشتدّ

ترجمہ: ''اور (جس کی دو یا زائد بیویاں ہوں تو) ہر بیوی کے پاس شوہر دن رات (برابر) قیام کرے، لیکن برابری رات میں لازم ہے (کہ جتنی رات پہلی بیوی کے پاس رہا اتنا ہی دوسری کے پاس رہے) یہاں تک کہ اگر ایک بیوی کے پاس غروبِ آفتاب کے بعد آیا اور دوسری کے پاس عشاء کے بعد آیا تو عدل جاتا رہا (یعنی دونوں بیویوں کے درمیان

مساوات کا تقاضا پورا نہیں ہوا)۔ اور کسی بیوی کے ساتھ اُس کے باری کے سوا مباشرت نہ کرے اگرچہ دن ہی میں ہو اور اسی طرح باری کے سوا اُس کے پاس رات کو نہ جائے سوائے اِس کے کہ اگر وہ بیمار ہے تو اس کی عیادت کے لئے جا سکتا ہے۔۔۔ مزید لکھتے ہیں:

(وان شاء ثلاثاً) ای ثلاثۃ أیام ولیالیھا (ولا یقیم عندھا اکثر الا باذن الاخری)

ترجمہ: ''اگر چاہے تین دن اور تین راتیں ہر ایک کے پاس رہے، دونوں میں سے کسی ایک کے پاس دوسری بیوی کی اجازت کے بغیر (باری سے) زیادہ دن قیام نہ کرے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 288، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

الغرض شرعاً قیامِ عدل کی شرط کا لحاظ کرتے ہوئے ایک سے زائد نکاح کی اجازت ہے بشرطیکہ تمام ازواج کے درمیان ایام کی تقسیم برابر برابر کرے اور رہائش، لباس اور طعام (یعنی نان ونفقہ) کا معیار بھی یکساں رکھے۔

آپ نے جو صورتِ حال بیان کی ہے اس کی رو سے آپ کے بھائی کا طرزِ عمل شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ انہیں چاہئے کہ حدیث مبارک میں بیان کی ہوئی ''وعید'' کی روشنی میں آخرت کے خسارے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں اور توبہ کریں۔ اور اپنی پہلی بیوی اور بچوں سے بھی معافی مانگیں اور اپنی ازواج کے درمیان عدل قائم کریں۔ تاہم نکاح اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک خدانخواستہ طلاق نہ ہو جائے یا شوہر وفات نہ پا جائے۔

دوسری شادی کی بابت شرعی حکم اور مسائل

میرے شوہر کی ایک بیوی پہلے سے ہے، پہلی بیوی سے اُن کی دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں کے حقوق وفرائض سے متعلق مجھے چند سوالات کے جوابات چاہئیں۔

(ثمرین رحمانی A-35 بھایانی ہائٹس گلشن اقبال، کراچی)

سوال: 101

1۔ اگر کوئی شخص دوسری شادی کرنا چاہتا ہو، تو اس سلسلے میں پہلی بیوی کی شرعی ذمہ داری کیا ہے؟

جواب :

شریعت میں شوہر کو دوسری شادی کی اجازت ہے لیکن یہ اجازت مطلق نہیں ہے بلکہ دونوں ازواج کے درمیان عدل کے ساتھ مشروط ہے، چنانچہ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

ترجمہ: ''اور اگر (ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی صورت میں) تمہیں اندیشہ ہو کہ (تمام ازواج کے درمیان) عدل قائم نہیں کر سکو گے تو صرف ایک نکاح پر اکتفا کرو، (النساء:3)

دوسری شادی کو مغرب میں غیر قانونی قرار دیا گیا ہے، مگر وہاں دوسری عورتوں کے ساتھ ان کی رضامندی سے جنسی تعلقات رکھنے کی کھلی آزادی ہے، نہ قانوناً جرم ہے اور نہ ہی معاشرے میں اسے معیوب سمجھا جاتا ہے، جبکہ اسلامی تعلیمات اور مسلم معاشرے کا مزاج مغرب کے اباحتِ کلی (Total Permissibility) سے بالکل مختلف ہے، یعنی سب جائز ہے کا اصول اسلام میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ لہٰذا اگر شوہر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے حالات وضروریات کے مطابق قائل کریں کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دے، ورنہ اسے اجازت دیدیں اور اپنے اور اپنی بچیوں کے جائز شرعی حقوق پر اصرار کریں، چاہیں تو اس کی بابت اس سے ایسا اقرار نامہ لے لیں جسے قانونی تحفظ حاصل ہو۔

دو بیویوں کے درمیان ایام کی تقسیم

سوال: 102

2۔ دو بیویاں رکھنے کی صورت میں شوہر مہینے کے کتنے دن اور کتنی راتیں دونوں کے گھروں میں گزارنے کا پابند ہے اور وسائل کو ان کے درمیان کس طرح تقسیم کرے؟ دونوں کے اخراجات کے درمیان کس تناسب سے خرچ کرے؟۔

جواب:

مرد کے دوسرا نکاح کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ وہ دونوں بیویوں کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے اور دونوں کے درمیان عدل قائم کرے، یعنی دونوں کو یکساں

معیار کی رہائش، نان ونفقہ اور مصارف زندگی فراہم کرے۔ اور دونوں میں ایام کی تقسیم بھی برابر برابر کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً
ترجمہ: ''یعنی اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم ایک سے زیادہ ازواج کے درمیان عدل قائم نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، (النساء:3)۔

اس آیت میں یہ مشروط اختیار ہے کہ جو شخص مالی اور جسمانی طور پر متعدد بیویاں رکھ سکتا ہو، وہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ایک سے زیادہ نکاح کر سکتا ہے، اگر وہ انصاف قائم نہ کر سکتا ہو تو صرف ایک بیوی نکاح میں رکھے۔
نوٹ: اس موضوع پر سوال نمبر: 100 کے جواب میں درج احادیث مبارکہ اور فقہاء کرام کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری بیوی کو طلاق دلانے کے جتن کرنا

سوال:103

3۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی دوسری بیوی کو اپنے لئے بے عزتی تصور کرتے ہوئے اپنے شوہر کو اُسے طلاق دینے پر مجبور کرتی ہے، اور اس کے لئے وہ ہر جتن کرتی ہے، تو کیا اُس کا مطالبہ اور اِس سلسلے میں اُس کی کوششیں جائز ہیں؟ اگر شوہر اپنی کسی ایک بیوی کی باتوں میں آکر یا اُن دونوں بیویوں کی ضد اور بحث سے تنگ آکر کسی ایک کو یا دونوں کو چھوڑ دیتا ہے تو کیا شوہر کا یہ عمل جائز ہے؟۔

جواب:

کسی عورت کا اپنے شوہر کے دوسرے نکاح کو اپنے لئے بے عزتی تصور کرنا، شرعی احکام سے جہالت کی بنا پر ہے۔ کیا آپ کو یہ بات پسند ہے کہ آپ کا شوہر حرام کاری میں مبتلا ہو، لہٰذا مذکورہ عمل کسی طرح بھی درست نہیں، اگر دونوں بیویوں کے حقوق پورے ہو رہے ہیں تو کسی ایک بیوی کا دوسری بیوی کو طلاق دینے کیلئے شوہر کو مجبور کرنا ناجائز ہے۔ تمام مباح امور میں طلاق اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ "اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ الطَّلَاقُ"۔
ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "(تمام) حلال امور میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ امر طلاق ہے۔
(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2171)

(۲) عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ مِنَّا مَنْ خَبَّبَ اِمْرَأَةً عَلٰى زَوْجِهَا
ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایسا شخص جو کسی عورت کو اُس کے شوہر کے خلاف برگشتہ کر کے اُن کے درمیان فساد پیدا کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے، (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2168)"۔

جس طرح شرعی جواز کے بغیر شوہر کا طلاق دینا جائز نہیں ہے، اسی طرح بیوی کا شوہر سے دوسری بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ بھی جائز نہیں ہے۔ شوہر کو چاہئے کہ طلاق دینے سے گریز کرے، طلاق دینا، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے۔ بعض لوگ وقتی طور پر مغلوب الغضب ہو کر تین طلاقیں دے بیٹھتے ہیں، بعد میں دونوں ہی پشیمان ہوتے ہیں، نتیجتاً بچوں کی تربیت اور پرورش کا معاملہ ابتری کا شکار ہو جاتا ہے۔

دوسری بیوی سے ملنے سے روکنا

سوال:104

4۔ پہلی بیوی شوہر کو دوسری بیوی سے ملنے سے روکنے کا حق رکھتی ہے جبکہ وہ اُس کی ضروریاتِ زندگی کا بھی خیال رکھتا ہے؟۔

جواب:

شریعت مطہرہ میں بیویوں کے حقوق مساوی رکھے گئے ہیں، یعنی شوہر پر یہ لازم ہے کہ اگر اس کی دو یا دو سے زیادہ بیویاں ہوں، تو وہ سب کے پاس برابر وقت گزارے۔ اُس کی کسی بیوی کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسری بیوی کے پاس رہنے یا ملنے سے اپنے شوہر کو روکے۔ قرآن مجید میں ایک سے زائد نکاح کرنے کا حکم ہی اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ اُن

کے درمیان عدل کرے، اگر عدل پر قادر نہ ہو، تو ایک ہی نکاح پر اکتفا کرے۔

شوہر کے فرائض

سوال:105

5۔ جو بیوی شوہر کی اطاعت نہ کرے اور شوہر اُسے کسی وجہ سے چھوڑنا بھی نہ چاہتا ہو تو ایسی بیوی کے معاملے میں شوہر کے کیا فرائض ہیں؟۔

جواب :

بیوی پر فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت اور فرماں برداری کرے، قرآن مجید میں شوہر کی فرماں بردار عورت کو نیک قرار دیا گیا ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

ترجمہ: ''نیک عورتیں (شوہر کی) فرمانبرداری کرتی ہیں اور شوہر کی غیر موجودگی میں (اس کے مال اور اپنی عِفّت وحیا کی) حفاظت کرتی ہیں، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت کا حکم دیا ہے، (النساء:34)''۔

ایک حدیث پاک میں بیوی کے ناشکرے پن کو جہنم کے عذاب کا سبب قرار دیا گیا ہے،

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا صَلَّتِ الْمَرْاَةُ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَحَفِظَتْ فَرْجَهَا وَاَطَاعَتْ زَوْجَهَا قِيْلَ لَهَا اُدْخُلِيْ مِنْ اَيِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتِ، رواه احمد والطبرانی فی الاوسط فیه ابن لهیعه۔ وحدیثه حسن وبقیة رجاله رجال الصحیح۔

ترجمہ: ''حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عورت پانچ وقت کی نمازیں پڑھے اور رمضان کے روزے رکھے اور اپنی عصمت (شرمگاہ) کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرے، (قیامت کے دن) اس سے کہا جائے گا: جس دروازے سے چاہو جنت میں داخل ہو جاؤ، یہ حدیث مسند احمد اور معجم طبرانی میں ہے، اس کے راویوں میں عبداللہ بن لھیعہ ہے، جس کی احادیث حسن

ہیں اور اس حدیث کے باقی راوی حدیث صحیح کے راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد، جلد 4 ص:306)

شریعتِ مطہرہ میں عورتوں کو بھی مردوں کے مساوی حقوق دیئے گئے ہیں، لیکن مردوں کو ایک درجہ فضیلت عطا کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ

ترجمہ: ''اور عورتوں کے مردوں پر وہی حقوق ہیں جو دستور کے مطابق مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے (البقرہ:228)''۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک اور اتحاد و اتفاق سے گزارنی چاہئے، ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع صرفِ نظر کرنا چاہئے۔ خاص طور پر شوہروں کو اُن کی بیویوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾

ترجمہ: ''اور تم اُن کے ساتھ نیک سلوک کرو، پھر اگر وہ تمہیں پسند نہ آئیں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند نہ کرو اور اللہ اس میں بھلائی رکھ دے، (النساء:19)''۔

یعنی اگر تمہیں اپنی بیویاں پسند نہ آئیں تو صبر سے کام لو، ممکن ہے کہ اس میں تمہارے لئے کوئی بہتری ہو۔ ان کلماتِ مبارکہ میں شوہروں کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ اگر بالفرض تمہاری بیوی تمہیں بدصورتی کی وجہ سے ناپسند ہو، تب بھی حتی الامکان اپنی طبیعت پر جبر کر کے اسے برداشت کرو اور طلاق نہ دو۔ ہو سکتا ہے شکل و صورت کی کمی کو اللہ تعالیٰ اس کے حسنِ اخلاق سے پورا فرما دے اور اس کی اچھی سیرت و کردار کی بدولت تمہارا گھر امن و سکون کا گہوارہ بن جائے۔ اور اگر وہ بداخلاق ہے اور تم اس کی اخلاقی کمزوری برداشت کر لو تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس صبر کی جزا و انعام کے طور پر تمہیں خوبصورت اور اعلیٰ ذہنی و جسمانی استعداد کی حامل اولاد سے نواز دے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی کے مزاج میں پوری مطابقت ہو جائے، دونوں کی سوچ ایک ہو جائے۔ اگر ایسا حسنِ اتفاق

ہو جائے تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا بندے پر بے پایاں فضل وانعام اور کرم ہوگا۔ شکل وصورت، رنگ روپ اور مزاج میں تنوع اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ۝

ترجمہ: ''اس کی (قدرت) کی نشانیوں میں سے (ایک) آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا (ایک دوسرے سے) مختلف ہونا ہے، بے شک اس میں دنیا والوں کے لئے نشانیاں ہیں، (الروم:22)''۔

لہٰذا اگر شوہر اور بیوی کی سوچ میں فرق ہو بلکہ تضاد ہو تو ایسے شوہروں کو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ فَاِذَا شَهِدَ اَمْرًا فَلْیَتَكَلَّمْ بِخَیْرٍ اَوْ لِیَسْكُتْ وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَیْرًا فَاِنَّ الْمَرْاَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَیْءٍ فِی الضِّلَعِ اَعْلَاهُ اِنْ ذَهَبْتَ تُقِیْمُهٗ كَسَرْتَهٗ وَاِنْ تَرَكْتَهٗ لَمْ یَزَلْ اَعْوَجَ اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، وہ جب کسی چیز کو دیکھے تو یا تو اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔ عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کرو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی کا اوپر کا حصہ زیادہ ٹیڑھا ہے اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو گے تو توڑ دو گے اور اگر تم نے اس کو (اُس کے حال پر) چھوڑ دیا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی، عورتوں سے خیر خواہی کرو (یعنی حکمت وتدبیر اور صبر واستقامت کے ساتھ ان کی اصلاح کرو)، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:3539)''۔ ایک اور روایت میں ہے:

اِنَّ الْمَرْاَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ لَنْ تَسْتَقِیْمَ لَكَ عَلٰی طَرِیْقَةٍ، فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا، اِسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَبِهَا عِوَجٌ، وَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِیْمُهَا كَسَرْتَهَا وَكَسْرُهَا طَلَاقُهَا۔

ترجمہ:''عورت ''پسلی'' سے پیدا کی گئی ہے،وہ سیدھا کرنے سے سیدھی نہیں ہوگی،اگرتم اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوتواس کی کجی کے باوجوداس سے فائدہ اٹھاؤ،اگرتم اس کوسیدھا کرنے لگوگےتواس کوتوڑدوگے،اوراس کاتوڑنااسےطلاق دیناہے۔

(صحیح مسلم،رقم الحدیث:3536)

عورت کوٹیڑھی پسلی سےتشبیہ دینے کامقصد یہ نہیں کہ اُس کی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ شوہرکوتعلیم دی گئی ہے کہ پیارومحبت اورنرمی سے اسے سمجھائے۔اوربعض صورتوں میں اس کی طبعی کمزوریوں کے باوجوداس سے نباہ کرے۔جوعورت شوہرکے لئے تکلیف وایذاکاسبب بنتی ہو،اُس کے لئےرسول اللہ ﷺ کافرمان ہے:

عَنْ مُعَاذِبْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَاتُؤْذِیْ اِمْرَأَةٌ زَوجَهَا اِلَّا قَالَتْ زَوجَتُهُ مِنَ الْحُورِ الْعِینِ لَاتُؤْذِیهِ قَاتَلَكِ اللهُ! فَاِنَّمَا هُوَعِنْدَكَ دَخِیلٌ أَوشَكَ اَنْ یُفَارِقَكِ اِلَیْنَا۔

ترجمہ:''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی عورت اپنے شوہرکوتکلیف پہنچاتی ہے،توحوروں میں اس کی بیوی کہتی ہے کہ اسے تکلیف نہ دو،اللہ! تجھے ہلاک کرے، یہ توتیرے پاس چندروز کے لئے ہے۔عنقریب یہ (وفات کے بعد) تجھے چھوڑکرہمارے پاس آجائے گا''۔

(سنن ترمذی،رقم الحدیث :1177،سُنن ابن ماجہ 2014 :،مسنداحمد:22162)

اگرکوئی عورت شریعت کےاحکام سن کربھی اپنے رویے سے بازنہ آئےتوقرآن مجید میں اسے''ناشزہ''(نافرمان) قراردیاگیاہےاوراس کیلئےقرآن مجید میں تدریجی اصلاح کا جوطریقہ تعلیم فرمایاہے،وہ یہ ہے :وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ

ترجمہ:''اور تمہیں جن عورتوں کی نافرمانی کااندیشہ ہو،اُنہیں سمجھاؤاور(اگرنصیحت بےاثر ثابت ہوتو) خواب گاہوں میں ان سےعلیحدہ رہواور(پھربھی بازنہ آئیں تو) انہیں (تنبیہ

کے طور پر معمولی) مار پیٹ کرو، (النساء: 34)"۔ اس آیت مبارکہ میں نافرمان بیوی کی اصلاح کے لئے تین مرحلے تجویز کئے گئے ہیں:

(۱) اُسے پیار و محبت سے سمجھائیں، واعظانہ اور ناصحانہ انداز میں اسے اس کے رویئے کے برے نتائج سے آگاہ کریں، چنانچہ فرمایا: فَعِظُوْهُنَّ، یعنی انہیں نصیحت کرو۔

(۲) اگر وعظ و نصیحت کارگر ثابت نہ ہو تو تنبیہ کے طور پر خواب گاہ میں اس سے علیحدگی اختیار کرو، شاید اُسے سمجھ آجائے۔ یہ قطع تعلق نفرت کے جذبے سے نہیں بلکہ اصلاح کی نیت سے کیا جائے، اس کے لئے فرمایا: وَاهْجُرُوْهُنَّ، یعنی عارضی طور پر ان سے دوری اختیار کرو۔

(۳) اگر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو تو تنبیہ کے طور پر معمولی مار پیٹ کی اجازت ہے، لیکن چہرے پر تھپڑ مارنے یا ضربِ شدید کی اجازت نہیں ہے۔

بیوی کے دائمی مریض ہونے کی صورت میں دوسری شادی کا حق

سوال: 106

ایک شخص جس کی شادی چار پانچ سال قبل ہوئی، اس کے تین بچے بھی ہیں۔ ابھی بلڈ ٹیسٹ سے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو ہیپاٹائٹس سی یعنی انتہائی درجے کا یرقان ہے، جو بہت خطرناک مرض ہے۔ میاں بیوی کے ازدواجی تعلق سے شوہر کو یہ بیماری لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی آپس میں ملنے (یعنی ازدواجی تعلق قائم کرنے) سے سختی سے منع کر دیا ہے۔ گذارش یہ ہے کہ کیا ایسی صورت میں مرد کو دوسری شادی کی اجازت ہے؟، جبکہ وہ اپنی پہلی بیوی اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اس صورت میں پہلی بیوی اور اس کے والدین دوسری شادی کی اجازت نہ دیں تو مرد کو کیا کرنا چاہئے جب کہ دوسری شادی اس کی ضرورت ہے، برائے کرم قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

(محمد الطاف قادری، بلاک 20 فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ پہلی بیوی اور بچوں کے حقوق کی مکمل پاس داری

کرتے ہیں اور آپ کو اپنے فطری تقاضے کی تکمیل کے لئے دوسری بیوی کی ضرورت ہے اور آپ اس کی مالی استطاعت بھی رکھتے ہیں، تو آپ کو دوسری شادی کی اجازت ہے۔ شرعاً اس کے لئے آپ اپنی پہلی بیوی یا سسرال کی اجازت و منظوری کے پابند نہیں ہیں۔ لیکن آپ کو دونوں بیویوں کے درمیان مساوات برتنی ہوگی، ایام کی تقسیم اور نان نفقے میں ایک ہی معیار رکھنا ہوگا۔

مفتی وقارالدین قادری رحمۃ اللہ علیہ سے دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی سے اجازت سے متعلق سوال ہوا، آپ نے اس کے جواب میں لکھا: ''قرآن کریم میں آزاد مرد کو ایک سے زائد شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس میں پہلی بیوی کی رضامندی یا عدمِ رضامندی کو کوئی دخل نہیں ہے، ہاں یہ تاکید فرمائی ہے کہ جب ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان میں عدل کرے گا۔ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ اور بود و باش رکھے گا اور اگر برابری نہیں کرے گا، تو اس پر حدیثوں میں سخت وعیدیں ہیں۔ (وقارالفتاویٰ جلد سوم، 95-94)

آپ کی پہلی بیوی کو چاہیے کہ آپ کو بخوشی دوسری شادی کی اجازت دے دیں، اگرچہ یہ اجازت لینا شرعاً ضروری نہیں ہے۔ اور اگر آپ اپنی اولاد کی خیر خواہی کے لئے اپنی خواہشات پر قابو پا سکتے ہوں، تو اس ایثار پر آپ اجر کے مستحق ہوں گے۔

خلع کے بعد دوبارہ نکاح کا حکم

سوال: 107

میری شادی جولائی 1997ء میں ہوئی۔ ایک سال کے بعد اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا۔ حالات شروع دن سے ہی اچھے نہیں تھے، رفتہ رفتہ اس نہج پر پہنچ گئے کہ مجھے مجبوراً والدہ کے گھر آنا پڑا، جس میں بڑا کردار ان کے گھر والوں کا تھا۔ عدالت جانے سے پہلے میرے گھر والوں نے مصالحت کی ہر ممکن کوشش کی۔ 30 اکتوبر 2001ء کو عدالت سے خلع ہوگئی، تب سے اب تک میرے شوہر اپنے بیٹے سے متواتر ملتے رہے۔ اب وہ اپنی غلطیاں تسلیم کرتے ہیں اور صلح کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں ہم میں صلح کی کوئی

گنجائش ہے۔کیا ہم پھر ایک ہو سکتے ہیں اور اس کا کیا طریقہ ہوگا؟۔کیا واپس جانے کے لئے حلالہ کرنا ہوگا؟(شمع سلطانہ، ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی)

جواب:

ابتدائی طور پر فیملی کورٹ میں دو مقدمے دائر کئے گئے تھے، ایک شمع سلطانہ بنت شوکت علی خان کی جانب سے اپنے شوہر محمد داؤد ولد سلیمان کے خلاف ''فسخِ نکاح بر بنائے خلع'' کا اور دوسرا مطالبہ محمد داؤد ولد سلیمان کی جانب سے اپنی بیوی شمع سلطانہ بنت شوکت علی خان کے خلاف حقوقِ زوجیت کا۔ بعدازاں فیملی جج کی عدالت میں محمد داؤد ولد سلیمان نے خلع پر رضامندی ظاہر کردی، لہٰذا یہ خلع درست ہے اور خلع ایک طلاق بائن کے حکم میں ہوتا ہے اور عورت پر لازم ہوتا ہے کہ اگر اس نے مہر وصول کیا ہے تو شوہر کو واپس کردے، وصول نہیں کیا تو مطالبۂ مہر سے دستبردار ہوجائے۔ خلع کے بعد زوجین عدت کے اندر اور عدت گذرنے کے بعد دونوں صورتوں میں باہمی رضامندی سے نیا مہر مقرر کر کے عقدِ ثانی کر سکتے ہیں، لیکن یہ طلاق بائن بصورتِ خلع آئندہ ممکنہ طلاقوں کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہے گی۔ اگر خدانخواستہ شوہر نے دو طلاقیں مزید دیدیں، تو اس کے ساتھ جمع ہوکر طلاقِ مغلظہ ہوجائے گی، پس زوجین کو محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔

نکاح میں لڑکے اور لڑکی کی رضامندی ضروری ہے

سوال:108

کیا شرعی طور پر بالغ لڑکے اور لڑکی کو اپنی پسند کی شادی کرنے کا حق اسلام میں حاصل ہے؟، کیا اُن کے والدین اُن کی مرضی کے خلاف نکاح کرسکتے ہیں؟۔

(محسن مسعود، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

شرعاً عاقل وبالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح اُن کی مرضی کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔ نکاح کے صحیح طور پر منعقد ہونے کے لئے دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ

ترجمہ:'' تو تمہیں جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو،(النساء:3)''۔شرعاً عاقلہ بالغہ عورت کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہوسکتا، حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ جَارِيَةً بِكْرًا أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ ، فَذَكَرَتْ أَنَّ أَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ، فَخَيَّرَهَا النَّبِيُّ ﷺ ۔

ترجمہ:'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان لڑکی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اس کے باپ نے اُس کا نکاح کردیا ہے اور وہ اس کو ناپسند کرتی ہے، نبی کریم ﷺ نے اُسے اختیار دیا کہ چاہے تو اس نکاح کو قائم رکھے ورنہ رَد کردے،(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2089)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں :

لا یجوز نکاح أحد علی بالغة صحیحة العقل من أب أو سلطان بغیر اذنها بکرا کانت أو ثیباً فان فعل ذلك فالنكاح موقوف علی اجازتها فان اجازته جاز وان ردّته بطل كذا فی السراج الوهاج۔

ترجمہ:'' کسی بھی عاقلہ، بالغہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، خواہ وہ نکاح اس کے والد یا حاکمِ وقت نے منعقد کیا ہو، وہ ثیبہ (شوہر دیدہ) ہو یا کنواری، اگر کسی نے یہ نکاح کر بھی دیا تو اُس (لڑکی) کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر اطلاع ملنے پر وہ اسے قبول کرلے (اور قائم رکھے) تو جائز ہوگا اور اگر وہ رَد کردے تو باطل ہوجائے گا،'' السراج الوہاج'' میں بھی اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:287، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

عاقل و بالغ لڑکی اور لڑکا والدین کی مرضی کے بغیر بھی اپنے کفو (Equal Status) کے ساتھ نکاح کرسکتے ہیں لیکن سعادت مندی یہ ہے کہ والدین کو راضی کرلیں۔

نکاح پر نکاح کا حکم

سوال :109

اگر کسی لڑکی یا عورت کا دوسرا نکاح کروادیا جائے اور وہ پہلے سے کسی کے نکاح میں ہو، شرعی اعتبار سے اُس کا کون سا نکاح صحیح ہے؟۔ جن لوگوں نے لڑکی کی رضامندی کے بغیر زبردستی دوسرا نکاح کروایا، اُن کے متعلق کیا حکم ہے؟ (محسن مسعود، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب :

شادی شدہ عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے قطعاً نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ، ترجمہ: ''اور (تم پر حرام کی گئی ہیں) وہ عورتیں جو پہلے سے دوسروں کے نکاح میں ہیں، (النساء:24)۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

لایجوز للرجل أن یتزوج زوجۃ غیرہ وکذلک المُعتَدَّۃ کذا فی السراج الوھاج

ترجمہ: ''کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی سے نکاح کرے اور اسی طرح ایامِ عدت میں مطلقہ عورت سے بھی نکاح جائز نہیں ہے، ''السراج الوہاج'' میں اسی طرح لکھا ہے''، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:280)۔

شادی شدہ عورت کا جان بوجھ کر دوسری جگہ نکاح کرنا ہرگز جائز نہیں، باطل وحرام ہے ۔جن لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ عورت منکوحہ ہے اور یہ جاننے کے باوجود وہ لوگ نکاح کے گواہ بنے یا نکاح پڑھایا، یا یہ نکاح کروایا، اگر انہوں نے یہ کام حلال سمجھ کر کیا ہے، تو ان سب پر توبہ وتجدیدِ اسلام لازم ہے اور شادی شدہ ہیں تو تجدیدِ نکاح بھی لازم ہے۔ اور اگر اس کو حرام سمجھتے ہوئے کیا ہے، تو یہ فسق وفجور ہے اور ضلالت ہے، اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے، وہ سب لوگ اپنی اس معصیت پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔

باپ کی بیوی کی (سابق شوہر سے) بیٹی سے بیٹے کا نکاح

سوال :110

ایک بیوہ یا مطلقہ عورت کسی شخص سے شادی کرے تو اس کے سابق شوہر سے جو بیٹی ہے، اس کا اُس شوہر ثانی کے کسی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے سے نکاح ہوسکتا ہے؟، (ڈاکٹر اشفاق احمد، راولپنڈی)۔

جواب:

یہ نکاح شرعاً جائز ہے۔ایک شخص نے کسی مُطلّقہ یا بیوہ عورت سے عدّت گذرنے کے بعد نکاح کیا ہواور اُس عورت کی سابق شوہر سے بیٹی ہو،تو اس کے ساتھ اِس زوجِ ثانی کے اُس بیٹے کا نکاح جائز ہے، جو اُس کی کسی اور بیوی کے بطن سے ہے۔اسی طرح اگر ایک شخص نے کسی مُطلّقہ یا بیوہ عورت سے عدت گزرنے کے بعد نکاح کیا ہواور اُس عورت کی سابق شوہر سے بیٹی ہے، تو اُس بیٹی سے اِس زوجِ ثانی کا باپ نکاح کرسکتا ہے، کیونکہ ان دونوں نکاحوں میں بیوی اور شوہر کے درمیان حرمتِ نکاح کا کوئی سبب نہیں ہے۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

واما بنت زوجة أبيه أو ابنه فحلال، ترجمہ: ''اور باپ کی بیوی کی بیٹی اور بیٹے کی بیوی کی بیٹی حلال ہے (یعنی یہ نکاح جائز ہے)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:4،ص:84)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا: زید کا ایک بیٹا ہے اور ہندہ کی ایک بیٹی، زید کا بیٹا ہندہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور زید ہندہ کی بیٹی سے، اس صورت میں یہ دونوں نکاح ہو سکتے ہیں یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: ''یہ دونوں نکاح حلال ہیں، قال اللہ تعالیٰ وَاُحِلَّ لَکُم مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ (آیت میں جن محرمات کا ذکر ہے) ان کے سوا باقی عورتوں کے ساتھ تمہارے لئے نکاح حلال ہے، النسا: 24)۔ظاہر ہے کہ زید کے بیٹے کے لئے ہندہ اگر ہوگی تو باپ کی ساس ہوگی۔ وذالك اذا تقدم نكاح زيد (اور یہ جب ہے کہ زید کا نکاح پہلے ہوا ہو) اور باپ کی ساس حلال ہے جبکہ وہ نانی نہ ہو۔ فی

ردالمحتار قال الخیرالرملی لا تحرم ام زوجة الاب۔ ترجمہ: ''ردالمحتار میں ہے کہ خیر الدین رملی نے فرمایا: باپ کی ساس حلال ہے۔اور زید کے لئے ہندہ کی بیٹی اگر ہو گی، تو بہو، یعنی زوجۂ پسر کی بیٹی ہوگی۔ وھذا اذا سبق نکاح ابن زید (یہ جب ہے کہ زید کے بیٹے کا نکاح پہلے ہوا ہو) اور بہو کی بیٹی حلال ہے جبکہ وہ اپنی پوتی نہ ہو۔فی ردالمحتار اما بنت زوجة ابنه فحلال۔ ردالمحتار میں ہے: بیٹے کی بیوی کی بیٹی حلال ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 11،ص: 317-316، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

بالغہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا

سوال:111

میرے شوہر کئی مرتبہ (تین بار سے زائد) مجھے طلاق دے چکے ہیں۔ان سے کوئی پوچھتا ہے کہ تمہاری بیوی کیا ہے؟، تو کہتے ہیں: ''وہ میری طرف سے فارغ ہے''۔ مجھے یہ بتائیے کہ مجھے طلاق ہوئی یا نہیں اور کتنی طلاقیں ہوئیں؟، یہ مغلّظہ ہے یا رجعی؟، کیا عدت گزرنے کے بعد میں دوسری شادی کے لئے آزاد ہوں؟، اگر والدین میرا زبردستی نکاح کرادیں، تو شرعاً منعقد ہوگا یا نہیں؟، (عالیہ، کراچی)۔

جواب:

اگر آپ کا دعویٰ درست ہے اور گواہوں کے ذریعے یا شوہر کے اقرار سے طلاقِ صریح ثابت ہے، تو آپ پر تین طلاقیں ہوگئیں اور تین طلاق کے بعد تحلیلِ شرعی کے بغیر رجعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ارشادِ ربانی ہے: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا

ترجمہ: ''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دیدے، تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ:230)۔

آزاد عاقل و بالغ لڑکی کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔

رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: (۱) اَلثَّیِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِھَا مِنْ وَلِیِّھَا، والبکر تستامر واذنھا سکوتھا، ترجمہ: ''بیوہ (یا مطلّقہ عورت) اپنے ولی کی بہ نسبت اپنے (نفس کی) زیادہ حق دار ہے اور کنواری لڑکی سے بھی اجازت لی جائے گی، اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3366)''۔

(۲) لَاتُنْکَحُ الثَّیِّبُ حَتّٰی تُسْتَاْمَرَ، وَلَاتُنْکَحُ الْبِکْرُ حَتّٰی تُسْتَاْذَنَ، وَاِذْنُھَا الصُّمُوْتُ

ترجمہ: ''بیوہ یا مطلقہ عورت کا نکاح اس کے مشورے کے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح بھی اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے اور اس کا خاموش رہنا اس کی اجازت ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5136، صحیح مسلم: 1419 سنن ترمذی: 1109)۔

بالغہ لڑکی (خواہ کنواری ہو یا بیوہ یا مطلّقہ) کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر صحیح نہیں ہے، وہ اپنے نکاح کی اپنے ولی کی نسبت زیادہ حق دار ہے۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لا یجوز نکاح أحد علی بالغة صحیحة العقل من أب أو سلطان بغیر اذنھا بکرا کانت أو ثیّباً فان فعل ذلك فالنکاح موقوف علی اجازتھا فان اجازته جاز وان ردّته بطل کذا فی السراج الوھاج۔

ترجمہ: ''کسی بھی عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، خواہ وہ نکاح اس کے والد یا حاکمِ وقت نے منعقد کیا ہو، اگر کسی نے (اس کی اجازت کے بغیر) یہ نکاح کر بھی دیا ہو، تو یہ نکاح اُس (لڑکی) کی اجازت پر موقوف ہے، اگر اطلاع ملنے پر وہ اسے قبول کرلے (اور قائم رکھے) تو جائز ہے اور اگر وہ رَد کردے تو نکاح باطل ہوجائے گا۔ ''السراج الوہاج'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 287)۔

لہٰذا آپ عدت گزرنے کے بعد اپنی مرضی سے جہاں چاہیں، نکاح کرسکتی ہیں، لیکن اپنے والدین کو بھی اس پر راضی کرلیں تو یہ بات آپ کے لئے سعادت کا باعث ہوگی۔

شوہر کا بیوی کو یہ کہنا کہ: ''تو میری طرف سے فارغ ہے''، یہ کنایہ ہے اور اس کا مدار

شوہر کی نیت پر ہے، اگر اس نے طلاق کی نیت سے یا غصے کی حالت میں کہا ہو تو ایک طلاقِ بائن واقع ہوگی اور عدت گزرنے کے بعد وہ عورت آزاد ہے۔ اگر اس کلمے کا اعادہ عدت گزرنے کے بعد کیا ہو، تو وہ غیر مؤثر ہے۔ عدت کے دوران یا عدت گزرنے کے بعد وہ دونوں تجدیدِ نکاح کر سکتے ہیں۔ پہلا مہر عدمِ ادائیگی کی صورت میں شوہر پر واجب رہے گا اور عقدِ ثانی کی صورت میں از سرِ نو مہر مقرر کرنا ہوگا۔

بلوغت کے بعد نابالغ لڑکی کے نکاح کے فسخ کا مسئلہ

سوال:112

ایک لڑکے اور لڑکی کا نکاح سنِ بلوغت سے پہلے ان کے والدین نے کر دیا تھا، اب بلوغت کے بعد لڑکی اس نکاح پر راضی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا لڑکی کو نکاح فسخ کرنے کا حق ہے یا نہیں؟، فقہ حنفی کی رُو سے جواب عنایت فرمائیں، (غلام فرید، آزاد کشمیر)

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق نابالغ لڑکی کا نکاح اگر اس کے باپ نے کیا ہو، تو وہ صحیح طور پر منعقد ہو جاتا ہے اور بالغ ہونے کے بعد لڑکی کو اسے فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

فان زوجهما الابُ والجدُّ فلا خیارَ لهما بعد بلوغهما وان زوجهما غیر الابِ والجدِّ فلکلِّ واحدٍ منهما الخیارُ اذا بلغَ، ان شآءَ اقام علی النکاح وان شآءَ فسخ وهذا عند ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله تعالیٰ ویشترط فیه القضاءُ۔

ترجمہ: "اگر نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح ان کے باپ اور (باپ کی عدمِ موجودگی میں) دادا نے کیا ہو، تو ان دونوں کو بالغ ہونے کے بعد (فسخِ نکاح کا اختیار نہیں ہے)، اور اگر ان دونوں کا نکاح باپ اور دادا کے علاوہ کسی اور ولی نے کیا ہو، تو بالغ ہونے پر ان دونوں کو اختیار حاصل رہے گا کہ اگر چاہیں تو نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں، اور یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے اور اس میں قضا شرط ہے"، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص:285)

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: وللولی انکاح الصغیر والصغیرۃ جبراً---- لزم النکاح ان کان الولی ابا اوجدا،

ترجمہ: ''اگر ولی باپ اور دادا ہوں تو انہیں نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح جبراً کرنے کا اختیار ہے اور نکاح لازم ہو جاتا ہے، (یعنی ان کی اجازت پر موقوف نہیں ہے اور نہ ہی اس میں خیارِ بلوغ ہے، یہ اس صورت میں ہے) جب کہ ولی باپ یا دادا ہوں''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:4،ص:127)

مسئلۂ خیارِ بلوغ کی وضاحت

گذشتہ دنوں خیارِ بلوغ کے موضوع پر ایک فتویٰ ہم نے روزنامہ ایکسپریس کے کالم ''تفہیم المسائل'' میں شائع کیا، اس مسئلے کی تفصیل نہ ہونے کی وجہ سے کئی علماء کرام نے ٹیلیفون پر وضاحت چاہی، لہٰذا ہم اس مسئلے کی تفصیل قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تا کہ ہماری طرف سے اختصار کی بنا پر جو غلط فہمی ہوئی، اس کا ازالہ ہو اور قارئین حقیقت حال سے آگاہ ہوں۔ نابالغ لڑکے اور لڑکی کے نکاح کی بابت فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ اگر ان کا نکاح ان کے باپ یا دادا نے کیا ہو، تو بالغ ہونے پر لڑکی یا لڑکے کو نکاح کے فسخ کا اختیار حاصل نہیں ہے، جو عبارت ہم نے گذشتہ فتوے میں نقل کی اس کا مفاد یہ ہے کہ ''اگر باپ یا دادا کے علاوہ دیگر اَولیاء (یعنی سرپرستوں Guardians) میں سے کسی اور نے ان کا نکاح کر دیا ہو، تو بالغ ہونے پر انہیں خیارِ بلوغ حاصل ہے''۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر المرغینانی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح ان کے باپ یا دادا نے کروایا، تو انہیں بالغ ہونے کے بعد (نکاح فسخ کرنے کا) اختیار نہیں، (ہدایہ اولین، ص:317)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

فان زوجھا الاب والجد فلا خیار لھما بعد بلوغھما وان زوجھا غیر الاب، والجد فلکل واحد منھما الخیار اذا بلغ ان شاء اقام علی النکاح وان شاء فسخ وھذا عند

ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله تعالیٰ ویشترط فیه القضاء بخلاف خیار العتق کذا فی الهدایة۔

ترجمہ: ”نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح ان کے باپ اور دادا نے کروایا، تو انہیں بالغ ہونے کے بعد (نکاح فسخ کرنے کا) اختیار نہیں، اگر باپ اور دادا کے علاوہ کسی اور شخص یا ولی نے ان کا نکاح کیا، تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو یہ اختیار ہے کہ جب بالغ ہو جائیں تو چاہیں تو اس نکاح کو قائم رکھیں اور اگر چاہیں تو فسخ کر دیں، یہ (حکم) امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک ہے، اور اس فسخ کے لئے قضا (قاضی کا حکم) شرط ہے، یہ خیارِ عتق کے خلاف ہے (یعنی خیارِ عتق میں قضاءِ قاضی شرط نہیں ہے)، ہدایہ میں بھی اسی طرح ہے“۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص:285، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

مذکورہ فتوے میں امام احمد رضا قادری قُدِّس سِرُّہ العزیز کی مُحوَّلہ عبارت کا تعلق اس نکاح سے ہے جو باپ یا دادا کے علاوہ کسی اور ولی نے کیا ہو، جس کی پوری عبارت مع سوال پیش کی جاتی ہے: سوال: زید نابالغ کا نکاح ہندہ نابالغہ کے ساتھ ان کے وارثوں نے کیا، یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟ اور زید یا ہندہ بعد بلوغ اسے فسخ کر سکتے ہیں یا نہیں؟۔

جواب: سائل مظہر کہ زید کا نکاح اُس کے باپ نے کیا، اور باپ کا کیا ہوا نکاح لازم ہوتا ہے یعنی اولاد کو اس کے فسخ کا اختیار نہیں ہوتا۔

فی الدر المختار لزم النکاح ولو بغبن فاحش بزیادة مهرہ او بغیر کفؤان کان الولی ابا او جدا ولم یعرف منهما سُؤ الاختیار

ترجمہ: ”درمختار میں ہے: جب باپ یا دادا نے اپنی ولایت میں نکاح کیا ہو، تو اگرچہ مہر میں غیر معمولی کمی یا اضافہ کیا ہو یا غیر کفو میں کیا ہو، تو وہ نکاح لازم ونافذ ہوگا، بشرطیکہ باپ اور دادا کا اس سے پہلے اِس اختیار کا غلط استعمال مشہور نہ ہو“۔

اور ہندہ کا نکاح اس کے چچا نے کیا کہ ہندہ کا باپ مر چکا تھا، اس صورت میں اگر زید ہندہ کا کفو نہیں یعنی اس سے قوم یا دین یا پیشہ وغیرہ امور معتبرہ میں ایسا گھٹا ہوا ہے، جس کے

ساتھ نکاح ہونا باعثِ عار و بدنامی ہو یا یہ کہ ہندہ کا جس قدر مہر مثل تھا اُس سے بہت کم باندھا گیا تو ان صورتوں میں نکاح اصلاً صحیح نہ ہوا، یہاں تک کہ اگر ہندہ بالغہ ہو کر اسے جائز رکھے تب بھی جائز نہ ہوگا۔

فی الدر المختار ان کان المزوج غیر الاب وابیہ ولو الام لایصح النکاح من غیر کفؤ اوبغبن فاحش اصلا ومافی صدر الشریعۃ صح ولھما فسخہ وھم۔

ترجمہ: "درمختار میں ہے: اگر نکاح کرانے والا باپ اور دادا کے علاوہ کوئی اور ہو، خواہ ماں ہی ہو، تو غیر کفو میں یا مہر میں غیر معمولی کمی یا زیادتی کی صورت میں ایسا نکاح بالکل صحیح نہیں ہوگا اور جو صدر الشریعہ میں کہا گیا کہ ایسا نکاح صحیح ہے اور نابالغ لڑکا، لڑکی کو (بلوغت کے) بعد فسخ کا اختیار ہے، یہ محض وہم ہے"۔ اور اگر یہ بات نہیں بلکہ زید کفو ہے اور مہر مثل میں غیر معمولی کمی نہ کی ہو، تو نکاح صحیح ہو گیا مگر ہندہ کو اختیار ہے کہ بعد بلوغ فوراً اس نکاح کو رَد کر دے اور حاکمِ شرع کے حضور دعویٰ کر کے فسخ کرائے۔

فی الدر المختار وان کان من الکفؤ وبمھر المثل صح ولصغیر وصغیرۃ خیار الفسخ ولو بعد الدخول بالبلوغ اوالعلم بالنکاح بعدہ لقصور الشفقۃ بشرط القضاء للفسخ

ترجمہ: "درمختار میں ہے: "اگر مہرِ مثل پر اور کفوٗ میں نکاح کیا ہو، تو صحیح ہے، لیکن نابالغ لڑکے اور لڑکی کو فسخ کا اختیار ہے، اگرچہ (بلوغ سے پہلے) دخول ہو چکا ہو اور یہ اختیار بالغ ہونے کے ساتھ ہوگا (اگر نکاح ہونے کا علم نہیں تھا تو) بلوغ کے بعد نکاح کے علم ہونے کے ساتھ ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ اور دادا کے غیر میں شفقت کمزور ہوتی ہے، تاہم فسخ کرنے کے لئے قاضی کا حکم شرط ہے"۔

مگر اس صورت میں کہ ہندہ کنواری ہے، تو حالتِ بلوغ میں جس وقت نکاح پر مطلع ہو فوراً رَد کر دے اور پہلے سے مطلّع تھی تو بالغ ہوتے ہی معاً نکاح کو رد کر دے، تو نکاح فسخ ہو جائے گا لیکن اگر ذرا بھی دیر کی، تو نکاح لازم ہو جائے گا اور اسے فسخ کرانے کا اختیار نہ

رہے گا، بحوالہ درمختار لکھتے ہیں:

فی الدرالمختار بطل خیار البکر بالسکوت لو مختارۃ عالمۃ باصل النکاح ولایبتد الی آخر المجلس

ترجمہ:''درمختار میں ہے:''اطلاع ملنے پر باکرہ (کنواری) کا ارادۂ سکوت اس کے فسخ کے اختیار کو باطل کردیتا ہے، بشرطیکہ اپنے نکاح کے بارے میں اس کو علم ہو اور وہ بالغ ہو، تاہم فسخ کا اختیار مجلس کے آخر تک دراز نہیں ہوگا''(فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص:529)۔

نافرمان بیوی

سوال:113

میری اہلیہ گذشتہ چھ سال سے اپنی مرضی سے اپنی والدہ کے گھر رہ رہی ہیں۔ میں نے بہت کوششیں کیں کہ وہ میرے ساتھ آکر رہیں لیکن وہ میرے گھر واپس آنے کے لئے تیار نہیں۔ اُن کا موقف یہ ہے کہ اُن کی والدہ تنہا رہتی ہیں، لہٰذا میں اُن کے ساتھ سسرال میں رہوں جبکہ میرے والد بھی تنہا ہی ہیں، میں اُنہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ کیا میں اس صورت میں دوسری شادی کرسکتا ہوں، کیا مجھے اس کے لئے پہلی بیوی سے اجازت لینا ہوگی؟ اگر میں دوسری شادی کرلیتا ہوں تو کیا مجھے پہلی بیوی کو خرچہ دینا ہوگا؟۔ دو بیٹے ہیں ایک کی عمر 11 سال اور دوسرے کی 9 سال ہے، بچوں کے اخراجات کے لئے کیا حکم ہے؟

(کاشف عباسی، پی۔آئی۔بی کالونی، کراچی)

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ کی بیوی گذشتہ چھ سال سے آپ سے الگ رہ رہی ہیں اور آپ کے بلانے کے باوجود آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں رہنے کے لئے تیار نہیں ہیں جب کہ آپ ان حقوق میں کوتاہی نہیں کرتے، تو ایسی بیوی کو فقہ کی اصطلاح میں ''ناشزہ (نافرمان)'' کہا جاتا ہے اور ایسی بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمے نہیں ہوتا۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وان نشزت فلا نفقۃ لھا حتیٰ تعود الی منزلہ

ترجمہ: ''اگر عورت نافرمان ہو کر شوہر کے گھر سے نکل جائے تو جب تک وہ واپس (شوہر کے) گھر لوٹ کر نہ آجائے، اس کا نان نفقہ شوہر کے ذمے نہیں''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:545،مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ''الانوار لاعمال الابرار'' کی عبارت کا خلاصہ لکھتے ہیں:

لانفقة للناشزة وان قدر علی ردها الی الطاعة قهرا ولو هربت منه او خرجت بلا اذنه من بيته فناشزة

ترجمہ: ''نافرمان بیوی کے لئے نفقہ کا استحقاق نہیں اگر بیوی شوہر کا گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہو یا اُس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل گئی ہو تو وہ نافرمان ہی قرار پائے گی، خواہ وہ جبراً اُسے واپس لانے پر قدرت رکھتا ہو'' (فتاویٰ رضویہ، جلد 12،ص:473)۔

آپ کے بیٹے چونکہ اب شعور کی عمر کو پہنچ چکے ہیں، اس لئے آپ اُنہیں اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ بیوی کا آپ کی مرضی کے خلاف اپنی والدہ کے ہاں رہنا درست نہیں ہے اور نہ ہی اُسے یہ حق حاصل ہے کہ آپ کو سُسرال میں رہنے پر مجبور کرے۔ اگر آپ کی بیوی کے بھائی یا غیر شادی شدہ بہنیں ہیں، تو وہ اپنی ماں کی خدمت کرسکتی ہیں، لیکن اگر آپ کی ساس کی خدمت کے لئے آپ کی بیوی کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہے، تو شریعت یہ چاہتی ہے کہ ضابطے سے ہٹ کر تبرُّع اور فضل واحسان کی بنیاد پر ازدواجی رشتے کو قائم رکھا جائے۔ لہٰذا اگر آپ کے مکان میں اتنی گنجائش ہو کہ الگ کمرے میں آپ کی ساس رہ سکیں اور آپ کی بیوی آپ کے حقوق کو ادا کرتے ہوئے اپنی ماں کی خدمت بھی کرسکے اور آپ اُنہیں اِس کی اجازت دے دیں، تو یہ صلۂ رحمی ہوگی اور اس پر آپ اللہ تعالیٰ سے اجر کے حق دار ہوں گے یا آپ کے سُسرال کے مکان میں اتنی گنجائش ہو کہ آپ میاں بیوی کے ساتھ آپ کے والد کو بھی وہاں الگ کمرے میں رکھا جاسکتا ہو اور آپ اُن کی دیکھ بھال کرسکتے ہوں اور آپ کی سُسرال والے اس کے لئے وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کریں، تو یہ بھی ایک بہتر متبادل صورت ہوگی۔

ایک صورت فضل واحسان کی یہ ہوسکتی ہے کہ اگر آپ کی ساس کا گھر قریب ہے اور آپ کی بیوی دن کے وقت کچھ وقت کے لئے جاکر اپنی ماں کی دیکھ بھال کرسکتی ہیں، تو آپ اسے اس کی اجازت دے دیں۔ تاہم اگر اس طرح کی درمیانی صورت پیدا نہ ہوسکتی ہو تو بیوی پر شوہر کا حق مقدم ہے، حدیثِ پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ قُلْتُ يَارَسُولَ اللهِ! مَنْ أَعْظَمُ النَّاسِ حَقًّا عَلَى الْمَرْأَةِ؟، قَالَ زَوْجُهَا، قُلْتُ مَنْ أَعْظَمُ النَّاسِ حَقًّا عَلَى الرَّجُلِ؟ قَالَ أُمُّهُ۔

ترجمہ: ''ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: عورت پر لوگوں میں سے سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اُس کے شوہر کا۔ میں نے عرض کیا: مرد پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اُس کی ماں کا''۔ (المستدرک للحاکم، رقم الحدیث: 7418)۔

آپ کی بیوی کے بلا اجازت یا آپ کی اجازت کے ساتھ کافی عرصے تک الگ رہنے سے رشتۂ نکاح از خود ختم نہیں ہوتا۔ شوہر پر شریعت کی رُو سے عقدِ ثانی کی کوئی پابندی نہیں ہے، صرف ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں ان سب کے درمیان عدل قائم کرنا اور برابری کا سلوک کرنا لازم ہے۔ اور اگر شوہر عدل قائم نہ کرسکتا ہو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ اگر آپ کا بیان درست ہے، تو بیوی کا نافرمان ہونا آپ کے لئے عقدِ ثانی کی ضرورت کو واضح کرتا ہے۔

اگر آپ دوسری شادی کرلیتے ہیں اور پہلی بیوی کو اپنی مرضی سے اُس کی ماں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دیتے ہیں، تو اُس کا نفقہ آپ کے ذمے ہوگا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

النفقة فتجب للزوجة على زوجها ولو هي في بيت أبيها اذا لم يطالبها الزوج بالنقلة، به يفتى، وكذا اذا طالبها ولم تمنع أو امتنعت للمهر لاخارجة من بيته بغير حق وهي الناشزة حتى تعود ملخصا

ترجمہ: ''اگر بیوی اپنے باپ کے گھر پر ہو بشرطیکہ شوہر اُس سے اپنے گھر منتقل ہونے کا مطالبہ نہ کرے، تو اس بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے، اسی قول پر فتویٰ ہے۔ یا جب وہ مطالبہ کرے تو بیوی اس کے گھر آنے سے انکار نہ کرے یا شوہر کے گھر آنے سے انکار کا سبب یہ ہو کہ وہ مہر کی ادائیگی کا مطالبہ کر رہی ہے، تو ان تمام صورتوں میں شوہر پر اُس بیوی کا نفقہ واجب ہوگا۔ ہاں! البتہ اگر وہ ناحق شوہر کے گھر سے باہر رہ رہی ہو تو جب تک وہ شوہر کے گھر واپس نہ آئے، وہ ''ناشزہ (نافرمان)'' قرار پائے گی (اور اس کا نفقہ شوہر کے ذمے واجب نہیں ہوگا)، جب تک کہ وہ شوہر کے گھر واپس نہ آئے (یہ) درمختار کی عبارت کا خلاصہ ہے'' (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 5، ص: 222 تا 227)۔

خاتون کے پہلے شوہر سے اولاد کی کفالت دوسرے شوہر کی ذمہ داری نہیں

سوال:114

میرے پہلے شوہر سے 3 بچے موجود ہیں، میرے پہلے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے اس شوہر سے تین بچے ہیں اور میرا ایسا کوئی محرم مرد نہیں ہے جو میری اور میرے بچوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا۔ ایک شخص نے مجھ سے میرے بچوں کی دیکھ بھال کا وعدہ کر کے نکاح کیا۔ میرے پاس میرے پہلے شوہر کا مکان اور پلاٹ بھی ہے، اب میرا دوسرا شوہر یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے پہلے شوہر کا مال اُس کے سپرد کر دوں، جبکہ میں اُس سے اپنے بچوں کی پرورش اور اخراجات پورے کرتی ہوں۔ میرا دوسرا شوہر مجھ سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ بچوں کو خود سے الگ کر کے اکیلے اس کے ساتھ رہوں، کیا میرے شوہر کے یہ مطالبات شرعاً جائز ہیں؟۔

میرے دوسرے شوہر کی ایک پہلی بیوی بھی ہے اور اس سے اولاد بھی ہے جبکہ اس دوسرے شوہر کی مجھ سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ میرے دوسرے شوہر نے اپنی پہلی بیوی، بچوں کو گھر، خرچہ، نان نفقہ ہر چیز دے رکھی ہے اور مجھ پر کچھ خرچ نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ تم اپنے سابقہ شوہر کی جائیداد سے اپنا خرچہ پورا کرو۔ سوال یہ ہے کہ مرد کے ذمے عورت کے

کیا حقوق ہیں اور آیا میرے شوہر کا میرے سابق شوہر سے ملے ہوئے ترکے اور میرے موروثی مال پر کوئی حق ہے اور آیا میرے لئے رہائش کا انتظام اور نان نفقہ میرے موجودہ شوہر کے ذمے نہیں ہے؟۔ اگر میرا موجودہ شوہر مجھے نان نفقہ اور گھر دیتا ہے تو اس پر میرے سابق شوہر سے جو بچے ہیں ان کا بھی کوئی حق ہے؟۔ میرے موجودہ شوہر کی ماہانہ آمدنی ڈیڑھ لاکھ روپے ہے، اس میں سے میرا حصہ کتنا بنتا ہے؟۔ میرے موجودہ شوہر نے نکاح کے وقت دس لاکھ روپیہ اور 25 تولے سونا حق مہر عند الطلب مقرر کیا تھا، کیا میں اس کی حقدار ہوں؟ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے موجودہ شوہر نے مال کی وجہ سے مجھ سے نکاح کیا تھا اور اس کی نظر اسی مال پر تھی، کیونکہ وہ مجھ سے مطالبہ کرتا رہتا ہے کہ میں مکان بیچ کر سارا مال اسے کاروبار کے لئے دے دوں، (ایک دینی بہن، گلستان جوہر، کراچی)۔

جواب:

نکاح کے نتیجے میں مرد پر عورت کے جو حقوق واجب ہوتے ہیں، اُن میں بیوی کا نان نفقہ، بنیادی ضروریات اور رہائش کا انتظام کرنا شوہر کے ذمے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ

ترجمہ: ''گنجائش والے کو چاہیے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچہ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہو تو وہ اسی میں سے (حسب حیثیت) خرچہ دے جو اللہ نے اسے دیا ہے، اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اس نے اسے عطا کر رکھا ہے''، (الطلاق: 7)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مالدار اور تنگدست میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق اپنی بیوی کو نفقہ دے''۔ (روح المعانی ج15 ص 207)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ**

ترجمہ: ''اپنی بیویوں کو وہاں رکھو جہاں اپنی حیثیت کے مطابق تم خود رہتے ہو، اور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ''۔ (الطلاق: 6)

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں: ترجمہ: ''حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے یوں پڑھا ہے کہ جہاں تم خود رہتے ہو وہاں اپنی بیویوں کو رکھو اور اپنی مالی حیثیت کے مطابق انہیں نفقہ دو''۔ (روح المعانی جلد: 15 صفحہ: 206)۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث خطبۂ حجۃ الوداع کی بابت مذکور ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''عورتوں کا شوہروں پر یہ حق ہے کہ وہ دستور کے مطابق انہیں نفقہ دیں''۔

علامہ محمود آلوسی روح المعانی جلد نمبر 15، صفحہ: 206,205 پر ''اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

من تبعیض کے لئے ہے، یعنی اپنے رہائشی مکان کے کسی حصے میں اپنی بیوی کو رہائش دو''۔

اور ''وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''کہ رہائش میں انہیں تکلیف نہ دو''۔

اور ''لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''یوں کہ مکان یا مکان میں بیوی کے لئے مخصوص رہائشی حصے کو کسی دوسرے استعمال میں لا کر یا اس کے ساتھ ایسے افراد کو ٹھہرا کر، جن کے ساتھ وہ رہنا نہیں چاہتی، (اس طرح کے حربوں سے) اسے تکلیف پہنچا کر گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا جائے، قرآن کی رو سے منع ہے''۔

شریعت کی رو سے شوہر پر اپنی حیثیت کے مطابق بیوی کو جائے رہائش دینا لازم ہے، اگر وہ اتنی مالی استطاعت رکھتا ہے کہ اسے علیحدہ مکان میں رکھ سکے تو ایسا ہی کرے۔ اور اگر اس کی مالی حیثیت بیوی کو علیحدہ مکان دینے کی متحمل نہیں ہے تو پھر بھی بیوی کا یہ حق ہے کہ مشترکہ فیملی مکان میں اس کے لئے علیحدہ کمرہ یا حصہ مختص ہونا چاہیے، جس میں دوسروں کا عمل دخل نہ ہو اور اس علیحدہ حصے یا کمرے کے ساتھ باورچی خانہ، بیت الخلاء اور لازمی ضروریات کا اہتمام بھی ہو اور ایسی سہولت ہو کہ وہ اپنے علیحدہ حصے یا کمرے کو بند کر سکے۔

مذکورہ سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس شخص نے دوسرا نکاح محض عورت کے مال کے سبب کیا ہے، کسی عورت سے اُس کے مال و دولت کی خاطر نکاح کرنا ناپسندیدہ ہے اور حدیث مبارک میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے

عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَا تَزَوَّجُوا النِّسَاءَ لِحُسْنِهِنَّ۔ فَعَسٰى حُسْنُهُنَّ أَنْ يُرْدِيَهُنَّ، وَلَا تَزَوَّجُوهُنَّ لِأَمْوَالِهِنَّ فَعَسٰى أَمْوَالُهُنَّ أَنْ تُطْغِيَهُنَّ وَلٰكِنْ تَزَوَّجُوهُنَّ عَلَى الدِّيْنِ۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورتوں سے اُن کے حسن کے سبب نکاح نہ کرو، ممکن ہے اُن کا حسن اُنہیں پستی میں گرادے۔ اور نہ ہی عورتوں سے اُن کے مال کے سبب نکاح کرو، ممکن ہے کہ ان کا مال انہیں سرکشی پر آمادہ کرے، عورتوں سے اُن کے دین کے سبب نکاح کرو''۔ (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1859)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَنْ تَزَوَّجَ اِمْرَأَةً لِعِزِّهَا لَمْ يَزِدْهُ اللهُ اِلَّا ذُلًّا وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِمَالِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللهُ اِلَّا فَقْرًا

ترجمہ: ''جو شخص کسی عورت سے اُس کی عزت (Social Status) کے سبب نکاح کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کی ذلت میں اضافہ فرمادے گا۔ اور جو شخص کسی عورت سے اُس کے مال کے سبب نکاح کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کے فقر و تنگ دستی میں اضافہ فرمادے گا''۔
(المعجم الاوسط للطبرانی، رقم الحدیث: 2363)

مرد کے دوسرا نکاح کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ وہ دونوں بیویوں کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، دونوں کے درمیان عدل قائم کرے، یعنی دونوں کو ایک معیار کی رہائش، ایک ہی معیار کی خوراک اور مصارف زندگی فراہم کرے اور دونوں میں ایام کی تقسیم بھی برابر برابر کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً،
ترجمہ: ''یعنی اگر تمہیں خدشہ ہو کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان تم عدل قائم نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو''۔ (النساء: 3)

اس آیت میں یہ گنجائش ہے کہ جو شخص مالی اور جسمانی طور پر ایک سے زائد بیویاں رکھ سکتا ہے اور ان بیویوں کے درمیان عدل بھی قائم کرتا ہے، تو وہ ایک سے زیادہ نکاح کرسکتا ہے، اور اگر وہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرسکتا، تو پھر اسے چاہئے کہ صرف ایک بیوی پر اکتفا کرے۔ شرعاً قیامِ عدل کی شرط کا لحاظ کرتے ہوئے ایک سے زائد نکاح کی اجازت ہے، بشرطیکہ تمام بیویوں کے درمیان ایام کی تقسیم برابر برابر کرے اور رہائش ،لباس اور طعام (یعنی نان نفقے) کا معیار بھی یکساں رکھے۔

احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ كَانَتْ لَهُ اِمْرَاَتَانِ فَمَالَ اِلٰی اِحْدٰاهُمَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَشِقُّهُ مَائِلٌ

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن میں (عدل قائم نہ کرتا ہو بلکہ) صرف ایک کی طرف میلان رکھتا ہو تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ مائل (جھکا ہوا) ہوگا''۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2126)

(۲) اِذَا كَانَ عِنْدَ الرَّجُلِ اِمْرَاَتَانِ فَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَشِقُّهُ سَاقِطٌ۔

ترجمہ:''جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن کے درمیان عدل نہیں کرتا تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ ساقط (بے کار) ہوگا''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1144، ابوداؤد:2132، ابن ماجہ:1969، مسند احمد:25165)

مہر عورت کا شرعی حق ہے جسے وصول کرنے کا اسے مکمل اختیار ہے، مہر کسی بھی قسم کا ہو، ہر صورت میں اُس کی ادائیگی لازم ہے۔

آپ کے بیان کے مطابق آپ کے شوہر نے دس لاکھ روپے اور پچیس تولے سونا مہر عند الطلب مقرر کیا تھا، تو آپ کے مطالبہ پر شوہر کے ذمے اس مہر کا ادا کرنا لازم ہے۔ شریعت کی رُو سے شوہر پر لازم ہے کہ دونوں بیویوں کو ایک معیار کا نان نفقہ (یعنی) یکساں

معیار کی رہائش گاہ اور مصارف زندگی) فراہم کرے اور دونوں کے درمیان ایام کی تقسیم بھی برابر کرے۔ سوال میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں، اگر درست ہیں تو آپ کے ساتھ شوہر کا برتاؤ عادلانہ نہیں ہے، یہ احکامِ شریعت کی صریح خلاف ورزی ہے اور ان کو اس وعید سے ڈرتے رہنا چاہیے جو رسول اللہ ﷺ نے احادیث میں بیان فرمائی ہے۔

آپ کے پاس جو اپنا موروثی اور سابق شوہر کے ترکے سے مال ہے، اس پر آپ کے موجودہ شوہر کا کوئی حق نہیں ہے، آپ کی پہلے شوہر سے اولاد کا نان نفقہ اور کفالت ونگہداشت دوسرے شوہر کے ذمے نہیں ہے، البتہ وہ اپنے باپ کے ترکے سے اپنے حصے کے حق دار ہیں اور اسی مال سے ان پر خرچ کیا جائے۔

آپ کی پہلے شوہر سے جو اولاد ہے، اس کو آپ کا موجودہ شوہر اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کرسکتا ہے، لیکن بیوی کو اپنی اولاد سے ملنے جلنے اور حسن سلوک سے منع کرنا قطعِ رحمی ہے اور قاطع رحم کے لئے حدیث پاک میں شدید وعید آئی ہے۔ اس کا ایک متوازن حل یہ ہے کہ آپ کا موجودہ شوہر آپ کو ایک ایسا مکان دلائے جس کے دو حصے ہوں، ایک حصہ جس میں آپ میاں بیوی رہیں، اتنے حصے کا کرایہ اور آپ کا خرچہ آپ کا موجودہ شوہر ادا کرے اور دوسرے حصہ کا کرایہ اور بچوں کا خرچہ آپ اپنے مال اور پہلے شوہر کے ترکے سے پورا کریں، یہ شوہر کی طرف سے تبرُّع، فضل، احسان اور حسنِ سلوک ہوگا، جس پر اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اجرِ کامل کی امید رکھنی چاہیے۔

برادری سے باہر نکاح کا حکم

سوال:115

میرا تعلق دھوبی برادری سے ہے، ہماری برادری میں شادی کی غیر ضروری رسومات بہت ہیں، جس کی وجہ سے میں اپنی بیٹی کی شادی غیر برادری میں کر رہا ہوں۔ جہاں میں نے اپنی بیٹی کی شادی طے کی ہے وہ اہلسنت وجماعت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن میرے کچھ قریبی رشتے دار اس بات سے ناراض ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ شادی برادری سے باہر نہ کی

جائے اور اگر ہوئی تو ہم اس میں شرکت نہیں کریں گے۔مہربانی فرما کر اس مسئلے کو حل فرمائیں۔(محمد بلال قادری، سرجانی ٹاؤن، کراچی)

جواب:

قرآن کریم نے مسلمان مرد وعورت کے درمیان نکاح کو مطلقاً جائز رکھا ہے۔لیکن شریعت نے زوجین کے درمیان خوشگوار ازدواجی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے کفو (Equal Status) کا اعتبار کیا ہے، تاکہ دونوں کا رہن سہن، عادات واطوار یکساں ہوں۔شرعاً کفو کا معیار مرد کی جانب سے معتبر ہوتا ہے، یعنی دونوں خاندان عزت، شرافت، دینداری، مالداری اور صنعت وحرفت میں برابر ہوں یا عورت کم درجہ کی ہو لیکن اگر والد راضی ہو تو بالغہ لڑکی غیر کفو میں بھی نکاح کرسکتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللہ عنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِذَاخَطَبَ اِلَیْكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِيْنَهُ وَخُلُقَهُ فَزَوِّجُوْهُ، اِلَّا تَفْعَلُوْا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِيْضٌ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب ایسا شخص نکاح کا پیغام بھیجے، جس کے اخلاق اور دین کو تم پسند کرتے ہو، تو نکاح کردو، اگر نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ وفسادِ عظیم ہوگا''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1086، سنن ابن ماجہ:1967)

برادری سے باہر نکاح کرنا نہ تو کوئی عیب ہے اور نہ ہی نکاح کے لئے مانع ہے۔

مفتی وقار الدین قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

برادری کا ایسی پابندی لگانا کہ اپنی برادری سے باہر لڑکی کی شادی نہیں کی جائے گی، غلط ہے۔اپنی برادری کی برابر حیثیت والی برادری یا اس سے اعلیٰ برادری میں شادی کرنے پر تو کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی، کم درجہ کے لئے پابندی لگائی جاسکتی ہے۔مگر جب لڑکی کے والدین راضی ہوں تو برادری اس تیسری صورت میں بھی اُن پر کوئی پابندی نہیں لگاسکتی، جبکہ اس پابندی سے خراب اثر پڑتا ہو کہ لڑکیاں بغیر شادی عمر گذار دیں، تو پابندی لگانا گویا

فتنوں کا دروازہ کھولنا ہے۔ جو ماں باپ اپنی لڑکی کی شادی غیر برادری میں کردیں، اُن سے تعلقات اس طرح منقطع کرنا کہ شادی بیاہ اور میت میں بھی شریک ہونے کو ممنوع قرار دے دیا جائے، حرام ہے۔ کسی جائز کام پر اس قسم کی پابندی لگانے والے سخت گناہ گار ہیں، اُنہیں توبہ کرنی چاہیے اور حکمِ شریعت کے خلاف پابندی کو فوراً ختم کردینا چاہیے''۔

(وقار الفتاویٰ، جلد سوم، ص:21)

آپ کی برادری والوں کا یہ کہنا کہ ''اگر برادری سے باہر شادی ہوئی تو ہم اس میں شرکت نہیں کریں گے''، قطع رحمی ہے، جو حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (1) لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ قَاطِعٌ۔ ترجمہ: ''رشتے اور قرابت کے تعلق کو توڑنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔ (صحیح بخاری، رقم:5984، صحیح مسلم، رقم:2556، سنن ترمذی، رقم:1916)

(2) اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَۃٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَہُ اللہُ وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَہُ اللہُ

یعنی ''رحم عرشِ الٰہی کے ساتھ معلق ہے اور (زبان حال سے) کہتا ہے کہ جو مجھے ملائے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے رحم وکرم سے ملائے رکھے اور جو مجھے توڑ دے، اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ٹوٹ جائے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5988)''۔

شرعاً کفو کا معیار مرد کی جانب سے معتبر ہوتا ہے

سوال:116

آزاد کشمیر میں سُدھن نامی قوم ہے، جسے یہاں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُس قوم کے ایک لڑکے نے موچی قوم کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ اِس رشتے کی وجہ سے سُدھن برادری لڑکے کا بائیکاٹ کر رہی ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ:

(1) آیا غیر کفو میں (یعنی برادری سے باہر کم تر خاندان میں) شرعاً یہ نکاح درست ہے؟۔

(2) اس رشتے کی وجہ سے اس لڑکے کا بائیکاٹ، علاقہ بدری یا جانی مالی نقصان پہنچانا درست ہے؟

(3) جو لوگ دباؤ ڈالنے کی تحریک میں شامل ہیں، ان کا شرعی حکم کیا ہے؟۔

(گل محمد، محمد جان، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)

جواب :

اگر سُدھن قوم کے لڑکے نے اپنی مرضی سے موچی قوم کی لڑکی سے شادی کرلی ہے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ہمارے فقہاء کرام نے اس امر کو مستحسن قرار دیا ہے کہ لڑکا اپنے سے کم تر حیثیت (Status) کی لڑکی سے شادی کرے تاکہ شوہر کا احترام اور عظمت اس کے دل میں قائم رہے۔ شرعاً کفو کا معیار مرد کی جانب سے معتبر ہوتا ہے، جب لڑکی ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں یعنی اپنے خاندان سے کم تر حیثیت (Status) کے لڑکے سے نکاح کرے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق یہ نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ لڑکے کی برادری کے لوگوں کا طرزِ عمل درست نہیں ہے اور جو لوگ اس طرح کے بائیکاٹ، علاقہ بدری یا کسی طرح کا جانی و مالی نقصان پہنچانے کا ارادہ کر رہے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ اُنہیں اپنی اس خلاف شرع حرکت سے رجوع کرنا چاہئے اور توبہ کرنی چاہئے۔ حرفت کی بنا پر کسی کو حقیر نہیں جاننا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے اپنے کپڑے سی کر اور اپنے جوتے کی مرمت فرما کر ان حرفتوں اور پیشوں سے وابستہ لوگوں کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، حدیث پاک میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے تکبر کی مذمت بیان فرمائی، تو ایک صحابی نے عرض کیا:

اِنَّ الرَّجُلَ یُحِبُّ اَنْ یَکُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَنَعْلُهٗ حَسَنَةً۔ قَالَ اِنَّ اللهَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ، اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ۔

ترجمہ: ''ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو، اس کے جوتے اچھے ہوں (کیا یہ بھی تکبر ہے؟)، آپ ﷺ نے فرمایا: تکبر (اپنی انانیت کی وجہ سے) حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو اپنے مقابلے میں حقیر جاننے کا نام ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 91)

آئمۂ اہل بیت نے غیر عرب خواتین اور باندیوں سے بھی نکاح فرمایا ہے۔

رضاعت کا رشتہ صرف ایک طرف سے متعدّی ہوتا ہے

سوال: 117

ہمارے خاندان میں ایک خاتون نے اپنے دیور کے بچے کو (جو کہ بیمار تھا اور بعد میں

انتقال کر گیا) دودھ پلایا تھا۔اب اُسی دودھ پلانے والی خاتون کے بیٹے کے لئے اُس بچے کی بہن (جو بعد میں پیدا ہوئی) کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔کیا از روئے شرع یہ رشتہ درست ہے؟ (محمد نواز، پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس۔کراچی)

جواب:

رضاعت (دودھ شریک) رشتہ دونوں طرف سے متعدی نہیں ہوتا بلکہ ایک جانب سے متعدی ہوتا ہے، یعنی جس بچی یا بچے نے کسی عورت کا دودھ مدتِ رضاعت (ڈھائی سال کی عمر تک) پیا ہے، اس دودھ پینے والے بچے پر رضاعی ماں باپ کی ساری اولاد، خواہ وہ دودھ پینے سے پہلے کی ہو یا بعد کی، اس کے موجودہ شوہر سے یا دوسرے شوہر سے، وہ سب اس دودھ پینے والے کے لئے رضاعی بہن بھائی ہو گئے اور ان میں سے کسی کی شادی اس دودھ پینے والے سے نہیں ہو سکتی۔جبکہ رضاعی ماں باپ کی اولاد پر صرف یہ بچہ یا بچی حرام ہے، جس نے دودھ پیا ہے، اس کے باقی بہن بھائی حرام نہیں ہیں (بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو)۔اسی طرح دودھ پینے والے بچے کے دوسرے بہن بھائی جنہوں نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا، ان کے ساتھ اس خاتون کی اولاد کا رضاعت کا کوئی رشتہ نہیں ہے، لہٰذا ان کے ساتھ بھی اس خاتون کی اولاد کا نکاح جائز ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وتحل أخت أخيه رضاعًا) يصح اتصاله بالمضاف كأن يكون له أخ نسبي له أخت رضاعية وبالمضاف اليه كان يكون لأخيه رضاعًا أخت نسبًا وبهما، وهو ظاهر۔

ترجمہ: ''حقیقی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح جائز ہے، رضاعت کا اتصال مضاف سے صحیح ہے، جس طرح اس کے نسبی بھائی کی رضاعی بہن ہو اور یہ بھی صحیح ہے کہ رضاعت کا اتصال مضاف الیہ سے ہو جس طرح کہ اُس کے رضاعی بھائی کی نسبی بہن ہو اور مضاف اور مضاف الیہ دونوں سے بھی متصل ہو سکتا ہے اور وہ ظاہر ہے کہ رضاعی بھائی کی رضاعی بہن ہو''۔

(رد المحتار علی الدر المختار: جلد: 4، ص: 301، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حقیقی بھائی کی رضاعی بہن یا رضاعی بھائی کی حقیقی بہن یا رضاعی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح جائز ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ ''زید بکر کا چچازاد بھائی ہے اور رضاعی بھی۔ زید کا صرف ایک حقیقی چھوٹا بھائی ہے اور بکر کا ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن، جو حقیقی ہیں اور بکر کی بہن دونوں بھائیوں سے چھوٹی ہے، تو زید کے چھوٹے بھائی کا نکاح بکر کی چھوٹی بہن سے جائز ہے یا نہیں؟، چونکہ زید اور بکر آپس میں رضاعی بھائی ہیں۔ آپ نے جواب میں لکھا: بکر نے اگر زید کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید اور اس کا بھائی بکر کے بھائی ہوئے نہ کہ بکر کی بہن کے۔ اور اگر زید نے بکر کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید بکر کی بہن کا بھائی ہوا نہ کہ زید کا بھائی۔ بہر حال زید کے بھائی اور بکر کی بہن میں نکاح جائز ہے لقولھم تحل اخت اخیہ رضاعا (فقہاء کے قول کے مطابق بھائی کی رضاعی بہن حلال ہے)''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص 279 :، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

طلاق کے مسائل

مرتد کا علیحدگی کے بعد بیوی کو عدت کے اندر طلاق دینا

سوال:118

زید کے والد نے اُس کی والدہ کو تین طلاقیں دیں اور اتنی آواز سے دیں کہ اوپر رہنے والے کرائے داروں نے بھی سنا۔زید کا والد کسی اور کمرے میں تھا اور والدہ دوسرے کمرے میں تھیں۔اب وہ شخص یہ عذر پیش کرتا ہے کہ وہ بہت ساری بیماریوں میں مبتلا ہے، رات بیوی سے جھگڑا ہوا جو محلہ والوں کی مصالحت سے ختم ہوا،صبح جب اُس کی آنکھ کھلی،تو وہ کہتا ہے میں نیند میں تھا اور میرے کان میں میری بیوی اور بیٹے کی گفتگو کی آواز آئی،میری بیوی بیٹے کو میرے خلاف بھڑکا رہی تھی،یہ سن کر مجھے غصہ آیا اور میں نے کہا''میں نے تجھے طلاق دی،طلاق دی،طلاق دی''۔ماضی میں مذکورہ شخص سے صریح کفریات ثابت ہیں، اِن کفریات میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کو معاذ اللہ گالیاں تک بکی ہیں۔معلوم یہ کرنا ہے کہ مذکورہ کفریہ باتوں کے بعد حالتِ کفر میں دی گئی تین طلاقیں نافذ ہیں یا نہیں؟،اور تجدیدِ ایمان کے بعد تجدیدِ نکاح کافی ہے؟۔(جواد،گوہر آباد،F.B ایریا،کراچی)

جواب:

ایسا شخص مرتد ہے،جو حالتِ اسلام میں کسی ایسے امر کا انکار کرے جو ضروریاتِ دین میں سے ہے،زبان سے ایسا کلمۂ کفر بکے،جس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو،یا کوئی ایسا فعل انجام دے،جو کفر کی واضح نشانی ہو۔مرتد کا نکاح بالاتفاق باطل ہے،جیسا کہ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ماھو باطل بالاتفاق نحو النکاح فلا یجوز لہ أن یتزوج امرأۃ مسلمۃ ولا مرتدۃ ولا ذمیۃ لا حرۃ ولا مملوکۃ

ترجمہ:''مرتد کے حق میں جو چیزیں بالاتفاق باطل ہیں،اُن میں نکاح بھی باطل ہے کہ وہ کسی عورت سے نکاح نہیں کرسکتا،نہ مسلمہ سے،نہ مرتدہ سے،نہ کافرہ سے،نہ آزاد عورت سے،نہ کنیز سے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد 2،ص:255،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

شوہر کے مرتد ہونے سے اس کا نکاح باطل ہوجاتا ہے اور ان کے درمیان علیحدگی کر دینی چاہیے، البتہ مرتد کے بعض تصرفات مؤثر ہوتے ہیں۔ پس اگر وہ عدت کے دوران اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو (اس کے نکاح سے نکلنے کے باوجود) وہ طلاق واقع ہوجائے گی، کیونکہ دونوں کے درمیان علیحدگی طلاق کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتی۔ اِرتداد کے بعد مرتد کے جن تصرفات کو نافذ مانا جاتا ہے، طلاق بھی اُن میں شامل ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَاعلم اَنَّ تَصَرُّفَاتِ الْمُرْتَدِّ عَلیٰ اربعةِ اَقسَامٍ ،فَيَنفُذُ مِنهُ اِتفَاقاً مَالَایَعْتَمِدُ تمامَ ولایةٍ، وَھِیَ خَمسٌ الاستیلاد، والطلاق، وقبول الھبة، وتسلیم الشفعة

ترجمہ: ''جاننا چاہیے کہ مرتد کے تصرفات چار اقسام پر ہیں، پس اُس کا ہر ایسا تصرف بالاتفاق نافذ ہے، جس کا مدار کمالِ ولایت (کامل اختیار) پر نہیں ہوتا۔ اور وہ پانچ ہیں، اُن میں سے: (ایک) استیلاد ہے (یعنی بچے کا نسب مرتد سے ثابت ہوگا اور وہ اپنے والد کا وارث ہوگا) اور (دوسرا) طلاق ہے اور (تیسرا) ھبہ کا قبول کرنا ہے (یعنی مرتد ھبہ کو قبول کرسکتا ہے) اور (چوتھا) فریقِ مخالف کی طرف سے شفعہ کا دعویٰ تسلیم کر کے اپنے حق سے دستبردار ہوجانا ہے۔ اِس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

واورد انه کیف یتصور طلاقه وقد بانت بِرِدَّتِهٖ،وَاُجِيبَ بِاَنَّهٗ لَایَلْزَمُ مِن وقوعِ الْبَینونَةِ امتناعُ الطَلاق وقد سلف انه المبانة یلحقها الصریح فی العدة۔

ترجمہ: ''یہاں ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ مرتد کی زوجہ اُس کے اِرتداد کے سبب بائن (نکاح سے خارج) ہوگئی، پھر اس پر طلاق کیسے واقع ہوگی؟۔ ہم اُس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ بائن (یعنی نکاح سے خارج) ہونے سے لازم نہیں آتا کہ اُس پر طلاق واقع نہ ہو حالانکہ (کتاب الطلاق میں) میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے کہ بائنہ عورت کو عدت میں صریح طلاق لاحق ہوسکتی ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص: 301)''۔

اگر آپ کا دعویٰ درست ہے کہ اس شخص نے اللہ عزّوجلّ اور رسولِ مکرم ﷺ کی شان

میں گالیاں بکی ہیں تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اہانت کرنے والا مرتد ہوجاتا ہے۔ پس اگر اس شخص نے کفریہ کلمات کہنے کے بعد تین حیض گزرنے سے پہلے طلاق کے الفاظ کہے ہیں تو اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں تجدیدِ ایمان کے ساتھ تجدیدِ نکاح کافی نہ ہوگا، بلکہ تحلیلِ شرعی کے بغیر رجعت قطعاً ممکن نہیں اور اگر کفریہ کلمات کہنے کے بعد تین حیض گزر چکے تھے تو تجدیدِ ایمان کے بعد براہِ راست اپنی اس سابق بیوی سے تجدیدِ نکاح کرسکتا ہے، تحلیلِ شرعی کی ضرورت نہیں، علامہ ابن عابدین شامی سابقہ عبارت کے لفظ ''والطلاق'' کی شرح میں لکھتے ہیں: والطلاق ای ما دامت فی العدۃ، ترجمہ: ''جب تک عورت عدت میں ہے، مرتد شوہر کی طلاق نافذ ہوگی، (ردالمحتار، جلد 6، ص: 301)۔

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو تین طلاقیں دینے کا اقرار کر رہا ہے تو اقرار کی بنا پر یہ طلاقیں مؤثر ہیں اور نافذ ہوں گی۔

کورٹ میرج اور طلاق

سوال: 119

ایک لڑکے اشتیاق علی نے ایک لڑکی سے کورٹ میرج کی۔ یہ بات تقریباً دو ماہ تک گھر والوں سے چھپا کر رکھی۔ گھر والوں کو معلوم ہوا تو محلہ میں موجود جسٹس آف پیس سے رابطہ کیا اور ساری صورتحال بتائی۔ اِس دو ماہ کے دوران لڑکی متعدد بار لڑکے کے ساتھ اُس کے گھر پر رہی۔ لڑکا اور لڑکی اور اُس کے گھر والوں کو جسٹس آف پیس نے طلب کیا۔ لڑکے کے والد نے لڑکے پر دباؤ ڈالا کہ اِس لڑکی کو طلاق دے دو۔ لڑکے نے والد کے کہنے اور دوستوں اور گھر والوں کے مشورے سے تین دن کے بعد جسٹس آف پیس کے سامنے چار گواہوں کی موجودگی میں لڑکی کو زبانی اور تحریری تین طلاقیں دے دیں اور یہ بھی لکھ کر دیا کہ آئندہ میرا اِس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ لیکن اِس دوران موبائل فون پر دونوں کا رابطہ رہا اور لڑکی لڑکے کے ساتھ چلی گئی اور دونوں ساتھ رہنے لگے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا ان

دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج باقی ہے یا طلاق واقع ہوگئی؟، کیا والد یا دیگر افراد کا لڑکے کو طلاق کے لئے آمادہ کرنا جبر کہلائے گا؟۔(سرفراز، اعظم بستی محمود آباد، کراچی)۔

جواب:

''کورٹ میرج'' سے اگر مراد یہ ہے کہ باقاعدہ دو گواہوں کی موجودگی میں آزادانہ ایجاب وقبول کے ذریعے ان دونوں کا نکاح ہوا تھا تو وہ لڑکا اگر اس لڑکی کا کفو (ہم پلہ) ہے، تو وہ نکاح شرعاً وقانوناً مؤثر اور منعقد ہے۔ آپ کے بیان کے مطابق شوہر نے کئی افراد کی موجودگی میں اپنی بیوی کو زبانی اور تحریری طور پر تین طلاقیں دیں۔ پس وہ تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور چونکہ نکاح کے بعد خلوتِ صحیحہ بھی پائی گئی، لہٰذا تحلیلِ شرعی کے بغیر رجعت کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ اَنۡ يَّتَرَاجَعَآ

ترجمہ: ''پھر اگر اس (شوہر) نے اپنی بیوی کو (تیسری) طلاق دے دی تو اس (تیسری طلاق) کے بعد وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت عدت گزرنے کے بعد) کسی اور شوہر سے نکاح کرے، پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے (اپنی مرضی سے) طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کرکے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ:230)''۔

اصولی طور پر فقہ حنفی میں ''طلاقِ مکرَہ'' (یعنی جس سے جبراً طلاق دلائی گئی ہو) معتبر ہے۔ البتہ اگر ''اِکراہِ تام'' یا ''اِکراہ مُلجی'' ہو، یعنی ایسی ضربِ شدید جس میں جان یا عضو کے تلف ہونے کا حقیقی خطرہ ہو، جیسے آج کل بندوق کی نوک (Gun Point) پر دھمکی دی جاتی ہے، اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ اس دھمکی پر عمل کرلے گا، تو اسے ''اکراہ مُلجی'' یا ''اکراہِ تام'' کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر جبر کرکے تحریری طلاق لی جائے تو وہ مؤثر نہیں ہوگی، کیونکہ تحریر ضرورت کے وقت کلام کے قائم مقام ہوتی ہے، لیکن اگر جبر کرکے زبانی طلاق دلا دی جائے تو وہ مؤثر ہو جائے گی۔ مذکورہ

صورت میں اکراہِ مُلجی یعنی اکراہِ تام نہیں ہے، کیونکہ جسٹس آف پیس کی عدالت میں کئی لوگوں کے سامنے یہ طلاق دی گئی ہے اور ایسے ماحول میں اس طرح کے جبر کا امکان نظر نہیں آتا، والدین اور رشتے داروں کے اخلاقی دباؤ سے دی گئی طلاق مؤثر ہوگی کیونکہ یہ شرعی جبر واکراہ نہیں ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا: ''ایک شخص نے کسی کے جبر وظلم سے محض ناچار و مجبور ہو کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور طلاق نامہ لکھ دیا تو اس صورت میں طلاق پڑے گی یا نہیں؟۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ ''طلاق بخوشی دی جائے خواہ بجبر، واقع ہو جائے گی۔ نکاح شیشہ ہے اور طلاق سنگ، شیشہ پر پتھر خوشی سے پھینکے یا جبر سے یا خود ہاتھ سے چھٹ پڑے شیشہ ہر طرح ٹوٹ جائے گا، مگر یہ زبان سے الفاظ کہنے میں ہے۔ اگر کسی کے جبر واکراہ سے عورت کو خطرے میں طلاق لکھی یا طلاق نامہ لکھ دیا اور زبان سے الفاظِ طلاق نہ کہے تو طلاق نہ پڑے گی۔ تنویر الابصار میں ہے:

ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو مکرَہا او مُخطئا وفی ردالمحتار عن البحر ان المراد الاکراہ علی التلفظ بالطلاق، فلو أُکرہ علی أن یکتب طلاق امرأتہ فکتب لا تطلق، لأن الکتابۃ أقیمت مقام العبارۃ باعتبار الحاجۃ ولا حاجۃ ھنا۔

ترجمہ: ''ہر عاقل بالغ خاوند کی طلاق نافذ ہو جائے گی اگرچہ اسے مجبور کیا گیا ہو یا غلطی سے طلاق دے دی، اور ردالمحتار میں ''البحر الرائق'' سے منقول ہے کہ ''جبر سے مراد یہ ہے کہ لفظ طلاق کہنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اور اگر اسے اپنی بیوی کو تحریری طلاق لکھنے پر مجبور کیا گیا اور اس نے مجبور ہو کر لکھ دی تو طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ کتابت کو تلفظ کے قائم مقام محض حاجت کی بنا پر کیا گیا ہے اور یہاں خاوند کو حاجت نہیں ہے''۔ مگر یہ سب اس صورت میں ہے جبکہ اکراہ شرعی ہو کہ اسے ضرر رسانی کا اندیشہ ہو اور وہ ایذا پر قادر ہو، صرف اس قدر کہ اس مُکرِہ (جبر کرنے والے) نے اپنے سخت اصرار سے مجبور کر دیا اور اس کے لحاظ پاس سے اسے لکھتے بنی، اکراہ کے لئے کافی نہیں، یوں لکھے گا تو طلاق ہو جائے گی، کما لا یخفی (جیسا

کہ ظاہر ہے)، (فتاویٰ رضویہ جلد:12، ص:385، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مسئولہ میں کسی قسم کے اکراہ یا جبر کے کوئی شواہد نہیں ہیں، کیونکہ ''جسٹس آف پیس'' یا حکومت کی منظور کردہ مصالحتی کمیٹی کے سامنے گواہوں کی موجودگی میں کھلی مجلس میں زبانی وتحریری طلاق دی ہے، لہٰذا یہ طلاق مؤثر ہے۔ جس وقت شوہر نے زبانی الفاظِ طلاق کہے، طلاق اسی وقت سے مؤثر ہوگئی اور عدت بھی شروع ہوگئی۔ چونکہ طلاق مغلّظہ ہے، لہٰذا زوجین کا عدت گزرنے کے بعد تحلیل شرعی کے بغیر آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا۔ اس طلاقِ مغلظہ کے بعد ان کا آپس میں میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا حرام ہے، زنا کے زمرے میں آئے گا، انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے۔ اور اس محلے یا بستی اور برادری کے لوگوں کو انہیں اس پر متوجہ کرنا چاہئے، اگر وہ اس کے باوجود باز نہ آئیں تو ان کا سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کرنا چاہئے۔

طلاق کو شرط کے ساتھ معلق کرنا

سوال:120

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: ''اگر میرے والد نے یہ مکان میرے نام نہ کیا تو تجھے طلاق ہے۔ ان کے والد کے پاس جو مکان تھا وہ پگڑی کا تھا اور وہ والد کی ملکیت میں نہیں ہے۔ اب اگر والد وہ مکان اپنے بیٹے کے نام نہیں کرتا تو کیا اس کی بہو پر طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں؟، (ش، م کراچی)۔

جواب:

ازدواجی تعلقات قائم ہونے کے بعد میاں بیوی کو چاہئے کہ حسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی گزاریں اور عقدِ نکاح کو حتی الوسع قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ باہمی اختلافات کی صورت میں فریقین کے بزرگ اور سرپرستوں پر ذمہ داری عائد کردی گئی ہے کہ وہ میاں بیوی کے اختلافات ختم کرانے میں کردار ادا کریں، اگر ساری اصلاحی تدابیر ناکام ہوجائیں تو انتہائی ناگزیر حالات میں شوہر کو نکاح ختم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ محض چھوٹی

باتوں پر طلاق دینا شرعاً انتہائی ناپسندیدہ اور گناہ کا سبب ہے۔صورتِ مسئولہ میں شوہر نے طلاق کو اس امر کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ اس کے والد مکان کی ملکیت اُس کے نام منتقل کردیں اور شرط کے مؤثر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مِلک یا سببِ مِلک کی طرف منسوب ہو، یعنی یا تو قسم کھاتے وقت مکان اس کے والد کی ملکیت میں ہوتا یا طلاق کی اضافت سببِ مِلک کی طرف ہوتی۔اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی اجنبی عورت سے کہا کہ تجھے طلاق ہے اور بعد میں اس نے کسی وقت اس کے ساتھ نکاح کرلیا تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ جس وقت اس کی طرف طلاق کی نسبت کی گئی تھی، وہ اُس وقت اس کے نکاح میں نہیں تھی، لہٰذا وہ محلِ طلاق نہیں تھی اور وہ طلاق لغو قرار پائی۔اس کے برعکس اگر کوئی شخص کسی اجنبی عورت سے کہے کہ میں جب بھی تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے، تو جب بھی وہ اُس عورت کے ساتھ نکاح کرے گا، اسے طلاق واقع ہوجائے گی کیونکہ یہاں پر نسبت سببِ مِلک کی طرف ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَلَا تَصِحُّ اِضَافَةُ الطَّلَاقِ اِلَّا اَنْ یَّكُوْنَ الْحَالِفُ مَالِكًا اَوْ یُضِیْفُ اِلٰی مِلْكٍ

ترجمہ: ''اور نسبت طلاق اس صورت میں درست ہوسکتی ہے کہ یا تو قسم کھانے والا مالک ہو یا شوہر طلاق کو مِلک کی طرف منسوب کرے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:420)''۔

صورتِ مسئولہ میں طلاق کی نسبت نہ تو مِلک کی طرف ہے اور نہ ہی سببِ مِلک کی طرف، لہٰذا طلاق واقع نہیں ہوگی، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

رَجُلٌ قَالَ: اِنْ تَزَوَّجْتُ اِمْرَأَةً مِنْ بَنَاتِ فُلَانٍ، فَهِیَ طَالِقٌ، وَلَیْسَ لِفُلَانٍ بِنْتٌ ثُمَّ وُلِدَتْ لَهٗ بِنْتٌ فَتَزَوَّجَهَا الْحَالِفُ قَالُوْا لَا یَحْنَثُ فِیْ یَمِیْنِهٖ وَیَشْتَرِطُ قِیَامُ الْبِنْتِ وَقْتَ الْیَمِیْنِ،

ترجمہ: ''کسی شخص نے کہا: اگر میں فلاں شخص کی بیٹیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کروں، تو اس کو طلاق ہے اور اُس وقت اُس شخص کی کوئی بیٹی نہیں تھی، پھر (بعدازاں) اُس کے ہاں

کوئی بیٹی پیدا ہوئی اور حلف اٹھانے والے نے اس کے ساتھ نکاح کرلیا تو فقہاء فرماتے ہیں کہ وہ شخص حانث نہیں ہوگا (یعنی اس لڑکی پر طلاق واقع نہیں ہوگی)، حانث ہونے (یعنی قسم ٹوٹنے) کے لئے حلف اٹھاتے وقت لڑکی کا موجود ہونا ضروری ہے"۔
(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:426)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر والد وہ مکان بیٹے کے نام نہیں کرتا تو طلاق نہیں ہوگی، کیونکہ اُس وقت وہ مکان والد کی ملکیت میں نہیں تھا۔

میں نے تمہیں چھوڑ دیا، طلاقِ صریح ہے

سوال:121

میری شادی کو 7 سال ہو چکے ہیں۔ ایک 5 سالہ بیٹی ہے، میرے شوہر ذمہ داریوں کو نہیں نبھاتے، نہ ہی کام کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی خرچہ دیتے ہیں۔ اکثر گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور بالکل لاتعلق رہتے ہیں۔ ان باتوں کے سبب اکثر ہمارے درمیان جھگڑا رہتا ہے، اس لڑائی کے دوران کئی مرتبہ انہوں نے مجھے گھر چھوڑنے کو کہا اور میرے منع کرنے پر مجھے چھوڑنے کی دھمکی بھی دی اور کہا کہ "میں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے"، چھ سات مرتبہ یہ جملہ کہہ چکے ہیں۔ ایک ہفتہ قبل انہوں نے مجھے دو مرتبہ کہا: "میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی"۔ ان تمام باتوں کے بعد میرا نکاح برقرار ہے یا نہیں؟۔
(افشین، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

علماء کرام کی تصریحات کے مطابق "میں نے تمہیں چھوڑ دیا" طلاقِ صریح میں شمار ہوتا ہے اور اس میں نیت کی کوئی ضرورت نہیں، تین مرتبہ کہے جانے سے طلاقِ مغلظہ واقع ہوجائے گی، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں: "عورت کو چھوڑ دیا" عرفاً طلاق میں صریح ہے اور پھر انہوں نے فتاویٰ عالمگیری کے حوالے سے فارسی کے کئی اور ہم معنی کلمات کا حوالہ دیا ہے:

لوقال الرجل لأمرأته ترا چنگ باز داشتم او بهشتم اویله کہ دمِ ترا او پاے کشادہ کہ دم ترا فهذا اکله تفسیر قوله طلقتك عرفاحتیٰ یکون رجعیاً ویقع بدون النیة۔

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کہے ''میں نے تیرا چنگل باز رکھا، تجھے چھوڑا، تجھے جدا کر دیا ہے یا تیرے پاؤں کھول دیئے ہیں، تو یہ تمام الفاظ عرفاً ''تجھے طلاق دی'' کے ہم معنی ہیں، اس لئے ان سے رجعی طلاق ہوگی اور بغیر نیت طلاق ہوگی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 12 ص:583)

اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ کے شوہر نے آپ کو تین مرتبہ (مختلف مجالس میں) یہ کلمہ کہا ہے کہ ''میں نے تمہیں چھوڑ دیا''، تو تیسری بار کہنے کے بعد آپ پر تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں، بشرطیکہ پہلی طلاق کے بعد دوسری اور تیسری طلاق عدت کے اندر دی گئی ہو تو تین طلاقیں نافذ ہو گئیں اور آپ دونوں کے درمیان تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی گنجائش نہیں ہے۔

جبری طلاق کا حکم

سوال:122

مسمّٰی ''الف'' نے مسماۃ ''ب'' کے ساتھ اپنے والدین کی رضامندی کے بغیر برضا و رغبت باقاعدہ گواہوں کی موجودگی میں ایک عالم کے پاس جا کر نکاح کیا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، کوئی ازدواجی تعلق استوار نہیں کیا۔ دونوں کے والدین کو معلوم ہوا تو بہت ناراض ہوئے۔ مسماۃ ''ب'' کو کسی دور دراز مقام پر لے جا کر گن پوائنٹ پر یہ کہلوانے پر مجبور کیا کہ وہ ''الف'' سے خلع چاہتی ہے۔ مسمّٰی ''الف'' کو حکمتِ عملی کے ذریعے لڑکی کے رشتے داروں نے یرغمال بنالیا اور گن پوائنٹ پر کہا کہ ''جان چاہیے تو اس کاغذ پر دستخط کرو، ہم تجھ سے طلاق لینا چاہتے ہیں''۔ مسمّٰی ''الف'' نے جان بچانے کے لئے زبان سے کہے بغیر سادہ کاغذ پر دستخط کر دیئے اور اس طرح جان بچا کر نکل آیا۔ بعد میں اُس سادہ کاغذ پر طلاق لکھی گئی یا نہیں اس کا قطعاً کوئی علم نہیں۔ کیا زبانی طلاق دیئے بغیر محض سادہ کاغذ پر دستخط کر دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے؟۔ (محمد عالم، ساکنہ استور، گلگت بلتستان)

جواب:

اگر با قاعدہ دو گواہوں کی موجودگی میں آزادانہ ایجاب وقبول کے ذریعے نکاح ہوا تھا، تو وہ نکاح شرعاً وقانوناً مؤثر اور منعقد ہے۔ تاہم اگر لڑکا لڑکی کا کفو نہیں ہے تو اس بارے میں فقہ حنفی کی رُو سے ایک موقف یہ ہے کہ نکاح اصلاً منعقد ہی نہیں ہوتا ہے، یہی مفتیٰ بہ ہے۔ چنانچہ درمختار، جلد: 4، ص: 116 (باب الولی) میں ہے:(ویفتی) فی غیر الکفو (بعدم جوازہ اصلا) وھو المختار للفتویٰ (لفساد الزمان)،

اور دوسرا موقف یہ ہے کہ ولی عدالت کے ذریعے نکاح فسخ کرا سکتا ہے، لیکن آج کل کی شہری زندگی میں ''کفو'' کا معیار کن امور کو قرار دیا جائے، قابلِ توجہ امر ہے۔ ہمارے فقہاءِ کرام نے کفات میں چھ چیزوں کا اعتبار کیا ہے: اسلام، نسب، پیشہ، حریت، دیانت، مال۔ دونوں کے لئے بہتر یہ ہوتا کہ والدین کی رضامندی سے نکاح کرتے تو دونوں کے لئے باعثِ سعادت ہوتا اور اجرِ آخرت کے مستحق ہوتے۔ اگر آپ کا بیان درست ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی کو زبانی طلاق نہیں دی، محض جبر کے تحت سادہ کاغذ پر دستخط کئے ہیں تو یہ طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ کاغذ کوئی تحریر نہیں تھی اور اگر طلاق نامہ تحریری بھی ہوتا تو جبر سے لئے گئے دستخط معتبر نہیں ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَفِی ''البَحر'' اَنَّ المُرَادَ الِاکرَاہُ عَلَی التَّلَفُّظِ بِالطَّلَاقِ، فَلَو اُکرِہَ عَلٰی اَن یَّکتُبَ طَلَاقَ اِمرَاَتِہٖ فَکَتَبَ لَا تُطَلَّقُ، لِاَنَّ الکِتَابَۃَ اُقِیمَت مَقَامَ العِبَارَۃِ بِاعتِبَارِ الحَاجَۃِ وَلَا حَاجَۃَ ھُنَا۔

ترجمہ: ''البحر الرائق'' میں ہے کہ جبر سے مراد یہ ہے کہ لفظ طلاق کہنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اور اگر کسی شخص کو مجبور کیا گیا ہو کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق لکھ کر دے اور اس نے جبر کے تحت طلاق لکھ دی تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ کتابت کو محض حاجت کی بنا پر تلفظ کے قائم مقام کیا گیا ہے اور یہاں کوئی حاجت نہیں ہے (کیونکہ خاوند طلاق نہیں دینا چاہتا)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص: 324، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

لیکن جس اِکراہ کی بنا پر تحریری طلاق مؤثر نہیں ہوتی، وہ ''اکراہِ تام'' یا ''اکراہِ مُلجی'' ہے اور اس کی تعریف یہ ہے: تَامٌ وَهُوَ الْمُلْجِیْءُ بِتَلَفِ نَفْسٍ أَوْ عُضْوٍ أَوْ ضَرْبٍ مُبَرِّحٍ
ترجمہ: ''احناف کے نزدیک ''اکراہِ تام'' یا ''اکراہِ مُلجی'' سے مراد ایسا اکراہ (Forcibility) ہے کہ جس میں کسی کی جان تلف ہونے یا عضو کے تلف ہونے کا حقیقی خطرہ یا واضح ضرب ہو، (ردالمحتار، جلد 9، ص:154، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔
یعنی محض زبانی دھمکی سے تحریری طلاق غیر مؤثر نہیں ہوتی جبکہ دھمکی دینے والا خدانخواستہ باقاعدہ نقصان پہنچانے پر قادر نہ ہو۔ جسے آج کل ''گن پوائنٹ'' پر کوئی کام لینا کہتے ہیں۔

طلاقِ صریح، طلاقِ بائن کو لاحق ہو جاتی ہے

سوال:123

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی کو ''انت حرام'' کے الفاظ سے طلاقِ بائن دی۔ پھر اس کے بعد تین مرتبہ ''انت طالق'' اس نیت سے کہا کہ بائن کے بعد صریح طلاق واقع نہیں ہوتی اور وہ اس کے ذریعے اپنی بیوی اور اس کے والدین کو ڈرانا چاہتا ہے تھا، کیونکہ وہ لوگ اکثر جھگڑتے رہتے ہیں۔ پھر زید کے والدین نے حلالہ کے بغیر اُس کی بیوی سے اُس کا دوبارہ نکاح کر دیا۔ آیا مذکورہ الفاظ سے طلاقِ بائن ہوئی یا طلاقِ مغلظہ؟۔ حالانکہ طلاقِ بائنہ سے فوراً نکاح ختم ہو جاتا ہے اور عدت تو صرف استبراءِ رحم کے لئے ہوتی ہے، تو پھر وہ طلاق کا محل کیسے بنی؟۔ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ عدت کے اندر صریح بائن کو لاحق ہو جاتی ہے۔
(محمد راشد، بستی جیون والا تحصیل وضلع مظفر گڑھ، پنجاب)

جواب:

لفظ ''انتِ حرامٌ'' سے طلاقِ بائن واقع ہوگی، علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:
خَلِيَةٌ بَرِيَةٌ حَرَامٌ بَائِنٌ، ترجمہ: ''خَلِيَةٌ (تو اکیلی ہے)، بَرِيَةٌ (تو بری ہے)، حَرَامٌ (تو حرام ہے)، سب طلاقِ بائن کے الفاظ ہیں ۔۔۔۔۔ علامہ ابن عابدین شامی لفظِ ''حرام''

کے ذیل میں لکھتے ہیں: مِن حرُم الشَّیئُ بِالضم حرامًا أُمتُنِعَ، أرِیدُ بہا ھنا الوصف، معناہ الممنوع، فیحمل علی ما سبق، وسیأتی وقوع البائن بہ بلا نیۃ فی زماننا للتعارف، لا فرق فی ذلک بین محرّمۃ وحرّمتُكِ، سواء قال علیّ أولا،

ترجمہ: ''یہ کلمہ ''حرُم الشئ حرامًا'' سے ماخوذ ہے، یعنی اس سے روک دیا گیا، یہاں اس کا وصف مراد ہے، یعنی اس کا معنی ہے: ایسی چیز کہ جس سے روک دیا گیا ہو، یہ پہلے کلمات پر محمول ہوگا، عنقریب اس امر کا بیان ہوگا کہ ہمارے زمانے کے عرف کے اعتبار سے اس کلمے سے نیت کے بغیر طلاقِ بائن واقع ہوجاتی ہے اور اس حوالے سے مُحَرَّمَۃٌ اور حَرَّمْتُكِ میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ عَلَیَّ (مجھ پر) کہا جائے یا نہ (صرف حَرَّمْتُكِ کہا ہو یا حَرَّمْتُكِ عَلَیَّ کہا ہو، (ترجمہ: ''میں نے تجھے حرام کیا یا میں نے تجھے اپنے اوپر حرام کیا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص: 396)''۔

صورتِ مسئولہ میں زید نے طلاقِ بائن کے بعد تین صریح طلاقیں دیں جو بائن کو لاحق ہوگئیں اور صریح بائن کے ساتھ لاحق ہونے سے بائن ہوجاتی ہے۔ آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ بائن کو صریح لاحق نہیں ہوتی۔ علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

الصریح یلحق الصریح ویلحق البائن بشرط العدۃ،

ترجمہ: ''عدت کے اندر دی گئی صریح طلاق (پہلے سے دی گئی) صریح طلاق کو لاحق ہوجاتی ہے اور (اسی طرح) طلاقِ صریح (عدت کے اندر) بائن کو بھی لاحق ہوجاتی ہے''۔

''ویلحق البائن'' کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

کما لو قال لہا انت بائن أو خالعہا علی مال ثم قال انت طالق أو ھذہ طالق۔ ''بحر'' عن ''البزازیۃ''، ثم قال واذا لحق الصریح البائن کان بائنًا، لأن البینونۃ السابقۃ علیہ تمنع الرجعۃ کما فی ''الخلاصۃ''۔

ترجمہ: ''جیسے کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے طلاقِ بائن ہے یا اس نے مال کے عوض طلاق دی (خلع کیا)، پھر کہا: انتِ طالقٌ یا ھذہٖ طالقٌ (تجھے طلاق ہے یا اسے طلاق ہے)،

یہ مسئلہ ''البحر الرائق'' میں ''بزازیہ'' کے حوالے سے منقول ہے۔ پھر کہا: جب طلاقِ صریح، طلاقِ بائن کولاحق ہوتو وہ بھی بائن ہوجاتی ہے، کیونکہ پہلی بائنہ کے بعد رجوع ممنوع ہوجاتا ہے، جیسا کہ ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد4، ص:405)''۔

آپ کا یہ کہنا کہ عدت کا تعلق استبراءِ رحم (عورت کے رحم کا حمل سے پاک ہونا) سے ہے نہ کہ عدت سے، آپ کی یہ سوچ درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ (الطلاق:1)

ترجمہ: اے نبی ﷺ! (ایمان والوں سے فرمادیجئے)، جب تم (اپنی) عورتوں کوطلاق دو، توان کی عدت کے وقت (سے پہلے طہر میں) انہیں طلاق دواور عدت کا شمار رکھو''۔

پس عدت اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، استبراءِ رحم اس کے مقاصد میں سے ایک ہے، ورنہ انتہائی عمر رسیدہ خاتون، جس کے حاملہ ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہوتا، اس کو بھی عدت گزارنے کا حکم ہے۔

دار الاسلام میں احکامِ شرعیہ سے جہالت کوئی عذر نہیں ہے اور جدید دنیا کا فلسفۂ قانون بھی یہی ہے کہ'' قانون سے ناواقفی کا عذر قابلِ قبول نہیں ہے''۔ طلاق مغلظہ کے بعد جو عقدِ ثانی کیا گیا ہے وہ باطل ہے، کالعدم ہے، زوجین کے درمیان فوراً تفریق کردی جائے۔ کیونکہ طلاقِ ثلاثہ کے بعد بغیر تحلیل شرعی کے تجدیدِ نکاح نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس عرصے میں کوئی اولاد ہوئی ہوتو اسے صحیح النسب ماناجائے گا۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولو طلقها ثلاثًا، ثم تزوجها قبل أن تنكح زوجًا غيره، فجاءت منه بولد ولا يعلمان بفساد النكاح، فالنسب ثابت وان كان يعلمان بفساد النكاح يثبت النسب أيضا عند أبي حنيفة رحمة الله تعالىٰ كذا في التاتارخانيه۔

ترجمہ: ''اگر شوہر نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، پھر تحلیلِ شرعی سے پہلے اس سے عقدِ ثانی کرلیا اور اِس کے نتیجے میں اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور انہیں اِس نکاح کے فاسد

ہونے کا علم نہیں تھا تو اِس بچے کا نسب اپنے ماں باپ سے ثابت ہے۔ اور اگر ان کو نکاح کے فاسد ہونے کا علم تھا، تو بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بچہ ثابت النسب ہے، ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:540)''۔

طلاق واقع ہوگئی

سوال:124

میری بیٹی فہمیدہ ناز کی شادی دو سال پہلے مسعود حسین سے ہوئی۔ شادی کے بعد اُس نے میری بیٹی کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ کبھی جہیز کا بہانہ بنا کر اور کبھی کسی دوسری وجہ سے تنگ کرتا رہا۔ بالآخر میری بیٹی میرے گھر آگئی اور چھ ماہ تک اُس نے کوئی خبر نہیں لی۔ اس دوران ہمارے کئی رشتہ داروں سے اُس نے کہا: ''وہ میری طرف سے آزاد ہے، اب وہ اپنے والدین کے گھر رہے، مجھے اُس کی کوئی ضرورت نہیں''۔ مورخہ 16 فروری 2007ء کو ایک طلاق نامہ بھی اُس نے ہمیں بھیجا، جس میں لکھا تھا: ''دونوں نے باہمی رضامندی سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کیا چنانچہ پہلے فریق نے دوسرے فریق کو طلاق دی دوسری پارٹی نے اسے قبول کیا''۔ آپ سے معلوم کرنا ہے کہ کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی ہے؟، (محمد صابر، یونائیٹڈ مینشن، نشتر روڈ، کراچی)۔

جواب:

شوہر کا یہ قول کہ ''وہ میری طرف سے آزاد ہے''، طلاقِ کنایہ کے الفاظ ہیں اور اِن الفاظ سے طلاق کا واقع ہونا شوہر کی نیت پر موقوف ہے۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَلَوْقَالَ اَعْتَقْتُكِ طُلِّقَتْ بِالنِّيَّةِ

ترجمہ: ''اور اگر (شوہر نے اپنی بیوی سے) کہا: ''میں نے تجھے آزاد کیا'' تو اگر اس نے یہ کلمات طلاق کی نیت سے کہے تو طلاق واقع ہوجائے گی''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:374)

لیکن شوہر کے یہ الفاظ کہ ''اب وہ اپنے والدین کے گھر رہے مجھے اُس کی کوئی

ضرورت نہیں'' اُس کی نیتِ طلاق کو ظاہر کرتے ہیں۔ پھر ایک طلاق (صریح) بذریعۂ تحریر دی، مجموعی طور پر دو طلاقیں بائن ہوگئیں۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

فان الصریح یلحق البائن والرجعی اذا جامعہ البائن جعلہ بائنا لامتناع الرجعۃ۔

ترجمہ: ''طلاقِ صریح، بائن اور رجعی (دونوں کو) لاحق ہوجاتی ہے اور جب صریح بائن کے ساتھ جمع ہوجائے تو وہ اسے بھی بائن بنا دیتی ہے کیونکہ یہاں رجوع نہیں ہوسکتا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص: 611، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

صورتِ مسئولہ میں دو بائن طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، شوہر کو عدت کے اندر بھی یک طرفہ طور پر رجوع کا حق نہیں تھا۔ اب چونکہ عدت گزر چکی ہے، اس لئے عورت آزاد ہے، جہاں چاہے اپنی مرضی سے نکاح کرسکتی ہے۔ اور اگر شوہر نے حق مہر ادا نہیں کیا تھا تو اس کی ادائیگی بھی اُس پر واجب ہے۔ تاہم اب بھی وہ دونوں باہمی رضامندی سے آپس میں نکاح کرسکتے ہیں، کیونکہ طلاقِ بائن کی صورت میں عدت کے دوران اور عدت کے بعد بھی شوہر رجوع کرسکتا ہے بشرطیکہ بیوی بھی راضی ہو۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اذا کان الطلاق بائنا دون الثلاث فلہ ان یتزوجھا فی العدۃ وبعد انقضائھا، (عالمگیری، جلد: 01، ص: 472)۔ ترجمہ: ''اور طلاق بائن تین سے کم ہوں (یعنی ایک یا دو ہوں) تو شوہر عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد (بیوی کے رضامندی سے) نکاح کرسکتا ہے''۔

اس کے لئے نیا مہر مقرر کرنا ہوگا۔ لیکن اس عقدِ ثانی کی صورت میں پہلے شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور اگر خدانخواستہ اس نے مستقبل میں ایک طلاق بھی دیدی تو سابق دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہوکر یہ تین ہوجائیں گی اور پھر تحلیلِ شرعی کے بغیر دونوں میں رجوع نہیں ہوسکے گا۔

متفرق مواقع پر دی گئی طلاقیں مؤثر رہتی ہیں

سوال:125

میں اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ میں رہتی ہوں، میرے دو بیٹے ہیں۔ایک کی عمر 7 سال اور دوسرے کی عمر 2 سال ہے۔میرے شوہر اور میں دونوں وہاں جاب کرتے ہیں۔ مجھے میرے شوہر جنید باوزیر نے آج سے دو سال قبل تین مرتبہ کہا:''میں تجھے طلاق دیتا ہوں''۔ہم بازار میں تھے،دو مرتبہ میں نے بالکل قریب سے طلاق کے الفاظ سنے اور اس دوران میں تھوڑا آگے چلی گئی تاکہ تیسری مرتبہ نہ سنوں،لیکن تیسری مرتبہ کے الفاظ بھی مجھے سنائی دیے۔ پھر اس بات کے ڈیڑھ سال بعد دو دفعہ کہا:''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔ پھر چند ماہ بعد دو دفعہ کہا:''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔پھر ابھی رمضان سے قبل دو دفعہ کہا: ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔معلوم یہ کرنا ہے کہ کتنی طلاق واقع ہوئیں اور ہمارے درمیان نکاح برقرار ہے یا نہیں؟ حنفی مسلک کے علاوہ دیگر آئمہ امام مالک،امام احمد بن حنبل اور بالخصوص امام شافعی کے نزدیک ان طلاقوں کا کیا حکم ہے؟ اُن کے نزدیک بھی طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟،(عائشہ،Willow ،6153 Knoll Way Dr 102 Brook il 60527)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کے تحریری بیان کے مطابق مختلف اوقات میں دی جانے والی ان طلاقوں کی مجموعی تعداد نو ہے۔شرعاً آپ کے شوہر نے آپ کو پہلی مرتبہ جو تین طلاقیں دی تھیں،اُن تین طلاقوں کے بعد آپ دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو چکے ہیں اور آپ دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج باقی نہیں رہا،نہ ہی تحلیلِ شرعی کے بغیر رجعت کی کوئی گنجائش ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَاۤ

ترجمہ: ''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دیدے تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ:230)''۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: وذهب جمهور الصحابة والتابعين ومن بعدهم من ائمة المسلمين الى انه يقع ثلاث۔

ترجمہ: ''جمہورِ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے آئمۂ دین کی متفقہ رائے ہے کہ (ایک وقت میں) دی گئی تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں''۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد چہارم ص:320)

علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

طلاق البدعة ان يطلقها ثلاثا بكلمة واحدة او ثلاثا فى طهر واحد، فاذا فعل ذلك وقع الطلاق وكان عاصيا

ترجمہ: ''اور طلاق بدعی یہ ہے کہ (شوہر اپنی بیوی کو) ایک ہی کلمے کے ساتھ یا تین کلمات کے ساتھ ایک ہی طہر میں تین طلاقیں دے، تو اس طریقے سے یہ تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی اور ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا، (فتح القدیر، جلد سوم، ص449)''۔

علامہ یحیٰ بن شرف نووی شافعی لکھتے ہیں:

وقد اختلف العلماء فيمن قال لامرأته انت طالق ثلثا فقال الشافعى ومالك وابوحنيفة احمد وجماهير العلماء من السلف والخلف يقع الثلاث،

ترجمہ: ''ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے تین طلاق (یا تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں)، تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، امام شافعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اجمعین اور جمہور علماءِ سلف وخلف کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، (شرح صحیح مسلم للنووی جلد1 ص478)''۔ ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

وتنفذ الطلقات الثلاث بالاتفاق، سواء طلق الرجلُ المرأةَ واحدةً بعد واحدةٍ، ام

جمیع الثلاث فی کلمۃ واحدۃ بان قال انتِ طالقٌ ثلاثًا عند الجمھور خلافًا الظاھریۃ

ترجمہ: ''اور جمہورِ آئمہ کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، خواہ کسی شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں یکے بعد دیگرے دی ہوں یا ایک ہی کلمے کے ساتھ دی ہوں، جیسے شوہر اپنی بیوی کو یہ کہے کہ تجھے تین طلاقیں ہیں، اس مسئلے میں (چاروں آئمہ متفق ہیں) صرف غیر مقلدین کا اختلاف ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد:9،ص:6906)''۔

اگر آپ کا بیان درست ہے تو پہلی ہی مرتبہ آپ کو تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اس کے بعد آپ دونوں کا میاں بیوی کے طور پر رہنا شرعاً حرام ہے اور اس پر آپ دونوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صدقِ دل سے توبہ کرنی چاہئے اور فوراً علیحدگی اختیار کرنی چاہئے، تاہم اس دوران اگر آپ کی کوئی اولاد ہوئی ہو تو اس کا نسب آپ دونوں سے ثابت ہوگا اور وہ اپنے ماں باپ کے وارث بھی ہوں گے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً آپ کے شوہر نے جو طلاقیں دی ہیں، وہ لغو ہیں کیونکہ تین طلاقوں کے بعد منکوحہ محلِ طلاق نہیں رہتی۔

تحریری طور پر تین طلاق کا حکم

سوال:126

میں نے مورخہ 18 اپریل 2009ء کو اپنی زوجہ کو تین طلاقیں تحریری دے دی ہیں، یہ طلاق نامہ بذریعہ وکیل تیار کیا گیا اور میں نے دو گواہوں کی موجودگی میں اس پر دستخط کئے اور کوریئر سروس (TCS) کے ذریعے اپنی زوجہ کے گھر بھجوادیا، انہوں نے وصول بھی کرلیا۔ اب یہ معاملہ رجسٹریشن کیلئے یونین کونسل میں ہے۔ وہاں میری زوجہ کے گھر والے اور مصالحتی کمیٹی کے اراکین زور دے رہے ہیں کہ میں اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرلوں اور عدت میں رجوع کرلوں، اُن کے بقول شرعاً رجوع کی گنجائش ہے۔ مجھے معلوم یہ کرنا ہے کہ اس وقت میری طلاق کی کیا حیثیت ہے؟ طلاق نامہ کی نقل منسلک ہے۔

(انور رشید لودھی، گلستانِ جوہر، بلاک 15، کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں منسلکہ طلاق نامے کی رُو سے تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور میاں بیوی دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو چکے ہیں، دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج باقی نہیں رہا اور تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ يَّتَرَاجَعَآ

ترجمہ: ''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دے دے تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ: 230)''۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: وذهب جمهور الصحابة والتابعين ومن بعدهم من ائمة المسلمين الى انه يقع ثلاث۔

ترجمہ: ''جمہور صحابہ، تابعین اور وہ مسلمہ آئمۂ دین جو ان کے بعد ہیں، ان سب حضرات کا متفقہ مذہب ہے کہ (اگر شوہر ایک ہی مجلس میں ایک کلمے کے ساتھ یا الگ الگ تین کلمات کے ساتھ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدے تو وہ) تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد چہارم، ص: 320، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: طلاق البدعة ان يطلقها ثلاثا بكلمة واحدة اوثلاثا في طهر واحد، فاذا فعل ذلك وقع الطلاق وكان عاصياً

ترجمہ: ''اور طلاق بدعی یہ ہے (کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو) تین طلاقیں دے، (خواہ) ایک کلمے کے ساتھ (مثلاً میں نے تم کو تین طلاقیں دیں)، یا ایک ہی طہر میں (ایک ہی وقت میں یا وقفے وقفے سے) تین طلاقیں دے (مثلاً میں نے تم کو طلاق دی، میں نے تم کو طلاق دی، میں نے تم کو طلاق دی)، تو ان دونوں صورتوں میں تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور

ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا، (فتح القدیر، جلد سوم، ص 449)"۔

مصالحتی کونسل اور آپ کی زوجہ کے گھر والوں کا کہنا درست نہیں ہے، شریعت میں رَدّ و بدل کا کسی کو اختیار نہیں، نہ ہی کوئی یونین کونسل کسی شرعی حکم کو تبدیل کرسکتی ہے۔

الفاظ بدل کر طلاق دینا

سوال: 127

میری شادی کو تقریباً چار ماہ ہوئے ہیں۔ 14 مئی 2009ء کی رات میں اپنی بیوی کو فون پر سمجھا رہا تھا اور وہ مستقل بدتمیزی کررہی تھی۔ میں نے اسے ڈرانے دھمکانے اور سدھارنے کی نیت سے یہ الفاظ کہے: "میں تجھے تلاف دیتا ہوں، میں تجھے تلاف دیتا ہوں، میں تجھے تلاف دیتا ہوں"، یہ الفاظ میں نے اتنی تیزی میں کہے کہ وہ سمجھ نہ سکی کہ میں نے کیا کہا ہے اور لائن ڈراپ کردی، اور پھر اس کا یقین دلانے کے لئے میں نے اس کے والد کو فون کیا اور اُن سے کہا کہ: "میں نے آپ کی بیٹی کو طلاق دے دی ہے"۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا کوئی طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (محمد فرحان، نارتھ کراچی)۔

جواب:

فقہاءِ کرام کی بیان کردہ تصریحات کے مطابق الفاظِ طلاق میں اگر تحریف بھی کی گئی ہو تو بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویقع بھا) ای بھذہ الالفاظ وما بمعناھا من الصریح، ویدخل نحو طلاغ، وتلاغ وطلاك وتلاك أو ط ل ق۔ أو طلاق باش بلا فرق بین عالم وجاھل، وان تعمدته تخویفا لم یصدق قضاء، الا اذا أشھد علیه قبله، به یفتی،

ترجمہ: "اور ایسے الفاظ جو صریح کے ہم معنی ہوں، اُن سے طلاقِ رجعی واقع ہوجاتی ہے، اور طلاقِ صریح میں (تحریف شدہ الفاظ بھی) داخل ہیں، جیسے: طلاغ، تلاغ (یعنی ط کی جگہ ت اور ق کی جگہ غ) اور لفظِ طلاک (یعنی ق کی جگہ ک) اور تلاک (یعنی ط کی جگہ ت اور ق کی جگہ ک) یا (طلاق کے بجائے حروف تہجی کو الگ الگ بول کر کہا) ط ل ق یا "طلاق

باش (طلاق ہوجائے)'' کہا۔لفظِ طلاق غلط بولنے میں عالم اور جاہل کا حکم ایک ہے (یعنی ان کلمات سے طلاق واقع ہوجائے گی کہ یہ صریح میں داخل ہیں)، اگر شوہر نے کہا: کہ میں نے طلاق کے یہ کلمات قصداً بولے ہیں (مگر طلاق کی نیت سے نہیں بلکہ) بیوی کو ڈرانے کے لئے کہے ہیں تو قضاءً اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی (کیونکہ شریعت کے احکام کا اطلاق ظاہر پر ہوتا ہے)، مگر صرف اُس صورت میں شوہر کے اِس دعوے (کہ اس نے طلاق کے ارادے سے یہ کلمات نہیں بولے) کی تصدیق کی جائے گی جبکہ شوہر نے بیوی کو طلاق کے کلمات بولنے سے پہلے گواہ بنا لئے ہوں کہ میں (ارادتاً نہیں بلکہ بیوی کو ڈرانے کے لئے) طلاق کے کلمات استعمال کروں گا، اسی قول پر فتویٰ ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 338 تا 340)

صورتِ مسئولہ میں آپ کے کہے ہوئے الفاظِ طلاق علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ کے بیان کردہ چند الفاظ میں ''تلاغ'' کے مشابہ ہیں، جو حکم لفظِ تلاغ کا بیان کیا گیا وہی اِس پر بھی لاگو ہوگا، یعنی آپ کی بیوی کو تین طلاقیں واقع ہوگئیں اور تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی گنجائش نہیں۔

''میری طرف سے بھی سمجھو چھٹی''، سے طلاق واقع نہیں ہوگی

سوال:128

ہم دونوں میاں بیوی میں کافی دنوں سے ناچاقی چل رہی تھی، جس کی بنا پر میری بیوی نے اپنے گھر والوں کو بلایا، میں بیٹھا تھا کہ انہوں نے آکر مجھے مارا۔ پھر فیصلے میں ایک صاحب نے میری بیوی سے پوچھا کہ آپ اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں یا نہیں؟، تو جواب ملا ''نہیں''۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟، تو میں نے بھی جواب دیا ''میری طرف سے بھی سمجھو چھٹی''۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ ان الفاظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (عبدالوحید، ملیر کراچی)۔

جواب:

لفظِ ''چھٹی'' حالتِ غضب میں طلاقِ بائن شمار ہوتا ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز سے سوال ہوا: ''ایک شخص نے اپنی عورت کو دو مرتبہ کہا: ''میں نے اسے چھٹی دی''، آپ نے جواب میں لکھا:

''سائل نے اظہار کیا کہ اس شخص نے حالتِ غضب میں اپنی زوجہ کی نسبت دوبار یہ لفظ کہے کہ ''میں نے اسے چھٹی دی''، اس کہنے سے عورت پر ایک طلاق بائن پڑ گئی، وہ نکاح سے نکل گئی، جب مرد و عورت دونوں راضی ہیں، نئے سرے سے پھر نکاح کر لیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:584، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اعلیٰ حضرت کے فتوے کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی کو غضب کی حالت میں یہ کہے: ''میں نے اسے چھٹی دی''، اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ انشاءِ طلاق کے کلمات ہیں اور حالتِ غضب قرینۂ طلاق ہے۔ لیکن صورتِ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ شوہر کے الفاظ یہ ہیں: ''میری طرف سے بھی سمجھو چھٹی''، ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

فتاویٰ امام قاضی خان میں ہے: امرأة قالت لزوجها مرا طلاق دہ ۔۔۔ ولو قال الزوج دادہ انکار، او قال کردہ انکار لایقع الطلاق وان نویٰ، کانہ قال بالعربیة احسبی انكِ طالقٌ، وان قال ذالك، لایقع وان نویٰ

ترجمہ: ''بیوی نے اپنے شوہر سے کہا: ''مجھے طلاق دے دو''۔۔۔۔ (یہاں کئی کلمات ذکر کرنے کے بعد امام قاضی خان لکھتے ہیں:) شوہر نے جواب میں کہا: ''تو دی ہوئی یا کی ہوئی خیال کر لے''، تو اگرچہ شوہر نے طلاق کی نیت سے یہ کلمات کہے ہوں، (تب بھی ان الفاظ سے) طلاق واقع نہیں ہوگی، یہ کلمات ایسے ہی ہیں، جیسے کوئی شوہر عربی میں اپنی بیوی سے کہے: ''سمجھو کہ تجھے طلاق ہے (یا یہ کہ تم طلاق سمجھو)''، تو اگر شوہر نے طلاق کی نیت سے بھی یہ کلمات کہے ہوں، تب بھی طلاق واقع نہیں ہوگی، (اس لئے کہ طلاق

انشاءات میں سے ہے اور یہ انشاء نہیں ہے، کیونکہ انشاء کا مطلب ہے کہ قصد و یقین کے ساتھ کوئی بات نافذ کرنا)''۔
(فتاویٰ قاضی خان، برحاشیہ عالمگیری، جلد: 1، ص: 457، مطبوعہ: لکھنو)

تعلیم کے لئے طلاق کے الفاظ استعمال کرنا

سوال:129

زید مسجد کا امام ہے۔ اس نے عمرو کو طلاق کے مسائل سمجھاتے ہوئے کہا: ''اے عمرو! مسئلہ طلاق کی تفصیل اس طرح سمجھو کہ مثال کے طور پر میں اپنی بیوی کو کہوں کہ تجھے ایک طلاق ہے تو ایک طلاق ہوگی اور میں رجوع کرسکتا ہوں۔ اور اگر میں اس طرح کہوں کہ تجھے دو طلاقیں ہیں تو دو طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ اب بھی میں بغیر تجدید نکاح رجوع کرسکتا ہوں۔ اور اگر میں اپنی بیوی سے کہوں کہ تجھے تین طلاقیں ہیں تو اب میری بیوی مجھ سے جدا ہوجائے گی اور حلالے کے بغیر میں اس سے نکاح نہیں کرسکتا''۔ وضاحت طلب امر یہ ہے کہ اس گفتگو کی وجہ سے زید کی بیوی کو طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ (ریاض محمود، میانوالی)

جواب:

جی نہیں! مثال دے کر طلاق کا مسئلہ سمجھانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ سوال میں واضح ہے کہ امام صاحب نے تعلیم و تعلم کے لئے یہ اندازِ بیان اختیار کرتے ہوئے کہا: ''اے عمرو! مسئلہ طلاق کی تفصیل اس طرح سمجھو کہ مثال کے طور پر میں اپنی بیوی کو کہوں کہ تجھے ایک طلاق ہے تو ایک طلاق ہوگی اور میں رجوع کرسکتا ہوں اور اگر میں اس طرح کہوں کہ تجھے دو طلاقیں ہیں تو دو طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ اب بھی میں بغیر تجدید نکاح رجوع کرسکتا ہوں اور اگر میں اپنی بیوی سے کہوں کہ تجھے تین طلاقیں ہیں تو اب میری بیوی مجھ سے جدا ہوجائے گی اور حلالے کے بغیر میں اس سے نکاح نہیں کرسکتا''۔ اس سے زید کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ یہاں ارادہ طلاق نہ ہونے کا قرینہ موجود ہے۔

کیونکہ یہ فقہی مسئلے کی تفہیم کا موقع ہے اور مسئلے کی تفہیم کے موقع پر سائل کو سمجھانے کے لئے مثالیں دی جاتی ہیں۔ یہ اُس سے بالکل مختلف صورت ہے کہ طلاق صریح کا کلمہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو کہے، لیکن امام یا معلم کو تفہیمِ دین کے لئے ذاتی مثال دینے کے بجائے فرضی مثال دینی چاہئے تاکہ اشتباہ پیدا نہ ہو۔

یہ فسخِ نکاح شرعاً مؤثر نہیں

سوال:130

میرا نکاح 2003ء میں میرے پھوپھی زاد محمد آصف سے ہوا، رخصتی نہیں ہوئی۔ رخصتی سے قبل کئی ایسی گھریلو ناچاقیاں پیدا ہوگئیں، جن کی وجوہات میں اُس کی طرف سے کچھ ایسے غیر اخلاقی مطالبات بھی تھے، جن کا پورا کرنا میرے لئے معیوب اور ناممکن تھا۔ توان وجوہات کی بنا پر میں نے اور میرے والدین نے رخصتی سے انکار کر دیا اور اُس سے طلاق کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب وہ کسی طرح نہیں مانا تو عدالت سے رجوع کرنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں 02، اکتوبر 2007ء کو عدالت نے مجھے اور آصف کو بلایا اور صلح کی تمام تدابیر اختیار کیں، جب کسی بھی طرح ہمارے درمیان صلح نہیں ہوئی تو عدالت نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ان الفاظ میں خلع کی ڈگری جاری کرنے کا حکم دیا: ''جاؤبی بی آپ کو کورٹ سے خلع ہے''۔ لیکن میرے سابق شوہر اس خلع کو نہیں مانتے۔ انہوں ایک فتویٰ ہمارے پاس بھیجا ہے کہ یہ خلع نہیں ہوا، جبکہ میں اس کے حق میں نہیں ہوں، کیونکہ شرح صحیح مسلم جلد 3، صفحات: 1118 تا 1121 پر جو تفصیل دی گئی ہے، اس کے مطابق عدالت کا خلع شرعی طور پر میرے حق میں نافذ ہوتا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ شرح صحیح مسلم کے یہ دلائل صحیح نہیں تو حوالہ کے ساتھ مدلّل طریقے سے ان کا جواب دیں۔

نیز کیا ایسی صورت میں اسلام کسی عورت پر جبر وزیادتی کی اجازت دیتا ہے۔ اور اس کے پاس اس کا کوئی حل موجود نہیں ہے؟۔ اس سلسلے میں آپ سے شرعی رہنمائی درکار ہے، اس لئے کہ میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے حق میں نہیں، (ایک خاتون، نارتھ کراچی)۔

جواب:

سوال کے مندرجات کے مطابق فسخ نکاح کا کوئی جواز ہمارے سامنے نہیں ہے، بس ایک مبہم سا بیان ہے۔شوہر نے رخصتی سے پہلے کیا غیر اخلاقی مطالبہ کیا، یہ واضح نہیں ہے۔ اگر شوہر بیوی سے کوئی غیر اخلاقی یا غیر شرعی مطالبہ کرے تو بیوی پر ایسے امور میں شوہر کی اطاعت لازم نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ، إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ

ترجمہ: ''یعنی کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے (خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بڑا ہو) جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، اطاعت تو فقط نیک کاموں میں لازم ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:1840)''۔

ہماری رائے میں یہ فسخ نکاح درست نہیں ہے، لہٰذا نکاح قائم ہے۔اس کے باوجود اگر آپ اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو مہر معافی کے بدلے میں باہمی رضامندی سے خلع لے لیں یا کوئی اور مناسب تدبیر اختیار کریں۔علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔

نشے میں طلاق کا حکم

سوال:131

ایک عورت نے میرے داماد جمیل عثمان کو مشروب میں نشہ آور دوا پلائی، جس سے وہ ذہنی طور پر مفلوج ہوگیا اور ایک خط اُس نے جمیل عثمان کی طرف سے جمیل عثمان کی بیوی کے نام تیار کیا، جس میں تین مرتبہ لکھا تھا: ''میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں''۔نشہ آور دوا کے زیر اثر اُس عورت نے جمیل عثمان سے دستخط کروا لیے۔دستخط کرتے وقت جمیل عثمان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس خط پر دستخط کر رہا ہے کیونکہ اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ اُس عورت نے وہ خط جمیل عثمان کی بیوی کو پہنچا دیا۔جمیل عثمان نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ بیان دیا کہ تمام حالات اسی طرح رونما ہوئے ہیں۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا طلاق

واقع ہوئی یا نہیں؟۔(سید محمد قاسم، دبئی)۔

جواب:

اس استفتاء کے ساتھ سید جمیل عثمان کا انگریزی میں تحریر کردہ ایک حلف نامہ بھی منسلک ہے، جس میں انہوں نے بیان دیا ہے کہ انہیں دھوکے سے کافی میں نشہ آور چیز ملا کر پلائی گئی تھی، اِس سے اُن پر نشہ طاری ہوگیا، وہ مدہوش ہوگئے اور حالتِ مدہوشی میں ایک ایسی تحریر پر اُن سے دستخط لئے گئے، جس میں اُن کی طرف سے اُن کی بیوی کو تین طلاقیں تحریر تھیں۔ اگر وہ اِس حلف نامے میں سچے ہیں تو یہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولا یقع طلاق الصبی وان کان یعقل والمجنون والنائم والمبرسم والمغمی علیہ والمدھوش ھکذا فی فتح القدیر۔

ترجمہ: ''اور بچے (نابالغ) کی طلاق واقع نہیں ہوگی اگرچہ وہ عقل رکھتا ہو اور (اسی طرح) مجنوں، سوئے ہوئے شخص، برسام (ذات الجنب) کے مریض، مُغمیٰ علیہ (یعنی بیمار جس پر بے ہوشی طاری ہو) اور مدہوش (ان سب) کی طلاق واقع نہیں ہوگی، فتح القدیر میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد: 1، ص: 353 مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

یہ حکم قضاءً ہے، یعنی ایسی صورتِ حال میں قضاءً طلاق نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا اور نکاح قائم رہے گا، جبکہ عنداللہ اُخروی احکام کا مدار حقیقتِ حال پر ہوگا۔ یعنی فی الواقع اگر اُسے دھوکے سے نشہ پلایا گیا تھا اور پینے سے پہلے مشروب کے نشہ آور ہونے کے بارے میں اُسے کچھ معلوم نہ تھا تو طلاق واقع نہ ہوگی، دنیا اور آخرت دونوں میں وہ بری الذمہ ہوگا۔ لیکن اگر اُسے معلوم تھا کہ یہ مشروب نشہ آور ہے یا ایسا معمول تھا کہ وہ عورت اُسے نشہ آور مشروب پلایا کرتی تھی اور یہ اپنی مرضی سے پیتے تھے اور درپیش صورتِ حال میں بھی ایسا ہی ہوا تھا اور یہ جھوٹی قسم کھا رہا ہے، تو دنیوی احکام کے اعتبار سے نکاح کے قائم رہنے اور طلاق کے واقع نہ ہونے کا حکم لگائے جانے کے باوجود آخرت میں وہ مسئول ہوگا اور اُس کی بقیہ ازدواجی زندگی حرام میں گزرے گی، کیونکہ یہاں اُس کے حلفیہ بیان کے علاوہ

حقیقتِ حال جاننے کا اور کوئی پیمانہ نہیں ہے۔اس کے برعکس جو اپنی مرضی سے نشہ کرے یا اسے معلوم تھا کہ اس مشروب میں نشہ آور چیز ہے اور پھر مدہوش ہو جائے اور ایسی حالت میں اپنی بیوی کو زبانی یا تحریری طلاق دیدے تو طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ حرام کا دانستہ ارتکاب کرے اور اس پر رعایت کا بھی حق دار ہو جائے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: أو سکران ولو بنبیذ أو حشیش أو أفیون أو بنج زجرا به یفتی، تصحیح القدوری

ترجمہ:''اور ہر نشہ کرنے والے کی (طلاق واقع ہو جاتی ہے)، خواہ اس نے شراب پی ہو یا حشیش یا افیون یا بھنگ پی ہو اسی پر فتویٰ ہے اور قدوری نے بھی اس کی تصحیح کی ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4 ص:328 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: و طلاق السکران واقع اذا سکر من الخمر أو النبیذ وھو مذھب اصحابنا رحمھما اللہ تعالیٰ کذا فی المحیط۔

ترجمہ:''اور نشہ کرنے والے کی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے خواہ وہ نشہ شراب سے آیا ہو یا نبیذ سے، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص:353 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

عدت کے مسائل

عدت کب سے ہوگی؟

سوال:132

نکاح کے بعد بیوی نے شوہر کے ساتھ خلوت میں کچھ وقت گزارا، مباشرت نہیں ہوئی۔ اگر اس کے بعد وہ بیوی عدالت کے ذریعے فسخِ نکاح کرائے تو کیا عدت لازم ہے، اگر لازم ہے تو کب سے؟۔ فقۂ حنفی کے مطابق قرآن وسنّت کی روشنی میں فتویٰ جاری فرما کر عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں، (ملک محمد بوستان قادری، کراچی)۔

جواب:

زوجین کے درمیان ایسی خَلوت (Privacy) کہ مباشرت میں کوئی طبعی یا شرعی (مثلاً زوجین کا روزے کی حالت میں ہونا یا ان میں سے کسی ایک کا روزے دار ہونا) رکاوٹ حائل نہ ہو، اسے فقہی اصطلاح میں ''خَلوتِ صحیحہ'' کہا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد اگر زوجین میں ''خلوتِ صحیحہ'' ہوجائے، خواہ مباشرت کی ہو یا نہ کی ہو، تو اسے مباشرت کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے اور اس کے بعد اگر شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو بیوی پر عدت گزارنا لازم ہے۔ عدت کا شمار طلاق کے وقت سے ہوتا ہے۔ باہمی رضامندی سے خلع یا عدالتی فسخِ نکاح طلاقِ بائن کے حکم میں ہوتا ہے اور طلاقِ بائن کی صورت میں بھی بہرحال عدت لازم ہے لیکن عدت کے اندر بھی زوجین باہمی رضامندی سے عقدِ ثانی کر سکتے ہیں، جس کے لئے نیا مہر مقرر کرنا ہوگا۔ بیوی پہلے مہر کی حقدار ہوجاتی ہے۔ عدالتی ''فسخِ نکاح'' شرعاً اسی وقت مؤثر ہے کہ قاضی شریعت کا عالم اور عامل ہو اور ''تنسیخِ نکاح'' میں حدودِ شرعیہ کی مکمل پاس داری کی ہو۔

ناشزہ (نافرمان) عورت نفقہ کی حق دار نہیں

سوال:133

میری شادی سوا مہینہ قبل ہوئی۔ ولیمہ کے بعد میری بیوی نے مجھے کہا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی مجھے طلاق دے دو۔ شادی کے کچھ دن بعد ہی اپنے والدین کے گھر جا کر

بیٹھ گئی، ہم منا کر لائے، پھر دوبارہ اپنے بھائی کے ساتھ چلی گئی۔ہم نے مصالحت کی کوشش کی لیکن اُس کا مطالبہ تھا کہ مجھے طلاق چاہیے، میں زہر کھالوں گی لیکن وہاں نہیں جاؤں گی۔ تمام معاملات یو۔سی ناظم کے سامنے ہوئے، تین طلاقیں تحریری دے دی گئیں۔مہر اور اُس کا سامان میں نے ادا کر دیا، لیکن کیا عدّت کا خرچ بھی میرے ذمہ ہے؟۔

(دانش عبدالقیوم، عزیز آباد، کراچی)

جواب:

اگر عورت شوہر کی طرف سے کسی ایذا رسانی کے بغیر اس کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو اور شوہر کے حقوق کا خیال نہ رکھے تو ایسی عورت فقہی اصطلاح میں ''ناشزہ'' یعنی نافرمان کہلاتی ہے اور ایسی عورت کا نان نفقہ، رہائش، علاج معالجہ وغیرہ شوہر کے ذمے لازم نہیں ہے جب تک کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہوجائے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وان نشزت فلا نفقة لها حتیٰ تعود الی منزله

ترجمہ: ''اگر عورت نافرمان ہو (کر شوہر کے گھر سے نکل) جائے تو جب تک وہ واپس (شوہر کے) گھر لوٹ کر نہ آجائے، اس کا نان نفقہ شوہر کے ذمے نہیں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:545، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: انوار میں ہے: لانفقة للناشزة وان قدر علی ردها الی الطاعة قهرا ولوهربت منه او خرجت بلا اذنه من بيته فناشزة

ترجمہ: ''نافرمان بیوی کے لئے نفقہ کا استحقاق نہیں ہے۔اگر بیوی شوہر کا گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہو یا اُس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل گئی ہو تو وہ نافرمان ہی قرار پائے گی، خواہ وہ جبراً اُسے واپس لانے پر قدرت رکھتا ہو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص:473)''۔

پس اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ کی بیوی شادی کے بعد آپ کا گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی اور واپس نہ آئی یہاں تک کہ طلاق پر معاملہ ختم ہوا۔آپ کا اس کو مہر ادا کرنا اور اُس کا سامان واپس کرنا درست ہے، نان نفقہ کی ادائیگی آپ پر لازم نہیں ہے، البتہ اگر اللہ تعالیٰ

نے آپ کو توفیق دی ہے اور آپ تبرُّعاً (مہربانی اور حسنِ سلوک کے طور پر) دینا چاہتے ہیں تو آپ کا یہ طرزِ عمل رسول اللہ ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کے عین مطابق ہوگا: ''وَاَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَاءَ اِلَیْکَ یعنی جو تجھ سے بدسلوکی کرے، تم اس کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ''۔ اس کا اجر اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا، لیکن قانونی اور شرعی طور پر وہ زمانۂ عدت کے لئے کسی قسم کے نفقے کی حقدار نہیں ہے۔

طلاق کے بعد بیوی کو رہائش کا حق

سوال:134

میری عمر 65 سال اور میری سابقہ اہلیہ کی عمر 55 سال ہے۔ ہمارے بہو، بیٹے اور پوتے پوتیاں بھی ہیں۔ چند ماہ پہلے کسی معمولی بات پر ہمارے درمیان اختلاف ہوا اور نوبت طلاق تک پہنچی، میں نے تین طلاقیں دے دیں۔ عدت کا دورانیہ بھی میرے گھر میں ہی بالکل لاتعلق ہوکر گزارا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ عمر کے اس حصے میں وہ کہیں اور جاکر رہ نہیں سکتیں اور میرے لئے بھی ممکن نہیں ہے، تو کیا وہ اسی گھر میں اپنے جوان بچوں کے ساتھ علیحدہ رہ سکتی ہیں؟ (ایک سائل، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

بہتر تو یہ ہے کہ اگر وہ یا ان کی اولاد مالی استطاعت رکھتے ہیں، تو وہ اپنی اولاد کے ساتھ الگ مکان میں رہیں۔ صحیح بخاری، رقم الحدیث: 7170 کے تحت امام بخاری لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اور قاسم نے کہا: حاکم کو چاہئے کہ عدالت میں شہادت کے بغیر محض اپنے علم پر فیصلہ نہ کرے، حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا علم (کسی بھی مسئلے میں) دوسرے کی شہادت سے زیادہ یقینی ہے، (لیکن محض اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ کرنے سے) قاضی اپنے آپ کو مسلمانوں کی تہمت کا نشانہ بنائے گا اور انہیں طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا کرے گا (یعنی کوئی بدگمانی کرسکتا ہے کہ بغیر شہادت کے کسی کے حق میں فیصلہ کر کے قاضی نے جانب داری کی ہے)''۔ اس کے بعد امام بخاری نے مندرجہ ذیل حدیث نقل فرمائی:

عَنْ عَلِیِّ بْنِ حُسَیْنٍ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ أَتَتْهُ صَفِیَّةُ بنتُ حُیَیٍّ فَلَمّا رجعتْ انْطَلَقَ مَعَهَا فَمَرَّ بِهٖ رَجُلَانِ مِنَ الْاَنْصَارِ، فَدَعَاهُمَا فقال انما هی ''صَفِیَّةُ، قَالَا سُبْحَانَ اللہ، قال اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنِ ابْنِ آدَمَ مَجْرَی الدَّمِ،

ترجمہ: ''علی بن حسین (امام زین العابدین) بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ کے پاس (آپ کی زوجہ) صَفِیَّةُ بنتُ حُیَیّ حاضر ہوئیں، پھر جب وہ واپس لوٹنے لگیں تو آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ چل پڑے، وہاں سے انصار کے دو شخص گزرے، آپ ﷺ نے ان دونوں کو بلایا اور فرمایا: ''یہ (میری بیوی) صَفِیَّہ ہے''، ان دونوں نے عرض کیا: ''سبحان اللہ''، آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان انسان کے وجود میں اسی طرح سرایت کئے ہوئے ہے، جیسے خون انسان (کی نس نس) میں رواں دواں ہے، (صحیح بخاری، رقم: 7171)''۔

امام بخاری لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو امام علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے امّ المؤمنین حضرت صَفِیَّہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔یہی حدیث باب الاعتکاف میں رقم: 2038 کے تحت قدرِ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، وہاں حدیث کے کلمات یہ ہیں: عن علی بن حسین رضی اللہ عنهما انّ صَفِیَّةَ زوج النبی ﷺ اخبرته، کان النبی ﷺ فی المسجدِ وعندہ ازواجُهٗ، فَرُحْنَ، فقال لِصَفِیَّةَ بنتِ حُیَیّ، لاتعجَلِی حتّٰی أَنْ أَصرِفَ معكِ وکانَ بیتُها فی دارِ اسامةَ، فخرجَ النبیُّ ﷺ معها، فَلَقِیَهٗ رَجُلَانِ من الانصارِ، فنظرَا الی النبی ﷺ، ثم أجازا، وقالَ لهما النبی ﷺ تَعَالَیا، اِنها صَفِیَّةُ بِنتُ حُیَیّ قالا: سبحان اللہ یا رسول اللہ! قال: اِنّ الشیطانَ یَجْرِیْ مِنِ الانسانِ مَجْرَی الدَّمِ، وانی خَشِیْتُ اَن یُلقِیَ فی انفسِکما شیئًا،

ترجمہ: ''علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ کی زوجہ حضرت صَفِیَّہ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں (معتکف) تھے اور آپ ﷺ کے پاس آپ کی ازواجِ مطہرات (ملاقات کے لئے) حاضر تھیں، پھر وہ چل پڑیں، تو آپ ﷺ نے صفیہ بنتِ حیی سے کہا: تم جلدی نہ کرو، میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا، اور ان کا گھر

دارِ اسامہ میں تھا، تو نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ نکلے، (راستے میں) انصار کے دو اشخاص سے آپ کی ملاقات ہوئی، ان دونوں نے نبی ﷺ کی طرف دیکھا اور آگے چلے گئے، تو نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: اِدھر آؤ، یہ (میری بیوی) صَفِیہ بنتِ حُیَیّ ہیں، ان دونوں نے عرض کیا: سبحان اللہ یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان اسی طرح انسان کے وجود میں سرایت کئے ہوئے ہے، جیسے خون (نَس نَس میں) دوڑ رہا ہے، (میں نے یہ وضاحت اس لئے کی کہ) مجھے اندیشہ ہوا کہیں تمہارے دل میں کوئی برا خیال نہ آجائے"۔

ایک روایت میں ہے: من سَلَكَ مسالِكَ الظّنّ اُتُّهِمَ، رواہ الخرائطی فی مکارمِ الاخلاقِ مرفوعًا بلفظِ مَنْ أَقَامَ نَفْسَهٗ مَقَامَ التُّهَمِ، فَلَا يَلُوْمَنَّ مَنْ أَسَاءَ الظَّنَّ بِهٖ

ترجمہ: "جو بدگمانی کی راہوں پر چلے گا، وہ (لوگوں کی) تہمت کا نشانہ بنے گا، خرائطی نے "مکارم الاخلاق" میں ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے: جو اپنے آپ کو تہمت کی جگہ ٹھہرائے گا تو جو لوگ اس کے بارے میں بدگمانی کریں، وہ انہیں ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے انہیں اس بدگمانی کا موقع فراہم کیا)۔

علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی الجراحی نے مندرجہ بالا روایت کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ: "اگرچہ "اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهْمَةِ، (یعنی تہمت کی جگہوں سے بچو!)"، کی روایت لفظاً ثابت نہیں ہے، لیکن مندرجہ بالا روایت کی بنا پر معنًی ثابت ہے"۔

(کشف الخفاء ومُزیل الالباس، جُزءِ اوّل، ص:44، مطبوعہ: مکتبۃ الغزالی، دمشق)

رسول اللہ ﷺ معصوم تھے اور تقوے کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اور کوئی آپ کے بارے میں اَخلاق سے گری ہوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود آپ نے ان دو انصاری اشخاص کو، جو آپ کے پاس سے گزرے، بتایا کہ میرے ساتھ جو خاتون ہیں، یہ کوئی اجنبیہ نہیں ہیں بلکہ میری بیوی صَفِیہ ہیں تاکہ کسی قسم کی بدگمانی کا کوئی امکان نہ رہے۔ تو عام مسلمان کو اس بارے میں بہت زیادہ احتیاط کرنی چاہئے، کیونکہ عزت اور نیک نامی اگر ایک مرتبہ مشتبہ ہوجائے تو دوبارہ اعتماد کو قائم کرنا کافی دشوار

ہوتا ہے۔

لیکن اگر آپ کی بیوی یا آپ کی اولاد کی اتنی مالی استطاعت نہیں ہے کہ آپ کے بچے اپنی ماں کے لئے الگ مکان کا انتظام کرسکیں۔اور آپ کا مکان اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ شرعی ستر وحجاب کی پابندی کو قائم رکھتے ہوئے کسی الگ حصے میں رہ سکتی ہیں، جہاں آپ سے میل جول اور آپ کے سامنے بے حجاب آنے کے مواقع نہ ہوں، تو آپ اس مکان میں انہیں رہائش دے سکتے ہیں۔لیکن آپ دونوں ایک دوسرے کے لئے بہر حال اجنبی رہیں گے اور آپ دونوں کو شرعی حدود کی پابندی کرنا ہوگی۔تاہم اولاد پر آپ دونوں کا احترام یکساں طور پر لازم ہے اور ضرورت کے مطابق دونوں کی کفالت بھی لازم ہے۔

خرید و فروخت کے مسائل

عقدِ مضاربت میں نفع کی مقدار مقرر کرنا فساد کا باعث ہے

سوال:135

زید نامی شخص خالد کو ایک لاکھ روپے کاروبار کے لئے دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ تم مجھے ہر ماہ دس ہزار روپے منافع دو گے یا خالد نے زید کو کہا ہو کہ میں آپ کو ہر ماہ دس ہزار روپے نفع دوں گا۔ کیا شرعاً یہ جائز ہے؟، عدمِ جواز کی صورت میں اس کی تصحیح کی کیا صورت ہوگی؟، (حافظ عبدالماجد، کراچی)۔

جواب:

آپ نے جو صورت بیان کی ہے، وہ صریح ربوٰ ہے، کیونکہ اس میں ایک لاکھ روپے پر دس ہزار روپے ماہانہ منافع پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کو سود کہتے ہیں۔ ایک رقم پر ماہانہ مقررہ منافع مشروط (Conditional) ہو یا معہود (Understood)، ہر صورت میں سود ہے اور حرام ہے۔

اس کے متبادل جو جائز صورت ہے، وہ مضاربت ہے۔ دو افراد کے درمیان ایسا عقد (Contract)، جس میں ایک فریق کا سرمایہ ہو اور دوسرے کی محنت، مضاربت کہلاتا ہے۔ جس فریق کا سرمایہ ہو، اسے ''رَبُّ المال (Capital Provider)'' اور جس کی محنت ہو، اُسے ''مُضارِب (Working Partner)'' اور سرمائے کو ''رأسُ المال (Capital)'' کہتے ہیں۔

''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' میں ہے: ''یہ شراکت کی ایک قسم ہے، اس شرط پر کہ ایک فریق کا رأس المال (سرمایہ) ہو اور دوسرے فریق کی محنت اور جدوجہد شامل ہو، رأسُ المال (سرمایہ) فراہم کرنے والے فریق کو ''رَبُّ المال'' اور عامل کو ''مُضارِب'' کہتے ہیں، یہ عقد ''مضاربت'' کہلاتا ہے، (مادہ: 1407)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی مضاربت کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(وکون الربح بینھما شائعاً) فلو عُیّن قدراً فسدت (وکون نصیب کل منھما

معلومًا) عند العقد۔ ترجمہ:''فریقین کے درمیان نفع کا تناسب معلوم ہو،اگر''رب المال'' کے لئے منافع کی کوئی رقم مقرر کر لی جائے تو عقدِ مضاربت فاسد ہوجائے گا،(اس کے جواز کی صورت یہی ہے کہ) کاروبار کے منافع میں سے عقد کے وقت فریقین میں سے ہر ایک کا حصہ معلوم ہو (یعنی دونوں کو نصف نصف ملے یا ایک کو ساٹھ فیصد اور دوسرے کو چالیس فیصد یا جو بھی تناسب (Ratio) ان دونوں کے درمیان طے پائے)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 8،ص:376،مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

اگر خدانخواستہ کاروبار میں کوئی نقصان ہوجائے تو اس کا سارا بار ربُّ المال (یعنی سرمایہ فراہم کرنے والے) پر آئے گا اور مضارِب پر کوئی مالی بار نہیں آئے گا۔اس کا نقصان فقط یہ ہے کہ اس کی محنت کا اسے صلہ نہیں ملے گا، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

رَجُلٌ دفعَ لآخَرَ أَمتِعَةً وقال بِعهاوَاشتَرِهَاوَمَا رَبِحتُ فَبَينَنَانِصفَينِ فَخَسِرَ فَلاَ خُسْرَانَ عَلَى العَامِلِ۔

ترجمہ:''ایک شخص (رَبُّ المال) نے دوسرے شخص (مُضارِب) کو کچھ سامان دیا اور کہا: اس سے خرید وفروخت (یعنی کاروبار) کرو اور جو نفع آئے،وہ ہمارے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا اور اسے (کاروبار میں) نقصان ہوگیا، تو عامل (یعنی مُضارِب) کے ذمے نقصان میں سے کچھ نہیں آئے گا (بس اسے صرف محنت کا اجر نہیں ملے گا)، (ردالمحتار، جلد:8،ص:374)''۔

نفلی خیراتی ٹرسٹ کی رقم کی شرعی سرمایہ کاری

سوال:136

عبداللہ کی کمپنی نے یہ طے کیا کہ جو بھی سال کے آخر میں کمپنی کو منافع ہوگا، اس کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں دیا جائے گا۔اس مقصد کے لئے ایک عبداللہ ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ فلاحی کاموں کے لئے اس منافع کی رقم کو اس ٹرسٹ کے ذریعے استعمال کیا جاسکے۔حسب قرارداد کمپنی نے اس سال منافع کی رقم میں سے 20 لاکھ روپے اس ٹرسٹ

کے اکاؤنٹ میں منتقل کردیئے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ:

کمپنی کے پارٹنر کا ارادہ ہے کہ جو رقم ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں ہے، اُس کو کسی بینک میں ڈال دیا جائے اور اُس سے جو منافع مثال کے طور پر 20 لاکھ روپے کی رقم پر سالانہ =/3,40,000 (تین لاکھ چالیس ہزار روپے) کی رقم منافع کے طور پر ملے گی، اُس کو فلاحی کاموں (غرباء کی مدد وغیرہ) میں استعمال کیا جائے۔اس طرح ہر سال 20 لاکھ کی رقم پر جو منافع بینک دے گا، اُسے فلاحی کاموں میں استعمال کیا جاتا رہے گا۔یا جو رقم 20 لاکھ ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں موجود ہے، وہی خرچ کی جائے، بینک کا منافع نہ لیا جائے تو کچھ ہی عرصے میں تمام رقم ختم ہوجائے گی اور مستقبل میں غرباء کی مدد نہیں کی جاسکے گی۔اس مسئلے پر آپ کی ماہرانہ رائے درکار ہے، (جاوید احمد غوری، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

بظاہر آپ کی کمپنی نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت میں سے ایک نفلی تصدُّق کی نیت کی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس کی عطا کردہ مالی نعمت کا بہترین تشکُّر ہے، بلکہ حقیقی اور عملی تشکُّر ہے۔آپ اس سعادت پر مبارک باد کے مستحق ہیں اور خود آپ حضرات کو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اِس توفیق پر اُس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔کاش کہ ہمارے تمام اہلِ صنعت وتجارت اور اہلِ ثروت یہی روش اختیار کریں۔نیک مقاصد کے لئے ٹرسٹ کا قیام بھی ایک اچھی پیش رفت ہے۔ٹرسٹ میں جمع شدہ اِس رقم کو آپ براہِ راست بھی ضرورت مند افراد پر خرچ کرسکتے ہیں، اور قرآن مجید نے اس عملِ خیر کو ذاتِ باری تعالیٰ سے ''تجارت'' سے تعبیر کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اے مومنو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتادوں جو تمہیں (آخرت کے) دردناک

عذاب سے نجات دے، (وہ اس طرح کہ) تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (مکرم ﷺ) پر (کامل) ایمان رکھو اور اپنے اَموال اور جانوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے رہو، یہ تمہارے لئے خیر (کاراستہ) ہے، اگر تم علم رکھتے ہو، (الصف: 11)"۔

اگر آپ نے اس پوری رقم یا اس کے کچھ حصے کو انوسٹ (Invest) کرنا ہے تو اسلامی بینک کے ساتھ کریں تاکہ خالص ربا سے بچ سکیں، کیونکہ حرام قطعی کو حصول اجر کا باعث سمجھنا بھی حرام ہے۔ آپ اس رقم کو کسی پرائیویٹ نفع بخش کاروبار میں بھی لگا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ لوگ قابلِ اعتماد ہوں اور آپ کے اپنے کاروبار میں اس کی گنجائش ہو تو اُس میں بھی لگا سکتے ہیں۔ لیکن اس رقم میں صرف اضافہ ہی مقصود نہ ہو بلکہ مستحقین پر خرچ کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ اسلامی بینک سے جو آپ کو منافع ملے گا، وہ جائز ہوگا اور اسے آپ ناداروں پر خرچ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حق اور خیر کی جانب ہم سب کی رہنمائی فرمائے اور قبولِ حق کی توفیق عطا فرمائے۔

اسلامی بینک کا منافع حلال ہے

سوال: 137

میں ایک تعمیراتی ادارے کا سربراہ ہوں اور مختلف بینکوں میں میرے کاروباری اکاؤنٹ ہیں، جس کے ذریعے اچھی خاصی کاروباری لین دین ہوتی ہے۔ بینک اکاؤنٹ چونکہ کاروبار کے لئے قانونی ضرورت بھی ہے اور اتنی بڑی رقم گھر میں رکھی بھی نہیں جاسکتی اور نہ ہی نقد لین دین کیا جاسکتا ہے۔ میرے تمام بینک اکاؤنٹ کرنٹ ہیں یعنی نفع نقصان سے مُبرا غیر سودی اکاؤنٹ۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ:

(1) بینک میری رقم کو اپنے کاروبار میں استعمال کر کے بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس نیت سے سودی اکاؤنٹ کھلوالوں کہ جو سود نفع کی شکل میں مجھے ملے، میں وہ رقم ضرورت مندوں میں تقسیم کر دوں یا کسی کے قرض کی ادائیگی یا کسی مصیبت زدہ کی ضرورت پر خرچ کروں۔ اس طرح بینک کی سودی آمدنی کسی مصیبت زدہ

کے کام آسکتی ہے؟، میری یہ سوچ شریعتِ محمدی کے تحت صحیح ہے یا نہیں؟۔
(2) آج کل اسلامی بینکنگ ہو رہی ہے، کیا یہ بینکنگ صحیح اسلامی بینکنگ ہے؟۔
(3) اگر میں اس اسلامی بینک میں نفع نقصان میں شراکت کا اکاؤنٹ کھلواؤں تو یہ صحیح ہے یا نہیں اور یہ نفع کی رقم ذاتی استعمال میں بھی لے سکتا ہوں یا نہیں؟۔
(سارا بلڈرز، ناظم آباد، کراچی)

جواب.

ہمارے یہاں عام بینکوں میں تمام کاروبار سودی بنیادوں پر ہوتا ہے اور کھاتے داروں کو اُسی سود کی آمدنی سے نفع کی رقم دی جاتی ہے۔ سود کی اُس رقم کا استعمال جس طرح اپنی ذات کے لئے استعمال کرنا حرام ہے، اِسی طرح اُس رقم کو حصولِ اجر کا باعث سمجھ کر مستحقین پر خرچ کرنا بھی حرام ہے، کیونکہ حرام قطعی کا ارتکاب حرام ہے اور حرام جانتے ہوئے ثواب کی نیت سے صدقہ کرنا کفر ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولو تصدق علی فقیر بشئی من مال الحرام یرجو الثواب یکفر

ترجمہ: ''اگر مالِ حرام میں سے کوئی شے کسی فقیر پر ثواب کی نیت سے صدقہ کی تو وہ کافر ہو جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 272، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز لکھتے ہیں: سود کے روپیہ سے جو کارِ نیک کیا جائے اُس میں استحقاقِ ثواب نہیں، حدیث شریف میں ہے: جو مال حرام لے کر حج کو جاتا ہے۔ لبیک کہتا ہے، ہاتفِ غیب اسے جواب دیتا ہے:

لَا لَبَّیْکَ وَلَا سَعْدَیْکَ وَحَجُّکَ مَرْدُوْدٌ عَلَیْکَ حَتّٰی تَرُدَّ مَا فِیْ یَدَیْکَ۔

ترجمہ: ''نہ بارگاہِ الٰہی میں تیری حاضری قبول ہے اور نہ ہی تیرا نذرانۂ بندگی قبول ہے۔ اور تیرا حج تجھے واپس لوٹایا جاتا ہے (یعنی یہ مقبول نہیں ہے) تاوقتیکہ تو یہ مالِ حرام جو تیرے قبضے میں ہے، تو (اُسے ان لوگوں کو) لوٹا دے (جو اس کے حق دار ہیں)۔ حدیث پاک میں ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ

ترجمہ: ''بے شک اللہ عزّوجل پاک ہے، وہ صرف پاک چیز ہی کو قبول فرماتا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد23، ص:541، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اگر آپ نے اس پوری رقم یا اس کے کچھ حصے کو انوسٹ (Invest) کرنا ہے تو اسلامی بینک میں مضاربت پر نفع نقصان کا اکاؤنٹ کھولیں تاکہ خالص ربا (سود) سے بچ سکیں، اسلامی بینک سے حاصل ہونے والے منافع کو آپ اپنے ذاتی استعمال میں بھی لے سکتے ہیں اور اس سے مستحقین کی مدد بھی کر سکتے ہیں اور ضرورت مندوں کو غیر سودی قرض دینے کا ایک فنڈ بھی قائم کر سکتے ہیں۔

سود سے حاصل کردہ رقم کی خیرات پر اجرِ آخرت کی نیت کا حکم

سوال:138

ایک شخص نے بینک میں رقم رکھوائی اور اس پر اس کو بینک نے منافع (سود) دیا۔ اب وہ شخص اس رقم کو کسی کی مدد کے لئے دینا چاہتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ منافع کی رقم لینے پر جو گناہ سود لینے والے کو ملا، کیا جس کی مدد کے لئے وہ رقم دے گا آیا اُس کو بھی اِس کا گناہ ملے گا؟۔ (محمد شریف خان K.B.R بفرزون، کراچی)۔

جواب:

سود کی رقم لینا اور اپنی ذات پر استعمال کرنا حرام ہے۔ اِسی طرح اُس رقم کو حصولِ اجر کا باعث سمجھ کر مستحقین پر خرچ کرنا بھی حرام ہے، کیونکہ حرام قطعی کو حصولِ اجر کا باعث سمجھنا بھی حرام ہے یعنی کفر ہے۔ تقویٰ تو یہی ہے کہ سود کی رقم نہ لی جائے تاکہ بندہ اس کی جوابدہی سے بچا رہے، سود حرام ہے اور حرام مال کا حکم یہ ہے کہ وہ معنیً خبیث ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

ترجمہ: ''اے مومنو! اپنی کمائی ہوئی پاکیزہ چیزوں میں سے اور اُن چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیں، (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، اور (خبردار!) ناقص (اور ناپاک) چیزوں کو (اللہ کی راہ میں) دینے کا ارادہ نہ کرو کہ تم اس سے خرچ کرتے ہو، حالانکہ تم خود اسے (کبھی) نہ لو، سوائے اس کے کہ تم اس میں چشم پوشی کرو، اور جان لو کہ اللہ (ہر چیز سے) بے نیاز ہے، (اس کی) بہت حمد بیان کی گئی ہے، (البقرہ: 267)''۔

لیکن اگر کسی مستحق شخص کو ثواب کی نیت کے بغیر وہ رقم دے دی جائے تو لینے والا گناہ گار نہیں ہوگا۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ'' آیا سودی مال کو خیرات کے طور پر مستحقین کا لینا جائز ہے یا نہیں؟''، انہوں نے جواب میں لکھا: ''فقیر کو اُس کا خیرات میں لینا تو بدرجۂ اولیٰ جائز ہے کہ یہ تو عین حکمِ شرع ہے جبکہ مالک کا پتا نہ رہا ہو اور ویسے بھی مالِ ربا میں بعد قبضہ عدمِ ملک نہیں صرف خُبثِ ملک ہے''، و فی الرد المحتار عن البحر الرائق عن القنیۃ عن الامام البزدوی ان من جملۃ صور البیع الفاسد جملۃ العقود الربویۃ یملک العوض فیھا بالقبض

ترجمہ: ''علامہ ابن عابدین شامی نے البحر الرائق کے حوالے سے لکھا ہے کہ القنیۃ نے امام بزدوی کی روایت نقل کی ہے کہ بیع فاسد کی منجملہ صورتوں میں سودی معاملات بھی شامل ہیں، ان سب میں قبضہ کرنے پر بدلے میں لئے ہوئے مال کا مالک بن جاتا ہے''۔

(ردالمحتار، باب الربا، جلد 7، ص: 302، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اور زیرِ ملکیت مال کا خبیث ہونا (فقیر کے لئے) بطور صدقہ لینے میں مانع نہیں ہے۔

فی الھندیۃ عن الحاوی عن الامام ابی بکر قیل لہ ان فقیرا یأخذ جائزۃ السلطان مع علمہ ان السلطان یأخذھا غصبا أیحل لہ قال ان خلط ذلک بدراھم اخری فانہ لاباس بہ الی آخرہ، ترجمہ: ''چنانچہ عالمگیری میں ہے کہ الحاوی میں امام ابوبکر سے منقول ہے کہ ان سے کہا گیا کہ فقیر یہ جاننے کے باوجود کہ بادشاہ لوگوں کا مال غصب کر کے لیتا ہے، اُس سے عطیہ لیتا ہے، تو کیا یہ اس کے لئے حلال ہوگا؟ ارشاد فرمایا: اگر وہ

دوسرے مال کے ساتھ مخلوط ہوجاتا ہے تو پھر اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے (عبارت مکمل)''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 541، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

پراویڈنٹ فنڈ پر سود

میں پاکستان سٹیل ملز میں مستقل ملازم ہوں۔ سروس کے دوران ادارہ پراویڈنٹ فنڈ کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ اس کے لئے ایک فارم پر کرنا ہوتا ہے، جس میں درج ہوتا ہے کہ ملازم پراویڈنٹ فنڈ کی سہولت غیر سودی یا سودی بنیاد پر لے گا۔ یہ فنڈ ماہانہ بنیاد پر ہر ملازم کی تنخواہ کا 10٪ حصہ کاٹ کر جمع کی جاتی ہے۔ ابتدائی تین سال تک ملازم اس رقم میں سے کچھ نہیں لے سکتا اور تین سال بعد 80٪ تک قرض حاصل کیا جاسکتا ہے جو 12 یا 24 اقساط میں واپس کرنا ہوتا ہے۔ اگر سودی طریقہ اختیار کیا ہو تو سالانہ 4 یا 8 فیصد سود اصل رقم کے ساتھ دینا پڑتا ہے اور اگر غیر سودی طریقہ اختیار کیا ہو تو صرف اصل رقم واپس لوٹانا ہوتی ہے۔ اب چند سوالات کے جواب مطلوب ہیں: (جاوید ارشد، گلشنِ حدید، کراچی)

سوال:139

کیا اپنی ہی جمع رقم سے قرض لینے پر سود دینا جائز ہے؟۔

جواب:

سود لینا یا دینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، خواہ وہ اپنی ہی جمع شدہ رقم پر ادا کیا جارہا ہو یا کسی دوسرے شخص سے لئے گئے قرض پر ادا کیا جارہا ہو، دونوں صورتوں میں حکم یکساں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ نے سود کو مطلقاً حرام فرمایا ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ میں ادارے کی جانب سے اضافی رقم سود نہیں

سوال:140

ادارہ پراویڈنٹ فنڈ میں جتنی رقم ملازم کی تنخواہ سے وضع کرتا ہے، اتنی ہی رقم وہ اپنی طرف سے اس اکاؤنٹ میں جمع کرتا ہے۔ یہ سہولت سودی اور غیر سودی دونوں اسکیموں کے لئے ہے۔ کیا یہ اضافی رقم جو ادارہ ملازم کو اپنی جانب سے دیتا ہے، جائز ہے؟۔

جواب:

جن اداروں میں یہ اصول ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے پراویڈنٹ فنڈ کی مد میں ماہانہ جتنی رقم کاٹی جاتی ہے، اتنی ہی رقم وہ ادارہ اپنی طرف سے تبرّعاً یعنی فضل واحسان کے طور پر اس فنڈ میں جمع کرے گا، جیسا کہ آپ نے سوال میں بیان کیا ہے، تو یہ رقم اُس ادارے کی طرف سے ملازم کے ساتھ تبرّع اور فضل واحسان ہے اور یہ ملازم کے لئے جائز ہے، اگر شرائطِ ملازمت کا حصہ ہے، تب بھی درست ہے۔

سوال:141

اگر ملازم پراویڈنٹ فنڈ کی سودی اسکیم لیتا ہے تو ملازم کی سالانہ جمع شدہ رقم پر ہر سال ادارہ سود ادا کرتا ہے اور ہر سال یہ رقم بڑھتی رہتی ہے۔ کیا اس سودی اسکیم کے تحت ادارے سے تمام رقم لینا جائز ہے؟۔

جواب:

سودی اسکیم کے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سود مطلقاً حرام ہے، خواہ کسی بھی اسکیم کے ذریعے ہو۔ ملازم کی طرف سے سود پر مبنی عقد کو ترجیحی طور پر اختیار کرنے کا اقرار یا معاہدہ اپنی اصل کے اعتبار سے ہی ناجائز ہے اور بعد میں اس پر ملنے والا سودی اضافہ بھی ناجائز اور باطل ہے۔ اور اِس گناہ میں وہ ادارہ بھی شامل ہوگا۔ بعض اسلامی بنکوں نے کارپوریشنوں، کمپنیوں، محکموں اور اداروں کے لئے ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کی جمع شدہ رقوم کی مضاربت کے شرعی اصول پر مبنی اسکیمیں بنائی ہیں، مثلاً داؤد اسلامک بینک لمیٹڈ نے ”خوش حال“ کے نام سے ایک اسکیم بنائی ہے اور اس کے لئے باقاعدہ ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے، کارپوریشنوں، کمپنیوں، محکموں اور اداروں کی ملازمین کی انجمنیں یا یونینیں (CBA) اپنے اداروں کے سربراہان کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ ملازمین کی جی پی فنڈ کی جمع شدہ رقوم کے لئے اسلامی تمویل (Financing) کے طریقے اختیار کریں اور جس ملازم کو اپنے جی پی فنڈ سے رقم نکلوانی ہو، وہ اسے بلاسود دیدی جائے، کیونکہ یہ اُس کا اپنا مال ہے۔

کیاانعامی بانڈز کاانعام سود میں شامل ہے؟

سوال:142

کیاانعامی بانڈ کی رقم جو اسٹیٹ بینک سے انعام نکلنے کی صورت میں ملتی ہے، لینا جائز ہے؟، جبکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ اسٹیٹ بینک کا تمام کام دوسرے بینکوں کے ساتھ سودی ہے،(یاسر عالم، سیکٹر 5-D، نیو کراچی)

جواب:

انعامی بانڈز کی خرید وفروخت اور ان پر ملنے والا انعام جائز ہے، بانڈ پر درج قیمت (Face value) پر خرید وفروخت میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے، البتہ اس کی انعامی رقم کے جواز پر علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے علماء اہلسنت وجماعت کے نزدیک یہ انعامی رقم لینا جائز ہے، اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ اختلاف فقہی دلائل کی بنیاد پر ہے، یہ مسلکی نوعیت کا اصولی یا اعتقادی اختلاف نہیں ہے۔ ہر دور کے نئے پیش آنے والے مسائل ''مجتہد فیہ'' ہوتے ہیں، یعنی جن پر اُس عہد کے اہلِ فتویٰ اور اہلِ علم کو شرعی دلائل کی روشنی میں جواز یا عدمِ جواز کا حکم لگانا ہوتا ہے۔ بعض اوقات علماء کی فقہی آراء اِن کے بارے میں مختلف ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں عام مسلمانوں کو میرا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ جن علماء کی فقاہت، اجتہادی اہلیت اور علمی دیانت پر انہیں زیادہ اعتماد ہو، ان کی رائے پر عمل کیا کریں۔ لیکن یہ ترجیح دین داری اور آخرت کی جوابدہی کی بنیاد پر ہونی چاہئے، نہ کہ محض خواہشِ نفس کی اِتباع کی جائے۔ ان بانڈز کا اجراء حکومتِ پاکستان کرتی ہے، بینک نہیں کرتے۔ وہ صرف ان کی خرید وفرخت کے لئے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں۔ اِن میں کوئی سودی معاہدہ بھی شامل نہیں ہے، نہ مشروط (Conditional) اور نہ ہی معہود (Understood)۔ یہ اختلاف ربا کی حرمت میں نہیں ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ انعامی بانڈز پر دیا جانا والا انعام سود ہے یا نہیں؟ جن علماء نے اسے حرام قرار دیا، انہوں نے اسے سود اور قمار (Gambling) کہا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ فتویٰ دلائل کی

بنیاد پر درست نہیں ہے۔اس مسئلے پر تفہیم المسائل کی جلد: چہارم میں ہم لکھ چکے ہیں اور اگر کسی کو مزید تفصیلی دلائل سے آگہی مطلوب ہو تو علامہ غلام رسول سعیدی کی شرح صحیح مسلم جلد 4،ص: 111 تا 126، علامہ مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کا وقار الفتاویٰ، جلد اول، ص: 226 تا 232 اور مفتی محمد رفیق حسنی صاحب کی کتاب رفیق الفقہاء کا مطالعہ فرمائیں۔

ایک رفاہی ادارے کا کسی دوسرے رفاہی ادارے کو منفعت کے عوض قرض دینا

سوال:143

ایک رفاہی ادارہ جو صحت کے شعبے میں کام کر رہا ہے،اس کے پاس کچھ رقم اس کی اپنی ضروریات سے زائد جمع ہے،جس کے بغیر یہ ادارہ چند سالوں تک اپنی خدمات انجام دے سکتا ہے۔کیا یہ زائد رقم جوز کوٰۃ،صدقات اور عطیات سے حاصل ہوئی ہے،کسی ایسے فلاحی ادارے کو، جو صحت کے شعبے میں کام کرتا ہے،مندرجہ ذیل شرائط پر دے سکتا ہے:

(۱) یہ رقم سمجھوتے کے تحت مقررہ مدت میں قابلِ واپسی ہوگی۔(۲) رقم کی ادائیگی اور واپسی کے درمیانی مدت میں رقم لینے والا ادارہ، رقم دینے والے ادارے کو صحت کے شعبہ میں کچھ خدمات مفت فراہم کرے گا،لیکن رقم دینے والا ادارہ اپنے مریضوں سے مذکورہ خدمات کے عوض قیمت وصول کرے گا،کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟۔(ہارون جونانی،عزیز آباد،کراچی)

جواب:

کوئی بھی رفاہی ادارہ یا انجمن جو عوام سے زکوٰۃ،صدقات اور عطیات وصول کرتا ہے، اس پر ایک ذمہ داری تو یہ عائد ہوتی ہے کہ صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ،فطرہ،نذرو کفارات وغیرہ کی رقوم) کا کھاتہ الگ رکھے۔اور اُن رقوم کو ان مصارف پر صرف کرے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مقرر فرمائے ہیں۔عام عطیات اور نفلی صدقات وخیرات میں توسُّع (گنجائش) ہے۔اگر آپ کے ادارے کے قواعد وضوابط (By Laws) آپ کو اختیار دیتے ہیں کہ آپ دوسرے اداروں کو قرض دے سکتے ہیں تو آپ ایسا کر سکتے ہیں،مگر آپ کو عطیات دینے والوں کو بھی اس کا علم ہونا چاہئے اور ان کی یہ اجازت آپ کو حاصل ہو کہ

آپ ان کے دیئے ہوئے عطیات میں ایسا تصرف کر سکتے ہیں۔لیکن آپ اس قرض پر منفعت نہیں حاصل کر سکتے کہ آپ اپنے مریضوں سے تو فیس چارج کریں اور مقروض ادارہ آپ کے اُنہی مریضوں کو کسی قسم کے چارج کے بغیر علاج کی سہولت فراہم کرے۔قرض پر ایسی منفعت جو معاہدے میں طے شدہ ہو یا معروف ہو شرعاً ربا (سود) کے زمرے میں آتی ہے اور حرام ہے۔آپ کے معاونین نے تو اجر کمانے کے لئے آپ کو زکوٰۃ، صدقات اور عطیات دیئے تھے نہ کہ اسے کاروبار میں لگانے کیلئے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:
كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنفِعةً فَهو رِبًا، ترجمہ: ''ہر وہ قرض جو (اصل رقم پر زائد) کسی منفعت کا باعث ہو، تو ایسی منفعت سود ہے، (کنز العمال، رقم الحدیث:15516)''۔

وراثت کے مسائل

شوہر کی وفات کے وقت جو عورت نکاح میں ہے، وارث بنے گی

سوال:144

محمد رفیق ولد گل احمد کا نکاح ثریا بیگم سے 1989ء میں ہوا۔ محمد رفیق محنت مزدوری کے لئے کراچی منتقل ہو گیا، جہاں اس کو کینسر کا مرض لاحق ہوا اور اسی مرض میں 29 دسمبر 2008ء کو اُس کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے بعد اُس کے بھائیوں نے بذریعہ یونین کونسل گڑھی حبیب اللہ ایک طلاق نامہ محمد رفیق کی طرف سے لڑکی والوں کو ارسال کیا، جس پر طلاق کے گواہوں کے کوئی دستخط نہیں ہیں اور جو محمد رفیق کے دستخط ظاہر کئے گئے ہیں وہ بھی جعلی ہیں، کیونکہ ہمیں ان کے دستخط کی پہچان ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا بیوی کو شوہر کے ترکے سے حصہ نہیں ملے گا؟، (نوید احمد، گڑھی حبیب اللہ، مانسہرہ)۔

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ محمد رفیق ولد گل احمد صاحب نے اپنی بیوی ثریا بیگم کو اپنی زندگی میں طلاق نہیں دی تھی اور وہ اُن کی وفات تک اُن کے نکاح میں رہیں، تو وہ ان کی جائز شرعی وارث ہیں۔ اگر کوئی شخص خدانخواستہ اپنی بیوی کو اپنے مرضِ وفات میں طلاق بائن بھی دیدے اور عدت کے اندر شوہر کا انتقال ہو جائے تو بھی وہ مُطَلَّقہ بائنہ اپنے شوہر کی وارث بنے گی، علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں:

وَاِذَا طَلَّقَ الرَّجُلُ اِمْرَاَتَهٗ فِیْ مَرَضِ مَوْتِهٖ طَلَاقاً بَائِناً، فَمَاتَ وَهِیَ فِی الْعِدَّةِ، وَرِثَتْهُ، وَاِنْ مَاتَ بَعْدَ انْقِضَاءِ الْعِدَّةِ، فَلَا مِیْرَاثَ لَهَا،

ترجمہ: ''اور جب کوئی شخص اپنی بیوی کو مرض موت میں طلاق بائن دیدے اور (مطلقہ بیوی کی) عدت کے دوران مرجائے تو وہ عورت اپنے شوہر کے ترکے سے حصہ پائے گی۔ اور اگر اُس شخص کا انتقال عدت گزرنے کے بعد ہوا تو عورت کو ترکے سے کچھ بھی نہیں ملے گا، (فتح القدیر، جلد 4، ص:129)''۔

آپ نے متوفّٰی محمد رفیق کے بھائیوں کی طرف سے جس طلاق نامے کا ذکر کیا ہے

اور جسے آپ کے بیان کے مطابق یونین کونسل میں جمع کیا گیا ہے، وہ صحیح ہے یا جعلی؟، اس امر کا فیصلہ عدالت کا کام ہے۔ آج کل عدالتوں کی معاونت کے لئے تحریر یا دستخط کے ماہرین بھی دستیاب ہوتے ہیں اور عدالتیں اُن سے فنی مدد لیتی ہیں۔ دستخط کے اصلی یا جعلی ہونے کے بارے میں ماہر کی رائے قرائن کی شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ عدالت سے رجوع کریں یا اپنی پنچایت اور برادری میں کسی مقامی مفتی اور عالم کو، جن پر فریقین کا اعتماد ہو، حَکَم مقرر کر کے فیصلہ کرائیں، بشرطیکہ دونوں فریق پیشگی یہ اقرار نامہ لکھ کر دیں کہ وہ اِس فیصلے کو تسلیم کریں گے۔

اگر کوئی شخص حیلے بہانے، مکر وفریب یا جعلی دستاویزات کے ذریعے کسی کی جائیداد ناحق لیتا ہے یا کسی کو وراثت سے محروم کرتا ہے یا کسی کا حق مارتا ہے، تو اس کے لئے حدیث پاک میں شدید وعید آئی ہے۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں:

(1) عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ یَّكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِیْ لَهٗ عَلٰی نَحْوِ مِمَّا اَسْمَعُ مِنْهُ فمن قَطَعْتُ لَهٗ مِنْ حَقِّ اَخِیْهِ شَیْئًا فَلَا یَاْخُذْهُ، فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ بِهٖ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس مقدمات لے کر آتے ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو دوسرے فریق کے مقابلے میں زیادہ دلائل کے ساتھ پیش کرے (یا زیادہ چرب زبان ہو) تو میں اس کے (ظاہری) دلائل کو سن کر (بالفرض) اس کے حق میں فیصلہ کر دوں (جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہو)، تو جس شخص کو میں اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ دے دوں تو (اللہ کا خوف کرتے ہوئے) وہ اسے نہ لے، کیونکہ (وہ یہ سمجھے کہ درحقیقت) میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4470)''۔

(2) عَنْ عَمْرِو بْنِ نُفَیْلٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنْ اَرْضٍ ظُلْمًا، طَوَّقَهُ اللهُ اِیَّاهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِیْنَ

ترجمہ: ''عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے (کسی دوسرے کی) ایک بالشت زمین بھی ظلماً لی، اللہ تعالیٰ (سزا کے طور پر) قیامت کے دن (اس کے گلے میں) سات زمینوں کو طوق بنا کر ڈالے گا''۔
(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4129)

ان احادیثِ مبارکہ کی رو سے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلے حقیقت کی بنیاد پر ہوں گے۔ اور اگر دنیا میں کسی نے کسی حیلے، فریب یا دباؤ یا سفارش کے ذریعے کسی کا حق مار بھی دیا تو اس دنیا کے عارضی فائدے کے بدلے میں آخرت کا نقصان کروڑ ہا درجے زائد ہوگا۔

مسلمان اور غیر مسلم میں باہمی وراثت کا مسئلہ

سوال:145

میرا کیتھولک عیسائی گھرانے سے تعلق ہے اور میرا نام بابر گل ولد سیموئیل فلپس گل اور والدہ کا نام نسیم گل ہے۔ یہ دونوں اپنی زندگی میں اور مرتے وقت بھی کیتھولک عیسائی تھے۔ ان کی تین اولاد (2 بیٹیاں اور ایک بیٹا) ہیں۔ دونوں بیٹیاں مسلمان ہو چکی ہیں اور میں (بابر گل) اب بھی کیتھولک عیسائی ہوں۔ ایک بیٹی روبی نے 1981ء میں لاہور میں بادشاہی مسجد میں اسلام قبول کیا اور اپنا اسلامی نام بابرہ بی بی رکھ لیا اور ایک مسلمان نذیر احمد بٹ کے ساتھ اسلامی طریقے سے نکاح کر لیا۔

اب جب کہ میرے والدین وفات پا چکے ہیں، تو وہ ان کی وفات کے بعد حصہ دار ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے، چونکہ پیسے اور گھر عیسائی ماں باپ اور عیسائی گھرانے کا ہے۔ کیا مسلمان ہونے کے بعد اُس عورت کا عیسائی وراثت میں حصہ بنتا ہے؟ (بابر گل، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور)

جواب:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا يَرِثُ الْكَافِرُ

الْمُسْلِمَ۔

ترجمہ: ''حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے اور نہ ہی کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے''۔

(صحیح مسلم: 4031، سنن ابی داؤد رقم الحدیث: 2901)

اس حدیث کے تحت علامہ نووی لکھتے ہیں:

أجمع المسلمون علی أن الکافر لایرث المسلم وأما المسلم فلا یرث الکافر ایضاً عند جماهیر العلماء من الصحابة والتابعین ومن بعدهم۔

ترجمہ: ''مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا۔ اور صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے جمہور فقہاء کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا''۔

(شرح مسلم للنووی، جلد رابع، جز: 11، ص: 52، مطبوعہ: مکتبۃ الغزالی، دمشق)

میراث سے محروم کرنے والے اسباب چار ہیں، ان میں سے ایک سبب دین کا اختلاف ہے، یعنی مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور دادا عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لایتوارث أهل ملتین شتّٰی۔

ترجمہ: ''دو مختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے''۔

(سنن ابی داؤد: 2903)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

واختلاف الدین ایضا یمنع الِارثَ، والمرادُ به الاختلافُ بینَ الاسلامِ والکفرِ، وأمّا اِختلافُ مِلَلِ الکُفّارِ کالنَّصرانِیَّةِ وَالیهودِ وَالمَجوسِیَّةِ وعَبَدَةِ الوَثَنِ فَلا یَمنعُ الِارثَ حتّٰی یَجرِیْ التَّوارُثُ بَینَ الیَهودِیِّ والنَّصرانِیِّ وَالمَجوسِیِّ واختلافُ الدّارینِ یَمنَعُ الِارثِ، کذَا فی التَّبیینِ، ولکن هذا الحکمُ فی حَقِّ أهلِ الکفرِ لافی حقِّ المُسلِمِیْنَ

ترجمہ: ''اور دین کا اختلاف بھی وراثت (پانے) میں مانع ہے، اور اس سے مراد اسلام اور

کفر کے درمیان اختلاف ہے۔اور جو اختلاف کفار کی ملتوں کے درمیان ہو،جیسا کہ نصرانی، یہودی، مجوسی اور بت پرست تو پھر یہ اختلاف وراثت سے مانع نہیں ہوگا (یعنی یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں)۔یہاں تک کہ یہودی اور نصرانی اور مجوسی کے درمیان وراثت جاری ہوگی اور دارین کا مختلف ہونا (دارالاسلام ودارالحرب) وراثت میں مانع ہے،جیسا کہ ''تبیین'' میں بیان کیا گیا ہے۔اور یہ حکم اہل کفر کے حق میں ہے،مسلمانوں کے حق میں نہیں ہے،(عالمگیری جلد 6ص:454 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(واختلافُ الدینِ)إسلاماً وکفراً

ترجمہ:''(اور دین کا مختلف ہونا) وراثت میں مانع ہے، (یعنی) مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔۔۔اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قَیَّدَ بِہٖ لِاَنَّ الْکُفَّارَ یَتَوَارَثُوْنَ فِیْمَا بَیْنَھُم، وَاِنِ اخْتَلَفَتْ مِلَلُھُمْ عِنْدَنَا، لِاَنَّ الْکُفْرَ کُلَّہٗ مِلَّۃٌ واحدۃٌ۔

ترجمہ:''یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ہمارے نزدیک کفار ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں،اگرچہ ان کے دین آپس میں مختلف ہوں،کیونکہ (مسلمانوں کے مقابلے میں) تمام کفر ایک ملت ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 10ص:418)''۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

اِختلافُ الدِّینِ بینَ المُورِثِ والوَارثِ بِالاسلامِ وغیرِہٖ مانعٌ من الِارثِ بِاتفاقِ المذاھِبِ الاَربعۃِ ،فَلَا یَرِثُ المسلمُ کافراً ،ولَاالکافرُ مسلماً ، سواءٌ بِسببِ القَرابۃِ أَو الزَّوْجِیَّۃِ، لقولہ ﷺ لایرثُ المُسْلِمُ الکافرَ ،ولَاالکافرُ المسلمَ۔ وقولہ لایتوارثُ اھلُ ملتین شتّٰی

ترجمہ:''اسلام اور غیر اسلام (کفر) کے اعتبار سے وارث اور مُورِث (جو وراثت چھوڑ کر مرے) کے درمیان مذہب کا اختلاف چاروں مذاہب کے نزدیک متفقہ طور پر وراثت میں مانع ہے۔پس نہ مسلمان کافر کا وارث ہوسکتا ہے اور نہ ہی کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا

ہے،(اور یہ اصول) سببِ قرابت یا سببِ زوجیت دونوں کے لئے برابر ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے، نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے، اور آپ ﷺ کا دوسرا قول یہ ہے کہ دو مختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے،(الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد 8،ص:263)"۔

ہاں البتہ اگر بھائی اپنی بہنوں پر مہربانی کر کے رضا کارانہ طور پر اپنی خوشی سے انہیں کچھ دیدے تو یہ ایک اچھی انسانی قدر ہے اور انسانی ہمدردی کی راہ میں مسیحیت بھی رکاوٹ نہیں ہے۔اسے اسلامی اخلاقیات میں تبرُّع اور فضل واحسان کہا جاتا ہے، یعنی کسی کے شرعی اور قانونی استحقاق کے بغیر اسے کچھ دیدینا یا کسی کو اس کے حق سے زیادہ دیدینا۔

ترکے کی تقسیم اور صدقاتِ جاریہ

سوال:146

زید نے 400 مربع گز کا ایک پلاٹ اپنی بیوی کے نام منتقل کر کے اسے مالک بنادیا تھا، اب بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ورثاء میں شوہر کے علاوہ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ شرعی اعتبار سے اس کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ نیز زید (شوہر) اپنے حصہ کی رقم کا مناسب حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق خرچ کرنا چاہتا ہے، ان مدات کی ترجیحات بھی بیان کر دیجیے،(منور احمد، کراچی)۔

جواب:

شریعت کی رو سے کوئی شخص وفات کے بعد جو ترکہ چھوڑ جاتا ہے، اس میں سے تقسیم وراثت سے پہلے بالترتیب مندرجہ ذیل مصارف وضع کیے جاتے ہیں:

(1) مصارف تکفین وتدفین　(2) اس کے ذمے اگر کسی کا قرض ہے تو اس کی ادائیگی

(3) اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو ادائے قرض کے بعد جو ترکہ بچے گا، اس کی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مقدار تک وصیت پر عمل درآمد ہوگا، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو۔ یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، انہیں منہا (Deduct) کرنے

کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ وفات یافتہ خاتون کا ترکہ 44 حصوں میں تقسیم ہوگا: شوہر کو 11 حصے، 5 بیٹوں کو 30 حصے (فی کس 6 حصے)، ایک بیٹی کو 3 حصے ملیں گے۔ اگر آپ یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ زید اپنی زندگی میں کچھ رقم بہ طورِ صدقۂ جاریہ خرچ کرنا چاہتا ہے، جو اسکے حق میں ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکے تو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ایصالِ ثواب میں ''صدقاتِ جاریہ'' کو ترجیح دینی چاہیے۔ یعنی مصارفِ ثواب کی ایسی صورتیں اختیار کی جائیں، جن کا فیضان اور اجر وثواب تادیر جاری وساری رہے۔ اس شخص کے نامۂ اعمال میں خیر کے کھاتے کھلے رہیں اور اجر وثواب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْہُ عَمَلُہٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَۃِ اَشْیَاءَ مِنْ صَدَقَۃٍ جَارِیَۃٍ اَوْ عِلْمٍ یُنْتَفَعُ بِہٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْلَہٗ

ترجمہ: ''جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کے اعمالِ خیر کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے (کہ جن کے اجر وفیضان کا سلسلہ انسان کی وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے)، صدقۂ جاریہ یا علم نافع (جس کا فیضان ان کے تلامذہ کے ذریعے بدستور جاری رہتا ہے) یا نیک اولاد جو اس کیلئے دعائے مغفرت کرتی رہے''۔ (سنن ابوداؤد: 2872)

''صدقاتِ جاریہ'' کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں: مثلاً مسجد کی تعمیر، دینی مدارس کی تعمیر، علماء وحفاظِ قرآن کی تعلیم وتربیت وکفالت، پانی کا کنواں کھود کر وقف کر دینا، خیراتی اسپتال بنانا، دعوتی وتبلیغی دینی لٹریچر وغیرہ شائع کرنا۔ صدقۂ جاریہ کی ایک پسندیدہ صورت ضرورت مندلوگوں کے لئے پانی کا انتظام بھی ہے۔ ضرورت مندلوگوں کو پانی فراہم کرنا اور کھانا کھلانا بھی صدقۂ جاریہ ہے، جو اجرِ کثیر کا باعث ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اَیُّمَا مُسْلِمٍ کَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلٰی عُرْیٍ کَسَاہُ اللّٰہُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّۃِ وَاَیُّمَا مُسْلِمٍ اَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰی جُوْعٍ اَطْعَمَہُ اللّٰہُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّۃِ

وَاَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰى مُسْلِمًا عَلٰى ظَمَأٍ سَقَاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الرَّحِيْقِ الْمَخْتُوْمِ،

ترجمہ: ''جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو بے لباسی کے وقت لباس پہنائے گا، تو (اس کے اجر میں) اللہ تعالیٰ اسے جنت کا سبز لباس پہنائے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کو بھوک کے عالم میں کھانا کھلائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھلوں میں سے کھلائے گا اور جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو (شدید) پیاس کے عالم میں پانی پلائے گا، تو (اس کے اجر کے طور پر) اللہ تعالیٰ اسے (جنت کی) مہر بند (Seal pack) شرابِ طہور پلائے گا''۔

(سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 1679)

سرکاری ملازم کی بیوہ بچوں کا عطیہ اور ورثاء کا استحقاق

سوال: 147

میری ایک بیوی، چار جوان بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ بڑا بیٹا محمد افضل 14 سال سے دیر اسکاؤٹ ملیشیا فورس میں ملازم تھا۔ دورانِ ملازمت حادثے میں شہید ہو گیا، حکومت کی طرف سے اس کی بیوہ خاتون بیگم کے نام چھ لاکھ روپے جمع کرائے گئے اور ماہانہ 3,500/ روپے پنشن مقرر کی گئی۔ گورنمنٹ نے 2,27000/ روپے کی زمین اس کی بیوہ اور بچوں (بلال، جنید اور فاطمہ) کے نام خرید کر اس پر اپنے خرچ سے ان کے لئے مکان بنوادیا۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ کی طرف سے میرے بیٹے کی بیوہ اور بچوں کے نام کچھ رقم بھی آتی رہی، جسے میں اُنہیں بتائے بغیر استعمال کرتا رہا، ہم سب اکٹھے رہتے ہیں۔ میرے باقی تینوں بیٹے بھی برسرِ روزگار ہیں۔ کیا حکومت کی طرف سے میرے مرحوم بیٹے کی بیوہ اور بچوں کو دی گئی رقم اور مکان پر ترکے کا اطلاق ہوتا ہے؟، کیا ہم اس رقم میں سے حصہ لینے اور خرچ کرنے کے حق دار ہیں؟۔ (محمد زمان، اوگی)۔

جواب:

میری رائے میں یہ سب حکومت کی طرف سے مرحوم کی بیوہ اور بچوں کے لئے تبرُّع اور فضل و احسان ہیں، یہ مرحوم کا ترکہ نہیں کہ اسے شرعی ورثاء میں اصولِ شرع کے مطابق

تقسیم کیا جائے۔آپ (یعنی مرحوم کے والد) کا اس مال میں تصرُّف ناجائز ہے۔ بچے اگر نابالغ ہیں اور قضائے الٰہی سے یتیم ہو گئے ہیں تو ولی کا ان کے مال میں باطل طریقے سے تصرُّف اور حیلے وتدبیر سے اُسے ہتھیا لینا از روئے قرآن نہایت قبیح فعل اور ظلم ہے، اس پر قرآن میں بڑی وعید آئی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ

ترجمہ: ''جو لوگ ظالمانہ طریقے سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ جھونک رہے ہیں، (النساء:10)''۔

(۲) وَلَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَہُمۡ اِلٰۤی اَمۡوَالِکُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حُوۡبًا کَبِیۡرًا ﴿۲﴾

ترجمہ: ''اور ان (یتیموں) کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے (النساء:2)''۔ اگر کوئی شخص کسی یتیم کا ولی ہے، خواہ وہ دادا ہو، چچا ہو یا بڑا بھائی، اس کے بارے میں قرآن مجید میں واضح ہدایت ہے:

(۳) وَلَا تَاۡکُلُوۡہَاۤ اِسۡرَافًا وَّبِدَارًا اَنۡ یَّکۡبَرُوۡا ؕ وَمَنۡ کَانَ غَنِیًّا فَلۡیَسۡتَعۡفِفۡ ۚ وَمَنۡ کَانَ فَقِیۡرًا فَلۡیَاۡکُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ

ترجمہ: ''اور ان کے مال کو فضول خرچ کر کے ان کے بڑے ہونے کے خوف سے جلدی جلدی نہ کھاؤ، اور (یتیم کا) جو (ولی) مالدار ہو، وہ (ان کا مال کھانے سے) بچتا رہے اور جو حاجت مند ہو، وہ دستور کے مطابق کھالے، (النساء:6)''۔

آپ کے مرحوم بیٹے کے بیوی بچوں کے نام وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے جو رقم آتی رہی اور آپ اُنہیں بتائے بغیر استعمال کرتے رہے، اس رقم کو آپ کیلئے ان کی جائز ضروریات پر صرف کرنا تو درست تھا، لیکن اپنے خاندان کے باقی افراد پر صرف کرنا درست نہیں تھا۔ آپ کی حیثیت ولی اور امین کی ہے، آپ کی ذمہ داری ہے کہ دوسروں پر خرچ کی گئی رقم واپس اُن بچوں کے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں۔ حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ جَابِرِبْنِ عَبْدِاللّٰہِ اَنَّ رَجُلاً قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ! اِنَّ لِی مَالاً وَّوَلَدًا،

وَاِنَّ اَبِی یُرِیْدُ اَنْ یَجْتَاحَ مَالِی، فَقَالَ اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس (کچھ) مال ہے اور میری اولاد بھی ہے، اور میرے والد چاہتے ہیں کہ وہ میرا مال لے لیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اور تمہارا مال (دونوں) تمہارے والد کے ہیں۔

(۲) اِنَّ اَوْلَادَکُمْ مِنْ اَطْیَبِ کَسْبِکُمْ فَکُلُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔

ترجمہ: ''بے شک تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی میں سے ہے، پس اپنی اولاد کی کمائی سے کھاؤ، (یعنی تمہیں اپنی اولاد کے مال میں سے کھانے کی اجازت ہے)''۔

(سُنن ابن ماجہ: 92-2291)

(۳) اِنَّ رَجُلًا اَتَی النَّبِیَّ ﷺ، فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللهِ! اِنَّ لِی مَالًا وَوَلَدًا، وَاِنَّ وَالِدِی یَجْتَاحُ مَالِی، قَالَ اَنْتَ وَمَالُکَ لِوَالِدِکَ، اِنَّ اَوْلَادَکُمْ مِنْ اَطْیَبِ کَسْبِکُمْ، فَکُلُوْا مِنْ کَسْبِ اَوْلَادِکُمْ،

ترجمہ: ''ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی یارسول اللہ! میرے پاس (کچھ) مال ہے اور میری اولاد بھی ہے اور میرے والد میرے مال کو سرے سے ختم کرنا چاہتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اور تمہارا مال تمہارے والد کے لئے ہے، بے شک تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی میں سے ہے، تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ، (سُنن ابوداؤد: 3524)

اس حدیث کی شرح میں صاحب عون المعبود لکھتے ہیں:

انتَ ومالکَ لِوالدکَ علی معنی انّهُ اِذا اِحتاجَ الی مالکَ، اخذَ منکَ قدَرَ الحاجۃِ کمایاخذُ مِن مالِ نفسِه

ترجمہ: ''تم اور تمہارا مال تمہارے والد کے لئے ہے۔ یہ اس صورت پر محمول ہے کہ جب باپ تمہارے مال کا محتاج ہو، تو وہ تم سے اپنی حاجت کے مطابق لے، جیسے اپنے مال سے لیتا

ہے، (عون المعبود، جلد 3، ص: 312)"۔ صاحب بذل المجہود نے اس کی شرح میں لکھا ہے:

وَقَيَّدَهُ الفقهاءُ بالحاجةِ، اَیْ اِذَا احْتَاجَ اِلَيهِ، وَاَمَّا اِذَا لَمْ يَحْتَجْ فَلَا يَجُوزُ لَهُ الْاَكْلُ اِلَّا بِاذْنِهٖ

ترجمہ: "(بعض) فقہاء نے حاجت کی قید لگائی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ (باپ کو اپنے بیٹے کے مال میں اُس کی اجازت کے بغیر تصرُّف کی اجازت صرف) اس صورت میں ہے جب وہ تمہارے مال کا محتاج ہو، تو وہ تمہارے مال میں سے اپنی حاجت کے مطابق لے جس طرح اپنے مال میں سے لیتا ہے، (بذل المجہود، جلد خامس، ص: 295)"۔

(۴) عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ، وَاِنَّ اَوْلَادَكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے پاکیزہ مال جو تم کھاتے ہو، وہ تمہاری اپنی کمائی ہے اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی میں سے ہے"۔ (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2290، سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1358)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں:

وَالْعَمَلُ عَلٰى هٰذَا عِنْدَ بَعْضِ اَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ وَغَيْرِهِمْ، قَالُوْا اِنَّ يَدَ الْوَالِدِ مَبْسُوْطَةٌ فِيْ مَالِ وَلَدِهٖ يَاْخُذُ مَا شَاءَ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا يَاْخُذُ مِنْ مَالِهٖ اِلَّا عِنْدَ الْحَاجَةِ اِلَيْهِ۔

ترجمہ: "حضور ﷺ کے اصحاب میں سے بعض اہلِ علم کا اور ان کے علاوہ دوسرے بعض فقہاء کا اس حدیث پر عمل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ باپ کو اپنی اولاد کے مال میں کھلا اختیار حاصل ہے، وہ جس قدر چاہے اُس میں سے لے سکتا ہے، اور ان میں سے بعض نے کہا کہ باپ اپنی اولاد کے مال میں سے اس وقت لے، جب اسے اس کی حاجت ہو"۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1358)

ان احادیث کی رُو سے باپ اپنی زندہ اولاد کے مال میں ان کی اجازت کے بغیر اپنی

جائز ضروریات اور حاجت کے لئے لے سکتا ہے۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ والد اپنی جائز ضروریات کے علاوہ بھی اپنی اولاد کے مال میں تصرُّف کرے۔ نیز جب اولاد کا انتقال ہوجائے تو باپ کو اپنی اولاد کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ ملے گا۔

یہاں یہ مال آپ کے یتیم پوتے اور پوتیوں کا ہے۔ آپ ان کے ولی اور اُن کے مال پر امین ہیں، لہٰذا آپ پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ البتہ اگر آپ کے بیٹے کا جی پی فنڈ حکومت کے پاس تھا، جو اس کی زندگی میں اس کی تنخواہ سے رضا کارانہ یا لازمی طور پر وضع کیا جاتا تھا تو یہ اُس کا ترکہ شمار ہوگا اور والدین سمیت تمام ورثاء کے درمیان شریعت کے قانون کے مطابق تقسیم ہوگا۔ اسی طرح مرحوم کی اپنی جمع کی ہوئی رقم اور دوسرا ترکہ بھی، اگر کچھ ہے تو تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

چونکہ آپ کے بیٹے کا انتقال ہو چکا ہے، لہٰذا اس کی اولاد (یعنی آپ کے پوتے، پوتیاں) آپ کے انتقال کے بعد آپ کے وارث نہیں بن سکتے، کیونکہ آپ کی اولاد موجود ہے اور اسلامی قانونِ وراثت کے ''اصولِ حجب'' کی رُو سے قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے۔ لہٰذا آپ کو چاہئے کہ اپنی جائیداد میں سے ان کے نام کچھ نہ کچھ ''ہبہ'' کر دیں یا اُن کے لئے وصیت کر دیں کہ آپ کے انتقال کے بعد اُنہیں آپ کے ترکے میں سے مناسب حصہ (جو بھی آپ مقرر کریں) دیا جائے۔ ترجیحی طور پر ہبہ یا وصیت کی مقدار اتنی ہونی چاہئے جتنی رقم آپ کے وفات یافتہ بیٹے کو آپ کے انتقال کے بعد اُس کے زندہ رہنے کی صورت میں ورثے میں ملتی۔ یہ ہبہ یا وصیت ایجابی (لازمی) نہیں ہے بلکہ رضا کارانہ ہوگی اور اس پر آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے یقیناً اجر پائیں گے۔

ذوی الفروض، عصبات اور ذوی الارحام کے درمیان تقسیم ترکہ میں ترتیب

سوال: 148

میری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے اور میں ان کی ایک ہی بیٹی ہوں۔ میرے علاوہ ان کی اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ میری والدہ کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا ان سے پہلے انتقال

ہو چکا ہے۔میری والدہ کے ایک بھائی تھے،ان کا بھی پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ان کی اولاد میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔والدہ کی بہن بھی انتقال کر چکی ہیں،ان کی اولاد میں چھ بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔میرا ترکے میں سے کتنا حصہ ہوگا؟۔اگر میرے ماموں زاد اور خالہ زاد سب باقاعدہ تحریری طور پر میرے حق میں دستبردار ہو جائیں تو کیا سب ترکہ مجھے مل سکتا ہے؟،(ص،ف،کراچی)۔

جواب:

تقسیم میں اصحابِ فرائض سے ابتداء کی جائے۔اصحابِ فرائض وہ ہیں،جن کے حصے قرآن مجید میں مقرر کر دیئے گئے ہیں۔اور اس کی تفصیل سورۃ النسآء کی ابتدائی آیات میں موجود ہے۔مذکورہ مسئلے میں اصحابِ فرائض میں سے صرف ایک بیٹی یعنی آپ موجود ہیں۔لہٰذا آپ ترکے میں نصف کی حق دار ہیں،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ

ترجمہ:''اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے درمیان (ترکے کی تقسیم کے بارے میں یہ) حکم دیتا ہے کہ ایک بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں کے برابر ہوگا اور اگر (کسی کی اولاد میں) صرف بیٹیاں ہی ہوں (اور دو یا) دو سے زیادہ ہوں تو ان سب کو مجموعی طور پر (قابلِ تقسیم) ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا۔اور اگر (کسی کی وارث) صرف ایک ہی بیٹی ہے تو اسے (کل ترکے کا) نصف ملے گا،(سورۃ النساء:11)''۔

ذوی الفروض (قرآن کی رو سے جن وارثوں کے حصے مقرر ہیں) کو ان کا حصہ دینے کے بعد جو ترکہ بچ جائے،وہ میت کے عصبات کو ملے گا،اور اس کی بابت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا، فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ

ترجمہ:''شریعت میں ذوی الفروض کے مقررہ حصے ان کو دے دو،اس کے بعد جو ترکہ باقی بچ جائے وہ قریب ترین مرد وارث (عصبہ) کو ملے گا،(صحیح بخاری:6735)''۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کو اپنی والدہ کے کل قابلِ تقسیم ترکے میں سے نصف ملے گا اور بقیہ نصف ترکہ آپ کی والدہ مرحومہ کے چار بھتیجوں میں مساوی طور پر تقسیم ہوگا۔ اور اگر آپ کے وہ چاروں ماموں زاد بھائی (یعنی آپ کی والدہ کے بھتیجے) اپنی آزادانہ مرضی سے آپ کے حق میں اپنے اپنے حصے سے دستبردار ہوجاتے ہیں تو یہ ان کی طرف سے آپ کے لئے تبرُّع اور فضل واحسان ہوگا، اس صورت میں سب ترکہ آپ کو مل سکتا ہے، یہ دراصل ان کی طرف سے آپ کے لئے ھبہ ہوگا۔ آپ کی والدہ کی بھتیجیوں اور بھانجوں، بھانجیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔

ہبہ میں ملی ہوئی جائیداد پر مالکانہ تصرُّف کا حق

سوال:149

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے تین بیٹے ہیں اور دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں۔ زید نے اپنی زندگی میں ایک دکان اور ایک مکان دوسری بیوی کے نام کر دیا تھا اور کاغذات بھی اُسی کے نام سے بنوائے اور کئی لوگوں کے سامنے اپنے اِس خدشے کا اظہار کیا کہ میرے بعد میری پہلی بیوی اور اس کی اولاد میری دوسری بیوی کا خیال نہیں کریں گے۔ بعد ازاں زید اور اُس کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا اور زید کے تینوں بیٹوں نے سارا مال آپس میں تقسیم کرلیا اور زید کی دوسری بیوی کو کچھ بھی نہیں دیا۔ اب مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ زید نے جو دکان اور مکان دوسری بیوی کے نام کیا تھا، کیا اسے دوسری بیوی اپنی حیات میں کسی کو ہبہ کرسکتی ہے؟، (قمر علی، کراچی)۔

جواب:

اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں کسی کو کوئی شے ہبہ (Gift) کردے اور موہوب لہٗ (جسے ہبہ کیا گیا ہے) اُس شے موہوبہ (Gifted Item) پر قبضہ بھی کرلے تو ہبہ تام (مکمل) ہوجاتا ہے اور وہ شے واہب (ہبہ کرنے والے) کی ملکیت سے نکل کر موہوب لہٗ کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔ پھر وہ موہوب لہٗ (جسے ہبہ کیا گیا ہے) اُس ہبہ کی ہوئی چیز کا

مالک بن جاتا ہے، اس کے بعد شریعت کی رو سے وہ اس جائیداد پر مالکانہ تصرّف کرسکتا ہے۔ اگر آپ کا بیان درست ہے کہ زید نے مذکورہ دکان اور مکان اپنی دوسری بیوی کو ہبہ کردیئے تھے اور اُس پر اُس نے قبضہ بھی کرلیا تھا، تو یہ ہبہ مکمل ہوگیا اور وہ خاتون اس مکان اور دکان کی مالک ہے۔ وہ اپنی زندگی میں جسے چاہے ہبہ (Gift) کرسکتی ہے، اُس کے مالکانہ تصرّف پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر زید کی پہلی بیوی بھی اس کی وفات کے وقت حیات تھی تو شریعت کی رو سے زید کے ترکے میں سے دونوں بیویوں کو فی کس 1/16 حصہ (مجموعی طور پر آٹھواں حصہ) ملے گا۔ اور اگر زید کی پہلی بیوی کا انتقال زید سے پہلے ہوگیا تھا تو دوسرے بیوی کو 1/8 حصہ ملے گا۔ زید کے بیٹوں کا اپنی سوتیلی ماں (زید کی دوسری بیوی) کو اپنے باپ کے ترکے سے محروم کرنا درست نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح سے اُس کے حق کو ظلماً غصب کرنا ہے، اگر کوئی کسی شخص کا حق غصب کرے، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کی وعید ہے: ''مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا طَوَّقَهُ اللهُ إِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِيْنَ''۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی شخص کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا، تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، (صحیح مسلم،: 4055)''۔

وصیت کی تعریف اور اس کی مقدار

مُوصی کی زندگی میں وصیت نافذ نہیں ہوتی

سوال:150

ایک شخص نے وصیت کی کہ میرا مال میرے بعد فلاں شخص کو دے دیا جائے، تو جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو وہ وصیت کرنے والے کی زندگی میں اُس پر قبضہ کرسکتا ہے؟۔

(سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

وصیت کرنے والے کو ''مُوصی'' اور جس کے حق میں وصیت کی جائے، اسے ''موصی

لہٗ'' کہتے ہیں۔ وصیت، مُوصی کی وفات کے بعد نافذ ہوتی ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار مُوصی کے ترکے کی ایک تہائی حد تک ہوتی ہے۔ اگر وصیت کی مقدار وفات یافتہ شخص کے ایک تہائی ترکے سے زیادہ ہے تو ایک تہائی سے زائد مقدار کالعدم ہو جائے گی، سوائے اس کے کہ وصیت کرنے والے کے تمام ورثاء یا کوئی ایک وارث اپنے حصے میں سے رضا کارانہ طور پر دستبردار ہو کر اسے نافذ کرے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَاصٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَعُوْدُنِیْ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ مِنْ وَجَعٍ اِشْتَدَّ بِهٖ، فقلتُ اِنِّیْ قَدْ بَلَغَ بِیْ مِنَ الْوَجَعِ وَاَنَا ذُوْ مَالٍ، وَلَا یَرِثُنِیْ اِلَّا اِبْنَةٌ اَفَاَتَصَدَّقُ بِثُلُثَیْ مَالِیْ؟، قَالَ لَا، فقلتُ بِالشَّطْرِ؟، فقال لَا، ثُمَّ قَالَ الثُّلُثُ، والثُّلُثُ کَبِیْرٌ اَوْ کَثِیْرٌ، اِنَّكَ ان تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِیَاءَ، خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ، وَاِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِیْ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ اِلَّا اُجِرْتَ بِهَا، حَتّٰی مَا تَجْعَلُ فِیْ فِیْ اِمْرَأَتِكَ

ترجمہ: ''حضرتِ سعد بن وقاص بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے سال رسول اللہ ﷺ میرے شدید درد کی وجہ سے میری عیادت کے لئے تشریف لائے، تو میں نے عرض کیا: مجھے شدید درد لاحق ہے اور میں مالدار آدمی ہوں اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے، تو کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کر دوں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں''، تو میں نے عرض کیا: کیا میں اپنا آدھا مال صدقہ کر دوں؟، تو آپ نے فرمایا: ''نہیں'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ایک تہائی مال صدقہ کر دو اور ایک تہائی بڑا ہے یا بہت ہے، اگر تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑو، یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں تنگ دست چھوڑو کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں اور تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جو بھی مال خرچ کرو گے اس پر تمہیں اجر ملے گا، یہاں تک کہ وہ روزی جو تم اپنی بیوی کے منہ ڈالتے ہو (اس پر بھی اجر ملے گا)''۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1295)

وصیت کا نفاذ مُوصی کی وفات کے بعد ہوتا ہے، مُوصٰی لہٗ اگر مُوصی کی زندگی میں وصیت کو قبول کر بھی لے تو اس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ البتہ مُوصی کی وفات کے بعد

اسے قبول کرنے کا حق حاصل رہے گا۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

قبولُ الوصیۃِ اِنَّمَا یکونُ بعدَ الموتِ، فاِنْ قبِلَھا فِی حَالِ حیاۃِ المُوصِی أو رَدَّھا، فَذٰلِكَ باطلٌ، ولہُ القبولُ بعدَ الموتِ، کذَا فِی السِّرَاجِیَّۃِ

ترجمہ:''وصیت قبول کرنے کا اعتبار مُوصی (وصیت کرنے والے) کی موت کے بعد ہے۔ اگر مُوصیٰ لہٗ (جس کے لئے وصیت کی جائے) نے موصی کی زندگی میں ہی اسے قبول کیا یا رد کیا تو باطل ہے۔(ہاں!)مُوصیٰ لہٗ (جس کے لئے وصیت کی جائے) کو مُوصی (وصیت کرنے والے) کی موت کے بعد قبول کرنے کا حق ہے،جیسا کہ''سراجیہ''میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری،جلد 6،ص:90 تا 92،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)

اگر کسی نے اپنے شرعی وارثوں میں سے کسی ایک کے حق میں وصیت کی ہو تو وہ شریعت میں معتبر نہیں ہے،کیونکہ ایسی وصیت کے ذریعے وہ شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ وارثوں کے حصے کے تناسب (Ratio) کو تبدیل کر دیتا ہے،چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ، قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ، فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ

ترجمہ:''ابواُمامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حصہ (اسلامی قانونی وراثت میں) دے دیا ہے،تو (اب کسی) وارث کے حق میں وصیت کوئی حیثیت نہیں رکھتی،(سنن ابوداؤد:2862)''۔

زندگی میں وصیت سے رجوع کا حق ہے

سوال:151

کیا کوئی شخص وصیت نامہ لکھنے یا زبانی وصیت کرنے کے بعد اپنی وصیت سے رجوع کر سکتا ہے؟،(سید ناصر علی قادری،گلشن اقبال،کراچی)۔

جواب:

وصیت کرنے والا اپنی وصیت سے رجوع کر سکتا ہے،اور اُس کے وصیت سے رجوع

کرنے کی صورت میں وہ وصیت باطل ہوجائے گی، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَیَصِحُّ لِلْمُوصِی الرّجوعُ عَنِ الوصیّۃِ، ثُمّ الرجوعُ قد یَثبُتُ صریحاً وقد یثبُتُ دلالۃً، فَالاوّلُ بِاَن یَّقولَ رَجعتُ اَونحوَہٗ، وَالثّانِی بِان یَّفعلَ فِعلاً یَدُلُّ عَلَی الرجُوعِ، ثُمّ کُلُّ فِعلٍ لوفَعلہُ الانسانُ فِی مِلکِ الغیرِ یَنقطِعُ بِہٖ حَقُّ المالِکِ، فَاِذَا فَعَلہُ المُوصِی کَانَ رَجُوعَاً۔۔۔ وَکَذَا کُلُّ تصرُّفٍ اَوجبَ زَوالَ مِلکِ المُوصِی فَھُو رجوعٌ

ترجمہ: ''وصیت کرنے والے کا اپنی وصیت سے رجوع کرنا جائز ہے، یہ رجوع کبھی صراحۃً ہوتا ہے اور کبھی دلالۃً ہوتا ہے۔ صریح کی صورت یہ ہے کہ صاف لفظوں میں کہے: ''میں نے اپنی وصیت سے رجوع کیا، یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ کہے''۔ دوسری صورت یعنی دلالۃً یہ ہے کہ کوئی ایسا عمل کرے جو رجوع کرنے پر دلالت کرتا ہے، (اس کے لئے قاعدۂ کلیہ یہ ہے) کہ ہر ایسا فعل جس کے غیر کے ملک میں عمل میں لانے سے مالک کا حق منقطع ہوجائے، اگر مُوصِی (وصیت کرنے والا) ایسا کام کرے، تو یہ اس کا اپنی وصیت سے رجوع کرنا ہوگا۔ مثلاً اس نے وصیت کی کہ میرے بعد یہ مکان یا دکان یا گاڑی فلاں کی ہوگی اور پھر ان چیزوں کو فروخت کردیا یا کسی اور کو ہبہ کردیا۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: اور اسی طرح مُوصِی کا ہر وہ تصرف جس کے ذریعے اُس کی مِلکیت وصیت کی ہوئی چیز سے زائل ہوجائے تو یہ بھی رجوع ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 90 تا 92)

غیر مملوکہ چیز کی وصیت

سوال: 152

کیا کسی ایسی چیز کی وصیت بھی کی جاسکتی ہے؟ جو وصیت کرنے والے کی ملکیت میں نہیں ہے، (سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

کوئی بھی ایسی شے، جو وصیت کرنے والے کی ملکیت میں نہیں ہے، اُس کے بارے میں وصیت نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے کہ وصیت کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ

وصیت کرنے والا مُوصیٰ بہٖ (وصیت کی جانے والی چیز) کا مالک ہو اور کسی دوسرے کو مالک بنانے کا اہل بھی ہو، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وشرطها كون الموصي أهلا للتمليك وَالمُوصٰى له أهلاً للتمليك، والموصیٰ به بعد الموصي مالا قابلا للتمليك

ترجمہ: ''(وصیت کی) شرط یہ ہے کہ موصی (وصیت کرنے والا دوسرے کو) مالک بنانے کا اہل ہو اور موصیٰ لہٗ (جس کے لئے وصیت کی جائے) وہ مالک بننے کا اہل ہو اور موصیٰ بہٖ (جس چیز کی وصیت کی جائے) وہ مُوصی کی موت کے بعد قابلِ تملیک مال ہو، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص:90 تا 92، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

اولاد نہ ہونے کی صورت میں بیوی کے ترکے سے شوہر کو نصف حصہ ملے گا

سوال:153

ہماری بہن رحمت بی کو گذشتہ سال مئی 2008ء میں ان کے ذاتی فلیٹ میں قتل کر دیا گیا۔ ایک ماہ بعد اُن کے شوہر عبدالرؤف کا ہارٹ اٹیک کے سبب انتقال ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہماری بہن رحمت بی کی کوئی اولاد نہیں ہے اور ہم دو بھائی اور ایک بہن ہی اُن کے حقیقی وارث ہیں۔ ترکے میں بہن کا ذاتی فلیٹ (جس میں وہ رہائش پذیر تھیں)، سونے کے زیورات اور گھریلو سامان ہے۔ اس کے علاوہ ایک عدد پلاٹ بھی تھا جو ان کے شوہر عبدالرؤف نے اُنہیں گفٹ کر دیا تھا اور اس وقت بھی وہ پلاٹ رحمت بی کے نام پر ہے اور اُس کے کاغذات بھی انہی کے پاس تھے۔ اس کی تقسیم کا کیا طریقہ ہے؟۔

نوٹ: عبدالرؤف صاحب ہمارے کارخانے میں ملازمت کرتے تھے اور وہ فلیٹ جس میں رحمت بی رہائش پذیر تھیں اور سونے کے زیورات، جو ان کے استعمال میں تھے، ہم نے بنوا کر اور مکان خرید کر دیا تھا اور ان سب چیزوں کی دیکھ بھال بھی ہم ہی کیا کرتے تھے۔

رحمت بی کے وارث 2 بھائی اور ایک بہن ہیں۔ عبدالرؤف صاحب کے ورثاء میں 2 بھائی اور 2 بہنیں ہیں۔ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟، (عظیم احمد، کراچی)۔

جواب:

شریعت کی رو سے کسی بھی شخص کی وفات کے بعد جو ترکہ وہ چھوڑ جاتا ہے، اس میں تقسیم وراثت سے پہلے بالترتیب مندرجہ ذیل مصارف وضع کئے جاتے ہیں:
(1) مصارف تکفین وتدفین (2) اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض باقی ہے تو اس کو ادا کرنا (3) اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو قرض کی ادائیگی کے بعد جو ترکہ بچ رہے گا، اسکی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مقدار تک وصیت پر عمل درآمد ہوگا، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو وضع کرنے کے بعد، بقیہ ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔
صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحومہ رحمت بی کے انتقال کے وقت اُن کے شوہر موجود تھے اور مرحومہ کی کوئی اولاد نہیں تھی، لہٰذا کل ترکے کا نصف عبدالرؤف کو ملے گا اور ان کی وفات کے بعد ان کا ترکہ ان کے شرعی وارثوں کو ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ
ترجمہ: ''اور تمہارے لئے (شوہر کے لئے) تمہاری وفات یافتہ بیوی کے چھوڑے ہوئے مال کا نصف ہے، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو، (النساء: 12)''۔
چنانچہ رحمت بی مرحومہ کے ترکے، کے 10 حصے کئے جائیں گے، ان میں سے ان کے شوہر کو پانچ حصے، دو بھائیوں کو چار حصے (فی کس دو، دو حصے) اور ایک بہن کو ایک حصہ ملے گا۔
متوفّی عبدالرؤف کو اپنی وفات یافتہ بیوی رحمت بی سے ملنے والا حصہ اور جو کچھ اُن کی ذاتی ملکیت کے طور پر موجود تھا، وہ اُن کا ترکہ کہلائے گا۔ ان کے ترکے کے کل 6 حصے کئے جائیں گے، 2 بھائیوں کو 4 حصے (فی کس دو، دو حصے) اور دو بہنوں کو 2 حصے (فی کس ایک ایک حصہ) ملیں گے۔ مرحومہ رحمت بی کا ذاتی فلیٹ، ان کے شوہر کا ھبہ کیا ہوا پلاٹ، اُن کے زیورات اور نقد رقم یا اور جو بھی مال وفات کے وقت وہ چھوڑ گئی ہیں، یہ سب ان کا ترکہ ہے اور اس کی تقسیم اس تناسب سے ہوگی جو پہلے درج کیا جا چکا ہے۔

عینی اور اخیافی بہن بھائی کے درمیان ترکے کی تقسیم

سوال: 154

ایک شخص کا انتقال ہوا۔ ورثاء میں ایک عینی (حقیقی) بہن، ایک اخیافی (ماں شریک) بھائی اور ایک اخیافی بہن موجود ہے۔ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟،
(یاسر عالم، سیکٹر D-5 نیو کراچی)

جواب:

ترکے کی تقسیم سے پہلے کے امور نمٹانے کے بعد ترکہ حسب ذیل تقسیم ہوگا۔ سراجی میں ہے:

واما للاخوات لاب وأم فاحوال خمس النصف للواحدۃ

ترجمہ: ''میت کی حقیقی بہنوں کی پانچ حالتیں ہیں، ایک بہن (کل ترکے کے) نصف کی حق دار ہے، (ص:21)''۔ اخیافی (ماں شریک) بھائی، بہن کے بارے میں لکھتے ہیں:

وَاَمَّا لِاَوْلَادِ الْاُمِّ، فاحوالٌ ثلاثٌ، السُّدسُ للواحد والثُّلثُ للاثنین فصاعداً، ذکورھم واناثھم فی القسمۃِ الاستحقاقِ سواءٌ

ترجمہ: ''ماں کی اولاد (ماں شریک بہن بھائی) کے تین احوال ہیں، اگر ایک ہی ہے تو اسے چھٹا ملے گا، اگر دو یا اس سے زیادہ ہیں تو ان کو مجموعی طور پر ایک تہائی ملے گا۔ ترکے کی تقسیم اور استحقاق میں ماں شریک بہن، بھائی برابر ہیں، (سراجی، ص:13)''۔

صورتِ مسئولہ میں رَد ہوگا اور مسئلہ پانچ سے کیا جائے گا، سراجی باب الرد میں ہے:

او من خمسۃٍ اذا کان فیھا ثلثان او سُدُسٌ او نصفٌ و سُدُسانِ او نصفٌ وثلثٌ

ترجمہ: ''اور جب مسئلہ میں ایک فریق کو دو ثلث (2/3) اور ایک کو ایک ثلث (1/3) یا ایک فریق کو نصف اور ایک کو چھٹا حصہ (1/6) یا ایک فریق کو نصف اور ایک کو ایک تہائی (1/3) مل رہا ہو تو مسئلہ پانچ سے ہوگا، (ص:57)''۔ یعنی ترکے کے کل پانچ حصے کیے جائیں گے اور ورثاء کے حصے حسب ذیل ہوں گے۔

زید 5/6

میت

عینی (حقیقی) بہن	اخیافی (ماں شریک) بھائی	اخیافی (ماں شریک) بہن
3	1	1

مالی معاملات میں ابہام نہیں ہونا چاہئے

سوال:155

میرا نام علیم احمد انصاری ہے، میرے فیملی ممبران میں میری زوجہ مشفق جہاں، ایک بیٹا محمود محسن اور ایک بیٹی ساشا انصاری ہیں۔ کافی عرصہ قبل مسماۃ ثمینہ شاہین کو میں طلاق دے چکا ہوں۔ میرے پاس جائیداد میں ایک کروڑ مالیت کی ایک رہائشی ملکیت ہے، جمع شدہ رقم تقریباً چالیس لاکھ روپے، ایک ذاتی استعمال کی گاڑی مالیت چھ لاکھ روپے، گھریلو استعمال کا متفرق سامان مالیت دو لاکھ روپے موجود ہیں۔

مجھ پر کسی قسم کا قرض نہیں ہے، جو لوگ میرے مقروض ہیں ان سے قرضے کا تقاضا کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ جو کیش رقم میرے پاس ہے، اس سے میرے کفن دفن اور جو رقم باقی بچ جائے، اس سے کنواں کھدوایا جائے، باقی رقم خیرات کر دی جائے۔ بیوی کے مہر کی رقم پچاس ہزار روپے علیحدہ موجود ہے، وہ ادا کر دی جائے۔ میں نے اپنے بیٹے محمود محسن انصاری کو دس لاکھ روپے شیئرز کے لئے دیئے تھے، اگر ہو سکے تو وہ میرے نام پر جمع کر لیں ورنہ اپنی شادی میں استعمال کر لیں۔ بیوی کے زیورات جو اُن کے استعمال میں ہیں، اُن کے ذاتی ہیں۔ برائے مہربانی ان تمام حالات کی روشنی میں تمام افراد کے حصوں کا تعین فرمائیں، مطلقہ کا حصہ ہے یا نہیں؟، (علیم احمد انصاری، گلشن معمار بلاک Z-1 کراچی)۔

جواب:

شریعت کی رو سے تین امور ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، ان کی تفصیل ہم گذشتہ صفحات میں وراثت کے کئی مسائل کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں، بار بار ان کے اعادے کی

ضرورت نہیں ہے۔ان امور کے بعد ترکہ شرعی وارثوں میں اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔

کسی شخص کی زندگی میں اس کا مال بطور ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتا، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنے وارثوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو اسے ھبہ کہتے ہیں، اس پر احکامِ وراثت کا اطلاق نہیں ہوتا۔شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ اولاد کو اگر ھبہ کرنا ہو تو بیٹوں اور بیٹیوں میں تفریق نہ کرے، بلکہ سب کو مساوی دے۔

آپ اپنے اور اپنی اہلیہ کے لئے جس قدر چاہیں رکھ سکتے ہیں۔مُورِث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والے شخص) کے انتقال کے بعد ترکہ ورثاء کے درمیان اسلامی قانونِ وراثت کے تحت حسبِ تناسب تقسیم کیا جاتا ہے۔اولاد کی موجودگی میں بیوی کو ترکے کا آٹھواں حصہ، اولاد نہ ہونے کی صورت چوتھائی حصہ ملتا ہے۔بیٹے اور بیٹی کو ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' (ایک لڑکے کے لئے حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت حصے ملیں گے۔

آپ کی مطلقہ بیوی کو آپ کے ترکے میں سے حصہ نہیں ملے گا، ہاں اگر کسی شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہو، مطلقہ بیوی کی عدت کے دوران قضاءِ الٰہی سے شوہر کا انتقال ہو جائے تو وہ وراثت میں حصہ پائے گی۔آپ نے اپنے ایک بیٹے محمود محسن انصاری کو جو دس لاکھ روپے کے شیئرز لے کر دیئے ہیں، آپ کو اپنی نیت واضح کرنی چاہئے، اگر آپ نے یہ رقم اسے ہبہ کردی ہے تو وہ اس کا مالک ہے۔اس کی مرضی جس طرح چاہے تصرُّف کرے۔لیکن اولاد کو ہبہ کرنے میں مساوی برتاؤ نہ کرنا شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ امر ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسے ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ اگر آپ اسے وصیت سمجھتے ہیں تو وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔اگر آپ اِسے وصیت کر رہے ہیں کہ وہ اس رقم سے آپ کی طرف سے حجِ بدل کرے تو ان پر اس کی تعمیل لازم ہوگی، بشرطیکہ آپ خود حج

کرنے سے معذور ہوں اور وہ معذوری بھی ایسی ہو کہ جو عمر بھر قائم رہے، ورنہ خود آپ پر حج کرنا فرض ہوگا۔ آج کل دس لاکھ روپے تک کے پُرتعیُّش حج کے پیکیج بھی موجود ہیں۔ اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تو پھر یہ رقم آپ کے ترکے میں شامل ہوگی اور آپ کی وفات کے وقت جو شرعی وارث موجود ہوں گے، ان کے درمیان اسلامی احکامِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوگی۔ مالی معاملات کو واضح ہونا چاہئے، ابہام نہیں رہنا چاہئے ورنہ بعد میں ورثاء میں یہ امور نفرت و کدورت اور قطعِ رحمی کا باعث بنتے ہیں۔

ترکے سے ضرورت کے وقت لی گئی رقم کی تقسیم

سوال:156

میرے ایک قریبی عزیز کی اہلیہ کا 1990ء میں انتقال ہوگیا، اُن کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ مرحومہ کے ترکے میں کچھ زیور ہے، جس میں سے شدید ضرورت کے سبب شوہر نے دو عدد چوڑیاں مبلغ/7,000 روپے میں بیچ کر رقم استعمال کر لی۔ اب وہ تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو کیا تقسیم میں /7,000 روپے شمار کریں گے یا سونے کے وزن کے حساب سے موجودہ ریٹ کی تقسیم کی جائے گی؟ نیز تقسیم میں شوہر، چار بیٹوں اور دو بیٹیوں کا حصہ کتنا ہوگا؟، (محمد شجاع الدین، بلاک 13/D، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

فوت شدہ خاتون کا ترکہ چالیس حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے اس کے شوہر کو دس حصے، چار بیٹوں کو چوبیس حصے (فی کس چھ حصے) اور دو بیٹیوں کو چھ حصے (فی کس تین حصے) ملیں گے۔ شوہر نے اپنی فوت شدہ بیوی کا جو زیور تقسیمِ ترکہ سے پہلے بیچا ہے، وہ اس کے حصے میں شمار ہوگا۔ اگر ان دو چوڑیوں کا وزن مجموعی ترکے کی چوتھائی کے برابر ہے تو باقی زیور مرحومہ کی اولاد میں حسبِ حصہ تقسیم کر دیا جائے، اگر وزن کے اعتبار سے کمی وبیشی ہے تو اسے ایڈجسٹ کر لیا جائے۔

بیوی کے پہلے شوہر سے اولاد دوسرے خاوند کی وارث نہیں بنتی

سوال: 157

ہمارے خاندان میں ایک خاتون کی شادی 70 یا 80 کی دہائی میں انڈیا میں ہوئی، دو بچے ہوئے اور اُس کے بعد طلاق ہوگئی۔ بچوں میں لڑکا باپ نے رکھ لیا، لڑکی ماں کو دے دی۔ پھر اُس خاتون کی والدہ اُسے پاکستان لاکر اُس کی دوسری شادی کر کے واپس انڈیا چلی گئیں۔ کراچی میں وہ اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ خوش رہنے لگی، بچی کو بھی بہت پیار دیا اس دوران دوسرے شوہر سے ایک بچی ہوئی۔ پھر اچانک دوسرے شوہر کا ٹریفک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ خاتون نے لوگوں کے کپڑے وغیرہ سی کر بڑی محنت سے دونوں بچیوں کی پرورش کی اور شوہر کا مکان وغیرہ اپنے نام ٹرانسفر کروالیا، وہ مکان بیچ کر دوسرا مکان اپنے نام سے خریدا۔ اس خاتون کا کہنا ہے کہ جو مکان میں نے اپنے نام کرایا وہ میری دوسری بیٹی کے حقیقی والد کا ہے، اس لئے میری پہلی بیٹی کا اس میں کوئی حصہ نہیں، آپ سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ کا صحیح حل بیان فرمائیں، (محمد شجاع الدین، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کا بیان درست ہے کہ وہ مکان اس کے مرحوم شوہر کا ترکہ ہے تو اُس کے شرعی وارث اُس کی بیوی اور حقیقی بیٹی ہی ہیں۔ اس خاتون کی پہلے شوہر سے بیٹی اس کے دوسرے شوہر کی وارث نہیں ہے۔ اس شخص کا ترکہ پانچ حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے ایک حصہ بیوہ کو اور چار حصے اس کی حقیقی بیٹی کو ملیں گے، بشرطیکہ اس وفات یافتہ شخص کے ماں باپ اس سے پہلے وفات پاچکے ہوں۔ البتہ اگر اس خاتون کی وفات اپنی دونوں بیٹیوں سے پہلے ہوجائے تو دونوں اس کی وارث بنیں گی، کیونکہ یہ دونوں کی حقیقی ماں ہے۔

حقیقی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی ساقط ہوجاتے ہیں

سوال: 158

ایک عورت جانیں کا انتقال ہوگیا۔ ورثاء میں ایک حقیقی بھائی اور دو حقیقی بہنیں ہیں، جبکہ

ایک بھائی اور ایک بہن باپ شریک بھی موجود ہیں۔آیا حقیقی بہن بھائیوں کی موجودگی میں سوتیلے حصہ پائیں گے؟، والدین کا پہلے انتقال ہو چکا ہے۔(محمد یوسف، مظفرآباد، آزادکشمیر)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے، اور ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو تقسیمِ ترکہ سے پہلے کے ضروری امور نمٹانے کے بعد مرحومہ جانیں کا ترکہ 4 حصوں میں تقسیم ہوگا، ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ''(ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت ایک بھائی کو 2 حصے، دو بہنوں کو 2 حصے (ہر ایک کو ایک حصہ) ملیں گے اور سوتیلے بھائی بہن محروم رہیں گے، سراجی میں ہے:

ویسقط بنو العلّات ایضاً بالاخ لابٍ وامٍ وبالاخت لابٍ وامٍ اذا صارت عصبةً

ترجمہ: ''اور جب ترکے کی تقسیم کے وقت حقیقی بھائی موجود ہو، تو علاتی (باپ شریک) بھائی بہن ساقط ہو جاتے ہیں، اور (علاتی بھائی) حقیقی بہن سے بھی ساقط ہو جاتے ہیں، جب وہ عصبہ بنے، (سراجی، ص:23)''۔

حلال وحرام کے مسائل

قرآنی آیات پر مشتمل تعویذ کا حکم

سوال:159

قرآنی آیت پر مشتمل تعویذات کا شرعی حکم کیا ہے، کیا انہیں پہن کر بیت الخلا میں جا سکتے ہیں؟، نیز چھوٹے سائز کا قرآن مجید اچھی طرح محفوظ کر کے تعویذ بنا کر بازو یا گلے میں باندھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اسی حالت میں یعنی جبکہ تعویذ بازو پر بندھا ہوا ہو، اپنی بیوی سے ہمبستری کر سکتے ہیں یا باتھ روم میں جا سکتے ہیں؟۔ (محمد جاوید طارق، دستگیر، کراچی)

جواب:

تعویذات کو، خواہ وہ قرآنی آیات پر مشتمل ہوں، اگر احتیاط کے ساتھ موم جامہ یا غلاف وغیرہ میں محفوظ کر کے استعمال کیا جا رہا ہے تو انہیں پہن کر بیت الخلا میں داخل ہونے میں حرج نہیں ہے، لیکن احتیاط افضل ہے۔ اور قرآن مجید کا حجم (سائز) چھوٹا کرنا کہ اس میں تلاوت نہ کی جا سکے، مکروہ ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ "بچوں کے گلے میں بچوں کے ماں باپ بچوں کی حفاظت کے لئے چھوٹی حمائل شریف ٹین کے تعویذ میں اور اوپر اُس کے کپڑا چڑھا کر ڈالتے ہیں، غرض بہت احتیاط سے یہ کام ہوتا ہے یا فقط ایک دو آیت۔ بچے پاخانے میں جاتے ہیں، طرح طرح کی بے ادبیاں ظہور میں آتی ہیں، یہ کام شرع میں جائز ہے یا نہیں؟۔

آپ نے اپنے جواب میں "ابو داؤد، مصنف عبدالرزاق، در مختار، ردالمحتار، تبیین الحقائق" سے دلائل بطور حوالہ درج فرمائے، ذیل میں اختصار کے ساتھ اس کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے: "غلاف میں لپٹے ہوئے تعویذ کے ساتھ بیت الخلاء میں داخل ہونا مکروہ نہیں ہے البتہ (اس سے) بچنا افضل ہے، (در مختار)"۔

"ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہے جسے آج کل "ہیکل" یا "حمائل" کہتے ہیں اور وہ آیاتِ قرآنیہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب اس کا غلاف الگ ہو، جیسے موم جامہ وغیرہ تو اس کے ساتھ بھی بیت الخلا میں داخل ہونا جائز ہے، نیز جنبی آدمی کا اسے ہاتھ لگانا اور اٹھانا بھی

جائز ہے، (ردالمحتار)''۔ بے ادبی سے احتیاط کی جائے۔اس موضوع کی تفصیل رسالہ ''الحراف الحسن فی الکتابۃ علی کفن'' میں ہے۔

تعویذ پر قرآن عظیم ومصحف کریم کا قیاس نہیں ہوسکتا:

اوّلاً: قرآن مجید اگرچہ دس غلافوں میں ہو، بیت الخلا میں لے جانا بلاشبہ مسلمانوں کی نگاہ میں قابلِ مذمت اور اُن کے عرف میں بے ادبی ٹھہرے گا اور ادب وتوہین کا مدار عرف پر ہے۔ایسے تعویذ جو آیات پر مشتمل ہوں، وہ آیات ضرور قرآن عظیم ہیں، مگر وہ تعویذ ہی کہلائیں گی، انہیں قرآن مجید نہیں کہا جاتا، جیسے علم نحو کی کتاب، نحوی کتابوں کی مثالوں میں قرآن کی آیات درج ہوتی ہیں، اُس کے لئے ''علمِ نحو کی کتاب'' ہی کا حکم ہوگا، قرآن عظیم کا نہیں۔قرآن مجید دارالحرب میں لیجانا منع ہے اور کتاب لے جانے سے کسی نے منع نہ کیا، مُصحف (قرآن مجید) کے پٹھے (گتے) کو بے وضو چھونا حرام ہے، لیکن اُس (تدریسی) کتاب کے ورق کو چھونا جائز ہے۔

ثانیاً: اُس کا ٹین میں رکھ کر بند کردینا یا موم جامے یا کپڑے ہی کے غلاف میں سی دینا یہ خود خلافِ شرع ہے کہ اُس کی تلاوت سے منع کرنے کا باعث ہے، آئمۂ سلف تو مصحف شریف کے غلاف میں بند لگانے کو مکروہ جانتے تھے کہ بند باندھنا بظاہر منع کی صورت ہی ہوگا، تو یوں ٹین وغیرہ میں رکھ کر ہمیشہ کے لئے سی دینا کہ حقیقتاً منع ہے، کس درجہ مکروہ اور قبیح ہے؟

تبیین الحقائق میں فرمایا: کان المتقدمون یکرھون شد المصاحف واتخاذ الشد لھا لئلا یکون فی صورۃ المنع فاشبہ الغلق علی باب المسجد

ترجمہ: ''متقدمین (فقہاءِ کرام)، قرآن پاک کو (کسی چیز میں) بند کردینے اور اسے بند کرنے کا ایسا کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے تاکہ (اس کی وجہ سے تلاوت سے) روکنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو، کیونکہ یہ اس امر کے مشابہ ہوگا جیسے مسجد کے دروازے کو (بالکل) بند کردیا جائے (کیونکہ پھر وہاں نماز نہیں پڑھی جاسکے گی)۔

ثالثاً: قرآن عظیم چھوٹی تقطیع پر لکھنا، حمائل (جسے بند کرکے گلے یا بازو میں لٹکایا جائے) بنانا

شرعاً مکروہ وناپسند ہے۔امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کے پاس قرآن مجید باریک لکھا ہوا دیکھا،تو اسے مکروہ جانا اور اس شخص کو مارا اور فرمایا:اللہ کی کتاب کی تعظیم کرو(ابوعبید نے اسے فضائل قرآن میں روایت کیا)۔

امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ الکریم مصحف کا چھوٹا بنانا مکروہ جانتے تھے،(عبدالرزاق نے اسے اپنی مصنف میں روایت کیا اور ابوعبید نے فضائل میں اس کا مفہوم نقل کیا ہے)۔ اسی طرح ابراہیم نخعی نے اسے مکروہ فرمایا(ابن ابی داؤد نے اسے مصاحف میں بیان کیا)۔

درمختار مع ردالمحتار میں ہے:قرآن پاک کو چھوٹی تقطیع میں لانا(اس کا حجم چھوٹا کرنا) مکروہ ہے۔

تو اس قدر چھوٹا بنانا کہ معاذ اللہ ایک کھلونا اور تماشا ہو،کس طرح مقبول ہوسکتا ہے۔اور وہ جری لوگ یہ نامناسب فعل انہی تعویذوں کی خاطر کرتے ہیں،اگر مسلمان ان کو تعویذ نہ بنائیں،تو کیوں خریدیں اور نہ خریدیں تو وہ کیوں اسے چھاپیں۔تو ان کا تعویذ بنانا اُن کے اِس فعل کا باعث ہے اور اِس کے ترک میں اُس کا انسداد۔تو اس کا تعویذ بنانا ضرور اس بات کا حق دار ہے کہ اسے ترک کیا جائے،اس دلیل کی تفصیل جلیل ہمارے رسالہ''الکشف الشافیا فی حکم فونو جرافیا''میں ہے،واللہ اعلم بالصواب''۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد 4،ص:608 تا 610،رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

مذکورہ تمام دلائل کی روشنی میں خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی آیات پر مشتمل تعویذات پہننا ہو تو اس کے ادب کا خیال رکھا جائے۔اور افضل یہ ہے کہ انہیں اتار کر طبعی حاجات پوری کریں،بیوی سے ہمبستری کے وقت بھی ادب کا تقاضا یہی ہے کہ اُس وقت یہ تعویذات اتار دیئے جائیں۔قرآن مجید کو اتنی باریک کتابت اور سائز میں طبع کرنا کہ پڑھا نہ جاسکے بلکہ محض تعویذ کے طور پر گلے میں باندھا جائے یا بطور حمائل گلے میں لٹکایا جائے،مکروہ ہے، کیونکہ قرآن کی کتابت وطباعت سے اصل مقصود اسے پڑھنا،سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے نہ کہ محض تعویذ کے طور پر استعمال کرنا۔

لاؤڈ اسپیکر کی آواز بلا ضرورت بلند کرنا

سوال:160

سڑکوں گلیوں وغیرہ کو بند کر کے انتہائی تیز آواز میں رات گئے تک محافلِ نعت ومختلف اجتماعات وغیرہ کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟، جبکہ علماء سے سنا ہے کہ اگر قرآن پاک کی تلاوت بھی اتنی آواز سے کی جائے کہ جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو تو منع ہے۔ تو کیا محافل واجتماعات کے مروجہ طریقے سے لوگوں کو تکلیف نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو کیا مستحب عمل کے لئے شاہراہوں کو بند کر دینا، رات گئے تک انتہائی تیز آواز میں اسپیکرز کا استعمال کرنا جائز ہے؟۔ اسی طرح سڑک پر بیت اللہ شریف اور گنبدِ خضرا کے ماڈل سجائے جاتے ہیں، جس سے دکاندار، ٹریفک اور پیدل چلنے والے بھی متاثر ہوتے ہیں، تو کیا لوگوں کو تکلیف پہنچانا گناہ نہیں ہے اور کیا یہ بہتر نہیں کہ اجتماعات ومحافل مساجد ومدارس یا کسی ہال یا پارک وغیرہ میں منعقد کی جائیں؟۔ واضح اور آسان ترین الفاظ میں جواب ارشاد فرمائیں۔

حافظ محمد عامر، سیکٹر ل-5، نیو کراچی

سید سلیم شاہ عطاری، نارتھ ناظم آباد، بلاک B، کراچی

جواب:

اہلسنت وجماعت کے نزدیک محافلِ قراءت اور محافلِ حمد ونعت کا انعقاد مستحب ومستحسن امر ہے، بشرطیکہ ادب واحترام کو ملحوظ رکھا جائے۔ ان محافل کے لئے سڑکوں اور شاہراہوں کو بند کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ سڑکوں اور شاہراہوں پر سب لوگوں کا حق مساوی ہوتا ہے، جسے فقہ کی اصطلاح میں ''حقِ مرور'' (Right of Passage) کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے سڑک اور شارع عام پر نمازِ جنازہ کو، جو کہ فرض کفایہ ہے، مکروہ قرار دیا ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

تکرہ فی الشارع وأراضی الناس کذا فی المضمرات

ترجمہ: ''اور شارع عام پر اور لوگوں کی ملکیتی زمین پر (ان کی اجازت ومنظوری کے بغیر) نماز

جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، ''مضمرات'' میں اسی طرح ہے''۔(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:165)

اس کراہت کا سبب یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کے وقت سڑک بند ہو جاتی ہے اور ٹریفک رُک جاتی ہے اور سب کا حق متاثر ہوتا ہے اور بعض اوقات نجاست بھی ہوتی ہے۔ جب فرضِ کفایہ کے لئے سڑک بند کرنے کی ممانعت ہے، حالانکہ اس کے لئے وقت بھی کم درکار ہوتا ہے تو مستحب اور مباح امور کے لئے بطریقِ اولیٰ ممانعت ہوگی۔ پارکوں اور کھلے میدانوں میں متعلقہ ادارے کی اجازت سے ایسی مجالس کے انعقاد میں کوئی حرج نہیں ہے۔ محافلِ میلاد، مجالسِ سیرت اور محافلِ نعت میں لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو اتنی بلند رکھنا کہ قرب وجوار کے لوگوں کے لئے باعثِ تکلیف ہو، درست نہیں ہے۔ کیونکہ رات گئے تک ان مجالس کے جاری رہنے سے لوگوں کی نیند میں خلل واقع ہوتا ہے، کچھ لوگ بیمار ہوتے ہیں، کچھ لوگ اپنے مطالعے اور امتحانات کی تیاری میں مشغول ہوتے ہیں، ایسا کرنا ان کو ''اذیت'' دینے کے زمرے میں آتا ہے اور اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاداتِ مبارکہ یہ ہیں:

(۱) لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ۔

ترجمہ: ''(مومن کو چاہئے) نہ خود نقصان اٹھائے اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچائے''۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2340,2341)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(۲) اِیَّاکُمْ وَالْجُلُوْسَ عَلَی الطُّرُقَاتِ، فقالوا مَالَنَا بُدٌّ، اِنَّمَا هِیَ مَجَالِسُنَا، نَتَحَدَّثُ فِیها، قَالَ فَاِذَا أَبَیْتُم اِلَّا الْمَجَالِسَ فَأَعْطُوا حَقَّهَا، قَالُوْا: وَمَا حَقُّ الطَّرِیْقِ؟ قَالَ: غَضُّ الْبَصَرِ، وَکَفُّ الْاَذٰی وَرَدُّ السَّلَامِ، وَاَمْرٌ بِالمعروفِ وَنَهْیٌ عَنِ الْمُنْکَرِ۔

ترجمہ: ''راستوں میں بیٹھنے سے بچا کرو، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! اس کے بغیر تو ہمارے لئے چارۂ کار ہی نہیں ہے، یہ ہماری مجالس ہیں، جہاں ہم (بیٹھ کر) گفتگو کرتے ہیں، (آپ ﷺ نے) فرمایا: تو راستے کو اس کا حق دیا کرو، انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! راستے کا حق کیا ہے؟ آپ ﷺ فرمایا: (غیر محرم

خواتین سامنے آئیں تو) نظر نیچی رکھنا، کسی بھی ایسی چیز کو راستے سے ہٹا دینا جو آنے جانے والوں کے لیے اذیت کا باعث ہو، کوئی سلام کرے تو اس کا جواب دینا، اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا، (صحیح بخاری، رقم: 6229،2465)"۔

حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

(۳) یَانَبِیَّ اللهِ! عَلِّمْنِی شَیْئًا، اَنْتَفِعُ بِهٖ، قَالَ اَعْزِلِ الْاَذٰی عَنْ طَرِیْقِ الْمُسْلِمِیْنَ،

ترجمہ: "اے اللہ کے نبی ﷺ! مجھے ایسی چیز بتایئے جس سے میں نفع حاصل کروں، آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کے راستے سے تکلیف دہ چیز دور کردو"۔ (صحیح مسلم، رقم: 6616)

(۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ اَوْبِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ شُعْبَةً، فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ، وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ، وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایمان کے ستر یا ساٹھ سے کچھ زیادہ شعبے ہیں، جن میں سے سب سے افضل کلمۂ طیبہ کا اعتقاد ہے، اور سب سے ادنیٰ شعبہ راستہ میں سے تکلیف دہ چیز کو دور کردینا ہے اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 152)"۔

(۵) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ یُمِیْطُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ صَدَقَةٌ

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (کوئی شخص) راستے سے (لوگوں کو) تکلیف پہنچانے والی چیز کو ہٹاتا ہے، (تو یہ بھی) صدقہ ہے، (صحیح بخاری: 2466)"۔

لہٰذا دینی مجالس میں لاؤڈ اسپیکر کی آواز صرف اُن لوگوں تک محدود رکھی جائے جو ارادتاً حصولِ ثواب کے لیے ان مبارک مجلسوں میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔ ہمیں ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے، جس سے لوگوں کے ذہنوں میں بلاسبب دین اور اہلِ دین کے بارے میں بدگمانی اور نفرت پیدا ہو۔

بیت اللہ اور روضۂ رسول کی شبیہ بنا کر شاہراہوں اور چوراہوں پر نصب کرنا مباح ہے، نہ منع ہے اور نہ شریعت کا مطلوب ہے۔ لیکن شبیہ کا حکم اصل کا نہیں ہوتا، اگر کوئی اسے اصل کے مرتبے میں سمجھ کر اسے نصب کرے یا وہاں حاضری کو عبادت سمجھتا ہو تو یہ بدعت ہے اور شریعت میں اپنی طرف سے زیادتی ہے۔

عرس کی تقریبات میں محرمات، مکروہات اور بدعات کا ارتکاب

سوال: 161

بزرگانِ دین کے عرسِ مبارک کی تقریب منعقد کرنا اہلسنت و جماعت کا شِعار ہے۔ لیکن بعض مقامات پر بزرگانِ دین کے عرس مبارک کی تقریبات میں بہت سے خلافِ شرع امور، ممنوعات اور مکروہات کا ارتکاب ہوتا ہے۔ علماءِ اہلسنت عرس کی اِن تقریبات میں شریک ہوتے ہیں، تقاریر کرتے ہیں، لیکن مصلحت کے تحت کلمۂ حق بلند نہیں کرتے، مداہنت کرتے ہیں اور اس سے مسلک اہل سنت بدنام ہوتا ہے اور مخالفین، اہلسنت کو ''بدعتی یا قبر پرست'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ازراہِ کرم ان امور کے بارے میں شرعی احکام وضاحت سے بیان کریں تا کہ دعوتِ دین کا حق بھی ادا ہو اور موافقین ومخالفین سب پر حجت بھی قائم ہو، (حافظ سجاد حسین، احمد پور سیال، جھنگ)۔

جواب:

آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ بدقسمتی سے بزرگانِ دین کے عرس کی تقریبات میں بعض مقامات پر خلافِ شرع امور کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مزارات کے سجادگان میں سے بعض احکامِ شریعت سے قطعی ناواقف ہیں اور شریعت کے معاملات میں خود بھی بے اعتدالی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مریدین ان کے غیر شرعی افعال کو بھی شریعت کا حصہ سمجھ کر اپنا لیتے ہیں۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض مزارات پر ان اَعراسِ مبارکہ میں اس طرح کے امور پائے جاتے ہیں، جیسے: (1) ڈھول تاشوں کا بجایا جانا (2) مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات (3) خواتین کا بے حجاب غیر محرم مردوں کے درمیان چلتے ہوئے

مزارات پر جانا (4) قبروں کو بوسہ دینا اور سجدہ کرنا (5) لنگر کی تقسیم کے موقع پر بدنظمی اور رزق کی بے حرمتی (6) مردوں، نوجوانوں اور بے حجاب عورتوں کا حال یا وَجد کے نام پر رقص (7) سجادگان کا اپنی وضع قطع سے غیر متشرع ہونا (8) طریقت کے بعض سلسلوں میں عورت کا مرشد بننا اور مردوں کا اس کے ہاتھ چومنا (9) اسی طرح سے عورتوں کا مرد پیر کے ہاتھ چومنا (10) بعض عقیدت مند مردوں اور عورتوں کو پاؤں چومتے بھی دیکھا گیا ہے (11) محافلِ سماع یا محافلِ نعت میں پیسوں کا لٹایا جانا وغیرہ۔

شریعت کی رو سے ان ممنوع امور کو مخالفین دانستہ طور پر اہلسنت کی طرف منسوب کر کے مسلکِ حق اہلسنت وجماعت کو بدنام کرتے ہیں، حالانکہ مسلکِ اہلسنت وجماعت میں ان امور کی شدید ممانعت ہے، علماء ومشائخ پر لازم ہے کہ ان بدعات کے سدِ باب کے لئے ایک پرزور اصلاحی مہم چلائیں تاکہ متصوِفین (جعلی صوفیوں) کی نشاندہی ہو اور وہ تصوف وطریقت کی آڑ میں مسلک اور دین کو بدنام نہ کرسکیں اور جاہل عوام ان کے چنگل اور دام تزویر میں نہ پھنسیں۔ کسی بھی مکتبۂ فکر کے متعلق کوئی نظریہ قائم کرنے سے قبل اس مکتبۂ فکر کے مستند ومسلّمہ اکابر کی کتب اور فتاویٰ کا مطالعہ ضروری ہے۔ محض کسی عام شخص یا عوام الناس کی خود سے قائم کی ہوئی غیر شرعی رسوم کو ان کے مسلک کا حصہ قرار دینا، نہ صرف زیادتی ہے بلکہ اِتہام، صریح بہتان اور کذب ہے۔ حضرت سید علی ہجویری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تصنیف ''کشف المحجوب'' میں حقیقی صوفی، متصوِف (جو صوفیاء کی وضع اختیار کرے) اور مُستَصوِف (جعلی اور فریب کار صوفی) کے فرق کو واضح کیا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''بزرگانِ دین کے عرس میں شب کو آتشبازی جلانا اور روشنی بکثرت کرنا، بلا حاجت اور جو کھانا بغرضِ ایصال ثواب پکایا گیا ہو، اس کو لٹانا، کہ جو لوٹنے والوں کے پیروں میں کئی من خراب ہو کر مٹی میں مل گیا ہو، اس فعل کو بانیانِ عرس مُوجبِ فخر اور باعثِ برکت قیاس کرتے ہیں، شریعت عالی میں اس کا کیا حکم ہے؟۔ آپ نے جواب میں لکھا:

آتشبازی اِسراف ہے اور اِسراف حرام، کھانے کا ایسا لٹانا بے ادبی ہے اور بے ادبی محرومی ہے، تضیعِ مال (مال کا ضائع کرنا) ہے اور تضیع حرام۔ روشنی اگر مصالح شرعیہ سے خالی ہوتو وہ بھی اِسراف ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 24، ص: 112، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

بازاری عورتوں کے مزارات پر رقص کے متعلق ایک سوال کے جواب میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: بازاری عورتوں کا رقص حرام ہے، (یہ ہم نے امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز کی عبارت کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے)، اس میں مردوں اور عورتوں کے مخلوط اور بے حجاب اجتماعات کی تمام صورتیں شامل ہیں، اولیائے کرام کے اَعراس میں بے قید جاہلوں نے یہ معصیت پھیلائی ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 29، ص: 92، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: اگر عورت نیک خصلت پابندِ شریعت واقفِ طریقت اپنے ہاتھ پر عورتوں اور مردوں کو بیعت کرنا شروع کردے تو از روئے طریقت اور شریعت یہ بیعت درست ہے یا نہیں؟ بحوالہ کتاب مع عبارت تحریر فرمائیں۔ آپ نے جواب میں لکھا:

اولیائے کرام کا اجماع ہے کہ داعی الی اللہ کا مرد ہونا ضرور ہے۔ لہٰذا سلفِ صالحین سے آج تک کوئی عورت پیر بنی نہ بیعت کیا، حضور پرنور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں:

لَن یُّفلِحَ قومٌ وَلَّوا امرَھم اِمراۃً، رواہ الائمۃ احمد والبخاری والترمذی والنسائی عن ابی بکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

ترجمہ: ''وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جنہوں نے کسی عورت کو والی بنایا، اس حدیث کو ائمہ کرام احمد و بخاری و ترمذی اور نسائی نے ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

امام عارف باللہ سیدی عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ میزان الشریعہ کتاب الاقضیہ میں فرماتے ہیں:

قَد اَجمعَ اَھلُ الکشفِ علیٰ اِشتراطِ الذُّکورۃِ فِی کُلِّ داعٍ اِلَی اللہِ تعالیٰ ولم یَبلُغنا اَنَّ

احداً مِن نِساءِ السلفِ الصالحِ تَصدَّرتْ لِتَربِيةِ المُريدينَ ابداً لِنقص النساءِ فی الدَّرجةِ وإنْ وَرَدَالكمالُ فی بَعضِهنَّ كَمريمَ بنتِ عمرانَ وآسيةَ امراةِ فرعونَ فَذلكَ كمالٌ بِالنِسبةِ للتَّقوىٰ والدِّينِ لابِالنسبةِ لِلحكمِ بينَ الناسِ وتسليكِهم فی مقاماتِ الولايةِ وغايةُ امرِالمراْةِ اَن تكونَ عابدةً زاهدةً كرابعةَ العدويةِ

ترجمہ: ''اہل کشف کا اجماع ہے کہ دین کے داعی کے لئے مرد ہونا شرط ہے اور ہم تک سلفِ صالحین سے ایک روایت بھی ایسی نہیں پہنچی کہ مریدین کی تربیت کا کام کسی خاتون نے انجام دیا ہو، کیونکہ خواتین میں (بعض طبعی عوارض) کی وجہ سے نقص ہوتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض میں دینی لحاظ سے کمال تھا، جیسے مریم بنت عمران، آسیہ زوجۂ فرعون۔ لیکن یہ کمال ان کے تقوے اور دین داری کے باعث تھا، اس لئے نہیں کہ وہ لوگوں پر حکومت کریں یا مقاماتِ ولایت میں ان کی تربیت کریں، زیادہ سے زیادہ یہی ہے ہوسکتا ہے کہ عورت عابدہ وزاہدہ ہوسکتی ہے، جیسے رابعہ عَدَوِیۂ بصریہ، (فتاویٰ رضویہ، جلد 21، ص:494)

قرآن مجید نے ازواجِ رسول اللہ ﷺ کو امہات المومنین (مومنوں کی مائیں) قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ اور اُس (نبی) کی بیویاں ان (مومنوں) کی مائیں ہیں، (الاحزاب:6)۔ اس کے باوجود یہ تاکیدی حکم ارشاد فرمایا:

(۱) وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ

ترجمہ: ''جب تم اُن (اُمہات المومنین) سے کوئی بات پوچھو، تو پردے کے باہر سے پوچھو، (الاحزاب:53)''۔

(۲) يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا

ترجمہ: ''اور اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم تقوے پر کاربند رہو، سو تم اپنے (غیر محرم لوگوں کے ساتھ) پرکشش لہجے میں بات نہ کرو کہ جس کے دل میں (فسق کی) بیماری ہے، (خدانخواستہ) وہ امید قائم کر بیٹھے، اور (ان کے ساتھ) دستور کے موافق

بات کرو، (الاحزاب:32)"۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے متعدد احادیث مروی ہیں، ان کے توسط سے شعبۂ نسواں کے دینی احکام بھی امت کو ملے، لیکن تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ حدودِ شریعت کے اندر رہا۔ مزارات کو بوسہ دینے کے متعلق فقہاءِ امت کی مختلف آراء ہیں، لیکن امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ عوام کے لئے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ انہیں قبر کو بوسہ دینے سے منع کیا جائے، کیونکہ بعض جہلاء بوسے سے تجاوز کر کے سجدۂ تعظیمی تک جا پہنچتے ہیں۔ اور شریعت کے مقاصد میں سے ایک "سدِ ذرائع" بھی ہے، یعنی ایسے اسباب وذرائع کو روکنا جو آخرِ کار محرمات اور مکروہات تک جا پہنچیں۔

ایامِ عرس میں مزارات کو غسل دینے کے لئے دن مخصوص کرنے کا شرعی حکم

سوال:162

بزرگانِ دین کے مزارات پر عرس کی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں اور ان تقاریب کے آغاز یا اختتام کے روز مزار کو غسل دیا جاتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ عرس کے آخری دن غسل دینے میں کوئی حرج تو نہیں؟ یا اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے؟ (حاجی عبدالروف، کراچی)

جواب:

اَعراس مبارکہ کی تقریبات تبلیغی اجتماعات، میلاد النبی ﷺ کے اجتماعات، ختمِ قرآن، افتتاحِ درسِ حدیث اور ختمِ بخاری کے اجتماعات، خیر کے ان تمام کاموں کے لئے دن، مقام اور وقت کا تعین سہولت کی غرض سے ہوتا ہے۔ یہ تعیینِ عرفی ہے، تعیینِ شرعی نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آج کل گھڑیوں کے حساب سے نماز کے اوقات مقرر کئے جاتے ہیں۔ تعیینِ شرعی سے مراد یہ ہے کہ کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اس خاص وقت، مقام، دن اور تاریخ کو یہ کام کرنا باعثِ اجر وثواب ہے اور اس سے پہلے یا بعد یا دوسرے وقت اور مقام پر ایسا کرنا باعثِ اجر نہیں ہے۔ یہ تعیینِ شرعی ہے اور ایسی تعیین صرف شارع کا اختیار ہے، جیسے وقوفِ عرفہ کے لئے 9 ذوالحجہ، ایامِ نحر، ایامِ عید یا فرض روزوں کیلئے رمضانِ مبارک

وغیرہ۔مزارات کوغسل دینے کے لئے دن یا وقت کا تعین بھی عرفی ہے،لوگوں کی اپنی سہولت اور صوابدید پر منحصر ہے،لہٰذا عرس کی تقریبات کے آغاز پر یا آخری دن غسل دینا،دونوں ہی درست ہیں اور اِس میں کوئی شرعی قباحت اور حرج نہیں ہے۔ ویسے مزارات کوغسل دینا کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے،تاہم اس کی حکمت یہ ہوسکتی ہے کہ کثیر تعداد میں لوگ بزرگانِ دین کے مزارات پر ایصالِ ثواب اور اظہارِ عقیدت کے لئے آتے ہیں،لہٰذا مزار اور اس سے ملحق جگہ کا صاف ستھرا ہونا اچھی بات ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔اور اس کی اصل غسلِ کعبہ ہے،مزار کو عرس کے آغاز پر غسل دیا جائے یا اختتام پر دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔

خواتین کا علماء سے مسائل دریافت کرنا

سوال:163

دارالافتاء میں خواتین اپنے مسائل کے حل کے لئے آتی ہیں،اُن میں اکثر برقع میں نہیں ہوتیں اور مفتیانِ کرام اُن سے براہِ راست بات کرتے ہیں،جبکہ یہ خواتین دوپٹہ اوڑھے ہوئے ہوتی ہیں اور ان کا چہرہ کھلا ہوتا ہے۔مفتی صاحبان ان سے دارالافتاء میں بالمشافہ گفتگو کرتے ہیں،اگر چہ دارالافتاء میں اور بھی افراد ہوتے ہیں،اُن کی موجودگی میں ان کے سامنے ہی گفت وشنید ہوتی ہے۔بعض حضرات تعلیمی ادارے بھی چلاتے ہیں اور طلباء کی مائیں بہنیں وغیرہ داخلے کے لئے ان اداروں میں آتی ہیں اور ادارے کی خواتین اساتذہ کے ساتھ مہتمم حضرات سے داخلے اور تعلیمی سرگرمیوں کے حوالے سے بات چیت کرتی ہیں۔میرے دوست کا کہنا ہے کہ اکثر مفتیانِ کرام اور مہتمم حضرات نماز بھی پڑھاتے ہیں،یہ خوانین سے بالمشافہ بات کرتے ہیں،جن میں اکثر خواتین کے چہرے کھلے ہوتے ہیں۔چونکہ یہ شریعت کے خلاف ہے،لہٰذا اُن کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔اور ان کی اقتدا میں جو نماز پڑھی جائے گی،اُس کا اعادہ کرنا ضروری ہے۔آپ سے گذارش ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے آگاہ فرمائیں،(محمد عارف،کراچی)

جواب:

آئیڈیل اور معیاری صورت تو یہ ہے کہ خواتین گھروں سے نہ نکلیں، اگر کسی شدید ضرورت یا حاجت کی بنا پر انہیں گھر سے نکلنا پڑے تو باپردہ اور شرعی حجاب کے ساتھ نکلیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم دینی واخلاقی معیارات کے اعتبار سے ایک تنزّل کے دور سے گزر رہے ہیں۔ بعض صورتوں میں مرد دن بھر روزگار اور کاروبار کے لئے گھروں سے باہر رہتے ہیں، خواتین کو سودا سلف خریدنے، چھوٹے بچوں کو اسکول پہنچانے اور واپس لانے یا ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے گھر سے باہر جانا پڑتا ہے اور بدقسمتی سے بعض خواتین حجابِ شرعی کا اہتمام بھی نہیں کرتیں۔ اسی طرح بعض خواتین دینی مسائل معلوم کرنے، فتویٰ لینے یا اپنے چھوٹے بچوں کو دینی مدارس میں چھوڑنے اور لینے کے لئے آتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس بھی بعض اوقات خواتین صحابیات شرعی مسائل معلوم کرنے کے لئے آتی تھیں حتیٰ کہ بیعت کرنے بھی آتی تھیں، جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ: ''اے نبی مکرم ﷺ! جب آپ کے پاس ایمان والی عورتیں حاضر ہوں اور اس شرط پر آپ سے بیعت کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی اور چوری نہیں کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان کوئی بہتان گھڑ کر لائیں گی اور نہ دستور کے مطابق کسی کام میں آپ کی نافرمانی کریں گی، تو آپ ان کو بیعت کرلیا کریں اور ان کے لئے اللہ سے مغفرت طلب کریں، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بے حد رحم فرمانے والا ہے، (سورۃ الممتحنہ: 12)''۔

اسی طرح صحابۂ کرام بھی امہات المومنین سے دینی مسائل معلوم کرنے کیلئے آتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۟ (الاحزاب :32)

ترجمہ: ''اے نبی کی (پاک) بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک کی بھی مثل نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرتی رہو، سو (پسِ پردہ) کسی مرد سے بات کرتے ہوئے ایسا لچک دار لہجہ اختیار نہ کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ طمع کرنے لگے اور دستور کے مطابق بات کیا کرو''۔

لہٰذا علماء کے لئے یہ تو مناسب اور لازم ہے کہ دینی مسائل اور ضروریات کے لئے آنے والی خواتین کو حجاب اور پردے کی تلقین کریں اور ان سے ضروری گفتگو کرتے وقت نگاہیں نیچی رکھیں، اس کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ (النور:30،31)

ترجمہ: ''(اے رسول!) مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ (غیر محرم عورتوں سے بات کرتے وقت) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے (حسنِ کردار) کے لئے بہت پاکیزہ (طریقہ) ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ کو اُن کے سب کاموں کی خوب خبر ہے۔ اور ایمان والی عورتوں سے بھی کہیں کہ وہ (بھی) اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی عفت کی حفاظت کریں اور اپنی زیبائش کو ظاہر نہ کریں، سوائے اُس کے جو ناگزیر ہے، اور اپنے سر پر اوڑھے ہوئے دوپٹے کے آنچل اپنے گریبانوں پر بھی ڈالے رکھیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات:12)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ کا سبب بنتے ہیں''۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ

ترجمہ: ''بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے''۔ (صحیح بخاری:5143)

لہٰذا ہمیں کسی عالم، دین دار شخص حتیٰ کہ ہر مسلمان کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لینا چاہئے اور کسی کی نیت اور باطنی محرکات کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے تاوقتیکہ کسی کی بدعملی اور بدکرداری کے واضح قرائن وشواہد اور ثبوت سامنے نہ آئیں۔ علماء اور اہلِ دین سے عوام کی یہ توقع بجا ہے کہ وہ مثالی کردار کے حامل ہوں، لیکن وہ بھی اسی معاشرے کی پیداوار ہیں اور اسی معاشرے میں رہ کر انہیں دین کا کام کرنا ہے۔ ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہر صورت حال میں حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا کام کرتے رہیں۔ جو عالم نگاہیں نیچی رکھے ہوئے خواتین کو مسئلہ بتائے، ضروری بات کرے، حظِّ نفس اور لذتِ نظر میں مبتلا نہ ہو، اس کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں اور بلاوجہ نہ خود بدگمانی میں مبتلا ہوں اور نہ دوسرے لوگوں کو بدگمانیوں میں مبتلا کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ

ترجمہ: ''کیا آپ نے انہیں نہ دیکھا جو خود اپنی پاکیزگی کے دعویدار ہیں بلکہ اللہ جسے چاہے (باطنی) پاکیزگی عطا فرماتا ہے، (النساء:49)''۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم:32)

ترجمہ: ''اپنی پارسائی کے دعوے نہ کرو، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ پرہیزگار کون ہے؟'۔

البتہ اہلِ علم پر بھی یہ لازم ہے کہ وہ خلوت میں کسی غیر محرم خاتون سے ملاقات نہ کریں، مجلس میں دینی ضرورت سے متعلق مسائل کے علاوہ دوستانہ اور بے تکلف گپ شپ نہ کریں۔ دینی علم اور علماء کے احترام کے لئے شرعی حدود وقیود کی احتیاط از حد لازم ہے۔ علماء کو چاہئے کہ ایسی عورتوں کو پردے کی تلقین کیا کریں جو کم از کم شرعی حجاب کا بھی اہتمام نہیں کرتیں۔

مکان کے دروازوں اور پیشانی پر قرآنی آیات لکھنا

سوال:164

مکان کی پیشانی پر قرآن کی آیات لکھنا کیسا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں

وضاحت فرمایئے، (محمد احسان، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا مقدس کلام ہے اور اس سے اصل مقصود اس کے احکام کو سمجھ کر ان پر عمل کرنا ہے، اس کی تلاوت بھی بہت بڑی سعادت ہے اور حصولِ ثواب کا ذریعہ ہے۔ قرآن کا احترام واجب ہے۔ قرآن باعث برکت اور اعتقادی اور عملی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ یہ تمام ظاہری و باطنی عوارض کے لیے شفا ہے۔ حصول برکت کے لیے آیات مبارکہ کو دیوار پر لکھنا جائز ہے' بشرطیکہ پاک رنگ' چونے یا مواد کے ساتھ لکھی جائیں، جو بارش وغیرہ سے اکھڑ کر بہہ نہ جائے یا تانبے، لوہے یا پلاسٹک کی شیٹ پر لکھ کر اسکرو سے دیوار پر ثائٹ کر دیا جائے۔ اگر کسی رنگ سے دیوار پر لکھی گئی ہوں اور دوبارہ اس جگہ پر رنگ کرنے کے لئے کھرچنا پڑے تو ان ذرّات کو کسی پاک جگہ دفن کر دیا جائے۔ وہ جگہ بلندی پر اور قابل احترام ہو اس پر کوئی ناپاک چیز لگنے کا خدشہ نہ ہو۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو کتب القرآن علی الحیطان والجدران بعضهم قالوا یرجی أن یجوز وبعضهم کرهوا ذلك مخافة السقوط تحت أقدام الناس کذا فی فتاویٰ قاضی خان،

ترجمہ: ''اگر قرآن مجید کی آیات دیواروں پر لکھی جائیں تو بعض فقہاء نے اس کے جواز کا قول کیا ہے اور بعض فقہاء نے اس اندیشے کے پیشِ نظر مکروہ قرار دیا ہے کہ اس کے ذرّات (یعنی چونے یا رنگ کے ذرّات) لوگوں کے پاؤں میں گریں گے (اور بے ادبی ہوگی)، فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 5، ص: 323)''۔

پس اگر اس امر کا اہتمام کر لیا جائے کہ اس کے ذرّات نیچے نہ گریں تو کراہت اٹھ جائے گی، نیز اگر کبھی دوبارہ رنگ کرنا ہو تو اسے کھرچ کر کسی محفوظ جگہ دفن کر دیا جائے اور جہاں آیتیں لکھی ہوں، وہاں بے وضو ہاتھ نہ لگائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ ترجمہ: ''اسے نہ چھوا کریں' مگر

پاک لوگ!" (الواقعہ: آیت :79)"۔ بعض مکانوں کا رخ گندی گلی کی طرف ہوتا ہے لہٰذا اس طرف آیات کا لکھنا بھی خلاف ادب ہوگا کہ وہ مقام محترم نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح مساجد کے استنجا خانوں کی طرف بھی نہ لکھی جائیں۔ اگر وضو خانہ استنجا خانے سے الگ ہو تو اس کی دیواروں پر مسنون دعائیں لکھی جاسکتی ہیں' تاکہ لوگ متوجہ ہوں اور پڑھ کر اجر پائیں۔ یاد رہے کہ حصول برکت کے لیے آیات کا لکھنا اگرچہ جائز ہے، لیکن شریعت کا اصل مقصود ومطلوب قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کرنا ہے اور اس کے احکام پر عمل کی سعادت حاصل کرنا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اسی کو اپنا شعار بنائیں۔

درآمد کردہ کھاد کے استعمال کا جواز

سوال:165

ہم کاروباری لوگ ہیں اور تجارت کے لئے یورپ سے کھاد درآمد کرتے ہیں، یہ کھاد 100 فیصد مرغیوں کے گوبر سے تیار کی جاتی ہے اور خالصتاً زمین کی زرخیزی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ یہ ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ پورٹ سے کلیرنس کے وقت کسٹم حکام نے لیبارٹری تجزیے کے دوران تحقیق کی، تو معلوم ہوا کہ اس کھاد میں سور کے فضلہ اور گوشت کے ذرات بھی پائے گئے ہیں۔ کسٹم حکام نے اِسے اسلامی تعلیمات کے خلاف گردانتے ہوئے مالِ ممنوعہ سمجھ کر ضبط کرلیا ہے۔ گورنمنٹ کی امپورٹ پالیسی میں اس کی ممانعت صرف اس صورت میں ہے، جب ایسی امپورٹ اسلامی اصولوں کے خلاف ہو، لیکن قانون میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ کن صورتوں میں اس کی ممانعت ہوگی اور اس کو منسوخ قرار دینے کا کون مجاز ہوگا اور اس کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟

ہماری رہنمائی فرمائیں کہ کیا ایسی کھاد (جو براہِ راست انسانی استعمال میں نہیں آتی اور) جس میں سور کے فضلے یا گوشت کے ذرات پائے گئے ہوں، کیا اس کی درآمد اور فروخت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائز ہوگی؟، (سید صادق محمود، بلاک 14، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

مرغیوں کے گوبر سے تیار کردہ ایسی کھاد، جس کے اجزائے ترکیبی میں سور کا فضلہ یا گوشت کے اجزا شامل ہوں، کا استعمال زمین کی زرخیزی کے لئے جائز ہے۔ زمین کی زرخیزی کے لئے عموماً نجس اشیاء ہی استعمال کی جاتی ہیں، مثلاً گوبر وغیرہ۔ اگر کھاد کی تیاری میں مرغیوں کے گوبر کے ساتھ سور کا فضلہ اور گوشت کے ذرات شامل بھی ہوں تو ایک نیا مرکب یا پروڈکٹ بننے کے بعد اس کی حقیقت بدل جاتی ہے۔ ایسی کھاد کے استعمال یا درآمد میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ ماہیت کے تبدیل ہونے (Substance) کا مطلب یہ ہے کہ وہ شے اپنی سابق ماہیت (Essential Nature) کو چھوڑ کر کسی دوسری ماہیت میں بدل جائے۔ ماہیت کے بدلنے سے اُس کا حکم بھی بدل جائے گا، جیسے شراب جب سرکہ بن جائے یا خون مُشک بن جائے یا نطفہ لوتھڑا بن جائے، تو اِن صورتوں میں جب کہ شراب نے اپنی حقیقتِ خمریہ، خون اپنی حقیقتِ دَمَویہ اور نطفہ اپنی حقیقتِ مَنویہ چھوڑ کر دوسری حقیقت و ماہیت میں بدل گئے ہوں، تو اِن کا حکم بھی بدل جائے گا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(و) لا (مِلحٌ كانَ حمارًا) او خنزيرًا ولا قذرٌ في بئرٍ فصارَ حمأةً لانقلابِ العينِ، بہ يفتى۔

ترجمہ: ''اور وہ نمک ناپاک نہیں ہے، جو (اپنے اصل وجود کے اعتبار سے) گدھا تھا یا خنزیر تھا، (پھر وہ نمک کی کان میں گر کے تحلیل (Dissolve) ہو کر نمک بن گئے اور ان کی سابق ماہیت باقی نہ رہی) اور کنویں میں گری ہوئی وہ گندگی بھی ناپاک نہیں ہے، جو (تحلیل ہو کر) کالی مٹی کی شکل میں کیچڑ بن گئی، کیونکہ اب اس کی سابق حقیقت بدل گئی ہے، اسی پر فتویٰ ہے۔۔۔۔۔۔ اس کے تحت علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(لانقلابِ العينِ) عِلَّةٌ لِلكُلِّ وهذا قولُ محمدٍ، وذكرَ معهُ في ''الذخيرة'' و ''المحيط'' اباحنيفةَ ''حلية'' قال في ''الفتح'' وكثيرٌ من المشائخِ اختارُوهُ، وهو المختارُ، لانَّ الشرعَ رتَّبَ وصفَ النجاسةِ على تلك الحقيقةِ وتَنتَفِي الحقيقةُ

بِانتفاءِ بعضِ اجزاءِ مفهومها، فكيف بالكلِّ؟------- ونظيرهٗ في الشرعِ النُّطفةُ نجسةٌ وتَصيرُ علقةً وهي نجسةٌ وتَصيرُ مُضغةً فتَطْهرُ، والعصيرُ طَاهرٌ، فيصيرُ خمراً، فينجس ويصيرُ خلاً فيطهرُ۔

ترجمہ:''یہ بات کہ ماہیت کے بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے، یہ علت (Cause) سب چیزوں کیلئے ہے، اور یہ امام محمد کا قول ہے اور اس کے ساتھ ''حلیہ'' میں ''ذخیرہ'' اور ''محیط'' کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کا بھی قول ہے۔ علامہ ابن ھمام نے ''فتح القدیر'' میں لکھا ہے کہ اکثر مشائخ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور یہی قول مختار ہے، کیونکہ شریعت نے اسی حقیقت پر وصفِ نجاست کو مرتب کیا ہے اور اپنے مفہوم کے بعض اجزاء کی نفی سے حقیقت کی بھی نفی ہوجاتی ہے، تو جب کسی چیز کے تمام اجزاء (اپنی سابق ہیئت کے ساتھ) معدوم ہوجائیں، (تو اس کی حقیقت معدوم کیوں نہیں ہوگی)؟۔۔۔آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں: اور شرع میں اس کی نظیر یہ ہے کہ نطفہ (منی) نجس ہے اور وہ (ماں کے رحم میں) جب عَلَقہ (منجمد خون Bloodsucker) کی شکل اختیار کرتا ہے، تب بھی وہ نجس ہوتا ہے۔ اور پھر جب وہ مُضغہ (گوشت کا لوتھڑا Embryo) بن جاتا ہے تو پاک ہوجاتا ہے۔ اور پھل وغیرہ سے کشید کیا ہوا رس پاک ہوتا ہے، پھر جب پھلوں کا رس سڑ جانے سے خمر (شراب) بن جاتا ہے تو نجس ہوجاتا ہے (کیونکہ اب اس کی حقیقت بدل گئی ہے)، پھر یہی شراب جو حرام اور نجس ہے جب (نمک اور لیموں ڈالنے سے) سرکہ بن جاتا ہے تو (اپنی حقیقت کے بدل جانے سے) پاک ہوجاتا ہے''۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:1 ص:463)

لہٰذا ان فقہی دلائل کی روشنی میں اُس کھاد کی درآمد اور زمین کی زرخیزی کے لئے اُس کا استعمال جائز ہے۔

کسی کو کافر کہنے کا حکم

سوال:166

ایک لڑکی کو اغوا کیا گیا، جس پر اس کی برادری والوں نے مشترکہ طور پر پوری برادری

سے حلف لیا کہ اغوا کرنے والے لڑکے کی برادری کا مکمل سماجی بائیکاٹ کیا جائے گا۔اس دوران لڑکی کی برادری میں ایک شخص کے بیٹے کی شادی ہوئی۔انہوں نے اپنی برادری میں جس شخص کی لڑکی اغوا ہوئی تھی، پرانی ناراضگی کی بنا پر شادی میں دعوت نہیں دی، اس پر برادری دو گروپوں میں تقسیم ہوگئی۔اسی طرح لڑکی کی برادری کے ایک شخص نے لڑکے کی برادری کے ایک فرد سے مکان کی تعمیر کے لئے لکڑی چرائی، جبکہ اس کی بیٹی کی وفات پر جنازے میں شرکت نہیں کی۔اب یہ دونوں گروپ ایک دوسرے کو محافل اور مساجد میں لفظ کافر اور منافق کہتے ہیں۔کیا کسی مسلمان کے جنازے میں اجتماعی صورت میں شرکت نہ کرنا اور دوسروں کو روکنا درست ہے؟ سوشل بائیکاٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر، منافق کہہ سکتا ہے؟، (محمد سرور، راولاکوٹ، آزاد کشمیر)۔

جواب:

مذکورہ صورت میں جس شخص نے اُس لڑکی کو اغوا کیا تھا، اُس شخص اور اُس کی برادری کے اُن افراد کا معاشرتی مقاطعہ (Sociol Boycott) کیا جانا چاہئے جو لوگ اس غیر شرعی فعل میں اس کے مددگار ہوں یا اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوں، ان کا بائیکاٹ بھی درست ہے۔البتہ اس کی برادری کے ان لوگوں کا بائیکاٹ صحیح نہیں ہے، جو ایسے حرام فعل اور اس کا ارتکاب کرنے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔شریعت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

''رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا:

''یَا رَسُولَ اللّٰہِ مَا الْعَصَبِیَّۃُ؟، قَالَ أَنْ تُعِینَ قَوْمَکَ عَلَی الظُّلْمِ''۔

ترجمہ: ''یارسول اللہ ﷺ! عصبیت کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: عصبیت یہ ہے کہ تو ظلم میں اپنی قوم کا مددگار بنے، (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 5078)''۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق برادری کے لوگ خیر کے کاموں میں آپس میں تعاون کریں اور برائی کے کامون میں تعاون نہ کریں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔لیکن پوری برادری یا اس کے کچھ لوگوں کا اپنے کسی رکن کے گناہ کے کاموں

میں مدد کرنا اور اس کی حمایت کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ معصیت ہے اور معصیت کے کاموں میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:
لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ، ترجمہ: ''کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے، جس پر عمل پیرا ہونے سے اللہ تعالیٰ کی معصیت لازم آئے''۔
(مسند امام احمد بن حنبل: 1095)

کسی بھی مسلمان کو دوسرے مسلمان کی نمازِ جنازہ سے روکنا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ حرام فعل ہے اور ایسے لوگ فعلِ حرام کے ارتکاب کے سبب فاسق قرار پائیں گے، جہاں تک سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کا تعلق ہے تو کسی عذرِ شرعی کے بغیر کسی مسلمان سے ترکِ تعلق جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:
''لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ''۔
ترجمہ: ''کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے (دینی) بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق (Boycott) کرے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6077)''۔
کسی سے نفرت یا محبت کا معیار ذاتی پسند یا ناپسند نہیں ہونا چاہئے، ذاتی عداوت کی خاطر کسی مسلمان سے قطع تعلق بھی شریعت کے خلاف ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:
(۱) عَنْ مُعَاذٍ أَنَّهُ سَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنْ أَفْضَلِ الْإِيمَانِ قَالَ أَفْضَلُ الْإِيمَانِ أَنْ تُحِبَّ لِلّٰهِ وَتُبْغِضَ فِي اللهِ وَتَعْمَلَ لِسَانَكَ فِي ذِكْرِ اللهِ، قَالَ وَمَاذَا يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ وَأَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتَكْرَهَ لَهُمْ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ وَأَنْ تَقُولَ خَيْرًا أَوْ تَصْمُتَ
ترجمہ: ''حضرت معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: ''افضل ایمان کیا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: افضل ایمان یہ ہے کہ تم اللہ (کی رضا) کے لئے (کسی سے) محبت کرو اور اللہ ہی (کی رضا) کے لئے کسی

سے ناراضگی کرو اور تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہے، اُس شخص نے دریافت کیا کہ وہ کس طرح ہوگا؟، آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، اور جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی ناپسند کرو، اور اچھی بات کہو یا خاموش رہو، (مسند امام احمد بن حنبل، جلد 5، ص: 248)''۔

(۲) عَنْ عَمرِو بْنِ جَمُوحٍ، اَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ لَايَحِقُّ الْعَبْدُ حَقَّ صَرِيحِ الايمانِ حتّٰی يُحبَّ للهِ تعالٰی ويُبغِضَ للهِ، فاذا أحبَّ لله تَبَارَكَ وتَعَالٰى وأَبْغَضَ لِلهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى، فَقَدِ اِسْتَحَقَّ الوِلاءَ من الله،

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ کوئی بندہ اس وقت تک صریح ایمان کا حق دار نہیں ہوگا، یہاں تک کہ اس کی کسی سے نفرت یا محبت صرف اللہ کی رضا کے لئے ہو۔ پس جب اس کی کسی سے محبت یا نفرت صرف اللہ کی رضا کے لئے ہو جائے تو وہ اللہ کی محبت کا حق دار ہو جائے گا''۔

(مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 15549 جلد 5، ص: 293، مطبوعہ: دار الفکر)

مذکورہ بالا احادیث میں ایمان کا کامل درجہ یہی بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی دوسرے لوگوں سے محبت کا مدار کسی خوف، طمع یا دنیوی غرض کے لئے نہ ہو بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو۔ ایمان کا رشتہ سب رشتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو کافر یا منافق کہنا ناجائز وحرام ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِذَا كَفَّرَ الرَّجُلُ اَخَاهُ فَقَدْ بَآءَ بِهَا اَحَدُهُمَا۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنے (دینی) بھائی کو کافر کہتا ہے تو دونوں میں سے کسی ایک شخص کی طرف کفر ضرور لوٹتا ہے، صحیح مسلم، رقم الحدیث: 123''۔ یعنی جس کو کافر کہا گیا ہے اگر حقیقت میں وہ کافر ہے تو یہ قول اس پر صادق آئے گا، ورنہ کسی شرعی دلیل وثبوت کے بغیر کسی کو کافر کہنے

والے پر خود یہ قول لوٹ آئے گا۔

(۴) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ دِیْنَارٍ اَنَّہٗ سَمِعَ ابْنَ عُمَرَ یَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَیُّمَا امْرِءٍ قَالَ لِاَخِیْہِ یَا کَافِرُ فَقَدْ بَاءَ بِھَا اَحَدُھُمَا اِنْ کَانَ کَمَا قَالَ وَاِلَّا رَجَعَتْ عَلَیْہِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے کسی (دینی) بھائی سے کہا، اے کافر!، تو کفر دونوں میں سے ایک کی طرف ضرور لوٹے گا، اگر وہ شخص واقعی ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے، تو ٹھیک ہے، ورنہ کفر اسی کی طرف لوٹے گا، (جس نے بلا ثبوت شرعی دوسرے کو کافر کہا ہے)، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 124)''۔ علامہ غلام رسول سعیدی اس حدیث کی شرح میں علامہ یحییٰ بن شرف النووی متوفی 676ھ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''بعض علماء نے اس حدیث کو مشکل احادیث میں سے شمار کیا ہے، کیونکہ اس حدیث کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے، اس لئے اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ قتل، زنا اور اسی طرح دوسرے کبیرہ گناہوں کی وجہ سے مسلمان کی تکفیر نہیں کی جاتی، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کو کافر (''اے کافر!'') کہے، جب کہ اس کا یہ اعتقاد نہ ہو کہ دین اسلام باطل ہے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی، اس وجہ سے اس حدیث کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں:

(۱) جو شخص جائز اور حلال سمجھ کر کسی مسلمان کو اے کافر! کہے، وہ کافر ہو جائے گا۔

(۲) جو شخص مسلمانوں کو بکثرت کافر کہے گا اس کی شامت سے وہ خود انجام کار کافر ہو جائے گا۔

(۳) جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہہ رہا ہے، وہ درحقیقت خود کو کافر کہہ رہا ہے۔ کیونکہ جس کو وہ کافر کہہ رہا ہے، اُس کے عقائد اسی کی مثل ہیں اور وہ اسی کی طرح مسلمان ہے۔

(۴) اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے گا (کسی جواز کے بغیر) تو اس کی تکفیر کا گناہ اس کی طرف لوٹے گا۔

(۵) اگر کسی شخص نے مسلمان کو بطور سبّ وشتم (گالی گلوچ) کافر کہا تو یہ گناہ کبیرہ ہے اور اگر

مسلمان کو اس کے اسلامی عقائد کی وجہ سے کافر کہا تو پھر یہ کفر اس کی طرف لوٹ جائے گا۔
(۶) قاضی عیاض نے امام مالک بن انس سے نقل کیا کہ یہ حدیث خوارج پر محمول ہے جو مسلمانوں کی تکفیر کرتے تھے، لیکن تحقیق یہ ہے کہ باقی اہلِ بدعت کی طرح خوارج کی بھی تکفیر نہیں کی جاتی''۔
(شرح صحیح مسلم للنووی، جلداول، جز ثانی ص:50، بحوالہ: شرح صحیح مسلم، جلداوّل:481)

کسی مسلمان کو کافر کہنے کی دو وجوہ ہوسکتی ہیں: (۱) گالی کے طور کہا جائے، اس سے کہنے والا کافر نہیں ہوتا، اگرچہ شرعاً یہ حرام فعل ہے اور اس پر وہ گنہگار ہوگا (۲) اس معنی میں کافر کہا جائے کہ وہ اسلام سے خارج ہے، اس صورت میں دلیلِ شرعی کے بغیر مسلمان کو کافر کہنے والا کافر ہوجائے گا، اس پر تجدیدِ ایمان لازم ہے اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو تجدیدِ نکاح بھی لازم ہے، جب تک تجدیدِ ایمان نہیں کرے گا، کوئی عبادت قبول نہیں ہوگی۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

والمختارُ للفتویٰ فی جنسِ ھذہ المسائلِ انَّ القائِلَ بمثلِ ھذہ المقالاتِ اِن کَانَ أرادَ الشتْمَ ولایَعْتَقِدُہٗ کَافِرًا، لَا یُکَفَّرُ وَاِنْ کَانَ یَعْتَقِدُہٗ کافِرًا، فَخَاطَبَہٗ بھذا بِناءً عَلٰی اِعتقادِہٖ أنَّہٗ کافرٌ، یُکَفَّرُ، کذا فی الذخیرۃ

ترجمہ: ''اس قسم کے مسائل میں مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو محض گالی کے طور پر کافر کہتا ہے اور اسے حقیقتاً کافر نہیں سمجھتا تو (اگرچہ یہ شرعاً انتہائی ناپسندیدہ بات ہے لیکن) کہنے والا کافر نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کو جو حقیقت میں مسلمان ہے، اسے کافر سمجھتے ہوئے کہتا ہے: اے کافر!، تو ایسا کہنے والا خود کافر ہوجائے گا، ''ذخیرہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:278، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

جامع الفصولین میں ہے: قال لغیرہٖ یا کافرُ، قال الفقیہ الاعمش البلخی کَفَرَ القَائلُ وقال غیرُہ مِن مشائخ بلخ لایکفر فاتفقت ھذہ المسألۃ ببخاری اذا اجاب بعض

آئمة بخاری انه کفر فرجع الجواب الی بلخ فمن افتی بخلاف الفقیه الاعمش رجع الی قوله وینبغی ان لایکفر علی قول ابی اللیث وبعض آئمة بخاری والمختار للفتوی فی جنس هذه المسائل ان القائل هذه المقالات لواراد الشتم ولا یعتقد کافرا لایکفر ولواعتقد کافرا کفر

ترجمہ: ''جامع الفصولین میں ہے: کسی غیر کو کہا: اے کافر! تو امام اعمش فقیہ بلخی نے فرمایا: وہ کہنے والا خود کافر ہوگیا۔ اور ان کے علاوہ مشائخ نے فرمایا: وہ کافر نہ ہوگا۔ اور یہی مسئلہ بخارا میں پیش آیا، تو بخارا کے بعض آئمہ نے فرمایا: وہ کافر ہوگیا، جب یہ جواب بلخ پہنچا تو جن لوگوں نے فقیہ امام اعمش کے خلاف فتویٰ دیا تھا، انہوں نے رجوع کر کے اعمش کے قول سے اتفاق کرلیا۔ اور ابواللیث اور بخارا کے بعض آئمہ کے نزدیک کافر نہ کہنا مناسب ہے، جبکہ اس قسم کے مسائل میں فتویٰ یہ ہے کہ مسلمان کو کافر کہنے والے نے اگر گالی مراد لی ہو اور کفر مراد نہ لیا ہو تو کافر نہیں ہوگا اور اگر اس نے کفر کا اعتقاد کیا تو وہ کافر ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 11 ص: 380379، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

دوسروں کو کافر کہنے والے کا حکم

سوال: 167

ایک صاحب جو دوسرے محلے کی مسجد کے پیش امام ہیں، علاقے کی مرکزی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد سلام پڑھتے ہی لوگوں کے ہجوم میں جب لوگ خطیب صاحب سے مصافحہ کر رہے تھے، آگے بڑھے اور یہ الفاظ کہے: ''ہم سے بھی سلام لے لیں، ہمارے دل میں کفر نہیں، آپ کافر ہیں اور میں یہ بات ثابت کرسکتا ہوں''۔ اس پر لوگ مشتعل ہوگئے کہ انہوں نے ہمارے خطیب کی توہین کی ہے، انہیں کافر کہا ہے۔ اس کے بعد وہ شخص ایک حافظ قرآن بچے کی سند لایا جو اسی مسجد سے فارغ ہوا تھا، مذکورہ شخص نے یہ اعتراض کیا کہ خطیب صاحب نے مُعلّم کی جگہ دستخط کیوں کئے، جبکہ مُعلّم کوئی اور ہے۔ اس پر مسجد کمیٹی نے لوگوں کی موجودگی میں اس بات کو غلط قرار دیا اور کہا کہ خطیب صاحب سے

دستخط کے لئے ہم نے کہا تھا، وہ اس مسجد کے امام وخطیب اور مدرسے کے منتظم ہیں۔اس پر پورے جمِ غفیر نے اُس (کافر کہنے والے) شخص کو غلط اور جھوٹا کہا، پھر مسجد کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلے پر کسی مفتی صاحب سے فتویٰ لیا جائے، ہمارے سوال درج ذیل ہیں:

۱۔کیا ایسا شخص امامت کا اہل ہے؟۔

۲۔ایسے الفاظ ادا کرنے پر شرع کا کیا حکم لاگو ہوتا ہے؟۔

۳۔کافر کہنے والے شخص کا نکاح قائم ہے یا نہیں؟۔

(سائلین: کمیٹی جامع مسجد واہلیانِ کلووال)

جواب:

مسلمان کو کافر کہنا شرعاً انتہائی ناپسندیدہ ہے اور اس کے قائل کے قول کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں:

(1) بطور گالی کہا جائے، اس سے کہنے والا کافر نہیں ہوتا۔

(2) مسلمان کو مذہبِ اسلام سے خارج جان کر کافر کہا تو اس صورت میں کہنے والا کافر ہو جاتا ہے، اُسے تجدیدِ ایمان کرنا ہوگی اور اگر شادی شدہ ہے تو تجدیدِ نکاح بھی لازم ہے، جب تک تجدیدِ ایمان نہیں کرے گا، اس کی نماز، روزہ وغیرہ قبول نہیں ہوں گے۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے والوں سے زبان روکو، اُنہیں کسی گناہ پر کافر نہ کہو''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

والمختارُ للفتویٰ فی جنسِ ھذہ المسائلِ انَّ القائلَ بمثلِ ھذہ المقالاتِ اِن کانَ أرادَ الشتمَ ولایَعتقدُہ کافِرا، لَا یُکفَر وَانْ کانَ یَعتَقِدُہ کافِرا، فَخاطَبَہٗ بھذا بِناءً علیٰ اِعتقادِہٖ أنَّہٗ کافرٌ، یُکفَرُ، کذا فی الذخیرۃ

ترجمہ:''اس قسم کے مسائل میں مفتیٰ بہٖ قول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو محض گالی کے طور پر کافر کہتا ہے اسے حقیقتاً کافر نہیں سمجھتا تو (اگرچہ یہ شرعاً انتہائی ناپسندیدہ بات ہے لیکن)

کہنے والا کافر نہیں ہوگا اور اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کو جو حقیقت میں مسلمان ہے، اسے کافر سمجھتے ہوئے کہتا ہے: اے کافر! تو ایسا کہنے والا خود کافر ہو جائے گا، ''ذخیرہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 278، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

صورتِ مسئولہ میں اُس شخص نے خطیب کو یہ کلمات کہے ''ہمارے دل میں کفر نہیں، آپ کافر ہیں اور میں یہ بات ثابت کرسکتا ہوں''، ایک تو اسے یہ معلوم ہے کہ ایمان وکفر کا تعلق دل اور اعتقاد سے ہے اور پھر اُس کا یہ دعویٰ کہ ''میں یہ بات ثابت کرسکتا ہوں'' یہ اپنی معصیت پر اصرار کے مترادف ہے، لہٰذا اس پر لازم ہے کہ تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح کرے اور خطیب سے کھلم کھلا معافی مانگے، ورنہ وہ امامت کا اہل نہیں رہے گا۔

ڈرائیور کا پٹرول میں خیانت کرنا

سوال:168

گورنمنٹ ایک ڈرائیور کی گاڑی چلانے پر ڈیوٹی لگاتی ہے جو کہ کراچی سے پشاور جاتا ہے اور پشاور سے کراچی واپس آتا ہے، اس سفر کا فاصلہ تقریباً 1600 کلومیٹر ہے اور اس سفر کے لئے گورنمنٹ 800 لیٹر پٹرول دیتی ہے۔ ڈرائیور اُس میں سے تقریباً 120 لیٹر پیٹرول بچالیتا ہے اور اُسے فروخت کر دیتا ہے۔ کیا یہ رقم اُس کے لئے حلال ہے؟،

(صفدر اقبال نعیم، ضلع سدھنوتی تحصیل پلندری، آزاد کشمیر)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں ڈرائیور کی حیثیت ملازم (اجیر) کی ہے، ڈرائیونگ کی اُسے اجرت دی جاتی ہے، ملازم کو جو چیزیں کسی کام کے لئے دی جائیں وہ امانت ہوتی ہیں اور جو ڈیزل اُسے دیا جاتا ہے وہ بھی سرکاری امانت ہے، جس کام کے لئے وہ ڈیزل دیا گیا اسے بچاکر اپنے ذاتی تصرف میں لانا یا فروخت کرنا، سب خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔ اسلام میں امانت داری کا موضوع بہت وسیع حیثیت کا حامل ہے، زندگی کے ہر شعبے میں امانت داری ضروری ہے۔ قرآن کریم میں جابجا امانت داری کی تاکید اور اہمیت بیان کی گئی

ہے۔قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کی بکریوں کو کنویں سے پانی نکال کر پلایا۔حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیوں نے اپنے والد حضرت شعیب علیہ السلام سے اس اجنبی نوجوان کا واقعہ بیان کیا اور پھر اپنے والد سے کہا:

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ٘ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝

ترجمہ:''ان دونوں خواتین میں سے ایک نے کہا: اے ابا جان! آپ ان کو اجرت پر رکھ لیجئے، کسی کو اجرت پر رکھنے کے لئے بہترین انتخاب ایسے شخص کا ہونا چاہئے جو (دوصفات کا حامل ہو) طاقت ور امانت دار ہو، (سورۃ القصص:26)''۔

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ بہترین اجیر وہ ہے جو قوی ہو اور امانت دار بھی ہو۔جو امانت داری کو چھوڑتا ہے یا حیلے بہانوں سے خیانت کی راہیں تلاش کرتا ہے، وہ گمراہ ہے، حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ بُرَیْدَۃَ ،عَنْ اَبِیْهِ ،عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰی عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقًا فَمَا اَخَذَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ غُلُوْلٌ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن ابی بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کسی کو ہم کسی کام کے لئے مقرر کریں اور اسے اس کی اجرت ادا کردیں تو اپنی اجرت کے علاوہ وہ جو کچھ بھی لے گا، وہ غبن کے زمرے میں آئے گا''۔

(سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2936)

تاہم اگر حکومت کسی کے ساتھ یہ معاہدہ کرے کہ تمہیں فلاں مقام سے فلاں مقام تک گاڑی لانی اور لے جانی ہے اور اس کا مجموعی معاوضہ یا اجرت (ایندھن اور اجرت کارکنان سمیت) یہ ملے گی تو پھر یہ معاہدہ درست ہے، اور وہ طے شدہ معاوضے کا حق دار ہے، لیکن اگر وہ ڈرائیور ملازم ہے اور اسے اپنے کام کی اجرت ملتی ہے تو پھر ایندھن میں خیانت حرام ہے۔

بجلی کی چوری کا مسئلہ اور اس کا شرعی حکم

سوال:271

آج کل لوگوں میں بجلی چوری کرنے کا رجحان بہت زیادہ ہوگیا ہے، چوری کے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں جیسے میٹر کی رفتار کو کم کرنا، کنڈا لگا لینا، میٹر کو بند کر دینا وغیرہ۔ وہ اس چوری جیسے بڑے گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ وہ کسی مادی چیز کے بغیر اجازت اٹھا لینے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے آنجناب سے معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں بجلی چوری کرنا گناہ ہے یا نہیں؟ برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی مکمل وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں، (مٹھا رمیمن، جی۔ ایم سینٹر کے۔ ای۔ ایس۔ سی کراچی)۔

جواب:

سرقہ کی تعریف کرتے ہوئے علامہ ابن ھمام لکھتے ہیں: ھِیَ اَخْذُ العاقلِ البالغِ عشرۃَ دراھمَ او مقدارَھا خُفیۃً عَمَّنْ ھو مُتَصَدٍّ للحفظِ مِمَّا لا یتسارعُ الیہ الفسادُ من المالِ المتموّلِ للغیرِ عن حرزٍ بلا شبھۃٍ

ترجمہ: ''عاقل بالغ کا (کسی محفوظ جگہ سے) کسی کا دس درھم (یا اس کے برابر یا زائد مالیت) کا ایسا مال، جس کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا ہو اور اس کا مال غیر ہونے میں کسی شبے یا تاویل کی گنجائش نہ ہو اور وہ چیز جلد خراب ہونے والی بھی نہ ہو، سرقہ کہلاتا ہے''۔

(فتح القدیر، جلد 5، ص:339، گجرات انڈیا)

علامہ شامی نے سرقہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں: (1) سرقہ صغریٰ (2) سرقہ کبریٰ، اگر مال مسروق کے نقصان کا تعلق فقط صاحب مال کے ساتھ ہو تو وہ سرقہ صغریٰ ہے اور اگر وہ نقصان فردِ واحد کے ساتھ خاص نہ ہو بلکہ عام ہو تو وہ سرقہ کبریٰ کہلائے گا۔۔۔۔۔علامہ شامی آگے لکھتے ہیں: وقد اشترکا فی التعریف واکثر الشروط اہ ای لان المعتبر فی کل منھما اخذ المال خفیۃ

ترجمہ: ''اور (چھوٹے اور بڑے) سرقہ کی ان دونوں قسموں کی تعریف اور اکثر شرائط ایک

ہی ہیں، کیونکہ ان دونوں اقسام میں جو مفہوم معتبر ہے، وہ یہ کہ (مالک یا محافظ کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے) خفیہ طور پر کسی کے مال کو چرانا"۔

مذکورہ بالا فقہی حوالوں سے معلوم ہوا کہ شرعی طور پر کسی کا مال لینا چوری ہے اور مالیت تمول الناس (لوگوں کے اس کے حاصل کرنے کی رغبت) سے ثابت ہوتی ہے جیسا کہ علامہ شامی نے تصریح کی ہے، والمالیة تثبت بتمول الناس۔ یعنی کسی چیز کا مال ہونا اس امر سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگ اس کے حاصل کرنے اور جمع کرنے میں رغبت رکھتے ہیں۔ بجلی پر تموّل کا تو اطلاق ہوتا ہے کیونکہ اس کی خرید وفروخت مال کے عوض ہوتی ہے، اگرچہ اس کو ذخیرہ نہیں کیا جاسکتا۔ ٹمپرنگ (Tempring) کر کے میٹر کو بند کر دینا یا میٹر کے باہر سے بجلی کے تار کو کنکٹ کر کے استعمال کرنا چوری بھی ہے، خیانت بھی ہے، فعلِ حرام بھی ہے۔ یہ عامۃ الناس کی بھی حق تلفی ہے اور ایک طرح سے سرقۂ کبریٰ ہے۔ حکومت اس کے لئے اپنی حکمت ومصلحت کے مطابق تعزیر مقرر کرسکتی ہے، قانون سازی کر کے اسے عدالت کے دائرے میں لایا جاسکتا ہے، لیکن یہ وہ سرقہ نہیں ہے جس پر قطعِ ید (ہاتھ کاٹنے) کی شرعی سزا مقرر ہے، کیونکہ اس کے لئے باقاعدہ شرائط مقرر ہیں جو یہاں نہیں پائی جاتیں۔ بجلی کے میٹر کی رفتار کو کم کرنا یا میٹر کو بند کر دینا یا کنڈا لگا کر غیر قانونی طریقے سے بجلی استعمال کرنا چوری ہے اور چونکہ بجلی کی چوری کا نقصان صرف فرد واحد کے ساتھ نہیں بلکہ عوام الناس کیساتھ ہے لہٰذا علامہ شامی کی تصریح کی رو سے یہ سرقہ کبریٰ کہلائے گا، لوگوں کو چاہئے کہ غیر قانونی طریقے سے بجلی کے استعمال سے گریز کریں۔

لیکن جس طرح صارفین کا بجلی کے حصول اور استعمال میں غیر قانونی طریقہ اختیار کرنا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح بجلی سپلائی کرنے والے محکمے یا ادارے کی طرف سے بجلی کے میٹروں کی رفتار کو تیز کرنا یا ان کی غفلت کی وجہ سے میٹر کا چلتے چلتے بند ہو جانا اور بعد میں اپنے من پسند معیار کے مطابق اوسط رقم (Everage) کا بل بھیجنا اور صارف سے زائد قیمت لینا، یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

ترجمہ: ''اے مومنو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، (النساء:29)''۔

اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ روزانہ کئی کئی گھنٹے لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے، بجلی کی سپلائی بند رہتی ہے مگر جب بل آتا ہے تو معمول سے زائد ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر صارف کو میٹر کے ناقص ہونے کی شکایت ہو تو اس کے جانچنے کا کوئی غیر جانبدارانہ عادلانہ نظام نہیں ہے، محکمہ یا ادارہ اپنے ظلم کے خلاف خود ہی منصف ہوتا ہے۔ بجلی کی چوری کی اکثر یا بعض صورتوں میں محکمے یا ادارے کے اہلکار اور ذمہ داران شریک ہوتے ہیں اور رشوت لے کر جرم کی ترغیب دیتے ہیں۔ پس جب تک اصلاح کا ایک جامع، غیر جانبدار اور انصاف پر مبنی نظام نہ ہو تو پھر عوام کا استحصال ہوتا رہے گا اور اگر بجلی کی سپلائی کا ادارہ قومی ہے تو قومی نقصان ہوگا۔ غیر جانب دار تجزیوں میں بتایا گیا ہے کہ بجلی کی ترسیل اور سپلائی کے محکمے یا ادارے کی ناقص کارکردگی کی وجہ سے بعض صورتوں میں چالیس فیصد ضیاع ہوتا ہے، جسے فنی اصطلاح میں Line Loss کہتے ہیں۔ اور ان تمام مصارف کو مجموعی مصارف میں شامل کر کے ان حقیقی صارفین کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے جو کوئی خیانت نہیں کرتے، دیانت داری سے بل ادا کرتے ہیں، لہٰذا محکمانہ یا ادارتی سطح پر دانستہ یا نادانستہ غفلت کا بوجھ بے قصور صارفین پر ڈالنا بھی ''اَکلُ الاَموال بالباطل'' (باطل طریقوں سے مال کھانے) کے ذیل میں آتا ہے۔

اگر غیر قانونی استعمال کا سدِّ باب کر دیا جائے اور ہر صارف کو بل ادا کرنا پڑے تو بجلی کی طلب (Demand) اور صرف (Consumption) میں بھی کمی آئے گی، بلکہ بہت ممکن ہے کہ یہ ادارے خسارے سے نکل کر نفع بخش بن جائیں اور حکومت کو زرِ تلافی (Subsidy) سے بھی نجات مل جائے۔ اور اسے نفع بخش کاروبار سمجھ کر مزید ادارے اس شعبے میں سرمایہ کاری کے لئے بخوشی آگے آئیں گے اور صنعتوں کو فروغ ملے گا۔

کراچی جیسے میگا پولیٹن شہر میں اگر شہری خدمات کے ادارے مقامی حکومت کی تحویل میں دیدیئے جائیں تو شہری انتظامیہ بجلی کے غیر قانونی استعمال کو کافی حد تک کنٹرول کر سکتی

ہے۔ اگر ہر صارف (Consumer) کو حقیقی بل ادا کرنا پڑے تو کمپنی کے مالی وسائل میں کافی اضافہ ہوسکتا ہے۔ شہری حکومت بین الاقوامی اداروں سے شہری خدمات کے اداروں کو جدید بنانے کے معاہدات کرکے خود ادائیگی کرسکتی ہے، جس میں بجلی کی ترسیل کا زیرِ زمین جدید نظام، اوور ہیڈ یا انڈر گراؤنڈ ریل کا جدید ترین نظام وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر مفتی مُنیب الرّحمٰن

کی زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی مؤثر تصنیف

تفسیر سورۃ النّسآء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم تفسیر، اندازِ بیان مؤثر و دلکش
قدیم و جدید اہم تفاسیر کا نچوڑ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

جلد ششم

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور ○ کراچی ○ پاکستان

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (صحیح مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد ششم

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد ششم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
پروف ریڈنگ وتصحیح	مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
اشاعت اول	جون 2012ء
اشاعت دوم	دسمبر 2012ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ9
قیمت	450/- روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔فون:۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350 فیکس:۔ 042-37225085

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-32212011-32630411 فیکس:۔ 021-32210212

e:mail:- info@zia-ul-quran.com

visit our website:- www.zia-ul-quran.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رحمۃ للعٰلمین، سیدنا و مولانا محمدٍ وّعلیٰ الہ الطیبین الطاھرین وعلیٰ صحابتہ الصدیقین الکاملین، وعلیٰ اولیاءِ امتہ وعلماءِ ملتہ من الفقھاء المجتھدین والمحدثین والمفسرین اجمعین.

حرفے چند

الحمد للہ علیٰ احسانہٖ تفہیم المسائل کی جلد ششم پیشِ خدمت ہے۔ اس میں اہم مسائل ہیں اور اکثر مسائل مفصّل و مدلّل ہیں۔ یہ مسائل روزنامہ ایکسپریس کے جمعۃ المبارک کے دین و دانش ایڈیشن میں چھپتے رہے ہیں، وہ اپنی پالیسی کے تحت دلائل کو حذف کر دیتے ہیں اور بعض اوقات عبارت بے ربط بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں ہم بے بس ہیں، کیونکہ اخبارات کی اپنی پالیسی ہوتی ہے۔

ان مسائل کے حوالہ جات و ترتیب کے سلسلے میں میرے نائب خصوصی مفتی عبدالرزاق نقشبندی کی بڑی کاوش ہے۔ میں نے اس کتاب کو امکانی حد تک لفظی اور معنوی اغلاط سے محفوظ رکھنے کے لئے دارالعلوم نعیمیہ کے ذی علم اور فقہی بصیرت رکھنے والے اساتذۂ کرام علامہ احمد علی سعیدی زید مجدہٗ اور مفتی محمد وسیم اختر المدنی زید مجدہٗ سے بھی اس پر نظرِ ثانی کروائی۔ ان حضرات نے کافی انہماک سے اس کا مطالعہ کیا اور حذف و اضافہ اور لفظی و معنوی اصلاح کے بارے میں مفید مشورے دیئے اور ان سے میں نے استفادہ کیا۔ جہاں نظرِ ثانی یا ردو بدل کی ضرورت محسوس ہوئی، میں نے اس میں کوئی تردد نہیں کیا۔ میں ان تینوں حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور ان کے علم اور فیضان میں اضافے کے لئے دعا گو ہوں۔

سب سے زیادہ حضرت علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی زید مجدہٗ کا ممنون و متشکر ہوں کہ انہوں نے نہایت عمیق نظر سے اس مسودہ کو پڑھا، ایک ایک حوالہ کو اصل مآخذ سے دوبارہ چیک (Tally) کیا، اعراب جہاں نہیں تھے لگائے اور جہاں ضرورت

محسوس کی وہاں اصلاح کی۔ اُن کے گرانقدر مشوروں سے بعض مسائل کی مزید وضاحت کی۔ الغرض اُن کے بے لوث علمی تعاون کا میں قدر دان ہوں اور چونکہ مسائل پر اُن کی گہری نظر ہے، اس لئے کوئی تسامح اُن کی نظر سے بچ نہیں سکتا۔

افتاء میں ہر سوال مستقل ہوتا ہے اور اس کے جواب میں ضروری دلائل دیئے جاتے ہیں۔ لیکن جب اُن فتاویٰ کو کتابی شکل دی جاتی ہے تو ایک جیسے سوالات کے جوابات میں بعض اوقات حوالوں کا تکرار محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ قارئین کی سہولت کے لئے میں نے بعض فقہی حوالہ جات کے تکرار کو حذف کر دیا ہے اور جہاں جہاں وہ حوالہ جات پہلے سے اس کتاب میں درج ہیں، اس کا حوالہ دے دیا ہے تا کہ اہلِ علم کے ذہن میں دلیل تازہ ہو جائے۔

میری ایک نفسیاتی کمزوری ہے کہ میں خود اپنی تحریر سے بھی مطمئن نہیں ہو پاتا، اور معیار کی بہتری، عبارت کو سلیس اور عام فہم بنانے کے لئے ہر نظرِ ثانی کے موقع پر کچھ نہ کچھ ردوبدل کرتا رہتا ہوں۔ اس کی وجہ سے تصحیح اور کمپوزنگ کی محنت زیادہ ہو جاتی ہے، اس کے لئے میں مولانا یاسر رحمان کا شکر گزار ہوں۔

میری ہمیشہ یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ اللہ عزّ وجلّ، رسول مکرم ﷺ، کسی صحابی، تابعی، امام، عالم وفقیہ اور مصنِّف ومصنَّف کا نام یا کوئی بھی مرکب کلمہ اس طرح نہ آئے کہ اس کا نصفِ اول سطر کے آخر میں ہو اور نصفِ ثانی اگلی سطر کے شروع میں آئے، مگر ہماری محنت سے قائم کی ہوئی یہ ترتیب بعض اوقات بگڑ جاتی ہے۔

اہلِ علم اور قارئین سے التجا ہے کہ کوئی بھی لفظی اور معنوی فروگزاشت ان کے علم میں آئے تو ضرور مطلع فرمائیں، میں نہایت شکر گزار ہوں گا۔ اللہ تعالیٰ میری لغزشوں سے درگزر فرمائے، اس کاوش کو اپنی بارگاہِ اقدس میں ماجور فرمائے اور اسے قبولِ عام عطا فرمائے۔

آپ نے اس کتاب کے مطالعہ کے دوران مشاہدہ کیا ہوگا کہ ہم عصرِ حاضر کے

عظیم مفسر، محدث، فقیہ اور عالمِ جلیل علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم کی تحقیقات سے کافی استفادہ کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں وہ کافی علیل رہے اور کچھ عرصے کے لئے ''نعمۃ الباری'' کا کام بھی موقوف ہوگیا تھا، لیکن الحمدللہ اب ان کی طبیعت کسی حد تک بحال ہوگئی ہے اور ''نعمۃ الباری'' کی نویں جلد کی تکمیل کے بعد دسویں جلد پر کام جاری ہے۔ آج کل انہیں گھٹنے کے درد (Arthritis) کی شدید تکلیف ہے، تمام قارئین سے درخواست ہے کہ اُن کی صحت یابی کے لئے ہمیشہ دعا کرتے رہیں۔ ہماری مخلصانہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تمام جسمانی، روحانی اور عقلی وفکری قویٰ کی سلامتی کے ساتھ اعلیٰ تحقیقی معیار پر ''نعمۃ الباری'' کی تکمیل کی سعادت نصیب فرمائے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ ''تبیان القرآن''، ''شرح صحیح مسلم''، ''نعمۃ الباری'' اور علامہ صاحب کی دیگر تصانیفِ جلیلہ صدیوں مطلعِ علم پر ضوفگن رہیں گی اور ہر عہد کے شائقینِ علم ان سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

طلبگارِ دعا:

العبد المفتقر الی اللّٰہ

منیب الرحمٰن

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
	عقائد کے مسائل	17
01	نبی اور رسول میں فرق	19
02	امام مہدی کی تشریف آوری	24
03	رسول اللہ ﷺ کی رسالت و نبوت مستقل اور بالذات ہے	25
04	بشر اور ملائکہ میں افضل کون	25
05	تخلیق کائنات میں نورِ مصطفیٰ ﷺ کی جلوہ گری	27
06	رسول اللہ ﷺ کو اپنی مذہبی تنظیم میں کام کی دعوت دینا	28
07	مُتصوّفین اور اُن کے ارادتمندوں کے خلافِ شرع عقائد کا رَد	32
08	مُتصوّفین کا ناجائز شِعار	39
09	تارکِ صلوٰۃ اور دینی شعائر کے ترک کا مطالبہ کرنے والی بیوی کا حکم	46
10	سورج یا چاند گرہن کا حاملہ عورت پر کوئی طبعی اثر مرتب نہیں ہوتا	46
11	کیا مولودِ کعبہ ہونا حضرت علی کی وجہِ فضیلت ہے	47
12	علماء کی اہانت	49
	طہارت کے مسائل	55
13	غسلِ مسنون کا طریقہ	57
14	ستر کھولنے سے وضو نہیں ٹوٹتا	59
15	حالتِ اعتکاف میں غسلِ مسنون کا حکم	60
	نماز کے مسائل	65
16	مسبوق مقتدی تشہد میں شامل ہو تو کیا کرے؟	67

17	نماز میں قراءت (قرآن کی لفظاً ادائیگی) فرض ہے	70
18	رکوع اور سجدے میں تسبیحات کے ساتھ دعائیں پڑھنا	71
19	نمازی کے آگے سے گزرنے کا حکم	76
20	قضائے عمری ادا کرنے کا طریقہ	82
21	قضاء نمازیں زیادہ ہوں تو تسبیحات میں تخفیف	86
22	نماز کی رکعات میں تخفیف کس صورت میں جائز ہے	87
23	نمازِ جمعہ میں فرض کے بعد بقیہ رکعات کی ادائیگی بھی ضروری ہے	88
24	نمازِ شکرانہ کا طریقہ	94
25	فرض نماز میں امام کے پیچھے کیا پڑھنا ضروری ہے	99
26	کتنے وقفے کے بعد نماز قضا ہو جاتی ہے	101
27	دعا کا طریقہ	101
28	کن صورتوں میں نماز توڑی جا سکتی ہے	103
29	دعائے قنوت یاد نہ ہو تو؟	105
30	جماعت میں ایک مقتدی اور ایک امام ہے اور مزید افراد آ گئے	105
31	قضا نمازوں کی ادائیگی سے بری الذمہ ہونے کا طریقہ	107
32	نمازوں کے فدیے کی ادائیگی	108
33	کئی سالوں کی قضا نمازوں کا حکم	109
34	فدیۂ صلوٰۃ کی ادائیگی کے وقت نیت کافی ہے	109
35	تکبیر تحریمہ کے فضائل	110
36	فرض نمازوں کے بعد دعا میں اختصار	111
37	عورت کی امامت کا حکم	117

38	امام کے پیچھے قراءت کا حکم	121
39	نماز میں مُصحف سے دیکھ کر پڑھنے کا حکم	122
40	نماز میں لقمہ دینے کا شرعی حکم	124
41	چار رکعت والی نماز کے قعدۂ اولیٰ میں بھول کر کھڑا ہو جانا	125
42	مسافر کے پندرہ دن سے کم قیام پر قصر ہے	129
	مساجد اور وقف کے مسائل	131
43	کسی کی ذاتی زمین پر مسجد بنانا یا اُسے مسجد میں شامل کرنا	133
44	مسجد فنڈ سے وضوخانہ کی تعمیر	135
45	دیہات میں عیدگاہ کا شرعی حکم	136
46	مسجد فنڈ سے ضعیف امام کی اعانت اور کفالت اور امام کی چھٹیوں کی تنخواہ	137
47	مسجد کی حیثیت کو تبدیل کرنا	138
48	مسجد میں انگلیاں چٹخانے کا شرعی حکم	141
49	مسجد میں فتنہ وفساد برپا کرنے والے کا شرعی حکم	143
50	محراب مسجد میں شامل ہے	146
	جنازے کے مسائل	153
51	غسلِ میّت کا طریقہ	155
52	قاتل اور ڈاکو کی نمازِ جنازہ کا شرعی حکم	156
53	نمازِ جنازہ کی تکرار جائز نہیں	158
54	مغفرت وایصالِ ثواب کے لئے اجتماعی دعا	160
55	شوہر، بیوی کا وارث ہے، ولی نہیں	162
56	قبروں کو مسمار کرنا یا ان کی بے حرمتی ناجائز ہے	165

57 مزارات پر حاضری کا طریقہ 169

58 قبروں/مزارات پر پھول ڈالنے کا شرعی حکم 172

59 قبروں کو سجدہ کرنے اور بوسہ دینے کا حکم 174

60 عورتوں کا مزارات پر جانا 176

61 غیر شرعی منت کا حکم 178

62 مزارات پر ڈھول اور رقص وغیرہ جیسی خرافات کا حکم 179

زکوٰۃ کے مسائل 181

63 زکوٰۃ وفطرہ کی جبری وصولی 183

64 زکوٰۃ کے مصارف اور اُن میں خرد بُرد 188

65 زکوٰۃ اور کمیونٹی فنڈز 190

66 زکوٰۃ فنڈ سے پگڑی پر مکان لینے کے لئے مدد کرنا 192

67 پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ 194

68 بیوی کا مہر زکوٰۃ واجب ہونے سے مانع نہیں 195

69 پینشن بینیفٹ اکاؤنٹ کی رقم پر زکوٰۃ 196

70 زکوٰۃ کے مسائل 197

روزے کے مسائل 199

71 بچوں کو روزہ رکھوانے کا حکم 201

72 مسجد میں افطار کرنے کا حکم 202

73 قے سے روزہ ٹوٹنے کا حکم 203

74 روزے کی حالت میں بچے کو دودھ پلانے کا حکم 204

75 روزے کی حالت میں احتلام ہونے سے روزہ نہیں ٹوٹتا 205

76	نمازِ تراویح کے اجتماعات میں تلفظ کی ادائیگی وقراءت کا حکم	207
77	صدقۂ فطر کس پر واجب ہے؟	209
78	صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جاسکتا ہے؟	210
79	تیس رمضان کو دن کے وقت چاند نظر آنے سے متعلق شرعی مسائل رویتِ ہلال سے متعلق چند اہم مسائل	211
	حج کے مسائل	233
80	شوال اور ذوالقعدہ کے ابتدائی دنوں میں عمرے کی ادائیگی	235
81	اجنبی عورت کا مَحرم بن کر عمرہ کرنا	240
82	عمرے کا طریقہ	243
83	رمضان میں عمرے کے بعد شوال تک قیام اور حج کی فرضیت	245
	قربانی اور ذبح کے مسائل	249
84	دین کے فرائض وواجبات کو ساقط کرنے کا کسی کو اختیار نہیں	251
85	قربانی کا وقت گزرنے کے بعد قربانی کا جانور زندہ صدقہ کردیا جائے	255
86	قربانی کے جانور میں عقیقے کا حکم	257
87	لڑکے اور لڑکی کے عقیقے کا فرق	258
88	طوطے کی حلت یا حرمت کا شرعی حکم	260
	نکاح کے مسائل	269
89	حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہ کا نکاح	271
90	نکاح میں ایک بار ایجاب وقبول کافی ہے	273
91	خطبۂ نکاح کب پڑھا جائے اور کیسے (کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر)	273
92	ٹیلی فون پر لڑکے اور لڑکی کا ایجاب وقبول	274

93	حقیقی چچا، رضاعی بھائی اور اس کی اولاد سے نکاح	277
94	حقیقی خالہ کی نواسی سے نکاح جائز ہے	278
95	سالی کی نواسی سے نکاح جائز نہیں	279
96	بیوی کے انتقال کے بعد اُس کی بہن سے نکاح جائز ہے	281
97	حُرمتِ نکاح کا ایک مسئلہ	282
98	پہلے شوہر سے طلاق یا خلع لئے بغیر دوسرے نکاح کا حکم	283
99	عیسائی عورت سے نکاح کا حکم	285
100	ہبہ اور خلع کا مسئلہ	290
101	غیر مدخولہ عورت کا مہر	293
102	زیور اور مہر کا فرق	294
103	عورت کا رقم دے کر خریدنا	295
104	بیوی کا علیحدگی کا مطالبہ کرنا	296
105	عورت کے لئے کھانا پکانا اُن کے حالات پر موقوف ہے	297
106	خاتون کے پہلے شوہر سے اولاد کی کفالت دوسرے شوہر کی ذمہ داری نہیں ہے	300
107	حقِ پرورش کا استحقاق کسے حاصل ہے؟	305
108	قطع رحمی حرام ہے	307
	طلاق کے مسائل	311
109	ایک طلاق دے کر تین طلاقیں مراد لینے کا حکم	313
110	نکاح کے بعد عائد کردہ شرطِ طلاق لاگو ہوتی ہے یا نہیں؟	314
111	یہ فسخِ نکاح کی جائز بنیاد نہیں	315
112	والدہ کے حکم پر بیوی کو طلاق دینا	317

113 نشے کی حالت میں دی جانے والی طلاق کا حکم 331

114 نشے کی حالت میں طلاق 337

115 حُرمت کا شرعی مسئلہ 352

116 موبائل SMS کے ذریعے طلاق کا حکم 354

117 طلاقِ کنایہ 369

118 مختلف الفاظِ طلاق کا حکم 370

119 شوہر نے ایک طلاق لکھنے کا کہا، زائد طلاقیں مؤثر نہیں 373

120 خبر دینے کی نیت سے کہے گئے الفاظ سے جدید طلاق واقع نہ ہوگی 374

121 طلاقِ تعلیق 375

122 طلاق واقع نہیں ہوئی 376

123 اضافتِ طلاق 378

124 طلاقِ سُنّی 380

125 بیوی کے قسم کھانے سے ایلاء نہیں ہوتا 381

126 زنا کی مرتکب عورت کے لئے شرعی حکم 383

127 بوجہ مرض حیض نہ آنے والی عورت کی عدّت 385

خرید و فروخت کے مسائل 389

128 کاروبار میں شراکت 391

129 بیع کے فسخ کرنے کا حق 392

130 رہن رکھی ہوئی چیز سے نفع 396

131 قسطوں پر قیمت طے کر کے کاروبار جائز ہے 399

132 طے شدہ اجرت سے وضع کرنا 400

133 جھوٹی قسم کے ذریعے کسی کا مال غصب کرنا 403

134 سودی لین دین کا معاہدہ حرام ہے 406

135 ایڈوانس کی رقم پر زیادہ لینا ناجائز ہے 406

136 کسی چیز کے بیچنے کے لئے دوسرے کو ایجنٹ بنانا 408

137 قرعہ اندازی پر موٹر سائیکل 409

وراثت کے مسائل 411

138 مخلوط مال کی صورت میں ترکے کی تقسیم 414

139 زندگی میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی 416

140 حج فارم میں نامزد شخص کی حیثیت 417

141 مقروض پر لازم ہے کہ قرض خواہ کے وارثوں کو قرض ادا کرے 418

142 تقسیمِ ترکہ 420

143 عقدِ ثانی کی صورت میں بیوہ کا حصہ متاثر نہیں ہوتا 421

144 زندگی میں کسی کو حصہ دے کر وراثت سے دستبردار کرنا 422

145 ترکہ کسے ملے گا؟ 426

146 تقسیم ترکہ 427

147 پینشن ترکہ نہیں 428

148 بیوی کو کوئی شے ہبہ کرنے کے بعد رجوع کا حق حاصل نہیں 429

149 قرابت داروں کو ہبہ کر کے رجوع نہیں کیا جاسکتا 431

150 والدہ کے ورثاء میں کون شامل ہیں؟ 433

151 تقسیم کا ایک پیچیدہ مسئلہ 434

152 جائیداد کے مختلف حصوں میں ترکے کا تعین 436

153 ہبہ محض زبانی کہہ دینے سے مکمل نہیں ہوتا 438

154 بیوی کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا 439

155 ذوی الارحام کس صورت میں وارث بنتے ہیں 440

156 ملازمت کے سرکاری قوانین اور ترکے کا حکم 442

157 بیٹے کے گھر میں باپ کی رہائش کا حق 443

حلال وحرام کے مسائل 447

158 برقی مچھر مار آلے کا استعمال 449

159 قانون کو ہاتھ میں لینا 451

160 موٹر سائیکل سوار کا اپنی غلطی سے موت سے دوچار ہونا 453

161 گواہی کا معیار 456

162 راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا 457

163 مصنوعی بال لگوانا اور بال اُگانا 460

164 زنا کا الزام 462

165 ذخیرہ اندوز کا شرعی حکم 464

166 جی۔پی فنڈ میں اضافہ 472

167 فرائض و مستحبات سے روکنا 473

متفرق مسائل 475

168 مساجد، دینی و تعلیمی اور صنعتی و کاروباری اداروں میں مسلح حفاظتی انتظامات 476

169 قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کے گودے (Pulp) کو دوبارہ استعمال (Recycling) میں لانے کا جواز 480

170 عدالت میں قرآن ہاتھ میں اٹھا کر جھوٹی گواہی دینا 487

171 قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا 490

172 بالغ نومسلم کا ختنہ 491

173 کیا استخارے سے چوری کا جرم ثابت ہوسکتا ہے؟ 493

174 مُخنّث (ہیجڑوں) سے متعلق ضروری مسائل 495

175 رخصتی سے قبل شوہر کے انتقال پر عدت، مہر، تقسیمِ ترکہ وغیرہ سے
متعلق 12 سوالات پر مشتمل تفصیلی فتویٰ 498

176 روڈ انشورنس کی رقم پر کس کا استحقاق ہے؟ 508

177 نام رکھنے سے متعلق ضروری مسائل 509

178 تقریبات میں پابندیِ وقت کا فقدان 515

179 دیوار پر قرآنی آیات لکھنا 518

180 سرکاری محکمے عاقلہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں 519

181 بچوں کو حسنِ سلوک کی تلقین کریں 526

182 دس محرم اور نیاز کی تقسیم 527

183 غیر مسلم کے سلام کا جواب 530

484 اشارات برائے یادداشت وحوالہ 534

عقائد کے مسائل

نبی اور رسول میں فرق

سوال: 01

نبی اور رسول میں کیا فرق ہے؟ اور ان میں سے کس کا رتبہ زیادہ بلند ہے؟ اور جو چار خلیفہ تھے وہ کس میں شامل ہوں گے؟ (افتخار احمد، ایف بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

رسول اس (کامل) بشر کو کہتے ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی طرف (اپنے) احکام کی تبلیغ کے لئے مبعوث فرمایا ہو اور اس میں کتاب کی بھی شرط لگائی گئی ہے (یعنی وہ ''صاحبِ کتاب'' ہو)۔ اس کے برعکس نبوت عام ہے (یعنی ہر رسول نبی ہوتا ہے، مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا)۔ نبوت ورسالت کبھی ہم معنی (Synonymous) استعمال ہوتے ہیں۔ علامہ سعد الدین تفتازانی نے شرح العقائد النسفیہ اور شرح المقاصد میں ہم معنی ہی مراد لیا ہے، جسے عربی میں ''مُترادِف'' کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ معنی کے اعتبار سے مُتَبَایِن (Words with different meanings) ہیں۔ ایک تعریف یہ ہے کہ رسول وہ ہے جو ''صاحبِ کتاب'' ہو اور حاملِ شریعت ہو۔ مگر اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ روایات کی رو سے رسولوں کی تعداد 313 (یا 315) ہے اور الہامی کتابوں کی تعداد 110 ہے اور انبیاءِ کرام کی تعداد کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام ''صاحبِ کتاب'' نہیں ہیں، مگر قرآن نے انہیں ''رسول نبی'' کہا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ۝

ترجمہ: ''اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کیجئے، بے شک وہ وعدے کے سچے (اور پکے) تھے اور رسول نبی تھے، (مریم:54)''۔

اس بنا پر رسول کی تعریف میں وسعت پیدا کی گئی اور اس میں یہ اضافہ کیا گیا کہ: ''اُسے بھی رسول کہتے ہیں، جو سابق رسول کی شریعت ہی کا داعی اور مبلغ ہو لیکن اسے کسی نئی قوم کی

طرف بھیجا گیا ہو، جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکۂ مکرمہ اور اُس خطے کے لوگوں کی طرف دین کی دعوت دینے کے لئے بھیجا گیا یا جیسے حضرت یوشع علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت ہی کے مبلّغ تھے۔ایک تعریف کی رو سے رسول وہ ہے جس کی طرف (پیغام رسانی کے لئے) فرشتہ آتا ہو اور نبی پر اور طریقوں سے بھی وحی آتی رہتی ہے، جیسے الہام (Revelation) ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں کوئی بات ڈال دی جائے یا نیند میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی وحی کی جائے۔ایک لحاظ سے نبی کے مقابلے میں رسول عام ہے، کیونکہ رسول انسانوں میں سے بھی گزرے ہیں اور فرشتوں میں بھی ہیں، جبکہ نبی صرف انسانوں میں ہوتے ہیں۔

(خلاصۂ بحث از شرح العقائد النسفیہ مع عقد الفرائد، ص:57، مکتبۃ البشریٰ، پاکستان)

قرآن مجید میں فرشتے پر رسول کا اطلاق کیا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: قَالَ إِنَّمَآ أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۝

ترجمہ: ''(جبرئیل علیہ السلام نے) کہا: (اے مریم!) میں تو صرف تمہارے رب کا رسول (بھیجا ہوا) ہوں تاکہ میں تمہیں ایک پاکیزہ بیٹا دوں، (مریم:19)۔اس آیت میں فرشتے کو رسول کہا گیا ہے اور صاحبِ کتاب ہونا یہ رسولِ بشر کا خاصہ ہے، فرشتے پر رسول کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے فرستادہ یا پیغام رساں کے معنی میں ہے۔اسی طرح قرآنِ مجید میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا؟، تو اس نے جواب دیا:

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۝

ترجمہ: ''اس نے کہا: میں نے وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی، تو میں نے اللہ کے رسول (جبرئیل علیہ السلام) کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی بھر (مٹی) لی، پھر میں نے اس کو (بچھڑے کے مجسمے میں) ڈال دیا اور اسی طرح میرے دل کو (یہی بات) بھلی لگی، (طٰہٰ:96)''۔یہاں بھی فرشتے پر رسول کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں عام پیغام رساں پر بھی رسول کا اطلاق ہوا ہے، لیکن یہ لغوی معنی میں ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ O

ترجمہ: ''تو جب اُن (یوسف علیہ السلام) کے پاس (بادشاہ کا) قاصد آیا، تو اُنہوں نے فرمایا: اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ اُن عورتوں کا کیا حال ہے، جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، بے شک میرا رب ان کی سازش کو خوب جاننے والا ہے، (یوسف:50)''۔

الہامی کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

حضرت شیث پر 50 صحیفے، حضرت خنوخ پر 30 صحیفے، حضرت ابراہیم پر 10 صحیفے، حضرت موسیٰ پر تورات سے پہلے 10 صحیفے نازل کئے گئے اور 4 کتابیں تورات، زبور، انجیل اور قرآن ہیں، (حلیۃ الاولیاء، جلد:1، ص:167، بیروت)۔ایک روایت کی رو سے چار بڑی کتابیں ہیں (تورات، زبور، انجیل اور قرآن) اور حضرت آدم پر 10 صحیفے، حضرت شیث پر 50 صحیفے، حضرت ادریس پر 30 صحیفے اور حضرت ابراہیم پر 10 صحیفے۔

(خلاصہ بحث از شرح العقائد النسفیہ مع عقد الفرائد، ص:57، مکتبۃ البشریٰ پاکستان)

یہ سب اخبارِ آحاد ہیں اور ظنی ہیں۔اسی لئے علماءِ کرام جب بھی الہامی کتب اور تعدادِ انبیاء کی بات کرتے ہیں تو ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش کے الفاظ بولتے ہیں، قطعیت کے ساتھ تعداد کا تعین نہیں کرتے، انبیاءِ کرام کی قطعی تعداد اور ان کے اسماءِ مبارکہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں۔علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

عقیدہ: نبی اس بشر کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لئے وحی بھیجی ہو، اور رسول بشر ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ملائکہ میں بھی رسول ہیں (جیسے جبرئیل وغیرہ)۔

عقیدہ: انبیاء سب بشر تھے اور مرد، نہ کوئی جن نبی ہوا اور نہ عورت.

عقیدہ: انبیاء علیہم السلام شرک وکفر اور ہر ایسے عیب سے جو خلق کے لئے باعثِ نفرت ہو،

جیسے کِذب وخِیانت وجَہل وغیرُھا صفاتِ ذَمیمہ سے نیز ایسے افعال سے جو وجاہت (Prominence/Dignity)اور مُروت(Sense of honor, Generosity) کے خلاف ہیں، قبلِ نبوت اور بعدِ نبوت بِالاجماع(By Consensus) معصوم ہیں اور کبائر سے بھی مطلقاً معصوم ہیں اور حق یہ ہے کہ تعمُداً(Intentionally) صغائر سے بھی قبل نبوت اور بعد نبوت معصوم ہیں،(بہارِشریعت،جلد:1،ص:11-9)۔

علامہ کمال الدین بن ہمام نے نبی کی بعض خصوصیات بیان کی ہیں، جودرج ذیل ہیں:
مذکر ہونا، عقل اور خِلقت(By Birth)کے اعتبار سے کامل ہونا، ذہانت (Intellect)اوراصابتِ رائے(Righteousness) کےاعتبار سے کامل ہونا،اُن کے آباءکااوصافِ رذیلہ(Depraved Qualities)سے پاک اور پاکیزہ کردار کا حامل ہونا، نرم دل اور شفیق ہونا، ایسے جسمانی نَقص (Defect) اور عیب(Deficiency)سے پاک ہونا جولوگوں کے نزدیک نفرت کا سبب ہو،جیسے برص، جذام وغیرہ،اُن کا کوئی فعل انسانی وقار کے منافی نہیں ہوتا،ایسے پیشے کا حامل نہ ہو جولوگوں کے نزدیک بےتوقیر اور نفرت یاعار کا سبب ہو۔اس پر علماءِ اُمّت کا اجماع ہے کہ نبی نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد کبائر سے مُطلَقاً معصوم ہوتا ہےاور عمداً(Intentionally)صغائر سے بھی معصوم ہوتا ہے،البتہ بعض اوقات نسیان یا اجتہادی خطا نبی سے ممکن ہے۔

(خلاصہ از تبیان القرآن،ج:1،ص:618)

قرآن مجید میں درج ذیل 26 انبیاءِ کرام کے نام صراحت اور قطعیت کے ساتھ آئے ہیں:
حضرت آدم،حضرت نوح،حضرت ابراہیم،حضرت اسماعیل،حضرت اسحاق،حضرت یعقوب، حضرت یوسُف،حضرت موسیٰ،حضرت ہارون،حضرت شعیب،حضرت لوط،حضرت ہود، حضرت داوٗد،حضرت سلیمان،حضرت عزیر،حضرت ایوب،حضرت زکریا،حضرت الیاس، حضرت اَلیَسَع،حضرت یحیٰی،حضرت عیسیٰ،حضرت یونُس،حضرت ادریس،حضرت ذُوالکِفل،

حضرت صالح اور ختم المرسلین حضرت سیّدنا محمد رّسول اللہ علیہم الصلاۃ والسلام۔
ان میں سے کسی ایک نبی کی بھی نبوت کا انکار کفر ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کا نام صراحت کے ساتھ قرآن میں مذکور نہیں ہے، ان کی نبوت میں بھی اختلاف ہے، تاہم جمہور علماءِ امت کی رائے ہے کہ وہ نبی تھے۔ ان کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں ہے: فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًاo
ترجمہ: ''تو اُن دونوں (حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع علیہما السلام) نے ہمارے بندوں میں سے ایک (مُقرّب) بندے (حضرت خضر) کو پایا، جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی اور اسے اپنا علمِ لَدُنّی سکھایا (یعنی اللہ تعالیٰ کے تکوینی امور کے پیچھے اُن کے اَسرار و رموز اور پوشیدہ حکمتوں کا علم عطا کیا)، (الکھف:65)''۔ اسی طرح قرآن میں حضرت لقمان کا ذکر یوں ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ، ترجمہ: ''اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی، (لقمان:12)''۔ ان کے بارے میں جمہور علماءِ امت کی رائے یہ ہے کہ یہ نبی نہیں تھے بلکہ مردِ دانا اور حکیم (Wise Man, Sage) تھے۔
مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہوگیا کہ رسول کا مقام نبی سے اَرفع ہوتا ہے اور پھر رسولوں میں سے اُولوالعزم رسولوں کا مقام بلند ہوتا ہے۔ لیکن یہ فرقِ مراتب اُن کے مابین درجات کے تفاوت کی وجہ سے ہے، ورنہ تمام رُسُلِ عِظام اور انبیاءِ کرام علیٰ نبیّنا و علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی اپنی جگہ بلند درجات کے حامل ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
(۱) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ،
ترجمہ: ''یہ (سب) رسول ہیں، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے، (البقرہ:253)''۔
(۲) لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ،
ترجمہ: ہم (ایمان لانے میں) اُس (اللہ) کے رسولوں میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی فرق نہیں کرتے، (البقرہ:285)''۔

تمام انبیاءِ کرام کا نام بہ نام ذکر قرآن وحدیث میں نہیں ہے، اس لئے قرآن وحدیث میں مذکور انبیاءِ کرام کے علاوہ دیگر انبیاءِ کرام پر اجمالاً (Generally) ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ،

ترجمہ: اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے (بھی) رسول بھیجے، ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان فرمادیا اور اُن میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان نہیں فرمایا، (المؤمن:78)''۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد جو صحابۂ کرام یکے بعد دیگرے آپ کے خلیفہ بنے، وہ اپنے فضائل اور رفعتِ شان کے باوجود امتی ہیں، آپ ﷺ کی شریعت کے پیروکار اور مبلغ رہے۔ غیر نبی مرتبے میں نبی کے برابر نہیں ہوسکتا۔ حدیثِ پاک میں ہے:

كَانَتْ بَنُوْ إِسْرَائِيلَ تَسُوْسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کے امورِ سیاست انبیاء انجام دیتے تھے، جب ایک نبی کا وصال ہوجاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا، مگر اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، بس خلفاء ہوں گے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:3455)''۔

امام مہدی کی تشریف آوری

سوال:02

امام مہدی اس دنیا میں کس حیثیت سے تشریف لائیں گے؟۔

جواب:

حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ اس دنیا میں رسول اللہ ﷺ کے امتی کی حیثیت سے تشریف لائیں گے اور امامت بھی وہی فرمائیں گے۔

حدیث پاک میں ہے:اَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَيْفَ أَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ ، وَاِمَامُكُمْ مِنْكُمْ۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (اے میری امت کے لوگو!) اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی ، جب عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام تمہارے درمیان نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا''۔

(صحیح بخاری:3449)

اس حدیث میں اُمتِ محمدیہ کے جس امام کی طرف اشارہ ہے، وہ حضرتِ امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی رسالت ونبوت مستقل اور بالذات ہے

سوال:03

کیا حضرت محمد ﷺ کی رسالت حضرت علی کے بغیر ثابت نہیں ہوتی ؟۔

جواب:

حضرت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت ونبوت مستقل اور بالذات ہے، اس کا ثبوت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمیت کسی اور شخصیت یا ذات پر موقوف نہیں ہے۔آپ ﷺ کو نبوت ورسالت، منصب خاتم النبیین ،رحمۃ للعالمین الغرض سارے کمالات براہِ راست اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے۔حضرت علی سمیت تمام خلفاءِ راشدین، عشرۂ مُبَشَّرہ، اہل بیتِ کرام اور تمام اصحابِ رسول رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی فضیلتیں آپ ﷺ کے طفیل، آپ کی نسبت سے، آپ پر ایمان لانے سے اور آپ کی برکات کے طفیل ہیں۔

بشر اور ملائکہ میں افضل کون

سوال:04

بشر اور ملائکہ میں کس کا رتبہ زیادہ ہے؟۔

جواب:

رُسُلِ بشر، رُسُلِ ملائکہ سے افضل ہیں اور رُسُلِ ملائکہ عام انسانوں سے افضل ہیں اور عام انسان عام ملائکہ سے افضل ہیں۔ رُسلِ ملائکہ کے عام انسانوں سے افضل ہونے پر جُمہور علماءِ اُمّت کا اجماع ہے اور یہ ضروریاتِ دین سے ہے، یعنی اسلام میں عام انسانوں پر رسول کی فضیلت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے، یہ دین کے قطعی امور سے ہے۔ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ عام انسان عام ملائکہ سے افضل ہیں، ان سے وہ انسان مراد ہیں، جو علماء وصُلَحَاء ہیں، ایمانِ کامل رکھتے ہیں، کسی عَلانیہ فسق و فجور اور بدعت وضلالت میں مبتلا نہیں ہیں۔ البتہ جو انسان قبولِ حق سے انکار کر دیں، خالق تبارک وتعالیٰ اور اس کے احکام اور ضروریاتِ دین کے منکر ہو جائیں، کفر و شرک، فسق و فجور اور بدعت وضلالت میں مبتلا ہوں، تو ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُولَـٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَـٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ،

ترجمہ: ''وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں، (الاعراف:179)''۔ اور فرمایا: ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ٥

ترجمہ: ''پھر ہم نے اسے پستی کے آخری درجے میں گرادیا، (التین:5)''۔

اس کے دلائل کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، علماء نے قرآن مجید کی متعدد آیات سے استدلال کیا ہے۔ چند یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں اور سجدے کا یہ حکم تعظیم و تکریم کے لئے تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ابلیس کے اعتراض کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

أَرَأَيْتَكَ هَـٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ،

ترجمہ: ''مجھے بتایئے کیا یہ وہی ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت عطا کی، (بنی اسرائیل:62)''۔

(۲) ابلیسِ لعین آدم علیہ السلام کی فضیلت کے حکمِ ربانی کو چیلنج کرتے ہوئے کہتا ہے:

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ،

ترجمہ: ''میں (اپنے جوہرِ تخلیق کے اعتبار سے) اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اُسے مٹی سے پیدا کیا، (الاعراف:12)''

(۳) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا، ترجمہ: ''اور اُس (اللہ) نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے، (البقرہ:31)''۔ یہاں علم کو آدم علیہ السلام کی فضیلت کا سبب قرار دیا۔ اس پر قرآن مجید کی بہت سی آیات شاہد ہیں۔

(۴) وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ، ترجمہ: ''اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو بزرگی عطا فرمائی، (بنی اسرائیل:70)''۔

معتزلہ، فلاسفہ اور بعض اَشاعرہ ملائکہ کی انسانوں پر فضیلت کے قائل ہیں، ان کے اپنے دلائل ہیں اور علماء نے ان دلائل کا جواب دیا ہے۔ اس کی تفصیل شرح العقائد النسفیہ مع عقد الفرائد، مطبوعہ: مکتبۃ البشریٰ، صفحات: 402 تا 407 پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

تخلیقِ کائنات میں نورِ مصطفیٰ ﷺ کی جلوہ گری

سوال: 05

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کرنے سے پہلے حضرت محمد ﷺ کا نور بنایا تو کیا انبیاء کے نور اس وقت موجود تھے؟۔

جواب:

مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ کائنات سے پہلے نورِ محمد ﷺ کو پیدا فرمایا، دیگر انبیاءِ کرام ورسلِ عظام کی اَرواحِ مبارکہ کی تخلیق اس کے بعد ہوئی۔ تاہم عالَمِ اجسام کی تخلیق سے پہلے درجہ بدرجہ تمام انسانوں کی ارواح تخلیق کی گئیں۔ قرآن مجید میں عالَمِ اَرواح میں ارواحِ انبیاء علیہم السلام کے سید المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی نصرت کا پختہ وعدہ لینے کا ذکر ہے، جس پر انبیاءِ کرام کو بھی شاہد بنایا گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں بھی اس پر شاہد ہوں اور اسے میثاق سے تعبیر فرمایا، (آلِ عمران: 81)۔ اور اسی طرح تمام انسانوں کی ارواح سے بھی اللہ نے

اپنی رُبوبیت کے اقرار کا عہد لیا اور اس کی تفصیل سورۃ الاعراف:172 میں بیان فرمائی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو اپنی مذہبی تنظیم میں کام کی دعوت دینا

سوال: 06

کیا فرماتے ہیں کہ علماءِ کرام اس بارے میں کہ ایک مذہبی تنظیم کے اجلاس کے دوران تنظیم کے ذمہ دار نے کارکنان کو تنظیمی کام کی ترغیب دلاتے ہوئے ایک خواب بیان کیا، جس کے الفاظ کچھ یوں ہیں کہ: ''حضور ﷺ ہمارے تنظیمی کام سے خوش ہیں اور پھر تنظیم کے ذمہ دار نے حضور ﷺ کو تنظیم میں کام کرنے کی پیشکش کی''۔ کیا اس قسم کے خوابوں کو بیان کر کے کسی بھی تنظیم کا کارکنان کو ترغیب دلانا کیسا ہے؟۔ کیا مذکورہ خواب میں حضور ﷺ کو تنظیم میں کام کرنے کی پیشکش کرنا بے ادبی تو نہیں؟۔

(محمد فاروق، لائنز ایریا، کراچی)

جواب :

اگر سائل کا بیان درست ہے، تو اس میں مذکور مذہبی تنظیم کے ذمہ دار کے حوالے سے دو باتیں ہیں، ایک تو اس بات کا دعویٰ کہ خواب میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی ہے، خواب میں زیارتِ رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے:

وَمَنْ رَآنِیْ فِی الْمَنامِ فَقَدْ رَآنِیْ، فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ فِیْ صُورَتِیْ، وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ''جس نے خواب میں مجھے دیکھا، اُس نے مجھے ہی دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کرسکتا، اور جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے، (صحیح بخاری، کتاب العلم، رقم الحدیث:110، 6197)''۔

اس حدیث مبارک کی رُو سے یہ امر ثابت ہے کہ سعادت مند مومن کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوسکتی ہے، یہ بھی ہمارا عقیدہ ہے کہ شیطان رسول اللہ ﷺ کی

صورت مبارکہ اختیار نہیں کرسکتا۔ اور مذکورہ حدیث میں جو دوسری اہم بات بیان فرمائی گئی، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنے والا حقیقتاً آپ ہی کو دیکھتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص محض اپنی بڑائی اور شان ظاہر کرنے کی خاطر جھوٹا خواب بیان کرے یعنی اس نے حضور ﷺ کی زیارت نہ کی ہو اور لوگوں سے بیان کرتا پھرے، تو حدیث کے مطابق وہ نارِ جہنم کا مستحق ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں اس طرح پتا چلتا ہے کہ خواب میں کوئی تعارف کرائے یا اس کے دل میں بات آئے کہ یہ نبی کریم ﷺ ہیں۔ اسی طرح اگر ظاہر حال کے اعتبار سے وہ شخص فاسق وفاجر یا مبتدع ہے، تو اس کے قول کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، یا وہ ایسی مذہبی تنظیم سے تعلق رکھتا ہے، جو اپنے یا اپنے رہنما کے بارے میں ایسے مذہبی تفرّدات کی مُدّعی ہے، جو صراحۃً خلافِ واقع ہیں یا ان کے عقائد میں کوئی فساد ہے، تو ان کے دعووں پر اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ البتہ عمومی طور پر شرعاً ہمیں کسی کے بارے میں ''سوءِ ظن'' کی ممانعت ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ دعویٰ باطل اور کذب ہے اور ہمارے پاس تصدیق کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہے، لہٰذا ایسے دعووں کے بارے میں ہمارے نزدیک سکوت بہتر ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا کسی دینی تنظیم کو پسند فرمانا، یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے، بلکہ ہر امرِ خیر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کو پسند ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ،

ترجمہ: ''بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، (البقرہ: 195)''۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ،

ترجمہ: ''بیشک اللہ بہت توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور نہایت پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، (البقرہ: 222)''۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ،

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ (آل عمران: 146)''۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ،

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے،(آل عمران:159)''۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ،

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے،(الممتحنہ:8)۔وغیرھا من الایات۔ تو جن صفات کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، یقیناً رسول اللہ ﷺ بھی اُن سے محبت فرماتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ کسی خاص مذہبی تنظیم کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اگر بظاہر اس تنظیم میں کوئی امر خلافِ شرع نہیں ہے اور وہ ایسے کاموں میں مشغول ہے، جو شرعاً فرض، واجب، سنت، مستحب اور اَولیٰ ہیں اور اُس کے لوگ مُحرّمات و مکروہات سے اجتناب کرتے ہیں، تو دنیا میں احکامِ شریعت کا اطلاق ظاہر حال پر ہوتا ہے، باطن اور نیتوں کا فیصلہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہوگا، ہمیں حسنِ ظن سے ہی کام لینا چاہئے اور قطعی شواہد و قرائن کے بغیر سُوءِ ظن (بدگمانی) سے اجتناب کرنا چاہئے۔ دوسری بات جو سوال میں مذکور ہے، وہ یہ ہے کہ کسی مذہبی تنظیم کے ذمہ دار نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی تنظیم میں کام کرنے کی پیش کش کی، ہمارے نزدیک یہ خواہش یا پیشکش کہ رسول اللہ ﷺ ان کی تنظیم میں کام کریں، ایسی ہے جس سے بظاہر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کے امیر کی سربراہی میں کام کریں، یہ خلافِ ادب ہے۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے خوابوں کو عوام میں بیان کرنا درست نہیں ہے، نہ ہی یہ دینی مصلحت و حکمت کا تقاضا ہے اور مقاصدِ شرعیہ میں ایک ''سدِ ذرائع'' بھی ہے، یعنی ایک ایسا امر جو شریعت کی رو سے فی نفسہٖ مستحسن ہو، لیکن وہ کسی اور فساد کا باعث بن رہا ہو یا بن سکتا ہو، تو دین کی حکمت و مصلحت کے تحت اُس مستحسن امر کو بھی چھوڑ دینا بہتر ہے، حدیث پاک میں ہے:

لَوْلَا حَدَاثَةُ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ، لَنَقَضْتُ الْبَيْتَ ثُمَّ لَبَنَيْتُهُ عَلٰى أُسَاسِ إِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، فَإِنَّ قُرَيْشًا اسْتَقْصَرَتْ بِنَاءَهُ، وَجَعَلْتُ لَهُ خَلْفًا۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تمہاری قوم ابھی تازہ تازہ کفر ترک کر کے اسلام میں داخل نہ ہوئی ہوتی، تو میں بیت اللہ کی عمارت کو منہدم (شہید) کر دیتا اور پھر اُسے ابراہیم علیہ السلام کی اصل بنیاد پر تعمیر کرتا، کیونکہ (اعلانِ نبوت سے پہلے جب بیت اللہ کی عمارت قدرتی اسباب سے شہید ہوگئی تھی، تو) قریش نے بیت اللہ کی عمارت کو (بناءِ ابراہیمی کے مقابلے میں) چھوٹا کر دیا تھا، اور میں اس کے پیچھے کی جانب بھی ایک دروازہ بناتا، (صحیح بخاری، کتاب الحج، رقم الحدیث: 1585)''۔

اس حدیث کا مستفاد یہ ہے کہ اعلانِ نبوت سے پہلے جب حادثاتِ زمانہ سے بیت اللہ کی عمارت شہید ہوگئی، تو قریشِ مکہ نے اس کی تعمیرِ نو کی۔ اس تعمیرِ نو کے لئے انہوں نے طے کیا تھا کہ حلال پیسہ خرچ کیا جائے گا، تو مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے انہوں نے عمارت کی حدود میں کمی کی۔ چنانچہ انہوں نے رکنِ عراقی اور رکنِ شامی کی جانب سے عمارت کی حد کو چھوٹا کر دیا اور اصل بناءِ ابراہیمی کی نشاندہی کے لئے چھوٹی سی دیوار بنادی، جسے ''حطیم'' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیچھے کی جانب کا دروازہ بند کر دیا تاکہ ان کی منظوری کے بغیر عام لوگ بیت اللہ میں داخل نہ ہوسکیں اور یہ اعزاز ان کے لئے ایک امتیاز کی علامت ہو۔ اب فتحِ مکہ کے بعد اسلام حجاز میں مکمل طور پر غالب آچکا تھا، یہاں تک حدودِ حرم میں مشرکین کا داخلہ منع تھا، وسائل کی کمی نہیں تھی اور رسول اللہ ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ بیت اللہ بناءِ ابراہیمی پر تعمیر ہو اور اس کی پچھلی جانب بھی دروازہ رکھا جائے اور یہ خواہش پسندیدہ بھی تھی۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے بناءِ ابراہیم علیہ السلام پر تعمیر کعبہ کے پسندیدہ ہونے، وسائل کی دستیابی اور اپنی خواہش کے باوجود اسے ترک فرما دیا تاکہ لوگوں کا ایمان متزلزل نہ ہو، کیونکہ بیت اللہ کی تقدیس کے پیشِ نظر اُس کی عمارت کو منہدم (شہید) کرنے کے عمل کو عام مسلمان کا ذہن بآسانی قبول نہ کرتا۔ اور عام قریش فتح مکہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے، وہ نومسلم تھے اور ان کے عقائد کو متزلزل کرنا حکمتِ دین کے منافی تھا۔ اس سے ذاتِ رسالت مآب ﷺ کا یہ مزاجِ مبارک واضح ہوتا ہے کہ بعض اوقات دینی

اعتبار سے دین کی بڑی حکمت کے پیشِ نظر کسی پسندیدہ بات کو بھی ترک کیا جا سکتا ہے اور اتباعِ رسالت میں ایسا کرنا چاہئے۔

مُتصوّفین اور اُن کے ارادتمندوں کے خلافِ شرع عقائد کا رَد

سوال: 07

کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس شخص کے بارے میں جو روحانی رہنما وپیر ہے، اُس کے عقائد مشتبہ تھے، مقامی علماء کرام نے اس کے پروگرام کی سی۔ڈی دیکھی جس میں سرعام اُسے سجدہ ہورہا ہے اور اس کی طرف اشارہ کرکے مریدین یارسول اللہ کا نعرہ لگا رہے ہیں اور وہ نعتیں جو رسول اللہ ﷺ کی شان میں ہیں، اس شخص کی طرف اشارہ کرکے پڑھ رہے ہیں۔ اس پر علماء کا ایک وفد اُسے ملنے کے لئے گیا۔ اِس پر اُس نے مندرجہ ذیل کلمات کہے، جس کے علماء اور بیس آدمی گواہ ہیں:

1۔ علماء نے پوچھا کہ لوگ آپ کو سجدہ کررہے ہیں حالانکہ غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے، تو اس نے کہا: یہ تمہاری نظروں میں مجھے سجدہ کررہے ہیں، درحقیقت میرے اندر اِن کو اللہ نظر آتا ہے، اُس کو سجدہ کررہے ہیں، اِس پر ایک مرید کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ اللہ ہمارے سرکار پاک کے اندر ہے اسلئے ہم ان کو سجدہ کرتے ہیں۔

2۔ علماء نے پوچھا: آپ کے مریدین آپ کی طرف اشارہ کرکے یارسول اللہ! کہہ رہے ہیں، اس نے کہا: یہ اُن کا عقیدہ ہے۔

3۔ حضرت آدم اور حضرت یوسف کو سجدہ ہوا ہے اور میں آدم زادہ ہوں، مجھے بھی سجدہ ہوسکتا ہے، کعبہ صرف ایک پوائنٹ ہے۔ اللہ ہر جگہ موجود ہے حتیٰ کہ بیت الخلا میں بھی سجدہ ہوسکتا ہے۔

4۔ آپ کو پتا ہے میں کہاں سے آیا ہوں، امریکہ سے آیا ہوں، اس کو ولایت کہتے ہیں مغرب، میں کہاں بیٹھا ہوں؟ اس کو کہتے ہیں مشرق، قرآن میں لکھا ہے:

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ، اب کوئی اور بات بھی ہے؟ اور میرا یہ آنا جانا چلتا رہے گا۔

5۔تم علماء قادیانیوں کو کافر کہتے ہو حالانکہ وہ کافر نہیں بلکہ روئے زمین پر کوئی بھی کافر نہیں، ہم تو کافر کو بھی کافر نہیں کہتے۔

6۔اس کے مریدین اس کے نام محمد اسحاق کے ساتھ محمد پر '' ص'' کا نشان لگاتے ہیں۔ اپنے پیر کے لئے حضور اور سرکار پاک کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور صرف جھکتے نہیں بلکہ مکمل سجدہ کرتے ہیں۔

نوٹ: اس گفتگو میں وہ یہ بھی کہتا رہا: رب ایک ہے، سجدہ رب کو ہی ہوتا ہے، حضور رسولوں کے رسول ہیں، I am nothing اور ساتھ ہی فوراً اوپر والے کلمات بھی کہتا رہا، یعنی اقرار بھی کرتا ہے اور انکار بھی۔اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس شخص اور اس کے مریدین کے بارے میں کیا حکم ہے؟۔کیا یہ شخص مذکورہ عقائد کی بنا پر مسلمان ہے یا دائرۂ اسلام سے خارج ہے؟۔ان باتوں میں توہینِ رسالت کا جرم ہے یا نہیں؟، خدائی دعویٰ کا کیا حکم ہے؟، اسلام میں اس کی سزا کیا ہے؟، نیز یہ شخص اب پولیس کی تحویل میں ہے کیا اگر اب توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہے یا نہیں؟، اگر قبول ہے تو طریقہ کیا ہے، اس کی حمایت کرنے والوں کا کیا حکم ہے؟۔ المستفتیان

مولانا عبدالرحمٰن عثمانی ،مولانا عبید الرحمٰن انور ،مولانا صابر ایوب ،مولانا شاہد کلیم ، مولانا عبدالرحمٰن نظام وایکشن کمیٹی ،تلہ گنگ، ضلع چکوال، پنجاب

جواب :

ولی اللہ، اللہ تعالیٰ کے مُحِبّ، محبوب اور مُقرَّب کو کہا جاتا ہے۔ولایت کی دو شرطیں ہیں: (۱) صاحبِ ایمان ہونا، (۲) صاحبِ تقویٰ ہونا۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ،

ترجمہ: ''اللہ کے ولی وہ ہیں جو ایمان لائے اور (ساری زندگی) تقوے پر کاربند رہے، (سورۂ یونس:63)''۔

علامہ علاؤالدین خازن رحمۃ اللہ علیہ ولایت کی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَقَالَ الْمُتَكَلِّمُوْنَ: وَلِيُّ اللّٰهِ مَنْ كَانَ آتِيًا بِالْاِعْتِقَادِ الصَّحِيْحِ الْمَبْنِيِّ عَلَى الدَّلِيْلِ وَيَكُوْنُ آتِياً بِالْاَعْمَالِ الصَّالِحَةِ عَلٰى وَفْقِ مَاوَرَدَتْ بِهِ الشَّرِيْعَةُ وَاِلَيْهِ الْاِشَارَةُ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔

ترجمہ:''ماہرینِ علم الکلام (علم العقائد) نے کہا ہے کہ اللہ کا ولی وہ ہے جو شرعی دلیلوں پر مبنی صحیح عقیدے پر قائم ہو اور شریعت کے مطابق اعمالِ صالحہ پر عمل پیرا ہو اور اللہ جل شانہٗ نے اپنے ارشاد''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ، ترجمہ:''اللہ کے ولی وہ ہیں جو ایمان لائے اور (ساری زندگی) تقوے پر کاربند رہے، (سورۂ یونس :63)''، میں اسی جانب اشارہ فرمایا ہے، (تفسیرِ خازن، جلد 2، ص:322، دارالکتب العربیہ، پشاور)''۔

کوئی بدعقیدہ اور بدعمل شخص اللہ کا ولی نہیں ہوسکتا۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اِعْلَمْ اَنَّ مِيْزَانَ الشَّرْعِ الْمَوْضُوْعَةِ فِي الْاَرْضِ هِيَ بِاَيْدِي الْعُلَمَآءِ مِنَ الشَّرِيْعَةِ فَمَا خَرَجَ وَلِيٌّ عَنْ مِيْزَانِ الشَّرْعِ الْمَذْكُوْرِ مَعَ وُجُوْدِ عَقْلِ التَّكْلِيْفِ وَجَبَ الْاِنْكَارُ عَلَيْهِ۔

ترجمہ:''یقین کیجئے شریعت کا ترازو جو زمین پر قائم کیا گیا ہے، وہی ہے جو علماءِ شریعت کے ہاتھوں میں ہے، پس جو ولی عقل وخرد اور ہوش وحواس کے سالم رہتے ہوئے میزان شریعت سے باہر نکلے، اس کا رَد اور انکار واجب ہے''۔

(فتاویٰ نوریہ، جلد 5، ص:108 بحوالہ مقال العرفاء)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: لَابُدَّ مِنْ تَصْحِيْحِ ظَاهِرِ الشَّرِيْعَةِ اَوَّلاً وَآخِراً،
ترجمہ:''اور یوں ہی اول وآخر ظاہر شریعت پر عمل پیرا رہنا ضروری ہے''۔

(فتاویٰ نوریہ، جلد 5، ص:108 بحوالہ اِحیاء العلوم)

حضرت سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں:
كُلُّ حَقِيْقَةٍ رَدَّتْهَا الشَّرِيْعَةُ فَهِيَ زَنْدَقَةٌ
ترجمہ:''ہر وہ حقیقت جس کو شریعت رَد کرے، وہ بے دینی ہے (یعنی ایسا شخص زندیق

ہے)۔(فتاویٰ نوریہ، جلد 5، ص: 108 بحوالہ فتوح الغیب)''۔

ان اکابر اولیاء وصوفیاء کرام کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ خلافِ شرع عمل مردود ہے اور ولی کے لئے شریعت پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اصل مسئلے کی جانب آتے ہیں، اگر سائلین (مستفتیان) کا بیان درست ہے، تو سوالات کے ترتیب وار جوابات حسبِ ذیل ہیں، یہ امر واضح رہے کہ مفتی کا منصب قضا نہیں ہے، کیونکہ قضا میں دعوے کی صحت کو پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد حکم لگایا جاتا ہے اور وہ شخص کسی سزا کا حق دار ہے تو اسے سزا دی جاتی ہے، جبکہ مفتی کا منصب یہ ہے کہ سوال میں بیان کردہ موقف کو درست فرض کرتے ہوئے اس کا حکم بیان کردے، بیان کی قائل کی طرف نسبت صحیح ہے یا غلط، اس کا فیصلہ قاضی اور عدالت کا کام ہے اور اس کے ثبوت کی ذمّے داری سائلین پر عائد ہوتی ہے۔

1۔استفتاء میں سوال نمبر 1 کے ذیل میں جو پیر کا قول نقل کیا گیا ہے وہ سراسر کفر ہے کیونکہ وہ اس بات پر راضی ہے کہ ان کے مریدین ان کو سجدہ کریں اور چونکہ پیر کا کہنا یہ ہے کہ میرے اندر ان کو اللہ نظر آتا ہے، وہ اُس کو سجدہ کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو سجدہ چونکہ بندگی کی نیت سے کیا جاتا ہے، لہٰذا پیر کو ''عَلیٰ وَجْہِ الْعُبُوْدِیَّۃ'' سجدہ کیا جارہا ہے جو کہ کفر وشرک ہے اور اس پر ایک واضح قرینہ مرید کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے سرکار پاک کے اندر ہے، اس لئے ان کو سجدہ کرتے ہیں۔ اگر یہ سجدہ علی وجہ التعظیم ہو تب بھی حرام ہے اور صریح فسق ہے اور کوئی فاسق پیر نہیں ہوسکتا۔

2۔استفتاء میں سوال نمبر 2 کے ذیل میں پیر کا جو عقیدہ بیان کیا گیا ہے، وہ بھی صراحۃً کفر ہے۔ پیر کے مریدین جو اپنے شیخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یارسول اللہ ﷺ! کہتے ہیں، وہ اپنے پیر کو (معاذ اللہ!) اللہ کا رسول سمجھتے ہیں، اس پر واضح دلیل خود پیر کا یہ قول ہے کہ یہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ مجھے اللہ کا رسول (معاذ اللہ!) اعتقاد کرتے ہیں، اگر یہ مریدین کا عقیدہ ہے تو باطل ہے اور پیر صاحب کا اس پر راضی ہونا اپنی رسالت کے مُدّعی ہونے کی

دلیل ہے جو کہ صریح کفر ہے۔

3۔حضرت آدم علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کی شریعت میں غیر خدا کو سجدۂ تعظیمی جائز تھا اور ایک روایت کی رُو سے ان کی حیثیت جہتِ سجدہ کی تھی، جیسے بیت اللہ ہے، لیکن شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں غیرِ خدا کے لئے سجدۂ تعظیمی ناجائز اور حرام ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے علم اور قدرت کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہے، یہ عقیدہ درست ہے، لیکن یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ موجود ہے، یہ کفر ہے، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا ''مُتَمَکِّنٌ فی المکان'' (یعنی کسی جگہ کا مکین ہونا) ہونا لازم آئے گا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: از خدا ہیچ مکان خالی نیست یکفر ترجمہ:''اگر کوئی کہے کہ خدا سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے، وہ کافر ہو جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:259)''۔

سجدہ جزءِ نماز ہے، نماز کے لئے طہارت شرط ہے، بیت الخلا نجس جگہ ہے، پیر کا یہ کہنا کہ بیت الخلا میں بھی سجدہ ہو سکتا ہے، استخفافِ عبادت (یعنی عبادت کو ہلکا اور معمولی سمجھنا) ہے، جو کہ کفر ہے۔حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ :اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى اَنْ يُّصَلِّيَ فِي سَبْعَةِ مَوَاطِنَ : فِي الْمَزْبَلَةِ، وَالْمَجْزَرَةِ ،وَالْمَقْبَرَةِ ،وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ ،وَفِي الْحَمَّامِ ،وَفِيْ مَعَاطِنِ الْاِبِلِ ،وَفَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ اللّٰهِ ۔

ترجمہ:''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات مقامات پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا، (وہ یہ ہیں) گوبر یا کوڑے کا ڈھیر، ذبح خانہ (مذبح)، قبرستان، شارعِ عام، حمّام، اونٹوں کا باڑہ اور بیت اللہ کی چھت''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:346)

ان سات مقامات میں سے بیت اللہ کی چھت پر نماز کی ممانعت تعظیم کے سبب ہے اور باقی مقامات پر نماز پڑھنا نجاست یا عام گزرگاہ ہونے کی وجہ سے خلافِ ادب ہے۔

4۔یہ دَجل (مکروفریب) ہے، ہمارے ہاں یورپ کو ولایت کہا جاتا رہا ہے، شاید یہ

مطلب ہو کہ اُس زمانے میں برصغیر اُن کے اقتدار وسلطنت کے ماتحت تھا، لیکن اس سے توریہ کرکے ''مقام ولایت'' سے تشبیہ دینا یہ زندقہ (بے دینی) ہے۔توریہ، تعریض اور ایہام کے معنی ہیں کہ کسی لفظ کے دو معنی ہوں، ایک قریب اور مُتبادر الی الفہم (یعنی جو ظاہری معنی ہو اور کسی غور وفکر کے بغیر مخاطَب کی سمجھ میں آجائے) اور دوسرا دور کا معنی ہو، بولنے والا مخاطَب کو قریب کے معنی یعنی عام فہم معنی کا تأثُّر دے اور خود دور کا معنی مراد لے۔

5۔سوال نمبر 5 کے ذیل میں جو پیر صاحب کا قادیانیوں کو مسلمان سمجھنا اور پوری روئے زمین سے کفر کے وجود کا انکار کرنا ہے، یہ بھی کفر صریح ہے۔قادیانیوں کے کفر پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔پیر صاحب کا ان کو مسلمان سمجھنا پیر صاحب کے کفر کی دلیل ہے، نیز یہود ونصاریٰ، سکھ، ہندو وغیرہم سب کافر ہیں اور اس وقت روئے زمین پر یہ مذاہب موجود ہیں، پیر کا یہ کہنا کہ روئے زمین میں کوئی کافر نہیں ہے، کفر اور اسلام دونوں کو ایک سمجھنے کے مترادف ہے۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(1)اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ،

ترجمہ:''بے شک اہلِ کتاب میں سے جو کفار ہیں اور مشرکین ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہیں گے،(سورۃ البیّنہ:6)''۔

اہلِ کتاب سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کو کافر فرمایا ہے:

(2)لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ

ترجمہ:''بے شک وہ لوگ کافر ہوگئے، جنہوں نے کہا کہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ تین میں سے تیسرا ہے،(المائدہ:73)''۔

(3)وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَO

ترجمہ:''اور جس نے اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو پسند کیا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا،(آلِ عمران:85)''۔

(4)اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ، ترجمہ:''بے شک اللہ کے نزدیک (مقبول) دین،

اسلام ہی ہے،(آلِ عمران:19)''۔

(5) لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ O

ترجمہ:''بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم (علیہم السلام) کی زبان سے اس وجہ سے لعنت کی گئی کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ (دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی مقررہ) حد سے تجاوز کرتے تھے،(المائدہ:78)''۔

(6) وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ O

ترجمہ:''اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پلٹ گیا (یعنی مرتد ہو گیا) اور وہ حالتِ کفر میں ہی مر گیا، تو اُن لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے، اور وہ جہنمی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے،(البقرہ:217)''۔

ان آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص دینِ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کی پیروی کرے گا، وہ کافر و مرتد ہے اور کافر کو کافر سمجھنا ہی اسلام ہے۔

مذکورہ پیر اور ان کے ان کفریات پر مطلع تمام مریدین شریعت اسلامیہ کی رُو سے کافر ہیں۔ مسلمانوں کا ان کے ساتھ تعلق رکھنا حرام ہے، اگر وہ اپنے کفریہ عقائد سے علانیہ توبہ کر لیں تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی، تجدیدِ ایمان کے بعد (اگر شادی شدہ ہیں تو تجدیدِ نکاح بھی ضروری ہے) ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا میل جول رکھنا جائز ہے۔ آج کل ایک بات فیشن کے طور پر کہی جاتی ہے کہ مولویوں نے کوئی اسلام کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ کسی کو کافر کہے، مگر قرآن میں اللہ تعالیٰ نے، اس کے رسول مکرم ﷺ نے اپنے ارشاداتِ مبارکہ میں کافر کو کافر کہا اور خلیفۃ الرسول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منکرینِ زکوٰۃ اور منکرینِ ختمِ نبوت کو مرتد قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کیا۔ یہاں پاکستان کی پارلیمنٹ نے 4 ستمبر 1974ء کو ساتویں آئینی ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو

مرتد قرار دیا۔اب قادیانیوں کو مسلمان کہنا پاکستان کے دستور سے بھی غداری ہے۔
خلاصۂ کلام یہ کہ کفر کا مطلقاً اور کفار کے وجود کا انکار اور کافر کو کافر نہ کہنا یہ بھی کفر ہے۔لیکن جب اسلامی حکومت کفر کے بارے میں غیر جانبدار ہو جائے اور دینی غیرت وحَمیّت سے عاری ہو جائے ،تو پھر علماء حق کی یہ شرعی ذمہ داری ہے کہ حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے کو واضح کریں اور حق کو ثابت کرنے کے لئے میدانِ عمل میں آئیں۔

مُتصوّفین کا ناجائز شِعار

سوال:08

پیر ومرشد کی آمد اور دورانِ تقریر ونعت پیر ومرشد کے گرد گھیرا ڈال کر جھومنا ، تالیاں بجانا اور تالیوں کی گونج میں اللہ ہو کا نعرہ بلند کرنا کیسا ہے اور ایسی محافل میں شرکت کا کیا حکم ہے؟،(عبدالحمید قریشی ،سعید آباد ،بلدیہ ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

(عبادت کی نیت سے) تالیاں بجانا شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے،اور قرآن مجید میں بیت اللہ کے پاس تالیاں بجانے کو فعلِ کفار قرار دیا ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَالْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ط فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَo

ترجمہ:’’اور بیت اللہ کے پاس اُن کی نماز اس کے سوا کیا تھی کہ یہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے،سواب عذاب کو چکھو کیونکہ تم کفر کرتے تھے،(الانفال:35)‘‘۔

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں:

قرآن مجید نے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کی جو مذمت کی ہے ،اِس میں اُن جاہل صوفیاء کا رد ہے ، جو رقص کرتے ہیں ،تالیاں پیٹتے اور بے ہوش ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں،(الجامع الاحکام القرآن ،جز7،ص:359،دارالفکر ،بیروت)‘‘۔

شریعت مُطَہّرہ میں تالیاں بجانے کو مکروہ عمل فرمایا ہے،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(وَكُرِهَ كُلُّ لَهْوٍ) أَيْ كُلُّ لَعْبٍ وَّعَبَثٍ،فَالثَّلَاثَةُ بِمَعْنًى وَاحِدٍ كَمَا فِيْ "شَرْحِ التَّأْوِيْلَاتِ"،وَالإِطْلَاقُ شَامِلٌ لِنَفْسِ الْفِعْلِ، وَاستِمَاعِهِ كَالرَّقْصِ وَالسُّخْرِيَّةِ وَالتَّصْفِيْقِ وَضَرْبِ الْأَوْتَارِ مِنَ الطُّنْبُوْرِ وَالبَرْبَطِ وَالرُّبَابِ وَالْقَانُوْنِ وَالْمِزْمَارِ وَالصَّنجِ وَالْبُوْقِ، فَإِنَّهَا كُلَّهَا مَكْرُوْهَةٌ لِأَنَّهَا زِيُّ الْكُفَّارِ،

ترجمہ: ''(ہر بیہودہ کھیل مکروہ ہے) یعنی ہر لہو ولعب اور عَبَث (بے مقصد کام) تینوں معنٰی ایک ہیں، جیسا کہ ''شرح التاویلات'' میں ہے۔لہو کو مطلق (یعنی کسی قید کے بغیر) ذکر کرنا نفسِ فعل اور اس کی توجہ سے سماعت کو شامل ہے، جیسے رقص کرنا، مذاق کرنا اور تالیاں بجانا، ڈھول بجانا، ستار بجانا، سارنگی بجانا، چنگ بجانا، قانون (ایک تار والا باجا) بجانا، مزامیر کا استعمال، جھانجھ (مجیرا) بجانا اور بگل بجانا، یہ سب مکروہ ہیں کیونکہ یہ عاداتِ کفار ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد9،ص:481،بیروت)

رقص کے متعلق امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''علامہ برکلی طریقہ محمدیہ میں فرماتے ہیں: یدخل فیهما مایفعله بعضُ الصوفيةِ بل هُو اَشدُّ من كل ما عداه منهما لِأَنَّهُم يَفعلونَهٗ عَلىٰ اعتقادِ العبادةِ قَالَ الامامُ أبوالوفاءِ بن عقيل رَحِمَهُ اللّٰه تعالىٰ: قَد نَصَّ الْقُرآنُ عَلَى النَّهيِ عَنِ الرَّقْصِ فَقَالَ:﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ وَذَمَّ الْمُختالَ بِقولِهٖ : ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ وَالرَّقصُ اَشَدُّ مِنَ المَرَحِ وَالبَطَرِ وَقَالَ أبو بكر الطرطوشي رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعالىٰ: فَاَوَّلُ مَنْ اَحْدَثَهٗ أصحابُ السَّامِرِيِّ لَمَّا اتَّخَذَلَهُمْ عِجْلاً جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ،وقَاموا يَرقُصونَ عَليهِ وَيَتَواجَدُونَ وَقَالَ الامام البزازی فی فتاواہُ: قَال القُرطُبی:ان هٰذا۔۔۔ الرَّقصُ حَرَامٌ بِالْاِجماعِ وَسَيِّدُ الطَّائفةِ أحمَد السّنوی صَرَّحَ بِحُرمتِهٖ وَرَأيتُ فَتوىٰ شَيخِ الإسلامِ جلال الملةِ والدين الكيلانى اَنَّ مُستَحِلَّ هٰذَاالرقصِ كَافِرٌ وَلِلزَّمخشرى فِی كَشَّافِهٖ كلماتٌ فيهم تقوم بها عليهم الطَّامات ولِلْامام

الـمَحبوبي اَشدُّ مِن ذٰلكَ اِنتهیٰ قلتُ: من لهٗ انصاف اِذارایٰ رَقص صُوفِيةِ زماننا فِـي الـمسـاجـدِ و الـدّعـواتِ مُختلِطاً بهم المردو أهلُ الهواءِ وَالقُریٰ من جُهّالِ العَوامِ وَالمُبتَدِعةِ الطعَام لايعرِفون الطهارةَ والقرآن والحلال والحرام بل لَايعرِفونَ الايـمـانَ وَالاِسْـلامَ لَهُـم زَعيـقٌ وَزَئيرٌ مثل هائی وهوئی وهئی وهيا يقولُ لامحالةَ هٰؤلاءِ اِتَّخذُوا دينَهم لَهوا وَلَعباً۔مُلَخّصًا،

ترجمہ:''جو کچھ بعض صوفیاء کرتے ہیں وہ اس میں داخل ہے بلکہ زیادہ سخت جرم ہے، کیونکہ یہ کام وہ عبادت کے عقیدے سے کرتے ہیں، چنانچہ امام ابوالوفا بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ناچنے سے منع کرنے پر قرآن مجید کی تصریح موجود ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''زمین پر اترا کر نہ چلو'' ۔اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے اترانے والوں کی مذمت فرمائی، بے شک اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے ،فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا اور ناچنا، اِترانا،فخر کرنا ایک جیسے اعمال ہیں بلکہ ناچنا، اِترانے اور فخر کرنے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔ابوبکر طرطوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: سب سے پہلے جس نے اس بدعت کو ایجاد کیا، وہ اصحابِ سامری ہیں ،جب انہوں نے بچھڑے کا ایک ڈھانچہ تیار کیا، جو گائے جیسی آواز نکالتا تھا یا جس سے گائے کی آواز کی طرح آواز نکلتی تھی ،تو وہ کھڑے ہوکر اُس کے سامنے ناچنے لگے اور وَجد کرنے لگے یعنی جھومنے لگے ۔امام بزازی نے اپنے فتاویٰ بزازیہ میں فرمایا: ناچ بالا جماع حرام ہے۔سید الطائفہ احمد سنوی نے اس کی حرمت کی صراحت فرمائی ہے ،میں نے شیخ الاسلام جلال الدین گیلانی کا فتویٰ دیکھا جس میں کہا گیا کہ ناچ کو حلال کرنے والا یعنی جائز قرار دینے والا کافر ہے۔علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر ''کشاف'' میں ان کے متعلق ایسے کلمات لکھے ہیں کہ جن سے ان (جاہل صوفیوں) پر بڑے مصائب قائم ہوسکتے ہیں اور امام محبوبی کے کلمات ان سے بھی زیادہ سخت ہیں، میں کہتا ہوں کہ جس کی طبیعت میں انصاف ہو، وہ ذرا ہمارے زمانے کے صوفیا کا مساجد میں ناچنا،

کودنا، شور مچانا دیکھے کہ بے ریش لونڈے خواہشات نفسانی کے متوالے، جاہل دیہاتی اور بیوقوف بدعتی ان میں ملے جلے ہوتے ہیں، جو طہارت سے ناآشنا، قرآن مجید کے ادب سے ناواقف اور حلال وحرام کی پہچان سے بے بہرہ ہوتے ہیں جو سوائے چیخنے چلانے کے اور کچھ نہیں جانتے، ایمان اور اسلام کی معرفت سے لاعلم ہوتے ہیں، فرمایا: ان لوگوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 24، ص: 90-89، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

جہاں تک ایسی محافل میں شرکت کا معاملہ ہے تو فقہاء نے اسے بہت آسان انداز میں بیان فرمادیا ہے، علامہ ابن عابدین شامی "الجوہرہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

مَـا يَفعَلُهُ مُتَصَوِّفَةُ زَمَانِنَا حَرَامٌ لايَجُوزُ الْقَصدُ وَالْجُلُوسُ اِلَيهِ، وَمِن قَبلِهِم لَم يُفعَلُ كَذَالِكَ،

ترجمہ: "ہمارے زمانے کے نمائشی (بناوٹی) صوفی جو کچھ کرتے ہیں، وہ حرام ہے، لہٰذا اس کا ارادہ کرنا اور ایسی مجلس میں بیٹھنا جائز نہیں اور ان سے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا گیا"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 425، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

ہم نے اکابر امت کے حوالہ جات کے ساتھ مسئلہ بیان کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک دین کی تقدیس وحرمت، خشوع وخضوع، خشیتِ الٰہی اور آداب اسلامی کا تقاضا یہی ہے کہ ذکرِ الٰہی باوقار انداز میں کیا جائے۔ جو لوگ اس طرح کرتے ہیں، ان کے گرد و پیش کیسے لوگ ہوتے ہیں، پورے ماحول سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ تاہم اگر ان کے پاس کچھ دلائل ہیں تو بھی زیادہ سے زیادہ اباحت وجواز کی حد تک ہو سکتے ہیں، مسلمانوں کو اختلاف میں ڈالنے کے بجائے ایسے اعمال سے انہیں اجتناب کرنا چاہیے۔ آج کل میڈیا کے ذریعے نوجوانوں کے مخلوط رقص اور ڈسکو کو رائج کیا جا رہا ہے، اہلِ دین کا شِعار اُن سے مختلف اور پاکیزہ ہونا چاہیے، جس سے لوگوں کے اندر خشیتِ الٰہی پیدا ہو، قلبی وذہنی سکون وقرار

نصیب ہو۔ جو حضرات اس موضوع پر مزید دلائل وحوالہ جات کا مطالعہ کرنا چاہیں ، وہ فتاویٰ رضویہ جلد 24، ص:90-89، جلد 4، ص:528، رضا فاؤنڈیشن ، لاہور ملاحظہ فرمائیں۔

تارکِ صلوٰۃ اور دینی شعائر کے ترک کا مطالبہ کرنے والی بیوی کا حکم

سوال:09

اگر بیوی شوہر سے ڈاڑھی منڈوانے کا مطالبہ کرے، تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟ میری بیوی نماز کی تلقین پر نماز پڑھنے لگی لیکن کبھی دو وقت کبھی تین وقت۔ ایک دن میں نے عشاء کی نماز کے متعلق تلقین کی کہ عشاء کی نماز لمبی ہے، پہلی فرصت میں پڑھ لیا کرو۔ اس پر بیوی نے جواب دیا کہ نماز پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی بیوی کے لئے کیا حکم ہے؟۔

ارمان نوشاد، محمد آباد 36/G لانڈھی، کراچی

جواب:

ڈاڑھی منڈوانا یا حدِ شرع سے کم کرنا حرام ہے اور کسی کی باتوں میں آ کر یہ کام کرنا دین پر دنیا کو ترجیح دینے کے مترادف ہے۔ اسی طرح بیوی کے کہنے پر یا شادی کے لئے ڈاڑھی منڈوانا بھی حرام ہے۔ ڈاڑھی شعارِ اسلام ہے اور شعارِ اسلام سے اِستہزاء اسلام سے اِستہزاء (مذاق) ہے، آپ کی بیوی کا آپ سے ڈاڑھی منڈوانے کا مطالبہ اگر ڈاڑھی کی تحقیر کی نیت سے ہے، تو کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی کے کاموں میں تعاون اور برائی کے کاموں میں عدمِ تعاون کا حکم دیا ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ،

ترجمہ: ''اور تم نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''۔ قرآن مجید کی سورۂ ''القلم'' میں ایک دشمن رسول کے مذموم اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ۔ ترجمہ: ''وہ نیکی کے کاموں سے بہت زیادہ روکنے

والا ہے،(سورۂ قلم:12)''۔

ایسی بیوی کو اللہ تعالیٰ کا خوف کرنا چاہئے اور اس عمل پر توبہ کرنی لازم ہے۔

تمام فرائض میں نماز نہایت اہم اور اعظم عبادت اور اسلام کا بنیادی رکن ہے۔قرآن مجید واحادیث میں اس کی اہمیت وفرضیت کی تاکید جابجا موجود ہے اور اِس کے ترک کرنے والوں کے لئے وعیدیں بھی آئی ہیں۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا٥

ترجمہ:''پھران کے بعد ایسے ناخلف آئے جنہوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشات کی پیروی کی تو عنقریب وہ جہنم کی''وادیِ غَی''میں جا گریں گے،(سورۂ مریم:59)''۔

جو فرضیتِ نماز کا انکار کرے یا اِس کو حقیر جانے ،اُس کے کفر میں کوئی شک نہیں۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(هِيَ فَرْضُ عَيْنٍ عَلَى كُلِّ مُكَلَّفٍ) بِالْإِجْمَاعِ ---------- (وَيُكَفَّرُ جَاحِدُهَا) لِثُبُوتِهَا بِدَلِيلٍ قَطْعِيٍّ (وَتَارِكُهَا عَمْداً مَجَانَةً) أَيْ تَكَاسُلاً فَاسِقٌ (يُحْبَسُ حَتَّى يُصَلِّيَ) لِأَنَّهُ يُحْبَسُ لِحَقِّ الْعَبْدِ فَحَقُّ الْحَقِّ أَحَقُّ ،وَقِيلَ يُضْرَبُ حَتَّى يَسِيلَ مِنْهُ الدَّمُ ۔وَعِنْدَ الشَّافِعِيِّ : يُقْتَلُ بِصَلَاةٍ وَّاحِدَةٍ حَدّاً ،وَقِيلَ كُفْراً

ترجمہ:''ہر مُکلّف (یعنی عاقل بالغ) پر بالاجماع نماز فرضِ عین ہے''۔۔۔مزید لکھتے ہیں: ''جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار کرے،وہ کافر ہے،نماز دلیلِ قطعی (یعنی قرآن سُنّت متوارثہ اور اِجماعی تعامل سے ثابت ہے)،جو قصداً(جان بوجھ کر) نماز چھوڑے اگرچہ ایک وقت کی ہو،سُستی اور کاہلی کے سبب چھوڑنے والا فاسق ہے اور جو نماز نہ پڑھتا ہو اُسے قید کیا جائے گا یہاں تک کہ(توبہ کرے اور) نماز پڑھنے لگے،کیونکہ بندے کو بندوں کے حق کے بدلے میں قید کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا حق تو سب سے مُقدّم اور اعلیٰ ہے اور بعض (امام محبوبی) نے کہا کہ تارک الصلوٰۃ کو اس حد تک مارا جائے کہ اُس کا خون بہنے لگے

اور امام شافعی (نیز امام مالک اور امام احمد) کے نزدیک ایک نماز چھوڑنے کے سبب اس کو قتل کیا جائے گا، اور بعض نے کہا کہ اپنے کفر کے سبب حدِ شرع کے تحت قتل کیا جائے گا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 7-6، بیروت)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

بَلْ يُسْتَحَبُّ لَوْ مُؤْذِيَةً أَوْ تَارِكَةَ صَلَاةٍ ۔"غاية"۔وَمَفَادُهُ أَنْ لَا إِثْمَ بِمُعَاشَرَةِ مَنْ لَّا تُصَلِّي،وَيَجِبُ لَوْفَاتَ الْإِمْسَاكُ بِالْمَعْرُوْفِ،

ترجمہ: "اگر عورت ایذا دینے والی ہے یا نماز کو ترک کرنے کی عادی ہے، تو (اُسے طلاق دینا) مستحب ہے، "غایہ"۔ اور (اذیت پسند اور بے نمازی عورت کو طلاق دینے کو مستحب قرار دینے کا) مفاد یہ ہے کہ ایسی عورت کو ساتھ رکھنا گناہ نہیں ہے (اگر گناہ ہوتا تو طلاق واجب ہوتی، مستحب نہیں)، اگر دستور کے مطابق رکھنا مشکل یا ناقابلِ عمل ہوجائے تو پھر طلاق دینا واجب ہے"۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

اَلظَّاهِرُ أَنَّ تَرْكَ الْفَرَائِضِ غَيْرِ الصَّلَاةِ كَالصَّلَاةِ،وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ : لَأَنْ أَلْقَى اللّٰهَ تَعَالٰى وَصَدَاقُهَا بِذِمَّتِي خَيْرٌ مِنْ أَنْ أُعَاشِرَ امْرَأَةً لَا تُصَلِّي،

ترجمہ: "نماز کے علاوہ دیگر فرائض کا ترک بھی نماز کی طرح ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: اللہ تعالیٰ سے میرا اس حال میں ملاقات کرنا کہ میری بیوی کا مہر میرے ذمے ہو، اس سے بہتر ہے کہ میں بے نمازی عورت سے معاشرت جاری رکھوں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص: 316-315، بیروت)"۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

علماء تو یہاں تک تصریح فرماتے ہیں کہ عورت اگر مارے سے بھی نماز نہ پڑھے، طلاق دے دے اگرچہ مہر دینے پر قادر نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے اس حال پر ملنا کہ اس کا مطالبۂ مہر اس کی گردن پر ہو اس سے بہتر ہے کہ ایک بے نمازی عورت سے صحبت کرے، فِي "الْغُنْيَةِ"

اَلزَّوْجُ لَهٗ اَنْ یَّضْرِبَ زَوْجَتَهٗ عَلٰی تَرْكِ الصَّلٰوةِ وَاِنْ لَّمْ تَنْتَهِ عَنْ تَرْكِهَا بِالضَّرْبِ یُطَلِّقُهَا وَلَوْ لَمْ یَكُنْ قَادِرًا عَلٰی مَهْرِهَا وَلِاَنْ یَّلْقَی اللّٰهَ تَعَالٰی وَمَهْرُهَا فِیْ ذِمَّتِهٖ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّطَأَ اِمْرَأَةً لَاتُصَلِّیْ ۔

ترجمہ:"غنیہ میں ہے:شوہر کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو نماز چھوڑنے پر مارے اور اگر مارنے کے باوجود وہ نماز چھوڑنے سے باز نہیں آتی تو طلاق دے دے،اگر چہ اس کو مہر کی ادائیگی پر قدرت نہ ہو کیونکہ اُس کا اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملنا کہ اس کی بیوی کا مہر اُس کے ذمہ پر ہو،اس سے بہتر ہے کہ ایسی عورت سے صحبت کرے جو نماز نہیں پڑھتی"۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد 17،ص:303،رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

آپ کی بیوی کا یہ کہنا کہ نماز پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے،یہ کلمۂ کفر ہے۔اس پر لازم ہے کہ توبہ کرے،تجدیدِ ایمان کرے اور آپ دونوں دو گواہوں کے سامنے نئے مہر کے ساتھ ایجاب وقبول کر کے تجدیدِ نکاح کریں۔

امام احمد رضا قادری قدّس سرّہ العزیز ایسے ہی ایک مسئلے کی بابت شرعی حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"(عورت)حسبِ روایت مفتیٰ بہا اپنے مسلمان شوہر کے نکاح سے نہ نکلے گی،نہ اسے اختیار ہوگا کہ دوسرے سے نکاح کرے،ہاں!ان کے شوہروں کو جائز نہ ہوگا کہ انہیں ہاتھ لگائیں جب تک وہ تائب ہو کر پھر اسلام نہ لائیں"۔

(فتاوی رضویہ قدیم،جلد:06،ص:45،مطبوعہ:مکتبۂ رضویہ،آرام باغ،کراچی)

سورج یا چاند گرہن کا حاملہ عورت پر کوئی طبعی اثر مرتب نہیں ہوتا

سوال:10

عوام میں یہ مشہور ہے کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت حاملہ عورت بیٹھے نہیں بلکہ چلتی پھرتی رہے،اسی طرح حاملہ جانور کو بھی سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت نہیں بیٹھنے دینا چاہئے،شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے؟۔

(مولانا محمد احمد ساجد،ریلوے روڈ بصیر پور ضلع اوکاڑہ)

جواب:

یہ خیال شرعاً بالکل باطل اور غلط ہے کہ سورج یا چاند گرہن کے موقع پر خواتین بالخصوص حاملہ خواتین پر کوئی اثرات مرتب ہوتے ہیں یا اُنہیں اُس وقت چلتے پھرتے رہنا چاہئے، اِن توہُمات کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے، ہاں! خواتین کو بھی چاہئے کہ نماز، ذکر، توبہ واستغفار اور تسبیح وتحمید میں مشغول رہیں۔ اسی طرح حاملہ جانور کو بھی سورج گرہن یا چاند گرہن کے وقت کھڑا رکھنے یا چلاتے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کیا مولودِ کعبہ ہونا حضرت علی کی امتیازی فضیلت ہے

سوال: 11

کیا حضرت علی کی جائے ولادت کعبۃ اللہ شریف ہے؟، اور کیا یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے امتیازی فضیلت کا سبب ہے؟، (حافظ بابر رحمان، نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت اعلانِ نبوّت سے قبل زمانۂ جاہلیت میں ہوئی۔ حکیم بن حزام کے متعلق بھی روایت مذکور ہے کہ وہ بھی کعبہ میں پیدا ہوئے۔ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کے اسلام میں بے شمار فضائل ہیں، تمام اہلِ ایمان کو اُن سے انتہائی عقیدت اور محبت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت مبارکہ کعبہ میں ہوئی ہے، ایسی روایات موجود ہیں اور یہ عہدِ جاہلیت یعنی زمانۂ قبل از اسلام کا واقعہ ہے۔ اس میں آپ کا تفرُّد نہیں ہے بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ حکیم بن حزام کی ولادت بھی کعبہ میں ہوئی۔

امام حاکم نیشاپوری بیان کرتے ہیں: أَبُو بَكرٍ محمد بْنِ أَحْمَدَ بْنِ بَالُوَيهِ حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ إِسْحَاقَ الْحَرْبِيُّ حَدَّثَنَا مُصْعَبُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ فَذَكَرَ نَسَبَ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ وَزَادَ فِيهِ وَأُمُّهُ فَاخِتَةُ بِنْتُ زُهَيرِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِالْعُزّٰى وَكَانَتْ وَلَدَتْ حَكِيمًا فِي الْكَعْبَةِ وَهِيَ حَامِلٌ فَضَرَبَهَا الْمَخَاضُ وَهِيَ فِي جَوْفِ الْكَعْبَةِ فَوَلَدَتْ فِيهَا، فَحَمَلَتْ فِي نَطْعٍ

وَغَسَلَ مَاكَانَ تَحْتَهَا مِنَ الثِّيَابِ عِنْدَ حَوْضِ زَمْزَمَ وَلَمْ يُولَد قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ فِي الْكَعْبَةِ اَحَدٌ ☆ قَالَ الْحَاكِمُ وَهِمَ مُصْعَبٌ فِي الْحَرْفِ الْأَخِيرِ فَقَدْ تَوَاتَرَتِ الْأَخْبَارُ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنتَ اَسَدٍ وَلَدَتْ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيَّ بْنَ اَبِي طَالِبٍ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ فِيْ جَوْفِ الْكَعْبَةِ ۔

ترجمہ: ''مصعب بن عبداللہ نے بیان کیا: انہوں نے حکیم بن حزام کا نسب بیان کیا اور اس میں یہ زیادہ فرمایا کہ ان کی والدہ فاختہ زہیر بن اسد بن عبدالعزیٰ کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے حکیم کو کعبہ میں جنم دیا۔ وہ حاملہ تھیں، اُنہیں دردِ زہ ہوا، وہ وسطِ کعبہ میں تھیں، انہوں نے وہیں اسے جنم دیا۔ اس نے اُنہیں چمڑے میں لپیٹ کر اٹھایا اور اپنے کپڑے زمزم کے کنویں پر دھوئے۔ اُن سے پہلے اور ان کے بعد کوئی کعبہ میں پیدا نہیں ہوا۔ حاکم نے کہا: مصعب کو آخری جملے میں وہم ہوگیا، حالانکہ یہ روایات تواتر کے ساتھ منقول ہیں کہ فاطمہ بنت اسد نے امیر المؤمنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو وسطِ کعبہ میں جنم دیا''۔

(المستدرک للحاکم، جلد 3، ص: 483)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

واز مناقب وے رضی اللہ عنہ کہ در حینِ ولادتِ اُو ظاہر شد، یکے آں است کہ در جوفِ کعبہ معظمہ تولّد یافت، قَالَ الْحَاكِمُ فِيْ تَرْجَمَةِ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ: وَقَوْلُ مُصْعَبٍ فِيْهِ لَمْ يُوْلَدْ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ فِي الْكَعْبَةِ أَحَدٌ، مَانَصُّهٗ حَاكِمٌ وَهِمَ مُصْعَبٌ فِي الْحَرْفِ الْاَخِيْرِ، فَقَدْ تَوَاتَرَتِ الْأَخْبَارُ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَسَدٍ وَلَدَتْ أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيًّا فِيْ جَوْفِ الْكَعْبَةِ۔

ترجمہ: ''اور اُن (حضرت علی) کے مناقب سے ایک یہ بات ہے جو اُن کی ولادت کے وقت ظاہر ہوئی کہ اُن کی ولادت کعبہ معظمہ میں ہوئی۔ حاکم نے حکیم بن حزام کے حالات کے بارے میں کہا کہ: مصعب کا یہ کہنا کہ ''حکیم بن حزام سے نہ کوئی پہلے کعبہ میں پیدا ہوا اور

نہ اس کے بعد''، یہ مُصعب کا وہم ہے، کیونکہ تواتر روایات سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو وسطِ کعبہ میں جنم دیا''۔

(ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، جلد 2، ص: 251)

رسول اللہ ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ اگر یہ بات وجہِ فضیلت ہوتی اور خانۂ کعبہ میں ولادت حُرمتِ کعبہ کے منافی نہ ہوتی تو اعلانِ نبوت کے بعد عہدِ رسالت مآب ﷺ میں مسلمان خواتین یہ اعزاز حاصل کرنے کے لئے اپنے بچوں کی ولادت کے وقت خانہ کعبہ میں جاتیں۔ مگر خانہ کعبہ کی تقدیس کی وجہ سے شرعی حکم یہ ہے کہ حیض ونفاس اور جنابت کی حالت میں خانۂ کعبہ کا طواف منع ہے۔ اگر کوئی حیض یا نفاس والی عورت یا مرد جنابت کی حالت میں طوافِ زیارت کرے تو اِس جنایت کے نتیجے میں اُس پر بدنہ یعنی اونٹ یا گائے کی قربانی واجب ہے۔

ہمارے علماء میں سے مفتی اقتدار احمد خان نعیمی نے اپنے دلائل سے اس واقعہ کا انکار کیا ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے، نہ ہی یہ بحث ضروریاتِ دین میں سے ہے اور عہدِ جاہلیت کا ہر عمل شرعی حُجت بھی نہیں ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس واقعے سے قطعِ نظر بھی اسلام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظمت مُسلّم ہے، اُن سے عقیدت ہمارے ایمان کا حصہ ہے، اُن کا چوتھا خلیفۂ راشد ہونا برحق ہے۔ اور ان کے بعض امتیازی فضائل ہیں: وہ نسلِ نبوت کے امین ہیں، رسول اللہ ﷺ کے ابنِ عم، آپ ﷺ کے داماد، آپ ﷺ کے پروردہ اور آپ ﷺ کے محبوب ترین اہلِ بیت اور انتہائی جلیل القدر صحابی ہیں۔ آپ کے خصائص میں سے یہ ہے کہ آپ اَورع واتقیٰ، اَشجع اور اَعلم صحابہ میں سے ہیں۔

علماء کی اہانت

سوال: 12

زید نے عصرِ حاضر کے علماء کے بارے میں کہا کہ'' ان مولویوں پر کوئی اعتبار

نہیں''۔ زید کا یہ قول جملہ علمائے کرام کے بارے میں ازروئے شرع کیسا ہے اور زید کا جملہ علماءِ کرام پر عدم اعتماد کس نوع کی غلطی شمار ہوگی؟۔ (عبدالرزاق عباسی، کراچی)۔

جواب:

علماء کا اِکرام شریعت کی رُو سے لازم ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ محض دین کا عالم ہونے کی بنا پر اُن کا اکرام کیا جائے اور یہ بالواسطہ دین کا اکرام ہے اور اگر کوئی عالمِ ربانی ہے، عالمِ حق ہے، علم کے تقاضوں اور شریعت کے احکام پر عمل کرتا ہے، تو اس کا اِکرام اس کی ذات اور کردار کے حوالے سے بھی لازم ہے، اور جو شخص ایسے علماء کی توہین کرتا ہے، اس کے فِسق وفُجور اور گمراہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

عالمِ دین کی اہانت کو فقہائے کرام نے کفر قرار دیا ہے اور اس پر بڑی شدت فرمائی ہے، شاید یہ زجراً کیا ہے تاکہ لوگ عالمِ ربّانی کی اہانت (INSULT) بے دھڑک نہ کرتے پھریں، کیونکہ اس سے بالواسطہ علمِ دین کی توہین ہوگی اور علمِ دین کی توہین بالواسطہ دین کی توہین ہے۔ لیکن ہماری رائے میں یہ ''کلامی'' اور ''اعتقادی'' کفر نہیں ہے، جو اس درجہ قطعی ہو کہ ''مَنْ شَكَّ فِي كُفْرِهٖ فَقَدْ كَفَرَ'' (یعنی جو ایسے شخص کے کفر میں شک کرے، وہ بھی کافر ہے) کے درجے میں ہو۔

علماء کی اہانت (Insult) کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اہانت صرف اس لئے کی جارہی ہے کہ وہ شخص دین کا عالم ہے، دراصل یہ بالواسطہ دین کی اہانت ہے۔ یہ طریقۂ کار وہ لوگ اختیار کرتے ہیں، جو مسلم معاشرے میں براہِ راست دین کی اہانت کی جسارت نہیں کرسکتے، انہیں مسلمانوں کے رَدِّعمل کا خوف ہوتا ہے تو دین کے بارے میں اپنے باطنی بُغض وعناد اور نفرت کی تسکین عالمِ دین کی اہانت کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہ دین میں ایک سنگین جرم ہے علامہ نظام الدین رحمہ اللہ ''خلاصہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں: مَنْ اَبْغَضَ عَالِماً مِنْ غَيْرِ سَبَبٍ ظَاهِرٍ خِيفَ عَلَيْهِ الْكُفْرَ

ترجمہ: ’’جس نے کسی ظاہری سبب کے بغیر کسی عالم سے بغض رکھا، اُس کے کفر کا اندیشہ ہے، ’’البحر الرائق‘‘ کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

وَيُخَافُ عَلَيْهِ الْكُفْرَ إِذَاشَتَمَ عَالِمًا أَوْ فَقِيْهًا مِنْ غَيْرِ سَبَبٍ،

ترجمہ: ’’جب کوئی شخص کسی عالم یا فقیہ کو بلا وجہ گالی دے، تو اس کے کفر کا اندیشہ ہے‘‘۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2 ص: 270)

یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص نماز یا داڑھی کو براہِ راست اپنی تضحیک اور تحقیر کا نشانہ بنانے کی جسارت نہیں کرسکتا، تو وہ یوں کہے گا کہ فلاں شخص نماز پڑھ کر یا ڈاڑھی رکھ کر ایسے کام کر رہا ہے، حالانکہ اُس کے کسی غلط فعل کے ساتھ نماز یا ڈاڑھی کی مذمت کا کوئی جواز نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی کسی عالم سے ذاتی نفرت وعناد اور بغض کی بناپر یا اُس کے شخصی کردار میں کسی عیب پر مطلع ہونے کی بنا پر اُس کی اہانت کرتا ہے یا اس عالم کی بے اعتدالی بالکل عَلانیہ ہو کہ وہ اپنے علم کے تقاضوں پر عمل نہیں کرتا ہو یا اس کے قول وفعل میں تضاد ہے تو ایسے عالم کی اہانت کرنے والا اس تکفیر کا مصداق نہیں ہے۔ کیونکہ ہر دور میں ’’علماءِ حق‘‘ بھی رہے ہیں اور ’’علماءِ سُوء‘‘ بھی، ایسی باتوں کو ہمیں ’’علماءِ سُوء‘‘ پر محمول کرنا چاہئے۔ اس سے وہ علماء مراد ہیں جو زمانہ ساز، ابن الوقت ہوں، محض دنیاوی منفعت کے لئے دین کے صریح حکم کو چھوڑ دیں یا دین کی مصلحت وحکمت کے خلاف کام کریں۔ دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کے لئے اہلِ دنیا یا اہلِ اقتدار کی بے اعتدالیوں کو سندِ جواز دینے کی خاطر طرح طرح کی تاویلیں کر کے باطل کی حمایت کریں، جسے قرآن مجید نے ’’مُداہَنت‘‘ (Flattery) سے تعبیر فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ،

ترجمہ: ’’وہ (مشرک) چاہتے ہیں کہ (دین کے معاملے میں) آپ ان کی بے جا رعایت کریں تاکہ وہ بھی (اس کے بدلے میں) آپ کے ساتھ رعایت کریں، (القلم: 9)‘‘۔

آج کل علماء کے بارے میں اہانت آمیز تبصرے ایسے ہی لوگوں کی مثالوں کو سامنے رکھ کر

کئے جاتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک ناپسندیدہ رجحان ہے اور اس سے بچنا چاہئے، یہ طرزِ عمل دینی سعادت سے محرومی کا باعث بن سکتا ہے، دوسروں کے کردار پر انگلی وہ اُٹھائے جس کا اپنا دامن صاف ہو، اس پر بدکرداری، بے عملی اور بے اعتدالی کا کوئی دھبہ نہ ہو۔ قرآنِ مجید کی ''سورۂ الحُجرات'' میں دوسروں کا مذاق اُڑانے، دوسروں کو بُرے ناموں سے پکارنے، دوسروں کے بارے میں بدگمانی کرنے اور غیبت سے منع فرمایا ہے۔ ''سورۃ الھُمَزہ'' میں دوسروں کی عیب جوئی اور طعن وتشنیع کرنے پر وعید فرمائی گئی ہے، لہٰذا یہ عادات اسلام میں انتہائی معیوب اور قبیح ہیں اور ہر مسلمان کو اِن سے اجتناب کرنا چاہئے۔ دوسروں کے عیب تلاش کرنے کے بجائے اپنے عیوب پر نظر رکھنا انسان کے لئے زیادہ مفید ہے اور اِس سے اپنی اِصلاح ہوتی ہے، بقولِ شاعر ؎

نہ تھی حال کی جب اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی حال پر جب اپنے نظر، تو نظروں میں کوئی برا نہ رہا

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:
لَایَسْتَخِفُّ بِحَقِّھِمْ اِلَّا مُنَافِقٌ رَوَاہُ الطَّبرانی فِي الکبیرِ عَنْ أَبی اُمَامَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عَنْہُ،
ترجمہ: ''علماء (کے حق) کو ہلکا نہ جانے گا مگر منافق (طبرانی نے کبیر میں ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسے روایت کیا)''۔

دوسری حدیث میں ہے: فرماتے ہیں ﷺ: لَایَسْتَخِفُّ بِحَقِّھِمْ اِلَّا مُنَافِقٌ بَیِّنُ النِّفَاقِ۔ رَوَاہُ أَبُو الشَّیخِ فِی التَّوبیخِ عَنْ جَابِرِ بنِ عبدِاللّٰہِ الْاَنصاریِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعالیٰ عَنھُما۔

ترجمہ: '' اُن کے حق کو ہلکا نہ سمجھے گا مگر کھلا منافق (اسے ابوالشیخ نے التوبیخ میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا)۔

اور فرماتے ہیں ﷺ:

لَیسَ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ لَّمْ یَعرِفُ لِعَالِمِنَا حَقَّہٗ،رَوَاہُ أحمدُ وَالحاکِمُ وَالطَّبرانی فی الکبیرِ عَنْ عُبادَۃَ بنِ الصَّامتِ رَضِی اللّٰہُ تَعالیٰ عَنہُ۔

ترجمہ:''جو ہمارے عالم کا حق نہ پہچانے وہ میری امت سے نہیں۔(اسے احمد،حاکم اور طبرانی نے معجم کبیر میں عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا)۔پھر اگر عالم کو صرف اس لئے برا کہتا ہے کہ وہ عالم ہے،جب تو صریح کافر ہےاور اگر بوجہ علم اس کی تعظیم فرض جانتا ہے مگر اپنی دنیاوی خصومت(اختلاف) کے باعث برا کہتا ہے،گالی دیتا ہے، تحقیر کرتا ہے تو سخت فاسق وفاجر ہے۔اور اگر بے سبب رنج رکھتا ہے تو مریضُ القلب خَبیثُ الباطن ہےاور اُس کے کفر کا اندیشہ ہے۔خلاصہ میں ہے:مَنْ أَبْغَضَ عَالِماً مِنْ غَیرِ سَبَبٍ ظَاھِرٍ خِیفَ عَلَیہِ الْکُفرَ

ترجمہ:''جو کسی عالم سے کسی ظاہری سبب کے بغیر عداوت رکھتا ہے،اس کے کفر کا اندیشہ ہے۔منح الروض الازہر میں ہے اَلظَّاھِرُ اَنَّہٗ یُکَفَّرُ(ظاہر یہ ہے کہ وہ کافر ہو جائے گا)۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد 21،ص:129،رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:عوام پر علمائے دین کا ادب باپ سے زیادہ فرض ہے۔رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:ثَلٰثَۃٌ لَایَسْتَخِفُّ بِحَقِّھِمْ اِلَّا الْمُنَافِقُ بَیِّنُ النِّفَاقِ ذُوالشَّیبَۃِ فِی الْاِسْلَامِ وَالْاِمَامُ الْمُقْسِطُ ومُعَلِّمُ الْخَیرِ۔رَوَاہُ أبو الشیخ فِی التوبیخ عَن جابرٍ والطَّبرانی فِی الکبیرِ بِسنَدٍ حَسَنٍ عَن أبی اُمامۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعالیٰ عنھما۔

ترجمہ:''تین شخص ہیں جن کے حق کو ہلکا نہ جانے گا مگر منافق جس کا نفاق واضح ہو،ان اشخاص میں ایک بوڑھا مسلمان،دوسرا عادل حکمران،تیسرا وہ شخص جو لوگوں کو نیکی کے کاموں کی تعلیم دے۔(اس کو ابوالشیخ نے التوبیخ میں حضرت جابر سے اور طبرانی نے معجم کبیر میں سندِ حسن کے ساتھ ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا)۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد 25،ص:216،رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز سے سوال کیا گیا: ''بعض جدید تعلیم یافتہ لوگ کہتے ہیں: مولوی لوگ کیا جانتے ہیں، کیا اس لفظ سے علم کی حقارت نہیں ہوئی؟'' آپ نے جواب میں لکھا: یہ لفظ کہ ''مولوی لوگ کیا جانتے ہیں''، اس سے ضرور علماء کی تحقیر نکلتی ہے اور علمائے دین کی تحقیر کفر ہے''۔

ایک اور مقام پر سوال کیا گیا کہ: ''اگر کوئی شخص غضبناک ہو کر علماء کی توہین اور حقارت کرے اور کہے کہ عالم لوگوں نے دیس خراب کر دیا ہے''، آپ نے جواب میں لکھا: علمائے دین کی توہین کفر ہے، مجمع الانہر میں ہے:

مَنْ قَالَ لِعَالِمٍ "عُوَيْلِمٌ" عَلٰى وَجْهِ الْإِسْتِخْفَافِ فَقَدْ كَفَرَ،

ترجمہ: ''جس نے بے ادبی کرتے ہوئے عالم کو عُوَیلِم کہا، اُس نے کفر کیا''۔ اُس شخص پر تجدیدِ اسلام لازم ہے اور اس کے بعد اپنی عورت سے نکاحِ جدید کرے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 14، ص: ص: 605-244، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

''عُوَیلِم'' عربی زبان میں تصغیر (Minimization) کا صیغہ ہے، تصغیر کی وضع اس مقصد کے لئے ہے کہ اس کلمے کے اصل ماخذ یا مصدر کے جو معنی ہیں، اس صیغے کے ذریعے انہیں کم تر یا کمترین درجے میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ ''عُوَیلِم'' کے معنی ہیں: چھوٹا سا یا معمولی سا یا بے توقیر سا عالم، جیسے پنجابی زبان میں لفظ مولوی کی تصغیر کر کے ''مُلوَٹا'' کہتے ہیں، یا اُردو میں کھاٹ کی جگہ ''کھٹیا'' کہہ دیتے ہیں۔

طہارت کے مسائل

غسلِ مسنون کا طریقہ

سوال:13

شرعاً غسل کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟، (جہانگیر عالم، کراچی)۔

جواب :

طہارت کی دو قسمیں ہیں: (۱) طہارتِ صغریٰ (۲) طہارتِ کبریٰ، جن چیزوں سے صرف وضو لازم آتا ہے، اُنہیں حَدَثِ اصغر کہتے ہیں اور جن سے غسل واجب ہو جائے اُنہیں حَدَثِ اکبر کہتے ہیں۔ جو غسل حَدَثِ اکبر کے ازالے کے لئے ہوتا ہے، اُسے ''طہارتِ کُبریٰ'' کہا جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوْا، ترجمہ: ''اور اگر تم جنبی ہو تو اچھی طرح پاکیزگی حاصل کرلو، (المائدہ:6)''۔

ایک غسل حَدَثِ اصغر کے ازالے اور جسمانی طہارت کے لئے ہوتا ہے، جو حضور نبی کریم ﷺ کی سنت کی نیت سے کیا جاتا ہے باعثِ اجر ہے۔ جب غسل جنابت یا حَدَثِ اکبر کے ازالے کے لئے کیا جائے تو مَضمَضہ (کلی) اور اِستِنشاق (ناک میں پانی ڈالنا) فرض ہے۔ اور اگر غسل محض جسمانی پاکیزگی کے لئے کیا جائے یا حَدَثِ اصغر کے لئے کیا جائے تو مَضمَضہ اور اِستِنشاق سنّت ہے۔

غسل کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ غسل اس طرح کیا جائے، جس میں سارے فرائض، سُنَن اور مُستَحبّات کی رعایت ہو اور ممنوعات سے اجتناب کیا جائے۔ حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ کے غسل فرمانے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے:

عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ : أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ : كَانَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ، بَدَأَ فَغَسَلَ يَدَيْهِ، ثُمَّ تَوَضَّأَ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ، ثُمَّ يُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِي الْمَاءِ، فَيُخَلِّلُ بِهَا

أُصُولَ شَعْرِهِ،ثُمَّ يَصُبُّ عَلٰى رَأْسِهِ ثَلَاثَ غُرَفٍ بِيَدَيْهِ ،ثُمَّ يُفِيْضُ الْمَاءَ عَلٰى جِلْدِهِ كُلِّهٖ ۔

ترجمہ:'' اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب جنابت کا غسل فرماتے تو پہلے اپنے ہاتھوں کو دھوتے ، پھر اس طرح وضو فرماتے ، جس طرح نماز کا وضو کرتے تھے ، پھر اپنی انگلیاں پانی میں داخل کر کے بالوں کی جڑوں میں خلال کرتے پھر اپنے ہاتھوں سے تین چلّو پانی لے کر سر پر بہاتے ، پھر اپنے تمام جسم پر پانی بہاتے ،(صحیح بخاری، رقم الحدیث:248)''۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی لکھتے ہیں:فَرْضُ الْغُسْلِ : اَلْمَضْمَضَةُ، وَالْاِسْتِنْشَاقُ ،وَغَسْلُ سَائِرِ الْبَدَنِ،

ترجمہ:''غسل کے فرائض میں مَضمَضہ (اس طرح کلی کرنا کہ پانی منہ کے سارے اندرونی حصے تک پہنچ جائے)،استنشاق (ناک کے نرم گوشے تک پانی پہنچانا اور سانس کے ذریعے اندر تک پانی چڑھانا)اور تمام بدن پر (تین مرتبہ) پانی بہانا ہے''۔۔۔۔۔۔آگے چل کر غسل کا مسنون طریقہ لکھتے ہیں:وَسُنَّتُهٗ أَنْ يَبْدَأَ الْمُغْتَسِلُ ،فَيَغْسِلُ يَدَيْهِ وَفَرْجَهٗ، وَيُزِيْلُ النَّجَاسَةَ اِنْ كَانَتْ عَلٰى بَدَنِهٖ ،ثُمَّ يَتَوَضَّأُ وُضُوْءَهٗ لِلصَّلَاةِ اِلَّا رِجْلَيْهِ ،ثُمَّ يُفِيْضُ الْمَاءَ عَلٰى رَأْسِهٖ وَسَائِرِ جَسَدِهٖ ثَلَاثًا ،ثُمَّ يَتَنَحّٰى عَنْ ذٰلِكَ الْمَكَانِ، فَيَغْسِلُ رِجْلَيْهِ،هٰكَذَا حَكَتْ مَيْمُوْنَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اِغْتِسَالَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، وَاِنَّمَا يُؤَخِّرُ غَسْلَ رِجْلَيْهِ لِاَنَّهُمَا فِيْ مُسْتَنْقَعِ الْمَاءِ الْمُسْتَعْمَلِ فَلَايُفِيْدُ الْغَسْلُ حَتّٰى لَوْكَانَ عَلٰى لَوْحٍ لَايُؤَخِّرُ وَاِنَّمَا يَبْدَأُ بِاِزَالَةِ النَّجَاسَةِ الْحَقِيْقِيَّةِ كَيْلَا تَزْدَادَ بِاِصَابَةِ الْمَاءِ ۔

ترجمہ:''غسل کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے غسل کرنے والا اپنے دونوں ہاتھ اور

شرمگاہ کو دھوئے اور اگر بدن پر (کوئی ظاہری) نجاست ہو تو نجاست زائل کرے، پھر وضو کرے جیسا نماز کے لئے وضو کرتے ہیں اور دونوں پاؤں نہ دھوئے، پھر اپنے سر پر پانی بہائے اور پھر تمام بدن پر تین بار پانی بہائے، پھر اُس جگہ سے ہٹ کر دونوں پاؤں دھولے۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے غسل فرمانے کا طریقہ اِسی طرح بیان فرمایا اور دونوں پاؤں تاخیر سے (آخر میں) دھونے کا حکم اس لئے ہے کہ دونوں پاؤں غسل میں استعمال شدہ پانی جمع ہونے کی جگہ پر ہیں، اس لئے اُن کا دھونا مفید نہ ہوگا، ہاں! اگر کسی تختہ (یا اونچی جگہ) پر ہو تو پھر وضو کے وقت پاؤں بھی دھولئے جائیں، پاؤں کے دھونے کو مؤخر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نجاستِ حقیقیہ زائل کرنے کے ساتھ ابتدا کرے تاکہ پانی پہنچ کر بڑھ نہ جائے (یعنی پانی کے ذریعے اس نجاست کا اثر باقی بدن تک تک نہ پہنچے)، (ہدایہ، جلد 1، ص:45-44)"۔

الغرض غسل کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ پہلے سنت کے مطابق باقاعدہ وضو کریں اور پھر پورے بدن پر پانی ڈالیں۔ غسلِ جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں اندر تک پانی ڈالنا فرض ہے، غسلِ طہارت اور غسلِ مسنون میں یہ دونوں امور فرض نہیں بلکہ سنت ہیں۔

ستر کھولنے سے وضو نہیں ٹوٹتا

سوال:14

غسل کے ساتھ جو وضو کیا جاتا ہے، کیا وہ وضو نماز کی ادائیگی اور تلاوتِ قرآن کے لئے کافی ہے یا دوبارہ وضو کرنا ہوگا؟۔ اسی طرح وضو کی حالت میں اگر کپڑے تبدیل کرتے ہیں تو کیا وضو قائم رہتا ہے؟، (محمد ابدال، نارتھ کراچی)۔

جواب :

غسلِ مسنون ہو یا فرض، تلاوتِ قرآنِ کریم اور نماز وغیرہ کی ادائیگی کے لئے دوبارہ وضو کرنا ضروری نہیں ہے اگر چہ برہنہ ہی غسل کیا ہو، یہی وضو کافی ہے۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ برہنہ ہونے کے سبب وضو ٹوٹ جاتا ہے، یہ خیال درست نہیں ہے۔ جب تک جسم سے کسی نجاست کا اخراج نہ ہو، وضو قائم رہتا ہے۔ شرعاً غسل کا نام طہارتِ کبریٰ ہے اور وضو کو طہارتِ صغریٰ کہا جاتا ہے۔ جب طہارتِ صغریٰ سے نماز ادا ہو سکتی ہے تو طہارتِ کبریٰ سے بدرجۂ اولیٰ ادا کی جا سکتی ہے۔ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''عوام میں جو مشہور ہے کہ گھٹنا یا ستر کھلنے یا اپنا، پرایا ستر دیکھنے سے وضو جاتا رہتا ہے، محض بے اصل بات ہے۔ ہاں! وضو کے آداب سے ہے کہ ناف سے زانو کے نیچے تک سب ستر چھپا ہو بلکہ استنجا کے بعد فوراً ہی چھپالینا چاہیئے کہ بغیر ضرورت ستر کھلا رہنا منع ہے اور دوسروں کے سامنے ستر کھولنا حرام ہے، (بہارِ شریعت، حصہ دوم، ص:95)''۔

حالتِ اعتکاف میں غسلِ مسنون کا حکم

سوال:15

رمضان المبارک کے آخری عشرے کے اعتکاف کے دوران جمعۃ المبارک یا غسلِ مسنون کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟۔

(محمد امیر ممتازی، فیڈرل بی ایریا، گوہر آباد، کراچی)

جواب:

تفہیم المسائل کی جلد سوم میں ہم نے اس مسئلے پر یہ موقف اختیار کیا تھا کہ''معتکف کے لئے غسلِ جنابت کے علاوہ غسلِ مسنون یا غسلِ تبرید (یعنی ٹھنڈک

حاصل کرنے کے لئے غسل کرنے کی خاطر) مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ شرعی ضرورت نہیں ہے''۔ لیکن اب مطالعے کے دوران نئے فقہی حوالے اور فقہاءِ کرام کی آراء سامنے آئیں، جن میں انہوں نے معتکف کو غسل واجب کے علاوہ نفلی غسل کی بھی رخصت دی ہے، اس لئے ہم نے بھی رائے تبدیل کرلی ہے اور اسے پہلی رائے سے رجوع سمجھا جائے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَحَرُمَ عَلَيْهِ)أَيْ عَلَى الْمُعْتَكِفِ اِعْتِكَافاً وَاجِباً، أَمَّاالنَّفْلُ فَلَهُ الْخُرُوْجُ لِأَنَّهُ مُنْهٍ لَهُ لَا مُبْطِلٌ كَمَا مَرَّ (اَلْخُرُوْجُ اِلَّا لِحَاجَةِ الْإِنْسَانِ)طَبِيْعِيَّةً كَبُوْلٍ وَّغَائِطٍ وَّغُسْلٍ لَواحْتَلَمَ لَا يُمْكِنُهُ الْاِغْتِسَالُ فِي الْمَسْجِدِ، كَذَا فِي "النَّهْرِ" (أَوْ)شَرْعِيَّةً كَعِيْدٍ وَاَذَانٍ لَوْ مُؤَذِّناً وَبَابُ الْمَنَارَةِ خَارِجُ الْمَسْجِدِ،

ترجمہ: ''اورواجب اعتکاف کرنے والے کے لئے شرعی یا طبعی حاجت کے بغیر مسجد سے نکلنا حرام ہے، لیکن نفلی اعتکاف والے کے لئے نکلنا جائز ہے، کیوں کہ مسجد سے نکلنا نفلی اعتکاف کو مکمل کردیتا ہے باطل نہیں کرتا۔ طبعی حاجت میں پیشاب، پاخانہ اور غسلِ واجب شامل ہے، جبکہ اس کے لئے (مسجد کو نجاست سے آلودہ کئے بغیر) مسجد میں غسل کرنا ممکن نہ ہو، ''النھر'' میں اسی طرح ہے۔ حاجتِ شرعی سے مراد جیسے مؤذن کا اذان دینے کے لئے نکلنا، اگرچہ منارہ کا دروازہ مسجد سے باہر ہو، وغیرہ، (ردالمحتار، جلد:3،ص:88-387)''۔ پس ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے غسل کی خاطر معتکف کو مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے۔ اس مسئلے پر ہم نے مزید تحقیق اور غور وفکر کا سلسلہ جاری رکھا اور اب ہماری رائے میں غسلِ مسنون کی خاطر معتکف کے لئے مسجد سے نکلنا جائز ہے۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی

صاحب مُدّ ظلہم نے بھی شرح صحیح مسلم میں معتکف کے لئے غسلِ مسنون کی خاطر مسجد سے نکلنے کے عدمِ جواز کا لکھا تھا، لیکن بعد میں انہوں نے نعمۃ الباری میں نئے دلائل آنے کے بعد اپنی رائے تبدیل فرمالی۔ جواز کے دلائل یہ ہیں:

(۱) ''شیخ عبدالحق مُحدث دہلوی متوفی 1052ھ لکھتے ہیں: رہا غسلِ جمعہ تو اس کے متعلق مجھے اصول میں صریح روایت نہیں ملی، سوائے اس کے کہ شرح اوراد میں یہ لکھا ہے کہ غسل کے لئے باہر آئے خواہ غسل فرض ہو یا نفل، (اَشِعّۃ اللمعات، جلد 2، ص: 128، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

شیخ عبدالحق ''لَمعات التنقیح'' میں لکھتے ہیں: ''رہا جمعہ کا غسل تو اس کے متعلق یہ تصریح نہیں ملی کہ وہ حاجت میں سے ہے یا نہیں، سوائے اس کے کہ شرح اوراد میں لکھا ہے کہ وہ غسل کے لئے نکلے خواہ غسل واجب ہو یا نفل، (مخطوطہ لمعات)''۔

(۲) علامہ عالم بن العلاء الانصاری الاندرا کیتی الدہلوی الہندی التوفی 789ھ لکھتے ہیں: وَيَخْرُجُ لِلْوُضُوْءِ وَالْاِغْتِسَالِ فَرْضًا كَانَ أَوْ نَفْلًا، ترجمہ: ''معتکف وضو اور غسل کے لئے نکلے خواہ فرض ہو یا نفل، (الفتاویٰ التاتارخانیہ، جلد 2، ص: 413)''۔

نفلی غسل سے مراد جمعہ کا غسل ہے، جو کہ حقیقت میں غسلِ مسنون ہے، اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معتکف کا جمعہ کے غسل کے لئے نکلنا بھی جائز ہے، کیونکہ سنت اپنی اصل کے اعتبار سے نفلی عبادت ہے۔

(۳) الشیخ علی بن احمد الفوری لکھتے ہیں: فِيْ فَتَاوَى الْحُجَّةِ وَيَجُوْزُ لِلْمُعْتَكِفِ أَنْ يَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ فِيْ سَبْعَةِ أَشْيَاءَ: الْبَوْلِ وَالْغَائِطِ وَالْوُضُوْءِ وَالْاِغْتِسَالِ فَرْضًا كَانَ أَوْ نَفْلًا وَالْجُمْعَةِ وَيَخْرُجُ أَيْضًا لِحَاجَةِ السُّلْطَانِ وَيَخْرُجُ أَيْضًا لِأَمْرٍ لَابُدَّمِنْهُ ثُمَّ يَرْجِعُ بَعْدَ مَافَرَغَ مِنْ ذٰلِكَ الْأَمْرِ سَرِيْعًا فِي الْخُوَارَزْمِيِّ وَالسِّغْنَاقِيِّ مِنَ

الذَّخِيرَةِ وَهٰذَا كُلُّهٗ فِي الْإِعْتِكَافِ الْوَاجِبِ۔

ترجمہ:''فتاویٰ الحجۃ میں مذکور ہے کہ سات امورانجام دینے کے لئے معتکف کا مسجد سے نکلنا جائز ہے :(۱)پیشاب (۲)پاخانہ (۳) وضو (۴)غسل خواہ فرض ہو یا نفل (۵)جمعہ کی ادائیگی (۶) حاکم کے کام سے (۷) وہ کام جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، پھر فارغ ہونے کے بعد جلد واپس آجائے ،خوارزمی اور سغناقی میں ''ذخیرہ'' سے نقل ہے اور یہ تمام باتیں اعتکافِ واجب میں ہیں،(خزانۃ الروایات (مخطوطہ) جلد 1،ص:431)''۔

مخطوطہ میں خزانۃ الروایات کے مصنف کا نام علی بن احمد الفوری لکھا ہے اور نزہۃ الخواطر اور کشف الظنون میں لکھا ہے کہ اس کے مصنف کا نام جگن ہندی گجراتی متوفی 920ھ ہے۔

(۴)علامہ یوسف بن عمر الصوفی الکماروی لکھتے ہیں:وَيَجُوْزُ لِلْمُعْتَكِفِ أَنْ يَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ فِيْ سَبْعَةِ أَشْيَاءَ: الْبَوْلِ وَالْغَائِطِ وَالْوُضُوْءِ وَالْاِغْتِسَالِ فَرْضًا كَانَ أَوْ نَفْلًا وَالْجُمُعَةِ ۔الخ

ترجمہ:''معتکف کے لئے سات چیزوں کی وجہ سے مسجد سے نکلنا جائز ہے : (۱) پیشاب (۲)پاخانہ(۳)وضو(۴)غسل خواہ فرض ہو یا نفل(۵)جمعہ پڑھنے کے لئے''۔

(جامع المضمرات والمشکلات شرح مختصر القدوری،(مخطوطہ)ص:170)

(نعمۃ الباری شرح صحیح البخاری،جلد 4،ص:554)

(۵)علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے''البیاض الہاشمی'' میں ''خزانۃ الروایات'' کا حوالہ نقل کر کے جواز کا قول کیا ہے۔وہ ''حیاۃ الصائمین'' میں ''الفتاوی الحمدیہ للمفتی محمد الھالائی السندی،جلد:2،ص:80'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وہم از حاجتِ شرعیہ وضو واغتسال است پس جائز است معتکف را خروج از مسجد برائے آں،

اگر چہ فرض باشد یا نفل، کذا فی "المضمرات و الفتاوی الحجة و التتارخانیة و کنز العباد و متانة الروایات"۔

ترجمہ: ''حاجتِ شرعیہ میں وضو اور غسل بھی شامل ہے۔ پس معتکف کا ان حاجات کے لئے مسجد سے نکلنا جائز ہے، خواہ غسل فرض ہو یا نفل''۔

(۶) مظہر الانوار میں ہے: یَجُوْزُ لِلْمُعْتَکِفِ الْخُرُوْجُ لِلْبَوْلِ وَالْغَائِطِ وَالْوُضُوْءِ وَالْاِغْتِسَالِ فَرْضًا کَانَ أَوْ نَفْلًا۔

ترجمہ: ''معتکف کے لئے پیشاب، پاخانہ، وضو اور غسل کے لئے نکلنا جائز ہے، خواہ فرض ہو یا نفل''۔ لہٰذا یہ اجازت صرف جمعۃ المبارک کے مسنون غسل کے لئے ہے، کیونکہ ہر سنت عمل اپنی اصل کے اعتبار سے نفل ہے۔ البتہ جو معتکف، اعتکاف واجب یا سنتِ مؤکدہ کر رہا ہے، اگر محض ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے غسل کرنے کی خاطر مسجد سے باہر جائے گا، تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

نماز کے مسائل

مسبوق مقتدی تشہّد میں شامل ہو تو کیا کرے

سوال:16

اگر مقتدی درمیان تشہد نماز میں شامل ہوتا ہے اور اس کے تشہد شروع یا مکمل کرنے سے پہلے امام کھڑا ہو جاتا ہے تو مقتدی کے لئے کیا حکم ہے؟،اسی طرح آخری قعدہ میں ایسا ہو جائے تو کیا حکم ہے؟۔

(مولانا محمد احمد ساجد، ریلوے روڈ بصیر پور ضلع اوکاڑہ)

جواب:

وہ مقتدی جو ابتدا سے امام کے ساتھ نماز میں شامل ہے، اُس کے لئے قعدۂ اُولیٰ پر بیٹھنا اور تشہّد کا پورا پڑھنا واجب ہے اور قعدۂ اخیرہ کے لئے تشہّد کی مقدار بیٹھنا فرض اور پورے تشہّد کا پڑھنا واجب ہے، تو اگر امام تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے اور مقتدی نے اپنا تشہّد پورا نہ پڑھا ہو، تو وہ تشہّد پورا کر کے کھڑا ہو، لیکن اگر اُسے اندیشہ ہو کہ امام جلدی فاتحہ مکمل کر کے رکوع میں چلا جائے گا، تو تشہّد نامکمل چھوڑ کر امام کے ساتھ قیام میں شامل ہو جائے۔ وہ مقتدی جو نماز کے درمیان میں پہلے یا آخری تشہّد میں امام کے ساتھ آ کر شامل ہو، تو قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ چونکہ اُس کی اپنی ترتیب کے اعتبار سے نہ اُس کا پہلا قعدہ ہے اور نہ آخری، لہٰذا وہ تشہّد ناتمام چھوڑ کر بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے اِن دو صورتوں میں مسبوق مقتدی کے لئے تشہّد پورا پڑھنے کو اپنا مختار قرار دیا ہے اور نامکمل چھوڑنے کو بھی جائز رکھا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وَشَمِلَ بِاِطْلَاقِهٖ مَالَوْ اِقْتَدٰی بِهٖ فِیْ اِثْنَاءِ التَّشَهُّدِ الْأَوَّلِ أَوِ الْأَخِیْرِ، فَحِیْنَ قَعَدَ قَامَ اِمَامُهٗ أَوْسَلَّمَ، وَمُقْتَضَاهُ اَنَّهٗ یَتِمُّ التَّشَهُّدَ ثُمَّ یَقُوْمُ وَلَمْ أَرَهٗ صَرِیْحاً، ثُمَّ رَأَیْتُهٗ فِیْ "الذَّخِیْرَةِ" نَاقِلاً عَنْ أَبِی اللَّیْثِ: اَلْمُخْتَارُ عِنْدِیْ اَنَّهٗ یُتِمُّ التَّشَهُّدَ وَاِنْ لَمْ یَفْعَلْ أَجْزَأَهٗ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ،

ترجمہ: "تشہّد کے مکمل پڑھنے کو مطلقاً واجب قرار دینا اِس صورت کو بھی شامل ہے کہ اگر

مقتدی پہلے یا آخری قعدہ کے دوران امام کے ساتھ جماعت میں شامل ہوااور وہ جونہی بیٹھا، امام (تیسری رکعت کے لئے) کھڑا ہوگیا یا اُس نے سلام پھیر دیا، تو ''اَلتَّحِیَّات'' مکمل پڑھنے کو مطلقاً واجب قرار دینے کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مقتدی بھی ''اَلتَّحِیَّات'' پوری پڑھے، پھر کھڑا ہو، لیکن میں نے یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ کہیں دیکھا نہیں ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ''الذخیرہ'' میں ابو اللّیث سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ اِس صورت میں بھی ''اَلتَّحِیَّات'' پوری پڑھے اور اگر پوری نہ پڑھے، تو بھی جائز ہے، اللہ تعالیٰ کا بے پایاں شکر ہے کہ اُس نے اِس مسئلے میں میری صحیح رہنمائی فرمائی۔۔۔۔

آگے چل کر علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(وَلَوْ لَمْ یُتِمَّ جَازَ) اَیْ صَحَّ مَعَ کَرَاهَةِ التَّحْرِیْمِ کَمَا اَفَادَهُ "الْحَلَبِیُّ" وَنَازَعَهُ "الطِّیْبِیُّ وَالرَّحْمَتِیُّ" وَهُوَ مَفَادُ مَا فِیْ "شَرْحِ الْمُنْیَةِ" حَیْثُ قَالَ: وَالْحَاصِلُ اَنَّ مُتَابَعَةَ الْإِمَامِ فِی الْفَرَائِضِ وَالْوَاجِبَاتِ مِنْ غَیْرِ تَاخِیْرٍ وَاجِبَةٌ، فَاِنْ عَارَضَهَا وَاجِبٌ لَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُفَوِّتَهُ، بَلْ یَأْتِیْ بِهٖ ثُمَّ یُتَابِعُهُ، لِأَنَّ الْإِتْیَانَ بِهٖ لَا یُفَوِّتُ الْمُتَابَعَةَ بِالْکُلِّیَّةِ، وَاِنَّمَا یُؤَخِّرُهَا، وَالْمُتَابَعَةُ مَعَ قَطْعِهٖ تُفَوِّتُهُ بِالْکُلِّیَّةِ، فَکَانَ تَاخِیْرُ اَحَدِ الْوَاجِبَیْنِ مَعَ الْإِتْیَانِ بِهِمَا اَوْلٰی مِنْ تَرْکِ أَحَدِهِمَا بِالْکُلِّیَّةِ، بِخِلَافِ مَا اِذَا عَارَضَهَا سُنَّةٌ، لِاَنَّ تَرْکَ السُّنَّةِ اَوْلٰی مِنْ تَاخِیْرِ الْوَاجِبِ،

ترجمہ: ''اور اگر (مقتدی) تشہد کو پورا نہیں کرے گا تو اُس کا یہ عمل جائز ہے مگر مکروہِ تحریمی ہے، جیسا کہ ''الحلبی'' سے مستفاد ہے۔ اور ''الطیبی اور الرحمتی'' نے اس سے اختلاف کیا ہے اور ''شرح المنیہ'' کا مفاد بھی یہی ہے کہ انہوں نے کہا: ''حاصل یہ ہے کہ فرائض اور واجبات میں واجب کی تاخیر کے بغیر امام کی پیروی واجب ہے، اگر کوئی واجب اس سے معارض ہو تو اسے فوت نہ کرے بلکہ اسے مکمل کر کے امام کی پیروی کرے، کیونکہ مقتدی کا تشہد کو پورا کرنا امام کی متابعت کو بالکلیہ فوت نہیں کرتا بلکہ اسے مؤخر کرتا ہے اور تشہد کو نا تمام چھوڑ کر امام کی پیروی کرنے سے تشہد کا واجب فوت ہو جاتا ہے۔ پس دو واجب امور کو ادا کر کے کسی ایک

میں تاخیر کرنا دوسرے کو مکمل طور پر ترک کرنے سے بہتر ہے۔اس کے برعکس اگر کوئی سنت امام کی پیروی سے معارض ہو جائے (تو سنت کو چھوڑ دیں گے اور امام کی پیروی کریں گے)، کیونکہ واجب کی تاخیر سے سنت کا ترک کرنا بہتر ہے۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تشہد کو ناتمام چھوڑ کر مقتدی نے امام کی پیروی کر لی تو کراہتِ تحریمی کے ساتھ جائز ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ التحیات واجب ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 177-176، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

یہ اس تشہد کے بارے میں ہے جو یقیناً واجب ہے اور یہ تین یا چار رکعت والی نماز کا ''قعدۂ اولیٰ'' ہے، جس کے بعد امام تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور یہ قعدہ مُدرِک مقتدی اور امام دونوں پر واجب ہے۔ابھی تک ایسا کوئی جزیہ ہمارے علم میں نہیں آیا، جس میں یہ صراحت ہو کہ اگر مقتدی آخری تشہد میں امام کے ساتھ ملا تو امام کی متابعت میں وہ تشہد مقتدی پر بھی واجب ہو جاتا ہے تاکہ التحیات نامکمل رہنے کی صورت میں اس پر بلاتردد مکروہِ تحریمی کا اطلاق کیا جاسکے۔تاہم امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز کی مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کی متابعت میں مسبوق مقتدی کے لئے بھی قعدۂ اخیرہ واجب ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''دوسرے یہ کہ اس کا فعل فعلِ امام کے بعد بدیر واقع ہوا اگرچہ بعد فراغ امام، فرض یوں بھی ادا ہو جائے گا، پھر یہ فصل بضرورت ہوا تو کچھ حرج نہیں، ضرورت کی یہ صورت کہ مثلاً مقتدی قعدۂ اولیٰ میں آکر ملا، اس کے شریک ہوتے ہی امام کھڑا ہو گیا اب اسے چاہئے کہ التحیات پوری پڑھ کر کھڑا ہو اور کوشش کرے کہ جلد جا ملے۔فرض کیجئے کہ اتنی دیر میں امام رکوع میں آگیا، تو اس کا قیام، قیامِ امام کے بعد ختم ہوگا، مگر حرج نہیں کہ یہ تاخیر بضرورتِ شرعیہ تھی، اور اگر بلاضرورت فصل کیا تو قلیل فصل میں جس کے سبب امام سے جاملنا فوت نہ ہو ترکِ سنت ہے اور کثیر میں جسطرح سوال میں ہے کہ فعلِ امام ختم ہونے کے بعد اس نے فعل کیا، ترکِ واجب ہے، جس کا حکم اس نماز کو پورا کر کے اعادہ کرنا ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 7، ص: 275)''۔

نماز میں قراءت (قرآن کی لفظاً ادائیگی) فرض ہے

سوال: 17

میری عمر اس وقت 60 سال ہے، سات سال کی عمر سے مستقل نمازیں پڑھتا ہوں۔ بچپن سے ہی میری عادت یہ ہے کہ نماز میں نماز کی قراءت اَذکار وغیرہ اور قرآنِ مجید دل ہی دل میں پڑھتا ہوں۔ اتفاق سے ایک عالمِ دین کی کتاب میں میں نے پڑھا کہ: ''نماز میں تلاوتِ قرآن، تکبیرات اور درود شریف اتنی آواز سے پڑھنا چاہئے کہ خود کو آواز آئے، ہونٹ اور زبان حرکت کرے، دل ہی دل میں نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی''۔ میں نے مسجد کے امام صاحب سے پوچھا تو انہوں نے اُس کی تائید کی اور کہا آپ کی نماز نہیں ہوئی، 60 سال کی نماز قضاءِ عمری کے طور پر ادا کریں۔ میں یہ سن کر پریشان ہوں کہ 60 سال کی نمازیں دوبارہ کیسے پڑھوں گا؟۔ شریعت کی روشنی میں میرے اس مسئلے کو حل فرمائیں، (صدیق حسن، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب :

دل میں قراءت کرنے سے نماز نہیں ہوگی بلکہ قراءت زبان سے اتنی آواز سے ہونی چاہئے کہ خود سُن سکے، علامہ برہان الدین ابوبکر فرغانی لکھتے ہیں:

ثُمَّ الْمُخَافَتَةُ أَنْ يُّسْمِعَ نَفْسَهٗ وَالْجَهْرُ أَنْ يُّسْمِعَ غَيْرَهٗ وَهٰذَا عِنْدَالْفَقِيْهِ أَبِیْ جَعْفَرِ نِ الْهِنْدُوَانِيِّ لِأَنَّ مُجَرَّدَ حَرَكَةِ اللِّسَانِ لَايُسَمّٰى قِرَاءَةً بِدُوْنِ الصَّوْتِ وَقَالَ الْكَرْخِيُّ أَدْنَى الْجَهْرِ أَنْ يُّسْمِعَ نَفْسَهٗ وَأَدْنَى الْمُخَافَتَةِ تَصْحِيْحُ الْحُرُوْفِ لِأَنَّ الْقِرَاءَةَ فِعْلُ اللِّسَانِ دُوْنَ الصِّمَاخِ

ترجمہ: ''پھر اخفاء (یعنی نماز میں آہستہ قرآن پڑھنا) یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنائے (یعنی پڑھنے والے کو خود سنائی دے) اور جہر یہ ہے کہ دوسرے کو سنائے اور یہ ''فقیہ ابوجعفر ہندوانی'' کے نزدیک ہے، کیونکہ آواز کے بغیر محض زبان کی حرکت کا نام قراءت نہیں ہے۔ اور امام کرخی فرماتے ہیں: جہر کی ادنیٰ صورت یہ ہے کہ خود سن سکے اور آہستہ (اِخفاء) یہ کہ حروف صحیح

ادا کرے، کیونکہ قراءت تو زبان کا فعل ہے نہ کہ کان کا، (ہدایہ اولین، ص:98)''۔
علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:
وَحَدُّ الْقِرَاءَةِ تَصْحِيحُ الْحُرُوفِ بِلِسَانِهٖ بِحَيْثُ يُسْمِعُ نَفْسَهٗ عَلَى الصَّحِيحِ
ترجمہ: ''صحیح قول کے مطابق قراءت کی حد یہ ہے کہ حروف کو اپنی زبان سے اس طرح صحیح طور پر ادا کرے کہ خود کو سنائی دے، (البحر الرائق، جلد 1، ص:510)''۔
الغرض وہ قراءت جو نماز میں فرض ہے، جب تک اس کو زبان سے لفظاً ادا نہ کیا جائے، فرض ادا نہیں ہوگا، اور نماز میں محض دل میں قرآن پڑھنے کا اعتبار نہیں، ایسا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے، یعنی اس سے فرضِ قراءت ادا نہیں ہوگا اور ترکِ فرض سے نماز ادا نہیں ہوتی۔ اب تک آپ لاعلمی میں جو محض دل میں پڑھتے رہے، یہ محض تخیُّل وتصور ہے، قراءت نہیں ہے، اور ضروریاتِ دین کے بارے میں دارالاسلام میں لاعلمی شرعاً قابلِ قبول عذر نہیں ہے، لہٰذا آپ ماضی کی اس غفلت پر اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے توبہ کریں اور فرض نمازیں اور وتر کی قضا پڑھتے رہیں اور نمازوں کی کثرت کی وجہ سے تخفیف کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، مثلاً سورۂ فاتحہ کے بعد کم ازکم مقدار واجب قراءت، رکوع وسجود میں کم ازکم ایک تسبیح، وتر میں دعاءِ قنوت کی جگہ ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِی'' وغیرہ اور آخری قعدہ ''التحیات'' کے بعد ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ'' پر اکتفا کرسکتے ہیں، لیکن یہ بہت زیادہ قضا نمازوں کے لئے ہے، معمول کی نمازوں کے لئے ہرگز نہیں ہے۔ معمول کی نماز سنت کے مطابق فرائض، واجبات، سُنن، مستحبات اور آداب کی رعایت کے ساتھ ادا کریں اور مکروہات سے اجتناب کریں۔

رکوع اور سجدے میں تسبیحات کے ساتھ دعائیں پڑھنا

سوال:18

فرض یا سنت نماز کی ادائیگی کے دوران اگر کوئی شخص حالتِ سجدہ میں کسی قسم کی دعا کرتا ہو مثلاً ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ'' وغیرہ، تو کیا نماز صحیح ادا ہو جائے گی یا فاسد ہو جائے گی؟۔ نماز کے دوران کس قسم کا کلام نماز کو فاسد کردیتا ہے؟، (سید شفاعت علی، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

حدیثِ پاک میں ہے:عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهَا اَنَّهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُكْثِرُ أَنْ يَقُوْلَ فِيْ رُكُوْعِهٖ وَسُجُوْدِهٖ "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ" يَتَأَوَّلُ الْقُرْآنَ ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی ﷺ اپنے رکوع اور سجود میں کثرت سے یہ کلمات پڑھا کرتے تھے:

"سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ "،وہ قرآن سے اس کی تاویل فرماتے تھے،(صحیح البخاری،رقم الحدیث:817)''۔

یعنی قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ

ترجمہ:''پس اپنے رب کی حمد وتسبیح بیان کرو اور اُس سے مغفرت طلب کرو،(النصر:۳)''۔

یعنی آیۂ مبارکہ میں تین امور کا تذکرہ ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی تسبیح (۲) حمدِ باری تعالیٰ (۳) استغفار۔پس رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات اپنے رکوع وسجود کی تسبیح میں ان تین باتوں کو اس آیۂ کریمہ کی متابعت میں جمع فرمادیا کرتے تھے۔

صحیح مسلم رقم الحدیث: 971 تا 978 میں رسول اللہ ﷺ سے رکوع وسجود کی مزید دعائیں بھی مذکور ہیں:

(1) اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ كُلَّهٗ ،دِقَّهٗ وَجِلَّهٗ ، وَأَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ،وَعَلَانِيَتَهٗ وَسِرَّهٗ

ترجمہ:''(تعلیمِ اُمت کے لئے آپ دعا فرماتے) اے اللہ! میرے تمام چھوٹے اور بڑے، اگلے اور پچھلے، ظاہر اور پوشیدہ ذُنوب کو بخش دے''۔

(2) سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ اِلَيْكَ

ترجمہ:''تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے،تو ہی ہر تعریف کے لائق ہے،میں تجھ سے اپنی بخشش کا طلب گار ہوں اور میں اپنے گناہوں کی معافی کے لئے تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں''۔

(3) سُبْحَانَكَ رَبِّیْ وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ

ترجمہ: ”اے میرے ربّ! تو ہر عیب سے پاک ہے، تو ہی ہر تعریف کے لائق ہے، اے اللہ! میری بخشش فرما“۔

(4) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، أَسْتَغْفِرُاللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ

ترجمہ: ”اللہ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے اور وہی ہر تعریف کے لائق ہے، میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں اور میں ہر گناہ سے معافی کے لئے اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں“۔

(5) سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ لَااِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ

ترجمہ: ”(اے اللہ!) تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے اور ہر تعریف تجھ ہی کو زیبا ہے، تیرے سوا کوئی عبادت کا حق دار نہیں“۔

(6) اَللّٰهُمَّ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ، وَأَعُوْذُبِكَ مِنْكَ،لَا أُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَيْكَ ،اَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ،

ترجمہ: ”اے اللہ ! میں تیری ناراضگی سے بچ کر تیری رضا کی پناہ میں آتا ہوں، اور تیری سزا سے بچ کر تیری معافی کی پناہ میں آتا ہوں، اور تیری گرفت سے بچنے کے لئے تیری آغوشِ رحمت کی پناہ میں آتا ہوں، میں تیری تعریف کا احاطہ نہیں کرسکتا، تیری کمالِ ثناوہی ہے جو تو نے خود اپنی ذات کی فرمائی“۔

(7) سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ

ترجمہ: ”(اے اللہ! تو) ہر عیب سے بہت پاک ہے، تیری ذات ہر نقص اور عیب سے بے انتہا پاکیزہ ہے، تو تمام فرشتوں اور جبریلِ امین کا بھی رب ہے“۔

امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق اور داؤد ظاہری رحمہم اللہ کے نزدیک فرض و نفل ہر نماز کے رکوع و سجود میں جتنی دعائیں چاہیں، پڑھ سکتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نخعی، حضرت حسن بصری، امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے

نزدیک سنت یہ ہے کہ رکوع میں تین بار ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ'' پڑھیں اور سجدے میں تین بار ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' پڑھیں، یہ کم از کم مسنون مقدار ہے، امام طحاوی نے کہا: ائمہ کے نزدیک رکوع میں ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ'' اور سجدے میں ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' پر اور کلمات کا اضافہ نہ کرے، ہاں! جس قدر چاہے اِن کلمات کو بار بار پڑھ سکتا ہے۔ لیکن امام کو چاہئے کہ مقتدیوں کی رعایت کے لئے تین بار پڑھنے پر اکتفا کرے تاکہ اُنہیں بار محسوس نہ ہو اور اُن کی حضوریِ قلب (Presence Of Mind) میں کمی نہ آئے، کیونکہ جماعت میں باہمت افراد کے ساتھ ساتھ بیمار، ضعیف اور عمر رسیدہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ تحدید فرائض کے لئے ہے اور نوافل میں ان مسنون تسبیحات کے ساتھ مذکورہ بالا مسنون دعائیں بھی حسبِ توفیق پڑھ سکتے ہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھیں گے اُتنے ہی زیادہ اجر کے حق دار ہوں گے''۔

(خلاصہ بحث: عمدۃ القاری، جلد 6، ص: 101-100، دارالکتب العلمیہ، بیروت وحاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 1 ص:362)

نوٹ: واجب اور سنّتِ مؤکدہ فرض کے تابع ہوتے ہیں۔

نماز کے اندر دعا کے بارے میں علامہ حسن بن عمار بن علی شرنبلالی ضابطہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اِنَّ صَلَاتَنَا هٰذِهٖ لَا يَصْلَحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِّنْ كَلَامِ النَّاسِ، قَدَّمَ هٰذَا الْمَانِعَ عَلٰى اِبَاحَةِ الدُّعَاءِ بِمَا اُعْجَبَهٗ فِي الصَّلَاةِ، فَلَا يَدْعُوْفِيْهَا اِلَّا (بِمَا يُشْبِهُ اَلْفَاظَ الْقُرْآنِ) ﴿رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا (آل عمران: 08)﴾ (وَ) بِمَا يُشْبِهُ اَلْفَاظَ (السُّنَّةِ) وَمِنْهَا مَارُوِيَ عَنْ اَبِيْ بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ: عَلِّمْنِيْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ دُعَاءً اَدْعُوْا بِهٖ فِيْ صَلَاتِيْ فَقَالَ: قُلْ، اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا، وَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ، اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَكَانَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَدْعُوْ بِكَلِمَاتٍ مِّنْهَا: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهٖ

مَاعَلِمْتُ مِنْهُ وَمَالَمْ أَعْلَمْ ،وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهٖ مَاعَلِمْتُ مِنْهُ وَمَالَمْ أَعْلَمْ وَ (لَا) يَجُوْزُ أَنْ يَّدْعُوَفِيْ صَلَاتِهٖ بِمَا يُشْبِهُ (كَلَامَ النَّاسِ) لِأَنَّهٗ يُبْطِلُهَا اِنْ وُّجِدَ قَبْلَ الْقُعُوْدِ وَقَدْرِ التَّشَهُّدِ ،وَيَفُوْتُ الْوَاجِبَ لِوُجُوْدِهٖ بَعْدَهٗ قَبْلَ السَّلَامِ بِخُرُوْجِهٖ بِهٖ دُوْنَ السَّلَامِ، وَهُوَ مِثْلُ قَوْلِهٖ: اَللّٰهُمَّ زَوِّجْنِيْ فُلَانَةً ،أَعْطِنِيْ كَذَا مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْمَنَاصِبِ،لِأَنَّهٗ لَايَسْتَحِيْلُ حُصُوْلُهٗ مِنَ الْعِبَادِ وَمَا يَسْتَحِيْلُ مِثْلَ الْعَفْوِ وَالْعَافِيَةِ۔

ترجمہ:''(نمازی) نماز میں صرف ان کلمات کے ساتھ دعا مانگے گا، جوقرآن وسنّت کے کلمات کے مشابہ ہوں ☆ قرآن کے کلمات کی مثال جیسے:رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا اِلٰی آخِرِہٖ (آل عمران:08) ☆ اور حدیث میں دعا کی مثال (یہ ہے): حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! مجھے ایسی دعا بتایئے جو میں اپنی نماز میں اللہ سے مانگوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ترجمہ''(یوں دعا مانگو) اے اللہ! میں نے اپنے آپ پر بہت ظلم کیا اور تیرے سوا کوئی گناہوں کا معاف کرنے والانہیں ہے۔ پس اپنے فضل سے میرے گناہوں کو معاف فرما اور مجھ پر رحم فرما، کیونکہ تو بہت بخشنے والا ،نہایت مہربان ہے''۔☆ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کلمات کے ساتھ (نماز میں) دعا مانگا کرتے تھے: ترجمہ''اے اللہ ! میں تجھ سے ہر قسم کی خیر کا سوال کرتا ہوں، خواہ وہ مجھے معلوم ہے یا معلوم نہیں، اور میں ہر قسم کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں، خواہ وہ مجھے معلوم ہے یا معلوم نہیں ☆ اور لوگوں کے کلام کے مشابہ کلمات کے ساتھ نماز میں دعا مانگنی جائز نہیں ہے، کیونکہ اگر تشہّد کی مقدار بیٹھنے سے پہلے ہو تو اِس سے نماز باطل ہوجاتی ہے اور اگر سلام سے پہلے مقدارِ تشہّد بیٹھنے کے بعد ہو، تو لفظِ سلام کے ساتھ نماز سے باہر آنا، جو واجب ہے، فوت ہوجاتا ہے۔ اُس کی مثال یوں ہے: ترجمہ:'' اے اللہ ! فلانی عورت سے میرا نکاح کرادے،، مجھے اتنا اتنا سونا ، چاندی اور عہدے عطا فرما ، کیونکہ ان امور کا حصول بندوں سے ممکن ہے، البتہ اس طرح کے امور کا حصول بندوں سے ممکن نہیں ، جیسے اے اللہ! مجھے

معافی اور عافیت عطا فرما، (حاشیۃ الطحاوی، جلد 1، ص: 372-371)''۔

نماز میں ایسی دعا کرنا، جس کا سوال بندے سے نہیں کیا جا سکتا، جائز ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

اِنْ دَعَابِمَا يَسْتَحِيْلُ سُؤَالُهٗ مِنَ الْعِبَادِ مِثْلَ الْعَافِيَةِ وَالْمَغْفِرَةِ وَالرِّزْقِ بِأَنْ قَالَ: اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي الْحَجَّ أَوِ اغْفِرْلِيْ لَاتَفْسُدُ وَلَوْدَعَابِمَا لَا يَسْتَحِيْلُ سُؤَالُهٗ مِنَ الْعِبَادِ مِثْلُ قَوْلِهٖ:" اَللّٰهُمَّ أَطْعِمْنِيْ أَوِ اقْضِ دَيْنِيْ أَوْزَوِّجْنِيْ"، فَإِنَّهٗ يُفْسِدُ، وَلَوْ قَالَ:" اَللّٰهُمَّ اُرْزُقْنِيْ فُلَانَةَ "فَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ يُفْسِدُ لِأَنَّ هٰذَا اللَّفْظَ أَيْضًا مُسْتَعْمَلٌ فِيْمَا بَيْنَ النَّاسِ،وَلَوْقَالَ:" اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ "لَاتَفْسُدُ لِاَنَّهٗ مَوْجُوْدٌ فِي الْقُرْآنِ، وَلَوْقَالَ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأَخِيْ ذَكَرَ الشَّيْخُ أَبُو الْفَضْلِ الْبُخَارِيُّ اَنَّهٗ يُفْسِدُ وَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ لَايُفْسِدُ لِأَنَّهٗ مَوْجُوْدٌ فِي الْقُرْآنِ كَذَافِيْ مُحِيْطِ السَّرَخْسِيِّ ،وَاِنْ قَالَ: اِغْفِرْلِيْ وَلِأُمِّيْ أَوْ لِعَمِّيْ أَوْ لِخَالِيْ أَوْلِزَيْدٍ فَسَدَتْ صَلَاتُهٗ كَذَافِي السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ۔

ترجمہ:''اگر (دورانِ نماز) ایسے امور کے بارے میں دعا کی جس کا بندوں سے سوال کرنا محال ہے، مثلاً عافیت، مغفرت اور رزق طلب کرنا، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، جیسے (یہ کہنا کہ:)''اے اللہ! مجھے حج نصیب فرما یا اے اللہ! میری مغفرت فرما'' ☆ اگر (دورانِ نماز) ایسے امور کے بارے میں دعا کی، جن کا بندوں سے سوال کرنا محال نہیں ہے، تو نماز فاسد ہو جائے گی، جیسے (یہ کہنا کہ:)''اے اللہ! مجھے کھانا کھلا دے یا میرا قرض ادا کر دے یا میرا نکاح کرا دے'' ☆ اور اگر یہ کہا کہ:''اے اللہ! فلاں عورت سے میرا نکاح کرا دے''، تو صحیح قول کے مطابق نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ ایسے کلمات عام طور پر لوگوں کے درمیان استعمال ہوتے ہیں ☆ اور اگر (دورانِ نماز) یہ کہا کہ:''اے اللہ! میری اور میرے ماں باپ کی مغفرت فرما''، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، کیونکہ ایسے کلمات قرآن مجید میں موجود ہیں ☆ اور اگر (دورانِ نماز) یہ کہا کہ:''اے اللہ! میرے بھائی کو بخش دے''، تو شیخ ابو الفضل بخاری نے ذکر کیا کہ نماز فاسد ہو جائے گی اور صحیح قول یہ ہے کہ

نماز فاسد نہیں ہوگی ،کیونکہ اس طرح کے کلمات قرآن مجید میں موجود ہیں ،جیسا کہ ''محیط السرخسی'' میں ہے☆اور اگر کہا کہ:''اے اللہ! میری اور میری والدہ یا میرے چچا یا میرے ماموں یا زید کی مغفرت فرما''،تو نماز فاسد ہو جائے گی،جیسا کہ''السراج الوہاج'' میں ہے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد 1،ص:100،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ فرض نماز کے دوران ایسی دعا کرنا،جس کا سوال بندوں سے محال ہے،مُفسدِ نماز نہیں ہے اور جس چیز کا سوال بندوں سے کیا جا سکتا ہو،وہ مُفسدِ نماز ہے،جیسا کہ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ نے اُن مقامات کی نشاندہی فرمائی۔

نماز کے اندر دنیاوی کلام،خواہ جان بوجھ کر کیا ہو یا غلطی سے،اپنی خوشی سے کیا ہو یا کسی نے مجبور کیا ہو،قلیل ہو یا کثیر،کم از کم اتنی آواز سے ہو کہ وہ خود سن سکے،نماز کو فاسد کر دیتا ہے۔

چند مقامات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جن میں سے بعض صورتیں مفسدِ نماز ہیں اور بعض صورتیں مفسدِ نماز نہیں ہیں:

(الف) دورانِ نماز سلام کرنا یا سلام کا جواب دینا۔

(ب) کسی کے جواب میں کوئی کلام کیا،مثلاً چھینک کے جواب میں''یَرحَمُكَ اللّٰہُ'' کہا،یا کسی دوسرے نے''یَرحَمُكَ اللّٰہُ'' کہا اور نمازی نے جواب میں''آمین'' کہا۔

(ج) خوشی کی خبر سن کر''اَلحَمدُ لِلّٰہِ'' کہا،لیکن اگر جواب کی نیت سے نہیں بلکہ یہ بتانے کے لئے کہا کہ میں نماز میں ہوں،تو نماز فاسد نہیں ہوئی۔

(د) بری خبر سن کر''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیهِ رَاجِعُونَ'' پڑھا یا الفاظِ قرآن کسی کے جواب میں پڑھے،نماز فاسد ہوگئی۔

(ہ) اللہ تعالیٰ کا نام سن کر''جَلَّ جَلَالُہٗ'' کہا یا نبی ﷺ کا اسمِ مبارک سن کر درود پڑھا یا امام کی قراءت سن کر''صَدَقَ اللّٰہُ وَصَدَقَ رَسُولُہٗ'' کہا تو نماز فاسد نہیں ہوگی، بشرطیکہ جواب کی نیت سے نہ ہو۔علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَلَوقَالَ: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ اَوْقَالَ : اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَاتَفْسُدُ صَلَاتُہٗ بِالْاِجْمَاعِ اِنْ

لَـمْ يُـرِدْ بِـهِ الْـجَـوَابَ، أَمَّـا اِذَا أَرَادَ الْجَوَابَ قَالَ بَعْضُهُمْ تُفْسِدُ صَلَاتَهٗ عِنْدَالْكُلِّ وَهُوَالظَّاهِرُ ولو صلى على النبى ﷺ فى الصلاة ان لم يكن جوابًا لغيره لَاتَفْسُدُ صَلَاتَـهٗ وَاِنْ سَـمِـعَ اِسْـمَ الـنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ جَوَابًا لَهٗ تَفْسُدُ صَلَاتُهٗ وَلَوْ قَرَأَ رَجُلٌ مَـا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَااَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَصَلّٰى عَلَيْهِ رَجُلٌ فِي الصَّلَاةِ لَاتَفْسُدُ صَلَاتُهٗ وَكَذَالَوْ قَرَأَ ذِكْرَالشَّيْطَانِ فَقَالَ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ لَعَنَهُ اللّٰهُ لَاتَفْسُدُ صَلَاتُهٗ۔

ترجمہ:'' اگر (دورانِ نماز) کسی کے جواب کا ارادہ کئے بغیر درود شریف پڑھا یا اللہ اکبر کہا، تو اس پر اجماع ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوگی ☆ اگر نماز کے اندر کسی شخص سے نبی ﷺ کا نام سنا اور اُس کے جواب میں درود پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی ☆ اور اگر کسی شخص نے یہ آیت پڑھی: ''مَـا كَـانَ مُحَمَّدٌ اَبَااَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ'' اور نماز کے اندر سن کر کسی نمازی نے درود پڑھا، تو نماز فاسد نہیں ہوگی ☆ اِسی طرح اگر کسی شخص نے شیطان کے بارے قرآن کی کوئی آیت پڑھی، اور نماز کے اندر نمازی نے ''لَـعَـنَـهُ الـلّٰـه '' (اللہ اُس پر لعنت فرمائے) پڑھا، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:99، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

نوٹ: ہم نے مسنون اور دیگر دعاؤں کا ترجمہ بھی لکھ دیا ہے لیکن نماز میں یہ دعائیں صرف عربی میں پڑھی جاسکتی ہیں۔

نمازی کے آگے سے گزرنے کا حکم

سوال:19

ہماری مسجد میں لوگ نمازیوں کے آگے سے بلا تکلف گزر جاتے ہیں ،نمازی کے آگے سے گزرنے کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟، بیان فرمائیں۔

محمد آصف اقبال قادری، گلبہار 2 کراچی

جواب:

حالتِ نماز میں نمازی کے آگے سے گزرنے والے کے بارے میں حدیث پاک میں سخت وعید آئی ہے۔ بسر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ زید بن خالد جہنی نے اُنہیں حضرت

ابو جُہیم انصاری کے پاس یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نمازی کے آگے سے گزرنے والے شخص کے بارے میں کیا سنا ہے؟،

قَالَ أَبُو جُهَيْمٍ :قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: لَوْيَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّيْ مَاذَاعَلَيْهِ، لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِيْنَ خَيْراً لَّهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ ـقَالَ أَبُو النَّضْرِ:لَاأَدْرِيْ قَالَ: أَرْبَعِيْنَ يَوْماً ،أَوْشَهْراً ،أَوْسَنَةً؟ـ

ترجمہ:’’حضرت ابو جُہیم نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والا یہ جان لے کہ اس پر کیا گناہ ہے؟،تو (وہ سوچتا کہ) نمازی کے آگے سے گزرنے کی بہ نسبت اُس کے لئے چالیس تک کھڑے رہ کر (انتظار کرنا) بہتر ہوتا۔ ابوالنضر کہتے ہیں :میں نہیں جانتا(یعنی مجھے یاد نہیں رہا) ،بُسر نے چالیس دن کہا تھا، چالیس ماہ یا چالیس سال،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:1019)‘‘۔

لیکن اگر ہم چالیس دن بھی نہیں بلکہ چالیس گھنٹے یا اُس سے بھی کم چالیس منٹ مراد لیں،تو بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنا شریعت کی نظر میں کتنا ناپسندیدہ فعل ہے۔

نمازی کے آگے کسی ایسی چیز کا ہونا جو نمازی کے لئے آڑ بن جائے اور نمازی کے سامنے یا آگے سے گزرنے والا گنہگار نہ ہو،اُسے فقہی اصطلاح میں ’’سُترہ‘‘ کہتے ہیں۔سُترہ کی مقدار لمبائی میں ایک ہاتھ سے تین ہاتھ کے برابر ہو اور موٹائی کم ازکم ایک انگلی کے برابر ہو۔ چھوٹی مسجد میں نمازی کے آگے دیوارِ محراب تک بغیر سُترہ کے کسی کو نہیں گزرنا چاہئے ،بڑی مسجد میں نمازی کے مقامِ سجدہ سے دو یا تین صفوں کا فاصلہ چھوڑ کر گزر سکتے ہیں۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَلَوْ مَرَّمَارٌّ فِيْ مَوْضِعِ سُجُوْدِهٖ لَاتَفْسُدُ وَإِنْ أَثِمَ، وَتَكَلَّمُوْا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِيْ يُكْرَهُ الْمُرُوْرُ فِيْهِ، وَالْأَصَحُّ أَنَّهٗ مَوْضِعُ صَلَاتِهٖ مِنْ قَدَمِهٖ إِلٰى مَوْضِعِ سُجُوْدِهٖ، كَذَا فِي "التَّبْيِيْنِ"،قَالَ مَشَايِخُنَا إِذَا صَلّٰى رَامِيًا بَصَرَهٗ إِلٰى مَوْضِعِ سُجُوْدِهٖ فَلَمْ يَقَعْ بَصَرُهٗ عَلَيْهِ لَمْ يُكْرَهْ وَهُوَ الصَّحِيْحُ، كَذَا فِي الْخُلَاصَةِ،وَهُوَ الْأَصَحُّ، كَذَا فِيْ

"اَلْبَدَائِعِ"،وَھُوَ الْاَشْبَهُ اِلَی الصَّوَابِ ،کَذَافِی "النِّھَایَةِ"،ھٰذَاحُکْمُ الصَّحْرَاءِ فَاِنْ کَانَ فِی الْمَسْجِدِ اِنْ کَانَ بَیْنَھُمَا حَائِلٌ کَاِنْسَانٍ اَوْ اُسْطُوَانَةٍ لَایُکْرَهُ، وَاِنْ لَّمْ یَکُنْ بَیْنَھُمَا حَائِلٌ وَالْمَسْجِدُ صَغِیْرٌ کُرِهَ فِیْ اَیِّ مَکَانٍ کَانَ وَالْمَسْجِدُالْکَبِیْرُ کَالصَّحْرَاءِ ،کَذَا فِی "الْکَافِی" ۔

ترجمہ:''اگر کوئی شخص نمازی کی سجدہ گاہ کے آگے سے گزرا تو نماز فاسد نہیں ہوگی ،اگر چہ وہ (یعنی گزرنے والا) گنہگار ہوگا۔نمازی کے آگے جس جگہ سے گزرنا مکروہ ہے،اُس کی حد کے بارے میں فقہاء کرام نے کلام کیا ہے(یعنی اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں)، زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ جگہ نمازی کے قدم سے لے کر اس کی سجدہ گاہ تک ہے،جیسا کہ''تبیین الحقائق'' میں ہے۔ہمارے مشائخ نے کہا ہے کہ جب کسی نمازی کی نظر سجدہ گاہ پر ہو اور (سامنے سے گزرنے والے پر) اس کی نظر نہ پڑے،تو اتنے فاصلے سے،نمازی کے آگے سے گزرنا مکروہ نہیں ہے،اور یہی صحیح ہے،جیسا کہ''خلاصۃ الفتاویٰ''میں ہے،''بدائع الصنائع''میں ہے کہ یہ زیادہ صحیح قول ہے،''نہایہ''میں اسی قول کو صواب (درستی) کے زیادہ مشابہ فرمایا ہے۔یہ صحرا (یعنی کھلے میدان میں نمازی کے آگے سے گزرنے) کا حکم ہے،لیکن اگر نمازی مسجد میں ہے اور نمازی اور گزرنے والے کے درمیان کوئی انسان یا ستون کی طرح کی کوئی چیز حائل ہے،تو گزرنا مکروہ نہیں ہے انسان کے حائل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اُس سے اگلی صف میں کوئی دوسرا نمازی اُس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھا ہو،اور اگر نمازی اور گزرنے والے کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو اور مسجد چھوٹی ہے تو اُس کے سامنے جہاں سے بھی وہ گزرے گا، (گزرنا) مکروہ ہوگا اور مسجد کبیر کا حکم صحراء کی طرح ہے،''کافی''میں اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد 1،ص:104،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

یعنی جب نمازی کی نظر سجدہ گاہ پر ہو اور گزرنے والے پر اُس کی نظر نہ پڑتی ہو،تو بڑی مسجد میں اتنے فاصلے سے نمازی کے آگے سے گزرنا مکروہ نہیں ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(وَمُرُوْرُ مَارٍّ فِی الصَّحْرَاءِ اَوْ فِیْ مَسْجِدٍ کَبِیْرٍ

بِمَوْضِعِ سُجُوْدِهٖ) فِي الْاَصَحِّ (أَوْ) مُرُوْرُهٗ (بَيْنَ يَدَيْهِ) اِلٰى حَائِطِ الْقِبْلَةِ (فِيْ) بَيْتٍ وَّ(مَسْجِدٍ) صَغِيْرٍ ،فَاِنَّهٗ كَبُقْعَةٍ وَّاحِدَةٍ،

ترجمہ:''صحراء اور بڑی مسجد میں نمازی کے آگے اس کی سجدہ گاہ سے (سُترہ کے بغیر) گزرنا مکروہ ہے، یہی قول زیادہ صحیح ہے، مسجد صغیر اور گھر میں نمازی اور دیوار قبلہ کے درمیان گزرنا مطلقاً مکروہ ہے۔گھر اور چھوٹی مسجد ایک قطعۂ زمین کی مثل ہیں۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: هُوَ مَا اخْتَارَهٗ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ "وَقَاضِيْ خَانْ" وَصَاحِبُ "الْهِدَايَةِ" وَاسْتَحْسَنَهٗ فِي "الْمُحِيْطِ" وَصَحَّحَهُ الزَّيْلَعِيُّ،

ترجمہ:''اسی قول کو شمس الائمہ، علامہ قاضی خان اور صاحبِ ہدایہ نے مختار اور صاحبِ ''محیط'' نے مستحسن اور ''زیلعی'' نے صحیح قرار دیا ہے''۔۔۔۔۔۔۔آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں: یہ حکم اس پر محمول ہے کہ نمازی کے آگے کوئی سُترہ نہ ہو اور اگر سُترہ ہے تو چھوٹی مسجد یا مکان میں بھی نمازی کے آگے سے گزرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔مسجدِ صغیر کی تعریف میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: مَسْجِدٌ صَغِيْرٌ هُوَ أَقَلُّ مِنْ سِتِّيْنَ ذِرَاعًا وَّقِيْلَ مِنْ اَرْبَعِيْنَ وَهُوَ الْمُخْتَارُ۔

ترجمہ:''مسجدِ صغیر جو ساٹھ ذراع (تیس مروّجہ گز) سے کم ہو اور ایک قول یہ ہے کہ جو چالیس ذراع (بیس مروّجہ گز) سے کم ہو''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 342-343، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ غلام رسول سعیدی ان حوالوں کی بابت لکھتے ہیں:

''اس کا مفاد یہ ہے کہ جس مسجد کا طول اور عرض بیس یا تیس گز سے کم ہو، وہ مسجدِ صغیر ہے، اس میں اگر نمازی بغیر سُترہ کے نماز پڑھ رہا ہو تو نمازی اور دیوارِ قبلہ کے درمیان گزرنا مطلقاً مکروہ ہے۔اور اگر مسجد کا طول اور عرض بیس یا تیس گز سے زیادہ ہو تو نمازی کی سجدہ گاہ سے دو یا تین صف کے فاصلہ سے بغیر سترہ کے بھی گزرنا بلاکراہت جائز ہے، کیونکہ اگر نمازی خشوع سے نماز پڑھ رہا ہو (یعنی یہ کہ اُس کی نظر سجدہ گاہ پر ہو) تو اُس کو اِتنے فاصلے سے

گزرنے والا نظر نہیں آئے گا۔آج کل شہر کی مساجد عموماً تیس گز سے بڑی ہوتی ہیں اس لئے ان میں نمازی کے آگے سے دوصفوں کے بعد گزرنا جائز ہے"۔

(شرح صحیح مسلم،جلد 1،ص:1326-1325)

مساجد میں عام طور پر جماعت ختم ہونے کے بعد جلد بازی میں نکلنے والے نمازی اس مسئلے میں احتیاط نہیں کرتے ،اسی طرح سے باہر سے آنے والے نمازی بھی عام طور پر احتیاط سے کام نہیں لیتے ،حالانکہ اس مسئلے میں زیادہ مشقت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ توجہ اور احتیاط کی ضرورت ہے۔نمازیوں کو اس حوالے سے حدیثِ پاک میں بیان کی گئی وعید پر توجہ دینا چاہئے۔

قضائے عمری ادا کرنے کا طریقہ

سوال:20

نماز قضائے عمری ادا کرنے کا شریعت میں کیا طریقہ ہے؟۔

سائل:جہانگیر عالم،کراچی

جواب:

قضا نمازوں کی ادائیگی فرض ہے،غزوۂ احزاب میں کفارِ مکہ کے شدید حملے کی وجہ سے چند نمازیں رہ گئیں تو رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے ساتھ قضا نمازوں کو باجماعت ادا فرمایا۔عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں:

اِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ شَغَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ أَرْبعِ صَلواتٍ يَومَ الخندَقِ، حَتّٰى ذَهَبَ مِنَ الَّيْلِ مَاشَاءَ اللّٰهُ: فَأَمَرَ بِلالاً فَأَذَّنَ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ،ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ،ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْمَغْرِبَ،ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعِشَاءَ۔

ترجمہ:"غزوۂ خندق کے دن رسول اللہ ﷺ کی چار نمازیں مشرکین (کے محاصرے) کی وجہ سے جاتی رہیں،یہاں تک کہ رات کا کچھ حصہ گزرگیا،پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا،اُنہوں نے اذان دی اور پھر اقامت کہی تو،رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی،پھر اقامت کہی تو عصر کی نماز پڑھائی،پھر اقامت کہی تو مغرب کی نماز

پڑھائی، پھر اقامت کہی تو عشاء کی نماز پڑھائی"۔
(سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 179، مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 3555 واللفظ من سنن الترمذی)
ڈاکٹر وھبہ زوحیلی لکھتے ہیں: وَمَنْ شَغَلَتْ ذِمَّتَهُ بِأَيِّ تَكْلِيفٍ لَا تَبْرَأُ إِلَّا بِتَفْرِيغِهَا أَدَاءً أَوْ قَضَاءً، لِقَوْلِهِ ﷺ: "فَدَيْنُ اللهِ أَحَقُّ أَنْ يُقْضَى"، فَمَنْ وَجَبَتْ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ، وَفَاتَتْهُ بِفَوَاتِ الْوَقْتِ الْمُخَصَّصِ لَهَا، لَزِمَهُ قَضَاؤُهَا فَهُوَ اٰثِمٌ بِتَرْكِهَا عَمْدًا، وَالْقَضَاءُ عَلَيْهِ وَاجِبٌ، لِقَوْلِهِ ﷺ: فَإِذَا رَقَدَ أَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ أَوْ غَفَلَ عَنْهَا، فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُوْلُ: "وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ"، (طٰه: ٢٠/١٤) وَلِلْبُخَارِيِّ: "مَنْ نَسِيَ صَلٰوةً فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذَالِكَ" وَمَجْمُوْعُ الْحَدِيْثِ الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ بَيْنَ الْبُخَارِيِّ وَمُسْلِمٍ: "مَنْ نَامَ عَنْ صَلٰوةٍ أَوْ نَسِيَهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا" فَمَنْ فَاتَتْهُ الصَّلٰوةُ لِنَوْمٍ أَوْ نِسْيَانٍ قَضَاهَا، وَبِالْأَوْلٰى مَنْ فَاتَتْهُ عَمَدًا بِتَقْصِيْرٍ يَجِبُ عَلَيْهِ قَضَاؤُهَا۔
ترجمہ: "کسی بھی مشکل کے سبب فرض نماز بروقت ادا نہ کر سکے تو جب تک ادا یا قضا کی صورت میں اداءِ فرض نہ کرے، آخرت کی جوابدہی سے بری الذمہ نہیں ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: فَدَيْنُ اللّٰهِ اَحَقُّ اَنْ يُّقْضٰى، (ترجمہ: "اللہ کا قرض (یعنی فریضہ) ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے، صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1953)، تو جس پر نماز فرض ہے اگر اُس نے اُسے مقررہ وقت پر ادا نہ کیا ہو تو اس کی قضا لازم ہے اور دانستہ ترک کرنے پر گنہگار اور فاسق وفاجر ہوگا اور اس پر قضا بہر حال واجب ہوگی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: فَاِذَا رَقَدَ اَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ اَوْ غَفَلَ عَنْهَا، فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا، فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُوْلُ: "وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ، طٰہٰ: 14" ترجمہ: پس جب تم میں سے کسی کی نماز سوتے میں یا غفلت سے رہ جائے، تو جب بھی یاد آئے ادا کرلے، کیونکہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے: "میری یاد کے لئے نماز پڑھو"۔
(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1454)

اور صحیح بخاری میں ہے: مَنْ نَسِیَ صَلٰوۃً فَلْیُصَلِّهَا اِذَا ذَکَرَهَا، لَاکَفَّارَةَ لَهَا اِلَّا ذَالِكَ (ترجمہ: جس کی نماز بھولے سے رہ جائے، تو جیسے ہی اسے یاد آئے، پڑھ لے، اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 597)''، اور صحیحین میں حدیث ہے: مَنْ نَامَ عَنْ صَلٰوۃٍ اَوْنَسِیَهَا فَلْیُصَلِّهَا اِذَا ذَکَرَهَا، (ترجمہ: جس کی نماز نیند کے سبب یا بھولے سے رہ جائے تو جوں ہی یاد آئے، پڑھ لے)''۔ تو جب نیند یا نسیان کے سبب قضا لازم ہے تو اگر کوئی شخص دانستہ کوتاہی کر کے نماز مقررہ وقت پر نہ پڑھے تو اس کی قضا بطریق اولیٰ لازم ہوگی''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد 2، ص: 1148)

قضا نمازیں مکروہ اوقات (طلوعِ آفتاب، زوال (نصف النہار) اور غروبِ آفتاب) کے علاوہ جب بھی فرصت ملے، ادا کرتے رہنا چاہئے اور ہر وقت کی نماز کے ساتھ یعنی وقتی نماز سے پہلے یا بعد میں اس وقت کی نماز کی کم از کم ایک قضا پڑھ لیں اور نیت اس طرح کریں مثلاً فجر یا ظہر یا عصر یا مغرب یا عشاء اور وتر کی پہلی یا آخری نماز جو میرے ذمے باقی ہے، اُسے بطور قضا ادا کرتا ہوں۔ نیت زبانی کرنا ضروری نہیں ہے، دل میں ارادہ کافی ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قضا نماز کے بارے میں واضح تاکیدات نہیں ہیں، تو اُس کا سبب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابۂ کرام کے بارے میں ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ بلا عذر دانستہ نماز قضا کر دیتے ہوں، جن دو صورتوں (یعنی نیند یا غفلت) کا بشری تقاضے کے تحت وقوع کا امکان تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کا حکم مذکورہ بالا احادیث میں واضح طور پر بیان فرما دیا۔ اور ایک صورت (یعنی حالتِ جنگ میں دشمن کا خوف) جو خود آپ کو صحابۂ کرام سمیت غزوۂ خندق میں پیش آئی، تو اُس میں آپ نے با جماعت قضا نماز پڑھی، لہٰذا خود آپ کے عمل سے قضا نماز پڑھنا ثابت ہے۔

''قضاءِ عمری'' عوام کی اصطلاح ہے یہ کوئی شرعی یا فقہی اصطلاح نہیں ہے۔ تاہم اس کے جو معنی ظاہری طور پر سمجھ میں آتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ کسی کی عمر بھر کی نمازیں خدانخواستہ قضا ہوگئی

ہوں۔شریعت میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ کسی خاص دن یا خاص موقع پر کوئی خاص نماز پڑھ لی جائے تو اس سے عمر بھر کی قضا نمازوں کی تلافی ہو جائے گی، یہ محض جاہلانہ سوچ ہے۔ انسان کے عاقل وبالغ ہونے کے بعد جب سے اس پر نماز فرض ہوئی ہے، وہ جو بھی نمازیں وقت پر ادا نہیں کر سکا، وہ سب اس کے ذمے باقی ہیں اور ان سب کی قضا لازم ہے۔ قضا پڑھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اپنی اس غفلت اور کوتاہی پر توبہ کرتے رہنا چاہئے، کیونکہ ایک بھی فرض نماز کسی عذر کے بغیر جان بوجھ کر چھوڑ دینا گناہِ کبیرہ ہے۔ پانچوں فرض نمازوں کی قضا فرض اور وتر کی قضا واجب ہے، سنتوں کی قضا واجب نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَالْقَضَاءُ فَرْضٌ فِي الْفَرْضِ وَوَاجِبٌ فِي الْوَاجِبِ وَسُنَّةٌ فِي السُّنَةِ،

ترجمہ:''فرض (نماز) کی قضاء فرض ہے اور واجب کی قضاء واجب ہے اور سنت کی قضاء سنت ہے (یعنی واجب نہیں ہے)، (عالمگیری، جلد:1، ص:121)۔

البتہ اگر کسی دن کسی کی فجر کی نماز قضا ہوگئی ہو تو اسی دن اشراق کے وقت (یعنی سورج نکلنے کے بیس منٹ بعد) قضا پڑھنے کی صورت میں اس دن کی فجر کی سنتوں کی قضا بھی کر لینی چاہئے، کیونکہ فجر کی سنتوں کی تاکید سب سے زیادہ آئی ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَالسُّنَنُ اٰكَدُهَا سُنَّةُ الْفَجْرِ اِتِّفَاقًا، ترجمہ:''فجر کی سنتوں کی تاکید سب سے زیادہ ہے، اس پر ائمہ کا اتفاق ہے۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: لِمَا فِي الصَّحِيْحَيْنِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا: لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ عَلٰى شَيْءٍ مِّنَ النَّوَافِلِ أَشَدَّ مِنْهُ تَعَاهُدًا عَلٰى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ وَفِي "مُسْلِمٍ"، "رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا"، وَفِي "أَبِيْ دَاؤدَ" لَاتَدَعُوْا رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ وَلَوْ طَرَدَتْكُمُ الْخَيْلُ"۔

ترجمہ: کیونکہ صحیحین میں ہے:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:''نبی ﷺ نوافل میں کسی قسم کے نوافل کی اتنی سختی سے پابندی نہیں فرماتے تھے، جتنی کہ فجر کی دو سنتوں کی فرماتے تھے (بخاری:1169، مسلم:724)۔ اور صحیح مسلم میں ہے:''فجر کی دو سنتیں دنیا وما فیہا سے بہتر ہیں''، اور سنن ابوداؤد، جلد:1، ص:187 میں ہے:''خواہ تمہیں (دشمن کے)

گھوڑے روندیں فجر کی دوسنتوں کو نہ چھوڑو، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:2،ص:394)''۔

قضاء نمازیں زیادہ ہوں تو تسبیحات میں تخفیف

سوال: 21

اگر کسی شخص کے ذمے قضاء نمازیں بہت زیادہ ہوں تو اُن نمازوں کی جلد ادائیگی کے لئے نماز میں کوئی تخفیف کی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

فرض کی پچھلی دو (تیسری اور چوتھی) رکعات میں قراءت فرض یا واجب نہیں ہے، لہٰذا اگر نمازی کچھ بھی نہ پڑھے اور ایک تسبیح (سبحان اللہ) کی مقدار سکوت اختیار کر کے کھڑا رہے یا محض ایک بار ''سبحان اللہ'' پڑھے یا ایک دو آیات (مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ) تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔ اگر قضا نمازوں کی تعداد بہت زیادہ ہو تو قراءت اور تسبیحات میں تخفیف کر سکتے ہیں، یعنی رکوع وسجود میں ایک تسبیح پر اکتفا کر لیں، لیکن اسے عام معمول ہرگز نہ بنایا جائے، معمول کی نمازیں سنت کے مطابق پڑھی جائیں اور ان میں فرائض، واجبات، سُنن اور مستحبات وآداب کی رعایت کی جائے۔ اسی طرح وتر میں دعاءِ قنوت کی جگہ ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ'' پڑھ لے اور ''قعدۂ اخیرہ'' میں مکمل درود ودعا کی جگہ ''اَللّٰھُمَّ صل علیٰ محمد'' پڑھ لے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''قضا ہر روز کی نماز کی فقط بیس رکعتوں کی ہوتی ہے، دو فرض فجر کے، چار ظہر، چار عصر، تین مغرب، چار عشا کے، تین وتر۔ اور قضا میں یُوں نیت کرنی ضرور ہے کہ نیت کی میں نے پہلی فجر جو مجھ سے قضا ہوئی یا پہلی ظہر جو مجھ سے قضا ہوئی، اسی طرح ہمیشہ ہر نماز میں کیا کرے، اور جس پر قضا نمازیں بہت کثرت سے ہیں وہ آسانی کے لئے اگر یوں بھی ادا کرے تو جائز ہے کہ ہر رکوع اور ہر سجدہ میں تین تین بار سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم، سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کی جگہ صرف ایک بار کہے، مگر یہ ہمیشہ ہر طرح کی نماز میں یاد رکھنا چاہئے کہ جب آدمی

رکوع میں پورا پہنچ جائے اس وقت سبحان کا سین شروع کرے اور جب عظیم کا میم ختم کرے اُس وقت رکوع سے سر اٹھائے اسی طرح جب سجدوں میں پورا پہنچ جائے، اُس وقت تسبیح شروع کرے اور جب پوری تسبیح ختم کر لے اُس وقت سجدہ سے سر اٹھائے۔ بہت سے لوگ جو رکوع سجدہ میں آتے جاتے یہ تسبیح پڑھتے ہیں بہت غلطی کرتے ہیں۔ایک تخفیف کثرت قضا والوں کی یہ ہوسکتی ہے، دوسری تخفیف یہ کہ فرضوں کی تیسری اور چوتھی رکعت میں الحمد شریف کی جگہ فقط سبحان اللہ، سبحان اللہ، سبحان اللہ تین بار کہہ کر رکوع میں چلے جائیں مگر وہی خیال یہاں بھی ضرور ہے کہ سیدھے کھڑے ہو کر سبحان اللہ شروع کریں اور سبحان اللہ پورے کھڑے کہہ کر رکوع کے لئے سر جھکائیں۔ یہ تخفیف فقط فرضوں کی تیسری چوتھی رکعت میں ہے وتروں کی تینوں رکعتوں میں الحمد اور سورت دونوں ضرور پڑھی جائیں۔ تیسری تخفیف پچھلی التحیات کے بعد دونوں درودوں اور دعا کی جگہ صرف اَللّٰھُمَّ صل علی محمد و الہ کہہ کر سلام پھیر دیں۔چوتھی تخفیف وتروں کی تیسری رکعت میں دعائے قنوت کی جگہ اللہ اکبر کہہ کر فقط ایک یا تین بار رَبِّ اغْفِرْلِی کہے"۔

(فتاوی رضویہ، جلد:08،ص:185،مطبوعہ:رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نماز کی رکعات میں تخفیف کس صورت میں جائز ہے

سوال:22

عشاء کی نماز میں اکثر لوگ چار فرض، دو سنت اور تین وتر پڑھتے ہیں، یہ کس صورت میں جائز ہے؟۔

جواب:

نمازِ عشاء کی ابتدائی چار رکعات سنّتِ غیر مؤکدہ اور چار رکعت فرض کے بعد دو سنت اور دو نفل، تین وتر اور پھر دو نفل، کل 17 رکعات پڑھی جاتی ہیں۔بعض سنتیں مؤکدہ ہیں جن کی ادائیگی کی تاکید آئی ہے، بغیر کسی عذر کے چھوڑنے پر گنہگار اور ترک کی عادت پر مستحق عذاب ہے۔

سنتِ غیرِ مؤکّدہ (جنہیں "سننِ الزوائد" بھی کہتے ہیں) پر شریعت میں اس قدر تاکید نہیں آئی۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے وہ درست ہے، یعنی اس پر کسی کو ملامت نہیں کرنی چاہئے، تاہم سُنَنِ غیرِ مؤکدہ اور نوافل پڑھنے پر جو اجر اور برکات ہیں ان سے محروم رہے گا۔

نمازِ جمعہ میں فرض کے بعد بقیہ رکعات کی ادائیگی بھی ضروری ہے

سوال: 23

نمازِ جمعہ میں اکثر لوگ دو فرض باجماعت ادا کر کے چلے جاتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟۔

جواب:

نمازِ جمعہ میں فرض کی ادائیگی کے ساتھ سُننِ مؤکدہ بھی ادا کرنی چاہئیں، سوائے اس کے کہ کبھی کوئی ہنگامی صورتِ حال درپیش ہو، مثلاً بس، ٹرین یا فلائٹ کی روانگی کا وقت ہے یا کسی مریض کو ہنگامی طور پر ہسپتال پہنچانا ہے، وغیرہ۔ نمازِ جمعہ میں دو رکعت فرض کے علاوہ آٹھ رکعات (چار رکعات فرض سے قبل اور چار رکعات فرض کے بعد) سنت مؤکدہ ہیں۔ اور جمعہ کے بعد کی چار رکعات کے بعد دو رکعات سنت غیر مؤکدہ ہیں اور اس کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا مستحب ہے۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ كَانَ النَّبِیُّ ﷺ يَرْكَعُ قَبْلَ الْجُمُعَةِ اَرْبَعًا لَا يَفْصِلُ فِیْ شَیْءٍ مِنْهُنَّ،

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جمعہ سے پہلے ایک سلام کے ساتھ چار رکعت پڑھتے تھے، (ابن ماجہ: 1129، مجمع الزوائد: 195/2)"۔

عَنْ اَبِیْ اَيُّوْبَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّیْ قَبْلَ الظُّهْرِ اَرْبَعًا اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ۔ لَا يَفْصِلُ بَيْنَهُنَّ بِتَسْلِيْمٍ، وَقَالَ اِنَّ اَبْوَابَ السَّمَآءِ تُفْتَحُ اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ۔

ترجمہ: "حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: سورج ڈھلنے کے بعد رسول اللہ ﷺ چار رکعات ادا فرماتے اور اُن (چار رکعات) کے درمیان سلام نہ ہوتا (یعنی ایک سلام سے چار رکعات ادا فرماتے) اور آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک جب سورج ڈھلتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، (سنن ابن ماجہ: 1157)"۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ السَّائِبِ أنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي أرْبَعًا بَعْدَ أنْ تَزُوْلَ الشَّمْسُ قَبْلَ الظُّهْرِ وَقَالَ: اِنَّهَا سَاعَةٌ تُفْتَحُ فِيْهَا أبْوَابُ السَّمَآءِ وَأُحِبُّ أنْ يَصْعَدَ لِيْ فِيْهَا عَمَلٌ صَالِحٌ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن سائب بیان فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ زوال کے بعد چار رکعات پڑھتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ (ایک مبارک) گھڑی ہے، اس میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، تو میں چاہتا ہوں کہ اس میں میرا نیک عمل عالَم بالا میں جائے، (سنن ترمذی:478)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت ہیں اور جمعہ کے بعد چھ رکعت سنت ہیں بایں طور کہ چار رکعت کے بعد سلام پھیر کر دو رکعت سنت پڑھی جائیں حسب ذیل احادیث سے جمعہ کی سنتوں پر استدلال کیا جاتا ہے:

عَنْ قَتَادَةَ أنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ كَانَ يُصَلِّي قَبْلَ الْجُمُعَةِ أرْبَعَ رَكَعَاتٍ وَبَعْدَهَا أرْبَعَ رَكَعَاتٍ قَالَ أبُوْ اِسْحَاقَ وَكَانَ عَلِيٌّ يُصَلِّي بَعْدَ الْجُمُعَةِ سِتَّ رَكَعَاتٍ۔

ترجمہ:''قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے ابواسحاق کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جمعہ کے بعد چھ رکعت پڑھتے تھے''۔

(امام عبدالرزاق بن ہمام، متوفی 211ھ المصنف، جلد:3، ص:247)

عَنْ أبِيْ عَبْدِالرَّحْمَانِ السُّلَمِيِّ قَالَ: كَانَ عَبْدُاللّٰهِ يَأمُرُنَا أنْ نُصَلِّيَ قَبْلَ الْجُمُعَةِ اَرْبَعًا وَّبَعْدَهَا اَرْبَعًا حَتّٰى جَاءَ نَا عَلِيٌّ فَأمَرَنَا اَنْ نُصَلِّيَ بَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ اَرْبَعًا۔

ترجمہ:''ابوعبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیں جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار سنتیں پڑھنے کا حکم دیتے حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور ہمیں حکم دیا کہ جمعہ کے بعد پہلے دو اور پھر چار سنتیں پڑھیں، (امام عبدالرزاق بن ہمام، متوفی 211ھ المصنف

جلد:3،ص:247،مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت الطبعۃ الاولیٰ 1390ھ)''۔

وَفِیْ حَدِیْثِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا، اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَتَطَوَّعُ قَبْلَ الْجُمُعَةِ اَرْبَعَ رَکَعَاتٍ وَاخْتَلَفُوْا بَعْدَھَا، قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ: اَرْبَعًا وَبِہٖ اَخَذَ اَبُوْ حَنِیْفَةَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَھُمَا اللّٰہُ تَعَالٰی لِحَدِیْثِ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: مَنْ کَانَ مُصَلِّیًا بَعْدَ الْجُمُعَةِ فَلْیُصَلِّ اَرْبَعَ رَکَعَاتٍ، وَقَالَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یُصَلِّیْ بَعْدَھَا سِتًّا، اَرْبَعًا ثُمَّ رَکْعَتَیْنِ، وَبِہٖ اَخَذَ اَبُوْ یُوْسُفَ رَحِمَہُ اللّٰہُ،وَقَالَ عُمَرُ رَکْعَتَیْنِ، ثُمَّ اَرْبَعًا، فَمِنَ النَّاسِ مَنْ رَجَّحَ قَوْلَ عُمَرَ بِالْقِیَاسِ عَلَی التَّطَوُّعِ بَعْدَ الظُّھْرِ، وَاَبُوْ یُوْسُفَ رَحِمَہُ اللّٰہُ اَخَذَ بِقَوْلِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، فَقَالَ یَبْدَءُ بِالْاَرْبَعِ لِکَیْلَا یَکُوْنَ مُتَطَوِّعًا بَعْدَ الْفَرْضِ مِثْلَھَا۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے اور جمعہ کے بعد کی سنتوں میں اختلاف ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ چار رکعت کہتے تھے،امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا اسی پر عمل ہے، کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے بعد نماز پڑھے، وہ چار رکعت پڑھے۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جمعہ کے بعد چھ رکعات نماز پڑھتے تھے، پہلے چار رکعات اس کے بعد دو رکعات، امام ابو یوسف کا اسی پر عمل ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے دو اور پھر چار رکعات نماز پڑھتے تھے۔بعض علماء نے ظہر کے بعد کی سنتوں پر قیاس کرتے ہوئے حضرت عمر کے قول کو ترجیح دی اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی اور کہا کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعت پڑھے تا کہ ایک فرض کے بعد اس کی مثل نفل پڑھنا لازم نہ آئے، (علامہ شمس الدین بن محمد بن احمد متوفی:483،المبسوط جلد:1،ص:157،مطبوعہ: دارالمعرفت بیروت)''۔

ہر چند کہ علامہ سرخسی نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت علی نے جمعہ کے بعد پہلے چار اور پھر دو رکعات پڑھیں، لیکن ہم نے جب کتب حدیث کا تتبع کیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جو روایات سامنے آئیں ان میں پہلے دو رکعات اور پھر چار رکعات کا ذکر ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں اس طرح کی متعدد روایات ہیں، ہم نے ایک کا ذکر کر دیا ہے دیگر کتب حدیث سے مزید احادیث ملاحظہ فرمائیں:

عَنْ عَطَاءٍ قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا صَلَّى الْجُمُعَةَ صَلَّى بَعْدَهَا سِتَّ رَكَعَاتٍ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ أَرْبَعًا۔

ترجمہ: عطاء کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جمعہ کے بعد چھ رکعات پڑھتے تھے پہلے دو رکعات پھر چار رکعات، (حافظ ابو بکر بن ابی شیبہ متوفی: 235ھ، المصنف، جلد: 2 ص: 132، مطبوعہ: ادارۃ القرآن، کراچی)۔

عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّهُ أَمَرَأَنْ يُصَلِّيَ بَعْدَالْجُمُعَةِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ أَرْبَعًا۔

ترجمہ: ''حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جمعہ کے بعد پہلے دو رکعتیں پڑھی جائیں پھر چار، (امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفی: 279ھ، جامع ترمذی، ص: 101، مطبوعہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)۔

رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يُصَلِّيْ بَعْدَالْجُمُعَةِ رَكْعَتَيْنِ فِيْ بَيْتِهِ وَابْنُ عُمَرَ بَعْدَالنَّبِيِّ ﷺ صَلَّى فِي الْمَسْجِدِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَيْنِ وَصَلَّى بَعْدَ الرَّكْعَتَيْنِ أَرْبَعًا۔

ترجمہ: ''نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ جمعہ کے بعد اپنے گھر میں دو رکعات پڑھتے تھے اور نبی ﷺ کے بعد حضرت ابن عمر جمعہ کے بعد مسجد میں پہلے دو رکعات پڑھتے پھر چار، (امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفی: 279ھ، جامع ترمذی، ص: 101)''۔

عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنْ عَطَاءٍ قَالَ أَبُوْ إِسْحٰقَ حَدَّثَنِيْ غَيْرَ مَرَّةٍ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ قَامَ فَصَلَّى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ۔

ترجمہ: ''عطاء نے روایت کیا کہ ابو اسحاق نے ایک سے زائد بار مجھ سے بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عمر کے ساتھ جمعہ کے دن نماز پڑھی، پس جب انہوں نے سلام پھیرا تو کھڑے ہوئے اور دو رکعات پڑھیں، پھر کھڑے ہوئے اور چار رکعات پڑھیں''۔

(امام ابو جعفر طحاوی، متوفی 321ھ شرح معانی الآثار، جلد: 1، ص: 199)

عَنْ أَبِي عَبْدِالرَّحْمانِ السُّلَمِيِّ قَالَ قَدِمَ عَلَيْنَا عَبْدُاللّٰهِ فَكَانَ يُصَلِّيْ بَعْدَالْجُمُعَةِ أَرْبَعًا فَقَدِمَ بَعْدَهُ عَلِيٌّ فَكَانَ اِذَا صَلَّى الْجُمُعَةَ صَلّٰى بَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَاَرْبَعًا۔

ترجمہ: ''عبدالرحمٰن سلمی بیان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس حضرت عبداللہ بن مسعود آئے، وہ جمعہ کے بعد چار سنتیں پڑھتے تھے، ان کے بعد حضرت علی تشریف لائے، تو وہ جب جمعہ پڑھ لیتے تو اس کے بعد پہلے دو رکعات اور پھر چار رکعات (سنتیں) پڑھتے، (امام ابوجعفر طحاوی متوفی 321ھ شرح معانی الآثار، جلد: 1، ص: 199، مطبوعہ: مطبع مجتبائی لاہور)''۔

امام طحاوی نے حضرت ابن عمر اور حضرت علی کی جو روایات ذکر کی ہیں، وہ یہی ہیں کہ جمعہ کے بعد پہلے دو اور پھر چار رکعات پڑھے۔ پھر ذکر کیا ہے کہ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعات پڑھے اور پھر دو، کیونکہ اگر جمعہ کے بعد پہلے دو رکعات پڑھیں تو یہ سنت فرض کے مشابہ ہو جائیں گے، کیونکہ دو رکعات جمعہ فرض ہے، اس کے بعد دو رکعت سنت پڑھی گئیں تو سنت اور فرض مشابہ ہو جائیں گے۔ اس مشابہت کو دور کرنے کیلئے جمعے کے بعد پہلے چار رکعات پڑھے اور پھر دو رکعات۔ لیکن علامہ شمس الدین سرخسی نے اس دلیل کو رد کر دیا ہے فرماتے ہیں: وَهٰذَا لَيْسَ بِقَوِيٍّ فَاِنَّ الْجُمُعَةَ بِمَنْزِلَةِ أَرْبَعِ رَكَعَاتٍ لِاَنَّ الْخُطْبَةَ شَطْرُ الصَّلٰوةِ۔

ترجمہ: ''امام ابو یوسف کی یہ دلیل قوی نہیں ہے، کیونکہ نماز جمعہ چار رکعات کے حکم میں ہے، اس لئے کہ خطبہ نصف نماز ہے، (المبسوط، جلد: 1، ص: 157، مطبوعہ: دارالمعرفۃ بیروت)''۔

بہر حال ہمارے فقہاء نے امام ابو یوسف کے قول کو ترجیح دی ہے۔ علامہ ابن نجیم نے ذخیرہ، تجنیس، بدائع اور منیۃ المصلی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعات اور پھر دو رکعات نماز پڑھے، (البحر الرائق، جلد: 2، ص: 49، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ)''۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ علامہ شمس الدین نے حضرت علی سے جو پہلے چار اور پھر دو رکعات نماز کو روایت کیا ہے، اس میں ان سے تسامح ہوا ہے، کیونکہ تمام اُمّہات کتب حدیث میں حضرت علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جمعہ کے بعد پہلے دو رکعات اور پھر چار رکعات کی

روایت ہے۔اور دوسری بات یہ ہے کہ جب بقول علامہ سرخسی امام ابو یوسف کی دلیل قوی نہیں ہے،تو آثارِ صحابہ کے مطابق جمعہ کے بعد پہلے دو رکعات اور پھر چار رکعات نماز پڑھنی چاہیے۔

علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ مالکیہ، حنابلہ اور بعض اصحاب شافعی جمعہ سے پہلے سنت پڑھنے کے قائل نہیں ہیں، کیونکہ وہ جمعہ کو عید پر قیاس کرتے ہیں اور جس طرح عید سے پہلے نماز نہیں ہے، جمعہ سے پہلے بھی نہیں ہے، (زاد المعاد، جلد: 1، ص: 119، 118)۔ہم نے اس بحث کے شروع میں جمعہ کی نماز سے پہلے چار رکعات کے ثبوت میں مصنف عبدالرزاق سے دو حدیثیں ذکر کی ہیں، یہ حدیثیں ان حضرات پر حجت ہیں اور ان کے قیاس کے مقابلہ میں حدیث پر عمل کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد: 02، ص: 444 تا 447)۔

آپ نے جن لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ جمعہ کے بعد مسجد میں سنتیں نہیں پڑھتے، اگر یہ لوگ بقیہ رکعتیں اپنے گھروں میں جا کر پڑھتے ہوں تو بہتر ہے۔لیکن اگر سرے سے پڑھتے ہی نہ ہوں اور فقط دو رکعت فرض پر اکتفا کرتے ہوں، تو اُن کا یہ عمل شرعاً درست نہیں ہے۔اور سنتِ مؤکدہ کے ترک کو معمول بنانے پر گنہگار ہوں گے۔سنتِ مؤکدہ کی ادائیگی کی شریعت مطہرہ میں سخت تاکید آئی ہے، بلا عذر سنت مؤکدہ کا چھوڑنا گناہ ہے۔تاہم سنتوں اور نوافل کا گھر پر پڑھنا بہتر ہے، ممکن ہے کہ کچھ لوگ گھر پر پڑھتے ہوں۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَالسُّنَّةُ نَوْعَانِ : سُنَّةُ الْهُدیٰ وَتَرْكُهَا يُوجِبُ اِسَاءَةً وَكَرَاهِيَةً۔

ترجمہ:''سنت کی دو قسمیں ہیں، ایک ''سُنَّتُ الھُدیٰ'' ہے اور اس کا ترک کرنا گناہ اور کراہیت کا سبب بنتا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 1، ص: 196، بیروت)''۔

مزید لکھتے ہیں: قولہ: (وَسُنَّ مُؤَكَّدًا) أَیْ اِسْتِنَانًا مُؤَكَّدًا بِمَعْنٰی أَنَّهُ طَلَبَ طَلَبًا مُؤَكَّدًا زِيَادَةً عَلٰی بَقِيَّةِ النَّوَافِلِ، وَلِهٰذَا كَانَتِ السُّنَّةُ الْمُؤَكَّدَةُ قَرِيْبَةً مِنَ الْوَاجِبِ فِیْ لُحُوْقِ الْاِثْمِ كَمَا فِی "الْبَحْرِ" وَيَسْتَوْجِبُ تَارِكُهَا التَّضْلِيْلَ وَاللَّوْمَ كَمَا فِی "التَّحْرِيْرِ" :أَیْ عَلٰی سَبِيْلِ الْاِصْرَارِ بِلَاعُذْرٍ كَمَا فِیْ شَرْحِهٖ۔

ترجمہ:''علامہ حصکفی کا یہ قول: (تاکید کے ساتھ سنت قرار دیا گیا ہے) یعنی اس کا سنت ہونا

تاکید کے ساتھ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ باقی نوافل کے مقابلے میں شارع علیہ السلام نے زیادہ تاکید کے ساتھ اس کے کرنے کا مطالبہ کیا ہے، لہٰذا سنت مؤکدہ اس معنی میں واجب کے قریب ہے کہ اس کا ترک کرنا گناہ کا سبب ہے، جیسا کہ ''البحر'' میں ہے۔ سنت کا تارک گمراہ قرار دیئے جانے اور ملامت کا سزاوار ہے، جیسا کہ ''التحریر'' میں ہے: یعنی جو سنت کو بلا عذر چھوڑے اور اس کے ترک پر اصرار کرے، جیسا کہ اس کی شرح میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 392، بیروت)

نمازِ شکرانہ کا طریقہ

سوال: 24

نماز شکرانہ کے نفل ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے اور نیت کس طرح ہوگی؟۔

(حامد اکرم، حاجی پورہ، مسلم کالونی سیالکوٹ)

جواب:

اس مسئلے کے مکمل فہم کے لئے پہلے یہ احادیثِ مبارکہ ملاحظہ کریں۔

عَنْ أَبِی ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: "يُصْبِحُ عَلٰی كُلِّ سُلَامٰی مِنْ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ، فَكُلُّ تَسْبِيحَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَحْمِيدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَهْلِيلَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَكْبِيرَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْیٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَيُجْزِئُ مِنْ ذٰلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحٰی،

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب کوئی صبح اٹھتا ہے تو اس کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہوتا ہے، اس کا ہر بار ''سبحان اللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار ''الحمد للہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار ''اللہ اکبر'' کہنا صدقہ ہے، کسی شخص کو نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے، کسی کو برائی سے روک دینا صدقہ ہے اور چاشت کی دو رکعت نماز پڑھ لینا ان سب کے لئے کفایت کرتا ہے''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1670)

"سُلامیٰ" انگلیوں کی ہڈیوں اور ہتھیلی کو کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد پورے بدن کی ہڈیاں اور مَفاصِل (جوڑ,Joints) مراد ہیں۔ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ أَنَّ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ قَالُوْا لِلنَّبِيِّ ﷺ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالْأُجُوْرِ: يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّيْ، وَيَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ، وَيَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ أَمْوَالِهِمْ۔ قَالَ: أَوَ لَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مَا تَصَّدَّقُوْنَ؟إِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةٌ ، وَكُلُّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَفِيْ بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ، قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، أَيَأْتِيْ أَحَدُنَا شَهْوَتَهُ وَيَكُوْنُ لَهُ فِيْهَا أَجْرٌ؟قَالَ: "أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِيْ حَرَامٍ أَكَانَ عَلَيْهِ فِيْهَا وِزْرٌ؟فَكَذٰلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهُ أَجْرٌ"۔

ترجمہ:''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے بعض صحابہ نے آپ سے کہا: یارسول اللہ ﷺ! مالدار لوگ تو (ڈھیروں) ثواب کما گئے ،وہ ہماری طرح (فرض اور نفل) نمازیں پڑھتے ہیں، ہماری طرح روزے رکھتے ہیں اور اپنے زائد مال سے (اللہ کی راہ میں) صدقہ دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بھی صدقات کے اسباب نہیں بنائے؟ ہر بار''سبحان اللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''اللہ اکبر'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''الحمدللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''لا الٰہ الا اللہ'' کہنا صدقہ ہے۔اور نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے اور برائی سے روکنا صدقہ ہے،(جائز طریقے سے) ازدواجی عمل صدقہ ہے۔صحابۂ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنی نفسانی خواہش پوری کرتا ہے، کیا اس میں بھی اس کے لئے اجر ہے؟،آپ ﷺ نے فرمایا: ذرا سوچو! اگر کوئی شخص حرام طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرے،تو کیا اس پر گناہ نہیں ہوگا؟، پس اسی طرح اگر وہ جائز طریقے سے اپنی خواہش پوری کرتا ہے تو اسے اجر ملے گا''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:2218)

عَنْ عَائِشَةَ تَقُوْلُ: إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:" إِنَّهُ خُلِقَ كُلُّ إِنْسَانٍ مِنْ بَنِيْ آدَمَ عَلٰى

سِتِّيْنَ وَثَلَاثِمِائَةِ مَفْصِلٍ: فَمَنْ كَبَّرَاللّٰه، وَحَمِدَاللّٰه، وَهَلَّلَ اللّٰه، وَسَبَّحَ اللّٰه، وَاسْتَغْفَرَاللّٰه، وَعَزَلَ حَجَراً عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ، أَوْ شَوْكَةً أَوْ عَظْمًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ وَأَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ، أَوْ نَهٰى عَنْ مُنْكَرٍ، عَدَدَ تِلْكَ السِّتِّيْنَ وَالثَّلَاثِمِائَةِ السُّلَامىٰ فَإِنَّهٗ يَمْشِيْ يَوْمَئِذٍ وَقَدْ زَحْزَحَ نَفْسَهٗ عَنِ النَّارِ"۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر انسان 360 جوڑوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، پس جس شخص نے ''اَللّٰهُ اَكْبَر'' کہا، ''اَلْحَمْدُلِلّٰه'' کہا، ''لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰه'' کہا، ''سُبْحَانَ اللّٰه'' کہا، ''اَسْتَغْفِرُاللّٰه'' کہا، لوگوں کے راستے سے کوئی پتھر یا کانٹا یا ہڈی ہٹائی اور نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا (اس نے یہ کام مجموعی طور پر) 360 جوڑوں کی تعداد کے برابر کیے، تو اُس دن وہ اس حال میں چل رہا ہوگا کہ اس نے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے آزاد کرلیا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2219)''۔

صحیح مسلم کی حدیث نمبر: 2222 اور 2224 میں مندرجہ ذیل امور کو بھی صدقے سے تعبیر فرمایا گیا ہے:

(الف) ایسا عملِ خیر جو اپنے لئے بھی نفع مند ہو اور دوسروں کو بھی اس کا فائدہ پہنچانا، (ب) مصیبت زدہ کی مدد کرنا، (ج) دو افراد کے درمیان انصاف کرنا، (د) سوار ہونے یا بار برداری میں کسی کی مدد کرنا۔

قَالَ الْقَاضِیْ: يَحْتَمِلُ تَسْمِيَتُهَا صَدَقَةً أَنَّ لَهَا أَجراً كَمَا لِلصَّدَقَةِ أَجْرٌ وَإِنَّ هٰذِهِ الطَّاعَاتِ تُمَاثِلُ الصَّدَقَاتِ فِي الْأُجُوْرِ وَسَمَّاهَاصَدَقَةً عَلٰى طَرِيْقِ الْمُبَالَغَةِ وَتُجْنِيْسِ الْكَلَامِ وَقِيْلَ مَعْنَاهُ أَنَّهَا صَدَقَةٌ عَلٰى نَفْسِه۔

ترجمہ: ''قاضی عیاض نے کہا: ان (تسبیحات اور دیگر امور) کو ''صدقہ'' سے تعبیر کرنے کا ایک سبب یہ ہے کہ جس طرح صدقے کے لئے اجر ہے، اسی طرح اِن امور کے لئے بھی اجر ہے اور یہ کہ اطاعتِ الٰہی پر مبنی ان امور کا نام مبالغے اور معنوی مناسبت کی بناء پر صدقہ رکھ دیا اور ایک معنی یہ ہیں کہ یہ امور انجام دینے والا اپنے اوپر صدقہ کررہا ہے''۔

(صحیح مسلم، مع شرح النووی، ج: 3، ص: 91)

انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے حد و بے حساب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا،

ترجمہ: ''اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو انہیں شمار نہ کر سکو گے، (ابراہیم: 34)''۔

اِن بے شمار نعمتوں میں سے ایک نعمتِ وجود اور نعمتِ جان ہے۔ حدیثِ مبارک کی رو سے انسانی وجود میں 360 جوڑ (Joints) ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اس مشین کے تمام پرزے اور 360 جوڑ فعّال (Active) ہوتے ہیں تو انسان نشست و برخاست، حرکت و سکون اور چلنے پھرنے کے قابل ہوتا ہے اور اگر یہی جوڑ کام کرنا چھوڑ دیں تو انسان کا وجود لکڑی کے ایک شہتیر کی مانند ہو جاتا ہے کہ وہ حرکت کے قابل نہیں رہتا۔ فالج زدہ شخص (Paralized) کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ سانس آ جا رہا ہے، مگر حرکت کے قابل نہیں ہوتا اور دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ تو اگر انسان ایک بار حرکت کرے تو بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ 360 بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ پھر ان احادیث میں اس تشکرِ نعمتِ باری تعالیٰ کی مختلف صورتیں بیان فرمائی گئی ہیں، جن میں مختلف تسبیحات، اَذکار و اَوراد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ضرورت مند اور مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کرنا، دو افراد کے درمیان صلح کرانا اور کسی کو نیکی کی کوئی بات کہہ دینا وغیرہ سب شامل ہیں، پھر ان کو ''صدقہ'' سے تعبیر کیا ہے اور قرآنِ مجید میں یہ کلمہ کئی معنی کے لئے آیا ہے، جن میں سے چند معانی یہ ہیں: (۱) مالی صدقہ و خیرات کرنا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) وَأَنْفِقُوا مِنْ مَا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصّٰلِحِينَ،

ترجمہ: ''اور جو رزق ہم نے تمہیں عطا کیا ہے، اس میں سے (راہِ حق میں) خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت (سر پر) آجائے، پھر وہ کہے اے پروردگار! تو نے مجھے کچھ دنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ دیتا اور نیک بندوں میں سے ہو جاتا، (المنافقون: 10)''۔

(۲) خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا،

ترجمہ: ''ان کے مال میں سے صدقہ لیجئے جس کے ذریعے آپ انہیں (بخل وحرص) سے پاک کریں اور ان کے (باطن کا) تزکیہ کریں، (التوبۃ: 103)''۔

(۳) وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ،

ترجمہ: اور تورات میں ہم نے ان پر فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں (کا بھی) بدلہ ہے، تو جو شخص بدلہ (یعنی اپنے قصاص کا حق) معاف کردے تو یہ معافی اس کے لئے (گناہوں کا) کفارہ ہوگی، (المائدہ: 45)''۔

اس آیت میں اپنا حق معاف کرنے کو بھی صدقے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(٤) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلٰى أَهْلِهٖ إِلَّا أَنْ يَّصَّدَّقُوا،

ترجمہ: ''کسی مومن کے لئے روا نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے، مگر یہ کہ خطا سے (یہ فعل سرزد ہوجائے)، اور جو شخص کسی مومن کو (نادانستہ یعنی) خطا سے قتل کردے، تو (اس کا کفّارہ) ایک غلام آزاد کرنا ہے اور مقتول کے وارثوں کو دِیَت (یعنی خون بہا) دینا ہے، سوائے اس کے کہ وہ (یعنی مقتول کے ورثاء اپنے اس حق کو) معاف کردیں، (النساء: 92)''۔

اس آیت میں بھی اپنا حق معاف کردینے کو 'تصدُّق' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

(۵) فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَآ أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا،

ترجمہ: ''تو جب وہ (برادرانِ یوسف) ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: اے عزیزِ (مصر!) ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم حقیری پونجی لے کر آئے ہیں، تو آپ ہمیں غلّہ پورا ناپ کردے دیجئے اور ہم پر صدقہ کیجئے، (یوسف: 88)''۔

اس آیت میں کسی کو اس کے حق سے زیادہ دینے کو صدقہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

(٦)وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔

ترجمہ: ''اور کم عقلوں کو اپنے وہ مال نہ دو جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گزر اوقات کا ذریعہ بنایا ہے اور اس مال میں سے ان کو کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے خیر خواہی کی بات کرو، (النساء: 05)''۔

اس آیت میں اچھی بات کہنے کو بھی نیکی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض بزرگوں نے کہا کہ اگر آدمی فجر سے عشاء تک فرض، واجب، سنت مؤکدہ اور غیر مؤکدہ کو ملا کر کل چالیس رکعات باقاعدگی سے پڑھا کرے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی ادائیگی کی نیت کے ساتھ اپنی نعمتِ وجود کے تشکر کی بھی نیت کرے تو کسی حد تک اس حق کی ادائیگی ہو جائے گی، کیونکہ ہر رکعت کے رکوع اور سجود میں کم از کم تین تسبیحات پڑھنا مستحب ہے اور یہ کل 9 تسبیحات بن جاتی ہیں اور مجموعی طور پر چالیس رکعات میں 360 تسبیحات ہو جائیں گی۔ اس طرح سے نعمتِ وجود کا شکر بھی ادا ہو جائے گا۔

نمازِ شکر بطورِ خاص مشروع نہیں ہے، البتہ بعض اہم مواقع پر سجدۂ شکر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ تاہم اگر کوئی کسی موقع پر اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کا بطورِ خاص نماز کے ذریعے شکر ادا کرنا چاہے، تو عام نوافل کی طرح جتنے نوافل چاہے انفرادی طور پر پڑھ لے۔ نمازِ شکر کی باجماعت نماز ثابت نہیں ہے، البتہ اجتماعی طور پر دعا کی جاسکتی ہے اور دعا کو بھی رسول اللہ ﷺ نے ''مغزِ عبادت'' اور ''عینِ عبادت'' قرار دیا ہے۔

فرض نماز میں امام کے پیچھے کیا پڑھنا ضروری ہے

سوال:25

امام کے پیچھے نیت باندھنے کے بعد مقتدی کو نماز میں کیا پڑھنا ضروری ہوتا ہے؟۔

جواب:

امام کی اقتداء میں تکبیرِ تحریمہ کہنا فرض ہے اور امام کے پیچھے حالتِ قیام میں

ثنا(سُبحَانَکَ اللّٰھُمَّ۔۔۔۔۔ وَلَااِلٰہَ غَیرُکَ تک) پڑھنا سنت ہے، البتہ اگر امام نے جہراً قراءت شروع کر دی ہو تو مقتدی ثنا نہیں پڑھے گا۔ نماز میں اگر چہ اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنا سنت ہے، لیکن چونکہ یہ قراءت کے تابع ہیں اور مقتدی پر قراءت نہیں ہے، اس لئے باجماعت نماز میں ''تعوّذ'' اور ''تسمیہ'' پڑھنا اس کے لئے مسنون نہیں ہے، ہاں مقتدی کی اگر کوئی رکعت رہ گئی ہے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد جب وہ اپنی بقیہ رکعت پڑھے گا تو ''اعوذ باللہ'' اور ''بسم اللہ'' بھی پڑھے گا۔ سورۂ فاتحہ سے پہلے اعوذ باللہ صرف پہلی رکعت میں پڑھے گا اور بسم اللہ تمام رکعات میں سورۂ فاتحہ کے شروع میں پڑھنا سنت ہے۔ امام کا جہری نماز میں جب وہ سورۂ فاتحہ مکمل کر لے تو ''وَلَا الضَّآلِّین'' کے بعد آہستہ آمین کہنا۔ رکوع میں تین بار ''سُبحَانَ رَبِّیَ العَظِیم'' پڑھنا اور تین سے زیادہ طاق بار مستحب ہے۔ رکوع سے اٹھتے ہوئے امام کے ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَن حَمِدَہٗ'' کہنے کے بعد مقتدی کا ''اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الحَمد'' کہنا۔ دونوں سجدوں میں تین بار ''سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلٰی'' کہنا سنت ہے اور تین سے زائد طاق بار مستحب ہے۔ رکوع میں جاتے ہوئے اور سجود میں جاتے اور اٹھتے ہوئے ''اَللّٰہُ اَکبَر'' کہنا سنت ہے، قعدۂ اولیٰ اور قعدۂ اخیرہ میں پوری ''اَلتَّحِیَّات'' پڑھنا واجب ہے۔ قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنا سنت ہے اور دعا بھی سنت ہے۔ رمضان المبارک میں وتر کی باجماعت نماز میں دعاءِ قنوت پڑھنا واجب ہے، مقتدی کے لئے امام کے ساتھ تکبیرِ قنوت کہنا واجب ہے اور عیدین کی زائد تکبیرات اور نماز عید کی دوسری رکعت میں تکبیرِ رکوع کہنا بھی واجب ہے۔ حدیث مبارک میں ہے: عَن نَافِعٍ اَنَّ عَبدَاللّٰہِ بنَ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنہُمَا کَانَ اِذَا سُئِلَ ھَل یَقرَأُ اَحَدٌ خَلفَ الاِمَامِ؟ قَالَ: اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُم خَلفَ الاِمَامِ فَحَسبُہٗ قِرَاءَۃُ الاِمَامِ وَاِذَا صَلّٰی وَحدَہٗ فَلیَقرَأ۔

ترجمہ: ''نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب سوال کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص امام کے پیچھے قراءت کرے؟، تو وہ فرماتے: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت اس کے لئے کافی ہے اور جب اکیلا نماز پڑھے تو

قراءت کرے، (الموطا امام مالک، باب ترک القراءۃ خلف الامام، ص:68)''۔

کتنے وقفے کے بعد نماز قضا ہو جاتی ہے

سوال:26

نمازِ فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء میں کتنی دیر بعد قضاء کی نیت کی جائے گی؟۔

جواب:

ہر نماز کا وقت اُس نماز کے وقت کے اختتام تک ہے یعنی نمازِ فجر کا وقت طلوعِ آفتاب تک ہے، نمازِ ظہر کا وقت، وقتِ عصر داخل ہونے تک ہے، نمازِ عصر کا وقت غروبِ آفتاب تک ہے، مغرب کا وقت غروبِ آفتاب سے غروبِ شفق (یعنی جانبِ مغرب سرخی ختم ہونے کے بعد ایک روشنی جنوباً اور شمالاً پھیلتی ہے، جسے شفق کہا جاتا ہے) یعنی عشاء کا وقت داخل ہونے تک ہے، نمازِ عشاء اور وتر کا وقت طلوعِ فجر تک رہتا ہے۔ اگر نماز کا وقت ختم ہو جائے تو پھر قضاء کی نیت سے اس کو ادا کیا جائے گا۔ آج کل مساجد میں نمازوں کے اوقات کے دائمی نقشے آویزاں ہوتے ہیں، ان میں پانچوں نمازوں کا وقت شروع ہونے، طلوعِ آفتاب، زوال اور غروبِ آفتاب کے اوقات درج ہوتے ہیں ۔وقتاً فوقتاً انہیں دیکھتے رہنا چاہئے، بعض اخبارات بھی روزانہ کے اوقات نماز شائع کرتے ہیں۔ اسی طرح مساجد میں روزانہ طلوعِ آفتاب، زوال اور غروبِ آفتاب اور نمازِ اشراق کے اوقات کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔

دعا کا طریقہ

سوال:27

نماز ختم کرنے کے بعد شریعت میں دعا کا کیا طریقہ ہے، دعا میں کیا پڑھنا چاہئے؟۔

جواب:

پہلے دعا کے آداب بیان کئے جاتے ہیں۔ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا آدابِ دعا میں سے ہے، احادیثِ مبارکہ میں ہے:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ لَمْ يَحُطَّهُمَا حَتّٰى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب دعا میں ہاتھ بلند فرماتے، تو ہاتھوں کو نیچے نہ گراتے یہاں تک کہ چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرلیا کرتے، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 3386)''۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: اَلْمَسْأَلَةُ : أَنْ تَرْفَعَ يَدَيْكَ حَذْوَ مَنْكِبَيْكَ أَوْ نَحْوَهُمَا، وَالْاِسْتِغْفَارُ: أَنْ تُشِيْرَ بِاِصْبَعٍ وَّاحِدَةٍ، وَّالْاِبْتِهَالُ: أَنْ تَمُدَّ يَدَيْكَ جَمِيْعًا۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ سوال یعنی دعا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں کے برابر اٹھاؤ اور استغفار کا طریقہ یہ ہے کہ ایک انگلی سے اشارہ کرو اور گڑگڑا کر سوال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلاؤ''۔
(سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 1483)

عَنْ مَالِكِ بْنِ يَسَارٍ السَّكُوْنِيِّ ثُمَّ الْعَوْفِيِّ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَسَلُوْهُ بِبُطُوْنِ أَكُفِّكُمْ، وَلَا تَسْأَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا۔

ترجمہ: ''حضرت مالک بن یسار سکونی، پھر عوفی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے سوال کرو اور ہتھیلیوں کی پُشت سے سوال نہ کرو (یعنی دعا کے وقت ہاتھ کی ہتھیلی کا رُخ آسمان کی طرف ہونا چاہئے)، (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 1481)''۔

وہ فرض نمازیں جن کے بعد سنتیں ہیں یعنی ظہر و جمعہ و مغرب و عشاء، مختصر دعا کرنا چاہئے، اُن نمازوں کے بعد صرف ''اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ (تا) يَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِكْرَام'' یا اس کے برابر کوئی دعا پڑھیں، اس سے زیادہ لمبی دعائیں نہ کی جائیں۔ نماز کے بعد مسنون تسبیحات واذکار اور اُس کے بعد دعا کریں۔ جو دعائیں قرآن وحدیث میں وارد ہوئی ہیں، اُن کے ساتھ دعا کرے، تاہم جو دعائیں قرآن کریم میں مذکور ہیں، دعا میں

اُن کو پڑھتے وقت اُن سے تلاوت کا ارادہ نہیں ہوتا۔علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:وَاَوَّلِ الدُّعَاءِ وَاَوْسَطِہٖ وَآخِرِہٖ

ترجمہ:''اوردعا کے اول،درمیان اورآخرمیں(درودشریف پڑھنا مستحب ہے)۔

(ردالمحتار جلد2،ص:204،داراحیاءالتراث العربی،بیروت)

صاحب مراقی الفلاح لکھتے ہیں:

ثُمَّ یَخْتِمُوْنَ بِقَوْلِہٖ تَعَالیٰ: سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ٥

ترجمہ:''پھراللہ تعالیٰ کےاس فرمان پاک(سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ) پر دعاکوختم کریں،(کتاب الصلاۃ،فصل صفۃ الاذکار،ص:171قدیمی کتب خانہ،کراچی)''۔

علامہ شیخ احمد طحطاوی لکھتے ہیں:(رَافِعِیْ اَیْدِیْھِمْ)حِذَاءَ الصَّدْرِ وَبُطُوْنُھَا مِمَّایَلِی الْوَجْہَ بِخُشُوْعٍ وَّسُکُوْنٍ

ترجمہ:''(دونوں ہاتھ بلندکریں)سینے کے مقابل ہوں اوراُن کا پیٹ چہرے کے قریب (سامنے)ہو،خشوع اورسکون کے ساتھ دعا کرے''۔

(حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح،جلد1 ص:429)

کن صورتوں میں نماز توڑی جا سکتی ہے

سوال:28

کن صورتوں میں نماز کی نیت توڑ سکتے ہیں؟۔

جواب:

کسی شے سے اذیت پہنچنے یا نقصان ہونے کا اندیشہ ہو،تو نماز توڑنے کی اجازت ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَیُبَاحُ قَطْعُھَا لِنَحْوِ قَتْلِ حَیَّةٍ ،وَنَدِّ دَابَّةٍ ،وَفَوْرِ قِدْرٍ ،وَضِیَاعِ مَاقِیْمَتُہٗ دِرْھَمٌ ،لَہٗ اَوْ لِغَیْرِہٖ ۔وَیُسْتَحَبُّ لِمُدَافَعَةِ الْاَخْبَثَیْنِ ،وَلِلْخُرُوْجِ مِنَ الْخِلَافِ اِنْ لَّمْ یَخَفْ فَوْتَ

وَقْتٍ أَوْ جَمَاعَةٍ۔ وَيَجِبُ لِاغَاثَةِ مَلْهُوْفٍ وَّغَرِيْقٍ وَّحَرِيْقٍ ،لَا لِنِدَاءِ أَحَدِ أَبَوَيْهِ بِلَا اِسْتِغَاثَةٍ اِلَّا فِي النَّفْلِ ،فَاِنْ عَلِمَ اَنَّهُ يُصَلِّيْ لَا بَأْسَ اَنْ لَّا يُجِيْبَهُ ،وَاِنْ لَّمْ يَعْلَمْ أَجَابَهُ۔

ترجمہ:''اورنماز کا توڑنا (اگرچہ فرض نماز ہو) ان صورتوں میں مباح ہے: (مثلاً) سانپ کو مارنا، سواری کا بھاگ جانا، ہانڈی کا اُبلنا اور ایسی چیز کا تلف ہوجانا جس کی قیمت ایک درہم ہو، خواہ نمازی کی ہو یا کسی اور شخص کی اور اگر پیشاب پاخانہ کی حاجت ہو تو نماز توڑنا مستحب ہے (علامہ شامی نے شدید حاجت کے وقت نماز توڑنا واجب لکھا ہے کیونکہ جب ان طبعی حاجات کا غلبہ ہو تو نماز میں یکسوئی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضوری کی کیفیت قائم نہیں رہتی) تو علماء کے اختلاف سے نکلنے کے لئے نماز توڑ سکتے ہیں (یعنی اگرچہ مذہبِ مختار کے مطابق اس صورت میں نماز صحیح طور پر ادا ہوجاتی ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ اتنی احتیاط کی جائے کہ تمام مذاہب کے مطابق بلا اختلاف نماز صحیح ہوجائے)، اگر نماز کا وقت نکل جانے یا جماعت کے فوت ہونے کا خوف نہ ہو اور جب کوئی (مصیبت میں مبتلا شخص) فریاد کررہا ہو مثلاً کوئی شخص پانی میں ڈوب رہا ہے یا آگ میں جل رہا ہے (تو اس کی مدد کے لئے) نماز توڑنا واجب ہے۔ معمول کی صورت حال میں والدین کے بلانے پر فرض نماز توڑنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر نفل نماز پڑھتے ہوئے والدین پکاریں تو جواب دینا واجب ہے، اگر والدین کو معلوم ہو کہ نماز پڑھ رہا ہے تو جواب نہ دینے میں کچھ مضائقہ نہیں، اگر معلوم نہ ہو تو (نماز توڑ کر) جواب دے (اور پھر ازسرِ نو وہ نفل نماز پڑھے)۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 369-368، بیروت)

علاوہ ازیں علامہ شامی نے چند مواقع اور ذکر کئے مثلاً بکریوں پر بھیڑیئے کے حملے کے خوف سے، نابینا راہ گیر کنویں میں گرا چاہتا ہو اور یہ اُس کے بچانے پر قادر ہو۔

دعائے قنوت یاد نہ ہو تو؟

سوال: 29

جب تک دعائے قنوت یاد نہ ہو کیا پڑھا جائے؟۔

جواب:

نمازِ وتر کی تیسری رکعت میں دعا پڑھنا واجب ہے اور کسی بھی دعا کے پڑھنے سے واجب ادا ہو جائے گا (شامی)، جو دعائے قنوت نہ پڑھ سکتا ہو، وہ "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا (آخر تک)" پڑھے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَمَنْ لَّا یُحْسِنُ الْقُنُوْتَ یَقُوْلُ: رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً آلایۃ ۔وَقَالَ اَبُو اللَّیْثِ، یَقُوْلُ: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ،یُکَرِّرُھَا ثَلَاثًا وَّقِیْلَ یَقُوْلُ: یَا رَبِّ ثَلَاثاً ،ذَکَرَہٗ فِی "الذَّخِیْرَۃِ" ۔

ترجمہ: "جو دعائے قنوت نہ پڑھ سکے، وہ یہ کہے "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً" (آخر تک) اور فقیہ ابو اللیث فرماتے ہیں: وہ تین مرتبہ "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ" کہے، اور بعض نے کہا کہ تین مرتبہ "یَا رَبِّ" کہے، "ذخیرہ" میں اسے ذکر کیا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 385، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔ تاہم اس دوران دعائے قنوت یاد کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے تاکہ نمازِ وتر کے اجرِ کامل سے محروم نہ رہیں۔

جماعت میں ایک مقتدی اور ایک امام ہے اور مزید افراد آگئے

سوال: 30

اگر فجر کی نماز میں صرف امام اور ایک مقتدی ہو، چاہے مؤذن ہی ہو، تو جب جماعت کے لئے کھڑے ہوں گے تو ایک ہاتھ کا فاصلہ رکھیں گے، لیکن اگر دورانِ نماز ایک مقتدی اور آگیا تو اب امام صاحب پاؤں اٹھا کے آگے جائیں گے یا پاؤں گھسیٹتے ہوئے آگے جائیں گے؟، (محمد رئیس، متعلم دارالعلوم نعیمیہ، کراچی)۔

جواب:

امام کے علاوہ اگر ایک مقتدی ہو تو وہ امام کے برابر دائیں جانب اس طرح کھڑا

ہو کہ مقتدی کا قدم امام سے آگے نہ ہو یعنی اس کے پاؤں کا گٹا امام کے پاؤں کے گٹے سے آگے نہ ہو۔ دورانِ نماز اگر دوسرا شخص جماعت میں شامل ہوتا ہے تو اس صورت میں یا تو امام آگے بڑھ جائے اور آنے والا شخص اُس مقتدی کے برابر کھڑا ہو جائے یا وہ مقتدی خود پیچھے ہٹ آئے یا آنے والا شخص اُس کو پیچھے کی جانب کھینچ لے (یعنی اس میں اس بات کا بھی لحاظ ہوگا کہ گنجائش کس جانب ہے، اگر آگے اور پیچھے دونوں جانب برابر گنجائش ہو تو امام آگے بڑھ سکتا ہے اور مقتدی بھی پیچھے ہٹ سکتا ہے، اگر گنجائش صرف پیچھے کی جانب ہے تو مقتدی پیچھے ہٹ جائے اور اگر گنجائش صرف آگے کی جانب ہے تو امام آگے بڑھ جائے، بعد میں آنے والا شخص پہلے سے جماعت میں شامل مقتدی کو اس صورت میں کھینچ کر پیچھے لائے، جب اُسے حُسنِ ظن ہو کہ اسے مسئلہ معلوم ہے)، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

اِذَا اقْتَدٰی بِاِمَامٍ فَجَاءَ آخَرُ یَتَقَدَّمُ الْاِمَامُ مَوْضِعَ سُجُوْدِہٖ، کَذَافِیْ "مُخْتَارَاتِ النَّوَازِلِ" وَفِی "الْقُھُسْتَانِیِّ" عَنِ الْجَلَّابِیِّ أَنَّ الْمُقْتَدِیَ یَتَأَخَّرُ عَنِ الْیَمِیْنِ اِلٰی خَلْفِ اِذَاجَاءَ آخَرُ۔ وَفِی "الْفَتْحِ" :وَلَوِ اقْتَدٰی وَاحِدٌ بِآخَرَ فَجَاءَ ثَالِثٌ یَجْذِبُ الْمُقْتَدِیَ بَعْدَالتَّکْبِیْرِ، وَلَوْ جَذَبَہٗ قَبْلَ التَّکْبِیْرِ لَا یَضُرُّہٗ ،وَقِیْلَ یَتَقَدَّمُ الْاِمَامُ۔

ترجمہ: ''جب ایک مقتدی امام کے ساتھ کھڑا ہو، دوسرا شخص آیا تو (بعض نے کہا کہ) امام قدم بڑھا کر سجدے کے مقام پر چلا جائے، جیسا کہ ''مختارات النوازل'' میں ہے اور ''قہستانی'' میں جلابی سے ہے کہ جب دوسرا مقتدی آجائے تو (پہلا) مقتدی پیچھے آجائے۔ اور ''فتح القدیر'' میں ہے: اگر ایک شخص امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے، پس تیسرا شخص آیا تو وہ تکبیر کہہ (نیت باندھ) کر مقتدی کو پیچھے کی جانب کھینچ لے اور اگر تکبیر کہے بغیر پیچھے کھینچ لے تب بھی کوئی حرج نہیں اور بعض نے کہا کہ امام آگے بڑھ جائے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2،ص:265، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''امام اور ایک مقتدی نماز پڑھتے ہوں دوسرا مقتدی آگیا تو امام کو وہیں رہنا چاہیے یا آگے چلا جائے یا نہیں (اور آگے بڑھنے

کی جگہ ہو)''، آپ نے جواب میں لکھا: ''اگر پہلا مقتدی مسئلہ دان (یعنی اس مسئلے کو جانتا) ہے اور اسے پیچھے ہٹنے کی جگہ ہے تو وہ ہٹ آئے دوسرا مقتدی اس کے برابر کھڑا ہو جائے اور اگر یہ مسئلہ دان نہیں یا اسے پیچھے ہٹنے کو جگہ نہیں تو امام آگے بڑھ جائے اور اگر امام کو بھی آگے بڑھنے کی جگہ نہیں تو دوسرا مقتدی بائیں ہاتھ کو کھڑا ہو جائے، مگر اب تیسرا مقتدی آکر نہ ملے ورنہ سب کی نماز مکروہِ تحریمی، اور سب کو اس کا پھیرنا واجب''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 611، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اس صورت میں آگے بڑھنے والا شخص پاؤں سرکتے ہوئے آگے جائے یا قدم اٹھا کر جائے، دونوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہے یعنی بقدرِ ضرورت قبلے کی طرف قدم اٹھا کر بھی چل سکتے ہیں، بلاضرورت پے در پے تین قدم چلنے سے نماز فاسد ہو جائے گی، اس مقصد کے لئے صرف ایک صف کی مقدار آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کی ضرورت ہوتی ہے، جو ایک دو قدم اٹھانے سے پوری ہو جاتی ہے۔

چند سوالات آپ کی خدمت میں پیش ہیں، امید ہے تسلی بخش جوابات عنایت فرمائیں گے۔

منظر شیخ، بلاک 7 گلشن اقبال، کراچی

قضا نمازوں کی ادائیگی سے بری الذمہ ہونے کا طریقہ

سوال: 31

(1) شریعت نے قضا نماز ادا کرنے کے لئے جو حیلہ مقرر کیا ہے، اس کا طریقہ کیا ہے؟۔

جواب:

جس شخص کے ذمے قضا نمازیں ہوں، زندگی میں اُس پر اُن نمازوں کی ادائیگی فرض ہے، جب تک اُنہیں ادا نہ کرے، آخرت کی جوابدہی سے بری الذمہ نہیں ہوگا۔ زندگی میں قضا نمازوں کی تلافی فدیہ یا کسی حیلے سے نہیں ہو سکتی، نمازیں پڑھنا لازمی ہے۔ ہاں! اگر کسی شخص نے اپنی زندگی میں وصیت کی ہو تو اُس کے ورثاء اُس کے ترکے کی ایک تہائی

مال سے نمازوں کا فدیہ ادا کریں، اگر قضا نمازیں بہت زیادہ ہیں اور ترکے کی ایک تہائی سے فدیہ پورا نہ ہوتا ہو تو اس سے زیادہ مقدار میں فدیے کی ادائیگی کا انحصار ورثاء کی مرضی پر ہے، اگر تبرّع اور احسان کے طور پر ترکے میں سے اپنے حصے سے دستبردار ہو کر ادا کرنا چاہیں، تو ان کے لئے سعادت کی بات ہوگی۔

نوٹ: روزے کے فدیہ کا حکم قرآن مجید میں ہے، فوت شدہ نمازوں کے فدیے کا حکم صراحت کے ساتھ قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔ مگر چونکہ نماز بھی روزے کی طرح خالص بدنی عبادت ہے، اس لئے ہمارے فقہاءِ کرام نے روزے پر قیاس کر کے ایک نماز کا فدیہ ایک روزے کے برابر مقرر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قبول کی امید پر اس کی ادائیگی کرنی چاہئے، اگر وہ قبول فرمالے تو یہ بندے پر اس کا کرم ہوگا، ورنہ کم از کم فدیے کے طور پر دی ہوئی رقم کے صدقے کا اجر تو یقیناً اسے ملے گا، ان شاء اللہ العزیز

نمازوں کے فدیے کی ادائیگی

سوال:32

(2) اگر کسی کے انتقال کے بعد اس کی قضا نمازوں کا حساب لگا کر فدیہ دیں تو اس کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہوگا؟۔

جواب:

ایک دن کی پانچ نمازوں (فرائض) اور وتر کو ملا کر چھ نمازیں شمار ہوں گی، ایک نماز کا فدیہ ایک روزے کے فدیے کے برابر ہے اور ایک دن کی نمازوں کا کل فدیہ چھ روزوں کے فدیے کے برابر ہوگا۔ ایک روزے کا فدیہ تقریباً 2 کلو 150 گرام گندم کا آٹا یا اُس کی قیمت ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں: (وَلَوْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صَلَوَاتٌ فَائِتَةٌ وَأَوْصَى بِالْكَفَّارَةِ يُعْطَى لِكُلِّ صَلَاةٍ نِصْفُ صَاعٍ مِنْ بُرٍّ) كَالْفِطْرَةِ (وَكَذَا حُكْمُ الْوِتْرِ) وَالصَّوْمِ وَإِنَّمَا يُعْطَى (مِنْ ثُلُثِ مَالِهِ)۔

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص فوت ہوگیا اور اس کی کئی نمازیں فوت شدہ (قضا) ہیں، اور اُس نے

ان نمازوں کے کفارے کی وصیت کی ہے، تو ہر نماز کے لئے نصف صاع (دوکلوگرام) گندم کفارہ دے، اسی طرح وتر اور ہر روزے کا کفارہ ہے اور یہ کفارہ اُس (میت) کے تہائی مال سے دیا جائے گا، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2،ص:466-465، بیروت)''۔

کئی سالوں کی قضا نمازوں کا حکم

سوال:33

(3) اگر کئی سالوں کی قضا نماز ہو تو اس کا فدیہ ادا کرنے کے لئے کتنی مدت کی رقم لی جائے تا کہ ورثاء پر بھی بوجھ نہ ہو اور ادائیگی بھی ہو جائے؟۔

جواب:

اگر کئی سالوں کی نمازیں قضا ہوں اور مدت کا اندازہ نہ کیا جا سکتا ہو، تو میت کی کُل عمر شمار کی جائے اور اگر میت مرد ہو تو کل عمر سے بارہ سال (میت اگر عورت ہو تو نو سال) نکال کر بقیہ مدت کا فدیہ میت کے مال سے ادا کیا جائے۔ اگر فدیہ کی رقم تہائی ترکے سے تجاوز کر جائے تو بقیہ رقم ورثاء کی مرضی پر موقوف ہوگی کہ اگر وہ راضی ہوں تو اپنے حصے یا اپنی جانب سے بطور تبرُّع اور فضل واحسان ادا کر دیں۔

فدیہ صلوٰۃ کی ادائیگی کے وقت نیت کافی ہے

سوال:34

(4) جس کو یہ فدیہ دیا جائے تو کیا اسکو بتانا ہوگا، بغیر بتائے یہ معاملہ کس طرح کیا جائے گا؟۔

جواب:

فدیہ دینے والے کی نیت کافی ہے، بتانا ضروری نہیں کہ یہ فدیہ کی رقم ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''دینے والے کی نیت کافی ہے، لفظ کی حاجت نہیں، کَمَا صَرَّحُوْا بِهٖ فِی الزَّکٰوةِ وَقَالَ الْعَلَّامَةُ السَّیِّدُ الْحَمُوِیُّ فِیْ شَرْحِ الْاَشْبَاهِ وَالنَّظَائِرِ الْعِبْرَةُ لِنِیَّةِ الدَّافِعِ لَایُعْلَمُ الْمَدْفُوْعُ اِلَیْهِ وَفِیْ رَدِّالْمُحْتَارِ لَااِعْتِبَارَ لِلتَّسْمِیَةِ

ترجمہ: ''جیسا کہ مسئلۂ زکوٰۃ میں اس کی تصریح موجود ہے علامہ سید حموی نے ''شرح الاشباہ والنظائر''
میں فرمایا: دینے والے کی نیت کا اعتبار ہے، جسے دی جارہی ہے، اُسے معلوم ہونا ضروری
نہیں۔ ردالمحتار میں ہے: زبان سے نام لینے کا اعتبار نہیں۔

مگر زبان سے بھی کہہ دینے کو علماء مناسب بتاتے ہیں یہاں تک کہ طریقہ ادا میں میت کے
باپ دادا تک کا نام لینا فرماتے ہیں کہ مسکین سے کہا جائے: یہ مال تجھے فلاں بن فلاں کے
اتنے روزوں یا اتنی نمازوں کے فدیہ میں دیا، وہ کہے: میں نے قبول کیا، شرح نقایہ علامہ قہستانی
میں ہے: يَنْبَغِيْ اَنْ يَقُوْلَ الدَّافِعُ لِلْمِسْكِيْنِ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ اِنِّيْ اُدْفَعُكَ مَالَ كَذَا لِفِدْيَةِ
صَوْمٍ كَذَا لِفُلَانِ بْنِ فُلَانِ اَلْمُتَوَفّٰى وَيَقُوْلُ الْمِسْكِيْنُ قَبِلْتُهٗ۔

ترجمہ: ''مسکین کو دینے والا ہر دفعہ کہے میں تجھے فلاں بن فلاں میت کی طرف
سے فدیہ صوم کے طور پر مال دے رہا ہوں اور مسکین کہے: میں نے اسے قبول کیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 543، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

فدیے کی ادائیگی کے وقت محض فدیے کی ادائیگی کی نیت کافی ہے، لیکن زبانی بتانا مناسب
ہے۔

تکبیر تحریمہ کے فضائل

سوال: 35

تکبیر تحریمہ یا تکبیر اولیٰ کی فضیلت جماعت میں کیا ہے؟ تفصیلی دلائل بیان
فرمائیں، (محمد سلطان حنفی تحصیل وضلع کوٹلی، آزاد کشمیر)۔

جواب:

''تکبیرِ تحریمہ'' بیک وقت نماز کی شرائط میں بھی شامل ہے اور نماز کا رکن بھی
ہے۔ اسے ''تکبیر اُولیٰ'' (پہلی تکبیر) بھی کہتے ہیں۔ اسے ''تحریمہ'' اس لئے کہتے ہیں کہ
جب بندۂ مومن ''اللہ اکبر'' کہہ کر نماز میں داخل ہوتا ہے، تو وہ بعض ایسے امور (جیسے کھانا، پینا، کلام
کرنا، چلنا پھرنا وغیرہ) جو اس کے لئے حلال ہوتے ہیں، نماز سے فراغت تک حرام ہو جاتے ہیں۔

نماز باجماعت کے لئے تکبیرِ اولیٰ کا اہتمام اور فضیلتیں احادیثِ مبارکہ میں وارد ہوئی ہیں:

(1) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَنْ صَلّٰى لِلّٰهِ أَرْبَعِيْنَ يَوْماً فِيْ جَمَاعَةٍ يُدْرِكُ التَّكْبِيْرَةَ الْأُوْلٰى، كُتِبَتْ لَهٗ بَرَاءَتَانِ بَرَاءَةٌ مِّنَ النَّارِ وَبَرَاءَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ۔

ترجمہ: ”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ کی (رضا) کے لئے چالیس دن باجماعت نماز پڑھے، تکبیرِ اولیٰ پائے، اس کے لئے دو آزادیاں لکھ دی جائیں گی: ایک جہنم سے اور دوسرا نفاق سے“۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث: 241)

(2) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

مَنْ صَلّٰى فِيْ مَسْجِدٍ جَمَاعَةً أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً لَا تَفُوْتُهُ الرَّكْعَةُ الْأُوْلٰى مِنْ صَلَاةِ الْعِشَاءِ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِهَا عِتْقًا مِّنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ”جو شخص چالیس راتیں مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھے کہ عشاء کی تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دوزخ سے آزادی لکھ دے گا“۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 798)

فرض نمازوں کے بعد دعا میں اختصار

سوال: 36

سنی بہشتی زیور، انوار التجلی، شرح منیۃ المصلی اور فتح القدیر میں ہے کہ جن فرائض کے بعد سنتیں ادا کی جاتی ہیں ان کے بعد لمبے وظائف نہ کرے بلکہ جلدی سنتیں ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے ورنہ سنتوں کا ثواب کم ہو جائے گا اور امداد الفتاح میں لکھا ہے: آج کل فرضوں کے بعد ہماری مساجد میں جو لمبے وظائف کا رواج پڑ گیا ہے یہ خلاف سنت ہے۔ مہربانی فرما کر بتائیں کہ فرضوں اور سنتوں کے درمیان مسنون طریقہ کے مطابق کتنا وقفہ کرنا چاہئے اور اس وقفہ میں کیا کیا پڑھنا چاہئے؟۔

(مولانا محمد احمد ساجد، ریلوے روڈ بصیر پور ضلع اوکاڑہ)

جواب:

فرض کے بعد اذکار کے بارے میں احادیث ملاحظہ ہوں: مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلٰوةٍ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ إِلَّا الْمَوْتُ،

(1) ترجمہ ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد '' آیۃ الکرسی''، پڑھی اس کے لئے جنت میں جانے سے موت کے سوا اور کوئی چیز رکاوٹ نہیں ہے۔

(مشکوۃ المصابیح، ص:89)

(2) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ ،قَالَ: أَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ أَقْرَأَ الْمُعَوِّذَاتِ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ۔

ترجمہ'' حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس، (یہ سورتیں) پڑھا کروں''۔

(سنن نسائی، رقم الحدیث:1335)

(3) عَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مُعَقِّبَاتٌ لَا يَخِيْبُ قَائِلُهُنَّ " يُسَبِّحُ اللّٰهَ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ ،وَيَحْمَدُهُ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ ،وَيُكَبِّرُهُ أَرْبَعًا وَّثَلَاثِيْنَ "۔

ترجمہ:''کعب بن عجرہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کچھ کلمات (نماز کے بعد بلا فاصلہ کہنے کے ہیں) جن کا کہنے والا نامراد نہیں رہتا، (ان کلمات میں) نماز کے بعد تینتیس مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہنا، تینتیس مرتبہ ''الحمد للہ'' کہنا، چونتیس مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہنا، (سنن نسائی، رقم الحدیث:1348)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

يُكْرَهُ تَأْخِيْرُ السُّنَّةِ إِلَّا بِقَدْرِ : اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ الخ۔قَالَ الْحُلْوَانِيُّ :لَا بَأْسَ بِالْفَصْلِ بِالْأَوْرَادِ ، وَاخْتَارَهُ الْكَمَالُ ، قَالَ الْحَلَبِيُّ: إِنْ أُرِيْدَ بِالْكَرَاهَةِ التَّنْزِيْهِيَّةُ

اِرْتَفَعَ الْخِلَافُ، قُلْتُ :وَفِیْ حِفْظِیْ حَمْلُهٗ عَلَی الْقَلِیْلَةِ ، وَیُسْتَحَبُّ اَنْ یَّسْتَغْفِرَ ثَلَاثًا وَّیَقْرَأُ" آیَةَ الْکُرْسِیِّ وَالْمُعَوِّذَاتِ" وَیُسَبِّحُ وَیُحَمِّدُ وَیُکَبِّرُ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ؛ وَیُهَلِّلُ تَمَامَ الْمِائَةِ وَیَدْعُوْا وَیَخْتِمُ بِسُبْحَانَ رَبِّكَ ۔

ترجمہ:''سنتوں میں تاخیر''اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ '(حدیث پاک میں روایت کردہ پورے کلمات یہ ہیں:اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَکْتَ یَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ) اس مقدار سے زیادہ مکروہ ہے۔''حلوانی'' نے فرمایا: اَذکار کے ساتھ فرائض وسُنَن میں وقفہ ہونے میں کوئی حرج نہیں،''کمال'' نے اسی کو اختیار کیا ہے۔''حلبی'' کہتے ہیں:اگر کراہت سے کراہتِ تنزیہی مراد ہے تو اختلاف ختم ہوجاتا ہے،(میں کہتا ہوں)اور مجھے اتنا یاد ہے کہ یہ کراہتِ تنزیہی قلیل فصل پر محمول ہے،اور مستحب یہ ہے کہ تین مرتبہ استغفار(مثلاً:اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ)پڑھے،آیۃ الکرسی اور مُعَوِّذات(سورۃ الفلق وسورۃ النّاس) تلاوت کرے اور'' سبحان اللہ ،الحمدللہ ،اللہ اکبر'' تینتیس،تینتیس مرتبہ پڑھے،اور سوویں مرتبہ'' لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه'' پڑھے،اس کے بعد دعا کرے اور آخر میں یہ پڑھے:''سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد2ص:218،219،داراحیاء التراث العربی،بیروت)

اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(اِلَّا بِقَدَرِ اَللّٰهُمَّ الخ)لِمَا رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِیُّ عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا قَالَتْ:"کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا یَقْعُدُ اِلَّا بِمِقْدَارِ مَا یَقُوْلُ:" اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ ،تَبَارَکْتَ یَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ"، وَاَمَّا مَا وَرَدَمِنَ الْاَحَادِیْثِ فِی الْاَذْکَارِ عَقِیْبَ الصَّلَاةِ فَلَا دَلَالَةَ فِیْهِ عَلَی الْاِتْیَانِ بِهَاقَبْلَ السُّنَّةِ ، بَلْ یُحْمَلُ عَلَی

الْإِتْيَانِ بِهَا بَعْدَهَا، لِأَنَّ السُّنَّةَ مِنْ لَوَاحِقِ الْفَرِيْضَةِ وَتَوَابِعِهَا وَمُكَمِّلَاتِهَا فَلَمْ تَكُنْ أَجْنَبِيَّةً عَنْهَا، فَمَا يُفْعَلُ بَعْدَهَا يُطْلَقُ عَلَيْهِ أَنَّهُ عَقِيْبَ الْفَرِيْضَةِ۔

ترجمہ: ''(یعنی مقدار: اللّٰهم الخ) کیونکہ مسلم اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (فرض نماز کے بعد) صرف '' اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَاذَاالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ " کی مقدار ہی بیٹھتے تھے، اور دیگر روایات میں جو نماز کے بعد اذکار کا ذکر ہے، اس میں یہ دلالت نہیں کہ وہ اذکار سنتوں سے پہلے ہوتے تھے، بلکہ ان تسبیحات واوراد کے پڑھنے کو سنتوں کے بعد پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے، کیونکہ سنتیں فرائض کے ساتھ لاحق ہوتی ہیں اور ان کے تابع ہوتی ہیں، اور ان (میں نادانستہ طور پر کوئی کمی رہ جائے تو اس کی) تکمیل کا سبب ہیں، لہٰذا یہ فرض نمازوں سے الگ کوئی چیز نہیں ہیں، لہٰذا جو تسبیحات ان سُنّتوں کے بعد پڑھی جائیں، ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ عمل فرضوں کے بعد ہی ادا ہوا''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2 ص: 218، 219، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

وہ فرض نمازیں، جن کے بعد سُنّتیں ہیں، (یعنی ظہر و جمعہ و مغرب و عشاء) ان نمازوں کے بعد دعا مختصر کرنی چاہئے، امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال ہوا کہ ''بعد نمازِ جمعہ انحرافِ قبلہ یعنی دائیں یا بائیں مڑ کر مناجات کرنا جائز ہے یا نہیں''۔

آپ نے جواب میں تحریر فرمایا: ''امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو مطلقاً سُنّت ہے اور اس کا ترک یعنی بعدِ سلام قبلہ رُو بیٹھے رہنا امام کے لئے بالاجماع مکروہ ہے۔ جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعا و مناجات بھی بالاجماع جائز ہے، مگر جس نماز کے بعد سنت ہے، یعنی ظہر و جمعہ و مغرب و عشاء اس کے بعد طویل تاخیر کسی کیلئے بہتر نہیں اور اگر کرے تو منع بھی نہیں، مگر اس قدر نہ ہو کہ مقتدیوں پر گراں گزرے، عادتِ مسلمین یوں جاری ہے کہ امام بعد سلام جب تک دعا سے فارغ نہ ہو مقتدی شریکِ دعا رہتے ہیں اور اس

سے قبل اُسے چھوڑ کر نہیں اٹھتے اور یہ اگر چہ شرعاً واجب نہیں مگر حسنِ ادب سے ہے۔
ترجمہ: ''(میں کہتا ہوں) اس پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے استدلال ممکن ہے'' اور جب وہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی معاملہ میں جمع ہوتے ہیں، تو آپ کی اجازت کے بغیر جاتے نہیں''، کیونکہ دعا سے فراغت اذن ہی تصور ہوتا ہے اور اس پر عرف جاری ہے، تو ایسی حالت میں اتنی طویل دعا کہ بعض مقتدیوں پر ثقیل ہو مطلقاً نہ کرنی چاہئے اگر چہ اس کے بعد سنت نہ ہو جیسے فجر و عصر، (فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص: 356 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔
تبلیغی جماعت کے شیخ عبدالحفیظ مکی ''مساجد میں مجالسِ ذکر جہری کا استحباب'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: **آیات مبارکہ:** ذکر اللہ کے بارے میں قرآن مجید میں جگہ جگہ حکم خداوندی ہے کہ خوب ذکر کرو، کثرت سے ذکر کرو وغیرہ اور ہر جگہ یہ حکم مطلق ہے، یعنی کہ یہ سب حالات کو شامل ہے، اجتماعی یا انفرادی، جہری یا سری اور مساجد میں یا گھروں یا کہیں بھی، اس سلسلہ کی چند آیات مختصراً ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ،

(سورۃ البقرہ، رکوع: 18)

ترجمہ: پس تم میری یاد کرو (میرا ذکر کرو) میں تمہیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرتے رہو، اور ناشکری نہ کرو۔

۲۔ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، (سورۃ آل عمران، رکوع: 20)۔

ترجمہ: (پہلے سے عقل مندوں کا ذکر ہے) وہ ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے ہوئے بھی اور آسمانوں اور زمینوں کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔

۳۔ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ، (سورۃ رعد، رکوع: 4)۔

ترجمہ: اور جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کو ہدایت فرماتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر (میں ایسی خاصیت ہے کہ اس) سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے۔

۴۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، (سورۃ نور۔رکوع 5)۔

ترجمہ: (کامل ایمان والوں کی تعریف کے ذیل میں ہے:) وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے نہ خرید غفلت میں ڈالتی ہے اور نہ فروخت۔

5۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ٥ وَّسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا،

(سورۃ احزاب، رکوع:8)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کا خوب کثرت سے ذکر کیا کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

۶۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ،

(سورۃ زخرف: رکوع:4)

ترجمہ: جو شخص رحمٰن کے ذکر سے (جان بوجھ کر) اندھا ہو جائے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پس وہ (ہر وقت) اس کے ساتھ رہتا ہے۔

۷۔ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ اٰمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ،

(سورۃ حدید۔رکوع:2)

ترجمہ: کیا ایمان والوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی یاد کے واسطے جھک جائیں۔

۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ، (سورۃ منافقون۔رکوع 2)۔

ترجمہ: اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کے ذکر سے (اس کی یاد سے) غافل نہ کرنے پائیں اور جو لوگ ایسا کریں گے، وہی خسارہ والے ہیں (کیونکہ یہ چیزیں تو دنیا ہی

میں ختم ہونے والی ہیں اور اس کی یاد آخرت میں کام آنے والی ہے)۔

۹۔ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَأَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ أُولٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ، (سورۃ المجادلۃ۔رکوع:3)۔

ترجمہ: ''(پہلے سے منافقوں کا ذکر ہے) ان پر شیطان کا تسلط ہوگیا، پس اس نے ان کو ذکراللہ سے غافل کردیا، یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں خوب سمجھ لو یہ بات محقق ہے کہ شیطان کا گروہ خسارہ والا ہے۔

۱۰۔ وَإِذَا قَامُوْا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآؤُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا، (سورۃ نساء، رکوع:21)۔

ترجمہ: (منافقوں کی حالت کا بیان ہے) اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں، صرف لوگوں کو اپنا نمازی ہونا دکھلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی نہیں کرتے مگر یوں ہی تھوڑا سا۔

یہ تمام آیات اور ان کا ترجمہ انہوں نے شیخ محمد زکریا کاندھلوی کی کتاب فضائلِ ذکر سے نقل کیا ہے۔ (صدائے ختم نبوت، ص:05، شمارہ مئی 2011)

یہ حوالہ ہم نے اس لئے نقل کیا ہے کہ نماز کے بعد ذکر بالجہر اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔

عورت کی امامت کا حکم

سوال: 37

کیا عورتیں صلوٰۃ التسبیح یا تراویح کی نماز باجماعت ادا کرسکتی ہیں؟۔

کامران اقبال، پونچھ آزاد کشمیر

جواب:

علامہ غلام سعیدی نے اپنی تفسیر تبیان القرآن، جلد:01، ص:97-393 میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور مذاہب اربعہ اُن کے اصل مآخذ کے حوالہ جات کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اس بحث کے شروع میں انہوں نے خلاصہ ان کلمات میں بیان فرمایا:

''جماعت کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ عورتوں کی جماعت ہے۔ امام شافعی کے نزدیک عورت کا عورتوں کو نماز پڑھانا اوران کا باجماعت نماز پڑھنا جائز ہے۔ امام احمد کے اس مسئلہ میں دوقول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ عورتوں کی جماعت مستحب ہے، اوردوسرا قول یہ ہے کہ غیر مستحب ہے۔ امام مالک کے نزدیک عورتوں کا عورت کی اقتدا میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت کا عورتوں کے لئے امام ہونا مکروہِ تحریمی ہے، ہرچند کہ امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک عورت کا عورتوں کے لئے امام ہونا جائز ہے لیکن انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ عورتوں کا مردوں کے لئے امام ہونا ناجائز ہے اور مردوں کے لئے عورت کی امامت باطل ہونے پر ائمہٴ اربعہ کا اجماع ہے''۔

عورت کی امامت کے بارے میں اصل یہ حدیث ہے:

عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ خَلَّادِ الْأَنْصَارِيِّ، عَنْ أُمِّ وَرَقَةَ بِنْتِ نَوْفَلٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا غَزَا بَدْرًا، قَالَتْ: قُلْتُ لَهُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! ائْذَنْ لِيْ فِي الْغَزْوِ مَعَكَ، أُمَرِّضُ مَرْضَاكُمْ، لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ شَهَادَةً، قَالَ: "قِرِّيْ فِيْ بَيْتِكِ، فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَرْزُقُكِ الشَّهَادَةَ"، قَالَ: فَكَانَتْ تُسَمَّى الشَّهِيْدَةَ، قَالَ: وَقَدْ قَرَأَتِ الْقُرْآنَ، فَاسْتَأْذَنَتِ النَّبِيَّ ﷺ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْ دَارِهَا مُؤَذِّنًا، فَاَذِنَ لَهَا، قَالَ: وَكَانَتْ دَبَّرَتْ غُلَامًا وَجَارِيَةً، فَقَامَا اِلَيْهَا بِاللَّيْلِ، فَغَمَّاهَا بِقَطِيْفَةٍ لَّهَا حَتّٰى مَاتَتْ، وَذَهَبَا، فَاَصْبَحَ عُمَرُ فَقَامَ فِي النَّاسِ، فَقَالَ: مَنْ عِنْدَهٗ مِنْ هٰذَيْنِ عِلْمٌ اَوْ مَنْ رَاٰهُمَا فَلْيَجِئْ بِهِمَا فَاَمَرَ بِهِمَا فَصُلِبَا فَكَانَا اَوَّلَ مَصْلُوْبٍ بِالْمَدِيْنَةِ۔۔۔۔۔۔ وَفِيْ حَدِيْثٍ اٰخَرَ:

قَالَ: وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَزُوْرُهَا فِيْ بَيْتِهَا، وَجَعَلَ لَهَا مُؤَذِّنًا يُؤَذِّنُ لَهَا، وَاَمَرَهَا اَنْ تَؤُمَّ اَهْلَ دَارِهَا۔۔۔۔ قَالَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ: فَاَنَا رَاَيْتُ مُؤَذِّنَهَا شَيْخًا كَبِيْرًا۔

ترجمہ: ''عبدالرحمٰن بن خلاد سے روایت ہے: اُمِ ورقہ بنت نوفل بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ جب غزوہٴ بدر کے لئے تشریف لے جانے لگے، تو میں نے ان سے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اپنے ساتھ جہاد میں جانے کی اجازت عنایت فرمائیں، میں بیماروں کی تیمارداری

کروں گی، شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا فرمادے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے گھر میں سکون سے رہو، اللہ عزوجلّ آپ کو یقیناً شہادت عطا فرمائے گا۔ عبدالرحمٰن بن خلاد کہتے ہیں کہ انہیں لوگ ''شہیدہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔۔۔۔۔عبدالرحمٰن کہتے ہیں:

اُمِ ورقہ بن نوفل نے قرآن پڑھا ہوا تھا، تو انہوں نے نبی ﷺ سے اجازت مانگی کہ وہ اپنے گھر میں ایک مؤذن رکھ لیں، آپ ﷺ نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔

عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ اُمِ ورقہ کا ایک غلام اور ایک باندی تھیں، ان دونوں کو انہوں نے مُدبَّر بنالیا تھا (یعنی یہ کہا کہ میری موت کے بعد تم دونوں آزاد ہو گے)، ایک رات وہ دونوں کھڑے ہوئے اور اُن کی چادر میں انہیں لپیٹ کر دبوچ لیا، یہاں تک کہ وہ وصال فرما گئیں اور پھر وہ دونوں بھاگ گئے۔ صبح کے وقت جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اُن کے قتل کی اطلاع ملی تو انہوں نے لوگوں سے کہا: جس شخص کو ان دونوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو یا جس نے ان دونوں کو دیکھا ہو، وہ انہیں پکڑ کر لے آئے (قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اِس قتل کا اعتراف کرلیا تھا)، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر اُن دونوں کو سولی چڑھا دیا گیا اور مدینہ منورہ میں یہ پہلے دو شخص تھے جنہیں سولی چڑھایا گیا۔

(نوٹ: ''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں جو ''شہیدہ'' قرار دیا تھا، آپ ﷺ کی یہ بشارت پوری ہوئی اور انہیں ان کے مُدبَّر غلام اور باندی نے ظلماً قتل کردیا)''۔۔۔۔اگلی حدیث میں عبدالرحمٰن بن خلاد بیان کرتے ہیں: اور رسول اللہ ﷺ اُمِ ورقہ بن نوفل سے ملنے اُن کے گھر جایا کرتے تھے اور آپ ﷺ نے اُن کے لئے ایک مؤذن مقرر کر دیا تھا اور اُنہیں حکم فرمایا کہ اپنے گھر والوں کی امامت کیا کریں۔۔۔۔عبدالرحمٰن بن خلاد بیان کرتے ہیں: میں نے دیکھا کہ اُن کا مؤذن ایک بوڑھا شخص تھا، (سنن ابی داؤد: 93-592)''۔

یہ روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری کی ''المستدرک'' اور امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی کی ''سنن کبریٰ'' میں بھی موجود ہے۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

(۱) ترجمہ: ''رائطہ حنفیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرض نمازوں میں عورتوں کی امامت کی اور اُن کے وسط میں کھڑی ہوئیں''۔

(۲) ترجمہ: ''عطاء بیان کرتے ہیں کہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا اذان دیتی تھیں، اقامت کہتی تھیں اور عورتوں کی امامت کرتی تھیں اوران کے وسط میں کھڑی ہوتی تھیں''۔

(سنن کبریٰ للبیہقی، جلد:03،ص:131،نشرالسنہ،ملتان)

اسی طرح حضرتِ اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی عورتوں کی امامت کی روایت بھی سننِ کبریٰ میں موجود ہے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عورت، عورتوں کی امامت کرے اوراُن کے وسط میں کھڑی ہو۔

اس پر سب کا اجماع ہے کہ عورت مردوں کی امامت نہیں کرسکتی اور جمعہ کی امامت بھی نہیں کرسکتی۔ ہمارے ائمہ میں سے علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی صاحب ''ہدایہ'' نے عورت کی امامت کومکروہِ تحریمی کہاہےاور علامہ کمال الدین بن ہمام صاحب ''فتح القدیر'' نے لکھاہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ مکروہِ تنزیہی یا خلافِ اولیٰ ہے۔

تاہم اگرکہیں کوئی عورت، عورتوں کی امامت کرے تو وہ آگے نہ کھڑی ہو بلکہ عورتوں کی صف کے درمیان میں کھڑی ہو۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں: وَتُكْرَهُ جَمَاعَتُهُنَّ، يَقِفُ الْإِمَامُ وَسْطَهُنَّ، وَلَا تَصْلُحُ إِمَامًا لِلرِّجَالِ۔

ترجمہ: ''اور عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، عورت امام ہوتو وہ صف کے درمیان کھڑی ہواور عورت مردوں کی امامت کی اہل نہیں ہے، (الاشباہ والنظائر، ص:316)''۔

علامہ ابن نجیم مزید اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اور عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، کیونکہ یہ حرام کے ارتکاب سے خالی نہیں ہے اور وہ ہے عورتوں کے امام کا صف کے درمیان کھڑا ہونا، تو ننگے بدن والوں کی جماعت کی طرح یہ

جماعت بھی مکروہ ہوگی، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے۔ یہ کراہتِ تحریمی پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ امام کا صف سے آگے ہونا واجب ہے، اس لئے کہ نبی ﷺ نے اس پر مُواظبت (ہمیشگی) فرمائی، اور واجب کا ترک کراہتِ تحریمی کا سبب ہے جو گناہ ہے''۔

(البحر الرائق، جلد: 01، ص: 614)

امام ابن ہمام کا عورتوں کے لئے عورت کی امامت کو مکروہِ تنزیہی قرار دینے کا سبب وہ احادیث ہیں، جو اوپر مذکور ہوئیں، جن میں حضور ﷺ نے اُمِ ورقہ کو امامت کی اجازت دی اور حضرتِ عائشہ اور حضرتِ ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے عورتوں کی امامت فرمائی۔ امام ابن نجیم اور صاحب ہدایہ و دیگر فقہاءِ امت کا عورت کی امامت کو مکروہِ تحریمی قرار دینا فقہی اصول کی بنا پر ہے، جسے ''البحر الرائق'' میں بیان کیا گیا ہے اور شاید ان ائمہ کے نزدیک وہ اجازت اُمِ ورقہ اور بعض صحابیات کے ساتھ خاص یا ان کے نزدیک یہ منسوخ ہے۔ ہمارے عہد کے مفتیانِ کرام دینی حکمت اور ضرورت کے تحت موقع کی مناسبت سے کسی ایک موقف پر رائے دے سکتے ہیں۔

امام کے پیچھے قراءت کا حکم

سوال: 38

''صلوٰۃ التسبیح'' کی جماعت میں پیچھے نماز پڑھنے والی عورتیں بھی قراءت کریں، تو کیا ان کا قراءت کرنا درست ہے؟۔

جواب:

مقتدی کا امام کے پیچھے قراءت کرنا ممنوع ہے۔ جب قرآن مجید پڑھا جائے تو خاموش رہنا اور غور سے سننا فرض ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○

ترجمہ: ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، (الاعراف: 204)''۔

اورحدیث مبارک میں ہے: عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَاللّٰہِ بْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانَ إِذَا سُئِلَ هَلْ يَقْرَأُ أَحَدٌ خَلْفَ الْإِمَامِ ،قَالَ: إِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ خَلْفَ الْإِمَامِ فَحَسْبُهُ قِرَاءَةُ الْإِمَامِ وَإِذَاصَلّٰى وَحْدَهُ فَلْيَقْرَأْ۔

ترجمہ:”نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب سوال کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص امام کے پیچھے قراءت کرے؟،تووہ فرماتے: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے توامام کی قراءت اس کے لئے کافی ہے اور جب اکیلا نماز پڑھے تو قراءت کرے“۔

(الموطاامام مالک،باب ترک القراءۃ خلف الامام،ص:68،میر محمد کتب خانہ،کراچی)

نماز میں مصحف سے دیکھ کر پڑھنے کا حکم

سوال:39

عورت اگر نماز میں قرآن مجید دیکھ کر قراءت کرے تو اس کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟۔اگر سامع دیکھ کرلقمہ دے تو کیا نماز ہوجائے گی یا نہیں؟۔

جواب:

مُصحَف (قرآن مجید) یا کسی تحریر کو دیکھ کر تلاوت کرنے سے نماز فاسد ہوجائے گی ،خواہ امام نے دیکھ کر پڑھا ہو یا نماز میں شامل کسی مقتدی یا سامع نے دیکھ کرلقمہ دیا اور امام نے اُس کا لقمہ لے لیا ہو تو امام اور تمام مقتدیوں کی نماز فاسد ہوجائے گی۔

علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

وَإِذَا قَرَأَ الْإِمَامُ مِنَ الْمُصْحَفِ : فَسَدَتْ صَلَاتُهُ عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ ،وَقَالَا : هِيَ تَامَّةٌ ،لِأَنَّهَا عِبَادَةٌ اِنْضَافَتْ اِلٰى عِبَادَةٍ أُخْرٰى، اِلَّا أَنَّهُ يُكْرَهُ ،لِأَنَّهُ تَشَبُّهٌ بِصَنِيْعِ أَهْلِ الْكِتَابِ،وَلِأَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ: أَنَّ حَمْلَ الْمُصْحَفِ،وَالنَّظَرَ فِيْهِ ،وَتَقْلِيْبَ الْأَوْرَاقِ عَمَلٌ كَثِيْرٌ ،وَلِأَنَّهُ تَلَقَّنٌ مِّنَ الْمُصْحَفِ ،فَصَارَ كَمَا اِذَاتَلَقَّنَ مِنْ غَيْرِهٖ ،وَعَلٰى هٰذَا لَافَرْقَ بَيْنَ الْمَحْمُوْلِ وَالْمَوْضُوْعِ،

ترجمہ: ''جب امام نے مُصحف سے دیکھ کر قراءت کی، تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے فرمایا: یہ نماز مکمل ہے، کیونکہ اس نماز کے ساتھ ایک اور عبادت مل گئی ہے، البتہ یہ نماز مکروہ ہے کیونکہ یہ اہلِ کتاب کی عبادت کے مُشابہ ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل یہ ہے کہ مصحف کو اٹھانا، اس کو پڑھنا اور اس کے ورق پلٹنا عملِ کثیر ہے اور اس لئے کہ اس میں مُصحف سے استفادہ ہے اور اس سے لقمہ لینا ہے، پس یہ اسی طرح ہے جس طرح خارج از نماز شخص سے نماز میں لقمہ لیا جائے۔ دوسری دلیل (یعنی یہ خارج از نماز شخص سے اصلاح لینی ہے) کے اعتبار سے اس میں کوئی فرق نہیں ہے، خواہ مصحف کو اٹھایا ہوا ہو یا رکھا ہوا ہو''۔

(ہدایہ، جلد 1، ص:269)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَقِرَاءَتُهُ مِنْ مُصْحَفٍ) أَيْ مَافِيْهِ قُرْآنٌ (مُطْلَقًا) لِأَنَّهُ تَعَلُّمٌ، اِلَّا اِذَا كَانَ حَافِظًا لِمَا قَرَأَهُ وَقَرَأَ بِلَا حَمْلٍ، وَقِيْلَ لَاتَفْسُدُ اِلَّا بِآيَةٍ۔

ترجمہ: ''اور نمازی کا قرآن مجید میں دیکھ کر پڑھنا مطلقاً مفسدِ نماز ہے، کیونکہ یہ (خارج نماز) سے سیکھنا ہے، مگر اس صورت میں یہ مفسد نہیں ہے جبکہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اس کا حافظ ہو اور قرآن کو (ہاتھ میں) اٹھائے بغیر پڑھے اور ایک قول یہ ہے کہ اگر ایک آیت سے کم مقدار میں قرآن مجید میں دیکھ کر پڑھے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (أَيْ مَافِيْهِ قُرْآنٌ) عَمَّمَهُ لِيَشْمَلَ الْمِحْرَابَ، فَإِنَّهُ اِذَا قَرَأَ مَافِيْهِ فَسَدَتْ فِي الصَّحِيْحِ، ''بَحر'' قَوْلُهُ: (مُطْلَقًا) أَيْ قَلِيْلًا أَوْ كَثِيْرًا، اِمَامًا أَوْ مُنْفَرِدًا، أُمِّيًا لَا يُمْكِنُهُ الْقِرَاءَةُ اِلَّا مِنْهُ أَوْ لَا قوله: (لِأَنَّهُ تَعَلُّمٌ) ذَكَرُوْا لِأَبِيْ حَنِيْفَةَ فِيْ عِلَّةِ الْفَسَادِ وَجْهَيْنِ: أَحَدُهُمَا: أَنَّ حَمْلَ الْمُصْحَفِ وَالنَّظَرَ فِيْهِ وَتَقْلِيْبَ الْأَوْرَاقِ عَمَلٌ كَثِيْرٌ۔ وَالثَّانِيْ: أَنَّهُ تَلَقُّنٌ مِنَ الْمُصْحَفِ فَصَارَ كَمَا اِذَا تَلَقَّنَ مِنْ غَيْرِهِ۔

ترجمہ: ''(جو کچھ قرآن مجید سے دیکھ کر پڑھا) اس میں محراب میں لکھی ہوئی عبارت بھی

شامل ہے، پس اگر اس سے دیکھ کر پڑھا، نماز فاسد ہو جائے گی، ''البحر الرائق'' میں بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ (ماتن کا قول مطلقا کا معنی یہ ہے کہ دیکھ کر جو کچھ پڑھا اس کی مقدار) خواہ کثیر ہو یا قلیل، (پڑھنے والا) امام ہو یا تنہا شخص، اُمّی ہو اُس کا پڑھنا اُس کے لئے ممکن نہ ہو لیکن جو لکھا ہوا ہے، (اُسے پڑھ سکتا ہو) یا اُمّی نہ ہو۔ (ماتن کا قول: اس لئے کہ یہ سیکھنا ہے) امام اعظم کے نزدیک دیکھ کر پڑھنے میں فساد کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں: اول: (جو ضعیف ہے) وہ یہ ہے کہ اس میں قرآن کو اٹھانا، اُس کو دیکھنا اور اُس کے ورق پلٹنا، جو کہ عملِ کثیر ہے۔ دوم: مصحف سے دیکھ کر پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے نماز سے باہر کسی شخص سے سیکھنا، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2، ص: 329، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

نماز میں لقمہ دینے کا شرعی حکم

سوال: 40

دورانِ نماز امام کو کوئی خارجِ نماز شخص لقمہ دے، تو اُس کا شرعی حکم کیا ہے؟۔

جواب:

امام کا اپنے مقتدی کے سوا کسی دوسرے شخص سے لقمہ لینا مفسدِ نماز ہے۔ غیر مقتدی کے بتانے پر اگر امام نے پڑھا تو امام کے ساتھ تمام مقتدیوں کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَفَتْحُهُ عَلٰی غَیْرِ اِمَامِهٖ) اِلَّا اِذَا اَرَادَ التِّلَاوَةَ وَكَذَا الْاَخْذُ اِلَّا اِذَا تَذَكَّرَ فَتَلَا قَبْلَ تَمَامِ الْفَتْحِ (بِخِلَافِ فَتْحِهٖ عَلٰی اِمَامِهٖ) فَاِنَّهٗ لَا یُفْسِدُ (مُطْلَقًا) لِفَاتِحٍ وَّآخِذٍ بِكُلِّ حَالٍ اِلَّا اِذَا سَمِعَهُ الْمُؤْتَمُّ مِنْ غَیْرِ مُصَلٍّ فَفَتَحَ بِهٖ تَفْسُدُ صَلَاةُ الْكُلِّ وَیَنْوِی الْفَتْحَ لَا الْقِرَاءَةَ۔

ترجمہ: ''نمازی کا اپنے امام کے سوا کسی دوسرے کو لقمہ دینا (یعنی قراءت میں رکنے پر اُس کو

بتانا خود اُس کے حق میں بھی) مفسدِ نماز ہے، لیکن اگر لقمہ دینے کی نیت سے نہیں پڑھا بلکہ تلاوت کی نیت سے پڑھا تو فاسد نہیں۔ اور اسی طرح امام کو نمازی کا لقمہ لینا مفسدِ نماز ہے مگر جب کہ خود یاد کر کے پڑھا تو مفسدِ نماز نہیں (یعنی اگر نمازی کو دوسرا شخص بتا دے تو اگر وہ اس کا بتایا ہوا پڑھے گا تو نماز فاسد ہوگی اور اگر ابھی بتانے والا بتا نہ چکا تھا کہ خود یاد آ گیا اور پڑھا تو نماز فاسد نہیں ہوگی)۔ نمازی کا اپنے امام کو لقمہ دینا مطلقاً مفسدِ نماز نہیں ہے یعنی نہ لقمہ دینے والے کی نماز کے لئے مفسد ہے اور نہ لقمہ لینے والے کے لئے ہر حال میں (یعنی امام اس قدر پڑھ چکا ہو جس سے نماز درست ہو جاتی ہے یا نہ پڑھ چکا ہو، ایک آیت سے دوسری آیت کی طرف چلا گیا ہو یا نہیں، لقمہ پہلی بار ہو یا دوسری، تیسری بار کسی طرح مفسدِ نماز نہیں) ہاں ! اگر مقتدی نے کسی خارجِ نماز شخص سے لقمہ سن کر اپنے امام کو بتایا اور امام نے لے لیا تو سب کی نماز فاسد ہوگئی۔ اور لقمہ دینے والا مقتدی بتانے کی نیت کرے نہ کہ قراءت کی (کیونکہ امام کے پیچھے قراءت مکروہ ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2، ص: 329، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

چار رکعت والی نماز میں قعدۂ اولیٰ بھول کر کھڑا ہو جانا

سوال: 41

اگر امام دو رکعت پڑھانے کے بعد بغیر تشہُد تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے اور مقتدیوں کے لقمہ دینے پر تشہُد کی طرف لوٹ آئے تو سجدۂ سہو کے ساتھ نماز ہو جائے گی یا لوٹانی ہوگی ؟، (کیپٹن زوار حسین عباسی، اسلام آباد)۔

جواب:

قَعدۂ اولیٰ واجب ہے اور واجب کے بھول کر چھوٹ جانے سے سجدۂ سہو واجب ہو جاتا ہے جس سے نماز ہو جائے گی۔ قعدۂ اولیٰ بھول جانے کی صورت میں

یاد آنے پر جب تک سیدھا کھڑا نہ ہو واپس لوٹ آئے اور سجدۂ سہو بھی واجب نہیں۔ لیکن اگر سیدھا کھڑا ہو گیا تو واپس نہ لوٹے اور آخر میں سجدۂ سہو کر لے، نماز ہو جائے گی۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(سَهَا عَنِ الْقُعُوْدِ الْأَوَّلِ مِنَ الْفَرْضِ)وَلَوْ عَمَلِيًّا،أَمَّا النَّفْلُ فَيَعُوْدُ مَالَمْ يُقَيِّدْ بِالسَّجْدَةِ (ثُمَّ تَذَكَّرَهُ عَادَ اِلَيْهِ)وَتَشَهَّدَ وَلَاسَهْوَ عَلَيْهِ فِي الْأَصَحِّ (مَالَمْ يَسْتَقِمْ قَائِمًا)فِيْ ظَاهِرِ الْمَذْهَبِ، وَهُوَ الْأَصَحُّ۔فَتْحٌ(وَاِلَّا) أَیْ وَاِنِ اسْتَقَامَ قَائِمًا (لَا) يَعُوْدُ لِاشْتِغَالِهٖ بِفَرْضِ الْقِيَامِ (وَسَجَدَ لِلسَّهْوِ)لِتَرْكِ الْوَاجِبِ۔

ترجمہ:"(اگر فرض نماز کا قعدۂ اولیٰ بھول گیا) اگر چہ وہ فرضِ عملی ہو (جیسے وتر)، رہا نفل نماز کا مسئلہ تو جب تک رکعت کا سجدہ نہیں کیا ہو لوٹ آئے۔ (پھر یاد آیا تو تشہد کی طرف لوٹ آئے) اور تشہد پڑھے۔ صحیح قول یہ ہے کہ اس پر سجدۂ سہو نہیں (جب تک وہ سیدھا کھڑا نہیں ہوا) ظاہر مذہب کے مطابق یہی صحیح ترین ہے، (فتح القدیر)۔ (اور اگر) سیدھا کھڑا ہو جائے تو (نہیں لوٹے گا) کیوں کہ اب وہ (رکن) یعنی قیام کے فرض میں مشغول ہو گیا ہے اور واجب کے ترک ہونے کی بناء پر آخر میں سجدۂ سہو کرے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2،ص:479,478)"۔

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا: "ایک شخص نماز فرض یا وتر میں پہلا قعدہ بھول کر کھڑا ہو گیا یا کھڑا ہونے لگا تو اس صورت میں کیا حکم ہے، لوٹ آئے یا نہ لوٹے؟ اور اگر کھڑا ہو گیا یا کھڑا ہونے کے قریب تھا، اس کے بعد لوٹ آیا تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟"۔

آپ نے جواب میں لکھا: "اگر ابھی قعود سے قریب ہے کہ نیچے کا آدھا بدن ہنوز سیدھا نہ ہونے پایا جب تو بالاتفاق لوٹ آئے، اس پر سجدۂ سہو نہیں۔ اور اگر قیام سے

قریب ہوگیا یعنی بدن کا نصف زیریں سیدھا اور پیٹھ میں خم باقی ہے تو بھی اصح وارجح میں پلٹ آنے ہی کا حکم ہے، مگر اب اس پر سجدۂ سہو واجب ہے۔ اور اگر سیدھا کھڑا ہوگیا تو پلٹنے کا اصلاً حکم نہیں بلکہ ختم نماز پر سجدۂ سہو کرلے۔ پھر بھی اگر پلٹ آیا بہت برا کیا، گناہگار ہوا، یہاں تک کہ حکم ہے کہ فوراً کھڑا ہوجائے اور اگر امام ایسا کرے تو مقتدی اس کی پیروی نہ کریں، کھڑے رہیں یہاں تک کہ وہ پھر قیام میں آئے مگر مذہب اَصَح (صحیح ترین) میں نماز یوں بھی نہ جائے گی، صرف سجدۂ سہو لازم رہے گا''۔

تنویرالابصار، ردالمحتار اور درمختار میں ہے:

فِیْ تَنْوِیْرِ الْاَبْصَارِ وَالدُّرِّالْمُخْتَارِ وَرَدِّالْمُحْتَارِ (سَھَا عَنِ الْقُعُوْدِ الْاَوَّلِ مِنَ الْفَرْضِ)وَلَوْ عَمَلِیًّا، اَمَّا النَّفْلُ فَیَعُوْدُ مَالَمْ یُقَیِّدْ بِالسَّجْدَۃِ (ثُمَّ تَذَکَّرَہٗ عَادَ اِلَیْہِ) وَتَشَھَّدَ وَلَاسَھْوَ عَلَیْہِ فِی الْاَصَحِّ (مَالَمْ یَسْتَقِمْ قَائِمًا) فِیْ ظَاھِرِ الْمَذْھَبِ وَھُوَ الْاَصَحُّ" فتح" یَعْنِیْ اِذَاعَادَ قَبْلَ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ قَائِمًا وَکَانَ اِلَی الْقُعُوْدِ اَقْرَبُ فَاِنَّہٗ لَاسُجُوْدَ عَلَیْہِ فِی الْاَصَحِّ وَعَلَیْہِ الْاَکْثَرُ،اَمَّا اِذَا عَادَ وَھُوَ اِلَی الْقِیَامِ اَقْرَبُ فَعَلَیْہِ سُجُوْدُالسَّھْوِ کَمَا فِیْ نُوْرِالْاِیْضَاحِ وَشَرْحِہٖ بِلَاحِکَایَۃِ خِلَافٍ فِیْہِ وَصَحَّحَ اِعْتِبَارُ ذٰلِکَ فِی الْفَتْحِ بِمَا فِی الْکَافِیْ اِنِ اسْتَوَی النِّصْفُ الْاَسْفَلُ وَظَھْرُہٗ بَعْدَ مُنْحَنٍ فَھُوَ اَقْرَبُ اِلَی الْقِیَامِ وَاِنْ لَّمْ یَسْتَوِ فَھُوَ اَقْرَبُ اِلَی الْقُعُوْدِ وَاِنِ اسْتَقَامَ قَائِمًا لَایَعُوْدُ وَسَجَدَ لِلسَّھْوِ فَلَوْ عَادَ اِلَی الْقُعُوْدِ لَاتَفْسُدُ لٰکِنَّہٗ یَکُوْنُ مُسِیْئًا اَیْ یَاْثَمُ کَمَافِی "الْفَتْحِ" فَلَوْ کَانَ اِمَامًا لَایَعُوْدُ مَعَہُ الْقَوْمُ تَحْقِیْقًا لِلْمُخَالَفَۃِ وَیَلْزَمُہُ الْقِیَامُ لِلْحَالِ" شَرْحُ الْمُنْیَۃِ عَنِ الْقُنْیَۃِ" وَیَسْجُدُ لِتَاخِیْرِ الْوَاجِبِ وَھُوَالْحَقُّ "بَحْرٌ"۔

ترجمہ:''اگر فرض کا قعدۂ اولیٰ بھول گیا، اگر چہ وہ فرض عملی ہو، رہا معاملہ نفل کا تو لوٹ

آئے جب تک رکعت کا سجدہ نہیں کیا (پھر اسے یاد آیا تو اس کی طرف لوٹ آئے) اور تشہد پڑھے اور صحیح ترین قول کے مطابق اس پر سجدۂ سہو نہیں (جب تک وہ سیدھا کھڑا نہیں ہوا) ظاہر مذہب کے مطابق ، اور یہی قول صحیح ترین ہے یعنی سیدھا کھڑے ہونے سے پہلے لوٹا حالانکہ قعود کے قریب تھا تو اب صحیح ترین قول کے مطابق اس پر سجدۂ سہو نہیں ۔ اکثریت کی یہی رائے ہے، اگر لوٹا، لیکن قیام کے قریب تھا تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہو جائے گا، جیسا کہ ''نور الایضاح'' اور اس کی شرح میں بلا اختلاف ذکر کیا ہے اور کافی کی اس عبارت کو ''فتح القدیر'' میں صحیح اعتبار کیا ہے کہ اگر نصف اسفل (نیچے کا آدھا دھڑ) سیدھا مگر پشت ابھی ٹیڑھی تھی تو نمازی قیام کے قریب اور اگر نچلا دھڑ سیدھا نہیں تو نمازی قعود کے قریب ہوگا۔ اور اگر کھڑا ہو گیا تو نہ لوٹے اور سجدۂ سہو کرے اور اگر اب بھی واپس لوٹ آتا ہے تو نماز فاسد نہ ہوگی، البتہ گناہ گار ہوگا جیسا کہ ''فتح القدیر'' میں ہے۔ اگر وہ امام ہے اور کھڑے ہو کر واپس لوٹے تو مقتدی اس کی موافقت میں واپس نہ لوٹیں تا کہ مخالفت ثابت ہو تو اس امام پر فوراً قیام لازم ہے۔ ''شرح المنیہ'' میں ''قنیہ'' سے ہے اور تاخیر واجب کی وجہ سے سجدۂ سہو کرے اور یہی حق ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد:8، ص:182،181)''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر دوسری رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ کے لئے بیٹھنے کے بجائے تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہو گیا ہے تو قُعُود (تشہد) کی طرف نہیں لوٹے گا اور سجدۂ سہو سے نماز درست ہو جائے گی۔ اگر ابھی سیدھا کھڑا نہیں ہوا اور قعود کے قریب ہے، تو بیٹھ جائے اور اس صورت میں سجدۂ سہو نہیں کرے گا۔ اگر مقتدی یا امام سیدھا کھڑے ہونے کے بعد خود یاد آنے پر تشہد کی طرف لوٹ آئیں تو علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَوْ عَادَ اِلَى الْقُعُوْدِ تَفْسُدُ صَلَاتُهٗ عَلَى الصَّحِيْحِ كَذَا فِي "التَّبْيِيْن"۔

ترجمہ: ''اور اگر (دوسری رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ کے لئے بیٹھنے کے بجائے تیسری رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہونے کے بعد) قعدے کی طرف لوٹ آیا، تو صحیح قول کے مطابق نماز فاسد ہوجائے گی۔ ''تبیین'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 127، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

لیکن سطور بالا میں امام احمد رضا قادری نے علامہ علاؤالدین حصکفی اور علامہ ابن عابدین شامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر منفرد یا امام سیدھا کھڑے ہونے کے بعد خود یاد آنے پر (قعدۂ اولیٰ کے لئے) لوٹ آئیں تو نماز فاسد نہیں ہوگی، لیکن وہ گناہگار ہوں گے اور تاخیر فرض یا ترک واجب کی بنا پر سجدۂ سہو لازم آئے گا۔ اگر امام مقتدی کے یاد دلانے پر کھڑا ہونے کے بعد قعدۂ اولیٰ (جسے وہ بھول کر کھڑا ہو گیا تھا) کی طرف لوٹ آیا تو اس صورت میں امام اور مقتدی سب کی نماز فاسد ہوجائے گی، کیوں کہ یہ تلقین (مقتدی کا اپنے امام کو غلطی پر مطلع کرنے کے لئے لقمہ دینا) اور تَلَقُّن (یعنی امام کا لقمہ لینا) بلاضرورت ہے اور یہ فساد صلوٰۃ کا سبب ہے۔ تلقین اور تَلَقُّن کے تفصیلی دلائل ہم تفہیم المسائل، جلد: سوم، ص: 54 پر تحریر کرچکے ہیں، وہاں مطالعہ فرمائیں۔

مسافر کے پندرہ دن سے کم قیام پر قصر ہے

سوال: 42

ایک شخص پشاور سے کراچی تک سفر کرتا ہے۔ ایک ہفتہ کراچی میں ہوتا ہے تو دوسرے ہفتے پشاور میں ہوتا ہے یعنی آنا جانا لگا رہتا ہے، تو ایسے شخص کی نماز کا کیا حکم ہے، وہ قصر نماز ادا کرے گا یا پوری؟۔

(صفدر اقبال نعیم، ضلع سدھنوتی، آزاد کشمیر)

جواب:

مذکورہ شخص وطنِ اصلی میں تو پوری نماز ادا کرے گا، لیکن جب حالتِ سفر میں ہوگا اور کسی مقام پر 15 دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو وہاں نماز قصر کرے گا۔ جب تک بندہ کسی مقام پر 15 دن یا اُس سے زائد عرصے کے لئے قیام کی نیت نہ کرے، تو وہ شرعاً مسافر ہی کہلائے گا، نماز میں قصر کرے گا۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (أَوْ يَنْوِي)وَلَوْ فِي الصَّلَاةِ إذَا لَـمْ يَـخْرُجْ وَقْتُهَا وَلَمْ يَكُ لَاحِقاً (إقَامَةَ نِصْفِ شَهْرٍ) حَقِيقَةً أَوْ حُكْمًا لِمَا فِي "الْبَزَّازِيَّةِ" وَغَيْرِهَا، (بِمَوْضِعٍ صَالِحٍ لَّهَا) مِنْ مَصْرٍ أَوْ قَرْيَةٍ أَوْ صَحْرَاءِ دَارِنَا وَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْأَخْبِيَةِ (فَيَقْصُرُ إنْ نَوَى)الْإِقَامَةَ (فِي أَقَلَّ مِنْهُ)أَيْ فِي نِصْفِ شَهْرٍ۔

ترجمہ: ''(یا وہ نصف ماہ اقامت کی نیت کرے) اگرچہ اقامت کی نیت نماز کے اندر کرے بشرطیکہ نماز کا وقت نہ نکلا ہو اور مسافر لاحق نہ ہو، پھر اقامت کی نیت حقیقت میں ہو یا حکماً دونوں معتبر ہیں جیسے کہ ''بزازیہ'' وغیرہ میں اس کی مثال موجود ہے، (اقامت کی نیت کسی ایسی جگہ کرے جو اقامت کی صلاحیت رکھتی ہو) شہر ہو یا گاؤں ہو یا ہمارے ملک کا صحرا ہو اور نیت کرنے والا خانہ بدوش ہو، (پس نماز میں قصر کریں گے، اگر پندرہ دن سے کم اقامت کی نیت کی ہو)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 528، 529، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

مساجد اور وقف کے مسائل

کسی کی ذاتی زمین پر مسجد بنانا یا اُسے مسجد میں شامل کرنا

سوال: 43

میں 2000ء میں وفاقی محتسب کے دفتر میں I.G.M کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ گورنمنٹ کی جانب سے مجھے ایک پلاٹ ملا، جس کا نمبر: L-534 سیکٹر 3 نیو کراچی الاٹ ہوا تھا۔ قریب ہی ایک جامع مسجد ہے، اُس مسجد کی انتظامیہ نے میرے پلاٹ پر غیر قانونی قبضہ کرلیا ہے اور میرے پلاٹ کو مسجد کا کمپاؤنڈ بنالیا ہے۔ میرے علاوہ قریب بارہ پلاٹ اور بھی مسجد انتظامیہ نے قبضہ کئے ہیں۔ جناب سے گذارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ عنایت فرمائیں کہ مسجد انتظامیہ کا طرزِ عمل درست ہے؟۔

انجینئر محمد اشفاق، تاج کمپلیکس، گلشنِ ظہور، کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کا بیان درست ہے اور مسجد انتظامیہ نے آپ کے اور دوسرے لوگوں کے ذاتی الاٹ شدہ پلاٹوں پر آپ لوگوں کی اجازت کے بغیر قبضہ کر کے مسجد میں شامل کیا ہے تو اُن کا یہ طرزِ عمل قطعاً ناجائز، خلافِ شرع اور خلافِ قانون ہے۔ آپ کے بیان کے مطابق پلاٹ کے آپ مالک ہیں، جسے مسجد کمپاؤنڈ میں شامل کیا گیا ہے، لیکن آپ کے سوال سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا آپ کی زمین کو مسجد کے اُس حصے میں شامل کیا گیا ہے، جس پر نماز ادا کی جارہی ہے؟، اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا حکم شرعی یہ ہے:

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

اَلصَّلاۃُ فِیْ أَرْضٍ مَغْصُوْبَۃٍ جَائِزَۃٌ وَلٰکِنْ یُعَاقَبُ بِظُلْمِہٖ فَمَا کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اللّٰہِ تَعَالٰی یُثَابُ وَمَا کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْعِبَادِ یُعَاقَبُ کَذَافِی "مُخْتَارِ الفَتَاوٰی"۔

ترجمہ: ''غصب شدہ زمین پر نماز جائز تو ہے (یعنی پڑھنے سے ادا ہو جائے گی)، لیکن اِس ظلم کے سبب اس کو سزا دی جائے گی، جو کچھ اُس بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے، (اگر

اللہ تعالیٰ چاہے تو اُسے نماز کا) ثواب دے گا اور جو کچھ اُس کے اور دوسرے بندوں کے درمیان ہے، اس کا مواخذہ کیا جائے گا، جیسا کہ ''مختار الفتاویٰ'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 109، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

لیکن مغصوبہ زمین پر نماز کے ادا ہو جانے کا یہ فتویٰ ''اسقاطِ فرض'' کے معنی میں ہے، اس پر اجر کا مدار اللہ تعالیٰ کے کرم پر موقوف ہے اور ہمارے بعض فقہاءِ کرام نے غصب شدہ زمین پر نماز کو مکروہ قرار دیا ہے۔

علامہ طحطاوی متوفیٰ 1231ھ لکھتے ہیں: (وَ) یُکْرَہُ فِیْ (أَرْضِ الْغَیْرِ بِلَا رِضَاہُ)

ترجمہ: ''کسی شخص کی زمین پر اُس کی مرضی کے بغیر نماز پڑھنا مکروہ ہے''۔

(حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 1، ص: 484)

اور اگر اُسے محض کمپاؤنڈ یا چہار دیواری میں شامل کر رکھا ہے، تب بھی دوسرے کی ملکیتی زمین پر غاصبانہ قبضہ ناجائز ہے، حدیث پاک میں ہے:

''مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ ظُلْماً، طَوَّقَهُ اللّٰهُ اِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرْضِيْنَ''۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا، تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4055)''۔

مفتی وقار الدین علیہ الرحمہ سے سوال کیا گیا: ''کسی کی زمین میں مسجد تعمیر کی گئی، آیا وہ مالک زمین اس مسجد کو منہدم کر سکتا ہے یا نہیں؟''۔ آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''کسی شخص کا اپنی شخصی ملکیت میں مسجد بنانا جائز ہے اور اگر کوئی دوسرا شخص بنالے تو وہ مسجد نہ ہوگی اس کے توڑ دینے کا مالک کو اختیار ہے اس لئے کہ مسجد وقف ہے اور وقف مالک ہی کر سکتا ہے، علامہ ابن عابدین شامی متوفیٰ 1252ھ نے شامی میں لکھا: ذَکَرَ فِی "الْبَحْرِ" أَنَّ مَفَادَ کَلَامِ الْحَاوِیْ اِشْتِرَاطُ کَوْنِ اَرْضِ الْمَسْجِدِ مِلْکًا لِّلْبَانِیْ

(کتاب الوقف، جلد 3، ص: 405، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

ترجمہ: ''''البحر الرائق'' میں ذکر کیا کہ ''الحاوی للفتاویٰ'' کے کلام کا حاصل یہ ہے

کہ (وقف کے صحیح ہونے کی) شرط یہ ہے کہ مسجد کی زمین بانیٔ مسجد کی ملک میں ہو۔ مالک کی اجازت کے بغیر کسی کی زمین پر قبضہ کرنا غصب کرنا ہے اور فقہ کی تمام کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ غصب کی ہوئی زمین پر نماز مکروہ ہے، لہٰذا ایسی مسجد جو مالک کی اجازت کے بغیر بنائی گئی ہو، اس میں تو نماز پڑھنا ہی مکروہ ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد دوم، ص:305)''۔

مذکورہ صورت میں آپ کو شرعی اور قانونی اختیار حاصل ہے کہ اپنے پلاٹ کے حصول کے لئے چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔ مسجد انتظامیہ کے لئے مناسب صورت یہ ہے کہ پلاٹ کے مالک کے ساتھ باہمی رضامندی سے زمین کا سودا کرلیں، ایسی صورت میں وہ پلاٹ مسجد کی ملکیت بن جائے گا اور اس کا مسجد میں شامل کرنا درست ہوگا یا پلاٹ کے مالکان اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنے پلاٹوں کو مسجد کے لئے وقف کردیں۔ ورنہ کسی کی زمین کو ظلماً غصب کر کے اور اس پر قبضہ کر کے اس کا مسجد بنانا شرعاً ناجائز ہے اور اس پر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

مسجد فنڈ سے وضو خانہ کی تعمیر

سوال: 44

مسجد کے ساتھ مدرسہ ہے اور مدرسے کی جگہ میں وضو خانہ اور استنجاء خانہ بنوانا ہے جو کہ دونوں کے لئے استعمال ہوگا، کیا ایسا کرنا درست ہوگا؟۔ نیز مسجد کی رقم سے تعمیر کی جاسکتی ہے یا نہیں، یا مدرسے کا علیحدہ فنڈ موجود ہے اُس سے تعمیر کروایا جائے؟۔

جامع مسجد عثمانیہ، اورنگی، کراچی

جواب:

فنائے مسجد یعنی مسجد کی حدود میں اگر اُس مقام پر پہلے سے کچھ تعمیر نہیں ہے، تو وہاں وضو خانہ اور استنجا خانہ بنوایا جاسکتا ہے اور مسجد و مدرسہ دونوں کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ ہاں! اگر اس جگہ پہلے ہی کچھ تعمیر ہے تو اس میں تبدیلی کرنا جائز نہیں۔ علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَلَا یَجُوزُ تَغْیِیرُ الْوَقْفِ عَنْ هَیْئَتِهٖ، ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490)''۔

مسجد کے عطیات صدقاتِ نافلہ ہوتے ہیں ۔آج کل مساجد کے لئے عوام سے جو عمومی چندہ یا عطیات لئے جاتے ہیں ،ان میں یہ امر معروف ہے کہ یہ مسجد کے مصارف جاریہ کے لئے ہیں،ان میں مساجد کی تعمیر ومرمت ،یوٹیلٹی بلز (بجلی ، لاؤڈ اسپیکر، گیس اور پانی وغیرہ)ضرورت کے وقت رنگ وروغن، دریاں ، قالین، ٹیوب لائٹس ، پنکھے ،پانی وسیوریج کا انتظام اور مسجد کے عملے کی تنخواہیں اور دیگر مصارف شامل ہوتے ہیں، البتہ جو رقم تعمیر یا کسی معینہ مصرف کے لئے دی جائے یا لی جائے ،اسے صرف اسی معیّن مصرف پر خرچ کرنا ضروری ہے۔وضو خانہ اور استنجا خانہ مسجد کی ضروریات میں سے ہے،لہٰذا اس پر مسجد کے فنڈ سے خرچ کیا جاسکتا ہے۔اگر مدرسے کا فنڈ الگ ہے اور وضو خانہ وغسل خانے وغیرہ صرف طلباء کی ضروریات کے لئے بنوانے ہیں،تو ان پر مدرسے کے فنڈ سے رقم خرچ کی جائے۔

دیہات میں عید گاہ کا شرعی حکم

سوال:45

ہمارے دیہات میں ایک قدیم عید گاہ قائم ہے جو کہ آبادی کے اندر واقع ہے اس کو آبادی سے باہر منتقل کرنا مقصود ہے۔کیا اس قدیمی عید گاہ کو آبادی سے باہر منتقل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ،کیا عید گاہ میں نصب اینٹوں کو مجوزہ عید گاہ کے لئے استعمال کر سکتے ہیں؟۔نئی عید گاہ کے لئے دیہات کے مکینوں نے اراضی حاصل کر لی ہے ،اب پرانی عید گاہ کے اراضی کو فروخت کر کے رقم نئے عید گاہ کے قیام کے تصرف میں لایا جاسکتا یا نہیں؟۔

خدا بخش بلوچ

چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف،کوئٹہ،بلوچستان

جواب:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے ''عیدین میں جگہ کی تنگی کے باعث قدیمی عید گاہ چھوڑ کر دوسری جگہ عید گاہ منتقل کرنے اور پرانی جگہ کو قبرستان میں تبدیل کرنے

سے متعلق'' سوال ہوا، انہوں نے جواب میں لکھا: بیانِ سائل سے معلوم ہوا کہ یہ موضع ایک گاؤں ہے، اور ہمارے ائمہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کے مذہب میں گاؤں میں عیدین جائز نہیں تو وہاں عیدہ گاہ وقف نہیں ہوسکتی کہ محض بے حاجت و بے قربت بلکہ مخالفِ قربت ہے، تو وہ زمین وعمارت مِلکِ بانیان ہیں انہیں اختیار ہے اس میں جو چاہیں کریں خواہ اپنا مکان بنائیں یا زراعت کریں یا قبرستان کرائیں اوراب وہاں دوسری عیدگاہ بنائی گئی اس کی بھی یہی حالت ہوگی۔ درمختار میں ہے:فِی "اَلْقُنْیَۃِ" صَلٰوۃُ الْعِیْدِفِی الْقُرٰی تُکْرَہُ تَحْرِیْمًا اَیْ لِاَنَّہٗ اِشْتِغَالٌ بِمَالَایَصِحُّ۔ ترجمہ: ''قنیہ'' میں ہے کہ گاؤں میں نمازِ عید مکروہِ تحریمی ہے یعنی ایسی چیز میں مشغول ہونا ہے جو صحیح نہیں، اُسی کی کتاب الوقف میں ہے:شَرْطُہٗ اَنْ یَّکُوْنَ قُرْبَۃً فِیْ ذَاتِہٖ ۔ترجمہ: ''شرطِ وقف یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے قربتِ مقصودہ ہو، (فتاویٰ رضویہ، جلد:16،ص:342)''۔

اعلیٰ حضرت مُحدثِ بریلی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوا کہ سابقہ پرانی عیدگاہ کا فروخت کرنا یا اس کو اپنے دوسرے تصرُّفات میں لانا جائز ہے، اسی طرح پرانی عیدگاہ کی اینٹوں کو نئی عیدگاہ کی تعمیر میں بھی استعمال کرنا جائز ہے، تاہم دیہات والوں کے لئے جو نئی عیدگاہ بنائی جائے گی، اس کا حکم بھی یہی ہوگا۔

مسجد فنڈ سے ضعیف امام کی اعانت اور کفالت اور امام کی چھٹیوں کی تنخواہ

سوال:46

(1) اگر کوئی امام، مؤذن اور خادم عملۂ مسجد اپنی کمزوری و بُڑھاپے کی وجہ سے کام کرنا چھوڑ دے، تو کیا مسجد فنڈ سے مستقل ماہانہ اس کی مدد کی جاسکتی ہے یا نہیں؟۔سال کے بعد عملے کا کوئی فرد (امام، مؤذن یا خادم) چھٹی بغیر انتظام کئے چلا جائے، چھٹی کی تنخواہ مسجد فنڈ سے لینا جائز ہے یا نہیں؟، (قاری خالد، کریمہ مسجد، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)۔

(2) ہماری مسجد میں شروع ہی سے یہ معمول رہا ہے کہ امام، مؤذن اور خادم عملۂ مسجد کو چھ ماہ بعد 15 دن یا ایک سال بعد ایک ماہ کی چھٹی مع تنخواہ دی جاتی ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً

جائز ہے؟۔ نیز ہماری مسجد کے مؤذن صاحب ایک سال ایک ماہ کے بعد استعفیٰ دے کر جارہے ہیں اور سال بھر میں انہوں نے چھٹیاں نہیں کیں۔ کیا اُنہیں ایک ماہ کی چھٹی کی تنخواہ لینا شرعاً جائز ہے؟۔ مسجد کے عملے کی تنخواہ چندے سے دی جاتی ہے، نمازیوں کے علم میں بھی یہ بات ہے (سردار احمد قادری، جامع مسجد فیضانِ اولیاء کھارادر، کراچی)۔

جواب:

اگر امام، مؤذن یا خادم وغیرہ میں سے کوئی فرد کسی بھی سبب سے اپنے منصب سے دستبردار ہو گیا تو اب مسجد کے فنڈ یا عطیات سے اُسے کوئی رقم نہیں دی جاسکتی کہ مسجد کی جمع شدہ رقم مالِ وقف ہے، جو صرف مصارفِ مسجد مثلاً مسجد کے عملے کا مشاہرہ اور ضروریات و مصالح مسجد کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ البتہ اگر مسجد کی انتظامیہ کے افراد یا اہلِ محلّہ اُس امام، مؤذن یا خادم کے عمر رسیدہ ہونے کا خیال کرتے ہوئے یا عقیدت کے سبب اس کی مالی مدد کے لئے علیحدہ فنڈ قائم کریں، خود بھی حصہ ڈالیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیں، تو یہ اجر کی بات ہے۔ مسجد کے عطیات یا فنڈ اس مقصد کے لئے استعمال نہ کریں۔ لیکن اگر مسجد انتظامیہ نے اپنے عملے کے لئے شرائط ملازمت طے کر رکھی ہوں، جن میں ہفتہ وار یا سالانہ تعطیلات مع تنخواہ اور ایامِ ضعیفی کا گزارہ الاؤنس اور علاج معالجہ وغیرہ شامل ہیں، اور چندہ وعطیات دینے والوں پر بھی یہ مقاصد واضح ہوں اور مسجد فنڈ میں گنجائش ہو تو ایسا کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن امر ہے۔ فقہاء کرام نے ائمہ اور مُدرسین کے لئے چھٹی کے زمانے کی تنخواہ لینا جائز لکھا ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَ فِی "الْقُنْیَةِ" مِنْ بَابِ الْإِمَامَةِ: إِمَامٌ یَتْرُكُ الْإِمَامَةَ لِزِیَارَةِ أَقْرِبَائِهِ فِی الرَّسَاتِیْقِ أُسْبُوْعًا أَوْ نَحْوَهُ أَوْلِمُصِیْبَةٍ أَوْلِإِسْتِرَاحَةٍ لَابَأْسَ بِهِ وَمِثْلُهُ عَفْوٌ فِی الْعَادَةِ وَالشَّرْعِ۔

ترجمہ: ''قنیہ'' باب الامامت میں یہ ہے کہ اگر امام اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر دیہات میں ایک ہفتہ یا کم وبیش مدت کے لئے اپنے رشتہ داروں سے ملنے گیا یا کسی مصیبت کی وجہ سے گیا یا محض آرام کی خاطر گیا، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اتنی رخصت یا غیر حاضری شرعاً اور

عادتاً معاف ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص:493، بیروت)"۔

سرکاری ونجی اداروں میں بھی عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ سال میں ایک مہینے کی چھٹی مع تنخواہ دی جاتی ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قَالَ فِی "الْأَشْبَاہِ" : وَقَدِ اخْتَلَفُوْا فِیْ أَخْذِ الْقَاضِیْ مَا رُتِّبَ لَہٗ فِیْ بَیْتِ الْمَالِ فِیْ یَوْمِ بِطَالَتِہٖ ،فَقَالَ فِی "الْمُحِیْطِ" :اِنَّہٗ یَأْخُذُ لِأَنَّہٗ یَسْتَرِیْحُ لِلْیَوْمِ الثَّانِیْ ،وَقِیْلَ :لَا۔ وَفِی "الْمُنْیَۃِ" :اَلْقَاضِیْ یَسْتَحِقُّ الْکِفَایَۃَ مِنْ بَیْتِ الْمَالِ فِیْ یَوْمِ الْبِطَالَۃِ فِی الْأَصَحِّ،

ترجمہ:" الاشباہ والنظائر میں ہے: فقہاء نے قاضی کو چھٹیوں کے ایام کی تنخواہ لینے میں اختلاف فرمایا ہے، جو قاضی کے لئے بیت المال سے مقرر کیا گیا ہے، "محیط" میں فرمایا: ایامِ تعطیلات کی تنخواہ لے گا کیونکہ وہ دوسرے دن کام کے لئے ہی آرام کرتا ہے، اور بعض نے کہا کہ (تنخواہ) نہیں لے گا۔ اور "منیہ" میں ہے: صحیح ترین یہ ہے کہ قاضی ایامِ تعطیلات کی تنخواہ کفایت کے مطابق لینے کا مستحق ہے"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، ص:444، بیروت)

امام کو متبادل انتظام کرکے یا انتظامیہ کو پیشگی اطلاع دے کر جانا چاہئے تاکہ وہ انتظام کرسکیں۔

مسجد کی حیثیت کو تبدیل کرنا

سوال: 47

ہمارے گاؤں میں ایک مسجد زیرِ تعمیر ہے جو کہ ایک مدرسہ میں ہے، تقریباً مکمل ہوچکی ہے، اس سے قبل ہمارے دادا کے وقتوں کی ایک چھوٹی سی مسجد چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اب نئی مسجد بن چکی ہے، تو پہلے والی مسجد کا کیا کریں، شہید کرکے اس جگہ کو عام استعمال میں لاسکتے ہیں یا نہیں، اگر اُسے شہید نہیں کرسکتے تو کیا کریں؟۔

محمد نعیم لطیف، حاصل پور: بہاولپور

جواب:

جب پہلے سے ایک مسجد موجود ہے تو اُس کے قریب دوسری مسجد تعمیر کرنا ہرگز

جائز نہیں تھا کہ اس سے سابقہ مسجد کی تعطیل وتخریب (بے کار کردینا ویران کردینا) ہے، جو حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا۔

ترجمہ: ''اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہے جو اللہ کی مساجد میں اس کے نام کے ذکر سے منع کرے اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے، (البقرہ:114)''۔

مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہی ہے اور اس کی مسجدیت کبھی باطل نہیں ہوسکتی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَا يَجُوْزُ تَغْيِيْرُ الْوَقْفِ عَنْ هَيْئَتِهٖ، ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں، (فتاویٰ عالمگیری جلد2 ص:490، مطبوعہ مکتبہء رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد آسمان کی بلندی اور زمین کی گہرائی (تحت الثریٰ) تک مسجد ہی ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

قَوْلُهٗ اِلٰى عَنَانِ السَّمَآءِ بِفَتْحِ الْعَيْنِ وَكَذَا اِلٰى تَحْتَ الثَّرٰى كَمَا فِى الْبِيْرِيِّ عَنِ الْاِسْبِيْجَابِيِّ ۔

ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے ''بیری'' میں اسبیجابی سے اسی طرح منقول ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2، ص:371-370)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پرانی مسجد کی جگہ چھوڑ کر نئی مسجد بنانے کے متعلق سوال کیا گیا، آپ نے جواب میں لکھا: ''حتی الامکان مسجد کا آباد کرنا فرض ہے اور ویران کرنا حرام، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا۔

ترجمہ: ''اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکتا ہے اور ان کی بربادی کی کوشش کرتا ہے، (البقرہ:114)''۔

مزید لکھتے ہیں کہ: جو صاحب پختہ بنانا چاہتے ہیں، اسی کو پختہ کریں اور آباد کریں، جدا مسجد بنانے میں نفل کا ثواب پائیں گے اور اس مسجد کے آباد کرنے میں فرض کا ثواب، نفل کے

ثواب کوفرض کے ثواب سے کچھ نسبت نہیں ہوسکتی"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 16، ص:413، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

پرانی مسجد کو شہید کرنا اور کسی دوسرے استعمال میں لانا قطعاً جائز نہیں ،مسجد بنانا یقیناً اجروثواب کا باعث ہے، لیکن اگر اُس سے پرانی مسجد ویران ہوتی ہوتو ہرگز نہیں بنانی چاہئے کہ مسجد کا ویران کرنا اور اُسے شہید کرنا حرامِ قطعی ہے۔شرعی مسئلہ تو آپ کونئ مسجد بننے سے پہلے معلوم کرنا چاہئے تھا، بہر حال اب جس طرح ممکن ہوکوشش یہ کرنی چاہئے کہ نئ مسجد بھی آباد ہواور پرانی مسجد بھی آباد رہے۔ایسی صورت میں ہمیشہ یہ تدبیر کرنی چاہئے کہ پہلے سے جو مسجد قائم ہے حسبِ ضرورت ملحق زمین حاصل کر کے اسی کی توسیع کی جائے۔زمین نقد قیمت پر بھی خریدی جاسکتی ہے اور تبادلے کے ذریعے بھی۔البتہ پرانی مسجد کو شہید کر کے نیا عمارتی نقشہ اس طرح بنایا جاسکتا ہے کہ پرانی مسجد نئ توسیع شدہ مسجد میں شامل ہو جائے۔

نئ مسجد بنانے سے پہلی مسجد کا حق ادانہیں ہوسکتا ہے،وہ مسجد قیامِ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، کسی دوسرے کام میں اسے ہرگز استعمال نہیں کیا جاسکتا،امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:"جو زمین متعلق مسجد ہے وہ مسجد ہی کے کام میں لائی جاسکتی ہے اور اس کے بھی اُس کام میں جس کیلئے واقف نے وقف کی ،وقف کواس کے مقصد سے بدلنا جائز نہیں، شَرْطُ الْوَاقِفِ کَنَصِّ الشَّارِعِ فِیْ وُجُوْبِ الْعَمَلِ بِہٖ۔ (واقف کی شرط وجوب عمل میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نص کی مثل ہے)۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 16، ص:546، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

مسجد میں انگلیاں چٹخانے کا شرعی حکم

سوال:48

مسجد میں انگلیاں چٹخانا کیسا ہے،(منور احمد،ملیر کراچی)۔

جواب:

انگلیاں چٹخانا ویسے بھی مکروہ اور ناپسندیدہ فعل ہے اور مسجد میں اس کی کراہیت

اور زیادہ بڑھ جائے گی۔

عَنْ عَلِيٍّ ،اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰه ﷺ قَالَ :لَا تُفَقِّعْ أَصَابِعَكَ وَأَنْتَ فِي الصَّلَاةِ ۔

ترجمہ:''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم نماز میں ہوتو انگلیاں نہ چٹخاؤ، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:965)''۔

حضرت کعب بن عجرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:اِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ فَأَحْسَنَ وُضُوءَهُ ،ثُمَّ خَرَجَ عَامِدًا اِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يُشَبِّكَنَّ بَيْنَ أَصَابِعِهٖ فَإِنَّهٗ فِيْ صَلَاةٍ ۔

ترجمہ:''تم میں سے جب کوئی شخص اچھی طرح وضو کر کے مسجد میں جانے کے ارادے سے نکلے ،پس ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں نہ ڈالے کہ وہ نماز میں ہے،(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:386)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:وَيُكْرَهُ اَنْ يُشَبِّكَ اَصَابِعَهٗ وَاَنْ يُفَرْقِعَ كَذَا فِيْ "فَتَاوٰى قَاضِيْ خَانْ"،وَالْفَرْقَعَةُ اَنْ يَغْمِزَهَا اَوْيَمُدَّهَا حَتّٰى تَصُوْتَ،كَذَا فِي "النِّهَايَةِ" وَالْفَرْقَعَةُ خَارِجَ الصَّلٰوةِ كَرِهَهَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ كَذَافِي "الزَّاهِدِيِّ" ۔

ترجمہ:''(نماز میں) انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈالنا اور انگلیاں چٹخانا مکروہ (تحریمی) ہے جیسا کہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے ۔اور انگلیاں چٹخانے کی ہر صورت، جس سے آواز پیدا ہو، (منع ہے)،خواہ انگلیاں موڑ کر دبانے سے ہو یا لمبا کرنے سے ہو،جیسا کہ ''نہایہ'' میں ہے اور نماز کے علاوہ بھی انگلیاں چٹخانا اکثر علماء کے نزدیک مکروہ ہے ،جیسا کہ ''زاہدی''میں ہے،(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:106،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(وَفَرْقَعَةُ الْأَصَابِعِ) وَتَشْبِيْكُهَا وَلَوْمُنْتَظِرًا لِصَلَاةٍ أَوْ مَاشِيًا اِلَيْهَا لِلنَّهْيِ ،وَلَا يُكْرَهُ خَارِجَهَا لِحَاجَةٍ۔

ترجمہ:''انگلیاں چٹخانا اور ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالنا مکروہ تحریمی ہے،خواہ نماز کے انتظار میں ہو یا نماز کے لئے جارہا ہو،اور اگر بیرونِ نماز کسی

ضرورت کے سبب ہوتو مکروہ نہیں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص:353، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مسجد میں فتنہ وفساد برپا کرنے والے کا شرعی حکم

سوال:49

اگر کسی نمازی کے سبب مسجد میں فتنہ وفساد پیدا ہوتا ہو تو کیا ایسے نمازی کو مسجد میں آنے سے روکا جاسکتا ہے؟۔

جواب:

ایسا شخص جو فتنہ وفساد کا سبب بنے اور اس کی حرکت یا قول وفعل سے نمازیوں کو تکلیف پہنچتی ہے یا لوگوں کی نمازوں، عبادات، ذکر وفکر، تلاوت اور دیگر معمولات میں خلل واقع ہوتا ہے یا وہ خواہ مخواہ شور مچاتا ہے، لوگوں سے جھگڑتا ہے، تو ایسے شخص کو مسجد سے روکنا درست ہے، خلافِ شرع ہرگز نہیں ہے۔ احادیثِ مبارکہ اور فقہاء کرام کے اقوال سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کچی پیاز، لہسن یا کوئی بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ :أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الْبَقْلَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسَاجِدَنَا ،حَتّٰى يَذْهَبَ رِيْحُهَا يَعْنِي الثُّوْمَ

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس ترکاری یعنی لہسن کو کھائے، وہ اس وقت تک ہماری مسجد کے قریب نہ آئے، جب تک اُس کے منہ سے بدبو نہ چلی جائے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:1136)''۔

ایسے شخص کو مسجد میں آنے سے روکنے کی حکمت لوگوں کو اس کے منہ سے نکلنے والی بدبو کی اذیت سے بچانا ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ ،عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الْبَقْلَةِ ،الثُّوْمِ وَقَالَ مَرَّةً: مَنْ أَكَلَ الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ وَالْكُرَّاثَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا،فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَأَذّٰى مِمَّا يَتَأَذّٰى مِنْهُ بَنُوْ آدَمَ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس ترکاری یعنی لہسن کو کھائے اور ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے لہسن، پیاز اور گندنا کھایا ہو، وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ فرشتوں کو بھی اُن چیزوں سے ایذا پہنچتی ہے، جن سے انسانوں کو ایذا پہنچتی ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1141)''۔

مساجد کے احترام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جَنِّبُوا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَمَجَانِينَكُمْ وَشِرَارَكُمْ وَبَيْعَكُمْ وَخُصُومَاتِكُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِكُمْ وَاِقَامَةَ حُدُودِكُمْ وَسَلَّ سُيُوفِكُمْ۔

ترجمہ: ''اپنی مساجد کو بچوں، پاگلوں، شریر لوگوں، خرید وفروخت کے معاملات، باہمی جھگڑوں، اپنی آوازیں بلند کرنے اور (مجرموں پر) حدودِ الٰہی قائم کرنے اور ایک دوسرے پر تلواریں سونتنے سے بچاؤ، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 750)''۔

بچوں سے مراد ایسے بچے ہیں جنہیں مسجد کے آداب کا شعور نہ ہو، شور مچاتے ہوں، دوڑ بھاگ کر لوگوں کی نمازوں میں خلل ڈالتے ہوں یا پیشاب کر کے مسجد کو آلودہ کر دیتے ہوں۔ یہی حکم ایسے افراد کے بارے میں ہے جن کا دماغی توازن درست نہ ہو اور اُن سے مسجد میں شور وشغب یا بے ادبی کا اندیشہ ہو، شرارتی اور جھگڑالو لوگ ویسے ہی فسادی ہوتے ہیں، خرید وفروخت بھی آدابِ مسجد کے منافی ہے، مسجد میں حدودِ الٰہی قائم کرنے سے منع کرنے کا سبب بھی یہی ہے کہ شور ہوگا، بے ادبی ہوگی اور مسجد آلودہ بھی ہوسکتی ہے اور تلوار سونتنے کا تو مطلب ہی لڑائی جھگڑا ہے، خواہ ڈنڈے چلیں یا کوئی اور صورت ہو۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: وَاَكْلُ نَحْوِ ثُومٍ، وَيُمْنَعُ مِنْهُ، وَكَذَا كُلُّ مُؤْذٍ وَلَوْ بِلِسَانِهٖ۔

ترجمہ: ''مسجد میں لہسن وغیرہ جیسی (کچی پیاز، مولی اور بُو والی) چیزیں کھا کر آنا مکروہ ہے، اور ایسے شخص کو مسجد میں آنے سے روکا جائے گا اور اسی طرح ہر وہ شخص جو (لوگوں کو) اذیت دیتا ہو، خواہ زبان سے اذیت دے، (اُسے مسجد آنے سے منع کیا جائے گا)''۔۔۔۔۔اس

کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَ کَذٰلِکَ اَلْحَقَّ بَعْضُهُمْ بِذٰلِکَ مَنْ بِفِیْهِ بَخَرٌ اَوْ جُرْحٌ لَهٗ رَائِحَةٌ ،وَ کَذٰلِکَ الْقَصَّابُ وَالسَّمَّاکُ وَالْمَجْذُوْمُ وَالْاَبْرَصُ اَوْلٰی بِالْاِلْحَاقِ۔

ترجمہ:''اور بعض فقہاءِ کرام نے اسی طرح (ایذا دینے والوں میں) ایسے لوگوں کو بھی شامل کیا ہے جن کے منہ سے بدبو آتی ہے یا اُس کے زخموں سے بو آتی ہے اور اسی طرح قصاب، مچھلی بیچنے والے، برص اور کوڑھ کے مریض بھی بطریق اولیٰ شامل ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 377، بیروت)

قصاب یا مچھلی فروش یا اس طرح کے پیشوں والوں کی ممانعت کا حکم اس صورت میں ہے کہ ان کا بدن اور لباس آلودہ ہوں، اُن سے بدبو آئے، لوگ کراہت محسوس کریں، ورنہ اگر وہ غسل کر کے باوضو ہو کر صاف ستھرا لباس پہن کر مسجد میں آئیں تو وہ عام مسلمانوں اور نمازیوں کے حکم میں ہیں اور لائق تکریم ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تقرُّب کا مدار تقویٰ پر ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:''عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں زیر حدیث فَلَا یَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا (وہ ہرگز ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئیں) پھر ردالمحتار میں ہے:

وَاُلْحِقَ بِالْحَدِیْثِ کُلُّ مَنْ اٰذَی النَّاسَ بِلِسَانِهٖ وَبِهٖ اَفْتٰی ابْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا وَهُوَ اَصْلٌ فِیْ نَفْیِ کُلِّ مَنْ یَتَاَذّٰی بِهٖ۔

ترجمہ:''اس مخالفت کے حکم میں وہ شخص بھی شامل ہے جو زبان سے لوگوں کو ایذا پہنچاتا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اسی پر فتویٰ دیا اور یہ ہر اس چیز کی نفی میں اصل ہے جس سے لوگوں کو ایذا ہوتی ہے۔ مگر طرفہ تحفظ کا لحاظ ضروری ہے اگر خود منع کرنے میں اندیشۂ فساد ہو، چارہ جوئی کر کے بند کرادیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 16، ص: 413-412)''۔

اعلیٰحضرت کی اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ مسجد کی انتظامیہ ایسی حکمت اور تدبیر اختیار کرے، جس سے مسجد میں شور و شغب نہ ہو اور خود شور شغب میں مبتلا نہ ہو، اگر اس سے فتنہ دفع نہ ہو تو قانونی چارہ جوئی کے ذریعے اِس کا سدِّ باب کریں۔

محراب مسجد میں شامل ہے

سوال:50

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام بیچ اس مسئلہ کے کہ: یہودیوں کی مخالفت کی وجہ سے امام محراب سے باہر کھڑے ہوکر جو نماز پڑھاتا ہے اس سے عوام تو عوام علماء تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ محراب کا حصہ مسجد سے باہر ہوتا ہے اس لئے امام محراب سے باہر نکل کر مسجد میں کھڑا ہوکر نماز پڑھاتا ہے۔اس وجہ سے بننے والی مسجدوں کا محراب کیا مسجد سے خارج ہوجائے گا اور اگر ایسا ہوا تو معتکف کا اس کے اندر چلے جانے سے اعتکاف ٹوٹ جائے گا اور امام تو اعتکاف کر ہی نہیں سکے گا تو اس کے ازالہ کی کیا صورت ہوگی؟۔کیا اب انتظامیہ کے محراب کو مسجد کے اندر شامل کر لینے کی نیت سے مسئلہ حل ہوجائے گا؟،(عبداللہ،انجینئر نفیس احمد)۔

جواب:

امام کا بلاضرورت محراب میں اس طرح کھڑا ہونا کہ پاؤں بھی محراب کے اندر ہوں مکروہ ہے، ہاں! اگر پاؤں باہر (یعنی مسجد میں) ہوں اور سجدہ محراب کے اندر ہو، تو کراہت نہیں ہے۔امام کا دَر میں کھڑا ہونا بھی مکروہ ہے حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ قُرَّةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ كُنَّا نُنْهٰى أَنْ نَّصُفَّ بَيْنَ السَّوَارِيْ،عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَنُطْرَدَ عَنْهَا طَرْدًا۔

ترجمہ:''معاویہ اپنے والد قرہ بن ایاس مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہمیں دوستونوں کے بیچ (یعنی دَروں) میں صف باندھنے سے منع فرمایا جاتا اور وہاں سے دھکے دے کر ہٹائے جاتے تھے''۔

(سنن ابن ماجہ،رقم الحدیث:1002)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: لَا تَصُفُّوْا بَيْنَ الْأَسَاطِيْنِ وَأَتِمُّوا الصُّفُوْفَ،
ترجمہ:''ستونوں کے بیچ میں صفیں نہ بناؤ اور صفیں پوری کرو''۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، باب الصلوٰۃ بین السواری فی غیر جماعۃ)

علامہ علاؤالدین حصکفی نماز کے مکروہات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(وَقِیَامُ الْاِمَامِ فِی الْمِحْرَابِ، لَاسُجُوْدُهٗ فِیْ) وَقَدَمَاهُ خَارِجَهٗ لِاَنَّ الْعِبْرَةَ لِلْقَدَمِ۔

ترجمہ: ''امام کا محراب میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، اگر قدم باہر ہوں اور سجدہ محراب میں ہو تو یہ مکروہ نہیں ہے کیونکہ اعتبار قدموں کا ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فِی "الْوَلْوَالِجِیَّةِ" وَغَیْرِهَا: اِذَالَمْ یَضِقِ الْمَسْجِدُ بِمَنْ خَلْفَ الْاِمَامِ لَا یَنْبَغِیْ لَهٗ ذَالِكَ لِاَنَّهٗ یُشْبِهُ تَبَایُنَ الْمَکَانَیْنِ اِنْتَهٰی یَعْنِیْ: وَحَقِیْقَةُ اخْتِلَافِ الْمَکَانِ تَمْنَعُ الْجَوَازَ فَشُبْهَةُ الْاِخْتِلَافِ تُوْجِبُ الْکَرَاهَةَ، وَالْمِحْرَابُ وَاِنْ کَانَ مِنَ الْمَسْجِدِ فَصُوْرَتُهٗ وَهَیْئَتُهٗ اِقْتَضَتْ شُبْهَةَ الْاِخْتِلَافِ۔

قُلْتُ: اَیْ لِاَنَّ الْمِحْرَابَ اِنَّمَا بُنِیَ عَلَامَةً لِمَحَلِّ قِیَامِ الْاِمَامِ لِیَکُوْنَ قِیَامُهٗ وَسَطَ الصَّفِّ کَمَا هُوَ السُّنَّةُ، لَا لِاَنْ یَقُوْمَ فِیْ دَاخِلِهٖ، فَهُوَ وَاِنْ کَانَ مِنْ بُقَاعِ الْمَسْجِدِ لٰکِنْ اَشْبَهَ مَکَانًا اٰخَرَ فَاَوْرَثَ الْکَرَاهَةَ۔

ترجمہ: ''''الولوالجیۃ'' وغیرہ میں ہے: جب امام کے پیچھے والے نمازیوں کے لئے جگہ تنگ نہ ہو تو امام کو محراب کے اندر نہیں کھڑا ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے اشتباہ پیدا ہوگا کہ مقتدیوں اور امام کے قیام کی جگہیں جدا جدا ہیں (الولوالجیہ کی عبارت ختم ہوئی)، یعنی مقتدیوں اور امام کی نماز باجماعت میں جائے قیام اگر حقیقتاً جدا جدا ہوں تو نماز جائز نہیں ہوگی، تو جہاں مقتدیوں اور امام کی نماز باجماعت میں قیام کی جگہ جدا جدا ہونے کا شبہ پیدا ہو (یعنی حقیقتاً جدا نہ ہو کیونکہ حقیقت میں تو محراب مسجد ہی کا حصہ ہے) وہاں یہ امر مکروہ ہوگا، محراب اگرچہ مسجد ہی کا حصہ ہے، لیکن اس کی ایک جداگانہ صورت اور ہیئت سے مقام کے جدا ہونے کا ایک شبہ پیدا ہوتا ہے، (علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں: محراب (جماعت کے وقت) امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کے تعین کی علامت کے طور پر بنائی جاتی ہے، تاکہ امام صف کے درمیان میں کھڑا ہو، جیسا کہ سنت ہے، (محراب) اس لئے

نہیں بنائی جاتی کہ امام اس کے اندر کھڑا ہو، تو محراب اگر چہ حدودِ مسجد ہی کا حصہ ہے، لیکن (اپنی جداگانہ ہیئت کی وجہ سے) ایک علیحدہ مقام کے مشابہ ہے، لہٰذا اس کے اندر کھڑا ہونا کراہت کا سبب بن جاتا ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

تَنْبِيهٌ: فِي "مِعْرَاجِ الدِّرَايَةِ" مِنْ بَابِ الْإِمَامَةِ: اَلْأَصَحُّ مَارُوِيَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ أَنَّهُ قَالَ: أَكْرَهُ لِلْإِمَامِ أَنْ يَقُومَ بَيْنَ السَّارِيَتَيْنِ أَوْ زَاوِيَةٍ أَوْ نَاحِيَةِ الْمَسْجِدِ أَوْ إِلٰى سَارِيَةٍ، لِأَنَّهُ بِخِلَافِ عَمَلِ الْأُمَّةِ اه، وَفِيهِ أَيْضًا: اَلسُّنَّةُ أَنْ يَقُومَ الْإِمَامُ إِزَاءَ وَسَطِ الصَّفِّ، أَلَا تَرىٰ أَنَّ الْمَحَارِيبَ مَا نُصِبَتْ إِلَّا وَسَطَ الْمَسَاجِدِ وَهِيَ قَدْ عُيِّنَتْ لِمَقَامِ الْإِمَامِ۔ اه ۔ وَفِي "التَّاتَارْخَانِيَّةِ" وَيُكْرَهُ أَنْ يَقُومَ فِي غَيْرِ الْمِحْرَابِ إِلَّا لِضَرُورَةٍ اه وَمُقْتَضَاهُ أَنَّ الْإِمَامَ لَوْ تَرَكَ الْمِحْرَابَ وَقَامَ فِي غَيْرِهِ يُكْرَهُ وَلَوْ كَانَ قِيَامُهُ وَسَطَ الصَّفِّ، لِأَنَّهُ خِلَافُ عَمَلِ الْأُمَّةِ، وَهُوَ ظَاهِرٌ فِي الْإِمَامِ الرَّاتِبِ دُونَ غَيْرِهِ وَالْمُنْفَرِدِ، فَاغْتَنِمْ هٰذِهِ الْفَائِدَةَ۔

ترجمہ: ''جاننا چاہئے: ''معراج الدرایۃ'' کے باب الامامت میں ہے: امام صاحب سے صحیح ترین روایت یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا: امام کا دوستونوں کے درمیان یا مسجد کے کسی گوشے میں یا مسجد کی کسی ایک جانب یا کسی ستون کی طرف کھڑا ہونا میں ناپسند کرتا ہوں، کیونکہ یہ امت کے تعامل کے خلاف ہے اھ۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ سنت یہ ہے کہ امام صف کے درمیان کھڑا ہو، کیا آپ غور نہیں کرتے کہ محراب تو وسطِ مسجد کی تعیین کے لئے ہی بنائی گئی ہیں اور یہ امام کے کھڑے ہونے کے لئے متعین ہوتی ہیں اھ۔ تاتارخانیہ میں ہے: امام کا محراب کے علاوہ کسی اور جگہ کھڑا ہونا مکروہ ہے اھ۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر امام محراب کو چھوڑ کر کسی دوسرے جگہ کھڑا ہو جائے، اگر چہ اس کا قیام وسطِ صف میں ہو، تب بھی مکروہ ہوگا کیونکہ یہ امت کے تعامل کے خلاف ہے اور یہ بات اس امام کے بارے میں ہے، جو (باقاعدہ اس مسجد میں امامت کے لئے) مقرر ہو، کسی اور امام یا تنہا نماز پڑھنے

والے کے لئے یہ پابندی یا کراہت نہیں ہے، پس اس فائدہ کو غنیمت جانو''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2،ص:358,357، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

سنتِ متوارثہ یہ ہے کہ امام وسطِ مسجد میں کھڑا ہو اور صفوں کا قیام اس طرح ہو کہ امام وسطِ صف میں رہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

اَلسُّنَّةُ اَنْ يَّقُوْمَ فِي الْمِحْرَابِ ، وَكَذَا قَوْلُهٗ فِيْ مَوْضِعٍ آخَرَ: اَلسُّنَّةُ اَنْ يَّقُوْمَ الْإِمَامُ إِزَاءَ وَسَطِ الصَّفِّ ، اَلَا تَرٰى اَنَّ الْمَحَارِيْبَ مَا نُصِبَتْ اِلَّا وَسَطَ الْمَسَاجِدِ وَهِيَ عُيِّنَتْ لِمَقَامِ الْإِمَامِ۔

ترجمہ:''سنت یہ ہے کہ امام محراب میں کھڑا ہو، جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر ان کا یہ قول موجود ہے کہ: امام کا وسطِ صف میں کھڑا ہونا سنت ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ محراب مساجد کے درمیان میں ہوتی ہیں اور امام کے کھڑے ہونے کے لئے متعین ہوتی ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2،ص:266، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

محراب کے قیام میں یہی حکمت ہے کہ مسجد میں یہ ایک نشان قائم کر دیا جاتا ہے کہ یہ مقام وسطِ مسجد ہے، عہدِ رسالت مآب ﷺ وخلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین میں محراب نہیں تھیں۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: اَيِ الْمِحْرَابِ، وَفِيْهِ طَرِيْقَانِ: كَوْنُهٗ يَصِيْرُ مُمْتَازًا عَنْهُمْ ، وَكَيْ لَا يَشْتَبِهَ عَلٰى مَنْ عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَيَسَارِهٖ حَالُهٗ حَتّٰى اِذَا كَانَ بِجَنْبَتَيِ الطَّاقِ عَمُوْدَانِ وَرَاءَ هُمَا فُرْجَتَانِ يَطَّلِعُ مِنْهَا أَهْلُ الْجِهَتَيْنِ عَلٰى حَالِهٖ لَايُكْرَهُ، وَاِنَّمَا هٰذَا بِالْعِرَاقِ لِأَنَّ مَحَارِيْبَهُمْ مُجَوَّفَةٌ مُطَوَّقَةٌ، فَمَنْ اِخْتَارَ هٰذِهِ الطَّرِيْقَةَ لَايُكْرَهُ عِنْدَهٗ اِذَالَمْ يَكُنْ كَذَالِكَ، وَمَنْ اِخْتَارَ الْاُوْلٰى يُكْرَهُ عِنْدَهٗ مُطْلَقًا وَلَا يَخْفٰى اَنَّ اِمْتِيَازَ الْاِمَامِ مُقَرَّرٌ مَّطْلُوْبٌ فِي الشَّرْعِ فِيْ حَقِّ الْمَكَانِ حَتّٰى كَانَ التَّقَدُّمُ وَاجِبًا عَلَيْهِ، وَغَايَةُ مَاهُنَا كَوْنُهٗ فِيْ مَخْصُوْصٍ مَّكَانٍ، وَلَا أَثَرَ لِذَالِكَ فَاِنَّهٗ بُنِيَ الْمَسَاجِدِ الْمَحَارِيْبُ مِنْ لَّدُنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلَوْ لَمْ تُبْنَ كَانَتِ السُّنَّةُ اَنْ يَّتَقَدَّمَ فِيْ

مَحَاذَاةِ ذَالِكَ الْمَكَانِ لِأَنَّهٗ يُحَاذِيْ وَسَطَ الصَّفِّ وَهُوَ الْمَطْلُوْبُ، اِذْ قِيَامُهٗ فِيْ غَيْرِ مُحَاذَاتِهٖ مَكْرُوْهٌ، وَغَايَتُهٗ اِتِّفَاقُ الْمِلَّتَيْنِ فِيْ بَعْضِ الْاَحْكَامِ، وَلَا بِدْعَ فِيْهِ عَلٰى أَنَّ اَهْلَ الْكِتَابِ اِنَّمَا يَخُصُّوْنَ الْاِمَامَ بِالْمَكَانِ الْمُرْتَفِعِ عَلٰى مَا قِيْلَ فَلَا تَشَبُّهَ۔

ترجمہ: ''محراب میں کھڑے ہونے کے دوطریقے ہیں: ایک طریقہ یہ ہے کہ امام لوگوں سے ممتاز ہوتا کہ اس کے دائیں اور بائیں لوگوں پر اس کا حال مشتبہ نہ ہوحتی کہ اگر محراب کی دونوں طرف ستون ہوں اور اس کے سامنے کشادہ جگہ ہواور اس کی دونوں طرف والے اس کے حال پر مطلع ہوں تو اس کا محراب میں کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہے اور مکروہ ہونا عراق میں ہوتا ہے جن کی محرابیں کھوکھلی اور طاق کے اندر ہوتی ہیں اور یہ بات مخفی نہ رہے کہ جگہ کے اعتبار سے امام کا ممتاز ہونا شرع میں مطلوب ہے حتی کہ امام کا صفوں پر مقدم ہونا واجب ہے اور یہاں امام کی مخصوص جگہ کو مکروہ کہا ہے اور اس کی تائید میں کوئی اثر (حدیث) نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد سے مساجد میں محرابیں بنائی گئی ہیں اور اگر عہدِ رسالت ﷺ میں محرابیں نہ بھی بنائی گئی ہوں تب بھی سنت یہ ہے کہ امام اس کے سامنے صف کے درمیان میں سب سے آگے کھڑا ہو اور یہی مطلوب ہے کیونکہ محراب کی محاذات (سیدھ) کے بغیر امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے اور امام کے محراب میں کھڑے ہونے سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آئے گا کہ دوملتوں کے بعض احکام میں متفق ہو جائیں اور اس میں کوئی بدعت نہیں ہے۔علاوہ ازیں اہل کتاب امام کے لئے خصوصیت کے ساتھ بلند چبوترے بناتے ہیں اور جب امام محراب میں فرش پر کھڑا ہوگا تو اس میں اہل کتاب کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رہے گی۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: مِنْ اَنَّهٗ تَشَبُّهٌ بِاَهْلِ الْكِتَابِ فَاِنَّهُمْ يَخُصُّوْنَ اِمَامَهُمْ بِالْمَكَانِ الْمُرْتَفِعِ

ترجمہ: ''اہل کتاب کے ساتھ تشبہ اس وقت ہے کہ جب امام بلند جگہ پر کھڑا ہو کیونکہ اہل کتاب امام کے لئے خاص طور پر بلند جگہ بناتے ہیں''۔

(فتح القدیر، جلد:1،ص:426-425، مرکز اہلسنت برکات رضا، گجرات، انڈیا)

عموماً لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ محراب مسجد سے خارج ہوتی ہے، اس لئے امام کا محراب میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، حالانکہ کراہت کا سبب مطلقاً محراب میں کھڑا ہونا نہیں بلکہ امام کا محراب میں کھڑا ہونا اس وقت مکروہ ہے، جب محراب میں امام کے کھڑے ہونے کے لئے بلند جگہ (چبوترہ) بنایا گیا ہو ورنہ امام کا محراب میں کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہے اور یہی ابن ھمام کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے۔ نیز مسجد سے خارج وہ چیز ہوگی جس کو مسجد بناتے وقت مسجد سے خارج رکھا جائے اور عرف اس پر شاہد ہے کہ مسجد بناتے وقت محراب کو مسجد سے خارج رکھنے کا قصد اور ارادہ نہیں کیا جاتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ''امام اگر محراب میں یا محراب کے باہر کسی بلند جگہ یا کسی چبوترے پر کھڑے ہو کر نماز پڑھاتا ہے، تو اس میں یہودیوں کے ساتھ مشابہت ہے، کراہت کا مدار مشابہت پر ہے، اگر مشابہت نہیں پائی جاتی، تو کراہت بھی نہیں ہے۔ امام کا تنہا بلند جگہ پر کھڑے ہو کر نماز پڑھانا مکروہ ہے، جس کی دلیل یہ حدیث ہے:

عَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ الْأَنْصَارِيِّ، حَدَّثَنِي رَجُلٌ أَنَّهُ كَانَ مَعَ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ بِالْمَدَائِنِ، فَأُقِيمَتِ الصَّلَاةُ، فَتَقَدَّمَ عَمَّارٌ، وَقَامَ عَلَى دُكَّانٍ يُصَلِّي، وَالنَّاسُ أَسْفَلَ مِنْهُ فَتَقَدَّمَ حُذَيْفَةُ فَأَخَذَ عَلَى يَدَيْهِ، فَاتَّبَعَهُ عَمَّارٌ حَتَّى أَنْزَلَهُ حُذَيْفَةُ، فَلَمَّا فَرَغَ عَمَّارٌ مِنْ صَلَاتِهِ قَالَ لَهُ حُذَيْفَةُ: أَلَمْ تَسْمَعْ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: "إِذَا أَمَّ الرَّجُلُ الْقَوْمَ فَلَا يَقُمْ فِي مَكَانٍ أَرْفَعَ مِنْ مَقَامِهِمْ " أَوْ نَحْوَ ذَالِكَ؟ قَالَ عَمَّارٌ: لِذَالِكَ اتَّبَعْتُكَ حِينَ أَخَذْتَ عَلَى يَدَيَّ۔

ترجمہ: ''عدی بن ثابت انصاری بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے یہ حدیث بیان کی کہ وہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے ساتھ مدائن میں تھے، حضرت عمار آگے بڑھ گئے اور

ایک چبوترے پر کھڑے ہو کر لوگوں کو نماز پڑھانے لگے اور لوگ ان سے نیچے تھے، حضرت حذیفہ نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ حضرت عمار نے ان کی اتباع کی حتیٰ کہ حضرت حذیفہ نے ان کو چبوترے سے نیچے اتار لیا۔ جب حضرت عمار نماز سے فارغ ہو گئے تو حضرت حذیفہ نے ان سے کہا: کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ رسول اللہ ﷺ یہ فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص لوگوں کا امام بنے تو لوگوں سے بلند جگہ پر کھڑا نہ ہو۔ حضرت عمار نے کہا: اسی وجہ سے میں نے آپ کی اتباع کی تھی، جب آپ نے میرا ہاتھ پکڑا تھا''۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 598)

وہ تمام جگہ مسجد ہے جسے واقف نے مسجد بناتے وقت مسجد میں شامل کرنے کی نیت کی ہو اور جیسا کہ مذکورہ بالا حوالوں میں گزرا کہ محراب بھی مسجد کا حصہ ہے، لہٰذا محراب کے اندر جانے سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح محراب کے دائیں بائیں جو حصہ خالی ہے، وہ بھی مسجد کا حصہ ہونے کی وجہ سے مسجد کے حکم میں ہے، لہٰذا وہاں جانے سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔

جنازے کے مسائل

غسلِ میت کا طریقہ

سوال: 51

مُردے کو غسل دینے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟،(شاہدہ نسیم،فیصل آباد)۔

جواب:

عموماً یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کے یہاں میت ہو جائے ،تو لوگ میت کو غسل وکفن دینے کے لئے پریشان پھرتے ہیں، کسی غسّال (غسل دینے والے مرد) یا غسّالہ (غسل دینے والی عورت) کو تلاش کرتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ میت کا ولی خود اُسے غسل دے۔ میت کو غسل دینا فرضِ کفایہ ہے۔ غسل کا طریقہ یہ ہے کہ جس چارپائی یا تختے پر غسل دینے کا ارادہ ہو، اُس کو تین، پانچ یا سات بار دھونی دیں یعنی جس چیز میں خوشبو سلگ رہی ہو، اُسے چارپائی وغیرہ کے گرد پھرائیں، میت کو اُس پر لٹا کر ناف سے گھٹنوں تک کسی کپڑے سے چھپادیں، پھر نہلانے والا اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر پہلے استنجا کرائے پھر نماز کی طرح وضو کرائے یعنی منہ، کہنیوں سمیت ہاتھ دھوئیں، سر کا مسح کریں پھر پاؤں دھوئیں۔ کسی کپڑے یا روئی کو بھگو کر دانتوں، مسوڑھوں اور ہونٹوں پر پھیر دیں، سر اور ڈاڑھی کے بال (اگر ہوں تو) پاک صابن سے دھوئیں، پھر بائیں کروٹ لٹا کر سر سے پیر تک (بیری کے پتے ڈال کر نیم گرم) پانی اس طرح ڈالیں کہ تختے تک پہنچ جائے، پھر داہنی کروٹ لٹا کر بھی اسی طرح پانی بہائیں، پھر ٹیک لگا کر بٹھائیں اور نرمی کے ساتھ نیچے کی جانب پیٹ پر ہاتھ پھیریں، اگر پیٹ سے کچھ نکلے تو دھو ڈالیں، وضو وغسل کا اعادہ نہ کریں، آخر میں سر سے پیر تک کافور ملا پانی بہائیں اور پھر کسی پاک کپڑے سے بدن کو آہستہ آہستہ پونچھیں۔ غسل میں ایک مرتبہ سارے بدن پر پانی بہانا فرض اور تین مرتبہ بہانا سنت ہے۔ جہاں غسل دیا جائے مستحب یہ ہے کہ پردہ کا اہتمام کرلیا جائے، غسل دینے والا باطہارت ہو۔

(مُلخص از فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:158)

قاتل اورڈاکو کی نمازِ جنازہ کا شرعی حکم

سوال: 52

مسلمان، قاتل اور ڈاکو کی نماز جنازہ، (مسلم قبرستان میں) تدفین کے بارے میں کیا شرعی احکام ہیں؟۔ محمد رفیع یوسفی، ناظم آباد، کراچی

جواب:

ہر مسلمان کی خواہ کیسا ہی گناہ گار اور مرتکب کبائر ہو، نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، سوائے چند لوگوں کے جن کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی:

(۱) جو امامِ برحق پر خروج و بغاوت کرے اور اسی بغاوت میں مارا جائے۔

(۲) ڈاکو جو ڈاکہ ڈالتے ہوئے مارا گیا، نہ اُس کو غسل دیا جائے گا اور نہ ہی نماز پڑھی جائے گی لیکن اگر حکومتِ وقت نے اُن پر قابو پالیا ہو اور سزا کے طور پر قتل کیا تو نماز و غسل ہے، اگر طبعی موت مرے ہوں، تب بھی نماز و غسل کے حق دار ہیں۔

(۳) وہ لوگ جو آپس میں ناحق لڑتے ہوئے مارے جائیں بلکہ جو شخص اُن کا تماشا دیکھنے کے لئے وہاں رُکا رہا اور گولی وغیرہ لگنے کے سبب مارا گیا، تو اُس کی بھی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

(۴) جس نے کئی مسلمان گلا گھونٹ کر یا کسی ہتھیار کے ذریعے ناحق قتل کر دیے ہوں، جب وہ خود مرے گا تو اُس کی بھی نماز نہیں پڑھی جائے گی۔

(۵) جس نے اپنے والدین کو قتل کیا ہو، اُس کی بھی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

زمین میں فساد برپا (ڈاکہ ڈالنے یا قتلِ ناحق) کرنے والوں کی دنیوی اور اُخروی سزا کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَالِكَ لَهُمْ

خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌO

ترجمہ:''اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے (ڈاکے ڈالتے) ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ ان کو چن چن کر قتل کیا جائے یا ان کو سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ ایک جانب سے اور پیر دوسری جانب سے کاٹ دیئے جائیں یا ان کو (اپنے وطن کی) زمین سے نکال دیا جائے، یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے،(المائدہ:33)''۔آج کل جلاوطنی عملی طور پر ممکن نہیں ہے،اس لئے ایسے شخص کو قید میں رکھا جائے تاکہ لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَیُصَلّٰی عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ مَاتَ بَعْدَالْوِلَادَةِ صَغِیْراً کَانَ أَوْ کَبِیْراً ذَکَراً کَانَ أَوْ أُنْثٰی حُرّاً کَانَ أَوْ عَبْداً اِلَّا الْبُغَاةَ وَقُطَّاعَ الطَّرِیْقِ

ترجمہ:''ہر مسلمان مُردے کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت،آزاد ہو یا غلام سوائے باغی اور ڈاکو کے''۔

(فتاویٰ عالمگیری،جلد 1،ص:163)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَهِیَ فَرْضٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ مَاتَ،خَلَا)أَرْبَعَةٍ : (بُغَاةٍ ،وَقُطَّاعِ طَرِیْقٍ) فَلَا یُغَسَّلُوْا وَلَا یُصَلّٰی عَلَیْهِمْ (اِذَاقُتِلُوْا فِی الْحَرْبِ)وَلَوْ بَعْدَهٗ صُلِّیَ عَلَیْهِمْ لِأَنَّهٗ حَدٌّ أَوْ قِصَاصٌ (وَکَذَا)أَهْلُ عُصْبَةٍ ،وَ(مُکَابِرٍ فِیْ مِصْرٍ لَیْلاً وَخَنَّاقٍ) الخ۔۔۔۔۔(لَا) یُصَلّٰی عَلٰی (قَاتِلِ أَحَدِ أَبَوَیْهِ) اِهَانَةً لَهٗ ،وَأَلْحَقَهٗ فِی "النَّهْرِ" بِالْبُغَاةِ ۔

ترجمہ:''چار افراد کے سوا ہر مسلمان کی نمازِ جنازہ فرض ہے:باغی ،رہزن (ڈاکو) نہ اُنہیں غسل دیا جائے گا اور نہ ہی اِن پر نماز پڑھی جائے گی،جبکہ یہ لڑائی میں مارے گئے ہوں اور اگر لڑائی کے بعد کسی وقت مارے جائیں تو اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اس لئے کہ یہ قتل

یا حد ہے یا قصاص (یعنی حدِ شرعی یا قصاص کے طور پر مارے جانے والے کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی)، اہلِ عصبہ (یعنی جو ظلم پر اپنی قوم یا برادری کی حمایت میں لڑائی میں شریک ہو جائیں اور مارے جائیں)۔ تیسرا شخص مکابر یعنی جو لوگ رات کے وقت لوٹ مار کرنے کے لئے شہر میں اسلحہ لے کر گھومیں اور گلا گھونٹنے والا۔۔۔۔۔۔ جس نے اپنے والدین یا اُن میں سے کسی ایک کو قتل کر دیا ہو، اُس کی اہانت کے لئے اُس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، ''النہرالفائق'' میں اُسے بھی باغیوں سے لاحق کیا ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد3،ص:103-101، بیروت)

غسل نہ دینے اور نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کا حکم اِن کی اہانت کے لئے ہے تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں، تدفین مسلمانوں کے قبرستان میں کی جاسکتی ہے۔

نمازِ جنازہ کی تکرار جائز نہیں

سوال: 53

کیا کسی میت پر نمازِ جنازہ دوبارہ ادا کی جاسکتی ہے؟۔

شاہد علی، نارتھ ناظم آباد، کراچی

جواب:

فقہائے احناف کے نزدیک اگر میت کا ولی خود نمازِ جنازہ پڑھ لے یا اُس کی اجازت سے دوسرا شخص پڑھائے، تو دوبارہ پڑھنا جائز نہیں ہے، حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کا بھی یہی قول ہے۔ نمازِ جنازہ کی تکرار جائز نہیں سوائے اس کے کہ پہلی مرتبہ پڑھی جانے والی نماز میں میت کا ولی شامل نہیں تھا۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی لکھتے ہیں:

فَاِنْ صَلّٰی غَیْرُ الْوَلِیِّ أَوِ السُّلْطَانِ أَعَادَ الْوَلِیُّ،یَعْنِیْ اِنْ شَاءَ لِمَا ذَکَرْنَا أَنَّ الْحَقَّ لِلْأَوْلِیَاءِ ،وَاِنْ صَلَّی الْوَلِیُّ لَمْ یَجُزْ لِأَحَدٍ أَنْ یُّصَلِّیَ بَعْدَہٗ لِأَنَّ الْفَرْضَ یَتَأَدّٰی

بِالْأَوَّلِ وَالتَّنَفُّلُ بِهَا غَيْرُ مَشْرُوْعٍ وَلِهٰذَا رَأَيْنَا النَّاسَ تَرَكُوْا عَنْ اٰخِرِهِمُ الصَّلَاةَ عَلٰى قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ الْيَوْمَ كَمَا وُضِعَ،

ترجمہ: ’’اگر ولی وحاکمِ اسلام کے سوا اور لوگ نمازِ جنازہ پڑھ لیں، اور ولی اگر چاہے تو اُسے اعادہ کا اختیار ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا: جنازہ اولیاء کا حق ہے اور اگر ولی پڑھ چکا تو اب کسی کو جائز نہیں کہ اُس کے بعد پھر پڑھے، کیونکہ فرض تو پہلی نماز سے ادا ہو چکا اور نماز جنازہ بطور نفل پڑھنی مشروع نہیں ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ (خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جنازہ پڑھنے کے بعد) تمام جہان کے مسلمانوں نے نبی ﷺ کے مزارِ اقدس پر نماز جنازہ پڑھنا چھوڑ دی، حالانکہ حضور آج بھی ویسے ہی ہیں جیسے اُس دن تھے جب آپ ﷺ کو قبر مبارک میں دفن کیا گیا تھا‘‘۔

(ھدایہ، جلد 1، ص:415)

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: وَلَوْ كَانَ مَشْرُوْعًا لَمَّا أَعْرَضَ الْخَلْقُ كُلُّهُمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَالرَّاغِبِيْنَ فِي التَّقَرُّبِ إِلَيْهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ بِأَنْوَاعِ الطُّرُقِ عَنْهُ فَهٰذَا دَلِيْلٌ ظَاهِرٌ عَلَيْهِ فَوَجَبَ اعْتِبَارُهُ ۔

ترجمہ: ’’اگر نمازِ جنازہ کی تکرار مشروع ہوتی تو علماء، صالحین اور مختلف (جائز) طریقوں سے نبی ﷺ سے تقرُّب کا شوق رکھنے والے سب لوگ (آج تک) یہ سلسلہ ترک نہ کرتے، مزارِ اقدس پر نماز پڑھنے سے تمام جہان اعراض نہ کرتا، تو یہ (نمازِ جنازہ کے تکرار کے مشروع نہ ہونے پر) ظاہر دلیل ہے اور اس کا اعتبار واجب ہے‘‘۔

(فتح القدیر، جلد 2، ص:123)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: لَا يُصَلّٰى عَلٰى مَيِّتٍ إِلَّا مَرَّةً وَاحِدَةً وَالتَّنَفُّلُ بِصَلَاةِ الْجَنَازَةِ غَيْرُ مَشْرُوْعٍ كَذَا فِي ’’الْإِيْضَاحِ‘‘۔

ترجمہ: ’’کسی میت پر ایک بار کے سوا نماز (جنازہ) نہ پڑھی جائے اور نمازِ جنازہ نفل ادا کرنا

غیر مشروع ہے، ''ایضاح'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:163، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَلَهٗ) اَیْ لِلْوَلِیِّ، وَمِثْلُهٗ کُلُّ مَنْ یُّقَدَّمُ عَلَیْهِ مِنْ بَابِ أَوْلٰی (اَلْاِذْنُ لِغَیْرِهٖ فِیْهَا) لِأَنَّهٗ حَقُّهٗ فَیَمْلِكُ اِبْطَالَهٗ۔

ترجمہ: '' اور ولی یا وہ سب (جیسے سلطان، قاضی، امام الحی) جن کو اَوْلَوِیَّتْ (More Entitlement) کی بنا پر نمازِ جنازہ میں تَقَدُّم (Priority) کا حق حاصل ہے، وہ دوسرے کو بھی جنازہ پڑھانے کی اجازت دے سکتے ہیں، کیونکہ یہ اُن کا حق ہے اور وہ اپنے حق سے دست بردار ہونے کا اختیار رکھتا ہے (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:115)''۔

مغفرت و ایصالِ ثواب کے لئے اجتماعی دعا

سوال: 54

ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ میت کی دعا کے لئے آنے والے حضرات قرآن شریف کی چند آیات یا ایک سورت پڑھ کر اجتماعی دعا برائے مغفرتِ میت کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تعزیت کے گھر میں پہلے سے موجود کوئی قاری یا عالمِ دین یا کوئی بھی مسلمان تلاوت کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہیں۔ عرصہ دراز سے جاری اس رواج کو بعض حضرات منع کرتے ہیں۔ کیا اُن کا منع کرنا درست ہے؟، (عبدالوکیل، چترال)۔

جواب:

مذکورہ صورت درحقیقت ایصالِ ثواب ہے، جو شرعاً جائز بلکہ مستحسن امر ہے۔ ''ایصالِ ثواب'' کے معنی ہیں: کسی شخص کا اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ.

(1) ترجمہ: ''حضرت موسیٰ نے التجا کی: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو

بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے،(الاعراف:151)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ۔

(2)ترجمہ:''(حضرت ابراہیم نے دعا کی)اے ہمارے رب! حساب(یعنی قیامت) کے دن میری، میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرمانا،(ابراہیم:41)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔

(3)ترجمہ:''اے ہمارے رب!ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی (بھی مغفرت)فرما، جو ہم سے پہلے وفات پا چکے(یا ایمان لانے میں ہم سے سبقت حاصل کر چکے ہیں)،(الحشر:10)''۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔

(4)ترجمہ:''(حضرت نوح نے دعا کی)اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما،(نوح:28)''۔

ایصالِ ثواب کا ذریعہ دعائے مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل وعمرہ، تلاوتِ قرآنِ پاک، اذکار، درود پاک وغیرہ۔علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْاَصْلُ فِیْ ھٰذَا الْبَابِ اَنَّ الْاِنْسَانَ لَهٗ اَنْ یَّجْعَلَ ثَوَابَ عَمَلِهٖ لِغَیْرِهٖ صَلَاةً کَانَ اَوْ صَوْمًا اَوْ صَدَقَةً اَوْ غَیْرَھَا کَالْحَجِّ وَقِرَاءَةِ الْقُرْاٰنِ وَالْاَذْکَارِ وَزِیَارَةِ قُبُوْرِ الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَالشُّھَدَاءِ وَالْاَوْلِیَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ وَتَکْفِیْنِ الْمَوْتٰی وَجَمِیْعِ اَنْوَاعِ الْبِرِّ کَذَا فِیْ "غَایَةِ السُّرُوْجِیِّ شَرْحِ الْھِدَایَةِ"۔

ترجمہ:''قاعدہ یہ ہے کہ انسان اپنے عمل کا ثواب دوسرے شخص کو پہنچا سکتا ہے، خواہ نماز ہو یا

روزہ یا صدقہ ہو یا کوئی اور نیک عمل، جیسے حج اور قرآن مجید کی تلاوت اور اذکار اور انبیاء علیہم السلام کی قبور کی زیارت اور شہداء اور اولیاء اور صالحین کی قبروں کی زیارت اور مردوں کو کفن دینا اور دیگر تمام نیکی کے کام، اسی طرح ''غایۃ السروجی شرح ہدایہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 257، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

دعا عبادت کی روح ہے، عبادت کا مغز اور نچوڑ ہے اور ایک حدیث مبارک میں دعا کو عین عبادت قرار دیا گیا ہے (اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ، سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2969)، کیونکہ بندہ اپنے آپ کو عاجز محتاج اور بے کس و بے بس سمجھ کر اپنے خالق و مالک کو پکارتا ہے، اسی کا نام بندگی ہے۔ دعا انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پر بہرصورت مستحسن و مستحب عمل ہے، حرمین طیبین میں بھی ختمِ قرآن کے موقع پر نمازِ تراویح میں اور خطبات مبارکہ میں اجتماعی دعا کی جاتی ہے، تو جب یہ اجتماعی دعا نماز کے اندر جائز ہے تو نماز سے باہر اس کی ممانعت کیوں ہوگی۔ جو اجتماعی دعا کی ممانعت کا دعویٰ کرتا ہے، اُس پر لازم ہے کہ دلیل پیش کرے۔ اب تو تبلیغی اجتماع میں بھی اجتماعی دعا کی جاتی ہے اور لوگ بڑے اہتمام سے اس میں شرکت کے لئے جاتے ہیں، تو ایک خاص موقع اور مقام پر اس کے جواز اور باقی مواقع اور مقامات پر اس کی ممانعت کی کیا دلیل ہے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص خود شارع بننے کی کوشش کرے اور ''مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ'' (خیر کے کاموں سے بہت زیادہ روکنے والا) بننا چاہتا ہو۔

شوہر، بیوی کا وارث ہے، ولی نہیں

سوال: 55

ایک سے زائد مرتبہ نمازِ جنازہ ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟۔ عورت کی وفات کے بعد اس کے ورثاء کون لوگ ہوتے ہیں، شوہر بیٹے یا بھائی؟، بعض لوگ کہتے ہیں کہ شوہر وارث نہیں ہوتا، صرف بھائی اور بیٹے وارث ہوسکتے ہیں، اس لئے ان دونوں میں سے کسی ایک نے جنازے میں شرکت نہ کی ہو تو دوبارہ جنازہ ہوسکتا ہے؟۔ جان بوجھ کر ایک بیٹا نمازِ

جنازہ میں شرکت نہیں کرتا تاکہ دوسری مرتبہ جنازہ میں شرکت کرے، کیا بلا عذرِ شرعی ایسا کرنا جائز ہے؟، (قاری اللہ دتہ سعیدی، مظفر گڑھ)۔

جواب:

نمازِ جنازہ کی تکرار جائز نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اگر پہلی مرتبہ پڑھی جانے والی نماز میں میت کا ولی شامل نہیں تھا، تو اب ولی دوبارہ نماز پڑھ سکتا ہے اور اُس کے ساتھ ہر وہ شخص جو پہلی نماز میں شریک نہیں تھا، نماز پڑھ سکتا ہے، لیکن اگر ولی نے نمازِ جنازہ پڑھ لی تو دوبارہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ آپ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شوہر وارث نہیں ہوتا، یہ درست نہیں، بلکہ شوہر وارث ہوگا اور شرعاً بیوی کے ترکے سے حصہ پائے گا، جیسا کہ سورۃ النساء میں شوہر کے حصے کی بابت ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۔

ترجمہ: ''اور تمہارے لئے آدھا (مال) ہے اُس کا جو چھوڑ جائیں تمہاری بیویاں، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو اور اگر ان کی اولاد ہو تو تمہارے لئے اُن کے ترکہ کا چوتھائی حصہ ہے، (النساء:12)''۔

شوہر بیوی کا وارث تو بنے گا، لیکن ولی نہیں ہے بلکہ اُس کے بیٹوں کو ولایت حاصل ہے اور اگر عورت کا کوئی ولی موجود نہ ہو تو ولایت شوہر کو حاصل ہو جائے گی، علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلِيٌّ فَالزَّوْجُ ثُمَّ الْجِيرَانُ ،

ترجمہ: ''پس اگر اُس کا کوئی ولی نہ ہو تو شوہر ولی ہوگا، پھر پڑوسی، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد3، ص:114، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ عورت کی ولایت بیٹوں کو حاصل ہوگی، اگر کسی ایک بیٹے نے بھی نمازِ جنازہ ادا کرلی ہے، تو دوبارہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ

لکھتے ہیں:

وَلَوْ مَاتَتْ اِمْرَأَةٌ وَّلَهَا زَوْجٌ وَّابْنٌ عَاقِلٌ بَالِغٌ مِّنْهُ، فَالْوِلَايَةُ لِلْاِبْنِ دُوْنَ الزَّوْجِ ، لٰكِنْ يُكْرَهُ لِلْاِبْنِ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَبَاهُ وَيَنْبَغِيْ اَنْ يُّقَدِّمَهٗ فَاِنْ كَانَ لَهَا ابْنٌ مِّنْ زَوْجٍ آخَرَ فَلَا بَأْسَ بِاَنْ يَّتَقَدَّمَ لِاَنَّهٗ هُوَ الْوَلِيُّ۔

ترجمہ:'' اور اگر کسی عورت کا انتقال ہوگیا اور (ورثاء میں) اُس کا شوہر اور بالغ و عاقل بیٹا موجود ہیں، پس ولی بیٹا ہوگا، شوہر نہیں، لیکن بیٹے کا اپنے (حقیقی) باپ پر پیش قدمی کرنا مکروہ ہے، مناسب یہ ہے کہ اپنے باپ کو مقدم رکھے، پس اگر یہ بیٹا عورت کے پہلے شوہر سے ہوتو کوئی حرج نہیں کہ یہ اپنے سوتیلے باپ پر سبقت کرے، اس لئے کہ یہ (بیٹا اُس عورت کا) ولی ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:163، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

'' فتاویٰ امام قاضی خان وظہیریہ وشرح نقایہ برجندی وخلاصہ وولوالجیہ وتجنیس وواقعات وبحرالرائق وغیرہا میں ہے: اِنْ كَانَ الْمُصَلِّيْ سُلْطَانًا وَّالْاِمَامَ الْاَعْظَمَ وَالْقَاضِيَ اَوْوَالِيَ الْمِصْرِ اَوْاِمَامَ حَيٍّ لَيْسَ لِلْوَلِيِّ اَنْ يُّعِيْدَ۔

ترجمہ:'' یعنی اگر بادشاہِ اسلام یا امیر المؤمنین یا قاضی شرع یا اسلامی حاکم مصر یا امام الحی (محلے یا بستی کا امام) نماز پڑھ چکا، تو اب ولی کو بھی اعادہ کا اختیار نہیں۔ شرح نقایہ علامہ قہستانی میں ہے: لَايُصَلّٰى عَلٰى مَيِّتٍ اِلَّا مَرَّةً، ترجمہ:'' کسی مُردے پر ایک بار سے زیادہ نماز نہ پڑھی جائے۔

سراج الوہاج و بحرالرائق وردالمحتار و جامع الرموز وجوہرۂ نیرہ وہندیہ ومجمع الانہر وغیرہ میں ہے: وَاللَّفْظُ لِلْبَحْرِ عَنِ السِّرَاجِ اِنْ صَلَّى الْوَلِيُّ عَلَيْهِ لَمْ يَجُزْ اَنْ يُّصَلِّيَ اَحَدٌ بَعْدَهٗ، ترجمہ:'' سراج الوہاج سے بحرالرائق کے الفاظ ہیں کہ اگر ولی نے اس پر نماز پڑھ لی تو اس کے بعد اب کسی کو جائز نہیں کہ نمازِ جنازہ پڑھے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص:274-273، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

کسی ایک بیٹے کا جان بوجھ کر نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہونا درست نہیں اور شریک نہ ہونے کے سبب اُسے دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا بھی حق حاصل نہیں، کہ دوسرے بیٹے (بحیثیتِ ولی) نماز پڑھ چکے، جب ایک درجے کے چند اولیاء موجود ہوں تو کسی ایک کے نمازِ جنازہ میں شامل ہونے سے دوسرے ولی کا حق ساقط ہو جائے گا۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَلَوْ صَلّٰی عَلَیْهِ الْوَلِیُّ وَلِلْمَیِّتِ أُوْلِیَاءُ أُخَرُ بِمَنْزِلَتِهٖ لَیْسَ لَهُمْ أَنْ یُّعِیْدُوْا کَذَا فِی الْجَوْهَرَةِ النَّیِّرَةِ۔

ترجمہ: ''اگر کسی ایک ولی نے نمازِ جنازہ پڑھ لی اور میت کے اولیاء میں اُس درجے کے اور بھی ولی ہیں تو اُن کے لئے نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا، ''جوہرۂ نیرہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 164، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

قبروں کو مسمار کرنا یا ان کی بے حرمتی ناجائز ہے

سوال: 56

ہمارے شہر میں واقع مرکزی قبرستان ہے، قبرستان کی چاردیواری کے باہر تینوں اطراف پکی سڑک بنی ہوئی ہے اور تینوں اطراف راستہ پہلے سے موجود ہے اور قبرستان میں مزید راستہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں دوسری جگہ قبرستان میں وافر مقدار میں نئی قبریں بنانے کے لئے جگہ موجود ہے۔ کچھ احباب کی رائے ہے کہ پرانی قبریں مسمار کر کے قبرستان میں مٹی بھروائی جائے جبکہ اس قبرستان میں بھی خاصا رقبہ تدفین کے لئے خالی ہے اور تھوڑے فاصلے پر ایک شخص نے تین کنال زمین مزید قبرستان کے لئے وقف کی ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ:

کیا قبرستان میں پرانی قبریں مسمار کر کے نئی قبریں بنائی جاسکتی ہیں؟۔

بعض احباب نے تو قبروں کے اوپر سے راستے بنا لئے ہیں اور اُن جگہوں کو نشان زدہ کر کے

فٹ پاتھ بنانا چاہتے ہیں۔قبرستان میں جہاں قبریں پرانی اور بوسیدہ ہوچکی ہیں، کچھ کے نشانات مٹ چکے ہیں اور کچھ کے نشان باقی ہیں، کیا وہاں باقاعدہ فٹ پاتھ تعمیر کر کے مستقل راستہ بنادینا چاہئے؟،(تجمل حسین، تحصیل کلر سیّداں ضلع راولپنڈی)۔

جواب:

جب قبرستان میں تدفین کے لئے جگہ موجود ہے اور ساتھ ہی دوسرا قبرستان بھی موجود ہے تو اگرچہ وہ دور ہو، وہیں مردے دفن کئے جائیں گے۔مسلمانوں کی قبروں کے جب تک نشانات باقی ہیں، اُنہیں مسمار کرنا جائز نہیں۔قبر کھود کر دوسری میت کو اس میں دفن کرنا اُس وقت تک جائز نہیں، جب تک پہلی میت کی ہڈیاں مٹی میں مل کر ختم نہ ہوجائیں۔ جان بوجھ کر کسی مسلمان کی قبر کھودنا جائز نہیں ہے، اگر قبر کھودنے کے بعد پتا چلا کہ یہاں قبر تھی اور ہڈیاں وغیرہ نکلیں اور وہاں دوسری جگہ قبر کے لئے خالی نہیں تو ان ہڈیوں کو اسی قبر میں ایک طرف دفن کر کے دوسری میت کو دفن کردیں۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَلَایُدفَنُ اِثنَانِ فِی قَبرٍ وَّاحِدٍ اِلَّا لِضَرُورَۃٍ قَالَ:فِی "الْفَتحِ": وَلَا یُحفَرُ قَبرٌ لِدَفنِ آخَرَ اِلَّا اِنْ بَلِیَ الْاَوَّلُ فَلَم یَبقَ لَہٗ عَظمٌ اِلَّا اَنْ لَّایُوجَدَ فَتُضَمُّ عِظَامُ الْاَوَّلِ وَیُجعَلُ بَینَھُمَا حَاجِزٌ مِنْ تُرَابٍ۔

ترجمہ:''اور بلاضرورت دومیتوں کوایک قبر میں دفن نہیں کریں گے ۔''فتح القدیر''میں ہے: دوسری میت کی تدفین کے لئے پہلی قبر کونہیں کھودا جائے گا سوائے اس صورت کے کہ اگر پہلی میت بوسیدہ ہوکر مٹی ہوچکی ہو اور اس کی ہڈیاں بھی باقی نہ رہیں، لیکن اگر پہلی میت کی ہڈیاں موجود ہوں تو ان دونوں کے درمیان مٹی سے منڈیر بنادی جائے گی''۔-------

مزید لکھتے ہیں: قَالَ فِی "الْحِلْیَۃِ": وَخُصُوصًا اِنْ کَانَ فِیھَا مَیِّتٌ لَم یَبلَ،وَمَا یَفعَلُہٗ جَھَلَۃُ الْحَفَّارِینَ مِنْ نَبشِ الْقُبُورِ الَّتِی لَم تَبلَ اَربَابُھَا ،وَاِدْخَالِ اَجَانِبَ عَلَیھِم فَھُوَ

مِنَ الْمُنْكَرِ الظَّاهِرِ،وَلَيْسَ مِنَ الضَّرُوْرَةِ الْمُبِيْحَةِ لِجَمْعِ مَيِّتَيْنِ فَأَكْثَرَ ابْتِدَاءً فِيْ قَبْرٍ وَّاحِدٍ۔

ترجمہ:''حلیہ میں خصوصاذکر کیا گیا کہ اگر میت قبر میں بوسیدہ نہیں ہوئی اور جاہل گورکن جو سلامت جسم والی قبروں کو کھود دیتے ہیں اور دوسری میت ان قبروں میں دفن کر دیتے ہیں، پس یہ واضح طور پر شرعا ممنوع ہے اور ضرورت کے تحت دو یا دو سے زیادہ میتوں کو شروع ہی سے ایک قبر میں دفن کرنے کے (جواز کے) حکم میں بھی نہیں آتا''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص:129، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

مسلمانوں کے قبرستان کو (خواہ کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو) مسمار کرنا یا کسی دوسرے مقصد کے لئے استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:وَسُئِلَ هُوَ (أَيِ الْقَاضِي الْإِمَامُ شَمْسُ الْاَئِمَّةِ مَحْمُوْدُ الْأُوْزْجَنْدِيُّ) عَنِ الْمَقْبَرَةِ فِي الْقُرىٰ إِذَا انْدَرَسَتْ وَلَمْ يَبْقَ فِيْهَا أَثَرُ الْمَوْتٰى لَاالْعَظْمُ وَلَا غَيْرُهُ هَلْ يَجُوْزُ زَرْعُهَا وَاسْتِغْلَالُهَا؟، قَالَ: لَا،وَلَهَا حُكْمُ الْمَقْبَرَةِ ،كَذَا فِي الْمُحِيْطِ۔

ترجمہ:''شمس الائمہ امام قاضی محمود اوزجندی سے دیہات میں موجود ایسے قبرستان کی بابت پوچھا گیا، کہ جس کے نشانات مٹ چکے ہوں اور اُس میں میت کی ہڈیاں یا کوئی دوسرے آثار (اعضاء وغیرہ) باقی نہ رہے ہوں، تو کیا اس پر کھیتی کرنا اور اس سے غلہ حاصل کرنا جائز ہے؟، آپ نے جواب میں فرمایا: نہیں بلکہ وہ قبرستان ہی کے حکم میں ہے، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے''۔

محشی نے اس پر حاشیہ لکھا: قَوْلُهٗ قَالَ :لَا ،هٰذَا لَايُنَافِيْ مَاقَالَهُ الزَّيْلَعِيُّ فِيْ بَابِ الْجَنَائِزِ مِنْ أَنَّ الْمَيِّتَ اِذَابَلِيَ وَصَارَ تُرَابًا جَازَ زَرْعُهٗ وَالْبِنَاءُ عَلَيْهِ اھ لِاَنَّ الْمَانِعَ هُنَا كَوْنُ الْمَحَلِّ مَوْقُوْفًا عَلَى الدَّفْنِ فَلَا يَجُوْزُ اِسْتِعْمَالُهٗ فِيْ غَيْرِهٖ فَلْيَتَأَمَّلْ وَلْيُحَرَّرْ

ترجمہ:''مصنف کا قول ''لا''، ''امام زیلعی'' کے اُس قول کے منافی نہیں ہے جو باب الجنائز

میں ہے کہ ”جب (قبر میں) میت بوسیدہ اور مٹی ہو جائے، تو اُس پر زراعت اور تعمیر کرنا جائز ہے“، یہاں (زراعت سے) ممانعت اس لئے ہے کہ یہ مقام تدفین کے لئے وقف ہے، اس کا دوسرے مصرف میں استعمال جائز نہیں، پس غور کرنا اور بچنا چاہئے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 470، 471، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)“۔

قبروں کے اوپر چلنا اور اُن پر راستہ بنانا حرام ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِاَنَّهُمْ نَصُّوا عَلٰی أَنَّ الْمُرُوْرَ فِیْ سِكَّةٍ حَادِثَةٍ فِیْهَا حَرَامٌ۔

ترجمہ: ”علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ قبرستان کے اندر نئے بنے ہوئے راستے پر چلنا حرام ہے، (ردالمحتار جلد 1 صفحہ: 482، داراحیاء التراث العربی بیروت)“۔

رسول اللہ ﷺ نے قبورِ مسلمین کی تعظیم وادب کا حکم ارشاد فرمایا ہے، حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَاَنْ یَّجْلِسَ اَحَدُكُمْ عَلٰی جَمْرَةٍ فَتُحْرِقَ ثِیَابَهٗ حَتّٰی تَخْلُصَ اِلٰی جِلْدِهٖ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّجْلِسَ عَلٰی قَبْرٍ"۔

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ آگ کپڑے جلا کر جلد تک پہنچ جائے، زیادہ بہتر ہے بجائے اس کے کہ قبر پر بیٹھے، (ابوداؤد، رقم الحدیث: 3220)“۔

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَاَنْ اَمْشِیَ عَلٰی جَمْرَةٍ اَوْ سَیْفٍ اَوْ اَخْصِفَ نَعْلِیْ بِرِجْلِیْ اُحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَمْشِیَ عَلٰی قَبْرِ مُسْلِمٍ وَمَا اُبَالِیْ اَوْسَطَ الْقُبُوْرِ قَضَیْتُ حَاجَتِیْ، اَوْ وَسَطَ السُّوْقِ"۔

ترجمہ: ”حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے آگ یا تلوار پر چلنا یا پاؤں سے جوتے پر پیوند لگانا زیادہ پسند ہے، بہ نسبت اس کے کہ کسی مسلمان کی قبر پر چلوں، اور مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ قبر کے وسط میں میری حاجت پوری ہوتی ہے یا بازار کے درمیان، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1568)“۔

مزارات پر حاضری کا طریقہ

سوال: 57

قبر کی زیارت کے لئے جانا شرعاً کیسا ہے؟، مزارات پر حاضری کا صحیح طریقہ کیا ہے؟۔

جواب:

قبر کی زیارت کرنا شرعاً جائز بلکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی نے مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے لکھا ہے:

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَأْتِي قُبُوْرَ الشُّهَدَاءِ بِأُحُدٍ عَلَى رَأْسِ كُلِّ حَوْلٍ فَيَقُوْلُ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ ہر سال شہداء احد کی قبروں پر تشریف لے جاتے تھے اور یہ فرماتے: ''تم پر سلامتی ہو اس لئے کہ تم نے صبر کیا، پس آخرت کا گھر کیا ہی اچھا ہے، (الرعد:24)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد3، ص:140، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''زیارتِ قبور سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: اَلَا فَزُوْرُوْهَا فَاِنَّهَا تُزَهِّدُكُمْ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُكُمُ الْاٰخِرَةَ۔

ترجمہ: ''سن لو! قبور کی زیارت کیا کرو تمہارے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا کرے گی اور آخرت یاد دلائے گی، (فتاویٰ رضویہ، جلد29، ص:282)''۔

مزارات پر حاضری کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کرتے ہوئے پائنتی کی جانب سے حاضر ہو اور چہرے کے سامنے آکر قبلہ کی جانب پیٹھ کر کے مزار سے چار ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا ہو، پھر دعا کرے اور اگر بیٹھنا چاہے تو حسب مرتبہ اس کے قریب یا دور اتنے فاصلے سے بیٹھے، جیسا زندگی میں اس کا معمول تھا۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی "شرحِ اللُّباب" لِلمُلّا علی القاری: ثُمَّ مِنْ آدَابِ الزِّيَارَةِ مَاقَالُوْا: مِنْ أَنَّهُ

يَـأْتِي الـزَّائِـرُ مِـنْ قِبَـلِ رِجْـلَـيِ الْمُتَوَفّٰى لَامِنْ قِبَلِ رَأْسِهٖ أَتْعَبُ لِأَنَّهٗ لِبَصَرِ الْمَيِّتِ، بِـخِلَافِ الْأَوَّلِ لِأَنَّـهٗ يَـكُوْنُ مُقَابِلَ بَصَرِهٖ ،لٰكِنْ هٰذَا اِذَا أَمْكَنَهٗ،وَاِلَّا فَقَدْ ثَبَتَ "أَنَّهٗ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ قَرَأَ أَوَّلَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ عِنْدَ رَأْسِ مَيِّتٍ وَّآخِرَهَا عِنْدَ رِجْلَيْهِ"۔ وَمِنْ آدَابِهَا أَنْ يُّسَلِّمَ بِلَفْظِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ عَلَى الصَّحِيْحِ لَا"عَلَيْكُمُ السَّلَامُ"،فَإِنَّهٗ وَرَدَ: اَلسَّلَامُ عَـلَيْـكُمْ دَارَقَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ،وَإِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ ،وَنَسْأَلُ اللّٰهَ لَـنَـاوَلَـكُـمُ الْـعَـافِيَةَ " ثُـمَّ يَـدْعُـوْ قَـائِمًا طَوِيْلًا ،وَّاِنْ جَلَسَ يَجْلِسُ بَعِيْدًا أَوْ قَرِيْبًا بِحَسْبِ مَرْتَبَتِهٖ فِيْ حَالِ حَيَاتِهٖ ۔

ترجمہ:''علامہ علی قاری''شرح اللباب''میں لکھتے ہیں: زیارت (قبور) کے آداب میں جو کہا گیا کہ زائر قبر کے سرہانے کی طرف سے نہ آئے بلکہ پائنتی کی طرف سے آئے تاکہ میت کو اُسے دیکھنے میں دشواری نہ ہو یعنی نظر گھما کر نہ دیکھنا پڑے،اس کے برعکس پائنتی کی طرف سے آتے ہوئے وہ اس کی نظروں کے سامنے رہے گا،لیکن ایسا کرنا ہر صورت میں لازم نہیں ہے،جب اس کے لئے یہ طریقہ آسان ہو تو اسے اختیار کرے۔ورنہ نہیں ''رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سورۂ بقرہ کا اول (رکوع) میت کے سرہانے کی جانب پڑھا اور سورۃ کا آخری حصہ میت کی پائنتی کی جانب پڑھا''۔اور آداب میں سے یہ بھی ہے کہ ''السلام علیکم'' کے الفاظ سے سلام کرے،صحیح یہی ہے علیکم السلام نہ کہے،حدیث میں سلام کے الفاظ اس طرح وارد ہوئے:

اَلسَّلَامُ عَـلَيْـكُـمْ دَارَقَـوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ،وَإِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ،وَنَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ۔

ترجمہ:''السلام علیکم! اے مومنین کے گھر والو! ہم ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں اور ہم اللہ سے اپنے لئے اور تمہارے لئے معافی کا سوال کرتے ہیں''۔

پھر کھڑے رہ کر دعا کرے اور اگر چاہے تو بیٹھ جائے،حسب مرتبہ اس کے قریب یا دور اتنے

فاصلے سے بیٹھے، جیسا زندگی میں اس کا معمول تھا، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3 ص: 141)"۔
زیارتِ قبر کے لئے جاتے ہوئے احادیث میں اور بھی کلمات آئے ہیں، ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

سلیمان بن بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ جب وہ قبرستان کی طرف جائیں تو ان میں سے ایک کہنے والا یہ کہے: "اَلسَّلَامُ عَلٰی أَھْلِ الدِّیَارِ، وَفِیْ رِوَایۃِ زُھَیْرٍ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ أَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ لَلَاحِقُوْنَ أَسْأَلُ اللّٰہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ۔

ترجمہ: "السلام علیکم! اے بستی والو! زہیر کی روایت میں ہے کہ (اس طرح کہے:) السلام علیکم! اے مومنین اور مسلمین کی بستی والو! ان شاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں، میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لئے معافی کا سوال کرتے ہیں، (صحیح مسلم: 2255)"۔

☆ زازان بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب قبرستان میں داخل ہوتے تو فرماتے: اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنْ فِیْ ھٰذِہِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ اَنْتُمْ لَنَا فَرَطٌ وَّنَحْنُ لَکُمْ تَبَعٌ وَّاِنَّا بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ترجمہ: "اس دیارِ مومنین و مسلمین (یعنی قبرستان) میں جو بھی ہیں، ان سب پر سلام ہو، آپ لوگ ہمارے پیش رو ہیں اور ہم آپ کے پیچھے آنے والے ہیں اور ہم تم سے ملنے والے ہیں بیشک ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: 11904)

ایک روایت میں ہے: "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَاِنَّا بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ"۔

ترجمہ: "تم پر سلام ہو اور ہم تم سے ملنے والے ہیں، (مصنف ابن ابی شیبہ: 11910)"۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَصْحَابَ الْقُبُوْرِ، اَلسَّلَامُ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ کے الفاظ بھی آئے ہیں، (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: 11911)۔

قبروں/مزارات پر پھول ڈالنے کا شرعی حکم

سوال:58

مزارات پر پھول ڈالنے کی حقیقت کیا ہے ؟۔

جواب:

قبر پر پھول ڈالنا مستحسن ہے اور اس کی اصل یہ حدیث ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا : مَرَّ النَّبِیُّ ﷺ عَلٰی قَبْرَیْنِ ،فَقَالَ: اِنَّہُمَا لَیُعَذَّبَانِ ، وَمَا یُعَذَّبَانِ مِنْ کَبِیْرٍ ،ثُمَّ قَالَ: بَلٰی ،اَمَّا اَحَدُہُمَا فَکَانَ یَسْعٰی بِالنَّمِیْمَۃِ ،وَاَمَّا اَحَدُہُمَا فَکَانَ لَایَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِہٖ،قَالَ: ثُمَّ اَخَذَ عُوْدًا رَطْبًا ، فَکَسَرَہٗ بِاثْنَتَیْنِ ،ثُمَّ غَرَزَ کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْہُمَا عَلٰی قَبْرٍ ،ثُمَّ قَالَ: لَعَلَّہٗ یُخَفَّفُ عَنْہُمَا مَالَمْ یَیْبَسَا۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایسی دو قبروں کے پاس سے گزرے ،جن کو عذاب دیا جا رہا تھا ،آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک ان کو عذاب دیا جا رہا ہے اور ان کو کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جا رہا، ان دونوں میں سے ایک تو پیشاب (کے قطروں) سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغلی کھاتا تھا، پھر آپ ﷺ نے کھجور کے درخت کی ایک تر شاخ لی ،اُس کے دو ٹکڑے کیے، پھر ہر ایک کی قبر پر ایک ٹکڑا گاڑ دیا،آپ ﷺ نے فرمایا: امید ہے کہ جب تک یہ شاخیں خشک نہیں ہوں گی، ان کے عذاب میں تخفیف ہوتی رہے گی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1378)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَاِذَا اَرَادَ زِیَارَۃَ الْقُبُوْرِ یُسْتَحَبُّ لَہٗ اَنْ یُّصَلِّیَ فِیْ بَیْتِہٖ رَکْعَتَیْنِ یَقْرَأُ فِیْ کُلِّ رَکْعَۃٍ الْفَاتِحَۃَ وَ آیَۃَ الْکُرْسِیِّ مَرَّۃً وَّاحِدَۃً وَّالْاِخْلَاصَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَّیَجْعَلُ ثَوَابَہَا لِلْمَیِّتِ یَبْعَثُ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَی الْمَیِّتِ فِیْ قَبْرِہٖ نُوْرًا وَّیَکْتُبُ لِلْمُصَلِّیْ ثَوَابًا کَثِیْرًا۔

ترجمہ:''اور جب زیارت قبور کے ارادے سے نکلے تو مستحب یہ ہے کہ پہلے اپنے گھر پر ہی

دو رکعت نفل پڑھے، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور آیۃ الکرسی ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد) تین مرتبہ پڑھے اور اس کا ثواب میت کو ایصال کردے، اللہ تعالیٰ اُس (ثواب) کو نور کی صورت میں مردے کی قبر میں داخل فرمائے گا اور نمازی (ایصالِ ثواب کرنے والے) کے لئے ڈھیروں ثواب لکھے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:350)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَضْعُ الْوَرْدِ وَالرَّيَاحِيْنَ عَلَى الْقُبُوْرِ حَسَنٌ وَاَنْ تَصَدَّقَ بِقِيْمَةِ الْوَرْدِ كَانَ اَحْسَنَ۔

ترجمہ: ''پھولوں اور خوشبودار چیزوں کو قبر پر رکھنا مستحسن ہے اور اگر ان کی قیمت کو صدقہ کرکے میت کو ثواب پہنچادے تو یہ افضل ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:351، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

بِاَنَّهٗ مَادَامَ رَطْباً يُسَبِّحُ اللّٰهَ تَعَالىٰ فَيُؤْنِسُ الْمَيِّتَ وَتَنْزِلُ بِذِكْرِهِ الرَّحْمَةُ وَنَحْوَهٗ فِي "الْخَانِيَّةِ"۔ اَقُوْلُ: وَدَلِيْلُهٗ مَاوَرَدَ فِي الْحَدِيْثِ مِنْ وَّضْعِهٖ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ الْجَرِيْدَةَ الْخَضْرَاءَ بَعْدَ شَقِّهَا نِصْفَيْنِ عَلَى الْقَبْرَيْنِ اللَّذَيْنِ يُعَذَّبَانِ، وَتَعْلِيْلُهٗ بِالتَّخْفِيْفِ عَنْهُمَا مَالَمْ يَيْبَسَا: اَيْ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا بِبَرَكَةِ تَسْبِيْحِهِمَا، اِذْهُوَ اَكْمَلُ مِنْ تَسْبِيْحِ الْيَابِسِ لِمَا فِي الْاَخْضَرِ مِنْ نَوْعِ حَيَاةٍ، وَعَلَيْهِ فَكَرَاهَةُ قَطْعِ ذَالِكَ وَاِنْ نَبَتَ بِنَفْسِهٖ وَلَمْ يَمْلِكْ لِاَنَّ فِيْهِ تَفْوِيْتَ حَقِّ الْمَيِّتِ، وَيُؤْخَذُ مِنْ ذَالِكَ وَمِنَ الْحَدِيْثِ نَدْبُ وَضْعِ ذَالِكَ لِلْاِتِّبَاعِ، وَيُقَاسُ عَلَيْهِ مَا اُعْتِيْدَ فِيْ زَمَانِنَا مِنْ وَضْعِ اَغْصَانِ الْآسِ وَنَحْوِهٖ،

ترجمہ: ''پھول جب تک تر رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرکے میت کا دل بہلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے، اسی کی مثل ''خانیہ'' میں بھی ہے۔ میں کہتا ہوں: اس کی دلیل جیسا کہ حدیث مبارک میں وارد ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہری شاخ

کو توڑ کر نصف نصف اُن دونوں قبروں پر لگا دیا، جن پر عذاب ہو رہا تھا اور وجہ اسکی یہ بیان فرمائی کہ جب تک یہ تر ہیں، ان کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی یعنی اُن کے تسبیح کرنے کی برکت سے عذاب میں کمی واقع ہوگی، کیونکہ وہ خشک شے کی تسبیح سے زیادہ کامل ہوتی ہے، کیونکہ تر نباتات میں ایک قسم کی حیات ہوتی ہے اور اسی بنا پر اس کا توڑنا مکروہ ہے اگرچہ وہ خود بخود اُگ آیا ہو اور کسی کی ملکیت نہ ہو، اس لئے کہ اس میں میت کے حق کا فوت ہونا ہے۔ اس بات سے اور حدیث پاک کی اتباع کے لحاظ سے اس کا قبر پر رکھنا مستحب ہے۔ اسی پر اُس کا قیاس بھی ہوگا جو ہمارے زمانے میں آس وغیرہ کی شاخیں رکھنے کا دستور ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:145، بیروت)''۔

قبروں کو سجدہ کرنے اور بوسہ دینے کا حکم

سوال:59

کیا قبر کو سجدہ کرنا یا بوسہ دینا جائز ہے؟۔

جواب:

قبر کو سجدہ کرنا سخت ناجائز و حرام ہے اور اُسے بوسہ دینا ممنوع ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: و لا یَمْسَحُ الْقَبْرَ وَلَا یُقَبِّلُهُ فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَادَةِ النَّصَارٰی وَلَا بَأسَ بِتَقْبِیلِ قَبْرِ وَالِدَیْهِ کَذَا فِی الْغَرَائِبِ۔

ترجمہ: ''نہ قبر کو چھوئے نہ بوسہ دے کیونکہ یہ نصاریٰ کی عادت ہے، البتہ ماں باپ کی قبر کو بوسہ دینے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ ''الغرائب'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:351، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''سجدۂ تعظیمی'' کی حُرمت پر'' اَلزُّبدۃُ الزَّکیۃُ لِتَحرِیمِ سُجُودِ التَّحِیَّۃِ '' کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا اور اس میں قرآن و حدیث اور فقہ کے 150 حوالہ جات سے سجدۂ تعظیمی کی حرمت کو ثابت کیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ سجدے کی

دو قسمیں ہیں ایک ''سجدۂ عبادت'' یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے قطعاً اور بلا اختلاف شرک وکفر ہے۔ دوسرا ''سجدۂ تعظیمی''، انہوں نے اسے حرام قرار دیا ہے، چنانچہ آپ نے لکھا: ''مسلمان اے مسلمان! اے شریعتِ مصطفوی کے تابع فرمان؛ جان کہ سجدہ حضرتِ عزّت جَلالُہٗ کے سوا کسی کے لئے نہیں، اس کے غیر کو ''سجدۂ عبادت'' تو یقیناً اجماعاً شرکِ مُہین وکفرِ مبین (یعنی انتہائی حقیر شرک اور واضح کفر) اور ''سجدۂ تحیت'' (یعنی سجدۂ تعظیمی) حرام وگناہِ کبیرہ بالیقین اور اس کے کفر ہونے میں اختلافِ علمائے دین، ایک جماعتِ فقہاء سے تکفیر منقول اور عندالتحقیق وہ کفرِ صوری (یعنی صورتاً کفر) پر محمول''۔ مزید لکھتے ہیں: ''مزارات کو سجدہ یا ان کے سامنے زمین چومنا حرام اور حدِ رکوع تک جھکنا ممنوع''۔

''علامہ علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ'' کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

وَلَا یَمَسُّ عِنْدَ الزِّیَارَۃِ الْجِدَارَ وَلَا یُقَبِّلُہٗ وَلَا یَلْتَصِقُ وَلَا یَطُوْفُ وَلَا یَنْحَنِیْ وَلَا یُقَبِّلُ الْاَرْضَ فَاِنَّہٗ اَیْ کُلَّ وَاحِدٍ غَیْرُ مُسْتَحْسَنَۃٍ۔

ترجمہ: ''زیارتِ روضۂ انور سید اطہر ﷺ کے وقت نہ دیوار کو ہاتھ لگائے، نہ چومے، نہ اس سے چمٹے، نہ طواف کرے، نہ جھکے، نہ زمین چومے کہ یہ سب بدعاتِ قبیحہ ہیں۔'' آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ''مزار کو سجدہ درکنار، کسی قبر کے سامنے اللہ عزّ وجلّ کو بھی سجدہ جائز نہیں اگرچہ وہ قبلہ رُخ ہی کھڑا ہو''۔ اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ دلائلِ شرعیہ کے ساتھ فتاویٰ رضویہ، جلد 22، ص: 426 تا 537، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور کیا جا سکتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ اولیائے کرام کی قبور کو بوسہ دینا، اُن کا طواف اور تعظیماً اُنہیں سجدہ کرنا شریعتِ مُطہرہ فقہ حنفی کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟، اُنہوں نے جواب میں لکھا: بلاشبہ غیرِ کعبہ معظمہ کا طوافِ تعظیمی ناجائز ہے اور غیر خدا کو سجدہ ہماری شریعت میں حرام ہے اور بوسۂ قبر میں علماء کو اختلاف ہے اور اَحوط منع ہے، خصوصاً مزاراتِ طیبہ اولیائے کرام کہ ہمارے علماء نے تصریح فرمائی کہ کم از کم چار ہاتھ

فاصلہ سے کھڑا ہو، یہی ادب ہے پھر تقبیل (بوسہ) کیونکر متصور ہے؟ (یعنی جب ادباً فاصلے پر کھڑا ہوگا تو بوسہ کیسے دے سکتا ہے؟) یہ وہ ہے جس کا فتویٰ عوام کو دیا جاتا ہے اور تحقیق کا مقام دوسرا ہے، لِكُلِّ مَقَامٍ مَقَالٌ وَلِكُلِّ مَقَالٍ رِجَالٌ وَلِكُلِّ رِجَالٍ مَجَالٌ وَلِكُلِّ مَجَالٍ مَنَالٌ ، نَسْأَلُ اللّٰهَ حُسْنَ الْمَآلِ، (احکامِ شریعت، حصہ سوم، ص:150)

ہم جب امام احمد رضا قادری اور اکابر اُمت کے حوالے سے قبروں کو بوسہ دینے کی ممانعت کا مسئلہ لکھتے ہیں تو ہمارے بعض علماءِ کرام اس پر اپنے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ بعض علماءِ کرام کے نزدیک اُن کے دلائل کی روشنی میں یہ جائز ہے۔ اس موقف میں علماء کے اختلاف رائے کی طرف اشارہ موجود ہے، لیکن اس کے باوجود عوام کے لئے سب سے زیادہ شرعی احتیاط پر مبنی یہی فتویٰ ہے کہ اُنہیں منع کیا جائے، کیونکہ بعض جُہلاء بوسے سے تجاوز کر کے سجدے تک جا پہنچتے ہیں اور اسے عقیدت کا نام دیتے ہیں ، اس غلُوّ (یعنی عقیدت کے زُعم میں شرعی حدود سے تجاوز کرنے) سے عوام کو محفوظ رکھنا از حد ضروری ہے۔

عورتوں کا مزارات پر جانا

سوال: 60

مزارات پر عورتوں کی حاضری کے بارے میں کیا حکم ہے؟ ۔ساتھ ہی فاتحہ پڑھنے کی جگہ اور راستہ بھی ایک ہونا کیسا؟۔

جواب:

ابتدائے اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے مطلقاً مرد وعورت سب کو قبرستان جانے سے منع فرمایا تھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَزُوْرُوْهَا ترجمہ: ''میں نے (ابتداءً) تمہیں قبرستان جانے سے منع کیا تھا، مگر اب (میں اجازت دیتا ہوں کہ) وہاں جایا کرو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2258)''۔

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: فَزُوْرُوا الْقُبُوْرَ ، فَاِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْمَوْتَ ۔

ترجمہ:''قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ تمہیں موت کی یاد دلاتی ہیں''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:2257)

حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ اجازت عام ہے، مردوں کے ساتھ بظاہر تخصیص کا کوئی قرینہ نہیں ہے، مگر اس کے باوجود فقہائے کرام نے عورتوں کو قبرستان جانے سے اس لئے منع کیا ہے کہ کہیں وہ بے پردہ ہو کر نہ جائیں، غیر محرم مردوں کے سامنے نہ آئیں، وہاں جا کر نوحہ خوانی نہ کریں، الغرض شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہو اور دعا و ایصالِ ثواب تو گھر بیٹھ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مرد و عورت کا اختلاط کسی مقام پر بھی جائز نہیں ہے، حیاتِ نبوی ﷺ میں جب خواتین مسجدِ نبوی میں نماز باجماعت ادا کرتیں تو آپ ﷺ تھوڑی دیر اپنی جگہ ٹھہرے رہتے تاکہ عورتیں اپنے گھروں کو چلی جائیں۔ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَلَّمَ قَامَ النِّسَاءُ حِيْنَ يَقْضِيْ تَسْلِيْمَهٗ وَيَمْكُثُ هُوَ فِيْ مَقَامِهٖ يَسِيْرًا قَبْلَ اَنْ يَّقُوْمَ، قَالَ: نُرٰى وَاللّٰهُ اَعْلَمُ اَنَّ ذَالِكَ كَانَ لِكَيْ يَنْصَرِفَ النِّسَآءُ قَبْلَ اَنْ يُدْرِكَهُنَّ اَحَدٌ مِّنَ الرِّجَالِ۔

ترجمہ:''جب رسول اللہ ﷺ سلام پھیرتے تھے تو آپ ﷺ کے سلام پھیرنے کے بعد عورتیں کھڑی ہو جاتی تھیں اور آپ کھڑے ہونے سے پہلے تھوڑی دیر اپنی جگہ پر رُکے رہتے تھے۔ زُہری نے کہا: اللہ زیادہ جانتا ہے! ہمارا گمان یہ ہے کہ آپ اس لئے رُکے رہتے تھے کہ عورتیں مردوں کے اختلاط سے پہلے گزر جائیں''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:870)

فقہائے کرام نے شرعی احتیاط کے پیشِ نظر عورتوں کو قبرستان جانے سے اور مساجد میں آنے سے بھی منع کیا ہے، لیکن آج کل دین کی طرف رغبت دلانے اور دینی مسائل سے آگہی کے لئے مساجد میں عورتوں کے لئے نمازِ جمعہ اور تراویح میں شرکت کی اجازت دینا میرے نزدیک دین کی حکمت کے مطابق ہے اور مستحسن ہے، بشرطیکہ وہ باپردہ ہوں، ان کے

آنے جانے کا راستہ جدا ہو، مردوں سے میل جول نہ ہو اور ان کی نماز کی جگہ میں پردے کا اہتمام ہو اور انہیں تاکید کی جائے کہ وہ ایسے چھوٹے بچوں کو لے کر نہ آئیں، جنہیں مسجد کے آداب کا شعور نہ ہو، جو مسجد میں شور مچا کر لوگوں کی نماز میں خلل ڈالیں اور مسجد کو آلودہ کریں۔ انہی شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے مُعمر عورتوں کو اپنے کسی عزیز کی قبر پر جانے کی اجازت دی جاسکتی ہے جبکہ وہاں جا کر نوحہ خوانی اور ادب میں حد سے تجاوز نہ ہو، لیکن خواتین سے ایسی احتیاط کی توقع کم ہوتی ہے اس لئے احتیاط کے پیشِ نظر علماء عورتوں کو مطلقاً مزارات پر جانے سے منع فرماتے ہیں۔

غیر شرعی منت کا حکم

سوال: 61

بغیر چپل (برہنہ پا) پیدل چلنے کی منت یا ہزاروں کی تعداد میں چادریں چڑھانے یا مزار کے سرہانے دھاگے باندھنے کی منت جیسے معاملات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔

جواب:

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسی نذر جو تعبُّدی ہو یعنی جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو اور اس نذر کا پورا کرنا کوئی نیک کام ہو، اس نذر کا پورا کرنا واجب ہے۔ اپنے نفس کو ضرورت کے بغیر تکلیف اور عذاب دینے میں اللہ عزوجل کی کوئی عبادت ہے نہ کوئی نیک کام، ایسی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں ہے۔

مزار پر چادر چڑھانے کی نذر ماننا نذرِ شرعی نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی امر تعبُّدی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی جنس سے کوئی عبادتِ مقصودہ واجب ہے، اسی طرح مزار پر تالے لگانے، دھاگے باندھنے اور کھولنے کی نذر بھی باطل ہے۔ عوام کو ایسی جاہلانہ نذریں ماننے سے روکنا چاہئے اور علماء کو اپنے خطباتِ جمعہ میں اصلاحی تقریریں کرنی چاہئیں۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَاٰى شَيْخًا يُهَادٰى بَيْنَ ابْنَيْهِ ،قَالَ: مَا بَالُ هٰذَا ؟،

قَالُوْا: نَذَرَ اَنْ يَّمْشِيَ، قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ عَنْ تَعْذِيْبِ هٰذَا نَفْسَهُ لَغَنِيٌّ وَاَمَرَهُ اَنْ يَّرْكَبَ۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص اپنے دو بیٹوں کے (کندھوں پر) ٹیک لگا کر چل رہا تھا، آپ ﷺ نے پوچھا: اس کو کیا ہوا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ جو اپنے آپ کو عذاب دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے (یعنی اسے بندوں سے ایسے اعمال مطلوب نہیں ہیں) اور آپ ﷺ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1865)

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ: نَذَرَتْ اُخْتِيْ اَنْ تَمْشِيَ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ، وَاَمَرَتْنِيْ اَنْ اَسْتَفْتِيَ لَهَا النَّبِيَّ ﷺ فَاسْتَفْتَيْتُهُ فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: لِتَمْشِ وَلْتَرْكَبْ۔

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری بہن نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ بیت اللہ تک پیدل جائیں گی اور اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے لئے نبی ﷺ سے یہ مسئلہ معلوم کروں، پس میں نے جب نبی ﷺ سے اس کے متعلق استفسار کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی مرضی پیدل جائے یا سواری پر جائے (یعنی پیدل چل کر حج کرنے کی منت پر عمل ضروری نہیں ہے)، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1866)''۔

مزارات پر ڈھول اور رقص وغیرہ جیسی خرافات کا حکم

سوال: 62

جو لوگ مزارات پر رقص، ڈھول وغیرہ کے ساتھ حاضری دیتے ہیں، اُن کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟۔

جواب:

شریعت مطہرہ میں عام حالات میں بھی مسلمان کے طرزِ زندگی میں رقص وسرور، ڈھول، گانے باجے وغیرہ کو مکروہ عمل فرمایا ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (وَكُرِهَ

كُلُّ لَهْوٍ) أَيْ كُلُّ لَعِبٍ وَّعَبَثٍ ،فَالثَّلاثُ بِمَعْنًى وَّاحِدٍ كَمَا فِيْ "شَرْحِ التَّأوِيْلَاتِ"، وَالْإِطْلَاقُ شَامِلٌ لِنَفْسِ الْفِعْلِ ، وَاسْتِمَاعِهٖ كَالرَّقْصِ وَالسُّخْرِيَّةِ وَالتَّصْفِيْقِ وَضَرْبِ الْأَوْتَارِ مِنَ الطُّنْبُوْرِ وَالْبَرْبَطِ وَالرُّبَابِ وَالْقَانُوْنِ وَالْمِزْمَارِ وَالصَّنْجِ وَالْبُوْقِ ، فَإِنَّهَا كُلُّهَا مَكْرُوْهَةٌ لِأَنَّهَا زِيُّ الْكُفَّارِ ،

ترجمہ:''(ہر کھیل مکروہ ہے) یعنی لہو، لعب اور عَبَث تینوں معنی ایک ہیں، جیسا کہ ''شرح التاویلات'' میں ہے۔ اِطلاق (بلا قید ذکر کرنا) نفسِ فعل اور اس کی سماعت کو شامل ہے، جیسے رقص کرنا، مذاق کرنا اور تالیاں بجانا، ڈھول بجانا، ستار بجانا، سارنگی بجانا، چنگ بجانا، قانون (ایک تار والا باجا) بجانا، مزامیر کا استعمال، جھانجھ (مجیرا) بجانا اور بگل بجانا، یہ سب مکروہ ہیں کیونکہ یہ عاداتِ کفار ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص:481، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مزارات پر رقص کے متعلق ایک سوال کے جواب میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:''بازاری عورتوں کا رقص حرام ہے، (یہ ہم نے امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز کی عبارت کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، اس میں مردوں اور عورتوں کے مخلوط اور بے حجاب اجتماعات کی تمام صورتیں شامل ہیں)، اولیائے کرام کے اَعراس میں بے قید جاہلوں نے یہ معصیت پھیلائی ہے''۔

(فتاوی رضویہ، جلد 29، ص:92، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

زکوٰۃ کے مسائل

زکوٰۃ وفطرہ کی جبری وصولی

سوال: 63

بعض علاقوں میں کچھ لوگ بدمعاشی اور طاقت کے بل پر لوگوں سے جبراً زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ اور صدقات وصول کرتے ہیں۔ اور لوگ ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے نہ ہی حکومت لوگوں کو ایسے مسلح گروپوں سے تحفظ دیتی ہے، اس لئے لوگ اپنی جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی خاطر مجبوراً ان لوگوں کو زکوٰۃ وصدقات دے دیتے ہیں۔ کیا جبر، خوف اور ڈر سے چندے کی صورت میں زکوٰۃ، فطرے کی ادائیگی سے شرعی حکم پورا ہوجاتا ہے یا دوبارہ مستحق افراد کو ادائیگی کرنا ضروری ہے؟، (محمد رفیع یوسفی، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوٰۃ قرآن مجید کی سورۂ توبہ، آیت: 60 میں متعین فرما دیئے ہیں اور وہ آٹھ مدات یہ ہیں:

(1) فُقَراء (2) مساکین (3) عاملینِ زکوٰۃ (4) مُؤَلَّفۃُ القلوب (5) غارمین: جن کی گردن کسی بڑے مالی بار تلے دبی ہوئی ہو (6) فی الرِّقاب: جن پر کوئی بھاری تاوان آگیا ہو، جس سے گلوخلاصی کی کوئی سبیل نہ ہو (7) فی سبیل اللہ: جو اپنے آپ کو ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے وقف کر چکے ہوں اور معاشی تگ و دو کے لئے انہیں وقت میسر نہ ہو، جیسے دین کا طالب علم، مجاہد فی سبیل اللہ (8) ابنُ السَّبیل: جو مسافر کسی ایسے مقام پر گھر گئے ہوں کہ "قُوتِ لَایَمُوت" (زندگی کی بنیادی ضروریات) دستیاب نہ ہوں اور گھر سے رابطہ اور مالی معاونت کا حصول ممکن نہ ہو۔

جبری زکوٰۃ وفطرہ کی وصولی کے متعلق فقہاء کے دو قول ہیں: (۱) زیادہ بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ دوبارہ ادا کر دی جائے (۲) آسانی اس میں ہے کہ اگر ان کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت کر لی جائے تو دوبارہ ادا نہ کی جائے۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

وَاِذَا أَخَذَ الْخَوَارِجُ الْخَرَاجَ وَصَدَقَةَ السَّوَائِمِ لَا يُثَنّٰى عَلَيْهِم لِأَنَّ الْإِمَامَ لَمْ يَحْمِهِمْ وَالْجِبَايَةُ بِالْحِمَايَةِ وَاَفْتَوْا بِأَنْ يُعِيْدُوْهَا دُوْنَ الْخَرَاجِ فِيْمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اللّٰهِ تَعَالٰى لِأَنَّهُمْ مَصَارِفُ الْخَرَاجِ لِكَوْنِهِم مُقَاتِلَةً وَالزَّكٰوةُ مَصْرَفُهَا الْفُقَرَاءُ فَلَا يَصْرِفُوْنَهَا اِلَيْهِمْ وَقِيْلَ اِذَا نَوٰى بِالدَّفْعِ التَّصَدُّقَ عَلَيْهِمْ سَقَطَ عَنْهُ وَكَذَا مَا دَفَعَ اِلٰى كُلِّ جَائِرٍ لِأَنَّهُمْ بِمَا عَلَيْهِمْ مِنَ التَّبِعَاتِ فُقَرَاءُ وَالْأَوَّلُ أَحْوَطُ ـ

ترجمہ:'' اور اگر خارجیوں نے خراج (ٹیکس) کو اور سائمہ (چرنے والے) جانوروں کی زکوٰۃ (جبراً) وصول کر لی، تو لوگوں سے دوبارہ نہیں لی جائے گی، کیونکہ امام نے لوگوں کی حفاظت نہیں کی ہے اور ٹیکس تو لوگوں کی ظالموں سے حفاظت کے سبب ہے اور لوگوں کو فتویٰ دیا جائے گا کہ وہ زکوٰۃ دوبارہ (فقیروں کو) دیدیں، خراج دوبارہ نہ دیں۔ (یہ دوبارہ زکوٰۃ دینا) ان کے اور اللہ کے درمیان ہے اس لئے خوارج، خراج کا مصرف ہیں، کیونکہ خوارج بھی لڑنے والوں میں ہیں اور زکوٰۃ کا مصرف فقراء ہیں اور (غالب امکان یہ ہے کہ) خوارج اس کو فقیروں پر خرچ نہ کریں گے اور کہا گیا (فقیہ ابو جعفر کا قول) ہے کہ: جب مال کے مالک نے خارجیوں کو دیتے وقت ان کو صدقہ دینے کی نیت کی تو مالک سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اور ایسے ہی ہر اُس مال کے دینے میں جو کسی ظالم کو دینا پڑے چونکہ ان لوگوں نے لوگوں کے حقوق اور مال ظلماً غصب کئے ہیں (جن پر ان کا حق نہیں ہے، لہٰذا یہ شرعاً اس مال کے مالک بھی نہیں ہیں، صرف غاصب ہیں)، اس لئے فقیر کے حکم میں ہیں اور قولِ اوّل میں زیادہ احتیاط ہے (یعنی شرعاً احتیاط اسی میں ہے کہ مالدار آدمی دوبارہ اپنی زکوٰۃ ادا کرے)''۔

علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

قَالَ فِي "الْجَامِعِ الصَّغِيْرِ" لِقَاضِيْ خَانْ: وَكَذٰلِكَ السُّلْطَانُ اِذَا صَادَرَ رَجُلًا،

وَأَخَذَ مِنْهُ أَمْوالاً ،فَنَوىٰ صَاحِبُ الْمَالِ الزَّكَاةَ عِنْدَالدَّفْعِ سَقَطَتْ عَنْهُ الزَّكَاةُ، لِأَنَّهُمْ بِمَا عَلَيْهِمْ مِنَ التَّبِعَاتِ فُقَرَاءُ،فَإِنَّهُمْ إِذَا رَدُّوْا أَمْوَالَهُمْ إِلَى مَنْ أَخَذُوْهَا مِنْهُمْ لَمْ يَبْقَ مَعَهُمْ شَئٌ ۔

ترجمہ:''''الجامع الصغیر''میں قاضی خان سے منقول ہے:اسی طرح حاکم اگرکسی شخص کے اموال (زبردستی) چھیننے کا حکم صادر کردے اور صاحبِ مال ، مال دیتے وقت زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کرلےتو مالک سے زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی ،اس لئے کہ یہ لوگ ،لوگوں کا مال ظلماً لینے کی وجہ سے فقیر ہیں،اگران سے یہ لوٹا ہوا سارا مال لے کر صاحبِ حق لوگوں کو دےدیا جائےتوان کے پاس کچھ باقی نہیں رہےگا،(ہدایہ،جلد2،ص:32-31)''۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ظلماً لیئے ہوئے مال پرظالم وغاصب کی ملکیت کا حق ثابت نہیں ہوتا،وہ صرف غاصب ہےاورمظلوموں کے حقوق کواداکرناان پرشرعاًلازم ہے۔لہٰذا اگرکبھی ان سے مظلوموں کے غصب کئے ہوئے مال اورحقوق وصول کرلئے جائیں،تووہ فقیر رہ جائیں گے۔تاہم ہرغاصب وظالم کے بارے میں ایسا قطعی طورپرنہیں کہا جاسکتا کہ اس کے پاس اپنا کوئی مال نہیں ہے۔لہٰذا احتیاطاً زکوٰۃ دوبارہ ادا کرنے کےقول ہی پرعمل بہتر ہے۔کیونکہ آج کل جو مسلح گروہ زبردستی زکوٰۃ ،فطرہ اورصدقات وصول کرتے ہیں،وہ خودبھی بااثراورمال دارہوتے ہیں۔

صاحبِ ہدایہ اس مسئلے کی تفہیم اس انداز سے کرتے ہیں کہ جب خوارج اہلِ عدل کے شہر میں گھس گئے اوروہاں کے کفار سے زبردستی خراج اورمسلمانوں سے زبردستی زکوٰۃ وصول کرلی تو اُن سے دوبارہ خراج یا زکوٰۃ نہیں لی جائے گی کہ امامِ عادل نے اُن کی کوئی حفاظت نہیں کی،کفار سے محصول (ٹیکس) حفاظت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے،جب امامِ عادل حفاظت نہیں کرسکا تومحصول (ٹیکس)واجب نہیں۔مسلمانوں کوفتویٰ یہ دیا جائے گا کہ وہ دیانتاً زکوٰۃ دوبارہ خودمحتاجوں کو دیدیں ،کفارخراج نہ دیں،اس لئے کہ خوارج خراج کا مصرف ہیں،

کیونکہ وہ باغی ہیں ۔رہا زکوٰۃ کا مسئلہ تو زکوٰۃ کا مصرف مسلمان فقیر ہیں، خوارج اس کو فقیروں پر خرچ نہیں کریں گے، خوارج کے نزدیک اہلِ عدل کا قتل مباح ہے تو یہ مسلمان فقیروں پر زکوٰۃ کا مال کیسے خرچ کریں گے اور جب مسلمانوں کی زکوٰۃ صحیح مصرف میں خرچ نہ ہوئی تو دیانتاً دوبارہ ادا کرنے کا فتویٰ دیا جائے گا۔فقیہ ابوجعفر نے کہا کہ جب مالک نے خارجیوں کو دیتے وقت زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت کرلی تو اس کی زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی۔ایسے ہی کسی ظالم طاقتور کو دیتے وقت نیت کرلے کہ اس فقیر کو زکوٰۃ دیتا ہوں تو زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی ،دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ۔صاحبِ ہدایہ نے فرمایا کہ پہلے قول میں احتیاط ہے کہ دوبارہ بذاتِ خود فقراء کو دینے سے زکوٰۃ یقینی اور قطعی ادا ہوجائے گی ،لیکن دوسرے قول میں آسانی ہے۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(أخَذَا لْبُغَاةُ)وَالسَّلَاطِيْنُ الْجَائِرَةُ (زَكَاةَ) الْأَمْوَالِ الظَّاهِرَةِ كَ(السَّوَائِمِ وَالْعُشْرِ وَالْخَرَاجِ لَا اِعَادَةَ عَلٰى أرْبَابِهَا اِنْ صُرِفَ) الْمَأْخُوْذُ (فِيْ مَحَلِّهٖ) الْآتِيْ ذِكْرُهٗ (وَاِلَّا) يُصْرَفُ (فِيْهِ فَعَلَيْهِمْ) فِيْمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اللّٰهِ (اِعَادَةُ غَيْرَ الْخَرَاجِ) لِأَنَّهُمْ مَصَارِفُهٗ، وَاخْتَلَفَ فِي الْأَمْوَالِ الْبَاطِنَةِ، فَفِي "الْوَلْوَالِجِيَّةِ" وَ"شَرْحَ الْوَهْبَانِيَّةِ": اَلْمُفْتٰى بِهٖ عَدَمُ الْاِجْزَاءِ،وَفِي "الْمَبْسُوْطِ ": اَلْأَصَحُّ الصِّحَّةُ اِذَا نَوٰى بِالدَّفْعِ لِظَلَمَةِ زَمَانِنَا الصَّدَقَةَ عَلَيْهِمْ لِأَنَّهُمْ بِمَا عَلَيْهِمْ مِّنَ التَّبِعَاتِ فُقَرَاءُ حَتّٰى أفْتٰى أمِيْرُبَلْخٍ بِالصِّيَامِ لِكَفَّارَةٍ عَنْ يَمِيْنِهٖ ؛ وَلَوْ أَخَذَهَا السَّاعِيْ جَبْرًا لَمْ تَقَعْ زَكَاةٌ لِكَوْنِهَا بِلَا اِخْتِيَارٍ ،وَلٰكِنْ يُجْبَرُ بِالْحَبْسِ لِيُؤَدِّيَ بِنَفْسِهٖ لِأَنَّ الْاِكْرَاهَ لَا يُنَافِي الْاِخْتِيَارَ ـوَفِي "التَّجْنِيْسِ": اَلْمُفْتٰى بِهٖ سُقُوْطُهَا فِي الْأَمْوَالِ الظَّاهِرَةِ لَا الْبَاطِنَةِ۔

ترجمہ:''اگر باغی اور ظالم حکمران لوگوں سے (زبردستی) ظاہری اموال کی زکوٰۃ لے لیں، جیسے اونٹوں (جانوروں کی زکوٰۃ)، عشر اور خراج وغیرہ، تو مالک کے ذمے دوبارہ ادائیگی لازم نہیں، بشرطیکہ اُنہوں نے اُسے صحیح مَصرف پر صرف کیا ہو، جس کا بیان ''بابُ المصرف'' میں

آ ئے گا۔اور اگر مَصرف میں خرچ نہیں کیا تو دیا مّتا مال کے مالک پر لازم ہے کہ زکوٰۃ دوبارہ ادا کرے سوائے خراج کے کہ اُس کا اعادہ لازم نہیں کیونکہ خراج مقاتلین کا حق ہے کہ وہ خراج کے مستحق ہیں اور اہلِ بغی اہلِ حرب سے مقاتلہ کرتے ہیں۔

اموالِ باطنہ (نقود اور زیورات وغیرہ) میں اختلاف ہے "ولوالجیہ" اور "شرح الوہبانیہ" میں ہے: مفتیٰ بہ قول یہی ہے کہ اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، یعنی پھر سے ادا کرنا ہوگی۔ اور "مبسوط" میں ہے: صحیح ترین قول یہ ہے کہ ادا ہو جائے گی یعنی مالک پر دوبارہ ادائیگی لازم نہیں جبکہ اموالِ باطنہ (پوشیدہ مال) کی زکوٰۃ باغیوں اور ظالموں نے لے لی ہو بشرطیکہ مال کا مالک ظالموں کو دیتے وقت اُن پر صدقہ کی نیت کرلے کہ ان پر لوگوں کے واجب الادا حقوق کے سبب وہ فقیر ہیں، اور اسی لئے امیر بلخ کو علماء نے فتویٰ دیا کہ وہ اپنی قسم توڑنے پر روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرے (یعنی اس کے پاس جو مال ہے، وہ ظلماً لوگوں سے لیا گیا ہے، لہٰذا اس مال پر اس کی مِلک صحیح نہیں ہے کہ اُس نے قسم کا جو مالی کفارہ ادا کیا ہے اُسے صحیح تسلیم کیا جائے)۔اور اگر کوئی زکوٰۃ دینے سے انکار کرتا ہے اور حاکم کے مُحصِّل (Recovery Inspector) نے اُس سے زبردستی زکوٰۃ لے لی، تو اُس کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کیونکہ اُس نے یہ بلا اختیار دیا۔اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں نیت اور اختیار ضروری ہے۔لیکن ایسے شخص کو قید کر کے مجبور کیا جائے گا تاکہ وہ خود زکوٰۃ ادا کرے کہ مجبور کرنا اختیار کے منافی نہیں ہے۔"تجنیس" میں ہے کہ: جابر حاکم کو دینے کی صورت میں مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ اموالِ ظاہری میں زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے نہ کہ باطنی میں، (یعنی ان اموال کی زکوٰۃ دوبارہ دینی ہوگی، آج سونے، چاندی کے زیورات، نقد رقوم، بینک ڈپازٹس اور مختلف نوعیت کے سیونگ سرٹیفکیٹ، شیئرز اور مالِ تجارت اموالِ باطنہ میں شمار ہوتے ہیں)"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3 ص: 199 تا 201، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

زکوٰۃ کے مصارف اوراُن میں خرد بُرد

عرض یہ ہے کہ راقم کا تعلق قوم آرائیں دہلی سے ہے، جسے آج ماڈرن دور میں رائی +راعیان کہلوایا جارہاہے۔برادری کا فرد ہونے کے ناطے انجمن دہلی راعیان کے عہدیداروں کی غیراسلامی ،غیراخلاقی حرکات وسکنات پر تنقید برائے تعمیر کو سامنے رکھتے ہوئے نشاندہی کرتا رہتا ہوں ،مگر عہدیداروں کی ہٹ دھرمی نے پوری قوم کو تباہی کے دہانے پہنچادیا ہے۔میرے چند سوالات ہیں:

سوال:64

1۔آرائیں برادری کے مُخیّر حضرات ہرسال رمضان المبارک میں لاکھوں روپے(زکوٰۃ وصدقات) نادار گھرانوں کی کفالت کے لئے انجمن دہلی راعیان کے عہدیداروں کو امین بناتے ہیں ،پھر چرمِ قربانی کی مَد میں لاکھوں روپے کی رقم جمع ہوتی ہے۔عہدیداران رمضان المبارک تاعیدِ قرباں منظرِ عام پررہ کر غائب ہوجاتے ہیں۔جمع شدہ زکوٰۃ کی رقم سال بھر خرچ نہیں کرتے ،ضرورت مند افراد ایک ایک پیسے کو ترستے ہیں،چرمِ قربانی کی آمدنی پانچ سالوں سے بینک میں سیونگ اکاؤنٹ میں جمع ہے، جسے ضرورت کے باوجود خرچ نہیں کیا جارہا۔قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

سوال:65

2۔آرائیں میڈیکل سینٹر جو 24 گھنٹے دکھی انسانیت کی خدمت انجام دے رہا ہے، کے فنڈ منجمد کردیئے گئے ہیں۔ایک مرحومہ کے لواحقین نے میڈیکل سینٹر کی توسیع کے لئے لاکھوں روپے عطیہ کیے۔اُس کے اثاثے میڈیکل سینٹر کے کام تو نہ آئے ،عہدیدار اس سے اپنی ضرورتیں پوری کررہے ہیں۔مفتی صاحب !ایسے لوگوں کے لئے قرآن کیا کہہ رہا ہے؟،(داروغہ اقبال احمد،سیکٹر 5-E نیو کراچی)۔

جواب:

کمیونیٹیز یا انجمنوں کے ذمہ داران زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اہلِ ثروت حضرات کے صرف وکیل ہوتے ہیں، اگر وہ اس ذمہ داری کو شرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔ زکوٰۃ جب تک مستحق تک نہیں پہنچے گی، محض کمیونیٹیز یا برادریوں کے فنڈ / اکاؤنٹ میں جمع ہونے سے ادا نہیں ہوگی، نیز فطرہ وزکوٰۃ کی رقوم جب تک الگ مَد میں رکھ کر تملیک (کسی کو مال کا مالک بنانا) کے شرعی اصول کے مطابق مستحق افراد کو ادا نہیں کی جائے، ادا نہیں ہوگی۔ مذکورہ صورت میں ذمہ داران صرف امین ہیں اور اُس رقم کو صحیح طور پر خرچ نہ کرنا یا غبن کرنا، خیانت کے زمرے میں آئے گا، امانت میں خیانت سے متعلق قرآنِ مجید میں آیاتِ کریمہ اور احادیثِ مبارکہ بکثرت موجود ہیں اور اُخروی عذاب کی وعیدیں بھی ہیں۔ مذکورہ ذمہ داران پر اس رقم کا تاوان دینا لازم ہے اور زکوٰۃ دینے والوں پر اپنی زکوٰۃ کی دوبارہ ادائیگی لازم ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ایک حدیث کا حوالہ درج فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

مَا خَالَطَتِ الصَّدَقَةُ اَوْ مَالُ الزَّكوٰةِ مَالاً اِلَّا اَفْسَدَتْهُ رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَ الْبَيْهَقِيُّ عَنْ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ الصِّدِّيْقَةِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کا مال جس مال میں ملا ہوگا، اُسے تباہ و برباد کردے گا، اس حدیث کو بزار اور بیہقی نے ام المومنین الصدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 172، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اسی حدیث کی شرح میں علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''بعض ائمہ نے اس حدیث کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ زکوٰۃ واجب ہوئی اور ادا نہ کی اور اپنے مال میں ملائے رہا تو یہ حرام اُس حلال کو ہلاک کردے گا اور امام احمد نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ مال دار شخص مالِ زکوٰۃ لے تو یہ

مالِ زکوٰۃ اس کے مال کو ہلاک کردے گا کہ زکوٰۃ فقیروں کے لئے ہے اور دونوں معنی صحیح ہیں، (بہارِ شریعت، جلد اوّل، ص: 357)"۔

ہلاکت کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ وہ مال ہلاک ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ زکوٰۃ کے اختلاط سے اس مال میں برکت نہیں رہے گی۔

ایسے اراکین جو زکوٰۃ وفطرہ کی رقم مستحقین تک نہیں پہنچاتے اُس میں غبن کرتے ہیں، برادری/انجمن کے ذمہ داران کو چاہئے کہ اُنہیں فوری طور پر معزول کردیں، اسی طرح مرحومہ کے لواحقین نے جو رقم میڈیکل سینٹر کے لئے دی، وہ محض اُسی کام کے لئے وقف تھی، اُسے کسی دوسرے مصرف یا ذاتی مصارف میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

زکوٰۃ اور کمیونٹی فنڈز

سوال: 66

انجمن ارائیاں، آرائیں برادری کی نمائندہ سماجی وفلاحی رجسٹرڈ تنظیم ہے، آرائیں برادری کی فلاح و بہبود اور تعمیر وترقی کے علاوہ غریب ونادار، یتیم ومسکین طلبا وطالبات، بیواؤں، جہیز کی حق دار بچیوں اور دیگر ضرورت مند افراد کی زکوٰۃ فنڈ سے مدد کرتی ہے، جس کے لئے صاحب حیثیت افراد سے زکوٰۃ کی رقم جمع کی جاتی ہے۔ انجمن آرائیں کے تحت شہرِ کراچی واندرونِ سندھ فری ڈسپنسری، سلائی سینٹر، ناظرہ قرآن کی تعلیم کے سینٹر، ٹیوشن سینٹر وغیرہ بھی چلائے جاتے ہیں۔ کیا ہم زکوٰۃ فنڈ سے ملازمین کی تنخواہیں، دفتری اخراجات اور دیگر ضروریات کی مَد میں استعمال کرسکتے ہیں؟۔

(۲) انجمن ارائیاں کے حلقہ جات میں سماجی اداروں کے لئے عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں، جن میں ڈسپنسری، سلائی سینٹرز وغیرہ۔ کیا ہم زکوٰۃ فنڈ سے ان اداروں کی تعمیر کرسکتے ہیں؟۔

حاجی مشتاق احمد آرائیں
نائب صدر زکوٰۃ ووظائف کمیٹی

جواب:

بعض کمیونیٹیز ، برادریوں ،مخصوص خاندانی یا علاقائی وحدت کے لوگوں نے اپنی کمیونیٹی یا برادری کے افراد کے لئے فنڈ قائم کر رکھے ہیں ،جس میں زکوٰۃ وفطرہ کی رقوم وصول کی جاتی ہیں ۔عمومی طور پر ان رقوم کے خرچ کرتے وقت شرعی معیار کوملحوظ نہیں رکھا جاتا ۔اول تو زکوٰۃ کی رقم محض برادری کے فنڈ میں جمع ہونے سے زکوٰۃ ادانہیں ہوگی تاوقتیکہ مستحقِ زکوٰۃ تک نہ پہنچادی جائے ۔دوسرا یہ کہ زکوٰۃ اورفطرہ کی رقم جب تک الگ مَد میں رکھ کر تملیک کے شرعی اصول کے مطابق مستحق افراد کونہیں دی جائے گی ،ادانہیں ہوگی ۔انجمنوں (Associations) کے ذمہ داران زکوٰۃ کا مال صَرف کرنے کے لئے اہلِ ثروت کے وکیل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس ذمہ داری کوشرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے،تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔

رفاہی ادارے جو مریضوں کے علاج کے لئے زکوٰۃ کی رقم جمع کرتے ہیں،وہ اگر حدودِ شرع میں رہ کر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہتے ہیں،تو اس کی چند صورتیں یہ ہیں:(۱) جو دوا نادار مستحق زکوٰۃ کی مِلک میں دے دی جائے گی ،وہ جائز ہے (۲) ڈاکٹر کی فیس، بیڈ کے کرائے، ایکسرے ،میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ پر جو خرچ آئے ،وہ مریض خود ادا کرے اور استحقاق کے تعین کے بعد شعبۂ زکوٰۃ سے مریض کو ان مصارف کے عوض کل یا گنجائش کے تناسب سے جتنی رقم دی جاسکتی ہے،دے دی جائے (۳) زکوٰۃ وفطرہ یعنی صدقاتِ واجبہ کی رقم صرف مستحق مریضوں کودی جائے ،غیر مسلم نادار مریضوں کے لئے الگ سے ''ویلفیئر فنڈ'' قائم کیا جائے جو عطیات پر مشتمل ہو ،یہ نفلی خیرات ،صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ کے زمرے میں آئے گا،جسے (Voluntary Charity) کہتے ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ نفلی صدقہ وخیرات اور عطیات پر مشتمل ایک رفاہی فنڈ (Welfare Fund) قائم کریں،جس سے ضرورت مندوں کوعلاج معالجے کی سہولتیں دیں اور اُسی

رقم سے ڈسپنسری کے اخراجات اور انجمن کے کارکنان کی تنخواہیں ادا کریں۔

زکوٰۃ کی رقم تعمیرات کی مد میں استعمال نہیں کی جاسکتی، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَلَا يَجُوزُ أَنْ يُبْنَى بِالزَّكَاةِ الْمَسْجِدُ وَكَذَا الْقَنَاطِرُ وَالسِّقَايَاتُ وَإِصْلَاحُ الطُّرُقَاتِ وَكَرْيُ الْأَنْهَارِ وَالْحَجُّ وَالْجِهَادُ وَكُلُّ مَا لَا تَمْلِيكَ فِيهِ.

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ کی رقم سے مسجد کی تعمیر جائز نہیں اور اسی طرح پلوں کی تعمیر، کنوؤں کی کھدائی، راستوں کی درستگی، نہروں کی کھدائی اور حج اور جہاد کے لئے (زکوٰۃ کی رقم کا براہِ راست استعمال) جائز نہیں ہے، (اسی طرح) ہراُس کام کے لئے جس میں تملیک نہیں پائی جاتی (زکوٰۃ کی رقم کا استعمال) جائز نہیں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 188، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

سوال میں مذکور اداروں کی تعمیری مصارف میں بھی زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی کہ وہاں بھی تملیک موجود نہیں ہے۔ سلائی سنٹر، ناظرہ قرآن کی تعلیم کے مدرسے، ٹیوشن سنٹر سے جو زکوٰۃ کے مستحق لوگ استفادہ کرتے ہیں، ان کی زکوٰۃ سے مدد کی جائے اور وہ اپنی فیس ادا کریں تو یہ طریقہ کار شریعت کے مطابق ہوگا۔

زکوٰۃ فنڈ سے پگڑی پر مکان لینے کے لئے مدد کرنا

سوال: 67

ہماری جماعت ایک فلاحی ادارہ ہے، جس کے تحت ہمارے غریب اور مستحق اراکین کی فلاح و بہبود کا کام کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہمارے مُخیر حضرات غریب اور مستحق اراکین کی رہائش کے لئے زکوٰۃ کی مد میں عطیہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں چونکہ رہائشی فلیٹ تقریباً پگڑی پر ملتے ہیں، غریب مستحق افراد خود ہی ایسے مکان ڈھونڈ لیتے ہیں اور جماعت میں درخواست دے دیتے ہیں۔ ہمارے مُخیر حضرات یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ ایسے غریب اور ضرورت مند اراکین کے لئے ہماری جماعت کو زکوٰۃ فنڈ دے کر

پگڑی کا مکان رہائش کے لئے دلوانے میں مدد کر سکتے ہیں اور اس طرح ان کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟۔

آنریری جنرل سیکریٹری، محمد صدیق صولی، پور بندر میمن جماعت، کراچی

جواب:

ہمارے بعض علماءِ کرام پگڑی پر جائیداد کے لین دین کے قائل ہیں اور بعض اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ جو جواز کے قائل ہیں ان کے نزدیک حقوق کی بیع جائز ہے، کیونکہ اس پر عرف جاری ہے۔لہٰذا ان کے نزدیک پگڑی پر دکان یا مکان کی خرید وفروخت جائز ہے۔تو ان کے نزدیک زکوٰۃ فنڈ سے کسی مستحق کو پگڑی پر مکان لے کر دینا بھی جائز ہے۔پس جو لوگ احتیاط پر عمل کرنا چاہیں وہ اس سے احتراز کریں اور جو اس سے استفادہ کرنا چاہیں، وہ ان علماء پر اعتماد کر کے ایسا کر سکتے ہیں۔ ہمارے معاصر علماء میں سے مفتی محمد رفیق حسنی، مفتی محمد ابراہیم قادری، مفتی وسیم اختر المدنی، مفتی محمد اسماعیل نورانی زید مجدہم پگڑی پر جائیداد کے لین دین کو جائز کہتے ہیں۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک (مالک بنانا) شرط ہے یعنی جسے زکوٰۃ دی جارہی ہے، اُسے اُس مال پر تصرُّف کا مکمل اختیار حاصل ہونا چاہیے جبکہ پگڑی سسٹم میں مکان یا فلیٹ کی ملکیت نہ پائے جانے کے سبب مالکانہ تصرُّف کا اختیار باطل ہو جاتا ہے۔علامہ علاؤالدین حصکفی زکوٰۃ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:(هِيَ) لُغَةً :اَلطَّهَارَةُ وَالنَّمَاءُ، وَشَرْعاً: (تَمْلِيْكٌ) خَرَجَ الْإِبَاحَةُ ،فَلَوْأَطْعَمَ يَتِيْمًا نَاوِيًا الزَّكَاةَ لَايُجْزِيْهِ اِلَّا اِذَا دَفَعَ اِلَيْهِ الْمَطْعُوْمَ، كَمَالَوْ كَسَاهُ بِشَرْطِ اَنْ يَّعْقِلَ الْقَبْضَ اِلَّا اِذَا حَكَمَ عَلَيْهِ بِنَفْقَتِهِمْ۔

ترجمہ:''زکوٰۃ لغت میں پاک ہونے اور بڑھنے کو کہتے ہیں اور شرعاً فقیر کو (شارع کے معیّن کردہ) حصے کا مالک کرنا ہے،تملیک کی قید سے محض مباح کرنا (یعنی اُس چیز کو استعمال کرنے کی عمومی اجازت دینا) خارج ہوگیا،پس اگر کسی نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کوئی

شخص کھانا کھلادے تو تملیک نہ ہونے کے سبب، ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی نہیں ہوگا، مگر جب کھانے کی چیز یتیم کے حوالے کردے، تو کافی ہوگا جیسے ادائے زکوٰۃ کے لئے یتیم کو کپڑا پہنائے بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہو، لیکن اگر حاکم نے اس شخص پر یتیم کو نان نفقہ دینے کا حکم صادر کردیا ہے، تو اب یتیم پر خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی (بلکہ وہ یتیم کی کفالت کر کے اپنا فرض ادا کرے گا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:3، ص:161)"۔

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَیُشْتَرَطُ اَنْ یَکُوْنَ الصَّرْفُ (تَمْلِیْکاً) لَا اِبَاحَۃً کَمَا مَرَّ۔

ترجمہ: "اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو زکوٰۃ کے مال پر مالکانہ تصرف کا اختیار دیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت ہو، جیسا کہ گزرا، (حوالۂ مذکورہ، ص:263)"۔

اگر آپ کی برادری یا کمیونٹی کے اُمراء زکوٰۃ کے مستحق بے گھر لوگوں کو سر چھپانے کے لئے پگڑی پر فلیٹ یا مکان دلوانا چاہتے ہیں تو وہ اُن علماء کے فتوے پر عمل کرسکتے ہیں، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ کی برادری کی انجمن کم قیمت کے مکانات یا فلیٹ مالکانہ بنیادوں پر اپنی برادری کے مستحقین زکوٰۃ کو دلادیں۔

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

سوال:68

سرکاری یا نجی اداروں میں جن ملازمین کو اُن کی ریٹائرمنٹ کے بعد پراویڈنٹ فنڈ دیا جاتا ہے، یہ رقم حکومت کے فنڈ میں جمع رہتی ہے دورانِ ملازمت ملازم اُس رقم سے قرض بھی لے سکتا ہے، کیا اس فنڈ پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟۔

(امیر ممتاز میوہ شاہی، کراچی واٹر سیوریج بورڈ)

جواب:

سرکاری محکموں اور پرائیویٹ کمپنیوں میں ملازمین کی تنخواہوں سے ہر ماہ کچھ رقم بطور فنڈ کاٹ لی جاتی ہے اور مدت ملازمت کی تکمیل یا ریٹائرمنٹ سے پہلے ملازمت

چھوڑنے پر طے شدہ قواعد کے مطابق محکمے یا کمپنی کی طرف سے کچھ رقم مزید ملا کر ملازم کو دی جاتی ہے۔دوران ملازمت بھی اگر اس ملازم کو اُس فنڈ سے کچھ رقم نکالنی ہوتو قرض کے طور پر لیتا ہے، جو اسے قسطوں میں واپس کرنی ہوتی ہے۔یہ رقم چونکہ ملازم کی مِلک میں نہیں آتی بلکہ اُس محکمے یا ادارے کے پاس ہی جمع رہتی ہے اور ملازم اس میں اپنی مرضی سے تصرُّف بھی نہیں کرسکتا، جب تک جی۔پی فنڈ کی رقم ملازم کے اکاؤنٹ میں نہیں آجاتی یا اسے وصول نہیں ہوجاتی اور اس پر اسے ملکیت و قبضہ حاصل نہیں ہو جاتا، وہ اس کا مال اور نصاب ہی نہیں کیونکہ محکمہ یا کمپنی اس فنڈ پر ملازم کا صرف حق تسلیم کرتی ہے اور اسے اپنے اوپر واجب الادا سمجھتی ہے۔اسے واجب الادا قرار دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ملازم کو اس فنڈ کا تب ہی مالک بنایا جائے گا اور اس کے قبضے میں دیا جائے گا جب وہ ریٹائرمنٹ کی شرائط پوری کرلے گا۔اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک اس رقم پر مکمل قبضہ اور تصرُّف حاصل نہ ہو، اس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی اور قبضہ حاصل ہونے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ اُس پر واجب نہیں ہوگی بلکہ اس سال اور آنے والے سالوں میں جتنی رقم اسکے پاس مجموعی طور پر جمع ہے، اُس پر اسے زکوٰۃ دینی ہوگی۔جی۔پی فنڈ کی وصولی کے وقت اگر ملازم کے پاس پہلے سے نصاب کے مطابق نقد رقم موجود ہوتو جی۔پی فنڈ سے ملنے والی رقم کو بھی اس کے ساتھ شامل کرلیا جائے گا اور جب پہلے سے موجود رقم کا سال مکمل ہوگا تو اس کا بھی سال مکمل سمجھا جائے گا اور رقم کے اس مجموعے سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔اگر فنڈ کی وصولی سے پہلے ملازم صاحب نصاب نہ ہوتو اس فنڈ پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بیوی کا مہر زکوٰۃ واجب ہونے سے مانع نہیں

سوال:69

کسی شخص پر اگر بیوی کا مہر واجب ہو، تو اُسے قرض شمار کرتے ہوئے کیا اُس شخص پر زکوہ واجب ہوگی؟، (امتیاز اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب :

آج کل بالعموم عورتوں کا مہر مؤجل ہی ہوتا ہے، جس کا مطالبہ دونوں میں سے کسی ایک کی موت یا طلاق کے بعد ہی ہوتا ہے ۔تاہم یہ ایسا قرض نہیں ہے، جس کی ادائیگی وجوبِ زکوٰۃ میں مانع ہو۔علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قَالَ مَشَایِخُنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ فِیْ رَجُلٍ عَلَیْهِ مَهْرٌ مُّؤَجَّلٌ لِأمْرَأتِهٖ وَهُوَ لَایُرِیْدُ أَدَائَهٗ لَایُجْعَلُ مَانِعًا مِّنَ الزَّکٰوۃ لِعَدَمِ الْمُطَالَبَةِ فِی الْعَادَةِ۔

ترجمہ:''ہمارے مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے مرد کے بارے میں فرماتے ہیں، جس کے ذمے مہرِ مؤجل ہے اور وہ اس کی ادائیگی کا ارادہ نہیں رکھتا، تو یہ قرض وجوبِ زکوٰۃ کیلئے رکاوٹ نہیں ہوگا، (کیونکہ اس کی فوری ادائیگی لازم نہیں ہے) اور عورت عادتاً مہر کا مطالبہ بھی نہیں کرتی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:173،مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

پینشن بینیفٹ اکاؤنٹ کی رقم پر زکوٰۃ

سوال:70

میں ایک 84 سالہ پنشنر ہوں۔ریٹائرمنٹ پر مجھے جو رقم ملی تھی، اسے میں نے پینشن بینیفٹ اکاؤنٹ میں جمع کردیا تھا جس پر مجھے ماہانہ کچھ رقم ملتی ہے، پینشن اور اس رقم سے میری گزراوقات ہوتی ہے۔کیا پی بی اے اکاؤنٹ میں جمع شدہ اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے؟، (اے اے شاہ، ڈی ایچ اے، کراچی)۔

جواب:

اگر اس رقم کی اصل مالیت 612.36 گرام چاندی یا 87.48 گرام سونے کی موجودہ بازاری قیمت کے برابر ہے اور وہ سال بھر آپ کے نام جمع رہی ہے تو سال کے اختتام پر ڈھائی فیصد کی شرح سے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

زکوٰۃ کے مسائل

سوال: 71

میرے بڑے بھائی بے روزگار ہیں۔ان کے پاس جائیداد، بینک بیلنس یا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے۔ایک بیوی اور ایک تین سالہ بیٹی ان کے زیرِ کفالت ہے۔ان کی بیوی کے پاس کچھ زیورات ہیں جو نصابِ زکوٰۃ کو پہنچتے ہیں، لیکن وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ میرا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے اور نہ ہی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے میرے پاس رقم ہے۔ویسے بھی زکوٰۃ میرے شوہر کو دینی چاہئے ، اگر وہ نہیں دیتے ،تو گناہگار بھی وہی ہوں گے۔زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا گناہ بھائی کو ہوگا یا بھابھی کو؟۔واضح رہے کہ یہ زیورات بھابھی کی ملکیت ہیں۔کیا میں اپنے بھائی کو زکوٰۃ کی رقم دے سکتا ہوں اور میں اپنی زکوٰۃ کی رقم سے ان کا قرض ادا کرسکتا ہوں؟ ،میری کپڑے کی دکان ہے۔مجھ سے بعض غریب اور یتیم امداد میں کپڑے مانگتے ہیں، کیا میں اپنی زکوٰۃ کی رقم سے انہیں کپڑے دے سکتا ہوں؟ ،کیا صدقے کی رقم سے پانی کا نل لگا کر وقف کیا جاسکتا ہے؟۔

(مشتاق احمد، انارکلی بازار، چکوال)

جواب:

سونے کے زیورات چونکہ آپ کی بھابھی کی ملکیت ہیں، اگر ان کا وزن 87.48 گرام یا اس سے زیادہ ہے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس مال میں سے زکوٰۃ دی جائے۔اگر کوئی نقد رقم نہیں ہے تو سونے کے مجموعی وزن کا چالیسواں حصہ اس میں سے نکال کردینا واجب ہے اور سونے کو جمع رکھنا مقاصدِ شریعت میں سے نہیں ہے۔زکوٰۃ نہ دینے پر آخرت میں جواب دہی آپ کی بھابھی پر ہوگی، بھائی پر نہیں ۔ہاں، اگر آپ کے بھائی مال دار ہوتے اور وہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے اپنی بیوی کی مالی اعانت کرتے تو یہ ان کی طرف سے حسنِ سلوک ہوتا۔

(2) اگر آپ کے بھائی کے پاس ساڑھے باون تولے یا612.36 گرام چاندی کی موجودہ قیمت کے برابر فاضل رقم یا ان کی حاجت سے زائد اتنی مالیت کا سامان جمع نہیں ہے تو وہ مستحقِ زکوٰۃ ہیں۔ آپ انہیں زکوٰۃ دے سکتے ہیں، بلکہ اس میں زیادہ اجر ہوگا: ایک فرض ادا کرنے کا اور دوسرا صلۂ رحمی کا۔ جب آپ اپنے بھائی کو زکوٰۃ دے دیں گے تو پھر وہ اسے اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی کفالت پر خرچ کر سکتے ہیں۔

(3) حدیثِ پاک کی رُو سے پانی کا کنواں کھدوانا یا پمپ لگوانا بہترین صدقۂ جاریہ ہے۔ آپ کے لئے سعادت کی بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ اپنے طیب مال میں سے اس صدقۂ جاریہ کا اہتمام کریں، لیکن اگر آپ ایسا کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہیں تو کسی مستحقِ زکوٰۃ کو اچھی خاصی رقم دے دیں اور اسے ترغیب دیں کہ اپنی ضروریات بھی پوری کرے اور کنویں کے مصارف بھی ادا کر دے، لیکن آپ ان پر یہ لازم نہیں کر سکتے۔

روزے کے مسائل

بچوں کو روزہ رکھوانے کا حکم

سوال: 72

بچوں کو کس عمر میں روزہ رکھوانا چاہئے؟۔(محمد امیر ممتازی،F.B ایریا، کراچی)

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر علاماتِ بلوغ ظاہر ہوجائیں تو اس پر بلوغت کا حکم لگایا جائے گا اور اُس پر احکامِ شرعیہ فرض ہوجائیں گے، اگر علامات ظاہر نہ ہوں تو پندرہ سال پورے ہونے پر بالغ تصور کیا جائے گا۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَیُؤْمَرُالصَّبِیُّ بِالصَّوْمِ اِذَا اَطَاقَہٗ وَیُضْرَبُ عَلَیْہِ ابْنُ عَشْرٍ ،کَالصَّلَاۃِ فِی الْاَصَحِّ۔

ترجمہ:''اور جب بچہ روزہ رکھنے کے قابل ہوجائے تو اُسے روزہ رکھنے کا کہا جائے گا اور جب دس سال کا ہوجائے تو صحیح ترین قول کے مطابق اسے سرزنش کرکے روزہ رکھوایا جائے جیسا کہ نماز کے بارے میں حکم ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:وَقَدَّرَ بِسَبْعٍ ،وَالْمُشَاھِدُ فِیْ صِبْیَانِ زَمَانِنَا عَدَمُ اِطَاقَتِھِمُ الصَّوْمَ فِیْ ھٰذَا السِّنِّ ہ ا قُلْتُ یَخْتَلِفُ ذَالِکَ بِاخْتِلَافِ الْجِسْمِ وَاخْتِلَافِ الْوَقْتِ صَیْفًا وَّشِتَاءً،وَالظَّاھِرُ اَنَّہٗ یُؤْمَرُ بِقَدْرِ الْاِطَاقَۃِ اِذَالَمْ یُطِقْ جَمِیْعَ الشَّھْرِ ۔

ترجمہ:''بعض فقہاء نے بچے کے روزہ رکھنے کے قابل ہونے کی عمر سات سال بتائی ہے، (وہ لکھتے ہیں) ہمارے زمانے کا مشاہدہ یہ ہے کہ اتنی عمر میں بچہ روزہ رکھنے کے قابل نہیں ہوتا اور اس کا مدار ہر ایک کی جسمانی صلاحیت،صحت اور موسم (گرما یا سرما) پر ہے اور ظاہر یہ ہے کہ جتنے دن آسانی سے وہ روزہ رکھ سکے،اسے کہا جائے ،پورے مہینے کے روزے رکھوانا ضروری نہیں ہے،(مزید لکھتے ہیں) اگر نابالغ بچہ روزہ رکھنے کے بعد بغیر عذر کے توڑ دے تو اس پر قضا نہیں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار،جلد 3،ص:344،داراحیاء التراث العربی،بیروت)

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ جن بچوں کی عمر بلوغت سے کم ہو، اُن پر روزہ رکھنا واجب نہیں ہے، متقدمین کی ایک جماعت نے مستحب قرار دیا ہے۔ ابن سیرین اور زہری کا بھی یہی قول ہے اور یہی امام شافعی کا قول ہے، اُنہوں نے کہا کہ جب بچے روزے رکھ سکیں تو ان کو مشق کرانے کے لئے ان سے روزے رکھوانے چاہئیں۔ امام شافعی کے اصحاب کے نزدیک اس کی حد نماز کی طرح سات سال اور دس سال ہے اور اسحاق کے نزدیک اس کی حد بارہ سال ہے اور امام احمد کے نزدیک ایک روایت میں اس کی حد دس سال ہے اور امام مالک کا مشہور قول یہ ہے کہ بچوں کے حق میں روزہ مشروع نہیں ہے۔ علامہ ابن بطال نے کہا ہے کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ عبادات اور فرائض صرف بلوغ کے وقت لازم ہوتے ہیں مگر اکثر علماء نے برکت کے لئے بچوں کو عبادات کی مشق کرانا مستحسن قرار دیا ہے تاکہ بچے عبادات کے عادی ہو جائیں اور جب ان پر عبادت لازم ہو، تو ان کے لئے عبادت کرنا آسان ہو اور جو اُن کو عبادت کی مشق کرائے گا، اس کو اجر ملے گا، (نعمۃ الباری، جلد: 04، ص: 437)''۔

مسجد میں افطار کرنے کا حکم

سوال: 73

ماہِ رمضان المبارک میں مسجد میں افطار کا اہتمام کیا جاتا ہے، کیا یہ درست ہے؟، (محمد حسان بن امیر، گوہر آباد، کراچی)

جواب:

بہتر تو یہ ہے کہ مسجد کے متصل کوئی جگہ بنالی جائے جہاں افطار کریں، مسجد میں معمول بنا کر کھانا درست نہیں ہے۔ مسجد میں کھانے کی صورت میں دو باتوں کی احتیاط رکھی جائے: (۱) مسجد میں کھانے کے ذرات نہ گریں اور مسجد ملوّث نہ ہو۔ (۲) مسجد میں داخل ہوتے وقت نفلی اعتکاف کی نیت کرلیں۔

قے سے روزہ ٹوٹنے کا حکم

سوال: 74

قے ہو جانے کی صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟۔

(محمد منور احمد، ملیر کراچی)

جواب:

خود بخود بلا اختیار قے ہو جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، چاہے منہ بھر ہو یا کم ہو۔
قصداً (جان بوجھ کر) قے کرنے سے (اگر منہ بھر ہو تو) بالاتفاق روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔
علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَاِنْ ذَرَعَهُ الْقَیُٔ وَخَرَجَ) وَلَمْ یَعُدْ (لَا یُفطِرُ مُطْلَقًا) مِلَاءً اَوْلَا۔
ترجمہ: ''اگر بلا اختیار قے ہوگئی اور حلق میں نہ لوٹی تو مطلقاً روزہ نہیں ٹوٹے گا خواہ منہ بھر ہو یا منہ بھر نہ ہو''۔
مزید لکھتے ہیں: (وَاِنْ اِسْتَقَاءَ) اَیْ طَلَبَ الْقَیْءَ (عَامِدًا) اَیْ مُتَذَکِّرًا لِصَوْمِه (اِنْ کَانَ مِلْءَ الْفَمِ فَسَدَ بِالْاِجْمَاعِ) مُطْلَقاً (وَاِنْ أَقَلَّ لَا) عِنْدَالثَّانِیْ وَهُوَالصَّحِیْحُ
ترجمہ: ''اور اگر قصداً (جان بوجھ کر) قے کی یعنی اسے اپنا روزہ دار ہونا یاد تھا، تو اگر منہ بھر ہے تو اس پر اجماع ہے کہ روزہ ٹوٹ گیا اور اگر منہ بھر سے کم ہے تو امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹتا یہی صحیح ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 3، ص: 349 تا 352، بیروت)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَهٰذَا کُلُّهُ اِذَا کَانَ الْقَیُٔ طَعَاماً أَوْ مَاءً أَوْ مِرَّةً فَاِنْ کَانَ بَلْغَمًا فَغَیْرُ مُفْسِدٍ لِلصَّوْمِ۔
ترجمہ: ''قے کے یہ احکام اس وقت ہیں جب قے میں کھانا یا صفراء یا خون آئے، اگر بلغم آیا تو روزہ نہیں ٹوٹتا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 204)''۔

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: مَنْ ذَرَعَهُ الْقَیُٔ فَلَیْسَ عَلَیْهِ قَضَاءٌ وَمَنِ اسْتَقَاءَ

عَمْدًا فَلْيَقْضِ ۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: جس نے بے اختیار قے کی، اُس پر قضا نہیں اور جس نے قصداً قے کی، اُس پر روزے کی قضا ہے، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 720)''۔

روزے کی حالت میں بچے کو دودھ پلانے کا حکم

سوال: 75

کیا بچے کو دودھ پلانے والی عورت روزے کے دوران بچے کو دودھ پلا سکتی ہے، روزہ ٹوٹ تو نہیں جائے گا؟، (طاہرہ، بوٹ بیسن، کراچی)۔

جواب:

بچے کو دودھ پلانے والی عورت اگر بہت کمزور ہے اور روزہ رکھنے کی صورت میں اس کی صحت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے یا بچے کے لئے اُس کا دودھ نہ ہونے یا انتہائی کم ہونے کی صورت میں بچے کی صحت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، تو اسے عذر کی بنا پر رمضان کا روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے، جس کی بعد میں قضا لازم ہے۔ تاہم اگر بچے کو دودھ پلانے والی عورت رمضان المبارک کا روزہ بھی رکھتی ہے اور بچے کو دودھ بھی پلاتی ہے تو اس کے روزے پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ احادیث وآثار میں فقہی اصول یہ بیان کیا گیا ہے:

''اَلفِطْرُ مِمَّا دَخَلَ وَلَيْسَ مِمَّا خَرَجَ''۔

ترجمہ:''روزے دار کے معدے میں کسی چیز کے داخل ہونے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، خارج ہونے سے نہیں ٹوٹتا''۔ اور ماں کا دودھ اُس کے وجود سے خارج ہوتا ہے۔

امام بخاری بیان کرتے ہیں: وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَعِكْرِمَةُ : اَلصَّوْمُ مِمَّا دَخَلَ وَلَيْسَ مِمَّا خَرَجَ

ترجمہ:''حضرت ابن عباس اور عکرمہ بیان کرتے ہیں: روزہ کسی چیز کے داخل ہونے سے ٹوٹتا ہے، خارج ہونے سے نہیں ٹوٹتا''۔

(صحیح بخاری، باب الحجامة و القیئ للصائم، جز ثانی، ص: 576، مکتبہ عصریہ، بیروت)

روزے کی حالت میں احتلام ہونے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال: 76

روزے کی حالت میں دن کے کسی حصے میں یا سحری کے وقت اگر غسل فرض ہوجائے، تو کیا روزہ باقی رہے گا یانہیں؟، (منور احمد، ملیر، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید میں (ماہِ رمضان میں) طلوعِ فجر تک کھانے پینے اور عملِ ازدواج کی اجازت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَالْـئٰـنَ بَـاشِـرُوْهُـنَّ وَابْتَـغُـوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ،

ترجمہ: ''پس اب (چاہو تو) اپنی بیویوں سے مباشرت کرو، اور طلب کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھا ہو، اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ (ممتاز ہوکر) ظاہر ہوجائے تمہارے لئے صبح کا سفید دھاگہ (رات کے) سیاہ دھاگے سے (یعنی صبحِ صادق شروع ہوجائے)، (البقرہ: 187)''۔

جب طلوعِ فجر تک ازدواجی فعل میں مشغول رہنا جائز ہوا، تو حالتِ جنابت میں روزے کی نیت کرنا بھی جائز ہوگیا۔ صحیحین میں ام المؤمنین حضرت عائشہ اور ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُدْرِكُهُ الْفَجْرُ، وَهُوَ جُنُبٌ مِّـنْ أَهْلِهِ، ثُمَّ يَغْتَسِلُ وَيَصُوْمُ۔ ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ ازواجِ مطہرات سے قربت فرماتے اور (کبھی) حالتِ جنابت میں صبحِ صادق ہوجاتی، پھر آپ غسل فرماتے، اور روزہ رکھتے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1926)''۔

اِنَّ عَـائِشَةَ زَوْجَ الـنَّبِـيِّ ﷺ قَـالَـتْ قَـدْ كَـانَ رَسُـوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُدْرِكُهُ الْفَجْرُ فِي رَمَضَانَ وَهُوَ جُنُبٌ مِّنْ غَيْرِ حُلُمٍ فَيَغْتَسِلُ وَيَصُوْمُ۔

ترجمہ: ''ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ماہِ رمضان میں کبھی رسول اللہ ﷺ پر احتلام کے بغیر حالتِ جنابت میں صبح صادق آجاتی، آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھتے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2486)''۔

حالتِ جنابت میں صبح صادق ہوئی ہو یا روزے کی حالت میں دن کے کسی حصے میں احتلام کے سبب غسل فرض ہوگیا ہو، تو روزے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ بِ الْخُدرِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ثَلاثٌ لَا یُفْطِرْنَ الصَّائِمَ: اَلْحِجَامَۃُ، وَالْقَیْئُ، وَالْإِحْتِلَامُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں (روزے دار کا) روزہ نہیں توڑتیں: پچھنا (فصد) لگوانا اور قے اور احتلام''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:719)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَمَنْ أَصْبَحَ جُنُباً أَوِ احْتَلَمَ فِی النَّھَارِ لَمْ یَضُرُّہٗ کَذَافِی مُحِیْطِ السَّرَخْسِیِّ ۔

ترجمہ: ''اور جس نے حالتِ جنابت میں صبح کی یا دن میں احتلام ہوگیا، تو یہ اس کے (روزے) کے لئے نقصان دہ نہیں، ''محیط سرخسی'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:200)

تاہم بیدار ہونے کے بعد غسل کر کے پاک ہونا چاہئے اور غُسل واجب میں اتنی تاخیر مکروہ تحریمی ہے، جس سے کوئی فرض نماز قضا ہوجائے، اگر نماز قضا ہوگئی تو گناہ گار ہوگا۔ اگر سحری کے وقت بیدار ہوا اور اس پر غُسل جنابت واجب ہے اور روزہ بند ہونے یعنی صبح صادق طلوع ہونے میں وقت اتنا تنگ ہے کہ اگر غُسل کرتا ہے تو سحری کا وقت نہیں رہتا، تو ہاتھ منہ دھو کر سحری کر کے روزہ رکھ لے اور اس کے بعد غُسل واجب کر لے۔

نمازِ تراویح کے اجتماعات میں تلفظ کی ادائیگی وقراءت کا حکم

سوال: 77

ماہِ رمضان المبارک میں جگہ جگہ 5 روزہ، 10 روزہ اور 15 روزہ تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں اکثر حفاظ قرآن پاک کو غلط انداز میں پڑھتے ہیں جبکہ مقتدیوں کا بھی تصور یہ ہوتا ہے کہ چند روزہ تراویح کے بعد مزید نہیں پڑھنی، دوسری طرف ان محافلِ تراویح میں شامل اکثر لوگ پیچھے بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے ہیں اور رکوع میں جانے سے پہلے جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کیا اس طرح کی تراویح کا اہتمام کرنا مناسب ہے؟، (حاجی رضوان الٰہی، نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید مطلقاً صحیح پڑھنا فرض ہے، خواہ نماز میں ہو یا بیرونِ نماز، قرآن مجید کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا۔

ترجمہ: ''اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھو، (المزمل: 4)''۔

حروف کی ادائیگی اُن کے مخارج سے درست طور پر ہو، وہ صفات جن سے ایک مخرج کے چند حروف ایک دوسرے سے ممتاز ہوں، اُن کی رعایت کی جائے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: لَا يَنْبَغِيْ لِلْقَوْمِ اَنْ يُّقَدِّمُوْا فِي التَّرَاوِيْحِ الْخُوشْخُوانْ وَلٰكِنْ يُّقَدِّمُوا الدُّرُسْتخوانْ فَاِنَّ الْاِمَامَ اِذَاقَرَأَ بِصَوْتٍ حَسَنٍ يَشْغَلُهٗ عَنِ الْخُشُوْعِ وَالتَّدَبُّرِ وَالتَّفَكُّرِ كَذَافِيْ فَتَاوٰی قَاضِيْ خَانْ۔

ترجمہ: ''قوم کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ نمازِ تراویح میں محض خوش الحان کو اپنا امام بنائیں بلکہ درست خواں (صحیح پڑھنے والے) کو امام بنانا چاہئے۔ کیونکہ بعض اوقات لوگ خوش الحان قاری کی آواز کے سحر میں کھو کر نماز میں خشوع وخضوع اور آیاتِ الٰہی میں تدبر وتفکر سے غافل ہو جاتے ہیں، جیسا کہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے''۔

نوٹ: فتاویٰ عالمگیری کے حاشیہ میں ''بحراوی'' کے حوالے سے ''خوشخواں'' کے معنیٰ ''اچھی

آواز کے ساتھ پڑھنے والا''اور''درست خواں''کے معنیٰ''صحیح قراءت کے ساتھ پڑھنے والا''کئے ہیں۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:116،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ اس مسئلے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''افسوس صد افسوس کہ اس زمانے میں حفاظ کی حالت ناگفتہ بہ ہے، اکثر تو ایسا پڑھتے ہیں کہ''یعلمون ،تعلمون''کے سوا کچھ پتا نہیں چلتا، الفاظ وحروف کھا جایا کرتے ہیں، جو اچھا پڑھنے والے کہے جاتے ہیں، اُنہیں دیکھئے تو حروف صحیح ادا نہیں ہوتے۔ ہمزہ، الف، عین اور ذ ،ز، ظ اور ث، ش ،ص، ت، ط وغیرہا حروف میں تفرقہ نہیں کرتے ،جس سے قطعاً نماز ہی نہیں ہوتی ،(بہارِ شریعت، جلد اول، حصہ پنجم،ص:271)''۔

پانچ روزہ، دس روزہ یا پندرہ روزہ تراویح کی ادائیگی میں شرعی طور پر تو کوئی قباحت نہیں ہے، بشرطیکہ قرآن مجید صحیح پڑھا جائے ،الفاظ کی ادائیگی صحیح ہو اور سننے والے کی سمجھ میں آئے نیز تراویح شاہراہِ عام پر نہ پڑھی جائے۔اگر پانچ یا دس روزہ تراویح وختمِ قرآن سے یہ سمجھا جائے کہ بس ایک قرآن ختم ہوگیا ،اب تراویح سے بھی فارغ ،تو یہ طرزِ عمل اور سوچ بالکل غلط ہے، تراویح پورے ماہِ رمضان کی سنت ہے، ختمِ قرآن خواہ ستائیسویں شب کو ہو یا اِس سے کم دنوں میں ، بقیہ دنوں کی تراویح بھی باقاعدگی سے پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔ دورانِ نماز مقتدیوں پر خاموشی کے ساتھ تلاوت سننا فرض ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○

ترجمہ:''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے ،(الاعراف:204)''۔

سہ روزہ، پنج روزہ، شش روزہ یا دس روزہ تراویح میں شرکت کرنے والے بعض افراد کا عمل جو آپ نے نقل کیا ہے، یہ انتہائی افسوس ناک ہے، یہ ایک طرح سے نماز، قرآن اور قیام کی اہمیت کو کم کرنا ہے اور اہانت کے مترادف ہے ،ایسے لوگ اپنا طرزِ عمل درست کریں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں۔

صدقۂ فطر کس پر واجب ہے؟

سوال: 78

کیا زکوٰۃ کی طرح صدقۂ فطر بھی صاحبِ نصاب پر واجب ہے، یا ہر مسلمان پر واجب ہے؟۔موجودہ مہنگائی کے دور میں مشاہدہ ہے کہ بعض سفید پوش گھرانے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو صدقۂ فطر ادا کرنے کے لئے رقم نہیں رکھتے ،تو کیا ایسے لوگوں پر بھی صدقۂ فطر واجب ہوگا ؟،اگر واجب ہے تو کیا بعد میں رقم آنے پر ان پر اُس کی قضا لازم ہوگی؟،(وقاص رحمٰن،نکیال آزاد کشمیر)۔

جواب:

صدقۂ فطر کا نصاب بھی وہی ہے ،جو زکوٰۃ کا ہے یعنی جس شخص کے پاس 87،48 گرام سونا یا612،36 گرام چاندی یا اُس کے مساوی رقم موجود ہو،اُس پر صدقۂ فطر واجب ہے۔صدقۂ فطر کے وجوب کے لئے نصاب پر سال گزرنا یا سال بھر صاحبِ نصاب رہنا شرط نہیں کیونکہ صدقۂ فطر شخص پر واجب ہوتا ہے،مال پر نہیں ۔ہر صاحبِ نصاب پر اس کی نابالغ اولاد کا صدقۂ فطر ادا کرنا بھی واجب ہے جبکہ وہ خود مالکِ نصاب نہ ہوں ورنہ صدقۂ فطر ان ہی کے مال سے ادا کیا جائے البتہ مجنون اولاد اگرچہ بالغ ہوں ان کا صدقۂ فطر والد پر واجب ہے جبکہ وہ مالکِ نصاب نہ ہوں۔ صدقۂ فطر نمازِ عید سے قبل ادا کرنا افضل ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس عیدالفطر کے دن طلوعِ فجر کے وقت یعنی یکم شوال المکرّم کو وقتی ضرورت سے زائد کم از کم زکوٰۃ کے نصاب کے برابر رقم نہیں ہے،تو اُس پر صدقۂ فطر واجب نہیں ہوگا اور نہ ہی اُس پر بعد میں اُس کی قضا واجب ہوگی۔ ہاں! اگر عیدالفطر یعنی یکم شوال المکرّم کو صاحبِ نصاب ہوتے ہوئے فطرہ ادا نہ کیا ہوتا تو جب تک اُسے ادا نہ کیا جائے ،ساقط نہیں ہوتا۔بعد میں جب بھی ادا کرے گا ادا ہی ہوگا قضا نہ ہوگا۔

صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جا سکتا ہے؟

سوال: 79

صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔محمد رفیق شاہ، کراچی

جواب:

صدقۂ فطر ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر واجب ہے، لیکن صدقۂ فطر کے وجوب کے لئے نصاب پر سال گزرنا یا سال بھر صاحبِ نصاب رہنا شرط نہیں ہے۔نصابِ شرعی کی مقدار 612.36 گرام چاندی یا اُس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم ہے جو اس کی بنیادی ضرورت سے زائد ہو۔

سونے کا نصاب اس وقت معتبر ہے جب کسی کے پاس صرف سونا ہو، اگر کچھ سونا ہے مثلاً ایک یا دو تولے اور کچھ چاندی یا نقد رقم ہے تو پھر پوری مالیت نکالی جائے گی اور چاندی کا نصاب (یعنی 612،36 گرام چاندی کی موجودہ قیمت) کا معتبر ہوگا۔

اگر عید الفطر کے دن یعنی یکم شوال المکرّم کو وقتی ضرورت سے زائد کم ازکم نصابِ زکوٰۃ کے برابر رقم نہیں ہے تو ایسے شخص پر فطرہ واجب نہیں ہے اور اِس کی ادائیگی کے لئے قرض لینے کی حاجت نہیں ہے۔ایسا شخص جو فطرہ ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، اُس پر فطرہ ادا کرنا واجب نہیں۔البتہ وہ صدقۂ فطر لینے کا استحقاق رکھتا ہے، اگر سب ہی فطرہ دینے والے ہوں تو لینے والا کون ہوگا؟۔قرض لے کر وہ اپنے اوپر ایک غیر واجب چیز کو از خود واجب کر رہا ہے۔

مفلس شخص اگر چہ مُکلّف نہیں لیکن اگر قرض لے کر فطرہ ادا کیا تو فطرہ ادا ہو جائے گا۔ مالدار شخص اگر کسی سبب سے اُس وقت فطرہ کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو چونکہ اُس پر فطرہ واجب ہے، لٰہذا اُس پر لازم ہے کہ قرض لے کر فطرہ ادا کرے۔

تیس رمضان کو دن کے وقت چاند نظر آنے سے متعلق شرعی مسائل
رویتِ ہلال سے متعلق چند اہم مسائل

سوال:80

30 رمضان المبارک کی شام غروبِ آفتاب سے قریب 20 منٹ پہلے ہمارے شہر میں چاند نظر آ گیا، معتکفین نے اعتکاف ختم کر دیا، کچھ لوگوں نے روزہ توڑ دیا اور چند ائمۂ مساجد نے بھی اِس کی حوصلہ افزائی کی اور مساجد سے چاند نظر آنے کا اعلان کیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ جن لوگوں نے روزہ توڑا، اُن کے لئے شرعی حکم کیا ہے، صرف روزہ کی قضا کریں یا کفارہ بھی ادا کریں؟۔ اس کے بعد لوگوں کو یہ اشتباہ ہو رہا ہے کہ کہیں یہ یکم شوال المکرّم یا عید الفطر کا دِن تو نہیں تھا؟، کیا یہ درست ہے؟۔ (جنید، میانوالی)۔

جواب:

اس سال 2010ء جمعرات 09 ستمبر یعنی 29 رمضان المبارک کی شام کو شوال المکرّم کا چاند نظر نہیں آیا تھا، لہٰذا جمعۃ المبارک 10 ستمبر کو 30 رمضان المبارک تھی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمیں ایک مزید روزے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اُس دِن سہ پہر کو غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے اسلام آباد اور بعض علاقوں میں لوگوں کو چاند نظر آ گیا۔ اس سے لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا ہوئے، کیونکہ ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہم بہت سے توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض باتیں جو روایتی طور پر چلی آ رہی ہیں، ہم اُن کے حصار سے نہیں نکل پاتے اور اس میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ حضرات میں بھی بعض اوقات کوئی فرق نہیں رہتا، خواہ جدید سائنسی علم ہو یا دینی علم۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا علم صرف نظریاتی (Theoratical) ہوتا ہے، عملی (Practical) اور اطلاقی (Applied) نہیں ہوتا۔

ہمیں بتایا گیا کہ بعض روزے داروں نے روزہ توڑ دیا اور بعض معتکفین نے اعتکاف توڑ دیا۔ کم علمی کے سبب بعض مساجد سے غروبِ آفتاب سے پہلے چاند نظر آنے کا اعلان کر دیا

گیا۔ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے کے تمام ضروری پہلوؤں پر گفتگو کریں تاکہ جولوگ مثبت ذہن کے مالک ہیں اورروایات وتوہمات کے اسیر نہیں ہیں ،اُن میں آگہی (Awairness) پیداہواور کھلے دل ودماغ کے ساتھ وہ حق بات کوقبول کریں۔یہ علمی بحث اس لئے ضروری ہے کہ یہ شریعت کاایک دائمی اور ہمیشہ جاری رہنے والامسئلہ ہے۔

قمری مہینے کا دورانیہ: قمری مہینہ یاتو29دن کاہوتاہے یا 30دن کا۔حدیث پاک میں ہے:سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ یَقُوْلُ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ : اَلشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا،یَعْنِیْ:ثَلَاثِیْنَ ،ثُمَّ قَالَ: وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا ۔یَعْنِیْ تِسْعًا وَّعِشْرِیْنَ، یَقُوْلُ : مَرَّةً ثَلَاثِیْنَ ،وَمَرَّةً تِسْعًاوَّعِشْرِیْنَ ۔

ترجمہ:'' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے (اپنے دونوں ہاتھوں کی دس انگلیوں کوکشادہ کرکے تین مرتبہ اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا: (قمری مہینہ) اس طرح ،اس طرح اوراس طرح ہوتاہے ،یعنی پورے تیس دن کا۔پھرآپ ﷺ نے (اسی طرح تین بار اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کوکشادہ کرکے تین بار اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا: (قمری مہینہ)اس طرح ،اس طرح اوراس طرح ہوتاہے ،(اورآخری بار آپ نے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کودبالیا) یعنی 29دن کا۔یعنی کبھی مہینہ پورے 30دن کا ہوتاہےاورکبھی29دن کا،(صحیح بخاری،رقم الحدیث:5302)''۔

کیاکئی قمری مہینے مسلسل 29دن یا30دن کے ہوسکتے ہیں:؟

شریعت میں اس طرح کاکوئی طے شدہ ضابطہ نہیں ہے کہ سال میں کتنے قمری مہینے مسلسل 30دن کے یا مسلسل 29دِن کے ہوسکتے ہیں؟۔قرآن وسنت میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنے قمری مہینے مسلسل 30دن کے ہوسکتے ہیں اور کتنے مسلسل 29دن کے ہوسکتے ہیں۔امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے علامہ قطب الدین شیرازی مصنف تحفۂ شاہیہ وزیج الغ بیگی کے حوالے سے لکھاہے کہ:''زیادہ سے زیادہ مسلسل چارقمری مہینے 30دن کے ہوسکتے ہیں اورزیادہ سے زیادہ مسلسل تین قمری

مہینے ممکنہ طور پر 29 دن کے ہوسکتے ہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:26،ص:423،رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

امام احمد قسطلانی نے ارشادالساری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے:''2یا3 قمری مہینے مسلسل 29 دِن کے ہوسکتے ہیں، 4ماہ سے زائد مسلسل 29 دِن کے نہیں ہوسکتے،(جلد:3، ص:357)''۔ایک ماہرِ فلکیات نے لکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلسل 5 قمری مہینے 29دن کے ہوسکتے ہیں،لیکن یہ سب امکانات کی بات ہے،ان پر کسی شرعی فیصلے کا مدار نہیں ہے۔

نئے چاند کا چھوٹا بڑا ہونا:

نئی قمری تاریخ کے تعیّن کا مدار شرعاً اور سائنسی طور پر ہلال کے چھوٹا بڑا ہونے یا غروبِ آفتاب کے بعد مطلع پر اس کے موجود ہونے کی مقدارِ وقت (Timing) سے نہیں ہوتا،جیسا کہ ہمارے ہاں بعض اوقات اہلِ علم بھی کہہ دیتے ہیں کہ چاند کافی بڑا ہے اور کافی دیر تک مطلع پر موجود رہا،لگتا ہے کہ ایک دن پہلے کا ہے۔یہ سوچ اور طرزِ فکر غیر شرعی اور غیر سائنسی ہے۔حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِی الْبَخْتَرِیِّ قَالَ: خَرَجْنَا لِلْعُمْرَۃِ، فَلَمَّا نَزَلْنَا بِبَطْنِ نَخْلَۃَ، قَالَ: تَرَآئَیْنَا الْھِلَالَ، فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: ھُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ، وَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: ھُوَ ابْنُ لَیْلَتَیْنِ، قَالَ: فَلَقِیْنَا ابْنَ عَبَّاسٍ فَقُلْنَا: اِنَّا رَأَیْنَا الْھِلَالَ، فَقَالَ بَعْضُ الْقَومِ: ھُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ، وَقَالَ بَعْضُ الْقَومِ: ھُوَ ابْنُ لَیْلَتَیْنِ، فَقَالَ: اَیَّ لَیْلَۃٍ رَأَیْتُمُوْہُ؟،قَالَ:فَقُلْنَا لَیْلَۃَ کَذَا وَ کَذَا، فَقَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ مَدَّہٗ لِلرُّؤْیَۃِ، فَھُوَ لِلَیْلَۃٍ رَأَیْتُمُوْہُ،

ترجمہ:''ابوالبختری بیان کرتے ہیں کہ ہم عمرے کے لئے گئے،جب ہم وادیٔ نخلہ میں پہنچے تو ہم نے چاند دیکھنا شروع کیا،بعض لوگوں نے کہا:''یہ تیسری تاریخ کا چاند لگتا ہے'' اور بعض نے کہا:''یہ دوسری تاریخ کا چاند لگتا ہے''۔راوی بیان کرتے ہیں: پھر ہماری ملاقات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہوئی،تو ہم نے (قیاس کی بنیاد پر

اختلاف کی) یہ صورتِ حال ان سے بیان کی، تو انہوں نے فرمایا: ''تم نے چاند کس رات کو دیکھا تھا''؟، ہم نے کہا: ''فلاں رات کو''، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے دیکھنے کے لئے اسے بڑھا دیا، درحقیقت یہ اسی رات کا چاند ہے، جس رات کو تم نے اسے دیکھا ہے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2418)''۔

یہ حدیث اس مسئلے میں شریعت کی اصل ہے کہ نئے چاند کا مدار رویت پر ہے، اس امر پر نہیں ہے کہ اس کا سائز چھوٹا ہے یا بڑا یا مطلع پر اس کے نظر آنے کا دورانیہ کم ہے یا زیادہ۔ اس لئے کسی عالم یا تعلیم یافتہ شخص کا نیا چاند دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ دو یا تین تاریخ کا لگتا ہے، یہ غیر شرعی اور غیر عالمانہ ہے۔ اسی طرح سائنسی حقیقت بھی یہی ہے، مثلاً کسی قمری مہینے کے 29 تاریخ گزرنے کے بعد شام کو نئے چاند کا غروبِ آفتاب کے فوراً بعد مطلع پر ظہور تو ہے مگر اس کا درجہ چار یا پانچ ہے، اس کی عمر 18 گھنٹے ہے اور مطلع پر اس کا ظہور پندرہ بیس منٹ ہے۔ تو اس صورت میں چاند مطلع پر موجود تو ہے لیکن اس کی رویت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا یہ قمری مہینہ 30 دن کا قرار پائے گا۔ اب اگلی شام کو اس چاند کی عمر 42 گھنٹے ہو جائے گی، مطلع پر اس کا درجہ 12 یا اس سے اوپر ہو جائے گا اور مطلع پر اس کا استقرار بھی نسبتاً زیادہ وقت کے لئے ہوگا، مثلاً پچاس منٹ اور اس کا حجم (Size) بھی بڑا ہوگا، لیکن یہ قطعیت کے ساتھ چاند کی پہلی تاریخ ہوگی۔ لہٰذا میری اہلِ علم اور اہلِ وطن سے اپیل ہے کہ توہّمات کے حصار سے نکلیں اور حقیقت پسند بنیں۔

اِس موضوع پر ہم رویت ہلال ریسرچ کونسل کے سیکریٹری جنرل خالد اعجاز مفتی صاحب کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں:

نئے چاند کی جسامت (سائز) بڑی محسوس ہونے پر غلط رویت ہونے کا قیاس

''بعض لوگ قمری مہینے کی 30 تاریخ کی شام کو دکھائی دینے والے نئے چاند کی جسامت کو نسبتاً بڑا دیکھ کر یہ قیاس آرائی کرنے لگتے ہیں کہ یہ لازمی طور پر دوسری رات کا چاند

ہے۔ یہ سوچ چاند کے فلکیاتی نظام سے لاعلمی پر مبنی ہے۔ نئے چاند کی جسامت کا کوئی خاص پیمانہ نہیں ہوتا۔ اس کا اندازہ اس کی عمر سے کیا جا سکتا ہے۔ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ ماہرین فلکیات کے مشاہدوں کے مطابق 20 گھنٹے تک کی عمر کا چاند عموماً دکھائی نہیں دیتا اور 20 سے 30 گھنٹے کے درمیان عمر کا چاند دکھائی دینے کا انحصار تعدد فلکیاتی کیفیات پر ہوتا ہے۔ اس طرح چاند کے پہلی مرتبہ نظر آنے کی عمر 50 سے بھی زائد گھنٹوں تک ہو سکتی ہے، لہٰذا مختلف عمروں کے چاند مختلف جسامت (Size) کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کی وضاحت درج ذیل مثالوں سے ہوگی۔

مثال (1): ایک قمری مہینے کی 29 تاریخ کی شام کو ایک مقام پر چاند کی عمر 21 گھنٹے ہے اور اس کے دیکھے جانے میں کوئی فلکیاتی کیفیت مزاحم نہیں، لہٰذا رویت ہلال ہوگئی۔ اگر اس کی عمر 18 گھنٹے ہوتی تو وہ نظر نہ آتا بلکہ اگلی شام کو مزید 24 گھنٹے گزر جانے کے باعث (18+24) 42 گھنٹے کی عمر ہو جانے پر پہلی مرتبہ دکھائی دیتا۔ اب اندازہ کیجئے کہ نیا چاند اول صورت میں 21 گھنٹے کی عمر میں نظر آ گیا جبکہ صورت دوم میں 42 گھنٹے کی عمر میں دکھائی دیا۔ دونوں چاند پہلی رات کے ہیں لیکن مؤخر الذکر صورت میں اس کی عمر دوگنا ہو جانے کے باعث اسی قدر جسامت کا حامل ہوگا اور اسی حساب سے افق سے کافی بلند ہوگا جسے لوگ غلطی سے دوسری رات کا چاند خیال کریں گے۔

مثال (2): یہ کم از کم کیفیت ہے، نیا چاند اس سے بھی بڑی جسامت کا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ 20 سے 30 گھنٹوں کے درمیان عمر کا چاند دکھائی دینے کا انحصار متعدد فلکیاتی کیفیات پر بھی ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ 24 گھنٹے کی عمر کا چاند دیگر فلکیاتی کیفیات کے موزوں نہ ہونے کے باعث دکھائی نہ دے

سکا۔ (جیسا کہ پچھلے عنوان کے تحت نقشہ اول میں ہم اس کے عملاً واقع ہونے کی صورت میں دیکھ چکے ہیں)۔ جب وہ اگلی شام کو نظر آئے گا تو اس کی عمر (24+24)48 گھنٹے ہو چکی ہوگی، لہٰذا وہ مثال اول میں 42 گھنٹے کی عمر میں دکھائی دینے والے چاند سے بھی بڑا ہوگا۔

مثال (3): یہی نہیں بلکہ ایک صورت میں پہلی رات کا چاند دوسری رات کے چاند سے بھی بڑا ہو سکتا ہے۔ مثال اول میں 21 گھنٹے کی عمر کا چاند نظر آ گیا لہٰذا اگلی شام کو جب یہ دوسری تاریخ میں داخل ہو گیا تو اس کی عمر (21+24) 45 گھنٹے ہوگی۔ مثال دوئم میں پہلی رات کا چاند 48 گھنٹے کی عمر میں دکھائی دیا۔ ظاہر ہوا کہ پہلی رات کا 48 گھنٹے کی عمر کا چاند دوسری رات کے 45 گھنٹے کی عمر کے چاند سے بھی بڑا ہے۔

درج بالا مثالوں سے واضح ہوا کہ تیس کے چاند کی جسامت کو بڑا دیکھ کر یہ قیاس کرنا کہ یہ ضروری طور پر دوسری رات کا چاند ہے، درست نہیں۔

چودھویں رات کے چاند سے رویتِ ہلال کی درستگی کا اندازہ کرنا:

عوام الناس میں یہ تصور عام ہے کہ رویت ہلال کے مطابق چودھویں رات کو چاند پوری شب مکمل دائرے کی صورت میں روشن ہوتا ہے۔ اس تصور کے تحت بعض لوگ چاند کی گولائی کی ظاہری تکمیل سے اس ماہ کی رویت ہلال کی درستگی کا اندازہ کرتے ہیں۔ یہ معیار قطعاً درست نہیں۔ چاند کی روشن جسامت ہر لمحے مسلسل بڑھتی یا گھٹتی رہتی ہے۔ قمری مہینے کے نصف اول میں بڑھتے رہنے کے عمل کے بعد ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ زمین کے مقابل چاند کی پوری جسامت روشن ہو جاتی ہے۔ فلکیات کی اصطلاح میں اسے ''فل مون (full moon)'' یا ''ماہِ کامل'' کہتے ہیں اور یہ وقت کرۂ ارض پر صبح، دوپہر، شام اور رات کے چوبیس گھنٹوں پر پھیلے ہوئے اوقات میں کوئی لمحہ بھی ہو سکتا

ہے۔اس کے فوراً بعد اس کی روشن سطح کے گھٹنے کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔معلوم ہوا کہ چاند ساری رات یکساں جسامت کے ساتھ روشن نہیں رہتا۔

محض آنکھوں سے چاند دیکھ کر یہ اندازہ کرنا کہ یہ پورا چاند ہے، بالکل ممکن نہیں اور نہ ہی بظاہر پورا دکھائی دینے والے چاند پر گھنٹوں نظر جما کر بھی یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تکمیل کے مرحلے میں ہے یا اس کے بعد مسلسل گھٹنے کے عمل میں ہے۔ یہ کام رصد گاہی آلات ہی انجام دے سکتے ہیں۔ جس طرح ماہرین فلکیات اپنے خصوصی فارمولوں سے چاند کی پیدائش کے ماہانہ اوقات کا تعین کرتے ہیں، اسی طرح وہ ہر مہینے کے ماہِ کامل کے اوقات بھی معلوم کرتے ہیں۔ پس چودھویں رات کے عمومی تصور سے اس ماہ کی رویت ہلال معلوم کرنے کا معیار مقرر کرنا درست نہیں"۔

دِن کے وقت نظر آنے والے چاند کے بارے میں وضاحت: چاند کی رویت سے متعلق یہ ضابطہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ دِن کے وقت نظر آنے والا چاند، خواہ وہ زوال سے پہلے نظر آئے یا بعد میں، آئندہ آنے والی رات کا قرار پائے گا۔ اور اب جو رات آئے گی، مہینے کا آغاز اُسی سے ہوگا، امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا قول یہی ہے اور یہی قول مختار ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَرُؤْيَتُهُ بِالنَّهَارِ لِلَّيْلَةِ الْآتِيَةِ مُطْلَقاً عَلَى "الْمَذْهَبِ"

ترجمہ: "اور جو چاند دِن کے وقت نظر آئے، صحیح مذہب کے مطابق وہ ہر صورت میں اگلی رات کا شمار کیا جائے گا"۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

أَيْ سَوَاءٌ رُئِيَ قَبْلَ الزَّوَالِ أَوْ بَعْدَهُ ،وَقَوْلُهُ "عَلَى الْمَذْهَبِ" : أَيِ الَّذِيْ هُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيْفَةَ وَمُحَمَّدٍ ـقَالَ فِي "الْبَدَائِعِ": فَلَايَكُوْنُ ذَالِكَ الْيَوْمُ مِنْ رَمَضَانَ عِنْدَهُمَا،وَقَالَ أَبُو يُوْسُفَ :إِنْ كَانَ بَعْدَالزَّوَالِ فَكَذَالِكَ،وَإِنْ كَانَ قَبْلَهُ فَهُوَ لِلَّيْلَةِ الْمَاضِيَةِ وَيَكُوْنُ الْيَوْمُ مِنْ رَمَضَانَ ،وَعَلَى هٰذَاالْخِلَافِ هِلَالُ شَوَّالٍ: فَعِنْدَهُمَا

يَكُونُ لِلْمُسْتَقْبِلَةِ مُطْلَقًا ،وَيَكُونُ الْيَوْمُ مِنْ رَمَضَانَ ،وَعِنْدَهُ لَوْ قَبْلَ الزَّوَالِ يَكُونُ لِلْمَاضِيَةِ وَيَكُونُ الْيَوْمُ يَوْمَ الْفِطْرِ،لِأَنَّهُ لَايُرٰى قَبْلَ الزَّوَالِ عَادَةً اِلَّا أَنْ يَكُونَ لِلَيْلَتَيْنِ ،فَيَجِبُ فِيْ هِلَالِ رَمَضَانَ كَوْنُ الْيَوْمِ مِنْ رَمَضَانَ،وَفِيْ هِلَالِ شَوَّالَ كَوْنُهُ يَوْمَ الْفِطْرِ،وَالْأَصْلُ عِنْدَهُمَا أَنَّهُ لَاتُعْتَبَرُ رُؤْيَتُهُ نَهَارًا ،وَاِنَّمَا الْعِبْرَةُ لِرُؤْيَتِهٖ بَعْدَغُرُوْبِ الشَّمْسِ لِقَوْلِهٖ ﷺ : صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَأَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ، أَمَرَ بِالصَّوْمِ وَالْفِطْرِ بَعْدَالرُّؤْيَةِ،فَفِيْمَا قَالَهُ أَبُوْ يُوْسُفَ مُخَالَفَةُ النَّصِّ،وَفِي "الْفَتْحِ":أَوْجَبَ الْحَدِيْثُ سَبْقَ الرُّؤْيَةِ عَنِ الصَّوْمِ وَالْفِطْرِ،وَالْمَفْهُوْمُ الْمُتَبَادِرُ مِنْهُ الرُّؤْيَةُ عِنْدَ عَشِيَّةِ آخِرِ كُلِّ شَهْرٍ عِنْدَالصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ ،بِخِلَافِ مَاقَبْلَ الزَّوَالِ مِنَ الثَّلَاثِيْنَ وَالْمُخْتَارُ قَوْلُهُمَا اھ۔

ترجمہ:''یعنی (دن میں چاند) زوال سے قبل نظر آئے یا زوال کے بعد (اس کا حکم ایک ہی ہے)،''مذہب پر''ہونے کا معنی یہ ہے کہ یہ قول امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا ہے۔ ''بدائع الصنائع''میں فرمایا:پس طرفین (امام اعظم اور امام محمد) کے نزدیک وہ دن رمضان کا نہیں ہوگا،امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ:اگر زوال کے بعد نظر آیا تو بے شک آئندہ شب کا ہے اور اگر زوال سے قبل نظر آیا تو پچھلی شب کا ہے اور وہ دِن رمضان کا ہوگا۔اور ائمۂ احناف کے اسی اختلاف پر (امام ابو یوسف کے نزدیک) یہ شوال کا چاند ہے،یعنی طرفین (امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ) کے نزدیک (دن میں چاند زوال سے پہلے نظر آئے یا زوال کے بعد) ہر صورت میں آئندہ شب کا ہے اور وہ دن رمضان کا ہوگا۔امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک اگر زوال سے پیشتر نظر آیا تو چاند شب گذشتہ کا ہے اور یہ دن عید کا ہے،اس لئے کہ ہلال عادتاً زوال سے قبل نظر نہیں آتا سوائے اِس کے کہ دوراتوں کا چاند ہو،پس ہلالِ رمضان میں وہ دِن رمضان کا ہونا ضروری ہوا اور شوال کے چاند میں عید کا دِن۔اور طرفین کے نزدیک اصل یہ ہے کہ دِن کی رویت کا اعتبار نہیں،اعتبار غروب کے بعد کا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'' (رمضان کا) چاند دیکھ کر روزے رکھو

اور (شوال کا) چاند دیکھ کر ہی روزہ چھوڑو، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1909)''۔ پس صوم وافطار کا حکم رؤیت کے بعد ہے، اس صورت میں امام ابو یوسف کا قول نص کے مخالف ہے۔ ''فتح القدیر'' میں ہے: حدیث شریف میں روزہ رکھنے یا عید منانے کے لئے یہ لازم قرار دیا ہے کہ چاند پہلے نظر آئے، صحابۂ کرام، تابعین اور ان کے بعد والے (ائمۂ کرام) کے نزدیک رویت سے ظاہر مفہوم یہی ہے کہ ہر قمری مہینے کی آخری شام کو (غروبِ آفتاب کے بعد) چاند نظر آئے، یعنی ہر مہینے کی تیس تاریخ کو زوال سے قبل کی رویت معتبر نہیں ہے، اور مختار قول امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص: 322، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''آخیر تاریخ رمضان شریف کا روزہ چاند دیکھ کر افطار کر لینا جائز ہے یا نہیں یعنی تیسویں کا چاند اکثر تیسرے پہر سے نظر آتا ہے تو آیا اُسی وقت روزہ کھول لیں یا غروبِ آفتاب کے بعد؟۔آپ نے جواب میں لکھا: کسی تاریخ کا روزہ دن سے افطار کر لینا ہرگز جائز نہیں بلکہ حرام قطعی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرض کیا کہ روزہ رات تک پورا کرو یعنی جب آفتاب ڈوبے اور دن ختم اور رات شروع ہو، اُس وقت کھولو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ترجمہ: ''پھر روزہ کو شام تک پورا کرو، (بقرہ: 187)''۔

درمختار میں ہے: لَاعِبْرَةَ بِرُؤْيَةِ الْهِلَالِ نَهَارًا مُطْلَقاً عَلَى مَذْهَبِ الْإِمَامِ الصَّحِيحِ الْمُعْتَمَدِ، وَأَمَّا عَلَى قَوْلِ الثَّانِيْ مِنْ اَنَّهٗ اِنْ رَأٰى قَبْلَ الزَّوَالِ فَلِلْمَاضِيَةِ فَلَيْسَ الْإِفْطَارُ بِمَعْنَى نَهَارَ الصَّوْمِ بَلْ لِثُبُوْتِ الْعِيْدِ عِنْدَهٗ بِذَالِكَ وَلَيْسَ هٰذَا مَعْنَى قَوْلِهٖ ﷺ: صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَالَّا يُوْجِبُ الصَّوْمَ بِمُجَرَّدِ رُؤْيَةِ الْهِلَالِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ وَهٰذَا وَاضِحٌ جِدًّا۔

ترجمہ: ''امام کے صحیح معتمد مذہب کے مطابق ہر حال میں دن کو چاند دیکھنے کا کوئی اعتبار نہیں، مگر امام ثانی (امام ابو یوسف) کے قول پر ہے کہ اگر زوال سے پہلے دیکھا تو یہ گذشتہ رات

کا ہوگا، تو اب افطار کا یہ معنیٰ نہیں کہ یہ دن کے روزے کا افطار ہے بلکہ اس سے امام ثانی کے نزدیک ثبوتِ عید ہو رہا ہے، کیونکہ گذشتہ رات کا چاند ہے تو عید کی وجہ سے افطار ہے اور حضور ﷺ کے فرمان مبارک ''چاند دیکھنے پر روزہ رکھو اور چاند دیکھنے پر عید کرو'' کا معنی یہ نہیں کہ جب دیکھو تو افطار کرو ورنہ یہ لازم آئے گا کہ مغرب کے بعد محض چاند دیکھنے سے اُسی وقت روزہ لازم ہو جائے اور یہ نہایت ہی واضح ہے''۔

نوٹ: درمختار میں جو عبارت ملی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ''وَرُؤْيَتُهُ بِالنَّهَارِ لِلَّيْلَةِ الْآتِيَةِ مُطْلَقًا عَلَى الْمَذْهَبِ ذَكَرَهُ الْحَدَّادِيُّ، وَاخْتِلَافُ الْمَطَالِعِ وَرُؤْيَتُهُ نَهَارًا قَبْلَ الزَّوَالِ أَوْ بَعْدَهُ غَيْرُ مُعْتَبَرٍ عَلَى ظَاهِرِ الْمَذْهَبِ''، درمختار میں لاعبرة الخ کے الفاظ نہیں ہیں۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 389-388، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اعتکاف اور روزہ توڑنے والوں کا حکم:

اعتکاف خواہ قصداً توڑا ہو یا کسی عذر کے سبب، اُس کی قضا واجب ہے اور جس دن توڑا فقط اُس ایک دِن کی قضا لازم ہے، یہ قضا روزے کے ساتھ ہوگی۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَإِذَا فَسَدَ الْاِعْتِكَافُ الْوَاجِبُ، وَجَبَ قَضَاؤُهُ، فَإِنْ كَانَ اعْتِكَافُ شَهْرٍ بِعَيْنِهِ ،إِذَا أَفْطَرَ يَوْمًا يَقْضِيْ ذَالِكَ الْيَوْمَ۔

ترجمہ: ''اور جب اعتکاف واجب فاسد ہو گیا، تو اُس کی قضا واجب ہے، پس اگر وہ کسی معین مہینے کا اعتکاف تھا، تو جس دن افطار کیا (یعنی اعتکاف فاسد ہوا)، اُسی ایک دن کی قضا اُس کے ذمے لازم ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 213)

علامہ غلام رسول سعیدی تفسیر تبیان القرآن میں علامہ ابن عابدین شامی حنفی کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف ہر چند کہ نفل ہے لیکن شروع کرنے سے لازم ہو جاتا ہے، اگر کسی شخص نے ایک دن کا اعتکاف کر کے فاسد کر دیا تو امام ابو یوسف کے نزدیک اس پر پورے دس دن کی قضا لازم ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے

نزدیک اس پر صرف اسی دن کی قضا لازم ہے (یعنی روزے کے ساتھ ایک دن کا اعتکاف)، اس کے برعکس نفل میں اگر کچھ دیر مسجد میں بیٹھ کر باہر نکل گیا تو اس پر قضا نہیں کیونکہ اس کے باہر نکلنے سے وہ اعتکاف ختم ہو گیا''۔

(تبیان القرآن، جلد 1، ص: 739)

جن لوگوں نے روزہ توڑ دیا اُن کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ بعد میں اُس ایک روزے کی قضا رکھیں، کفارہ لازم نہیں۔ اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی نے رمضان یا عید کا چاند دیکھا مگر اس کی گواہی کسی سبب سے رَد کر دی گئی، مثلاً فاسق ہے یا عید کا چاند اُس نے تنہا دیکھا تو اسے حکم ہے کہ روزہ رکھے اگرچہ اس نے خود عید کا چاند دیکھا ہے، مگر اس روزہ کو توڑنا جائز نہیں اگر توڑے گا تو کفارہ لازم نہیں۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(رای) مُکَلَّفٌ (هِلَالَ رَمَضَانَ أَوِ الْفِطْرِ وَرُدَّ قَوْلُهُ) بدلیل شرعیّ (صام) مُطْلَقًا وُجُوْبًا، وقِیل ندبًا (فَانْ أَفْطَرَ قَضٰی فَقَطْ) فِیْهِمَا لِشُبْهَةِ الرَّدِّ۔

ترجمہ: ''کسی عاقل بالغ نے رمضان یا عید کا چاند دیکھا اور اُس کا قول دلیل شرعی کی بنا پر رَد کر دیا گیا (یعنی اس کی گواہی قبول کر کے اس پر فیصلہ نہیں کیا گیا)، تو اس کے لئے مُطلقاً روزہ رکھنا واجب ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کے لئے روزہ رکھنا مستحب ہے، اگر روزہ نہ رکھا تو فقط قضا ہے، کیونکہ گواہی رَد ہونے کی بنا پر اس کے لئے صورت مسئلہ مشتبہ ہے (اور حدود و کفارات شبہے کی بنا پر ساقط ہو جاتے ہیں)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 313، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

فقہی حوالہ جات کی روشنی میں شرعی مسئلہ واضح کرنے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ سائنسی اور فنی وجوہات کو بھی قارئین کے سامنے لائیں، اس سلسلے میں رویتِ ہلال ریسرچ کونسل کے سیکریٹری جنرل خالد اعجاز مفتی صاحب کی سائنسی توجیہہ درج ذیل ہے:

10 ستمبر 2010ء کی سہ پہر اسلام آباد میں چاند دکھائی دینے کی وجوہ

09 ستمبر 2010ء بمطابق 29 رمضان المبارک کی شام پاکستان کے کسی بھی حصے سے رویتِ ہلال کی مستند شہادتیں موصول نہ ہونے کے باعث مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی نے 10 ستمبر 2010ء جمعتہ المبارک کو 30 رمضان قرار دیتے ہوئے 11 ستمبر 2010ء کو یکم شوال المکرّم 1431ھ قرار دیا۔

جمعتہ المبارک 10 ستمبر کو سہ پہر تقریباً تین بجے اسلام آباد میں چاند دکھائی دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں بلکہ سائنس کے عین مطابق ہے۔ یہ واقعہ غیر معمولی اس لئے قرار پا گیا کہ گذشتہ شام رویتِ ہلال کی سائنسی لحاظ سے نا قابل یقین شہادتوں کو مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی نے رَد کر دیا تھا جبکہ صوبہ خیبر پختونخوا کی حکومت انہیں قبول کرتے ہوئے عید منا رہی تھی۔ اس واقعہ کی بدولت مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے 10 ستمبر 2010ء کو 30 رمضان المبارک قرار دینے کے فیصلہ کو مشکوک یا غلط قرار دینے سے قبل ہمیں ''نئے چاند'' کی فلکیاتی اور دینی اصطلاحات کے علاوہ رویتِ ہلال کے سائنسی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔

اگر ہم چاند کے بڑھنے گھٹنے کے عمل پر غور کریں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ قمری ماہ کے پہلے دو ہفتے یہ ہمیں روز بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے، یہاں تک کہ ایک موقع پر یہ دائرے کی صورت میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلے دو ہفتے اس کی جسامت ہر روز کم ہوتی نظر آتی ہے اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کا وجود بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چاند بڑھنے کا عمل نئے سرے سے شروع ہوتا ہے۔ عین اس وقت کو قرانِ شمس وقمر (Conjunction) یا اتصال شمس و قمر یا اماوس کہتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب سورج اور چاند ایک سیدھ میں صفر درجہ پر ہوتے ہیں۔ علمِ فلکیات میں یہی اُس کے ''نیا چاند'' کہلانے کا وقت ہے اور رصد گاہی کتب میں نئے چاند کے اوقات اسی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسے نئے چاند کی پیدائش

بھی کہتے ہیں اور چاند کی طبعی عمر اسی وقت سے شمار کی جاتی ہے۔

فلکیاتی اصطلاح کا نیا چاند اپنے ابتدائی دور میں بال سے زیادہ باریک، سورج سے بہت قریب اور اس کی طاقت ور شعاعوں کی براہ راست زد میں ہوتا ہے۔ لہٰذا انسانی آنکھیں یا غیر معمولی قوت کی دُور بینیں بھی اسے دیکھنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ جوں جوں چاند کی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اس کی جسامت بڑھتی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ سورج سے دور ہٹتے ہوئے اس کی شعاعوں کی طاقت سے بھی ایک حد تک محفوظ ہوتا جاتا ہے۔ بالآخر ایک وقت اس کا وجود اس قدر ہو جاتا ہے کہ سورج سے ایک خاص فاصلے پر غروب آفتاب کے بعد انسانی آنکھوں کو پہلی بار نظر آنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ بصری (Visval) نیا چاند ہے جو دوسرے الفاظ میں رویت ہلال کے معروف نام سے موسوم ہے۔

فلکیاتی اور مقامی احوال کے تحت رویت ہلال پر اثر انداز ہونے والے عوامل یوں ترتیب دیئے جا سکتے ہیں۔

فلکیاتی کیفیات:

(الف) چاند کی عمر (ب) غروبِ شمس اور غروبِ قمر کے درمیان فرق (ج) چاند کا سورج سے زاویائی فاصلہ (Longitudinal Distance) (د) سورج کا اُفق سے نیچے ہونا (ح) چاند کا ارتفاع (Altitude of Moon) (و) چاند کا زمین سے فاصلہ

مقامی کیفیات:

(1) مطلع (Horizon) کی کیفیت (2) فضا کا شفاف پن (Transparency) (3) مقام مشاہدہ کا محل وقوع یعنی طول بلد (Longitude) اور عرض بلد (Latitude) مقام مشاہدہ کی سطح سمندر سے بلندی اگر کم ہو تو اِنعطاف نور (Refraction of Light) کی شرح زیادہ ہو گی اور رُویَت ہلال کے لیے زیادہ سازگار ہو گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہاڑوں کی نسبت ساحل سمندر پر نیا چاند دکھائی دینے کے

امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ سائنسی اور فلکیاتی توضیحات کی باریکیوں میں الجھے بغیر ایک عام آدمی بھی مطلع صاف ہونے کی صورت میں صرف دو معلومات کی بناء پر کسی حد تک رویتِ ہلال کے امکان کا پیشگی تعین کر سکتا ہے یا شہادتوں کے معیار کو پرکھ سکتا ہے۔ اول چاند کی عمر اور دوئم غروبِ شمس اور غروب قمر کا درمیانی فرق۔

رویتِ ہلال کیلئے چاند کی عمر کم از کم بیس گھنٹے نیز غروبِ شمس اور غروبِ قمر کا درمیانی فرق کم از کم چالیس منٹ ہونا چاہئے، اگر چاند کی عمر 30 گھنٹوں سے بڑھ جائے تو غروبِ شمس اور غروبِ قمر کا درمیانی فرق 35 منٹ ہونے پر بھی ہلال نظر آجاتا ہے یا اگر غروبِ شمس اور غروبِ قمر کا درمیانی فرق 50 منٹ سے بڑھ جائے تو تقریباً 19 گھنٹے کی عمر کا چاند بھی دکھائی دے جاتا ہے۔

اصل مسئلہ: رویتِ ہلال کے لئے غروبِ آفتاب کا وقت اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس سے قبل ہم نیا چاند دیکھنے کی کوشش کریں گے تو سورج کی تیز روشنی کے باعث ہماری آنکھیں چندھیا جائیں گی اور ہم اتنا باریک چاند موجودگی کے باوجود دیکھ نہیں پائیں گے۔ نیا چاند دکھائی دینے کیلئے سورج کا غروب ہونا یا سورج کی براہِ راست شعاعوں کا عدم وجود ضروری ہے۔ ستمبر 2010ء میں نیا چاند 8، ستمبر کو پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق سہ پہر تین بجکر تیس منٹ پر پیدا ہوا۔ 9، ستمبر کو غروب آفتاب کے وقت اگر چہ چاند کی عمر پاکستان کے تمام شہروں میں ساڑھے 26 گھنٹوں سے بھی تجاوز کر چکی تھی لیکن غروب شمس اور غروب قمر کا درمیانی فرق کسی بھی شہر میں 28 منٹ سے زائد نہیں تھا، لہٰذا جمعرات کی شام نیا چاند دکھائی نہیں دیا۔ اگر نیا چاند سہ پہر ساڑھے تین بجے کی بجائے گیارہ بجے قبل از دوپہر پیدا ہوا ہوتا تو وہ جمعرات کی شام دکھائی دے جاتا۔

جمعۃ المبارک 10، ستمبر بمطابق 30 رمضان المبارک کی سہ پہر اسلام آباد میں سورج کے آگے اتنے گھنے بادل آگئے کہ وہ سورج کی براہ راست روشنی کے آئی نائن سیکٹر پہنچنے کی راہ میں مزاحم ہو گئے، جبکہ بادلوں کے اوپر سے سورج کی روشنی چاند کے جس حصے پر پہنچ رہی

تھی، وہ روشن ہو رہا تھا۔ لہٰذا وہ پتنگ اڑاتے بچے کو بھی دکھائی دے گیا، حالانکہ وہ بچہ رویتِ ہلال کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ یہ امر مدنظر رہے کہ اس وقت چاند کی عمر 47 گھنٹوں سے بھی تجاوز کر چکی تھی۔ اگر بادل سورج کی روشنی میں مزاحم نہ ہوتے تو کوئی بھی انسان چاند کی وہاں موجودگی کے باوجود اُسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا تو آنکھیں چندھیا جانے کے باعث اُسے دیکھ نہ پاتا۔

رہا یہ سوال کہ اس واقعہ سے ماہِ شوال 1431ھ کا 10 ستمبر کی شام سے آغاز مشکوک قرار پاتا ہے تو اس کا انتہائی سادہ جواب یہ ہے کہ جب 9 ستمبر کی شام رویتِ ہلال نہیں ہوئی تھی تو شرعی حکم کے مطابق رمضان المبارک کے تیس ایام مکمل کرنے کے بعد ہی شوال کا آغاز ہونا تھا۔ 9 ستمبر کی شام رویتِ ہلال نہ ہونے کے فیصلے کی بات ہوگی تو خیبر پختونخوا کی بیس یا بائیس شہاداتِ کاذبہ کا ذکر بھی ضرور آئیگا جن کو قبول کر کے تفرقہ پیدا کیا گیا۔ ان شہادتوں کو پرکھنے کیلئے ہمیں پھر سائنس سے رجوع کرنا ہوگا۔

راقم الحروف نے 18 اگست کو چیئرمین مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان اور 19 اگست کو وزارتِ مذہبی امور، اسلام آباد کو ای میل کے ذریعے 9 ستمبر 2010ء کی شام پاکستان کے تقریباً تمام اہم شہروں کی رویتِ ہلال کے حوالے سے فلکیاتی کیفیات بشمول متذکرہ شہر کے طول بلد، عرض بلد، اوقات غروبِ شمس اور غروبِ قمر، شمس و قمر کے غروب کے درمیان وقت کا فرق، چاند کی عمر اور کیفیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ خیبر پختونخوا کے شہروں ایبٹ آباد، چارسدہ، چترال، ڈیرہ اسماعیل خان، دِیر، ہری پور، ہزارہ، کوہاٹ، مالاکنڈ، مانسہرہ، مردان، نوشہرہ اور پشاور کے علاوہ باغ، کرم، کوٹلی، مالاکنڈ، میرپور اور مظفر آباد میں کہیں بھی ننگی آنکھ تو درکنار ٹیلی سکوپ سے بھی چاند دکھائی دینے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔

یہ عمل بھی غور طلب ہے کہ اگر پشاور کے گردونواح میں کہیں چاند کی رویت ہوگئی تھی جب کہ وہاں غروبِ آفتاب کا وقت 6 بجکر 28 منٹ تھا، تو پھر آدھ گھنٹہ بعد سورج غروب ہونے والے شہروں گوادر، جیوانی اور کراچی کے علاوہ بلوچستان اور سندھ کے اُن شہروں میں چاند

کیوں دکھائی نہ دیا جہاں مطلع صاف تھا اور نہ صرف چاند کی عمر زیادہ ہو چکی تھی بلکہ غروب شمس اور غروبِ قمر کا درمیانی فرق بھی زیادہ ہو چکا تھا۔ پشاور میں اکثر چند لوگوں کو دکھائی دے جانے والا چاند آخر کہاں غائب ہو جاتا ہے کہ کراچی اور گوادر میں صاف آسمان پر لاکھوں متلاشی نگاہوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ رمضان المبارک کے چاند سے متعلق فلکیاتی کیفیات بتاتے ہوئے یہ رائے دی گئی تھی کہ 11، اگست کی شام مطلع صاف ہونے کی صورت میں چاند واضح دکھائی دے گا اور اسی طرح ہوا۔ مختلف ٹی وی چینلز نے چاند کو کیمرے کے ذریعے ناظرین کو براہ راست دکھا دیا تھا۔ ''چن چڑھیا کُل عالم ویکھے''

(چاند جب نکلتا ہے تو سب کو نظر آتا ہے)

رویتِ ہلال سے متعلق بعض غلط فہمیاں

29 یا 30 دنوں کے کم از کم مسلسل مہینے

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ 30 دنوں کے مسلسل دو مہینوں کے بعد تیسرا مہینہ ضروری طور پر 29 دن کا ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ 29 دنوں کے مسلسل دو مہینوں کے بعد تیسرا لازمی طور پر 30 دن کا تصور کرتے ہیں۔ فلکیاتی توضیحات سے قطع نظر اگر ان کے اس خیال کو درست سمجھ لیا جائے تو بھی یہ صورت فقہی اصولوں کی روشنی میں ناقابلِ عمل ہوگی۔ مثال ملاحظہ ہو۔

فرض کیجئے کہ قدرت کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ایک علاقے میں کسی سال کے پہلے چار مہینوں کی تعداد اس طرح ہے:

محرم (29)　صفر (30)　ربیع الاول (29)　ربیع الآخر (29)

ہوا یوں کہ اس علاقے میں محرم کی 29 تاریخ کو مطلع ابر آلود ہونے کے باعث چاند دیکھے جانے کی کوئی شرعی شہادت موصول نہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح فقہی طور پر یہ مہینہ 30 دن کا قرار پایا۔

ایک دن کی اس تاخیر کے باعث صفر کی 29 تاریخ کو (جو پچھلے ماہ مطلع ابر آلود نہ ہونے کی صورت میں رویت ہلال ہو جانے کے باعث 30 تاریخ ہوتی) چاند نظر آ گیا، لہٰذا عملی طور پر ماہ صفر 29 دن کا ہو گیا۔ ربیع الاول کا مہینہ اپنے حساب سے 29 دن کا ہوا۔ اس طرح صفر اور ربیع الاوّل دو ماہ مسلسل 29 دن کے ہو گئے۔ اس سے اگلے مہینے ربیع الآخر کے ایام بھی فلکیاتی نظام کے تحت اسی قدر ہیں، لہٰذا تین مہینے مسلسل انتیس کے ہوں گے۔ یہ درست نہیں کہ تیسرے ماہ کو محض اس وجہ سے، کہ پچھلے دو ماہ انتیس کے ہو چکے، پہلے ہی تیس کا قرار دے دیا جائے۔ خیال کیجئے کہ ایسی صورت میں جب ربیع الآخر کی 29 تاریخ کو چاند نظر آ جائے تو پھر کیا کیفیت برپا ہو گی؟۔ ایسی ہی سطحی معلومات کی بنا پر پروفیسر طاہر القادری نے آغاز شوال 1420 ہجری کے بارے میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان کے فیصلے پر تنقید کرتے ہوئے اسے توڑ دینے کا مطالبہ کر دیا۔ اعتراض یہ تھا کہ جب رجب اور شعبان کے مہینے تیس تیس کے ہو چکے تو پھر اس سے اگلا ماہ رمضان بھی تیس کا کیوں قرار دیا گیا؟۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اخباری خبروں کے مطابق کمیٹی کے سامنے چاند دیکھنے کا دعویٰ کرنے والے چند باریش حضرات پیش ہوئے تھے لیکن جب انہیں قرآن اٹھا کر شہادت دینے کو کہا گیا تو وہ واپس چلے گئے۔ (بے سوچے سمجھے محض کلمہ گو، باریش یا نمازی ہونے کے ناطے قبل از وقت رویت ہلال کی ناقابلِ یقین شہادتیں دھڑا دھڑ قبول کر لینے والے ہمارے صوبہ سرحد کے علما کے لئے لمحہ فکریہ ہے)۔ اس سے بھی زیادہ لطف کی بات یہ ہوئی کہ معترضین کے فلسفۂ رویت ہلال کے برعکس پاکستان کے اکثر علاقوں میں شوال کی 29 تاریخ کو (جو اُن کے حساب سے 30 تاریخ تھی) مطلع صاف ہونے کے باوجود اگلے مہینے کا چاند بھی دکھائی نہ دیا۔ اس طرح مسلسل چار مہینے

تیس تیس کے ہو گئے۔ واضح ہو کہ ہمارے ایک ماہرِ فلکیات سید صمد حسین رضوی اس سے قبل ہی 2000ء میں واقع ہونے والی ہر قمری مہینے کی رویت ہلال کی پیشین گوئیوں کی تفصیل میں واضح طور پر یہ بتا چکے تھے کہ گو چاند 29 شوال کو نظر آنے کے قابل ہو گا مگر پاکستان میں دکھائی نہیں دے گا۔ (دیکھئے ماہنامہ تہذیب کراچی، جنوری 2000ء، صفحہ 49)۔ اب آیئے اس مسئلے کی فلکیاتی توضیح کی جانب۔

چاند کی بے قاعدہ گردش کے باعث قمری مہینوں کی مدت یکساں نہیں ہوتی۔ ایک نئے چاند کی پیدائش سے اگلے نئے چاند کی پیدائش کا عرصہ 29 دن 6 گھنٹے اور 29 دن 20 گھنٹے کے درمیان منٹوں تک کے فرق کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کسی بھی دور کے متعدد مہینوں کی مقدار مدت کا کسی اور دور کے مہینوں کی مدت سے موازنہ کیا جائے تو ان میں قطعاً یکسانیت نہیں پائی جائے گی۔ یہ سلسلہ تیرہ چودہ گھنٹے کے پھیلاؤ میں کم سے زیادہ اور زیادہ سے کم مدت کی جانب ایک غیر یکساں تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ کبھی یہ کم از کم یا زیادہ سے زیادہ مدت کے قریب تک پہنچ کر واپس ہوتا ہے اور کبھی ذرا دور ہی سے پلٹ جاتا ہے۔ اگر یہ سلسلہ مہینوں کی زیادہ سے زیادہ مدت کے قریب تر ہو تو 30 دنوں کے مسلسل تین مہینوں کا بھی امکان ہوتا ہے اور اگر ان کے فوراً بعد کے مہینے کی 29 تاریخ کو متعدد فلکیاتی کیفیات رویت ہلال میں مزاحم ہوں تو مسلسل چار مہینے تیس کے ہو جاتے ہیں۔ اب ہم متذکرہ بالا چاروں مہینوں کے قِرانِ شمس و قمر یعنی نئے چاند کی پیدائش کے اوقات کی بنیاد پر ایک نقشہ ترتیب دیتے ہیں جس سے علوم فلکیات کی رُو سے ہر 29 تاریخ کو چاند نظر نہ آنے کی وجوہ معلوم ہوں گی۔ اس کے علاوہ ان مہینوں کے نئے چاند کی پیدائش کے اوقات کے درمیانی عرصہ یعنی ہر مہینے کی مقدار مدت سے قمری مہینوں کی غیر یکسانیت بھی واضح ہو گی اور ساتھ ہی مہینوں کے اس

سلسلے کے زیادہ سے زیادہ ماہانہ مدت کے قریب تر ہونے کے باعث تیس کے مسلسل چار مہینے ہو جانے کی مذکورہ بالا وضاحت کی تصدیق ہوگی۔

ماہ ہائے 1420ھ ہجری مطابق 1999ء۔2000ء

		رجب	شعبان	رمضان	شوال
یکم ماہ قمری	*	11/ اکتوبر	10 نومبر	10 دسمبر	9 جنوری
29 ماہ قمری	*	8 نومبر	8 دسمبر	7 جنوری	6 فروری
تاریخ پیدائش نیا چاند	9/ اکتوبر	8 نومبر	8 دسمبر	6 جنوری	5 فروری
وقت پیدائش (۱)	16-34	08-53	03-32	23-14	18-03
29 کو چاند کی عمر	*	9 گھنٹے	14 گھنٹے	18/19	24 گھنٹے
کیفیت رویت ہلال	*	نظر نہیں آیا	نظر نہیں آیا	آیا	نظر نہیں آیا
مہینے کے ایام	*	30 دن	30 دن	30 دن	30 دن

مقدار ماہ	*	منٹ۔گھنٹے	منٹ۔گھنٹے	منٹ۔گھنٹے	منٹ۔گھنٹے
(29دن+..)		16-19	18-39	19-42	18-49

ماہرینِ فلکیات کے مشاہدوں کے مطابق 20 گھنٹے تک کی عمر کا چاند عموماً دکھائی نہیں دیتا۔20 سے 30 گھنٹے کی درمیانی عمر کا چاند دکھائی دینے کا انحصار متعدد فلکیاتی کیفیات پر ہوتا ہے، جن میں چاند کا ارتفاع، اس کا افقی زاویہ، غروب شمس وقمر میں تفاوت کی مقدار وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

نقشے میں ملاحظہ کیجئے کہ پہلے تین مہینوں میں چاند کی عمر رویت ہلال کے معیار سے کم تھی اس لئے دکھائی نہ دیا، جبکہ چوتھے ماہ میں فلکیاتی کیفیات کے موزوں نہ ہونے کے سبب نظر نہ آیا۔اس طرح چار مہینے مسلسل تیس کے ہوگئے۔یہ کوئی استثنائی مثال نہیں، اس سے پہلے ایسا ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔وقفوں وقفوں سے ایسی مثالیں مشاہدے میں آتی رہتی ہیں، البتہ تیس کی نسبت انتیس کے مسلسل مہینے بہت کم واقع ہوتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قمری مہینے کی اوسط مدت ساڑھے انتیس دن سے تقریباً پون گھنٹہ زائد ہوتی ہے اس لئے قمری تقویم میں تیس کے مہینے زیادہ آتے ہیں۔اس کے علاوہ چاند کی بے قاعدہ گردش کا رخ اوسط سے زائد مدت کی جانب زیادہ ہوتا ہے لہٰذا تیس کے مسلسل مہینوں کے سلسلے زیادہ واقع ہوتے ہیں۔درج بالا نقشے کی تائید میں مستقبل میں واقع ہونے والے ایک اور سلسلے کے کوائف درج ہیں جن سے صورت حال اور کھل کر واضح ہوتی ہے۔

ماہہائے 1439 ہجری مطابق 2017ء۔2018ء

		ربیع الاول	ربیع الثانی	جمادی الاول	جمادی الثانی

متوقع یکم ماہ قمری	*	20 نومبر	20 دسمبر	19 جنوری	18 فروری
29 ماہ قمری	*	18 دسمبر	17 جنوری	16 فروری	18 مارچ
تاریخ پیدائش نیا چاند	18 نومبر	18 دسمبر	17 جنوری	16 فروری	17 مارچ
وقت پیدائش	16-42	11-31	07-17	02-05	18-12
29 کو چاند کی عمر	*	6 گھنٹے	10/11 گھنٹے	16 گھنٹے	24 گھنٹے
کیفیت رویت ہلال	*	ناقابلِ رویت	ناقابلِ رویت	ناقابلِ رویت	؟
مہینے کے ایام	*	30 دن	30 دن	30 دن	؟
مقدار ماہ (29 دن+...)	*	منٹ۔گھنٹے 18-49	منٹ۔گھنٹے 19-46	منٹ۔گھنٹے 18-48	منٹ۔گھنٹے 16-07

اس مثال میں بھی تیس کے مسلسل تین مہینے بالکل واضح ہیں کیونکہ ان کی 29 تاریخوں کو چاند کی عمر زیادہ سے زیادہ 16 گھنٹے ہوگی جو رویت کے لئے ناکافی ہے۔ چوتھا مہینہ چونکہ حدِ فاصل پر ہے اس لئے اس کے تیس یا انتیس کے ہونے کے متعلق متعدد

فلکیاتی کیفیات کی تفصیل معلوم ہونے پر ہی کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیس کے مسلسل تین ماہ تو گاہے بگاہے آتے رہتے ہیں بلکہ مسلسل چوتھے مہینے کے امکانات بھی موجود ہوتے ہیں''۔ ہم نے شرعی اور سائنسی دونوں پہلوؤں کی وضاحت کردی ہے۔ سائنسی اور فلکیاتی اعتبار سے قمری ماہ کی اُنتیس یا تیس تاریخ کو دِن کے وقت بعض موسمی احوال کی وجہ سے چاند نظر آسکتا ہے، لیکن اُس سے چاند کی تاریخ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ چاند گذشتہ شب ہی سے متعلق ہوتا ہے۔ شرعی اور سائنسی اعتبار سے نئے قمری ماہ کا آغاز اُسی صورت میں ہوگا جب چاند اُس دِن غروبِ آفتاب کے بعد نظر آئے۔ یہ تفصیلی بحث ہم نے اِس لئے کی کہ جب تک دنیا قائم ہے، نظامِ شمس وقمر بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے جاری رہے گا، شمسی اور قمری مہینوں کا آغاز اور اختتام بھی ہوتا رہے گا اور اُن کے ساتھ جو دینی امور متعلق ہیں وہ بھی جاری وساری رہیں گے۔ بس یہ ضابطہ ذہن میں رہے کہ نئے قمری مہینے کا آغاز اُسی وقت ہوگا، جب قمری مہینے کی اُنتیس تاریخ کو غروبِ آفتاب کے بعد مَطلَع پر چاند نظر آئے، ورنہ وہ قمری مہینہ تیس کا قرار پائے گا اور اگلے دِن کو بعض موسمی وجوہ اور فلکیاتی احوال کے باعث کسی وقت آسمان پر چاند نظر بھی آجائے، تو اُس سے قمری تاریخ میں کوئی رَدوبدل نہیں ہوگا۔ اِس لئے تمام برادرانِ ملّت سے گزارش ہے کہ وہ اِس حوالے سے توہّمات اور ضعیف الاعتقادی میں مبتلا نہ ہوں۔

حج کے مسائل

شوال اور ذوالقعدہ کے ابتدائی دنوں میں عمرے کی ادائیگی

سوال: 81

کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ: شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ کے ابتدائی دنوں میں عمرہ ادا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟، وضاحت کے ساتھ جواب مرحمت فرمائیں، (محمد طلحہ، نیو کراچی)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے: (۱) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ الْحُصَيْنِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ جَمَعَ بَيْنَ حَجٍّ وَّعُمْرَةٍ ثُمَّ لَمْ يَنْزِلْ فِيْهَا كِتَابٌ وَلَمْ يَنْهَنَا عَنْهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فِيْهَا رَجُلٌ بِرَأْيِهِ مَا شَاءَ۔

ترجمہ: ''حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج اور عمرہ کو جمع کیا، پھر کتاب اللہ میں ایسا کوئی حکم نازل نہیں ہوا (جس میں اس سے روکا ہو) اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور جس شخص نے (اس کے خلاف) جو کہا وہ محض اپنی رائے سے کہا، (صحیح مسلم: 2975)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تَمَتُّع سے منع کرتے تھے، اس کی تشریح میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا تَمَتُّع سے منع کرنا ان کے اجتہاد کی وجہ سے تھا اور وہ تنزیہاً منع کرتے تھے تحریماً منع نہیں کرتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک اِفراد، تَمَتُّع اور قِران سے افضل تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے اس مسئلہ میں بحث کی اور فرمایا تم جانتے ہو کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تَمَتُّع (قِران) کیا ہے، حضرت عثمان نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم اس وقت خوف زدہ تھے، شاید حضرت عثمان کی مراد سات ہجری کا عمرۂ قضاء تھا، کیونکہ مسلمانوں کے خوف زدہ ہونے کا اس کے بعد کوئی تصور بھی نہیں تھا، دس ہجری میں حج تَمَتُّع ہوا ہے اور اس وقت مسلمانوں کے

خوف زدہ ہونے کا کوئی تصور نہیں تھا، چونکہ حضرت عثمان کے جواب سے حضرت علی کا سوال نہیں اٹھتا تھا، اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان کے جواب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا اور ان سے اس مسئلہ میں بحث کی، حضرت عثمان نے کہا مجھے چھوڑ دو، حضرت علی نے فرمایا میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ اور حضرت عثمان کے منع کرنے کے باوجود قران کا احرام باندھا، اس سے معلوم ہوا کہ علمی مسائل میں مذاکرہ اور مناظرہ کرنا چاہیے اور دینی مسائل میں تبلیغ کرنی چاہیے۔ حاکمِ وقت اگر اپنے اجتہاد سے بھی رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف کوئی حکم دے تو حاکم کے منصب کی پرواہ کیے بغیر تمام لوگوں کو سنت رسول پر عمل کی دعوت دینی چاہیے، ان احادیث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ پیغامِ حق سنانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور شیعہ حضرات کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف تَـقِیَّہ کی نسبت کرنا بالکل باطل اور مردود ہے۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت علی کے نزدیک قران اِفراد سے افضل تھا، اور رسول اللہ ﷺ نے حجِ قران کیا تھا اور حضرت عثمان کے نزدیک بھی رسول اللہ ﷺ کا حجِ قران ہی تھا کیونکہ حضرت عثمان نے قران کی تاویل کی، انکار نہیں کیا۔

نوٹ: یاد رہے کہ صحابۂ کرام قران پر بھی تَمَتُّع کا اطلاق کرتے تھے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ حضرت علی نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا اور یہ قران ہے، قران اور تَمَتُّع میں اصطلاحی فرق بعد کی بات ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد:03، ص:50-449)"۔

(۲) عَنِ ابْنِ شِهَابٍ: اَنَّ سَالِمَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ حَدَّثَهُ اَنَّهُ سَمِعَ رَجُلًا مِنْ اَهْلِ الشَّامِ، وَهُوَ يَسْأَلُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ عَنِ التَّمَتُّعِ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ، فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: هِيَ حَلَالٌ فَقَالَ الشَّامِيُّ، اِنَّ اَبَاكَ قَدْ نَهٰى عَنْهَا، فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: اَرَاَيْتَ اِنْ كَانَ اَبِيْ نَهٰى عَنْهَا، وَصَنَعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَاَمْرَ اَبِيْ نَتَّبِعُ اَمْ اَمْرَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ؟ فَقَالَ الرَّجُلُ: بَلْ اَمْرَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: لَقَدْ صَنَعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ۔

ترجمہ: "ابن شہاب روایت کرتے ہیں کہ سالم بن عبداللہ نے ان سے بیان کیا کہ انہوں

نے سنا کہ شام کے ایک شخص نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے تَمَتُّع کے بارے میں (یا ایک ہی احرام کے ساتھ پہلے عمرہ اور پھر حج کرے، جسے قِران کہتے ہیں) سوال کیا: تو عبداللہ بن عمر نے کہا: یہ جائز ہے، شامی نے کہا: کہ آپ کے والد نے تو اِس سے منع کیا ہے، تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا: ''تم بتاؤ! ایک کام سے میرے باپ نے منع کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے وہ کام کیا ہے، ہم اپنے باپ کے حکم کی پیروی کریں گے یا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی؟''، اُس شخص نے کہا: بلکہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی، تو عبداللہ بن عمر نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے تو یہ کام کیا ہے (یعنی اشہرِ حج میں عمرہ ادا کیا ہے)، (سنن ترمذی:824)''۔

نوٹ: گزشتہ حدیث کے ذیل میں یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ صحابۂ کرام ''حجِ قران'' پر بھی تَمَتُّع کا اطلاق کرتے تھے۔ بعد میں دو الگ اصطلاحات وضع ہوئیں، اگر عمرہ کر کے احرام کھول دیا جائے اور پھر حرم سے آٹھ ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھ کر حج ادا کیا جائے، تو اسے ''تَمَتُّع'' کہتے ہیں اور اگر ایک ساتھ عمرے اور حج کا احرام باندھا جائے اور عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام نہ کھولا جائے بلکہ اسی احرام میں حج مکمل کیا جائے تو اسے ''قِران'' کہتے ہیں۔ صحابۂ کرام قِران پر بھی تَمَتُّع کا اطلاق کرتے تھے۔

اس سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے جذبۂ اخلاص و رضا کا پتا چلتا ہے، ان کے والد گرامی حضرت عمر رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، امیر المؤمنین اور رسول اللہ ﷺ دوسرے خلیفۂ راشد ہیں۔ لیکن اس جلالتِ شان کے باوجود اُن کی نظر میں مقامِ رسول اللہ ﷺ سب سے بلند ہے، وہ پیکر صدق و صفا اور مظہر اخلاص و وفا تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے جو چیز ثابت ہو، بعد میں کسی کی رائے اُس سے معارِض ہو، تو فعلِ رسول اور امرِ رسول اللہ ﷺ ہر صورت میں مُقدّم رہے گا۔

مندرجہ بالا حدیث کی شرح میں شیخ عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں:

''''الباجی'' نے کہا: حضرت عمر کا تَمَتُّع سے روکنا اس بنا پر تھا کہ اُن کے نزدیک حجِ اِفراد،

تَمَتُّع سے افضل ہے، لہٰذا یہ نہی تحریمی نہیں تھی (تنزیہی تھی)،۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں:
امام نووی نے کہا مختار یہ ہے کہ حضرت عمر و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اُس ''متعۂ معروفہ'' سے روکتے تھے کہ اشہرِ حج میں پہلے عمرہ ادا کیا جائے، پھر اسی احرام میں رہتے ہوئے حج ادا کیا جائے، یہ نہی تنزیہی پر محمول ہے، تاکہ حجِ افراد کی ترغیب دی جائے (جو ان کے نزدیک افضل تھا)، پھر اس پر اجماع ہوگیا کہ تَمَتُّع بغیر کسی کراہت کے جائز ہے، اور افضلیت میں اختلاف باقی رہا، ''المُحَلّٰی شَرحُ المُوَطّا'' میں بھی اسی طرح ہے، (تحفۃ الاحوذی، جلد:02، ص:82)''۔

(۳) عَنْ عِمْرَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ تَمَتَّعْنَا عَلٰی عَہْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ، فَنَزَلَ الْقُرْآنُ قَالَ رَجُلٌ بِرَاْیِہٖ مَاشَآءَ۔

ترجمہ: ''حضرت عمران رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تمتع کیا اور قرآن نازل ہوا اور ایک شخص نے محض اپنی رائے سے جو چاہا کیا''۔
(صحیح بخاری:1571)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔

ترجمہ: ''تو جو شخص حج کے ساتھ عمرہ ملائے تو وہ ایک قربانی کرے جس کو وہ آسانی کے ساتھ کر سکے۔ اور جو قربانی نہ کر سکے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات روزے جب تم لوٹ آؤ، یہ کامل دس (روزے) ہیں، یہ (حجِ تَمَتُّع کا) حکم اس شخص کے لئے ہے جس کے اہل وعیال مسجد حرام (مکہ مکرمہ) کے رہنے والے نہ ہوں، (البقرہ:196)''۔
حضرتِ عکرمہ سے ایک طویل حدیث روایت ہے، جسے میں آگے چل کر بیان فرمایا:
ترجمہ: ''سو ان لوگوں نے ایک سال میں حج اور عمرہ کی دو عبادتیں جمع کرلیں، اس حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے اور یہ اس کے نبی ﷺ کی سنت ہے اور اس

تَمَتُّع کو مکہ والوں کے سوا باقی تمام مسلمانوں کے لئے مشروع فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ذَالِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (یعنی یہ اس کے لئے جس کے اہل حرم میں نہ رہتے ہوں)''۔ اور حج کے جن مہینوں کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے، وہ شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں، سو جو شخص ان مہینوں میں تمتع کرے اس پر قربانی لازم ہے یا روزے''۔

(صحیح بخاری، جلد: 01، ص: 14-213، مطبوعہ: نور محمد، اصح المطابع، کراچی، 1381)

اس کے ذیل میں علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی ﷺ نے جو حج کیا وہ حج قران تھا اور یہی سب سے افضل حج ہے۔

(۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كَانُوْا يَرَوْنَ أَنَّ الْعُمْرَةَ فِيْ أَشْهُرِ الْحَجِّ مِنْ أَفْجَرِ الْفُجُوْرِ فِى الْأَرْضِ، وَيَجْعَلُوْنَ الْمُحَرَّمَ صَفَرًا، وَيَقُوْلُوْنَ: إِذَا بَرَأَ الدَّبَرُ، وَعَفَا الْأَثَرُ، وَانْسَلَخَ صَفَرُ، حَلَّتِ الْعُمْرَةُ لِمَنِ اعْتَمَرَ، فَقَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ وَأَصْحَابُهٗ صَبِيْحَةَ رَابِعَةٍ مُهِلِّيْنَ بِالْحَجِّ، فَأَمَرَهُمْ أَنْ يَجْعَلُوْهَا عُمْرَةً، فَتَعَاظَمَ ذَالِكَ عِنْدَهُمْ، فَقَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، أَيُّ الْحِلِّ؟ قَالَ الْحِلُّ كُلُّهٗ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی بیان کرتے ہیں کہ (زمانہ جاہلیت میں) لوگ یہ گمان کرتے تھے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا زمین پر سب سے بڑا گناہ ہے اور وہ محرم کے مہینہ کو صفر قرار دیتے تھے، وہ کہتے تھے کہ جب اونٹنیوں کی پیٹھیں اچھی ہو جائیں اور راستہ سے حاجیوں کے نشانِ قدم مٹ جائیں اور صفر کا مہینہ ختم ہو جائے، تو عمرہ کرنے والوں کے لئے عمرہ حلال ہو جاتا ہے۔ جب ذوالحج کی چار تاریخ کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ احرام باندھے ہوئے مکہ میں آئے، تو آپ نے حکم دیا کہ اس احرام کو عمرے کے احرام میں تبدیل کر دو، صحابہ کرام پر یہ بات گراں گزری، انہوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! ہم کس طرح حلال ہوں، فرمایا: پورے حلال ہو جاؤ، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1240)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَوَقْتُهَا جَمِيْعُ السَّنَةِ إِلَّا خَمْسَةَ أَيَّامٍ تُكْرَهُ فِيْهَا الْعُمْرَةُ لِغَيْرِ الْقَارِنِ، كَذَا فِيْ "فَتَاوٰى قَاضِيْخَانْ"، وَهِيَ يَوْمُ عَرَفَةَ وَيَوْمُ النَّحْرِ وَأَيَّامُ التَّشْرِيْقِ۔

ترجمہ: ''عمرے کا وقت غیر قارن (جس نے حج وعمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام نہ باندھا ہو) کے لئے سارا سال ہے، سوائے پانچ دنوں کے (یعنی 9 تا 13 ذوالحجہ)، مگر جس نے حجِ قِران کا احرام باندھا ہو وہ ان دنوں میں بھی عمرہ ادا کرسکتا ہے، ''فتاوی قاضی خان'' میں بھی اسی طرح ہے اور یہ یوم عرفہ، یوم النحر اور (دیگر) ایامِ تشریق ہیں''۔

(فتاوی عالمگیری، جلد: 1، ص: 237، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ عبدالرحمٰن الجزیری لکھتے ہیں: لَهَا مِيْقَاتٌ زَمَانِيٌّ وَمِيْقَاتٌ مَكَانِيٌّ، فَأَمَّا الزَّمَانِيُّ فَهُوَ كُلُّ السَّنَةِ، فَيَصِحُّ إِنْشَاءُ الْإِحْرَامِ لِلْعُمْرَةِ مِنْ غَيْرِ كَرَاهَةٍ فِيْ أَوْقَاتِ السَّنَةِ، إِلَّا فِيْ أَحْوَالٍ مُفَصَّلَةٍ فِي الْمَذَاهِبِ، أَمَّا مِيْقَاتُهَا الْمَكَانِيُّ فَهُوَ كَمِيْقَاتِ الْحَجِّ۔

ترجمہ: ''میقات (وقت مقررہ) ظرف کا صیغہ ہے اور ظرفِ زمانی بھی ہوتا ہے اور مکانی بھی)، عمرے کے لئے ایک میقات زمانی ہے، جو پورا سال ہے، لہٰذا سال کے تمام اوقات میں عمرہ بغیر کسی کراہت کے جائز ہے، سوائے ان احوال کے جن کی تفصیل مذاہب فقہ میں بیان کی گئی ہے۔ اور ایک میقات مکانی ہے، پس جہاں تک میقاتِ مکانی کا تعلق ہے، تو عمرے کے لئے بھی میقات وہی ہے، جو حج کے لئے ہے''۔

(الفقہ علی مذاہب الاربعہ، جلد: 1، ص: 685)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سارے سال حتیٰ کہ شوال، ذیقعدہ، یا ذی الحجہ کے ابتدائی دنوں میں بھی بغیر کسی کراہت کے عمرہ ادا کیا جاسکتا ہے اور شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اجنبی عورت کا محرم بن کر عمرہ کرنا

سوال: 82

میری عمر 38 سال ہے، ایک کاروانِ حج وعمرہ کے توسط سے میں نے عمرہ پر جانے کی تیاریاں کی اور الحمد للہ چند روز میں روانگی ہے۔ حج وعمرہ سے متعلق سعودی

گورنمنٹ کی جانب سے پابندی عائد ہوگئی ہے کہ 40 سال سے کم کوئی شخص محرم عورت کے بغیر تنہا حج وعمرہ کے لئے نہیں جاسکتا۔ اس قانون کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا، عمرہ پر روانگی کی تمام کاروائی میں نے پہلے انجام دے دی تھی۔ اب میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا میرا اس طرح جانا درست ہوگا؟، جبکہ روانگی کی تاریخ بھی کنفرم ہوچکی ہے۔ سعودی قانون کا کاروانِ حج وعمرہ والوں نے حل یہ کیا ہے کہ اپنے گروپ میں موجود کسی خاتون کو وہ کاغذات میں اُس کا محرم ثابت کردیتے ہیں، کاغذی کاروائی پوری ہوجاتی ہے اور اس طرح عمرے پر جانے والے مرد وخواتین حج یا عمرے پر چلے جاتے ہیں، لیکن اِس دوران وہ اجنبی ہی رہتے ہیں۔ الگ الگ ہی رہائش ہوتی ہے، الگ ہی تمام معاملات انجام دیتے ہیں، صرف کاغذات میں وہ ایک دوسرے کے مَحرم شمار ہوتے ہیں۔ کاروان والے ازخود یہ کارروائی کرتے ہیں اور حج وعمرہ پر جانے والے کا اِس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا جیسا کہ میرے معاملے میں ہوا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ ایک شخص جس کی عمر 38 سال ہے، اب وہ سعودی قانون کو اہمیت دے یا عمرہ کی ادائیگی کے لئے جانے کو؟، نیز کیا اس شخص کا حج یا عمرہ کی ادائیگی درست ہوگی؟، (طاہر حسین، ڈبل اسٹوری مکان نمبر 23 سیکٹر D-11 نیو کراچی)۔

جواب:

عمرے کی ادائیگی کے لئے شریعت کی رو سے عُمر کی شرط نہیں ہے، یہاں تک کہ حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ لَقِيَ رَكْبًا بِالرَّوْحَاءِ فَقَالَ: مَنِ الْقَوْمُ؟، قَالُوا: الْمُسْلِمُوْنَ، فَقَالُوا: مَنْ أَنْتَ؟، قَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ فَرَفَعَتْ اِلَيْهِ امْرَأَةٌ صَبِيًّا فَقَالَتْ: أَلِهٰذَا حَجٌّ؟ قَالَ: نَعَمْ وَلَكِ أَجْرٌ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رَوحاء کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کی چند سواروں کے ایک قافلے سے ملاقات ہوئی، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کون لوگ ہیں؟، انہوں نے عرض کی: ہم مسلمان ہیں، پھر اُن لوگوں نے پوچھا:

آپ کون ہیں؟،آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا رسول، پھر ایک عورت نے ایک بچہ آپ کے سامنے اٹھا کر پوچھا: ''کیا اس کا بھی حج ہے (یعنی اسے حج کا ثواب ملے گا)''؟،آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں (یعنی اسے بھی حج کا ثواب ملے گا) اور تمہارے لئے بھی (اسے گود میں اٹھا کر حج کرانے کا) اجر ہے،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:3143)''۔

البتہ فرض حج کی ادائیگی کے لئے عاقل و بالغ ہونا شرط ہے اور عمرہ اپنی اصل کے اعتبار سے نفلی عبادت ہے۔لہٰذا اگر آپ عمرے پر چلے جائیں تو عمرہ صحیح طور پر ادا ہو جائے گا۔لیکن آپ کے کاروان والوں نے جھوٹ بول کر اور دھوکا دے کر آپ کا ویزا حاصل کیا ہے اور یہ گناہ ہے۔آپ کے بیان کے مطابق ابتدا میں تو آپ اس گناہ میں شامل نہیں تھے،لیکن اب چونکہ آپ کو حقیقت معلوم ہوگئی ہے،اس لئے اگر آپ یہ جاننے کے باوجود عمرے پر جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنے ٹریول ایجنٹ کی جھوٹ کے ذریعے حاصل کی ہوئی عمرے کی سہولت کو قائم رکھنے پر راضی ہیں اور گناہ پر راضی ہونا بھی گناہ ہے اور عمرے جیسی پاکیزہ اور بابرکت عبادت کا آغاز گناہ سے کرنا درست نہیں ہے،کیونکہ آپ جب ائیرپورٹ پر ان کے امیگریشن سے گزریں گے تو گویا آپ یہ ظاہر کر رہے ہوں گے کہ آپ کسی خاتون کے مَحرم ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے،اسی طرح کاروان والوں کو بھی جعل سازی اور دروغ بیانی سے گریز کرنا چاہئے،ہمارے بہت سے اہلِ وطن کو ٹریول ایجنٹوں کی خلافِ قانون دستاویزات کے سبب دوسرے ممالک میں قید کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ سعودی حکومت کا چالیس سال سے کم عمر والے ایسے مردوں پر، جو کسی خاتون کا مَحرم بن کر عمرے پر نہ جا رہے ہوں،عمرے کی پابندی لگانا شرعی حکم تو نہیں ہے؟،یہ بات بالکل درست ہے،لیکن حکومتوں کو اپنی انتظامی مصلحتوں کے تحت مباح امور میں قانون بنانے کا اختیار رہتا ہے،جیسے مختلف ممالک کے لئے حج کا کوٹہ مقرر کرنا۔اور کسی کے ملک

میں جب ہم ویزا لے کر داخل ہوتے ہیں تو اس کے قوانین کی پابندی ہم پر لازم ہوتی ہے، اور قانون توڑنے کی صورت میں اگر گرفت میں آ گیا تو عزت پامال ہوتی ہے اور مسلمان کو اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اسی طرح ویزا لیتے وقت جھوٹ بولنا گناہ ہے اور یہ کوئی ایسی اضطراری صورت حال نہیں ہے کہ جھوٹ اور غلط بیانی کی رخصت دی جائے۔

حدیث پاک میں ہے:

وَاِنَّ الْکِذْبَ یَهْدِیُ اِلَی الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ یَهْدِیُ اِلَی النَّارِ۔

ترجمہ: ''جھوٹ (اللہ کی) نافرمانی کا راستہ دکھاتا ہے اور فُجور (اللہ کی نافرمانی انسان کو) جہنم کا راستہ دکھاتی ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6094)''۔

عمرے کا طریقہ

سوال:83

عمرے کا طریقہ کیا ہے اور رمضان میں عمرہ کرنے کی فضیلت بیان فرمائیں؟۔

جواب:

عمرہ احرام باندھنے کے بعد چند افعال کا نام ہے، جس کا مفصل طریقہ درج ذیل ہے:

میقات سے پہلے احرام باندھے، جب احرام باندھنے کا ارادہ ہو تو پہلے غسل کرے (اگر کوئی مجبوری ہو تو وضو بھی کافی ہے)، حجامت کرائے، ناخن تراشے، بدن کی اچھی طرح صفائی کرکے احرام باندھ لے، احرام کی دو چادریں (نئی یا دھلی ہوئی سفید بہتر ہیں)، ایک اوڑھیں اور ایک تہبند کے طور پر باندھیں، سنت طریقہ یہ ہے کہ طواف کے وقت چادر داہنی بغل کے نیچے کرکے دونوں پلو بائیں مونڈھے پر ڈالیں اور طواف کے علاوہ باقی وقتوں میں عادت کے مطابق چادر اوڑھی جائے یعنی دونوں مونڈھے اور پیٹ، سینہ سب چھپا رہے۔ وقتِ مکروہ نہ ہو تو دو رکعت نماز بہ نیتِ احرام پڑھیں، پھر نیت کریں: اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اُرِیۡدُ الْعُمْرَۃَ فَیَسِّرْھَا لِیۡ وَتَقَبَّلْھَا مِنِّیۡ، نَوَیۡتُ الْعُمْرَۃَ وَاَحْرَمْتُ بِھَا مُخْلِصًا لِلّٰہِ تَعَالٰی

ترجمہ: ''اے اللہ! میں عمرہ کرنے کا ارادہ کرتا ہوں میرے لئے اسے آسان فرما اور مجھ سے اسے قبول فرما اور میں خالص اللہ کے لئے احرام باندھتا ہوں۔ پھر تلبیہ (لَبَّیْکَ ۔ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ۔ لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ ۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ ۔ لَاشَرِیْکَ لَکَ) پڑھے اور کثرت سے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے پڑھتا رہے، یاد رہے کہ خانۂ کعبہ پر جب پہلی نظر پڑے تو دعا مانگے، اس وقت جو بھی دعا کرے گا، ضرور قبول ہوگی۔ حجرِ اسود کے سامنے پہنچے تو یہ دعا پڑھے: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ صَدَقَ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

طواف شروع کرنے سے قبل مرد اضطباع کرلے یعنی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر دائیں مونڈھا کھلا رکھیں اور دونوں کنارے بائیں مونڈھے پر ڈال دے۔ حرم شریف پہنچنے کے بعد کعبہ کی طرف منہ کرکے حجرِ اسود کے داہنی طرف رکن یمانی کی جانب سنگِ اسود کے قریب اس طرح کھڑا ہو کہ حجرِ اسود داہنے ہاتھ کی طرف رہے، پھر طواف کی نیت کریں: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ طَوَافَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ فَیَسِّرْہُ لِیْ وَتَقَبَّلْہُ مِنِّیْ۔

اس نیت کے بعد کعبہ کی طرف منہ کئے ہوئے اپنی دہنی جانب چلئے، کانوں تک ہاتھ اٹھا کر (کہ ہتھیلیاں حجرِ اسود کی طرف رہیں) پڑھو: بِسْمِ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ۔

ممکن ہو تو دونوں ہتھیلیاں اور ان کے بیچ میں منہ رکھ کر حجرِ اسود کو بوسہ دو یا ہاتھ سے چھوکر یا اشارے سے یا لکڑی سے چھوکر بوسہ دو، اسے ''اِستلام'' کہتے ہیں۔ طواف کے پہلے تین پھیروں میں مرد رَمَل کرتا ہوا چلے یعنی چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے شانے ہلاتے ہوئے چلے لیکن اس عمل میں کسی کو ایذا نہ دے، باقی چار پھیروں میں آہستہ بغیر شانے ہلائے معمول کی رفتار سے چلے۔ جب سات پھیرے مکمل ہوجائیں تو آخر میں حجرِ اسود کو بوسہ دے ہر ایک پھیرے کی طرح۔ ساتوں پھیروں میں جو مسنون دعائیں ہیں انہیں کسی معتبر

کتاب سے یاد کرلے۔ مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھے، حدیث مبارک میں ہے کہ: جو مقامِ ابراہیم پر دو رکعت پڑھے اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ پھر ملتزَم پر آکر دعا کریں، پھر زمزم پی کر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے، سعی عمرے کے واجبات میں سے ہے۔ کوہِ صفا سے سعی کا آغاز کیا جائے گا، اگر مروہ سے شروع کی تو یہ شمار نہیں ہوگی۔ سعی کے ساتوں پھیرے پے در پے کرے ''میلین اخضرین'' کے دوران ہلکی رفتار سے دوڑیں (نوٹ: آج کل ان کی نشاندہی کے لئے مَسعیٰ میں ہری روشنی والی دو لائٹیں لگی ہوئی ہیں)، سعی کے بعد حلق یا قَصر کرے، اگر بال اتنے چھوٹے ہوں کہ ایک پور کے برابر نہ کتروا سکیں تو حلق ہی کرنا ہوگا۔ حلق کے معنی سر منڈانا ہے اور قصر سے مراد کم از کم انگلی کی ایک پور کے برابر بال کتروانا ہے۔ حلق یا قصر کے بعد احرام کھول دے، عام لباس پہنے، اس طرح عمرہ مکمل ہوگیا۔ متبرک مقامات کی زیارت مستحب ہے۔

عورتیں احرام میں سلے ہوئے کپڑے ہی پہنے رہیں، صرف چہرہ کھلا رہے، تلبیہ بلند آواز سے نہ پڑھیں بلکہ آہستہ آہستہ پڑھیں رمل نہ کریں۔ سعی کے وقت ''میلین اخضرین'' کے درمیان عام رفتار سے چلیں۔ سعی کے بعد اپنے بالوں کے آخری سرے سے صرف ایک پور انگلی کے برابر بال کتریں، ان کے لئے حلق جائز نہیں۔

رمضان میں عمرے کے بعد شوال تک قیام اور حج کی فرضیت

سوال: 84

ہمارے کافی لوگ رمضان میں عمرے کے لئے جاتے ہیں۔ ان میں سے جو رمضان میں واپس نہیں آپاتے اور ان پر شوال کا آغاز مکہ مکرمہ ہی میں ہو جاتا ہے، وہ حسبِ توفیق عمرہ ادا کر کے شوال میں واپس آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جو شخص ایامِ حج (یعنی شوال، ذیقعدہ اور ذوالحجہ) میں کسی بھی وجہ سے مکہ مکرمہ (یعنی حدودِ حرم) میں موجود ہو، اس پر حج فرض ہو جاتا ہے، حالانکہ ان واپس آنے والوں میں سے بعض کے پاس وہاں مزید قیام کے مصارف نہیں ہوتے، اور اگر کسی کے پاس مالی استطاعت ہو تب بھی سعودی

حکومت کے نزدیک یہ قیام غیر قانونی اور جرم ہے۔حکومت ایسے لوگوں کو گرفتار بھی کرتی ہے۔کیا شریعت کی روشنی میں ان لوگوں پر حج فرض ہوجائے گا اور نہ کرنے پر وہ گناہگار ہوں گے،(منور احمد صدیقی ،ملیر کراچی)۔

جواب:

رمضان المبارک میں عمرے کی ادائیگی بے شمار فضیلتوں اور برکات کی حامل ہے۔حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کی ایک عورت سے کہا:مَا مَنَعَكِ أَنْ تَحُجِّيْ مَعَنَا ؟،قَالَتْ: لَمْ يَكُنْ لَنَا اِلَّا نَاضِحَانِ فَحَجَّ أَبُوْ وَلَدِهَا وَابْنُهَا عَلٰى نَاضِحٍ وَّتَرَكَ لَنَا نَاضِحًا نَنْضِحُ عَلَيْهِ ،قَالَ: فَإِذَا جَاءَ رَمَضَانُ فَاعْتَمِرِيْ،فَأَنَّ عُمْرَةً فِيْهِ تَعْدِلُ حَجَّةً ۔

ترجمہ:''تم ہمارے ساتھ حج کرنے کیوں نہیں جاتیں؟''،اس نے جواب دیا:ہمارے پاس پانی لانے کے دو ہی اونٹ تھے،ایک پر میرا شوہر اور بیٹا حج کرنے گئے ہیں اور دوسرا اونٹ ہمارا پانی لانے کے لئے ہے۔آپ نے ارشاد فرمایا:''اچھا جب رمضان آئے تو عمرہ کرلینا، کیوں کہ رمضان میں عمرہ کرنے کا ثواب حج کے برابر ہے''۔

(صحیح مسلم،رقم الحدیث:3036)

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:فَعُمْرَةٌ فِيْ رَمَضَانَ تَقْضِيْ حَجَّةً ،أَوْ حَجَّةً مَعِيَ۔

ترجمہ:''رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے''۔یا یہ ارشاد فرمایا:''میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:3037)''۔

شوال میں عمرہ کرنے والے پر استطاعت کے بغیر حج فرض ہونے کی تحقیق کے ضمن میں علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:''ہمارے زمانے میں یہ مشہور ہے کہ جس شخص نے پہلے حج نہ کیا ہو،وہ اگر شوال میں عمرہ کرے تو اس پر حج فرض ہوجاتا ہے،خواہ اس کے پاس ایام حج تک وہاں ٹھہرنے اور کھانے پینے کی استطاعت نہ ہو اور خواہ اس کے پاس وہاں ٹھہرنے کے لئے سعودی عرب کا ویزا نہ ہو۔اگر وہ حج کیے بغیر واپس آگیا تو حج کا فرض اس کے

ذمے ہوگا۔اس پر لازم ہے کہ وہ کسی سے قرض لے کر یا کسی بھی طرح حج کرے۔اگر اس نے حج نہیں کیا اور مرگیا تو گناہ گار ہوگا۔ یہ فتویٰ قرآن، حدیث اور فقہ کے صریحاً خلاف ہے۔قرآن مجید میں آیا ہے:

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ O

ترجمہ: ''لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ اس کے گھر کا حج کریں جو اس کے راستے کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو (استطاعت کے باوجود حج نہ کرے اور) کفرانِ نعمت کرے تو اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے، (آل عمران: 97)''۔

اس آیت سے واضح ہوگیا کہ استطاعت کے بغیر حج فرض نہیں ہوتا۔

استطاعت کی تفسیر میں مولانا امجد علی لکھتے ہیں: ''سفر خرچ اور سواری پر قادر ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ یہ چیزیں اس کی حاجت سے فاضل ہوں، یعنی مکان، لباس، خادم اور سواری کا جانور اور پیشہ کے اوزار اور خانہ داری کے سامان۔اور قرض سے اتنا زائد ہو کہ سواری پر مکہ معظمہ جائے اور وہاں سے سواری پر واپس آئے۔اور جانے سے واپسی تک کے ایام کا نفقہ اور مکان کی مرمت کے لئے کافی مال چھوڑ جائے اور جانے آنے میں اپنے نفقے اور گھر اہل وعیال کے نفقے میں قدر متوسط کا اعتبار ہے، نہ کمی نہ اسراف۔عیال سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا نفقہ اس پر واجب ہے''۔

(بہار شریعت (بحوالہ: درمختار، عالمگیری)، جلد: 6، ص: 11,12، شیخ علی اینڈ سنز، کراچی)

اس عبارت سے واضح ہوگیا کہ شوال میں عمرہ کرنے والے جس شخص کے پاس حج کرنے تک مکہ معظمہ میں ٹھہرنے اور طعام کی استطاعت نہیں، اس پر حج فرض نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ مَّلَکَ زَادًا وَّرَاحِلَۃً تُبَلِّغُہٗ اِلٰی بَیْتِ اللّٰہِ وَلَمْ یَحُجَّ فَلَا عَلَیْہِ اَنْ یَّمُوْتَ یَھُوْدِیًّا اَوْ نَصْرَانِیًّا۔

ترجمہ: ''جس شخص کو حج کرنے سے کوئی ظاہری حاجت (طعام، قیام اور سفرخرچ کی کمی) مانع نہ ہوئی، نہ ظالم بادشاہ نہ کوئی ایسی بیماری جو حج سے مانع ہو، وہ شخص اس حال میں مرجائے کہ اس نے حج نہ کیا ہو، تو اس کے لئے برابر ہے خواہ وہ یہودی ہو کرے مرے یا نصرانی ہوکر، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 812)''۔

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ ظالم بادشاہ کے منع کرنے سے بھی حج فرض نہیں ہوتا اور جو شخص شوال میں واپسی کا ویزا لے کر عمرہ کرنے گیا ہے، اسے سعودی حکام مکے میں قیام کرنے سے منع کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں اور جو پکڑا جائے اسے پہلے گرفتار کر کے سزا دیتے ہیں پھر واپس اس کے ملک بھیج دیتے ہیں۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ جو لوگ شوال میں عمرہ کرنے والے پر بغیر استطاعت حج کرنے کو فرض کہتے ہیں، ان کا دعویٰ بلا دلیل ہے، (تبیان القرآن)۔

پھر ہر مسلمان پر اپنی عزت نفس کی پاسداری لازم ہے لہٰذا شوال تا ذوالحجہ مکہ مکرمہ میں قیام اور مصارف حج کی استطاعت کے باوجود قانون شکنی کر کے اپنے آپ کو مجرم بنانا، بعض لوگوں کا قیدی بن جانا یا ملک بدر کیا جانا اور اپنی عزت نفس کو پامال کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

قربانی اور ذبح کے مسائل

دین کے فرائض وواجبات کو ساقط کرنے کا کسی کو اختیار نہیں

سوال: 85

ایک ادارے کا سربراہ یہ کہتا ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ بدترین سیلاب کی زد میں ہیں، لوگوں کے گھر، مال، مویشی اور جانیں تباہ ہو رہی ہیں، لہٰذا 10 ذوالحجہ کو سنتِ ابراہیمی کے طور پر جو قربانی کی جاتی ہے، اس سال نہ کی جائے اور وہ رقم سیلاب زدگان کو بطورِ امداد دی جائے تاکہ اُن کی مشکلات میں کمی ہو سکے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ علمائے کرام نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ لوگ حج وعمرہ کے بجائے یہ رقم سیلاب زدگان پر خرچ کریں تو انہیں کئی حج اور عمرہ کا ثواب ملے گا۔ مزید یہ کہ حج صاحبِ استطاعت پر فرض ہے اور قربانی سنت۔ اس سلسلے میں رہنمائی فرمائیں۔

قاری محمد جمیل قادری، پاکستان رینجرز ہیڈ کوارٹر، غازی روڈ، لاہور

جواب:

اِس مسئلے کے حل سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ دین میں قربانی کی حیثیت کیا ہے؟، کیا اِس کا مقام یہی ہے کہ اِسے ہر شخص کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے کہ جو چاہے، جب چاہے، اپنی مرضی سے اِس کے حکم کو باطل کردے یا نافذ کردے۔ قربانی ہر صاحبِ نصاب بالغ مرد وعورت پر واجب ہے۔ قربانی کو واجب قرار دینے کے سلسلے میں ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

ترجمہ: ''اپنے رب کی نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے، (کوثر: 2)''۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَاعَمِلَ آدَمِيٌّ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ أَحَبَّ إِلَى اللّٰهِ مِنْ إِهْرَاقِ الدَّمِ ،إِنَّهَا لَتَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَأَشْعَارِهَا وَأَظْلَافِهَا ،وَإِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ أَنْ يَّقَعَ مِنَ الْأَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْساً۔

ترجمہ: ''اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قربانی کے دِن بنی آدم کا کوئی بھی عملِ (خیر) اللہ تعالیٰ کے نزدیک (قربانی کے جانور

کا) خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔اور قربانی کا یہ جانور قیامت کے دِن اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ (اللہ تعالیٰ کے حضور) آئے گا۔اور (قربانی کے جانور کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کے درجے کو پالیتا ہے، پس (اے مومنو!) تم خوش دِلی سے قربانی کیا کرو، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1493)''۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ كَانَ لَهُ سَعَةٌ ،وَلَمْ يُضَحِّ ،فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا ۔

ترجمہ: ''جس شخص کے پاس گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 3123)''۔

قربانی نہ کرنے پر وعید کا لاحق ہونا، اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب قربانی واجب ہو۔

عَنْ جُنْدُبِ بْنِ سُفْيَانَ قَالَ: شَهِدْتُ الْأَضْحٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهُ بِالنَّاسِ ،نَظَرَ اِلٰى غَنَمٍ قَدْ ذُبِحَتْ ،فَقَالَ: مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ ، فَلْيَذْبَحْ شَاةً مَكَانَهَا ،وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ ذَبَحَ ،فَلْيَذْبَحْ عَلَى اسْمِ اللّٰهِ ۔

ترجمہ: ''حضرت جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں عید الاضحیٰ کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، جب آپ ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا کر فارغ ہوئے، تو آپ ﷺ نے ذبح کی ہوئی بکری کو دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے نماز سے پہلے قربانی کی ہے، وہ اِس کی جگہ دوسری بکری کو ذبح کرے اور جس نے ابھی تک ذبح نہیں کیا، وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 5060)''۔

آیت اور احادیث مبارکہ میں قربانی کا امر (حکم) کیا ہے اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔

جس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے قربانی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنّت فرمایا ہے (سنّة ابيكم ابراهيم ،سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 3127)، اُس سے مراد یہ ہے کہ قربانی دین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور یہ وجوب کی نفی نہیں کرتا۔

امام برہان الدین علی المرغینانی لکھتے ہیں: اَلْاُضْحِيَّةُ وَاجِبَةٌ عَلٰى كُلِّ حُرٍّ مُسْلِمٍ مُقِيْمٍ

مُوسِرٍ فِیْ یَوْمِ الْاَضْحٰی عَنْ نَفْسِہٖ وَعَنْ وُلْدِہِ الصِّغَارِ، وَ اَمَّا الْوُجُوْبُ فَقَوْلُ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ وَمُحَمَّدٍ وَزُفَرَ وَحَسَنٍ وَاِحْدَی الرِّوَایَتَیْنِ عَنْ اَبِیْ یُوْسُفَ۔

ترجمہ: ''ہر آزاد، مسلمان، مقیم، مالدار پر ایامِ قربانی (10 تا 12 ذوالحجہ) میں اپنی طرف سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے قربانی کرنا واجب ہے، امام ابوحنیفہ، امام محمد، امام زفر، امام حسن اور ایک روایت میں امام ابو یوسف رحمہم اللہ اجمعین کے نزدیک قربانی واجب ہے، (ہدایہ، جلد7، ص:154)''۔

''ظاہر الروایۃ'' کے مطابق نابالغ پر قربانی واجب نہیں ہے، چنانچہ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: فَتَجِبُ التَّضْحِیَۃُ عَلٰی حُرٍّ مُسْلِمٍ مُقِیْمٍ مُوْسِرٍ عَنْ نَفْسِہٖ لَا عَنْ طِفْلِہٖ عَلَی الظَّاہِرِ بِخِلَافِ الْفِطْرَۃِ،

ترجمہ: ''ہر آزاد مقیم مالدار مسلمان پر اپنی طرف سے قربانی واجب ہے، (حنفی مذہب کی) ''ظاہر الروایۃ'' کے مطابق نابالغ بچے کی جانب سے قربانی واجب نہیں ہے، البتہ نابالغ کا فطرہ واجب ہے، ۔۔۔۔۔۔۔۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''ظاہر الروایۃ'' کے مطابق نابالغ کے لئے قربانی واجب نہیں بلکہ مستحب ہے البتہ صدقۂ فطر واجب ہے، امام حسن کی روایت کے مطابق اپنی نابالغ اولاد اور یتیم پوتے پوتی کی قربانی واجب ہے، مگر فتویٰ ''ظاہر الروایۃ'' پر ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی بالغ اولاد اور بیوی کی جانب سے قربانی کرے تو ان کی اجازت لے کر کرے۔ ایک روایت میں اگر بلا اجازت بھی کردی تو استحساناً جائز ہے، (ردالمحتار، جلد:9، ص:382)''۔

فقہائے مالکیہ میں متقدمین قربانی کے وجوب کے قائل ہیں اور متاخرین کے نزدیک سنتِ مؤکدہ ہے۔ حنابلہ اور شافعیہ کے نزدیک قربانی سنتِ مؤکدہ ہے۔ مذکور شخص کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ'' لوگ حج وعمرہ کے بجائے یہ رقم سیلاب زدگان پر خرچ کریں تو انہیں کئی حج اور عمروں کا ثواب ملے گا''۔ دراصل اُس شخص نے علماء کے موقف کو صحیح نہیں سمجھا۔ علماء کا بیان یہ تھا کہ فرض حج تو کسی طور پر بھی ساقط نہیں ہوتا، البتہ نفلی حج کو مؤخر

کر کے یہ رقم سیلاب زدگان پر خرچ کی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ اہلِ پاکستان پر ایک بہت بڑی آزمائش تھی اور عمرہ اپنی اصل کے اعتبار سے ہی ایک نفلی عبادت ہے۔ لیکن واجب قربانی کو نہ تو ترک کیا جاسکتا ہے، نہ ساقط کیا جاسکتا ہے۔ البتہ مالی حیثیت والے لوگ اگر اپنے روزمرّہ کے مصارف یا تعیُّشات میں کمی کر کے پس انداز کی ہوئی رقم سیلاب زدگان کی مدد پر صرف کریں تو یہ اُن کی دینی اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے اور اعلیٰ انسانی قدر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ O وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ O فَكُّ رَقَبَةٍ O أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ O يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ O أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ O

ترجمہ: ''پس وہ دشوار گھاٹی سے کیوں نہیں گزرا، اور آپ کیا سمجھے وہ دشوار گھاٹی کیا ہے؟، (قرض یا غلامی سے) گردن چھڑانا یا بھوک کے دِن کھانا کھلانا، ایسے یتیم کو جو رشتے دار بھی ہو یا (افلاس کے مارے ہوئے) خاک نشین مسکین کو، (البلد: 16-11)''۔

(2) مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ O قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ O وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ O

ترجمہ: ''(قیامت کے روز جہنمیوں سے پوچھا جائے گا:) کیا چیز تمہیں جہنم میں لے جانے کا سبب بنی، وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، (المدثر: 44-42)''۔

(3) وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ

ترجمہ: ''اور جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے، اُسے زمین پر قرار ملتا ہے، (الرعد: 17)''۔

ارشادِ رسول ﷺ ہے: خَيْرُ النَّاسِ: أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ۔

ترجمہ: ''بہترین انسان وہ ہے، جس کی ذات انسانیت کے لئے زیادہ نفع رساں ہو''۔

(الجامع الکبیر، رقم الحدیث: 11760)

قربانی بھی ضرورت مند انسانوں کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے۔ مویشی پالنے والے لوگ

سال بھر اسی آس پر جانور پالتے ہیں کہ ایامِ قربانی میں اُنہیں فروخت کر کے اپنی ضروریات پوری کریں گے، پھر قربانی کے گوشت سے بھی غریبوں اور ناداروں کی مدد کی جاتی ہے اور کھال بھی ناداروں کی مدد کا ایک ذریعہ ہے۔ نیز قربانی اسلام کا ایک شِعار ہے، حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام اور امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنّتِ جلیلہ ہے اور اس کی بے شمار شرعی حکمتیں اور برکات ہیں۔

قربانی کا وقت گزرنے کے بعد قربانی کا جانور زندہ صدقہ کردیا جائے

سوال: 86

زید نے دو گائے قربانی کی نیت سے خریدیں، پہلے دن ایک گائے، حضور ﷺ، حضرت امام حسن وحضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حضور غوثِ اعظم، حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ، اپنے بیٹے اور اپنے نام سے ذبح کی اور دوسری گائے تیسرے دن ذبح کرنا تھی، جس میں اُس کی زوجہ، مرحوم والدین اور چار حصے اپنی اولاد کی جانب سے رکھے تھے، لیکن تیسرے دن اچانک بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا، جس کی وجہ سے دوسری گائے ذبح نہیں کی جاسکی۔ اب اُس گائے کے بارے میں کیا حکم ہے؟۔ گیارہویں کے لنگر میں استعمال کی جائے یا آئندہ سال قربان کی جائے؟۔

محمد راشد خان، سیکٹر F-11 نیو کراچی

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَلَوْ تُرِكَتِ التَّضْحِيَةُ وَمَضَتْ أَيَّامُهَا تَصَدَّقَ بِهَا حَيَّةً نَاذِرٌ لِمُعَيَّنَةٍ وَفَقِيرٌ شِرَاهَا لَهَا وَبِقِيمَتِهَا غَنِيٌّ شِرَاهَا أَوْلَا۔

ترجمہ: ''اگر قربانی چھوڑ دی گئی اور ایامِ قربانی گزر گئے تو معینہ قربانی کی نذر ماننے والا اور فقیر جس نے جانور کی قربانی نیت سے خریدا ہو، وہ اُسے زندہ صدقہ کرے اور مال دار نے خواہ جانور خریدا ہو یا نہ خریدا ہو، اُس کی قیمت صدقہ کرے۔۔۔۔۔۔اس کی شرح میں طویل بحث کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں ''بدائع الصنائع'' میں ہے کہ قربانی کے لئے خریدی ہوئی بکری کی جب قربانی نہ کی یہاں تک کہ وقت گزر گیا، تو فقیر کی طرح مال دار بعینہٖ زندہ اُس جانور کو صدقہ کرے، اِس میں ہمارے علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے، کیوں کہ امام محمد نے کہا: یہ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور ہمارا قول ہے، اس مسئلے کی تفصیل وہاں پر موجود ہے اور یہ اُسی کے مطابق ہے جو ہم نے ابھی ''غایۃ البیان'' کے حوالے سے بیان کیا، اور ہر صورت میں ظاہر یہ ہے کہ اُس جانور کو جب ذبح کرے تو اُس کے لئے گوشت کا خود کھانا جائز نہیں ہے، جیسا کہ اُس کی قیمت میں سے کوئی چیز روکنا جائز نہیں ہے، توجہ طلب بات ہے۔ علامہ حصکفی نے جو یہ لکھا: ''(فَالْمُرَادُ بِالْقِیْمَۃِقِیْمَۃُ شَاۃٍ تُجْزِئُ فِیْھَا (یعنی قیمت سے مراد ایسی بکری کی قیمت جو قربانی کے معیار پر پورا اترے)''، یہ صاحبِ ''تنویرالابصار'' کے اِس مجمل قول کی تفصیل ہے، جو انہوں نے کہا: ''تَصَدَّقَ بِقِیْمَتِھَا''، ظاہر ہے کہ یہ اُس صورت کا بیان ہے، جب جانور پہلے سے خریدا ہوا تھا، کیونکہ اُس کی قیمت معلوم ہے، لیکن اگر پہلے سے خریدا ہوا نہیں تھا، تو ''اُس کی قیمت صدقہ کرے'' کے کیا معنی؟، کیونکہ وہ تو معین نہیں ہے، پس واضح ہوا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب پہلے سے خریدا ہوا نہ ہو، تو ایسے جانور کی قیمت صدقہ کرے جو قربانی کے معیار پر پورا اترتا ہو''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 9، ص: 89-388)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: وَلَوْ تُرِکَتِ التَّضْحِیَۃُ حَتّٰی مَضٰی وَقْتُھَا، تَصَدَّقَ بِھَا صَاحِبُھَا حَیَّۃً اِنْ کَانَتْ مَنْذُوْرَۃً اَوْ جَبَھَا عَلٰی نَفْسِہٖ، اَوْمُشْتَرَاۃً مِنْ فَقِیْرٍ اَوْ غَنِیٍّ لِلْاُضْحِیَۃِ، لِاَنَّھَا فِیْ حُکْمِ الْمَنْذُوْرَۃِ عُرْفًا۔ وَاَمَّا الْغَنِیُّ اِذَا لَمْ یَشْتَرِالْاُضْحِیَۃَ، فَیَتَصَدَّقُ بِقِیْمَۃِ شَاۃٍ عَلَی الصَّحِیْحِ، کَمَا فِی "الْبَدَائِعِ" وَھُوَ قَوْلُ الْاِمَامِ وَصَاحِبَیْہِ، لِاَنَّ الْاُضْحِیَۃَ وَاجِبَۃٌ عَلَی الْغَنِیِّ، وَتَجِبُ عَلَی الْفَقِیْرِبِالشِّرَاءِ بِنِیَّۃِ الْاُضْحِیَۃِ۔

ترجمہ ''اور اگر قربانی چھوڑ دی یہاں تک کہ قربانی کے دن گزر گئے، تو اس کا مالک اُسے زندہ صدقہ کرے، کیوں کہ اگر اُس کی نذر مانی تھی، تو اُس شخص نے خود اپنے اوپر واجب کر دیا یا

فقیر یا مال دار نے قربانی کی نیت سے جانور خریدا تھا، کیونکہ یہ بھی عرفاً نذر ہی کے معنی میں ہے۔لیکن اگر مال دار نے قربانی کے لئے جانور خریدا نہیں تھا(اور ایامِ قربانی میں قربانی نہیں کی)،تو صحیح قول کے مطابق وہ بکری کی قیمت صدقہ کرے،جیسا کے''بدائع الصنائع''میں ہے اور یہی امامِ اعظم اور صاحبین کا قول ہے، کیونکہ مال دار پر فی نفسہٖ قربانی واجب ہے اور فقیر پر قربانی کی نیت سے خریدنے سے واجب ہو جاتی ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ،جلد:04،ص:2715)

آپ نے جوصورتِ مسئلہ بیان کی ہے، بظاہر زید مال دار ہے اور اُس نے ایصالِ ثواب کیلئے مرحوم والدین کے لئے نفلی قربانی کی نیت کی تھی اور اپنی زوجہ اور اولاد کی قربانی ادا کرنا مقصود تھی ،صاحبِ ''بدائع الصنائع'' کے مطابق ائمہ احناف کا متفق علیہ قول یہی ہے کہ قربانی کے لئے خریدے ہوئے جانور کی قربانی اگر ایامِ قربانی میں کسی وجہ سے نہ کی ہو،تو فقیر کی طرح مالدار بھی بعینہٖ اُس جانور کو زندہ صدقہ کرے اور ذبح کر کے صدقہ کرنے کی صورت میں اُس کا گوشت خود نہ کھائے ،کیوں کہ اس جانور کا صدقہ کرنا واجب ہے اور جانور کو ذبح کرنے سے قیمت میں جتنی کمی آئی، اتنی رقم صدقہ کرنا ہوگی۔اگر اسے گیارہویں شریف کے لنگر میں استعمال کیا جائے تو وہ لنگر صرف مستحق زکوٰۃ فقراء کو کھلایا جائے۔آئندہ سال تک مؤخر نہیں کرنا چاہئے۔

قربانی کے جانور میں عقیقے کا حکم

سوال:87

قربانی کے جانور میں عقیقہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ محمد آصف اقبال اشرفی،کراچی

جواب:

قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ شامل کیا جاسکتا ہے،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:ھٰکَذَا لَوْ أَرَادَ بَعْضُھُمُ الْعَقِیْقَةَ عَنْ وَلَدٍ قَدْوُلِدَ لَهٗ مِنْ قَبْلُ لِأَنَّ ذَالِكَ جِھَةُ التَّقَرُّبِ بِالشُّکْرِ عَلٰی نِعْمَةِ الْوَلَدِ،

ترجمہ: ''اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے بچے کے عقیقے کا ارادہ کرے، قربانی سے قبل جس بچے کی ولادت ہوئی ہو (تو کرسکتا ہے) کیونکہ یہ نعمت اولاد کا شکر ادا کرنے کے سبب اللہ تعالیٰ کی عبادت کی حیثیت رکھتا ہے، (ردالمحتار، جلد 9، ص:395، بیروت)''۔

لڑکے اور لڑکی کے عقیقے کا فرق

سوال:88

عقیقے میں لڑکے اور لڑکی کی جانب سے کتنے جانور ذبح کیے جاتے ہیں؟۔

سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال، کراچی

جواب:

عقیقہ کرنا سنت ہے۔ سنت یہ ہے کہ لڑکے کے عقیقے میں دو بکرے یا بکری اور لڑکی کے عقیقے میں ایک بکری یا بکرا ذبح کی جائے، اگر بڑے جانور یعنی گائے وغیرہ میں حصہ لیا ہو تو لڑکے کی طرف سے دو حصے اور لڑکی کی طرف سے ایک حصہ شمار ہوگا۔ لڑکے کے عقیقے میں نر جانور اور لڑکی کے عقیقے میں مادہ جانور مناسب ہے لیکن اگر اس کے برعکس یا کسی ایک جنس کے جانور ذبح کیے جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

عَنْ یُوْسُفَ بْنِ مَاهَكَ :اَنَّهُمْ دَخَلُوْا عَلٰی حَفْصَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ فَسَأَلُوْهَا عَنِ الْعَقِیْقَةِ فَأَخْبَرَتْهُمْ أَنَّ عَائِشَةَ أَخْبَرَتْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَمَرَهُمْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ وَعَنِ الْجَارِیَةِ شَاةٌ ۔

ترجمہ: ''حضرت یوسف بن ماہک بیان کرتے ہیں کہ ہم حفصہ بنت عبدالرحمٰن کے پاس گئے اور اُن سے عقیقے کے بارے میں سوال کیا، اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خبر دی کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لڑکے کے عقیقے میں دو بکریاں اور لڑکی کے عقیقے میں ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1513، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:3162)

حضرت اُمّ کرز رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عقیقے کے بارے میں سوال کیا:

فَقَالَ: عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ ،وَعَنِ الْأُنثٰی وَاحِدَةٌ وَّلَا یَضُرُّکُمْ ذُکْرَانًا کُنَّ أَمْ إِنَاثًا۔

ترجمہ:'' آپ ﷺ نے فرمایا: لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری (ذبح کرو) اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ (جانور) نر ہو یا مادہ''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1516، سُنن ابوداوٗد، رقم الحدیث: 2827)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ،أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَقَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ کَبْشًا کَبْشًا۔

ترجمہ:'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے (عقیقے میں) ایک ایک مینڈھا ذبح کیا، (سُنن ابوداوٗد، رقم الحدیث: 2834)''۔

سُنن نسائی کی ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: عَقَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ، رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا بِکَبْشَیْنِ کَبْشَیْنِ۔

ترجمہ:'' رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن اور حضرت حسین کی طرف سے دو دو مینڈھے ذبح کئے، (سُنن نسائی، رقم الحدیث: 4230)''۔

شارح بخاری و مسلم شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی صاحب اس حدیث کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں جن احادیث کا ذکر ہے وہ سب سُنن ابوداوٗد اور سُنن نسائی میں بھی مذکور ہیں، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سُنن ابوداوٗد میں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے ایک ایک مینڈھے کو ذبح کرنے کا تذکرہ ملتا ہے اور سُنن نسائی میں دو دو مینڈھے ذبح کرنے کا ذکر ہے تو اس کی کیا توجیہہ ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی ولادت کے دن ایک ایک مینڈھا ذبح کیا اور ساتویں دن

ایک ایک مینڈھا اور ذبح کیا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک مینڈھا آپ نے اپنی طرف سے ذبح کیا اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کو دوسرا مینڈھا ذبح کرنے کا حکم دیا۔تو جس نے ایک ایک مینڈھے کے ذبح کی روایت کی اس نے آپ کی طرف ذبح کی حقیقی نسبت کی اور جس نے دودو مینڈھے ذبح کرنے کی روایت کی اس نے آپ کی طرف مجازاً نسبت کی،(تبیان القرآن،جلد2،ص:133)''۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ : أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ أَنْ نَّعُقَّ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَيْنِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةً

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کا عقیقہ کرنے کا حکم دیا''۔

(سنن ابن ماجہ،رقم الحدیث:3163)

طوطے کی حلت یا حرمت کا شرعی حکم

سوال:89

طوطا حلال ہے یا حرام؟۔(محمد اعیان،سیکٹر D-11،نیو کراچی)

جواب:

اس سوال کے جواب سے پہلے حُرمت (Prohibition) کی فقہی تعریف، اُس کے ثبوت کا شرعی معیار اور اُس کے حکم کا جاننا ضروری ہے۔فقہی اعتبار سے حرام کی دو قسمیں ہیں:(1) حرام قطعی (2) حرامِ ظَنّی یا مکروہِ تحریمی (1) حرام قطعی (Definite Prohibition)،حرام قطعی اُس حرام کو کہتے ہیں:جس کی حُرمت کا حکم ایسی دلیل سے ثابت ہو،جو قطعیُ الثّبوت اور قطعیُ الدّلالت ہو۔قَطعیُ الثّبوت سے مراد یہ ہے کہ نصِ قرآنی یا حدیثِ متواتر سے ثابت ہو،اُس کے ثبوت کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہ ہو۔اور قطعی الدلالت سے مراد یہ ہے کہ جس عبارت یا کلمے سے کوئی حرام ثابت ہے،اُس کی دلالت اپنے معنی پر حتمی،قطعی اور یقینی ہو،اُس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو اور نہ ہی وہ کلمہ ذومعنی ہو یعنی ایک سے زائد معانی کا احتمال رکھتا ہو،جیسے قتلِ ناحق،زنا،مُحرمات سے

نکاح، مُردار، ذبح کے وقت جانور کا بہنے والا خون، خنزیر اور وہ حلال جانور جس کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی اور کے نام پر تقرُّب (یعنی بندگی اور حصولِ ثواب) کی نیت سے ذبح کیا گیا ہو اور خمر، ان چیزوں کی حُرمت مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی سے ثابت ہے:

(۱) إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ

ترجمہ: ''اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کیا مُردار اور (رگوں سے بہا ہوا) خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا، (البقرہ: 173)''۔

(۲) إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ

ترجمہ: ''تم پر حرام کیا ہے صرف مُردار اور (رگوں سے بہا ہوا) خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا، (النحل: 115)''۔

(۳) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَآئِكُمْ ط

ترجمہ: ''حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری (وہ) مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں اور تمہاری عورتوں کی مائیں، (النسا: 23)''۔

(۴) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ٥

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اس کے سوا کچھ نہیں کہ شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر (سب) ناپاک ہیں شیطانی کاموں سے ہیں تو تم ان سے بچو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ، (المائدہ: 90)''۔

(۵) وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيلًا ط

ترجمہ: ''اور زنا کے قریب نہ جاؤ بے شک وہ بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے، (بنی اسرائیل: 32)''۔

(٦) وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ○

ترجمہ: ''جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے اور (اللہ تعالیٰ نے) اس کیلئے عذابِ عظیم تیار کر رکھا ہے''، (سورۃ النساء:93)۔

(2) حرامِ ظنّی (Indefinite Prohibition):

یہ اُس حرام کو کہتے ہیں جس کی حُرمت کا حکم ایسی دلیل سے ثابت ہو جو (۱) قطعی الدلالت، مگر ظنّی الثبوت ہے (۲) ظنّی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے، جیسے کُچلیوں سے شکار کرنیوالے درندوں (جیسے شیر، چیتا، بھیڑیا، کتا، بلی وغیرہ) اور پنجوں سے شکار کرنے والے پرندوں (جیسے باز، چیل، گدھ، کوا وغیرہ) کو رسول اللہ ﷺ نے حدیثِ پاک میں حرام قرار دیا۔ حدیث پاک میں ہے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ كُلِّ ذِىْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ وَعَنْ كُلِّ ذِىْ مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے تمام کُچلیوں والے درندوں اور چنگل (ناخنوں) والے پرندوں کو کھانے سے منع فرمایا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:4989)''۔

عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ، عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ: اَلَا اِنِّىْ اُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ، اَلَا يُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَقُوْلُ: عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ، فَمَا وَجَدْتُّمْ فِيْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ، وَمَا وَجَدْتُّمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ! اَلَا لَا يَحِلُّ لَكُمْ لَحْمُ الْحِمَارِ الْاَهْلِىِّ، وَلَا كُلُّ ذِىْ نَابٍ مِّنَ السَّبُعِ۔

ترجمہ: ''حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آگاہ ہو جاؤ! مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اُس کا مثل (حدیث) بھی، خبردار! عنقریب ایک پیٹ بھرا اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہوئے کہے گا کہ: اِس قرآن کو لازم سمجھو، سو

جو چیز تم اس میں حلال پاؤ، اُسے حلال جانو اور جو چیز تم اِس میں حرام پاؤ اُسے حرام جانو۔ سنو! تمہارے لئے پالتو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ ہی کچلیوں سے شکار کرنے والا درندہ، (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 4594)"۔

عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَلَا هَلْ عَسَى رَجُلٌ يَبْلُغُهُ الْحَدِيثُ عَنِّي وَهُوَ مُتَّكِئٌ عَلَى أَرِيكَتِهِ فَيَقُولُ: بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ، فَمَا وَجَدْنَا فِيهِ حَلَالًا اسْتَحْلَلْنَاهُ وَمَا وَجَدْنَافِيهِ حَرَاماً حَرَّمْنَاهُ، وَإِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُولُ اللّٰهِ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ۔

ترجمہ: "حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سنو! عنقریب ایک شخص جسے میری حدیث پہنچے گی اور وہ یہ کہے گا: تمہارے اور ہمارے درمیان اللہ کی کتاب (کافی) ہے، سو جو ہم اُس میں حلال پائیں گے، اُس کو حلال جانیں گے اور جو اُس میں حرام پائیں گے، اُس کو حرام جانیں گے، بے شک رسول اللہ ﷺ کا حرام فرمایا ہوا بھی ویسے ہی حرام ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا حرام فرمایا ہوا، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 2664)"۔

جانوروں کے حلال یا حرام ہونے کے حوالے سے فقہاء کا بیان کردہ قاعدہ یہ ہے:

علامہ یحییٰ بن شرف النووی شافعی لکھتے ہیں:

وَفِي هٰذِهِ الْأَحَادِيثِ دَلَالَةٌ لِمَذْهَبِ الشَّافِعِيِّ وَأَبِي حَنِيفَةَ وَأَحْمَدَ وَدَاوُدَ وَالْجُمْهُورِ أَنَّهُ يَحْرُمُ أَكْلُ كُلِّ ذِي نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ وَكُلِّ ذِي مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ۔ وَقَالَ مَالِكٌ: يُكْرَهُ وَلَا يَحْرُمُ، قَالَ أَصْحَابُنَا: اَلْمُرَادُ بِذِي النَّابِ مَايَتَقَوّٰى بِهٖ وَيَصْطَادُ وَاحْتَجَّ مَالِكٌ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰى ﴿قُلْ لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّماً الانعام: 145﴾ وَاحْتَجَّ أَصْحَابُنَا بِهٰذِهِ الْأَحَادِيثِ قَالُوا: وَالْآيَةُ لَيْسَ فِيهَا إِلَّا الْإِخْبَارُ بِأَنَّهُ لَمْ يَجِدْ فِي ذَالِكَ الْوَقْتِ مُحَرَّمًا إِلَّا الْمَذْكُورَاتِ فِي الْآيَةِ ثُمَّ أُوحِيَ إِلَيْهِ بِتَحْرِيمِ كُلِّ ذِي نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ فَوَجَبَ قَبُولُهُ وَالْعَمَلُ بِهٖ۔

ترجمہ:''امام شافعی ،امام ابوحنیفہ ،امام احمد ،داؤد(ظاہری)اور جمہور فقہاءِ اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ تمام کچلیوں والے درندے اور چنگل (ناخنوں) والے پرندے حرام ہیں اور ان احادیث میں جمہور کی دلیل ہے۔اور امام مالک فرماتے ہیں :حرام نہیں ہیں بلکہ مکروہ ہیں۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں کچلیوں والے درندوں سے مراد وہ جانور ہیں جو پنجوں سے گرفت کرتے ہیں اور شکار کرتے ہیں اور امام مالک نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا (آپ فرمادیجئے ! میں نہیں پاتا اُس وحی میں جو میری طرف کی گئی کسی کھانے والے پر کوئی حرام کی ہوئی چیز ،الانعام:145)۔ہمارے علماء نے ان احادیث سے استدلال کیا ہے اور آیت کے بارے میں فرمایا کہ اس میں تو صرف خبر ہے کہ اُس وقت مذکورہ چیزوں کے علاوہ حرام نہیں پایا گیا پھر اللہ تعالیٰ نے (رسول اللہ ﷺ کی طرف) کچلیوں والے درندوں کے بارے میں حرمت کی وحی فرمائی ،اب اس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے،(شرح صحیح مسلم ،جلد 6،ص:11)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَلَا یَحِلُّ ذُوْنَابٍ یَصِیْدُ بِنَابِہٖ) فَخَرَجَ نَحْوُ الْبَعِیْرِ (أَوْ مِخْلَبٍ) یَصِیْدُ بِمِخْلَبِہٖ أَیْ ظُفُرِہٖ ،فَخَرَجَ نَحْوَ الْحَمَامَۃِ (مِنْ سَبُعٍ) بَیَانٌ لِذِیْ نَابٍ وَالسَّبُعُ : کُلُّ مُخْتَطِفٍ مُنْتَہِبٍ جَارِحٍ قَاتِلٍ عَادَۃً (أَوْ طَیْرٍ)

ترجمہ:''اور جو (درندے) کچلیوں سے شکار کرتے ہیں اور جو (پرندے) اپنے پنجوں سے شکار کرتے ہیں ،حلال نہیں ہیں ،کچلیوں سے شکار کی قید لگانے سے اونٹ اِس سے نکل گیا اور پنجوں سے شکار کی قید لگانے سے کبوتر نکل گیا (اگر چہ وہ چنگل دار ہے لیکن چنگل سے شکار نہیں کرتا)۔اور درندہ ہر وہ جانور ہے جو اپنی عادت کے مطابق اُچک لے جانے والا غارت گر، پھاڑنے والا ،قاتل ہوتا ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار ،جلد 9،ص:368)''۔

فقیہ اعظم علامہ مفتی الحاج نوراللہ نعیمی رحمہ اللہ سے طوطے کی بابت پوچھا گیا کہ اس کا کھانا حلال ہے یا حرام؟۔سائل نے طوطے کے حرام ہونے کی بابت یہ دلیل دی کہ طوطا پنجے سے

کھاتا ہے اور جو پرندہ پنجے سے کھائے وہ حرام ہے۔۔۔۔۔(خلاصۂ سوال)۔آپ نے جواب میں لکھا:''قواعد وضوابطِ شریعتِ غرّاء(روشن شریعت) کی رُو سے طوطا حلال ہے کہ ایسا پرندہ جس میں بہنے والا خون ہو،اُس کی حرمت اِن دو چیزوں سے ثابت ہوتی ہے:
(۱)چنگل (مخلب) سے شکار کرنا (۲) مردار خور ہونا۔علامہ نوراللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤقف کی تائید میں جلیل القدر فقہاءِ کرام کی عبارات نقل کی ہیں،اُن میں یہی دو اصول بیان کئے گئے ہیں،یعنی مردار خور جانور کا گوشت حرام سے نشوونما پاتا ہے،لہٰذا وہ عادتاً خبیث ہوتا ہے۔۔۔۔۔آگے چل کر اُنہوں نے فتاویٰ برہنہ جلد2 ص:152 کا حوالہ بھی دیا ہے کہ حلال جانوروں کے بیان میں لکھا ہے:''و ہمچنیں بر طوق دار کما فی خزانۃ المفتیین''۔۔۔۔۔۔آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:
''بلکہ صریح طوطے کی تصریح بھی اسی صفحہ میں ہے:''و ہمچنیں طوطی و علیہ الفتویٰ''،بلکہ ہمارے امام اعظم علیہ الرحمہ کے ساتھ ائمۂ اربعہ سے حضرت امام مالک،حضرت امام احمد بن حنبل علیہما الرحمۃ بھی متفق ہیں،بلکہ ایک قول میں امام شافعی بھی متفق ہیں،میزانِ شعرانی،جلد2 صفحہ 62 میں ہے: وَالنَّظْمُ مِنَ الْمِيزَانِ مِنْ ذَالِكَ قَوْلُ الْاَئِمَّةِ الثَّلَاثَةِ فِي الْمَشْهُوْرِ عَنْهُمْ اَنَّهٗ لَاكَرَاهَةَ فِيْمَا نُهِيَ عَنْ قَتْلِهٖ كَالْخُطَّافِ (الی ان قال) وَالْبَبَّغَاءِ كَمَا فِي "الْغِيَاثِ" وَ"الصُّرَاحِ" وَ"منتهی الارب" وَ"مُنْتَخَبِ اللُّغَاتِ" وَالطَّاوُوْسِ مَعَ قَوْلِ الْاِمَامِ الشَّافِعِيِّ فِيْ اَرْجَحِ الْقَوْلَيْنِ اَنَّهٗ حَرَامٌ اَيْ وَالْقَوْلُ الْاٰخَرُ اَنَّهٗ حَلَالٌ وَكَذَا عُدَّ فِيْ كِتَابِ الْفِقْهِ عَلَى الْمَذَاهِبِ الْاَرْبَعَةِ الْبَبَّغَاءُ فِي الطُّيُوْرِ الْحَلَالِ فِيْ ج ۲ ص ۲ عِنْدَ الْاَئِمَّةِ الثَّلَاثَةِ،(فتاویٰ نوریہ،جلد3،ص:332 تا 335)''۔

علامہ نوراللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے طوطے کے حلال ہونے کا فتویٰ فقہی اصول کی بنیاد پر دیا ہے،لیکن ہمیں ائمہ مجتہدین کے فتاویٰ میں اس کے حلال ہونے کا صریح قول نہیں ملا، تاہم جن فقہاء نے طوطے کو حرام کہا ہے،اُن کی مراد حرامِ ظنّی اور حرامِ اجتہادی ہے اور حرامِ ظنّی مکروہ تحریمی ہوتا ہے،حرام قطعی نہیں۔علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: اَلْحَيَوَانُ

فِـی الْأَصْـلِ نَوْعَانِ : نَوْعٌ یَعِیْشُ فِی الْبَحْرِ وَنَوْعٌ یَعِیْشُ فِی الْبَرِّ ۔۔۔۔ وَأَمَّا الَّذِیْ یَـعِیْـشُ فِـی الْبَـرِّ فَـأَنْـوَاعٌ ثَلَاثَةٌ مَالَیْسَ لَهٗ دَمٌ أَصْلًا وَمَالَیْسَ لَهٗ دَمٌ سَائِلٌ وَمَالَهٗ دَمٌ سَـائِـلٌ فَـمَـالَادَمَ لَـهٗ مِثْـلُ الْـجَـرَادِ وَالـزُّنْبُـوْرِ وَالـذُّبَابِ وَالْعَنْكَبُوْتِ وَالْخُنْفَسَاءِ وَالْعَقْرَبِ وَالْبَبَّغَاءِ وَنَحْوُهَا لَایَحِلُّ أَكْلُهٗ إِلَّاالْجَرَادَ خَاصَّةً۔

ترجمہ: ’’حیوان اصل میں دوقسموں پر ہیں: ایک قسم وہ جو پانی میں رہتے ہیں اور دوسری قسم وہ جو خشکی میں رہتے ہیں۔۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ترجمہ: ’’اور رہے وہ جانور جو خشکی میں رہتے ہیں، اُن کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جن میں بالکل خون نہیں ہوتا اور دوسرے وہ جن میں بہنے والا خون نہیں ہوتا اور تیسرے وہ جن میں خون بہنے والا ہوتا ہے۔ پس وہ (جانور) جن میں خون نہیں ہوتا مثلاً ٹڈی، بھڑ، مکھی، مکڑی، گبریلا، بچھو، طوطا اور اُس کی مثل دوسرے جانور، (ان میں سے) ٹڈی کے سوا کسی کا کھانا جائز نہیں‘‘۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:289، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ نے طوطے کی حُرمت کی وجہ دمِ مسفوح نہ ہونا بیان کی ہے، جوکہ مشاہدے کے خلاف ہے، اس لئے عالمگیری کا یہ فتویٰ اُس طوطے کے بارے میں نہیں، ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ جس طوطے کی حُرمت کا فتویٰ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ دیتے ہیں، وہ کوئی اور ہو۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وحـرم الشـافـعی الـخـطـاف والببغاء والطّاوس والهد هد۔

ترجمہ: ’’امام شافعی نے خطاف (سیاہ رنگ کا چھوٹے پاؤں والا پرندہ) طوطا، مور اور ہُد ہُد کو حرام فرمایا ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، ص: 371، بیروت)‘‘۔

علامہ عبدالوہاب شعرانی متوفی 973ھ لکھتے ہیں:

مِـنْ ذَالِكَ قَـوْلُ الْأَئِمَّةِ الثَّلَاثَةِ فِی الْمَشْهُوْرِ عَنْهُمْ: أَنَّهٗ لَا كَرَاهَةَ فِیْمَا نُهِیَ عَنْ قَتْلِهٖ كَـالْـخُـطَّـافِ وَالْهُـدْ هُدِ وَالْخُفَّاشِ وَالْبُوْمِ وَالْبَبَّغَاءِ وَالطَّاوُوْسِ، مَعَ قَوْلِ الْإِمَامِ الشَّـافِـعِیِّ: فِـیْ أَرْجَـحِ الْقَوْلَیْنِ: أَنَّهٗ حَرَامٌ، فَالْأَوَّلُ مُخَفَّفٌ وَالثَّانِیْ مُشَدَّدٌ فَرَجَعَ

الْأَمْرُ إِلٰى مَرْتَبَتَي الْمِيزَانِ، وَوَجْهُ الْأَوَّلِ : أَنَّهُ لَوْكَانَ أَكْلُهُ يُؤْذِيْ لَمَا كَانَ نُهِيَ عَنْ قَتْلِهِ ،وَوَجْهُ الثَّانِيْ : أَنَّهُ لَايَلْزَمُ مِنَ النَّهْيِ عَنْ قَتْلِهِ حِلُّ أُكْلِهِ فَقَدْ يَحْرُمُ وَذَالِكَ كَلَحْمِ كَلْبِ الصَّيْدِ وَالْمَاشِيَةِ فَافْهَمْ ۔

ترجمہ:''ائمۂ ثلاثہ کامشہورقول اورامام شافعی کاقول یہی ہے کہ:جس کےقتل سےمنع کیاگیا ہےاس(کےکھانے)میں کوئی کراہت نہیں ہے،مثلاً:خطاف(سیاہ رنگ کاچھوٹےپاؤں والا پرندہ) ہُد ہُد ،چمگادڑ ،اُلّو ،طوطااورمور،امام شافعی کاایک قول(ائمۂ ثلاثہ)کےساتھ ہےاوردوقولوں میں سےراجح قول یہ ہےکہ:یہ(مذکورہ پرندے)حرام ہیں،پہلے(قول یعنی جس میں عدمِ کراہت کوبیان کیاگیا)میں تخفیف ہےاوردوسرےقول میں شدّت ہے، پھرمعاملہ میزان کےدومرتبوں کی طرف لوٹےگا(یعنی حلت اورحرمت کی دلیل کو دیکھاجائےگاکہ کس جانب دلیل قوی ہے)۔پہلی(عدمِ کراہت)کی وجہ:اگراُن کاکھانا موذی ہوتاتوان کےقتل سےنہ روکاجاتا،اوردوسری وجہ(حرمت کی)یہ ہے:اوراُن کےقتل سےروکنےسےیہ لازم نہیں آتاکہ اُن کاکھاناحلال ہےاورکبھی حرام بھی ہوتاہےجیسےشکاری کتے کاگوشت اورچرواہےکےساتھ(مویشیوں کی حفاظت کےلئے)چلنےوالاکتا،پس یہ مقام غورکاہے،(میزان الکبریٰ الشعرانیہ،جلد2،ص:73،بیروت)''۔

ڈاکٹروھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

وَحَرَّمَ الشَّافِعِيَّةُ أَكْلَ الْبَبَّغَاءِ وَالطَّاوُوْسِ لِخُبْثِ لَحْمِهِمَا ،كَمَاحَرَّمُوْا أُكْلَ الْهُدْهُدِ وَالصُّرَدِ (وَهُوَ طَائِرٌ فَوْقَ الْعُصْفُوْرِ يَصِيْدُ الْعَصَافِيْرَ)

ترجمہ:'' امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے طوطے اور مور کا کھانا اُس کے گوشت کے ناپاک(گندہ)ہونےکےسبب حرام فرمایاہے،جیسےہُد ہُد اورصُرَد(موٹےسر،سفید پیٹ اورسبز پیٹھ کاایک پرندہ جوچھوٹےپرندوں کوشکارکرتاہے)کاکھاناحرام فرمایاہے''۔

(الفقہ الاسلامی وأدلتہ،جلد4،ص:2796-2797)

عبدالرحمٰن الجزیری لکھتے ہیں:وَيَحِلُّ مِنَ الطَّيْرِ أُكْلُ الْعَصَافِيْرِ بِأَنْوَاعِهَا وَالسُّمَانِ

وَالْقُنبُرِ وَالزُّرْزُوْرِ وَالْقطَا وَالْكَرْوَانِ وَالْبُلْبُلِ وَالْبَبَّغَاءِ۔

ترجمہ:''پرندوں میں سے چڑیوں کی تمام اقسام، بٹیر، چنڈول یا چکاوک، زرزور (چڑیا سے بڑا ایک پرندہ)، قطا، کروان، بلبل اور طوطا کا کھانا حلال ہے''۔

(کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد2، ص:2، بیروت)

علامہ محمد بن موسیٰ بن عیسیٰ کمال الدین الدمیری رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

يَحْرُمُ أَكْلُهَا عَلَى الْأَصَحِّ فِي الرَّافِعِيِّ وَنَقَلَهُ فِي الْبَحْرِ عَنِ الصُّمَيْدِيِّ وَأَقَرَّهُ عَلَّلَ ذَالِكَ بِخُبْثِ لَحْمِهَا وَقِيْلَ حَلَالٌ لِأَنَّهَا تَأْكُلُ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَلَيْسَتْ مِنْ ذَوَاتِ السُّمُوْمِ وَلَامِنْ ذَوَاتِ الْمِخْلَبِ وَلَا أُمِرَ بِقَتْلِهَا وَلَا نُهِيَ عَنْهُ۔

ترجمہ:''رافعی میں لکھا ہے کہ صحیح قول کے مطابق طوطے کا گوشت حرام ہے، اس قول کو ''الصمیدی'' نے ''البحر'' میں لکھ کر برقرار رکھا ہے۔ طوطے کے حرام ہونے کی علت گوشت کی گندگی ہے۔ بعض اہلِ علم نے طوطے کا گوشت حلال قرار دیا ہے اس لئے کہ اس کی غذا پاکیزہ چیزیں ہیں چنانچہ طوطا زہریلے پرندوں میں سے نہیں ہے اور نہ ہی چنگل مارنے والوں میں سے ہے، نیز نہ طوطے کے مارنے کا حکم دیا گیا اور نہ اس سے منع کیا گیا ہے۔

(حیاۃ الحیوان، ص:104)

مندرجہ بالا تفصیلی دلائل کی روشنی میں، میں مفتی محمد نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے سے متفق ہوں کہ طوطا اور مور حلال ہیں، کیونکہ جس چیز کی حُرمت قرآن وسنت میں منصوص نہ ہو، تو اُس کا حکم ہمیں قرآن وسنت اور فقہ میں بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں دینا پڑے گا۔ اِس مسئلے میں اگرچہ اکابر فقہاء میں سے کسی کی رائے یا اَخذ کردہ نتیجے سے ہمیں دلیل کی بنیاد پر اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ تاہم جن فقہائے اُمت نے حرام کہا ہے، اُنہوں نے بھی اپنی معلومات اور علمی وفقہی دیانت کی بنیاد پر فیصلہ کیا ہے۔

نکاح کے مسائل

حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہ کا نکاح

سوال: 90

حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہ کا نکاح کس نے پڑھایا تھا؟۔

افتخار احمد، ایف بی ایریا، کراچی

جواب:

ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے اعلانِ نبوت سے پہلے ہوا اور اس دور کے دستور کے مطابق زوجین کے خاندان کے کوئی بزرگ بطورِ ولی وکالت کرتے اور اپنے خاندان کے فضائل اور تفاخر کی باتیں اپنے خطبے میں بیان کرتے تھے۔

حضرت خدیجہ کی طرف سے ان کے چچا عمرو بن اسد وکیل بنے۔ خواجہ ابو طالب نے حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف سے وکالت کا فریضہ انجام دیا۔ انہوں نے اس وقت ایک فصیح و بلیغ خطبہ نکاح ارشاد فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَنَا مِنْ ذُرِّیَّةِ اِبْرَاهِیْمَ وَزَرْعِ اِسْمَاعِیْلَ وَضِنْضِیْ مَعْدٍ وَّعُنْصُرِ مُضَرَ، وَجَعَلَنَا حَضَنَةَ بَیْتِهٖ وَسُوَّاسَ حَرَمِهٖ، وَجَعَلَ لَنَا بَیْتًا مَّحْجُوْجًا وَّحَرَمًا اٰمِنًا وَجَعَلَنَا الْحُکَّامَ عَلَی النَّاسِ ثُمَّ اِنَّ ابْنَ اَخِیْ هٰذَا مُحَمَّدُبْنُ عَبْدِاللّٰهِ (ﷺ) لَایُوْزَنُ بِرَجُلٍ اِلَّا رَجَحَ بِهٖ وَاِنْ کَانَ فِی الْمَالِ قُلًّا وَّاِنَّ الْمَالَ ظِلٌّ زَائِلٌ وَّاَمْرٌ حَائِلٌ وَّمُحَمَّدٌ (ﷺ) مَنْ قَدْ عَرَفْتُمْ قَرَابَتَهٗ وَقَدْ خَطَبَ خَدِیْجَةَ بِنْتَ خُوَیْلِدٍ، وَقَدْ بَذَلَ لَهَا مِنَ الصَّدَاقِ مَا اٰجِلُهٗ وَعَاجِلُهٗ اِثْنَتَا عَشَرَةَ اُوْقِیَّةً ذَهَبًا وَّنَشًّا وَهُوَ وَاللّٰهِ بَعْدَ هٰذَا لَهٗ نَبَاٌ عَظِیْمٌ وَخَطَرٌ جَلِیْلٌ۔

ترجمہ: ”سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، جس نے ہمیں حضرت ابراہیم کی اولاد سے، حضرت اسماعیل کی کھیتی سے، معد کی نسل اور مضر کی اصل سے پیدا فرمایا۔ اور ہمیں ایک ایسا (مقدس) گھر دیا جس کا حج کیا جاتا ہے۔ اور ایسا حرم بخشا جہاں امن ہی امن ہے اور

ہمیں لوگوں پر حاکم بنایا۔ حمد کے بعد میرا یہ بھتیجا محمد بن عبداللہ (ایسی شان کا مالک ہے کہ) دنیا کے جس بڑے آدمی کے ساتھ بھی اس کا مقابلہ کیا جائے گا، اِس کا درجہ بلند ہوگا۔ اگرچہ یہ مالدار نہیں ہے (تو کوئی بات نہیں) کیونکہ مال ایک ڈھلنے والا سایہ ہے اور یہ لوگوں کے درمیان گردش کرتا رہتا ہے۔ اور محمد ﷺ، جن کی قرابت کو تم خوب جانتے ہو، انہوں نے خدیجہ بنت خویلد کا رشتہ مانگا ہے اور ساڑھے بارہ اوقیہ سونا مہر میں دیا ہے، بخدا مستقبل میں ان کے لئے بڑی نوید ہے اور ان کا مرتبہ بلند ہے"۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل نے جوابی خطبہ دیا، جو درج ذیل ہے:

ترجمہ: "سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں وہ فضیلتیں بخشیں جن کو آپ نے گنا ہے۔ پس ہم سارے عرب کے سردار اور رہبر ہیں۔ ا رتم بھی ان صفات سے متصف ہو۔ قبیلہ کا کوئی فرد ان کا انکار نہیں کرتا اور کوئی شخص تمہاری فضیلت کو رد نہیں کرتا۔ ہم اپنا تعلق تم سے استوار کرنے میں بڑا اشتیاق رکھتے ہیں۔ اے خاندانِ قریش کے سردارو! گواہ رہو: میں نے خدیجہ دختر خویلد کا نکاح محمد بن عبداللہ کے ساتھ کر دیا ہے"۔

پھر خواجہ ابو طالب کی خواہش پر حضرت خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد نے بھی چند کلمات کہے، جو درج ذیل ہیں:

اِشْهَدُوْا يَامَعَاشِرَ قُرَيْشٍ اِنِّيْ قَدْ اَنْكَحْتُ مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِاللهِ (ﷺ) خَدِيْجَةَ بِنْتَ خُوَيْلِدٍ وَّشَهِدَ عَلٰى ذَالِكَ صَنَادِيْدُ قُرَيْشٍ،

ترجمہ: "اے قبائل قریش! گواہ رہنا کہ میں نے محمد بن عبداللہ (ﷺ) کا نکاح خدیجہ بنت خویلد کے ساتھ کر دیا ہے اور اس پر قریش کے بڑے بڑے سردار گواہ ہیں"۔

(ضیاء النبی، جلد: دوم، ص: 137-136، بحوالہ: خاتم النبیین مصنفہ امام محمد ابو زہرہ)

نکاح کے وقت حضور ﷺ کی عمر مبارک 25 سال تھی اور حضرت خدیجہ کی عمر 40 سال تھی، وہ اس سے پہلے دو بار بیوہ ہو چکی تھیں۔

نکاح میں ایک بار ایجاب وقبول کافی ہے

سوال: 91

نکاح کے وقت دولہا سے تین مرتبہ قبول کرانا ضروری ہے یا ایک مرتبہ ہی کے قبول کروانے سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے؟،(محمد رمیز، سیکٹر 11-D، نارتھ کراچی)۔

جواب:

عقدِ نکاح ہو یا کوئی اور عقد (معاہدہ) ہو، ایک بار ہی قبول کرنا کافی ہے تین مرتبہ کہنے کی حاجت نہیں اور اگر تین مرتبہ کہا جائے، تو اِس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ نکاح کرنے والے کو تین مرتبہ قبول کرنا شرط ہے یا ایک بار؟، آپ نے جواب میں لکھا کہ ''نکاح، خواہ کوئی اور عقد ہو، میں تین بار قبول اصلاً ضرور نہیں، ایک ہی بار کافی ہے اور تین بار تین طرح الفاظِ قبول ادا ہونا کچھ مضر نہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص:217)''۔ یعنی ایجاب وقبول کے الفاظ ایک ہی بار کہنے سے نکاح منعقد ہو جائے گا، تین بار کہنا ضروری نہیں ہے اور کہنے میں حرج بھی نہیں ہے، بس مزید تاکید ہو جائے گی۔

خطبۂ نکاح کب پڑھا جائے اور کیسے (کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر)

سوال:92

نکاح کا خطبہ ایجاب وقبول سے پہلے پڑھا جائے یا بعد میں اور یہ خطبہ کھڑے ہو کر پڑھنا چاہئے یا بیٹھ کر؟،(محمد رمیز، سیکٹر 11-D، نارتھ کراچی)۔

جواب:

نکاح کا خطبہ ایجاب وقبول سے پہلے پڑھنا مستحب ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَيُنْدَبُ اِعْلَانُهٗ وَتَقْدِيْمُ خُطْبَةٍ ، ترجمہ: ''اور نکاح کا اعلانیہ ہونا اور اس سے پہلے خطبہ پڑھنا مستحب ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص:57، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

تمام خطبے خواہ نمازِ جمعہ کے ہوں یا عیدین کے، اُن میں قیام (کھڑا ہونا) افضل ہے، لیکن نکاح کا خطبہ نفل ہے، بیٹھ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ خطبۂ نکاح کھڑے ہو کر پڑھنا چاہئے یا بیٹھ کر؟، آپ نے جواب میں لکھا:

''اگر چہ خطبے میں مطلقاً افضل قیام ہے کہ آواز بھی دور پہنچتی ہے اور باعثِ توجہ حاضرین بھی ہوتا ہے اور اس امر میں سب خطبے مشترک ہیں، ہاں جو خطبہ سواری پر ہوتا ہے جیسے خطبۂ عرفہ، وہاں قیامِ مَرکب قائم مقام راکب ہے، مگر نفلی خطبات بیٹھ کر بھی ثابت ہیں، ''اِبْنُ جَرِیْرٍ'' عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ قَالَ سَمِعْتُ مَعْرُوْرًا اَوِ ابْنَ مَعْرُوْرِ ن التَّمِيْمِيَّ قَالَ: سَمِعْتُ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ وَصَعِدَ الْمِنْبَرَقَعَدَ دُوْنَ مَقْعَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِمَقْعَدَيْنِ فَقَالَ :اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا لِمَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَمْرَكُمْ۔

ترجمہ: '' ابن جریر نے سماک بن حرب سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا: میں نے معرور یا ابن معرور تمیمی سے سنا اُنہوں نے کہا: میں نے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا: جب آپ منبر پر حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی نشست گاہ سے دو سیڑھیاں نیچے تشریف فرما ہوئے، تو آپ نے فرمایا: ''میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور جسے اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے معاملات کا والی بنایا ہو، اس کے فرمان کو سنو اور اس کے احکام کی اطاعت کرو''۔ اور خطبۂ نکاح نفل ہی ہے، تو بیٹھ کر بھی مضائقہ نہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص:222، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ٹیلی فون پر لڑکے اور لڑکی کا ایجاب وقبول

سوال:93

روزنامہ ایکسپریس ''تفہیم المسائل'' کالم میں آپ نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے: ''تین چیزیں ایسی ہیں (کہ ہر طور پر نافذ اور مؤثر ہوتی ہیں) سنجیدگی سے کہی جائیں تب بھی اور مذاق میں کہی جائیں تب بھی، نکاح، طلاق اور رجعت''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث:1184)

سوال یہ ہے کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی کی منگنی ہوئی۔لڑکے نے ٹیلی فون پرلڑکی سے کہا:''مجھ سے یہ جملہ کہو،تو مجھے قبول ہے''۔لڑکی نے کہہ دیا:''تم مجھے قبول ہو،تم مجھے قبول ہو'' حالاں کہ اس وقت وہاں کوئی گواہ نہیں تھا،کیا یہ نکاح ہوگیا؟۔بعد میں ان کی منگنی ٹوٹ گئی اورلڑکی کی کسی دوسری جگہ شادی ہوگئی؟۔کیالڑکی نے نکاح پرنکاح نہیں کیا؟۔اگرطلاق مذاق میں ہوجاتی ہےتو کیا نکاح مذاق میں نہیں ہوتا؟۔

(محمد بشیر،ساہیوال،ضلع سرگودھا)

جواب:

ٹیلی فون پر یا تنہائی میں لڑکے اورلڑکی کے ایجاب وقبول سے نکاح منعقد نہیں ہوتا،ایسا نکاح فاسد ہے۔نکاح کے لئے چند امور ضرور ہیں:نکاح کا علانیہ طور پر ہونا مستحب ہے۔حضرت عائشہ صدیقہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا:

أَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ،وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ،وَاضْرِبُوْا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ۔

ترجمہ:''(لوگو!)نکاح کا اعلان کیا کرو(یعنی اس کی تشہیر کیا کرو)اورمسجدوں میں نکاح کرواوراس کی تشہیر کے لئے دف بجایا کرو''۔

(سُنن ترمذی،رقم الحدیث:1089)

نکاح کے صحیح طورپرمنعقد ہونے کے لئے رکنِ نکاح ایجاب وقبول کے موقع پرمجلسِ نکاح میں دوگواہوں کا ہونا شرط(ضروری)ہے،خواہ لڑکا اورلڑکی براہِ راست ایجاب وقبول کریں یابذریعۂ وکیل،اگروکیل کے ذریعے ایجاب وقبول ہوتو اس امر کے ثبوت کے طورپرکہ لڑکی نے ایک مقررہ مہرپراس لڑکے ساتھ اس وکیل کواپنے نکاح کا اختیاردیا ہے،الگ سے دوگواہوں کا ہونا بہتر ہے۔گواہوں کے بغیر نکاح پروعید آئی ہے۔

نبی ﷺ نے ارشادفرمایا:اَلْبَغَايَا اللَّاتِيْ يُنْكِحْنَ أَنْفُسَهُنَّ بِغَيْرِ بَيِّنَةٍ۔

ترجمہ:''بدکارعورتیں وہ ہیں جوبغیرگواہوں کے اپنا نکاح کرتی ہیں''۔

(سُنن ترمذی،رقم الحدیث:1103)

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا کہ اگر عورت مرد باہم ایجاب وقبول کرلیں اور کسی کو اطلاع نہ ہو تو کیا یہ نکاح ہو جائے گا؟۔

آپ نے جواب میں لکھا کہ دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر نکاح فاسد ہے۔ پھر آپ نے مندرجہ بالا حدیث مبارک کا حوالہ دیا۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 11، ص: 219، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

شیخ الاسلام برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی لکھتے ہیں:

(وَلَایَنْعَقِدُ نِکَاحُ الْمُسْلِمِیْنَ اِلَّا بِحُضُوْرِ شَاھِدَیْنِ حُرَّیْنِ عَاقِلَیْنِ بَالِغَیْنِ مُسْلِمَیْنِ رَجُلَیْنِ أَوْ رَجُلٍ وَّامْرَأَتَیْنِ عُدُوْلًا کَانُوْا أَوْ غَیْرَ عُدُوْلٍ أَوْ مَحْدُوْدَیْنِ فِی الْقَذْفِ۔

ترجمہ: ''(جب تک مجلسِ نکاح میں) دو آزاد، عاقل اور بالغ مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں موجود نہ ہوں، مسلمانوں کا نکاح (شرعی طور) پر منعقد ہی نہیں ہوتا وہ گواہ خواہ عادل ہوں یا غیر عادل یا محدود فی القذف ہوں''۔ اس کی شرح میں علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: أَمَّا اشْتِرَاطُ الشَّهَادَةِ فَلِقَوْلِهِ ﷺ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِشُهُوْدٍ۔

ترجمہ: '' نکاح کے صحیح طور پر منعقد ہونے کے لئے فقہائے کرام نے دو گواہوں کی جس موجودگی کو شرط قرار دیا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے ثابت ہے: ''(غیر کفو میں) ولی کی اجازت کے بغیر اور (اسی طرح) دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا''۔

(فتح القدیر مع ہدایہ، جلد: 3، ص: 190,191، مطبوعہ: مرکز اہلسنت برکات رضا)

وَالصَّحِیْحُ مَارُوِیَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَوْلُهٗ: لَانِکَاحَ اِلَّا بِبَیِّنَةٍ۔

امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے: ''گواہوں کے بغیر نکاح جائز نہیں''۔ (سُنن ترمذی، جلد 2، ص: 185)

امام اعظم ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے نزدیک نکاح کے صحیح طور پر منعقد

ہونے کے لئے دوگواہوں کا ہونا شرط ہے۔

آپ نے میرے ایک سابقہ فتوے کا اقتباس نقل کرتے ہوئے، ایک حدیث کا حوالہ دیا جس میں واضح ہے کہ نکاح اور طلاق کے کلمات سنجیدگی سے ادا کئے جائیں (یعنی ارادۂ نکاح وطلاق سے بولے جائیں) یا مذاق میں، ہر صورت میں، وہ شرعاً مؤثر اور نافذ العمل ہوجاتے ہیں۔ان کا ثبوت بھی دوگواہوں کی موجودگی کی شرط کے ساتھ ہوگا۔

حقیقی چچا، رضاعی بھائی اور اس کی اولاد سے نکاح

سوال: 94

ایک بچے نے چھ ماہ کی عمر میں اپنی دادی کا دودھ پیا تھا۔اس لحاظ سے وہ بچہ اپنے چچا کا رضاعی بھائی ہوا۔کیا اسی چچا کی بیٹی سے نکاح شرعاً درست ہے؟۔

(شاہد عزیز ساغر، ضلع ملتان)

جواب:

وہ بچہ جس نے ایامِ رضاعت میں اپنی دادی کا دودھ پیا ہے، اُس کے تمام چچا اور پھوپھیاں اس کے رضاعی (دودھ شریک) بھائی اور بہنیں ہیں اور چچا زاد لڑکیاں بالترتیب اس کی رضاعی بھتیجیاں اور بھانجیاں ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی سے بھی اس کا نکاح جائز نہیں ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

يَحْرُمُ عَلَى الرَّضِيعِ أَبَوَاهُ مِنَ الرَّضَاعِ وَأُصُوْلُهُمَا وَفُرُوْعُهُمَا مِنَ النَّسَبِ وَالرَّضَاعِ جَمِيْعًا حَتّٰى أَنَّ الْمُرْضِعَةَ لَوْ وَلَدَتْ مِنْ هٰذَا الرَّجُلِ أَوْ غَيْرِهِ قَبْلَ هٰذَا الْإِرْضَاعِ أَوْبَعْدَهُ أَوْ أَرْضَعَتْ رَضِيْعًا أَوْ وُلِدَ لِهٰذَا الرَّجُلِ مِنْ غَيْرِ هٰذِهِ الْمَرْأَةِ قَبْلَ هٰذَا الْإِرْضَاعِ أَوْبَعْدَهُ أَوْ أَرْضَعَتْ اِمْرَأَةٌ مِّنْ لَّبَنِهِ رَضِيْعًا، فَالْكُلُّ إِخْوَةُ الرَّضِيعِ وَأَخَوَاتُهُ وَأَوْلَادُهُمْ أَوْلَادُ إِخْوَتِهِ وَأَخَوَاتِهِ وَأَخُو الرَّجُلِ عَمُّهُ وَأُخْتُهُ عَمَّتُهُ وَأَخُو الْمُرْضِعَةِ خَالُهُ وَأُخْتُهَا

خَالَتُهٗ وَ كَذَا فِي الْجَدِّ وَالْجَدَّةِ۔

ترجمہ: ''دودھ پینے والے پر اس کے رضائی ماں باپ اور ان کے تمام اصول اور فروع حرام ہو جاتے ہیں، خواہ وہ نسبی رشتے سے اصول وفروع ہوں یا رضائی رشتے سے، حتیٰ کہ اگر دودھ پلانے والی کے ہاں اسکے موجودہ شوہر سے یا کسی اور شوہر سے کوئی اولاد ہو، خواہ دودھ پلانے سے پہلے ہو یا دودھ پلانے کے بعد ہو یا وہ کسی اور بچے کو دودھ پلائے یا دودھ پلانے والی کے شوہر کی کسی اور بیوی سے اولاد ہو، خواہ اس کو دودھ پلانے سے پہلے یا بعد میں، تو یہ سب دودھ پینے والے کے بھائی اور بہن اور ان کی اولاد اس کے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہیں۔ دودھ پلانے والی کے شوہر کا بھائی اس کا چچا ہے اور اس کی بہن اس کی پھوپھی ہے اور دودھ پلانے والی کا بھائی اس کا ماموں ہے اور بہن اس کی خالہ ہے۔ اسی طرح دادا، دادی اور نانا، نانی کے رشتے ہیں، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: اول، ص: 343، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

حقیقی خالہ کی نواسی سے نکاح جائز ہے

سوال: 95

میری خالہ کی حقیقی بیٹی کی ایک بیٹی ہے، جو رشتے کے اعتبار سے میری بھانجی لگتی ہے۔ کیا اُس سے میرا نکاح جائز ہے؟، (محمد ریحان علی، ایف۔ بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

جی ہاں! حرمتِ نکاح کا کوئی اور سبب موجود نہ ہو، تو یہ نکاح جائز ہے۔ جب خود خالہ کی بیٹی سے نکاح ہو سکتا ہے، تو اس کی بیٹی سے بطریقِ اولیٰ ہو سکتا ہے۔ خالہ کی بیٹی محرمات (وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے) میں شامل نہیں، خالہ کی بیٹی سے بھی ہو سکتا ہے۔ جن خواتین سے شرعاً نکاح حرام ہے، قرآن مجید سورۂ نساء کی آیات 22 تا 24 میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور پھر مزید فرمایا: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ۔

ترجمہ: ''اور ان (مذکورہ محرمات عورتوں) کے علاوہ باقی سب عورتوں کے ساتھ تمہارا نکاح

جائز ہے،(النساء:24)''۔

مفتی محمد نور اللہ نعیمی نور اللہ مرقدہٗ سے ایک سوال ہوا کہ:''آیا زید کی حقیقی خالہ کی حقیقی نواسی سے زید کا نکاح ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں؟'' کے جواب میں لکھتے ہیں:''ہاں! جائز ہے، اللہ رب العالمین جلّ وعلا نے فرمایا: وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَآءَ ذَالِكُمْ (پارہ:۵)اور شامی جلد2،ص:380 میں فتح القدیر سے ہے: وَفُرُوْعُ أَجْدَادِهٖ وَجَدَّاتِهٖ بِبَطْنٍ وَّاحِدٍ فَلِهٰذَا تَحْرُمُ الْعَمَّاتُ وَالْخَالَاتُ وَتَحِلُّ بَنَاتُ الْعَمَّاتِ وَالْأَعْمَامِ وَالْخَالَاتِ وَالْأَخْوَالِ۔ (یعنی اجداد وجدات کے فروع جو ایک بطن سے ہوں (ان سے نکاح جائز ہے)، لہٰذا پھوپھیوں اور خالاؤں سے تو نکاح حرام ہے،(لیکن) پھوپھی زاد، چچازاد، خالہ زاد اور ماموں زاد بہنوں سے نکاح جائز ہے)اور یونہی کتاب الفقہ جلد4،ص:61، 62 میں بھی ہے،(فتاویٰ نوریہ،جلد2،ص:446)''۔

سالی کی نواسی سے نکاح جائز نہیں

سوال: 96

میں ملک محمد بنارس ولد ملک محمد عارف پہلے سے شادی شدہ ہوں، لیکن اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔میری بیوی اپنی بہن کی نواسی سے میری دوسری شادی کروانا چاہتی ہے۔کیا یہ رشتہ جائز ہے؟،(ملک محمد بنارس،جہلم)۔

جواب:

محرماتِ نکاح کی نو اقسام میں سے ایک قسم''جمع بین المحارم'' ہے یعنی وہ عورتیں کہ ان میں سے اگر ایک کو مرد فرض کریں تو دوسری اُس کے لئے حرام ہو، مثلاً''دو بہنیں'' کہ ایک کو مرد فرض کریں، تو بھائی بہن کا رشتہ ہوا یا''پھوپھی بھتیجی'' کہ پھوپھی کو مرد فرض کریں، تو''چچا اور بھتیجی'' کا رشتہ ہوا اور بھتیجی کو مرد فرض کریں، تو''پھوپھی اور بھتیجے'' کا رشتہ یا ''خالہ بھانجی'' کہ خالہ کو مرد فرض کریں، تو''ماموں اور بھانجی'' کا رشتہ ہوا اور بھانجی کو مرد فرض کریں، تو بھانجے اور خالہ کا رشتہ ہوا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَالْأَصْلُ أَنَّ كُلَّ

امْرَأَتَيْنِ لَوْ صَوَّرْنَا اِحْدَاهُمَا مِنْ أَيِّ جَانِبٍ ذَكَرًالَمْ يَجُزِ النِّكَاحُ بَيْنَهُمَا بِرَضَاعٍ أَوْ نَسَبٍ لَمْ يَجُزِ الْجَمْعُ بَيْنَهُمَا هٰكَذَا فِي الْمُحِيطِ۔

ترجمہ: ''اور قاعدہ یہ ہے کہ ایسی دو عورتیں جن میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو ان کا آپس میں نکاح جائز نہ ہو، نسب کے رشتے سے ہی خاص نہیں بلکہ رضائی رشتے میں بھی دونوں کا جمع کرنا حرام ہے، ''محیط'' میں بھی اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 277، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

اللہ جل شانہٗ نے محرمات نکاح کے تفصیلی احکام میں ارشاد فرمایا: وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ۔ (ترجمہ) ''اور کسی شخص کا (بیک وقت) اپنے نکاح میں دو بہنوں کا جمع کرنا بھی حرام ہے، (النساء)''۔ آیت میں اگرچہ صراحت کے ساتھ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا گیا ہے، لیکن مفسرین کرام اور فقہاءِ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ ایسی ہر دو عورتوں کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، جن میں سے ہر ایک کو مرد فرض کریں تو ان دونوں میں حرمت کا رشتہ قائم ہو جائے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "لَا يُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَعَمَّتِهَا، وَلَا بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بھتیجی اور اس کی پھوپھی'' کو اور ''بھانجی اور اس کی خالہ'' کو نکاح میں ایک ساتھ جمع نہ کیا جائے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5109)''۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ أَرْبَعِ نِسْوَةٍ أَنْ يُجْمَعَ بَيْنَهُنَّ "الْمَرْأَةِ وَعَمَّتِهَا" "وَالْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عورتوں کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے، ''بھتیجی اور اس کی پھوپھی'' اور ''بھانجی اور اس کی خالہ''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3333)''۔

عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ : حَدَّثَنِي قَبِيصَةُ بْنُ ذُؤَيْبٍ :أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ : نَهَى النَّبِيُّ ﷺ أَنْ تُنْكَحَ الْمَرْأَةُ عَلَى عَمَّتِهَا ، وَالْمَرْأَةُ وَخَالَتُهَا۔ فَنَرَى خَالَةَ أَبِيهَا بِتِلْكَ الْمَنْزِلَةِ۔

ترجمہ:''زہری فرماتے ہیں کہ قبیصہ بن ذویب نے یہ حدیث بیان کی کہ انہوں نے ابو ہریرہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ''عورت اوراس کی پھوپھی'' کوایک نکاح میں (جمع) کرنے سے منع فرمایا، اوراسی طرح ''عورت پراس کی خالہ'' کو(جمع کرنے سے منع فرمایا) ۔(زہری کہتے ہیں)ہمارا خیال یہ ہے بیوی کے باپ کی خالہ کا بھی یہی حکم ہے،(صحیح بخاری،رقم الحدیث:5110)''۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ :"أَنَّهُ نَهَى أَنْ تُنْكَحَ الْمَرْأَةُ عَلَى عَمَّتِهَا، أَوْ خَالَتِهَا"۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ پھوپھی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھتیجی سے نکاح کیا جائے یا بھتیجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی پھوپھی کے ساتھ یا خالہ کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بھانجی کے ساتھ یا بھانجی کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی خالہ سے نکاح کیا جائے،(سنن نسائی،رقم الحدیث:3290)''۔

صورتِ مسئولہ میں یہ نکاح جمع بین المحارم کے سبب جائز نہیں ہے،آپ کی بیوی کی موجودگی میں آپ کا نکاح اُس کی بہن یا بہن کی بیٹی یا نواسی سے نہیں ہوسکتا، جب ماں یا نانی سے نکاح نہیں ہوسکتا تو نواسی سے بطریقِ اولیٰ جائز نہیں۔

بیوی کے انتقال کے بعد اُس کی بہن سے نکاح جائز ہے

سوال: 97

میرا نکاح کچھ سال پہلے چچا کی لڑکی سے ہوا، کچھ عرصے بعد رضائے الٰہی سے میری بیوی کا انتقال ہوگیا۔اب وہی چچا اپنی دوسری بیٹی سے میرا نکاح کرنا چاہتا ہے۔کیا

میں مرنے والی بیوی کی بہن سے نکاح کرسکتا ہوں؟۔(محمد ارشاد، وہاڑی)۔

جواب:

جی ہاں! آپ کی بیوی کے انتقال کے بعد اُس کی حقیقی بہن سے آپ کا نکاح ہوسکتا ہے۔دو بہنوں کوایک ساتھ نکاح میں رکھنا یا اپنی بیوی کوطلاق دینے کی صورت میں جب تک، وہ عدت میں ہے، اُس کی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے۔اللہ جلّ شانہٗ نے محرماتِ نکاح کے تفصیلی احکام میں ارشادفرمایا:وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ، ترجمہ:''اور کسی شخص کا (بیک وقت) اپنے نکاح میں دو بہنوں کوجمع کرنا بھی حرام ہے،(النساء:23)''۔

اگرکوئی شخص اپنی بیوی کوطلاق دے دے،تو جب تک وہ عدت میں ہے،اُس کی حقیقی بہن سے نکاح نہیں کرسکتا،علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

تَزَوُّجُ الْأُخْتَيْنِ مَعًا ،وَنِكَاحُ الْأُخْتِ فِيْ عِدَّةِ الْأُخْتِ،وَنِكَاحُ الْمُعْتَدَّةِ ، وَالْخَامِسَةِ فِيْ عِدَّةِ الرَّابِعَةِ۔

ترجمہ:''دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا،ایک بہن (مُطلقہ بیوی) کی عدت میں اُس کی دوسری بہن سے نکاح کرنا،کسی عورت سے (اس کی) عدت میں نکاح کرنا اور چوتھی بیوی کی عدت میں پانچویں سے نکاح کرنا (نکاحِ فاسد ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد4،ص:202،بیروت)

حُرمتِ نکاح کا ایک مسئلہ

سوال:98

مولانا علم الدین اور میر عالم حقیقی بھائی ہیں۔میر عالم کی بیٹی نے مولانا علم الدین کی بیوی کا دودھ پیا تھا۔علم الدین کی بیوی کے انتقال کے بعدانہوں نے دوسری شادی کی۔دوسری بیوی سے اولاد ہوئی۔میر عالم کی بیٹی کی بھی اولاد موجود ہے۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ میر عالم کی بیٹی کی بیٹی کا علم الدین کی دوسری بیوی سے موجود لڑکے سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟۔(عزیز اللہ منہاس، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں یہ نکاح جائز نہیں کہ علم الدین کی اولاد میر عالم کی بیٹی کے رضاعی بہن بھائی ہوئے اور میر عالم کی نواسی کے رضاعی ماموں اور خالائیں، جو رشتے نسب کے سبب حرام ہیں وہی رضاعت کے سبب بھی حرام ہیں۔

عَنْ عائشة قالت : قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ"۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں جونسب سے حرام ہوتے ہیں''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3505، مکتبہ نزار مصطفی الباز، مکۃ المکرمۃ)

سوال نمبر: 94 کے جواب میں ''فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 345'' کے حوالے سے محرمات رضاعی کا تفصیلی بیان موجود ہے، اس موقع پر قارئین سے گزارش ہے کہ گذشتہ صفحات پر متعلقہ عبارت کو مع ترجمہ ملاحظہ فرمالیں۔

پہلے شوہر سے طلاق یا خلع لئے بغیر دوسرے نکاح کا حکم

سوال: 99

1987ء میں میری شادی نیویارک میں ہوئی۔ ہم دونوں میاں بیوی امریکن نیشنلٹی ہولڈر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا، جن کی عمریں اس وقت 17، 18 سال ہیں۔ زندگی اچھی گزر رہی تھی کہ اچانک گھر کے حالات خراب ہوگئے۔ محترمہ کے تعلقات ایک شخص سے ہوگئے اور ایک دن محترمہ اپنا سامان لے کر اُس کے گھر منتقل ہوگئیں۔ تقریباً چھ سات ماہ بعد پاکستان جاکر خلع کا مقدمہ دائر کردیا۔ خلع یا طلاق کا فیصلہ ہوتے ہوتے قریب کوئی دو سال لگ گئے، 03 جون 2009ء میں کورٹ سے فیصلہ (Marriage Dessolve) ہوا۔ لیکن فیصلہ ہونے سے پہلے اُس نے اُس شخص سے نکاح کرلیا، کیا یہ شادی جائز ہے؟۔ اور اگر کوئی اولاد ہوتی ہے تو کیا وہ جائز ہوگی؟۔

عزیز الرحمٰن، نیویارک، امریکہ

جواب:

صورت مسئولہ میں مذکورہ خاتون جب تک آپ کے نکاح میں ہیں، اُن کا نکاح کسی دوسرے شخص سے قطعاً نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ،
ترجمہ: ’’اور (تم پر حرام کی گئی ہیں) وہ عورتیں پہلے سے جو دوسروں کے نکاح میں ہیں، (النساء:24)‘‘۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

لَايَجُوْزُ لِلرَّجُلِ أَنْ يَتَزَوَّجَ زَوْجَةَ غَيْرِهٖ وَكَذَالِكَ الْمُعْتَدَّةُ كَذَا فِي السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ
ترجمہ: ’’کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی سے نکاح کرے اور اسی طرح ایامِ عدت میں مطلقہ عورت سے نکاح جائز نہیں ہے، ’’سراج الوہاج‘‘ میں اسی طرح لکھا ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:280، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)‘‘۔

شادی شدہ عورت کا جان بوجھ کر دوسری جگہ نکاح کرنا ہرگز جائز نہیں، باطل وحرام ہے۔ جن لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ عورت منکوحہ ہے اور یہ جاننے کے باوجود وہ لوگ نکاح کے گواہ بنے یا نکاح پڑھایا، یا یہ نکاح کروایا، اگر اسے حرام جانتے ہوئے کسی بھی حیثیت میں اس میں شرکت کی، تو اُن سب پر توبہ لازم ہے اور اگر اس فعل کو جائز اور حلال سمجھتے ہوئے انہوں نے اس میں شرکت کی، نکاح پڑھایا یا وکیل اور گواہ بنے، تو اس صورت اُن پر توبہ اور تجدیدِ ایمان لازم ہے اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں تجدید نکاح بھی لازم ہے۔

جب تک عورت کسی کے نکاح میں ہے اس کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوگا، اس کا نسب اسی شخص کی طرف منسوب ہوگا، جس کے نکاح میں وہ عورت ہے اور وہ بچہ اس کا وارث بھی بنے گا، حدیث پاک میں ہے: اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ۔
ترجمہ: ’’بچے کا نسب اسی کی طرف منسوب ہوگا، جس کے نکاح میں اس کی ماں ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے، (زانی محروم رہے گا)، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:2053، 6749)‘‘۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی کا دوسرا نکاح قطعاً منعقد نہیں ہوا اور آپ کی بیوی پر لازم

ہے کہ اُس شخص سے فوری علیحدگی اختیار کرے۔اگر بیوی ہٹ دھرم ہے، قبولِ حق کے لئے تیار نہیں ہے اور حکومت کا عدالتی نظام بھی حق کی حمایت نہیں کرتا تو آپ اسے رضا کارانہ طور پر طلاق دے دیں اور عدت گزرنے کے بعد وہ جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے۔اس طرح آپ اسے گناہ میں مبتلا ہونے سے بچا سکیں گے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر پائیں گے۔

عیسائی عورت سے نکاح کا حکم

سوال:100

میرے شوہر نے کچھ عرصہ قبل ایک عیسائی عورت سے اس کے اسلام قبول کرنے کے دوسرے دن ہی نکاح کر لیا، جبکہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور چار بچوں کی ماں ہے اور اُس کے شوہر نے اُسے طلاق بھی نہیں دی، قاضی صاحب سے بھی یہ بات چھپائی گئی کہ وہ عورت پہلے سے شادی شدہ ہے، اب ان دونوں کی ایک بچی بھی ہے۔ایک مفتی صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ ''اسلام صدقِ دل سے قبول کرنے کا نام ہے، دنیاوی غرض سے اسلام قبول کرنا قطعاً معتبر نہیں ،ایسے شخص کو مسلمان نہیں بلکہ منافق تصور کیا جائے گا، لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق مذکورہ عورت کا اسلام قبول نہیں ہے''۔معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا ان کا نکاح درست ہے؟۔اس عورت کے بارے میں کیا حکم ہے؟،اور عدت کے بارے میں کیا حکم ہے؟۔

میرے شوہر دوسری شادی سے قبل کئی مرتبہ اور اب مورخہ: 18 مئی 2009ء بروز پیر اپنی زبان سے کہہ چکے ہیں کہ ''میں قادیانی ہو جاؤں، لڑکی بھی ملتی ہے اور 10 لاکھ روپے بھی''۔ جب میں نے شرم دلائی کہ ایمان سے بڑھ کر کچھ نہیں تو بات کو مذاق میں ٹال گئے کہ میں ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔میں نے جب بھی اُس عیسائی عورت سے علیحدگی اور اُس کے مسلمان ہونے کے بارے میں بات کی تو میرے شوہر نے کہا کہ: ''اگر وہ عورت مسلمان نہیں تو میں خود عیسائی ہو جاتا ہوں''۔کفر کی باتیں کرتا ہے اور کبھی کہتا ہے کہ میں کسی کو نہیں مانتا۔میرے شوہر کا یہ عمل کفر میں تو شامل نہیں؟،(ناصرہ جبیں، سرگودھا، پنجاب)۔

جواب:

ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے، جو شخص دل سے ضروریاتِ دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے، اور جس کا دل تصدیق سے خالی ہو وہ کافر ہے۔ ایمان محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ دل کی سچائی سے تمام ضروریاتِ دین جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت، کتب الٰہی، آخرت اور دیگر تمام ضروریاتِ دین پر، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں، کامل یقین رکھنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے، جو شخص دل سے ضروریات دین کا قائل ہو وہ مسلمان اور مؤمن ہے۔

اس طرح کے واقعات میں عام مشاہدہ ہے کہ اکثر و بیشتر نکاح کے لئے ہی اسلام قبول کیا جاتا ہے، لیکن ہم کسی کے دل کی صداقت کو کسی ظاہری پیمانے سے نہیں جانچ سکتے، امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں:

عَنْ أَبِي فِرَاسٍ قَالَ خَطَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَقَالَ: يَاأَيُّهَاالنَّاسُ أَلَا إِنَّا إِنَّمَا كُنَّانَعْرِفُكُمْ إِذْبَيْنَ ظَهْرَيْنَاالنَّبِيُّ ﷺ وَإِذْيَنْزِلُ الْوَحْيُ وَإِذْيُنَبِّئُنَا اللّٰهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ، أَلَا وَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَدِانْطَلَقَ وَقَدِ انْقَطَعَ الْوَحْيُ وَإِنَّمَا نَعْرِفُكُمْ بِمَا نَقُولُ لَكُمْ ،مَنْ أَظْهَرَ مِنْكُمْ خَيْرًا ظَنَنَّا بِهِ خَيْرًا وَأَحْبَبْنَاهُ عَلَيْهِ، وَمَنْ أَظْهَرَ مِنْكُمْ لَنَاشَرًّا ظَنَنَّا بِهِ شَرًّاوَأَبْغَضْنَاهُ عَلَيْهِ سَرَائِرُكُمْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ رَبِّكُمْ،

ترجمہ: ''ابوفراس بیان کرتے ہیں کہ (ایک بار) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے لوگو! سنو! (عہدِ رسالت میں) ہم تمہاری (حقیقتِ حال) کو جان لیتے تھے کیونکہ نبی ﷺ ہمارے درمیان موجود تھے اور نزولِ وحی کا سلسلہ جاری تھا اور اللہ تعالیٰ (رسول اللہ ﷺ پر وحی کے ذریعے) ہمیں تمہاری (پوشیدہ) خبریں بھی بتا دیتا تھا، (مگر) سنو! (اب) نبی ﷺ (دنیا سے) تشریف لے جا چکے ہیں اور وحی (ربانی) کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، (اب ہم) تمہارے بارے میں وہی کہتے ہیں جو (ظاہری طور

پر) جانتے ہیں۔ سو تم میں سے جس سے خیر ظاہر ہوتی ہے، تو ہم اس کے بارے میں اچھا گمان کرتے ہیں اور اس بناء پر اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور تم میں سے جس سے شر کا ظہور ہوتا ہے، اس کے بارے میں ہم بُرا گمان کرتے ہیں اور اس پر ناراض ہوتے ہیں۔ تمہارے پوشیدہ امور کا فیصلہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ہوگا (کیونکہ وہی نیتوں اور سب کے پوشیدہ احوال کا جاننے والا ہے)''۔

(مسند امام احمد بن حنبل، جلد 1، ص: 384، مطبوعہ: دارالفکر، بیروت)

لہٰذا کسی غیر مسلم کے قبولِ اسلام کے بعد کسی کو یہ کہنے کا اختیار نہیں کہ ''اُس کا قبولِ اسلام معتبر نہیں''۔ کسی مفتی یا مذہبی پیشوا کو عنداللہ قبولیت یا عدمِ قبولیت کے سرٹیفیکیٹ جاری کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے، آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلہ اخلاصِ عمل اور نیت پر ہوگا اور نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

ہاں مذکورہ صورت میں اُس عیسائی عورت کے قبولِ اسلام کے بعد (چونکہ دونوں ہی دارالاسلام میں ہیں) لازم یہ تھا کہ اُس کے عیسائی شوہر کو بھی اسلام کی دعوت دی جاتی، اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کرتا تو عدالت اس کے انکار کو ملحوظ رکھتے ہوئے فسخِ نکاح کا حکم جاری کرے گی، جو ایک طلاق شمار ہوگی۔ اور عدت کے بعد وہ عورت نکاحِ ثانی کے لئے آزاد ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَلَوْ أَسْلَمَ أَحَدُ الزَّوْجَيْنِ، عُرِضَ الْإِسْلَامُ عَلَى الْآخَرِ، فَإِنْ أَسْلَمَ فَبِهَا، وَإِلَّا فُرِّقَ بَيْنَهُمَا كَذَا فِي الْكَنْزِ، وَإِنْ سَكَتَ وَلَمْ يَقُلْ شَيْئًا فَالْقَاضِي يَعْرِضُ الْإِسْلَامَ عَلَيْهِ مَرَّةً بَعْدَ أُخْرَى حَتَّى يَتِمَّ الثَّلَاثُ احْتِيَاطًا كَذَا فِي الذَّخِيرَةِ۔

ترجمہ: ''اور اگر مرد و عورت میں سے کسی ایک نے اسلام قبول کیا تو دوسرے پر اسلام پیش کیا جائے گا، اگر اُس نے اسلام قبول کر لیا تو ٹھیک، ورنہ دونوں کے درمیان (قاضیِ مجاز کے ذریعے) تفریق کر دی جائے گی، ''کنز الدقائق'' میں اسی طرح ہے۔ اور اگر شوہر خاموش رہا اور اُس نے کچھ نہ کہا تو قاضی دوسری مرتبہ اُس کو اسلام کی دعوت دے گا یہاں

تک کہ احتیاطاً تین مرتبہ اُس پر اسلام پیش کرے گا ''ذخیرہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 338، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَاِذَا أَسْلَمَ أَحَدُ الزَّوْجَیْنِ الْمَجُوْسِیَّیْنِ أَوِ امْرَأَةُ الْکِتَابِیِّ عَرَضَ الْاِسْلَامَ عَلَی الْآخَرِ، فَاِنْ أَسْلَمَ) فَبِهَا (وَاِلَّا) بِأَنْ أَبٰی أَوْ سَکَتَ (فَرَّقَ بَیْنَهُمَا)

ترجمہ: ''اور جب مجوسی مرد و عورت میں سے کسی ایک نے یا کتابی عورت نے اسلام قبول کرلیا تو قاضی دوسرے (یعنی اگر شوہر نے اسلام قبول کیا تو بیوی پر اور بیوی نے اسلام قبول کیا تو شوہر) پر اسلام پیش کرے (یعنی اُسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دے)، پھر اگر اُس نے اسلام قبول کرلیا تو نکاح باقی رہے گا اور اگر اُس نے انکار کردیا یا خاموش رہا تو دونوں کے درمیان قاضی تفریق کردے گا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص: 267، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

قاضی (جج) کا دونوں کے درمیان تفریق کرنا طلاق قرار دی جائے گی اور بغیر تفریق عورت کا کسی دوسرے شخص سے نکاح درست نہیں ہوگا اور اُسی کافر شوہر کے نکاح میں شمار کی جائے گی، شادی شدہ عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے قطعاً نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ

ترجمہ: ''اور (تم پر حرام کی گئی ہیں) وہ عورتیں پہلے سے جو دوسروں کے نکاح میں ہیں، (النساء: 24)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: لَایَجُوْزُ لِلرَّجُلِ أَنْ یَّتَزَوَّجَ زَوْجَةَ غَیْرِهٖ وَکَذَالِكَ الْمُعْتَدَّةُ کَذَا فِی السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ۔

ترجمہ: ''کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی سے نکاح کرے اور اسی طرح ایامِ عدت میں عورت سے نکاح جائز نہیں ہے، ''سراج الوہاج'' میں اسی طرح لکھا ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 280، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

یہ نکاح، نکاحِ فاسد ہوگا، بچی کا نسب اس دوسرے شخص سے ثابت ہوگا اور وہ باپ کی وارث

بنے گی۔امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: اولاد کہ نکاحِ فاسد میں وقت وطی سے چھ مہینے بعد پیدا ہوئی، بالاجماع ثابت النسب و مستحق الارث ہے:

فِی الدُّرِّالْمُخْتَارِ وَیَثْبُتُ النَّسَبُ اِحْتِیَاطًا بِلَا دَعْوَۃٍ وَّتُعْتَبَرُ مُدَّتُہٗ وَھِیَ سِتَّۃُ اَشْھُرٍ مِنَ الْوَطْیِ وَاِلَّا لَایَثْبُتُ وَھٰذَا قَوْلُ مُحَمَّدٍ وَّبِہٖ یُفْتٰی، وَقَالَا اِبْتِدَاءُ الْمُدَّۃِ مِنْ وَقْتِ الْعَقْدِ کَالصَّحِیْحِ وَرَجَّحَہٗ فِی النَّھْرِ بِاَنَّہٗ اَحْوَطُ۔

ترجمہ:''درمختار میں ہے: نکاح فاسد میں بغیر دعویٰ احتیاطاً نسب ثابت ہوگا، اور اس کی مدت کا اعتبار ہوگا جو کہ وطی سے چھ ماہ تک ہے ورنہ نہیں (یعنی اگر وطی کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ پیدا ہوا تو نسب ثابت نہیں ہے)، یہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔اور امام اعظم و امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول پر مدت کا اعتبار وقتِ نکاح سے چھ ماہ ہے جیسا کہ نکاحِ صحیح میں ہوتا ہے،''نہر'' میں اس کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس میں زیادہ احتیاط ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص: 341، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے شوہر دو متفرق موقعوں پر اپنے قادیانی اور عیسائی ہونے کا ارادہ ظاہر کرچکے ہیں، شرعاً اپنے کفر کا اقرار کفر ہے، لہٰذا جو شخص خود کو کسی غیر مسلم فرقے سے ظاہر کرے یا اُس میں شمولیت کا ارادہ کرے، وہ کافر ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِہٖٓ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ وَلٰکِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْکُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْھِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰہِ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌO

ترجمہ:''جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا سوا، اس کے جس کو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ لوگ جو کھلے دل کے ساتھ کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے، (النحل: 106)''۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ کَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ ترجمہ:''اب عذر نہ پیش کرو، بے شک تم اپنے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کرچکے ہو، (التوبہ: 66)''۔

علامہ علی بن سلطان محمد القاری متوفی 1014ھ لکھتے ہیں:

وَفِي الْمُحِيطِ مَنْ قَالَ فَاِنَّا كَا فِرٌاَوْ سَوْفَ أُكْفِرُ قَالَ اَبُو الْقَاسِمِ هُوَ كَافِرٌ مِّنْ سَاعَتِهٖ۔

ترجمہ: ''اور ''محیط'' میں ہے: کہ جو کہتا ہے کہ میں کافر ہوں یا میں عنقریب کفر اختیار کروں گا، ابوالقاسم نے کہا: وہ اسی وقت کافر ہوگیا، (شرح فقہ اکبر، ص:183)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَمَنْ يَّرْضٰى بِكُفْرِ نَفْسِهٖ فَقَدْ كَفَر

ترجمہ: ''اور جو شخص اپنے کفر پر راضی ہوجائے تو وہ کافر ہوجائے گا''۔

(فتاوٰی عالمگیری، جلد: دوم، ص: 257، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَيُكَفَّرُ فِيْهِمَا) لِرِضَاهُ بِالْكُفْرِ۔

ترجمہ: ''کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 5 ص: 393، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مذکورہ بالا حوالہ جات کی رو سے اقرارِ کفر بھی کفر ہے، اگر واقعی آپ کے شوہر نے مذکورہ باتیں کہی ہیں، تو اُس نے کفر کا ارتکاب کیا ہے، لہٰذا اُس پر لازم ہے کہ فوراً توبہ کرے، تجدیدِ ایمان کرے اور تجدیدِ نکاح کرے، جب تک وہ توبہ اور تجدیدِ ایمان و نکاح نہ کرے، عورت پر لازم ہے کہ اُس سے علیحدگی اختیار رکھے۔

ہبہ اور خلع کا مسئلہ

سوال: 101

میری شادی محمد اقبال سے 2000ء میں ہوئی، مہر کی رقم ایک لاکھ روپے مقرر کی جواب تک ادا نہیں کی۔ شادی کے وقت گلستانِ جوہر میں ایک فلیٹ خریدا جو اُس نے مجھے تحفہ دیا، میں شادی کے وقت سے اب تک اُسی فلیٹ میں قیام پذیر ہوں۔ شادی کے وقت اقبال نے مجھے بتایا کہ اُس نے مجھ سے قبل ایک شادی کی تھی اور اُس کو طلاق دے چکا ہے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اُس کی ایک بیوی اور موجود ہے۔ شادی کے بعد اُس نے مجھ سے تین ماہ تعلق قائم رکھا اور اُس کے بعد آنا جانا چھوڑ دیا، ماہانہ اخراجات بھی پوری طرح ادا نہیں کیے، کبھی تین چار ماہ کے بعد کچھ رقم بھیج دیتا تھا یہ سلسلہ بھی 2004ء میں موقوف

ہوگیا۔فلیٹ کے کاغذات اُسی کے پاس ہیں اور میرے نام کرنے کی کوئی کاغذی کاروائی بھی نہیں کی گئی، کیا یہ فلیٹ وہ واپس لے سکتا ہے؟۔

(2)۔میں نے اُس سے ساتھ رہنے کا مطالبہ کیا تو اُس نے رَد کر دیا اور طلاق مانگی تو کہا کہ فلیٹ خالی کردو اور خلع مانگو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔طلاق دینے میں وہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے تاکہ مہر کی رقم ادا نہ کرنا پڑے، شریعت عورت کے تحفظ کے لئے کیا کہتی ہے؟۔

ناہید سلطانہ، گلستانِ جوہر، کراچی

جواب:

مذکورہ فلیٹ جو آپ کو بطور تحفہ دیا، اور اُس فلیٹ پر آپ کا قبضہ پائے جانے کے سبب ہبہ (گفٹ) مکمل ہوگیا، لہٰذا اب یہ فلیٹ شرعاً آپ کی ملکیت ہے، کاغذی کاروائی قانونی تقاضا ہے۔ہبہ کے ارکان ایجاب وقبول ہیں، لیکن ایجاب وقبول کے کلمات زبانی کہنا شرط نہیں ہے۔علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: فَقَدْ أَفَادَ انَّ التَّلَفُّظَ بِالْاِیْجَابِ وَالْقَبُوْلِ لَایُشْتَرَطُ، بَلْ تَکْفِی الْقَرَائِنُ الدَّالَّةُ عَلَی التَّمْلِیْکِ۔

ترجمہ: ’’گذشتہ عبارت سے معلوم ہوا کہ ہبہ میں ایجاب وقبول کے کلمات (یعنی ایک فریق یہ کہے کہ میں نے یہ پلاٹ یا فلیٹ تمہیں ہبہ کیا اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا) ضروری نہیں ہے، بلکہ ایسے قرینوں کا پایا جانا کافی ہے، جو تملیک (مالک بنائے جانے) پر دلالت کرتے ہوں، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 8، ص:425)‘‘۔

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں: وَالْقَبُوْلُ تَارَةً یَکُوْنُ بِالْقَوْلِ وَتَارَةً بِالْفِعْلِ۔

ترجمہ: ’’ہبہ کا قبول کبھی قول سے ہوتا ہے اور کبھی فعل سے (مثلاً ایک نے ایجاب کیا یعنی یہ کہا: میں نے یہ چیز تمہیں ہبہ کردی، دوسرے نے لے لی، تو ہبہ مکمل ہوگیا)‘‘۔

(البحر الرائق، جلد 7، ص:485)

زوجیت رجوع سے مانع ہے یعنی ہبہ کرتے وقت اگر عورت اُس ہبہ کرنے والے کے نکاح میں تھی، تو واہب (ہبہ کرنے والا) ہبہ سے رجوع نہیں کرسکتا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی ہبہ سے رجوع کرنے کی ممانعت کے باب میں لکھتے ہیں:

أَلزَّوْجِيَّةُ وَقْتَ الْهِبَةِ،فَلَوْ وَهَبَ لِامْرَأَةٍ ثُمَّ نَكَحَهَا رَجَعَ وَلَوْ وَهَبَ لِامْرَأَتِهِ لَا

ترجمہ:''ہبہ کے وقت زوجیت (یعنی نکاح میں ہونا رجوع سے) مانع ہے،لہذا اگرکسی عورت کو ہبہ کر کے بعد میں اس سے نکاح کیا،تو ہبہ میں رجوع کرسکتا ہے،اور اگراپنی بیوی کو ہبہ کیا تو رجوع نہیں کرسکتا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 8،ص:443،داراحیاء التراث العربی،بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:''فی الواقع بعد نکاح جو کچھ تملیکاً دیا،اُس سے رجوع نہیں کرسکتا اور قبل نکاح جو کچھ دیا اُسے بیوی کی مرضی کے بغیر واپس لینا گناہ ہے اور خود چھین لینے کا ہرگز اختیار نہیں ، بلکہ عورت نہ دے تو نالش کر کے قاضی کے حکم سے لے سکتا ہے اور گنہگار اِس میں بھی ہوگا کہ صحیح حدیث میں فرمایا:اَلْعَائِدُ فِیْ هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِیْ قَيْئِهٖ لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ۔

ترجمہ:''یعنی بری مثال مسلمان کے شایاں نہیں ،دے کر لینے والا کتے کی طرح ہے کہ قے کر کے پھر چاٹ لیتا ہے۔

درمختار میں دربارۂ موانع رجوع ہے:اَلزَّوْجِيَّةُ وَقْتُ الْهِبَةِ،فَلَوْ وَهَبَ لِامْرَأَةٍ ثُمَّ نَكَحَهَا رَجَعَ وَلَوْ وَهَبَ لِامْرَأَتِهٖ لَا۔

ترجمہ:''(یعنی ہبہ کر کے رجوع کرنے سے جو امور مانع ہیں،ان میں سے ایک ''موہوب لہا'' کا) ہبہ کے وقت منکوحہ بیوی ہونا،الہٰذا اگر کسی عورت کو ہبہ کر کے بعد میں اس سے نکاح کیا تو اُس ہبہ میں رجوع کر سکے گا اور اگر منکوحہ بیوی کو ہبہ کیا،تو رجوع نہ کر سکے گا''۔اسی میں ہے:لَايَصِحُّ الرُّجُوْعُ اِلَّا بِتَرَاضِيْهِمَا اَوْ بِحُكْمِ الْحَاكِمِ۔

ترجمہ:''باہمی رضامندی سے یا حاکم کے حکم سے ہی رجوع صحیح ہوگا۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد 19،ص:388،رضافاؤنڈیشن،لاہور)

ہبہ (گفٹ) کر کے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ

فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْعَائِدُ فِیْ ھِبَتِہٖ کَالْعَائِدِ فِیْ قَیْئِہٖ۔

ترجمہ: ''ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے والا اُس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے دوبارہ اسے چاٹ لے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4062)''۔

مَثَلُ الَّذِیْ یَرْجِعُ فِیْ صَدَقَتِہٖ کَمَثَلِ الْکَلْبِ یَقِیْئُ ثُمَّ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ فَیَأْکُلُہٗ۔

ترجمہ: ''جو شخص صدقہ کر کے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اُس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4058)''۔

(2) سوال میں جو صورتِ مسئلہ آپ نے بیان کی ہے، اگر یہ درست ہے تو نکاح کے بعد آپ کے شوہر نے آپ کو جو فلیٹ ہبہ کیا تھا، وہ آپ کی ملکیت ہے، یہ شرعی حکم ہے، قانونی پوزیشن کیا ہے، یہ کسی وکیل سے دریافت کرلیں۔

آپ کے بیان کے مطابق شوہر آپ کو خلع دینے کے لئے تیار ہے، تو آپ اپنے حق مہر سے دستبردار ہو کر ان سے خلع لے سکتی ہیں، باہمی رضامندی سے خلع طلاقِ بائن کے حکم میں ہوتا ہے، اس کے لئے عدالت جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ دونوں باہمی رضامندی سے اسے تحریری دستاویز کی صورت میں بھی کر سکتے ہیں۔

غیر مدخولہ عورت کا مہر

سوال: 102

میرا نکاح ہوا، رخصتی نہیں ہوئی، لیکن وجوہات کی بنا پر یہ رشتہ ختم کرنا پڑ رہا ہے۔ طلاق کی صورت میں حق مہر ادا کرنا ہوگا یا نہیں؟۔

محمد جمال جیلانی، سیکٹر M-5 نارتھ کراچی

جواب:

غیرِ مدخولہ کو طلاق دینے کی صورت میں شوہر پر واجب ہے کہ نصف مہر عورت کو ادا کرے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ۔

ترجمہ:'' اور اگر تم نے عورتوں کو چھونے سے پہلے طلاق دے دی،اور تم ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے،تو جو مقرر ہوا تھا،اس کا آدھا(واجب) ہے،(البقرۃ:237)''۔

زیور اور مہر کا فرق

سوال:103

اسلام میں عورت کی شادی میں زیور کتنا ہونا چاہئے اور مہر اور زیور میں کیا فرق ہے؟،(ولی الرحمٰن،کراچی)۔

جواب:

نکاح کے لئے شرعاً کسی کثیر رقم کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ نکاح کی استطاعت ہونا ضروری ہے،استطاعت سے مراد یہ ہے کہ نکاح کرنے والا مہر اور نان نفقہ (عورت کا خرچہ) ادا کرسکتا ہو۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ،فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ ،فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ۔

ترجمہ:'' تم میں سے جو شخص گھر بسانے کی طاقت رکھتا ہو،وہ نکاح کرلے کیونکہ نکاح نگاہ کو ہوس سے محفوظ رکھتا ہے اور شرم گاہ کی حفاظت کرتا ہے اور جو نکاح کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ لازماً روزے رکھے کیونکہ روزہ (کسی حد تک) شہوتِ نفسانیہ کو کم کرتا ہے''۔

(صحیح بخاری،رقم الحدیث:1905)

شادی کے لئے زیور کوئی ضروری شے نہیں،شریعت میں شادی کا مقصد یہ نہیں جو آج ہمارے معاشرے میں رائج ہے،مثلاً آرائش وزیبائش،جہیز،کپڑے اور زیورات۔ رسول اللہ ﷺ نے خود شادیاں کیں اور اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں اور سادگی کو اپنایا، مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے ہی میں نجات ہے۔

اسلام نے مہر عورت کی تکریم کی علامت کے طور پر مشروع کیا ہے،مہر عورت کا شرعی حق ہے،جو فریقین کی باہمی رضامندی سے طے کیا جاتا ہے۔

مہر کے تعین میں مختلف امور کو دیکھا جاتا ہے ،دونوں کی مالی حیثیت ،دونوں کی خاندانی حیثیت (Status)۔اپنی حیثیت کے مطابق مہر مقرر کیا جاسکتا ہے اور مہر کی ادائیگی زیور کی صورت میں بھی کی جاسکتی ہے۔

عورت کو رقم دے کر خریدنا

سوال: 104

جوعورت پیسے کے عوض خریدی جائے ،اسلام میں اُس کی کیا حیثیت ہے؟۔

ولی الرحمن ،کراچی

جواب:

کسی بھی آزاد مرد یا عورت کی خرید وفروخت جائز نہیں ،اب چونکہ دورِ غلامی بھی ختم ہو چکا ہے تو کنیزوں اور باندیوں کا تصور بھی موجود نہیں ہے۔اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ کسی عورت کے اولیاء کو رقم دے کر اُس سے نکاح کیا جائے ،تو اُن کے لئے اس رقم کا لینا قطعاً جائز نہیں ہے،علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:لَوْ خَطَبَ امْرَأَةً فِی بَیْتِ أَخِیهَا فَأَبَی الْأَخُ إلَّا أَنْ یَدْفَعَ إلَیْهِ دَرَاهِمَ فَدَفَعَ ثُمَّ تَزَوَّجَهَا كَانَ لِلزَّوْجِ أَنْ یَسْتَرِدَّ مَادَفَعَ لَهُ۔

ترجمہ:''اگر کسی خاتون کو اس کے بھائی کے گھر نکاح کا پیغام دیا گیا ،تو اُس کے بھائی نے رقم کے بغیر رشتہ دینے سے انکار کردیا ،پھر اُس شخص نے اس کے بھائی کو (مطلوبہ) رقم دی ،تو اُس کے عوض اس کے بھائی نے اُس شخص کے ساتھ اپنی بہن کا نکاح کردیا ،تو شادی کے بعد شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی بیوی کے بھائی سے وہ رقم واپس لے''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:أَیْ قَائِمًا أَوْ هَالِكًا لِأَنَّهُ رِشْوَةٌ كَذَا فِی الْبَزَّازِیَّةِ۔

ترجمہ:''یعنی وہ رقم اس کے پاس موجود ہو یا ضائع ہوگئی ہو کیونکہ وہ رشوت ہے (ہرصورت میں اسے اپنی دی ہوئی رقم کے مطالبے کا حق ہے) جیسا کہ ''فتاویٰ بزازیہ'' میں ہے''۔

(البحر الرائق ،جلد 3 ،ص:324 ،مکتبہ رشیدیہ ،کوئٹہ)

البتہ نکاح کے وقت لڑکی کے لئے مہر مقرر کرنا ضروری ہے، خواہ اس کی ادائیگی فوری طور پر نقد کردی جائے یا یہ طے ہو کہ جب بھی بیوی مطالبہ کرے گی، وہ ادا کردے گا (اس مہر کو عندالطلب بھی کہتے ہیں) یا بیوی نے مہر کے مطالبہ کو مؤجل (Defered) کردیا ہے، تب بھی (بصورتِ طلاق) طلاق کے موقع پر یا موت سے پہلے اُس کی ادائیگی ضروری ہے، اگر زندگی میں ادا نہ کیا ہو اور شوہر نے وصیت بھی نہ کی ہو، تو شوہر کے ترکے سے عورت قرض کے طور پر ترکے کی تقسیم سے پہلے اپنا مہر وصول کرے گی، مگر مہر کی یہ رقم عورت کا حق ہے، اُس کے بھائی یا والد کا نہیں ہے۔

بیوی کا علیحدگی کا مطالبہ کرنا

سوال:105

اگر کوئی عورت شادی کے بعد پہلی شب ہی اپنے شوہر سے علیحدہ گھر کا مطالبہ کرے جبکہ ابھی گھر کے کسی بھی فرد سے کوئی معاملہ ہوا ہی نہیں، تو اس صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟، (ارمان نوشاد، محمد آباد 36/G لانڈھی، کراچی)۔

جواب:

''بیوی کا نفقہ اور رہائش یعنی مصارفِ ضروریہ کی فراہمی شوہر کی ذمہ داری ہے۔
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۚ

ترجمہ: کشادہ روزگار والا اپنی حیثیت کے مطابق (اپنی بیوی کو) نفقہ دے اور جس پر روزی تنگ کردی گئی ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال میں سے (اپنی حیثیت کے مطابق بیوی کو) نفقہ دے، اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی بساط سے بڑھ کر کسی بات کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا، (الطلاق:7)''۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۚ

ترجمہ:''(اپنی حیثیت کے مطابق) عورتوں کو وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہواور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ''،(الطلاق:6)۔

علامہ برہان الدین المرغینانی ''الھدایہ'' میں لکھتے ہیں:(وَعَلَی الزَّوْجِ اَنْ یُسْکِنَھَافِیْ دَارٍ مُفْرَدَةٍ لَیْسَ فِیْھَا اَحَدٌ مِنْ اَھْلِہٖ اِلَّااَنْ تَخْتَارَ ذَالِکَ)لِاَنَّ السُّکْنٰی مِنْ کِفَایَتِھَا فَتَجِبُ لَھَا کَالنَّفَقَةِ وَقَدْ اَوْجَبَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی مَقْرُوْنًا بِالنَّفَقَةِوَاِذَاوَجَبَ حَقًّا لَّھَا لَیْسَ لَہٗ اَنْ یُّشْرِکَ غَیْرَھَا فِیْہِ لِاَنَّھَا تَتَضَرَّرُ فِیْہِ فَاِنَّھَا لَا تَأْمَنُ عَلٰی مَتَاعِھَا وَیَمْنَعُھَا ذَالِکَ مِنَ الْمُعَاشَرَةِ مَعَ زَوْجِھَا وَمِنَ الْاِسْتِمْتَاعِ اِلَّا اَنْ تَخْتَارَ لِاَنَّھَا رَضِیَتْ بِانْتِقَاصِ حَقِّھَا۔

ترجمہ:''شوہر پر لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی کو الگ گھر میں رکھے، جہاں اس کے گھر والوں میں سے کوئی نہ رہتا ہو، ہاں اگر بیوی کو ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تو پھر دوسروں کے ساتھ رکھنا بھی درست ہے، کیونکہ 'جائے رہائش' بیوی کی ضروریات میں سے ہے تو اس کا یہ حق اس طرح واجب ہے جیسے نفقہ، اللہ تعالیٰ نے اس کے وجوب کا حکم نفقہ کے وجوب کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور جب الگ ''جائے رہائش'' بیوی کے حق کے طور پر واجب ہے تو اس پر دوسروں کو اپنے ساتھ ٹھہرانا لازم نہیں ہے، کیونکہ یہ اس کے لئے باعث تکلیف ہوسکتا ہے اور اس کا سامان بھی اس طرح محفوظ نہیں رہے گا، اور شوہر کے ساتھ بلا تکلف میل جول میں بھی (مشترکہ رہائش) رکاوٹ بنے گی اور وہ آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے لطف نہیں اٹھاسکیں گے، ہاں اگر وہ خود ایسی صورت حال پر راضی ہے تو درست ہے کیونکہ اس نے خود ہی اپنا حق کم کردیا، (ہدایہ، جلد ثالث، ص:327 مکتبۃ البشریٰ، کراچی)''۔

علیحدہ رہائش آپ کی بیوی کا حق ہے، لہٰذا اگر آپ استطاعت رکھتے ہوں تو اُنہیں علیحدہ رہائش کا انتظام کردیں، ورنہ کم ازکم اُسی گھر میں اُن کے لئے علیحدہ کسی حصے یا کمرے کا انتظام کردیں۔

عورت کے لئے کھانا پکانا اُن کے حالات پر موقوف ہے

سوال: 106

رشتہ طے ہوتے وقت امورِ خانہ داری کے بارے میں والدین کے سوال پر میری

ساس نے کہا تھا کہ میری بیٹی ماسٹر ہے۔شادی کے بعد 14 دن میرے یہاں رہیں اوران دنوں میں جو کچھ پکایا، وہ کھانے کے لائق ہی نہیں تھا۔میرے گھر والوں نے اُن کے بھائی اوروالدہ سے شکایت کی تو بجائے اصلاح کے کہا کہ یہ نوکرانی نہیں ہے،شریعت کا حکم یہ ہے کہ بیوی کا کام کھانا پکانا نہیں بلکہ شوہر کی ذمہ داری ہے کہ بیوی کو ہوٹل سے لاکر کھانا کھلائے یاپکا کردے،(ارمان نوشاد،محمد آباد 36/G لانڈھی،کراچی)۔

جواب:

عورت اگرایسے گھرانے کی ہے کہ اُس گھر کی عورتیں کام نہیں کرتیں اورگھر کا کام کاج ملازمین سے لیا جاتا ہے،تو اب شوہر اُس عورت پر گھر کے کام کاج کے لئے جبر نہیں کرسکتا بلکہ اُس پر لازم ہے کہ اُس کے لئے خادمہ رکھ دے۔علامہ علاؤالدین ابوبکر مسعود کاسانی متوفی 587ھ لکھتے ہیں:وَذَکَرَ الْفَقِیْهُ أَبُو اللَّیْثِ اَنَّ هٰذَا اِذَا کَانَ بِهَا عِلَّةٌ لَاتَقْدِرُ عَلَی الطَّبْخِ وَالْخَبْزِ أَوْکَانَتْ مِنْ بَنَاتِ الْأَشْرَافِ،فَأَمَّا اِذَا کَانَتْ تَقْدِرُ عَلٰی ذَالِكَ وَهِیَ مِمَّنْ تَخْدِمُ بِنَفْسِهَا تُجْبَرُ عَلٰی ذَالِكَ۔

ترجمہ:’’اورفقیہ ابواللیث نے بیان کیا کہ یہ(یعنی عورت کو کھانا پکانے پر مجبور نہ کرنا)اُس وقت ہے،جب اُسے کوئی ایسی بیماری ہو جس کی وجہ سے کھانا پکانے پر قدرت نہ رکھتی ہو یا کسی مُعزز گھرانے کی بیٹی ہو(جہاں عورتیں گھر کے کام کاج نہیں کرتیں)لیکن جب وہ کھانا پکانے پر قدرت رکھتی ہواورایسی عورتوں میں سے ہو جو عموماً اپنا کام کاج خود کیا کرتی ہیں،تو اسے کھانا پکانے پر مجبور کیا جائے گا،(بدائع الصنائع،جلد رابع،ص:34)‘‘۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:وَاِنْ قَالَتْ لَاأَطْبَخُ وَلَاأَخْبِزُ،قَالَ فِی الْکِتَابِ لَاتُجْبَرُ عَلَی الطَّبْخِ وَالْخَبْزِ،وَعَلَی الزَّوْجِ أَنْ یَّأْتِیَهَا بِطَعَامٍ مُهَیَّأٍ أَوْ یَأْتِیَهَا بِمَنْ یَّکْفِیْهَا عَمَلَ الطَّبْخِ وَالْخَبْزِ،قَالَ الْفَقِیْهُ أَبُو اللَّیْثِ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی:اِنِ امْتَنَعَتِ الْمَرْأَةُ عَنِ الطَّبْخِ وَالْخَبْزِ اِنَّمَا یَجِبُ عَلَی الزَّوْجِ أَنْ یَّأْتِیَهَا بِطَعَامٍ مُهَیَّأٍ اِذَا کَانَتْ مِنْ بَنَاتِ الْأَشْرَافِ لَاتَخْدِمُ بِنَفْسِهَا فِیْ أَهْلِهَا،أَوْ لَمْ تَکُنْ مِنْ بَنَاتِ الْأَشْرَافِ

لٰکِنْ بِهَا عِلَّةٌ تَمْنَعُهَا مِنَ الطَّبْخِ وَالْخَبْزِ أَمَّا اِذَالَمْ تَکُنْ کَذَالِكَ فَلَایَجِبُ علی الزَّوْجِ أَنْ یَّأْتِیَهَا بِطَعَامٍ مُّهَیَّأً کَذَا فِی "الظَّهِیْرِیَّةِ"۔

ترجمہ:''اگر عورت کہتی ہے کہ وہ سالن اور روٹی نہیں پکائے گی، تو کتاب میں ہے کہ اُسے روٹی اور سالن پکانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور شوہر پر لازم ہے کہ اُسے تیار کھانا دے یا کسی (خادم یا خادمہ) کا انتظام کرے جو کھانا تیار کردے، فقیہ ابواللیث رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عورت اگر کھانا پکانے سے انکار کرتی ہے، اگر وہ ایسے گھرانے سے ہے کہ اُس گھرانے کی عورتیں اپنے گھریلو کام خود نہیں کرتیں، یا وہ ایسے گھرانے کی نہیں ہے لیکن اسے کوئی ایسی بیماری یا تکلیف ہے جس کے سبب وہ روٹی، سالن پکا سکتی ہے، تو شوہر پر لازم ہے کہ اُسے تیار کھانا دے اور اگر ان میں سے کوئی صورت نہیں ہے تو شوہر پر بیوی کو تیار کھانا دینا لازم نہیں ہے، ''ظہیریہ'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:548، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

فقہاءِ کرام کے ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ بیوی پر ہر صورت میں گھریلو کام کاج اور کھانا پکانا لازم نہیں ہے، یہ ان کے خاندانی پس منظر اور حالات پر موقوف ہے۔ اگر آپ کی بیوی کے خاندان میں عورتیں گھریلو کام کاج اور کھانا پکانے کے کام کرتی ہیں، تو آپ کی بیوی کو بھی یہ کام کرنے ہوں گے، اگر اُنہیں کھانا پکانا نہیں آتا تو آپ کے گھر کی خواتین کو پیار و محبت سے اسے سکھانا چاہئے۔ اور اگر اُن کے خاندان میں خادم یا خادمہ کام کرتی ہیں، تو آپ انہیں ان کاموں پر مجبور نہیں کر سکتے بلکہ آپ کو کوئی انتظام کرنا ہوگا کیونکہ نان نفقہ کی فراہمی شوہر کی ذمہ داری ہے۔ اسلام نے خوش گوار عائلی زندگی کا مدار زوجین کے ایک دوسرے کے ساتھ فضل و احسان، مروّت اور حسنِ سلوک پر رکھا ہے۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی حقوق الزوجین سے متعلق لکھتے ہیں:

مسئلہ: کھانا پکانے کے تمام برتن اور سامان شوہر پر واجب ہے، مثلاً چکی، ہانڈی، توا، چمٹا، رکابی، پیالہ، چمچہ وغیرہا جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے حسبِ حیثیت اعلیٰ، ادنیٰ متوسط۔

یوہیں حسب حیثیت اثاث البیت دینا واجب، مثلاً چٹائی، دری، قالین، چارپائی، لحاف، توشک، تکیہ، چادروغیرہا۔ یوہیں کنگھا، تیل، سردھونے کے لئے کھلی وغیرہ اور صابن یا بیسن میل دور کرنے کے لئے اور سرمہ، مسی، مہندی دینا شوہر پر واجب نہیں، اگر لائے تو عورت کو استعمال ضروری ہے۔ عطر وغیرہ خوشبو کی اتنی ضرورت ہے جس سے بغل اور پسینہ کی بو دفع کر سکے۔

مسئلہ: غسل و وضو کا پانی شوہر کے ذمہ ہے عورت غنی ہو یا فقیر۔

مسئلہ: عورت اگر چائے یا حقہ پیتی ہے تو ان کے مصارف شوہر پر واجب نہیں اگرچہ نہ پینے سے اُس کو ضرر پہنچے گا، یوہیں پان، چھالیا، تمبا کو شوہر پر واجب نہیں۔

مسئلہ: عورت بیمار ہو تو اُس کی دوا کی قیمت اور طبیب کی فیس شوہر پر واجب نہیں۔ فصد یا پچھنے کی ضرورت ہو تو یہ بھی شوہر پر نہیں۔

مسئلہ: بچہ پیدا ہو تو جنائی کی اُجرت شوہر پر ہے اگر اس نے بُلایا۔ اور عورت پر ہے اگر عورت نے بلوایا۔ اور اگر وہ خود بغیر ان دونوں میں کسی کے بلائے آجائے تو ظاہر یہ ہے کہ شوہر پر ہے۔

مسئلہ: سال میں دو جوڑے کپڑے دینا واجب ہے ہر ششماہی پر ایک جوڑا جب ایک جوڑا کپڑا دیدیا تو جب تک مدت پوری نہ ہو دینا واجب نہیں اور اگر مدت کے اندر پھاڑ ڈالا اور عادۃً جس طرح پہنا جاتا ہے اُس طرح پہنتی تو نہیں پھٹتا تو دوسرے کپڑے اس ششماہی واجب نہیں ورنہ واجب ہیں اور اگر مدت پوری ہوگئی اور جوڑا باقی ہے تو اگر پہنا ہی نہیں یا کبھی اس کو پہنتی تھی اور کبھی اور کپڑے اس سے باقی ہے تو اب دوسرا جوڑا دینا واجب ہے اور اگر یہ وجہ نہیں بلکہ کپڑا مضبوط تھا اس وجہ سے نہیں پھٹا تو دوسرا جوڑا واجب نہیں۔

(بہار شریعت، جلد: 02، ص: 67-266، مطبوعہ: مکتبۃ المدینہ)

خاتون کے پہلے شوہر سے اولاد کی کفالت دوسرے شوہر کی ذمہ داری نہیں ہے

سوال: 107

ایک عورت جس کے پہلے شوہر سے 3 بچے موجود ہیں۔ ایک شخص نے اُس

عورت کے بچوں کی دیکھ بھال کا وعدہ کر کے اُس سے نکاح کیا۔عورت کے پہلے شوہر کا مکان اور پلاٹ بھی ہے،اب وہ دوسرا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت اپنے پہلے شوہر کا مال اُس کے سپرد کردے،جبکہ عورت اُس سے اپنے بچوں کی پرورش اور اخراجات پورے کرتی ہے۔ دوسرا شوہر عورت سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ بچوں کو خود سے الگ کر کے اکیلے مرد کے ساتھ رہے،کیا یہ صحیح ہے؟۔

اُس شخص کی دو بیویاں ہیں،پہلی سے اولاد ہے اور دوسری بیوی کے پہلے شوہر سے تین بچے ہیں۔اُس شخص نے پہلی بیوی،بچوں کو گھر،خرچہ،نان نفقہ ہر چیز دے رکھی ہے اور دوسری بیوی پر کچھ خرچ نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ تم اپنے سابقہ شوہر کی جائیداد سے اپنا خرچہ پورا کرو۔ مرد کے ذمے عورت کے کیا حقوق ہیں؟،کیا دوسری بیوی کا اپنے شوہر کی کمائی پر کوئی حق نہیں ہے؟۔

کیا شوہر اسے گھر اور نان نفقہ نہیں دے گا اور اگر گھر دے گا تو اس میں پہلے شوہر کے بچے نہیں رہیں گے؟۔حالانکہ رہنے کے علاوہ سب خرچہ پہلے شوہر کا ہی ہو رہا ہے۔مرد کی کمائی ایک لاکھ پچاس ہزار روپے ماہانہ ہے دوسری بیوی کے حصے میں اندازاً کتنا آئے گا؟۔

مرد نے نکاح کے وقت دس لاکھ روپیہ اور 25 تولے سونا حق مہر عندالطلب لکھا ہے،کیا عورت وہ لینے کا حق رکھتی ہے؟،(مسز نورین،بلاک 3 گلستان جوہر،کراچی)۔

جواب:

نکاح کے نتیجے میں مرد پر عورت کے جو حقوق واجب ہوتے ہیں،اُن میں بیوی کا نان نفقہ،بنیادی ضروریات اور رہائش کا انتظام کرنا شوہر کے ذمے ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ط لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ط

ترجمہ:"گنجائش والے کو چاہیے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچہ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہو تو وہ اسی میں سے (حسبِ حیثیت) خرچہ دے جو اللہ نے اسے دیا ہے،اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اس نے اسے عطا کر رکھا ہے"،(الطلاق:7)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ مالدار اور تنگدست میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق اپنی بیوی کو نفقہ دے، (روح المعانی ج 15 ص 207)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ؕ

ترجمہ: ''اپنی بیویوں کو وہاں رکھو، جہاں اپنی حیثیت کے مطابق تم خود رہتے ہو، اور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ، (الطلاق: 6)''۔

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں: ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے یوں پڑھا ہے کہ جہاں تم خود رہتے ہو وہاں اپنی بیویوں کو رکھو اور اپنی مالی حیثیت کے مطابق انہیں نفقہ دو، (روح المعانی جلد: 15 صفحہ: 206)''۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث خطبۂ حجۃ الوداع کی بابت مذکور ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''عورتوں کا شوہروں پر یہ حق ہے کہ دستور کے مطابق انہیں نفقہ دیں''۔

علامہ محمود آلوسی روح المعانی جلد نمبر 15 صفحات 206,205 پر "أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُمْ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

من تبعیض کے لئے ہے، یعنی اپنے رہائشی مکان کے کسی حصے میں اپنی بیوی کو رہائش دو''۔

اور "وَلَا تُضَارُّوهُنَّ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''کہ رہائش میں انہیں تکلیف نہ دو''۔

اور "لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''یوں کہ مکان یا مکان میں بیوی کے لئے مخصوص رہائشی حصے کو کسی دوسرے استعمال میں لا کر، یا اس کے ساتھ ایسے افراد کو ٹھہرا کر، جن کے ساتھ وہ رہنا نہیں چاہتی (ایسے طریقوں سے)، اسے تکلیف پہنچا کر گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا جائے قرآن کی رو سے منع ہے''۔ شریعت کی رو سے شوہر پر اپنی حیثیت کے مطابق بیوی کو جائے رہائش دینا لازم ہے، اگر وہ اتنی مالی استطاعت رکھتا ہے کہ اسے علیحدہ مکان میں رکھ سکے تو ایسا ہی کرے اور اگر اس کی مالی حیثیت بیوی کو علیحدہ مکان دینے

کی متحمل نہیں ہے تو پھر بھی بیوی کا یہ حق ہے کہ مشترکہ فیملی مکان میں اس کے لئے علیحدہ کمرہ یا حصہ مختص ہونا چاہیے، جس میں دوسروں کا عمل دخل نہ ہو، اور اس علیحدہ حصے یا کمرے کے ساتھ باورچی خانہ، بیت الخلاء اور لازمی ضروریات کا اہتمام بھی ہو اور ایسی سہولت ہو کہ وہ اپنے علیحدہ حصے یا کمرے کو بند کر سکے۔

مذکورہ سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس شخص نے دوسرا نکاح محض عورت کے مال کے سبب کیا ہے، کسی عورت سے اُس کے مال و دولت کی خاطر نکاح کرنا ناپسندیدہ ہے اور حدیث مبارک میں ممانعت وارد ہوئی ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَا تَزَوَّجُوا النِّسَاءَ لِحُسْنِهِنَّ، فَعَسٰی حُسْنُهُنَّ أَنْ یُرْدِیَهُنَّ، وَلَا تَزَوَّجُوْهُنَّ لِأَمْوَالِهِنَّ فَعَسٰی أَمْوَالُهُنَّ أَنْ تُطْغِیَهُنَّ وَلٰكِنْ تَزَوَّجُوْهُنَّ عَلَی الدِّیْنِ،

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورتوں سے اُن کے حسن کے سبب نکاح نہ کرو، ممکن ہے اُن کا حسن اُنہیں (پستی میں گرادے) اور نہ ہی عورتوں سے اُن کے مال کے سبب نکاح کرو، ممکن ہے کہ ان کا مال انہیں سرکشی پر آمادہ کرے، عورتوں سے اُن کے دین (یعنی دینداری) کے سبب نکاح کرو''۔
(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1859)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً لِعِزِّهَا لَمْ یَزِدْهُ اللّٰهُ اِلَّا ذُلًّا وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِمَالِهَا لَمْ یَزِدْهُ اللّٰهُ اِلَّا فَقْرًا۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی عورت سے اُس کی عزت (Social Status) کے سبب نکاح کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کی ذلت میں اضافہ فرمادے گا اور جو شخص کسی عورت سے اُس کے مال کے سبب نکاح کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے فقر و تنگ دستی میں اضافہ فرمادے گا''۔
(المعجم الاوسط للطبرانی، رقم الحدیث: 2363)

مرد کے دوسرا نکاح کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ وہ دونوں ازواج کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، دونوں کے درمیان عدل قائم کرے، یعنی دونوں کو ایک معیار کی

رہائش، ایک ہی معیار کی خوراک اور مصارف زندگی فراہم کرے اور دونوں میں ایام کی تقسیم بھی برابر برابر کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً.
ترجمہ: ''یعنی اگر تمہیں خدشہ ہو کہ ایک سے زیادہ ازواج کے درمیان تم عدل قائم نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، (النساء:3)''۔
اس آیت میں دلیل ہے کہ جو شخص مالی اور جسمانی طور پر متعدد بیویاں رکھ سکتا ہو، وہ بشرط عدل و انصاف ایک سے زیادہ نکاح کر سکتا ہے یعنی ایک وقت میں چار تک، اور اگر وہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہ کر سکے، تو وہ صرف ایک بیوی کو نکاح میں رکھے۔ شرعاً قیامِ عدل کی شرط کا لحاظ کرتے ہوئے ایک سے زائد نکاح کی اجازت ہے بشرطیکہ تمام ازواج کے درمیان ایام کی تقسیم برابر برابر کرے اور رہائش، لباس اور طعام (یعنی نان نفقہ) کا معیار بھی یکساں رکھے۔ احادیث مبارکہ میں ہے: عَنۡ اَبِیۡ هُرَیۡرَةَ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنۡ کَانَتۡ لَهُ امۡرَاَتَانِ فَمَالَ اِلٰی اِحۡدٰاهُمَا: جَآءَ یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ وَشِقُّهُ مَائِلٌ۔
ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن میں (عدل قائم نہ کرتا ہو بلکہ) صرف ایک کی طرف میلان رکھتا ہو تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ مائل (جھکا ہوا) ہوگا، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2126)''۔
ترمذی کی روایت میں ہے: اِذَا کَانَ عِنۡدَ الرَّجُلِ امۡرَاَتَانِ فَلَمۡ یَعۡدِلۡ بَیۡنَهُمَا جَاءَ یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ وَشِقُّهُ سَاقِطٌ۔
ترجمہ: ''جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن کے درمیان عدل نہیں کرتا، تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ ساقط (بے کار) ہوگا''۔
(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1141)
مہر عورت کا شرعی حق ہے جسے وصول کرنے کا اختیار عورت کو حاصل ہے، مہر کسی بھی قسم کا ہو بہر کیف اُس کی ادائیگی لازم ہے۔
جیسا کہ سوال میں درج ہے کہ شوہر نے دس لاکھ روپے اور پچیس تولے سونا مہر عندالطلب

مقرر کیا تھا، تو بیوی کے مطالبہ پر شوہر کے ذمے ادائیگی لازم ہے۔ شریعت کی رُو سے شوہر پر لازم ہے کہ دونوں بیویوں کو ایک معیار کا نان نفقہ (یعنی یکساں معیار کی رہائش گاہ اور مصارف زندگی) فراہم کرے اور دونوں کے درمیان ایام کی تقسیم بھی برابر کرے۔ سوال میں جو حقائق بیان کئے گئے ہیں، اگر درست ہیں تو شوہر کا برتاؤ دوسری بیوی کے ساتھ عادلانہ نہیں ہے اور یہ شریعت کی صریح خلاف ورزی ہے۔ پہلی بیوی کے پاس جو اپنا موروثی اور سابق شوہر کے ترکے سے مال ہے اس پر دوسرے شوہر کا کوئی حق نہیں ہے، البتہ دوسری بیوی کی پہلے شوہر سے اولاد کا نان نفقہ اور کفالت ونگہداشت دوسرے شوہر کے ذمے نہیں ہے، البتہ وہ اپنے باپ کے ترکے سے اپنے حصے کے حق دار ہیں اور اسی سے ان پر خرچ کیا جائے۔

اپنی بیوی کی پہلے شوہر سے اولاد کو دوسرا شوہر اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کرسکتا ہے، لیکن بیوی کو اپنی اولاد سے میل ملاپ اور حسن سلوک سے منع کرنا قطعِ رحمی ہے اور قاطع رحم کے لئے حدیث پاک میں شدید وعید آئی ہے۔ اس کا ایک متوازن حل یہ ہے کہ شوہر اپنی دوسری بیوی کو ایک ایسا مکان دلادے جس کے دو حصے ہوں، ایک حصہ جس میں میاں بیوی رہیں، اتنے حصے کا کرایہ اور بیوی کا خرچہ وہ شوہر ادا کرے اور دوسرے حصہ کا کرایہ اور بچوں کا خرچہ بیوی اپنے مال اور پہلے شوہر کے ترکے سے پورا کرے، یہ شوہر کی طرف سے تبرُّع، فضل واحسان اور حسنِ سلوک ہوگا، جس پر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ماجور ہوگا۔

حقِ پرورش کا استحقاق کسے حاصل ہے؟

سوال:108

میرے داماد سید منصور حسین کے والد سید حامد حسین نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے ایک بیٹی آپا بیگم (مرحومہ) اور ایک بیٹا اقبال حسین (مقیم امریکا) ہیں۔ دوسری بیوی سعادت بیگم اپنے پہلے شوہر کی بیٹی شہناز بیگم کے ساتھ منصور کے والد کے نکاح میں آئیں اور بعد میں اُن سے سید منصور حسین تولد ہوئے، جو میرے داماد ہیں۔ میری بیٹی رفعت قریشی کے انتقال کے بعد میرے داماد سید منصور حامد نے میری بھتیجی رخشندہ سے دوسرا

نکاح کیا، لیکن چار ماہ بعد ہی داماد کا انتقال ہوگیا۔ سید مصطفیٰ منصور عمر 9 سال (رفعت کا بیٹا) میرا حقیقی نواسا ہے۔ میرے داماد سید منصور حسین کی سوتیلی بہن شہناز بیگم میرے نواسے مصطفیٰ منصور کو لے کر اپنی بیٹی کے گھر رہ رہی ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ میرے نواسے مصطفیٰ منصور کے والدین کے انتقال کے بعد اُس کی پرورش کا حق کسے حاصل ہے؟۔

(1) سگی نانی (راحت النساء) کو، (2) سگے ماموں (فرید محمد) کو، (3) سگی خالہ (قدسیہ قریشی) کو، (4) سوتیلی ماں (رخشندہ کو) یا (5) شہناز بیگم جو سید مصطفیٰ منصور کی سوتیلی پھوپھی ہے؟، (راحت النساء، النور سوسائٹی F.B ایریا، کراچی)۔

جواب:

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے اس کی رُو سے مصطفیٰ منصور کی چونکہ والدہ وفات پا چکی ہے، اس لئے اس کی پرورش ونگہداشت کا حق اس کی ماں کی عدم موجودگی میں اس کی سگی نانی راحت النساء کا ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

"اَلْحِضَانَةُ" تَثْبُتُ لِلْاُمِّ---------- (ثُمَّ) أَیْ بَعْدَ الْاُمِّ بِأَنْ مَاتَتْ أَوْ لَمْ تَقْبَلْ أَوْ أَسْقَطَتْ حَقَّهَا أَوْ تَزَوَّجَتْ بِأَجْنَبِیٍّ (أُمُّ الْاُمِّ)

ترجمہ: ''بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے----------آگے چل کر لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''ماں فوت ہو جائے یا بچے کو قبول نہ کرے یا اپنا حقِ حضانت (پرورش) ساقط کر دے، یا کسی ایسے شخص کے ساتھ نکاح کر لے جو بچے کے لئے اجنبی ہے، تو پھر ماں کے بعد نانی کو پرورش کا حق ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5 ص: 203، 211، 212 مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی)

تاہم حقِ حضانت لڑکے کے لئے فقہاء کرام نے اس کی مدت سات سال بتائی ہے اور مصطفیٰ منصور ماشاءاللہ نو سال کے ہو چکے ہیں، اب اس کی تربیت کا زیادہ حق اس کے چچا کو ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ثُمَّ الْعَصَبَاتُ بِتَرْتِیْبِ الْاِرْثِ، فَیُقَدَّمُ الْاَبُ ثُمَّ الْجَدُّ ثُمَّ الْاَخُ الشَّقِیْقُ، ثُمَّ لِاَبٍ ثُمَّ بَنُوْهُ کَذٰلِكَ، ثُمَّ الْعَمُّ

ترجمہ: ''پھر عصبہ مرد حضرات وارث ہونے کی ترتیب پر یعنی پہلے باپ، پھر دادا، پھر حقیقی

بھائی، پھر باپ کی طرف سے علاتی بھائی، پھر بھائی کے بیٹے اسی ترتیب پر، پھر چچا''۔
(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5، ص: 213، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

قطعِ رحمی حرام ہے

سوال: 109

میری بیوی پانچ ماہ سے میکے گئی ہوئی ہیں۔ وہ حاملہ تھیں، اس دوران بیٹے کی ولادت بھی ہوگئی۔ ہماری کوئی ناراضی نہیں تھی، مگر سسرال والے بیوی اور بچے کو مجھ سے نہیں ملنے دیتے اور نہ کوئی رابطہ کرتے ہیں۔ شریعت کی رو سے ان کا یہ عمل کیسا ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟، (عبداللہ، نارتھ کراچی)۔

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے تو اس کی روشنی میں آپ کے سسرال والوں کا طرزِ عمل شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ بیوی کو شوہر یا بیٹے کو باپ سے ملنے نہ دینا، قطعِ رحمی، سنگ دلی اور شقاوت ہے۔ رسولِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ
ترجمہ: ''قطع رحمی (یعنی قرابت کے رشتے کو توڑنے والا) کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5984)''۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ، وَيُنْسَأَلَهُ فِي أَثَرِهِ، فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ۔
ترجمہ: ''جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اُس کے رزق میں کشادگی ہو اور اُس کی عمر دراز ہو تو اُسے چاہیے کہ صِلۂ رحمی کیا کرے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5986)''۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: اَلرَّحِمُ شُجْنَةٌ، فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعْتُهُ۔
ترجمہ: ''رحم ایک شاخ کی مانند ہے جو اُس سے ملے گا تو میں اُس سے ملوں گا اور جو اُس سے تعلق ختم کرے گا تو میں اُس سے قطع تعلق کرلوں گا''۔
(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5989)

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ: مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَهُ اللّٰهُ، وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَهُ اللّٰهُ۔

ترجمہ: ''رحم'' عرش (الٰہی) کے ساتھ مُعلّق شاخ کی مانند ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو مجھے ملا کر رکھے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنے ساتھ ملائے گا اور جو مجھے توڑے گا، اللہ تعالیٰ اس کا رشتہ اپنی ذات سے توڑے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 614)''۔

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ أَعْمَالَ بَنِیْ آدَمَ تُعْرَضُ كُلَّ خَمِيْسٍ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ، فَلَا يُقْبَلُ عَمَلُ قَاطِعِ رَحِمٍ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بنی آدم کے تمام اعمال ہر جمعرات شبِ جمعہ پیش کیے جاتے ہیں، پس قطع رحمی کرنے والے کا (کوئی) عمل قبول نہیں کیا جاتا''۔

(مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 10272)

والدین کو چاہئے کہ اپنی بیٹی کو اس کے گھر میں بسنے دیں۔ قرآن مجید میں اہلِ بابل کی شقاوت اور سرکشی کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی جس صفتِ مذمومہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ میاں بیوی میں تفریق ہے:

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اور انہوں نے اس (جادو کے کفریہ کلمات) کی پیروی کی جسے سلیمان کے دورِ حکومت میں شیطان پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا، البتہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو جادو (کے کفریہ کلمات) سکھاتے تھے اور انہوں نے اس (جادو)

کی پیروی کی، جو شہر بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اتارا گیا تھا۔ اور وہ (فرشتے) اس وقت تک کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک کہ یہ نہ کہتے: ہم تو صرف آزمائش ہیں، تو تم کفر نہ کرو۔ وہ ان سے اس چیز کو سیکھتے جس کے ذریعے وہ شوہر اور اس کی بیوی کے درمیان علیحدگی کرا دیتے، اور اللہ کی منشا کے بغیر وہ اس (جادو) سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ وہ اس چیز کو سیکھتے جو انہیں نقصان پہنچائے اور انہیں نفع نہ دے، اور بے شک، وہ خوب جانتے تھے کہ جس نے اُس (جادو) کو خرید لیا، اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور وہ کیسی بری چیز ہے جس کے بدلے میں انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کر ڈالا، کاش، وہ یہ جان لیتے، (البقرہ:102)''۔

قرآن مجید نے نافرمان بیوی کو''ناشزہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ ناشزہ یعنی شوہر کی بلاسبب نافرمانی کرنے والی عورت کے بارے میں حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا دَعَاالرَّجُلُ امْرَأَتَهُ اِلٰی فِرَاشِهِ فَأَبَتْ ،فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَیْهَا ،لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰی تُصْبِحَ ۔

ترجمہ:'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ آنے سے انکار کر دے، اور شوہر غصے میں رات گزارے تو صبح تک اس (نافرمان) عورت پر فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:3237)''۔

شوہر کی اطاعت گزار بیوی کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَیُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ ۔

ترجمہ:''اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کسی عورت کا اس حال میں انتقال ہو کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو، وہ جنت میں داخل ہو گی، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1161)''۔

حقوق الزوجین کے بارے میں رسول کریم ﷺ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ نہایت

واضح ہیں۔آپ اپنی ازواج کی دل داری فرمایا کرتے تھے۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ:قَالَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : اِنِّي لَأَعْلَمُ اِذَا كُنْتِ عَنِّيْ رَاضِيَةً ،وَاِذَا كُنْتِ عَلَيَّ غَضْبٰى ۔ قَالَتْ:فَقُلْتُ:مِنْ اَيْنَ تَعْرِفُ ذَالِكَ ؟،فَقَالَ: أَمَّااِذَاكُنْتِ عَنِّيْ رَاضِيَةً،فَاِنَّكِ تَقُوْلِيْنَ:لَاوَرَبِّ مُحَمَّدٍ،وَاِذَاكُنْتِ غَضْبٰى ، قُلْتِ:لَاوَرَبِّ اِبْرَاهِيْمَ،قَالَتْ: قُلْتُ: أَجَلْ، وَاللّٰهِ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ،مَاأَهْجُرُ اِلَّااسْمَكَ۔

ترجمہ:’’حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول مکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا:’’تم مجھ سے کب راضی ہوتی ہو اور کب ناراض، میں خوب جانتا ہوں،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: آپ یہ بات کیسے جانتے ہیں؟ارشاد فرمایا: جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو تو کہتی ہو: رب محمد ﷺ کی قسم!اور جب تم مجھ سے ناراض ہو تو کہتی ہو: رب ابراہیم کی قسم!‘‘۔ یہ سن کر میں نے عرض کی:’’جی ہاں۔(ایسا ہی ہے مگر)اے اللہ کے رسول!اللہ کی قسم!میں ایسے موقع پر غیر اختیاری حالت میں آپ کا نام نہیں لیتی،(ورنہ میرا دل ہر حال میں آپ کی محبت میں غرق رہتا ہے اور آپ کی محبت میرے رگ و پے میں سرایت کیے ہوتی ہے)‘‘۔

(صحیح بخاری،رقم الحدیث:5228،مسند امام احمد بن حنبل،رقم الحدیث:24318)

آپ بھی اپنے رویے پر غور کریں،ہوسکتا ہے آپ کے ناروا رویے کی وجہ سے آپ کی بیوی اور سسرال والوں کے دلوں میں آپ سے شدید نفرت پیدا ہوگئی ہو۔اگر ایسا ہے تو اس کی تلافی کریں،اپنا رویہ درست کریں،بیوی کو اس کا جائز مقام دیں اور باہمی اکرام وتکریم کی فضا پیدا کریں۔

طلاق کے مسائل

ایک طلاق دے کر تین طلاقیں مراد لینے کا حکم

سوال:110

زید نے اپنی بیوی کو کہا: ''میں نے تجھے طلاق دی''، اب اس کے بعد زید کہتا ہے کہ اس سے میری مراد تین طلاقیں تھیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایک طلاق صریح بول کر تین مراد لی جاسکتی ہیں یا نہیں؟، کتب فقہ حنفیہ سے اس مسئلے کو بیان کریں۔

محمد عبداللہ قادری، لیاقت آباد، کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں ایک طلاقِ رجعی واقع ہو جائے گی، اگر چہ زید کی نیت اُس کے خلاف ہو کیونکہ الفاظِ صریح میں نیت کی حاجت نہیں ہوتی۔

علامہ برہان الدین علی بن ابوبکر فرغانی المرغینانی لکھتے ہیں: وَلَا يَفْتَقِرُ اِلَى النِّيَّةِ، لِأَنَّهُ صَرِيْحٌ فِيْهِ، لِغَلَبَةِ الْاِسْتِعْمَالِ۔

ترجمہ: ''اور یہ (یعنی صریح الفاظ) نیت کے محتاج نہیں ہوتے، کہ کثرتِ استعمال کی وجہ سے (اپنے معنی میں) صریح ہیں، (ہدایہ، جلد 3، ص: 143)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَهُوَ كَأَنْتِ طَالِقٌ وَمُطَلَّقَةٌ وَطَلَّقْتُكِ وَتَقَعُ وَاحِدَةٌ رَّجْعِيَّةٌ وَاِنْ نَوَى الْأَكْثَرَ أَوِ الْاِبَانَةَ أَوْلَمْ يَنْوِ شَيْئًا كَذَافِي الْكَنْزِ۔

ترجمہ: ''وہ (یعنی صریح الفاظ) جیسے کہ ''تجھے طلاق ہے''، ''تو طلاق یافتہ ہے''، ''میں نے تجھے طلاق دی''، سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہو جائے گی اگر چہ (ایک سے) زائد کی نیت ہو یا بائن کی نیت ہو یا کچھ بھی نیت نہ ہو، ''کنز'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 354، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (صَرِيْحُهُ مَالَمْ يُسْتَعْمَلُ اِلَّا فِيْهِ كَطَلَّقْتُكِ وَاَنْتِ طَالِقٌ وَّمُطَلَّقَةٌ وَيَقَعُ بِهَا وَاحِدَةٌ رَّجْعِيَّةٌ، وَاِنْ نَوَى خِلَافَهَا) مِنَ الْبَائِنِ أَوْ أَكْثَرَ

خِلَافًا لِلشَّافِعِيِّ (أَوْلَمْ يَنْوِ شَيْئًا)

ترجمہ: ''طلاق کے صریح الفاظ جو طلاق کے سوا دوسرے معنی میں استعمال نہ ہوتے ہوں، جیسے میں نے تجھے طلاق دی، تجھے طلاق ہے، تو طلاق یافتہ ہے، اِن سب الفاظ سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی، خواہ (ایک رجعی) کے خلاف کا ارادہ کیا ہو یعنی بائن کا یا ایک سے زیادہ طلاقوں کا، (اس کی یہ نیت لغو ہے)، بخلاف امام شافعی کے (یعنی اُن کے نزدیک بائن یا ایک سے زیادہ کی نیت معتبر ہوگی)، یا طلاقِ صریح بول کر کچھ ارادہ نہ کیا ہو (تو بھی ایک طلاق رجعی واقع ہوگی)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 337، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگی اور شوہر کا تین کی نیت کرنا لغو ہے۔

نکاح کے بعد عائد کردہ شرطِ طلاق لاگو ہوتی ہے یا نہیں؟

سوال: 111

(ز) کا نکاح (ح) سے ہوا اور یہ شرط رکھی گئی کہ ''ز'' کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کرسکتا۔ اقرار نامہ میں لکھا گیا کہ: ''مسماۃ ''ح'' سے نکاح ہو جانے کے بعد اُن کے علاوہ جس عورت سے جب بھی اور جتنی بار نکاح کروں، تو مندرجہ ذیل صورتوں کے علاوہ، وہ عورت مجھ پر تین طلاق ہے۔

۱۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق مسماۃ ''ح'' عقیم (بانجھ) ہو۔ ۲۔ ''ح'' میری سازش کے بغیر طبعی موت مر جائے۔ ۳۔ مسماۃ ''ح'' کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اِس شرط کے تحت ''ز'' کسی اور عورت سے نکاح نہیں کرسکتا، اگر کرے گا، تو کیا اُس عورت کو طلاق واقع ہو جائے گی؟ (میاں محمد شفیق، بہاول گڑھ تحصیل کہروڑ پکا)۔

جواب:

طلاق کو کسی شرط پر معلق کرتے وقت اگر طلاق کی نسبت مِلک یا سببِ مِلک کی طرف کی گئی ہے، تو شرط پائے جانے کی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی، جیسے اپنی

منکوحہ بیوی سے کہے: اگر میں اپنے والد کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہوں، تو تجھے طلاق ہے یا اگر میں اپنے والد کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہوں، تو جس عورت سے بھی میں نکاح کروں، اُسے طلاق ہے، تو ان دو صورتوں میں اگر وہ والد کے ساتھ ایک مکان میں رہنے لگے، تو طلاق واقع ہو جائے گی، یعنی اگر طلاق کی نسبت مِلک (یعنی باقاعدہ منکوحہ بیوی) یا سببِ مِلک (جس خاتون سے جب بھی نکاح ہوگا یا کروں گا) پایا جائے، تو طلاق واقع ہو جائے گی، یہاں سوال میں آپ نے درج کیا ہے کہ: ''مسماۃ ''ح'' سے نکاح ہو جانے کے بعد اُن کے علاوہ جس عورت سے جب بھی اور جتنی بار نکاح کروں، تو مندرجہ ذیل صورتوں کے علاوہ وہ عورت مجھ پر تین طلاق ہے''، لہٰذا مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ، جن کا استثناء کیا گیا ہے، جب بھی ''ز'' کسی عورت سے نکاح کرے گا، تو اُس عورت کو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَلَا تَصِحُّ اِضَافَةُ الطَّلَاقِ اِلَّا اَنْ یَّكُوْنَ الْحَالِفُ مَالِكًا اَوْ یُضِیْفُهٗ اِلٰی مِلْكٍ وَالْاِضَافَةُ اِلٰی سَبَبِ الْمِلْكِ كَالتَّزَوُّجِ كَالْاِضَافَةِ اِلَی الْمِلْكِ۔

ترجمہ: ''اور طلاق کی نسبت تب مؤثر ہوتی ہے، جب قسم کھانے والا مالک ہو یا مِلک کی طرف نسبت کرے، اور سببِ مِلک کی طرف نسبت بھی مِلک کی طرف نسبت کی مانند ہے، جیسے کہ نکاح کرنے کی نسبت (کیونکہ نکاح سببِ مِلک ہے، جیسے کہے کہ اگر میں تم سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے)، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص: 420)''۔

یہ فسخِ نکاح کی جائز بنیاد نہیں

سوال: 112

میری شادی کو 20 سال کا عرصہ ہو چکا ہے، شوہر کی غیر ذمہ داری، کبھی کبھی مارنا، کبھی کبھی خرچ میں تنگی بھی ہو جاتی تھی اور 20 سال سے ہم جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ میری بیٹی کا رشتہ میرے والدین اور میرے شوہر کی

رضا مندی سے طے ہوا، نکاح کی تاریخ بھی میرے شوہر نے دی، سب کچھ اُن کی مرضی سے ہوا۔ لیکن ہم دونوں کی نااتفاقی کے سبب وہ بیٹی کی شادی میں شریک نہیں ہوئے، اِن سب باتوں سے پریشان ہوکر اور اپنے شوہر کے رویئے کو دیکھ کر میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے کورٹ کے ذریعے خلع حاصل کرلیا، میرے شوہر نے کورٹ میں جج کے سامنے یہ کہا تھا کہ ''نہ میں اپنی بیوی کو طلاق دوں گا اور نہ ہی کبھی اپنی زندگی میں چھوڑوں گا، اگر گورنمنٹ یکطرفہ خلع دینا چاہتی ہے، تو دے دے''، یہ کہہ کر کورٹ سے چلے گئے اور کسی قسم کے کوئی دستخط بھی نہیں کیے۔ کوئی شرعی وجہ خلع یا فسخ نکاح کی نہیں تھی، خلع لینے کے 15 دِن بعد مجھے اپنی غلطی کا شدّت سے احساس ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا، شوہر اور بچوں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ میں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اپنی اِس غلطی کی معافی مانگی۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا یہ عدالتی حکم نافذ ہے، جس کی کوئی شرعی وجہ موجود نہیں ہے یا ہمارا نکاح قائم ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں۔

خالدہ، 533/51-B لانڈھی، کراچی

جواب:

خلع عدالت کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ زوجین کی باہمی رضا مندی سے ہوتا ہے، جس میں بیوی اپنے مہر کے حق سے دستبردار ہوکر کہے کہ: ''تم مجھے اس کے عوض طلاق دے دو اور شوہر اس کے مطالبے کو قبول کرتے ہوئے کہے کہ میں نے تمہیں خلع دیا''، یہ خلع ہے اور طلاق بائن کے حکم میں ہے۔ بنیادی طور پر عدالت کا اختیار ''فسخِ نکاح'' (Dissolution of Marriage) کا ہوتا ہے۔ اور قاضی کو عورت کے دعوے، دلائل اور شواہد سے یہ اطمینان ہوجاتا ہے کہ شوہر ظالم ہے، بیوی کو نان نفقہ نہیں دیتا، مار پیٹ کرتا ہے اور اس کے حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرتا، تو ایسے شوہر کو ''زوجِ متعنت'' کہتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں قاضی نکاح کو فسخ کردیتا ہے اور زوجین میں تفریق کردیتا ہے، یہ طلاقِ بائن کے حکم میں ہے۔ موجودہ پاکستانی قانون کے تحت عورت عدالت میں خلع کا دعویٰ دائر کرتی

ہے اور عدالت عورت کے نفقے اور مہر کو ساقط کر کے خلع کی ڈگری دے دیتی ہے اور بعض اوقات یہ ڈگری یک طرفہ ہوتی ہے یعنی شوہر کو نہ عدالت میں طلب کیا جاتا ہے نہ اس کا موقف معلوم کیا جاتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ عدالتی عمل نہ خلع کی تعریف میں آتا ہے اور نہ فسخِ نکاح کی، یہی وجہ ہے کہ مفتیانِ کرام ایسے عدالتی فیصلوں کی توثیق نہیں کرتے، کیونکہ ان کی توثیق کی کوئی شرعی بنیاد نہیں بنتی۔

آپ نے اپنے سوال میں جو بیان کیا ہے اگر وہ درست ہے اور حقیقت یہی ہے تو عدالت کا فیصلہ غلط ہے اور آپ کا نکاح بدستور قائم ہے اور آپ دونوں اپنی ازدواجی زندگی کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ یہ ہم نے شرعی مسئلہ بیان کیا ہے، قانونی معاملات کے لئے کسی ماہر وکیل سے مشورہ کریں۔

ہماری رائے میں اگر عدالت میاں بیوی میں خلع کے ذریعے تفریق کرانا چاہتی ہے، تو اسے شوہر کو بلا کر خلع پر آمادہ کرنا چاہئے اور عدالت ایسا کر سکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری عدالتیں لکیر کا فقیر بن کر صرف قانونی تقاضوں کو پورا کرتی ہیں، شرعی تقاضوں کی پاسداری نہیں کرتیں۔

والدہ کے حکم پر بیوی کو طلاق دینا

سوال:113

میرا ایک کلاس فیلو ہندو تھا جس کے گھر میرا آنا جانا تھا۔ میرے رہن سہن اور اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر اُس گھر کی ایک لڑکی (جو کہ سیکنڈری اسکول میں ٹیچر ہے) نے اسلام قبول کر لیا اور اپنی خوشی سے میرے نکاح میں آگئی۔ میرے گھر والوں میں سے کوئی اس نکاح میں شریک نہیں تھا۔ جب میری والدہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے طوفان کھڑا کر دیا اور مجھے مجبور کرنے لگیں کہ میں اس لڑکی کو طلاق دے دوں۔ میں نے اپنا ذاتی مکان بھی والدین کو دے دیا کہ یہ سب رکھ لیں میں آپ کی ہر طرح ذمہ داری پوری کروں گا، لیکن انہوں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے اور طلاق دلوانے پر بضد ہیں۔

اگر میں اُسے طلاق دیدوں تو اس میں مذہب کی بدنامی کا بھی خطرہ ہے اور مسلمان ہو جانے

کی وجہ سے میری اہلیہ کو اُس کے ہندو گھر والے قبول بھی نہیں کریں گے۔ان حالات میں مجھے قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیے کہ کیا مجھ پر اپنی اہلیہ کو طلاق دینا واجب ہے؟۔طلاق نہ دینے کی صورت میں کیا والدہ کی نافرمانی اور اس کے نتائج مجھ پر لاگو ہوں گے؟۔

محمد مشتاق، اورنگی ٹاؤن، کراچی

جواب:

نوٹ: یہ استفتاء پہلے دارالعلوم امجدیہ کے شیخ الحدیث حضرت علامہ مفتی محمد اسماعیل ضیائی صاحب کی خدمت میں پیش ہوا، تو انہوں نے اپنے دلائل کی روشنی میں فتویٰ دیا کہ والدہ کے کہنے پر طلاق دینا واجب ہے۔کسی خاص سیاق وسباق میں اُن کا یہ جواب درست بھی قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن جب یہ سوال میرے سامنے آیا، تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے اور پھر اپنا جواب میں نے شیخ الحدیث حضرت علامہ مفتی محمد اسماعیل ضیائی صاحب کے پاس نظرِ ثانی کے لئے بھیجا تو انہوں نے ازراہِ کرم اس کی توثیق فرمائی۔

بلاشبہ اسلام میں والدین کا بڑا مقام اور مرتبہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ ط اِلَیَّ الْمَصِیْرُ o وَاِنْ جَاھَدٰکَ عَلٰی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْھُمَا وَصَاحِبْھُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفاً۔

ترجمہ: ''کہ میرا اور اپنے والدین کا شکرادا کرو، (تم سب کو) میری ہی طرف لوٹنا ہے، اور اگر وہ تجھ پر دباوَ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک ٹھہرا جس کا تجھے کچھ علم نہیں، تو (اس مطالبہ معصیت میں) ان کی اطاعت ہرگز نہ کرو، (لیکن اس کے باوجود) دنیا میں ان سے حسن سلوک کرتے رہو، (لقمان 14-15)''۔

اس آیت میں اولاد کو پابند کیا گیا ہے کہ اگر بدقسمتی سے کسی کے والدین اس پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے لئے دباوَ ڈالیں، تو معصیت الٰہی میں ان کی اطاعت لازم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اولاد کو دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا

ہے، یعنی مشرک والدین کے ساتھ بھی دنیا میں حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔

آیا از روئے شریعت بیٹے پر لازم ہے کہ والدین کے حکم پر اپنی بیوی کو طلاق دیدے؟ تو اولاً گزارش یہ ہے کہ طلاق اگرچہ ناگزیر صورت حال میں ایک مشروع و مباح امر ہے، لیکن یہ تمام مباح امور میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ الطَّلَاقُ"۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''(تمام) حلال امور میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ امر طلاق ہے، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 2171)''۔

(۲) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: وَلَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ أَبْغَضَ إِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ ہو، (رواہ الدارقطنی، رقم الحدیث: 3939)''۔

(۳) عَنْ ثَوْبَانَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا طَلَاقًا مِنْ غَيْرِ بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ۔

ترجمہ: ''حضرت ثوبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو عورت بغیر کسی ناگزیر مجبوری (اور ناقابل برداشت صورت حال) کے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے''، (یہ الفاظ ترمذی شریف کے ہیں)۔

(ترمذی، رقم الحدیث: 1187، ابوداؤد، رقم الحدیث: 2221، ابن ماجہ: 2134)

نوٹ: ناگزیر صورت حال سے مراد ایسے حالات کا رونما ہوجانا جن کے تحت شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے زوجین کا آپس میں نباہ ممکن نہ رہے۔

پس ناگزیر صورت حال میں رسول اللہ ﷺ نے صرف ماں باپ کو یہ حق دیا ہے کہ اُن کے مطالبے پر بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دیدے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: كَانَتْ تَحْتِيْ امْرَأَةٌ وَكُنْتُ أُحِبُّهَا وَكَانَ أَبِيْ يُبْغِضُهَا، فَذَكَرَ ذَالِكَ عُمَرُ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَأَمَرَنِيْ أَنْ أُطَلِّقَهَا فَطَلَّقْتُهَا،

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک بیوی تھی جس سے میں محبت کرتا تھا، اور میرے والد اُس سے نفرت کرتے تھے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی اس نفرت کا ذکر نبی ﷺ سے کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں اُسے طلاق دے دوں، پس میں نے (نبی ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں) اُسے طلاق دے دی، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:2088)''۔

اس حدیث کی شرح میں حاشیہ مشکوٰۃ میں بحوالہ اَشِعَّۃ اللّمعات للشیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''اگر حق والدین کی جانب ہو تو اولاد کے لئے طلاق دینا واجب ہے کیونکہ ترک حقوق سے عُقوق (نافرمانی) لازم آتی ہے اور اگر حق عورت کی جانب ہے اور والد کی رضا کے لئے طلاق دیدیتا ہے تو جائز ہے''۔ یعنی اگر اس صورت میں جبکہ حق باپ کی جانب نہیں ہے اور بیٹا طلاق نہ دے تو والد کی نافرمانی کی وعید کا مصداق نہیں بنے گا۔

(۲) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ إِنَّ رَجُلًا أَتَاهُ فَقَالَ: إِنَّ لِيْ اِمْرَأَةً وَإِنَّ أُمِّيْ تَأْمُرُنِيْ بِطَلَاقِهَا، قَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اَلْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَإِنْ شِئْتَ فَأَضِعْ ذَالِكَ الْبَابَ أَوْ اِحْفَظْهُ۔ ترجمہ: ''حضرت ابودرداء بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا: ''میری ایک بیوی ہے اور میری ماں مجھے حکم دے رہی ہے کہ میں اسے طلاق دوں''، تو ابو درداء نے اس سے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: والد جنت کا درمیانی دروازہ ہے، اگر تو چاہتا ہے تو اس دروازے کی حفاظت کر یا اسے ضائع کردے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:1900)''۔

اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْبَابُ الْأَوْسَطُ هُوَ مُحَافَظَةُ حُقُوقِ الْوَالِدِ فَالْمُرَادُ بِالْوَالِدِ الْجِنْسُ أَوْ إِذَا كَانَ حُكْمُ الْوَالِدِ هٰذَا فَحُكْمُ الْوَالِدَةِ أَقْوٰى وَبِالْاِعْتِبَارِ أَوْلٰى،

ترجمہ: ''جنت کے درمیانی دروازے سے داخل ہونے سے مراد یہ ہے کہ والد کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور والد سے جنس مراد ہے (یعنی والدہ بھی اس حکم میں داخل ہے) یا جب والد کا یہ حکم ہے تو والدہ کا حق تو اور زیادہ ہے اور بطریقِ اولیٰ وہ اس احترام کی حق دار ہے''۔

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، جلد 9، ص: 200)

علامہ ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا والد سے جنس مراد لینے کا معنی یہ ہے کہ جن سے وہ پیدا ہوا، تو جس طرح والد اس کی اصل ہے تو والدہ بطریقِ اولیٰ اس کی اصل قرار پائے گی، کیونکہ والدہ پر اصل ہونے کا اطلاق اَقویٰ (قوی ترین) اور اولیٰ (اَحق یعنی زیادہ حقدار) ہے۔

علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ ''مرآۃ المناجیح'' شرح مشکوٰۃ المصابیح میں لکھتے ہیں:

یعنی فرمائیے کہ میں کیا کروں، اسے طلاق دوں یا نہ دوں کہ طلاق تمام مباح چیزوں میں سے بہت ہی ناپسندیدہ چیز ہے، مقصد یہ ہے کہ یا تو اپنی بیوی سے اپنی ماں کو راضی کرا دو، ساس بہو کی صلح کرا دو یا طلاق دے دو، صراحتہً طلاق کا حکم نہ دیا کہ ایسی صورت میں طلاق دینا واجب نہیں، بہتر ہے، اور اگر ماں باپ بیوی پر ظلم کرنے کا حکم دیں کہ اسے خرچہ نہ دے، اسے میکے میں چھوڑ دے، تو ہرگز ظلم نہ کرے کہ ظلم حرام ہے، (ایسی صورت میں) ماں باپ کی اطاعت حکمِ شرع کے خلاف ہے، (جلد: 6، ص: 361)''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت کردہ حدیث کی شرح میں امام حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ لکھتے ہیں:

إِنَّ أَوَّلَ مَنْ أَمَرَ ابْنَهٗ بِطَلَاقِ امْرَأَتِهِ الْخَلِيلُ إِبْرَاهِيمُ، وَرُوِيَ فِي الصَّحِيحِ أَنَّهٗ لَمَّا وَضَعَ تَرِكَتَهٗ: إِسْمَاعِيلَ ابْنَهٗ وَأُمَّهٗ عِنْدَ دَوْحَةٍ بِإِزَاءِ زَمْزَمَ وَانْصَرَفَ، أَقَامَ أَعْوَامًا ثُمَّ

اسْتَأْذَنَ رَبَّهٗ فِیْ أَنْ یُّطَالِعَ تَرِکَتَهٗ،فَجَاءَ اُمَّ اِسْمَاعِیْلَ فَوَجَدَهَا قَدْ مَاتَتْ وَاِسْمَاعِیْلُ قَدْ تَزَوَّجَ وَلَمْ یَکُنْ حَاضِرًا بِمَنْزِلِه ،فَسَأَلَ زَوْجَهٗ عَنْ حَالِهِمْ فَلَامَتْ،فَقَالَ : اِذَاجَاءَ اِسْمَاعِیْلُ فَقُوْلِیْ لَهٗ یُبَدِّلُ عَتَبَةَ بَیْتِه، فَجَاءَ اِسْمَاعِیْلُ فَأَخْبَرَتْهُ فَقَالَ: ذَالِكَ أَبِیْ وَقَدْ أَمَرَنِیْ بِفِرَاقِكِ ،اِلْحَقِیْ بِأَهْلِكِ ،وَذَکَرَ الْحَدِیْثَ،وَکَفٰی بِه أُسْوَةً وَّقُدْوَةً۔وَمِنْ بِرِّالْاِبْنِ بِأَبِیْهِ أَنْ یَّکْرَهَ مَایَکْرَهُ أَبُوْهُ وَاِنْ کَانَ لَهٗ مُحِبًّا۔قِیْلَ: وَیُحِبُّ مَا یُحِبُّ أَبُوْهُ وَاِنْ کَانَ لَهٗ کَرِهَ مِنْ قَبْلُ،بَیْدَ أَنَّ ذَالِكَ اِنْ کَانَ الْأَبُ عَلٰی بَصِیْرَةٍ فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ کَذَالِكَ اسْتُحِبَّ لَهٗ فِرَاقُهَا لِاِرْضَائِه وَلَمْ یَجِبْ عَلَیْهِ فِی الْحَالَةِ الْاُوْلٰی ،فَاِنَّ طَاعَةِ الْأَبِ فِی الْحَقِّ مِنْ طَاعَةِ اللّٰهِ وَبِرَّهٗ مِنْ بِرِّه ،وَلَوْ أَنَّ الزَّوْجَةَ لَاتُؤَاتِیْ مَعَ أَنَّ الزَّوْجَ لَایُسْتَحَبُّ لَهٗ فِرَاقُهَا ،اِذْ مَعْنَی الزَّوْجِیَّةِ الْقِیَامُ عَلَی الزَّوْجِ وَبَنِیْهِ ،أَلَا تَرٰی اِلٰی قَوْلِ جَابِرٍ اِذْسَأَلَهُ النَّبِیُّ ﷺ فَقَالَ لَهٗ: "أَبِکْرًا تَزَوَّجْتَ أَمْ ثَیِّبًا"، فَقَالَ: بَلْ ثَیِّبًا،فَقَالَ:هَلَّا بِکْرًا تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ،قَالَ: اِنَّهٗ تَرَكَ لِیْ تِسْعُ أَخَوَاتٍ فَکَرِهْتُ أَنْ أُضِیْفَ اِلَیْهِنَّ مِثْلَهُنَّ،وَأَرَدْتُّ أَنْ تَقُوْمَ عَلَیْهِنَّ۔

ترجمہ:"پہلا شخص جس نے اپنے بیٹے کو طلاق کا حکم دیا، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تھے، روایت صحیح میں ہے کہ جب وہ اپنے بیٹے اسماعیل اوران کی ماں (یعنی اپنی بیوی ہاجر) کو(مکہ مکرمہ میں) زمزم کے نزدیک دوحہ کے مقام پر چھوڑ کر چلے گئے، تو چند سال تک وہ رکے رہے، پھر انہوں نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے اپنے ان پسماندگان کا حال معلوم کرنے کی اجازت مانگی، وہ اپنی (بیوی) اُمِ اسماعیل کے پاس آئے تو پتا چلا کہ وہ انتقال کر چکی ہیں اوراسماعیل نے شادی کر لی ہے، لیکن وہ اس وقت اپنے مکان پر موجود نہیں تھے، تو آپ نے ان کی بیوی سے ان کا حال دریافت کیا تو اس نے ملامت کی (یعنی تنگی حالات کا شکوہ کیا)، اس پر آپ نے فرمایا: جب اسماعیل آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ اپنے گھر کی

چوکھٹ بدل دو، پھر جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو ان کی بیوی نے سارا ماجرا سنا دیا، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے (بیوی سے) فرمایا: وہ میرے باپ تھے اور انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں، لہٰذا اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ، انہوں نے ان کی گفتگو کا حوالہ دیا اور فرمایا: ان کا نمونہ عمل اتباع کیلئے کافی ہے، اور بیٹے کے اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک میں سے ایک یہ ہے جس چیز کو باپ ناپسند کرے، (چاہیے کہ) اسے بیٹا بھی ناپسند کرے، خواہ وہ اس کی پسندیدہ چیز (ہی کیوں نہ) ہو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس چیز کو اس کا باپ پسند کرے، وہ بھی اسے پسند کرے، خواہ اس سے پہلے (طبعی طور پر) وہ اس کو ناپسند ہی (کیوں نہ) ہو، ظاہر بات یہ ہے کہ (بہر صورت باپ کی تعمیل ارشاد کا) یہ حکم اس صورت میں ہے کہ (یہ امر یقینی ہو کہ) باپ (دینی) بصیرت کا حامل ہے، لیکن اگر صورت حال اس کے برعکس ہے (یعنی باپ دینی بصیرت کا حامل نہیں ہے) تو باپ کی رضا کیلئے بیوی کو طلاق دینا (واجب نہیں بلکہ) پہلے مرحلے میں صرف مستحب ہے، کیونکہ امور حق میں باپ کی اطاعت (درحقیقت) اللہ ہی کی اطاعت ہے اور اس کی اطاعت کرنا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا ہے، اور اگر بیوی کی شوہر کے ساتھ (طبعی) موافقت ہی نہیں ہے تو (باپ کے حکم پر) اسے چھوڑ دینا مستحب ہے، کیونکہ زوجیت کے معنی ہی شوہر اور اس کی اولاد کی نگہداشت کے ہیں، کیا تو نے حضرت جابر کے اس قول پر غور نہیں کیا کہ جب نبی ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ: تو نے کنواری لڑکی سے شادی کی ہے یا ثیب سے (ثیب سے مراد ایسی مطلقہ یا بیوہ عورت جو اس سے پہلے شوہر کے تجربے سے گزر چکی ہے)؟۔ تو انہوں نے عرض کیا: ثیب سے شادی کی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے کنواری لڑکی سے شادی کیوں نہ کی کہ تم دونوں ایک دوسرے سے (وفور محبت میں خوش طبعی ہنسی مذاق اور) چھیڑ خانی کرتے، حضرت جابر نے عرض کی: میری نو بہنیں ہیں، تو مجھے یہ مناسب نہ لگا کہ ان

جیسی نا تجربہ کار بیوی (IMMATURE) بیاہ کر لے آؤں، میں نے تو یہ سوچ کر ثیّب عورت سے نکاح کیا کہ وہ ان کی صحیح نگہداشت (اور تربیت) کر سکے"۔

(عارضۃ الاحوذی، جلد 3، ص، 132، دارالکتب علمیہ، بیروت)

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت نے باپ کے حکم پر بیٹے کو بیوی کے طلاق دینے کا جو وجوبی حکم دیا ہے،، وہ دینی مصلحت پر مبنی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ باپ کے مزاج پر دین داری کا غلبہ ہو اور دینی مصلحتوں کا صحیح ادراک رکھتا ہو، اس پر نفسانی خواہشات، ہیجانی کیفیت، انتقامی جذبے اور غیظ وغضب کا غلبہ نہ ہو بلکہ وہ متحمل مزاج ہو، اور ہمارے سامنے دو مثالیں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام تو ابو الانبیاء، اولو العزم رسول، ملت ابراہیم کے مؤسِّس، وحیِ ربانی اور فطرت سلیم کے حامل تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی "مُحدَّثِ خیر الامم" مُلہَم من اللہ اور "موفَّق من اللہ" تھے، بعض اوقات منشائے وحی ربانی کو ان کی فطرتِ سلیم نزول وحی سے پہلے ہی سمجھ لیتی تھی، چنانچہ ایسی آیات قرآنی، جن کے منشاء کا انہوں نے نزول وحی پہلے ہی ادراک کر لیا تھا، کو مُوَفَّقاتِ عمر کہا جاتا ہے۔

آج کل عام طور پر ہم میں اصابتِ فکر (RIGHTIOUSNESS)، مزاج میں توازن واعتدال، منشائے شریعت معلوم ہونے پر اس کے سامنے سپر انداز (SURRENDER) ہونے کا رجحان اور مغلوب الغضب نہ ہونے کا تناسب کتنا ہے؟، ہم سب جانتے ہیں. لہٰذا موجودہ حالات میں اگر ماں باپ بیٹے کو حکم دیں کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو، تو بیٹے کو چاہیے کہ ٹھنڈے دل سے شرحِ صدر کے ساتھ ماں باپ کی فرمائش پر غور کرے، اگر ان کے فرمان کی وجوہِ شرعی موجود ہیں تو کھلے ذہن کے ساتھ نہ صرف ان کے حکم کی تعمیل کرے بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت عبد اللہ بن عمر کی طرح اسے اپنی سعادت

سمجھے۔لیکن اگر اس پر یہ امر واضح ہو کہ ماں باپ کا حکم شرعی مصلحت کے تابع نہیں بلکہ اس پر نفسانیت کا غلبہ ہے، ظلم اور صریح ناانصافی کا باعث ہے، تو اُس پر اِس کی تعمیل واجب نہیں ہے۔تاہم ماں باپ کا احترام قائم رکھے دیگر تمام جائز امور میں ان کی فرماں برداری جاری رکھے اور نہایت نرمی اور تواضع کے ساتھ انہیں اپنا مؤقف سمجھانے کی کوشش کرے، شاید کسی مرحلے پر اللہ تعالیٰ ان کے ذہن کو قبول حق پر آمادہ فرمالے۔کیونکہ شریعت کے جو عمومی احکام ہیں، وہ یہ ہیں کہ:

(۱) وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

ترجمہ:''نیکی اور تقوے کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''۔

(۲) لَا طَاعَةَ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ،اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ۔

ترجمہ:''کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے (خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بڑا ہو)، جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، لازمی اطاعت تو بس صرف نیک کاموں میں ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:1840)''۔

امامِ اہلسنت اعلیحضرت عظیم البرکت امام احمد رضا قادری قدس سرہم العزیز ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:''آیت کا وہ حکم اور احادیث کے یہ ارشادات انہی وجہین حل وبغض پر ہیں، اگر عورت پر کوئی شبہ ہو یا وہ عاصیہ ہو یا نماز نہ پڑھتی ہو یا بوڑھی ہوگئی ہو اور اسے ''قسم بین النساء'' سے بچنا ہو تو ان سب صورتوں میں طلاق بلا کراہت جائز ومباح ہے، بلکہ بعض صورتوں میں مستحب۔علماء فرماتے ہیں کہ اگر عورت نماز نہ پڑھے اور یہ ادائے مہر پر قادر نہ بھی ہو جب بھی طلاق دے دینی چاہیے کہ:اللہ تعالیٰ کے ہاں پیشی میں بیوی کا مہر شوہر کے گلے میں پڑا ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ بے نماز عورت سے معاشرت جاری رکھے، جیسا کہ

خانیہ،غنیہ وغیرھا میں ہے، بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہوتی ہے، جیسے اس کو اس کے ماں باپ عورت کو طلاق دینے کا حکم دیں اور نہ دینے میں ان کی ایذا اور ناراضی ہو، واجب ہے کہ طلاق دے دے، اگرچہ عورت کا قصور نہ ہو: "لِأَنَّ الْعُقُوقَ حَرَامٌ وَّالْاِجْتِنَابُ عَنِ الْحَرَامِ وَاجِبٌ"۔

ترجمہ: ''کیونکہ (والدین کی) نافرمانی حرام ہے اور حرام سے بچنا واجب ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص: 331، 332، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

(نوٹ: اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے مندرجہ ذیل حدیث نقل فرمائی ہے: "وَاِنْ أَمَرَاكَ أَنْ تَخْرُجَ مِنْ أَهْلِكَ وَمَالِكَ فَاخْرُجْ"، ترجمہ: ''اگر والدین تمہیں بیوی اور مال سے علیحدگی کا حکم دیں تو ایسا ہی کرو، بحوالہ: الترغیب والترھیب، مصطفیٰ البابی مصر 383/1، السنن الکبریٰ 304/1، اس حدیث پر تفصیلی تبصرہ منسلک ہے)۔

اعلیحضرت نے یہ فتویٰ 1336ھ میں دیا ہے اور 1339ھ میں آپ نے ایک اور فتویٰ جاری فرمایا، جو مع سوال درجِ ذیل ہے: حضورِ والا! بعد سلام عرض ہے کہ غلام کی بیوی اطاعت نہیں کرتی، سمجھانا اثر نہیں کرتا، والدین بھی ناخوش ہیں والدین کی خوشی ہے کہ طلاق دے دو تو حضور اُس کو کس طریقہ سے طلاق دی جائے؟، آپ نے جواب میں لکھا: اگر آپ طلاق دینا چاہیں تو عورت جب حیض سے فارغ ہو اس کے بعد قبل جماع اس سے ایک بار کہئے کہ میں نے تجھے طلاق دی، پھر اسے چھوڑے رہئے اور اس سے بالکل الگ رہئے یہاں تک کہ طلاق کے بعد تین حیض شروع ہو کر ختم ہو جائیں اُس وقت وہ نکاح سے نکل جائے گی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص: 361، 362، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

اس فتویٰ میں اعلیحضرت نے بیوی کی نافرمانی پر والدین کی ناراضگی کے باوجود شوہر پر طلاق دینے کو واجب اور لازم قرار نہیں دیا بلکہ ''اگر آپ طلاق دینا چاہیں'' کہہ کر شوہر کی مرضی پر

چھوڑا ہے یعنی جواز اور اباحت کے درجے میں رکھا ہے اور یہ فتویٰ آپ نے 1339ھ کو
جاری فرمایا۔ بظاہر یہی سمجھا جائے گا کہ آپ نے پہلے موقف کے مقابلے میں نرمی اختیار
فرمائی اور شوہر پر طلاق کو لازم قرار نہیں دیا یا ممکن ہے کہ پہلی صورتِ مسئلہ میں عورت
کا عصیان ونشوز اور شوہر کے والدین کی ایذا رسانی انتہائی درجے کی ہوگی۔
علامہ مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا کہ: ''ماں بیٹے کو مجبور کرے کہ اپنی بیوی کو
طلاق دے دو تو کیا اس صورت میں جبکہ بیوی کی کوئی غلطی نہ ہو، ماں باپ کی اطاعت لازم
ہوگی اور اگر ماں باپ کے کہنے پر طلاق دے دی گئی تو یہ ظلم نہیں ہوگا؟، اس کے جواب میں
وہ لکھتے ہیں: لہٰذا علماء یہ فرماتے ہیں کہ اگر والدین حق پر ہوں تو اُن کے کہنے سے طلاق دینا
واجب ہے، اگر بیوی حق پر ہے، جب بھی ماں کی رضامندی کے لئے طلاق دینا جائز
ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد سوم، ص:252)''۔
مفتی صاحب نے اپنے اس فتوے میں جائز اسباب کے نہ ہونے کی صورت میں ماں باپ
کی فرمائش پر بیٹے کے اپنی بیوی کو طلاق دینے کو جواز کے درجے میں رکھا ہے، واجب قرار
نہیں دیا۔ موجودہ صورتحال میں کہ جب آپ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ
محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرتے ہیں، حدودِ شرع کی پاسداری کرتے
ہیں تو محض ماں کی خواہش پر آپ کے لئے اپنی بیوی کو طلاق دینا لازم نہیں ہے۔ ہاں البتہ
اگر کسی خاص مسئلے میں ماں کی رائے کی وجوہِ شرعی ہوں، تو ان پر ضرور غور کرنا چاہیے، اور
جب ماں کی رائے مصلحت شرعی کے موافق ہو جائے تو ان کی تعمیل ارشاد میں کوئی حرج نہیں
ہے۔ اگر آپ کی والدہ مطالبہ کرتی ہیں کہ بیوی کو الگ رکھو، تو ان کی اس فرمائش پر ضرور عمل
کریں، ان شاء اللہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ آپ کی
بیوی کو خوش دلی سے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔ دورِ حاضر میں بہو کے بارے میں

والدین کی رائے بالعموم کسی دینی مصلحت پر مبنی نہیں ہوتی، نہ ہی ان میں وہ شفقت پدری ہوتی ہے جس کی اولین ترجیح دینی اصلاح ہو، بلکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بالعموم بہو سے نفرت کے سارے محرکات نفسانی ہوتے ہیں الا ماشاء اللہ، اگر کوئی بہو نماز بالکل نہ پڑھے، روزہ نہ رکھے، دین دار نہ ہو تو اس سے اس بنیاد پر کوئی گلہ شکوہ نہیں ہوتا۔ ایک اور لحاظ سے بھی اس مسئلے میں آپ کی بیوی زیادہ حسنِ سلوک کی حق دار ہیں کیونکہ وہ نو مسلم ہیں، اپنے خاندان سے وہ کٹ چکی ہیں اور طلاق کی صورت میں وہ کہاں جائے، اگر والدین کے پاس یا خاندان میں جاتی ہیں تو وہ اسے شاید قبول نہ کریں یا خدانخواستہ ترکِ اسلام پر مجبور کریں۔ اس لئے شوہر محمد مشتاق صاحب کے والدین اور خاندان سے ہماری گزارش یہ ہے کہ ایثار کا مظاہرہ کریں، اسلام نے تو مصارفِ زکوٰۃ میں ''مؤلّفۃ القلوب'' کا ایک مستقل مصرف رکھا ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل حدیث مبارک ملاحظہ کیجئے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم نے فتح خیبر کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں فرمایا: اُنْفُذْ عَلٰی رِسْلِكَ، حَتّٰی تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَی الْاِسْلَامِ، وَأَخْبِرْهُمْ بِمَا يَجِبُ عَلَيْهِمْ مِنْ حَقِّ اللّٰهِ فِيْهِ، فَوَاللّٰهِ لَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌلَّكَ مِنْ أَنْ يَّكُوْنَ لَكَ حُمْرُالنَّعَمِ۔

ترجمہ: ''آہستہ اور باوقار انداز میں چلتے رہو، جب تم ان کے علاقے میں پہنچ جاؤ تو انہیں اسلام کی دعوت دو اور (دین کے حوالے سے) جو فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں، ان کی بابت اُن کو بتاؤ، اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے ایک شخص کو (قبولِ اسلام کی) ہدایت نصیب فرمادے، یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں (کی قیمتی دولت) سے بہتر ہے۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 3701،2942)

ہم نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث اس لئے کی ہے تاکہ یہ واضح ہو کہ اگر بیوی عاصیہ اور ناشزہ نہیں ہے تو محض والدین کی ناپسندیدگی کی بنا پر اُسے طلاق دینا شرعاً لازم نہیں ہے اور ایسی

صورت میں ماں باپ کی خواہش کے برعکس طلاق نہ دینے والا شوہر ماں باپ کا نافرمان نہیں قرار پائے گا بشرطیکہ وہ زندگی کے دیگر معاملات میں ماں باپ کا اطاعت گزار، فرمانبردار اور اُن کے ہر جائز حکم کی تعمیل کرتا ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح

باسمہ تعالیٰ

والدین کے حکم پر لڑکے کے لئے اپنی بیوی کو طلاق دینا اس وقت واجب ہے جبکہ وہ حق پر ہوں ورنہ مباح۔ ہر شق کی تفصیل اس فتوے میں تحریر ہے، یہ جواب زیادہ تفصیلی ہے اور موجودہ تحریر کے تناظر میں زیادہ بہتر ہے، اسی پر عمل کیا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

شیخ الحدیث و مفتی محمد اسماعیل ضیائی

رئیس دار الافتاء دار العلوم امجدیہ، کراچی

22 رجب المرجب 1430ھ 17 جولائی 2009ء

محترم جناب قبلہ مفتی محمد الیاس رضوی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

ایک فتویٰ آپ کی خدمت میں استصواب اور تائید و توثیق کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ دار العلوم امجدیہ، کراچی کے فتوے کی نقل بھی منسلک ہے، جو اعلیحضرت امام احمد رضا قادری کے فتوے پر مبنی ہے۔ میں نے ذرا تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ آپ کے لئے علمی و فقہی دیانت کے مطابق اتفاق و اختلاف کی دونوں راہیں کھلی ہیں۔ لیکن اپنی فوری رائے سے ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ میں نظرِ ثانی کے لئے دار العلوم امجدیہ بھیجنے کے بارے میں فیصلہ کر سکوں۔

11، جولائی 2009ء

والسلام

﴿مفتی منیب الرحمٰن﴾

رئیس دار الافتاء، دار العلوم نعیمیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب

محتشم ومکرم جناب قبلہ مفتی محمد منیب الرحمٰن حفظہ اللہ تعالیٰ نے سائل محمد مشتاق کے استفتاء پر جو تفصیلی فتویٰ دیا ہے، راقم کے نزدیک صحیح ہے۔

حاشیۃ المشکوٰۃ میں ہے: ان کان الحق فی جانب الوالدین فطلاقھا واجب للزوم العقوق فی الحقوق وان کان فی جانب المرأۃ فان طلقھا لرضاء الوالدین فھو جائز، (حاشیہ علی المشکوٰۃ، ص:421)۔

امام اہلسنت اعلیٰحضرت امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمٰن نے وجوبِ طلاق کا جو فتویٰ دیا ہے، جسے شیخ الحدیث حضرت علامہ مفتی محمد اسماعیل رضوی ضیائی مدظلہ العالی نے نقل کیا ہے اور قبلہ محمد منیب الرحمٰن دامت برکاتہم العالیہ نے اس کا حوالہ دیا ہے، اسے اس صورت پر محمول کرنا چاہئے، جس میں طلاق دینا واجب ہو کہ مُصنف کی عبارت میں معمولی کمی بیشی ہونا ممکن ہے، نیز یہ فتویٰ 1336ھ میں دیا گیا ہے، جبکہ 1339ھ میں ''ایک عورت جس سے اس کے شوہر کے والدین ناخوش اور والدین کی خوشی اس میں کہ اسے طلاق دے دو''، کے جواب میں لکھتے ہیں: ''اگر آپ طلاق دینا چاہیں تو عورت جب حیض سے فارغ ہو اسکے بعد قبلِ جماع اس سے ایک بار کہیے کہ: ''میں نے تجھے طلاق دی''۔

(فتاویٰ رضویہ جدید، جلد 12، ص:362)

اس فتوی کے الفاظ واضح طور پر جوازِ طلاق پر دلالت کررہے ہیں نہ کہ وجوبِ طلاق پر۔۔۔۔۔ نیز یہ فتویٰ مؤخر ہے، لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی آخری تحقیق یہی ہے اور پہلی تحقیق وہ ہے جسے شیخ الحدیث جامعہ امجدیہ نے نقل کیا ہے کہ وہ فتویٰ مُقدّم ہے۔

ھذا ما عندی والعلم بالحق عند ربی

کتبہٗ

محمد الیاس الرضوی الاشرفی

11، جولائی 2009ء

نشے کی حالت میں دی جانے والی طلاق کا حکم

سوال: 114

16 اپریل 2005ء کو مجھے میرے شوہر نے شراب کے نشے میں میرا نام لے کر تین مرتبہ کہا: ''رفعت سلطانہ میں تم کو طلاق دیتا ہوں''، میں اُس وقت اپنے بیٹے کے پاس امریکہ میں تھی اور میں دو ماہ سے وہاں مقیم تھی، اس دوران E-Mail بھی بھیجی کہ میں تم کو گھر والوں سے بات کر کے طلاق بھجواتا ہوں۔ مجھے طلاق دینے کے بعد اپنے ایک دوست کو لاہور سے کراچی فون کر کے بتایا۔ آپ مجھے بتائیں کہ کیا میری طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں؟۔

میرے سابق شوہر جاوید اختر نے ادارہ ''المورد'' لاہور سے اس مسئلے میں استفسار کیا، تو ان کے اسکالر ساجد حمید صاحب نے جو تحریری جواب دیا، اُس کے مندرجات یہ ہیں:

''آپ نے جس حالت میں طلاق دی اس حالت میں شریعت کی رُو سے طلاق نہیں ہوتی، اس لئے ایسے سنجیدہ امور میں ہوش وحواس کا قائم ہونا از روئے شریعت ضروری ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب آدمی بالغ نہ ہو یا ذہنی توازن درست نہ ہو، تو ایسی حالت میں اس پر شرعی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَۃٍ،عَنِ النَّائِمِ حَتّٰی یَسْتَیْقِظَ وَعَنِ الصَّبِیِّ حَتّٰی یَحْتَلِمَ وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰی یَعْقِلَ۔

ترجمہ: ''تین لوگوں سے شریعت کا قلم اٹھالیا گیا ہے: ایک سویا ہوا شخص جب تک جاگ نہ جائے، بچہ جب تک بالغ نہ ہوجائے اور پاگل جب تک کہ اس کی عقل واپس نہ آجائے، (سنن ابی داؤد)''۔ ایسی ہی حالت اس شخص کی ہے جو کسی وجہ سے نشے میں دھت ہوگیا ہو، وہ نشے کی حالت میں مجنون آدمی کے حکم کے تحت ہوگا۔ اس لئے قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ یقیناً نشہ کرنے کی وجہ سے شراب نوشی کی سزا کا تو مستحق ہے، لیکن اس حالت میں اس کے کئے ہوئے کام نافذ (Executed) نہیں مانے جائیں گے، چنانچہ نشے کی حالت میں آپ نے جو طلاق دی، اُسے نافذ نہیں مانا جائے گا، یعنی یہ طلاق واقع نہیں ہوئی

ہے، آپ دونوں تا حال میاں بیوی ہیں''۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں طلاق واقع نہیں ہوئی، کیا یہ موقف درست ہے؟، کیا نشہ کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی؟، (رفعت سلطانہ، بلاک ل، نارتھ ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

شریعت کی رُو سے نشے کی حالت میں دی جانے والی طلاق واقع ہو جاتی ہے،

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

أَوْ سَكْرَانَ وَلَوْ بِنَبِيْذٍ أَوْ حَشِيْشٍ أَوْأَفْيُوْنٍ أَوْ بَنْجٍ زَجْرًا بِهِ يُفْتٰى ۔تَصْحِيْحُ الْقُدُوْرِيِّ۔

ترجمہ: ''اور طلاق واقع ہو جاتی ہے ہر نشہ کرنے والے کی خواہ اس نے شراب پی ہو یا حشیش یا افیون یا بھنگ پی ہو اسی پر فتویٰ ہے اور قدوری نے بھی اس کی تصحیح کی ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4 ص: 328 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَطَلَاقُ السَّكْرَانِ وَاقِعٌ إِذَا سَكِرَ مِنَ الْخَمْرِ أَوِ النَّبِيْذِ وَهُوَ مَذْهَبُ اَصْحَابِنَارَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی كَذَا فِي الْمُحِيْطِ۔

ترجمہ: ''اور نشہ کرنے والے کی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے خواہ وہ نشہ شراب سے آیا ہو یا نبیذ سے، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص: 353 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَأَمَّا السَّكْرَانُ إِذَاطَلَّقَ امْرَأَتَهُ فَإِنْ كَانَ سُكْرُهُ بِسَبَبٍ مَحْظُوْرٍ بِأَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ وَالنَّبِيْذَ طَوْعًا حَتّٰى سَكِرَ وَزَالَ عَقْلُهُ فَطَلَاقُهُ وَاقِعٌ عِنْدَ عَامَّةِ الْعُلَمَاءِ، وَعَامَّةِ الصَّحَابَةِ۔

ترجمہ: ''نشے والا شخص جب اپنی بیوی کو طلاق دیدے، تو اگر اس کا یہ نشہ کسی ممنوع سبب کی بنا پر ہے، تو عام علماء اور عام صحابہ کرام کے نزدیک اس کی طلاق واقع ہو جائے گی، (اس کی

صورت یہ ہے کہ جیسے اس نے اپنی مرضی سے شراب پی یا نبیذ پی ہو، حتیٰ کہ اسے نشہ آگیا ہو)

۔۔۔۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَلَنَا :عُمُوْمُ قَوْلِہٖ عَزَّوَجَلَّ :(اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ) اِلٰی قَوْلِہٖ سُبْحَانَہٗ تَعَالٰی : فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَاتَحِلُّ لَہٗ مِنْ بَعْدُحَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ(البقرۃ : 230)مِنْ غَیْرِ فَصْلٍ بَیْنَ السَّکْرَانِ وَغَیْرِہٖ اِلَّا مَنْ خَصَّ بِدَلِیْلٍ وَقَوْلُہٗ عَلَیْہِ الصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ :"کُلُّ طَلَاقٍ جَائِزٌ اِلَّا طَلَاقَ الصَّبِیِّ وَالْمَعْتُوْہِ" وَلِاَنَّ عَقْلَہٗ زَالَ بِسَبَبٍ ھُوَ مَعْصِیَۃٌ فَیُنْزِلُ قَائِمًا عُقُوْبَۃً عَلَیْہِ وَزَجْرًا لَہٗ عَنِ ارْتِکَابِ الْمَعْصِیَۃِ، وَلِھٰذَا لَوْ قَذَفَ اِنْسَانًا اَوْقَتَلَ یَجِبُ عَلَیْہِ الْحَدُّ وَالْقِصَاصُ،وَاَنَّھُمَا لَایَجِبَانِ عَلٰی غَیْرِ الْعَاقِلِ دَلَّ اَنَّ عَقْلَہٗ جُعِلَ قَائِمًا۔

ترجمہ:"(نشہ کرنے والے کی طلاق واقع ہونے کے بارے میں) ہم اللہ عزوجل کے اس ارشاد کے عموم سے استدلال کرتے ہیں کہ:"(الطلاق مرتان)........اور(فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَاتَحِلُّ لَہٗ مِنْ بَعْدُحَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ(البقرۃ :230)"(قرآن کی اس آیت میں طلاق کے واقع ہونے کا ذکر) حالتِ نشہ یا حالتِ ہوش میں کسی تفریق کے بغیر ہے، سوائے اس صورت کے کہ جسے کسی دلیل کی بنا پر خاص کر دیا گیا ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:"ہر طلاق جائز ہے، سوائے بچے اور فاتر العقل کی طلاق کے"، (یعنی ان دونوں کی طلاق کا مؤثر نہ ہونا، اس حدیث کی بنا پر قرآن کے عموم سے مستثنیٰ ہے) اور نشہ کرنے والے کی طلاق اس سبب سے بھی واقع ہو جائے گی کہ اُس کی عقل ایسے سبب سے زائل ہوئی، جس کا ارتکاب گناہ تھا، تو (نشے کی حالت میں طلاق دینے والے کو) معصیت کے ارتکاب کی وجہ سے سزا اور زَجر (روک ٹوک، ڈانٹ ڈپٹ) کے طور پر عاقل کے درجہ میں قرار دیا جائے گا۔ اسی بنا پر اگر نشہ کرنے والا شخص کسی انسان پر تہمت لگائے یا قتل کرے، تو اس پر (اس کے جرم کے مطابق) حد اور قصاص واجب ہوگا، حالانکہ حد اور قصاص غیرِ عاقل پر واجب نہیں ہوتے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نشہ کرنے والا عاقل کے حکم میں ہے، (بدائع الصنائع، جلد 3، ص:145، مطبوعہ: مرکز اہلسنت برکاتِ رضا، گجرات، انڈیا)"۔

نشہ کرنے والا شخص حالتِ نشہ میں بھی از روئے قرآن مُکلّف بالشرع (یعنی شریعت کی رُو سے ذمہ دار اور جواب دہ) ہے، چنانچہ علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں: هُوَ مُكَلَّفٌ لِقَوْلِهٖ تَعَالىٰ (لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى) خَاطَبَهُمْ تَعَالىٰ وَنَهَاهُمْ حَالَ سُكْرِهِمْ ،فَاِنْ كَانَ السُّكْرُ مِنْ مُّحَرَّمٍ فَالسَّكْرَانُ مِنْهُ هُوَالْمُكَلَّفُ وَاِنْ كَانَ مِنْ مُّبَاحٍ فَلَا فَهُوَ كَالْمُغْمٰى عَلَيْهِ،لَايَقَعُ طَلَاقُهٗ۔

ترجمہ: '' اللہ تعالیٰ کے ارشاد کہ (تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ،النساء:43) کے سبب نشہ کرنے والا احکامِ شرعیہ کا مُکلّف ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے امرِ شرعی کا مخاطَب بنایا اور نشے کی حالت میں نماز کی ادائیگی سے منع فرمایا، پس اگر یہ نشہ کسی حرام چیز کا ہے، تو اِس نشے میں مبتلا شخص احکامِ شرعیہ کا مُکلّف ہے اور اگر یہ نشہ کسی مباح چیز کا ہے، تو (وہ احکامِ شرعیہ کا مُکلّف) نہیں ہے، اس کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس پر غشی طاری ہوگئی ہو، تو اس کی طلاق واقع نہیں ہوگی ------- پھر مزید لکھتے ہیں:

وَالْفَتْوٰى عَلٰى اَنَّهٗ اِنْ سَكِرَ مِنْ مُّحَرَّمٍ فَيَقَعُ طَلَاقُهٗ۔

ترجمہ: '' اور فتویٰ اسی پر ہے اگر کسی شخص نے حرام چیز کا نشہ کیا ہو، تو اس شخص کی دی ہوئی طلاق واقع ہوجائے گی، (الاشباہ والنظائر، ص:304)''۔

''المورد'' کے اسکالر نے جس حدیث کی بنیاد پر نشے کی حالت میں طلاق کو غیر مؤثر قرار دیا ہے، ان کا اس حدیث سے قیاس کی بنیاد پر یہ استدلال کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ جنون غیر اختیاری چیز ہے اور محض اللہ تعالیٰ کا تکوینی امر ہے، اس میں بندے کی کسی تقصیر کا کوئی دخل نہیں ہے، جبکہ اس کے برعکس حرام چیز کا نشہ کرنا بندے کا اختیاری فعل ہے اور یہ تشریعی معاملہ ہے، لہٰذا یہ قیاس مع الفارق ہے۔ ''المورد'' کے فاضل اسکالر نے طلاق کو اپنے اجتہاد کی بنا پر سنجیدہ امر قرار دیا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے مذاق اور غیر سنجیدگی میں دی گئی طلاق کو بھی مؤثر قرار دیا ہے، آپ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ : ثَلٰثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَّهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ، وَالطَّلَاقُ، وَالرَّجْعَةُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں (کہ وہ بہر طور نافذ اور موثر ہوتی ہیں) سنجیدگی سے کہی جائیں تب بھی اور مذاق میں کہی جائیں تب بھی یعنی نکاح، طلاق اور رجعت''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1184)

''المورد'' کے اسکالر نے نشے کی کیفیت میں مبتلا شخص کو مطلقاً مرفوع القلم (یعنی ناقابلِ مؤاخذہ اور ہر شرعی حکم کی جواب دہی سے بری الذمہ) قرار دیا ہے، اس کے تصرفات پر اُسے کھلی چھوٹ دے دی ہے اور اسے نائم (سوئے ہوئے شخص) کے درجہ میں قرار دیا ہے، حالانکہ 25 مقامات ایسے ہیں، جہاں سویا ہوا شخص بھی مُستیقِظ (جاگے ہوئے شخص) کے حکم میں ہے، علامہ زین الدین ابن نجیم نے ''ولوالجی'' کے حوالے سے یہ مقامات بیان کئے ہیں، جن میں سے چند ملاحظہ ہوں:

(الف) اِذَا جَامَعَهَا زَوْجُهَا وَهِيَ نَائِمَةٌ يَفْسُدُ صَوْمُهَا (ب) لَوْ كَانَتْ مُحْرِمَةً فَجَامَعَهَا زَوْجُهَا وَهِيَ نَائِمَةٌ فَعَلَيْهَا الْكَفَّارَةُ (ج) اَلْمُحْرِمُ اِذَا نَامَ فَجَاءَ رَجُلٌ فَحَلَقَ رَأْسَهُ وَجَبَ الْجَزَاءُ عَلَيْهِ (د) اَلْمُحْرِمُ اِذَا نَامَ فَانْقَلَبَ عَلٰى صَيْدٍ فَقَتَلَهُ وَجَبَ عَلَيْهِ الْجَزَاءُ (ہ) اَلْمُصَلِّيْ اِذَا نَامَ وَتَكَلَّمَ فِيْ حَالَةِ النَّوْمِ تَفْسُدُ صَلَاتُهُ (و) رَجُلٌ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ طَلَاقًا رَّجْعِيًا فَجَاءَ الرَّجُلُ وَمَسَّهَا بِشَهْوَةٍ وَّهِيَ نَائِمَةٌ صَارَ مُرَاجِعًا (ز) لَوْ كَانَ الزَّوْجُ نَائِمًا فَجَاءَتِ الْمَرْأَةُ وَقَبَّلَتْهُ بِشَهْوَةٍ يَصِيْرُ مُرَاجِعًا اَبِيْ يُوْسُفَ۔

ترجمہ: ''(الف) جب کسی شخص نے اپنی (روزہ دار) بیوی سے اُس کے سوتے ہوئے مباشرت کرلی ہو، تو اس کا روزہ فاسد ہوجائے گا، (حالانکہ بیوی تو سوئی ہوئی ہے اور وہ ارادتاً اس عمل میں شریک نہیں ہے)۔ (ب) اگر عورت احرام کی حالت میں تھی اور اس کے شوہر نے اس سے مباشرت کرلی، تو اس عورت پر کفارہ لازم ہوگا۔ (ج) ایک شخص حالتِ احرام میں سورہا تھا، کسی دوسرے شخص نے اس کا سر مونڈ دیا، تو مُحرِم پر کفارہ واجب ہوگا۔

(د) حالتِ احرام میں سوتے ہوئے شخص کے نیچے کوئی شکار آ کر دب گیا اور ہلاک ہو گیا، تو مُحرِم پر کفارہ واجب ہوگا۔ (ہ) نمازی دورانِ نماز (چند لمحوں کے لئے) سو گیا اور نیند کی حالت میں اُس نے بات کر لی تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ (و) کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دی اور پھر اس کے پاس آیا اور اسے نیند کی حالت میں شہوت کے ساتھ چُھوا، تو اس کا رجوع ثابت ہو گیا۔ (ز) اگر شوہر سو رہا تھا اور بیوی اس کے پاس آئی اور اُس نے اُسے شہوت کے ساتھ بوسہ دیا، امام ابو یوسف کے نزدیک رجوع ثابت ہو گیا''۔

(الاشباہ والنظائر، ص:312 تا 314)

اسی طرح قتلِ قائم مقام خطا میں قاتل کے عصبات پر دیت اور کفارہ واجب ہے، اگرچہ اُس کا قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس کی خطا کے سبب کسی شخص کی جان گئی، تو اس کے عصبات پر دیت واجب ہوگی، علامہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: ''علامہ ابوبکر رازی کی تعریف قتلِ قائم مقام خطا یہ ہے کہ مثلاً نیند میں کوئی شخص کسی پر گر پڑے اور اس سے اس کی موت واقع ہو جائے، تو یہ قتلِ عمد ہے نہ قتلِ خطا، کیونکہ سونے والے شخص کا قصد (ارادہ) متصور ہی نہیں ہے، لیکن اس کا کروٹ بدل کر کسی شخص پر گرنا اس شخص کی ہلاکت کا موجب بنا، لہٰذا اس کے عصبات پر دیت اور کفارہ واجب ہوگا اور اگر وہ مقتول کا وارث تھا تو اس کی وراثت سے بھی محروم ہوگا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس نے کوئی کوتاہی کی ہو یا وہ نیند میں نہ ہو اور اس نے جلد میراث حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا ہو''۔

(المبسوط، جلد 26، ص:68، بیروت، بحوالہ: شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد 4، ص:676)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَأَمَّا مَا جَرٰى مَجْرَى الْخَطَأْ فَهُوَ مِثْلُ النَّائِمِ يَنْقَلِبُ عَلٰى رَجُلٍ فَيَقْتُلُهُ فَلَيْسَ هٰذَا بِعَمْدٍ وَلَا خَطَأٌ كَذَا فِي الْكَافِي۔ وَكَمَنْ سَقَطَ مِنْ سَطْحٍ عَلٰى إِنْسَانٍ فَقَتَلَهُ أَوْ سَقَطَ مِنْ يَدِهٖ لَبِنَةٌ أَوْ خَشَبَةٌ وَأَصَابَتْ إِنْسَانًا وَّقَتَلَتْهُ أَوْ كَانَ عَلٰى دَابَّةٍ فَوَطِئَتْ دَابَّتُهٗ

اِنسانًا ھٰکَذَا فِی الْمُحِیْطِ۔وَحُکْمُہٗ حُکْمُ الْخطأ مِنْ سُقُوْطِ الْقِصَاصِ وَوُجُوْبِ الدِّیَۃِ وَالْکَفَّارَۃِ وَحِرْمَانِ الْمِیْرَاثِ کَذَا فِی الْجَوْھَرۃِ النَّیِّرَۃِ۔

ترجمہ:''اور''قتلِ قائم مقام خطا'' کی مثال یہ ہے کہ کسی سونے والے شخص پر کوئی گرا،جس سے وہ (سونے والا شخص) ہلاک ہوگیا،پس نہ یہ قتلِ عمد ہے اور نہ ہی قتلِ خطا،'' کافی''میں بھی اسی طرح ہے۔ایک اور مثال یہ ہے کہ چھت سے کوئی شخص کسی انسان پر گرا اور اس طرح اسے ہلاک کردیا یا ایک انسان کے ہاتھ سے اینٹ یا لکڑی گر گئی اور وہ دوسرے شخص پر آ گئی اور اس کی ہلاکت واقع ہوگئی یا وہ سواری پر تھا اور اس کے جانور نے کسی شخص کو روند ڈالا ،''محیط''میں بھی اسی طرح ہے اور اس (قتل قائم مقام خطا) کا حکم بھی قتل خطا کے حکم کی طرح ہے کہ قصاص ساقط ہو جائے گا اور دیت اور کفارہ واجب ہوگا اور قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا،''جوہرۃ النیرہ''میں اسی طرح مذکور ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری،جلد 6،ص:3،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)

نشہ کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

اَلسُّکْرُ: حَالَۃٌ تَعْرِضُ لِلاِنْسانِ مِنْ امْتِلاءِ دماغِہِ مِنَ الْاَبْخِرۃِ الْمُتصاعِدۃِ الَیہِ ، فَیَتَعطَّلُ مَعَہٗ عَقْلُہُ الْمُمَیِّزُ بَیْنَ الْاُمُوْرِ الحسنۃ وَالْقَبِیْحَۃِ۔

ترجمہ:''دماغ کی طرف چڑھنے والے بخارات سے جو کیفیت انسان کو لاحق ہوتی ہے، اُسے''سکر'' کہتے ہیں،اس کے نتیجے میں انسان کے ذہن میں اچھی اور بری چیزوں میں تمیز کی جو اہلیت ہے،وہ مُعطّل ہو جاتی ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ،جز الرابع،ص:129،دار الفکر،دمشق)

ہمارے اس جواب کے رَد میں مفتی خلیل الرحمٰن لکھوی صاحب نے درج ذیل تحریر ہمیں بھیجی۔جس کو من وعن شائع کر کے ہم آخر میں اس کا جواب تحریر کریں گے۔

نشے کی حالت میں طلاق

روزنامہ ایکسپریس بروز جمعۃ المبارک 25 جنوری 2008ء صفحہ دین ودانش

میں معروف عالم دین جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب کا فتویٰ نشے کی حالت میں طلاق کے قابل اعتبار ہونے کے حوالے سے شائع ہوا۔ جس میں فقہ حنفی کی چند معروف کتابوں کے حوالے سے بعض ائمہ احناف کے اقوال ذکر فرمائے گئے ہیں۔ ایک حدیث پاک: ''ہر طلاق جائز ہے سوائے بچے اور فاتر العقل کے'' کے عموم سے استدلال فرمایا گیا ہے۔ (حالانکہ نشے کی حالت میں انسان فاتر العقل ہی ہوتا ہے)۔ آگے فرماتے ہیں کہ نشہ کرنے والا شخص نشے کی حالت میں بھی از روئے قرآن یعنی آیت (یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ، (النساء:43) مکلّف بالشرع ہے۔

نوٹ: یہ آیت قبل از حرمت خمر (شرب حرام ہونے سے پہلے) نازل ہوئی تھی۔

جواباً عرض ہے کہ یہ رائے درست نہیں۔ امام المفسرین ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس نہی میں سکران (نشئی) مخاطب نہیں ہے کیونکہ وہ خطاب کو نہیں سمجھتا، اور نشئی مجنون کے حکم میں ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے علاوہ بھی کئی ائمہ اصولیین رحمہم اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔ یعنی یہ خطاب اس کی طرف ہے جو کلام کو سمجھتا ہے نہ کہ اس نشئی (سکران) کی طرف جو یہ نہیں جانتا کہ اسے کیا حکم دیا جا رہا ہے۔ جبکہ مکلّف ہونے کے لئے فہم خطاب شرط ہے۔ محترم مفتی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں: ''جو لوگ مذکورہ روایت یعنی (ہر طلاق جائز ہے سوائے بچے اور فاتر العقل کے) سے استدلال کرتے ہیں وہ نشئی کو فاتر العقل پر قیاس کرتے ہیں حالانکہ یہ قیاس درست نہیں کیونکہ جنون غیر اختیاری ہے اور نشہ اختیاری''۔

جواباً عرض ہے کہ یہ صرف قیاس ہی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں صریح اور صحیح ترین احادیث موجود ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم (واللفظ لہ) میں قصہ حضرت ماعز بن مالک الاسلمی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب انہوں نے جناب رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر زنا کا اقرار کیا تو آپ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا کیا یہ مجنون تو نہیں؟ ان کے قبیلے و دیگر لوگوں

نے بتایا کہ نہیں یہ تندرست اور سلیم العقل ہے۔ آپ ﷺ نے مزید پوچھا کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ ایک شخص نے اٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور بتایا کہ اس نے شراب نہیں پی۔ (الیٰ آخر القصہ) اس روایت میں جناب رسول اللہ ﷺ نے مجنون اور نشی کو ایک ہی حکم میں رکھا ہے۔ روایت ہذا کے بعد بھی کوئی صاحب قیاس کی بات کریں تو سمجھ سے بالاتر ہے۔

2۔ صحیح بخاری میں حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصہ میں جب انہوں نے حالت نشہ میں (شراب کی حرمت سے پہلے کا قصہ ہے) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر ڈالے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی، آپ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیکر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے جا کر انہیں ملامت کی، نشہ کی وجہ سے حمزہ رضی اللہ عنہ کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا ''تم تو میرے باپ کے غلام ہو'' یہ سن کر آپ ﷺ جان گئے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نشے میں ہیں (اور ان کے ہوش ٹھکانے نہیں)، لہٰذا آپ ﷺ انکا مواخذہ کیے بغیر پچھلے پاؤں واپس تشریف لے گئے۔ اگر مذکورہ توہین آمیز قول: ''تم تو میرے باپ کے غلام ہو'' کوئی غیر نشی کہے گا تو اس کا یہ قول کفر اور ارتداد کے زمرے میں آئیگا۔

3۔ اگر کوئی شخص حالت نشہ میں شرکیہ یا کفریہ کلمہ کہہ دے تو معلوم نہیں کہ محترم مفتی صاحب اس کے بارے میں حد ارتداد کا فتویٰ صادر فرمائیں گے یا نہیں!۔

موصوف آگے ایک دوسری روایت ''تین چیزیں ایسی ہی کہ بہر طور نافذ اور مؤثر ہوتی ہیں سنجیدگی سے کہی جائیں تب بھی اور مذاق میں کہی جائیں تب بھی یعنی: نکاح، طلاق، رجعت'' کے عموم سے استدلال فرماتے ہیں، اسکا مفصل جواب تو امام ابن القیم رحمہ اللہ کی معروف تصنیف ''زاد المعاذ'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مختصر اُ عرض یہ ہے کہ نشے کی حالت میں انسان نہ سنجیدہ ہوتا ہے اور نہ ہی مذاق میں۔ معلوم نہیں مفتی صاحب اسے ''ھازل'' سمجھتے ہیں یا ''جاذ''!۔

دیگر دلائل:

1۔ امام زہری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شرابی شخص حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی عدالت میں لایا گیا اس نے کہا کہ ''حضرت میں حالت نشہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہوں'' یہ سن کر بشمول حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تمام حاضرین کی رائے یہی تھی کہ اسے کوڑے لگائے جائیں اور شوہر بیوی کے درمیان علیحدگی کروادی جائے (یعنی طلاق کا اعتبار کیا جائے)۔لیکن ایسے میں حضرت ابان بن عثمان رحمہ اللہ نے اپنے والد محترم خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ نقل فرمایا کہ ''لیس للمجنون و لا للسکران طلاق ''یعنی مجنون اور نشی کی طلاق غیر معتبر ہے۔یہ سن کر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حاضرین سے کہا کہ ''تم مجھے کیسے کوڑوں اور تنفیذ طلاق کا مشورہ دے رہے تھے؟ جبکہ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے یہ بات بیان کر رہے ہیں۔پھر شرابی کو صرف کوڑے مارے گئے اور بیوی لوٹادی گئی، (بحوالہ سنن البیہقی و مصنف ابن ابی شیبہ)۔

مذکورہ روایت شیخین (بخاری و مسلم) کی شرط پر ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے معلقاً بصیغہ جزم ذکر فرمائی ہے۔اسی طرح امام احمد رحمہ اللہ نے المسائل لابنہ میں جازماً ذکر کرنے کے بعد فرمایا اس باب میں یہ روایت ارفع ترین معیار کی ہے۔

2۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: "لیس لسکران و لا لمضطهد طلاق"(بحوالہ سنن سعیدبن منصور و مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ)۔

نیز اسی طرح کی روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے بصیغہ جزم معلقاً ذکر کی ہے۔اور تمام اہل علم جانتے ہیں کہ صحیح بخاری میں وہ تمام معلقات جو صیغہ جزم کے ساتھ نقل کی گئی ہیں سب کی سب صحیح ہیں۔

لہٰذا قوی ترین مؤقف یہ ہے کہ حالت نشہ میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔واللہ اعلم بالصواب

منجانب:

مفتی خلیل الرحمٰن لکھوی

فاضل مدینہ یونیورسٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون الوہاب

نشے کی حالت میں وقوع طلاق پر ہم نے قرآن مجید کی سورۃ النساء کی آیت نمبر:43 سے استدلال کرتے ہوئے فقہ حنفی کی مشہور ومعروف کتاب بدائع الصنائع کے حوالے سے لکھا تھا کہ نشے کی حالت میں انسان مکلّف بالشرع ہوتا ہے۔

معہد القرآن کے رئیس مفتی خلیل الرحمٰن صاحب نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے علامہ ابن جریر طبری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ''سکران'' اس نہی میں شامل نہیں ہے، کیونکہ وہ خطاب کو نہیں سمجھتا اور نشی مجنون کے حکم میں ہے۔

جواباً عرض ہے کہ نشے کی حالت میں طلاق کا واقع ہونا اور نشی کا مکلّف بالشرع ہونا اور نشی کا مجنون کے حکم میں نہ ہونا، یہ صرف ہمارا موقف نہیں بلکہ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی یہی موقف ہے۔

امام ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی متوفی 450ھ لکھتے ہیں:

وَدَلِیْلُنَا مِنْ طَرِیْقَیْنِ:أحَدُهُمَا ثُبُوْتُ تَکْلِیْفِهٖ: وَالثَّانِیْ وُقُوْعُ الطَّلَاقِ، فَأمَّا ثُبُوْتُ التَّکْلِیْفِ فَبِقَوْلِهٖ تَعَالیٰ" یَا أیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ "فَدَلَّتْ عَلٰی تَکْلِیْفِهِمْ مِنْ وَّجْهَیْنِ: أحَدُهُمَا تَسْمِیَتُهُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ: وَنِدَائُهُمْ بِالْاِیْمَانِ: وَلَایُنَادٰی بِهٖ اِلَّا لَهٗ: وَالثَّانِیْ نَهْیُهُمْ فِیْ حَالِ السُّکْرَانْ یَقْرَبُوْاالصَّلٰوةَ، وَلَا یُنْهٰی اِلَّا مُکَلَّفٌ وَلِأنَّهٗ اِجْمَاعُ الصَّحَابَةِ، لِأنَّ عُمَرَ شَاوَرَهُمْ فِیْ حَدِّ الْخَمْرِ، وَقَالَ: أرَی النَّاسَ قَدْ بَالَغُوْا فِیْ شُرْبِهٖ وَاسْتَهَانُوْا بِحَدِّهٖ، فَمَاذَاتَرَوْنَ؟فَقَالَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اِنَّهٗ اِذَا شَرِبَ سَکِرَ، وَاِذَا سَکِرَ هَذٰی، وَاِذَا هَذٰی اِفْتَرٰی، فَأرٰی أنْ یُحَدَّحَدَّالْمُفْتَرِیْ ثَمَانِیْنَ، فَحَدَّهٗ عُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِیٌّ ثَمَانِیْنَ، فَکَانَ الدَّلِیْلُ مِنْهُ أنَّ الزِّیَادَةَ عَلَی الْأرْبَعِیْنَ عِلَّةٌ لِإفْتِرَائِهٖ فِیْ سُکْرِهٖ، وَلَوْ کَانَ غَیْرَ مُکَلَّفٍ لَمَا حُدَّ بِمَا أتَاهُ، وَلَا کَانَ مُؤَاخَذًا بِهٖ، وَفِیْ مُؤَاخَذَتِهٖ بِهٖ دَلِیْلٌ

عَلٰی تَکْلِیفِہٖ۔ فَاِذَا ثَبَتَ اَنَّہٗ مُکَلَّفٌ، وَجَبَ اَنْ یَقَعَ الطَّلَاقُ کَالصَّاحِیْ وَاَمَّا الدَّلِیلُ عَلٰی وُقُوْعِ طَلَاقِہٖ فِی الْاَصْلِ: فَمَا رَوَاہُ الزُّھْرِیُّ، عَنْ سَعِیدِ ابْنِ الْمُسَیِّبِ وَرَوَاہُ عَبْدُاللّٰہِ بْنُ الزُّبَیْرِ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمَّا خَطَبَ خَدِیْجَۃَ بِنْتَ خُوَیْلِدٍ تَزَوَّجَھَا مِنْ اَبِیْھَا خُوَیْلِدٍ وَھُوَ سُکْرَانُ وَدَخَلَ بِھَا، فَلَمَّا جَآءَ الْاِسْلَامُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ "لَا یُزَوِّجُ نَشْوَانُ وَلَا یُطَلِّقُ الا اجزائتہ" وَھٰذَا نَصٌّ وَلِاَنَّہٗ مُؤَاخَذًا بِشَرِّہٖ فَوَجَبَ اَنْ یَکُوْنَ مُؤَاخَذًا بِمَا حَدَثَ عَنْ سُکْرِہٖ۔ ترجمہ: ''اور ہماری دلیل دوطرح سے ہے، (1) یہ کہ نشی کا مکلّف ہونا ثابت ہے (2) اس کی طلاق کا نافذ ہونا۔

نشی کا مکلّف ہونا اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ثابت ہے ''اے ایمان والو! تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ یہاں تک کہ تم کو معلوم ہو کہ کیا کہہ رہے ہو، (النساء:43)''۔ یہ آیت ان کے مکلّف ہونے پر دوطرح سے دلالت کرتی ہے، (الف) ان کو مومنین کے ساتھ موسوم کرنا اور صفتِ ایمان کے ساتھ پکارنا اور ایمان کے ساتھ صرف مکلّف ہی کو پکارا جاتا ہے (ب) نشے کی حالت میں ان کو نماز کے قریب جانے سے روکنا صرف مکلّف ہی کو روکا جاتا ہے۔ اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے شراب پینے والوں کی حد کے بارے میں مشورہ کیا اور فرمایا میں لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ شراب پینے میں مبالغہ کرتے ہیں اور اس کی حد کو انہوں نے معمولی سمجھ رکھا ہے، پس تمہارا کیا خیال ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: جب آدمی شراب پیتا ہے تو نشے میں مبتلا ہوتا ہے اور جب نشے میں مبتلا ہوتا ہے تو اول فول باتیں کرتا ہے اور جب اول فول باتیں کرتا ہے تو جھوٹی تہمت لگاتا ہے، پس میرا خیال ہے کہ اسے قذف کی حد لگائی جائے جو اسی کوڑے ہیں۔ تو حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے اسی کوڑے حد لگائی، پس یہ اس امر کی دلیل ہے کہ نشے میں تہمت لگانے کی وجہ سے چالیس کوڑے زیادہ کیے ہیں، اگر وہ مکلّف نہ ہوتا تو اس کو اس پر حد نہ لگائی جاتی اور نہ ہی اس کا مواخذہ ہوتا۔ اور اس کا مواخذہ اس کے مکلّف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ پس جب

یہ ثابت ہوا کہ وہ مکلف ہے تو لازم ہے کہ اس کی طلاق ایسے ہی واقع ہو جیسے کے ہوش مند آدمی کی طلاق واقع ہوتی ہے۔ اور اصل میں نشی کی طلاق کے واقع ہونے پر دلیل وہ حدیث ہے جو امام زہری نے سعید بن میتب سے اور انہوں نے عبداللہ بن زبیر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت خدیجہ بن خویلد کو نکاح کا پیغام بھیجا اور ان کے والد خویلد کی اجازت سے نکاح کیا،'' حالانکہ وہ اس وقت نشے میں تھے'' اور آپ ﷺ نے ان سے مباشرت بھی فرمائی، تو جب اسلام آیا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نشی نکاح نہ کرے اور نہ طلاق دے ورنہ اگر (اس نے دیدی تو) میں اسے قائم رکھوں گا، اور یہ نص ہے اور اس لئے بھی کہ نشے کی بناپر نشی کا مواخذہ ہوتا ہے، تو ضروری ہوا کہ اس سے نشے کی حالت میں جو فعل صادر ہو اس پر بھی اس کا مواخذہ ہو''۔

(الحاوی الکبیر، جلد:3،ص:106)

شیخ ابی بکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی لکھتے ہیں: قَالَ الشَّافِعِیُّ وَیَجُوْزُ طَلَاقُ السُّکْرَانِ مِنَ الشَّرَابِ الْمُسْکِرِ وَعِتْقُهُ وَقَالَ: وَأَکْثَرُ مَنْ لَقِیْتُ مِنَ الْمُفْتِیْنَ عَلَی أَنَّ طَلَاقَهُ یَجُوْزُ، قَالَ ﷺ: رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ، عَنِ النَّائِمِ حَتّٰی یَسْتَیْقِظَ، وَعَنِ الصَّبِیِّ حَتّٰی یَحْتَلِمَ، وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰی یُفِیْقَ۔ وَالسَّکْرَانُ لَیْسَ وَاحِدًا مِّنْ هٰؤُلَاءِ وَلَا فِیْ مَعْنَاهُ۔

ترجمہ: ''امام شافعی نے فرمایا کہ نشی کی طلاق اور عتاق جائز ہے جب کہ اس کو شراب پینے سے نشہ ہوا ہو اور فرماتے ہیں میری اکثر مفتیوں سے ملاقات ہوئی ہے جو نشی کی طلاق کو جائز سمجھتے ہیں، اور حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ: تین آدمیوں سے قلم اٹھا دیا گیا ہے، سوئے ہوئے سے یہاں تک کہ بیدار ہو جائے، بچے سے تاوقتیکہ بالغ ہو جائے مجنون سے تاوقتیکہ اسے افاقہ ہو جائے، اور نشی ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے اور نہ ان میں سے معنیٰ کسی ایک کے حکم میں ہے، (معارفۃ السنن والآثار، جلد:5،ص:497)''۔

امام محی الدین ابی زکریا یحیٰ بن شرف النووی متوفی 676ھ لکھتے ہیں: وَاِنْ لَّمْ یَعْقِلْ

بسببٍ لَّایعذرُ فِیہِ، کَمَنْ شَرِبَ الْخَمرَ بِغَیرِ عُذْرٍ فَسَکِرَ، أَوْ شَرِبَ دَوَاءً لِغَیرِ حَاجَۃٍ فَزَالَ عَقْلُہٗ، فَالْمَنْصُوْصُ فِی السَّکْرَانِ أَنْ یَّصِحَّ طَلَاقُہٗ۔

ترجمہ: ''اور اگر اس کی عقل کسی ایسے سبب سے زائل ہوئی ہے کہ جس میں شرعاً معذور نہ قرار دیا گیا ہو۔ جیسے اس نے بغیر عذر کے شراب پی لی ہو اور نشے میں آیا یا حاجت کے بغیر دوا پی لی اور اس کی عقل زائل ہوگئی، تو نشی کے بارے میں یہ نص (صریح حکم) ہے کہ اس کی طلاق صحیح یعنی نافذ ہوگی ــــــ چند سطور آگے وقوعِ طلاق کی علت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وَفِیْ عَلَّتِہٖ ثَلَاثَۃُ أَوْجُہٍ: أَحَدُھَا وَھُوَ قَوْلُ أَبِی الْعَبَّاسِ: اِنَّ سُکْرَہٗ لَا یَعْلَمُ اِلَّا مِنْہُ، وَھُوَ مُتَّھَمٌ فِیْ دَعْوَی السُّکْرِ لِفِسْقِہٖ، فَعَلٰی ھٰذَا یَقَعُ الطَّلَاقُ فِی الظَّاھِرِ، وَیَدِیْنُ فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَالثَّانِیْ: أَنَّہٗ یَقَعُ طَلَاقُہٗ: تَغْلِیْظًا عَلَیْہِ لِمَعْصِیَتِہٖ، فَعَلٰی ھٰذَا یَصِحُّ مَافِیْہِ تَغْلِیْظٌ عَلَیْہِ، فَالطَّلَاقُ، وَالْعِتْقُ، وَالرِّدَّۃُ، وَمَایُوْجِبُ الْحَدَّ وَالثَّالِثُ: أَنَّہٗ لَمَّا کَانَ سُکْرُہٗ بِمَعْصِیَتِہٖ، أُسْقِطَ حُکْمُہٗ، فَجُعِلَ کَالصَّاحِ، فَعَلٰی ھٰذَا یَصِحُّ مِنْہُ الْجَمِیْعُ، وَھٰذَا ھُوَ الصَّحِیْحُ، لِأَنَّ الشَّافِعِیَّ نَصَّ عَلٰی صِحَّۃِ رَجْعَتِہٖ۔

ترجمہ: ''اور اس کی طلاق کے واقع ہونے کی تین وجوہات ہیں: (1) یہ ابی العباس کا قول ہے کہ اس کے نشے کا پتہ اسی سے چلتا ہے اور وہ نشہ کے دعویٰ میں اپنے فسق کی بناء پر تہمت زدہ ہے، لہٰذا اس کی طلاق ظاہر میں واقع ہوجائے اور اس کا معاملہ اس کے اور اللہ کے درمیان چھوڑ دیا جائے گا، (2) یہ کہ اس کی معصیت کی بنا پر اس پر سختی کرتے ہوئے اس پر طلاق واقع ہونے کا حکم لگایا جائے گا، لہٰذا زجر کے طور پر نشے کی حالت میں اس سے جو کچھ صادر ہوگا وہ صحیح (طور پر نافذ) ہوگا جیسے طلاق، عتق، رِدّت (مرتد ہونا) اور ہر وہ فعل جس پر حد واجب ہوتی ہے، (3) جب اس کا نشہ اس کے معصیت کے سبب سے ہے تو نشے کا حکم ساقط ہوجائے گا اور وہ غیر نشی کے حکم میں قرار دیا جائے، لہٰذا اس کے جمیع افعال صحیح یعنی نافذ ہونگے۔ اور یہی قول صحیح ہے، اس لئے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے رجوع

کے صحیح ہونے کی تصریح کی ہے، (مجموع شرح المھذب، جلد:20، ص:388، دارالکتب)''۔

امام ابی محمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ لکھتے ہیں:

وَلَنَا: أَنَّ الصَّحَابَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ قَالُوْا فِي السَّكْرَانِ: إِذَا سَكِرَ هَذٰى وَإِذَا هَذٰى افْتَرٰى فَحُدُّوْهُ حَدَّ الْمُفْتَرِيْ، فَأَوْجَبُوْا عَلَيْهِ حَدَّ الْفِرْيَةِ الَّتِيْ يَأْتِيْ بِهَا فِيْ سُكْرِهٖ، وَأَقَامُوْا مَظِنَّتَهَا مَقَامَهَا وَلِأَنَّهٗ يَصِحُّ طَلَاقُهٗ فَصَحَّتْ رِدَّتُهٗ كَالصَّاحِيْ، وَقَوْلُهُمْ لَيْسَ بِمُكَلَّفٍ مَمْنُوْعٌ فَإِنَّ الصَّلَاةَ وَاجِبَةٌ عَلَيْهِ، وَكَذٰلِكَ سَائِرُ أَرْكَانِ الْإِسْلَامِ وَيَأْثَمُ بِفِعْلِ الْمُحَرَّمَاتِ، وَهٰذَا مَعْنَى التَّكْلِيْفِ وَلِأَنَّ السَّكْرَانَ لَا يَزُوْلُ عَقْلُهٗ بِالْكُلِّيَّةِ۔

ترجمہ: ''اور ہماری دلیل یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنھم نے نشے میں مبتلا شخص کے بارے میں کہا: جب کوئی شخص نشے میں ہو تو وہ اول فول بکے گا اور جب ہذیانی کیفیت میں ہوگا تو افترا پردازی کرے گا، تو انہوں نے اس پر تہمت (قذف) کی حد (اسی کوڑے) لگائی، تو اس پر جھوٹی تہمت کی حد واجب کی، جس کا ارتکاب وہ نشے کی حالت میں کرتا ہے، تو انہوں نے مقامِ امکان تہمت کو تہمت کے قائم مقام کر دیا اور چونکہ اس کی طلاق صحیح ہے تو باہوش شخص کی طرح اس کا مرتد ہونا بھی موثر ہے اور (مخالفین) کا یہ کہنا کہ نشے میں مبتلا شخص احکامِ شرعیہ کا مکلف نہیں ہے، تو یہ قول ممنوع ہے کیونکہ اس پر نماز واجب ہے، اسی طرح باقی ارکانِ اسلام اور محرماتِ شرعیہ کے ارتکاب پر گناہ گار ہوگا، تکلیف شرعی کے یہی معنی ہیں کیونکہ (مجنون کی طرح) اس کی عقل مکمل طور پر زائل نہیں ہوتی، (المغنی، جلد:9، ص:32)''۔

امام ابی منصور محمد بن محمود الماتریدی متوفی 333ھ لکھتے ہیں:

وفي الاية دلالة أنّ السكران مخاطب بقوله (يا أيّها الّذين امنوا لا تقربوا الصّلاة وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ) نُهِيَ عَنْ قِرْبَانِ الصَّلٰوةِ فِيْ حَالِ السُّكْرِ، فَالنَّهْيُ إِنَّمَا وَقَعَ فِيْ حَالِ السُّكْرِ، فَإِذَا كَانَ مُخَاطَبًا عمل طلاقه وَنَفَذَتْ عُقُوْدُهٗ، أَلَا تَرٰى أَنَّهٗ قَالَ فِيْ آيَةِ الْأُخْرٰى: "إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ

وَالْبَغْضَاءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ، فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ" فَلَوْلَمْ یَکُنْ عَلَیْهِمْ ذِکْرٌ فِیْ حَالِ السُّکْرِ لَمْ یَکُنْ لِیَصُدَّهُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ مَعْنًی وَلَا ذِکْرَ عَلَیْهِمْ دَلَّ اَنَّهٗ مُخَاطَبٌ، وَلِهٰذَا قَالَ اَبُوْیُوْسُفَ اِنَّهٗ اِذَا ارْتَدَّ عَنِ الْاِسْلَامِ یَقُوْلُ ارْتِدَادُهٗ اِرْتِدَادًا، وَلَمَّا نَفَذَ طَلَاقُهٗ وَسَائِرُ عُقُوْدِهٖ وَفُسُوْخِهٖ، فَعَلٰی ذَالِكَ الْاِرْتِدَادُ۔

ترجمہ: ''اور قرآن کی آیت: ''یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ'' میں اس امر پر دلالت ہے کہ نشئی احکامِ الٰہی کا مخاطب ہے، نشے کی حالت میں نماز کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے، پس نہی حالتِ نشہ میں واقع ہوئی ہے۔ پس جب وہ مخاطب ہے تو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی اور (دیگر) تمام عقود بھی نافذ ہوں گے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ (تمہیں) شراب اور جوئے میں (مبتلا کر کے) تمہارے درمیان عداوت اور بغض پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے''، پس اگر نشے کی حالت میں ان پر ذکر واجب نہ ہوتا، تو (اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کہ وہ چاہتا ہے) ''انہیں اللہ کے ذکر سے روکے'' کا کوئی مقصد نہ ہوتا، اگر ان پر نشے کی حالت میں ذکر واجب نہیں ہے، یہ دلالت کرتا ہے کہ نشئی (احکامِ شرعی کا) مخاطَب ہے، لہٰذا امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر نشئی اسلام سے مرتد ہو جائے تو وہ مرتد ہی کہلائے گا اور جب اس کی طلاق اور تمام عقود اور فسوخ نافذ ہوتے ہیں، تو اس کا ارتداد بھی نافذ ہوگا''۔

(تاویلات اہل السنۃ تفسیر لماتریدی، جلد: 3، ص: 89-188)

علامہ ابن عبد البر مالکی لکھتے ہیں: عَنْ اَبِیْ لَبِیْدٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَجَازَ طَلَاقَ السَّکْرَانِ بِشَهَادَةِ النِّسْوَةِ۔

ترجمہ: ''ابی لبید روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نشئی کی طلاق کو عورتوں کی گواہی سے جائز قرار دیا ہے''۔

(الاستذکار، جلد: 18، ص: 163، مصنف ابن ابی شیبہ، جلد: 9، ص: 554)

علامہ ابن عبدالبر مالکی لکھتے ہیں: امام مالک نے فرمایا کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار سے نشی کے طلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو دونوں نے جواب میں فرمایا: اذا طَلَّقَ السَّكْرَانُ جَازَ طَلَاقُهُ وَإِنْ قَتَلَ قُتِلَ بِهِ، قَالَ مَالِكٌ: وَعَلَىٰ ذَالِكَ الْأَمْرُ عِنْدَنَا۔

ترجمہ: ''کہ جب نشی نے طلاق دی تو اس کی طلاق جائز ہے اور اگر وہ قتل کرے تو اس کے بدلے میں اُس کو (قصاص میں) قتل کیا جائے گا، امام مالک نے فرمایا: یہی ہمارا موقف ہے، (الاستذکار، جلد:18، ص:160)''۔

علامہ موصوف مزید لکھتے ہیں: اِلَى هٰذَا ذَهَبَ مَالِكٌ وَأَبُو حَنِيفَةَ (وَأَصْحَابُهُمَا) وَالثَّوْرِيُّ، وَالْأَوْزَاعِيُّ، وَأَبُو عُبَيْدٍ، وَعَنِ الشَّافِعِيِّ فِي ذَالِكَ رِوَايَتَانِ، إِحْدَاهُمَا مِثْلُ قَوْلِ مَالِكٍ فِي أَنَّ طَلَاقَهُ لَازِمٌ فِي حَالِ سُكْرِهِ، وَهُوَ الْأَشْهَرُ عَنْهُ۔

ترجمہ: ''کہ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، امام ثوری، امام اوزاعی، امام ابوعبید اسی طرف گئے ہیں کہ نشے کی حالت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے، امام شافعی سے اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں، اور ان میں پہلی روایت امام مالک کے قول کی طرح ہے کہ اس کی طلاق نشے کی حالت میں لازم ہے اور ان کی یہی روایت زیادہ مشہور ہے، (الاستذکار، جلد:18، ص:161)''۔

علامہ عینی لکھتے ہیں: وَذَهَبَ مُجَاهِدٌ إِلَى أَنَّ طَلَاقَهُ يَقَعُ، وَكَذَا قَالَهُ مُحَمَّدٌ وَالْحَسَنُ وَسَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ وَإِبْرَاهِيمُ بْنُ يَزِيدَ النَّخَعِيُّ وَمَيْمُونُ بْنُ مِهْرَانَ وَحُمَيْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَانِ وَسُلَيْمَانُ بْنُ يَسَارٍ وَالزُّهْرِيُّ وَالشَّعْبِيُّ وَسَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللهِ وَالْأَوْزَاعِيُّ وَالثَّوْرِيُّ وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ وَأَبِي حَنِيفَةَ۔

ترجمہ: ''مجاہد کے نزدیک نشی کی طلاق واقع ہو جاتی ہے، محمد، حسن، سعید بن مسیب، ابراہیم بن یزید نخعی، میمون بن مہران، حمید بن عبدالرحمٰن، سلیمان بن یسار، زہری، شعبی، سالم بن عبداللہ، اوزاعی، ثوری، امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا یہی قول ہے''۔

(عمدۃ القاری، جلد:20، ص:356)

علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: وَقَالَ بِوُقُوعِه طَائِفَةٌ مِّنَ التَّابِعِيْنَ كَسَعِيْدِ بْنِ مُسَيَّبِ وَالْحَسَنِ وَاِبْرَاهِيْمَ وَالزُّهْرِيِّ وَالشَّعْبِيِّ وَبِه قَالَ الْأَوْزَاعِيُّ وَالثَّوْرِيُّ وَمَالِكٌ وَأَبُوْ حَنِيْفَةَ، وَاِمَامٌ شَافِعِيٌّ قَوْلَانِ الْمُصَحَّحُ مِنْهَا وُقُوعُهٗ۔

ترجمہ: ''تابعین کی ایک جماعت سعید بن مسیب، حسن، ابراہیم، زہری، شعبی، اوزاعی، ثوری، امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے اور امام شافعی کے دو قول ہیں، ان کا صحیح قول یہ ہے کہ طلاق واقع ہو جاتی ہے، (فتح الباری، جلد:6، ص:463)''۔

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ نشی مکلف بالشرع ہے اور اس کی دی ہوئی طلاق نافذ ہوگی، نیز نشی کو مجنون کے حکم میں قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ حدیث میں صرف تین افراد کو ''مرفوع القلم'' (یعنی احکامِ شرعی کا غیر مکلف) قرار دیا گیا ہے کہ جن پر نہ تو دیانتاً مواخذہ ہے اور نہ قضاءً، جب کہ نشی کا دیانتاً اور قضاءً ہر طرح سے مواخذہ ہوتا ہے اور علامہ ماوردی کی عبارت میں یہ تصریح ہوگئی ہے کہ شراب پینے والوں کے لئے صحابۂ کرام کی مشاورت سے اسی کوڑے مقرر کئے گئے ہیں، اگر نشی بھی مجنون کے حکم میں ہوتا تو صحابہ بھی اس کو مرفوع القلم قرار دیتے اور اس کے لئے یہ حد مقرر نہ کرتے، نیز صحابہ کرام کی اس مشاورت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، جس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک بھی نشی مجنون کے حکم میں نہیں ہے۔

مفتی صاحب آگے چل کر حضرت ماعز اسلمی والی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں [illegible] اور صحیح ترین احادیث موجود ہیں، جب کہ ماعز اسلمی نے زنا کا اقرار کیا تو آپ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ مجنون تو نہیں؟، ان کے قبیلے اور دیگر لوگوں نے بتایا نہیں، یہ تندرست اور سلیم العقل ہے، تو آپ ﷺ نے مزید پوچھا کہ کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟، ایک شخص نے اٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور بتایا کہ اس نے شراب نہیں پی ہے (الٰی آخر قصتہ)، اس روایت میں جناب رسول اللہ ﷺ نے مجنون اور نشی کو ایک حکم میں رکھا، روایت ہذا کے بعد بھی کوئی صاحب قیاس کی بات کریں تو سمجھ سے بالاتر ہے۔

جواباً عرض ہے کہ مفتی صاحب قیاس کرتے ہوئے بھی قیاس کا انکار کر کے فرماتے ہیں کہ اب بھی قیاس سمجھنا، سمجھ سے بالاتر ہے، جب کہ خود مفتی صاحب اس حدیث پر طلاق کو قیاس کرتے ہیں جو کہ حدود سے متعلق ہے اور طلاق حدود میں شامل نہیں ہے، حدود کے الگ احکامات ہیں اور طلاق کے کچھ اور احکامات ہیں، ہمیں تو مفتی صاحب کے اس قیاس کرنے پر حیرت ہے اور مفتی صاحب کا یہ قیاس کرنا ہی سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس کا طلاق سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اور مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ مجنون اور نشی دونوں کو ایک حکم میں رکھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ دو چیزوں کو ایک ساتھ بیان کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں کا حکم بھی ایک ہو (جیسا کہ مفتی صاحب نے سمجھا)، بلکہ ایک روایت میں تو ''ابك جنونٌ'' کے بجائے ''هَلْ أُحْصِنْتَ'' کے الفاظ بھی موجود ہیں، تو کیا شادی شدہ بھی مجنون کے حکم میں آگیا؟ نہیں، بلکہ حدیث میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر یہ مجنون ہے تو مجنون مرفوع القلم ہوتا ہے لہٰذا، اس پر حد جاری نہیں ہوگی، اور اگر نشے میں ہے تو نشی کا حدود میں اقرار معتبر نہیں ہے، جیسا کہ فقہاءِ کرام نے تصریح کی ہے، وَلَا يَصِحُّ إِقْرَارُ السَّكْرَانِ بِالْحُدُوْدِ الْخَالِصَةِ، (الاشباہ والنظائر، ص:128)۔ اور خود آپ ﷺ کا فرمان: اِدْفَعُوا الْحُدُوْدَ مَا اسْتَطَعْتُمْ، (الاشباہ والنظائر، ص:127)۔ نیز حدیث میں یہ بھی احتمال ہے کہ نشے کی حالت میں چونکہ حد جاری نہیں ہوتی، لہٰذا اس لئے حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے پوچھا کہ اس نے شراب تو نہیں پی رکھی، حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ نشی بھی مجنون کی طرح مرفوع القلم ہے، اور مفتی صاحب کا حضرتِ امیر حمزہ والی حدیث پر قیاس کرنے پر بھی حیرت ہے کہ ابتداءِ اسلام کا واقعہ ہے جب کہ اس وقت خمر کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی، اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ تارِ عنکبوت کی مثل کمزور ہے، حرمت کے نازل ہونے کے بعد والے دلائل سے استدلال کریں تاکہ بات میں جان پیدا ہو۔ علامہ حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں: زَادَ ابْنُ جُرَيْجٍ: "وَذَالِكَ قَبْلَ تَحْرِيْمِ الْخَمْرِ" أَيْ وَلِذَالِكَ لَمْ يُؤَاخِذِ النَّبِيُّ ﷺ حَمْزَةَ بِقَوْلِهِ: وَفِيْ هٰذِهِ الزِّيَادَةِ رَدٌّ عَلٰى

مَنِ احْتَجَّ بِهٰذِهِ الْقِصَّةِ عَلٰی أَنَّ طَلَاقَ السَّکْرَانِ لَایَقَعُ۔

ترجمہ: ''ابن جریج نے فرمایا کہ: ''یہ تحریم خمر سے پہلے کا واقعہ ہے''، یعنی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ان کلمات پر ان کا مواخذہ نہیں فرمایا، اور اس میں ان لوگوں کا بھی رد ہے جو اس حدیث سے نشئی کی طلاق کے عدمِ وقوع پر استدلال کرتے ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: فَلَیْسَ فِیْ ھٰذَاالْحَدِیْثِ حُجَّةٌ لِاِثْبَاتِ ذَالِكَ وَلَانَفْیِهٖ۔

ترجمہ: ''پس اس حدیث میں نہ وقوعِ طلاق کی دلیل ہے اور نہ عدمِ طلاق کی''۔

(فتح الباری، جلد: 4، ص: 384، دارالمعارف، بیروت)

علامہ ابن بطال البکری القرطبی لکھتے ہیں: قَالَ الْمُهَلَّبُ: ذَهَبَ الْخَطَّابِیُّ اِلٰی أَنَّهٗ لَمَّا کَانَتِ الْخَمْرُ مُبَاحَةً وَّقْتَ شُرْبِهَا کَانَ مَاتَوَلَّدَ مِنْهَا بِسُکْرٍ مِّنَ الْجَفَاءِ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ لَا تَلْزَمُ فِیْهِ عُقُوْبَةٌ، فَعَذَرَهٗ، ﷺ لِتَحْلِیْلِ الْخَمْرِ مَعَ أَنَّهٗ کَانَ شَدِیْدَ التَّوْقِیْرِ لِعَمِّهٖ وَالتَّعْظِیْمِ لَهٗ الْبِرِّ بِهٖ۔ فَاَمَّا الْیَوْمَ الْخَمْرُ مُحَرَّمَةٌ فَیَلْزَمُ السَّکْرَانَ حَدُّالْفِرْیَةِ، وَجَمِیْعُ الْحُدُوْدِ، لِاَنَّهٗ سَبَبُ زَوَالِ عَقْلِهٖ مِنْ فِعْلٍ مُّحَرَّمٍ عَلَیْهِ۔

ترجمہ: ''مھلب نے کہا: خطابی نے یہ رائے قائم کی ہے کہ (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے) شراب پینے کے وقت شراب کا پینا مباح تھا (یعنی اب تک اس کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا)، تو نشے کی حالت میں ان سے نبی ﷺ کے بارے میں جو سخت کلمات سرزد ہوئے، آپ ﷺ نے انہیں (اس وقت تک شراب کے حلال ہونے کی وجہ سے شرعاً) معذور قرار دیا، حالانکہ آپ ﷺ چچا ہونے کی بنا پر ان کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے اور تعظیم فرماتے تھے اور ان کے ساتھ بہت زیادہ حسنِ سلوک فرماتے تھے، لیکن اب جب کہ شراب حرام قرار دی گئی ہے، تو شراب کے نشئی پر حدِ قذف اور (دیگر) تمام حدود نافذ ہوں گی، کیونکہ اس کی عقل ایک ایسے فعل کی وجہ سے زائل ہوئی جو اس پر حرام قرار دیا گیا ہے''۔

(شرح ابن بطال، جلد: 5، ص: 265، دارالکتب العلمیہ، بیروت)

جبکہ نشے کی حالت میں طلاق کے واقع ہونے پر نص صریح موجود ہے: لَایُزَوِّجُ نَشْوَانُ وَلَا

يُطَلِّقُ الا اجزائته ،(الحاوی الکبیر:107)۔
مفتی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں: ''اس حدیث سے استدلال کرنا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو بہر طور پر نافذ اور مؤثر ہوتی ہیں، سنجیدگی سے کہی جائیں تب بھی اور مذاق سے کہی جائیں تب بھی، یعنی نکاح، طلاق، رجعت، صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ نشے کی حالت میں انسان نہ سنجیدہ ہوتا ہے اور نہ ہی مذاق میں، معلوم نہیں مفتی صاحب اسے ''ھازل'' سمجھتے ہیں یا ''جادّ''۔

جواباً عرض ہے کہ ہم نشے کی حالت میں انسان کو نہ ''ھازل'' (مذاق کے طور پر بات کرنے والا) سمجھتے ہیں اور نہ ''جادّ'' (سنجیدگی سے بات کرنے والا) اور نہ ہم نے اس کو ''ھازل'' یا ''جادّ'' کہا ہے، بلکہ ہم نے تو صرف حدیث سے استدلال کیا ہے کہ طلاق خواہ مذاق میں ہو یا سنجیدگی میں یا نشے میں، بہر حال نافذ ہو جائے گی، کیونکہ ان حالتوں میں انسان مکلّف بالشرع ہوتا ہے۔

آگے مفتی صاحب لکھتے ہیں: اگر نشے کی حالت میں کلمۂ کفریہ یا شرکیہ کہہ دے تو معلوم نہیں کہ مفتی صاحب ارتداد کا فتویٰ صادر فرمائیں گے یا نہیں؟۔

جواباً عرض ہے کہ نشے کی حالت میں کلمات کفریہ یا شرکیہ کہہ دینے پر ہم پہلے امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام ابو یوسف کے اقوال بیان کر دیتے ہیں تا کہ یہ بات مزید واضح ہو جائے کہ شوافع، حنابلہ کے نزدیک بھی نشے کی حالت میں انسان مکلّف بالشرع ہوتا ہے اور اس کے اقوال اور افعال پر شریعت کا حکم لاگو ہوگا۔

چنانچہ علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں: وَقَالَ الشَّافِعِيُّ اِنْ ارْتَدَّ سَكْرَانُ فَمَاتَ كَانَ مَالُهٗ فَيْئًا وَلَا نَقْتُلُهٗ فِيْ سُكْرِهٖ، وَلَا نَسْئَلُ التَّوْبَةَ مِنْهُ۔

ترجمہ: ''امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: اگر نشئی مرتد ہوا اور مر گیا تو اس کا مال، مالِ فيئ ہوگا اور ہم اس کو نشے کی حالت میں قتل نہیں کریں گے اور نہ ہی اس سے توبہ طلب کریں گے، (الاستذکار، جلد: 18، ص: 162)''۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: فَصَحَّتْ رِدَّتُهٗ كَالصَّاحِیْ، ترجمہ (امام احمد بن حنبل کے نزدیک) اس کی رِدّت (یعنی مرتد ہونے کا حکم لگانا) صحیح ہوگی جیسے کہ ہوش مند کی ردّت صحیح ہوتی ہے، (المغنی: جلد: 9،ص: 32)''۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں: اِنَّهٗ اِذَا ارْتَدَّ عَنِ الْاِسْلَامِ يَكُوْنُ اِرْتِدَادُهٗ اِرْتِدَادًا وَلَمَّا نَفَذَ طَلَاقُهٗ وَسَائِرُ عُقُوْدِهٖ وَفُسُوْخِهٖ فَعَلٰى ذَالِكَ الْاِرْتِدَادُ۔

ترجمہ:''کہ جب نشئی اسلام سے مرتد ہوا تو اس کا حکم مرتد ہی کا ہوگا، جب اس کی طلاق اور تمام عقود اور فسوخ (یعنی معاملات و معاہدات کا کرنا یا توڑنا) نافذ ہوتے ہیں، تو اسی اصول پر اس کا ارتداد بھی مؤثر ہوگا، (تاویلات اہل السنۃ، جلد: 32،ص: 189)''۔

امام اعظم کے نزدیک استحساناً مرتد نہیں ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر اور ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے اگرچہ ظاہری معیارِ شریعت کے مطابق اقرار باللسان شرط ہے، اور نشے کی وجہ سے چونکہ ارادۂ قلب نہیں پایا جاتا ہے، لہٰذا استحساناً اس پر مرتد کا حکم نہیں لگایا جائے گا، برخلاف دوسرے معاملات کے کہ ان کا تعلق زبان اور ظاہری حال سے ہوتا ہے، لہٰذا صحیح ترین موقف یہ ہے کہ نشے کی حالت میں طلاق واقع ہوجائے گی، واللہ اعلم بالصواب۔

حُرمت کا شرعی مسئلہ

سوال: 115

میری عمر 55 سال ہے اور میری بیوی کی عمر 50 سال ہے، چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ چند روز قبل میرا میری بیوی سے جھگڑا ہوا، نوبت گالی گلوچ تک پہنچ گئی، میں نے بیوی کو بالوں سے پکڑ کر تھپڑ مارا، بیوی نے بچنے کے لئے مجھے دھکا دیا اور میں کرسی پر گر گیا۔ اس سارے جھگڑے میں میری خالہ اور بچے جمع ہوگئے۔ ہم دونوں کے درمیان جھگڑا جاری تھا نہ وہ چپ ہورہی تھی اور نہ میں چپ ہورہا تھا، بددعائیں اور طنزیہ جملے کہتی رہی، مجھے مزید غصہ آیا لیکن میری خالہ اور بیٹے نے مارنے سے روک لیا۔ مگر میری بیوی نے کہا: میں نے 35 سال میں یہاں کوئی سکھ نہیں دیکھا، وہ مجھے برابر غصہ دلاتی رہی، پھر نہ جانے میرے منہ

سے ''میں نے تمہیں طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی'' کے الفاظ نکل گئے ۔ وہ بھی خاموش ہوگئی اور میں بھی حیران رہ گیا ۔ اب ہم اس کا حل چاہتے ہیں، میرے سسرال والے کہتے ہیں ہم بیٹی کا حلالہ نہیں ہونے دیں گے اور میرا اپنا بھی یہی موقف ہے، اس کا کوئی دوسرا متبادل حل جو شریعت کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہو ۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں حل فرمائیں، (محمد خان، بلدیہ ٹاؤن کراچی، معرفت حاجی احمد مجاہد روزنامہ نوائے وقت کراچی) ۔

جواب:

صورت مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر حرام ہوچکے ہیں، دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج باقی نہیں رہا، نیز تحلیلِ شرعی کے بغیر رجعت کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا ۔

ترجمہ: ''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دے دے، تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کر لے ۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ:230)'' ۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: وَذَهَبَ جُمْهُوْرُ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ مِّنْ اَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ اِلٰى اَنَّهٗ يَقَعُ ثَلَاثٌ ۔

ترجمہ: ''جمہور صحابہ اور تابعین اور وہ ائمۂ دین جو ان کے بعد ہیں، ان سب حضرات کا متفقہ مذہب ہے کہ ایک مجلس میں یا ایک جملے میں تین یا تین سے زائد طلاق دے، تو تین واقع ہوجاتی ہیں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد چہارم، ص:320)'' ۔ یہ حرمتِ شرعی کا مسئلہ ہے اس کا متبادل کوئی نہیں، واللہ اعلم بالصواب ۔

موبائل SMS کے ذریعے طلاق کا حکم

سوال: 116

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کی ذیل میں کہ میری بیوی کسی سبب ناراض ہوکر اپنے والدین کے گھر چلی گئی، جب میں اُسے لینے گیا تو اس نے آنے سے انکار کردیا، اس پر میں نے ایس۔ایم۔ایس کیا: ''میں نہیں رہ سکتا آج جو ہوا مرتے دم تک نہیں بھولوں گا، قسم خدا کی مجھے جان کی پرواہ نہیں: طلاق، طلاق، طلاق''۔ آیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (محمد فرحان، R-315 سیکٹر 11-C/1، نارتھ کراچی)۔

جواب:

طلاق دینے کے تین طریقے ہیں: ا۔ یہ کہ لفظاً طلاق دی جائے اور یہی طلاق میں اصل ہے، یعنی کوئی شخص اپنی بیوی کو براہِ راست مخاطب کرکے یہ کہے: ''میں نے تجھے طلاق دی'' یا بیوی کا نام لے کر کہے: ''میں نے فلانہ بنت فلاں کو طلاق دی''۔ یہ طلاق کا نہایت واضح طریقہ ہے اور اس میں کوئی اشکال اور ابہام نہیں رہتا۔

۲۔ یہ کہ کسی کو طلاق دینے کے لئے اپنا وکیل بنائے، اسے ''توکیل بالطلاق'' کہتے ہیں۔

۳۔ یہ کہ لکھ کر طلاق دے۔ طلاق جس طرح لفظاً اور زبانی واقع ہوتی ہے، اسی طرح تحریری طلاق بھی مؤثر ہوتی ہے۔ لیکن اگر اِکراہِ مُلجی یا اِکراہِ تام کے ذریعے تحریری طلاق لی جائے، تو یہ مؤثر نہیں ہوتی، کیونکہ تحریر ضرورت کے وقت لفظی اور زبانی طلاق کے قائم مقام ہوتی ہے، جب کہ حالتِ جبر میں ضرورت نہیں ہوتی۔ ''اِکراہِ مُلجی'' یا ''اِکراہِ تام'' سے مراد یہ ہے کہ جان سے مارنے کی دھمکی دے یا کسی عضو کو تلف کرنے کی دھمکی دی جائے وغیرہ۔ اور بظاہر اس کے آثار بھی نظر آئیں کہ اگر ''مُکرِہ (جبر کرنے والے'' کی بات نہ مانی گئی تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کرلے گا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: رَجُلٌ اُکرِہَ بِالضَّرْبِ وَالْحَبْسِ عَلٰی اَنْ یَّکْتُبَ طَلَاقَ اِمْرَأَتِہٖ فُلَانَۃَ بِنْتِ فُلَانٍ فَکَتَبَ: اِمْرَأَتُہٗ فُلَانَۃُ بِنْتُ فُلَانِ بِنِ فُلَانٍ طَالِقٌ: لَا تُطَلَّقُ اِمْرَأَتُہٗ،

كَذَا فِيْ فَتَاوٰى "قَاضِيْ خَانْ" ـ

ترجمہ: ''ایک شخص کو مار پیٹ کر یا قید کر کے مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق لکھ کر دے، تو اُس نے لکھا: ''میری بیوی فلانہ بنت فلاں بن فلاں کو طلاق ہے''، تو اس کی بیوی کو طلاق واقع نہیں ہوگی، جیسا کہ ''فتاویٰ قاضی خان'' میں ہے، (جلد: 01، ص: 379)''۔

تحریری طلاق کی کئی صورتیں ہیں، عالمگیری میں ہے:

اَلْكِتَابَةُ عَلىٰ نَوْعَيْنِ: مَرْسُوْمَةٌ وَغَيْرُمَرْسُوْمَةٍ، وَنَعْنِيْ بِالْمَرْسُوْمَةِ أَنْ يَّكُوْنَ مُصَدَّراً وَمُعَنْوَناً، مِثْلَ مَايُكْتَبُ اِلَى الْغَائِبِ، وَغَيْرُالْمَرْسُوْمَةِ لَا يَكُوْنُ مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا، وَهُوَ عَلىٰ وَجْهَيْنِ: مُسْتَبِيْنَةٌ وَغَيْرُ مُسْتَبِيْنَةٍ، فَالْمُسْتَبِيْنَةُ مَايُكْتَبُ عَلَى الصَّحِيْفَةِ وَالْحَائِطِ وَالْأَرْضِ عَلىٰ وَجْهٍ يُمْكِنُ فَهْمُهٗ وَقِرَاءَتُهٗ، وَغَيْرُ الْمُسْتَبِيْنَةِ مَا يُكْتَبُ عَلَى الْهَوَاءِ وَالْمَآءِ وَشَيْءٍ لَا يُمْكِنُ فَهْمُهٗ وَقِرَاءَتُهٗ، فَفِيْ غَيْرِ الْمُسْتَبِيْنَةِ لَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَاِنْ نَوىٰ، وَاِنْ كَانَتْ مُسْتَبِيْنَةً لٰكِنَّهَا غَيْرُمَرْسُوْمَةٍ، اِنْ نَوَى الطَّلَاقَ يَقَعُ وَاِلَّا فَلَا، وَاِنْ كَانَتْ مَرْسُوْمَةً يَقَعُ الطَّلَاقُ، نَوىٰ اَوْ لَمْ يَنْوِ، ثُمَّ الْمَرْسُوْمَةُ لَا تَخْلُوْ، اِمَّا اِنْ أَرْسَلَ الطَّلَاقَ بِأَنْ كَتَبَ: "اَمَّا بَعْدُفَاَنْتِ طَالِقٌ"، فَلَمَّا كَتَبَ هٰذَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَتَلْزَمُهَاالْعِدَّةُ مِنْ وَّقْتِ الْكِتَابَةِ، وَاِنْ عَلَّقَ طَلَاقَهَا بِمَجِيْءِ الْكِتَابِ، بِاَنْ كَتَبَ: "اِذَا جَاءَكِ كِتَابُ هٰذَا فَاَنْتِ طَالِقٌ"، فَمَا لَمْ يَجِئْ اِلَيْهَاالْكِتَابُ، لَا يَقَعُ،

كَذَا فِيْ فَتَاوٰى "قَاضِيْ خَانْ" ـ

ترجمہ: ''تحریری طلاق کی دو قسمیں ہیں، مرسومہ اور غیر مرسومہ:

مرسومہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ با قاعدہ مکتوب الیہ کے نام اور عنوان سے شروع کیا جائے، جیسے کسی غائب کو خط لکھا جاتا ہے (عربی میں لکھتے ہیں: الیٰ فُلان اور اردو میں لکھتے ہیں: بنام فلاں یا فلاں کے نام، فلاں کی جگہ مکتوب الیہ کا نام لکھا جاتا ہے)۔

غیر مرسومہ سے مراد یہ ہے کہ مکتوب الیہ کا نام لکھ کر با قاعدہ اُسے مخاطب نہ کیا جائے۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں: واضح ہو یا غیر واضح۔ واضح اور نظر آنے والا وہ ہے جسے کاغذ یا دیوار یا

زمین پراس طرح لکھا جائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن ہو۔اور غیر واضح سے مراد یہ ہے کہ جسے ہوا یا پانی یا کسی ایسی چیز (جیسے انگلی سے شفاف شیشے پر لکھنا) پر لکھا جائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن نہ ہو، تو غیر واضح تحریر سے طلاق واقع نہیں ہوگی، خواہ لکھنے والے نے نیت بھی کی ہو۔اور اگر تحریر تو واضح ہے، لیکن مکتوب الیہ کو نام کے ساتھ مخاطَب کر کے نہیں لکھی گئی، تو اگر لکھنے والے نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت سے لکھا ہے، تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر اُس نے طلاق کی نیت سے نہیں لکھا، تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔اور اگر تحریر واضح ہے اور اپنی بیوی کو نام کے ساتھ مخاطَب کر کے طلاق نامہ لکھا ہے، تو نیت کی ہو یا نہ، طلاق واقع ہو جائے گی۔

پھر اگر طلاق مرسومہ ہے، یعنی اپنی بیوی کا نام لکھ کر طلاق نامہ لکھا ہے، تو اس کی دو صورتیں ہیں: (۱) یہ کہ طلاق کو کسی شرط پر مقید نہیں کیا، یعنی شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور اُسے مخاطَب کر کے یوں لکھا: ''تجھے طلاق ہے''، تو جس وقت یہ تحریر لکھی، اُسی وقت سے طلاق واقع ہو جائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی۔(۲) اور اگر شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور پھر اُسے مخاطَب کر کے لکھا: ''جیسے ہی میری یہ تحریر یا خط یا طلاق نامہ آپ کو ملے، آپ پر طلاق ہے''، تو جب تک اُس کی بیوی کو تحریر نہیں ملے گی، طلاق واقع نہیں ہوگی (اور تحریر ملتے ہی طلاق واقع ہو جائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی)''۔

(جلد:01،ص:378)

بعض فقہاء کے نزدیک تحریری طلاق قابلِ تسلیم نہیں ہے، جیسا کہ فتاویٰ نعیمیہ میں ہے:

شروع اسلام کے زمانوں سے ماضیِ قریب کے زمانوں تک زبانی طلاق ہی مروّج رہی ہے، اُن زمانوں میں لکھی ہوئی طلاق کا اتنا رواج نہ تھا، اسی لئے بعض فقہاء نے تو طلاق بالکتابت یعنی تحریری طلاق کو بالکل تسلیم ہی نہیں کیا۔وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی خاوند اپنی رضا خوشی سے بھی صرف لکھ کر طلاق دے دے گا اور زبان سے بالکل طلاق کے الفاظ ادا نہ کرے، تو بھی طلاق قطعاً نہیں ہوتی۔اُن کی دلیل یہ ہے کہ طلاق، نکاح کو ختم کرنے کے

لئے ہوتی ہے اور نکاح بالکتابت متفقاً جائز نہیں ہے۔ تمام ائمۂ اربعہ کے نزدیک یہ مسئلہ واضح ہے کہ اگر کوئی مرد مُنہ سے نکاح کا ایجاب یا قبول بالکل نہ کرے صرف کاغذ پر لکھ دے کہ: ''میں فلاں عورت سے نکاح کرتا ہوں یا تجھ سے نکاح کرتا ہوں''، اور عورت بھی لکھ دے کہ مجھ کو قبول ہے، مُنہ سے کچھ نہ بولے، گواہ بھی تحریر کو پڑھ لیں، دستخط بھی کر دیں، مگر اس طرح کا یہ نکاح شرعاً صحیح و درست نہ ہوگا، تو اس طرح کی طلاق بھی درست نہیں ہو سکتی۔ لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ جب خاوند اپنی مرضی و ارادے سے طلاق لکھ کر دے گا، تو مُنہ سے کہے یا نہ کہے، طلاق واقع ہو جائے گا، (جلد:03، ص:179)۔

حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا:

''ایک شخص نے اپنی بیوی مسمات فاطمہ کو یہ تحریر لکھ کر بھیجی کہ: ''میں نے فاطمہ بی بی کو طلاق دے دی''، نیچے اپنے دستخط کر دیئے طلاق ہوگئی یا نہیں؟''۔

مفتی صاحب جواب میں لکھتے ہیں: ''اگر شوہر نے بہ نیتِ طلاق یہ عبارت لکھی ہے، تو طلاقِ رجعی واقع ہوگئی، ورنہ نہیں، کیونکہ جو طلاق اَلقاب و آداب کے بغیر ویسے ہی لکھ دی جاوے، وہ نیت پر موقوف ہے۔ اس کے بعد مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتابت کی اقسام اور تعریفات کے حوالے سے وہی عبارات لکھیں، جو ہم نے اوپر درج کی ہیں، انہوں نے ''مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا'' کے معنی لکھے ہیں: ''باقاعدہ القاب و آداب کے ساتھ''، (ص:150)''۔

موبائل فون سے اپنی بیوی کو SMS کر کے یہ لکھنا کہ: ''طلاق، طلاق، طلاق''۔ مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں یہ طلاق بالکتابت ہی کی ایک قسم ہے اور یہ ''طلاقِ غیر مرسوم، مُستبین، غیر معلّق بوصول الکتاب'' کی ایک جدید شکل ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ تحریری طلاق میں طلاق کے واقع ہونے کا حکم اُسی وقت ہوتا ہے، جب تحریر ''اکراہِ شرعی'' کے بغیر ہو، شوہر خود اپنی تحریر کا اقرار کرے یا گواہوں سے ثابت ہو کہ یہ تحریر اُسی کی ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''لِأَنَّ الْخَطَّ یُشْبِهُ الْخَطَّ وَالْخَاتَمُ یُشْبِهُ الْخَاتَمَ، کَمَا فِی ''الْهِنْدِیَّةِ'' وَغَیْرِهَا اور لِأَنَّ الْکِتَابَ یُشْبِهُ الْکِتَابَ فَلَا

یَثْبُتُ"(کیونکہ خط، خط کے مشابہ ہوتا ہے اور مُہر، مُہر کے مشابہ ہوتی ہے، جیسا کہ ہندیہ میں ہے۔۔۔۔۔اور ہدایہ میں ہے: تحریر، تحریر کے مشابہ ہوتی ہے، یعنی شوہر کے اقرار یا گواہوں کے بغیر بیوی کو ایسی تحریر سے طلاق ثابت نہیں ہوگی، جس میں بیوی کو براہِ راست نام کے ساتھ مخاطب کر کے تحریر نہ لکھی گئی ہو)"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:415 و 448)

علامہ ابن نجیم احکام الکتابت کے تحت لکھتے ہیں:

فَقَالَ فِی الْبَزَّازِیَۃِ: اَلْکِتَابَۃُ مِنَ الصَّحِیحِ وَالْأَخْرَسِ عَلٰی ثَلَاثَۃِ اَوْجُہٍ:(۱) اِنْ کَتَبَ عَلٰی وَجْہِ الرِّسَالَۃِ مُصَدَّرًا مُعَنْوَنًا وَثَبَتَ ذَالِکَ بِاِقْرَارٍ اَوْ بِالْبَیِّنَۃِ فَکَالْخِطَابِ۔

ترجمہ:" کلام پر قادر اور گونگے شخص کی تحریر کی تین صورتیں ہیں: (۱) اگر وہ اپنی بیوی کو نام کے ساتھ مخاطب کر کے طلاق لکھے اور یہ بات شوہر کے اقرار یا گواہوں سے ثابت ہو، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اُس نے براہِ راست بیوی کو مخاطب کر کے زبانی طلاق دی"۔

(الاشباہ والنظائر، ص:293)

صورتِ مسئولہ میں شوہر نے اپنی بیوی کو مذکورہ SMS بھیجنے کا اقرار کیا ہے اور اُس میں یہ تحریر ہے:"میں نہیں رہ سکتا، آج جو ہوا مرتے دم تک نہیں بھولوں گا، قسم خدا کی مجھے جان کی پرواہ نہیں" یہ تو طلاق نہیں ہے نہ صریح نہ کنایہ، البتہ اُس کے تحریر کردہ یہ کلمات "طلاق، طلاق، طلاق"، صریح طلاق کے الفاظ ہیں، مگر یہ اضافت سے خالی و عاری ہیں اور اس پوری تحریر میں کوئی ایسے کلمات نہیں جو اضافت کا فائدہ دیں، جب کہ طلاق کے واقع ہونے کیلئے اضافت کا ہونا ضروری ہے، خواہ طلاق زبانی ہو یا تحریری، کیونکہ وقوعِ طلاق، ایقاع (واقع کرنے) کے بغیر نہیں ہوتا۔ اور ایقاع اس وقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک طلاق کا تعلق بیوی سے نہ کیا جائے اور یہ اضافت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اضافت ضروری ہے، خواہ لفظی ہو، عام ازیں صراحۃً ہو یا تقدیراً، خواہ قلبی۔

فتاویٰ اجملیہ میں ایک سوال کے جواب میں تحریر ہے:

''صرف لفظ طلاق، طلاق اگر کسی مطالبہ کے جواب میں نہ ہوں اور زوجہ کی طرف اشارہ کر کے نہ ہوں اور ان الفاظ سے عورت کو طلاق دینے کی نیت بھی نہ ہو، تو ان سے طلاق واقع نہ ہوگی، اس میں بیوی کی طرف کسی کی نسبت اور اشارہ نہ پایا گیا، درمختار میں ہے: لَمْ یَقَعْ لِتَرْکِهِ الْاِضَافَةَ اِلَیْهَا، (یعنی بیوی کی طرف نسبت نہ ہونے کی وجہ سے طلاق واقع نہ ہوئی)، (جلد:03،ص:378)''۔

مسئلۂ اضافت کی تفصیل کا اختصار فتاویٰ رضویہ سے یہ ہے:

اِنَّ الْاِضَافَةَ لَا بُدَّ مِنْهَا، اِمَّا فِی اللَّفْظِ وَاِمَّا فِی النِّیَّةِ، اِذْلَا طَلَاقَ اِلَّا بِالْاِیْقَاعِ وَلَا اِیْقَاعَ اِلَّا بِاِحْدَاثِ تَعَلُّقِ الطَّلَاقِ بِالْمَرْأَةِ، وَلَیْسَ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْاِضَافَةِ، وَهٰذَا ضَرُوْرِیٌّ لَا شَكَّ فِیْهِ، اِذْ لَوْلَاهُ لَزِمَ الطَّلَاقُ عَلٰی کُلِّ مَنْ تَلَفَّظَ بِلَفْظِ طَلَاقٍ اَوْطَالِقٍ وَنَحْوِهِمَا، وَاِنْ لَّمْ یُرِدْ عَلٰی هٰذَا شَیْئًا اَوْلَمْ یُرِدْ طَلَاقَ امْرَأَتِهٖ وَهُوَ بَاطِلٌ قَطْعًا، فَاشْتِرَاطُ الْاِضَافَةِ حَقٌّ لَا مِرْیَةَ فِیْهِ، نَعَمْ قَدْ تُوْجَدُ الْاِضَافَةُ فِی اللَّفْظِ فَلَایَحْتَاجُ فِی الْحُکْمِ اِلَی النِّیَّةِ، وَقَدْ لَا تُوْجَدُ فِی اللَّفْظِ فَیَحْتَاجُ اِلٰی ظُهُوْرِ النِّیَّةِ____ آگے چل کر لکھتے ہیں:

اَمَّا وُجُوْدُ الْاِضَافَةِ فِی اللَّفْظِ فَاَقُوْلُ عَلٰی ثَلَاثَةِ اَنْحَاءٍ: اَلْاَوَّلُ تَحَقُّقُهَا صَرِیْحًا فِیْ کَلَامِ الزَّوْجِ، وَهٰذَا الَّذِیْ ذَکَرَ الْحَلَبِیُّ وَالطَّحَاوِیُّ اُمْثِلَتَهٗ کَقَوْلِهٖ: اَنْتِ طَالِقٌ اَوْ طَلَّقْتُكِ اَوْ هٰذِهٖ اَوْ زَیْنَبُ اَوْ بِنْتُ زَیْدٍ اَوْ اُمُّ عَمْرٍو اَوْ اُخْتُ بَکْرٍ اَوْ امْرَأَتِیْ طَالِقٌ۔ اَلثَّانِیْ تَحَقُّقُهَا فِیْهِ لِاَجْلِ کَوْنِهٖ جَوَابًا لِکَلَامٍ تَحَقَّقَتْ فِیْهِ، فَتَحَقَّقَ فِی الْجَوَابِ اَیْضًا، لِاَنَّ السُّؤَالَ مُعَادٌ فِی الْجَوَابِ، وَهٰذَامَا فِی "الْهِنْدِیَّةِ" عَنْ "الْخُلَاصَةِ" قَالَتْ: طَلَاقِ بِدَسْتِ تُوْ اَسْتْ، مَرَا طَلَاقْ کُنْ، فَقَالَ الزَّوْجُ: طَلَاقْ مِیْ کُنَمْ وَکَرَّرَ ثَلٰثًا، طُلِّقَتْ ثَلٰثًا۔

ترجمہ: ''طلاق کے مؤثر و نافذ ہونے کے لئے اضافت (یعنی بیوی کی طرف طلاق کی

نسبت) ضروری ہے، خواہ شوہر کے اپنے الفاظ میں نسبت واضح ہو یا اُس کی نیت اور ارادے میں ہو، کیوں کہ طلاق ایقاع (بیوی پر واقع کرنے) کے بغیر از خود واقع نہیں ہوتی اور بیوی پر طلاق کا اُس وقت تک ایقاع نہیں ہوتا جب تک طلاق کو عورت کے ساتھ متعلق نہ کیا جائے اور یہ بات صرف اضافت کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے۔ اور یہ (یعنی طلاق واقع کرنے کے لئے بیوی کی طرف نسبت) ضروری ہے، اس میں کوئی شک نہیں، ورنہ (یعنی اگر نسبت کو لازمی نہ قرار دیا جائے تو) جو شادی شدہ شخص بھی طلاق یا طالق وغیرہ الفاظ یا لفظ بولے، خواہ اُس کا اِن کلمات کے بولنے سے کوئی ارادہ ہی نہ ہو یا اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ نہ کیا ہو، پھر بھی اُس کی بیوی کو طلاق واقع ہوجائے، اور یہ بات قطعاً باطل ہے۔ پس بیوی پر طلاق کے مؤثر اور نافذ ہونے کے لئے طلاق کا بیوی کی طرف منسوب ہونا حق ہے، اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہاں! بیوی کی طرف طلاق کی نسبت جب لفظوں میں موجود ہو تو طلاق کا حکم لگانے میں نیت معلوم کرنے کی حاجت نہیں ہوتی، مگر جب طلاق کی نسبت لفظوں میں موجود نہ ہو، تو شوہر کی نیت کو ظاہر کرنے یعنی معلوم کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔

لیکن جہاں تک لفظوں میں طلاق کی نسبت پائے جانے کا تعلق ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اُس کی تین قسمیں ہیں:

(۱) یہ کہ طلاق کی نسبت شوہر کے کلام میں صراحت و وضاحت کے ساتھ ثابت ہو (یعنی شوہر کی نیت پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئے)، یہ وہ قسم ہے جس کی مثالیں ''علامہ حلبی اور علامہ طحاوی'' نے ذکر کی ہیں، جیسے: أَنْتِ طَالِقٌ یا طَلَّقْتُكِ یا یہ یا زینب یا زید کی بیٹی یا عمرو کی ماں یا بکر کی بہن یا میری بیوی کو طلاق ہے، (یعنی بیوی کو خطاب کر کے کہے کہ تجھے طلاق یا میں نے تجھے دی یا اُس کی طرف براہِ راست اشارہ کر کے کہے کہ اِسے طلاق ہے یا اُس کا نام لے کر کہے کہ مثلاً زینب کو طلاق ہے یا باپ یا بیٹے یا بھائی کی نسبت سے کہے کہ زید کی بیٹی یا عمرو کی ماں یا بکر کی بہن یا میری بیوی کو طلاق ہے اور زید کی ایک ہی بیٹی ہو یا اس کی ایک ہی بیوی ہو)۔

(٢) یا یہ کہ شوہر طلاق کے الفاظ کسی ایسے سوالیہ کلام کے جواب میں کہے، جس میں بیوی کی طرف طلاق کی نسبت پہلے سے موجود ہے، تو یہ نسبت از خود جواب کے ساتھ متعلق ہو جائے اور ثابت ہو جائے گی، اس کی مثال ''فتاویٰ عالمگیری'' اور ''خلاصۃ الفتاویٰ'' کے حوالے سے یہ درج ہے: ''بیوی نے شوہر سے کہا: ''طلاق تیرے اختیار میں ہے، مجھے طلاق دے دے''، جواب میں شوہر نے کہا: ''طلاق دیتا ہوں'' اور یہ کلمہ تین بار کہا، تو اِس سے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی''، (کیوں کہ اگر چہ شوہر کے کلام میں بیوی کی طرف طلاق کی نسبت مذکور نہیں ہے، مگر بیوی کے جس کلام کے جواب میں شوہر نے یہ الفاظ کہے ہیں، ان میں پہلے سے بیوی کی طرف نسبت موجود ہے اور وہ نسبت جواب میں بھی معتبر ہوگی)۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:345-344)

آگے چل کر امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلثَّالِثُ اَنْ لَّا یَشْتَمِلَ کَلَامُهٗ عَلَی الْاِضَافَةِ وَلَا یَکُوْنُ خَرَجَ مَخْرَجَ الْجَوَابِ لٰکِنْ یَکُوْنُ اللَّفْظُ خَصَّهُ الْعُرْفُ بِتَطْلِیْقِ امْرَأَةٍ، فَحَیْثُ یُطَلِّقُ یُفْهَمُ مِنْهُ اِیْقَاعُ الطَّلَاقِ عَلَی الْمَرْأَةِ، کَقَوْلِهِمْ: "الطَّلَاقُ یَلْزَمُنِیْ"، "وَالْحَرَامُ یَلْزَمُنِیْ"، "وَعَلَیَّ الطَّلَاقُ"، "وَعَلَیَّ الْحَرَامُ"، فَاِنَّهٗ کَمَا قَالَ فِیْ رَدِّالْمُحْتَارِ، صَارَ فَاشِیًا فِی الْعُرْفِ فِیْ اِسْتِعْمَالِهٖ فِی الطَّلَاقِ، لَا یَعْرِفُوْنَ مِنْ صِیَغِ الطَّلَاقِ غَیْرَهٗ، وَلَا یَحْلِفُ بِهٖ اِلَّا الرَّجُلُ، فَهٰهُنَا وَاِنْ لَّمْ تُذْکَرِ الْاِضَافَةُ لَفْظًا لٰکِنَّهَا ثَابِتَةٌ عُرْفًا، وَالْمَعْهُوْدُ عُرْفًا کَالْمَوْجُوْدِ لَفْظًا، فَمِنْ هٰهُنَا وُجِدَتِ الْاِضَافَةُ فِی اللَّفْظِ، وَحُکِمَ بِالْوُقُوْعِ مِنْ دُوْنِ نِیَّةٍ، فَهٰذِهٖ صُوَرُ تَحَقُّقِ الْاِضَافَةِ فِی اللَّفْظِ، وَاَمَّا اِذَا خَلَا عَنْهَا بِوُجُوْهِهَا الثَّلٰثَةِ فَحِ لَا بُدَّ مِنْ وُجُوْدِهَا فِی النِّیَّةِ، فَاِنْ نَوٰی وَقَعَ، وَاِلَّا لَا، وَهٰذَا مَا قَالَ فِی "الْهِنْدِیَّةِ" عَنِ "الْمُحِیْطِ": لَا یَقَعُ فِیْ جِنْسِ الْاِضَافَةِ اِذْلَمْ یَنْوِ لِعَدَمِ الْاِضَافَةِ اِلَیْهَا اه هٰذَا فِیْمَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ رَبِّهٖ تَعَالٰی۔

ترجمہ: ''(٣) لفظی نسبت کی تیسری صورت یہ ہے کہ نہ شوہر کے کلام میں اضافت ہو اور نہ

کسی ایسے کلام کے جواب میں شوہر نے طلاق دینے کا کلمہ استعمال کیا ہو، جس میں نسبت پہلے سے موجود ہے، لیکن عرف میں اِس لفظ کو بیوی کو طلاق دینے کے لئے خاص کر دیا گیا ہے، تو شوہر جب بھی ایسا لفظ بولے گا، اُس سے بیوی کو طلاق دینا ہی سمجھا جائے گا، جیسے: شوہر کہے: ''مجھ پر طلاق لازم ہے'' اور ''حرام مجھ پر لازم ہے'' یا ''مجھ پر طلاق لازم ہے'' یا ''مجھ پر حرام واجب ہے''، تو جیسے کہ ''ردالمحتار'' میں فرمایا: ان الفاظ کا استعمال عرف میں طلاق کے لئے مشہور ہے، حتیٰ کہ اہلِ عرف (یعنی عام لوگ) طلاق کے لئے دوسرے الفاظ سے متعارف نہیں ہیں۔ اور ان الفاظ کو صرف مرد ہی کے لئے حلف کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ پس یہاں اگرچہ طلاق کی نسبت لفظاً مذکور نہیں ہے، لیکن یہ عرفاً ثابت ہے اور جو چیز عرف میں مشہور و معروف ہو، وہ ایسے ہی معتبر ہے، جیسے لفظوں میں مذکور ہو، پس یہاں لفظوں (یعنی کلام) میں اضافتِ طلاق اور نیت کا اعتبار کئے بغیر طلاق واقع ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔

پس یہ وہ صورتیں ہیں جن میں طلاق کی لفظی نسبت موجود ہوتی ہے۔ لیکن اگر شوہر کا کلام طلاق کی لفظی نسبت کی ان تین صورتوں سے خالی ہو، تو پھر اس صورت میں طلاق کی نسبت کا نیت میں پایا جانا ضروری ہے۔ پس اگر اُس نے طلاق کی نیت سے ایسے الفاظ بولے ہوں گے، تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر شوہر نے طلاق کی نیت کے بغیر الفاظ بولے ہوں گے، تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور عالمگیری میں ''المحیط'' کے حوالے سے ''نسبتِ طلاق'' کے بارے میں یہی بات کہی گئی ہے کہ طلاق کے کلمات میں (جہاں لفظی نسبت موجود نہ ہو) جب شوہر خود طلاق کی نیت نہ کرے، ایسے کلمات سے طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ ان میں عورت کی طرف طلاق کی نسبت موجود نہیں ہے (اور طلاق کے واقع کرنے کے لئے بیوی کی طرف نسبت لازمی ہے)، یہ نیت کا معاملہ بندے اور اُس کے رب کے درمیان ہے۔۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَمَّا قَضَاءً فَتَنْقَسِمُ هٰذِهِ الصُّوْرَةُ اِلٰی قِسْمَيْنِ: اَلْاَوَّلُ اَنْ تُوْجَدَ هٰهُنَا قَرِيْنَةٌ يُسْتَأْنَسُ

بِهَا عَلٰی تَحَقُّقِ النِّیَّةِ، وَیَکُوْنُ هُوَ الْأَظْهَرُ فِی الْمَقَامِ، فَحِ یُحْکَمُ بِالْوُقُوْعِ مَالَمْ یَقُلْ اِنِّیْ لَمْ أُرِدْهَا، فَإِنْ قَالَهٗ فَلَا یُصَدَّقُ اِلَّا بِالْیَمِیْنِ، فَإِنْ حَلَفَ صُدِّقَ، لِکَوْنِهٖ اَمِیْنًا فِی الْإِخْبَارِ عَمَّا فِیْ نَفْسِهٖ وَقَدْ اَتٰی بِمَا یَحْتَمِلُهٗ کَلَامُهٗ، وَهٰذَا مَا قَالَ فِی الْهِنْدِیَّةِ عَنْ خُلَاصَةِ الْفَتَاوٰی۔

ترجمہ: لیکن قضاءً نیت کی بنا پر طلاق کا حکم لگانے کا جو سوال ہے، اُس کی دو قسمیں ہیں:
(۱) یہ کہ شوہر کے کلام میں ایسا قرینہ موجود ہو جس سے محسوس ہو کہ شوہر نے بیوی کی طرف طلاق کی اضافت کی نیت کی ہے اور یہ بات اُس مقام پر ظاہر و واضح ہو، تو ایسی صورت میں طلاق واقع ہونے کا حکم لگایا جائے گا، جب تک شوہر یہ نہ کہے کہ میری نیت طلاق کی نہیں تھی۔ اگر وہ یہ بات کہتا ہے تو قسم کے بغیر اُس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اور ''شوہر قسم کھا کر کہہ دیتا ہے کہ میری بیوی کو طلاق دینے کی نیت نہیں تھی، تو قضاءً اُس کے قول کو سچا مانا جائے گا (یعنی طلاق واقع نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا)، کیوں کہ اپنی نیت کے بارے میں وہی امین ہے، جب کہ اُس کے کلام میں اِس معنی کا احتمال موجود ہے اور ''فتاویٰ عالمگیری'' میں ''خلاصۃ الفتاویٰ'' کے حوالے سے یہی بات کہی گئی ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 12، ص: 51-50-349)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال ہوا:
''محمد بخش نے اپنی عورت کو اِس ترکیب سے ایک خطبہ میں طلاق دیا کہ: ''طلاق، طلاق، طلاق''۔ اور مہر جو کچھ بھی تھا ادا کر دیا اور طلاق دیئے ہوئے عرصہ ایک سال کا ہوا۔ اور اب پھر دوبارہ نکاح کرنا چاہتے ہیں مطابق دوسرے پارہ کے، جیسا کہ چودھویں رکوع میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، مگر ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا، صورت بالا میں مطابق قرآن وحدیث کے جواب مرحمت فرمادیا جاوے''۔
آپ نے جواب میں لکھا:
''اگر اُس نے اتنے ہی لفظ کہے کہ: ''طلاق، طلاق، طلاق''۔ نہ یہ کہا کہ دی، نہ یہ کہا کہ: تجھ

کو یا اِس عورت کو، نہ یہ الفاظ کسی ایسی بات کے جواب میں تھے، جس سے عورت کو طلاق دینا مفہوم ہو، تو طلاق اصلاً نہ ہوئی، وہ بدستور اُس کی عورت ہے، دوبارہ نکاح کی حاجت نہیں۔ اور اگر اُس کے ساتھ یا اُس بات میں جس کے جواب میں یہ الفاظ تھے، وہ لفظ موجود تھے، جن سے یہ مفہوم ہو کہ اُس نے اپنی عورت کو طلاق دی یا وہ اقرار کرے کہ میں نے یہ الفاظ عورت کو طلاق دینے کی نیت سے کہے تھے، تو تین طلاقیں ہو گئیں، بے حلالہ اُس کے نکاح میں نہیں آسکتی، (فتاویٰ رضویہ، جلد:12، ص:92-391)"۔

ایک اور موقع پر امام احمد رضا قادری قُدِّس سرُّہٗ العزیز سے سوال ہوا:

زن وشو میں باہمی نزاعِ لفظی واقع ہوا، اُس پر شوہر نے کہا: "تو میری چیز کھائے تو طلاق ہے"۔الخ

آپ نے جواب میں لکھا:

اگر الفاظ اسی قدر تھے جو مذکور ہوئے، جن میں کچھ ذکر نہیں کہ کون طلاق ہے، کس پر طلاق ہے؟۔اور ایسی حالت میں شوہر کا بہ قسم بیان کہ اِن الفاظ سے میں نے طلاقِ زوجہ کی نیت نہ کی، تو صورتِ مذکورہ میں بموجب روایاتِ کثیرہ "فتاویٰ قاضی خان وخلاصۃ الفتاویٰ وفتاویٰ بزازیہ وفتاویٰ ہندیہ وفتاویٰ ذخیرہ ومحیط امام برہان الدین وقُنیہ والبحر الرائق ودرمختار" وغیرُھا، اِن الفاظ پر کوئی اثر نہ اب ہے، نہ آئندہ کسی چیز کے کھانے سے پیدا ہو، الخ

(فتاویٰ رضویہ، جلد:13، ص:116-115)

اسی طرح امام احمد رضا قادری قُدِّس سرُّہٗ العزیز سے ایک طویل سوال میں بیوی کے گھر والوں نے شوہر سے متعلق کہا کہ اُس نے اپنی بیوی سے کہا: "اگر عصر تک آپ اپنے گھر نہ آئیں تو میری طرف سے جواب ہے"۔

آپ نے جواب دیا:

"بالفرض لفظِ جواب" معنی ردو انکار کا صالح نہ ہوتا، بلکہ جانے دیجئے، یوں فرض کیجئے کہ وہ سرے سے کنایہ ہی نہ ہوتا بلکہ خاص صریح ہوتا، جب بھی صورتِ مُستفسَرہ میں بعد اِس کے

کہ فصلِ کریم نے حلفاً انکارِ نیت کیا، حکمِ طلاق زنہار (تب بھی) ممکن نہ تھا کہ یہاں عورت کی طرف اضافت نہیں، صرف اتنا کہا کہ: ''میری طرف سے جواب ہے''، یہ کچھ نہ کہا کہ کس کو جواب ہے اور ترکِ اضافت ہمیشہ مانعِ حکمِ طلاق ہے، جب کہ شوہر بہ حلف انکارِ نیت کرے۔

ثانیاً: اُسے نہ سوجھا کہ لفظ اضافت سے خالی ہے، تو بحالِ انکارِ نیت حکمِ طلاق ناممکن ہے، اگر چہ خود لفظِ طلاق ہوتا، جیسا کہ مسائل مذکورہ میں گزرا، نہ کہ لفظِ ''جواب'' نہ کنایہ ہے اور متحمل ردو انکار، محیط میں ہے:

لَا یَقَعُ فِیْ جِنْسِ الْاِضَافَۃِ اِذَا لَمْ یَنْوِ لِعَدَمِ الْاِضَافَۃِ اِلَیْھَا ، ترجمہ: ''جنسِ اضافت میں عورت کی طرف طلاق کی نسبت نہ ہونے کی وجہ سے طلاق واقع نہ ہوگی، جب تک شوہر خود نیت نہ کرے، (فتاویٰ رضویہ، جلد:13، ص:123-120-116-115)''۔

آج کل انٹرنیٹ اور موبائل کا استعمال عام ہے۔ انٹرنیٹ سے E-mail اور موبائل سے SMS نے ایک وبائی شکل اختیار کر لی ہے۔ آئی۔ ٹی کمپنیوں اور اُن کے توسط سے پرائیویٹ ٹی۔ وی چینلز کی آمدنی کا یہ ایک بڑا ذریعہ ہے۔ انٹرنیٹ ID یا موبائل سیٹ تک کسی کی بھی رسائی (Reach) ہوسکتی ہے اور وہ کسی قسم کی دست درازی یا فنکاری (Manipulation) کے ذریعے اُس کا ایسا استعمال بھی کرسکتا ہے، جو اُس کے لئے نقصان دہ ہو، کیوں کہ لوگ باہمی اعتماد کی بنا پر یا Good Faith میں دوستوں کو اپنی ای میل کا Password بتا دیتے ہیں۔ اس لئے جس کی آئی ڈی سے میل یا موبائل فون سے ایس ایم ایس بھیجا گیا ہے، اُس کے اقراری بیان سے ہی اِس کی تصدیق ہوسکتی ہے کہ یہ اُس نے بھیجا ہے۔ اگر اُس کے بیان کی صداقت پر کسی کو اعتماد نہ ہو اور گواہ بھی نہ ہوں تو اُس کے حلفیہ بیان پر فیصلہ ہوگا۔ اگر وہ جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو سارا وبال اُس پر ہوگا۔

سائل محمد فرحان نے دریافت کہ وہ اپنی بیوی کو اُس کے میکے لینے گیا تو اس نے ساتھ آنے سے انکار کردیا۔ اُس پر محمد فرحان نے اپنی بیوی کو SMS کیا اور اس میں لکھا: ''میں نہیں رہ

سکتا، آج جو ہوا مرتے دم تک نہیں بھولوں گا، قسم خدا کی مجھے جان کی پرواہ نہیں، طلاق، طلاق، طلاق''۔ آیا ان الفاظ سے طلاق ہوئی یا نہیں؟۔ اس SMS میں بیوی کا نام لئے بغیر اور اُس کو براہِ راست مخاطَب کئے بغیر صرف تین دفعہ لفظِ طلاق لکھا ہے۔

ابتدا میں ہم نے جو تحریری طلاق کی مختلف صورتیں یا قسمیں تحریر کی ہیں، اُن میں سے یہ ''طلاق غیر مرسوم مستبین غیر مُعلَّق بوصول الکتاب'' ہے۔ یعنی اس تحریر میں مندرجہ ذیل امور ہیں:

(۱) بیوی کا نام لے کر نہیں لکھا گیا کہ فلانہ بنت فلاں کو طلاق (۲) بیوی کو براہِ راست مخاطَب کر کے بھی نہیں لکھا گیا کہ تجھے طلاق ہے۔ لہٰذا یہ ''طلاق مرسومہ'' نہیں ہے کہ خط کتابت کے معروف و مروّج طریقے کے مطابق شوہر نے اپنی بیوی کو براہِ راست مخاطَب کر کے خطاب کے صیغے کے ساتھ یا اُس کا نام لکھ کر طلاق لکھی ہو، یعنی یہ ایسی تحریر نہیں ہے جسے فتاویٰ کی کتابوں میں ''مَرْسُوْمًا مُصَدَّرًا مُعَنْوَنًا'' سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) یہ بھی نہیں لکھا کہ میری بیوی کو یا فلاں کی بیٹی کو طلاق ہو وغیرہ

(۴) اسی طرح بیوی کا نام لے کر یہ بھی نہیں لکھا کہ جب میرا یہ SMS تمہیں پہنچے تو تمہیں ایک یا دو یا تین طلاق۔

اس لئے اوپر ہم نے لکھا کہ یہ طلاق ''غیر مرسوم مستبین غیر مُعلَّق بوصول الکتاب'' ہے۔

البتہ یہ تحریر مستبین ہے، یعنی واضح طور پر تحریر ہے، پڑھی جارہی ہے اور سمجھ میں آرہی ہے۔ شوہر خود اپنے ارسال کئے ہوئے SMS کا اقرار بھی کررہا ہے۔ لیکن اِس میں اُس کو بیوی طرف طلاق کی اضافت (نسبت) نہیں ہے۔ اضافتِ طلاق کی تین ممکنہ صورتیں جو ہم نے گذشتہ سطور میں بیان کی ہیں، اُن میں سے ایک صورت میں بھی اِس تحریر میں نہیں پائی جاتی۔ صریح نسبت بھی نہیں جو عرف میں صرف اور صرف بیوی کو طلاق دینے کے لئے معروف، مشہور، معہود اور معتاد ہوں جن کی تفصیل گذشتہ سطور میں بیان کی جاچکی ہے۔

چونکہ SMS کی تحریر بہر حال مستبین ہے یعنی واضح اور پڑھی جارہی ہے، لہٰذا یہ شوہر کی نیت

پر موقوف ہے۔
یہاں ایسا قرینہ بھی نہیں ہے کہ اسے ''ایقاعِ طلاق'' پر محمول کیا جائے۔لہٰذا SMS کی اس تحریر کے بارے میں شوہر سے پوچھا جائے گا، اگر وہ کہے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت سے تین مرتبہ ''طلاق، طلاق، طلاق'' لکھ کر اسے SMS ارسال (SEND) کیا ہے۔تو اس سے طلاق ثلاثہ واقع ہو جائیں گی۔اور اگر وہ کہتا ہے کہ میری نیت بیوی کو طلاق دینے کی نہیں تھی، تو پھر وقوعِ طلاق کا حکم نہیں دیا جائے گا۔
فرض کیجئے کہ شوہر اور بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہوتا ہے (مطالبۂ طلاق کی صورت نہیں ہے) اور شوہر بیوی کے سامنے بغیر اضافت کے ''طلاق، طلاق، طلاق'' کہتا ہے۔تو زبانی کلماتِ طلاق بولنے کے باوجود یہ علی الاطلاق وقوعِ طلاق کا قرینہ نہیں ہے، حالانکہ زبانی طلاق دینا ہی اصل ہے، تحریری طلاق خلاف قیاس ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی پر ''اکراہِ شرعی'' کر کے طلاق پر مجبور کیا جائے تو اُس کی زبانی طلاق تو مؤثر ہو جائے گی، لیکن تحریری نہیں، کیونکہ تحریری طلاق ضرورت کے وقت زبانی طلاق کے قائم مقام ہوتی ہے اور یہاں ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔اگر شوہر اپنے ہاتھ سے تین مرتبہ ''طلاق، طلاق، طلاق'' لکھ کر بھی اپنی بیوی کو ڈاک کے ذریعے بھیج دے، تب بھی یہ مطلقاً قصد وانشاءِ طلاق کا قرینہ نہیں ہے، جب تک شوہر یہ اقرار نہ کرے کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے ارادے سے ہی یہ تحریر بھیجی ہے۔
صراحۃً اضافتِ طلاق کی چند صورتیں یہ ہیں:
جیسے شوہر کہے: ''میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی'' یا اپنی بیوی کا نام لے کر کہے: ''میں نے فلانہ کو طلاق دی'' یا اپنی بیوی سے براہِ راست مخاطِب ہو کر کہے: ''میں نے تجھے طلاق دی'' یا شوہر اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہے: ''میں نے اِسے طلاق دی'' یا بیوی کی طرف طلاق کی نسبت تقدیراً ہو، جیسے: بیوی نے شوہر سے سوال کیا یا مطالبہ کیا کہ: ''مجھے طلاق دے دے''، اِس کے جواب میں شوہر کہے: ''میں نے طلاق دے دی'' یا کسی نے شوہر سے کہا: ''اپنی بیوی کو طلاق دے دے'' یا اُس کا نام لے کر کہا: ''فلانہ کو طلاق دے

دے''، تو اس کے جواب میں شوہر کہے: ''میں نے طلاق دی'' یا ''میں طلاق دیتا ہوں''، کیونکہ سوال جواب میں معتبر ہوتا ہے یا جواب سوال ہی پر موقوف ہوتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ کوئی دوسرے فریق سے عدالت میں قسم کا مطالبہ کرے تو اَلْیَمِیْنُ عَلٰی نِیَّةِ الْمُسْتَحْلِفِ یعنی قسم کی توجیہ قسم کا مطالبہ کرنے والی کی مراد پر ہوگی''۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شوہر نے کہا: ''میں نے طلاق دی''۔ اور پوچھنے پر اُس نے اقرار کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے، کیونکہ عامۃ الناس اچھی طرح جانتے ہیں کہ طلاق بیوی ہی کو دی جاتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ نیت میں نسبت موجود نہ ہو۔ البتہ یہ اُس صورت میں ہوسکتا ہے کہ شوہر عالم ہو اور اضافتِ طلاق کے مسئلے سے بخوبی واقف ہو۔ ورنہ عام حالات میں اگر اضافت صراحۃً اور تقدیراً نہ ہو مگر نیت میں اضافت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں SMS کے مسئلے میں اضافتِ طلاق نہ صراحۃً ہے: نہ تقدیراً اور نہ نیت پر کوئی قرینہ ہے۔ پس اگر شوہر کہتا ہے کہ SMS میں ''طلاق، طلاق، طلاق'' لکھنے میں میری نیت بیوی کو طلاق دینے کی نہیں تھی، تو حکم دیا جائے گا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی اور اس صورت میں حلف کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے اس سوال کے جواب میں مختصر جواب لکھا تھا اور فتوے کا حتمی نتیجہ وہی تھا جو سطور بالا میں درج ہے، لیکن میں نے اس فتوے کو نظر ثانی کے لئے محترم مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی زید مجدہم کے پاس بھیجا، انہوں نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے معرکۃ الآراء فتاویٰ اور دیگر کتب فتاویٰ سے اس پر تفصیلی حوالہ جات لکھے، نفسِ مسئلہ کی بڑی فقیہانہ وضاحت کی، میں نے اُن سب کو اس جواب کا حصہ بنا دیا ہے تاکہ ہمارے نوجوان علماء اس سے استفادہ کریں اور پھر اصل مصادر اور مآخذ کا بھی مطالعہ کریں اور اس مسئلے پر عبور حاصل کریں، کیونکہ یہ روزمرہ پیش آنے والے مسائل میں سے ہے۔ میں ایک بار پھر حضرت مفتی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُن کے علم اور تفقہ فی الدین میں مزید اضافے اور مہارتِ تامہ کاملہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوں۔

طلاقِ کنایہ

سوال: 117

میری بیٹی کا نکاح ہوا، رخصتی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہونا قرار پائی، نکاح کے بعد نہ ہی خلوت پائی گئی اور دونوں کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ لڑکے نے فون پر لڑکی سے مطالبہ کرنا شروع کردیا کہ فوراً رخصتی کردی جائے، لڑکی نے ناراضگی کا اظہار کیا کہ یہ فیصلہ میرے گھر والے کریں گے، لڑکے نے بار بار فون پر یہی سوال کرنا شروع کردیا اور کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ ''یہ نکاح تمہاری مجبوری ہے، میں تمہیں اس مجبوری سے آزاد کرتا ہوں''، پھر اُسی وقت کہا کہ: ''جاؤ میں نے تمہیں آزاد کیا جو جی چاہے کرو''۔ اب لڑکے کا کہنا یہ ہے کہ اُس نے یہ الفاظ غصے کی حالت میں کہے تھے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُس نے کئی مولویوں سے فتویٰ لیا ہے کہ غصے میں ایسے الفاظ کہنے سے طلاق نہیں ہوتی۔ شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے، فقہ حنفی کے مطابق جواب عنایت فرمائیں۔

کشور سلطانہ، سیکٹر 9، نارتھ کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں شوہر کا یہ قول ''یہ نکاح تمہاری مجبوری ہے، میں تمہیں اس مجبوری سے آزاد کرتا ہوں'' طلاقِ صریح کا کلمہ نہیں بلکہ کنایات میں سے ہے اور بحالتِ غصہ اس سے ''طلاقِ بائن'' مراد لی جائے گی، چونکہ شوہر اقرار کرتا ہے کہ اُس نے غصے میں یہ الفاظ کہے، واضح رہے کہ طلاق غصے ہی میں دی جاتی ہے، نیز اُس کا قول: ''یہ نکاح تمہاری مجبوری ہے، میں تمہیں اس مجبوری سے آزاد کرتا ہوں'' اس بات پر قرینہ ہے کہ اُس کی مراد طلاق ہے، لہٰذا ایک طلاق بائن واقع ہوگئی اور چونکہ لڑکی غیر مدخولہ ہے لہٰذا نکاح ختم ہوگیا، اب وہ دونوں چاہیں تو باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں اور لڑکی کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لئے بھی آزاد ہے، اگر سابق شوہر سے نکاح کیا تو آئندہ اُسے صرف دو طلاق کا حق حاصل رہے گا، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: وَلَوْ قَالَ

أَعْتَقْتُكِ طُلِّقَتْ بِالنِّيَّةِ كَذَا فِي مِعْرَاجِ الدِّرَايَةِ۔

ترجمہ: ''اور اگر (خاوند) نے اپنی بیوی سے کہا: ''میں نے تجھے آزاد کیا''، اگر (یہ کلمات ادا کرتے وقت) ان کی نیت طلاق کی تھی، تو ایک طلاق واقع ہو جائیگی، جیسا کہ معراج الدرایہ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 1 ص: 376 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)''۔

مختلف الفاظِ طلاق کا حکم

سوال: 118

میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کے دوران شوہر نے اشتعال میں آکر دو بار ایک سانس میں کہا ''میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی''۔ بیوی کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنے پورے ہوش وحواس میں تین بار سنا ہے اور وہ حلف کے لئے بھی تیار ہے، مگر شوہر کا کہنا ہے کہ صرف دو مرتبہ کہا ہے۔ ساتھ ہی بیوی کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ تقریباً 14 سال قبل شوہر نے اُس سے کہا تھا کہ ''اگر اس نے اپنی ماں سے بات کی یا ملنے گئی تو وہ خود کو طلاق سمجھے مگر خاتون تسلیم کرتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی مرضی کی بنا نہ تو کبھی اپنی ماں سے ملنے گئی اور نہ ہی کبھی بات کی۔ ایک نیا دعویٰ اور بھی ہے کہ شوہر نے اسے ایک مدت قبل یہ کہہ کر گھر میں پابند کیا تھا کہ اگر تم شوہر کی مرضی کی بنا گھر سے باہر گئیں تو تمہیں طلاق دے دوں گا، مگر یہاں بھی وہ تسلیم کرتی ہیں کہ انہوں نے شوہر کی مرضی کے بغیر کبھی گھر سے قدم باہر نہیں نکالا۔ شوہر ان دونوں واقعات کا سرے سے انکار کرتا ہے کہ ذہن پر پورا زور دیئے کے باوجود مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں۔ خاتون خود کو مذہبی کہتی ہیں لیکن حال اُن کا یہ ہے کہ اپنے تین بچوں سے کہا کہ انہیں طلاق ہوگئی ہے اور وہ عدت میں ہیں گھر سے نہیں نکل سکتیں، لیکن ایک گھنٹہ بعد ہی بچوں کو لے کر شہر سے 100 میل دور کسی عبادت کے لئے چلی گئیں، باپ نے بچوں سے کہا کہ عدت میں ہیں تو پھر 100 میل دور کیسے چلی گئیں؟، جواب ملا: اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟۔

محمد آفاق فاروقی، نیویارک

جواب:

صورتِ مسئولہ میں شوہر دو طلاق کا اقرار کر رہا ہے، لہٰذا دو طلاقِ رجعی واقع ہو گئیں، مگر عدت کے اندر اُسے رجوع کا حق حاصل ہے، خواہ رجوع قولی ہو یا فعلی۔ قولی سے مراد یہ ہے کہ زبانی کہے کہ: میں نے رجوع کیا یا میں رجوع کرتا ہوں، فعلی سے مراد یہ ہے کہ ازدواجی تعلق قائم کر لے۔ تاہم رجوع کی صورت میں آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور یہ دو طلاق مستقبل میں خدانخواستہ دی جانے والی طلاق کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہیں گی۔ اگر شوہر نے رجوع نہیں کیا تو عدت گزرنے کے بعد عورت کسی بھی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے آزاد ہوگی جبکہ کوئی مانع شرعی نہ ہو، عدّت تین حیض کا گزرنا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عورت تین طلاق دینے کا دعویٰ کرتی ہے اور شوہر صرف دو طلاق کا اقرار کرتا ہے تو چونکہ عورت کے پاس تیسری طلاق کے ثبوت کے لئے گواہ نہیں ہیں، لہٰذا شوہر کو قسم دی جائے گی اور قضاءً قسم کے ساتھ اس کا قول معتبر ہوگا۔

امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز لکھتے ہیں:

''اگر گواہ نہ ہوں اور عورت کے سامنے طلاق نہ دی ہو تو عورت اس سے حلف لے، اگر وہ حلف دے کہ میں نے طلاق نہ دی تو عورت اپنے آپ کو اس کی زوجہ سمجھے، اگر شوہر نے حلف جھوٹا کیا تو وبال اس پر ہے اور اگر خود زوجہ کے سامنے اسے تین طلاقیں دیں اور منکر ہو گیا اور گواہ عادل نہیں ملتے تو عورت جس طرح جانے اس سے رہائی لے اگرچہ اپنا مہر چھوڑ کر یا اور مال دے کر، اور اگر وہ یوں بھی نہ چھوڑے تو جس طرح بن پڑے اس کے پاس سے بھاگے اور اسے اپنے اوپر قابو نہ دے، اور اگر یہ بھی نہ ممکن ہو تو کبھی اپنی خواہش سے اس کے ساتھ زن وشو کا برتاؤ نہ کرے نہ اُس کے مجبور کرنے پر اس سے راضی ہو پھر وبال اس پر ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 12، ص: 424، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

عورت پر لازم ہے کہ عدت شوہر کے گھر میں گزارے، عدت میں اس کا چلے جانا خلافِ

شرع ہے اور وہ اس پر گناہ گار ہے۔
یہ حکم ہم نے قضا کا بیان کیا ہے، جو ظاہری ثبوت وشواہد پر مبنی ہوتا ہے، لیکن اگر کسی عورت نے پورے یقین کے ساتھ اپنے شوہر کی زبان سے تین طلاق کے کلمات سنے ہیں، تو اسے چاہئے کہ اپنے شوہر سے آزادی کے لئے جو بھی طریقہ ممکن ہو اختیار کرے۔ خواہ وہ شخص رضا کارانہ طور پر طلاق دے دے یا مہر کی معافی یا مال کے بدلے میں خلع دے دے، ورنہ ازدواجی تعلقات سے مکمل اجتناب کرے۔
''خود کو طلاق سمجھ'' سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، فتاویٰ قاضی خان میں ہے: اِمْرَأَةٌ قَالَتْ لِزَوْجِهَا: '' مرا طلاق دہ''، فَقَالَ الزَّوْجُ: ''دادہ انگار''، اَوْ قَالَ: ''کردہ انگار''، لَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَاِنْ نَوٰى كَاَنَّهٗ قَالَ لَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ اِحْسِبِيْ اَنَّكِ طَالِقٌ وَاِنْ قَالَ ذَالِكَ لَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَاِنْ نَوٰى.
ترجمہ: ''بیوی نے شوہر سے کہا: ''مجھے طلاق دے''، خاوند نے جواب دیا: ''تو دی ہوئی یا کی ہوئی خیال کر (سمجھ) لے''، تو طلاق واقع نہیں ہوگی اگرچہ طلاق کی نیت ہو کیونکہ عربی زبان میں اس کا معنی یوں ہے: ''تو گمان کرلے کہ تو طلاق والی ہے''، اور اگر یوں بالفاظِ عربی کہا تو طلاق نہ ہوگی چاہے طلاق کی نیت کی ہو۔۔۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: لَوْ قِيْلَ لِرَجُلٍ أَطَلَّقْتَ امْرَأَتَكَ فَقَالَ: عُدَّهَا مُطَلَّقَةً اَوِاحْسِبْهَا مُطَلَّقَةً لَا تُطَلَّقُ امْرَأَتُهٗ،
ترجمہ: ''ایک شخص نے دوسرے سے کہا: کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی''، دوسرے شخص نے جواب میں کہا: ''تو اس کو طلاق دی ہوئی شمار (سمجھ) لے، تو مطلقہ سمجھ لے''، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، (فتاویٰ قاضی خان علی ہامش فتاویٰ ہندیہ، جلد 1، ص: 457،463، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔
شوہر کا دوسرا قول ''کہ اگر تم شوہر کی مرضی کی بنا گھر سے باہر گئیں تو تمہیں طلاق دے دوں گا''، سے بھی کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، کہ یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ طلاق انشاء میں سے ہے یعنی شوہر واضح طور پر

کہے: میں تمہیں طلاق دیتا ہوں (بصیغۂ حال) یا میں نے تمہیں طلاق دی (بصیغۂ ماضی)۔

شوہر نے ایک طلاق لکھنے کا کہا، زائد طلاقیں مؤثر نہیں

سوال: 119

میں محمد شاہد ولد نور جمال اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے یہ تحریر لکھ رہا ہوں کہ میں نے گھریلو جھگڑوں کی بنا پر اپنے دوست رئیس سے کہا کہ تم ایک طلاق نامہ میرے نام سے میری بیوی کو اس کے میکے پہنچا دو اور میرے دوست نے طلاق نامہ مجھے دکھائے بغیر اس کے گھر ارسال کر دیا۔ اس طلاق نامے کو میں نے پڑھا بھی نہیں اور نہ ہی اس طلاق نامے پر میرے دستخط موجود ہیں بلکہ میرے دوست نے میرے دستخط کئے تھے۔ مذکورہ بالا رونما صورت میں طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟۔

محمد شاہد جمال، A-550 بلاک L، نارتھ ناظم آباد، کراچی

جواب:

اگر صورتِ مسئولہ میں سائل کا بیان درست اور حقیقت پر مبنی ہے، تو چونکہ شوہر نے عددِ طلاق ذکر نہیں کیا اور یہ وضاحت بھی نہیں ہے کہ اُس کا ارادہ کتنی طلاق دینے کا تھا، مطلقاً اتنا کہا کہ: ''تم ایک طلاق نامہ میرے نام سے میری بیوی کو اس کے میکے پہنچا دو''، لہٰذا ان الفاظ سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی ہے اور شوہر کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل ہے، مفتی محمد عبداللہ نعیمی فتاویٰ القرویہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

قَالَ لِلصَّکَّاکِ اُکْتُبْ طَلَاقَ اِمْرَأَتِیْ تُطَلَّقُ کَتَبَ اَوْلَمْ یَکْتُبْ وَصَحَّ فِی "اَلْقُنْیَۃِ" اَنَّہٗ لَایَقَعُ مَالَمْ یَکْتُبْ۔

ترجمہ: ''وثیقہ نویس سے کہا کہ میری بیوی کو طلاق لکھ دے، طلاق واقع ہو جائے گی، خواہ کاتب لکھے یا نہ لکھے اور ''قنیہ'' میں ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر کاتب نے نہ لکھا تو طلاق واقع نہیں ہوگی''۔ مزید لکھتے ہیں:

لیکن کاتب حکم میں وکیل کے ہے، کاتب کو آمر کے حکم کے بغیر ایک طلاق سے زائد لکھنے کا کوئی حق نہیں ہے، (فتاویٰ مجددیہ نعیمیہ، ج 1 ص: 254-253)۔

شوہر نے جس شخص کو طلاق نامہ اپنی بیوی کو پہنچانے کا وکیل بنایا تھا، اس نے تین طلاقیں لکھ کر اپنے اختیارات سے تجاوز کیا، لہٰذا صرف ایک طلاق واقع ہوئی، بقیہ طلاقیں مؤثر نہیں ہیں۔

خبر دینے کی نیت سے کہے گئے الفاظ سے جدید طلاق واقع نہ ہوگی

سوال: 120

میرے شوہر نور حسین نے آج سے 5 سال قبل مجھے ایک مرتبہ کہا: ''غزالہ سحر بنت شریف محمد میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔ پھر رجوع کر لیا۔ 09، اگست 2009ء کو یہ کہا کہ: ''میں تجھے طلاق دے چکا ہوں، اب میرا تجھ سے کوئی رشتہ نہیں''، پھر 06 اگست 2009ء کو دوبارہ میری بہنوں، ماں اور بھائی کی موجودگی میں غصے میں کہا: ''میں تجھے طلاق دے چکا ہوں، میرا تجھ سے کوئی رشتہ نہیں ہے، میں تجھے فارغ کر چکا ہوں''۔ اب وہ کہہ رہے ہیں کہ ایسے کوئی طلاق نہیں ہوتی اور نہ میری نیت تھی وہ تو ایسے ہی غصے میں منہ سے نکل گیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (غزالہ سحر ناگن چورنگی، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں پانچ سال قبل آپ کے شوہر نے جو ایک طلاقِ رجعی دی تھی آپ کے بیان کے مطابق انہوں نے اُس سے رجوع بھی کر لیا تھا، آئندہ اُنہیں دو طلاق کا اختیار حاصل تھا۔ بعد میں کہے جانے والے الفاظ اردو میں خبر کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، لہٰذا اگر اُن الفاظ سے شوہر کی نیت طلاق کی خبر دینے کی تھی، تو قسم کے ساتھ اس کا قول مان لیا جائے گا اور اگر دونوں مرتبہ اُس کی نیت جدید طلاق کی تھی تو طلاقِ مغلظ واقع ہوگئی اور تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی قطعاً گنجائش باقی نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ''پھر اگر اُس (شوہر) نے اسے (تیسری) طلاق دے دی، تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق کے بعد) اُس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس

کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے، پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کرکے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ:230)''۔

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: شوہر کا یہ کہنا کہ میں اس کو طلاق دے چکا، ظاہر یہ ہے کہ اس سے تیسری طلاق واقع نہ ہوگی، یہ لفظ اردو میں خبر دینے کے لئے بولا جاتا ہے، لہٰذا اگر اس تیسرے لفظ سے اس کی نیت خبر دینے کی ہے یعنی پہلے جو طلاقیں دے دی ہیں، ان کی خبر دیتا ہے تو اس کا قول مان لیا جائے گا، (فتاویٰ امجدیہ، جلد دوم، ص:215)''۔

لیکن اگر ''میں تجھے طلاق دے چکا ہوں'' سے شوہر کی مراد سابق طلاق کی خبر دینا نہیں ہے بلکہ انشاءِ طلاق ہے یعنی قصداً طلاق دینے کے لئے یہ الفاظ بولے تھے، تو پھر تین طلاق واقع ہوچکی ہیں۔ چونکہ یہ حلال وحرام کا مسئلہ ہے، اس لئے شوہر کو اپنی نیت کا دیانت داری سے اظہار کرنا چاہئے اور قطعی فیصلہ اس کی نیت پر ہی موقوف ہوگا۔ اور اگر وہ جھوٹ بولتا ہے اور اپنی نیت کے اظہار میں دیانت سے کام نہیں لیتا، تو آخرت کی جوابدہی دنیا کی چندروزہ راحت کے مقابلے میں بہت مشکل ہے۔

طلاقِ تعلیق

سوال: 121

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید نے اپنی زوجہ زینب سے بطور اصلاح کہا: ''ٹھیک ہوجا (یعنی ساس سسر سے زبان درازی نہ کرنا) اگر نہیں ہوئی تو تجھے طلاق، طلاق، طلاق ہے۔ از روئے شرع کیا حکم ہے؟۔

نوٹ: اس کے بعد بیوی کے رویے میں تبدیلی آئی اور دوبارہ اُس سے مذکورہ شکایت نہیں رہی، (عبدالمتین، یوٹیلٹی اسٹور، اوگی، مانسہرہ)۔

جواب:

سوال میں مذکور کلمات طلاقِ تعلیق کی قبیل سے ہیں اور ان الفاظ میں طلاق خاتون کا رویّہ درست ہونے پر مشروط ہے، چنانچہ اگر مذکورہ خاتون کے رویے میں تبدیلی واقع ہوئی اور دوبارہ جس بات پر اُسے سرزنش کی گئی، نہ ہوئی تو طلاق واقع نہیں ہوئی۔ اس شرط سے

چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ زید اپنی بیوی کو ایک طلاق دے دے اور دورانِ عدت عملاً یا قولاً رجوع نہ کرے، عدت گزرتے ہی یہ طلاق بائن ہو جائے گی، اگر مہر ادا نہیں کیا تو مہر بھی ادا کرے، اس کے بعد وہ سابقہ ساس اور سسر سے زبان درازی کرے۔ عدت گزرنے کے بعد چونکہ زید کی بیوی اُس کے نکاح سے خارج ہو جائے گی، اس لئے یہ شرط غیر موثر ہو جائے گی۔ بعد ازاں دونوں باہمی رضامندی سے عقدِ ثانی کر سکتے ہیں، اس عقد کے لئے نیا مہر مقرر کرنا ہوگا، لیکن اب آئندہ کے لئے زید کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا۔ عقدِ ثانی کے لئے دونوں گواہوں کی موجودگی میں مہر مقرر کر کے براہِ راست ایجاب و قبول کر لیں، تو شرعاً نکاح منعقد ہو جائے گا۔

طلاق واقع نہیں ہوئی

سوال: 122

دو سال قبل جھگڑے کے دوران میں نے اپنی بیوی سے کہا: ''میں تمہیں طلاق دے دوں گا، میں تمہیں طلاق دے دوں گا''، پھر تھوڑی دیر بعد کہا: ''میں نے تمہیں ایک طلاق دی''، لیکن بعد میں ہم نے رجوع کر لیا تھا۔ میرے مالی حالات ابتر ہونے کے سبب مئی 2009 میں میری اہلیہ اپنے والدین کے گھر رہنے چلی گئیں، کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ ایک دن مجھے فون کر کے بلایا کہ بچوں سے مل لو، میں وہاں گیا تو میری بیوی اور سالا وہاں موجود تھے، میری بیوی نے ایک اسٹامپ پیپر پر مجھے دستخط کرنے کے لئے کہا، میں فوری طور پر ایسی کسی صورتِ حال کے لئے تیار نہ تھا، بدحواسی میں، میں نے اُسے دیکھے اور پڑھے بغیر دستخط کر دیئے اور وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ میں نے اب تک طلاق نامے کو نہیں پڑھا ہے۔ دستخط کرتے وقت مجھے صرف یہ اندازہ تھا کہ دو سال قبل جو ایک طلاق میں نے دی تھی، یہ اُسی کی تحریر ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس تمام صورت حال میں کتنی طلاقیں واقع ہوئیں اور کیا رجوع کی گنجائش باقی ہے؟، (عبدالرحمٰن، D-133، سیکٹر 10 اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

☆ میں اپنے شوہر کے مذکورہ بیان سے اتفاق کرتی ہوں، تمام واقعہ اسی طرح ہوا۔

عرشی بنت وزیر احمد، اورنگی ٹاؤن، کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں شوہر کا قول: ''میں تمہیں طلاق دے دوں گا''، سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، کہ یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ طلاق انشاء میں سے ہے یعنی شوہر واضح طور پر کہے: میں تمہیں طلاق دیتا ہوں (بصیغۂ حال) یا میں نے تمہیں طلاق دی (بصیغۂ ماضی)۔ ''میں نے تمہیں ایک طلاق دی'' سے ایک طلاق واقع ہوگئی اور چونکہ رجوع بھی کرلیا تھا اس لئے نکاح بدستور قائم ہے۔ بشرطیکہ شوہر نے عدت کے دوران رجوع کیا ہو، عدت ختم ہونے کے بعد تجدیدِ نکاح کے بغیر رجوع نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر شوہر کا بیان درست ہے اور واقعی اُس نے مذکورہ طلاق نامہ دیکھے اور سمجھے بغیر دستخط کردیئے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَكَذَالِكَ كُلُّ كِتَابٍ لَّمْ يَكْتُبْهُ بِخَطِّهٖ وَلَمْ يُمْلِهٗ بِنَفْسِهٖ لَايَقَعُ بِهِ الطَّلَاقُ اِذَا لَمْ يُقِرَّ اَنَّهٗ كِتَابُهٗ۔

ترجمہ: ''اسی طرح ہر وہ خط، جسے اس نے خود نہ لکھا ہو اور نہ اسے لکھوایا ہو اور وہ اسے خود لکھنے، لکھوانے یا کسی کے لکھے ہوئے کو برضامندی قبول کرنے کا اقرار بھی نہیں کرتا، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 379، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مفتی محمد نور اللہ نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ سے ایک طویل سوال کیا گیا: ''ایک آدمی نے بغیر نیاز احمد کے کہنے کے طلاق نامہ لکھنا شروع کیا اور نیاز احمد کو زبردستی دستخط کرنے پر مجبور کیا، پڑھ کر بھی نہیں سنایا گیا، نہ طلاق نامے کو پڑھا ہے اور نہ لکھنے والے کو کہا کہ لکھ''۔ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ آپ نے طویل جواب لکھا جس میں مذکورہ مسئلے سے متعلق یہ عبارت قابلِ غور ہے: ''اگر نیاز احمد مُکرَہ تھا تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور اگر مُکرَہ (یعنی جسے جبر کرکے طلاق دلائی گئی ہو) نہیں تھا تو پھر بھی ظاہر یہی ہے کہ واقع نہیں ہوئی کہ تحریر خود اس کی نہیں اور نہ ہی اس نے لکھائی ہے اور نہ پڑھی ہے نہ سنی ہے، صرف دستخط کیے جو خوشی سے ہرگز نہیں تو وہ بھی طلاق نہیں بن سکتے، قلم زبان کا ترجمان ہے تو جس طرح الفاظِ طلاق وہی ہیں جو

اپنی زبان سے کہے جائیں یا دوسرے کو وکیل بنا کر کہلائے جائیں اور بلاوجہ دوسرے کی زبان سے کوئی لفظ بھی طلاق نہیں بن سکتا یونہی دوسرے کے قلم سے بھی نہیں اور جس طرح اپنا نام بول دینا طلاق نہیں، یونہی دستخط کر دینا بھی طلاق نہیں، بہر حال بادلِ نخواستہ ایسی حالت میں صرف دستخط کر دیئے جبکہ قرائنِ ظاہرہ سے واضح ہو رہا کہ عبارتِ مندرجہ بالا کی تصدیق مطلوب و مراد نہیں، کسی صورت بھی طلاق نہیں بن سکتی"۔

(فتاویٰ نوریہ، جلد 3، ص: 212، 213)

صورتِ مسئول۔ میں شوہر پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے اور عام طور پر پڑھا لکھا آدمی تحریر پڑھ کر ہی دستخط کرتا ہے اور اسے اپناتا ہے اور سائل کے یہ الفاظ کہ "دستخط کرتے وقت مجھے اندازہ تھا کہ دو سال قبل جو ایک طلاق میں نے دی تھی یہ اُسی کی تحریر ہے" اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ شوہر اس امر سے باخبر تھا کہ یہ طلاق ہی کی دستاویز ہے۔ لہٰذا اب اگر شوہر اس تحریر میں درج طلاقوں کے قصد اور انشاء سے منکر ہے اور اپنے آپ کو اس سے لاعلم ظاہر کرتا ہے تو اسے باقاعدہ حلف دیا جائے گا، اگر وہ حلف اٹھا کر انشاء طلاق و علم طلاق سے انکار کرتا ہے تو قضاءً ان طلاقوں کے غیر نافذ ہونے کا حکم دیا جائے گا، لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فیصلہ حقیقتِ حال پر ہوگا اور اگر اُس نے جھوٹی قسم کھائی ہے تو اس کی ساری زندگی حرام کی گزرے گی۔ تاہم آئندہ شوہر کو صرف دو طلاق کا اختیار حاصل ہے، خدانخواستہ جب بھی مزید دو طلاقیں دے گا، گذشتہ ایک طلاق کے ساتھ مل کر مؤثر ہو جائیں گی اور دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو جائیں گے۔

اضافتِ طلاق

سوال: 123

میری بیٹی کی شادی نو سال قبل محمد حنیف قریشی سے ہوئی، دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ میرے داماد جب سے انجمن سرفروشانِ اسلام میں شامل ہوئے ہیں، تب سے بیوی بچوں کے ساتھ رویہ درست نہیں، برا بھلا کہنا، مار پیٹ کرنا معمول بن گیا ہے۔ ایک دن صبح کے وقت میرے داماد نے اپنے دو سال کے بچے کے منہ پر بہت زور سے تھپڑ مارا، بچے

کا پیشاب نکل گیا اور گال سوج گیا۔ میں اپنے داماد سے پوچھنے گیا کہ اس طرح بچے کو کیوں مارا؟، تو مجھ سے لڑنے لگا اور کہا میری اولاد ہے میں جو چاہے کروں اور غصے میں کہا: ''اس قصے کو ختم کردیتا ہوں، میں طلاق دیتا ہوں، میں طلاق دیتا ہوں، میں طلاق دیتا ہوں''۔ اب وہ کہتا ہے کہ میرے منہ سے غصے میں یہ الفاظ نکل گئے اور مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اب وہ صلح کرنا چاہتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ طلاق ہوئی یا نہیں؟۔

عبدالکریم شیخ، B-283 سیکٹر E-11 نارتھ کراچی

جواب:

طلاق میں اضافت کا پایا جانا ضروری ہے خواہ وہ اضافتِ لفظی ہو یا معنوی ہو یا کسی ایسے کلام کے جواب میں ہو جس میں اضافت مذکور تھی، صورتِ مسئولہ میں شوہر کے کلام میں اضافتِ لفظی تو موجود نہیں لیکن اگر شوہر نے ان الفاظِ طلاق سے بیوی کو طلاق دینے کی نیت کی ہو تو اضافت معنویہ کی وجہ سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ لیکن مذکورہ صورت میں معنوی اضافت موجود ہے، جو وقوعِ طلاق کے لئے کافی ہے۔ شوہر کا یہ کہنا کہ: ''میرے منہ سے غصے میں یہ الفاظ نکل گئے اور مجھ سے غلطی ہوگئی''، گویا اس بات کا اقرار ہے کہ اُس کی مراد بیوی کو طلاق دینا تھی۔

علامہ زین الدین بن ابراہیم بن محمد المعروف ابن نجیم متوفیٰ 970ھ لکھتے ہیں: فَلَوْ قَالَ طَالِقٌ فَقِيْلَ لَهُ مَنْ عَنَيْتَ ؟، فَقَالَ: امْرَأَتِيْ ،طُلِقَتْ اِمْرَأَتُهُ۔

ترجمہ: ''اگر شوہر نے کہا ''طالق'' (طلاق یافتہ)، اُس سے پوچھا گیا کہ تیری کیا مراد ہے؟، جواب دیا کہ میری بیوی مراد ہے، تو اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی''۔

(البحر الرائق، جلد 3، ص: 442، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں اور تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاتَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُحَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا۔

ترجمہ: ''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دے دے، تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ:230)''۔

طلاقِ سُنّی

سوال: 124

ایک شخص اپنی منکوحہ کو باہمی اختلافات اور بداعتمادی کی وجہ سے طلاق دینا چاہتا ہے، طلاق کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟۔ نکاح کے وقت جو مہر مقرر ہوا تھا، طلاق کی صورت میں وہ پورا نقد ادا کرنا ہوگا؟۔ عبدالعزیز، کراچی

جواب:

اسلامی تعلیمات کا منشا اور مزاج یہی ہے کہ شوہر و بیوی کے مابین ''رشتۂ نکاح'' تاحیات قائم رہے، مگر بعض حالات میں طلاق اور خلع کا راستہ کھلا ہے۔ طلاق کی وہ صورت جسے فقہاء نے ''احسن'' قرار دیا ہے اور اسے ''طلاقِ سُنّی'' سے تعبیر کیا ہے، درج ذیل ہے:

یہاں یہ بات یاد رہے کہ ''طلاقِ سُنّی'' سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ طلاق دینا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ البتہ آپ ﷺ نے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی تھی، لیکن بعد میں رجوع کرلیا تھا۔

طلاقِ سُنّی کا مطلب یہ ہے کہ یہ طلاق کا وہ طریقہ ہے جو خود رسول اللہ ﷺ نے تعلیم فرمایا، شوہر نے جن ایامِ طہر (پاکیزگی) میں اپنی بیوی سے ہمبستری نہ کی ہو، ان میں اپنی بیوی کو ایک طلاق رجعی دے دے یعنی یوں کہے کہ میں نے تمہیں ایک طلاق دی یا میں تمہیں ایک طلاق دیتا ہوں۔ اس کے بعد تین حیض گزرنے پر عدت مکمل ہوجاتی ہے۔ طلاقِ رجعی کا یہ فائدہ ہے کہ عدت کے دوران شوہر جب چاہے، رجوع کرسکتا ہے، اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے، یہ رجوع عمل سے بھی ہوسکتا ہے اور محض زبان سے یہ کہہ کر بھی

کہ ''میں رجوع کرتا ہوں''، عمل سے رجوع یہ ہے کہ شوہر بیوی سے جماع کرے یا بوس وکنار کرے۔اگر شوہر نے عدت کے دوران رجوع نہ کیا ہو تو عدت گزرنے کے بعد یہی طلاقِ رجعی، ایک طلاقِ بائن ہو جاتی ہے اور زوجین جب چاہیں بغیر تحلیل شرعی کے باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں، لیکن آئندہ صرف دو طلاقوں کا حق شوہر کو حاصل رہے گا اور اگر آئندہ کسی موقع پر شوہر نے دو طلاقیں (ایک ساتھ یا الگ الگ وقفوں میں) دیں تو طلاقِ مغلّظ ہو جائے گی۔

بیوی کے قسم کھانے سے ایلاء نہیں ہوتا

سوال: 125

میں (Mental Disorder) یعنی وہم کی مریضہ ہوں اور مختلف قسم کے وہم مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے آیت پڑھی:

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِھِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْھُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌO

ترجمہ: ''جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، اُن کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے، اگر انہوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے، (البقرہ:226)''۔

مجھے یہ خیال آیا کہ جو لوگ یہ قسمیں کھاتے ہوں گے وہ اِس طرح کہتے ہوں گے کہ: میں قسم کھاتی ہوں کہ میں چار مہینے تک اپنے شوہر سے رجوع نہیں کروں گی۔ مجھے یہ وہم ہے کہ میں نے بھی یہ قسم کھائی ہے اور یہ یاد نہیں کہ میں نے اس قسم کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہیں۔ مجھے یہ وہم بھی ہو رہا ہے کہ اس کا کفّارہ ہوگا یا نکاح پر بھی کوئی اثر پڑے گا۔میری رہنمائی فرمایئے، (مسز آصف، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

مذکورہ آیت کو ''آیتِ ایلاء'' کہتے ہیں اور یہ مردوں سے متعلق ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے متعلق قربت نہ کرنے کی قسم کھا لیتے ہیں۔اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا یہ معمول تھا کہ اپنی عورتوں سے مال طلب کرتے، اگر وہ دینے سے انکار کرتیں تو ایک سال، دو یا تین سال یا اس سے زائد عرصہ اُن کے پاس نہ جانے اور

صحبت ترک کرنے کی قسم کھالیتے اورانہیں پریشان چھوڑ دیتے، اسلام نے اس ظلم کومٹایا اور ایسی قسم کھانے والوں کے لئے مدت متعین فرمادی۔

مرد یہ قسم کھائے تو ایلاء کہلاتا ہے اور مذکورہ آیت میں اُس کا حکم موجود ہے۔لیکن اگر عورت یہ الفاظ کہے تو یہ ایلاء نہیں بلکہ ''یمین'' ہے اور اگر یہ قسم وہ خود توڑے یا شوہر اُس کی مرضی سے یا زبردستی قربت کرے، تو عورت پر کفارہ لازم ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِىْ أَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِيْنَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ أَهْلِيْكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَالِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ۔

ترجمہ: ''بلاقصد کھائی ہوئی قسموں پر اللہ تم سے مواخذہ نہیں فرمائے گا، لیکن تمہاری بالقصد کھائی ہوئی قسموں (یمینِ منعقدہ) پر تم سے مواخذہ فرمائے گا، تو اس قسم کا کفارہ تمہارے درمیانی قسم کے کھانوں میں سے دس مسکینوں کا کھانا دینا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا دس مسکینوں کو کپڑے دینا ہے یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جس کو اس پر قدرت نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھے، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھا کر (توڑ دو)، (المائدہ:89)''۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: حَلَفَتْ بِهِ الْمَرْأَةُ كَانَ يَمِيْنًا۔

ترجمہ: ''اگر عورت نے قسم کے ساتھ شوہر سے کہا (تو مجھ پر حرام ہے) تو یہ قول یمین (قسم) ہوگا۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِأَنَّ الزَّوْجَةَ لَوْ قَالَتْ لِزَوْجِهَا: أَنَا عَلَيْكَ حَرَامٌ أَوْ حَرَّمْتُكَ صَارَ يَمِيْنًا، حَتّٰى لَوْ جَامَعَهَا طَائِعَةً أَوْ مُكْرَهَةً تَحْنَثُ۔

ترجمہ: ''اس لئے کہ بیوی اگر اپنے شوہر سے کہے کہ ''میں تجھ پر حرام ہوں'' یا یہ کہے کہ ''تو مجھ پر حرام ہے''، یہ یمین (قسم نافذ) ہوجائے گی، یہاں تک کہ اگر شوہر اُس سے زبردستی یا اُس کی رضامندی سے جماع کرے، تو وہ (عورت) حانث ہوجائے گی''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد5، ص:64، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

لہٰذا آپ پر کفارہ لازم ہے اور کفارہ قسم توڑنے کے بعد ادا کیا جائے گا جو کہ اپنے اوسط معیار

کے مطابق دس مساکین کو دو وقت کھانا کھلانا یا اُنہیں لباس فراہم کرنا اور اگر اِس کی استطاعت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھنا ہے، اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑا، نکاح بدستور قائم ہے۔ لیکن قسم وہم یا خیال سے منعقد نہیں ہوتی اور اس سے کفارہ بھی لازم نہیں آتا۔ کفارہ تب لازم آئے گا کہ آپ کو قسم کا یقین ہو، ویسے احتیاطاً آپ دس مساکین کو دو وقت کھانا کھلا دیں تو یقیناً اجر ملے گا۔

زنا کی مرتکب عورت کے لئے شرعی حکم

سوال: 126

ایک شادی شدہ عورت بار بار زنا کا ارتکاب کرتے ہوئے اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ چار مرتبہ بازیاب کروائی گئی۔ آخرکار پنچایت ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا: (1) لڑکے والے (زانی) اپنے خاندان کی لڑکی کا رشتہ عورت کے خاندان کو دیں گے۔ (2) خاوند عورت کو طلاق دے گا، عورت کا نکاح آشنا کے ساتھ کرایا جائے گا۔ اب لڑکے والے ان شرائط پر عمل کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ عورت (زانیہ) نے قرآن پر عہد کیا تھا کہ اس کے بعد فعلِ بد نہیں کرے گی جبکہ وہ اب بھی زنا کی مرتکب ہو رہی ہے اور چھ سات ماہ کی حاملہ بھی ہے۔ قرآن وحدیث اور شریعتِ مطہرہ میں مرد و عورت کا کیا حکم ہے؟۔

ایک شہری، ڈرگ روڈ کراچی

جواب:

قرآن وسنت کی رُو سے زنا ایک سنگین جرم ہے، یہ جرم اگر شرعی معیار (یعنی چار عینی گواہ یا مجرم کے اقرار و اعترافِ جرم) کے مطابق ثابت ہو جائے تو ''موجبِ حد'' ہے اور اس پر حدِ شرعی نافذ ہوگی، جو غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے (سورۃ النور، آیت:2) اور شادی شدہ کے لئے رَجم (یعنی سنگسار کرنا) ہے۔ رَجم کی حد رسول اللہ ﷺ کے اپنے فیصلوں اور بکثرت احادیث مبارکہ اور آثارِ صحابہ سے ثابت ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْأَنْصَارِيِّ :أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَسْلَمَ،أَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَحَدَّثَهُ أَنَّهُ قَدْ زَنٰى ،فَشَهِدَ عَلٰى نَفْسِهِ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ، فَأَمَرَ بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَرُجِمَ،

وَ كَانَ قَدْ أُحْصِنَ۔

ترجمہ:''حضرت جابر بن عبداللہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ قبیلۂ بنی اسلم کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں پر اس نے اعترافی بیان دیا کہ اس نے زِنا کیا ہے، پھر اس نے چار مرتبہ اپنے اوپر اقرارِ جرم کیا تو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اسے رجم (سنگسار) کردیا جائے، وہ شخص شادی شدہ تھا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6814)''۔

حدود قائم کرنا حاکمِ اسلام یا اُس کے مقررہ ومُجاز قاضی کا کام ہے، محلے بستی یا برادری کے لوگ اتنا کرسکتے ہیں کہ اُنہیں خوفِ خدا دلائیں اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں تو اُن کا سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کردیں۔شرعاً اُس (زانیہ) عورت کے شوہر کو اُسے طلاق دینا واجب نہیں ہے، ہاں! اگر اُس کے اِس فعل کی وجہ سے شوہر کو نفرت ہوگئی ہے اور وہ حدودِ شرع کی پاسداری کے ساتھ اسے اپنے نکاح میں رکھنا نہیں چاہتا تو اُسے طلاق دیدے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:بَلْ يُسْتَحَبُّ لَوْ مُؤْذِيَةً أَوْ تَارِكَةَ صَلَاةٍ۔

ترجمہ:''اگر بیوی اپنے قول یا فعل سے (شوہر کو) ایذا پہنچائے یا تارکِ نماز ہو تو اسے طلاق دینا مستحب ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4، ص:315)''۔

کسی دوسری بے قصور لڑکی کو اس کی رضامندی کے خلاف اس کے بھائی کی سزا کے طور پر کسی کے نکاح میں دینا درست نہیں ہے، البتہ اگر وہ اس نکاح پر راضی ہے تو نکاح جائز ہوگا۔

جب تک عورت کسی کے نکاح میں ہے اس کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوگا، اس کا نسب اسی شخص کی طرف منسوب ہوگا، جس کے نکاح میں وہ عورت ہے اور وہ بچہ اس کا وارث بھی بنے گا، حدیث پاک میں ہے:اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ۔

ترجمہ:''بچے کا نسب اسی کی طرف منسوب ہوگا، جس کے نکاح میں اس کی ماں ہے اور زانی کے لئے پتھر (رجم کی سزا) ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:2053)''۔

فقہ حنفی کی رُو سے کسی عورت کی رضامندی کے بغیر اُس کا کسی شخص کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔زانیہ عورت کا بار بار بدکاری کا ارتکاب کرنا بدنصیبی ہے، اُس پر توبہ لازم ہے اور قسم کھا کر اس کو توڑنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔بغیر ثبوتِ شرعی کے کسی پر بدکاری کی تہمت

لگانا بھی ناجائز ہے اور اگر بغیر ثبوتِ شرعی کے کوئی کسی پر زنا کی تہمت لگائے اور جس پر تہمت لگائی گئی ہے، وہ شرعی عدالت سے رجوع کرے اور عدالت میں جرم ثابت نہ ہو سکے تو تہمت لگانے والوں کو 80 کوڑے حدقذف کے لگائے جائیں گے۔

بوجہ مرض حیض نہ آنے والی عورت کی عدت

سوال: 127

جس عورت کے طہر کی مدت ایک سال یا دو سال یا اس سے زائد ہوتی ہے یعنی اسے کافی عرصے تک حیض نہیں آتا تو ایسی عورت طلاق کی صورت میں اپنی عدت کس طرح گزارے گی۔ اگر تین حیض گزارے تو یہ تین یا چھ سال بن جاتے ہیں اور اگر تین ماہ گزارے، تو ''ثلثة قروء'' پر کیسے عمل ہوگا؟، (منور احمد، ملیر)۔

جواب:

حیض اور طہر (پاکی کے ایام) کا دورانیہ ہر عورت کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ اور اگر عورت کو حیض نہیں آتا، خواہ کسی طبعی یا طبّی سبب سے ہو یا کم عمر ہے اور حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا یا وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہوگئی ہیں، جب فطری طور پر حیض کا سلسلہ موقوف ہو جاتا ہے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ترجمہ: ''اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہو چکی ہیں اور تمہیں اس امر میں شبہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہے؟) تو ان کی عدت تین ماہ ہے، اور وہ عورتیں جن کو حیض نہیں آتا (ان عدت بھی تین ماہ ہے)، (الطلاق: 4)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَالْعِدَّةُ فِیْ حَقِّ مَنْ لَّمْ تحِضْ لِصِغَرٍ بِأَنْ لَّمْ تَبْلُغْ تِسْعًا أَوْ کِبَرٍ بِأَنْ بَلَغَتْ سِنَّ الْاِیَاسِ أَوْ بَلَغَتْ بِالسِّنِّ وَلَمْ تحِضْ۔۔۔۔۔۔ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ بِالْاَهِلَّةِ لَوْ فِی الْغُرَّةِ وَاِلَّا فَبِالْاَیَّامِ۔

ترجمہ: ''اور جس عورت کو کم عمری کے سبب حیض نہ آتا ہو (یعنی اس کی عمر نو سال بھی نہ ہوئی ہو) یا عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو اور وہ عمر کے اعتبار سے بالغ ہوگئی ہو (لیکن اس کے باوجود اسے حیض نہ آتا ہو)، تو اس کی عدت تین ماہ ہے، اگر طلاق قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو دے دی گئی ہو تو تین قمری مہینے مکمل ہونے پر عدت پوری ہو جائے، ورنہ 90 دن

مکمل ہونے پر عدت پوری ہوگی''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 5، ص:146، 149، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ جلال الدین خوارزمی لکھتے ہیں:

وَاِذَا کَانَتِ الْمَرْأَۃُ لَاتَحِیْضُ مِنْ صِغَرٍ أَوْ کِبَرٍ فَأَرَادَأَنْ یُطَلِّقَهَا ثَلَاثاً لِلسُّنَّةِ طَلَّقَهَا وَاحِدَةً فَاِذَا مَضٰی شَهْرٌ طَلَّقَهَا أُخْرٰی، فَاِذَا مَضٰی شَهْرٌ طَلَّقَهَا أُخْرٰی لِأَنَّ الشَّهْرَ فِیْ حَقِّهَا قَائِمٌ مَّقَامَ الْحَیْضِ۔

ترجمہ: ''جب عورت کو کم عمری یا سن ایاس کو پہنچنے کے سبب حیض نہ آتا ہو، اور اسے (اس کا شوہر) سنت میں تعلیم فرمائے ہوئے طریقے کے مطابق تین طلاق دینے کا ارادہ رکھتا ہو، تو وہ اس کو ایک طلاق دے پھر ایک مہینہ گزرنے کے بعد دوسری طلاق دے کیونکہ مہینہ (گزرنا) اس کے حق میں حیض کے قائم مقام ہے''۔

(فتح القدیر جلد 3، ص:58-457، مطبوعہ: مرکز اہل السنۃ برکات رضا)

سوال میں جس خاتون کا ذکر ہے، ایسی عورت کو "مُمْتَدَّةُ الطُّهر" (یعنی لمبے طہر والی) کہتے ہیں اور اس کی عدت فقہاءِ احناف کے نزدیک تین حیض ہی ہیں، خواہ کتنے سال میں آئیں۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسی عورت کی عدت نو ماہ ہے اور ضرورت کے تحت امام مالک کے قول پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: نَعَمْ لَوْ قَضٰی مَالِکِیٌّ بِذَالِکَ نَفَذَ کَمَا فِی الْبَحْرِ وَالنَّهْرِ،

ترجمہ: ''ہاں! اگر فقہِ مالکی کے قاضی نے (نو ماہ کی عدت کا) فیصلہ دیا، تو نافذ ہوجائے گا جیسا کہ البحر الرائق اور النہر الفائق میں ہے ------ علامہ ابن عابدین شامی علامہ حصکفی کی عبارت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (نَعَمْ لَوْ قَضٰی مَالِکِیٌّ بِذٰلِکَ نَفَذَ) لِأَنَّهٗ مُجْتَهَدٌ فِیْهِ، وَهٰذَا کُلُّهٗ رَدٌّ عَلٰی مَا فِی "الْبَزَّازِیَّةِ"، قَالَ الْعَلَّامَةُ: وَالْفَتْوٰی فِیْ زَمَانِنَا عَلٰی قَوْلِ مَالِکٍ وَعَلٰی مَا فِیْ "جَامِعِ الْفُصُوْلَیْنِ": لَوْ قَضٰی قَاضٍ بِانْقِضَاءِ عِدَّتِهَا بَعْدَ مَضِیِّ تِسْعَةِ اَشْهُرٍ، نَفَذَ اھ، لِاَنَّ الْمُعْتَمَدَ اَنَّ الْقَاضِیَ لَا یَصِحُّ قَضَاءُهٗ بِغَیْرِ مَذْهَبِهٖ خُصُوْصًا قُضَاةُ زَمَانِنَا ------ قُلْتُ: لٰکِنْ هٰذَا ظَاهِرٌ اِذَا اَمْکَنَ

قَضَاءُ مَالِكِيٍّ بِهٖ أَوْ تَحْكِيمُهٗ، أَمَّا فِيْ بِلَادٍ لَا يُوْجَدُ فِيهَا مَالِكِيٌّ يَحْكُمُ بِهٖ، فَالضَّرُوْرَةُ مُتَحَقِّقَةٌ، وَكَأَنَّ هٰذَا وَجْهُ مَا مَرَّ عَنِ (الْبَزَّازِيَّةِ) وَ (الْفُصُوْلَيْنِ) فَلَا يَرِدُ قَوْلُهٗ فِيْ (النَّهْرِ): أَنَّهٗ لَا دَاعِيَ إِلَى الْإِفْتَاءِ بِقَوْلٍ نَعْتَقِدُ أَنَّهٗ خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ مَعَ إِمْكَانِ التَّرَافُعِ إِلَى مَالِكِيٍّ يَحْكُمُ بِهٖ اه، تَأَمَّلْ، وَلِهٰذَا قَالَ الزَّاهِدِيُّ: وَقَدْ كَانَ بَعْضُ أَصْحَابِنَا يُفْتُوْنَ بِقَوْلِ مَالِكٍ فِيْ هٰذِهِ الْمَسْأَلَةِ لِلضَّرُوْرَةِ اه۔

ترجمہ: ''ہاں ! اگر کوئی مالکی قاضی یا مفتی ''مُمْتَدَّةُ الطُّهْر '' کے لئے نو ماہ گزرنے پر عدت ختم ہونے کا فیصلہ کرلے تو یہ فیصلہ نافذ ہوجائے گا، کیونکہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے، یہ (علامہ حصکفی کا مالکی کی قضاء کے نفاذ کا قول) ''بزازیہ'' کی اس عبارت کا رد ہے، علامہ نے کہا: ہمارے زمانے میں فتویٰ امام مالک کے قول پر ہے اور اُس کا رد ہے جو ''جامع الفصولین'' میں ہے: ''اگر کسی قاضی نے نو ماہ گزر جانے کے بعد ''مُمْتَدَّةُ الطُّهْر ''(مطلقہ) عورت کی عدت ختم ہونے کا فتویٰ دیا، تو یہ فتویٰ نافذ ہوگا (یعنی حنفی قاضی فتویٰ دے سکتا ہے)، کیونکہ قاضی خصوصاً ہمارے زمانے کے قاضیوں کا اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے امام کے مذہب پر فتویٰ دینا صحیح نہیں ہے''۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''میں کہتا ہوں: لیکن یہ (یعنی مالکی قاضی یا مفتی سے فیصلہ لینا) ظاہر ہے کہ اس صورت میں ممکن ہوگا، جب کسی مالکی مفتی یا قاضی سے فیصلہ کرانا ممکن ہو۔ لیکن ایسے ملک میں جہاں کوئی ایسا مالکی قاضی نہیں پایا جاتا جس سے فیصلہ کرایا جائے، پس ضرورت تو موجود ہے اور گویا یہی اُس قول کی توجیہ ہے جو ''بزازیہ'' اور ''جامع الفصولین'' میں گزرا (کہ ان کے نزدیک مالکی قاضی نہ ہونے کی وجہ سے ضرورت متحقق تھی)، تو اس قول پر ''النہر الفائق'' کی اس عبارت سے اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ: ''ایسے کسی قول پر فتویٰ دینے کا کوئی داعی نہیں ہے، جس کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہو کہ وہ خطا ہے مگر صواب (درست ہونے) کا احتمال رکھتا ہے، جبکہ کسی مالکی قاضی سے مرافعہ ممکن ہو کہ وہ فیصلہ کرے، پس غور کیجئے (یعنی ''بزازیہ'' کا قول ضرورت کے متحقق ہونے کی بنا پر ہے اور ''صاحبِ نہر'' کا قول ضرورت متحقق نہ ہونے کی صورت میں ہے)، اسی لئے ''زاہدی'' نے کہا: ہمارے بعض اصحاب اس مسئلے میں ضرورت کی بنا پر امام مالک کے قول پر

فتویٰ دیتے تھے،(ردالمحتار علی الدر المختار،جلد 5،ص:149)''۔

فقیہ العصر علامہ مفتی نوراللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''بہر حال مذہب وہی ہے اور ضرورتِ شدیدہ کے وقت یہ بھی فرمایا گیا ہے جو اوپر مذکور ہوا، یہ فتویٰ نہیں دیا جارہا ہے مگر ضرورتِ شدیدہ کے وقت اس پر کوئی عمل کرے تو امید کہ گناہگار نہ ہوگا کہ ''فتاویٰ خیریہ''،جلد:01،ص:61 میں ہے:لَا شَکَّ اَنَّہٗ اِذَا قَضٰی مَالِکِیُّ الْمَذْھَبِ فِیْ مُمْتَدَّۃِ الطُّھُرِ بِانْقِضَاءِ الْعِدَّۃِ بِتِسْعَۃِ اَشْھُرٍ یَنْفُذُ، وَلَایَجُوْزُ نَقْضُہٗ لِاَنَّہٗ لَمْ یُخَالِفِ الْکِتٰبَ وَالسُّنَّۃَ الْمَشْھُوْرَۃَ وَلَا الْاِجْمَاعَ۔

ترجمہ:''اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی مالکی المذہب قاضی نوماہ گزرنے پر مُمْتَدَّۃُ الطُّھُر کی عدت گزرنے کا فیصلہ کرلے تو وہ نافذ ہوجائے گا اور اس کا توڑنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب،سنتِ مشہورہ اور اجماع کے مخالف نہیں ہے''۔

(فتاویٰ نوریہ،جلد:03،ص:79-278)

جب بقول علامہ مفتی نوراللہ بصیر پوری نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا کہ کوئی مُمْتَدَّۃُ الطُّھُر مالکی مذہب پر عمل کرلے تو جائز ہے،اب ظاہر ہے کہ عام لوگوں کو تو مذاہب کی اتنی تفصیل معلوم نہیں ہے،تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ مالکی قاضی دستیاب نہ ہونے کی صورت میں حنفی قاضی یا مفتی قولِ امام مالک پر فیصلہ کرے یا فتویٰ دے۔

خرید وفروخت کے مسائل

کاروبار میں شراکت

سوال:128

زید اپنے جانور مثلاً گائے کو کسی شخص کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ آدھی قیمت مجھے دے دو (یہ اُس صورت میں ہے کہ جب مشتری کے پاس پوری قیمت ادا کرنے کی ہمت نہ ہو) لیکن جب اس گائے کا بچہ فروخت کروگے تو اس کی آدھی قیمت مجھے دے دینا اور جب اس گائے کے بچے فروخت کروگے اُس کی آدھی قیمت مجھے دینا ہوگی، کیا یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟۔ ہمارے گاؤں میں مذکورہ طریقے پر جانوروں کی خرید وفروخت عام ہے، اگر یہ ناجائز ہے تو شریعت کی روشنی میں کوئی ایسا حل بیان فرمائیں کہ لوگوں کے معاملات میں بڑی تبدیلی لائے بغیر انہیں مذکورہ منفعت حاصل ہو جائے۔

محمد ساجد، ضلع مظفر گڑھ

جواب:

شرعاً بیع کے صحیح طور پر منعقد ہونے کی شرط یہ ہے کہ مبیع موجود ہو اور مبیع وثمن دونوں معلوم ہوں اور اُن کے بارے میں کوئی ایسی لاعلمی نہ ہو جو آگے چل کر فریقین میں تنازعے کا سبب بنے۔ حدیثِ پاک میں ہے:

(1) ''لَاتَبِعُ مَالَیۡسَ عِنۡدَكَ" ترجمہ: ''ایسی چیز فروخت نہ کرو، جو تمہارے پاس موجود نہ ہو، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 3497)''۔

(2) عَنۡ عَبۡدِاللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنۡهُ عَنۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ نَهٰی عَنۡ بَیۡعِ حَبَلِ الۡحَبَلَةِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حاملہ (جانور) کے حمل کی بیع (یعنی اُس کے بطن میں جو جنین ہے) سے منع فرمایا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3807)''۔ اس ممانعت کا سبب یہ ہے کہ کسی کو پتا نہیں کہ حاملہ جانور کے پیٹ میں کیا ہے؟، آیا وہ پیدا ہوگا یا نہیں؟، اگر پیدا ہوگا تو زندہ بھی ہوگا یا نہیں؟۔

بیع درست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ثمن مجہول نہ ہو اور اس کی مقدار متعین اور واضح ہو۔ مذکورہ صورت میں چونکہ ثمن مجہول ہے، اس لئے بیع فاسد ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ بیع کے صحیح ہونے کی شرائط کی بابت لکھتے ہیں:

وَمِنْهَا أَنْ يَكُوْنَ الْمَبِيْعُ مَعْلُوْمًا وَّالثَّمَنُ مَعْلُوْمًا عِلْمًا يَمْنَعُ مِنَ الْمُنَازَعَةِ فَبَيْعُ الْمَجْهُوْلِ جَهَالَةٌ تُفْضِيْ إِلَيْهَا غَيْرُ صَحِيْحٍ كَبَيْعِ شَاةٍ مِّنْ هٰذَا الْقَطِيْعِ وَبَيْعُ شَيْءٍ بِقِيْمَتِهٖ وَبِحُكْمِ فُلَانٍ۔

ترجمہ: ''بیع کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ایک یہ ہے کہ مبیع اور ثمن اس طرح واضح طور پر معلوم ہوں کہ (آگے چل کر) جھگڑا پیدا نہ ہو، چنانچہ ایسی مجہول چیز کی بیع صحیح نہیں ہے جو آگے چل کر تنازعے کا سبب بنے، جیسے کہا جائے کہ: میں نے اس گلے میں سے ایک بکری آپ پر فروخت کی (کیونکہ سب بکریاں ایک جیسی نہیں ہوتیں اور قیمتوں میں بہت فرق پڑتا ہے) یہ چیز میں نے آپ پر اس کی قیمت (Market Value) پر فروخت کی یا فلاں شخص اس کی جو بھی قیمت مقرر کرے، وہ لازم ہوگی''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، ص: 3، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

اس بیع میں جواز کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ بائع آدھی گائے فروخت کرے، مشتری اور بائع دونوں گائے میں شریک ہو جائیں اور اس صورت میں گائے کی رکھوالی پر جو اخراجات آئیں گے، دونوں فریق اُس میں برابر شریک ہوں گے اور اُس گائے سے حاصل ہونے والے منافع میں بھی دونوں برابر شریک ہوں گے۔ یا دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مویشی کا مالک ایک شخص ہو اور مویشیوں کے منافع اسی کو حاصل ہوں اور دوسرے شخص کو وہ اجرت پر رکھ لے اور اس کی خدمات کے عوض اسے مقررہ اجرت ادا کرے۔

بیع کے فسخ کرنے کا حق

سوال: 129

میں نے اپنا ایک فلیٹ اپنے ایک واقف کار محمد عابد کو =/75,000 روپے میں

فروخت کیا، محمد عابد نے بیعانہ کے طور پر =/38,000 روپے دے کر چابی وصول کر لی۔ میں نے یہ معاہدہ کیا کہ جب وہ بقیہ رقم ادا کرے گا، میں اُسے فلیٹ کے کاغذات بھی دے دوں گا اور پھر Sale Deed کا معاہدہ کروں گا۔ اب تقریباً 24 سال گزرنے کے باوجود محمد عابد نے بقیہ رقم ادا نہیں کی اور 24 سال سے اُسی فلیٹ میں رہ رہا ہے، اس دوران میں نے بار بار رقم کا تقاضا کیا، لیکن نہ تو اُس نے رقم دی اور نہ ہی میں نے رقم کی واپسی کے لئے سختی کی۔ میں گذشتہ ماہ اُس کے پاس گیا تو کہنے لگا کہ اب میں صرف بقیہ رقم =/37,000 روپے ادا کرسکتا ہوں۔ جبکہ میرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے =/38,000 روپے لے کر مجھے فلیٹ واپس کر دے، فلیٹ کے کاغذات میرے پاس ہیں۔ معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ میرے مطالبے کی کیا شرعی حیثیت ہے؟۔ نوٹ: معاہدے کی نقل (اردو ترجمہ) منسلک ہے، (خطیب اللہ قریشی، مارٹن کوارٹر، نیوٹاؤن، کراچی)۔

جواب:

نفسِ مسئلہ سے قبل یہ بات مدّنظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق تجارت و معاملات میں دیانت، امانت، صداقت اور عہد و پیمان کی پابندی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور یہ خوبیاں اسلامی تعلیمات کا طرۂ امتیاز ہیں۔

ایجاب و قبول سے بیع منعقد ہو جاتی ہے اور چیز بائع کی مِلک سے نکل کر مشتری کی مِلک میں داخل ہو جاتی ہے۔ بیع منعقد ہونے کے بعد اُسے کوئی ایک فریق یک طرفہ طور پر فسخ نہیں کرسکتا، لہٰذا آپ کا مطالبہ شرعاً درست نہیں ہے۔ مذکورہ صورت میں مشتری، بائع کا مقروض ہے اور اُس سے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، علامہ ابوبکر فرغانی مرغینانی لکھتے ہیں: وَإِذَا حَصَلَ الْإِيجَابُ وَالْقَبُوْلُ لَزِمَ الْبَيْعُ وَلَا خِيَارَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا إِلَّا مِنْ عَيْبٍ أَوْ عَدَمِ رُؤْيَةٍ۔

ترجمہ: ”اور جب ایجاب و قبول دونوں ہو جائیں تو بیع لازم اور تمام ہو جاتی ہے اور بائع و مشتری میں سے کسی کو فسخ کا اختیار حاصل نہیں رہتا، سوائے اس کے کہ مبیع (فروخت شدہ چیز) میں

کوئی عیب ظاہر ہوجائے یا مشتری نے بیع کے وقت مبیع کو نہ دیکھا ہو (تو خیارِ عیب اور خیارِ رویت حاصل ہوتا ہے)، (ہدایہ، جلد:5،ص:7-6،مطبوعہ:مکتبۃ البشریٰ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:
''بیع ایجاب وقبول سے تمام ہوجاتی ہے اور جب بیع صحیح شرعی واقع ہولے تو اس کے بعد بائع یا مشتری کسی کو بے رضامندی دوسرے کے اس سے یوں پھر جانا روا نہیں، نہ اس کے پھرنے سے وہ معاہدہ جو مکمل ہو چکا ہے، ٹوٹ سکتا ہے۔ زید پر لازم ہے کہ مال فروخت شدہ تمام وکمال خریدار کو دے، ہدایہ میں ہے: اِذَا حَصَلَ الْاِیْجَابُ وَالْقَبُوْلُ لَزِمَ الْبَیْعُ وَلَا خِیَارَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا اِلَّا مِنْ عَیْبٍ اَوْعَدَمِ رُؤْیَةٍ۔ ترجمہ:''اور جب ایجاب وقبول حاصل ہوجائے تو بیع لازم ہوجاتی ہے اور بائع ومشتری میں سے کسی کو فسخ کا خیار حاصل نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ مبیع میں کوئی عیب ظاہر ہوجائے یا مشتری نے بیع کے وقت اس کو دیکھا نہ ہو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 17،ص:87، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

ایجاب وقبول کے بعد مبیع کا نرخ اگر بڑھ جائے تو بائع کو زائد رقم لینے کا اختیار نہیں ہے، بلکہ طے شدہ قیمت پر ہی مُشتری کو دے گا۔

محمد عابد صاحب کو چونکہ آپ مکان کا قبضہ اپنی رضا ورغبت سے دے چکے تھے، تو شرعاً بیع اسی وقت مکمل، ہوگئی اور بقایا =/37,000 روپے آپ کے اُس کے ذمے واجب الاداء رہ گئے، Sale Deed یا بیع نامہ کی تکمیل محض قانونی تقاضا ہے۔ آپ نے خود تحریر کیا ہے کہ آپ نے اپنی رقم کا تقاضا کرنے میں نرمی برتی، ایک روایت کی رُو سے کسی شخص کا دوسرے شخص پر قرض ہو اور وہ اس کا تقاضا نہ کرے تو اسے ہر روز اتنی رقم کے برابر صدقے کا ثواب ملتا ہے: عَنْ بُرَیْدَۃَ الْاَسْلَمِیِّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا کَانَ لَهٗ بِکُلِّ یَوْمٍ صَدَقَةٌ، وَمَنْ اَنْظَرَهٗ بَعْدَ حِلِّهٖ کَانَ لَهٗ مِثْلُهٗ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ صَدَقَةٌ۔

ترجمہ:''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے تنگ دست (مقروض) کو قرض کی ادائیگی میں مہلت دی، تو اُس کو ہر دن اُس قرض کی رقم کے

برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا، اور جس نے قرض کی ادائیگی کا وقت پورا ہونے کے بعد مقروض کو مہلت دی تو اُس قرض خواہ کو ہر روز قرض کی کل رقم کے برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا''۔

(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2418، مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 22970)

اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کا شِعار تو یہ رہا ہے کہ محض دل میں ارادہ کرلیا ہو، ابھی عقد تمام نہ ہوا ہو، تب بھی اُس پر قائم رہتے ہیں:

''ابو سعید بکر بن منیر بیان کرتے ہیں کہ امام بخاری کے پاس فروخت کے لیئے کچھ سامان آیا، شام کو ان کے پاس بعض تاجر آئے اور پانچ ہزار درہم کے نفع پر وہ سامان خریدنا چاہا، امام بخاری نے کہا: میں تمہیں کل بتاؤں گا۔ دوسرے دن تاجروں کا دوسرا گروہ آیا، انہوں نے دس ہزار درہم کے نفع سے خریدنے کی پیشکش کی، امام بخاری نے کہا: کل جو تاجر آئے تھے، میں نے دل میں ان کو فروخت کرنے کی نیت کرلی تھی، اب میں پانچ ہزار درہم کے نفع کی خاطر اپنی نیت بدلنا نہیں چاہتا''۔

(تاریخ بغداد، جلد 2 ص: 12، تاریخِ دمشق، جلد 55، ص: 60-59)

محمد عابد صاحب نے اتنے طویل عرصے میں اگر استطاعت کے باوجود رقم ادا نہیں کی تو اسے حدیث پاک میں ظلم قرار دیا گیا ہے، اسے آپ سے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ ترجمہ: ''قرض کی ادائیگی میں مالدار کا تاخیر کرنا ظلم ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3999)''۔ اسے آج کل کاروباری اصطلاح میں WILL FULL DEFAULT کہا جاتا ہے۔ البتہ اگر محمد عابد آپ کے مطالبے یا پیشگی شرط کے بغیر اصل واجب الادا رقم سے کچھ زائد تبرّعًا دیدیں تو وہ جائز اور مستحسن ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مِسعر نے کہا: وَكَانَ لِيْ عَلَيْهِ دَيْنٌ، فَقَضَانِيْ وَزَادَنِيْ ۔

ترجمہ: ''میرا رسول اللہ ﷺ پر قرض تھا، آپ نے وہ قرض ادا کردیا اور (قرض سے) زیادہ عطا فرمایا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 2394)''۔

رہن رکھی ہوئی چیز سے نفع

سوال:130

ایک شخص نے اپنا مکان کرائے پر دیا۔ مالک مکان کو رقم کی ضرورت پڑی تو اُس نے کرایہ دار سے پچاس ہزار روپے بطور قرض مانگے۔ کرائے دار نے کہا کہ آپ مجھ سے ایک لاکھ روپے لے لیں اور اپنا مکان (جس میں وہ کرایہ دار ہے) میرے پاس گروی رکھ دیں۔ جب آپ مجھے رقم لوٹائیں گے، میں اُسی وقت سے آپ کو کرایہ ادا کروں گا اور جتنے عرصے تک میری رقم آپ کے پاس رہے گی، میں کرایہ ادا نہیں کروں گا۔ کیا یہ عمل درست ہے؟، کیا اتنی مدت تک کرایہ ادا نہ کرنا سود کے زمرے میں آئے گا؟۔

(محمد صدیق نورانی، ناظم آباد، کراچی)

جواب:

اس مسئلے کے جاننے سے پہلے ضروری اصطلاحات کا مفہوم سمجھ لیں:

(۱) جو چیز کسی کے پاس رہن رکھی جائے، اُسے ''مرہون'' کہتے ہیں۔

(۲) رہن رکھنے والے کو ''راہن'' کہتے ہیں۔

(۳) جس کے پاس وہ شے رہن رکھوائی جارہی ہے، اُسے ''مُرتَہِن'' کہتے ہیں۔

شریعتِ مطہرہ میں ''عقدِ رہن'' کو صرف اس لئے مشروع کیا گیا ہے کہ قرض دہندہ کو اپنی رقم سے متعلق اطمینان ہوجائے اور رقم ڈوبنے کا خدشہ نہ رہے۔ اس کی مالیت سے ایک حق مرتہن کے متعلق ہوجاتا ہے اور مرتہن کو اس شے کی حفاظت اور اپنے پاس بطور ضمانت روکے رکھنے کے علاوہ تصرُّف کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ شے اس کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ اس نے اپنے پاس اس طرح روکی ہوئی ہے کہ مالک اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (لَا الْاِنْتِفَاعُ بِهٖ مُطْلَقًا) لَا بِاسْتِخْدَامٍ وَلَا سُکْنٰی وَلَالُبْسٍ وَلَااِجَارَةٍ وَلَا اِعَارَةٍ، سَوَاءٌ کَانَ مِنْ مُرْتَهِنٍ أَوْ رَاهِنٍ (اِلَّا بِاِذْنٍ) کُلٍّ لِلْآخَرِ، وَقِیْلَ: لَا یَحِلُّ لِلْمُرْتَهِنِ لِأَنَّهٗ رِبًا، وَقِیْلَ: اِنْ شَرَطَهٗ کَانَ رِبًا، وَاِلَّا، لَا

ترجمہ: ''مرتہن کو مرہون سے کسی قسم کا نفع حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہے، مثلاً اگر غلام یا باندی ہے تو اُس سے خدمت لینے کی اجازت نہیں، مکان رہن رکھا ہوا ہے تو مرتہن کے لئے اس میں رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ لباس ہے تو پہننے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی رہن رکھی ہوئی چیز کو اُجرت پر دینے یا عاریتاً دینے کی اجازت ہے۔ یہ انتفاع راہن یا مرتہن دونوں میں سے کسی کے لئے جائز نہیں، مگر یہ کہ ایک دوسرے کو یعنی راہن، مرتہن کو یا مرتہن، راہن کو انتفاع کی اجازت دے دے (تو درست ہے)۔ بعض علماء نے کہا کہ اگر چہ راہن اجازت دے دے تب بھی مرتہن کو نفع حاصل کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ سود ہے اور بعض نے کہا کہ: عقدِ رہن میں استیفاء منافع شرط کرلیا ہے تو، سود ہے اور اگر شرط نہیں کیا تو سود نہیں''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِبْنِ اَسْلَمَ السَّمَرْقَنْدِيِّ ،وَكَانَ مِنْ كِبَارِ عُلَمَاءِ سَمَرْقَنْدَ :أَنَّهٗ لَايَحِلُّ لَهٗ أَنْ يَّنْتَفِعَ بِشَيْءٍ مِنْهُ بِوَجْهٍ مِّنَ الْوُجُوهِ وَاِنْ أَذِنَ لَهُ الرَّاهِنُ ،لِأَنَّهٗ أَذِنَ لَهٗ فِي الرِّبَا، لِأَنَّهٗ يَسْتَوْفِيْ دَيْنَهٗ كَامِلاً فَتَبْقٰى لَهُ الْمَنْفَعَةُ فَضْلاً فَيَكُوْنُ رِبًا۔

ترجمہ: ''عبداللہ محمد بن اسلم سمرقندی جو سمرقند کے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں، بیان کرتے ہیں: مرتہن کو مرہون سے کچھ بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے اگر چہ راہن نے اجازت دے دی ہو کیونکہ یہ سود کی اجازت ہے، اس لئے مرتہن نے اپنا دین (قرض) پورا پالیا، تو جو منفعت حاصل کی، وہ اصل رقم پر زیادتی ہے اور یہی تو سود ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 10، ص:70، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

نوٹ: فتاویٰ رضویہ، جلد:25، ص:242 اور غمز عیون البصائر، جلد:3، ص:244 پر عبداللہ بن محمد بن اسلم ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: شے مرہون کو اپنے استعمال میں لانا یا اُس میں سکونت کرنا کسی طور جائز ہے یا نہیں؟، آپ نے جواب میں فرمایا: کسی طرح جائز نہیں ہے۔ حدیث پاک میں ہے: كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبوا،اَخْرَجَهُ الْحَارِثُ

عَنْ سَيِّدِنَا عَلِيٍّ كَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالىٰ وَجْهَهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ، ترجمہ: ''وہ قرض جس کے ذریعے سے کوئی منفعت حاصل کی جائے، وہ سود ہے''۔ (بحوالہ کنز العمال) اس کی تخریج حارث نے حضرت علی سے کی اور حضرت علی نے اسے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا)۔ علامہ طحطاوی پھر علامہ شامی خود شرح درمختار میں فرماتے ہیں: اَلْغَالِبُ مِنْ اَحْوَالِ النَّاسِ اَنَّهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُوْنَ عِنْدَ الدَّفْعِ الْاِنْتِفَاعَ وَلَوْ لَاهُ لَمَا اُعْطَاهُ الدَّرَاهِمَ وَهٰذَا بِمَنْزِلَةِ الشَّرْطِ لِاَنَّ الْمَعْرُوْفَ كَالْمَشْرُوْطِ وَهُوَ مِمَّا يُعَيِّنُ الْمَنْعَ ۔ اَقُوْلُ وَلَاشَكَّ اَنَّ هٰذَا بِعَيْنِهٖ حَالُ اَهْلِ الزَّمَانِ يَعْرِفُهٗ مِنْهُمْ كُلُّ مَنِ اخْتَبَرَ وَمَعْلُوْمٌ اَنَّ اَحْكَامَ الْفِقْهِ اِنَّمَا تَبْنِيْ عَلَى الْكَثِيْرِ الشَّائِعِ ولا تذكر حال شذت و ندرت فيه الجواز كَمَانَصَّ عَلَيْهِ الْمُحَقِّقُ حَيْثُ اُطْلَقَ فِيْ فَتْحِ الْقَدِيْرِ وَغَيْرُهٗ مِنَ الْعُلَمَاءِ الْكِرَامِ فَالْحُكْمُ فِيْ زَمَانِنَا هُوَ اِطْلَاقُ الْمَنْعِ لَايَرْتَابُ فِيْهِ مَنْ لَّهٗ اِلْمَامٌ بِالْعِلْمِ.

ترجمہ: ''لوگوں کا غالب حال یہ ہے کہ وہ مرہون شے دیتے وقت نفع اٹھانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اگر نفع اٹھانا مطلوب نہ ہو تو وہ قرض کے لئے رقم ہی نہ دیں اور یہ شرط کے درجے میں ہے، اس لئے کہ جو چیز معروف ہو، وہ مشروط ہی کی طرح ہوتی ہے اور یہی بات شے مرہون سے نفع اٹھانے کی ممانعت میں معین ہے۔ میں (امام احمد رضا قادری) کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے زمانے کے لوگوں کا یہی حال ہے جسے ہر باخبر شخص جانتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ فقہی احکام کی بنیاد کثیر الوقوع امور پر ہوتی ہے اور شاذ و نادر احوال کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ جیسا کہ اس پر محقق علی الاطلاق علامہ کمال الدین بن ہُمام نے ''فتح القدیر'' میں اور دیگر علماء کرام نے بھی صراحت فرمائی ہے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں مرہون شے سے مطلقاً نفع اٹھانے کی ممانعت کا حکم ہے، جس کا دینی علم سے معمولی تعلق بھی ہوگا، اُسے اس مسئلے میں کوئی شک نہیں ہوگا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 25، ص: 217، 218)

قسطوں پر قیمت طے کر کے کاروبار جائز ہے

سوال: 131

ایک شخص ایک پرائیویٹ بینک سے پچاس ہزار روپے بطور قرض لیتا ہے اور اس رقم کو تین سال کے عرصے میں ہر ماہ قسط وار گیارہ ہزار روپے اضافی اصل رقم کے علاوہ واپس لوٹاتا ہے۔اس سلسلے میں اُس کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ یہ اضافی رقم سود کے زمرے میں آتی ہے ،جبکہ خالد کا کہنا ہے کہ یہ اضافی رقم سود نہیں بلکہ بطور اجرت یا بینک کے اخراجات کی مَد میں ہوتی ہے۔درست کیا ہے؟۔

نیز قسطوں پر سامان خریدنے پر جو اضافی رقم ادا کی جاتی ہے کیا وہ بھی سود کے زمرے میں آتی ہے؟،(محمد صدیق نورانی،ناظم آباد،کراچی)۔

جواب:

بینک کا قسط وار اصل رقم کو وصول کرنا،اپنے دیئے ہوئے قرض کو وصول کرنا ہے اور اُس پر جو اضافی رقم وصول کی جارہی ہے،وہ سود کہلائے گی۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز (فتاویٰ رضویہ،جلد 25،ص: 217،رضا فاؤنڈیشن، لاہور پر) کنز العمال کے حوالے سے حدیث نقل فرماتے ہیں: کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَۃً فَھُوَ رِبٰوا،اَخْرَجَہُ الْحَارِثُ عَنْ سَیِّدِنَا عَلِیٍّ کَرَّمَ اللّٰہُ تَعَالیٰ وَجْھَہُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ

ترجمہ:''یعنی قرض کے ذریعے سے جو منفعت حاصل کی جائے وہ سود ہے،(اس کی تخریج حارث نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے کی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اس کو نبی کریم ﷺ سے روایت کیا)۔فقہی اصول ہے کہ ''جس قرض کی وجہ سے کوئی نفع اٹھایا جائے،وہ سود ہے''۔

مختلف افراد،کمپنیاں اور ادارے ادھار پر سامان فروخت کرتے ہیں اور قیمت اقساط میں وصول کی جاتی ہے قیمت باہمی رضامندی سے طے کرلی جاتی ہے،عام طور پر یہ موجودہ بازاری قیمت سے زیادہ ہوتی ہے،اسی طرح قسط کی رقم اور ادائیگی کی کل مدت پہلے سے طے ہوتی ہے،مبیع (SOLD ITEM) خریدار کے حوالے کر کے اس کی ملک میں دے

دی جاتی ہے، تو یہ عقد شرعاً صحیح ہے، بشرطیکہ اس میں یہ شرط شامل نہ ہو کہ اگر خدانخواستہ مقررہ مدت میں اقساط کی ادائیگی میں تاخیر ہوگئی تو ادائیگی کی اضافی مدت کے عوض قیمت میں کسی خاص شرح سے کوئی اضافہ ہوگا۔ اور اگر تاخیری مدت کی عوض قیمت میں اضافہ کردیا تو یہ سود ہے اور حرام ہے۔ فی نفسہٖ حدودِ شرع کے اندر اقساط کی بیع جائز ہے۔

قسطوں پر سامان لینے پر جو اضافی رقم ادا کی جاتی ہے، وہ سود میں شمار نہیں، مفتی وقار الدین قادری علیہ الرحمۃ'' سے سوال کیا گیا کہ: (''قسطوں پر سامان لینا کیسا ہے؟ مثلاً ایک چیز کی قیمت نقد =/17,000 روپے ہے اور قسطوں پر ہم اُس چیز کو لیتے ہیں، تو اس کی قیمت =/21,000 روپے ہو جاتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ نقد رقم سے جو زیادہ روپے دینے پڑتے ہیں، یہ سود ہے یا نہیں؟ مالک بتا دیتا ہے کہ آپ قسطوں پر لیں گے تو آپ کو اتنے روپے زیادہ دینے پڑیں گے''؟) آپ نے جواب میں لکھا: ''فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمتوں میں فرق کرنا جائز ہے اور اس طرح بیع کرنا کہ یہ چیز نقد دس روپے کی ہے اور ادھار پندرہ روپے کی، یہ جائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں قسطوں پر سامان لینا جائز ہے اور قسطوں کی صورت میں جو زیادہ پیسہ دیا جاتا ہے، یہ سود نہیں ہے۔ اس میں ناجائز ہونے کی صورت مندرجہ ذیل ہوگی کہ اگر مالک سے قیمت متعین کر کے کوئی چیز خریدی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اتنے روپے مالک کے خریدار کے ذمے واجب ہیں اور خریدار اُس چیز کا مالک ہوگیا اب خریدار مالک کو یہ روپیہ نقد نہ دے بلکہ یہ کہے کہ میں قسطوں میں اِس سے زیادہ ادا کروں گا، تو اِس صورت میں یہ زیادتی سود ہے اور حرام ہے، (وقار الفتاویٰ، جلد سوم ص: 271)''۔

طے شدہ اجرت سے وضع کرنا

سوال: 132

زید ایک وقف کے مال سے چلنے والے ادارے میں اجیر ہے، جہاں ہر سال اجارہ ہوتا ہے۔ قمری سال 1430ھ کا اجارہ اس سال کے آٹھ ماہ اور اگلے سال کے مزید چار ماہ ملا کر بارہ ماہ کا کیا اور زبانی وتحریری محفوظ کرلیا گیا۔ اجارہ میں جو اُجرت مقرر ہوئی، وہ

ادارے نے نہیں دی، بلکہ اُس سے کم رقم دی۔کیا زید اپنی مقرر کی ہوئی رقم ادارے سے لینے کا حق رکھتا ہے اور ادارے نے جو رقم مقرر کی وہ نہ دی، تو کیا حکم ہے؟۔
اگر ادارہ زید کی مقرر کی ہوئی رقم دینے سے انکار کرے اور کہے یہ وقف کا مال ہے، ہم سے غلطی سے تحریری اور زبانی طور پر اجارہ ہوگیا تو اب کیا حکم ہے؟۔اگر ادارہ زید کو مقرر رقم دینے کے بجائے اجارہ فسخ کرنا چاہے تو کیا حکم ہے؟، (عبداللہ عطاری، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ وقف ادارے کے ذمہ داران کو چاہئے کہ اجارہ کے وقت جو اجرت طے کی، مہینے کے اختتام پر اجیر کو طے شدہ پوری رقم دیں، جو اجیر کا حق ہے اور اُسے لینے کا حق رکھتا ہے۔اجیر کو اس کی اجرت نہ دینے پر حدیث پاک میں وعید آئی ہے:
عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ ،عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ : ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ :رَجُلٌ أُعْطٰی بِیْ ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَکَلَ ثَمَنَهٗ، وَرَجُلٌ اِسْتَأْجَرَ أَجِیْرًا فَاسْتَوْفٰی مِنْهُ وَلَمْ یُعْطِهٖ أُجْرَهٗ ۔
ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن میں تین شخصوں سے جھگڑا کروں گا، ایک وہ جس نے میرے نام پر عہد کیا اور اس عہد کو توڑ دیا، دوسرا وہ جس نے آزاد آدمی کو فروخت کیا اور اُس کی قیمت کھائی، تیسرا وہ جس نے کسی کو (اجرت پر) مزدور رکھا اور پورا کام لے کر اُسے (پوری) مزدوری نہ دی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:2270)''۔
اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ:''اگر کوئی شخص کسی مزدور کو برائے مزدوری سو (100) کوس یا پچاس کے فاصلے پر لے جائے، بعدازاں اس سے چار یا پانچ ماہ تک کام کرالے اور حساب کے وقت اُس کو تیس روپے کے کام کے بیس روپے دے اور اس پر سختی کرے اور اسے پریشان کرے، جائز ہے یا نہیں؟''۔آپ نے جواب میں لکھا:''حرام، حرام، حرام، کبیرہ، کبیرہ، کبیرہ۔رسول اللہ ﷺ فرماتے

ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ كُنْتُ خَصْمَهُ خَصَمْتُهُ رَجُلٌ أَعْطَى بِيْ ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اِسْتَأْجَرَ أَجِيْرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُوْفِهِ أَجْرَهُ ۔رَوَاهُ الْأَئِمَّةُ اَحْمَدُ وَالْبُخَارِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَاَبُوْ يَعْلٰى وَغَيْرُهُمْ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَذَكَرَهُ ۔وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ وَعِلْمُهُ جَلَّ مَجْدُهُ اَتَمُّ وَاَحْكَمُ۔

ترجمہ:''میں قیامت کے دن تین شخصوں کا مخالف ہوں گا اور جس کا میں مخالف ہو جاؤں، میں ہی اس پر غلبہ پاتا ہوں ،ایک وہ جس نے میرے نام پر عہد کیا، پھر اس عہد کو توڑ دیا، دوسرا وہ جس نے کسی آزاد کو غلام بنا کر بیچ ڈالا اور اس کی قیمت کھائی ،تیسرا وہ جس نے کسی شخص کو مزدوری میں لے کر اپنا کام تو اس سے پورا کرالیا اور مزدوری اُسے پوری نہ دی (اسے امام احمد ، بخاری ،ابن ماجہ ،ابویعلیٰ وغیرہم ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ،فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، پھر آپ نے یہی حدیث ارشاد فرمائی)''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 19 ،ص:454،455،رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

فریقین پر لازم ہے کہ عقدِ اجارہ کی پابندی کریں ،ظاہر ہے کہ مستاجر نے اجارہ وقف کے متولی یا اس کے نمائندۂ مُجاز ہی کی حیثیت میں کیا ہوگا نہ کہ شخصی اور ذاتی حیثیت میں ۔اگر وقف کے متولّی کا گمان یہ ہے کہ اس نے اجیر کی اجرت ،اجرتِ مثلی سے زیادہ مقرر کی ہے، تو اس کا بار متولی کی ذات پر آئے گا اور یہ بار اُسے اپنے ذمے لینا پڑے گا، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: لَوْ زَادَ الْمُتَوَلِّيْ دَانِقًا عَلٰى أَجْرِ الْمِثْلِ ضَمِنَ الْكُلَّ،

ترجمہ:''اگر متولی نے مزدوری کا چھٹا حصہ بڑھا کر (مزدور کو) دیا تو متولی کل مزدوری کا ضامن ہوگا''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

صُوْرَتُهُ : اِسْتَأْجَرَ الْمُتَوَلِّيْ رَجُلًا فِيْ عِمَارَةِ الْمَسْجِدِ بِدِرْهَمٍ وَدَانِقٍ ،وَأُجْرَةُ مِثْلِهِ

دِرْهَمٍ ضَمِنَ جَمِيعَ الْأُجْرَةِ مِنْ مَّالِهِ لِأَنَّهُ زَادَ فِي الْأَجْرِ أَكْثَرَ مِمَّا يَتَغَابَنُ فِيهِ النَّاسُ، فَيَصِيرُ مُسْتَأْجِرًا لِنَفْسِهِ ،فَإِذَا نَقَضَ الْأَجْرَ مِنْ مَّالِ الْمَسْجِدِ كَانَ ضَامِنًا.

ترجمہ:''متولی نے کسی شخص کو مسجد کا کام کرنے کے لئے ایک درہم اور درہم کے چھٹے حصے (یعنی 11/6 درہم) کی اجرت پر اجیر رکھا، حالانکہ اس جیسے کام کی اجرت معمول کے مطابق ایک درہم بنتی ہے تو ساری اجرت متولی کو اپنے پاس سے دینا پڑے گی، اس لئے کہ متولی نے واجبی اجرت سے اتنا بڑھا کر دیا کہ لوگ دھوکا کھا کر بھی اتنی زیادہ اجرت نہیں دیتے ،تو یہ قرار پائے گا کہ اُس نے اپنے لئے مزدور رکھا ہو، پھر جب متولی نے مسجد کے مال سے مزدوری ادا کی تو متولی اس کا ضامن ہوگا''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6،ص:443،داراحیاء التراث العربی، بیروت)

لیکن جہاں تک امامت وخطابت اور تدریس کے شعبے سے وابستہ اشخاص کا تعلق ہے، اس میں ہر فرد کی اپنی اپنی صلاحیت وقابلیت ہوتی ہے، سب کو ایک ترازو سے نہیں تولا جاسکتا، لہٰذا ہر ایک کے ساتھ جو اجرت طے پائے گی، وہ اس کا حق دار ہوگا اور مستاجر کی طرف سے اس میں کمی کرنا عہد شکنی ہوگی۔ مذکورہ صورت میں ذمہ داران پر تاوان لازم ہے اور کسی ایک فریق کو تنہا فسخِ اجارہ کا حق حاصل نہیں۔

جھوٹی قسم کے ذریعے کسی کا مال غصب کرنا

سوال:133

میں نے کاروبار کے سلسلے میں ایک شخص کو تین گواہوں کی موجودگی میں جواہرات دیئے اور تحریر بھی لکھی گئی۔ اس کے بیٹے بھی کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں کہ آپ کی ہمارے والد پر رقم ہے، لیکن کتنی ہے یہ نہیں معلوم۔ جرگے میں فیصلہ ہوا، جرگے نے بھی اُس شخص کو ملامت کی۔ اب وہ جھوٹی قسم کھارہا ہے اور میری رقم دینے سے انکاری ہے۔شرعی لحاظ سے اُس کی قسم کا کیا حکم ہے اور کس پر قسم جائز ہے؟۔

(حاجی نور حسین، فیڈرل بی ایریا، کراچی، معرفت: مولانا مقبول الرحمٰن)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں چونکہ آپ کے کاروباری معاہدے کی تحریر اور گواہ موجود ہیں، گواہ اگر عادل ہیں تو اُن کی گواہی مانی جائے گی اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ شرعاً قسم اُس وقت لی جاتی ہے جب کوئی گواہ موجود نہ ہوں اور مُدعیٰ علیہ انکار کرتا ہو، حدیث پاک میں ہے: عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي خُطْبَتِهِ: "اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي وَالْيَمِيْنُ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ"۔

ترجمہ: ''عمرو بن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ (اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو) اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1339)''۔

الغرض مُدَّعیٰ علیہ کے دعوے سے انکار اور مدعی کے پاس گواہ نہ ہونے کی صورت میں مُدعیٰ علیہ کو قسم دینے کی نوبت آتی ہے۔ درپیش صورتِ حال میں آپ کے پاس گواہ موجود ہیں تو گواہی پر ہی فیصلہ ہوگا اور مُدَّعیٰ علیہ کو قسم دینے کی نوبت نہیں آئے گی۔ تاہم جھوٹی گواہی شریعت کی نظر میں کتنا بڑا گناہ ہے، اس پر قرآن وحدیث میں وعیدیں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيلاً أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ○

ترجمہ: ''بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت خریدتے ہیں (یعنی دنیوی مفاد اور مالی منفعت کے عوض جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں)، اُن لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ آخرت میں اللہ ان سے کوئی کلام فرمائے

گا اور نہ ہی قیامت کے دن ان کی طرف نظر کرم فرمائے گا اور نہ اُن کو (گناہوں کے میل سے) پاک فرمائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، (سورۂ آل عمران: 77)"۔
حدیث پاک میں ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جس شخص نے جھوٹی قسم کھا کر مال حاصل کیا، تو وہ (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر غضب فرمائے گا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے طور پر یہ آیت نازل فرمائی: إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (ترجمہ: "بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی (جھوٹی) قسموں کے عوض تھوڑی قیمت خریدتے ہیں (یعنی دنیوی مفاد اور مالی منفعت کے عوض جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں)، اُن لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ آخرت میں اللہ ان سے کوئی کلام فرمائے گا اور نہ ہی قیامت کے دن ان کی طرف نظر کرم فرمائے گا اور نہ اُن کو (گناہوں کے میل سے) پاک فرمائے گا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے) (سورۂ آل عمران: 77)۔ پھر حضرت اشعث بن قیس آئے اور کہا کہ ابو عبدالرحمٰن نے تم سے کیا حدیث بیان کی ہے؟، انہوں نے بتایا: اس اس طرح حدیث بیان کی ہے، تو انہوں نے کہا: کہ انہوں نے سچ بیان کیا، یہ آیت میرے متعلق ہی نازل ہوئی ہے، میرا ایک شخص کے ساتھ ایک کنویں کے معاملے میں نزاع تھا، تو ہم یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لے کر گئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "یا تو تمہارے پاس (اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے) دو گواہ ہوں اور یا وہ شخص (مُدعیٰ علیہ) قسم کھائے"، میں نے عرض کی: وہ تو جھوٹی قسم کھا لے گا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرے، تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر غضب ناک ہوگا"،

تو اللہ تعالیٰ نے (نبی ﷺ کے اس فرمان کی) تصدیق کے طور پر یہ آیت نازل فرمائی، پھر رسول اللہ ﷺ نے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر: 77 تلاوت فرمائی جو اوپر مذکور ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 16-2515)''۔

سودی لین دین کا معاہدہ حرام ہے

سوال: 134

مارکیٹ یونین میں اکثر سود کے متعلق کیس آتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کیس آیا ہے، دکان دار نے کاریگر سے دو لاکھ کا سونا لیا باہمی رضامندی سے سود (منافع) طے کرلیا۔ چند ماہ میں ہی دونوں کے درمیان تنازع ہوگیا کہ میں اب منافع نہیں دے سکتا۔ دکان دار اب تک تیس ہزار روپے منافع یعنی سود میں دے چکا ہے اور دس ہزار باقی ہیں۔ اب معلوم یہ کرنا ہے: جو منافع (سود) کاریگر کھا چکا ہے، وہ رقم واپس ہوگی؟ یا جو رقم (سود) باقی ہے، وہ ختم ہوگی اور کاریگر کی اصل رقم کتنی واپس کی جائے گی؟، (محمد ظہور، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

سودی لین دین کا معاہدہ اصلاً ہی گناہ وحرام تھا اور اس کے لئے سود لینے اور دینے کا معاہدہ کرنے والے دونوں گناہ گار ہیں اور یہ گناہِ کبیرہ ہے، لہٰذا دونوں کو اپنے اپنے گناہ کا صدقِ دل سے اعتراف کر کے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے، جو رقم سودی قرض لینے والے شخص نے بطور سود ادا کی ہے، اسے قرض کی کُل رقم سے وضع کر کے باقی اصل رقم قرض خواہ کو ادا کردی جائے۔ سود کے نام پر جو رقم قرض خواہ نے لی ہے، وہ اس کے لئے حرام ہے۔

ایڈوانس کی رقم پر زیادہ لینا ناجائز ہے

سوال: 135

میں نے کاروبار کے سلسلے میں ایک مکان کا کچھ حصہ گودام اور لیبر کی رہائش کے لئے 1980ء میں کرایہ پر لیا تھا، جس کا کرایہ باقاعدگی سے ادا کرتا رہا۔ مالک مکان کا

انتقال ہوگیا ہے، اُن کی اولاد (وارث) اس مکان کو بیچنا چاہتے ہیں۔ 1980ء سے آج تک کوئی تحریری اقرار نامہ میرے اور مالک مکان کے درمیان نہیں ہوا تھا میں نے زبانی وعدہ کیا تھا کہ حسبِ ضرورت میں یہ مکان خالی کردوں گا اور میں اپنے وعدہ پر قائم ہوں، بطور سیکورٹی ایڈوانس کی رقم =/5100 روپے جمع کرائی تھی، جمع شدہ رقم آج کل کے سونے کی قیمت کے فرق سے واپس لی جائے گی یا وہی جمع شدہ رقم وصول کی جائے گی؟۔

حاجی محمد یونس، بلاک 14، فیڈرل بی ایریا، کراچی

جواب:

مذکورہ صورت شریعت کی اصطلاح میں ''اجارہ'' کہلاتی ہے اور یہ زبانی بھی منعقد ہوجاتا ہے، تحریری دستاویز مفید بھی ہے اور فریقین کے حقوق کے تحفظ کیلئے قانونی ضرورت بھی، لیکن شرعاً لازم نہیں ہے۔ جو رقم آپ نے ایڈوانس جمع کرائی تھی، وہ بطور زرِ ضمانت تھی اور شرعاً متاجر کے لئے اُس کی حیثیت قرض کی تھی، اور جتنی رقم آپ نے جمع کروائی تھی، متاجر پر اُس کی واپسی لازم ہے اور آپ کا اُس سے زائد رقم کا مطالبہ کرنا درست نہیں، چونکہ آپ نے وہ رقم بطور ضمانت جمع کروائی تھی، جس کی حیثیت قرض کی سی ہے، اگر اس رقم پر بڑھا کر وصول کریں گے، تو یہ سود ہوگا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبًو۔

ترجمہ: ''ہر وہ قرض جو (اصل رقم پر زائد) کسی منفعت کا باعث ہو، تو ایسی منفعت سود ہے، (کنز العمال، رقم الحدیث:15516)''۔

البتہ اگر عقدِ اجارہ کے وقت نقد رقم کے بجائے سونا دیدیا کریں تو پھر سونا ہی واپس لینے کا حق ہوگا، اس صورت میں افراطِ زَر یعنی روپے کی قدر میں غیر معمولی کمی کے اثرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ایسے میں کسی بھی ایسی چیز کو معیار بنا سکتے ہیں جس کی قدر عام طور پر قائم رہتی ہو۔

کسی چیز کے بیچنے کے لئے دوسرے کو ایجنٹ بنانا

سوال: 136

زید نے عابد کو اپنا موبائل فون مثلاً 100 روپے میں فروخت کرنے کیلئے دیا، مگر عابد نے 110 روپے میں فروخت کر دیا اور زید کو نہیں بتایا۔ آیا یہ نفع عابد کو رکھنا کیسا ہے؟۔ دوسری صورت میں عابد نے زید کو نفع بتا کر رکھا، لہٰذا اب عابد کے لئے یہ نفع جائز ہے یا نہیں؟۔

تیسری صورت میں زید نے عابد سے کہا کہ مجھے 100 روپے دے دینا، اس سے اوپر جتنا منافع ہو، وہ تمہارا ہے، آیا اس صورت میں عابد کے لئے اُس نفع کا کیا حکم ہے؟۔

حافظ محمد آصف، صدر کراچی

جواب:

پہلی صورت ناجائز ہے کہ زید کے علم میں لائے بغیر زائد رقم اپنے پاس رکھ لینا غبن ہے۔ اس صورت میں دوسری قباحت یہ ہے کہ زید نے عابد پر واضح نہیں کیا کہ اس عمل (موبائل فروخت کرنے) پر عابد کو کتنی اجرت دے گا؟۔

دوسری صورت میں جو نفع حاصل ہوا چونکہ عابد نے زید کو بتا کر رکھا اور زید نے اس پر رضامندی بھی ظاہر کر دی، تو عابد کے لئے یہ منافع جائز ہے۔

تیسری صورت میں اگر چہ منافع مجہول ہے، لیکن اثر ابن عباس کی وجہ سے بطور استحسان جائز ہے، اثر ابن عباس کا بیان آگے آرہا ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ ''اجارۂ فاسدہ'' کے بیان میں لکھتے ہیں: اَلْفَسَادُ قَدْ یَکُوْنُ لِجَهَالَةِ قَدْرِ الْعَمَلِ بِاَنْ لَّا یُعَیَّنَ مَحَلُّ الْعَمَلِ وَقَدْ یَکُوْنُ لِجَهَالَةِ قَدْرِ الْمَنْفَعَةِ بِاَنْ لَّا یُبَیِّنَ الْمُدَّةُ وَقَدْ یَکُوْنُ لِجَهَالَةِ الْبَدَلِ۔

ترجمہ: ''اور کبھی اجارہ کام کی مقدار کے مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے جب یہ معین

نہ کیا گیا ہو کہ کیا کام لیا جائے گا اور کبھی منفعت کی مقدار مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے یعنی مدت بیان نہیں کی گئی ہو اور کبھی بدل یعنی قیمت کے مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے۔(فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص:439)''

اس کے برعکس بہتر صورت یہ ہے کہ عابد زید سے 100 روپے پر وہ موبائل خرید لے، پھر وہ اسے حسب منشا قیمت پر بیچ سکتا ہے یا زید عابد سے یہ کہے کہ یہ موبائل مجھے اتنے میں پڑا ہے، آپ اسے نفع پر بیچ دیں اور منافع کی رقم ہم نصف نصف یا جو بھی تناسب طے ہو اس کے مطابق تقسیم کرلیں گے۔صحیح بخاری میں سمسار (کمیشن ایجنٹ) کے ساتھ عقد کے جواز کی ایک صورت اثر عبداللہ بن عباس کے حوالے سے ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کہے کہ ''یہ کپڑا اتنے میں بیچ دو، اس سے زیادہ جو رقم تمہیں ملے وہ تمہاری ہے۔تابعی ابن سیرین نے کہا کہ: ایک شخص نے (کمیشن ایجنٹ) سے یہ کہا کہ یہ چیز اتنے میں بیچ دو، اس سے زیادہ جو نفع ملے، وہ تمہارا ہے یا ہم دونوں نصف نصف کے حق دار ہوں گے۔(جلد 2، ص:670)''۔تو جہاں یہ عرف رائج ہو تو بطور استحسان یہ جائز ہے۔

قرعہ اندازی پر موٹر سائیکل

سوال: 137

ایک کمپنی کے تیس ممبران ہر ماہ دو دو ہزار روپے جمع کرتے ہیں، پھر قرعہ اندازی کی جاتی ہے، جس کا نمبر نکلتا ہے، اس کو ایک عدد موٹر سائیکل دے دیتے ہیں اور پھر اُس سے مزید کوئی رقم نہیں لی جاتی، ایسا کرنا سود میں تو شمار نہیں ہوتا؟

حافظ عابد حسین مہروی، نیو کراچی

جواب:

آپ کے بیان کیے ہوئے طریقۂ کار میں یہ وضاحت موجود نہیں کہ اگر کوئی شخص درمیان میں چھوڑنا چاہے تو اس کی رقم واپس ملے گی یا ڈوب جائے گی، اگر رقم ڈوب جاتی

ہے تو یہ ''قمار'' (Gambling) ہے اور حرام ہے۔ قمار (جوئے) کے معنی یہی ہیں کہ مال کو اس طرح داؤ پر لگایا جائے کہ یا تو زائد مل جائے گا یا مکمل طور پر مال ڈوب جائے گا۔ قرعہ اندازی میں نام آنے کے بعد اُس ممبر کو موٹر سائیکل تو مل جائے گا، مگر اس سے پوری قیمت وصول نہیں کی جائے گی، کسی کو دو ہزار میں مل جائے گا، کسی کو بالترتیب، چار، چھ، آٹھ اور دس ہزار میں ملے گا، حتیٰ کہ آخر تک یہ صورت چلے گی اور کسی کو ساٹھ ہزار میں ملے گا۔ یہ بھی قمار ہی کی صورت ہے اور قمار حرام ہے۔

اِس میں مزید قباحت یہ ہے کہ موٹر سائیکل کی قیمت مجہول (Unknown) ہے، جس کے سبب یہ بیع فاسد ہے۔ بیع درست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ثمن (قیمت) مجہول نہ ہو اور اس کی مقدار متعیّن اور واضح ہو۔ مذکورہ صورت میں چونکہ ثمن مجہول ہے، اس لئے بیع فاسد ہے۔

سوال نمبر:128 کے جواب کے ضمن میں ''فتاویٰ عالمگیری، جلد:03، ص:03'' کا حوالہ موجود ہے کہ بیع کے صحیح ہونے کے لئے مبیع اور ثمن کا اس طرح واضح طور پر معلوم ہونا ضروری ہے کہ جس کی وجہ سے بعد میں فریقین میں کوئی تنازعہ پیدا نہ ہو۔

وراثت کے مسائل

نوٹ: ہر مفتی وراثت سے متعلق فتویٰ میں یہ لکھتا ہے کہ ''اُمُورٌ مُتَقَدِّمَۃٌ عَلَی الْاِرْث'' کے بعد یعنی ان امور کے نفاذ کے بعد، جو تقسیم وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ترکہ حسبِ ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا۔ بجائے اِس کے کہ ہر فتوے کے شروع میں اس کا اعادہ کیا جائے، ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک ضابطے کے طور پر انہیں یہاں بیان کردیا جائے اور ہر قاری یہ سمجھ لے کہ اس کا اطلاق وراثت کے ہر فتوے پر ہوتا ہے۔

ترکہ کی تعریف:

مرتے وقت میت کی مِلک میں جو مال ہو (خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، منقولہ ہو یا غیر منقولہ)، وہ ''ترکہ'' یا مال متروکہ (پیچھے چھوڑا ہوا مال) یا وِرثہ یا مَورُوث یا وِراثت کہلاتا ہے۔

مُورِث وہ شخص ہے جو مال چھوڑ کر وفات پاتا ہے اور وارث وہ ہے جسے شریعت کی رو سے کسی کے ترکے میں سے حصہ ملے۔

وصیت: کوئی شخص اپنے مرنے سے پہلے یہ کہے کہ میرے ترکے میں سے اتنا حصہ فلاں شخص یا اشخاص کو دینا یا فلاں کارِ خیر میں صَرف کرنا، اسے ''وصیت'' کہتے ہیں۔

مقدارِ وصیت: کوئی شخص اپنے مال متروکہ میں سے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی وصیت کرسکتا ہے۔ اگر ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کی، تو وہ صرف ترکے کے ایک تہائی حد تک ہی نافذ ہوگی، تہائی ترکے سے زیادہ کی وصیت کالعدم ہوجائے گی۔ تہائی سے زائد مقدار کا نفاذ اُس صورت میں ہوسکتا ہے جب تمام بالغ وُرثاء یا کوئی ایک بالغ وارث اپنے حصے سے رضاکارانہ طور پر اِسے پورا کرنے کے لئے تیار ہو، ورنہ نہیں۔ البتہ تہائی ترکے کی حد تک بہرحال نافذ ہوگی۔

وارث کے حق میں وصیت: اگر مرنے والے نے اپنے ورثاء میں سے کسی ایک کے حق میں وصیت کی ہے تو شرعاً وہ نافذ نہیں ہوگی، کیونکہ اس سے شریعت کے مقرر کئے ہوئے وراثت کے حصوں کا تناسب وتوازن (Ratio,Proportionate) بدل جائے گا، جس کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ اور رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ''

یعنی ''وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے، (سنن ابی داؤد:2862)''۔
ہاں اگر تمام ورثاء عاقل بالغ ہوں مورث کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے اسے نافذ کرنے پر راضی ہوں تو صرف اِس صورت میں وہ وصیت وارث کے حق میں نافذ ہوگی۔
ترکہ کی تقسیم کے شرعی اصول: کسی بھی میت کے ترکے کی تقسیم حسب ذیل اصول شرع کے مطابق ہوگی:
(۱) مصارف تجہیز و تکفین: سب سے پہلے میت کے ترکے میں سے اُس کی تجہیز و تکفین کے مصارف وضع کیے جائیں گے۔
(۲) ادائے قرض: اس کے بعد اگر اُس کے ذمّے کسی کا کچھ قرض ہے، تو اس کی ادائیگی ترکے میں سے کی جائے گی۔ امام شافعی کے نزدیک اگر اس کے ذمّے شرعی واجبات بھی ہیں، جیسے زکوٰۃ وغیرہ، تو وہ بھی قرض کے طور پر وضع کیے جائیں گے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک ''دَینِ شرع'' کا نفاذ وصیت پر موقوف ہے۔
(۳) نفاذ وصیت: اس کے بعد اگر اُس نے کوئی وصیت کی ہو تو اُسے شریعت کے ضابطے کے مطابق نافذ کیا جائے گا، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

مخلوط مال کی صورت میں ترکے کی تقسیم

سوال:138

میرے والد کا انتقال 1980 اور والدہ کا 1984 میں ہوا۔ ورثاء میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں، سب کم عمر تھے، پرورش، تربیت اور شادیاں چچا تایا اور پھوپھیوں نے کی۔ والد کی ایک دکان تھی، جس کی مالیت پانچ لاکھ روپے تھی، والد کے انتقال کے بعد اُسے کرائے پر دے دیا، ماہانہ =/3800 روپے 1986 تا 1992 کرایہ آتا رہا، اس کرائے کی رقم سے سوا دو لاکھ روپے کا پگڑی پر فلیٹ لے لیا۔ 1993 میں مزمل اور منصور دونوں بھائیوں نے دکان کی ذمہ داری سنبھالی، کرائے کی رقم سے سوا دو لاکھ کا مکان پگڑی پر

خریدا اور 70 ہزار کا مال دکان میں ڈالا۔اسی دوران مزمل اور منصور نے ایک جائیداد اور بنالی اور پگڑی پر دکان خریدی۔پانچ سال قبل سب سے چھوٹے بھائی مدثر کی شادی پر 13 لاکھ روپے کا ایک مکان خریدا،جس کی مالیت آج 22 لاکھ روپے ہے۔جس وقت مزمل اور منصور نے دکان سنبھالی ایک لاکھ ستر ہزار روپے مدثر نے انشورنس کے لئے تھے،تینوں بہنوں کو بھی انشورنس کی رقم ادا کردی گئی ہے،مگر مزمل اور منصور نے ایک لاکھ دس ہزار روپے اپنی دکان میں لگا دیئے،جس کا ابھی تک حساب نہیں ہوا،ان دونوں نے پیسے نہیں لئے۔ چھوٹے بیٹے مدثر نے دکان پر کوئی مالی اور محنت طلب کام نہیں کیا۔کیا اس کا حصہ دوسری دکان اور مکان میں بنتا ہے؟۔اب اس جائیداد میں 3 بہنوں اور 3 بھائیوں کا کیا حصہ بنتا ہے؟،(مزمل،کراچی)۔

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں،اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا: ترکے کے 9 حصے کئے جائیں گے،ان میں سے ہر بیٹے کو فی کس دو دو حصے (کل چھ حصے) اور ہر بیٹی کو فی کس ایک ایک حصہ (کل تین حصے) ملے گا۔چونکہ ترکہ والد کے انتقال کے فوراً بعد تقسیم نہیں ہوا،اس لئے دوکان سے حاصل ہونے والی آمدنی ترکے میں شامل ہوگی اور اگر اس سے مزید کوئی چیز خریدی ہے،تو اسے بھی ترکے میں شامل کیا جائے گا۔جن بھائیوں اور بہنوں نے انشورنس کی رقم ترکے میں سے لی ہے،وہ قرض ہے،اس کو مجموعی ترکے میں شامل کرکے ترکے کی تقسیم کے وقت ان کے حصے میں سے وضع کرلیا جائے،اسی طرح جن بھائیوں نے ترکے کے مال میں سے رقم لے کر اپنے کاروبار میں لگائی ہے،اس کا بھی یہی حکم ہے۔واضح رہے کہ ترکے کی تقسیم کے وقت ہر چیز کی تقسیم کا حکم الگ الگ نہیں بیان کیا جاتا،ترکے (مثلاً مکان،دوکان،پلاٹ،زیورات، بینک اکاؤنٹ،ڈیپازٹ سرٹیفکیٹس وغیرہ) میں سے ہر چیز کو فروخت کرکے یا اس کی موجودہ قیمت لگا کر مجموعی مالیت نکالی جاتی ہے اور پھر اس سب مال کی شریعت کے مطابق

تقسیم ہوتی ہے۔ترکے کی آمدنی میں سے اگر کسی وارث نے کوئی دوکان خریدی ہے،تو یہ طے کرنا ورثاء کا کام ہے کہ آیا وہ رقم اُس نے بطور قرض لے کر اپنے ذاتی کاروبار کے لئے دوکان خریدی تھی اور ذاتی کاروبار کررہا تھا؟ اگر جواب ہاں میں ہے،تو یہ رقم قرض ہے اور اسے کل ترکے میں جمع کر کے ترکے کی تقسیم کے وقت اس کے حصے میں سے وضع کی جاتی ہے،دوکان کا نفع ونقصان اسی کا ہوگا۔اگر دوکان اس نے مشترکہ جائیداد کے طور پر لی تھی،تو اس کا نفع ونقصان مشترکہ ہے،البتہ جو عامل بھی (Working Partner) ہے،وہ اپنی محنت کی اجرت لے سکتا ہے۔یہ فیصلہ کرنا تمام وارثوں کا کام ہے یا اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان کی برادری میں عرف کیا ہے،یا کمیونٹی کے بزرگوں کی ایک ثالثی کمیٹی بنا کر اس سے فیصلہ کرالیں اور اسے سب قبول کریں اور فیصلہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے منصفانہ فیصلہ کریں۔

زندگی میں وراثت تقسیم نہیں ہوتی

سوال:139

ھند کے والد نے تین شادیاں کی،ھند کی والدہ سے ھند سمیت چار لڑکیاں پیدا ہوئیں،ھند کی پہلی سوتیلی والدہ سے ایک بہن اور دوسری سوتیلی والدہ سے ایک بھائی اور ایک بہن ہیں۔ھند کی کوئی اولاد نہیں ہے اور شوہر کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔معلوم یہ کرنا ہے کہ ھند کے مرنے کے بعد یا اُس کی حیات میں تین سگی بہنوں،دو سوتیلی بہنوں اور ایک سوتیلے بھائی کا کیا حصہ بنتا ہے؟،(محمد قمر علی،عبداللہ ہارون روڈ،صدر،کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں ھند اپنی جائیداد کی مالک ومختار ہیں،وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرُّف کرسکتی ہیں۔اپنی زندگی میں وہ اگر چاہیں تو اپنی جائیداد کا کچھ حصہ یا کل جائیداد کسی ایک فرد یا افراد کو ھبہ کرسکتی ہیں،اپنی کل جائیداد کے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی حصہ تک کسی فرد یا افراد یا اداروں کے نام وصیت کرسکتی ہیں،البتہ وارث کے حق میں وصیت

شرعاً مؤثر نہیں ہوتی ۔ھند کی وفات کے وقت جو شرعی وارث موجود ہوں گے، وہ اسلامی احکامِ وراثت کے مطابق ترکے میں سے اپنا حصہ پانے کے حق دار ہوں گے۔ ہمیں غیب کا علم نہیں ہے کہ کس کی موت پہلے واقع ہوگی اور کس کی بعد میں، کون وارث بنے گا اور کون مورث (جس کی وراثت دوسروں کو ملے گی)۔

حج فارم میں نامزد شخص کی حیثیت

سوال:140

زید، بکر کے پاس ملازم ہے۔بکر جب حج کے لئے گیا تو حج کے فارم میں بکر نے زید کو جائیداد کا وارث مقرر کیا جبکہ بکر کے بیٹے بھی ہیں۔بکر کا حج کے دوران انتقال ہوگیا، کیا زید بکر کی وراثت کا حق دار ہے یا نہیں؟۔جبکہ بکر کا Death Certificate بھی زید کے نام آیا ہے، (محمد قمر علی، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی)۔

جواب:

حج کے فارم میں کسی شخص کو نامزد کرنے کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاجی کی وفات کی صورت میں اُس سے رابطہ قائم کیا جائے یا اسے اطلاع دی جائے اور اس کے کچھ بقایا جات یا انشورنس کی رقم کا چیک اس کے نام پر بنایا جائے ،ایسی صورت میں اس شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس رقم کو امانت سمجھے اور اس کے وارثوں تک پہنچادے اور اگر وزارتِ حج والوں کے نزدیک یہ نامزدگی اس لئے ہے کہ متوفّی حاجی کے تمام بقایا جات کا وہ حق دار ہے تو اس کی نامزدگی کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وصیت کی ہوگی اور یہ رقم اگر متوفی کے کل ترکے کا ایک تہائی حصہ یا اس سے کم ہے تو یہ اسے مل جائے گی بشرطیکہ وہ شخص وفات یافتہ حاجی کا شرعی وارث نہ ہو، اور اگر ایک تہائی ترکہ سے زیادہ ہے تو جتنی رقم زیادہ ہے اس کے حق دار وارث ہوں گے۔بہتر یہ ہے کہ وزارتِ حج اس امر کی وضاحت کردے کہ اس نامزد کردہ شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ یہ رقم وہ اصل وارثوں تک پہنچادے تا کہ کوئی نزاع پیدا نہ ہو۔

مقروض پر لازم ہے کہ قرض خواہ کے وارثوں کو قرض ادا کرے

سوال:141

زید بکر کے پاس نوکری کرتا ہے۔زید بکر سے کچھ رقم ادھار لیتا تھا اور کہتا تھا کہ میری تنخواہ سے کاٹ لینا،مگر بکر تنخواہ میں سے کچھ رقم نہیں لیتا تھا،زید رقم دیتا تھا مگر بکر کہتا تھا کہ رہنے دو،اس طرح کئی مرتبہ ہوا اب بکر کا انتقال ہو گیا ہے۔کیا زید نے جو رقم ادھار لی تھی،وہ رقم بکر کے ورثاء کو دینے کا پابند ہے یا نہیں جبکہ زید نے بکر کی زندگی میں کئی مرتبہ رقم دینے کی کوشش کی تھی،مگر بکر نے نہیں لی اور اب بھی زید ساری رقم بکر کے وارثوں کو دینے کو تیار ہے۔

محمد قمر علی،عبداللہ ہارون روڈ،صدر،کراچی

جواب:142

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے،اُس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ بکر نے زید کا قرض معاف کر دیا تھا،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُسے مہلت دے رہے تھے، شریعت کے احکام کا اطلاق ظاہر پر ہوتا ہے،ہم کسی کی نیت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔لہٰذا زید کو چاہئے کہ اُس کے ذمے بکر کا جو بھی قرض تھا،وہ اُس کے وارثوں کو ادا کر دے۔مقروض کو مہلت دینا ایک پسندیدہ امر ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَإِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلٰى مَيْسَرَةٍ۔

ترجمہ:''اور اگر (مقروض) تنگ دست ہے تو اسے اس کی فراخ دستی تک مہلت دو،(البقرة:280)''۔

احادیثِ مبارکہ میں اپنے مقروض کو مہلت دینے والے قرض خواہ کے لئے بہت بڑا اجر بیان کیا گیا ہے،اِس سلسلے میں چند احادیثِ مبارکہ پیشِ خدمت ہیں:

(1)عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جس

شخص نے تنگ دست (مقروض) پر آسانی کی، اللہ تعالیٰ اُس پر دنیا اور آخرت میں آسانی فرمائے گا، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:2417)''۔

(2) عَنْ بُرَيْدَةَ الْأَسْلَمِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا كَانَ لَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ، وَمَنْ أَنْظَرَهُ بَعْدَ حِلِّهِ كَانَ لَهُ مِثْلُهُ، فِي كُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ۔

ترجمہ: ''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے تنگ دست (مقروض) کو قرض کی ادائیگی میں مہلت دی، تو اُس کو ہر دن اُس قرض کی رقم کے برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا، اور جس نے قرض کی ادائیگی کا وقت پورا ہونے کے بعد مقروض کو مہلت دی تو اُس قرض خواہ کو ہر روز قرض کی کل رقم کے برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا''۔

(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:2418، مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث:22970)

(3) امام احمد بن حنبل نے اپنی سند کے ساتھ یہی حدیث حضرت سلیمان بن بریدہ سے روایت کی ہے، اُس میں اِن الفاظ کا اضافہ ہے:

فَإِذَا حَلَّ الدَّيْنُ فَأَنْظَرَهُ فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلَيْهِ صَدَقَةٌ۔

ترجمہ: ''جب قرض کی ادائیگی کا مُقررہ وقت آجائے اور پھر بھی قرض خواہ مقروض کو مہلت دے تو اُسے ہر دن اُس قرض کی رقم کی دُگنی مقدار کے برابر صدقہ کرنے کا اجر ملے گا، (مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث:23046)''۔

(4) عَنْ أَبِي الْيَسَرِ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا أَوْ وَضَعَ عَنْهُ، أَظَلَّهُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ، قَالَ: قَالَ مُعَاوِيَةُ: يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے تنگ دست کو مہلت دی یا اُس کو معاف کردیا، اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے سایۂ (رحمت) میں رکھے گا، فرماتے ہیں کہ معاویہ نے کہا کہ: جس دن اللہ کے سایۂ (رحمت) کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا، (مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث:15521)''۔

مقروض کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ خِیَارَکُم اَحسَنُکُم قَضَآءً۔
ترجمہ: ''تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرض ادا کرنے میں اچھا ہو''۔
(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 2305)

ان احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں بکر کے تمام یا بعض ورثا اُس کے ایصالِ ثواب کے لئے زید کا قرض معاف کرنا چاہیں تو انہیں بھی اجر ملے گا اور بکر کو بھی اِس کا ثواب پہنچے گا، لیکن یہ قرض اُن ہی ورثا کے حصے میں سے منہا ہو گا جو رضا کارانہ طور پر معاف کرنا چاہیں۔

تقسیمِ ترکہ

سوال: 143

میرے ماموں عباس میاں کا 6 سال پہلے 2002ء میں انتقال ہوا، وہ غیر شادی شدہ تھے۔ اُن کے تین بھائی (ممتاز میاں، الیاس میاں، محمد میاں) اور ایک بہن (میری والدہ ذکیہ خانم) ہیں، محمد میاں اور اُن کی اہلیہ (رحمت جان) کا انتقال 2003ء میں ہوا، اُن کی بھی کوئی اولاد نہیں، بیوی کا صرف ایک بھائی (ضیاء) ہے، باقی کوئی وارث نہیں۔ ترکے میں ایک مکان راولپنڈی میں ہے۔ اب اُس کی تقسیم کی جارہی ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ تقسیم کس طرح ہوگی؟۔ ورثاء میں دو بھائی اور ایک بہن حیات ہیں۔

شاہد احمد انصاری، L-122 بلاک 13/G، گلشن اقبال، کراچی

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسبِ ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ ترکہ 70 حصوں میں تقسیم ہوگا، جس میں متوفی کے بھائی ممتاز میاں کو 26 حصے، الیاس میاں کو 26 حصے، بہن ذکیہ خانم کو 13 حصے اور محمد میاں کی بیوہ رحمت جان کو 5 حصے ملیں گے، جبکہ محمد میاں کی بیوہ رحمت جان کا کُل ترکہ اُس کے بھائی ضیاء کو ملے گا، بشرطیکہ اس کا کوئی اور وارث نہ ہو، جیسا کہ سائل نے بیان کیا ہے، واللہ اعلم بالصواب

عقدِ ثانی کی صورت میں بیوہ کا حصہ متاثر نہیں ہوتا

سوال: 144

میری شادی کے ڈیڑھ سال بعد میرے شوہر کا انتقال ہوگیا، اُن کی پہلی بیوی (جسے وہ طلاق دے چکے تھے) سے 2 بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور مجھ سے بھی ایک بیٹا ہے۔ میرے شوہر کی 11 لاکھ مالیت کی ذاتی دکان تھی، جسے شادی کے بعد فروخت کر کے رقم والد کے کاروبار میں لگادی، سہراب گوٹھ پر ایک کارخانہ تھا، جس کی مالیت اِس وقت تقریباً 20 لاکھ روپے ہے۔ میرے شوہر اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں شراکت دار تھے اور تمام کاروبار میرے سُسر کے نام ہے۔ مکان کا اوپر والا حصہ میرے شوہر نے بنوایا، مگر پورا مکان سسر کے نام ہے۔ اب میرے سُسرال والے کہتے ہیں کہ تمہارا صرف مہر بنتا ہے، تمہارا حصہ تب بنتا جب تمہارے شوہر کی الگ جائیداد ہوتی، جبکہ میرے شوہر اور اُن کے بھائی سُسر کے کاروبار میں شراکت دار تھے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ: میرا اور میرے بیٹے کا میرے شوہر کی جائیداد میں کتنا حصہ ہے؟۔ میرے بیٹے کا خرچہ اُس کے جوان ہونے تک کس کے ذمے ہے؟ مہر اور حصہ طلب کرنے کے بعد میں سُسر کے گھر رہ سکتی ہوں، یا فوراً مکان خالی کرنا ہوگا؟، اگر میں ساری زندگی سسرال میں گزارنا چاہوں تو گزار سکتی ہوں یا نہیں؟، اگر میں دوسرا نکاح کرلوں تو میرا حصہ ختم تو نہیں ہوگا؟۔

بیوہ شرف الدین، فیڈرل بی ایریا، کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل آپ کے شوہر اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں جس قدر حصے کے شریک تھے، وہ حصہ مرحوم کا ترکہ قرار دیا جائے گا اور حسبِ تناسب ورثاء کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔ وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسب ذیل شرع سے تقسیم ہوگا۔ کل ترکے کے 168 حصے ہوں گے، متوفی کے والد کو 28 حصے، والدہ کو 28 حصے، بیوہ کو 21 حصے، تین بیٹوں کو 78 حصے (فی

کس 26 حصے)اورایک بیٹی کو 13 حصے ملیں گے۔

بچوں کے اخراجات اُن کے بالغ ہونے تک ان کے حصوں سے اُس مال سے پورے کئے جائیں گے، جو اُن کے والد نے بطورترکہ چھوڑا ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَاِنْ کَانَ الْأَبُ قَدْمَاتَ وَتَرَکَ اَمْوَالاً وَّتَرَکَ أَوْلاَدًا صِغَارًا کَانَتْ نَفَقَةُ الْأَوْلاَدِ مِنْ أَنْصِبَائِهِمْ وَکَذَا کُلُّ مَنْ یَّکُوْنُ وَارِثًا فَنَفَقَتُهٗ فِیْ نَصِیْبِهٖ۔

ترجمہ:'' باپ کا انتقال ہوگیا اور اُس نے مال چھوڑا ہے اور نابالغ بچے بھی ورثاء میں چھوڑے ہیں تو بچوں کا نفقہ اُن کے حصوں میں سے دیا جائے گا، یونہی ہر وارث کا نفقہ اُس کے حصہ میں سے دیا جائے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 564، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

اگر آپ کے سُسر آپ کا حصہ دینے کے بعد بھی آپ کو اپنے گھر میں اپنے پوتے کی ماں ہونے کی حیثیت سے رہنے کی اجازت دے دیں تو آپ وہاں رہ سکتی ہیں۔ بیوہ عورت کے عقدِ (نکاح) ثانی کرنے کی صورت میں سابق شوہر کے ترکے میں حقِ وراثت متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ بدستور قائم رہتا ہے جب تک کہ اُسے ادا نہ کردیا جائے، اگر خدانخواستہ اپنے مرحوم شوہر کے ترکے سے حصہ پائے بغیر کسی بیوہ کا انتقال ہوجائے تو یہ حقِ وراثت عورت کے ورثاء کو منتقل ہوجائے گا اور وہ اس کے جائز دعویدار ہوں گے۔ دوسرا نکاح کرنے کی صورت میں بھی متوفیٰ شوہر کے ترکے سے آپ کو حصہ ملے گا۔

زندگی میں کسی کو حصہ دے کر وراثت سے دستبردار کرنا

سوال: 145

زید کا انتقال ہوا، ورثاء میں (دو زوجہ سے) چھ بیٹے (الف، ب، ج، د، ہ اور و) اور آٹھ بیٹیاں (ز، ح، ط، ی، ک، ل، م اور ن) ہیں۔ ازواج کا انتقال ہو چکا ہے، زید نے اپنی وراثت میں بتیس لاکھ روپے چھوڑے ہیں۔ زید نے اپنی زندگی میں اپنے ایک بیٹے (الف) کو دیگر تین بیٹوں (ب، ج اور د) کی موجودگی میں ایک دوکان دی تھی اور کہا تھا کہ اس کو اب میری وراثت سے کچھ نہیں ملے گا۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بقیہ وارثوں

نے ترکہ کے مکان کو اپنے نام کروالیا، جس پر ایک لاکھ پینسٹھ ہزار روپے خرچ آئے جو کہ ترکہ کی رقم سے ہی کیے گئے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ:

(۱) کیا واقعی الف کو والد کے ترکے سے کچھ نہیں ملے گا یا اُس کا بھی حصہ ہوگا؟۔

(۲) الف کے علاوہ بقیہ وارثوں نے ترکہ کے مکان کو اپنے نام کرانے میں جو اخراجات کیے، اس کا کیا حکم ہے؟۔

(۳) ورثاء کے درمیان ترکے کی تقسیم کس تناسب سے ہوگی؟، اور یہ بھی ارشاد فرمائیں باقی ورثاء زید کی بات پر عمل کرتے ہوئے الف کو اگر کچھ نہ دینا چاہیں اور تمام ترکہ آپس میں تقسیم کرلیں تو ان پر کیا حکمِ شرعی لاگو ہوگا؟، نیز اس صورت میں زید کا ترکہ الف کے بغیر ہی تقسیم کرلیا گیا تو کوئی بھائی یا بہن یہ سمجھے کہ الف کو بھی حصہ ملنا چاہئے تھا مگر نہیں دیا گیا تو وہ اپنے حصے میں آنے والی زائد رقم کی کتنی مقدار الف کو دیدے تاکہ اس پر کوئی وبالِ شرعی نہ آئے؟، (ڈاکٹر عامر صدیقی، ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں جو مسئلہ سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص اپنی زندگی میں کسی ایک ممکنہ وارث کو اپنے مال میں سے کچھ دے کر یک طرفہ طور پر یہ فیصلہ کردیتا ہے کہ اُس شخص کی وفات کے بعد اس وارث کو اس کے ترکے میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، کیونکہ کسی کو علم نہیں کہ کون وارث بنے گا اور کون مُورِث، کس کا انتقال پہلے ہوگا اور کس کا بعد میں۔ وارث بننا اختیاری امر نہیں ہے بلکہ شریعت کے تحت ایک جبری امر ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، اس میں کافی اضطراب ہے، اقوالِ فقہاء دونوں طرف ہیں، جواز کا قول بھی مل جاتا ہے اور عدمِ جواز کا بھی۔ الاشباہ والنظائر میں ایک قول اس کے جواز اور مؤثر ہونے کا ہے، اسے علامہ جلال الدین امجدی نے اپنے فتاویٰ ''فیض الرسول'' میں اختیار کیا ہے اور اسے اعلیٰحضرت کا بھی مختار قرار دیا ہے، چنانچہ اُن کا جواب مع سوال درجِ ذیل ہے:

مسئلہ:"باپ نے اپنی زندگی میں اپنے ایک بیٹے کو کچھ جائیداد دے کر الگ کر دیا اور بیٹے نے یہ منظور کرلیا کہ باپ کے انتقال پر اب ہم کو اس کے ترکے میں کچھ حق نہ رہے گا، تو اس صورت میں باپ کے فوت ہونے پر اس کی جائیداد میں اس کے بیٹے کا حق ہے یا نہیں؟۔

جواب:"صورتِ مسئولہ میں باپ کے انتقال کے بعد اس کا ترکے میں کچھ حق نہیں، اعلیحضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان تحریر فرماتے ہیں: بزرگ موصوف نے اپنی حیات میں صاحبزادی صاحبہ کو کچھ عطا فرما کر میراث سے علیحدہ کر دیا اور وہ بھی راضی ہوگئیں کہ میں نے اپنا حصہ پالیا اور بعد انتقال مورث کے ترکہ میں میرا حق نہیں، اشباہ میں طبقات علامہ شیخ عبدالقادر سے اس صورت کا جواز نقل کیا اور اسے علامہ ابوالعباس ناطفی پھر جرجانی صاحب خزانہ، پھر شیخ عبدالقادر، پھر فاضل زین الدین صاحب اشباہ، پھر علامہ سید احمد حموی نے مقرر و مسلم رکھا اور فقیہ ابوجعفر محمد بن یمانی نے اس پر فتویٰ دیا اور ایسا ہی فقیہ محدث ابوعمر وطبری اور اصحاب احمد بن ابی الحارث نے روایت کیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد یازدہم، ص:95)، (فتاویٰ فیض الرسول، حصہ سوم، ص:492)"۔

علامہ زین الدین بن ابراہیم بن نجیم کی جس عبارت کا حوالہ مفتی جلال الدین امجدی نے دیا ہے، وہ یہ ہے:

قَالَ الشَّيْخُ عَبْدُالْقَادِرِ فِی الطَّبَقَاتِ فِیْ بَابِ الْهَمْزِ فِیْ أَحْمَدَ :قَالَ الْجُرْجَانِیُّ فِی الْخزانَةِ قَالَ الْعَبَّاسُ النَّاطِفِیُّ :رَأَيْتُ بِخَطِّ بَعْضِ مَشَايِخِنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ ـفِیْ رَجُلٍ جَعَلَ لِأَحَدِ بَنِيهِ دَارًا بِنَصِيبِهِ عَلَى أَنْ لَّايَكُوْنَ لَهٗ بَعْدَ مَوْتِ الْأَبِ مِيرَاثٌ،جَازَ وَأَفْتَى بِهِ الْفَقِيهُ أَبُوْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بْنُ الْيَمَانِیُّ أَحَدُ أَصْحَابِ مُحَمَّدِ بْنِ شُجَاعٍ الْبَلْخِیِّ ،وَحَكَیٰ ذَالِكَ أَصْحَابُ أَحْمَدَ بْنِ أَبِی الْحَارِثِ وَأَبُوْ عَمْرٍو الطَّبَرِیُّ ـ

ترجمہ:"شیخ عبدالقادر نے طبقات کے باب الھمز فی احمد میں فرمایا، جرجانی نے خزانہ میں کہا کہ ابوالعباس ناطفی نے فرمایا: میں نے اپنے بعض مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ کی وہ تحریر دیکھی جو اس شخص کے بارے میں جس نے اپنے بیٹوں میں سے ایک کو اس کے حصے کا مکان اس

شرط پر دیا کہ باپ کی موت کے بعد اس کے لئے ترکے سے حصہ نہیں ہوگا، تو یہ جائز ہے،
اسی پر فقیہ ابو جعفر محمد بن الیمانی نے فتویٰ دیا جو کہ محمد بن شجاع بلخی کے تلامذہ میں سے ہیں۔
احمد بن ابو حارث اور ابو عمر وطبری کے شاگردوں نے اس کو نقل کیا ہے"۔
(الاشباہ والنظائر، ص:294، قدیمی کتب خانہ، کراچی)

لیکن امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے طویل بحث سے قبل اپنا مختار موقف بیان کیا
ہے، وہ یہ ہے:

وارث سے اس کے حصہ میراث کے بابت جو صلح حیاتِ مورث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والے شخص کی زندگی) میں کی جائے تحقیق یہ ہے کہ باطل و بے اثر ہے اس سے وارث کا حقِ ارث اصلاً زائل نہیں ہوتا، ہاں! اگر بعد موتِ مُورِث اس صلح پر رضامند رہے تو اب صحیح ہو جائے گی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 26، ص:232، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

پس اس صورت حال میں اگر مُورِث کا بیٹا "الف" اس پر رضامند ہے کہ اسے باپ نے جو دیا تھا، وہ اس پر قانع ہے، وہ موجودہ ممکنہ حصۂ ترکہ سے کم ہو یا زیادہ، اور تمام ورثاء بھی اس پر متفق ہوں تو اسے چھوڑ کر باقی ورثاء میں ترکہ تقسیم کر دیا جائے ورنہ اس کے حصے کو مجموعی ترکہ میں شامل کر کے تقسیم کی جائے۔ پہلی صورت میں جبکہ "الف" اور دوسرے ورثاء اس پر راضی اور متفق ہیں کہ جو حصہ باپ نے اپنی زندگی میں "الف" کو دیا تھا وہ اسی کے پاس رہے اور بقیہ ترکے میں وہ اپنے حصے کے مطالبے سے دستبردار ہو جائے، تو ترکے کی تقسیم حسب ذیل ہوگی:

کل ترکہ 18 حصوں میں منقسم ہوگا، "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" (ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11) کے تحت 5 بیٹوں کو 10 حصے (فی کس 2 حصے) اور 8 بیٹیوں کو 8 حصے (ہر ایک کو ایک حصہ) ملیں گے۔

دوسری صورت میں جبکہ "الف" اور دیگر ورثاء پہلی صورت پر مطمئن اور متفق نہ ہوں تو "الف" کو جو کچھ دیا جا چکا ہے، اسے مجموعی ترکے میں شامل کر لیا جائے گا اور "الف" بھی دیگر

ورثاء کے ساتھ تقسیمِ ترکہ میں شامل ہوکر اپنا حصہ پائے گا، تو ترکے کی تقسیم حسبِ ذیل ہوگی:
کل ترکہ 20 حصوں میں منقسم ہوگا، "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" (ایک لڑکے کے لئے دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11) کے تحت 6 بیٹوں کو 12 حصے (فی کس دو، دو حصے) اور 8 بیٹیوں کو 8 حصے (فی کس ایک، ایک حصہ) ملیں گے۔
مکان نام کروانے میں جو اخراجات ہوئے چونکہ وہ تقسیم سے قبل ترکے ہی کی رقم سے کئے گئے لہٰذا جب ترکہ تقسیم ہوگا تو از خود ہی وہ اخراجات تمام ورثاء کے حصص سے منہا ہو جائیں گے۔

ترکہ کسے ملے گا؟

سوال: 146

ایک شخص کا انتقال ہوا، ورثاء میں ایک بیوہ، متوفی کی ایک خالہ، ایک پھوپھی، ایک چچازاد بھائی، چار ماں شریک بھائی اور دو ماں شریک بہنیں موجود ہیں۔ ترکہ کی تقسیم کس طرح ہوگی اور مذکورہ ورثاء میں سے کون کون حق دار ہوگا؟۔
(پروفیسر رضی الدین، A-3 گلبرگ بلاک 16، کراچی)

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسبِ ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ متوفی کا ترکہ 36 حصوں میں منقسم ہوگا، کُل ترکے کا چوتھائی یعنی 9 حصے بیوہ کو ملیں گے۔ اخیافی (ماں شریک) بھائی بہن ثلث کے حق دار ہیں، سراجی میں ہے: اَمَّا لِأَوْلَادِ الْأُمِّ فَأَحْوَالٌ ثَلٰثٌ: اَلسُّدُسُ لِلْوَاحِدِ وَالثُّلُثُ لِلْاِثْنَيْنِ فَصَاعِدًا ذُكُوْرُهُمْ وَاِنَاثُهُمْ فِي الْقِسْمَةِ وَالْاِسْتِحْقَاقِ سَوَاءٌ۔
ترجمہ: "اخیافی (ماں شریک) بھائی بہن کی تین حالتیں ہیں، ایک اخیافی بہن یا اخیافی بھائی کو ترکہ کا چھٹا حصہ ملتا ہے، دو یا دو سے زائد اخیافی بھائی بہن کو ترکہ کا تہائی حصہ ملتا ہے۔ اخیافی بھائی بہن تقسیم فرائض میں اور فرائض کا حق دار ہونے میں برابر ہیں (یعنی دونوں کو

مساوی حصہ ملے گا)،(سراجی، ص:13)''۔اس اصول کے تحت 4اخیافی بھائی اور 2اخیافی بہنوں کومساوی طور پر 12 حصے (ہر ایک کو 2 حصے)ملیں گے ،بقیہ 15 حصے بطور عصبہ چچازاد بھائی کوملیں گے۔خالہ اور پھوپھی محروم رہیں گی۔

تقسیمِ ترکہ

سوال:147

میرا مکان جس میں ،میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہوں ،میرے سسر (بکر) نے بنوایا تھا اور اُن ہی کے نام تھا۔اُن کا انتقال 1972ء میں ہوا ورثاء میں اُن کی بیوہ (ہند)،ایک بیٹی (زینب)اورایک بیٹا (زید میرے شوہر) چھوڑے ۔1999ء میں بیٹی (زینب) کا اور پانچویں روز بیوہ (ہند) کا بھی انتقال ہوگیا،اب صرف میرے شوہر (زید) موجود ہیں ۔اس مکان میں تعمیراتی مَد میں میں نے اور میرے شوہر نے ضرورت کے تحت وقتاً فوقتاً ڈیڑھ لاکھ روپے کے لگ بھگ لگایا۔اب صورتِ حال یہ ہے کہ میری مرحومہ نند(زینب) کے بچے اس مکان میں حصہ مانگ رہے ہیں ،میری نند کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔تینوں شادی شدہ اوراپنے ذاتی مکان کے مالک ہیں۔مکان اب تک میرے سسر مرحوم(بکر) کے نام ہے۔ازروئے شریعت اس میں میری نند (زینب) کے بچوں کا حصہ ہے،اگر ہےتو کتنااور کیسے تقسیم کیا جانا چاہئے؟،(عذرا سلطانہ،فیڈرل بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

وہ امور جوترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں،اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا:متوفی (بکر) کا ترکہ مجموعی طور پر 576 حصوں میں تقسیم ہوگا ،زید کو 436 حصے ملیں گے جبکہ زینب کے ایک بیٹے عمرو کو 70 حصے اور دو بیٹیوں کو 70 حصے (فی کس 35 حصے)ملیں گے۔

چونکہ متوفیہ(بیٹی زینب) کے انتقال کے وقت اُس کی والدہ (ہند) حیات تھیں ،لہٰذا متوفیہ(زینب) کے ترکے سے چھٹا حصہ والدہ (ہند) کو ملے گا ۔چونکہ پانچ روز بعد

والدہ (ہند) کا بھی انتقال ہوگیا ہے، تو اُن کا حصہ اُن کے بیٹے (زید) کو ملے گا۔

آپ نے اور آپ کے شوہر نے جو ایک لاکھ روپے مکان پر وقتاً فوقتاً صرف کیے، تو اس مکان میں تقریباً 75 فیصد کے خود آپ کے شوہر مالک ہیں، لہٰذا اس رقم کا 75 فیصد حصہ تو آپ نے اپنی مملوکہ مکان پر صرف، اگر اتنا عرصہ آپ اس مکان میں اکیلے رہے ہیں، تو آپ نے دوسروں کا حصہ بھی استعمال کیا اور اس عرصے میں اُن کو ان کا حصہ بھی نہیں دیا، تو بقیہ 25 فیصد رقم کو ان کے کرائے کے عوض بھی آپ سمجھ لیں۔

پینشن ترکہ نہیں

سوال: 148

میرے شوہر کا انتقال 20 جولائی 2009ء کو ہوا، میں اپنے شوہر کی دوسری بیوی ہوں، پہلی بیوی نے خلع لے لیا تھا اور اُس سے ان کے تین بچے، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں، جو پہلی بیوی ساتھ لے گئی تھی اور بچوں کا باپ سے کوئی تعلق نہیں تھا، مجھ سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ میرے شوہر کی گورنمنٹ جاب تھی اور ایک پلاٹ، ایک فلیٹ اور کچھ فنڈ چھوڑا ہے، پینشن بھی ملتی ہے۔ میرے شوہر نے انتقال سے پہلے میری اور اپنی جانب سے حج کے لئے درخواست دی تھی اور حج قرعہ اندازی میں دونوں کا نام بھی آ گیا تھا، لیکن ان کے انتقال کے سبب ہم حج پر نہیں جا سکے، دونوں کی جانب سے جمع شدہ حج کی رقم واپس مل گئی ہے لیکن میری نند نے تمام رقم اپنے پاس رکھ لی ہے اور مجھے نہیں دے رہی۔ اس تمام صورتِ حال میں تقسیم کس طرح ہوگی؟۔ بیوہ محسن اختر، کراچی

جواب:

اگر آپ کی بیان کردہ صورتِ حال درست ہے، تو متوفی کے ترکہ سے آپ کو آٹھواں حصہ ملے گا اور بقیہ ترکہ متوفی کے (سابقہ بیوی سے موجود) ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کے درمیان تقسیم ہوگا، اُن کا اپنے والد سے لاتعلق رہنا وارث بننے سے مانع نہیں ہے، والد کے ترکے سے وہ اپنا حصہ پائیں گے، ہاں! سابقہ (خلع یافتہ) بیوی کو ترکے سے کچھ نہیں

ملے گا۔متوفی کا ترکہ 32 حصوں میں تقسیم ہوگا اور بیوہ کو 4 حصے (آٹھواں حصہ) اور بقیہ ترکہ ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ''(ترجمہ:ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11) کے تحت ایک بیٹے کو 14 حصے اور دونوں بیٹیوں کو 14 حصے (ہر ایک کو 7 حصے) ملیں گے۔

حج کے لئے جمع شدہ رقم بھی ترکے میں شامل ہوگی ،البتہ اگر مرحوم اپنا فرض حج ادا کرنے والے تھے ،تو تمام ورثاء باہمی رضامندی سے اس رقم سے ان کا حجِ بدل ادا کرادیں ،تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے فرض کو ساقط فرمادے اور سب کو اجر سے بھی نوازے۔پنشن چونکہ حکومت کی طرف سے تبرُّع اور فضل واحسان ہے اور حکومت اپنے قانون کے مطابق بیوہ کو دیتی ہے ،لہٰذا اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔

بیوی کو کوئی شے ہبہ کرنے کے بعد رجوع کا حق حاصل نہیں

سوال: 149

ایک شخص نے اپنی تمام پراپرٹی اپنی بیوی اور بچوں کے نام کردی اور اسے کاغذی طور پر رجسٹرڈ بھی کروادیا اور بیوی کو بچوں کا سربراہ بنادیا۔پراپرٹی رجسٹر کرانے میں اُس کی بیوی کی بھی نصف رقم صرف ہوئی۔شوہر کا کہنا یہ ہے کہ میں نے یہ جائیداد گفٹ کی تھی اس لئے میں اسے واپس لے سکتا ہوں جبکہ باقاعدہ کاغذی طور پر رجسٹر بھی کرواچکا ہے۔کیا اس صورت میں شوہر اپنی جائیداد واپس لے سکتا ہے؟،(معرفت:مولانا خالد محمود)۔

جواب:

مذکورہ صورت میں اگر شوہر کے گفٹ (ہبہ) کئے جانے کے بعد اُس پراپرٹی پر بیوی اور بچوں کا قبضہ بھی پایا گیا تو یہ ہبہ (گفٹ) مکمل ہوگیا ،اب اس کی واپسی کا شرعاً شوہر کو حق حاصل نہیں ہے۔زوجیت رجوع سے مانع ہے یعنی ہبہ کرتے وقت اگر عورت اُس ہبہ کرنے والے کے نکاح میں تھی ،تو واہب (ہبہ کرنے والا) ہبہ سے رجوع نہیں کرسکتا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی ہبہ سے رجوع کرنے کی ممانعت کے باب میں لکھتے ہیں: اَلزَّوْجِیَّةُ وَقْتَ الْھِبَةِ ،فَلَوْ وَھَبَ لِامْرَأَۃٍ ثُمَّ نَکَحَھَا رَجَعَ وَلَوْ وَھَبَ لِامْرَأَتِہٖ لَا۔

ترجمہ: ''ہبہ کے وقت زوجیت (یعنی نکاح میں ہونا رجوع سے) مانع ہے، لہٰذا اگر کسی عورت کو ہبہ کرکے بعد میں اس سے نکاح کیا، تو ہبہ میں رجوع کرسکتا ہے، اور اگر اپنی بیوی کو ہبہ کیا تو رجوع نہیں کرسکتا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 8، ص:443)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''فی الواقع بعد نکاح جو کچھ تملیکاً دیا، اُس سے رجوع نہیں کرسکتا اور قبل نکاح جو کچھ دیا اُسے بیوی کی مرضی کے بغیر واپس لینا گناہ ہے اور خود چھین لینے کا ہرگز اختیار نہیں، بلکہ عورت نہ دے تو نالش کرکے قاضی کے حکم سے لے سکتا ہے اور گنہگار اس میں بھی ہوگا کہ صحیح حدیث میں فرمایا:

اَلْعَائِدُ فِیْ ھِبَتِہٖ کَالْکَلْبِ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ لَیْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ۔

ترجمہ: ''ھبہ کرکے اُس سے رجوع کرنے والا اُس کتے کی مانند ہے، جو قے کرکے اُسے چاٹ لیتا ہے، بری مثال ہمارے لئے اختیار کرنا اچھا نہیں ہے''۔

درمختار میں دربارۂ موانع رجوع ہے: اَلزَّوْجِیَّةُ وَقْتَ الْھِبَةِ،فَلَوْ وَھَبَ لِامْرَأَۃٍ ثُمَّ نَکَحَھَا رَجَعَ وَلَوْ وَھَبَ لِامْرَأَتِہٖ لَا.

ترجمہ: ''ہبہ کے وقت منکوحہ بیوی ہونا، لہٰذا اگر کسی عورت کو ہبہ کیا، پھر بعد میں اس سے نکاح کیا تو ایسے ہبہ میں رجوع کرسکے گا، اور اگر اپنی (منکوحہ) بیوی کو ہبہ کیا، تو رجوع نہ کرسکے گا''۔ اسی میں ہے: لَایَصِحُّ الرُّجُوْعُ اِلَّا بِتَرَاضِیْھِمَا اَوْ بِحُکْمِ الْحَاکِمِ۔

ترجمہ: ''باہمی رضامندی سے یا حاکم کے حکم سے ہی رجوع صحیح ہوگا۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 19، ص:388، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

ہبہ (گفٹ) کرکے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْعَائِدُ فِیْ ھِبَتِہٖ کَالْعَائِدِ فِیْ قَیْئِہٖ۔

ترجمہ: ''ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے والا اُس شخص کی طرح ہے جو قے کرکے دوبارہ اسے چاٹ لے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4171)۔

مَثَلُ الَّذِیْ یَرْجِعُ فِیْ صَدَقَتِہٖ کَمَثَلِ الْکَلْبِ یَقِیْئُ ثُمَّ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ فَیَاْکُلُہٗ۔

ترجمہ: ''جو شخص صدقہ کرکے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اُس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4167)''۔

لیکن اگر قبضہ نہیں دیا تھا تو ہبہ مکمل نہ ہوا اور شوہر بدستور اپنی جائیداد کا مالک ہے، ہاں! رجسٹر کرانے میں بیوی کی جو رقم صرف ہوئی، وہ اُسے واپس کرنا ہوگی۔

قرابت داروں کو ہبہ کرکے رجوع نہیں کیا جاسکتا

سوال: 150

ایک شخص کا انتقال ہوا، اس کا ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگیا اور محکمۂ مال کی جانب سے قبضہ دے دیا گیا۔ جب ہر وارث اپنے متعین حصے کا قابض و مالک ہوگیا، تو بیٹیوں نے اپنا حصہ والدہ کو تملیک کردیا، قانوناً وشرعاً قبضہ بھی دے دیا۔ والدہ نے وہ تملیک شدہ حصہ بیٹے کو تملیک کرکے شرعاً وقانوناً قبضہ دے دیا۔ کچھ عرصے بعد تنازعہ کے سبب بیٹیوں نے بھائی سے حصے کی واپسی کا مطالبہ کیا، ماں نے یہ کہہ کر جھگڑا ختم کیا کہ تم نے مجھے تملیک کیا تھا، مجھ سے مطالبہ کرو، اُس سے آج کے بعد مطالبہ نہیں کروگی۔ والدہ کو تملیک کرتے وقت بہنوں نے بھائی سے قسم لی تھی کہ جو حصہ ہم والدہ کو دیں اور والدہ تم کو تملیک کردے تو مستقبل میں ہمارے مطالبے پر واپس کروگے، بھائی نے بہنوں کے کہنے پر قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم دے دی، قسم کے بعد بہنوں نے کہا کہ ہم نے یہ قسم محض آپ کا ذہن دیکھنے کے لئے لی تھی نہ کہ حقیقتاً ہم اپنا حصہ واپس لینا چاہتے ہیں۔ صورتِ مسئولہ میں کیا تملیک مکمل ہوئی، واپس ہوسکتی ہے اور بھائی واپس کرنے کا پابند ہے یا نہیں؟۔ جو قسم لی گئی اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، (محمد نوید انجم، ضلع وہاڑی، پنجاب)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بیٹیوں نے اپنا حصہ اپنی والدہ کو ہبہ کیا اور پھر قبضہ بھی دے دیا، جس کے بعد ہبہ مکمل ہوگیا اور بیٹیوں کو اُس سے رجوع کرنے کا اختیار حاصل نہ رہا۔ سات مواقع ایسے ہیں جہاں ہبہ کر کے رجوع نہیں کیا جاسکتا، جن میں سے ایک قرابت ہے یعنی قرابت مانع رجوع ہے اور قرابت سے مراد ذی رحم محرم ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: وَلَا یَرجِعُ فِی الْھِبَۃِ مِنَ الْمَحَارِمِ بِالْقَرَابَۃِ کَالْآبَاءِ وَالْاُمَّھَاتِ وَاِنْ عَلَوْا، وَالْاَوْلَادِ وَاِنْ سَفَلُوْا، وَأَوْلَادِ الْبَنِیْنَ وَالْبَنَاتِ فِیْ ذَالِکَ سَوَاءٌ وَکَذَالِکَ الْاِخْوَۃُ وَالْاَخَوَاتُ وَالْاَعْمَامُ وَالْعَمَّاتُ۔

ترجمہ: ''اور قرابت کے سبب محارم سے ھبہ میں رجوع جائز نہیں ہے۔ جیسے باپ، دادا، ماں، دادی اگرچہ کئی پشت اوپر کے ہوں، اور اولاد (یعنی بیٹا اور بیٹی) اگرچہ کئی پشت نیچے تک ہوں اور بیٹوں اور بیٹیوں کی اولاد (یعنی پوتا، پوتی، نواسا، نواسی سب اس میں برابر ہیں اور اِسی طرح بھائی، بہن چچا اور پھوپھیاں (کہ یہ سب ذی رحم محرم ہیں)''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص: 387، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

ہبہ (گفٹ) کر کے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْعَائِدُ فِیْ ھِبَتِہٖ کَالْعَائِدِ فِیْ قَیْئِہٖ۔

ترجمہ: ''ہبہ کر کے اس سے رجوع کرنے والا اُس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے دوبارہ اسے چاٹ لے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4171)۔

مَثَلُ الَّذِیْ یَرْجِعُ فِیْ صَدَقَتِہٖ کَمَثَلِ الْکَلْبِ یَقِیْئُ ثُمَّ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ فَیَأْکُلُہٗ۔

ترجمہ: ''جو شخص صدقہ کر کے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اُس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4167)''۔

مذکورہ صورت میں چونکہ بیٹیوں نے والدہ کو ہبہ کیا اگر براہِ راست بھائی کو بھی ہبہ کیا ہوتا تو

اُس سے رجوع ممکن نہیں۔لیکن بہنوں نے بھائی کو جو قسم دی تھی وہ منعقد ہوگئی اور اُس پر لازم ہے کہ اپنی قسم پوری کرے اور والدہ سے ملنے والا بہنوں کا حصہ بہنوں کو واپس (ہبہ) کردے، یہ جدید ھبہ ہوگا، اِس سے بھائی قسم سے بری ہوجائے گا اور اگر قسم پوری نہ کی تو قسم توڑنے کے سبب کفارہ لازم ہوگا، جو قرآن مجید کی سورۃ المائدہ کی آیت :89 میں بیان کیا گیا ہے، یعنی اپنے اوسط معیار کے مطابق دس مساکین کو دووقت کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس فراہم کرنا، اور جو یہ نہ کرسکے تو وہ تین دن کے روزے رکھے۔

والدہ کے ورثاء میں کون شامل ہیں؟

سوال:151

میرے والد صاحب کا انتقال 2004ء میں ہوا، ورثاء میں بیوہ اور چار بیٹیاں موجود تھیں، بیٹا کوئی نہیں ۔میرے والد صاحب کے ایک ہی بھائی تھے ،جن کا انتقال 2002ء میں ہوگیا تھا اور اُن کی اولاد میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں ۔میرے دادا دادی کے انتقال کو عرصۂ دراز ہو چکا ہے ۔ہم نے چند علماء اور وکلاء کی مدد سے والد صاحب کا ترکہ تقسیم کردیا اور والدہ کو آٹھواں حصہ دے کر بقیہ چاروں بہنوں کے درمیان مساوی تقسیم کرلیا، بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس ترکے میں تایا کی اولاد کو بھی حصہ ملے گا ،تو ہم تمام بہنیں کسی بھی حقدار کا حق غصب کرنا نہیں چاہتیں ،لہٰذا ازسرِ نو ترکے کی تقسیم جاننا چاہتی ہیں ۔مزید یہ کہ ہماری والدہ کا انتقال ایک سال قبل 2009ء میں ہوا ،ہم چار بیٹیوں کے علاوہ والدہ کی دو بہنیں تھیں ، بھائی کوئی نہیں ۔ایک بہن کا انتقال 2004ء میں ہوگیا ہے، مرحومہ خالہ کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے ۔معلوم یہ کرنا ہے کہ:

(1) والد صاحب مرحوم کے ورثاء کون کون ہوں گے اور ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟۔

(2) والدہ کی جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی؟۔

(3) میری والدہ کی جائیداد میں میری خالہ جو حیات ہیں ،اُن کا اور مرحومہ خالہ کی اولاد کا بھی اُس ترکے میں حصہ ہوگا؟۔

(4) میری ایک خالہ جو حیات ہیں، اُن کی ایک بیٹی نے ایک عیسائی سے شادی کرلی ہے، جس سے اُس کی اولاد بھی ہے اور خالہ خالو نے اپنی اُس بیٹی سے تعلق قائم رکھا ہوا ہے، کیا اس بنا پر میری والدہ کے ترکے میں اُن کا حصہ ختم تو نہیں ہو جاتا؟۔

مسز قدسیہ مبشر خان، اسلام آباد

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ آپ کے متوفی والد کا ترکہ 48 حصوں میں منقسم ہوگا، اُن میں سے متوفی کی بیوہ (یعنی آپ کی والدہ) کو 6 حصے، چار بیٹیوں کو 32 حصے (ہر ایک کو 8 حصے) اور دونوں بھتیجوں کو 10 حصے (فی کس 5 حصے) ملیں گے اور تینوں بھتیجیاں محروم رہیں گی۔

آپ کی والدہ مرحومہ کا ترکہ 6 حصوں میں منقسم ہوگا، چاروں بیٹیوں کو 4 حصے (فی کس ایک، ایک حصہ) اور ایک بہن کو 2 حصے ملیں گے، اُن کی دوسری فوت شدہ بہن کے بیٹے اور بیٹی (یعنی مرحومہ کے بھانجے اور بھانجیاں) محروم رہیں گے۔

آپ کی خالہ کی بیٹی نے عیسائی شخص سے نکاح کرکے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے، اگر وہ علیحدگی اختیار کرلے تو درست ورنہ اُن کا سماجی مقاطعہ (Socail Boycott) کیا جائے، لیکن بیٹی کے ناجائز کام کرنے کے سبب ماں کے حصۂ وراثت پر اثر نہیں پڑے گا۔

تقسیم کا ایک پیچیدہ مسئلہ

سوال: 152

ہم صرف دو بہن بھائی (سیدہ نیر جہاں اور سید ارشد علی کاظمی) ہیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد ہمارے والد سید شوکت علی کاظمی نے ولایت آباد کا مکان جنوری 1992ء مبلغ دو لاکھ بیس ہزار روپے میں فروخت کردیا، نارتھ کراچی میں تین لاکھ اسی ہزار روپے میں دوسرا مکان خریدا، جس میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے میں نے لگائے۔ مکان فروخت

کرنے والے نے مختار نامہ عام (General Power of Attorney) والد صاحب کے نام لکھ دیا کہ وہ ضروری قانونی کاروائی کے بعد مکان اپنے نام منتقل کروالیں۔ جولائی 2003ء میں والد صاحب کا انتقال ہوگیا اور وہ مکان اپنے نام منتقل نہ کرواسکے، ان کے انتقال کے بعد مختار نامے کی قانونی حیثیت ختم ہوگئی، میں نے اصل مالک مکان سے رجوع کیا اور مکان میرے نام منتقل ہوگیا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد میں نے ایک لاکھ بانوے ہزار چار سو پچاس روپے قرض لیا اور کچھ رقم اپنے پاس سے ملا کر دو لاکھ پچاس ہزار روپے مکان کی اوپری منزل پر لگایا، جو ابھی تک نامکمل اور نا قابلِ رہائش ہے۔ غرض مکان میں اب تک جو رقم لگی ہے اس میں 35% رقم والد صاحب مرحوم کی اور 65% رقم میری جو میں نے مختلف ذرائع سے حاصل کر کے لگائی۔ میری ہمیشہ یہ نیت رہی کہ جیسے ہی میں اس قابل ہوا، اپنی بہن کا شرعی حصہ ضرور ادا کروں گا۔ اب میری ہمشیرہ اپنا حصہ مانگ رہی ہیں اور ان کا اصرار ہے کہ مکان کی موجودہ قیمت (تقریباً بائیس لاکھ روپے) کی بنیاد پر ہونا چاہئے اور اُن کا کہنا ہے کہ میں آپ سے مکان کا کرایہ بھی وصول کرسکتی ہوں۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ترکے کی تقسیم کس بنیاد پر ہوگی؟۔ سید ارشد علی کاظمی، نارتھ کراچی

جواب:

مذکورہ صورت مسئلہ میں تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔ (۱) آپ نے مذکورہ رقم بطور تبرُّع اور فضل واحسان کے دی ہو، (۲) بطور قرض دی ہو، (۳) شراکت داری کے تحت دی ہو۔

تینوں صورتوں میں احکام جدا جدا ہوں گے، اول الذکر (یعنی وہ رقم اپنے والد کو بطور تبرُّع دینے کی) صورت میں شرعاً آپ اُس رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتے اور مذکورہ مکان آپ کے والد کا ترکہ شمار ہوگا اور تقسیم کاعمل مکان کی موجودہ قیمت پر جاری ہوگا (۲) اگر آپ نے وہ رقم بطور قرض دی تھی اور یہ طے کرلیا تھا کہ بعد میں اپنی رقم وصول کرلیں گے، تو آپ کو صرف وہی رقم یعنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے لینے کا حق حاصل ہے، اُس سے زائد

نہیں لے سکتے ،اگر اس رقم پر بڑھا کر وصول کریں گے ،تو یہ سود ہوگا ،رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبٰو۔

ترجمہ: '' ہر وہ قرض جو (اصل رقم پر زائد) کسی منفعت کا باعث ہو ،تو ایسی منفعت سود ہے،(کنز العمال ،رقم الحدیث: 15516)''۔یہی حکم مکان کے تعمیری مصارف میں صرف ہونے والی رقم کا ہے۔

(۳) اگر آپ نے وہ رقم بطور شراکت مکان میں لگائی تھی ،تو آپ اپنی لگائی ہوئی رقم کے تناسب سے رقم منہا کرلیں گے اور بقیہ 35% پر موجودہ قیمت کے حساب سے تقسیم کا عمل جاری ہوگا۔

بعد فراغت امور متقدمہ علی الارث بقیہ ترکہ تین حصوں میں تقسیم ہوگا،'' لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ'' (ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت ایک بیٹے کو 2 حصے اور ایک بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔

جائیداد کے مختلف حصوں میں ترکے کا تعین

سوال: 153

میری بیٹی کا شوہر شوکت علی خان کا فروری 2010ء میں انتقال ہوگیا ہے،ورثاء میں ایک بیوہ ،والدہ ،ایک بھائی اور ایک بہن حیات ہیں ، اولاد کوئی نہیں ۔ (U.D.C +کیمرہ مین پاکستان ملٹری اکیڈمی میں) سرکاری ملازم تھا ،اپنی زندگی میں واجبات کے حصول کے لئے اپنی زوجہ سمیرا کو نامزد کیا تھا ،جس میں پینشن ،فیملی پینشن ، GP فنڈ ،ڈیتھ پیکیج ،ہاؤس رینٹ اور گروپ انشورنس وغیرہ شامل ہیں۔ان تمام واجبات پر کس کا حق ہے؟۔

اس کے علاوہ شوکت کا مکان ،ایک دوکان (جو اس نے سرکاری ملازم ہونے کے سبب اپنی چھوٹے بھائی کے نام کی تھی)شوکت علی کے پیسے سے بنی تھی ،اُس دوکان کا کیا حکم ہے؟۔ نوے ہزار روپے کی ایک کمیٹی شوکت نے اپنی زندگی میں ڈالی تھی ،انتقال کے ایک ہفتہ بعد

اس کی والدہ نے وصول کرلی، اس کمیٹی کی تقریباً 12 اقساط باقی ہیں۔شادی کے موقع پر دلہن کوسونے کے زیورات دیئے گئے تھے، ہار سیٹ، دوانگوٹھیاں، چار چوڑیاں۔انتقال سے 8 ماہ قبل چار چوڑیاں واپس لے کر فروخت کردیں اور حاصل شدہ رقم سے فوٹوگرافر کی دوکان بنائی، مزید پچاس ہزار روپے بینک سے قرض لے کر دوکان پر خرچ کئے۔زیورات پر کس کا حق ہوگا؟۔مہر کی رقم ایک لاکھ روپے (عندالطلب) رکھی گئی تھی، اُس کی ادائیگی کا حکم کیا ہے؟ لڑکی کو ہم نے تقریباً دولاکھ روپے مالیت کا جو جہیز دیا تھا، اُس کا مالک کون ہو گا؟۔اس کے علاوہ مرحوم دولاکھ روپے کا مقروض ہے، جس کے متعلق کوئی معقول ثبوت نہیں کہ شادی سے پہلے شوکت علی کے والد نے لیا اور زیورات پر خرچ ہوا، یا دوکان (جو چھوٹے بھائی کے پاس ہے) کے لئے شوکت علی نے قرض لیا۔

عبدالرشید، عابدآباد، کراچی

جواب:

وہ امور جو ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، اُن کے نفاذ کے بعد ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔متوفی شوکت علی کا ترکہ 36 حصوں میں منقسم ہوگا، بیوہ (سمیرا) کو 9 حصے، والدہ کو 6 حصے، ایک بھائی کو 14 حصے اور بہن کو 7 حصے ملیں گے۔

پنشن حکومت کی طرف سے تبرُّع (گفٹ) ہے، یہ ترکہ نہیں ہے اور حکومت اپنے قوانین کے مطابق وفات یافتہ سرکاری ملازم کی بیوہ کو دیتی ہے، لہٰذا اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ملازم کی تنخواہ سے جی پی فنڈ کی مد میں ماہانہ رقم کاٹی جاتی ہے اور اُتنی رقم ہی ماہانہ اپنی طرف سے اس فنڈ میں جمع کرتی ہے، اسے متوفی کے ترکے میں شمار کیا جائے گا۔دوکان اگر متوفی شوکت علی نے اپنے بھائی کو ہبہ (گفٹ) کردی تھی، تو اب یہ ترکہ شمار نہیں ہوگی اور اگر مرحوم نے اپنی ملکیت میں رکھتے ہوئے بھائی کو صرف تصرُّف کا حق دیا تھا تو اب یہ متوفی کا ترکہ شمار ہوگی اور تمام ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگی۔کمیٹی کی جتنی رقم متوفی نے ادا کی تھی وہ اُس کا ترکہ شمار ہوگی اور ورثاء کے درمیان تقسیم کی جائے گی اور جتنی اقساط باقی ہیں، وہ اُس

کے ذمے ہیں جس نے اُس رقم کو لیا، اگر تمام ورثاء کے درمیان پورے نوے ہزار تقسیم کیے گئے تو بقیہ بارہ اقساط اُن سب کے ذمے ہوں گی، اپنے حصے کے بقدر ادا کریں گے۔
زیورات اگر بیوی کی مِلک کردیئے تھے، تو اُس کی مالک بیوی ہے اور اُسے ترکے میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ مہر کی ادائیگی شوہر پر لازم ہے اور تقسیم سے پہلے اُس کے ترکے سے ادا کیا جائے گا۔ اسی طرح بینک سے لیا گیا پچاس ہزار قرض بھی شوکت علی کے ترکے سے ادا کیا جائے گا۔ جہیز کے سامان کی مالک آپ کی بیٹی یعنی مرحوم کی بیوہ ہے۔ مذکورہ دو لاکھ روپے اگر متوفی شوکت علی نے قرض لئے تھے، تو یہ رقم شوکت علی کے ترکے سے ہی ادا کی جائے گی۔

ہبہ محض زبانی کہہ دینے سے مکمل نہیں ہوتا

سوال: 154

ہمارے والد کا انتقال 1996ء میں اور والدہ کا انتقال 2008ء میں ہوا، ورثاء میں 3 بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ والدہ نے انتقال سے چند دن پہلے اپنے بیٹے سے زیورات کے لئے کہا کہ ان کو بچیوں (پوتیوں، نواسیوں) میں تقسیم کردو، بھائی نے کہا کہ بچوں کی ماؤں کو دیدیں، بچیوں کو خود بخود پہنچ جائے گا۔ والدہ خاموش ہوگئیں یہ گفتگو سب وارثوں کے درمیان نہیں ہوئی، زبانی ہوئی اور والدہ کے انتقال کے بعد سامنے آئی۔ اس گفتگو کی شرعی حیثیت کیا ہے اور ان زیورات کی تقسیم کس طرح ممکن ہوگی؟۔

خلیل احمد، بلاک 16 الیف۔ بی ایریا، کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کے بقول آپ کی والدہ نے زیورات اپنی پوتیوں اور نواسیوں کو دینے کی خواہش کا اظہار کیا، جس پر آپ کے بھائی نے اُنہیں اپنی رائے دی، اُس رائے کے بعد آپ کی والدہ نے نہ رضامندی ظاہر کی اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی وصیت کی، اِس صورت میں زیورات اُن کا ترکہ شمار ہوں گے اور تمام ورثاء کے درمیان ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' (ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11)

کے تحت تقسیم ہوگا۔اگر آپ اپنی والدہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان کے وکیل کے طور پر ان زیورات کو بچیوں میں تقسیم کردیتے اور سونا ان کے قبضے اور مِلک میں چلا جاتا، تو ہبہ مکمل ہوجاتا اور وہ سب اپنے اپنے حصے کے مطابق اس کے مالک بن جاتے اور یہ مال آپ کی والدہ کی مِلک سے نکل جاتا اور ترکہ نہ رہتا۔

بیوی کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا

سوال:155

میری شادی 2003ء میں ہوئی اور 2005ء کے زلزلے میں میری بیوی انتقال کرگئی ،اُس کا زیور جو بوقت حادثہ میری بیوی کے والدین کے گھر تھا ،اب وہ زیور میرے حوالے نہیں کررہے بلکہ مختلف بہانے کررہے ہیں مثلاً: میری ساس کا خیال ہے کہ زیور پر میری مرحوم بیوی کی بہنوں کا حق ہے، یعنی میری سالیوں کا۔دوسرا جواز یہ بتاتی ہیں کہ یہ زیور میں کسی دوسری عورت کے گلے میں برداشت نہیں کرسکوں گی کیونکہ آپ نے ابھی شادی کرنا ہے۔تیسرا جواز یہ کہ یہ زیور مجھے بہت پیارا اور عزیز ہے،میری بیٹی کی نشانی ہے،اس کو میں کسی کے حوالے نہیں کرسکتی۔چوتھا جواز یہ کہ یہ مرحومہ کی یادگار ہے،اس کو کوئی غیر اس عزت اور حرمت اور شان سے زیب تن نہیں کرے گا،جس طرح مرحومہ کی بہنیں اس کی تکریم کریں گی۔یہ زیور میری ساس کے پاس بطور امانت تھا۔شریعت کے مطابق میرا اپنے زیور کے لئے تقاضا کرنا اور اس میں میری حدود وقیود کا شرعاً تعین کردیں کہ میں واپس لینے کا اختیار رکھتا ہوں اور کتنا؟۔نیز یہ کہ میری غیر موجودگی میں میری مرضی اور منشا کے خلاف میرا کوئی بھائی یا رشتہ دار میری کسی چیز کو کسی کے حوالے کرنے کا اختیار رکھتا ہے؟۔

حافظ محمد جاوید،اسلام آباد

جواب:

صورتِ مسئولہ میں سب سے پہلے آپ اس بات کا تعین کریں کہ وہ زیور کس کی ملکیت تھا؟،اگر آپ کا تھا اور آپ نے بطور عاریت استعمال کرنے کے لئے اپنی بیوی کو دیا

تھا، تو زیور آپ کی ملکیت ہے اور کسی دوسرے شخص کو آپ کی اجازت کے بغیر مالکانہ تصرُّف کا حق اور اختیار حاصل نہیں ہے یا آپ نے اپنی بیوی کو زیور کا مالک بنادیا تھا، اگر آپ نے اپنی بیوی کو مالک بنادیا تھا یا یہ زیور اس کو جہیز میں ملا تھا تو اب وہ زیور مرحومہ کا ترکہ شمار ہوگا اور حسبِ تناسب اُس کے ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگا۔ اگر مرحومہ کی اولاد ہے، تو آپ کو اپنی بیوی کے ترکے سے چوتھائی حصہ اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں کل ترکے کا نصف حصہ ملے گا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ترجمہ: ''اور تمہارے لئے آدھا مال ہے اس کا جو چھوڑ جائیں تمہاری بیویاں اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو، (سورۃ النسا: 12)''۔

اولاد ہونے کی صورت میں شوہر کو بیوی کے ترکے سے چوتھائی حصہ ملے گا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ، ترجمہ: ''اور اگر ان کی اولاد ہو تو تمہارے لئے ان کے ترکے کا چوتھائی حصہ ہے، (سورۃ النسا: 12)''۔

بقیہ ترکے میں سے اس وقت جو شرعی وارث موجود ہوں گے، اسلامی احکامِ وراثت کے مطابق اپنا حصہ پانے کے حق دار ہوں گے۔ آپ کی ساس صاحبہ صرف زیور کی امین تھیں اور اُن پر لازم ہے کہ اپنی بیٹی کی رکھوائی ہوئی امانت میں کسی بھی حیلے بہانے سے خیانت نہ کریں اور شرعی احکام کے مطابق اُس زیور کو وارثین تک پہنچادیں۔

ذوی الارحام کس صورت میں وارث بنتے ہیں

سوال: 156

ہمارے والد صاحب کا انتقال 1977ء میں اور والدہ کا اُن سے پہلے ہوگیا تھا۔ ہم چار سگی بہنیں اس وقت موجود ہیں، چار میں ایک شادی شدہ بہن ہے، جس کی شادی بھائی نے کی ہے اور ایک بہن (غیر شادی شدہ) کا 1985ء میں انتقال ہوگیا۔ والدہ صاحبہ کا اُن کے پہلے شوہر سے ایک بیٹا ہے۔ ایک مکان جس میں آدھا حصہ ہمارے والد صاحب اور آدھا حصہ سوتیلے بھائی کا تھا، سوتیلے بھائی سے ہم تینوں بہنوں نے مکان کا آدھا حصہ

خریدلیا، جس بہن کا انتقال 1985ء میں ہوا، اس مکان میں اُس کے بیس ہزار روپے شامل ہیں۔ اب اس مکان کا شرعی طور پر جس میں ہم تینوں (غیر شادی شدہ) بہنوں نے رقم ادا کر کے بھائی کا حصہ ادا کر دیا ہے اور باقی والد کے مکان کے حصے کی رقم ہے۔ شرعی طور پر ہم چار بہنوں کے حصے کے بارے میں بتا دیجئے؟ شادی شدہ بہن کی تین اولاد (دو بیٹے اور ایک بیٹی) ہیں۔

نجم النساء، R-527، سیکٹر 7-D/3 نارتھ کراچی

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائلہ اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو بعد از فراغت امورِ متقدمہ علی الارث بقیہ ترکہ ورثاء کے درمیان حسبِ تناسب تقسیم ہوگا۔ مکان کا آدھا حصہ چونکہ تینوں بہنوں نے خریدا تھا، لہٰذا مکان کے اس آدھے حصے کی مالک وہ تینوں بہنیں ہیں جنہوں نے اسے خریدا۔ آپ نے لکھا ہے کہ اس مکان میں بیس ہزار روپے مرحومہ بہن کے شامل ہیں، لہٰذا وہ بیس ہزار روپے مرحومہ کا ترکہ شمار ہوگا اور چاروں بہنوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔ بقیہ آدھا مکان آپ کے والد کا ترکہ ہے، دو سے زائد بیٹیاں ہوں تو ذوی الفروض ہونے کی حیثیت سے دوتہائی ملے گا اور چونکہ بیٹیوں پر رَد کیا جا سکتا ہے، جو چاروں بہنوں کے درمیان مساوی (برابر) تقسیم ہوگا۔ شادی شدہ بہن کی اولاد ذوی الارحام کہلاتے ہیں اور ذوی الارحام اُسی وقت وارث ہوں گے جب اصحابِ فرائض میں سے وہ لوگ موجود نہ ہوں، جن پر مال دوبارہ رَد کیا جا سکتا ہو اور عصبہ بھی نہ ہو، لہٰذا شادی شدہ بہن کی اولاد محروم رہے گی۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَاِنَّمَا یرث ذوو الارحام اذالم یکُنْ اُحدٌ مَّن اُصْحابِ الفَرائِضِ مِمَّنْ یُرَدُّ علیہ ولم یکُنْ عصبۃٌ،

ترجمہ: ”ذوی الارحام اُسی وقت وارث ہوں گے جب اصحابِ فرائض میں سے وہ لوگ موجود نہ ہوں، جن پر مال دوبارہ رَد کیا جا سکتا ہو اور عصبہ بھی نہ ہو“۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 459)

ملازمت کے سرکاری قوانین اور ترکے کا تعین

سوال: 157

زید پاکستان آرمی میں بحیثیت فوجی ملازم تھا، اچانک موت واقع ہوگئی، زید شادی شدہ تھا لیکن اولاد کوئی نہیں، ورثاء میں ایک بیوہ، والدہ، چار بھائی اور دو بہنیں حیات ہیں۔ پاکستان آرمی کا قانون ہے کہ متوفی شخص کے جو بھی مالی حقوق ہوتے ہیں، بیوہ اُس کی وارث ہوتی ہے۔ کیا کسی فرد یا ادارے کو یہ حق حاصل ہے کہ ایک وارث کے علاوہ باقی ورثاء کو محروم کر دے؟۔ مزید یہ بھی وضاحت فرما دیں کہ ہر وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟۔

عبدالرزاق عباسی، کراچی

جواب:

ہماری رائے میں ادارے کی جانب سے ملنے والے واجبات حکومت کی طرف سے مرحوم کی بیوہ کے لئے تبرُّع اور فضل واحسان (Donatoin or Gift) ہیں، یہ مرحوم کا ترکہ نہیں کہ اسے شرعی ورثاء میں اصولِ شرع کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ مثلاً پنشن حکومت کی طرف سے تبرُّع (گفٹ) ہے، یہ ترکہ نہیں ہے اور حکومت اپنے قوانین کے مطابق وفات یافتہ سرکاری ملازم کی بیوہ کو دیتی ہے، لہٰذا اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ حکومت یا محکمے کی طرف سے جو مالیاتی رعایت حکومت کی طرف سے تبرُّع (Donation) ہیں، اُن میں ان کے قوانین جاری ہوں گے۔ اگر آپ کی ان قوانین (Service Rules) میں تبدیلی کی خواہش ہے تو اس کا فورم وفاقی شرعی عدالت ہے۔ البتہ اگر زید کا جی پی فنڈ حکومت کے پاس تھا، جو اس کی زندگی میں اس کی تنخواہ سے رضا کارانہ یا لازمی طور پر وضع کیا جاتا تھا، تو یہ اُس کا ترکہ شمار ہوگا اور والدہ سمیت تمام ورثاء کے درمیان شریعت کے قانون کے مطابق تقسیم ہوگا۔ اسی طرح مرحوم کی اپنی جمع کی ہوئی رقم اور دوسرا ترکہ بھی، اگر کچھ ہے، تو تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں متوفی کا ترکہ 120 حصوں میں تقسیم ہوگا، بیوہ کو 30 حصے، والدہ

کو 20 حصے، چاروں بھائیوں کو 56 حصے (فی کس 14 حصے) اور دونوں بہنوں کو 14 حصے (فی کس 7 حصے) ملیں گے۔

بیٹے کے گھر میں باپ کی رہائش کا حق

سوال: 158

میری عمر 70 سال ہے۔ کمزور، ناتواں اور بے روزگار ہوں۔ اپنے بیٹے کے پاس رہنے کا ارادہ کیا تو بیٹے نے کہا: ''میرے گھر میں آپ کا رہنا غیر شرعی ہے''۔ کیا والدین کا اپنے بیٹے کے پاس رہنا غیر شرعی ہے؟، (ابوکامل، کراچی)۔

جواب:

باپ کو اپنے گھر میں رہنے سے روکنا اور اپنے گھر میں اس کے قیام کو غیر شرعی قرار دینا، بیٹے کی بدنصیبی اور شرعاً مکروہ تحریمی ہے، اس پر وہ گناہ گار ہے۔ اس کے لیے سکراتِ موت کی شدت اور آخرت میں عذاب کا خوف ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نصیب فرمائے۔

رسول اللہ ﷺ نے اولاد پر ماں باپ کی اطاعت کو لازم قرار دیا ہے اور ماں باپ کی ناراضگی کو اللہ کی ناراضگی کا سبب قرار دیا ہے۔ رسول پاک نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''رب کی رضا باپ کی رضا میں ہے، اور رب کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے''۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ أَنَّ رَجُلاً قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! اِنَّ لِیْ مَالاً وَّوَلَداً، وَاِنَّ أَبِیْ یُرِیْدُ أَنْ یَّجْتَاحَ مَالِیْ، فَقَالَ: أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِیْكَ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس کچھ مال ہے اور میں صاحب اولاد بھی ہوں اور میرے والد چاہتے ہیں کہ وہ میرا مال لے لیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اور تمہارا مال (دونوں) تمہارے والد کے ہیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ مزید ارشاد فرمایا: اِنَّ أَوْلَادَکُمْ مِنْ أَطْیَبِ کَسْبِکُمْ فَکُلُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔

ترجمہ: ''بے شک تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی ہے، پس اپنی اولاد کی کمائی سے کھاؤ (اُسے اپنے لئے جس طرح چاہو، استعمال کرو)، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2291،2292)''۔

سُنن ابوداؤد میں ہے: أَنْتَ وَمَالُكَ لِوَالِدِكَ، اِنَّ أَوْلَادَكُمْ مِنْ أَطْیَبِ کَسْبِکُمْ۔ فَکُلُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ۔

صاحبِ عون المعبود لکھتے ہیں:

أَنْتَ وَمَالُكَ لِوَالِدِكَ علی مَعْنٰی أَنَّهٗ اِذَا احْتَاجَ اِلٰی مَالِكَ أَخَذَ مِنْكَ قَدْرَ الْحَاجَةِ کَمَا یَأْخُذُ مِنْ مَّالِ نَفْسِه۔

ترجمہ: ''اس کا مطلب یہ ہے کہ جب باپ تمہارے مال کا محتاج ہو تو وہ تم سے بقدرِ ضرورت لے جیسے اپنے مال سے لیتا ہے، (عون المعبود، جلد 3، ص: 312)''۔

صاحب بذل المجہود نے اس کی شرح میں لکھا ہے:

وَقَیَّدَهُ الْفُقَهَاءُ بِالْحَاجَةِ، أَیْ اِذَا احْتَاجَ اِلَیْهِ وأَمَّا اِذَا لَمْ یَحْتَجَّ فَلَا یَجُوْزُ لَهُ الْأَکْلُ اِلَّا بِاِذْنِه۔

ترجمہ: ''(بعض) فقہاء نے حاجت کی قید لگائی ہے یعنی (بیٹے کے مال میں بلا اجازت) باپ کو تصرُّف کی اجازت صرف اس صورت میں ہے جب وہ اس کا محتاج ہو، اگر باپ محتاج نہیں تو بیٹے کی اجازت کے بغیر اس کا لینا جائز نہیں ہے، (بذل المجہود، جلد خامس، ص: 295)''۔

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ أَطْیَبَ مَا أَکَلْتُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ، وَاِنَّ أَوْلَادَکُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے پاکیزہ مال جو تم کھاتے ہو، وہ تمہاری اپنی کمائی ہے اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2290، سُنن ترمذی، رقم الحدیث: 1358)''۔

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں:

وَالْعَمَلُ عَلٰی ھٰذَا عِنْدَ بَعْضِ أَھْلِ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ وَغَیْرِھِمْ، قَالُوْا: إِنَّ یَدَ الْوَالِدِ مَبْسُوْطَۃٌ فِیْ مَالِ وَلَدِہٖ یَأْخُذُ مَاشَاءَ۔ وَقَالَ بَعْضُھُمْ: لَا یَأْخُذُ مِنْ مَالِہٖ إِلَّا عِنْدَ الْحَاجَۃِ إِلَیْہِ۔

ترجمہ: ''نبی کریم ﷺ کے اصحاب اور بعض اہلِ علم کا اُس پر عمل رہا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ باپ کو اپنی اولاد کے مال میں کھلا اختیار حاصل ہے، جس قدر چاہے وہ اُس میں سے لے سکتا ہے اور بعض نے کہا کہ یہ اختیارِ تصرّف ضرورت کی حد تک ہے''۔

(سُنن ترمذی، المجلد الثانی، ص: 347، مطبوعہ: دارالکتب علمیہ، بیروت)

اگر آپ کے بیٹے کی بیوی بداخلاق اور نافرمان ہے اور اپنے گھر میں آپ کے قیام میں رکاوٹ ہے تو آپ کے بیٹے پر لازم ہے کہ آپ کے لئے متبادل انتظام کرے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ آپ کا کوئی اور بیٹا یا بیٹی آپ کی خدمت اور کفالت کے لئے موجود نہ ہو۔

أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِیْكَ کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ بیٹا اپنے مال کا بالکل مالک نہیں رہتا۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''ثالثاً: ایسا ہو تو خود قبضۂ شوہر بھی منتفی ہو جائے گا اور کلام اپنے مقصود پر نقص کرتا پلٹ آئے گا کہ قبضۂ شوہر بواسطہ قبضۂ زن مانا تھا بقیاس مساوات کہ قَابِضُ القَابِضِ قَابِضٌ جب سرے سے قبضۂ زن منفی ہو جائیگا، قبضۂ شوہر کہ اس واسطے سے تھا کہاں سے آئے گا، ھَلْ ھٰذَا إِلَّا جَھْلٌ مُبِیْنٌ (کیا یہ واضح جہالت نہیں ہے؟۔ت) تو خود یہی روایات کہ ڈگری داروں نے پیش کیں اُن کا صریح رد ہیں''۔

رابعاً: ''کلام علماء باب حدیث ''أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِیْكَ'' سے ہے، جیسے بیٹے کے لئے ارشاد ہوا کہ وہ اُس کا مال سب اس کے باپ کا ہے، کوئی عاقل اس سے یہ وہم نہیں کرسکتا کہ بیٹے کی ملک کی نفی فرمائی ہے، ایسا ہو تو باپ بیٹے کا وارث نہ ہو سکے، اور آیہ کریمہ لِأَبَوَیْہِ لِکُلِّ

مِنۡهُمَا السُّدُسُ (اورمیت کے ماں باپ میں سے ہرایک کواُس کے ترکہ سے چھٹا حصہ ملے گا۔ت) کا معاذ اللہ صاف انکار لازم آئے کہ اِرث ترکۂ مُورِث میں جاری ہوگی اور ترکہ مُثبتِ مِلک جب، منتفی، تو اِرث کہاں؟''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:18، ص:284، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قُدِّس سِرُّہٗ العزیز کی اِس عبارت کا ماحصل یہی ہے کہ ''اَنۡتَ وَمَالُكَ لِأَبِيۡكَ'' کا ہرگز یہ معنی نہیں ہے کہ بیٹا مع اپنے مال کے باپ کا مملوک ہوا اور اُس کا کچھ نہ رہا، تو پھر یقیناً اس حدیث کا معنی یہی ہے کہ باپ اپنی ضرورت کی حد تک بیٹے کی ملکیت میں اُس کی اجازت کے بغیر بھی تصرُّف کرسکتا ہے۔ اگر حدیث کو ظاہری معنی پر محمول کیا جائے تو بیٹا اپنے مال کا مالک نہ رہے اور اگر قضاءِ الٰہی سے باپ کی حیات میں بیٹے کا انتقال ہوجائے تو اُس ترکے میں والدین کے حصے کا کیا معنی رہے گا، جب باپ ویسے ہی بیٹے کے تمام مال کا مالک ہے۔

حلال وحرام کے مسائل

برقی مچھر مار آلے کا استعمال

سوال:159

کیا برقی مچھر مار آلہ(Electric Mosquito Killer)استعمال کرنا جائز ہے؟۔روز نامہ اُمّت بروز اتوار 30 مئی 2010ء کی اشاعت میں دارالعلوم دیو بند کے مفتی صاحب سے یہ سوال کیا گیا تو اُنہوں نے جواب میں لکھا کہ:''خدا کی مخلوق کو تعذیب بالنّار دینا یعنی اُنہیں آگ میں جلا دینا ہمارے لئے جائز نہیں ہے،مچھروں کو مارنے اور بھگانے کے دوسرے بہت سے طریقے ہیں،اُنہیں استعمال کرنا چاہئے ،اگر کوئی دوسری صورت نہ ہو تو پھر گنجائش ہے۔(واللہ اعلم) (یاسر رحمٰن،نکیال آزاد کشمیر)

جواب:

مذکورہ مفتی صاحب کا جواب اور استدلال درست نہیں ہے، کیونکہ برقی مچھر مار آلے(Electric Mosquito Killer) کا استعمال روایتی آگ میں جلانے کا عمل نہیں ہے، اِس لئے اس کے استعمال پر''تعذیب بالنّار(آگ کے عذاب)''کا اطلاق درست نہیں ہے۔

ذیل میں وہ احادیث مبارکہ درج کی جاتی ہیں،جن میں تعذیب بالنّار(آگ کا عذاب دیئے جانے)کی ممانعت ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِیْ بَعْثٍ فَقَالَ: اِنْ وَجَدْتُمْ فُلَانًا وَّفُلَانًا فَأَحْرِقُوْهُمَا بِالنَّارِ،ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حِیْنَ أَرَدْنَا الْخُرُوْجَ : اِنِّیْ أَمَرْتُکُمْ أَنْ تُحْرِقُوْا فُلَانًا وَّفُلَانًا ،وَاِنَّ النَّارَ لَا یُعَذِّبُ بِهَا اِلَّا اللّٰهُ، فَاِنْ وَجَدْتُمُوْهُمَا فَاقْتُلُوْهُمَا۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک مقام پر روانہ فرمایا اور فرمایا کہ فلاں فلاں کو پاؤ تو اُن دونوں کو(آگ میں)جلا دینا،پس جب ہم نے نکلنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے پھر فرمایا:میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ فلاں

فلاں کوجلا دینا لیکن آگ کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ ہی عذاب دیتا ہے، پس تم اُن دونوں کو پاؤ تو قتل کر دینا''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:3016،سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1571)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نَزَلَ نَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَآءِ تَحْتَ شَجَرَةٍ فَلَدَغَتْهُ نَمْلَةٌ فَأَمَرَ بِجَهَازِهِ فَأُخْرِجَ مِنْ تَحْتِهَا وَأَمَرَ بِهَا فَأُحْرِقَتْ فِي النَّارِ، قَالَ: فَأَوْحَى اللّٰهُ اِلَيْهِ فَهَلَّا نَمْلَةً وَّاحِدَةً۔

ترجمہ:''انبیاء(سابقین) میں سے ایک نبی، ایک درخت کے نیچے ٹھہرے، اُنہیں ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، اُنہوں نے درخت کے نیچے سے چیونٹیوں کے چھتے کو نکالنے کا حکم دیا، پھر ان کے حکم سے اس کو آگ میں جلا دیا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی کی کہ آپ نے ایک چیونٹی کے مارنے پر اکتفا کیوں نہ کی، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:5845)''۔

موذی جانوروں کو شریعت میں مارنے کی اجازت ہے۔ ماہرینِ طب نے بعض خاص قسم کے Virus اور Bacteria دریافت کئے ہیں، جو اگر انسان کو لاحق ہو جائیں، تو بعض اوقات انسان کی موت کا سبب بھی بن جاتے ہیں، جیسے ڈینگی وائرس وغیرہ۔ اور مقاصدِ شریعت میں سے ایک سدِّ ذرائع ہے، اسی طرح ترجیحات کے اعتبار سے دفعِ مضرّت (یعنی ممکنہ نقصان کا ازالہ) جلبِ منفعت (یعنی فائدے کے حصول) پر مقدّم ہے۔ بعض اوقات کمرے میں اگر چند مچھر بھی آ جائیں تو ساری رات کی نیند کو غارت کر دیتے ہیں۔ پس انسان کو اپنے آرام کے حصول کے لئے حفاظتی اقدامات اختیار کرنا شرعاً جائز ہیں۔ مچھروں سے بچاؤ کے لئے دھوئیں والا گلوب، پیپرمیٹ اور الیکٹرک میٹ استعمال کئے جاتے رہے ہیں، لیکن ان ذرائع سے بھی مچھروں کے ضرر سے یقینی تحفظ نہیں مل پاتا۔ آج کل برقی مچھر مار آلہ (Electric Mosquito Killer) استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ باقاعدہ روایتی آگ جلا کر مچھروں کو مارنے کا آلہ نہیں ہے اور نہ ہی مچھروں کو پکڑ کر آگ میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے فقط اتنا عمل ہوتا ہے کہ جو مچھر

اِس سے آکر ٹکرا جائیں، وہ الیکٹرک شاک سے مرجاتا ہے۔میرے نزدیک اس کا استعمال جائز ہے۔اس کی مثل یہ فقہی جزئیہ ہے:

اَلْفَیْلَقُ الَّذِیْ یُقَالُ لَہٗ بِالْفَارِسِیَّۃِ (پِیْلَہ) یُلْقٰی فِی الشَّمْسِ لِیَمُوْتَ الدِّیْدَانُ وَلَا یَکُوْنُ بِہٖ بَأْسًا لِاَنَّ فِیْ ذَالِکَ مَنْفَعَۃَ النَّاسِ، اَلَا یُرٰی اَنَّ السَّمَکَۃَ تُلْقٰی فِی الشَّمْسِ فَتَمُوْتُ وَلَایُکْرَہُ کَذَا فِیْ خِزَانَۃِ الْمُفْتِیْنَ

ترجمہ:’’ ’’فیلق‘‘ جسے فارسی میں’’پیلہ‘‘ کہتے ہیں،اُسے دھوپ میں ڈالا جاتا ہے تاکہ (دھوپ کی تمازت سے) کیڑے مرجائیں،اس میں کوئی حرج نہیں،کیونکہ اس میں انسانوں کا فائدہ ہے،ذرا سوچیں کہ مچھلی کو دھوپ میں ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ مرجائے اور یہ مکروہ نہیں ہے،’’خزانۃ المفتین‘‘میں اسی طرح ہے‘‘۔

(فتاویٰ عالمگیری،جلد5،ص:361،مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)

اسی طرح دیہات میں لوگ کھٹملوں کو مارنے کے لئے چارپائیاں سخت دھوپ میں ڈال دیتے ہیں یا چارپائی کی چولہوں پر کھولتا ہوا پانی ڈالتے ہیں،اِن سب صورتوں میں جاندار کو براہِ راست آگ میں نہیں جلایا جاتا،لیکن حرارت وتمازت سے موت واقع ہوجاتی ہے۔ یہی صورت برقی مچھر مار آلے(Electric Mosquito Killer) کی ہے،لہٰذا اُس پر آگ کے عذاب کا اطلاق درست نہیں ہے اور یہ بلاکراہت جائز ہے،اور موذی جانوروں کا اُن کے ضَرر سے بچنے کے لئے جلانا زیادہ سے زیادہ مکروہ ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَاِحْرَاقُ الْقَمْلِ وَالْعَقْرَبِ بِالنَّارِ مَکْرُوْہٌ۔ ترجمہ:’’جوؤں اور بچھوؤں کا آگ میں جلانا مکروہ ہے،(فتاویٰ عالمگیری،جلد5،ص:361)‘‘۔

قانون کو ہاتھ میں لینا

سوال:160

میرے تایا نے 30 سال پہلے اڑھائی ایکڑ زمین بہت کم قیمت پر چالیس ہزار روپے

میں فروخت کردی اور بعد میں اُس پر مقدمہ کردیا، جس کی وجہ سے دشمنی بڑھ گئی، تایا کے بیٹے فریقِ مخالف کو دھمکی دیتے تھے کہ زمین ہمیں واپس کردو۔ فریقِ مخالف نے وہ زمین کسی اور شخص کو فروخت کردی، اب یہی دشمنی اِن کے درمیان بڑھ گئی۔ اُس آدمی نے پولیس کو بھاری رقم دے کر میرے دو تایا زاد بھائیوں کو قتل کروادیا، میرے تایا زاد بھائی گھر میں آرام کر رہے تھے کہ پولیس نے آکر فائرنگ شروع کردی اور گھر کی چھت کو آگ لگادی اور دونوں کزن کو قتل کردیا۔ تایا نے اُس آدمی اور پولیس پر کیس کردیا، اُس آدمی نے ایک غنڈے کے ذریعے تایا اور اُن کے بیٹے کو اٹھالیا اور یہ مطالبہ رکھا کہ اپنی زمین اور چار لاکھ روپے لے کر کیس ختم کردو، ورنہ تمہیں بھی قتل کردیں گے، تایا نے کیس ختم کردیا لیکن میں (مقتول کا چچازاد بھائی) اُس قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ یہ بدلہ لینے میں ہم شرعاً گنہگار تو نہیں ہوں گے؟۔ (محمد اسلم عطاری، ضلع نارووال، تحصیل شکرگڑھ)۔

جواب:

اس مسئلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو قصاص کے مطالبے کا حق حاصل نہیں، بلکہ شرعاً قصاص لینے یا قاتل کو معاف کرنے کا حق مقتول کے قریبی اولیاء کو حاصل ہے۔ اولیاء کے اقرب اور ابعد ہونے میں یہاں بھی وہی ترتیب معتبر ہے، جو وراثت میں معتبر ہے یعنی سب سے مقدم بیٹا، پھر پوتا، پھر پڑپوتا اگرچہ کئی پشت کا فاصلہ ہو، یہ نہ ہوں تو پھر باپ، دادا وغیرہم اگرچہ کئی پشت اوپر کا ہو، پھر حقیقی بھائی۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: فَأَقْرَبُ الْعَصَبَاتِ الِابْنُ، ثُمَّ ابْنُ الِابْنِ، وَإِنْ سَفَلَ، ثُمَّ الْأَبُ، ثُمَّ الْجَدُّ أَبُ الْأَبِ، وَإِنْ عَلَا، ثُمَّ الْأَخُ لِأَبٍ وَأُمٍّ، ثُمَّ الْأَخُ لِأَبٍ، ثُمَّ ابْنُ الْأَخِ لِأَبٍ وَأُمٍّ۔

ترجمہ: ''عصبات میں قریب ترین (ورثاء کی ترتیب یہ ہے) سب سے مقدم بیٹا، پھر پوتا، اگرچہ کئی پشت کا فاصلہ ہو، (یہ نہ ہوں تو) پھر باپ، دادا وغیرہم اگرچہ کئی پشت اوپر کا ہو، پھر حقیقی بھائی، پھر باپ شریک بھائی، پھر حقیقی بھائی کا بیٹا''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 451، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

مذکورہ صورت میں یہ حق اگر مقتول کا بیٹا ہو تو اُسے حاصل ہے ورنہ مقتول کے والد اور اُن کے بعد مقتول کے بھائی کو حاصل ہے، لیکن قصاص لینے کے لئے وہ ازخود کوئی انتقامی کاروائی نہیں کر سکتے بلکہ اُن کی جانب سے حکومت قصاص لے گی، حکومت کی طرف سے قائم کی گئی مُجاز عدالتوں کا کام ہے کہ وہ اعترافِ جرم کی صورت میں یا گواہوں کے ذریعے جرم ثابت ہونے کی صورت میں ملکی قانون کی رُو سے قصاص لیں، انفرادی طور پر کسی شخص، برادری یا قبیلے کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ بدلے کے طور پر سزائیں دیتا پھرے۔

علامہ غلام رسول سعیدی علامہ عبدالقادر عودہ مصری کے حوالے سے لکھتے ہیں :

''اس زمانے میں بر بناءِ ضرورت طریقہ قدیمہ کے مطابق قصاص لینے کا کام ولی کے سپرد نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ولی کی طرف سے قصاص لے اور مقتول کے اولیاء اور ورثاء کو یہ چاہئے کہ اگر وہ قصاص لینا چاہتے ہیں تو حکومت کو قصاص لینے کی اجازت دیں اور اگر وہ مقتول کا خون معاف کرنا چاہتے ہیں تو حکومت کو قصاص لینے سے منع کر دیں، (شرح صحیح مسلم، جلد 4، ص: 686)''۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر آپ عہدِ جاہلیت کی رسم کے مطابق ازخود انتقام لیں گے، تو یقیناً گنہگار ہوں گے اور قانون کی نظر میں مجرم ہوں گے، لہٰذا اس طرح کا کوئی بھی اقدام نہ کریں، قانون کو ہاتھ میں لینا اور خود ہی مدعی و منصف بن جانا شرعاً وقانوناً درست نہیں ہے۔

موٹر سائیکل سوار کا اپنی غلطی سے موت سے دوچار ہونا

سوال: 161

میں ایک ڈرائیور ہوں اور کوسٹر چلاتا ہوں۔ میں ایئر پورٹ سے ایک پارٹی کو بکنگ پر لے گیا اور واپسی پر جب میں ٹریفک سگنل پر پہنچا تو میری سائیڈ کا سگنل کھلا ہوا تھا اور ہم ایئر پورٹ سے شارع فیصل جا رہے تھے، اچانک ٹرمینل 3 کی طرف سے ماڈل کالونی کی طرف جانے کے لئے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل سگنل توڑتے ہوئے ہماری طرف

آئی ،موٹر سائیکل پر دونو جوان سوار تھے ،ہماری گاڑی (کوسٹر) کو بیچ میں دیکھ کر گھبرا گئے اور جو لڑکا پیچھے بیٹھا تھا، اُس نے موٹر سائیکل چلانے والے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر جمپ لگائی، جس کی وجہ سے موٹر سائیکل کا توازن بگڑ گیا اور موٹر سائیکل سِلپ ہو کر کوسٹر کے پچھلے وہیل سے ٹکرائی، میں نے گاڑی روک دی۔ موٹر سائیکل چلانے والے کے سر پر چوٹ لگنے کے سبب موت واقع ہوگئی تھی ۔ جو لڑکا موٹر سائیکل سے جمپ کر کے اتر گیا تھا اُس نے فون کر کے مزید لڑکوں کو بلا لیا اور مجھے اتنا مارا کہ میرے کان کا پردہ پھاڑ دیا، کچھ دیر میں پولیس آئی اور تھانے لے گئی ۔اس تمام صورتِ حال میں، میں قصوروار ہوں یا نہیں اور آیا مجھ پر قصاص یا جرمانہ واجب ہے، اگر ہے تو کیا ہے؟۔ موٹر سائیکل چلانے والا لڑکا بغیر ہیلمٹ بغیر لائسنس اور کسی دوسرے لڑکے کی موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے،(طارق محمود،محمود آباد، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی آپ کا بیان درست اور حقیقت پر مبنی ہے تو مذکورہ صورت قتل کی پانچ اقسام میں سے کسی قسم کے تحت داخل نہیں ہوتی بلکہ اِس میں موٹر سائیکل سوار کا اپنا قصور ہے کہ اُس نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی، سگنل توڑا اور اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالا ،لہٰذا شرعاً آپ پر اُس کی جان کے بدلے قصاص یا دیت واجب نہیں ہوتی ۔علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَكَذَالِكَ لَوْ تَعَمَّدَ الْمُرُوْرَ عَلَى الْحَجَرِ وَالْخَشَبِ فَعَثَرَ بِهٖ لَايَضْمَنُ الْوَاضِعُ وَقَالَ بَعْضُ مَشَايِخِنَا هٰذَا اِذَا رَشَّ بَعْضَ الطَّرِيْقِ اَوْ وَضَعَ الْحَجَرَ وَالْخَشَبَ فِيْ بَعْضِهٖ فَاَمَّا اِذَا رَشَّ كُلَّ الطَّرِيْقِ اَوْ اَحْدَثَ الْخَشَبَ فِيْ كُلِّهٖ فَمَرَّ عَلَيْهِ وَعَثَرَ بِهٖ ضَمِنَ الرَّاشُّ وَالْوَاضِعُ۔

ترجمہ:’’ اگر کوئی شخص راستے میں رکھی ہوئی لکڑی یا پتھر کے اوپر سے جان بوجھ کر گزرا اور پھسل گیا، تو (لکڑی یا پتھر رکھنے والا) اس (کی جان یا عضو کے تلف ہونے کے نقصان)

کا ضامن نہیں ہوگا، ہمارے بعض مشائخ کا قول ہے کہ یہ مسئلہ (اس صورت پرمبنی ہے) کہ راستے کے کچھ حصے میں پانی (کی وجہ سے کیچڑ) ہے یا بعض جگہ پتھر یا لکڑی رکھی ہوئی ہے، لیکن اگر کسی نے سارے راستے پر پانی ڈال دیا ہو یا سارے راستے میں لکڑی رکھ دی ہو اور راہ چلنے والا اُس پر سے گزرا اور پھسل گیا، تو پانی ڈالنے والا اور لکڑی رکھنے والا نقصان کا ضامن ہوگا، (عالمگیری، جلد:6،ص:41)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں: رَجُلٌ حَفَرَ بِئْرًا فِی الطَّرِیْقِ فَجَاءَ اِنْسَانٌ وَاَلْقٰی فِیْهَا نَفْسَهٗ مُتَعَمِّدًا لَا یَضْمَنُ الْحَافِرُ کَذَافِی "فَتَاوٰی قَاضِی خَانْ".

ترجمہ:''کسی شخص نے راستے میں کنواں کھودا اور کوئی شخص آیا اور جان بوجھ کر اُس میں اپنے آپ کو گرادیا، تو کنواں کھودنے والا ضامن نہیں ہوگا، جیسا کہ ''فتاویٰ قاضی خان'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری جلد 6 ص:45، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

ہاں! اس دوران جن لڑکوں نے آپ کو مارا اور آپ کے کان کا پردہ پھاڑ دیا، اگر اس سے آپ کی سماعت متأثر ہوئی ہو، تو مارنے والوں پر دیت لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ط

ترجمہ:'' جان کا بدلہ جان اور آنکھ کا بدلہ آنکھ اور ناک کا بدلہ ناک اور کان کا بدلہ کان اور دانت کا بدلہ دانت ہے اور زخموں میں بدلہ قصاص ہے، (سورۃ المائدہ:45)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَاِذَا ضَرَبَ اُذُنَ اِنْسَانٍ حَتّٰی ذَهَبَ سَمْعُهٗ تَجِبُ الدِّیَةُ وَطَرِیْقُ مَعْرِفَةِ ذَهَابِ سَمْعِهٖ اَنْ یُّطْلَبَ غَفْلَةً فَیُنَادِیْ فَاِنْ اَجَابَ عُلِمَ اَنَّ سَمْعَهٗ لَمْ یَذْهَبْ کَذَافِی الظَّهِیْرِیَّةِ.

ترجمہ:''اور جب کسی شخص کے کان پر ایسی ضرب لگائی ہو کہ اُس کی سماعت جاتی رہی، تو (مارنے والے پر پوری) دیت واجب ہوگی۔ اور اُس کی سماعت جانے کی معرفت کا طریقہ یہ ہے کہ اُسے ایسے وقت بلائے کہ وہ (بلانے والے کی طرف متوجہ نہ ہو اور) غفلت کے

عالم میں ہو، پس اگر وہ اُس کا جواب دے دے، تو معلوم ہو جائے گا کہ اُس کی سماعت زائل نہیں ہوئی، جیسا کہ ''فتاویٰ ظہیریہ'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص:25، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

اگر آپ کی سماعت متأثر ہوئی ہے تو آپ دیت کا مطالبہ کر سکتے ہیں، تاہم معاف کر دینا افضل ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ۔

ترجمہ: '' سو جس نے معاف کر دیا اور اصلاح کی اس کا اجر اللہ کے ذمہ (کرم) پر ہے، (الشوریٰ:40)''۔

لائسنس اور ہیلمٹ کے بغیر موٹر سائیکل چلانے کا تعلق مروّجہ قانون سے ہے اور شریعت مباح امور میں حکومت وقت کو قانون بنانے کا اختیار دیتی ہے اور ہر وہ قانون جو شریعت کے خلاف نہ ہو، اس کا احترام اور پابندی کرنی چاہیے۔ ٹریفک قوانین بھی گاڑی چلانے والے کی اپنی اور دوسروں کی جانوں کو خطرات سے امکانی حد تک محفوظ رکھنے کے لئے بنائے جاتے ہیں، لہٰذا سب کو ان کی پابندی کرنی چاہیے۔ جو لوگ اپنی غلطیوں کی بنا پر حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں، اگر حکومت قومی خزانے سے ان کو فضل واحسان کے طور پر زرِ تلافی دینا چاہے، تو یہ حکومت کا اچھا اقدام ہوگا، کیونکہ بعض حادثات کے نتیجے میں خاندان اپنے کفیل سے محروم ہو جاتے ہیں۔

گواہی کا معیار

سوال: 162

اسلام میں ایک عورت کی گواہی ہو سکتی ہے یا نہیں؟۔

جواب:

حدود اور قصاص کے معاملات میں عورت کی گواہی معتبر نہیں، نکاح اور طلاق، وصیت وغیرہ کے لئے گواہی کا شرعی معیار یہ ہے کہ دو مرد عادل یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: (وَ) نِصَابُهَا (لِغَيْرِهَا مِنَ الْحُقُوْقِ سَوَاءٌ كَانَ) الْحَقُّ

(مَالًا أَوْ غَيْرَهُ كَنِكَاحٍ وَّطَلَاقٍ وَّوَكَالَةٍ وَّوَصِيَّةٍ وَّاسْتِهْلَالِ صَبِيٍّ)وَلَوْ لِلْاِرْثِ (رَجُلَانِ أَوْ رَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ)۔

ترجمہ:''اور (گواہی کا) نصاب (حدود اور قصاص) کے سوا دیگر حقوق سے جن کا تعلق مال سے ہو یا اُن کے علاوہ مثلاً نکاح، طلاق، وکالت، وصیت اور بچے کی ولادت کی گواہی، خواہ یہ گواہی وراثت کے لئے ہو، (ان تمام صورتوں میں گواہی کا نصاب یہ ہے کہ) دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 11، ص:86-85 کتاب الشہادات)

وَتُقْبَلُ فِي الْوِلَادَةِ وَالْبِكَارَةِ وَالْعُيُوْبِ بِالنِّسَاءِ فِي مَوْضِعٍ لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ الرِّجَالُ شَهَادَةُ امْرَأَةٍ وَّاحِدَةٍ، لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: شَهَادَةُ النِّسَاءِ جَائِزَةٌ فِيْمَا لَا يَسْتَطِيْعُ الرِّجَالُ النَّظَرَ اِلَيْهِ۔

ترجمہ:''ولادت، بکارت (Virginity) کسی ایسے عضو کے بارے میں عورتوں کے عیوب جس پر مرد مطلع نہیں ہو سکتے (یعنی ان کا اُن اعضاء پر نظر ڈالنا حرام ہے)، (ان تمام امور میں) ایک عورت کی گواہی بھی قبول کی جائے گی، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: جن چیزوں پر مردوں کا نظر ڈالنا جائز نہیں ہے، ان کے بارے میں عورتوں کی گواہی جائز ہے، (ہدایہ مع شرح ہدایۃ المبتدی، جلد:05، ص:403، مکتبۃ البشریٰ)۔

راستے کی تکلیف دہ چیز ہٹانا

سوال:163

ہم نے سنا ہے کہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی کارِ ثواب ہے۔ آج کل لوگ اپنے گھر کا کچرا اور پھلوں سبزیوں کے چھلکے ادھر ادھر پھینک دیتے ہیں۔ گندگی بھی خوب کرتے ہیں۔ صاف ستھری دیواروں کو داغ دار کرتے ہیں۔ اسلام اس بارے میں کیا حکم دیتا ہے، (محمد شفاعت، اندروٹھ، آزاد کشمیر)۔

جواب:

پاکیزگی و طہارت ایمان کا لازمی جزو ہے۔ شریعت مطہرہ جہاں انفرادی صحت و صفائی

کے اصول بیان کرتی ہے وہیں صالح معاشرے کی تشکیل وتکمیل کے لیے اجتماعی کاوشوں کی طرف بھی راہ نمائی کرتی ہے۔اس ضمن میں ذیل میں چند قرآنی آیات پیش کی جارہی ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ،

ترجمہ:''بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور خوب پاکی حاصل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے،(البقرہ:222)''۔

لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ،

ترجمہ:''اس قرآن کریم کو نہیں چھوتے مگر پاکیزہ لوگ،(الواقعہ:79)''۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُؤُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا،

ترجمہ:''اے ایمان والو! جب نماز کے لیے کھڑے ہو تو اپنے چہرے دھولو اور اپنے ہاتھ کہنیوں سمیت اور اپنے سروں کا مسح کرو اور ٹخنوں سمیت اپنے پاؤں (دھولو) اور اگر جنابت کی حالت میں ہو تو اچھی طرح پاکی حاصل کرلو،(المائدہ:6)''۔

اور اب چند احادیث ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ، أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً، فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَىٰ عَنِ الطَّرِيقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ۔

ترجمہ:''رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایمان کی ستر یا ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں جن میں سب سے افضل شاخ کلمہ طیبہ کا اعتقاد ہے اور سب سے ادنیٰ شاخ راستے میں سے تکلیف دہ چیز کو دور کردینا ہے اور حیاء بھی ایمان کی شاخ ہے،(صحیح مسلم، رقم الحدیث:153)''۔

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ بِالطُّرُقَاتِ۔ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، مَا لَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا نَتَحَدَّثُ فِيهَا۔ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِذَا أَبَيْتُمْ إِلَّا الْمَجْلِسَ، فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ، قَالُوا: وَمَا حَقُّهُ؟ قَالَ: غَضُّ الْبَصَرِ، وَكَفُّ

الْأَذٰی، وَرَدُّالسَّلَامِ، وَالْأَمْرُبِالْمَعْرُوْفِ، وَالنَّهْیُ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: راستوں میں بیٹھنے سے بچا کرو، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس کے علاوہ تو ہمارے لیے چارۂ کار ہی نہیں ہے۔ یہ ہماری مجالس ہیں جہاں ہم بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: تو راستے کو اس کا حق دیا کرو، صحابہ نے عرض کیا راستے کا حق کیا ہے؟۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: (نامحرم خواتین سامنے آئیں تو) نظر نیچی رکھنا، لوگوں کو تکلیف دینے سے اجتناب کرنا، کوئی سلام کرے تو اُس کا جواب دینا، اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 5541)“۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِمَاطَةُ الْأَذٰی عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ،

ترجمہ: ”نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص راستے سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹاتا ہے تو یہ صدقہ ہے، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 5243)“۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَّمْشِیْ فِیْ طَرِيْقٍ اِذْ وَجَدَ غُصْنَ شَوْكٍ فَاَخَّرَهٗ فَشَكَرَاللّٰهُ لَهٗ فَغَفَرَلَهٗ،

ترجمہ: ”رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: ایک شخص کسی راستے پر جارہا تھا کہ اس نے ایک کانٹے دار شاخ دیکھی تو اسے راستے سے ہٹادیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ ادا قبول فرمائی اور اسے بخش دیا، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1958)“۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهٗ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْلِيَصْمُتْ،

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے، اور جو اللہ

اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے"۔
(صحیح بخاری، رقم الحدیث:6018)

عَنْ أَبِیْ شُرَیْحٍ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: وَاللّٰہِ لَایُؤْمِنُ بِاللّٰہِ، واللّٰہِ لایؤمن باللّٰہ، واللّٰہِ لایؤمن باللّٰہ، قیل: من یا رسول اللّٰہ؟ قال: الذی لایأمن جارُہٗ بَوَائِقَہٗ۔

ترجمہ: "نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں، لوگوں نے عرض کیا: ایسا شخص کون ہے؟، نبی پاک ﷺ نے فرمایا: جس کی آفتوں سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6016)"۔

گذشتہ صفحات میں سوال نمبر:161 کے جواب میں "فتاویٰ عالمگیری، جلد:06، ص:41" کے حوالے سے فقہی عبارت موجود ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ اس موقع پر اس مقام کا مطالعہ فرمالیں۔

اس مقام پر ہمارے ایک قابلِ قدر مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی زید مجدہ نے متوجہ کیا کہ دینی مدارس اور دینی اجتماعات کے اشتہارات بھی بعض اوقات لوگوں کی دیواروں پر چسپاں کر دیئے جاتے ہیں یا من پسند سلوگن اور نعرے لکھ دیئے جاتے ہیں، تو اُن کے لئے بھی مسئلہ یہی رہے گا، البتہ پبلک عمارات کی دیواروں یا پلوں وغیرہ کے اطراف کی دیواروں پر جو اشتہار لکھے جاتے ہیں یا چسپاں کئے جاتے ہیں، تو اُن کی کسی حد تک گنجائش ہے، کیونکہ اُن پر ہم نے کمرشل اشتہارات بھی لکھے ہوئے دیکھے ہیں۔ اور میری رائے میں بہتر صورت یہ ہے کہ مقامی حکومتیں خود ان کے لئے جگہیں متعین کر دیں۔

مصنوعی بال لگوانا اور بال اُگانا

سوال: 164

کیا مصنوعی بال لگوانا جائز ہے؟، (قاری بہادر خان، چترال)۔

جواب: مصنوعی بالوں کے لگوانے سے متعلق حدیث مبارک میں ہے:

عَن أَسمَاء بِنتِ اَبِی بَکرٍ قَالَت: جَاءَ تِ امرأَةٌ اِلَی النَّبِی ﷺ فَقَالَت: یَارَسُولَ اللّٰهِ اِنَّ لِی ابنَةً عُرَیساً:اَصَابَتهَا حَصبَةٌ فَتَمَرَّقَ شَعرُهَا، اَفَاَصِلُهُ؟فَقَالَ: لَعَنَ اللّٰهُ الوَاصِلَةَ وَالمُستَوصِلَةَ ۔

ترجمہ:''حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک عورت نے حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول کریم ﷺ ! میری لڑکی دلہن بنی ہے اور اسے چیچک نکل آئی ہے، جس کی وجہ سے اُس کے بال جھڑ گئے ہیں۔کیا میں اُس کے بالوں کے ساتھ بال ملاکر پیوند کردوں؟۔نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا: بال جوڑنے اور بال جڑوانے والی پراللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:5458)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَوَصلُ الشَّعرِ بِشَعرِ الآدَمِیِّ حَرَامٌ سَوَاءٌ کَانَ شَعرُهَا أَو شَعرُ غَیرِهَا،لِقَولِهِ ﷺ : لَعَنَ اللّٰهُ الوَاصِلَةَ وَالمُستَوصِلَةَ وَالوَاشِمَةَ وَالمُستَوشِمَةَ وَالوَاشِرَةِ وَالمُستَوشِرَةَ وَالنَّامِصَةَ وَالمُتَنَمِّصَةَ،

ترجمہ:''ایک آدمی کا اپنے بالوں کے ساتھ دوسرے آدمی کے بالوں کو ملانا (پیوند کرنا) حرام ہے خواہ وہ اسی عورت کے بال ہوں یا کسی اور کے ۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: اللہ تعالیٰ نے بال ملانے والی، ملوانے والی، گودنے والی ،گدوانے والی ، دانتوں کو مصنوعی طریقے سے تیز کرنے والی اور کروانے والی اور بال نوچنے والی اور نُچوانے والی پر لعنت فرمائی ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد9،ص:454)''۔

اس مسئلے کی تفصیل علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تصنیف شرح صحیح مسلم، جلد6، صفحہ:481تا487بیان کی ہے۔

لیکن آج کل چونکہ شعبۂ طب نے کافی ترقی کرلی ہے اور آدمی کے اپنے بالوں کو طبی عمل سے سر پر اُگایا جاتا ہے، جسے ہیئر پلانٹیشن (Hair Plantation) کہتے ہیں،لہٰذا میرے

نزدیک یہ عمل جائز ہے، کیونکہ ہمارے فقہاء نے عورت کے لئے اپنے گیسوؤں میں حلال جانوروں کے بال جوڑنے کی اجازت دی ہے اور اُنہوں نے حدیث پاک میں بال جوڑنے کی ممانعت کو اس پر محمول کیا ہے کہ دوسرے انسان کے بالوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَلَابَأْسَ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَجْعَلَ فِيْ قُرُوْنِهَا وَذَوَائِبِهَا شَيْئًا مِنَ الْوَبَرِ۔

ترجمہ: ''اس میں کوئی حرج نہیں کہ عورت اپنے گیسوؤں کے ساتھ (حلال) جانور کے بال یا رُواں جوڑے''۔

جب حلال جانور کے بال یا رُواں جوڑا جا سکتا ہے تو پاک چیز سے بنے ہوئے مصنوعی بال بھی جوڑے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَلَعَلَّهُ مَحْمُوْلٌ عَلٰى مَا اِذَا فَعَلَتْهُ لِتَتَزَيَّنَ لِلْأَجَانِبِ، وَاِلَّا فَلَوْ كَانَ فِيْ وَجْهِهَا شَعْرٌ يَنْفِرُ زَوْجُهَا عَنْهَا بِسَبَبِهٖ فَفِيْ تَحْرِيْمِ اِزَالَتِهٖ بُعْدٌ لِاَنَّ الزِّيْنَةَ لِلنِّسَاءِ مَطْلُوْبَةٌ لِلتَّحْسِيْنِ۔

ترجمہ: ''حدیث پاک میں بال نوچنے کی ممانعت شاید اس بات پر محمول ہے کہ کوئی عورت اجنبی مردوں کے سامنے اپنے آپ کو دلکش بنا کر آئے، لیکن اگر عورت کے چہرے پر اس طرح کے بال ہیں کہ جس سے اس کے شوہر کو نفرت پیدا ہوتی ہے، تو اس صورت میں بال نوچنے (یا کسی پاک کیمیکل یا پاوڈر یا کریم سے صاف کرنے) کو حرام قرار دینا (حکمتِ دین اور فطرت سے) بعید بات ہے، کیونکہ خواتین کو تزئین کی ضرورت ہوتی ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص:455)

زنا کا الزام

سوال:165

مسماۃ حور زعفران نے مسماۃ تاج النساء پر زنا کا الزام لگایا، مسماۃ حور زعفران نے کہا کہ مجھے عائشہ رحمٰن نے بتایا تھا۔ رات 11 بجے مسمّٰی عاشق حسین، انور اور عمران حور

زعفران کے ہمراہ میرے گھر آئے اور جرگہ شروع ہوا، میری بیوی عائشہ رحمٰن سے پوچھا گیا اور اِس بات کا ثبوت طلب کیا تو اُس نے انکار کردیا اور کہا کہ میں نے یہ بات نہ سنی ہے اور نہ ہی مجھے اِس کا پتا ہے اور قرآن اٹھانے پر تیار ہوگئی، لیکن اُس کی بات نہیں مانی گئی۔ عاشق حسین نے کہا کہ مسماۃ حور زعفران کی بات قرآن کے موافق ہے، لہٰذا آپ پچاس ہزار روپے جرمانہ ادا کریں، مجھے ڈرایا، دھمکایا گیا اور زبردستی جرمانے کی ادائیگی کی تحریر لے لی۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ الزام لگانے سے انکار کرنے والی عورت عائشہ رحمٰن یا حور زعفران، دونوں میں سے کس سے قسم لی جائے گی؟۔ (ولی الرحمٰن، آزاد کشمیر)۔

جواب:

شریعتِ مطہرہ میں زنا کا الزام لگانے والے پر لازم ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے چار ثقہ مرد گواہ عدالت کے سامنے لائے، اگر وہ گواہ نہ پیش کرسکے تو اُسے 80 کوڑوں کی سزا دی جائے گی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِيۡنَ يَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ يَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡهُمۡ ثَمٰنِيۡنَ جَلۡدَةً وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَةً اَبَدًا۔

ترجمہ: ''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں پھر (اس کے ثبوت میں) چار گواہ نہ پیش کرسکیں تو تم ان کو 80 کوڑے مارو اور ان کی شہادت کو کبھی بھی قبول نہ کرو، (النور: 4)''۔ زنا کے ثبوت کے لئے چار مسلمان آزاد مردوں کی گواہی ضروری ہے عورتوں کی گواہی سے زنا ثابت نہیں ہوتا، جس پر قرآن مجید، احادیث، اجماع فقہاء سے بکثرت دلائل موجود ہیں۔

صورتِ مسئولہ میں دو دعوے ہیں: (۱) ایک مسماۃ حور زعفران کی جانب سے مسماۃ تاج النساء پر زنا کا دعویٰ (۲) یہ کہ دعویٰ اُس نے عائشہ رحمٰن کے کہنے پر لگایا ہے۔ زنا کا الزام شرعاً ''قذف'' کہلاتا ہے، جس میں اگر مُجاز شرعی عدالت کے سامنے چار ثقہ مرد گواہوں کے ذریعے الزام ثابت ہوجائے تو مُدّعیٰ علیہ یا مُدّعیٰ علیہا (یعنی جس پر زنا کا الزام ہے) پر

حدِ زنا جاری کی جاتی ہے، جو غیر شادی شدہ کے لئے 100 کوڑے اور شادی شدہ کے لئے رجم (سنگسار) کرنا ہے۔ اور الزام ثابت نہ ہوسکے تو مُدَّعی یا مُدَّعیہ کو "حدِ قذف" لگائی جاتی ہے، جو 80 کوڑے ہے۔ لیکن یہ اسلامی حکومت کی جانب قائم کی گئی مُجاز شرعی عدالت کا کام ہے، پرائیویٹ عدالت یا برادری کا جرگہ اس کا مُجاز نہیں ہے، جرمانے کی سزا بھی غیر شرعی ہے۔ البتہ برادری میں قسم کھا کر کوئی جھوٹے الزام یا دعویٰ سے اپنی براءت ثابت کرے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس سے خاندان کے افراد کے درمیان نفرت وعداوت کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور ناجائز کردار کشی کا کسی حد تک ازالہ ہوسکتا ہے، مذکورہ بالا صورت میں قسم تاج النساء اور عائشہ رحمٰن کو دی جاسکتی ہے اور الزام غلط ثابت ہونے پر حور زعفران تاج النساء اور عائشہ رحمٰن سے معافی مانگے اور برادری میں اپنے جرم کا اعتراف کرے اور جن کی دل آزاری کی، ان سے معافی مانگے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے۔

ذخیرہ اندوز کا شرعی حکم

سوال: 166

ذخیرہ اندوزی کے بارے میں شرعی احکام بیان فرمائیں؟۔

جواب:

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روح یہ ہے کہ کاروبار فطری انداز سے جاری وساری رہے۔ طلب (Demand) اور رَسَد (Supply) میں توازن رہے۔ لہٰذا اگر مارکیٹ میں غلہ وافر مقدار میں موجود ہے تو خرید کر اسٹاک کرنا منع نہیں ہے، کیونکہ تجارتی منصوبہ بندی اسی طریقے سے ہوتی ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ اشیائے صرف (Consumer Items) میں سے کسی چیز کی پیداوار معاشرے کی ضرورت سے کم ہو یا قومی اور بین الاقوامی طور پر طلب کے مقابلے میں رَسَد کم ہوگئی ہے، تو ایسے حالات میں کوئی سرمایہ دار یا کاروباری شخص مارکیٹ سے اُس مال کو خرید کر ذخیرہ (Stock) کرلیتا ہے یا یہ مال پہلے سے اُس کے گوداموں (Stocks) میں موجود

ہے، لیکن شدید طلب کے باوجود وہ اِسے روکے رکھتا ہے اور مارکیٹ میں سپلائی نہیں کرتا کہ طلب بڑھے اور لوگ مجبوراً بنیادی ضرورت کی اشیاء کاروبار کے فطری اصول کے خلاف انتہائی مہنگے داموں خریدنے پر مجبور ہوجائیں، تو یہ ''احتکار'' ہے، ذخیرہ اندوزی (Hoarding) ہے۔ اور یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں، جو شقی القلب ہوں، سنگ دل ہوں اور لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاکر اپنی تجوریاں بھر رہے ہوں، اسے آج کل Expliotation کہتے ہیں، تو یہ عمل اور یہ طرزِ فکر غیر اسلامی ہے اور غیر انسانی بھی ہے۔ اس لئے ذخیرہ اندوز کو حدیث پاک میں خطاکار اور ملعون فرمایا گیا ہے اور اس کے لئے بڑی وعید آئی ہے:

(1) عَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قال: لایَحْتَکِرُ اِلَّا خَاطِئٌ۔

ترجمہ: ''حضرت معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ذخیرہ اندوزی صرف گنہگار شخص کرتا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4120)''۔

(2) سُنن ترمذی میں ہے: وَالعملُ علی ھٰذا عندأھلِ العلم: کرِھُوا احتکار الطَّعام و رَخَّص بَعْضُھُمْ فی الْاِحْتِکار فیْ غیْرِ الطَّعام۔ وقال ابنُ الْمُبارکْ: لابأْس بالْاِحْتِکارِ فی الْقُطْنِ والسَّخْتِیان و نحوِ ذالِک۔

ترجمہ: ''اہلِ علم کے نزدیک عمل اس پر ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں ذخیرہ اندوزی مکروہ ہے اور بعض علماء نے غیر طعام میں ذخیرہ اندوزی کی رخصت دی ہے اور عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں: کپاس اور بکری کی کھال اور اس کی مثل دوسری چیزوں کی ذخیرہ اندوزی میں حرج نہیں ہے، (سُنن ترمذی، جلد: 2، ص: 294، دار الکتب العلمیہ، بیروت)''۔

(3) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخطَّاب قال: قال رسُوْلُ اللّٰہ ﷺ: الْجالِبُ مَرْزُوْقٌ وَالْمُحْتَکِرُ مَلْعُوْنٌ۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تاجر خوش بخت ہے اور ذخیرہ اندوز ملعون ہے''۔

(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2153)

(4) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنِ احْتَكَرَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ طَعَامًا ضَرَبَهُ اللّٰهُ بِالْجُذَامِ وَالْإِفْلَاسِ۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے ہیں: جس شخص نے مسلمانوں پر ذخیرہ اندوزی کی، اللہ تعالیٰ اُس پر جذام (کوڑھ) اور افلاس کو مسلّط کردے گا، (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2155)''۔

ہر انسان فطری طور پر دولت سے محبت کرتا ہے۔ مستقبل کے لئے کچھ پس انداز کر رکھنا شرعاً درست ہے، زکوٰۃ و فطرہ کے علاوہ اپنے مال سے انفاق فی سبیل اللہ کا بڑا اجر و ثواب ہے اور جو دولت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کی جائے، اللہ تعالیٰ اُس کا اجر کئی سو گنا بڑھا کر عطا فرماتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت 261 تا 266 میں صدقہ و خیرات کی ترغیب دلائی گئی ہے، ایک جگہ ارشاد فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌO

ترجمہ: ''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانے کی طرح ہے، جس نے سات ایسے خوشے اُگائے کہ ہر خوشے میں سو دانے ہیں اور اللہ جس کے لئے چاہے ان کو دگنا کر دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا بہت علم والا ہے، (البقرہ: 261)''۔

صحابۂ کرام جو صدق و وفا کا پیکر تھے اور راہِ خدا میں اپنا مال بے دریغ لٹاتے رہے، ان آیاتِ قرآنیہ کی عملی تفسیر ہیں۔ مدینہ منورہ میں جب قحط پڑا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنا تمام مال صدقہ کر دیا:

عن ابن عبّاس قال: قحط النّاسُ فِيْ زمانِ أبِيْ بكرٍ فقالَ أبُوْبكرٍ لاتُمْسُوْنَ حتّى يُفرّجَ اللّٰهُ عنكُم فلمّا كان من الغد جاءَ البشيرُ إليه قال: قدمتْ لِعُثمانَ ألفُ راحلةٍ بُرًّا وّطعاماً قال: فغدا التُّجّارُ على عُثمانَ فقرعُوا إليه الباب فخرجَ إليهم وعليه مُلاءةٌ وقد خالف بين طرفيها على عاتقيه فقالَ لهُم ماتُرِيْدُوْنَ، قالُوا: بلغنا

اَنَّہٗ قَدِمَ لَكَ اَلْفُ رَاحِلَةٍ بُرًّا وَّطَعَامًا بِعْنَا حَتّٰی نُوَسِّعَ بِهٖ عَلٰی فُقَرَاءِ الْمَدِيْنَة فقَالَ لَهُمْ عُثْمَانُ ادْخُلُوْا،فَدَخَلُوْا فَاِذَا اَلْفُ وِقْرٍ قَدْ صُبَّ فِيْ دَارِ عُثْمَانَ فَقَالَ لَهُمْ كَمْ تُرْبِحُوْنِيْ عَلٰی شِرَائِيْ مِنَ الشَّامِ فقَالُوْا: اَلْعَشَرَةُ اِثْنَيْ عَشَرَ قَالَ :قَدْ زَادُوْنِيْ ،قَالُوْا: اَلْعَشَرَةُ اَرْبَعَةَ عَشَرَ،قَالَ: قَدْزَادُوْنِيْ قَالُوْا: اَلْعَشَرَةُ خَمْسَةَ عَشَرَ،قَالَ:زَادُوْنِيْ ،قَالُوْا: وَمَنْ زَادَكَ وَنَحْنُ تُجَّارُ الْمَدِيْنَةِ،قَالَ: زَادُوْنِيْ بِكُلِّ دِرْهَمٍ عَشَرَةً عِنْدَكُمْ زِيَادَةٌ، قَالُوْا:لَا ،قَالَ:فَأُشْهِدُكُمْ مَعْشَرَ التُّجَّارِ اِنَّهَا صَدَقَةٌ عَلٰی فُقَرَاءِ الْمَدِيْنَةِ ،قَالَ عَبْدُاللّٰه : فَبِتُّ لَيْلَتِيْ فَاِذَا اَنَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَنَامِيْ وَهُوَ عَلٰی بِرْذَوْنٍ اَشْهَبَ يَسْتَعْجِلُ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ مِّنْ نُوْرٍ وَّبِيَدِهٖ قَضِيْبٌ مِّنْ نُوْرٍ وَعَلَيْهِ نَعْلَانِ شِرَاكُهُمَا مِنْ نُوْرٍ فَقُلْتُ لَهٗ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَقَدْ طَالَ شَوْقِيْ اِلَيْكَ فقَالَ ﷺ اِنِّيْ مُبَادِرٌ لِاَنَّ عُثْمَانَ تَصَدَّقَ بِاَلْفِ رَاحِلَةٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْقَبِلَهَامِنْهُ وَزَوَّجَهٗ بِهَا عُرُوْسًا فِي الْجَنَّةِ وَاَنَا ذَاهِبٌ اِلٰی عُرْسِ عُثْمَانَ۔

ترجمہ:”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں (مدینہ میں) قحط پڑا،حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:تم صبح نہیں کرو گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تم پر (رزق) کشادہ فرمادے گا۔اگلے دن صبح یہ خبر ملی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار اونٹ گندم اور اشیائے خوراک کے منگوائے ہیں، آپ نے فرمایا:مدینے کے تاجر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، آپ گھر سے باہر تشریف لائے،اس حال میں کہ چادر آپ کے کاندھوں پر تھی اور اُس کے دونوں سرے مخالف سمت میں کاندھے پر ڈالے ہوئے تھے۔آپ نے مدینے کے تاجروں سے پوچھا کہ تم لوگ کس لئے آئے ہو؟،کہنے لگے:ہمیں خبر پہنچی ہے کہ آپ کے پاس ایک ہزار اونٹ غلے کے آئے ہیں،آپ انہیں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیجئے تاکہ ہم مدینے کے فقراء پر آسانی کریں،آپ نے فرمایا:اندر آؤ،پس وہ اندر داخل ہوئے،تو ایک ہزار تھیلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں رکھے ہوئے تھے،آپ نے فرمایا:اگر میں تمہارے

ہاتھ فروخت کروں، تم مجھے کتنا منافع دو گے؟۔ اُنھوں نے کہا: دس پر بارہ، آپ نے فرمایا: مجھے اس سے زیادہ مل رہے ہیں، اُنھوں نے کہا دس پر چودہ، آپ نے فرمایا: مجھے اس سے زیادہ مل رہے ہیں، اُنھوں نے کہا: دس پر پندرہ، آپ نے فرمایا: مجھے اس سے زیادہ مل رہے ہیں، اُنھوں نے کہا: اس سے زیادہ کون دے گا، جبکہ ہم مدینے کے تاجر ہیں (یعنی مارکیٹ کا ہمیں پتا ہے)، آپ نے فرمایا: آپ لوگوں کے ہاں نرخ زیادہ ہیں۔ اُنھوں نے کہا: نہیں، پھر آپ نے فرمایا: اے گروہِ تُجّار! تم گواہ ہو جاؤ کہ (یہ تمام مال) میں نے مدینہ کے فقراء پر صدقہ کر دیا۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ رات کے وقت رسول اللہ ﷺ میرے خواب میں تشریف لائے، آپ ﷺ سیاہی مائل سفید سواری پر تشریف فرما تھے، آپ جلدی میں تھے اور آپ کے دست مبارک میں ایک قندیل تھی جس سے روشنی نور کی طرح پھوٹ رہی تھی، نعلین مبارک کے تسموں سے نور پھوٹ رہا تھا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے آپ ﷺ کے دیدار کا طویل عرصے سے اشتیاق تھا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں جلدی میں ہوں کیونکہ عثمان نے ایک ہزار اونٹ اللہ کی راہ میں صدقہ کئے اور اللہ تعالیٰ نے اُسے قبول فرمایا اور اُن کا نکاح جنت کی ایک حور سے فرما دیا ہے اور میں عثمان کے (نکاح کی) خوشیوں میں شریک ہونے جا رہا ہوں، (ازالۃ الخفا، جلد 2، ص: 224)"۔

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

اَلْحکرُ اِدّخارُ الطّعامِ لِلتّربُّص ۔ ترجمہ: ""حکر" کا معنی ہے: کھانے پینے کی چیزوں کو (مہنگائی کے) انتظار میں ذخیرہ کرنا۔

ابن سیدہ نے کہا: اَلاِحتکارُ جَمعُ الطّعامِ وَنَحوِہٖ مِمّا یُؤکَلُ وَاحتِباسُہٗ اِنتِظارَ وَقتِ الغَلاءِ بِہٖ ۔ ترجمہ: "کھانے پینے کی چیزوں کو مہنگائی کے وقت کے لئے جمع کرنا"۔

(لسان العرب، جلد 4، ص: 208)

احتکار کی فقہی تعریفات اور احکام درج ذیل ہیں:

علامہ محی الدین شرف النووی لکھتے ہیں:

قَالَ الْعُلَمَاءُ: وَالْحِكْمَةُ فِي تَحْرِيمِ الْاِحْتِكَارِ دَفْعُ الضَّرَرِ عَنْ عَامَّةِ النَّاسِ كَمَا أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى أَنَّهُ لَوْ كَانَ عِنْدَ إِنْسَانٍ طَعَامٌ، وَاضْطَرَّ النَّاسُ إِلَيْهِ وَلَمْ يَجِدُوا غَيْرَهُ أُجْبِرَ عَلَى بَيْعِهِ دَفْعًا لِلضَّرَرِ عَنِ النَّاسِ۔

ترجمہ: ''علماء نے کہا ہے کہ احتکار کی حکمت یہ ہے کہ عام لوگوں سے ضرر کو دور کیا جائے۔ اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس اشیائے خوراک ہوں اور لوگوں کو اس طعام کی سخت ضرورت ہو اور اس کے علاوہ کہیں سے نہ ملے، تو لوگوں کو ضرر سے بچانے کے لئے اس شخص کو طعام فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے گا''۔

(شرح صحیح مسلم للنووی، جلد 5، ص: 144)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

اَلْاِحْتِكَارُ مَكْرُوْهٌ وَذَالِكَ أَنْ يَّشْتَرِيَ طَعَامًا فِيْ مِصْرٍ وَيَمْتَنِعَ مِنْ بَيْعِهِ وَذَالِكَ يَضُرُّ بِالنَّاسِ كَذَا فِي الْحَاوِيْ ۔وَإِنِ اشْتَرَى فِيْ ذَالِكَ الْمِصْرِ وَحَبَسَهُ وَلَا يَضُرُّ بِأَهْلِ الْمِصْرِ لَابَأْسَ بِهِ كَذَافِي "التَّاتَارْخَانِيَةِ" نَاقِلاً عَنِ التَّجْنِيْسِ ۔وَإِذَااشْتَرَى مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ مِّنَ الْمِصْرِ فَحَمَلَ طَعَامًا إِلَى الْمِصْرِ وَحَبَسَهُ وَذَالِكَ يَضُرُّ بِأَهْلِهِ فَهُوَ مَكْرُوْهٌ هٰذَاقَوْلُ مُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالىٰ وَهُوَ إِحْدَى الرِّوَايَتَيْنِ عَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالىٰ، وَهُوَ الْمُخْتَارُ، هٰكَذَا فِي "الْغِيَاثِيَّةِ" وَهُوَ الصَّحِيْحُ هٰكَذَا فِيْ "جَوَاهِرِ الْأَخْلَاطِيِّ" وَفِيْ جَامِعِ الْجَوَامِعِ فَإِنْ جَلَبَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ وَاحْتَكَرَ لَمْ يُمْنَعْ كَذَا فِي "التَّاتَارْخَانِيَّةِ"، وَإِنِ اشْتَرَى طَعَاماً فِيْ مِصْرٍ وَّجَلَبَهُ إِلَى مِصْرٍ آخَرَ وَاحْتَكَرَ فِيْهِ فَإِنَّهُ لَايُكْرَهُ، هٰكَذَافِي "الْمُحِيْطِ"۔

ترجمہ: ''ذخیرہ اندوزی مکروہ ہے اور یہ اس صورت میں کہ (کوئی شخص) غلّہ (کھانے پینے کی اشیاء) شہر میں خریدے اور اُن کو فروخت سے روک رکھے اور اُس سے لوگوں پر تنگی

ہوجائے، جیسا کہ "الحاوی" میں ہے۔اور اگر (صورتِ حال ایسی ہو کہ) شہر میں خرید کر روک لیا اور اس سے لوگوں پر تنگی نہیں ہوتی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ "فتاویٰ تاتارخانیہ" نے تجنیس سے نقل کیا ہے۔اور جب شہر کے قریب ہی کسی مقام سے خریدا اور اٹھا کر شہر تک لایا اور (فروخت سے) روکے رکھا، اگر اہلِ شہر کے لئے اس سے تنگی ہوتی ہو، تو یہ مکروہ ہے، یہ قول امام محمد رحمہ اللہ علیہ کا ہے، اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ سے دو روایتوں میں سے ایک روایت میں یہی منقول ہے ، اور یہی مختار قول ہے ، اسی طرح "غیاثیہ" میں ہے، یہی صحیح ہے، اسی طرح "جواہر الاخلاطی" میں بھی ہے۔اور جامع الجوامع میں ہے، پس اگر کسی دور کے مقام سے اناج خرید کر لایا اور (شہر میں) ذخیرہ کیا تو یہ منع نہیں ہے، جیسا کہ "تتارخانیہ" میں ہے اور اگر کھانے پینے کی چیزیں شہر میں خریدیں اور انہیں دوسرے شہر لے گیا اور وہاں ذخیرہ کیا تو اس میں کراہت نہیں ہے، جیسا کہ "محیط" میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، ص:213، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(و) کُرِهَ (اِحتِکَارُ قُوتِ البَشَرِ) کَتِبنٍ وَّعِنَبٍ وَّلَوزٍ (وَالبَهَائِمِ) کَتِبنٍ وَّقَتٍّ (فِی بَلَدٍ یَضُرُّ بِأَهلِهِ) لِحَدِیثِ :اَلجَالِبُ مَرزُوقٌ وَّالمُحتَکِرُ مَلعُونٌ، فَإِن لَّم یَضُرَّ لَم یُکرَه، وَمِثلُهُ تَلَقِّی الجَلَبِ (وَ)یَجِبُ أَن (یَّأمُرَهُ القَاضِی بِبَیعِ مَافَضَلَ عَن قُوتِهِ وقُوتِ أَهلِهِ ،فَإِن لَّم یَبِع)بَل خَالَفَ أَمرَ القَاضِی (عَزَّرَهُ) بِمَایَرَاهُ رَادِعًا لَّهُ (وَبَاعَ) القَاضِی (عَلَیهِ) طَعَامَهُ (وِفَاقًا) عَلَی الصَّحِیحِ۔

ترجمہ: "انسان کی خوراک (انجیر، انگور اور بادام) اور چوپایوں کی خوراک (بھوسہ اور چارہ خشک وتر)، مہنگی فروخت کرنے کے لئے ایسے شہر میں روک رکھنا مکروہ ہے، جہاں اُس کے روکنے سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو اور اگر ضرر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے ۔(احتکار کے مکروہ ہونے کی دلیل) یہ حدیث ہے کہ : تاجر خوش بخت ہیں اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے ملعون ہیں ۔پس اگر یہ ذخیرہ اندوزی لوگوں کے لئے مُضر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے، جیسے کہ

''تَلقِّی الجَلَب ''(شہر سے باہر نکل کر دیہات سے مارکیٹ میں لانے والے کو خریدنا)اور قاضی پر واجب ہے کہ ذخیرہ اندوز کے پاس اُس کی اور اُس کے گھر والوں کی قوت (ضرورت کی خوراک) سے جس قدر زائد غلہ ہو،اُس کے فروخت کرنے کا حکم دے، پھر اگر وہ نہ بیچے اور قاضی کی مخالفت کرے تو قاضی اُس کو تعزیر کرے جس طرح مناسب ہو زجر وتوبیخ کرے اور قاضی اُس کے غلے کو (زبردستی) فروخت کردے، صحیح قول کے مطابق اس پر ائمہ کا اتفاق ہے''۔علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

وَشَرعًا اِشتِراءُ طَعَامٍ وَّنَحوِهٖ وَحَبسُهٗ اِلَی الغَلَاءِ اَربعِینَ یَومًا ،لِقَولِهٖ عَلَیهِ الصَّلَاۃُ وَ السَّلَامُ :مَنِ احتَکَرَ عَلَی المُسلِمِینَ اَربَعِینَ یَومًا ضَرَبَهُ اللّٰهُ بِالجُذَامِ وَالاِفلَاسِ وَفِی رِوَایَۃٍ : فَقَد بَرِیٔ مِنَ اللّٰهِ وَبَرِیٔ اللّٰهُ مِنهُ،قَالَ فِی الکِفَایَۃِ : اَی خَذَلَهٗ وَالخُذلَانُ تَرکُ النُّصرَۃِ عِندَ الحَاجَۃِ،وَفِی اُخرٰی :فَعَلَیهِ لَعنَۃُ اللّٰهِ وَالمَلَائِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجمَعِینَ ،لَا یَقبَلُ اللّٰهُ مِنهُ صَرفًا وَّلَاعَدلًا، اَلصَّرفُ:النَّفلُ ، وَالعَدلُ:اَلفَرضُ،"شَرُنبُلَالِیَّۃ "عَنِ "الکَافِی"وَغَیرِہٖ ۔وَقِیلَ شَهرًا وَقِیلَ اَکثَرَ،وهٰذا التَّقدِیرُ لِلمُعَاقَبَۃِ فِی الدُّنیَا بِنَحوِ البَیعِ وَالتَّعزِیرُ لَا لِلاِثمِ لِحُصُولِهٖ وَاِن قَلَّتِ المُدَّۃُ وَتَفَاوُتُهٗ بَینَ تَرَبُّصِهٖ لِعِزَّتِهٖ اَو لِلقَحطِ وَالعِیَاذُ بِاللّٰهِ تَعَالیٰ۔"دُرَّ المُنتَقٰی" مَزِیدًا،وَالتَّقیِیدُ بِقُوتِ البَشَرِ قَولُ اَبِی حَنِیفَۃَ وَمُحَمَّدٍ وَّعَلَیهِ الفَتوٰی ، کَذَافِی "الکَافِی" ۔وَعَن اَبِی یُوسُفَ : کُلُّ مَا اَضَرَّ بِالعَامَّۃِ حَبسُهٗ فَهُوَ اِحتِکَارٌ ۔وَعَن مُحَمَّدٍ : اَلاِحتِکَارُ فِی الثِّیَابِ ۔

ترجمہ:''کھانے پینے کی چیزوں کو مہنگائی کے انتظار میں چالیس دن تک ذخیرہ کرنا (شرعاً) احتکار ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''جس شخص نے مسلمانوں پر چالیس دن ذخیرہ اندوزی کی، اللہ تعالیٰ اُس پر جذام (کوڑھ) اور افلاس کو مسلّط کردے گا''۔اور ایک روایت میں ہے:''وہ اللہ تعالیٰ سے بری ہوگیا اور اللہ تعالیٰ اُس سے ناراض ہوگیا''،اور ''کفایہ'' میں ہے:یعنی رسوائی اُس پر مسلط کردی جائے گی اور ضرورت کے وقت اُس کی مدد

نہیں کی جائے گی۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے: اُس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ اُس کا فرض قبول کرے گا نہ نفل، صرف سے مراد نفل اور عدل سے مراد فرض ہے، یہ ''شرنبلالیہ'' میں ''کافی'' وغیرہ سے ہے۔ بعض نے ایک ماہ اور بعض نے اس سے زیادہ کا قول کیا ہے۔ چالیس دن کی مدت اس پر دنیوی سزا مثلاً تعزیر جاری کرنے کے لئے ہے، گناہ کے لئے یہ قید نہیں ہے، اگر چند دن بھی مہنگائی کے انتظار میں یا قحط کے لئے ذخیرہ اندوزی کی تو گنہگار ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنی پناہ عطا فرمائے، ''درالمنتقی'' میں اس پر مزید اضافہ کیا: احتکار کی تعریف میں کھانے پینے کی چیزوں کی قید امام ابوحنیفہ اور امام محمد نے لگائی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، جیسا کہ ''کافی'' میں ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک ہر وہ چیز جس کی ذخیرہ اندوزی سے مسلمانوں کو ضرر ہو، وہ احتکار ہے۔ اور امام محمد رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک احتکار کپڑوں میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، ص: 487-486، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

جی۔ پی فنڈ میں اضافہ

سوال: 167

ہم ڈیفنس میں سرکاری ملازمین ہیں، ہماری ماہانہ تنخواہ سے حکومت جی۔ پی فنڈ کے طور پر کچھ رقم ہر ماہ کاٹتی ہے۔ ریٹائرمنٹ پر وہ رقم ہمیں مل جائے گی۔ یہ کمیوٹ اور پینشن کے علاوہ ہوتی ہے۔ اس رقم پر گورنمنٹ اپنی مرضی سے ایک شرح مقرر کر کے ہر سال اس میں اضافہ کرتی رہتی ہے، جس سے یہ رقم بڑھتی رہتی ہے۔ یہ فرمایئے کہ جو شرح گورنمنٹ اس رقم پر پر امداداً لگاتی ہے، وہ کیسی ہے، کیوں کہ ریٹائرمنٹ کے وقت وہ رقم اصل رقم سے زیادہ ہوگی؟، (سرکاری ملازمین، کیماڑی)۔

جواب:

حکومت ہر ملازم کی تنخواہ سے جی۔ پی فنڈ کے نام سے جو لازمی ماہانہ کٹوتی کرتی ہے، وہ رقم چوں کہ ملازم کی مِلک میں نہیں آتی، بلکہ حکومت کے پاس ہی جمع

رہتی ہے اور ملازم اس میں اپنی مرضی سے تصرف بھی نہیں کرسکتا، لہٰذا اس میں حکومت اپنی طرف سے جو اضافہ کرتی ہے، وہ اس کی طرف سے تبرُّع یعنی مہربانی اور احسان ہے۔ اس بناء پر بعض علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے، البتہ جو ملازمین زیادہ کے شوق میں اپنی رضا مندی سے اپنی تنخواہ سے اضافی کٹوتی کراتے ہیں، اس پر فیصد لینا میرے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اپنی اصل جمع شدہ رقم ہی لیں تو بہتر ہے اور جو تقویٰ پر عمل کرنا چاہیں تو وہ قناعت کریں اور اصل رقم ہی لیں اور اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھیں۔

فرائض و مستحبات سے روکنا

سوال: 168

کیا کوئی برادری، تنظیم، کمیٹی یا پنچایت کسی فرد پر کسی کی موت یا میت میں جانے، نمازِ جنازہ پڑھنے، سوئم یا قرآن خوانی میں شریک ہونے پر پابندی لگاسکتی ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

(حاجی امام الدین، گوہر آباد، دستگیر)

جواب:

اگر کوئی تنظیم، برادری، کمیونٹی یا پنچایت اپنے منشور میں یہ مقاصد شامل کرے کہ ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کریں گے، یعنی اپنی برادری میں نیکیوں کو فروغ دیں گے اور برائیوں کو مٹائیں گے تو یہ درست ہے، لیکن انہیں خلافِ شرع امور کو فروغ دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: لَاطَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ، اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ،

ترجمہ: ''یعنی کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے (خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بڑا ہو) جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، اطاعت تو فقط نیک کاموں میں لازم ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1840)''۔

نمازِ جنازہ پڑھنا فرضِ کفایہ ہے، اس میں شرکت پر پابندی لگانا حرام ہے اور حرام کے مرتکبین فاسق قرار پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی ٥ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ٥ ترجمہ: ''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو (اللہ کے) بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے، (العلق:10-9)''۔

ایصالِ ثواب کی مجالس، جن میں مجالسِ وعظ اور قرآن خوانی وغیرہ شامل ہیں، مستحب امور ہیں، ان سے روکنا مکروہِ تحریمی ہے اور اس پر یہ لوگ گناہ گار ہوں گے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک دشمن رسول کے رذیل اوصاف کے ضمن میں اُس کی ایک خصلت مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ، (یعنی خیر سے بہت زیادہ روکنے والا)، (القلم:12)''، بیان فرمائی ہے۔ مستحب پر عمل نہ کرنا خلافِ اولیٰ ہے۔

متفرق مسائل

مساجد، دینی و تعلیمی اور صنعتی و کاروباری اداروں میں مسلح حفاظتی انتظامات

سوال: 169

آج کل دہشت گردی کے پیشِ نظر مساجد کے اندرو باہر اور مدارس میں، کلاسز میں تعلیمی عمل پر نظر رکھنے کے لئے یا چوری کے واقعات کی روک تھام کے لئے جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے، کلوز سرکٹ کیمرے لگانا شرعاً جائز ہے؟۔ اسی طرح مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کا اپنی جان کی حفاظت کے پیشِ نظر حفاظتی اقدامات کرنا، سیکورٹی گارڈ متعین کرنا اور اسلحہ رکھنا جائز ہے؟، (قاضی غلام مصطفیٰ، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی)۔

جواب:

عام حالات میں ایک اسلامی ریاست وحکومت اور اسلامی معاشرے کے لئے یہ بات باعثِ افتخار نہیں ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے لئے خطرہ بن جائیں یا ایک دوسرے سے خطرہ محسوس کریں، بلکہ اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ نے تو ایک کامل مسلمان کی تعریف ہی یہ فرمائی ہے کہ: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِن لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ۔

ترجمہ: ''صحیح مسلمان وہی ہے، جس کی زبان اور ہاتھ (کی اذیّت وآزار) سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 10)۔''

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِن لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ، وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صحیح مسلمان وہی ہے، جس کی زبان اور ہاتھ (کی اذیّت وآزار) سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، صحیح مومن وہی ہے (جس کے شر) سے لوگوں کی جان ومال محفوظ رہیں''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2627)

لیکن بدقسمتی سے گذشتہ کچھ عشروں سے ہمارا ملک قتل وغارت گری، فساد اور دہشت گردی کی

زد میں ہے،اس کی وجوہ داخلی بھی ہیں اور بین الاقوامی بھی۔مساجد ومدارس،تعلیمی مراکز، پبلک مقامات یہاں تک کہ وہ ادارے بھی ،جن پر قومی سلامتی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، محفوظ نہیں ہیں۔حکومت عوام کو تحفظ دینے میں ناکام ہو چکی ہے۔عوام حکومت کو ٹیکس بھی دیتے ہیں اور پھر جو لوگ مالی استطاعت رکھتے ہیں،انہیں اپنے مکانات ،دکانوں، کارخانوں حتیٰ کہ اپنے ساتھ بھی پرائیویٹ گارڈ رکھنے پڑتے ہیں۔تحفظِ جان،تحفظِ مال، تحفظ دین اور تحفظِ آبرو مقاصدِ شرعیہ میں سے ہے اور یہ ایک مسلمہ انسانی قدر اور ضرورت بھی ہے۔لہٰذا جو ادارے اپنی حدود میں جس قدر حفاظتی اقدامات وانتظامات کر سکتے ہیں،شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عہدِ رسالت مآب اور خود رسول اللہ ﷺ سے بھی حفاظتی انتظامات کا ثبوت ملتا ہے،چند احادیثِ مبارکہ پیشِ خدمت ہیں:

أَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ سَهِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَقْدَمَهُ الْمَدِيْنَةَ لَيْلَةً، قَالَ:لَيْتَ رَجُلًا صَالِحًا يَحْرُسُنِي اللَّيْلَةَ. قَالَتْ: فَبَيْنَمَا نَحْنُ كَذَالِكَ إِذْ سَمِعْنَا خَشْخَشَةَ السِّلَاحِ، فَقَالَ: مَنْ هٰذَا؟،فَقَالَ:سَعْدُبْنُ أَبِيْ وَقَّاصٍ، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا جَاءَ بِكَ؟"،فَقَالَ سَعْدٌ: وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ خَوْفٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَجِئْتُ أَحْرُسُهُ فَدَعَا لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ نَامَ۔

ترجمہ:''ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی (ہجرت کرکے) مدینہ آمد ہوئی،تو ایک رات آپ ﷺ کی آنکھ نہ لگی،تو آپ ﷺ نے فرمایا: کاش!کوئی نیک مرد ہوتا جو آج رات میرے لئے حفاظتی پہرہ دیتا،حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ: ہم اسی خیال میں تھے کہ ہم نے ہتھیاروں کی جھنکار سنی،تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ کون ہے؟،تو انہوں نے عرض کی: سعد بن ابی وقاص، آپ ﷺ نے اُن سے فرمایا: کیسے آنا ہوا؟ ،سعد بن ابی وقاص نے عرض کی: میرے دل

میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اندیشہ ہوا (کہ کوئی آپ کو ضرر نہ پہنچادے)، اس لئے میں آپ پر پہرہ دینے کے لئے حاضر ہوا ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی اور پھر آپ (اطمینان سے) سو گئے"۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث:3756)

حضرت علی مسجدِ نبوی میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے پہرہ دیا کرتے تھے اور اس مقصد کے لئے (حجرۂ اقدس کے باہر) ایک چوکی بنائی گئی تھی، جسے "اُسطوانِ علی بن ابی طالب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حضرت موسیٰ بن سلمہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جعفر بن عبداللہ بن حسین سے "اُسطوانِ علی بن طالب" کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے فرمایا:
ترجمہ:"یہ وہ چوکی ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے حجرۂ اقدس کے دروازے کے قریب ہے، جہاں بیٹھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے پہرہ دیا کرتے تھے، (سمہودی، وفاء الوفا، جلد 2، ص:448)"۔

اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے موقع پر حفاظتی اقدامات کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے اور اسباب کو اختیار کرنا توکّل کے منافی نہیں ہے بلکہ اسباب اختیار کر کے ذاتِ مُسبّبُ الاسباب پر بھروسا کرنا عینِ توکّل ہے۔ یہ مدَنی زندگی کے ابتدائی دور کی بات ہے، پھر جب اللہ جلّ شانہٗ نے آپ ﷺ کی حفاظت اپنے ذِمّۂ کرم پر لے لی، تو پھر آپ اپنی حفاظت کے لئے اسباب سے بے نیاز ہو گئے، چنانچہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحْرَسُ حَتّٰى نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" فَأَخْرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَأْسَهٗ مِنَ الْقُبَّةِ فَقَالَ لَهُمْ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ انْصَرِفُوْا فَقَدْ عَصَمَنِيَ اللّٰهُ۔

ترجمہ:"عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ: نبی ﷺ کی حفاظت کا اہتمام کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی:" وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ "۔ (اور اللہ

لوگوں کے شر سے آپ کی حفاظت فرمائے گا)، تو رسول اللہ ﷺ نے خیمہ مبارکہ سے اپنا سَرِ مبارک باہر نکالا اور اُن (پہرہ دینے والے صحابہ کرام) سے فرمایا: اے لوگو! چلے جاؤ، اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کا ذمہ خود لے لیا ہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:3046)''۔

کتا رکھنا اسلام میں انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے یہ وعید فرمائی ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ أَمْسَكَ كَلْبًا، فَإِنَّهُ يَنْقُصُ كُلَّ يَوْمٍ مِّنْ عَمَلِهِ قِيْرَاطٌ، إِلَّا كَلْبَ حَرْثٍ أَوْ مَاشِيَةٍ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کتا پالا، اس کے اجر سے ہر روز ایک قیراط (سونے) کے برابر اجر کم ہوتا رہے گا،۔۔۔۔۔۔۔ مگر پھر رسول اللہ ﷺ نے ضرورت کی بنا پر چوکیداری کیلئے کتا رکھنے کو اس وعید سے مستثنیٰ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَ وَأَبُوْ صَالِحٍ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: إِلَّا كَلْبَ غَنَمٍ أَوْ حَرْثٍ أَوْ صَيْدٍ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا: سوائے اس کتے کے جو بکریوں اور کھیت کی حفاظت یا شکار کے لئے پالا گیا ہو، (صحیح بخاری: 2322)''۔ ایک اور روایت میں ہے:

عَنِ ابْنِ الْمُغَفَّلِ قَالَ: أَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِقَتْلِ الْكِلَابِ ثُمَّ قَالَ: "مَا بَالُهُمْ وَبَالُ الْكِلَابِ" ثُمَّ رَخَّصَ فِيْ كَلْبِ الصَّيْدِ وَكَلْبِ الْغَنَمِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مغفل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے صحابہ کو کتوں کے قتل کرنے کا حکم دیا، پھر فرمایا: انہیں کتوں کے قتل کرنے سے کیا ملے گا؟ پھر آپ ﷺ نے شکار اور بکریوں کی حفاظت کے لئے کتے رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی، (صحیح مسلم: 4018)''۔

یہ عالمِ اسباب ہے اور اسباب کو اختیار کرنا مقاصدِ شریعت میں سے ہے اور رسول اللہ ﷺ کی سنّتِ جلیلہ ہے۔ لہٰذا تدبیر اور توکل دونوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ اسباب کے مؤثر ہونے

اور تدبیر کے کارگر ہونے کے لئے ایمان ویقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہئے، اس کا کرم شاملِ حال ہو، تب ہی اسباب مؤثر ہوتے ہیں اور تدبیر نتیجہ خیز ہوتی ہے، ورنہ لوگوں نے ماضیِ قریب میں ایسے کئی واقعات مشاہدہ کئے، جہاں تمام تر تدابیر واسباب کے باوجود المناک حادثات رونما ہوئے۔ عالم ہو یا غیر عالم، کوئی مذہبی رہنما ہو یا عام سیاسی رہنما یا کوئی عام شہری، اگر اسے خطرات درپیش ہیں اور وہ اپنی حفاظت کے وسائل رکھتا ہے، تو مسلّح گارڈ بھی رکھ سکتا ہے، دیگر جو حفاظتی اقداماتِ درکار ہوں، وہ بھی اختیار کرسکتا ہے۔ ہم جیسے عام شہری جو اتنے مالی وسائل نہیں رکھتے کہ مسلّح گارڈ رکھ سکیں، انہیں اللہ تعالیٰ کی نصرت وحفاظت کے سہارے پر بھروسا کرنا ہوگا اور شریعت، آئین اور قانون کی رُو سے اُن کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت کی ذمّے داری ریاست وحکومت پر ہے۔ آج کل جو جدید حفاظتی وسائل دستیاب ہیں، مثلاً اداروں کے داخلی دروازے (Entrance) پر اسکینر (Scanning Machine) یا (Metal Detecter) لگانا یا ادارے کی حدود میں کلوز سرکٹ (Close Circuit) کیمرے نصب کرکے اسکرین پر تمام سرگرمیوں کی نگرانی کا عمل ضرورت کی بنا پر جائز ہے، اس سے حفاظتی عمل کے ساتھ ساتھ چوری چکاری سے بھی تحفظ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کے گودے (Pulp) کے دوبارہ استعمال (Recycling) میں لانے کا جواز

سوال:170

آج کل قرآن مجید کے ناقابلِ استعمال بوسیدہ اوراق انتہائی پرانے نسخوں اور مختلف اخبارات، رسائل، جرائد اور کتب میں درج قرآنی آیات کی حرمت کو قائم رکھنا ایک گھمبیر مسئلہ بن چکا ہے، جبکہ یہ ہماری دینی ضرورت ہے اور عقیدت کا مسئلہ بھی ہے۔ اگر کیمیائی طریقے سے ان بوسیدہ اوراق اور نسخوں سے تحریر کو مٹایا جاسکتا ہو تو کیا Recycling کرکے اس کا گودا (Pulp) دوبارہ کاغذ سازی یا گتہ سازی میں استعمال کیا جاسکتا ہے؟، اس

کیمیائی عمل سے آیات کی تحریر کی مطبوعہ روشنائی کاغذ سے جدااور تحلیل ہوکر مائع (Liquid) کی شکل اختیار کرلے گی تو اگر وہ سیال جو ایک زہریلا (Poisoned) کیمیکل ہوگا، کیا فیکٹری کے سیورج میں مل جائے تو شرعاً کوئی حرج تو نہیں ہے یا اس کے لئے کوئی انتظام لازمی ہے۔(محمد صدیق شیخ، پروگریسوٹریڈرز شریف پیلس حقانی چوک، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اوراس کی تکریم ہر مومن پر لازم ہے بلکہ اس کے ایک ایک حرف کی تعظیم لازمی ہے اور کسی بھی قسم کی دانستہ بے حرمتی ایمان سے محروم ہونے کا سبب ہے۔ بلکہ مُصحف کے علاوہ کہیں بھی اور کسی بھی چیز پر قرآنی آیات تحریر ہوتو اس کا بھی ادب اور تعظیم لازمی ہے اور بے وضو انکو ہاتھ لگانا ناجائز ہے۔ اس لئے ہمارے فقہاء نے تعظیماً بوسیدہ اور ناقابل انتفاع اوراقِ مُصحف کو جلانے اور ایسی جگہ رکھنے سے منع فرمایا ہے کہ جہاں گندگی اور غبار وغیرہ کا خدشہ ہو۔ البتہ انہوں نے ان بوسیدہ اوراق کو زمین میں دفن کرنے یا بہتے ہوئے پانی یا سمندر میں ڈال دینے یا پانی سے ان کی روشنائی اور تحریر مٹانے کے بعد بقیہ اوراق کو جلا دینے کی صورتوں کو جائز قرار دیا ہے۔ زمین میں دفن کرنے کی صورت میں لحد بنائی جائے یا گڑھے میں ڈال کر اس کے اوپر چھت ڈال دی جائے، انبیاءِ کرام علیھم السلام جیسی مقدس ہستیاں بھی زمین میں دفن ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَفِي الذَّخِيرَةِ الْمُصْحَفُ اذا صار خَلِقًا و تعذّر القراءَةُ مِنْهُ لا يُحْرَقُ بالنّارِ، اليه اشار مُحَمَّدٌ وبِهِ نَأْخُذُ، وَلَا يُكْرَهُ دَفْنُهُ، وَيَنْبَغِي أنْ يُلَفَّ بِخِرْقَةٍ طاهرة، ويُلحدُ لهُ، لأنَّهُ لَوْ شُقَّ وَدُفِنَ يَحْتَاجُ إلى اهالَة التُّرابِ عليه وفي ذالكَ نَوْعُ تحْقِيرٍ، إلَّا اذا جَعَلَ فَوْقَهُ سَقْفٌ، وَإنْ شَاءَ غَسَلَهُ بِالْمَاءِ أوْ وَضَعَهُ فِي مَوْضعٍ طاهرٍ لا تَصِلُ اليه يَدُ مُحْدِثٍ وَلَا غُبارٌ وَلا قَذَرٌ تَعْظِيمًا لِكَلامِ اللّٰه عَزَّ وجَلَّ۔

ترجمہ: ''اور ذخیرہ میں ہے کہ مُصحف جب بوسیدہ ہوجائے اور اسے پڑھا نہ جاسکتا ہوتو اس

کو آگ میں نہیں جلایا جائے گا، امام محمد رحمہ اللہ علیہ نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور اس کو دفنانا مکروہ نہیں ہے۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ مصحف کو ایک پاک کپڑے میں لپیٹ کر اور لحد (بغلی قبر کی طرح جگہ) بنا کر دفن کر دیا جائے، اگر صرف گڑھا کھودا گیا (لحد نہ بنائی) تو اس میں دفنانے کے بعد اس پر مٹی ڈالنے کی ضرورت ہوگی اور اس میں مصحف کی ایک قسم کی بے ادبی ہے۔ ہاں اگر گڑھے کے اوپر چھت بنائی جائے (پھر جائز ہے)۔ اور اگر چاہے تو اس کو پانی کے ساتھ دھو لے یا کسی پاک جگہ رکھ دے کہ جہاں بے وضو کا ہاتھ نہ لگے اور غبار اور گندگی وغیرہ نہ لگے، کلام اللہ کی تعظیم کی وجہ سے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:9، ص:518)''۔ فتاویٰ عالمگیری، جلد:5، ص:323 پر اسی طرح مذکور ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْکُتُبُ الَّتِیْ لَا یُنْتَفَعُ بِھَا یُمْحٰی عَنْھَا اسْمُ اللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ وَیُحْرَقُ الْبَاقِیْ۔

ترجمہ: ''ایسی کتابیں جو قابلِ انتفاع نہ رہی ہوں ان سے اسماءِ الٰہیہ، اسماءِ ملائکہ اور اسماءِ رُسل علیہم السلام مٹا دیئے جائیں اور بقیہ اوراق جلا دیئے جائیں''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد:9، ص:518)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: حاصل البتہ قواعد بغدادی وابجد اور سب کتب غیر منتفع بھا (یعنی جن سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا ہو) ماورائے مصحف کریم کو جلا دینا بعد محوِ اسماء باری تعالیٰ اور اسمائے رُسل وملائکہ علیہم السلام اجمعین کے جائز ہے۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:23، ص:339)

نیز ہمارے فقہاء نے جاری پانی میں ڈالنے کا حکم غالباً اسی لئے دیا ہے کہ اس کی تحریر مٹ جائے، باقی اوراق اگر کہیں گر جائیں تو بے ادبی نہ ہو، اس لئے کہ تحریر مٹنے سے اس میں تغیر آ گیا اور تغیر آنے سے ''شے'' کا حکم بدل جاتا ہے اور فتویٰ اسی قول پر ہے۔

آج کل کے مطبوعہ حروف ونقوش کو عام پانی سے مٹانا ممکن نہیں۔ لہٰذا سوال میں جو صورت

بیان کی گئی ہے ،وہ یہ ہے کہ کیمیکل کے ذریعے مطبوعہ حروف کو مٹادیا(Wash Out)جائے اور اس کیمیکل سیّال مادّے (Liquid) کو پاک جگہ بہادیا جائے ۔ اس طرح جو کچھ باقی بچے گا ،وہ کاغذ نہیں رہے گا بلکہ گودے (Pulp) کی شکل میں ہوگا اور اس کی ماہیت بدل جائے گی ،اس کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ماہیّت کے بدل جانے کے بعد چیز کا حکم بھی بدل جاتا ہے، لہٰذا اب وہ اوراق قرآن نہیں ہیں اور اگر ان کی تشکیل نو (Recycling) ہوسکتی ہو، تو اس کا متبادل استعمال بھی جائز ہے۔ ہمارے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ترجمہ:''اور مجتبیٰ کی عبارت ہے کہ ناپاک تیل اگر صابون میں ڈالا گیا تو اس کی طہارت کا حکم دیا جائے گا، کیونکہ اس کی ماہیّت بدل گئی اور امام محمد کے نزدیک ماہیّت بدل جانے سے چیز پاک ہو جاتی ہے اور عمومِ بلوٰی (عام لوگوں کے اس میں مبتلا ہونے) کی وجہ سے اسی پر فتویٰ دیا جائے گا۔ اور اسی سے یہ مسئلہ بھی نکالا جائے گا کہ اگر انسان یا کتا صابون بنانے والے برتن میں گر جائیں (اور تحلیل ہو جائیں) تو وہ صابون بن جائیں گے، تو حقیقت بدلنے کی وجہ سے وہ پاک ہو جائیں گے۔ پھر جان لے کہ امام محمد کے نزدیک (حکم کے بدلنے) کی علّت تغیُّر اور انقلابِ حقیقت ہے اور عمومِ بلوٰی کی وجہ سے اسی پر فتویٰ دیا جائے گا، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ حکم صرف صابون کے ساتھ خاص نہ ہو، بلکہ اس میں ہر وہ چیز داخل ہو جائے گی جسمیں تغیر اور حقیقت کا بدلنا پایا جائے اور اس میں عمومِ بلوٰی بھی ہو۔ علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(لَا) یَکُوْنُ نَجِسًا (رَمَادُ قَذَرٍ) وَاِلَّا لَزِمَ نَجَاسَةُ الْخُبْزِ فِیْ سَائِرِ الْاَمْصَارِ (وَ) لَا (مِلْحٌ کَانَ حِمَارًا) اَوْخِنْزِیْرًا وَلَا قَذَرٌ وَقَعَ فِیْ بِئْرٍ فَصَارَ حَمْأَۃً لِاِنْقِلَابِ الْعَیْنِ، بِهٖ یُفْتٰی۔

ترجمہ:''کوڑا جل کر راکھ بن جائے تو ناپاک نہیں رہتا ورنہ وہ تمام علاقے جہاں ایسی آگ پر روٹی پکائی جاتی ہے، لازماً ناپاک قرار پاتی۔ اور نہ وہ نمک ناپاک ہے جو اوّل گدھا تھا

یا خنزیر (یعنی نمک کی کان میں گرنے سے گدھا یا خنزیر کی پوری ماہیت تبدیل ہوگئی، جس کی وجہ سے اب وہ گدھے یا خنزیر کے حکم میں نہ رہے) اور نہ وہ گندگی ناپاک ہے جو کنوئیں میں گری، پھر کالی مٹی ہو کر کیچڑ ہوگئی، اس چیز کے بدلنے کی وجہ سے اسی پر فتویٰ ہے۔۔۔۔۔۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(قَوْلُہٗ لِانْقِلَابِ الْعَیْنِ) عِلَّۃٌ لِلْکُلِّ وَھٰذَا قَوْلُ مُحَمَّدٍ وَّذَکَرَ مَعَہٗ فِی "الذَّخِیْرَۃِ" وَ"الْمُحِیْطِ" "أَبَا حَنِیْفَۃَ" "حِلْیَۃ" قَالَ فِی "الْفَتْحِ": وَکَثِیْرٌ مِّنَ الْمَشَایِخِ اِخْتَارُوْہُ، وَھُوَ الْمُخْتَارُ لِأَنَّ الشَّرْعَ رَتَّبَ وَصْفَ النَّجَاسَۃِ عَلٰی تِلْکَ الْحَقِیْقَۃِ وَتَنْتَفِي الْحَقِیْقَۃُ بِانْتِفَاءِ بَعْضِ أَجْزَاءِ مَفْھُوْمِھَا فَکَیْفَ بِالْکُلِّ؟ فَاِنَّ الْمِلْحَ غَیْرُ الْعَظْمِ وَاللَّحْمِ، فَاِذَا صَارَ مِلْحًا تَرَتَّبَ حُکْمُ الْمِلْحِ۔ وَنَظِیْرُہٗ فِی الشَّرْعِ النُّطْفَۃُ نَجِسَۃٌ وَّتَصِیْرُ عَلَقَۃً وَّھِیَ نَجِسَۃٌ وَتَصِیْرُ مُضْغَۃً فَتَطْھُرُ، وَالْعَصِیْرُ طَاھِرٌ فَیَصِیْرُ خَمْرًا فَیَنْجُسُ وَیَصِیْرُ خَلًّا فَیَطْھُرُ، فَعَرَفْنَا أَنَّ اِسْتِحَالَۃَ الْعَیْنِ تَسْتَتْبِعُ زَوَالَ الْوَصْفِ الْمُرَتَّبِ عَلَیْھَا۔

ترجمہ: ''اس چیز کی ماہیت وحقیقت کے بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے، یہ علت (Cause) سب چیزوں کے لئے ہے اور یہ امام محمد کا قول ہے اور اس کے ساتھ ''حلیہ'' میں ''ذخیرہ اور محیط'' کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کا بھی قول ہے۔ علامہ ابن ھمام نے ''فتح القدیر'' میں لکھا ہے کہ اکثر مشائخ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور یہی قول مختار ہے، کیونکہ شریعت نے اسی حقیقت پر وصفِ نجاست کو مرتب کیا ہے اور اپنے مفہوم کے بعض اجزاء کے نہ ہونے سے حقیقت کی بھی نفی ہو جاتی ہے، تو جب کسی چیز کے تمام اجزاء، (اپنی سابقہ وضع وہیئت کے ساتھ) معدوم ہو جائیں، تو اس کی حقیقت معدوم کیوں نہیں ہوگی؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔اور شرع میں اس کی نظیر یہ ہے کہ نطفہ (منی) نجس ہے اور وہ (ماں کے رحم میں) جب منجمد خون کی شکل اختیار کرتا ہے، تب بھی وہ نجس ہوتا ہے اور پھر جب وہ گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے تو

پاک ہوجاتا ہے۔اور پھل وغیرہ سے کشید کیا ہوا رس پاک ہوتا ہے، پھر جب پھلوں کا رس سڑ جانے سے خمر (شراب) بن جاتا ہے تو نجس ہوجاتا ہے (کیونکہ اب اس کی حقیقت بدل گئی ہے)، پھر یہی شراب جو حرام اور نجس ہے جب (نمک اور لیموں ڈالنے سے) سرکہ بن جاتا ہے، تو (اپنی حقیقت کے بدل جانے سے) پاک ہوجاتا ہے"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:1، ص:463، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

اس استدلال پر یہ اعتراض درست نہیں ہوگا کہ صابن، کریم اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ میں اگر خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہو، تو علماء اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے استعمال کے عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، حالانکہ ان چیزوں میں بھی اختلاط کی وجہ سے چربی کی ماہیت بدل جاتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ان چیزوں میں شریعت کے مقصد کو باطل کرنے کے لئے ارادتاً اس نجس اور حرام چیز کی ملاوٹ کی جاتی ہے، لہٰذا اس کی حرمت کا فتویٰ درست ہے۔اس کے برعکس ہم نے فقہاءِ کرام کے حوالے سے صابن بنانے والے بوائلر (Boiler) یا نمک کی کان میں گر کر تحلیل ہوجانے والی حرام چیز کی طہارت کا فتویٰ ضرورت کی بنا پر دیا ہے، کیونکہ یہاں ارادتاً ایسا نہیں کیا جاتا۔اسی طرح قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کے حوالے سے ان کے حروف کی روشنائی محو ہونے کے بعد گودے کے استعمال کے جواز کا فتویٰ مقصدِ شریعت کو باطل کرنے کے لئے نہیں بلکہ حرمتِ قرآن کو قائم رکھتے ہوئے ضرورت کی بنا پر دے رہے ہیں، کیونکہ آج کے دور میں یہ ناقابلِ استعمال مواد اتنا ہے کہ اس کے ادب واحترام کو قائم رکھتے ہوئے اس کو محفوظ رکھنا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔اب مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں ہم آپ کے سوالات کے براہِ راست جوابات درج کرتے ہیں:

(1) اگرچہ کیمیکل کے ذریعے مقدس اوراق کی تحریر مٹانے کا عمل آج کل جدید مشینوں سے ہوتا ہے، مگر اس عمل میں شریک کارکنوں کے لئے باوضو رہنا ضروری ہے، کیونکہ انہیں تمام بوسیدہ نسخے اور اوراق اٹھا کر مشین میں ڈالنے ہوں گے، اسی طرح قرآن مجید کی طباعت سے لے کر جلد بندی اور نقل وحمل تک کے تمام مراحل میں شریک کارکنان کو بھی باوضو رہنے

کا اہتمام کرنا چاہئے، کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْن.
ترجمہ: ''قرآن کو صرف باوضو لوگ چھوئیں، (واقعہ:79)''۔ نیز جو حکم ہم نے قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کا بتایا ہے، اس کا اطلاق قرآن مجید کے ان اوراق پر بھی ہوتا ہے، جو طباعت کے دوران ناقص رہ جاتے ہیں، جزوی طور پر طباعت ناقص (Mis Print) رہ جاتی ہے، بعض اوقات کاغذ کی شیٹس (Sheets) مڑ جانے کی وجہ سے بعض صفحات نیم طبع ہو جاتے ہیں، بعض اوقات کاغذ کے صحیح ڈائرکشن یا صحیح زاویے میں نہ ہونے کی وجہ سے مطبوعہ صفحات ٹیڑھے ہو جاتے ہیں اور یہ سب ضائع کرنے پڑتے ہیں، کیونکہ یہ کسی اور استعمال میں نہیں آسکتے نہ ہی ردّی میں بیچے جاسکتے ہیں، لہٰذا ان سب صورتوں میں وہی عمل کرنا چاہئے، جو بوسیدہ اوراق کے لئے ہے۔

(2) اس سیال مادّہ (Liquid Chemical) کو، اگر چہ وہ زہریلا کیمیکل ہو، فیکٹری کے سیوریج میں ملانے سے اجتناب کرنا لازمی ہے، کیونکہ اس زہریلے کیمیکل سے قرآن مجید کے کلماتِ مبارکہ اور اسماءِ مقدّسہ کو مٹایا گیا (Wash Out) ہے اور یہ کلماتِ قرآن کا دھوون ہے، لہٰذا اس کا ادب واحترام واجب ہے۔ لہذا اس کیمیکل کو کسی محفوظ گڑھے میں ڈالنے کا انتظام ہونا چاہئے یا اگر اسے حرارت دے کر گیس کی شکل میں تبدیل کیا جاسکتا ہو، تو ایسا کرلیا جائے، بشرطیکہ یہ گیس انسانی اور حیوانی حیات کے لئے نقصان دہ نہ ہو۔

(3) جس کیمیکل سے آیاتِ قرآنیہ اور اسماءِ مقدّسہ کو مَحو (Wash Out) کیا جائے گا، اس کا نجس اشیاء سے پاک ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ نجس اشیاء سے قرآنی آیات کا دھونا ناجائز اور بے ادبی ہے۔

(4) قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق یا قرآن مجید کی پرنٹنگ پریس کے ایسے اوراق جو ناقص طباعت کی وجہ سے ضائع کرنے پڑتے ہیں، جب کیمیکل سے ان کی تحریر کو مٹادیا جائے، تو وہ گودا (Pulp) بن جائے گا اور اب اس کی ماہیت تبدیل ہو جائے گی۔ اور تبدیلیٔ ماہیت سے حکم بدل جاتا ہے، لہٰذا اب وہ قرآن کے حکم میں نہیں ہے اور اس گودے کو دوبارہ

کاغذ سازی یا گتہ سازی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(5) اس امر پر بھی غور کر لیا جائے کہ وہ لانچیں جو مچھلیوں کے شکار کے لئے نسبتاً گہرے سمندر میں جاتی ہیں، اگر ان کے ساتھ کوئی قابلِ عمل عقد (Contract) طے پا سکتا ہو، تو پھر ان مقدّس نسخوں اور اوراق کو سمندر بُرد بھی کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ یہ آبی حیات کے لئے نقصان دہ نہ ہو اور اس سے سمندر میں آلودگی کا مسئلہ نہ پیدا ہو۔ یہ ہم نے اس لیے کہا کہ ہمیں ایک اخباری سروے کرنے والے نے بتایا کہ نیٹی جیٹی کے پل سے قرآنِ مجید کے بوسیدہ اوراق سمندر میں عرصے سے گرائے جا رہے تھے، اس کے ساتھ کچھ توہم پرست لوگ مخصوص ایام میں کھیر یا میٹھی چیزیں بنا کر سمندر میں ڈالتے تھے، اس کے نتیجے میں سمندر کے اس حصے کا پانی گدلا ہو گیا، اس میں آلودگی شامل ہو گئی اور اب وہ جگہ آبی حیات کیلئے سازگار نہیں ہے۔

عدالت میں قرآن ہاتھ میں اٹھا کر جھوٹی گواہی دینا

سوال: 171

اگر کوئی شخص عدالت میں قرآن شریف ہاتھ میں لے کر جھوٹی گواہی دے تو قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی کیا سزا ہے؟۔

محمد رفیق، زیب النساء اسٹریٹ، صدر، کراچی

جواب:

معاملات کا تعلق خواہ بندوں سے ہو (مثلاً نکاح، طلاق ودیگر معاملات کی گواہی) یا احکامِ شرع (مثلاً ہلالِ رمضان وعید کی رویت کی گواہی وغیرہ) سے ہو، ہر صورت سچائی پر عمل پیرا رہنے کا حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ ترجمہ: ''اور جھوٹی بات سے پرہیز کرو، (الحج: 30)''۔

جھوٹی قسم کھانے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ O

ترجمہ: ''بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت خریدتے ہیں، اُن لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ آخرت میں اللہ ان سے کوئی کلام فرمائے گا اور نہ ہی قیامت کے دن ان کی طرف نظر کرم فرمائے گا اور نہ اُن کو (روحانی آلائشوں سے) پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، (سورۂ آل عمران: 77)''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے حاکم کے فیصلہ سے حلف اٹھایا تاکہ اس قسم کے ذریعے کسی مسلمان شخص کا مال کھالے، وہ جس وقت اللہ سے ملاقات کرے گا، وہ اس پر غضب ناک ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل کی:

إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (سورۂ آل عمران: 77)۔ پھر حضرت اشعث بن قیس آئے اور پوچھا: حضرت ابو عبدالرحمن نے تم سے کیا حدیث بیان کی ہے؟، انہوں نے بتایا: اس اس طرح حدیث بیان کی ہے، انہوں نے کہا: یہ آیت میرے متعلق نازل ہوئی تھی، میرے عم زاد کی زمین میں میرا کنواں تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش کیا، آپ نے فرمایا: تم اس کے ثبوت میں گواہ لاؤ، ورنہ پھر اس کی قسم پر فیصلہ ہوگا، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو اس پر قسم کھالے گا! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے حاکم کے فیصلہ سے جھوٹی قسم کھائی تاکہ اس قسم کے ذریعہ وہ مسلمان کا مال کھالے وہ جب قیامت کے دن اللہ سے ملاقات کرے گا تو اللہ اس پر غضب ناک ہوگا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث :2515، 2670)''۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِاَكْبَرِ الْكَبَائِرِ اَلَا وَ قَوْلُ الزُّوْرِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ

ترجمہ: ''کیا میں تمہیں نہ بتادوں کہ کبیرہ گناہ کون سا ہے؟، جھوٹی بات یا یہ ارشاد فرمایا: جھوٹی گواہی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 5976)''۔

عَنِ ابْنِ عُمر قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:لَنْ تزُوْل قدما شَاھِدِالزُّوْرِ حتّٰی یُوْجِبَ اللّٰہُ لَہُ النَّارَ۔

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جھوٹی گواہی دینے والا اپنا قدم ہٹانے نہیں پاتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے جہنم واجب کر دیتا ہے،(سُنَن ابنِ ماجہ،رقم الحدیث:2373)''۔

عَنْ خُرَیْمِ بْنِ فَاتِكٍ قَالَ:صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ صَلَاۃَ الصُّبْحِ، فَلَمَّا انْصَرَفَ قَامَ قَائِمًا فَقَالَ: عُدِلَتْ شَھَادَۃُ الزُّوْرِ بِالْاِشْرَاكِ بِاللّٰہِ،ثَلَاثَ مَرَّاتٍ،ثُمَّ قَرَأَ:فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ O حُنَفَآءَ لِلّٰہِ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِہٖ۔

ترجمہ:''حضرت خریم بن فاتک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی اور پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:جھوٹی گواہی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے برابر ہے،آپ نے تین مرتبہ یہی ارشادفرمایا،پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: (ترجمہ:پس بتوں کی نجاستوں سے بچواور پرہیز کروجھوٹی بات سے،ہر باطل سے الگ، صرف اللہ کے ہوکر(کسی کو)اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراتے ہوئے''۔

(سُنَن ابی داوٗد،رقم الحدیث:3594)

اوراُس کی جھوٹی گواہی سے کسی کا حق سلب ہوتا ہوتو وہ جھوٹی گواہی دینے والا اُس کا بھی مجرم ہے اوراُس کی جھوٹی گواہی سے جس کا حق سلب ہوا، جب تک وہ معاف نہ کرے، اللہ عزّ وجلّ اسے معاف نہیں فرمائے گا۔اِلّا یہ کہ وہ خصوصی کرم فرمادے،حدیث پاک میں ہے:عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ، أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: الْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یُکَفِّرُ کُلَّ شَیْءٍ، اِلَّا الدَّیْنَ،

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت ہر چیز کا کفارہ بن جاتی ہے،سوائے قرض کے،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:4880)''۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ جھوٹی گواہی گناہِ کبیرہ ہے،حرام ہے،گواہی قسم کے ساتھ ہوتی

ہے۔خواہ قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا جائے یا ویسے ہی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی قسم کھائی جائے ، ہمارے ہاں چونکہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا زیادہ بھاری محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر قسم توڑی تو بڑا وبال آئے گا تو کسی حد تک قسم کی پاس داری کرتے ہیں ورنہ تمام قسموں کو ہلکا محسوس کرتے ہوئے انہیں توڑ دیتے ہیں اور ان کی پاس داری نہیں کرتے یا جھوٹی قسم کو معمولی چیز سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانا

سوال: 172

زید کی ملکیت پر بکر نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے، زید کے پاس ملکیت کے تمام تحریری شواہد بھی موجود ہیں، زید کا کہنا ہے کہ اُس نے اپنی شے بکر کو عاریتاً استعمال کے لئے دی تھی اور اب بکر اُس پر قابض ہوگیا ہے جبکہ بکر یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ شے اس (بکر) کی ملکیت ہے اور زید سے کہتا ہے کہ تم قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ، ان حالات میں شریعت کا کیا حکم ہے؟، (ملک محمود عباسی ،گلستانِ جوہر، کراچی)۔

جواب:

شریعت کا اصول ہے کہ جب کوئی بندہ کسی دوسرے شخص پر کسی چیز کا دعویٰ کرے تو بارِ ثبوت مدعی کے ذمے ہے ،وہ گواہ پیش کرے ،اگر اس کا دعویٰ گواہوں سے ثابت ہوجائے تو اس کا حق دلایا جائے گا ،اگر مُدعی کے پاس گواہ نہ ہوں تو مُدّعیٰ علیہ سے پوچھا جائے گا ،اگر وہ دعوے کا اقرار واعتراف کرتا ہے تب بھی اس پر لازم ہے کہ مدعی کا حق اسے واپس کرے۔ اور اگر وہ مُدّعی کے دعوے کو درست تسلیم نہیں کرتا بلکہ باطل قرار دیتا ہے تو عدالت اسے قسم دے گی ،اگر وہ قسم کھا کر کہہ دیتا ہے کہ مُدّعی کا دعویٰ باطل ہے، تو وہ بری ہوجائے گا۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي خُطْبَتِهِ : "اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي وَالْيَمِينُ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ"۔

ترجمہ: ''عمرو ابن شعیب اپنے والد سے،وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم

ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لئے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1341)''۔

پس صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے کہ زید کے پاس اپنے حقِ ملکیت کے ثبوت میں تمام ''تحریری شواہد'' موجود ہیں تو وہ اُنہیں عدالت میں پیش کرے، اگر ان شواہد سے عدالت مطمئن ہوجاتی ہے تو اس کے حق میں فیصلہ دے دے گی ورنہ بکر کو انکارِ دعویٰ کی صورت میں قسم دی جائے گی۔ شرعاً اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی قسم معتبر ہوتی ہے لیکن چونکہ ہمارے معاشرے میں بدقسمتی سے لوگ عام قسم کو خفیف اور معمولی سمجھتے ہیں اور قرآن پر قسم کھانے کو بھاری سمجھتے ہیں کہ اس کا وبال برداشت ہوگا، تو ایسی قسم کھاسکتا ہے یا عدالت ضروری سمجھے تو ایسی قسم دے سکتی ہے۔

بالغ نومسلم کا ختنہ

سوال: 173

بالغ شخص مسلمان ہوجائے تو ختنہ کا کیا حکم ہے اور اس کی کیا صورت ہوگی؟، (قاری محمد شوکت، گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ)۔

جواب:

یہاں بظاہر دو احکامِ شرعی کا ٹکراؤ ہے، ایک یہ کہ سترِ عورت واجب ہے اور دوسرا یہ کہ ختنہ نہ صرف یہ کہ سنتِ انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم ہے بلکہ شعائرِ اسلام میں سے ہے، اسی لئے بعض اوقات کسی گمنام مردانہ میت کو ختنہ سے شناخت کرکے مسلمان قرار دیا جاتا ہے اور اس کا جنازہ پڑھنے کا حکم ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص صاحبِ عزیمت ہے اور خود اپنا ختنہ کی ہمت رکھتا ہے اور اسے اس کا طریقہ بھی آتا ہے، اس طرح کہ اس کی جان کو خطرہ لاحق نہ ہو تو پھر اپنا ختنہ خود کرلے یہ صورت سب سے بہتر ہے۔ اگر اتفاق سے کسی نومسلم کی بیوی نرس یا ڈاکٹر ہو اور وہ ختنہ کرنا جانتی ہو تو اپنے شوہر کا ختنہ کرسکتی ہے۔ چونکہ ختنہ شعائر

اسلام میں سے ہے، جس طرح کسی مرض کے علاج کے لئے ڈاکٹر کو بقدرِ ضرورت مریض یا مریضہ کے ان جسمانی اعضاء یا حصوں کو دیکھنے کی اجازت ہے، جن کا ستر لازم ہے، اسی طرح نومسلم بالغ مسلم ڈاکٹر سے ختنہ کرا سکتا ہے اور بقدرِ ضرورت شرم گاہ کو عریاں کرسکتا ہے۔ البتہ اگر نومسلم شخص معمرّ اور ضعیف ہے اور ڈاکٹر کہے کہ اس کے لئے ختنہ کسی بڑے نقصان کا باعث ہوسکتا ہے تو وہ چھوڑ دے اور ختنہ نہ کرائے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ ''جو شخص قریب تیس برس کی عمر میں اسلام قبول کرے اس کی سنّت (ختنہ) کرانا جائز ہے یا ناجائز ہے؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''اگر ختنہ کی طاقت رکھتا ہو تو ضرور کیا جائے، حدیث میں ہے کہ ایک صاحب خدمتِ اقدس حضور سید عالم ﷺ میں حاضر ہوکر مشرف با اسلام ہوئے، حضور پُر نور ﷺ نے فرمایا: اَلْقِ عَنْكَ شَعْرَ الْكُفْرِ ثُمَّ اخْتَتِنْ رَوَاهُ الْاِمَامُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوٗدَ عَنْ عُثَيْمِ بْنِ كُلَيْبٍ اَلْحَضْرَمِيِّ الْجُهْنِيِّ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ۔

ترجمہ: ''اپنے زمانۂ کفر کے بالوں کو دور کرو پھر اپنا ختنہ کرو (یہ حدیث امام احمد اور امام ابوداؤد نے عثیم بن کلیب حضرمی جُہنی سے، اس نے اپنے باپ سے اور اس نے اپنے دادا سے روایت کی ہے)۔ ہاں! اگر خود کرسکتا ہو تو آپ اپنے ہاتھ سے کرلے یا کوئی عورت جو اس کام کو کرسکتی ہو ممکن ہو تو اس سے نکاح کرا دیا جائے وہ ختنہ کردے، اس کے بعد چاہے اُسے چھوڑ دے اور اگر یہ صورتیں نہ ہوسکیں تو حجام ختنہ کردے کہ ایسی ضرورت کے لئے ستر دیکھنا منع نہیں، درمختار میں ہے: يَنْظُرُ الطَّبِيْبُ اِلٰى مَوْضِعِ مَرَضِهَا بِقَدْرِ الضَّرُوْرَةِ اِذَالضَّرُوْرَاتُ تَتَقَدَّرُ بِقَدْرِهَا وَكَذَا نَظَرُ قَابِلَةٍ وَّخَتَّانٍ۔

ترجمہ: ''بقدرِ ضرورت طبیب جائے مرض (خواہ وہ جائے پردہ ہو) کو دیکھ سکتا ہے، اور ضروراتِ (شرعیہ) اپنی حد تک محدود رہتی ہیں (یعنی اس میں شرم وحیا ملحوظ رہے، حدِ ضرورت سے تجاوز نہ ہو اور حظِّ بصر اور لذّتِ نظر مقصود نہ ہو)، اسی طرح دایہ اور ختنہ کرنے والے کا معاملہ ہے''۔ آگے چل کر درمختار کے حوالے سے لکھتے ہیں: اَلطَّاهِرُ فِی

الْكَبِيرِ اَنَّهٗ يُخْتَنُ۔ ترجمہ: ''اور ظاہر یہ ہے کہ بالغ آدمی کا بھی ختنہ کیا جائے۔

ردالمحتار میں ہے: اَلْخِتَانُ مُطْلَقٌ يَشْمَلُ خِتَانَ الْكَبِيرِ وَالصَّغِيرِ وَهٰكَذَا اَطْلَقَهٗ فِي النِّهَايَةِ كَمَا قَدَّمْنَاهُ وَاَقَرَّهُ الشُّرَّاحُ وَالظَّاهِرُ تَرْجِيحُهٗ وَلِذَا عَبَّرَ هُنَا عَنِ التَّفْصِيلِ بِقِيلَ۔

ترجمہ: ''ختنہ کرنے کا حکم مطلق (بلا قید ذکر کیا) ہے، لہٰذا یہ حکم بڑے اور چھوٹے دونوں کو شامل ہے اور اسی طرح ''نھایہ'' میں اسے مطلق رکھا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور شارحین نے اس کو برقرار رکھا ہے، بظاہر یہی راجح ہے اس لئے یہاں لفظ قیل سے تفصیل کی تعبیر فرمائی گئی۔

ہندیہ میں ہے: ذَكَرَ الْكَرْخِيُّ فِي الْجَامِعِ الصَّغِيرِ وَيَخْتِنُهُ الْحَمَّامِيُّ كَذَا فِي الْفَتَاوٰى الْعَتَّابِيَّةِ۔

ترجمہ: ''امام کرخی نے جامع صغیر میں فرمایا کہ بالغ آدمی کا ختنہ حمام والا (یعنی حجام) کرے یونہی فتاویٰ عتابیہ میں مذکور ہے، (آج کل ڈاکٹر کی خدمت حاصل کرسکتا ہے)۔خلاصہ میں ہے: اَلشَّيْخُ الضَّعِيفُ اِذَا اَسْلَمَ وَلَا يُطِيقُ الْخِتَانَ اِنْ قَالَ اَهْلُ الْبَصَرِ لَا يُطِيقُ يُتْرَكُ۔

ترجمہ: ''بہت بوڑھا شخص اگر اسلام قبول کرے اور بوجہ ضعف وکمزوری ختنہ نہ کر سکے یا نہ کرا سکے تو اگر ماہرین طب یہ کہیں کہ (واقعی یہ شخص) ختنہ کے قابل نہیں، تو اسے بلا ختنہ ہی رہنے دیا جائے اور اس کا ختنہ نہ کیا جائے''۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 22، ص: 593 تا 595، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

کیا استخارے سے چوری کا جرم ثابت ہوسکتا ہے؟

سوال: 174

زید کا موبائل چوری ہوگیا، جس کے لئے عمرو نے استخارہ کر کے بتایا کہ بکر نے موبائل چوری کیا ہے، مگر بکر انکار کرتا ہے۔ تینوں نے حلف اٹھانے کا فیصلہ کیا، عمرو اپنے ساتھ قرآن لایا اور کہا کہ: میں اس پر ہاتھ رکھوں گا اور رکھواؤں گا۔ لوگوں نے کہا کہ یہاں دیگر قرآن

پاک بھی تو ہیں، ان پر ہاتھ کیوں نہیں رکھواتے؟، اس پر عمرو نے کہا کہ یہ میرا خاص قرآن ہے، سوال یہ ہے: (۱)۔ اس ضمن میں استخارے کی کیا حیثیت ہے، کیا استخارے سے چوری کا پتہ چل جاتا ہے؟۔ (۲)۔ کیا اتنی چھوٹی سی بات پر قرآن اٹھانا جائز ہے؟۔

(محمد آصف ہزاروی، سرجانی ٹاؤن، کراچی)

جواب:

استخارہ کے لفظی معنٰی ہیں: خیر طلب کرنا اور اس کے جامع معنٰی ہیں: ایسا مباح معاملہ جس کے نفع بخش یا نقصان دہ ہونے کا انسان اپنی عقل کی روشنی میں فیصلہ نہ کرسکے اور تردُّد میں مبتلا ہوجائے کہ اسے کروں یا نہ کروں، تو اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرے، اس کا تعلق ماضی کے معاملات سے نہیں ہے، مستقبل میں درپیش ایسے معاملات سے ہے، جن کو کرنا ہے۔

''استخارہ'' کی روح یہ ہے کہ جس بندے کو کوئی مسئلہ درپیش ہے، وہ خود استخارہ کرے، کیونکہ جتنا درد، شکستگیِ دل، حضوریِ قلب، تضرُّع وعاجزی کسی شخص کو اپنے معاملے میں ہوسکتی ہے، دوسرے شخص کو نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں ہے: رب ذوالجلال فرماتا ہے: ترجمہ: میں ان کے پاس ہوتا ہوں، جو میری (خشیت ومحبت اور انکسار کی) وجہ سے شکستہ دل رہتے ہیں، (الاسرارالمرفوعہ، رقم الحدیث: 249، کشف الخفاء، ج 1 ص: 232، الشفاء قاضی عیاض مالکی ج 1 ص: 78)''۔

وہ لوگ جو استخارے کے نام پر ماضی کے احوال بتاتے ہیں، مثال کے طور پر کسی پر کالا جادو ہوگیا ہے، سفلی عمل کردیا گیا ہے، چند سیکنڈ میں یہ تمام غیبی امور ان پر منکشف ہوجاتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں ان کا حل بھی نکل آتا ہے، اس کا ہمیں علم نہیں ہے، اس سے لوگ توہُّم پرستی اور تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں، تقدیرِ الٰہی پر رضا جو مومن کا شعار ہونا چاہیے، اُس میں کمزوری واقع ہوتی ہے۔ پھر لوگ کسی مشکل صورتِ حال میں، جب انہیں کوئی فیصلہ کن راہ سجھائی نہ دے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے براہِ راست رجوع کرنے اور اس کے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے توسُّل کے بجائے،

اِس روش کو ترک کر کے، اِس طرح کے عاملوں سے رجوع کرتے ہیں۔ استخارہ تو مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرنے کا نام ہے۔

استخارے کا مفہوم ہرگز یہ نہیں کہ کسی چور کا پتا چل جائے یا ماضی میں ہونے والے کسی واقعے کی تصدیق یا تکذیب کی جا سکے یا حقائق معلوم کئے جا سکیں، اگر ایسا ہوتا تو آج دنیا بھر میں ہونے والے جرائم قتل وغارت گری کے ملزمان کا انہی عاملوں کے ذریعے پتا چلا لیا جاتا، لہٰذا مذکورہ شخص عمرو کی بات درست معلوم نہیں ہوتی۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''کیا کسی سچی بات کے لئے قرآن کی قسم کھانا یا اس کا اٹھالینا گناہ ہے؟، آپ نے جواب میں لکھا: جھوٹی بات پر قرآن مجید کی قسم کھانا یا اٹھانا سخت گناہِ کبیرہ ہے اور سچی بات پر قرآن عظیم کی قسم کھانے میں کوئی حرج نہیں، ضرورت ہو تو اُٹھا بھی سکتا ہے، مگر اس قسم کو بلا ضرورت بہت سخت نہیں کرنا چاہیے''۔

مُخنث (ہیجڑوں) سے متعلق ضروری مسائل

سوال: 175

اگر مُخنث کا انتقال ہو جائے تو کیا اس کی میت کو غسل دینا واجب ہے؟، اسے کون غسل دے گا؟، کیا اس کی نمازِ جنازہ بھی فرضِ کفایہ ہے؟، اگر ہے تو کون سی دعا پڑھی جائے گی؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہیجڑے کی نمازِ جنازہ نہیں ہوتی اور اسے رات کی تاریکی میں دفن کیا جاتا ہے، کیا یہ درست ہے؟، کیا یہ لوگ احکامِ شرعیہ کے مُکلّف ہوتے ہیں؟، کیا مُخنث کو خیرات دینا جائز ہے؟، (مولانا محمد طاہر سرفراز، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ تخلیق سے انسان کو پیدا کیا اور اس کی دو اصناف (Gender) بنائیں، ایک مذکر (Male) اور دوسری مؤنث (Female)۔ ان دونوں کے ذریعے انسانی نسل کی افزائش اور توالد وتناسل کا نظام قائم فرمایا۔ دونوں کی جسمانی ساخت اور ہیئت ایک دوسرے سے ممتاز رکھی۔ ازدواجی زندگی میں دونوں کا وظیفۂ

عمل بھی اپنا اپنا رکھا اور دونوں کی جسمانی علامات بھی ایک دوسرے سے ممتاز رکھیں ۔ بعض عوارض میں بھی دونوں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں ۔ ان دونوں کے درمیان ایک تیسری صنف بھی پیدا فرمائی جسے "مُخنث" کہتے ہیں ۔ انگریزی میں انہیں Intersexual، isexual اور Hermaphrodite کہتے ہیں، آج کل انہیں میڈیا میں She Male کہا جاتا ہے، جیسے گونگے بہرے یا انتہائی معذور بچوں کو Special Children کہتے ہیں ۔

Eunuchs یا مخنث کا لفظ بالعموم ان مردوں کے لئے مستعمل ہے جو باطنی وظاہری مردانہ خصوصیات سے محروم ہوں، چاہے کسی پیدائشی نقص کے نتیجے میں یا بعد میں جان بوجھ کر کردیئے گئے ہوں یا حادثاتی طور ہو گئے ہوں ۔ کسی بھی انسان کی جنسی خصوصیات کا متعین ہونا ایک پیچیدہ عمل ہے جس میں متعدد عوامل کارفرما ہوتے ہیں تاہم آسان طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ جنس کا تعین تین سطحوں پر ہو سکتا ہے ۔

(1) Sex Chromosomal یعنی وہ جنس جو "حیاتی گچھا" کی ساخت کے نتیجے میں متعین ہوتی ہے ایک تندرست فرد کے اندر (46) کروموسوم یہ خلیے کے مرکز میں موجود ہوتے ہیں، اس میں سے (2) جنسی معاملات سے متعلق ہوتے ہیں، ایک تندرست عورت کے اندر دونوں کروموسوم x x (الگ کا لفظ x) ہوتے ہیں ۔ اور تندرست مرد کے اندر XY (2) Gonadal یعنی جس کا وہ تعین جو زنانہ یا مردانہ فوطوں کی موجودگی پر منحصر ہے مردوں میں Testis یا خصیے اور عورتوں میں Ovary یا بیضہ دانی

(3) Genital Sex یعنی ظاہری آلۂ تناسل کی شکل وصورت کے باعث متعین ہونے والی صنفیں، مردوں میں یہ آلۂ تناسل Penis ہے اور عورتوں میں Vagina یعنی فرج ۔ اس کے بعد جسم میں مختلف غدود ہیں جو مختلف Hormones پیدا کرتے ہیں ۔ ہارمونز ایسی رطوبتیں ہیں جو خون میں شامل ہو کر مختلف اعضاء کی نشوونما اور ان کی مسلسل ومناسب کارکردگی کا باعث بنتی ہیں ۔ ان کی کمی یا بیشی کی وجہ سے انسانی جسم کے بہت سے اعضاء وافعال میں نقص آسکتا ہے جس میں Gonads اور Genitalia بھی شامل ہیں ۔

کسی شخص کی غیر متعین جنس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں:

1۔ ظاہراً مرد غالب زنانہ خصوصیات کے ساتھ

2۔ ظاہراً عورت مردانہ خصوصیات کے ساتھ

3۔ ایک ہی فرد میں دونوں فوطوں کی موجودگی یعنی Hermaphrodites

4۔ Interest یا بالکل غیر متعین جنس

فقہی اعتبار سے مُخنث وہ ہے جس میں مرد اور عورت دونوں کی علامتیں پائی جائیں اور کسی ایک جانب کو ترجیح نہ دی جا سکتی ہو۔ اگر بلوغت سے پہلے یا بعد میں کوئی ایسی علامت پائی جائے جو کسی ایک صِنف کے زیادہ قریب ہو تو اُس پر اُسی کا حکم عائد ہوگا، اگر مذکر کی علامت غالب ہو تو اسے مردوں کے زمرے میں شامل سمجھا جائے گا۔ اور اگر مؤنث کی علامت غالب ہو تو اسے عورتوں کے زمرے میں شامل سمجھا جائے گا۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے ایک اور علامت بھی بتائی ہے، وہ یہ کہ اگر وہ ''مُخنث'' پیشاب کی ابتدا علامتِ ذکور (Male) سے کرتا ہے، تو اسے مردوں کے زمرے میں شامل کر دیں گے اور اگر علامتِ اناث (Female) سے کرتا ہے، تو اسے عورتوں کے زمرے میں شامل کر دیں گے، اگر ایسا امتیاز بھی ممکن نہ ہو اور کسی ایک جانب کی علامت غالب نہ ہو تو وہ ''خُنثیٰ مُشکِل'' ہے۔ اگر وہ چھوٹی عمر کا ہو اور حدِ شہوت کو نہ پہنچا ہو اور اس کا انتقال ہو جائے تو مرد اور عورت دونوں ہی اسے غسل دے سکتے ہیں۔ اگر بلوغت کے قریب عمر کو پہنچ کر وفات پائے یا بلوغت کو پہنچ کر وفات پائے، تو اسے غسل نہیں دیا جائے گا بلکہ تیمم کرائیں گے، اگر تیمم کرانے والا محرم ہے تو اپنے ہاتھ سے براہِ راست تیمم کرا سکتا ہے، ورنہ ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر تیمم کرائے۔ اگر وہ بچپن میں وفات پائے تو نمازِ جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد بچے والی دعا پڑھی جائے گی۔ اگر بلوغت کے قریب عمر کو پہنچ کر یا بالغ ہو کر وفات پائے، تو بالغ والی دعا پڑھی جائے گی، بہر کیف اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ اس کی قبر عام مسلمانوں کی قبر کی طرح بنائی جائے گی۔ اسے قبر میں عام مسلمانوں کی طرح قبلہ رُو

رکھا جائے گا، بہتر یہ ہے کہ اسے خواتین کی میت کی طرح اس کے محرم ہی (اگر موجود ہیں تو) باپردہ قبر میں اتاریں، اسے کفن بھی حسبِ معمول پہنایا جائے گا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مُخنّث کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جاتی اور اسے رات میں عام لوگوں سے خفیہ طور پر جنازے کے بغیر ہی دفن کیا جاتا ہے، یہ شرعاً غلط ہے۔ اگر کچھ لوگوں نے اپنی جہالت کی بنا پر اسے جنازے کے بغیر دفن کردیا اور اگر اس کی میت تازہ ہو تو قبر پر نمازِ جنازہ پڑھ لی جائے۔ اگر وہ مستحق ہے تو اسے زکوٰۃ وخیرات دی جاسکتی ہے اور دینی چاہئے۔ وہ ایمان لانے اور احکامِ شرعیہ کا مُکلّف ہے، اگر نماز باجماعت میں شریک ہے، تو بچوں کے بعد والی صف میں کھڑا ہو، اسی طرح اس پر روزہ بھی فرض ہے۔ اگر استطاعت ہے اور محرم کی رفاقتِ سفر بھی دستیاب ہے تو حج بھی فرض ہے۔ اگر بچپن میں ختنہ نہ کیا ہو تو بلوغت کے قریب پہنچنے یا بالغ ہونے کے بعد اس کا ختنہ نہ کیا جائے۔ ہمارے فقہاء نے اس کی بعض صورتیں بیان فرمائی ہیں، جن کا تذکرہ یہاں مناسب نہیں ہے۔ فقہاء نے ان کے وراثتی احکام بھی بیان فرمائے ہیں، جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ان کے اس جسمانی نقص یا کمزوری کی وجہ سے ان سے نفرت نہ کی جائے۔ یہ عام انسانوں کی طرح اللہ کی مخلوق ہیں اور ان کی یہ ہیئتِ تخلیق اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تکوینی امر کے تحت ہے۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ ان سے ہمدردی کی جائے، اگر یہ لوگ اپنے خاندانوں سے بچھڑے ہوئے ہیں تو حکومت یا دین دار اہلِ خیر ان کے لئے دارالکفالت بنائیں، یہ بہت بڑی انسانی خدمت ہوگی۔

رخصتی سے قبل شوہر کے انتقال پر عدت، مہر، تقسیمِ ترکہ وغیرہ سے متعلق 12 سوالات پر مشتمل تفصیلی فتویٰ

مؤدبانہ عرض یہ ہے کہ میری بیٹی سحرش خان بنت عقیل احمد خان کا نکاح ستمبر 2003ء میں محمد راشد الحق ولد رضاء الحق سے ہوا، ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی، لڑکا بیرونِ ملک ملازمت کرتا تھا، رخصتی 2005ء میں ہونی تھی۔ اسی اثناء میں لڑکے کا بیرونِ ملک 10 مارچ 2005ء کے دن ایکسیڈنٹ میں فوری طور پر انتقال ہوگیا، اس کا جسدِ خاکی

17 مارچ 2005ء کے دن پاکستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔
اب مجھے مندرجہ ذیل باتوں کے لئے قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی درکار ہے، میرے بارہ سوالات درج ذیل ہیں، (رضوان احمد خان، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔
نوٹ: چونکہ ایک ہی استفتاء میں بارہ سوالات دریافت کئے گئے ہیں، اس لئے ہم ترتیب وار ہر سوال درج کر کے اس کے آگے اس کا جواب درج کر رہے ہیں۔

سوال (1):176

دورانِ عدت لڑکی اپنی نوکری پر صبح جا کر دوپہر ایک بجے تک واپس آسکتی ہے یا نہیں؟۔

(نوٹ: محترمہ گورنمنٹ اسکول میں سروس کرتی ہیں)

جواب:

قرآن مجید میں عدت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا فَعَلۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ۔

ترجمہ: ''اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں چار مہینے دس دن اپنے آپ کو (اپنے آپ کو نکاح کرنے سے) روکے رکھیں، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو کوئی حرج نہیں تم پر اس بات میں جو دستور (شرع) کے موافق وہ اپنے حق میں فیصلہ کریں، (البقرہ:234)''۔

عورت کو زمانہ عدت میں گھر سے نکلنا حرام ہے، ہاں! اگر عدت موت کی ہو اور اس کے پاس کھانے کو نہ ہو، بغیر گھر سے نکلے کام نہ چل سکے گا، تو روزگار کے لئے ضرورت کے تحت گھر سے باہر جا سکتی ہے اور رات اسی گھر میں گزارے اور بغیر ضرورت شرعیہ نکلنا حرام ہے۔ چونکہ محترمہ سرکاری ملازمہ ہیں، اور حکومت پاکستان کے احکام کے تحت بیوہ کو عدت وفات کی باقاعدہ باتنخواہ رخصت ملتی ہے، اس لئے اسے گھر سے نکلنے کیلئے کوئی شرعی جواز

نہیں ہے۔تنویرالابصاروالدرالمختار میں ہے:

(وَ)الْعِدَّةُ(لِلْمَوْتِ أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍوَّعَشَرَةٌ مُطْلَقًا)وُطِئَتْ أَوْ لَا وَلَوْ صَغِيْرَةً،

ترجمہ:اور موت کی عدت مطلقاً چار ماہ دس دن ہے بیوی مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ،اگرچہ نابالغہ ہو،(درمختار جلد 5 ص:150 داراحیاء التراث العربی،بیروت)۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:وفات کی عدت عورتِ غیر حامل پر مطلقاً چار ماہ دس دن ہے خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ،مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 13 ص:293 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن،لاہور)۔

ایامِ عدت میں جن وجوہات کی بناء پر عورت گھر سے باہر نکل سکتی ہے فقہائے کرام اس کی وضاحت فرماتے ہیں،تنویرالابصاروالدرالمختار میں ہے:

(وَمُعْتَدَّةُ مَوْتٍ تَخْرُجُ فِي الْجَدِيْدَيْنِ،وَتَبِيْتُ)أَكْثَرَ اللَّيْلِ(فِيْ مَنْزِلِهَا)لِأَنَّ نَفَقَتَهَا عَلَيْهَا،فَتَحْتَاجُ لِلْخُرُوْجِ،

ترجمہ:"اور جو عورت عدت وفات گزار رہی ہو،وہ بوقت ضرورت دن یا رات میں نکل سکتی ہے،لیکن رات کا اکثر حصہ گھر میں گزارے،اس لئے کہ وہ اپنے اخراجات کی ذمہ دار خود ہے،پس وہ اس کے لئے باہر نکلنے کی محتاج ہے"۔نوٹ:"جدیدین" سے دن اور رات مراد ہیں،کیونکہ گردش لیل ونہار کی وجہ سے ہر روز نیا دن اور نئی رات طلوع ہوتی ہے۔

(درمختار جلد 5 صفحہ 180 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی،بیروت)

علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود لکھتے ہیں:

وَأَمَّا الْمُتَوَفّٰى عَنْهَا زَوْجُهَا فَلَا تَخْرُجُ لَيْلًا،وَلَا بَأْسَ بِأَنْ تَخْرُجَ نَهَارًا فِي حَوَائِجِهَا لِأَنَّهَا تَحْتَاجُ إِلَى الْخُرُوْجِ بِالنَّهَارِ لِاكْتِسَابِ مَاتُنْفِقُهُ،لِأَنَّهُ لَا نَفَقَةَ لَهَا مِنَ الزَّوْجِ الْمُتَوَفّٰى بَلْ نَفَقَتُهَا عَلَيْهَا،فَتَحْتَاجُ إِلَى الْخُرُوْجِ لِتَحْصِيْلِ النَّفَقَةِ،

ترجمہ:"اور جس عورت کا شوہر وفات پا گیا ہو وہ رات میں گھر سے نہ نکلے،اور اپنی ضروریات کیلئے دن کے وقت نکلنے میں حرج نہیں اس لئے کہ دن کے وقت روزگار کیلئے نکلنا

اس کی ضرورت ہے، کیونکہ اس کا نفقہ اسکے وفات یافتہ شوہر پر نہیں بلکہ وہ خود اس کی ذمہ دار ہے، پس اپنے مصارف کے لئے باہر نکلنا اس کی ضرورت ہے‘‘۔

(بدائع الصنائع جلد 3 صفحہ 299، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، ھند)

صورتِ مذکورہ میں چونکہ لڑکی اپنے والد کی کفالت میں ہے اور اسے کوئی معاشی ضرورت یا مجبوری بھی درپیش نہیں ہے، لہٰذا عدت کے ایام میں گھر سے نہ نکلے۔

سوال(2):177

مرنے والے کے ترکے میں بیوی کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ جبکہ میت کے ورثاء میں والد، چار بھائی اور تین بہنیں ہیں۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے اور ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں اور ترکے میں تقسیمِ وراثت سے پہلے کے واجبات (مصارفِ تکفین وتدفین، ادائیگی قرض اگر کوئی ہو، اور تہائی ترکے کی حد تک تنفیذِ وصیت اگر کوئی متوفی نے کی ہو) شرعی ترجیحات کے مطابق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 4 حصوں میں منقسم ہوگا، مرحوم کے والد کو 3 حصے، زوجہ کو 1 حصہ ملے گا، باپ کی موجودگی میں متوفی کے بھائی اور بہنیں محروم ہوں گے۔

سوال(3):178

نکاح کے وقت جو زیورات اور کپڑے دیئے گئے وہ واپس ہونگے یا نہیں؟۔

جواب:

شادی کے موقعے پر دلہن کو شوہر یا سسرال والوں کی جانب سے جو زیورات، لباس، سامان اور تحائف وغیرہ ملتے ہیں، اسے عرف عام میں ’’بری‘‘ کہا جاتا ہے۔ بری کے سامان کی ملکیت واستحقاق کا مسئلہ ہمارے معاشرے میں نارمل حالات میں اٹھتا ہی نہیں ہے، اگر عائلی وازدواجی زندگی خوشگوار ہے، باہم محبت ہے، سب معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں، تو اس طرح کے سوالات خواب وخیال میں بھی نہیں آتے چہ جائے کہ عملی زندگی

میں ان کو چھیڑا جائے۔تاہم ان کی ممکنہ صورتیں اور ان کے احکام درج ذیل ہیں:

(الف) یہ کہ کسی علاقے، کمیونٹی یا برادری میں یہ معروف اور طے شدہ اصول ہو کہ بری کا سامان شوہر یا اس کے خاندان کی ملکیت ہوتا ہے، تو عرف بھی نصِ شرع کی طرح ہوتا ہے اور اسی پر معاملات کا فیصلہ ہوگا اور عورت کے لئے محض تصرف واستعمال کی اجازت ہی سمجھی جائے گی۔اور طلاق کی صورت میں وہ سامان شوہر کا ہوگا اور اس کی وفات کی صورت میں وہ اس کے ترکے میں شمار ہوگا۔

(ب) شادی کے موقع پر اگر باقاعدہ تحریری طور پر یا زبانی طے کرلیا گیا ہو کہ بری کا سامان کس کی ملکیت ہوگا؟، تو بعد میں اسی کے مطابق عمل ہوگا اور بہتر یہی ہے کہ شادی کے موقع پر نکاح نامے میں یہ درج کرادیا جائے کہ بری کے زیورات اور سامان کس کی ملکیت ہوں گے تاکہ بعد میں خدانخواستہ طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت میں تنازع نہ پیدا ہو۔

(ج) شادی کے موقع پر یہ سامان دلہن کو ہبہ (GIFT) کردیا گیا ہو، لیکن بعد میں زوجین میں اختلافات رونما ہونے کی بناء پر نیت میں فتور آجائے تو ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) اَلْعَائِدُ فِیْ ھِبَتِہٖ کَالْعَائِدِ فِیْ قَیْئِہٖ۔

ترجمہ:''ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کرکے دوبارہ اسے چاٹ لے،(صحیح مسلم، رقم الحدیث:4171)''۔

(۲) مَثَلُ الَّذِیْ یَرْجِعُ فِیْ صَدَقَتِہٖ کَمَثَلِ الْکَلْبِ یَقِیْئُ ثُمَّ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ فَیَأْکُلُہٗ۔

ترجمہ:''جو شخص صدقہ کرکے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے،(صحیح مسلم، رقم الحدیث:4167)''۔

فقہ حنفی کی رو سے بیوی کو ہبہ کرنے کے بعد اُس سے رجوع نہیں ہوسکتا۔

امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں:''دلہن کا گہنا جوڑا جو بری میں جاتا ہے، اگر نصاً یا عرفاً اس

میں بھی تملیک ہوتی ہو، جیسے شکر، میوہ، عطر پھلیل وغیرہ میں مطلقاً ہوتی ہے، تو وہ بھی قبضہ منکوحہ، ملکِ منکوحہ ہوگا، ہمارے یہاں شرفاء کا عرفِ ظاہر یہی ہے، ولہٰذا بعد رخصت اس کے واپسی لینے کو سخت معیوب وموجبِ مطعونی جانتے ہیں، اور اگر لے لیں تو طعنہ زن یہی کہتے ہیں کہ دے کر پھیر لیا یا صرف دکھانے کو دیا تھا، جب دلہن آئی چھین لیا، یعنی یہ ان کی رسمِ معہود (UNDERSTOOD MARITAL CUSTOM) کے خلاف ہے، اس صورت میں تو اس کے لئے بعینہ وہی احکام ہوں گے جو دولہا کے جوڑے میں گزرے کہ بعد ہلاک دلہن سے تاوان لینے کا اصلاً اختیار نہیں، جیسے شکر، میوہ کا تاوان بننے کے بعد نہیں مل سکتا، اگرچہ ہنوز کھانے میں نہ آیا ہو......

آگے چل کر لکھتے ہیں...... ہاں جہاں عرف تملیک نہ ہو بلکہ صرف پہنانے کے لئے بھیجا جاتا اور بنانے والوں ہی کی ملک سمجھا جاتا ہو، وہاں دلہن کی ملک نہیں، ایک عاریت ہے کہ بحالتِ بقا جس سے رجوع ہر وقت جائز و حلال"۔

(فتاویٰ رضویہ، ج ۱۲، ص ۲۰۸، رضا فاؤنڈیشن۔ لاہور)

میری دانست میں ہمارے یہاں بھی معزز خاندانوں اور شرفا کا معمول اور عرف یہی ہے کہ بری کا سامان وزیورات وغیرہ دلہن کو بطورِ ملک دیئے جاتے ہیں اور وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہتی ہے، تاہم جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، اگر کسی خاندان، برادری، کمیونٹی یا علاقے کا رواج اور عرف یہی ہے کہ بری کے زیورات اور سامان دلہن کو عاریتاً محض استعمال کے لئے دیئے جاتے ہیں نہ کہ ملکیت کے طور پر، تو وہ اپنے عرف پر ان کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

سوال(4):179

مہر ادا ہوگا یا نہیں؟

جواب:

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وَیَتَأَکَّدُ (عِنْدَ وَطْءٍ اَوْ خَلْوَۃٍ صَحَّتْ) مِنَ

الزَّوْ جِ(اَوْ مَوْتِ اَحَدِهِمَا)

ترجمہ: ''اور منکوحہ سے وطی یا خلوتِ صحیحہ کی صورت میں یا زوجین میں سے کسی ایک کی موت واقع ہونے پر بیوی کا حق مہر مؤکد ہو جائیگا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4 ص:170، داراحیاء التراث العربی)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَالْمَهْرُ يَتَأَكَّدُ بِأَحَدِ مَعَانٍ ثَلَاثَةٍ اَلدُّخُوْلُ وَالْخَلْوَةُ الصَّحِيْحَةُ وَمَوْتُ اَحَدِ الزَّوْجَيْنِ

ترجمہ: ''اور مہر تین باتوں میں سے کسی ایک کے پائے جانے پر مؤکد ہو جائے گا یعنی مباشرت یا خلوتِ صحیحہ یا زوجین میں سے کسی ایک کی موت واقع ہونے پر''۔

(فتاوٰی عالمگیری ج ا ص ۳۰۳، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

اعلیٰحضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اسی سے ملتے جلتے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: '' جب شوہر مر جائے پورا مہر واجب ہوتا ہے اگرچہ ایک نے دوسرے کی صورت نہ دیکھی ہو اور چار مہینے دس دن کی عدت فرض ہے، اس سے پہلے نکاح حرام ہے، (فتاوٰی رضویہ جلد 12 ص:176 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔''

مندرجہ بالا حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ اُس فوت شدہ شخص کی بیوہ کو پورا مہر دیا جائے گا، اور اس کی ادائیگی تقسیم ترکہ سے پہلے ہوگی، جیسے قرض کی ہوتی ہے۔

سوال(5):180

مرنے والے نے اپنی زندگی میں اگر اپنی بیوی کے نام رقم یا اپنا انشورنس کیا ہو تو وہ بیوی کی ملکیت ہے یا ترکے میں شامل کیا جائے گا؟۔

جواب:

اگر وفات شدہ شوہر نے اپنی زندگی میں کوئی رقم، جائیداد یا چیز اپنی بیوی کے نام پر کردی ہو اور بیوی کا اس پر قبضہ مکمل ہو چکا ہو تو یہ ہبہ کہلاتا ہے اور اب وہ چیز بیوی کی ملکیت متصور ہوگی۔ ہاں اگر شوہر نے کسی بینک اکاؤنٹ یا انشورنس پالیسی میں بیوی کو نامزد

(Nominate) کیا ہوتو اس کی حیثیت وصیت کی ہے اور وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حقَّہٗ فَلا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ"۔

ترجمہ: "بیشک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے"۔

(سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2862)

اگر گروپ انشورنس میں نامزدگی کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ Employer ادارہ اپنی طے شدہ پالیسی کے تحت بیوہ ہی کو دیتا ہے، تو پھر وہ از قسمِ تبرُّع ہے، اس کا وراثت یا ترکے سے کوئی تعلق نہیں ہے، ادارہ اپنے قانون یا طے شدہ پالیسی کے تحت جس کے نام ڈرافٹ جاری کرتا ہے، وہی اس کا حق دار ہوگا۔

سوال(6): 181

مرنے والے کی فرم کے بقایا جات اگر بیوی کے نام ہوں تب وہ بیوی کی ملکیت ہے یا وہ رقم ترکے میں شامل کی جائے گی؟۔

جواب:

متوفّٰی کی فرم کے بقایا جات اگر بصورتِ حیات یا وفات اس کا استحقاق ہے، جسے عدم ادائیگی کی صورت میں عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہو، تو اس کی حیثیت ترکے کی ہے اور وہ شرعی اصولوں کے مطابق تمام جائز شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ اور اگر وہ اس کا استحقاق نہیں بلکہ کوئی فرم، ادارہ یا حکومت اپنی صوابدید سے تبرعاً اپنے فوت شدہ سابق ملازم کی بیوہ کو کچھ رقم ادا کرتی ہے، تو وہ اس کا حق ہے، جیسے حکومت وفات شدہ شوہر کی پینشن اس کی بیوہ کو دیتی ہے، اور اگر بیوہ نہیں ہے تو نابالغ بچوں کو دیتی ہے، تو یہ ترکہ نہیں ہے، حکومت یا متعلقہ ادارے کا صوابدیدی فیصلہ یا قانون ہے جو مؤثر ہے اور اس میں ترکہ جاری نہیں ہوگا۔

سوال(7):182

مرنے والے نے اگر رخصتی میں بیوی کو دینے کیلئے زیورات بنوائے تھے۔وہ اب بیوی کی ملکیت ہیں یا ترکے میں دیئے جائیں گے؟

جواب:

وفات شدہ شوہر نے جو زیورات وغیرہ بیوی کو دینے کی نیت سے بنائے تھے،مگر دیئے نہیں، وہ ترکہ ہے اور مجموعی ترکے میں شامل ہوکر تمام ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا۔

سوال(8):183

مرنے والے کی بڑا گھر لینے کی اور ماں، باپ کو حج کروانے کی خواہش تھی۔اب یہ خواہشات ترکے سے پوری ہوں گی یا ختم ہوگئیں؟۔(نوٹ:ماں کا انتقال 5 سال قبل ہو چکا تھا)

جواب:

اس کا ترکے سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہاں اگر اس نے باقاعدہ وصیت کی ہو کہ میری وفات شدہ ماں کا حج بدل میرے ترکے میں سے کرایا جائے ،تو اس کی حیثیت وصیت کی ہوگی اور تہائی ترکے کی حد تک نافذ العمل ہوگی، محض خواہش کو وصیت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

سوال(9):184

مرنے والے نے اپنی بھانجیوں کی شادی کیلئے بھانجیوں کے نام سے جو رقم جمع کی اب وہ رقم بھانجیوں کو دی جائے گی یا ترکے میں شامل کی جائے گی؟۔

جواب:

بھانجے بھانجیوں کی شادی کیلئے متوفّٰی نے جو رقم جمع کر رکھی تھی یا مختص کر رکھی تھی، لیکن اپنی زندگی میں انہیں نہیں دی،تو یہ رقم بھی مجموعی ترکے میں شامل ہوکر شرعی وارثوں میں اسلام کے قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوگی ، اور صورتِ مسئولہ میں بھانجے بھانجیاں

اس کے ورثاء میں شامل نہیں ہیں، ہاں اگر یہ لوگ نادار ہیں تو تقسیم ترکہ کے وقت اگر سب ورثاء برضا ورغبت انہیں تقسیم سے پہلے کچھ دیدیں تو قرآن کی رو سے یہ مستحسن امر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝

ترجمہ: ''اور جب (ترکے کی) تقسیم کے موقع پر (غیر وارث) رشتے دار اور یتیم اور محتاج آ جائیں تو انہیں (بھی) اس میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو ۝ اور وہ لوگ (جو وراثت میں حصے دار ہیں یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور (و بے سہارا) اولاد چھوڑ گئے ہوتے تو انہیں انکے بارے میں خدشات ہوتے، پس انہیں چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں، (النساء:9-8)'' تقسیم ترکہ کے بعد ہر وارث کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔

سوال(10):185

مرنے والے کو نکاح کے وقت انگوٹھی، گھڑی اور کپڑے دیئے گئے تھے، وہ اب کس کی ملکیت ہیں؟۔

جواب:

وفات پانے والے شوہر کو شادی کے وقت جو تحائف دیئے گئے بظاہر یہ ھبہ کے حکم میں ہیں، اس لئے یہ اشیاء بھی مجموعی ترکے میں شامل ہونگی۔

سوال(11):186

مرنے والے کی ملکیت کا حساب مکمل طور پر کس طرح سے کیا جائے گا؟۔

جواب:

یہ لایعنی سوال ہے۔

سوال(12):187

ترکے کی تقسیم کون کرے گا؟،باپ،بیوی یا بھائی؟۔

جواب:

ترکے کی تقسیم وہ تمام ورثا ءل کر کرتے ہیں،جن کا ترکے میں حصہ ہوتا ہے۔

روڈانشورنس کی رقم پر کس کا استحقاق ہے؟

سوال :188

میرے شوہر راشدالحق کا بیرونِ ملک ملازمت کے دوران 2005ء میں روڈا یکسیڈنٹ میں انتقال ہوا۔ترکے،لائف انشورنس کی رقم اور فرم کے بقایا جات وغیرہ سے متعلق میں نے آپ سے فتویٰ 2005ء میں لیا تھا،جس کے مطابق عمل بھی کیا گیا۔ 2006ء میں ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کے خلاف مقدمہ کیا تھا،جس کا فیصلہ اب 2008ء میں ہمارے حق میں ہوا ہے،ٹیکسی ڈرائیور کی غلطی سامنے آئی ۔چونکہ ڈرائیور نے اپنا روڈ انشورنس کروایا ہوا تھا،بیرون ملک یہ قانون ہوتا ہے کہ اگر کوئی روڈا یکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو جائے تو اس کا ہرجانہ انشورنس کمپنی ادا کرے گی ۔کمپنی نے مرحوم کی بیوہ (یعنی میرے نام)،والد،مرحوم کے چار بھائیوں اور تین بہنوں کے نام علیحدہ علیحدہ سب کے ناموں کے ساتھ چیک جاری کئے ہیں۔نام بنام یہ رقم ہم سب کی ملکیت ہے یا ترکے میں شمار ہوگی؟۔ 2008ء میں مرحوم راشدالحق کے والد اور ایک بہن (غیر شادی شدہ) کا انتقال ہوگیا ہے۔ اُن کا حصہ کسے ملے گا؟،(سحرش خان،فیڈرل بی ایریا،کراچی)۔

جواب:

ٹیکسی ڈرائیور کی جانب سے کروائے جانے والے روڈ انشورنس کی مَد میں ملنے والی یہ رقم از قسمِ تبرُّع ہے،اس کا وراثت یا ترکے سے کوئی تعلق نہیں ہے،کمپنی اپنے قانون یا طے شدہ پالیسی کے تحت جس کے نام ڈرافٹ جاری کرتی ہے،وہی اس کا حق دار ہوگا اور مذکورہ کمپنی کی جانب سے ہر ایک کے نام چیک جاری کئے گئے ہیں،تو وہی اُس رقم کے حق دار

ہیں، اِس کا شمار ترکے میں نہیں ہوگا۔ متوفی کے والد اور بہن کے نام جو رقم ملی ہے، اب ان کے انتقال کے بعد وہ ان کے شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگی، واللہ اعلم بالصواب

نام رکھنے سے متعلق ضروری مسائل

سوال: 189

کیا ''راعنہ'' یا راعنا یا رائحہ نام رکھنا درست ہے؟ اگر نام مناسب نہ ہو تو بدل سکتے ہیں؟۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کچھ نام بھاری ہوتے ہیں اور بچے بکثرت روتے رہتے ہیں، چڑچڑے ہوجاتے ہیں، غصیلے ہوجاتے ہیں، بیمار رہنے لگتے ہیں، لہٰذا ایسے نام بدل دینے چاہئیں، خواہ معنوی طور پر وہ نام اچھے ہی کیوں نہ ہوں، کیا شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے؟، (یاسر رحمان، ضلع کوٹلی تحصیل نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

جو بچہ زندہ پیدا ہوا ہو، خواہ پیدا ہونے کے بعد وفات پا گیا ہو، اس کا نام رکھنا سنت ہے۔ نام رکھنے اور ناموں کے ساتھ پکارنے کے بارے میں قرآن وحدیث میں تعلیمات موجود ہیں۔

برے نام سے پکارنے کی ممانعت: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ،

ترجمہ: ''اور ایک دوسرے کو برے ناموں سے نہ پکارو، (حجرات: 11)''۔

اچھے نام رکھنے کا حکم: حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنَّكُمْ تُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَسْمَائِكُمْ وَأَسْمَاءِ آبَائِكُمْ فَأَحْسِنُوا أَسْمَاءَكُمْ،

ترجمہ: ''حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہیں قیامت کے دن تمہارے اپنے ناموں اور تمہارے باپوں کے ناموں کے ساتھ پکارا جائے گا، پس اپنے (اور اپنے بچوں کے) اچھے نام رکھا کرو''۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 4909)

نوٹ: قیامت کے دن باپ کے نام سے پکارے جانے کے عنوان پر ہم نے تفہیم المسائل، جلددوم، ص:55 تا59 پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ماں کے نام سے پکارے جانے کی روایات اور توجیہات بیان کردی ہیں، یہاں ہم چند ضروری مسائل بیان کررہے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نام: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَحَبُّ الْاَسْمَاءِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالیٰ عَبْدُاللّٰہِ وَعَبْدُالرَّحْمَان،

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کو یہ نام بہت پسند ہیں: عبداللہ اور عبدالرحمٰن''۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:4910)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت سچے نام یہ ہیں: حارث (اس کے معنی ہیں: کاشت کرنے والا، کھیت میں ہل چلانے والا یعنی محنت کرنے والا) اور ہُمام (اس کے معنی ہیں: بلند ہمت بادشاہ، بہادر، سخی سردار، شیر)، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: انبیاءِ کرام علیہم السلام کے ناموں پر نام رکھو۔

اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ نام: حرب (اس کے معنی ہیں: ''جنگ'') اور مُرّہ (اس کے معنی ہیں: ''کڑوی چیز'')۔

جنگ میں چونکہ قتل وقتال ہوتا ہے، اس لئے بدفالی سے بچنا چاہئے اور کڑوی چیز سے انسان کو طبعاً نفرت ہوتی ہے اور شیطان کی کنیت ''ابومُرّہ'' ہے۔

نام کی تاثیر: حدیث پاک میں ہے:

عَبْدُالْحَمِیْدِ بْنُ جُبَیْرِبْنِ شَیْبَۃَ قَالَ: جَلَسْتُ اِلیٰ سَعِیْدِبْنِ الْمُسَیَّبِ، فَحَدَّثَنِیْ:اَنَّ جَدَّہٗ حَزْناً قَدِمَ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ: مَااِسْمُکَ قَالَ: اِسْمِیْ حَزْنٌ، قَالَ: بَلْ اَنْتَ سَھْلٌ قَالَ: مَااَنَابِمُغَیِّرٍاِسْمًاسَمَّانِیْہِ اَبِیْ،قَالَ ابْنُ الْمُسَیَّبِ: فَمَازَالَتْ فِیْنَاالْحُزُوْنَۃُبَعْدُ۔

ترجمہ: ''عبدالحمید بن جبیر بن شیبہ بیان کرتے ہیں کہ میں سعید بن مسیب کے پاس بیٹھا، تو انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کے دادا، جن کا نام ''حَزن'' تھا، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا نام کیا ہے؟، انہوں نے عرض کیا: میرا نام

''حزن'' ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: (نہیں) بلکہ تمہارا نام ''سہل'' ہے، انہوں نے عرض کیا: میں اپنے اُس نام کو جو میرے باپ نے رکھا، تبدیل نہیں کروں گا، تو سعید بن مسیّب نے کہا: تو (اسی لئے) ہمارے خاندان میں ''حزونۃ'' (سختی) ہے''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6193)

مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمہ اللہ تعالیٰ مندرجہ بالا حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''حضورِ اکرم ﷺ کا یہ نام بدلنا استحباباً (یعنی بطورِ مستحب کے) تھا اور تفاؤل (نیک فال) کے طور پر تھا، کسی کا نام رکھنے میں لغوی معنی کے ساتھ مناسبت کا لحاظ نہیں ہوتا اور اس واقعہ میں حضور اقدس ﷺ کی بات نہ ماننے کا اثر پڑا''۔

(نزھۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد: 5، ص: 593)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے خصائص میں سے ہے کہ آپ کو وحی کے ذریعے سے کسی خاص شخص پر نام کی معنوی تاثیر کا علم ہوجاتا تھا۔ اور سعید بن مسیّب کے خاندان میں سختی ان کے دادا کے رسول اللہ ﷺ کے مشورے کو نہ ماننے پر پیدا ہوئی اور ان کی نسل میں بھی یہ اثر قائم رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے بعض نام نیک فال اور استحباب کے طور پر تبدیل بھی فرمائے، کیونکہ یہ قاعدۂ کلیہ نہیں ہے کہ اگر کسی کے نام میں معنوی حسن نہیں ہے، تو اسے لازماً تبدیل کردیا جائے، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم میں سے بعض کے اسماءِ گرامی، جن میں معنوی حسن نہیں ہے، آپ ﷺ نے تبدیل نہیں فرمائے۔ بلکہ نسبت سے عقیدت کی وجہ سے امت میں یہ نام رکھنے کی روایت ہمیشہ موجود رہی ہے، کیونکہ اکابر کے نام پر نام رکھنے میں نسبت کی فضیلت کا حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، ان میں سے چند نام یہ ہیں: جیسے عباس، عثمان، مُصْعَب، حُذَیفہ، سماک، اُویس، حنظلہ، عِکرمہ، وکیع، قُتیبہ، مِسوَر، عکاشہ، عَلقمہ، عوف، جندل وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ نے اچھے نام رکھنے کی تلقین فرمائی اور چند ناموں کو آپ ﷺ نے تبدیل بھی فرمایا جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یُغَیِّرُ الْاِسْمَ الْقَبِیْحَ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ برے نام کو (اچھے نام سے) تبدیل کر دیا کرتے تھے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2839)''۔

(۲) عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدَبٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَاتُسَمِّ غُلَامَكَ رَبَاحًا، وَلَایَسَارًا وَلَا اَفْلَحَ وَلَانَافِعًا۔

ترجمہ: ''حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے لڑکے کا نام رباح، یسار، افلح اور نافع نہ رکھو، (صحیح مسلم: 5594)''۔

(۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ ابْنَةً لِعُمَرَ کَانَتْ یُقَالُ لَھَا عَاصِیَةُ فَسَمَّاھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ جَمِیْلَةَ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک صاحبزادی کا نام عاصیہ تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام جمیلہ رکھ دیا، (صحیح مسلم: 5599)''۔

رسول اللہ ﷺ نے جو نام تبدیل فرمائے، وہ دو طرح کے ہیں، ایک وہ جن کے معنی بظاہر اچھے ہیں، جیسے آپ ﷺ نے یسار (آسانی)، رَباح (نفع)، نجیح (کامیاب)، اَفلح (بہت زیادہ کامیاب)، نافع، یعلیٰ (بلندی)، بَرَکہ اور اسلام وغیرہ نام رکھنے سے منع فرمایا، کیونکہ جب یہ نام لیکر پکارا جائے گا، مثلاً: کیا اسلام، برکت، نافع وغیرہ ہیں؟، اگر وہ موجود نہیں ہیں، تو کہا جائے گا اسلام یا برکت یا نافع نہیں ہے، اس طرح سے بدفالی کا تاثر ہوگا اور اسے آپ ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا، لیکن صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ بعد میں آپ ﷺ نے ان کی ممانعت فرمانا چھوڑ دیا۔ دوسرے ایسے نام ہیں جن کے معنی اچھے نہیں ہیں، تو آپ ﷺ نے ان کو تبدیل فرمایا، جیسے مَلِكُ الاَملاك (جسے فارسی میں شاہنشاہ یعنی بادشاہوں کا بادشاہ، جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جلالت ہی پر صادق آتا ہے)، بَرّہ (اس کے معنی ہیں نیک، اس میں خودستائی اور پارسائی کے معنی پائے جاتے ہیں) اور آپ ﷺ نے اس نام کو بدل کر ''زینب'' رکھ دیا، عاص یا عاصیہ (اس کے معنی ہیں نافرمان)، آپ ﷺ

نے اسے بدل کر جمیلہ رکھ دیا، اَصرم (اس کے معنی ہیں بہت زیادہ کاٹنے والا اور محتاج)، اس کو بدل کر آپ ﷺ نے زُرعہ رکھ دیا (جس کے معنی ہیں کاشت کرنا اور بیج)، عزیز (اس کے معنی ہیں غلبے والا، یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے)، عَتَلہ (اس کے معنی ہیں سختی، شدت)، شیطان (اس کے معنی ہیں رحمتِ الٰہی اور خیر سے دور)، حَکَم (اس کے معنی ہیں حاکم اور حاکم حقیقی اللہ تعالیٰ ہے)، غُراب (دوری)، حُباب (یہ شیطان کا نام ہے اور سانپ کو بھی کہتے ہیں)، شِہاب (آگ کا شعلہ) وغیرہ۔ فقہاءِ کرام نے ایسے نام رکھنے سے منع فرمایا، جن میں تعلّی (برتری) یا خودستائی اور پارسائی کے معنی پائے جاتے ہوں، جیسے محی الدین (دین کو زندہ کرنے والا)، تاج الدین، شمس الدین، بدرالدین، شمس الاسلام اور فخر الاسلام وغیرہ۔

غریب نواز، سلطان الہند، سلطان الاولیاء اور اعلیٰ حضرت، صدر الشریعہ، صدر الافاضل، وغیرہ، یہ بعض اولیاءِ کرام اور علماءِ کبار کے القاب ہیں، لیکن یہ انہوں نے خود نہیں رکھے، نہ ہی ان کے والدین نے رکھے ہیں، بلکہ ان کے معاصر یا ان کے بعد کے صلحاءِ امت نے حسنِ عقیدت کی بنیاد پر رکھے ہیں اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ اسی طرح علماء نے محمد نبی، احمد نبی، نبی احمد وغیرہ، نام رکھنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ ان کا اطلاق صرف رسول اللہ ﷺ پر ہوسکتا ہے، اسی طرح طٰہٰ اور یٰسین نام رکھنے سے منع فرمایا ہے کہ قطعی طور پر معلوم نہیں ہیں کہ یہ اللہ کے نام ہیں یا رسول اللہ ﷺ کے نام ہیں اور یہ کہ ان کا قطعی مصداق کیا ہے؟ لہٰذا محمد طٰہٰ اور محمد یٰسین نام رکھنے سے بھی احتراز کرنا چاہئے، کیونکہ اگر یہ رسول اللہ ﷺ کے نام ہیں تو اس کے معنی ہو جائیں گے: محمد رسول اللہ ﷺ اور اس کا مصداق بھی صرف آپ ﷺ ہی ہیں۔ البتہ غلام کی نسبت سے غلام محمد، غلام احمد، غلام مصطفیٰ، غلام رسول نام رکھنے جائز ہیں اور غلام حسین، غلام علی وغیرہ نام رکھنے بھی جائز ہیں، لیکن ان کے شروع میں محمد یا احمد نہ لگایا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں آپ ﷺ کے اسمِ مبارک اور کنیت کو جمع کر کے ''ابوالقاسم محمد'' نام رکھنا منع تھا تاکہ اس شخص کو بلانے پر آپ ﷺ کا اشتباہ نہ ہو۔ علما نے

کہا ہے کہ آپ ﷺ کے وصالِ مبارک کے بعد اس کی ممانعت نہیں ہے، تاہم امام شافعی اور بعض دیگر علماء کے نزدیک اس کی ممانعت اب بھی قائم ہے، لہٰذا احتیاط بہتر ہے۔ بعض اوقات کسی بچے کا نام انتہائی اچھا اور بامعنی ہوتا ہے، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کسی نے کہا ہے کہ یہ نام بچے پر بھاری ہے، جلالی ہے، اسلئے بچہ اکثر روتا رہتا ہے یا چڑچڑا ہو گیا ہے اس لئے نام بدل دیا جائے، میرے علم میں اب تک کوئی ایسا فقہی حوالہ نہیں آیا، جو اس موقف کا مؤید ہو۔ امام احمد رضا قادری نے اسم کی مسمّٰی میں معنوی تاثیر کی جو بات کی ہے، اس کی رو سے تو اچھے معنی کے حامل اسم کی اچھی تاثیر ہونی چاہئے، اس سے اسم کی تاثیرِ بد یا بدفالی مراد لینا میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ سوال میں ''راعنہ'' نام کی بابت دریافت کیا گیا ہے، بظاہر اس اسم کے مادہ کے معنی ہیں: بیوقوف ہونا، ڈھیلا ہونا، بے احتیاط ہونا، کلام میں بیوقوف اور طیش والا ہونا، لہٰذا معنیٰ کے اعتبار سے یہ اسم درست نہیں ہے۔ ''رائحہ'' کے معنی ہیں: بُو، شام کے وقت کی بارش یا بادل، اس سے نیک فال کے طور پر خوشبو مراد لے سکتے ہیں، اسی مادہ سے ''ریحان'' ہے، جس کے معنی خوشبو کے ہیں۔

تاریخی نام: (یعنی یہ کہ نام کے حروفِ تہجی کے اَعدادِ ابجد کے حساب سے مسمّٰی کے سنِ پیدائش کے موافق ہوں) رکھنے کی بھی بطورِ سنت یا بطورِ استحباب کوئی اصل نہیں ہے، تاہم بعض اکابر علماء کے ہاں یہ شعار رہا ہے اور شریعت میں اس کی کوئی ممانعت بھی نہیں ہے، امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سرُّہ العزیز نے اپنے نام کا مادّۂ تاریخ بھی نکالا ہے اور اپنی کتابوں کے تاریخی نام بھی رکھا کرتے تھے، جیسے فتاویٰ رضویہ کا تاریخی نام انہوں نے ''العطایا النبویہ'' رکھا تھا اور اس فن میں ان کو بڑا ملکہ اور مَہارتِ تامّہ حاصل تھی اور اس سے نیک فال لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جن حضرات کے نام اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ کی طرف مضاف کر کے عبدالرحیم، عبدالرحمٰن، عبدالستار اور عبدالجبار وغیرہ ہیں، ان کو جب بھی پکارا جائے، پورا نام لیا جائے، رحمٰن صاحب، رحیم صاحب، ستار صاحب اور جبار صاحب وغیرہ کہہ کر پکارنا ناجائز ہے، کیونکہ الرحمٰن، الرحیم، اَلسَّتّار اور اَلجبّار وغیرھا اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حُسنیٰ مقدّسہ مبارکہ

ہیں۔لہٰذا بندے کو جب بھی پکاریں ''عبد'' کی اضافت کے ساتھ پکاریں۔

تقریبات میں پابندیٔ وقت کا فقدان

سوال:190

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ لوگ کسی بھی تقریب کے موقع پر رات کو دس بجے تک کھانا کھلانے کی تحریری دعوت دیتے ہیں اور رات کو 2 بجے کھانا کھلایا جاتا ہے۔اس موقع پر اگر کوئی شخص وقت کی پابندی کا تقاضا کرے اور اس کے مضر پہلوؤں پر روشنی ڈالے،مثلاً: رات کی نیند خراب کر کے دل و دماغ اور اعصابی تھکاوٹ اور دیگر بیماریوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہو،اگلے روز کی ذمہ داریوں کو کماحقہٗ ادا کرنے کا اہتمام رکھتا ہو،اور قرآن واحادیث کی روشنی میں رات گئے تک جاری رہنے والی ان محافل کی مذمت کرتا ہو،تو اسے لوگ پرانے خیال کا حامل،بیوقوف،احباب کا دل شکن،وقت کے ساتھ نہ چلنے والا کہہ کر خاموش کرادیتے ہیں۔آیا اپنے اس موقف میں وہ لوگ درست ہیں یا یہ اصلاح کی نیت رکھنے والا درست ہے؟۔

مہربانی فرما کر اس نوزائیدہ غیر معقول کلچر کے مذہبی معاشرتی اور طبی نقصانات بیان کرتے ہوئے مضمون نما مفصل جواب عنایت فرمائیں،(محمد ذکی،نارتھ ناظم آباد،کراچی)۔

جواب:

ہمارے معاشرے میں یہ رجحان اس قدر تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ تقریبات خواہ کسی نوعیت کی ہوں،نہ تو وقت پر شروع ہوتی ہیں اور نہ ہی وقت پر اختتام پذیر ہوتی ہیں، نتیجۃً نہ صرف اگلے روز کی مصروفیات متاثر ہوتی ہیں بلکہ ذہنی اور اعصابی تھکاوٹ کے سبب صحت بھی روبہ زوال رہتی ہے۔

ذرا غور کریں تو اس قسم کی تقاریب میں جب بھی مدعو کیا جاتا ہے،تو گویا داعی کی جانب سے مدعوئین سے تحریری صورت میں یہ وعدہ ہوتا ہے کہ آپ اس وقت تشریف لائیں،ہم آپ کو اس وقت تک فارغ کردیں گے اور طعام کا یہ وقت ہوگا،تو یہ محض ایک تحریر نہیں ہوتی بلکہ

ایک وعدہ ہوتا ہے جو ہم ایک ہی وقت میں کئی سو یا ہزار افراد سے کر رہے ہوتے ہیں اور تاخیر کی صورت میں یہ ایک وعدہ خلافی نہیں بلکہ مدعوئین کی تعداد کے مطابق ہزارہا وعدوں کی صورت میں شمار کی جائے گی اور اُسی قدر اس کا خلاف بھی پایا جائے گا۔ حالانکہ اسلام میں ایفائے عہد کی بہت تاکید کی گئی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولًا۔

ترجمہ: ''اور وعدہ پورا کرو، بیشک وعدے کی بابت (آخرت میں ہر ایک سے) پوچھا جائے گا، (بنی اسرائیل: 34)''۔

اور فلاح یافتہ اہلِ ایمان کی صفاتِ حمیدہ بیان کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ

ترجمہ: ''اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد کی (مکمل) پاسداری کرتے ہیں، (المؤمنون: 8)''۔

اسی طرح نیکی کے مرتبۂ کمال پر فائز اہلِ ایمان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ، ترجمہ: ''اور (وہ) جب وعدہ کرلیں تو (پھر) اپنے عہد کی (مکمل) پاس داری کرتے ہیں، (البقرۃ: 177)''۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ○

ترجمہ: ''اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو وہ بات جو کرتے نہیں، (الصف: 2)''۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے منافق کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے، تو خیانت کرے''۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: 33)

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا: اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: چار باتیں جس میں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے، یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے، (اور وہ چار خصلتیں یہ ہیں) جب اسے امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب جھگڑے تو بیہودہ بکواس کرے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 34)''۔

ایسی صورت میں کہ جب داعی یہ جانتا ہے کہ لوگوں کو دیا جانے والا نظام الاوقات قابلِ عمل نہیں ہے اور تمام امور وقت پر انجام نہیں پا سکتے بلکہ لازماً تاخیر ہو جائے گی، تو یہ جانتے ہوئے اس کا لوگوں سے تحریری وعدہ کر لینا، انہیں دھوکہ دینے اور ضرر پہنچانے کے مترادف ہے، ارشادِ رسول ﷺ ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ۔

ترجمہ: ''(مومن وہ ہے جو) نہ خود نقصان اٹھائے اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچائے''۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2340,2341)

پھر یہ بھی ملاحظہ رہے کہ ایسی صورت حال میں رات دیر تک یا صبح تک جاری رہنے والی تقریبات کے نتیجے میں جو مصائب اور تکالیف خود صاحب خانہ یا احباب اور مدعوئین کو درپیش ہوتی ہیں (مثلاً دور دراز کے علاقوں سے آنے والوں کے لئے واپسی کے مسائل، فیملی بالخصوص بچوں کے ساتھ مزید دشواری کا سامنا) بعض مہمانوں پر ان کی وسعت سے زیادہ ٹیکسی وغیرہ کے کرائے کا بوجھ پڑتا ہے، جس کی بسا اوقات وہ طاقت بھی نہیں رکھتا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

لَایَنۡبَغِیۡ لِلۡمُؤۡمِنِ أَنۡ یُّذِلَّ نَفۡسَهٗ قَالُوۡا: وَ کَیۡفَ یُذِلُّ نَفۡسَهٗ؟قَالَ: یَتَعَرَّضُ مِنَ الۡبَلَاءِ لِمَالَایُطِیۡقُ۔

ترجمہ:''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلت سے دوچار کرے، صحابہ نے عرض کی (یارسول اللہ ﷺ)!وہ اپنے آپ کو ذلت سے کیسے دوچار کرے گا؟، آپ ﷺ نے فرمایا: (وہ اس طرح کہ)وہ اپنے آپ کو ایسی مصیبت سے دوچار کرے، جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث:2254)

بعض اوقات خدانخواستہ ڈاکے پڑ جاتے ہیں، لہٰذا ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایفاءِ عہد، قول وفعل میں مطابقت اور دوسروں کو راحت پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

آج غیر مسلم اقوام وممالک میں بعض اقدار کی پاس داری ہے، لیکن مسلمانوں میں بدقسمتی سے نہیں ہے، وقت کی تو ہمارے ہاں کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔

دیوار پر قرآنی آیات لکھنا

سوال:191

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مکان کی پیشانی پر قرآن کی آیات لکھنا کیسا ہے؟، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیے۔

(محمد احسان، لیاقت آباد نمبر 6، کراچی)

جواب:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا مقدس کلام ہے، اس کا احترام واجب ہے، باعث برکت ودفعِ بلا ہے، ظاہری وباطنی عوارض کے لئے شفا ہے، حصول برکت کے لئے آیاتِ مبارکہ کو دیوار پر لکھنا جائز ہے بشرطیکہ جس رنگ یا چونے یا مواد کے ساتھ آیاتِ مقدسہ لکھی جائیں، وہ پاک ہو۔ اگر دوبارہ اس جگہ پر رنگ کرنے کے لئے کھرچنا پڑے، تو ان ذرّات کو کسی پاک جگہ دفن کر دیا جائے، وہ جگہ بلندی پر اور قابلِ احترام ہو، اس پر کوئی ناپاک چیز لگنے کا

خدشہ نہ ہو۔علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَلَوْ كَتَبَ الْقُرْآنَ عَلَى الْحِيْطَانِ وَالْجُدْرَانِ بَعْضُهُمْ قَالُوْا: يُرْجٰى اَنْ يَّجُوْزَ وَبَعْضُهُمْ كَرِهُوْا ذٰلِكَ مَخَافَةَ السُّقُوْطِ تَحْتَ اَقْدَامِ النَّاسِ، كَذَا فِيْ "فتاوىٰ قاضيخان"۔

ترجمہ: ''اگر قرآنِ مجید کی آیات دیواروں پر لکھی جائیں تو بعض فقہاء نے اس کے جواز کا قول کیا ہے اور بعض فقہاء نے اس اندیشے کی بناپر مکروہ قرار دیا ہے کہ اس کے ذرات (یعنی چونے یا رنگ کے ذرات) لوگوں کے پاؤں میں گریں گے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد:5،ص:323،مطبوعہ:مکتبۂ رشیدیہ،کوئٹہ)

پس اگر اس امر کا اہتمام کرلیا جائے کہ اس کے ذرات نیچے نہ گریں تو کراہت اٹھ جائے گی، نیز اگر کبھی دوبارہ رنگ کرنا ہو، تو اس کو کھرچ کر کسی محفوظ جگہ دفنانے کا انتظام بھی ہو، دفن کر دیا جائے اور جہاں آیتیں لکھی ہوں وہاں بے وضو ہاتھ نہ لگائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ○

ترجمہ: ''اس کو نہ چھوئیں کریں مگر پاک لوگ، (الواقعہ: آیت 79)''۔

بعض مکانوں کا رخ گندی گلی کی طرف ہوتا ہے، لہٰذا اس طرف آیات کا لکھنا بھی خلافِ ادب ہوگا کہ وہ مقام محترم نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح مساجد کے استنجا خانوں کی طرف بھی نہ لکھی جائیں، اگر وضو خانہ استنجا خانے سے الگ ہو تو اس کی دیواروں پر مسنون دعائیں لکھی جاسکتی ہیں تاکہ لوگ متوجہ ہوں اور پڑھ کر اجر پائیں۔ یاد رہے کہ حصولِ برکت کے لئے آیات کا لکھنا اگرچہ جائز ہے، لیکن شریعت کا اصل مقصود و مطلوب قرآن مجید کی تلاوت کرنا ہے اور تلاوت ہی کو شعار بنانا چاہئے کہ یہ افضل عبادت ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات احکامِ قرآن پر عمل کرنا ہے۔

سرکاری محکمے عاقلہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں

سوال:192

مورخہ:5،ستمبر 2006ء بوقت:7:35 منٹ این۔ایل۔سی کا حاضر سروس

ڈرائیورنمبر:3260528 سپاہی طارق محمود ولد محمد ابراہیم این ایل سی ٹریلر لے کر کراچی آرہا تھا کہ خیر پور میرس بحریہ کالج کے مقابل جی ٹی روڈ ایک رکشہ روڈ کے بائیں طرف کچی جگہ پر کھڑا تھا، جس کو ڈرائیور طارق محمود کراس کرتے وقت ٹریلر کے بائیں طرف رکشے کے ساتھ لگا، جس کے نتیجے میں ایک عورت جمیلہ بی بی زخمی ہوگئی اور خیر پور ہسپتال میں فوت ہوگئی۔فوت شدہ جمیلہ بی بی کے خاوند نے نہ تو ایف آئی آر کٹوائی اور نہ ہی قصاص ودیت کا مطالبہ کیا، بلکہ جمیلہ مرحومہ کے خاوند غلام اکبر ولد محمد بخش نے خون معاف کردیا اور اسٹامپ پیپر پر بیانِ حلفی بھی لکھ دیا، جس کی نقل منسلک ہے۔فوت شدہ خاتون کے پانچ نابالغ بچے ہیں۔معافی کے باوجود ڈائریکٹر جنرل این ایل سی نے محکمانہ کاروائی کرتے ہوئے، سمری فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کا حکم دیا اور ایک انکوائری کمیٹی تشکیل دی، جس نے انکوائری مکمل کرنے کے بعد ڈرائیور طارق محمود کو تین ماہ قید فوجی جیل بغیر تنخواہ اور چھ لاکھ تینتالیس ہزار سات سو ساٹھ روپے دیت ادا کرنے کا حکم سنایا۔ڈرائیور طارق محمود کے والدین فوت ہوچکے ہیں، دو چھوٹے بھائی اور چھ چھوٹی بہنیں ہیں، مزید ڈرائیور کا بڑا بھائی بھی فوت ہوچکا ہے، جس کی بیوہ اور بچی بھی طارق محمود کی کفالت میں ہیں، علاوہ ازیں ڈرائیور کے اپنے بچے بھی ہیں جو کل چودہ افراد بنتے ہیں، جن کا یہ واحد کفیل ہے، ڈرائیور کے وسائل نہیں ہیں جس کی بنیاد پر وہ دیت کی رقم ادا نہیں کرسکتا، معلوم یہ کرنا ہے کہ:

1۔ کیا فوت شدہ خاتون کے خاوند کی طرف سے معافی نامے کے بعد ڈرائیور پر دیت کی رقم دینا لازم ہے؟۔

2۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دیت کی رقم کتنی بنتی ہے؟، دیت کی رقم کس طرح حاصل کی جائے؟، ہمارے ادارے میں ہر ڈرائیور سے ماہانہ سو روپے ایکسیڈنٹ فنڈ بھی جمع ہوتا ہے۔(میجر محمد اظہر، منیجر ٹرانسپورٹ گروپ نمبر:2 این ایل سی، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں یہ "قتل بالسبب" کی صورت ہے اور "قتل بالسبب" میں

قاتل کے عصبہ (وُرثاء) پر دِیت لازم ہے اور قاتل پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَأَمَّا الْقَتْلُ بِسَبَبٍ فَمِثْلُ حَفْرِ الْبِئْرِ وَوَضْعِ الْحَجَرِ فِي غَيْرِ مِلْكِهٖ كَذَا فِي الْكَافِي وَلَوْ وَطِئَتْ دَابَّتُهٗ إِنْسَانًا فَقَتَلَتْهُ وَهُوَ سَائِقُهَا أَوْ قَائِدُهَا فَهُوَ قَتْلٌ بِسَبَبٍ، كَذَا فِي الْمُضْمَرَاتِ وَمُوجَبُهٗ إِذَا تَلِفَ بِهٖ آدَمِيٌّ الدِّيَةُ عَلَى الْعَاقِلَةِ وَلَا يَتَعَلَّقُ بِهِ الْكَفَّارَةُ وَلَا حِرْمَانُ الْمِيرَاثِ عِنْدَنَا، كَذَا فِي الْكَافِي وَاللّٰهُ أَعْلَمُ۔

ترجمہ: ""قتل بِالسَّبَب" یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص راستہ میں کنواں کھودے یا راستہ میں پتھر وغیرہ رکھ دے اور کوئی شخص کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جائے یا پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرے اور مر جائے؛ "کافی" میں بھی اسی طرح ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سواری پر سے گرا اور ہلاک ہو گیا اور یہ (یعنی جس پر قتل کا الزام ہے) اُس سواری کو چلا رہا تھا، پس یہ بھی قتل بِالسَّبَب میں شامل ہے، "مضمرات" میں اسی طرح سے ہے۔ پس ہم (احناف) اس کے عصبات پر دیت واجب کرتے ہیں تاکہ انسانی جان رائیگاں جانے سے بچ جائے اور اس شخص پر کفارہ واجب نہیں ہوگا اور اگر (قتل کے سبب سے متعلق شخص مقتول کا وارث ہے) تو وہ مقتول کی وراثت سے محروم نہیں ہوگا، "کافی" میں بھی اسی طرح ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 3 مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ غلام رسول سعیدی شرح صحیح مسلم جلد چہارم، صفحات 676، 677 پر المبسوط سرخسی، جلد 26، صفحہ 68 کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قتل بِالسَّبَب: علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ: "جو قتل عمد ہے نہ خطا نہ قائم مقام خطا (یعنی قتل بِالسَّبَب)، وہ یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص راستہ میں کنواں کھودے یا راستہ میں پتھر وغیرہ رکھ دے اور کوئی شخص کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جائے یا پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرے اور مر جائے، یہ شخص قتل

کرنے کا مرتکب نہیں ہے کیونکہ اس نے مقتول پر کوئی فعل واقع نہیں کیا، اس کا فعل تو زمین کے ساتھ متصل تھا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ عمد، شبہ عمد، خطایا قائم مقام خطاء قتل کی کسی قسم کا مرتکب نہیں ہے، بلکہ اس کے ایک سبب سے قتل ہوا ہے جو سبب متعدی ہے، پس ہم اس کے عصبات پر دیت واجب کرتے ہیں تاکہ انسانی جان رائیگاں جانے سے بچ جائے اور اس شخص پر نہ کفارہ واجب ہوگا اور نہ وہ مقتول کی وراثت سے محروم ہوگا۔

حسب ذیل صورتیں بھی قتل بِالسَّبَب میں داخل ہیں:

۱۔ کوئی شخص کسی جانور کو ہانک کر لے جا رہا ہو اور وہ جانور کسی شخص کو ہلاک کردے۔

۲۔ کوئی شخص تیز رفتار گاڑی چلائے اور اس کی جھپٹ میں آکر کوئی شخص ہلاک ہو جائے۔

۳۔ کوئی اناڑی شخص گاڑی چلائے اور اس کی گاڑی کے نیچے کوئی آکر ہلاک ہو جائے۔

۴۔ کوئی شخص نشہ میں آکر گاڑی چلائے اور اس کی گاڑی کے نیچے آکر کوئی شخص مرجائے''۔

شرعاً قاتل کو معاف کرنے کا حق اولیاءِ مقتول کا ہے، آپ کے پیش کردہ حقائق کی روشنی میں مقتولہ کے ورثاء نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے قاتل کو معاف کردیا ہے، لہٰذا اسے مزید سزا دینے کا کوئی جواز نہیں ہے، اسے آزاد کرکے ملازمت پر بحال کیا جائے اور قاتل پر کوئی کفارہ بھی واجب نہیں ہے۔

اسلام نے قتل بِالسَّبَب کی دِیَت قاتل کی عاقلہ پر عائد کی ہے، یعنی قاتل کے والد کی طرف کے قریبی رشتے دار۔ لیکن حکومت کے مختلف محکموں کے وہ ملازمین جو ماہانہ یا سالانہ تنخواہ حکومت سے پاتے ہیں، اگر اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے ڈیوٹی کے دوران اُن سے ''قتل بِالسَّبَب'' کا ارتکاب ہو جائے، تو ان کے لئے عاقلہ ان کا متعلقہ ادارہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ این۔ایل۔سی (N.L.C) ایک باقاعدہ منظم ادارہ ہے، لہٰذا اسے ''عاقلہ'' قرار دیا جاسکتا ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(وَالعاقِلَةُ اَهْلُ الدِّيْوَانِ) وَهُمُ الْعَسْكَرُ،

ترجمہ: ''محکمے کے لوگ بھی عاقلہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس سے لشکری یا فوجی مراد ہیں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:10 ص:265 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

عَاقِلَةُ الرَّجُلِ أَهْلُ دِيْوَانِهِ عِنْدَنَا كَذَا فِي " الْمُحِيْطِ " وَاَهْلُ الدِّيْوَانِ أَهْلُ الرَّايَاتِ وَهُمُ الْجَيْشُ الَّذِيْنَ كُتِبَتْ أَسَامِيُهُمْ فِي الدِّيْوَانِ كَذَافِي "الْهِدَايَةِ"۔

ترجمہ: ''ہمارے (احناف) کے نزدیک کسی شخص کی عاقلہ اس کے دفتر (محکمے) کے لوگ ہوسکتے ہیں، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے۔ محکمے کے لوگ پرچم بردار ہیں، یہ وہ فوجی ہیں، جن کے ناموں کا رجسٹر میں اندراج کیا گیا ہے، اسی طرح ہدایہ میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص:83، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

نوٹ: دیوان سے دفتری یا محکمانہ نظام مراد ہے اور یہ محکمانہ نظام سب سے پہلے حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قائم ہوا، ہر دیوان یا محکمے سے متعلق لوگوں کے ناموں کے اندراج کے لئے ایک رجسٹر ہوتا تھا، اسی طرح مجاہدین یا فوجیوں کا باقاعدہ ریکارڈ مرتب ہوتا تھا۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

قَالَ الْحَنَفِيَّةُ: اَلْعَاقِلَةُ هُمْ أَهْلُ الدِّيْوَانِ، اِنْ كَانَ الْقَاتِلُ مِنْ أَهْلِ الدِّيْوَانِ، وَهُمُ الْجَيْشُ أَوِالْعَسْكَرُالَّذِيْنَ كُتِبَتْ أَسَامِيُهُمْ فِى الدِّيْوَانِ: وَهُوَ جَرِيْدَةُ الْحِسَابِ۔ اَوْهُمُ الْمُقَاتِلَةُ مِنَ الرِّجَالِ الْاَحْرَارِ الْبَالِغِيْنَ الْعَاقِلِيْنَ ،أَىْ اَهْلُ الرَّايَاتِ وَالْاَلْوِيَةِ، تُؤْخَذُمِنْ عَطَايَاهُمْ أَوْمِنْ أَرْزَاقِهِمْ لَا مِنْ أُصُوْلِ اَمْوَالِهِمْ بِدَلِيْلِ فِعْلِ عُمَرَرَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ، فَاِنَّ الدِّيَةَ كَانَتْ عَلٰى أَهْلِ النُّصْرَةِ، وَكَانَتْ بِأَنْوَاعٍ:بِالْقَرَابَةِ، وَالْحِلْفِ، وَالْوَلَاءِ، وَالْعَقْدِ، فَلَمَّادَوَّنَ عُمَرُالدَّوَاوِيْنَ جَعَلَ الْعَقْلَ(اَلدِّيَةَ)عَلٰى اَهْلِ الدِّيْوَانِ بِمَحْضَرٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ رَضِىَ اللّٰهُعَنْهُمْ۔

ترجمہ: ''احناف نے کہا ہے کہ: عاقلہ محکمے کے لوگ ہی ہیں، اگر قاتل محکمے کے لوگوں میں

سے ہواور وہ لشکری یا فوجی ہیں، جن کے ناموں کا رجسٹر میں اندراج ہے اور یہ حساب کتاب (دفتری ریکارڈ) کا رجسٹر ہے یا اس سے مراد آزاد عاقل، بالغ لوگوں کا گروہ ہے (جو مشترکہ مقاصد کے لئے) جنگ کرتے ہیں، یعنی پرچم بردار جو لوگ بطور فضل واحسان کے دِیَت ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کریں ،اُن پر(واجب الادا دِیَت)ان کو ملنے والے (سرکاری) عطایا اور وظائف (تنخواہوں) سے لی جائے گی ،نہ کہ اُن کے اصل مال سے۔ اس کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فعل ہے کیونکہ دِیَت اہلِ نصرت پر ہوگی اور اس کی چند اقسام ہیں ،دِیَت بالقرابت ،دِیَت بالحلف (یعنی جو باقاعدہ حلف اٹھا کر باہمی معاہدے کے تحت ایک دوسرے کی دِیَت کی ذمہ داری قبول کریں)،دِیَت بِالوَلاء (یعنی مالک کا آزاد کردہ غلام جب فوت ہو جائے اور اس کے نسبی وارث نہ ہوں ،تو اس کا ترکہ آزاد کرنے والے کو دیا جاتا ہے اور اس کو ''عصبہ سببی'' کہتے ہیں) یا غلام کو آزاد کرنے والا سابق مالک، کہ اگر وہ وفات پا جائے اور اس کے نسبی وارث نہ ہوں ،تو اس کا آزاد کردہ غلام اس کا وارث بن جائے گا)،دِیَت بِالعَقد (اس سے مراد ایسے فریقین ہیں جو باہم یہ عقد کریں کہ ہم ایک دوسرے کی دِیَت ادا کریں گے)،جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ محکمانہ نظام قائم کیا ،تو اُنہوں نے دِیَت کو اہلِ دیوان (ایک دفتر یا محکمے کے لوگوں) پر صحابہ کرام کی موجودگی میں عائد کیا تھا''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ،جلد 7،ص:28-5727،دارالفکر بیروت)

ہمارے فقہاء کرام نے ایک دفتر یا ادارے میں کام کرنے والوں کو بھی عاقلہ قرار دیا ہے، میری رائے میں این۔ایل۔سی (N.L.C) کے ادارے کی حیثیت بھی ''عاقلہ'' ہی کی ہے۔ یہ ادارہ چونکہ بڑے بڑے ٹریلر چلاتا ہے، جن سے وقتاً فوقتاً حادثات کا واقع ہونا خارج از امکان نہیں ہے ،بعض اوقات ڈرائیور کی غلطی یا غفلت باعث بنتی ہے اور بعض اوقات اتفاقیہ طور پر حادثہ پیش آجاتا ہے ،لہٰذا این۔ایل۔سی (N.L.C) کو ان حادثات کے حوالے سے ''قتل بالسبب'' کی دِیَت کے لئے ایک کفالتی فنڈ (Compensatory

(Fund) قائم کرنا چاہئے۔اس میں ایک حصہ این۔ایل۔سی (N.L.C) بھی ڈالے اور کچھ ماہانہ رقم ڈرائیوروں کی تنخواہوں سے بھی وضع کی جائے (جیسا کہ آپ نے سوال میں لکھا کہ ''ہمارے ادارے میں ہر ڈرائیور سے ماہانہ سو روپے ایکسیڈنٹ فنڈ بھی جمع ہوتا ہے'') اور حادثے کی صورت میں مقتول کے ورثاء کو اُس فنڈ سے دیت ادا کی جائے تاکہ جو خاندان اپنے کفیل سے محروم ہوگیا ہے، اس کی کسی حد تک کفالت ہو سکے، ڈرائیوروں سے بھی کچھ نہ کچھ رقم وضع کرنا اس لئے ضروری ہے تاکہ وہ ذمہ داری کا مظاہرہ کریں۔آپ نے ڈرائیوروں کی تنخواہوں سے ماہانہ ''ایکسیڈنٹ فنڈ'' کا ذکر تو کیا ہے، لیکن اس کا مصرف بیان نہیں کیا کہ کیا ہے اور اس کے تقسیم کرنے کا طریقۂ کار کیا ہے۔

علامہ ابوالحسن مرغینانی لکھتے ہیں:

وَقَتْلُ الْخَطَأُ تَجِبُ بِهِ الدِّيَةُ عَلَى الْعَاقِلَةِ، وَالْكَفَّارَةُ عَلَى الْقَاتِلِ، لِمَا بَيَّنَّامِنْ قَبْلُ، قَالَ: وَالدِّيَةُ فِي الْخَطَأْمِائَةٌ مِّنَ الْإِبِلِ أَخْمَاسًا: عِشْرُوْنَ بِنْتَ مَخَاضٍ، وَّعِشْرُوْنَ بِنْتَ لَبُوْنٍ، وَّعِشْرُوْنَ ابْنَ مَخَاضٍ، وَّعِشْرُوْنَ حِقَّةً، وَّعِشْرُوْنَ جَذْعَةً،قَالَ وَمِنَ الْعَيْنِ أَلْفُ دِيْنَارٍ وَمِنَ الْوَرِقِ عَشْرَةَ الَافِ دِرْهَمٍ۔

ترجمہ: ''امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک قتلِ خطا میں پانچ قسم کی سو اونٹنیاں ہیں: بیس دوسرے سال کی اونٹنیاں، بیس تیسرے سال کی اونٹنیاں، بیس دوسرے سال کے اونٹ، بیس چوتھے سال کی اونٹنیاں، اور بیس پانچویں سال کی اونٹنیاں یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہوں، (الھدایۃ، جلد:8،ص:72)''۔

ایک ہزار دینار چار اعشاریہ تین سات چار (۴،۳۷۴) کلوگرام سونے کے برابر ہیں اور دس ہزار درہم چاندی تیس اعشاریہ چھ ایک آٹھ (۳۰،۶۱۸) کلوگرام چاندی کے برابر ہیں یا اس کی موجودہ بازاری قیمت (Market Value) کے مطابق رقم ہے۔

نوٹ: انشورنس کے متبادل اسلامی تصورِ کفالت پر مبنی تکافل کمپنیاں وجود میں آچکی ہیں، آپ اِن میں سے کسی ادارے کے ساتھ اپنے نظام کو مربوط ومنسلک کر سکتے ہیں۔قومی

اداروں کی صاحبِ بصیرت (Visionary) قیادت کو چاہئے کہ case to case معاملات کو دیکھنے اور ہر بار ایک نئی صورتِ حال کا حل ڈھونڈنے کے بجائے باقاعدہ ایک نظام وضع کرے تاکہ ایک قابلِ عمل خودکار طریقے سے معاملات چلتے رہیں۔

بچوں کو حسنِ سلوک کی تلقین کریں

سوال:193

میری شادی تقریباً 19 سال پہلے ہوئی تھی ۔میرے چار بچے ہیں ۔بڑا بیٹا 17 سال کا، بیٹی 16 سال کی ،دوسرا بیٹا 15 سال کا اور چھوٹی بیٹی 5 سال کی ہے۔میرے شوہر نے بہ ہوش وحواس تقریباً سولہ سال قبل مجھے دو طلاقیں دیں، لیکن اس کے بعد بھی ہم میاں بیوی کے طور پر ازدواجی زندگی گزارتے رہے ۔اور اس کے بعد بھی اکثر وبیشتر طلاقیں دیتا رہا، چونکہ مجھے اُس وقت علم نہیں تھا اور بعد تک بھی شریعت سے زیادہ معلومات نہ ہونے کے سبب گنہگار ہوتی رہی ۔اس کے علاوہ بھی میرے ساتھ بہت زیادتی کرتا رہا ہے، جو نا قابلِ بیان ہے۔آپ سے اس مسئلے میں رہنمائی درکار ہے۔

لبنیٰ جہانگیر، کراچی

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ شوہر نے سب سے پہلے آپ کو دو طلاقیں دیں اور پھر رجوع کرلیا اور آپ دونوں میاں بیوی کے طور پر رہے ،تو شرعاً دو طلاق کے بعد رجوع کی گنجائش ہے ۔اس کے بعد آپ کے شوہر نے جب تیسری طلاق دی ،تو پہلی دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہو کر کل تین طلاقیں ہوگئیں اور آپ ان پر حرام ہوگئیں، اس میں رجوع کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔تین طلاقیں مکمل ہونے کے بعد آپ دونوں نے عدت کے اندر اور عدت کے بعد جو ازدواجی زندگی گزاری ،وہ شرعاً حرام گزاری ہے، آپ دونوں فوری طور پر علیحدگی اختیار کرلیں اور اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ توبہ کرتے رہیں۔ چھوٹی بچی کی نگہداشت آپ کا حق ہے اور جب تک آپ دوسری شادی نہ کریں بچی اور آپ کا نان نفقہ بچی کے والد کو دینا

چاہئے۔باقی بچوں کے ساتھ بھی والد کو حسنِ سلوک کرنا چاہئے اور آپ کو بھی چاہئے کہ بچوں کو ان کے والد کے ملنے سے نہ روکیں اور نہ ہی انہیں والد سے نفرت دلائیں بلکہ جب والد کو ان کی مدد کی ضرورت ہو اور یہ اس قابل ہوں تو ان کی ہر ممکن مدد کریں۔

دس محرم اور نیاز کی تقسیم

سوال:194

محرم الحرام کی دس تاریخ کو نیاز میں حلیم، بریانی اور شربت وغیرہ لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کیا یہ جائز ہے؟ شریعت کی روشنی میں مدلّل جواب عنایت فرمائیں، (محمد مسکین، کراچی کینٹ)۔

جواب:

مذکورہ بالا سوال کا جواب دینے سے قبل یہ واضح ہو کہ عاشورے کے موقع پر مذکورہ امور کی انجام دہی کا مقصود ایصالِ ثواب ہے تو پہلے ہم ایصالِ ثواب کا مفہوم واضح کرتے ہیں:

ایصالِ ثواب کے معنی کسی شخص کا اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا ہے، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو، یہ شرعاً جائز ہے، بلکہ مستحسن امر ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ○

ترجمہ: ”حضرت موسیٰ نے التجا کی: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی (ہارون) کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے، (الاعراف:151)“۔

(2) رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ○

ترجمہ: ”(حضرت ابراہیم نے دعا کی) اے ہمارے رب! حساب (یعنی قیامت) کے دن

میری، میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرمانا، (ابراہیم:41)"۔

(3) رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ O

ترجمہ: "اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی (بھی مغفرت) فرما جو ہم سے پہلے وفات پا چکے، (الحشر:10)"۔

(4) رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

ترجمہ: "(حضرت نوح نے دعا کی) اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما، (نوح:28)"۔

عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ، أَنَّهُ قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ: إِنَّ أُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ، فَأَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟، قَالَ: اَلْمَاءُ، قَالَ: فَحَفَرَ بِئْرًا وَّقَالَ: هٰذِهِ لِأُمِّ سَعْدٍ۔

ترجمہ: "حضرت سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کی: "یارسول اللہ ﷺ! امّ سعد (یعنی میری والدہ) وفات پا گئی ہیں تو (ان کے ایصالِ ثواب کے لئے) کون سا صدقہ افضل ہے؟، آپ نے ارشاد فرمایا: "پانی"، چنانچہ انہوں نے کنواں کھدوا کر (وقف کر دیا) اور کہا، یہ امّ سعد کا کنواں ہے"۔

(سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:1678)

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا: أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: إِنَّ أُمِّي افْتُلِتَتْ نَفْسُهَا، وَأَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ، فَهَلْ لَهَا أَجْرٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟، قَالَ: نَعَمْ۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ: "ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: میری والدہ کا اچانک انتقال ہو گیا ہے، میں گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ کچھ وصیت کرتیں تو صدقہ کرنے کا حکم کرتیں۔ اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو اس کا انہیں اجر ملے گا؟ نبی رحمت نے فرمایا: ہاں! (اس کا اجر اسے

ملے گا،(صحیح بخاری،رقم الحدیث:1388،الفاظ کے کچھ تغیر کے ساتھ:2760)''۔
پانی پلانا اور کھانا کھلانا فی نفسہ ایسا ثوابِ جاریہ ہے جسے شریعتِ مطہرہ میں باعثِ اجر بیان فرمایا گیا ہے۔
حضرت ابوسعید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:اَیُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰی جُوْعٍ أَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ ، وَاَیُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰی مُسْلِمًا عَلٰی ظِمَأٍ سَقَاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الرَّحِیْقِ الْمَخْتُوْمِ۔
ترجمہ:''جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو بھوک کے وقت کھانا کھلائے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھلوں (نعمتوں) سے کھلائے گا،اور جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو سخت پیاس کے وقت پانی پلائے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کی مہر بند شراب طہور پلائے گا،(سنن ابی داؤد،رقم الحدیث:1679)''۔
امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:''پانی یا شربت کی سبیل لگانا، جب کہ بہ نیت محمود اور خالصاً لوجہ اللہ ثواب رسانی ارواحِ طیبہ ائمۂ اطہار مقصود ہو،تو بلاشبہ بہتر و مستحب وکارِ ثواب ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان عالی شان ہے:
اِذَا کَثُرَتْ ذُنُوْبُكَ فَاسْقِ الْمَآءَ عَلَی الْمَآءِ تَتَنَاثَرُ کَمَا یَتَنَاثَرُ الْوَرَقُ مِنَ الشَّجَرِ فِی الرِّیْحِ الْعَاصِفِ۔رَوَاهُ الْخَطِیْبُ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ۔
ترجمہ:''جب تیرے گناہ زیادہ ہوجائیں تو (پیاسوں کو) بہ کثرت پانی پلا،اس طرح تیرے گناہ جھڑ جائیں گے جیسے سخت آندھی میں درخت کے پتے جھڑتے ہیں''،(رواہ الخطیب عن انس بن مالک)۔اسی طرح کھانا کھلانا،لنگر بانٹنا بھی باعثِ اجر ہے۔رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:
اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یُبَاهِیْ مَلٰٓئِکَتَهٗ بِالَّذِیْنَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ مِنْ عَبِیْدِهٖ ،رَوَاهُ اَبُو الشَّیْخِ فِی الثَّوَابِ عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا۔
ترجمہ:''بے شک،اللہ تعالیٰ ان (فیاض بندوں) پر فرشتوں کے سامنے فخر و مسرت کا

اظہار فرماتا ہے، جو اس کے (محتاج) بندوں کو (بھوک کی حالت میں) کھانا کھلاتے ہیں، (رواہ ابوالشیخ فی الثواب عن الحسن مرسلا)۔ مگر لنگر لٹانا جس میں لوگ چھتوں پر بیٹھ کر روٹی وغیرہ پھینکتے ہیں، کچھ ہاتھوں میں جاتی ہیں، کچھ زمین پر گرتی ہیں اور کچھ پاؤں کے نیچے آتی ہیں، یہ منع ہے کہ اس میں رزقِ الٰہی کی بے تعظیمی ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 24، ص: 520،521، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

عاشورے کے موقع پر حلیم، بریانی اور شربت وغیرہ کی تقسیم اسی ایصالِ ثواب کے عمل کا حصہ ہے، لیکن اس تقسیم میں اس امر کو ملحوظ رکھنا لازم ہے کہ رزق کی بے حرمتی اور ضیاع نہ ہو۔

غیر مسلم کے سلام کا جواب

سوال: 195

اگر کوئی غیر مسلم ہم سے ہاتھ ملائے تو اس کے جواب میں خاموش رہیں یا وعلیکم السلام کہیں؟ شریعتِ محمدیہ کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

نعیم انجم، اسلم کالونی

جواب:

کسی غیر مسلم کو سلام میں پہل کرنا حرام ہے اور اس کے سلام کے جواب میں صرف "وعلیکم" کہنا واجب ہے۔

حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِذَا سَلَّمَ عَلَیْکُمْ اَھْلُ الْکِتَابِ فَقُوْلُوْا: وَعَلَیْکُمْ۔

ترجمہ: "جب اہلِ کتاب تمہیں سلام کریں تو ان کے جواب میں (صرف) "وعلیکم" کہو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 5646)"۔

علامہ یحییٰ بن شرف الدین نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

وَاخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِیْ رَدِّ السَّلَامِ عَلَی الْکُفَّارِ وَابْتِدَائِھِمْ بِہٖ فَمَذْھَبُنَا تَحْرِیْمُ

اِبتِدائِھِم بِہٖ وَوُجُوبُ رَدِّہٖ عَلَیھِم بِاَنْ یَّقُولَ وَعَلَیکُم اَوْ عَلَیکُم فَقَط، وَدَلِیلُنَا فِی الْاِبتِدَاءِ قَولُہٗ ﷺ لَاتَبدَؤُوا الْیَھُودَ وَلَاالنَّصارٰی بِالسَّلامِ وَفِی الرَّدِ قَولُہٗ ﷺ فَقُولُوا "وَعَلَیکُم" وَبِھٰذَا الَّذِی ذَکَرنَاہُ عَنْ مَذھَبِنَا، قَالَ اَکثَرُ الْعُلَماءِ وَعَامَّۃُ السَّلفِ وَذَھَبَتْ طَائِفَۃٌ اِلٰی جَوَازِ ابتِدَائِنَا لَھُم بِالسَّلامِ۔

ترجمہ: ''کفار کو سلام میں پہل کرنے اور ان کے سلام کا جواب دینے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارا مذہب یہ ہے کہ انہیں سلام میں پہل کرنا حرام ہے اور صرف ''وعلیکم'' یا ''علیکم'' کہہ کر ان کے سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ کفار کو سلام میں پہل کرنے کی حرمت کے بارے میں ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل نہ کرو''۔ اور کفار کے سلام کا جواب دینے کے بارے میں یہ ارشاد رسول ہے: ''جب کفار سلام کریں تو جواب میں ''وَعَلَیکُم'' کہو۔ اور اسی لئے ہم نے اسے ''مذہبِ شوافع'' کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اکثر علماء اور عام متقدمین کا یہی مذہب ہے اور علماء کی ایک جماعت نے غیر مسلم کو سلام میں پہل کرنے کو بھی جائز قرار دیا ہے''۔

(شرح مسلم للنووی، جلد:6، ص:293، مکتبۃ البشریٰ، دمشق)

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''الاشباہ والنظائر وتنویر الابصار'' و ''درمختار'' وغیرہ میں ہے کہ اگر کسی نے ذمی کافر کی تعظیم کرتے ہوئے سلام کیا، تو کافر ہوگیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد:21، ص:247، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔ یعنی اس کے کفر کی بنا پر تعظیم کرے گا تو کفر لازم آئے گا، ورنہ بعض اوقات غیر مسلم کے کسی دنیاوی منصب کی وجہ سے بربناء منصب مدارات کے طور پر اکرام کرنا پڑتا ہے، اس سے کفر لازم نہیں آتا، کیوں کہ کفر سے نفرت تو مسلمان کے دل میں تب بھی موجود ہوتی ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَاَمَّاالتَّسلِیمُ عَلٰی اَھلِ الذِّمَّۃِ فَقَدْ اِختَلَفُوا فِیہِ قَالَ بَعضُھُم لَابَأسَ بِاَنْ یُّسَلِّمَ عَلَیھِم وَقَالَ بَعضُھُم لَایُسَلِّمُ عَلَیھِم وَھٰذَا اِذَالَم یَکُنْ لِلْمُسلِمِ حَاجَۃٌ اِلَی الذِّمِّیِّ، وَاِذَا

كَانَ لَهُ حَاجَةٌ فَلَا بَأْسَ بِالتَّسْلِيمِ عَلَيْهِ وَلَا بَأْسَ بِرَدِّ السَّلَامِ عَلٰى أَهْلِ الذِّمَّةِ وَلٰكِنْ لَا يُزَادُ عَلٰى قَوْلِهٖ "وَعَلَيْكُمْ" قَالَ الْفَقِيْهُ أَبُو اللَّيْثِ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى، اِنْ مَرَرْتَ بِقَوْمٍ وَّفِيْهِمْ كُفَّارٌ فَأَنْتَ بِالْخِيَارِ اِنْ شِئْتَ قُلْتَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَتُرِيْدُ بِهِ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِنْ شِئْتَ قُلْتَ "اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى" كَذَا فِي "الذَّخِيْرَةِ"۔

ترجمہ: ''اور رہا ذِمّیوں کو سلام کرنے کا مسئلہ تو ذِمّیوں کو سلام کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء کہتے ہیں کہ انہیں سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں اور بعض منع کرتے ہیں۔ اور یہ (اختلاف) اس صورت میں ہے کہ اس ذمی سے (کلام کرنے کے سلسلے میں) مسلمان کو کوئی حاجت درپیش نہ ہو، اور اگر اس سے مسلمان کی کوئی (جائز) غرض وابستہ ہو، تو اسے سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ذمی کے سلام کا جواب دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جواب میں اضافہ نہ کرے (صرف) ''وعلیکم'' کہے۔ فقیہ ابواللیث فرماتے ہیں کہ: اگر کسی ایسے مجمعے کے پاس سے گزر ہوا، جس میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی ہیں تو تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو مسلمانوں کی نیت کر کے ''السلام علیکم'' کہو اور چاہو تو ''اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى'' (یعنی جو ہدایت پر ہے اسے سلام) ''ذخیرہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 5، ص: 325، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

میری رائے میں ہمارے فقہاءِ کرام کی آراء ان کے اپنے دور کے تناظر میں تھیں، جب مسلمان غالب پوزیشن میں تھے اور شاید اس دور میں غیر مسلم، مسلمانوں کو سلام کرنے یا مسلمانوں کو اُن کے سلام کا جواب دینے کو اپنے لئے اعزاز وافتخار سمجھتے ہوں۔ موجودہ دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا باہمی تعامل بہت زیادہ ہوگیا ہے، مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے اداروں اور ملکوں میں ملازمتیں بھی کرتے ہیں، حکومتوں اور صنعتی وکاروباری اداروں اور سول سوسائٹی کی سطح پر روابط بھی قائم ہوتے ہیں، بین المذاہب مکالمہ بھی ہوتا ہے، اس لئے سلام میں پہل بھی کرنی پڑتی ہے، سلام کا جواب بھی دینا پڑتا ہے اور بعض اوقات مصافحہ اور معانقہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ بعض صورتوں میں مسلم ممالک میں

ایک ساتھ دفاتر میں کام بھی کرتے ہیں اور افسر و ماتحت بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک میز یا دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا بھی پڑتا ہے، لہٰذا سلام و جوابِ سلام کا یہ باہمی برتاؤ ناگزیر ہے۔ یہ باہمی سلام کلام بالعموم مدارات کے طور پر ہوتا ہے، جس کی اسلام میں گنجائش ہے، کیوں کہ اسلام انسانیت سے نفرت نہیں سکھاتا، انسانیت کی بنیاد پر ہمدردی اور حسنِ سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ مسلمان کے حسنِ سلوک اور معاملات میں عدالت، دیانت، امانت اور صداقت سے متاثر ہو کر کوئی غیر مسلم اسلام بھی قبول کر سکتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ اگر غیر مسلم کا سامنا ہو اور ہم منہ موڑ لیں تو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں منفی تأثر پیدا ہوگا کہ یہ انسانوں اور دیگر اہلِ مذاہب سے نفرت کرتے ہیں۔ اس سے ان کے دل میں بھی ہمارے لئے نفرت پیدا ہوگی تو یہ حکمتِ دین کے منافی ہے۔ حدیث و فقہ میں اس پر بحث کی حکمت ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ''السلام علیکم'' مسلمانوں کے باہمی میل جول کا شِعار ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی سُنّتِ طیبہ ہے۔ اِخلاص پر مبنی کلمۂ دعا ہے اور اپنی طرف سے مسلمان بھائیوں کے لئے پیامِ امن و سلامتی بھی ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک بہتر یہی ہے کہ غیر مسلموں سے میل ملاقات کے وقت وہ کلمات استعمال کئے جائیں جو ان کا شِعار اور روزمرہ ہیں اور وہ ان کی کوئی امتیازی مذہبی علامت بھی نہیں ہے، جیسے ''صبح بخیر'' یا ''گڈ مارننگ''، ''شب بخیر'' یا ''گڈ نائٹ''۔ اہلِ عرب کے ہاں ''صَبَاحَ الْخَیْر''، ''مَرْحَبًا''، ''اَھْلًا وَّ سَھْلًا''، یعنی ''خوش آمدید'' اسی طرح ان کلمات کے انگریزی مترادف ہیلو، ویلکم ہیں یا ''حَیَّاكَ اللّٰهُ'' (جیتے رہو) یا ''ھَدَانَا وَھَدَاكَ اللّٰهُ'' (اللہ ہم سب کو ہدایت دے) کہہ کر اخلاص کے ساتھ ان کے لئے توفیقِ ہدایت کی دل سے دعا کریں۔ اسی طرح ہمارے علاقائی زبانوں میں کلمات ہیں، مثلاً پشتو میں ''ہر کلہ راشہ'' اور ہندکو زبان میں ''ہر کدے آؤ'' سندھی زبان میں ''بھلے آیو، چنگی آیو''، پنجابی زبان میں ''صدقے آیا نوں'' وغیرہ ہیں۔ ان تمام کے مشترک معنی خوش آمدید ہیں یا آپ کے آنے پر خوشی ہوئی، ایسے ہی آتے رہو۔ فارسی زبان میں کہتے ہیں: ''اے کہ آمدنت تو باعث آبادی

ما''اور کبھی اگر وہ ہمیں ''السلام علیکم'' کہہ کر پہل کریں، تو ہم بھی وعلیکم کہہ سکتے ہیں۔ شرعاً جوامر ممنوع ہے، وہ ''مُداہنت'' ہے، یعنی کسی ذاتی غرض، طمع، ریا یا خوف کے تحت تملُّق، خوشامد اور چاپلوسی کے طور پر غیر مسلم کی تعظیم وتکریم کرنا، بے جا تعریف کرنا اور اپنے آپ کو بے توقیر کرنا وغیرہ شرعاً حرام ہیں۔ اس سے اسلام پر مسلمان کی بے توقیری ہوتی ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔ قرآن نے بھی اس سے منع فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ○

ترجمہ: ''وہ کافر چاہتے ہیں کہ آپ (دین کے معاملے میں بے جا رعایت دے کر) مداہنت کریں اور وہ بھی جواباً آپ کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کریں، (القلم:9)''۔

ضروری یادداشت

ضروری یادداشت

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

کی زیور طبع سے آراستہ ہونے والی مؤثر تصنیف

تفسیر سورۃ النسآء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم تفسیر، انداز بیان مؤثر و دلکش
قدیم و جدید اہم تفاسیر کا نچوڑ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　　　　　　　　　　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- ❖ گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- ❖ گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریمو کر دیا جائے گا۔
- ❖ کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریمو کرکے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ❖ ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- ❖ اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- ❖ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریمو کر دیا جائے گا۔

- ❖ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کرکے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- ❖ عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- ❖ **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- ❖ اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریمو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　　　　　　　　　　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

بعض اعتقادی اور عملی کمزوریوں کی اصلاح کی مخلصانہ کوشش

اصلاحِ عقائد واعمال

مفتی اعظم پاکستان

مفتی منیب الرحمٰن

تائیدات وتصدیقات

علماء ومشائخ اہلسنّت وجماعت

ناشر

دار العلوم نعیمیہ

بلاک 15 فیڈرل بی ایریا کراچی

نام کتاب	:	اصلاحِ عقائد واعمال
مؤلّف	:	مفتی منیب الرحمن
تائیدات وتصدیقات	:	علماء ومشائخ اہلسنت وجماعت
کمپوزنگ	:	حافظ محمد جمشید ہاشمی
اشاعت	:	اوّل
تعداد	:	پانچ ہزار پانچ سو
ناشر	:	دارالعلوم نعیمیہ کراچی
رابطہ	:	+92 21 36314508 +92 345 8083522

ملنے کے پتے:

دارالعلوم نعیمیہ، بلاک 15، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور/کراچی

مکتبہ غوثیہ، پرانی سبزی منڈی، کراچی

مکتبہ اہلسنت، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور

مکتبہ نعیمیہ، گوہرآباد، نزد دارالعلوم نعیمیہ، فیڈرل بی ایریا، کراچی

علامہ فضلِ حق پبلی کیشنز، دربار مارکیٹ، لاہور

خوشخبری

مسلک اہلسنت و جماعت کے عقائد و نظریات۔۔۔

بد مذہبوں کے باطلہ عقائد اور ان کے رد۔۔۔

اہلسنت پر کئے جانے والے اعتراضات کے جوابات پر مشتمل

کتب و رسائل، آڈیو ویڈیو بیانات اور والپیپر حاصل کرنے کے لئے

تحقیقات چینل ٹیلیگرام جوائن کریں

https://t.me/tehqiqat

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ

ترجمہ: ''اللہ نے گواہی دی کہ فقط وہی معبودِ برحق ہے اور فرشتوں نے (بھی) اور اہلِ علم نے (بھی) عدل پر قائم رہتے ہوئے (گواہی دی)، (آل عمران: ۱۸)''۔

انتساب

اہلسنّت و جماعت کے اُن تمام علمائے کرام اور مشائخِ عظام کے نام جو، مفاد پرست ملامت کرنے والوں کی ملامت سے بے نیاز ہو کر محض اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ مکرّم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رضا کے لیے اور اپنے عہد کے لوگوں پر حجت قائم کرنے کے لیے، میرے ہم سفر بنے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب کو ہمیشہ صحت وسلامتی کے ساتھ اپنے حفظ وامان میں رکھے اور راہِ حق میں استقامت نصیب فرمائے، اپنے عہد اور آنے والے زمانے کے لیے مشعلِ حق فروزاں رکھنے کی سعادت نصیب فرمائے، آمین۔

خُوَیْدِمُ الْعُلَمَاءِ وَالْمَشَایِخ

مفتی منیب الرحمٰن

تشکرخاص

میں حضرت علامہ مفتی محمد الیاس اشرفی رضوی زیدمجدُہم اور علامہ مفتی محمد وسیم اختر المدنی کا بطورِ خاص شکر گزار ہوں کہ ان دونوں حضرات نے اس کے مسوّدے کو متعدد بار پڑھا، مفید اصلاحات کیں، جہاں مناسب سمجھا اضافات کیے تاکہ کسی بدنیت کے لیے بلیک میلنگ کا کوئی روزن کھلا نہ رہے۔ اسی سبب اس کتاب کی آخری تسوید وتبییض تک مختلف مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس دوران مخلص علمائے کرام کے مشوروں کو بھی ہم نے پیشِ نظر رکھا اور حتی الامکان مدلَّل بنانے کی کوشش کی۔ بہت سے دیگر مسائل کے بارے میں فرمائشیں آئیں، ان شاء اللہ العزیز! یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔ ہمیں کسی صلہ وستائش کی تمنا نہیں ہے، ہماری یہ عاجزانہ کاوش اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرّم ﷺ کی رِضا کا سبب بن جائے اور شرفِ قبول نصیب ہوجائے، امید ہے کہ ہمارے لیے یہ وسیلۂ نجات وشفاعت بن جائے گی۔

مُجسّم تشکّر وامتنان

مفتی منیب الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ حِکَایَةً عَنْ شُعَیْبٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ○

ترجمہ: ''میں تو جہاں تک ہوسکے، صرف اصلاح چاہتا ہوں اور میری توفیق صرف اللہ کی عطا سے ہے، میں نے اُسی پر بھروسا کیا اور میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں، (ہود:۸۸)''۔

قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اَلدِّیْنُ النَّصِیحَةُ، قُلْنَا: لِمَنْ؟،

قَالَ: لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِهِمْ

ترجمہ: نبی ﷺ نے فرمایا: ''دین خیرخواہی کا نام ہے، صحابہ نے عرض کی: (یارسول اللہ!) کس کی خیر خواہی؟، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ، اُس کی کتاب، اُس کے رسول، مسلمانوں کے حکمرانوں اور عام مسلمانوں کی خیرخواہی (دین ہے)، (صحیح مسلم:۵۵)''۔

قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ سِیْرِیْنَ:

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ، فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ

ترجمہ: محمد بن سیرین رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے کہا: بے شک یہ علم دین ہے، سوخوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو (صحیح مسلم)

فہرست

نمبرشمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	تقدیم	11
2	**(۱) اصلاحِ عقائدواعمال اور علماء کی ذمہ داریاں**	15
3	محکم معنی اور تاویلِ باطل کا فرق	16
4	عقیدہ عاشرہ......شریعت وطریقت	22
5	**(۲) "تکفیر" اور "فتویٰ کفر" جاری کرنے کی بابت شرعی اصلاح**	29
6	ضروریاتِ دین	29
7	ضروریاتِ مذہب اہلسنّت وجماعت	29
8	ثابتات محکمات	29
9	ظَنّیاتِ مُحْتَمَلَه	30
10	کفرِ لزومی والتزامی میں فرق	30
11	کسی کو اہل سنت سے خارج کہنے کا اصول	37
12	"تفضیلی" اہلسنّت سے خارج ہیں	38
13	منافقت کی علامات	42
14	اہلِ بیت اطہار اور تمام صحابۂ کرام کی تعظیم لازم ہے	44
15	**(۳) میلادالنبی ﷺ کی محافل اور جلوس کی بابت اصلاح**	47
16	مُرَوَّجہ نعت خوانی کی اصلاح	52
17	ذکرِ الٰہی کو بگاڑ کر موسیقی کی جگہ استعمال کرنا	53
18	مختلف فیہ مسائل میں کسی فریق کی تفسیق جائز نہیں ہے	54
19	میلادالنبی ﷺ کے جلوس	57
20	**(۴) تحفظِ ناموسِ رسالت اور ہماری ذمے داریاں**	59
21	بلاگرز کا فتنہ	61
22	اہلسنّت وجماعت کی نَشأَۃِ ثَانِیَہ کے لئے ترجیحی امور	65
23	**(۵) وعظ وبیان کی بابت شرعی اصلاح**	69
24	جاہل خطباء کے ذریعے دین کا نقصان	69
25	نعت خوانی کی اجرت	72
26	وعظ کی اجرت	72
27	سچی محبت اور خلوصِ نیت	74
28	پیشہ ور نقیبوں سے محافل کو بچایئے!	74
29	شفاعتِ مصطفی ﷺ کی وضاحت	77
30	مروجہ خطابات کی اصلاح	81
31	**(۶) شاعری کی بابت شرعی اصلاح**	85
32	عصرِ حاضر میں شاعرانہ اور نقیبانہ خرافات کی مثالیں	91
33	**(۷) خانقاہوں اور آستانوں کی بابت شرعی اصلاح**	95
34	پیری مریدی کی شرائط اور اقسام	98
35	(۱) مرشدِ عام	98
36	(۲) مرشدِ خاص	98
37	(۱) شیخ اتصال	99
38	شیخ ایصال	101
39	مزارات پر خرافات	103

40	**(۸)الیکٹرانک میڈیا پر رمضان المبارک کی بابت شرعی اصلاح**	105
41	فغانِ رمضان	105
42	**(۹)جمعۃ الوَدَاع کی بابت شرعی اصلاح**	113
43	جمعۃ الوداع کی شرعی حیثیت	113
44	ایک بے اصل روایت کی وضاحت	116
45	**(۱۰)جمعۃ المبارک کے خطبہ کی بابت اصلاح**	123
46	**(۱۱)توبہ کی بابت شرعی اصلاح**	125
47	دعا میں ترنم کی شرعی حیثیت	126
48	قضائے عمری	128
49	وضاحت	131
50	**تائیدات وتصدیقات علماء ومشائخ اہلسنّت وجماعت**	133
51	صوبہ پنجاب	133
52	صوبہ سندھ	177
53	صوبہ خیبر پختونخوا	189
54	صوبہ بلوچستان	195
55	آزاد کشمیر	199
56	یوکے، امریکا، ماریشس	201

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ

وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

تقدیم

اہلسنّت وجماعت کی طرف اپنی نسبت کرنے والے بعض افراد میں کچھ عرصے سے چند خرابیاں دَر آئی ہیں۔ دین ومسلک کا درد رکھنے والے علمائے کرام، مشائخِ عِظام اور اہلِ فکر ونظر اس پر متفکر تھے اور سوچ بچار میں رہتے کہ اِن امور کی اصلاح کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے اور اس کی تدبیر کیا ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ بعض امور ایک طبقے کا ذریعۂ معاش بن چکے ہیں، پس مفاد پرست طبقے کے مفاد پر جب زد پڑتی ہے، تو وہ چلّا اٹھتا ہے اور مذہب ومسلک کے نام پر بلیک میلنگ پر اتر آتا ہے۔ ایسے ماحول میں بہت سے حضرات رخصت پر عمل کرتے ہوئے اپنی عزت بچانے کے لیے خلوت گزینی اور اِن امور سے لاتعلق رہنے ہی میں عافیت سمجھتے رہے۔ مگر ہماری پہچان دین ہے اور ہمیں جو عزت ملی وہ دین ومسلک کی نسبت سے ملی ہے، لہٰذا دین کی عزت وناموس کو سربلند رکھنے کے لیے ہمیں عزیمت پر عمل کرتے ہوئے ہر قربانی کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔

چنانچہ میں نے اہلِ درد علماء ومشائخ اہلسنّت کی مشاورت سے اہلسنّت وجماعت سے منسوب بعض افراد میں نفوذ کرنے والی چند اعتقادی وعملی کمزوریوں کا ادراک کیا اور اپنی دینی وشرعی ذمے داری پوری کرنے اور اپنے معاصرین پر حُجّت قائم کرنے کے لیے ''اصلاحِ عقائدواعمال'' کے عنوان سے یہ تحریر مرتب کی ہے۔ اس کا مقصد محض اصلاح ہے، کسی کی تنقیص ہرگز مقصود نہیں ہے۔

اس مضمون میں کسی علمی شخصیت، تنظیم یا گروہ کو تعیین کے ساتھ ہدف نہیں بنایا گیا، کیونکہ اہلسنّت وجماعت ایک ملّت ہیں، جَسدِ واحد ہیں اور یہ اصلاحِ ذات کی ایک تعمیری اور مثبت کوشش ہے۔ ہمارا یہ ادّعاء ہرگز نہیں ہے کہ یہ حتمی نسخۂ اصلاح ہے، بلکہ اخلاصِ نیت کے ساتھ اصلاح کی ایک ادنیٰ کاوش ہے۔ دوسرے صاحبانِ علم اس میں مثبت اضافات اور بہ سے بہتر اور بہتر سے بہترین کی سعی کرسکتے ہیں۔ اصلاحِ احوال کے لیے اس تحریر کو خشتِ اول اور قرطاسِ عمل کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

میں نے کراچی کے جیّد، مُعتَمَد اور ثقہ مفتیانِ کرام کو اس کارِخیر میں شرکت کی دعوت دی اور الحمدللہ! سب نے بہ طیبِ خاطر لبیک کہا اور غالب کے الفاظ میں سب کا جواب یہی تھا:

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ابتدائی تحریر میں نے اور مفتی محمد وسیم اختر المدنی نے مشترکہ طور پر مرتّب کی، پھر اِسے نظرِ ثانی اور مناسب حذف واضافے کے لیے علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی، علامہ مفتی محمد اکمل مدنی اور علامہ مفتی محمد اسماعیل نورانی کو بھیجی اور اُن کے مشوروں کی روشنی میں حتمی مسوّدہ تیار کیا۔ یہ سارے اہلِ علم اہلسنّت وجماعت کا قیمتی اثاثہ ہیں، ہم ان کی علمی اعانت اور مخلصانہ تعاون پر تہِ دل سے شکر گزار ہیں اور اِن سب کے لیے تادیر صحت وسلامتی، خیر وبرکت اور دنیاوی واُخروی فلاح ونجات کے لیے دعاگو ہیں۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اہلسنّت وجماعت کو ان علمائے کرام ومفتیانِ عظام سے ہمیشہ فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب فرمائے۔ یہ اخلاص اور ''اَلدِّیۡنُ النَّصِیۡحَۃُ'' کے جذبے پر مبنی ایک عاجزانہ کوشش ہے۔

علمائے کرام سے گزارش ہے کہ وہ اِسے اصلاح کی نظر سے دیکھیں اور اس

حوالے سے مفید مشوروں سے نوازیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ بھی اس اصلاحی مشن میں ہمارے رفیقِ سفر بنیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ اہلِ خیر سے گزارش ہے کہ وہ **خَالِصاً لِوَجْہِ اللہ** اس کتاب کی اشاعت اور تقسیم کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں تا کہ بڑی تعداد میں عوام اس سے مستفید ہوسکیں۔اسی طرح دینی تنظیموں اور انجمنوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ اپنے کارکنان کواس کے مطالعے کی تلقین کریں،**وَمَا تَوْفِیْقُنَا اِلَّا بِاللہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم** ۔ہم نے اس بحث کوگیارہ عنوانات پر تقسیم کیا ہے۔

دین ومسلک کا یہ جذبہ اور درد ہمیں امام اہلسنّت، مجدد دِین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ سے ملا ہے، ہم اُن کی بلندیِ درجات اور روحِ پُرفتوح کے عالَمِ بالا میں سکون کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دست بہ دعا ہیں۔اہلسنّت کے بعض افراد نے بے عملی اور بے حسی کا شِعار اپنا رکھا ہے، دینی ترجیحات کونظر انداز کر کے عشق ومحبتِ رسول کے من پسند معیارات بنار کھے ہیں،اس کے نتیجے میں ہم زوال آشنا ہو چکے ہیں، امام اہلسنّت نے اس پر اپنے سوزِ دروں اور دردِدل کواس فارسی شعر میں بیان کیا:

مرا سوزیست اندر دل ،اگر گویم زباں سوزد
اگر دم درکشم، ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

ترجمہ: میرے دل میں اہلسنّت کی زبوں حالی اور پستی پر جذبات کا ایسا شعلۂ جوّالہ موجزن ہے کہ اگرانہیں زبان پرلاؤں تو زبان جل جائے اوراگر اپنے جذبات کو سینے میں دبائے رکھتا ہوں تو مجھے اندیشہ ہے کہ شدّتِ احساس کی حرارت سے میری ہڈیاں تو کیا ہڈیوں کا گودا تک جل جائے گا،اسی مفہوم کواردو شاعر نے منظوم کیا ہے:

اگر سچ کہتا ہوں، مزا اُلفت کا جاتا ہے
جو چپ رہتا ہوں ،کلیجہ منہ کو آتا ہے

پس وقت آگیا ہے کہ ہم مصلحت سے بالاتر ہوکر اپنے عہد کے لوگوں پر اللہ

کی حجت قائم کریں اوراپنے دینی فریضے سے عہدہ برآ ہوں، کیونکہ ہم میں سے ہرایک اپنی جگہ مسئول ہے، قارئین سے گزارش ہے کہ ہماری اس دعا پر آمین کہیں:

اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی وَلَا تُوَفِّقْنَا لِمَا لَا تُحِبُّ وَلَا تَرْضٰی،
اَللّٰھُمَّ اھْدِنَا سَبِیْلَ الرَّشَادِ وَقَوْلَ الْحَقِّ وَفَصْلَ الْخِطَابِ،
اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنَا الصَّوَابَ وَجَنِّبْنَا الْخَیْبَۃَ وَالْخُسْرَانَ وَالْخَطَأَفِی الْفِکْرِ وَالْعَمَلِ وَالْمَیْلَ عَنِ الْحَقِّ وَالصَّوَابِ،
رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَۃً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَھَّابُ،
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا جُھُوْدَنَا وَمَسَاعِیَنَا وَبَارِكْ لَنَا فِیْھَا وَاجْعَلْھَا نَافِعَۃً لِجَمِیْعِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ،
آمِّیْنَ بِجَاہِ سَیِّدِنَا وَسَیِّدِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ
عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَفْضَلُ الصَّلَوَاتِ وَالتَّسْلِیْمَاتِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا

مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ اَمَّا بَعۡدُ

(۱)

اصلاحِ عقائدواعمال اور علماء کی ذمہ داریاں

(۱) جوعقائد واحکام قرآن وسنت سے نصاً اور ظاہراً ثابت ہوں، ان کے مقابل مرجوح اور رکیک احتمالات کا سہارا لے کر تشکیک پیدا کرنا یا اجماع اور جمہور کے مقابل شاذ اقوال کا سہارا لینا اہلِ بدعت کا وتیرہ رہا ہے، جس کے ذریعے وہ لوگوں کو بہکاتے اور اِن میں فتنہ برپا کرتے چلے آرہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی گمراہ لوگوں کے بارے میں فرمایا:

فَأَمَّا الَّذِینَ فِی قُلُوبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَابۡتِغَآءَ تَأۡوِیلِہٖ وَمَا یَعۡلَمُ تَأۡوِیلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ۔

ترجمہ: "پس جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ فتنہ جوئی اور معنی متعیّن کرنے کے لیے آیاتِ متشابہات کے درپے رہتے ہیں، حالانکہ ان کے اصل مرادی (حقیقی) معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، (آل عمران: ۷)"۔

اس آیت کی تفسیر میں ائمہ تفسیر ابنِ جریر، بغوی اور ابنِ کثیر ایسے جلیل القدر مفسرین اور بیضاوی، مدارک اور جلالین ایسی درسی تفاسیر میں ائمہ تفسیر نے ایک ہی بات لکھی ہے، مثلاً قاضی بیضاوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فَیَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ، فَیَتَعَلَّقُوۡنَ بِظَاہِرِہٖ أَوۡ بِتَأۡوِیۡلٍ بَاطِلٍ اِبۡتِغَاءَ الۡفِتۡنَۃِ ،طَلَبَ أَنۡ یُّفَتِّنُوا النَّاسَ عَنۡ دِیۡنِہِمۡ

بِالتَّشۡکِیۡکِ وَالتَّلۡبِیۡسِ وَمُنَاقَضَۃِ الۡمُحۡکَمِ بِالۡمُتَشَابِہِ وَابۡتِغَاءَ تَأۡوِیلِہٖ، وَطَلَبَ أَنۡ یُّؤَوِّلُوۡہُ عَلٰی مَا یَشۡتَہُوۡنَہٗ۔

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ لوگ متشابہات کے درپے رہتے ہیں، پس ان آیاتِ متشابہات کو اُن کے ظاہر پر محمول کرتے ہیں یا فتنہ جوئی کے لیے باطل تاویل کرتے ہیں۔ یہ کاوش اس مقصد کے لیے ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں شک پیدا کرکے اور مفہوم کو خلط ملط کرکے دین کے بارے میں انہیں آزمائش میں ڈالیں اور آیاتِ محکمات (یعنی جن کے معنی قطعی اور واضح ہیں) کو متشابہات کی نقیض ثابت کرنا چاہتے ہیں اور تاویل کے درپے ہونے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آیاتِ متشابہات کی من پسند تاویل کریں"۔

(تفسیر بیضاوی، زیر آیت: 7، آل عمران)

علامہ ابنِ کثیر دِمشقی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

اِنَّمَا یَأۡخُذُوۡنَ مِنۡہُ بِالۡمُتَشَابِہِ الَّذِیۡ یُمۡکِنُہُمۡ اَنۡ یُّحَرِّفُوۡہُ اِلٰی مَقَاصِدِہِمُ الۡفَاسِدَۃِ وَیُنۡزِلُوۡہُ عَلَیۡہَا لِاِحۡتِمَالِ لَفۡظِہٖ لِمَا یُصَرِّفُوۡنَہٗ ۔

ترجمہ: "یہ لوگ قرآن سے اُن متشابہات کا سہارا لیتے ہیں جن کے ذریعے ان کو موقع ملتا ہے کہ قرآنی آیات کے معنی میں تحریف کرکے انہیں اپنے فاسد مقاصد پر دلیل بنا کر پیش کریں اور اِن آیات کو فاسد معانی پر محمول کریں، کیونکہ (متشابہات کے) الفاظ میں ان کے باطل معنی کا (کوئی مرجوح یا مردود) احتمال بھی بظاہر موجود ہوتا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۴۷۸)

اور فرماتے ہیں: "وَھٰذَا الۡمَوۡضِعُ مِمَّا زَلَّ فِیۡہِ أَقۡدَامُ کَثِیۡرٍ مِنۡ أَھۡلِ الضَّلَالَاتِ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں بہت سے گمراہوں نے لغزش کھائی، (البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۲۴۸)"۔

محکم معنی اور تاویلِ باطل کا فرق:

محکم سے مراد وہ آیات جن کے معنی واضح، قطعی اور متعیّن ہیں اور اُن میں کسی

تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور شریعت کے احکام اوامر ونواہی اور عقائدِ قطعیہ آیاتِ محکمات ہی سے ثابت ہیں۔قرآن،سنت، اجماع اور جمہور کے فیصلے ہی محکمات ہیں اور ان کے مقابلے میں شاذ، متروک اور مردود اقوال کو پروان چڑھانا دین میں فتنہ انگیزی ہے اورحق کے بارے میں لوگوں کوشک میں مبتلا کرنا ہے،امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

"وہ مسائل بالکل قلیل ہیں،جن میں (مسلّمات کے) خلاف کوئی قولِ شاذ نہ مل سکے۔بہت سے مسائل مسلّمہ مقبولہ،جنہیں ہم اہلِ حق اپنا دین وایمان سمجھتے ہیں، ان کے خلاف بھی مرجوح، مجروح،متروک اور مردود اقوال تلاش کرنے سے مل سکتے ہیں۔کتابوں میں غثّ وسَمین (ردّی و پُرموقع کلام)ورطب و یابس (صائب اور خطا پر مبنی کلام) کیا کچھ نہیں ہوتا۔مگر جنہیں اللہ تعالیٰ نے سلیم الفطرت بنایا ہے،وہ صحیح و سقیم میں امتیاز کر لیتے ہیں ،ورنہ انسان بدعت کی گمراہیوں میں حیران وسرگرداں رہ جاتا ہے۔اگر شریر طبیعتوں، فاسد طینتوں کا خوف نہ ہوتا تو فقیر اپنی تصدیقِ دعویٰ کے لیے چند اس قسم کے مسائل مَعرضِ تحریر میں لاتا۔مگر کیا کیجیے! کہ بعض طبائع اصلِ جبلّت میں حسّاسہ جَسّاسہ (غیر ضروری امور کی ٹوہ میں لگے رہنے والی) بنائی گئی ہیں کہ شب وروز تَتَبُّعِ اَباطیل و تَفَحُّصِ قال و قیل میں رہتے ہیں، کَمَا قَالَ رَبُّنَا تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی:''فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَأْوِیْلِهٖ"،ان طبیعتوں کو جہاں بھی دین میں رخنہ اندازی کا ادنیٰ موقع ملتا ہے،اسلام کی بنیادوں کوڈھانے کے لیے کمر بستہ ہوجاتی ہیں،اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ شَرِّهِنَّ، آمِیْن"۔

(مطلع القمرین،بتصرف،صفحہ ۱۷)

عزیزانِ گرامی! جب آپ اس اصول کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے تو آپ پر واضح ہوجائے گا کہ آج کل الیکٹرانک،سوشل اور پرنٹ میڈیا میں مختلف سیکولر اور لبرل تحریکوں کی شکل میں سامنے آنے والے متعدّد فتنے ایک ہی مرض کی مختلف علامتیں ہیں،حدیثِ پاک میں ہے:

''عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا، قَالَتْ تَلَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الْآيَةَ هُوَ الَّذِی أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ،قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا رَأَيْتِ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَأُولٰئِكَ الَّذِينَ سَمَّى اللّٰهُ فَاحْذَرُوهُمْ"۔

ترجمہ:"اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے آلِ عمران آیت:7 تلاوت کی:(ترجمہ:''اللہ وہ ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی،اُس میں سے کچھ آیات مُحکم (قطعی) ہیں،یہ اصلِ کتاب ہیں اور دوسری آیات متشابہات ہیں،پس جن کے دلوں میں کجی ہے،وہ فتنہ جوئی اور معنیٰ متعیّن کرنے کے لیے آیاتِ متشابہات کے درپے رہتے ہیں، حالانکہ ان کے اصل مرادی (حقیقی) معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو علم میں رسوخ رکھتے ہیں،وہ کہتے ہیں: ہم ان پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے رب کی جانب سے (حق) ہیں اور صرف عقلمند لوگ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں)"۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (اے عائشہ!) جب تم اُن لوگوں کو دیکھو جو آیاتِ متشابہات کے درپے رہتے ہیں تو (جان لو!) یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیۂ مبارکہ میں فرمایا ہے، سو اِن سے بچ کر رہو، (صحیح بخاری: 4547)"۔

(۲) "تصوف" کی آڑ میں کچھ بے دین، بے عمل بلکہ بدعمل، غیر متشرع جاہل پیر حضرات اپنے نام نہاد مریدوں کو ہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی علمِ دین حاصل کرنے سے روکتے ہیں اور علمِ شریعت کی مخالفت میں طرح طرح کے اقوال سناتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے گمراہ کن عقائد اور جاہلانہ تعلیمات کے مقابلے میں جب قرآن وسنت اور اجماعِ امت کے قوی دلائل کا سمندر دیکھتے ہیں، تو حق کو قبول کرنے کی بجائے عام مسلمانوں کو علم سے روکنا انہیں آسان نظر آتا ہے تاکہ اُن کے اَللّے تَللّے جاری رہیں۔

یہ ایک مخصوص مکتبِ فکر ہے جو "دامِ ہمرنگِ زمیں" کے مصداق اہلِ سنت کو اندر سے نقصان پہنچاتا چلا آرہا ہے، یہ عَدُوِّ مَستور ہے۔ ماضی میں اسے "فرقۂ ہامیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ غوثِ اعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اسی فرقۂ ہامیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: "ہامیہ فرقہ کے لوگ علمِ شریعت کے مخالف ہیں اور علومِ دینیہ کی تدریس سے منع کرتے ہیں، فلسفیوں کے تابع ہیں اور کہتے ہیں: قرآن حجاب ہے، شاعری طریقت کا قرآن ہے، اپنے پیروکاروں کو شعر سکھاتے ہیں اور اوراد کو ترک کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس اعتقاد کی وجہ سے ہلاک ہو گئے، یہ اپنے آپ کو اہلِ سنت کہتے ہیں مگر یہ اہلِ سنت نہیں ہیں۔۔ یہ خود کو قلندری اور حیدری کہتے ہیں، (سرالاسرار: ۵۸)"۔

حالانکہ حضرتِ علی حیدرِ کرّار رضی اللہ عنہ تو علم کا سمندر تھے، مدینۃُ العلم کا ایک باب تھے، کمالاتِ فیضِ رسالت مآب ﷺ کا مظہرِ اتم تھے۔

یہ اپنے جاہل مریدوں کو علماء سے دور رکھنے کے لیے طرح طرح کے حیلے تراشتے ہیں، ان کا دام تزویر کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ شریعت الگ ہے اور طریقت الگ، ہم طریقت والے ہیں اور علماء شریعت والے ہیں، علماء اور صوفیہ کی آپس میں کبھی نہیں بنتی، شریعت اس کے لیے ہے جس نے حقیقت کو نہ پایا ہو۔ امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا قادری رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے رد میں "مَقَال العُرَفَاء بِاعْزَاز شَرع وعُلَمَاء" کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا، اُس سے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) "عمرو کا قول کہ شریعت چند احکام یعنی فرض وواجب اور حلال وحرام کا نام ہے، محض اندھا پن ہے۔ شریعت تمام احکامِ جسم وجان وروح وقلب وجملہ علومِ الٰہیہ ومَعارفِ لامتناہیہ کو جامع ہے، جن میں سے ایک ٹکڑے کا نام طریقت ومعرفت ہے۔ ولہٰذا تمام اولیائے کرام کا قطعی اجماع ہے کہ تمام حقائق کو شریعتِ مُطہَّرہ پر پیش کرنا فرض ہے۔ اگر شریعت کے مطابق ہوں، تو حق ہیں اور مقبول ہیں، ورنہ مردود ومخذول (یعنی باعثِ رسوائی) ہیں۔ تو یقیناً قطعاً شریعت ہی اصلِ کار ہے، شریعت ہی مَناط و مَدار ہے، شریعت ہی مِحَکّ (کسوٹی) ومعیار ہے۔ شریعت "راہ" کو کہتے ہیں اور شریعت محمدیہ (عَلٰی صَاحِبِهَا اَفضل الصلوات والتحیات) کا ترجمہ "محمد رسول اللہ ﷺ کی راہ" ہے، یہ قطعاً عام ومطلَق ہے، نہ کہ صرف چند احکامِ جسمانی سے خاص، یہی وہ راہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانچوں وقت ہر نماز بلکہ ہر رکعت میں اس کا مانگنا اور اس پر ثبات واستقامت کی دعا کرنا ہر مسلمان پر واجب فرمایا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم، اے اللہ! ہم کو محمد ﷺ

کی راہ چلا، ان کی شریعت پر ثابت قدم رکھ"۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:21،ص:523، بتصرف، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

(۲) "عمرو کا یہ قول: ''طریقت ''وصول الیٰ اللہ'' کا نام ہے" محض جنون وجہالت ہے۔ معمولی پڑھا لکھا شخص بھی جانتا ہے کہ طریق، طریقہ اور طریقت راہ کو کہتے ہیں، نہ کہ پہنچ جانے کو، تو یقیناً طریقت بھی راہ ہی کا نام ہے۔ سو اگر وہ شریعت سے جدا ہو، تو قرآنِ مجید کی شہادت کی رُو سے ایسی طریقت خدا تک نہ پہنچائے گی، بلکہ شیطان تک پہنچائے گی، جنت تک نہ لے جائے گی بلکہ جہنم رسیّد کرے گی۔ کیونکہ شریعت کے سوا سب راہوں کو قرآن مجید باطل ومردود فرما چکا ہے۔ پس لازم وضروری ہے کہ طریقت شریعت ہی ہے، یعنی اسی راہِ روشن کا ایک ٹکڑا ہے، طریقت کا شریعت سے جدا ہونا محال وناممکن ہے، جو اسے شریعت سے جدا جانتا ہے وہ اسے راہ خدا سے توڑ کر راہ ابلیس مانتا ہے، مگر حاشا! طریقتِ حقہ راہِ ابلیس نہیں، قطعاً راہ خدا ہے، تو یقینا وہ شریعتِ مُطھَّرہ ہی کا ٹکڑا ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:21،ص:524، بتصرف، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

(۳) "مندرجہ بالا تفصیلات سے واضح ہے کہ شریعت کے حامل علماء ہرگز طریقت کے لیے سدِّ راہ نہیں ہیں، بلکہ وہی اس کا دروازہ کھولنے والے اور اس کے نگہبان ہیں۔ ہاں! ایسی طریقت کہ بندگانِ شیطان جس کا نام طریقت رکھیں اور اسے شریعتِ محمد رسول اللہ ﷺ سے جدا مانیں، علمائے حق ضرور اُن کے آگے سدِّ راہ ہیں۔ صرف علماء ہی کیا، خود اللہ عزوجل نے اس راہ کو مسدود، مردود، ملعون اور مطرود (دھتکارا ہوا) فرمایا۔ سطورِ بالا سے واضح ہوا کہ علمائے شریعت کی حاجت ہر مسلمان کو

ہر وقت ہے اور خاص طور پر طریقت میں قدم رکھنے والوں کو اور زیادہ، ورنہ حدیث میں شریعت سے محروم یا شریعت سے متصادم طریقت والوں کو چکی کھینچنے والا گدھا فرمایا ہے، تو اگر علماء تمہیں گدھا بننے سے روکتے ہیں، تو کس گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں؟"۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:21،ص:535، بتصرف، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ اہلسنّت کے دس عقائد کا مفصل بیان کرتے ہوئے دسویں عقیدے کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

عقیدہ عاشرہ......شریعت وطریقت:

شریعت وطریقت، دو راہیں متبائن نہیں (کہ ایک دوسرے سے جدا یا ایک دوسرے کے خلاف ہوں) بلکہ بے اتباعِ شریعت، خدا تک وصول محال، شریعت تمام احکامِ جسم و جان و روح وقلب و جملہ علومِ الٰہیہ و معارفِ نامتناہیہ کو جامع ہے، جن میں سے ایک ایک ٹکڑے کا نام طریقت ومعرفت ہے۔ ولہٰذا باجماعِ قطعی جملہ اولیائے کرام کے تمام حقائق کو شریعتِ مُطھَّرہ پر عرض کرنا فرض ہے۔ اگر شریعت کے مطابق ہوں، تو حق وقبول ہیں ورنہ مردود ومخذول، مطرود ونامقبول، تو یقیناً قطعاً شریعت ہی اصل کار ہے، شریعت ہی مَناط ومدار ہے، شریعت ہی مِحَکّ (کسوٹی) ومعیار ہے اور حق وباطل کے پرکھنے کی کسوٹی۔

شریعت راہ کو کہتے ہیں اور شریعت محمدیہ عَلٰی صَاحِبِہَا الصَّلَوَاتُ وَالتَّحِیَّاتُ کا ترجمہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی راہ۔ اور یہ قطعاً عام و مطلق ہے نہ کہ صرف چند احکامِ جسمانی سے خاص۔ یہی وہ راہ ہے کہ

پانچوں وقت، ہر نماز کی ہر رکعت میں اس کا مانگنا اور اس پر صبر و استقامت کی دُعا کرنا ہر مسلمان پر واجب فرمایا ہے کہ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (ہم کو سیدھا راستہ چلا)، ہم کو محمد ﷺ کی راہ پر چلا، ان کی شریعت پر ثابت قدم رکھ۔

یونہی طریق، طریقہ اور طریقت راہ کو کہتے ہیں نہ کہ پہنچ جانے کو، تو یقیناً طریقت بھی راہ ہی کا نام ہے، اب اگر وہ شریعت سے جدا ہو تو بشہادتِ قرآنِ عظیم خدا تک نہ پہنچائے گی، بلکہ شیطان تک پہنچائے گی، جنت تک نہ لے جائے گی، بلکہ جہنم میں لے جائے گی کہ شریعت کے سوا سب راہوں کو قرآنِ عظیم باطل و مردود فرما چکا۔

لازم وضروری ہوا کہ طریقت ہی شریعت ہے کہ اسی راہ روشن کا ٹکڑا ہے۔ اِس کا اُس سے جدا ہونا محال و ناممکن ہے، جو اسے شریعت سے جدا مانتا ہے، گویا وہ اسے راہِ خدا سے توڑ کر راہِ ابلیس مانتا ہے، مگر حاشا! طریقتِ حقّہ راہِ ابلیس نہیں قطعاً راہِ خدا ہے، خواہ بندہ کیسی ہی ریاضتوں، مجاہدوں اور چِلّہ کشیوں میں وقت گزارے، ہرگز اس رُتبہ تک نہیں پہنچے گا کہ تکالیفِ شرع (یعنی اوامر ونواہی سے متعلق شریعتِ مُطھَّرہ کے فرامین) اُس سے ساقط ہوجائیں اور اسے اسپ بے لگام و شُترِ بے زمام کر کے چھوڑ دیا جائے۔

قرآنِ عظیم میں فرمایا: ''اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ''، ترجمہ: ''بے شک اسی سیدھی راہ پر میرا رب ملتا ہے'' اور فرمایا: ''وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡہُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ''، اس رکوع کے آغاز سے احکامِ شریعت بیان کر کے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اور اے محبوب! تم فرمادو کہ یہ شریعت میری سیدھی راہ ہے، تو اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا اور راستوں کے پیچھے نہ لگ جاؤ کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے جدا کر دیں گے''۔ دیکھو! قرآنِ عظیم نے صاف فرمادیا کہ شریعت ہی صرف وہ راہ ہے، جس کا مُنۡتَھٰی (یعنی مقصود) اللہ ہے اور جس سے وصول الی اللہ ہے، اس کے سوا آدمی جو راہ چلے گا، اللہ کی راہ سے دُور پڑے گا۔ طریقت میں جو کچھ منکشف ہوتا ہے، شریعت ہی کے اتباع کا صدقہ ہے، ورنہ بے اتباعِ شرع بڑے بڑے کشف راہبوں، جوگیوں، سنیاسیوں کو دیے جاتے ہیں، پھر وہ کہاں تک لے جاتے ہیں، اُسی نارِ جحیم وعذاب الیم تک پہنچاتے ہیں''۔

(مَقَالُ الۡعُرَفَاء بِاِعۡزَازِ شَرۡعٍ وَعُلَمَاء، بحوالہ فتاویٰ رضویہ، ج:21، ص:24-523)

''صوفی'' وہ ہے کہ اپنی خواہشات کو تابعِ شرع کرے، بے اتباعِ شرع کسی خواہش پر نہ لگے۔ اسی طرح وہ شخص بھی صوفی نہیں ہوسکتا جو ہوا وہوس اور نفسانی خواہشات کی خاطر شریعت کو ترک کردے اور اتباعِ شریعت سے آزاد ہو، شریعت غذا ہے اور طریقت قوت، جب غذا ترک کی جائے گی تو قوت خود کمزور ہوگی، شریعت آنکھ ہے اور طریقت نظر (اور) آنکھ پھوٹنے کے بعد نظر کا باقی رہنا محال ہے، کیونکہ عقلِ سلیم اِسے قبول نہیں کرتی تو شریعتِ مُطھَّرہ میں کب مقبول ومعتبر ہوگی۔ قربِ الٰہی کی منزل پانے کے بعد اگر اتباعِ شریعت کے ترک کی گنجائش ہوتی اور احکامِ شریعت پر عمل لازم نہ رہتا یا بندہ اس میں مختار ہوتا، تو سیّدالعالمین ﷺ اور امام الواصلین علی کرّم اللہ تعالیٰ وجھہ اس کے سب سے زیادہ حق دار ہوتے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں، بلکہ جو جس قدر حق تبارک وتعالیٰ کے زیادہ قریب ہوتا ہے، اُس کے لیے شریعت کی پابندیاں اور زیادہ سخت ہوجاتی ہیں، اسی لیے کہا گیا ہے: ''حَسَنَاتُ الۡاَبۡرَارِ سَیِّئَاتُ

الْمُقَرَّبِيْنَ ''، یعنی بعض صورتوں میں عام نکوکار لوگوں کے لیے جو امور نیکی کا درجہ رکھتے ہیں، وہی اعلیٰ مرتبے کے حامل صالحین کے لیے عیب قرار پاتے ہیں، کسی نے کہا ہے: ''نزدیکاں رابیش بود حیرانی'' (قریب والوں کو حیرت زیادہ ہوتی ہے) اور: ''جن کے رُتبے ہیں سوا، ان کو سوا مشکل ہے''۔

سب کو معلوم ہے کہ سیّد المعصومین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رات، رات بھر عبادات و نوافل میں مشغول رہتے اور امت کی فکر میں سرگرداں رہتے۔ نماز پنجگانہ تو تمام اہلِ ایمان کے ساتھ آپ پر بھی فرض تھی، لیکن آپ کے بلند ترین مقام کے سبب آپ پر نمازِ تہجد بھی فرض قرار دی گئی، حالانکہ اُمّت کے لیے وہ صرف سنت ہے۔

حضرت سیّد الطائفہ جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا گیا: کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ احکامِ شریعت تو وصول الی اللہ کا ذریعہ تھے اور ہم تو واصل ہو گئے ہیں، یعنی اب ہمیں اتباعِ شریعت کی کیا حاجت؟، فرمایا: وہ سچ کہتے ہیں، واصل ضرور ہوئے مگر کہاں تک؟، جہنم تک۔۔۔۔ مزید فرمایا: چور اور زانی ایسے عقیدے والوں سے بہتر ہیں۔ اگر میری زندگی ہزار برس بھی ہو جائے، تو فرائض و واجبات کا ترک تو بڑی بات ہے، میں عذرِ شرعی کے بغیر نوافل و مستحبات میں بھی کوئی کمی نہ کروں۔ تو خلق پر تمام راستے بند ہیں مگر وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نشانِ قدم کی پیروی کرے۔

خلافِ پیغمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

ترجمہ: جس کسی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کیا ہرگز منزل مقصود پر نہ پہنچے گا۔

توہینِ شریعت کفر ہے اور علمائے دین کو برا کہنا آخرت میں فضیحت و رسوائی کا سبب ہے۔ شریعت کے دائرے سے باہر نکلنا فسق اور نافرمانی ہے۔

صوفی باصفا، سنی صحیح العقیدہ عالم کے بارے میں خدا اور رسول کے فرمان کے مطابق ہمیشہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ علمائے دین وارثانِ خاتم النبیین ہیں اور علوم شریعت کے نگہبان و علمبردار ہیں۔ پس ان کی تعظیم و تکریم درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعظیم و تکریم ہے اور اس پر دین کا مدار ہے اور مُتدَیِّن خدا ترس عالم دین ہمیشہ صوفی باصفا سے تواضع و انکسار سے پیش آئے گا، کیونکہ وہ حق سے آگاہ ہے اور حق کی پناہ میں ہے اور وہ اسے اپنے سے افضل و اکمل جانے گا کہ وہ دنیاوی آلائشوں سے پاک ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:29، ص:386-390، بتصرف)

عزیزانِ گرامی! آپ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان جاہل، بے عمل بلکہ بدعمل پیروں کی طرف سے آج قرآن و سنت اور اجماعِ امت کے مقابلے پر شاعری کو حجت کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ ان لوگوں نے بزرگوں کے وہ قصے یاد کر لیے ہیں جن کی اولاً تو صحت ہی مشکوک ہے اور اگر بالفرض اُن میں سے کوئی روایت درست بھی ہو تو اسی طرح اُس کی تاویل کرنا ضروری ہے، جس طرح قرآنی آیاتِ متشابہات کی تاویلات ائمۂ تفسیر نے بیان کی ہیں۔ نیز ان بزرگوں کے وہ واقعات جو مستند ہیں، علم دوستی اور علم کی اشاعت پر مبنی ہیں، یہ لوگ ان کو یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکابرِ امت نے گزشتہ صُحفِ سماویہ کے بارے میں یہ اصول بتایا:

(الف) اُن میں جو بات قرآن و سنت کے مطابق ہے، ہم اُس کی تصدیق و تصویب کرتے ہیں۔

(ب) اُن میں جو بات قرآن و سنت کے خلاف ہے، ہم اُس کو رَدّ کرتے ہیں۔

(ج) اُن میں جو بات، نہ قرآن و سنت کے مخالف ہے اور نہ ہی موافق، ہم اُس کے بارے میں سکوت اختیار کرتے ہیں۔

(۳) نبی کریم ﷺ نے ایک جانب کئی ممالک کے حکمرانوں کو خطوط لکھے، اقوامِ عالم

کے ساتھ معاہدے فرمائے اوراتمامِ حجت کے بعد جہادفرما کر اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کا فریضہ ادا فرمایا۔ دوسری جانب آپ ﷺ نے خوارج، روافض اور قدریہ جیسے وجود میں آنے والے اندرونی فتنوں کے نام اور اوصاف بیان کر کے مسلمانوں کوخبردار کیا اور ان کا رَدِّ بلیغ فرمایا۔لہٰذا ہر عالمِ دین کو چاہیے کہ کسی ایک موضوع پر کام کرتے وقت دوسرے فتنوں اور گمراہ فرقوں کے ردکرنے میں تساہل کا شکار نہ ہوں، علمی و باوقار انداز میں حکمت عملی کے ساتھ ان کی گمراہیوں کومسلمانوں پر آشکار کریں تا کہ وہ ان فتنوں سے خبر دار ہوں اوران سے بچے رہیں۔

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

"ضرورت کے وقت اہلِ بدعت کا رد اہم فرائض میں سے ہے، چنانچہ امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رَدِّ جہمیہ میں کتاب تصنیف فرمائی۔وَفِیْ حَدِیْثٍ عِنْدَ الْخَطِیْبِ وَغَیْرِہٖ: اَنَّہٗ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: اِذَا ظَھَرَتِ الْفِتَنُ اَوْ قَالَ: اَلْبِدَعُ وَسُبَّ اَصْحَابِیْ فَلْیُظْھِرِ الْعَالِمُ عِلْمَہٗ، فَمَنْ لَّمْ یَفْعَلْ ذٰلِكَ فَعَلَیْہِ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلَائِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ، لَا یَقْبَلُ اللّٰہُ مِنْہُ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا، ترجمہ: خطیب بغدادی ودیگر محدثین کرام نے روایت کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب فتنے یا بدعتیں ظاہر ہونے لگیں اور میرے اصحاب کو گالی دی جانے لگے، تو اِن مواقع پر عالم پر لازم ہے کہ وہ اپنا علم ظاہر کرے اور جو ایسا نہ کرے (یعنی مداہنت سے کام لے) تو اُس پر اللہ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے، اللہ نہ اُس کی کوئی فرض عبادت قبول فرمائے گا اور نہ ہی نفل، (فتاویٰ رضویہ، ج:27، ص:131، بتصرف)"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علمائے حق اور مجدّدِ عصر کی ذمہ داریاں اس طرح بیان فرمائی ہیں:

"یَحْمِلُ ھٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُہٗ، یَنْفُوْنَ عَنْہُ تَحْرِیْفَ

الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاْوِیْلَ الْجَاھِلِیْنَ"۔ ترجمہ: اس علم کی ذمے داری بعد میں آنے والے ہر زمانے کے بہترین لوگ اٹھائیں گے، جو دینِ حق سے انتہا پسندوں کی تحریف، باطل پرستوں کی کذب بیانی اور جاہلوں کی ہیرا پھیری کی نفی کریں گے"۔

(مشکوٰۃ: ۲۴۸، شرح مشکل الآثار: ۳۸۸۴، مسند البزار: ۹۴۲۳)

اس حدیثِ مبارک کے کلمات "یَحْمِلُ ھٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ" اور ایک روایت میں "یَرِثُ ھٰذَا الْعِلْمَ" سے معلوم ہوا کہ مجددِ عصر اور علمائے حق کا سابق مجدّدِ دین کے تابع، ہم خیال اور اجماع کا پابند ہونا ضروری ہے۔ "یَنْفُوْنَ عَنْہُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ، "اِنْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْن" اور "تَاْوِیْلَ الْجَاھِلِیْنَ" کے کلمات سے معلوم ہوا کہ دین اور خصوصاً دینی شخصیات کے بارے میں غلو کی نفی کرنا، اہلِ بدعت کو بے نقاب کرنا اور گمراہ فرقوں کی باطل تاویلوں کا رد کرنا ہر دور کے مجدد اور علمائے حق کی ذمہ داری ہے۔

۞

(۲)

"تکفیر" اور "فتویٰ کفر" جاری کرنے کی بابت شرعی اصلاح

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

فائدہ جلیلہ: چار قسم کی باتیں مُسلّمات میں سے ہیں:

(۱) **ضروریاتِ دین:** جن کا ثبوت قرآن عظیم یا حدیث متواتر یا اجماع قَطْعِيَاتُ الدَّلَالَات وَاضِحَةُ الْإِفَادَات سے ہوتا ہے، جن میں کسی شبہے اور تاویل کی کوئی گنجائش نہیں اور ان کا منکر یا ان میں باطل تاویلات کا مرتکب کافر ہوتا ہے۔

(۲) **ضروریاتِ مذہبِ اہلسنّت وجماعت:** ان کا ثبوت بھی دلیل قطعی سے ہوتا ہے، مگر ان کے قطعی الثبوت ہونے میں معمولی سے شبہے اور تاویل کا احتمال رہتا ہے، اسی لیے ان کا منکر کافر نہیں، بلکہ گمراہ، بدمذہب اور بے دین کہلاتا ہے۔

(۳) **ثابتاتِ محکمات:** ان کے ثبوت کو دلیل ظنی کافی ہے، جب کہ اس سے اس درجے کا ظنِ غالب حاصل ہو کہ اس کی جانبِ مخالف مطروح، مضمحل (کمزور) قرار پائے اور خاص توجہ کے قابل نہ رہے۔ ان کے ثبوت کے لیے احادیثِ آحاد، صحیح یا حسن کافی ہے، اسی طرح سوادِ اعظم کے

اصلاحِ عقائدواعمال

قول اور جمہور علماء کی سند ثَابِتَاتِ مُحْکَمَات کے لیے کافی ہے، فَاِنَّ يَدَ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ (جماعت کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے)۔ مندرجہ بالا معیار کے مطابق مسائل کی وضاحت کے بعد ان کا منکر خطاکار وگناہگار قرار پاتا ہے، لیکن اسے بے دین یا بد دین یا گمراہ یا کافر یا خارج از اسلام قرار نہیں دیا جائے گا۔

(۴) ظَنِّيَاتِ مُحْتَمَلَه: ان کے ثبوت کے لیے ایسی دلیل ظنّی بھی کافی ہے، جس کے بعد جانبِ مخالف کی بھی گنجائش ہو، ان کے منکر کو صرف خطاکار اور قصوروار کہا جائے گا، گنہگار، گمراہ اور کافر نہیں کہا جائے گا۔

ان میں سے ہر بات اپنے ہی مرتبے کی دلیل چاہتی ہے، جو فرقِ مراتب نہ کرے اور ہر مسئلے کے لیے اعلیٰ درجے کی دلیل مانگے، وہ جاہل، بے وقوف یا مکّار فلسفی ہے:

ہر سخن وقتے، ہر نکتہ مقامے دارد

ترجمہ: ''ہر بات کا کوئی وقت اور ہر نکتے کا کوئی خاص مقام ہوتا ہے''۔۔۔اور:

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

ترجمہ: ''جو دعوے اور دلیل کے درمیان مناسبت کو ملحوظ نہ رکھے، وہ زندیق ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:29، ص:385، بتصرف)

امام اہلسنّت کے فرمان کا منشا یہ ہے کہ کسی بات کے لیے جس درجے کے عقیدے یا فقہی حیثیت کا دعویٰ ہو، اُسی درجے کی دلیل مانگنی چاہیے۔

کفرِ لزومی والتزامی میں فرق:

(۱) کفر کی دو اقسام ہیں:

اولاً: یہود و ہنود و نصاریٰ، مجوس، صابئین اور بت پرستوں کا کفر قرآن میں صراحۃً

مذکور ہے۔ مادہ پرست، بدھ مت اور جین مت وغیرہ کے پیروکار اور دہریہ کا کفر دلالت النص سے ثابت ہے۔

ثانیاً: کوئی اپنے ظاہر یا دعوے کے مطابق مسلمان ہے، لیکن وہ قرآن یا سنتِ متواترہ یا اجماعِ قطعی سے جو عقیدہ یا عمل اس طرح ثابت ہو کہ قطعی الدلالۃ اور قطعی الثبوت ہو اور ضروریاتِ دین میں سے ہو اور اُس کا براہِ راست انکار یا توہین واستہزاء کرے، تو کافر ہوجائے گا، اِسی کو "کُفرِ التزامی" کہا جاتا ہے۔

مثلاً: ختمِ نبوت کا انکار، خاتم النبیین کے اجماعی معنی کا انکار، آخرت، اُخروی جزا وسزا، حشر ونشر اور جنت وجہنم کا انکار، اللہ تعالیٰ یا کسی بھی نبی مکرّم کی شان میں اہانت، اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان طرازی، قرآن کو تحریف شدہ یا بیاضِ عثمانی ماننا، غیرِ نبی کو نبی سے افضل ماننا اور مسلمانوں کے خون کو بلا تاویل حلال قرار دینا، شعائرِ اسلام جیسے نماز، روزہ اور حج وغیرہ کا مذاق اڑانا اور اس کے علاوہ وہ تمام کفریات، جو عقائد اور فقہ کی معتبر کتابوں میں صراحت کے ساتھ مذکور ہیں، کا قائل ہونا۔

(۲) بعض فقہائے کرام "لُزُومِ کفر" کی صورت میں بھی کفر کا اطلاق کردیتے ہیں۔ "لُزُومِ کُفر" سے مراد یہ ہے کہ براہِ راست ضروریاتِ دینیہ میں سے کسی بات کا انکار تو نہیں ہوتا، لیکن مقدمات ترتیب دیے جائیں تو یہ بات آخر کار ضروریاتِ دینی میں سے کسی ایک کے انکار پر مُنتَج ہوتی ہے۔ اس صورت میں احتیاطاً توبہ اور تجدیدِ ایمان کا حکم دیا جاتا ہے، لیکن اس کی بنیاد پر کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔ الغرض جب تک کسی کے قول میں تاویل کے ساتھ صحت کا ادنیٰ پہلو بھی موجود ہے، اسکی تکفیر سے گریز کرنا واجب ہے۔ اسی طرح بدگمانی سے کام لینا اور صحت کا پہلو تلاش کرنے کی بجائے منفی پہلو تلاش کرنا، محض عوام کے دلی جذبات سے ناجائز فائدہ

اٹھاتے ہوئے انہیں کسی کے خلاف بھڑکا دینا، علمائے حق کا طریقہ نہیں بلکہ بدمذہبوں کا شعار ہے۔

اہلسنّت وجماعت کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ کسی کی تکفیر کرنے میں حد درجہ محتاط رہتے ہیں اور جب تک کفر واضح وروشن نہ ہو، تکفیر سے گریز کرتے ہیں۔ یہ ہمارے مخالفین کا طریقۂ واردات رہا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر کفر وشرک کے فتوے لگا کر مسلمانوں کو کافر قرار دے رہے ہوتے ہیں، حالانکہ اُس بات میں کفر کا دور دور تک کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ پس ہمیں بھی اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کسی کی تکفیر میں حد درجہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے اسماعیل دہلوی کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے رد میں ''اَلْکَوْکَبَۃُ الشِّھَابِیَّۃُ فِی کُفْرِیَاتِ اَبِی الْوَھَّابِیَّۃِ'' کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا، اس میں آپ نے اسماعیل دہلوی کے ستّر کفریات شمار فرمائے، لیکن اُس کی توبہ کی افواہ کی بنیاد پر آپ نے اس کی تکفیر سے گریز فرمایا۔

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ''**اہم تنبیہ**'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"یہ فقہی حکم سفیہانہ کلمات سے متعلق تھا، مگر اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور بے حد برکتیں ہمارے علماءِ کرام، عُظَماءِ اسلام، مُعَظِّمِین کلمۂ خیر الانام علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام پر کہ وہ یہ سب کچھ دیکھتے، ان لوگوں کے ہاتھوں شدید اذیت پاتے، اس گمراہ فرقے کے امام وپیروکاروں سے بلاوجہ شرعی بات بات پر صحیح العقیدہ سنی مسلمانوں کی نسبت حکم کفر وشرک

سنتے ہیں، ایسی ناپاک وغلیظ گالیاں کھاتے ہیں،لیکن اس کے باوجود شدتِ غضب سے مغلوب ہوکر احتیاط کا دامن نہیں چھوڑتے۔ اِن نالائق ولایعنی خباثتوں پر انتقام پر نہیں اترتے۔علمائے حق اس سب کچھ کے باوجود ابھی تک یہی تحقیق فرما رہے ہیں کہ لزوم والتزام میں فرق ہے، اقوال کوکلمۂ کفر کہنے اور قائل کو کافر قرار دینے میں فرق ہے۔ہم اُس وقت تک احتیاط برتیں گے،سکوت اختیار کریں گے، جب تک ضعیف سے ضعیف احتمال ملے گا، کفر کا حکم جاری کرنے سے اجتناب کریں گے۔فقیر غَفَرَلَہٗ تَعَالیٰ نے اپنے رسالے "سُبْحٰنُ السُّبُّوْح عَنْ عَیْبِ کَذِبٍ مَقْبُوْح" کے آخر میں اس موضوع کا قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے اور وہاں بھی اس کے باوجود کہ اُس امام اور اس کے پیروکاروں پر صرف ایک مسئلہ اُمکان کذب میں اٹھتّر (۷۸) وجوہ سے لزوم کفر کا ثبوت دیا،مگر اُس کی تکفیر سے زبان کو روکے رکھا، (فتاویٰ رضویہ، ج:15، ص:236، بتصرف)''۔

(۳) کسی پر کفر یا گمراہی کا حکم دینے سے یہ مطلب لینا کہ مسلمان کو کافر یا گمراہ بنا دیا جو آج کل کے آزاد خیال بیان کرتے ہیں، غلط ہے۔کوئی کسی کے فتوے کی بنیاد پر کافر یا گمراہ نہیں ہوتا، بلکہ اس نے ایسا عقیدہ یا عمل اختیار کیا ہوتا ہے جو اُس کے اسلام سے خروج کا سبب ہوتا ہے۔ اگر علماء اس کے بارے میں فتویٰ جاری نہ بھی کریں، پھر بھی اپنے اس کفریہ عقیدے کی بنیاد پر وہ خود بخود اسلام سے خارج ہو جائے گا، یعنی فتویٰ اس میں موجود خرابی کو ظاہر کرتا ہے، نا کہ اس میں اس خرابی کو پیدا کرتا ہے۔اس لیے اگر کوئی شخص کفرِ التزامی کا ارتکاب کرے تو اس ظالم کو کچھ نہ کہنا اور اُس کی بجائے شرعی حکم بتانے والے عالمِ دین کو دھر لینا بلکہ انہیں دہشت گرد کہہ کر ان کے خلاف مقدمہ بازی کرنا بہت بڑا ظلم ہے اور اسکے خلاف آواز بلند کرنا نہایت ضروری

ہے۔

(۴) اہل سنت کا طریقہ ہے کہ بامحل تکفیر اور بے محل تکفیر میں فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس کے برعکس ہمارے مخالفین کے شِعار پر سب کافر یا سب مسلم کی اندھا دھند پالیسی نہیں اپناتے۔بعض لوگ قطعی اور ظنّی کفر (یعنی لزُوم والتزامِ کفر) کا فرق تک نہیں سمجھتے، مگر وہ دوسروں کو کافر کہتے پھرتے ہیں، جب کہ کسی کو کافر قرار دینے کا فیصلہ صرف اور صرف فقہاء کر سکتے ہیں ورنہ اس کے مفاسد بالکل واضح ہیں، وَلَا عِبْرَۃَ بِغَیْرِ الْفُقَھَآءِ، (فتح القدیر جلد ۶ صفحہ ۹۳، فتاویٰ شامی جلد ۳ صفحہ ۳۲۱)''۔

یعنی یہ تلوار غیر فقہاء کے ہاتھ میں نہیں دی جا سکتی، ورنہ اندھا دھند بے قصور لوگوں کی گردنیں کٹیں گی۔غزالئ زماں علامہ سیّد احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''مسئلۂ تکفیر میں ہمارا مسلک ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جو شخص بھی کلمۂ کفر بول کر اپنے قول یا فعل سے التزامِ کفر کر لے گا تو ہم اس کی تکفیر میں تأمّل نہیں کریں گے، دیوبندی، بریلوی، کانگریسی، نیچری، ندوی، خواہ کوئی بھی ہو۔اس بارے میں اپنے پرائے کا امتیاز کرنا اہلِ حق کا شیوہ نہیں۔اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایک لیگی نے کلمۂ کفر بولا تو ساری لیگ کافر ہوگئی یا ایک ندوی نے التزامِ کفر کیا، تو معاذ اللہ! سارے ندوی مُرتَد ہو گئے۔ہم تو بعض دیوبندیوں کی عباراتِ کفریہ کی بنا پر ہر ساکنِ دیوبند کو بھی کافر نہیں کہتے، چہ جائیکہ تمام لیگی اور سارے ندوی کافر ہوں۔

ہم اور ہمارے اکابر نے اعلان کیا ہے کہ ہم کسی دیوبند یا لکھنو والے کو کافر نہیں کہتے۔ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ کافر ہیں، جنہوں نے معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور محبوبانِ ایزدی (ملائکہ وانبیائے کرام علیہم السلام) کی شان میں صریح گستاخیاں کیں اور باوجود شدید تنبیہ کے انہوں نے اپنی گستاخیوں سے توبہ نہیں کی، نیز وہ لوگ جو ان کی گستاخیوں (یعنی گستاخانہ معنی پر آگاہ ہونے یا مطلع کیے جانے

کے باوجود اس) کو حق سمجھتے ہیں اور گستاخیاں کرنے والوں کو مومن ، اہلِ حق ، اپنا مقتدیٰ اور پیشوا مانتے ہیں اور بس ان کے علاوہ ہم نے کسی مدّعیِ اسلام کی تکفیر نہیں کی ۔ ایسے لوگ جن کی ہم نے تکفیر کی ہے، اگر ان کو ٹٹولا جائے تو وہ بہت قلیل اور محدود افراد ہیں، ان کے علاوہ نہ کوئی دیوبند کا رہنے والا کافر ہے، نہ بریلی کا، نہ لیگی، نہ ندوی، ہم سب کو مسلمان سمجھتے ہیں، (الحق المبین، ص:25-23)''۔

کسی مسلمان کو ناحق کافر قرار دینا حدیث کی رُو سے بہت سخت گناہ ہے اور ایسی صورت میں یہ وبال اُسی کافر کہنے والے پر لوٹے گا۔ مفتیانِ کرام جب کسی قول کو کفریہ قرار دیتے ہیں، تو عموماً یہ لُزومِ کفر ہوتا ہے، جب تک قائل پر اِتمامِ حجّت نہ کر لی جائے، التزامِ کفر سے گریز لازم ہے۔ ہمارا یہ بھی مشورہ ہے کہ موجودہ دور کے مفتیانِ کرام تکفیری فتویٰ جاری کرنے سے پہلے اپنے عہد کے دیگر ثقہ مفتیانِ کرام سے مشاورت ضرور کر لیا کریں۔

وہ واعظین ومقررین جنہوں نے افتاء کی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی، انہیں کسی بھی قسم کے فتوے خاص طور پر کفر کے فتوے جاری کرنے کی اجازت نہیں ہے، خواہ قولاً ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ اگر وہ اپنی روِش تبدیل نہیں کرتے تو وہ حدیث پاک کی اس وعید میں شامل ہیں: ''مَنْ أُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ کَانَ إِثْمُہُ عَلٰی مَنْ أَفْتَاہُ'' ترجمہ: ''جس کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا، (غلط فتوے پر عمل کرنے کی صورت میں) اُس کا وبال اُسی فتویٰ دینے والے پر ہوگا، (سنن ابوداؤد: ۳۶۵۷)''۔

بعض لوگ گزشتہ مسلّم بزرگ شخصیات کی عبارات پر گرفت کرنے کے شوق میں مبتلا ہیں۔ اول تو انہیں ان عبارات کے صحیح محمل کی خبر نہیں ہوتی۔ اگر ان عبارات کی کوئی صحیح تاویل ممکن ہو تو ایک عام مسلمان سے حسن ظن رکھتے ہوئے اس کی محتمل عبارت کو صحیح معنی پر محمول کرنا واجب ہے۔ پس مسلّم بزرگ شخصیت کی ذات پر بلا سبب طعن

شروع کر دینا کتنا برا ہوگا اور اگر بالفرض ان عبارات کی کوئی صحیح تاویل ممکن نہ ہو تو انہیں بعد والوں کا الحاق قرار دیا جائے گا۔

(۵) اہلِ مغرب نے ماضی قریب میں اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کے فریضے سے علمائے حق کو دستبردار کرنے اور ''سب کچھ جائز ہے'' کی روش کو قبولیت دینے کے لیے تصوف کی آڑ میں ایک شعوری تحریک برپا کی، اسی کو ''صُلحِ کُلّی'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور گزشتہ تین عشروں کی دہشت گردی کی آڑ لے کر مسلمانوں کو جہاد کے اصول سے دستبردار کرنا بھی مقصود تھا، ہم ایسی تحریکوں کے ہمنوا نہیں بن سکتے، کیونکہ شرعی جہاد ہمارے عقیدے اور دین کا حصہ ہے، جس کی تفصیلی شرائط فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ یہ اصول بھی ناقابلِ تسلیم ہے کہ صرف وہ یہودی اور عیسائی کافر تھے، جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے زمانے میں آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا، بعد والے یہود و نصاریٰ کافر نہیں، یہ بھی ''تلبیسِ ابلیس'' ہے۔ اسی طرح عالمی سطح پر یہ تقسیم کہ مطلق کفار ومشرکین ایک زُمرے میں ہیں اور یہود ونصاریٰ مسلمانوں کے ساتھ دوسرے زُمرے میں ہیں، جنہیں مومنین (Believers) سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ تعبیر وتشریح قرآنِ مجید کی صریح اور قطعی آیات کے خلاف ہے، اس لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ قرآنِ مجید نے ''سُوْرَۃُ الْبَیِّنَۃِ'' میں اہلِ کتاب کو کفار ومشرکین کے زُمرے میں شامل فرمایا ہے اور یہی امت کا اجماعی عقیدہ ہے۔

علامہ ابن حجر مکی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

''وَأَنَّ مَنْ لَّمْ یُکَفِّرْ مَنْ دَانَ بِغَیْرِ الْإِسْلَامِ کَالنَّصَارٰی أَوْ شَكَّ فِیْ تَکْفِیْرِھِمْ أَوْ صَحَّحَ مَذْھَبَھُمْ فَھُوَ کَافِرٌ''۔

ترجمہ: ''اور یہ کہ اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرنے والوں کی جو

تکفیر نہ کرے، جیسے نصاریٰ یا اُن کے کفر میں شک کرے یا اُن کے مذہب کو صحیح مانے، تو وہ کافر ہے، (اَلْاِعْلَامُ بِقَوَاطِعِ الْاِسْلَامِ، ص:164)"۔

کسی کو اہلِ سنت سے خارج کہنے کا اصول:

(۱) اس امت کا اجماع "حجت" ہے، لہٰذا اجماعی اور جمہوری عقیدے کا منکر بھی "مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّار، (المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۳۹۰)"، کا مصداق ہے۔ آزاد خیالی کا پہلا زینہ اجماع اور جمہور کی مخالفت ہے، اجماعی مسئلہ وہی ہے جس کی تصریح معتبر علمائے امت نے کی ہے۔ جو کوئی ان تصریحات کا اعتبار نہ کرے اور بزعمِ خویش پوری امت کا مقتدا بن بیٹھے، وہ دراصل اجماع کی حجیت کا منکر ہے اور امت میں فساد کا سبب ہے۔ مُتَنَبِّی قادیان (قادیانیوں کے جھوٹے نبی) کا طریقۂ واردات بھی یہی تھا۔

قرآن کی آیات، صحیح احادیث اور اجماعِ امت کے مقابل ابن ہشام اور ابن عساکر کی موضوع روایات اور مرجوح اقوال کو پیش کرنا اور اپنے تصورِ عشق کو دینی مُسلّمات پر ترجیح دینا اور عقلی چٹکلے بیان کرنا حرام و ناجائز اور دین کو منہدم کرنے کے مترادف ہے، جس کے نتیجے میں قرآن و سنت اور شرعی محکمات و مُسلّمات سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

(۲) اہلسنّت و جماعت نے روافض سے اپنا امتیاز یہ بتایا ہے: اَنْ تُفَضِّلَ الشَّیْخَیْنِ وَ تُحِبَّ الْخَتَنَیْنِ وَ تَمْسَحَ عَلَی الْخُفَّیْنِ یعنی حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو تمام صحابہ اور اہلبیت رضوان اللہ علیہم اجمعین میں افضل مانو اور حضرات عثمان و علی رضی اللہ عنہما سے محبت کرو اور موزوں پر مسح جائز مانو۔

(شرح عقائد نسفی صفحہ ۱۵۰، التمہید لابی الشکور السالمی صفحہ ۱۶۵، تکمیل الایمان صفحہ ۷۸، فتاویٰ رضویہ ۹/ ۶۱)

اس کے مقابل فضیلت کا کوئی اور معیار اور اصول قرار دینا اہلسنّت و جماعت

اصلاحِ عقائد و اعمال

کے طریقے کے خلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے لکھا: "وَاَفْضَلُ النَّاسِ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم اَبُوْبَکْرٍ الصِّدِّیْقُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ کے بعد سب لوگوں سے افضل ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، (شرح مُلّا علی القاری عَلی الفقہِ الاکبر، ص:61)"۔

"تفضیلی" اہلسنّت سے خارج ہیں:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس امت میں انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ماننا اہلسنّت و جماعت کا اجماعی عقیدہ ہے۔ اس کے برخلاف کسی اور صحابی خواہ حضرت عمر یا حضرت عثمان یا حضرت علی رضی اللہ عنہم کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل ماننا اہلسنّت سے باہر نکلنا اور روافض کی وادی میں قدم رکھنا ہے۔

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی سے سوال ہوا: "زید کی والدہ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علی شیرِ خدا کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ کے برابر کسی صحابی کا رتبہ نہیں"، تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: "زید کی والدہ عقیدۂ مذکورہ کے سبب اہلسنّت سے خارج اور ایک گمراہ فرقے تفضیلیہ میں داخل ہے، جن کو ائمہ دین نے رافضیوں کا چھوٹا بھائی کہا ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:21، ص:152، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اسی طرح یہ قول کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کے سیاسی خلیفہ بلافصل ہیں اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم روحانی خلیفہ بلافصل ہیں، اہلسنّت و جماعت کے جمہور کے خلاف ہے، اسی لیے اس طرح کے قول سے بچنا بھی لازم ہے کہ اس طرح کے اقوال ہی تفضیلیت کی بنیاد بنتے ہیں۔

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے

"مَطْلَعُ الْقَمَرَيْنِ فِيْ اِبَانَةِ سَبَقَةِ الْعُمَرَيْنِ" کے نام سے افضلیتِ ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما پرایک وقیع کتاب تصنیف کی ہے،اس میں آپ لکھتے ہیں:

"سنیت اس صراطِ مستقیم کا نام ہے جس میں (سورۃ الکہف :ا کے مطابق) طرفین کا افراط وتفریط کی طرف میلان بحمد اللہ حرام ہے،ارشادِ باری تعالیٰ ہے:"وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا،ترجمہ:اوراس میں اصلاً کوئی کجی نہیں رکھی"۔لہٰذا ہم جس طرح ان تبصرات میں اپنے مخالفِ اوّل یعنی فرقۂ تفضیلیہ کے خیالاتِ باطلہ واوہامِ عاطلہ کی بیخ کنی کرتے آئے ہیں،واجب کہ کچھ دیر اوپر سے باگ پھیر کر چار باتیں اُن حضرات سے بھی کرلی جائیں،جنہوں نے بعض متاخرینِ ہند کے بعض کلماتِ زورآزمائی دیکھ کر بداہتِ عقل وشہادتِ نقل کو بالائے طاق رکھا اور حضراتِ شیخین یا جنابِ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی تفضیل مِنْ جَمِيْعِ الْوُجُوْہ کا دعویٰ دائر کردیا کہ جس طرح وہ فرقۂ متفرقہ ہمارے طریقِ مراد میں سنگِ راہ ہے،اِن لوگوں کی خلش بھی چشمِ انصاف میں خارِ دامانِ نگاہ ہے۔جب طرفین کے شبہات کا علاج ہوجائے گا تو ہمارے نزدیک جو تفضیل کے معنی ہیں،ان شاءاللہ اُن کے چہرے سے نقاب اٹھائیں گے کہ مقصودِ اعظم ان مباحث سے وہی ہے،وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ"۔

اب ذرا تبصرۂ اُولیٰ کی تقریر پر دوبارہ نظر ڈالئے کہ جس طرح اس سے یہ امر منصّہ وضوح پر جلوہ گر ہوچکا کہ مجرّد کسی فضیلت سے اختصاص مناطِ افضلیت واکرمیت نہیں،ورنہ تناقضِ بیّن لازم آئے کہ صحابہ میں اکثر حضرات فضائلِ خاصہ سے ممتاز تھے جو اُن کے غیر میں نہ پائے جاتے اور بہ ہمیں وجہ بعض آحادِ صحابہ خلفائے اربعہ سے افضل قرار پائیں اور وہ خلافِ اجماع ہے۔اسی طرح یہ مقدمہ بھی انجلائے تام (وضاحتِ کاملہ) پاچکا کہ ان حضرات میں ایک دوسرے سے بہ جمیع وجوہ افضل اور تمام

افرادِ محامد میں اعلیٰ واکمل نہیں کہہ سکتے،ورنہ خصائص،خصائص نہ رہیں کَمَا لَا يَخْفٰی۔

فقیر حیران ہے،یہ حضرات مفضولیتِ مطلقہ کا اختصاص بہ خصائص میں منافات نہ مانیں گے یا مولیٰ علی کے مناقبِ خاصّہ سے انکار کرجائیں گے،خدارا! ذرا آنکھیں کھول کر کتبِ حدیث دیکھیں۔جس قدر خصائص وافرہ حضرت مولیٰ کے مالک ومولیٰ نے انہیں عطا فرمائے،دوسرے کو تو ملے بھی نہیں،پھر صریح آفتاب کا انکار کیونکر بن پڑے گا؟۔بِحَمْدِ اللهِ! ہمارے آقائے نامدار پر"وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کا ایسا پرتوِ جَلِيَّہ ہے کہ ان کے فضائل ہماری نشر وتذکیر کے محتاج نہیں،نہ ہماری قدرت اس کی وسعت رکھے،مگر حبیب کا ذکر حبیب اور رحمتِ الٰہی کا نزول قریب،لہٰذا شوقِ دلی جوش زن ہے کہ شیخین کی تفضیل من جمیع الوجوہ ماننے والے ذرا سنبھل کر ہمیں بتائیں کہ وہ کون تھا،جسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(ا)"عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: النَّاسُ مِنْ شَجَرٍ شَتَّى، وَأَنَا وَعَلِيٌّ مِنْ شَجَرَةٍ وَاحِدَةٍ"۔

ترجمہ:"جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: لوگ (اپنی اصل کے اعتبار سے) اشجارِ نسب کے مختلف سلسلوں کی شاخیں ہیں اور میں اور علی ایک ہی شاخ سے ہیں"۔

(المعجم الاوسط للطبرانی:4150)

(۲)"عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: كُلُّ بَنِي أُنْثَى فَإِنَّ عَصَبَتَهُمْ لِأَبِيهِمْ، مَا خَلَا وُلْدِ فَاطِمَةَ فَإِنِّي أَنَا عَصَبَتُهُمْ وَأَنَا أَبُوهُمْ"۔

ترجمہ:"حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ہر خاتون کی اولاد کا صُلبی رشتہ ان کے

باپ سے چلتا ہے، سوائے اولادِ فاطمہ کے، کیونکہ میں ان کی صُلب ہوں اور میں ان کا باپ ہوں، (المعجم الکبیر للطبرانی: 2631)''۔ اسی طرح امام اہلسنّت نے فضائلِ امیر المومنین علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور فضائل وخصائص کا بھی ذکر کیا ہے۔

(مَطْلَعُ الْقَمَرَیْن فِی اِبَانَةِ سَبْقَةِ الْعُمَرَیْن، ص:68، کتب خانہ امام احمد رضا، لاہور)

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام میں ''افضلیتِ مطلقہ'' بالترتیب حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو حاصل ہے، البتہ مختلف شعبوں اور زاویوں سے اللہ تعالیٰ نے مختلف صحابۂ کرام کو اختصاص وفضیلت سے نوازا ہے اور ان خصائص وامتیازات میں امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ و کرّم اللہ تعالیٰ وجہہُ الکریم کی شان سب سے ممتاز ہے اور اس کا کسی منصف مزاج صاحبِ علم اور صاحبِ نظر کو انکار نہیں ہونا چاہیے۔ ''افضلیتِ مطلقہ'' سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی صاحبِ ایمان سے سوال کیا جائے: تمام صحابۂ کرام میں افضل کون ہے؟، تو اس کا جواب ہوگا: حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، لیکن اس کو مثبت معنیٰ میں لیا جائے، منفی معنیٰ میں نہ لیا جائے۔ پس افضلیتِ مُطلَقہ اور افضلیت مِن کُلِّ الْوُجُوْہ ہم معنی نہیں ہیں۔

اسی طرح آگے چل کر امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے اسی کتاب کے ص: 78-77 پر جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

سیّد المرسلین ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے جڑے ہوئے تصوف کے زیادہ تر سلاسل کا مرکز یہ اور نقطۂ اتصال امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وَ کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْھَہُ الْکَرِیْم کی ذاتِ گرامی ہے اور اس سے بھی کسی کو اختلاف نہیں ہے، تاہم امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اس سے اتفاق نہیں فرماتے

کہ خلافتِ بلافصل کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، یعنی ایک خلافتِ امارت اور دوسری خلافت روحانی، اس نظریہ کو بھی آپ نے اہلسنّت کے طریقے کے خلاف قرار دیا ہے اور کثیر دلائل کے ساتھ اس نظریہ کی تردید فرمائی ہے، اس نظریے کے حاملین کو آپ نے ''سَنْفَضِیَّہ'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی وہ لوگ جنہوں نے اہلسنّت وجماعت کے روشن مسلک کو بکمالِ عیاری سنّیت اور تفضیلیت کا ملغوبہ بنادیا ہے۔

اسی طرح مفضول کا اَحَبّ (محبوب ترین) ہونا افضلیت مطلقہ کے منافی نہیں ہے، حدیث مبارک میں ہے:

حضرت علی نے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سے حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بابت پوچھا: ''اَھِیَ اَحَبُّ اِلَیْكَ اَم اَنَا؟، قَالَ: ھِیَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْكَ وَاَنْتَ اَعَزُّ عَلَیَّ مِنْھا''۔

ترجمہ: ''(یارسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْكَ وَسَلَّم!) آپ کو فاطمہ زیادہ محبوب ہیں یا میں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ مجھے تم سے زیادہ محبوب ہیں اور تم مجھے ان سے زیادہ عزیز ہو، (مسند حمیدی: 38)''۔

جیسے ہمارے نزدیک اجر کی مقدار کے اعتبار سے از روئے حدیث مکۃ المکرمہ افضل ہے، لیکن محبوب ترین مدینہ منورہ ہے اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے خود اس کے محبوب ترین ہونے کی دعا فرمائی، جس کے مستجاب ہونے میں کوئی مومن شک نہیں کرسکتا''۔

منافقت کی علامات:

اہلسنت کا تحقیقی شعار یہ ہے کہ تمام دلائل پر نظر رکھنے کے بعد فیصلہ کرتے ہیں تا کہ انتشار اور افراط وتفریط کا دروازہ بند ہوجائے۔ مثلاً تمام دلائل دیکھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ منافقت کی مندرجہ ذیل چار علامات ہیں:

سب سے پہلا اور بنیادی منافق وہ ہے جس کے دل میں نبی کریم ﷺ کا بغض ہو، سورۃ المنافقون انہی کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ یہ لوگ کافر سے بھی بدتر ہیں اور دائمی عذاب میں رہیں گے۔

منافقت کی دوسری نشانی:

خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا بغض ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر اور عمر کی محبت ایمان کی نشانی ہے اور ان کا بغض کفر کی نشانی ہے (فضائلِ صحابہ از امام احمد بن حنبل: ۴۸۷)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے کا جنازہ نہیں پڑھا، (سنن ترمذی: ۳۷۰۹)۔ انصار صحابۂ کرام کی محبت ایمان کی نشانی ہے اور انکا بغض منافقت کی نشانی ہے، (صحیح بخاری: ۱۷، صحیح مسلم: ۲۳۵)۔

”قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَللّٰهَ اللّٰهَ فِي أَصْحَابِي، لَا تَتَّخِذُوهُمْ غَرَضًا بَعْدِي، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ، وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِي، وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللّٰهَ، وَمَنْ آذَى اللّٰهَ فَيُوشِكُ أَنْ يَأْخُذَهُ“۔

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خبردار! میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو، میرے بعد انہیں ہدفِ تنقید نہ بناؤ، پس جس نے اُن سے محبت کی، اس کا مُحرّک میری محبت ہے اور جس نے اُن سے بغض رکھا، اُس کا مُحرّک مجھ سے بغض ہوگا اور جس نے اُن کو ایذا پہنچائی، اُس نے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی تو اُس نے اللہ کو ناراض کیا اور جس نے اللہ کو ناراض کیا تو عنقریب اللہ اُسے اپنی گرفت میں لے لے گا، (سنن ترمذی: ۳۸۶۲)، ایسا شخص گمراہ، بے دین ہے اور جہنم کا حقدار ہے۔

منافقت کی تیسری نشانی:

سیدنا علی اور اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کا بغض ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: علی سے صرف مؤمن ہی محبت کرے گا اور صرف منافق ہی اُن سے بغض رکھے گا، (مسلم: ۲۴۰)، میری محبت کا تقاضا ہے کہ میرے اہلِ بیت سے محبت کرو، (ترمذی: ۳۷۸۹)۔ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کی محبت اللہ نے تم پر لازم کردی ہے، (طبقاتِ حنابلہ ۱/۸۲)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلبیت سے بغض رکھنے والا شخص بھی گمراہ، بے دین اور جہنم کا حقدار ہے۔

منافقت کی چوتھی نشانی:

امانت دی جائے تو خیانت کرے، بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جھگڑا کرے تو گالیاں دے، (صحیح بخاری: ۳۴، صحیح مسلم: ۲۱۰)۔

ایک روایت میں ہے: جب معاہدہ کرے تو دھوکا دے۔ منافقین کی یہ علامات احادیث میں مذکور ہیں۔ ان سے مراد عملی منافق ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں چار خصلتیں موجود ہوں تو پھر تم دنیا کی کسی نعمت سے محروم ہونے پر ملال نہ کرو: ”(۱) امانت کی حفاظت کرنا، (۲) اچھے اخلاق، (۳) سچ بولنا، (۴) پاکیزہ کمائی، (مسند احمد ج: ۲ ص: ۱۷۷)“۔

اہلِ بیت اطہار اور تمام صحابۂ کرام علیہم الرضوان کی تعظیم لازم ہے:

اہلسنّت وجماعت کا شِعار رہا ہے کہ وہ خلفائے راشدین، عشرۂ مبشرہ، جمیع اہلبیتِ اطہار، اُمّہات المؤمنین اور جمیع صحابۂ کرام علیہم الرضوان سے محبت کرتے ہیں، اُن سب کی تعظیم کرتے ہیں اور اُن کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں۔ کسی ایک کی تعریف کا مطلب دوسرے کی تنقیص نہیں ہوتا، لیکن احتیاط کا پہلو یہ ہے کہ ایک صحابی رسول کی تعریف کے ساتھ مِنجملہ دیگر صحابۂ کرام واہلبیت عظام کی بھی تعریف کی جائے، امام اہلسنّت

نے حدیث کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا:

اہلسنّت کا ہے بیڑا پار ،اصحابِ حضور
نجم ہیں اور ناؤ ہے عترت رسول اللہ کی

تعظیم اکابر کے بارے میں اہلسنّت وجماعت کا شعار یہی ہے۔بعض لوگ محبت یا منقبت سے متعلق احادیث میں سے کسی ایک کے ساتھ تمسُّک اور دوسری کو نظرانداز کرنے کا شعار اختیار کر کے کج ذہن لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں یا غُلو اور اِفراط وتفریط کی طرف لے جاتے ہیں۔

قرآن کریم کی رُو سے تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی محبت وتعظیم لازم ہے، لیکن خود انبیائے کرام علیہم السلام کے درمیان تفضیلِ درجات کا فرق موجود ہے، اس کے باوجود کسی کی تنقیص کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔اسی طرح صحابۂ کرام علیہم الرضوان کے درمیان بھی درجات ومراتب کا فرق موجود ہے ،لیکن کسی کی تنقیص وتوہین کی اجازت نہیں ہے۔

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی تحریر فرماتے ہیں:

''علامہ شہاب الدین خفاجی ''نسیم الریاض شرح شفا قاضی عیاض'' میں فرماتے ہیں: ''جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن کرے، وہ جہنم کے کتوں میں سے ایک کتا ہے، (فتاویٰ رضویہ، ج:29،ص:363،رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

خطبائے اہلسنّت کی ذمے داری ہے کہ عوام کے درمیان مُتَّفَقَات اور مُسلَّمات کو بیان کریں اور کسی عظیم شخصیت کی فضیلت اس انداز میں بیان نہ کریں کہ اُس کے مقابل اشارۃً ، کنایۃً، استعارۃً اور توریہ وتعریض کے طور پر کسی دوسری شخصیت کی تنقیص یا اہانت کا پہلو نکلتا ہو۔اس سے اہلسنّت وجماعت میں تقسیم در تقسیم اور فساد کے شِعار کو نفوذ کرنے کا موقع ملتا ہے،لہٰذا بہرصورت اس سے اجتناب لازم ہے۔

بالفرض اگر کسی کے دل ودماغ میں تعصب سے ماورا ہو کر اپنی علمی دیانت کے مطابق کوئی تفرُّد یا تمیُّز ہے، تو ایسے اصحابِ علم پر لازم ہے کہ ان تفرُّدات کو اپنی ذات تک محدود رکھیں اور اجماعِ امت کی پیروی کو اپنا شِعار بنائیں۔اکابر علماء وفقہائے امت کے احترام کو ملحوظ رکھیں اور ہرگز ہرگز اسے عوام اہلسنّت میں تفریق اور تقسیم در تقسیم کا ذریعہ نہ بنائیں۔ہمیں معلوم ہے کہ بعض مسائل میں ہمارے بعض علماء کی آراء کا تفرّد ہے، اُسے عوام میں زیرِ بحث نہ لائیں۔

❁

(۳)

میلادالنبی ﷺ کی محافل اور جلوس کی بابت اصلاح

امام الانبیاء والمرسلین رحمۃ للعالمین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت اور بعثتِ مبارکہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے اور سورۂ آل عمران آیت نمبر: ۱۶۴ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بطورِ امتنان واحسان اس نعمتِ عظمیٰ کا ذکر فرمایا اور سورۂ یونس آیت: ۵۸ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت پر اہلِ ایمان کو فرحت وانبساط کا حکم فرمایا اور سورۃ الضحیٰ آیت: ۱۱ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو بار بار بیان کرنے کا حکم فرمایا اور ان احکام کا بہترین مصداق سیدالانام سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کی خوشی ہے۔ اس کے علاوہ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر آپ ﷺ کے فضائل بیان ہوئے اور خود آپ ﷺ نے بھی اپنے فضائل بیان فرمائے۔

لہٰذا آپ کے فضائل بیان کرنا اور آپ کی ولادتِ باسعادت کی خوشی منانا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے اور آپ کی ذاتِ بابرکات سے اظہارِ محبت کا ایک مظہر ہے، اس لیے اہلسنّت وجماعت میں میلادالنبی ﷺ کی مجالس کا انعقاد تواتر کے ساتھ ایک شِعار کے طور پر رائج رہا ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ آج بھی یہ مبارک ومسعود سلسلہ جاری وساری ہے اور اِنْ شَآءَ اللہ تاقیامت جاری وساری رہے گا۔

حشر تک ڈالیں گے ہم پیدائشِ مولا کی دھوم
مثلِ فارس نجد کے قلعے گراتے جائیں گے

اصلاحِ عقائدواعمال

گزشتہ سال میں نے ”محافل میلاد میں منکرات وبدعات کا ارتکاب“ کے عنوان سے فتویٰ لکھا، جو مختلف اخبارات میں بھی شائع ہوا اور سوشل میڈیا پر بھی اُسے بے حد پذیرائی ملی، اس میں راقم (مفتی منیب الرحمن) نے میلاد شریف کے جلسے جلوس کا شرعی جواز بیان کیا، میلادالنبی ﷺ کے جلسے جلوس کی دو حیثیتیں ہیں:

(۱) اپنی اصل کے اعتبار سے نہ ضروریاتِ دین سے ہیں اور نہ ہی ضروریاتِ مسلکِ اہلسنّت وجماعت سے ہیں۔ البتہ نہ صرف ہمارے دیار میں بلکہ اکثر مسلم ممالک میں بھی یہ اہلسنّت کا شِعار اور معمول ہیں اور فی نفسہٖ جائز اور مستحسن ہیں، لیکن ان کا جواز واستحسان اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ انہیں محرّمات، بدعات اور منکرات سے پاک رکھا جائے۔

(۲) اپنے مقصد ومنشا یعنی محبت وتعظیم سیّدالمرسلین ﷺ کے اعتبار سے محافل میلاد اور میلادالنبی ﷺ کے جلوس یقیناً ایمان کا تقاضا ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَتُعَزِّرُوْہُ وَتُوَقِّرُوْہُ“ یعنی رسول اللہ ﷺ کی تعظیم وتوقیر کرو، (الفتح:9)“۔ لہٰذا میلادالنبی ﷺ کی مجالس اور میلاد سے مطلقاً روکنے کا حکم دینا تعظیم وتوقیر رسول ﷺ سے روکنے کے مترادف ہے۔

میلاد کا جواز مسلکِ دیوبند کے بعض اکابر علماء سے بھی ثابت ہے، اگرچہ اب اس دور میں سَلَفی ووہابی فکر سے مغلوب ہوکر یا بعض مفادات کے سبب وہ اسے شرک وبدعت قرار دینے لگے ہیں، حدیثِ پاک میں ہے:

سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ عَنْ صَوْمِ یَوْمِ الْاِثْنَیْنِ، قَالَ: ذَاکَ یَوْمٌ وُلِدْتُ فِیْہِ وَیَوْمٌ بُعِثْتُ فِیْہِ اَوْ اُنْزِلَ عَلَیَّ فِیْہِ۔

ترجمہ: ”(پیر کا نفلی روزہ رکھنا رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا)، آپ ﷺ سے پیر کے

روزے کے بارے میں پوچھا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: (میں پیر کا روزہ اس لیے رکھتا ہوں کہ) یہ میری پیدائش کا دن ہے اور اسی دن میری نبوت کا اعلان ہوا یا اسی دن مجھ پر نزولِ قرآن کا آغاز ہوا، (صحیح مسلم:2739)"۔

اس حدیث کی شرح میں مشہور اہلِ حدیث عالم وحیدالزماں کانپوری لکھتے ہیں:

"اس حدیث سے ایک جماعتِ علماء نے آپ کی ولادت کی خوشی یعنی مجلسِ میلاد کرنے کا جواز ثابت کیا ہے اور حق یہ ہے کہ اگر اس مجلس میں آپ کی ولادت کے مقاصد اور دنیا کی رہنمائی کے لیے آپ کی ضرورت اور امورِ رسالت کی حقیقت کو بالکل صحیح طریقے پر اس لیے بیان کیا جائے کہ لوگوں میں اس حقیقت کا چرچا ہو اور سننے والے یہ ارادہ کر کے سنیں کہ ہم کو اپنی زندگیاں اُسوۂ رسول کے مطابق گزارنا ہیں اور ایسی مجالس میں کوئی بدعت نہ ہو، تو مبارک ہیں ایسی مجلسیں اور حق کے طالب ہیں ان میں حصہ لینے والے، بہر حال یہ ضرور ہے کہ یہ مجلسیں عہدِ صحابہ میں نہ تھیں"۔

(لُغات الحدیث، ج:۲،ص،صفحہ:۱۱۹)

ہماری محبت کا تعلیمِ نبوی کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ مقدس محافل میں موضوع روایات پیش کرنے، مساجد کے اندر اور دروازوں پر تصاویر آویزاں کرنے، بعض مقامات پر نامحرم عورتوں کے ساتھ رقص کرنے، تالیاں بجانے، مذہبی معاملات کا جاہل واعظین اور بدعمل غیر متشرع پیروں کے ہاتھ میں ہونے کی قباحت وشناعت ہر باشعور شخص پر واضح ہے۔ بعض مقامات پر نعت خوانوں اور پیشہ ور مقررین کی ایجنٹوں کے ذریعے بکنگ، میلاد کے نام پر کاروبار، معروف گانوں کی طرز پر نعت خوانی، موسیقی کے آلات اور دُف ڈھول کا استعمال کرنے، مَنوں کے کیک کاٹ کر اہلِ ثروت کی ذاتی تشہیر کی خواہش کی تکمیل وغیرہ، ایسے امور ہیں جن کی روک تھام ضروری ہے۔ پھر راقم نے علمائے وقت سے درخواست کی ہے: تمام مصلحتوں سے بالاتر ہو کر حکمت

واخلاص کے ساتھ ان منکرات کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔

نوٹ: وعظ کی اجرت کے احکام آگے آرہے ہیں۔

ہمیں تسلیم ہے کہ اصلاحِ عقائد پر زور دینے کی اشد ضرورت ہے، لیکن یہ اس انداز میں نہیں ہونا چاہیے کہ اعمالِ صالحہ کی اہمیت کم کی جائے یا انہیں نظرانداز کر دیا جائے اور عوام یہ سمجھنے لگیں کہ جب محض صحتِ عقیدہ نجات کے لیے کافی ہے تو اعمالِ صالحہ کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اعمال کو ایمان کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یقیناً اعمال کی قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے اور جہنم کے دائمی عذاب سے نجات کے لیے محض ایمان کافی ہے، ایمان کے ساتھ تقویٰ و پرہیزگاری بھی ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید واثق ہے کہ بلا عذاب جنت میں داخلہ نصیب ہوگا۔ بعض گنہگار مسلمان یقیناً جہنم میں داخل کیے جائیں گے، جہنم کا سب سے ہلکا عذاب یہ ہے کہ آگ کی جوتیاں پہنائی جائیں گی جس کی گرمی سے اس کا دماغ کھولتا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے اور اپنے حبیب ﷺ کی شفاعتِ عُظمیٰ کے طفیل بلاحساب داخلِ جنت فرمائے۔

بلاشبہ نعرے ہمارا شعار ہیں، لیکن سید المرسلین ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مبارک زندگیوں میں نعروں سے زیادہ عمل اور اصلاحِ کردار پر زور تھا، ہم نے اس پہلو کو مناسب اہمیت دینا ترک کر دیا ہے۔ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی کا اکثر حصہ دعوت وارشاد، کفارِ مکہ کا ستم سہنے اور ہجرت پر منتج ہوا، طائف کا واقعہ اس کی واضح مثال ہے۔

مدنی زندگی میں عباداتِ الٰہی کے علاوہ آپ کی حیاتِ مبارکہ کا مُعتَدبہ حصہ بدر، اُحد، خندق، غزوۂ حدیبیہ، فتحِ خیبر، فتحِ مکہ اور حنین وتبوک ودیگر غزوات میں گزرا۔ روایات کے مطابق جن غزوات میں سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے شرکت فرمائی، اُن کی تعداد پچیس یا ستائیس یا انتیس ہے، اگرچہ تمام غزوات میں جنگ کی

نوبت نہیں آئی۔صحابہ کرام کے سراپا کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔

”محافل میلاد“ اہلسنّت و جماعت کے معمولات کا اہم حصہ ہیں، یہ محافل روحانی بالیدگی اور علم کے حصول کا اہم ذریعہ ہیں،لیکن کچھ عرصے سے بعض دنیاداروں نے اپنی ذات کی نمود ونمائش کی غرض سے محافل نعت کا انعقاد شروع کردیا ہے۔ اِن محافل میں عام طور پر پیشہ ور نعت خواں آتے ہیں جو عجیب وغریب وضع قطع اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں اوران کی نعت خوانی کا مقصد بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کی بجائے دنیاوی منفعت کا حصول ہوتا ہے، جواُن کی عشوہ طرازی اور پڑھنے کے انداز سے بخوبی عیاں ہوتا ہے۔اس طرح کی محافل میں نعت گوئی اور نعت خوانی کے آداب بھی کماحقہٗ ملحوظ نہیں رکھے جاتے۔عام طور پرکسی مستند عالم سے تقریر نہیں کرائی جاتی۔اگر کہیں کسی عالمِ دین کو بلا بھی لیا جائے تو اس کی تقریر سب سے آخر میں یا سب سے پہلے رکھی جاتی ہے، جب عوام کی مُعتد بہ تعداد حاضر نہیں ہوتی۔

ان محافل میں بعض نعت خوان اہلسنّت وجماعت کے برعکس عقائد کے حامل ہوتے ہیں۔بعض کی نعت خوانی اُن کے عقیدے کا حصہ نہیں ہوتی بلکہ محض معاش کا ذریعہ ہوتی ہے، ایسی مثالیں بے شمار مل جائیں گی۔بعض نعت خوانوں کے بارے میں معروف ہے کہ وہ رفض کی طرف رجحان رکھتے ہیں اور بعض کی بدکرداریاں بھی زبان زدعام ہیں۔

نعتِ پاک مصطفیٰ ﷺ اور میلادالنبی کی محافل کی تشہیر کے لیے جدید ذرائع اختیار کرکے خطیر رقم خرچ کی جارہی ہے، جو لوگوں سے دین اور حُبِ مصطفیٰ ﷺ کے نام پر لی جاتی ہے، ہمارے نزدیک مناسب تشہیر پر اکتفا کیا جائے اور اس رقم کو سرکارِ دوعالم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق صدقاتِ جاریہ کی مدات پر خرچ کیا جائے۔

مُرَوَّجہ نعت خوانی کی اصلاح:

سرکارِ دوعالم ﷺ کی نعتِ پاک بیان کرنا سنتِ الٰہیہ ہے اور خود آپ ﷺ کی سنتِ مبارکہ بھی ہے۔مجالسِ نعت کا انعقاد اور نثر ونظم میں آپ کے اوصاف کو بیان کرنا ہمیشہ سے اہلسنّت وجماعت کا شِعار رہا ہے اور یہ ہمارے لیے باعثِ سعادت ہے اور اس شِعار کو اس کی تقدیس اور آداب کے مطابق جاری وساری رہنا چاہیے۔

نعت یا کلام سننے کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیبِ مکرم ﷺ کی محبت، نفس کی اصلاح، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پر مبنی اطاعت واتباع کا حصول ہونا چاہیے۔ان مقاصدِ خیر کے لیے کلام کا خلافِ شرع امور سے پاک ہونا، محفل کا مردوزن کے اختلاط سے پاک ہونا، دُف اور ڈھول کا نہ ہونا اور پیسے کے لالچ کے بغیر ہونا ضروری ہے۔حضرت سیّد علی ہجویری المعروف داتا صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”جاہلوں نے کلام کے ظاہر کو اختیار کرلیا ہے اور اس کے باطن اور اصل مقصد کو چھوڑ کر خود بھی ہلاک ہوئے اور سامعین کو بھی ہلاک کردیا“۔

(کشف المحجوب صفحہ ۴۵۲)

نعت شریف کو جان بوجھ کر گانوں کی طرز پر پڑھنا سخت قبیح ہے، سیّد المرسلین ﷺ نے فرمایا:

اِقْرَؤُوا الْقُرْآنَ بِلُحُونِ الْعَرَبِ وَأَصْوَاتِهَا وَإِيَّاكُمْ وَلُحُونَ أَهْلِ الْعِشْقِ وَلُحُونَ أَهْلِ الْكِتَابَيْنِ، وَسَيَجِيئُ بَعْدِیْ قَوْمٌ يُرَجِّعُوْنَ بِالْقُرْآنِ تَرْجِيعَ الْغِنَاءِ وَالنَّوْحِ لَايُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ، مَفْتُونَةٌ قُلُوبُهُمْ وَقُلُوبُ الَّذِينَ يُعْجِبُهُمْ شَأْنُهُمْ۔

ترجمہ: قرآن کو اہلِ عرب کے لب ولہجہ اور انداز میں پڑھو اور قرآن کو فساق اور

یہود و نصاریٰ کے طرز پر ہر گز نہ پڑھو۔ میرے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو موسیقی اور نوحہ خوانی کے طرز پر قرآن کو پڑھیں گے، اُن کا یہ پڑھنا اُن کے حلق تک رہے گا (یعنی دل میں نہیں اترے گا)، اُن کے دل آزمائش میں ڈال دیے گئے اور اُن لوگوں کے دل بھی جو اُن کے انداز کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں"۔

(شعب الایمان للبیہقی: ۲۶۴۹، مشکوۃ: ۲۲۰۷)

دُف یا ڈھول کے ساتھ نعت پڑھنا جمہور کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ علامہ ملّا علی قاری ''اَلْفِقْهُ الْاَكْبَرُ لِلْاِمَامِ الْاَعْظَمِ اَبِیْ حَنِیْفَةَ نُعْمَانَ بْنِ ثَابِتٍ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

"دُف اور ڈانڈیوں پر قرآن پڑھنا کفر ہے۔ میں کہتا ہوں: اور اسی طرح دُف اور ڈانڈیوں پر اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے اور نعتِ مصطفیٰ ﷺ پڑھنے کا حکم بھی اس کے قریب تر ہے اور اسی طرح ذکرِ الٰہی پر تالیاں بجانا بھی ممنوع ہے، (ص:167)"۔

ذکرِ الٰہی کو بگاڑ کر موسیقی کی جگہ استعمال کرنا:

نعت خوان کا اپنے دائیں بائیں لڑکوں کی ٹیم بٹھالینا جو اللہ تعالیٰ کا اسمِ گرامی بگاڑ بگاڑ کر اس کی تکرار کرتے رہتے ہیں، سخت ناجائز ہے اور اللہ تعالیٰ کا نام بگاڑنا حرام ہے۔ ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا نہیں ہوتا، بلکہ دراصل یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نام کے ذریعے ڈھول کی آواز پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح لاؤڈ اسپیکر یا ساؤنڈ سسٹم کی گونج (Echo) اس طریقے سے کھولنا کہ آلاتِ موسیقی جیسا رِدھم پیدا ہو جائے، ناجائز ہے اور ڈھول ہی کے مترادف ہے۔

مختلف فیہ مسائل میں کسی فریق کی تفسیق جائز نہیں ہے:

آلاتِ موسیقی کے ساتھ قوالی کا مسئلہ علمائے اہلسنّت میں مختلف فیہ رہا ہے۔ بعض علماء نے آلاتِ موسیقی کی ممانعت والی روایات کے مطلق ہونے کی وجہ سے ایسی قوالی کو ناجائز قرار دیا جبکہ دیگر بعض نے ان روایات کی تاویل لہو ولعب کے ساتھ کر کے قوالی کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا۔ ان کے منجملہ دلائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب حکم کسی مشتق پر لگے، تو اس کی علت ''ماخذِ اشتقاق'' ہوتا ہے، سو ''ملاھی'' کا ماخذِ اشتقاق ''لہو ولعب'' ہے، لہٰذا یہ حکم صرف اس صورت میں ہوگا جب ان آلات کو لہو ولعب کے لیے استعمال کیا جائے۔

اس اختلاف کے سبب جن علماء نے قوالی کو ناجائز وممنوع قرار دیا، انہوں نے اہلِ علم اور پابندِ شریعت قوالی سننے والے حضرات کو فاسق وگنہگار قرار دینے سے احتراز کیا اور ان کے باہمی احترام میں بھی اس کی وجہ سے کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کی واضح مثال امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَهُ اللهُ تعالیٰ اور مشائخ کچھوچھہ شریف کے درمیان باہمی احترام پر مبنی تعلقات ہیں۔ امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَهُ اللهُ تعالیٰ نے آلاتِ موسیقی کے ساتھ قوالی کے عدم جواز کا قول کیا اور کچھوچھہ شریف کے علماء یعنی شیخ المشائخ علامہ شاہ علی حسین صاحب اشرفی میاں رَحِمَهُ اللهُ تعالیٰ اور ان کے فرزند محبوب المشائخ حضرت علامہ احمد اشرف رَحِمَهُ اللهُ تعالیٰ آلاتِ موسیقی کے ساتھ قوالی سنتے تھے۔ یہ بات اعلیٰ حضرت رَحِمَهُ اللهُ تعالیٰ کے علم میں تھی، اس کے باوجود آپ ان دونوں بزرگوں کی انتہائی تعظیم وتکریم فرماتے تھے، حالانکہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ فاسق کی تعظیم نہیں کرتے تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غفلت نہیں برتتے تھے۔ اس لیے سلسلۂ چشتیہ کے پابندِ شریعت علماء ومشائخ عظام کی ایسی قوالی جو منکرات شرعیہ سے خالی ہو اور ان کی

بیان کردہ شرائط کے مطابق ہو، اس پر کوئی کلام نہیں ہے۔ البتہ ایسی محافل جس میں مردوزن کا اختلاط ہو، پڑھنے اور سننے والے فاسق وفاجر ہوں، پڑھا جانے والا کلام شریعت کے مخالف بلکہ کفریات پر مشتمل ہو،اس کے عدمِ جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے،اس لیے یہ محافل چاہے وہ قوالی کے نام پر ہوں یا نعت خوانی کے نام پر، ان میں شرکت کرنا جائز نہیں۔

ہمارے مسلّمہ اور مقتدر علمائے اہلسنّت کے درمیان مُجتہد فیہ مسائل میں کسی چیز کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں اختلاف کی نوعیت ایسی ہی ہے، جیسے ائمۂ اربعہ کے درمیان اختلاف رہا ہے اور اس کی بے شمار مثالیں ہمارے فقہی سرمائے میں موجود ہیں۔لیکن اس اختلاف کے باوجود انہوں نے ایک دوسرے کی تفسیق وتضلیل اور اہانت کو اپنا شعار نہیں بنایا، بلکہ باہمی احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ! علماء اہلسنّت اور طریقت وسلوک کے مختلف سلسلوں سے وابستہ مشائخ اہلسنّت کے درمیان بعض فروعی مسائل میں اختلاف کے باوجود باہمی احترام کا رشتہ قائم ودائم ہے۔

شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالٰی لکھتے ہیں:

''بات یہ ہے کہ جب کسی مسئلے میں خود علمائے اہلسنّت میں اختلاف ہو تو ایک دوسرے کو فاسق کہنا درست نہیں ہے، یہاں یہی معاملہ ہے۔ حضراتِ کچھوچھۂ مقدّسہ ہمارے معتمد علمائے اہلسنّت ہیں، وہ مزامیر کے ساتھ قوالی کو جائز کہتے ہیں۔ان کا فرمانا یہ ہے کہ ہدایہ کی عبارت: ''اِنَّ الْمَلَاهِیَ کُلَّهَا حَرَامٌ'' سے مراد وہ آلاتِ موسیقی ہیں جو لہوولعب کے لیے ہوں۔اس بنا پر ان کا موقف یہ ہے کہ لہوولعب کی نیت سے مزامیر سننا حرام ہے،لیکن جو شریعت کو مطلوب کسی نیک مقصد کے لیے سنا جائے، تو اس کو سننا جائز ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ موقف صحیح نہیں ہے،

کیونکہ احادیثِ مبارکہ میں مزامیر اور مَعازِف کو مطلقاً حرام فرمایا ہے اور کسی معنی میں تخصیص عقل سے جائز نہیں ہے،مگر مُجَوِّزین بھی چونکہ معتمد علماء ہیں اور وہ تاویل کے ساتھ اس کو جائز کہتے ہیں،اس لیے ان کی تفسیق جائز نہیں ہے، البتہ ان کے قول کا ردّ کیا جائے گا، اسی بنا پر جو سنی علماء ومشائخ مزامیر کے ساتھ قوالیاں سنتے ہیں،ان کو فاسق کہنا درست نہیں ہے،(فتاویٰ شارح بخاری،بتصرف)''۔

شہزادۂ اعلیٰ حضرت مفتی اعظم ہند علامہ مصطفٰی رضا خان رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالٰی نے اپنے ایک فتوے میں مزامیر کے ساتھ قوالی سننے والی عوام سے حکمِ فسق کی نفی فرمائی اور لکھا:

''مزامیر کے ساتھ قوالی ہمارے نزدیک ضرور حرام وناجائز وگناہ ہے، بعض اہلِ علم نے اختلاف کیا ہے،اگرچہ ہمارے نزدیک ان کا موقف لائقِ التفات نہیں،مگر اس نے ان مبتلا افراد کو حکمِ فسق سے بچا دیا ہے جو اِن کے قول پر اعتماد کر کے اور جائز سمجھ کر مرتکب ہوتے ہیں، (ملخصاً، بتصرف)''۔اس فتوے سے عام لوگوں کو سماع بالمزامیر کی ترغیب نہ ہو، اس لیے فوراً فرمایا:

''اگرچہ شرعاً ان پر اب دوہرا الزام ہے،ایک ارتکابِ حرام کا،دوسرا اسے جائز سمجھ کر جمہور کے قولِ صحیح کے خلاف چلنے کا، (فتاویٰ مصطفویہ، ص:۴۵۶،بتصرف)''۔

مفتی اعظم ہند رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالٰی کا آخر میں اس دوہرے الزام کو ذکر کرنا موصوف کی شانِ فقاہت اور فتویٰ نویسی میں کمال کی ایک بہترین مثال ہے۔مگر ظاہر ہے کہ یہ دونوں الزام جائز سمجھ کر مبتلا ہونے والوں کو گناہگار یا فاسق ثابت کرنے کے

لیے کافی نہیں ہیں، اسی لیے حضور مفتی اعظم رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ نے ان پر حکمِ فسق نہیں لگایا۔

میلادالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلوس:

میلادالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلوس تعظیم وتوقیرِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اظہار کا ایک طریقہ ہیں، اس لیے ان جلوسوں میں نگاہیں نیچے کر کے زبان پر درود شریف یا نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جاری رکھتے ہوئے باوضو اور باوقار انداز میں شرکت کرنی چاہیے کہ اگر کوئی غیر مسلم دیکھے تو کشش محسوس کرے۔ لیکن بعض جلوس اس قدر منفی اثرات کے حامل ہوتے ہیں کہ اغیار کا متاثر ہونا تو کجا، خود سنجیدہ مسلمان بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔

مسجد نبوی اور کعبہ شریف کی شبیہ رکھ کر اُس کے ارد گرد مرد وزن کا اختلاط، بازاروں میں ابتذال اور رزق کی بے حرمتی اس کی چند مثالیں ہیں۔ ان جلوسوں سے دینی فائدہ حاصل کرنے کے لیے مناسب حکمتِ عملی کی ضرورت ہے تاکہ اہلسنّت وجماعت کا صحیح تشخص واضح ہو۔ مستحب اور مستحسن دینی کاموں کو بدعات وخرافات سے پاک رکھنے کا اہتمام بھی ضروری ہے، تاکہ اِن خرابیوں کو گمراہ لوگ اہلسنّت وجماعت کی طرف منسوب کر کے مسلکِ حق کو ہدفِ طعن نہ بنا سکیں۔

(۴)

تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ اور ہماری ذمے داریاں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قریش کی ہجو کرو، کیونکہ اُن پر ہجو تیر کی بوچھاڑ سے زیادہ شاق گزرتی ہے۔ پھر آپ نے حضرت ابنِ رواحہ کو طلب کر کے فرمایا: اِن (کفار) کی ہجو کرو، سوانہوں نے اُن کی ہجو کی، لیکن آپ ﷺ کو اطمینان نہ ہوا۔ پھر آپ نے کعب بن مالک کو طلب کیا، پھر حسان بن ثابت کو طلب کیا، سو جب حضرت حسان آپ کے پاس آئے تو انہوں نے عرض کی: اب وقت آ گیا ہے، آپ نے اس شیر کو طلب فرمایا ہے جو (دشمن کو) اپنی دُم سے مارتا ہے پھر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنی زبان نکال کر اُس کو ہلانے لگے اور عرض کی:

> اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان کو اپنی زبان (کی کاٹ) سے اس طرح چیر پھاڑ دوں گا جس طرح چمڑے کو پھاڑا جاتا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
> (حسّان!) جلدی نہ کرو، کیونکہ اِن قریش کے ساتھ مجھے نسب میں قرابت بھی ہے، ابوبکر قریش کے سب سے بڑے ماہرِ انساب ہیں، پس ابوبکر سے رہنمائی حاصل کرو کہ وہ میرا نسب اُن سے ممتاز کر دیں۔

حضرت حسان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے، رہنمائی لے کر لوٹ آئے اور عرض کی: یارسول اللہ! انہوں نے آپ کے نسب کو ممتاز کر دیا ہے۔ اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا، میں آپ (کے نسب) کو اُن کے بیچ سے اس طرح صفائی سے نکال لوں گا، جس طرح گُندھے ہوئے آٹے سے بال نکالا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں: میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ حسان سے فرمارہے تھے:

> (اے حسان!) جب تک تم اللہ اور اُس کے رسول (کی ناموس) کا دفاع کر رہے تھے، رُوحُ القُدُس (جبریلِ امین) مسلسل تمہاری تائید کر رہے تھے۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: حسّان نے اُن کی ہجو کر کے مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچائی اور کفار کے دلوں کو رنجیدہ کیا۔

حضرت حسّان کے مُنجملہ اشعار میں سے ایک یہ ہے:

> هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَأَجَبْتُ عَنْهُ   وَعِنْدَ اللهِ فِي ذَاكَ الْجَزَاء
>
> ترجمہ: ''(اے دشمنِ رسول!) تو نے محمد (ﷺ) کی ناموس پر حملہ کیا، تو میں نے اس کا جواب دیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں میرے لیے اس میں بڑی جزا ہے، (صحیح مسلم: 6273)''۔

حضرت حسّان نے کفارِ قریش کی ہجو کا رد کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے ارشادِ مبارک کی تعمیل میں آپ ﷺ کی ناموسِ مبارک کا دفاع کیا اور آپ کے فضائل پر مبنی اشعار کہے اور اُن میں بھی آپ ﷺ نے احتیاط کا حکم دیا کہ چونکہ میرا نسب قریش کے ساتھ مخلوط ہے، اس لیے ماہرِ انساب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس

بارے میں رہنمائی حاصل کرلوتا کہ کہیں بالواسطہ آپ کے نسبِ پاک کی طرف طعن کا کوئی شائبہ نہ ہو۔

موجودہ دور میں ناموس رسالت ﷺ کے خلاف باقاعدہ ایک عالمگیر مہم چلائی جارہی ہے، دورحاضر میں "بلاگرز کا فتنہ" اسی کی ایک کڑی ہے۔آج بھی اگر "تحفظ ناموس رسالت ﷺ" کے لیے کوئی اشعار کا سہارا لیتا ہے تو وہ شعراء کرام بہت مبارک ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی ناموس کی حفاظت ہر مسلمان کی غیرت ایمانی کا تقاضا ہے اور ہر مسلمان کو اپنی حیثیت اور دائرۂ کار میں اس کے لیے تن من دھن سے حصہ لینا چاہیے۔

ہم یہ بھی واضح کردینا چاہتے ہیں کہ قانونِ تحفظ ناموس رسالت 295-C میں کسی بھی قسم کی ترمیم کی نہ صرف ہر سطح پر مذمت اور مزاحمت ناگزیر ہے بلکہ اس کے نفاذ کو غیر مؤثر بنانے کے لیے ضابطۂ تعزیرات میں جو قانونی یا انتظامی اقدامات کیے جاتے ہیں، ان کی بھی مذمت اور مزاحمت ضروری ہے، مثلاً یہ کہ جب تک ایس ایس پی سطح کا پولیس افسر یا کسی سطح کا جج مطمئن نہ ہو، 295-C کی ایف آئی آر درج نہیں ہوگی۔

بلاگرز کا فتنہ:

میں نے "بلاگرز کا فتنہ" کے عنوان سے 6 مارچ 2017ء کو ایک کالم لکھا، جس سے ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے:

> Blog کے معنی ہیں: "اپنے نظریات، خیالات، مشاہدات اور تجربات کو باقاعدہ انٹرنیٹ پر محفوظ کرنا تاکہ لوگ انہیں پڑھیں اور پھر اُن میں نئے اندراجات کرنا، کسی مسئلے پر واحد اندراج کو بھی کہتے ہیں"۔اسی کا اسمِ فاعل Blogger ہے۔

میں گزشتہ کچھ عرصے سے بعض اخبارات میں "بلاگرز" پر شدید ردِّعمل دیکھ رہا ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جو ناموسِ رسالت مآب ﷺ، شعائرِ دین اور دینی اقدار کو اپنے ابلیسی جذبات کے اظہار کے لیے تختۂ مشق بناتے ہیں۔میرے لیے ایسی چیزوں کا پڑھنا یا سننا بھی دشوار ہے، کیونکہ نہ دل ودماغ ان چیزوں کو سننے کی تاب رکھتے ہیں اور نہ ہی نگاہ میں یہ حوصلہ ہے کہ ان چیزوں کو دیکھ سکے۔آئی ٹی کی وزارت کی ذمے داری ہے کہ ان بلاگرز کو فوری طور پر بلاک کریں اور ان کی شناخت کر کے انہیں عبرت ناک سزا دیں، اُن کی خاموشی مجرمانہ ہے۔

ہمارے ہاں Cybercrime کا قانون بن چکا ہے، لیکن ہماری روایت یہ ہے کہ قوانین محض دکھاوے کے لیے بنائے جاتے ہیں، انہیں نافذ کرنے کا عزم اور حوصلہ نہیں ہوتا، بس وقت گزاری اور عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کا یہ ایک حربہ ہے۔مزید المیہ یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کے دل ودماغ پر ماڈریٹ اور لبرل بننے کا خَبط سوار ہے تاکہ اہلِ مغرب اور لبرل حلقوں میں اُن کے لیے ایک درجۂ قبولیت پیدا ہوجائے۔لبرل سے مراد ایسے لوگ جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ مکرّم ﷺ کی محبت، شعائرِ دین کی حرمت اور حبّ الوطنی ایسی اَقدار سے مادر پدر آزاد ہوں اور اِن امور کو جب چاہیں نشانے پر رکھ دیں۔ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، رسولِ مکرم ﷺ، قرآنِ کریم کی ناموس اور شعائرِ دین کی حرمت مسلمانوں کے لیے انتہائی حسّاس مسئلہ ہے۔

پہلے ایسی فضا پیدا کی جاتی ہے کہ مسلمان مشتعل ہوں اور پھر اُن پر

انتہا پسندی، نفرت انگیزی اور جذباتیت کی چھاپ لگادی جائے اور جی بھر کر ملامت کی جائے۔ کئی دنوں سے ان بدنصیب بلاگرز کا مسئلہ چل رہا ہے، لیکن اِن لبرل حضرات نے اس پر نہ کوئی آواز اٹھائی اور نہ ہی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی۔ اگر کسی حسّاس ادارے کے بارے میں کوئی اس طرح کی حرکت کر بیٹھے تو اُسے غائب کر دیا جاتا ہے، لیکن ناموسِ رسالت مآب ﷺ، جن پر ہمارے ماں باپ اور ہم سب کی جانیں قربان ہوں، کے حوالے سے اداروں کو بھی کسی کارروائی کی توفیق نہیں ہوتی۔ مذہبی انتہا پسندی کا رونا تو روز رویا جاتا ہے، لیکن لبرل اور سیکولر انتہا پسندوں کے بارے میں کوئی آواز نہیں اٹھاتا، انہیں فتنہ انگیزی، عصبیت اور انتہا پسندی کی کھلی اجازت ہے۔

پس ہماری گزارش ہے کہ قبل اس کے کہ مسلمان سڑکوں پر آئیں اور اُن کے جذبات بے قابو ہوجائیں، آئی ٹی کی وزارت کے حکام، انٹیلی جنس ادارے اور دیگر حسّاس مراکز فوری اِقدام کر کے عوام کے جذبات مشتعل ہونے سے بچائیں۔ ہماری اعلیٰ عدلیہ آئے دن بعض معاملات پر ازخود نوٹس لیتی رہتی ہے، لیکن ان حسّاس امور پر اُن کا Suo Moto نوٹس کبھی علم میں نہیں آیا، کیا ہماری لائقِ صد احترام عدلیہ اور فاضل جج صاحبان کے نزدیک مقدّساتِ دین کی حرمت ان امور کے برابر بھی نہیں، جن پر وہ آئے دن نوٹس لیتے رہتے ہیں۔ سو چیف جسٹس آف پاکستان سے نہایت ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ وہ اس پر فوری نوٹس لیں اور اس فتنے کی ہمیشہ کے لیے سرکوبی کریں، شاید اس کی برکت سے اُن کی حُسنِ عاقبت کا سامان ہوجائے۔

مزید گزارش ہے کہ دینی اَقدار کو پامال کر کے سوشل میڈیا پر جو بین المسالک فتنے برپا کیے جارہے ہیں، اُن کا بھی سَدِّ باب کیا جائے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اِن مذہبی جیالوں کے پاس اس شِعار کا دینی جواز کیا ہے؟۔ مقاصدِ شریعہ میں ایک ''سَدِّ ذرائع'' ہے، اس کے معنی ہیں: ایسی حکمتِ عملی اختیار کرنا کہ کسی برائی کے دَر آنے کا امکان ہی ختم ہوجائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور (اے مسلمانو! مشرکوں کے) اُن (باطل) معبودوں کو برا نہ کہو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں، مبادا وہ بے علمی اور سرکشی کے سبب اللہ کی شان میں کوئی ناروا بات کہہ دیں، (الانعام:108)"۔ یہاں یہ اصول بتایا کہ مشرکوں کے باطل معبودوں کی اہانت سے ممانعت کا سبب یہ نہیں کہ وہ مسلمانوں کی نظر میں قابلِ احترام ہیں، بلکہ یہ ہے کہ کہیں وہ رَدِّعمل میں اللہ تعالیٰ کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ نہ کہہ دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱) "بڑے کبیرہ گناہوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایک شخص اپنے والدین پر لعنت کرے، صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! کوئی شخص اپنے والدین پر کیوں لعنت کرے گا؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ایک شخص دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے، تو وہ (جواب میں) اِس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے، (بخاری:5973)"۔

(۲) کبیرہ گناہوں میں سے کسی شخص کا اپنے ماں باپ کو گالی دینا ہے، صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دے سکتا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! وہ دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے،

تو (رَدِّعمل میں) وہ اِس کے باپ کوگالی دیتا ہے، وہ اُس کی ماں کوگالی دیتا ہے، تووہ اِس کی ماں کوگالی دیتا ہے، (مسلم:146)"۔

ان احادیثِ مبارکہ میں یہ تعلیم دی گئی کہ اگر کسی نے اپنے ماں باپ کی ناموس کی حفاظت کرنی ہے، تو اُسے دوسرے کے ماں باپ کی اہانت، گالی دینے یا اُن پر لَعن طَعن کرنے کے شِعار کو ترک کرنا ہوگا، خواہ اُس کی نظر میں وہ کتنے ہی بےتوقیر کیوں نہ ہوں، کیونکہ رَدِّعمل میں اِقدام کرنا انسان کی فطرت ہے اور اس سے صرف پاک طینت لوگ ہی بچ سکتے ہیں۔

(مطبوعہ: روزنامہ دنیا، 6، مارچ 2017ء)

اہلسنّت کو متحد ہوکر تحفظِ ناموسِ رسالت کے لیے کوئی مشترکہ لائحۂ عمل ترتیب دینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

اہلسنّت وجماعت کی نَشأَۃِ ثَانِیَہ کے لئے ترجیحی امور:

(ماخوذ از: امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی)

(فتاویٰ رضویہ، جلد29، ص:599)

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی سے محبت کے دعوے تو بہت کیے جاتے ہیں، لیکن اُن کی تعلیمات اور شِعارِ زندگی سے اپنی ترجیحات کے مطابق استفادہ کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اہلسنّت وجماعت کی نَشْأَۃ کے لیے جو ترجیحات بتائی تھیں، اُن پر بہت کم عمل کیا جاتا ہے۔ پس لازم ہے کہ مسلکِ امامِ اہلسنّت کو اپنی ترجیحات کے مطابق نہیں، بلکہ اُن کی فکر کے مطابق قبول کیا جائے، یہ نہ ہو کہ بعض چیزوں کو لے لیا اور بعض کو چھوڑ دیا، اسی کو انگریزی میں Pick & Choose کہا جاتا ہے، آپ نے اہلسنّت وجماعت کی نَشْأَۃِ ثَانِیَہ کے لیے جو بارہ نکاتی منشور دیا، سب اپنے اپنے گریبان میں جھانکیں اور فیصلہ کریں کہ اس منشور پر ہم نے کس حد تک عمل کیا

ہے؟۔ امامِ اہلسنّت نے اپنی ظاہری حیات میں جو دردِ دل بیان کیا تھا، کیا آج تقریباً ایک صدی گزرنے کے باوجود ہم نے اُن کی روح کو سکون پہنچانے کا قابلِ اطمینان اہتمام کیا ہے؟، وہ منشور درج ذیل ہے:

(۱) اہلسنّت وجماعت کی خالص اجتماعی قوت کی ضرورت ہے، مگر اس کے لئے تین چیزوں کی سخت حاجت ہے:

(الف) علماء کا اتفاق، جو کہ امامِ اہلسنّت کے بقول اُن کے عہد میں بھی مفقود تھا۔

(ب) تَحَمُّلِ شَاق قدر بِالطَّاق (یعنی اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق مشکلات کو برداشت کرنا)۔

(ج) امراء کا اِنفاق لوجہ الخَلّاق یعنی محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اُمراء کا دینی ترجیحات کے مطابق اس طرح مال خرچ کرنا کہ نام ونمود کا شائبہ تک نہ ہو۔ جب کہ اعلیٰ حضرت کے بقول ہمارے اغنیاء نام ونمود چاہتے ہیں اور وہ اپنی مَن پسند ترجیحات میں خرچ کرتے ہیں۔

امامِ اہلسنّت رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی مزید لکھتے ہیں:

(۲) عظیم الشان مدارس کھولے جائیں، باقاعدہ تعلیمی نظام ہو۔

(۳) اہل اور لائق طلبہ کو وظائف ملیں کہ وہ تعلیمِ دین کی طرف مائل ہوں۔

(۴) مُدرّسین کو اعلیٰ معیار پر بیش بہا تنخواہیں دی جائیں۔

(۵) علم کے شعبوں میں طلبہ کے طبعی رجحان کو جانچا جائے، جسے آج کل Aptitude Test کہتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کا میلان دین کے جس شعبے کی طرف زیادہ ہو، انہیں اُسی شعبے کا مُتَخَصِّص (Specialist) بنایا جائے۔ اس حکمتِ عملی کے تحت اہلسنّت کے لیے مختلف شعبوں کے ماہرین تیار ہوں گے، یعنی مدرسین، مُصنّفین، واعظین اور حسبِ ضرورت مناظرین، پھر تصنیف اور مناظرہ

کے بھی کئی شعبہ جات ہیں۔

(۶) ہر شعبے کے ماہرین کو معیاری تنخواہیں دے کر ملک بھر میں پھیلایا جائے کہ تحریر، تدریس، خطابت ووعظ اور مناظرہ، الغرض ہر شعبے میں اشاعتِ دین کا کام اعلیٰ معیار پر جاری وساری رہے۔

(۷) مصنفین کو معقول اعزازیہ دے کر دینِ حق کی حمایت اور باطل مذاہب کے رد میں دلائلِ حق پر مبنی تصانیف کا اہتمام کیا جائے۔

(۸) پھر ان تصانیف کو اعلیٰ معیار پر طبع کر کے ان کی اشاعت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے۔

(۹) اہلسنّت وجماعت کی ایک مجلسِ مفکّرین (Think Tank) ہو، جو یہ طے کرے کہ کہاں کہاں اور کس شعبے میں ترجیحی طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱۰) مختلف علمی شعبہ جات کے کئی ایسے مُتَخَصِّصِیْن ہیں جو اپنے معاشی مشاغل کی وجہ سے اُن شعبہ جات میں خدمتِ دین کے لیے وقت نہیں نکال پا رہے، انہیں بیش بہا وظائف دے کر معاشی ضروریات سے مستغنی کیا جائے تاکہ اُن کا جوہرِ قابل (Talent) دین کے کام آئے۔

(۱۱) دینی رسائل وجرائد اور اخبارات کا اجراء بھی ہر عہد کی ضرورت ہے، یہ علمی مواد بلا قیمت یا لاگت پر مہیا کیا جائے۔ ایک اور مقام پر آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

(۱۲) سودی نظام کے شکنجے سے نجات دلانے کے لیے مسلمانوں کے اپنے مالیاتی ادارے ہوں، جو اسلامی شراکت ومضاربت کے اصولوں پر تاجروں اور صنعت کاروں کی معاشی ضروریات کو پورا کریں۔

نوٹ: ہم نے امام اہلسنّت کے افکار کا خلاصہ سہل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی

ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ نصف صدی قبل حکیم الاُمت علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی بدایونی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اپنا دردِ دل اس رباعی میں بیان کیا ہے:

اہل سنت بہرِ قوالی و عرس
دیوبندی بہرِ تصنیفات و درس
خرچِ سنی برقبور و خانقاہ
خرچِ نجدی برعلوم و درسگاہ

✿

(۵)

وعظ و بیان کی بابت شرعی اصلاح

جاہل خطباء کے ذریعے دین کا نقصان:

ایسے خطیب اور قاری حضرات جو باقاعدہ عالم نہیں ہیں، دین کے لیے نقصان کا سبب بن رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

سَیَأْتِیْ عَلٰی اُمَّتِیْ زَمَانٌ یَکْثُرُ الْقُرَّاءُ، وَیَقِلُّ الْفُقَھَاءُ، وَیُقْبَضُ الْعِلْمُ وَیَکْثُرُ الْھَرْجُ

ترجمہ: ''میری امت پر جلد ہی ایسا وقت آئے گا کہ اس زمانے میں قاری کثرت سے ہوں گے، فقیہ کم ہوں گے، علم اٹھا لیا جائے گا اور فسادات پھیل جائیں گے''۔

(المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۱۴۰۱، المعجم الاوسط للطبرانی: ۳۲۷۷، مجمع الزوائد: ۸۸۹)

امیر المؤمنین سیّدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایک واعظ سے پوچھا:

کیا تم ناسخ و منسوخ کا علم جانتے ہو؟ اس نے جواب دیا: نہیں! آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' فَاخْرُجْ مِنْ مَسْجِدِنَا وَلَا تُذَکِّرْ فِیْہِ ''، ترجمہ: ''ہماری مسجد سے نکل جا اور یہاں وعظ مت کر، (کنز العمال: ۲۹۴۳۵)''۔

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی سے سوال ہوا: ''ایک شخص اسلام و ایمان و شرع شریف کے احکام کو جانتا ہے، وہ لوگوں کو ''فَذَکِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّکْرٰی'' کے تحت گناہ سے بچنے کی تلقین کرسکتا ہے یا نہیں؟''۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''اگر عالم ہے تو اس کا یہ منصب ہے اور جاہل کو وعظ کہنے کی اجازت

نہیں، وہ جتنا سنوارے گا، اس سے زیادہ بگاڑے گا''۔

(فتاویٰ رضویہ ج:23، ص:717)

غیر عالم کسی مستند سنی عالم کی لکھی ہوئی کتاب سے حذف و زیادتی اور تشریح کے بغیر دیکھ کر درس دے سکتا ہے۔ درحقیقت یہ اس کا وعظ نہیں بلکہ اس سنی عالم کا وعظ کہلائے گا، لیکن اگر وہ اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا زیادتی کرتا ہے تو یہ اس کا وعظ کرنا کہلائے گا اور جاہل کا وعظ کرنا جائز نہیں ہے۔

امام غزالی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اپنے عہد کے جاہل خطیبوں کا شکوہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک گروہ دوسرا ہے جو وعظ و تذکیر کی اصل منہاج سے انحراف کر چکا ہے، اس زمانے کے سارے واعظین اس میں مبتلا ہیں، سوائے اُن نادر اہلِ علم کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس شرورِ نفس سے محفوظ فرما لیا ہے۔۔۔۔

آگے چل کر امام غزالی مزید لکھتے ہیں:

''ان چند مستثنیات کے سوا ہو سکتا ہے کہ ملک کے بعض علاقوں میں ایسے پاکیزہ نفوس لوگ موجود ہوں، لیکن ہمیں اُن کا علم نہیں ہے''۔

(احیاء علوم الدین، ج:۳، ص:۴۸۶)

یہ امام غزالی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے دور کا حال ہے، اس سے اپنے دور کا اندازہ لگا لیجیے، کسی نے سچ کہا ہے: ''قیاس کُن زِگلستانِ مَن بہارِ مَرا''۔۔۔

امام غزالی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی مزید لکھتے ہیں:

''ان واعظین کا ایک گروہ ایسا ہے جو نکتہ آفرینیاں کرتا ہے، ہم وزن جملے بازیوں اور تک بندیوں سے کام لیتا ہے، الغرض ان کی ساری کاوش معنویت کی بجائے وزن بندی پر صَرف ہوتی ہے۔ وہ (عوام میں جوش

پیدا کرنے کے لیے) وصال وفراق کے اشعار پڑھتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُن کی مجالس میں مصنوعی وجد اورنعرے بازی پائی جائے ،خواہ یہ سب کچھ فاسداغراض ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ یہ انسان کے بھیس میں شیطان ہیں ،انہوں نے لوگوں کوراہِ راست سے بھٹکادیا ہے۔گزشتہ زمانوں کےواعظین میں اگرکوئی ذاتی کمزوری بھی ہوتی،توکم ازکم وہ دوسروں کی اصلاح کرتے تھے،شریعت کےمطابق وعظ وتذکیرکرتے ، لیکن یہ لوگ تواللہ کی راہ میں رکاوٹ بن چکے ہیں اورانہوں نے اللہ کی مخلوق کواللہ کی رحمت کے نام پر دلفریب امیدیں دلا کردھوکے میں ڈال دیا ہے۔سواِن کےخطاب سے سننے والوں میں گناہ پر جسارت اور دنیا کے بارے میں رغبت پیدا ہوتی ہے۔(واعظوں کا یہ فریب دوآتشہ ہوجاتا ہے ،خاص طور پر جب یہ) حسین وجمیل لباس اورسواریوں سے خودکو مزیّن کرتے ہیں،اگرآپ سرکی چوٹی سے لےکر پاؤں تک اُن کی ہیئت کو دیکھیں تو دنیا کے بارے میں ان کی شدیدحرص کا آپ کو اندازہ ہوجائے گا،پس اِن واعظین کا فساد اصلاح کے مقابلے میں زائد ہے، بلکہ درحقیقت اصلاح تو ہے ہی نہیں ،یہ بڑی تعداد میں لوگوں کوگمراہ کرتے ہیں اوران کی دھوکابازی پوشیدہ نہیں ہے"۔

(احیاءعلوم الدین،ج:۳،ص:۴۸۶،دارصادر،بیروت)

معراج کی شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک منظر یہ بھی دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبان اور ہونٹ آگ کے انگاروں سے کاٹے جارہے تھے،آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا گیا: یہ آپ کی امت کےفتنہ پرورخطیب ہیں،ایک اورروایت امام ابن حبان اپنی سند کے ساتھ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے فرمایا: معراج کی شب میں نے کچھ لوگ دیکھے جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جارہے تھے،میں نے پوچھا: اے جبرائیل !یہ کون لوگ ہیں؟،انہوں نے کہا: یہ آپ کی امت کے وہ خطیب ہیں جولوگوں کونیکی کاحکم دیتے تھےاوراپنے آپ کو بھول جاتے تھے،حالانکہ یہ کتاب کی تلاوت کرتے تھے،کیایہ عقل نہیں رکھتے۔

(الاحسان بہ ترتیب صحیح ابن حبان،ج:۱،ص:۲۲۳۔۲۲۲،موسسۃ الرسالہ،بیروت)

نعت خوانی کی اجرت:

نعت خوانی کو پیشہ بنانا بھی ناجائزوحرام ہے۔حمدونعت اللہ تعالیٰ اوراُس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقرُّب اور اظہارِمحبت کا ذریعہ ہے۔طاعات میں صرف ان چیزوں کا اجارہ جائز ہے جن کے نہ ہونے سے دین میں حرج واقع ہو: جیسے امامت، مؤذنی،تعلیم قرآن وفقہ وحدیث وتفسیروغیرہ۔نعت خوانی کےذریعے حاصل ہونے والی اجرت ناجائزوحرام ہےاورایسی نعت خوانی کرنے اورکروانے سےثواب توکُجاالٹا گناہ ہوگا۔امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

"زیدنے جواپنی مجلس خوانی خصوصاً راگ سے پڑھنے کی اجرت مقرر کر رکھی ہے،ناجائزوحرام ہے۔یہ اجرت لینا اُس کے لیے ہرگز جائز نہیں اوراس کا کھانا صراحۃً حرام ہے۔اس پرواجب ہے کہ جن جن سےفیس لی ہے یاد کر کے سب کو واپس دے،وہ نہ رہے ہوں تو ان کے وارثوں کو پھیرے،پتانہ چلےتواتنامال فقیروں پرتصدّق کرےاورآئندہ اس حرام خوری سےتوبہ کرےتاکہ گناہ سے پاک ہو"۔

(فتاویٰ رضویہ،ج:23،ص:724)

امام اہلسنّت نےصرف وقت کےاجارے کی اجازت دی ہے۔

وعظ کی اجرت:

اسی طرح وعظ وبیان سےمقصودصرف دنیاوی مال وزر کا حصول ہو،توممنوع

ہے،جس طرح آج کل بعض پیشہ ورمقررین وواعظین نے اپنی تقریروں کا معاوضہ مقرر کررکھا ہے اور پیشگی اجرت وصول کیے بغیر وہ تقریر ووعظ کے لیے کہیں نہیں جاتے ۔ یہ شِعار سخت مذموم اور علماء یہود کی صفات میں سے ہے ۔

امام اہلسنّت وعظ کی اجرت کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''اگر وعظ کہنے اور حمد ونعت پڑھنے سے مقصود یہی ہے کہ لوگوں سے کچھ مال حاصل کریں تو بیشک اس آیتِ کریمہ کے مصداق میں داخل ہیں اور حکم: لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ وصول کرو) کے مخالف، وہ آمدنی ان کے حق میں خبیث ہے، خصوصاً جبکہ ایسے حاجتمند نہ ہوں جن کو سوال کی اجازت ہے، کہ اب تو بے ضرورت سوال دوسرا حرام ہوگا اور وہ آمدنی خبیث تر وحرام مثلِ غصب ہے ۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: مَاجَمَعَ السَّائِلُ بِالتَّکَدِّیْ فَھُوَ خَبِیْثٌ، سائل نے کدوکاوش سے جو کچھ جمع کیا، وہ مالِ خبیث ہے ۔ دوسرے یہ کہ وعظ اور حمد ونعت سے ان کا مقصود محض اللہ کی رضا ہے اور مسلمان بطور خود ان کی خدمت کریں تو یہ جائز ہے اور وہ مال حلال ہے ۔ تیسرے یہ کہ وعظ سے مقصود تو اللہ ہی ہو مگر ہے حاجتمند اور عادۃً معلوم ہے کہ لوگ خدمت کریں گے، اس خدمت کی طمع بھی ساتھ لگی ہوئی ہے، تو اگرچہ یہ صورت دوم کے مثل محمود نہیں، مگر صورتِ اُولیٰ کی طرح مذموم بھی نہیں ہے، جسے درمختار میں فرمایا: اَلْوَعْظُ لِجَمْعِ الْمَالِ مِنْ ضَلَالَۃِ الْیَھُوْدِ وَ النَّصَارٰی، مال جمع کرنے کے لئے وعظ کہنا یہود ونصاریٰ کی گمراہیوں میں سے ہے ۔ یہ تیسری صورت بَین بَین ہے اور اول کے مقابلے میں دوسری صورت کے زیادہ قریب ہے ۔ جس طرح حج کو جائے اور تجارت کا کچھ

مال بھی ساتھ لے جائے جسے: لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ، ترجمہ: ''تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی حلال رزق) تلاش کرو''، فرمایا، لہٰذا فتویٰ اس کے جواز پر ہے، اَفْتٰی بِہِ الْفَقِیْہُ ابواللیث رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کَمَا فِی الْخَانِیَّۃِ وَالْھِنْدِیَّۃِ وَغَیْرِھِمَا، وَالَّذِیْ ذَکَرْتُہٗ تَوْفِیْقٌ بَیْنَ الْقَوْلَیْنِ وَبِاللہِ التَّوْفِیْقِ وَاللہ تعالیٰ اعلم،

ترجمہ: حضرت فقیہ ابواللیث سمرقندی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اسی پر فتویٰ دیا ہے، جیسا کہ فتاویٰ قاضی خان و عالمگیری وغیرہ میں مذکور ہے ۔ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، یہ دوقولوں کے درمیان موافقت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے ہے، وَاللہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ'' ۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:23، ص:381، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

سچی محبت اور خلوصِ نیت:

محفلِ میلاد منعقد کرانے والے احباب پر لازم ہے کہ پیشہ ور نعت خوانوں اور پیشہ ور واعظین کو نہ بلایا کریں ۔ مخلص واعظ اور نعت خوان وہ ہے جو یہ سعادت مند کام پیسوں کے لالچ میں نہ کرے ۔

پیشہ ور نقیبوں سے محافل کو بچایئے!

سٹیج سیکرٹری جسے نقیبِ محفل کہا جاتا ہے، یہ موجودہ دور کی پیداوار ہے ۔ اگر اباحتِ اصلیہ کے تحت کسی کو نقیبِ محفل بنایا بھی جائے تو عالمِ دین یا سنجیدہ باادب ذی علم شخص کو مقرر کیا جائے تاکہ اس کے فائدے پر اس کا نقصان غالب نہ ہو اور وہ صرف اعلان پر اکتفا کرے ۔ غیر عالم کو تو وعظ و بیان کی بھی اجازت نہیں چہ جائیکہ پوری محفل ہی اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دی جائے، آج کل نقابت کے موضوع پر کاروباری لوگوں نے کتابیں چھاپی ہوئی ہیں جنہیں پڑھ کر محض چرب زبان آدمی اچھی خاصی نقابت کر

لیتا ہے۔

نقیب کا اصل کام یہ ہے کہ قاری، نعت خواں یا مقرر کو دعوت دے کر مائیک اس کے حوالے کردے، لیکن یہ نام نہاد نقیب محفل میں نقب لگاتے ہوئے پوری محفل کا آدھا وقت ضائع کر دیتا ہے۔

عام طور پر نقیبِ محفل ناجائز شعر اور من گھڑت روایات بیان کرنے میں ماہر ہوتے ہیں، اپنی جہالت کی بنا پر غلط مسئلہ یا عقیدہ بیان کر دیتے ہیں جس کو مخالفین اہلسنّت کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بعد میں علماء کو جواب دینا پڑتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اِتَّقُوا الْحَدِيْثَ عَنِّي إِلَّا مَا عَلِمْتُمْ، فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ، وَمَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.(سنن الترمذی:۲۹۵۱)''۔

ترجمہ: ''میری حدیث بیان کرتے وقت سخت احتیاط کرو، وہی بات کہو جس کا تمہیں صحیح صحیح علم ہو، جس نے میرے بارے میں جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے اور جو قرآن کی تفسیر اپنی ذاتی رائے سے کرے وہ بھی اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے''۔

(۳) امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى ''اَلْحَدِيْقَةُ النَّدِيَّة'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''عام آدمی کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ایسی بحث کرنا، جس کے نتیجے میں وہ کفر میں گر جائے، بدکاری اور چوری کرنے سے بھی بدتر ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:۱۰،ص:۶۴)

خدا کا خوف رکھنے والے دوستوں سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اگر آپ عالم نہیں ہیں تو یہ ذمہ داری اپنے سر نہ لیں اور ذمہ دار علماء سے بھی درخواست ہے کہ اس قسم کے نوجوانوں کو اپنا نا سمجھ بچہ سمجھتے ہوئے اس کام سے منع فرمائیں اور اپنی محافل میں

انہیں زحمت نہ دیا کریں۔

(۴) غیر ذمہ داروں کے ہاتھوں میں دی گئی ان محفلوں کو رات گئے تک جاری رکھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے محفل کے اکثر شرکاء کی نمازِ فجر یا کم از کم جماعت فجر ضرور ترک ہوجاتی ہے، جو بلاشبہ خلافِ شرع ہے۔ ان محافل میں نعت خوان حضرات بخشش کے پروانے تقسیم کر رہے ہوتے ہیں، بے عملی بلکہ بدعملی کی ترغیب دیتے ہیں۔ حالانکہ ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے، اعمال کا مدار خاتمے پر ہے۔

حضرت علاء بن زیاد تابعی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى فرماتے ہیں:

''تُحِبُّوْنَ أَنْ تُبَشَّرُوا بِالْجَنَّةِ عَلٰى مَسَاوِئِ أَعْمَالِكُمْ وَإِنَّمَا بَعَثَ اللهُ مُحَمَّدًا مُبَشِّرًا بِالْجَنَّةِ لِمَنْ أَطَاعَهُ وَمُنْذِرًا بِالنَّارِ مَنْ عَصَاهُ''۔

ترجمہ: ''تم لوگ چاہتے ہو کہ برے اعمال پر تمہیں جنت کی خوشخبریاں دی جائیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس شخص کیلئے جنت کی خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا ہے جو انکی اطاعت کرے اور اُس شخص کے لیے جہنم کا ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے جو ان کی نافرمانی کرے''۔

(بخاری قبل حدیث:۴۸۱۵)

عقائد نسفی میں ہے:

''اَلْيَأْسُ مِنَ اللهِ تَعَالٰى كُفْرٌ وَالْاَمْنُ مِنَ اللهِ تَعَالٰى كُفْرٌ''۔

یعنی اللہ تعالیٰ (کی رحمت) سے مایوس ہونا بھی کفر ہے اور اللہ تعالیٰ (کے جلال سے اور گرفت پر اُس کی قدرت) سے بے خوف ہوجانا بھی کفر ہے۔

(متن عقائد نسفی صفحہ ۸)

جن محافل میں گناہگاروں کو بے عملی پر تنبیہ کے بغیر محض ان مجالس میں

شرکت کے سبب جنت کی خوش خبریاں سنائی جاتی ہوں، وہاں شیطان کومحنت کرنے کی کیاضرورت ہے۔

ہمیں بتایا گیاہے کہ رات دیر گئے تک محافل کے انعقاد کی وجہ سے لوگوں کی نمازِ فجر یاجماعتِ فجر فوت ہونے کے اندیشے کی بنا پر ایک مذہبی تنظیم نے اپنے کارکنوں کو پابند کیاہے کہ وہ اپنے تنظیمی امور لازمی طور پر عشاء کی جماعت سے لے کر دو گھنٹے کے اندر اندر مکمل کرکے اپنے گھر جاکر جلدی سونے کی ترکیب بنائیں۔نیز محافلِ میلاد کا دورانیہ بھی عشاء کی جماعت کے بعد ایک گھنٹہ پچیس منٹ تک ہوگا،اگر واقعی ایسا ہے تو ہم اس امر کی تحسین کرتے ہیں اور دیگر جماعتوں سے بھی التجا کرتے ہیں کہ وہ بھی اس شعار کو اپنائیں۔

شفاعتِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وضاحت:

ان محافل میں پیشہ ور واعظین ،نعت خوانوں، جاہل پیروں اور نقیبوں کی بے اعتدالیوں کے سبب یوں لگتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اُس کے رسولِ مکرّم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بس گناہگاروں کے ہیں، تقویٰ وطہارت کے حاملین کسی کھاتے میں نہیں، جب کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:''إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ ،ترجمہ: بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے عزت والا وہ ہے، جو سب سے زیادہ متقی ہے،(الحجرات:13)''۔

حضرت معاذ بن جبل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُنہیں رخصت کرنے کے لیے نکلے، حضرت معاذ سوار تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پیدل چلتے ہوئے انہیں وصیت فرمارہے تھے۔وصیت سے فراغت کے بعد آپ نے فرمایا: معاذ! شاید اس سال کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکو اور شاید تمہارا گزر میری مسجد اور میری قبرِ انور کے پاس ہو، (یہ سن کر) حضرت معاذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فراق کا غم محسوس کرتے ہوئے زار وقطار روئے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ کی طرف متوجہ ہوئے

اور فرمایا: میرے سب سے زیادہ قریب اہلِ تقویٰ ہوں گے، وہ جو بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں،(مسند احمد:22052)''۔

بعض واعظین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث ''شَفَاعَتِیْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِیْ'' بیان کرکے لوگوں کو گناہوں پر جری بناتے ہیں اور کہتے ہیں:''پتا چلا کہ وہاں کبیرہ گناہ والوں کے مزے ہوں گے، نیکیاں کرنے والوں کو کوئی نہیں پوچھے گا''، عِیاذًا باللہ! یہ حدیث کی مَن پسند تشریح ہے۔تمام محدثین نے اس حدیث کے تحت خوارج کا رَد کیاہے، جو کبیرہ گناہ والوں کو شفاعت کا حق دار نہیں مانتے تھے۔

محدثین نے فرمایا: شفاعت سے مکمل محرومی اُن کے لیے ہوگی جو صاحبانِ ایمان نہیں ہوں گے، جن کا آخرت پر یقین نہیں ہوگا، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، لیکن جنہوں نے صدقِ دل سے کلمہ پڑھا ہوا اور اُن کا خاتمہ بھی ایمان پر ہوا ہو، کسی نہ کسی مرحلے میں انہیں شفاعت نصیب ہوگی، خواہ اُن سے کبیرہ گناہوں کا صدور بھی ہوگیا ہو، یعنی وہ دائمی طور پر محرومِ شفاعت نہیں رہیں گے۔ ذرا سوچیے! بعض پیشہ ور واعظین اپنی مارکیٹنگ کے لیے احادیثِ مبارکہ کی کس طرح مَن پسند تاویلات کرتے ہیں اور سامعین کو خوش کرنے کے لیے مَن پسند توجیہات پیش کرتے ہیں تاکہ نعرے لگیں اور نذرانے ملیں، خواہ دین کا حقیقی تصور مسخ کردیا جائے۔

بعض پیشہ ور واعظین امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا یہ شعر بھی اپنے مَن پسند موقف کے حق میں استدلال کے طور پر پیش کرتے ہیں:

کیا ہی ذوق افزا شفاعت ہے تمہاری واہ واہ
قرض لیتی ہے گُنہ، پرہیز گاری واہ واہ

یہ شعر امام اہلسنّت نے ایک خاص کیفیت میں کہا ہے اور ہماری دانست میں

اس کا اشارہ کسی خاص خوش نصیب گناہگار کی طرف ہے، آپ نے اس کو مسلمانوں کا عام مزاج بنانے کے لیے ارشاد نہیں فرمایا، ایک حدیث پاک میں سیّدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

”میں اُس آخری جنتی کو جانتا ہوں جو جنت میں داخل ہوگا اور سب سے آخر میں جہنم سے نکالا جائے گا۔ یہ وہ شخص ہوگا جسے قیامت کے دن (اللہ تعالیٰ کے حضور) لایا جائے گا، پھر حکم ہوگا: اس کے چھوٹے گناہ اس پر پیش کرو اور بڑے گناہوں کو پوشیدہ رکھو۔ سو اُس کے چھوٹے گناہ اُس پر پیش کر کے اُس سے پوچھا جائے گا: تم نے فلاں فلاں دن یہ یہ کام کیے، وہ چاروناچار اقرار کرے گا: جی میں نے یہ کام کیے ہیں، کیونکہ اُسے انکار کی مجال نہیں ہوگی اور وہ اپنے بڑے گناہ پیش کیے جانے سے ڈر رہا ہوگا۔ پھر اُسے کہا جائے گا: ہر گناہ کے بدلے میں تمہارے لیے ایک نیکی ہے، پھر وہ (اللہ کی رحمت کو موجزن دیکھ کر) عرض کرے گا: ”ربِ کریم! میں نے بہت سے اور گناہ بھی کیے ہیں، جو یہاں نہیں پیش کیے گئے“، (راوی بیان کرتے ہیں:) میں نے اس موقع پر دیکھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسکرائے یہاں تک کہ آپ کے اطراف کے دندانِ مبارک بھی نظر آئے (یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی انتہائی مسرّت کی ادا تھی)“۔

(صحیح مسلم: 5587)

پس آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے خاص مظاہر ہوں گے، جو خاص خوش نصیبوں کے لیے ہوں گے، ہوسکتا ہے اُس شخص کی کوئی ادا اللہ تعالیٰ کو پسند آگئی ہو، لیکن خطبائے کرام کو عوام میں شریعت کے عمومی ضابطے بیان کرنے چاہییں۔ خاص احوال اور کیفیات کی حکمتوں کو ہر شخص نہیں سمجھ پاتا اور اُس کے گناہوں پر جری ہونے کا

خدشہ رہتا ہے، عالم کی ذمے داری ہے کہ لوگوں کو گناہوں پر ابھارنے کی بجائے اُن سے بچنے کی تلقین کرے۔

یہ ایسا ہی ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے سو اشخاص کو قتل کیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی شانِ کریمی سے اُس کی توبہ قبول فرمالی۔ کیا اُس واقعے کو بیان کر کے لوگوں کو قتل پر ابھارا جائے گا کہ عِیَاذًا بِاللہ! پروا نہیں قتل کرتے چلے جاؤ، آخر میں معافی تو ہو ہی جائے گی یا یہ بتایا جائے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود رحمت کے فیضان کا ایک خاص واقعہ ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آس لگائے رکھنا اور کبھی بھی مایوس نہ ہونا ایمان کا تقاضا ہے، سو بڑے سے بڑے گناہگار کو بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ ایک بزرگ ابوسعید ابوالخیر نے کہا:

باز آ باز آ، ہر آنچہ ہستی باز آ ۔۔۔ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
این درگہِ ما، درگہِ نومیدی نیست ۔۔۔ صد بار اگر توبہ شکستی، باز آ

ترجمہ: ”اے گناہگار! تو جو کوئی بھی ہے اللہ کی نافرمانی سے پلٹ آ، خواہ تو کافر یا آتش پرست یا بت پرست ہے، پھر بھی توبہ کر اور رحمتِ باری کی طرف پلٹ آ۔ اللہ کی بارگاہ ناامیدی کی بارگاہ نہیں ہے، تو نے اگر سو بار بھی توبہ کر کے پیمانِ وفا کو توڑ دیا ہے، پھر بھی پلٹ آ“۔

جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، کوئی رہروِ منزل ہی نہیں

اب اگر کوئی واعظ اس واقعے کو شریعت کے عمومی ضابطے کے طور پر بیان

کرکے کبیرہ گناہوں کی طرف بالواسطہ یا بلاواسطہ ترغیب دے ،تواسی کوعربی میں ''تَأْوِیْلُ مَالَمْ یَرْضَ بِہِ الْقَائِلُ'' کہتے ہیں،یعنی کسی کے قول کی ایسی تاویل کرنا جوقائل کی منشاکے خلاف ہو۔

قتلِ ناحق کی مذمت وشناعت میں توکثرت کے ساتھ قرآن وسنت کی نصوص موجود ہیں:اللہ تعالیٰ نے ایک بےقصور انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل سے تعبیر فرمایاہے اور حدیث میں فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک پورے نظامِ کائنات کی بساط کو لپیٹ دینا ایک بےقصور مسلمان کے قتلِ ناحق کے مقابلے میں معمولی بات ہے''۔

(سنن ترمذی:1395)

یہاں گنجائش نہیں کہ کتاب وسنت کی تمام نصوص کوتفصیل سے بیان کیاجائے۔
اسی طرح سیّد المرسلین ﷺ کی شفاعتِ عظمٰی کا بیان اس طرح کرنا کہ کبیرہ گناہوں کی سنگینی کومعمولی بنا کر پیش کیا جائے یااس سے کبیرہ گناہوں پر جری کیا جائے ،ایسا کرنے والا ضالّ ومُضِلّ ہے اور:''خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃ'' کا مصداق ہے،یہ بہت بڑا ظلم ہے اور ایسے شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا۔امام اہلسنّت امام احمد رضا قادری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا مذکورہ بالا شعر تو رحمۃٌ للعالمین ﷺ کی شفاعتِ کبریٰ اور شفاعتِ عظمٰی کو بدرجۂ کمال بیان کرنے کے تناظر میں ہے،دین کی نزاکتوں کو بازیچۂ اطفال نہ بنایا جائے۔

مروجہ خطابات کی اصلاح:

آج کے دور کی مُجملہ خرابیاں یہ ہیں:

(۱) جاہل لوگوں کا خطیب بن جانا۔

(۲) خوش آوازی اللہ کی نعمت ہے لیکن اسے علم پر ترجیح دینا غلط ہے۔

(۳) قرآن وسنت اور مستند روایات کی بجائے موضوع روایات بیان کرنا۔

(۴) اصلاح کی بجائے عوام کی بے جا فرمائشوں کو ترجیح دینا۔

(۵) صرف جنت کی بشارتیں سنانا اور گناہ کی وعیدیں بیان نہ کرنا۔

(۶) منہاجِ نبوت کے خلاف وعظ کرنے والوں کا سٹیج پر بیٹھے علماء کو اپنی خرافات پر گواہ بنانا اور علماء کا انہیں نہ ٹوکنا۔

(۷) اگر کوئی غلط بات پر ٹوک دے تو اس کی بے جا مخالفت شروع کردینا۔

(۸) علمی خطاب پر پیشہ ورانہ نعت خوانی کو ترجیح دینا اور دیر سے خطاب شروع کرانا۔

(۹) رات دیر گئے تک محافل کو جاری رکھنا اور صبح کی نماز سے محرومی کے اسباب پیدا کرنا۔

(۱۰) دینی محافل ومقاصد کے لیے بجلی کا غیر قانونی استعمال جائز نہیں ہے اور اس پر اجر کی توقع کرنا عبث ہے،اس کے لیے متعلقہ ادارے سے باقاعدہ اجازت لی جائے اور ادائیگی کی جائے۔

(۱۱) عملی ومعاشرتی خرابیوں پر مشتمل موضوعات کو فراموش کرنا۔

(۱۲) علم دین کو فروغ دینے کے بجائے غیر ترجیحی امور کو فروغ دینا۔

(۱۳) نقیبِ محفل کے نام سے ایک نئے پیشہ ور طبقے کو فروغ دینا جو اپنی ٹُک بندیوں سے محفل کا کافی وقت ضائع کردیتا ہے۔

(۱۴) متبادل راستہ دیئے بغیر عام گزرگاہوں پر محافل کا انعقاد کرکے لوگوں کی آمد ورفت کے حق کو تلف کرنا،اسی کو فقہ میں 'حقِ مُرور'' (Right of passage) کہا گیا ہے۔

(۱۵) اسپیکر کی آواز کوضرورت سے زیادہ بلند کرنا جس سے لوگوں کو ایذا پہنچے اور دلیل یہ دینا کہ کیا گانے زور سے نہیں بج رہے ہوتے ۔ایک غلطی کو دوسری غلطی کے جواز کی دلیل بنانا درست نہیں ہے، اسی کو ''بِنَاءُ الْفَاسِدِ عَلَی الْفَاسِد'' کہتے ہیں۔

(۱۶) لاؤڈ اسپیکر پر خواتین کا نعت پڑھنا اور خطابات کرنا جو فتنے کا باعث ہوسکتا ہے، اسے امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے ناجائز قرار دیا ہے۔البتہ خواتین کی مجلس میں خاتون مبلّغہ کا وعظ کرنا جائز ہے، تاہم لاؤڈ اسپیکر کی آواز بقدرِ ضرورت ہونی چاہیے۔

(۱۷) بزرگانِ دین کے اعراس شریعت کے مطابق منانے کی بجائے انہیں کھیل تماشے اور میلے ٹھیلے کا رنگ دے دینا اور پیشہ ور واعظین کا جاہل و بدعمل سجادگان کی خوشامد کرنا۔ یہ چند امور ہیں جو خرابی کا سبب بن رہے ہیں اور ان کی اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔

❁

(۶)

شاعری کی بابت شرعی اصلاح

شاعری فی نفسہٖ نہ حرام ہے اور نہ مطلوبِ شرعی، اس پر شرعی حکم اس کے مندرجات یا مشمولات (Contents) پر لگے گا، اس کا حَسَن، حَسَن ہے اور قبیح، قبیح ہے۔ قرآن مجید نے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر مروّج شاعری کی مذمت کی ہے:

(الف) یہ خیر وشر کے امتیاز کے بغیر ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

(ب) ان کے قول وفعل میں (بالعموم) تضاد ہوتا ہے۔

(ج) شاعری کے حَسَن، یعنی جو حمد ونعت، بزرگانِ دین کی منقبت اور حکمت ودانش کی باتوں پر مشتمل ہے، کو نبی کریم ﷺ نے ان کلماتِ مبارکہ کے ذریعے قبیح کے حکم سے مستثنیٰ فرمایا ہے: ’’وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِکْمَۃً‘‘ اور یقیناً بعض شعروں میں حکمت کی باتیں بھی ہوتی ہیں، (صحیح بخاری: ۶۱۴۵)‘‘۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

’’وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ‘‘۔

ترجمہ: ’’اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں، کیا آپ نے نہیں دیکھا

کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اور بے شک وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کیا اور مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لیا اور عنقریب ظالم لوگ جان لیں گے کہ وہ کون سے ٹھکانے پر پلٹ کر جائیں گے‘‘۔

(الشعراء: ۲۲۴ تا ۲۲۷)

ان آیاتِ مبارکہ کی تفسیر ملاحظہ کیجیے:

(۱) کفار نے ہمارے نبی کریم ﷺ پر شاعر ہونے کا الزام لگایا تھا، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے شاعری کی نفی کرتے ہوئے فرمایا: ’’شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں، (الشعراء: ۲۲۴)‘‘۔

مراد یہ ہے کہ شاعروں کی پیروی اکثر گمراہ اور عیاش قسم کے لوگ کرتے ہیں جبکہ اللہ کے محبوب ﷺ کے دامنِ اقدس سے وابستہ ہونے والے تمام لوگ تقویٰ کے پیکر ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام علیہم الرضوان کی عظیم سیرت وکردار کو اپنے محبوب کی طہارت کی دلیل بتایا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ’’کیا تم دیکھتے نہیں کہ یہ شاعر ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں، (الشعراء: ۲۲۵)‘‘۔

سرگرداں پھرنے والے شاعر وہ ہیں جو دینی طور پر غیور نہیں ہوتے، محض مال اور واہ واہ کے دلدادہ ہوتے ہیں، خود کو دین ومذہب سے بالاتر سمجھتے ہیں، ان کے مشاعرے میں ہر مذہب کے شاعر پائے جاتے ہیں، گمراہ شخص اور باطل مذہب کی تائید کرتے ہیں، ان کی فرمائش پر کلام لکھتے ہیں، ہر محفل اور ہر سٹیج پر پہنچ جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے ’’ہر وادی‘‘ کا کلمہ بیان فرمایا ہے، یہاں وادی سے مراد کلام کی مختلف اَصناف ہیں، اسی کو اَوْدِیَۃُ الْکَلَامِ کہا جاتا ہے، (بغوی جلد ۳ صفحہ ۳۷۸)‘‘۔

یعنی کبھی حقیقت، کبھی مجاز، کبھی استعارہ، کبھی کنایہ، کبھی غزل، کبھی گانا، کبھی مزاح، کبھی طنز، کبھی مدح کبھی ذم، کبھی نوحہ کبھی سہرا وغیرہ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''فِیْ کُلِّ لَغْوٍ یَخُوضُوْنَ'' یعنی یہ لوگ ہر لغو اور فضول بات میں غور وخوض کرتے رہتے ہیں، (بخاری قبل حدیث: ۶۱۴۵)''۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں: فِیْ کُلِّ فَنٍّ یُفْتَنُوْنَ یعنی ہر فن میں یہ لوگ خوبصورتی سے بات کرتے ہیں (ابن جریر جلد ۱۱ جزو اول صفحہ ۱۴۷)۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں: یَمْدَحُونَ قَوْماً بِالْبَاطِلِ وَیَشْتِمُونَ قَوْماً بِالْبَاطِلِ یعنی کسی کی خواہ مخواہ تعریف کرتے ہیں اور کسی کی بلاوجہ تنقیص وتوہین کرتے ہیں۔

(ابن جریر جلد ۱۱ جزو اول صفحہ ۱۴۷)

(۳) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"یہ لوگ وہ بات کہتے ہیں، جس پر عمل نہیں کرتے"، (الشعراء: ۲۲۶)۔

اس آیت میں بے عمل شاعر مراد ہیں خواہ کافر ہوں یا مسلم۔

امام بغوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ فرماتے ہیں: ''یَکْذِبُونَ فِی شِعْرِھِمْ، یَقُولُونَ فَعَلْنَا وَ فَعَلْنَا وَھُمْ کَذَبَۃٌ یعنی یہ لوگ اپنے اشعار میں جھوٹ بولتے ہیں، کہتے ہیں: ہم نے یہ کیا ہم نے وہ کیا، حالانکہ یہ سب جھوٹے ہوتے ہیں، (تفسیر بغوی جلد ۳ صفحہ ۳۷۸)''۔

امام قرطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کہتے ہیں: یہ لوگ نہایت بزدل آدمی کو نہایت دلیر آدمی پر فضیلت دے دیتے ہیں اور نہایت کنجوس آدمی کو حاتم طائی سے بڑھا دیتے ہیں۔ نہایت نیک آدمی پر بہتان باندھتے ہیں اور اسے فاسق ثابت کرتے ہیں۔ کسی کی شان بیان کرتے وقت افراط اور مبالغے سے کام لیتے ہیں جس کا وہ اہل نہیں ہوتا۔

(تفسیر قرطبی جلد ۱۳ صفحہ ۱۴۳)

امام قرطبی لکھتے ہیں: فرزدق نے کہا:

فَبِتْنَ بِجَانِبَیَّ مُصَرَّعَاتٍ وَ بِتُّ اَفُضُّ اَغْلَاقَ الْخِتَامِ

وقت کے حکمران سلیمان بن عبدالملک نے جب یہ شعر سنا تو فرزدق سے کہا کہ تجھ پر حد لازم ہے یعنی تجھے سنگسار کرنا چاہیے۔ فرزدق نے کہا: اے امیر المؤمنین! قرآن مجید میں ہے: وَاَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ، یعنی شاعر وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں، لہٰذا اُس سے حد ٹل گئی۔

(تفسیر قرطبی جلد ۱۳ صفحہ ۱۴۴، ۱۴۵)

(۴) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کیا اور مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لیا اور عنقریب ظالم لوگ جان لیں گے کہ اُن کا ٹھکانا کیا ہے، (الشعراء: ۲۲۷)"۔

حضرت حسان بن ثابت، حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے روتے ہوئے عرض کی: یا رسول اللہ! قرآن نے شاعروں کی مخالفت کر دی ہے، جبکہ ہم شاعر ہیں، اس وقت یہ کلماتِ مبارکہ نازل ہوئے: "سوائے ان شاعروں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کیا، (ابن جریر جلد ۱۱ جزو اول صفحہ ۱۴۸)"۔

اس آیت سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ ایسے لوگوں کی شاعری جائز ہے:

(۱) اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا، صحیح العقیدہ ہوں،

(۲) وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ، باعمل ہوں اور ان کے شعر خلافِ شرع نہ ہوں، کیونکہ خلافِ شرع ہونا فسق ہے، جو عملِ صالح کے خلاف ہے،

(۳) وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا، اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے ہوں اور ان کی شاعری کا

غالب حصہ اللہ کے ذکراور نعتِ پاکِ مصطفیٰ ﷺ پر مشتمل ہو۔ ایسے شعراء کوانہی خصوصیات کی بناپر شاعری کی اجازت ہے، ورنہ اوپر بیان کیے گئے برے شاعروں میں ان کا شمار ہوگا۔

آپ ﷺ نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ پر یہ پابندی لگائی: ''لَا تَعْجَلْ، فَاِنَّ اَبَابَکْرٍ اَعْلَمُ قُرَیْشٍ بِاَنْسَابِهَا، وَاِنَّ لِیْ فِیْهِمْ نَسَباً، حَتّٰی یُلَخِّصَ لَكَ نَسَبِیْ ''۔

ترجمہ:''اے حسان! بے شک ابوبکر قریش کے سب سے بڑے ماہرِ انساب ہیں اور میرا نسب بھی قریش میں سے ہے، جب تک ابوبکر تمہارے لیے میرے نسب کو ممتاز نہ کردیں، شعر کہنے میں جلدی مت کرنا، (صحیح مسلم: ۲۴۹۰)''۔

یعنی کفار کی ہجو کرتے ہوئے کہیں میرے آباء واجداد کی ہجو نہ کردو، اس لئے ابوبکر صدیق سے اس معاملہ میں رہنمائی لو۔ نبی کریم ﷺ کے سامنے کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ نے کلام پڑھا، اس کلام میں ایک نعتیہ شعر اس طرح پڑھا گیا:

اِنَّ الرَّسُوْلَ لَسَیْفٌ یُسْتَضَاءُ بِهٖ   مُهَنَّدٌ مِنْ سُیُوفِ الْهِنْدِ مَسْلُوْلُ

ترجمہ:''بے شک رسول ایسی تلوار ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، آپ سونتی ہوئی ہندی تلوار ہیں''۔

آپ ﷺ نے اس شعر پر حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو ٹوک دیا اور شعر کی اسطرح اصلاح فرمائی:

اِنَّ الرَّسُوْلَ لَنُوْرٌ یُسْتَضَاءُ بِهٖ   مُهَنَّدٌ مِنْ سُیُوفِ اللهِ مَسْلُوْلُ

ترجمہ: بے شک رسول ایسا نور ہیں، جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی ایک شمشیرِ بے نیام ہیں، (سبل الهدیٰ والرشاد، ج:۱ص:۳۷۴)۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے ''ہندی تلوار'' کی نسبت کو پسند نہیں فرمایا بلکہ اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی نسبت کو پسند فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نعت لکھنا انتہائی نازک کام ہے، اگر افراط سے کام لیا تو شرک ہوجائے گا اور تفریط سے کام لیا تو بے ادبی کے سبب اعمال ضائع ہوجائیں گے۔

پس احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ غیر عالم نعت لکھنے سے اجتناب کرے اور اگر کوئی یہ سعادت حاصل کرنا ہی چاہتا ہے تو اپنے کلام کی توثیق کسی مستند عالمِ دین سے کرائے بغیر ہرگز ہرگز اُسے نہ پڑھے۔

نبی کریم ﷺ نے اشعار کے بارے میں فرمایا:

هُوَ کَلَامٌ فَحَسَنُهٗ حَسَنٌ وَقَبِیْحُهٗ قَبِیْحٌ

یعنی شعر ایسا کلام ہے، جس کا (معنوی اعتبار سے حسن، حسن ہے اور قبیح، قبیح ہے)، (مشکوٰۃ:۴۸۰۷)''۔

اس حدیث شریف میں اچھے شاعروں کی حوصلہ افزائی اور خلافِ شرع لکھنے والوں کی خرابی بیان ہوئی ہے، اچھے شعروں کو اچھا سمجھنے اور برے شعروں کو برا سمجھنے پر امت کا اجماع ہے۔

جو شاعر علم وحکمت کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں انہی کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:''اِنَّ الْمُؤْمِنَ یُجَاهِدُ بِسَیْفِهٖ وَ لِسَانِهٖ'' یعنی بے شک مؤمن اپنی تلوار اور زبان (دونوں) سے جہاد کرتا ہے (مسند احمد:۲۷۰۵۲، شرح السنۃ للبغوی:۳۴۰۹)۔ نیز فرمایا: ''اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِکْمَةً یعنی بعض شعر حکمت پر مشتمل ہوتے ہیں، (بخاری:۶۱۴۵)''۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

''وہ شاعر مستثنیٰ ہیں، جنہیں شاعری اللہ کے ذکر کی کثرت سے نہیں روکتی، بلکہ ان کے اکثر شعر اللہ کے ذکر پر مشتمل ہوتے ہیں، یعنی وہ اللہ کی توحید وثناء اور اس کی اطاعت کے بارے میں ہوتے ہیں، (تفسیر مظہری جلد ۵ صفحہ ۳۱۵)''۔

شاعری اگر جائز طریقے سے کی جائے تو پھر بھی اس قدر احتیاط لازم ہے کہ

اسے اپنے اوپر اتنا غالب نہ کیا جائے کہ اللہ کے ذکر یا علم حاصل کرنے یا قرآن مجید پڑھنے میں رکاوٹ بنے۔امامِ اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

''شعر کی نسبت حدیث میں فرمایا: وہ ایک کلام ہے، جس کا حَسَن، حَسَن اور قبیح، قبیح، یعنی مضمون پر مدار ہے، اگر اچھا ذکر ہے، شعر بھی محمود اور برا تذکرہ ہے تو شعر بھی مذموم۔بُحور وعروض پر موزوں ہوجانا خواہی نہ خواہی قُبحِ کلام کا باعث نہیں، اگرچہ اس میں انہماک واستغراقِ تام متکلم کے حق میں شرع کو ناپسند، (فتاویٰ رضویہ، ج:8،ص:303)''۔

امام بخاری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے اسی معنی پر مشتمل ایک باب باندھا ہے: ''بَاب مَا یُکْرَہُ اَنْ یَکُونَ الْغَالِبَ عَلَی الْاِنْسَانِ الشِّعْرُ حَتّٰی یَصُدَّہٗ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَالْعِلْمِ وَالْقُرْآنِ (صحیح بخاری صفحہ ۱۲۵۹، کتاب الادب: باب ۹۲/ ۹۲)''، یعنی شعروشاعری کا اس حد تک غالب آجانا کہ اللہ کے ذکر، علم اور تلاوتِ قرآن کی راہ میں رکاوٹ بن جائے، مکروہ ہے۔

اس باب میں یہ حدیث مذکور ہے:

''لَاَنْ یَّمْتَلِیَٔ جَوْفُ اَحَدِکُمْ قَیْحاً خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَنْ یَمْتَلِیَٔ شِعْراً''۔

یعنی اگر تم میں سے کسی کا پیٹ پیپ سے بھرا ہو، یہ اس سے بہتر ہے کہ اس کا پیٹ (خرافات پر مشتمل) اشعار سے بھرا ہو''۔

(صحیح بخاری: ۶۱۵۴،۶۱۵۵،صحیح مسلم: ۵۸۹۳)

عصرِحاضر میں شاعرانہ اور نقیبانہ خرافات کی مثالیں:

فرشتوں کو (معاذ اللہ) کمی (کام کرنے والے نوکر) کہنا یا سیّدنا جبریل علیہ السلام کو درزی کہنا، حالانکہ اللہ کریم فرشتوں کو اپنے مکرم بندے قرار دیتا ہے: بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ، ترجمہ:''بلکہ وہ معزز بندے ہیں''۔

علامہ ابوشکور سالمی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:''مَنْ ذَکَرَ نَبِیًّا اَوْ مَلَکاً بِالْحَقَارَۃِ فَاِنَّہٗ یَصِیْرُ کَافِراً'' یعنی جس نے کسی نبی یا کسی فرشتے کا حقارت کے ساتھ ذکر کیا، وہ کافر ہوجائے گا، (التمہید صفحہ ۱۱۲)۔

اسی طرح اہلِ بیت اطہار علیہم الرضوان کا تقابل نبی کریم ﷺ سے اس طرح کرنا کہ تنقیص اور توہینِ رسالت لازم آئے، حالانکہ غیر نبی کو کسی بھی نبی پر فضیلت دینا کفر ہے چہ جائیکہ سیّد الانبیاء ﷺ سے بھی بڑھا دیا جائے۔

چند سال پہلے محرم الحرام کے موقع پر کراچی کی نورانی چورنگی پر اس شعر کا بینر آویزاں کیا گیا:

خلیل بھی نہ پاسکا مقامِ حسین کو   کعبہ تو بنالیا، کربلا بنا نہ سکا

اسی طرح وہ اشعار جو اسلام اور نظریاتِ اہلسنّت کے خلاف ہیں، پڑھنا جائز نہیں ہیں، امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

''وہ پڑھنا سننا جو منکراتِ شرعیہ پر مشتمل ہو، ناجائز ہے، جیسے روایاتِ باطلہ وحکایاتِ موضوعہ، واشعار خلافِ شرع، خصوصاً جن میں توہینِ انبیاء و ملائکہ علیہم الصلوٰۃ والسلام ہو کہ آج کل کے جاہل نعت گو لوگوں کے کلام میں یہ بلائے عظیم کثرت سے ہے، حالانکہ وہ صریح کلمۂ کفر ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ ۱۰/ ۶۴)

قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر جنت کی بے بہا نعمتوں کا ذکر ہے اور طلبِ جنت کی دعوت دی گئی ہے۔عین میدانِ جہاد میں مجاہد چند لمحوں کے لیے اپنی توانائی بحال کرنے آتا ہے اور چند کھجوریں کھانے کے لیے ہاتھ میں لیتا ہے، اِس اثنا میں وہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھتا ہے: اگر میں ابھی کفار سے لڑتے لڑتے شہید ہوجاؤں تو میرا ٹھکانا کہاں ہوگا؟، آپ ﷺ نے فرمایا:''جنت میں''، وہ فرطِ شوق میں کھجوریں رکھ دیتا ہے اور میدانِ جہاد میں کود پڑتا ہے اور لڑتے لڑتے شہید ہوجاتا

ہے۔تاجدارِمدینہ خود جنت کا شوق دلا رہے ہیں۔

مدنی سورتوں آل عمران:133اورالحدید:21 میں حصولِ جنت پر برانگیختہ کرنے کے لیے اہلِ مدینہ سمیت جملہ اہلِ ایمان کو بالترتیب جنت کی طرف مُسارعت اور مُسابقت کا حکم فرمایا گیا ہے،"ریاضُ الجنّۃ" تو ہے ہی جنت کا باغ، امام اہلسنّت نے فرمایا کہ روضۂ رسول اور ساری مساجد جنت میں جائیں گی۔

لٰہذا جنت اور مدینۂ منورہ کا اس طرح تقابل کہ جنت کی بے قدری لازم آئے،جیسا کہ آج کل لوگوں کی عقیدت کو ابھارنے کے لیے بہت سے نعت گو شعراء نے یہ وتیرہ بنالیا ہے،اس سے اجتناب لازم ہے۔ایسے تمام اشعار جو صراحۃً یا دلالۃً جنت کی توہین پر مشتمل ہوں کفریہ ہیں۔اسی طرح ایسے اشعار،جن میں کسی باطل معنی کا وہم پیدا ہوتا ہو،کا پڑھنا یا موزوں کرنا ناجائز ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

"اَنَّ مُجَرَّدَ اِیْهَامِ الْمَعْنَی الْمُحَالِ کَافٍ فِی الْمَنْعِ عَنِ التَّلَفُّظِ بِهٰذَا الْکَلَامِ وَاِنِ احْتَمَلَ مَعْنًی صَحِیْحاً"۔

ترجمہ:''کلام سے محال معنی کا وہم پیدا ہونا اس کلام کے پڑھنے کی ممانعت کے لیے کافی دلیل ہے،اگرچہ وہ کلام کسی صحیح معنی کا بھی احتمال رکھتا ہو''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار،ج:9،ص:482،داراحیاءالتراث العربی،بیروت)

بعض حضرات اس شِعار کے جواز میں امام اہلسنّت اور حضرت مولانا حسن رضا خان رحمہما اللہ تعالیٰ کے دو اشعار پیش کرتے ہیں۔ایک عالم کسی خاص کیفیت میں اگر کوئی بات کہہ دے تو اُسے عمومی رنگ دینا اور ابتذال کی کیفیت پیدا کرنا حکمتِ شریعت کے منافی ہے۔امامِ اہلسنّت نے شریعت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا حکم دیا ہے،حدیثِ پاک میں مسجد الحرام میں نماز کا اجر ایک لاکھ گنا بتایا گیا ہے،جب کہ مسجدِ نبوی میں اُس کے مقابلے میں کم ہے،تو محبتِ مدینہ کی شدت کے باوجود انہوں

نے کہا:

طیبہ نہ سہی افضل ،مکہ ہی بڑا زاہد
ہم عشق کے بندے ہیں ،کیوں بات بڑھائی ہے

یعنی ہم حدیث کو رد نہیں کرتے ،اجر کے اعتبار سے مکہ ہی کی افضلیت کو مانتے ہیں،البتہ مفضول کا محبوب تر ہونا افضل کی فضیلت کے منافی نہیں ہے اور امامِ اہلسنّت نے مدینے اور جنت کا تقابل نہیں کیا بلکہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیدار کی عظمت کو بیان کیا ہے اور آپ کا دیدار وقرب جنت کی منجملہ نعمتوں میں سے ہے۔

فتاویٰ امجدیہ میں صدر الشریعہ حضرت علامہ امجد علی اعظمی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے مولانا آسی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے ایک شعر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ عالم کے کلام کو غیر عالم کے کلام پر قیاس نہ کیا جائے،وہ لکھتے ہیں:

''یہ شعر کسی بے باک زبان دراز کا کلام نہیں،جس کی عادت ایسی ہو کہ جو جی میں آئے بک دے، بلکہ ایک واقفِ شریعت کی طرف منسوب ہے،لٰہذا تاحدِّ امکان اُس کلام کی تاویل کی جائے گی اور کلام کو ظاہر پر حمل نہیں کیا جائے گا،(فتاویٰ امجدیہ،جلد چہارم،ص:279)''۔

امامِ اہلسنّت رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے عام، گمنام اور بے ہودہ لوگوں کے اشعار کے مطالب پوچھنے پر ناگواری کا اظہار فرمایا،چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''ایسے اشعار کا مطلب اُس وقت پوچھا جاتا ہے،جب معلوم ہو کہ قائل کوئی معتبر شخص تھا،ورنہ بے معنی لوگوں کے ہذیان کیا قابلِ التفات''۔

(فتاویٰ رضویہ،ج:29،ص:67)

(۷)

خانقاہوں اور آستانوں کی بابت شرعی اصلاح

صوفیہ کے آستانے اور خانقاہیں اہلسنّت وجماعت کے قدیم دینی، اصلاحی اور رفاہی ادارے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں آباد رکھے۔ مگر موجودہ حالات میں بعض آستانوں کی اصلاح کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مندرجہ ذیل گزارشات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) بعض آستانوں پر اُن کے اپنے ہی مشائخ کی تعلیمات کو فراموش کردیا گیا ہے اور اپنے سلسلۂ مشائخ کی تعلیمات کے برخلاف بہت سی خرافات کو رواج دیا گیا ہے۔ کیا کوئی قادری کسی صحابی کی تنقیص کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، کیونکہ اگر قادری حضرات حضور سیّدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتب کا مطالعہ کریں تو اہلسنّت کے عقائد اُن پر واضح ہوجائیں گے، خصوصاً ''اَلْفَتْحُ الرَّبَّانِیْ، فُتُوْحُ الْغَیْب اور سِرُّ الْاَسْرَار'' کا مطالعہ اور حضرت سیّد علی ہجویری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی کتاب ''کَشْفُ الْمَحْجُوْب'' کا مطالعہ کرنے والا تمام صحابۂ کرام (بشمول) سیّدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کا احترام کرے گا، داتا صاحب لکھتے ہیں:

''یَزِیْدُ بْنُ مُعَاوِیَۃَ اَخْزَاہُ اللّٰہُ دُوْنَ اَبِیْہِ''، یعنی یزید بن معاویہ کو اللہ رسوا کرے، مگر اس کے والد کو نہیں، (کشف المحجوب صفحہ ۷۸)''۔

نقشبندی سلسلے والے اگر مشائخ نقشبند کی کتب خصوصاً مکتوباتِ امامِ ربانی کا خود

بھی مطالعہ کریں اور اپنے مریدوں کو بھی کروائیں تو اُن کے سلسلے سے وابستہ کوئی بھی شخص کبھی رافضی یا خارجی نہیں بنے گا۔ اسی طرح چشتی سلسلے سے وابستہ حضرات اگر اپنے مشائخ کی کتب خصوصاً سبع سنابل، فوائد الفواد اور حضرت خواجہ تونسوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے ملفوظات کا مطالعہ کریں، تو کبھی رَفض میں مبتلا نہیں ہوں گے۔

حضرت سلطان باہو رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا پیروکار آپ کی کتابوں عقل بیدار اور نورالھدیٰ میں چار یار کی تصریح دیکھے گا تو ہرگز رافضیت اور خارجیت کی طرف مائل نہ ہوگا۔ حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

از مذهبِ روافض واز ملّتِ خوارج بیزار ام من که سنی، دوست دارِ چهار یار م هرکه خواهد هروقت مشرّف شود بدیدار محمد رسول الله ﷺ واصحابِ کبار وپنجتنِ پاك غنچهٔ دل شگفته شود ومعرفتِ الله به ملازمة شاه محی الدین ازیں نقش خوش ببیں

ترجمہ: ''یعنی میں مذہبِ روافض اور ملتِ خوارج سے بیزار ہوں، میں سنی ہوں، چہار یار یعنی خلفائے راشدین سے محبت کرنے والا ہوں، جو بھی محمد رسول اللہ ﷺ، آپ کے اصحابِ کبار و پنجتن پاک کے دیدار سے مشرّف ہونا چاہے، اُس کے دل کی کلی کھِل جائے گی''۔

پھر آپ نے خلفائے راشدین، حسنین کریمین، سیّدہ فاطمۃ الزہرا اور غوث اعظم رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی پر مشتمل ایک نقش بنایا اور لکھا:

''جو کوئی غوثِ اعظم سے وابستہ رہتے ہوئے اس نقش کو سامنے رکھے گا، اُسے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ اور خلفائے راشدین کی حضوری کا شرف نصیب ہوگا، (عقل بیدار، ص: 208-209)''۔

اسی طرح سہروردی سلسلے والے عوارفُ المعارف اور دیگر تصوف کی کتابوں کا

درس اپنی خانقاہوں میں رائج کریں تا کہ دین کی صحیح تعلیمات ان کے مریدین ومتوسلین تک پہنچ سکیں۔جامی ہندی نے لکھا:

بندۂ پروردگارم اُمّتِ احمد نبی   دوست دارِ چار یارم تا بہ اولادِ علی
مذہبِ حنفیہ دارم، ملّتِ حضرت خلیل   خاک پائے غوث اعظم ،زیرِ سایہ ہر ولی

(۳) آستانوں پر مشائخ کے صاحبزادگان اور خلفاء کے لیے ضروری دینی علوم کے ساتھ ساتھ اپنے سلسلے کے اذکار ومراقبات ،نفس کی اصلاح اور حصولِ استغناء کے لیے تزکیہ وتربیت کا اہتمام ضروری ہے۔تشرُّع وتدَیُّن ، اہلیت اورعلم کے بغیر محض اولاد ہونے کی بنیاد پر خلافت اورسجادگی کی مَسند پر بٹھا دینا مقاصدِ رُشدوہدایت اورطریقت وشریعت کے خلاف ہے، ہمارے ہاں نفوذ کرنے والی بہت سی خرابیوں کا بڑا سبب یہی ہے۔

(۴) بعض آستانوں پر حاضر ہونے والے زائرین کی تعلیم وتربیت کا کوئی نظام نہیں۔ اعراسِ مبارکہ کی تقریبات میلوں میں تبدیل ہوگئی ہیں،ضعیف الاعتقادی اورتوہُّم پرستی کو فروغ دے کرلوگوں کواپنی عقیدت کے حصار میں رکھا جاتا ہے۔ان آستانوں کوقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَ قَالَ الرَّسُوْل ﷺ یعنی دینی تعلیم وتربیت کے مراکز بننا چاہیے:

خوشا مسجد و مدرسہ وخانقاہے   کہ دروے بود قیل وقالِ محمد (ﷺ)

ترجمہ'': کیا ہی بات ہے اُس مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کی ، کہ جہاں سیّدنا محمد ﷺ کے ارشاداتِ مبارکہ کی تعلیم دی جارہی ہو''۔

آج نیرنگیِ زمانہ نے تنزُّلی کے اس مقام تک پہنچادیا ہے کہ اہلِ علم کی بات تو درکنار،خوداہلِ تصوُّف اپنوں سے اِن الفاظ میں گِلہ کررہے ہیں:

''کَانَ التَّصَوُّفُ فِیْمَا سَبَقَ حَقِیْقَۃً بِلَا اِسْمٍ وَالْیَوْمَ ھُوَ اِسْمٌ بِلَا حَقِیْقَۃٍ''۔

ترجمہ: ماضی میں تصوُّف محض نام نہیں تھا، بلکہ ایک حقیقتِ ثابتہ تھی، مگر آج تصوُّف کا نام تو ہے، حقیقت معدوم ہوچکی ہے،یعنی تصوف کی روح فنا ہوچکی ہے،(دُرَرُ الرَّسَائِلِ لِلْمُرِیْدِ السَّائِلِ ،ص:36)''۔

بعض جاہلوں نے محض دنیا کمانے کے لیے پیری مریدی کا جعلی کاروبار شروع کررکھا ہے،گزشتہ دنوں سرگودھا کے نواحی علاقے میں ایک دھوکے باز پیر نے بیس افراد کوقتل کردیا۔اس طرح کے جعلی اورمکار پیروں کو بے نقاب کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

پیری مریدی کی شرائط اوراقسام:

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی بیعت کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اوّل:اب مرشد کی دواقسام ہیں:

(۱)مرشدِ عام:

اس سے مراد کلام اللہ،کلام الرسول وکلامِ ائمہ شریعت وطریقت وکلام علمائے دین اہلِ رشد وہدایت ہے۔اس سلسلۂ صحیحہ پر کہ عوام کا ہادی کلام علماء، علماء کا رہنما کلام ائمہ، ائمہ کا مرشد کلامِ رسول، رسول کا پیشوا کلام اللہ جَلَّ وَعَلَا وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّم ۔فلاح ظاہر ہو یا فلاحِ باطن،اُسے اس مرشد سے چارہ نہیں، جو اس سے جدا ہے، بلاشبہ کافر ہے یا گمراہ اوراس کی عبادت بربادوتباہ۔

(۲)مرشدِ خاص:

اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ کسی عالم،سنی،صحیح العقیدہ وصحیح الاعمال وجامع شرائطِ بیعت کے ہاتھ میں ہاتھ دے۔یہ مرشدِ خاص جسے پیر وشیخ کہتے ہیں،اس کی بھی

دواقسام ہیں: شیخ اتصال، شیخ ایصال۔

(۱) شیخ اتصال:

یعنی جس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انسان کا سلسلہ حضور پر نور سیّدالمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک متصل ہوجائے، اس کے لئے چار شرطیں ہیں:

(الف) شیخ کا سلسلہ باتّصالِ صحیح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا ہو، بیچ میں منقطع نہ ہو، کہ منقطع کے ذریعے اتصال ناممکن ہے۔ بعض لوگ بلا بیعت محض بزعمِ وراثت اپنے باپ دادا کے سجادے پر بیٹھ جاتے ہیں یا بیعت تو کی تھی مگر خلافت نہ ملی تھی، بلا اذن مرید کرنا شروع کردیتے ہیں یا سلسلہ ہی وہ ہو کہ قطع کردیا گیا، اس میں فیض نہ رکھا گیا، لوگ براہِ ہوس اس میں اذن وخلافت دیتے چلے آتے ہیں یا سلسلہ فی نفسہ اچھا تھا، مگر بیچ میں کوئی ایسا شخص واقع ہوا جو بعض شرائط کے نہ ہونے کی وجہ سے قابلِ بیعت نہ تھا۔ لہٰذا اس سے جو شاخ چلی وہ بیچ میں سے منقطع ہے، ان تمام صورتوں میں اس بیعت سے ہرگز اتصال حاصل نہ ہوگا۔ یہ بیل سے دودھ نکالنے یا بانجھ سے بچہ پیدا ہونے کی خواہش کرنا ہے، جو عقلِ سلیم کے خلاف ہے۔

(ب) شیخ سنی العقیدہ ہو۔ بدمذہب گمراہ کا سلسلہ شیطان تک پہنچے گا، نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک، آج کل بہت کھلے ہوئے، بددینوں بلکہ بے دینوں حتیٰ کہ وہابیہ نے کہ سرے سے منکر ودشمنِ اولیاء ہیں، مکاری کے لئے پیری مریدی کا جال پھیلا رکھا ہے، ہوشیار! خبردار! احتیاط لازم ہے:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　پس بہر دستے نباید داد دست

ترجمہ: ''بہت سے ابلیس انسانی صورت میں ہیں، پس ہر ہاتھ میں

عقیدت کا ہاتھ نہیں دینا چاہئے''۔

(ج) عالم ہو، یعنی علم فقہ اس کی اپنی ضرورت کے قابل کفایت کرتا ہو اور یہ بھی لازم ہے کہ عقائد اہلسنّت سے پورا واقف ہو، کفر واسلام وضلالت وہدایت کے فرق کا خوب جاننے والا ہو، ورنہ اگر آج بدمذہب نہیں ہے، توکل ہوجانے کا اندیشہ ہے: ''فَمَنْ لَّمْ یَعْرِفِ الشَّرَّ فَیَوْمًا یَقَعُ فِیْہِ'' (جو شر سے آگاہ نہیں، ایک دن اس میں مبتلا ہوجائیگا)۔

سینکڑوں کلمات وحرکات ہیں جن سے کفر لازم آتا ہے اور جاہل اپنی جہالت کی بنا پر ان میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اول تو خبر ہی نہیں ہوتی کہ ان کے قول یا فعل سے کفر سرزد ہوا اور بے خبری میں توبہ کا تصور ناممکن ہے، تو اس شر میں مبتلا ہی رہیں گے اور اگر کوئی خبر دے تو ایک سلیم الطبع جاہل تو ڈر جاتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے، مگر وہ جو سجادۂ مَشیخت پر ہادی ومرشد بنے بیٹھے ہیں، ان کا پندارِ نفس انہیں حق قبول کرنے کی اجازت نہیں دے گا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُہٗ جَہَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِہَادُ''، ترجمہ: ''جب اس سے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر، تو گھمنڈ اُسے گناہ پر ابھارتا ہے، (البقرہ:۲۰۶)''۔

اور اگر حق کو قبول کرتے بھی ہیں تو صرف اتنا ہی کہ خود توبہ اور تجدیدِ ایمان کرلیں گے۔ لیکن کفریہ قول یا فعل کی وجہ سے جو بیعت فسخ ہوگئی، اس کو بحال کرنے کے لیے اب کسی اور کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور نئے شیخ کے نام کا شجرہ اپنے مریدین کو دینا، خواہ وہ شیخِ اول ہی کا خلیفہ ہو، ان کا نفس گوارا نہیں کرتا۔ ان کو یہ بھی گوارا نہیں کہ بیعت فسخ ہونے کی وجہ سے وہ لوگوں کو بیعت کرنے کا سلسلہ روک دیں۔ لہٰذا وہ بیعت کے سلسلے کو منقطع ہونے کے باوجود جاری رکھتے رہیں اور پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ منقطع سلسلے سے اتصال ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ان تمام خرابیوں سے بچنے کے لیے ضروری

ہے کہ پیر تمام عقائدِ اہلسنّت کا عالم ہو۔

(د) فاسق معلن نہ ہو، یعنی تمام فرائض، واجبات اور سُننِ مؤکّدہ کا عامل ہو اور تمام حرام، مکروہِ تحریمی اور اِساءت سے اجتناب کرتا ہو۔ اس شرط پر اگرچہ اتصال کا حصول موقوف نہیں ہے، کیونکہ محض فسق کی وجہ سے خود بخود بیعت فسخ نہیں ہوتی، لیکن پیر کی تعظیم لازم ہے اور فاسق کی توہین واجب ہے اور تعظیم اور توہین بیک وقت جمع نہیں ہو سکتے، اس لیے پیر کا فسق سے پاک ہونا ضروری ہے۔ امام زیلعی تبیین الحقائق میں فاسق کے بارے میں لکھتے ہیں: ''فِیْ تَقْدِیْمِہٖ لِلْاِمَامَۃِ تَعْظِیْمُہٗ وَقَدْ وَجَبَ عَلَیْھِمْ اِھَانَتُہٗ شَرْعًا''، یعنی امامت کے لئے فاسق کو آگے کرنے میں اس کی تعظیم ہے، حالانکہ شریعت میں تو اس کی توہین واجب ہے۔

(۲) پیر کی دوسری قسم ''**شیخِ ایصال**'' ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ مذکورہ بالا چاروں شرائط کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ نفس کی خرابیوں، شیطان کی مکاریوں اور خواہشات کا شکار ہونے سے آگاہ ہو۔ یہ شیخ دوسروں کی تربیت کرنا جانتا ہو اور اپنے متوسلین کے ساتھ مکمل شفقت سے پیش آتا ہو، ان کے عیوب پر انہیں مطلع کرے اور ان کا علاج بتائے اور طریقت کی راہ میں انہیں جو مشکلات پیش آئیں، اُن کا حل بتائے، نہ محض سالک ہو اور نہ نرا مجذوب، عوارف المعارف میں فرمایا: ''یہ دونوں پیر بننے کے قابل نہیں ہیں''۔

اس لئے کہ سالک خود ابھی تک راہ میں ہے اور تربیت کا طریقہ نہیں جانتا، بلکہ مجذوبِ سالک ہو یا سالکِ مجذوب اور مجذوبِ سالک اولیٰ ہے، کیونکہ اگرچہ وہ مراد کو پا چکا ہے، لیکن وہ دوسروں کو سلوک کی منزل پر چلانے سے غافل ہے۔ اس لیے کہ مجذوبِ سالک مراد ہے اور سالکِ مجذوب مرید اور مرید سے مراد

افضل ہوتا ہے۔ پھر بیعت کی بھی دو قسمیں ہیں: بیعت برکت، بیعت ارادت۔

(۱) بیعت برکت کہ صرف تبرک کے لئے داخلِ سلسلہ ہوجانا، آج کل عام بیعتیں یہی ہیں بشرطیکہ نیک نیتی کے ساتھ ہوں، ورنہ جن کی بیعت کا مقصد دنیاوی اغراضِ فاسدہ ہوتی ہیں، وہ خارج از بحث ہے۔ اس بیعت کے لئے شیخِ اتصال کا شرائطِ اربعہ کا جامع ہونا کافی ہے۔ اس بیعت کا بھی بہت فائدہ ہے اور دنیا اور آخرت میں کارآمد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے محبوبین کے غلاموں میں نام شامل ہونا اور اُن کے ساتھ سلسلے کا اتصال خود اپنی جگہ باعثِ سعادت ہے۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:21، ص:505۔507، بتصرف، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مزید فرماتے ہیں:

(۲) بیعت کی دوسری قسم بیعتِ ارادت ہے، اس بیعت کا مطلب ہے کہ سلوک کے معاملات میں مرید اپنے ارادے اور اختیار پر انحصار کرنے کی بجائے اپنے آپ کو شیخ و مرشد، ہادیِ برحق اور واصل بحق (یعنی سلوک کے منازل طے کرنے والے) کے ہاتھ میں بالکل سپرد کردے، اسے مطلقاً اپنا حاکم و مالک و متصرف جانے، اس کی رہنمائی میں راہ سلوک پر چلے، کوئی قدم اس کی مرضی کے بغیر نہ اٹھائے۔ اسے شیخ کی بعض ہدایات یا افعال اپنی فہم کے مطابق صحیح معلوم نہ ہوں، تو انہیں خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے افعال کی مثل سمجھے اور اپنی عقل کا قصور جانے، اس کی کسی بات پر دل میں بھی اعتراض نہ لائے، اپنی ہر مشکل اس پر پیش کرے۔ غرض اس کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ ہو کر رہے۔ یہ بیعت سالکین ہے اور یہی مقصودِ مشائخ و مرشدین ہے۔ یہی بیعت اللہ عزوجل تک پہنچاتی ہے، یہی بیعت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے لی ہے۔

سیّدنا عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہ تعالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِیْ

الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمُكْرَهِ وَاَنْ لَّانُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ"،

ترجمہ: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس پر بیعت کی کہ ہر آسانی ودشواری اور ہر خوشی وناگواری میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے اور صاحب حکم کے کسی حکم میں چون چرانہ کریں گے''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:21،ص:509،بتصرف،رضافاؤنڈیشن لاہور)

نوٹ: امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا فرمان ایسے مشائخ طریقت سے متعلق ہے جو عالمِ باعمل ہوں، شریعت وطریقت کو ایک دوسرے کی ضد نہ سمجھتے ہوں، شریعت کو سب امور پر حاکم مانتے ہوں، صرف بعض اَسرار ورموز کی ایسی باتیں اُن سے صادر ہوتی ہوں، جو عام لوگوں کے فہم سے ماوراہوتی ہیں، حقیقت میں وہ شریعت کے خلاف نہیں ہوتیں۔ اس سے پیری کا لبادہ اوڑھنے والے بدعمل اور بے دین دھوکے باز مراد نہیں ہیں جو اپنے لوگوں کو ذبح کریں، عورتوں کے ساتھ بے حجاب اختلاط کریں اور بعض صورتوں میں بدکاری میں مبتلا ہوں۔ ہماری ماضیِ قریب کی تاریخ میں اس کے شواہد موجود ہیں۔

مزارات پر خرافات:

بعض مزارات کا ماحول بھی بدعات، خرافات، منکَرات، نشہ فروخت کرنے والے اور نشے کے عادی افراد کا گڑھ بن چکا ہے۔ بزرگانِ دین کے مزارات کو اِن بدعات وخرافات سے پاک رکھنا ضروری ہے۔ اسی لیے ہم نے سہون شریف میں حضرتِ عثمان مروندی عُرف لعل شہباز قلندر رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے مزارِ مبارک کے سانحے کے بعد علماء ومشائخ اہلسنّت کے ہمراہ وہاں حاضری دی اور پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''ہمارے نزدیک مروّجہ دھمال اور مرد وزن کے مخلوط رقص کا دینی روایات وتعلیمات سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ اس کا کوئی شرعی جواز ہے۔ اس کلچر کی وجہ سے

آوارہ منش اور نشے کے عادی لوگ یہاں آتے ہیں۔ اس کلچر کا تصوُّف، روحانیت، تزکیہ وتربیت اور عرفان واحسان سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ اس کی ضد ہے۔ صوفیہ کے وجد اور تواجد کا مروّجہ دھمال سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اسی طرح اکابر علمائے احناف کے نزدیک عورتوں کو مزارات پر نہیں جانا چاہیے اور موجودہ خرابیوں کو دیکھا جائے تو پابندی کی حکمت اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے۔ محکمۂ اوقاف اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ مزارات پر بے اعتدالیاں ہورہی تھیں اور بعض جگہ سجادگان اور مزارات کے متولّی اپنے مفادات کے لیے اِن غیر شرعی بے اعتدالیوں کا سَدِّ باب نہیں کرتے تھے۔ لیکن اب اوقاف کے ذمے داران نے ان کی جگہ لے لی ہے اور صورتِ حال پہلے سے ابتر ہوچکی ہے۔ محکمۂ اوقاف کی بہت سی مساجد میں محکمے کی طرف سے مقررہ امام ڈیوٹی پر موجود نہیں ہوتے اور وہاں لوگوں کو الگ سے امام کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح اوقاف کے زیرِ اہتمام مساجد کی تزئین وآرائش اور دیگر ضروریات کا اہتمام بھی لوگوں کے چندے سے ہوتا ہے۔ سو مزارات کے نظام میں اصلاح کی شدید ضرورت ہے اور اس کے لیے اہلسنّت وجماعت کے ثقہ علماء اور متشرّع مشائخ کا ایک نگران بورڈ بنایا جائے اور سجادگی کے لیے اس خانقاہ سے منسلک مُتَدَیّن، باشرع، صحیح العقیدہ اور ذی علم شخص کا انتخاب کیا جائے۔ جاہل، بےعمل بلکہ بدعمل سجادہ نشین پیروں کو فی الفور معزول کیا جائے، علامہ اقبال نے کہا ہے:

ترکے میں ملی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن
یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذر ودلقِ اویس وچادرِ زہرا

(۸)

الیکٹرانک میڈیا پر رمضان المبارک کی بابت شرعی اصلاح

جب سے آزاد الیکٹرانک میڈیا وجود میں آیا ہے، رمضان المبارک کا ٹائٹل لگا کر اُس کے تحت ہر طرح کی خرافات و بدعات اور غیر شرعی حرکات کو جمع کر دیا گیا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے شراب کی بوتل پر آبِ طہور کا لیبل لگا دیا جائے۔ علمائے کرام کا تبلیغِ دین اور شریعت کے احکام بیان کرنے کے لیے ٹیلی ویژن پر جانا ہمارے نزدیک جائز ہے۔ لیکن علمائے کرام کو ایسے پروگراموں میں شرکت سے گریز کرنا چاہیے، جہاں ابتذال ہو، خرافات ہوں، رمضانِ مبارک، قرآنِ کریم اور دین کا تقدس پامال ہو۔ ہاں! اگر رمضانِ مبارک کے ٹائٹل کے تحت پروگرام خرافات سے پاک ہیں، تو علمائے کرام بصد شوق اس میں شرکت فرمائیں اور اپنے علم کے فیضان کو عام کریں۔

دیگر عنوانات کے تحت جو خرافات ہو رہی ہیں، اِن کی براہِ راست یا بالواسطہ ذمے داری علماء پر عائد نہیں ہوتی۔ گزشتہ سال میں نے ''فغانِ رمضان'' کے عنوان سے اپنے دردِ دل کو بیان کیا تھا، ہم اُسے یہاں شاملِ اشاعت کر رہے ہیں:

فغانِ رمضان:

جب سے ہمارا آزاد الیکٹرانک میڈیا وجود میں آیا ہے، نفع نقصان کا تخمینہ آج تک کسی نے نہیں لگایا کہ اس نے ہمیں دیا کیا ہے اور ہم سے لیا کیا ہے؟۔ اگرچہ آزاد میڈیا کے باوجود کرپشن کے آگے کوئی مضبوط بند

تو نہیں باندھا جاسکا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بدولت کرپشن کے خلاف ایک توانا آواز بلند ہو رہی ہے اور وقت کے حکمران ہمیشہ خوف زدہ رہتے ہیں۔ سو بلاشبہ یہ ایک مثبت پہلو ہے، اسی طرح کافی حد تک اب خبروں پر پردہ ڈالے رکھنا اور حقائق کو چھپانا عملاً ممکن نہیں رہا۔

اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہمارے آزاد میڈیا نے ہمارے سیاسی وسماجی مسائل کا کوئی مثبت اور قابلِ عمل حل پیش کرنے کی بجائے سنسنی خیزی پر زیادہ توجہ دی ہے، اس کا سبب مسابقت کا حکمت سے عاری رجحان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دلیل واستدلال پر توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، البتہ شور وغوغا بہت زیادہ ہے اور معقولیت پر جارحانہ انداز کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پہاڑی ندی نالوں جیسا شور زیادہ ہے، سمندر جیسا سکوت اور دلیل واستدلال کی سَطوت وشوکت کم ہے۔ اِس کا سبب ریٹنگ بتائی جاتی ہے جو بجائے خود ایک سربستہ راز ہے، جس کی حقیقت سے میڈیا کی مارکیٹنگ کا شعبہ اور تشہیری ادارے ہی واقف ہوتے ہیں۔ اور اس میں بھی ذرہ برابر شک نہیں کہ آزاد میڈیا نے معاشرتی اور دینی اقدار کی پامالی کی صورت میں اہلِ پاکستان سے بھاری قیمت وصول کی ہے۔

اس میں سے ایک رمضان المبارَک کی تقدیس کی پامالی ہے۔ رمضان المبارَک میں لوگ عام دنوں کے برعکس ذہنی اور فکری طور پر دین کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں، عبادات کا ذوق بڑھ جاتا ہے اور یہ رمضان المبارک کی برکات کا ایسا اعجاز ہے جو ہر کس وناکس کو صاف نظر آتا ہے۔ رمضان المبارک کی فضیلت اور روزے کے احکام قرآن میں بیان کئے گئے ہیں اور احادیث کا ذخیرہ تو رمضان المبارک اور عباداتِ صوم

کے فضائل سے معمور ہے۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے:’’جب رمضان داخل ہوتا ہےتو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں،ان میں سے کوئی دروازہ بندنہیں رہتا،جہنم کے دروازے بندکردیئے جاتے ہیں اوران میں سےکوئی دروازہ کھلانہیں رہتا۔سرکش شیطان جکڑ دیئے جاتے ہیں اور ان کو بیڑیاں پہنادی جاتی ہیں‘‘۔

الغرض مجموعی ماحول کونیکیوں کے لیے سازگار اور گناہوں کے لیے ناسازگار بنادیا جاتا ہے۔مگرمیڈیا نے رمضان کی مارکیٹنگ شروع کردی، طرح طرح کے ٹائٹل سانگ،سلوگن اوررمضان کے نام پرلہو ولَعب اور تماشے سج گئے۔ انعام رمضان، مہمان رمضان، شان رمضان، ایمان رمضان اور نہ جانے کیا کیا عنوان وضع کیے گئے، ایک دل جلے نے کہا: بہتر یہ ہے کہ سب’’دکان رمضان‘‘ کا ایک ہی ٹائٹل لگالیں،لیکن ٹائٹل میں کیا رکھا ہے۔’’دکان رمضان‘‘ ہی کا منظرتو ہر سو بپا ہے اور اب اداکارائیں بھی ماہِ رمضان میں جنت کا راستہ دکھانے کے لیے میڈیا پر رونق افروز ہیں۔کوئی ہمیں بتائے کہ قرآن مجید اور رمضان کی تقدیس سے اسے کیا نسبت ہے؟۔

رمضان المبارک کا مقدّس عنوان ہے اور مردوزن کا مخلوط اجتماع، بازاری ماحول،نماز کی فکرنہیں، بلکہ نماز سے دوری کا پورا اہتمام ہے،بس صرف میلاٹھیلا رہ گیا ہے،درمیان میں تھوڑا سا مذہب کا تڑکا اور چٹخارے کے لیے مذہب کی چٹنی ہے، باقی مارکیٹنگ ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم بی اے مارکیٹنگ کرنے والے بھی کیا مارکیٹنگ کریں گے، جو رمضان کا پروگرام کرنے والے مایۂ ناز سیلز پرسن مذہب کا خوبصورت ٹائٹل لگا کر

کرتے ہیں، ان کی مہارت لاجواب ہے اوراس کی قیمت بھی وہ خوب وصول کرتے ہیں۔ایک صاحب نے بتایا کہ ایک معروف ٹیلیویژن چینل کے مارکیٹنگ کے شعبے میں رمضان کے سحر وافطار کے اشتہارات کی بابت میٹنگ ہورہی تھی،تو بتایا گیا کہ لاہور کی اذان بِک گئی ہے،کراچی کی اذان کا کنٹریکٹ ابھی باقی ہے۔اگر یہی کچھ کرنا ہےتو کم ازکم رمضان کے تقدس کوتو پامال نہ کیا جائے،کوئی اورعنوان بھی رکھا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:(۱)’’اوران لوگوں کو چھوڑیے،جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنالیا ہے اورجن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور اس (قرآن) کے ساتھ ان کو نصیحت کرتے رہو،کہیں یہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہلاکت میں مبتلا نہ ہوجائیں، (الانعام:70)‘‘۔
(۲)’’جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنالیا تھا،تو آج کے دن ہم ان کو نظر انداز کردیں گے، جس طرح انہوں نے اِس (قیامت کے) دن کی ملاقات کو بھلا رکھا تھا اور وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے، (الاعراف:51)‘‘۔

سورمضان المبارک زبانِ حال سے فریادی ہے کہ اُس کی تقدیس وحُرمت کا دامن علامہ اقبال کےقول کےمطابق’’جفا پروفا‘‘ کا دلکش لیبل لگا کرتار تار کیا جارہا ہے۔ بھانڈپن اورآوارگی کو مذہب اوررمضان کے پُرکشش غلاف میں لپیٹ کردین کے حصہ کےطور پر پیش کیا جارہا ہے۔دین کے ساتھ ایک تقدیس واحترام کا تصور ذہن میں آتا ہے، اسے آرٹ بنا کر آرٹسٹوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہےاورشوخی وطنّازی کی نذرکردیا گیا ہے۔ہونا تو یہ چاہیے کہ جسے آرٹسٹ بننا ہے وہ تقدیس کا چولا اتارکر اپنے

اصل رنگ میں آجائے، آرٹ کے شعبے لاتعداد اور رنگارنگ ہیں۔ جسے بھانڈ پن اور جُگت بازی کا شعبہ اختیار کرنا ہے، وہ اس رنگ میں آئے اور دورنگی چھوڑ دے۔ کسی فقہی اصول یا ضرب المثل کا سبب خاص ہوتا ہے، لیکن حکم عام ہوتا ہے، ساحرلدھیانوی نے کہا تو کسی اور تناظر میں تھا، لیکن ہمارے حسبِ حال ہے:

کہاں ہیں، کہاں ہیں، محافظ خودی کے
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

اس شعر میں آپ تھوڑا سا تصرف کرکے ''مشرق'' کی جگہ ''مذہب'' لکھ لیں، تو پیغام سمجھ میں آجائے گا۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ ہمارے وہ سرمایہ دار اور صنعت کار جو دین داری کی شہرت رکھتے ہیں، حج اور عمرے کا ناغہ نہیں کرتے، عام زندگی میں دینی مزاج کے حامل نظر آتے ہیں، وہ بھی چمک دمک، آب وتاب اور چکاچوند سے عاری خالص دینی آگہی کے حامل کسی پروگرام کو سپانسر کرنے اور اپنے اشتہار سے نوازنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، بس نیم لباس عورت اور تشہیری فنکاری لازم وملزوم ہیں۔ یہ دین کے حوالے سے ایسی ہی دورنگی اور منافقت ہے، جس کا منظر ہماری فلموں میں دکھایا جاتا تھا کہ ایک اداکار ایک منظر میں چور اور ڈاکو کے روپ میں نظر آتا ہے اور دوسرے منظر میں وہ مصلّٰی بچھائے نماز اور تسبیح ودرود میں مصروف نظر آتا ہے۔ سائل پوچھتا ہے: یہ کیسا تضاد؟، وہ جواب دیتا ہے: ''وہ میرا پیشہ ہے، یہ میرا مذہب ہے''۔ الغرض پیغام یہ ہے کہ دین کے ساتھ سب کچھ چلتا ہے اور چل رہا ہے اور یہی سکۂ رائج الوقت ہے۔

دوسری جانب ہماری خالص مذہبی جماعتیں اور مذہبی سیاسی جماعتیں ہیں،

جو اس شِعار سے بالکل لاتعلق ہیں، وہ ایک فرد کی غلطی پر تو آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں، لیکن دین کی اِس منظم بے حرمتی کے آگے سپر انداز ہیں۔ آخر میڈیا تو سب کو ضرورت ہے، یہی وہ پیکرِ نازوانداز اور عَشوہ طراز محبوب ہے، جس کی دلداری زاہد ورند سب کو عزیز ہے۔ دین کے حوالے سے اُن کی ترجیحات کافی بدل چکی ہیں، اُن کی ترجیحات کی فہرست میں خالص دین اور اس کے تقاضے بہت آخر میں آتے ہیں، ضروری نہیں کہ ہر مسئلے پر سڑکوں پر آکر احتجاج کیا جائے اور ریلیاں نکالی جائیں، میڈیا مالکان کے ساتھ ایک سنجیدہ نشست کا بھی اہتمام کیا جاسکتا ہے۔

میں نے ۱۴۳۶ ہجری کی قومی سیرت کانفرنس کے موقع پر صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب ممنون حسین سے عاجزانہ اپیل کی تھی کہ سیرت النبی ﷺ پر محض نظریاتی خطابات سے آگے بڑھ کر عملی قدم اٹھائیں۔ اسلام کے نام پر قائم اس وطنِ عزیز میں اگر آپ کو دس بیس معتبر اور قابلِ احترام افراد نظر آتے ہوں، تو اُن کے ساتھ میڈیا مالکان کی ایک طویل نشست کا اہتمام کریں۔ یہ اہلِ فکرونظر باہمی اتفاقِ رائے سے ہماری دینی، اَخلاقی اور معاشرتی اَقدار کا ایک کم از کم قابلِ قبول اور قابلِ عمل معیار وضع کریں اور پھر میڈیا مالکان اس پر رضا کارانہ طور پر عمل کریں اور اس پر نظر رکھنے کے لیے ایک مجلسِ نظارت (Vigilance Cell) قائم کریں۔ شاید اس سے پچیس تیس فیصد بہتری آجائے۔ لیکن یہ وہ بھاری پتھر ہے جس کو اٹھانے کے لیے کوئی بھی آمادہ نہیں ہے، ہر ایک کو اپنی عزت عزیز ہے اور اپنے لیے عافیت کا خواہاں ہے، ملک وملّت کی ترجیحات بعد میں آتی ہیں۔

ایک صاحب نے کہا تھا: اہلِ عزیمت تو اس دور میں ناپید ہیں، مگر اہلِ رخصت بھی رخصت پر چلے گئے ہیں، سو دین کی ناموس کے تحفظ کے لیے میدانِ عمل میں کوئی بھی موجود نہیں ہے اور راوی ہر سو چین ہی چین لکھتا ہے۔ جو سادہ مزاج عزیمت کی بات کرے، وہ از کارِ رفتہ ہے، Rigid ہے، یبُوست زدہ ہے، دقیانوسی ہے، عصرِ حاضر کے تقاضوں سے بے خبر اور وقت کے لَمس سے ناآشنا ہے، غالب نے کہا تھا:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو

جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

چیئرمین پیمرا ممتاز حسین قادری شہید کے جنازے کے مناظر کو الیکٹرانک میڈیا پر روکنے میں تو فعال نظر آئے، کیا وہ رمضان اور قرآن کی تقدیس کی حفاظت کے لیے بھی کوئی کردار ادا کریں گے؟۔ گزشتہ سال بھی نصف درجن سے زیادہ سنجیدہ کالم نگاروں نے اس جانب متوجہ کیا تھا، ان سب سے دست بستہ اپیل ہے کہ اس سال رمضان المبارک کی آمد سے پہلے اپنے قلم کی طاقت کو تقدیسِ قرآن ورمضان کے تحفظ کے لیے استعمال کریں، یہ ان کے فن کی زکوٰۃ ہوگی۔ سنا ہے کہ سوشل میڈیا پر تو دین دار لوگوں کی بھاری اکثریت فریاد کُناں رہتی ہے۔

❁

(۹)

جمعۃ الوَدَاع کی بابت شرعی اصلاح

سال بھر کے تمام جمعوں کی فضیلت یکساں ہے۔البتہ حدیثِ پاک کی روشنی میں منجملہ فرائض کے ساتھ ساتھ رمضانِ مبارک کے تمام جمعوں کو بھی ایک اختصاص حاصل ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے رمضان میں ایک فرض ادا کیا،تو اُسے غیرِ رمضان کے ستّر فرائض کے برابر ثواب ملے گا''۔

سو اِس ارشادِ رسول کے مطابق رمضانِ مبارک میں دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ جمعوں کا اجر بھی ستّر گنا بڑھ جاتا ہے۔مگر اس میں رمضانِ مبارک کے تمام جمعوں کی فضیلت یکساں ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ''جمعۃ الوَداع'' کے نام سے کوئی مخصوص خطبہ ثابت نہیں ہے،نہ ہی خلفائے راشدین اور ائمۂ دینِ متین سے ثابت ہے۔لیکن ہمارے ہاں یہ شِعار رائج ہوگیا ہے کہ رمضانِ مبارک کے عام جمعوں کے مقابلے میں آخری جمعے میں حاضری زیادہ ہوتی ہے اور نعت خواں غمناک انداز میں اشعار پڑھتے ہیں اور لوگ وہی کیفیت اپنے اوپر طاری کرکے ان اشعار کو پڑھنا یا سننا باعثِ اجر سمجھتے ہیں،یہ کہیں سے ثابت نہیں ہے۔اس حوالے سے میں نے اخبارات میں ایک تفصیلی فتویٰ بھی لکھا تھا،جس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

جمعۃ الوداع کی شرعی حیثیت:

ہمارے خطے میں رمضانِ مبارک کے آخری جمعے کو ''جمعۃ الوَداع'' کے طور پر

منایا جاتا ہے اور بعض جگہ اس کے لئے جمعے کے خطبے میں ''اَلْوَداعُ الْوَداعُ یا شھرَ رمضانَ'' کے کلمات بھی پڑھے جاتے ہیں یا نعت خوان جمعہ کی نماز کے بعد یا رمضان مبارک کے آخری دن ''الوداع اے ماہِ رمضان'' کی طرز کے اشعار ترنّم سے پڑھتے ہیں،سنت نبویہ عَلیٰ صَاحِبِھَا الصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے،اگرچہ خرافات سے پاک ہونے کی صورت میں اباحتِ اصلیہ کی بنیاد پر اس کا صرف جواز ہے۔

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ سے سوال ہوا:

(۱) ''رمضان المبارک میں نبی کریم احمد مجتبیٰ محمد مصطفی ﷺ نے ''خطبۃ الوَداع'' پڑھا ہے یا نہیں؟۔

(۲) اگر حضور محمد رسول اللہ ﷺ نے نہیں پڑھا ہے،تو سب سے پہلے خطبۃ الوَداع کس نے پڑھا ہے اور اس کا مُوجِد ومُختَرِع (اختراع کرنے والا) کون ہے؟،صحابہ کرام رِضْوَانُ اللہِ عَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْن یا ائمۂ مجتہدین وفقہاء ومُحدّثین رَحِمَھُمُ اللہُ تَعَالیٰ۔

(۳) شریعتِ مُقدَّسہ مُطہَّرہ مُنوَّرہ مُحمّدیہ حنفیہ اہلسنّت وجماعت میں خطبۃ الوَدَاع کا کیا درجہ ہے؟،فرض یا واجب یا سنّت یا مستحب یا مباح؟،صاف صاف مُدلّل تحریر فرمائیں۔

(۴) جس جمعۃ الوَدَاع کو''خطبۃُ الوَدَاع'' نہ پڑھا جائے،وہ جمعہ صحیح ہوگا یا نہیں؟اور ''تارک''خطبۃُ الوَدَاع'' کس درجہ کا خاطی وگنہگار ہے،قابلِ ملامت وزَجَر ہے یا نہیں؟''۔

آپ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالیٰ نے جواب میں لکھا:

(۱) ''اَلوَدَاع جس طرح رائج ہے حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں۔

(۲) نہ صحابۂ کرام ومجتہدین عِظام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، نہ ہی اس کا مُوجِد معلوم ہے۔

(۳) یہ اپنی حدِّ ذات میں مباح ہے، ہر مباح نیتِ حسن سے مستحب ہوجاتا ہے اور خارجی عوامل کی بنیاد پر خلافِ اولیٰ سے لے کر مکروہ تحریمی اور حرام بھی ہوسکتا ہے۔

(۴) جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے، **خاص "خطبۃُ الوَدَاع"** کوئی چیز نہیں، اس (خاص خطبے) کے ترک سے نماز پر کچھ اثر نہیں پڑتا، اس کے ترک میں کوئی حرج نہیں ہے، نہ ہی اس کے چھوڑنے والے پر زَجر وملامت جائز ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 451-452، بتصرف)

فتاویٰ رضویہ میں مُندَرِج اس سوال میں سائل نے کتاب ''شبیہ الانسان'' کے ص: 24 کے حوالے سے فارسی عبارت لکھی ہے، جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

ترجمہ: "رمضان کے آخری جمعہ میں حسرت وافسوس کے کلمات پڑھنا مباح ہے، لیکن اَسلاف سے منقول نہیں، ترک افضل ہے تاکہ عوام اسے واجب یا سنّت نہ بنالیں، شرط یہ ہے کہ اِس میں رسالت مآب ﷺ کی نسبت جھوٹ شامل نہ ہو، ورنہ حرام ہے، اور وہ یہ ہے:

اکثر محمد مصطفیٰ، محبوب ومطلوبِ خدا گفتے دریں حسرتا، اے ماہِ رمضاں الوَداع

یعنی "خدا کے محبوب ومطلوب محمد مصطفی ﷺ (رمضان المبارک کے آخر میں) اکثر حسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے: اے ماہِ رمضاں الوداع"۔

اس کے بارے میں امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے لکھا: "اِس فتوے میں جو کچھ لکھا ہے، حرف بحرف صحیح ہے، سوائے اس

لفظ کے: ''افضل ترک است''، اس کی جگہ یوں لکھنا چاہیے: "التزامش نہ باید، گاہے ترک ہم کنند تا کہ عوام گمانِ وجوب واستنان نہ کردند" (ترجمہ: اس کا التزام نہیں کرنا چاہیے، کبھی اسے ترک کردیں تاکہ عوام کو وجوب یا سنّت ہونے کا وہم نہ ہو)، فقد صرّح العُلَمَاءُ الکِرَامُ اَنَّ التَّرکَ اَحیَاناً یُزِیلُ الاِیہَام، ترجمہ: ''علماء کرام نے تصریح کی ہے کہ بعض اوقات ترک کردینا عوام کے وہم کو زائل کردیتا ہے، (حوالہ مذکورہ بالا)۔

آپ سے سوال کیا گیا:

''منکر رالوداع شریف کوئی عمل شرعی میں نقص رکھتا ہے اور یہ عمل درست ہے یا نادرست؟''۔ آپ نے جواب میں لکھا: "مروّجہ الوداع کے کرنے کا نہ کوئی شرعی حکم ہے اور نہ ہی شریعت میں اس سے منع کیا ہے، ہاں! علماء اس کا التزام نہ کریں، کبھی ترک بھی کریں کہ عوام واجب نہ سمجھنے لگیں اور سچی الوداع قلب سے ہے کہ رمضان شریف کے آنے سے خوش ہو اور جانے سے غمگین، اور اگر یہ حالت ہو کہ آنا بوجھ تھا اور جانے کے لیے گھڑیاں گنیں، تو جھوٹی الوداع ہے۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 451-454، بتصرف)

ایک بے اصل روایت کی وضاحت:

امامِ اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے دور میں عربی خطبے میں الوداع کے الفاظ کہے جاتے تھے جس کا جواز آپ نے اباحتِ اصلیہ کے ساتھ بیان فرمایا، لیکن ہمارے دور میں کچھ عرصے سے رمضان کے آخری جمعۃ المبارک، ستائیسویں شب اور چاندرات وغیرہ میں ترنّم کے ساتھ آدھ پون گھنٹے تک الوداع کے اشعار پڑھے جاتے ہیں جن میں کوشش کی جاتی ہے کہ لوگوں پر رقّت

طاری ہوجائے۔ اس کا سبب ہماری معلومات کے مطابق ''انیس الواعظین'' نامی غیر مستنداور بےاصل روایات پر مشتمل کتاب کی یہ روایت ہے:

''جوشخص رمضان المبارک کے آنے کی خوشی اور جانے کا غم کرے، اُس کے لیے جنت ہے اور اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اُسے جنت میں داخل فرمائے، (انیس الواعظین)''۔

انیس الواعظین نامی کتاب میں بے شمار موضوع اور من گھڑت روایات موجود ہیں۔ یہ روایت بھی کثیر تتبّع اور تلاش کے باوجود حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ملی۔ یہ بے اصل ہے اور محدثین کے بیان کردہ ضابطہ کے مطابق ایسی روایت کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں ہے۔ امام اہلسنّت سے الوداع کے بارے میں جو سوال کیا گیا تھا، اس میں بھی یہ ذکر تھا کہ الوداع پڑھنے کا جواز اس بات سے مشروط ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹ کی نسبت نہ ہو اور اگر حضور کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے تو ایسا کلام پڑھنا حرام ہے۔ سائل نے ایک جھوٹی روایت پر مبنی یہ شعر ذکر کیا:

اکثر محمد مصطفیٰ، محبوب و مطلوبِ خدا　　گفتے دریں حسرتا، اے ماہِ رمضان الوداع

ترجمہ: یعنی خدا کے محبوب و مطلوب محمد مصطفیٰ ﷺ (رمضان المبارک کے آخر میں) اکثر حسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے: اے ماہِ رمضان الوداع۔

امام اہلسنّت رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے سوال میں مذکور جواب کی تائید ان الفاظ سے فرمائی: ''اس فتوے میں جو کچھ لکھا ہے حرف بہ حرف صحیح ہے''۔

عام لوگ اس بات سے آگاہ نہیں کہ ہم الوداع جس روایت کی بنیاد پر پڑھتے ہیں، وہ بے اصل ہے اور اس روایت کو بیان کرنا اور اس کا اعتقاد رکھنا جائز

نہیں ہے، اس لیے اب تک لوگ اس الوداع کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عمل ہماری بخشش کا ذریعہ ہے، ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم۔''

جمعۃ الوداع کے بارے میں رائج بدعات کی بابت مولوی احمد بن مولوی عبداللہ سکندر پوری ہزاروی کے استفتاء کے جواب میں علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالٰی متوفّٰی 1304ھ، نے ایک مفصل و مدلّل رسالہ لکھا ہے اور اس کے آخر میں قولِ فیصل کے طور پر لکھتے ہیں:

''وَالْإِنْصَافُ أَنَّ قِرَاءَةَ خُطْبَةِ الْوَدَاعِ إِذَا كَانَتْ مُشْتَمِلَةً عَلٰى مَعَانٍ صَحِيْحَةٍ وَأَلْفَاظٍ لَطِيْفَةٍ، لَمْ يَدُلَّ دَلِيْلٌ عَلٰى مَنْعِهَا وَلَيْسَ فِيْهَا اِبْتِدَاعٌ وَّضَلَالَةٌ فِيْ نَفْسِهَا، لٰكِنَّ الْاَوْلٰى هُوَ الْاِتِّبَاعُ لِطَرِيْقَةِ النَّبِيِّ ﷺ وَأَصْحَابِهٖ، فَإِنَّ الْخَيْرَ كُلَّهُ فِي الْاِتِّبَاعِ بِهٖ، لَا سِيَّمَا إِذَا وُجِدَ اِلْتِزَامُ مَا لَمْ يَلْزَمْ، وَظُنَّ مَا لَيْسَ مِنَ الشَّرْعِ مِنَ الشَّرْعِ وَمَا لَيْسَ بِسُنَّةٍ مِّنَ السُّنَّةِ، وَقَدْ تَقَرَّرَ فِيْ مَقَرِّهٖ أَنَّ كُلَّ مُبَاحٍ أَدّٰى إِلَى الْتِزَامِ غَيْرِ مَشْرُوْعٍ وَإِلٰى إِفْسَادِ عَقَائِدِ الْجَهَلَةِ وَجَبَ تَرْكُهُ عَلَى الْكَمَلَةِ۔

فَالْوَاجِبُ عَلَى الْعُلَمَاءِ أَلَّا يَلْتَزِمُوْا عَلٰى قِرَاءَةِ مِثْلِ هٰذِهِ الْخُطْبَةِ، لِكَوْنِهٖ مُؤَدِّيًا إِلٰى اِعْتِقَادِ السُّنِّيَّةِ، وَقَدْ وَقَعَ ذٰلِكَ مِنَ الْعَوَامِّ، حَيْثُ اِهْتَمُّوْا بِمِثْلِ هٰذِهِ الْخُطْبَةِ غَايَةَ الْاِهْتِمَامِ وَظَنُّوْهَا مِنَ السُّنَنِ الْمَأْثُوْرَةِ حَتّٰى اَنَّ مَنْ يَّتْرُكُهَا يَنْسِبُوْنَهٗ إِلٰى سُوْءِ الْعَقِيْدَةِ، وَمِنْ ثَمَّ مَنَعَ الْفُقَهَاءُ عَنْ اِلْتِزَامِ قِرَاءَةِ سُوْرَةِ الدَّهْرِ وَتَنْزِيْلِ السَّجْدَةِ فِيْ صَلَاةِ فَجْرِ الْجُمُعَةِ مَعَ كَوْنِهٖ ثَابِتًا فِي الْأَخْبَارِ الْمَشْهُوْرَةِ وَعَنْ سَجْدَةٍ مُنْفَرِدَةٍ بَعْدَ صَلَاةِ الْوِتْرِ وَأَمْثَالِ ذٰلِكَ مِمَّا يُفْضِيْ إِلٰى ظَنِّ الْعَوَامِّ أَنَّهٗ مِنَ السُّنَّةِ وَأَنَّ مُخَالَفَتَهٗ بِدْعَةٌ وَنَظَائِرُهٗ كَثِيْرَةٌ فِيْ كُتُبِ الْعُلُوْمِ شَهِيْرَةٌ۔

وَقَدْ بَلَغَ اِلْتِزَامُ خُطْبَةِ الْوَدَاعِ وَالْاِهْتِمَامُ بِهَا فِيْ أَعْصَارِنَا وَدِيَارِنَا إِلٰى حَدٍّ

أَفْسَدَ ظُنُوْنَ الْجَهَلَةِ فَعَلٰى أَهْلِ الْعِلْمِ الَّذِيْنَ هُمْ كَالْمِلْحِ فِي الطَّعَامِ إِذَا فَسَدَ فَسَدَ الطَّعَامُ، أَنْ يَّتْرُكُوا الْاِلْتِزَامَ، هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَلَعَلَّ عِنْدَ غَيْرِيْ أَحْسَنُ مِمَّا عِنْدِيْ، وَهٰذَا آخِرُ الْكَلَامِ فِيْ هٰذِهِ الرِّسَالَةِ''۔

ترجمہ: انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر خطبۃ الوداع صحیح معانی اور لطیف الفاظ پر مشتمل ہو، تو نہ اس کی ممانعت پر کوئی دلیل موجود ہے اور نہ اس میں فی نفسہٖ کوئی بدعت وضلالت ہے۔ لیکن افضل و اولیٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے اصحاب کے طریقے کی پیروی کی جائے، کیونکہ پوری کی پوری خیر اسی اتباع میں ہے۔ خاص طور پر ایسی صورتحال میں کہ جب (شریعت کی رو سے) غیر لازم چیز کو لازم بنالیا جائے اور وہ چیز جو شریعت میں نہیں ہے، اُسے شریعت (کا مطلوب) گمان کرلیا جائے اور جو سنت نہیں ہے، اُسے سنت سمجھا جائے۔ اور یہ بات اپنی جگہ ثابت ہوچکی ہے کہ ہر مباح کام جو غیر مشروع چیز کے التزام اور جہلاء کے عقائد کے بگاڑ کی طرف پہنچائے، (علمائے) کاملین پر اس کا ترک واجب ہے۔

پس علماء پر واجب ہے کہ وہ ایسے خطبوں کے پڑھنے کا التزام نہ کریں، کیونکہ یہ التزام ان کے سنت ہونے کے اعتقاد تک پہنچاتا ہے اور عوام سے اس اعتقاد کا وقوع ہو بھی چکا ہے، کیونکہ وہ ایسے خطبوں کا نہایت اہتمام کرتے ہیں اور انہیں سننِ ماثورہ سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی انہیں چھوڑے تو وہ اسے بدعقیدہ کہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے فقہائے کرام نے جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۃ الدہر اور سورۃ السجدۃ پڑھنے کا التزام کرنے سے منع فرمایا ہے، حالانکہ اس کا ثبوت اخبارِ مشہورہ سے ہے اور اسی طرح فقہائے کرام نے نماز وتر کے بعد الگ سے ایک سجدہ کرنے

سے بھی منع فرمایا ہے۔ اور اس جیسی کئی مثالیں ہیں جو عوام کے ذہن میں اُن امور کے سنت ہونے اور ان کی مخالفت کے بدعت ہونے کا تاثر پیدا کرتی ہیں اور مشہور کتابوں میں ایسی چیزوں کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔

''خطبۃ الوداع'' کا التزام واہتمام ہمارے زمانے اور ہمارے خطے میں اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ جاہلوں کے ذہن میں اس کے مشروع یا سنت ہونے کا عقیدہ پیدا ہوگیا ہے۔ پس اہلِ علم، جو طعام میں نمک کی طرح ہیں کہ اس کا توازن بگڑ جائے تو طعام بدمزا ہوجاتا ہے، پر لازم ہے کہ اس کے التزام کو ترک کریں۔ یہ میری رائے ہے اور ہوسکتا ہے کہ کسی دوسرے (صاحبِ علم) کے پاس مجھ سے بہتر رائے ہو، (رَدْعُ الْاِخْوَان عَنْ مُحْدَثَاتِ آخِرِ جُمُعَةِ رَمَضَان، ص:77-76)''۔ اس سے اکابر علماء کی تواضع معلوم ہوتی ہے کہ وہ کسی مجتہَد فیہ مسئلے کے بارے میں مدلل ومفصل بحث کرنے کے باوجود اپنی رائے کو حرفِ آخر قرار نہیں دیتے اور دیگر علماء کے لیے احترام کے جذبات رکھتے ہیں۔

اس لیے علماء پر لازم ہے کہ لوگوں کو اصل صورتِ مسئلہ سے آگاہ کریں کہ اس روایت کا پڑھنا اور الوداعی اشعار پڑھ کر یا سن کر چند آنسو بہا کر یہ سمجھنا کہ ہم جنت کے حق دار ہوگئے، درست نہیں ہے۔ اگر کوئی اباحتِ اصلیہ کی بنیاد پر ایسی الوداع پڑھنا ہی چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس میں غلو سے بچے اور الوداع سے پہلے لوگوں میں یہ اعلان کرے کہ کوئی اُس بے اصل روایت کی بنیاد پر اس الوداع میں شرکت نہ کرے، یہ ایک مباح کام ہے جس کی فضیلت اور ثواب پر اصلاً کوئی حدیث نہیں ہے۔ البتہ اگر رمضان کی رخصتی کا غم دل پر طاری ہے اور بے اختیار آنسو نکل آئے، تو یہ مستحسن ہے۔ ہم نے عشق ومحبت کے سارے تقاضے اپنے قلب پر طاری کرنے اور

اپنےعمل کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے خوش گلونعت خوانوں کے سپرد کردیئے ہیں۔

رمضانِ مبارک کی تربیت کا تقاضا یہ ہے کہ عبادت کے ذوق وشوق کو زندگی کا لازمی حصہ بنایا جائے اوراسلام کومکمل صورت میں قبول کیا جائے۔ہاں!اگرکوئی یہ دعا کرناچاہے کہ اے سارے جہانوں کے پروردگار! یہ سعادت زندگی میں بار بارنصیب فرما،تویہ''درازیِ عمربالخیر'' کی دعاہےاورایسی دعائیں اورتمام مسنون دعائیں کثرت سے کرنی چاہئیں۔

۞

اصلاحِ عقائدواعمال

(۱۰)

جمعۃ المبارک کے خطبہ کی بابت اصلاح

جب رسول اللہ ﷺ نمازِ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے، تو وہ آپ کے عہدِ مبارک میں قرآن مجید کی نازل شدہ آیات کے ابلاغ اور احکام شرعیہ کی تبلیغ کا مؤثر ذریعہ تھا، بعض اوقات جہادی مہمات کی تشکیل بھی اس موقع پر ہوتی تھی۔ خلفائے راشدین بھی اپنے خطبات میں امت کے اجتماعی معاملات اور ریاستی امور کے بارے میں ہدایات جاری فرماتے، یہ موجودہ دور میں امریکا کے ''اسٹیٹ آف دی یونین ایڈریس'' سے ملتی جلتی صورت تھی۔ فرق یہ ہے کہ اسلام میں حکومت اور نظم اجتماعی اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق کی بجا آوری کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ آج کل جمعۃ المبارک کے خطبات احکام شریعت کی تبلیغ کا ذریعہ ہیں۔

اصل مسنون تو عربی خطبہ ہے، جو عہدِ نبوت سے توارُث اور تسلسُل کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ لیکن چونکہ سب لوگ عربی نہیں جانتے، اس لئے غیر عربی ممالک میں تبلیغ کے لیے مسنون خطبے سے پہلے مقامی زبان میں خطاب کیا جاتا ہے اور خطبۂ مسنونہ سنت رسول کی اِتّباع میں عربی میں دیا جاتا ہے۔ خطبائے کرام پر لازم ہے کہ خطباتِ جمعہ کو تعلیمِ دین کا ذریعہ بنائیں، ہر جمعۃ المبارک کے خطاب میں موقع کی مناسبت سے

چند شرعی مسائل بھی بیان فرمایا کریں۔

اگر ہمارے خطبائے کرام لوگوں کے رُوبرو روزمرہ اور عملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل پر بات کریں، دینی رہنمائی کے ساتھ ساتھ ان کی دینی معلومات میں اضافہ کریں، ان کے سامنے حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ دینی مسائل کی تطبیق کریں اور اخلاقی واصلاحی امور پر جامع، مفصل اور مدلّل انداز میں گفتگو کریں، تو ہمارا تجربہ ہے کہ لوگ بصد شوق سننے کے لئے آتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوان زیر بحث موضوع پر غور بھی کرتے ہیں، ان کے ذہنوں میں جو اِشکالات اور سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا بھی اظہار کرتے ہیں اور اس طرح مثبت اور تعمیری انداز میں ربط باہمی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں پر کوئی بات مسلط نہ کی جائے بلکہ دلیل اور استدلال سے انہیں قائل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ ترجمہ: ''(لوگوں کو) اپنے رب کے راستے (یعنی دین) کی طرف حکمت اور پرتاثیر نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور احسن طریقے سے بحث (یا مکالمہ) کرو، (نحل:125)''۔

(۱۱)

توبہ کی بابت شرعی اصلاح

ہمارے ہاں بہت سے دینی امور سے اُن کی روح نکال کر رسمی حیثیت دے دی جاتی ہے، جیسے گزشتہ چند سالوں سے ٹیلی ویژن چینلز پر اور مجالس میں خوش گلو نعت خواں ''میری توبہ قبول ہو'' پر مشتمل اشعار پڑھ کر سب کو توبہ سے فارغ کردیتے ہیں، حالانکہ توبہ نعت خوانی کے انداز میں اشعار پڑھنے کا نام نہیں ہے، بلکہ توبہ ایک مربوط قلبی اور روحانی عمل کا نام ہے، جس کی روح یہ ہے:

(الف) بندۂ مومن اپنی معصیتوں اور گناہوں کا اللہ تعالیٰ کے حضور اقرار کرے۔

(ب) پھر اُن پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نادم وشرمسار ہو اور اللہ تعالیٰ سے اُن کی معافی مانگے، حدیثِ پاک میں ہے: ''اَلنَّدَمُ تَوْبَۃٌ ،یعنی گناہوں پر ندامت ہی (حقیقی) توبہ ہے، (سنن ابن ماجہ: ۴۲۵۲)''۔

(ج) شرعی تعلیمات کے مطابق اُن گناہوں اور تقصیرات کی تلافی کرے، مثلاً:

(1) جتنی قضا نمازیں اُس کے ذمے باقی ہیں، اُن کی قضا پڑھے۔

(2) ماضی کے سالوں کی جو زکوٰۃ اُس کے ذمے ہے، اُسے ادا کرے۔

(3) ماضی میں جو روزے چھوٹ گئے ہیں، اُن کی قضا رکھے۔

(4) بندوں کی جو حق تلفی ہوئی ہے، اس کی تلافی یا ازالہ کرے اور اُن سے معافی مانگے۔

(5) دیگر شعبوں میں بھی تلافی کی جو صورتیں شریعت نے مقرر کی ہیں، اُنکو اختیار کرے۔

(6) اللہ تعالیٰ سے عہد کرے کہ آئندہ وہ ان گناہوں کا اعادہ نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ سے اس پیمانِ وفا پر قائم رہنے کی توفیق مانگے۔

(7) علانیہ گناہوں کی توبہ بھی علانیہ کرنی ہوگی، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ مُعَاذٍ، قَالَ:قُلْتُ:یَارَسُولَ اللهِ!أَوْصِنِی، فَقَالَ عَلَیْکَ بِتَقْوَی اللهِ مَا اسْتَطَعْتَ، وَاذْکُرِ اللهَ عِنْدَ کُلِّ حَجَرٍ وشَجَرٍ، وَمَا عَمِلْتَ مِنْ سُوءٍ فَأَحْدِثْ لِلّٰهِ فِیهِ تَوْبَةَ السِّرِّ بِالسِّرِّ، وَالْعَلَانِیَةُ بِالْعَلَانِیَةِ''۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بیان کرتے ہیں: میں نے عرض کی: یارسول اللہ(صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ وَسَلَّمَ)! مجھے وصیت فرمائیے، آپ ﷺ نے فرمایا: جس قدر تمہارے بس میں ہے، اللہ کے تقوے کو اپنے اوپر لازم کرلو اور اللہ کو ہر شجر وحجر کے پاس (یعنی ہر مقام پر) یاد کرو اور تم نے کوئی گناہ کیا ہو تو اللہ کی رضا کے لیے جلد توبہ کرو، پوشیدہ گناہ کی پوشیدہ اور علانیہ گناہ کی علانیہ، (المعجم الکبیر للطبرانی:331)''۔

دعا میں ترنم کی شرعی حیثیت:

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے والدِ ماجد رئیس المتکلمین علامہ نقی علی خان رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی آدابِ دعا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ادب:۳۶:

دعا میں سجع اور تکلُّف سے بچے کہ باعثِ شُغلِ قلب وزوالِ رقّت ہے، حدیثِ پاک میں آیا: اِیَّاکُمْ وَالسَّجْعَ فِی الدُّعَاءِ، (دعا میں ہم آواز الفاظ سے بچو)۔

(احیاء علوم الدین، کتاب الاذکار والدعوات، الباب الثانی، ج:۱،ص:۴۰۵)

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اس کی شرح

میں لکھتے ہیں:

قَالَ الرِّضَا: ''اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سجع کا آنا ہے نہ کہ سجع کا لانا اور ممنوع مُسَجَّع کرنا ہے، نہ کہ مُسَجَّع ہونا کہ مُشَوِّشِ خاطر وہی ہے، نہ کہ یہ، والہٰذا حضرتِ مصنفِ عَلّامہ قُدِّسَ سِرُّہٗ نے لفظِ تکلُّف زیادہ فرمایا''۔

ادب:۳۷:

راگ اور زمزمے (ترنُّم) سے احتراز کرے کہ خلافِ ادب ہے۔

ادب:۳۹:

بہتر ہے کہ جو دعائیں حدیثوں میں وارد اور دنیا وآخرت کی اکثر مرادوں کی جامع ہیں، انہی پر اکتفا کرے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نیک حاجت دوسرے کے مانگنے کو نہ چھوڑی۔ (اَحْسَنُ الْوِعَالِآدَابِ الدُّعَا، ص:85-84)

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

علامہ کمال الدین ابن ہمام رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے یہی بات کہی اور اُن کے شاگرد محقق ابنِ امیر الحاج حلبی نے اس کی بہت تحسین کی:

> ''دعا میں گلے بازی (یعنی گانے کے انداز) کو میں جائز نہیں سمجھتا، جیسا کہ آج کل کے قاری کرتے ہیں اور یہ فعل ایسے لوگوں سے بھی صادر ہوتا ہے جو سوال اور دعا کے معنی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ ایک قسم کا کھیل اور مذاق ہے۔ اگر مشاہدے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کوئی سائل جو بادشاہ سے اپنی حاجت کی درخواست کررہا ہو اور اپنے سوال کو گویّوں کی طرح گا کر آواز کی بلندی اور پستی اور آواز کو بنا بنا کر مانگے تو ایسے سائل کو کھیل اور مذاق کی تہمت دی جائے گی کہ مقام، الحاح وزاری کا ہے، نہ کہ گانے کا''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:۲۸، ص:۱۶۵)

ان اصولوں کی روشنی میں ہر مسلمان خَلوت میں اللہ تعالیٰ سے رجوع کرے اور توبہ واستغفار کرے، البتہ جو گناہ کسی نے عَلانیہ کیے ہوں تو اُسی فورم پر اُن سے رجوع کرے اور استغفار کے علاوہ جو گناہ تعیین کے ساتھ اُسے یاد ہوں، اُن کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے۔ مُعیَّن گناہوں کے لیے عمومی توبہ کافی نہیں ہے۔

قضائے عمری:

ہمارے اس خطے میں ایک بے اصل روایت چلی آرہی ہے کہ بعض بڑی راتوں میں دو یا چار نفل قضائے عمری کی نیت سے پڑھ لیے جائیں تو یہ ساری عمر کی قضا نمازوں کی تلافی کا سبب بن جائیں گے اور عمر بھر کی نمازوں کا مواخذہ نہیں ہوگا، یہ روایت باطل ہے، گمراہی کا سبب ہے، بدعت واختراع ہے اور نہ جانے کس نے یہ شارٹ کٹ ڈھونڈا ہے۔ عاقل وبالغ ہونے کے بعد ہر نماز کی جوابدہی شریعت کی رو سے لازم ہے، اگر بروقت ادا نہ کی ہو تو اُس کی قضا پڑھے۔

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالیٰ سے سوال ہوا: ''بعض مشائخ سے منقول ہے: بعض نمازیں نفل کی، مثلاً رمضانِ مبارک کے آخری جمعہ کی نماز سے قبل چار رکعت نفل پڑھ لیے جائیں، تو یہ عمر بھر کی قضا نمازوں کی تلافی کا سبب بن جائیں گے''، آپ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

> ''نماز قضائے عمری کہ آخر جمعہ ماہ مبارکِ رمضان میں اس کا پڑھنا اختراع کیا گیا اور اس میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نماز سے عمر بھر کی اپنی اور ماں باپ کی بھی قضائیں اُتر جاتی ہیں، محض باطل و بدعت سَیِّئَہ شَنِیْعَہ ہے، کسی معتبر کتاب میں اصلاً اس کا نشان نہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:7، ص:418-417، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

دوسرے مقام پر آپ سے سوال ہوا: ''رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں

عوام النّاس امام کی اقتدا میں پانچ وقت کی نماز قضائے عمری پڑھتے ہیں، یہ درست ہے یا ممنوع؟، کیونکہ قضا نماز جب تک ادا نہ کی جائے، ساقط نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی شخص رمضان کے آخری جمعہ کو تمام عمر کی قضا نمازوں کی نیت سے قضائے عمری پڑھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ تمام عمر کی نمازیں ساقط ہوجائیں گی، تعجب کی بات ہے''، آپ جواب میں لکھتے ہیں:

''فوت شدہ نمازوں کے کفارہ کے طور پر جو یہ طریقہ (قضائے عمری) یاد کرلیا گیا ہے، یہ بدترین بدعت ہے، اس کے بارے میں جو روایت ہے، وہ موضوع (یعنی خودساختہ ہے اور کہیں بھی ثابت نہیں ہے) ہے، یہ عمل سخت ممنوع ہے، ایسی نیت واعتقاد باطل ومردود ہے، اس جہالتِ قبیحہ اور واضح گمراہی کے بطلان پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذٰلِكَ، قَالَ قَتَادَةُ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي''۔

ترجمہ: ''انس بن مالک بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس سے (فرض) نماز بھولے سے رہ گئی، تو جونہی یاد آئے، اسے پڑھ لے، (نماز کے قضا ہونے پر) اس کے بغیر کوئی کفارہ نہیں ہے، حضرت قتادہ نے استشہاد کے طور پر سورۂ طٰہٰ آیت: 14 کی تلاوت کی: ''وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي'' (ترجمہ:) اور میری یاد کیلئے نماز قائم کیجیے، (مسلم: 684)''۔

علامہ علی القاری رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالیٰ تے ہیں:

حدیث: ''جس نے رمضان کے آخری جمعہ میں ایک فرض نماز ادا کرلی، اُس سے اس

کی ستر سال کی فوت شدہ نمازوں کی تلافی ہوجاتی ہے''۔

(اَلْاَسرارُ الْموضوعة فِي الاَخبارِ الموضوعة، رقم الحدیث: 953، ص: 242)

یہ یقینی طور پر باطل ہے، کیونکہ یہ اس اجماع کے خلاف ہے کہ عبادات میں سے کوئی شئے سابقہ سالوں کی فوت شدہ عبادات کے قائم مقام نہیں ہوسکتی۔

امام ابن حجر مکی ''شرح منهاج للامام النووی'' میں پھر علامہ زرقانی ''شرح مواهب اللدنیه للامام قسطلانی'' رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تعالیٰ میں فرماتے ہیں:

''اس سے بھی بدتر وہ طریقہ ہے جو بعض شہروں میں ایجاد کرلیا گیا ہے کہ جمعہ کے بعد پانچ نمازیں اس نیت سے ادا کرلی جائیں کہ اس سے سال یا تمام سابقہ قضا شدہ نمازوں کا کفارہ ہوجاتا ہے، اس عمل کے حرام ہونے کی وجوہ نہایت واضح ہیں، (شَرحُ الزّرقانی علی المواهبِ اللّدنیه وَاَمَّا حَفِيْظَةُ رَمَضَانَ، ج:7، ص:110)''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:8، ص:154 تا 156، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن لاہور)

طٰہٰ: 14 کی تفسیر میں علامہ غلام رسول سعیدی رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''اس حدیث (مسلم: 684) سے معلوم ہوا کہ جو شخص سونے کی وجہ سے یا کسی کام میں مشغولیت کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے نماز نہ پڑھ سکا ہو، اس پر اس نماز کی قضا کرنا واجب ہے، (تبیان القرآن، ج:7، ص:355)''۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''قضائے عمری کہ شبِ قدر یا اخیر جمعہ رمضان میں جماعت سے پڑھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ عمر بھر کی قضائیں اسی ایک نماز سے ادا ہوگئیں، یہ باطل محض ہے، (بہارِ شریعت، حصہ چہارم، ص:708)''۔

قضائے عمری کا یہ تصور اسی طرح باطل ومردود ہے، جیسے ہمارے پاس بعض

علاقوں سے سوال آتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیں اور کسی مولوی صاحب نے یا کسی پیر صاحب نے اسے کہا کہ دو دیگیں پکا کر فقیروں میں بانٹ دو اور بیوی سے رجوع کرلو، یہ بھی باطل ومردود ہے اور کسی کے پاس حرام کو حلال کرنے کا یہ اختیار نہیں ہے، یہ شریعت میں سراسر تصرّف ہے اور اختراع ہے، اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ تِلْکَ الْخُرَافَات۔

وضاحت:

ہم صرف غیر مُتَشَرِّع (بے شرع) اور غیر مُتَدَیِّن (غیر دیندار)، جاہل اور بے عمل بلکہ بدعمل پیروں اور منکَرات کے حامل عاملوں سے عوامِ اہلسنّت کو اجتناب کی تلقین کرتے ہیں۔ اس کا لزومی معنی یہ ہے کہ امامِ اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے بیان کردہ معیار پر جو عالم، مُتَشَرِّع اور مُتَدَیِّن پیرانِ طریقت رُشد وہدایت کے مناصب پر فائز ہیں، انہیں ایک گونہ اطمینان ہونا چاہیے کہ اُن کے لیے گنجائش پیدا ہورہی ہے اور ہم بالواسطہ طور پر عوام کو اُن کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح جب ہم جاہل اور بے عمل بلکہ بدعمل واعظین سے عوام کو اجتناب کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، تو ذی علم اور باعمل خطبائے کرام اور واعظینِ کرام کو سکون کا سانس لینا چاہیے کہ اُن کے لیے گنجائش پیدا ہورہی ہے اور ہم عوام کو بالواسطہ اُن کی طرف متوجہ کررہے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ

آمِیْنَ یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ بِجَاہِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ

تائیدات وتصدیقات

علماءومشائخ اہلسنّت وجماعت

صوبہ پنجاب

اصلاحِ عقائدواعمال

استاذ الاساتذہ، شیخ طریقت، شیخ الحدیث

علامہ ابوالخیر حسین الدین شاہ دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ الْعَالِیَۃ

سرپرستِ اعلیٰ تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان

بانی ومہتمم جامعہ رضویہ ضیاء العلوم، سٹیلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

بانی ومہتمم جامعہ آمنہ ضیاء البنات، ہمک، ماڈل ٹاؤن، متصل ڈی ایچ اے اسلام آباد

سرپرستِ اعلیٰ تنظیم علمائے ضیاء العلوم والمدینہ (چیریٹیبل) ہیلتھ سنٹر، اسلام آباد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

علماء ومشائخ اہلسنّت کی علمی اعانت، مشاورت اور تائید وتوثیق کے ساتھ شیخ الفقہ والحدیث حضرت علامہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب مُدَّاللّٰہُ تَعَالٰی ظلہ العالی صدر تنظیم المدارس اہلسنت وجماعت پاکستان نے ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کے عنوان سے یہ کتاب مرتّب کی، اس کی تقدیم سے ہر قاری کو بحسن وخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ:

"یہ کتاب اخلاص ورضائے الٰہی کے جذبے سے مرتّب کی گئی ہے، اس کا مقصد کسی تنظیم، فرد، افراد یا طبقے کو ہدف تنقید بنانا مقصود، نہ ہی کسی کی طرف تعریض، توریہ یا ایہام مطلوب ہے، بلکہ صرف اور صرف اصلاح مقصد ہے"۔

لہٰذا سب اہلِ علم پر لازم ہے کہ اس کتاب کو کھلے ذہن سے پڑھیں۔ مؤلّف اور اُن کے معاونین کے بارے میں حُسنِ ظن سے کام لیں اور اُن کے جذبہ اصلاح کو "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" کی صورت میں دیکھیں۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے مسوّدے کو کمپوز کرنے کے بعد مفتیانِ کرام کی موجودگی میں بار بار خواندگی کی گئی اور باہمی مشورہ سے حذف واضافہ بھی کیا

گیا۔ اسے زیادہ سے زیادہ مقبول عام بنانے کے لیے امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مولانا الشاہ احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے حوالہ جات سے مدلّل ومُبَرہَن کیا گیا ہے، تاکہ اہلسنّت پر حجت قائم ہو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تَعَالٰی! وارثانِ علمِ نبوّت، حاملانِ شریعتِ مطہرہ، متکلمین، محدثین، مفسرین، فقہاء اور اصفیاء نے ہر دور میں اسلامی عقائد واعمال میں اہلِ ہوا اور جُہّال کے خودساختہ تصورات وافعال کا مدلل رد کرتے ہوئے اصلاح فرمائی، جس کی برکت سے آج قرآن وسنت کی پاکیزہ تعلیمات اصل شکل میں موجود ہیں۔ زیر نظر کتاب "اصلاح عقائد واعمال" بھی اسی سلسلہ اصلاح وہدایت کی کڑی ہے۔

اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیری، علماء وصوفیاء کی مساعی جمیلہ اور مجاہدین کی قربانیوں سے پیغامِ اسلام چاردانگِ عالَم میں پھیلا، اس سے جہاں مسلمانوں کی آبادی بڑھی، وہیں نئے نئے فتنے بھی پیدا ہوئے اور مسائل بھی بڑھے۔ ماضی کی بہ نسبت آج اصلاح کی زیادہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ تمام اہلِ درد کی تمنا تھی کہ کوئی نہ کوئی آگے بڑھے اور منظّم انداز سے اصلاح کے مشن کا پرچم بلند کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے حضرت مفتی اعظم پاکستان استاذ المدرسین مفتی منیب الرحمن صاحب زید مجدہ کو اس کی توفیق عطا فرمائی، تَقَبَّلَ اللّٰہُ مِنْہُ وَجَزَاہُ اللّٰہُ عَنَّا خَیْرَالْجَزَاء۔

ہم سب کو ''تَعَاوَنُوا عَلَی الْبِرّ'' (الآیہ) پر عمل کرتے ہوئے اس پیغام کو عام کرنے میں مُمِدّ ومعاون بننا چاہیے۔ میری خواہش تھی کہ یہ کام حکمت کے تحت انجام پائے تاکہ ''کَلِمَۃُ الْحَقّ اُرِیْدَ بِھَا الْبَاطِل'' کے مصداق معاندین اسے منفی مقاصد کے لیے استعمال نہ کریں۔ میں اس تحریر کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کرسکا، لیکن

"گلستانِ مہرعلی" جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی کے ناظمِ تعلیمات اور استاذ الحدیث علامہ حافظ محمد اسحاق ظفر صاحب نے اس کا بالا ستیعاب مطالعہ کیا ہے اور انہوں نے بتایا کہ میلاد النبی ﷺ ،نعتِ پاک مصطفیٰ ﷺ ، ایصالِ ثواب اور دیگر عنوانات پر اصلاحی گفتگو سے پہلے قرآن وحدیث سے اُن کا حکم ،نفسِ جواز واستحباب بھی بیان کر دیا گیا ہے۔

لہٰذا مجھے یقین ہے کہ اب نہ اپنے لوگ اس سے بدکیں گے، نہ بلیک میل کر سکیں گے اور نہ ہی مخالفین اسے منفی مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں گے اور بتوفیق اللہ تعالیٰ "معمولاتِ اہلسنت" پہلے سے زیادہ ذوق وشوق اور تمام تر شرعی آداب کے ساتھ جاری وساری رہیں گے اور امید کامل ہے کہ یہ کاوش ان معمولات وشعائر کو ہر قسم کی بدعات سیئہ سے پاک وصاف رکھنے میں نمایاں کردار ادا کرے گی، اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْعَظِیْم ! میں نے خود بھی اس سال (۱۴۳۸ھ) ماہ ربیع الاول میں عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر ایک اصلاحی پمفلٹ "**سنی بھائیوں کے نام دردمندانہ گزارش**" کے عنوان سے شائع کیا جسے اہلِ محبت واہلِ درد نے اپنے طور پر ہزاروں کی تعداد میں شائع کر کے تقسیم کیا، فَجَزَاھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاءَ۔

صدقۂ جاریہ:

اس کتاب کے حوالے سے بھی اسی شِعار کو اپنانا چاہیے! اصلاح امت کے ارادے سے ائمۂ کرام، خطبائے عظام، مشائخ طریقت اور دین کی راہ میں کھلے دل سے مالی وسائل صرف کرنے والے اہلِ خیر کو چاہیے کہ اس کتاب کو بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع کرائیں اور کالج و یونیورسٹیز، سرکاری دفاتر اور عامۃ الناس تک اسے پہنچائیں۔ یہ ایصالِ ثواب کا بہترین طریقہ بلکہ صدقہ جاریہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ نقشِ اول ہے، حرفِ آخر نہیں ہے، لہٰذا اس کتاب کے دیگر حصے بھی وقفے وقفے سے آتے رہیں گے، رفتہ رفتہ یہ سلسلہ اصلاح بڑھتا رہے گا، اسلامی عبادت وتہذیب کے مراکز، مدرسہ، خانقاہ، محراب ومنبر کے علمی، عملی اور مالی معاملات کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ تعلیم کی بہ نسبت تربیت کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ نہایت احتیاط، حکمت وموعظت، اخلاص اور تحمل وبرداشت کے ساتھ اس سمت قدم اٹھنا چاہیے! تکبّر، ریاست پرستی، تحقیر الناس، حُبِّ دنیا وجاہ، طمع، ریا، سمع، عُجب، کذب، غیبت، بہتان اور سوئے ظن جیسے امراض کے علاج پر صوفیائے کرام نے زیادہ توجہ فرمائی ہے۔

گزارش:

مسائل کو زیر بحث لاتے وقت اکابر اہل سنت کے علمی اختلاف، صوفیہ وعُرفا کے معمولات اور بدعت حسنہ کے مراتب و اقسام، واجب، مندوب، اور مباح (جنہیں عرف عام میں بدعت نہیں کہا جاتا) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ ناصح، مصلح اور مربی کو اخلاص، شفقت اور تحمل وبرداشت کے ساتھ قدم بڑھانا چاہیے!

مجھے یقین ہے کہ اس کاوش کی برکت سے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو "مسلکِ اہل سنت وجماعت" کو اپنی اصل شکل میں سمجھنے کا موقع ملے گا اور وہ اس کی طرف راغب ہوں گے۔ "اہل سنت" کے بارے میں جو منفی پروپیگنڈے کیے جاتے رہے ہیں، اِس سے اُن کا نہ صرف سدِّ باب ہوگا، بلکہ قلع قمع بھی ہوگا۔ میں اس اصلاحی کاوش کی تائید وتوثیق کرتا ہوں۔

میں صمیمِ قلب سے دعا گو ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کے طفیل اخلاص پر مبنی اس کاوش کو قبولِ عام عطا فرمائے، امت کے لیے نفع رساں

بنائے ۔ اہلِ منبر ومحراب اوراصحابِ سجادہ کو اسے عام کرنے اور برتنے کی سعادت نصیب فرمائے ۔اللہ تبارک وتعالیٰ مجھ خطا کار کو بھی سچی توبہ کی توفیق دے، آمین یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ بجاہِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْن ۔

حضرت علامہ صاحبزادہ سیّد ارشد سعید کاظمی دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ انوار العلوم ملتان
سینیر نائب صدر تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

علامہ پروفیسر مفتی اعظم مفتی منیب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب بعنوان ''اصلاح عقائد واعمال''فقیر کوموصول ہوئی ۔اس پر فقیر کا تبصرہ مندرجہ ذیل ہے:

حضرت مفتی صاحب نے مروّجہ نعت خوانی اور پیشہ ور نقیبوں کے بارے میں جو تحریر فرمایا، وہ بہت خوب ہے کہ ان محافل میں عام طور پر پیشہ ور نعت خواں نظر آتے ہیں جو عجیب وغریب وضع وقطع اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں ۔ ان کی ظاہری سج دھج دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا مطمحِ نظر اللہ تعالیٰ کی رضا کی بجائے دنیاوی منفعت کا حصول ہے ۔

محافل کروانے والے حضرات محافل نعت پر لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے خرچ کردیتے ہیں جبکہ ہمارے مدارس مالی اعتبار سے یتیم ہیں اور جن میں قَالَ اللہُ اور قَالَ الرَّسُوْل کی باقاعدگی سے تعلیم دی جاتی ہے،ان پر خرچ کرنے کے بارے میں توجہ ہی نہیں کرتے بلکہ انہیں قابل اعتناء ہی نہیں جانتے ۔ اس کتاب میں عام نقیب محفل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے کہ وہ بعض اوقات ایسے عقائد بیان کردیتے ہیں ، اگر اس وقت علماء بولیں تو تخریب کا رقرار پائیں ،اگر خاموش رہیں تو بعد میں جواب دینا مشکل ہوجائے ۔

اس کتاب کی قابل اصلاح باتوں میں ہم مفتی صاحب کے ساتھ ہیں اور

اپنے طور پر اپنے حلقے اور اپنی حدود میں ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، چونکہ فقیر اپنے شیخ ومرشد، استاذ اور والد گرامی حضرت غزالیٔ زماں رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے مزاج سے آشنا ہے، اس لیے اتنا عرض کرتا ہے کہ اگر ان کے زمانہ میں یہ نئی نئی خرافات جو اصل دین اور با ادب نعت خوانی وغیرہ کے علاوہ ہوتیں، تو یقیناً آپ علیہ الرحمہ بھی ان کے خلاف ایک عظیم بند باندھ دیتے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمت عطا فرمائے کہ ہم اِسراف اور دیگر لا یعنی امور کے انسداد میں کوشش کرتے ہوئے پورا اتریں، آمِیْن بِجَاہِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْن۔

❁

حضرت علامہ صاحبزادہ محمد فیض الرسول رضوی زِیْدَ مَجْدُھُمْ

سجادہ نشیں، آستانہ عالیہ محدث اعظم پاکستان، فیصل آباد

رئیس الجامعہ، جامعہ محدث اعظم (اسلامک یونیورسٹی) رضا نگر، چنیوٹ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اہلسنّت وجماعت آج جس کربناک صورتحال سے دوچار ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عقائد اور اعمال کی مختلف بدعات نے اسلامی معاشرہ کو نڈھال کر دیا ہے، مسجدیں ویران، مدرسے بے چراغ اور خانقاہیں ملنگوں اور منشیات فروش قلندروں کی آماجگاہیں بن چکی ہیں۔ دین کا لبادہ اوڑھ کر جاہل ملاں اور مذہب بیزار دانشور دین اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ ادب سے ناواقف گویئے سٹیجوں پر عشق نیلام کرتے نظر آرہے ہیں اور وہ تارے یکے بعد دیگرے ڈوبتے چلے جارہے ہیں جو زندگی کے صحراؤں میں بھٹکنے والوں کو اپنی منزل کا نشان بتاتے تھے۔ ہمارے اکابرین نے روافض، خوارج اور بدمذہبوں کے خلاف نظریاتی پختگی کی جو دیوار قائم کی تھی، آج صلح کلی کے نام پر اسے گرایا جارہا ہے۔ ہرطرف مایوسی کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ امید کی کوئی کرن کسی گوشہ سے بھی جھانکتی نظر نہیں آرہی۔ ایسے میں مفتی منیب الرحمن صاحب نے عوام الناس میں بعض اعتقادی اور عملی کمزوریوں کی اصلاح کے لیے کتاب ''اصلاح عقائد واعمال'' تحریر کی ہے۔

یہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک منفرد اصلاحی کوشش ہے۔ اللہ عزوجل اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صدقے مفتی صاحب کو بہترین صلہ عطا فرمائے۔ اہل علم حضرات سے میری گزارش ہے کہ زیرِ نظر کتاب کا گہری نظر سے مطالعہ فرمائیں اور کلمۂ حق بلند کرتے ہوئے عوام الناس کی اصلاح کی کوشش فرمائیں، اللہ عزوجل اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہم سب کے حامی وناصر ہوں۔

اساطین واکابر جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فتنوں کے اس دور میں جہاں اسلام دشمن عناصر میڈیا اور دیگر ذرائع سے اپنا زہر پھیلا رہے ہیں وہیں اپنے بعض نادانوں کی حرکتیں بھی دین ومسلک کے لیے نقصان دہ ثابت ہورہی ہیں۔ایسے حالات میں حضرت مفتی اعظم محمد منیب الرحمن دامت برکاتہم العالیہ کا اصلاحِ امت کے لیے تقریر وتحریر وتصنیف کے ذریعے سعی فرمانا مسلمانوں پر احسانِ عظیم ہے۔

آپ کے خطابات عوام وخواص کے لیے عام فہم اور اصلاحی پیغام پر مشتمل ہوتے ہیں۔آپ نے وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر ان فتنوں کا سد باب کرنے کے لیے ''اصلاحِ عقائدواعمال'' کے نام سے تحقیقی کتاب لکھی ہے جس میں قرآن وسنت سے عقائد واعمال کے اصلاحی پہلوؤں کو بڑے احسن انداز میں واضح فرمایا ہے۔اللہ تعالیٰ حضرت مفتی اعظم دامت برکاتہم القدسیہ کی اس عظیم کوشش کو نافع ومقبول عام بنائے۔

دستخط کنندگان:

حضرت علامہ محمد عبدالمصطفیٰ ہزاروی مُدَّ ظِلُّھُم	ناظم اعلیٰ
استاذالاساتذہ حضرت علامہ حافظ محمد عبدالستار سعیدی مُدَّ ظِلُّھُم	شیخ الحدیث وناظم تعلیمات
استاذالاساتذہ حضرت علامہ ڈاکٹر فضل حنان سعیدی مُدَّ ظِلُّھُم	شیخ الحدیث
حضرت علامہ مفتی محمد تنویر القادری زِیۡدَ مَجۡدُھُمۡ	مفتی
حضرت علامہ مفتی محمد اکمل قادری زِیۡدَ مَجۡدُھُمۡ	نائب مفتی
حضرت علامہ محمد فاروق شریف زِیۡدَ مَجۡدُھُمۡ	مدرس اعلیٰ
حضرت علامہ احمد رضا سیالوی زِیۡدَ مَجۡدُھُمۡ	نائب ناظم تعلیمات

علامہ محمد صدیق ہزاروی سعیدی ازہری دَامَتۡ بَرَکَاتُھُمُ الۡعَالِیَۃ

شیخ الحدیث، جامعہ ہجویریہ، مرکز معارف اولیاء

دربارِ عالیہ حضرت داتا گنج بخش رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

راقم (محمد صدیق ہزاروی سعیدی) نے آپ کی کتاب ''اصلاحِ عقائدواعمال'' کو اول سے آخر تک لفظ بلفظ پڑھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ بلا مبالغہ اصلاحِ احوال کے لیے اس سے بہتر پیغام نہیں ہوسکتا۔

آپ نے مرض کی تشخیص بھی کی اور علاج بھی تجویز کیا اور اپنی تحریر کو قرآن وسنت اور اقوال مفسرین سے مُزَیَّنۡ وَمُدَلَّل فرمایا اور خاص طور پر امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان رحمۃُ اللّٰہُ تعالیٰ کا نہایت حکمت بھرا پیغام بھی سنایا تاکہ اعلیٰ حضرت کے نام پر کھانے والوں کو کچھ تو احساس ہو۔یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جو بھی اس کتاب کو پڑھے گا، وہ راہِ حق کے قریب ہوجائے گا۔

میری گزارش ہے کہ حضرت مفتی صاحب مُدَّظِلُّہٗ کے اس پیغام، جو درحقیقت قرآن وسنت اور اکابرِ امت کا پیغام ہے، کو عام کرنے کے لیے اہلسنّت کے تمام اہل درد حضرات اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کی بھرپور سعی کریں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے توسل سے حضرت علامہ مفتی محمد منیب الرحمن صاحب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور اس بیش قیمت کتاب کی افادیت میں برکات عطا فرمائے اور اسے قبولِ عام فرمائے، آمین ثم آمین۔

حضرت علامہ مفتی محمد رمضان سیالوی دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ

خطیب جامع مسجد داتا دربار، لاہور

شیخ الحدیث جامعہ ہجویریہ، داتا دربار لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نوائے قلوبِ دردمنداں

اللہ رب العزت کی یہ سنت کریمہ رہی ہے کہ جب بھی باطل اور گمراہی نے کسی بھی صورت میں سر اٹھایا تو اس کی سرکوبی اور خاتمے کیلئے حق اور ہدایت کو اس نے پوری طاقت سے ظاہر فرمایا اور انسانی معاشرے کی تطہیر فرما کر اسے از سرِ نو عزت اور دوام عطا فرما دیا، یہ سلسلہ حضرت آدم سے نبی کریم ﷺ تک نبوت کی صورت میں اور حضور خاتم النبیین ﷺ کے بعد صحابہ کرام، اہل بیت اطہار، فقہاء عظام، اولیاء کبار اور مجددین امت محمدی ﷺ اور صلحائے عظام کے ذریعے جاری رہا ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اسلام کی نمائندہ جماعت ”اہل سنت و جماعت“ کو ہر دور میں جن چیدہ مسائل اور تحدّیات (Challenges) کا سامنا رہا ہے ان میں سے اہم اندرونی انتشار اور اباحت و استحباب کے نام پر سنت نبوی ﷺ سے دوری ہے، جس کے نتیجہ میں عمومی ماحول و معاشرہ فطری تساہل کی بنیاد پر فرائض وسنن کا تارک یا غافل جبکہ مستحبات پر مُصر اور خوب متحرک نظر آتا ہے، ایسے ماحول اور حالات میں عمومی افراد تو کیا خواص بھی حق گوئی اور اصلاح و درستی کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور

مصلحین وواعظین بھی ”چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی“، کی روش کو اپنا کر کام چلانے میں عافیت سمجھتے ہیں۔

سابقہ احوال کے تناظر میں ہمارے اس عہد میں بھی اہلسنّت و جماعت کو جن چند مسائل اور خرابیوں بلکہ بعض خرافات کا ایک طویل عرصے سے سامنا ہے، ہر دردمند اور مخلص اس پر پریشان اور ان امور میں اصلاح اور رہنمائی کا خواہش مند تھا۔ اگرچہ انفرادی اور جزوی طور پر ہلکے پھلکے انداز میں کوئی نہ کوئی بات، فتوای، بیان، خطاب، تبصرہ، تجزیہ، کالم اور کتابچہ کہیں نہ کہیں سامنے آجاتا تھا لیکن ان سارے امور اور مسائل پر علمی اور خالص اصلاحی انداز میں مبسوط کام کی اشد ضرورت تھی، جس کو پورا کرنے کی سعادت ہمارے اس عہد کی اس عظیم علمی، فکری اور اصلاحی شخصیت کو میسر آئی ہے جو اسم با مسمّٰی ”منیب الرحمن“ ہیں۔ آپ کی شخصیت کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں ہے، علمی وفکری، تحقیقی، تحریری، عملی، تبلیغی اور امامت واصلاحی دنیا کے تمام القابات اور Titels آپ کے نام نامی کے ساتھ لگ کر اپنے اور حضرت کے وقار میں اضافے کا سبب بنتے ہیں، میری مراد استاذ العلماء حضرت مفتی منیب الرحمن دَامَتْ بَرَکَاتُھُمْ وَ اَدَامَ اللّٰہُ ظِلّھم سے ہے۔ آپ نے اپنے علمی، فکری، معاشرتی اور اصلاحی مقام و مرتبہ اور اس کی ذمہ داری کا مکمل احساس و ادراک فرما کر اپنی مذہبی ومسلکی ذمہ داری کو کما حقہ پورا کر کے عہد حاضر کے بے شمار مخلصین کے بوجھ کو ہلکا اور کم کر دیا ہے اور معاندین ومعترضین کی جانب سے اہل سنت و جماعت پر قرض کو بھی چکا دیا ہے۔

اس کام کی بنیاد اگرچہ امام اہلسنّت مجدد دین وملت الشاہ احمد رضا خان قادری بریلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے تجدیدی اور اصلاحی فرمودات پر ہے جو اہلسنّت و جماعت کی نشاۃ ثانیہ کے آج بھی رہنما اور اساسی اصولوں کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن عصر حاضر کے مسائل کو جس خوبصورت انداز میں الفاظ کی لڑیوں میں پرویا گیا ہے، پڑھنے

والا اسے مکمل کئے بغیر اور عمل کا جذبہ اپنے اندر موجزن محسوس کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

اہل سنت و جماعت کو درپیش عصر حاضر کا شاید ہی کوئی مسئلہ یا موضوع ہو جو اس کتاب میں زیر بحث نہ ہو، کتاب کیا ہے، علمی اور فقہی جزئیات کے ساتھ حسب موقعہ اصطلاحات والفاظ کا استعمال اس قدر خوبصورت ہے کہ کتاب کسی ادبی شہ پارے سے کم نہیں، حسب موقع اشعار نے اس کے وقار علمی میں مزید اضافہ کر دیا ہے، ”فغان رمضان“ کا اچھوتا عنوان ساحر لدھیانوی کے شعر سے مزین کیا ہے، یہ جس درد کو ظاہر کرتا ہے وہ کسی دردمند سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا:

”کہاں ہیں، کہاں ہیں، محافظ خودی کے   ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں

شریعت، طریقت وتصوف، اقسام بیعت کے تحت جو تربیتی اور اصلاحی انداز اپنایا گیا ہے وہ حقیقت تصوف کو آشکار کرنے کے لئے کافی ہے۔ مزارات پر ہونے والی خرافات کی نشاندہی اور اصلاحی تجاویز کسی نعمت سے کم نہیں ہیں اور فتوی کفر کے اجراء میں احتیاطِ شرعی کے تحت کفر لزومی اور کفر التزامی کی نفیس و دقیق علمی بحث، خصوصاً اخراج عن اہل السنۃ کا اصول موجودہ دور کی فرقہ پرستی کے خاتمے میں بہت مُمِد ثابت ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں مذاہب ونظریات باطلہ کی تردید کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام اور اہل بیت کے مراتب و مقام پر اہلسنّت و جماعت کے موقف کی تشریح کے ساتھ خوارج وتفضیلی نظریات وعقائد کا صریح رد، احقاقِ حق کے تقاضوں کو خوب پورا کر رہا ہے۔ وعظ ونعت خوانی کے ساتھ واعظین ونعت خوان حضرات کے لئے مکمل ضابطہ اخلاق بلکہ ضابطۂ حیات موجود ہے جبکہ منتظمین محافل نعت ذکر کردہ 17 اصلاحات پر عمل کر کے محافل کو قابل رشک وقابل تقلید بلکہ Ideal بنا سکتے ہیں، یہی نہیں نقیبان محفل بھی اپنی اصلاح کے لئے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں، کیونکہ اس میں شاعرانہ اور نقیبانہ بلکہ واعظانہ خرافات کی خوب خبر لینے کے ساتھ اس کی بھرپور اصلاح بھی کی گئی ہے۔

رمضان المبارک میں ”رمضان نشریات“ کا آرٹسٹوں کے ذریعے جس طرح تقدس پامال کیا جاتا ہے، نیز جمعۃ الوداع کی بابت پائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالے اور اصلاح کی تجاویز صرف عوامی نہیں حکومتی اور انتظامی افراد کے لئے کسی دعوت فکر سے کم نہیں۔ تحفظ ناموس رسالت کے عنوان میں بلاگرز اور سوشل میڈیا کی فتنہ انگیزیوں کی نشاندہی حضرت قبلہ مفتی صاحب دامت فیوضہم کے بارے میں اس تاثر عمومی کو مزید پختہ کرتی ہے کہ آپ کی نظر عصر حاضر کی قانونی ترمیمات پر بہت گہری ہے۔

الغرض کتاب اپنی جامعیت اور علمیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اسے ہر سنی خود پڑھے، دوسروں کو پڑھ کر سنائے، اپنے گھر میں اس کتاب کے درس کا اہتمام کرے اور اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ طبع کرا کے ہر طبقے میں تقسیم کرے، تاکہ اس عظیم کام کے اثرات حضور ﷺ کی پوری امت تک پہنچیں۔ حضرت علی بن عثمان المعروف حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ کے وسیلے سے دعا ہے کہ اللہ کریم حضرت قبلہ مفتی صاحب کا سایا اہل سنت و جماعت پر تادیر قائم رہے اور آپ کے فیوضات علمی قیامت تک صدقہ جاریہ کی صورت میں جاری وساری رہیں، آمین۔ فقیر اس کتاب کے عنوانات، مندرجات اور تجاویز کی مکمل تائید کرتا ہے۔

❁

حضرت علامہ صاحبزادہ محمد محب اللہ نوری دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَة

شیخ الحدیث ومہتمم اعلیٰ دارالعلوم حنفیہ فریدیہ، بصیر پور
سجادہ نشین، آستانہ عالیہ نوریہ قادریہ
مدیر اعلیٰ، ماہنامہ نورالحبیب (اوکاڑا)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن! سوادِ اعظم اہل سنت و جماعت سرکار ابد قرار ﷺ، آپ کے صحابہ کبار رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ اور ائمہ مجتہدین رَحِمَھُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے طریقہ پر گامزن چلے آ رہے ہیں، اب کچھ عرصہ سے بعض طبقات کی غفلت، بے علمی یا بدعملی کی بنا پر عقائد و معمولاتِ اہل سنت میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، مستحبات و مستحسنات کو فرض اور واجب کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، بلکہ فرائض اور واجبات و سُنَنِ ھُدیٰ سے لاپرواہی اور بے عملی کو فروغ دیا جا رہا ہے، اندریں حالات اصلاح احوال کی شدید ضرورت ہے۔

حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن دامت برکاتہم العالیہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ''اصلاح عقائد واعمال'' کے نام سے ایک رہنما نصاب مرتب کر دیا ہے، جس میں بگاڑ کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ عقائد واعمال کی صحیح اور حقیقی صورت کو واضح کر دیا ہے۔

اندازِ بیان اصلاحی اور مُدَلَّلْ وَ مُبَرْھَن ہے، احقر کتاب کا بالاستیعاب تو مطالعہ نہیں کر سکا، البتہ اس کے بعض مقامات کا غائرانہ اور اکثر مقامات کا طائرانہ جائزہ لیا ہے، مجھے قوی امید ہے کہ یہ کتاب اصلاح عقائد واعمال کے لیے مفید ثابت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ جلَّ وعلا حضرت مفتی صاحب اور ان کے معاونین و مویدین کی اس کاوش کو شرف قبولیت اور جزائے خیر سے نوازے، آمین بِجَاہِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

حضرت علامہ صاحبزادہ محمد مظہر فرید شاہ زِیْدَ مَجْدُھُمْ

ناظمِ اعلیٰ جامعہ فریدیہ ساہی وال
رکن شعبۂ امتحانات تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کائنات کا جمال۔۔۔۔۔توازن واعتدال

نظام کائنات کا مرکزی نقطہ توازن واعتدال ہے، کسی بھی مقام پر افراط وتفریط ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔ عقائد، اعمال اور اخلاقیات بھی نتیجہ خیز اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ یہ بھی متوازن ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ رات بھر عبادت کرنے، ہمیشہ روزہ رکھنے اور کبھی شادی نہ کرنے کا عہد کرنے والے صحابہ کے رویوں کو غیر متوازن قرار دے کر توازن اختیار کرنے کے لیے حضور ﷺ نے اپنی ذات کو بطور نمونہ پیش فرما دیا۔

عصرِ حاضر میں بھی بعض افراد، جماعتوں، تنظیموں، سیاستدانوں، شاعروں، خطیبوں، ادیبوں، روحانی اداروں، واعظوں، نعت خوانوں، مصنفوں، پرنٹ اور بالخصوص الیکٹرانک میڈیا نے انفرادیت کے اظہار، ناموری اور شہرت، اموال کی جمع آوری اور نمود ونمائش کی خاطر توازن چھوڑ کر افراط وتفریط ہی کو اختیار کر لیا ہے اور بعض سادہ لوح لوگوں نے اسی رویہ کو بغیر کسی حصول ووصول کی خواہش کے بزعم خویش رضائے الٰہی کے لیے اپنی کم علمی اور فکری بے بضاعتی کی وجہ سے بھی اختیار رکھا ہے۔

ایسے حالات میں صحیح کو سقیم سے، کھرے کو کھوٹے سے، مقبول کو مردود سے اور حقیقت کو مجاز سے متمیز اور متشخص کرنا یقیناً احیاء دین کی تحریک کا عظیم حصہ ہے۔ امت مسلمہ کی اصلاح کے لیے کوشش کرنے والے صاحبان ذوق بالخصوص مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن صاحب، حضرت علامہ

مولانا پیر سیّد کرامت حسین شاہ صاحب اور حضرت علامہ مولانا غلام رسول قاسمی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی مساعی جمیلہ کو اللہ جل جلالہ قبول فرمائے اور امت مسلمہ کو تعمیل کی توفیق عطا فرمائے، وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّمَ۔

اساطین واکابر جامعہ قادریہ رضویہ، فیصل آباد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

محترم جناب حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے رفیق کار مفتی وسیم اختر المدنی کی معاونت سے کتاب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' تحریر فرما کر عقائد اہلسنّت کی اصلاح کی اور ان کے معمولات کو غیر شرعی خرافات سے پاک کرنے کی سعی جمیل فرمائی ہے۔ آج کے اس پُرفتن اور پر آشوب دور میں ہر سنجیدہ، باشعور اور ذمہ دار اہلسنّت ایسی اصلاحات کے لیے فکر مند ضرور تھا۔ لیکن کچھ ذاتی مصروفیات اور بعض اپنوں کی شدید مخالفت کے ڈر سے قلم اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے۔ لیکن حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن جیسی عظیم اور ذمہ دار شخصیت نے یہ اہم ذمہ داری نبھائی اور حالات کی نبض پر ہاتھ رکھ کر تمام معمولاتِ اہلسنّت کے لیے اصلاحی تجاویز پیش کیں۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر تمام علماء، واعظین اور خطباء کی ذمہ داری ہے کہ اپنے اپنے حلقہ میں اسے عملی جامہ پہنائیں اور مدرسین اپنے طلبہ کو آگاہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ قبلہ مفتی صاحب، ان کے معاونین اور ہر اس شخص کو جزائے خیر عطا فرمائے، جو اس پر عمل کرے اور دوسروں کو اس پر عمل کی دعوت دے۔

دستخط کنندگان:

استاذ الحدیث والتخصص حضرت علامہ اعجاز احمد القادری دَامَتْ بَرَکَاتُھُم الْعَالِیَہ
شیخ الحدیث والفقہ حضرت علامہ وارث علی دَامَتْ بَرَکَاتُھُم الْعَالِیَہ
استاذ الحدیث والتخصص حضرت علامہ غلام مصطفی بندیالوی دَامَتْ بَرَکَاتُھُم الْعَالِیَہ
حضرت علامہ مفتی عزیز احمد القادری دَامَتْ بَرَکَاتُھُم الْعَالِیَہ
حضرت علامہ مفتی محمد غلام رسول القادری دَامَتْ بَرَکَاتُھُم الْعَالِیَہ
رئیس المدرسین حضرت علامہ مولانا عبد الرشید سعیدی زِیْدَ مَجْدُھُم
مدرسِ اعلیٰ حضرت علامہ محمد رضوان علی رزاقی زِیْدَ مَجْدُھُم

استاذ الاساتذہ حضرت علامہ سیّد ضیاء الحق سلطانپوری دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ الْعَالِیَۃ
مہتمم وشیخ الحدیث
جامعہ ضیاء العلوم، مولوی محلہ صدر، راولپنڈی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مجھے آپ کی جانب سے ای۔میل کے ذریعہ ایک تحریر بعنوان ''اصلاح عقائد واعمال'' ملی، جسے میں نے پہلی فرصت میں حرف بحرف پڑھا ہے۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت تا قیامت رکھے، آپ کی اس کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، یہ قدم جو آپ نے اٹھایا ہے اس سے گم گشتہ راہ، راہِ ہدایت پر آجائیں گے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔نیز بعض مسائل ایسے بھی ہیں جس بارے ہمارے مسلک سنی حنفی بریلوی میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، ان کے لیے بھی اتفاق کا سبب بنے گا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے، انہیں بروئے کار لا کر امت مسلمہ کی رہنمائی فرماتے رہا کریں۔

استاذ الاساتذہ علامہ پروفیسر ڈاکٹر مفتی محمد ظفر اقبال جلالی زِیْدَ مَجْدُھُمْ
پرنسپل وشیخ الحدیث جامعہ اسلام آباد
اسلام آباد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کلماتِ تحسین

مفتیٔ اعظم پاکستان، بین الاقوامی شہرت یافتہ اسکالر، ممتاز دانشور حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن صاحب اطال اللہ عمرہٗ کی پروقار شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔آپ ایک جہاندیدہ، بیدار مغز فقیہ اور ثقہ مفتی ہیں۔آپ گوناگوں اوصاف وکمالات کے جامع ہیں۔ پاکیزہ فکر، طہارت عمل اور اصابت رائے آپ کا امتیازی جوہر ہے۔ متانت، سنجیدگی، حلم وبردباری، تقویٰ وطہارت اور اعلیٰ ظرفی دیکھ کر سلف صالحین کی پُرخلوص زندگی ذہن وفکر میں گردش کرنے لگتی ہے۔دعوت وارشاد، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، افتاء وقضاء میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔آپ کی ذات والا صفات علم وعمل، تصلب واعتدال، حکمت ودانائی، دل جوئی ودل آسائی، سادگی وتوکل، خوش گمانی وخوش بیانی کا ایسا نورانی امتزاج ہے جو خود ان کو روشن رکھتا ہے اور ان سے ملنے والوں کو بھی پُرنور کردیتا ہے۔جب آپ کا اسم گرامی زبان پر آتا ہے تو آپ کی صورت خوشبو بن کر دل ودماغ کو معطر کردیتی ہے۔جیسے آپ کا نام ثقاہت واعتماد کا حوالہ ہے، ایسے ہی آپ کا کام بھی قابل اعتماد اور قابلِ فخر ہے۔

آپ نے دنیا بھر میں تبلیغی دورے کیے اور دنیا کے کونے کونے میں دین متین کی خدمت کے لیے صدائے حق بلند کی۔ درس وتدریس، وعظ ونصیحت کے ذریعے علم کے نور سے ایک عالم کو روشن کیا۔آپ نے مختلف علمی وتحقیقی محافل

ومجالس میں دین اسلام کی اصلی صورت کوعیاں کیا۔الغرض آپ نے ہرفورم اور ہر سطح پر اہل سنت و جماعت کے عقائدونظریات اورمعمولات کی ترجمانی کی۔

آپ کا اندازِ تحریر خوب ہے،جس میں شگفتہ بیانی،تسلسل عبارت کا عنصر پنہاں ہے اورآپ کی زبان بھی شستہ اور عام فہم ہے جس کی جھلک آپ کی تصانیف سے بخوبی عیاں ہوتی ہے۔مسلک اہلسنّت و جماعت کے عقائدواعمال میں افراط وتفریط کودیکھ کر دل بہت کڑھتا تھا اوراہلسنّت کی عقائدواعمال کے لحاظ سے موجودہ بگڑتی صورتحال کودیکھ کر دل خون کے آنسو روتا تھا اورضرورت تھی کہ کوئی مستند عالم دین، صائب الرائے مفتی، اہلسنّت و جماعت کی اس صورت حال کو بے نقاب کرے اوراعتقادی غلطیوں اورعملی خامیوں کی اصلاح کے لیے مقدور بھر کوشش کرے۔

جب جلیل القدر فاضل محتشم حضرت صاحبزادہ غلام مرتضیٰ ہزاروی زیدشرفہ ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ شیخوپورہ کی وساطت سے آپ کی حقائق سے لبریز،فکر انگیز تالیف''اصلاح عقائدواعمال'' توثیق وتائید کے لیے موصول ہوئی تو اسے دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ ماشاء اللہ مستند دلائل و براہین سے مرصع ومزین ہے۔قبلہ مفتی صاحب نے عصر حاضر کی ضرورت کومحسوس کرتے ہوئے اہلسنّت و جماعت میں پائے جانے والے امراض کی شناخت کی اوراس کا حل بھی پیش کیا جو یقیناً آپ کی دردمندانہ سوچ وفکر کی عکاسی کرتا ہے اور یہ کہنا بے جانہیں ہے کہ قبلہ مفتی صاحب کی یہ کاوش دورحاضر کی ضرورتوں اورشرعی تقاضوں کے عین مطابق ہے جوآپ کی صحت مندفکراور پرخلوص عمل کا نتیجہ ہے اوراس تحریر کودیکھ کرسلف صالحین کے احقاق حق کا جذبہ اورابطال باطل کی ہمت وجرأت کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔گویا کہ آپ نے مختصر مگر جامع، مدلل اور واضح انداز میں امت مسلمہ کوعقائدواعمال کے لحاظ سے درپیش

مسائل کا ادراک کرتے ہوئے حل پیش کیا ہے۔

زیرنظر کتاب''اصلاحِ عقائدواعمال'' میں آپ نے مختلف عنوانات پر سیر حاصل بحث کی۔افضلیت حضرت سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت سیّدنا امیر معاویہ کے حوالے سے عقائد میں بگڑتی سوچ،تکفیر کے معاملے میں راہِ اعتدال سے انحراف،میلادالنبی ﷺ کی محافل وجلوس میں خرافات اوراعراس مقدسہ میں غیر شرعی رسوم،تحفظ ناموس رسالت جیسے اہم فریضہ کے معاملے میں امت مسلمہ کی سستی وغفلت،منبرومحراب پر براجمان کچھ جاہل خطباء کی طرف سے منبرومحراب کے تقدس وحرمت کو پامال کرنا، رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں میڈیا پر اینکر پرسن اور اداکاروں کا دین کی من گھڑت تشریح کرنا وغیرہم جیسی خرافات کی آپ نے نشاندہی بھی کی اوراصلاحی ہدایات بھی بیان کی ہیں۔

ان علمی وتحقیقی مسائل پر تحقیق پیش کرنے پر محترم مفتی صاحب کوجس قدر خراج تحسین پیش کیا جائے،کم ہے۔بلامبالغہ آپ کی تصنیف نے دورحاضر کی ایک بہت بڑی علمی واصلاحی ضرورت کو پورا کیا ہے۔یہ کتاب ہرعام وخاص کی ضرورت ہے،لہٰذا ہر مکتبہ اورلائبریری کی زینت ہونی چاہیے،مساجد کے ائمہ وخطباء، مدارس کے اساتذہ وطلبہ اور ہر مسلمان کواس کتاب سے استفادہ کرنا چاہیے۔

دعاگوہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعمل اورتقریروتحریر اورخدمت دین میں مزید خلوص وبرکت عطا فرمائے اور پروردگار عالم مفتی صاحب کی اس کاوش کو قبول فرماتے ہوئے اس کتاب کوقبولیت عام بخشے اورقبلہ مفتی صاحب کواس کارِ خیر پر اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مفتی محمد سلیمان رضوی چشتی دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ
شیخ الحدیث، دارالعلوم انوارِ رضا، راولپنڈی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بدایۃً علم خِلقتِ انسان کے ساتھ وصفِ لازم بلکہ راجح ہے، آدم علیہ السلام کے پیدا ہوتے ہی ان کو علم عطا کردیا گیا۔ جوں جوں افرادِ انسان بڑھے، تقاضاہائے علم بڑھتے گئے اور علوم کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ انہیں اگر تقسیم اُولیٰ میں دوحصوں پر تقسیم کیا جائے تو منقولات اور معقولات کہلائیں گے، جب کہ ان میں ترجیح منقولات کو ہے، اس لیے کہ یہ دنیا میں دخیلِ کامیابی ہیں اور بنیادی وجہِ ترجیح منقولات کی ہے کہ وہ موقوف علی النقل ہیں، ان کا بنیادی مآخذ قرآن مجید ہے اور اس کے ساتھ ہی حدیث رسول ﷺ اور بعدہٗ مجتہدین، فقہاء، مستنبطین ہیں۔ اس طرح ضرورت لازم بنے کہ ان کے بغیر زندگی محال قرار پائی۔

ان سے ماخوذ علم کئی شعبوں میں تقسیم، تقریر وتحریر ان میں نمایاں ہیں، حتیٰ کہ اہل علم نے علم کی انواع واجناس، فرائض وواجبات، مستحبات ومستحسنات کو نیز قرطاس پر جگہ دی کہ فرائض وواجبات کے ساتھ مستحسنات کو نہ صرف شامل کیا بلکہ یوں ترجیح دی جانے لگی کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے کثرتِ ثواب یقینی ہے، جو سبب نجات بن سکتا ہے۔

تاآنکہ کرم فرماؤں نے بجائے خودی کے خودنمائی کو ترجیح دی۔ اُمور مستحبہ کے بجالانے بشمول اس غلطی کے کہ فرائض وواجبات کو نظر انداز کرکے ریاکاری پر مبنی مستحبات کو ترجیح اس تزویر میں دی کہ اصل عبادات اور بنیادی علمی ضروریات اور عملی اقدامات وتقاضے معدوم ہونے لگے، حتیٰ کہ ہمارے احباب نے بھی ان ہی نقصان دہ

پہلوؤں کو اپنایا اور قوم کو حقیقی عملی اور علمی ضروریات سے دور رکھا۔ اب اس خرابی نے تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کو نظر انداز کرکے ایسے معمولات میں مخمور کردیا کہ اہل سنت، تصنیف وتالیف اور تعلیم وتعلم اور درس وتدریس سے محروم ہونے لگے بلکہ مکمل دور ہوچکے ہیں۔

حتیٰ کہ نباضِ ملت اسلامیہ حضرت العلام مولانا مفتی منیب الرحمن صاحب نے اس خامی کو نہ یہ کہ محسوس کیا بلکہ اصلاحِ امت کی راہ متعین کرتے ہوئے اس کے متبادل نظام پیش کیا کہ ہمیں ان ریاکاری کے اعمال سے قدرے دوررہ کر امت کی حقیقی اصلاح کرنی ہے اور یہ بوجھ اہل علم، صاحبان طریقت نے اٹھانا ہے، اس تفصیل سے اس غلطی اور کمزوری کا حل پیش کیا ہے کہ شاید وباید۔

امید کی جانی چاہیے کہ تمام علماء اہل سنت اور مشائخ اہل سنت ان کی اس عنوان پر لکھی تحریر الموسوم ''اصلاح عقائدواعمال'' پر عمل پیرا ہوں گے تاکہ اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو اور اس میں درجِ اصلاح احوال کے ارشادات کو اپنایا جائے اور ہر ذمہ دار شخصیت اپنے اپنے حلقہ میں اس پر خود بھی عمل پیرا ہو اور اپنے منتسبین، متعلقین، متوسلین کو اس کتاب پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرے۔ یوں اصلاح عقائدواعمال کا پہلو اتنا اجاگر ہو کہ باقی احباب بھی اس کو اپنے لیے رشدوہدایت کی راہ قراردیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب قبلہ کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔ تمام مسلمانوں کو اس متعین کردہ راہ پر چلنے کی توفیق بالعموم اور اہل سنت کو بالخصوص عطاء فرمائے، (آمین ثم آمین)، ایں دعاء ازمن واز جملہ جہاں آمین باد۔

❁

استاذ العلماء حضرت علامہ محمد یعقوب ہزاروی دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ الْعَالِیَۃ

شیخ الحدیث جامعہ رضویہ ضیاء العلوم

ڈی بلاک، سٹیلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

فقیر پر تقصیر غَفَرَلَہٗ رَبُّہُ الْقَدِیْر نے رسالہ مبارکہ ''اصلاح عقائدواعمال'' تصنیف لطیف حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن اَدَامَ اللّٰہُ تَعَالٰی فُیُوْضَاتِہِمْ کا مطالعہ کیا ہے، ماشاء اللہ بہت عمدہ اور بہتر ہے اور جس قدر انہوں نے تحقیق فرمائی قابل تحسین ہے۔ یہ رسالہ مسائل صحیحہ مُحَقَّقَہْ مُنَقَّحَہ پر مشتمل ہے۔ اس وقت ایسے مسائل بیان کرنے کی بہت ضرورت تھی کہ عوام صحیح مسائل پائیں اور گمراہی سے بچیں۔

اللہ تعالیٰ مؤلف کو اس سعی جمیل کی جزاء جزیل عطا فرمائے۔ اس رسالہ کو اہلسنّت میں شائع ومعمول اور دنیا وآخرت میں نافع ومقبول فرمائے۔

(آمین بجاہ طٰہٰ ویٰسین) وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَحِزْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

❁

استاذ العلماء حضرت علامہ عبدالرزاق بھترالوی حطاروی دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ الْعَالِیَۃ

مہتمم وشیخ الحدیث دار العلوم جماعتیہ مھریہ، راولپنڈی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْغَفَّارُ وَالصَّلٰوۃُ عَلَی النَّبِیِ الْمُخْتَارُ وَصَحَابَتِہِ الْاَخْیَارُ وَآلِہِ الْاَطْھَار اَمَّا بَعْدُ! قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ''وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ -

ترجمہ کنز الایمان: ''اورتم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے کہ بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی بات کا حکم دیں اور بری سے منع کریں اور یہی لوگ مراد کو پہنچے''

(آل عمران: 104)

رَب تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اچھی باتوں کے حکم اور برائی سے روکنے کا کام خود مصطفی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ نے مستحسن طریقے سے اسے سرانجام دیا۔ پھر یہی کام علماء نے شروع فرمایا اور آج تک نبھا رہے ہیں اور قیامت تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ حق بات کہنے والے علماء کو معرض وجود میں لاتا رہے گا۔

یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر وباہر ہے کہ حق بات کہی جائے، جو مدلّل ہو، لایعنی خرافات نہ ہوں۔ عقائد واعمال، ذکرواذکار، خطابات وتقریر میں غُلُوّ اور حد سے تجاوز نے معاشرے کی اصلاح کی بجائے بگاڑ پیدا کیا۔

حضرت علامہ مفکر اسلام مدبر احوال مفتی اعظم مولانا منیب الرحمن مُدَّظِلُّہُ الْعَالِیْ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ رؤیت ہلال کمیٹی کے چیئرمین ہونے کی حیثیت سے آپ نے جس ذمہ داری کو نبھایا اور نبھا رہے ہیں اس کی تحسین وتوصیف ہر ذی شعور نے کی، بلکہ ضروری ہے زیادہ سے زیادہ اس کی تحسین وتوصیف کی جائے۔ چاند کے اعلان پر آپ کے کلمات طیبات سن کر ہی سمجھ لیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی کمال

عطا فرمایا اور آپ کے فتاویٰ کو روزنامہ جنگ کے جمعہ ایڈیشن میں محبت سے پڑھتا ہوں ،آپ زیادہ تر فتاویٰ رضویہ سے استدلال کرتے ہیں ۔مُدَلَّل طریقے سے حق بیان کرنا آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔

میلادالنبی ﷺ کے جلوس کے متعلق غُلُوّ کے خلاف روزنامہ جنگ میں آپ کے مطبوعہ فتویٰ کو میں اپنی تصنیف ”نجوم القرآن“ میں شامل کر چکا ہوں ۔مفتی صاحب نے اصلاح وعقائد واعمال کتاب تحریر کرکے احسانِ عظیم فرمایا۔ایک ایک مضمون میرے دل کی آرزو ہے، میرے دل کا سرور اورروح کا چین ہے، بلکہ ہر منصف مزاج اورراہِ حق پر قائم شخص کے دل کی آرزو ہے ۔نعت خوانی اچھا کام ،لیکن نعت خوانوں کی تصاویر والے اشتہار براعمل ہے۔نعت خوانی جہاں قابل تعریف ہے وہاں نعت خوانوں کا پیسے مقرر کرنا قابل مذمت ہے۔نعت خوانی قابل تحسین ہے،لیکن نمازوں کا ضیاع قابلِ مذمت ہے ۔پھر عقائدِ اہلسنّت کے خلاف جاہلانہ غلو والے اشعار قابلِ مذمت ہیں۔

تقاریر وخطابات اگر قرآن وحدیث اور صالحین صادقہ کے مصلحانہ اقوال پر مشتمل ہوں ،تو یقینا اصلاحِ عقائد واعمال کا ذریعہ ہیں۔لیکن موضوع روایات اور باطل اقوال پر مشتمل تقاریر وخطابات عقائد بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں ۔تقاریر میں جب نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سنت پر عمل ہو تو وہی شریعت میں مقبول ہیں، ورنہ مردود ہیں۔تقاریر میں ضرورت پڑنے پر ایک انگلی سے اشارہ کرنے پر اکتفا ہو تو مسنون ہے،مقرر کبھی اٹھے،کبھی بیٹھے،کبھی میز پر مکے مارے،کبھی ادھر منہ بنائے،کبھی ادھر،کبھی اپنی پگڑی گرائے،کبھی بال بکھیرے اس سے تو بھانڈ مراثی اچھے ہیں،ان کا کام ہی ڈرامے بازی ہے۔دین کے مُبلِّغ جب ڈرامہ باز بن جائیں،تو پھر وہ یقینا مُخرِّبِ عقائد واعمال ہیں۔

مقرر ومبلغ جب اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے تقریر کرے، بلانے والے ان کی حوصلہ افزائی کے لئے اس کی معاونت اپنی خوشی سے کریں تو وہ درست ہے،لیکن پیسے مقرر کرکے مبلغ کا جانا اور گویّے (مقرر) کو پیسے مقرر کرکے بلانا دونوں ہی قابل مذمت ہیں ۔آج کل مقررین اور نعت خوانوں کا پیسے مقرر کرکے جانا اور محافل نعت کے منتظمین کا ہزاروں روپے مقرر کرکے انہیں بلانا دین اسلام کی توہین اور شریعتِ مصطفوی ﷺ سے بغاوت ہے ۔ان کے مقاصد دین اسلام کی اشاعت وترویج تو ہو نہیں سکتے ،معلوم نہیں درپردہ مقاصد کیا ہیں؟۔خانقاہی نظام اور دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کا مَنہَج جب تک صحیح نہیں ہوگا،تو مثبت نتائج نہیں نکلیں گے۔

نقابت کا ایک پیشے کی صورت اختیار کرنا ایک بدعت ہے، بہروپیے نقیب جو وقت ضائع کرتے ہیں،اگر وہ وقت کسی محقق عالم دین کو دیں تو لوگوں کو مسائل کا پتا چلے۔صرف گانے کی طرز پر نعتیں وتقاریر اور وقت کے ضیاع کا سبب بننے والی نقابت پر مشتمل محافل میں جانے کی بجائے اللہ اللہ کرنا اور گوشہ نشینی بہتر ہے۔

کاش کہ اہلسنّت کو صحیح مدارس قائم کرنے کے فوائد سمجھ آئیں اور اپنے صدقاتِ جاریہ کا پیسہ ان پر خرچ کریں۔دینی مدارس کا ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا کہاں کا انصاف ہے؟، اللہ کرے ہر پاکستانی کو سمجھ آجائے کہ ملک کیوں ٹوٹا اور یہود ونصاریٰ کے عزائم کیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کی حفاظت فرمائے ۔تفضیلیوں نے اہلسنّت کے اتحاد کو افتراق میں بدل دیا ہے،راقم نے بھی اپنی کتابوں ”نجوم التحقیق“ اور ”جواہر التحقیق“ میں احقاقِ حق کر دیا ہے ۔محترم منیب الرحمن مدظلہُ العالی نے ایک ایک مسئلہ کو مُدَلَّل اور مُحَقَّق بیان کرکے اپنے عہد کے علماء کا فرضِ کفایہ ادا کیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور علماء کو اس پیغام کو عام کرنے کی جرأت اور سعادت وتوفیق عطا فرمائے،آمین۔

پیرطریقت حضرت علامہ صاحبزادہ خواجہ محمد حسن باروی دَامَتْ بَرَکَاتُهُمُ الْعَالِيَة
سجادہ نشین آستانہ عالیہ پیر بارو شریف، فتح پور، لیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بوئے گل، نالہ دل

مفکر اسلام، نباض وقت، مفتی اعظم علامہ پروفیسر مفتی منیب الرحمن دَامَتْ بَرَکَاتُهُمُ الْعَالِيَةُ وَ اَدَامَ اللّٰهُ فُيُوْضَهٗ بلاشبہ عصر حاضر کے ایک عظیم فقیہ، جید عالم دین، سچے عاشق رسول اور سواد اعظم مسلک اہلسنّت و جماعت کے حقیقی رہنما اور ترجمان ہیں۔ اعلیٰ حضرت اسی سواد اعظم کے قائد ہیں، برصغیر پاک و ہند سمیت پوری ملت اسلامیہ انہیں اپنا قائد اور روحانی پیشوا مانتی ہے۔

مخالفین اہلسنّت آج اپنے اوچھے ہتھکنڈوں اور طاغوتی قوتوں کے بل بوتے پر سواد اعظم کو بریلوی کہہ کر ایک مسلکی برانڈ کا تاثر قائم کر کے عالمی سطح پر اَہلُ السّنّة والجماعة سے الگ کرنے کی شعوری سازش کر رہے ہیں اور کسی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے، مگر اس میں اپنوں کی مہربانیوں کا بھی دخل ہے، حالانکہ اعلیٰ حضرت تو اہلسنّت کے مسلّمہ امام تھے، آپ امام اعظم سیّدنا ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مقلد اور سلسلۂ طریقت میں قادری تھے۔ آپ کو اپنے مولد کی نسبت سے بریلوی کہا جاتا ہے۔

اس تناظر میں ایسے حضرات کا وجود غنیمت اور اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے، جو عہدِ حاضر میں اہلسنّت کو صحیح سمت لے جا رہے ہیں، علامہ اقبال نے کہا تھا:

بھٹکے ہوئے آہو کو، پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو، پھر وسعتِ صحرا دے

ان میں سرفہرست حضرت قبلہ مفتی صاحب ہیں، جن کی زندگی کا ہر لمحہ دینِ اسلام کی خدمت کے لیے وقف ہے، ان کا مشن کوئی نیا نہیں بلکہ سَلَف صالحین کے مشن کی تجدید ہے، آپ کی فکر قرآن وسنت اور شِعارِ اَسلاف کے تابع ہے، یہ المیہ ہے کہ ہر دور میں مصلحین کی راہ میں روڑے اٹکائے گئے ہیں اور مفتی صاحب کو یہ کانٹے چننے پڑ رہے ہیں اور کسی کی ملامت کی پرواہ کیے بغیر اپنے مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں، وہ علامہ اقبال کے ان اشعار کی تصویر ہیں:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَهُ اللّٰهُ تعالیٰ نے کہا تھا:

نہ مرا نوش زتحسیں ،نہ مرا نیش زطعن
نہ مرا گوش بمدحے ،نہ مرا ہوشِ ذمے
منم وکُنجِ خمولے کہ نہ گنجد دروے
جز مَن و چند کتابے و دوات و قلمے

انہوں نے دینی، اخلاقی، معاشرتی معاملات کی اصلاح اور بدعات کے خاتمے کے لیے اپنے قلم اور زبان کا بھرپور استعمال کیا اور آج کے اس پرفتن دور میں فسق وفجور اور بدعات ومنکرات کے رد میں زبانی اور قلمی جہاد کی ایک نئی مثال قائم کی۔ وہ امور جو فی الواقع بدعت ہیں یا جنہیں دینی شعار کی مخالفت کا ادنیٰ شائبہ بھی ہے، خواہ وہ ہماری عملی زندگی میں ہوں، مساجد وخانقاہوں میں ہوں اور عوام الناس جہالت کی بنا پر اسے ثواب سمجھ کر کر رہے ہوں، مفتی صاحب نے ان کے بارے میں صدائے حق

بلندفرمائی اورکلمۂ حق کہنے میں اپنے اور بیگانے میں تمیز رَوانہیں رکھی ۔انہوں نے ہر مقام پرقلم وزبان سے مدرسہ وخانقاہ کی حرمت کی پاسداری کی ۔زیرِنظرکتاب ''اصلاحِ عقائدواعمال'' اسی تناظر میں لکھی گئی ہے، جو ہمارے لیے نعمت غیرمترقبہ ہے۔

مجھے عزیز القدر مولانا غلام مرتضیٰ اعظمی کی وساطت سے مفتی صاحب کا حکم ملا کہ میں اس کتاب پر اپنے تاثرات لکھوں ،حالتِ سفر میں ، میں اس کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کرسکا،لیکن چیدہ چیدہ مقامات کو دیکھا اور ہرمسئلے کو قرآن وحدیث ،سلف صالحین اور امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالیٰ کے حوالہ جات سے مزیّن پایا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ہمارے مشائخ طریقت،نوجوان علماء وخطباء اور دین سے محبت رکھنے والے ہرفرد کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوگی ۔ میں اس کتاب کے تمام مندرجات کی مکمل تائید اور توثیق کرتا ہوں اور اہلِ خیر سے اپیل کرتا ہوں کہ اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اور ابلاغ کا اہتمام فرمائیں۔

ہمارے آستانے سے مجلّہ ''الفقیر'' کے مدیرمحترم علامہ طاہرعزیز باروی زیدمجدہٗ وقتاً فوقتاً مفتی صاحب کی قلمی نگارشات کو اس مجلّے میں شائع کرتے رہتے ہیں اور میں ان سے کہوں گا کہ اس کتاب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کے اہم مضامین کو ماہنامہ ''الفقیر'' میں شائع کرتے رہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھاسکیں۔

میری خواہش ہے کہ اصلاح کے سلسلے کو جاری رکھا جائے اور اس کتاب کے مزید حصے بھی آئیں تاکہ اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کا فریضہ بکمال وتمام ادا ہو اور سب پر اللہ کی حجت قائم ہو۔اللہ کریم حضرت قبلہ مفتی صاحب کا سایا ہم پہ قائم رکھے اور ہمیں قرآن وحدیث کی تعلیمات مقدسہ کی روشنی میں زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے ،آمِیْن بِجَاہِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۔

دعوت بالحکمہ وموعظۂ حسنہ کے مثیل مجسم

حضرت علامہ پیرزادہ محمد رضا ثاقب مصطفائی دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ الْعَالِیَۃ

امیرِ اعلیٰ ،ادارۃ المصطفیٰ انٹرنیشنل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قبلہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب کا قیمتی وجود اس عہدِ زبوں کے لیے سرمایۂ افتخار اور نادرِ روزگار ہے۔آپ کے علمی وفکری خطابات اور مختلف رسائل وجرائد میں چھپنے والی منزل نواز تحریریں امت کی صحیح رہنمائی کا موثر ذریعہ ہیں۔اہلسنّت وجماعت میں درآنے والی خرافات اور ان کے تدارک کے لیے آپ کی جرأت رِندانہ اور کاوشیں قابلِ ستائش ہی نہیں قابلِ تقلید بھی ہیں۔یہی اہلسنّت وجماعت اور اسلام کی حقیقی شناخت اور روشن چہرہ ہے، جسے بعض لوگوں کی جہالت، ہٹ دھرمی ،افتادِطبع اور سطحی مفادات نے دھندلا کر رکھ دیا ہے۔

مفتی صاحب نے ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کے ذریعے اسلام کا اصلی روپ اور حقیقی چہرہ اجال دیا اور جُہلاء وسُفَہاء کی جانب سے ڈالی گئی دھول ہٹا کر مسلک کی حقیقی تصویر واضح کردی ہے تاکہ سب پر حجت قائم ہوجائے کہ ہمارے عقائد وہ نہیں ہیں جو بے دین ملنگوں، جاہل پیروں اور وعظ فروش مولویوں کے کردار وعمل سے ظاہر ہورہے ہیں، بلکہ ہمارے عقائد واعمال قرآن وحدیث کی تعلیمات کا عکسِ جمیل ہیں۔اپنے حصے کا کام سرخروئی کی ضمانت ہے جو ہمارے ممدوح کرگزرے۔دریں حالات یہ راستہ اگرچہ بہت پیچیدہ، کٹھن اور حوصلہ فرسا تھا،لیکن:

آئین جواں مرداں حق گوئی وبے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اب اس کی اشاعت وترسیل ہماری دینی ومسلکی ذمہ داری ہے۔ میرے خیال میں اس کتاب کومختلف زبانوں میں منتقل کر کے پوری دنیا تک پہنچانا وقت کی اشد ضرورت بھی ہے اور ہمارے لیے وسیلۂ سعادت بھی۔ ہمارے فکری مخالفین کو ہمارا حقیقی چہرہ اس آئینے میں دیکھنے کی توفیق ملے تو زبانِ طعن زہرا گلنے کی بجائے غلط فہمی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجائے گی۔ اللہ جلّ شانہٗ اس کتاب کو امت کے لیے نافع بنائے اور مفتی صاحب قبلہ کو عمرِ خضر نصیب کرے، حیاتِ جاودانش دہ کہ حسنِ جاوداں دارد۔

❁

حضرت علامہ حافظ محمد رمضان اویسی زِیْدَ مَجْدُھُمْ
ناظم اعلیٰ جامعہ ریاض المدینہ
جی ٹی روڈ، گوجرانوالہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

مفتی اعظم پاکستان جناب علامہ منیب الرحمٰن کی کتاب ''اصلاحِ عقائدواعمال'' کو چیدہ چیدہ مقامات سے پڑھنے کا موقع میسر آیا جو ہمارے لیے ایک سعادت ہے۔

مسلک حق اہلسنّت وجماعت کا مصداق جو صحابۂ کرام، تابعین کرام، تبع تابعین، ائمۂ مجتہدین اور سلفِ صالحین کے شعارِ حق وصداقت اور سوادِ اعظم کا جادۂ مستقیم ہے، مفتی صاحب ہمارے مسلک کے حقیقی ترجمان ہیں، انہوں نے اسے خرافات کی میل جھاڑ کر اپنی اصل شکل میں پیش کیا ہے اور تمام علماء کی جانب سے ذمے داری کو نبھایا ہے۔

''اصلاحِ عقائدواعمال'' پڑھنے کے بعد بے ساختہ دل کی گہرائیوں سے ان کے حق میں دعائے خیر زبان پر آتی ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ انہیں اسی طرح احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں سرخرو رکھے، آمین۔

❁

حضرت علامہ محمد احسان اللہ نقشبندی زِیْدَ مَجْدُھُمْ

مدرس ومفتی، جامعہ مدینۃ العلوم، گوجرانوالہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، اَمَّا بَعْدُ!

مفتی شہیر مولانا منیب الرحمٰن صاحب دامَ ظِلُّہٗ کی مختصر کتاب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کے اکثر حصے کے مطالعے سے مشرّف ہوا، اسے دلائل وبراہین سے مزیّن ومُبَرہَن اور مسلکِ حق اہلسنّت والجماعت کے موقف کے عین مطابق پایا۔ خاص طور پر قرآن وسنت کے دلائل کے ساتھ ساتھ اکثر مسائل میں فتاویٰ رضویہ اور امام اہلِ السنّۃ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کی دیگر کتب سے اپنے موقف پر تائیدی حوالہ جات پیش کرنا، کتابِ مذکور کی صحت کی بیّن دلیل ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر علمائے حق کی امتیازی شان ہے۔ الحمد للہ! مفتی صاحب دامَ ظِلّہٗ نے اس معاملے میں اچھی پیش رفت فرمائی ہے۔ مولیٰ کریم ان کی سعیِ جلیلہ کو بارآور فرمائے اور اس کتاب کو سرگردان ہائے بادیۂ ضلالت کے لیے وسیلۂ ہدایت بنائے، آمین۔

تائید:

مفتی احسان اللہ صاحب نے کتاب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کا جامع تعارف لکھ دیا ہے، میں اس سے کلی طور پر متفق ہوں، اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو دارین کی سعادتیں عطا فرمائے، جنہوں نے وقت کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

حضرت علامہ قاری اکرام اللہ مجددی زِیْدَ مَجْدُھُمْ

ناظم، جامعہ مدینۃ العلوم، گوجرانوالہ

حضرت علامہ سجاد حسین حنیف محمدی دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ

جامعہ ریاض الاسلام، گوجرانوالہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مفتی منیب الرحمٰن صاحب کی شائع کردہ کتاب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کا چند مقامات سے مطالعے کا شرف حاصل ہوا، جس سے پتا چلا کہ آپ نے مرض کی تشخیص کے ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی بتایا ہے۔ اس کتاب میں مفتی صاحب نے جن عقائد واعمال کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے، موجودہ دور میں اس کی سب سے بڑی ضرورت تھی، اس پر عمل پیرا ہوکر ہم روشن زندگی کی طرف پلٹتے ہیں۔ مفتی صاحب مسلکِ حق اہلسنّت وجماعت کے ترجمان ہیں، ان کا اندازِ بیان مدلّل اور آسان ہے، اس سے ہر کوئی فیض یاب ہوسکتا ہے۔ اس کتاب میں صرف خرافات کی نشاندہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ عقائد واعمال کی صحیح اور حقیقی صورت کو بھی واضح کیا ہے۔

اہلسنّت میں نفوذ کرنے والی خرابیوں کا سبب دین کا لبادہ اوڑھنے والے بے عمل خطیب، پیشہ ور نعت خوان اور مذہب سے بےزار دانشور ہیں، کسی نے سچ کہا ہے:

تو اِدھر اُدھر کی نہ بات کر، یہ بتا کہ قافلہ کیوں لٹا
مجھے رہزنوں سے گلہ نہیں، تیری رہبری کا سوال ہے

مفتی صاحب نے رہزنوں سے مسلک کے روشن چہرے کو بچانے کے لیے رہبری کا حق ادا کیا ہے، دعا ہے اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب اور ان کے رُفقاء کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اُن کی اس سعیِ جمیل کو ماجور فرمائے اور قبولِ عام عطا فرمائے، آمین۔

❁

حضرت علامہ حافظ محمد اشرف سعیدی دَامَتْ بَرَکَاتُهُمُ الْعَالِیَة

ناظم اعلیٰ دارالعلوم جامعہ غوثیہ (عیدگاہ) پتوکی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ، اَمَّا بَعْدُ!

بخدمت اقدس حضرت قبلہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب حَفِظَکُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی مِنْ کُلِّ سُوْءٍ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

محترم جناب علامہ غلام مرتضیٰ صاحب زیدمجدہ نے آپ کی تالیف ''اصلاحِ عقائد واعمال'' سے شادکام فرمایا اور اسے پڑھ کر اپنے تاثرات کے اظہار کی ترغیب دلائی، حالانکہ میں اس قابل نہیں ہوں۔

اہلسنّت میں دخیل خرافات کے تدارک کے لیے جناب کی کتاب ایک قابلِ ستائش عمل ہے۔ بلاشبہ یہ عظیم کوشش ہے جو عظیم شخصیت سے صادر ہوئی ہے۔ سرورِ عالم ﷺ کی ہر سنت اپنے اندر برکتوں کا سمندر رکھتی ہے۔ میں آپ کو رسول اللہ ﷺ کی اس سنت: ''مُتَوَاصِلُ الْاَحْزَانِ، دَائِمُ الْفِکْرَةِ، لَیْسَتْ لَهٗ رَاحَةٌ، طَوِیْلُ السَّکْتِ، لَایَتَکَلَّمُ فِیْ غَیْرِ حَاجَةٍ'' کا مصداق سمجھتا ہوں۔

ایسے رہنماؤں کا دست وبازو بننا سب کے لیے باعث شرف ہے اور آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنا نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا وآخرت میں مزید عزتوں سے نوازے، آمین بجاہ سیّد المرسلین ﷺ

استاذ العلماء حضرت علامہ حافظ بشیر احمد فردوسی گولڑوی دَامَتْ بَرَکَاتُهُمُ الْعَالِیَة

مہتمم وشیخ الحدیث، جامعۃ الفردوس، حاصل پور، ضلع بہاولپور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دردِ دل رکھنے والے پیرِ طریقت صاحبزادہ سیّد خلیل الرحمٰن شاہ صاحب زیدمجدہٗ نے اتوار 10 ستمبر 2017ء جامعہ غوثیہ حنفیہ عارف والا میں عظیم الشان ''تاجدارِ ختمِ نبوّت کانفرنس'' منعقد کی۔ اُس میں خصوصی طور پر مفکرِ اسلام، نبّاضِ قوم حضرت العلاّم مفتی محمد منیب الرحمٰن صاحب صدر تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان وچیئرمین مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی پاکستان تشریف لائے۔ کانفرنس کے مین سیشن سے پہلے تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان کے زیرِ اہتمام کئی ڈویژن کے اکابر اور نمائندہ علماء کے ساتھ مفتی صاحب کی ایک خصوصی نشست منعقد ہوئی اور آپ نے اس سے خطاب کیا، یہ اہتمام پیر صاحب کے صاحبزادے اور تنظیم کے کوآرڈینیٹر علامہ سیّد محمد احمد شاہ بخاری زیدمجدہٗ نے کیا تھا اور یہ اُن کی انتظامی صلاحیت کا آئینہ دار تھا۔

اس موقع پر مفتی صاحب نے مجھ سے فرمایا: ''میں نے موجودہ حالات کے تناظر میں ''اِصلاحِ عقائد واعمال'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، آپ اِس پر اپنی رائے کا اِظہار فرمائیں''۔ بندہ ناچیز نے اِس کتاب کا مطالعہ کیا، عصرِ حاضر میں اہلسنّت وجماعت کو جو مسائل درپیش ہیں، آپ نے احسن انداز میں ان کا شرعی حکم بیان فرمایا ہے۔ دراصل کچھ عرصہ سے اہلسنّت وجماعت کے عقائد واعمال میں کئی خرابیاں در آئی ہیں، ان کے منجملہ اسباب یہ ہیں: جاہل خطباء، بے علم پیرانِ عظّام اور بے عمل نعت خواں حضرات نے اہلسنّت وجماعت کے عقائد کو بیان کرنا شروع کر رکھا ہے، جبکہ وہ خود قرآن وسنّت کے فہم سے خالی ہیں۔ انہیں خود عقائد ومسائل کا صحیح

اِدراک نہیں، جس کی وجہ سے خرابی بڑھتی چلی گئی۔

جولوگ صاحبِ علم تھے، اُنہوں نے مصلحت کا لبادہ اوڑھ لیا اور عموماً خاموشی اِختیار کی، اس کے نتیجے میں جہلاء کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اس پر بعض حضرات نے کسی حد تک اس کے سدِّ باب کی کوشش کی، ان میں خاص طور پر میرے شیخِ طریقت نصیرِ ملّت صاحبزادہ علامہ سیّد نصیر الدّین نصیر رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کا نامِ نامی سرِ فہرست ہے۔ اب عصرِ حاضر کے مفکّر، مصلحِ قوم اور امّتِ مسلمہ کا درد رکھنے والے قبلہ مفتی محمّد منیب الرّحمٰن صاحب زیدمجدہٗ نے توانا آواز بلند کی اور جہاد باللّسان کے بعد جہاد بالقلم کا آغاز کیا ہے اور ہر مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ نہایت آسان اور عام فہم انداز میں دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر فقط فتاویٰ رضویہ شریف کے حوالہ جات پر اکتفا کیا ہے، اگرچہ اِمامِ اہلسنّت کا نام ہی سند ہے، لیکن بہتر ہوتا کہ اِن کے ساتھ قرآن وسنّت کے حوالہ جات سے مسئلہ کو واضح کیا جاتا تا کہ کسی کو اِنکار کی گنجائش نہ رہتی۔ بندہ ناچیز کی گزارش ہے کہ علماء و مشائخِ اہلسنّت اور امّت کا درد رکھنے والے اِس قلمی جہاد میں مفتی صاحب سے تعاون فرمائیں تا کہ اہلسنّت وجماعت کے عقائد واعمال پر اغیار کے رکیک الزامات واتہامات کا تسلّی بخش جواب آجائے اوراپنے پرائے ہر ایک کو پتا چلے کہ ہماری جماعت اِن خرافات سے منزّہ اور مبرّا ہے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ کریم قبلہ حضور مفتی اعظم پاکستان کی اِس کاوش کو شرفِ قبولیّت عطا فرمائے، آمین بجاہ النّبی الکریم ﷺ۔

❁

رہبرِ شریعت پیرِ طریقت علامہ پیر سیّد خلیل الرحمٰن شاہ بخاری دَامَتْ بَرَکَاتُهُمُ الْعَالِيَة

چیف آرگنائزر جماعتِ اہلسنّت پاکستان

سجادہ نشین آستانۂ عالیہ قادریہ منظور العارفین ٹھیکواں شریف، عارف والا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ!

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَعْلٰى دَرَجَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ الْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهِ الْهَادِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ وَتَابِعِيْهِمْ وَتَبَعَتِهِمْ مِّنَ الْاَئِمَّةِ الْمُجْتَهِدِيْنَ وَالْمُسْتَنْبِطِيْنَ خُصُوْصًا عَلَى الْاِمَامِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ سِرَاجِ الْاُمَّةِ اِمَامِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَلٰى سَائِرِ الْفُقَهَاءِ وَالْمُحَدِّثِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ، اَمَّا بَعْدُ!

اللہ رب العزت کی حمد وثنا اور حضور سرورِ انبیاء ﷺ کی ذاتِ اقدس پر درود وسلام کا نذرانہ پیش کرنے کے بعد عرض گزار ہوں کہ مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی منیب الرحمن دامت برکاتہم العالیہ کی خلوص ومحبت سے تحریر کردہ کتاب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' پڑھ کر بے حد دلی اطمینان وسکون اور خوشی محسوس ہوئی کہ رب ذوالجلال کے فضل وکرم اور رسولِ مکرم ﷺ کی نذرِ عنایت سے آج بھی حقیقی مصلحین امت موجود ہیں اور وہ تا قیامت ان شاءاللہ تعالیٰ موجود رہیں گے۔

انہی حقیقی مصلحین امت میں سے حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی منیب الرحمن صاحب ہیں، جو ہر معاملے میں کسی ''لومۃِ لائم'' کی پرواہ کیے بغیر شرعی اصول وضوابط اور احکامات کی پابندی پر زور دیتے ہوئے ہر بڑے اور چھوٹے کو فوراً تنبیہ فرمادیتے ہیں۔

آپ کی یہ تصنیفِ مبارک بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور یہ جہاد بالقلم کی زندہ مثال ہے کہ کسی کی توہین وتنقیص کیے بغیر آپ نے قرآن وحدیث، ائمۂ مجتہدین اور

مفسرینِ کرام کے اقوال کے ذریعے وارثین منبر ومحراب کی خصوصاً اور عوام الناس کی عموماً اصلاح فرمائی۔

اگر امتِ مسلمہ کا ہر آدمی مفتی صاحب کے پند ونصائح سے بھرے اقوال پر عمل پیرا ہو تو یقیناً امتِ مسلمہ آج پھر اپنے اسلاف کا وہی مقام حاصل کرلے گی، جس کو آج وہ کھو چکے ہیں۔ آج ہم ڈاکٹر علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے اس شعر کا مصداق بنے ہوئے ہیں:

تھے وہ آباء تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے، منتظرِ فردا ہو

لیکن اگر ہم قرآن وحدیث اور اقوالِ سَلَف کے ساتھ ساتھ مفتیٔ اعظم پاکستان زید شرفہٗ کی اس تصنیفِ لطیف پر عمل پیرا ہوں تو وہ دن دور نہیں جب امتِ مسلمہ مجتمع اور متحد ہو کر باطل کا مقابلہ کرنے میں سرخرو ہوگی۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ رب العزت مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی منیب الرحمن صاحب کو صحت وعافیت کے ساتھ عمرِ خضری عطا فرمائے اور اسی طرح اصلاحِ امتِ مسلمہ کے لیے دن رات کام کرتے رہنے کی سعادت عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کتاب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کو شرفِ قبولیت عطا فرماتے ہوئے امتِ مسلمہ کے لیے نافع بنائے، آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

تائید کنندگان:

(۱) حضرت علامہ صاحبزادہ پیر سیّد محمد احمد بخاری زِیْدَ مَجْدُھُمْ
کوآرڈینیٹر ضلع پاکپتن، تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان
(۲) صدر المدرسین علامہ عبد الرسول رضوی زِیْدَ مَجْدُھُمْ

تائیدات وتصدیقات

علماء ومشائخ اہلسنّت وجماعت

صوبہ سندھ

اصلاحِ عقائد واعمال

استاذ العلماء حضرت علامہ جمیل احمد نعیمی ضیائی چشتی صابری دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ
استاذ الحدیث وناظم تعلیمات
دارالعلوم نعیمیہ، فیڈرل بی ایریا، کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

سخن جمیل

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کے محبوب مکرم ﷺ کے فیضان کرم سے زمانہ قدیم سے علمائے ربّانی اور مشائخ حقّانی نے حق کی تائید اور باطل کی تردید نیز مسلک اہلسنّت پر بھرپور کام کیا اس سلسلے میں علمائے فرنگی، علمائے بدایوں، علمائے بریلی، علمائے رام پور، علمائے مراد آباد، علمائے خیر آباد، علمائے کچھوچھا شریف نیز علمائے کرام مشائخ عظام سیال شریف اور گولڑہ شریف کی خدمات تاریخ کے درخشاں اور تاباں ابواب میں موجود ہیں۔

اس سلسلے میں، میں اگر ان تمام علمائے کرام اور مشائخ عظام کے درس وتدریس، تبلیغ وارشاد اور علمی وتحقیقی تصانیف کا ذکر کروں تو ایک ضخیم اور عظیم کتاب مرتّب ہوسکتی ہے، لیکن سرِ دست میں اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

ہمارے زمانے میں بھی عقائد باطلہ اور خیالات فاسدہ کے حامل پیدا ہونا شروع ہوئے، جن کے تعقب اور تردید کے لیے دارالعلوم نعیمیہ میں 13 اپریل 2017 کو دس بجے صبح اہلسنّت کے علمائے کرام ومشائخ عظام کا ایک اہم اجلاس زیر صدارت حضرت علامہ قاضی مفتی منیب الرحمن مہتمم دارالعلوم نعیمیہ وچیرمین مرکزی

روٗیت ہلال کمیٹی پاکستان منعقد ہوا، اس اجلاس میں راقم الحروف کے علاوہ شرکائے کرام کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں:

(۱) علامہ پیر غلام رسول قاسمی　　(۲) علامہ مفتی محمد رفیق الحسنی
(۳) علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی　　(۴) علامہ مفتی محمد اکمل مدنی قادری
(۵) علامہ مفتی محمد ابوبکر صدیق الشاذلی　　(۶) علامہ محمد رضوان احمد نقشبندی
(۷) علامہ مفتی احمد علی سعیدی　　(۸) علامہ مفتی محمد اسماعیل نورانی
(۹) علامہ مفتی محمد عابد مبارک　　(۱۰) علامہ مفتی محمد وسیم اختر المدنی
(۱۱) علامہ مفتی خالد کمال　　(۱۲) علامہ مفتی محمد عمران شامی
(۱۳) علامہ سیّد نذیر حسین شاہ　　(۱۴) علامہ مفتی محمد آصف
(۱۵) علامہ مفتی محمد نذیر جان نعیمی　　(۱۶) علامہ مفتی محمد عبداللہ نورانی

بحمدہٖ تعالیٰ اتفاقِ رائے سے ایک کتاب بنام ''اصلاحِ عقائدو اعمال'' ترتیب دینے کی تائید کی گئی۔ یہ کارِ عظیم الحمدللہ مکمل کرلیا گیا ہے اور ان شاءاللہ العزیز کتاب عنقریب منظر عام پر آرہی ہے۔ میں اس کتاب کی تکمیل پر تمام علمائے کرام اور مشائخ عظام کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ رب ذوالجلال اپنے حبیب مکرم رَءُوف و رَحِیم ﷺ کے طفیل ان تمام علمائے کرام ومشائخ عظام کو صحت وعافیت اور سلامتیٔ ایمان کے ساتھ تادیر قائم ودائم رکھے، آمین ثم آمین بجاہ حبیبہ الآمین ﷺ، شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

رہتا ہے نام باقی کتابوں سے، اے امیر!
اولاد سے تو بس، یہی دو پشت چار پشت

حضرت علامہ مفتی محمد ابراہیم قادری دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ
مفتیٔ اعظم سندھ وشیخ الحدیث، جامعہ غوثیہ رضویہ، سکھر
سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مفتی منیب الرحمن صاحب کی مرتّبہ کتاب بعنوان ''اصلاحِ عقائدواعمال'' گزشتہ دنوں مجھے موصول ہوئی اور میں نے روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میں نے اس کو پچانوے فیصد بالاستیعاب پڑھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جو پانچ فیصد میری نظر سے نہیں گزری، ان شاءاللہ وہ بھی پچانوے فیصد کی طرح مُدَلَّل ومُبَرھَن ہوگی۔

اس کتاب کے مندرجات سے مجھے مکمل اتفاق ہے اور میں اس کی تصدیق، توثیق اور تصویب کرتا ہوں اور الحمد للہ! مجھے اس سے سو فیصد اتفاق ہے، کیونکہ یہ سارا علمی موادعقائدواعمال کی اصلاح سے متعلق ہے۔

میں دعا کرتا ہوں ہے اللہ رب العزت آپ، آپ کے رُفقاء اور اُن تمام اہل علم واہلِ فکر ونظر، جن کا اس مشن میں آپ کو علمی اور فکری تعاون حاصل رہا، کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، اس کاوش کو اہلسنّت وجماعت میں اصلاح کا ذریعہ بنائے اور قبولِ عام عطا فرمائے، اس کی اشاعت ہم سب کا دینی فریضہ ہے۔

استاذ العلماء حضرت علامہ مفتی محمد رفیق حسنی دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ
مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم
گلستانِ جوہر، بلاک ۱۵، کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ!

میں نے کتاب ''اصلاح عقائدواعمال'' ابتدا سے انتہا تک حرفاً حرفاً دیکھی، میں اس کے تمام مندرجات سے حرف بہ حرف متفق ہوں۔

میں اس کتاب کی تصدیق اور تصویب کرتا ہوں۔ موجودہ حالات میں اصلاح عقائداوراحوال کی اشد ضرورت تھی اوراس کے لئے انداز بھی قدرے جارحانہ مناسب تھا، کیونکہ معاملہ بہت زیادہ بگڑ چکا ہے، ایسے حالات میں زجراورتشدید سے اصلاح ہوتی ہے۔

بحمدہٖ تعالیٰ! مفتی صاحب نے موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنی تحریر کا انداز جارحانہ اورسخت رکھا ہے، بعض علماء اسے ناپسند کریں گے مگر درحقیقت اسی انداز سے ہی اصلاح کا عمل موثر ہوسکتا ہے۔ مفتی صاحب کا مسلک اہلسنّت وجماعت کے لوگوں کے ساتھ اخلاص شک اورشبہ سے پاک ہے۔ علماء اورمشائخ کی اصلاح سے ہی عوام کی اصلاح ہوگی۔ آج کل کی خرافات علماء کی نرمی اور مداہنت کی وجہ سے ہورہی ہیں۔ بے شک اسلاف ہمیشہ اصلاح کے معاملات میں شدت سے کام لیتے رہے ہیں، کتب فقہ کے اکثر فتاویٰ زجراورتوبیخ اوراطلاق کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی کوشش اور کاوش کو کامیابی عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

استاذ العلماء حضرت علامہ سیّد عظمت علی شاہ ہمدانی دَامَتْ بَرَکَاتُهُمُ الْعَالِیَة

بانی ومہتمم وصدر دار العلوم قمر الاسلام

بانی وصدر شاہ ہمدان ٹرسٹ انٹرنیشنل

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رب رحیم ورحمٰن نے اپنے عبد منیب حضرت علامہ مفتی منیب الرحمٰن حَفِظَهُ اللّٰهُ الرَّحْمٰن کوغیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ان صلاحیتوں کو اعلیٰ دینی وملی مقاصد کے لیے نہایت شائستگی اور عمدگی سے بروئے کار لانے کی پیہم توفیقات بھی عطا فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت اور لطف وعنایت سے حضرت مفتی صاحب زید مجدہ امت مسلمہ کی صلاح وفلاح کے لیے بھرپور اور پرخلوص زبانی وقلمی جہاد جاری رکھے ہوئے ہیں۔

آپ کی زیرِ نظر تالیف ''اصلاح عقائد واعمال'' اس اصلاحی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں آپ نے مسلکِ اہلسنّت وجماعت، جس کی پہچان اور امتیازی شان ہی راہِ اعتدال ہے، کے بعض افراد وطبقات میں نفوذ کرنے والی اعتقادی وعملی بے اعتدالیوں بلکہ بعض خرافات کی اصلاح کی سعی مشکور فرمائی ہے اور اسے علماء ومشایخ اَهْلُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَة کی تائیدات وتوثیقات سے مزیّن کیا ہے، اس سے اس کتاب کی ثقاہت، حقانیت اور صحتِ معنوی ہر شک وشبہے سے بالاتر ہوگئی ہے، آپ نے تمام علماء ومشایخ کا فرضِ کفایہ ادا کرکے انہیں بھی عند اللہ اور عند الناس سرخرو ہونے کا اعزاز عطا فرمایا۔ اس اعتبار سے آپ کا عوام اہلسنّت کے ساتھ علماء ومشایخ اہلسنّت پر بھی احسان ہے جس پر آپ اور آپ کے مصاحبین، معاونین اور مؤیدین بجا طور پر تحسین وستائش اور شکر وسپاس کے مستحق ہیں، فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَحْسَنَ الْجَزَاءَ وَاَجْزَلَ عَلَيْهِمُ الْبَرَكَاتُ۔

حضرت مفتی صاحب زید فضلہ نے جس دردمندی اور دل سوزی سے یہ تالیف فرمائی ہے، امید واثق ہے کہ خشیتِ الٰہی اور دردِ ملت رکھنے والے اربابِ شریعت وطریقت کے لیے یہ طمانیت اور فرحت کا باعث بنے گی، راقم آثم کے لیے تو یہ بے حد طمانیت وراحت اور انبساط ونشاط کا باعث بنی ہے۔ کیونکہ اہلسنّت وجماعت کی موجودہ درماندگی وزبونی کے درماں اور اس کے بعض افراد وطبقات کی بے اعتدالی وبے راہروی کی اصلاح کے لیے اس کی اشد ضرورت تھی۔

رب قدیر مجھ فقیر پر تقصیر کو بھی اس نہج پر زبان وقلم کے ذریعے اصلاحی کوشش وکاوش کی توفیق عطا فرمارہا ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ جمعہ کے خطابات کے علاوہ دیگر اجتماعات خاص طور سے اعراس بزرگانِ دین کے اجتماعات میں توفیق نصیب ہوتی رہتی ہے۔

جنوبی افریقا میں اہلسنّت وجماعت کے دینی وروحانی حلقوں کے اجتماعات اور معمولات بھی بے اعتدالی اور بے راہ روی سے دوچار ہیں، وہاں بہت زیادہ اصلاح کی ضرورت ہے۔ راقم آثم کو ۲۰۰۳ء سے ان اجتماعات وتقریبات میں مدعو کیا جاتا ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ! عوامی خطباء ومقررین کے عوام کو خوش کرنے اور داد وتحسین حاصل کرنے والے خطابات کے شِعار سے ہٹ کر اصلاحی گفتگو کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ راقم آثم کو مذکورہ بالا بے اعتدالی وبے راہ روی اور اختراعات وخرافات کی اصلاح کی جانب فاضل مؤلف مفتی منیب الرحمٰن حَفِظَهُ اللّٰهُ الرَّحْمٰن کو توجہ دلانے کی توفیق بھی نصیب ہوئی تھی۔

اللہ رب العزت کی رحمت وعنایت سے امیدوار ہوں کہ ''اَلدَّالُ عَلَی الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ'' کا مصداق صلاح وفلاح کے اس عظیم کارِ خیر میں شامل اجر کرلیا جاؤں گا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ، وَذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ يَسِيْرٌ، وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ، وَبِالْاِجَابَةِ جَدِيْرٌ۔

بسا اوقات منکرات، ممنوعات ومکروہات کے سد باب کے لیے مشتبہات ومباحات ومستحبات میں تجاوزات کے انسداد کی ضرورت بھی پیش آتی ہے، جب دوا کے ذریعہ مرض کا علاج نہ ہو تو آپریشن کی نوبت آجاتی ہے، اس کی نظائر زیر نظر کتاب میں بھی ہیں، میں اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف ایک نظیر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

تفضیلی اہلسنّت سے خارج ہیں:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس امت میں انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ماننا اہلسنّت وجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے۔ اس کے برخلاف کسی اور صحابی خواہ حضرت عمر یا حضرت عثمان یا حضرت علی رضی اللہ عنہم کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل ماننا اہلسنّت سے باہر نکلنا اور روافض کی وادی میں قدم رکھنا ہے۔ امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی سے سوال ہوا: ''زید کی والدہ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علی شیر خدا کرّم اللہ وجہہ کے برابر کسی صحابی کا رتبہ نہیں''، تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: ''زید کی والدہ عقیدہ مذکورہ کے سبب اہلسنّت سے خارج اور ایک گمراہ فرقے تفضیلیہ میں داخل ہے، جن کو ائمہ دین نے رافضیوں کا چھوٹا بھائی کہا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱ ص:۱۵۲، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

شارح بخاری حضرت مولانا مفتی محمد شریف الحق امجدی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی ''نُزْهَةُ الْقَارِیْ شَرْحُ صَحِیْحِ الْبُخَارِیْ'' میں غیر مقلدین کے شیخ الکل میاں نذیر حسین صاحب کی صحیحین کے راوی محمد بن فضیل پر کی گئی یہ جرح کہ وہ منسوب برفض ہیں، پر مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی تنقید فتاویٰ رضویہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

''یہ بکف چراغی قابل تماشہ کہ ابن فضیل کے منسوب بہ رفض ہونے کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں عبارت تقریب رمی بالتشیّع، ''ملاجی کو بایں سال خوری ودعوائے محدثی آج تک

اتنی خبر نہیں کہ زبانِ متاخرین میں شیعہ روافض کو کہتے ہیں خَذَلَهُمُ اللهُ تَعَالٰی جَمِیْعًا، بلکہ آج کل کے بیہودہ مہذبین روافض کو رافضی کہنا خلاف تہذیب جانتے اور انہیں شیعہ ہی کے لقب سے یاد کرنا ضروری مانتے ہیں۔ خود ملاجی کے خیال میں اپنی ملائی جی کے باعث یہی تازہ محاورہ تھا یا عوام کو دھوکہ دینے کے لیے متشیع کو رافضی بنایا، حالانکہ سلف میں جو تمام خلفائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ حسنِ عقیدت رکھتا اور حضرت امیر المومنین مولیٰ علی کَرَّمَ اللهُ تَعَالٰی وَجْهَهُ الْكَرِیْم کو ان میں افضل جانتا شیعی کہا جاتا، بلکہ جو صرف امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تفضیل دیتا اسے بھی شیعی کہتے، حالانکہ یہ مسلک بعض علمائے اہلسنّت کا تھا، اسی بنا پر متعدد کو شیعہ کہا گیا، بلکہ کبھی محض غلبہ محبتِ اہل بیت کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو شیعیت سے تعبیر کرتے، حالانکہ یہ محض سنیت ہے، (نزہۃ القاری، ج:۵ ص:۶۶۷)''۔

جب بے راہ روی اور بے دینی عام ہو جائے، اعتدال وتوازن کے بجائے افراط وتفریط کی راہ اختیار کرلی جائے، مباحات سے تجاوز کر کے مکروہات وممنوعات ومحرمات کا ارتکاب کیا جانے لگے، مستحبات ومندوبات کو فرائض وواجبات سے زیادہ اہمیت دی جانے لگے، بلکہ فرائض، واجبات اور سنن الہدیٰ سے بے پروائی اور لاتعلقی کا اظہار ہونے لگے، غیر شرعی رسومات وخرافات کو شرعی احکام وتعلیمات کی حیثیت دی جانے لگے، تو دین وملت کا درد رکھنے والے مصلحین کو حتی الوسع تمام مؤثر ومناسب اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔

مومن کی شان اور پہچان تو یہ ہے کہ اس کی خواہشات، اس کے عزائم، اس کا مزاج، اس کی طبیعت تابعِ شریعت ہوں۔ سیّدی ضیاء الامت حضرت علامہ جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی نے تفسیر ضیاء القرآن میں حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی کا قول نقل کیا ہے:

وَکَمَالُ الْاِیْمَانِ اَنْ یَّکُوْنَ الطَّبِیْعَۃُ تَابِعَۃً لِلشَّرِیْعَۃِ

ترجمہ: ایمان کامل یہ ہے کہ طبیعت شریعت کے تابع ہو اور طبیعت اس چیز کا تقاضا ہی نہ کرے جس کا شریعت نے حکم نہ دیا ہو''۔

مگر المیہ یہ ہے کہ اب شریعت وطریقت دونوں کو بھی طبیعت کے تابع بنایا جارہا ہے۔

زیرِ نظر تالیف اپنے جلیل القدر مؤلف علامہ مفتی منیب الرحمن حَفِظَہُ اللّٰہُ الرَّحْمٰن کے دردِ دل اور سوزِ دروں کی آئینہ دار ہے، جس کا ذکر انہوں نے امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے حوالے سے اس شعر کے ذریعہ کیا:

مرا سوزیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
اگر دم در کشم ، ترسم کہ مغزِ اُستخواں سوزد

انہوں نے ایک سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اہلسنّت وجماعت کے بعض افراد وطبقات میں نفوذ کر جانے والی تقریباً تمام اعتقادی اور عملی کمزوریوں، بے اعتدالیوں، غیر شرعی رسومات اور خرافات کا احاطہ کر کے اصلاح کی پُرخلوص اور پُرسوز کوشش وکاوش فرمائی ہے، جس پر جتنا بھی خراجِ تحسین پیش کیا جائے، بجا ہے۔

ربِ کریم اپنے حبیب کریم علیہ وآلہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے طفیل مؤلفِ نبیل، فاضلِ جلیل علامہ مفتی منیب الرحمن حَفِظَہُ اللّٰہُ الرَّحْمٰن کی اس تالیفِ لطیف کو اپنے لطف وکرم کے شایانِ شرفِ قبول سے نوازتے ہوئے بیش از بیش ثمر بار فرمائے اور عوام وخواص کو اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے، آپ کو اور آپ کے رفقائے کار، مصاحبین، معاونین اور مؤیّدین زِیْدَ عِلْمُھُمْ کو اجرِ عظیم اور ثوابِ جزیل عطا فرمائے، آمین یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلٰی حَبِیْبِکَ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ رَحْمَۃٍ لِّلْعٰلَمِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

تائیدات وتصدیقات

علماءومشائخ اہلسنّت وجماعت

صوبہ خیبر پختونخوا

حضرت علامہ مفتی ابوالفضل محمد سبحان قادری دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ الْعَالِیَۃ

شیخ القرآن والحدیث جامعہ قادریہ نوشہرہ روڈ، مردان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

محترم مفتی منیب الرحمن صاحب کی مرتبہ کتاب (اصلاحِ عقائدواعمال) کو پڑھ کر دلی سکون ہوا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب علمی وروحانی دنیا کی اصلاح کے لیے روشن مینار ہے اور اس میں تقریباً تمام شعبوں اور افراد کا ذکر موجود ہے جو بظاہر خود مصلح نظر آتے ہیں لیکن وہ خود اصلاح کے محتاج ہیں۔ لہٰذا میں تمام مصلحین امت کو دردمندانہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو اپنے اوپر تنقید نہ سمجھیں بلکہ اپنے لیے سامان رشدوہدایت سمجھ کر اپنی اصلاح کی کوشش کریں۔

اللہ کریم ہم سب کو اپنی اصلاح کی توفیق نصیب فرمائیں اور مفتی صاحب کی مساعی جمیلہ قبول فرمائیں۔

حضرت صاحبزادہ علامہ ڈاکٹر نور الحق قادری دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ الْعَالِیَۃ

سابق وفاقی وزیر وایم این اے، لنڈی کوتل، خیبر ایجنسی

مہتمم دارالعلوم جنیدیہ غفوریہ جمرود روڈ، پشاور

سجادہ نشین پیر طریقت حضرت حاجی گل صاحب دامت برکاتہم العالیہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَرِضَا نَفْسِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ رُسُلِهٖ وَ أَفْضَلِ خَلْقِهٖ حَبِيْبِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ وَأَصْحَابِهِ الْمُكَرَّمِيْنَ وَعَلٰى مَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ، أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ!

پیش نظر کتاب مخدومی مفتی اعظم پاکستان پروفیسر منیب الرحمن صاحب زِیْدَ مَجْدُہٗ اور آپ کے معتمد رفقاءکار، ذی احتشام علماء اور محققین کی بروقت اور جرأت مندانہ کاوش ہے، جس کیلئے امت مسلمہ بالعموم اور اہلسنّت و جماعت بالخصوص ممنون و مُتَشَکِّر ہیں۔

اصلاح وتعمیر ایک جاری عمل اور مثبت و مستحسن اقدام ہے۔ بظاہر جمود وانتشار کے شکار سوادِ اعظم کو سنبھلنے اور منظم ہونے کیلئے اس کتاب میں متعین طریقہ عمل اور رویوں کو اپنانا انتہائی ناگزیر ہے۔ اہلِ جُبّہ و دستار، وارثانِ منبر ومحراب اور جانشینانِ خانقاہ و مزار کیلئے اعلیٰ حضرت الشاہ احمد رضا خان بریلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے فرمودات وارشادات سے فرار ممکن نہیں، کیونکہ آپ رَحِمَہُ اللّٰہ نے ایک سچے عاشق رسول، سالک صوفی اور مُتَبَحِّر عالمِ دین کے طور پر شریعتِ مُطَهَّرَہ کا خلاصہ قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان فرمایا ہے۔

اس سے پہلے کہ اغیار ہم پر شدید معاندانہ اور متعصّبانہ تنقید کے ساتھ یلغار کریں، ہمیں دردِ دل کے ساتھ اپنی صفوں کے اندر سے اٹھنے والی ندائے حق کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا چاہیے، کیونکہ ہم عقیدۂ حق پر عمل پیرا امتِ وَسط ہیں۔

میری دعا ہے: اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کے طفیل دردِ دل سے لکھی جانے والی کتاب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کو فاضل مؤلّف کی توقعات سے بدرجہا زائد کامیابی نصیب فرمائے، یہ عہدِ حاضر اور آئندہ آنے والے علمائے ربّانیین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو اور اصلاح کے میدان میں کام کرنے والوں کو حوصلہ عطا کرے اور ان کے عزم کو اس سے استقامت نصیب ہو، اللہ تعالیٰ عامّۃ المسلمین اور عوامِ اہلسنّت کے دل ودماغ کی زمین کو اس کتاب میں پیش کردہ انوارِ ہدایت کے جذب کرنے اور عمل کے سانچے میں ڈھالنے کی سعادت وتوفیق عطا فرمائے، آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ بِجَاہِ النَّبِیِّ الْاَمِیْنِ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ اَفْضَلُ الصَّلَوَاتِ وَالتَّسْلِیْمَاتِ۔

حضرت علامہ مفتی اظہار اللہ زِیْدَ مَجْدُھُمْ

دارالعلوم عربیہ، پھام گلی

تحصیل اوگی، ضلع مانسہرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس پرفتن دور میں عام مسلمانوں اور خاص طور پر اہلسنّت وجماعت کو مختلف قسم کے فتنوں کا سامنا ہے۔ خاص طور پر نام نہاد جعلی پیر اور دین کے نام پر دنیا کمانے والے جاہل واعظین مسلک حق اہلسنّت وجماعت وفرقہ ناجیہ کو کافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

حضرت علامہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے زیرنظر کتاب ''اصلاح عقائد واعمال'' لکھ کر اِحقاقِ حق کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کے علم وعمل اور عمر میں برکتیں عطا فرمائے۔ بے شک مفتی صاحب اس حدیث شریف کا مصداق ہیں: ''یَحْمِلُ ھٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُہٗ، یَنْفُوْنَ عَنْہُ تَحْرِیفَ الغَالِینَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِینَ وَتَاْوِیْلَ الجَاھِلِینَ، (مرقات المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح)''۔

مفتی صاحب سے گزارش ہے کہ ان بہروپیوں کے خلاف بھی قلم کو حرکت دیں جو یہ کہتے ہیں کہ دل صاف ہونا چاہیے، ظاہر جیسا بھی ہو، حالانکہ ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے مربوط ہیں، ظاہر سے وجود ملتا ہے اور باطن سے اسکی تکمیل ہوتی ہے۔

تائیدات وتصدیقات

علماءومشائخ اہلسنّت وجماعت

صوبہ بلوچستان

اصلاحِ عقائدواعمال

حضرت علامہ مفتی فتح محمد نقشبندی سیفی دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ الْعَالِیَۃ

مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ فیض العلوم نقشبندی سبی، بلوچستان

مہتمم جامعہ انوارمدینہ، سیف اللہ کالونی، کوئٹہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، اَمَّا بَعْدُ!

حضرت علامہ مفتی منیب الرحمٰن جل مجدہٗ کی کتاب مستطاب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کماحقہٗ اسم بامسمّٰی ہے، اس کتاب کو از اول تا آخر حرف بحرف اس عاجز نے پڑھا۔ جناب مفتی صاحب نے علمی وشرعی تحقیق کے اصولوں کے مطابق دلائلِ حقّہ اور سلف صالحین کے حوالہ جات سے اپنے موقف کو ثابت کیا ہے تا کہ ہر ایک پر حجتِ شرعی قائم ہو۔

حضرت علامہ مفتی صاحب نے مختلف عنوانات کے تحت شریعت وطریقت میں فرق کرنے والوں کا رد، تصوف کا صحیح مفہوم، بیعت کی اقسام، مزارات مبارکہ پر ہونے والی خرافات، الوداع رمضان ودیگر مسائل کے متعلق صحیح رہنمائی فرما کر علمی واصلاحی ضرورت کو پورا فرمایا ہے۔

دعا ہے کہ اہلِ علم حضرات اپنے خطابات وتقاریر میں اس کتاب کے حوالے سے لوگوں کے عقائد کی درستگی فرمائیں گے۔ اللہ جلّ جلالہٗ حضرت مفتی صاحب کے علم وعمل اور ان کی دینی خدمات پر ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

اصلاحِ عقائدواعمال

حضرت علامہ حبیب احمد نقشبندی دَامَتْ بَرَکَاتُہم الْعَالیۃ

بانی ومہتمم وشیخ الحدیث

جامعہ اسلامیہ نوریہ، کوئٹہ وجامعہ امام اعظم خاران

بلوچستان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مصلحِ امت، نقادِ اہلسنّت، قاطع شرک وبدعت حضرت علامہ مفتی منیب الرحمٰن مُدَّ ظِلُّہُ العالی کی تصنیف جدید بنام ''اصلاح عقائد واعمال'' کے چند مباحث ومسائل کا بغور مطالعہ کیا۔ علامہ نے مسلک حق اہلسنّت کے مقدس محبوبات ومعمولات اور محاسن کا بھی تذکرہ فرمایا ہے اور غیر ضروری اور نامناسب اختلاطات کی نفی فرمائی ہے، یہ بہت ہی احسن اقدام ہے۔ خدا کرے کہ خواص وعوام اہلسنّت اپنے ان مصلح پیشواؤں کے پندونصائح پر متوجہ ہوں اور اپنے پاک مسلک کو منکرات سے بچاتے ہوئے اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کریم ﷺ کی اطاعت میں زندگی گزاریں۔

علامہ صاحب نے نہایت خلوص ومحبت سے جن کوتاہیوں کی نشاندہی فرمائی ہے، ان سے اجتناب واحتراز کیا جائے۔ ضد وعناد کی بجائے علامہ صاحب کی اصلاحی فکر ''الدین النصیحۃ'' کے جذبے کے تحت دل سے قبول کیا جائے اور ان کے لیے درازیٔ عمر وصحت وعافیت کی دعا کی جائے۔ فقیر دعا گو بھی ہے اور دعا جو بھی ہے۔

استاذ العلماء شیخ الحدیث

حضرت علامہ مفتی محمد حیات قادری چشتی دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ

بانی و مہتمم دار العلوم حنفیہ رضویہ، ہجیرہ پونچھ آزاد کشمیر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مفکر اسلام حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن، صدر تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان وسیکرٹری جنرل اتحادِ تنظیمات مدارس دینیہ پاکستان، چیئرمین مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی پاکستان، مفتی و مہتمم دار العلوم نعیمیہ کراچی کی دینی، ملی خدمات کو پورے پاکستان بشمول آزاد کشمیر اور پوری دنیا میں جانا، پہچانا اور مانا جاتا ہے۔ آپ کئی سالوں سے چیئرمین مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی پاکستان کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا تمام مکاتبِ فکر میں یکساں احترام ہے اور آپ کے فیصلے کو سب دل وجان سے تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کے اصلاحی بیانات کو پوری دنیا میں بڑی توجہ سے سنا جاتا ہے۔ آپ نے سالہا سال کے تجربات کے بعد ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کے عنوان سے جو کتاب تالیف کی ہے، یہ یقیناً امت مسلمہ کے لیے گرانقدر سرمایہ ہے۔ ہم دل سے ان کو اس سعی جمیل پر مبارکباد پیش کرتے ہیں، امید ہے کہ یہ کاوش اہلسنّت وجماعت میں اصلاحِ عقائد واعمال کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوگی، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں ماجور فرمائے اور اسے قبولِ عام عطا فرمائے۔

میں اپنے ادارے کے تمام فاضلین کو یہ پیغام دیتا ہوں کہ مفتی صاحب کے اس علمی اور اصلاحی کاوش سے بھرپور استفادہ کریں، اس اصلاحی مشن میں ان کے رفیقِ سفر اور اس کی اشاعت اور ابلاغ میں ان کے مُمِدّ ومعاون بنیں۔

تائیدات وتصدیقات

علماءومشائخ اہلسنّت وجماعت

یوکے،امریکا،ماریشس

مفکرِ اسلام، خطیب العصر

حضرت علامہ محمد قمر الزماں اعظمی دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ الْعَالِیَۃ

سکریٹری جنرل

ورلڈ اسلامک مشن، انگلینڈ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَامِداً وَّمُصَلِّیاً وَّمُسَلِّماً!

بحمدہٖ تعالیٰ! آج حضرت مفتی اعظم پاکستان علامہ منیب الرحمٰن زیدَ مجدہ کی کتاب ''اصلاحِ عقائدواعمال'' نظرنواز ہوئی ہے، بے پایاں مسرت ہوئی۔ میں ساؤتھ افریقا کے سفر کے لیے پابرکاب ہوں، اس لیے پوری کتاب کے حرفاً حرفاً مطالعے کا شرف حاصل نہ کرسکا، البتہ سرسری طور پر کتاب کی زیارت سے فیض یاب ہوا۔

حضرت علامہ نے اس کتاب میں ان تمام مفاسد کی نشاندہی کی ہے جو آج کل ہمارے معاشرے میں رواج پارہے ہیں، جن کا سدِّ باب بہت ضروری ہے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ نے بیش تر مقامات پر اپنے موقف کی تائید میں امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے فتاویٰ جات کا حوالہ پیش فرمایا ہے، ان کے اس طرزِ استدلال سے یقیناً اہلسنّت وجماعت کا ہر طبقہ مطمئن ہوگا اور اہلسنّت وجماعت کے مذہبی حریفوں کے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہوگا جو ان تمام خرافات وبدعات کا الزام اہلسنّت کے سرڈالتے ہیں۔

امام اہلسنّت علیہ الرحمہ نے اگرایک طرف اہلسنّت کے مراسم ومعمولات کو استدلال کی زبان عطا فرمائی ہے تو دوسری طرف ان تمام بدعات وخرافات کا رد فرمایا

ہے جو دین کے نام پر ہمارے معاشرے کا حصہ بنتی جارہی تھیں۔ اپنے فتاویٰ جات کے ذریعے امام اہلسنّت نے ردِّ بدعات ومنکرات کا ایک عظیم کارنامہ انجام دیا، حضور مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کی طرح انہوں نے اپنے دور میں پھیلی ہوئی تمام بدعتوں کا قلع قمع فرمایا۔ آج ہماری غفلت اور بے حسی کی وجہ سے وہ بدعات وخرافات پھر معاشرے میں دراندازہورہی ہیں، جن کے انسداد کے لیے امام احمد رضا نے پوری زندگی قلمی جہاد فرمایا۔

بلاشبہ محافل میلاد ونعت خوانی اہلسنّت وجماعت کے شعائر میں سے ہے اور آج پوری دنیا میں یہ محافل ہماری شناخت ہیں، مگران مستحب امور کوجس طرح سے منایا جارہا ہے، وہ ناقابلِ قبول ہیں۔ اسی طرح بزرگانِ دین کے اَعراس کے قائلین بھی آج کے بیش تر اَعراس میں داخل ہونے والی بدعاتِ سیئہ کی تردید اپنا دینی فریضہ تصور کرتے ہیں۔

نعت خوانی کے باب میں بدعقیدہ، بدعمل یا فسق وفجور میں مبتلا نعت خوانوں کی حوصلہ شکنی اور ان کے جلبِ منفعت اور ہوسِ زرگری کی تردید انتہائی ضروری ہے۔ نعت خوانی کے نام پر مردوزن کا اختلاط شدید حرام ہے، جس جس سے روکنا ہر پابندِ شریعت اورحساس مسلمان کی ذمے داری ہے۔

آج کا آزاد اور سیکولر میڈیا جہاں ایک طرف بے دینی کے رجحانات کو تقویت پہنچارہا ہے، وہیں اس طرح کی مخلوط محافل کا انعقاد کر کے مسلم معاشرے میں بے راہ روی کی حوصلہ افزائی کررہا ہے۔

مفتیٔ اعظم پاکستان کے اس قلمی جہاد کی تائید کے ساتھ ساتھ دعا کرتا ہوں کہ علماء ومشائخ اہلسنّت کے لیے یہ صدا بانگِ درا ثابت ہو۔

پیرِ طریقت، رہبرِ شریعت حضرت علامہ

صاحبزادہ پیر حبیب الرحمن محبوبی دَامَتْ بَرَکَاتُهُمُ الْعَالِيَة

مہتمم وشیخ الحدیث: جامعہ صفۃ الاسلام، بریڈفورڈ، یوکے

سجادہ نشین دربارِ عالیہ ڈھانگری شریف، میرپور، آزاد کشمیر

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

عَنِ الْاِمَامِ الشَّافِعِي رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى اَنَّهُ قَالَ لَوْلَمْ يَنْزِلْ غيرهٰذِهِ السُّوْرَة لَكَفَتِ النَّاسَ لأنها شَمِلَتْ جَمِيْعَ عُلُوْمِ الْقُرْآنِ، اَخْرَجَ الطَّبْرَانِيُّ فِي الْاَوْسَط وَالْبَيْهَقِيُّ فِي الشُّعُبِ عَنْ اَبِيْ حُذَيْفَةَ وَكَانَتْ لَهُ صُحْبَةٌ، قَالَ كَانَ الرَّجُلَانِ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ اِذَا الْتَقَيَا لَمْ يَتَفَرَّقَا حَتّٰى يُقْرِئَ اَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ سُوْرَةَ وَالْعَصْرِ، ثُمَّ يُسَلِّمَ اَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ، فِيْهَا اِشَارَةٌ اِلٰى حَالِ مَنْ لَّمْ يُلْهِهِ التَّكَاثُرُ، وَلِذَا وُضِعَتْ بَعْدَ سُوْرَتِهِ۔ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَايِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوبِقُهَا۔

ترجمہ: ''اور زمانہ کی قسم!، بے شک ہر انسان ضرور نقصان میں ہے، سوا اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے اور انہوں نے ایک دوسرے کو دینِ حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی، (العصر: ۱۔۳)''۔ امام شافعی رَحِمَهُ اللهُ تعالیٰ سے روایت ہے: انہوں نے کہا: سورۃ العصر کے سوا اگر اور کوئی بھی (قرآن یا حکم) نازل نہ ہوا ہوتا، تو (بھی) یہ سورت لوگوں کے لیے تمام علوم قرآن کی جامع ہوتی، طبرانی نے ''المعجم الاوسط'' میں اور بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں ابوحذیفہ سے روایت کیا ہے، اور ان کے کئی ساتھی تھے، انہوں نے کہا: (صحابۂ کرام کا معمول یہ تھا

کہ) رسول اللہ ﷺ کے کوئی بھی دو صحابی آپس میں ملتے، تو جدا ہونے سے پہلے ایک دوسرے پر سورۃ العصر کی تلاوت کرتے (یعنی وہ ایک دوسرے کو اس کے مضامین کی طرف متوجہ کرتے رہتے)، پھر ایک دوسرے کو سلام کرتے (اور رخصت ہوجاتے)، اس میں ایسے شخص کے حال کی طرف اشارہ ہے، جسے کثرتِ دولت کی خواہش نے اللہ سے غافل نہ کردیا ہو، اسی لیے (ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے) سورۃ العصر کو سورۃ التکاثر کے بعد رکھا گیا ہے، (روح المعانی، سورۃ العصر)''۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر شخص جب صبح کرتا ہے، وہ اپنے نفس کا سودا کرتا ہے، پھر ان میں سے کوئی اپنے آپ کو (عذابِ جہنم سے) آزاد کرنے والا ہوتا ہے اور کوئی (عذاب کا سزاوار بن کر) اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والا ہوتا ہے، (صحیح مسلم: ۲۲۳)''۔

قرآنی آیات احادیث نبویہ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی اُس کے لیے سب سے قیمتی دولت ہے، اس کی قدر و قیمت کا مدار عقائد واعمال کی درستگی پر ہے، اس کے ثمرات انعامِ الٰہی کی صورت میں قیامت کے دن عنایت ہوں گے۔ راقم کو وحید فکر کے حامل، فرید شخصیت کے مالک، جن کی علمی تمکنت، فقہی ثقاہت، ملی وملکی وجاہت مسلمہ ہے، ایک زمانہ معترف ہے، کی تصنیف ''اصلاحِ عقائد واعمال'' موصول ہوئی۔ عبقری العصر، مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ مفتی منیب الرحمٰن متعنا اللہ المنان بطول حیاتہ الی طول الزمان کی اس تالیف کے تمام مباحث کو حتی المقدور پڑھنے کی کوشش کی ہے، میرے بعض تاثرات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) مصنف محترم خلوصِ نیت سے اصلاحِ امت چاہتے ہیں اور وہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادِ مبارک: ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّات (بخاری: ۱)'' کے مصداق ان شاء اللہ العزیز اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کے طفیل یقیناً اجرِ عظیم کے حقدار

ہوں گے۔

(۲)مفتی صاحب کا وجود باجود اہلسنّت وجماعت کے لیے اس پُرفتن دور میں حجت کا درجہ رکھتا ہے۔

(۳)مفتی صاحب حقیقۃً منیب الرحمٰن ہیں، بلاشبہ آپ ان علمائے ربانیین سے ہیں جو حجۃ اللہ علی الارض ہیں۔

(۴) کتاب مستطاب پڑھنے سے اعلیٰ حضرت کے متعلق پھیلائی گئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ودفاع بھی ہوجائے گا۔

(۵) مصنف علّام کی یہ تصنیف منیف آیات واحادیث کا حاصل ہے۔

(۶) مصنف علّام نے اپنی تصنیف منیف میں آیات واحادیث نبویہ سے استدلالات کی روشنی میں بکثرت فتاویٰ رضویہ کے حوالہ جات پیش کر کے واضح کردیا ہے کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلی کسی مذہب ومسلک کے بانی نہیں ہیں، بلکہ ترجمان، شارح اور مبلغ ہیں اوران کی تعلیمات کا مستدَل قرآن وسنت ہے اوروہ اہلسنّت وجماعت کے متفق علیہ مُقتدیٰ ہیں۔

(۷) کتاب کی بے پناہ افادیت کے پیشِ نظر اہلسنّت وجماعت کی مرجع خلائق شخصیات (مشائخ عظام وعلمائے کرام) کو چاہیے کہ اس کتاب کو اپنے منتسبین اورتلامذہ کو لازمی مطالعہ کرائیں، کیونکہ یہی لوگ مستقبل میں شریعت وطریقت کے میدان میں اپنے اکابر کے جانشین اوراُن کی علمی اورروحانی ورثے کے امین اور مُبلغ ہوں گے۔

ان شاء اللہ تعالیٰ ''الجامعة صفة الاسلام'' کے طلبہ کرام کے لیے اس کتاب کو لازمی مطالعہ کا حصہ قرار دے گا، اساتذہ کی نگرانی میں کتاب کے مندرجات ذہن نشین کرائے جائیں گے تاکہ اُن میں عقائدواعمال میں درآنے والے فتنوں کے ادراک اور اُن سے نبردآزما ہونے کی صلاحیت پیدا ہو۔ مجھے کامل اُمید ہے کہ

اکابرمشائخ عظام اور علمائے کرام کی تائیدات وتصدیقات اورتوثیقات کے بعد وہ مسلک کے نام پر بلیک میل کرنے والوں کے جال میں نہیں پھنسیں گے، بلکہ پوری استقامت کے ساتھ اِن بدعات وخرافات کا سَدِّ باب کریں گے۔

استدعا:

حضرت ممدوح گرامی قدر سے استدعا ہے کہ اہلسنّت کے حالِ زار پر مزید ترحم فرمائیں، اصلاحِ عقائدواعمال کی بقیہ ضروری ابحاث پر بھی قلم اٹھائیں تاکہ ان فتنوں سے نجات ملے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی اس سعیِ جمیل کو اپنی بارگاہ میں مشکور وماجور فرمائے، خواص وعوامِ اہلسنّت میں قبولِ عام عطا فرمائے اور اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کے اس مشن میں تمام مشائخ عظام وعلمائے کرام اوردین کا درد رکھنے والے طبقات کو دل وجان سے ان کا دست وبازو بننے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

❁

حضرت علامہ محمد نظام الدین القادری المصباحی دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ

فاضل الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، انڈیا
صدر مدرس جامعہ غوثیہ، بلیک برن، یو کے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

محقق اہلسنّت، مفتی اسلام، ناشر مسلک امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز حضرت علامہ پروفیسر مفتی منیب الرحمن مدظلہ کی تالیف جلیل ''اصلاح عقائد واعمال'' کے مطالعہ سے فارغ ہوا، کتاب موضوع کے اعتبار سے کافی معلوماتی اور سنی بریلوی حضرات کی موجودہ حالت زار کی عکاس ہے، نیز خرافات وبدعات کی اصلاح کلام رضا کی روشنی میں ایک عمدہ سعی ہے۔امید ہے ارباب حل وعقد اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حتی الوسع سعی کریں گے۔

معمولات اہلسنّت میں بعض احباب وجماعتوں نے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر جن بدعات وخرافات کو شامل کیا اور پھر اپنی دنیا سنوارنے کے لیے ان کو شدّومد کے ساتھ فروغ دیا، مفتی منیب الرحمن حفظہ اللہ تعالی نے ان تمام امور کا بنظرِ عمیق جائزہ لیا اور خوب تحقیق ومطالعہ کے بعد ایک مصلح امت ہونے کی حیثیت قرآن وحدیث، اقوال ائمہ بالخصوص امام اہلسنّت امام احمد رضا محدث بریلی قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز کی تصریحات وتعلیمات کی روشنی میں مدلّل حل پیش کیا۔اس عظیم دینی اور مسلکی خدمت پر قبلہ مفتی اعظم پاکستان علامہ مفتی منیب الرحمن صاحب لائق مبارکباد ہیں اور اب یہ تصنیفِ جلیل اہلسنّت وجماعت کے لیے نعمتِ غیر مترقّبہ اور وقت کی ضرورت ہے۔

اب حاملینِ مسلک رضا کی یہ دینی، شرعی اور مسلکی ذمہ داری ہے کہ اس کتاب ''اصلاح عقائد واعمال''میں پیش کیے گئے اصلاحی امور کو نہ صرف قبول کریں

بلکہ دینی اور ملّی جذبے کے تحت اسے عملی جامہ پہنائیں تاکہ دنیا کے سامنے سنیت کا وہ نورانی چہرہ جس کو امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز دیکھنا چاہتے تھے، اسے دیکھ کر آپ کی روح کو عالم ارواح میں راحت وسکون ملے اور اہلسنّت کے معاندین کے باطل پروپیگنڈے کا رد ہو۔

میری دعا ہے: اللہ تعالیٰ قبلہ مفتی صاحب کو صحت سلامتی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے اور آپ کی دینی اور آفاقی خدمات کو آنے والی نسلوں کے مشعل راہ بنائے، آمین۔

حضرت علامہ مفتی محمد انصر القادری دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ

جمعیت تبلیغ الاسلام

بریڈفورڈ، انگلینڈ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، اَمَّا بَعْدُ!

اَلْحَمْدُلِلّٰہ! حضرت مفتی صاحب دَامَ ظِلُّہٗ کی یہ تحریر نہ صرف کسی خاص طبقے بلکہ امت کے جمیع افراد کے لیے انتہائی کارآمد، نفع بخش اور سودمند ہے۔خواہ ان کا تعلق معاشرے کے کسی بھی طبقے سے ہو، مشائخ عظام، علمائے کرام، مدرسین کرام، واعظین کرام، طلبہ، الغرض عوام وخواص سب کے لیے یکساں مفید ہے۔ یہ تالیف اَلِیف جہالت کے اس دور میں روشنی کا چراغ ہے، گم گشتۂ راہ کو ساحل مراد تک پہنچانے کے لیے ایک مربّی اور مرشد کا کام دینے والی ہے۔لَارَیْب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' اسم بامسمّٰی ہے۔تحریر میں نام کی معنویت کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے، یہ مفتی صاحب کی فراستِ مومنانہ، جرأتِ رندانہ اور ہمتِ مردانہ کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔آپ نے ''اصلاح عقائدواعمال'' لکھ کر مسلم معاشرے میں جنم لینے والی عقیدہ واعمال کی خامیوں اور برپا ہونے والے فتنوں کا قلع قمع کرنے کا کَمَاحَقّہٗ اہتمام کیا ہے۔آپ نے اُس ضرورت کو پورا کیا جس کی کمی دین کا درد رکھنے والا ہر باشعور شخص نہایت شدت سے محسوس کر رہا تھا، نگاہیں منتظر تھیں کہ دینی حمیت سے معمور کوئی ایسی جامع تحریر منصّۂ شہود پر آئے، جو اہلسنّت وجماعت میں نفوذ کرنے والی خرافات کا سدِّ باب کرسکے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن! اس تحریر نے اس کمی کو پورا کردیا ہے، عربی شاعر

نے درست کہا ہے:

فَاِنَّ فَقِیْھًا وَاحِدًا مُتَوَرِّعاً
عَلٰی اَلْفِ ذِیْ زُھْدٍ تَفَضُّلُ وَاعْتَلٰی

ترجمہ:''ایک صاحب تقویٰ فقیہ ہزارزاہدوں پرفضیلت اور بلندی رکھتا ہے''۔

حضرت مفتیٔ اسلام مفتی پاکستان نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے، ان کی اس مختصر مگر جامع تجدیدی تحریر سے اسلاف کے کردار کی جھلک نظر آتی ہے اور انداز ایسا دلنشیں ہے کہ زخم پر نمک نہیں چھڑکتے، بلکہ مرہم رکھتے ہیں، واویلا اور شوروغوغا نہیں کرتے بلکہ علاج مہیا کرتے ہیں، اس کا قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

امیر المومنین، امام المسلمین، اسد اللہ الغالب حضرت علی المرتضیٰ کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْھَہُ الْکَرِیْم کا یہ فرمان کتنا دلنشین ہے:

مَا الْفَضْلُ اِلَّا لِاَھْلِ الْعِلْمِ اِنَّھُمْ
عَلَی الْھُدٰی لِمَنِ اسْتَھْدٰی اَدِلَّاءُ
وَوَزْنُ کُلِّ امْرِیءٍ مَا کَانَ یُحْسِنُہٗ
وَالْجَاھِلُوْنَ لِاَھْلِ الْعِلْمِ اَعْدَاءُ
فَفُزْ بِعِلْمٍ وَلَا تَجْھَلْ بِہٖ اَبَدًا
اَلنَّاسُ مَوْتٰی وَاَھْلُ الْعِلْمِ اَحْیَاءُ

ترجمہ:''فضیلت تو صرف اہلِ علم کے لیے ہے، وہ خود بھی ہدایت پر ہیں اور دوسروں کی ہدایت کا وسیلہ بھی بنتے ہیں۔ ہر شخص کی قدرومنزلت کا مدار اس کے حسنِ عمل پر ہوتا ہے اور جاہل لوگ اہلِ علم کے دشمن ہوتے ہیں۔پس تو علم سے کامیابی حاصل کر اور جہالت سے ہمیشہ کنارہ کش رہ، اس لیے کہ علم والے ابدی زندگی پاتے ہیں اور

جاہل زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہوتے ہیں،یعنی وہ صحتِ عقیدہ اور حسنِ عمل کی سعادت سے بہرہ ورنہیں ہوتے۔

حضرت مفتی صاحب کی یہ مساعی جمیلہ جویانِ حق کے لیے نہ صرف قابل تقلید ہیں بلکہ واجب التقلید ہیں،مرزا اسداللہ خاں غالب نے کیا خوب کہا ہے:

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے
ادائے خاص سے غالب ہوا نکتہ سرا
صَلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم العالیہ والقدسیہ کا سایہ درازتر فرمائے اور آپ کی اس سعی کامل سے ہم سب کو فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے،ایں دعا از من و جملہ جہاں آمین باد۔

حضرت علامہ قاری محمد طیب دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ

مہتمم جامعہ رسولیہ اسلامک سنٹر، مانچسٹر، یوکے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حامداً ومصلیاً!

مجھے مفتی اسلام مفتی اعظم پاکستان علامہ مفتی محمد منیب الرحمن حفظہُ اللہُ المنّان عن شرورِ اھل الزمان کی تصنیف کردہ کتاب ''اصلاحِ عقائد واعمال'' بذریعہ ای میل موصول ہوئی، جسے میں نے طائرانہ نظر سے پڑھا ہے۔مفتی صاحب قبلہ نے اصلاحِ عقائد واعمال کے لیے مجاہدانہ اقدام فرمایا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم سے نوازے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعتِ کبریٰ سے بہرہ ورفرمائے۔

عقائد کے حوالہ سے آپ نے درج ذیل امور کی وضاحت واصلاح فرمائی ہے:

(۱) شریعت وطریقت کو باہم متضاد سمجھنے کا رد

(۲) کفرلزومی والتزامی میں واقع لطیف فرق کو واضح کرنا کہ اس فرق کو سمجھے بغیر بعض غیرمحقق علماء تکفیر بازی کرکے فساد برپا کرتے ہیں۔

(۳) کن اصول سے انحراف کرتے ہوئے کوئی شخص اہلسنّت سے خارج ہوتا ہے، اس کی وضاحت

(۴) یہ وضاحت کہ تفضیلی فرقہ اہلسنّت سے خارج ہے

(۵) صحابہ کرام اور اہل بیت عظام کے مراتب کے بیان میں اعتدال کی اہمیت

(۶) شفاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بعض ناپختہ واعظین کا یوں بیان کرنا کہ گویا سب گناہوں کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے، اس کا رد۔

اصلاح اعمال کے حوالے سے قبلہ مفتی محمد منیب الرحمن مدظلہ نے مروّجہ طریقے پر محافل میلاد ونعت خوانی کی مجالس میں نفوذ کرنے والی بعض خرابیوں کی

درست نشاندہی فرمائی ہے، جیسے:

(۱) گانوں کی طرز پر پڑھی جانے والی نعتوں کا رواج

(۲) پیشہ ور خطباء اور نعت خوانوں کا عشقِ مصطفیٰ ﷺ کو اپنے دنیا سنوارنے کے لیے کاروبار بنالینا، یہ آیات اللہ کا ثمن قلیل سے اشتراء کے مثل ہے، گاہک کی تجوری بھاری ہو توعشقِ مصطفیٰ مہنگے داموں بکتا ہے، ہلکی ہو تو سستا سودا ہوجاتا ہے۔

(۳) میلاد النبی ﷺ کے جلسہ وجلوس کے لیے پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر راستے بند کردینا، مردوزن کا اختلاط، کعبۃ اللہ اور روضۂ رسول کی شبیہیں بنا کر لوگوں کی عقیدت کا استحصال کرنا اور نذرانے جمع کرنا۔

(۴) نقابت ایک پیشہ بن گیا ہے، بعض نقیبانِ محفل خلافِ شرع وجاہلانہ تک بندیاں کرتے اور اہل مجلس کا اکثر وقت ضائع کرتے ہیں، اس کی قباحت۔

مفتی صاحب قبلہ دامت برکاتہم العالیہ نے پیری مریدی کے مروجہ طریقہ کی قباحتوں کو بھی کھول کر بیان فرمایا ہے اور شیخ طریقت کی شرائط پر روشنی ڈالی ہے اور مزارات پر ہونے والی خرافات کا رد لکھا ہے، آپ نے رمضان المبارک میں ٹی وی چینلز پر بپا کی گئی قباحتوں کی بھی خوب نشاندہی فرمائی ہے۔

اللہ رب العزت قبلہ مفتی صاحب دام اقبالہ اور آپ کے مخلص رفیق کار حضرت علامہ مفتی وسیم اختر مدنی اور دیگر معاون مفتیان کرام کو جزائے جزیل وانعامِ عمیم عطا فرمائے: ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

نوٹ: عرض ہے کہ مفتی صاحب قبلہ یہ بات بھی شامل فرمادیں کہ صحیح تلفظ کے ساتھ قرأتِ قرآن خصوصاً امام کے لیے کس قدر اہم ہے، ہمارے ائمہ کرام کی ایک بڑی اکثریت مخارج وصفات لازمہ میں لحن جلی کی مرتکب ہے حتیٰ کہ معانی تک بدل جاتے ہیں اور نماز فاسد ہوجاتی ہے۔ ائمہ کرام اس سارے بوجھ کو سر پر لیتے ہیں، اسی طرح خشخشی ڈاڑھی والے ائمہ بھی میدان میں آگئے ہیں، اس کی حوصلہ شکنی پر بھی آواز اٹھنی چاہیے۔

حضرت علامہ غلام ربانی افغانی دَامَتْ بَرَكَاتُهُمُ الْعَالِيَة

بانی فیضان اسلام انٹرنیشنل، برطانیہ

ترجمان جماعت اہلسنّت برطانیہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اسلام دین فطرت اور صبحِ قیامت تک ہر دور، ہر قریہ اور ہر رنگ ونسل سے وابستہ بنی نوع انسان کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ فکر ونظر سے لے کر قلب وروح تک کے لیے عقائد واعمال کا ایسا شجرِ ثمر بار ہے، جس کی ہر کلی مشامِ جاں کے لیے عطر افشاں اور ہر خوشہ جسم وروح کے لیے تسکین وراحت کا سامان لیے ہوئے ہے۔

ابلیس کو حضرت آدم کی جنت کی سکونت گوارا نہ تھی، وہ بھلا کیسے اولادِ آدم کو دخولِ جنت اور حصولِ رضوان کی اس راہ مستقیم پر گامزن رہنا گوارا کرسکتا تھا، سوذریت آدم کو جادۂ حق سے بہکا کر افراط وتفریط کے گہرے اور گدلے سمندر میں غوطہ زن کرنے کی مشق میں ہمہ وقت مصروف ومشغول ہے۔

مفتی اعظم پاکستان استاذی المکرم پروفیسر مفتی منیب الرحمن دامت برکاتہم العالیہ کی تدریسی، تقریری، تحریری اور تنظیمی صلاحیتوں کے اپنے پرائے سب معترف ہیں۔ بطورِ خاص اس پرفتن دور میں حال ومستقبل کے خطرات کا ادراک کرتے ہوئے بلاخوفِ لومۃِ لائم بصیرت افروز اور مدبرانہ انداز سے سوادِ اعظم اہلسنّت وجماعت کی ''اصلاحِ عقائدواعمال'' کے عنوان سے رہنمائی فرمائی ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے:

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشند خدائے بخشندہ

انتہائی اہم موضوعات پر اس قدر اچھوتا اور دلکش انداز کہ فقیر نے از اول تا

آخر پڑھ کر ہی دم لیا، اس میں دلیل واستدلال کا ایسا انداز اور ملّت کا ایسا درد ہے جو قاری کو اپنا اسیر بنالیتا ہے اور ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ للّٰہیّت اور اخلاص پر مبنی اس کاوش کو علومِ نبوت اور ائمۂ دین وسلَف صالحین کے علمی وروحانی فیضان کی ایسی مصباح بنائے، جو اہلِ ایمان واہلسنّت وجماعت کے قلوب واذہان میں مشکوٰۃ کی طرح انوارِ ہدایت کی تجلیات فروزاں کرے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ اہلسنّت اور اہل اسلام پر تادیر قائم فرمائے۔

❁

حضرت علامہ محمد نصیر اللہ نقشبندی زِیْدَ مَجْدُھُمْ

خطیب مدینہ مسجد بولٹن، یو کے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمدللہ رب العالمین! آج مفتی اعظم پاکستان فقیہِ ملت استاذ العلماء سیّدی واستاذی حضرت علامہ پروفیسر مفتی منیب الرحمن صاحب دامت برکاتہم کی تصنیف جلیل ''اصلاح عقائد واعمال'' کے مطالعہ سے فارغ ہوا۔ مفتی صاحب قبلہ نے دور حاضر میں ہمارے معاشرے میں بالعموم اور اہلسنّت وجماعت کی بعض محافل میں بالخصوص پائی جانے والی بدعات ومنکرات کی نہ صرف نشاندہی فرمائی بلکہ اس کا حل بھی اپنے اکابر کے مستند حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا۔ یہ کتاب موضوع کے اعتبار سے جامع، معلوماتی اور اہلسنّت وجماعت کی موجودہ حالت زار کی عکاس ہے، نیز خرافات وبدعات کی اصلاح قرآن وحدیث، عبارات ائمہ دین متین اور فتاویٰ رضویہ کی روشنی میں ایک سعیِ جمیل ہے۔ امید ہے کہ مشائخ عظام، علماء وخطبائے کرام اور دین کا درد رکھنے والے اہلسنّت اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس پیغام کی ترویج واشاعت اور ابلاغ میں اپنا مثبت کردار ادا کریں گے۔

مفتی اعظم پاکستان نے اپنی دینی اور شرعی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اِحقاقِ حق اور اِبطال باطل کیا ہے۔ میں اِس تصنیف جلیل پر مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن حفظہ اللہ تعالی کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد بہت سے لوگوں کے مفادات پہ زد پڑے گی اور بلیک میل کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کا پروپیگنڈا قرآنِ کریم کے کلماتِ مبارکہ کے مطابق ''جُفاء'' اور ''هَبَاءً مَّنْثُوْراً'' ثابت ہوگا اور یہ کتاب قرآنِ کریم کی اس

بشارت کا مصداق بنے گی: ’’وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ‘‘۔
(ترجمہ:) ’’اور جو چیز لوگوں کے لیے نفع رساں ہے، وہ زمین میں قرار پاتی ہے،
(الرعد:۱۷)‘‘۔

مفتی اعظم پاکستان اسلام اور اہلسنّت کی آبرو ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالی اپنے فضل وکرم سے ان کو ہمیشہ سلامت رکھے، معاندین کے شر اور حاسدین کے حسد سے محفوظ رکھے۔ میں اس موقع پر اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت مجدد دین ملت امام احمد رضا محدث بریلی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا یہ شعر قبلہ مفتی اعظم کی نذر کرتا ہوں:

خوف نہ رکھ رضا ذرا ، تو تو ہے عبد مصطفیٰ
تیرے لیے امان ہے، تیرے لیے امان ہے

۞

حضرت علامہ مفتی محمد قمر الحسن قادری دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ

مدرس وامام وخطیب جامع مسجد النور
النوراسلامک سنٹر آف گریٹر ہیوسٹن
چیئرمین رویت ہلال کمیٹی آف نارتھ امریکا
ہیوسٹن، امریکا

اصلاح عقائدواعمال وقت کی اہم ترین ضرورت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن صاحب مدظلہ العالی کی تازہ ترین تصنیف ''اصلاحِ عقائدواعمال'' کا سرسری طور پر مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اہلسنّت وجماعت کی تنقیح کی ضرورت برسوں سے محسوس کی جارہی تھی۔ بعض وہ امور جوعوام اہلسنّت میں شعوری یا لاشعوری طور پر درآئے تھے اور ان سے مسلکی تشخص مجروح ہورہا تھا، ان کے تزکیہ کی ضرورت تھی۔ مستحب اور باعث برکات ہوتے ہیں مگر فرائض وواجبات سے صرفِ نظر کرکے مستحبات کو حرزِ جان بنانا یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح ضروریات دینیہ میں نرم گوشے تلاش کرنا یہ بھی ہلاکت کا موجب ہے۔ ایک عرصے سے ان امور کی اصلاح کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ علماءِ حق اپنی دینی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوں اور اپنے عہد کے لوگوں پر حجت قائم کریں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! حضرت مفتی صاحب نے اس ضرورت کو احسن طریقے سے پورا کرکے علمائے اہلسنّت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

آپ کے خطابات یا نجی مجلسوں میں اس درد کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ امریکا جب بھی آپ تشریف لائے تو اپنے خطابات میں اس کا برملا اظہار کیا اور نجی مجلسوں میں بھی اس پر اظہار خیال فرمایا۔ آپ کی گفتگو سے ملت کا درد وکرب ظاہر ہوتا ہے۔

مذکورہ کتاب کو سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ آپ جو بات کہتے ہیں صرف دعویٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کو قرآن وسنت اور اقوال سلف سے مدلل بھی فرماتے ہیں۔ آپ کے فتاویٰ علماء وعوام دونوں میں یکساں مقبول ہیں۔ زبان عام فہم، رواں اور شستہ استعمال فرماتے ہیں۔ جو بھی بات کہتے ہیں انتہائی سلیقہ اور ثقاہت سے کہتے ہیں۔

اس کتاب میں بھی یہ ساری خوبیاں مذکور ہیں۔ میں نے بالاستیعاب تو نہیں بلکہ سرسری طور پر دیکھا تو کتاب کو انتہائی مفید پایا۔ اس کو زیادہ سے زیادہ شائع کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ مجموعی طور پر کتاب لائق تبریک ہے مگر فہرست مضامین نہ ہونے کا احساس ہوا۔ اگر اس میں تفصیلی نہ سہی اجمالی فہرست بھی شامل کردی جائے تو قاری کے لیے آسان ہوگا۔

اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے اور عوام کی اصلاح میں یہ کتاب مفید تر ثابت ہو۔ آمین یارب العالمین بجاہ حبیبہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔

❁

حضرت علامہ منظرالاسلام ازہری دَامَتْ بَرَکَاتُہُمُ الْعَالِیَۃ

اسلامک سینٹر آف کیری، نارتھ کیرولینا، امریکا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقدیم علیٰ کتاب ''اصلاح عقائدواعمال''

مسلمان بالعموم اور برصغیر کے سنی بریلوی مسلمان خاص طور پر جس پستی، ذلت اور علمی تنزلی کا شکار ہیں، اس کا حال سب کے سامنے ہے۔ ترقی کے اسباب میں سب سے اہم علمی برتری اور فکری بالیدگی کا کردار ہے۔ برصغیر کی اس جماعت کا سطحی جائزہ بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ یہ جماعت علمی اور فکری تنزلی میں کسی بھی جماعت سے آگے ہے۔ اس جماعت کے ایک گروہ نے مدرسہ سے سندِ فراغت کو سندِ علم سمجھ لیا ہے، خطابت اور چرب زبانی کو قابلِ فخر صلاحیت تصور کرلیا ہے، قرآن وسنت کی من مانی تشریح کو نکتہ آفرینی بتا کر عوام سے داد و دہش وصول کرنا اپنا شعار بنالیا ہے۔ جھوٹی اور من گھڑت روایتیں بیان کر کے علامۂ زماں اور امام وقت کا خطاب حاصل کرنا اپنا محبوب مشغلہ بنالیا ہے۔ ڈھونگی کا روپ بنا کر صوفی اور روحانی پیشوا بن جانے کا بلند و بانگ دعویٰ کرنا اپنے اور عوام کے لئے اُخروی نجات کا ذریعہ بنالیا ہے۔ ان تمام جاہلانہ اوصاف کے ساتھ ساتھ انہوں نے علم وتحقیق سے خالی فتویٰ نویسی کو ''مسلک'' کی خدمت اور دین کی روح سمجھ رکھا ہے۔ اگر کوئی صاحبِ علم ان کی خامیوں کو اجاگر کر کے اصلاح کی بات کرے، تو ان کے جاہلانہ فتوؤں کی زد میں آجاتا ہے اور ان فتوؤں کو بنیادی دین سمجھ کر ایسے صاحبانِ علم وفکر کے خلاف عوام کو اس حد تک ورغلایا جاتا ہے کہ آپس میں قتل وغارت تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ حال ہی میں ہندوستان کی دوخانقاہوں کے ماننے والوں کے درمیان اور دومفتیانِ کرام کے حامیوں میں تلخ کلامی

اس حد تک بڑھی کہ معاملہ ایک مسلمان کے قتلِ ناحق پر منتج ہوا، وَالْعِیَاذُ بِاللّٰہِ تَعَالیٰ۔

اہلسنّت و جماعت (بریلوی) کا شیرازہ اس طرح بکھر چکا ہے کہ کوئی اس جماعت کا والی ووارث نظر نہیں آتا۔ آپس کے نزاع اور فتوے بازی نے ہر ایک کی شخصیت مجروح کر دی ہے۔ اس پُرفتن ماحول میں مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن صاحب مدظلہ العالی قابل مبارک باد ہیں، کہ انہوں نے ''اصلاح عقائدواعمال'' کتاب لکھ کر اپنی قائدانہ ذمہ داری نبھائی ہے۔ یہ منصب انہیں کا تھا اور انہوں نے اس کا استعمال بھی ایسے وقت پر کیا ہے جب سب زبانیں خاموش، قلم خشک، اور فکر بانجھ ہوچکی ہے۔ اکیسویں صدی میں اہلسنّت و جماعت کے درمیان یہ خرابیاں جوناسور کی شکل اختیار کرچکی ہیں، حضرت مفتی اعظم صاحب نے نہایت حکیمانہ انداز میں اصلاح کی کوشش کی ہے۔ میری نگاہ میں اس کتاب کی اہمیت کے چار اہم پہلو ہیں:

(۱): برصغیر کے اہلسنّت و جماعت کی فکری کج روی عیاں ہوچکی ہے، اس کتاب میں اس کا بھرپور بیان اور مسلک کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔

(۲): عام طرزِ تحریر سے ہٹ کر ان کی کتاب کا اندازِ بیان نہایت عمدہ اور سادہ ہے، اس سادگی میں علمی تحقیق اور فکری جولانیت اپنے عروج پر ہے۔ موجودہ حالات میں برصغیر کے اہلسنّت و جماعت کے درمیان نفوذ کرنے والی خرابیوں پر صرف تنقید ہی نہیں کی، بلکہ مخلصانہ مشورہ اور اصلاحی پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے۔ بعض ایسے مسائل، جن کا تعلق مغربی دنیا کے مسلمانوں سے ہے اور ان میں بھی اعتدال کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، کی نہ صرف نشاندہی کی گئی ہے بلکہ ان کا حل بھی پیش کیا ہے۔

(۳): کتاب کی ترتیب بھی نہایت خوبصورت ہے۔ شروع میں عقیدہ کا مفہوم، ضروریاتِ دین، ضروریاتِ اہلسنّت و جماعت، کفر اور کسی کو کافر کہنے کے اصول، کفری عقائد، کفرِ لزومی اور التزامی، مفتی کی ذمہ داری اور مفتی کا منصب ایسے پیچیدہ مسائل کو

نہایت خوبصورتی کے ساتھ آسان اور سہل انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ایسے علمی مسائل ہیں جن کو سمجھنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر مفتی اعظم پاکستان نے نہایت عام فہم انداز میں ان کو بیان کردیا ہے۔

(۴): ان سب کے ساتھ ساتھ حوالہ اور مصادر میں خاص طور پر یہ التزام کیا ہے کہ جو طبقہ مخاطب ہے، ان کے نزدیک مستند اور قابل اعتماد علماء کے حوالہ جات سے اپنے موقف کو مدلّل کیا ہے، مثلاً: نعت خواں اور مقررین کے جس طبقہ سے گفتگو کی جارہی ہے، ان پر صرف امام احمد رضا فاضل بریلوی ہی کی بات حجت ہے، اس لئے مفتی صاحب نے حوالہ میں جگہ جگہ امام احمد رضا فاضل بریلوی ہی کی توضیح وتشریح کا حوالہ دیا ہے۔ اسی طرح صوفیہ اور خانقاہی گروہ سے خطاب کے ضمن میں خاص طور پر تمام معروف سلاسل کے بانی مشائخ کے اقوال کو نقل کیا ہے تاکہ آج کے نام نہاد صوفی کو کوئی گریز کا راستہ نہ مل سکے۔ الغرض کتاب میں موجود مسائل، کتاب کی ترتیب اور اس کے مصادر وماخذ میں بڑی حکمت اور حسن نظر آتا ہے۔

''خانقاہ اور آستانوں کی بابت شرعی اصلاح'' کے ضمن میں پیشوایانِ سلاسل کے حوالوں کے ساتھ بات کی ہے، جو عام قاری کے لئے سکون اور اعتماد کا باعث ہے، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر اس طبقہ کو پڑھنے لکھنے سے کچھ بھی تعلق ہوتا تو شاید حضرت مفتی صاحب قبلہ کو یہ کتاب لکھنے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی، فَیَا لَلْعَجَب!

تمام مسائل کی طرح ''قضائے عمری'' پر بھی بڑی نفیس اور تحقیقی گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی معقول شرعی عذر کے سبب وقت پر نماز نہیں پڑھ سکا تو جب یاد آئے، اس کی قضا کرلے۔ مگر میری کوتاہ نظر میں یہ مسئلہ تشنہ رہ گیا ہے کہ اگر کوئی شخص دس یا بیس سال یا ایک عرصہ گذر جانے کے بعد اپنی نمازوں کا قضا کرنا چاہتا ہے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہونا چاہئے۔ اگر دس یا بیس سال بعد قضا کرنا جائز ہے تو اس کے ادا

کرنے کا صحیح شرعی طریقہ کیا ہونا چاہئے، یہ رہنمائی بھی کردی جائے تو مسئلہ کی جامعیت اور بھی واضح ہوجائے گی۔

الغرض مفتی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اپنے عہد کے لوگوں پر حجت قائم کی ہے اور وقت کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس کتاب میں اہلسنّت و جماعت کے عقائد کو نہایت شفاف شکل میں پیش کردیا گیا ہے، اس میں اہل دانش کے لئے علمی مواد، عوام کے لئے مشعلِ راہ اور نئی نسل کے لئے دین اسلام کا منہاج موجود ہے، اس کو عام کرنا برصغیر کے مسلمانوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

''اصلاح عقائد واعمال'' پر کچھ بھی اظہار خیال کرنا میں اپنی سعادتمندی سمجھتا ہوں۔ اس پر اظہار خیال میرا منصب نہیں ہے، کیونکہ کتاب کے مؤلف اپنے وقت کے معزز ترین عالم دین اور پاکستان کے مفتی اعظم ہیں اور میری لیاقت نہ ہونے پر میری علمی کم مائےگی اور بے بضاعتی سب سے بڑی دلیل ہے، مگر حضرت مفتی اعظم پاکستان کا حکم تھا، جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی، اس لئے اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈال دیا ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس کتاب کے نفع کو زیادہ سے زیادہ عام فرمائے۔

حضرت علامہ فیضان المصطفیٰ قادری دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ

نبیرۂ صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی
پرنسپل النورانسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سائنسز
النوراسلامک سنٹر آف گریٹر ہیوسٹن امریکا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِوَلِیِّہٖ وَالصَّلاَۃُ وَالسَّلاَمُ عَلٰی نَبِیِّہٖ

حضرت مفتی منیب الرحمن صاحب قبلہ کی تصنیف لطیف ’’اصلاح عقائدواعمال‘‘ پیش نظر ہے، جسے اصلاح کی ایک مخلصانہ کوشش کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مفتی صاحب کی تقریر وتحریر کا مطمحِ نظر کلی طور پر اصلاح ہی رہتا ہے، لیکن خاص بات یہ ہے کہ موصوف ان مسائل پر بھی کھل کر لکھتے اور بولتے ہیں جن پر بولنے اور لکھنے کی ہر ایک کو ہمت نہیں ہوتی، اس کے لیے جرأت، حق گوئی، بے باکی، اور انذار وتبشیر میں جوتوازن درکار ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دولت سے مالا مال فرمایا ہے۔

مفتی صاحب نے اِس رسالہ میں اُن خرابیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اہلسنّت وجماعت میں معمولاتِ اہل سنت کے عنوان سے درآئی ہیں اور اُن خرابیوں کو خوب واضح کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحب کو استدلالی کلام کرنے کی جو مہارت عطا فرمائی ہے، وہ آپ کی انفرادی شان ہے۔ دعوت وارشاد کا اپنا ایک فطری اسلوب ہوتا ہے، جس کی بنا پر مخاطَب داعی کی بات پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے، ورنہ اِس دور میں بہت بڑے طبقے نے واعظین اور علماء کی باتوں سے اپنے کانوں کو بند کرلیا ہے، اگرچہ اِس کی وجوہ کئی ہوسکتی ہیں، لیکن حق بات یہ ہے کہ استدلال میں متانت اور اسلوب میں کشش ہوتو آج بھی دلوں کے بند دریچے کھل سکتے ہیں۔ اس

رسالہ کی شان بان یہی ہے کہ جس مسئلہ کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے، اس کے تمام لازمی عناصر کے ساتھ ساتھ اس کے دعوتِ اسلوب کا بھرپور لحاظ رکھا ہے۔ ہر بات کو مستند حوالوں سے آراستہ کرکے اس قدر مدلل اور متین فرمادیا ہے کہ اس پر حذف واضافہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اب ضرورت ہے کہ ہم اسے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت دے کر اخلاص کے ساتھ نافذ کرنے کی کوشش کریں۔

ہماری زبوں حالی کی ایک تصویر یہ ہے کہ لوگ بھی اپنی اپنی پسند کے علماء سے جڑ گئے ہیں، جس کی بنا پر وہ کارِ خیر میں تعاون سے اس لیے محروم رہ جاتے ہیں کہ یہ فلاں عالم کی طرف سے ہے، فلاں کی طرف سے نہیں ہے، یہ ایک طرح کی عصبیت ہے، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پسند وناپسند کا مدار شخصی وابستگی پر نہیں، بلکہ دلیلِ حق پر ہونا چاہیے اور حق قبول کرنے کے لیے اپنے دل ودماغ کے دریچے کھلے رکھنے چاہییں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا، (سورہ محمد: ۷)‘‘، مدد کرنے کا رہنما اصول یہ ہے: ’’نیکی اور پرہیزگاری کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی کے کام میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو، (مائدہ: ۲)‘‘۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر مفتی منیب الرحمن صاحب قبلہ کی اس دعوتِ خیر پر ہم سب لوگ ہم آواز اور ہم آہنگ ہوجائیں، تو جلد اس کے بہ سے بہتر نتائج برآمد ہوں گے، ورنہ اس کوشش پر مفتی صاحب اور ان کے اعوان وانصار کے لیے جو اجر بارگاہ رب العزت میں مقدر ہے، وہ ان کو مل کر رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہر عمل خیر میں داعئ حق کے دل وجان سے معاون بنیں اور ہر برے کام کے آگے سدِّ راہ بنیں، آمین بجاہ حبیبہ سیّدالمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

حضرت علامہ مقصود احمد قادری دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَۃ
ناظمِ اعلیٰ جماعتِ اہلسنّت، نارتھ امریکا
خطیب جامع مسجد السلام، نیوجرسی، امریکا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مصلحِ امت، نبّاضِ ملت، مفکرِ اسلام، استاذ العلماء والفضلاء، مبلغِ اسلام، محقق اہلسنّت، پاسبانِ مسلکِ رضا، فقیہِ عصر، یادگارِ اسلاف، عالمِ ربانی، مخدومِ اہلسنّت، پیکرِ اخلاص مفتیٔ اعظم پاکستان علامہ مفتی منیب الرحمن مُدَّ ظِلُّہُ الْعَالِی کی تصنیف ''اصلاحِ عقائدواعمال'' کا بغور مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا، صرف عقیدت کی نظر سے نہیں، بلکہ بعض مقامات کو تنقیدی نظر سے بھی پڑھا۔

اس پُرفتن، مادّہ پرست، مصلحت اندیش، مبالغہ خیز، افراط وتفریط سے لبریز، صلحِ کلّیت اور بےعملی کے دور میں سوادِ اہلسنّت وجماعت کا شیرازہ بکھرتا جارہا ہے۔ بعض مفاد پرست ائمہ ومشائخ، خودغرض واعظین وخطباء، موقع پرست قائدین، دین فروش قصیدہ خواں اور نقیب اسلامی تعلیمات اور معمولاتِ اہلسنّت میں خودساختہ تشریحات وایجادات، من مانی تاویلات، بدعات وخرافات، غلوفی الدین، نت نئی خرافات اور افراط وتفریط کے نشے میں مست اور مخمور ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر دین اور مسلک سے بیزاری پروان چڑھ رہی ہے۔ بعض اہلِ فکر ونظر کے دل خون کے آنسو رو رہے ہیں، ان مخلصین کے خلوص سے نکلنے والی آہیں اور دعائیں مکینِ گنبدِ خضریٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسُّل سے مستجاب اور مقبول ہوئیں اور قادرِ مطلق نے اس بارِ عظیم اور خدمتِ جلیلہ کے لیے مفتی منیب الرحمن کو یہ عظیم سعادت عطا فرمائی۔

آپ کا وجود اہلسنّت کے لیے باعثِ افتخار اور لائقِ تشکُّر ہے۔ خالقِ کائنات

نے آپ کو علم وعمل، اَخلاقِ حسنہ، اَفکارِ عالیہ، صبر واستقامت، حق گوئی وبےباکی، وسعتِ قلبی ودوراندیشی، تعلیم وتدریس، تحریر وتقریر، تذکیر ونصیحت، فصاحت وبلاغت، ذوقِ تحقیق، فتاویٰ اور کالم نویسی، تفقُّہ فی الدین، تعمُّق فی المسائل، تبیینِ حق، دینی وقار، شخصی وجاہت، فکرِامت، استحضارِ علمی اور ابلاغِ مبین کی صفات سے موصوف فرمایا ہے۔ آپ نے نہ صرف امراض کی صحیح تشخیص کی ہے، بلکہ مکمل علاج بھی تجویز فرمایا ہے۔

کتاب کا ایک ایک حرف محبت، خلوص اور اصلاح کے جذبے سے سرشار ہے، ہر بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے، شاعر نے بجا طور پر کہا ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

مفتی صاحب اس قدر قادرالکلام اور خوش اَخلاق ہیں کہ سخت سے سخت بات کو بڑے دلنشیں انداز اور محبت وشفقت آمیز لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ نصیرِ ملّت علامہ صاحبزادہ پیر سیّد نصیرالدین نصیر رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے اصلاحِ امت کے لیے ان الفاظ میں جھنجھوڑا تھا:

چل جادۂ مصطفیٰ پہ، گمراہ نہ بن
محتاج ہے خِلقۃً، شہنشاہ نہ بن
آئینِ شریعت میں، نہ لا تبدیلی
ارے تو بندۂ اللہ بن، اللہ نہ بن

مفتی صاحب نے کلمۂ حق بلند کردیا ہے، ابلاغِ مبین، تبیینِ حقائق، اِعلاءِ کلمۃ الحق اور اِتمامِ حُجت کا حق ادا کردیا ہے، اس پر لبیک کہنا ہر ذی شعور سنی کی ذمے داری ہے۔ بحرِ ظلمات وبدعات، صحرائے غفلت وتساہل اور وادیٔ جہالت وظلمت میں چراغِ حق روشن کردیا ہے۔ اذانِ حق وصداقت اور اِعلاءِ کلمۃ الحق کا منظّم آغاز کردیا ہے۔ اب ہماری ذمے داری ہے کہ مفتی صاحب کے دست وبازو بن کر اس کتاب کو عام

کریں۔ محققین مفتیانِ کرام اور اربابِ علم ودانش سے گزارش ہے کہ اپنی سفارشات، تجاویز اور تحفظات (اگر کوئی ہوں) تحریری طور پر براہِ راست مفتی صاحب کو پیش فرمائیں تاکہ یہ سلسلہ جاری وساری رہے۔

اسلامی تنظیموں، دینی اداروں، جامعات اور مخیر حضرات کو بڑھ چڑھ کر اس کتاب کی نشر واشاعت میں حصہ لینا چاہیے۔ راقم الحروف بارہ سو کتابوں کی مفت تقسیم کے لیے اخراجات برداشت کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس کتاب کو عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی شائع کرنے کو ترجیحات میں شامل کیا جائے۔

اس کتاب میں مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعالیٰ کے مسلک کی باحوالہ ترجمانی کی گئی ہے۔ توازن واعتدال، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، امتِ وَسَط اور خیرِ امت کا حسین امتزاج ہر صفحے سے عیاں وروشن ہے، شاعر نے کہا ہے:

کشتیٔ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

آیئے! ہم سب مل کر اپنے اپنے حصے کا چراغ جلائیں اور منظّم ومتحد ہو کر اصلاحِ امت کی اس خالص دینی اور غیر سیاسی تحریک کے فروغ کے لیے مُمِدّ ومعاون بنیں، احمد فراز نے کہا تھا:

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کا کوئی چراغ جلاتے جاتے

دعا ہے: اللہ کریم مفتی صاحب کے علوم وفیوض اور عمر وصحت میں برکتیں عطا فرمائے، ان کے اور ان کے معاونین کی اس کاوش کو قبولِ عام عطا فرمائے، آمین۔

حضرت علامہ پروفیسر ڈاکٹر غلام زرقانی قادری دَامَتْ بَرَکَاتُھُمُ الْعَالِیَة

خَلَفِ ارشد رئیس التحریر حضرت علامہ ارشد القادری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعالیٰ
چیئرمین حجاز فاؤنڈیشن
ہیوسٹن، امریکا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت علامہ مفتی منیب الرحمن چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان کی فکر انگیز تصنیف ''اصلاح عقائد واعمال'' پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ گو یہ افکار وخیالات موصوف کے ہوں، تاہم حقیقت یہ ہے کہ صرف الفاظ وبیانات ان کے ہیں، آواز اہل سنت وجماعت کے ہر فرد کی ہے اور کہنے دیا جائے کہ کسی بھی فکری کاوش کے حوالے سے یہ اعزاز بہت ہی قیمتی بھی ہے، وقیع بھی اور قبولیت عام کی سند بھی۔

مفکر ملت حضرت مفتی منیب الرحمن صاحب نے پیش نگاہ کتاب میں تخمینی اعداد وشمار اور تصوراتی حالات وواقعات پر اپنی بات کی بنیاد نہیں رکھی ہے، بلکہ انہوں نے معاشرے میں پروان چڑھتے رسم ورواج کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے اور یہ اصلاح احوال کے لیے ایک سلجھی ہوئی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ امر واضح رہے کہ یہ سارے رسم ورواج بنام ''اسلام'' ہو رہے ہیں، ظاہر ہے کہ انہیں یوں ہی رہنے دیا جائے تو عجب نہیں کہ مستقبل بعید میں دین اسلام کی درست تصویر کی نشاندہی مشکل ہو جائے۔

مجھے یاد آیا کہ علمائے کرام نے مستحبات اعمال کے حوالے سے حد درجہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ فرض نمازوں کے بعد دعا مانگنے کے لیے رخ تبدیل کر لیا جائے،

اذان واقامت سے پہلے 'الصلوٰۃ والسلام' کی صدالگانے کے لیے لب ولہجہ تبدیل کرلیا جائے، نماز جنازہ کے بعد دعامانگتے وقت صفوں کی ہیئت نماز کی سی نہ رہے، وغیرہ دسیوں ایسے مسائل ہیں، جن کے بارے میں علمائے کرام نے کوشش کی ہے کہ شرعی ضابطہ مستحبات سے ہمیشہ ممتاز رہے اور کسی بھی وقت لوگوں کو دونوں کے درمیان تمیز کرنے میں چنداں دشواری نہ ہو۔

تاہم یہ امر دوپہر کی دھوپ کی طرح عیاں ہے کہ عہد حاضر میں مباحات کو ''اظہار محبت وعقیدت'' سے کچھ اس طرح جوڑ دیا گیاہے کہ دین کے نام پر دنیاوی مفادات زیادہ سے زیادہ حاصل ہوسکیں۔ گفتگو کی اس منزل پر پہنچ کر مجھے یہ کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا کہ بنام دین، دنیا حاصل کرنے کی کوشش، دنیا کے نام پر دنیا حاصل کرنے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ، قابل مذمت اور باعث ننگ وعار ہے۔

کان قریب کریں تو عرض کروں کہ مفتی صاحب قبلہ نے جو گفتگو کی ہے، اس سے مجھے توقع نہیں کہ عام لوگ فیضاب ہوسکیں، تاہم یہ امید ضرور ہے کہ مفتیان کرام، علمائے عظام اور ارباب علم ودانش توجہ دیں تو واقعی معاشرے میں انقلابی تبدیلی آسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں اب ہماری ذمہ داری پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے آیئے ہم سب عہد کریں کہ متذکرہ اصلاحی تحریک کے دست وبازو بن کر اسے کامیابیوں سے ہمکنار کریں گے۔

❁

حضرت علامہ (مفتی) محمد منظر مصطفی نازؔ صدیقی اشرفی
خطیب جامع البیت المکرم مسجد
صدر مدرس سنی مدرسہ نور محمدی
بوناکے، ماریشش، افریقا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آفاقی وہمہ گیر مذہب کا نام اسلام، اس کے ماننے والوں کا نام مسلمان، قومِ مسلم کی مذہبی زندگی، معاشی زندگی، معاشرتی زندگی، سماجی زندگی اور سیاسی زندگی کا دستور وقانون اور مآخذِ اصلیہ قرآن وحدیث ہیں۔ دنیا کے جملہ علوم وفنون اسی بحر ناپیدا کنار کا فیضان ہیں۔ اعلانِ عام ہے ''تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ''، لیکن اس معجز ومقدس قرآن کے معانی اور مطالب تک رسائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ بلکہ اس بحر بیکراں کا مشاق غوطہ زن بھی اپنی علمی اور فکری بساط کے مطابق ہی اس میں سے کچھ نکال پاتا ہے، یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر نتیجۂ فکر درست ہی ہو، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا''۔

احادیث رسول میں بھی یہی معاملہ ہے کہ صحاح، ضعاف، موضوعات، مقبول ومردود اور ناسخ ومنسوخ کے بارے میں کماحقہٗ آگہی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح مفاہیم اخذ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں:

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشہ دیکھے
دیدۂ کور کو کیا نظر آئے کیا دیکھے

قرآن کریم کے تراجم وتفاسیر اور احادیثِ نبی کریم ﷺ کی متون، تراجم وشروح اس دور میں یقیناً دستیاب ہیں، لیکن ان سے کماحقہٗ استفادہ کرنے اور مسائل کا

استنباط کرنے کے لیے مطلوبہ مہارت لازمی ہے اور پھر اپنے عہد کے جدید مسائل کا بھی ادراک ضروری ہے۔محض عربی دانی کافی نہیں ہے،اسی مطلوبہ علمی قابلیت اور اجتہادی صلاحیت کے فُقدان کے باعث رافضی ،خارجی ،قدری، جبری ،معتزلی جیسے گمراہ فرقے وجود میں آئے اوران کی عقلیت پر مبنی حجت بازی نے اسلام کونقصان پہنچایا،لیکن ہر دور میں علمائے حق نے ان فتنوں کا سدِّ باب کیا اوراسلام کے روشن چہرے کو ہمیشہ درخشاں،تاباں اورفروزاں رکھا۔

آج کے اس پرفتن ماحول میں بھی اگرچہ افکار میں تعصب اورتشدد سکّۂ رائج الوقت بن گیا ہے،لیکن الحمدللہ! شریعت وطریقت کے اصولوں کے شناور بھی موجود ہیں۔اسی طرح اگرچہ دورِحاضر میں تعلیمی انحطاط اور عملی بے راہ روی کے سبب باکمال اساتذہ اورمدرسین کا فقدان ہے،تبلیغِ دین کے لیے رضائے الٰہی کا جذبہ رکھنے والے خطبائے کرام کی تعدادبھی تشویشناک حدتک کم ہے،لیکن ایسا بھی نہیں کہ علمائے ربّانیین کا بالکل قحط ہواورعلم کا میدان ہوس کے پجاریوں کےحوالےکردیاجائے۔

اس تناظر میں ایسی جامع اورمختصر کتاب کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی ،جس سے کم علم اورمتوسط علم رکھنے والے دیندارطبقات خودبھی فائدہ اٹھاسکیں اورقومِ مسلم کوصراطِ مستقیم پرقائم گامزن کرتے رہیں۔

اس ضرورت کومحسوس کرتے ہوئے اپنی پیرانہ سالی کے باوجودحضرت علامہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے عزم وشجاعت اورعلمی وقار کے ساتھ''اصلاحِ عقائد واعمال'' کی صورت میں یہ حسین وجمیل گلدستہ مرتّب کیاہے۔

معمارِقوم،نباضِ ملت ،مفکر اسلام حضرت علامہ مولانا مفتی منیب الرحمن صاحب قبلہ مدظلہ العالی بلاشبہ عصرحاضر کے ایک عظیم فقیہ،جید عالم دین ، سچے عاشق رسول اورسوادِاعظم مسلک اہلسنت وجماعت کے حقیقی رہنما ہیں،جو خدمت دین و

خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہیں۔

مفتی صاحب قبلہ نے اس کتاب میں دورحاضر میں ہمارے معاشرے میں بعض محافل میں پائی جانے والی بدعات ومنکرات کی نشاندہی فرماکراسکاحل بھی بتایا۔ کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے بعدقاری اس بات کوتسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ یہ کتاب موضوع کے اعتبار سے جامع ،مدلّل اورمفید معلومات کی حامل ہے، اہلسنت وجماعت کےحالات کی صحیح عکاس ہےاورمستندحوالہ جات سےمزین ہے۔

میں مفتی صاحب کواس سعی جمیل پرتہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں، نیز دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اس سعی جمیل کومقبول وماجورفرمائے ،مفتی صاحب کو ہمیشہ سلامت رکھےاوردارین کی سعادتوں سے مالامال فرماتے ہوئےمزید دینی خدمات کرنے کی توفیق عطافرمائے،آمین بجاہ سیّدالمرسلین ﷺ۔

تائیدات وتصدیقات

نمبرشمار	اسمائے گرامی مفتیانِ کرام	ادارہ
1	علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی	مہتمم جامعہ نضرۃ العلوم، کراچی
2	علامہ مفتی محمد رحیم سکندری	شیخ الحدیث جامعہ راشدیہ پیر جوگوٹھ، کراچی
3	علامہ مفتی محمد جان نعیمی	شیخ الحدیث دارالعلوم مجددیہ نعیمیہ کراچی
4	علامہ مفتی محمد ابوبکر صدیق شاذلی	استاذ درجہ تخصص فی الفقہ والافتاء جامعہ نعیمیہ، کراچی
5	علامہ رضوان احمد نقشبندی	مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ انوار القرآن، کراچی
6	علامہ مفتی محمد اکمل مدنی	مہتمم وشیخ الحدیث الفرقان اسکالرز اکیڈمی، کراچی
7	علامہ مفتی محمد اسماعیل نورانی	مفتی واستاذ الحدیث جامعہ انوار القرآن، کراچی
8	علامہ ڈاکٹر سید جمیل الرحمٰن شاہ	پیر آف کامونکی شریف
9	علامہ احمد علی سعیدی	شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ کراچی
10	علامہ مفتی محمد وسیم اختر مدنی	استاذ درجہ تخصص فی الفقہ والافتاء جامعہ نعیمیہ کراچی
11	علامہ مفتی خالد کمال	استاذ درجہ تخصص فی الفقہ والافتاء جامعہ نعیمیہ کراچی
12	علامہ مفتی محمد عمران شامی	استاذ درجہ تخصص فی الفقہ والافتاء جامعہ نعیمیہ کراچی
13	علامہ سیّد نذیر حسین شاہ	استاذ الحدیث، جامعہ نعیمیہ، کراچی
14	حضرت علامہ مفتی سیّد صابر حسین	استاذ التخصص فی الفقہ والافتاء جامعہ نعیمیہ لاہور شریعہ ایڈوائزر ایم سی بی اسلامک بینک
15	علامہ غلام جیلانی اشرفی	شیخ الحدیث جامعہ نضرۃ العلوم، کراچی
16	علامہ لیاقت حسین اظہری	خطیب جامع مسجد اقصیٰ محمد علی سوسائٹی، کراچی
17	علامہ مفتی سہیل رضا امجدی	خطیب جامع مسجد عیدگاہ ایم۔اے جناح روڈ کراچی
18	علامہ حافظ محمد عبداللہ	استاذ حدیث جامعہ نعیمیہ، کراچی
19	علامہ مفتی محمد احسن اویسی	مفتی دارالعلوم حنفیہ غوثیہ، کراچی
20	علامہ مفتی سیف اللہ باروی	استاذ الحدیث دارالعلوم حنفیہ غوثیہ، کراچی
21	علامہ مفتی عبدالرزاق نقشبندی	دارالافتاء دارالعلوم نعیمیہ، کراچی
22	مولانا مفتی بختیار علی	دارالافتاء دارالعلوم نعیمیہ، کراچی
23	مولانا علی عمران صدیقی	استاذ درجات عالیہ دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

علماء وخطباء کے لیے
رمضان المبارک کا تحفہ

خلاصۃ تفسیر

المُسمّٰی

زُبدۃُ تَفسِیرِ القُرآنِ فِی شَھرِ رَمضان

پروفیسر مُفتی مُنیبُ الرّحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ
هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ،(البقرہ:185)

رمضان المبارک میں خلاصہ تفسیر

بعنوان:

زُبْدَۃُ تَفْسِیْرِ الْقُرْآنِ فِیْ شَهْرِ رَمَضَان

مِنْ اِفَادَاتِ منیب الرحمن

پروفیسر مُفتی مُنیبُ الرّحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور کراچی پاکستان

نام کتاب	رمضان المبارک میں خلاصۂ تفسیر
مفسر	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
	چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان
	صدر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	باراول مئی 2017ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	QT65

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

ziaulquranpublications@gmail.com

Website:- www.ziaulquran.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اوّل

رمضان المبارک کو قرآنِ مجید سے خاص نسبت ہے اور اِسی سبب اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کے لیے ماہِ رمضان اور شبِ قدر کا انتخاب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''رمضان وہ (عظیم المرتبت) مہینہ ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور (اس میں) حق و باطل کے درمیان امتیاز کے روشن دلائل ہیں، (البقرہ: 163)''۔ رمضانِ مبارک میں ماحول نیکیوں کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق سرکش شیطانوں کو جکڑ دیا جاتا ہے اور بارگاہِ غیب سے منادی ندا دیتا ہے: ''اے نیکیوں کے طلب گار! آگے بڑھ اور اے شر کے طلب گار! رُک جا''۔

بہت سی مساجد میں نمازِ تراویح کے بعد تلاوت کردہ قرآنی آیات کی مختصر تفسیر بیان کی جاتی ہے اور یہ ایک قابلِ تحسین شِعار ہے۔ ہم نے خطبائے کرام اور ائمۂ کرام کے لیے قرآنِ مجید کی بیشتر منتخب آیات کا تفسیری خلاصہ مرتّب کیا ہے تاکہ اِن حضرات کے لیے اور قرآن فہمی سے رغبت رکھنے والے عام پڑھے لکھے مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہو۔ اسی طرح معتکفین ایامِ اعتکاف میں اس کا مطالعہ کر کے قرآن سے ذہنی اور فکری مطابقت پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر ہماری یہ کاوش اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کامیاب رہی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں کو اس خیر کی جانب مائل فرمایا تو قوی امید ہے کہ دین سے شغف رکھنے والے اہلِ ایمان کی ایک مُعتَد بہ تعداد اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے قرآن کی تفسیر کی طرف مائل ہوں اور یہی ہمارا مقصود و مدعا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبولِ عام عطا فرمائے اور اِس کے ذریعے اپنے دیندار بندوں کو قرآن سے جڑے رہنے کا جذبہ، شوق اور لگن عطا فرمائے، آمین یا ربّ العالمین بجاہ سید المرسلین علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہٖ افضل الصلوات والتسلیمات۔

فہرست

خلاصۂ تفسیر پارہ:۱	5	خلاصۂ تفسیر پارہ:۲۰	239
خلاصۂ تفسیر پارہ:۲	15	خلاصۂ تفسیر پارہ:۲۱	249
خلاصۂ تفسیر پارہ:۳	25	خلاصۂ تفسیر پارہ:۲۲	261
خلاصۂ تفسیر پارہ:۴	37	خلاصۂ تفسیر پارہ:۲۳	271
خلاصۂ تفسیر پارہ:۵	51	خلاصۂ تفسیر پارہ:۲۴	283
خلاصۂ تفسیر پارہ:۶	65	خلاصۂ تفسیر پارہ:۲۵	293
خلاصۂ تفسیر پارہ:۷	81	خلاصۂ تفسیر پارہ:۲۶	305
خلاصۂ تفسیر پارہ:۸	95	خلاصۂ تفسیر پارہ:۲۷	317
خلاصۂ تفسیر پارہ:۹	107	خلاصۂ تفسیر پارہ:۲۸	329
خلاصۂ تفسیر پارہ:۱۰	117	خلاصۂ تفسیر پارہ:۲۹	341
خلاصۂ تفسیر پارہ:۱۱	129	خلاصۂ تفسیر پارہ:۳۰	352
خلاصۂ تفسیر پارہ:۱۲	141		
خلاصۂ تفسیر پارہ:۱۳	153		
خلاصۂ تفسیر پارہ:۱۴	165		
خلاصۂ تفسیر پارہ:۱۵	177		
خلاصۂ تفسیر پارہ:۱۶	191		
خلاصۂ تفسیر پارہ:۱۷	203		
خلاصۂ تفسیر پارہ:۱۸	215		
خلاصۂ تفسیر پارہ:۱۹	229		

خلاصۂ تفسیر

پارہ: ۱

سورۃ الفاتحہ

یہ ترتیب کے اعتبار سے قرآن کی سب سے پہلی اور نزول کے اعتبار سے پانچویں سورت ہے، اس کو فاتحہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے قرآن مجید کا افتتاح ہوتا ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی قراءت کو فرض نماز کی پہلی دو رکعات اور باقی تمام نمازوں کی ہر رکعت میں واجب قرار دیا گیا ہے۔ یہ سورت سات آیات پر مشتمل ہے اور ایک حدیثِ قدسی میں اسے ''صلوٰۃ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، یعنی جب بندہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' پڑھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آتی ہے کہ میرے بندے نے میری حمد بیان کی اور جب بندہ ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' پڑھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آتی ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا کی اور جب بندہ ''مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' پڑھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آتی ہے کہ میرے بندے نے میری عظمت وجلالت بیان کی یا بندے نے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا اور جب بندہ ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' پڑھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آتی ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے یعنی عبادت صرف میری کی جائے گی اور ہر مشکل میں مدد کے طلب گار کی مدد کی جائے گی۔ اور جب بندہ ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' سے ''وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' تک پڑھتا ہے، تو چونکہ یہ کلماتِ دعا ہیں اور بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صراطِ مستقیم پر قائم ودائم رہنے کی دعا مانگتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آتی ہے کہ یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے نے جو سوال کیا ہے، وہ اُسے عطا ہوگا''۔ (صحیح مسلم: 877)

ایصالِ ثواب کے موقع پر دعا کیلئے اسے پڑھا جاتا ہے، اس لئے اس کا نام فاتحہ پڑ گیا۔ سورۂ فاتحہ کو سُوْرَۃُ الدُّعَا، سُوْرَۃُ الْمَسْئَلَۃ، سُوْرَۃُ الشِّفَاء، سُوْرَۃُ الْکَنْز، سُوْرَۃُ

اَلْوَاقِيَة، سُوْرَةُ الْكَافِيَة، سُوْرَةُ الرُّقْيَة اور سُوْرَةُ الْحَمْد کے ناموں سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کی عظمت کا بیان ہے، اس امر کا بیان ہے کہ عبادت کی حق دار صرف اسی کی ذات پاک ہے اور بالذات صرف اسی سے مدد طلب کی جائے اس میں اللہ کی بارگاہ سے دعا والتجا کے آداب بیان کئے گئے ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دعا کی گئی ہے اور ''ہدایت'' ہی وہ جامع لفظ ہے جو تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد، اُن کی تعلیمات اور تمام کُتب سماویہ کا خلاصہ ولب لباب ہے، اسی لئے اُسے قرآن مجید کا بھی خلاصہ قرار دیا گیا ہے۔

سورۃ البقرۃ

سورۃ البقرۃ قرآن مجید میں ترتیب مصحف کے اعتبار سے دوسرے جبکہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے ستاسی نمبر پر ہے۔ سورۃ البقرہ قرآن مجید کی سب سے طویل اور مدینہ منورہ میں سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت ہے۔ اس سورت میں مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی نظام حیات، عبادات، سیاسیات، معاشیات، اقتصادیات اور عمرانیات کے اصول اور احکام بیان فرمائے گئے ہیں۔ اس سورت میں ایک آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات اس کی وحدت اور اس کی اہم صفات کا بیان ہے اور یہ آیت الکرسی ہے۔

سورۃ البقرہ کا نام بقرہ اس لئے رکھا گیا کہ اس سورت میں بقرہ (گائے) کا ذکر ہے۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں کے نام توقیفی ہیں اور ادنیٰ مناسبت سے رکھے گئے ہیں، حدیث میں ہے:

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۃ البقرہ پڑھی جاتی ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہماری (دوسرے) لوگوں پر تین وجہ سے فضیلت ہے۔ تمام روئے زمین کو ہمارے لئے مسجد بنادی گئی ہے اور

اس کی مٹی ہمارے لئے ذریعہ طہارت بنادی گئی ہے، اور ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح ہیں اور ہم کو یہ آیات دی گئی ہیں سورہ بقرہ کی آخری آیات عرش کے نیچے سے نازل ہوئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو دی گئی ہیں اور نہ میرے بعد کسی کو دی جائیں گی۔

سورۃ البقرہ کی دوسری آیت میں یہ بتایا گیا کہ اگر قرآن کی حقانیت کے دلائل پر کوئی ٹھنڈے دل سے غور کرے، تو اس پر عیاں ہوگا کہ اس کتاب میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کفار ومشرکینِ مکہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ یہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنا بنایا ہوا کلام ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیات 23 اور 24 میں ایسے تمام معاندین اور منکرین کو چیلنج کیا گیا کہ اگر تمہیں قرآن کے کلام اللہ ہونے میں شک ہے، تمہیں اپنی فصاحت وبلاغت پر بڑا ناز ہے، تو تم سب مل کر اس جیسا کلام بنا کر لے آؤ اور تاریخ میں ایسا کوئی حوالہ نہیں ہے کہ قرآن کے اس چیلنج کو قبول کیا گیا ہو، چنانچہ قرآن نے فیصلہ کن انداز میں اعلان کیا کہ تم یہ کام ہرگز نہ کرسکو گے اور وہ نہ کر سکے۔

آیت نمبر: 3 تا 5 میں مومنین کی صفات، ایمان بالغیب، اقامتِ صلوٰۃ، انفاق فی سبیل اللہ، کتبِ الٰہیہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان کا ذکر ہے۔ آیت نمبر: 5 اور 6 میں ان لوگوں کا ذکر ہے، جن کا کفر ظاہر اور عیاں ہے اور وہ اپنے کفر کو چھپاتے نہیں ہیں اور اپنی سرکشی میں اس حد تک آگے جا چکے ہیں کہ اب ان کا ہدایت پانا عملاً ناممکن ہے، ان کی سرکشی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ان کے دل ودماغ قبولِ حق کی صلاحیت سے محروم ہو چکے اور اُن پر ابدی شقاوت اور بدبختی کی مہر لگ چکی ہے۔

آیت نمبر: 8 تا 20 میں منافقین کا ذکر ہے، یہ انسانیت کا وہ طبقہ ہے، جن کے ظاہر و باطن میں تضاد ہے، دنیوی مفاد کے لئے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن دل ایمان سے خالی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس کیفیت کو ایک سے زائد مثالوں کے ذریعے بیان فرمایا ہے اور یہ بھی کہ اپنی دانست میں یہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور مومنوں کو فریب دے رہے ہیں لیکن دراصل یہ ان کی خود فریبی ہے اور اس کا وبال انہی پر آئے گا۔ آیت نمبر: 21 اور 22 میں

توحید کی دعوت اور شرک سے باز رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مختلف نعمتوں کا ذکر کر کے بتایا گیا کہ نعمتیں عطا کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، وہی حیات دینے والا ہے اور وہی موت دینے والا ہے اور آخر کار سب کو اسی کی عدالت میں جانا ہے۔

آیت نمبر 23,24 میں قرآن کے بے مثل کتاب ہونے اور لوگوں کے مثل لانے سے عجز کا بیان ہے۔ قرآن کا یہ اسلوب ہے کہ بعض امور کو مثالوں کے ذریعے اپنے مخاطبین کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہے، اسی لئے آیت نمبر :26 میں بتایا گیا کہ کسی چیز کا چھوٹا یا بڑا ہونا اصل نہیں ہے بلکہ اصل وجہ مشابہت ہے۔

آیت نمبر :30 تا 39 میں ہے: فرشتوں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ میں آدم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا رہا ہوں، فرشتوں نے اپنی فہم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ عرض کیا کہ بنی آدم زمین میں فساد کریں گے، خون ریزی کریں گے اور اے اللہ! ہم ہمہ وقت تیری تسبیح وتقدیس میں مشغول رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں جن اسرار اور حکمتوں کو جانتا ہوں تم نہیں جانتے اور پھر نعمتِ علم کے ذریعے آدم علیہ السلام کی فضیلت اور برتری کو فرشتوں پر ثابت کیا۔ پھر فرشتوں کو حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کرو اور ابلیس لعین کے سوا تمام ملائک نے حکمِ ربانی کی بلا چوں وچرا تعمیل کی۔ یہ سجدہ عبادت کا نہیں تھا بلکہ ''سجدۂ تعظیمی'' تھا، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے واقعے میں بھی ذکر ہے اور اُن انبیائے کرام کی شریعت میں ''سجدۂ تعظیمی'' جائز تھا، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں جائز نہیں ہے، بلکہ حرام ہے۔ بعض مفسرین نے یہ توجیہہ کی ہے کہ سجدہ تو درحقیقت اللہ کی ذات ہی کے لئے تھا، بس بیت اللہ کی طرح آدم علیہ السلام کو ''جہتِ سجدہ'' بنایا گیا تھا اور یہ اُن کی تعظیم کی علامت تھی، جیسے بیت اللہ جہتِ سجدہ ہونے کی وجہ سے عظیم ہے۔ پھر آدم وحوا علیہما السلام کے جنت میں داخل کرنے اور وہاں اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں سے استفادے کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک درخت کے قریب نہ جانے کی پابندی کا ذکر ہے۔ اسی کے ساتھ ابلیسِ لعین کے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے، حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے دلوں میں وسوسہ

ڈال کر انہیں لغزش دینے اور جنت سے نکالے جانے کا ذکر ہے۔ اور پھر آدم علیہ السلام کو توبہ کے کلمات اِلقاء کئے جانے، اِن کلمات سے ان کی توبہ اور توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے۔ یہ کلماتِ توبہ سورۂ اعراف، آیت: 23 میں مذکور ہیں، جن کا ترجمہ یہ ہے "اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، پس اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے، تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔

اِس کے بعد متعدد آیات میں بنی اسرائیل اور اُن کی طرح طرح کی عہد شکنیوں، اُن پر مختلف انعامات اور اُن کی سرکشی کے مختلف انداز بیان کئے ہیں۔

پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کی گئی اپنی کئی نعمتوں کا ذکر فرمایا جو یہ ہیں: فرعون اور فرعونیوں کے تسلُّط اور نسل کشی سے نجات دلانا، ان کے لئے سمندر کو پاٹ کر وادیٔ سینا میں پہنچانا، وادیٔ سینا میں اُن پر طویل عرصے تک بادلوں کا سایہ فگن ہونا، منّ و سلویٰ کی صورت میں تیار خوانِ نعمت کا نازل کرنا، چٹان پر عصائے موسیٰ کی ضرب سے بارہ قبیلوں کے لئے بارہ چشموں کا جاری ہونا، گائے ذبح کر کے اس کے مقتول پر لَمس (Touch) سے قاتل کا پتا چلانا، ان کو اپنے عہد کے لوگوں پر فضیلت دینا، بنی اسرائیل میں بکثرت انبیائے کرام کی بعثت، وغیرہ۔

پھر اس کے بعد اُن کی سرکشی کا تفصیلی بیان ہوا، جس کی تفصیل یہ ہے: اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو توڑنا، ان کے علماء کے قول و فعل کا تضاد، دنیاوی مال کی لالچ میں بااثر لوگوں کے لئے اَحکامِ الٰہی میں ردّ و بدل کرنا یا اَحکامِ الٰہی کو جان بوجھ کر چھپانا، موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر گئے تو ان کی عدم موجودگی میں بچھڑے کی پوجا کرنا، منّ و سلویٰ کی گراں قدر اور تیار سماوی نعمت کو ٹھکرا کر گندم، سبزی، ککڑی، مسور کی دال اور پیاز (یعنی زمینی پیداوار) کی فرمائش کرنا، گویا اعلیٰ کو رد کر کے ادنیٰ کو طلب کرنا، انبیاء کو ناحق قتل کرنا، سبت (ہفتہ) کے دن کی حرمت کو پامال کرنا، گائے ذبح کرنے کے سیدھے سادے حکم کو ماننے کے بجائے اس کے بارے میں کئی سوالات اٹھانا، کلامِ الٰہی میں لفظی و معنوی تحریف

(ردوبدل) کرنا، تورات وانجیل میں سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بیان کی گئی بشارتوں کو چھپانا، شوہر اور بیوی میں تفریق کے لئے جادو سیکھنا اور اس کا استعمال، اشارات وکنایات اور لفظی ردوبدل کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی شان میں اہانت کرنا وغیرہ۔ چنانچہ آیت نمبر: 104 میں واضح ارشاد ہوا: ''اے اہلِ ایمان! (جب تمہیں نبی کی کوئی بات سمجھ میں نہ آئے، تو دوبارہ بیان کے لئے) ''رَاعِنَا'' (یعنی ہماری رعایت کیجئے) نہ کہو (کیوں کہ اسے یہود اور منافقین اہانت کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں، لہٰذا یوں کہو کہ) یارسول اللہ! ہم پر توجہ فرمائیے اور (اس سے بھی زیادہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ہی نبی کی بات کو) خوب توجہ سے سنو!''۔ یعنی مومنوں کو رسول اللہ ﷺ کی شان میں ایسا ذو معنی کلمہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے جس کو کوئی بدفطرت شخص اشارۃً، کنایۃً یا صراحۃً اہانت کے معنی میں استعمال کرسکتا ہو۔

آیت 54 میں بتایا گیا کہ بچھڑے کی پرستش کے جرم کی توبہ اس طرح قبول ہوئی کہ ان پر اندھیرا مسلّط کردیا گیا اور ہزاروں کی تعداد میں انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ایک دوسرے کو قتل کیا، آیت 65 میں بتایا کہ ان میں سے اصحاب سبت کی صورتوں کو مسخ کرکے انہیں ذلیل وحقیر بندر کی شکل دے دی گئی اور پھر وہ موت سے ہمکنار ہوئے۔

بنی اسرائیل جبریلِ امین سے اس لئے عداوت رکھتے تھے کہ ان کے ذریعے بنی اسرائیل پر اللہ کا عذاب نازل ہوا، تو اللہ نے فرمایا: جبرائیل ومیکائیل اللہ تعالیٰ ہی کے احکام کو نازل کرتے ہیں، پس جوان کا دشمن ہے وہ اللہ کا دشمن ہے۔

بنی اسرائیل کی اس خوش فہمی کو بھی رد کیا گیا کہ وہ کسی استحقاق کے بغیر اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور آخرت وجنت پر یہود ونصاریٰ کا اجارہ ہے۔ اہلِ ایمان کو یہ بتایا گیا کہ جب تک تم یہود ونصاریٰ کی خواہشات کی پیروی نہ کرلو، وہ تم سے راضی نہیں ہوسکتے۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر: 123 اور اس کے بعد کی آیات میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے منصب امامت پر فائز کئے جانے کا تذکرہ ہے۔ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے بیت اللہ کو تعمیر

کرنے کا ذکر ہے اور اس امر کا بیان ہے کہ تعمیرِ بیت اللہ کے بعد انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا کی: اے ہمارے رب ان (اہلِ مکہ) میں، انہی میں سے ایک عظیم رسول کو مبعوث فرما، جو ان لوگوں پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کی اصلاح کرے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ میں حضرت عیسیٰ کی بشارت اور حضرت ابراہیم کی دعا کا ثمر (نتیجہ) ہوں۔ اس کے بعد اس سورت میں اولادِ ابراہیم حضرت اسماعیل، حضرتِ اسحاق، حضرت یعقوب اور ان کی اولاد حضرت موسیٰ وعیسیٰ اور اجمالی طور پر دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی کہ اہل ایمان سب انبیاء پر ایمان لاتے ہیں اور ایمان کے لانے میں رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور یہ بھی کہ حضرات ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد یہودی ونصرانی نہیں تھے بلکہ سب کے سب ایک ہی دینِ اسلام کے علمبردار اور داعی تھے۔ ان آیات میں یہ بھی بتایا گیا کہ مشرکینِ مکہ اور اہلِ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کے روشن دلائل آنے کے باوجود اس لئے اُن پر ایمان نہیں لاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے رسالت کی نعمتِ عظمیٰ کے لئے اُن کے بجائے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیوں منتخب فرمایا ہے؟۔ یعنی ان کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا انکار کسی مقبول عذر، لاعلمی مضبوط شبہ یا حجتِ صحیحہ کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ محض ضد، عِناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر تھا اور اس کا باطنی محرّک ان کے دلوں میں حسد کا جذبہ تھا کہ اس نعمت کے لئے انہیں کیوں نہ چنا گیا۔

چنانچہ اُن میں سے اگر کوئی تورات میں بیان کی گئی نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کی علامات کو بیان کرتا، تو یہود اُس سے کہتے: ''کیا تم اُن (مسلمانوں) کو وہ (حق) باتیں بتادیتے ہو، جو اللہ نے تم پر عیاں کی ہیں، (بقرہ:76)''۔ ان آیات میں یہ حقیقت بھی بیان کردی گئی کہ: ''وہ اس (بعثت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے (اس نبی کے وسیلے سے) کفار کے خلاف فتح کی دعا کرتے تھے اور جب اُن کے پاس وہ آگئے، جن کو وہ پہچان چکے تھے، تو انہوں نے ان کے ساتھ کفر کیا، (بقرہ:89)''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر دیتا ہے''۔
ان آیات میں مشرکین مکہ اور اہل کتاب کے بے مقصد مطالبات کا بھی ذکر ہے کہ: اللہ تعالیٰ ہم سے کیوں نہیں کلام فرمالیتا، ہمارے لئے براہِ راست کوئی نشانی کیوں نہیں آجاتی یا موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل کا یہ مطالبہ کہ ہمیں کھلے عام اللہ کا دیدار ہو جائے، ایسی سب باتیں کٹ حجتی کے طور پر ہوتی ہیں، قبولِ حق کے لئے اتمامِ حجت کے طور پر نہیں۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ: ۲

2

دوسرے پارے کے مضامین

دوسرے پارے کا آغاز بھی اس بیان سے ہے کہ اب مسلمانوں کا قبلہ تبدیل کیا جارہا ہے اور ہٹ دھرم لوگ اور منافقین اس پر اعتراض کریں گے کہ یہ کیوں ہوا؟۔ دراصل رسول اللہ ﷺ کے مدنی دور کی ابتدا میں سولہ سترہ ماہ تک بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نمازیں پڑھی گئیں، پھر ایک دن ظہر کی نماز کے دوران رسول اللہ ﷺ کی خواہش پر اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلۂ نماز بنانے کا حکم نازل فرمایا اور اس تحویلِ قبلہ کی حکمت بھی اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمادی: ''اور (اے رسول!) جس قبلہ پر آپ پہلے تھے، ہم نے اس کو قبلہ اس لئے بنایا تھا تاکہ ہم ظاہر کردیں کہ کون (غیر مشروط طور پر) رسول کی پیروی کرتا ہے اور اس کو اُس سے ممتاز کردیں جو اپنی ایڑیوں پر (کفر کی جانب) پلٹ جاتا ہے''۔ یہ بھی فرمایا: ''بے شک ہم نے بارہا (وحی کے انتظار میں) آپ کو آسمان کی طرف رخ پلٹتے ہوئے دیکھا ہے، سو ہم آپ کو ضرور بالضرور اسی قبلہ کی جانب پھیر دیں گے، جو آپ کو پسند ہے، پس آپ اپنا رخ مسجدِ حرام کی جانب پھیرلیں''۔ آگے چل کر پھر فرمایا کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں اُسے نماز کے وقت اپنا رخ مسجدِ حرام کی جانب پھیر دینا چاہئے اور اس پر اہلِ کتاب سے کوئی سودے بازی یا مفاہمت نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی بتایا کہ تورات وانجیل میں رسول اللہ ﷺ کی جو روشن نشانیاں بتائی گئی ہیں، ان کی روشنی میں اہلِ کتاب رسول اللہ ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں لیکن ان کے انکار کا سبب صرف کتمانِ حق ہے۔ اسی سورت میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور منصبِ نبوت کے فرائض کو ایک بار پھر بیان کیا گیا یعنی تلاوتِ آیاتِ الٰہی، تزکیۂ باطن اور تعلیم کتاب وحکمت۔

آیت نمبر: 153 تا 155 میں ہر مصیبت کے وقت صبر اور نماز کو اللہ تعالیٰ کی نصرت کا

وسیلہ بنانے کی تعلیم دی گئی ہے اور راہ حق میں پیش آنے والی آزمائشوں کا ذکر ہے، جو (دشمن کے) خوف، بھوک، جان و مال اور اولاد کے تلف ہونے کی صورت میں بھی ہوسکتی ہیں۔ ان مشکلات میں ثابت قدمی پر اہل صبر کو بشارتیں دی گئی ہیں اور اللہ کی راہ میں درجۂ شہادت پانے والوں کے لئے ابدی زندگی کی بشارت دی گئی ہے۔

آیت نمبر :159 تا162 میں بتایا گیا کہ جولوگ دین کی حقانیت کے روشن دلائل اور پیغام ہدایت کو چھپاتے ہیں، اُن پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت اور دائمی عذاب کی وعید ہے۔ مگر جو توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرلے، اور اس پیغام ہدایت کو کھول کر بیان کرے، اُن کے لئے توبہ کی قبولیت کا دروازہ کھلا ہے۔ ہاں جس کا خاتمہ بالکفر ہوان پر ہمیشہ کیلئے اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ ان کے عذاب میں نہ تخفیف ہوگی نہ ان کو مہلت دی جائیگی۔

آیت نمبر :164 تا167 میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کی نشانیوں کا ذکر ہے، یعنی زمین و آسمان کی پیدائش، گردش لیل ونہار کا نظام، سمندروں میں انسانی فائدے کے لئے کشتیوں اور جہازوں کا رواں دواں رہنا، بارش کے قدرتی نظام کے ذریعے خشک اور بنجر زمین کا دوبارہ زرخیز اور آباد ہونا، ہواؤں کا چلنا اور آسمان اور زمین کے درمیان بادلوں کا معلق رہنا وغیرہ۔ یہ بھی بتایا کہ مشرکوں کو جتنی اپنے باطل معبودوں سے محبت ہے، اہل ایمان کو اُس سے بہت زیادہ اللہ سے محبت ہے۔ یہ بھی بیان ہوا کہ اس دنیا میں لوگ اپنے جن قائدین کی پیروی میں گمراہی کو اختیار کئے ہوئے ہیں، قیامت کے دن یہ لیڈر اللہ کے عذاب کو دیکھ کر اپنے پیروکاروں سے براءت ظاہر کریں گے۔

آیت نمبر :172 تا173 میں حکم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ پاک نعمتوں کو کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ پھر چار قطعی حرام چیزوں کا بیان ہوا، جو یہ ہیں: مردار (اس سے وہ حلال جانور مراد ہے، جو طبعی موت مرگیا ہو)، ذبح کے وقت بہنے والا خون، خنزیز کا گوشت اور وہ حلال جانور جس پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، صرف حالتِ اضطرار میں محض

بقاءِ حیات کے لئے بقدرِ ضرورت ان کے استعمال کو مباح قرار دیا گیا۔

آیت نمبر 174 میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے احکام کو چھپانے اور اس پر دنیاوی مال لینے کو پیٹ میں آگ بھرنے اور اللہ سے کلام کے شرف سے محرومی اور ناپاکی کا سبب بتایا ہے۔

آیت نمبر:177 میں بتایا کہ اصل نیکی صرف عبادت کے وقت مشرق ومغرب کی جانب رخ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ کامل نیکی ایک جامع پیکج کا نام ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، یومِ قیامت، ملائک، تمام الہامی کتب اور سارے انبیاء پر ایمان، اس کے ساتھ ساتھ انفاق فی سبیل اللہ، نظامِ صلوٰۃ وزکوٰۃ کا قیام، ایفاءِ عہد اور ہر مصیبت کے وقت صبر واستقامت، پھر فرمایا کہ درحقیقت جولوگ ان تمام صفات کے حامل ہیں، وہی دعویٰ ایمان میں سچے اور متقی ہیں۔

آیت نمبر:178 اور 179 میں اسلام کے قانونِ قصاص کا بیان ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے''۔ چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ جس معاشرے میں قانونِ قصاص عملاً نافذ نہیں ہے، وہاں آئے دن بے قصور انسانوں کی جان، مال اور آبرو کی حُرمت پامال ہورہی ہے۔

آیت نمبر:183 تا 185 میں رمضان میں نزولِ قرآن اور رمضان کے روزوں کی فرضیت کا بیان ہے اور بیماری یا سفر کی حالت میں عارضی طور پر روزوں کے چھوڑنے کی رخصت دی گئی ہے، جن کی بعد میں قضاء ہوگی۔ اور اس امر کا بھی بیان ہے کہ جو شخص انتہائی ضعیف العمری یا شدید بیماری کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھے، تو اسے فی روزہ ایک مسکین کا دو وقت کا کھانا بطورِ فدیہ دینا ہوگا۔ رمضان کی راتوں میں غروب آفتاب سے صبح صادق تک روزے کی پابندیوں کے استثنیٰ کا بیان ہے اور اعتکاف کی جانب بھی اجمالی اشارہ ہے۔ اس امر کا بھی بیان ہے کہ قمری نظام کا ایک فائدہ روزے اور حج کی عبادت کا تعین ہے۔

آیت نمبر:194 میں چار مہینوں کی حرمت کا بیان ہے۔ آیت نمبر:195 میں انفاق

فی سبیل اللہ کا ذکر ہے، اس کے بعد آیت 203 تک حج اور عمرے اور حج کے بعض مسائل کا بیان ہے۔ آیت نمبر: 207 اور 208 میں بتایا کہ حقیقتِ ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی جان کا سودا ہے اور اسلام بعض چیزوں کو قبول کرنے اور بعض کو رد کرنے کا نام نہیں بلکہ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے تمام احکام (اوامر ونواہی) کو من وعن قبول کیا جائے، یہ نہیں ہوسکتا کہ بعض باتیں آپ کو پسند ہوں، تو اُنہیں قبول کرلیں اور جو باتیں آپ کو پسند نہ ہوں، تو اُنہیں رَد کردیں یعنی اسلام Pick & Choose کا نام نہیں ہے۔ آیت نمبر: 213 میں بتایا گیا کہ تمام لوگ اصل کے اعتبار سے ایک تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے نظامِ رسالت قائم فرمایا، ہر دور کے لوگوں کے لئے کتابِ ہدایت نازل کی، اُس کے بعد انسانیت دو گروہوں میں بٹ گئی ایک اہلِ حق یعنی انبیاء کے پیروکار اور دوسرے اہلِ باطل یعنی خواہشاتِ نفس اور شیطان کے پیروکار۔

آیت نمبر: 214 میں یہ بتایا گیا کہ جنت کا حقدار بننے کے لئے محض دعویٰ ایمان کافی نہیں ہے بلکہ اُس کے لئے راہِ حق میں مشکلات کا استقامت کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے، جیسا کہ انبیاءِ کرام اور ان کے سچے پیروکاروں کی روشن مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

آیت نمبر: 215 میں انفاق فی سبیل اللہ کے مصارف کا بیان ہے اور اگر آیت نمبر: 219 کو اس سے ملا کر سمجھا جائے تو اس امر کا بیان ہے کہ جو مال تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو، اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اسی آیت میں شراب اور جوئے کی حُرمت کا ابتدائی بیان ہے کہ ان کے نفع کے مقابلے میں ان کا گناہ بہت بڑا ہے۔

آیت نمبر: 216 میں جہاد کی فرضیت کا بیان ہے۔ آیت نمبر: 221 میں مشرک مردوں اور عورتوں سے نکاح کی ممانعت کا بیان ہے اور آیت نمبر: 222 میں اس امر کا بیان ہے کہ ایامِ مخصوص (یعنی حالتِ حیض ونفاس) میں عورت سے مباشرت منع ہے۔

آیت نمبر: 224 اور 225 میں اس امر کا بیان ہے کہ اگر کسی نے ایسی قسم کھالی ہے جس پر قائم رہنا، شریعت کی رو سے ناپسندیدہ ہے، تو چاہئے کہ اسے توڑ دے اور کفارہ ادا

کرے، چنانچہ فرمایا: ''اور تم نیکی، تقویٰ اور لوگوں کی خیر خواہی سے بچنے کے لئے اللہ کے نام کی قسمیں کھانے کو بہانہ نہ بناؤ'' اور فرمایا: ''کہ اللہ کے نزدیک مواخذہ ان قسموں پر ہوگا، جو پختہ ارادے سے کھائی ہوں (یعنی غیر ارادی قسموں پر مواخذہ نہیں ہے)''۔

آیت نمبر: 226 اور 227 میں ''ایلا'' کا بیان ہے، ''ایلا'' یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو یہ کہے: ''اللہ کی قسم میں چار ماہ تک یا ہمیشہ کے لئے تمہارے ساتھ ازدواجی تعلق قائم نہیں کروں گا''۔ اگر چار ماہ کے اندر قسم کا کفارہ ادا کر کے قسم توڑ دے تو نکاح قائم رہے گا، ورنہ ایک طلاقِ بائن واقع ہوجائے گی۔ آیت نمبر: 228 میں یہ بتایا کہ مطلّقہ عورت کی عدت ایامِ مخصوص کے تین دورانیوں کی تکمیل ہے۔

آیت نمبر: 229 میں یہ حکم بیان ہوا کہ دو صریح طلاقیں (خواہ الگ الگ دی جائیں یا ایک ساتھ) دینے کے بعد بھی شوہر کو یک طرفہ طور پر رجوع کا حق حاصل ہے اور اگر تیسری طلاق دے دی، تو بیوی اس پر حرام ہوجائے گی (یعنی اب براہِ راست یا عقد ثانی کے ذریعے رجوع کی گنجائش نہیں ہے)، سوائے اس کے کہ وہ عورت عدت گزرنے کے بعد اپنی مرضی سے کسی اور شخص سے نکاح کرے اور وہ شخص اپنی مرضی سے اسے طلاق دے، تو صرف اس صورت میں وہ سابق شوہر سے نکاح کرسکتی ہے۔ اس میں خلع کا بھی بیان ہے کہ اگر زوجین کو یہ خدشہ ہو کہ اللہ کی حدود میں رہتے ہوئے ان کے لئے ازدواجی تعلق قائم رکھنا، نہایت دشوار ہے اور عورت آزادی چاہتی ہے، تو اپنے مہر سے دست بردار ہوکر یا مالی بدل کے ذریعے شوہر کی رضامندی سے خلع لے سکتی ہے اور خلع ایک طلاقِ بائن کے حکم میں ہے۔

آیت نمبر: 231 اور 232 میں یہ بیان ہوا کہ عورت کو طلاقِ رجعی دینے کے بعد اگر خوش دلی سے اور حسنِ سلوک کے ساتھ اپنے نکاح میں رکھنے کا ارادہ ہو تو عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کرلو۔ اور اگر اسے حسنِ سلوک کے ساتھ نکاح میں رکھنے کا ارادہ نہ ہو تو محض ضرر پہنچانے اور اذیت دینے کے لئے اس سے رجوع نہ کرو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور جس نے ایسا کیا تو بے شک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا، تو اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ''۔ یہ

اذیت رساں شوہروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعید ہے۔

آیت نمبر: 233 میں اس امر کا بیان ہے کہ "رضاعت" کی کامل مدت دو سال ہے۔ اگر دو سال سے کم مدت میں ماں کا دودھ چھڑانے سے بچے کی زندگی کو کوئی خطرہ نہ ہو یا دوسری غذاؤں سے اس کی ضرورت پوری ہوسکتی ہو، تو اس مدت کی تکمیل اس صورت میں مستحب ہے۔ اگر خدانخواستہ شیر خوار بچے کی ماں کو طلاق ہو جائے، تو دودھ پلانا پھر بھی ماں کی ذمہ داری ہے اور دستور کے مطابق اس کے ضروری اخراجات بچے کے باپ کے ذمے ہوں گے۔ یہ بھی حکم ہوا کہ بچے کی وجہ سے نہ ماں بچے کے باپ کے لئے باعثِ ضرر بنے اور نہ ہی بچے کا باپ اُس کی ماں کے لئے ضرر رساں بنے۔

آیت نمبر: 235 میں فرمایا کہ شوہر کی وفات کی صورت میں بیوہ (خواہ صرف نکاح ہوا ہو اور رخصتی نہ ہوئی ہو یا آپس ازدواجی تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں) کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے۔ عدت گزرنے کے بعد بیوہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہے۔ عدت کے زمانے میں عورت کو صراحت کے ساتھ نکاح کا پیغام دینا حرام ہے اور ایامِ عدت میں معتدہ کے ساتھ نکاح بھی حرام ہے۔ البتہ اشارات و کنایات میں ارادۂ نکاح کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

آیت نمبر: 237 میں اس امر کا بیان ہے کہ اگر کسی شخص کا کسی عورت سے نکاح ہو گیا ہو، مگر رخصتی عمل میں نہ آئی ہو اور ایسی خلوت بھی نہ ہوئی ہو، جس میں ازدواجی تعلق میں کوئی مانع نہ ہو، تو ایسی عورت کو طلاق دینے کی صورت میں مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا۔ اور اُس پر عدت بھی عائد نہیں ہوگی۔ آیت نمبر 39۔238 میں سب نمازوں خصوصاً نماز عصر کی حفاظت کا حکم ہے۔ بعد والی آیت میں خوف کی حالت میں سواری پر نماز پڑھنے کی رخصت کا ذکر ہے۔ آیت نمبر 243 میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر موت طاری کرنے اور پھر زندہ کرنے کا بیان ہے۔ آیت نمبر 244 میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے اور آیت نمبر 245 میں قرض حسنہ کے اجر کو دگنا کرنے کا ذکر ہے۔

دوسرے پارے کے آخر میں بنی اسرائیل کے مطالبے پر طالوت کو بادشاہت عطا کئے جانے کا ذکر ہے، اس پر مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ اُن کی اہلیت کا مدار جسمانی قوت اور علم ہے اور بادشاہت اللہ کی عطا سے ملتی ہے۔ پھر شموئیل علیہ السلام نے طالوت کی بادشاہت کی نشانی کے طور پر اپنی قوم کو بتایا کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا، جسے فرشتے اٹھائے ہوں گے، جو تمہارے لئے تمہارے رب کی جانب سے باعثِ طمانیت ہوگا اور اس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے تبرکات ہوں گے۔ پھر طالوت کے ساتھ لڑنے والے لشکر کو ایک آزمائش سے گزارا گیا اور کم لوگ اس آزمائش پر پورا اترے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ اہلِ ایمان کی قلیل جماعت دشمن کی کثیر جماعت پر غالب آ جاتی ہے۔ پھر جب جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو اہلِ حق اور اصحاب طالوت نے یہ دعا پڑھی: ''اے ہمارے رب ہم پر صبر انڈیل دے اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافروں کی قوم کے خلاف ہماری مدد فرما''۔ پھر حضرت داؤد نے جالوت کو قتل کیا، جالوت کے لشکر کو شکست ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو سلطنت اور حکمت عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ مفسدین کے شر کو اگر نیک لوگوں کے ذریعے دفع نہ فرمائے تو زمین میں فساد برپا ہو جائے۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ: ۳

تیسرے پارے کے مضامین

تیسرے پارے کے شروع میں اس امر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبی اور رسول علیہم السلام معزز و مکرم ہیں اور ان کی شان بڑی ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے رسولوں میں ایک کے لئے دوسرے کے مقابلے میں فضیلت اور درجے کی بلندی رکھی ہے، چنانچہ فرمایا: ''بعض سے اللہ نے کلام فرمایا اور بعض کو (بے شمار درجوں کی) بلندی عطا فرمائی اور عیسیٰ ابن مریم کو واضح نشانیاں دیں اور ہم نے روح القدس (جبرائیل امین) سے ان کی مدد فرمائی''۔

آیت نمبر: 254 میں فرمایا کہ قیامت کے دن (نیکیوں کا) لین دین، دوستی اور سفارش نہیں چلے گی، اور کفار ہی حقیقت میں ظالم ہیں۔ قرآن کی عظیم آیت جو ''آیۃ الکرسی'' کے نام سے معروف ہے، یہ آیاتِ قرآن کی سردار ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید، شانِ جلالت اور وسعتِ قدرت بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اُس کے اذن سے ہی اُس کی بارگاہ میں شفاعت ہوگی۔ اگلی آیت میں یہ اصول بیان ہوا کہ ہدایت اور گمراہی کے واضح ہونے کے بعد دین میں داخل ہونے کے لئے کسی پر جبر نہیں ہوگا۔

آیت نمبر: 258 میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمرود کے ساتھ اس مناظرے کا ذکر ہے، جس کے نتیجے میں وہ لاجواب ہوا، یعنی جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہا: ''اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے (تجھے اگر خدائی کا دعویٰ ہے)، تو اسے مغرب سے نکال لے''۔ آیت نمبر: 259 میں اس امر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک محبوب بندے (بعض مفسرین نے کہا کہ اس سے مراد عزیر علیہ السلام ہیں) کو حیات بعد الموت کی حقیقت بتانے کے لئے اُن پر سو سال موت طاری کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا اور اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود ان کے کھانے پینے کا سامان اُسی طرح تروتازہ رہا، گلا سڑا نہیں، جبکہ ان کا دراز

گوش (گدھا) اِس عرصے میں گل سڑ چکا تھا، اللہ تعالیٰ نے اُسے زندہ کر کے یہ بتایا کہ اسی طرح قیامت میں مُردوں کو زندہ کیا جائے گا۔

آیت نمبر: 260 میں ابراہیم علیہ السلام کے اطمینانِ قلب کے لئے اللہ تعالیٰ نے حیات بعد الموت کو بصورتِ معجزہ دکھایا کہ چار پرندوں کو ذبح کر کے اُن کے گوشت کے ٹکڑے چاروں طرف پہاڑوں پر پھیلا دیئے اور پھر جب انہوں نے اُن پرندوں کو ان کے معروف ناموں سے بلایا، تو ایک لمحے میں اُن کے منتشر اجزاء یکجا ہو گئے، اُن میں جان پڑ گئی اور وہ دوڑے چلے آئے۔

آیت نمبر: 261 میں مثال کے ذریعے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا اجر بندے کے اخلاص اور اللہ کے فضل کے مطابق چودہ سو گنا تک عطا کیا جائے گا۔ اگلی آیات میں یہ بتایا کہ اللہ کی راہ میں صدقہ دے کر احسان جتلانے اور ریاکاری سے صدقے کا اجر ضائع ہو جاتا ہے آیت نمبر 263 اور 264 میں ریاکاری اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کو دو مختلف مثالوں سے واضح فرمایا ہے، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ناقص اور ناکارہ چیز نہ دو، جب انسان خود نفیس، عمدہ اور پاکیزہ چیز کو پسند کرتا ہے، تو اللہ کی راہ میں بھی ایسا ہی مال دینا چاہئے، ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اللہ کی راہ میں دینے سے وہی لوگ بخل کرتے ہیں جنہیں شیطان فقر و فاقہ سے ڈراتا رہتا ہے۔ پھر بتایا کہ صدقہ کسی دینی حکمت کے تحت ظاہر کر کے بھی دیا جا سکتا ہے، مگر چھپا کر دینا افضل ہے۔

آیت نمبر: 273 میں فرمایا کہ صدقات و خیرات کے حق دار وہ لوگ ہیں، جو جہاد فی سبیل اللہ یا دین کے کسی کام (مثلاً دین کی تعلیم و تعلّم) میں مشغول ہوں اور انہیں طلبِ معاش کی فرصت نہ ہو اور وہ اتنے خوددار ہوں کہ وہ لوگوں سے مانگتے نہ پھریں اور ان کی حقیقتِ حال سے ناواقف آدمی انہیں مالدار سمجھے۔ آیت نمبر: 275 میں فرمایا کہ: ''سود خور کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی شخص کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو''، پھر فرمایا کہ سود کی حرمت کا حکم آنے کے بعد سود کا لین دین چھوڑ دو، ماضی کی خطا معاف ہے، البتہ اگر کسی شخص کے

دوسرے کے ذمے سابق مالی واجبات ہوں تو اصل زَر لے لے اور سود چھوڑ دے۔ سود کی حرمت کا حکم آنے کے بعد سود سے باز نہ آنے والوں کے خلاف اللہ تعالیٰ نے اعلانِ جنگ فرمایا، یہ بھی فرمایا کہ تنگدست مقروض کو مہلت دو یا ہو سکے تو اس کا قرض معاف کر دو۔

آیت نمبر:282 میں مالی معاملات اور تجارت و لین دین کے چند بنیادی و اساسی اصول بیان کئے ہیں:

(۱) دستاویزی شکل (Documentation) دو۔

(۲) ادائیگی کا وقت مقرر کرو۔

(۳) مالی معاملات کی دستاویز لکھنے پر قدرت رکھنے والے کو اپنے مسلمان بھائی کی لکھنے میں مدد کرنی چاہئے۔

(۴) تحریر لکھوانا قرض خواہ کی ذمہ داری ہے۔

(۵) تحریر لکھنے میں دیانت داری سے کام لینا فرض ہے۔

(۶) مقروض نادان، کمزور یا تحریر نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کا ولی تحریر لکھوائے۔

(۷) تجارتی و مالی معاملات میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانا چاہئے۔

(۸) گواہوں کو گواہی دینے سے انکار نہیں کرنا چاہئے بلکہ خوش دلی سے گواہی دینا چاہئے۔

(۹) گواہوں اور دستاویز لکھنے والوں کو تحفظ فراہم کرنا عاقدین کی ذمہ داری ہے۔

(۱۰) گواہوں اور دستاویز لکھنے والے کو ایذا پہنچانا گناہ ہے۔

(۱۱) گواہی کو چھپانا گناہ ہے۔

(۱۲) حالتِ سفر میں کوئی لین دین کا معاملہ ہو تو کوئی فریق ضمانت کے طور پر چیز اپنے پاس رہن رکھ سکتا ہے۔

(۱۳) اگر دستاویزی ثبوت لکھنے یا گواہوں کے بغیر کسی نے اعتماد کر کے کسی کے ساتھ لین دین کیا ہو، تو وہ دوسرے کی امانت واپس کرے اور آخر میں فرمایا: اس معاملہ میں اللہ سے ڈرتا رہے۔

آیت نمبر: 284 میں فرمایا کہ تم اپنے دلوں میں کوئی بات چھپاؤ یا اُسے ظاہر کرو، اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے گا۔ آیت نمبر: 285 میں اسلام کے بنیادی عقائد کا ذکر ہے، یعنی اللہ کے رسولوں پر ایمان، ملائک پر ایمان، تمام آسمانی کتابوں پر ایمان اور قیامت پر ایمان کا بیان ہے، نیز یہ بھی بتایا کہ مسلمان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور تمام رسولوں پر ایمان لائے یعنی یہ نہ ہو کہ ایک نبی کو مانے اور دوسرے کا انکار کرے۔ آیت نمبر: 286 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اللہ کسی شخص کو کسی ایسے حکم کا مُکلّف (Accountable) نہیں بناتا، جو اس کی طاقت سے بڑھ کر ہو، ہر انسان کو اپنے نیک و بد عمل کا جواب دینا ہوگا''۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ میں ان الفاظ میں دعا کی تعلیم دی: ''اے ہمارے رب! ہم سے اگر بھول یا خطا ہو جائے تو ہماری گرفت نہ فرمانا، اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا بھاری بوجھ نہ ڈال، جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا اور اے ہمارے رب! تو ہم پر (احکام یا آزمائشوں) کا ایسا بوجھ نہ ڈال، جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو، تو ہمیں معاف فرما، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو ہمارا مالک ہے، کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما''۔

نبی ﷺ نے فرمایا: جس گھر میں لگاتار تین دن تک سورۂ بقرہ کی آخری آیات پڑھی جائیں، شیطان اُس گھر کے قریب نہیں آتا (مشکوٰۃ)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سورۂ بقرہ کی آخری آیات خود بھی سیکھو اور اپنی خواتین کو بھی سکھاؤ کیونکہ قرآن کے علاوہ یہ بہترین حمد و ثنا اور بہترین دعا بھی ہیں، (سُنن دارمی)''۔

سورۂ آل عمران

آل عمران مدنی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے تیسری جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 89 ویں سورت ہے۔ اس سورت میں آل عمران کو فضیلت دینے کا ذکر ہے اسلئے اس سورت کا نام آل عمران رکھا گیا ہے۔ اس سورت میں عقائد اور احکام شرعیہ کا بیان ہے۔ عقائد میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور الوہیت کا ذکر، الوہیت عیسیٰ اور تثلیث کے

عقیدے کا رد ہے۔قرآن مجید کی صداقت اور کلام اللہ ہونے میں اہل کتاب کے شبہات کو دور کیا گیا ہے اس سورت کا نصف ردعیسائیت جبکہ تہائی یہودیوں کے قبائح اور جرائم کے بیان پر مشتمل ہے۔احکام شرعیہ میں فرضیت حج اور جہاد،سود کی تحریم،زکوۃ ادا نہ کرنے والوں کی سزا اور منافقین کو زجر و توبیخ کا بیان ہے۔

سورت آل عمران کی ابتدا حروف مقطعات سے ہوئی ہے۔ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت،قرآن کی حقانیت اور تورات و انجیل کے مصدق اور مؤید ہونے،اللہ تعالیٰ کا اپنی قدرت سے ماؤں کے ارحام میں اپنی مرضی کی صورتیں تخلیق فرمانے کا بیان فرمایا ہے۔

آیت نمبر:07 میں بتایا کہ آیاتِ قرآنی کی دو قسمیں ہیں:

(۱) محکم، یہ وہ آیات ہیں جن کی دلالت اپنے معنی،مفہوم اور منطوق پر بالکل قطعی اور واضح ہے، ان میں تمام شرعی احکام، حلال وحرام،فرائض وواجبات، حدود وفرائض اور اوامر (What to do) ونواہی (What not to do) کا بیان ہے۔(۲) متشابہ، ان آیات پر ہر مومن کا ایمان لانا فرض قطعی ہے اور جن کے معنی ہم پر واضح نہیں ہیں، ان کی مراد ہم اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔اللہ نے فرمایا:''جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ فتنہ جوئی اور متشابہات کا محمل (توجیہہ اور مراد) نکالنے کے لئے کنایات کے درپے رہتے ہیں، حالانکہ متشابہ آیات کا قطعی اور آخری معنی اللہ ہی جانتا ہے اور جنہیں علم دین میں مہارت حاصل ہے ،وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے اور یہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے''۔

آیت نمبر:24 میں بتایا کہ'' (انسان کی آزمائش کے لئے)عورتوں اور بیٹوں کی جانب میلان،سونا اور چاندی کے جمع شدہ خزانوں،نشان زدہ گھوڑوں، چوپایوں اور کھیتی باڑی (یعنی مال ومتاعِ دنیا مختلف زمانوں میں اس کی ظاہری صورت جو بھی ہو) کی رغبت کو آراستہ اور پرکشش بنا دیا گیا ہے، یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور عمدہ ٹھکانہ صرف اللہ کے پاس ہے''۔اس کے بعد بتایا کہ ان سے بدرجہا بہتر اور پائیدار نعمتیں اللہ کے پاس ہیں جو جنت میں عطا ہوں گی۔اگلی آیت میں مومنینِ مخلصین کا یہ شعار بتایا کہ:''جو یہ کہتے

ہیں کہ اے ہمارے رب! بیشک ہم ایمان لائے، سو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور دوزخ کے عذاب سے بچا، (یہ لوگ) صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، (اللہ کی) اطاعت کرنے والے، (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے (اور رات کے پچھلے پہر اٹھ کر اللہ سے) بخشش کی دعائیں مانگنے والے ہیں''۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: ''اللہ کے نزدیک (پسندیدہ) دین صرف اسلام ہی ہے''۔ اس کے بعد اہلِ کتاب کی بداعمالیوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ دین سے ان کے انحراف واعراض کا سبب ان کی یہ خوش فہمی ہے کہ: ''انہوں نے کہا ہمیں (جہنم کی) آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن''۔

آیت نمبر: 26 اور 27 میں اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ''(اے نبی!) کہو: اے اللہ! مُلک کے مالک، تو جسے چاہتا ہے، مُلک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے مُلک چھین لیتا ہے اور تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت میں مبتلا کر دیتا ہے، سب بھلائی تیرے ہی دست قدرت میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں، تو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے اور تو جس کو چاہے بے حساب رزق دیتا ہے''۔

آیت نمبر: 31 میں اللہ تعالیٰ کے رسول مکرم ﷺ کی عظمتِ شان کا ان الفاظ میں ذکر ہے: ''(اے رسول!) کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کے دعوے دار ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ (خود) تمہیں اپنا محبوب بنالے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے''۔ اس آیت میں واضح طور پر بتادیا گیا کہ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے قُرب اور رِضا کا طلب گار ہو، تو اُس کا فقط ایک ہی راستہ ہے، یعنی اتباعِ مصطفی ﷺ۔

آیت نمبر: 35 سے 64 تک حضرت مریم کا واقعہ بیان ہوا۔ عمران بن یاشھم حضرت مریم کے والد ہیں اور ان کی والدہ کا نام حنہ بنت فاقوذ مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جب عمران کی بیوی نے عرض کیا: اے میرے رب! جو (حمل) میرے پیٹ میں ہے، اُس کو میں نے تیرے (بیت المقدس کی خدمت کے لئے دوسری ذمے داریوں سے) آزاد رکھنے

کی نذر مانی ہے، سوتو میری طرف سے (اس نذر کو) قبول فرما، بے شک تو بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ پھر جب اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی، تو اس نے (عرض کیا) اے میرے رب! میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے (جب کہ وہ بیٹے کی امید لگائے بیٹھی تھیں)، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اس کے ہاں کیا پیدا ہوا اور (میرا مطلوب) لڑکا (اللہ کی عطا کردہ) لڑکی کی مثل نہیں ہو سکتا اور میں نے اس کا نام مریم (اس کے معنی ہیں عبادت گزار) رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولا کو شیطانِ مردود (کے شر) سے تیرے پناہ میں دیتی ہوں''۔ اس کے بعد اگلی آیات میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مریم کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمایا اور اسے عمدہ طریقے سے پروان چڑھایا اور حضرت زکریا علیہ السلام تربیت کے لئے ان کے کفیل بنے۔ اور حضرت مریم کو بیت المقدس کے ایک حجرے میں ٹھہرایا گیا۔ پھر جب حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم کے پاس بے موسم کے پھل دیکھے تو حیران ہو کر کہا: ''اے مریم! یہ (بے موسم کے) پھل کہاں سے؟، حضرت مریم نے کہا: یہ اللہ کی جانب سے''۔ اس موقع پر حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں اولاد کی خواہش ابھری کہ جو رب مریم کو بے موسم کے پھل دے سکتا ہے، وہ مجھے بڑھاپے میں اولاد بھی دے سکتا ہے۔ اور یہ ذوات فاضلہ کے قریب دعا کی قبولیت کی دلیل ہے۔ تب زکریا علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی (اور) کہا: ''اے میرے رب مجھے اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو ہی دعا کا بہت سننے والا ہے''۔ پھر جب زکریا علیہ السلام حجرے میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، فرشتے نے انہیں بشارت دی: ''بے شک اللہ آپ کو یحیٰ کی بشارت دیتا ہے، جو کلمۃ اللہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرنے والے ہوں گے، سردار اور عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے ہوں گے اور نبی ہوں گے''۔ پھر حضرتِ زکریا علیہ السلام اور ان کی بیوی کو بڑھاپے اور بظاہر ناامیدی کی عمر میں بیٹے کی پیدائش کی نشانی بتاتے ہوئے یہ فرمایا: ''تمہاری علامت یہ ہے کہ تم تین دن تک اشاروں کے سوا لوگوں سے کوئی بات نہ کر سکو گے اور اپنے رب کا کثرت سے ذکر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح بیان کرو''۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتے کے ذریعے حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے

فرمایا کہ ان کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے اور ان کے یہ اوصاف بیان فرمائے: ''وہ دنیا اور آخرت میں معزز ہوں گے، گہوارے اور پختہ عمر میں لوگوں سے کلام کریں گے، اور انہیں کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دیں گے اور بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوں گے''۔ اور حضرت مریم نے بن بیاہی ماں بننے پر حیرت کا اظہار فرمایا تو فرمایا کہ اللہ جب کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کیلئے ظاہری اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ صرف اللہ کا یہ فرمان ہی کافی ہوتا ہے کہ ہوجا تو وہ ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر ہے، یعنی اذنِ الٰہی سے مٹی سے پرندہ بنا کر اُس میں جان ڈالنا، مادرزاد اندھے اور برص کے مریض کو شفا دینا، مردے کو اپنے ہاتھ کے لمس سے زندہ کرنا، لوگوں کو یہ بتانا کہ وہ کیا کھا کر آئے ہیں اور گھروں میں کیا ذخیرہ کر کے آئے ہیں اور ان سب معجزات کے باوجود میں اللہ کا بندہ ہوں، اور اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی سو اس کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

آیت نمبر 52 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی مدد کرنے کے مطالبے پر حواریوں کے اللہ کی دین کی مدد کرنے کا ذکر ہے۔

''حور'' کے معنی سفید ہیں۔ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو) حواری اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے کپڑے سفید تھے، پھر کسی بھی شخص کے مخلص مصاحب کو حواری کہا جانے لگا، اسی لیے ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں اور میرے حواری زبیر بن عوام ہیں۔ (جامع البیان، ج: ۳، ص: ۲۰۰۔۲۰۱، ملخصاً)

پھر عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کا ذکر ہے اور یہ کہ جس طرح اللہ نے امرِ کُن سے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو بن باپ کے پیدا کیا۔ نجران کے نصاریٰ نے قطعی دلائل آنے کے باوجود دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو انہیں مباہلے کی دعوت دی گئی مگر انہوں نے مباہلے کا چیلنج قبول نہ کیا اور جزیہ دینے پر راضی ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ کتاب کو کہا کہ: ''اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے تو آؤ اُن

نکات پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہیں، اتفاق کرلو یعنی عبادت صرف اللہ کی ہوگی، شرک کو ترک کرنا ہوگا اور اللہ کو چھوڑ کر بندوں کو رب ماننے کا شِعار ترک کرنا ہوگا۔ اہلِ کتاب مشترکات (Comonalities) پر بھی جمع نہ ہوئے جو اُن کی ہٹ دھرمی کا واضح ثبوت ہے۔ آیت نمبر 67 یں اہل کتاب کی ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہودی اور نصرانی ہونے کی غلط بیانی، ابراہیم کے ملت حنیف پر ہونے اور مشرکین میں سے نہ ہونے کا ذکر ہے اور یہ کہ ابراہیم کے سب سے زیادہ قریب نبی علیہ السلام اور مومنین ہیں اس کے بعد آیت نمبر 69 سے اہل کتاب کی کئی اخلاقی برائیوں اور بد دیانتیوں کا ذکر ہے۔

آیت نمبر: 77 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت لیتے ہیں، اُن لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ آخرت میں اللہ اُن سے کلام فرمائے گا اور نہ ہی اُن کو پاکیزہ کرے گا''۔

آیت نمبر: 81 میں عالمِ اَرواح کے اُس عظیم واقعے کو بیان کیا گیا جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور (اے رسول!) یاد کیجئے جب اللہ نے تمام نبیوں سے پختہ عہد لیا کہ میں تم کو (اپنی اپنی باری پر دنیا میں بھیج کر) جو کتاب اور حکمت دوں، پھر (بالفرض) تمہارے پاس وہ عظیم رسول آئیں، جو اُس چیز کی تصدیق کرنے والے ہوں، جو تمہارے پاس ہے، تو تم اُن پر ضرور بالضرور ایمان لانا اور ضرور بالضرور اُن کی مدد کرنا، (اللہ نے) فرمایا: کیا تم نے اقرار کرلیا اور میرے اس بھاری عہد کو قبول کرلیا؟، اُنہوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا، (تو اللہ نے) فرمایا: پس گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں''۔ اس میثاق سے معلوم ہوا کہ ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کی نصرت وحمایت کا ہر نبی پابند تھا۔ اور پھر اس کا عملی مظاہرہ شبِ معراج کو اُس وقت ہوا، جب آدم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء کرام نے آپ کی اقتدا میں نماز پڑھی اور آپ کے امام الانبیاء ہونے کا عملی طور پر اظہار ہوا۔

اس پارے کی آخری آیات میں یہ بیان فرمایا کہ دینِ اسلام ایک تسلسل کا نام ہے جو

حضرت آدم علیہ السلام سے ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک چلا آ رہا ہے اور اب بھی اُسی دین کی طرف بلایا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان تمام مخلوق کا جو بھی تکوینی نظام قائم ہے، وہ سب خوشی یا ناخوشی اس نظام اور اطاعت کا پابند ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے، جس کی دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور اُن کی اولاد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت عیسیٰ علیہ السلام دیتے آئے ہیں۔ اور اسلام کے سوا کسی اور دین کو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، پس اگر کوئی شخص اسلام کے سوا کسی اور دین میں پناہ تلاش کرتا ہے، تو وہ خاسرین میں سے ہو جائے گا۔

آیات نمبر: 86 تا 88 میں اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کے بعد کفر کرنے والوں کی سزا، اُن پر ہمیشہ عذاب اور اس میں تخفیف نہ ہونے اور کسی طرح کی کوئی مہلت نہ دیئے جانے کا بیان فرمایا ہے۔ بعد کی آیت میں جہاں توبہ کرنے والوں کی بخشش کا بیان ہے، وہیں کفر پر ڈٹے رہنے والے اور حالتِ کفر میں مرنے والوں کی گمراہی کے ساتھ اُن کے ہمیشہ ہمیشہ توبہ قبول نہ کئے جانے کا بیان ہے کہ اگر وہ پہاڑ برابر بھی سونا فدیے میں دے دیں تو قبول نہ کیا جائے گا۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ: ۴

چوتھے پارے کے مضامین

چوتھے پارے کی پہلی آیتِ مبارکہ میں بیان ہوا کہ اگرچہ اللہ کی راہ میں خرچ کئے ہوئے ہر مال کا اُس کے مطابق اجر ملے گا، لیکن نیکی کا مرتبۂ کمال یہ ہے کہ اپنے پسندیدہ اور محبوب مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ اونٹ کا گوشت کھاتے تھے اور اونٹنی کا دودھ نوش فرماتے تھے، اس پر یہود نے اعتراض کیا کہ اونٹنی کا گوشت اور اُس کا دودھ شریعتِ ابراہیمی سے حرام چلا آرہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اگرچہ اُمّی (اپنی پیدائشی حالت پر) تھے اور آپ ﷺ نے رسمی طور پر لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا، مگر آپ نے یہود کو چیلنج کیا کہ اگر تمہارا دعویٰ سچا ہے، تو تورات لے آؤ اور اُس میں یہ حکم دکھادو، ورنہ یہ اللہ پر تمہارا افترا ہے، کیونکہ شرعی طور پر کسی چیز کو حرام قرار دینا، یہ اللہ عزّ وجلّ کا حق ہے یا اُس کے اختیار سے رسول اللہ ﷺ کا حق ہے جیسا کہ اعراف: 157 میں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر قسم کا طعام بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا، سوائے اُس کے جس کو تورات کے نزول سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ازخود اپنے اوپر حرام قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اونٹنی کے گوشت اور دودھ کی خوراک کو ترک کردینا اللہ کی طرف سے نہیں تھا بلکہ عزیمت کے طور پر اُنہوں نے خود اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرلی تھی، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی تنگدستی کی وجہ سے اپنے اوپر شہد کے استعمال کی پابندی لگا دی تھی۔

آیت نمبر 98،99 میں اہلِ کتاب کے اللہ تعالیٰ کے آیات کا انکار اور اللہ کے دین سے منع کرنے کی مذمت کا بیان ہے۔ بعد کی آیت میں مومنین کو اہلِ کتاب کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے۔

آیت نمبر: 95 تا 97 میں صاحبِ استطاعت پر حج کی فرضیت کا حکم بیان ہوا اور یہ کہ

زمین پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے سب سے پہلا گھر مکۂ مکرمہ میں بیت اللہ بنایا گیا، جس میں واضح نشانیاں ہیں، مقامِ ابراہیم ہے اور یہ جائے امن ہے۔

آیت نمبر: 103 تا 110 میں اتحادِ اُمت اور فرقہ بندی سے بچنے کا حکم بیان ہوا اور فرمایا کہ اسلام سے پہلے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور اپنی بداعمالیوں کے سبب آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے، مگر نعمتِ بعثتِ مصطفیٰ اور نعمتِ اسلام کی برکت سے اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم بھائی بھائی بن گئے۔ پھر مزید تاکید کے طور پر فرمایا کہ واضح دلائل آنے کے بعد پچھلی امتوں کی طرح فرقہ بندی نہ کرو ورنہ روزِ قیامت عذابِ عظیم سے دوچار ہونا پڑے گا۔ قیامت کے دن اہلِ ایمان کے چہرے روشن ہوں گے اور اللہ اور اس کے رسول کے نافرمان رُوسیاہ ہوں گے۔

آیت نمبر: 110 میں امتِ مسلمہ کو بہترین امت قرار دے کر اس کی وجہِ فضیلت بیان کی کہ تمہیں اس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ عالمِ انسانیت میں نیکیوں کو پھیلاؤ اور برائیوں کو روکو، یعنی اُمتِ مُسلمہ کی ذمہ داری عالَمِ انسانیت کو دعوتِ حق دینا اور نبوی مشن کو سرانجام دینا ہے۔

آیت نمبر: 112 میں بتایا کہ یہود پر اُن کے ناروا اعمال کے سبب ذلت مسلط کر دی گئی، کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے، اور اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اہلِ کتاب میں ایک گروہ ایسا تھا، جو حق پر قائم رہا، تلاوتِ آیاتِ الٰہی، عبادت، خیر کے کاموں میں مستعد رہنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کا شعار تھا۔

آیت نمبر: 118 میں حکم ہوا کہ اہلِ ایمان کو چاہئے کہ وہ اپنے دین کے دشمنوں کو اپنا راز دار نہ بنائیں، وہ مسلمانوں کی بربادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے اور مسلمانوں کا مصیبت میں مبتلا ہونا ان کی خواہش ہے، ان کی مسلمانوں سے نفرت کسی حد تک ان کی باتوں سے عیاں ہے اور جو بغض وعناد وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، وہ اس سے سوا

ہے۔ان کا شِعار منافقت ہے، سامنے آئیں تو محبت کے دعوے اور پسِ پشت مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی منصوبہ سازی کرتے ہیں۔مسلمانوں کی راحت سے انہیں تکلیف پہنچتی ہے اور دکھ سے انہیں راحت پہنچتی ہے۔

غزوۂ بدر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آیت نمبر:122 میں فرمایا کہ منافقین کا ساتھ چھوڑنے کے بعد مسلمانوں کی دو جماعتوں (بنوحارثہ اور بنوسلمہ) کی ہمتیں پست ہو رہی تھیں کہ اللہ نے انہیں بچا لیا۔آیت نمبر:123 تا 128 میں غزوۂ بدر کا ذکر ہے، اللہ نے ایسے حالات میں کہ مسلمان ظاہری اعتبار سے کمزور تھے، تین ہزار فرشتے ان کی مدد کے لئے اتارے اور مزید نصرتِ غیبی کا وعدہ فرمایا۔اور یہ بھی بتایا کہ مجاہدین کی مدد کے لئے فرشتوں کا نزول مومنوں کے اطمینانِ قلب کے لئے تھا۔

آیت نمبر:130 میں ایک بار پھر سود کی ممانعت کا حکم نازل ہوا کہ حرام طریقے سے مال کو دگنا چوگنا نہ کرو۔آیت نمبر:133 اور 134 میں بیان ہوا کہ جنت کے حق دار اہلِ تقویٰ کا شِعار یہ ہے کہ خوشحالی ہو یا تنگدستی ہر حال میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں، غصے پر قابو پاتے ہیں اور لوگوں کی خطاؤں کو معاف کر دیتے ہیں۔اگلی آیات میں امت کے گناہگاروں کو نویدِ مغفرت دی گئی کہ اگر تم نے بدقسمتی سے اللہ کی نافرمانی اور بے حیائی کے کام کر بھی دیئے ہیں، تو ایک بار پھر تمہیں دعوت ہے کہ پلٹ آؤ، اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو، اللہ خطا کاروں اور گناہگاروں کو بخشنے والا ہے بشرطیکہ وہ گناہوں پر اصرار نہ کریں بلکہ انہیں ترک کر دیں۔

آیت نمبر:139 تا 143 میں غزوۂ احد میں اَفرادی قوت اور اسباب میں کمی کے سبب دل چھوڑنے والے مجاہدین کو تسلی دی کہ ثابت قدم رہو، آخر کار تم ہی سرفراز ہو گے۔اگر وقتی طور پر تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو اہلِ حق کے ساتھ ایسا ماضی میں بھی ہوتا رہا، مگر برے دن ہمیشہ نہیں رہتے اور یہ ابتلائیں مسلمانوں کے لئے درجات کی بلندی کا سبب بنتی ہیں اور جنت کے حصول کے لئے مسلمانوں کو مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔یہ بھی بتایا کہ موت سے

ڈرنا مسلمانوں کا شِعار نہیں ہے۔

غزوۂ احد میں جب یہ افواہ اڑا دی گئی کہ (عِیَاذاً بِاللہ) اللہ کے رسول شہید ہو گئے ہیں، تو مسلمانوں کے قدم عارضی طور پر لڑکھڑا گئے، اُن کو اطمینان دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہی تو ہیں، ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں، تو اگر (قضائے الٰہی سے) وہ فوت ہو جائیں یا (بفرض محال) شہید ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں واپس پلٹ جاؤ گے؟''۔ یعنی مسلمان کو ہر حال میں راہِ حق میں ثابت قدم رہنا چاہئے اور نبوی مشن کی تبلیغ کیلئے سرگرم عمل رہنا چاہیے۔ گزشتہ امتوں کے بلند ہمت اہلِ حق کا یہ شِعار بتایا کہ وہ ہر مشکل و مصیبت میں اللہ سے استغفار کرتے ہیں۔

غزوۂ اُحُد کے بارے میں انہی آیات میں یہ بتایا کہ جب عارضی طور پر مسلمانوں کی ہمتیں جواب دینے لگیں اور طرح طرح کے گمان ان کے ذہنوں میں پیدا ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کی تسلی کے لئے اُن پر اونگھ طاری کر دی اور نیند کی کیفیت میں انہیں امید افزا منظر دکھایا تا کہ ہمت بندھ جائے۔ ان کے ذہنوں میں یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ ہم مدینے سے نکل کر احد کے میدان میں نہ آتے تو شاید موت سے بچ جاتے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''(موت برحق ہے) اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہو، تو جہاں جس کی موت مقدر ہے، وہ خود اپنے مَقتَل کی طرف نکل آئے گا، (یعنی کوئی بھی تدبیر موت کے وقت اور مقام کو ٹال نہیں سکتی)''۔ ان آیات میں یہ بھی بتایا کہ منافقین مسلمانوں کو بددل کرنے کے لئے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے، لیکن اللہ کی راہ میں موت اُخروی انعامات کا سبب ہے۔

جو مسلمان عارضی طور پر پسپا ہو گئے تھے، بعد میں وہ آپ کے پاس لوٹ آئے، تو آپ نے ان پر کوئی گرفت نہیں فرمائی، آپ کی اس اخلاقی عظمت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا: ''سو اللہ کی عظیم رحمت سے آپ مسلمانوں کے لئے نرم ہو گئے اور اگر آپ تندخو اور سخت دل ہوتے، تو وہ ضرور آپ کے گرد و پیش سے بھاگ جاتے، پس آپ انہیں معاف کر دیں اور ان کے لئے استغفار کریں اور (اہم) امور میں ان سے مشورہ کریں، پس جب آپ (کسی

کام کا) عزم کرلیں، تو پھر اللہ پر توکل رکھیں"۔

آیت نمبر:164 میں اللہ تعالیٰ نے بعثتِ مصطفیٰ ﷺ کو اہلِ ایمان کے لئے اپنی نعمت اور احسان قرار دیا اور آپ کے فرائضِ نبوت کو ایک بار پھر بیان فرمایا۔ آیت نمبر 165 میں غزوہ احد کی تکالیف کو سرکار دو عالم ﷺ کی حکم عدولی کا نتیجہ قرار دیا اور اس کو مومنین اور منافقین دونوں کے لئے آزمائش کا سبب بتایا۔ چونکہ منافق غزوۂ احد کے مجاہدین کو بار بار ذہنی اذیت پہنچاتے ہوئے کہتے کہ اگر تم نے ہماری بات مانی ہوتی اور احد کے میدان میں نہ گئے ہوتے تو ان نتائج سے بچ جاتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے شہداء کی عظمتِ شان کو مسلمانوں کی طمانیت کے لئے ان الفاظ میں بیان فرمایا: "اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جائیں (مردہ کہنا تو درکنار، اپنے ذہن کے کسی گوشے میں)، انہیں مردہ گمان بھی نہ کرو، وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے، اللہ نے اپنے فضل سے جو انہیں عطا فرمایا ہے وہ اس پر خوش ہیں"۔

آیت نمبر 172 میں زخمی ہونے اور لوگوں کے ایک بڑے لشکر سے ڈرانے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنے والے اور شیطان اور اس کے چیلوں کے بہکاوے میں نہ آنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے اجرِ عظیم کا ذکر ہے۔

کافروں کو بتایا گیا کہ انہیں جو دنیا میں ڈھیل دی جارہی ہے، یہ ان کے لئے مزید تباہ کن ہوگی، کیوں کہ جتنی سرکشی وہ کرتے چلے جائیں گے، انجامِ کار اس کا وبال اُن پر ہی آئے گا۔

آیت نمبر:180 میں ان بخیل مالداروں کو جو اللہ کا دیا ہوا مال اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتے وعید سنائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جو (مال) انہیں عطا کر رکھا ہے، وہ یہ گمان نہ کریں یہ ان کے حق میں بہتر ہے، بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے اور قیامت کے دن اُن کے اِسی جمع کئے ہوئے مال کا طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔

آیت نمبر 181 میں اللہ تعالیٰ کو فقیر اور خود کو غنی کہنے کے اہل کتاب کے گستاخانہ قول کا

ذکر ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس قول اور انبیاء کے قتل ناحق لکھنے اور ان کیلئے عذاب جہنم کا ذکر فرمایا۔

آیت نمبر:183 میں رسول اللہ ﷺ سے یہود کے اس مطالبے کا ذکر ہے کہ ان کے نزدیک نبی کی صداقت کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ کے لئے قربانی پیش کریں اور آسمان سے آگ آئے اور اسے کھا جائے (یعنی جلا کر راکھ کر دے)۔بتایا گیا کہ یہ محض ان کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جن رسولوں نے یہ معجزہ پیش کیا، ان پر وہ نہیں ایمان لائے؟۔

آیت نمبر 185 میں ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنے، ہر کسی کو ان کے اعمال کا بدلہ دینے اور حقیقی کامیابی یعنی دخول جنت کا ذکر ہے۔بعد کی آیت میں اہل کتاب اور مشرکین کی ایذا رسانی پر صبر کرنے اور تقویٰ اختیار کرنے کو عزم الامور سے شمار فرمایا ہے۔

آیت نمبر 187 میں اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم ﷺ کی شان اقدس کو بیان کرنے اور اسے نہ چھپانے کا اہل کتاب سے وعدہ لیا تھا لیکن انہوں تھوڑی قیمت کے بدلے میں اس وعدے کو پس پشت ڈال دیا۔آیت نمبر 188 میں بغیر کسی استحقاق کے تعریفیں سمیٹنے والوں کیلئے دردناک عذاب کی وعید کا بیان ہے۔

آیت نمبر:190 اور اس کے بعد والی آیات میں یہ بتایا کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور نظامِ گردشِ لیل ونہار میں عقلمندوں کیلئے نشانیاں ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو حالتِ قیام میں، بیٹھے ہوئے اور کروٹوں کے بل لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی حکمتوں پر غور وفکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:''اے ہمارے پروردگار! تو نے اس (نظامِ کائنات) کو بے مقصد پیدا نہیں کیا''۔ یعنی یہ کائنات اور اس میں تمام اسرار و رموز، نظم وضبط اور ایک نظر نہ آنے والے کنٹرول، اللہ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی قدرت وجلالت کی عقیدت میں ڈوب کر وہ کہتے ہیں کہ:اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایمان کے داعی کی استدعا کو سنا کہ

اپنے رب پر ایمان لے آؤ، تو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے پروردگار! تو ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری خطاؤں کو مٹا دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ فرما۔ اے ہمارے پروردگار! اپنے رسولوں کی زبانی تو نے ہم سے جو وعدہ فرمایا، وہ ہمیں عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرما کر ارشاد فرماتا ہے کہ میں کسی بھی مرد اور عورت کے عملِ خیر کو ضائع نہیں کروں گا اور دین کی راہ میں سب کی قربانیوں کی بہتر جزا دوں گا۔ اس سورت کی آخری آیت میں فرمایا اے ایمان والوں صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہو اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

سورۃ النساء

سورۃ النساء مدنی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے چوتھی جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 92ویں سورت ہے۔ یہ سورۃ بقرہ کے بعد سب سے لمبی سورت ہے۔ اس سورت میں رشتہ داروں سے حسن سلوک، یتیموں کے حقوق کی ادائیگی، تعدد ازدواج کی مشروط اجازت، وراثت کے احکام، معاشرے سے بے حیائی کے خاتمے کے ابتدائی احکام، محرمات نکاح کا بیان، اعمال صالحہ کی تلقین، مسلمانوں کا مال ناحق کھانے اور مسلمانوں کو قتل کرنے کی ممانعت، عائلی اور معاشرتی احکام، والدین اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کا بیان، بخل کی مذمت، یہود کی شرارتوں کا رد، اور مسلمانوں کو یہودیوں سے خبردار کرنے، منافقین کی سرزنش، جہاد کی تلقین، اور یتیموں سے متعلق تفصیلی احکام کا ذکر ہے۔

سورۃ النساء کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ: اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک شخص سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی (حواء) کو پیدا کیا اور پھر ان دونوں کے ذریعے کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں زمین میں پھیلا دیئے، یعنی تمام انسانیت کی اصل ایک ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اپنے زیرِ کفالت یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے، اسی طرح اپنے خراب مال کو یتیم کے اچھے مال سے تبدیل نہ کرو۔ اگلی آیت میں یہ بتایا کہ اگرچہ بوقتِ ضرورت ایک سے زیادہ چار تک شادیوں کی

اجازت ہے، لیکن ازواج کے درمیان عدل کی کڑی شرط کے ساتھ۔ زیرِ کفالت یتیموں کے حوالے سے فرمایا کہ اگر وہ اپنے مال کی حفاظت کا شعور نہیں رکھتے، تو ان کے سرپرست کو چاہئے کہ ان کے مال کی حفاظت کرے، ان کی ضروریات کی کفالت کرے اور ان سے حسنِ سلوک کرے۔ یتیم کا مال اس وقت اس کے سپرد کرو جب وہ بالغ اور عقلمند ہو جائے۔ اس اندیشے سے یتیم کا مال جلدی جلدی ہڑپ نہ کرو کہ وہ بالغ ہو کر اپنے مال کا مطالبہ کرے گا اور جب یتیم کا مال اس کے حوالے کرو، احتیاطاً گواہ مقرر کرلو۔ قرآن نے یہ بھی بتایا کہ یتیم کا سرپرست اگر غنی ہے تو اپنی ذات اور ضروریات پر یتیم کے مال کو خرچ نہ کرے اور اگر وہ فقیر ہے تو صرف بقدرِ ضرورت اپنے اوپر خرچ کرلے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ مرد ہو یا عورت، شریعت میں اپنے مقررہ حصے کی وراثت پانے کا حق دار ہے، یعنی اسلام میں عورت کو وراثت سے محروم نہیں رکھا گیا۔ سفارش کے طور پر قرآن نے یہ بھی بتایا کہ تقسیمِ وراثت کے موقع پر ایسے قرابت دار، یتیم اور مسکین آجائیں جن کو وراثت میں حصہ نہیں مل رہا تو نفلی صدقے کے طور پر انہیں کچھ نہ کچھ دے دو، ذرا یہ سوچو کہ کل خدانخواستہ تمہاری اولاد اس محرومی کی حالت سے دوچار ہو جائے تو ان پر کیا گزرے گی۔

سورۃ النساء کی آیت نمبر: 11 اور 12 میں وراثت کے مسائل بیان فرمائے گئے ہیں جو یہ ہیں:

(۱) کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کی اولاد میں بیٹے اور بیٹیاں ہیں، تو ہر بچے کو بیٹی کا دگنا حصہ ملے گا۔

(۲) اگر صرف ایک ہی بیٹا ہو تو جن وارثوں کا حصہ شریعت میں مقرر ہے، ان کو دینے کے بعد بقیہ کل ترکہ بیٹے کو مل جائے گا۔

(۳) ایک سے زائد بیٹے ہوں تو ان میں برابر تقسیم ہوگا۔

(۴) اگر کسی کی وارث صرف ایک بیٹی ہو تو اسے بقیہ ترکے کا آدھا حصہ ملے گا۔

(۵) اگر ایک سے زائد صرف بیٹیاں ہوں، تو ان کو مجموعی طور پر بقیہ ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا۔

(۶) کسی شخص کا انتقال ہوگیا اور وہ صاحبِ اولاد ہے اور اس کے ماں باپ بھی حیات ہیں، تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔

(۷) اگر کسی شخص کا انتقال ہوا اور اس کی اولاد نہیں ہے اور اس کے ماں باپ بقیدِ حیات ہیں، تو ماں کو ترکے کا تہائی حصہ ملے گا اور بقیہ ترکہ باپ کو ملے گا۔

(۸) فوت شدہ شخص کے لاولد ہونے کی صورت میں اگر اس کے بہن بھائی ہیں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

(۹) اگر بیوی لاولد ہو تو اس کا نصف ترکہ شوہر کو ملے گا۔

(۱۰) اگر شوہر لاولد ہو تو اس کے ترکے سے بیوی کو چوتھائی حصہ ملے گا۔

(۱۱) اگر شوہر کی وفات ہوگئی تو بیوی ایک ہو یا ایک سے زائد، (اولاد کی موجودگی میں) سب کو مجموعی طور پر شوہر کے ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔

(۱۲) اگر کسی لاولد شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کے ماں باپ بھی نہ ہوں اور صرف ماں کی طرف سے بہن یا بھائی ہو تو اسے چھٹا حصہ ملے گا اور اگر صرف ماں کی طرف ایک سے زائد بھائی یا بہن ہوں تو انہیں کل ترکے کا ایک تہائی حصہ ملے گا۔

میت کے انتقال کے بعد اس کے ترکے میں سے سب سے پہلے اس کے کفن و دفن کے اخراجات وضع کئے جائیں گے، اس کے بعد اس کے ذمے اگر کوئی قرض ہے، تو اس کی ادائیگی کی جائے گی۔ اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہے (اور وہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہیں ہے)، تو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک اس کی وصیت نافذ کی جائے گی۔ یہ تین امور تقسیمِ وراثت پر مقدم ہیں۔

آیت نمبر 16،15 میں بدکاری کی ابتدائی اور عارضی سزا کا بیان ہے، مستقل سزا پھر سورۃ نور میں نازل ہوئی اور اس کیلئے چار گواہوں کی کڑی شرط بھی لگائی ہے۔ اور توبہ کرنے

والوں کیلئے بخشش اور مغفرت کا مژدہ سنایا ہے۔

آیت نمبر: 17 میں اللہ تعالیٰ نے قبولیتِ توبہ کا اصول بیان فرمایا ہے کہ جن لوگوں سے گناہ سرزد ہو جائے اور وہ غلطی کا احساس ہونے پر جلدی توبہ کرلیں، تو ان کی توبہ کی قبولیت اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے۔ لیکن جو لوگ زندگی بھر گناہ کرتے چلے جائیں یہاں تک کہ فرشتۂ اجل سر پر آ کھڑا ہو اور پھر کہیں کہ میں نے توبہ کی تو ان کی توبہ کی قبولیت کی کوئی ضمانت نہیں اور جن کی موت کفر پر واقع ہو جائے، ان کی آخرت میں نجات کی کوئی ضمانت نہیں۔

آیت نمبر: 20 میں ارشاد ہوا کہ بیوی کا مقررہ مہر خواہ کم ہو یا زیادہ ادا کرنا چاہیے۔ اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح جائز نہیں اور اس کے بعد اُن قرابت دار عورتوں کا بیان ہے، جن سے نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہے اور وہ یہ ہیں:

(الف) اُمّ یعنی ماں (اس میں دادی، نانی اور اس سے اوپر کی جدات سب داخل ہیں)۔

(ب) بنت یعنی بیٹی (اس میں صلبی لڑکی، پوتی، نواسی، نیچے تک سب داخل ہیں) البتہ منہ بولی بیٹی اور لے پالک اس میں شامل نہیں ہیں بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو۔

(ج) اخوات: بہنیں اس میں حقیقی، علاتی (باپ شریک) اور اخیافی (ماں شریک) سب شامل ہیں۔

(د) عمّات: پھوپھیاں (باپ کی حقیقی، علاتی (باپ شریک) اور اخیافی (ماں شریک) سب اس میں شامل ہیں)۔

(ہ) خالات: خالائیں (والدہ کی حقیقی، علاتی (باپ شریک) اور اخیافی (ماں شریک) سب بہنیں اس میں شامل ہیں)۔

(و) بَنٰتُ الْاَخِ: بھتیجیاں (حقیقی، علاتی اور اخیافی ہر قسم کے بھائیوں کی بیٹیوں سے نکاح حرام ہے)۔

(ز) بَنٰتُ الْاُخْتِ: بھانجیاں (حقیقی، علاتی اور اخیافی ہر قسم کی بہنوں کی بیٹیوں سے نکاح حرام ہے)۔

(ح) ساس: (یعنی بیویوں کی مائیں اور ان کی دادیاں، خواہ کتنے ہی اوپر درجے کی ہوں)۔

(ط) منکوحہ بیوی، جس کے ساتھ مباشرت کا تعلق قائم ہو چکا ہے، کی کسی اور شوہر سے بیٹی کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ اور اگر صرف نکاح ہوا، بیوی سے مباشرت نہیں ہوئی اور کسی وجہ سے علیحدگی ہو چکی ہو، تو اس کے سابق شوہر سے بیٹی کے ساتھ اس شخص کا نکاح جائز ہے۔

(ی) اپنے نسلی بیٹوں کی بیویوں کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ اس میں بہو، پوتے کی بیوی اور نواسے کی بیوی خواہ نیچے کے درجے میں ہوں، سب حرام ہیں۔

(ق) کسی بھی شخص کے لئے بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں رکھنا حرام ہے، اگر بیوی کو طلاق دے دی ہو تو عدت گزرنے کے بعد اُس کی دوسری بہن سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایسی دو خواتین کو بھی بیک وقت نکاح میں رکھنا حرام ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو مرد فرض کر لیا جائے، تو ان کا آپس میں نکاح جائز نہ ہو، جیسے پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی وغیرہ۔ آیتِ مبارکہ میں اس مسئلے کو ''جمع بینَ الاُختَین'' (یعنی دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے) سے تعبیر فرمایا ہے۔

(ل) جس طرح نسبی رشتے سے دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، اسی طرح رضاعی بہنوں کا بھی بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس حکم کے آنے سے پہلے ماضی میں جو اسی طرح کے نکاح ہوئے ہیں وہ معاف ہیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ جن عورتوں سے نسب کے رشتے سے نکاح حرام ہے، اُن سے رضاعت کے رشتے سے بھی حرام ہے اور ''النساء:23'' میں بھی یہ مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ:۵

پانچویں پارے کے مضامین

پانچویں پارے کے شروع میں محرمات قطعیہ کے تسلسل میں یہ بھی بتایا کہ جب تک کوئی عورت کسی دوسرے شخص کے نکاح میں ہے، اس سے نکاح حرام ہے، یہاں تک کہ اگر شوہر نے طلاق دے دی ہو تو عدت کے اندر نکاح اور واضح الفاظ میں نکاح کا پیغام دینا بھی حرام ہے۔ البتہ عدت کے بعد عورت اپنی رضامندی سے دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرسکتی۔ ہاں کفار کی وہ عورتیں جو میدان جنگ سے پکڑی جائیں اور تمہاری ملک میں آجائیں تو ان سے جماع حلال ہے۔ آیت نمبر 25 میں فرمایا کہ جو شخص آزاد عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہیں رکھتا وہ کنیزوں سے نکاح کرسکتا ہے۔

آیت نمبر:29 میں بتایا کہ باطل طریقوں سے (یعنی جوا، سٹہ، غصب، چوری، ڈاکہ، خیانت، رشوت، جھوٹی قسم کھا کر اور جھوٹی گواہی کے ذریعے) ایک دوسرے کا مال کھانا حرام ہے اور باہمی رضامندی سے تجارت جائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والا نفع بھی جائز ہے۔ اسی طرح ہبہ اور وراثت کے ذریعے جو مال ملے وہ بھی جائز ہے۔

آیت نمبر:30 میں فرمایا کہ جو شخص ظلماً دوسروں کا مال کھائے گا وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر بندہ کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے تو وہ اپنے فضل و کرم سے بندے کے صغیرہ اور غیر ارادی گناہوں کو معاف فرما دے گا۔

آیت نمبر:32 میں حسد کی ممانعت کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے کسی کو مال، عزت یا مرتبے میں فضیلت دے رکھی ہے تو اس کے زائل ہونے کی تمنا نہ کرو، کیونکہ یہی حسد ہے جو حرام ہے، کسی کے ساتھ حسد کرنے سے بہتر ہے کہ اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو، اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔

آیت نمبر:34 سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''مرد عورتوں کے منتظم اور کفیل ہیں، کیوں کہ

اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس لئے (بھی) کہ مردوں نے ان پر اپنے مال خرچ کئے ہیں (یعنی شوہر مہر بھی ادا کرتا ہے اور بیوی بچوں کی کفالت بھی اس کے ذمے ہے)''۔ جو عورت شوہر کی نافرمان ہو، اسے ''ناشزہ'' کہتے ہیں۔ قرآن نے نافرمان عورت کی تدریجی اصلاح کا حکم بیان کیا ہے، یعنی (الف) اسے پیار ومحبت سے سمجھانا (ب) عارضی طور پر ان کے بستر علیحدہ کرنا (ج) تادیباً سرزنش کرنا۔ اگر ان تدریجی اقدامات سے عورت اصلاح قبول کر لے تو اس پر سختی کی ممانعت ہے۔ اگر ان تدریجی اقدامات سے زوجین کے درمیان تنازع رفع نہ ہو تو قرآن نے مصالحت کا یہ طریقہ تعلیم فرمایا ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں کے خاندانوں سے ایک ایک حَکَم (منصف) مل بیٹھیں اور اگر وہ اصلاح پسند ہوں گے تو اللہ تعالیٰ زوجین کے درمیان اتفاق پیدا فرما دے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے ازدواجی زندگی کو خوشگوار رکھنے اور استوار رکھنے کو بڑی اہمیت دی ہے۔

آیت نمبر:36 سے اللہ تعالیٰ نے توحید کا حکم فرمایا اور شرک (کی تمام صورتوں) کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس کے بعد حقوق العباد کا بیان ہوا اور فرمایا کہ ماں باپ، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں، مسافروں اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ پھر پڑوسیوں کی درجہ بندی کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک پڑوسی وہ ہے جو قرابت دار ہے، یہ قرابت رشتے داری کی بھی ہو سکتی ہے اور اسلامی رشتے کے حوالے سے بھی۔ دوسرا وہ پڑوسی جو اجنبی ہے، اس اجنبی سے مراد یہ ہے کہ جو رشتے دار نہ ہو اور وہ بھی ہے جو کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ تیسرا وہ جس کے ساتھ دفتر یا کارخانے میں، سفر میں یا کلاس یا مجلس میں قربت کا تعلق قائم ہو جائے۔ ان سب کے درجہ بدرجہ حقوق ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص مومن نہیں، جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو اور جو اپنے پڑوسی کی عزت نہ کرے''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ: ''جبرائیل امین مجھے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اتنی تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان گزرا کہ شاید پڑوسی کو

وارث بنادیا جائے گا''۔

آیت نمبر: 37 تا 40 میں بُخل اور رِیا کاری کی ممانعت اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم ہے اور فرمایا کہ جس کو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہ ہو وہی رِیا کاری کر سکتا ہے، یہ بھی فرمایا کہ اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں فرماتا اور نیکی کا اجر دُگنا فرما دیتا ہے۔ آیت نمبر 41 میں فرمایا کہ قیامت کے دن تمام انبیاء اپنی اپنی امتوں کے احوال و اعمال کی شہادت دیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انبیائے کرام کی شہادت کے درست ہونے کی گواہی دیں گے۔ آیت نمبر 42 میں انبیاء ورسل کی نافرمانی کرنے والوں کے پچھتاوے کا ذکر ہے۔ آیت نمبر 44 میں یہود کی گمراہیوں اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دینے کا ذکر ہے۔

آیت نمبر 43 میں نماز کے چند مسائل بیان فرمائے:

(الف) نشے کی حالت میں نماز ادا نہ کرو، نماز تو کسی حالت میں چھوڑی نہیں جا سکتی تو مسلمان کو ہر قسم کا نشہ چھوڑ دینا چاہئے۔

(ب) بعض ناگزیر صورتوں میں تیمم کی اجازت دی گئی ہے، وہ یہ ہیں: آدمی مسافر ہو اور پانی سرے سے دستیاب ہی نہ ہو یا قیمت پر دستیاب ہو اور وہ قیمت اس کی استطاعت میں نہ ہو یا صرف اتنا پانی ہو کہ پیاس بجھائے یا وضو کرے، تو پیاس بجھانے کو ترجیح دی جائے گی یا پانی دستیاب تو ہے لیکن بیمار ہے اور پانی استعمال کرنے کی صورت میں اس کی زندگی یا صحت کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بے وضو ہو یا غسل واجب ہو، دونوں صورتوں میں تیمم کی رخصت ہے۔ تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ نیت کے ساتھ ایک بار پاک مٹی پر ہاتھ مارے اور اس سے چہرے کا مسح کرے اور دوسری بار مٹی پر ہاتھ مارے اور کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں کا مسح کرے۔ زمین کی جنس سے جو بھی پاک چیز ہو اس سے تیمم کرنا جائز ہے۔

آیت نمبر: 46 میں یہودیوں کی ایک قبیح خصلت کا ذکر ہے کہ وہ کلامِ الٰہی میں تحریف کرتے ہیں، اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی لفظ کو اپنے مقام سے ہٹا دیا جائے یا اسے چھپا دیا جائے۔ اور جب انہیں اللہ کا حکم سنایا جاتا ہے تو وہ ''ہم نے سنا اور اطاعت کی'' کہنے

کے بجائے کہتے ہیں: ''ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی اور آپ کا حکم نہ سنا جائے''۔اور ''رَاعِنَا (ہماری رعایت کیجئے)'' کے کلمے کو زبان پھیر کر ''رَاعِیْنَا (ہمارے چرواہے)'' کہتے ہیں یعنی اہانت آمیز معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور یہ ان کی اللہ کے رسول سے نفرت اور فطری خباثت کی وجہ سے ہے اور اسی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برستی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ جس طرح تم کلماتِ الٰہی کو بگاڑتے ہو، اس کی سزا کے طور پر تمہاری صورتیں بھی بگاڑی جاسکتی ہیں۔

آیت نمبر:48 میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک کے گناہ کو کسی صورت میں معاف نہیں فرماتا، اس کے علاوہ وہ جس کے لئے چاہے اس سے کم تر گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے، آیت نمبر 49 میں اپنی پاکبازی بیان کرنے والوں کا رد ہے فرمایا کہ اللہ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے۔اس میں ہر شیخی خور، اور ڈینگیں مارنے والوں کیلئے عبرت ہے۔آیت نمبر 51 میں فرمایا: اہلِ کتاب بت اور شیطان پر ایمان لاتے ہیں۔یہود کے سردار کعب بن اشرف اور حُیَیّ بن اَخْطَب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جنگ کی خاطر مشرکینِ مکہ کو حلیف بنانے کے لئے گئے، تو مشرکینِ مکہ نے کہا کہ جب تک تم لوگ ہمارے بتوں کو سجدہ نہ کرو ہم تم پر اعتبار نہیں کریں گے، انہوں نے اہلِ کتاب اور اہلِ توحید ہونے کے باوجود عداوتِ رسول میں بتوں کو سجدہ کرلیا اور اللہ کی لعنت کے سزاوار بنے۔قرآن نے بتایا کہ ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی عداوت کا سبب آپ کو نبوت کا عطا کیا جانا تھا، حالانکہ اس سے پہلے ابراہیم اور آلِ ابراہیم کو بھی اللہ نے کتاب وحکمت اور بادشاہت کا اعزاز عطا فرمایا تھا اور وہ جسے چاہے نوازدے۔پھر فرمایا کہ یہود کو اُن کی اِن نافرمانیوں کی پاداش میں جہنم کا سخت عذاب دیا جائے گا اور ان کی کھالیں جلتی رہیں گی اور جلنے کے بعد انہیں نئی کھالیں دے کر عذاب جاری رکھا جائے گا۔

آیت نمبر:58 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ امانتیں ان کے حق داروں کو دو اور جب فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔حکومت واقتدار اور منصب وعہدہ بھی امانت

ہے، مشورہ بھی امانت ہے اور کسی کے پاس کسی نے کوئی چیز ودیعت رکھی ہو، تو یہ بھی امانت ہے۔ حدیثِ پاک میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا: ''قیامت کب آئے گی؟''، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب امانت ضائع کردی جائے''، پوچھا گیا کہ امانت کیسے ضائع ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب امت کی زمامِ اقتدار نااہلوں کے سپرد کی جائے''۔

آیت نمبر:59 میں فرمایا: ''اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے صاحبانِ اختیار ہیں، ان کی اطاعت کرو''۔ اس میں اللہ عزّوجلّ اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر مشروط اطاعت کا حکم ہے اور اہلِ اقتدار کی اطاعت مشروط ہے۔ اگر اہلِ اقتدار کے ساتھ کسی معاملے کے جائز یا ناجائز ہونے کی بارے میں اختلاف ہو جائے، تو فیصلہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہوگا۔

آیت نمبر:60 تا 63 میں منافقین کی مکروہ چالوں اور دورُخے پن کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اہلِ ایمان کے لئے ایک ایمان افروز نوید ہے، اللہ عزّوجلّ نے ارشاد فرمایا: ''اور ہم نے ہر رسول کو صرف اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے اور جب یہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو اے رسول! یہ آپ کے پاس آئیں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگیں اور رسول بھی ان کے لئے دعاءِ مغفرت کریں، تو یہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، بے حد رحم کرنے والا پائیں گے''۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے اللہ سے استغفار کیا جائے، تو اللہ اسے رد نہیں فرماتا اور یہ وسیلۂ مغفرت آج بھی ہر مسلمان کو حاصل ہے۔

آیت نمبر:65 میں فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے رسول کو آپس کے جھگڑوں میں حاکم نہ بنائیں اور پھر آپ جو فیصلہ صادر فرمادیں، اسے دل وجان سے قبول نہ کریں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے پر دل میں بھی کوئی تنگی اور ملال نہیں آنا چاہئے) تو وہ بظاہر دعوائے ایمان کے باوجود حقیقت میں مومن نہیں ہوسکتے۔

آیت نمبر:69 میں فرمایا: جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، تو وہ (آخرت میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، جو انبیاء، صدیقین، شہدا اور عباد الصالحین ہیں۔ اس کے بعد جہاد کے بارے میں اَحکام، ہدایات اور کامیابی کی بشارتیں ہیں۔ مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ ایسے عالم میں جب معاشرے کے کمزور لوگ، عورتیں اور بچے مدد کے لئے پکاریں کہ ہمیں ظالموں کی بستی سے نکال دو تو مظلوموں کی مدد کے لئے، ان پر میدانِ جہاد میں آنا لازم ہے۔

آیت نمبر:76 اور اس کے بعد والی آیات میں بتایا کہ منافق اور بزدل لوگوں کو جب جہاد کی دعوت دی جاتی ہے، تو جان جانے کے خوف سے ان کے دل لرز جاتے ہیں اور وہ زندگی کی مہلت چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے رسول کہہ دیجئے! دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے اور اہلِ تقویٰ کے لئے آخرت بہتر ہے''۔ موت کے ڈر سے جہاد سے گریز کرنے والوں کو فرمایا: ''تم جہاں کہیں بھی ہو، موت تم کو پالے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں قلعہ بند ہی کیوں نہ ہو جاؤ''۔ منافقوں کا ایک شعار یہ بھی بتایا کہ: ''انہیں کوئی بھلائی پہنچے تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچے تو (رسول اللہ سے) کہتے ہیں: یہ آپ کی طرف سے ہے، (اے رسول!) آپ کہہ دیجئے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے''۔ پھر فرمایا: ''تمہیں جو اچھائی پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور تمہیں جو برائی پہنچے تو وہ تمہاری ذات کی وجہ سے ہے''۔ منافقوں کی ایک خصلت یہ بھی بتائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کہتے ہیں ہم نے آپ کا حکم مانا، پھر رات کو اپنی مجلسوں میں اس کے برعکس بات کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے، اگر یہ قرآن اللہ کے غیر کے پاس سے آیا ہوتا، تو یہ اس میں بہت اختلاف پاتے''۔ قرآن نے ایک اصول بتایا کہ حالتِ جنگ اور زمانۂ جنگ میں امن اور خوف (یعنی فتح وشکست) کے حوالے سے ہر سنی سنائی خبر کو پھیلانا نقصان کا سبب بنتا ہے، ایسے زمانے میں خبروں پر نگرانی کا اہتمام ہونا چاہئے کہ کس

خبر کی اشاعت مسلمان کے لئے مفید اور کس کی اشاعت مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہے، اسے آج کل کی اصطلاح میں Censorship کہتے ہیں اور جدید دنیا میں بھی حالتِ جنگ میں خبروں کی اشاعت سرکاری کنٹرول ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ کرنا اہلِ نظر اور سیاست و جنگ کے ماہرین کا کام ہوتا ہے۔ کیونکہ فوج اور قوم کے مورال پر ان افواہوں کا اثر پڑتا ہے۔ اور اب میدانوں کے علاوہ پراپیگنڈہ کر کے نفسیاتی جنگ بھی لڑی جاتی ہے۔

آیت نمبر 84 میں نبی کریم ﷺ کو خود جہاد کرنے اور مومنین کو جہاد کی ترغیب دینے کا حکم ہے۔ آیت نمبر 85 میں فرمایا کہ جائز سفارش کا اجر اور ناجائز سفارش کا وبال سفارش کرنے والے کیلئے ہوگا۔

آیت نمبر :86 میں معاشرتی آداب بتائے گئے کہ جب تمہیں کسی لفظ سے سلام کیا جائے، تو تم اس سے بہتر الفاظ میں جواب دو (جیسے السلام علیکم کے جواب میں کہا جائے وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ وبرکاتہٗ) یا کم از کم انہی الفاظ میں جواب دو (جیسے السلام علیکم کے جواب میں کہا جائے وعلیکم السلام)۔

زمانۂ جنگ میں مسلمانوں کو کئی طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا:

(الف) وہ منافقین جو دل سے مسلمانوں کی تباہی اور ناکامی چاہتے تھے، ان کے لئے فرمایا کہ نہ تو انہیں اپنا دوست بنایا جائے اور نہ ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی جائے بلکہ ان کا قلع قمع کر دیا جائے۔

(ب) کچھ لوگ وہ تھے جو جنگ سے گریز چاہتے تھے، نہ مسلمانوں سے لڑنا چاہتے تھے اور نہ اپنی قوم کی حمایت میں لڑنا چاہتے تھے یا وہ ایسی قوم کے پاس چلے جاتے جن کے ساتھ مسلمانوں کا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہے، تو قرآن نے بتایا اگر وہ جنگ سے کنارہ کش ہو جائیں اور مسلمانوں سے نہ لڑیں اور مسلمانوں کو صلح کا پیغام دیں، تو مسلمانوں کو بھی ان سے تعرض نہیں کرنا چاہئے۔

(ج) منافقین کا ایک گروہ وہ تھا جو مسلمانوں اور اپنی قوم دونوں کے ساتھ امن سے رہنا

چاہتا تھا، لیکن ان کی باطنی کیفیت یہ تھی کہ اگر ان کی قوم کی طرف سے مسلمانوں پر جنگ مسلط کردی جائے، تو وہ اس میں کود پڑیں۔ تو قرآن نے بتایا: اگر وہ مسلمانوں سے الگ نہ ہوں اور مسلمانوں کو صلح کا پیغام نہ دیں اور موقع ملنے پر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے اپنا ہاتھ نہ روکیں، تو مسلمانوں کو بھی حق ہے کہ موقع ملنے پر ان کا قلع قمع کردیں۔

آیت نمبر: 92 قتلِ خطا کا حکم بیان ہوا ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ہاتھوں غیر ارادی طور پر غلطی سے کسی مسلمان کا قتل ہو جائے، تو اس کی تلافی کے لئے کفارہ بھی دینا ہوگا اور مقتول کے ورثاء کو دیت بھی دینی ہوگی، سوائے اس کے کہ مقتول کے ورثاء دیت معاف کر دیں۔ اسی طرح کسی معاہد قوم کا کوئی فرد مسلمان کے ہاتھوں غلطی سے قتل ہو جائے، تو اس کا حکم بھی یہی ہے۔ اور اگر کسی مسلمان کے ہاتھوں کسی دشمن قوم کا کوئی فرد غلطی سے قتل ہو جائے، تو اس کے لئے صرف کفارہ ہے۔ کفارہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے اور اگر مومن غلام دستیاب نہ ہو جیسے کہ اب دنیا میں غلامی کا رواج ختم ہو چکا ہے اور اسلام بھی غلامی ختم کرنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ اسلام نے مختلف ترغیبات دے کر اور اسے کار ثواب کے طور پر پیش کر کے اس کے خاتمے کی بنا ڈالی ہے۔ تو ایسی صورت میں کفارہ دو مہینے کے مسلسل روزے رکھنا ہے، یہ اللہ کی طرف سے توبہ ہے۔ قتلِ خطا کی دیت حدیث پاک میں بیان ہوئی ہے، جو یہ ہے: ایک ہزار طلائی (Golden) دینار یا دس ہزار نقرئی (Silver) درہم یا سو اونٹ۔ قتلِ خطا کی ذیلی اقسام اور دیت کی تفصیلات کے لئے کتب فقہ کا مطالعہ کیجئے۔

آیت نمبر: 93 میں قتلِ عمد یعنی ارادی طور پر کسی بے قصور انسان کی جان کو تلف کرنے کا حکم بیان کیا گیا، جو یہ ہے: ''جہنم کا دائمی عذاب (اگر حرام سمجھ کر قتل کیا ہے تو جب تک اللہ کی مشیت کا تقاضا ہو، مدتِ دراز تک جہنم میں رہے گا اور اگر قتلِ ناحق کو حلال جان کر کیا ہو تو ہمیشہ جہنم میں رہے گا) اور اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اللہ کی لعنت ہوگی اور آخرت میں اس کے لئے عذابِ عظیم ہے۔ اگر کسی نے قصداً قتلِ ناحق کیا ہے اور دنیا میں اس سے

قصاص لے لیا گیا ہے، تب بھی آخرت کی نجات کے لئے توبہ شرط ہے۔قتلِ ناحق کی صورت میں قاتلِ سے قصاص بھی لیا جاسکتا ہے اور کسی بھی مالی بدل پر صلح کی جاسکتی ہے یا بغیر کسی مالی بدل کے معاف کیا جاسکتا ہے، یہ دنیاوی احکام ہیں۔آیت نمبر 94 میں مومنین سے ارشاد فرمایا کہ جہاد کے سفر یا میدان جنگ میں اگر کوئی اقرار ایمان کرلے تو مالِ غنیمت کے حصول کیلئے ایسے شخص کے ایمان کا انکار کر کے اسے قتل نہیں کرنا چاہئے اور فرمایا اللہ کے پاس بہت غنیمتیں ہیں اور تمہیں اللہ نے احسان کر کے دولت ایمان سے نوازا ہے۔

آیت نمبر :95 میں یہ بتایا کہ جو لوگ جہاد سے کنارہ کش ہیں، ان کا درجہ ان کے برابر نہیں ہوسکتا، جو اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں، ان کو اللہ نے فضیلت دی ہے، البتہ جو بیماری یا ضعیف العمری کے سبب عملی جہاد میں شریک نہیں ہے، لیکن وہ جنگ کا منصوبہ ساز ہے، حکمتِ عملی ترتیب دینے والا ہے، جنگی چالیں سکھانے والا ہے یا مجاہدین کی خدمت میں مشغول ہے، وہ یقیناً مجاہد کا اجر پائے گا۔

عہدِ رسالت کے تناظر میں جبکہ مسلمان مستقل حالتِ جنگ میں تھے، جو لوگ جنگ سے گریز کرتے رہے، ان کے بارے میں فرمایا کہ جب اُن کی روح قبض کرنے کا وقت آئے گا، تو فرشتے ان سے پوچھیں گے کہ حق و باطل کی جنگ کے وقت تم کہاں تھے؟۔وہ کہیں گے ہم زمین میں کمزور تھے، تو فرشتے ان سے کہیں گے کہ تم نے دارالایمان کی طرف ہجرت کیوں نہ کی؟، لیکن جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی کمزور تھے، ان کے لئے کوئی راہِ نجات نہ تھی تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا۔یہ بھی فرمایا کہ ہجرت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ وسعت عطا فرمائے گا اور جو شخص ہجرت کے ارادے سے اپنے گھر سے روانہ ہو جائے اور اسی دوران اسے موت آجائے، تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔

آیت نمبر :101 اور بعد کی آیات میں مسافر کے لئے نماز میں قصر کا حکم بیان ہوا ہے، فقہِ حنفی میں مسافتِ سفر کی مقدار 98 کلومیٹر ہے۔نماز اور جماعت اتنا لازمی فریضہ ہے کہ حالتِ جنگ میں بھی ساقط نہیں ہوتا، چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ عین حالتِ جنگ میں

نماز کا وقت آجائے تو ضرورت کے مطابق مجاہدین کا ایک حصہ دشمن کے مقابل مورچہ بند رہے اور دوسرے امام کی اقتدا میں ایک رکعت نماز پڑھیں اور پھر وہ مورچے میں چلے جائیں اور جو مجاہدین مورچہ بند تھے وہ دوسری رکعت میں آکر امام کے ساتھ شامل ہوں اور اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی نماز مکمل کریں اور پھر یہ مورچوں میں چلے جائیں اور دوسرا فریق آکر اپنی بقیہ نماز مکمل کرے، اسے صلوٰۃ الخوف کہتے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ دفاع سے غافل ہونا کسی طور پر جائز نہیں ہے، اسی کو آج کل کی جنگ کی اصطلاح میں Red Alert یا High Alert کہتے ہیں اور یہ کہ کسی بھی صورت نماز کو ترک کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ جب تم نماز ادا کر چکو تو حالتِ قیام، حالتِ قعود اور کروٹوں کے بل لیٹے ہوئے، یعنی ہر حال میں اللہ کو یاد کرو، اللہ کا ذکر کرو اور جب حالتِ جنگ ختم ہو جائے اور امن کی حالت ہو تو معمول کے مطابق نماز ادا کرو، بے شک نماز مومنوں پر وقت مقرر میں فرض کی گئی ہے۔

آیت نمبر 104 میں فرمایا کہ دشمن کے تعاقب میں سستی نہ دکھائیں۔اگر تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو ان کو بھی تم جیسے دکھ پہنچتا ہے حالانکہ تم اجر آخرت کے امیدوار بھی ہو۔

آیت نمبر 105 سے لیکر 108 میں عہد رسالت میں پیش آنے والے ایک یہودی اور مسلمان کے درمیان چوری کے معاملے میں ہونے والے فیصلے کے ایک خاص واقعے کی طرف اشارہ ہے جب مسلمانوں کے ایک قبیلے کے کچھ افراد جان بوجھ کر گناہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہگار ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کو حقیقت حال کا علم عطا فرمایا اور فرمایا کہ گناہگار اپنا ہو یا پرایا گناہگار کو سزا ملنی چاہئے اور اس لئے اس کی حمایت نہیں کرنی چاہئے کہ وہ اپنا ہے اور بے گناہ کی حمایت کرنی چاہئے اگر کہ وہ غیر ہی کیوں نہ ہو۔

اللہ فرماتا ہے کہ جو کوئی گناہ کا کام کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے، تو وہ اللہ کو غفور و رحیم پائے گا اور ہر شخص کی بداعمالیوں کا وبال اُسی پر آئے گا۔

آیت نمبر 115 میں فرمایا کہ عملی اقدامات کے بغیر صرف مشوروں اور میٹنگوں میں کوئی بھلائی نہیں۔ اور عملی اقدامات کرنے والوں کیلئے اجرِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور جو شخص ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور تمام مسلمانوں کے راستے کے خلاف چلے، تو ہم اُسے اُسی طرف پھیر دیں گے، جسے اُس نے خود اختیار کیا اور اُسے جہنم میں داخل کردیں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے''، اِس میں واضح طور پر وعید ہے کہ کسی شخص کا مسلمانوں کے اِجماعی راہ سے ہٹ کر اپنے لئے الگ راہِ عمل متعین کرنا جہنم کا راستہ اختیار کرنا ہے۔

آیت نمبر 116 میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ تمام گناہوں کو معاف فرماتا ہے اور اللہ کے ساتھ شرک بہت بڑی گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے پیروکاروں کے لئے جہنم کی وعید سنائی ہے اور مومنینِ کاملین کے لئے جنت کی بشارت دی ہے اور فرمایا کہ ہر صاحبِ ایمان مرد اور عورت جنہوں نے حالتِ ایمان میں نیک کام کئے، وہ جنت میں داخل ہوں گے۔

آیت نمبر 123، 122 میں بیان ہوا کہ نجات کا دارومدار آرزوؤں اور جھوٹی امیدوں پر نہیں بلکہ عمل صالح پر ہے اور جو برا عمل کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔

آیت نمبر 125 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُس سے اچھا دین کس کا ہوگا، جو اپنے آپ کو اللہ کی بندگی کے سپرد کردے، اور وہ نیکوکار ہو اور ملّتِ ابراہیم کا پیروکار ہو۔ آیت نمبر 127 میں یتیم لڑکیوں کے میراث میں حصے، شادی کے معاملات، مہر وغیرہ حقوق کے بارے میں ذکر ہے اور فرمایا کہ اگر تم ان سے نکاح کرنے کے خواہش مند ہو تو ان کے حقوق ادا کرو اور کمزور یتیم بچوں کے حقوق کا بھی خیال رکھو۔

آیت نمبر 128 میں فرمایا کہ اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے نکاح برقرار رکھنے کیلئے اپنے حقوق کو ساقط کر کے صلح کرنا چاہے تو کوئی حرج نہیں، اور شوہر کو احسان کرنے اور اللہ سے ڈرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

آیت نمبر 129 میں فرمایا کہ تم پورا پورا انصاف نہیں کر سکتے لیکن یہ نہ ہو کہ ایک بیوی کی طرف مکمل جھک جاؤ اور دوسری کو بالکل نظر انداز کر کے لٹکا دو بلکہ حتی الوسع انصاف سے کام لیتے رہو اور اگر نباہ نہ ہو سکے اور جدائی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ بہتر اسباب پیدا فرمانے والا ہے۔

آیت نمبر:135 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے مومنو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ (یہ گواہی) تمہاری ذات کے خلاف ہو یا تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کے خلاف ہو، (فریقِ معاملہ) خواہ امیر ہو یا غریب، اللہ اُن کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے، پس (گواہی دیتے وقت) تم خواہش کی پیروی کر کے عدل سے رُوگردانی نہ کرو، اور اگر تم نے گواہی میں ہیر پھیر کیا یا اِعراض کیا، تو اللہ تمہارے سب کاموں سے خوب باخبر ہے''۔

آیت نمبر 136 میں ایمان والوں کو دین پر ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بعد والی آیت میں ہوا کا رخ دیکھ کر دین بدلنے والوں کیلئے بخشش اور ہدایت سے محرومی کا ذکر فرمایا۔

آیت نمبر 142 سے منافقین کی عادات بد کا ذکر ہے۔ ایک علامت یہ بتائی کہ نماز میں سستی کرتے ہیں، نماز کو ایک بوجھ سمجھتے ہیں اور صرف دکھاوے کے لئے نماز پڑھتے ہیں اور مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ کُفر و ایمان کے درمیان مُتزلزل رہتے ہیں، اِسی لئے فرمایا کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

آیت نمبر 146 میں توبہ کرنے والوں اور دین پر مضبوطی سے جمے رہنے والوں کیلئے اجرِ عظیم کا ذکر فرمایا۔

آیت نمبر 147 میں فرمایا کہ اللہ کا عذاب تو ناشکروں اور بے ایمانوں کیلئے ہے اگر تم شکر گزار بنو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ:٦

چھٹے پارے کے مضامین

اسلام کا ایک اہم اُصول یہ ہے کہ اسلام دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی کا حکم دیتا ہے اور برائی کی تشہیر کو پسند نہیں فرماتا ،مگر اس کے باوجود مظلوم کی دادرسی کے لئے ظالم کے خلاف آواز بلند کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

آیت نمبر:150 میں بتایا کہ جولوگ ایمان لانے میں اللہ اور اُس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں یا بعض رسولوں پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کریں یا ایمان اور کفر کے درمیان کوئی درمیانی راستہ تلاش کریں، یہ سب لوگ پکے کافر ہیں۔مومن صرف وہی ہیں جو اللہ پر ایمان لائیں اور بلاتفریق اُس کے سارے رسولوں پر بھی ایمان لائیں۔

آیت نمبر 153 تا 161 میں یہود کی بہت سی جہالتوں، سرکشیوں، ہٹ دھرمیوں اور فرمائشی مطالبات کا ذکر ہے۔

اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ ہم پر آسمان سے کتاب نازل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام سے اِس سے بھی بڑے مطالبات کر چکے ہیں، جو یہ ہیں:

(الف) اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہمیں کھلم کھلا دکھلاؤ، چنانچہ اُن کے ظلم کی پاداش میں اُنہیں آسمانی بجلی نے پکڑ لیا۔

(ب) پھر واضح دلائل آنے کے باوجود اُنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ کو قبول فرمایا۔

(ج) اُن کے سروں پر طور کو اُٹھا کر اُن سے دین پر قائم رہنے کا عہد لیا اور اُنہوں نے عہد کو توڑ دیا۔

(د) اِسی طرح اُن سے سجدہ ریز ہوتے ہوئے دروازے میں داخل ہونے اور ہفتے کے دن کی تقدیس کو پامال نہ کرنے کا عہد لیا گیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کی عہد شکنی اور کفر کی وجوہ کو بیان کیا کہ (۱) اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا، اِس سے انبیاء کرام کے معجزات مراد ہیں۔ (۲) انبیاء کرام کو ناحق قتل کیا۔ (۳) حضرت مریم پر بہتان باندھا۔ (۴) مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کے قتل کا دعویٰ کیا (۵) ہٹ دھرمی سے یہ کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''دراصل اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اُنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی اُنہیں سولی دی بلکہ اُن پر صورتِ حال مُشتبہ کردی گئی۔

مُفسّرین نے لکھا ہے: ''کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری کی صورت اُن کے مشابہ بنا دی گئی اور اُسے سولی پر چڑھا کر وہ یہ سمجھے کہ اُنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کردیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اُن کو اپنی طرف (زندہ) اُٹھالیا''۔

پھر فرمایا کہ قیامت سے پہلے اہلِ کتاب ضرور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن اُن کی گواہی دیں گے۔ اللہ نے فرمایا: یہود کے ظلم کے سبب ہم نے اُن چیزوں کو اُن پر حرام قرار دے دیا، جو اُن کے لئے حلال کی گئی تھیں، اِس کی کچھ تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے اور کچھ آگے آئے گی۔

یہود کی ایک سرکشی یہ تھی کہ ممانعت کے باوجود وہ سود لیتے تھے اور ناحق لوگوں کا مال کھاتے تھے۔ لیکن قرآن نے بتایا کہ جو اُن میں سے پُختہ علم والے تھے وہ قرآن پر اور اُس سے پہلی سماوی کتابوں پر ایمان لاتے تھے، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ پر وہ کاربند تھے، اللہ اور قیامت کے دن پر اُن کا ایمان تھا اور ایسے ہی لوگوں کو اجرِ عظیم عطا کیا جائے گا۔

آیت نمبر: 163 میں بتایا کہ وحیٔ ربانی اور نبوّت کا سارا سلسلہ آپس میں مربوط ہے۔ حضرت نوح اور اُن کے بعد کے انبیائے کرام علیہم السلام اور حضرت ابراہیم تا حضرت عیسیٰ مُتعدد انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: جس طرح ہم نے اِن انبیاء کرام پر باری

باری وحی نازل فرمائی اِسی طرح اے رسولِ مکرم ﷺ! آپ پر بھی وحی نازل کی ہے۔ مزید فرمایا کہ کچھ رسولوں کے نام اور حالات ہم نے آپ پر بیان کیے اور ایسے بھی رسول ہیں، جن کے واقعات قرآن میں بیان نہیں ہوئے، جن کے نام قرآن وحدیث میں بیان ہوئے، اُن پر تعیّن کے ساتھ ایمان لانا فرض ہے اور جن کے نام اور حالات بیان نہیں ہوئے، اُن پر اجمالی طور پر ایمان لانا فرض ہے یعنی جس کو بھی اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہم اُن پر ایمان لاتے ہیں۔ اور نظامِ نبوت ورسالت کی حکمت یہ بتائی کہ تمام انسانوں پر دعوتِ حق کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی حُجّت قائم ہوجائے اور قیامت کے دن کسی بھی انسان کے پاس کفر وشرک، فسق وفجور اور ضلالت پر قائم رہنے کے لئے کوئی عُذر نہ رہے، اِسی لئے انبیاء کا فریضہ رحمتِ الٰہی کی بشارت سنانا اور عذابِ الٰہی سے ڈرانا قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے نبی ﷺ پر وحی کے نازل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور اس طرح اُن کی نبوت کو ظاہر کرتے ہیں۔ کفر کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی سیدھی راہ سے روکنے والے لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔ اور ایسے کافروں اور ظالموں کی اللہ تعالیٰ نہ تو مغفرت فرماتا ہے اور نہ ہی اُنہیں دوزخ کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ کی طرف گامزن فرماتا ہے۔ لوگ اگر رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی بات کو مان لیں تو یہ بہتر ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں کے کفر کی کوئی پرواہ نہیں ہے، اس لئے وہ زمین وآسمان اور جو کچھ اُن میں ہے، اُس سب کا مالک ہے۔

نصاریٰ نے دین میں غُلو (Exaggeration) کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" قرار دیا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دین میں حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے بارے میں ناحق بات نہ کہو، مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ تھے، اللہ کا کلمہ تھے، جسے اُس نے حضرت مریم کو اِلقا کیا اور اُس کی رُوح تھے۔ مزید فرمایا کہ: یہ نہ کہو کہ معبود تین ہیں (یعنی مُقدّس باپ، مُقدّس بیٹا اور رُوح القُدُس)، فرمایا: عقیدے کی بے اِعتدالی سے باز آجاؤ، اللہ کی ذات صرف ایک ہے، وہی مُستحقِ عبادت ہے وہ اولاد کی نسبت سے پاک ہے اور وہی آسمانوں

اور زمین کا مالک ہے۔مزید فرمایا:

''نہ تو مسیح علیہ السلام کو اور نہ ہی مُقرّب فرشتوں کو اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی عار ہے،یعنی اللہ کی بارگاہ میں ہر درجے کی مخلوق کے لئے شانِ بندگی ہی اعزاز و اکرام ہے''۔

آیت نمبر:174 میں فرمایا: اے لوگو! تمہارے پس اللہ کی طرف سے قوِی دلیل آ گئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف واضح نور نازل کیا ہے، برہان (قوی دلیل) سے مراد''سیّدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کی ذاتِ گرامی ہے۔سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور واضح نور قرآن مجید سے مکمل وابستگی اختیار کرنے سے ہی رحمتِ الٰہیہ کا حصول اور صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہنے کا انحصار ہے۔سورۃ النساء کی آخری آیت میں وراثت کا ایک مسئلہ بیان ہوا کہ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اُس کے ماں باپ بھی بقیدِ حیات نہ ہوں اور کوئی اولاد بھی نہ ہو، اِسے شریعت کی اصطلاح میں'' کلالہ'' کہتے ہیں اور اُس کی ایک حقیقی یا باپ کی طرف سے بہن ہو، تو اُس بہن کو کل ترکے کا آدھا ملے گا اور اگر وہ بہن فوت ہو جائے اور وہ بھی لا وَلد ہو تو یہ شخص اُس کے پورے ترکے کا وارِث ہوگا۔اور اگر اُس کی دو(یا دو سے زائد) بہنیں ہوں، تو اُنہیں کل ترکے کا دوتہائی ملے گا۔اور اگر اُس شخص کے وُرثاء میں حقیقی یا باپ کی طرف سے بہن بھائی ہوں تو اُن میں پورا ترکہ تقسیم ہوگا اور ہر بھائی کو ہر بہن سے دگنا حصہ ملے گا۔چونکہ اللہ تعالیٰ ضلالت و گمراہی سے بچانا چاہتا ہے، اِس لئے وہ ان مالی معاملات کو بھی وضاحت سے بیان کرتا ہے، اِس کے بعد سورۃ المائدہ ہے۔

سورۃ المائدہ

سورۃ المائدہ مدنی سورت ہے۔لیکن اسکی بعض آیتیں مکہ میں نازل ہوئیں ہیں۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے پانچویں اور ترتیب نزول کے اعتبار سے 113ویں سورت ہے اس سورت کے دو آیتوں میں مائدہ (کھانے،خوان) کا ذکر ہے۔اسلئے اس کو سورت المائدہ کہتے ہیں، اس سورت کو سورۃ العقود اور سورۃ المنقذہ بھی کہتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سورۃ المائدہ اللہ کی ملکوت میں منقذہ کہلاتی ہے کیونکہ یہ سورت اپنے

پڑھنے والے کو عذاب کے فرشتوں سے نجات دیتی ہے (تفسیر المنیر ج6ص60)

وعدے کو پورا کرنے کا حکم دے کر تربیت اخلاق سے اس سورت کا آغاز ہو رہا ہے۔ انفرادی، اجتماعی بلکہ بین الاقوامی معاملات وتعلقات میں وعدے کو پورا کرنے کی اہمیت ہر ذی شعور پر عیاں ہے۔

مزید فرمایا: مُستثنیات کے سِوا (جن کا بیان آگے آرہا ہے) چار پاؤں والے جانور حلال کئے گئے ہیں، لیکن احرام کی حالت میں شِکار حلال نہیں ہے۔ مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں اور حُرمت والے (چار) مہینوں کی بے حُرمتی نہ کرو، اِسی طرح کعبہ میں بھیجی ہوئی قربانیوں اور جن جانوروں کے گلوں میں (قربانی کی علامت کے) پٹّے پڑے ہوں، اُن کی بھی بے حُرمتی نہ کرو اور یہ کہ احرام کھولنے کے بعد شکار کر سکتے ہو۔ اِس کے بعد مسلمانوں کو نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنے اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں مدد نہ کرنے کا حکم ہوا ہے۔ یہ آیتِ مبارکہ جوامع الکلم میں سے ہے۔ ہر خیر وشر، بھلائی اور برائی کا اس آیتِ مبارکہ میں بڑے اختصار کے ساتھ تذکرہ کر کے قرآن مجید نے تمام کاموں کے لئے ایک اصل اور ضابطہ قرار دے دیا ہے۔

آیت نمبر:3 میں مُحرماتِ قطعیہ کا بیان ہے، جو یہ ہیں:

(۱) وہ حلال جانور جو طبعی موت مر گیا ہو اور ذبح نہ کیا جاسکا ہو، یعنی مُردار۔

(۲) ذِبح کے وقت بہنے والا خون۔

(۳) خنزیر کا گوشت۔

(۴) جس جانور پر ذِبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

(۵) وہ حلال جانور جو گلہ گھونٹنے سے مر جائے۔

(۶) وہ حلال جانور جو چوٹ لگنے سے مر جائے۔

(۷) وہ حلال جانور جو بلندی سے گر کر مر گیا ہو۔

(۸) وہ حلال جانور جسے دوسرے جانور نے سینگوں کی چوٹ سے مار دیا ہو۔

(۹) جسے درندوں نے کھایا ہو۔

(۱۰) وہ حلال جانور جو بتوں کے تھان پر ذِبح کیا گیا ہو۔

(۱۱) اور فال کے تیروں سے قسمت کا حال معلوم کرنا۔

یہی وہ آیتِ مبارکہ ہے جس میں مسلمانوں کے لئے ایک اِعزازی اعلان ہوا کہ: ''آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کو (بطور دین) پسند کر لیا ہے''۔ قرآن سے پہلے کی کسی اِلہامی کتاب میں تکمیلِ دین کا اعلان نہیں ہوا۔ اِسی آیت میں بتایا کہ حالتِ اضطرار میں بقائے جان کے لئے بقدرِ ضرورت حرام چیز کا کھانا جائز ہے۔ اِسی سورت میں شِکاری کتوں کے ذریعے شِکار کئے گئے حلال جانور کے حکم کو بیان کیا گیا ہے، جس کے تفصیلی مسائل تفسیر و حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

آیت نمبر: 5 میں بتایا کہ مسلمانوں کا کھانا اہلِ کتاب کے لئے حلال ہے اور اہلِ کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لئے حلال ہے، بشرطیکہ وہ کھانا اپنے اصل کے اعتبار سے حلال ہو اور اُس میں کسی حرام کی آمیزش نہ ہو۔ اِسی آیت میں یہ حکم بھی بیان ہوا کہ اہلِ کتاب کی آزاد، پاکدامن عورتوں سے مسلمان کا نکاح جائز ہے۔

آیت نمبر: 6 میں وضو کے چار فرائض بیان ہوئے یعنی (۱) پورے چہرے کو دھونا (۲) کہنیوں سمیت ہاتھوں کا دھونا (۳) سر کا مسح (۴) ٹخنوں سمیت پاؤں کا دھونا۔ اِس کے بعد مریض، مسافر، بے وضو اور جُنبی (جس پر غسل واجب ہو) کے لئے ضرورت کے وقت تیمم کی اجازت کا بیان ہے، جس کی تھوڑی سے تفصیل سورۃ النساء کی تفسیر میں بیان کی جاچکی ہے۔

آیت نمبر: 8 میں بے لاگ انصاف کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ''کسی قوم کی عداوت کی وجہ سے تم بے انصافی پر آمادہ نہ ہو، تم عدل کرتے رہو اور یہی رَوِش خوفِ خدا کے زیادہ قریب ہے''۔

آیت نمبر 11 میں یہودیوں کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھاری پتھر لڑھکا کر شہید کرنے کی

سازش کو ناکام کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کرنے کی اللہ تعالیٰ کے احسان کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:12 میں اللہ تعالیٰ کے بنی اسرائیل سے میثاق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''اور اللہ نے فرمایا بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور تم میرے رسولوں پر ایمان لائے اور تم نے اُن کی تعظیم کے ساتھ مدد کی اور اللہ کو (اُس کے دیئے ہوئے مال سے) اچھا قرض دیا، تو میں ضرور بالضرور تم سے تمہارے گناہوں کو مٹادوں گا اور میں تم کو ضرور اُن جنتوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں''۔ اس کے بعد پھر بنی اسرائیل کی عہد شکنی، سنگدلی، کلام اللہ میں تحریف کرنے پر ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت کا ذکر ہے۔

اور آگے چل کر فرمایا کہ میثاقِ الٰہی کے بڑے حصے کو بھلا دینے کی پاداش میں اُن کے درمیان قیامت تک کے لئے بغض وعداوت اور منافرت کو پیدا کر دیا۔ اہلِ کتاب کے جرائم تو بہت زیادہ ہیں لیکن یہاں اُن کے بہت کم جرائم کو بیان کیا گیا ہے کیونکہ مقصود اُن کی اصلاح ہے نہ کہ اُن کے جرائم کی تشہیر۔ پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہوا: ''بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نورِ نبوّت اور روشن کتاب آئی۔ اللہ اِس کے ذریعے سلامتی کے راستوں پر اُن لوگوں کو چلاتا ہے، جو اُس کی رضا کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے اِذن سے اُن کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور اُن کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے''۔

آیت نمبر:17 میں اللہ تعالیٰ نے مسیح ابن مریم کو''اِلٰہ'' قرار دینے والوں کو کافر کہا ہے اور فرمایا کہ (بفرضِ محال) اللہ مسیح ابن مریم اور اُن کی ماں کو ہلاک کرنا چاہے، تو ساری زمین والے مل کر بھی اُن کو بچا نہیں سکتے۔ پھر یہود ونصاریٰ کی اس خوش فہمی اور زعمِ باطل کا رَد فرمایا کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اُس کے محبوب ہیں، فرمایا کہ تم بھی منجملہ انسانوں میں سے ہو۔ اہلِ کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ انبیاء کی بعثت کے بعد ایک فترۃ (اِنقطاعِ (Gap) نبوّت ورسالت) کا دور آیا اور پھر ہم نے اپنے رسولِ عظیم کو مبعوث فرمایا تا کہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ

ہمارے پاس کوئی بشیر ونذیر نہیں آیا، سواب تمہارے پاس اللہ کی رحمت کی بشارت دینے والے اور اُس کے عذاب سے ڈرانے والے آخری رسول (محمد رسول اللہ ﷺ) آ چکے۔

آیت نمبر: 21 تا 26 میں اِس بات کا ذکر ہے کہ بنی اسرائیل کو مُقدّس سرزمین میں داخل ہونے کا حکم دیا، اُنہوں نے کہا: اے موسیٰ! اِس سرزمین میں تو بڑی بڑی جسامت والے لوگ ہیں، جب تک اُن کو نکال نہ دیا جائے، ہم داخل نہیں ہوں گے، لہٰذا ''آپ اور آپ کا رب جائیں اور دونوں (اُن سے) جنگ کریں، بے شک ہم یہیں بیٹھے رہیں گے''۔ موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم سے مایوس ہو گئے تو اللہ کی بارگاہ میں عرض کی کہ اے پروردگار! میرا بس تو صرف اپنے آپ پر اور اپنے بھائی (ہارون) پر چل سکتا ہے، پس میرے اور میری نافرمان قوم کے درمیان فیصلہ فرما دیجئے۔ بنی اسرائیل کی اِن نافرمانیوں کی پاداش میں چالیس سال تک اُن پر مُقدّس سرزمین کو حرام کر دیا گیا اور وہ زمین میں یونہی بھٹکتے رہے۔

آیت نمبر: 27 تا 31 میں آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا واقعہ بیان ہوا کہ دونوں نے اللہ کی بارگاہ میں قربانی پیش کی، ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی رَد ہوگئی۔ اُس زمانے کی شریعتوں میں قربانی کی قبولیت کی علامت یہ تھی کہ آسمان سے آگ آتی اور اُسے جلا ڈالتی۔ قابیل، جس کی قربانی رَد ہوگئی، اُس نے غصے میں اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا، اِس قربانی کا پس منظر کُتبِ تفسیر میں مذکور ہے۔ پھر قابیل کو یہ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اپنے بھائی کی لاش کے ساتھ کیا کرے، پھر اللہ تعالیٰ نے کوا بھیج کر اُسے لاش کو زمین میں دفن کرنا سکھایا۔

اِس پس منظر کو بیان کرنے کے بعد اللہ عزّوجلّ نے ارشاد فرمایا: ''اِسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جس شخص نے جان کے بدلے کے بغیر (یعنی حقِ قصاص کے بغیر) یا زمین میں فساد پھیلانے کے (جرم کے) بغیر کسی انسانی جان کو قتل کیا، تو گویا اُس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے (کسی بے قصور) شخص کی جان کو بچا دیا تو گویا اُس نے تمام انسانوں کو بچا لیا''۔ اِس سے معلوم ہوا کہ انسانی جان کی حُرمت انسانیت کا اجتماعی حق ہے اور ایک بے قصور انسان کو قتل کرنا پوری انسانیت کے تحفظِ جان کے حق کو پامال کرنا۔

اِس کے بعد انسانیت کے سب سے بڑے جرم، جسے آج کل دہشت گردی کہا جاتا ہے، کی حد کو اللہ تعالیٰ نے اسے اللہ اور رسول کے خلاف جنگ قرار دے کر اِن کلمات میں بیان فرمایا: ''اور جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور دہشت گردی کرتے ہیں، اُن کی یہی سزا ہے کہ اُن کو چُن چُن کر قتل کیا جائے یا اُن کو سولی دی جائے یا اُن کے ہاتھ ایک جانب سے اور پیر دوسری جانب سے کاٹ دیئے جائیں یا اُن کو زمین سے نکال دیا جائے (یعنی قید کر دیا جائے)، یہ اُن کے لئے دنیا میں رُسوائی ہے اور آخرت میں اُن کے لئے بڑا عذاب ہے''۔

آیت نمبر:35 میں اہلِ ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے اور اللہ کی بارگاہ میں (نجات کا) وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا۔ آیت نمبر:36 میں فرمایا کہ کوئی شخص ساری روئے زمین کا مالک ہو جائے اور اتنی ہی دولت اُسے اور مل جائے، اور وہ یہ سب کچھ اپنی جان کے فدیے کے طور پر دے دے، تو پھر بھی قیامت کے دن کافر کی نجات ممکن نہیں ہے۔

آیت نمبر:38 میں چوری کرنے والے مرد اور عورت کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا کا حکم ہے، یہ اُن کے کئے کی سزا ہے اور اللہ کی طرف سے دوسرے لوگوں کے لئے درسِ عبرت ہے۔ اِس کے بعد اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کے لئے آمادہ ہو جائیں تو اللہ اُنہیں معاف فرمانے والا ہے۔ آیت نمبر:40 میں زمینوں اور آسمانوں کی بادشاہی اور عذاب دینے اور معاف کرنے کی قدرت رب العالمین کا خاصہ بیان فرمائی ہے۔ آیت نمبر:42-41 میں ایک بار پھر یہود کے نفاق کو بیان کیا:

(۱) زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور دلوں میں نفاق ہے۔

(۲) بہت زیادہ جھوٹی باتیں سننے والے ہیں۔

(۳) جو لوگ آپ سے دور رہتے ہیں، اُن کی باتیں بڑی توجہ سے سنتے ہیں۔

(۴) اللہ کے کلام میں تحریف کرتے ہیں۔

(۵) وہ آپ کے پاس اپنے مقدمات اِس نیت سے لے کر آتے کہ اُن کا پسندیدہ فیصلہ

کیا جائے، تو قبول ہے ورنہ وہ آپ کے فیصلے کو نہیں مانتے۔
(۶) بہت زیادہ حرام کھانے والے ہیں۔
(۷) تورات میں زنا کی سزا رجم ہے، مگر اُن کے علماء اِس حکم کو چھپاتے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے اِسے ظاہر فرما دیا۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا کہ اگر وہ آپ کے پاس کوئی مقدمہ لے کر آئیں تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ فیصلہ کریں یا نہ کریں، لیکن اگر آپ کو فیصلہ کرنا ہو تو وہی فیصلہ کریں، جو انصاف پر مبنی ہو۔ اِس کے بعد آیت نمبر: 47-45-44 میں بالترتیب فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے اَحکام کے موافق فیصلہ نہ کریں، وہ کافر ہیں، ظالم ہیں اور فاسق ہیں، یعنی جو اتنا سرکش ہو کہ اللہ کے حکم کو سرے سے تسلیم ہی نہ کرتا ہو، تو وہ کافر ہے۔ اور جو اپنی ہٹ دھرمی یا بے عملی کی وجہ سے نافذ نہ کرے، تو وہ ظالم اور فاسق ہے۔

آیت نمبر 44 میں فرمایا کہ ہم نے توراۃ کو نازل فرمایا اس میں ہدایت اور نور ہے، اسی کے مطابق انبیاء جو ہمارے فرماں بردار تھے یہودیوں کو حکم دیتے تھے اور اللہ والے اور علماء اس لئے کہ اللہ کے کتاب کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے یعنی تورات کی حفاظت کی ذمہ داری علماء یہود کی تھی اس وجہ سے اس میں تحریف ہوئی جبکہ قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لی ہے اس لئے تحریف سے محفوظ ہے جو کہ قرآن کا اعجاز ہے۔

آیت نمبر: 45 میں قانونِ قصاص کو بیان کیا کہ جان کا بدلہ جان، آنکھ کا بدلہ آنکھ، ناک کا بدلہ ناک، کان کا بدلہ کان، دانت کا بدلہ دانت اور اِسی طرح زخموں کا بھی قصاص ہے اور جو خوشدلی سے قصاص دے دے (اور اپنے جرم پر صدقِ دل سے توبہ بھی کرے) تو یہ اُس کے گناہ کا کفارہ ہے۔

آیت نمبر 46 میں فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی سلسلہ نبوت جاری رہا اور ان کے نقش قدم پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے، انہوں نے توراۃ کی تصدیق کی اور ان کو انجیل دی گئی جو تورات کی طرح سراپا ہدایت ونور تھی۔ تورات اور انجیل کے بعد قرآن اور

اس کی خصوصیات کا ذکر فرمایا کہ قرآن کا نزول حق کے ساتھ ہوا ہے اور یہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور یہ کہ قرآن ان کتب پر مہیمن یعنی محافظ، نگران اور نگہبان ہے۔

آیت نمبر :48،49 میں بتایا کہ اللہ نے ہر اُمّت کے لئے ایک شریعت اور واضح راہِ عمل مُقرر کی ہے۔ اگر اللہ کی مشیّت ہوتی تو سب کو ایک اُمّتِ اِجابت بنا دیتا، لیکن اُس نے اپنے بندوں کو اختیار دیا ہے کہ وہ حق یا باطل جس راہِ عمل کو چاہیں اختیار کریں اور اِسی میں نیک و بد کی آزمائش ہے سو نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ باطل پرستوں کی خواہش کا بیان ہوا کہ وہ تو صرف جاہلیت و اندھیر نگری چاہتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام و حکم انتہائی بہتر و عمدہ ہے۔

آیت :51 میں بتایا کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، مسلمانوں کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کے حامی اور دوست ہیں، لہٰذا جو اُن کی دوستی اختیار کرے گا، وہ اُنہی میں سے ہوگا۔ اور منافقین جو گردش میں آنے سے ڈرتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح سے نوازے گا تو یہ لوگ اپنے طرزِ عمل پر نادم ہوں گے۔ آیت :54 میں بتایا کہ اللہ کا دین کسی کا محتاج نہیں ہے، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو ایسی قوم پیدا فرما دے گا، جس سے وہ محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کرے گی، وہ مسلمانوں کے لئے نرم دل ہوں گے اور کافروں پر سخت ہوں گے۔

آیت نمبر 56 میں فرمایا اور جو اللہ اور رسول اور ایمان والوں کو دوست بنائے تو بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب ہے۔

آیت :57 میں بتایا کہ اہلِ کتاب میں سے دین کو مذاق بنانے والوں اور کافروں کو دوست نہ بنانا۔ آیت نمبر :60 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بدترین سزا اُن لوگوں کی ہے، جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی، اُن پر غضب فرمایا، اُنہوں نے شیطان کی عبادت کی اور اُن میں سے بعض کی صورتوں کو مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنا دیا۔

آیت نمبر 61،62 میں منافقین یہود کی بے ایمانی جھوٹ، گناہ، زیادتی اور حرام خوری

کے کاموں میں تیزی سے بڑھنے کا ذکر ہے۔

آیت نمبر 63 میں یہود کی ان بداعمالیوں پر علما و مشائخ یہود کے خاموش رہنے اور فرائض منصبی سے غفلت برتنے کی مذمت فرمائی ہے۔

آیت نمبر 64 میں یہودیوں کے اس گستاخانہ جسارت کا ذکر فرمایا کہ خدا کیلئے فقیر اور بخیل جیسے الفاظ استعمال کئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ ان بدبختوں کے ہاتھ جکڑے ہوئے ہیں اور اس گستاخانہ قول کے سبب ان پر لعنت ہو بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں، جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ آیت نمبر 66 میں فرمایا کہ اہل کتاب اگر تورات اور انجیل کے احکامات پر عمل کرتے تو ان کو فراخ رزق دیا جاتا اور فرمایا کہ ایک اعتدال پسند جماعت کے علاوہ اہل کتاب مجموعی طور پر برائیوں میں مبتلا ہے۔

آیت نمبر: 67 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے رسول! آپ کے رب کی جانب سے جو کلام آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں کو پہنچا دیجئے، اور اگر (بالفرض) آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اپنے رب کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ فرمائے گا۔

آیت نمبر 68 میں اہل کتاب سے فرمایا کہ جب تک تورات، انجیل اور قرآن کے احکامات پر عمل نہیں کرو گے ہدایت کو نہیں پا سکتے۔

آیت نمبر 69 میں فرمایا ایمان کے مدعی، یہودی، صابئین اور نصاریٰ، (ان میں سے) جو بھی اللہ اور قیامت کے دن پر (حقیقی معنی میں) ایمان لائے اور نیکی پر کاربند رہے، تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اللہ پر صحیح معنی میں ایمان لائیں گے تو اللہ کے تمام احکام کو قبول کریں گے، قرآن اور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ان کا ایمان ہوگا، اب وہ یہودی، نصرانی اور صابی نہیں رہیں گے، بلکہ مومن ہو جائیں گے۔

آیت نمبر 71،70 میں بنی اسرائیل کے انبیاء کو جھٹلانے اور قتل کرنے کا بیان ہے اور اس کا سبب ان کی یہ خوش فہمی ہے کہ ان کو عذاب نہیں دیا جائیگا۔

آیت نمبر:73 سے 80 تک نصاریٰ کے عقیدے کی خرابیوں کو بیان کیا کہ وہ الوہیت عیسیٰ اور تثلیث (Trinity) کے عقیدے کے قائل ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہٗ لاشریک ہے اور مسیح بن مریم نے بھی بنی اسرائیل سے یہی فرمایا تھا۔ مسیح ابن مریم اسی طرح ایک رسول ہیں، جس طرح ان سے پہلے رسول گزر چکے اور ان کی ماں صدیقہ ہیں، وہ (عام انسانوں کی طرح) کھانا کھاتے تھے جو کہ احتیاج ہے اور جو محتاج ہو، تو وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔ نافرمانیوں، بے اعتدالیوں، حد سے تجاوز اور نیکی کا حکم نہ دینے اور برائی سے نہ روکنے کی وجہ سے یہود پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے لعنت کی گئی۔ یہود کی بے اعتدالیوں کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ مسلمانوں کے ساتھ سب سے زیادہ عداوت یہود اور مشرکین کو ہے اور نصاریٰ میں عالم اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے، اس لئے ان میں مسلمانوں کے دوست ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ: ۷

ساتویں پارے کے مضامین

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب نجاشی کے پاس پہنچے اور انہوں نے قرآن کریم پڑھا اور ان کے علماء اور راہبوں نے قرآن مجید سنا، تو حق کو پہچاننے کی وجہ سے ان کے آنسو بہنے لگے، اس کیفیت کو ساتویں پارے کی ابتدائی آیات میں بیان کیا گیا کہ: ''اور جب وہ اس (قرآن کو سنتے ہیں)، جو رسول کی طرف نازل کیا گیا، تو حق کو پہچاننے کی وجہ سے آپ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کو بہتا ہوا دیکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، تو ہمیں (حق کی) گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے''۔ اس کے بعد ان کے لئے اجرِ آخرت اور دخولِ جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے۔

آیت نمبر 87 میں مومنوں سے فرمایا کہ حلال حرام کا اختیار صرف اللہ اور اس کے رسول کے پاس ہے اس لئے اپنی طرف سے اللہ کے حلال کردہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ اور اللہ کے حلال اور پاکیزہ رزق میں سے کھاؤ۔

آیت نمبر: 89 میں یمینِ منعقدہ کا حکم بیان کیا گیا ہے، یمینِ منعقدہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے، اگر وہ اس قسم پر قائم رہتا ہے، تو فقہی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ قسم میں بری ہے اور اگر وہ قسم کو توڑ دیتا ہے، یعنی جو کہا ہے اس کے برعکس کرتا ہے، تو فقہی اعتبار سے اسے ''حانث'' ہونا کہتے ہیں۔ اس آیت میں اسی کا کفارہ بیان ہوا ہے، جو یہ ہے: دس مسکینوں کو اپنے اوسط معیار کے مطابق دو وقت کا کھانا کھلانا یا ان کو لباس دینا یا غلام آزاد کرنا ہے (آج کل غلامی کا رواج نہیں ہے)۔ اور اگر کوئی ان چیزوں پر قادر نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو تاکہ کفارے کی نوبت نہ آئے۔ حدیثِ پاک میں فرمایا کہ اگر کسی شخص نے کسی ایسی بات کی قسم کھائی ہے جس پر قائم رہنا شریعت کی رو سے منع ہو (جیسے ماں

باپ یا بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرنا)، تو اسے توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔

آیت نمبر:90 اور 91 میں فرمایا: ''اے مومنو! شراب، جوا، بتوں کے پاس (قربانی کے لئے) نصب شدہ پتھر اور فال کے تیر محض ناپاک شیطانی کاموں سے ہیں، سو تم ان سے اجتناب کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان بغض اور عداوت پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے، تو کیا تم باز آنے والے ہو؟''۔ ان دو آیات میں شراب کو محرمات قطعیہ کے ساتھ ذکر کر کے نو وجوہ سے اس کی حرمت کی تاکید فرمائی گئی ہے، اب شراب کے حرامِ قطعی ہونے میں کسی شک وشبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آیت نمبر:95 تا 99 میں حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت کا حکم بیان ہوا۔ اور جو کوئی اس جنایت کا ارتکاب کرے تو اسے فدیے کے طور پر اس جیسے جانور کی قربانی دینا ہوگی، جسے حدودِ حرم میں لے جا کر قربان کیا جائے گا اور دو منصف شکار کی جزا کا تعین کریں گے اور پھر مُحرِم کو اختیار ہوگا کہ اتنی مالیت کے برابر مساکین کو کھانا کھلائے یا وہ رقم جتنے روزوں کے فدیے کے برابر ہو، اتنے روزے رکھے۔ تفصیلی مسائل کتبِ فقہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ مزید فرمایا کہ حالتِ احرام میں خشکی کے جانور کا شکار حرام ہے، جبکہ بحری شکار حلال ہے۔

آیت نمبر:100 تا 103 میں رسول اللہ ﷺ سے غیر ضروری سوالات کرنے سے منع فرمایا گیا کہ اگر بہت سی باتیں تم پر ظاہر ہو جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں۔ زمانۂ جاہلیت میں مشرکوں نے بعض حلال جانوروں کو بتوں کے نام پر وقف کر کے ان کا دودھ دوہنا، ان پر سامان لادنا اور ان کا گوشت کھانا ممنوع قرار دے رکھا تھا، ان میں سے چند یہ ہیں: بَحِیْرَہ، سَائِبَہ، وَصِیْلَہ اور حَام۔ ان کی تعریفات میں مختلف اقوال ہیں، جو کتبِ حدیث وفقہ میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کافر اللہ پر بہتان تراشتے ہیں''، یعنی حرام وحلال قرار دینا یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم ﷺ کا اختیار ہے، بندے کا یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی حلال کو حرام قرار دے دے۔

آیت نمبر:104 میں بتایا گیا کہ جب اہلِ کتاب اور دین سے انحراف کرنے والوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کے نازل کردہ دین اور رسول کی طرف اتباع کے لئے چلے آؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم جس روش پر ہیں، اسی پر ہم نے اپنے آباواجداد کو پایا ہے اور ہم اپنے آباواجداد کے شعار کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں، خواہ ان کے آباواجد جاہل ہوں اور راہِ ہدایت سے بھٹکے ہوئے ہوں۔ ہر دور کے مُلحدین جب دلائل حق سے لاجواب ہو جاتے، تو ہٹ دھرمی کے طور پر ان کا آخری جواب یہی ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس رویے سے تکلیف پہنچتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی تسلی کے لئے فرمایا کہ جب تک تم خود ہدایت پر ہو کسی کی گمراہی تمہارے لئے نقصان دِہ نہیں ہے۔

آیت نمبر:106 میں فرمایا کہ جب وصیت کرنی ہو تو دو عادل گواہ مقرر کرنے چاہئے تاکہ بعد میں تنازعہ پیدا نہ ہو اور یہ بھی حکم دیا کہ حق کی گواہی کو چھپانا نہیں چاہئے۔ ابتدائے اسلام میں وصیت کو فرض قرار دیا گیا تھا، لیکن احکام وراثت نازل ہونے کے بعد صرف اس کی اباحت اور خیر کے کاموں کے لئے استحباب باقی ہے۔

آیت نمبر:110 تا 111 میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی نعمتوں کی یاد دہانی کرائی:

(۱) میں نے روح القدس سے تمہاری مدد کی۔

(۲) (میری دی ہوئی طاقت سے) تم گہوارے میں بھی لوگوں سے کلام کرتے تھے اور پختہ عمر میں بھی کرو گے۔

(۳) میں نے تمہیں کتاب وحکمت، تورات اور انجیل کی تعلیم دی۔

(۴) پھر عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات عطا کئے گئے ان کا ذکر فرمایا، یعنی اذنِ الٰہی سے مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں جان ڈالنا، مادرزاد اندھے اور برص کے مریض شفایاب کرنا، مردے کو زندہ کرنا، بنی اسرائیل کی ایذا رسانی سے بچانا وغیرہ۔

آیت نمبر:112 میں اس بات کا ذکر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان سے استدعا کی کہ اللہ آسمان سے ہمارے لئے تیار خوانِ نعمت نازل کرے، اس سے ہم کھائیں اور قلبی

اطمینان پائیں، تو عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی کہ: ''اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے خوانِ نعمت نازل فرما، جو ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے عید ہو اور تیری قدرت کی نشانی اور ہمیں رزق عطا فرما، بے شک تو بہترین رزق عطا کرنے والا ہے''۔ اللہ عزّوجل نے فرمایا: ''میں یہ نعمت نازل تو کردوں گا، مگر پھر جو شخص (مطلوبہ نشانی دیکھنے کے بعد) کفر کرے گا تو اسے ایسا عذاب دوں گا، جو جہان والوں میں سے کسی کو بھی نہ دوں گا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ نعمتِ الٰہی کے نزول کے دن کو عید کہا جا سکتا ہے اور اسی لئے مسلمان میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک دن کو ''عید'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس کے بعد کی آیات میں نصاریٰ پر حجت قائم کرنے کے لئے فرمایا کہ: ''اے عیسیٰ! کیا آپ نے لوگوں کو یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو خدا بنالو''۔ ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے براءت کا اظہار کیا اور کہا: ''میں نے ان لوگوں سے وہی کہا تھا، جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ (صرف) اللہ کی عبادت کرو، جو میرا اور تمہارا رب ہے''۔ یعنی اب ان کا معاملہ تیرے سپرد ہے۔

سورۃ الانعام

سورۃ الانعام مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے چھٹی جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 55ویں سورت ہے۔ سورۃ الانعام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یکبارگی نازل ہوئی۔ اس سورت میں توحید و رسالت کے بنیادی مسائل اور دلائل بیان فرمائے ہیں اور حیات بعد الموت، حشر نشر اور جزا و سزا کا بیان فرمایا ہے۔ اصل دین ابراہیم کی وضاحت، انسان کے اندرونی بیرونی شہادتوں اور عقل و فطرت کے تقاضوں سے استدلال کیا ہے، مشرکین کے فرمائشی معجزات ظاہر نہ کرنے کی وجوہ بیان فرمائی ہیں تقدیر کا بیان کیا ہے اور بعض مشرکانہ رسوم اور مشرکین کی جہالت کا رد فرمایا ہے۔ تمدنی اور معاشرتی زندگی کے مسلمہ اخلاق و آداب کا بیان فرمایا ہے۔

اس سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بیان ہے کہ اس نے آسمانوں، زمین،

ظلمت اور نور کو پیدا کیا، اسی نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس کے لئے ایک مدتِ حیات اور قیامت کا وقت مقرر فرمایا، لیکن کافر پھر بھی اپنے رب کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور اس کی قدرت کے بارے میں شک میں مبتلا ہوتے ہیں، حالانکہ وہ ظاہر و باطن اور انسان کے ہر عمل کو جانتا ہے۔ منکروں کا ایک شِعار یہ ہے کہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں آنے کے باوجود ان میں غور نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم سے پہلے بھی کئی قوموں کو ہم نے زمین میں اقتدار عطا کیا، ان پر موسلا دھار بارشیں برسائیں، ان کے لئے باغات کے نیچے نہریں جاری کیں اور پھر ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ہلاک کر دیا۔

آیت نمبر: 07 میں فرمایا کہ کافروں کا حال تو یہ ہے کہ اگر لکھی ہوئی کتاب ان کے پاس اتار دی جائے، جسے وہ اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ لیں، تو پھر بھی ایمان نہ لائیں بلکہ اسے جادو قرار دیں۔ اسی طرح اگر ان کے پاس فرشتہ اتر کر آ جائے، تو ملکوتی شکل میں تو وہ دیکھ نہ پائیں اور اگر بشری لباس میں آئے، تو پھر وہ کہیں گے کہ یہ تو ہم جیسا بشر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر دور کے کفار اپنے اپنے نبیوں کا مذاق اڑاتے رہے ہیں، آپ زمین پر چل پھر کر دیکھ لیں، گزشتہ امتوں کے تباہ شدہ آثار، ان کے انجام کا پتا دیں گے۔

آیت نمبر: 14 میں رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا کہ آپ کافروں اور مشرکوں کو بتائیں کہ کیا میں زمین و آسمان کے خالق اور سب کے روزی رساں کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا کارساز مان لوں؟ آپ کہہ دیں کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہوں۔ اللہ جس کو ضرر پہنچائے، اس کے سوا کوئی نجات دینے والا نہیں اور اگر وہ کسی کو خیر سے نوازے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا، وہ ہر خیر کا مالک ہے۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں ہر مخاطب کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤں اور اس کی توحید کی دعوت دوں اور شرک سے براءت کا اعلان کروں۔

آیت نمبر 20 میں اہل کتاب کی اس غلط بیانی کا رد فرمایا کہ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بارے میں نہیں جانتے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ آپ کو اپنے بیٹوں کی طرح

پہچانتے ہیں کہ آپ کی نبوت برحق ہے۔

آیت نمبر:22 میں فرمایا کہ قیامت کے دن ہم سب مشرکوں کو جمع کریں گے اور پوچھیں گے کہ تمہارے باطل معبود اب کہاں ہیں، تو وہ اپنے ماضی کو جھٹلائیں گے۔

آیت نمبر:25 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ منکرین آپ کی بات کو توجہ سے سنتے ہیں، لیکن ان کی بداعمالیوں کے سبب ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے کانوں میں بندش ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سنتے تو ہیں، لیکن یہ سننا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہوتا اور وہ ہٹ دھرمی سے حق کو رد کر جاتے ہیں۔ آخرت میں وہ تمنا کریں گے کہ کاش ہمیں واپس دنیا میں بھیج دیا جائے اور ہم ایمان لانے والوں میں سے ہو جائیں، لیکن اس دنیا میں رہتے ہوئے وہ حیات بعد الموت کے منکر ہیں۔

آیت نمبر 27 میں قیامت کے دن کفار کے پچھتاوے اور دنیا میں واپس جا کر آیات الٰہی کے نہ جھٹلانے کے وعدے کا بیان ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم ان کو لوٹا بھی دیں تو تب بھی یہ وہی کام کریں گے جن سے ان کو منع کیا گیا تھا۔ اور یہ اخروی زندگی کے منکر ہیں جب اللہ تعالیٰ اپنے سامنے کھڑا کر کے ان سے اخروی زندگی کے متعلق پوچھے گا، تو یہ لوگ حقانیت کا اقرار کریں گے لیکن اس وقت اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

آیت نمبر:31 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہوں نے اللہ کے حضور پیش ہونے کی حقیقت کو جھٹلایا، وہ اپنی بداعمالیوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور جب اچانک قیامت آپہنچے گی تو کہیں گے ہائے افسوس! ہم نے بہت کوتاہی کی۔ رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ غمگین نہ ہوں، یہ آپ کو نہیں جھٹلا رہے بلکہ درحقیقت آیاتِ الٰہی کا انکار کر رہے ہیں اور آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا اور انہوں نے صبر کیا۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو جبراً ہدایت پر جمع فرما دیتا، لیکن بندے کو اختیار دے کر آزمانا اور جزا و سزا کا نظام قائم کرنا، اس کی حکمت کا تقاضا تھا۔ آیت نمبر 36 میں فرمایا کہ حق وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور ان لوگوں کے دل مردہ ہیں۔ اس کے

بعد کفار کے باطل فرمائشوں کا ذکر ہے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرنے پر قادر ہے لیکن یہ اس کے حکمت کے خلاف ہے۔

آیت نمبر :38 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین پر چلنے والے حیوان اور فضاؤں میں اڑنے والے پرندے تمہاری طرح مخلوق ہیں، جب قیامت آجائے گی اور اللہ کا عذاب نگاہوں کے سامنے ہوگا تو پھر یہ مشرک بھی ایک ہی رب کو پکاریں گے۔ آیت نمبر 44 میں قوموں کی تربیت اور گمراہی سے ہدایت پر گامزن کرنے کے طریقے اور لوگوں کے ہدایت کو بھول جانے اور بطور آزمائش ان کے رزق میں فراوانی اور ان کے ان نعمتوں پر اترانے اور اچانک پکڑ کا ذکر ہے

آیت نمبر :46 تا 50 میں فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری سننے اور دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب فرمالے، تو کون ہے جو تمہیں نعمتیں عطا کرسکتا ہے۔ مشرک رسول اللہ ﷺ سے طرح طرح کے فرمائشی مطالبات کرتے تھے، تو اللہ نے فرمایا: آپ کہہ دیں میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں از خود غیب جانتا ہوں اور نہ میں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو فقط اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں، جس کی مجھے وحی کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اگرچہ اللہ کے بتانے پر غیب کی باتیں جانتے تھے، مگر عالم الغیب علی الاطلاق اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، نبی کے سارے امور اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہیں۔

مشرکوں کے سرداروں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اگر آپ ہمارے لئے کوئی ایسا وقت مخصوص کریں جس میں فقراء صحابۂ کرام (صہیب، عمار، مقداد، بلال، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم) آپ کے پاس نہ ہوں، تو شاید ہم آپ کی بات پر غور کرلیں، رسول اللہ ﷺ دعوتِ حق کے لئے نہایت خواہشمند رہتے تھے، اس لئے آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان کی اس خواہش کو بھی پورا کرلیا جائے۔

آیت نمبر 51 میں دوبارہ جی اٹھنے پر یقین رکھنے والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے

کا حکم ہے۔آیت نمبر:52 تا آیت نمبر 54 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''جو اہلِ ایمان صبح و شام اپنے رب کی عبادت کرتے رہتے ہیں اور اس کی رضا کے طلب گار رہتے ہیں، آپ انہیں اپنے آپ سے دور نہ کریں''۔

کفار نے جب اپنے تمول کو معیارِ حق بنایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا اور مساکین مسلمانوں کے بارے میں فرمایا کہ جب وہ آپ کے پاس آئے تو آپ کہیں تم پر سلامتی ہو تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے کہ تم میں سے جس کسی نے ناواقفیت کی بنا پر کوئی برا کام کیا پھر اس کے بعد توبہ کرلی اور اصلاح کرلی تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

آیت نمبر:59 میں فرمایا:''اور غیب کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں، اُس کے سوا (از خود) ان کو کوئی نہیں جانتا، وہ ہر اُس چیز کو جانتا ہے، جو خشکی اور سمندر میں ہے، وہ درخت سے گرنے والے ہر پتے کو جانتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں ہر دانہ کو جانتا ہے اور تر اور خشک ہر چیز لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔آیت نمبر 60 میں نیند اور بیداری کے تسلسل کے جاری رہنے میعاد مقرر پر مرنے اور اللہ کی طرف لوٹنے کا بیان ہے۔آیت نمبر:61 میں فرمایا: اللہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہ اُن پر نگرانی کرنے والے فرشتے بھیجتا ہے اور جب کسی کی موت کا وقت آجائے، تو وہ فرشتے کسی کوتاہی کے بغیر اُس کی رُوح کو قبض کرلیتے ہیں۔آیت نمبر:63 میں فرمایا کہ بَرّ و بحر کی ظلمتوں میں کون تمہیں نجات دیتا ہے، جس کو تم عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارتے ہو کہ اگر وہ ہمیں اِس مصیبت سے بچالے تو ہم ضرور شکر گزاروں میں ہوجائیں گے، اے رسول! کہہ دیجئے اللہ ہی تم کو اِس مصیبت اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے، پھر بھی تم اُس کے ساتھ شرک کرتے ہو۔آیت نمبر:65 میں فرمایا: اللہ اِس پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر سے اور تمہارے پاؤں کے نیچے سے تم پر عذاب بھیجے اور تمہیں ایک دوسرے سے بھڑا دے اور تمہیں ایک دوسرے سے لڑائی کا مزا چکھادے۔

مُفسرین نے فرمایا کہ اوپر کے عذاب کی ایک صورت تباہ کُن آندھیاں اور طوفانی

بارشیں ہیں اور نیچے کے عذاب کی ایک صورت سیلاب، زلزلے اور قحط سالی ہے اور اوپر کے عذاب کی ایک صورت ظالم حکمرانوں کا مُسلط ہونا اور ماتحتوں کا نافرمان ہوجانا ہے اور اُمّت کے مختلف گروہوں کا ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہونا بھی ایک صورتِ عذاب ہے اور ان صورتوں کے مظاہر ہم وقتاً فوقتاً دیکھتے رہتے ہیں۔

آیت نمبر 68 میں گمراہ کن عقائد کے حامل لوگوں کی صحبت بد سے بچنے کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ ہماری آیات میں بیہودہ بحثیں کرتے ہیں ان سے منہ پھیر لیں اور اگر بھولے سے بیٹھ بھی گئے ہو تو یاد آنے پر ظالموں کے ساتھ مت بیٹھنا۔

آیت نمبر 70 میں عشرت میں بدمست اور دین کو کھیل اور دل لگی کا سامان بنانے والوں کو اپنے حال پر چھوڑنے اور ان کو تسلسل کے ساتھ نصیحت کرنے کا بیان ہے۔

آیت نمبر: 71 میں مُشرکوں کے رَد میں فرمایا کہ اے رسول کہہ دیجئے: کیا ہم اللہ معبود برحق کو چھوڑ کر اُن باطل معبودوں کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، تو کیا ہم اللہ کی طرف سے ہدایت پانے کے بعد اُلٹے پاؤں کفر کی طرف پلٹ جائیں، عقلِ سلیم اِسے کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔

آیت نمبر: 73 میں فرمایا: اللہ وہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمینوں کو برحق پیدا کیا اور وہ جس دن کسی فنا شدہ چیز کو فرمائے گا کہ ہو جا، تو وہ موجود ہو جائے گی۔

آیت نمبر: 74 تا 81 حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے، اللہ نے فرمایا: ابراہیم کو یقینِ کامل عطا کرنے کے لئے ہم نے اُنہیں آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی دکھائی، یعنی کائنات کے تکوینی نظام کے اَسرار اور حکمتیں بتائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مظاہر پرست قوم کی حکمت کے ساتھ اِصلاح کرنے اور مظاہرِ کائنات کے فانی ہونے اور اللہ کی توحید کو دلائل سے ثابت کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا، رات کی تاریکی چھا گئی اور اُنہوں نے ایک روشن ستارہ دیکھا، تو کہا: (کیا) یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا کہ میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر جب جگمگاتے ہوئے چاند کو دیکھا، تو کہا: (کیا) یہ

میرا رب ہے، لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا، تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اگر میرا رب مجھے ہدایت نہیں دے گا، تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا، تو کہا: (کیا) یہ میرا رب ہے، یہ (ان) سب سے بڑا ہے، لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا، تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے میری قوم! میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام نے نہایت حکمت کے ساتھ قوم کو یہ بتایا کہ جو خود کو زوال، غروب اور فنا سے نہ بچا سکے، وہ رب کیسے ہو سکتا ہے؟۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: میں نے اپنا رُخِ بندگی اُس ذات کی طرف کر دیا، جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، میں تمام باطل مذاہب سے رُخ پھیر کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی اختیار کرتا ہوں۔ آپ نے اپنی حُجت باز اور جھگڑالو قوم سے فرمایا: تم اُس اللہ کی ذات کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو، جس نے مجھے ہدایت دی۔ اِس طویل عقلی اور فکری بحث اور دلائلِ حقہ کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ وہ قوی دلیلیں ہیں جو ہم نے ابراہیم کو اُن کی قوم کے مقابلے میں عطا کیں۔ پھر نوح، اولادِ ابراہیم، اسحاق، یعقوب، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ سب صالحین میں سے تھے اور ہم نے اِن میں سے ہر ایک کو اُس کے عہد کے لوگوں پر فضیلت عطا کی۔ اِنہیں ہم نے کتاب اور حکمِ شریعت اور نبوّت عطا کی۔ پھر فرمایا: یہ وہی لوگ ہیں جنہیں ہم نے ہدایت دی، سو آپ بھی اُن کے طریقے پر چلیں۔

آیت 91 میں فرمایا: اور انہوں نے اللہ کی قدر نہ کی، جس طرح کہ اُس کی قدر کرنے کا حق تھا۔ یہود کہتے ہیں: اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ اے رسول آپ کہیے! جس کتاب کو موسیٰ لے کر آئے، جو لوگوں کے لئے نور اور ہدایت ہے، اُسے کس نے نازل کیا؟۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (اے مخاطب!) کاش تو وہ منظر دیکھے جب یہ ظالم موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں گے اور فرشتے اُن کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں گے (اور کہیں گے:) نکالو اپنی جانوں کو، آج تمہیں ذلت والے عذاب کی سزا دی جائے گی۔

آیت نمبر 94 میں فرمایا کہ تمہارے جھوٹے خدا جن کو تم اللہ تعالیٰ کے شریک مانتے تھے، آج تمہاری سفارش کیلئے موجود نہیں ہیں اور تم ہمارے پاس اکیلے ہی آئے ہو جیسے کہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور تم سب کچھ دنیا میں چھوڑ کر آئے ہو اور سارے رشتے ٹوٹ گئے اور توقعات ختم ہو گئے۔

آیت نمبر:95 میں فرمایا: بے شک اللہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے، وہ زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے۔مزید فرمایا: (وہ شب کی ظلمتوں کا سینہ) چاک کر کے صبح کو نکالنے والا ہے اور اُس نے رات کو آرام کے لئے بنایا اور سورج اور چاند کے لئے نظام مُقرر کیا۔اور ستاروں کو بحر بر میں تمہارے لئے نشان راہ بنایا

آیت نمبر:98 میں فرمایا: اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا، پھر ہر ایک کے لئے ایک ٹھہرنے کی جگہ (رَحمِ مادر اور دنیاوی جائے قیام) اور سپردگی کی جگہ (قبر) ہے۔

آیت نمبر:99 میں بارش کے برسانے، اُس سے سبزہ اُگانے، کھیتوں کی ہریالی، طرح طرح کے پھولوں اور پھلوں کی نعمتوں کا ذکر کر کے اس سے توحیدِ الٰہی پر استدلال کیا گیا ہے۔

آیت نمبر:100 میں فرمایا: مشرکوں نے جِنّات کو جو کہ مخلوق ہیں، اللہ کا شریک ٹھہرایا اور اُس کی طرف بیٹے اور بیٹیوں کی نسبت کی، حالانکہ وہ اِس سے پاک ہے، وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور بیوی اور اولاد کی نسبت سے پاک ہے۔وہ اللہ ہے خالق ہے آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں وہ باریک بین باخبر ہے۔

آیت نمبر 104 تا 107 میں فرمایا کہ تمہارے پاس روشن دلائل آگئے ہیں اگر کوئی اس کی روشنی میں چلے گا تو اس کا فائدہ ہے اور اگر کوئی گمراہی اختیار کرے گا تو اس کا اپنا نقصان ہے اور اگر کوئی شرک کرے تو اس کے لئے ملول نہ ہوں آپ صرف وحی الٰہی کی پیروی کریں۔

آیت نمبر:108 میں مختلف مذاہب کے درمیان پُرامن بقائے باہمی کا ایک اُصول بیان کرتے ہوئے فرمایا: اور(اے مسلمانوں)تم مشرکوں کے باطل معبودوں کو برانہ کہو، مبادا یہ لوگ اپنی بے علمی وسرکشی کے باعث اللہ کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ کہہ دیں۔یعنی اللہ تعالیٰ کی ناموس کو کُفار ومشرکین کی یادہ گوئی سے بچانے کے لئے سدِّ ذرائع کے طور پر مسلمانوں کواُن کے باطل معبودوں کی توہین نہیں کرنی چاہئے۔

آیت نمبر 109 میں فرمایا کہ کہ یہ لوگ قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آگئی توضرور ایمان لائیں گےاس کے ساتھ،آپ فرمایئے کہ نشانیاں توصرف اللہ کے پاس ہیں اور(اے مسلمانوں)تمہیں کیا خبر کہ جب یہ نشانی آجائے توتب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ:۸

آٹھویں پارے کے مضامین

کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طرح طرح کے مطالبے کرتے تھے کہ ہم اس وقت ایمان لائیں گے جب فرشتے ہمارے پاس اتر کر آئیں یا برزخ و آخرت کے بارے میں آپ جو باتیں ہمیں بتاتے ہیں، ہمارے جو لوگ مر چکے ہیں، وہ زندہ ہو کر آئیں اور آپ کے دعوؤں کی تصدیق کریں، قرآن نے بتایا کہ اُن کی یہ ساری باتیں جہل پر مبنی اور اِنکارِ حق کے لئے محض بہانے بازیاں ہیں۔

آیت 112 میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شیطان انسانوں اور جنوں کو دشمن بنایا، جو (لوگوں کو) دھوکے میں ڈالنے کے لئے ایک دوسرے کو خوش نما باتیں اِلقا کرتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ وہ یہ اِس لئے کرتے ہیں تاکہ منکرینِ آخرت کے دلوں کو اپنی طرف مائل کریں۔

آیت نمبر:118-117 میں فرمایا: جس (حلال جانور) پر ذِبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو، اُسے کھاؤ، مُحرّمات کو تمہارے لئے تفصیل سے بیان کر دیا گیا، صرف حالتِ اضطرار میں بقدرِ بقائے حیات اُن سے استفادے کی اجازت ہے۔ مزید فرمایا: جس ذبیحے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اُسے نہ کھاؤ۔ آیت نمبر 120 میں فرمایا کہ گناہ کھل کر ہو یا چھپ کر بہر صورت گناہ ہے اور ترک کرنا ہے اور جو گناہ کرے گا اس کی سزا پائے گا۔ آیت نمبر 122 میں فرمایا کہ کیا وہ شخص جو گمراہی کے بعد ہدایت پا گیا اور قرآن کی ہدایت کی روشنی میں آگے بڑھ رہا ہو اور وہ جو مسلسل گمراہی میں ہو برابر ہو سکتے ہیں۔

آیت نمبر:123 میں فرمایا: اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اُس کے مجرموں کو سردار بنایا تاکہ وہ وہاں فریب کاری کریں اور اُن کے دَجل و فریب کا وبال اُنہی پر آئے گا۔

آیت نمبر:124 میں فرمایا: اور جب اُن کے پاس کوئی نشانی آتی ہے، تو وہ کہتے ہیں:

ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ ہمیں بھی اُس کی مثل دیا جائے، جیسا کہ اللہ کے رسولوں کو دیا گیا ہے، (اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنا منصبِ رسالت کسے تفویض کرے۔

آیت 125 میں فرمایا: سو اللہ جس کو ہدایت دینا چاہے، اُس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کے لئے گمراہی (مُقدّر فرمانا) چاہتا ہے، اُس کے سینے کو (قبولِ حق کے لئے) گھٹا ہوا، تنگ کر دیتا ہے۔

آیت نمبر 129 میں فرمایا اور ہم اسی طرح بعض ظالموں پر بعض کو مسلط کر دیتے ہیں کیونکہ وہ معصیت کے کام کرتے تھے آیت نمبر: 131-130 میں اِتمامِ حُجت کے لئے فرمایا: اے جنات اور انسانوں کے گروہ! کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے تھے، جو تم پر میری آیات بیان کرتے تھے اور تمہیں اِس (قیامت کے) دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے؟، وہ کہیں گے: ہم خود اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں اور اُنہیں دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ (یہ گواہی اس وجہ سے دی گئی کہ) آپ کا رب بستیوں کو ظلماً ہلاک کرنے والا نہیں ہے۔

آیت نمبر 136 میں مشرکین عرب کی جہالت کا ذکر کیا کہ جو فصل اللہ تعالیٰ اگاتا ہے اور مویشی اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے، ان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بتوں کو شریک کرتے ہیں بلکہ بتوں کے حصے کو زیادہ ضروری اور مقدس سمجھتے ہیں اسی طرح اولاد کو قتل کرنا بھی مشرکین کی جہالت ہے۔

آیت نمبر 138 تا 140 میں اس بات کا بیان ہے کہ کفار و مشرکین نے زمانۂ جاہلیت میں اپنے مویشیوں اور اپنے کھیتوں کی تین قسمیں کر دی تھیں:

(۱) وہ مویشی اور کھیت جن کے متعلق وہ کہتے تھے کہ ان سے نفع اٹھانا کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے، یہ ان کے باطل معبودوں اور بتوں کے لئے مخصوص ہے، ان کو وہی شخص کھا سکتا ہے جس کو ہم کھلانا چاہیں اور ان کو صرف وہ مرد کھا سکتے ہیں جو بتوں کی خدمت پر مامور ہیں،

عورتیں نہیں کھاسکتیں۔

(۲) بعض مویشیوں کو بتوں کے لئے خاص کر کے ان پر سوار ہونا اور سامان لادنا انہوں نے حرام قرار دیا تھا۔

(۳) بعض مویشیوں پر وہ ذبح کے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے تھے، یعنی ان کو بتوں کے نام پر ذبح کر کے ان کا استعمال ممنوع قرار دیتے تھے۔ قرآن نے بتایا کہ یہ سب ان کی خودساختہ باتیں ہیں۔

آیت نمبر: 141 تا 146 میں اللہ تعالیٰ نے پھلوں، کھیتوں اور جانوروں کے ذریعے جو نعمتیں عطا کی تھیں، ان کا ذکر فرمایا اور کہا کہ اللہ کی ان نعمتوں کو کھاؤ اور اسراف نہ کرو اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، پھلوں اور کھیتوں کی پیداوار میں اللہ تعالیٰ کے حق (عُشر یا نصف عُشر) کو ادا کرو، اسی میں حلال جانوروں کی اقسام کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان محرماتِ قطعیہ کا بیان ہے، جو پہلے بھی آچکا ہے، یہ بھی فرمایا کہ یہود کی سرکشی کی وجہ سے ناخن والے جانوروں اور گائے اور بکری کی چربی کو ان پر حرام کر دیا گیا تھا، انہوں نے اسے پگھلایا اور فروخت کر دیا۔

آیت نمبر: 148 میں ہر دور کے منکرین کے ایک نفسیاتی حربے کو بیان کیا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، یہ اللہ کی مشیت ہے، اگر وہ نہ چاہتا تو ہم یہ سب کچھ نہ کر پاتے۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ اللہ کی مشیت اور ہے اور اس کی رِضا اور ہے، مثلاً مجرم کو سزا دینا اس کی مشیت ہے، لیکن اس کی رِضا اس میں ہے کہ کوئی اس کی نافرمانی نہ کرے۔ اگر سب کو جبری طور پر اطاعت کے راستے پر ڈالنا اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی، تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی حکم عدولی کرے۔

آیت نمبر: 151 تا 160 میں فرمایا کہ (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، (۲) والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، (۳) تنگ دستی کے خوف سے اولاد کو قتل نہ کرو، (۴) ظاہر و مستور فحاشی سے اجتناب کرو، (۵) قتلِ ناحق نہ کرو، (۶) یتیم کا مال ناجائز طریقے

سے نہ کھاؤ، (۷) لین دین میں ناپ تول پورا کرو، (۸) بلاتمیز سب کے ساتھ انصاف کرو (۹) اور اللہ سے کئے گئے عہد کی پاسداری کرو۔ چونکہ یہ نو اَحکامِ شرعیہ ہی دینِ اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ اور لبِّ لُباب ہیں اور باقی تمام شرعی اَحکام اِنہی پر منحصر ہیں، اسی لئے فرمایا: یہی سیدھا راستہ ہے، فرقہ بندی چھوڑ کر اسی کی پیروی کرو اور کتابِ الٰہی کے احکام کو ملحوظ رکھو۔ فرمایا یہ لوگ ایمان لانے کے لئے نشانیاں طلب کرتے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا اللہ تعالیٰ خود آئے یا اس کی کوئی نشانی آئے، قرآن نے بتایا کہ جس دن عالمِ غیب کی نشانیاں آجائیں گی تو پھر ان منکرین کے لئے ایمان لانا بھی نفع بخش نہیں ہوگا، یہ بھی فرمایا کہ اے رسول! جنہوں نے دین کو فرقوں میں بانٹ دیا، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آیت نمبر: 162 میں حقیقتِ ایمان اور روحِ ایمان اور مسلمان کے مقصدِ حیات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''(اے رسول!) کہہ دیجئے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت (سب کچھ) اللہ رب العالمین کے لئے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں''۔ کفار آپ ﷺ سے بار بار کہتے کہ آپ ہمارا دین قبول کر لیجئے ہم ذمہ دار ہیں کہ دنیا و آخرت میں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آپ فرمایئے کہ میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں؟ حالانکہ وہ ہر چیز کا رب ہے اور ہر شخص جو کچھ بھی کرتا ہے اس کا وہی ذمہ دار ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

آیت نمبر: 165 میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ درجات و مراتب میں فرق صرف آزمائش کے لئے ہے کہ کون مال و رزق کی فراوانی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا ہے اور کون دولت کے نشے میں اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو بھلا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا بھی ہے اور بخشش و مغفرت فرمانے والا بھی ہے۔

سورۃ الاعراف

سورۃ الاعراف مکی سورۃ ہے۔ترتیب مصحف کے اعتبار سے ساتویں جبکہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے انتالیسویں سورت ہے۔اس سورت میں سورۃ الانعام کے بعض مسائل کے اجمال کی تفصیل ہے۔مختلف انبیائے کرام کی دعوت اوراس کے نتیجے میں ان کو پہنچنے والے تکالیف کا ذکر ہے۔حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اور جنت سے ہجرت اور زمین پر نزول کا ذکر ہے۔ اس کے بعد کئی رکوعات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات فرعون اور بنی اسرائیل دونوں کے ایذارسانیوں کا ذکر ہے۔اس سورت میں مشرکین اور مکذبین کے اخروی انجام کا ذکر ہے۔اس سورت میں اہل اعراف کا اہل دوزخ سے مکالمے کا بیان ہے اس لئے اس سورت کوالاعراف سے موسوم کیا گیااس سورت میں حیات بعدالموت کا ذکراور شرک کا تفصیلی رد ہے۔

اعراف کے معنی بلندی کے ہیں اور اس کا معنی جاننا اور پہچاننا بھی ہے۔''اصحابِ اعراف'' کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ ان کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں گے اور ان کا مقام جنت اور دوزخ کے درمیان ہوگا یا یہ وہ لوگ ہیں جو اہل جنت اور اہلِ جہنم کو پہچاننے والے ہوں گے اور ایک قول کے مطابق یہ انبیاء ہیں یا ملائکہ ہیں۔

اس سورت کی ابتداء میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ کفار کے جور جفا اور معاندانہ رویے سے تنگ دل نہ ہوں بلکہ اپنا فرض ادا کرتے رہیں اور اس کتاب مقدس کی تبلیغ میں سرگرم رہیں۔

آیت نمبر:04 میں بتایا کہ بعض بستیوں پر دوپہر کو سوتے ہوئے عذاب آیا،تو اُن کے مکینوں نے اقرار کیا کہ ہاں! ہم ظالم تھے۔آیت نمبر:8 میں بتایا کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن کیا جانا حق ہے اور جن کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا،وہی فلاح پانے والے اور کامیاب ہیں اور جن کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

آیت نمبر 10 میں زمین میں انسانوں کے آباد کرنے اور ذرائع معاش مہیا کرنے کی

نعمتوں کا ذکر فرمایا اور فرمایا کہ بہت کم لوگ شکر ادا کرتے ہیں۔

آیت نمبر: 11 تا 27 میں آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ بیان ہوا کہ جب ابلیس نے اللہ کے حکم پر آدم کو سجدہ نہ کیا، تو ربِ ذوالجلال نے اس سے پوچھا کہ تم نے میرے حکم کے باوجود سجدہ کیوں نہ کیا۔ اس نے اپنی سرکشی کا جواز عقلی دلیل سے پیش کیا کہ میں آدم سے بہتر ہوں، انہیں مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، میرا جوہرِ تخلیق آگ ہے اور آگ لطیف ہونے کی بنا پر مٹی سے افضل ہے۔ تکبر کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو رسوا کر کے مقامِ عزت سے نکال دیا۔ ابلیس کے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک مہلت طلب کرنے پر اللہ تعالیٰ نے اُسے یہ مہلت عطا کر دی، اِس پر اُس نے کہا کہ میں صراطِ مستقیم پر گھات لگا کر بیٹھ جاؤں گا اور بنی آدم کو دائیں بائیں، آگے پیچھے، حتی کہ ہر جانب سے گمراہ کروں گا۔ اللہ نے فرمایا: تمہارے پیروکار جہنم میں جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا علیہما السلام کو جنت میں داخل کیا اور انہیں خاص درخت کے قریب جانے سے منع فرمایا۔ شیطان نے ان کو وسوسہ ڈالا اور مخلص اور خیر خواہ کا روپ اختیار کر کے کہا کہ آپ لوگوں کو اس درخت کے قریب جانے سے محض اس لئے منع کیا گیا ہے کہ اس کے قریب جا کر آپ لوگ فرشتے بن جائیں گے اور آپ لوگوں کو ابدی زندگی مل جائے گی، اس نے قسمیں کھا کر اپنی خیر خواہی کا یقین دلایا، پھر ان سے اجتہادی خطا ہوئی اور اس درخت کو چکھنے سے ان کی شرمگاہیں ظاہر ہوئیں اور وہ درختوں کے پتوں سے اپنے ستر کو ڈھانپنے لگے، یہاں قرآن نے یہ بھی بتایا کہ شیطان کا مقصد ان کے ستر کو بے حجاب کرنا تھا۔ اپنی اجتہادی خطا کا احساس ہونے پر آدم علیہ السلام نے توبہ کی اور ان کی توبہ کے کلمات آیت نمبر: 23 میں بیان ہوئے، پھر انہیں جنت سے زمین پر اتارا گیا اور فرمایا ایک مقررہ مدت تک تمہیں یہاں رہنا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مقصدِ لباس بیان فرمایا کہ ہم نے بنی آدم پر لباس اس لئے اتارا کہ ان کی ستر پوشی ہو اور سامانِ زینت ہو اور سب سے بہتر لباس تو تقویٰ ہے۔ پھر بنی آدم کو متنبہ کیا گیا کہ شیطان کے مکر و فریب میں نہ آئیں، اس کو یہ ملکہ دیا گیا ہے کہ وہ تمہیں ہر جہت سے دیکھ سکتا ہے۔

آیت نمبر 28 میں فرمایا کہ جب کفار کو عقائد باطلہ اور اعمال قبیحہ سے روکا جاتا تو وہ کہنے لگتے کہ یہ ہمارے باپ دادا کا طریقہ ہے اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ اللہ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں فرماتا بلکہ اللہ عدل وانصاف کا حکم فرماتا ہے تو تم بھی اسی کی دل سے عبادت کرو۔

آیت نمبر: 31 اور 32 میں فرمایا: اے بنی آدم! ہر عبادت کے وقت لباسِ زینت کو اختیار کرو اور اسراف سے بچتے ہوئے اللہ کی نعمتوں سے استفادہ کرو، پاکیزہ چیزیں، خواہ لباس ہو یا خوراک مومنوں کے لئے حلال ہیں، اللہ نے تو ظاہر و باطن میں بے حیائی، گناہ اور حق سے عدول کو حرام قرار دیا ہے۔

آیت نمبر 35 میں رسل کرام کی اطاعت کرنے والوں تقویٰ اور عمل صالح کرنے والوں کیلئے جنت کی بشارت جبکہ کفر، تکذیب اور تکبر کرنے والوں کیلئے جہنم کی وعید ہے۔

آیت نمبر: 40 میں فرمایا کہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں اور تکبر کرنے والوں کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں اور نہ ہی وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ آیت نمبر: 43 میں فرمایا کہ اللہ نے اہلِ جنت کے دلوں سے کینہ نکال دیا ہے اور وہ ہدایت پانے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، کیونکہ اسی کے فضل سے ہدایت ملتی ہے۔

آیت نمبر: 44 اور بعد کی آیات میں بتایا کہ آخرت میں جنتی جہنمیوں کو پکاریں گے کہ ہم نے تو اپنے رب کے وعدے کو سچا پایا، بتاؤ تم نے کیسا پایا تو اُن دونوں کے درمیان سے ایک پکارنے والا پکارے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو۔ مزید فرمایا کہ جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان حجاب ہوگا اور اہلِ اعراف دونوں گروہوں کو ان کی نشانیوں سے پہچانیں گے اور جنتیوں کو سلام کریں گے اور جہنمیوں سے کہیں گے کہ تمہاری جماعت اور تمہارا تکبر آج تمہارے کسی کام نہ آیا۔ جہنمی، جنتیوں سے استدعا کریں گے کہ ہم پر تھوڑا سا پانی انڈیل دو اور جو نعمتیں تمہیں عطا ہوئی ہیں، ان میں سے تھوڑا سا ہمیں بھی دے دو، مگر اللہ نے فرمایا کہ یہ چیزیں کافروں پر حرام ہیں۔ جن لوگوں نے دین کو کھیل تماشا سمجھ رکھا تھا، اللہ ان سے

فرمائے گا کہ جس طرح تم نے قیامت کے دن کو فراموش کر رکھا تھا، آج تم بھی نظر انداز کر دیئے جاؤ گے۔

آیت نمبر: 54 میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائیں اور اس کے بعد فرمایا کہ اپنے رب کو گڑ گڑا کر، چپکے چپکے اُس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے، اس کی رحمت کا یقین رکھتے ہوئے پکارو۔ اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ۔

آیت نمبر: 57 میں اللہ تعالیٰ نے بارانِ رحمت کے نظام کے بارے میں بتایا کہ اس کے حکم سے ہوائیں پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو چلا کر لے جاتی ہے اور بنجر زمین پر برسا کر اس میں اللہ کی نعمتیں پیدا کر دیتی ہے، اس طرح مردوں کو دوبارہ زندہ فرمائے گا۔ پھر فرمایا کہ اچھی زمین اللہ کے حکم سے سبزہ اگاتی ہے اور خراب زمین باغ و بہار نہیں لاتی۔ یہ مثالیں دے کر قرآن یہ بتاتا ہے کہ انسانوں کے دل و دماغ کی زمین کا حال بھی ایسا ہی ہے، یعنی پاکیزہ دل و دماغ میں ایمان قرار پاتا ہے اور اعمال کے ثمرات پیدا ہوتے ہیں، جب کہ خبیث دل و دماغ میں خیر کے پھل اور پھول پیدا نہیں ہوتے۔

آیت نمبر: 59 سے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے حالات بیان کئے گئے ہیں کہ ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: (معاذ اللہ) آپ کھلی گمراہی میں ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو اللہ کا رسول ہوں اور میرا کام تمہاری خیر خواہی اور تم تک دعوتِ حق کو پہنچانا ہے۔ اس کے بعد قوم نوح کی تکذیب، طوفان نوح اور نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھ کشتی میں سوار افراد کے سوا سب کے غرق ہونے کا ذکر ہے۔

آیت نمبر: 65 سے حضرت ہود اور ان کی قوم عاد کا ذکر ہے کہ قومِ عاد نے بھی اللہ کے نبی پر طعن کیا کہ (معاذ اللہ) آپ حماقت میں مبتلا ہیں۔ پھر ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو وہی جواب دیا، جو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دیا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے قومِ عاد کو انعاماتِ الٰہیہ کا شکر ادا کرنے کی تلقین کی تو اُنہوں نے انکار کر دیا چنانچہ اُن پر اللہ کا عذاب اور غضب نازل ہوا، اللہ نے حضرتِ ہود اور ان کے ساتھیوں کو نجات دی اور آیاتِ الٰہی کو

جھٹلانے والوں کا قلع قمع کر دیا۔

آیت نمبر :73 سے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کا ذکر ہے۔قومِ ثمود کے مطالبے پر اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح کے معجزے کے طور پر چٹان سے حاملہ اونٹنی کو پیدا کیا اور انہیں حکم دیا کہ اسے چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔قومِ ثمود کے لوگ بڑے طاقت ور تھے اور یہ نرم زمین میں محلات بناتے اور پہاڑوں کو تراش کر ان میں گھر بناتے تھے، گویا ان کو اپنی طاقت پر ناز تھا۔ پھر قومِ ثمود نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی کی سزا اس طرح دی کہ ان پر رات کو زلزلے کا عذاب آیا اور صبح کو وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔

آیت نمبر :80 سے حضرت لوط اور ان کی قوم کا ذکر ہے کہ وہ بے حیائی میں اپنے زمانے کے سب لوگوں پر سبقت لے گئے، وہ اپنی جنسی خواہش کو غیر فطری طریقے سے پورا کرتے تھے اور جب اللہ کے نبی عذاب کا ڈر سناتے تو وہ اسے مذاق سمجھتے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا، آسمان سے پتھر برسائے اور اس طرح ان کا نام ونشان مٹا دیا گیا، یہاں تک کہ حضرت لوط علیہ السلام کی وہ بیوی جو قومِ لوط کی ہم خیال تھی وہ بھی عذاب سے نہ بچ سکی، صرف حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے ساتھ قبیلے کے چند نیکوکار لوگ ہی محفوظ رہے۔

آیت نمبر :85 سے حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم اہلِ مدین کا ذکر ہے، قرآن نے بیان کیا کہ ان کی ناپاک خصلتیں یہ تھیں کہ وہ ناپ تول میں ڈنڈی مارتے اور دوسروں کو چیزیں کم تول کر دیتے تھے اور راستے میں بیٹھ کر اہلِ ایمان کو ڈراتے اور انہیں راہِ راست سے روکتے۔ انہیں بھی کہا گیا کہ فساد فی الارض سے باز آجاؤ اور اپنے سے پہلی سرکش امتوں کا انجام دیکھ لو۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ:۹

نویں پارے کے مضامین

اس پارے کے شروع میں قومِ شعیب کے سرکش سرداروں کی اس دھمکی کا ذکر ہے کہ اے شعیب! ہمارے دین کی طرف پلٹ آؤ، ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے پیروکاروں کو جلاوطن کر دیں گے۔ شعیب علیہ السلام نے اللہ سے التجا کی کہ اے اللہ! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے۔ پھر اُن پر قومِ ثمود کی طرح عذاب نازل ہوا اور وہ ایسے نیست و نابود ہوئے کہ جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ آیت نمبر 94 میں فرمایا کہ نبی کو جھٹلانے کے بعد فوراً اس قوم کو تباہ نہیں کیا گیا بلکہ پہلے ان کو سختی اور تکلیف پھر انعام واکرام سے آزمایا گیا جب ہر حال میں کفر پر ڈٹے رہے تو پھر ان کو تباہ کیا گیا۔ آیت نمبر: 96 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اِن بستیوں والے ایمان لائے ہوتے اور تقوے کو اختیار کیا ہوتا تو ہم اِنہیں زمین و آسمان کی نعمتیں فراوانی سے عطا کر دیتے۔ لیکن حق کو جھٹلانے کے سبب وہ انجامِ بد سے دوچار ہوئے۔ ان بستی والوں کو اس سے بے پرواہ نہیں ہونا چاہئے تھا کہ اِن پر ہمارا عذاب رات کو سوتے میں یا دِن چڑھے آسکتا ہے۔ گزشتہ امتوں کے احوال سنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفارِ مکہ کی ایذا رسانیوں پر تسلی دینا اور مشرکینِ مکہ کو عبرت دلانا مقصود ہے۔

آیت نمبر: 103 سے 129 تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور فرعون اور اس کے پیروکاروں کا ذکر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دعوتِ حق دی اور کہا کہ میں تمہارے پاس واضح نشانیاں لایا ہوں اور بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو، فرعون نے معجزات پیش کرنے کے لئے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر ڈالا تو وہ ایک واضح اژدھا بن گیا، انہوں نے اپنا ہاتھ (گریبان سے) نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لئے روشن ہوگیا۔ فرعون کے سرداروں نے حق کو قبول کرنے کی بجائے اسے جادو قرار دیا اور کہا کہ یہ تمہیں اپنے ملک سے نکالنا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس معاملے کو ذرا ڈھیل دو اور جادوگروں کو جمع کرو،

جادوگر آئے اور انہوں نے فرعون سے کہا کہ اگر ہم غالب آ گئے تو ہمارا انعام کیا ہوگا، اس نے کہا کہ تم ہمارے مقربین میں سے ہو جاؤ گے۔ جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ پہل کریں گے یا ہم کریں؟۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم پہل کرو، جب جادوگروں نے اپنی (رسیاں) زمین پر ڈال دیں تو لوگوں کی نگاہوں کو سحر زدہ کر دیا اور انہیں ڈرا دیا اور (انہوں نے کہا یہ تو) بڑا جادو لے آئے۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنا عصا (زمین پر) ڈالیں، وہ عصا سانپ بنا اور جادوگروں کی چیزوں کو نگلنے لگا۔ اس طرح معجزے کی حقانیت اور جادو کا بُطلان ثابت ہوا اور فرعونی رسوا ہوئے۔ جادوگر سجدے میں گر پڑے، اللہ پر ایمان لے آئے، فرعون نے انہیں دھمکی دی کہ میری اجازت کے بغیر تم ایمان لے آئے، میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دوں گا اور تمہیں سولی چڑھاؤں گا، انہوں نے کہا کہ ایمان لانے کی پاداش میں تم ہمیں سزا دینا چاہتے ہو؟ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے صبر و استقامت کی دعا کی۔ اس کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرنے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو صبر کی تلقین کی اور کہا کہ نیک انجام اہلِ تقویٰ کے لئے ہے۔

آیت نمبر: 130 تا 143 میں بتایا کہ اللہ نے فرعونیوں پر قحط سالی کا عذاب نازل کیا، فرعونیوں کا طریقہ یہ تھا کہ اچھائی کو اپنا کمال گردانتے اور برائی کو بدشگونی کے طور پر موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے۔ پھر ان پر ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کا عذاب نازل کیا۔ جب عذاب میں مبتلا ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ ہم سے یہ عذاب ٹل جائے، اگر ایسا ہوا تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی آزاد کر دیں گے، لیکن موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے نتیجے میں عذاب ٹل جانے کے بعد فرعونی اپنے وعدے سے پھر گئے، تو اللہ تعالیٰ نے بھی اُنہیں سمندر میں غرق کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے کمزور لوگوں کو مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا اور بنی اسرائیل سے جو خیر کا وعدہ تھا وہ پورا ہوا۔ بنی اسرائیل سمندر پار کر کے ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو بتوں کو پرستش کرتی تھی، انہوں

نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے لئے بھی ایک خدا بنا دیجئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: بت پرستی کرنے والے جاہل ہیں اور اپنی جاہلیت کے باعث ہی ہلاک ہونے والے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بنایا اور کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور یہ چالیس دن کا عرصہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنا جلوہ دکھانے کی استدعا کی، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے بالواسطہ تجلی فرمائی، تو موسیٰ علیہ السلام اس کی تاب نہ لاکر بیہوش ہو گئے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

آیت نمبر: 144 تا 155 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسالت عطا کرنے، کلیم اللہ کا منصب عطا کرنے اور تورات عطا کرنے کا ذکر ہے۔ آگے چل کر بتایا کہ متکبر آیاتِ الٰہی سے اعراض کریں گے اور جو لوگ اللہ کی آیات اور قیامت کو جھٹلاتے ہیں، ان کے اعمال باطل ہیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر قیام کے عرصے میں بنی اسرائیل کے زیورات سے بچھڑا بنا کر اسے معبود بنانے کا ذکر ہے۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو قوم پر غصے اور افسوس کا اظہار کیا اور کہا میرے پیچھے تم نے ایسا برا کام کیا، انہوں نے تورات کی تختیاں زمین پر ڈالیں اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کا سر پکڑ کر ان سے جواب طلبی کی۔ انہوں نے کہا: اے میرے بھائی قوم نے مجھے بے بس کر دیا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں، اب آپ مجھ پر سختی کر کے دشمنوں کو ہنسی کا موقع نہ دیں، پھر آیت نمبر: 151 میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور کلماتِ استغفار کا ذکر ہے۔ آگے چل کر بتایا کہ غصہ ٹھنڈا ہونے پر موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی تختیوں کو اٹھایا، جن کی تحریر میں اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت کی نوید تھی۔

آیت نمبر: 156 تا 158 میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے، جس میں انہوں نے اپنی قوم کے لئے اللہ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کامل نعمت میں ان لوگوں کو عطا کروں گا جو ایمان کے ساتھ تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور اس عظیم رسول نبی امی کی پیروی کریں گے، جس کا ذکر وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں اور یہ نبی ان کو نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے

حلال کرے گا اور ناپاک چیزوں کو حرام کرے گا اور بداعمالیوں کا بوجھ اور ان کے گلوں میں پڑے ہوئے طوق اتار دے گا، سو جو لوگ ان پر ایمان لائے، ان کی تعظیم اور نصرت کی اور اس نورِ (ہدایت) کی پیروی کی جو اُن کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالتِ عامہ کا ذکر ہے۔کہ آپ کی رسالت کسی قوم سے مخصوص ہے نہ خاص زمانے تک محدود بلکہ جس طرح اس کے بھیجنے والے کی حکومت و سروری عالم گیر ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت بھی جہان گیر ہے۔

آیت نمبر:160 سے موسیٰ علیہ السلام کی پتھر پر ضرب سے ان کی قوم کے بارہ قبیلوں کے لئے بارہ چشمے جاری ہونے کے معجزے، بادل کے سایہ کرنے اور مَن اور سلویٰ کے اتارنے کا بیان ہے۔اس کے بعد اس امر کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ معافی مانگتے اور سجدہ کرتے ہوئے بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ، مگر انہوں نے اس مسئلے میں بھی تحریف کی، مزید بتایا کہ سمندر کے کنارے ایلا نامی بستی میں انہیں ہفتے کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا گیا، مگر انہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی۔سوائے ایک گروہ کے بنی اسرائیل کی ان نافرمانیوں کے باعث اُن کی صورتوں کو مسخ کر کے بندر بنا دیا گیا۔آیت نمبر 168، 167 میں یہود کے برے اعمال کے سبب ان کی جمعیت کے منتشر ہونے اور ان پر جابر لوگوں کے مسلط ہونے کا ذکر ہے۔بعد والی آیت میں ان کے برے جانشینوں کا ذکر ہے جو رشوت لے کر اللہ تعالیٰ کی آیات میں ردوبدل کر دیتے تھے۔اور ان سب برائیوں کے باوجود اس مغالطے اور خود فریبی کا شکار تھے کہ وہ بخشے جائیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آخرت کا گھر صرف متقین اور اللہ کے فرماں بردار بندوں کیلئے ہے۔

آیت نمبر:172 میں اس امر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی ارواح کو جمع کیا اور ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار کروایا، اس اقرار کو ’عھدِ اَلَسْت‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آیت نمبر 175 میں ذکر شخص کے مصداق پر علماء کا اختلاف ہے بعض نے اسے بلعم ابن باعور، بعض نے امیہ بن الصلت اور بعض نے ابو عامر فاسق قرار دیا ہے۔ان تینوں

میں ایک برائی حسد قدر مشترک ہے یہ سب علم اور زہد وریاضت والے لوگ تھے لیکن بلعم ابن باعور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حسد کی وجہ سے اور امیہ بن الصلت اور ابو عامر بن صیفی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسد کی وجہ سے کفر اختیار کر کے راہ حق سے منحرف ہو گئے۔

آیت نمبر:179 میں اللہ تعالیٰ کی نعمتِ عقل کو قبولِ ہدایت کے لئے استعمال نہ کرنے والوں کو چوپایوں سے بدتر قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ: ان کے دل ہیں مگر وہ (حق کے دلائل کو) سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ (آیاتِ الٰہی کو) دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر وہ (دعوتِ حق کو) سنتے نہیں۔

آیت نمبر 180 میں اللہ تعالیٰ کو اسمائے حسنیٰ کے ساتھ پکارنے کا ذکر ہے آیت 183 میں اللہ تعالیٰ کے مہلت دینے اور خفیہ تدبیر کا بیان فرمایا۔

آیت نمبر 186 تا188 میں منکرین کے قیامت کے بارے میں پوچھنے اور قیامت کے اچانک آنے کا ذکر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بارگاہِ الوہیت میں عجز و نیاز کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا: "کہو! میں اپنی ذات کے لئے (خود سے) کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں (اپنی ذات سے) غیب کو جانتا تو میں (ازخود) خیرِ کثیر جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی"، یعنی غیب کے علوم اور ساری نعمتیں رب ہی کی عطا سے ہیں اور کبھی کوئی تکلیف پہنچے تو اس کی قضا وقدر سے پہنچتی ہے۔

آیت نمبر:189 تا190 میں بتایا کہ تمام بنی آدم کو ایک جان (آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بھی بنایا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے۔ اور جب بیوی امید سے ہو تو میاں بیوی تندرست لڑکے کی دعا کرتے ہیں اور شکر ادا کرنے کا اقرار کرتے ہیں لیکن جب اللہ ان کو عطا کرتا ہے تو یہ لوگ اس کے ساتھ شریک بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد والی آیتوں میں کفار کے معبودان باطل کی عجز، کمزوریوں اور احتیاج کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:194 سے مشرکوں کے معبودانِ باطلہ کے بارے میں بتایا کہ وہ تمہاری ہی طرح مخلوق ہیں اور آنکھ، کان، ہاتھ اور پاؤں کی نعمت سے بھی محروم ہیں، یعنی وہ خود ہی

عاجز و بے بس ہیں اور کسی کو نقصان یا نفع پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ یہ چیزیں اللہ کے اختیار میں ہے۔

آیت نمبر 199 میں اخلاق حسنہ کی جامع ترین تعریف ہے اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم سے فرمایا کہ جو قصور وار معذرت طلب کرتے ہوئے آپ کے پاس آئے تو اسے معاف کر دیجئے، اچھی باتوں اور نیک کاموں کا حکم دیجئے اور نا سمجھ لوگوں سے الجھنے کی بجائے رخ انور پھیر لیجئے۔ اگر شیطان وسوسہ اندازی کرے تو اعوذ باللہ پڑھیے، اللہ کے ذکر سے شیطان کے شر سے پناہ حاصل ہو جائے گی۔

سورۂ اعراف کے آخر میں آیت 204 میں ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے اور اپنے رب کو صبح و شام خوف اور عاجزی کے ساتھ پست آواز میں دل میں یاد کرو اور غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

آخری آیت میں فرشتوں کی صفات کا ذکر فرمایا کہ وہ اللہ کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، تسبیح بیان کرتے ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اس سے مستفاد یہ ہے کہ انسان جو مسجود ملائک ہے اسے بہ طریق اولیٰ یہ کام کرنے چاہییں۔

سورۃ الانفال

سورۃ الانفال مدنی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے آٹھویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 88 ویں سورت ہے۔ اس سورت میں مال غنیمت کا ذکر ہے جسے عربی زبان میں انفال کہتے ہیں اس لئے اس سورت کو الانفال سے موسوم کیا گیا۔ اس سورت میں مال غنیمت کے احکام کا بیان ہے۔ اتحاد و اتفاق، مسلمانوں کا غزوہ بدر کیلئے نکلنے، قلت تعداد کے باوجود اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے کامیابی، دشمن کے خلاف جہاد کی تیاری، دین کی بنا پر ایک دوسرے کی مدد کرنے، معرکہ بدر میں دونوں جمعیتوں کے قتال کی کیفیت، مسلمانوں اور کافروں کے درمیان معاہدوں کے احکام اور دار الحرب میں رہنے والے مسلمانوں کے احکام کا بیان ہے۔

انفال مطلقاً مالِ غنیمت کو بھی کہتے ہیں اور کسی مجاہد کو غیر معمولی کارکردگی کی وجہ سے دوسرے مجاہدین کے مقابلے میں کچھ زائد دیا جائے، تو اسے بھی نفل یا انفال کہتے ہیں اور انفال اللہ اور رسول کے حکم کے تابع ہے جس کو جتنا چاہیں عطا کردیں۔

آیت نمبر:02 سے کامل مؤمنوں کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں:

(۱) وہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔

(۲) آیاتِ الٰہی سن کر ان کے ایمان کو تقویت ملتی ہے۔

(۳) وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

(۴) اقامتِ صلوٰۃ اور (۵) ادائے زکوٰۃ ان کا شِعار ہے۔ اور یہ سچے اور پکے مومن ہیں۔

آیت نمبر:05 میں فرمایا کہ کچھ لوگ جہاد کے لئے دل وجان سے آمادہ نہ تھے اور مجاہدین کی خواہش تھی کہ ابوجہل کی قیادت میں مشرکینِ مکہ کے مسلح ومنظم لشکر کے بجائے ابوسفیان کے تجارتی قافلے سے ٹکراؤ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ مکہ سے تصادم کو مقدر فرمایا تاکہ حق کی حقانیت اور غلبہ ثابت ہوجائے۔

آیت نمبر:9 تا 24 سے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں مجاہدین کے اطمینانِ قلب کے لئے اور فتح کی بشارت کے طور پر فرشتے نصرت کے لئے بھیجے۔ میدانِ بدر میں سخت زمین اور پانی کے چشمے کفار کے پاس تھے اور نرم زمین (جس پر چلنا دشوار ہوتا ہے) مسلمانوں کے پاس تھی اور پانی کی بھی قلت تھی، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے توہمات پیدا ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بارش برسائی اور مسلمانوں نے وافر پانی جمع کر لیا اور ان کی شرعی اور طبعی ضروریات بھی پوری ہوئیں اور دلوں کو بھی اطمینان ملا۔ اللہ تعالیٰ نے میدانِ جہاد میں پسپائی اختیار کرنے والوں کو اپنے غضب کا حق دار قرار دیا۔ میدانِ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مٹھی میں ریت لے کر کافروں کی جانب پھینکی اور فرمایا کہ یہ لوگ رسوا ہوجائیں، یہ ریت اُن کی آنکھوں میں جا پڑی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے رسول! وہ خاک آپ نے نہیں پھینکی، جس وقت کہ آپ نے پھینکی تھی، لیکن درحقیقت وہ اللہ نے پھینکی

تھی''۔اللہ تعالیٰ نے بدر کو فیصلہ کن جنگ قرار دیا اور مسلمانوں سے فرمایا:''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے بلانے پر (فوراً) حاضر ہو، جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں، جو تمہارے لئے حیات آفرین ہے''۔آیت نمبر 25 میں فرمایا کہ یہ مت سمجھنا کہ ظالموں کے فتنے کا وبال صرف ان لوگوں تک محدود رہے گا اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل رک گیا تو اسکے اثرات باقی معاشرے کو بھگتنا ہوں گے۔آیت نمبر 26 میں ہجرت سے پہلے مسلمانوں کی بے بسی اور بعد میں اللہ کی مدد سے مضبوط ہونے اور اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنے کا بیان ہے۔مزید فرمایا کہ اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور اپنی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو۔

آیت نمبر:30 میں ہجرت کے موقع پر مشرکینِ مکہ نے اپنے پارلیمنٹ (دارالندوہ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو مشاورت کی، اس کے احوال بیان کرتے ہوئے فرمایا: اور (اس وقت کو) یاد کیجئے جب کافر آپ کے خلاف سازش کر رہے تھے تا کہ آپ کو قید کریں یا (معاذ اللہ) قتل کریں یا جلاوطن کریں، وہ اپنی سازش میں لگے ہوئے تھے اور اللہ خفیہ تدبیر فرما رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔

آیت نمبر:32 تا 35 میں بیان فرمایا کہ کفارِ مکہ اپنی سرکشی کی وجہ سے اس طرح کے مطالبات کرتے تھے کہ اگر آپ کے پاس یہ قرآن حق ہے، تو اللہ سے دعا کیجئے کہ ہم پر آسمان سے پتھر برسائے یا ہمیں دردناک عذاب دے، (مگر اللہ نے فرمایا) اور جب کہ آپ ان میں موجود ہیں، اللہ ان کو عذابِ (استیصال) نہیں دے گا اور جب تک وہ استغفار کر رہے ہوں، تو بھی اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہیں دے گا۔پھر فرمایا:'بیت اللہ کے پاس مشرکوں کی نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کی صورت میں تھی'' اور آگے چل کر مقصدِ جہاد بیان فرمایا:''اور ان سے جنگ کرتے رہو حتیٰ کہ کفر کا غلبہ نہ رہے اور پورا دین اللہ کا ہو جائے''۔اور فرمایا کہ اللہ کے راستے سے روکنے کیلئے خرچ کرنے والوں کے ہاتھ بجز حسرت کے اور کچھ نہیں آئے گا۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ:۱۰

دسویں پارے کے مضامین

دسویں پارے کے شروع میں کفار پر غلبے کی سورت میں حاصل شدہ مالِ غنیمت کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ اس کے چار حصے مجاہدین کے درمیان تقسیم ہوں گے اور پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور (رسول کے) قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے، یعنی یہ اللہ کے رسول کی صوابدید پر ہوگا۔

آیت نمبر:42 میں بتایا کہ میدانِ بدر میں مسلمان مجاہدین کی زمینی پوزیشن کفار کے مقابلے میں بظاہر کمزور تھی، یعنی مسلمانوں کی طرف کی زمین کا نرم ہونا اور پانی کی قلت اور مال واسباب کی قلت مسلمانوں کی کمزوری کی ظاہری علامت تھی، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں خدشات پیدا ہوتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا: (یہ اس لئے ہوا) کہ اللہ اپنے طے شدہ فیصلے کو نافذ کردے، یعنی ظاہری کمزوری کے باوجود مسلمانوں کا غلبہ اور فتح مقدر کردے اور اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرما دیتا ہے، وہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔

آیت نمبر:45 سے اس مضمون کو اس طرح سے بیان فرمایا کہ مسلمانوں اور کفار دونوں پر نیند طاری کردی گئی اور کفار مسلمانوں کو خواب میں کم تعداد میں دکھائے گئے تاکہ مسلمانوں کی ہمت بندھی رہے اور وہ ثابت قدم رہیں اور اسی طرح کفار کو بھی خواب میں مسلمان کم تعداد میں دکھائے گئے تاکہ وہ کم ہمتی میں مبتلا ہو کر میدان چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں، کیوں کہ اللہ کی مشیت کا تقاضا تھا کہ بدر میں حق و باطل کا معرکہ برپا ہو کر رہے اور حق غالب آجائے۔ مزید بتایا کہ جنگ میں کفر کے مقابل ثابت قدم رہو اور اللہ کا ذکر کرتے رہو، آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور کافروں کی طرح اپنی طاقت پر اتراؤ بھی نہیں اور دِکھاوا بھی نہ کرو۔ مزید بتایا کہ شیطان کافروں کو فتح کی بشارت دیتا رہا

اور اپنی حمایت کا یقین دلاتا رہا، لیکن حق و باطل کے مقابلے کے وقت وہ الٹے پاؤں بھاگا۔

آیت نمبر 48 میں منافقین کے اس حاسدانہ قول کا ذکر فرمایا کہ جب مسلمانوں کی ہمت اور جرات کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ان مسلمانوں کو ان کے دین نے مغرور کر دیا ہے۔

آیت نمبر :53 میں قانونِ قدرت کے ایک اصول کو بیان کیا، جسے علامہ اقبال نے اپنے کلام میں منظوم کیا ہے:۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ ،اپنی حالت کے بدلنے کا

آیت نمبر :54 سے بتایا کہ آلِ فرعون اور پچھلی امتیں آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے کے جرم میں ہلاک کردی گئیں۔ آیت نمبر 56 تا58 میں یہودی قبائل کی عہد شکنی اور دوبارہ ان کی طرف سے خیانت کی صورت میں صلح کے معاہدے کو ختم کرنے کا ذکر ہے۔ آیت نمبر :60 میں فرمایا کہ دشمن کے مقابلے میں اپنی پوری دستیاب قوت اور اسباب کے ساتھ تیار رہو اور High Alert رہو، اس کے ذریعے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ڈرا سکو گے۔ آگے چل کر یہ بتایا کہ اگر دشمن صلح پر آمادہ ہو تو تم بھی صلح کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر توکل کرو اور اگر ان کی نیت دھوکہ دینے کی ہو تو تمہارے لئے اللہ کافی ہے۔

آیت نمبر :63 سے بتایا کہ اللہ نے اپنے کرم سے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور اگر تم زمین کے سارے خزانے بھی خرچ کر دو تو یہ باہمی الفت تمہارے اندر پیدا نہ ہوتی اور فرمایا اے نبی! آپ کو اللہ کافی ہے اور آپ کے تابع فرمان مؤمنوں کی جماعت کافی ہے۔

آیت نمبر :65 سے نبیِ کریم ﷺ کو حکم ہوا کہ مومنوں کو جہاد پر ابھاریئے ، اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے سے دس گنا تعداد پر مشتمل کافروں پر فتح عطا فرمائے گا، پھر بعد میں جب مسلمانوں میں کمزوری آئی تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دشمنوں کی دگنی تعداد پر فتح عطا فرمائے گا۔

ابتدائے اسلام میں جنگی قیدیوں کے احکام نہیں آئے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے

صحابہ کرام کے مشورے سے جنگی قیدیوں کو چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا، قرآن نے اس مرحلے پر اس فیصلے کو پسندیدہ تو قرار نہیں دیا، لیکن مسلمانوں کی خطاءِ اجتہادی پر مواخذہ بھی نہیں فرمایا۔ تفصیلی احکام بعد میں آئے۔

آیت نمبر:72 سے بتایا کہ جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مؤمنین مہاجرین اور انصار صحابہ کرام ایک دوسرے کے دوست ہیں اور آگے چل کر فرمایا کہ یہی سچے اور پکے مومن ہیں اور ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت والی روزی ہے اور اسی طرح کفار بھی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ہجرت سے پہلے اور بعد کے مسلمان ہونے والوں کے حقوق درجات میں فرق کے باوجود یکساں ہیں۔

سورۃ التوبہ

سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کے مضامین چونکہ باہم مربوط ہیں، اس لئے ان دونوں کے درمیان فصل کے لئے بسم اللہ نہیں لکھی جاتی۔ یہ مدنی سورت ہے ترتیب مصحف کے اعتبار سے نویں جبکہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے 114 ویں سورت ہے۔ چونکہ اس سورت میں مشرکین سے سابقہ معاہدات منسوخ کر کے براءت کا اعلان کیا گیا ہے اس لئے اس کو سورۃ البراءۃ بھی کہتے ہیں سورۃ التوبہ میں مشرکین کا داخلہ مسجد حرام میں بند اور مناسک حج ادا کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ مشرکین سے حالت جنگ کا اعلان جبکہ اہل کتاب سے جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور ان کے احبار و رہبان کے باطل عقائد و نظریات کا رد کیا گیا ہے۔ حرمت کے مہینوں کے احکام، جہاد کی ترغیب، انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب، مسجد ضرار بنانے والوں کی مذمت، دیہاتیوں میں سے نیک اور بد لوگوں کا ذکر، بغیر عذر کے غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے والوں کی ندامت اور تنگی کے بعد توبہ کی قبولیت کا بیان، زکوٰۃ کی مشروعیت اور فضیلت علم کا بیان فرمایا گیا ہے۔

اس سورت کی پہلی آیت میں مشرکینِ عرب سے براءت کا اعلان کرتے ہوئے انہیں مسلمانوں سے فیصلہ کن جنگ کرنے یا اسلام قبول کرنے کے لئے چار مہینے کا ٹائم دیا۔ اور

یہ بھی فرمایا کہ جن کفار کے ساتھ مسلمانوں کا پہلے سے کوئی معاہدہ ہے اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کسی دشمن کی مدد بھی نہیں کی، تو مقررہ مدت تک مسلمان یکطرفہ طور پر معاہدے کو نہ توڑیں۔ پھر فرمایا کہ چار مہینے کا نوٹس پیریڈ گزرنے کے بعد مسلمان مشرکینِ عرب کے خلاف Crackdown کریں، ان کا مکمل محاصرہ کریں اور وہ جہاں بھی ملیں، انہیں ان کے کیفر کردار تک پہنچائیں۔

آیت نمبر 6 میں فرمایا کہ اگر کوئی مشرک قرآن کے پیغام کو سمجھنے کیلئے اور حق کی تلاش میں آپ کے پاس آئے تو اسے موقع دیں اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لیں۔

آیت نمبر:8 تا10 سے بتایا کہ کفار مسلمانوں کے ساتھ منافقانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور اُن کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں پر خدانخواستہ غالب آجائیں تو قرابت داری کا بھی پاس نہ کریں۔ مزید بتایا کہ ان کفار میں سے جو توبہ کر کے ایمان لے آئیں اور اس کے تقاضوں پر کاربند رہیں، تو پھر وہ مسلمانوں کے دینی بھائی ہیں۔ یعنی اُن کے لئے ماضی کی نفرتوں کو دل سے نکال دیا جائے۔

آیت نمبر:12 میں بتایا کہ جو کفار عہد کر کے اپنی قسموں کو توڑ دیں، تو پھر وہ کسی رو رعایت کے مستحق نہیں ہیں، وہ پہلے بھی رسول اللہ کے ساتھ اس طرح کی عہد شکنیاں کر چکے ہیں۔

آیت نمبر:16 میں بتایا کہ مسلمانوں پر آزمائشیں آئیں گی تاکہ سچے مومنوں کا کردار کھل کر سامنے آئے۔ آیت نمبر:17 اور 18 میں بتایا کہ کافروں کا شعار مسجدیں بنانا نہیں ہے، یہ تو ان لوگوں کا کام ہے کہ جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔

آیت نمبر 19 سے فرمایا کہ حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کی تعمیر اگرچہ اچھے کام ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان اور اللہ کے راستے میں جہاد کے برابر نہیں ہو سکتے۔ ہجرت اور جہاد کرنے والے مومنوں کیلئے اجر عظیم ہے اور صرف یہی لوگ کامیاب ہونے

والے ہیں۔

آیت نمبر:23 میں حکم ہوا کہ تمہارے باپ دادا اور بھائیوں میں سے جو کفر کو ایمان پر ترجیح دیں، ان سے تعلق توڑ دو اور کافروں سے دوستی کرنے والا ظالم ہے۔

آیت نمبر:24 میں ان تمام چیزوں کا یکے بعد دیگرے ذکر فرمایا کہ جن سے انسان کو فطری اور طبعی طور پر محبت ہوتی ہے، یعنی باپ دادا، اولاد، بھائی بہن، بیویاں یا شوہر، کنبہ اور قبیلہ، کمایا ہوا مال اور تجارت جس کے خسارے کا کھٹکا لگا رہتا ہے اور پسندیدہ مکانات، ان سب چیزوں کی محبت اپنے اپنے درجے میں مُسلّم، لیکن اگر یہ سب چیزیں مل کر بھی تمہارے لئے اللہ، اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب ہو جائیں، (تو ایمان کا دعویٰ تو دور کی بات ہے) پھر تمہیں اللہ کے عذاب کا انتظار کرنا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک اللہ اور اس کے رسول کی محبت کسوٹی پر پوری نہ اترے تو پھر محض دعوئ محبت نجات کے لئے کافی نہیں ہے۔

آیت نمبر:25 میں غزوۂ حنین کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ بعض اوقات کثرتِ تعداد پر اترانا اور نازاں ہونا بھی شکست کا باعث بن جاتا ہے، یہی مسلمانوں کے ساتھ غزوۂ حنین میں ہوا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مومنوں پر قلبی سکون نازل کیا اور غیبی لشکروں سے ان کی مدد فرمائی۔

9 ہجری کے یوم الحج کو عرفات میں اعلان ہوا کہ اس سال کے بعد مشرک حدودِ حرم میں داخل نہیں ہو سکیں گے اور فرمایا کہ تنگدستی کی فکر نہ کرو اللہ اپنے فضل سے تم لوگوں کو غنی کر دے گا۔

آیت نمبر 29 میں اہل کتاب کو جزیہ دینے کا حکم فرمایا اور فرمایا کہ نہ دینے کی صورت میں جنگ کیلئے تیار ہو جائیں۔ آیت نمبر:30 سے بتایا کہ یہود نے عزیر کو اللہ کا بیٹا کہا اور نصاریٰ نے مسیح کو اللہ کا بیٹا کہا، مگر یہ سب ان کی خود ساختہ باتیں ہیں، ان پر اللہ کی مار ہے۔ مزید فرمایا کہ نصاریٰ نے اپنے علماء اور راہبوں کو خدا بنا لیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی۔

حالانکہ انہیں وحدہٗ لاشریک اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ آگے چل کر فرمایا کہ منکر اپنی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں، مگر اللہ ان کی خواہش کے برعکس اس نور کو مکمل فرمائے گا اور اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے۔

آیت نمبر: 34 سے علماء و مشائخ یہود کے باطل طریقوں سے لوگوں کے مالوں کو کھانے اور اللہ کے راستے سے روکنے کا بیان ہے اور فرمایا کہ سونا اور چاندی (یعنی دنیاوی دولت) ذخیرہ کرنے والوں اور راہِ خدا میں خرچ نہ کرنے والوں کیلئے دردناک عذاب کی وعید ہے اور پھر بتایا کہ قیامت کے دن ان کے اپنے جمع کئے ہوئے مال کو نارِ جہنم میں تپا کر اُس سے اُن کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اپنے ہی جمع کئے ہوئے مال کا مزہ چکھو۔

آیت نمبر: 36 میں بتایا کہ ابتداءِ آفرینش سے اللہ کی کتابِ تقدیر میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے، اُن میں سے چار (ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب المُرجب) حرمت والے ہیں، ان مہینوں میں جنگ کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ کفارِ مکہ جب اِن مہینوں میں جنگ کرنا چاہتے تو ان کی ترتیب میں رَدّ و بدل کر دیتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مہینوں کو مؤخر کرنا کفر میں زیادتی ہے۔

آیت نمبر 38،39 میں فرمایا کہ جب جہاد کیلئے نفیر عام ہو جائے تو سستی نہیں کرنا چاہیے اور جو ایسا کرے گا اس کیلئے عذاب الیم ہے اور تم یہ مت سمجھنا کہ جہاد کا فریضہ صرف تم پر موقوف ہے تم نہیں کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور تم اس کو بالکل نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

آیت نمبر: 40 میں سفرِ ہجرت کے موقع پر غارِ ثور میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رفاقتِ خاص کو ایک شانِ امتیازی کے ساتھ بتایا اور اس آیت میں چھ مرتبہ مختلف انداز میں سیدنا صدیق اکبر کا ذکر ہوا۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کلمۂ کفر کو پست رکھا اور اللہ کا دین ہی

سر بلند ہے۔آگے فرمایا کہ جب جہاد کے لئے عام لام بندی کا حکم ہو جائے ،تو پھر جس حال میں بھی ہو تمام وسائل کے ساتھ جہاد میں شریک ہو جاؤ۔ پھر فرمایا کہ منافقین قسمیں کھا کھا کر اور طرح طرح کے بہانے بنا کر جہاد سے پہلو تہی اختیار کریں گے، جبکہ سچے مومن دل وجان سے جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔مزید فرمایا کہ جہاد سے پہلو تہی اختیار کرنے والے وہی لوگ ہیں جن کا اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں اور جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے، ایسے تشکیک کے مارے جنگ میں شامل بھی ہو جائیں تو فساد کا باعث بنتے ہیں اور مجاہدین کی صفوں میں فتنے اور سازشیں کرتے ہیں اور یہ لوگ پہلے بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔منافقین کا شِعار یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو کوئی بھلائی پہنچے تو وہ اس پر کڑتے ہیں اور اگر مسلمانوں کو کوئی تکلیف پہنچے تو خوشی سے کہتے ہیں کہ ہمیں تو یہ نتیجہ پہلے سے معلوم تھا، اس لئے ہم نے احتیاط سے کام لیا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:"(اے رسول!) کہہ دیجئے کہ ہمیں ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، سوائے اس کے جو اللہ نے ہمارے لئے مقدر کر دی ہے اور فتح ہو یا شہادت دونوں صورتوں میں ہم کامیاب ہیں"۔منافقین کی ایک روش یہ بھی بتائی کہ وہ نماز خوش دلی سے نہیں بلکہ کسل مندی سے پڑھتے ہیں اور ناخوشی سے بامر مجبوری خرچ کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ منافق اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ آپ ہی میں سے ہیں، حالانکہ وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہیں،لیکن وہ جان و مال کے خوف کے باعث مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہنا چاہتے ہیں۔

آیت نمبر 57 تا 59 میں منافقین کے دوغلے پن ،مسلمانوں سے بیزاری، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صدقات کے معاملے میں طعن کرنے اور ان کے حریصانہ فطرت کا بیان فرمایا ہے اور فرمایا کہ اگر یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی عطاء پر راضی ہو جاتے تو یہ ان کیلئے بہتر ہوتا۔

آیت نمبر:60 میں اللہ تعالیٰ نے صدقاتِ واجبہ اور زکوٰۃ کے مصارف (مستحقین) کو قطعیت کے ساتھ بیان کیا، جو یہ ہیں: فقراء، مساکین، عاملینِ زکوٰۃ، مؤلَّفَۃُ القلوب، غلامی سے گردن کو آزاد کرنا، جو قرض کے بار تلے دبے ہوئے ہوں، فی سبیل اللہ (یعنی

جنہوں نے اپنے آپ کو کل وقتی طور پر اللہ کے دین کی کسی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہو) اور مسافر۔

آیت نمبر: 61 میں فرمایا کہ بعض منافق اللہ کے نبی کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کانوں کے کچے ہیں جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام لوگوں کی بات سننا مومنین کے لئے باعثِ رحمت ہے اور جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان کے لئے دردناک عذاب ہے، فرمایا: منافق جھوٹی قسمیں کھا کر مسلمانوں کو راضی کرنے کا یقین دلاتے ہیں، اگر وہ سچے مومن ہوتے تو اللہ اور اس کا رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ انہیں راضی کیا جائے۔ منافقوں کا شِعار یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور اگر ان سے اس کے بارے میں پوچھا جائے تو کہتے ہیں کہ ہم تو محض خوش طبعی اور دل لگی کرتے ہیں، تو کیا وہ اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے ہیں؟۔

آیت نمبر: 67 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ منافق مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں اور خیر کے کاموں سے اپنا ہاتھ روکے رکھتے ہیں۔ انہوں نے اللہ کو بھلا دیا اور اللہ نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ آگے چل کر فرمایا کہ مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ اللہ نے مومنین اور مومنات سے جنت کی دائمی اور ابدی نعمتوں کا وعدہ فرما رکھا ہے اور اللہ کی رِضا ہی سب سے بڑی سعادت ہے۔

۔ آیت نمبر: 73 سے فرمایا کہ کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، یہ کلمۂ کفر کہتے ہیں اور پھر قسمیں کھا کر منکر ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انہوں نے کلمۂ کفر کہا ہے اور اسلام لانے کے بعد انہوں نے کفر کو اختیار کیا۔

آیت نمبر: 75 میں فرمایا کہ بعض منافق وہ ہیں، جو اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ اگر اللہ نے اپنے فضل سے ہمیں عطا کیا، تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور نیکوکاروں میں سے ہو

جائیں گے، پس جب اللہ نے اپنے فضل سے انہیں مال عطا کیا، تو انہوں نے بخل کیا اور رُوگردانی کی۔

آیت نمبر:78 میں اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا کہ اللہ دلوں کے رازوں اور سرگوشیوں کو بھی جانتا ہے اور وہ غیبی باتوں کو بہت زیادہ جاننے والا ہے۔

آیت نمبر:79 میں منافقوں کا ایک شِعار یہ بتایا کہ نادار مومنین جب اپنی محنت کی کمائی سے تھوڑا سا مال صدقہ کرتے ہیں، تو یہ منافق ان پر طعن کرتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں، (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) اللہ ان کو ان کے مذاق کی سزا دے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا: (یہ منافق آپ کے گستاخ ہیں) آپ کا ان کے لئے استغفار کرنا نہ کرنا برابر ہے، اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں (تو ان کی شقاوتِ قلبی کی وجہ سے) اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

آیت نمبر 81 میں منافقین کی اس بری خصلت کا ذکر ہے کہ خود تو جہاد نہیں کرتے اور گھروں میں بیٹھے ہیں ساتھ میں مسلمانوں کو گرمی کا ڈراوا دے کر ان کو بھی جہاد سے منع کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے اگر وہ سمجھتے ہیں۔

آیت نمبر:84 میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منافقین کے کفر کے سبب ان کی نمازِ جنازہ پڑھانے اور اِن کی قبر پر جانے سے ہمیشہ کے لئے منع فرمادیا۔

سورۂ توبہ کی آیات میں منافقین کی مسلسل مذمت فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ضعیفوں، بیماروں اور ناداروں کو عذر کی بنا پر رخصت عطا فرمائی ہے اور ایسے مجاہدین کو بھی جو خود بھی جہاد کے لئے اپنے مصارف برداشت نہ کر سکتے ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھی ان کی سواری اور زادِ راہ کا سامان نہ ہو، البتہ جو لوگ صحت مند ہونے اور مالی وسائل رکھنے کے باوجود جہاد سے پہلو تہی اختیار کرنا چاہیں تو وہ قابلِ مذمت ہیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ:۱۱

گیارہویں پارے کے مضامین

اس پارے کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو غیب کی خبر سے مطلع فرمایا کہ جب آپ سفرِ جہاد سے واپس مدینہ طیبہ پہنچیں گے تو بغیر کسی عذر کے جہاد سے پیچھے رہنے والے منافقین جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے عذر پیش کریں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ بہانے بنانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے حالات سے مطلع فرما دیا۔ یہ واقعہ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہنے والوں کا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان سے صرفِ نظر کریں، یہ ناپاک لوگ ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

آیت نمبر:98 سے عرب کے دیہاتی لوگوں کے دو طبقوں کا بیان ہوا، ایک وہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو تاوان سمجھتے ہیں اور مسلمانوں پر برے دن آنے کے منتظر رہتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ ہیں، جو اِسے اللہ تعالیٰ کی رِضا اور نبی ﷺ کی نیک دعاؤں کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

آیت نمبر:100 میں اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے میں پہل کرنے والے مہاجرین وانصار اور نیکی کے ساتھ ان کی اتباع کرنے والوں کو اپنی رضامندی کی قطعی سند عطا فرمائی اور ان کے لئے جنت کی دائمی نعمتوں کی بشارت سنائی۔

آیت نمبر:103 میں فرمایا: (اے رسول!) مسلمانوں کے مال داروں سے زکوٰۃ لیجئے تاکہ اس کے ذریعے آپ انہیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں، بے شک آپ کی دعا ان کے لئے سکون کا سبب ہے۔

آیت نمبر:107 میں ''مسجد ضرار'' کا ذکر ہے، منافقین نے ابو عامر راہب کی سازش سے یہ مسجد بنائی تھی اور حضور کو اس میں نماز پڑھنے کی دعوت دی تاکہ یہ مستند ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اس میں نماز پڑھنے سے منع فرما دیا اور بتایا کہ اس مسجد کے

مقاصد یہ ہیں:

(۱) مسلمانوں کو ضرر پہنچانا (۲) کفر کرنا (۳) اہلِ ایمان کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا (۴) اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے والوں کے لئے سازشوں کا مرکز بنانا۔

اللہ عزوجل نے نبی ﷺ کو فرمایا کہ آپ واپسی کے سفر میں مسجدِ قباء میں قیام کریں جس کی بنیاد تقوے پر رکھی گئی ہے اور جس میں اللہ کے پسندیدہ بندے نماز پڑھتے ہیں، منفی مقاصد کے لئے بنائی ہوئی مسجد اس کے برابر نہیں ہوسکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات بظاہر نیک کام اگر منفی مقاصد کیے لئے کیا جائے تو اللہ کے ہاں اسے قبولیت نہیں مل سکتی۔

آیت نمبر: 111 میں فرمایا کہ اہلِ ایمان کا اللہ تعالیٰ سے سودا ہو چکا ہے اور انہوں نے اپنی جان و مال کو اللہ کو فروخت کر دیا ہے، یعنی وہ اپنا سب کچھ اللہ کی رضا کے لئے قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں جنت کی نعمت عطا فرمائے گا۔

آیت نمبر: 112 میں اہلِ ایمان کی صفات بیان ہوئیں کہ وہ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، اللہ کی حمد کرنے والے، روزے رکھنے والے، رکوع و سجود کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اگلی آیات میں اسلام کا یہ اصول بتایا کہ مشرکوں کے لئے دعاءِ مغفرت نہیں ہوسکتی اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے (عرفی) باپ کے لئے وعدے کی پاسداری میں دعا کی تھی، لیکن جب ان پر واضح ہوا کہ یہ اللہ کا ازلی دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے۔

آیت نمبر: 118 میں غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے تین صحابہ (کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم) کا بیان ہے کہ انہوں نے جھوٹی بہانہ بازی نہیں کی بلکہ اپنی غلطی کو تسلیم کیا، انہیں ایک ابتلاء کے دور سے گزرنا پڑا، لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کی قبولیت کے لئے اپنے نبی ﷺ پر وحی نازل فرمائی اور یہ ان کا بہت بڑا اعزاز ہے۔

آیت نمبر: 122 میں بیان کیا کہ سارے مسلمان اپنے سارے مشاغل کو چھوڑ کر اپنے

آپ کو دین کے لئے وقف نہیں کر سکتے، پس ضروری ہے کہ ہر علاقے اور طبقۂ زندگی میں سے کچھ لوگ دین کی راہ میں نکل کھڑے ہوں اور دین میں مہارت حاصل کریں تاکہ وہ اپنی قوم کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں، یعنی یہ پورے معاشرے پر فرضِ کفایہ ہے۔

آیت نمبر: 124 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وحیِ ربانی نازل ہونے سے مخلص مومنوں کے ایمان کو تقویت ملتی ہے اور منافقین اور منکرین کے کفر اور نفاق کی بیماری میں اضافہ ہوتا ہے۔

سورۂ توبہ کی آخری دو آیات شانِ رسالت کے بارے میں اور بڑی بابرکت ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک عظیم رسول آ گئے ہیں، تمہارا مشقت میں پڑنا ان پر بہت شاق ہے تمہاری فلاح پر وہ بہت حریص ہیں مومنوں پر بہت شفیق اور نہایت مہربان ہیں اب اگر یہ لوگ منہ پھیرتے ہیں تو آپ کہہ دیں کہ مجھے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو بعض بزرگوں نے خواب میں دیکھا کہ حضور کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر ان کی آنکھوں کے درمیان شفقت سے بوسہ دیا، اہلِ مجلس کے دریافت کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ہر نماز کے بعد مجھ پر تین مرتبہ ''صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ یَا مُحَمَّد'' کے الفاظ کے ساتھ درود پڑھ کر سورۂ توبہ کی آخری دو آیات تلاوت کرتے ہیں۔

سورۂ یونس

سورۃ یونس مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے دسویں جبکہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے اکیاونویں سورت ہے۔ اس سورت میں حضرت یونس علیہ السلام اور آپ کی قوم کا تذکرہ ہے اس لئے اس کو سورۃ یونس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس سورت میں توحید کے اثبات کے دلائل، شرک کے رد، رسالت محمدی کی حقانیت کے اثبات، قرآن کریم کی حقانیت اور شک کی صورت میں مثل لانے کے چیلنج، حیات بعد الموت اور نفع وضرر کا مالک اللہ ہونے

کا بیان ہے۔

آیت نمبر 1 تا 4 میں قرآن کی حقانیت، نبی ﷺ کی رسالت، مومنین کیلئے اجر آخرت، زمین و آسمان کی پیدائش، اللہ کی طرف لوٹ کر جانے اور اللہ کے اذن کے بغیر شفاعت کے نامقبول ہونے، اور صرف اسی کی عبادت کرنے اور انکار کی صورت میں عذاب الیم کا ذکر ہے۔

آیت نمبر: 05 میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورج کو روشنی دینے والا بنایا اور چاند کو روشن بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں تاکہ سالوں کا حساب ہوسکے۔ مزید فرمایا کہ گردشِ لیل ونہار اور زمین و آسمان کی پیدائش میں اہلِ تقویٰ کے لئے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔

آیت نمبر: 11 میں بتایا کہ لوگ دنیا کے مفادات طلب کرنے میں جتنی جلدی کرتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ ان کی بداعمالیوں کی سزا میں اتنی ہی جلدی فرمائے، تو ان کی موت جلد آجائے، لیکن انہیں مہلت دی جاتی ہے۔ اگلی آیت میں انسان کی فطری خودغرضی کو بیان کیا کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل ہر حالت میں اللہ سے دعا کرتے ہیں، لیکن جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو رب کو فراموش کر دیتے ہیں۔

آیت نمبر 13 میں گذشتہ امتوں کے رسولوں پر ایمان نہ لانے اور ظلم کرنے کے سبب ہلاکت کا بیان فرمایا اور یہ کہ اب ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں ان کا جانشین بنایا تاکہ ہم ظاہر کریں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

آیت نمبر: 15 سے بتایا کہ منکرینِ آخرت کے سامنے جب آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں آپ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آئیں یا اس کو تبدیل کر دیں، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اے رسول!) آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھے اپنی جانب سے اس میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں ہے، میں تو صرف وحیِ ربانی کی پیروی کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے درمیان اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ گزارا ہے، تو کیا تم سمجھتے نہیں، یعنی اس چالیس سالہ زندگی میں تم نے میرے قول و قرار میں، کردار میں کوئی

جھول یا نقص دیکھا ہے؟۔

آیت نمبر:18 میں فرمایا کہ مشرک اللہ کو چھوڑ کر ایسے باطل معبودوں کو پوجتے ہیں جو انہیں نفع ونقصان پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں۔ یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ مشرکوں کے بت اور تمام معبودانِ باطل ''مِنْ دُوْنِ اللہ'' ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ، انبیائے کرام علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس کی بارگاہ میں شفاعت کریں گے۔

آیت نمبر:22 سے اللہ تعالیٰ نے اپنی مختلف نعمتوں کا ذکر فرمایا جس میں دریاؤں میں بادبانی کشتیوں کا چلنا اور بارش سے انسانوں اور جانوروں کی خوراک کے لئے پودوں اور سبزوں کا اُگنا شامل ہے۔ لیکن انسان کی فطرت یہ ہے کہ طوفان کے گرداب میں پھنس جائے، تو آخری سہارے کے طور پر اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے اور جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی شروع کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی تیار فصل اچانک کسی آفت کے نتیجے میں تباہ وبرباد ہو جاتی ہے، حالانکہ انسان سمجھتا ہے کہ اب یہ میرے قبضہ وقدرت میں ہے، لیکن حکم صرف اللہ کا چلتا ہے۔ آیت نمبر:26 میں بتایا کہ قیامت کے روز نیک اعمال کرنے والوں کو بہترین جزا ملے گی اور برائی کا ارتکاب کرنے والوں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ آیت نمبر 28 میں قیامت کے دن مشرکین اور ان کے معبودوں کے درمیان پھوٹ پڑنے اور معبودوں کی ان کی عبادت سے بے خبری کا ذکر فرمایا ہے۔

آیت نمبر:31 سے بتایا کہ اگر ان مشرکوں سے پوچھا جائے کہ زمین وآسمان سے روزی کون عطا کرتا ہے، حیات وموت کس کے قبضہ وقدرت میں ہے اور نظامِ کائنات کو کون چلاتا ہے، تو وہ کہیں گے کہ اللہ، لیکن پھر راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ پہلی بار اسی نے پیدا کیا اور دوبارہ بھی وہی پیدا کرے گا، تو تم حق کو چھوڑ کر فاسد خیالات کی پیروی کیوں کرتے ہو۔ قرآن کی حقانیت کے حوالے سے بھی ایک بار پھر منکرین کو چیلنج کیا کہ اگر تمہارے نزدیک یہ اللہ کا کلام نہیں ہے، تو اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ۔ ان آیات میں

بار بار اللہ کی قدرت اور آخرت کے بارے میں متنبہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تم لوگ جو مطالبہ عذاب کرتے ہو تو اللہ تمہاری جلد بازی کی وجہ سے اپنے فیصلے نہیں بدلتا، میں اپنی ذات کے لئے نفع اور نقصان کا (ذاتی) اختیار نہیں رکھتا، مگر اسی کا جو اللہ چاہے۔ ہر امت کے لئے ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ وقتِ مقرر آ جائے، تو ایک گھڑی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی اور فرمایا کہ کیا تم لوگ ایمان لانے کیلئے عذاب الٰہی کا انتظار کر رہے ہو اس وقت پھر تمہارا ایمان لانا مقبول نہیں ہوگا اور عذاب الٰہی کوئی دھمکی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اور آخرت کی مشکل گھڑی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے اوپر اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ظلم کر رکھا ہے تو قیامت کے دن اگر ساری دولت اس کے قبضے میں آ جائے تو اس کو اپنے گناہوں کے فدیے کے طور پر دینے کے لئے تیار ہوگا، لیکن وہاں یہ دنیاوی مال و دولت اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔

آیت نمبر 41 تا 44 میں فرمایا کہ ان میں سے بعض لوگ آپ کو سنتے ہیں اور بعض دیکھتے ہیں لیکن دل کے کانوں سے سنتے ہیں نہ دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ان کا دیکھنا سننا بے فائدہ ہے۔ آیت نمبر 45 میں فرمایا کہ قیامت کے دن کفار یہ گمان کریں گے کہ وہ دنیا میں صرف دن کی ایک گھڑی بھر رہے ہیں۔

آیت نمبر: 57 میں قرآن مجید کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک عظیم نصیحت آئی ہے، جو دلوں کی بیماریوں کے لئے شفاء ہے اور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

آیت نمبر 58 میں فرمایا کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر خوشی منانا چاہیئے۔ بعض اہل علم نے سرکار دو عالم ﷺ کی پیدائش پر خوشی منانے کا اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ آیت نمبر 59 میں کفار کے حلال و حرام کے خود ساختہ فیصلوں کو اللہ کی طرف منسوب کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے علم کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا لوگوں کی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا کوئی عمل اور زمین و آسمان میں کوئی ذرہ یا اس سے چھوٹی یا

بڑی چیز اللہ کے علم سے باہر یا پوشیدہ نہیں ہے۔

آیت نمبر:63 سے اولیاء اللہ کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں نہ کسی آنے والی بات کا خوف ہوگا اور نہ ہی کسی گزری ہوئی بات کا رنج وملال، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ہمیشہ تقوے پر کاربند رہے، ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بشارت ہے اور آخرت میں بھی، اللہ کے کلمات میں تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

آیت نمبر 65 میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اے حبیب آپ رنجیدہ خاطر نہ ہو، میں جو سب سرفرازیوں کا واحد مالک ہوں تیرا مددگار ہوں اور مشرکین صرف وہم وگمان اور اٹکل پچو کی پیروی کرتے ہیں۔

آیت نمبر:68 میں فرمایا کہ ان منکروں نے کہا کہ اللہ نے بیٹا بنالیا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اس سے بے نیاز ہے، تو کیا اس باطل دعوے کی ان کے پاس کوئی دلیل ہے؟۔

آیت نمبر:71 سے نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا جارہا ہے کہ میرا تمہارے درمیان رہنا اور تمہیں اللہ کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کرنا کیوں ناگوار ہے جب کہ میں نے تو اللہ پر توکل کیا ہے اور تم سے دعوتِ حق کے صلے میں کسی اجر کا طلب گار بھی نہیں ہوں۔انہوں نے نوح علیہ السلام کو جھٹلایا، ہم نے نوح اور ان کے پیروکاروں کو نجات دے دی اور آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے والوں کو طوفان میں غرق کردیا۔اس کے بعد ہم نے موسیٰ وہارون علیہما السلام کو فرعون اور اس کی قوم کے لئے بھیجا، انہوں نے قبولِ حق سے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ ہیں۔قومِ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جادو قرار دیا اور کہا کہ آپ ہمیں آباء واجداد کے دین سے پھیرنا چاہتے ہیں اور زمین پر اپنی سرداری چاہتے ہیں، اس کے بعد جادوگروں سے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کا ذکر ہے، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرعونیوں کے ڈر سے قومِ موسیٰ کے تھوڑے سے لوگ ایمان لائے اور فرعون زمین میں متکبر بن بیٹھا۔موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم اللہ پر ایمان لاچکے ہو تو اسی پر توکل کرو اور پھر انہوں نے دعا کی کہ

ہم نے اللہ پر بھروسا کیا اور التجا کی اے پروردگار! تو ہمیں ظالموں کی قوم کے ذریعے آزمائش سے محفوظ فرما اور اپنی رحمت سے قومِ کفار سے نجات عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم دیا کہ مصر میں اپنی قوم کے لئے گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو عبادت گاہ بناؤ اور نماز قائم کرو، یہ حکم اس لئے ہوا کہ بنی اسرائیل کے لئے فرعونیوں کے جبر کی وجہ سے کھلے عام عبادت کرنا مشکل تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ فرعون اور درباریوں کو چونکہ مال و دولت اور دنیا کی زینت میسر ہے اور اس کے ذریعے وہ لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، تو اے اللہ! تو ان کے مالوں کو تباہ کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے تاکہ وہ دردناک عذاب سے دوچار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں نے تمہاری دعا قبول کر لی ہے، آپ دونوں ثابت قدم رہیں اور جاہلوں کی پیروی نہ کریں۔

آیت نمبر:90 سے بیان کیا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سلامتی کے ساتھ سمندر پار کرا دیا اور فرعون اور اس کا لشکر عداوت اور سرکشی میں ان کے تعاقب میں آئے، یہاں تک کہ جب سمندر میں غرق ہونے لگے تو فرعون نے کہا: میں اُس ہستی پر ایمان لایا، جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور جس کے سوا کوئی بھی مستحق عبادت نہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ سکراتِ موت، موت اور غرغرہ کی کیفیت طاری ہونے سے پہلے تک اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے، لیکن اس مرحلے پر توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو فرمایا کہ آج ہم تیرے (بے جان) جسم کو بچالیں گے، تاکہ تم بعد میں آنے والوں کے لئے نشانِ عبرت بنے رہو۔ قرآن کا یہ معجزہ آج بھی سچا ہے کہ مصر کے فرعون کی حنوط شدہ لاش آج بھی موجود ہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی آزادی ان کے رزق میں فراخی اور ان کے آپس کے اختلاف کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:96 سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن پر اللہ کے عذاب کا فیصلہ صادر ہو چکا ہو، وہ ایمان سے محروم رہتے ہیں، خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں، سورۂ یونس کی آخری آیات میں بیان ہوا کہ سرکش قوموں میں سے صرف قومِ یونس ہی ایسی تھی کہ جو

عذابِ الٰہی آنے سے پہلے ایمان لے آئے، انہوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں رسوا کن عذاب سے نجات دے دی۔ اس کی تفصیل کتبِ احادیث اور تفاسیر میں موجود ہے۔ اس کے بعد کی آیات میں فرمایا کہ شرف ایمان سے فقط وہی مشرف ہوتے ہیں جن کی یاوری توفیق الٰہی کرے اور بلا وجہ لوگوں کو توفیق ایمان سے محروم نہیں کر دیا جاتا۔

آیت نمبر: 104 سے اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے فرمایا کہ آپ کفارِ مکہ سے کہہ دیں کہ اگر تمہیں میرے دین میں کوئی شک ہے، تو میں کسی بھی صورتِ حال میں تمہارے باطل معبودوں کی عبادت نہیں کروں گا، بلکہ میں اس اللہ کی عبادت کروں گا، جو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے، یعنی جس کے قبضہ وقدرت میں تمہاری جان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی ایسے باطل معبود کی عبادت نہ کرو جو تمہارے نفع ونقصان پر قادر نہ ہو، اگر (بالفرض) آپ نے ایسا کیا تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

آیت نمبر: 107 سے فرمایا کہ ہر چیز اللہ کی قدرت واختیار میں ہے، اگر وہ کسی کو تکلیف پہنچانا چاہے تو کوئی بچانے والا نہیں اور اگر وہ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے، تو کوئی اس کے فضل کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔ اے رسول! کہہ دو کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق آچکا، سو جس نے ہدایت کو اختیار کیا تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جس نے گمراہی کو اختیار کیا اس کا وبال اسی پر آئے گا اور میں تم پر جبر کرنے والا نہیں ہوں۔ آخری آیت میں اتباع وحی کرنے اور ایذاء کفار پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

سورۃ ہود

سورۃ ہود مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے گیارہویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 52ویں سورت ہے اس سورت میں حضرت ہود علیہ السلام اور آپ کی قوم کا ذکر ہے اس لئے اس سورت کا نام ہود رکھا گیا۔ اس سورت میں توحید، رسالت، بعث بعد الموت، جزا وسزا کے متعلق اسلام کے اصول اور عقائد کا بیان ہے۔

سورۃ ہود کی پہلی آیت میں قرآن کی حقانیت، اس کے مدعا کے واضح ہونے اور صورۃ و معنیً درجہ کمال پر فائز ہونے کا بیان ہے۔ دوسری آیت میں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بشیر و نذیر ہونے کا ذکر ہے بعد والی آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانے اور اللہ تعالیٰ کے ظاہر و مستور ہر چیز اور ہر عمل کے بارے میں جاننے کا ذکر ہے۔

خلاصۂ تفسیر
پارہ: ۱۲

بارہویں پارے کے مضامین

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمۂ کرم پر ہے، وہ اُس کے قیام کی جگہ (اِس سے مراد باپ کی پُشت یا ماں کا رَحم یا زمین پر جائے سکونت ہے) اور سپردگی کی جگہ (اِس سے مراد مکان یا قبر ہے) جانتا ہے، اور یہ سب کچھ روشن کتاب میں مذکور ہے۔ مزید فرمایا: تخلیقِ کائنات کا مقصد انسان کے خیر وشر کی آزمائش ہے، اس کے بعد کافروں کے حیات بعد الموت کو سحر قرار دینے اور ان کی سرکشی کا بیان ہے کہ عذاب میں تاخیر کو احسان شمار کرنے کی بجائے مسلمانوں کو طعنے دیتے ہیں کہ عذاب کو کس چیز نے روک لیا؟۔ آگے چل کر انسان کی خودغرضی کو بیان فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کو کوئی نعمت عطا کرے، تو وہ اُس پر شکرگزار نہیں ہوتا، لیکن نعمت چھن جانے پر نا اُمید اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح اگر مصیبت کے بعد کوئی نعمت ملے، تو انسان اِتراتا ہے اور شیخی بگھارتا ہے، البتہ جو ہر حال میں صابر وشاکر رہیں اور عملِ صالح کریں تو اُن کے لئے بخشش اور بڑا اجر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی تسلی کے لئے فرمایا کہ کُفّار طرح طرح کی فرمائشیں کرتے ہیں کہ آپ پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل کیا گیا اور آپ کی تائید کے لئے فرشتہ کیوں نہ اُترا، آپ اِس پر تنگ دل نہ ہوں، آپ کا کام تو صرف لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرانا ہے۔ اِس سورت میں بھی قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا انکار کرنے والوں کو چیلنج دیا گیا کہ اپنے تمام حامیوں کو ملا کر اِس جیسی دس سورتیں بنا لاؤ۔

آیت نمبر: 15 میں فرمایا: دنیا اور اِس کی زینت کے طلبگاروں کو اُن کے اعمال کا اجر اسی دنیا میں مل جائے گا اور آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہے، اجرِ آخرت کے اعتبار سے اُن کے اعمال باطل ہیں آیت نمبر 17 میں قرآن کی حقانیت کا انکار کرنے والوں کیلئے نارِ جہنم کی وعید کا ذکر ہے اور قرآن کے اللہ کی جانب سے حق ہونے اور بغیر کسی شک کے اس

پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنے والوں اور اللہ کے راستے سے روکنے والوں کا ذکر ہے کہ قیامت کے دن ان پر گواہ پیش ہونگے کہ یہ اپنے رب پر جھوٹ باندھتے تھے اور ان پر اللہ کی لعنت ،ان کیلئے دہرے عذاب اور آخرت میں ان کی یقینی ناکامی کا ذکر ہے۔

آیت نمبر :23 میں بتایا کہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے اور اپنے رب کے حضور عاجزی کی ،تو یہ لوگ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔مزید فرمایا: مومن اور کافر کی مثال ایسی ہے، جیسے اندھا اور بینا اور بہرا اور سننے کی صلاحیت رکھنے والا۔

آیت نمبر :25 تا 32 سے پھر نوح علیہ السلام اور اُن کی قوم کے حالات بیان ہوئے کہ نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور انکار پر عذاب الٰہی سے ڈرایا تو قوم کے سرداروں نے اُن سے کہا: آپ ہم جیسے بشر ہیں اور آپ کے پیروکار پسماندہ اور کم عقل لوگ ہیں، ہماری رائے میں آپ کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے بلکہ ہمارے خیال میں آپ (معاذ اللہ) جھوٹے ہیں۔نوح علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں اپنے رب کی جانب سے واضح دلیل رکھتا ہوں اور اُس نے مجھے رحمت سے نوازا ہے لیکن تم میرے مقام کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ،میں تم سے دعوتِ حق کے صلہ میں کسی اجر کا طلب گار نہیں اور نہ ہی میں اہلِ ایمان کو اپنے پاس سے دھتکارنے والا ہوں ۔اور میں نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں ،نہ ہی میں (ازخود) غیب جانتا ہوں اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تم اپنی نظروں میں حقیر جانتے ہو، اللہ اُنہیں خیر سے نہیں نوازے گا۔

قومِ نوح نے کہا کہ آپ نے ہم سے بہت بحث کی ،پس جس عذاب سے آپ ہمیں ڈرارہے ہیں، وہ لے آئیے ،نوح علیہ السلام نے کہا کہ اللہ چاہے گا ،تو تم پر عذاب آجائے گا۔

آیت نمبر: 37 تا 47 سے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنایئے اور ظالموں کے بارے میں ہم سے کوئی

بات نہ کریں، وہ ضرور غرق ہو جائیں گے، پھر وہ کشتی بنانے لگے، جب اُن کی قوم کے سردار اُن کے پاس سے گزرتے تو اُن کا مذاق اُڑاتے۔ نوح علیہ السلام نے کہا کہ وہ وقت آنے والا ہے کہ تمہارا مذاق اُڑایا جائے گا اور تمہیں پتا چل جائے گا کہ رُسوا کن عذاب کس پر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب ہمارا حکمِ عذاب آپہنچا اور تندور ابلنے لگا، تو ہم نے نوح علیہ السلام سے کہا: آپ خود اپنے گھر والوں کے ساتھ اِس کشتی میں سوار ہو جائیں اور اہلِ ایمان کو بھی سوار کرلیں اور ہر چیز کے جوڑے (یعنی نَر و مادہ) کو سوار کرلیں اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والے بہت کم تھے۔ نوح علیہ السلام نے کہا کہ یہ دعا پڑھتے ہوئے سوار ہو جاؤ: بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَمُرۡسٰىهَا اِنَّ رَبِّىۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ، ترجمہ: اس کشتی کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے۔ بے شک میرا رب ضرور بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔ کشتی اُنہیں پہاڑ جیسی موجوں میں لئے جا رہی تھی کہ نوح علیہ السلام نے الگ کھڑے اپنے بیٹے سے کہا: اے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ رہو۔ اُس (پسرِ نوح کنعان) نے کہا: میں کسی پہاڑ کی پناہ میں آجاؤں گا، جو مجھے پانی سے بچالے گا، نوح علیہ السلام نے کہا: آج اللہ کے حکم کے سوا کوئی بچانے والا نہیں، سوائے اُس کے جس پر اللہ رحم فرمائے، پھر اُن دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ ڈوب گیا۔ اللہ کی طرف سے حکم ہوا: اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا اور پانی خشک ہو گیا، اللہ کا فیصلہ نافذ ہو گیا اور کشتی کوہِ جودی پر ٹھہر گئی۔ نوح علیہ السلام نے اللہ سے التجا کی: اے پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے کہ میرے اہل کو بچا لیا جائے گا۔ اللہ نے فرمایا: اے نوح! وہ آپ کے اہل میں سے نہیں ہے، اُس کے اَعمال ٹھیک نہیں اور جس بات کی حقیقت آپ کو معلوم نہ ہو، اُس کے بارے میں سوال نہ کریں۔ نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنی اجتہادی خطا پر مغفرت اور رحم کی دعا کی۔ پھر طوفانِ نوح تھم جانے کے بعد وہ سلامتی کے ساتھ اُتر گئے۔

آیت نمبر: 50 سے قومِ عاد کا ذکر ہے کہ اُن کی طرف دعوتِ توحید دینے کے لئے حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ ہود علیہ السلام نے قوم سے کہا: میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہیں ہوں

اور میرا اجر اللہ پر ہے۔ پس تم اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اُس کی بارگاہ میں توبہ کرو، اللہ تم پر موسلا دھار بارش بھیجے گا اور تمہاری قوت میں اضافہ فرمائے گا۔ قومِ عاد نے دعوتِ حق کو رَد کر دیا اور ایمان نہ لائے بلکہ ہود علیہ السلام پر طنز کیا کہ ہمارے بعض معبودوں نے تم کو مجنون بنا دیا ہے۔ ہود علیہ السلام نے کہا کہ میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا، میں تمہارے شرک سے بری ہوں اور میں اللہ پر توکل کرتا ہوں اور میں نے حق رسالت ادا کر دیا ہے۔ آیت نمبر:58 سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب ہمارے عذاب کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود اور اُن کے ساتھ مومنوں کو نجات عطا کی۔ قوم عاد نے اللہ کی نشانیوں اور رسولوں کو جھٹلایا اور دنیا و آخرت میں لعنت کے حقدار قرار پائے۔

آیت نمبر:61 سے حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کی قوم ثمود کے حالات کو بیان کیا گیا۔ حضرت صالح نے کہا: اے میری قوم! اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو، اُس سے بخشش طلب کرو اور اُس کی بارگاہ میں توبہ کرو، اُس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اِس پر آباد کیا۔ قومِ صالح نے جواب دیا: اے صالح! ہمارے آباء و اجداد کے معبودوں کی عبادت کو روکنے سے پہلے ہمیں آپ سے بڑی اُمیدیں تھیں، لیکن اب ہمیں آپ کی دعوت کے بارے میں شکوک ہیں۔ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے، اسے چرنے کے لئے آزاد چھوڑو، اِسے تکلیف نہ پہنچاؤ ورنہ تمہیں عذاب پہنچے گا، اُنہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، صالح علیہ السلام نے کہا: تم صرف تین دن اپنے گھروں میں مزے اُٹھاؤ، پھر اللہ کا یقینی عذاب آئے گا۔ پھر ایک چنگھاڑ نے اُن کو آ دبوچا اور وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل اوندھے پڑے رہ گئے، صرف صالح علیہ السلام اور اُن کے ساتھ اہل ایمان اس عذاب سے بچے رہے۔ آیت نمبر:69 سے اِس بات کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے بشری شکل میں آئے، اُنہوں نے اجنبی مہمانوں کے لئے بچھڑے کا بھنا گوشت تیار کیا۔ پھر جب اُنہوں نے دیکھا کہ مہمان کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے، تو اُن کو ڈر سا محسوس ہوا، فرشتوں نے کہا: ہمیں قومِ لوط کے عذاب کے

لئے بھیجا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کھڑی تھیں، اِس پر وہ مسکرائیں، تو فرشتوں نے اللہ کی طرف سے اُنہیں حضرت اسحاق اور اُن کے بعد حضرت یعقوب کی بشارت دی۔ اُنہوں نے حیرت سے کہا: ہم دونوں میاں بیوی بوڑھے ہیں، اِس عمر میں اولاد کیسے ہوگی؟، فرشتوں نے جواب دیا: اے اہلِ بیتِ ابراہیم! تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں، اللہ کی قدرت پر تمہیں کیوں تعجب ہے؟۔ اللہ فرماتا ہے کہ بیٹے کی بشارت سن کر ابراہیم علیہ السلام کا خوف دور ہوگیا اور وہ قومِ لوط کے بارے میں ہم سے بحث کرنے لگے، ابراہیم علیہ السلام بہت بُردبار، اللہ سے آہ وزاری کرنے والے اور اُس کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا کہ اے ابراہیم! اِس عرضداشت سے گریزاں رہیں کہ اِس کا یقینی فیصلہ ہو چکا ہے اور اِن پر نہ ٹلنے والا عذاب نازل ہوکر رہے گا۔

آیت نمبر: 77 سے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم (اہلِ سدوم) کی بداَعمالیوں اور حضرت لوط علیہ السلام کے اپنی قوم کی بداَعمالیوں کے باعث فرشتوں کی آمد، قوم کے بداعمال لوگوں کے دوڑ کر آنے حضرت لوط کے ان کو سمجھانے اور ان کے انکار پر مضطرب ہونے کا ذکر ہے۔ جس پر فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو تسلی دی کہ آپ فکر نہ کریں، ہم آپ کے رب کے فرشتے ہیں، یہ آپ اور ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے، آپ رات کے آخری حصے میں قوم کی طرف توجہ کئے بغیر ہجرت فرمالیں۔ اس لئے کہ صبح کے وقت ان پر عذاب آئے گا، جب اللہ کا عذاب آیا تو اُس نے بستی کے اوپر کے حصے کو نیچے کردیا اور قومِ لوط کے اوپر اللہ کی طرف سے لگاتار نشان زدہ پتھر برسائے گئے۔

آیت نمبر: 84 سے حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم اہلِ مدیَن اور اُن کے جرائم کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ ناپ تول میں کمی کرتے، دوسروں کو چیزیں کم تول کر دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے فرمایا کہ فساد فی الارض سے باز آجاؤ اور اپنے سے پہلی سرکش اُمتوں کا انجام دیکھ لو۔ لیکن جب اہلِ مدیَن پر حضرت شعیب علیہ السلام کی نصیحتوں کا اثر نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بھی عذاب سے ہلاک فرمادیا۔

آیت نمبر:94 میں فرمایا: جب ہمارا عذاب آیا تو ہم نے اپنی رحمت سے حضرت شعیب اور اُن پر ایمان لانے والوں کو بچالیا اور ظالموں کو ایک زبردست چنگھاڑ نے پکڑلیا، تو صبح کو وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے، گویا کہ وہ کبھی آباد ہی نہیں تھے۔

آیت نمبر:96 سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کئے جانے والے نو معجزات کا ذکر کیا۔ پھر فرعون اور اُس کے پیروکاروں کی باطل روِش کے باعث اُن کی ہلاکت کا ذکر فرمایا اور دُنیا وآخرت دونوں میں اُنہیں ملعون قرار دیا۔ جن بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کیا، اُن میں سے بعض کے آثار موجود ہیں اور بعض کے آثار تک معدوم ہو چکے ہیں، اُن میں سے ہر بستی والے اپنے ظلم کے باعث ہی ہلاک ہوئے، اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں فرماتا۔ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ جو شخص عذابِ آخرت سے ڈرتا ہو، اُس کے لئے اس میں نشانی (عبرت) ہے۔

آیت نمبر:106 سے اللہ تعالیٰ نے انجام کے اعتبار سے لوگوں کی دو قسمیں بیان کی ہیں: (۱) سعادت مند (۲) بدبخت۔ بدبختوں کا ٹھکانہ جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور نیک بختوں کا ٹھکانہ جنت ہے، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور اُن کے لئے اللہ کی طرف سے نہ ختم ہونے والی عطائیں ہیں۔ آیت نمبر 110 میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح یہ لوگ قرآن کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں اسی طرح قوم موسیٰ نے تورات کے بارے میں بھی اختلاف کیا تھا۔ اور اللہ ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

آیت نمبر:112 سے سرکشی کو چھوڑ کر اَحکامات دِین پر اِستقامت اختیار کرنے اور ظالموں کے ساتھ میل جول رکھنے سے بچنے کا حکم دیا گیا اور فرمایا کہ ظالموں سے میل جول کا انجام دوزخ کی آگ ہے۔ آیت:114 میں دن کے دونوں طرفوں میں اور (ابتدائی) رات کے کچھ حصے میں نماز قائم کرنے کا حکم دیا اور یہ بتایا کہ بیشک نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں اور یہ نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے نصیحت ہے۔

آیت نمبر:120 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسولوں کی تمام خبریں، آپ

کے دل کی تسکین اور تقویت کے لئے بیان کرتے ہیں اور اِن میں مومنوں کے لئے نصیحت وعبرت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید ورسالت اور وقوعِ قیامت کے دلائل بھی ہیں۔ آیت نمبر:123 میں فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں کے سب غیب اللہ ہی کے ساتھ مختص ہیں، ہر کام اُسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے، آپ اُسی کی عبادت کیجئے، اُسی پر توکل کیجئے اور آپ کا رب لوگوں کے اَعمال سے غافل نہیں ہے۔

سورۂ یوسف

سورۃ یوسف مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے بارہویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 53ویں سورت ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اِس سورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر ہے اور قدرِ تفصیل کے ساتھ ہے یہی اس سورت کی وجہ تسمیہ ہے اس سورت میں یوسف علیہ السلام کے مشکلات کے بعد کامیابی کا ذکر فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اس میں علم تعبیر الرءیا کا ذکر ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ وفا، امانت، عفت، صدق، صبر اور توبہ سے بندہ اللہ کی بارگاہ میں قرب اور مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ اور یہ کہ قید ہو یا آزادی توحید اور اللہ کے دین کی دعوت کا عمل جاری رہنا چاہئے اس سورت میں گذشتہ امتوں کی تاریخ، قوانین، نظام حکومت، تجارت اور سزا کے طریقوں کا ذکر ہے۔ قرآن نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کو ''حسین ترین قصہ'' قرار دیا ہے۔ سب سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کا ذکر ہے، اُنہوں نے دیکھا: ''سورج، چاند اور گیارہ ستارے اُن کو سجدہ کر رہے ہیں''۔ اُنہوں نے اپنا یہ خواب اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو بیان کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُنہیں فرمایا کہ یہ خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کریں، ورنہ وہ تمہارے خلاف سازش کریں گے۔

قرآن نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کے قصے میں پوچھنے والوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے مشورہ کیا کہ یوسف اور اُن کے حقیقی بھائی بنیامین ہمارے والد کو زیادہ محبوب ہیں، حالانکہ ہم ایک جماعت ہیں۔ پھر

اُنہوں نے مشورہ کیا کہ یوسف کو قتل کردو یا دور کسی ملک میں چھوڑ آؤ، آخر کار والد کا رُجحان ہماری طرف ہو جائے گا۔ اُن میں سے ایک قدرے اعتدال پسند بھائی نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو، اسے کسی گہرے کنویں میں ڈال دو، کوئی قافلے والا اسے اٹھا لے جائے گا۔ پھر اپنی تدبیر پر عمل کرنے کے لئے اُنہوں نے اپنے والد سے کہا کہ یوسف کے معاملے میں آپ ہم پر بھروسہ کریں ہم اس کے خیر خواہ ہیں، اِسے کل ہمارے ساتھ بھیج دیں تا کہ وہ پھل کھائے، کھیلے کودے، ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے تردد کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت میں اِسے بھیڑیا چیر پھاڑ ڈالے۔ الغرض وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے گئے اور پھر ایک گہرے کنویں میں ڈال دیا۔ اللہ کی قدرت سے ایک قافلے والے آئے، اُنہوں نے پانی نکالنے کے لئے ڈول ڈالا اور یوسف علیہ السلام جیسا حسین لڑکا ڈول میں بیٹھ کر سلامتی کے ساتھ باہر نکل آیا، اُنہوں نے اُسے مالِ تجارت بنا لیا۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف کو چند درہموں کے عوض اُنہی کے ہاتھ بیچ دیا۔ دوسری جانب یوسف علیہ السلام کے بھائی اُن کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر روتے ہوئے باپ کے پاس آئے کہ اُنہیں بھیڑیا کھا گیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ یہ تمہاری من گھڑت بات ہے، لیکن اب میرے لئے صبرِ جمیل ہی بہتر ہے۔ قافلے والوں نے یوسف علیہ السلام کو مصر میں لے جا کر عزیزِ مصر کے ہاں بیچ دیا اور اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اِس کو عزت سے رکھو، اِسے ہم اپنا بیٹا بنا لیتے ہیں۔ جب یوسف علیہ السلام پُختہ عمر کو پہنچے تو عزیزِ مصر کی بیوی نے (جس کا نام زلیخا بتایا گیا ہے) اپنے گھر میں دروازے بند کر کے اُنہیں دعوتِ گناہ دی۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میں اپنے مُربّی کی احسان کُشی نہیں کر سکتا۔ یوسف علیہ السلام دروازے کی طرف دوڑے اور پیچھے سے عزیزِ مصر کی بیوی نے اُن کی قمیص پکڑی جو پھٹ گئی۔ اِسی اثنا میں اُس کا شوہر سامنے آیا اور عزیزِ مصر کی بیوی نے سارا الزام یوسف علیہ السلام پر لگا دیا چنانچہ خود عزیزِ مصر کی بیوی کے خاندان سے ایک فرد نے گواہی دی کہ اگر یوسف کی قمیص سینے کی جانب سے پھٹی ہے تو یہ قصور وار ہیں اور اگر پُشت کی جانب سے پھٹی ہے، تو عورت قصور وار

ہے، اور آپ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی تو عزیز مصر نے کہا: یہ تم عورتوں کی سازش ہے بے شک تمہاری سازش بہت سنگین ہے۔، اور وہ قید کر دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُس عورت نے اُن سے (گناہ کا) قصد کیا اور اُنہوں نے اُس سے بچنے کا قصد کیا، اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے (تو معاذ اللہ) گناہ میں مبتلا ہو جاتے۔ جب یہ چرچا ہوا کہ عزیزِ مصر کی بیوی ایک نوجوان غلام پر فریفتہ ہوگئی ہے، تو عورتوں نے اُس پر طعن کیا اور کہا: کہاں تیرا مَنصب اور کہاں ایک زَرخرید غلام؟۔ چنانچہ عزیزِ مصر کی بیوی نے ایک دعوت کا اہتمام کیا اور اُن عورتوں کو بلا کر اُن کے ہاتھوں میں پھل کاٹنے کے لئے چھریاں پکڑا دیں اور اچانک اُن کے سامنے یوسف علیہ السلام کو پردے سے باہر لے آئی، جب اُن عورتوں کی نظر حضرت یوسف علیہ السلام پر پڑی، تو حسنِ یوسف نے اُن کے ہوش اُڑا دیئے، اُنہوں نے پھلوں کے بجائے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور کہا: حاشاللہ یہ بشر نہیں، یہ تو کوئی مُعزز فرشتہ ہے۔ پھر عزیزِ مصر کی بیوی نے کہا کہ یہی تو وہ پیکرِ جمال ہے، جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اے پروردگار! گناہ میں مبتلا ہونے سے قید کی مُشقت میرے لئے بہتر ہے اور تیرے ہی کرم سے مجھے اِن عورتوں کی سازش سے نجات ملی۔ پھر جب حضرت یوسف علیہ السلام کو قید میں ڈال دیا گیا تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اُن کے دو قیدی ساتھیوں نے اُن کے سامنے اپنا اپنا خواب بیان کیا۔ ایک نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں انگور سے شراب کشید کر رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹی ہے اور پرندے اُسے کھا رہے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمایا تھا اُنہوں نے بالترتیب دونوں کے خوابوں کی تعبیر بتا دی، ایک سے کہا کہ تم دربار میں پہنچو گے اور اپنے آقا کو شراب پلاؤ گے اور دوسرے کو بتایا کہ تمہیں سولی دی جائے گی اور پرندے تمہارا گوشت نوچ کر کھائیں گے اور بالآخر ایسا ہی ہوا۔ آپ نے دونوں کو دعوتِ توحید دی۔ پھر بادشاہ نے ایک خواب دیکھا کہ سات تندرست گائیں، سات دُبلی گائیوں کو کھا رہی ہیں اور فصل کے سات خوشے سرسبز ہیں اور سات خشک۔ بادشاہ نے

اپنے درباریوں سے خواب کی تعبیر پوچھی لیکن وہ نہ بتا سکے۔ پھر یوسف علیہ السلام کے قیدی ساتھی کے ذریعے جواب بادشاہ کا ساتھی بن چکا تھا، یوسف علیہ السلام کے خوابوں کی تعبیر میں مہارت کا علم ہوا، چنانچہ آپ سے رجوع کیا گیا۔ آپ نے تعبیر یہ بتائی کہ سات سال تم پر سرسبزی اور شادابی کے آئیں گے اور پھر سات سال قحط سالی کے آئیں گے۔ تمہیں چاہئے کہ آبادی کے سات سالوں میں فاضل پیداوار کو خوشوں میں ہی محفوظ رکھنا تاکہ خشک سالی میں تمہارے کام آئے۔ پھر بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو دربار میں طلب کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک مجھ پر لگنے والے الزام کی صفائی نہ ہو جائے، میں جیل سے باہر نہیں آؤں گا۔ چنانچہ عزیز مصر نے ان خواتین کو بلایا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے اور ان سے حقیقت حال دریافت کی، سب نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کا اعتراف کیا، اس طرح سے آپ کی براءت ثابت ہوئی اور خود عزیزِ مصر کی بیوی نے بھی اعتراف کرلیا کہ یوسف علیہ السلام پاک دامن ہیں اور میں نے ہی اُنہیں دعوتِ گناہ دی تھی۔

خلاصہ تفسیر

پارہ: ۱۳

تیرہویں پارے کے مضامین

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پاکدامنی ثابت ہونے پر تفاخر کا اظہار کرنے کے بجائے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں اپنے نفس کی براءت کا دعویٰ نہیں کرتا، نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے، مگر جس پر میرا رب رحم فرمائے (اُسے اُس کے نفس کی برائی سے محفوظ فرماتا ہے) بے شک میرا پروردگار بہت بخشنے والا بہت مہربان ہے۔ پھر بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے کہا کہ آج کے بعد آپ ہمارے نزدیک مُقتدر اور امانت دار ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: مجھے اِس ملک کے خزانوں کا انچارج مقرر کردیں، بے شک میں حفاظت کرنے والا، علم والا ہوں یعنی اللہ نے مجھے یہ علم عطا کیا ہے کہ مال کس سے لیا جائے اور کس کو دیا جائے اور قومی خزانوں کی حفاظت کس طرح کی جائے؟۔ اِسی سے علماء نے یہ اُصول وضع کیا ہے کہ عہدے کی تمنا اگرچہ پسندیدہ بات نہیں ہے، لیکن اگر کسی شخص کے سوا کوئی اور عہدے کا اہل نہ ہو تو اہل شخص اپنی خدمات پیش کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ابتلا کے دور سے گزار کر اقتدار عطا کیا۔ پھر جب سارے ملک میں قحط پڑا، تو کنعان سے یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی غلّہ لینے کے لئے آئے۔ یوسف علیہ السلام نے اُن کو غلّہ عطا کیا اور کہا کہ آئندہ اپنے دوسرے بھائی کو بھی لے کر آنا ورنہ تمہیں غلہ نہیں ملے گا۔ اور اُنہوں نے بھائیوں کے پیسوں کی تھیلی بھی اُن کے سامان میں رکھوادی۔ پھر برادرانِ یوسف بنیامین کو بھی باپ کی اجازت سے لے کر آئے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُنہیں ہدایت کی کہ تم سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا تاکہ تم نظرِ بد سے محفوظ رہو۔

جب برادرانِ یوسف اُن کے پاس پہنچے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو روکنے کی ایک خفیہ تدبیر کی کہ بھائی کے سامان میں شاہی پیالہ رکھ دیا اور پھر منادی نے

اعلان کیا کہ قافلے والوں میں سے کسی نے چوری کرلی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا کہ واللہ ہم فساد اور چوری کے لئے نہیں آئے۔ درباریوں نے کہا کہ اگر کسی کے سامان میں پیالہ مل جائے تو اُس کی سزا کیا ہوگی؟ اُنہوں نے کہا کہ اُسے روک لیا جائے۔ بالآخر وہ پیالہ یوسف علیہ السلام کے بھائی کے سامان میں مل گیا اور اس تدبیر سے اُن کو روک لیا گیا اور اُن کو روکنے کی یہی صورت تھی۔ برادرانِ یوسف نے کہا: اس سے پہلے اس کے بھائی بھی چوری کر چکے ہیں، لیکن یوسف علیہ السلام نے حقیقتِ حال کو ظاہر نہیں کیا۔ برادرانِ یوسف نے پیشکش کی کہ بنیامین کے بجائے ہم میں سے کسی کو روک لیا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ کسی اور کو روکنا مقصود ہی نہیں تھا۔ برادرانِ یوسف نے واپسی پر یہ واقعہ والد کے سامنے بیان کیا تو اُنہیں ایک بار پھر شدید دکھ ہوا مگر پھر صبرِ جمیل کو اختیار کیا۔ شدّتِ غم سے روتے روتے یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں کی بینائی بھی چلی گئی اور اُنہوں نے کہا: میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں۔ پھر یعقوب علیہ السلام نے برادرانِ یوسف کو یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی تلاش میں بھیجا اور کہا کہ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور ان کی تلاش میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ کی رحمت سے صرف کافر ہی مایوس ہوتے ہیں۔ ان کے مصر پہنچنے پر بالآخر یوسف علیہ السلام نے حقیقتِ حال بھائیوں پر ظاہر کردی، وہ شرمسار ہوئے، اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور کہا کہ اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت دی ہے۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: اللہ نے ہم پر احسان کیا ہے اور جو تقوے پر کاربند ہو اور صبر کرے، تو اللہ نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا۔ اس موقع پر یوسف علیہ السلام نے انتہائی اَخلاقی عظمت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے بھائیوں کو معاف کردیا۔ اپنی قمیص اُنہیں عطا کی کہ اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈالو (ان شاء اللہ) اُن کی بینائی لوٹ آئے گی اور اپنے سب گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ۔ جونہی برادرانِ یوسف مصر سے چلے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: مجھے یوسف کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے اس پر موجود بیٹے کہنے لگے یہ بھی آپ پر یوسف کی پرانی محبت کا اثر ہے۔ الغرض پھر قمیصِ یوسف، حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈالتے ہی

اُن کی بینائی لوٹ آئی اور اُنہوں نے برادرانِ یوسف کے لئے اللہ کی بارگاہ میں استغفار کی۔ پھر جب یہ قافلہ مصر میں داخل ہوا، تو یوسف علیہ السلام نے نہایت اعزاز کے ساتھ اُن کا استقبال کیا۔ اور جب یہ قافلہ شاہی دربار میں پہنچا تو خاندانِ یعقوبی کے تمام لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کی تعظیم کے لئے سجدے میں گر گئے۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: اے میرے باپ! یہ میرے اُس پہلے خواب کی تعبیر ہے، بے شک میرے رب نے اُس کو سچ کر دکھایا اور اُس نے مجھ پر احسان فرمایا۔ یوسف علیہ السلام نے ربِّ ذوالجلال کا اِن کلمات میں شکر ادا کیا: ''اے میرے رب! تو نے مجھے (مصر کی) حکومت عطا کی اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمایا، اے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے، مجھے (دنیا سے) مسلمان اُٹھانا اور مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دینا''۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا: یہ غیب کی خبریں ہیں، جس غیب کی ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں۔ قَصَصِ انبیاء میں یوسف علیہ السلام کا قصہ اِس لحاظ سے منفرد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سورت میں اِسے نہایت تفصیل کے ساتھ اور مربوط کر کے بیان فرمایا لیکن اس تفصیلی اور فرمائشی بیان کے باوجود وہ لوگ ایمان نہیں لائے اور کفر پر ڈٹے رہے۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی ایسی نشانیاں ہیں، جن سے لوگ رُوگردانی کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور اکثر لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ شرک کرنیوالے ہوتے ہیں۔' اور سورت کے آخر میں فرمایا: ''بے شک اِن قصوں میں عقل والوں کے لئے نصیحت ہے''۔

سورۃ الرعد

سورۃ الرعد مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے تیرہویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 96 ویں سورت ہے۔ اس کی ایک آیت میں الرعد کا ذکر ہونے کی وجہ سے اس کا نام الرعد رکھا گیا ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل اور اللہ تعالیٰ کے مختلف صفات کا ذکر ہے۔ حیات بعد الموت کا بیان ہے۔

اِس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وجلالت کو بیان کیا گیا ہے، اُس کا بغیر ستونوں کے آسمانوں کو بلندی پر قائم رکھنا، سورج اور چاند کو ایک نظم کے تابع کر کے چلانا، زمین کا پھیلاؤ اور اُس میں پہاڑوں کو لنگر کی طرح قائم رکھنا، دریاؤں کی رَوانی، نظامِ لیل و نہار، طرح طرح کے پھل، انگوروں اور کھجوروں کے باغات اور اُمورِ کائنات کی تدبیر وغیرہ۔ پھر فرمایا: اہلِ عقل کے لئے اِس میں نشانیاں ہیں۔

آیت نمبر: 8 میں فرمایا کہ اللہ ہر مادہ کے حمل اور رحم کے حالات کو جانتا ہے اور اُس کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ ہے۔ آیت نمبر 9، 10 میں فرمایا کہ اللہ ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کو اور آہستہ سرگوشیوں اور بلند آواز کو جانتا ہے۔

آیت 11 میں قوموں کی سربلندی کا راز بتایا کہ حالات تب بدلتے ہیں جب کوئی خود کو بدلتا ہے۔ آگے چل کر فرمایا کہ اللہ تمہیں کبھی ڈرانے کے لئے اور کبھی اُمید دلانے کے لئے بجلی کی چمک دکھاتا ہے اور بھاری بادل پیدا کرتا ہے۔

آیت نمبر: 13 میں رعد کا ذکر ہے، اجسامِ فلکی یا بادلوں کی رگڑ سے جو آواز پیدا ہوتی ہے، اُس کو ''رعد'' کہتے ہیں اور ایک حدیث کی رُو سے رعد اُس فرشتے کا نام ہے، جو بادلوں کو چلانے پر مامور ہے، چنانچہ فرمایا کہ یہ مُعین فرشتہ اُس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتا ہے اور باقی فرشتے (بھی) اُس کے خوف سے (حمد و تسبیح) کرتے ہیں۔ آیت نمبر 14 میں فرمایا کہ پکارنے کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے جو پکار کا جواب سن کر دیتا ہے جبکہ معبودانِ باطل پکار کے جواب دینے سے عاجز ہیں اور کافروں کی پکار رائیگاں ہے۔ آیت نمبر: 15 میں فرمایا: آسمانوں اور زمین میں جو بھی چیز ہے، وہ سب خوشی اور ناخوشی سے اللہ ہی کے لئے سجدہ کر رہی ہے، یعنی مظاہرِ کائنات میں سے ہر چیز کا قادرِ مُطلق کی جانب سے تفویض کی ہوئی اپنی ڈیوٹی کو انجام دینا، یہ اُس کی عبادت ہے۔ آیت نمبر: 16 میں فرمایا کہ اللہ کو چھوڑ کر تم کیونکر ایسے باطل معبودوں کی پرستش کرتے ہو، جو (دوسروں کو تو چھوڑیئے) خود اپنے نفع وضرر کے بھی مالک نہیں، کیا بینا اور نابینا، ظلمت اور نور برابر ہو سکتے ہیں؟، کیا مشرکوں کے معبودوں نے

بھی اللہ کی طرح کوئی مخلوق پیدا کی ہے؟ (نہیں بلکہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے)۔

آیت نمبر: 17 سے فرمایا کہ آسمان سے برسنے والی بارش کے نتیجے میں ندی، نالے جاری ہوتے ہیں، پھر سیلاب سے بلبلے والے جھاگ پیدا ہوتے ہیں۔ آگے چل کر زمین میں باقی رہنے کے اصول بیان کرتے ہوئے فرمایا: پس رہا جھاگ تو وہ تو (بے فائدہ ہونے کی وجہ سے) زائل ہو جاتا ہے، لیکن جو چیز لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے، وہ زمین میں باقی رہتی ہے۔ پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ حق اور باطل کے فرق کو واضح کرنے کے لئے اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے۔

آیت: 18 میں اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے والوں کے لئے بھلائی ہی بھلائی اور نافرمانوں سے کسی قسم کے فدیے کے قبول نہ کرنے کا بیان ہے۔ آیت نمبر 19 سے بیان فرمایا کہ وہ اہلِ عقل نصیحت حاصل کرتے ہیں جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور پکے عہد کو نہیں توڑتے اور قرابت کے جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُنہیں جوڑے رکھتے ہیں، اللہ کی رضا کی طلب میں صابر رہتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ظاہراً اور پوشیدہ طور پر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں، برائی کو بھلائی سے ٹالتے ہیں، اُن کے لئے آخرت کا گھر کتنا پیارا ہے، پھر منکرین کے لئے فرمایا کہ عہد شکنی کرتے ہیں، قطع رحمی کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، اِن پر لعنت ہے اور ان کا برا ٹھکانہ ہے آیت نمبر 26 میں فرمایا کہ کسی کے رزق میں کمی یا زیادتی کرنا صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ آیت نمبر: 28 میں فرمایا کہ سکونِ قلب کی دولت اللہ کے ذکر سے ہی ملتی ہے، مومن نیکوکاروں کے لئے خوشخبری ہے اور بہترین انجام۔

آیت: 31 سے مشرکینِ مکہ کے ناروا مطالبات کا ذکر ہوا، وہ کہتے ہیں کہ کوئی ایسا قرآن ہوتا کہ جس سے پہاڑ چل پڑتے، زمین پھٹ جاتی، مردے کلام کرنے لگتے، تو اللہ نے فرمایا: یہ سب چیزیں اللہ کے اختیار میں ہیں، مسلمان کافروں کی ان بیہودہ باتوں سے ناامید نہ ہوں، اگر اللہ کی مشیت اس میں ہوتی کہ سب اطاعت گزار ہو جائیں، تو وہ سب

لوگوں کو ہدایت دے دیتا، یعنی اُس کی حکمت اِسی میں ہے کہ اپنے اختیار سے نیکی کرنے والوں کو جزا ملے اور بدی کرنے والوں کو سزا ملے۔ آیت نمبر 38 میں فرمایا کہ ہم نے آپ سے پہلے رسول بھیجے تھے ان کی بیویاں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔ آگے چل کر یہ بھی بتایا کہ نبی محض کفار کی فرمائش پر نہیں بلکہ اللہ کے اِذن سے معجزات پیش کرتے ہیں۔

سورۂ ابراہیم

سورۃ ابراہیم مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار چودھویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 72 ویں سورت ہے۔ اس سورت کے چھٹے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے اس لئے اس کا نام ابراہیم رکھا گیا ہے۔

سورۂ ابراہیم کے شروع میں ایک بار پھر قرآن کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت واختیار کا ذکر ہوا، لیکن کفار آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہیں، حق کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور کجی کے طلب گار رہتے ہیں۔ آیت نمبر :4 میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے درمیان جو رسول بھیجا، وہ اُنہی کی زبان بولنے والا تھا تاکہ وہ وضاحت کے ساتھ اللہ کے اَحکام کو بیان کر سکے اور لوگوں پر اللہ کی حُجت قائم ہو جائے۔ آیت نمبر :6 سے ایک بار پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کا ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرنے اللہ کا شکر ادا کرنے اور ناشکری نہ کرنے کا کہا اور فرمایا کہ اگر تمام روئے زمین والے مل کر بھی کفر کو اختیار کریں، تو اللہ تعالیٰ کی قدرت وجلالت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، وہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ آیت نمبر :13 سے بتایا کہ ہر دور کے کافروں نے اپنے عہد کے رسولوں سے لایعنی اور جہالت پر مبنی بحثیں کیں اور اپنے آباواجداد کے دین پر ڈٹے رہے اور انبیاء سے معجزات کی فرمائشیں کرتے رہے اور جب لاجواب ہوتے تو انبیاء سے کہتے کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ ورنہ ہم تمہیں جلاوطن کر دیں گے اور انجامِ کار ہر جابر، سرکش ہلاک ہوا۔

آیت نمبر :18 میں بتایا کہ کافروں کے اعمال کی مثال اُس راکھ کی سی ہے کہ سخت

آندھی کے دن تیز ہوا کا جھونکا آئے اور سب اُڑا لے جائے۔

آیت نمبر:21 سے بتایا کہ سب کفار آخرت میں اللہ کی عدالت میں پیش ہوں گے، اُن کے کمزور، اپنے بڑوں سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم تمہاری پیروی کرتے تھے، کیا اب اللہ کے عذاب سے نجات کے لئے تم ہمارے کسی کام آؤ گے، وہ کہیں گے کہ ہمیں خود کوئی چھڑانے والا نہیں اِسی طرح شیطان بھی اپنے پیروکاروں سے اپنا دامن جھاڑ لے گا اور کہے گا کہ تم نے اللہ کے سچے وعدے کو رَد کیا اور میرے جھوٹے وعدے کو مانا، سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرو، اب ہم ایک دوسرے کے کام آنے والے نہیں۔

آیت نمبر:24 تا 26 میں اللہ تعالیٰ پاکیزہ کلمے کی برکات اور خبیث کلمے کی نحوست کو مثال کے ذریعے بیان فرماتا ہے۔ آیت نمبر 28 اور اس کے بعد میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ناشکری سے بدلنے والوں اور اللہ کے ساتھ شریک بنانے والوں کیلئے جہنم کی وعید ہے۔ آیت نمبر 31 میں فرمایا کہ میرے مومن بندوں سے کہ دو کہ قیامت سے پہلے نماز قائم کریں اور زکواۃ ادا کریں۔ آیت نمبر:32 سے ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کی کائنات میں پھیلی ہوئی قدرت وجلالت کی نشانیوں کو بیان کر کے فرمایا: اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو، تو شمار نہ کرسکو گے، بے شک انسان بہت ظالم، بہت ناشکرا ہے۔ آیت 35 میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے مکہ کو شہر امن بنانے اور ان کو اور ان کی اولاد کو بت پرستی سے بچانے کی دعا اور بتوں کی مذمت کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:37 سے اُس واقعے کا ذکر ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام اللہ کے حکم سے حضرت ہاجرا اور اسماعیل کو مکے کی بے آب وگیاہ زمین میں چھوڑ کر آئے، تو رخصت ہوتے وقت اللہ سے دعا کی: ''اے ہمارے ربّ! (میں نے) اپنی بعض اولاد کو تیری حرمت والے گھر کے نزدیک بے آب وگیاہ وادی میں ٹھہرا دیا ہے، تاکہ وہ نماز کو قائم رکھیں اور لوگوں میں سے بعض کے دلوں کو اِن کی طرف مائل فرما اور اِن کو پھلوں سے روزی عطا فرما۔ آیت نمبر:39 سے ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے میں حضرت اسماعیل واسحاق علیہما السلام جیسی اولاد کے

عطا کئے جانے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے یہ دعا کی: ''اے میرے ربّ! مجھے (ہمیشہ) نماز قائم کرنے والا بنا دے اور میری بعض اولاد کو بھی، اے ہمارے رب! میری دعا کو قبول فرما، اے ہمارے رب! مجھے، میرے ماں باپ اور سب مومنوں کی قیامت کے دن مغفرت فرما''۔

آیت 42 سے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو غافلوں کی بداَعمالیوں سے بے خبر نہ سمجھو، اللہ تعالیٰ تو اُنہیں اُس دن تک ڈھیل دے رہا ہے، جس دن دہشت سے سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، لوگ سر اٹھائے بے تحاشا دوڑ رہے ہوں گے، اُن کی پلک تک نہ جھپک سکے گی اور اُن کے دل ہوا ہو رہے ہوں گے۔ اُس دن ظالم یہ عرض کریں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں کچھ مہلت دے دے تا کہ ہم تیرے پیغام کو قبول کریں اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم نے اس سے پہلے یہ قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ تم پر بالکل زوال نہیں آئے گا۔ تم اُن لوگوں کے گھروں میں رہتے تھے، جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور تم پر یہ بھی بالکل واضح ہو چکا تھا کہ ہم نے اُن کے ساتھ کیسا معاملہ کیا تھا۔ اور ہم نے تمہارے لئے مثالیں بھی بیان کردی تھیں اور اُنہوں نے ایسی گہری (خطرناک) سازشیں کیں کہ اُن سے پہاڑ بھی (اپنی جگہ سے) ہل جائیں اور اللہ کے پاس اُن کی سازشیں لکھی ہوئی ہیں، تو تم اللہ کو اپنے رسولوں سے کئے ہوئے وعدے کے خلاف کرنے والا نہ سمجھو۔ بے شک اللہ بہت غالب انتقام لینے والا ہے۔ آیت 52: میں فرمایا: اور یہ قرآن تمام لوگوں کے لئے پیغام (ہدایت) ہے تا کہ اُنہیں اِس کے ساتھ ڈرایا جائے اور وہ یہ جان لیں کہ ایک اللہ ہی لائقِ عبادت ہے، تا کہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔ آیت نمبر 48 میں قیامت کے دن کی ہولناک ماحول کا ذکر ہے جس دن زمین اور آسمان کی ماہیت بدل جائیگی، مجرم زنجیروں میں جکڑے جائیں گے اور ان کا لباس تارکول کا ہوگا اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ رہی ہوگی۔

سورۃ الحجر

سورۃ الحجر مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے پندرہویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 54ویں سورت ہے۔ اس سورت کی وجہ تسمیہ اس کی ایک آیت میں الحجر کا مذکور ہونا ہے۔

خلاصہ تفسیر

پارہ: ۱۴

چودہویں پارے کے مضامین

چودہویں پارے کی پہلی آیت کا شانِ نزول حدیث میں آیا کہ اہلِ جہنم جب جہنم میں جمع ہوں گے، تو جہنمی ان گناہگار مسلمانوں پر طعن کریں گے کہ تم تو مسلمان تھے، پھر بھی ہمارے ساتھ جہنم میں جل رہے ہو، پھر اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے گناہگار مسلمانوں کو جہنم سے نکال کر جنت میں لے جائے گا تو کفار تمنا کریں گے کہ کاش ہم بھی مسلمان ہوتے تو اس مرحلے پر نجات پالیتے۔ چودہویں پارے کی ابتدائی آیات میں کفار کے طعن واستہزاء کا ذکر ہے کہ معاذ اللہ وہ رسول کو مجنون کہیں گے اور کہیں گے کہ اگر آپ سچے ہیں، تو فرشتوں کو سامنے لا کر دکھادیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم فرشتوں کو حق کے ساتھ نازل کرتے ہیں اور پھر کوئی مہلت نہیں دی جائے گی۔ آیت نمبر 9 میں اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود لینے کا ذکر ہے جو بلاشبہ قرآن مجید کا اعجاز ہے آیت نمبر 15، 14 میں فرمایا: اگر ہم آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ منکرین خود اس سے چڑھ کر جائیں، تو پھر بھی کہیں گے کہ ہم پر جادو کردیا گیا ہے، ہماری نظر بندی کردی گئی ہے۔ آیت نمبر: 17 میں بتایا کہ شیطان فرشتوں کی باتیں سننے کے لئے آسمانوں پر جاتے ہیں تو ان پر آگ کے کوڑے برسائے جاتے ہیں، یعنی ان کا داخلہ عالمِ بالا میں بند ہے۔

آیت نمبر: 19 سے زمین کے پھیلاؤ، اس میں پہاڑوں کے نصب کرنے، سبزے اگانے اور دیگر وسائلِ معیشت کا ذکر ہے اور یہ کہ تمام نعمتوں کے خزانے اللہ کے پاس ہیں۔

آیت نمبر: 22 میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس قدرت کا ذکر فرمایا کہ پانی سے لدے ہوئے بادلوں کو ہمارے حکم سے ہوائیں چلا کر لے جاتی ہیں اور پھر بارش برستی ہے اور بلند فضاؤں میں کسی سہارے کے بغیر اللہ تعالیٰ ہی نے لاکھوں گیلن کے حساب سے پانی اسٹور کر رکھا ہے۔ اور وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور سب کچھ اس کا ہے آیت نمبر 24

میں فرمایا کہ اگلوں اور پچھلوں سب کا علم اللہ کو ہے اور وہی قیامت کے دن ان سب کو جمع فرمائے گا۔

آیت نمبر:26 تا 47 میں انسانوں اور جنات کے جوہرِ تخلیق کا بیان ہے کہ انسان کو سڑے ہوئے گارے کی کھنکتی ہوئی خشک مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو بغیر دھویں کی آگ سے پیدا کیا۔ پھر اللہ نے آدم علیہ السلام کا پیکر تخلیق فرمانے کے بعد فرشتوں کو تعظیم کے طور پر انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا، تمام فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کردیا اور وجہِ انکار اپنے جوہرِ تخلیق کو بتایا۔ پھر اللہ نے اسے اپنے قربِ خاص سے نکال کر دھتکار دیا اور قیامت تک اُس پر لعنت ہوتی رہے گی۔ شیطان نے دھتکارے جانے کے بعد قیامت تک کے لئے مہلت طلب کی، جو اسے مل گئی، چنانچہ اُس نے اِس عزم کا اظہار کیا کہ اے اللہ! میں تیرے چنے ہوئے بندوں کے علاوہ سب کو گمراہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے منتخب بندوں پر تیرا داؤ نہیں چلے گا۔ اس مقام پر جہنم کے سات دروازوں کا ذکر ہے، ان دوازوں کے نام یہ ہیں: جَهَنَّمُ ، سَعِيْر، لَظٰی ،حطمة، سَقَر، جَحِيْم اور هَاوِيَه۔ اس مقام پر یہ بھی بتایا کہ اہلِ جنت کے دل کینوں سے پاک ہوں گے اور وہ اعزاز و اکرام کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل مسندوں پر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ آیت 49،50 میں فرمایا کہ میرے بندوں کو میرے غفور رحیم ہونے کی خبر دیجئے اور یہ کہ میرا عذاب دردناک عذاب ہے یعنی خوف اور رجاء دونوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ چند آیات میں حضرت ابراہیم ولوط علیہما السلام کا واقعہ بیان ہوا، جس کی تفصیل اس سے پہلے گزر چکی ہے کہ اللہ نے قومِ لوط کی سرکشی کے سبب ان پر سنگ باری کی اور ان کی بستیوں کو تہ وبالا کردیا۔

آیت نمبر:79 تا 84 سے ''اصحاب الآیکه'' اور ''اصحاب الحِجر'' کا ذکر ہے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی نشانیاں آئیں جس سے انہوں نے اعراض کیا اور ان کی تعمیری صلاحیتوں کا ذکر کیا کہ وہ پہاڑوں کو کھود کر اپنے لئے محفوظ مکانات بناتے تھے لیکن ان قوموں نے انبیاء کو جھٹلایا تو یہ سب کچھ ان کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے اور ان پر اللہ کا

عذاب نازل ہوا۔آیت نمبر:99میں قرآن مجید کی نعمت اور سورۂ فاتحہ کا خاص طور پر ذکر ہے کافروں کے انجام پر رنجیدہ نہ ہونے اور مسلمانوں پر اپنی ساری محبت نچھاور کرنے کا بیان ہے۔آخری آیت میں فرمایا کہ اپنی آخری سانس تک اللہ کی عبادت کرتے رہیں۔ اس آیت میں ان لوگوں کیلئے عبرت ہے جو شریعت پر عمل کے بغیر ولایت کے دعویدار ہیں۔

سورۃ النحل

سورۃ النحل مکی سورت ہے۔ترتیب مصحف کے اعتبار سے سولہویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 70ویں سورت ہے۔اس سورت میں نحل (شہد کی مکھی) کا ذکر ہے اس لئے اس کا نام النحل رکھا گیا ہے۔اس سورت کے اکثر مضامین میں اللہ تعالیٰ کی توحید، الوہیت، استحقاق عبادت میں منفرد ہونے اور اس پر بے شمار دلائل پر مشتمل ہے اس میں شرک کی مذمت، منکرین عذاب آخرت کیلئے وعید، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ورسالت کے اثبات کا بیان ہے

کفار نے مکی زندگی میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت ایذائیں پہنچائیں آپ برداشت فرماتے رہے آپ سے مسلسل استہزاءً عذاب الٰہی کا مطالبہ کرتے رہے، مکہ میں یہ آپ کے آخری دن تھے اور مدینہ میں کفار کیلئے عذاب کے اسباب موجود تھے اس لئے فرمایا کہ اللہ کا حکم آپہنچا اس لئے اے کافرو تم اس کے طلب میں عجلت نہ کرو۔اس کے بعد فرمایا کہ منصب رسالت اللہ تعالیٰ کی مرضی سے عطا کیا جاتا ہے اور آسمانوں زمینوں اور انسان کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔

آیت نمبر:05 سے چوپایوں کی پیدائش کا ذکر ہے، جن میں انسانوں کے لئے کئی طرح کے فوائد ہیں، یہ انسانوں کے لئے راحت کا سبب ہیں، اِن میں بعض جانوروں کو کھایا جاتا ہے اور بعض میں دیگر فوائد ہیں، جیسے بھیڑوں کی اون سے گرم لباس حاصل ہوتا ہے، کچھ بار برداری کے کام آتے ہیں اور کچھ سواری کے کام آتے ہیں، جیسے گھوڑے، خچر اور گدھے وغیرہ۔

آیت نمبر 9 میں جبری ہدایت کی نفی ہے۔اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدھے راستے کے بیان کو اپنے ذمہ کرم پر لیا ہے اور گمراہی اور ہدایت کو قبول کرنا انسان کے اختیار میں ہے

آیت نمبر: 11 سے زمین سے پیدا ہونے والے پھلوں اور نعمتوں کا ذکر ہے۔ اور یہ کہ شمس وقمر اور ستارے اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ انسان سمندر پر سواری کر کے تلاش رزق کے لئے سفر بھی کرتا ہے اور مچھلیوں کا شکار کر کے تازہ گوشت کھاتا ہے، سمندروں ہی سے مختلف قسم کے زیورات میں استعمال ہونے والی چیزیں نکلتی ہیں اس کے بعد زمین میں پہاڑوں کے گاڑنے ،نہروں ،منزل پانے کیلئے راستوں ،نشان منزل اور ستاروں کا ذکر فرمایا۔ان تمام نعمتوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد فرمایا:''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو ان کا احاطہ نہیں کرسکو گے''۔

آیت نمبر: 20 سے مشرکوں کے باطل معبودوں کی بے بسی اور بے کسی کا ذکر ہے کہ وہ خود مخلوق ہیں، وہ بے جان ہیں، نعمتِ حیات سے محروم ہیں، انہیں خود اپنے انجام کا کچھ پتا نہیں، جب کہ مسلمانوں کا معبود اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے۔

آیت نمبر: 25 میں بتایا کہ جو لوگ گمراہوں کے رہنما ہیں، وہ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو انہوں نے گمراہ کیا ہے، ان کا وبال بھی ان پر ہوگا۔ اہلِ تقویٰ اور اہلِ ایمان کو عطا کی جانے والی نعمتوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ: ان کی وفات کے وقت فرشتے ان کی پاکیزہ روحوں کا استقبال کریں گے اور ان پر سلام بھیجیں گے۔

آیت نمبر: 35 سے ہر دور کے کفار و مشرکین کا ایک عذرِ لنگ بیان کیا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرتے اور نہ ہی اُس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اللہ کی مشیّت اور ہے اور اللہ کی رضا اور ہے، ایک استاد ایک نالائق شاگرد کو فیل کرتا ہے، تو یہ اس کی خواہش یا رضا نہیں ہوتی بلکہ قانون کا تقاضا ہوتا ہے اور مشیتِ الٰہی قانونِ الٰہی ہے۔

آیت نمبر 36 سے فرمایا کہ کہ ہم نے آپ سے پہلے امتوں میں رسول بھیجے انہوں نے

توحید کی دعوت دی اور طاغوت سے روکا، جس کے نصیب میں ہدایت تھی وہ ہدایت پا گئے اور جو بد بخت تھے وہ گمراہی کا شکار ہوئے اور آپ خواہ ان کے ہدایت یافتہ ہونے پر کتنے ہی حریص ہوں ,اللہ جسے گمراہ کر دیتا ہے اسے ہدایت نہیں دیتا۔ کفار کی قسمیں کھا کر وقوع قیامت کے انکار پر بتایا کہ قیامت ضرور آئے گی۔

آیت نمبر :40 میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی جلالت کو اس طرح بیان کیا کہ: جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں، تو ہمارے ''کُن'' (ہوجا) کہتے ہی وہ چیز وجود میں آجاتی ہے۔ آیت نمبر 41 میں مہاجرین کیلئے دنیا میں بہترین ٹھکانے اور آخرت میں بڑے اجر کا بیان ہے۔

آیت نمبر :43 سے اللہ تعالیٰ نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ: آپ سے پہلے بھی ہم نے مردوں کو رسول بنایا تھا، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے اور حقانیت کے واضح دلائل اور کتابیں بھی بھیجی اور (اے رسول!) ہم نے آپ کی طرف بھی قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو ہمارے وہ احکام وضاحت کے ساتھ بتادیں جو ان کی طرف اتارے گئے ہیں۔ قرآن نے یہ بھی فرمایا کہ جو کچھ تم نہیں جانتے وہ اہلِ علم سے پوچھ لو۔ آیت نمبر 45 سے فرمایا کہ اسلام اور داعی اسلام کے خلاف سازشیں کرنے والے کفار کو اللہ کے عذاب سے بے پرواہ نہیں ہونا چاہئے جو ان کے پاس کسی بھی صورت میں آسکتا ہے۔

آیت نمبر :48 سے اللہ تعالیٰ نے اس امر کو بیان فرمایا کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی بارگاہ میں مصروفِ عبادت ہے، یہاں تک کہ چیزوں کا سایہ جو دائیں اور بائیں جھکتا ہے وہ بھی اللہ کو سجدہ کر رہا ہوتا ہے۔ آیت نمبر 51 سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، ہر چیز اس کی ملک ہونے، ہر نعمت اس کی طرف سے ہونے اور اللہ کی اطاعت لازمی ہونے کا بیان ہے۔ اور مشرکین کا مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کی جناب میں گڑگڑانے اور مصیبت دفع ہونے کی صورت میں دوبارہ شرک کرنے کا بیان ہے۔

آیت نمبر 56 میں کفار کا اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے بتوں کیلئے حصے مقرر

کرنے کی مذمت ہے۔

آیت نمبر: 57 سے بتایا کہ مشرک اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں، وہ ان تمام نسبتوں سے پاک ہے، (ان کا اپنا حال یہ ہے کہ) اگر ان کو بیٹی کی پیدائش کی خبر دی جائے تو ان کا چہرکالا پڑ جاتا ہے اور وہ غصے سے بھر جاتے ہیں، (بیٹی کی پیدائش کو) بری خبر جانتے ہوئے، اپنی قوم سے چھپتے پھرتے ہیں کہ بیٹی کو ذلت اٹھا کر زندہ رکھیں (یا رسوائی سے بچنے کے لئے) اسے زندہ درگور کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس عہد میں قرآن نازل ہو رہا تھا، اُس میں بیٹیوں کے حوالے سے لوگوں کی سوچ کیا تھی، پھر اسلام نے عورت کو ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے روپ میں کتنا تقدس عطا کیا۔

آیت نمبر 60 میں گناہوں پر اللہ کے جلد مواخذہ نہ کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر اللہ لوگوں کو فوراً پکڑتا تو زمین پر کوئی جاندار باقی نہ بچتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ آگے اور پیچھے نہ ہونے والے مقررہ میعاد تک مہلت دیتا ہے۔

آیت نمبر 64 میں فرمایا اور ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے تاکہ آپ اس چیز کو صاف بیان کر دیں جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں اور یہ کتاب مومنوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہے۔

آیت نمبر: 66 سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں بیان کی گئیں کہ دودھ دینے والے جانوروں کے پیٹ میں خوراک جاتی ہے اور ان کے معدے کے ایک ہی کارخانے میں رنگین، بدبودار اور ناپاک گوبر پیدا ہوتا ہے اور خون بنتا ہے اور ان دونوں ناپاک رنگین چیزوں کے درمیان ہی میں چاندنی کی طرح چمکتا ہوا صاف، شفاف، سفید اور پاکیزہ دودھ بنتا ہے۔ اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے رزق اور میٹھے شربت بننے کے عمل میں عقل مندوں کیلئے نشانیاں ہیں۔

آیت نمبر: 68 سے شہد کی مکھی کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس چھوٹی سی مخلوق کو پہاڑوں، درختوں اور چھپروں میں اپنا مستحکم گھر بنانے کا شعور عطا کیا، پھر شہد کی مکھی طرح

طرح کے پھولوں کا رَس چوس کر آتی ہے اور اس کے معدے کے کارخانے میں شہد بنتا ہے جس میں انسانیت کے لئے شفاء ہے۔

آیت نمبر 70 میں انسان کی پیدائش، وفات اور بڑھاپے کا طاری کرنا اللہ کی طرف سے ہونے کا بیان ہے۔

آیت نمبر: 71 تا 72 سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے اپنی حکمت سے بعض لوگوں کو بعض پر روزی میں فضیلت عطا کی، اللہ نے انسانوں ہی میں سے انسانوں کے لئے جوڑے بنائے اور پھر بیٹوں اور پوتوں یعنی اولاد کی نعمت عطا کی اور پاکیزہ رزق عطا کیا، پھر بھی لوگ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔

آیت نمبر: 75 سے اللہ تعالیٰ مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک مجبور و بے اختیار غلام ہے، جو کسی چیز کا مالک نہیں اور دوسرا وہ ہے کہ جس کے پاس رزق کی فراوانی ہے اور وہ ظاہراً اور پوشیدہ طور پر اس میں سے خرچ کرتا ہے، اسی طرح ایک شخص گونگا ہے اور کوئی کام نہیں کرسکتا اور اپنے مالک پر بوجھ ہے، جہاں بھی اسے بھیجا جائے کوئی خیر کی خبر نہیں لاتا اور دوسرا وہ شخص ہے جو راہِ راست پر ہے اور نیکی کا حکم دیتا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟، یعنی جب بے اختیار اور با اختیار، بے فیض اور فیض رساں بندے برابر نہیں ہوسکتے، تو بُت اللہ کے برابر کیسے ہوسکتے ہیں؟۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ قیامت پلک جھپکنے یا اس سے بھی کم وقت میں قائم ہوجائے گی۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ اللہ نے تمہیں سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں عطا کیں تاکہ تم اللہ کے شکر گزار بندے بنو۔

آیت نمبر: 79 میں فرمایا کہ جو پرندے فضاؤں میں اڑتے ہیں، اُنہیں اللہ ہی تو بغیر کسی سہارے کے فضا میں قرار عطا کرتا ہے۔

آیت: 80 میں آرام دہ گھروں، جانوروں کی کھالوں، مویشیوں کے اون، پشم اور بالوں سے حاصل ہونے والے فوائد کا ذکر ہے۔ چیزوں کے سایہ کرنے، پہاڑوں میں پناہ گاہوں، گرمی اور جنگ سے بچانے والے لباس جیسی نعمتوں کا ذکر ہے۔ یعنی یہ سب چیزیں

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار ہیں۔

آیت نمبر 86 سے فرمایا کہ مشرکین جن معبودوں کو پوجتے ہیں کل بروز قیامت وہ ان سے بے زاری کا اظہار کرینگے اور ان کو جھوٹا ثابت کر کے اللہ کی بارگاہ میں عاجزی پیش کریں گے ان کو دہرا یعنی اپنے کفر اور دوسروں کو حق سے روکنے کا عذاب ملے گا۔

آیت :89 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ہم ہر امت کے خلاف انہی میں سے ایک گواہ (یعنی اس عہد کے نبی اور رسول) پیش کریں گے اور (اے رسولِ کریم!) ہم ان سب پر آپ کو گواہ بنا کر پیش کریں گے، یعنی ہر نبی اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ اُس نے دعوتِ حق کا فریضہ انجام دیا تھا اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ان سب نبیوں کی گواہیوں کی تصدیق کریں گے۔

آیت نمبر :90 قرآن مجید کی آیات ''جامع الاحکام'' میں سے ایک آیت ہے، جسے تقریباً ہر خطبے میں پڑھا جاتا ہے کہ اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم فرماتا ہے، بے حیائی، برائی اور سرکشی سے روکتا ہے، تم اُس کی نصیحت کو قبول کرو۔

آیت :91 میں وعدے کی پاسداری کا حکم دیا اور قسمیں کھا کر توڑنے سے منع فرمایا۔ دنیاوی فائدے کے لئے یا دھوکہ دہی کے لئے قسمیں کھانے کو معیوب قرار دیا اور فرمایا کہ: ان لوگوں کی مثال اس عورت جیسی ہے، جو سوت کاتتی ہے اور پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے، یعنی محنت کر کے اسے ضائع کر دیتی ہے۔ اگلی آیات میں فرمایا کہ دنیا کے حقیر اور ناپائیدار فائدے کے لئے اللہ کے عہد کو نہ توڑو، دائمی اور ابدی نعمتیں صرف اللہ کے پاس ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ ہر مومن مرد اور عورت جو نیک کام کریں گے تو ہم ان کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کو بہترین جزا دیں گے۔

آیت نمبر :98 میں یہ تعلیم دی کہ قرآن مجید کی تلاوت شروع کرنے سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھنا چاہئے اور یہ کہ شیطان کا زور مومنوں پر نہیں صرف اپنے دوستوں اور مشرکوں پر چلتا ہے۔

آیت نمبر 101 میں ایک آیت کی جگہ دوسری آیت لانے کے خلاف کفار کی ہرزہ سرائی کا ذکر ہے فرمایا کہ اللہ خوب جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے

آیت نمبر:103 سے بتایا کہ جب نبی امی کی زبان سے اعلیٰ ترین درجے کی فصاحت وبلاغت کے حامل قرآن کا معجزہ کفارِ مکہ کے سامنے پیش ہوا اور وہ اس کے بار بار کے چیلنج کا جواب نہ دے سکے تو یہ کہنے لگے کہ ان کو کوئی بشر یہ کلام سکھاتا ہے اور ان کی دلیل کی کمزوری کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ قرآن فصیح وبلیغ عربی میں ہے اور جس شخص کی طرف انہوں نے سکھانے کی نسبت کی، وہ عجمی ہے۔

آیت نمبر:106 میں ایک حکم بیان ہوا کہ اگر کوئی مسلمان کفار کے نرغے میں آجائے اور کافر اُسے قتل کرنے کی دھمکی دے کر کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کریں، اگرچہ عزیمت تو یہ ہے کہ جان چلی جائے، مگر کلمۂ کفر زبان پر نہ آئے، مگر پھر بھی کم ہمت لوگوں کو یہ رخصت دی گئی کہ اگر دل میں ایمان قائم ہے، تو جان بچانے کے لئے کلمۂ کفر کہنے سے انسان ایمان سے محروم نہیں ہوتا۔

آیت نمبر:112 میں اللہ تعالیٰ ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ وہ بستی بے خوف وخطر تھی، ہر طرف سے اطمینان تھا، ہر جگہ سے بستی والوں کے لئے کشادہ روزی آتی تھی، پھر انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بداعمالیوں کے سبب ان کو بھوک اور خوف کے لباس کا مزہ چکھایا، یعنی ان پر بھوک اور خوف کو ایک عذاب کی صورت میں مسلط کردیا۔

آیت نمبر 114 میں اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے حلال طیب رزق سے کھانے اور اس کا شکر ادا کرنے کا حکم فرمایا۔

آیت نمبر:115 میں اللہ تعالیٰ نے چار محرمات قطعیہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر کوئی حالتِ اضطرار میں ہو اور جان بچانے کے لئے کوئی حلال چیز میسر نہ آئے، تو محض جان بچانے کی حد تک وہ ان سے استفادہ کرسکتا ہے۔ آیت نمبر 116 میں خود ساختہ حلال اور

حرام کے قوانین مقرر کرنے کی مذمت ہے۔

آیت نمبر:119 میں ایک بار پھر اس رعایت کا بیان ہوا کہ اگر بندہ نادانی میں گناہ کر بیٹھے اور احساس ہونے پر سچے دل سے توبہ کر کے نیکی پر کاربند ہو جائے تو اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔

آیت نمبر:120 سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفاتِ کریمہ کا بیان ہوا کہ وہ اپنی ذات میں ایک امت تھے، توحید پر قائم اور شرک سے دور تھے، اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے اور اللہ نے انہیں "صراطِ مستقیم" کی ہدایت سے نوازا تھا، انہیں دنیا میں بھی اچھائی عطا فرمائی اور وہ آخرت میں بھی نیکوکاروں میں ہوں گے۔آیت:123 میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملتِ ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا۔

آیت نمبر:125 میں دعوتِ دین کے اسلوب کو بیان کیا گیا ہے کہ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلاؤ (اور اگر بحث کی نوبت آئے) تو احسن طریقے سے حجت قائم کرو اور مشکلات میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کرو کہ صبر کی توفیق اللہ تعالیٰ کی عطا سے ملتی ہے اور اس کا بدلہ بھی اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔آخر میں فرمایا کہ اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں اور نیک کام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

خلاصۂ تفسیر
پارہ:۱۵

پندرہویں پارے کے مضامین

سورۂ بنی اسرائیل

سورۃ بنی اسرائیل مکی سورت ہے ترتیب مصحف کے اعتبار سے سترہویں جبکہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے 50ویں سورت ہے۔اس سورت میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے اس لئے اس کا نام بنی اسرائیل رکھا گیا،اس سورت میں مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفر اسراء کا ذکر ہے،اس لیے اس کو سورۃ الاسراء بھی کہتے ہیں۔

اس سورت میں معجزہ معراج کا ذکر اور بنی اسرائیل کا تفصیلی ذکر ہے۔تخلیق کائنات سے ذات باری تعالیٰ اور توحید پر دلائل،مشرکین کے رد،قرآن کی حقانیت کے دلائل،تکریم انسانیت،نماز اور خصوصاً نماز تہجد کا بیان ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزۂ معراج کی پہلی منزل مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کا ذکر صراحت کے ساتھ ہے۔یہ تاریخِ نبوت،تاریخِ ملائک اور تاریخِ انسانیت میں سب سے حیرت انگیز اور عقلوں کو دنگ کرنے والا واقعہ ہے،اس کی مزید تفصیلات سورۂ النجم اور احادیث میں مذکور ہیں۔

آیت نمبر:4 سے بیان ہوا کہ بنی اسرائیل کو بائبل میں بتادیا گیا تھا کہ وہ زمین میں دو مرتبہ فساد اور سرکشی کریں گے،چنانچہ یہ دونوں مواقع آئے اور اللہ نے ان پر جابر بندے مسلط کئے۔

آیت نمبر 11 میں انسان کی جلد باز فطرت کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:12 میں بتایا کہ ہم نے نظامِ لیل ونہار کو اپنی قدرت کی دو نشانیاں اور ہم نے دن کو روشن بنایا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور سالوں کی گنتی اور حساب کو جان لو۔

آیت نمبر:13 سے بتایا کہ ہم نے ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے، (یعنی اللہ کی قضاوقدر میں جو طے ہے وہ ہو کر رہے گا) اور قیامت کے دن یہ اعمال نامہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی صورت میں ہوگا، (بندے سے کہا جائے گا) اپنا اعمال نامہ پڑھو، آج تم خود ہی احتساب کرنے کے لئے کافی ہو، جس نے ہدایت کو اختیار کیا تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جس نے گمراہی کو اختیار کیا تو اس کا وبال بھی اسی پر آئے گا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہم اس وقت تک عذاب دینے والے نہیں ہیں، جب تک کہ (اتمامِ حجت کے لئے) ہم رسول نہ بھیج دیں۔ اگلی آیت میں قدرت کا ایک قانون بیان کیا ہے کہ: جب ہم کسی بستی والوں کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں، تو اس کے عیش وعشرت کے دلدادہ لوگوں کو اپنے احکام بھیجتے ہیں، پھر وہ ان احکام کی نافرمانی کر کے عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں اور یوں ہم ان کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ آیت نمبر:18 میں فرمایا کہ جو صرف دنیا کے فائدے کا طلبگار ہو، ہم اس کو اس دنیا میں جتنا چاہیں دے دیتے ہیں اور پھر اس کا انجام جہنم ہوتا ہے۔

آیت نمبر:19 میں فرمایا: اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہو اور اس کے لئے ایمان کے ساتھ بھر پور کوشش کرے تو ایسے لوگوں کی سعی اللہ کی بارگاہ میں اجر کی حقدار قرار پائے گی۔

آیت نمبر 21 میں ایک دوسرے پر دنیا میں فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ آخرت کے بہت بڑے درجات ہیں اور اس کی فضیلت بہت بڑی ہے۔

آیت نمبر:23 میں والدین کے حقوق کی جانب متوجہ کرتے ہوئے فرمایا اور تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اگر تمہاری زندگی میں وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پہنچ جائے، تو ان کو اف تک نہ کہو، ان کو جھڑ کو بھی نہیں اور ان کے ساتھ ادب سے بات کرو اور ان کے لئے عاجزی اور رحم دلی کا بازو جھکائے رکھو اور یہ دعا کرو "اے میرے رب! ان پر رحم فرمانا، جیسا کہ انہوں نے بچپن میں رحم کے ساتھ میری پرورش کی"۔ آیت:26 میں قرابت داروں،

مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا کرنے اور فضول خرچی سے اجتناب کا حکم ہے اور یہ کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ اور اگر بسب تنگدستی خرچ نہ کر سکو تو ان سے نرم بات کرو۔

آیت نمبر:29 سے تسلسل کے ساتھ احکام کا بیان ہے:

(۱) خرچ کرنے میں بُخل، حرص اور فضول خرچی کے درمیان میانہ روی کو اختیار کرنا، یعنی نیک کاموں میں کھلے دل سے خرچ کرنا، مباح کاموں میں اعتدال کے ساتھ خرچ کرنا اور ناجائز کاموں میں بالکل خرچ نہ کرنا۔

(۲) افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کی ممانعت اور یہ کہ سب کا رازق اللہ ہے۔

(۳) زنا کی ممانعت۔

(۴) قتلِ ناحق کی ممانعت اور قصاص لینے میں حدِ اعتدال میں رہنے کا حکم۔

(۵) یتیم کا مال کھانے کی ممانعت اور اس کے بالغ ہونے تک اس کے مال کی حفاظت۔

(۶) وعدے کو پورا کرنے کا حکم۔

(۷) ناپ تول میں خیانت کی ممانعت۔

(۸) جس چیز کا علم نہ ہو اس کے درپے ہونے کی ممانعت بے شک کان آنکھ اور دل ان سب سے روز قیامت سوال کیا جائے گا۔

(۹) تکبر اور اترا کر چلنے کی ممانعت۔

(۱۰) شرک کی ممانعت۔

(۱۱) یہ بھی بیان ہوا کہ کسی کی روزی کی کشادگی یا تنگی کا مدار اس کی فضیلت یا بے قدری نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت کا معاملہ ہے۔ ان تفصیلات کے بعد فرمایا: (اے رسول!) یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جن کی ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے۔

آیت نمبر:40 میں کفار اور مشرکین کی اس خبیث فطرت کو بیان کیا کہ خود تو بیٹوں کی تمنا کرتے ہیں اور اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

آیت نمبر:44 سے بیان فرمایا کہ:''سات آسمان اور زمینیں اور جو بھی ان میں ہیں، اپنے اپنے انداز میں اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور ہر چیز اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہی ہے، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے''۔

آیت نمبر:45 سے فرمایا کہ منکرینِ آخرت قرآن کی تعلیمات سے استفادہ کرنے سے محروم رہتے ہیں اور ان کے دل ودماغ حق کو قبول کرنے کی سعادت سے محروم ہیں۔ وہ فصیح وبلیغ قرآن سن کر بھی نبی پر سحر زدہ ہونے کے طعن کرتے ہیں۔

آیت نمبر:49 میں بتایا کہ منکرینِ آخرت کہتے ہیں کہ جب ہماری ہڈیاں (گل سڑ کر) ریزہ ریزہ ہو جائیں گی، تو کیا ہمیں از سرِ نو پیدا کیا جائے گا؟، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی اور مخلوق جو تمہارے خیال میں بہت سخت ہو، وہی ربِ ذوالجلال دوبارہ پیدا کرے گا جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔

آیت نمبر 52 میں عمدہ بات کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

آیت نمبر:56 میں بتایا کہ باطل معبود اپنے پوجنے والوں کی تکلیف کو دور کرنے یا بدلنے پر قادر نہیں ہیں۔

آیت نمبر:61 سے ایک بار پھر فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے اور شیطان کے انکار کا ذکر ہے اور اس بات کا بھی کہ شیطان جو کچھ بھی کرلے اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں پر اس کا داؤ نہیں چلے گا۔

آیت نمبر 67 میں فرمایا کہ جب یہ سمندری طوفان میں گر جاتے ہیں تو معبودانِ باطل کی بجائے صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں لیکن نجات کی صورت میں یہ لوگ پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

آیت نمبر:68 سے مشرکوں کو متنبہ کیا گیا کہ اگر ان پر کوئی آفت آگئی یا انہیں خشک سرزمین پر کہیں دھنسا دیا گیا یا کسی اور مصیبت میں مبتلاء کیا گیا تو اللہ کے سوا کوئی نجات دلانے والا نہیں ہے۔

آیت نمبر:70 میں بنی آدم کی عزت وکرامت کا ذکر ہے کہ اللہ نے بنی آدم کو اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت عطا کی۔ آیت نمبر 71 میں انسانوں کے اپنے پیشواؤں کے ساتھ بلائے جانے اور دائیں ہاتھ سے اعمال نامہ لینے والوں کی کامیابی کا بیان ہے۔اور جو دنیا میں حق سے اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

آیت نمبر 73 سے کفار کے آپ ﷺ کو راہ حق سے ہٹانے کے باطل ارادوں کا ذکر فرمایا اللہ تعالیٰ نے حق کے راستے میں آپ کی ثابت قدمی کو اپنا فضل وکرم بتایا۔آپ کو جزیرہ عرب سے نکالنے کی کفار کے سازش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو برے انجام سے بچ نہیں سکیں گے۔

آیت نمبر:78 سے اشارۃً پانچ نمازوں کا حکم ہے، فجر کی فضیلت کا بیان، نمازِ تہجد کی ترغیب اور رسول اللہ ﷺ کے لئے مقامِ محمود (جو مقامِ شفاعتِ کبریٰ ہے) عطا کئے جانے کا بیان ہے۔آیت:81 سے حق کی آمد اور باطل کے نیست و نابود ہونے کا بیان ہے اور یہ کہ قرآن میں اہلِ ایمان کے لئے شفاء اور رحمت ہے۔

آیت نمبر 83 میں انسان کی اس فطرت کا ذکر ہے کہ نعمتوں پر ناشکری اور مصیبت پر ناامیدی کا اظہار کرتا ہے۔

آیت نمبر:85 میں اس امر کا بیان ہے کہ یہود نے رسول اللہ ﷺ سے روح کے بارے میں سوال کیا، تو اللہ نے فرمایا کہ:" (اے رسول!) کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے اور تم کو محض تھوڑا سا علم عطا کیا گیا ہے"۔اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جن چیزوں کی حقیقت جاننے پر ہدایت ونجات موقوف نہیں ہے، ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

آیت نمبر 88 میں ایک بار پھر قرآن کا مثل لانے کا چیلنج اور کافروں کی عجز کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:90 سے مشرکینِ مکہ کے بعض فاسد مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے کہا ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، حتیٰ کہ (۱) آپ ہمارے لئے

زمین سے پانی کا کوئی چشمہ جاری کر دیں۔(۲) یا آپ کھجوروں اور انگوروں کے باغات کے مالک بن جائیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں (۳) یا آپ ہمیں جس عذاب سے ڈراتے ہیں، وہ لے آئیں یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دیں (۴) یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے بے حجاب لے آئیں (۵) یا آپ کے لئے سونے کا گھر ہو (۶) یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور پھر آسمان سے ہم پر کتاب نازل کریں جس کو ہم پڑھیں۔ ان سب مطالبات کے جواب میں اللہ نے فرمایا: (اے رسول کہہ دو) میرا رب ہر عیب سے پاک ہے، (میں کوئی شعبدے باز نہیں ہوں بلکہ) میں ایک بشر ہوں جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا۔

آیت نمبر: 94 سے کفارِ مکہ کے اس اعتراض کا ذکر ہے کہ اللہ نے بشر کو رسول بنا کر کیوں بھیجا، یعنی کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ (اے رسول!) کہہ دو اگر زمین میں فرشتے بستے اور اطمینان سے چلتے پھرتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتہ ہی رسول بنا کر نازل کرتے، یعنی نبی اور رسول جس مخلوق کی طرف مبعوث ہوتے ہیں، اس کی جنس سے ہوتے ہیں۔ ان آیات میں یہ بھی بتایا کہ منکرین آخرت کو ان کے مونہوں کے بل اندھا، گونگا اور بہرا بنا کر اٹھایا جائے گا اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ آیت نمبر 100 میں فرمایا کہ آپ کہئے اگر بالفرض تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تم خرچ کے ڈر سے ان کو روکے رکھتے اور (دراصل) انسان ہے ہی بخیل۔

آیت نمبر 101 سے موسیٰ علیہ السلام کو نو معجزات عطا کئے جانے، فرعون کا آپ کو ساحر کہنے، فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے زمین میں آباد ہونے کا ذکر ہے۔

آیت نمبر: 105 میں قرآن مجید کو بتدریج یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے کی حکمت یہ بتائی کہ رسول ان پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں، ان کے لئے قرآن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ مشرکینِ مکہ اعتراض کرتے کہ کبھی آپ اللہ کہتے اور کبھی رحمان کہتے ہیں، ہم تو رحمان کو نہیں جانتے، تو اللہ نے فرمایا: (اے رسول!) کہہ دیجئے کہ (معبودِ برحق کو) تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ

کر پکارو تم اسے جس نام سے بھی پکارو، سب اُسی کے نام ہیں اور اسے پکارنے میں میانہ روی سے کام لو۔ آخری آیت میں فرمایا کہ اللہ کی نہ کوئی اولاد ہے، نہ کوئی اس کی سلطنت میں اس کا شریک ہے اور نہ اسے کسی مددگار کی حاجت ہے۔ اور آپ اس کی کبریائی بیان کرتے رہئے۔

سورۃ الکہف

سورۃ الکہف مکی سورت ہے۔ ترتیب نزول کے اعتبار سے 69 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے اٹھارویں سورت ہے۔ اس سورت میں اصحاب کہف کا ذکر ہے اس لئے اس کو سورۃ الکہف سے موسوم کیا گیا۔ اس سورت میں قرآن کی حقانیت، اصحاب کہف، موسیٰ علیہ السلام، خضر علیہ السلام، ذوالقرنین، آدم علیہ السلام اور ابلیس، کے قصے اور ان قصوں کے درمیان حکمت وموعظت کی بہت ساری باتوں کا بیان ہے

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے سورۃ الکہف کی دس آیتیں حفظ کرلیں وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔ (صحیح مسلم 809)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے جمعہ کے دن سورۃ الکہف کو پڑھا اس کیلئے دو جمعوں کے درمیان نور کو روشن کردیا جائے گا۔ (مستدرک 3444)

سورۃ الکہف کی ابتدائی آیات میں قرآن کو اللہ کی جانب سے نازل کردہ کجی سے پاک، اصلاح کرنے والی، اللہ کی گرفت سے ڈرانے والی اور مومنین صالحین کو مژدہ سنانے والی کتاب قرار دیا ہے۔ اور جو لوگ بغیر کسی علم کے اللہ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں یہ بہت بڑی جسارت اور جھوٹ ہے۔ اور آپ ان کے ایمان نہ لانے سے غمزدہ نہ ہو۔ دنیا کی رنگینیوں میں گم لوگوں سے فرمایا کہ زمین کو خوبصورتی بخشنے والی چیزوں کو ہم نے پیدا کیا ہے اور ہم اسے فنا بھی کریں گے۔

اس سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر:09 سے اصحابِ کہف کا بیان ہے، یہ چند صالح نوجوان

تھے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے عقیدۂ توحید اور ایمان پر ثابت قدم رکھا، لیکن ان کی قوم مشرک تھی اور ایک ظالم بادشاہ ان پر مسلط تھا، وہ لوگ ان نوجوانوں کے دشمن ہو گئے تو انہوں نے ان کے شر سے بچنے کے لئے غار میں پناہ لی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی: اے ہمارے رب ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے مشن میں کامیابی کے اسباب مہیا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی اور اس کیفیت میں وہ 309 سال تک رہے۔ غار میں اللہ تعالیٰ نے ایسا غیبی انتظام کیا کہ وہ ایک کشادہ جگہ میں تھے، جب سورج طلوع ہوتا تو دھوپ غار کے دائیں جانب رہتی اور غروب ہوتے وقت بائیں جانب پھر جاتی۔ اللہ تعالیٰ انہیں حسبِ ضرورت دائیں بائیں کروٹیں بدل دیتا، تاکہ ان کو روشنی، حرارت اور ہوا ملتی رہے اور ایک ہی ہیئت میں سوتے ہوئے ان کے بدن پر زخم نہ ہو جائیں جن کو آج کل طبی زبان میں Bed Soul کہتے ہیں۔ اصحابِ کہف کا ایک کتا بھی تھا، جو اُن کی چوکھٹ پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا رہا۔ اسی وجہ سے علماء نے اہل اللہ کی چوکھٹ کی برکات کو بیان کیا ہے کہ وہ کتا جو نیکوکاروں کے ساتھ وابستہ رہا، قرآن مجید میں مختلف انداز میں پانچ مرتبہ اُس کا ذکر فرمایا۔ بعض مُفسرین نے لکھا ہے کہ یہ کتا کسی انسانی شکل میں جنّت میں جائے گا، بقولِ شاعر ؎

سگِ اصحابِ کہف، روزے چند با مرداں بنشست مردم شد
پسرِ نوح بابداں بنشست خاندانِ نبوتش گم شد

یعنی اصحابِ کہف کا کتا عظیم المرتبت انسانوں کے پاس بیٹھا تو اُسے انسان جیسی عزت ملی، اس کے برعکس نوح علیہ السلام کا بیٹا بروں کے ساتھ بیٹھا، تو خاندانِ نبوت کی نسبت سے ہی محروم ہو گیا۔

اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں قرآنِ مجید میں لوگوں کے حوالے سے تین اقوال نقل کیے ہیں، پہلے دو اقوال کو قرآن نے لوگوں کی "تکہ بازی" قرار دیا اور تیسرے قول کو قرآن نے رَد نہیں کیا، یعنی وہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا تھا، لہٰذا مُفسرین نے

اِسی تعداد کو صحت کے قریب قرار دیا ہے، اللہ نے فرمایا: اُن کی صحیح تعداد کو اللہ ہی سب سے زیادہ جاننے والا ہے، اُن کو صرف چند لوگ جاننے والے ہیں (یعنی جنہیں اللہ تعالیٰ نے اِس کا علم عطا کیا)۔ قرآن نے اِن کی تعداد کے بارے میں زیادہ بحث سے منع فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ نے اُن کے منظر کو بارعب بنادیا تھا تاکہ کوئی اُن کی طرف جھانک تانک نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھنے والا سمجھتا کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اِس طرح ہم نے اُن کو اٹھایا تاکہ ایک دوسرے کا حال پوچھیں، اُن میں سے ایک نے کہا تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے، اُنہوں نے کہا: ہم ایک دن یا اُس سے بھی کم ٹھہرے، پھر اُنہوں نے قطعی بات کہنے کے بجائے اِس مدت کے تعین کو اللہ کے علم کے سپرد کردیا۔

پھر اُنہوں نے اپنے ایک ساتھی کو چاندی کا سکہ دے کر کوئی پاکیزہ کھانے لانے کے لئے شہر کی طرف بھیجا اور ساتھ ہی یہ تاکید کی کہ نرمی سے کام لینا، مبادا کسی کو پتا چل جائے کیونکہ اگر اُن کو ہمارے بارے میں پتا چل گیا تو وہ ہمیں سنگسار کردیں گے یا ہمیں اپنے دین میں جبراً داخل کردیں گے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن پر موت طاری کردی چونکہ اہلِ شہر اِن نوجوانوں کی حقیقت سے واقف ہوچکے تھے، اِس لئے اظہارِ عقیدت کے لئے اُن میں بحث ہوئی کہ اِن کی یادگار کو کیسے باقی رکھا جائے۔ ایک فریق نے کہا کہ یادگار کے طور پر یہاں کوئی عمارت بنادی جائے، مگر جس فریق کی رائے غالب قرار پائی، وہ یہ تھی کہ یہاں مسجد بنالی جائے۔ اِسی سے مُفسرین نے یہ مسئلہ اَخذ کیا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کے مزارات کے جوار میں مسجد بنانا اچھی بات ہے تاکہ جو لوگ اُن مزارات پر فاتحہ پڑھنے کے لئے آئیں، اگر نماز کا وقت ہو تو وہ مسجد میں نماز ادا کرسکیں۔

آیت نمبر: 28 کا پس منظر یہ ہے کہ مکے کے بعض بڑے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ کی بات سن لیتے ہیں، لیکن جب ہم آپ کے پاس آئیں تو خباب، صہیب، بلال وغیرھم فقراءِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنے پاس سے اٹھا دیا کریں،

کیوں کہ ان کے پاس بیٹھنا ہمارے شایانِ شان نہیں ہے، تو اللہ عزوجل نے ان فقراء صحابہ کی دل داری کے لئے فرمایا: ''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ لازم رکھیں، جو صبح اور شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں، اس کی رضا کے طلب گار ہیں اور آپ اپنی آنکھیں ان سے نہ ہٹائیں''۔ یعنی انہیں ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھیں۔ آیت:29 میں بتایا کہ جہنمیوں کو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح گرم مشروب پلایا جائے گا اور اہلِ جنت کو سونے کے کنگن اور ریشم کے ہلکے اور دبیز کپڑے پہنائے جائیں گے۔

آیت نمبر:32 سے اللہ تعالیٰ نے دو لوگوں کا واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک شخص کے انگوروں کے باغات تھے اور چاروں طرف سے انہیں کھجور کے درختوں نے گھیر رکھا تھا اور درمیان میں کھیتی تھی اور بیچ میں دریا بہہ رہا تھا اور ان باغات نے بہت عمدہ فصل دی۔ ایک دن یہ شخص اپنے ساتھی سے کہنے لگا کہ میرا مال اور افرادی قوت تم سے زیادہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ باغ کبھی برباد نہیں ہوگا۔ اول تو مجھے قیامت کا یقین ہی نہیں، لیکن اگر قیامت آئی تو مجھے وہاں اس سے بھی بہتر مال ملے گا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے کہا: تو اپنی اصل کو بھول گیا اور تو نے اپنے خالق کی ناشکری کی جو کہ وحدہٗ لاشریک ہے، اگر تم نے باغ میں داخل ہوتے وقت ''ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ'' کہہ دیا ہوتا، تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوتا گرچہ میں مال اور اولاد میں تجھ سے کم ہوں، لیکن میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بہتر نعمتیں عطا کرے گا اور آسمان سے کوئی آفت آئے گی اور تمہارا باغ تباہ و برباد ہو جائے گا یا اگر اس کا پانی زمین میں دھنس گیا تو پھر تم اسے تلاش نہ کر پاؤ گے، بالآخر اس شخص کا باغ برباد ہو گیا اور وہ کفِ افسوس ملتے ہوئے کہنے لگا کہ کاش میں نے شرک نہ کیا ہوتا، لیکن پھر اس کا کوئی مددگار نہ تھا۔

آیت نمبر:45 میں اللہ تعالیٰ دنیا کی زندگی کی ناپائیداری کو ایک مثال سے بیان فرماتا ہے کہ آسمان سے بارش نازل ہوئی، گھنا سبزہ نکلا، پھر وہ سوکھ کر چورہ چورہ ہو گیا، جسے ہوا اڑا لے گئی، مال اور بیٹے تو محض دنیا کی زندگی کی زینت ہیں، تمہارے رب کے پاس ثواب

اور انجام کے اعتبار سے باقی رہنے والی نیکیاں ہی بہتر ہیں۔

آیت نمبر 47 سے فرمایا کہ قیامت دن تمام روئے زمین ایک کھلے میدان کی صورت میں ہوگا سب لوگ صف باندھے رب کے حضورا کیلئے حاضر ہوں گے اور اپنے اعمال ناموں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر کہیں گے ہائے افسوس اس نامہ اعمال کو کیا ہوا اس نے نہ کوئی صغیرہ گناہ چھوڑا ہے نہ کبیرہ مگر سب کو شمار کیا ہے۔

آیت نمبر 50 میں حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدے، ابلیس کی نافرمانی، اور شیطان اور اس کی ذریت کا انسان کے دشمن ہونے کا بیان ہے۔

آیت نمبر :60 سے موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کا بیان ہے۔ وہ اپنے ایک خادم یوشع بن نون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کی حکمتوں اور اسرار و رموز کو جاننے کے لئے حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش میں نکلے، دورانِ سفر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا کہ ناشتہ لاؤ، ہم سفر کرتے کرتے تھک چکے ہیں، خادم نے کہا کہ دورانِ سفر جب ہم چٹان کے پاس ٹھہرے تھے، تو شیطان نے مچھلی کو مجھ سے بھلا دیا اور وہ سمندر میں راستہ بناتے ہوئے نکل گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ دو سمندروں (بحرِ فارس اور بحرِ روم) کا سنگم ہی ہماری منزل ہے، وہ دونوں واپس لوٹے اور پھر ہمارے ایک بندۂ خاص کو وہاں پایا، جس کو ہم نے اپنے پاس سے رحمت عطا کی تھی اور ہم نے اُسے ''علمِ لَدُنِّی'' عطا کیا، مُفسّرین کے مطابق یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو رُشد و ہدایت کا علمِ خاص عطا کیا ہے، اُس میں سے کچھ مجھے بھی تعلیم دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی اور رسول ہیں، کلیم ہیں، افضل ہیں، لیکن افضل کے مقابلے میں کسی دوسرے شخص کو کسی خاص شعبے میں کوئی فضیلت عطا کی جاسکتی ہے، یہی صورتِ حال یہاں بھی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے سے کم مرتبہ شخص سے بھی کسی خاص شعبے کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے اور اِس بنا پر اُس کی تکریم کی جاسکتی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: جن اَسرار کا آپ کو علم نہیں، اُن کے بارے میں آپ صبر نہیں کر پائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے''۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: '' آپ میری پیروی کرتے ہوئے میرے کسی فعل کے بارے میں سوال نہیں کریں گے، تاوقتیکہ میں خود آپ کو بتادوں''۔ چلتے چلتے وہ دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے تو، حضرت خضر علیہ السلام نے اُس کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''یہ تو آپ نے بہت بری بات کی، اِس سے تو سواریوں کے ڈوبنے کا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے''۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: میں نے آپ سے یہی تو کہا تھا کہ آپ صبر نہیں کر پائیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میری بھول پر میری گرفت نہ کیجئے اور میرے مشن کو مجھ پر دشوار نہ کیجئے۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ:۱۶

سولہویں پارے کے مضامین

سورۂ کہف کی آیت نمبر:74 میں بتایا کہ راہ چلتے اُن دونوں کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی اور حضرت خضر علیہ السلام نے اُس لڑکے کو قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''آپ نے ایک بے قصور شخص کو قتل کر دیا، آپ نے یہ بہت برا کام کیا''۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: ''میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے''۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اس کے بعد میں اگر آپ سے کوئی سوال کروں، تو مجھے ساتھ نہ رکھئے گا، آپ کے پاس اس کا جواز ہوگا۔ پھر چلتے چلتے ایک بستی والوں کے پاس آئے، انہوں نے اُن سے کھانا مانگا، تو اُنہوں نے میزبانی نہ کی، اس کے باوجود اُس گاؤں کی ایک دیوار گرا چاہتی تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے اُسے ٹھیک کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اِن بے لحاظ لوگوں سے آپ نے مزدوری ہی لے لی ہوتی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: اب آپ کے اور میرے راستے جدا ہیں، میں اپنے تینوں کاموں کی حکمت آپ کو بتا دیتا ہوں: (۱) کشتی سمندر میں کام کرنے والے مسکین لڑکوں کی تھی اور آگے ایک ظالم بادشاہ تھا، جو ہر صحیح وسالم کشتی کو زبردستی لے لیتا تھا، میں نے اُس کشتی کو عیب دار کر دیا تا کہ اُس کی دست برد سے بچی رہے۔ (۲) لڑکے کے ماں باپ مومن تھے، اور اندیشہ تھا کہ یہ بڑے ہو کر اُن کو سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اِس کے بدلے میں اُن کو ایک پاکیزہ اور زیادہ رحم دل بیٹا عطا فرمائے گا۔ (۳) گاؤں میں دیوار دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اُس کے نیچے اُن کا خزانہ دفن تھا اور اُن دونوں کا باپ ایک صالح شخص تھا، تو آپ کے رب نے چاہا کہ وہ جوان ہو کر اپنے رب کی رحمت سے اپنا خزانہ نکالیں۔ یہ تینوں کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کئے، یعنی یہ اللہ کا حکم تھا، لیکن آپ صبر نہ کر سکے اور جلد بازی میں سوال کر بیٹھے۔

آیت نمبر:83 سے 110 تک ذوالقرنین کا ذکر ہے، اللہ نے اسے زمین میں اقتدار

عطا کیا، وہ ایک مہم پر نکلے اور طلوعِ آفتاب کی جگہ پہنچے تو ایک قوم کو پایا، جن پر سورج پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا، پھر ایک اور مہم پہ نکلے اور دو پہاڑوں کے درمیان پہنچے، ان پہاڑوں کے اس پار ایک قوم تھی جو کوئی بات نہیں سمجھتی تھی۔ انہوں نے کہا: اے ذوالقرنین! یاجوج وماجوج زمین میں فساد کررہے ہیں، ہم آپ کو کچھ سامان مہیا کرتے ہیں آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنادیں۔ ذوالقرنین نے کہا اللہ نے مجھے طاقت دی ہے، تم افرادی قوت سے میری مدد کرو اور میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنادوں گا۔ اس دیوار میں لوہا اور تانبا بھی پگھلایا تاکہ وہ دیوار ناقابلِ شکست ہوجائے، پھر یاجوج وماجوج اس دیوار پر نہ چڑھ سکیں۔ ذوالقرنین نے کہا کہ یہ میرے رب کی رحمت سے بنی ہے اور جب میرے رب کا مقررہ وقت آئے گا، تو وہ اس دیوار کو ریزہ ریزہ کردے گا۔ سورۂ کہف کے آخری رکوع میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے بارے میں بتایا کہ وہ شرک کرتے ہیں اور ہم نے ان کے لئے جہنم تیار کررکھا ہے۔ دنیا کے بظاہر خوشنما کام آخرت میں ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ پھر اہلِ ایمان کے لئے جنت کی نعمت کا ذکر ہے۔ آخری آیات میں اللہ نے فرمایا کہ اگر سارے سمندر، اور ان جیسے اور بھی آجائیں، مل کر روشنائی بن جائیں تو میرے رب کے کلمات ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہوجائیں گے۔ آخری آیت میں (اللہ نے فرمایا اے رسول!) کہہ دیجئے میں (خدا نہ ہونے میں) تمہاری ہی مثل بشر ہوں، میری طرف یہی وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، سو جسے قیامت کے دن اپنے رب سے ملنے کا یقین ہو وہ نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔

سورۂ مریم

سورۃ مریم مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے انیسویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 44ویں سورت ہے۔ اس سورت میں حضرت مریم کا ذکر مبارک ہونے کی وجہ سے اس کو سورۃ مریم کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس سورت میں توحید اور حیات بعد الموت کا

بیان ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت اور جھولے میں کلام، ابراہیم علیہ السلام اور آذر کے مناقشے، اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہے۔

سورۂ مریم میں اس امر کا بیان ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام لاولد تھے اور بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اولاد کی دعا کی، جو ان کا اور آلِ یعقوب کا وارث بنے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹے کی بشارت دی، جس کا نام ''یحییٰ'' ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیدائش سے پہلے نام رکھا جا سکتا ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں نبوت عطا کی اور کتاب دی، ان کے اوصاف یہ بیان کئے: وہ پاکیزہ اور متقی تھے، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے اور سرکش نہیں تھے، ان پر سلام ہو جب وہ پیدا ہوئے اور جب ان کی وفات ہوگی اور جب قیامت کے دن انہیں اٹھایا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی ولادت کے دن ان پر سلام بھیجنا، سنت الٰہی ہے۔ اس کے بعد حضرت مریم کا ذکر ہے کہ وہ گھر والوں سے دور چلی گئیں اور با پردہ جگہ کو اختیار کر لیا۔ ان کے پاس فرشتہ بشری شکل میں آیا اور کہا کہ میں آپ کے رب کا فرستادہ ہوں اور اس نے انہیں پاکیزہ لڑکے کی بشارت دی۔ حضرت مریم نے کہا میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، حالانکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور میں بدکار بھی نہیں ہوں۔ فرشتے نے کہا کہ اللہ کے لئے یہ بات آسان ہے اور اللہ اسے لوگوں کے لئے نشانی بنائے گا اور اللہ کا یہ فیصلہ طے ہو چکا ہے۔ انہیں حمل ہوا اور وہ ایک دور مقام پر کھجور کے درخت کے پاس چلی گئیں اور کہنے لگیں: کاش کہ میں اس سے پہلے مر جاتی اور میں بھولی بسری ہو جاتی۔ فرشتے نے ندا دی کہ آپ غمگین نہ ہوں، اللہ نے آپ کے نیچے نہر جاری کر دی ہے آپ کھجور کے درخت کو ہلائیں تو آپ کے اوپر تر و تازہ کھجوریں گریں گی، کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی رکھو، اگر کوئی بشر آپ سے سوال کرے، تو کہیے کہ میں نے (چپ کے) روزے کی نذر مانی ہے اور میں کسی انسان سے کلام نہیں کروں گی۔ پھر وہ بچے کو اٹھائے قوم کے پاس گئیں تو قوم نے ملامت کی کہ یہ کیا ہوا۔ مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا اور قوم نے کہا کہ ہم گود کے بچے سے کیسے کلام کریں، بچے نے کہا: میں اللہ کا بندہ

ہوں، اس نے مجھے کتاب ونبوت عطا کی ہے اور بابرکت بنایا ہے اور زندگی بھر نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے، میں اپنی والدہ کا فرمانبردار ہوں، قرآن نے کہا: یہ عیسیٰ ابن مریم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بیٹے کی نسبت سے پاک ہے۔

آیت نمبر: 41 سے ایک بار پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کہ وہ بہت سچے نبی تھے۔ انہوں نے اپنے (عرفی) والد کو بے جان بتوں کی عبادت سے روکا اور عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔ اس نے کہا: آپ ہمیں ہمارے خداؤں سے پھیرنا چاہتے ہیں، اس سے رک جائیں ورنہ آپ کو سنگسار کر دیا جائے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں آپ کے لئے اپنے رب سے استغفار کرتا رہوں گا، وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسحاق (بیٹے) اور یعقوب (پوتے) کی بشارت دی کہ وہ نبی ہوں گے۔

آیت نمبر: 51 تا 58 میں مختلف انبیاءِ کرام کا ذکر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو برگزیدہ، رسول نبی اور اللہ کا رازدار کہا گیا اور حضرت ہارون کی نبوت کا بیان ہوا۔ اسماعیل علیہ السلام کو وعدے کے سچے، نماز اور زکوٰۃ کا حکم دینے والے رسول نبی اور اللہ کے پسندیدہ قرار دیا گیا۔ ادریس علیہ السلام کو صدیق نبی قرار دیتے ہوئے فرمایا: ہم نے ان کو بلند جگہ پر اٹھالیا۔

آیت: 59 سے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور سرکش بندوں کے احوالِ آخرت کا بیان ہے۔

آیت نمبر: 66 میں بتایا کہ منکرینِ آخرت حیات بعد الموت کے بارے میں ہمیشہ شک میں مبتلا رہے، انہیں یقین ہونا چاہئے کہ مرنے کے بعد دوبارہ وہی خالق زندہ کرے گا، جس نے پہلی بار بغیر کسی نام ونشان کے پیدا کیا۔

آیت نمبر: 76 سے بتایا کہ جو لوگ گمراہی میں مبتلاء ہیں، ان کی ابتلاء میں اضافے کے لئے مہلت کی مدت بڑھا دی جاتی ہے اور جو ہدایت یافتہ ہیں، ان کو مزید استقامت نصیب ہوتی ہے اور اللہ کے ہاں ثواب اور انجامِ خیر کے اعتبار سے باقی رہنے والی نیکیاں سب سے بہتر ہیں۔

آیت نمبر 81 میں فرمایا کہ مشرکین اس امید پر اللہ کے سوا معبودانِ باطل کی عبادت

کرتے ہیں کہ مشکل میں ان کی مدد کریں گے فرمایا ہرگز نہیں وہ ان کے دشمن بن کر عبادت کا انکار کریں گے۔

آیت نمبر:88 سے بتایا کہ کفار نے اللہ کی طرف اولاد کی نسبت کر کے نہایت سخت بات کہی ہے، یہ تو اتنا سنگین جرم ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑے، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ مزید فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کوئی بھی ہے، سب اللہ کے حضور بندے بن کر حاضر ہوں گے۔

آیت نمبر 97 میں فرمایا بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے عنقریب رحمان ان کیلئے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا فرما دے گا۔ آخری آیت میں پہلے کئی قوموں کے ہلاک ہونے اور ان کے نام ونشان باقی نہ رہنے کا بیان ہے۔

سورۂ طٰہٰ

سورۂ طٰہٰ مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے بیسویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 45ویں سورت ہے اس سورت کے پہلے کلمے طٰہٰ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے اس لئے اس کا نام سورۃ طٰہٰ رکھا گیا۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قرآن کی حقانیت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت، اور اثبات قیامت کا ذکر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آدم علیہ السلام اور ابلیس کے قصے مذکور ہیں۔

کفار قریش نے جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لمبی لمبی نمازیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے جب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آباؤ اجدا کے دین کو چھوڑا ہے آپ بہت سختی اور مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی پیشانی پر لکھ دیا۔ اے طٰہٰ ہم نے یہ قرآن اس لئے نازل نہیں کی کہ آپ کو سختی اور مشقت میں مبتلا کریں۔

اور فرمایا: یہ قرآن نصیحت کے لئے نازل ہوا اور اللہ ظاہر و باطن سب کو جانتا ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور اس کے سبھی نام اچھے ہیں۔ آیت نمبر:10 سے مدین سے واپسی کے سفر کے دوران موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعے کا بیان ہے کہ وہ ایک جگہ اپنی اہلیہ کو ٹھہرا کر آگ

لینے طور پر گئے۔ وہاں انہیں غیب سے ندا آئی کہ اے موسیٰ! میں آپ کا رب ہوں، آپ طویٰ کی مقدس وادی میں ہیں، ادباً اپنے جوتے اتار دیجئے، میں نے آپ کو چن لیا ہے اور میرے پیغامِ وحی کو توجہ سے سنئے، میں اللہ وحدہٗ لاشریک ہوں، میری بندگی کیجئے اور میری یاد کے لئے نماز قائم کیجئے، قیامت آنے والی ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا ؎

خدا کی دَین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اسی موقع پر آپ کو یہ معجزات عطا کئے گئے: (۱) آپ اپنے عصا کو زمین پر ڈالتے تو وہ دوڑتا ہوا سانپ بن جاتا، دوبارہ ہاتھ میں پکڑتے تو عصا بن جاتا، (۲) آپ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال کر نکالتے تو آفتاب کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا۔ پھر آپ کو حکم ہوا کہ جا کر فرعون کو دعوتِ حق دیجئے۔ اس موقع پر موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کی۔ آیات 25 تا 28: ''اے میرے رب میرے لئے میرا سینہ کھول، میرے لئے میرا کام آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ لوگ میری بات سمجھیں''۔ اسی چیز کا دوسرے مقام پر یوں بیان ہے: ''میرا سینہ تنگ ہے اور میری زبان نہیں چل رہی''۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بچپن میں انگارہ زبان پر رکھنے کی وجہ سے آپ کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی تھی، آپ نے اس کے ازالے کی دعا مانگی۔ آپ نے مزید التجا کی کہ میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو اس مشن میں میرا وزیر بنا دیجئے تاکہ مجھے تقویت ملے اور اسے میرا شریکِ کار بنا دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دعا کو قبول فرمالیا۔

آیت نمبر: 38 سے موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت کے حالات کا ذکر ہے۔ نجومیوں نے فرعون کو بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا، جو تمہاری تباہی کا باعث بنے گا، اس لئے فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہر گھر میں پیدا ہونے والے بیٹے کو قتل کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ وہ اپنے

نومولود بیٹے کو ایک صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیں، اللہ کے حکم سے یہ تابوت کنارے لگے گا اور اللہ کے دشمن (فرعون) کے ہاتھ لگ جائے گا، موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ایسا ہی کیا تاکہ رب کی نگرانی میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش ہو۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی بہن دریا کے کنارے صندوق پر نظر رکھے ہوئے چلتی رہی اور جب فرعون کے دربار میں ان کے لئے دودھ پلانے والی کے انتخاب کا وقت آیا تو آپ نے کسی عورت کے پستان کو منہ نہیں لگایا، پھر ایک اجنبی کی حیثیت سے ان کی بہن نے اپنی ماں کی نشاندہی کی اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اُم موسیٰ کو آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا قرار عطا کیا۔ آیت: 43 سے موسیٰ وہارون علیہما السلام کو حکم ہوا کہ آپ دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش ہو چکا ہے، اسے نرمی کے ساتھ دعوتِ حق دو، شاید وہ نصیحت حاصل کر لے۔ موسیٰ وہارون علیہما السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کی کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا۔ اللہ نے فرمایا: تم گھبراؤ نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں، میں سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ وہ دونوں فرعون کے پاس گئے اور کہا کہ ہم اللہ کے رسول ہیں، بنی اسرائیل کو اذیت نہ دو اور انہیں ہمارے ساتھ بھیج دو۔ فرعون نے اللہ کی ذات کے بارے میں موسیٰ وہارون علیہما السلام سے مجادلہ کیا، ان پر جادوگر ہونے کا الزام لگایا اور پھر اپنے جادوگروں کو بلا کر مقررہ دن پر مقابلے کا چیلنج دیا، اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے کہ جادوگر ناکام ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ غالب آیا اور جادوگر اللہ پر ایمان لے آئے اور سجدہ ریز ہو گئے۔ فرعون نے انہیں دھمکی دی کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمت میں کاٹ دوں گا، تمہیں سولی چڑھا کر درخت میں لٹکاؤں گا۔ جادوگروں نے کہا: آپ جو چاہے کیجئے، ہمارے پاس روشن دلیل آچکی۔ انہوں نے کہا: ہم اپنے رب پر ایمان لائے تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے اس جادو کے گناہ کو بھی معاف فرمادے۔

آیت: 77 سے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر نکل جائیں، اُنہیں اللہ کی طرف سے یقین دلایا گیا کہ اُن کے لئے سمندر میں خشک راستہ نکال لیا جائے

گا۔فرعونیوں نے اُن کا تعاقب کیا اور سمندر میں غرق کر دیئے گئے۔اِس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے احسانات کا ایک بار پھر ذکر فرمایا۔آیت نمبر:85 سے سامری کا ذکر ہے کہ اُس نے بنی اسرائیل کو گمراہ کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے جب طور سے واپس آ کر یہ منظر دیکھا تو قوم پر سخت ناراض ہوئے۔سامری نے ایک بچھڑے کا مُجسمہ بنایا،جس سے بیل کی طرح آواز نکلتی تھی اور بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے۔اُنہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ بچھڑا نہ اُن کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔اس مرحلے پر موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام پر بھی ناراض ہوئے اور پھر سامری سے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا؟،سامری نے کہا: میں نے جبرائیل کے نقشِ قدم کی مُٹھی بھر مٹی لی اور اُسے بچھڑے کے مجسمے میں ڈال دیا اور یہ تدبیر میرے نفس نے مجھے سجھائی۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُس سے کہا کہ تو یہاں سے چلا جا زندگی میں تیرے لئے وحشت کی سزا ہے اور تیری سزا کا وقت (آخرت میں) مُقرر ہے اس کے بعد والی آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کتاب اللہ کی حقانیت اور اس سے روگردانی کرنے والوں کیلئے عذاب آخرت کا بیان ہے۔

اِسی تسلسل میں قیامت اور صور پھونکے جانے کا ذکر ہے۔آیت نمبر:105 سے فرمایا: لوگ آپ سے پہاڑوں کے متعلق سوال کرتے ہیں،آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب اُنہیں ریزہ ریزہ کر دے گا اور پوری زمین ہموار میدان کی طرح ہو جائے گی۔آیت: 109 میں قیامت کی ہولناکیوں کا ذکر ہوا اور فرمایا: آج اللہ کی بارگاہ میں کسی کو مجالِ شفاعت نہیں ہوگی،سوائے اُس کے جسے وہ اِذنِ شفاعت عطا کرے اور جس کے قول سے وہ راضی ہو۔

آیت نمبر 110 سے اکڑی گردنوں کے حی و قیوم کے سامنے جھکنے۔ظالموں کے نامراد ہونے اور مومنین صالحین کے کامیاب ہونے کا ذکر ہے۔آیت نمبر 114 میں علم میں اضافے کی دعا تعلیم فرمائی: اے میرے رب میرے علم میں مزید اضافہ فرما۔آیت:115 سے اس بات کا ذکر ہے کہ آدم علیہ السلام جو جنت میں درخت کے قریب چلے گئے،تو یہ اُن کی

بھول اور اجتہادی خطا تھی، انہوں نے قصداً اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی نہیں کی۔ آدم علیہ السلام کو جنت میں داخل کر کے بتایا کہ یہاں نہ بھوک لاحق ہوگی، نہ بے لباسی ہوگی، نہ پیاس لگے گی اور نہ ہی دھوپ کی تپش محسوس ہوگی۔ اور یہ کہ آپ اپنے دشمن شیطان کی چالوں سے بچے رہیں گے۔ اس مقام پر قرآن نے اس موضوع کو پھر بیان کیا کہ شیطان نے وسوسہ ڈالا اور مخلص اور ہمدرد کا روپ اختیار کر کے ان کو بہکایا۔ انہوں نے ممنوعہ درخت سے کھالیا سوان کے ستر کھل گئے اور وہ جنت کے پتوں سے اپنے ستر کو ڈھانپنے لگے۔ پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی اور جنت سے زمین پر بھیج دیا۔

آیت نمبر :124 سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو ہماری یاد سے غافل رہے گا، اس کے لئے معیشت تنگ کر دی جائے گی اور اسے قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا، وہ کہے گا: میرے رب تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں دنیا میں بینا تھا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمہارے پاس میری نشانیاں آئی تھیں، جنہیں تو نے نظر انداز کر دیا تھا، اسی طرح آج تم بھی نظر انداز کر دیئے جاؤ گے۔ آیت :130 سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اِن کی باتوں پر صبر کیجئے، سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح پڑھتے رہیے اور رات کے بعض اوقات میں اور دن کے حصوں میں بھی تسبیح پڑھتے رہیں تا کہ آپ راضی ہو جائیں''۔ مزید فرمایا کہ اپنے اہلِ خانہ کو نماز کا حکم دیں اور خود بھی نماز پر مستقیم رہیں اور نیک انجام صرف تقوے پر کار بند لوگوں کے لئے ہے۔ کفار قریش کے عذاب کے مطالبے کے جواب میں فرمایا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اللہ نے ہلاک کر دیا تھا اور عذاب کا وقت مقرر ہے اور اگر ہم رسول بھیجنے سے پہلے ہلاک کرتے تو یہ لوگ کہتے کہ ہمارے پاس عذاب سے پہلے رسول کیوں نہیں بھیجا۔ اور فرمایا انتظار کرو تم عنقریب جان لو گے کہ سیدھے راستے والے اور ہدایت یافتہ کون لوگ ہیں۔

خلاصہ تفسیر

پارہ:۱۷

سترہویں پارے کے مضامین

سورۃ الانبیاء

سورۃ انبیا مکی سورۃ ہے ترتیب مصحف کے اعتبار سے 21ویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 73ویں سورت ہے۔اس سورت میں کئی انبیاء کا ذکر ہے اس لئے اس کا نام سورۃ الانبیاء رکھا گیا ہے۔

فرمایا: لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا اور وہ غفلت کا شکار ہیں، دین کی باتوں سے روگردانی کر رہے ہیں اور جب بھی نصیحت کی کوئی نئی بات ان کے پاس آتی ہے تو توجہ سے نہیں سنتے، بس کھیل تماشے کے انداز سے سنتے ہیں اور نبی کو اپنے جیسا بشر قرار دیتے ہیں، قرآن کو جادو، خوابِ پریشاں، شاعری اور خود ساختہ کلام قرار دیتے ہیں۔قرآن نے بتایا کہ پہلے رسول بھی حاملینِ وحی تھے، وہ بھی کھاتے پیتے تھے، یعنی بشری تقاضے نبوت و رسالت کی عظمتِ شان کے خلاف نہیں ہیں۔اس کے بعد پچھلی قوموں کی سرکشی اور ان پر نازل کئے جانے والے عذاب کے آنے پر ان کے اقرار جرم اور ندامت کے رائیگاں جانے اور ان کے نیست و نابود ہونے کا ذکر ہے۔

آیت نمبر :22 میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کے نظم وضبط، توازن واعتدال اور حکیمانہ نظام کو توحید کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو ان کا نظام ضرور درہم برہم ہو جاتا، یعنی اگر بہ فرض محال دو خدا ہوتے اور دونوں برابر اختیارات کے مالک ہوتے، تو ان کی ترجیحات اور فیصلوں میں ٹکراؤ ہوتا اور نتیجہ کائنات میں فساد اور تباہی کی شکل میں رونما ہوتا۔ اور اگر ایک کا حکم چل جاتا اور دوسرے کا نہ چلتا، تو جس کا حکم نہ چلتا وہ خدا کیسے کہلاتا۔

آیت نمبر:25 میں فرمایا کہ ہر رسول کی طرف اس امر کی وحی کی جاتی رہی ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور صرف اور صرف وہی عبادت کا حق دار ہے۔

آیت نمبر:30 سے اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ کائنات کے سلسلے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آسمان اور زمین بند تھے، تو ہم نے ان دونوں کو کھول دیا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز بنائی۔آج بھی تخلیقِ کائنات کا ایک سائنسی نظریہ ''بگ بینگ تھیوری'' کہلاتا ہے کہ ایک بہت بڑا آتشیں بگولا تھا، ایک بہت بڑے دھماکے سے وہ پھٹا اور اس کے لامحدود ٹکڑے فضا میں بکھر گئے، جنہوں نے سورج، چاند، ستاروں اور سیاروں کی شکل اختیار کی۔قرآن میں اس کے لئے ''فتق'' اور ''فلک'' کے کلمات آتے ہیں۔اللہ نے زمین میں توازن قائم رکھنے کے لئے اونچے اونچے پہاڑ بنا دیئے اور ان کے درمیان کشادہ راستے بنا دیئے ہیں اور آسمان کو (بغیر ستونوں کے) محفوظ چھت بنا دیا، رات اور سورج اور چاند کو پیدا کیا، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

آیت نمبر:35 میں قانونِ قدرت بیان کیا کہ ''ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے''، یعنی ہر ذی حیات پر موت آئے گی۔آگے چل کر بتایا قیامت اچانک آئے گی، حیرت زدہ کر دے گی اور نہ کوئی اسے رد کر سکے گا اور نہ کسی کو مہلت ملے گی۔

آیت نمبر 42 سے اللہ کے سوا کسی بھی معبود کی نفی کا ذکر ہے آیت نمبر 46 میں فرمایا کہ جو لوگ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اگر ان کو اللہ کے عذاب کا جھونکا بھی لگے تو یہ اپنے ظالم ہونے کا اعتراف کر لیں۔

آیت نمبر:47 میں فرمایا کہ قیامت کے دن عدل کا ترازو قائم ہوگا اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا، ہر ایک کا رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل ہوا، تو وہ ریکارڈ پر آئے گا۔

آیت نمبر:51 سے ایک بار پھر ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کہ وہ اپنے عرفی باپ اور قوم کو بت پرستی پر ملامت کر رہے ہیں اور کہتے ہیں: ''اللہ کی قسم تمہارے پیٹھ پھیر کے جانے کے بعد میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک خفیہ تدبیر کروں گا، سو ابراہیم نے ان کے بڑے بت

کے سوا سب بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے''۔ پھر ایسا ہی ہوا، نمرود کی قوم نے کہا کہ ہمارے بتوں کا یہ حشر کس نے کیا، پھر انہوں نے خود ہی کہا کہ ایک جوان ہے، جس کا نام ابراہیم ہے۔ حضرت ابراہیم کو مجمع عام میں بلا کر ان سے جواب طلبی کی گئی، تو انہوں نے کہا یہ سوال اپنے بڑے بت سے کرو، اگر وہ بول سکتے ہیں۔ اس پر وہ شرمندہ ہوئے اور کہا کہ آپ کو معلوم ہے یہ نہیں بولتے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تم اللہ (معبودِ برحق) کو چھوڑ کر ایسے بتوں کو پوجتے ہو، جو تمہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ اس کے بعد انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے ایک آلاؤ میں ڈالا، مگر اللہ کے حکم سے وہ آگ ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈک اور سلامتی بن گئی۔ اس کے بعد لوط، اسحاق و یعقوب علیہم السلام کا ذکر ہے کہ انہیں امامِ ہدایت بنایا اور نبوت اور علم عطا کیا۔

آیت نمبر: 78 سے حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے ایک مقدمے کا ذکر ہے، جس میں حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک فیصلہ کیا اور سلیمان علیہ السلام نے اس فیصلے کو غلط قرار دیئے بغیر دوسرا فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''ہم نے سلیمان کو (صحیح فیصلہ کرنے کی) سمجھ عطا کی اور ہم نے دونوں کو قوتِ فیصلہ اور علم عطا کیا تھا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک عدالت کے فیصلے پر دوسری عدالت نظرِ ثانی کر سکتی ہے اور ایک فیصلہ اگر بہتر ہے، تو دوسرا بہترین ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد داؤد علیہ السلام کے معجزات کا ذکر ہے، یعنی پہاڑوں کا اُن کے تابع ہونا، پہاڑوں اور پرندوں کا ان کے ساتھ تسبیح کرنا اور جنگ سے حفاظت کے لئے زرہیں بنانا۔ اسی طرح ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا جو ان کے حکم سے ان کے تخت کو اڑا کر لے جاتی تھی اور جنات کو ان کے تابع کر دیا، وہ ان کے حکم سے کام کرتے تھے۔ اس کے بعد ایوب علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انہیں تکلیف سے دو چار ہونا پڑا، انہوں نے اللہ سے دعا کی اور اللہ نے ان کی تکلیف کو دور فرما دیا اور پہلے سے بھی زیادہ اہل و عیال اور نعمتوں سے نواز دیا۔ پھر اسماعیل، ادریس، ذوالکفل، ذوالنون (یونس) اور زکریا علیہم السلام کا ذکر ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے اور پھر اللہ کی تقدیر سے دریا میں ڈال دیئے گئے، دریا میں ان کو

مچھلی نے نگل لیا اور انہوں نے تہ در تہ ظلمتوں میں اللہ سے ان کلمات کے ساتھ توبہ کی: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ''۔ اسی کو ''آیتِ کریمہ'' کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو ہم نے ان کی پکار سن لی اور انہیں غم سے نجات عطا کی اور ہم اسی طرح مومنوں کو نجات دیتے ہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کے لئے دعا کی، اللہ نے ان کو بڑھاپے میں یحییٰ علیہ السلام عطا کئے، ان کی دعا کے کلمات یہ تھے: ''رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ''، اے میرے رب مجھے اکیلا نہ چھوڑنا، تو ہی سب سے بہتر وارث ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم رضی اللہ عنہا کا ذکر ہے۔

دعائے قضائے حاجات:

''حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے والد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ سے وظیفۂ قضاءِ حاجات نقل کیا ہے کہ جو شخص مصیبت میں مبتلاء ہو جائے وہ چار رکعت نماز نفل کی نیت باندھے، پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سو مرتبہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ o فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُنجِي الْمُؤْمِنِينَ''، دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سو مرتبہ ''رَبِّ إِنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ'' پڑھے۔ تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سو مرتبہ ''وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ''، چوتھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سو مرتبہ ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ'' پڑھے اور سلام پھیرنے کے بعد سو مرتبہ ''رَبِّ إِنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ'' پڑھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز بیان کرتے ہیں کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ چاروں آیتیں اسمِ اعظم ہیں اور ان کے وسیلے سے جو دعا کی جائے وہ قبول ہوتی ہے''۔

آیت نمبر 94 میں مومنین صالحین کے اعمال رایگاں نہ جانے اور اس کے لکھنے کا ذکر ہے۔ آیت نمبر 96 میں یاجوج اور ماجوج کا ذکر ہے، آیت نمبر 98 سے مشرکین اور ان کے معبودوں کا جہنم کا ایندھن بننے کا بیان ہے اور یہ کہ اگر یہ الٰہ ہوتے تو جہنم میں کیوں داخل ہوتے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ بھلائی کو مقدر فرمادے، وہی جہنم سے دور ہوں گے،

ان کے لیے ہر قسم کی نعمتیں ہوں گی اور ان کے لیے قیامت کے دن گھبراہٹ سے نجات ہے اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے۔

سورۂ الانبیاء کے آخری رکوع میں آیت نمبر: 107 میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ کریم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو ایک بے مثل و بے مثال اعزاز سے نواز اور ارشاد فرمایا: ''وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ''، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی ذات کو ''رب العالمین'' فرمایا اور نبی کریم ﷺ کو ''رحمۃ للعالمین''، یعنی کائنات کے ہر ذرے کے لئے اللہ تعالیٰ کی ''ربوبیت'' اور اس کے حبیبِ کریم ﷺ کی ''رحمت'' ثابت ہے۔

اس سورت کی آیت نمبر 108 میں اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں کو زمین کی حکومت دینے کا زبور میں کیے گئے وعدے کا ذکر ہے۔

سورۃ الحج

سورۃ الحج مدنی سورت ہے، ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے ۲۲ ویں جب کہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے ۱۰۳ ویں سورت ہے۔ اس سورت کی ایک آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ کے حکم سے لوگوں کو حج کا اعلان کرنے کا ذکر ہے، اس لیے اس کو سورۃ الحج کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حیات بعد الموت، وقوعِ قیامت، اجازت جہاد اور پچھلی امتوں کے احوال سے عبرت حاصل کرنے کا بیان ہے۔

اس کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیتے ہوئے قیامت کی ہولناکیوں کو بیان کیا کہ قیامت ایک زلزلے کے طور پر برپا ہوگی اور اُس کا منظر اس قدر دہشت ناک ہوگا کہ دودھ پلانے والی مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں کو فراموش کر دیں گی، ہر حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے گا، لوگ مدہوش نظر آئیں گے جبکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے لیکن اللہ کے عذاب کی شدت کے باعث اُن کی یہ کیفیت ہوگی۔ آیت نمبر: 03 سے بتایا کہ بعض لوگ بغیر علم کے اللہ کے متعلق جھگڑا کرتے ہیں اور ہر اُس سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں، جس کے متعلق (لوحِ محفوظ) میں لکھا جا چکا ہے کہ جو اُس کو دوست بنائے گا، وہ اُس کو گمراہ

کر دے گا اور اُس کو بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف لے جائے گا۔

آیت:05 سے اللہ تعالیٰ نے حشر و نشر کی صحت اور امکان پر تخلیقِ انسانی اور انسانی عمر کے مراحل کے ذریعے استدلال فرمایا۔

آیت:9 میں (از راہِ تکبر) اپنی گردن موڑنے والے شخص کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اللہ کی راہ سے گمراہ کرنے والا ہے، اِسی باعث اس کے لئے دنیا میں ذلت اور قیامت کے دن جلانے والا عذاب ہے اور یہ اُس کی اُن بداعمالیوں کی سزا ہے، جو اُس نے آگے بھیجیں اور بے شک اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

آیت:11 سے اُن لوگوں کا ذکر کیا کہ جن کا مقصود دنیاوی مفادات ہیں، اگر اُنہیں کوئی بھلائی مل جائے تو وہ دین پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش آجائے، تو منہ کے بل پلٹ جاتے ہیں۔ ایسوں نے ہی دنیا اور آخرت کا نقصان سمیٹا، ایسے لوگ اُن کی عبادت کرتے ہیں جو نہ اُنہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نفع دے سکتے ہیں، یہی دور کی گمراہی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایمان لانے والے اور اَعمالِ صالحہ انجام دینے والے ایسی جنتوں میں داخل ہوں گے، جن کے نیچے دریا بہتے ہیں اور اللہ جس کا ارادہ کرتا ہے، اُس کو کر کے رہتا ہے۔ آیت:15 سے فرمایا کہ جس کا یہ خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اپنے رسول کی ہرگز مدد نہیں کرے گا، تو اُس کو چاہیے کہ وہ اونچی جگہ پر رَسّا باندھ کر (اپنے گلے میں ڈال لے) پھر اُس رَسّے کو کاٹ لے، پھر یہ دیکھے کہ آیا اُس کی یہ تدبیر اُس کے غضب اور غصے کو دور کرتی ہے (یا نہیں)۔ اسی طرح ہم نے قرآن کو واضح آیتوں کے ساتھ نازل کیا، بے شک اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ آیت:17 میں فرمایا کہ دنیا میں بظاہر اہل ایمان، یہود، صابی، عیسائی، آتش پرست اور شرک کرنے والے ملے جلے سے ہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کے درمیان فیصلہ فرمائے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔

آیت:18 میں بتایا گیا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، سورج، چاند،

ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بہت سے انسان اللہ ہی کے لئے سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے وہ بھی ہیں جن پر عذاب مقدر ہو چکا ہے اور جس کو اللہ ذلیل کر دے، اُس کو کوئی عزت دینے والا نہیں۔

آیت:19 سے مومنین اور کفار ہر دو فریق کا ذکر ہے، کفار کے لیے دردناک عذاب اور مومنین کے لیے اخروی نجات اور نعمتوں کا ذکر ہے۔

آیت:25 سے فرمایا: جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے اور اُس مسجدِ حرام سے روکنے لگے، جس کو ہم نے لوگوں کے لئے مساوی بنایا ہے، خواہ وہ مقامی ہوں یا باہر سے آئیں۔ جو اس مسجد (حرام) میں ظلم کے ساتھ زیادتی کا ارادہ کرے گا، ہم اُس کو دردناک عذاب چکھائیں گے۔

آیت:27 سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ لوگوں میں بلند آواز سے حج کا اعلان کیجئے وہ آپ کے پاس دور دراز راستوں سے پیدل اور ہر دبلے اونٹ پر سوار ہو کر آئیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر ندا کی: اے لوگو! اللہ نے تمہارے اوپر حج فرض کر دیا، اللہ تعالیٰ نے یہ ندا اُن سب کو سنا دی جو مردوں کی پشتوں میں اور عورتوں کے رحموں میں تھے، اُن سب نے اس ندا کا جواب دیا، جو اللہ کے علم میں قیامت تک حج کرنے والے تھے۔ اُنہوں نے کہا: ''لبیک اللھم لبیک''۔

آیت:28 میں مقررہ ایام (یومِ نحر اور بعد کے دو دنوں) میں قربانی کرنے کا حکم دیا گیا۔ آیت:29 میں ایسی نذروں کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا جو معصیت پر مبنی نہ ہوں اور اللہ کے گھر کے طواف کا حکم بھی۔

آیت:30 میں حرمت اللہ کی تعظیم، حرام قطعی کے سوا تمام حلال جانوروں کی حلت، بتوں کی نجاست اور جھوٹی بات سے اجتناب کرنے کا حکم ہے۔

آیت:31 میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دینے والے کی مثال کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایسا شخص گویا آسمان سے گرا، پھر اُسے مردار خور پرندوں نے جکڑ لیا یا آندھی نے

اُس کو کسی دور کی جگہ پھینک دیا ہو۔آیت:32 میں فرمایا کہ جس نے اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کی ،تو بے شک یہ دلوں کے تقوے کی علامت ہے۔

آیت:34 سے فرمایا: ہم نے ہر اُمت کے لئے قربانی کا طریقہ مقرر کیا تا کہ وہ اللہ کے دیئے ہوئے بے زبان چوپایوں پر(ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں ،پس تمہاری عبادت کا مستحق ایک اللہ ہی ہے۔اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے اللہ کی نشانیوں میں سے بنادیا ہے،ان میں تمہارے لئے بھلائی ہے۔پس تم ان کو قطار میں کھڑا کر کے (ان کے نحر کرنے کے وقت) اللہ کا نام لو۔پھر اُن سے خود بھی کھاؤ اور محتاج اور مانگنے والوں کو بھی کھلاؤ۔

آیت نمبر:37 میں عبادات میں اخلاص کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ قربانی کا مقصد گوشت پوست کا حصول نہیں بلکہ اس فعلِ قربانی سے جو تقویٰ حاصل ہوتا ہے،وہ قربانی کی اصل روح ہے،اگر چہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کی امت کو قربانی کے گوشت پوست سے استفادے کی اجازت دی ہے۔

آیت نمبر:39 میں مظلوم مہاجر مسلمانوں سے نصرت کا وعدہ کر کے اپنے دفاع میں لڑنے کی اجازت کا بیان ہے۔

آیت نمبر:39 تا 41 میں بتایا کہ یہ سنتِ الٰہیہ ہے کہ وہ مجاہدین کے ذریعے ظالموں کا قلع قمع فرماتا ہے،اگر ایسا نہ ہوتا تو راہبوں کی خانقاہیں ،کلیسا اور یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مسلمانوں کی مساجد کو ویران کر دیا جاتا۔اگلی آیت میں حکومتِ اسلامیہ کے قیام کا مقصد نظامِ صلوٰۃ وزکوٰۃ کے قیام ،نیکیوں کے پھیلاؤ اور برائیوں کے سدِ باب کو قرار دیا۔

آیت نمبر:42 سے سرکارِ دو عالم ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ سے پہلے قوم نوح ،قوم عاد ،قوم ثمود ،قوم ابراہیم ،قوم لوط ، اصحابِ مدین اور قوم موسیٰ نے بھی اپنے انبیاء کی تکذیب کی تھی ،مہلت کے باوجود وہ باز نہ آنے پر ان کی پکڑ ہوئی اور ان کی آبادیاں تباہ وبرباد ہوئیں۔

آیت نمبر:46 میں فرمایا کہ پچھلی امتوں کے آثار کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنی چاہئے، لیکن اس کے لئے سوچنے سمجھنے اور مشاہدے کی صلاحیتوں کا صالح ہونا ضروری ہے۔

آیت نمبر:48 میں کفار کے عذاب کے معاملے میں جلدی کرنے، مہلت ملنے سے غلط فہمی کا شکار ہونے پر فرمایا کہ عذاب تو آکر ہی رہے گا، اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

آیت نمبر:49 میں رسول اللہ ﷺ کے تمام روئے زمین کے انسانوں کے لیے نذیر ہونے کا بیان ہے۔

آیت نمبر:52 سے فرمایا کہ آپ سے پہلے انبیاء جب امت کے سامنے آیاتِ الٰہی پڑھتے تو شیطان امت کے افراد کے دلوں میں شبہات ڈال کر عمل سے روکتے اور یہ وسوسہ اندازی بیمار اور سخت دل والوں کے لیے آزمائش اور اہلِ علم کے ایمان میں مضبوطی کا سبب بنتا ہے۔

آیت نمبر:56 میں فرمایا کہ قیامت کے دن حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی، وہی لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

آیت نمبر:61 سے نظامِ گردشِ لیل ونہار، بارش کے نزول اور اس کے نتیجے میں سبزے کے اُگنے کو اپنی قدرت کی نشانیاں قرار دیا۔

آیت نمبر:65 میں زمین کی تمام اشیاء کی تسخیر، کشتیوں کی سمندر میں روانی، آسمان کا زمین پر گرنے سے روکے رکھنے کی نعمتوں کا بیان فرمایا۔ حیات، موت اور پھر اخروی حیات کو ذکر کر کے انسان کے ناشکرے پن کا بیان فرمایا۔

آیت نمبر:67 میں ہر قوم کے لیے وقتی شریعت مقرر کرنے اور اس پر ایک وقت تک عمل ہونے، اسلام کی دائمی اور ابدی تعلیمات آنے کے بعد بغیر کسی جھگڑے کے اس کی پیروی کرنے اور اس کی طرف دعوت دینے کا بیان ہے۔

آیت نمبر:73 میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے بتوں کی بے بسی کو بیان فرمایا کہ وہ سب

مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے، تو اس سے واپس نہیں لے سکتے، بت اور ان کے پجاری دونوں کمزور ہیں۔

آیت نمبر: 75 میں فرمایا کہ منصب رسالت کوئی فرمائشی منصب نہیں، اللہ تعالیٰ خود رسولوں کو منتخب فرماتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔

آیت نمبر: 77 میں ہمہ وقت بندگی کا حکم فرمایا ہے۔

آخری آیت میں دین کی سربلندی کے لیے سرتوڑ کوشش کرنے، دین کے معاملے میں تنگی نہ ہونے، ملتِ ابراہیم کی پیروی کرنے اور آخر میں نماز قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور اللہ تعالیٰ کے دامنِ رحمت کو مضبوطی سے پکڑنے کا بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان چیزوں سے وابستہ ہے۔

خلاصہ تفسیر

پارہ:۱۸

اٹھارہویں پارے کے مضامین

سورۃ المؤمنون

سورۃ المؤمنون مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 23ویں جب کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے 74ویں سورت ہے۔ اس سورت کا نام ''المؤمنون'' پہلی آیت میں مذکور ہے، اس سورت کی ابتدا میں اسلامی پاکیزہ معاشرے کے قیام کے لیے ناگزیر مومنانہ صفات اور اخلاقی خصائل کا ذکر فرمایا ہے، اس سورت میں دلائلِ توحید، رَدِ شرک، تخلیقِ انسانی کے مراحل اور پچھلی امتوں کی ہلاکت کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔

سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات تعلیماتِ اسلامی کی جامع ہیں، ان میں فلاح یافتہ اہلِ ایمان کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں: نمازوں میں خشوع وخضوع، ہر قسم کی بیہودہ باتوں سے لاتعلقی، زکوٰۃ کی ادائیگی، اپنی پاکدامنی کی حفاظت، امانت اور عہد کی پاسداری اور نمازوں کی پابندی، آخر میں فرمایا کہ ان صفات کے حامل اہلِ ایمان ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

آیت نمبر: 13 سے انسانی تخلیق کے مدارج کو بیان کیا، یعنی نطفہ، پھر علقہ (جما ہوا خون)، پھر گوشت کا لوتھڑا اور پھر گوشت اور ہڈیوں پر مشتمل جسم کی تشکیل۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہی خالق ومالک موت کے بعد آخرت میں دوبارہ زندہ کرے گا۔

آیت نمبر: 17 سے اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر اپنی قدرت کی نشانیوں کو بیان کیا، یعنی آسمان کے سات طبقات، مناسب مقدار میں بارش کے پانی کا نزول اور اس کا زمین میں قرار، پھر اس کے ذریعے کھجوروں، انگوروں اور طرح طرح کے پھلوں کی پیدائش اور خاص طور پر زیتون کے تیل کا ذکر فرمایا جو ایک مکمل خوراک ہے۔ اس کے بعد چوپایوں، ان کے

دودھ اور دیگر منافع کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:27 سے ایک بار پھر نوح علیہ السلام کے کشتی بنانے اور طوفان نوح کا ذکر ہے اور نوح علیہ السلام کو یہ حکم کہ ظالموں کے بارے میں آپ سفارش نہیں کریں اور یہ بھی حکم دیا کہ کشتی پر بیٹھ کر یہ دعا پڑھیں: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ٥ رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ''۔

آیت نمبر:33 سے بیان ہوا کہ ہود علیہ السلام کی قوم کے کفار، منکرینِ آخرت اور خوشحال لوگوں نے نبی پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو ہم جیسے بشر ہیں، عام انسانوں کی طرح کھاتے اور پیتے ہیں اور اپنے جیسے بشر کی اطاعت کرنا بڑے خسارے کی بات ہے۔ یہ حیات بعد الموت کا وعدہ کرتے ہیں جو نا قابلِ یقین بات ہے۔ انہوں نے کہا جو کچھ ہے، اسی دنیا کی زندگی میں اور مرنے کے بعد کس نے جینا ہے۔ اس کے بعد ان کے نبی علیہ السلام کی دعا اور کفار کے ہلاک ہونے کا ذکر ہے۔ اگلی آیات میں نظامِ رسالت کے تسلسل کا ذکر ہے، موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی بعثت کا ذکر ہے اور قومِ موسیٰ کی سرکشی کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:52 سے دین اسلام کے ایک ہی حق دین ہونے، فرقہ بازوں کا اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے، ان کے تمول سے خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا بیان ہے۔

آیت نمبر:56 سے فرمایا کہ وہ اہلِ ایمان جن کے دلوں میں خشیتِ الٰہی ہے، جو شرک نہیں کرتے، جو اللہ کی راہ میں عاجزی کے ساتھ خرچ کرتے ہیں اور جنہیں قیامت پر ایمان ہے وہی لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور سبقت کرتے ہیں۔

آیت نمبر:64 سے کفار کی پکڑ اور اس پر ان کے چلّانے کا بیان ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے روگردانی کرتے اور تکبر اختیار کر کے قرآن کو افسانہ کہہ کر بکواس کرتے تھے۔

آیت نمبر:78 سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر ہے کہ اس نے انسان کو سننے کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سمجھنے کے لئے دل عطا کیا، گردش لیل ونہار اور زندگی اور

موت اسی کے قبضہ وقدرت میں ہے۔

آیت نمبر:85 سے اللہ تعالیٰ نے استفہامی انداز میں بیان فرمایا کہ اگر ان منکرینِ آخرت سے پوچھا جائے کہ زمین اور اس کے خزانوں کا مالک کون ہے، سات آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے، ہر چیز کی بادشاہت کس کے قبضے میں ہے کہ جس کا مقابل کوئی نہیں، تو ہر سوال کے جواب میں کہیں گے کہ اللہ، تو پھر آپ ان سے پوچھئے کہ کیا تم سحر زدہ ہو، یعنی پھر اس مالک الملک پر ایمان کیوں نہیں لاتے ، اس کے احکام کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟۔

آیت نمبر:91 سے بیان ہوا کہ اللہ کی کوئی اولاد نہیں، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، اگر ایسا ہوتا کہ ایک سے زیادہ خدا ہوتے، تو ہر ایک اپنے لشکر کو لے کر دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرتا، حالانکہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔ سورت کے آخر میں بیان فرمایا کہ انسان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا اور اللہ کی بارگاہ میں آخری جوابدہی کے لئے لوٹ کر جانا ہے۔

آیت نمبر:96 میں برائی کو اچھائی سے دفع کرنے کا بیان فرمایا۔ اس کے بعد اپنے حبیبِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ہر قسم کے شیطان کے شر سے پناہ مانگنے کا طریقہ تعلیم فرمایا۔

آیت نمبر:99 سے کفار کی موت کے وقت کی ندامت اور ان کے دنیا میں واپس جا کر نیک عمل کرنے جیسی ناممکن باتوں کی تمنا کرنے کا بیان ہے۔

آیت نمبر:101 سے قیامت کے دن تمام رشتوں کے ختم ہونے اور اعمال کا سبب نجات ہونے کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:106 سے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے والوں کی گفتگو کہ ہماری بدبختی نے ہم کو گمراہ کیا اور اگر ایک بار ہم نکل گئے تو دوبارہ لوٹ کر نافرمانی نہ کرنے کا بیان ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور میرے ساتھ بات نہ کرو، تم دنیا

میں مومن بندوں کا مذاق اڑاتے تھے جو یہ دعا پڑھتے تھے: ''رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ''، ان کو ان کے صبر کا بدلہ کامیابی کی صورت میں ملا ہے۔

آیت نمبر: 112 میں فرمایا کہ جب ان سے زمین میں گزاری ہوئی مدت کے بارے میں پوچھا جائے گا تو یہ کہیں گے کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ گزارا ہے۔

آخری آیت میں امتِ محمدیہ کو استغفار کرنے اور رحم کی دعا مانگنے کا حکم ہے جو کہ یہ ہے: ''رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ''۔

سورۃ النور

سورۃ النور مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 24ویں جب کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے 102ویں سورت ہے۔

اس سورت کی ایک آیت میں نور کا ذکر ہے، یا یہ کہ اس سورت میں تمام انسانوں کے تمدنی اور اجتماعی حیات کے اصول و احکام منور اور روشن کر دیے ہیں، اس لیے اس سورت کا نام ''النور'' رکھا گیا۔

اس سورت میں زنا کی حد، مشرکین سے نکاح کی ممانعت، حد قذف، لعان، منافقین کی سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگائی گئی تہمت کا جواب، اپنے اور پرائے گھروں میں داخل ہونے کے آداب و اخلاقیات، پردے کے متعلق احکام، نکاح کے احکام، بارگاہِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آداب اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بیان ہے۔

سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے خانگی اور معاشرتی اَحکام کو بیان فرمایا۔ ابتدائی آیات میں زنا کرنے والے (غیر شادی شدہ) مرد و عورت کی سزا کو بیان کیا کہ اُن کی سزا سو کوڑے ہیں اور (صاحبان اقتدار) اہلِ ایمان کو کہا گیا کہ تمہیں اِس سزا کے نفاذ میں اُن پر رحم نہیں آنا چاہئے اور تمہاری ایک جماعت کو اِس سزا کے نفاذ کے وقت موجود رہنا چاہئے۔

آیت: 4 سے بیان کیا گیا کہ جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر (اُس کے ثبوت میں) چار گواہ نہ پیش کر سکیں، تو تم اُن کو 80 کوڑے مارو اور اُن کی شہادت

کو کبھی بھی قبول نہ کرو اور یہی لوگ فاسق ہیں۔سوائے اُن لوگوں کے جو اِس کے بعد اللہ تعالیٰ سے توبہ اور اصلاح کر لیں۔آیت:6 میں یہ ضابطہ بیان فرمایا: اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو زنا کی تہمت لگائے اور اُس کے ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کر سکے اور اُس کی بیوی اِس تہمت کا انکار کرے، تو فریقین ایک دوسرے پر لعان کریں، شوہر چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے: بیشک وہ ضرور سچوں میں سے ہے اور پانچویں بار یہ کہے: اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو، تو اُس پر اللہ کی لعنت۔

اور عورت سے حدِ زنا اِس طرح دور ہو سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ اُس کا خاوند یقیناً جھوٹوں میں سے ہے اور پانچویں بار کہے کہ اگر اُس کا خاوند سچوں میں سے ہو تو اُس (عورت) پر اللہ کا غضب نازل ہو۔

آیت:11 تا16 تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو منافقین نے تہمت لگائی تھی، اُس کی جانب اشارہ فرمایا اور اُن چیزوں کا سدِّ باب کیا، جو معاشرے کی بگاڑ کا باعث ہو سکتی ہیں اور جن منافقین نے یہ تہمت لگائی تھی، اُن کا پردہ فاش کیا، جو مسلمان منافقین کے بچھائے ہوئے حسین جال میں پھنس گئے تھے، اُن پر بھی عتاب فرمایا اور اُن کو تنبیہ کی کہ وہ آئندہ ہوشیار رہیں اور منافقین کے کہنے میں نہ آئیں۔منافق مسلمانوں کی عزت و ناموس کو برباد کرنے کے دَرپے ہیں، اِس لئے مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ سنی سنائی بات کو آگے بڑھا دیں بلکہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو اپنوں کے متعلق نیک گمان کرنا چاہئے اور اگر تہمت لگانے والے اُس تہمت پر چار گواہ نہ لائیں، تو وہی اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں اور اگر دنیا و آخرت میں تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی، تو تم نے جس (تہمت) کا چرچا کیا تھا، اُس کی وجہ سے تمہیں بہت بڑا عذاب پہنچتا۔تم نے اُس کو سنتے ہی یہ کیوں نہ کہا کہ ایسی بات کرنا ہمارے لئے جائز نہیں ہے، اے اللہ! تو پاک ہے، یہ تو بہت سنگین بہتان ہے۔

آیت:19 سے یہ فرمایا کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی

بات پھیلے، اُن کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ آیت: 21 سے فرمایا کہ اے ایمان والو! شیطان کے قدم بقدم نہ چلو، کیونکہ جو شخص شیطان کے قدم بقدم چلے گا، تو بے شک شیطان بے حیائی (اور برائی) کے کاموں پر اُبھارتا ہے۔

آیت نمبر: 22 میں رشتہ داروں اور مسکینوں کی دل آزاری کے سبب ان پر خرچ کرنے سے ہاتھ نہ روکنے، معاف کرنے اور درگزر کرنے کا بیان ہے۔

آیت: 23 سے پاکدامن، بے خبر، ایمان والی عورتوں پر (بدکاری) کی تہمت لگانے والوں کے لئے دنیا و آخرت میں لعنت اور بہت بڑے عذاب کا بیان ہوا ہے، جس دن اُن کے خلاف اُن کی زبانیں، اُن کے ہاتھ اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ دنیا میں کیا کرتے رہے ہیں، اُس دن اللہ تعالیٰ حق اور انصاف کے ساتھ اُن کو پورا بدلہ دے گا۔ آیت: 26 میں فرمایا کہ بری باتیں برے لوگوں کے لئے اور برے لوگ بری باتوں کے لئے ہیں اور اچھی باتیں اچھے لوگوں کے لئے اور اچھے لوگ اچھی باتوں کے لئے۔ وہ (اچھے لوگ) اُن تہمتوں سے بری ہیں۔ آیت: 27 سے فرمایا کہ مسلمانوں کے لئے ایک دوسرے کے گھروں میں بلا اجازت داخل ہونا جائز نہیں اور اجازت لے کر داخل ہونے پر گھر والوں کو سلام کریں اور اگر اُن سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ، تو اُنہیں واپس چلے جانا چاہئے۔ ہاں! اگر کسی گھر میں لوگوں کی رہائش نہ ہو اور وہاں مسلمانوں کی کوئی چیز ہو تو وہاں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں (جیسے پبلک مقامات)۔

آیت: 30 سے مسلمان مردوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اسی طرح مسلمان خواتین کو حکم دیا کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زیبائش کو ظاہر نہ کریں اور جسم کے جس حصے کا پردہ ممکن نہ ہو، جیسے ہاتھ اور پیر، ان کے سوا باقی جسم کو ڈھانپ کر رکھیں اور اپنے گریبانوں کو دوپٹوں سے چھپائے رکھیں اور اپنے خاوند، محارم اور اپنے نوکروں اور کم عمر ناسمجھ بچوں کے سوا اپنے بناؤ سنگھار کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں اور زمین پر زور سے پاؤں

مار کر نہ چلیں تا کہ اُن کی پوشیدہ زینت ظاہر نہ ہو اور ان تمام برائیوں سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے میں کامیابی ہے۔آیت :32 سے فرمایا کہ تم اپنے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کردو اور اپنے باصلاحیت غلاموں اور باندیوں کا، اگر وہ فقیر ہوں تو اللہ اُن کو اپنے فضل سے غنی کردے گا۔جو لوگ نکاح کی گنجائش نہیں رکھتے، وہ اپنی عفت اور پاکیزگی برقرار رکھیں حتیٰ کہ اللہ اُنہیں اپنے فضل سے غنی کردے۔

آیت نمبر :33 میں مکاتبت کی خواہش رکھنے والے غلاموں سے معاملہ کرنے کا بیان فرمایا ہے۔اس کے بعد لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کرنے کی ممانعت کا بیان ہے، آج کل گداگری کے ٹھیکیداری سسٹم میں بھی یہی اکراہ کی صورت پائی جاتی ہے (یعنی ان کو سوال جیسے گناہ پر مجبور کیا جاتا ہے)، یہ سراسر حرام اور انسانی اقدار کے منافی ہے۔

آیت نمبر 35 میں فرمایا کہ اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے اور پھر اس نور کی وضاحت کی گئی ہے۔

آیت :37 سے اللہ تعالیٰ نے اپنے گھروں میں اللہ کا ذکر کرنے پر اُن مسلمانوں کی تعریف فرمائی، جن کو تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر کرنے، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی، وہ اُس دن سے ڈرتے ہیں، جس میں دل اور آنکھیں اُلٹ پلٹ جائیں گے۔

آیت :39 سے کافروں کے اَعمال کی مثال کو اِس طرح بیان کیا کہ وہ زمین میں چمکتی ہوئی اُس ریت کی طرح ہیں، جس کو پیاسا دور سے پانی گمان کرتا ہے، حتّٰی کہ جب وہ اُس کے قریب پہنچتا ہے، تو کچھ نہیں پاتا اور وہ اللہ کو اپنے قریب پاتا ہے جو اُس کو اُس کا پورا حساب چکا دیتا ہے یا (اُن کے اعمال) گہرے سمندر کی تاریکیوں کے مثل ہیں، جن کو تہہ در تہہ موج ڈھانپے ہوئے ہے۔اُس کی بعض تاریکیاں بعض سے زیادہ ہیں، جب کوئی اپنا ہاتھ نکالے تو اُس کو دیکھ نہ سکے اور جس کے لئے اللہ نور نہ بنائے، اُس کے لئے کوئی نور نہیں ہے۔

آیت :43 سے فرمایا کہ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو چلاتا ہے، پھر اُن کو

(باہم) جوڑ دیتا ہے، پھر اُن کو تہہ دَر تہہ کر دیتا ہے۔ پھر آپ دیکھتے ہیں کہ اُن کے درمیان سے بارش ہوتی ہے اور اللہ آسمانوں کی طرف سے پہاڑوں سے اولے نازل فرماتا ہے۔ سووہ جس پر چاہے اُن اولوں کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہے اُن کو پھیر دیتا ہے۔ قریب ہے کہ اُس کی بجلی کی چمک آنکھوں کی بینائی کو زائل کر دے۔ اللہ دن اور رات کو بدلتا رہتا ہے، بے شک اِس میں غور کرنے والوں کے لئے بڑی نصیحت ہے۔

آیت نمبر: 45 میں تمام جانوروں کو پانی سے پیدا کرنے اور جانوروں کی مختلف اقسام کا ذکر کر کے اپنی بے مثال خالقیت کا ذکر فرمایا۔

آیت: 47 سے منافقین کی دوہری پالیسی پر تنبیہ فرمائی کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے اور ہم نے اِطاعت کی، پھر جب اُنہیں اللہ اور اُس کے رسول کی طرف دعوت دی جاتی ہے، تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ فرمادیں، تو اُس وقت اُن میں سے ایک فریق اعراض کرنے والا ہوتا ہے اور اگر اُن کے حق میں فیصلہ ہو، تو وہ آپ کی فرمانبرداری کرتے چلے آتے ہیں۔ آیا اُن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ اِس سے ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اُس کا رسول اُن پر ظلم کریں گے اور مومن تو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی بات مان کر اطاعت کرتے ہیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

آیت نمبر: 51 میں فرمایا: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں اور اس کی نافرمانی سے بچے رہتے ہیں، تو وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ اس آیت کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ جوامع الکلم ہے اور ایک رومی نومسلم نے اپنے ایمان لانے کا سبب اس آیت کا تمام کتب مقدسہ کی تعلیمات اور احکامات کا جامع ہونا بتایا ہے۔

آیت: 53 میں فرمایا: منافق اللہ کی خوب پکی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ (جہاد کے لئے) ضرور نکلیں گے، آپ کہیے کہ زیادہ قسمیں نہ کھاؤ، تمہاری اطاعت (کی حقیقت)

ہمیں معلوم ہے۔آیت:55میں اہلِ ایمان کو یہ بشارت دی کہ اللہ تمہیں زمین میں ضرور خلافت عطافرمائے گااور ضرور بالضرور اس دین کو محکم اور مضبوط کر دے گا۔تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور (اخلاص کے ساتھ) رسول کی اطاعت پر ڈٹے رہو، اللہ تمہارے خوف اور پریشانی کو حالتِ امن اور سکون سے بدل دے گا۔

آیت:58سے پردے کے اُحکام کی وضاحت فرمائی کہ تمہارے نوکروں اور نابالغ بچوں کے لئے بھی تین اوقات میں اجازت حاصل کرنی ضروری ہے:(۱) نمازِ فجر سے پہلے۔(۲) ظہر کے وقت، جب تم اپنے (فالتو) کپڑے اتار دیتے ہو۔(۳) عشاء کی نماز کے بعد۔جب تمہارے لڑکے بلوغت کی عمر کو پہنچ جائیں ،تو اُن کو بھی اجازت طلب کر کے آنا چاہئے، جیسا کہ اُن سے پہلے مرد اجازت طلب کرتے ہیں۔

آیت:60سے فرمایا: وہ بوڑھی عورتیں جو نکاح کی اُمید نہیں رکھتیں ،اُن پر اضافی پردہ وحجاب کا اہتمام نہ کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے،لیکن اگر وہ اِس میں بھی احتیاط کریں تو اُن کے لئے زیادہ افضل ہے۔

آیت:61میں معذور لوگوں اور دیگر مسلمانوں کو اپنے والدین ،رشتے داروں اور دوستوں کے گھر سے کچھ کھاپی لینے کی اجازت دی گئی اور اس کے بعد اکیلے اور مل کر کھانے کی اجازت اور گھر داخل ہوتے وقت گھر والوں کو سلام کرنے کا بیان ہے۔

آیت:62میں انتظامی آداب کا بیان فرمایا گیا ہے کہ مومنین صرف وہی ہیں، جو اللہ اور اُس کے رسول پر حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اور جب وہ کسی مجتمع ہونے والی مہم میں رسول کے ساتھ ہوتے ہیں، تو اُن کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاتے اور اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! جو لوگ آپ سے اپنے کام کے سلسلے میں اجازت طلب کرتے ہیں، آپ اُن میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیں اور اُن کے لئے اللہ سے مغفرت طلب کریں۔

آیت:63میں بارگاہِ رسالت کے آدابِ گفتگو اور اندازِ خطاب کا ذکر فرمایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر مرتب ہونے والے عذاب سے ڈرایا گیا کہ تم رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کے بلانے کو ایسا قرار نہ دو ،جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو اور جو لوگ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں ،وہ اِس سے ڈریں کہ اُنہیں کوئی مصیبت پہنچ جائے یا اُنہیں کوئی دردناک عذاب پہنچ جائے۔ بے شک اللہ ہی کی ملکیت ہے ،جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔اللہ کو تمہارے حال کا خوب علم ہے۔اور جس دن وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے ،تو وہ اُن کے کئے ہوئے سب کاموں کی خبر دے گا اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

سورۃ الفرقان

سورۃ الفرقان مکی سورت ہے ،ترتیب مصحف کے اعتبار سے پچیسویں جب کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے بیالیسویں سورت ہے۔اس سورت کی ابتدا میں الفرقان کا ذکر ہونے کی وجہ سے اس کا نام ''سورۃ الفرقان'' ہے۔ اس سورت میں توحید، رسالت ، جلالتِ قرآن ، رَدِ شرک اور آخرت کے دلائل کا ذکر ہے ،کافروں کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے ،نیکوکاروں کی مدح وستائش اور بدکاروں پر نزول عذاب کا بیان ہے۔

سورۂ فرقان کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی جلالت ،توحید ،اولاد کی نسبت اور شرک سے براءت کا ذکر ہے۔کفار کے باطل معبودوں کے مخلوق ہونے ،اپنے لئے نفع اور نقصان کا مالک نہ ہونے اور موت وحیات کا مالک نہ ہونے کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:04 سے اس بات کا بیان ہے کہ کفار نے قرآن مجید کے کلامِ الٰہی ہونے کا انکار کیا اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خود ساختہ کلام قرار دیا کہ پچھلے لوگوں کی کوئی افسانوی کہانیاں ہیں ،جو انہوں نے لکھوالی ہیں۔کفارِ مکہ کے اس اعتراض کا بھی ذکر ہے کہ یہ رسول کھانا کھاتے ہیں ، بازاروں میں چلتے ہیں ،ان کی تائید کے لئے کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا؟۔انہیں کوئی خزانہ اور باغات کیوں نہ عطا کئے گئے اور انہوں نے اللہ کے رسول کو سحر زدہ کہا اور قیامت کے دن کو جھٹلایا۔اللہ تعالیٰ نے ان کی ان بے تکی باتوں کا رد فرمایا ، قرآن کو اللہ کا کلام کہا اور یہ کہ پہلے رسول بشری تقاضے کے تحت کھانا بھی کھاتے تھے اور

اپنی ضرورت کے لئے بازار بھی جاتے تھے، یعنی بشری ضروریات نبوت ورسالت کے منافی نہیں ہیں۔

آیت نمبر:12 سے کفار کیلیے عذابِ جہنم جہنم کی سختیوں اور مومنین کے لیے دائمی جنتوں اوراس کی نعمتوں کا بیان فرمایا۔

آیت نمبر:17 سے کفار اور ان کے معبودوں کے اکٹھے ہونے، معبودانِ باطل سے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو گمراہ کرنے کے بارے میں استفسار اور معبودانِ باطل کا سارا الزام کفار پر لگانے کا ذکر فرمایا۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ:۱۹

انیسویں پارے کے مضامین

انیسویں پارے کے شروع میں ایک بار پھر کفارِ مکہ کے ناروا مطالبات کا ذکر ہے کہ منکرینِ آخرت یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ہمارے پاس فرشتہ اتر کر آئے یا ہم اللہ تعالیٰ کو کھلے عام دیکھیں۔قرآن نے بتایا کہ جس دن کفار ان نشانیوں کو دیکھ لیں گے تو وہ ان کے لئے بہت برا دن ہے۔قیامت کے دن کفار ندامت سے اپنے ہاتھوں کو کاٹیں گے کہ کاش دنیا میں ہم نے رسولوں سے تعلق رکھا ہوتا اور گمراہ کرنے والے دوستوں سے تعلق نہ رکھا ہوتا۔

آیت نمبر:30 سے کفار کے قرآن مجید کی طرف التفات نہ کرنے پر آپ کو تسلی فرمائی کہ ایسا ہر نبی کے ساتھ ہوا ہے اور ہدایت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

آیت نمبر:32 میں کفار کے اس اعتراض کا ذکر ہوا کہ پورا قرآن ایک ہی وقت میں نازل کیوں نہ کیا گیا،قرآن نے بتایا کہ تدریجی نزول میں حکمت یہ ہے کہ وحی کے تسلسل کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رہے اور آپ کے دل کو قرار وسکون نصیب ہو۔

آیت نمبر:33 میں کفار کے ہر اعتراض کا مسکت جواب دینے کا بیان فرمایا۔

آیت نمبر:35 سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا،فرعون کی نافرمانی اور قومِ نوح،قومِ عاد،قومِ ثمود،اصحاب الرّس اور قومِ لوط کے تباہ ہونے کا بیان فرمایا۔

آیت نمبر:45 سے اللہ تعالیٰ نے سائے کے پھیلاؤ اور سمٹاؤ اور نیند کو باعثِ راحت اور دن کو ذریعہ معاش بنانے کو اپنی نشانی قرار دیا۔

آیت نمبر:48 سے بارش کے نظام،آسمان سے پاک پانی کے نزول،اس کے ذریعے بنجر زمین کو زرخیز بنانے،سمندروں میں میٹھے اور نمکین پانی کے الگ الگ جاری ہونے اور دیگر انعامات کا ذکر ہے۔آیت نمبر:54 میں بتایا کہ انسان کا جوہرِ تخلیق پانی ہے اور پھر اس کے ذریعے نسب اور سسرال کے رشتے قائم ہوئے۔

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں آسمانوں میں برج بنانے، سورج اور چاند کی روشنی اور نظامِ لیل ونہار کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی دلیل بتایا۔ ماہرینِ فلکیات نے بتایا کہ برج بارہ ہیں: جمل، ثور، جوزہ، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جَدْی، دَلْو اور حوت ہیں۔ یہ مختلف چیزوں کے نام ہیں، ماہرین بتاتے ہیں کہ بالائی فضا میں مختلف مقامات پر ستاروں کے جھگھٹے ان چیزوں کی تصویروں کے مشابہ ہوتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ برج یا ستارے کسی کی تقدیر کے مالک ہیں یا ان سے بندوں کے فائدے یا نقصان وابستہ ہیں۔ غیب کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اور وہی نفع ونقصان کا مالک ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کی اعلیٰ صفات کا ذکر ہے، جو یہ ہیں: زمین پر شرافت اور متانت سے چلنا، راتوں کو سجدہ وقیام یعنی اللہ کی عبادت میں گزارنا، عذابِ جہنم سے اللہ کی پناہ چاہنا، مال خرچ کرتے وقت بخل اور اسراف کی دو انتہاؤں کے درمیان توازن واعتدال سے کام لینا، شرک، قتلِ ناحق، زنا، جھوٹی گواہی بیہودہ مجالس سے اجتناب، اللہ کی آیات یاد دلانے پر اندھا، بہرا نہ بننے یعنی نصیحت قبول کرنے اور اللہ تعالیٰ سے نیک اور صالح اولاد کی دعا کرنا۔ اس میں گناہگاروں کے لئے نہ صرف توبہ کی قبولیت کی نوید ہے بلکہ گناہوں کے بدلے میں نیکیاں عطا کرنے کی بشارت اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا کئے جانے کا ذکر ہے۔

سورۃ الشعراء

سورۃ الشعراء مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 26ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 47ویں سورت ہے۔

اس سورت کی آیت نمبر: 224 میں شعراء کا ذکر ہے، اس لیے اس کا نام ''الشعراء'' رکھا ہے۔ اس سورت میں قرآن مجید کی عظمت، فصاحت وبلاغت، اس کی نظیر سے عجز کے چیلنج کا بیان ہے، کفار کے فرمائشی معجزات کا رد، مختلف انبیائے کرام کی دعوت اور قوم کے جواب کا ذکر ہے۔

اس سورت کی ابتدا میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے

رنجیدہ ہونے پر تسلی دی کہ آپ رنجیدہ نہ ہوں، اگر ہماری مرضی ہوتی تو یہ سب کے سب ایمان لاتے۔

آیت نمبر:7 میں اللہ تعالیٰ نے زمین سے مختلف قسم کے پودوں کے اگانے کو اپنی قدرت کی نشانی بتایا۔

اس سورت میں ایک بار پھر موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس جا کر دعوتِ حق دینے کے حکم کا ذکر فرمایا، بشری تقاضے کے تحت موسیٰ علیہ السلام کے خدشات کا ذکر ہے، فرعون کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کی تربیت کا احسان جتانے کا ذکر ہے۔ فرعون نے دعوتِ توحید کے جواب میں کہا کہ "رب العالمین" کون ہے؟، انہوں نے فرمایا کہ وہ آسمانوں اور زمینوں، مشرق و مغرب اور تمہارا اور تمہارے پہلے آباء واجداد کا رب ہے۔ اس مقام پر بھی ایک بار پھر جادوگروں کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزات (خاص طور پر عصا کا اژدھا بننا) کے غالب آنے کا ذکر ہے، پھر جادوگروں کے ایمان لانے اور فرعون کی طرف سے قید میں ڈالنے، ہاتھ پاؤں کو مخالف سمت سے کاٹنے اور سولی چڑھانے کی دھمکیوں کا ذکر ہے۔ پھر اس بات کا بیان ہے کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر گئے، سامنے سمندر تھا اور پیچھے فرعون اور اس کے پیروکاروں کا تعاقب۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کی ضرب سے سمندر پھٹ گیا، بنی اسرائیل کے لئے راستہ بنا، وہ سلامتی کے ساتھ سمندر پار چلے گئے اور فرعون اپنے لاؤلشکر سمیت سمندر میں غرق ہو گیا۔

آیت نمبر:69 سے ایک بار پھر ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کہ وہ اپنی قوم کو بتوں کی بے بسی کی جانب متوجہ کرتے، پھر ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ نے مجھے پیدا کیا، وہی ہدایت دیتا ہے، وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، جب بیمار ہوتا ہوں تو شفا دیتا ہے، وہی میری روح قبض کرے گا اور آخرت میں دوبارہ پیدا کرے گا، مجھے یقین ہے کہ قیامت کے دن میری خطاؤں کو معاف فرمائے گا۔ وہ دعا کرتے ہیں: اے پروردگار! تو مجھے صحیح فیصلہ کرنے کی قوت عطا فرما اور مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دے،

اے اللہ! بعد میں آنے والے لوگوں میں میرا ذکر خیر سچائی کے ساتھ جاری فرما، مجھے جنت کی نعمتوں کا وارث بنا اور مجھے قیامت کے دن رسوا نہ فرمانا۔

آیت نمبر :91 سے متقین اور سرکش لوگوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کا ذکر ہے اور گمراہ لوگوں کے جہنم میں آپس میں لڑنے اور ہر طرف سے ناامید ہونے، اور ان کے دنیا میں واپس جا کر ایمان لانے کی ناممکن خواہش کا ذکر ہے۔

آیت نمبر :105 سے نوح علیہ السلام کی دعوتِ حق کا ذکر ہے، وہ رسولِ امین تھے، سرکش لوگوں نے کہا ہم آپ پر کیسے ایمان لائیں، آپ کے پیروکار تو پسماندہ لوگ ہیں، پھر نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے اپنے اور اپنی قوم کے درمیان آخری فیصلے کی دعا مانگتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے پیروکار مومنوں کو کشتی کے ذریعے نجات عطا فرماتا ہے اور سرکش قوم طوفان میں ڈوب جاتی ہے۔

آیت نمبر :124 سے ہود علیہ السلام اور ان کی قوم عاد کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر نعمتوں کی فراوانی چوپایوں، اولاد اور نہری باغات کی صورت میں فرمائی تھی، انہوں نے مضبوط مکانات اور بلند مقامات پر عشرت گاہیں تعمیر کر رکھی تھیں۔ پھر بالآخر نبی کی تکذیب کی بنا پر اس قوم کو ہلاک کر دیا گیا۔

آیت نمبر :141 سے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کی نافرمانیوں کا ذکر ہے، ان پر بھی اللہ تعالیٰ نے نعمتوں کی فراوانی فرما رکھی تھی، میٹھے چشموں، باغات اور زرخیز زمین کی کثرت تھی، پہاڑوں کو تراش کر مکانات بناتے تھے، لیکن جب انہوں نے "ناقۃ اللہ" (وہ اونٹنی جسے اللہ نے معجزے کے طور چٹان سے پیدا کیا تھا) کی بے حرمتی کی اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالی تو ان پر عذاب نازل ہوا۔

آیت نمبر :160 سے لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر ہے، اس قوم کی بداعمالیوں کا ذکر ہے کہ وہ حلال بیویوں کو چھوڑ کر غیر فطری طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرتے تھے، لوط علیہ السلام کی بیوی بھی ان کی ہم خیال تھی، بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو بھی تباہ و برباد کر دیا۔

پھر حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر ہے، یہ لوگ ''اصحابُ الایکہ'' کہلاتے ہیں، یہ لوگ لین دین کے وقت ناپ تول میں ڈنڈی مارتے تھے اور ان کی سرکشی کا عالم یہ تھا کہ نبی سے کہتے: اگر آپ سچے ہیں تو ہم پر آسمان کیوں نہیں پھٹ جاتا، پھر اس قوم پر بھی عذاب نازل ہوا اور تباہ و برباد کر دیئے گئے۔

آیت نمبر: 192 سے بتایا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، جسے واضح عربی زبان میں جبرائیل امین نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ پاک پر نازل کیا۔ ان آیات میں یہ بھی بتایا کہ جن قوموں کا نام و نشان مٹا دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اتمامِ حُجت کے لئے ان کے پاس رسول بھیجے۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے غور و فکر کا مقام ہے کہ جن بداعمالیوں کے سبب پچھلی امتوں کا نام و نشان مٹا دیا گیا، آج وہ سب اخلاقی خرابیاں اس امت میں جمع ہو چکی ہیں، بس صرف اتنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس امت پر اس طرح کا عذاب نہیں آئے گا کہ نام و نشان ہی مٹ جائے، ورنہ اخلاقی زوال انتہا کو پہنچ چکا ہے۔

آیت نمبر: 218 میں فرمایا: اے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ عبادت کے وقت آپ کے قیام اور عبادت گزاروں کے درمیان آپ کے سجدوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

اس سورت کی آخری آیات میں مومنین صالحین کا استثناء کر کے شعراء کی گمراہی اور بے راہ روی اور جھوٹ کا بیان فرمایا۔

سورۃ النمل

سورۃ النمل مکی سورت ہے، ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے 27 ویں اور ترتیب نزول کے اعتبار سے 48 ویں سورت ہے، اس سورت کی آیت نمبر: 18 میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر اور چیونٹی کا ذکر ہے، اس لیے اس سورت کو ''اَلنَّمل'' سے تعبیر فرمایا۔

اس سورت میں قرآن کی حقانیت، مومنین کی صفات، مختلف انبیاء کے احوال، اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلائل، قیامت کی ہولناکیوں اور حیات بعد الموت کا بیان ہے۔

اس سورت کی ابتدائی آیات میں ایک بار پھر موسیٰ علیہ السلام کے احوال اور معجزات کا بیان ہے۔ آیت نمبر: 16 سے سلیمان علیہ السلام کا ذکر ہے کہ وہ داؤد علیہ السلام کے وارث بنے اور انہیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی، جنات اور انسانوں کے لشکر ایک فوجی ڈسپلن کے ساتھ ان کے پاس حاضر رہتے، پھر اس واقعے کا ذکر ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے لشکر کا گزر چونٹیوں کی وادی پر ہوا تو چونٹیوں کی ملکہ نے اپنی رعایا سے کہا کہ اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان کا لشکر تمہیں کچل نہ ڈالے، سلیمان علیہ السلام چونکہ جانوروں کی بولیاں جانتے تھے، تو یہ سن کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی: اے میرے رب! تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر جو بے پایاں نعمتیں فرمائی ہیں، مجھے ان کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما اور مجھے اپنے پسندیدہ نیک اعمال پر قائم اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیکوکار بندوں میں داخل فرما۔ پھر ہدہد پرندہ جو ان کے لشکر کی رہنمائی کے لئے آگے جاتا تھا، کافی دیر غائب رہا اور پھر یمن کی ملکہَ سبا کے بارے میں ایک یقینی خبر لے کر آیا کہ ان کا ایک بڑا تخت ہے، یہ لوگ سورج پرست ہیں اور انہیں ہر طرح کی نعمتیں میسر ہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے ملکہَ سبا کی طرف ایک خط بھیجا جس کا عنوان یہ تھا: یہ خط سلیمان کی جانب سے ہے: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ، (تمہارے لئے پیغام یہ ہے) کہ سرکشی چھوڑ دو اور اطاعت گزار بن کر میرے پاس چلے آؤ، ملکہَ سبا نے قوم سے مشورہ کیا، قوم کو اپنی طاقت پر ناز تھا۔ ملکہَ سبا نے سلیمان علیہ السلام کو محض ایک دنیادار بادشاہ سمجھتے ہوئے آپ کے پاس تحفے تحائف بھیجے، سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے جو مال دے رکھا ہے، وہ تمہارے مالوں کے مقابلے میں بہت بہتر ہے اور ہدہد سے کہا کہ یہ خط پہنچاؤ ہم ان پر حملہ کریں گے۔ ملکہَ سبا نے سلیمان علیہ السلام کے سامنے سپر انداز ہونے کا فیصلہ کیا اور چل پڑی، اس دوران سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباریوں سے کہا کہ ان کے اطاعت گزار ہو کر آنے سے پہلے یہ تخت میرے پاس کون لائے گا۔ ایک بہت بڑے جن نے کہا: ''میں اِس تخت کو آپ کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے لے آؤں گا، میں امین ہوں اور اس پر قادر ہوں''۔ سلیمان علیہ السلام کے کتابِ الٰہی کے عالم صحابی (ان کا نام مفسرین

نے آصف بن برخیا لکھا ہے اور یہ اللہ کے ولی تھے) نے کہا: ''میں آپ کے پاس پلک جھپکنے سے پہلے اس تخت کو لے آؤں گا''۔ انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو تخت سامنے رکھا ہوا تھا، اِسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کامل بندے کا کہنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''کُن'' کی بمنزلہ ہوتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے اللہ کے اس فضل پر اپنے رب کا شکر ادا کیا اور فرمایا: ''جو اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے، اس کا فائدہ اسی کو پہنچتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا رب بے پرواہ، سب کمالات والا ہے''۔ مفسرین نے اس مقام پر لکھا ہے کہ اللہ کے ولی کی یہ طاقت ہے، تو نبی کی طاقت کا عالَم کیا ہوگا اور پھر امام الانبیاء کی شان کا عالَم کیا ہوگا۔ پھر سلیمان علیہ السلام کے حکم سے اس تخت میں کچھ تبدیلی کی گئی کہ آیا مَلکہ اسے پہچان پائے گی یا نہیں، مَلکہ نے اسے پہچان لیا۔ پھر پانی کے تالاب پر چکنا بلّوری فرش بنایا، مَلکۂ سبا نے اس پر قدم رکھا اور پانی گمان کرتے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھایا تو سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ چکنا بلّوری (Crystal & Glace) ہے۔ اِس موقع پر ملکۂ سبا نے کہا: ''اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین پر ایمان لے آئی''۔

آیت :47 سے قومِ ثمود کا حضرت صالح علیہ السلام سے بدشگونی لینے کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بدشگونی ونحوست اللہ کے نبی صالح علیہ السلام کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ تم ہی میں نحوست ونامبارکی ہے اور تم فتنہ میں مبتلا لوگ ہو۔

آیت نمبر :48 سے قومِ صالح علیہ السلام کے ان نو افراد کا ذکر ہے جنہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹیں اور حضرت صالح علیہ السلام پر شب خون مارنے کے ارادے سے گئے تو فرشتوں نے پتھر مار مار کر ان کو ہلاک کر دیا اور پوری قوم حضرت جبریل علیہ السلام کی چیخ سے ہلاک ہوئی۔

آیت نمبر :54 سے ایک بار پھر لوط علیہ السلام کی قوم کی فحاشی اور اس کے نتیجے میں ان کی تباہی وبربادی کا ذکر ہے۔

خلاصۂ تفسیر
پارہ:۲۰

بیسویں پارے کے مضامین

بیسویں پارے کے شروع میں اللہ تعالیٰ استفہامی انداز میں اپنی جلالت قدرت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا، آسمان سے بارش برسا کر بارونق باغات کس نے اگائے، زمین کو کس نے مقامِ قرار بنایا اور اس کے بیچ دریا جاری کئے اور لنگر کی صورت میں مضبوط پہاڑ گاڑ دیئے، مبتلائے مصیبت کی فریاد کو کون سنتا ہے اور اس کے دکھوں کا مداوا کون کرتا ہے، خشکی اور سمندر کی ظلمتوں میں راہ کون دکھاتا ہے، بارش کی نوید بنا کر ٹھنڈی ہوائیں کون چلاتا ہے، ابتداءً مخلوق کو کون پیدا کرتا ہے اور دوبارہ کون زندہ کرے گا۔ زمین و آسمان کی مخلوق کو روزی کون دیتا ہے؟۔ یہ سارے سوالات اٹھانے کے بعد اللہ عزوجل انسان کی عقل سلیم سے سوال کرتا ہے کہ کیا اللہ معبودِ برحق کے سوا یہ سب کام کرنے والا کوئی اور ہے اور اس سوال کو قرآن بار بار دہراتا ہے تاکہ عقل کے اندھے انسانوں کا ضمیر جاگ اٹھے اور وہ حق تبارک وتعالیٰ کی جلالت قدرت کو تسلیم کرلیں۔ اس مقام پر بھی قرآن فرماتا ہے کہ اے انسان! زمین پر چل پھر کر دیکھ لو باغی قومیں کس انجام سے دوچار ہوئیں۔ یہ بھی فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی مستور ہے، سب لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

آیت: 80 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بے شک آپ مُردوں کو نہیں سناتے اور نہ ہی بہروں کو (اپنی) پکار سناتے ہیں، جب وہ پیٹھ پھیر کر جارہے ہوں''۔ مزید فرمایا: ''آپ تو صرف ان لوگوں کو سناتے ہیں، جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں''۔ مُردوں کا قبروں میں سننا حدیث پاک سے ثابت ہے، ان آیات کا ایک معنی یہ ہے کہ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں کہ دانا اور بینا ہوتے ہوئے بھی قبولِ حق کی استعداد سے محروم ہوجاتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی لوگوں کو دعوتِ حق دیتے رہتے تھے۔ سورت کے آخر میں بتایا: مجھے حکم دیا گیا ہے

کہ میں فرمانبرداروں میں سے رہوں اور قرآن کی تلاوت کروں، سو جس نے ہدایت قبول کی، اس میں اسی کا فائدہ ہے اور جو راہِ راست سے بھٹکا رہا، تو کہہ دیں کہ میں صرف عذاب سے ڈرانے والوں میں سے ہوں''۔

آیت نمبر: 82 سے دابۃ الارض کا ذکر فرمایا، اس کے بعد ہر امت میں سے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے والے گروہوں کو اکٹھا کرنے، دہشت سے ان کے اپنی جگہ سے نہ ہٹنے اور دلیل نہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہنے کا ذکر ہے۔

آیت نمبر: 87 میں صور پھونکے جانے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گھبراہٹ کا ذکر ہے اور نیکوکاروں کا قیامت کے دن کی گھبراہٹ سے مامون ہونے کا ذکر ہے۔

سورۃ القصص

سورۃ القصص مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 28 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 49 ویں سورت ہے۔ اس سورت میں القصص کا لفظ آنے کی وجہ سے اس کا نام ''سورۃ القصص'' رکھا گیا۔

اس سورت میں توحید، رسالت، حیات بعد الموت جیسے عقائد اور اصول کا بیان ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے لے کر تورات عطا فرمانے تک کا تفصیلی بیان ہے۔ قارون، اس کے خزانے اور اس کی ہلاکت کا ذکر ہے۔

سورۃ القصص کے شروع میں ایک بار پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر ہے، یہاں اس مرحلے کا بیان ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اللہ کی تدبیر سے فرعون کے دربار میں پہنچے تو بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرنے کا قانون موجود تھا، ایسے ماحول میں آسیہ (زوجۂ فرعون) نے فرعون سے کہا: اسے قتل نہ کرو، یہ میری اور آپ کی آنکھ کی ٹھنڈک ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے اور ہم اس کو بیٹا بنالیں اور انہیں شعور نہیں تھا (کہ اللہ تعالیٰ اُن کی ہلاکت کی خفیہ تدبیر فرما رہا تھا)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخِ انسانیت کی چار بڑی خواتین میں آسیہ زوجۂ فرعون کا بھی ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام کی کفالت

وحفاظت کا اہتمام فرمایا۔قرآن نے بتایا کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ (ان کا نام مُفسرین نے یوحانذ بتایا ہے) نے انہیں دریا کے حوالے کیا تو اُن کا دل بیٹے کی محبت کے غلبے کی وجہ سے نہایت مضطرب و بے قرار تھا، اگر اللہ تعالیٰ اُن کی ڈھارس نہ بندھاتا، تو وہ اپنے راز پر قابو نہ پاسکتیں۔

آیت :11 سے موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کے دربار میں پہنچنے، اُن کا سب دودھ پلانے والیوں کے پستان کو منہ نہ لگانے کا ذکر ہے۔پھر اس بات کا بیان ہے کہ اُن کی بہن نے، جو اجنبی بن کر وہاں موجود تھی، کہا: ایک دودھ پلانے والی خاتون کا مجھے علم ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کی اِس خفیہ تدبیر سے موسیٰ علیہ السلام اپنے ماں کی گود میں آگئے اور اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن گئے۔پھر جب وہ جوانی کی عمر کو پہنچے، تو ایک مظلوم کے بچاؤ کے لئے اُنہوں نے ظالم کو مکہ مارا اور وہ ہلاک ہوگیا۔موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر زیادتی کی، سوتو مجھے بخش دے، پس اللہ نے ان کو معاف کردیا۔پھر موسیٰ علیہ السلام شہر میں سہمے ہوئے رہے۔آیت :20 میں بتایا کہ شہر کے دور والے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اُس نے کہا: ''فرعون کے لوگ آپ کے قتل کا مشورہ کررہے ہیں، میں آپ کا خیر خواہ ہوں، آپ یہاں سے نکل جایئے''۔موسیٰ علیہ السلام وہاں سے مدین کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں اُن کے پانی کے گھاٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلارہے ہیں اور دوخواتین اپنے جانوروں کو روکے ہوئے ہیں، آپ نے اُن سے پوچھا: کیابات ہے، اُنہوں نے کہا: ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں، تو جب تک یہ سب چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلاکر چلے نہ جائیں، ہم اُس وقت تک اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلا سکتے۔آپ نے اُن خواتین کی مدد کی۔اُن خواتین نے گھر جاکر اپنے والد سے ایک اجنبی نوجوان کا ذکر کیا کہ اُس نے ہماری مدد کی ہے، آپ اُسے اجرت پر رکھ لیں، وہ طاقت ور اور امانت دار ہے، چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی بیٹی کے ذریعے بلا بھیجا۔شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: میں اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا آپ کے ساتھ اس شرط پر نکاح

کر دوں گا کہ آپ آٹھ سال تک اجرت پر میرا کام کریں اور اگر آپ دس سال پورے کر دیں، تو یہ آپ کی طرف سے احسان ہوگا۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ پیشکش قبول کر لی۔

آیت:29 میں فرمایا کہ جب مقررہ میعاد پوری ہوگئی تو موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ کو لے کر مصر کی طرف روانہ ہوئے۔ اس سفر کے دوران آگ کی تلاش میں اُن کے طور پر جانے، مبارک سرزمین پر اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کا ذکر ہے۔ وہاں آپ کو نبوت عطا ہوئی، عصا اور یدِ بیضاء کے معجزے عطا ہوئے اور ہارون علیہ السلام کو رسالت کے مشن میں ان کی درخواست پر ان کا مددگار بنایا گیا۔ آیت:38 سے اللہ تعالیٰ نے اُن سے اپنی نصرت کا وعدہ فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کو دعوتِ حق دی تو اُس نے اپنے وزیر ہامان سے کہا کہ میرے لئے ایک بلند عمارت بناؤ تا کہ میں بلندی سے جھانک کر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں اور میرا یقین ہے کہ (معاذ اللہ) یہ جھوٹے ہیں، اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے، وہ پیچھے گزر چکے ہیں چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالفین کی بنسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخالفین زیادہ قوی، سازشی اور مقتدر تھے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غالب فرمادیا تو اس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی کٹھن کیوں نہ ہوں بالآخر غلبہ آپ ہی کے لئے ہی ہے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں بار بار آیا ہے، لیکن ہر مقام پر دوسرے مقام سے الگ انداز اور زاویے سے عبرت وسبق آموزی کو واضح کیا گیا۔

آیت نمبر:44 میں فرمایا کہ اگر تمہیں اس کتاب میں شک ہے تو تم اس سے زیادہ ہدایت والی کتاب اللہ کے پاس سے لے آؤ اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی کہ یہ لوگ اس لیے آپ کی پیروی نہیں کرتے کیونکہ یہ اپنی خواہشات کے پیروکار ہیں۔

آیت نمبر:52 سے نجاشی کے دربار سے آئے ہوئے وفد کے قبولِ اسلام، ابوجہل کی بدتمیزی اور ان نیک طینت لوگوں کا یہ کہنا کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں، تم سلامت رہو، ہم جاہلوں (سے الجھنے) کے خواہاں نہیں ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کی منشا پر ہے اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو خوب جانتا ہے۔

آیت :57 سے کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ''اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں تو ہم اپنے ملک سے اچک لئے جائیں گے''، یعنی موجودہ فوائد سے محروم ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کیا ہم نے ان کو اپنے حرم میں آباد نہیں کیا، جو امن والا ہے، اُس کی طرف ہمارے دیئے ہوئے ہر قسم کے پھل لائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے (اکثر لوگ) نہیں جانتے، یعنی اسلام کی برکت سے دنیاوی نعمتیں چھن نہیں جائیں گی بلکہ ان میں اضافہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے بہت سی ان بستیوں کو ہلاک کر دیا، جن کے رہنے والے اپنی خوشحالی پر اتراتے تھے، یعنی ماضی کی خوشحال سرکش قوموں کے کھنڈرات نشانِ عبرت ہیں۔ اِن آیات میں یہ بھی بتایا گیا کہ بستیوں والوں کو اُس وقت تک ہلاک نہیں کیا جاتا جب تک کہ رسول بھیج کر اُن پر اتمامِ حجت نہیں کر دیا جاتا۔

آیت نمبر :62 میں قیامت کے دن کفار کو ندا کر کے ان کے معبودانِ باطل کے بارے استفسار کا ذکر ہے اور کفار کا اپنے معبودوں پر الزام، معبودوں کی بیزاری اور دونوں کی بے بسی، فرشتوں کے اس سوال کے جواب میں خاموش رہنے کا بیان ہے کہ تم نے اپنے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا۔

آیت نمبر :68 میں اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے، عالم الغیب اور معبودِ برحق ہونے کا بیان ہے۔

آیت :71 سے ایک بار پھر اللہ تعالیٰ نے استفہامی (Interrogative) انداز میں اپنے قدرت وجلالت کی طرف متوجہ فرمایا کہ اگر وہ قیامت تک کے لئے مسلسل رات کا سلسلہ جاری رکھے تو تمہارے لئے روشنی کون لے کر آئے گا اور اسی طرح اگر اللہ تمہارے لئے مسلسل دن بنا دے، تو رات کو سکون تمہیں کون دے گا؟ پس کیا تم سنتے نہیں، سوچتے اور سمجھتے نہیں۔ آیت :76 سے قارون کا ذکر ہے یہ قومِ موسیٰ کا ایک سرکش شخص تھا اور اللہ نے اپنی حکمت سے اُسے اتنے خزانے عطا کئے تھے کہ ایک طاقتور جماعت تھی، جو اُس کی چابیوں کو اٹھا نہ پاتی۔ اُس کی قوم نے اُس سے کہا: ''اتراؤ نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ اترانے

والوں کو پسند نہیں فرماتا''، اس نعمتِ دولت کے بدلے میں آخرت کو تلاش کرو اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی لوگوں کے ساتھ احسان کرو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو، یعنی مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اُس نے کہا: یہ مال مجھے میرے علم کی وجہ سے دیا گیا ہے، یعنی اُس نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے اپنے علم اور مہارت پر ناز کیا۔ اللہ نے فرمایا: اِس سے پہلی قوموں میں اس سے بھی زیادہ طاقتور اور بڑے مالداروں کو ہلاک کر دیا گیا۔

آیت: 81 میں فرمایا: (اُس کی سرکشی کی سزا کے طور پر) ہم نے اُسے اور اُس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا تھا، پھر اللہ کے مقابل اُس کا کوئی مددگار نہ تھا۔ قرآن نے بتایا کہ اُس کے کرّوفر کو دیکھ کر جو لوگ اُس جیسا دولت مند ہونے کی تمنا کر رہے تھے، اُس کے انجام کو دیکھ کر انہوں نے کہا کہ: ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ فرما دیتا ہے (یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ دولت وطاقتِ دنیا ہر صورت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبولیت کی دلیل ہے)۔ اُنہوں نے کہا: (اُس جیسی دولت کا نہ ہونا ہمارے حق میں اچھا ثابت ہوا) اگر اللہ ہم پر احسان نہ فرماتا تو ہم بھی دھنسا دیئے جاتے۔

آیت: 83 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ آخرت کا گھر ہم اُن کے لئے مقدر کرتے ہیں، جو زمین میں نہ تو تکبر کرتے ہیں اور نہ ہی فساد، اچھا انجام صرف پرہیزگاروں کے لئے ہوتا ہے''۔ اگلی آیت کا مفہوم ہے کہ ہر ایک اپنے اچھے یا برے اعمال کی جزا یا سزا پائے گا۔

آخری آیت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کے معبود برحق ہونے، سوائے اس کی ذات کے ہر چیز کے فنا ہونے، اس کا حکم نافذ ہونے اور اس کی طرف لوٹنے کا بیان ہے۔

سورۃ العنکبوت

سورۃ العنکبوت مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 29 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 85 ویں سورت ہے۔ عنکبوت مکڑی کو کہتے ہیں اس سورت کی آیت

نمبر: 41 میں عنکبوت کا ذکر ہے، اس لیے اس کا نام عنکبوت رکھا گیا۔

اس سورت میں حق اور سچائی کے راستے میں مشکلات پر ثابت قدمی اور صبر، ماں باپ کی اطاعت اور اس کی حدود کا تعین، انبیائے سابقین کی امتوں کے حالات کا اجمالی ذکر، اہل کتاب اور مشرکین کے سرکارِ دو عالم ﷺ کی رسالت پر اعتراضات کے جوابات اور مسلمانوں کو ہجرت کی ہدایت اور اس پر اجرِ آخرت کا بیان ہے۔

اس سورت کے شروع میں قرآن نے متوجہ کیا کہ قطعی نجات کے لئے صرف دعوائے ایمان کافی نہیں ہے بلکہ آزمائش بھی ہوسکتی ہے، جیسا کہ پچھلی امتوں کے لوگوں کو کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا اور ابتلا سے گزرنے کے بعد ہی سچے مومن اور جھوٹے کا فرق واضح ہوتا ہے۔

آیت: 8 میں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور ان کی اطاعت کی حدود کا تعین کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ تمہیں شرک پر مائل کرنا چاہیں تو گناہ کے کاموں میں ماں باپ کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ حدیث میں بھی ہے کہ کسی بھی ایسے مسئلے میں مخلوق (خواہ وہ کوئی بھی ہو) کی اطاعت لازم نہیں ہے، جس میں اللہ کی نافرمانی لازم آتی ہو۔ آیت: 14 سے ایک بار پھر حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سالہ تبلیغی زندگی اور اُن کی قوم کے انکار اور ان پر عذاب کا ذکر ہوا۔

آیت: 16 سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو متوجہ کیا کہ اللہ کو چھوڑ کر بے بس بتوں کی عبادت نہ کرو، صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو سن کر قوم نے کہا: اسے قتل کردو یا جلا ڈالو، تو اللہ نے اُنہیں آگ سے بچالیا۔ آیت: 26 سے لوط، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا ذکر ہے کہ ہم نے اُنہیں نبوت اور کتاب عطا کی۔ لوط علیہ السلام کی قوم کی انتہائی سرکشی کا ذکر ہے کہ وہ غیر فطری طریق سے اپنی جنسی خواہش پورا کرتے اور ڈاکے ڈالتے اور انتہا یہ ہے کہ کھلے بندوں بے حیائی کے کام کرتے تھے اور لوط علیہ السلام سے نزولِ عذاب کا مطالبہ کرتے تھے یعنی یہ اُن کی

سرکشی کی انتہا تھی۔

ان آیات میں بتایا کہ بالآخر اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام اور اُن کے اہل کو بچالیا اور قوم کے ساتھ قوم کی برائیوں کو پسند کرنے والی ان کی بیوی سمیت ساری بستی کو ہلاک کر دیا۔ پھر مدین کی سرزمین پر حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم کی سرکشی کا ذکر ہوا، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی تکذیب کے جرم میں ان کو بھی تباہ و برباد کر دیا۔ قرآن نے اہلِ مکہ کو مخاطب کر کے بیان کیا کہ تم اپنے تجارتی سفر کے دوران شیطان کے بہکاوے میں آنے والے عاد و ثمود کی بستیوں سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہو، یہ لوگ سمجھدار ہونے کے باوجود شیطان کے نرغے میں آکر راہِ راست سے ہٹ گئے۔

آیت :40 سے قرآن نے بتایا کہ ان میں سے بعض سرکش قوموں پر ہم نے پتھر برسائے، بعض کو چنگھاڑ نے پکڑ لیا، بعض کو زمین میں دھنسا دیا اور بعض کو سمندر میں غرق کر دیا۔ فرمایا: اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ یہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے۔ آیت :41 میں فرمایا کہ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر باطل معبودوں کو اپنا مددگار بناتے ہیں، اُن کے عقائد کے بودے پن کی مثال مکڑی کے جالے جیسی ہے اور سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔ آخر میں اللہ نے فرمایا کہ ہم حق کو ثابت کرنے کے لئے لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتے ہیں، لیکن صرف اہلِ عقل و خرد ہی ان سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

آیت نمبر :46 میں اہل کتاب سے بحث و مباحثہ اور مجادلہ کے آداب اور اسلوبِ تبلیغ کے شائستہ اور پسندیدہ بنانے کا بیان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ:۲۱

اکیسویں پارے کے مضامین

اس پارے کی پہلی آیت میں تلاوتِ قرآن اور اقامتِ صلوٰۃ کا حکم ہے اور نماز کے منجملہ فوائد میں سے یہ ہے کہ یہ بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے، اسی معیار پر ہر مسلمان اپنی نماز کی مقبولیت اور افادیت کا جائزہ لے سکتا ہے۔

آیت نمبر:46 میں اہل کتاب سے بحث ومباحثہ اور مجادلہ کے آداب اور اسلوبِ تبلیغ کے شائستہ اور پسندیدہ ہونے کا بیان ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ''نبی امی'' تھے، یعنی آپ نے رسمی طور پر لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ تھی، آیت نمبر:48 میں فرمایا: ''اور آپ نزولِ قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ ہی اس سے پہلے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے، ورنہ باطل پرست شک میں مبتلاء ہوجاتے''، یعنی کوئی منکر یہ کہہ سکتا تھا کہ پچھلی کتابوں کا کوئی ذخیرہ یا دفینہ ان کے ہاتھ آ گیا ہے، جسے پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم، جلد:05 اور تفسیر تبیان القرآن، جلد:04 میں قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ بعد میں معجزے کے طور پر آپ سے لکھنا پڑھنا ثابت ہے۔

آیت نمبر:50 سے کفار کے معجزے کی فرمائش کے جواب میں فرمایا کہ قرآن مجید سے بڑھ کر معجزہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ عذاب کے مطالبے پر فرمایا کہ اس کا ایک وقت مقرر ہے۔

آیت نمبر:56 میں مومن بندوں کو فرمایا جارہا ہے کہ جس سرزمین پر منشاءِ ربانی کے مطابق زندگی گزارنا مشکل ہو تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی خاطر وہاں سے ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کرو جہاں بے خوف وخطر رب کی بندگی کرسکیں۔

آیت نمبر:59 میں فرمایا ''اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے،

ان کو اللہ ہی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی''، یعنی انسان کتنی ہی منصوبہ بندی کیوں نہ کرے، اسباب کا اختیار کرنا بجا، لیکن رازقِ حقیقی صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے۔ آیت نمبر:62 میں فرمایا کہ رزق کی کشادگی کو کوئی اپنے لئے معیارِ فضیلت نہ سمجھے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے یہ فیصلے فرماتا ہے۔

آیت نمبر:64 میں دنیاوی زندگی کے کھیل تماشا ہونے اور اخروی زندگی ہی اصل زندگی ہونے کا بیان ہے۔ اس کے بعد مشرکین کے سمندری طوفان میں گھرنے کے بعد خالص اللہ تعالیٰ کو پکارنے اور نجات پا کر خشکی پر جانے کے بعد شرک کرنے کا بیان ہے۔ اس کے بعد مکہ والوں کو نعمت امن کی یاد دلا کر ناشکری سے بچنے کی تاکید کی جارہی ہے۔

آخری آیت میں فرمایا:''اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں اور مشقت اٹھاتے ہیں، ہم ضرور انہیں اپنی راہیں دکھائیں گے''۔

سورۃ الروم

سورۃ الروم مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 30ویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 84ویں سورت ہے۔ اس سورت میں روم کی شکست کے بعد بطور پیشن گوئی ان کی فتح کا ذکر ہے اس لئے اس سورت کا نام روم رکھا گیا۔ اس سورت میں توحید، رسالت، بعث بعد الموت، قیامت اور جزاوسزا کا بیان ہے۔ ان نیک خصائل کا ذکر ہے جن کی اسلام دعوت دیتا ہے اور مشرکین کے برے اعمال کا ذکر ہے۔

قرآن کی حقانیت کی ایک دلیل قطعی یہ ہے کہ قرآن میں مستقبل کی جو خبریں دی ہیں وہ ہمیشہ سچ ثابت ہوئیں۔ اہل روم اور اہلِ فارس میں لڑائیاں چلتی رہتی تھیں، ایک بار اہلِ فارس جو مشرک تھے اہلِ روم پر غالب آگئے اور رومی اہلِ کتاب تھے، چنانچہ مشرکینِ مکہ اہلِ فارس کی فتح سے خوشیاں منانے لگے، تو قرآن نے فرمایا یہ خوشیاں عارضی ہیں چند (بِضع کا اطلاق تین سے لے کر نو تک ہوتا ہے) سال میں رومی فارس والوں پر غالب آجائیں گے، چنانچہ قرآن کی بشارت کے عین مطابق ساتویں سال میں رومیوں کو اہلِ فارس پر

دوبارہ فتح نصیب ہوئی۔

آیت نمبر:9 سے بتایا کہ لوگوں کو اپنی مادّی قوت وطاقت پر اِترا کر اللہ عزوجل کی غالب قدرت کو بھول نہیں جانا چاہئے ، ماضی میں کتنی ہی ایسی قومیں آئیں جو مادّی قوت کی حامل تھیں، لیکن آج ان کے کھنڈرات ان کی مادّی قوت کی ناپائیداری کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

آیت نمبر:17 سے نماز کے اوقاتِ خمسہ کی طرف اشارہ فرمایا:''پس شام کے وقت اللہ کی تسبیح کرو اور جب تم صبح کو اٹھو اور اسی کے لئے تمام تعریفیں ہیں آسمانوں اور زمینوں میں اور پچھلے پہر اور دوپہر کو''، صبح اور شام میں مغرب،عشاء اور فجر کی نمازیں آتی ہیں،پچھلے پہر میں عصر کی نماز اور دوپہر میں ظہر کی نماز۔

آیت نمبر:21 سے بتایا کہ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے انسان کو مٹی سے پیدا فرمایا،اسی کی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ ان سے سکون حاصل کریں اور زوجین کے درمیان محبت اور ہمدردی کا رشتہ قائم کیا اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے زمین وآسمان کی تخلیق اور انسانوں کی بولیوں اور رنگوں کا تنوع ہے اور نیند کے لئے رات اور تلاش معاش کے لئے دن کا بنانا ہے اور اسی طرح آگے کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی متعدد نشانیوں کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:27 میں حیات بعد الموت کے منکرین سے فرمایا کہ وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور دوبارہ زندہ بھی وہی کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے۔

آیت نمبر:28 میں مشرکین سے فرمایا کہ کیا تمہارے غلام تمہارے مال میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں؟،اگر نہیں تو پھر تم اللہ کے ساتھ کیسے بے جان بتوں کو شریک ٹھہراتے ہو۔

آگے چل کر امت محمدی کو تعلیم دینے کی خاطر فرمایا کہ آپ باطل ادیان سے کنارہ کش ہو کر اپنے آپ کو دینِ فطرت پر قائم رکھیں۔

آیت نمبر:33 سے انسان کی فطری خود غرضی کو بیان کیا کہ تکلیف کے وقت اللہ کو

پکارتے ہیں، لیکن راحت کے وقت اسے بھول جاتے ہیں بلکہ شرک کرنے لگتے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ اللہ کی رحمت سے ناامید ہوجاتے ہیں۔ آیت نمبر:38 میں قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دینے کا حکم فرمایا۔

سود سے بظاہر مال بڑھتا ہے اور زکوٰۃ سے مال کم ہوتا ہے، لیکن آیت نمبر:39 میں فرمایا کہ اللہ کے نزدیک مالِ زکوٰۃ بڑھتا ہے اور سود کا مال گھٹتا ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے، رازق ہونے، مارنے اور زندہ کرنے کی صفات کو ذکر کر کے شرک کا بطلان کیا جارہا ہے۔

آیت نمبر:41 میں فرمایا کہ بروبحر میں فساد لوگوں کے اپنے کرتوتوں کے سبب ہے اور لوگوں کو ایک دوسرے سے بھڑا دینا بھی ایک صورتِ عذب ہے۔

آیت نمبر:46 سے اللہ تعالیٰ نے بارش کے نظام کو اپنی قدرت کی نشانی کے طور پر بیان فرمایا کہ وہ ٹھنڈی ہوائیں اپنی رحمت کی نوید بنا کر بھیجتا ہے، پھر وہ اللہ کی مرضی سے بادلوں کو آسمان میں پھیلا دیتی ہیں، بادل ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں اور ان کے درمیان سے جہاں اللہ کا حکم ہوتا ہے، پانی برستا ہے، پھر بنجر اور بے جان زمین میں اگانے اور حیات کے سامان کے پیدا کرنے کو اللہ تعالیٰ نے حیات بعد الموت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

آیت نمبر:54 میں انسانی وجود سے اپنی وحدانیت پر استدلال فرمایا کہ کمزوری کی حالت میں انسان کی پیدائش، پھر قوت اور قوت کے بعد پھر کمزوری اور بڑھاپا یہ سب حالتیں اللہ تعالیٰ ہی طاری فرماتا ہے۔

آیت نمبر:55 میں مجرموں کا اس بات پر قسمیں اٹھانے کا ذکر ہے کہ وہ دنیا میں صرف پل بھر رہے ہیں تو ان سے اتنا سخت محاسبہ کیوں کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جھوٹ بولنا ان کی پرانی عادت ہے۔

آخر میں سرکارِ دو عالم ﷺ اور مومنین کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی مدد کا وعدہ سچا ہے۔

سورۂ لقمان

اس سورت کا نام لقمان ہے، کیونکہ اس کی ایک آیت میں حضرت لقمان کا ذکر ہے، یہ مکی سورت ہے ،ترتیب مصحف کے اعتبار سے یہ 31 ویں اور ترتیب نزول کے اعتبار سے 57 ویں سورت ہے۔

اس سورت کی ابتدا قرآن مجید کی حقانیت سے کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن نماز قائم کرنے والے، زکوٰۃ دینے والے اور آخرت پر یقین رکھنے والے نیکوکاروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے آیات سے تکبر کرنے والوں کے لیے عذاب الیم اور مومنین صالحین کے لیے ہمیشہ رہنے والی جنتوں کا بیان ہے۔

آسمان کے بغیر ستونوں کو قائم کرنے، زمین میں پہاڑوں کے نصب کرنے، زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلانے، آسمان سے بارش برسانے اور زمین سے ہر قسم کے عمدہ غلے (اور میوے) پیدا کرنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: یہ ہے اللہ کا پیدا کیا ہوا، پس مجھے وہ دکھاؤ جو اللہ کے سوا دوسروں نے پیدا کیا ہے۔

آیت نمبر:12 سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی اور حکم دیا کہ اللہ کا شکر ادا کرو اور جو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، اس کا فائدہ اسی کو پہنچتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز ہے اور تمام تعریفوں کا حق دار ہے۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کیں ،قرآن ان کو بیان کرتا ہے، وہ یہ ہیں: (۱) شرک سے اجتناب (۲) اللہ اور ماں باپ کا شکر گزار ہونا (۳) والدین کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرنا ،اس مقام پر قرآن نے اولاد کے لئے ماں کی مشقتوں کا بھی ذکر کیا (۴) اگر خدانخواستہ کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو ان کے دباؤ پر شرک میں مبتلا ءنہ ہونا ،لیکن اس کے باوجود دنیوی امور میں ماں باپ کے ساتھ بدستور نیک برتاؤ کرنا (۵) پابندی سے نماز قائم کرنا (۶) نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا (۷) لوگوں کے ساتھ تکبر سے پیش نہ آنا (۸) زمین میں اکڑ کر نہیں بلکہ عاجزی

سے چلنا (۹) چال اور گفتار میں تواضع اختیار کرنا وغیرہ۔ حضرت لقمان کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، لیکن زیادہ راجح قول یہ ہے کہ یہ ایک حکیم اور دانا شخص تھے، اللہ نے ان کو فکرِ سلیم عطا کی تھی، ان کا بیٹا اور بیوی دونوں کافر تھے اور یہ مسلسل انہیں نصیحت کرتے رہتے تھے۔

اگلی آیات میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت وجلالت، تسخیر کائنات، تسخیر شمس وقمر، نظامِ لیل ونہار اور دیگر بے پایاں نعمتوں کا ذکر ہے۔ آیت نمبر: 27 میں فرمایا کہ اگر زمین کے سارے درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائیں اور اس میں سات سمندر کا اضافہ ہو جائے (اور یہ اللہ کے کلمات کو لکھنے لگیں) تو قلمیں ختم ہو جائیں گی، سمندر خشک ہو جائیں گے، لیکن اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے۔

آخری آیت مُغیبّاتِ خمسہ سے متعلق ہے یعنی قیامت کب قائم ہوگی، بارش کب برسے گی، ماں کے رحم میں کیا ہے، کوئی شخص کل کیا کام کرے گا اور کس کی موت کہاں واقع ہوگی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ذات سے کوئی ان امورِ غیبیہ کو نہیں جانتا، علامات، اسباب وقرائن اور آلات کی مدد سے حاصل شدہ علم کے ذریعے بارش کی پیشن گوئی یا ماں کے رحم میں جنین کے بارے میں بتانا اس آیت کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاء میں سے کسی کو ان کے متعلق باخبر ومطلع کرنا بھی اُس کے منافی نہیں ہے، بلکہ آیت کے آخر میں مذکور اسمِ الٰہی ''خَبِیْرٌ'' اس کی طرف مشیر ہے اور اس کا مؤید ہے۔

سورۃ السجدہ

سورۃ السجدہ مکی سورت ہے، اس کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے والے مومنین کی تعریف وتحسین ہے، اس لیے اس کا نام ''السجدہ'' رکھا گیا۔

ترتیب مصحف کے اعتبار سے 20ویں اور ترتیب نزول کے اعتبار سے 75ویں سورت ہے۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، خالقیت اور ربوبیت پر دلائل، قرآن مجید کی

حقانیت اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے برحق ہونے اور معاد کا بیان ہے، پچھلی امتوں کے منکرین کے انجام سے اس زمانہ کے منکرین کو ڈرایا گیا ہے۔

اس سورت کی ابتدا میں قرآن کے من جانب اللہ ہونے اور رسالت محمدی کے برحق ہونے اور اللہ تعالیٰ کے خالق اور مدبر ہونے کا بیان ہے۔

آیت نمبر: 7 سے انسان کی مٹی سے پیدائش اور نسل انسانی کے لیے جو ہر حیات، نفخ روح، کان، آنکھ اور دل جیسی نعمتوں کا ذکر فرمایا۔

آیت نمبر: 10 سے منکرین حیات بعد الموت کے اعتراض، قیامت کے دن عذاب کو ملاحظہ کرنے کے بعد پشیمانی اور دنیا میں واپس جا کر نیک عمل کرنے کی خواہش اور ان کے دخول جہنم کا ذکر ہے۔

آیت نمبر: 13 میں فرمایا کہ ہدایت کوئی جبری چیز نہیں ہے۔

آیت نمبر: 15 میں فرمایا کہ ہماری آیات پر ایمان وہ لوگ لاتے ہیں کہ جب ان آیات کے ذریعے انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اپنے رب کی تسبیح اور حمد کرتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہیں، تکبر نہیں کرتے، ان کے پہلو (عبادت الٰہی میں مشغولیت کی وجہ سے) بستروں سے دور رہتے ہیں، وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمت کا یقین رکھتے ہوئے اسے پکارتے ہیں۔

آیت نمبر 18 میں فرمایا: مومن اور فاسق برابر نہیں ہو سکتے، باعمل مومنین کے لئے جنت کی صورت میں اللہ نے مہمانی تیار کر رکھی ہے، جبکہ فاسقوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ جب بھی جہنم سے نکلنا چاہیں گے انہیں واپس اسی آگ میں لوٹا دیا جائے گا۔ آیت: 24 میں فرمایا: جن لوگوں نے صبر وتحمل کو اپنا وتیرہ بنالیا، تو ہم نے اُنہیں لوگوں کے منصبِ امامت پر فائز کر دیا۔

سورۃ الاحزاب

سورۃ الاحزاب مدنی سورت ہے، اس سورت میں غزوۂ احزاب کے متعلق آیات نازل

ہوئیں اس لیے اس کو ''الاحزاب'' سے موسوم کیا۔

ترتیب مصحف کے اعتبار سے 33 ویں جبکہ نزول کے اعتبار سے 90 ویں سورت ہے۔

اس سورت میں منافقین کے رد، منہ بولے بیٹے کی حیثیت، آدابِ معاشرت، حکمِ ظہار، نبی ﷺ کا مومنوں کی جان سے زیادہ قریب ہونے، آپ کی ازواج کا امہات المؤمنین ہونے، ختمِ نبوت، حکمِ درود، غزوۂ احزاب میں یہودیوں کی عہد شکنی، منافقین کی سازشوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کی مدد و نصرت کا بیان ہے۔

اس سورت کی ابتدا میں نبی ﷺ کو وحی الٰہی کی اتباع کرنے، تقویٰ پر کاربند رہنے اور کفار و منافقین کا کہنا نہ ماننے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا بیان ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد کی تمام باطل قوتیں مجتمع ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئیں، ''حزب'' جماعت کو کہتے ہیں اور ''احزاب'' کے معنی ہیں جماعتیں، یعنی عہد رسالت میں مسلمانوں کے خلاف کفار اور مشرکین اور منافقین کی یہ اجتماعی یلغار تھی، جسے بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید و نصرت سے ناکام و نامراد فرمایا اور یہی واقعہ اس سورت کا مرکزی موضوع ہے۔

آیت نمبر: 4 میں فرمایا کہ اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے، یعنی کفر اور ایمان، ہدایت اور گمراہی اور حق و باطل ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اسی آیت میں فرمایا کہ کسی کے منہ بولے بیٹے حقیقی بیٹوں کے حکم میں نہیں ہیں، یہ لوگوں کی خود ساختہ باتیں ہیں، مزید فرمایا کہ لوگوں کو ان کے حقیقی باپوں کی طرف منسوب کر کے پکارو، اللہ کے نزدیک یہی بات مبنی بر انصاف ہے اور اگر ان کے حقیقی باپوں کا پتا نہ چلے تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

آیت نمبر: 6 میں فرمایا کہ نبی مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہیں (اور بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ نبی مومنوں کی جانوں کے مالک ہیں) اور نبی کی بیویاں مومنوں کی روحانی مائیں ہیں۔

آیت نمبر: 7 میں انبیائے کرام سے فرائض رسالت کے متعلق لیے گئے وعدے کا

ذکر ہے۔

آیت نمبر:8 سے بیان کیا کہ غزوۂ احزاب (اسے غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں) کے موقع پر کفار ہر جانب سے جمع ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے، (شدتِ غم سے) مسلمانوں کی آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور دلوں میں اللہ (کی نصرت کے بارے میں) طرح طرح کے گمان پیدا ہونے لگے۔ اس موقع پر اہلِ ایمان کی آزمائش کی گئی اور انہیں شدت سے جھنجھوڑ دیا گیا، یہاں تک کہ منافق اور جن کے دلوں میں شک کی بیماری تھی کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کر رکھا تھا، وہ محض دھوکہ تھا، اس پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مومنو! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم پر کفار کے لشکر حملہ آور ہوئے تو ہم نے ان پر ایک آندھی اور ایسے (غیبی) لشکر بھیجے، جنہیں تم نے دیکھا نہیں اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر کفار ایک ماہ تک مسلمانوں کا محاصرہ کئے رہے، ایک موقع پر مسلمانوں کی تین نمازیں (ظہر، عصر، مغرب) بھی قضاء ہوئیں، بالآخر طوفانی آندھی آئی، ان کے خیمے اکھڑ گئے، ان کی دیگیں الٹ گئیں، ان کے جانور رسیاں تڑا کر بھاگنے لگے اور ایسے عالم میں کہ بظاہر انہیں اپنی کامیابی کا یقین تھا، انہیں ناکام اور نامراد ہو کر واپس جانا پڑا، اسی کو نصرتِ الٰہی کہتے ہیں۔

منافقین نے اس جنگ میں بزدلانہ روش، موت سے فرار، مومنین کو ورغلانے اور مالِ غنیمت کے حصول میں پیش پیش رہنے کا جو طرزِ عمل اختیار کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا بصورتِ مذمت ذکر فرمایا۔

آیت نمبر:21 میں فرمایا: بے شک رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہو، نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ اس سورت میں یہ بھی بتایا کہ جہاں منافق کفار کے بھاری لشکر کو دیکھ کر متزلزل ہو رہے تھے، وہاں مسلمانوں کے ایمان اور تسلیم و رضا میں اضافہ ہو رہا تھا کہ یہ تو وہی منظر ہے، جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کر رکھا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کا

فرمان سچ ہے۔ آیت نمبر:23 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اہلِ ایمان میں ایسے مردانِ باوفا ہیں کہ جو اللہ سے کئے ہوئے وعدے پر سچے ثابت ہوئے، ان میں سے کچھ (شہید ہوکر) اپنی نذر پوری کر چکے اور کچھ اپنی باری کے انتظار میں ہیں۔

آیت نمبر:26 میں بنو قریظہ کی بدعہدی کے بعد ان کے محاصرے، قلعوں سے نیچے اترنے، ان کو قتل کرنے اور قیدی بنا لینے، ان کی زمینوں، مکانوں اور مال ومتاع کے مسلمانوں کو وارث بنانے کا بیان ہے۔

آیت نمبر:28 میں امہات المومن ازواجِ مطہرات وطیبات رضی اللہ عنہن کو دعوتِ عزیمت دی گئی کہ اگر تم میں سے کسی کو دنیا کی زندگی کی زینت مطلوب ہو، تو اسے اختیار کرنے کی اجازت ہے اور اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت مطلوب ہے، تو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی نیک شِعار بیویوں کے لئے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے، اس میں کسی مومن کو شک نہیں ہونا چاہئے کہ ازواجِ رسول نے دنیا کی عارضی زیب وزینت اور راحتوں پر آخرت کی ابدی اور دائمی نعمتوں کو ترجیح دی۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ: ۲۲

بائیسویں پارے کے مضامین

اِس پارے کے شروع میں ازواجِ مُطہرات سے کہا گیا کہ آپ لوگوں کا مقام امتیازی ہے، سوتقویٰ اختیار کرو، غیر محرم مردوں کے ساتھ نرم لہجے میں بات نہ کرو اور ضرورت کے مطابق بات کرو، اپنے گھروں پر رہو اور زمانۂ جاہلیت کی طرح زیب وزینت کی نمائش نہ کرو، نماز اور زکوٰۃ اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت پر کاربند رہو اور جو ایسا کریں گی تو اُن کو دُہرا اجر ملے گا اور اُن کے لئے آخرت میں عزت کی روزی کا اہتمام ہے۔ اسی مقام پر اہلِ بیتِ رسول کے لئے نوید ہے کہ اللہ اُن سے ناپاکی کو دور کرنا چاہتا ہے اور اُنہیں خوب پاکیزہ رکھنا چاہتا ہے۔ مُفسرین کے مطابق اس آیتِ تطہیر کا مصداق سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی اور حسنین کریمین رضی اللہ عنہم کے ساتھ ساتھ اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن بھی ہیں کیونکہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم وموسیٰ علیہما السلام کے واقعات میں ''اہل بیت'' کا بیوی پر بھی اطلاق کیا گیا ہے۔ آیت:35 میں مومن مردوں اور عورتوں کی مشترکہ صفات بیان کی گئی ہیں کہ وہ اطاعت شعار ہیں، صداقت شعار ہیں، پیکرِ صبر ورضا ہیں، اُن کے دل اللہ کے حضور عجز وتواضع کے خوگر ہیں، وہ صدقات دینے والے ہیں، روزے دار ہیں، اپنی حیاء اور عزت کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے ہیں، ان کے لئے اللہ نے بخشش اور اجرِ عظیم کی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔

آیت نمبر:36 میں فرمایا: اور نہ کسی مومن مرد اور نہ کسی مومن عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا فیصلہ فرمادیں تو ان کے لیے اپنے اس کام میں کوئی اختیار ہو، یعنی کسی مسلمان فرد، قوم، حکومت یا حکومتِ اسلام کے مقرر کردہ کمیشن اور قانون ساز ادارے کو اس امر کا اختیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کے مقابلے میں کوئی نئی راہِ عمل تجویز کرے۔

آیت :37 سے یہ مسئلہ بیان ہوا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کے حکم میں نہیں ہوتا اور اُس کی مُطلقہ بیوی سے نکاح میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی معیوب بات ہے۔ آیت :40 میں سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے ایک عظیم ترین اعزاز کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں آخری نبی ورسول بنایا اور ''خاتم النّبیین'' ہونا آپ کے مقامِ فضیلت میں بیان ہوا۔ آیت :44 میں رسول اللہ ﷺ کے امتیازی صفات کا ذکر ہے کہ آپ کو شاہد، مُبشر (رحمت الٰہی کی بشارت دینے والا)، نذیر (اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا)، اذنِ الٰہی سے دعوتِ حق دینے کا اور ''سراجِ منیر'' (روشن کرنے والا آفتاب) بنا کر بھیجا۔

آیت نمبر :49 میں اس مطلقہ کا حکم بیان فرمایا جس سے خلوتِ صحیحہ نہ ہوئی ہو کہ اس پر عدت لازم نہیں ہے، ان کو کچھ مال دے کر حسن سلوک سے رخصت کردو۔

آیت :53 سے آدابِ بارگاہِ نبوت بیان ہوئے کہ اجازت کے بغیر نبی کے گھر میں داخل نہ ہو، دعوتِ طعام ہو تو کھانا کھا کر منتشر ہوجاؤ، نبی کی بیویوں سے کوئی چیز مانگو، تو پردے کے پیچھے سے مانگو، نبی کی بیویوں سے آپ کی رحلت کے بعد دائمی طور پر مسلمانوں کا نکاح ممنوع ہے اور اپنے کسی بھی عمل سے اللہ کے رسول ﷺ کو کوئی ایذا نہ پہنچاؤ۔ آیت :56 شانِ رسالت میں عظیم ترین آیت ہے، فرمایا: ''بے شک اللہ اور اُس کے فرشتے نبی پر درود پڑھتے ہیں، اے اہلِ ایمان! تم بھی اُن پر درود پڑھو اور کثرت سے سلام بھیجو''۔ مُفسّرین نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''صلوٰۃ علی الرسول'' کے کئی معنی بتائے ہیں، لیکن جو معنیٰ آپ کے شایانِ شان ہے، وہ ہے: ''عظمت عطا کرنا''۔ آیت :57 میں بتایا کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو ایذا پہنچانے والوں پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور اللہ نے اُن کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ آیت :59 میں مومنات خواتین کے لئے پردے کا حکم ہے، یعنی ایسی چادر اوڑھنا جس سے کامل ستر حاصل ہوجائے۔ آیت :60 تا 61 میں منافقین اور فاسقین، جن کے دلوں میں عداوتِ مصطفیٰ کا روگ ہے، اور مدینے میں جھوٹی افواہیں (Disinformition) پھیلانے والوں کو خبردار کیا گیا کہ

اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے، تو اُنہیں مدینے میں رہنے نہیں دیا جائے گا اور یہ لوگ لعنتی ہیں اور جہاں بھی پائے جائیں، انہیں چن چن کر قتل کر دیا جائے۔ آیت:67 میں بتایا کہ فسق و فجور اور گمراہی کو اختیار کرنے والے اور اُن کے لیڈر قیامت کے دن ایک دوسرے کے خلاف سلطانی گواہ بنیں گے۔ آیت:70 سے اہلِ ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے، سیدھی اور کھری بات کرنے اور اپنے اعمال کو درست رکھنے کا حکم دیا گیا اور ان اعمال کی جزا گناہوں کی مغفرت اور بڑی کامیابی بتائی گئی۔

سورۂ سبا

سورۂ سبا مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 34 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 58 ویں سورت ہے۔ اس سورت میں سبا کا ذکر ہے جو کہ یمن کے ایک علاقے کا نام ہے، اس لیے اس سورت کو اس نام سے موسوم کیا گیا۔

اس سورت میں توحید، رسالت، قیامت اور مرنے کے بعد زندہ ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور اہل سبا کو عطا کردہ نعمتوں کا ذکر ہے۔

اس سورت کی ابتدا میں دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے لیے حمد، زمین میں داخل ہونے والی اور اس سے نکلنے والے چیزوں، آسمان سے نازل اور اس کی طرف عروج کرنے والی چیزوں کا علم اللہ تعالیٰ کو ہونے کا بیان ہے۔

منکرین قیامت کے انکار کے جواب میں فرمایا کہ قیامت ضرور آئے گی۔

آیت:09 سے میں دشمنانِ رسول کے لئے عبرت ناک عذاب کی وعید ہے۔

آیت:10 سے حضرت داؤد علیہ السلام کے معجزات کا ذکر ہے کہ اُنہیں یہ فضیلت دی گئی کہ پہاڑ اور پرندے اُن کے ساتھ تسبیح کرتے تھے، لوہا اُن کے لئے نرم کر دیا گیا تھا اور وہ زِرہیں بناتے اور باندھنے کے لئے اُن میں کڑیاں ڈالتے۔ اسی طرح سلیمان علیہ السلام کے معجزات کا ذکر ہے کہ ہوا اُن کے تخت کو تیز رفتاری سے اڑا کر لے جاتی، اُن کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا، اللہ کے اِذن سے جنّات اُن کے اَحکام کو بجالانے کے پابند

تھے، سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جنات بڑے بڑے قلعے اور ٹاور، مجسمے اور حوضوں کے برابر ٹب اور چولہوں پر جمی ہوئی دیگیں بناتے تھے، ان تمام نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آلِ داؤد! شکر کرو اور میرے بہت کم بندے شکر گزار ہیں۔ دریں اثنا کہ جنات سلیمان علیہ السلام کے حکم سے تعمیرات میں مصروف تھے، تو وہ ایک بلوری (Crystal) کیبن میں تشریف فرما ہوئے اور اس دوران قضائے الٰہی سے اُن کی وفات ہوگئی، مگر جنات کو اُن کی وفات کا تب پتا چلا جب دیمک نے اُن کے عصا کو جس سے وہ ٹیک لگائے ہوئے تھے، اندر سے چاٹ لیا اور پھر وہ زمین پر گر گئے، اُس وقت جنات کفِ افسوس ملنے لگے کہ اگر ہمیں غیب کا علم ہوتا تو اتنے طویل عرصے تک ہم ذلت آمیز مزدوری میں مصروف نہ رہے ہوتے، شاید یہی وہ ''ہیکلِ سلیمانی'' ہے، جس کے آثار کی تلاش میں یہود وقتاً فوقتاً بیت المقدس کی عمارت کو گرانے کی مذموم کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ موت انبیاء کے اَجسام پر کوئی طبعی اثرات مرتب نہیں کرتی اور یہی وجہ ہے کہ جنات کو اُن کی موت کا پتا نہ چل سکا۔

آیت: 15 سے ایک بار پھر ملکۂ سبا کے باغات اور اُن پر تُند و تیز سیلاب اور اُس کی تباہ کاریوں کا ذکر ہے۔ آیت: 22 سے مشرکین کے باطل معبودوں کی بے بسی کا ذکر ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حضور اُس کے اذن کے بغیر کسی کو مجالِ شفاعت نہیں۔ آیت: 28 میں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالتِ عامہ کا ذکر ہے کہ آپ کی دعوت پورے عالمِ انسانیت کے لئے تھی اور یہ سارا عالمِ انسانیت آپ کی ''اُمتِ دعوت'' ہے اور جن خوش نصیب اہلِ ایمان نے اس دعوت کو قبول کیا، وہ سب ''اُمتِ اجابت'' ہیں۔ اگلی آیات میں اس مفہوم کا بیان ہے کہ اپنے عہد کے جابروں اور مُتکبرین کو آخرت میں اُن کے عہد کے کمزور طبقات کے لوگ یہ کہیں گے کہ ہمارے ایمان سے محرومی کا سبب تم بنے تھے۔ مزید بتایا کہ پچھلی اُمتوں کے خوشحال لوگ مال و دولت کی فراوانی کو اپنی مقبولیت کی دلیل سمجھتے تھے، اللہ نے فرمایا: اُس کا قُرب مال و دولت کی فُراوانی سے نہیں ملتا بلکہ ایمان اور عملِ صالح کی دولت

سے ملتا ہے، رزق کی کشادگی یا تنگی کا تعلق کسی کی فضیلت یا بے توقیری سے نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ کبھی وہ نعمتوں کی فراوانی امتحان کے طور پر فرماتا ہے اور کبھی ابتلا و آزمائش کے طور پر۔

آیت نمبر:40 میں اللہ تعالیٰ کے فرشتوں سے سوال کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے اور فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہوئے اس کی بندگی کے اظہار کرنے کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:45 میں فرمایا کہ ان کفار سے پہلے جن لوگوں نے رُسل کو جھٹلایا وہ ان سے قوت و دبدبے میں زیادہ تھے، لیکن وہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہ بچ سکے۔

آخری آیات میں فرمایا کہ روزِ حشر کفار کی خواہش ہوگی کہ عذاب سے نجات مل جائے، مگر ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔

سورۂ فاطر

سورۂ فاطر مکی سورت ہے، ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے 35 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 43 ویں سورت ہے۔ اس کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفت ''فاطر'' کا ذکر ہے، اس لیے اس سورت کو ''فاطر'' کا نام دیا گیا۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اثبات، فرشتوں اور جنات کی الوہیت کے رد اور مشرکین کے خود ساختہ معبودوں کے بطلان کو بیان کیا گیا ہے۔

اِس سورت کی ابتدا میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو دو اور چار چار پروں والے فرشتے پیدا کئے، اللہ تعالیٰ قادرِ مُطلق ہے، وہ کسی پر اپنی رحمت کے فیضان کو کھول دے، تو کسی کی مجال نہیں کہ اسے روک دے اور جس کے لئے وہ روک دے، تو کسی کی مجال نہیں کہ وہ فیضانِ رحمت عام کردے۔ رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: آپ غمگین نہ ہوں، آپ سے پہلے رسولوں کو بھی جھٹلایا گیا ہے۔

آیت نمبر:5 میں تمام انسانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کا وعدہ حق

ہے اور دنیاوی زندگی کی لذتوں میں کھوکر کہیں دھوکے میں نہ پڑ جاؤ اور شیطان تمہارا دشمن ہے، اس لیے اس کو اپنا دشمن سمجھو۔

آیت 9: سے 13 تک ایک بار پھر اللہ کی قدرت کے تحت بارش کے نظام کا ذکر ہے، انسان کو اُس کے جوہرِ تخلیق کی طرف متوجہ کیا گیا ہے تاکہ سرکشی کا شکار نہ ہو اور یہ کہ وہ مادہ کے پیٹ میں حمل کو بھی جانتا ہے اور یہ کہ کسی کی عمر میں درازی یا کمی ہوتی ہے، تو وہ اللہ کی کتاب وتقدیر میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے۔ آیت 12: سے فرمایا کہ میٹھے اور کھارے پانی کے سمندر برابر نہیں ہوتے، لیکن سب سمندروں سے تمہیں مچھلی کا تازہ گوشت ملتا ہے اور تم اُن سے پہننے کے زیور نکالتے ہو اور کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں، نظامِ لیل ونہار اور شمس وقمر اُسی کے حکم کے تابع ہے۔

آیت نمبر 14: میں ایک بار پھر کفار کے معبودوں کی بے بسی کا ذکر ہے۔

آیت 18: میں بتایا کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، یعنی ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کا جواب دینا ہوگا، جو تزکیہ اور تقویٰ اختیار کرے گا، اُس کا فائدہ اُسی کو پہنچے گا۔ اندھا اور بینا، ظلمت ونور، سایہ اور دھوپ اور زندہ ومردہ لوگ برابر نہیں ہو سکتے، یہاں کُفار اور منکرین کو اندھے، ظلمت، دھوپ اور مردے سے تشبیہ دی اور اہلِ ایمان کو بینا، نور، سایہ اور زندوں سے تشبیہ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں یہ بھی بتایا کہ حُجّتِ الٰہیہ قائم کرنے کے لئے ہر قوم کی طرف نذیر یعنی روشن دلائل اور الہامی کتابیں دے کر نبی اور رسول بھیجے گئے، لیکن ہر دور میں پیغامِ حق کو جھٹلانے والے موجود رہے۔

آیت نمبر 27: میں فرمایا کہ ایک پانی سے مختلف رنگوں کے پھلوں، ایک ہی پہاڑی سلسلے میں مختلف رنگوں کے پہاڑ، ایک نوعِ انسانی میں مختلف رنگ کے لوگوں اور چار پایوں اور جانوروں کو مختلف رنگوں میں پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہے۔

آیت 28: میں بتایا کہ علمائے ربانیین کے دلوں میں اللہ کی خشیت ہوتی ہے۔ آیت نمبر 32 سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو برگزیدہ وچنیدہ اور نیکی کے کاموں میں سبقت

کرنے والے فرما کر جنّت کی اُن نعمتوں کا ذکر کیا جواُن عبادِ صالحین کے لئے تیار ہیں۔

آیت نمبر :40 میں مشرکین کے باطل معبودوں کا رد کیا گیا ہے۔

آیت :41 سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو اپنے مرکز سے ہٹنے نہیں دیتا، اور اگر وہ اپنے مرکز سے ہٹ جائیں تو اللہ کے سوا کوئی اُن کو اپنی جگہ قائم نہیں کرسکتا۔ آیت :45 میں فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے ان کی گرفت فرماتا، تو روئے زمین پر کسی جاندار کو (زندہ) نہ چھوڑتا لیکن وہ ایک وقت مقررہ تک انہیں ڈھیل دے رہا ہے، پس جب ان کا وقت آجائے گا، تو اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھ لے گا۔

سورۂ یٰس

سورۂ یٰس مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 36 ویں جب کہ نزول کے اعتبار سے 41 ویں سورت ہے۔ اس سورت کا نام یٰس ہے جو پہلی آیت میں مذکور ہے۔ اس سورت کو قرآن کا دل بھی کہتے ہیں۔ احادیث میں اس کو مغفرت، قضائے حاجات اور آسانی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

سورت کے شروع میں فرمایا کہ نزولِ قرآن کا مقصد غافل لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا ہے اور اُن پر حق کی حجت کو قائم کرنا ہے، لیکن کچھ سرکش لوگ ایسے ہیں کہ جن پر دعوتِ حق اثر انداز نہیں ہوتی۔ دعوتِ حق اُنہی پر اثر انداز ہوتی ہے جو نصیحت کو قبول کریں اور جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہو۔ اگلی آیات میں اس امر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعوتِ حق کے لئے اپنے نبی ایک بستی (انطاکیہ) کی طرف بھیجے، بستی والوں نے اُن کی تکذیب کی اور اُن سے بدفالی لی اور اُنہیں سنگسار کرنے اور دردناک عذاب دینے کی دھمکی دی، انبیاء نے اُن پر حُجتِ الٰہیہ کو قائم کیا اور شہر کے آخری کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ ان کی پیروی کرو، یہ تم سے کسی اجر و انعام کے طلبگار نہیں ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ: ۲۳

تیئیسویں پارے کے مضامین

پہلی آیت میں بجائے اس کے کہ مشرکین کے باطل معبودوں کی مذمت کی جاتی، نہایت حکیمانہ انداز میں یہ فرمایا: ''میں اس معبود کی عبادت کیوں نہ کروں، جس نے مجھے پیدا کیا اور تم بھی اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے، کیا میں معبودِ برحق کو چھوڑ کر ان (بتوں) کو معبود قرار دوں کہ اگر رحمان مجھے نقصان پہنچانا چاہے، تو ان کی شفاعت میرے کسی کام نہ آئے اور نہ ہی وہ مجھے نجات دے سکیں''۔ اس کے بعد اس مومن کو جنت میں داخل کرنے اور اس قوم کی تباہی اور ہلاکت کا بیان ہے۔

آیت نمبر: 38 سے اللہ تعالیٰ کی قدرت وجلالت کو بیان کیا کہ سورج، چاند اور سیارے قادرِ مطلق کے نظم کے تابع چل رہے ہیں اور یہ ممکن ہی نہیں کہ ان میں کوئی فساد یا ٹکراؤ ہو جائے۔

آیت نمبر: 48 میں فرمایا کہ کفار کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب آئے گا اگر تم سچے ہو، اس کے بعد وقوعِ قیامت اور بعث بعد الموت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔

آیت نمبر 54 سے بغیر کسی ظلم کے اعمال کا بدلہ دینے اور جنتی لوگوں کے لیے نعمتوں کا ذکر ہے اور مجرموں کو الگ کرنے اور جہنم کے عذاب کا ذکر ہے۔

آیت نمبر: 65 سے بتایا کہ قیامت کے دن مجرموں کے مونہوں پر مہریں لگا دی جائیں گی اور ان کے ہاتھ اور پاؤں (اور دیگر اعضاء) سلطانی گواہ بن کر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم سے کیا کیا جرائم کرائے جاتے رہے۔

آیت نمبر: 68 میں بتایا کہ جسے ہم لمبی عمر دیتے ہیں تو ہم اس کی جسمانی بناوٹ کو (ابتدائی حالت کی طرف) الٹ دیتے ہیں، یعنی ایسی لمبی عمر کی دعا مانگنی چاہئے جس میں انسان کی عقلی، علمی، فکری اور جسمانی قُویٰ سلامت رہیں۔ آیت نمبر: 78 سے منکرینِ آخرت کے

اس عقلی سوال کا ذکر فرمایا کہ جب انسان مرجائے گا اور ہڈیاں تک بوسیدہ ہوجائیں گی، تو دوبارہ کون زندہ کرے گا؟ اور پھر جواب دیا کہ دوبارہ بھی وہی خالق تبارک وتعالیٰ زندہ کرے گا، جس نے بغیر کسی نام ونشان کے پہلے پیدا کیا تھا، حالانکہ اب کوئی ذرۂ خاک یا راکھ موجود ہے۔ مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے تو فرماتا ہے ''کُن'' (ہوجا)، تو وہ چیز وجود میں آجاتی ہے، ''کن'' کہنا بھی ضروری نہیں ہے، صرف اللہ تعالیٰ کا ارادہ کافی ہے۔

سورۃ الصّٰفّٰت

سورۂ ''الصّٰفّٰت'' مکی سورت ہے، ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے 37ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 56ویں سورت ہے، اس سورت کی وجہ تسمیہ پہلی آیت میں ''الصّٰفّٰت'' کا مذکور ہونا ہے۔

اس سورت کے شروع میں فرشتوں کی مختلف جماعتوں کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کا ذکر فرمایا ہے۔

پہلے شیطان کا داخلہ عالمِ بالا کی طرف ہوتا تھا، مگر آیت نمبر: 10 میں بتایا کہ اب اس کا داخلہ عالمِ بالا میں بند ہے اور اگر وہ ادھر کا رخ کرے تو اس پر آگ کے انگارے برسائے جاتے ہیں۔ آیت نمبر: 22 سے منکرینِ آخرت کی بے بسی کا ذکر ہے کہ وہ سرنگوں ہوں گے، ایک دوسرے کی مدد نہیں کرپائیں گے اور سب داخلِ عذاب ہوں گے، کیوں کہ جب انہیں دنیا میں دعوتِ توحید دی جاتی تھی تو وہ تکبر کی بنا پر اسے رد کرتے تھے۔

آیت نمبر: 40 تا 49 میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کو آخرت میں عطا کی جانے والی نعمتوں کا ذکر ہے کہ انہیں عمدہ میوے ملیں گے، وہ جنت میں اعزاز واکرام کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل مسندوں پہ بیٹھے ہوئے ہوں گے، سفید اور لذیذ شرابِ طہور کے جام گردش میں ہوں گے کہ جن سے نہ دردِ سر ہوگا اور نہ ہوش اڑیں گے، پیکرِ شرم وحیاء حوریں ہوں گی اور وہ بلند مقام سے جہنمیوں کا مشاہدہ کررہے ہوں گے۔

آیت نمبر:62 سے جہنمیوں کی کیفیت کو بیان کیا کہ شیطان کے سروں کی طرح دوزخ کی جڑ سے پیدا ہونے والا ''زقوم'' (تھوہر) کا درخت ان کی غذا ہوگا، پھر انہیں جہنم کا کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔ اس کے بعد آیت نمبر 75 سے طوفانِ نوح سے نوح علیہ السلام کے ساتھ صالح مسلمانوں کے نجات پانے اور سرکشوں کے ڈبوئے جانے کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:83 سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ایک بار پھر مذکور ہوا کہ آپ قوم کے ساتھ میلے میں نہ گئے اور ان کے بتوں کو پاش پاش کر دیا اور پھر انہوں نے آگ کا ایک الاؤ تیار کر کے ابراہیم علیہ السلام کو اس میں ڈال دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان کی تدبیر کو ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کی بشارت، اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے کی عمر کو پہنچنے کے بعد خواب میں ان کے ذبح کا حکم دیئے جانے اور پھر باپ بیٹے دونوں کے حکم ربانی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا ذکر ہے۔ آیت:105 میں فرمایا کہ ابراہیم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا اور اسماعیل علیہ السلام کے فدیے کے طور پر غیب سے نمودار ہونے والے ایک مینڈھے کے ذبح کئے جانے کا ذکر ہے، جسے قرآن نے ''ذبحِ عظیم'' قرار دیا ہے۔ اس کے بعد دیگر انبیائے کرام، حضرت اسحاق، موسیٰ، ہارون، الیاس، الیاسین، لوط اور یونس علیہم السلام کا ذکر ہے۔ یونس علیہ السلام کے قوم سے بھاگ کر کشتی میں سوار ہونے، پھر قرعہ اندازی کے ذریعے ڈولتی ہوئی کشتی سے دریا میں ڈالے جانے اور پھر مچھلی کے نگل جانے کا ذکر ہے اور اللہ کی شانِ اعجاز کہ انہیں مچھلی کے پیٹ میں سلامت رکھا اور ان تمام مراحل میں وہ اپنی خطائے اجتہادی پر اپنے آپ کو ملامت کرتے رہے، پھر انہوں نے توبہ کے ارادے سے یہ تسبیح پڑھی: ''لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ''۔ اللہ عزوجل نے فرمایا اگر وہ تسبیح نہ پڑھتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلی نے انہیں ساحل پر اگل دیا، وہ بیمار تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لئے لوکی کی ایک بیل کو اگا کر ان پر سایہ فگن کر دیا۔ قرآن نے یہ بھی بتایا کہ وہ ایک لاکھ سے زیادہ لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔

آیت نمبر:149 سے مشرکوں کی عجب فطرت کا ذکر ہے کہ اپنے لئے بیٹوں کی تمنا کرتے ہیں اور اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں، (وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے)۔ وہ اللہ کی طرف جھوٹ پر مبنی اولاد کی نسبت کرتے ہیں، حالانکہ اللہ اس سے پاک ہے۔

آیت نمبر:158 میں اللہ تعالیٰ اور جنات کے درمیان نسبی قرابت کا رد فرمایا ہے اور بعد کی آیتوں میں فرشتوں کی عبودیت کا ذکر فرما کران کی الوہیت کا رد فرمایا ہے۔

سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح وحمد بیان کی گئی ہے، اس کے بعد انبیائے کرام علیہم السلام پر سلام بھیجا گیا ہے اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ تمام تعریفوں کا استحقاق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔

سورۂ صٓ

سورۂ صٓ مکی سورت ہے، ترتیب مصحف اور ترتیب نزول دونوں اعتبار سے 38 ویں سورت ہے۔ اس سورت کا پہلا کلمہ ''صٓ'' ہے، اس لیے اس سورت کا نام ''صٓ'' رکھا گیا ہے۔

اس سورت میں کفار کے باطل عقائد، گزشتہ امتوں کی سرکشی اور تباہی، حضرت داؤد، سلیمان، ایوب علیہم السلام کے حالات اور قصۂ آدم علیہ السلام وابلیس کا ذکر ہے۔

اس سورت کی ابتدا میں قرآن کی قسم کھا کر فرمایا کہ کافر تکبر اور مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں، اس کے بعد سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتخاب پر اور بے شمار معبودوں کی بجائے الٰہ واحد کی عبادت پر کفار کے تعجب کا ذکر فرمایا۔

آیت نمبر:10 سے ان مشرکین کو جنہیں اپنی طاقت پر ناز تھا اور خدائی کے دعوے کرتے تھے، فرمایا کہ اگر آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان ہر چیز کی بادشاہت ان کی ہے تو پھر انہیں چاہئے کہ آسمانوں کی طرف چڑھیں اور ظاہر ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے، تو پھر انہیں اپنے عجز کا اعتراف کر لینا چاہئے۔ اس سورت میں قوم نوح، عاد و فرعون، ثمود، قوم لوط

اور اصحاب الایکہ کا ایک بار پھر ذکر ہے کہ انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا، ان پر اللہ کا عذاب سچا ثابت ہوا۔ آیت: 17 سے داؤد علیہ السلام اور ان کے معجزات کا ذکر ہے کہ پرندے زبور کی تلاوت کرتے وقت جمع ہوتے تھے اور اللہ نے انہیں سلطنت، حکمت اور قولِ فیصل عطا کیا اور ان کے پاس دائر ایک مقدمے کا ذکر آیا۔ ایک شخص نے کہا کہ میرے بھائی کی ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے اور وہ مجھ پر دباؤ ڈال رہا کہ میں وہ ایک بھی اسی کو دے دوں۔ داؤد علیہ السلام نے کہا کہ ایک دنبی کا مطالبہ کر کے اس نے ظلم کیا ہے اور اکثر شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ کئے۔ قرآن سلیمان علیہ السلام کا ذکر فرماتا ہے کہ وہ اللہ کے بہت اچھے بندے اور اس کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے۔ آیت: 31 سے سلیمان علیہ السلام کے سامنے سدھائے ہوئے تیز رفتار گھوڑوں کے پیش کئے جانے کا ذکر ہے، آپ نے ان پر ہاتھ پھیرا، پھر ان کی آزمائش کا ذکر ہے جس کی تفصیل کو قرآن نے بیان نہیں کیا، تفاسیر میں مختلف روایات ہیں، جن میں سے اکثر روایات اسرائیلیات سے ہیں اور اس سلسلہ میں محقق مفسرین کا ضابطہ وقاعدہ یہ ہے کہ ہر ایسی روایت جو مقامِ نبوت کے خلاف ہو اسے رد کر دینا چاہئے۔

آیت نمبر: 41 سے حضرت ایوب علیہ السلام اور ان کے مصائب کا ذکر ہے۔ اللہ نے انہیں حکم دیا: اپنا پاؤں زمین پر مارو، ان کے پاؤں کی ضرب سے غسل اور پینے کے لئے ٹھنڈا پانی نکل آیا اور مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ ان کے لئے وسیلۂ شفا بھی بنا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے طور پر اہل و مال کی جو نعمتیں ان سے سلب فرمائی تھیں وہ ان کو دگنی مقدار میں دوبارہ عطا فرما دیں۔ انہوں نے کسی وجہ سے اپنی بیوی کو سو کوڑے مارنے کی قسم کھائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس قسم سے بری ہونے کے لئے ان کو یہ تدبیر بتائی کہ سو تنکوں کا ایک جھاڑو بنا کر ایک ضرب لگائیں تو یہ قسم پوری ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایوب علیہ السلام صابر تھے، اللہ کے پیارے بندے تھے اور اس کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے۔ مفسرین نے ایوب علیہ السلام کے مصائب کے حوالے سے بہت سی اسرائیلی روایات نقل کی

ہیں، اللہ کے نبی کی طرف منسوب ہر اس بات کو رد کر دینا چاہئے جو مقامِ نبوت کے شایانِ شان نہ ہو۔ اگلی آیات میں ایک بار پھر ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولادِ امجاد انبیاء کا ذکر ہے کہ یہ سب اللہ کے چنیدہ اور پسندیدہ بندے تھے۔

آیت نمبر: 49 سے اہلِ تقویٰ کے لئے جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے اور جہنمیوں کے لئے عذاب کی مختلف صورتوں کا ذکر ہے کہ ان کو پینے کے لئے کھولتا ہوا پانی اور جہنمیوں کے زخموں کی پیپ دی جائے گی جبکہ اہلِ جنت کو طرح طرح کے پھل اور شرابِ طہور ملے گا۔

آیت نمبر: 71 سے آدم علیہ السلام کی تخلیق، تمام فرشتوں کے انہیں سجدہ کرنے اور تکبر کی بنا پر شیطان کے سجدے سے انکار کا ذکر ہے۔

آیت نمبر: 75 میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے جواب طلب فرمایا کہ آدم کو میں نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا، تو تمہارے اس کو سجدہ کرنے سے کون سی چیز مانع ہوئی، تو نے تکبر کیا یا پہلے ہی تو تکبر کرنے والوں میں سے تھا۔ شیطان نے کہا کہ میں آدم سے افضل ہوں، میرا مادۂ تخلیق (آگ) آدم علیہ السلام کے مادۂ تخلیق (مٹی) سے افضل ہے۔ اللہ نے فرمایا تو مردود ہے، جنت سے نکل جا اور قیامت تک تجھ پر میری لعنت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اپنی خطائے (اجتہادی) کو تسلیم کرنا اور اس پر اللہ سے معافی مانگنا آدم علیہ السلام کی سنت ہے اور اپنی معصیت پر ڈٹ جانا اور اس کو درست ثابت کرنے کے لئے دلیل کا سہارا لینا یہ ابلیس کا شعار ہے۔ اگلی آیات میں بتایا کہ شیطان کو قیامت تک کے لئے مہلت دے دی گئی اور اُس نے عہد کیا کہ میں اللہ کے مخلص بندوں کے سوا تمام اولادِ آدم کو گمراہ کروں گا۔

سورۃ الزمر

''سورۃ الزمر'' مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 39 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 59 ویں سورت ہے۔

اس سورت کی آیت نمبر: 71 اور 73 میں ''زمر'' کا لفظ آیا ہے، اس لیے اس کا نام ''الزمر'' رکھا گیا ہے۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا اثبات اور مشرکین کے شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے، قرآن کی جلالت وعظمت اور مومنین کے اوصاف کا ذکر ہے اور قیامت کے وقوع اور حساب وکتاب کا ذکر ہے۔

اس سورت کی ابتداء میں حکم فرمایا کہ دین کو اللہ کے لئے خالص کرو، مشرک یہ کہتے کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔ اللہ نے فرمایا کہ وہ جھوٹے کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

آیت نمبر: 04 میں اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹا ثابت کرنے والوں کا رد ہے۔

آیت نمبر: 05 سے ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، گردشِ لیل ونہار کا نظام بنایا اور سورج اور چاند کے لئے اپنا اپنا مدار اور منزلیں مقرر کیں۔ تمام انسانوں کو ایک جان آدم علیہ السلام سے پیدا کیا اور انہی سے ان کا جوڑا پیدا کیا اور وہی ہے جو ماں کے پیٹ میں تہ در تہ ظلمتوں میں جنین کی پرورش کرتا ہے۔

آیت نمبر: 7 میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی ناشکری کی کوئی پروا نہیں اور اپنے بندوں کے لیے ناشکری کو ناپسند اور شکر کو پسند فرماتا ہے۔

آیت نمبر: 08 سے ایک بار پھر انسان کی فطری خودغرضی کو بیان کیا کہ نعمت ملے تو رب کو بھول جاتا ہے اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے۔

آیت نمبر: 09 سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے، جو اپنی راتوں کو سجدہ اور قیام میں گزارے، آخرت کے عذاب سے ڈرتا رہے اور اللہ کی رحمت پر یقین رکھے، (ان کا مرتبہ بلند ہے)۔ تعلیمِ امت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا: آپ کہیے کہ مجھے خالص اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے، مجھے سب سے پہلا مسلمان بننے کا حکم دیا گیا ہے اور میں اپنے دین وعبادت کو اللہ کے لئے خالص کرتا ہوں۔ آیت نمبر: 21 میں ایک بار پھر اللہ کی قدرت وجلالت کا بیان ہوا کہ اس نے آسمان سے بارش برسائی، زمین میں چشمے جاری کئے، رنگ برنگی فصل اگائی، پھر جب فصل پک کر زرد ہو جاتی ہے تو وہ اس کو

چورہ چورہ کر دیتا ہے، اس میں عقل والوں کے لئے نصیحت ہے۔

آیت نمبر:10 میں مومنین کو تقویٰ پر کار بند رہنے اور رکاوٹ کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی زمین کے وسیع ہونے اور مصائب وآلام پر صبر کرنے والوں کے لیے بے حساب اجر وثواب کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:15 سے غیر اللہ کی عبادت کرنے والوں کے لیے عذابِ شدید اور بتوں کی عبادت سے اجتناب کرنے والوں اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والوں اور اچھی بات سن کر پیروی کرنے والوں کو بشارت دینے اور ہدایت دینے کا ذکر ہے۔

آیت :22 میں فرمایا: اللہ جس کے سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے تو وہ اپنے رب کی طرف سے نورِ ہدایت پر قائم رہتا ہے۔ آیت نمبر:23 میں قرآن مجید کی اثر آفرینی کو بیان کیا کہ یہ ملتے جلتے مضامین پر مشتمل بہترین کلام ہے، جسے بار بار دہرایا جاتا ہے، (جن کے دلوں میں خشیتِ الٰہی ہے، اسے سن کر) ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کے جسم اور دل اللہ کی یاد کے لئے نرم ہو جاتے ہیں۔

آیت نمبر:27 سے فرمایا کہ ہم نے نصیحت کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں، یہ قرآن عربی ہے اور اس میں کوئی کجی نہیں۔ اللہ تعالیٰ دو شخصوں کی مثالیں بیان فرماتا ہے ایک وہ ہے جو کئی متضاد خیالات لوگوں کی غلامی میں ہے اور دوسرا وہ ہے جو صرف ایک شخص کا غلام ہے، کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں، یعنی جو اللہ وحدہٗ لاشریک کا بندہ ہے، اس کا قلب ایمان وایقان اور نورِ ہدایت کی نعمت سے معمور ہوگا اور اسے صرف ایک مالک کو راضی کرنا ہے، یہ مومن کامل ہے اور مشرک جو باطل معبودوں کا پجاری ہے، وہ تشکیک اور وہم میں مبتلاء ہے اور اسے سجھائی نہیں دیتا کہ کس معبود کو راضی کرے اور کس کو ناراض۔

آیت نمبر:60 میں اللہ پر جھوٹ باندھنے والوں کے چہروں کے سیاہ ہونے اور آیت نمبر:61 میں متقین کی کامیابی اور نجات کا ذکر ہے۔

آیت نمبر :62میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق اور نگہبان ہے اور زمین اور آسمان کی کنجیوں کا مالک ہے۔

آیت نمبر :68میں دوبار صور پھونکے جانے، زمین کا رب کے نور سے جگمگا اٹھنے، دفترِ عمل رکھ دیے جانے اور حساب کتاب کا انصاف کے ساتھ ہونے کا بیان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ: ۲۴

چوبیسویں پارے کے مضامین

اس کے شروع میں اللہ پر جھوٹ باندھنے اور حق کو جھٹلانے والے کو جہنمی قرار دیا گیا اور سچے دین کو لے کر آنے والے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی تصدیق کرنے والے (مفسرین نے اس سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مراد لیا ہے) کو متقی قرار دیا گیا۔

آیت نمبر: 36 میں کفار کے اپنے معبودوں کے حوالے سے دھمکیوں کے جواب میں فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں؟۔

آیت: 38 میں بتایا کہ اللہ کی قدرت پر کسی کا بس نہیں چلتا۔

آیت: 41 میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے آپ پر حق پر مبنی کتاب نازل کی، سو جو ہدایت کو اختیار کرے اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو گمراہی کو اختیار کرے، اس کا وبال اسی پر ہوگا، آپ ان کے ذمے دار نہیں ہیں۔ اگلی آیت میں نیند کو عارضی موت سے تعبیر کیا اور بتایا کہ نیند اور موت میں اتنا ہی فرق ہے کہ موت کی صورت میں بندے کی روح عارضی طور پر نہیں بلکہ مدت دراز کے لئے قبض کر لی جاتی ہے۔

آیت نمبر: 43 اور 44 میں فرمایا کہ سب شفاعت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے اور کفار کے معبودانِ باطل کو کسی شفاعت کا اختیار نہیں بلکہ وہ تو اپنے لیے بھی کسی چیز کے مالک نہیں۔

آیت: 47 میں بے پناہ دولت جمع کرنے والوں کو خبردار کیا کہ اگر وہ زمین کی ساری دولت کے مالک بن جائیں اور اس کے برابر اور بھی ان کو مل جائے اور وہ قیامت کے دن یہ سب کچھ دے کر عذاب سے اپنی گردن چھڑانا چاہیں تو بھی ان کی گلو خلاصی نہیں ہو سکے گی۔

آیت: 53 میں گناہگارانِ امت کو بشارت دی گئی کہ ''(اے رسول!) کہہ دیجئے اے میرے وہ بندو جو گناہ کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر چکے ہیں، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ

ہو، بے شک اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا، یقیناوہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے''۔ یعنی جو اللہ کی راہ سے بھٹک چکا ہے، اسے امید دلائی گئی ہے کہ سچی توبہ کے ذریعے واپسی کا راستہ باقی ہے۔آیت:71 سے بتایا کہ کافروں کو گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکا جائے گا اور وہاں ان کا استقبال توہین آمیز انداز میں ہوگا، جبکہ اہلِ ایمان کو اکرام کے ساتھ جنت کی طرف لے جایا جائے گا اور وہاں ان کا استقبال اعزاز واکرام کے ساتھ ہوگا اور اہلِ جنت اور فرشتے اور کائنات کی ہر چیز اپنے رب کی حمدوثنا کریں گے۔

سورۃ المومن

سورۃ المؤمن مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 40ویں جب کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے 60ویں سورت ہے۔اس سورت میں آل فرعون کے ایک مومن فرد کا ذکر ہے، اس وجہ سے اسے مومن کے نام سے موسوم کیا گیا۔

آیت:02 سے اللہ کے بندوں کو ایک بار پھر نویدِ مغفرت دیتے ہوئے فرمایا:''وہ گناہوں کا بخشنے والا اور توبہ قبول فرمانے والا، (سرکشوں کو) سخت عذاب دینے والا ہے اور (نیکوکاروں پر) بڑا احسان فرمانے والا ہے''۔

آیت نمبر:04 سے کفار کی ہٹ دھرمی پر فرمایا کہ ان سے پہلے لوگوں نے بھی اپنے دور کے انبیاء کو جھٹلایا جس پر ان کی پکڑ ہوئی اور ان کفار کا انجام بھی ان جیسا ہوگا۔نیز اس آیت میں فرمایا کہ مشرکین مکہ کا تجارت کی غرض سے مختلف شہروں کے پرامن اسفار آپ کو ان کے انجام کے متعلق دھوکے میں نہ ڈالے یعنی ان کا انجام برا ہی ہوگا۔آیت نمبر:5 میں فرمایا کہ پچھلی امتوں کے کفار نے بھی اپنے وقت کے رسولوں کو جھٹلایا اور ان سے حق میں جھگڑا کیا سو ان کی پکڑ ہوئی اور عذاب میں مبتلا ہوئے۔اس کے بعد کفار کے دوزخی ہونے کا ذکر ہے۔

آیت:07 سے فرمایا:''وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں، وہ سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں

اور مومنوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں، (اور کہتے ہیں) اے ہمارے رب! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کو محیط ہے، سو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرے راستے کی اتباع کی ہے، ان کی مغفرت فرما اور ان کو دوزخ کے عذاب سے بچا"۔ اس آیت میں بتایا گیا کہ اللہ کے مقرب فرشتے نہ صرف اس کے تائب بندوں کے لئے بلکہ ان کے صالح آباء و اجداد، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد کے لئے بھی جنت کی دائمی نعمتوں کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔

آیت نمبر: 10 میں فرمایا کہ کفار کو قیامت کے دن بلند آواز سے کہا جائے گا کہ تم لوگوں کو اپنے اوپر جتنا غصہ آ رہا ہے، اس سے زیادہ غصہ اللہ تعالیٰ کو تم پر آتا تھا جب تم لوگوں کو ایمان کی دعوت دی جاتی اور تم کفر کرتے تھے، وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے کہیں گے کہ کیا جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت ہے۔

آیت نمبر: 16 میں قیامت کے دہشت ناک دن کا نقشہ کھینچا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: آج کس کی بادشاہی ہے، (سب جانتے ہوئے خاموش ہوں گے)، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اللہ کی، جو واحد سب پر غالب ہے۔

آیت: 17 سے بتایا کہ قیامت کے دن سب کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا، وہاں ظالموں کا کوئی حمایتی اور سفارشی نہیں ہوگا، اللہ خیانت کرنے والی آنکھوں اور سینوں میں چھپے رازوں کو بھی جانتا ہے۔ آیت: 23 سے بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے اپنی نشانیاں اور روشن معجزے عطا کر کے فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا، تو انہوں نے انہیں (معاذ اللہ) جادوگر اور جھوٹا قرار دیا اور اس کے بعد انہی واقعات کا ذکر ہے جو اس سے پہلے بارہا گزر چکے ہیں۔ قرآن نے بتایا کہ فرعون کے پیروکاروں میں سے ایک شخص نے کہا: "کیا تم ایک ایسے شخص کے قتل کے درپے ہو، جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے"۔ آگے چل کر کہا: "اے میری قوم آج تو زمین پر تمہاری حکومت ہے، لیکن اگر اللہ کا عذاب آ گیا تو پھر ہمیں کون بچائے گا"۔

آیت نمبر 36 سے بتایا کہ فرعون نے ہامان سے کہا: میرے لئے ایک بلند عمارت

بناؤ تا کہ میں آسمانوں کے راستوں تک پہنچوں اور موسیٰ کے خدا کے بارے میں خبر لوں اور میرا گمان تو یہ ہے کہ (معاذ اللہ) یہ جھوٹے ہیں اور اسی طرح فرعون کے برے عمل کو اس کے نزدیک خوشنما بنا دیا گیا اور (اس کی سرکشی کے سبب) اسے سیدھے راستے سے روک دیا گیا اور فرعون کی سازش ناکام رہی۔

آیت نمبر 40 تا 46 میں فرمایا: جس نے برا کام کیا، اس کو صرف اسی کے برابر سزا دی جائے گی اور جس مرد و عورت نے ایمان پر قائم رہتے ہوئے نیک کام کیا، تو وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، جہاں انہیں بے حساب رزق عطا کیا جائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، بے شک اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے، سو اللہ نے مخالفین کی سازشوں سے انہیں محفوظ رکھا اور فرعونیوں کو بدترین عذاب نے گھیر لیا، انہیں صبح و شام دوزخ کی آگ پر پیش کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت آئے گی، (یہ حکم دیا جائے گا کہ) آلِ فرعون کو شدید ترین عذاب میں ڈال دو۔ مفسرین نے فرمایا کہ اس آیت سے عذابِ قبر کا ثبوت ملتا ہے۔

آیت: 49 میں بتایا کہ جہنمی، جہنم کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے رب کو بلاؤ کہ ہمارے ساتھ عذاب میں ایک دن کی تخفیف کر دے، جہنم کا محافظ عملہ ان سے کہے گا کہ کیا دنیا میں تمہارے پاس رسول نشانیاں لے کر نہیں آئے تھے، وہ اقرار کریں گے۔ آگے چل کر فرمایا کہ قیامت میں ظالموں کی عذر خواہی انہیں کوئی کام نہیں آئے گی، ان کے لئے لعنت ہے اور برا گھر ہے۔

آیت نمبر: 60 میں فرمایا کہ تیرے رب نے فرمایا کہ مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔

آیت نمبر: 64 سے فرمایا: اللہ ہی نے زمین کو تمہارے لیے جائے قرار اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور تمہاری صورتیں بنائی ہیں اور وہی تمہیں پاکیزہ رزق دیتا ہے۔

آیت: 65 سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: وہی (ہمیشہ) زندہ

رہنے والا ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، سوتم اخلاص کے ساتھ اسی کی بندگی کو اختیار کرو۔

آیت نمبر: 67 میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اور اس کے بعد موت تک کے مختلف مراحل کو اپنی نشانیوں کے طور پر بیان فرمایا ہے۔

آیت: 78 سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بے شک ہم نے آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے، ہم نے ان میں سے بعض کے واقعات آپ کے سامنے بیان کئے ہیں اور بعض کے واقعات بیان نہیں کئے''، لیکن سورۂ ہود آیت: 120 میں فرمایا: ''ہم آپ کے سامنے تمام رسولوں کی خبریں بیان کررہے ہیں''، یعنی رسول اللہ ﷺ کو تمام انبیائے کرام کے احوال بتادیئے گئے تھے، قرآن میں جن انبیائے کرام کے نام بتادیئے گئے ہیں، ان پر نام بہ نام ایمان لانا فرض عین ہے اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام پر تعداد کے تعین کے بغیر (یعنی ان کی حقیقی تعداد کو اللہ کے علم کی طرف مفوّض کر کے) اجمالی طور پر ایمان لانا فرض ہے۔

سورۂ حٰمٓ السجدۃ

سورہ حٰمٓ السجدہ مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 41ویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 61ویں سورت ہے۔ اس سورت کی ابتدا میں حٰمٓ کا کلمہ ہے جب کہ اس سورت میں سجدۂ قرآن ہے اس لیے اس کو حٰمٓ السجدہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اس کا ایک نام ''فُصِّلَت'' بھی ہے جو کہ آیت نمبر: 3 میں مذکور ہے۔

اس سورت میں توحید، قیامت، حشر و نشر پر دلائل، مذاق اڑانے والوں کو عذاب کی وعید، قرآن مجید کی عظمت، مخالفین کے اعتراضات کے جوابات کا بیان اور مشرکین کی شفاعت کی باطل امیدوں کا رد ہے۔

اس سورت کی ابتدا میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے تقاضے سے قرآن مجید نازل فرمایا جو نیکوکاروں کو ثواب کی بشارت دیتا ہے اور بروں کو عذاب سے ڈراتا ہے۔

آیت: 05 میں کفار کی انتہائی سرکشی کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''اور

انہوں نے کہا: جس دین کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں ، ہمارے دلوں میں اس پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان حجاب ہے، سو آپ اپنے کام سے کام رکھئے اور ہم اپنے ڈھب پر کاربند رہیں گے''، یعنی وہ کسی بھی طور پر قبولِ حق کے لئے تیار نہیں تھے۔ آیت نمبر: 9 سے ایک بار پھر اس کائنات کی تخلیق کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں قدرت وجلالت کا ذکر ہے اور ان کھلی نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود منکر قوموں کی سرکشی کا ذکر ہے۔

آیت :15 سے قومِ عاد کی سرکشی کا ذکر ہے کہ انہیں اپنی مادی طاقت پر بڑا ناز تھا اور کہتے تھے کہ ہم سے بڑھ کر بھی کوئی زبردست ہے؟، ان کو جواب دیا گیا کہ تم سے بڑا زبردست وہ اللہ ہے، جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر قومِ عاد پر منحوس دنوں میں خوفناک آواز والی آندھی بھیجی اور ان کا نام ونشان مٹا دیا گیا، قومِ ثمود کا انجام بھی برا ہوا۔

آیت :19 سے بیان ہوا کہ قیامت کے دن اللہ کے دشمنوں کو جمع کر کے جہنم کی طرف لے جایا جائے گا، تو جب وہ جہنم تک پہنچیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور جلدیں ان کے خلاف سلطانی گواہ بن جائیں گی ، کفار اپنی جلدوں سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟، (ان کے اعضاء) جواب دیں گے: ہمیں اسی اللہ نے قوتِ گویائی عطا کی، جس نے ہر چیز کو بولنا سکھایا اور اسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی جانب لوٹائے جاؤ گے۔ آیت :30 سے بتایا کہ ایمان پر ثابت قدم رہنے والے اہلِ ایمان کی روح جب اس دنیا سے پرواز کرے گی تو اس کے استقبال کے لئے فرشتے نازل ہوں گے اور کہیں گے کہ تم نہ کسی آنے والی بات کا خوف کرو اور نہ کسی گزشتہ بات کا رنج وملال اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، پھر انہیں بتایا جائے گا کہ اللہ ''غفور الرّحیم'' نے ان کے لئے جنت میں ضیافت کا اہتمام فرمایا ہے اور وہاں وہ جس نعمت کی بھی خواہش کریں گے انہیں دستیاب ہوگی۔

آیت :34 میں بتایا کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں، دوسروں کی بدی کا جواب نیکی سے

دو، اس کے نتیجے میں تمہارا مخالف تمہارا سرگرم اور پر جوش دوست بن جائے گا۔

آیت نمبر: 37 میں اجرام فلکی کی عبادت کرنے والوں سے فرمایا کہ ان اجرامِ فلکی کا خالق اللہ ہے، اس لیے ان کو سجدہ کرنے کی بجائے اللہ کو سجدہ کرو۔

آیت: 39 سے اللہ تعالیٰ نے حیات بعد الموت کے ثبوت کے لئے حسی مثال دی کہ تم دیکھتے ہو کہ زمین خشک، بنجر اور غیر آباد ہوتی ہے، (یعنی بے جان ہوتی ہے)، تو ہم اس پر بارش کا پانی نازل کرتے ہیں، جس کے ذریعے وہ سرسبز اور شاداب ہو جاتی ہے اور نُمو یعنی نباتات اگانے اور بڑھانے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، جو زمین کے لئے حیات ہے، پس جو اللہ بے جان زمین میں جان ڈالتا ہے، وہی آخرت میں مردوں کو زندہ کرے گا۔

آیت نمبر: 42 میں قرآن کی شانِ اعجاز کو بیان کیا کہ اس میں کسی بھی جانب سے باطل کی آمیزش نہیں ہوسکتی، یہ سراسر حق ہے۔ اگلی آیت میں بتایا کہ رسول بھی عربی ہیں اور قرآن بھی عربی ہے (اور سب سے پہلی مخاطَب قوم بھی عربی تھی)، اس لئے اسے عربی زبان میں اتارا تاکہ لوگوں کی سمجھ میں آئے، یہ قرآن مومنوں کے لئے ہدایت اور شفاء ہے اور کافر جن کے حق میں ہدایت مقدر نہیں ہے، ان کے کان قبولِ حق کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں اندھی بن جاتی ہیں۔ آخری آیت میں فرمایا کہ ہر شخص کو اس کے نیک عمل کی جزا ملے گی اور برے عمل کی سزا ملے گی اور تمہارا رب اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

خلاصہ تفسیر
پارہ:۲۵

پچیسویں پارے کے مضامین

اس پارے کی ابتدا میں بتایا کہ قیامت، شگوفوں سے نکلنے والے پھلوں، حمل اور وضع حمل کا علم اللہ ہی کی طرف لوٹایا جائے گا۔ انسان کی فطری خود غرضی کو آیت:49 میں بیان کیا کہ انسان اپنی بھلائی کی دعا مانگتے ہوئے تو کبھی نہیں تھکتا اور اگر اسے کبھی کوئی شر پہنچ جائے، تو وہ مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے۔

آیت:51 میں پھر فرمایا: اور جب ہم انسان پر کوئی انعام کرتے ہیں، تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو بچا کر ہم سے دور ہو جاتا ہے اور جب اس پر مصیبت آتی ہے، تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے والا ہو جاتا ہے، یعنی اللہ کی ذات سے وہ خود غرضی اور ذاتی منفعت پر مبنی تعلق تو قائم رکھتا ہے، مگر اس کے احکام کو فراموش کر دیتا ہے۔

مزید بتایا کہ انسان کو تکلیف پہنچنے کے بعد اللہ کوئی رحمت عطا کرے، تو وہ اسے انعامِ الٰہی سمجھنے کے بجائے، اپنا استحقاق سمجھنے لگتا ہے اور قیامت کا انکار کرنے لگتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اگر قیامت آ بھی گئی تو وہاں بھی مجھے یہ سب نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم کافروں کو ان کے اعمال بد کا مزہ سخت عذاب کی شکل میں چکھائیں گے۔

آیت نمبر:53 میں فرمایا کہ ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں اطرافِ عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود اُن کے نفسوں میں بھی حتیٰ کہ ان پر قرآن کی حقانیت واضح ہو جائے۔

سورۃ الشوریٰ

سورۃ الشوریٰ مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 42ویں جب کہ ترتیبِ نزول کے اعتبار سے 62ویں سورت ہے۔ اس سورت کی آیت نمبر:38 میں مسلمانوں کو اپنے کام باہمی مشورے سے کرنے کا حکم ہے، اس لیے اس کا نام ''الشوریٰ'' رکھا گیا۔

اس سورت میں حقیقت وحی، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ، مختلف دلائل سے توحید کے اثبات، رسالت اور قرآن کی حقانیت کا بیان ہے۔

اس سورت کے شروع میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو بیان کیا اور قیامت کا منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا: عنقریب آسمان (اس کی ہیبت سے) اپنے اوپر پھٹ پڑیں گے (یعنی آسمانوں کی شکست وریخت اوپر سے نیچے کی طرف ہوگی) اور فرشتے اس کی حمد کے ساتھ تسبیح پڑھتے رہتے ہیں اور زمین والوں کے لئے مغفرت طلب کرتے رہتے ہیں، سنو! بے شک اللہ ہی بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

آیت :8 میں بتایا کہ اگر سب لوگوں کی جبری اطاعت اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ سب لوگوں کو ایک دین پر کاربند فرما دیتا، لیکن جزا وسزا کا مدار اختیاری اطاعت پر ہے اور جو اپنے اختیار سے اطاعت کریں گے وہی رحمت کے حق دار ہوں گے۔

آیت نمبر :10 سے اختلاف کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی ہدایات کی طرف رجوع کرنے کا بیان ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کا پیدا فرمانے والا ہے اور اس نے انسانوں اور مویشیوں کے جوڑے بنائے اور اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے، وہ بے مثل ہے، رزق کو گھٹانا بڑھانا اس کے اختیار میں ہے اور زمین وآسمان کے خزانوں کی کنجیاں اسی کی مِلک میں ہیں۔

آیت :13 سے بتایا کہ نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے تمام انبیائے کرام کی شریعتوں میں دین ایک ہی اساس کے طور پر شامل رہا ہے اور آپ کے لئے بھی اسی دین کو مشروع (مقرر) کیا اور دین میں تفرقہ کی گنجائش نہیں ہے، لہٰذا آپ اسی دین کی طرف دعوت دیں اور ثابت قدم رہیں اور منکرینِ دین کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔

آیت :19 میں بتایا کہ جو آخرت کی جزا کے طلب گار ہیں، ان کے لئے آخرت کی نعمتوں میں اضافہ ہوگا اور جو صرف دنیا کے طلب گار ہیں، ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

آیت نمبر:23 میں فرمایا: آپ فرما دیجیے کہ میں اس تبلیغِ دین پر تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا سوائے قرابت کی محبت کے، اور جو شخص نیکی کرے گا، ہم نیکی کے حسن کو اور بڑھا دیں گے۔ بعض مفسرین نے قرابت سے آپ کے اہلبیت کی محبت مراد لی ہے، اس کے بعد والی آیت میں باطل کے مٹنے اور حق کے ثابت رہنے کا بیان ہے۔

آیت نمبر:25 میں فرمایا کہ اللہ اپنے کرم عظیم سے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔

آیت:27 میں بتایا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کا رزق وسیع کر دیتا تو وہ ضرور زمین میں سرکشی کرتے، لیکن اللہ اپنی حکمت سے جتنا چاہتا ہے روزی عطا کرتا ہے، بے شک وہ اپنے بندوں کے حالات سے باخبر ہے اور لوگوں کے ناامید ہونے کے بعد وہی بارش نازل فرماتا ہے اور رحمت پھیلاتا ہے۔

آیت نمبر:33 میں سمندر میں رواں دواں پہاڑوں کی مانند جہازوں کو اپنی نشانیوں میں سے قرار دیا۔

آیت:36 سے بتایا: سوتم کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے، وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ایمان والوں کے لئے زیادہ اچھا ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے اور وہ اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں اور کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور غصے کے وقت معاف کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم کو قبول کرتے ہیں اور نمازوں کو قائم کرتے ہیں۔ مزید بتایا کہ مسلمانوں کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوتے ہیں اور برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے (یعنی یہ عدل کا تقاضا ہے)، لیکن جس نے اپنے (قصوروار کو) معاف کر دیا، تو اس کا اجر اللہ کے ذمۂ کرم پر ہے۔

آیت نمبر:41 میں فرمایا کہ جو ظلم کا بدلہ لے لے اس سے کوئی مواخذہ نہیں، مواخذہ لوگوں پر ظلم کرنے والوں اور روئے زمین پر ناحق سرکشی کرنے والوں کا ہونا چاہیے اور فرمایا کہ صبر اور معاف کرنا عزم الامور سے ہیں۔

آیت :49 سے بتایا کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لئے ہے، وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہے بیٹیاں عطا کرے اور جسے چاہے بیٹے دے اور جسے چاہے بانجھ کردے، بے شک وہ بہت علم والا، قدرت والا ہے۔ مزید فرمایا: کسی بشر کی شان نہیں کہ وہ اللہ سے کلام کرے، سوائے اس کے کہ وہ وحی فرمائے یا پردے کی اوٹ سے کلام فرمائے یا وہ کسی فرشتے کو بھیج دے کہ وہ اللہ کے حکم سے جو چاہے وحی کرے، اس سے مراد یہ ہے کہ وحی ہی اللہ سے ہم کلام ہونے کا ذریعہ ہے، خواہ اللہ تعالیٰ بالمشافہ اور بالمشاہدہ بندے سے ہم کلام ہو، جیسا کہ معراج کی حدیث میں ہے یا اس صورت میں ہو کہ کلام تو سنائی دے، لیکن جلوۂ ذات دکھائی نہ دے جیسا کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا۔

مزید فرمایا: اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ کی طرف روح (قرآن) کی وحی کی ہے، اس سے پہلے آپ از خود یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے اس کتاب کو نور بنا دیا، جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت دیتے ہیں اور بے شک آپ ضرور صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ کا ماخذ وحیِ ربانی ہے، اس کا مدار عقل وقیاس پر نہیں ہے۔

سورۃ الزخرف

سورۃ الزخرف مکی سورت ہے، ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے 43ویں جبکہ ترتیبِ نزول کے اعتبار سے 63ویں سورت ہے۔ اس سورت کے آیت نمبر 35 میں زخرف کا لفظ آیا ہے یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس سورت میں شرک کا رد کیا گیا ہے، فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے کی مذمت اور مختلف نشانیوں سے توحید پر استدلال کیا گیا ہے۔

سورت کے شروع میں بتایا کہ ہر عہد کے منکرین اپنے نبی کا مذاق اڑاتے رہے، اس وجہ سے ہم نے بڑی طاقت ور قوموں کو بھی ہلاک کر دیا۔

آیت نمبر 11 میں نزول بارش کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی دینے سے حیات

بعد الموت کا اثبات کیا گیا ہے۔

آیت نمبر: 12 تا 14 میں تمام چیزوں کے جوڑے بنانے، کشتیوں اور چوپایوں پر سوار ہونے اور سواری کے وقت یہ دعا پڑھنے کا بیان ہے: ''پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہماری قدرت میں کر دیا اور ہم خود اس پر قادر ہونے والے نہیں تھے اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں''۔

کفار فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے (آیت :19) حالانکہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: کیا یہ لوگ ان (فرشتوں) کی پیدائش کے وقت موجود تھے، چنانچہ آیت :16 میں کفار کے اِس انداز کے بارے میں فرمایا: کیا اس نے مخلوق میں سے اپنے لئے بیٹیاں بنائی اور تمہارے لئے بیٹے مختص کر دیئے، حالانکہ ان میں سے جب کسی کو اس کی بشارت دی جائے، جس کے ساتھ اس نے رحمان کو متصف کیا ہے (یعنی بیٹیاں) تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غصے میں کڑتا رہتا ہے۔

آیت نمبر: 26 میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عقیدہ توحید پر کاربند رہنے اور اس عقیدے کو اپنی اولاد میں باقی رکھنے کا ذکر ہے۔

آیت: 31 سے کفار مکہ کا یہ مطالبہ بیان ہوا کہ یہ قرآن دو بستیوں مکہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی (یعنی ولید بن مغیرہ اور ابو مسعود ثقفی) پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟۔ اللہ نے فرمایا کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ تقسیم کرتے ہیں (یعنی یہ فیصلہ تو اللہ نے کرنا ہے کہ منصبِ نبوت کسے عطا کیا جائے) ہم نے ان کی دنیاوی زندگی میں ان کی معیشت (کے وسائل) کو تقسیم کیا ہے اور ہم نے (معاشی اعتبار سے) بعض کو بعض پر کئی درجے فضیلت عطا کی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور آپ کے رب کی رحمت اس مال سے بہت بہتر ہے جس کو یہ جمع کر رہے ہیں۔ دنیا کی زندگی کی بے وقعتی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر لوگوں کے کفر میں مبتلاء ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم ان کے لئے گھروں کی چھتیں، سیڑھیاں، دروازے اور مسندیں چاندی کی بنا دیتے (اور چاندی ہی کیا) سونے کی

بھی بنا دیتے اور یہ سب دنیا کا سامانِ زیست ہے اور آپ کے رب کے پاس آخرت (کی نعمتیں صرف) متقین کے لئے ہیں۔ مزید فرمایا جو رحمان کی یاد سے (غافل ہو کر) اندھا ہو جاتا ہے، اس پر ہم شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں، تو وہی اس کا ساتھی ہے۔

آیت نمبر: 46 سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور فرعون کے انکار، تکبر اور سرکشی اور غرقابی اور نشانِ عبرت بننے کا ذکر ہے۔

جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت: ''اے مشرکین! تم اور تمہارے معبود جہنم کے ایندھن ہیں''، قریش کے سامنے پڑھی تو قریش نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی عبادت ہوئی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر: 57 میں فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اللہ کے بندے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے اور بنی اسرائیل کے لیے قدرت کی نشانی بنایا ہے اور سورۂ انبیاء میں ارشاد فرمایا کہ جن کے لیے ہماری طرف سے اچھی جزا پہلے سے مقرر ہو چکی ہے وہ دوزخ سے دور رکھے جائیں گے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: بے شک اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے، سو تم اس کی عبادت کرو۔

آیت: 67 سے بتایا کہ دنیا میں جو منکرین ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے، یعنی ایک دوسرے کے خلاف سلطانی گواہ بنیں گے، لیکن اہلِ تقویٰ کی دوستی کا رشتہ قیامت میں جاری وساری رہے گا، انہیں بشارت دی جائے گی کہ اب تم ہر قسم کے خوف اور رنج والم سے آزاد ہو، اپنی بیویوں کے ساتھ ہنسی خوشی جنت میں داخل ہو جاؤ، ان کے لئے من پسند اور نگاہوں کو لبھانے والے ماکولات و مشروبات کے دور سونے کے برتنوں میں چلیں گے اور ان سے کہا جائے کہ یہی وہ جنت ہے جس کا تمہیں وارث بنایا گیا تھا۔

آیت نمبر: 77 میں فرمایا کہ عذاب سے تنگ آ کر کفار دوزخ کے نگران فرشتے کو پکار کر کہیں گے کہ اے مالک! چاہیے کہ تمہارا رب ہمیں ختم کر دے، وہ کہے گا: تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو۔ آیت نمبر: 81 میں فرمایا کہ فرما دیجیے! اگر رحمٰن کا بیٹا ہوتا تو میں سب سے

پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوتا، اللہ تعالیٰ ان عیوب سے پاک ہے۔ آخر میں آپ ﷺ کو درگزر کرنے اور ان کے لیے سلامتی کی دعا کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

سورۃ الدخان

سورۃ الدخان مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 44ویں جب کہ نزول کے اعتبار سے 64ویں سورت ہے۔

اس سورت کی ایک آیت میں دخان کا لفظ آیا ہے اس لیے اس کا نام ''الدُّخَان'' رکھا گیا۔

اس سورت کے شروع میں لیلۂ مبارکہ کا ذکر ہے، اکثر مفسرین نے اس سے لیلۃ القدر مراد لی ہے، مگر حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے حوالے سے بعض مفسرین نے اس سے شعبان المعظم کی پندرہویں شب مراد لی ہے۔ اس رات میں طے شدہ معاملات فرشتوں کو تفویض ہوتے ہیں۔

آیت نمبر: 7 سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، الوہیت سمیت دیگر صفات کا ذکر ہے۔

آیت: 25 سے بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونیوں کے غرق کیے جانے کے پسِ منظر میں فرمایا: وہ کتنے ہی باغات، چشمے، (لہلہاتے) کھیتوں، عمدہ محلات اور وہ نعمتیں جن میں وہ مصروفِ عیش تھے، (اپنے پیچھے) چھوڑ گئے، اسی طرح ہوا اور ہم نے سب چیزوں کا دوسروں کو وارث بنا دیا، سو ان کی بربادی پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ ہی انہیں مہلت دی گئی۔ اس میں ان سب لوگوں کے درسِ عبرت ہے جو دنیا کی ناپائیدار عیش و عشرت ہی کو اپنا مقصودِ حیات بنا لیتے ہیں اور پھر ایک دن منظر یوں ہوتا ہے کہ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارا۔

آیت نمبر: 38 میں فرمایا کہ ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ اس کے درمیان میں ہے، کی تخلیق بہ طور کھیل نہیں فرمائی، اس کے بعد فرمایا کہ فیصلے کا دن ان سب کے لیے مقرر کیا ہوا ہے۔

اس سورت کے آخر میں بتایا کہ کفار ومشرکین کی غذا جہنم میں زقوم (تھوہر) کا درخت ہوگا، جو پگلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹوں میں جوش مارے گا، جیسے کھولتا ہوا پانی جوش مارتا ہے، انہیں گھسیٹتے ہوئے جہنم کے وسط میں لے جایا جائے گا اور پھر ان کے سر پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا اور یہ صورتِ عذاب ہوگی۔ اس کے بعد متقین کے لئے جنت کی عالی شان نعمتوں کا ذکر ہے کہ وہ مقامِ امن میں ہوں گے، جنتوں اور چشموں میں، وہ باریک اور دبیز ریشم کا لباس پہنے ہوئے آمنے سامنے (اکرام کے ساتھ) بیٹھے ہوئے ہوں گے۔

سورۃ الجاثیہ

سورۃ الجاثیہ مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 45ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 65ویں سورت ہے۔ اس کی آیت نمبر:28 میں ''جاثیہ'' کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے: گھٹنوں کے بل گری ہوئی، اس لیے اس کا نام ''الجاثیہ'' رکھا گیا۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لانے کی دعوت، سرکارِ دو عالم ﷺ کی رسالت کی تصدیق اور قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرنے کا بیان، وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت کا اثبات اور منکرین حساب وکتاب وحشر ونشر کا رد ہے۔ اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وجلالت کی نشانیوں کا ذکر ہے۔ ان مضامین کو قرآن مجید میں بار بار بیان کیا گیا ہے۔ آیت نمبر:7 سے فرمایا کہ ہر بہتان تراشنے والے بدکار کے لیے ہلاکت ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو سننے کے بعد بھی کفر پر ڈٹا رہتا ہے۔

کفارِ قریش یہ کہتے تھے کہ جو دنیا میں زیادہ خوش حال اور طاقت ور ہوگا، وہی آخرت میں بھی خوش حال اور طاقت ور ہوگا، اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر:21 میں اس کا رد فرمایا کہ علانیہ گناہگاروں اور مومنین صالحین کی زندگی اور موت برابر نہیں ہیں۔

آیت نمبر:23 میں فرمایا: پس کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا کہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا اور اللہ نے اس کو علم کے باوجود گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا، پس اللہ کے بعد اس کو کون ہدایت دے سکتا ہے،

تو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے ، یعنی اگر ایک طرف اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے اور دوسری جانب بندے کے اپنے نفس کے مطالبات اور خواہشات ہوں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو نظر انداز کر کے اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی اختیار کر لے، تو خواہ وہ کلمہ پڑھے، لیکن عملاً تو اس نے اپنے نفس کو معبود بنالیا۔

اس کے بعد منکرینِ آخرت کے اس نظریے کو بیان کیا جو ہر دور کے ملحدین کا عقیدہ رہا ہے کہ جو کچھ ہے یہ دنیا کی زندگی ہے، پسِ مرگ کچھ بھی نہیں اور ہمیں صرف دہر ہلاک کرتا ہے، یعنی خالق کا انکار کرتے ہیں، موت فنائے دوام ہے، لہٰذا جتنی عشرتیں اپنے دامن میں سمیٹ سکتے ہو، سمیٹ لو، قرآن نے بتایا کہ جس نے پہلی بار پیدا کیا، وہی دوبارہ زندہ کرے گا اور پھر اللہ کی عدالت میں حساب وکتاب ہوگا، جس سے کسی کو مَفر نہیں ہے۔ آگے چل کر یہ بھی بتایا کہ جنہوں نے اس دنیا میں قیامت کے دن کو فراموش کر رکھا ہے، اس دن انہیں رحمتِ باری نظر انداز کر دے گی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ:۲۶

چھبیسویں پارے کے مضامین

سورۃ الاحقاف

سورۃ الاحقاف مکی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 46ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 66ویں سورت ہے۔ اس سورت کی آیت نمبر:21 میں ایک علاقے ''احقاف'' کا ذکر ہے، اس لیے اس کو ''الاحقاف'' سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس سورت میں وہی مضامین بیان ہوئے ہیں جو مکی سورتوں کا خاصہ ہے۔

اس سورت کی ابتدا میں کلامِ مجید کی حقانیت کو بیان کیا گیا ہے۔

آیت نمبر:5 میں کفار کے باطل معبودوں کا جواب دینے سے بے بسی اور ان کے پکار سے بے خبر ہونے کا بیان ہے۔

آیت نمبر:14 میں اللہ تعالیٰ کو رب مان کر استقامت اختیار کرنے والوں کے لیے جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:15 سے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا تاکیدی حکم ہے اور ماں نے حمل اور وضعِ حمل کے دوران جو بے پناہ مشقتیں اٹھائیں ان کا ذکر ہے اور یہ بھی بتایا کہ حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے، چونکہ حدیث کی رو سے دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے، اس لئے فقہاء نے فرمایا کہ ممکنہ طور پر کم از کم مدتِ حمل چھ ماہ ہے۔ پھر قرآن نے بتایا کہ صالح اولاد پختگی کی عمر کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس کی ان نعمتوں کا جو اس نے اس پر اور اس کے والدین پر کیں، شکر ادا کرنے کی توفیق طلب کرتی ہے اور اس بات کی دعا بھی کہ مجھے اپنا پسندیدہ عمل کرنے کی توفیق عطا فرما اور میری اولاد کی بھی اصلاح فرما اور میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور میں اطاعت گزاروں میں سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے

وفاشعار اور اپنے ماں باپ کے فرمانبردار بندوں کے لئے فرماتا ہے کہ ہم ان کے نیک اعمال کو قبول فرماتے ہیں اور ان کی لغزشوں سے درگزر کرتے ہیں، یہ لوگ اہلِ جنت میں سے ہیں اور یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ اس آیت میں ابتداءً ماں باپ دونوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر ہے، لیکن ماں کی قربانیوں کا قرآن نے زیادہ ذکر فرما کر اس کے زیادہ استحقاق کی طرف متوجہ فرمایا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثِ پاک میں اس کی مزید تاکید فرمائی۔

آیت نمبر:17 میں والدین کے نافرمان، گمراہی پر جمے ہوئے اور آخرت کا انکار کرنے والے شخص کے برے انجام کا ذکر ہے۔

آیت نمبر:20 میں فرمایا کہ جس دن کفار کو دوزخ میں جھونک دیا جائے گا (تو ان سے کہا جائے گا) کہ تم اپنی لذیذ چیزیں دنیا کی زندگی میں لے چکے ہو اور ان سے فائدہ اٹھا چکے ہو، پس آج تم کو ذلت والا عذاب دیا جائے گا، اس سے بعض لوگ مومنوں کے لیے دنیا کی لذتوں سے فائدہ اٹھانے کی ممانعت کا استدلال کرتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ آیت کفار کے حق میں نازل ہوئی ہے اور اس میں مومنوں کی نہیں کافروں کی مذمت ہے۔

آیت نمبر:21 سے قومِ عاد کو حضرت ہود علیہ السلام کی دعوتِ توحید، ان کے کفر پر ڈٹے رہنے اور عذاب کا مطالبہ اور تیز آندھی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور قوم عاد کی بربادی کا بیان ہے۔

آیت نمبر:29 سے حضور کی بارگاہ میں جنات کے حاضر ہونے کا ذکر ہے کہ جنات کے ایک گروہ نے آپ کے پاس سے گزرتے ہوئے قرآن سنا اور جا کر اپنی قوم سے کہا کہ ہم نے ایسی آسمانی کتاب سنی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی اور جو پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، ان جنات نے اپنی قوم کو کہا کہ اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے نجات عطا فرمائے گا اور جو شخص اللہ کی طرف بلانے

والے کی دعوت کو قبول نہیں کرے گا تو زمین میں اللہ کی گرفت سے اس کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔ آخر میں سرکار دو عالم ﷺ کو اولوالعزم انبیاء کی طرح صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

سورۂ محمد

سورۂ محمد مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 47ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 96ویں سورت ہے۔ اس سورت کی آیت نمبر 2 سرکار دو عالم ﷺ کا نام نامی اسم گرامی ذکر ہوا ہے اسلئے اس سورت کا نام محمد رکھا گیا۔

اس سورت میں ترغیب جہاد، مجاہدین کو بشارتوں، منافقین کی صفات اور سازشوں اور مسلمانوں کو منافقین سے خبردار کرنے کا بیان ہے۔

اس سورت کے شروع میں فرمایا کہ کفار کے اعمال ضائع جبکہ مؤمنین کے اعمال مقبول اور گناہ مغفور ہیں۔

غزوۂ بدر سے پہلے اسلام کے تفصیلی جنگی قانون نازل نہیں ہوئے اور یہ ہدایت نہیں آئی تھی کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، اس سورۂ مبارکہ کی آیت :04 میں فرمایا کہ جب جنگ ختم ہو جائے، مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو جائے، تو جنگی قیدیوں کے ساتھ تین طرح کا سلوک کیا جا سکتا ہے، انہیں قید کر دیا جائے تا کہ وہ مسلمانوں کو دوبارہ شر نہ پہنچا سکیں یا ان کی اصلاح اور قبولِ اصلاح کی امید ہو تو ان پر احسان کر کے انہیں آزاد کر دیا جائے یا فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے۔

آیت نمبر :15 سے اہلِ تقویٰ کے لئے جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے کہ جنت کی نہروں میں ایسا شفاف اور تازہ پانی ہوگا جس میں کوئی باسی پن یا تغیر نہیں آئے گا، دودھ جیسی نہریں ہوں گی جن کا ذائقہ کبھی نہیں بدلے گا، شرابِ طہور کی ایسی نہریں ہوں گی، جو لذت سے ماموں ہوں گی اور خالص اور شفاف شہد کی نہریں ہوں گی اور ان کے لئے ہر طرح کے پھل دستیاب ہوں گے اور ان کے رب کی جانب سے مغفرت کر دی جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے

انسان کے عقلِ سلیم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا ان عالی مرتبت لوگوں کی تقلید کی جائے یا ان کی راہ پہ چلا جائے جو دائمی طور پر جہنم میں رہیں گے اور انہیں جہنم کی آگ میں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو کاٹ دے گا۔

آیت نمبر :20 میں حکم جہاد کے نزول کے بعد منافقین کے بزدلانہ رویے کا بیان ہوا اور فرمایا کہ جہاد کے قطعی حکم کے بعد اگر وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے رہتے تو ان کے حق میں زیادہ بہتر ہوتا۔

آیت نمبر :24 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اتنے واضح دلائل کے باوجود یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟۔

آیت نمبر :29 میں فرمایا کہ جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق) کی بیماری ہے، انہوں نے گمان کر رکھا ہے کہ اللہ ان کے دلوں کے فتنہ کو ظاہر نہیں کرے گا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے بعد کوئی منافق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چھپا نہ رہا اور پھر ایک موقع پر آپ نے منافقین کو نام لے لے کر مسجد سے باہر نکال دیا۔

آیت نمبر :35 سے مسلمانوں کو فرمایا کہ تم ہمت نہ ہارو اور کفار کو صلح کی دعوت نہ دو، غلبہ تمہارے لیے ہی ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو ہرگز ضائع نہیں فرمائے گا۔ مزید فرمایا گیا کہ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت پر بخل کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس بخل کی سزا اس کو ملے گی، اللہ تعالیٰ بے نیاز و غنی ہے، پھر اگر وہ چاہے تو دین سے روگردانی کرنے والوں کی جگہ دوسری قوم لے آئے گا پھر وہ ان کی طرح دین سے روگردانی کرنے والے نہیں ہوں گے۔

سورۃ الفتح

سورۃ الفتح مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 48ویں جب کہ ترتیبِ نزول کے اعتبار سے 112ویں سورت ہے۔

اس سورت کا نام ''الفتح'' اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ اس سورت میں فتحِ مکہ

کی بشارت، بیعتِ رضوان، نبی کریم ﷺ کی تعظیم وتوقیر کرنے اور منافقین کے احوال اور صحابہ کرام کی قدسی صفات کا ذکر ہے۔

اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیا ہے۔

آیت نمبر: 08 سے اللہ عزوجل نے رسولِ مکرم ﷺ کی شان کو بیان فرمایا کہ ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، جنت کی بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور مزید فرمایا کہ اللہ کے رسول کی تعظیم وتوقیر کرو۔

آیت: 10 میں اللہ تعالیٰ نے بیعت رضوان کے منظر کو بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا، اس لئے آپ کے ہاتھ پر بیعت درحقیقت اللہ ہی سے بیعت ہے۔

آیت نمبر: 11 میں جہاد سے پیچھے رہنے والوں کی حقیقتِ حال سے اپنے نبیِ کریم ﷺ کو باخبر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ بہانہ بازی کریں گے کہ ہم اپنے مال اور اہلِ کی مصروفیت کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہو سکے، سو ہماری خطا معاف فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں، جو ان کے دل میں نہیں ہے۔

آیت نمبر: 17 میں اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے، معذوروں اور بیماروں کا جہاد میں شمولیت سے استثناء بیان کیا گیا ہے۔

آیت نمبر: 18 سے اللہ تعالیٰ نے ان وفا شعار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جنہوں نے حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر جانثاری اور جاں سپاری کی بیعت کی تھی، کو اپنی رضامندی کی قطعی سند سے نوازا، پس جس سے اللہ راضی ہو جائے، اس کے ایمان کی صداقت، اخلاص اور بے ریائی ہر قسم کے شک وشبے سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کے بارے میں دل میں کوئی بھی بدگمانی اللہ تعالیٰ کی اس سندِ رضا کی نفی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو فرمایا تھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ ہم بے خوف وخطر ہو کر بیت اللہ میں داخل ہو رہے ہیں، لیکن جب صلحِ حدیبیہ کے موقع پر معاہدۂ

حدیبیہ کی شرائط کے تحت صحابۂ کرام کو عمرہ ادا کئے بغیر احرام کھولنا پڑا، تو بعض صحابۂ کرام کے جذبات کو ٹھیس پہنچی اور انہوں نے اپنے قلبی اضطراب کا اظہار کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: اللہ نے اپنے رسول کے حق پر مبنی خواب کو سچ کر دکھایا اور ایک نہ ایک دن تم ضرور بے خوف وخطر ہو کر سر کو منڈاتے ہوئے یا بال ترشواتے ہوئے ان شاء اللہ حرمِ کعبہ میں داخل ہو گے اور پھر اللہ تعالیٰ نے عنقریب فتح کی نوید بھی سنائی۔ اس سورت کی آخری آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی وہ صفات بیان فرمائیں جو پہلے سے تورات اور انجیل میں بیان کر دی گئیں تھیں کہ وہ کفار کے مقابلے میں انتہائی سخت ہیں، آپس میں رحیم وشفیق ہیں، اے مخاطب تو جب بھی انہیں دیکھے گا اللہ کی عبادت میں مشغول پائے گا، وہ اللہ کے فضل اور رضا کے طلب گار رہتے ہیں اور ان کی جبینیں سجدے کے اثر سے نیر وتاباں ہیں۔ مفسرین کرام نے فرمایا کہ اس آیت میں خلافتِ راشدہ کی ترتیب کی طرف بھی اشارہ ہے۔

سورۃ الحجرات

سورۃ الحجرات مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 49ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 108ویں سورت ہے۔ اس سورت کی آیت نمبر:4 میں الحجرات کا ذکر ہے اس لیے اس کا نام الحجرات رکھا گیا۔ اس سورت میں بارگاہ رسالت کا احترام کرنے اور اصلاح معاشرہ کیلئے اقدامات کا بیان ہے۔

سورۂ حجرات کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے بارگاہِ نبوت کے آداب کو بیان فرمایا کہ ان کی آواز پر آواز کو اونچا کرنا بھی ادب کے منافی ہے، ان کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرنا بھی ایسی بے ادبی ہے جس سے ساری نیکیاں برباد ہو سکتی ہیں اور اہلِ ادب کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم کی نوید سنائی گئی ہے۔

آیت نمبر:6 میں اہم خبروں کی تحقیق اور چھان بین کے بغیر تصدیق کرنے اور بغیر تصدیق ان پر ایکشن لینے کی ممانعت کا بیان ہے۔

آیت نمبر:09 میں مسلمانوں کے متحارب گروہوں میں عدل وانصاف پر مبنی صلح کا حکم

دیا گیا ہے اور بغاوت کرنے والوں سے اللہ کے حکم کی طرف لوٹ کر آنے تک لڑنے کا بیان ہے اور مسلمانوں کے درمیان اخوت کا ذکر ہے۔

اس سورت کے دوسرے رکوع میں اخلاقیات کی تعلیم ہے خاص طور پر یہ کہ مسلمان مرد وزن ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائیں، ایک دوسرے کی عیب جوئی نہ کریں، ایک دوسرے کو برے ناموں سے نہ پکاریں، ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانی نہ کریں، دوسرے کے پوشیدہ احوال کا سراغ نہ لگائیں اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کریں اور پھر غیبت کو اتنا گھناؤنا جرم قرار دیا کہ گویا اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچنا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ انسانیت کی اصل ایک ہی ہے یعنی سب آدم وحواء علیہما السلام کی اولاد ہیں اور قبائل اور برادریاں تفاخر کے لئے نہیں، تعارف کے لئے ہیں اور عزت وکرامت کا معیار تقویٰ ہے، پھر اس میں ایمانِ صادق اور ایمانِ کامل کی تعریف بیان کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا کہ کوئی ایمان لا کر اللہ پر احسان نہ جتلائے بلکہ یہ تو اللہ کا بندے پر احسان ہے کہ اس نے نعمتِ ایمان سے نوازا۔

سورۂ ق

سورۂ ق مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 50ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 34ویں سورت ہے، اس کی پہلی آیت میں لفظِ ق مذکور ہونے کی وجہ سے اس کا نام ق رکھا گیا۔

اس سورت میں مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر بھی دلائل ہیں۔

ابتدائے سورت میں مرنے کے بعد زندہ ہونے پر کفار کے تعجب کا ذکر فرمایا۔

اس سورت میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کو بیان کیا گیا ہے یعنی آسمانوں کی رفعت اور شمس وقمر اور کواکب ونجوم سے اس کا مزین کرنا، اس میں کسی شگاف کا نہ ہونا، زمین کی وسعت اور اس میں بلند وبالا پہاڑوں کو لنگر کی طرح ثبت کردینا، آسمان سے بارش کا برسنا اور اس سے طرح طرح کا اناج پھل پھول اور باغات کا اگانا، مردہ زمین

کو زندہ کرنا وغیرہ۔

آیت نمبر:15 میں حیات بعد الموت کے اثبات میں فرمایا کہ کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے ہیں (نہیں) بلکہ وہ اپنے از سر نو پیدا ہونے کے متعلق شک میں ہیں۔

آیت نمبر:16 میں بتایا کہ اللہ انسان کا خالق ہے، اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور ظاہری اعمال تو در کنار اس کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے وسوسوں اور قلبی واردات کو بھی جانتا ہے، یعنی اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اور اس کے ہر کہے لفظ کو لکھا جاتا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر:22 کے بارے میں بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ اگر کسی کی بصارت متاثر ہو رہی ہو تو یہ آیت پڑھ کر دم کیا جائے تو اللہ تعالیٰ بصارت کو بحال فرماتا ہے۔

آیت نمبر:30 میں جہنم کی وسعت اور بھوک کے بارے میں بتایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جہنم سے پوچھے گا کہ کیا تیرا پیٹ بھر گیا ہے؟، وہ کہے گی: کیا کچھ اور (زیادہ) ہیں؟۔

آیت نمبر:39 میں طلوع وغروب شمس سے پہلے رات کے کچھ حصہ میں اور نمازوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح بیان کرنے کی تاکید ہے۔ آخری آیات میں حشر و نشر کے اثبات کا بیان ہے۔

سورۃ الذاریات

سورۃ الذاریات مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 51ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 67ویں سورت ہے۔ پہلی آیت کے پہلے لفظ ''الذَّارِیَات'' کے مذکور ہونے کی وجہ سے اس کا نام ''الذَّارِیَات'' رکھا گیا۔

اس سورت کی ابتدا میں ہواؤں، کشتیوں اور فرشتوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ قیامت کا وعدہ سچ ہے۔

آیت نمبر:15 سے اہلِ تقویٰ کے انعاماتِ اخروی کو بیان کرنے کے بعد ان کے

اوصاف بیان کئے کہ وہ راتوں کو بہت کم سوتے ہیں، رات کے پچھلے پہر استغفار کرتے ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ نے جن کو نعمتِ مال سے نوازا ہے، ان کے مال میں سائل کا بھی حق ہے اور ان کا بھی جو نعمتِ مال سے محروم ہیں۔

آیت نمبر:58 میں فرمایا کہ بے شک اللہ ہی سب سے بڑا رزق دینے والا اور سب سے زبردست قوت والا ہے، بعض اہل اللہ اس آیت کو کشادگی رزق کے لیے تجویز فرماتے ہیں۔

سورت کے آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کی بشری شکل میں آمد اور ان کی طرف سے ضیافت کے اہتمام کا ذکر ہے اور فرشتوں کے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے پر جو انہیں بتقضائے بشری خوف لاحق ہوا اس کا ذکر ہے اور پھر حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ علیہما السلام کے بڑھاپے کی عمر میں حضرتِ اسحاق کی بشارت کا ذکر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ: ۲۷

ستائیسویں پارے کے مضامین

اس پارے کے شروع میں اس بات کا بیان ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے والے اجنبی انسان نہیں تھے بلکہ بشری شکل میں فرشتے تھے، تو ابراہیم علیہ السلام نے اُن سے پوچھا کہ آپ کا مشن کیا ہے، اُنہوں نے کہا: ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ اُن پر مٹی سے پکے ہوئے پتھر برسائیں، جو آپ کے رب کے نزدیک حد سے تجاوز کرنے والوں کے لئے نشان زدہ (Guided) ہیں، سائنسی دنیا گائیڈڈ میزائیل کی جس تکنیک تک بہت دیر میں پہنچی ہے، قرآن نے اُس کا تصور بہت پہلے پیش کیا۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم اہلِ ایمان کو صحیح سلامت اُس بستی سے باہر نکال دیں گے اور اُس میں مسلمانوں کا ایک ہی گھر ہے، یعنی حضرت لوط علیہ السلام۔ اس کے بعد فرعون اور موسیٰ علیہ السلام اور فرعونیوں کے سمندر میں غرق ہونے کا ذکر ہے، قومِ عاد و ثمود پر عذاب کا ذکر ہے۔ آیت: 47 میں فرمایا: آسمان کو ہم نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور ہم (ہر آن) اِس کو توسیع دینے والے ہیں۔ آج ماہرین فلکیات اور سائنس دان نت نئی کہکشاؤں (Galaxies) کے دریافت کرنے کی بات کرتے ہیں اور اُن کا کہنا ہے کہ ابھی لاتعداد کہکشائیں ایسی ہیں جو دریافت نہیں ہوسکیں، تو قرآن نے بالائی کائنات اور قدرت کے خلائی نظام کی وسعت کی بات بہت پہلے بیان کر دی۔ آیت: 56 وہ مشہور آیت ہے جس میں رب کائنات نے جنوں اور انسانوں کے مقصدِ تخلیق کو بیان کیا یعنی اللہ کی عبادت اور اُس کی معرفت۔

سورۃ الطور

سورۃ الطور مکی سورت ہے، ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے 52 ویں اور ترتیب نزول

کے اعتبار 75 ویں سورت ہے۔اس سورت کا نام اس سورت کی پہلی آیت ''وَالطُّوْر'' سے ماخوذ ہے۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے اَٹل عذاب کا ذکر ہے کہ جب اُس کا فیصلہ ہو جاتا ہے، تو اُسے کوئی ٹالنے والی طاقت نہیں ہے، اس دن آسمان تھرتھرا رہے ہوں گے اور پہاڑ بہت تیزی سے چل رہے ہوں گے۔

آیت:21 سے اہلِ جنت کے لئے اللہ عزوجل کی جانب سے جو نعمتیں، راحتیں تیار ہیں، اُن کا ذکر ہے اور یہ بھی کہ اہلِ ایمان کی اولاد میں سے جو اُن کے سچے پیروکار ہوں گے، وہ بھی اُن سے جاملیں گے۔آیت نمبر 33 سے قرآن کو اپنی طرف سے گھڑنے کے الزام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ سچے ہیں تو قرآن کی مثل کوئی بات بنا کر لے آئیں۔آیت:35 سے قدرتِ باری تعالیٰ کے منکرین کو مخاطب کر کے بتایا گیا کہ کیا وہ بغیر کسی سبب کے پیدا کر دیئے گئے یا وہ خود ہی اپنے خالق ہیں، کیا آسمانوں اور زمینوں کو انہوں نے پیدا کیا ہے، کیا تیرے رب کی رحمت کے خزانے ان کے قبضہ وقدرت میں ہیں یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے، جس پر چڑھ کر یہ بالائی کائنات کی باتوں کو سن لیتے ہیں، اگر ایسا ہے تو کوئی واضح دلیل تو پیش کریں؟۔

سورۃ النجم

اس سورت کا نام ''النجم'' اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے 53 ویں جب کہ ترتیبِ نزول کے اعتبار سے 23 ویں سورت ہے۔

مشرکین یہ کہتے تھے کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس قرآن کو از خود بنالیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتے، وہ صرف وہی کہتے ہیں جس کی ان کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

اس سورت کی ابتدائی 18 آیات میں سید المرسلین، رحمۃ للعالمین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفرِ معراج کی اُس منزلِ رفعت کا ذکر ہے کہ جس میں اُنہیں اللہ تعالیٰ کا قربِ

خاص عطا ہوا اور اللہ نے اپنے مقدس بندے کی طرف جو چاہا، وحی فرمائی ۔رسول اللہ ﷺ اپنے قلبِ اطہر کی پوری حضوری اور یقین کے ساتھ اپنے خالق و مالک کے جلووں کو دیکھتے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے ریب و شک میں مبتلا لوگوں کو فرمایا کہ کیا تم ان سے اس پر جھگڑ رہے ہو تو انہوں نے دیکھا، انہوں نے تو نورِ ازل کے اس جلوے کو بارِ دیگر دیکھا ہے، وہاں ''جنت المأوٰی'' ہے اور آپ ﷺ اپنے خالق کے جلوۂ نور کو اس قرار وانہماک کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ آپ کی نظر نہ کج ہوئی نہ بہکی۔

آیت نمبر: 21 سے مشرکین کے باطل دیوی اور دیوتاؤں اور اللہ کے لیے بیٹیاں ثابت کرنے کا رد ہے۔ اللہ تالیٰ نے فرمایا کہ یہ صرف وہ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی اور اس کو گمان اور خواہشات نفس کی پیروی قرار دیا۔

آیت نمبر: 26 میں شفاعت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضا کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔

آیت نمبر: 32 سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ صغیرہ گناہوں کے ماسوا کبیرہ گناہوں سے بچے رہتے ہیں، انہیں بشارت دی گئی کہ بے شک آپ کا رب وسیع مغفرت والا ہے، اسی مفہوم کی ایک اور آیت میں فرمایا کہ نیکیاں گناہوں (صغیرہ) کو مٹا دیتی ہے۔ مزید فرمایا کہ اللہ تمہیں خوب جاننے والا ہے، جب اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا تھا اور جب تم اپنی ماؤوں کے پیٹ میں تھے، سو تم اپنی پارسائی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ متقین کو خوب جانتا ہے۔

آیت نمبر: 38 سے فرمایا کہ کسی کے گناہ کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا، ہر شخص کو اپنے کئے کا پورا پورا صلہ ملے گا۔

آیت نمبر: 42 سے اللہ تعالیٰ کی صفات کریمہ اور قوتِ حاکمہ کا ذکر فرمایا اور فرمایا کہ آخر کار آپ کے رب کے پاس ہی پہنچنا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

سورۃ القمر

سورۃ القمر کا نام اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 54ویں جب کہ نزول کے اعتبار سے 37ویں سورت ہے۔

اس سورت کے شروع میں فرمایا: ''قیامت قریب آگئی اور چاند دو ٹکڑے ہوگیا اور (کافر) اگر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو رخ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو وہ جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے''۔ ''شق القمر'' کا واقعہ تقریباً آٹھ سنِ نبوی میں ہوا، اہلِ مکہ نے معجزے کا مطالبہ کیا تو آپ نے ان کو یہ معجزہ دکھایا یہاں تک کہ انہوں نے چاند کا ایک ٹکڑا حرا پہاڑ کے ایک جانب اور دوسرا دوسری جانب دیکھا، یہ واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد اور سننِ بیہقی اور کتبِ تفاسیر میں مذکور ہے، حافظ ابنِ کثیر ودیگر مفسرین نے ان احادیث کو متواتر کے درجے میں قرار دیا ہے اور اس واقعے کی صداقت کی عقلی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے برملاء اس کا دعویٰ کیا اور اس دور میں کسی نے بھی اس واقعے کی صداقت کو چیلنج نہیں کیا اور قرآن نے اسے علاماتِ قیامت میں سے قرار دیا۔ اسی سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے چار مرتبہ تکرار در تکرار کے ساتھ فرمایا کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، تو ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ اور اسی کے ساتھ اس سورت میں قومِ عاد، قومِ ثمود اور آلِ فرعون پر عذاب کا ذکر ہے، جس کی تفصیلات اس سے پہلے قرآن میں گزر چکی ہیں۔

آیت نمبر: 49 سے ہر چیز کو اندازے سے بنانے کا ذکر ہے۔ آیت نمبر: 52 سے ہر چیز یعنی چھوٹے بڑے کو صحائف میں لکھا ہونے کا اور متقین کے لیے جنتوں اور نعمتوں کا بیان ہے۔

سورۃ الرحمٰن

سورۃ الرحمٰن مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 55ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 97ویں سورت ہے۔ اس سورت کا نام اس کی پہلی آیت سے ماخوذ

ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز کی ایک دلہن ہوتی ہے اور قرآن کی دلہن سورۂ رحمن ہے۔

اس سورت کے شروع میں فرمایا: ''رحمن نے اپنے رسولِ مکرم کو قرآن کی تعلیم دی، اس نے انسان (کامل) کو پیدا کیا اور ان کو (ہر چیز کے) بیان کی تعلیم دی''۔ آیت نمبر: 6 سے اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کے غیر مرئی نظم وضبط (Unseen Control) زمین پر بچھے ہوئے سبزے اور درختوں کی کیفیتِ سجدہ اور آسمان کی رفعت کو اپنی قدرت کی دلیل کے طور پر پیش فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اپنی قدرت کی بے پایاں نعمتوں کا بار بار ذکر فرمایا اور پھر اکتیس بار اپنی ذی عقل مخلوق، جنوں اور انسانوں سے خطاب کر کے فرمایا: ''پس تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

آیت نمبر: 19 سے دو سمندروں کے ملنے اور پانی اور ذائقے کا ایک دوسرے سے نہ ملنے، سمندروں سے موتیوں اور جواہرات کے نکلنے، سمندروں میں بڑی کشتیوں کے چلنے سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر استدلال کیا ہے۔

آیت نمبر: 41 میں فرمایا کہ قیامت کے دن مجرم اپنے حلیوں سے پہچان لیے جائیں گے۔

آیت نمبر: 33 میں فرمایا ''اے جنات اور انسان کے گروہ! اگر تم یہ طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمینوں کے کنارے سے نکل جاؤ، تو نکل جاؤ، تم جہاں بھی جاؤ گے وہاں اسی (ربِ ذوالجلال) کی سلطنت ہے''۔ یعنی انسان بالائی خلا اور کہکشاؤں کی دریافت میں کتنا بھی آگے نکل جائے، وہ وہاں اللہ تعالیٰ ہی کی بادشاہت اور قدرت کے جلوے دیکھے گا۔

آیت نمبر: 46 سے دو جنتوں کی نعمتوں کا بیان ہے کہ وہاں سرسبز شاخوں والے باغات ہوں گے، ان جنتوں میں دو چشمے بہہ رہے ہوں گے، ہر پھل کی دو قسمیں ہوں گی، اہلِ جنت ایسی مسندوں پر جلوہ افروز ہوں گے جن کے استر نفیس دبیز ریشم کے ہوں گے، وہاں

یاقوت و مرجان کی طرح باحیاء حوریں ہوں گی، پھر فرمایا کہ ان دونوں کے علاوہ دو جنتیں اور ہوں گی جن میں فوارے کی طرح چھلکتے ہوئے دو چشمے ہوں گے اور اسی طرح کی مزید نعمتوں کو بیان کرنے کے بعد فرمایا: ''احسان کا بدلہ احسان ہے''۔

سورۃ الواقعہ

اس سورت کا نام اس کی پہلی آیت میں مذکور ہے۔ ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے 56 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 46 ویں سورت ہے۔ اس سورت کی ابتدا میں فرمایا ہے کہ جب قیامت آئے گی تو زمین میں زلزلہ آ جائے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، پھر جو لوگ حساب کتاب کے لیے پیش ہوں گے، ان کی تین قسمیں ہوں گی:

ایک ''اَصْحَابُ الْمَیْمَنَه''، یعنی اہلِ سعادت و خیر، دوسرے ''اَلسَّابِقُوْنَ الْمُقَرَّبُوْنَ'' یہ وہ لوگ ہوں گے جو نیکی میں سب پر سبقت لے جائیں گے اور تیسرے ''اَصْحَابُ الْمَشْئَمَه'' یہ بدنصیب لوگ اہلِ جہنم ہوں گے۔ اس کے بعد ایک بار پھر جنت کی پرکشش نعمتوں کا ذکر ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بالمقابل تکیوں پر ٹیک لگائے، زر و جواہر سے مرصع تختوں پر بیٹھے ہوں گے، ان پر شرابِ طہور کے جام گردش کر رہے ہوں گے اور یہ ایسی شراب ہوگی کہ عقل پر اثر انداز نہیں ہوگی اور پُر کیف ہوگی۔ اس کے بعد ''اصحابِ یمین'' کے لئے مزید نعمتوں کا ذکر ہے اور پھر ''اصحاب الشمال'' (یعنی اللہ کے نافرمان لوگ) کے لئے عذاب کی مختلف صورتوں کا ذکر ہے، ان میں سے ایک یہ کہ ان کی خوراک ''زقوم'' (تھوہر کے درخت) سے ہوگی، (اس درخت کا پھل انتہائی کڑوا ہے)، اس سے وہ پیٹ بھریں گے اور اس پر کھولتا ہوا پانی پئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم کاشت کرتے ہو، اس کو (درحقیقت) تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اسے چورہ چورہ کر کے رکھ دیں، پھر تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو تاوان پڑ گیا، بلکہ ہم تو محروم ہو گئے''۔

آیت نمبر: 77 سے قرآن عظیم کا ذکر ہے کہ یہ کتاب لوحِ محفوظ میں ہے اور اس کتاب

کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔

آیت نمبر: 83 سے روح کے نکلتے وقت مرنے والے اور قریب لوگوں کی بے بسی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: تم اس روح کو لوٹاتے کیوں نہیں اگر تم سچے ہو، یعنی اثبات صرف اللہ تعالیٰ کی سلطنت کو ہے۔

سورة الحدید

اس سورت کی آیت نمبر: 25 میں حدید (لوہے) کا ذکر ہے، اس لیے اس کا نام الحدید رکھا گیا۔ ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے یہ سورت 57 ویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 95 ویں سورت ہے۔

اس سورت کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر اپنی آیاتِ قدرت کا ذکر فرمایا۔

آیت نمبر: 7 میں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی گئی ہے اور تحسین کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کے مابین درجاتِ فضیلت میں مختلف مدارج بیان کئے ہیں، ایک طبقۂ صحابہ وہ تھا جو اعلانِ نبوت کے فوراً بعد ایمان لائے، پھر ایک سنگِ میل وہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد چالیس تھی، پھر ایک سنگِ میل ہجرت ہے کہ ہجرت سے پہلے اور بعد میں ایمان لانے والے، پھر ایک سنگِ میل غزوۂ بدر ہے، اہلِ بدر کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا اعلان فرمایا، ایک سنگِ میل صلحِ حدیبیہ ہے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر موجود تمام صحابۂ کرام کو اپنی رضامندی کی سند عطا فرمائی اور پھر ایک سنگِ میل فتح مکہ ہے جس کا اس سورت کی آیت نمبر: 10 میں ذکر ہوا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''(اے مسلمانو!) تم میں سے کوئی بھی ان کے برابر نہیں ہو سکتا جنہوں نے فتح (مکہ) سے پہلے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا اور (کافروں سے) جہاد کیا، ان سب کا (ان مسلمانوں سے) بہت بڑا درجہ ہے، جنہوں نے (فتح مکہ) کے بعد (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا اور (کافروں سے) جہاد کیا''۔

مگر اس باہمی فضیلت اور درجہ بندی سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی صحابی کے مرتبے کو گرائے یا ان کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ کہے یا ان کے اخلاص اور ایمان میں کوئی شک

کرے، اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے فتنوں کا سدِ باب کرنے کے لئے فرمایا: ''اور اللہ نے (اپنے رسول کے تمام صحابہ سے) اچھے انجام (یعنی جنت) کا وعدہ فرمایا ہے۔

آیت 12 میں فرمایا کہ میدانِ حشر میں مومنین اور مومنات کی امتیازی شان ہوگی اور ان کا نوران کے سامنے اور ان کی دائیں جانب ضوفشاں ہوگا اور انہیں جنت کی بشارت دی جائے گی۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ: ''منافق مرد اور عورتیں مومنوں سے کہیں گے: تم ہماری طرف دیکھو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کریں، ان سے کہا جائے گا: تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ پھر کوئی نور تلاش کرو، پھر ان کے درمیان ایک ایسی دیوار حائل کر دی جائے گی، جس میں دروازہ ہوگا اس کے اندرونی حصے میں رحمت ہوگی اور باہر کی جانب عذاب ہوگا''۔ وہ کہیں گے: ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے، وہ کہیں گے: تمہاری منافقت نے تمہیں یہ دن دکھائے ہیں۔

آیت نمبر: 16 میں فرمایا کہ کیا ابھی تک ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر اور حق کے لیے نرم ہو جائیں۔

آیت: 20 میں دنیا کے مال و دولت اور دنیا کی زیب و زینت کی ناپائیداری کو بیان کیا اور فرمایا اپنے رب کی مغفرت کی جانب دوڑے چلے آؤ اور اس جنت کی طرف پیش قدمی کرو، جس کی وسعت آسمان اور زمین کی مثل ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اس آیت میں جنت کی تنقیص کرنے والوں کا رد ہے۔

آیت: 25 میں فرمایا: ''بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو قوی دلائل کے ساتھ بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) کو نازل فرمایا تا کہ لوگ عدل پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں سخت قوت ہے اور انسانوں کے لئے فوائد''۔ قرآن مجید کی اس آیت کی حقانیت کی قوی دلیل یہ ہے کہ آج دنیا بھر میں سامانِ حرب کی تیاری اور دفاعی اور اقدامی جنگ کے لئے فولاد بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور تمام قدیم و جدید صنعتوں کی اساس یہی ہے۔

آیت نمبر:27 سے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے از خود رہبانیت کو ایجاد کرلیا تھا اور اس سے ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تھا، پھر انہوں نے اس کی رعایت نہ کی جو رعایت کا حق تھا تو ہم نے ان میں سے ایمان والوں کو ان کا اجروثواب عطا کردیا اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

آیت نمبر:29 میں فرمایا کہ اہل کتاب اللہ تعالیٰ کے فضل پر قادر نہیں ہیں، فضل اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ اس سے جس کو چاہے سرفراز فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

پارہ:۲۸

اٹھائیسویں پارے کے مضامین

سورۃ المجادلہ

سورۃ المجادلہ مدنی سورت ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 58ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 105ویں سورت ہے۔ اس سورت کا نام ''المجادلہ'' اس سورت کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔

اس سورت کا پسِ منظر یہ ہے کہ ایک صحابیہ خولہ بنت ثعلبہ کے ساتھ ان کے شوہر اوس بن صامت نے ظِہار کرلیا تھا، ظِہار کے ذریعے زمانۂ جاہلیت میں بیوی شوہر پر حرام ہو جاتی تھی۔ خولہ بنت ثعلبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا پہلے میں جوان تھی، حسین تھی اب میری عمر ڈھل چکی ہے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، انہیں شوہر کے پاس چھوڑتی ہوں تو ہلاک ہو جائیں گے اور میرے پاس کفالت کے لئے مال نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے کیوں کہ ابھی ظِہار کا حکم نہیں آیا تھا، خولہ رسول اللہ ﷺ سے بحث وتکرار کرنے لگیں کہ میرے مسئلے کا حل کیا ہے اور اللہ سے فریاد کرنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی ابتدائی آیات میں بیان فرمایا: ''(اے رسول!) اللہ نے اس عورت کی بات سن لی، جو آپ سے اپنے خاوند کے بارے میں بحث کر رہی تھی اور اللہ سے شکایت کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی باتیں سن رہا تھا، بے شک اللہ بہت سننے والا خوب دیکھنے والا ہے''۔ چنانچہ خولہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے نزول کا سبب بنیں، ایک بار حضرت عمر فاروق سواری پر آرہے تھے کہ خولہ نے انہیں روک لیا اور باتیں کرنے لگیں کسی نے کہا: امیر المومنین اس بڑھیا کی خاطر آپ اتنی دیر سے رکے ہوئے ہیں، انہوں نے فرمایا میں زمین پر اس کی بات کیوں نہ سنوں جس کی فریاد کو اللہ نے آسمانوں پر سن لیا۔ اس

کے بعد اسلام میں ظِہار کا حکم نازل ہوا کہ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظِہار کر لیں اور پھر رجوع کرنا چاہیں تو ان کا کفارہ بیوی سے قربت سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جسے اس کی استطاعت نہ ہو، اُس کے لئے دو مہینے کے لگا تار روزے رکھنا ہے اور جو یہ نہ کر سکے تو اسے ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا ہے، ظِہار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: ''تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی مثل ہے'' یا بیوی کے کسی عضو کو اپنی ماں کے عضو سے تشبیہ دے تو اس سے ظِہار ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو صرف اتنا کہے کہ تو میری ماں ہے یا بہن ہے تو اگر چہ یہ قولِ ناپسندیدہ ہے، مگر اس سے کوئی چیز لازم نہیں آتی، یعنی اس کی بیوی حرام نہیں ہوگی۔

آیت: 9 سے معصیت پر مبنی سرگوشیوں سے منع کیا گیا ہے اور آیت: 11 میں آدابِ مجلس بیان کئے گئے اور اہلِ علم کی فضیلت کو بیان کیا گیا ہے۔ آیت نمبر: 22 میں فرمایا: بے شک جو لوگ اللہ پر اور قیامت پر یقین رکھتے ہیں، آپ ان کو ایسا نہیں پائیں گے کہ وہ ان سے محبت رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول سے عداوت رکھے خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے رشتہ دار ہوں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان رکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ان کی مدد فرمائی اور انہیں جنت میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے، یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں، سنو بے شک اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔ آخری آیت میں فرمایا کہ مومنِ صادق اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی نہیں کر سکتا، خواہ وہ اس کے ماں باپ یا اولاد یا بہن بھائی یا خاندان کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔

سورۃ الحشر

سورۃ الحشر مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 59 ویں جب کہ ترتیبِ نزول کے اعتبار سے 98 ویں سورت ہے۔ اس سورت کا نام الحشر اس لیے ہے کہ حشر کا معنی ہے: اکٹھا کرنا اور بنو نضیر کو اکٹھا کر کے مدینے سے نکالا گیا اور پھر خیبر اور شام کی طرف

جلاوطن کردیا گیا۔

بنونضیر مدینہ کے ایک بڑے محلہ میں آباد تھے، یہ وہاں بڑے قوت والے تھے، اسی گھمنڈ میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور آپ کو قتل کرنے کی سازش کی، اس کے نتیجے میں ان کو مدینہ بدر کردیا گیا اور ان کے گھروں، زمینوں اور اموال پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ آیت نمبر 7 سے اموال فئی کا اور اس کے مصارف کا ذکر ہے یعنی وہ اموال جو بغیر کسی جنگ کے مسلمانوں کو حاصل ہوں اموال فئی کہلاتے ہیں اور یہ اموال وقف ہوتے ہیں۔

اس سورت کی آیت :9 میں ایک واقعے کے پس منظر میں بیان ہوا کہ اہلِ ایمان خود حاجت مند ہونے کے باوجود ایثار وقربانی کا پیکر بن کر دوسروں کی حاجات پوری کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ آیت :10 میں اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن مہاجرین وانصار صحابۂ کرام کا مدح کے انداز میں ذکر فرمانے کے بعد فرمایا کہ بعد میں آنے والے اپنے سابق اہلِ ایمان بھائیوں کے لئے دعاءِ مغفرت کرتے ہیں اور یہ آیت ایصالِ ثواب کی اصل ہے۔ آیت نمبر :11 منافقین کی سازش، جھوٹ اور بزدلی کا بیان ہے۔

آیت نمبر :18 میں اللہ سے ڈرنے اور قیامت کے لیے آگے کچھ بھیجنے کا ذکر فرمایا۔

آیت :21 میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی جلالت وہیبت کو بیان فرمایا کہ اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے اور (اسے عقل وشعور کی نعمت عطا کرتے تو) تو اے انسان! تو دیکھتا کہ وہ پہاڑ (قرآن کی ہیبت سے) جھکا ہوا ہوتا اور اللہ کے خوف سے پاش پاش ہو جاتا۔ اس سورت کی آخری آیات وہ ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے متعدد اسماءِ صفات کو یکجا بیان کیا گیا ہے کہ صرف وہی مستحق عبادت ہے، ہر ظاہر وباطن کا جاننے والا ہے، اَلرَّحْمٰن اَلرَّحِیْم ہے اور پھر مزید صفات بیان ہوئیں: اَلْمَلِک (بادشاہ)، اَلْقُدُّوْس (نہایت پاک)، اَلسَّلَام (ہر نقص اور کمزوری سے محفوظ)، اَلْمُؤْمِن (امان عطا کرنے والا)، اَلْمُهَيْمِن (نگہبان)، اَلْعَزِیْز (نہایت غالب)، اَلْجَبَّار (نہایت عظمت والا)، اَلْمُتَكَبِّر

(کبریائی والا)، سُبْحَان (نہایت بے عیب) اَلْخَالِقُ، اَلْبَارِئُ (ایجاد فرمانے والا)، اَلْمُصَوِّرُ (صورت بنانے والا)، اَلْحَکِیْمُ (بڑی حکمت والا) اور فرمایا کہ تمام اچھے نام اسی کے لئے ہیں۔

سورۃ الممتحنہ

سورۃ الممتحنہ مدنی سورت ہے۔ اس سورت میں مکہ سے ہجرت کر کے آنے والی مومن خواتین کا امتحان لینے کا ذکر ہے، اس لیے اس کا نام اَلْمُمْتَحِنَہ رکھا گیا۔

ترتیب مصحف کے اعتبار سے 60 ویں جب کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے 92 ویں سورت ہے۔

اس سورت میں اہلِ ایمان کو دشمنانِ خدا اور دشمنانِ اسلام کی دوستی سے منع کیا گیا ہے۔ البتہ یہ فرمایا کہ جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں قتال نہیں کیا اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا تو ان سے نیکی کرنے اور انصاف کرنے سے اللہ نہیں روکتا، لیکن جنہوں نے دین کے معاملے میں مسلمانوں سے قتال کیا ہے اور انہیں جلاوطن کیا ہے یا اس سلسلے میں مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد کی ہے تو اللہ ان کی دوستی سے منع فرماتا ہے اور فرماتا ہے کہ ان سے دوستی کرنے والے ظالم ہیں۔

آیت نمبر:10 میں ہجرت کر کے آنے والی مومن عورتوں کے بارے میں مومنین سے فرمایا کہ ان کے ایمان کا یقین ہونے کے بعد کفار کی طرف مت لوٹاؤ اور فرمایا کہ مومن عورتیں کافروں کے لیے حلال ہیں نہ کافر مرد مسلمان عورتوں کے لیے۔ نیز فرمایا کہ مسلمان بھی کافر عورتوں کو اپنے پاس نہ روکیں۔

آیت:12 میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا کہ اگر مومنات صحابیات آپ سے ایک طے شدہ دستور اور منشور پر بیعت کرنا چاہیں تو ان کی بیعت قبول کیجئے اور ان کے لئے اللہ سے استغفار کیجئے، وہ منشور یہ ہے کہ: وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا نہیں کریں گی، (افلاس کے خوف سے) اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں

گے، بے اصل بہتان تراز ی نہیں کریں گی اور کسی بھی نیک کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔ حدیث پاک میں ہے کہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام سے فرماتے کہ اگر تم بھی بیعت مومنات کرنا چاہو تو آؤ کرو۔

سورۃ الصّف

سورۃ الصّف مدنی سورت ہے، اس سورت کا نام اس کی چوتھی آیت سے ماخوذ ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 61ویں جب کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے 108ویں سورت ہے۔

اس سورت کے شروع میں قول وفعل کے تضاد سے منع کیا گیا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے ناراض ہوتا، جن کے قول وفعل میں تضاد ہے۔ مزید فرمایا: اللہ تعالیٰ ان مجاہدین کو پسند فرماتا ہے، جو اس کی راہ میں صف بستہ قتال کرتے ہیں، جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

آیت نمبر:6 میں فرمایا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور اس (عظیم) رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہے۔

آیت نمبر:8 سے فرمایا کہ دشمنان دین چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں سے (پھونکیں مارکر) بجھادیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے، خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

آیت:9 میں بتایا کہ اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لئے بھیجا ہے کہ اسے تمام باطل ادیان پر غالب کرے، خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ آیت:10 سے مسلمانوں کو اللہ کے ساتھ ایک تجارت کی ترغیب دی گئی اور اس پر اجرِ عظیم کی بشارت دی گئی اور وہ تجارت یہ ہے کہ اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

سورت کے آخر میں فرمایا: بنی اسرائیل کی ایک جماعت تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان

لے آئی اور دوسری جماعت نے کفر کیا، پس ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی تو مومن (کافروں پر) غالب آ گئے۔

سورۃ الجمعۃ

سورۃ الجمعہ مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 62ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 106ویں سورت ہے۔ اس سورت کی آیت نمبر:9 میں نمازِ جمعہ کا ذکر ہے، اس لیے اس سورت کا نام ''الجمعہ'' رکھا۔

اس سورت کے شروع میں بعثت رسول کے مقاصد کو بیان کیا گیا، یعنی تلاوتِ آیاتِ الٰہی، تزکیۂ باطن اور کتاب وحکمت کی تعلیم۔ اور فرمایا: جن لوگوں کو تورات دی گئی اور انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا، ان کی مثال اس گدھے کی طرح ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ اس کے بعد یہود کا ذکر ہوا اور انہیں دعوت دی گئی کہ اگر تمہارا دعویٰ سچا ہے کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے دوست ہو تو اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو، کیوں کہ مُحِبّ اپنے محبوب سے جلد از جلد ملنا چاہتا ہے اور پھر قرآن نے پیشگوئی کی کہ اپنے ناروا کرتوتوں کے سبب یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔

اس سورت کی آیت نمبر:8 میں موت سے مفر نہ ہونے کا بیان فرمایا۔

اس سورت کے دوسرے رکوع میں نماز جمعہ کی فرضیت کا حکم نازل ہوا کہ جب نماز جمعہ کے لئے ندا دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر نماز کے لئے دوڑے چلے آؤ اور کاروبار چھوڑ دو، جب نماز ادا کر چکو تو وسائل رزق کو تلاش کرو۔ حدیث پاک میں فرمایا کہ جو شخص سستی کی بنا پر تین جمعے چھوڑ دے، تو اللہ اس کے دل پر مہر لگا دے گا اور ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برسرِ منبر فرمایا کہ لوگ جمعہ ترک کرنے کی روش سے باز آ جائیں، ورنہ (اس نافرمانی کی پاداش میں) اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا اور وہ غافل ہو جائیں گے۔

سورۃ المنافقون

سورۃ المنافقون مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 63ویں جب کہ

ترتیب نزول کے اعتبار سے 102 ویں سورت ہے۔اس کی پہلی آیت میں لفظ ''اَلْمُنٰفِقُوْن'' مذکور ہونے کی وجہ سے اس کا نام ''اَلْمُنٰفِقُوْن'' رکھا گیا۔

اس سورت کی ابتدا میں منافقین کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی زبانی اقرار اور باطنی کفر جھوٹی قسموں کو ڈھال بنانے پر ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگنے اور ان کے دشمن اسلام ہونے اور ان سے خبردار ہونے کا بیان فرمایا۔آیت نمبر 8 میں رئیس المنافقین کی ہرزہ سرائی کے جواب میں فرمایا کہ عزت تو صرف اللہ اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے۔

اس سورت کے دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو فرمایا کہ مال اور اولاد (کی محبت) تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردے اور فرمایا کہ ہم نے تمہیں جو مال عطا کیا ہے، موت سر پر آنے سے پہلے اسے دین کی راہ میں خرچ کرو، ورنہ فرشتۂ اجل کو دیکھ کر ہر ایک کہے گا کہ مجھے تھوڑی سی مہلتِ حیات مل جائے کہ میں صدقہ کروں اور نیکوکاروں میں سے ہو جاؤں۔اللہ نے فرمایا کہ موت کا مقررہ وقت آنے پر کسی کو ایک سانس کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔

سورۃ التغابن

سورۃ التغابن مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 64 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 107 ویں سورت ہے۔

آیت نمبر:9 میں ''اَلتَّغَابُنْ'' کا لفظ مذکور ہونے کی وجہ سے ''اَلتَّغَابُنْ'' سے موسوم کیا گیا۔اس سورت کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرنے کے بعد اس کی ملک، حمد، قدرت، خالقیت، مصوری، ظاہر و مستور ہر چیز اور سینوں کے رازوں کے عالم ہونے کا بیان ہے۔

آیت نمبر:9 میں قیامت کو کفار کے لیے نقصان اور دخولِ نار اور مومنین صالحین کے لیے دخولِ جنت کا دن فرمایا۔آیت نمبر:16 میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے، سننے، اطاعت کرنے اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے اور بخل سے بچنے والوں کو اخروی فلاح پانے

والے قرار دے رہے ہیں۔

آیت :14 میں اہلِ ایمان کو فرمایا کہ ''تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن ہیں، سوان سے ہوشیار رہو''، یعنی بعض اوقات اہل وعیال کی محبت کے غلبے اور ان کی جائز و ناجائز فرمائشوں اور خواہشات کی تکمیل کے لیے انسان دین سے دور ہو جاتا ہے اور جہاد سے قدم روک لیتا ہے۔

سورۃ الطلاق

سورۃ الطلاق مدنی سورت ہے، اس سورت کی پہلی آیت میں طلاق دینے اور طلاق کی عدت کا ذکر ہے، اس لیے اس کا نام ''اَلطَّلَاق'' رکھا گیا۔ ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے 65ویں جب کہ نزول کے اعتبار سے 96ویں ہے۔

اس سورت کے شروع میں فرمایا کہ جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو، ان کی عدت کا وقت (شروع ہونے سے پہلے طہر میں) انہیں طلاق دو۔ یعنی طلاق کے بعد عدت کا حساب رکھنا اور پورا کرنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں مختلف احوال کی مناسبت سے عدت کے احکام بیان کئے گئے ہیں، جو یہ ہیں: (۱) جس عورت کو ماہواری (Menses) آتی ہو، اس کی عدت اس کے تین دورانیے ہے اور طلاق پاکی کے اس دورانیے میں دینی چاہئے کہ جس میں شوہر نے عورت سے قربت نہ کی ہو۔ (۲) جس عورت کو ماہواری نہ آتی ہو، اس کی عدت تین مہینے ہے، قرآن میں ایسی عورت کو ''آئِسَہ'' کہا ہے (۳) حاملہ عورت کو طلاق دے دی جائے، تو بچہ پیدا ہوتے ہی اس کی عدت ختم ہو جاتی ہے، خواہ مدت کم ہو یا زیادہ (۴) وہ عورت جس سے نکاح ہوا ہو، لیکن رخصتی عمل میں نہ آئی ہو اور خلوت (Privacy) بھی نہ ہوئی ہو، تو اس پر کوئی عدت نہیں ہے، طلاق دیتے ہی وہ نکاح سے خارج ہو جائے گی اور اپنی آزادانہ مرضی سے کسی کے ساتھ بھی نکاح کرنے کے لئے آزاد ہوگی۔ (۵) جس عورت کا شوہر وفات پا گیا ہو، اس کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے، عدت وفات ہر صورت میں لازم ہوگی، خواہ رخصتی عمل میں آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ حاملہ عورت کا شوہر وفات پا گیا ہو،

تو اس کے حق میں حاملہ والی عدت بھی مؤثر ہے، خواہ اس کا دورانیہ عدت وفات سے کم ہو یا زیادہ۔ قرآن نے یہ بھی فرمایا کہ طلاقِ رجعی کی صورت میں عدت کی تکمیل سے پہلے بھلائی کے ساتھ یعنی نیک ارادے سے رجوع کر لو یا دستور کے مطابق جدا کر دو اور رجوع کی صورت میں دو گواہ مقرر کر لو، یہ حکم ایجابی (Compulsory) نہیں ہے، استحبابی (Appreciadle) ہے۔ قرآن نے یہ بھی حکم دیا کہ مطلقہ عورتوں کو عدت کے دوران اپنی حیثیت کے مطابق نان نفقہ دو اور انہیں تنگ نہ کرو اور اگر وہ حاملہ ہیں تو وضعِ حمل (Delivery) تک ان کو نان نفقہ اور رہائش دو اور اگر وہ وضعِ حمل کے بعد بچے کی پرورش کرنے اور دودھ پلانے پر آمادہ ہوں تو انہیں اجرت بھی دو اور یہ تمام مصارف صاحب حیثیت اپنی حیثیت کے مطابق ادا کرے اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق کرے۔

سورۃ التحریم

سورۃ التحریم مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 66ویں جب کہ ترتیب نزول کے لحاظ سے 105ویں سورت ہے۔

اس سورت کا نام ''التحریم'' ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا جو اس سورت کی پہلی آیت میں مذکور ہے۔

اس سورت کے شروع میں بیان ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض وجوہ سے شہد نہ کھانے کی قسم فرمالی تھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کفارہ ادا کر کے قسم توڑ دیں۔ ازواجِ رسول کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں طلاق دے دی، تو عنقریب ان کا رب ان کو تمہارے بدلے میں تم سے بہتر بیویاں دے دے گا، جو فرمانبردار، ایمان دار، اطاعت گزار، توبہ کرنے کرنے والیاں، عبادت گزار، روزے دار، شوہر دیدہ اور کنواریاں ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ازواجِ مطہرات طیبات امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن نے اللہ کے رسول کو دل و جان سے راضی رکھا۔

آیت :6 میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے

بچاؤ، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ آیت: 8 میں خالص توبہ کا حکم ہوا اور اس پر گناہوں کی معافی اور جنت کی بشارت دی گئی۔ آیت: 9 میں محارب کفار سے جہاد کا حکم فرمایا۔

آیت: 10 میں حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کا ذکر ہوا کہ کفر کے سبب قربِ نبی سے بھی ان کو کوئی فائدہ نہ ہوا، بعد کی آیت میں آسیہ زوجہ فرعون کا ذکر ہوا کہ ایمان کے سبب کافر کا قرب ان کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ اس کے بعد حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی اور اطاعت گزاری کا ذکر ہوا۔

آخر سورت میں حضرت آسیہ زوجہ فرعون کے ذکر کے ذریعے مومن خواتین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر راہِ حق میں انہیں مظالم برداشت کرنا پڑیں تو وہ حضرت آسیہ سے سبق سیکھیں۔

اسی طرح حضرت سیدہ مریم کی پاک دامنی اطاعت شعاری اور احکام شرع کی تصدیق کا بیان کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مردوں میں بہت کامل ہیں اور عورتوں میں صرف چار کاملہ ہیں: آسیہ بنت مزاحم زوجہ فرعون، مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسی ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر، (سنن ترمذی)۔

خلاصہ تفسیر
پارہ:۲۹

اُنتیسویں پارے کے مضامین

سورۃ الملک

سورۃ الملک مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 67ویں جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 76ویں سورت ہے۔ اس سورت کی پہلی آیت میں الملک کا لفظ مذکور ہونے کی وجہ سے اس کا نام سورۃ الملک رکھا گیا۔

حدیث پاک میں سورۃ الملک کی بڑی برکات بیان کی گئی ہیں، اسے "المنجیہ" (نجات دینے والی) اور "الواقیہ" (حفاظت کرنے والی) کہا گیا، اس سورت کی تلاوت عذابِ قبر میں تخفیف اور نجات کا باعث ہے، اس کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے موت وحیات کی حکمت بیان فرمائی کہ اس کا مقصد بندوں کی آزمائش ہے کہ کون عمل کے میزان پر سب سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔ اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے سات آسمانوں کی تخلیق کو اپنی قدرت کی نشانی قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی تخلیق میں تمہیں کوئی عیب یا نقص نظر نہیں آئے گا، ایک بار پھر نظر پلٹ کر دیکھ لو، کیا اس میں تمہیں کوئی شگاف نظر آتا ہے، پھر بار بار نظر اٹھا کر دیکھ لو (اللہ کی تخلیق میں کوئی عیب یا جھول تلاش کرنے میں) تمہاری نظر تھک ہار کر ناکام پلٹ آئے گی۔ آسمانِ اول کے نیچے لاتعداد چمکتے تاروں کو اللہ نے قمقموں سے تعبیر فرمایا۔

آیت نمبر 8 سے کفار اور جہنم کے محافظ کے درمیان جو مکالمہ ہوگا اس کا بیان، ان کے اعترافِ جرم اور عذابِ جہنم جب کہ مومنین کے لیے مغفرت اور بڑے اجر کا بیان ہے۔

آیت 19: میں اللہ نے فرمایا: کیا انہوں نے اپنے اوپر (کبھی) پر پھیلائے اور (کبھی) پر سمیٹے ہوئے پرندوں کو نہیں دیکھا، ان کو (فضا میں) رحمٰن کے سوا کوئی نہیں روک سکتا۔

آیت :20 سے اللہ کے مدد کرنے اور رزق عطا فرمانے کا بیان ہے۔

آیت :23 میں فرمایا کہ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں عطا کیں، (مگر) کم بندے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔

آخری آیت میں فرمایا: آپ کہیے: بھلا یہ بتاؤ اگر صبح کو تمہارا پانی زمین میں اتر جائے تو تمہارے پاس بہتا ہوا پانی کون لا کر دے گا۔

سورۃ القلم

سورۃ القلم مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 68ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر دوسرا ہے۔ سورت کی ابتدائی آیت میں لفظ القلم کا مذکور ہونا اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے قلم اور کارکنانِ قضا و قدر کے نوشتوں کی قسم فرما کر کفار کے الزامات سے اپنے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع فرمایا کہ اپنے رب کے فضل سے آپ مجنون نہیں ہیں اور آپ کے لئے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے اور آپ اخلاق کے عظیم مرتبے پر فائز ہیں، عنقریب آپ دیکھ لیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون مجنون تھا۔ عام اصول یہ ہے کہ جس پر الزام ہو، وہ اپنی صفائی پیش کرتا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز عطا فرمایا کہ آپ پر کفار و مشرکین کی جانب سے جو الزام لگائے جاتے رہے، اللہ تعالیٰ نے آیاتِ قرآنی میں ان کا رد فرمایا۔

ولید بن مغیرہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نازیبا کلمات کے رد میں اللہ تعالیٰ نے اس کے نو قبیح اوصاف گنوا کر بیان فرمائے۔

آیت :4 میں اخلاقِ مصطفیٰ کی عظمتوں کا بیان ہے اور یہ عظمت مخلوق کے پیمانے سے نہیں، خالق عزوجل کے پیمانے سے ہے۔ ''علیٰ'' کا کلمہ عربی میں استعلا یعنی کسی چیز پر کمانڈنگ پوزیشن کو ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کو اخلاق کے رائج پیمانوں سے نہیں ناپا جائے گا بلکہ جو کردار آپ کی ذات کا حصہ

بن جائے وہی عظیم قرار پائے گا۔

آیت :8 سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا کہ کفار چاہتے ہیں کہ دین کے معاملے میں آپ ان سے بے جا رعایت برتیں تاکہ وہ بھی جواب میں رعایت کریں، ایسا نہیں ہوسکتا، حق پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا اور اس کے بعد ایک دشمنِ رسول (مفسرین کے مطابق یہ ولید بن مغیرہ ہے) کے نو قبیح اوصاف بیان کئے گئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے نبیِ کریم ﷺ کی دل آزاری کرنے والا کتنا ناپسند ہے۔

آیت :17 سے ان باغ والوں کا ذکر ہے جنہوں نے پھل کاٹنے کے ارادے میں ان شاء اللہ نہ کہا، اور اللہ کی تسبیح سے غافل رہے اور مسکینوں کو ان کا حصہ دینے سے بخل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے باغ کو تباہ کر دیا، اس کے بعد ان کے پچھتاوے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا ذکر ہے۔

اس سورت کی آخری آیت کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ اس آیت کو پڑھ کر دم کیا جائے تو نظرِ بد کا ازالہ ہوجاتا ہے۔

سورۃ الحاقہ

سورۃ الحاقہ مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 69 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 77 ویں ہے۔ اس سورت کو الحاقہ کے سوال کے ساتھ شروع کیا گیا ہے، اس لیے اس کا نام الحاقہ رکھا گیا ہے۔

اس سورت کے شروع میں قیامت کے حق اور یقینی ہونے کو بیان کیا گیا ہے، پھر قومِ ثمود و عاد اور فرعون پر نازل ہونے والے عذاب کا ذکر ہے، یہ مضامین قرآن مجید میں کئی جگہ بیان ہوئے ہیں۔

آیت نمبر :13 سے صور پھونکے جانے، زمین اور پہاڑوں کے اٹھالیے جانے اور ضرب سے ریزہ ریزہ کر دیے جانے، آسمان کے پھٹنے اور کمزور ہونے اور آٹھ فرشتوں کا اللہ کے عرش کو اٹھانے کا بیان ہے۔

آیت :19 سے بتایا کہ قیامت میں جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، یہ اس کے سرخ رو ہونے کی علامت ہوگی اور وہ افتخار کے ساتھ لوگوں سے کہے گا آؤ میرا نامۂ اعمال پڑھو۔ اس کے برعکس جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، یہ اس کی رسوائی کی علامت ہوگی اور وہ کہے گا کہ کاش مجھے میرا نامۂ اعمال دیا ہی نہ جاتا اور موت کے ساتھ ہی میرا قصہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہوتا۔ انہی آیات میں صالحین کے لئے جنت کی نعمتیں اور منکرین کے لئے اخروی عذاب کا بیان ہے۔

آیت نمبر :40 میں فرمایا کہ قرآن نہ کسی شاعر کا بیان ہے اور نہ کسی کاہن کا کلام، یہ صرف اللہ کا کلام ہے۔

سورۃ المعارج

سورۃ المعارج مکی سورت ہے، اس سورت کی آیت نمبر 3 میں معارج کا لفظ مذکور ہے اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ مصحف کی ترتیب کے لحاظ سے اس کا نمبر 70 واں جب کہ ترتیبِ نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر 77 واں ہے۔

اس سورت کے شروع میں عذابِ قیامت کا ایک بار پھر بیان ہے کہ حشر کا ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا، پہاڑ دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے اور کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ ہوگا، اس وقت مجرم یہ تمنا کرے گا کہ بیوی، بھائی، رشتے دار اور تمام اہل زمین سب کو اپنا فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔

آیت نمبر :19 سے انسان کی کم حوصلگی، مصیبت کے وقت گھبرا جانے اور نفع پہنچنے کی صورت میں بخل کرنے کا ذکر ہے۔

اس سورت میں اہلِ حق، ان کی اعلیٰ صفات اور اُخروی جزا کا بیان ہے۔

سورۂ نوح

سورۂ نوح مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 71 واں جب کہ ترتیب نزول

کے اعتبار سے اس کا نمبر 72 ہے، اس سورت کی آیت 1 میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے، اس لیے اس کا نام نوح رکھا گیا۔

اس سورت کے شروع میں حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کی طرف مبعوث ہونے، قوم کو اللہ کی عبادت کی دعوت دینے اور گناہوں کو چھوڑنے کا ذکر فرمایا۔

حضرت نوح علیہ السلام اللہ کی بارگاہ میں فریاد کرتے ہیں کہ میں نے اپنی قوم کو شب و روز دعوتِ حق دی، مگر ان کی سرکشی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اور جب بھی میں انہیں دعوتِ حق دیتا تو وہ قبولِ حق سے انکار کے لئے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے اور ضد اور تکبر میں اپنے آپ کو کپڑوں سے ڈھانپ لیتے، میں نے ان سے کہا: تم اپنے رب سے استغفار کرو، وہ بہت زیادہ معاف فرمانے والا ہے، وہ تم پر موسلا دھار بارش نازل فرمائے گا اور مالوں اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔ جب نوح علیہ السلام جماعتِ انبیاء میں طویل ترین عرصۂ تبلیغ گزارنے کے بعد قوم کے ایمان سے مایوس ہوئے تو انہوں نے ان کے لئے دعاءِ عذاب کی کہ اے اللہ ان کا نام ونشان مٹا دے اور اسی موقع پر اپنے لئے، اپنے والدین کے لئے اور جملہ مومنین اور مومنات کے دعاءِ مغفرت فرمائی۔

سورۃ الجن

سورۃ الجن مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 72واں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس سورت کا نمبر 48 ہے۔ جنات کی ایک جماعت کا پہلی آیت میں قرآن مجید سننے کا ذکر ہے، اس لیے اس سورت کو ''الجن'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اس سورت میں اس امر کا بیان ہوا کہ جنات عالَم بالا میں خبروں کی سن گن لینے کے لئے جایا کرتے تھے، مگر اب وہ وقت آ گیا تھا کہ عالَم بالا میں ان کا داخلہ بند ہو گیا اور جو بھی جاتا محافظ ان کا راستہ روک لیتے اور آگ کے گولے ان پر برسائے جاتے۔ جنات نے مشورہ کیا کہ پورے روئے زمین کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ آخر یہ سارا منظر کیوں تبدیل ہو گیا، ضرور کوئی بڑی تبدیلی آئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ ان کی ایک

جماعت تہامہ (مکہ) کی طرف گئی اور وہاں نبی ﷺ عکاز کے بازار میں اپنے اصحاب کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے، جب انہوں نے قرآن کو سنا تو کہا یہی وہ چیز ہے جو ہمارے اور آسمان کے درمیان حائل ہوگئی ہے اور پھر انہوں نے جا کر اپنی قوم کو بتایا کہ ہم نے عجب قرآن سنا ہے جو راہِ ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے، ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم ہر گز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، بے شک ہمارے رب کی شان بلند ہے اور اس کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ بیٹا۔ انہوں نے کہا کہ ہم میں سے کچھ اطاعت گزار ہیں اور کچھ سرکش ہیں اور جنات کا سرکش گروہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔ عربی میں ''ج ن ن'' سے جو بھی کلمات بنتے ہیں، ان میں ستر اور پوشیدگی کے معنی پائے جاتے ہیں، اسی معنی میں ''جن'' ہے کہ وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں، گھنے باغ کو کہ زمین درختوں کی کثرت سے چھپ جائے ''جنت'' کہتے ہیں، سینے میں پوشیدہ دل کو ''جنان'' کہتے ہیں، رحم میں بچے کو ''جنین'' کہتے ہیں، ڈھال کو ''جُنہ'' کہتے ہیں وغیرہ۔

آیت 26: میں فرمایا ''وہ ہر غیب کا جاننے والا ہے، سو وہ اپنے ہر غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا، ماسوا ان کے جن کو اس نے پسند فرمالیا ہے، جو اس کے (سب) رسول ہیں''، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کو غیب کا علم عطا فرماتا ہے۔

سورۃ المزمل

سورۃ المزمل مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 73 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر 3 ہے، اس سورت کا نام ''المزمل'' اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔

اس سورت میں محبت کے انداز میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو ان کی ایک خاص ادا کے ساتھ مخاطب فرمایا کہ ''اے چادر اوڑھنے والے''، اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے ''قیام اللیل'' کا بیان فرمایا، قرآن کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ساری ساری رات قیام فرماتے تھے، تو اللہ نے فرمایا: آپ رات کو نماز میں قیام کریں، مگر

تھوڑا، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیں یا اس پر کچھ اضافہ کر دیں اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ یہ بھی فرمایا کہ: رات کو اٹھنا نفس پر سخت بھاری ہے اور کلام کو درست رکھنے والا ہے۔ نیز فرمایا آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیں اور سب سے منقطع ہو کر اسی کے ہو رہیں۔

آیت نمبر: 17 میں قیامت کی ہولنا کی کا بیان فرمایا کہ وہ بچوں کو بوڑھا کر دے گی۔

دوسرے رکوع میں پھر فرمایا کہ آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ (کبھی) دو تہائی رات کے قریب قیام کرتے ہیں اور کبھی آدھی رات تک اور کبھی تہائی رات تک اور آپ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت بھی مصروفِ عبادت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تکرار کے ساتھ فرمایا کہ جتنا آسانی سے قرآن پڑھ سکتے ہیں، پڑھ لیا کریں۔ علماءِ کرام نے فرمایا کہ یہ تہجد کے بارے میں ہے اور آپ پر نمازِ تہجد فرض یا واجب تھی۔

آخر میں فرمایا کہ تم اپنی بھلائی کے لیے جو کچھ آگے بھیجو گے، اس کو اللہ تعالیٰ کے پاس اس سے بہتر اور زیادہ ثواب میں پاؤ گے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہو بے شک اللہ بہت مغفرت فرمانے والا، بے حد رحم والا ہے۔

سورۃ المدثر

سورۃ المدثر مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 74 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس سورت کا نمبر 4 ہے۔

اس سورت کے شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ'' سے خطاب فرمانے کی وجہ سے اس کا نام المدثر رکھا گیا۔

اس سورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو شانِ محبوبی کے ساتھ خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے چادر لپیٹنے والے، اٹھئے اور لوگوں کو اللہ کے عذاب ڈرایئے اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کیجئے''۔

آیت نمبر: 39 میں اصحاب الیمین کی تعریف کی گئی ہے۔

آیت :42 میں فرمایا: جہنمیوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے جہنم میں جانے کا سبب کیا بنا، تو وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہم لغو کاموں میں مشغول رہتے تھے اور ہم قیامت کے دن کو جھٹلاتے تھے کہ موت سر پہ آ گئی ۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اہلِ ایمان اور جنت کے طلب گاروں کو جہنمیوں کی عادات سے بچنا چاہئے ۔

سورۃ القیامۃ

سورۃ القیامہ مکی سورت ہے، اس سورت کا نام اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 75 ویں سورت ہے جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر 31 ہے۔

ان لوگوں کے بارے میں جو آخرت کے منکر ہیں، اللہ تعالیٰ نے قسم ذکر فرما کر ارشاد فرمایا: کیا انسان نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم مرنے کے بعد اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے، کیوں نہیں، ہم اس بات پر بھی قادر ہیں کہ ان کی انگلیوں کے پور جیسے پہلے تھے، ویسے ہی بنا دیں ۔ آیت :16 سے فرمایا: (اے رسول!) وحیِ ربانی کو جلد یاد کرنے کے شوق میں آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے، اس قرآن کو جمع کرنا اور آپ کی زبان پر جاری کرنا ہمارے ذمۂ کرم پر ہے، سو جب ہم (یعنی ہمارا بھیجا ہوا فرشتہ) پڑھ لیں تو آپ اس پڑھے ہوئے کی اتباع کریں، پھر اس کا (معنی) بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ سورت کے آخر میں آخرت کے احوال اور موت کے منظر کو بیان کیا گیا اور انسان کی پہلی بار پیدائش کی طرح دوبارہ زندہ کرنے کا ذکر فرمایا۔

سورۃ الدھر

اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے کے متعلق اختلاف ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 76 واں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے بعض کے نزدیک 30 واں جب کہ بعض کے نزدیک 98 واں نمبر ہے۔ اس کو ''سُوْرَۃُ الْاِنْسَان'' بھی کہتے ہیں، اس سورت کا نام

اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔

اس سورت کے شروع میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ہدایت دے کر ان کی آزمائش کی ہے، اس سورت میں انفاق فی سبیل اللہ، مسکین، یتیم اور اسیر (قیدی) کو کھانا کھلانے کی نیکی کو اپنے بندوں کے وصفِ کمال کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس سورت کی بیشتر آیات میں جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے۔

آیت نمبر 3 میں فرمایا کہ ہم نے انسان کو سیدھا راستہ دکھا دیا، اب وہ چاہے شکر کرنے والا ہو یا ناشکرا۔

سورۃ المرسلات

سورۃ المرسلات مکی سورت ہے، اس سورت کی پہلی آیت کا پہلا لفظ ''اَلْمُرْسَلَات'' اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 77ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر 33 ہے۔

اس سورت کے شروع میں آثارِ قیامت کا ذکر ہے اور بار بار تکرار کے ساتھ فرمایا کہ اس دن قیامت کو جھٹلانے والوں کے لئے ہلاکت ہے اور آخر میں ایک بار پھر اہلِ تقویٰ کے لئے اجرِ آخرت اور اُخروی نعمتوں کی بشارت ہے۔

اس سورت کی آیت 15 میں مجرمین کے انجام کا ذکر فرمایا۔ آیت نمبر 29 سے جہنم کی ہولناکیوں کا ذکر فرمایا۔

خلاصۂ تفسیر

پارہ: ۳۰

تیسویں پارے کے مضامین

سورۃ النباء: ''نبا'' خبر کو کہتے ہیں، یہ مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 78ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس سورت کا نمبر 80 ہے۔ اس سورت کے شروع میں فرمایا کہ لوگ ایک عظیم خبر کے متعلق، جس کے بارے میں یہ باہم اختلاف کررہے ہیں، ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں، یعنی قیامت کے وقوع اور حق ہونے کے بارے میں کچھ لوگوں کو اختلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا عنقریب قیامت برپا ہوگی تو انہیں معلوم ہوجائے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیوں کو بیان کرنے کے بعد آیت: 17 میں فرمایا کہ فیصلے کے دن کا وقت مقرر ہے اور پھر علاماتِ قیامت کا بیان فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا کہ جہنم سرکشوں کا ٹھکانہ ہے، جس میں وہ مدت دراز تک رہیں گے، اس میں انہیں کھولتا ہوا پانی اور جہنمیوں کے زخموں کی پیپ کے سوا کوئی مشروب میسر نہیں ہوگا۔ آیت: 31 سے اہلِ تقویٰ کے لئے انعامات کا بیان کیا گیا ہے۔

آیت: 38 میں جبرائیل اور فرشتوں کے صف بستہ کھڑے ہونے اور اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کسی کی بات کرنے کی ہمت نہ ہونے کا بیان ہے۔ آخری آیت میں فرمایا کہ کافر کہے گا: کاش میں مٹی ہوجاتا۔

سورۃ النازعات: اس سورت کی پہلی آیت کا پہلا لفظ ''وَالنّٰزِعٰتِ'' ہے، اس لیے اس سورت کا نام ''وَالنّٰزِعٰتِ'' رکھا گیا۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 79ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس سورت کا نمبر 81 ہے۔ اس سورت میں یہ بتایا کہ موت کے فرشتے جہنمیوں کی روح نہایت سختی سے نکالتے ہیں اور اہل ایمان کی روح کو نہایت نرمی سے، اس کے بعد فرشتوں کا ذکر ہے کہ جنہیں کارخانۂ قدرت کے معاملات کی تدبیر تفویض کی جاتی ہے، اس کے بعد ایک بار پھر قیامت کا ذکر ہے۔

آیت :15 سے اس امر کا بیان ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کو دعوتِ حق دینے کے لئے بھیجا گیا اور اس نے ان کی تکذیب اور نافرمانی کی اور اپنے آپ کو ''ربِ اعلیٰ'' قرار دیا یعنی خدائی کا دعویٰ کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے عذاب دے کر درسِ عبرت بنا دیا۔ حیات بعد الموت کے منکرین کے اس اشکال کا جواب دیا کہ ایک بار مرجانے کے بعد دوبارہ کون زندہ کرے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین وآسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کی تخلیق کا حوالہ دے کر فرمایا کہ دوبارہ پیدا کرنا دشوار ہے یا اتنے بڑے نظامِ کائنات کو جو تمہارے سامنے ہے، قائم کرنا۔ اس سورت یہ بھی بتایا کہ سرکشوں کا ٹھکانہ جہنم اور جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے اور وہ نفس پرست نہیں ہیں، ان کا ٹھکانہ جنت ہوگا۔

آیت نمبر :27 سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت پر دلائل نفسی اور دلائلِ خارجی سے استدلال فرمایا۔

سورۂ عبس: مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 24 ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس سورت کا نمبر 80 واں ہے۔ اس سورت کا پہلا لفظ ''عَبَسَ'' اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ بارگاہِ رسالت میں رؤوسائے قریش حاضر تھے اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تبلیغ فرما رہے تھے کہ اسی اثناء میں ایک نابینا صحابی عبداللہ بن ام مکتوم حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو سکھایا ہے، مجھے بھی اس میں سے سکھایئے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مداخلت ناگوار گزری، یہ ناگواری فریضہ تبلیغ میں بے جا مداخلت پر تھی اور بجا تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر بھی عبداللہ بن ام مکتوم کی دلجوئی فرماتے ہوئے اس سورۂ مبارکہ کا نزول فرمایا تاکہ دنیا کو پتا چل جائے کہ اس بارگاہ میں شکستہ دلوں اور سوختہ جگروں کا جو مقام ہے وہ کسی اور کی نہیں، اور جو لوگ اس سورۂ مبارکہ سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ عالیہ کی تنقیص کرتے ہیں وہ محب اور محبوب کے درمیان رمزِ محبت سے ناواقف اور پرلے درجے کے کم فہم ہیں۔

اس سورت کے آخر میں قیامت کے نفسی نفسی کے منظر کو بیان کیا گیا ہے کہ دنیا میں ایک

دوسرے پر جان چھڑکنے والے اور محبت کا دعویٰ کرنے والے دامن چھڑائیں گے، ایک شخص اپنے بھائی، ماں باپ، بیوی اور بیٹوں سے جان چھڑا کر بھاگے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سب کو اپنی پڑی ہوگی، کچھ کے چہرے روشن مسکراتے اور ہشاش بشاش ہوں گے اور کچھ کے چہرے غبار آلود ہوں گے اور ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔

سورۃ التکویر: سورۃ التکویر مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 81ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر 7 ہے، اس سورت کا نام التکویر ہے جو کہ ''کُوِّرَتْ'' کا مصدر ہے۔

اس سورت میں بھی علاماتِ قیامت کا ذکر ہے کہ سورج کی بساطِ نور کو لپیٹ دیا جائے گا، ستارے جھڑ جائیں گے، پہاڑ چلائے جائیں گے، دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں بے کار چھوڑ دی جائیں گی، یعنی دنیا کی مال و دولت کی قدر ختم ہو جائے، وحشی جانور جمع کئے جائیں گے، سمندر بڑھکائے جائیں گے، جانیں ایک بار پھر جسموں سے ملادی جائی جائیں گی اور آگے چل کر فرمایا اعمال کے صحیفے پھیلا دیئے جائیں گے، دوزخ کو بھڑکایا جائے گا، جنت قریب کر دی جائے گی اور ہر شخص جان لے گا کہ اس نے اپنی آخرت کے لئے کیا ذخیرہ عمل آگے بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر قرآن مجید اور رسالت محمدی کی حقانیت کا ذکر فرمایا ہے۔

سورۃ الانفطار: سورۃ الانفطار مکی سورت ہے، ترتیب مصحف اور ترتیب نزول دونوں کے اعتبار سے اس سورت کا نمبر 82واں ہے، اس سورت کی پہلی آیت میں اس کا نام مذکور ہے۔

اس سورت میں تقریباً گزشتہ سورتوں کے مضامین یعنی آثار قیامت اور احوالِ قیامت کا بیان ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بندے کے نامۂ اعمال کو لکھنے کے لئے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، جنہیں ''کِرَامًا کَاتِبِیْنَ'' (معزز لکھنے والے) کہا گیا ہے اور بندہ جو بھی عمل کرتا ہے وہ جانتے ہیں۔ نیکوکاروں کے نعمتوں میں ہونے اور بدکاروں کے دوزخ میں ہونے کا بیان ہے اور یہ کہ بروز قیامت کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا اور اس دن صرف اللہ کا حکم چلے گا۔

سورۃ المطففین: سورۃ المطففین مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 83واں جب کہ نزول کے اعتبار سے 86واں نمبر ہے، تطفیف کے معنی ناپ تول میں کمی کرنے کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے شدید عذاب ہے کہ جب وہ لوگ دوسروں سے لیتے ہیں، تو پورا پورا ناپ کر لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں، یعنی ڈنڈی مارتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ کیا ان لوگوں کو قیامت پر یقین نہیں ہے، یہ بھی فرمایا کہ کافروں کا نامۂ اعمال ''سِجّین'' میں ہے جو کہ مہر لگا یا ہوا صحیفہ ہے، یہ لوگ قیامت کو جھٹلاتے ہیں اور آیاتِ الٰہی کو پچھلی قوموں کے قصے کہانیاں قرار دیتے ہیں، اللہ نے فرمایا کہ ان کے کرتوتوں کے سبب ان کے دل زنگ آلود ہو چکے ہیں اور یہ آخرت میں اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے۔ مزید فرمایا کہ نیکوکاروں کا صحیفۂ اعمال ''علیین'' میں ہوگا، یہ بھی ایک مہر بند(Seal Pack)صحیفہ ہے جس پر اللہ کے مقرب بندے گواہ ہیں۔ مزید فرمایا کہ نیکوکار جنت کی نعمتوں میں راحت میں ہوں گے، ان کے چہرے تر و تازہ ہوں گے، ان کو مہر بند شرابِ طہور پلائی جائے گی، جس کی خوشبو مشک ہے۔

سورۃ الانشقاق: سورۃ الانشقاق مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 84 جب کہ نزول کے اعتبار سے 83ویں سورت ہے۔ اس سورت کی پہلی آیت میں ''انشقت'' کا لفظ ہے جس سے اس سورت کا نام ماخوذ ہے۔ اس سورت میں بھی آثار واحوالِ قیامت کا بیان ہے اور یہ کہ قیامت کے دن جن لوگوں کا صحیفۂ اعمال(Result Card)ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، ان کا اخروی حساب بہت آسان ہوگا اور وہ اپنے اہل کی طرف خوشی خوشی لوٹے گا اور جن کا نامۂ اعمال پیٹھ پیچھے سے دیا جائے گا وہ کہے گا کاش کہ مجھے موت آ جائے اور اسے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔

آیت نمبر 16 سے اللہ تعالیٰ نے شفق، رات اور چاند کی قسم کھا کر فرمایا کہ قیامت کا دن مشرکین کے لیے سخت ہولناک ہوگا۔

آیت 20 سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین و کفار کے ایمان نہ لانے اور سجدہ نہ کرنے کی مذمت کی اور ان کے لیے دردناک عذاب کی وعید بیان فرمائی ہے اور مومنین صالحین کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والے اجر کا بیان ہے۔

سورۃ البروج: سورۃ البروج مکی سورت ہے، اس کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بروج والے آسمان کی قسم کھائی ہے، اس لیے اس کا نام البروج رکھا گیا ہے۔ ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے 85ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 27ویں سورت ہے۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ عزیز وحمید پر ایمان لانے کی پاداش میں ''اَصْحَابِ اُلْخُدُوْد'' (خندقوں والے) کو اس طرح قتل کیا گیا کہ انہیں بھڑکتی آگ میں ڈال دیا گیا، ان اہلِ حق کی تفصیلات کتب تفسیر میں موجود ہیں، جن پر ان کے زمانے کے کافروں نے بے پناہ مظالم ڈھائے تھے۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ کی پکڑ بہت سخت ہے، وہی پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ زندہ کرے گا، وہ جس کام کا ارادہ فرمالے اس کو کرنے والا ہے۔

آیت نمبر 10 سے مومن مرد و عورتوں کو فتنہ میں ڈالنے والوں کے لیے عذابِ جہنم کی وعید جب کہ مومنین صالحین کے لیے جنت کی نعمتوں اور کامیابی کا ذکر ہے۔

آخر میں سرکارِ دو عالم ﷺ اور مومنین کو تسلی فرمائی کہ فرعون، ثمود جیسے بڑے لشکروں والے سرکشوں کا آج نام و نشان بھی نہیں ہے اور یہ تکالیف اور مشکلات عارضی ہیں۔

سورۃ الطارق: سورۃ الطارق مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 86ویں جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 36 نمبر سورت ہے۔ اس سورت کی پہلی آیت میں ''اَلطَّارِقِ'' کا لفظ مذکور ہے، اس لیے اس کا نام ''اَلطَّارِقِ'' رکھا گیا۔

اس سورت میں انسان کو اس کے مادۂ تخلیق اور کیفیتِ تخلیق کی جانب متوجہ فرمایا اور فرمایا جس دن چھپی باتیں ظاہر کر دی جائیں گی، اس وقت اللہ کے سوا نہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کسی کے پاس طاقت ہوگی۔

سورۃ الاعلیٰ: سورۃ الاعلیٰ مکی سورت ہے، اس سورت کی پہلی آیت میں ''اَلْاَعْلٰی'' کا لفظ آیا

ہے اس لیے اس کو الاعلیٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے اس سورت کا نمبر 87 جب کہ نزول کے اعتبار سے 8 ہے۔ اس سورت کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور بلندی کا ذکر فرما کر اس کی تسبیح کرنے کا حکم فرمایا۔

آیت نمبر 6 میں فرمایا کہ عنقریب ہم آپ کو قرآن پڑھائیں گے تو آپ نہیں بھولیں گے۔ اس سورت کے آخر میں فرمایا جس نے اپنا باطن صاف کرلیا اور اپنے رب کا نام لے کر پھر نماز پڑھی وہ کامیاب ہوا، بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو اور آخرت ہی بہت عمدہ اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ بے شک یہی پیغام پہلے صحیفوں، ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں مذکور ہے۔

سورۃ الغاشیہ: سورۃ الغاشیہ مکی سورت ہے، اس سورت کی پہلی آیت میں ''اَلْغَاشِيَة'' کا لفظ ذکر ہونے کی وجہ سے اس کا نام سورۃ الغاشیہ ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 88 جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 68 نمبر سورت ہے۔

اس سورت کے شروع میں ان لوگوں کے انجام کا ذکر ہے، جو آخرت میں عذاب سے دوچار ہوں گے، اس کے بعد ان خوش نصیب مومنوں کا ذکر ہے جنہیں اخروی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا اور پھر اللہ تعالیٰ کی شانِ تخلیق کا ذکر ہے۔

آیت نمبر 17 سے اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کے علم پر آسمانوں، اونٹوں، پہاڑوں اور زمینوں وغیرہا کی تخلیق سے استدلال فرمایا ہے۔

آخر میں یاد دہانی ہے کہ سب نے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

سورۃ الفجر: سورۃ الفجر مکی سورت ہے، اس سورت کا نام ''اَلْفَجْر'' اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 89 جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 10 ویں سورت ہے۔ ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے فجر کی، ذوالحجہ کی دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ کفار کو ضرور بالضرور عذاب ہوگا۔

اس سورت میں قوم عاد، ثمود اور فرعون کا ذکر ہے، ان اقوام نے طاقت کے زعم میں

آ کر سرکشی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب کے کوڑے برسائے۔

آیت: 17 سے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے، ایک دوسرے کو یتیم کے کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے، وراثت میں ملا ہوا پورا مال ہڑپ کر جاتے ہو، تمہیں مال سے بے پناہ محبت ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ آخرت میں اس مال کی ناپائیداری کا احساس ہوگا، انسان پچھتائے گا، مگر یہ پچھتاوا کچھ کام نہیں آئے گا۔ آخری آیت میں فرمایا کہ ''نَفْسِ مُطْمَئِنَّه'' یعنی اعلیٰ درجے کے ایمان کے حاملین کا وفات کے وقت اعزاز واکرام کے ساتھ استقبال کیا جائے گا۔

سورۃ البلد: سورۃ البلد مکی سورت ہے، ترتیب مصحف کے اعتبار سے 90 جب کہ ترتیب نزول کے اعتبار سے 25 نمبر سورت ہے۔ پہلی آیت میں لفظ ''اَلْبَلَد'' کا مذکور ہونا اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس سورت میں نبی ﷺ کی عظمت وجلالت کا بیان ہے کہ اس شہر کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں۔ اس سورت میں فرمایا کہ ہم نے انسان کو دیکھنے کے لئے دو آنکھیں، بولنے کے لئے زبان اور دو ہونٹ عطا کئے اور نیکی اور بدی کا شعور عطا کیا۔ آگے اللہ تعالیٰ نے نفس کی باطل خواہشات اور شیطانی ترغیبات کے خلاف جہاد کو مشکل ترین مرحلہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اس دشوار گزار گھاٹی کو سر کرنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ کسی مالی تاوان تلے دبے ہوئی گردن کو آزاد کرنا، بھوک میں مبتلا شخص کو کھانا کھلانا، ترجیحاً ایسے یتیم کو جو قرابت دار بھی ہو یا کسی خاک افتادہ مسکین۔

سورۃ الشمس: سورۃ شمس مکی سورت ہے۔ ترتیب نزول کے اعتبار سے 26 ویں سورت جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 91 نمبر سورت ہے، اس سورت میں سورج کی قسم کھائی گئی ہے اس لئے اس کو الشمس سے موسوم کیا گیا۔

اس سورت کے شروع میں تمہید کے طور پر اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس سمیت سات چیزوں کی قسم فرمائی اور بتایا کہ اللہ نے ہر انسان کو نیکی اور بدی میں تمیز کا شعور کا الہام کر دیا ہے، سو جس نے اپنے نفس کو پاک رکھا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اپنے نفس کو گناہوں سے

آلودہ کرلیا وہ ناکام ہوا۔ آخر میں صالح علیہ السلام کی قوم کا اونٹنی کی کونچیں کاٹنے اور ان پر اللہ کے عذاب کا ذکر ہے

سورۃ اللیل: سورۃ الیل مکی سورت ہے۔ تریب مصحف کے اعتبار سے ۹۲ جبکہ ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر 9 ہے۔ اس سورت کے شروع میں والیل کا لفظ مذکور ہے اس لئے اس کا نام الیل رکھا گیا۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان کی جدوجہد دو مختلف سمتوں میں جاری رہتی ہے، ایک طبقہ وہ ہے کہ اللہ کے عطا کردہ مال میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے، تقوے پر کاربند رہتا ہے اور نیک باتوں کی تصدیق کرتا ہے تو ہم اس کے لئے آسانی یعنی جنت تک رسائی کی منزل آسان کردیں گے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے کہ جو اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے بخل کی وجہ سے خرچ نہیں کرتا، وہ دولت کی فراوانی میں مست ہوکر اللہ سے بے پرواہ ہوجاتا ہے اور نیک باتوں کو جھٹلاتا ہے، تو اس کے لئے ہم مشکل منزل یعنی دوزخ کا راستہ آسان کردیتے ہیں۔ آخری آیات میں فرمایا کہ نارِ جہنم سے وہی شخص بچارہے گا کہ جو کسی کے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے نہیں بلکہ اپنے ربِ اعلیٰ کی رضا جوئی کے لئے اپنا مال اللہ کی راہ میں دیتا ہے تاکہ اس کا قلب بخل، حرص وہوس اور دولت کی محبت کے غلبے سے پاک ہوجائے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان کے بارے میں نازل ہوئیں۔

سورۃ الضحیٰ: مکی سورت ہے، ترتیب نزول کے اعتبار سے 11 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 93 ویں سورت ہے، اس سورت کا نام اس کے پہلے کلمے والضحیٰ سے ماخوذ ہے۔

یہ سورۂ مبارکہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمتِ شان کو بیان کررہی ہے کفار قریش نے جب یہ کہا: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رب نے ان کو چھوڑ دیا ہے اور ان سے ناراض ہوگیا ہے، تو ان کی اس ہرزہ سرائی کے جواب میں اللہ عزوجل نے فرمایا کہ اے رسولِ مکرم! آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے، نہ آپ سے ناراض ہوا ہے، آپ کی ہر آنے والی ساعت آپ کی پہلی ساعت سے بہتر ہے اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو

جائیں گے۔اس سورت کی آیت :7 کا ترجمہ کرتے ہوئے بہت سے اہلِ علم فکری لغزش کا شکار ہوئے اور صرف یہی ایک آیت نہیں بلکہ قرآن مجید کی متعدد آیات ہیں جن میں مقامِ الوہیت اور مقامِ رسالت کا پاس نہ رکھا گیا جس کی وجہ سے امت میں تفرقہ اور انتشار پیدا ہوا۔اس سورت میں یتیموں پر غصہ کرنے اور سوال کرنے والوں کو جھڑکنے سے منع کیا گیا ہے،آخر میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر تحدیث نعمت کا ذکر ہے۔

سورۃ الانشراح: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 12 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 94 ویں سورت ہے اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کے شرحِ صدر کا ذکر ہے، اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ کفار کے طعن و تشنیع اور دل آزار باتوں سے آپ کا سینہ تنگ ہو جاتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کا سینہ کھول دیا یعنی آپ کو عزیمت و استقامت کی نعمت سے نوازا یا شرحِ صدر سے شقِ صدر مراد ہے، جس کی تفصیل احادیث میں موجود ہے۔اِس میں ایک آیت رفعتِ شانِ مصطفیٰ ﷺ کے لئے غیر معمولی عطائے ربانی ہے کہ اللہ نے فرمایا: ''اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کر دیا ہے''اور فرمایا بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔آخر میں عبادات کے بعد کوشش کے ساتھ دعا مانگنے کا ذکر ہے۔

سورۃ التین: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 28 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 95 ویں سورت ہے اس سورت کے شروع میں وَالتِّین کا لفظ آیا ہے یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔اس سورت میں فرمایا:'' بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا اور پھر اُس کو مومنین صالحین کے علاوہ سب سے نچلے طبقے میں لوٹا دیا۔اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں تقرب اور عزّ و شرف کا مدار انسان کی ظاہری صورت پر نہیں ہے بلکہ ایمان وعمل پر ہے۔

سورۃ العلق: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے پہلی جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 96 ویں سورت ہے۔اس سورت سے وحی کا آغاز ہوا اس سورت کی پہلی پانچ آیات وہ پہلی وحیِ ربانی ہے جو غارِ حرا میں سید المرسلین ﷺ پر نازل ہوئی اور ان آیات سے آپ

کی نبوت کا اعلان ہوا۔اس سورت میں انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی حکمت بیان فرمائی ہے کہ اس کو ضعف سے قوت کی طرف منتقل فرمایا اور اس میں قراءت اور کتابت کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔مزید بتایا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا اور اپنے مال و دولت پر تکبر کرتا ہے۔اس سورت میں ابوجہل کی مذمت ہے جو حضور ﷺ کو نماز سے منع کرتا تھا اور اپنے زعم میں اپنے بتوں کی مدد کرتا تھا۔اور رسول اللہ ﷺ کو ابوجہل کی دھمکیوں کی پرواہ نہ کرنے کا ذکر ہے۔

سورۃ القدر: مکی سورت ہے، ترتیب نزول کے اعتبار سے 25 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 97 ویں سورت ہے۔یہ سورت شبِ قدر کی فضیلت میں نازل ہوئی،شبِ قدر کو اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کی نسبت سے مُشرف فرمایا اور اِسے ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا، اور اس رات میں فرشتوں اور جبرائیل علیہ السلام کے نزول کا ذکر فرمایا۔شبِ قدر کو قطعیت کے ساتھ متعین نہیں فرمایا تاکہ بندوں کے ذوق اور خیر کی جستجو کا امتحان ہو، تاہم اس سورت میں ایسے قرائن موجود ہیں جو ستائیسویں شب کو راجح قرار دے رہے ہیں۔

سورۃ البینۃ: مدنی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 100 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 98 ویں سورت ہے۔اس سورت کی پہلی آیت میں اَلْبَیِّنَه کا لفظ ہے جس کا معنی ہے بہت صاف اور واضح دلیل یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ اور مجوس اور مشرکین کے مذاہب باطلہ کا بطلان فرمایا ہے اور اس بات کا حکم دیا کہ تمام باطل ادیان کو چھوڑ کر اخلاص کے ساتھ صرف اللہ کی بندگی کو اختیار کریں اور نماز قائم کرتے رہیں، زکوٰۃ ادا کرتے رہیں، یہی دینِ مستقیم ہے۔آیات 6 تا 8 میں کفار کو مخلوق کا بدترین گروہ فرمایا اور مومنین کو مخلوق کا بہترین گروہ فرمایا۔

سورۃ الزلزال: مدنی سورت ہے، ترتیب نزول کے اعتبار سے 93 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 99 ویں سورت ہے۔اس سورت کی پہلی آیت میں اس کی وجہ تسمیہ مذکور ہے۔اس سورت میں قیامت کا منظر بیان کیا گیا کہ قیامت کے دن زمین میں شدید زلزلہ

آئے گا، زمین کے سینے پر جو کچھ بھی ہوا، وہ سارے راز اگل دے گی یا جو بھی اَموات مدفون ہیں، اُنہیں نکال باہر کرے گی۔ اس دن زمین اللہ کے حکم سے ساری خبریں بیان کرے گی اور تمام مخلوق حساب کیلئے میدان محشر میں جمع ہوگی اور ہر ایک اپنی معمولی سے معمولی نیکی یا بدی کا انجام دیکھ لے گا۔

سورۃ العادیات: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 14 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 100 ویں سورت ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے گھوڑوں کی مختلف کیفیات کو قسم کے ساتھ بیان فرمایا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب مجاہد کے گھوڑے کا یہ مقام ہے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خود مجاہد کا کیا مقام ہوگا۔ اس سورت میں انسان کے ناشکرے پن اور مال سے محبت میں شدت کا بیان فرمایا ہے اور مردوں کے قبر سے اٹھنے اور رازوں کے آشکار ہونے اور اللہ کا ان سب سے باخبر ہونے کا ذکر ہے۔

سورۃ القارعہ: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 30 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 101 ویں سورت ہے، اس کی پہلی آیت کا پہلا لفظ القارعہ ہے اس لئے اس کا نام القارعہ رکھا گیا۔ اس سورت میں قیامت کی ہولناکی اور اَحوال کو بیان کیا گیا ہے اور میزان حساب کتاب اور جزاوسزا کا بیان فرمایا ہے اور فرمایا کہ جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا، وہ پسندیدہ زندگی میں ہوگا اور جس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا، اُس کا ٹھکانہ دہکتی ہوئی آگ ہوگی۔

سورۃ التکاثر: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 16 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 102 ویں سورت ہے، اس سورت کی وجہ تسمیہ اس سورت کی پہلی آیت میں لفظ التکاثر کا مذکور ہونا ہے۔ اس سورت میں بتایا کہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی خواہش نے انسان کو اللہ سے غافل کر دیا ہے، مگر جب قبروں میں پہنچیں گے، تو اس کا انجام معلوم ہو جائے گا پھر انہیں عین الیقین حاصل ہو جائے گا۔

سورۃ العصر: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 13 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 103 ویں سورت ہے۔ اس سورت میں بتایا کہ انسان خسارے میں ہے اور اس

سے نکلنے کی صورت صرف یہی ہے کہ ایمان لائیں، عملِ صالح کریں اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کریں۔ اس سورت میں اختصار کے ساتھ اسلام کے بنیادی اصول بتادیئے ہیں اور وہ ایمان، اعمال صالحہ اور ایک دوسرے کی خیر خواہی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا ہے۔

سورۃ الھمزۃ: مکی سورت ہے، ترتیب نزول کے اعتبار سے 32 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 104 ویں سورت ہے، اس سورت کی پہلی آیت میں اَلْھُمَزَۃ کا لفظ مذکور ہے یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے طعنہ زنی اور عیب جوئی کی شدید مذمت فرمائی اور بتایا کہ اس اخلاقی مرض میں وہ لوگ مبتلا رہتے ہیں جنہیں اپنی دولت پر ناز ہوتا ہے، لیکن اُن کا انجام اللہ کی بھڑکائی ہوئی ایسی آگ ہے جو چورا چورا کردے گی۔

سورۃ الفیل: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 19 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 105 ویں سورت ہے۔ اس سورت کا نام الفیل اس لئے رکھا گیا اس میں اصحابِ فیل یعنی یمن کے بادشاہ ابرہہ اور اُس کے لشکر کا ذکر ہے کہ وہ (معاذ اللہ) بیت اللہ کو مسمار کرنے کے مذموم عزائم کے ساتھ آئے، تو اللہ نے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیجے، جنہوں نے اُن پر پتھر کی کنکریاں برسا کر اُنہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کردیا۔ یہ کعبۃ اللہ کی فضیلت، بزرگی اور عظمتِ شان کی مظہر ہے۔

سورۂ قریش: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 29 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 106 ویں سورت ہے، اس سورت کا نام قریش اسلئے رکھا گیا کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنے احسان کا ذکر فرمایا کہ بیت اللہ کی تولیت (Trusteeship) کی وجہ سے وہ بے خوف وخطر گرمیوں میں شام کا اور سردیوں میں یمن کا تجارتی سفر کیا کرتے تھے اور بیت اللہ کی نسبت کی وجہ سے ان کے تجارتی قافلے بے خوف وخطر رہتے تھے اور ان کی معیشت محفوظ تھی۔ اس لئے فرمایا کہ اس مقدس گھر کے رب کی عبادت کرو جس کی وجہ سے تمہیں معاشرے میں احترام کا مقام حاصل ہے۔

سورۃ الماعون: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 17 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 107 ویں سورت ہے، اس سورت میں ماعون روزمرہ استعمال کی معمولی چیزیں) منع نہ کرنے کا بیان ہے اس لئے اس کا نام الماعون رکھا گیا۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے یتیم کے ساتھ ناروا سلوک اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینے جیسے مذموم عمل کو قیامت کے جھٹلانے سے تعبیر کیا اور نمازوں میں غفلت اور تمام عبادات میں ریاکاری کی مذمت بیان فرمائی۔ اور روزمرہ استعمال کی معمولی چیزوں کو منع کرنے کی مذمت فرمائی۔

سورۃ الکوثر: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 15 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 108 ویں سورت ہے، اس سورت میں سرکار دو عالم ﷺ کو کوثر دئے جانے کا ذکر ہے، اس لئے اس کا نام الکوثر رکھا گیا۔ یہ قرآن مجید کی وہ مختصر ترین سورت ہے جس کے ذریعے عرب کے فُصحاء و بلغاء کو مقابلے کا چیلنج دیا گیا تھا، مگر وہ اس کے مقابل کلام بنا کر نہ لا سکے، اس میں اللہ عزوجل کی جانب سے رسول اللہ ﷺ کو کوثر عطا کئے جانے کا ذکر ہے، اس سے مراد خیرِ کثیر ہے، جس کا ایک حصہ حوضِ کوثر بھی ہے، جہاں محشر میں رسول اللہ ﷺ پیاسوں کو سیراب کریں گے۔ اس سورت میں نماز ادا کرنے اور قربانی کرنے کا ذکر ہے اور یہ کہ سرکار دو عالم کے دشمن بے نسل رہیں گے۔

سورۃ الکافرون: مکی سورت ہے، ترتیب نزول کے اعتبار سے 18 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 109 ویں سورت ہے۔ کفار مکہ کو اس سورت میں الکافرون سے مخاطب کیا گیا ہے اس لئے اس کا نام الکافرون رکھا گیا۔ اس سورت میں یہ پیغام دیا گیا کہ حق اور باطل میں کوئی مفاہمت نہیں ہوسکتی، بقول علامہ اقبال ؎

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اور یہ کہ کفر اور اسلام دو الگ ملتیں ہیں۔

سورۃ النصر: مدنی سورت ہے، ترتیب نزول کے اعتبار سے 114 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 110 ویں سورت ہے، یہ قران کی آخری سورت ہے یہ حجۃ الوداع کے موقع

پر نازل ہوئی۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت سے اسلام کی فتح کو اپنی نعمت کے طور پر بیان کیا کہ لوگ فوج درفوج اسلام میں داخل ہونے لگے، تو بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ تشکرِ نعمت کے طور پر اللہ کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح بیان کی جائے اور اُس سے استغفار طلب کی جائے۔

سورۃ اللھب: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے چھٹی جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار 111 ویں سے سورت ہے، اس سورت میں دشمنِ رسول ابولہب کی ہلاکت کا ذکر ہے اس لئے اس کا نام لہب رکھا گیا۔ اس میں ابولہب (جو حضور کا چچا تھا اس کا نام عبدالعزیٰ تھا) اور اُس کی بیوی (اُم جمیل) جو کہ رسول اللہ ﷺ کے شدید ترین دشمن تھے دونوں کی سخت مذمت اور انجامِ بد کو بیان کیا گیا اور بتایا کہ جس مال و دولت اور اولاد کی کثرت پر اُسے ناز تھا، وہ اُس کے کسی کام نہ آیا۔

سورۂ اخلاص: مکی سورت ہے، ترتیب نزول کے اعتبار سے 22 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 112 ویں سورت ہے اس سورت کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی توحیدِ خالص کا بیان ہے اور یہ کہ وہ بے نیاز ہے، ابنیت اور اُبوّت کی نسبت سے پاک ہے اور اُس کا کوئی ہمسر نہیں۔ اس کو سورۃ التوحید سورۃ النجات، سورۃ الاساس سورۃ المعرفہ اور سورۃ التفرید کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔

سورۃ الفلق: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 20 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 113 ویں سورت ہے اس سورت میں لفظ فلق کا مذکور ہونا اس کی وجہ تسمیہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے تعلیم فرمائی کہ اس کی مخلوق کے شر، ہر قسم کی ظلمت کے شر، جادوگروں کے شر اور حاسدین کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

سورۃ الناس: مکی سورت ہے ترتیب نزول کے اعتبار سے 21 ویں جبکہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے 114 ویں سورت ہے اس سورت میں الناس کا لفظ مذکور ہے یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے یہ لفظ اس سورت میں پانچ مرتبہ آیا ہے۔ اس سورت میں پلٹ پلٹ کر اور چھپ کر

وسوسے ڈالنے والوں کے شر سے اللہ تعالیٰ نے اپنی پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے اور یہ بتایا کہ انسانوں کو بہکانے والے، وسوسے اور توہمات میں ڈالنے والے جن بھی ہوتے ہیں اور انسان بھی۔ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ صبح وشام ان آخری تین سورتوں کی تلاوت فرما کر اپنے ہاتھوں پر دَم فرماتے اور پھر اُن مُتبرک ہاتھوں کو اپنے سر اور چہرۂ مبارک اور پورے بدنِ مبارک پر پھیر دیتے اور یہ عمل آپ تین مرتبہ فرماتے۔ س کی برکت سے بندہ اللہ کی حفاظت و پناہ میں آ جاتا ہے اور مختلف نقصان پہنچانے والی چیزوں کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

کی زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی

تفہیم المسائل جلد 10

قرآن و حدیث کی روشنی میں
فقہی مسائل کا مؤثر انداز میں نچوڑ

تفسیر سورۃ النسآء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم تفسیر
اندازِ بیان مؤثر و دلکش
قدیم و جدید اہم تفاسیر کا نچوڑ

آئینۂ ایام

حالاتِ حاضرہ کا عکس ایک صاحبِ نظر کے زاویے سے

جلد 4

زکوٰۃ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور، کراچی، پاکستان

042-3722[illegible] ... 22047[illegible]
042-37[illegible]5085 ... 042-37247350
021-3221201[illegible]

اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

جلد نہم

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور • کراچی • پاکستان

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِينٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (صحیح مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد نہم

پروفیسر مفتی مُنیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاھور۔ کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد نہم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
	چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان
	صدر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان
کمپوزنگ	محمد جمشید ہاشمی
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	باراول جنوری 2017ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ9

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 32630411-32212011-021۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com
ziaulquranpublications@gmail.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرس

صفحہ نمبر	مضمون	نمبر شمار
11	آغازِ تکلّم	
13	عقائد کے مسائل	★
15	کُتُبِ الٰہیہ	1
19	علانیہ گناہ کی توبہ علانیہ ہوگی	2
21	جنت کی اہمیت کو کم کرنا	3
28	گنبدِ خضرا کی شبیہہ کا حکم	4
35	طہارت کے مسائل	★
37	واشنگ مشین میں کپڑوں کی دھلائی	5
38	قالین کی طہارت	6
40	دائمی معذور کی نماز اور مسجد میں جانے کا حکم	7
43	نماز کے مسائل	★
45	عورتوں کی نماز کی ہیئت	8
48	نماز میں عورت کے سجدہ کرنے کا طریقہ	9
49	اذان کا جواب دینے کا طریقہ	10
51	ایک سے زائد اذان کا جواب دینا	11

12	صلوٰۃ کی اہانت	52
13	نمازوں کی قضا	55
14	مسجد کے عملے کی رہائش مصالح مسجد میں سے ہے	59
15	نماز کی نیت اور تکبیر تحریمہ کا طریقہ	62
16	بے وضو شخص کی اذان کا حکم	63
17	نماز کے بعد امام کے بیٹھنے کی ہیئت	64
18	نماز میں سلام پھیرتے وقت ''السلام علیکم'' کہنا چاہیے	65
19	امام کا اقامت سے پہلے مصلّیٰ پر بیٹھنا ضروری نہیں ہے	67
20	امام کا سنت غیر مؤکدہ کا التزام نہ کرنا	68
21	عادی طور پر ہیر پھیر کا مرتکب ہونا	71
22	مسجد سے نمازیوں کو روکنے کا حکم	74
23	نماز چاشت واشراق کے اوقات	78
24	نماز تراویح میں عورت کی امامت کا حکم	81
25	طواف اور سعی کے دوران افضل اذکار	85
26	مسجد میں امام کا مصلے پر بیٹھ کر ہنسنا	89
27	مسجد میں چار پائی ڈال کر سونا	93
28	فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت	94
29	نماز تراویح میں فاسد نماز کی قراءت کا اعادہ	103
30	نماز میں سترے کی ہیئت	105
31	نماز میں قصر کا حکم	106

32	نماز میں آستین فولڈ کرنا	108
★	**مسجد اور وقف کے مسائل**	111
33	مسجد میں کُنڈا لگا کر بجلی لینے کا حکم	113
34	مسجد کی تعمیر نو کے بعد اضافات کا شرعی حکم	115
35	مسجد کی افطاری کا مصرف	119
36	مسجد کے غیر ضروری سامان کا حکم	120
37	مسجد کا چندہ سڑک پر صرف کرنا	123
38	مسجد کے بیت الخلاء میں پانی کا استعمال	128
39	ٹرسٹ کو سرمایہ کاری کی رقم میں نامزد کرنا	129
40	وقتی نماز جنازے پر مُقدم ہے	131
41	مسجد میں نمازِ جنازہ کا حکم	132
42	سرکاری زمین پر مسجد کا قیام	137
43	دینی مدارس اور مساجد سے Withholding Tax کی کٹوتی	140
44	مسجد امامت کا اجارہ اور امام کی معزولی	141
45	مسجد عطیات: فنڈ پر زکوٰۃ نہیں	144
46	انجمن کے فنڈ سے قرضِ حسن دینے کا حکم	144
47	زکوٰۃ کا مصرف	146
★	**روزے کے مسائل**	149
48	جمعۃ الوداع کی شرعی حیثیت	151
49	رخصت رمضان کی اباحت، افضلیت اور وجوب کا بیان	165

50	رمضان المبارک کے حوالے سے چند اہم سوالات	169
51	شب قدر کی برکات	172
52	زکوٰۃ کا نصاب	173
53	صدقۂ فطر کی مقدار	177
54	روزے میں انجکشن لگانے کا حکم	179
55	قارن پر جنایت کے سبب ایک یا دو دم لازم آنے کا ضابطہ	181
56	عمرے کا طریقہ	184
57	مخصوص ایام میں احرام باندھنے کا شرعی حکم	186
58	عمرہ کے بعد حج کی فرضیت کا حکم	187
★	نکاح کے مسائل	189
59	ارتداد سے لازم شدہ مہر ساقط نہیں ہوتا	191
60	دو بہنوں سے نکاح	193
61	نابالغہ کا نکاح	194
62	محرمات کے بارے میں شرعی حکم	196
63	ستر وحجاب کا فرق	197
64	صورت یا رنگ کی مشابہت نہ ہونے کی وجہ سے نسب میں شک کرنا	201
★	طلاق کے مسائل	207
65	موبائل SMS کے ذریعے طلاق	209
66	ثبوت طلاق کے لیے شوہر کا اقرار کافی ہے	212
67	طلاق کا حکم	214

نمبر	عنوان	صفحہ
68	طلاق کا ایک مسئلہ	215
69	توکیلِ طلاق	219
70	غیر منقسم ترکے کے کاروبار میں ورثاء کا استحقاق	220
★	خرید وفروخت کے مسائل	223
71	ڈیلر یا کمیشن ایجنٹ کی اجرت کا تعین ضروری ہے	225
72	عقدِ مضاربت میں نفع میں کمی بیشی پر اختلاف	227
73	بیع بالتقسیط کی ایک صورت	228
74	کسی شراکت دار کے لیے نفع کے حصے میں باہمی رضامندی سے اضافہ	229
75	حقِ شفعہ میں ترجیح شریک کا حق پڑوسی پر مقدم ہے	232
76	شراکتی کاروبار میں نقصان کا ضمان	239
77	حدِ سرقہ کے لیے شرعی ثبوت ضروری ہے	24
78	استحقاق کے بغیر ملنے والے اضافے کا شرعی حکم	243
79	ویزوں کی خرید وفروخت	244
80	کتے کی خرید وفروخت کا شرعی حکم	246
★	وراثت کے مسائل	253
81	وراثت کا حکم	255
82	ترکہ کا مسئلہ	256
83	زندگی میں کچھ دے کر وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا	257
84	یتیم پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی بابت قرآن کا ترغیب وترحم پر مبنی ارشاد	260

85	وراثت سے محض دست برداری معتبر نہیں ہے	263
86	ترکے کا مسئلہ	267
87	ترکے کی تقسیم	268
88	گمشدہ فرد کی موت کا حکم	269
89	بہنوں کو حصے سے محروم کرنا ظلم ہے	271
⭑	**حلال وحرام کے مسائل**	275
90	غیر مسلم معلمہ کے ذریعے اسلامیات کی تعلیم	277
91	غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کپڑوں کا حکم	280
92	چھپکلی مارنے کا حکم	281
93	ضرورت کے تحت جانوروں کا مارنا	284
94	ڈی این اے ٹیسٹ کا حکم	286
95	قتل عمد میں باہمی رضامندی سے مال پر صلح جائز ہے	289
96	خنزیر کے بالوں کا ضرورت کے تحت استعمال	291
97	عاقدین کی باہمی رضامندی سے بیع منعقد ہونے کے بعد کسی ایک فریق کو یکطرفہ طور پر فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے	296
98	جادو حرام ہے	298
99	استخارہ	301
⭑	**جنازے کے مسائل**	305
100	میت کے گھر کا کھانا	307
101	قبر کی بے حرمتی کی رسم	315

102	وقف قبرستان کی حیثیت تبدیل نہیں کی جاسکتی	318
103	جوتے پہن کر نمازِ جنازہ پڑھنا	319
104	تنگ علاقوں میں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم	323
105	قبر کے لیے مترادف کلمات	325
106	تعزیت کی ناپسندیدہ رسوم	327
107	ایصالِ ثواب کی مشروعیت اور اس کا مستحسن طریقہ اور اجتماعی قرآن خوانی کی شرعی حیثیت	331
★	**متفرقات**	355
108	کثرتِ استغفار کی برکات اور حکمتیں	357
109	گم شدہ گائے کا حکم	360
110	طبی تحقیق کے لیے جانوروں کا استعمال	362
111	اچھے اور برے خواب	363
112	رسم آمین	365
113	کیا حجرۂ انور یا روضۂ انور بھی جنت کی کیاری ہے	369
114	بزرگانِ دین کی تصویر لٹکا کر اس کی تعظیم کرنا اور اس سے حاجات مانگنا	372
115	علانیہ شرعی مجرم کا سماجی مقاطعہ	376
116	وظائف اور دعائیں پڑھنا	381
117	تبلیغِ دین فرضِ کفایہ ہے	382
118	اسلامی یا شرعی لباس کا کم از کم معیار	389
119	نامناسب نظر آنے والے بالوں کا ازالہ	391

120	نعت خوان کے خلاف شرع ریمارکس	394
121	کیا یہ ناشکری ہے	396
122	نام بگاڑنا	400
123	عائشہ نام رکھنا	401
124	غیر قانونی واٹر کنکشن کا مسئلہ	404
125	محفل قراءت ونعت میں تالیاں بجانا	409
126	محافل میلاد میں منکرات کا ارتکاب	410
127	فکر رضا کی روشنی میں نعت خوانی اور خطابت کے نذرانوں کی جائز وناجائز صورتیں	417
128	عام لنگر پر صدقات واجبہ کی رقم نہیں لگائی جاسکتی	429
129	ڈاکوؤں سے مزاحمت میں مارا جانا	434
130	داڑھی کا مذاق اڑانا	436
131	ڈرائیونگ کے دوران موبائل فون کے استعمال کا شرعی حکم	437
132	خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت	439
133	وسوسے کا علاج	440

آغازِ تکلُّم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَحْمَۃٍ لِّلْعٰلَمِیْنَ، سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ وَعَلٰی صَحَابَتِہِ الصِّدِّیْقِیْنَ الْکَامِلِیْنَ، وَعَلٰی اَوْلِیَاءِ اُمَّتِہٖ وَعُلَمَاءِ مِلَّتِہٖ مِنَ الْفُقَھَاءِ الْمُجْتَھِدِیْنَ وَالْمُفَسِّرِیْنَ وَالْمُحَدِّثِیْنَ اَجْمَعِیْنَ

الحمدللہ علیٰ احسانہ! تفہیم المسائل کی نویں جلد پیشِ خدمت ہے۔ ربِ ذوالجلال کا شکر ہے کہ تسلسل کو قائم رکھنے میں کامیابی نصیب ہوئی۔ اس جلد کی تدوین وتبویب اور حوالہ جات نکالنے میں مفتی عبدالرزاق نقشبندی کا تعاون شاملِ حال رہا ہے۔ حوالہ جات کی اصل سے تطبیق، تراجم اور نفسِ مسائل پر نظرِ ثانی اور نہایت باریک بینی سے پروف ریڈنگ اور تصحیح کا کام مولانا بختیار احمد نے کیا ہے۔ کمپیوٹر پر تصحیح کا آخری مرحلہ حافظ محمد جمشید ہاشمی نے انجام دیا ہے۔ میں اپنے ان تمام معاونین کا تہہِ دل سے شکرگزار ہوں اور ان کی علمی صلاحیت، قابلیت اور استعداد میں اللہ تعالیٰ کے حضور برکات کے لیے دعا گو ہوں۔

ہمارے شیخ الحدیث علامہ احمد علی سعیدی نے بھی اس جلد کے تمام مندرجات کو پڑھا ہے، مکررات کی نشاندہی کی اور بعض مقامات پر مسائل کی تصحیح بھی کی، میں بطورِ خاص ان کا شکرگزار ہوں۔ علامہ مفتی محمد الیاس رضوی نے حسبِ معمول آخر میں اسے بہ نظرِ عمیق دیکھا اور ضروری ترمیمات واضافے تجویز کیے، میں ان کا ممنون ہوں۔ بشری استطاعت کی حد تک یہ کتاب اغلاط سے پاک ہے، لیکن تسامحات کا امکان ہمیشہ رہتا ہے، اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کسی بھی فروگزاشت پر مطلع ہوں تو ضرور نشاندہی فرمائیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ یہ سلسلۂ خیر جاری رکھے اور اس کی افادیت میں برکت عطا فرمائے۔

المفتقر الی اللہ الغنی

منیب الرحمٰن

عقائد کے مسائل

کُتُبِ الٰہیہ

سوال:

ہمارے خاندان میں ایک صاحب کا عقیدہ ہے کہ ''آسمانی جتنی بھی کتابیں ہیں، سب قابلِ عمل ہیں، نہ وہ منسوخ ہوئیں اور نہ اس کا ثبوت ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ کتابیں منسوخ ہوگئیں، وہ کافر ہے''۔ یہ صاحب قادیانیوں کو اہلِ حق اور مسلمان شمار کرتے ہیں۔ کیا ان عقائد کا حامل شخص مسلمان ہے اور اُس کا نکاح قائم ہے؟۔

(خلیل احمد، بلاک 6 گلشن اقبال کراچی)

جواب:

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ختم المرسلین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیاءِ کرام ورُسلِ عظام علیہم السلام دینِ اسلام ہی کے داعی اور علم بردار تھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

ترجمہ: ''بے شک اللہ کے نزدیک (مقبول) دین، اسلام ہی ہے''۔ (آلِ عمران:19)

(۲) وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝

ترجمہ: ''اور جس نے اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو پسند کیا، تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا''۔ (آلِ عمران:85)

(۳) شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰۤی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ كَبُرَ عَلَی الْمُشْرِكِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ ؕ اَللّٰهُ یَجْتَبِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ ۝

ترجمہ: ''اس (اللہ) نے تمہارے لیے اُسی دین کو مشروع (مقرر) کیا ہے، جس کا حکم اُس

نے نوح کو دیا تھا اور جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو حکم دیا تھا (اس تاکید کے ساتھ) کہ تم اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا، جس دینِ (توحید) کی طرف آپ مشرکوں کو دعوت دے رہے ہیں، یہ اُن پر بہت بھاری اور گراں گزرتا ہے، اللہ ہی جسے چاہتا ہے اس (پسندیدہ) دین کے لیے منتخب فرمالیتا ہے، اور جو اُس کی طرف رجوع کرتا ہے، وہ اُسے اس کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔ (شوریٰ:13)

الغرض دینِ اسلام کی بنیادی عقائد (توحید و رسالت و آخرت و کتبِ الٰہی پر ایمان، تقدیر پر ایمان، عبادات وغیرہ) تمام انبیاءِ کرام کی تعلیمات کا حصہ رہے ہیں۔ البتہ مختلف رسولوں کی شریعتوں اور تفصیلی اَحکام میں فرق رہا ہے۔ دینِ اسلام کبھی منسوخ نہیں ہوا ہے، شریعتیں یعنی تفصیلی اَحکام میں نسخ اور تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا

ترجمہ: ''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ شریعت اور واضح راہِ عمل بنائی ہے''۔ (مائدہ:48)

ان آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ دینِ اسلام اور اصولِ دین ہمیشہ ایک رہے ہیں، اسلام کے بنیادی اصول و عقائد دائمی ہیں اور غیر مُتبدِل (Unchangeable) ہیں اور ناقابلِ تنسیخ (Irrevocable) ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ، آیت: 48 میں واضح فرما دیا کہ رسولوں کی شریعت اور منہاج یعنی تفصیلی اَحکام میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت تفاوت رہا ہے، اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ خاتم النّبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ اور خاتم الکُتب الالٰہیہ قرآنِ مجید کے نزول کے بعد دینِ اسلام قائم و دائم رہا، مگر سابق انبیاءِ کرام کی شریعتیں یعنی تفصیلی اَحکام منسوخ ہوگئیں اور اب شریعتِ مُصطفوی ہی قیامت تک نافذ العمل (Implemented) اور معمول بہا (Applicable) رہے گی۔

مندرجہ ذیل اَحادیثِ مبارکہ اس پر شاہدِ عدل ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ سابق انبیائے کرام کی شریعتوں کو منسوخ ماننے والا کافر ہے، تو مسلمان کو کافر کہنے والا خود کافر ہو جائے گا۔ اِسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر (بفرضِ محال) موسیٰ علیہ السلام میرے عہدِ نبوت میں، جو کہ قیامت تک کے لیے ہے، آجائیں تو اُن کے لیے میری اتباع کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔ اب اَحادیثِ مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ حِيْنَ اَتَاهُ عُمَرُ فَقَالَ: اِنَّا نَسْمَعُ أَحَادِيثَ مِنَ الْيَهُوْدِ تُعْجِبُنَا أَفَتَرَى أَن نَّكْتُبَ بَعْضَهَا، فَقَالَ: أَمُتَهَوِّكُوْنَ اَنْتُم كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارَى، لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً، وَلَوْكَانَ مُوسىٰ حَيًّا مَاوَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِي۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو عرض کی: بے شک ہم لوگ یہود سے بہت سی باتیں سنتے ہیں جو ہمیں اچھی لگتی ہیں، کیا آپ مناسب سمجھتے اور رائے دیتے ہیں کہ ہم لوگ ان میں سے کچھ لکھ لیا کریں؟، آپ ﷺ نے زجر و انکار کے طور پر فرمایا: کیا تم لوگ دین اسلام کے بارے میں اس طرح حیرت میں ہو (اور اس کے کامل دین ہونے میں تمہیں شک ہے)۔ جس طرح یہود و نصاریٰ حیرت و شبہات کی وادیوں میں بھٹکنا شروع ہو گئے تھے۔ بے شک میں تمہارے پاس ایک صاف و روشن شریعت لے کر آیا ہوں۔ اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری پیروی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا یعنی اب میری شریعت کے آنے کے بعد سابق شرائع منسوخ ہو گئی ہیں''۔

(مسند احمد بن حنبل:15156)

(۲) عَنْ جَابِرٍ اَنَّ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ اَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِنُسْخَةٍ مِنَ التَّوْرَاةِ فَسَكَتَ فَجَعَلَ يَقْرَأُ وَوَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَتَغَيَّرُ، فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ: ثَكِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ اَمَا تَرٰى مَابِوَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَنَظَرَ عُمَرُ اِلٰى وَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَغَضَبِ رَسُوْلِهٖ ﷺ رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ

نَبِيًّا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ : وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ بَدَا لَكُمْ مُوسَىٰ فَاتَّبَعْتُمُوهُ وَتَرَكْتُمُونِي لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِي لَاتَّبَعَنِي۔

ترجمہ:''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رسول اللہ ﷺ کے پاس تورات کا ایک نسخہ لائے، آپ ﷺ خاموش رہے اور وہ اُسے پڑھنے لگے اور رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر ناراضی کے آثار ظاہر ہونے لگے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تیری ماں تجھ کو روئے، تو رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک (کے تاثرات) کو نہیں دیکھتا، حضرت عمر نے رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھا اور کہا: میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے غضب سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، بے شک ہم اللہ کو رب ماننے، اسلام کو دین کی حیثیت سے اختیار کرنے اور محمد ﷺ کی رسالت پر راضی ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے، اگر آج موسیٰ علیہ السلام آجائیں تو کیا تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرو گے، (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم گمراہ ہوجاؤ گے، اگر موسیٰ (آج) زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو ان کے لیے میری پیروی لازم ہوتی''۔(سنن دارمی:439)

(۳) كَيْفَ بِكُمْ إِذَا نَزَلَ بِكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ فَأَمَّكُمْ أَوْ قَالَ: وَإِمَامُكُمْ مِنْكُمْ۔

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ (منظر تمہارے لیے) کتنا عظیم ہوگا جب مسیح ابن مریم تمہارے درمیان نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا، (مسند احمد بن حنبل: 7680)'' (یعنی وہ اُس وقت مستقبل بالذات نبی کی حیثیت سے نہیں بلکہ آپ ﷺ کے اُمتی کی حیثیت میں آئیں گے)۔

جو شخص دینِ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کی پیروی کرے گا، وہ کافر و مرتد ہے اور کافر کو کافر سمجھنا ہی اسلام ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے، اس کے رسول مکرم ﷺ نے اپنے ارشاداتِ مبارکہ میں کافر کو کافر کہا اور خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرینِ زکوٰۃ اور منکرینِ ختم نبوت کو مرتد قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کیا۔ مذکورہ

شخص اگر اپنے کفریہ عقائد سے عَلانیہ توبہ کرے، تجدیدِ ایمان کے بعد (اگر شادی شدہ ہے تو تجدیدِ نکاح بھی ضروری ہے) اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا میل جول رکھنا جائز ہوگا۔

قرآن مجید سے پہلے کی الہامی کتب اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں، ان کا برحق ماننا قرآن پر ایمان لانے کا لازم ہے، کیونکہ قرآن مجید اپنے (سے پہلی) کُتب کا مُصدِّق (تصدیق کرنے والا) ہے۔ اسی لیے ہمارے ایمانیات اور بنیادی عقائد میں تمام کُتُبِ الٰہی پر ایمان شامل ہے، کیونکہ نبوت ورسالت ایک تسلسل کا نام ہے۔ البتہ خاتم الکتب قرآن مجید کے نزول کے بعد ان کی شریعت اب معمول بہا یا نافذ العمل نہیں ہے۔ ان میں تحریف بھی ہوچکی ہے اور قرآن مجید یہود کی تحریف پر شاہد ہے، قرآن اُن کی اصل کُتبِ الٰہیہ کا مصدِّق ہے، نہ کہ تحریف شدہ کتب کا۔ ہمارے لیے ایک جامع ضابطہ یہ ہے کہ سابق کُتبِ سماوی، جو موجودہ شکل میں ہمارے سامنے ہیں، ان کی جو تعلیمات قرآن کریم کے مطابق ہیں، ہم اُن کی تصدیق کریں گے اور جو قرآن کریم کے خلاف ہیں، اُن کو رَد کردیں گے اور جو نہ موافق ہیں نہ مخالف، اُن کے بارے میں سُکوت اختیار کریں گے۔

قادیانی شرعی اور آئینی طور پر دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ کو آخری نبی ماننا اُمت مسلمہ کا متفقہ، قطعی حتمی اور لازمی عقیدہ ہے، ایمان کی اساس ہے، قادیانی اس عقیدے سے منحرف ہیں۔ تمام علماء کا مُتفقہ فتویٰ ہے کہ قادیانی کافر ہیں، پاکستان کی پارلیمنٹ نے بھی 4 ستمبر 1974ء کو دوسری آئینی ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو مرتد قرار دیا۔ قادیانیوں کو مسلمان کہنا پاکستان کے دستور سے بھی غداری ہے اور ایسا شخص مسلمان نہیں رہتا، کیونکہ قادیانیوں کو مسلمان سمجھنا عقیدۂ ختم نبوت کے انکار کو مستلزم ہے اور عقیدۂ ختمِ نبوت کا منکر کافر ہے، ختمِ نبوت پر اُمّت کا اجماع ہے، لہٰذا اس عقیدہ کے بارے میں کوئی بھی تاویل یا توجیہ قابلِ قبول نہیں ہے۔

عَلانیہ گناہ کی توبہ عَلانیہ ہوگی

سوال: ایک شخص عَلانیہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، کیا تنہائی میں کی گئی اُس شخص کی توبہ قبول

ہو جائے گی؟۔(منور احمد نعیمی، ملیر کراچی)۔

جواب: عَلانیہ طور پر کیے گئے گناہ کی توبہ بھی عَلانیہ کی جائے گی اور جو گناہ پوشیدہ کیے ہوں، اُن کی توبہ پوشیدہ ہوگی اور جس فعل میں کسی بندے کی حق تلفی ہوئی ہو، اس کی تلافی شریعت کے مطابق کرنی ہوگی اور جہاں اُس شخص سے معافی مانگنے سے تلافی ہوسکتی ہو، وہاں معافی مانگنی ہوگی۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں: ''اُس کی توبہ صرف یہی نہ ہوگی کہ اللہ عزوجل کے حضور تائب ہو، بلکہ لازم ہوگا کہ عَمرو سے اپنے قصور کی معافی مانگے کہ وہ نہ صرف حق اللہ بلکہ حق العبد میں بھی گرفتار ہے اور تنہائی میں توبہ بھی کافی نہ ہوگی، اس نے مجمع میں گناہ کیا ہے، مجمع ہی میں توبہ کرے۔ حدیث میں ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً فَأَحدِث عِندھَا تَوبَۃَ اَلسِّرُّ بِالسِّرِّ وَالْعَلَانِيَةُ بِالْعَلَانِيَةِ، وَاللہ تَعَالٰی أَعْلَمُ۔

ترجمہ: ''جب تو کوئی گناہ کرے تو چھپے گناہ کی خفیہ اور برملا گناہ کی اعلانیہ توبہ کرو، واللہ تعالیٰ اعلم''۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 324)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: ''اور جو گناہ علانیہ کیا ہو، اُس کی توبہ بھی علانیہ چاہیے اور پوشیدہ کی پوشیدہ''۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 22، ص: 258)

مکمل حدیث مبارک یہ ہے:

عَنْ عَطَاءٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُعَاذًا إِلَى الْيَمَنِ فَقَالَ لَهُ مُعَاذٌ: أَوْصِنِي يَا رَسُولَ اللهِ، قَالَ: عَلَيْكَ بِتَقْوَى اللهِ مَا اسْتَطَعْتَ، وَاذْكُرِ اللهَ عِنْدَ كُلِّ شَجَرٍ وَحَجَرٍ، وَإِذَا عَمِلْتَ سُوْءًا فَأَحْدِثْ لَهُ تَوْبَةً، السِّرُّ بِالسِّرِّ وَالْعَلَانِيَةُ بِالْعَلَانِيَةِ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو (قاضی بنا کر) یمن کی طرف بھیجا، حضرت معاذ نے عرض کی: یارسول اللہ! مجھے وصیت فرمائیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی استطاعت کے مطابق تقویٰ پر کاربند رہو اور ہر شجر و حجر کے پاس (یعنی ہر جگہ) اللہ کو یاد کرو

اور جب (کسی بشری کمزوری کے تحت) تم سے گناہ صادر ہو جائے، تو اس پر توبہ کرو۔ جو گناہ خَلوت میں کیا ہو، اس کے لیے خَلوت میں توبہ کرنا کافی ہے اور جو گناہ علانیہ (بر سرِ عام) کیا ہو، اس پر علانیہ توبہ کرنی ہوگی''۔ (احادیث اسماعیل بن جعفر، جلد 1، ص:455)

جنت کی اہمیت کو کم کرنا

سوال: فاروقی مسجد گلشن اقبال میں دورانِ محفل یہ شعر پڑھا گیا:

کوئی مر رہا ہے بہشت پر، کوئی چاہتا ہے نجات کو
میں تجھی کو چاہوں خدا کرے، میری اس دعا کا سلام لو

محفل میں موجود مفتی صاحب نے فرمایا: یہ شعر درست نہیں اور سب کو تجدید ایمان کروایا۔ اس بارے میں دینی رائے کیا ہے؟، (محمد ابراہیم میمن، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر جنت کے حسن ورعنائی کو انتہائی خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے اور جابجا اہلِ ایمان کی رغبت کے لیے اُس کے دلکش نظاروں اور بے پایاں نعمتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ جنت کی دائمی نعمتوں کا بیان کیا گیا ہے تاکہ اُن کے دل میں جنت کی خواہش پیدا ہو اور اُس کے حصول کے لیے اعمالِ خیر کا جذبہ پیدا ہو۔ سورۃ الرحمٰن میں ''فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ'' کو 31 مرتبہ تکرار کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے اور اِس سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں، خاص طور پر جنت کے انعامات کا تفصیل کے ساتھ بیان ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

جَنَّتَانِ مِن فِضَّةٍ آنِيَتُهُمَا وَمَا فِيهِمَا وَجَنَّتَانِ مِن ذَهَبٍ آنِيَتُهُمَا وَمَا فِيهِمَا وَمَا بَيْنَ الْقَوْمِ وَبَيْنَ أَن يَنظُرُوا إِلَى رَبِّهِمْ إِلَّا رِدَاءُ الْكِبْرِ عَلَى وَجْهِهِ فِي جَنَّةِ عَدْنٍ۔

ترجمہ: ''دو جنتیں چاندی کی ہیں، ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے (وہ چاندی کا ہے) اور دو جنتیں سونے کی ہیں، اُن کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے (وہ سونے کا ہے) اور جنت عدن میں لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے دیدار کے درمیان اُس کی کبریائی کی چادر ہے یعنی اللہ

تعالیٰ کی ذات بندوں کے لیے ایک (غیر مادی) حجاب میں ہے"۔ (صحیح بخاری: 4878)

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی تجلیات کے دیدار کی بشارت دی ہے، ارشاد فرمایا: "اور (اہلِ جنت) کے چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی تجلیات کا دیدار کر رہے ہوں گے"۔ (القیامہ: 23-22)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے جن محبوب بندوں کو اپنے دیدار سے نوازتا ہے، اُن کے اندر اس کی استعداد بھی پیدا فرما دیتا ہے، جیسا کہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا دیدار فرمایا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لیے جا بجا جنت کی بشارت دی ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (توبہ: 72)

ترجمہ: "اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ان جنتوں کا وعدہ فرمایا ہے، جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور دائمی جنتوں میں پاکیزہ رہائش گاہوں کا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ کی رضا (ان سب سے) بڑی ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے"۔

پس قرآن مجید میں جنت کی صفات اور اس میں عطا کی جانے والی نعمتوں کو بار بار اور تکرار کے ساتھ بیان کرنے سے یہی مراد سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں میں حصولِ جنت کا ذوق و شوق پیدا ہو، حدیث پاک میں ہے:

اِنَّ الْجَنَّةَ حُفَّتْ بِالْمَكَارِهِ وَاِنَّ النَّارَ حُفَّتْ بِالشَّهَوَاتِ۔

ترجمہ: "جنت ناگواریوں اور مشقتوں سے گھری ہوئی ہے اور جہنم شہوتوں سے گھری ہوئی ہے"۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: 34527)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جنت کا حصول کوئی آسان بات نہیں ہے، اس کے لیے راہِ حق میں طرح طرح کی عزیمتوں اور مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے، جب کہ اس کے برعکس جو اپنے نفس کی خواہشات کے تابع اور اسیر ہو جاتے ہیں، وہ دنیا میں تو ممکن ہے راحت

پالیں، لیکن انجامِ کار اُن کے لیے جہنم ہے۔ جنت مومن کا مطلوب ومقصود ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ

ترجمہ: ''بے شک اللہ نے ایمان والوں سے اُن کی جانوں اور اُن کے مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا''۔ (توبہ:111)

علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''سب سے عظیم نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار اور اس کی رضا ہے لیکن یہ نعمت بھی جنت میں حاصل ہوگی۔ بعض جاہل شعراء اور جعلی اور بناوٹی صوفیہ جنت کی بہت تحقیر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دیدار اور اس کی رضا کی اہمیت بیان کر کے جنت کی طلب کو بہت گھٹیا اور بہت خسیس کہتے ہیں، حالانکہ قرآن اور حدیث میں جنت کی بہت فضیلت ذکر فرمائی گئی ہے اور اس کی طلب کی ترغیب دی گئی ہے اور جنت کو طلب کرنے کا حکم دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی جنت کا سوال کیا ہے اور ہمیں بھی جنت الفردوس کی دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کا طلب گار مؤنث ہے، جنت کا طلبگار مخنث (ہیجڑا) ہے اور مولیٰ کا طلب گار مذکر ہے، اسی طرح یہ لوگ مدینہ منورہ کی طلب کے مقابلہ میں بھی جنت کی طلب کو گھٹیا اور خسیس کہتے ہیں ان کے اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں:

تیری میری چاہ میں زاہد بس اتنا فرق ہے
تجھ کو جنت چاہیے، مجھ کو مدینہ چاہیے

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس جگہ آرام فرما ہیں، وہ بلا مبالغہ جنت سے بھی افضل ہے، وہ بھی جنت کا ایک ٹکڑا ہے اور آخرت میں بھی آپ جنت کے سب سے نمایاں مقام میں ہوں گے، جسے دعا بعد الاذان کی حدیث میں ''مقامِ وسیلہ'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ اول وآخر جنت ہی ہے۔ ہماری نظر میں مدینہ منورہ اور جنت میں تقابل کا یہ شِعار اختیار نہیں کرنا چاہیے اور اس کی آڑ میں عام مسلمانوں کے دلوں میں جنت کی اہمیت کو کم کرنے کا شِعار ترک کر دینا چاہیے، بلکہ دونوں کی فضیلت کو کسی تقابل کے بغیر

مثبت انداز میں بیان کرنا چاہیے۔ آج بھی مدینہ منورہ میں زمین کے جس حصے پر آپ تشریف فرما ہیں، اس کی افضلیت تو مسلّم ہے، لیکن یہ آپ کی عارضی قیام گاہ ہے اور آپ کی دائمی قیام گاہ جنت ہے اور روضۂ رسول بھی جنت میں جائے گا۔ پھر آپ کی دائمی قیام گاہ کے درجہ میں التزاماً کمی کرنا، کیا یہی آپ ﷺ سے عشق ومحبت کا تقاضا ہے۔ کبھی اللہ کی رضا کے مقابلہ میں بھی جنت کو کم درجہ کا اور گھٹیا کہا جاتا ہے کہ ہم کو جنت نہیں اللہ کی رضا چاہیے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جس جنت کی اللہ تعالیٰ نے بہت تعریف کی ہے اور اسکی طرف دوڑنے کا حکم دیا ہے تو اس کی اہمیت کو کم کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا یا ناراض؟۔ سب سے بلند درجہ اللہ تعالیٰ کا دیدار اور اس کی رضا کا ہے اور اس کے بعد جنت کا درجہ ہے لیکن یہ بلند درجات جنت ہی میں حاصل ہوں گے۔ اس لیے عام مسلمانوں کو ایمانِ کامل اور اعمالِ صالحہ کے ذریعے جنت کے حصول کی طرف راغب کرنا کرنا چاہیے اور جنت کے حصول کی دعا کرتے رہنا چاہیے، حدیث میں ہے:

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَقَابُ قَوْسٍ فِي الْجَنَّةِ، خَيْرٌ مِمَّا تَطْلُعُ عَلَيْهِ الشَّمْسُ وَتَغْرُبُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: کمان کے ایک سر کے برابر جنت میں جگہ ان تمام جگہوں سے بہتر ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے یا غروب ہوتا ہے''۔
(صحیح بخاری:2793، مسلم:1882، سنن نسائی:3118)

(۲) مَوْضِعُ سَوْطٍ فِي الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا۔

ترجمہ: ''حضرت سہل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جنت میں ایک چابک کے برابر جگہ بھی دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے''۔
(صحیح بخاری:2792,3250، مسلم:1881)

جنت کو کم تر قرار دینے والے جاہل شعراء اور جعلی صوفیہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حصولِ جنت کی

دعا کی ہے: وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ﴿٨٥﴾

ترجمہ: ''اور (اے اللہ!) مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے بنادے''۔

(الشعراء:85)

اور ہمارے نبی سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی جنت کے حصول کی دعا کی ہے:

وَاَسْئَلُكَ الدَّرَجَاتِ الْعُلٰى مِنَ الْجَنَّةِ آمِیْن

ترجمہ: ''اور میں تجھ سے جنت کے بلند درجات کا سوال کرتا ہوں، آمین''۔

(المعجم الکبیر، جلد 23، ص:316)

اور جب رسول اللہ ﷺ نے حصولِ جنت کی دعا کی ہے تو پھر جنت کی دعا کی اہمیت کو اپنا مدعا و مقصود بنانا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ حدیث کافی ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سَاَلَ اللهَ الْجَنَّةَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَتِ الْجَنَّةُ: اَللّٰهُمَّ اَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ، وَمَنْ اسْتَجَارَ مِنَ النَّارِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَتِ النَّارُ: اَللّٰهُمَّ اَجِرْهُ مِنَ النَّارِ

ترجمہ: ''جس شخص نے تین مرتبہ اللہ سے جنت کا سوال کیا تو جنت کہتی ہے: اے اللہ! اس کو جنت میں داخل کردے اور جس نے تین مرتبہ دوزخ سے پناہ طلب کی تو دوزخ کہتی ہے: اے اللہ! اسے آگ کے عذاب سے اپنی پناہ عطا فرما''۔

(سنن ترمذی:2572)، (تبیان القرآن، جلد 7، ص:221)

مسجدِ نبوی مدینۂ منورہ میں ہے۔ مدینۂ منورہ سے اہلِ ایمان کو بے پناہ عقیدت و محبت ہے اور مسجدِ نبوی میں عبادت کا اجر بعض روایات کی رُو سے ہزار گنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

صَلَاةٌ فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ صَلَاةٍ فِیْمَا سِوَاهُ اِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَام

ترجمہ: ''مسجدِ حرام کے سوا دیگر مساجد کے مقابلے میں میری مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب ہزار گنا ہے، (صحیح بخاری:1190)''۔ ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: گھر

میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب پچیس گنا ہے اور جامع مسجد میں پانچ سو گنا اور مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ نبوی میں پچاس ہزار گنا اور مسجدِ حرام میں ایک لاکھ گنا ہے، (سنن ابن ماجہ:1413)''۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

مَابَیْنَ بَیْتِی وَمِنْبَرِی رَوضَۃٌ مِن رِیَاضِ الْجَنَّۃِ وَمِنْبَرِی عَلٰی حَوْضِی۔

ترجمہ:'': میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض (یعنی حوضِ کوثر) پر ہے، (صحیح بخاری:1888)''۔ ہر مسلمان، جسے مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہو، کی خواہش ہوتی ہے کہ چند لمحے ریاض الجنہ میں بیٹھنے، نماز پڑھنے اور تلاوت واذکار ودرود پڑھنے کا شرف نصیب ہوجائے، کیونکہ یہ جنت کا ٹکڑا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یقیناً یہ جنت میں جائے گا اور شاید یہاں بیٹھنے والوں کو اِس کی برکت سے جنت نصیب ہوجائے۔ امام احمد رضا قادری نے الملفوظ میں لکھا ہے:

''کعبۂ معظمہ اور تمام مساجد جنت میں جائیں گی اور روضۂ نبوی ﷺ کعبۂ معظمہ سے افضل ہے، تو روضۂ رسول بدرجۂ اَولیٰ جنت میں جائے گا اور تمام انبیاءِ کرام کی تُربتیں (یعنی قبریں) بھی جنت میں جائیں گی''۔ (الملفوظ، حصہ چہارم، ص:528، ملخصاً)

صحابۂ کرام تو رسول اللہ ﷺ کے زیرِ سایہ اور آپ کی معیت میں مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور اس کے باوجود جنت کے طلب گار ہوتے تھے۔ حدیث مبارک میں ہے:

''غزوۂ اُحد کے موقع پر ایک شخص نے (جو میدانِ جنگ سے کچھ دیر کے لیے اپنی توانائی کو مجتمع کرنے آیا، وہ چند کھجوریں ہاتھ میں لے کر کھا رہا تھا کہ اس) نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''(یا رسول اللہ!) مجھے بتایئے کہ اگر میں (میدانِ جنگ میں لڑتے لڑتے) شہید ہوجاؤں تو میرا ٹھکانا کہاں ہوگا؟''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں''، تو (یہ سن کر) اس نے اپنے ہاتھ سے کھجوریں رکھ دیں (اور میدانِ جنگ میں کود پڑا) اور لڑتے لڑتے شہید ہوگیا''۔ (صحیح بخاری:3820)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب صحابیِ رسول کو رسالت مآب ﷺ کی زبانِ

مبارک سے شہادت کی صورت میں جنت ملنے کا یقین ہوگیا تو اس نے مدینے میں رہتے ہوئے اتنی دیر بھی جنت سے دور رہنا پسند نہ کیا کہ وہ آرام سے چند کھجوریں کھا کر میدانِ جنگ میں کودتا بلکہ جنت کے حصول کے اشتیاق کا اس پر اتنا غلبہ ہوا کہ فی الفور میدانِ جنگ میں کود پڑا اور شہادت کا اعزاز پا کر جنت میں جا پہنچا۔

مدینۂ منورہ سے اظہارِ محبت کے ہزاروں انداز اختیار کیے جاسکتے ہیں، لیکن کیا اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا جنت سے تقابل کیا جائے اور جنت کو اہلِ محبت وعقیدت کی نظر میں کم تر کر کے پیش کیا جائے۔ یہ شِعار ان لوگوں نے عام کیا، جنہوں نے محبت وعشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشن کی بجائے معاش بنالیا اور پھر اس طرح ابتذال پر مبنی اشعار ترتیب دیے تاکہ عوام کی عقیدت کو اپنے مقاصد کے لیے ابھارا جائے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جنت کے حصول کی تلقین وترغیب دی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران: 133)

ترجمہ: ''اور اپنے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف جلدی کرو، جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے، اور وہ پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے''۔

مذکورہ بالا شعر پر کفر کا اطلاق تو نہیں ہوتا لیکن تقابل کا ایسا انداز کہ جس سے جنت کی بے توقیری کا تصور پیدا ہو یا اس کی اہمیت کم معلوم ہو، بہر حال ناپسندیدہ ہے اور اس شِعار کو ترک کرنا چاہیے۔ کلمہ پڑھ کر ایمان تازہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی ''تبیین المحارم'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''(وہ اُمور جن کا جاننا ضروری ہے، اُن میں سے) حرمت اور کُفر کا سبب بننے والے کلمات ہیں۔ اور میری جان کی قسم! اس زمانے میں یہ مسئلہ نہایت اہم ہے، کیونکہ آپ عوام کو غفلت (اور نادانی) میں اکثر کفریہ کلمات کہتے ہوئے سنتے ہیں اور احتیاط اِسی میں ہے کہ (دینی مسائل سے) نابلد شخص ہر روز تجدیدِ ایمان کرے اور وقتاً فوقتاً تجدیدِ نکاح کرے،

کیونکہ عورتوں سے بھی اکثر (نادانی میں) اس طرح کے کلمات سرزد ہوتے ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 1 ص:122 ملخصاً)

شاید اِسی لیے برِ صغیر پاک وہند کے بعض علاقوں میں علماء نے نکاح کے موقع پر کلمے پڑھانے کا شِعار رائج کیا کہ مبادا کبھی بے خیالی اور نادانی میں کوئی کفریہ کلمہ سرزد ہوگیا ہو تو تجدیدِ ایمان ہوجائے۔

گنبدِ خضرا کی شبیہ کا حکم

سوال:

مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ حرام کے بعد کیا ہمارے آقا کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے روضۂ مبارک کے گنبدِ خضریٰ سے کل کائنات میں کسی کا افضل واعلیٰ مقام ہے؟۔ آج کل کاروباری مقاصد کے لیے پینا فلیکس پر اشتہار بنائے جاتے ہیں، اکثر اشتہارات میں انسانی تصویروں کے ساتھ گنبدِ خضریٰ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ انسانی تصاویر کبھی گنبد کے اوپر کبھی دائیں بائیں ہوتی ہیں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟۔ اِسی طرح دینی محافل میں اسٹیج پر بڑی بڑی پینا فلیکس اسکرین کعبۃ اللہ اور گنبدِ خضریٰ کی لگائی جاتی ہیں، اسٹیج پر بیٹھنے والے عکس کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھتے ہیں، کیا یہ بے ادبی ہے؟۔ گنبدِ خضریٰ پر مبنی تصویر پر جب نظر پڑے تو کیا یہ تصور لازم نہیں ہے کہ اس کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا روضہ ہے؟

(پیر خواجہ عبدالسلام نقشبندی، عظیم ٹاؤن، خانیوال)

جواب:

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:

اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ اِلَینَا الْمَدِینَۃَ کَحُبِّنَا مَکَّۃَ أَوْ أَشَدَّ، اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَافِي صَاعِنَا وَفِي مُدِّنَا، وَصَحِّحْھَالَنَا، وَانْقُلْ حُمَّاھَا اِلَی الْجُحْفَۃِ۔

ترجمہ: ''اے اللہ! ہمارے نزدیک مدینہ کو اس طرح محبوب بنادے، جس طرح ہمیں مکہ

محبوب ہے یا اس سے بھی زیادہ، اے اللہ! ہمارے صاع (چار کلو کا پیمانہ) میں اور ہمارے مُد (دو کلو کا پیمانہ) میں برکت دے اور مدینہ کی ہوا کو صحت آفریں بنا دے اور اس کے بخار کو الجحفہ کی طرف منتقل کر دے''۔ (صحیح بخاری:1889)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ بِالْمَدِینَةِ ضِعْفَیْ مَا بِمَکَّةَ مِنَ الْبَرَکَةِ۔

ترجمہ: ''اے اللہ! جتنی برکتیں مکہ میں نازل کی ہیں، اس کی دوگنی برکتیں مدینہ میں نازل فرما''۔ (صحیح مسلم:3313)

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:

مَا بَیْنَ بَیْتِی وَمِنْبَرِی رَوْضَةٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِی عَلٰی حَوْضِی۔

ترجمہ: ''میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے''۔ (صحیح بخاری:1888)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

وَمَکَّةُ افضلُ مِنْھَا عَلَی الرَّاجِحِ، اِلَّا مَاضَمَّ أَعْضَائَہُ عَلَیْہِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ فَاِنَّہٗ أفضلُ مُطْلقاً حَتّٰی مِنَ الْکَعْبَةِ وَالْعَرْشِ وَالْکُرْسِیِّ۔

ترجمہ: ''راجح قول یہ ہے کہ مکہ افضل ہے، مگر وہ جگہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسمِ اقدس سے متصل ہے، وہ مطلقاً (تمام جگہوں سے) افضل ہے، یہاں تک کہ کعبہ، عرش اور کرسی سے (بھی) افضل ہے''۔ (جلد 4، ص:47، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری نے الملفوظ میں لکھا ہے: ''کعبۂ مُعظمہ اور تمام مساجد جنت میں جائیں گی اور روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کعبۂ مُعظمہ سے افضل ہے، تو روضۂ رسول بدرجۂ اولیٰ جنت میں جائے گا اور تمام انبیاءِ کرام کی تُربتیں (یعنی قبریں) بھی جنت میں جائیں گی''۔

(الملفوظ، حصہ چہارم، ص:528، ملخصاً)

مسجدِ نبوی میں عبادت کا اجر بعض روایات کی رُو سے ہزار گنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کا فرمان ہے:

صَلَاۃٌ فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا خَیْرٌ مِنْ أَلْفِ صَلَاۃٍ فِیْمَا سِوَاہُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ

ترجمہ: ''مسجدِ حرام کے سوا دیگر مساجد کے مقابلے میں میری مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب ہزار گنا ہے''۔ (صحیح بخاری: 1190)

ایک اور روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

صَلَاۃُ الرَّجُلِ فِیْ بَیْتِهٖ بِصَلَاۃٍ، وَصَلَاتُهٗ فِیْ مَسْجِدِ الْقَبَائِلِ بِخَمْسٍ وَعِشْرِیْنَ صَلَاۃً، وَصَلَاتُهٗ فِی الْمَسْجِدِ الَّذِیْ یُجَمَّعُ فِیْهِ بِخَمْسِ مِائَةِ صَلَاۃٍ وَصَلَاتُهٗ فِی الْمَسْجِدِ الْأَقْصٰی بِخَمْسِیْنَ أَلْفِ صَلَاۃٍ وَصَلَاتُهٗ فِیْ مَسْجِدِیْ بِخَمْسِیْنَ أَلْفَ صَلَاۃٍ، وَصَلَاتُهٗ فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِائَةِ أَلْفِ صَلَاۃٍ۔

ترجمہ: ''گھر میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب پچیس گنا ہے اور جامع مسجد میں پانچ سو گنا اور مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ نبوی میں پچاس ہزار گنا اور مسجدِ حرام میں ایک لاکھ گنا ہے''۔ (سنن ابن ماجہ: 1413)

امام احمد رضا قادری نے لکھا:

طیبہ نہ سہی افضل، مکہ ہی بڑا زاہد
ہم عشق کے بندے ہیں، کیوں بات بڑھائی ہے

یعنی ہوسکتا ہے کہ شرعی ضابطے کی رُو سے نماز کے اجر کی مقدار کے اعتبار سے مکہ افضل ہے، لیکن ایک افضل (Superior) چیز کے مقابلے میں مفضول (Inferior) چیز زیادہ محبوب ہوسکتی ہے، جیسے باپ افضل ہے لیکن بیٹا محبوبیت میں زیادہ ہوتا ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''شیخ ابن تیمیہ اور ان کے موافقین کے سوا تمام مُتقدمین اور متاخرین علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کائنات کی ہر جگہ سے افضل ہے، حتیٰ کہ کعبہ اور عرش سے بھی افضل ہے۔

قاضی عیاض مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

وَلَا خِلَافَ اَنَّ مَوْضِعَ قَبْرِہٖ اَفْضَلُ بِقَاعِ الْاَرْضِ

ترجمہ: ''اس بات میں علماء کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی جگہ تمام روئے زمین سے افضل ہے''۔ (شفاء جلد 2، ص: 91، دار الفکر بیروت)

تمام علماء تسلسل اور تواتر کے ساتھ قبر انور کی تمام روئے زمین پر فضیلت کا اظہار کرتے رہے تا آنکہ آٹھویں صدی میں شیخ ابن تیمیہ حنبلی نے اس کا سب سے پہلے انکار کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور کی افضلیت پر میرے شیخ علامہ سید سعید احمد کاظمی قدس سرہٗ نے یہ دلیل دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چوتھے آسمان پر ہیں، اور وہ اللہ کے شکر گزار بندے ہیں کیونکہ تمام انبیاء شاکرین ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم: 7) ''اگر تم شکر کرو تو میں تمہاری نعمتوں میں زیادتی کروں گا''۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو زمین سے چوتھے آسمان کی بلندی پر لے گیا اگر اس سے زیادہ بلندی اور عظمت عرش پر ہوتی تو اللہ تعالیٰ آپ کو عرش پر لے جاتا کیونکہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو زمین پر لا کر قرب قیامت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں دفن کرائے گا، معلوم ہوا کہ عظمت اور بلندی عرش پر نہیں آپ کے قُرب اور جوار میں ہے اور اس جگہ ہے جہاں آپ مدفون ہیں اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی قبرِ انور عرشِ معلیٰ سے افضل ہے۔

میرے استاذ علامہ عطا محمد بندیالوی مدظلہ نے فرمایا: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ (سورۃ البلد: 2-1) ''میں اس شہر کی قسم صرف اس وجہ سے کھاتا ہوں کہ آپ اس شہر میں چلتے پھرتے ہیں''۔ مکہ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ کی وجہ قسم بننے کی عزت اور کرامت صرف اس وجہ سے ملی ہے کہ آپ اس شہر میں ہیں اور جب آپ مدینہ منورہ گئے تو وہ فضیلت مدینہ کو حاصل ہوئی، جب آسمانوں پر گئے، تو آسمانوں کو عزت ملی، عرش پر پہنچے تو عرش کو کرامت ملی اور اب جس جگہ آرام فرما ہیں وہ جگہ سب سے افضل ہے۔ مجھے یہ سمجھ آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس جگہ مدفون ہیں (خواہ اس کو بیت قرار دیں یا قبر) اس کے متعلق آپ نے فرمایا: یہ جنت کے باغات میں سے ایک

باغ ہے اور جنت کے بارے میں حضرت سہل بن ساعدی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَوضِعُ سَوْطٍ فِی الْجَنَّةِ خَیْرٌمِنَ الدُّنیَا وَمَافِیْھَا۔''ایک چابک کے برابر بھی جنت کی جگہ دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے''۔اس سے واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جس جگہ آرام فرما ہیں، وہ جگہ دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے، پس کعبہ، بیت المقدس وغیرہ ہر جگہ سے افضل وہ جگہ ہے جہاں آپ آرام فرما ہیں''۔

(شرح صحیح مسلم،جلد3،ص:747,750-751)

مگر یہ تمام فضیلتیں قبرِ انور کو حاصل ہیں،یعنی زمین کا وہ مبارک حصہ جسے آپ کے بدنِ اطہر سے مَس ہونے کا شرف حاصل ہے۔گنبدِ خضرا اگرچہ آپ ﷺ کی نسبت کی وجہ سے لاکھوں درجے قابلِ عزت وتکریم ہے،لیکن اسے قبرِ انور والی فضیلت کے مقام ومرتبے پر سمجھنا درست نہیں ہے اور اس پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے اور نہ ہی اکابر اُمت نے اس درجے میں اس کی فضیلت کو بیان کیا ہے اور گنبدِ خضریٰ تو عہدِ رسالت مآب ﷺ کے بہت بعد میں بنایا گیا ہے۔بعض روایات میں ہے کہ پہلے گنبد کا رنگ سفید تھا،بعد میں اس پر ہرا رنگ کیا گیا۔رسول اللہ ﷺ نے گنبد بنانے کا حکم ہی نہیں فرمایا،اس لیے گنبد کے رنگ کے انتخاب کو آپ کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے۔

اسلام میں جاندار چیزوں کی تصاویر بنانے کی ممانعت ہے اور بے جان چیزوں کی تصویر بنانے کی اجازت ہے۔البتہ تمدنی،عمرانی اور معاشی ضروریات،جن کے لیے تصویر ضروری ہے،مثلاً شناختی کارڈ،پاسپورٹ،ویزا،ڈومیسائل،ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ،ان ضروریات کے لیے تصویر بنوانا جائز ہے۔تعظیم وتکریم کے لیے فوٹو کھینچنا ناجائز وحرام ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابنِ عُمَرَ،عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ:اَلَّذِیْنَ یَصْنَعُوْنَ الصُّوَرَ یُعَذَّبُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ، یُقَالُ لَھُمْ:أَحْیُوا مَا خَلَقْتُمْ۔

ترجمہ:''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جو

لوگ ان (جانداروں کی) تصویروں کو بناتے ہیں، ان کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا، اُن سے کہا جائے گا کہ جن کو تم نے بنایا تھا، ان کو اب زندہ کرو''۔ (صحیح مسلم: 5501)

اگرچہ تصویر کا حکم اصل کا نہیں ہوتا، مگر جس طرح آج کل شِعار بن گیا ہے کہ جا بجا کعبۃ اللہ، گنبدِ خضرا اور مزاراتِ اولیائے کرام کی شبیہیں بنائی جاتی ہیں اور اس میں کافی حد تک ابتذال ہو گیا ہے، یہ درست نہیں ہے، کیونکہ لوگ انہیں اُسی عقیدت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تاہم فقہی اعتبار سے شرعی حکم یہی ہے کہ گنبدِ خضرا کی شبیہہ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا خلافِ ادب نہیں ہے یا تصویر کا گنبد سے اوپر ہونے کا بھی یہی حکم ہے، نعت خوانوں، واعظین اور پیرانِ عظام کی تصاویر پر مشتمل لاکھوں روپے کے جو پینا فلیکس آویزاں کیے جاتے ہیں، تصاویر کے شرعی حکم سے قطع نظر، ہمارے نزدیک یہ اسراف ہے، کیونکہ عوام یہ رقم دین کے نام پر دیتے ہیں اور اسے دین کے ترجیحی مصارف پر صرف کرنا چاہیے۔ جلسے کے لیے تو اعلان اور اطلاعِ عام مقصود ہوتی ہے اور وہ کم سے کم مصارف پر ہونی چاہیے۔ لہٰذا جس انداز سے یہ اِسراف ہو رہا ہے، یہ ناجائز و ناپسندیدہ ہے۔ جہاں تک حقیقی گنبدِ خضراء کا تعلق ہے، وہ روضۂ رسول کے چھت کے حکم میں ہے اور جب آپ ﷺ کی تدفین حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں ہوئی، اُس وقت بھی اس کی چھت موجود تھی، پس حجرہ یا بیت کی جو حرمت ہے تو اس میں چھت بھی شامل ہے۔ لیکن شبیہہ گنبدِ خضراء کا وہ حکم نہیں ہے، کیونکہ حرمت و تقدیس اصل کے لیے ثابت ہے نہ کہ شبیہہ کے لیے۔

علامہ مفتی محمد وقار الدین سے سوال ہوا:

''جائے نماز یعنی مصلے پر جو خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی علی صاحبہا افضل الصلوات والتسلیمات کی تصویریں ہوتی ہیں، اُن پر نماز پڑھنا جائز ہے کہ نہیں؟ نیز ایسے مصلے پر بیٹھنا یا پاؤں رکھنا کیا حکم رکھتا ہے اور ان تصاویر کی تعظیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟''۔

انہوں نے جواب میں لکھا: ''تصاویر اصل شے کا حکم نہیں رکھتیں۔ لہٰذا ایسی جائے نمازوں پر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ دھیان بٹنے کا احتمال نہ ہو اور اگر ایسی

تصاویر پر پاؤں وغیرہ پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں اور تصاویر کی تعظیم بے سود ہے۔ (وقار الفتاوی، جلد دوم، ص: 514)''۔ ذرا سوچیے! اگر کسی کو بیت اللہ میں داخلے کی سعادت نصیب ہو جائے تو وہ اپنے قدموں کے ساتھ اندر جائے گا اور نماز پڑھے گا، البتہ بیت اللہ کی چھت پر نماز پڑھنے کے خلافِ ادب ہونے کی وجہ سے حدیث پاک میں منع فرمایا ہے''۔ (سنن ترمذی: 346)

مُقدّس دینی علامات اور شعائر کو کاروبار کے لیے استعمال کرنا پسندیدہ بات نہیں ہے۔ بعض لوگ مقدس مقامات کی تصاویر یا شبیہ کو اشتہارات میں استعمال کرتے ہیں اور اگر اُن کا مقصد اس سے برکت حاصل کرنا ہے، تو پھر اُن کا احترام بھی کرنا چاہیے، ایسے بل بورڈ کے نیچے خلافِ شرع کوئی کام نہیں ہونا چاہیے اور دیانت وامانت سے کام لینا چاہیے، ورنہ ان شعائر کے ساتھ دل سے عقیدت کا رشتہ رکھنا ہی بہتر ہے۔ اسلامی اَحکام اصولِ تیسیر پر مبنی ہیں، چنانچہ ہمارے فقہائے کرام نے لکھا کہ اگر انسان کسی طرف پاؤں پھیلا کر لیٹا ہے اور اسی جانب قرآن مجید الماری کے اندر بند ہے یا بلندا و طاق پر رکھا ہوا ہے، تو یہ بے ادبی نہیں ہے۔

طہارت کے مسائل

واشنگ مشین میں کپڑوں کی دھلائی

چند اہم اور ضروری سوالات کے جوابات مطلوب ہیں، (محمد معروف، وارنگٹن۔یو کے)

سوال: پاک اور ناپاک کپڑے ایک ساتھ کسی برتن میں بھگو دینا یا مشین میں ڈال دینا کیسا ہے؟۔ واشنگ مشین کے دھلے ہوئے کپڑوں کا شرعاً کیا حکم ہے، نیز بعض مشینوں کا سسٹم سارے پانی کو خارج نہیں کرتا، خود نکالنا بھی مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اکثر مشینوں میں آج کل ایسا سیفٹی لاک سسٹم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے درمیان میں مشین کو کھولنا ممکن نہیں ہوتا اور اگر کسی وجہ سے کھولنا بھی پڑے تو مشین کو مکمل بند کرنا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے کچھ مشینیں نئے سرے سے کپڑے دھونا شروع کر دیتی ہیں، اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟۔

جواب: پاک وناپاک کپڑوں کو ایک ساتھ کسی برتن یا مشین میں دھونے سے تمام کپڑے ناپاک ہوجاتے ہیں، اُنہیں پاک کرنے کے لیے پہلے سے استعمال شدہ ناپاک پانی نکال کر دوبارہ سہ بارہ تازہ پانی میں دھوکر نچوڑا جائے۔ اگر مشین میں یہ سہولت ہو کہ استعمال شدہ پانی خارج کر کے تازہ پانی ڈال لیا جائے، تو کپڑے پاک ہوجائیں گے۔ عام طور پر گھروں میں استعمال ہونے والی واشنگ مشینیں آٹومیٹک ہوتی ہیں اور اُن میں یہ سہولت موجود ہوتی ہے۔لیکن اگر واشنگ مشین میں ایسی سہولت موجود نہ ہو تو ایسے کپڑوں کو پاک کرنے کے لیے مشین سے نکال کر پاک صاف پانی میں ایک دو بار بھگو کر نچوڑا جاسکتا ہے۔
لہٰذا جن مشینوں میں استعمال شدہ پانی خارج ہونے کا سسٹم نہ ہو اور اُسی ناپاک پانی میں کپڑے دھلتے رہتے ہوں، اُن تمام کپڑوں کو بھی پاک کرنے کے لیے مشین سے باہر نکال کر صاف پانی ڈال کر نچوڑنا ہوگا۔

سوال: مشین میں مقررہ وزن سے زیادہ کپڑوں کی طہارت کا کیا حکم ہوگا، نیز اگر کسی مشین میں پانی دو یا تین دفعہ خارج نہیں ہوتا، تو اس صورت میں شرعاً کپڑے پاک ہوں گے یا نہیں؟۔

جواب: یہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ جن مشینوں میں استعمال شدہ پانی خارج ہونے کا سسٹم نہ ہو اور اُسی ناپاک پانی میں کپڑے دھلتے رہتے ہوں، اُن تمام کپڑوں کو پاک کرنے کے لیے باہر نکال کر صاف پانی میں ایک دو مرتبہ بھگو کر نچوڑنا ہوگا۔

سوال: غیر مسلم دھوبی سے کپڑے دھلوانا یا استری کروانا کیسا ہے؟۔

جواب: اگر اُس کے ہاتھ پاک وصاف ہوں تو غیر مسلم ملازم سے تمام جائز کام لیے جاسکتے ہیں، کپڑے دھلوانے اور استری کروانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال: ناپاک کپڑے پاک کیے بغیر پھینک دینا یا کسی خیراتی ادارے میں دینا کیسا ہے؟۔

جواب: اگر کسی ضرورت مند شخص یا کسی ادارے کو استعمال شدہ کپڑے دینا ہوں تو بہتر صورت یہ ہے کہ کپڑے پاک کرنے کے بعد دیے جائیں۔لیکن اگر ضائع کرنا یا پھینکنا ہی مقصود ہے تو دھونے کی ضرورت نہیں۔کسی ضرورت مند کو دینے ہوں تو احتیاطاً یہ کہہ دیں کہ یہ ناپاک کپڑے ہیں، انہیں استعمال کرنے سے پہلے پاک کرلیا جائے۔

قالین کی طہارت

سوال: قالین کے پاک کرنے کا شرعی طریقہ بیان فرمادیں کہ اکثر اس حوالے سے خلش رہتی ہے کہ آیا قالین پاک ہوگیا یا نہیں؟، (محمد ابدال، سرجانی)

جواب: قالین (Carpet) پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اُس کا ناپاک حصہ ایک بار دھو کر لٹکا دیں، یہاں تک کہ پانی ٹپکنا بند ہوجائے، پھر دوسری اور تیسری مرتبہ بھی اسی طرح کریں، قالین پاک ہوجائے گا۔اس طریقے پر پاک کرنے کے بعد مطمئن رہیں کہ قالین پاک ہوگیا، اُس مقام پر کسی خلش کے بغیر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: ' وَالنَّجَاسَةُ ضَرْبَانِ: مَرْئِيَّةٌ. وَغَيْرُ مَرْئِيَّةٍ فَمَا كَانَ مِنْهَا مَرْئِيًا فَطَهَارَتُهُ زَوَالُ عَيْنِهَا ''۔

ترجمہ: اور نجاست کی دو قسمیں ہیں: (۱) جو نظر آئے (۲) جو نظر نہ آئے، پس جو نجاست نظر آئے تو اس کو زائل کرنا ہی اس کا پاک ہونا ہے۔

اور مزید لکھتے ہیں: ''وَمَا لَیْسَ بِمَرْئِیٍّ فَطَهَارَتُهُ أَنْ يُغْسَلَ حَتّٰى يَغْلِبَ عَلٰى ظَنِّ الْغَاسِلِ أَنَّهُ قَدْ طَهُرَ''۔

ترجمہ: ''اور جو نجاست نظر نہ آئے (یعنی جذب ہوگئی ہو یا خشک ہوگئی ہو) تو اس کو دھویا جائے یہاں تک کہ دھونے والے کا گمانِ غالب یہ ہو کہ وہ چیز پاک ہوگئی، تو یہ اس کی طہارت ہے''۔ (فتح القدیر، ج:1،ص:210)

فتح القدیر میں ہے:

''كَالْحَصِيْرِ مَثَلًا فَإِنَّ اَبَايُوْسُفَ يَقُوْلُ: يُغْسَلُ ثَلَاثًا وَيُجَفَّفُ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ فَيَطْهُرُ لِاَنَّ لِلتَّجْفِيْفِ اَثَرًا فِي اِسْتِخْرَاجٍ فَيَقُوْمُ مقامَ الْعَصْرِ اِذْ لَا طَرِيْقَ سِوَاهُ وَالْحَرَجُ مَوْضُوْعٌ. وَمُحَمَّدٌ يَقُوْلُ: لَا يَطْهُرُ اَبَدًا لِاَنَّ الطَّهَارَةَ بِالْعَصْرِ وَهُوَ مِمَّا لَا يُنْعَصَرُ''

ترجمہ: ''دری یا چٹائی کے متعلق امام ابو یوسف فرماتے ہیں: اس کو تین مرتبہ دھویا جائے گا اور ہر بار سکھایا جائے گا تو یہ پاک ہوجائے گی، کیونکہ خشک کرنے کا اثر نجاست باہر نکالنے میں ظاہر ہے تو یہ نچوڑنے کے قائم مقام ہوگیا، جب کہ اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہ ہو اور حرج درپیش ہو۔ امام محمد فرماتے ہیں کہ کبھی بھی پاک نہیں ہوگی، کیونکہ طہارت نچوڑنے سے حاصل ہوگی اور (دری یا چٹائی) ان چیزوں میں سے ہے جس کو نچوڑا نہیں جاسکتا''۔

(فتح القدیر، ج:1،ص:213)

بدائع الصنائع میں ہے:

''وَإِنْ كَانَ مِمَّا لَا يُمْكِنُ عَصْرُهُ، كَالْحَصِيْرِ الْمُتَّخَذِ مِنَ الْبُوْرِيِّ وَنَحْوِهِ، أَيْ مَا لَا يَنْعَصِرُ بِالْعَصْرِ إِنْ عَلِمَ أَنَّهُ لَمْ يَتَشَرَّبْ فِيهِ، بَلْ أَصَابَ ظَاهِرَهُ يَطْهُرُ بِإِزَالَةِ الْعَيْنِ، أَوْ بِالْغَسْلِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ غَيْرِ عَصْرٍ، فَأَمَّا إِذَا عَلِمَ أَنَّهُ تَشَرَّبَ فِيهِ فَقَدْ قَالَ أَبُوْ يُوْسُفَ: يُنْقَعُ فِي الْمَاءِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، وَيُجَفَّفُ فِي كُلِّ مَرَّةٍ فَيُحْكَمُ بِطَهَارَتِهِ''۔

ترجمہ: ''اور اگر کسی چیز کا نچوڑنا ممکن نہ ہو جیسے دری یا چٹائی (یا صورتِ مسئولہ میں قالین) جو بوری سے بنی ہو یا اس جیسی اور چیزیں جن کو نچوڑا نہ جاسکتا ہو، اگر دھونے والا جانتا ہے کہ

نجاست اس میں جذب نہیں ہوئی بلکہ ظاہر کو لگی ہے تو نجاست کو کھرچ کر دور کرنے سے یا نچوڑے بغیر تین مرتبہ دھونے سے وہ چیز پاک ہوجائے گی۔ پس اگر وہ جانتا ہے کہ نجاست اس چیز میں جذب ہوچکی ہے تو امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ پانی میں تین مرتبہ بھگولیا جائے اور ہر بار خشک کیا جائے تو اس کی طہارت کا حکم دیا جائے گا، (بدائع الصنائع، ج:1، ص:132) آج کل اگر نچوڑنے کے لیے مشین دستیاب ہو جس کے ذریعے دبا کر نچوڑا جاسکتا ہو، تو اس کا استعمال مستحسن ہے۔ یعنی ایک مرتبہ پانی ڈالا، دھویا اور نچوڑا اور گندا پانی نکالا، پھر صاف پانی ڈالا، دھویا اور نچوڑا اور گندا پانی نکالا، پھر تیسری مرتبہ اس کا اعادہ کیا، تو اس سے ہر شبہے کا ازالہ ہوجائے گا۔

دائمی معذور کی نماز اور مسجد میں جانے کا حکم

سوال: ڈاکٹرز نے میرے مثانے میں ٹیومر، جو کینسر کا سبب ہوتا ہے، تشخیص کیا ہے اور مشورہ دیا ہے کہ آپریشن کے ذریعے مثانے کو نکال دیا جائے، ورنہ زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ آپریشن کی صورت میں معدے سے ایک نالی کے ذریعے پلاسٹک بیگ جسم کے باہر جوڑ دیا جائے گا اور معدے سے غیر محسوس طور پر پیشاب رِس رِس کر اُس پلاسٹک بیگ میں آئے گا۔ اُس پلاسٹک بیگ کو دو تین گھنٹے کے بعد خالی کرنا ہوگا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرے وضو اور طہارت کی صورت کیا ہوگی اور اس بیگ کے ساتھ، جس میں پیشاب جمع ہوگا، میرا مسجد میں جا کر باجماعت نماز پڑھنا خلافِ ادب تو نہیں ہوگا۔ ازراہِ کرم شرعی حکم بیان کریں۔

جواب: جو صورت آپ نے بیان کی ہے، اس میں آپ پر شرعی معذور کی تعریف صادق آتی ہے اور وضو و نماز کے لیے رخصت شرعی پر عمل کریں گے۔ ایسا شخص جس کو کوئی ایسی بیماری ہے جس سے وضو زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے، مثلاً پیشاب کے قطرے مسلسل آنے کا مرض یا ریح (ہوا) خارج ہونے یا دکھتی آنکھ سے پانی بہنے یا پھوڑے یا ناسور سے رطوبت یا پیپ بہنے یا کان، ناف اور پستان سے بیماری کی وجہ سے مواد رسنے کا مرض لاحق ہو، ایسا شخص فقہی

اصطلاح میں ''شرعی معذور'' ہے، بشرطیکہ اس کے یہ اَعذار ایک نماز کے پورے وقت کو اس طرح گھیر لیتے ہوں کہ اس عذر کے بغیر وہ ایک وقت کی فرض نماز بھی ادا نہ کرسکتا ہو اور اتنی دیر تک اپنا وضو قائم رکھنے پر قادر نہ ہو کہ ایک وقت کی پوری نماز پڑھ لے۔ لہٰذا بار بار عذر لاحق ہونے کی وجہ سے اُسے شرعاً یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ ہر وقت کی نماز کے لیے تازہ وضو کرے اور اس دوران اس عذر کی وجہ سے پیشاب نکلنے کے باوجود اُس وقت کے فرض، واجب، سنّت کے علاوہ قضا نماز، نوافل اور تلاوت، الغرض جو عبادات ادا کرنا چاہے، کرسکتا ہے۔ لیکن جب دوسری نماز کا وقت آئے تو پھر تازہ وضو کرکے اسی طرح پڑھے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْمُسْتَحَاضَةُ وَمَن بِهٖ سَلَسُ البَوْلِ أَوِاسْتِطْلَاقُ البَطْنِ أَو انفلَاتُ الرِّيحِ أَو رُعَافٌ دَائِمٌ أَو جُرحٌ لَايَرقأ، يَتوضَّؤن لِوقتِ كُلِّ صلاةٍ وَيُصَلّون بِذٰلِك الوضوءِ فِي الوَقتِ مَاشَاءُوْا مِنَ الفَرَائِضِ وَالنَّوافلِ هٰكَذَافِي ''البَحرُالرَّائِق''۔

ترجمہ: ''مستحاضہ (یعنی وہ خاتون جسے حیض ونفاس کے علاوہ رحم سے خون جاری ہونے کی بیماری لاحق ہے) اور جسے پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا مسلسل دست کی بیماری (Diarrhoea) ہو یا مسلسل ریح (یعنی ہوا) خارج ہوتی ہو یا دائمی نکسیر جاری ہو یا زخم مسلسل رِستا رہتا ہو، تو ایسے معذور لوگ ہر نماز کے وقت کے لیے تازہ وضو کریں اور اُس وقت کے اندر فرائض ونوافل جس قدر چاہیں اُسی وضو سے ادا کرلیا کریں، جیسا کہ ''البحرالرائق'' میں ہے۔۔ مزید لکھتے ہیں: وَيَبطُلُ الوُضوءُ عِندَ خُروجِ وقتِ المفروضةِ بِالحدَثِ السَّابِقِ هٰكَذا فِى ''الهدايةِ''۔ ترجمہ: ''دائمی معذور کا وضو سابقہ حدث (ناپاکی) کی وجہ سے فرض نماز کا وقت نکل جانے سے ٹوٹ جاتا ہے، جیسا کہ ''ہدایہ'' میں ہے''، یعنی ہر وقت کی نماز کے لیے تازہ وضو کرنا ہوگا''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص:41)

شرعی معذور پر جماعت کا التزام نہیں ہے، لیکن اگر مذکورہ Urine Bag کپڑوں میں چھپا ہوا ہے اور نظر نہیں آتا کہ لوگوں کو اس سے کراہت محسوس ہو، اسی طرح اس بیگ

سے بد بو بھی نہیں نکلتی اور نماز کے ارکان کی ادائیگی کے وقت مسجد کی تلویث کا احتمال بھی نہیں ہوتا، تو وہ مسجد میں جا کر باجماعت نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن اگر معذوری ایسی ہے کہ مسجد کے نجاست سے آلودہ ہونے کا اندیشہ ہو یا اس کی حالت دوسرے نمازیوں کے لیے کراہت اور نفرت کا سبب بنے تو پھر اسے مسجد میں نہیں آنا چاہیے اور اس کے لیے ہم اس حدیثِ مبارک سے استدلال کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے کچی پیاز، لہسن یا کوئی بد بودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الْبَقْلَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسَاجِدَنَا، حَتّٰى يَذْهَبَ رِيْحُهَا يَعْنِي الثُّوْمَ

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس ترکاری یعنی لہسن کو کھائے، وہ اس وقت تک ہماری مساجد کے قریب نہ آئے، جب تک اُس کے منہ سے بد بو نہ چلی جائے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1136)

ایسے شخص کو مسجد میں آنے سے روکنے کی حکمت لوگوں کو اس کے منہ سے نکلنے والی بد بو کی اذیت سے بچانا ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الْبَقْلَةِ، الثُّوْمِ وَقَالَ مَرَّةً: مَنْ أَكَلَ الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ وَالْكُرَّاثَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَأَذّٰى مِمَّا يَتَأَذّٰى مِنْهُ بَنُوْ آدَمَ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس ترکاری یعنی لہسن کو کھائے اور ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے لہسن، پیاز اور گندنا کھایا ہو،، وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ فرشتوں کو بھی اُن چیزوں سے ایذا پہنچتی ہے، جن سے انسانوں کو ایذا پہنچتی ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1141)

ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو اذیت سے بچانا ضروری ہے، خواہ اس کا سبب کوئی بھی ہو اور یہ اصول زیرِ بحث صورتِ حال پر بھی صادق آتا ہے۔

نماز کے مسائل

عورتوں کی نماز کی ہیئت

سوال:

الحمدللہ کل عمرے سے وطن واپسی ہوئی، ایک سوال دریافت کرنا ہے، کہ پاکستان میں بچپن سے لڑکیوں کو سمٹ کر اور مردوں کو مختلف انداز سے نماز کی تعلیم دی جاتی ہے، مگر جب میں یہاں آئی تو عرب عورتیں مردوں کی طرح نماز ادا کرتی دکھائی دیں۔ مستند احادیث کے حوالے سے وضاحت فرمادیں کہ کون سا طریقہ درست اور احادیث سے ثابت ہے؟،

(رمشا عمر، کراچی)

جواب:

اس موضوع پر ہم تفصیلی فتویٰ جاری کرچکے ہیں، تفہیم المسائل جلد پنجم، جلد ہشتم میں اضافاتِ جدیدہ کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں مختصراً احادیث درج کی جارہی ہیں۔

نماز میں عورتوں کے سجدہ کرنے اور بیٹھنے کا طریقہ اور ہیئت مردوں سے جدا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کی نماز کی ادائیگی کا جو طریقہ ارشاد فرمایا، اُس میں عورت کے سجدہ کرنے کا طریقہ اور صورت مرد کے سجدہ کرنے کی ہیئت سے جدا ہے، ضروری نہیں کہ ہر حدیث صحیح بخاری یا صحاح ستّہ کی کُتب میں موجود ہو۔ اور بھی احادیث کی بہت سی کُتب ہیں، جو اُمّت میں متداول اور مقبول ہیں، پھر یہ اعتقادی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق عبادت کے طریق ادا سے ہے۔ جس کے لیے ضعیف حدیث بھی کافی ہے، مگر یہاں تو متعدد احادیث ہیں، جو ایک دوسرے کے لیے تقویت کا باعث ہیں۔ جیسا کہ درجِ ذیل احادیثِ مبارکہ میں ارشاد فرمایا:

(۱) عَنْ یَزِیْدَبْنِ اَبِیْ حَبِیْبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہ ﷺ مَرَّعَلٰی اِمْرَاَتَیْنِ تُصَلِّیَانِ فَقَالَ اِذَا سَجَدْتُمَا فَضُمَّا بَعْضَ اللَّحْمِ اِلَی الْاَرْضِ فَاِنَّ الْمَرْاَۃَ لَیْسَ فِیْ ذٰلِکَ کَالرَّجُلِ۔

ترجمہ: ''یزید بن ابی حبیب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے

گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کے بعض حصے کو زمین سے لگایا کرو کیونکہ اس میں عورت مرد کی طرح نہیں ہے''۔

(مراسیل ابوداؤد، ص:8)

(۲) علامہ علی متقی بن حسام الدین برہان پوری متوفی 975ھ روایت فرماتے ہیں:

عَنْ ابْنِ عُمَرَ اِذَا جَلَسَتِ الْمَرْاَۃُ فِی الصَّلٰوۃِ وَضَعَتْ فَخِذَ ھَا عَلٰی فَخِذَھَا الْاُخْرٰی فَاِذَا سَجَدَتْ اَلْصَقَتْ بَطْنَھَا فِی فَخِذَیْھَا کَاَ نْ اَسْتَرَمَا یَکُوْنُ لَھَا۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب عورت نماز میں بیٹھے تو اپنی ایک ران دوسری ران پر رکھ لے اور جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں کے ساتھ چمٹائے، اس میں اُس کے ستر کی زیادہ رعایت ہے۔

(کنزالعمال، جلد 7، ص:549، رقم الحدیث:20203، موسسۃ الرسالہ بیروت)

علامہ غلام رسول سعیدی عورتوں کی نماز میں سجدہ کی بابت لکھتے ہیں: عورتوں کی نماز کے طریقہ کے متعلق احادیث اور آثار:

مُحدث امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ نے عورت کی رکوع اور سجدے کی کیفیت اور ہیئت کے بارے میں باقاعدہ باب باندھے ہیں اور عنوان قائم کیے ہیں:

(۱) امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی حضرت وائل بن حجر سے روایت کرتے ہیں:

قَالَ لِی رَسُوْلُ اللہ ﷺ: یَاوَائلَ بنَ حجرٍ اِذَا صَلَّیْتَ فَاجْعَلْ یَدَیْکَ حِذَاءَ اُذُنَیْکَ، وَالْمَرْاَۃُ تَجْعَلُ یَدَیْھَا حِذَاءَ ثَدْیَیْھَا۔

ترجمہ: ''انہوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے وائل بن حجر! جب تم نماز پڑھو تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے کانوں کے مقابل اٹھاؤ اور عورت اپنے ہاتھ اپنے سینہ کے مقابل اٹھائے''۔

(معجم کبیر، جلد 22، ص:19، رقم الحدیث:28، مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ، مجمع الزوائد، جلد 1، ص:103)

(۲) ''عَنْ خَالِدِ بْنِ اللَّجلَاجِ قَالَ: کُنَّ النِسَاءُ یُؤمَرْنَ أن یَتَرَبَّعْنَ اِذَا جَلَسْنَ فِی

الصَّلَاةِ، وَلَا يَجْلِسْنَ جُلُوسَ الرِّجَالِ عَلٰى أَوْرَاكِهِنَّ،

ترجمہ:''خالد بن لجلاج بیان کرتے ہیں کہ عورتوں کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ نماز میں چارزانو (آلتی پالتی مار کر) بیٹھیں اور مردوں کی طرح سرین پر نہ بیٹھیں''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ:2783،مکتبۃ الرشد، ریاض)

(۳)عَنْ نَافِعٍ :أَنَّ صَفِيَّةَ كَانَتْ تُصَلِّيْ وَهِيَ مُتَرَبِّعَةٌ۔

ترجمہ:''نافع بیان کرتے ہیں کہ صفیہ رضی اللہ عنہا نماز میں چارزانو بیٹھتی تھیں''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ:2784،مکتبۃ الرشد، ریاض)

اس حدیث میں جس صفیہ کا ذکر ہے، یہ ابوعبید کی بیٹی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی زوجہ ہیں۔

(۴)عَنْ قَتَادَةَ قَالَ:تَجْلِسُ كَمَا تَرىٰ أَنَّهُ أَيْسَرُ۔

ترجمہ:''قتادہ نے کہا:عورت کو جس طرح آسانی ہو،اس طرح بیٹھے''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ:2803)

(۵)عَنْ نَافِعٍ قَالَ: كُنَّ نِسَاءُ ابْنِ عُمَرَ يَتَرَبَّعْنَ فِي الصَّلَاةِ۔

ترجمہ:''نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ازواج نماز میں چار زانو بیٹھتی تھیں''۔(مصنف ابن ابی شیبہ:2805)

(۶)عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ قَالَ: قُلْتُ لِعَطَاءٍ: أَتَجْلِسُ الْمَرْأَةُ فِي مَثْنٰى عَلٰى شِقِّهَا الْأَيْسَرِ؟، قَالَ: نَعَمْ، قُلْتُ: هُوَأَحَبُّ إِلَيْكَ مِنَ الْأَيْمَنِ؟، قَالَ: نَعَمْ، تَجْتَمِعُ جَالِسَةً مَا اسْتَطَاعَتْ۔

ترجمہ:''ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ میں نے عطا سے پوچھا: کیا عورت دو رکعت کے بعد اپنے بائیں کولہے پر بیٹھے؟، انہوں نے کہا: ہاں! میں نے کہا: کیا یہ ہیئت آپ کے نزدیک دائیں کولہے پر بیٹھنے کی بہ نسبت احسن ہے؟، انہوں نے کہا: ہاں، جس قدر ہو سکے سمٹ کر بیٹھے''۔(مصنف ابن ابی شیبہ:2807،2791،دارالکتب علمیہ، بیروت)

نماز میں عورت کے سجدہ کرنے کا طریقہ

(۱) عَنِ الْحَارِثِ، عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: إِذَا سَجَدَتِ الْمَرْأَةُ فَلْتَحْتَفِزْ، وَلْتَضُمَّ فَخِذَيْهَا۔

ترجمہ: ''حارث بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنے جسم کو سمیٹے اور اپنی رانوں کو (اپنے پیٹ کے ساتھ) ملائے''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: 2793، مجلس علمی، بیروت)

(۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ صَلَاةِ الْمَرْأَةِ؟، فَقَالَ: تَجْتَمِعُ وَتَحْتَفِزُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عورت کی نماز کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: وہ اپنے اعضاء کو جمع کرے اور سمیٹے''۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: 2794، مجلس علمی، بیروت)

(۳) عَنْ اِبْرَاهِيمَ قَالَ: إِذَا سَجَدَتِ الْمَرْأَةُ فَلْتَضُمَّ فَخِذَيْهَا، وَلْتَضَعْ بَطْنَهَا عَلَيْهِمَا۔

ترجمہ: ''ابراہیم نخعی نے کہا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنی رانوں کو ملائے اور اپنا پیٹ ان پر رکھے''۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: 2795، مجلس علمی، بیروت)

(۴) عَنْ اِبْرَاهِيمَ قَالَ: إِذَا سَجَدَتِ الْمَرْأَةُ فَلْتَلْزَقْ بَطْنَهَا بِفَخِذَيْهَا، وَلَا تَرْفَعْ عَجِيزَتَهَا، وَلَا تَجَافَى كَمَا يُجَافِي الرَّجُلُ۔

ترجمہ: ''ابراہیم نے کہا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو اپنی رانوں کے ساتھ ملائے اور اپنے کولہوں کو اوپر نہ اٹھائے اور اپنے پیٹ کو اپنی رانوں سے دور نہ رکھے، جس طرح مرد دور رکھتا ہے''۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: 2798، مجلس علمی، بیروت)، (نعمۃ الباری شرح صحیح البخاری، جلد 2، ص: 754)

فقہی عبارات:

(۱) مُصنف ہدایہ، علامہ ابوالحسن بن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی، (۲) مُصنف بنایہ، علامہ بدرالدین عینی حنفی، (۳) مُصنف مبسوط، علامہ ابو بکر محمد بن احمد السرخسی، (۴) مُصنف المحیط البرہانی، علامہ محمود بن صدر الشریعہ (۵) مُصنف تلخیص الحبیر، علامہ عثمان بن علی زیلعی حنفی (۶) مُصنف تبیین الحقائق، علامہ عثمان بن علی زیلعی حنفی (۷) مُصنف ردالمحتار، علامہ

سید ابن عابدین شامی (۸) مُصنف فتاویٰ عالمگیری، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۹) مُصنف الفقہ الاسلامی، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے اس مسئلے پر فقہی دلائل پیش کیے ہیں۔

اذان کا جواب دینے کا طریقہ

سوال:

اذان کے جواب دینے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ (رفعت محمود، راولپنڈی)

جواب:

حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِذَا أَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ فَقُولُوا مِثْلَ قَوْلِهِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مؤذن کو اذان کہتے ہوئے سنو تو جو وہ کہتا ہے، (اس کی مثل) تم بھی کہو''۔

(سنن ابن ماجہ: 718)

(۲) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ اَللهُ أَكْبَرُ اَللهُ أَكْبَرُ، فَقَالَ أَحَدُكُمْ: اَللهُ أَكْبَرُ، اَللهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ قَالَ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، قَالَ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، ثُمَّ قَالَ: أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ، قَالَ: أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ، ثُمَّ قَالَ: حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، قَالَ: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ، ثُمَّ قَالَ: حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، قَالَ: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ، ثُمَّ قَالَ: اَللهُ أَكْبَرُ اَللهُ أَكْبَرُ، قَالَ: اَللهُ أَكْبَرُ، اَللهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، مِنْ قَلْبِهِ۔ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مؤذن ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' کہے تو تم میں سے کوئی بھی شخص دل سے اس کے جواب میں ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' کہے، پھر مؤذن ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ'' کہے تو وہ بھی ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ'' کہے، پھر مؤذن ''أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ'' کہے تو وہ بھی ''أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ'' کہے، پھر مؤذن ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' کہے تو وہ ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ'' کہے،

پھر مؤذن کہے: ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ'' تو وہ کہے: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ إِلَّا بِاللّٰہِ'' پھر مؤذن کہے: اللہ اکبر اللہ اکبر، تو وہ بھی کہے اللہ اکبر اللہ اکبر، پھر مؤذن کہے: لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ، تو وہ بھی کہے: لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ، تو وہ جنت میں داخل ہوجائے گا، (صحیح مسلم:385)''۔

(۳) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ أَنَّہٗ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا یَقُوْلُ، ثُمَّ صَلُّوْا عَلَیَّ، فَإِنَّہٗ مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ صَلَاۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ بِھَا عَشْرًا، ثُمَّ سَلُوا اللّٰہَ لِیَ الْوَسِیْلَۃَ، فَإِنَّھَا مَنْزِلَۃٌ فِی الْجَنَّۃِ لَا تَنْبَغِیْ إِلَّا لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللّٰہِ، وَأَرْجُوْ أَنْ أَکُوْنَ أَنَا ھُوَ، فَمَنْ سَأَلَ لِیَ الْوَسِیْلَۃَ حَلَّتْ لَہُ الشَّفَاعَۃُ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم مؤذن سے اذان سنو تو اس کی مثل کلمات کہو، پھر مجھ پر درود پڑھو، کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ پھر میرے لیے جنت میں ''مقامِ وسیلہ'' کی دعا مانگو، کیونکہ وہ جنت کا ایک ایسا مقام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف ایک بندہ کو ملے گا اور مجھے امید ہے کہ وہ شخص میں ہوں گا اور جو شخص میرے لیے اس مقام کی دعا مانگے گا، اس کے حق میں میری شفاعت واجب ہوجائے گی''۔ (صحیح مسلم:384)

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَیَجِبُ عَلَی السَّامِعِیْنَ عِنْدَ الْأَذَانِ الْإِجَابَۃُ، وَھِیَ أَنْ یَقُوْلَ مِثْلَ مَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ، إِلَّا فِیْ قَوْلِہٖ حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ، فَإِنَّہٗ یَقُوْلُ مَکَانَ حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ إِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَمَکَانَ قَوْلِہٖ: حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ مَا شَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ، کَذَا فِیْ ''مُحِیْط السَّرَخْسِی''، وَھُوَ الصَّحِیْحُ کَذَا فِیْ ''فَتَاوَی الْغَرَائِبِ'' وَکَذَا فِیْ قَوْلِ الْمُؤَذِّنِ اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، لَا یَقُوْلُ السَّامِعُ مِثْلَہٗ وَلٰکِنْ یَقُوْلُ: صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ کَذَا فِیْ ''مُحِیْط السَّرَخْسِی''۔

ترجمہ: ''سننے والوں پر اذان کا جواب دینا واجب ہے، جو کلمات مؤذن کہتا ہے، جواب

میں وہی کلمات کہے، مگر جب مؤذن ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ'' اور ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ'' کہے تو سننے والا ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ'' کے جواب میں ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ'' کہے اور حی علی الفلاح کے جواب میں کہے: مَاشَاءَ اللّٰہِ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ، محیط سرخسی میں اسی طرح ہے اور یہی صحیح ہے، جیسا کہ فتاویٰ غرائب میں ہے، اسی طرح جب مؤذن ''اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌمِّنَ النَّوْمِ (نماز نیند سے بہتر ہے)'' کہے، تو سننے والا اُس کی مثل نہ کہے، بلکہ ''صَدَقْتَ وَبَرِرْتَ (آپ نے سچ کہا اور اپنی ذمے داری سے بری ہوئے)'' کہے، محیط سرخسی میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد1 ص:57)

ایک سے زائد اذان کا جواب دینا

سوال:

کیا صرف قریبی مسجد سے آنے والی اذان کا جواب دینا کافی ہے؟۔ لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے قریب ودور کی کئی مساجد کی آواز دیر تک آتی رہتی ہے، کیا اُن سب کا جواب دینا ہوگا، (رفعت محمود، راولپنڈی)

جواب:

اگر چند اذانیں سنے، تو اس پر پہلی ہی اذان کا جواب لازم ہے اور بہتر یہ ہے کہ سب کا جواب دے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(أَجَابَ الْأَوَّلَ) سَوَاءٌ كَانَ مُؤَذِّنَ مَسْجِدِهٖ أوغَيْرَهٗ، ''بَحر'' عَنِ ''الْفَتْح'' بَحْثًا، وَيُفِيْدُهُ مَافِي ''الْبَحْرِ'' أَيْضًا عَنِ ''التَّفَارِيْقِ'': (إِذَا كَانَ فِي الْمَسْجِدِ أَكْثَرُمِنْ مُؤَذِّنٍ أَذَّنُوْا وَاحِدًا بَعْدَ وَاحِدٍ فَالْحُرْمَةُ لِلْأَوَّلِ)

ترجمہ: ''(پہلی اذان کا جواب دے) خواہ وہ اس کی مسجد کے مؤذن نے اذان دی ہو یا کسی دوسرے نے۔ ''البحر الرائق'' میں مزید بحث کرتے ہوئے لکھا: جب کسی مسجد میں ایک سے زیادہ مؤذن ہوں، جو یکے بعد دیگرے اذان دیتے ہوں (جیسے مسجد نبوی میں پہلے ہوتا تھا)، تو پہلے مؤذن کی اذان کا احترام کیا جائے''۔ (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد2، ص:622، دمشق)

صلوٰۃ کی اہانت

سوال:

نومبر 2015ء کو میری شادی سید اسعد نقوی کے ہمراہ ہوئی، شادی کے تیسرے دن میں شوہر کے ساتھ ترکی چلی گئی، جو کہ معاش کے سلسلے میں وہاں مقیم ہیں۔ میں صوم وصلوٰۃ کی پابند ہوں، اپنے شوہر کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا، میں نے انہیں نماز پڑھنے کو کہا تو جواب دیا: ''ہمیں کیا ضرورت ہے نماز پڑھنے کی؟، ہم نے تو خود لوگوں کو نماز سکھائی ہے۔ ہم سید ذات ہیں ہمیں جنت میں جانے سے کون روک سکتا ہے، نماز تو منافق پڑھتے ہیں''، کیا ایسے عقائد کے حامل شخص کے ساتھ میرا رہنا جائز ہے؟،

(اریبہ حسن، ناظم آباد 1، کراچی)

والد کا بیان: میں جاوید حسن اریبہ کا والد ہوں۔ میری بیٹی کے سسر نے ایک دن فون پر مجھ سے کہا: ''تم لوگ نماز پڑھتے ہو، مجھے دیکھو میں نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا لیکن میں کہاں ہوں اور تم لوگ کہاں ہو، جو نماز پڑھتے ہیں وہ منافق ہوتے ہیں۔ ہم لوگ نہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی روزہ رکھتے ہیں۔ جناب سے گزارش ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

(جاوید حسن، ناظم آباد 1، کراچی)

جواب:

نماز اسلام کا اہم بنیادی رکن ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(1) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الشِّرْکِ وَالْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ۔

ترجمہ: ''بندے اور کفر کے درمیان فرق نماز کا ترک ہے''۔ (صحیح مسلم: 82)

(2) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْھُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللہ ﷺ: بُنِیَ الْاِسلامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَھَادَۃِ أَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللہِ، وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ، وَاِیتَاءِ الزَّکَاۃِ،

وَالحَجِّ، وَصَومِ رَمضَانَ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، (۱) یہ شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے رسول ہیں (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ ادا کرنا (۴) حج کرنا (۵) اور رمضان کے روزے رکھنا''۔ (صحیح بخاری:8)

(3) عَنْ عَبدِ اللّٰہِ بنِ شَقِیقٍ قَالَ: کَانَ أَصحَابُ رَسُولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لَا یَرَوْنَ شَیْئًا مِنَ الاَعْمَالِ تَرکُہٗ کُفْرٌ غَیرَ الصَّلٰوۃِ۔

ترجمہ:''عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب نماز (کی فرضیت کے انکار) کے علاوہ کسی بھی عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے''۔ (سنن ترمذی:2622)

اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جو شخص نماز کی فرضیت کا انکار کرے، وہ کافر ومرتد ہے۔ کیونکہ نماز کی فرضیت قرآن، سنت اور اجماع کے قطعی دلائل سے ثابت ہے، تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(ھِیَ فَرضُ عَینٍ عَلٰی مُکَلَّفٍ۔۔۔۔ وَیُکَفَّرُ جَاحِدُھَا) لِثُبُوتِھَا بِدَلِیلٍ قَطْعِیٍّ (وَتَارِکُھَا عَمَدًا مَجَانَۃً) أَیْ تَکَاسُلًا فَاسِقٌ (یُحْبَسُ حَتّٰی یُصَلِّیَ) لِاَنَّہٗ یُحْبَسُ لِحَقِّ الْعَبدِ فَحَقُّ الْحَقِّ أَحَقُّ۔ الخ

ترجمہ:''ہر مکلف یعنی عاقل وبالغ مسلمان پر نماز فرض عین ہے، اس کی فرضیت کا منکر کافر ہے، کیونکہ نماز کا ثبوت دلیل قطعی سے ہے اور جو سستی کی بنا پر نماز کو قصداً چھوڑے، وہ فاسق ہے، (جو نماز نہ پڑھتا ہو) اسے قید کیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ نماز پڑھنے لگے، کیونکہ جب بندے کے حق کی وجہ سے قید کیا جاتا ہے تو اللہ کا حق سب سے بڑھ کر ہے، (کہ اس کی نافرمانی پر) اسے قید کیا جائے''۔ (جلد2ص:6,7)

جنت میں داخل ہونے کا مدار نسب پر نہیں ہے، بلکہ ایمان واعمالِ صالحہ پر ہے۔ وہ احادیث جن میں ترکِ نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے، انہیں نماز کی فرضیت کے انکار پر محمول کیا

جائے گا، یعنی جو نماز کی فرضیت کا منکر ہو اس کے کفر پر اجماع ہے، ایسا شخص ملتِ اسلام سے خارج ہے، البتہ جو شخص نماز کی فرضیت کا عقیدہ تو رکھتا ہے لیکن کوتاہی کی بنا پر نماز کا تارک ہے تو وہ ائمۂ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک فاسق ہے۔ حدیث میں جو ترکِ نماز کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں اس سے مراد اعتقاداً ترک کرنا ہوگا، یعنی فرضیت کے انکار یا تارکِ صلوٰۃ کے ظاہر حال کو بیان کیا گیا ہے کہ عملاً اس میں اور ایک کافر میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

سوال میں درج دونوں بیان اگر درست ہیں تو آپ کے شوہر اور سسر کا یہ قول کہ ''نماز تو منافق پڑھتے ہیں، ہمیں کیا ضرورت ہے نماز پڑھنے کی ہم تو سید ذات ہیں، ہمیں جنت میں جانے سے کون روک سکتا ہے، نماز تو ہم نے لوگوں کو سکھائی ہے، وغیرہ''، اس میں اگرچہ نماز کی فرضیت کا صراحۃً انکار نہیں ہے، لیکن نماز کی فرضیت کا انکار اس سے یقیناً لازم آتا ہے نیز ان کے ان کلمات میں نماز کا واضح استخفاف ہے، اہانت ہے، اسے شعار منافقین قرار دیا گیا ہے، لہٰذا فقہی اعتبار سے یہ کفر ہے۔ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

وَفِی ''الْفَتْحِ'' مَنْ هَزَلَ بِلَفْظِ كُفْرٍ ارتَدّ، وَاِنْ لَمْ يَعْتَقِدْهُ لِلِاسْتَخْفَافِ فَهُوَ كَكُفْرِ العِنَادِ۔

ترجمہ: '''' فتح القدیر'' میں ہے: جس نے بطور استہزاء اور خوش طبعی کے کفریہ الفاظ کہے، اگرچہ اُس کا اعتقاد نہ ہو، تخفیف کے سبب وہ مرتد ہوگیا، یہ کفرِ عنادی کی مانند ہے''۔

(جلد6،ص:270)

شوہر کے ارتداد کی وجہ سے بیوی نکاح سے نکل گئی، اس لیے عدت گزارنے کے بعد عورت دوسرے مرد سے نکاح کرسکتی ہے۔ آپ کے شوہر پر لازم ہے کہ ان کلمات سے توبہ کریں اور تجدیدِ ایمان کریں اور تجدیدِ نکاح بھی کریں۔

نمازوں کی قضا

سوال:

مجھے قضا نمازوں کی ادائیگی کے اوقات کے بارے میں آگاہ کردیں اور قضا نمازوں کی ادائیگی کی نیت دن کا نام لے کر کرسکتے ہیں کیا (فلاں دن اور فلاں وقت کی نماز) اور بہت عرصہ گزر جانے کے بعد قضا شدہ نمازوں کی ادائیگی کا خیال آئے اور یاد نہ ہو کہ کتنی نمازیں کس کس وقت کی قضا ہوئیں تو اس صورت میں کیا نیت ہوگی؟ اِس مسئلے کے بارے میں کیا احکامات ہیں؟ (ایس بتول، کراچی)۔

جواب:

انسان کے عاقل وبالغ ہونے کے بعد پانچ وقت کی نماز اس پر فرض ہوجاتی ہے۔ان میں سے جو نمازیں وہ وقت پر ادا نہیں کرسکا، وہ سب اس کے ذمے باقی ہیں اوران سب کی قضا لازم ہے۔قضا پڑھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اپنی اس غفلت اور کوتاہی پر توبہ کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ ایک بھی فرض نماز کسی عذر کے بغیر جان بوجھ کر چھوڑ دینا گناہِ کبیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝

ترجمہ:''پس اُن نمازیوں کے لیے خرابی ہے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ (الماعون:5)

حدیث پاک میں ہے: ''جو نمازوں کی پابندی نہیں کرے گا تو (نماز) اس کے لیے (آخرت کی ظلمتوں میں) نور اور (حساب کے موقع پر) برہان اور وسیلۂ نجات نہیں بنے گی''۔(سنن دارمی:2721)

پانچوں فرض نمازوں کی قضا فرض اور وتر کی قضا واجب ہے،سنتوں کی قضا واجب نہیں بلکہ سنت ہے،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَالْقَضَاءُ فَرْضٌ فِي الْفَرْضِ وَوَاجِبٌ فِي الْوَاجِبِ وَسُنَّةٌ فِي السُّنَّةِ ۔

ترجمہ:''فرض (نماز) کی قضا فرض ہے اور واجب کی قضا واجب ہے اور سنت کی قضا سنت

ہے(یعنی واجب نہیں ہے)۔(عالمگیری،جلد:1،ص:121)

قضا نمازوں کی ادائیگی فرض ہے،غزوۂ احزاب میں کفارِ مکہ کے ساتھ مسلسل حالت جنگ کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام چند نمازیں وقت پر ادا نہ کرسکے،تو رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے ساتھ قضا نمازوں کو باجماعت ادا فرمایا۔عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں:

اِنَّ الْمُشْرِکِیْنَ شَغَلُوْا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَنْ أَربعِ صَلواتٍ یومَ الْخَنْدَقِ،حَتّٰی ذَهَبَ مِنَ اللَّیْلِ مَاشَاءَ اللهُ: فَأَمَرَ بِلَالًا فَاَذَّنَ،ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّی الظُّهْرَ،ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّی الْعَصْرَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّی الْمَغْرِبَ،ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّی الْعِشَاءَ۔

ترجمہ:''غزوۂ خندق کے دن رسول اللہ ﷺ مشرکین (کے محاصرے) کے سبب چار نمازیں (بروقت) ادا نہ کرسکے، یہاں تک کہ رات کا کچھ حصہ گزر گیا۔پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، اُنہوں نے اذان دی اور پھر اقامت کہی تو، رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی، پھر اقامت کہی تو عصر کی نماز پڑھائی پھر اقامت کہی تو مغرب کی نماز پڑھائی، پھر اقامت کہی تو عشاء کی نماز پڑھائی''۔

(سُنن ترمذی،رقم الحدیث:179)

اس حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ تین نمازیں (ظہر،عصر،مغرب) قضا ہوچکی تھیں اور عشاء کی نماز مستحب وقت سے مؤخر ہوچکی تھی، کیونکہ عشاء کی نماز کا مستحب وقت رات کی پہلی تہائی ہے، ایسا شخص پہلے قضاء شدہ نمازیں پڑھے اور پھر وقتی نماز پڑھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔فقہائے کرام نے بتایا ہے کہ جس شخص کی مسلسل چھ نمازیں قضا نہ ہوئی ہوں، وہ صاحبِ ترتیب ہے۔ظاہر بات ہے کہ نسیان کی صورت میں نماز کا وقت نکل بھی سکتا ہے اور اسی کو قضا کہتے ہیں، اس سے بادی النظر میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاید نسیان کی بنا پر تاخیر یا قضا کی صورت میں اللہ تعالیٰ مواخذہ نہیں فرمائے گا۔

(۲) مَنْ نَسِیَ صَلٰوةً فَلْیُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا، لَا كَفَّارَةَ لَهَا اِلَّا ذَالِكَ

ترجمہ: جس کی نماز بھولے سے رہ جائے تو جیسے ہی اسے یاد آئے پڑھ لے، اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے (صحیح بخاری: 597)"۔ یاد آتے ہی پڑھنے کا حکم قضا پر ہی محمول ہوگا۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

وَمَنْ شَغَلَتْ ذِمَّتُهُ بِأَيِّ تَكْلِيْفٍ لَا تَبْرَأُ إِلَّا بِتَفْرِيْغِهَا أَدَاءً أَوْ قَضَاءً، لِقَوْلِهِ ﷺ: "فَدَيْنُ اللهِ اَحَقُّ اَنْ يُّقْضٰى"، فَمَنْ وَجَبَتْ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ، وَفَاتَتْهُ بِفَوَاتِ الْوَقْتِ الْمُخَصَّصِ لَهَا، لَزِمَهُ قَضَاؤُهَا فَهُوَ اٰثِمٌ بِتَرْكِهَا عَمْدًا، وَالْقَضَاءُ عَلَيْهِ وَاجِبٌ، لِقَوْلِهِ ﷺ: فَاِذَا رَقَدَ اَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ اَوْ غَفَلَ عَنْهَا، فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا، فَاِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ: "وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ، (طٰہٰ: ۲۰/۱۴) وَلِلْبُخَارِيِّ: "مَنْ نَسِيَ صَلٰوةً فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا، لَا كَفَّارَةَ لَهَا اِلَّا ذٰلِكَ" وَمَجْمُوْعُ الْحَدِيْثِ الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ بَيْنَ الْبُخَارِيِّ وَمُسْلِمٍ: "مَنْ نَامَ عَنْ صَلٰوةٍ أَوْ نَسِيَهَا فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا" فَمَنْ فَاتَتْهُ الصَّلٰوةُ لِنَوْمٍ أَوْ نِسْيَانٍ قَضَاهَا، وَبِالْأَوْلٰى مَنْ فَاتَتْهُ عَمْدًا بِتَقْصِيْرٍ يَجِبُ عَلَيْهِ قَضَاؤُهَا۔

ترجمہ: "کسی بھی مشکل کے سبب دینی فریضہ بروقت ادا نہ کرسکے تو جب تک ادا یا قضا کی صورت میں ادائے فرض نہ کرے، آخرت کی جوابدہی سے بری الذمہ نہیں ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے فَدَيْنُ اللهِ اَحَقُّ اَنْ يُّقْضٰى، (ترجمہ: "اللہ کا قرض (یعنی فریضہ) ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے، صحیح بخاری: 1953)، تو جس پر نماز فرض ہے اگر اُس نے اُسے مقررہ وقت پر ادا نہ کی ہو تو اس پر اس کی قضا لازم ہے اور دانستہ ترک کرنے پر گنہگار ہوگا اور اس پر قضا بہر حال واجب ہوگی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: فَاِذَا رَقَدَ اَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ اَوْ غَفَلَ عَنْهَا، فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا، فَاِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ: "وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ، طٰہٰ: 14" ترجمہ: پس جب تم میں سے کسی کی نماز سوتے میں یا غفلت سے رہ جائے تو جب بھی یاد آئے ادا کرلے، کیونکہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے: "اور میری یاد کے لیے نماز قائم کیجیے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1454)"۔

اور بخاری ومسلم کی متفق علیہ حدیث میں ہے کہ جو نماز کے وقت سو گیا یا بھول گیا تو جب یاد آئے تو اُسے پڑھ لے۔تو جس کی نماز نیند یا غفلت کی وجہ سے فوت ہوجائے تو وہ اس کی قضا کرے اور جس کی نماز قصداً فوت ہوجائے تو اُس پر اس کی قضا واجب ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج:2،ص:1148)۔یعنی سوتے رہنے سے نماز قضا ہوجائے تو نیند سے بیدار ہوتے ہی، وضو کرکے نماز پڑھ لے، بشرطیکہ مکروہ تحریمی وقت نہ ہو۔نیند میں مسلسل غافل رہنے سے اگر بیدار ہوتے ہی نماز پڑھ لے تو امید ہے کہ اس پر قضا کرنے کے گناہ کا وبال نہیں ہوگا، لیکن اگر نیند کے دوران ایک بار بیدار ہوگیا اور پھر نیند کی غفلت میں چلا گیا تو پھر یقیناً گنہگار ہوگا۔

قضا نمازیں مکروہ اوقات (طلوعِ آفتاب کے بعد احتیاطاً بیس منٹ تک، نصف النہار شرعی (زوال) اور غروبِ آفتاب سے قبل کے بیس منٹ) کے علاوہ جب بھی فرصت ملے، ادا کرتے رہنا چاہیے اور ہر وقت کی نماز کے ساتھ یعنی وقتی نماز سے پہلے یا بعد میں اس وقت کی نماز کی کم از کم ایک قضا پڑھ لیں اور نیت اس طرح کریں مثلاً فجر یا ظہر یا عصر یا مغرب یا عشاء اور وتر کی پہلی یا آخری نماز جو میرے ذمے باقی ہے، اُسے بطور قضا ادا کرتا ہوں۔نیت زبانی کرنا ضروری نہیں ہے، دل میں ارادہ کافی ہے۔اگر کوئی یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قضا نماز کے بارے میں واضح تاکیدات نہیں ہیں، تو اُس کا سبب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابۂ کرام کے بارے میں ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ عذر شرعی کے بغیر دانستہ نماز قضا کردیتے ہوں، جن دو صورتوں (یعنی نیند یا غفلت) کا بشری تقاضے کے تحت وقوع کا امکان تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کا حکم مذکورہ بالا احادیث میں واضح طور پر بیان فرمادیا۔اور ایک صورت (یعنی حالتِ جنگ میں دشمن کا محاصرہ) جو خود آپ کو صحابۂ کرام سمیت غزوۂ خندق میں پیش آئی، تو اُس میں آپ نے قضا نماز باجماعت پڑھی، لہٰذا خود آپ کے عمل سے قضا نماز پڑھنا ثابت ہے۔حالتِ جنگ پر اور بھی ایسی صورتوں کو قیاس کرسکتے ہیں جہاں کسی خوف یا خطرے سے اتنی بھی فرصت نہ ملے

کہ اُس وقت کی فرض نماز ادا کی جاسکے۔

مسجد کے عملے کی رہائش مصالحِ مسجد میں سے ہے

سوال:

میں ٹنڈو الله یار میں محکمۂ اوقاف کی مسجد میں گریڈ 6 میں امام ہوں، ماہانہ مشاہرہ 12000 روپے اور رہائش اوقاف کی طرف سے ہے، یہ رہائش امام کی ملکیت نہیں ہے۔ مسجد میں جمعۃ المبارک کا چندہ بھی جمع ہوتا ہے۔ امام کی رہائش گاہ میں تعمیری کام کی ضرورت ہے، کیا یہ تعمیری کام مسجد کے چندے سے ہوسکتا ہے؟۔ پہلے بھی تعمیراتی کام مسجد عطیات سے ہوتے رہے ہیں۔ (محمد ضیاء الحق، مرکزی عیدگاہ ضلع ٹنڈو الہیار سندھ)

جواب:

امامت کا منصب چونکہ کل وقتی ہے، کسی بھی وقت امام کی خدمات کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اس لیے مساجد کے ساتھ عملے کے مکانات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہمارے ہاں عرف عام میں بھی اسے لازم وملزوم سمجھا جاتا ہے۔ فقیہ العصر علامہ محمد نور الله نعیمی (فتاویٰ نوریہ جلد 1 ص: 184) لکھتے ہیں: ''تکمیل تعمیر کے بعد ضروریات مسجد میں سے امام اول نمبر میں ہے کیونکہ مسجد کی صرف ظاہری تعمیر کا کوئی اعتبار نہیں جب تک کہ اس کی معنوی اور حقیقی تعمیر نہ ہو حتیٰ کہ مسجد کے لیے روشنی پانی وغیرہ کے وسیع تر انتظام سے امام کی ضروریات مقدم ہیں''۔

مسجد کی جمع شدہ رقم مالِ وقف ہے، جو صرف مصارفِ مسجد مثلاً مسجد کے عملے کا مشاہرہ اور ضروریات ومصالح مسجد کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ مسجد کے عطیات صدقاتِ نافلہ ہوتے ہیں۔ آج کل مساجد کے لیے عوام سے جو عمومی چندہ یا عطیات لیے جاتے ہیں، ان میں یہ امر معروف ہے کہ یہ مسجد کے مصارف جاریہ کے لیے ہیں، ان میں مساجد کی تعمیر ومرمت، یوٹیلٹی بلز (بجلی، لاؤڈ اسپیکر، گیس اور پانی وغیرہ) ضرورت کے وقت رنگ وروغن، دریاں، قالین، ٹیوب لائٹس، پنکھے، پانی وسیوریج کا انتظام اور مسجد کے عملے کی تنخواہیں اور دیگر مصارف شامل ہوتے ہیں، البتہ جو رقم تعمیر یا کسی معینہ مصرف کے لیے دی جائے یا لی

جائے، اسے صرف اسی معیّن مصرف پر خرچ کرنا ضروری ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ثُمَّ اِلیٰ مَاھُوَ اَقْرَبُ اِلَی الْعِمَارَۃِ وَاَعَمُّ لِلْمَصْلَحَۃِ کَالْاِمَامِ لِلْمَسْجِدِ وَالْمُدَرِّسُ لِلْمَدْرَسَۃِ یُصْرَفُ اِلَیْھِمْ بِقَدْرِ کِفَایَتِھِمْ ثُمَّ السِّرَاجُ وَالْبُسُطُ کَذٰلِکَ اِلیٰ اٰخِرِ الْمَصَالِحِ، ھٰذَا اِذَا لَمْ یَکُنْ مُعَیَّنًا، فَاِنْ کَانَ الْوَقْفُ مُعَیَّنًا عَلیٰ شَیْئٍ یُصْرَفُ اِلَیْہِ بَعْدَ عِمَارَۃِ الْبِنَائِ کَذَا فِی الْحَاوِی الْقُدْسِیِّ

ترجمہ: ''پھر وقف کے مال کو اُن امور پر ضرورت کے مطابق خرچ کیا جائے، جن سے مسجد کی زیادہ آباد کاری ہو اور مسجد کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہوں جیسے مسجد کے لیے امام اور مدرسے کے لیے مُدَرِّس جن پر اس قدر رقم خرچ کی جائے جو ان کی ضروریات کے لیے کفایت کرے، پھر چراغ (یعنی روشنی) اور دَریوں وچٹائیوں کا انتظام اور اسی طرح دوسری مفید چیزیں۔ وقف کے مال کو خرچ کرنے میں یہ (وسعت) اس صورت میں ہے کہ اس کا مصرف (واقف کی طرف سے) مُعَیَّن نہ ہو، لیکن اگر وقف کا مَصرف (واقف کی طرف سے) مُعَیَّن ہے تو عمارت کی تعمیر کے بعد اسی مصرف پر صرف کیا جائے گا ''الحاوی القدسی'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 368، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

ہماری رائے میں مسجد کے ضروری عملے کے مکانات بھی مصالح مسجد میں شامل ہیں، مصالح سے مراد وہ اُمور یا اشیاء جو تعمیر مسجد کے مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہوں یا مُمِد ومعاون ہوں اور ان میں سہولت کا سبب بنیں۔ آج کل مسجد کو دیے جانے والے عطیات میں یہ معروف ہے۔

وضو خانے اور استنجا خانے کے لیے بالعموم معین طور پر الگ چندہ نہیں لیا جاتا اور مسجد کے عمومی فنڈ سے یہ کام انجام پاتے ہیں۔ اب مساجد میں بالعموم ٹوائلٹ بھی بنائے جارہے ہیں، کیونکہ صفائی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے۔ شاہراہوں پر سرِ راہ جو مساجد ہیں یا شہروں کی مساجد میں اجنبی نمازیوں کے لیے یہ ضرورت بن گئی ہے۔ اسی طرح

امام وخطیب اور خدّام کی رہائش گاہوں کا مسئلہ ہے۔انتظامیہ کو چاہیے کہ شرعی احتیاط کے پیشِ نظر چندے کی رسید پر لکھ دیا کریں: ''مسجد سے متعلق جملہ مصارف کے لیے'' اور اعلان بھی اسی طرح کیا کریں۔ ہاں! جو عطیات کسی خاص مد میں لیے جائیں، اُنہیں انہی مدات پر خرچ کیا جائے۔علامہ نور اللہ بصیر پوری کے فتوے میں ''معنوی تعمیر'' سے یہی مراد ہے کہ مسجد کی عمارت ہی مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ اس کو عبادت گزاروں سے آباد کرنا اور اس مقصد کے لیے سہولتیں فراہم کرنا بھی مقاصدِ تعمیر میں شامل ہے۔اسی لیے مُفسرین کرام نے سورۂ توبہ آیت:18 میں ''عِمَارَةُ الْمَسْجِدِ'' کو اسی عموم میں لیا ہے۔علامہ محمد طاہر پٹنی لکھتے ہیں: ''عَمَرَ الْمنزلَ وَعَمَرَ الْمَنْزِلَ'' کے معنیٰ ہیں: گھر بسانا اور آباد کرنا''۔

(مجمع بحار الانوار، جلد 2، ص:678)

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: ''عمارۃ مسجد کے دو معنیٰ ہیں: (۱) مسجد میں کثرت سے آنا اور مسجد کو لازم پکڑ لینا (۲) مسجد کو بنانا اور اس کی تعمیر کرنا، (تفسیر کبیر، جلد 6، ص:9)''۔ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں: ''بعض مُفسرین نے عمارت مسجد سے مراد مسجد میں آنا اور عبادت کے لیے بیٹھنا مراد لیا ہے، امام احمد، امام ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم دیکھو کہ ایک شخص مسجد (عبادت کے ذریعے) آباد رکھتا ہے، تو اس کے ایمان کی شہادت دو اور پھر اس آیت (توبہ:18) کا حوالہ دیا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''عمارت مسجد سے مراد یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ عبادت کی جائے، ذکر الٰہی اور قرآن کی تعلیم و تعلُّم کا سلسلہ جاری ہو۔

(تفسیر مظہری، جلد 4، ص:147-146)

یہ امر واضح ہے کہ مسجد کے عملے کے مکانات و دیگر متعلقات مسجد کے عمومی وقف کا حصہ ہوتے ہیں، امام وخطیب کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتے اور وہ اُن سے اسی وقت تک استفادہ کرنے کے مُجاز ہوتے ہیں، جب تک وہ اس منصب پر فائز ہیں اور یہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

نوٹ: جامع مسجد مصطفیٰ KBR بفرزون کراچی کی انتظامیہ نے نماز سے متعلق چند سوالات ارسال کیے ہیں، جو سوال وجواب کی صورت میں درجِ ذیل ہیں:

نماز کی نیت اور تکبیرِ تحریمہ کا طریقہ

سوال:

ایک شخص نماز کی نیت کرتے وقت شرعی تقاضے پورے نہیں کرتا، یعنی اُس کی انگلی و ہتھیلی کا رُخ کعبہ کی طرف نہیں ہوتا، تو ایسے شخص کا نماز ادا کرنا کیسا ہے۔

(انتظامیہ جامع مسجد مصطفیٰ، KBR بفرزون کراچی)

جواب:

نیت دل کے ارادے کا نام ہے، زبان سے نیت کے کلمات، جو ہمارے ہاں معروف ہیں، کا ادا کرنا نہ حدیث سے ثابت ہے، نہ شرعاً ضروری ہے، ہمارے متاخرین فقہاء کرام نے حضورِ ذہنی (Presence of Mind) کے لیے زبانی نیت کو مستحب قرار دیا ہے۔
تکبیر نماز کا رُکنِ اول ہے اور فرض ہے۔ نماز کی نیت سے اللہ اکبر کہنے سے انسان نماز میں داخل ہو جاتا ہے، اسے تکبیرِ تحریمہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اُمور (مثلاً کلام وطعام وغیرہ) جو نماز میں داخل ہونے سے پہلے حلال تھے، اب وہ نماز سے فراغت تک حرام ہو گئے ہیں، نماز کے اندر رکوع میں جانے، سجدہ میں جانے اور اٹھنے کے لیے جو تکبیرات کہی جاتی ہیں، اُنہیں تکبیراتِ انتقال کہتے ہیں، یہ تکبیرات سُنّت ہیں، اگر بھولے سے رہ جائیں تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جاتی ہے، البتہ جان بوجھ کر نہیں چھوڑنی چاہییں، اِس سے ترکِ سنت لازم آئے گا اور نماز کے اجر میں کمی واقع ہو گی۔

نیت کرتے وقت تکبیرِ تحریمہ کے لیے ہاتھ اٹھانا اور ہتھیلی اور انگلیوں کا پیٹ قبلہ رُو ہونا نماز کی سنتوں میں سے ہے اور سنت یہ ہے کہ ہاتھوں کی انگلیاں اپنے حال پر چھوڑ دے یعنی نہ بالکل ملائے اور نہ بہ تکلف کشادہ رکھے بلکہ اپنے حال پر چھوڑ دے۔ اس کا ترک خلافِ سنت ہے، لیکن نماز ادا ہو جائے گی۔ بلکہ اگر بھول کر کوئی شخص تکبیرِ تحریمہ کے لیے

ہاتھ نہ اٹھائے تو اُس کی نماز بھی درست ہوگی، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:
وَلَو كَبَّرَ وَلَم يَرفَعْ يَدَيهِ حَتّى فَرَغَ مِنَ التَّكبِيرِ لَم يَأتِ بِهٖ وَاِنْ ذَكَرَهٗ فِي اِثْنَاءِ التَّكبِيرِ يَرفَعُ

ترجمہ: ''اگر تکبیر کہہ لی اور (بھول کر) ہاتھ نہ اٹھائے یہاں تک کہ تکبیر پوری کہہ لی تو اب ہاتھ نہ اٹھائے اور اگر تکبیر پوری کہنے سے پہلے یاد آ گیا تو ہاتھ اٹھالے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:73)

بے وضو شخص کی اذان کا حکم

سوال:

اگر مؤذن بغیر وضو اذان پڑھتا ہے تو کیسا ہے؟۔

جواب:

بغیر وضو اذان نہ دی جائے، حدیث پاک میں ہے: لَایُؤَذِّنُ اِلَّا مُتَوَضِّیءٌ۔
ترجمہ: ''کوئی شخص بغیر وضو اذان نہ دے''۔ (سنن ترمذی:200)
(۲) لَایُنَادِی بِالصَّلَاۃِ اِلَّا مُتَوَضِّیءٌ۔
ترجمہ: ''کوئی مؤذن نماز کے لیے بغیر وضو نہ پکارے''۔ (سنن ترمذی:201)
تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: (وَیُکْرَہُ أَذَانُ جُنُبٍ وَاقامتُہٗ وَاِقَامَۃُ مُحدِثٍ لَاأذانُہٗ) عَلَی الْمَذھَبِ۔

ترجمہ: ''جُنُب کی اذان اور اقامت مکروہ ہے اور صحیح مذہب کے مطابق بے وضو کا اقامت کہنا مکروہ ہے، (عند الضرورت) اذان مکروہ نہیں ہے، (جلد 2، ص:605، دمشق)''۔ لیکن بے وضو اذان دینے کو عادت بنالینا بہر حال قابلِ ملامت وقابلِ مذمت ہے، کیونکہ حدیث پاک میں اس سے منع فرمایا گیا ہے۔

نماز کے بعد امام کے بیٹھنے کی ہیئت

سوال:

امام کا نماز ختم ہوتے ہی دعا سے پہلے مُصَلّٰی پر اپنی پیٹھ قبلے کی طرف کر کے بیٹھنا کیسا ہے اوراس کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟۔

جواب:

فرض نماز سے سلام پھیرنے کے بعد سنت یہ ہے کہ امام دائیں یا بائیں کو انحراف کرے، دائیں طرف افضل ہے۔اگر سامنے کوئی شخص نماز نہ پڑھ رہا ہوتو قبلے کی طرف پیٹھ اور مقتدیوں کی جانب منہ کر کے بھی بیٹھ سکتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا صَلّٰی صَلٰوةً اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ۔

ترجمہ:''حضرت سَمُرَہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب نماز پڑھ لیتے تو ہماری طرف منہ کر کے بیٹھتے''۔(صحیح بخاری:845)

نماز پڑھانے کے بعد امام پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ کسی ایک جانب مڑ کر بیٹھے، وہ دائیں طرف بھی مڑ کر بیٹھ سکتا ہے اور بائیں طرف بھی اور قبلے کی طرف پیٹھ کر کے بھی بیٹھ سکتا ہے۔

وَكَانَ اَنَسٌ يَنْفَتِلُ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ يَسَارِهٖ وَيَعِيبُ عَلٰى مَن يَتَوَخّٰى، أَو مَنْ يَعْمِدُ الْاِنْفِتَالَ عَنْ يَمِيْنِهٖ۔

ترجمہ:''حضرت انس رضی اللہ عنہ(نماز کے بعد) کبھی دائیں طرف مڑ کر بیٹھتے تھے اور کبھی بائیں طرف اور جو دائیں طرف مڑنے کا التزام کرتا،اس کو ناپسند کرتے تھے''۔

(صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الانفتال والانصراف عن الیمین والشمال)

حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا:

لَا يَجْعَلْ أَحَدُكُم لِلشَّيْطَانِ شَيْئًا مِن صَلَاتِهٖ يَرَى أَنَّ حَقًّا عَلَيْهِ أَن لَا يَنْصَرِفَ اِلَّا عَنْ يَمِيْنِهٖ، لَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ كَثِيْرًا يَنْصَرِفُ عَنْ يَسَارِهٖ۔

ترجمہ:''تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کا کوئی حصہ نہ بنائے ، یعنی وہ یہ نظریہ رکھتا ہو کہ اُس پر دائیں طرف مڑ کر بیٹھنا لازم ہے، کیونکہ میں نے بہت دفعہ نبی ﷺ کو بائیں طرف مڑتے ہوئے دیکھا ہے''۔(صحیح بخاری:852)

اس حدیث مبارک کے ان الفاظ،'' کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام پھیرنے کے بعد اکثر بائیں جانب مڑتے ہوئے دیکھا''، کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی ایک رُخ پر مُڑنے کا التزام نہیں فرماتے تھے، بلکہ اپنی سہولت کے مطابق کسی ایک جانب رخ پھیر لیتے تھے۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہ العزیز سے سوال کیا گیا:'' نماز کے بعد چاروں جہات میں سے کسی ایک جانب رُخ کر کے دعا کرنا درست ہے یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا:''جہتِ قبلہ ہر جگہ افضل ہے، مگر امام کے لیے (نہیں) کہ بعد سلام اُسے قبلہ رُو رہنا مکروہ ہے، دائیں یا بائیں پھر جائے یا (قبلے کی جانب پشت کر کے) مقتدیوں کی طرف منہ کر لے، اگر سامنے کوئی نماز نہ پڑھتا ہو''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص:190، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نماز میں سلام پھیرتے وقت ''السلام علیکم'' کہنا چاہیے

سوال:

نماز میں سلام پھیرتے وقت السلام علیکم کہنا چاہیے یا سلام علیکم کہنا ٹھیک ہے؟۔

جواب:

سلام کے الفاظ کہنا واجب ہیں اور دونوں طرف چہرہ پھیرنا سنت ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يُسَلِّمُ عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ يَسَارِهِ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ (نماز کے اختتام پر) دائیں اور بائیں جانب سلام پھیرتے اور فرماتے: السلام علیکم و رحمۃ اللہ''۔ امام ترمذی نے کہا:

مُتعدد صحابۂ کرام سے اس عنوان پر روایات منقول ہیں''۔(سُنن ترمذی:295)

عَنْ عَبْدِاللهِ أَنَّهُ كَانَ يُسَلِّمُ عَنْ يَمِيْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ خَدِّهِ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نماز کے اختتام پر) دائیں اور بائیں جانب سلام پھیرتے، یہاں تک کہ (آپ کے اطراف میں صف میں بیٹھے ہوئے صحابۂ کرام کو) آپ کے رخسارِ مبارک کی سفیدی بھی نظر آتی (اور فرماتے:) اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ، (سُنن ابن ماجہ:914)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

(وَلَفظ اَلسَّلَامُ) مَرَّتَيْنِ، فَالثَّانِي وَاجِب عَلَى الْأَصَحِّ، بُرهَان''، دُوْنَ عَلَيْكُمْ، وَتنقَضِي قُدْوَةٌ بِالْأَوَّلِ قَبلَ ''عَلَيْكُم'' عَلَى الْمَشْهُورِ عِنْدَنَا

ترجمہ:''اور لفظ''السلام'' دو مرتبہ کہنا واجب ہے، یہی قول صحیح ترین ہے، بحوالہ''برہان شرح مواہب الرحمٰن''۔ لفظ''علیکم'' کہنا واجب نہیں ہے اور امام کی نماز پہلے لفظ پر (یعنی ''السلام'' کہنے سے) مکمل ہو جاتی ہے، صاحبین کے نزدیک یہی مشہور قول ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا: بعض نے لفظ''السلام'' کو سنّت کہا ہے''۔(جلد2،ص:143)

ہمارے فقہاءِ کرام نے نماز کے ارکان بیان کرتے ہوئے آخر میں کہا:''اور نمازی کا اپنے کسی ایسے فعل کے ذریعے جو نماز کے منافی ہو، نماز سے خارج ہونا''۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أَيْ بِصنْعِ الْمُصَلِّيْ أَيْ فِعلِهِ الْاِخْتِيَارِيِّ بِأَيِّ وَجهٍ كَانَ مِنْ قَولٍ أَوفِعلٍ يُنَافِي الصَّلَاةَ بعدَ تَمَامِهَا كَمَا فِي ''الْبَحرِ'' وَذٰلِكَ بِأَن يُّبْنِيَ عَلٰى صَلَاتِهٖ صَلَاةً مَا فرضًا أونفلًا، أَوْيَضْحَكَ قَهْقَهَةً، أَوْيُحْدِثَ عَمدًا، أَوْيَتَكَلَّمَ أَوْيَذْهَبَ أَويُسَلِّمَ، ''تاتارخانية''۔

ترجمہ:''یعنی نمازی کا تکمیلِ نماز پر اپنے اختیار سے قولاً یا فعلاً ایسا کام کرنا، جو نماز کے منافی ہو، جیسا کہ''البحر الرائق'' میں ہے اور یہ اٹھ کر کسی دوسرے فرض یا نفل کی نیت کرنے کی

صورت میں بھی ہوسکتا ہے یا قہقہہ لگانا یا دانستہ بے وضو ہوجانا یا کلام کرنا یا اُٹھ کر چلے جانا یا سلام کرنا، بحوالہ ''تتارخانیہ''، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد:1، ص:121، داراحیاء التراث العربی)''۔ مگر قہقہہ وغیرہ کو تنویر الابصار مع الدرالمختار میں مکروہ تحریمی قرار دیا گیا ہے، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اِتباع میں ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰه'' دائیں بائیں رُخ کر کے کہنا چاہیے اور بعض علماء نے اسے سنّت اور بعض نے واجب کہا ہے۔ نماز کے اندر قہقہہ ناقض وضو بھی ہے۔

امام کا اقامت سے پہلے مصلّٰی پر بیٹھنا ضروری نہیں ہے

سوال:

امام کو جماعت سے کتنی دیر قبل مصلے پر بیٹھنا افضل ہے، امام کا پیچھے بیٹھ کر باتیں کرنا کیسا ہے؟۔ امام کا فجر میں جماعت سے ایک منٹ قبل یا اس سے بھی کم وقت میں آنا پھر سنت جلدی جلدی ادا کرنا اور جماعت تاخیر سے کرانا کیسا عمل ہے؟۔

جواب:

اقامت کے وقت امام کا مصلے پر موجود ہونا کوئی ضروری نہیں، نہ ہی افضلیت کا کوئی معیار اِس سے قائم ہوگا۔ صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا گیا: ''امام مصلّٰی پر نہیں ہے، مسجد کے صحن میں کھڑا یا بیٹھا ہے یا بیرونِ مسجد حجرہ میں ہے اور مکبّر نے اقامت شروع کردی، یہ جائز ہے یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''تکبیر شروع کردینا جائز ہے اور یہی طریقہ زمانۂ رسالت میں تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجرہ میں ہوتے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ تکبیر کہہ دیا کرتے تھے، اقامت کے وقت امام کا مصلّٰی پر ہونا نہ واجب، نہ سنّت، نہ مستحب، مُصلّٰی پر ہو یا نہ ہو دونوں برابر''۔ (فتاویٰ امجدیہ جلد 1، ص:67)

لہٰذا خود سے شریعت میں اضافہ کرنا درست نہیں ہے کہ اقامت سے پہلے امام سے مُصلّٰی پر بیٹھنے کا تقاضا کیا جائے۔ مسجد میں دنیاوی غیر ضروری گفتگو کرنا منع ہے، ہاں شرعی مسائل وغیرہ سمجھانے کی لیے کسی سے گفتگو کررہا ہے تو جائز ہے، لیکن اس کے لیے بھی بہتر یہ

ہے کہ علیحدہ سے نشست رکھے۔

جماعت کے وقت کی تعیین شارع کی طرف سے نہیں ہے، بندوں نے اپنی آسانی کے لیے اوقات مقرر کیے ہیں، لیکن یہ شریعت کی بیان کی ہوئی ابتدائی وانتہائی مُقررہ حد کے اندر ہونے چاہییں۔ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صرف نماز کے ابتدائے وقت اور انتہائے وقت کی نشاندہی فرمائی ہے اور مستحب وقت کو بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا۝

ترجمہ: ''بے شک ایمان والوں پر نماز وقت مقررہ میں فرض کی گئی ہیں''۔ (نساء:103)

امام پنج وقتہ نماز پڑھانے کا پابند ہے، اُسے وقت کی پابندی کرنی چاہیے، جماعت کا وقت ہونے سے پہلے سکون ووقار کے ساتھ سنت ادا کرنی چاہییں۔

امام کا سنتِ غیر مؤکَّدہ کا التزام نہ کرنا

سوال:

کیا امام کے لیے غیر مؤکدہ سنت پڑھنا منع ہے، چونکہ یہ حضرات پڑھتے ہوئے نظر نہیں آتے، بلکہ عشاء کی نماز تو مستقل طور پر گیارہ یا تیرہ رکعت بھی ہمیشہ پڑھنا ایک امام کے لیے کیسا عمل ہے؟۔

جواب:

نمازِ عشاء کی ابتدائی چار رکعات سنتِ غیر مؤکدہ ہیں اور چار رکعت فرض کے بعد دو رکعات سنّت مؤکدہ ہیں اور تین رکعات وتر واجب ہے۔ بعض سنّتیں مؤکدہ ہیں جن کی ادائیگی کی تاکید آئی ہے، بغیر کسی عذر کے چھوڑنے پر گنہگار اور ترک کی عادت پر مستحقِ عذاب ہے۔ سنتِ غیرِ مُؤکَّدہ (جنہیں ''سنن زوائد'' بھی کہتے ہیں) پر شریعت میں اس قدر تاکید نہیں آئی، تاہم سُنَنِ غیر مُؤکّدہ اور نوافل پڑھنے پر جو اجر اور برکات ہیں، وہ اُسی کو عطا ہوں گی، جسے پڑھنے کی سعادت نصیب ہوگی۔

ایسے علماء ومفتیان کرام جو دین کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں اور لوگ

اُن کی جانب رجوع کرتے ہیں، اُنہیں کثرتِ مشاغل کے سبب سنتیں ادا نہ کرنے کی رخصت ہے، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

وَلَایَجُوزُ تَرکُهَا لِعَالِمٍ صَارَ مَرجِعًا فِی الفتاوٰی بخلافِ بَاقِی السُّنَن فَلَهُ تَرکُهَا لِحَاجَةِ النَّاس اِلٰی فَتوَاہ

ترجمہ: ''فجر کی دو رکعات سنت کا ترک کرنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی عالم مرجع فتویٰ ہو کہ لوگوں کی حاجت کے سبب فتویٰ دینے میں اُسے سنت پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، تو (نمازِ فجر کی سنت کے علاوہ) باقی سنتیں ترک کرسکتا ہے''۔ (جلد 4، ص: 265، دمشق)

آپ نے لکھا: ''یہ حضرات پڑھتے ہوئے نظر نہیں آتے''، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام ائمہ کے بارے میں آپ نے بدگمانی کی کہ سنتیں نہیں پڑھتے، شریعت میں مومن کے بارے میں حسنِ ظن رکھنے کی تلقین کی گئی ہے، ممکن ہے کہ مذکورہ امام صاحب اپنے گھر میں پڑھتے ہوں۔ سنتوں اور نوافل کا گھر پر پڑھنا بہتر ہے۔ احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) فَاِنَّ خَیرَصَلَاةِ الْمَرْءِ فِیْ بَیتِهٖ اِلَّا الصَّلَاةَ الْمَکْتُوبَةَ۔

ترجمہ: ''فرض نمازوں کے سوا (کہ اُن کا مسجد میں باجماعت پڑھنا افضل ہے) بہترین نماز وہ ہے، جو کوئی شخص اپنے گھر میں پڑھتا ہے''۔ (سُنن ابوداؤد: 1442)

(۲) اِجْعَلُوْا فِیْ بُیُوتِکُمْ مِنْ صَلَاتِکُمْ، وَلَاتَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا۔

ترجمہ: ''اپنی (نفلی) نمازیں اپنے گھروں میں بھی پڑھا کرو اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ (کہ گھروں میں نمازیں بالکل نہ پڑھی جائیں)''۔ (سُنن ابوداؤد: 1445)

(۳) اَفْضَلُ صَلَاتِکُمْ فِیْ بُیُوتِکُمْ اِلَّا الْمَکْتُوبَةَ۔

ترجمہ: ''فرض نمازوں کے علاوہ نفلی نماز کا گھر میں پڑھنا افضل ہے''۔ (سُنن ترمذی: 450)

(۴) اِذَا قَضٰی اَحَدُکُمُ الصَّلَاةَ فِیْ مَسجِدِهٖ، فَلْیَجعَل لِبَیتِهٖ نَصِیبًا مِنْ صَلَاتِهٖ، فَاِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ فِیْ بَیتِهٖ مِن صَلَاتِهٖ خَیرًا۔

ترجمہ: ''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں فرض) نماز پڑھ لے تو اپنی نماز کا ایک حصہ اپنے

گھر کے لیے رکھ لے، اللہ تعالیٰ اس کی نماز کے سبب سے اس کے گھر میں خیر رکھنے والا ہے''۔ (صحیح مسلم:1791)

آپ نوافل اور سُنّتِ غیر مؤکّدہ نہ پڑھنے پر کسی کو ملامت نہیں کر سکتے، البتہ پڑھنے والے کی تحسین کرنا اچھی بات ہے، آج کل ایک اخلاقی بیماری اپنی بڑائی اور پارسائی کے زعم میں مبتلا ہونے کی ہے، اس کے لیے دوسروں کے عیوب تلاش کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَا تُزَكُّوٓا أَنفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰٓ

ترجمہ: ''سو تم اپنی پارسائی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ متّقین کو خوب جانتا ہے''۔ (نجم:32)

حدیث پاک میں ہے:

(۱) وَلَا تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِهِم، فَإِنَّهُ مَن تَتَبَّعَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسلِمِ تَتَبَّعَ اللهُ عَوْرَتَهُ،

ترجمہ: ''مسلمانوں کے پوشیدہ احوال کا سراغ نہ لگاؤ، کیونکہ جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ دری کے درپے ہوگا، اللہ اس کی پردہ دری فرمائے گا''۔ (سُنن ترمذی:2032)

(۲) مَنْ سَتَرَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ، سَتَرَ اللهُ عَوْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ وَمَنْ كَشَفَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ، كَشَفَ اللهُ عَوْرَتَهُ حَتّٰى يَفْضَحَهُ بِهَا فِي بَيْتِهِ۔

ترجمہ: ''جو اپنے مسلمان بھائی (کے عیوب) پر پردہ ڈالے گا، اللہ تعالیٰ (اس کی جزا میں) قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا اور جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ دری کرے گا، اللہ اس کا پردہ فاش فرمائے گا، یہاں تک کہ اسے اس کے گھر میں رسوا کر دے گا۔

(سُنَنِ ابن ماجہ:2546)

ہمیں اپنی اصلاح پر توجہ دینی چاہیے، دوسروں کی پردہ پوشی اچھی بات ہے، سوائے اس کے کہ کسی کی بدعملی اتنی ظاہر و باہر ہو کہ اس کے شر سے پورا معاشرہ متاثر ہو رہا ہو۔ بہادر شاہ ظفر نے کہا ہے:

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

عادی طور پر ہیر پھیر کا مرتکب ہونا

سوال: ایک ایسا شخص جو جھوٹ، دھوکا، بددیانتی اور پیسے کے ہیر پھیر کا مرتکب ہوا ہو، لوگوں کے سامنے توبہ کر کے آئندہ ان حرکتوں کو ترک کرنے کا وعدہ بھی کرے، پھر اگلے روز انہی حرکتوں کا ارتکاب کرے تو کیا ایسا شخص مؤذن بن سکتا ہے، اُس کے پیچھے تراویح پڑھی جاسکتی ہیں۔(انتظامیہ جامع مسجد محمدی، ناتھا خان گوٹھ)

جواب:

سچائی، دیانت وامانت مومن کی صفات بھی ہیں اور تعلیماتِ مصطفیٰ ﷺ کا منشا بھی۔ دین سے وابستہ افراد کو تو ان کمالات سے مُتصف ہونا ہی چاہیے۔حدیث پاک میں ہے:

قِيْلَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا، فَقَالَ: نَعَمْ، فَقِيْلَ لَهُ: أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ بَخِيْلاً، فَقَالَ: نَعَمْ، فَقِيْلَ لَهُ: أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا، فَقَالَ: لَا۔

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہاں، پھر پوچھا گیا کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، پھر پوچھا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے، فرمایا: نہیں، (موطا امام مالک:3630، شعب الایمان، جلد 10، ص: 326، رقم الحدیث: 4622)''۔اسی طرح کسی کو دھوکا دینا شرعاً حرام اور ناجائز ہے، حدیث مبارک میں اِس کی شناعت کو یہ بیان فرمایا:

مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا۔

ترجمہ:''جس نے ہمیں دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں''۔(صحیح مسلم:279)

کثیر آیاتِ قرآنِ کریم واحادیثِ مبارکہ دیانت وامانت اور ایفائے عہد کے وجوب کے بارے میں موجود ہیں۔اگر آپ کا بیان درست ہے کہ سوال میں ایک شخص کے ایسے رذیل خصائل بیان کیے گئے ہیں، جو فسق کے ذیل میں آتے ہیں، مثلاً جھوٹ، خیانت،

دھوکا دہی وغیرہ اور پھر توبہ کر کے بار بار ان کا اعادہ کرنا، ان عادات کا مرتکب فاسق ہے، تاوقتیکہ سچی توبہ کرے اور آئندہ ان حرکات سے اجتناب کرے۔ فاسق کو مسجد میں باقاعدہ مؤذن مقرر کرنا درست نہیں ہے۔ فاسق کی اذان کے بارے میں فقہی احکام یہ ہیں:

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''وَیُکْرَہُ اَذَانُ الْفَاسِقِ وَلَا یُعَادُ، ھٰکَذَا فِی ''الذخیرۃ''، وَکرہ اَذَانُ الْجُنُبِ وِاقَامَتُہٗ بِاِتِّفَاقِ الرِّوَایَاتِ وَالْاَشْبَہُ اَنْ یُّعَادَ الْاَذَانُ وَلَا تُعَادَالاقامۃ''۔

ترجمہ: ''فاسق کی اذان مکروہ ہے اور اس کا اعادہ نہیں کیا جائے گا، ''ذخیرہ'' میں اسی طرح ہے اور جنبی (یعنی جس پر غسل واجب ہے) کی اذان واقامت بہ اتفاقِ روایات (فقہی) مکروہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اذان کا اعادہ کیا جائے اور اقامت کا اعادہ نہ کیا جائے''۔

(عالمگیری، ج:1 ص:54)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَیُکْرَہُ اَذَانُ جُنُبٍ وَاِقَامَتُہٗ وَاِقَامَۃُ مُحدِثٍ، لا اذانہ عَلَی الْمَذھَب وَاَذَانُ اَمْرَأۃٍ وَخُنْثٰی و (فَاسِقٍ) وَلو عَالِمًا، لٰکِنَّہٗ اَولٰی بِاِمامۃٍ وَاذانٍ من جَاھِلٍ تَقِیٍّ''۔

ترجمہ: ''جُنب کی اذان واقامت اور بے وضو کی ''اقامت'' مکروہ ہے، مذہب مختار کے مطابق بے وضو کی اذان مکروہ نہیں ہے، اور عورت، خُنثیٰ اور فاسق کی اذان مکروہ ہے، خواہ وہ عالم ہو، لیکن (اگر امامت کا صحیح اہل دستیاب نہ ہوتو) جاہل متقی کے مقابلے میں فاسق عالم اذان واقامت کا زیادہ حق دار ہے''۔

(حاشیہ ابن عابدین، جزء:2 ص:606، دار الثقافۃ والتراث، دمشق)

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فاسق کو مستقل امام بنایا جائے، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کہیں باجماعت نماز کا موقعہ آجائے اور جملہ فقہی شرائط کا اہل امام دستیاب نہ ہوتو جاہل متقی کی بجائے فاسق عالم کو امامت میں ترجیح دی جائے۔

اسی طرح جس امام سے مقتدی دینی وجوہ کی بنا پر ناراض ہو، اس کو امام مقرر کرنا

درست نہیں ہے۔تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

(وَلَوأَمَّ قومًا وَهُمْ لهٗ كَارِهُون، اِنَّ) الْكَرَاهَةَ (لِفَسَادٍ فِيهِ أَوْ لِاَنَّهُم أَحَقُّ بِالإِمَامَةِ مِنهُ كُرِهَ) لهٗ ذٰلِكَ تَحرِيمًا لحديثِ أبي داوٗدَ'' لايقبَلُ اللهُ صَلاَةَ من تَقَدَّمَ قومًا وهُمْ لهٗ كارهون'' (وإن هو اَحَقُّ، لا) والكراهةُ عليهم۔

ترجمہ:''اگر کسی شخص نے کسی ایسی قوم کی امامت کی جو اُسے (کسی دینی خرابی کے سبب) ناپسند کرتے ہیں یا اس لیے کہ وہ اس کے مقابلے میں (شرعی اعتبار سے) امامت کے زیادہ حق دار ہیں، تو سنن ابوداؤد کی حدیث کی رُو سے اُس کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔

سنن ابوداؤد کی حدیث یہ ہے:

''اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں فرماتا جو کسی ایسی قوم کی امامت کے لیے آگے بڑھے جو اسے ناپسند کرتے ہوں''۔(سنن ابوداؤد:589)

اور اگر وہ شخص (شریعت کی رُو سے) امامت کا زیادہ حق دار ہے، تو اس کی امامت مکروہ نہیں ہے اور کسی شرعی سبب کے بغیر امام سے نفرت کا وبال مقتدیوں پر ہوگا''۔

(جلد2،ص:254مطبوعہ:داراحیاء التراث العربی، بیروت)

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ مؤذن نے ان غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور توبہ کرنے کے بعد پھر اُن کا ارتکاب کر رہا ہے، تو اُس کو منصب سے ہٹایا جاسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْإِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ، اَللّٰهُمَّ أَرْشِدِ الْأَئِمَّةَ وَاغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِيْنَ۔

ترجمہ:''امام (مقتدیوں کی نماز کا) ضامن ہے اور مؤذن (اوقات صلوٰۃ کے شروع ہونے کا اعلان کرنے میں) امین ہے، اے اللہ! اماموں کو ہدایت عطا فرما اور مؤذنوں کی مغفرت فرما''۔(سُنن ترمذی:207)

بشری کمزوریاں تو سب میں ہوتی ہیں اور مُتنبّہ کر کے ان کو اصلاح کا موقع دینا چاہیے۔لیکن جب کوئی ان اخلاقی جرائم پر جری ہوجائے، تو اس کا مؤذن اور امامِ تراویح

کے منصب پر برقرار رکھنا ان مَناصِب کے شرعی وقار کے منافی ہے۔

مسجد سے نمازیوں کو روکنے کا حکم

سوال:

جامع مسجد الفلاح (کونکر گڈاپ ٹاؤن ملیر) میں نمازِ باجماعت کے دوران چند افراد مسجد کے گیٹ پر کھڑے ہوکر نمازیوں کو جماعت میں شامل ہونے سے روکتے ہیں، جماعت ختم ہوتے ہی مسجد کے ایک کونے میں اپنی الگ جماعت کرتے ہیں۔کیا اس طرح نمازیوں کو روکنا، عمداً جماعت میں شامل نہ ہونا اور علیحدہ جماعت کرانا شرعاً جائز ہے؟

(محمد رمضان گبول، خطیب وامام مسجد الفلاح، کونکر گڈاپ ٹاؤن، ضلع ملیر، کراچی)

جواب:

سورۃ القلم آیت نمبر:12 میں ایک دشمنِ رسول کی مذموم صفات میں ایک صفت ''مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ'' بیان کی گئی ہے، جس کے معنی ہیں: ''نیکی سے بہت زیادہ روکنے والا''۔اور ارشاد فرمایا: اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى ۙ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ؕ﴿۱۰﴾ ترجمہ: ''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے (ہمارے) بندے کو جب وہ نماز پڑھے''۔(العلق:10-9)

محلے کی مساجد میں جہاں امام مقرر ہو، امام نے اذان واقامت کے ساتھ مسنون طریقے پر جماعت ادا کرلی ہو تو اذان واقامت کے ساتھ ہیئتِ اولیٰ پر دوبارہ جماعت قائم کرنا مکروہ ہے، شارعِ عام کی مساجد، اسٹیشنز اور سرائے کی مساجد اِس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

وَيُكْرَهُ تَكْرَارُ الْجَمَاعَةِ بِأَذَانٍ وَإِقَامَةٍ فِي مَسْجِدِ مَحَلَّةٍ، لَا فِي مَسْجِدِ طَرِيقٍ أو مسجدٍ لَا إِمَامَ لَهُ وَلَا مُؤَذِّنَ۔

ترجمہ: ''محلہ کی مسجد میں اذان واقامت کے ساتھ جماعت کی تکرار مکروہ ہے، مگر شارعِ عام کی مسجد اور وہ مسجد جہاں امام ومؤذن مقرر نہ ہوں''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''(قوله باذان واقامة)۔۔۔ یکرہُ تکرارُ الجماعَةِ فِیْ مَسْجِدِ مَحَلَّةٍ بأذانٍ واقامةٍ، اِلّااِذَا صَلّٰی بھما فیه أوّلاًغیرُ أھلهٖ، أو أھلُهٗ لٰکِنْ بِمُخَافَتَةِ الاَذَانِ، وَلَو کَرَّرَ أھلُهٗ بِدُوْنِھِمَا، أَوْکَانَ مَسْجِدَ طرِیقٍ جَازَاِجْمَاعًا کَمَافِیْ مَسْجِدٍ لَیْسَ لَهٗ اِمَامٌ وَلَا مُؤذِنٌ وَیُصَلِّی النَّاسُ فِیْهِ فوجًا فوجًا، فَاِنَّ الاَفْضَلَ أَنْ یُصَلِّیَ کُلُّ فَرِیْقٍ بِأَذَانٍ وَاِقَامَةٍ عَلٰی حِدَةٍ کمافی ''أمالی قاضی خان''۔

ترجمہ:'' محلہ کی مسجد میں اذان واقامت کے ساتھ جماعت کی تکرار مکروہ ہے، مگر جب کہ پہلے غیر مقامی باشندوں نے اذان واقامت کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی ہو یا مقامی باشندوں نے چپکے سے اذان دے کر پڑھی ہو۔ مقامی باشندوں کا اذان واقامت کے بغیر یا شارع عام کی مسجد ہے، تو اجماعاً جماعت کی تکرار جائز ہے جیسا کہ ایسی مسجد جہاں امام ومؤذن مقرر نہیں اور لوگ جوق دَر جوق اُس میں نماز پڑھتے ہوں، ان کے لیے افضل یہ ہے کہ ہر فریق نئی اذان واقامت سے جماعت کرے، جیسا کہ ''امالی قاضی خان'' میں ہے''۔ (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد3، ص:503، دمشق)

اس سے مراد یہ ہے کہ بعض لوگ یا مسافر کسی مسجد میں ضرورتاً جلد باجماعت اذان و اقامت کے ساتھ نماز پڑھ کر اپنے کام کے لیے نکل جاتے ہیں، اسے مستقل شعار بنانا درست نہیں ہے کیونکہ ایسا عام طور پر انتشار پسند لوگ کرتے ہیں تاکہ لوگ مختلف الخیال ہو جائیں اور یہ مقصد جماعت کے منافی ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْمَسجِدُ اِذَاکَانَ لَهٗ اِمَامٌ مَعْلُومٌ وَجَمَاعَةٌ مَعلُومَةٌ فِیْ مَحَلَّةٍ، فَصَلّٰی اھلُهٗ فِیهِ بِالجَمَاعَةِ، لَایُبَاحُ تکرَارُھَا فِیهِ بِاَذَانٍ ثَانٍ، أَمااِذَاصَلّوابِغَیْرِاَذَانٍ یُبَاحُ اِجْمَاعًا۔

ترجمہ:'' محلہ کی مسجد میں جہاں امام اور جماعت مقرر ہوں، پس جب مقامی لوگوں نے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرلی تو اب اذانِ ثانی کے ساتھ اُس مسجد میں جماعت کی تکرار جائز نہیں ہے، پس اگر اذانِ ثانی کے بغیر پڑھی تو بالاتفاق جائز ہے''۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

وَفِی ''الْاَصْلِ'' لِلصَّدرِ الشَّھِیدِ اَمَّا اِذَا صَلَّوا بِجَمَاعَۃٍ بِغَیرِ اَذَانٍ وَاِقَامَۃٍ فِی نَاحِیَۃِ الْمَسجِدِ لَایُکرَہُ۔

ترجمہ: ''صدرالشہید کی ''اصل'' میں ہے کہ اگر اذان واقامت کے بغیر مسجد کے ایک گوشے میں جماعت قائم کی ہو تو کراہت نہیں ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:83)

شیخ حافظ الدین محمد بن محمد بن شہاب المعروف ابن بزاز کردری حنفی لکھتے ہیں:

عَنِ الثَّانِیْ اِذَالَمْ یَکُنْ عَلَی الْھَیْئَۃِ الْاُوْلٰی لَایُکْرَہُ وَاِلَّا فَیُکْرَہُ وَھُوَ الصَّحِیْحُ وَبِالْعُدُوْلِ عَنِ الْمِحْرَابِ تَخْتَلِفُ الْھَیْئَۃُ۔

ترجمہ: ''اور امام ابو یوسف سے منقول ہے کہ جماعتِ ثانی جب ہیئتِ اولیٰ پر نہ ہو، تو مکروہ نہیں ہے اور اگر ہیئتِ اولیٰ پر ہے تو مکروہ ہے اور یہی صحیح ہے اور محراب سے ہٹ کر پڑھنے سے ہیئت بدل جاتی ہے''۔ (فتاویٰ بزازیہ بھامش الہندیہ، جلد 4، ص:56)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''عَنْ أَبِی یُوسُفَ'': أَنَّہُ اِذَالَمْ تَکُنِ الْجَمَاعَۃُ عَلَی الْھَیْئَۃِ الْاُوْلٰی لَاتُکْرَہُ، وَاِلَّا تُکْرَہُ، وَھُوَالصَّحِیْحُ وَبِالْعُدُوْلِ عَنِ الْمِحْرَابِ تَخْتَلِفُ الْھَیْئَۃُ، کَذَافِی ''الْبَزَّازِیَّۃ''۔

ترجمہ: ''امام ابو یوسف کے نزدیک جب جماعت (ثانی) ہیئتِ اولیٰ پر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے، اگر ہیئتِ اولیٰ پر ہو تو مکروہ ہے، یہی صحیح ہے اور محراب سے ہٹ کر جماعت کھڑی کرنے سے ہیئت بدل جاتی ہے، ''فتاویٰ بزازیہ'' میں اسی طرح ہے''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 3، ص:505، دمشق)

مقاصدِ شرعیہ میں سے ایک سدِّ ذرائع، دفعِ فساد اور حفظِ امن ہے۔ اسی حکمت کے تحت ہمارے فقہائے کرام نے ایک محلے کی مسجد میں جہاں اذان وباجماعت نماز کا باقاعدہ اہتمام موجود ہے اور امام مُقرر ہے، تکرارِ جماعت کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے، کیونکہ ایسا کرنے والے بالعموم انتشار وفساد کی نیت سے کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کو تقسیم کرنے اور گروہ بندی کے لیے ایسا کرتے ہیں، یہ خوارج کا شِعار رہا ہے اور اِسی لیے امیر المومنین حضرت علی رضی

اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا تھا: ''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ''یعنی حکم تو اللہ ہی کا چلے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور حق ہے، لیکن خوارج اس کلمۂ حق کو باطل مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں، اس لیے آپ نے ان کے خلاف جہاد کیا اور اُن کی سرکوبی کی۔ آپ کے سوال سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ اسی فتنہ پرور گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ فقہائے کرام نے با قاعدہ جماعت کی ہیئتِ اولیٰ سے ہٹ کر جو جماعت کی اجازت دی ہے، یہ اس پر محمول ہے کہ کبھی اتفاقاً کچھ لوگوں کی نماز رہ گئی ہو تو وہ جماعت کا ثواب حاصل کرنے کے لیے پیچھے ہٹ کر با جماعت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ گیٹ پر کھڑے ہو کر لوگوں کو با قاعدہ جماعت میں شریک نہ ہونے کی ترغیب دیں اور خود بھی شریک نہ ہوں، تو یہ فتنہ انگیزی ہے، فساد اور بے امنی کے اسباب پیدا کرنا ہے اور ان کو روکنا ضروری ہے۔ اگر مقامی آبادی کے شُرفاء کے سمجھانے سے باز آجائیں تو فبہا ورنہ انتظامیہ کی مدد لی جائے۔

چنانچہ ایسی ہی صورتِ حال کی بابت امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا: ''اگر کسی نمازی کے ذریعہ حفظِ امن میں خلل واقع ہوتا ہو اور شر و فساد کا اندیشہ ہو یا عام نمازیوں کو کسی قسم کی تکلیف اور اذیت پہنچتی ہو تو ایسے شخص کو بغرضِ حفظِ امن و انسدادِ شر و فساد جماعت سے روک دینا کیا شرع کے خلاف ہے؟''۔ آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''ہاں! شرعاً حکم ہے کہ ایسے لوگ مسجد سے باز رکھے جائیں، قال اللہ تعالیٰ: ''اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انہیں مساجد میں داخل نہیں ہونا چاہیے مگر ڈرتے ہوئے۔ درمختار میں ہے: ''یُمْنَعُ مِنْہُ کُلُّ مُؤْذٍ وَلَوْ بِلِسَانِہٖ (ترجمہ: ''ہر ایذا دینے والے کو مسجد سے روکا جائے گا اگرچہ وہ زبان سے ایذا پہنچائے)۔ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں زیرِ حدیث فَلَا یَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا (وہ ہرگز ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئیں) پھر ردالمحتار میں ہے: وَالْحِقَ بِالْحَدِیْثِ کُلُّ مَنْ اٰذَی النَّاسَ بِلِسَانِہٖ وَبِہٖ اَفْتٰی ابْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا وَھُوَ اَصْلٌ فِیْ نَفْیِ کُلِّ مَنْ یَّتَاَذّٰی بِہٖ۔

ترجمہ: ''اس مخالفت کے حکم میں وہ شخص بھی شامل ہے جو زبان سے لوگوں کو ایذا پہنچاتا ہے

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اسی پر فتویٰ دیا اور یہ ہر اس چیز کی نفی میں اصل ہے جس سے لوگوں کو ایذا ہوتی ہے۔ مگر طریقۂ تحفظ کا لحاظ ضروری ہے اگر خود منع کرنے میں اندیشۂ فساد ہو، چارہ جوئی کر کے بند کرادیں''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد16 ،ص:413-412)

اعلیٰ حضرت کی اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ مسجد کی انتظامیہ ایسی حکمت اور تدبیر اختیار کرے، جس سے مسجد میں شور وشغب نہ ہو اور فساد نہ ہو، اگر اس سے فتنہ دفع نہ ہو تو قانونی چارہ جوئی کے ذریعے اِس کا سدّ باب کریں۔

نمازِ چاشت واشراق کے اوقات

سوال:

نمازِ اشراق اور چاشت کس وقت تک پڑھی جاسکتی ہے؟

(شکیل الرحمٰن، بفرزون کراچی)

جواب:

فرض نمازوں کی ادائیگی سے عہدہ برا ہونے کے بعد بندوں کا نوافل یا اذکار وتسبیحات ودرود میں مشغول رہنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور فرشتے ایسے خوش نصیب بندوں کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، حدیث پاک میں ہے:

(1) ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ''الْمَلَائِكَةُ تُصَلِّي عَلَى أَحَدِكُمْ مَا دَامَ فِي مُصَلَّاهُ الَّذِي صَلَّى فِيهِ، مَا لَمْ يُحْدِثْ، تَقُولُ: اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، اللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: تم میں سے جب تک کوئی نمازی فرض نماز پڑھ کر اپنی جگہ پر بیٹھا رہے تو فرشتے اس کے لیے اس وقت تک مغفرت کی دعا کرتے ہیں، جب تک کہ وہ بے وضو نہ ہو جائے، فرشتوں کی دعا کے کلمات یہ ہیں: اے اللہ! اس کی مغفرت فرما، اے اللہ! اس پر رحم فرما'' (صحیح البخاری:445)

(2) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

لَا يَزَالُ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاةٍ مَا دَامَ يَنْتَظِرُهَا، وَلَا تَزَالُ الْمَلَائِكَةُ تُصَلِّي عَلَى أَحَدِكُمْ مَا دَامَ فِي الْمَسْجِدِ، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، اللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ، مَا لَمْ يُحْدِثْ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ حَضْرَمَوْتَ: وَمَا الْحَدَثُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ قَالَ: فُسَاءٌ أَوْ ضُرَاطٌ

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تک تم میں سے کوئی شخص (مسجد میں) نماز کے انتظار میں (بیٹھا) رہتا ہے، وہ ایسا ہی ہے جیسے نماز میں مشغول ہے اور تم میں سے کوئی شخص (فرض نماز سے فراغت کے بعد) جب تک مسجد میں بیٹھا رہتا ہے، جب تک کہ وہ بے وضو نہ ہو، فرشتے مسلسل اس کے لیے اِن الفاظ میں دعا کرتے رہتے ہیں: ''اے اللہ! اس کی بخشش فرما، اے اللہ! اس پر رحم فرما''، حضرموت سے آئے ہوئے ایک شخص نے عرض کی: اے ابوہریرہ! بے وضو ہونے سے کیا مراد ہے، انہوں نے جواب دیا: آواز سے یا بغیر آواز کے ریح کا خارج ہوجانا''۔

(سنن ترمذی:330)

ان دونوں احادیثِ مبارکہ سے مستفاد یہ ہے کہ مسجد میں آکر کوئی نمازی جتنی دیر باوضو بیٹھ کر جماعت کا انتظار کرتا ہے یا جماعت سے فراغت کے بعد جتنی دیر اپنی نماز کی جگہ پر وضو قائم رکھتے ہوئے بیٹھا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا جماعت سے پہلے اور بعد کا یہ سارا وقت نماز ہی میں محسوب ہوتا ہے، یعنی اُسے اس پورے وقت کے لیے نماز ہی کا اجر ملتا ہے۔

نمازِ اشراق کا اول وقت وہ ہے، جب سورج ایک نیزہ کی مقدار بلند ہوجائے اور طلوعِ آفتاب کے بعد بیس منٹ گزر جائیں اور آخری وقت وہ ہوتا ہے، جب چاشت کی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے، اس لیے چاشت کی نماز اس وقت پڑھنی چاہیے، جب سورج خوب گرم اور سفید ہوجاتا ہے۔ چاشت کا وقت نصف النہار شرعی (عرفِ عام میں زوال کا وقت) تک ہے اور بہتر چوتھائی دن کے حصے میں ادا کرنا ہے۔ حدیث پاک میں ہے۔

(1) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ صَلَّى الْغَدَاةَ فِي

جَمَاعَةٍ، ثُمَّ قَعَدَ يَذْكُرُ اللهَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ كَانَتْ لَهُ كَأَجْرِ حَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: تَامَّةٍ تَامَّةٍ تَامَّةٍ۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص فجر کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد وہیں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتا رہے یہاں تک کہ آفتاب بلند ہو جائے، پھر دو رکعت (اشراق کے نوافل) پڑھے، تو اسے ایک حج اور عمرے کا ثواب ملے گا، حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا کہ پورے حج و عمرے کا ثواب ملے گا''۔ (سُنن ترمذی: 586)

(2) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ صَلَّى الضُّحٰى ثِنْتَي عَشْرَةَ رَكْعَةً بَنَى اللهُ لَهُ قَصْرًا مِنْ ذَهَبٍ فِي الْجَنَّةِ۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے چاشت کی نماز بارہ رکعات پڑھیں، (اس کی جزا کے طور پر) اللہ تعالیٰ اُس کے لیے جنت میں سونے کا محل بنائے گا''۔ (سُنن ترمذی: 473)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(وَمِنَ الْمَنْدُوْبَاتِ صَلَاةُ الضُّحٰى) وَأَقَلُّهَا رَكْعَتَانِ وَأَكْثَرُهَا اثْنَتَا عَشْرَةَ رَكْعَةً وَوَقْتُهَا مِنِ ارْتِفَاعِ الشَّمْسِ اِلٰى زَوَالِهَا۔

ترجمہ: ''نمازِ چاشت کم از کم دو رکعات اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات ہیں اور اس کا وقت سورج بلند ہونے سے زوال (یعنی زوال شروع ہونے سے پہلے) تک ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 112)

یہ امر ذہن میں رہے کہ بعض نفلی عبادات پر جو غیر معمولی اجر کی بشارت دی گئی ہے، اس کو اسلام کے مجموعی نظامِ عبادات سے الگ کر کے نہ سمجھا جائے، جیسے ہمارے ہاں بعض مُقدّس راتوں میں لوگ رات بھر یا رات کا اکثر حصہ نوافل پڑھتے ہوئے گزار دیتے ہیں، اور اسے کبھی قضائے عمری سے تعبیر کرتے ہیں یا لاعلمی کی بنا پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس ایک

رات کی عبادت برسوں کی قضا کی ہوئی فرض نمازوں کا فدیہ یا کفارہ بن جائے گی، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اسی منفی سوچ یا اپروچ کا نتیجہ ہے کہ اس کے بعد لوگ سال بھر یا سال کا اکثر حصہ فرض نمازوں سے بھی غافل رہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے غیر معمولی اجر کی بشارتوں کے حق دار وہ لوگ ہیں، جو مُحرّمات سے اجتناب کرتے ہوں، فرائض وواجبات پر پابندی سے عمل پیرا ہوں اور اس پر مُستزاد یہ کہ اِن نوافل کو بھی ادا کرتے ہوں۔ اسی طرح نمازِ چاشت پر حجِ کامل اور عمرۂ کاملہ کا اجر ملنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی کا فریضۂ حج ساقط ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ترجمہ: ''جو نیک کام کرے تو اس کے لیے دس گنا اجر ہے''۔ (انعام:160)

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایک فرض نماز پڑھے گا تو اسے دس گنا ثواب ملے گا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایک فرض نماز پڑھنے سے دس فرائض کی مسئولیت سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اسی طرح حرمِ کعبہ میں ایک نماز پر ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملنے سے بھی یہی مراد ہے۔

نمازِ تراویح میں عورت کی امامت کا حکم

سوال:

کیا عورتیں کسی مسجد یا مدرسہ میں جمع ہو کر نمازِ تراویح یا صلوٰۃ التسبیح باجماعت ادا کرسکتی ہیں؟، جب کہ عورتوں کے لیے پردے کا اہتمام کیا گیا ہو۔

(مولانا محمد عبدالرحمٰن جامی، ضلع گوجرانوالہ)

جواب:

علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تفسیر تبیان القرآن، جلد: 01، ص:97-393 میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور مذاہبِ اربعہ اُن کے اصل مآخذ کے حوالہ جات کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اس بحث کے شروع میں انہوں نے خلاصہ ان کلمات میں بیان فرمایا: ''جماعت کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ عورتوں کی جماعت ہے۔ امام

شافعی کے نزدیک عورت کا عورتوں کو نماز پڑھانا اور ان کا باجماعت نماز پڑھنا جائز ہے۔ امام احمد کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ عورتوں کی جماعت مستحب ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ غیر مستحب ہے۔ امام مالک کے نزدیک عورتوں کا عورت کی اقتدا میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت کا عورتوں کے لیے امام ہونا مکروہِ تحریمی ہے، ہر چند کہ امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک عورت کا عورتوں کے لیے امام ہونا جائز ہے لیکن انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ عورتوں کا مردوں کے لیے امام ہونا ناجائز ہے اور مردوں کے لیے عورت کی امامت باطل ہونے پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے"۔

عورت کی امامت کے بارے میں اصل یہ حدیث ہے:

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ خَلَّادِ الْاَنْصَارِیِّ، عَنْ اُمِّ وَرَقَةَ بِنْتِ نَوْفَلٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمَّا غَزَا بَدْرًا، قَالَتْ: قُلْتُ لَهٗ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! اِئْذَنْ لِیْ فِی الْغَزْوِ مَعَكَ، اُمَرِّضُ مَرْضَاكُمْ، لَعَلَّ اللّٰهَ یَرْزُقُنِیْ شَهَادَةً، قَالَ: "قِرِّیْ فِیْ بَیْتِكِ، فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یَرْزُقُكِ الشَّهَادَةَ، قَالَ فَكَانَتْ تُسَمَّی الشَّهِیْدَةَ، قَالَ: وَقَدْ قَرَأَتِ الْقُرْاٰنَ، فَاسْتَاْذَنَتِ النَّبِیَّ ﷺ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْ دَارِهَا مُؤَذِّنًا، فَاَذِنَ لَهَا، قَالَ: وَكَانَتْ دَبَّرَتْ غُلَامًا وَجَارِیَةً، فَقَامَا اِلَیْهَا بِاللَّیْلِ، فَغَمَّاهَا بِقَطِیْفَةٍ لَّهَا حَتّٰی مَاتَتْ، وَذَهَبَا، فَاَصْبَحَ عُمَرُ فَقَامَ فِی النَّاسِ، فَقَالَ: مَنْ عِنْدَهٗ مِنْ هٰذَیْنِ عِلْمٌ اَوْ مَنْ رَاٰهُمَا فَلْیَجِئْ بِهِمَا فَاَمَرَ بِهِمَا فَصُلِبَا فَكَانَا اَوَّلَ مَصْلُوْبٍ بِالْمَدِیْنَةِ۔۔۔ وَفِیْ حَدِیْثٍ اٰخَرَ: قَالَ: وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَزُوْرُهَا فِیْ بَیْتِهَا، وَجَعَلَ لَهَا مُؤَذِّنًا یُؤَذِّنُ لَهَا، وَاَمَرَهَا اَنْ تَؤُمَّ اَهْلَ دَارِهَا۔ قَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ: فَاَنَا رَاَیْتُ مُؤَذِّنَهَا شَیْخًا كَبِیْرًا

ترجمہ: "عبدالرحمٰن بن خلاد سے روایت ہے: اُمِّ ورقہ بنت نوفل بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ جب غزوۂ بدر کے لیے تشریف لے جانے لگے، تو میں نے ان سے عرض کی: یارسول اللہ! مجھے اپنے ساتھ جہاد میں جانے کی اجازت عنایت فرمائیں، میں بیماروں کی تیمارداری کروں گی، شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا فرمادے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے

گھر میں سکون سے رہو، اللہ عزوجل آپ کو یقیناً شہادت عطا فرمائے گا۔ عبدالرحمٰن بن خلاد کہتے ہیں کہ انہیں لوگ ''شہیدہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔۔۔۔۔عبدالرحمٰن کہتے ہیں: اُمِ ورقہ بن نوفل نے قرآن پڑھا ہوا تھا، تو انہوں نے نبی ﷺ سے اجازت مانگی کہ وہ اپنے گھر میں ایک مؤذن رکھ لیں، آپ ﷺ نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔

عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ اُمِ ورقہ کا ایک غلام اور ایک باندی تھیں، ان دونوں کو انہوں نے مُدبَّر بنالیا تھا (یعنی یہ کہا کہ میری موت کے بعد تم دونوں آزاد ہو گے)، ایک رات وہ دونوں کھڑے ہوئے اور اُن کی چادر میں اُن کو لپیٹ کر دبوچ لیا، یہاں تک کہ وہ وصال فرما گئیں اور پھر وہ دونوں بھاگ گئے۔ صبح کے وقت جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اُن کے قتل کی اطلاع ملی تو انہوں نے لوگوں سے کہا: جس شخص کو ان دونوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو یا جس نے ان دونوں کو دیکھا ہو، وہ انہیں پکڑ کر لے آئے (قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اِس قتل کا اعتراف کرلیا تھا)، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر اُن دونوں کو سولی چڑھا دیا گیا اور مدینۂ منورہ میں یہ پہلے دو شخص تھے جنہیں سولی چڑھایا گیا۔

(نوٹ: ''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں جو ''شہیدہ'' قرار دیا تھا، آپ ﷺ کی یہ بشارت پوری ہوئی اور انہیں ان کے مُدبَّر غلام اور باندی نے ظلماً قتل کردیا)''۔۔۔۔اگلی حدیث میں عبدالرحمٰن بن خلاد بیان کرتے ہیں: اور رسول اللہ ﷺ اُمِ ورقہ بن نوفل سے ملنے اُن کے گھر جایا کرتے تھے اور آپ ﷺ نے اُن کے لیے ایک مؤذن مقرر کردیا تھا اور اُنہیں حکم فرمایا کہ اپنے گھر والوں کی امامت کیا کریں۔۔ عبدالرحمٰن بن خلاد بیان کرتے ہیں: میں نے دیکھا کہ اُن کا مؤذن ایک بوڑھا شخص تھا، (سنن ابی داؤد :88-587)''۔ یہ روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری کی ''المستدرک'' اور امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی کی ''سنن کبریٰ'' میں بھی موجود ہے۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

(۱) ترجمہ: ''رائطہ حنفیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرض نمازوں میں عورتوں کی امامت کی اور اُن کے وسط میں کھڑی ہوئیں''۔

(۲) ترجمہ: ''عطاء بیان کرتے ہیں کہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا اذان دیتی تھیں، اقامت کہتی تھیں اور عورتوں کی امامت کرتی تھیں اور ان کے وسط میں کھڑی ہوتی تھیں''۔

(سنن کبریٰ للبیہقی، جلد:03،ص:131، نشر السنہ، ملتان)

اسی طرح حضرتِ اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی عورتوں کی امامت کی روایت بھی سننِ کبریٰ میں موجود ہے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عورت، عورتوں کی امامت کرے اور اُن کے وسط میں کھڑی ہو۔

اس پر سب کا اجماع ہے کہ عورت مردوں کی امامت نہیں کرسکتی اور جمعہ کی امامت بھی نہیں کرسکتی۔ ہمارے ائمہ میں سے علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی صاحبِ ''ہدایہ'' نے عورت کی امامت کو مکروہِ تحریمی کہا ہے اور علامہ کمال الدین بن ہمام صاحبِ ''فتح القدیر'' نے لکھا ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ مکروہِ تنزیہی یا خلافِ اولیٰ ہے۔ تاہم اگر کہیں کوئی عورت، عورتوں کی امامت کرے تو وہ آگے نہ کھڑی ہو بلکہ عورتوں کی صف کے درمیان میں کھڑی ہو۔ علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

وَتُکْرَہُ جَمَاعَتُھُنَّ، یَقِفُ الْاِمَامُ وَسَطَھُنَّ، وَلَا تَصْلُحُ اِمَامًا لِلرِّجَالِ۔

ترجمہ: ''اور عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، عورت امام ہو تو وہ صف کے درمیان کھڑی ہو اور عورت مردوں کی امامت کی اہل نہیں ہے''۔ (الاشباہ والنظائر،ص:316)

علامہ ابن نجیم البحر الرائق میں مزید اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ترجمہ: ''اور عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، کیونکہ یہ حرام کے ارتکاب سے خالی نہیں ہے اور وہ ہے عورتوں کے امام کا صف کے درمیان کھڑا ہونا، تو ننگے بدن والوں کی جماعت کی طرح یہ جماعت بھی مکروہ ہوگی، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے۔ یہ کراہتِ تحریمی پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ امام کا صف سے آگے ہونا واجب ہے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس پر مُواظبت (ہمیشگی) فرمائی، اور

واجب کا ترک کراہتِ تحریمی کا سبب ہے جو گناہ ہے''۔ (البحر الرائق، جلد:01،ص:614)
امام ابن ہمام کا عورتوں کے لیے عورت کی امامت کو مکروہِ تنزیہی قرار دینے کا سبب وہ احادیث ہیں، جو اوپر مذکور ہوئیں، جن میں حضور ﷺ نے اُمِ وَرقہ کو امامت کی اجازت دی اور حضرتِ عائشہ اور حضرتِ ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے عورتوں کی امامت فرمائی۔ امام ابن نجیم اور صاحبِ ہدایہ ودیگر فقہاءِ امت کا عورت کی امامت کو مکروہِ تحریمی قرار دینا فقہی اصول کی بنا پر ہے، جسے ''البحر الرائق'' میں بیان کیا گیا ہے اور شاید ان ائمہ کے نزدیک وہ اجازت اُمِ ورقہ اور بعض صحابیات کے ساتھ خاص ہوگی یا ان کے نزدیک یہ منسوخ ہے۔
ہمارے عہد کے مفتیانِ کرام دینی حکمت اور ضرورت کے تحت موقع کی مناسبت سے کسی ایک موقف پر رائے دے سکتے ہیں۔

طواف اور سعی کے دوران افضل اَذکار

سوال:

بیت اللہ کا طواف یا صفاومروہ کی سعی کرتے وقت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کی منقبت، اُن سے استعانت وندا پر مشتمل اشعار پڑھنا جائز ہے، افضل کیا ہے؟
(معین الدین نوری، گلشنِ شمیم کراچی)

جواب:

احادیثِ مبارکہ میں عبادات کا طریقہ اور اُن میں پڑھی جانے والی تسبیحات، اَذکار اور دعائیں مُتعین ومقرر ہیں، یہ اوراد اوران کی تعداد کلید (چابی) کی حیثیت رکھتے ہیں، اُن کی ادائیگی کا اُسی طرح التزام کرنا چاہیے۔ البتہ بعض طویل دعاؤں کے یاد نہ ہونے کے سبب مختصر دعاؤں کا ذکر بھی حدیث میں ملتا ہے۔
عطاء بن ابی رباح بیت اللہ کا طواف کررہے تھے، ابن ہشام نے ان سے رکنِ یمانی کے بارے میں سوال کیا، توانہوں نے کہا: ''مجھ سے ابوہریرہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے رکنِ یمانی کے پاس مندرجہ ذیل

دعا پڑھے، تو اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، جو اس دعا پر آمین کہتے ہیں، وہ دعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ أَسأَلُكَ العَفوَ وَالعَافِیَۃَ فِی الدُّنیَا وَالآخِرَۃِ رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَۃً وَّفِی الآخِرَۃِ حَسَنَۃً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

مَنْ طَافَ بِالبَیتِ سَبْعًا وَلَا یَتَکَلَّمُ اِلَّا بِسُبحَانَ اللہِ وَالحَمدُ لِلّٰہِ، وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ، وَاللہُ أَکبَرُ، وَلَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ، مُحِیَتْ عَنهُ عَشْرُ سَیِّئَاتٍ، وَکُتِبَتْ لَهُ عَشْرُ حَسَنَاتٍ، وَرُفِعَ لَهُ بِهَا عَشَرَۃُ دَرَجَاتٍ، وَمَنْ طَافَ فَتَکَلَّمَ وَھُوَ فِی تِلكَ الحَالِ، خَاضَ فِی الرَّحمَۃِ بِرِجلَیهِ، کَخَائِضِ المَاءِ بِرِجلَیهِ۔

ترجمہ: ''جو سات پھیرے طواف کرے اور یہ پڑھے: ''سُبحَانَ اللہِ وَالحَمدُ لِلّٰہِ، وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ، وَاللہُ أَکبَرُ، وَلَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ'' اُس کے دس گناہ مٹا دیے جائیں گے اور دس نیکیاں لکھی جائیں گی اور دس درجے بلند کیے جائیں گے اور جس نے طواف میں یہی کلمات مبارکہ پڑھے، وہ رحمت میں اپنے پیروں سے چل رہا ہے، جیسے کوئی پانی میں چلتا ہے''۔

(سنن ابن ماجہ: 2957)

طواف کے پھیروں میں حجرِ اسود کے سامنے، اِستلام کرتے وقت، ملتزم کے سامنے، میزابِ رحمت کے پاس، رُکنِ عراقی، رُکنِ شامی، رُکنِ یمانی، مقامِ مُستجاب اور سعی کے پھیروں کے دوران پڑھی جانے والی دعائیں جو اَسلافِ اُمّت سے منقول ہیں، کُتبِ فقہ میں درج ہیں، اُنہیں پڑھنا چاہیے، لیکن اگر یاد نہ ہوں، تو صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''جس کو مخصوص مواقع ومقامات کی مسنون وماثور دعائیں یاد نہ ہوں، تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بشارت اور وعدے کے مطابق درود پاک پڑھتا رہے، انہوں نے اس حدیث مبارک سے استدلال کیا ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اگر ایسا کرے گا (یعنی فرائض، واجبات اور سُنَن کے علاوہ نوافل کے تمام اوقات میں صرف درود پڑھتا رہے گا)

تو اللہ عزوجل تیرے سب کام بنادے گا اور تیرے گناہ معاف فرمادے گا''۔

(بہارِ شریعت، جلد اول، ص:1098)

علامہ امجد علی اعظمی نے دعائیں یاد نہ ہونے کی صورت میں رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنے کو بہتر وافضل فرمایا ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے ہم نے صدرالشریعہ کی عبارت کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

انبیاءِ کرام واولیاءِ عظام سے بالتبع استعانت اور وسیلہ کی اگرچہ شریعت میں اجازت ہے، لیکن طواف وسعی یا شعائر اللہ اور مناسکِ حج کے مراحل پر کسی طرح بھی اہلِ اسلام کے لیے شایانِ شان نہیں ہیں، کیونکہ یہ مقامات عباداتِ الٰہیہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس لیے ایسے اشعار ومنقبت کے کلمات کی جگہ مسنون دعاؤں، تسبیحات واذکار کا ورد کرتے رہنا چاہیے، جو نبی کریم ﷺ، صحابۂ کرام علیہم اجمعین اور اسلافِ اُمت سے منقول ہیں اور جن میں یقیناً بہت بڑی روحانی تاثیر بھی ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے انبیاءِ کرام علیہم السلام اور اولیاءِ کرام سے توسُّل اور استعانت پر مفصَّل ومدلَّل بحث کی ہے اور دلائل سے جائز ثابت کیا ہے، لیکن وہ علامہ عبدالحکیم شرف قادری کے حوالے سے لکھتے ہیں: ہمارے فاضل معاصر علامہ محمد عبدالحکیم شرف لکھتے ہیں: ''البتہ یہ ظاہر ہے کہ جب حقیقی حاجت روا، مشکل کشا اور کارساز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو اَحسن اور اَولیٰ یہی ہے کہ اُسی سے مانگا جائے اور اُسی سے درخواست کی جائے اور انبیاء واولیاء کا وسیلہ اس کی بارگاہ میں پیش کیا جائے، کیونکہ حقیقت، حقیقت ہے اور مجاز، مجاز ہے یا بارگاہِ انبیاء واولیاء سے درخواست کی جائے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں وہ ہماری مشکل آسان فرمادے اور حاجتیں بَرلائے، اس طرح کسی کو غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہوگی اور اختلافات کی خلیج بھی زیادہ وسیع نہیں ہوگی''۔

(ندائے یارسول اللہ، ص:12، مطبوعہ: مرکزی مجلس رضا، لاہور)

خلاصہ یہ ہے کہ نداءِ غیر اللہ اعتقادِ مذکور کے ساتھ ہر چند کہ جائز ہے، لیکن اَفضل، اَولیٰ

اور احسن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے، جیسا کہ حدیثِ مذکور کا تقاضا ہے''۔

(شرح صحیح مسلم، جلد 7، ص:8990، مطبوعہ: فرید بک اسٹال، لاہور)

انبیاء علیہم السلام اور اولیاءِ کرام سے استمداد اور استغاثہ کرنا ہر چند کہ جائز ہے، لیکن افضل، احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ ہر حال میں اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے۔ امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمًا فَقَالَ: يَا غُلَامُ إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ اِحْفَظِ اللهَ يَحْفَظْكَ اِحْفَظِ اللهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللهَ إِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ لَكَ وَإِنِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن ایک سواری پر نبی ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تم کو چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں، تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہاری حفاظت کرے گا، تم اللہ کو یاد رکھو، تم اُسے (مصیبت کے وقت اپنی مدد کے لیے) موجود پاؤ گے، جب تم سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے سوال کرو اور جب تم مدد مانگو تو اللہ سے مدد مانگو اور جان لو کہ اگر تمام امت تم کو نفع پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے، تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے (اپنی تقدیرِ مبرم میں) تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ اور اگر تمام لوگ تم کو نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائیں، تو تمہیں صرف وہی نقصان پہنچا سکتے ہیں، جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں (یعنی تقدیر کے معاملات اللہ تعالیٰ کے ہاں طے پا چکے ہیں)''، (جامع الترمذی، رقم الحدیث: 2516)۔ یہ حدیث مسندِ امام ابو یعلیٰ (جلد:3 ص: 84-85)، عمل الیوم واللیلۃ (للامام ابن سنی ص: 136) اور تمہید (للامام ابن عبدالبر، ج:4، ص:

111) میں بھی موجود ہے۔

مسجد میں امام کا مصلے پر بیٹھ کر ہنسنا

سوال:

کیا امام کو مصلے پر بیٹھے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنسنے کی اجازت ہے اور کیا ایسا شخص امامت کا اہل ہے؟،(محمد شاہد،سرجانی ٹاؤن کراچی)

جواب:

اسلام دینِ فطرت ہے اور انسان کے جِبلّی اور فطری تقاضوں کا پاس رکھتا ہے۔ مثبت اور تعمیری فطری جذبات کے اظہار کے مواقع عطا کرتا ہے اور منفی جذبات کی اصلاح کرتا ہے۔ انہی فطری تقاضوں میں فرحت وانبساط اور غیظ وغضب کے مواقع بھی آتے ہیں۔ انسان فطری طور پر مسرت کے موقع پر ہنستا ہے اور یہ جذبات اس کے منہ اور چہرے سے عیاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام کے لشکر کے روندے ڈالنے کے خطرے سے بچنے کے لیے چیونٹیوں کی ملکہ نے اپنی ہم جنس چیونٹیوں سے کہا: ''اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اُن کا لشکر بے خبری میں تمہیں کچل ڈالے، اس کی بات پر وہ (سلیمان) مسکرا کر ہنس دیے، (نمل:19-18)''۔سلیمان علیہ السلام کا ہنسنا اظہارِ تعجب یا خوشی کے طور پر تھا''۔(حاشیہ جلالین،ص:318)

التعریفات میں لکھا ہے: اَلتَّبَسُّمُ مَالَایَکُوْنُ مَسْمُوْعًا لَهٗ وَلِجِیْرَانِهٖ،وَالضِّحْکُ مَایَکُوْنُ مَسْمُوْعًا لَهٗ، لَالِجِیْرَانِهٖ، القَهْقَهَةُ: مَایَکُوْنُ مَسْمُوْعًا لَهٗ وَلِجِیْرَانِهٖ

ترجمہ:''تبسم (مسکراہٹ) اسے کہتے ہیں کہ نہ اس کی آواز خود سنے اور نہ ہی برابر والا سنے (یعنی بے آواز ہو اور صرف ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو) اور ضحک اسے کہتے ہیں، جس کی آواز خود سنے، برابر والا نہ سنے اور قہقہہ اسے کہتے ہیں، جس کی آواز خود بھی سنے اور برابر والا بھی سنے''۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ بھی اظہارِ مسرت کے موقع پر کبھی تبسم فرماتے، کبھی ضحک

فرماتے اور صرف چند غیر معمولی مواقع پر آپ نے قہقہہ فرمایا، جس کا ذکر احادیثِ مبارکہ میں موجود ہے۔

رسول اللہ ﷺ مسرت کے موقع پر صرف زیرِ لب مسکرایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی عام عادتِ مبارکہ تبسُّم کی تھی یعنی صرف لبوں پر مسکراہٹ کا آجانا، بعض خاص مواقع پر آپ نے ضِحک فرمایا: ضِحک اسے کہتے ہیں کہ جس میں ہلکی آواز بھی نکلے جو اسی تک محدود ہو اور ایسا ضِحک یا قہقہہ جس میں نواجذ (ڈاڑھ مبارک) نظر آئیں، انتہائی نادر ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ مُسْتَجْمِعًا قَطُّ ضَاحِكًا حَتّٰى أَرٰى مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ، اِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو اس طور پر کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ کے دہنِ مبارک کا اندرونی حصہ نظر آجائے، آپ ﷺ صرف تبسم فرمایا کرتے تھے، (صحیح بخاری: 6092)''۔ رسول اللہ ﷺ نے قہقہہ مار کر ہنسنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت جابر بن سمرہ بیان کرتے ہیں: كَانَ لَا يَضْحَكُ اِلَّا تَبَسُّمًا رسول اللہ ﷺ کا ہنسنا صرف تبسُّم ہوتا تھا''۔ (شمائل ترمذی، ص: 232)

عبداللہ بن حارث بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی کو تبسُّم فرماتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ عام حالات میں اپنے اصحاب کے ساتھ خوشگوار انداز میں پیش آتے اور ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ ان کا استقبال فرماتے۔ حضرت ابوذر غفاری بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اس شخص کو خوب جانتا ہوں جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا اور اسے بھی جانتا ہوں جو سب سے آخر میں جہنم سے نکالا جائے گا۔ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ اس پر پیش کرو اور بڑے گناہوں کو چھپایا

جائے گا۔اس سے کہا جائے گا: تم نے فلاں فلاں دن یہ یہ گناہ کیے، وہ اقرار کرے گا اور اپنے بڑے گناہوں کے بارے میں خوف زدہ ہوگا۔ پھر (فرشتوں کو) حکم ہوگا کہ ان گناہوں کے بدلے میں اسے نیکیاں دے دو، پھر (وہ خودغرض بندہ جب رحمتِ باری تعالیٰ کو اس جولانی پر دیکھے گا تو) کہے گا: میرے بہت سے گناہ تو ابھی سامنے آئے ہی نہیں ہیں۔ابوذر بیان کرتے ہیں: (اس موقع پر) میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ہنسے یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھ مبارک بھی نظر آئی''۔(شمائلِ ترمذی،ص:235)

یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمتِ فراواں اور بندے کی خودغرضی اور طلب کے انداز کو دیکھ کر آپ بے ساختہ ہنسے،ظاہر ہے کہ یہ غیر معمولی خوشی کا موقع تھا۔

عباس بن مرداس اسلمی بیان کرتے ہیں کہ اُن کے والد نے اپنے والد (عباس کے دادا) سے بیان کیا کہ:''نبی ﷺ نے (حجۃ الوداع کے موقع پر) عرفہ کی شام اپنی اُمت کے (گنہگاروں) کے لیے مغفرت کی دعا کی،تو (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے آپ کو) جواب ملا: میں نے حقوق العباد کے سوا انہیں بخش دیا، میں ان سے مظلوم کا حق لے کر اسے دوں گا، آپ ﷺ نے عرض کی: اے پروردگار! اگر تو چاہے تو مظلوم کو جنت دے دے اور ظالم کو بخش دے، لیکن اُس شام یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ مزدلفہ میں صبح کے وقت آپ نے پھر دعا فرمائی،تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا قبول فرمائی، (راوی بیان کرتے ہیں): رسول اللہ ﷺ نے (یہ بشارت سن کر تبسم فرمایا یا ضحک فرمایا۔تو حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے عرض کی: (یارسول اللہ!) ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، (گریہ وزاری کے) ایسے مواقع پر ہنسی فرمانا آپ کا طریقہ تو نہیں ہے،تو آپ کی ہنسی کا سبب کیا ہے؟، (جبکہ ہماری تو تمنا ہے کہ اس نورانی چہرے کو) اللہ تعالیٰ ہمیشہ مسکراتا رکھے،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے دشمن ابلیس کو جب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمالی ہے اور میری اُمت کی مغفرت فرمائی ہے،تو وہ اپنے سر پر مٹی ڈالتا ہوا اور ہائے میں ناکام ہوگیا، ہائے میں تباہ ہوگیا، کہتا ہوا فریاد کررہا ہے،تو اس کی اس بے قراری اور فریاد کو دیکھ کر مجھے ہنسی

آ گئی''۔(سنن ابن ماجہ:3013)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وَلَاتُکْثِرِ الضَّحِکَ فَاِنَّ کَثْرَۃَ الضَّحِکِ تُمِیتُ الْقَلْبَ''۔ترجمہ:''تم زیادہ نہ ہنسا کرو کہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کردیتا ہے،(سُنن ترمذی:2305)''۔اس کا مطلب یہ ہے کہ موقع بے موقع یا بلاسبب ہنسنے کو معمول بنانا پسندیدہ عادت نہیں ہے۔ایک اور روایت میں ہے:
وَالْقَھْقَھَۃُ مِنَ الشَّیطَانِ وَالتَّبَسُّمُ مِنَ اللہِ۔

ترجمہ:''قہقہہ شیطان کی طرف سے ہے اور تبسم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، (المعجم الکبیر للطبرانی:203)''۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں اس کا محرک شیطانی جذبہ ہوتا ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ قہقہے مار کر دوسروں کی تحقیر واہانت میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد میں خاص طور پر انسان کو باادب ہو کر بیٹھنا چاہیے اور اس پر خشیتِ الٰہی کا غلبہ ہونا چاہیے۔مسجد میں غیر ضروری اور دنیوی باتیں کرنا منع ہے،حدیث پاک میں ہے:
جَنِّبُوْا مَسَاجِدَکُمْ صِبْیَانَکُمْ وَمَجَانِیْنَکُمْ وَشِرَاءَ کُمْ وَبَیْعَکُمْ وَخُصُوْمَاتِکُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِکُمْ وَاِقَامَۃَ حُدُوْدِکُمْ وَسَلَّ سُیُوْفِکُمْ۔

ترجمہ:''اپنی مسجدوں کو (بے شعور) بچوں، پاگلوں، آپس کے خرید وفروخت کے معاملات، باہمی جھگڑوں، شور شرابے، (مجرموں پر) اللہ کی حدود قائم کرنے اور ایک دوسرے پر تلواریں سونتنے سے بچاؤ''۔(سُنن ابن ماجہ:750)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسجد میں ہنسنا قبر میں اندھیرا لاتا ہے''۔(جامع الصغیر:5231)

الغرض مسجد کا تقدُّس واحترام ہر مسلمان پر لازم ہے۔جن اُمور کو عام زندگی میں پسندیدہ نہیں قرار دیا گیا، تو اُن کا مسجد کے اندر کیا جانا بدرجۂ اَولیٰ ممنوع ہے۔محراب ومنبر اور مصلّٰی کا تقدُّس رسول اللہ ﷺ سے نسبت کے سبب زیادہ ادب واحترام کا متقاضی

ہے۔ مسجد میں دنیاوی اور غیر ضروری گفتگو کرنا منع ہے، قرآن فہمی یا دینی مسائل سمجھانے کے لیے بھی مجلس درس منعقد کی جاسکتی ہے، لیکن اس میں بھی اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ لوگوں کی نمازوں میں خلل واقع نہ ہو۔ نماز کے اندر قہقہہ مار کر ہنسنے پر نہ صرف نماز بلکہ وضو ٹوٹنے کا حکم بھی لگایا گیا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ ضَحِكَ فِی الصَّلٰوۃِ قَهْقَهَةً فَلْيُعِدِ الْوُضُوْءَ وَالصَّلٰوۃَ۔

''ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے نماز میں قہقہہ لگایا وہ اپنا وضو اور نماز دہرائے''۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، ج:4،ص:316)

امام صاحب کو محراب میں قہقہہ مار کر نہیں ہنسنا چاہیے، یہ بے ادبی ہے اور اُنہیں چاہیے کہ اس سے احتراز کریں۔ اس سے کوئی امامت کے لیے نااہل نہیں ہوتا لیکن چونکہ امام دوسروں کے لیے نمونۂ عمل ہوتا ہے اور لوگ دین کے معاملے میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اس لیے انہیں حد درجہ احتیاط کرنی چاہیے، مزید یہ کہ کسی کی غلطی کو مشتہر کرنے سے پہلے اس سے براہِ راست رابطہ کر کے اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

مسجد میں چار پائی ڈال کر سونا

سوال:

کیا معتکف، امام یا مؤذن مسجد کے صحن میں چار پائی ڈال کر سو سکتے ہیں۔

(عبدالمجید چانڈیو، دادو، سندھ)

جواب:

بعض مسائل عُرف کی بنا پر جانے جاتے ہیں اور اِسی اعتبار سے جواز و عدمِ جواز کا حکم دیا جاتا ہے۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی سے سوال کیا گیا:'' زید حالتِ اعتکاف میں کسی عذر کی وجہ سے مسجد کے اندر چار پائی بچھا کر لیٹتا ہے، یہ فعل از روئے شرع کیسا ہے؟۔ جواب میں لکھتے ہیں:''مسجد میں چار پائی پر لیٹنا اور سونا عُرف نے ادب کے خلاف قرار دیا ہے اور ایسے اُمور میں شرعِ مطہّر نے عُرف کا لحاظ کیا ہے اور اس کے نظائر کُتب فقہ میں کثیر

ہیں، لہٰذا بلاعذر ایسا نہ کرے اور عذر ہو تو '' اَلضَّرو راتُ تُبِیحُ المَحظُوراتِ '' کی بنا پر اجازت ہے، مگر زید کو چاہیے کہ جن اوقات میں لوگ مسجد کے اندر آتے جاتے ہوں، اُن اوقات میں چار پائی کو علیحدہ کر دے تاکہ تنفیر عوام اور منازعت نہ واقع ہو کہ (یعنی عوام کے لیے نفرت اور جھگڑے کا سبب نہ بنے) اس میں لوگوں کو مبتلا کرنا بہت سخت ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ امجدیہ، اول ص:256)''۔ یعنی اس کے سبب لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہوگی اور خواہ مخواہ ایک دوسرے سے الجھیں گے۔ الغرض مسجد کے اندر چار پائی بچھا کر لیٹنے میں شریعت کی رو سے فی نفسہٖ تو عدمِ جواز کا کوئی سبب نہیں ہے، لیکن ہمارے ہاں عُرف میں یہ ادب کے منافی ہے، اس لیے اس سے اجتناب کرنا اَولیٰ ہے۔

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

ہمیں فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کے جواز یا شرعی حیثیت کے بارے میں جوہر ٹاؤن لاہور سے محمد سرور صاحب کا استفتاء موصول ہوا۔ اپنے سوال میں اُنہوں نے سعودی عرب کے مفتی شیخ عبداللہ بن باز کے فتوے کا حوالہ دیا کہ نبی کریم ﷺ فرض نماز پڑھا کر فوراً اٹھ جایا کرتے تھے اور آپ ﷺ نے کبھی بھی فرض نماز پڑھا کر مقتدیوں کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا نہیں کی۔ پھر اُنہوں نے اِسی سوال سے متعلق ''حاصلِ کلام'' کے عنوان سے مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب کا فتویٰ بھیجا، جو درجِ ذیل ہے:

زبدۃ الکلمات مع ضمیمہ میں مندرجہ تحقیقات کا حاصل یہ ہے:

(1) نماز کے بعد اجتماعی دعا کا مروجہ طریقہ بالاجماع بدعت قبیحہ شنیعہ ہے۔

(2) دعا بعد الفرائض میں رفع یدین نہیں، اِلَّا اَن یَّدعُوَ اَحیَانًا لِحَاجَۃٍ خَاصَّۃٍ۔

(3) امام مالک وامام طرطوشی اور ان دونوں کے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر نماز کے بعد فارغ ہوتے ہی فوراً امام کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا لازم ہے۔

(4) عندالاحناف رحمہم اللہ تعالیٰ بھی امام کا فجر وعصر کے سوا نماز کے بعد تین بار استغفار اور دعا اَللّٰھُمَّ اَنتَ السَّلَامُ الخ سے زیادہ دیر بیٹھنا مکروہ ہے، اس دعا میں نہ رفع یدین ہے نہ

اجتماعیت، امام ومقتدی ہر شخص بلا رفع یدین سراً انفراداً یہ مختصر سی دعا مانگ کر سنتوں میں مشغول ہو جائے۔

فجر وعصر کے بعد بیٹھنا اس شرط سے جائز ہے کہ اوراد وادعیہ میں امام اور مقتدیوں کے درمیان کوئی رابطہ نہ رہے، نماز کے بعد کی دعا میں اجتماعیت بدعت ہے، امام ہو یا مقتدی ہر شخص اپنے طور پر انفراداً سراً بلا رفع یدین دعا مانگے، فرض کے بعد کی دعا میں رفع یدین نہیں، البتہ کبھی کبھار کسی خاص ضرورت سے کوئی دعا مانگنا چاہے تو رفع یدین کر سکتا ہے مگر دوسروں کے سامنے التزام نہ کرے تا کہ کسی کو فرض کے بعد کی دعا میں رفع یدین کے مسنون ہونے کا شبہ نہ ہو۔

(5) نوافل کے بعد انفراداً ہاتھ اُٹھا کر طویل دعا مسنون ہے۔

(6) دعا کے لیے اجتماع بدعت ہے، البتہ کسی دوسرے مقصد کے لیے اجتماع ہو تو اس میں اجتماعی دعا جائز ہے۔

''وَاللهُ الهَادِیْ اِلیٰ سَبِیلِ الرَّشَادِ وَهُوَ العَاصِمُ مِنَ الْمُحْدَثَاتِ فِی الدِّیْنِ وَالبِدَعِ وَالضَّلَالِ، (احسن الفتاویٰ جلد:10 ،باب صفۃ الصلوٰۃ وما یتعلق بھا)''۔

محمد سرور صاحب لکھتے ہیں: ''اس کے باوجود پاکستان کی اکثر حنفی، سلفی مساجد میں ہر فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کی جاتی ہے، اگر قرآن وسنت میں اس کی کوئی ثقہ دلیل موجود ہے تو اسے پوری تحقیق کے بعد واضح فرمائیں''۔

جواب: سب سے پہلے یہ اَمر ذہن نشین رہے کہ کسی خاص شرعی مسئلے پر کسی کا موقف کیا ہے اور اس کے نزدیک اس مسئلے کی شرعی حیثیت (Status) کیا ہے؟۔ اس کے تعین کے بعد اُسی درجے کی دلیل طلب کی جانی چاہیے۔ آج کل لوگوں نے یہ شِعار بنالیا ہے کہ فرض، واجب، سنّت اور مستحب کے لیے ایک ہی درجے کی دلیل طلب کرتے ہیں، یہ انداز علمی وفقہی نہیں ہے۔

زیرِ بحث مسئلے کے بارے میں پہلے ایک اور شخص ملک کامران کے ایسے ہی سوال کے

جواب میں ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ''بنوری ٹاؤن کراچی کے مہتمم مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر کا موقف 27 نومبر 2015ء کے روزنامہ جنگ کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں، اس کے بعد نفسِ مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی:

''فرض نمازوں کے بعد کے اوقات حدیث شریف کے مطابق قبولیت کے اوقات ہیں۔ فرائض کے بعد دعا کرنا نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلف صالحین سے ثابت ہے، اس سلسلے میں کثیر احادیث موجود ہیں۔ محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے معارف السنن میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے اسود العامری کی روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میرے والد فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی، آپ نے جب سلام پھیرا تو پلٹے اور ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی''، (معارف السنن، 125/3)۔ اسی طرح کنز العمال میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو بندہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور کہتا ہے: اے میرے معبود!۔۔۔ اللہ تعالیٰ اُس کی دعا ضرور قبول فرماتا ہے، اسے خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹاتا، (ایضاً)۔ اس طرح کی روایات فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کے ثبوت واستحباب کے لیے کافی ہیں، البتہ اسے سنتِ مستمرہ دائمہ کہنا مشکل ہے، اس بنا پر اسے ضروری اور لازم سمجھ کر کرنا اور نہ کرنے والوں پر طعن وتشنیع کرنا دونوں درست نہیں''۔

اگر نہ کرنے والے کرنے والوں پر مطلقاً طعن وتشنیع کریں تو یہ مکروہ ہے یا وہ اِسے حرام سمجھ کر طعن وتشنیع کریں تو وہ مجرم ہیں اور شریعت مطہرہ پر افتراء کرنے والے ہیں، نیز سلام پھیرتے ہی جوتے ہاتھ میں تھام کر مسجد سے نکل جانا کس کی سنت ہے اور اس کی کیا دلیل ہے؟۔

ہمیں جناب ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر کے موقف سے اتفاق ہے کہ فرائض کے بعد اجتماعی دعا مُستحب ہے، نہ کہ سنتِ مُستمرہ۔ نیز اِسے واجب اور لازم سمجھ کر کرنا اور نہ کرنے

والوں پر طعن و تشنیع کرنا درست نہیں ہے۔ ہم اپنے موقف کو تفصیلی دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

(1) اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً

ترجمہ: ''دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑا کر اور آہستہ''۔ (سورۃ الاعراف: 55)

(2) ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ

ترجمہ: ''مجھ سے دعا کرو میں (ضرور) قبول کروں گا''۔ (المؤمن: 60)

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''المؤمن: 60 میں ارشاد ہے: ''اور تمہارے رب نے فرمایا: تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول فرماؤں گا، بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلت سے جہنم میں داخل ہوں گے''۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد دعا ہے یا اس آیت میں دعا سے مراد عبادت ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں دعا سے مراد عبادت ہے، ان کی دلیل یہ حدیث ہے: ''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ''وَقَالَ رَبُّکُم ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ'' کی تفسیر میں فرمایا: ہر عبادت دعا میں منحصر ہے اور آپ نے یہ آیت پڑھی: ''بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلت سے جہنم میں داخل ہوں گے''، (سنن ترمذی: 2969، سنن ابوداؤد: 1479، سنن ابن ماجہ: 3828)''۔ میں کہتا ہوں کہ اگر دعا سے اس کا معروف معنیٰ مراد لیا جائے تو وہ بھی درست ہے اور اس حدیث کے منافی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا بھی اس کی عبادت کرنا ہے''۔ (تبیان القرآن، جلد دہم ص: 395)

بندے کی دعا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور کسی نہ کسی درجے میں مطلوب ہے، ذیل میں چند احادیثِ مبارکہ ملاحظہ ہوں:

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: وَاِنَّهٗ مَنْ لَمْ یَسْئَلِ اللّٰهَ یَغْضَبْ عَلَیْهِ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ سے دعا نہیں کرتا اللہ اس پر غضب فرماتا ہے''۔(سنن ترمذی:3373)

(۲)عَنْ سَلْمَانَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْيِ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اِلَيْهِ اَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا۔

ترجمہ:''حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارا رب حیادار کریم ہے، جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ ان کو خالی لوٹانے سے حیا فرماتا ہے''۔(سنن ابی داوٗد:1485،سنن ترمذی:3627)

(۳)عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : اِنَّ اَسْرَعَ الدُّعَاءِ اِجَابَةً دَعْوَةُ غَائِبٍ لِغَائِبٍ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کی عدمِ موجودگی میں اس کے حق میں کی جانے والی دعا(اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں)بہت جلد قبول ہوتی ہے''۔(سنن ابی داوٗد:1532)

(۴)عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ:كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ لَمْ يَحُطَّهُمَا حَتّٰى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ۔

ترجمہ:''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب دعا میں ہاتھ بلند فرماتے،تو ہاتھوں کو نیچے نہ گراتے یہاں تک کہ چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرلیا کرتے''۔(سنن ترمذی:3386)

(۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: اَلْمَسْاَلَةُ: اَنْ تَرْفَعَ يَدَيْكَ حَذْوَ مَنْكِبَيْكَ اَوْ نَحْوَهُمَا، وَالْاِسْتِغْفَارُ:اَنْ تُشِيْرَ بِاِصْبَعٍ وَاحِدَةٍ،وَالْاِبْتِهَالُ:اَنْ تَمُدَّ يَدَيْكَ جَمِيْعًا۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ سوال یعنی دعا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں کے برابر اٹھاؤ اور استغفار کا طریقہ یہ ہے کہ ایک انگلی سے اشارہ کرو اور گڑگڑا کر سوال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ ایک ساتھ

پھیلاؤ''۔ (سنن ابوداؤد: 1489)

(۲) عَنْ مَالِكِ بْنِ يَسَارِ السَّكُوْنِيِّ ثُمَّ الْعَوْفِيِّ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: إِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَسَلُوْهُ بِبُطُوْنِ أَكُفِّكُمْ، وَلَا تَسْأَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا۔

ترجمہ: ''حضرت مالک بن یسار سکونی، پھر عوفی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے سوال کرو اور ہتھیلیوں کی پُشت سے سوال نہ کرو (یعنی دعا کے وقت ہاتھ کی ہتھیلی کا رُخ آسمان کی طرف ہونا چاہیے)''۔ (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 1483)

مَعَارِفُ السُّنَن (مرتبین فضلاء جامعہ خیر المدارس، ادارہ تالیفات اشرفیہ، چوک فوارہ، ملتان) میں ہے: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر ان کی ہتھیلیوں کو چہرے کے مقابل کرتے تھے اور ختمِ دعا کے بعد دونوں ہاتھوں کو چہرے پر ملنا بھی آدابِ دعا ہے جبکہ نماز کی حالت کے علاوہ ہو، مدارج النبوۃ''۔ (جلد دوم، ص: 111-110)

اس میں کسی وقت کی قید نہیں لگائی گئی، لہٰذا مسلمان ہر وقت دعا کرسکتا ہے جب کہ کوئی شرعی یا عقلی مانع نہ ہو، حصن حصین میں دعا کی قبولیت کے اوقات بتائے گئے ہیں، ان میں ایک وقت یہ بیان کیا: ''بَعْدَ كُلِّ عَمَلٍ صَالِحٍ'' یعنی ہر نیک کام کے بعد، اور فرض نماز سے بڑھ کر عملِ صالح اور کیا ہوسکتا ہے۔

عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ الدُّعَاءِ أَسْمَعُ قَالَ جَوْفُ اللَّيْلِ الْآخِرُ وَدُبُرُ الصَّلَوٰةِ الْمَكْتُوْبَاتِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کس دعا کی شنوائی یا قبولیت (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) سب سے زیادہ ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رات کے آخری حصہ میں اور فرائض کے بعد''۔

(سنن ترمذی: 3499)

نماز اعلیٰ درجے کی نیکی ہے، لہٰذا اس کے بعد دعا کرنا مستحسن ہے۔ الشیخ حسن بن علی شرنبلالی ''نور الایضاح'' میں لکھتے ہیں:

وَيُسْتَحَبُّ لِلإِمَامِ بَعدَ سَلَامِهِ اَن يَتَحَوَّلَ اِلىٰ يَسَارِهِ لِتَطَوُّعٍ بَعدَ الْفَرْضِ وَاَن يَّسْتَقبِلَ بَعدَهُ النَّاسَ وَيَسْتَغْفِرُونَ اللهَ ثَلَاثاً وَيَقرَؤُنَ آيَةَ الْكُرسِيِّ وَالمُعَوِّذَاتِ وَيُسَبِّحُوْنَ اللهَ ثَلَاثاً وَثَلَاثِينَ وَيحمَدُونَهُ كَذٰلِكَ وَيُكَبِّرُونَهُ كَذٰلِكَ ثُمَّ يَقُولُونَ لَااِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحدَهُ لَاشَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَعَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ،ثُمَّ يَدعُونَ لِاَنفُسِهِمْ وَلِلْمُسلِمِينَ رَافِعِي اَيدِيهِمْ ثُمَّ يَمْسَحُوْنَ بِهَا وُجُوهَهُمْ فِي آخِرِهِ۔

ترجمہ: ''امام کیلیے مستحب ہے کہ فرض سے سلام پھیرنے کے بعد نوافل کیلیے بائیں جانب مڑ جائے، اس کے بعد لوگوں کی طرف منہ کرے، پھر اللہ سے تین بار استغفار کرے، آیۃ الکرسی، مُعَوِّذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھے اور 33,33 مرتبہ ''سُبحَانَ الله''، ''اَلحَمدُلله'' اور ''اَللهُ اَكبَرُ'' کا ورد کرے۔ پھر ''لَااِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحدَهُ لَاشَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمدُ وَهُوَعَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ'' پڑھ کر اپنے لیے اور دیگر تمام مسلمانوں کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور آخر میں ہاتھ اپنے چہروں پر پھیرلیں''۔

(کتاب الصلوٰۃ، فصل فی الاذکار الواردہ بعد الفرض، ص:79، مکتبہ امام احمد رضا)

صاحب مراقی الفلاح ''اَن يَسْتَقبِلَ بَعْدَهُ النَّاس'' کے تحت لکھتے ہیں: أَيْ بَعدَ التَّطَوُّعِ وَعقِبَ الْفَرضِ اِنْ لَّمْ يَكُنْ بَعْدَهُ نَافِلَةٌ

ترجمہ: ''امام کے لیے مستحب ہے کہ نوافل کے بعد اور فرائض کے بعد اگر نوافل نہ ہوں، تو لوگوں کی طرف منہ کرے''۔ آگے چل کر مزید فرماتے ہیں: ثُمَّ يَخْتِمُونَ بِقَولِهِ تَعَالىٰ: ''سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ'' ترجمہ: ''پھر اللہ تعالیٰ کے فرمان ''سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ'' پر دعا کو ختم کریں، (کتاب الصلاۃ، فصل صفۃ الاذکار، ص: 171)''۔ اس میں فجر اور عصر کے بعد اجتماعی طور پر اَوراد وتسبیحات پڑھنے کا استحباب بیان کیا گیا ہے۔

دعا عبادت کی روح ہے، عبادت کا مغز اور نچوڑ ہے۔ نماز کے بعد دعائیں، تسبیحات وادراد اور بعض سورتوں کا پڑھنا احادیث سے ثابت ہے۔ اجتماعی دعا کا نہ ثبوت ہے نہ ہی ممانعت، تو پھر اپنی اصل کے اعتبار سے دعا انفرادی بھی کی جاسکتی ہے اور اجتماعی بھی، کیونکہ دعا کو اصلِ عبادت اور جوہرِ عبادت قرار دیا گیا ہے اور ایک حدیث مبارک میں دعا کو عین عبادت قرار دیا گیا ہے (اَلدُّعَاءُ ھُوَ الْعِبَادَۃُ، سنن ترمذی، رقم الحدیث : 2969)۔ اور اس کی بہت زیادہ ترغیب دی گئی ہے، پھر نمازِ جمعہ کا خطبہ جو واجب ہے اور عیدین کا خطبہ جو سنت ہے، ان میں بھی اجتماعی دعا ثابت ہے۔ نمازِ تراویح کی جماعت تو عہدِ رسالت مآب ﷺ اور عہدِ صدیقی کے بعد رائج ہوئی، اس میں حرمین طیبین کے ائمہ ختمِ قرآن کے موقع پر گڑگڑا کر نماز کے اندر دعا کرتے ہیں، یہ بھی تو رسول ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ثابت نہیں ہے، لیکن اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ دعا انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پر بہر صورت مستحسن ومستحب عمل ہے۔ سو آپ سنتِ رسول ﷺ سے ثبوت کے بغیر نیک نیتی سے ایک عمل کریں تو درست اور دوسرا کرے تو بدعتِ قبیحہ، کسی نے سچ کہا ہے:

تمہاری زُلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں کہ: ''حدیث میں ہے حضور پُرنور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: اِنَّ لِرَبِّکُمْ فِی اَیَّامِ دَھْرِکُمْ نَفَحَاتٍ، فَتَعَرَّضُوا لَہٗ لَعَلَّہٗ اَنْ یُصِیْبَکُمْ نَفحۃٌ مِنْھَا فَلَا تَشْقُوْنَ بَعدَھا اَبَدًا، رَوَاہُ الطَّبرَانِی فِی الْکَبِیْرِ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَۃَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔

ترجمہ: ''بیشک تمہارے رب کی طرف سے تمہارے ایام زندگی میں کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں، جن میں رحمتِ باری تعالیٰ کے جھونکے آتے ہیں تو انہیں پانے کی تدبیر کرو، شاید ان میں سے کوئی مبارک لمحہ تمہیں نصیب ہوجائے تو پھر کبھی بدبختی تمہارے پاس نہ آئے، اسے طبرانی نے کبیر میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ اور خود حدیث نے اُن

اوقات میں سے ایک وقت ''اجتماعِ مسلمین'' کا بتایا کہ ایک گروہِ مسلمان جمع ہوکر دعا مانگے، کچھ عرض کریں، کچھ آمین کہیں، کتاب المستدرک علی البخاری ومسلم میں ہے:

عَنْ حَبِيبِ بْنِ مَسْلَمَةَ الْفِهْرِيِّ، وَكَانَ مُجَابَ الدَّعْوَةِ، أَنَّهُ أُمِّرَ عَلَى جَيْشٍ، فَدَرِبَ الدُّرُوبَ، فَلَمَّا أَتَى الْعَدُوَّ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: لَا يَجْتَمِعُ مَلَأٌ فَيَدْعُو بَعْضُهُمْ، وَيُؤَمِّنُ الْبَعْضُ، إِلَّا أَجَابَهُمُ اللهُ ثُمَّ إِنَّهُ حَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: اللّٰهُمَّ احْقِنْ دِمَاءَنَا، وَاجْعَلْ أُجُورَنَا أُجُورَ الشُّهَدَاءِ فَبَيْنَمَا هُمْ عَلَى ذَلِكَ إِذْ نَزَلَ الْهُنْبَاطُ أَمِيرُ الْعَدُوِّ، فَدَخَلَ عَلَى حَبِيبٍ سُرَادِقَهُ۔

ترجمہ: ''حبیب بن مسلمہ فہری مستجاب الدعوات تھے، اُن سے روایت ہے کہ انہیں ایک لشکر پر امیر بنایا گیا، وہ دشمن کی سرزمین میں داخل ہوئے اور دشمن تک پہنچ گئے، (اس مرحلے پر) انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جب کوئی جماعت (مومنین) جمع ہوتی ہے اور اُن میں سے کوئی دعا کرتا ہے اور دوسرے آمین کہتے ہیں، تو اللہ اُن کی دعا کو قبول فرماتا ہے، پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور دعا کی: ''اے اللہ! ہماری جانوں کی حفاظت فرما اور ہمیں شہدا کی طرح اجر عطا فرما، اسی اثنا میں دشمن کا سردار ہُنباط حضرت حبیب کے ہاں آیا اور آپ کے خیمہ میں داخل ہوگیا''۔

(المستدرک علی الصحیحین: 5478)

علماء نے مجمعِ مسلمین کو اوقاتِ قبولیتِ دعا میں شمار کیا ہے۔ حصن حصین میں ہے: وَاجْتِمَاعُ الْمُسْلِمِيْن یعنی مسلمانوں کے اجتماع کا اوقاتِ اجابت سے ہونا حدیثِ صحاحِ ستہ سے مستفاد ہے، علامہ علی القاری شرح میں فرماتے ہیں: ثُمَّ كُلُّ مَا يَكُوْنُ الْاِجْتِمَاعُ فِيْهِ أَكْثَرَ كَالْجُمُعَةِ وَالْعِيْدَيْنِ وَعَرَفَةَ يُتَوَقَّعُ فِيْهِ رَجَاءُ الْاِجَابَةِ أَظْهَرُ۔ یعنی جس قدر مجمع کثیر ہوگا جیسے جمعہ وعیدین وعرفات میں، اسی قدر قبولیت دعا کی امید بہت زیادہ ہوگی''۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 8، ص: 522,523 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

دعا انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پر، بہر صورت مستحسن ومستحب عمل ہے، حرمین

طیبین میں بھی ختمِ قرآن کے موقع پر نمازِ تراویح میں اور خطباتِ مبارکہ میں اجتماعی دعا کی جاتی ہے، تو جب یہ اجتماعی دعا نماز کے اندر جائز ہے، تو نماز سے باہر اس کی ممانعت کیوں ہوگی۔ جو اجتماعی دعا کی ممانعت کا دعویٰ کرتا ہے، اُس پر لازم ہے کہ دلیل پیش کرے، اب تو تبلیغی اجتماع میں بھی اجتماعی دعا کی جاتی ہے اور لوگ بڑے اہتمام سے اس میں شرکت کے لیے جاتے ہیں، تو ایک خاص موقع اور مقام پر اس کے جواز اور باقی مواقع اور مقامات پر اس کی ممانعت کی کیا دلیل ہے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص خود شارع بننے کی کوشش کرے اور ''مَنَّاعٍ لِلْخَیْر'' (خیر کے کاموں سے بہت زیادہ روکنے والا) بننا چاہتا ہو۔ الغرض قبولیتِ دعا کا جو عمومی قرینہ نماز کے بعد اور اجتماعِ کثیر کے مواقع پر بتایا گیا ہے، فرض نمازوں کے بعد اس کی ممانعت کہیں نہیں فرمائی گئی ہے۔ ہم اسے درجۂ استحباب میں قرار دیتے ہیں، واجب یا سنّتِ مؤکدہ کا درجہ نہیں دیتے۔ اگر ہر مستحب و پسندیدہ کام کا معیار یہ بنایا جائے کہ قرآن وسنّت میں اس کا ذکر ہو تو پھر بہت سے پسندیدہ، معمول بہا اور متفق علیہ اُمور کو بھی ترک کرنا پڑے گا۔ مثلاً نمازِ تراویح کی جماعت، قرآن مجید کو صحیفے کی شکل میں مدوّن کرنا، پھر باقی قراءت کو ترک کر کے لُغتِ قریش کو باقی رکھنا۔ بعد میں حجاج بن یوسف کے عہد میں قرآن کریم کی حرکات وسکنات واعراب لگانا، آیات کی علامت کا اندراج، سورتوں کے ناموں کا اندراج اسے قارئین کی سہولت کے لیے اجزاء میں تقسیم کرنا، رکوعات کی تقسیم وغیرہ۔ الغرض بے شمار ایسے اُمور ہیں، جنہیں اُمت مستحسن سمجھ کر کر رہی ہے، لیکن عہدِ رسالت مآب ﷺ میں یہ اُمور اس ہیئت پر نہیں تھے۔

نمازِ تراویح میں فاسد نماز کی قراءت کا اعادہ

سوال:

نمازِ تراویح میں امام غلطی سے تین رکعات ادا کرلے اور پھر اُن کا اعادہ کرے، لیکن جو قرآن ان تین رکعتوں میں پڑھا، اُس کو نہ پڑھے بلکہ آگے سے پڑھے تو کیا نمازِ تراویح درست ہوگی؟۔ نیز گزشتہ سال ایسا ہوا، نمازیوں نے امام صاحب سے مطالبہ کیا کہ تراویح

دہرائیں اور سابق رکعات میں جو آیات پڑھیں اُنہیں بھی دہرائیں، تو اُنہوں نے ایسا نہیں کیا، کیا ایسے امام کے پیچھے تراویح جائز ہے؟(المصطفیٰ مسجد، KBR بفرزون کراچی)

جواب:

فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق نمازِ تراویح میں تین رکعات پڑھیں، اگر دوسری رکعت میں قعدہ نہیں کیا تھا تو اِن دو رکعات کا اعادہ کرے، یعنی دو رکعات دوبارہ پڑھے اور ان تین رکعات میں جتنی آیات تلاوت کیں، اُن کو بھی دوبارہ پڑھے۔ اگر دو رکعات پر قعدہ کیا تھا، تو رکعات دہرانے کی ضرورت نہیں البتہ تیسری رکعت میں جو آیات تلاوت کی تھیں، اگلی رکعت میں اُن کو دوبارہ پڑھے۔ تاہم قراءت کا اعادہ نہ کرنا نماز کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوگا، البتہ تراویح میں تکمیلِ قرآن میں اُن آیات کی کمی رہ جائے گی، لیکن اس پر امام کو ملامت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ بعض فقہاء نے قراءت کے دُہرانے کو لازمی قرار نہیں دیا۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَاِذَا غَلَطَ فِی الْقِرَاءَةِ فِی التَّرَاوِیحِ فَتَرَكَ سُورَةً أَوْ آیَةً وَقَرَأَ مَا بَعْدَهَا فَالْمُسْتَحَبُ لَهُ أَنْ یَقْرَاءَ الْمَتْرُوكَةَ ثُمَّ الْمَقْرُوأَةَ لِیَكُونَ عَلَی التَّرْتِیبِ كَذَا فِی فَتَاوَی ''قَاضِی خَان''۔ وَاِذَا فَسَدَ الشَّفْعُ وَقَدْ قَرَأَ فِیْهِ لَایُعْتَدُّ بِمَا قَرَأَ فِیهِ وَیُعِیدُ الْقِرَاءَةَ لِیَحْصِلَ لَهُ الْخَتْمُ فِی الصَّلَاةِ الْجَائِزَةِ وَقَالَ بَعْضُهُم یَعْتَدُّ بِهَا كَذَا فِی ''الْجَوهَرَةِ النَّیِّرَة''۔

ترجمہ: ''اور جب نمازِ تراویح میں قراءت میں غلطی ہوئی اور کوئی سورت یا آیت چھوڑ دی اور اُس کے بعد کی آیات تلاوت کیں، تو مستحب یہ ہے کہ پہلے چھوڑی ہوئی آیات پڑھے، پھر پڑھی ہوئی آیات (دوبارہ) پڑھے تاکہ ترتیب صحیح ہوجائے، جیسا کہ ''فتاویٰ قاضی خان'' میں ہے۔ جب دو رکعت تراویح فاسد ہوجائے اور اس میں (کچھ حصہ) تلاوت کرچکا تھا، تو اس فاسد نماز میں پڑھی ہوئی تلاوت کا شمار نہیں کیا جائے گا اور قراءت کا اعادہ کرے گا تاکہ جائز نماز میں ختم قرآن کی برکت حاصل ہو اور بعض فقہاء نے کہا: فاسد نماز میں پڑھی

ہوئی قراءت کا شمار کیا جائے گا، ''اَلْجَوھَرَةُ النَّیِّرَہ'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:118)

نماز میں سُترے کی ہیئت

سوال:

نمازی کے آگے سترہ کی مقدار کتنی ہونی چاہیے؟۔اکثر مساجد میں سترہ اس طرح بنا ہوتا ہے کہ اس کے دونوں کنارے، پائے زمین پر ہوتے ہیں اور دونوں کناروں کے ملانے کے لیے درمیان میں لکڑی یا لوہا وغیرہ لگا ہوتا ہے، جس کا زمین سے فاصلہ ایک فٹ ہوتا ہے، کیا یہ سترہ بن سکتا ہے؟۔(قاری محمد احسان قادری، اورنگی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے: عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ سُئِلَ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ عَنْ سُتْرَةِ الْمُصَلِّيْ، فَقَالَ: كَمُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے سُترہ (Cover) کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: پالان کی پچھلی لکڑی کے برابر ہو''۔(صحیح مسلم:500)

سُترہ کی لمبائی ایک ہاتھ اور موٹائی ایک انگلی کے برابر ہونی چاہیے، زیادہ سے زیادہ لمبائی تین ہاتھ ہے۔علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(سُتْرَةً بِقَدْرِ ذِرَاعٍ) طُوْلاً (وَغِلَظِ اِصْبَعٍ) لِتَبْدُوَ لِلنَّاظِرِ (بِقُرْبِهِ) دُوْنَ ثَلَاثَةِ أَذْرُعٍ

ترجمہ: ''سُترہ کی مقدار ایک ہاتھ لمبا اور موٹائی ایک انگلی کے برابر ہونی چاہیے تاکہ دیکھنے والے پر ظاہر ہو، زیادہ سے زیادہ لمبائی تین ہاتھ ہے''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4، ص:126-125، دمشق)

سُترہ کا نصب کرنا لازم نہیں ہے، مُعلّق شے بھی بطور سُترہ استعمال ہوسکتی ہے، جیسا کہ تنویر الابصار مع الدر المختار میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَصُورَتُهُ: أَنْ تَكُونَ السَّتَارَةُ مِنْ ثَوبٍ أَوْنَحوِهٖ مُعَلَّقَةً فِي سَقْفٍ مَثَلاً ثُمَّ يُصَلِّيْ قَرِيْبًا مِنْهُ، فَاِذَا سَجَدَ تَقَعُ عَلىٰ ظَهْرِهٖ وَيَكُوْنُ سُجُوْدُهٗ خَارِجًا عَنْهَا۔ وَاِذَا قَامَ أَوْقَعَدَ سَبَلَتْ عَلَى الْاَرْضِ وَسُتْرَتِهٖ۔

ترجمہ: ''اس کی صورت یہ ہے: کپڑے کا پردہ یا اُس کے جیسی کوئی شے چھت سے مُعلَّق (لٹکی ہوئی) ہے، پھر اس کے قریب کوئی نماز پڑھ رہا ہو، پس جب سجدہ کرے تو پردہ اُس کی پشت پر ہوگا اور سجدہ اُس (پردے) کے خارج میں۔ اور جب نمازی قیام یا قعدہ کرے گا تو پردہ زمین پر لٹک رہا ہوگا اور سترہ ہوگا''۔ (جلد 2،ص:345، بیروت)

نماز میں قصر کا حکم

سوال:

میرا تعلق مظفرآباد، آزاد کشمیر کے ایک گاؤں سے ہے جو کہ شہر سے تقریباً 44 کلومیٹر ہے۔ جبکہ مظفرآباد شہر میں بھی کرائے کے گھر میں تقریباً 15 سال سے رہائش پذیر ہوں۔ میں عرصہ پانچ سال سے بسلسلہ ملازمت اسلام آباد میں مقیم ہوں جو کہ 145 کلومیٹر ہے، جبکہ میں ہر دو ہفتوں کے بعد مظفرآباد شہر میں گھر واپس جاتا ہوں جمعہ کو اور اتوار کو یا سوموار کی صبح واپس اسلام آباد آجاتا ہوں۔ جبکہ کبھی کبھی اتوار یا سوموار کو واپس اسلام آباد آنے کے بعد جمعے کو ہی واپس مظفرآباد آجاتا ہوں جو کہ تقریبا 4,5 دن بنتے ہیں جبکہ اگر ایک جمعے کو چھوڑ کر اگلے جمعے کو جاؤں تو اس صورت میں تقریبا 10 دن بنتے ہیں۔ مفتی صاحب رہنمائی فرمائیں کہ آیا میں نماز قصر کروں گا یا نہیں، جبکہ میں قصر نہیں کررہا۔ میرا ایک دوست، جو زیادہ تر سوموار کو آنے کے بعد جمعے کو واپس گھر چلا جاتا ہے، قصر کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان ملازمت کے سلسلے میں گھر سے کتنے کلومیٹر کے فاصلے پر ہو تو مسافر کہلاتا ہے اور نماز میں قصر کرسکتا ہے، (منہاس خان فرید محمد، مظفرآباد)۔

جواب:

فقہاء کرام کے اقوال میں سے مفتیٰ بہ قول اٹھارہ فرسخ ہے اور اٹھارہ فرسخ چوّن میل

شرعی ہیں، اور یہ فاصلہ اٹھانوے اعشاریہ سات تین چار (98.734) کلومیٹر کے برابر ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ثُمَّ اخْتَلَفُوا فَقِيلَ أَحَدٌ وَعِشْرُونَ، وَقِيلَ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ، وَقِيلَ خَمْسَةَ عَشَرَ، وَالْفَتْوَىٰ عَلَى الثَّانِي لِأَنَّهُ الْأَوْسَطُ۔

ترجمہ:''بعض فقہاء نے اکیس فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اٹھارہ فرسخ قرار دیا ہے اور بعض نے پندرہ فرسخ قرار دیا ہے اور مفتیٰ بہ اٹھارہ فرسخ کا قول ہے، کیونکہ یہ متوسط قول ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار ج:2،ص:526، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی)''۔ لہٰذا مفتیٰ بہ قول کے مطابق تقریباً اٹھانوے (98) کلومیٹر کی مسافت کے بعد ہی سفرِ شرعی اور قصر کے احکام لاگو ہوں گے۔

جب آپ وطنِ اصلی میں ہوں، تو پوری نماز ادا کریں گے، لیکن جب کسی مقام پر 15 دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو، تو وہاں نماز قصر پڑھیں گے، جب تک بندہ کسی مقام پر 15 دن یا اُس سے زائد عرصے کے لیے قیام کی نیت نہ کرے، تو وہ شرعاً مسافر ہی کہلائے گا، نماز میں قصر کرے گا۔

تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے: (أَوْ يَنْوِيْ) وَلَوْ فِي الصَّلَاةِ إِذَا لَمْ يَخْرُجْ وَقْتُهَا وَلَمْ يَكُ لَاحِقًا (إِقَامَةَ نِصْفِ شَهْرٍ) حَقِيقَةً أَوْ حُكْمًا لِمَا فِي ''الْبَزَّازِيَّةِ'' وَغَيْرِهَا. (بِمَوْضِعٍ صَالِحٍ لَهَا) مِنْ مِصْرٍ أَوْ قَرْيَةٍ أَوْ صَحْرَاءِ دَارِنَا وَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْأَخْبِيَةِ (فَيَقْصُرُ إِنْ نَوَى) الْإِقَامَةَ (فِي أَقَلَّ مِنْهُ) أَيْ فِي نِصْفِ شَهْرٍ۔

ترجمہ:''(یا وہ نصف ماہ اقامت کی نیت کرے) اگرچہ اقامت کی نیت نماز کے اندر کرے بشرطیکہ نماز کا وقت نہ نکلا ہو اور مسافر لاحق نہ ہو، پھر اقامت کی نیت حقیقت میں ہو یا حکماً دونوں معتبر ہیں جیسے کہ ''بزازیہ'' وغیرہ میں اس کی مثال موجود ہے، (اقامت کی نیت کسی ایسی جگہ کرے جو اقامت کی صلاحیت رکھتی ہو) شہر ہو یا گاؤں ہو یا ہمارے ملک کا صحرا ہو اور نیت کرنے والا خانہ بدوش ہو، (پس نماز میں قصر کریں گے، اگر پندرہ دن سے کم اقامت کی نیت کی ہو)''۔ (جلد2،ص:528، 529، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

پس اسلام آباد، مظفر آباد سے مسافتِ سفر وہاں ٹھہرنے پر ہے اور پندرہ دن سے کم قیام کا ارادہ ہو تو آپ نماز قصر پڑھیں گے اور بہتر یہ ہے کہ مسجد میں باجماعت نماز پڑھیں، اس صورت میں امام کی متابعت میں آپ پوری نماز پڑھیں گے۔

نماز میں آستین فولڈ کرنا

سوال:

کیا جرسی فولڈ کر کے نماز پڑھنا درست ہے؟، (فرحان انجم)۔

جواب:

نماز میں کپڑا سمیٹنے یا موڑنے سے منع فرمایا گیا ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَن ابن عَبَّاسٍ قَالَ: أُمِرَ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَسْجُدَ عَلٰى سَبعَةٍ، وَنَهٰى أَنْ يَكُفَّ شَعْرَهُ وَثِيَابَهُ قَالَ أَبُوالرَّبِيعِ: عَلٰى سَبْعَةِ أَعْظُمٍ، وَنُهِيَ أَنْ يَكُفَّ شَعْرَهُ وَثِيَابَهُ، اَلْكَفَّيْنِ وَالرُّكْبَتَيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ وَالْجَبْهَةِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کو سات (اعضاء) پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا اور نماز کی حالت میں بال سمیٹنے اور کپڑوں کو موڑنے سے منع کیا گیا ہے، ابوالربیع کی روایت میں سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے اور بالوں کو سنوارنے اور کپڑوں کو سمیٹنے کی ممانعت کا ذکر ہے، وہ سات ہڈیاں یہ ہیں، دو ہتھیلیاں، دو گھٹنے، دونوں قدم اور پیشانی، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1095)''۔ اس حدیث میں ''کفِ ثوب'' سے ممانعت کا حکم ہے۔ ہمارے نزدیک کپڑوں کو نیفے کی جانب اڑسنا، پتلون یا شلوار یا پاجامے کے پائنچے کی تہیں بنا کر نیچے سے اوپر موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا سب اس کا مصداق بنتے ہیں، اسی طرح آستینوں کی تہیں بنا کر موڑنا یا جسے عرفِ عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ''تشمیر'' کہتے ہیں، اس پر بھی ''کفِ ثوب'' کا اطلاق ہوتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث مبارک اور دیگر احادیث کی رو سے ممنوع ہے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: (وَ) كُرِهَ (كَفُّهُ) أَيْ رَفعُهُ وَلَوْ لِتُرَابٍ كَمُشَمِّرِكُمٍّ أَوْ

ذَیْلٍ (وَعَبَثُہُ بِہٖ) أَیْ بِثَوبِہٖ

ترجمہ: ''اور کپڑے کا سمیٹنا یعنی اوپر اٹھانا مکروہ ہے، خواہ مٹی سے بچنے کے لیے ایسا کرے، جیسے آستین چڑھانا یا دامن کو اوپر اٹھانا اور کپڑے کے ساتھ کھیلنا۔''اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أَی کَمَالَو دَخَلَ فِی الصَّلَاۃِ وَھُوَمُشَمِّرٌکُمَّہُ أَوْذَیْلَہُ، وَأَشَارَ بِذٰلِکَ اِلٰی أَنَّ الْکَرَاھَۃَ (لَاتَخْتَصُّ بِالْکَفِّ وَھُوَفِی الصَّلَاۃِ، کَمَاافَادَہٗ فِی ''شَرْحِ الْمُنْیَۃِ''، لٰکِن قَالَ فِی ''الْقُنْیَۃِ'': وَاخْتُلِفَ فِیمَنْ صَلّٰی وَقَد شَمَّرَکُمَّیْہِ لِعَمَلٍ کَانَ یَعمَلُہُ قَبلَ الصَّلَاۃِ أَوھَیئَتُہُ ذٰلِکَ) وَمِنہُ مَالَو شَمَّرَلِلوَضُوءِ، ثُمَّ عَجَّلَ لِاِدرَاکِ الرَّکعَۃِ مَعَ الاِمَامِ، وَاِذَا دَخَلَ فِی الصَّلَاۃِ کَذٰلِکَ وَقُلنَابِالْکَرَاھَۃِ فَھَلِ الأَفضَلُ اِرْخَاءُ کُمَّیْہِ فِیھَابِعَمَلٍ قَلِیلٍ أَوتَرکُھُمَا؟لَم أَرَہٗ: وَالأَظھَرُالأَوَّلُ بِدَلِیلِ قَولِہِ الآتِی: وَلَوسَقَطَتْ قَلَنْسُوَتُہ فَاِعَادَتُھَا أَفضَلُ تَأَمَّلْ۔

ترجمہ: ''یعنی جس طرح ایک شخص نماز میں داخل ہوتے وقت ہی آستین یا دامن چڑھائے ہوئے تھا، اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ کراہت صرف اس صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ نماز کے اندر آستین چڑھائے تو تب مکروہ ہے، جیسا کہ ''شرح المنیہ'' سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔ لیکن ''القنیہ'' میں کہا ہے کہ: ''اس امر میں اختلاف رائے ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اور وہ (نماز میں داخل ہونے سے) پہلے ہی کسی کام کی بناء پر آستین چڑھائے ہوئے تھا یا اس کی ہیئت ہی ایسی ہے۔'' اور انہی میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اس نے وضو کے لیے آستین چڑھائیں، پھر امام کے ساتھ رکعت پانے کی خاطر عجلت کی اور جب نماز میں داخل ہوگیا، تو وہ اسی حالت میں (یعنی آستین چڑھائے ہوئے تھا) تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا اب نماز کے اندر عمل قلیل کے ذریعے آستینیں کھول دے یا اپنی حالت پر چھوڑ دے، میں نے کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں پایا، لیکن زیادہ واضح بات پہلے والی بات ہے (یعنی یہ کہ عمل قلیل سے کھول دے)، اس کی دلیل علامہ حصکفی کے اس قول سے ملتی ہے کہ: ''اگر نمازی کی ٹوپی گر جائے تو

اٹھا کر سر پر رکھ لینا ہی افضل ہے، غور کیجیے"۔ آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ:

وَقَیَّدَ الْکَرَاھَةَ فِی "الْخُلَاصَةِ" وَ"الْمُنیَةُ" بِأَنْ یَکُوْنَ رَافِعًا کُمَّیْهِ اِلَی الْمِرْفَقَیْنِ، وَظَاھِرُهٗ أَنَّه لَایُکْرَهُ اِلٰی مَادُوْنِهِمَا، قَالَ فِی "الْبَحرِ": وَالظَّاھِرُ الْاِطْلَاقُ لِصِدْقِ کَفِّ الثَّوبِ عَلَی الْکُلِّ۔

ترجمہ: "خلاصہ" اور "منیہ" میں کراہت کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا ہے کہ آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی ہیں، اور اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ کہنیوں سے نیچے تک چڑھانا، باعث کراہت نہیں ہے، لیکن "البحر الرائق" میں لکھا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً آستینیں چڑھانا (کہنیوں سے نیچے ہو یا اوپر) کراہت کا سبب ہے، کیونکہ "کفِ ثوب" تمام صورتوں پر صادق آتا ہے"۔ (جلد 4، ص:8-137، دمشق)

آپ نے جو جرسی کی بابت دریافت کیا ہے، اس میں واضح نہیں ہے کہ آپ کی مراد آستینوں کا فولڈ کرنا ہے یا نیچے سے؟ نیچے سے ایک دو پرت فولڈ کرنا آج کل خلافِ وضع نہیں ہے، لہٰذا اس پر کراہت کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اسی طرح اگر جرسی کی آستینیں لمبی ہیں اور ایک دو پرت فولڈ کر کے اسے مناسب حالت پر لایا جاتا ہے، تو اس میں بھی کراہت کا حکم نہیں لگایا جائے گا، البتہ نماز کے اندر اگر اس کے لیے عملِ کثیر کرنا پڑے، تو پھر منع ہے۔ اسی طرح اگر آدھی آستین کی جرسی ہے، تو چونکہ یہ وضع کے مطابق ہے، اس لیے اسے پہن کر نماز پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں ہے، اسی طرح آدھی آستین کی قمیص پہن کر نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے، اگرچہ یہ ناپسندیدہ بات ہے، کیونکہ اس کی وضع یہی ہے اور مرد کے لیے بازو کا کہنیوں تک ڈھانپنا نماز میں فرض، واجب یا سنّت نہیں ہے۔

مسجد اور وقف کے مسائل

مسجد میں کُنڈا لگا کر بجلی لینے کا حکم

سوال:

سرجانی ٹاؤن میں بجلی کے میٹر فراہم نہیں کیے گئے ہیں، جس کی بنا پر کنڈے کے ذریعے بجلی حاصل کی جاتی ہے۔ ہماری مسجد فیضانِ جمالِ مصطفیٰ میں بھی بجلی کا حصول اسی ذریعے سے کیا گیا ہے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ چوری کی بجلی ہے، لوگوں کی نماز ادا نہیں ہورہی۔ برائے مہربانی اس مسئلے کا حل ارشاد فرمادیں۔

(محمد انس قادری، فیضانِ جمالِ مصطفیٰ مسجد، سرجانی ٹاؤن)

جواب:

آپ کے بیان کے مطابق آپ کے علاقے میں بجلی کی ترسیل کے لیے K-Electirc کی جانب سے میٹر فراہم نہیں کیے گئے، کُنڈے کے ذریعے بجلی کا استعمال ہورہا ہے، آپ اُس کا جائز طریقہ یہ اختیار کرسکتے ہیں کہ K-Electirc سے عارضی کنکشن حاصل کریں، جس کا ماہانہ بل ادا کیا جائے، اُس کا ریکارڈ اپنے پاس محفوظ رکھیں اور اُس اداشدہ بل کی کاپی مسجد میں آویزاں کردیا کریں تاکہ کسی کے لیے اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ بجلی کے میٹر کو مصنوعی طریقے سے ٹمپر کر کے یا اُس کی رفتار کم کر کے یا کُنڈا لگا کر جو بجلی استعمال کی جاتی ہے اور اس کے واجبات کی ادائیگی نہیں کی جاتی، یہ خیانت اور غبن ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا اور اجر کی توقع رکھنا ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

ترجمہ: ''اور (اللہ کی راہ میں) ایسی ناکارہ اور ناقابلِ استعمال چیز دینے کا قصد نہ کرو، جس کو تم خود بھی آنکھیں بند کیے بغیر لینے والے نہیں ہو اور یقین رکھو کہ اللہ بہت بے نیاز نہایت تعریف کیا ہوا ہے''۔ (بقرہ: 267)

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: "أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا وَإِنَّ اللهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِينَ. فَقَالَ: {يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ} وَقَالَ: {يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ} ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ، أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ. يَا رَبِّ! يَا رَبِّ! وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ. وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ. وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ. فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ؟۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے لوگو! بیشک اللہ پاک ہے اور صرف پاک (صدقات کو) قبول فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اسی بات کا حکم دیا ہے، جس کا حکم رسولوں کو دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو بیشک تم جو بھی عمل کرتے ہو، مجھے اس کا بخوبی علم ہے، (المومنون: 51)" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے مومنو! ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ"، پھر آپ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ غبار آلود ہے، بال پراگندہ ہیں، طویل سفر کر کے آیا ہے، اور اپنے ہاتھ دعا کے لیے آسمان کی طرف پھیلا کر پکارتا ہے: اے میرے پروردگار، اے میرے پروردگار! حالانکہ اس کا کھانا حرام کا ہے، پینا حرام ہے اور لباس حرام کا ہے اور اسے حرام ذرائع سے غذا دی جاتی ہے، تو کیسے اس کی دعا قبول ہوگی"۔ (صحیح مسلم: 2343)

قرآنی آیات، احادیث میں طیّب (پاک مال) سے مراد وہ مال ہے، جسے حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو، حرام طریقے سے حاصل کیا ہوا مال خبیث اور ناپاک ہے۔ یہ خباثت یا ناپاکی حسی نہیں بلکہ معنوی ہے، یعنی یہ مال چونکہ ناجائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہے، اس لیے یہ حکماً ناپاک ہے۔ جہاں تک نماز کی ادائیگی کا سوال ہے، سو اگر نماز تمام فقہی اصولوں اور شرعی احکام کے مطابق صحیح طور پر ادا کی جارہی ہے، تو فقہی طور پر کہا جائے گا کہ

نماز ادا ہوگئی اور بندہ ادائے فرض سے بری الذمہ ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت اُس کی رضا پر موقوف ہے اور اس کا علم اسی کے پاس ہے۔ دنیا میں حکم ظاہر پر لگایا جاتا ہے، باطن کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے۔ تاہم اکلِ حرام اور کسبِ حرام کا اثر عبادات اور دعاؤں کی قبولیت پر یقیناً مرتب ہوتا ہے اور اس سلسلے میں احادیث موجود ہیں:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ''لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ، وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) طہارت کے بغیر نماز مقبول نہیں اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں''۔ (سنن ترمذی، رقم الحدیث:1)

عام نمازی جن کا مسجد میں کنڈا لگانے سے کوئی تعلق نہیں، نہ اُن کی مرضی سے کنڈا لگایا گیا ہے، اُن کی نمازوں پر اعتراض بے محل ہے، تاہم یہ نمازی اگر تقوے پر کاربند رہنا چاہتے ہیں اور شرعی احتیاط پر عمل کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں چاہیے کہ کوشش کرکے مجاز ادارے سے عارضی کنکشن حاصل کریں اور اُس کے بل کی ادائیگی کا اہتمام کریں۔ تقوے کے تقاضے محض فتویٰ لینے یا اعتراض کرنے سے پورے نہیں ہوتے، وہ عملی اقدام کریں اور مسجد کی ضروریات پوری کرنے میں ممد ومعاون بنیں، البتہ مسجد انتظامیہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اور قانون کے سامنے ضرور جوابدہ ہوگی۔

مسجد کی تعمیرِ نو کے بعد اضافات کا شرعی حکم

سوال:

انڈس ہسپتال کے احاطے میں ایک مسجد بنام الاتّین والا واقع ہے، جس میں الحمدللہ کئی برسوں سے باقاعدہ پنج وقتہ نمازیں ادا کی جارہی ہیں۔ یہ مسجد بوسیدہ ہوگئی ہے اور از سرِ نو تعمیر اور توسیع زیرِ غور ہے۔ اس وقت یہ مسجد صرف سطحِ زمین Ground Floor پر ہے، نیچے، اوپر کوئی تعمیر موجود نہیں ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ درج ذیل میں سے کیا اضافہ کیا جاسکتا ہے:

(1) نماز اور تدریس کے لیے اوپر کی منزلیں اور تہہ خانہ؟۔

(2) تہہ خانہ (Basement) میں مسجد اور ہسپتال کے لیے استعمال کے لیے پانی کا ذخیرہ (Water Tank)۔

(3) تہہ خانوں میں نمازیوں کے لیے کار پارک۔

(4) تہہ خانے میں مسجد اور دینی اُمور کا انتظامی دفتر۔

5۔ تہہ خانے میں وضو خانے اور ٹائلٹ، (محمد صدیق شیخ، کراچی)۔

جواب:

مسجد کی تکمیل کے بعد اگر ضرورت پڑے، تو مسجد کی تعمیر نو کی جاسکتی ہے لیکن وہاں مسجد کے علاوہ کسی اور قسم کی تعمیر کرنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ مسجد کے مصالح یعنی ضروریات، منافع اور سہولت ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ اس لیے مسجد کی جگہ پر تہہ خانے میں وضو خانہ، بیت الخلاء، کار پارکنگ وغیرہ بنانا وقف کی ہیئت میں تبدیلی کے مترادف ہے اور یہ جائز نہیں ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''لَایَجُوزُ تَغْیِیرُ الْوَقْفِ عَنْ ھَیْئَتِہٖ''

ترجمہ: ''وقف کو اپنی ہیئت سے تبدیل کرنا جائز نہیں''۔ (فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص: 490)

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

''لَوْ بَنٰی فَوقَہٗ بَیْتًا لِلْاِمَامِ لَا یَضُرُّ لِاَنَّہٗ مِنَ الْمَصَالِحِ. اَمَّا لَوْتَمَّتِ الْمَسْجِدِیَّۃُ ثُمَّ اَرَادَالْبِنَاءَ مُنِعَ، وَلَوْقَالَ عَنَیْتُ ذٰلِکَ لَمْ یُصَدَّقْ ''تَتَارخَانِیَۃ''، فَاِذَاکَانَ ھٰذَا فِی الْوَاقِفِ فَکَیْفَ بِغَیْرِہٖ. فَیَجِبُ ھَدْمُہٗ وَلَوْعَلٰی جِدَارِ الْمَسْجِدِ''

ترجمہ: ''اگر واقف نے (ابتداہی میں) مسجد کی عمارت کے اوپر امام کے لیے مکان بنایا تو حرج نہیں، کیونکہ وہ مصالح مسجد میں سے ہے، لیکن تمام مسجدیت کے بعد اگر وہ ایسا کرنا چاہے (یعنی مسجد کے اوپر امام کے لیے حجرہ بنانا چاہے) تو اس کو منع کیا جائے گا۔ اور اگر وہ کہے کہ میرا شروع سے یہی ارادہ تھا، تب بھی اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی، بحوالہ ''فتاویٰ تتارخانیہ''۔ جب واقف کے لیے یہ حکم ہے تو غیر واقف کے لیے اس طرح کرنا کیسے جائز

ہو سکتا ہے، لہٰذا ایسی تعمیرات کا گرانا واجب ہے اگرچہ وہ صرف مسجد کی دیوار کے اوپر ہو''۔

(جلد:6،ص:428، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

نوٹ: ''مسجدیت'' سے مراد مسجد بن جانا یا مسجد قرار پانا ہے۔

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ (لَوتَمَّتِ الْمَسْجِدِيَّةُ) کے تحت لکھتے ہیں:

أَي بِالْقَوْلِ عَلَى الْمُفْتٰى بِهِ أَوبِالصَّلَاةِ فِيهِ عَلىٰ قَولِهِمَا۔ وَعِبَارَةُ ''التَّتَارخَانِيَةِ: وَإِنْ كَانَ حِيْنَ بنَاهُ خَلّٰى بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّاسِ ثُمَّ جَاءَ بَعدَ ذٰلِكَ يَبنِى لَايُتْرَكُ''

ترجمہ: ''اگر مسجدیت تمام ہوگئی یعنی مفتیٰ بہ قول کے مطابق زبان سے (اس جگہ کو مسجد قرار دے دیا) یا طرفین کے نزدیک وہاں نماز پڑھ لی گئی ہو۔ ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' کی عبارت یہ ہے: جب مسجد کی عمارت بنائی (اور) اس کو لوگوں کے حوالے کردیا، پھر آکر (اس میں کوئی اور چیز) تعمیر کرنا چاہتا ہے تو اس کو اجازت نہیں دی جائے گی''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:6،ص:428، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال ہوا کہ پرانی مسجد کو شہید کرکے ازسرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ ہے اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ نیچے دکانیں بنالی جائیں تاکہ ان کے کرائے کی آمدنی مسجد کی ضروریات پر صرف کی جائے اور اوپر مسجد تعمیر کرلی جائے، سب سے اوپر امام کے لیے بالاخانہ (یعنی رہائش گاہ) بنالی جائے، کیا یہ شرعاً جائز ہے (خلاصۂ سوال)۔ اُنہوں نے جواب میں لکھا: ''صورتِ مسئولہ میں وہ دکانیں قطعی حرام، اور وہ بالاخانہ بھی حرام۔ یعنی اگر مسجد بناتے وقت اور تمامِ مسجدیّت سے پہلے بانیِ مسجد نے اس کے نیچے مسجد کے لیے دوکانیں یا اوپر امام کے لیے بالاخانہ بنالیا اور اس کے بعد اُنہیں ختم کرکے مسجد میں شامل کرنا چاہے، تو یہ جائز ہے۔ اور اگر مسجد بننے کے بعد اُس میں تبدیلی کرکے نیچے دکانیں اور اوپر بالاخانہ بنانا چاہے، خواہ مسجد کی صرف دیوار ہی استعمال میں آئے، یہ تبدیلی ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگی، خواہ وہ یہ کہے کہ میری شروع ہی سے یہ نیت تھی، ایسی عمارت کو گرادیا جائے گا (یعنی جب ایک بار مسجد بن جائے، تو اُس کی ہیئت میں

تغیر و تبدّل جائز نہیں ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، ج:16، ص:432، رضا فاؤنڈیشن)''۔ نوٹ: یہ عبارت ہم نے سمجھانے کے لیے آسان کر کے لکھی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ زمین کا قطعہ جب ایک بار مسجد کے لیے وقف کر دیا یعنی اس کا رستہ الگ کرنے کے بعد وہاں پر لوگوں کو دائمی طور پر نماز پڑھنے کی اجازت دے دی یا صاحبین (امام محمد اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ) کے مطابق وہاں پر ایک مرتبہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کر لی گئی، تو اب اس مسجد کی مسجدیت تمام ہو گئی اور وہ جگہ زمین سے آسمان تک مسجد ہو گئی، اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا جائز نہیں ہے۔ فقہائے احناف نے اصول یہی بیان کیا ہے کہ مسجد زمین کی تہہ سے آسمان تک مسجد ہی کے حکم میں ہوتی ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

قَوْلُہٗ اِلٰی عَنَانِ السَّمَآئِ بِفَتْحِ الْعَیْنِ وَکَذَا اِلٰی تَحْتَ الثَّرٰی کَمَا فِی ''الْبِیْرِیْ'' عَنِ ''الْاِسْبِیْجَابِیْ''۔

ترجمہ: ''مسجد آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک مسجد ہی ہے، ''بیری'' میں ''اسبیجابی'' سے اسی طرح منقول ہے''۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، ج:2، ص:371-370)

ہاں! اگر طویل عرصہ گزرنے کی وجہ سے مسجد بوسیدہ ہو جائے یا نمازیوں کے لیے جگہ تنگ ہو جائے اور اس کو از سرِ نو تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہو، تو اُسے شہید کر کے تعمیر نو جائز ہے، لیکن نیچے سے اوپر تک اس کی مسجد کی حیثیت ہی بحال رکھی جائے گی، اس کے تہہ خانے (Basement) میں وائنڈنگ یا پارکنگ یا وضو خانہ یا انتظامی دفاتر کا قیام جائز نہیں ہے، یہ مسجد کی ہیئت کی تبدیلی قرار پائے گا اور تمام مسجدیت کے بعد اس کی ہیئت میں تبدیلی جائز نہیں ہے۔ البتہ مسجد میں تمام تر آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن کی تعلیم و تعلّم جائز ہے، بشرطیکہ نمازیوں کی نماز میں خلل واقع نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسجد کی افطاری کا مصرف

سوال:

ماہِ رمضان المبارک میں اہل محلہ اپنی استطاعت کے مطابق مسجد غفران میں ضرورتمندوں کے لیے افطاری کا اہتمام کرتے ہیں، جس سے مسافر اور غریب روزہ دار مستفید ہوتے ہیں، کیا اس افطاری سے امام مسجد اپنے اور گھر والوں کے لیے حصہ منگوا سکتے ہیں؟، (ارشاد صدیقی، مسجد غفران، دستگیر کالونی کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں محلے کے عطیہ دینے والے اہلِ خیر حضرات کی طرف سے یہ انتظام اگر نفلی خیرات (Charity) کی رقم سے کیا جارہا ہے تو یہ جائز ہے، اس سے کسی بھی روزے دار کو افطار کرایا جاسکتا ہے اور وہ چاہے تو گھر بھی لے کر جاسکتا ہے، کیونکہ چندہ دینے والوں کے لیے یہ معہود (Understood) و معروف ہے اور ان کا سکوت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس پر راضی ہیں۔ افطار کے لیے دی جانے والی رقم کا مصرف (یعنی روزے داروں کو افطار کرانا) متعین ہے، لیکن افراد متعین نہیں ہوتے۔ لہٰذا کسی بھی روزے دار کو اس سے افطار کرایا جاسکتا ہے۔ چونکہ نفلی صدقہ کے لیے لینے والے کا مستحق زکوٰۃ یعنی فقیر و مسکین ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے کسی بھی روزے دار کو افطار کرایا جاسکتا ہے اور وہ افطار کرسکتا ہے، خواہ امام مسجد یا انتظامیہ کا رکن ہی کیوں نہ ہو اور اگر عطیہ دینے والوں کی طرف سے کوئی شرط عائد نہیں ہے، تو لوگ ساتھ بھی لے جاسکتے ہیں اور معتکفین کو بھی کھلایا جاسکتا ہے۔ تاہم عطیہ دینے والوں کو یہ بتادیا جائے کہ وہ اس مد میں زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم نہ دیں، کیوں کہ صدقاتِ واجبہ کے مصارف متعین ہیں اور ان رقوم کے خرچ کرنے کے لیے شرعی شرائط کی پابندی لازم ہے۔ ان رقوم سے صرف مالکانہ بنیاد پر فقراء و مساکین کو نقد رقم یا کھانا وغیرہ دیا جاسکتا ہے، صرف اباحت کافی نہیں ہے۔ اس کو معتکفین یا غیر مستحقِ زکوٰۃ پر صرف نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی انتظامیہ کے لوگ اسے خود

کھا سکتے ہیں یا گھر لے جاسکتے ہیں۔ اگر مسجد میں افطاری کا اہتمام کرنے یا اس مقصد کے لیے چندہ دینے والوں کو یہ معلوم ہے کہ مسجد کے عملے کے اہلِ خانہ کی افطاری بھی اسی سے بھیجی جاتی ہے اور کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہے، تو یہ جائز ہے۔

مسجد کے غیر ضروری سامان کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ: ہماری مسجد میں کچھ استعمال شدہ سامان ہے جیسے پرانی صفیں، قالین، پرانے اور خراب پنکھے، جھومر، ٹیوب لائٹس کی پٹیاں، لاؤڈ اسپیکر کے یونٹ (جو کہ اب استعمال نہیں ہوتے)، لکڑی کے دروازے، کھڑکیاں، وغیرہ، جو استعمال میں نہ ہونے کی وجہ سے مزید خراب ہو رہے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

1۔ کیا کمیٹی (متولی) ان سامان کو فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم کو مسجد کے دیگر کاموں میں استعمال کر سکتا ہے؟۔ یہ سامان کسی کو بھی فروخت کر سکتے ہیں کوئی قید تو نہیں؟۔ مذکورہ سامان میں سے جو استعمال میں آسکتا ہے وہ سامان کسی کو بھی فروخت کر سکتے ہیں یا صرف کسی مسجد ہی میں دیا جاسکتا ہے؟، (محمد رئیس قادری، کراچی)۔

جواب:

ضرورت سے زائد چٹائیاں اور ڈیسک اگر مسجد کے استعمال کے لیے کار آمد نہ ہوں، تو دوسری مسجد کو دیئے جاسکتے ہیں اور متولی مسجد انہیں فروخت کر کے دیگر مصالح مسجد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

وَأَمَّا الْحَصِيْرُ وَالْقَنَادِيلُ فَالصَّحِيْحُ مِنْ مَذْهَبِ أَبِي يُوسُف أَنَّهُ لَايَعُودُ إِلَى مِلْكِ مُتَّخِذِهٖ بَلْ يَحُوْلُ إِلَى مَسْجِدٍ آخَرَ أَوْ يَبِيعُهُ قَيِّمُ الْمَسْجِدِ لِلْمَسْجِدِ۔

ترجمہ: ''چٹائیاں اور قندیلیں اگر مسجد کے لیے بے کار ہو جائیں تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ دینے والے کی ملک کی طرف نہیں لوٹیں گی بلکہ کسی دوسری مسجد کو دے دی جائیں گی یا متولی مسجد انہیں بیچ کر قیمت کو مسجد کے کام میں صرف

کردے''۔ (البحر الرائق، جلد 5، ص: 421، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

فتاویٰ تاتارخانیہ جلد نمبر 5 ص: 850 پر ہے:

وَفِی الْمُنتَقٰی: بَوَارِی المَسجِدِ اِذَا خَلُقت فَصَارَت لاَ یُنتفعُ بِھَا فَارَادَ الَّذِی بَسَطھَا اَنْ یَاْخُذَھَا ویَتَصدّق بِھَا وَیَشْتَرِیْ مَکَانَھَا فَلَہٗ ذٰلِکَ، وَاِن کَانَ ھُوَ غَائِبا فَارَادَ اَھْلُ المَحَلَّۃِ اَنْ یَاخُذُوْا البوارِیَ فَتَصَدَّقُوْا بِھَا مَا خَلُقَتْ، لَمْ یَکُنْ لَھُمْ ذٰلِکَ، اِنْ کَانَ لَھَا قِیْمَۃٌ، وَاِنْ لَمْ یَکُنْ لَھَا قِیْمَۃٌ فَلاَ بَاْسَ بِذٰلِکَ۔

ترجمہ: ''اور منتقیٰ میں ہے: مسجد کی چٹائیاں وغیرہ جب اتنی پرانی ہوگئیں کہ ان سے اب فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، انہیں بچھانے والے شخص نے چاہا کہ انہیں لے لے اور صدقہ کردے اور ان کی جگہ اور خرید لے، تو یہ اس کے لیے جائز ہے۔ اور اگر وہ موجود نہیں ہے، اور محلے والوں نے چاہا کہ وہ چٹائیوں کو لے لیں اور ان میں سے جو پرانی ہوگئی ہیں، انہیں صدقہ کردیں، تو اگر ان کی کوئی قیمت ہے تو اس صورت میں ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے، اور اگر اب ان کی کوئی قیمت نہیں رہی تو پھر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے''۔ ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' کی اس عبارت کی روشنی میں مسجد کا وہ ملبہ جس کی کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ آج کل شہروں میں اس کے اٹھانے پر بھی پیسا خرچ ہوتا ہے، اسے کوئی عام آدمی بھی لے سکتا ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا گیا: ''علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ مسجد کا فرش اور لکڑیاں جو خراب ہوجاتی ہیں، سوا مسجد کے اور کسی کام میں تصرف کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟، آخر کیا کرنا چاہیے، تحریر فرمائیں''۔ آپ نے جواب دیا: ''فرش جو خراب ہوجائے کہ مسجد کے کام کا نہ رہے، جس نے وہ فرش مسجد کو دیا تھا، وہ اس کا مالک ہوجائے گا، جو چاہے کرے اور اگر مسجد ہی کے مال سے تھا تو متولی بیچ کر مسجد کے جس کام میں چاہے لگادے اور مسجد کی لکڑیاں یعنی چوکھٹ کواڑ کڑی تختہ یہ بیچ کر خاص عمارت مسجد کے کام میں صرف ہو''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد ششم، ص: 430، مطبوعہ مکتبہ رضویہ، کراچی)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ بہارِ شریعت، جلد دوم، ص: 561 پر (بحوالہ درمختار، ردالمحتار) لکھتے ہیں: ''مسجد کی چٹائی جائے نماز وغیرہ اگر بے کار ہوں اور اس مسجد کیلیے کار آمد نہ ہوں تو جس نے دیا ہے وہ جو چاہے کرے، اُسے اختیار ہے۔ اور مسجد ویران ہوگئی کہ وہاں لوگ رہے نہیں تو اس کا سامان دوسری مسجد کو منتقل کردیا جائے بلکہ ایک مسجد منہدم ہوجائے اور اندیشہ ہو کہ اس کا ملبہ (سامان) لوگ اٹھالے جائیں گے اور اپنے صرف میں لائیں گے تو اسے بھی دوسری مسجد کی طرف منتقل کردینا جائز ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی نے ''ردالمحتار علی الدرالمختار'' جلد نمبر 6 صفحہ نمبر 430 پر ''مطلب فِی نَقْلِ انْقَاضِ الْمَسْجِدِ وَنَحْوِہٖ'' (یعنی مسجد کے ملبے اور شکستہ چیزوں کا بیان) کے عنوان کے تحت بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد کا ایسا ملبہ، بوسیدہ یا شکستہ اشیاء جن کی اس مسجد کو کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن وہ کسی اور مسجد کے کام آسکتی ہیں، تو ایسی اشیاء دوسری ضرورت مند مسجد کو دے دی جائیں، ورنہ ان اشیاء کو چور یا زور آور لوگ یا اوقاف کے نگران ویسے ہی ہڑپ کرلیں گے۔ امام ابوشجاع نے بتایا کہ مجھ سے امیر نے اس طرح کی اشیاء کے دوسری جگہ استعمال کی اجازت کا فتویٰ دریافت کیا تو میں نے علامہ شرنبلالی کی متابعت میں منع کردیا، بعد میں مجھے بتایا گیا کہ بعض دادا گیر لوگ اس مال کو ویسے ہی اٹھا کر لے گئے، تو مجھے اپنے فتوی پر ندامت ہوئی، پھر اب میں نے ''الذخیرہ'' میں دیکھا، صاحب ذخیرہ لکھتے ہیں: ''فتاویٰ نسفی'' میں ہے: شیخ الاسلام سے پوچھا گیا کہ ایک بستی کے لوگ اپنی مسجد کو ویران چھوڑ کر چلے گئے بعض زور آور لوگ اس کی لکڑیوں (یعنی ملبے) پر قابض ہوگئے اور اسے اپنے گھروں کو لے گئے، تو کیا محلے کے کسی شخص کیلیے جائز ہے کہ وہ قاضی کی اجازت سے لکڑیاں بیچ ڈالے اور قیمت بعض مساجد پر یا اسی مسجد پر صرف کرے؟، تو انہوں نے جواب دیا: جی ہاں!۔

مسجد کا چندہ سڑک پر صرف کرنا

سوال:

ہمارے علاقے موہاڑ ڈڈیال آزاد کشمیر کے عوام نے ایک مرکزی جامع مسجد تعمیر کی۔ یوکے اور دیگر جگہوں کے مسلمانوں نے بھی عطیات دیے، مسجد کے اکاؤنٹ میں ابھی لاکھوں روپے موجود ہیں۔ ابھی مسجد کی تعمیر مثلاً ٹائلز، رنگ وروغن اور میناروں کا کام باقی ہے۔ سب لوگوں نے اتفاقِ رائے سے ایک شخص کو متولی مقرر کیا۔ اب وہ شخص عوام سے اس تحریر پر دستخط کروا رہا ہے کہ جن لوگوں نے مسجد میں عطیات دیے ہیں وہ اُسے اختیار دے دیں کہ مسجد کا جمع شدہ فنڈ سڑک کی تعمیر میں استعمال کیا جائے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ: کیا مسجد کی جمع شدہ رقم سڑک کی تعمیر پر خرچ کی جاسکتی ہے؟ جن لوگوں نے عطیات دیے، کیا اب ان کو یہ حق حاصل ہے کہ تحریر پر دستخط کے ذریعے وہ اُس مسجد کی رقم کو سڑک کی تعمیر پر خرچ کرنے کا اختیار دے دیں، (حاجی محمد بشیر، وِنسن گرین برمنگھم یو۔کے)

جواب:

مساجد کے عطیات میں یہ امر معروف ہے کہ یہ مسجد کے مصارف جاریہ کے لیے ہوتے ہیں۔ اُن مصارف جاریہ میں ضروری تعمیر ومرمت کے علاوہ مسجد کے (بجلی، گیس اور پانی وغیرہ کے) یوٹیلیٹی بلز، ضرورت کے وقت رنگ وروغن، دریاں، قالین، ٹیوب لائٹس، پنکھے، پانی وسیوریج کا انتظام، عملے کی تنخواہ اور مصارف شامل ہوتے ہیں۔ آج کل چونکہ بجلی کا بحران ہے اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس لیے بعض مساجد میں جنریٹر کا انتظام کیا گیا ہے، خاص طور پر رمضان المبارک میں شدید گرمی کے موسم میں تراویح پڑھنا عوام کے لیے مشکل ہوتا ہے، جنریٹر کو چلانے میں ڈیزل/ پٹرول/ گیس الغرض ایندھن کا استعمال ہوتا ہے، یہ بھی مصارف جاریہ میں سے ہیں۔ یہ سب معروف ومعہود (Understood,Known) مصارف ہیں، ان پر مسجد کے فنڈ سے خرچ ہوتا ہے اور عطیات دینے والے اس سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں، بعض اوقات ان ضروریات کے

حوالے سے اپیل بھی کی جاتی ہے، لہٰذا مذکورہ بالا مصارف پر مسجد فنڈ سے پیسے کا استعمال جائز ہے۔ البتہ جو رقم کسی خاص مصرف اور مد کے لیے لی جائے یا عطیہ دینے والے کسی خاص مد کو مُتعین کر کے دیں، جیسے تعمیرِ مسجد، تو اُس رقم کو اُسی مصرف پر یا اُسی مد میں خرچ کیا جائے، جس مَصرف کے لیے دینے والوں نے مُتعیّن کیا ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ثُمَّ إِلٰی مَا هُوَ أَقْرَبُ إِلَی الْعِمَارَةِ وَأَعَمُّ لِلْمَصْلَحَةِ كَالْإِمَامِ لِلْمَسْجِدِ وَالْمُدَرِّسِ لِلْمَدْرَسَةِ يُصْرَفُ إِلَيْهِمْ بِقَدْرِ كِفَايَتِهِمْ. ثُمَّ السِّرَاجُ وَالْبُسُطُ كَذٰلِكَ إِلٰی آخِرِ الْمَصَالِحِ. هٰذَا إِذَا لَمْ يَكُنْ مُعَيَّنًا. فَإِنْ كَانَ الْوَقْفُ مُعَيَّنًا عَلٰی شَيْءٍ يُصْرَفُ إِلَيْهِ بَعْدَ عِمَارَةِ الْبِنَاءِ كَذَا فِي ''الْحَاوِي الْقُدْسِي''

ترجمہ: ''پھر وقف کے مال کو اُن امور پر خرچ کیا جائے، جو ضروری ہونے میں تعمیرِ مسجد کے قریب ہوں اور جن سے مسجد کی زیادہ آباد کاری ہو اور مسجد کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہوں، جیسے مسجد کے لیے امام اور مدرسے کے لیے مُدرّس، اُن پر اتنی رقم خرچ کی جائے گی جو اُن کی ضروریات کے لیے کفایت کرے، پھر چراغ (یعنی روشنی کا انتظام) اور دریوں و چٹائیوں (یعنی فرش) کا انتظام اور اسی طرح کے دوسرے امور جو مسجد میں نمازیوں کے لیے سہولت کا باعث ہوں (مصالح سے یہی مراد ہے)۔ وقف کے مال کو خرچ کرنے میں یہ (وسعت) اُس صورت میں ہے کہ (کسی مُعطی یا واقف کی طرف سے) مَصرف مُعیَّن نہ کیا گیا ہو۔ لیکن اگر مُعطی یا واقف کی طرف سے وقف کا مَصرف مُتعیّن کر دیا گیا ہے، تو عمارت کی تعمیر کے بعد اُسی مَصرف پر صرف کیا جائے گا ''الحاوی القدسی'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 368، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

وقف متعین کرنے کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص نے رقم دی ہو کہ اس سے نمازیوں کو ٹھنڈا پانی فراہم کرنے کے لیے کولر لگا دیں یا گرمی کی شدت سے بچانے کے لیے جنریٹر کا انتظام کر دیں، تو اس صورت میں یہ رقم فقط اسی مصرف پر خرچ کی جا سکے گی اور متولی اس کا

پابند ہوگا۔ البتہ اگر مسجد زیرِ تعمیر ہو تو اس رقم کو واقف کی شرط کے برخلاف تعمیر مسجد میں لگا سکتے ہیں۔

مسجد کے عطیات/آمدنی مسجد کی ضروریات کے لیے صرف کی جاسکتی ہیں، اسی طرح جو رقم تعمیر کے لیے جمع کی گئی، وہ مُعیّن ہے، اس کے سوا کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا جائز نہیں۔ البتہ تعمیرِ مسجد کے بعد بھی اگر رقم بچ جائے تو اس کو مسجد کی دوسری ضروریات میں خرچ کرسکتے ہیں۔ سڑک کی تعمیر کے لیے مسجد کے فنڈ یا عطیات سے قطعاً رقم خرچ نہیں کی جاسکتی۔ اِس مقصد کے لیے مُتولی کا لوگوں سے اختیار لینا بھی جائز نہیں ہے کہ جن لوگوں نے تعمیرِ مسجد کے لیے رقم دی، اب وہ اُس رقم کا مَصرَف تبدیل نہیں کرسکتے کہ جو رقم دی تھی، اب وہ وقف ہوگئی۔ الشیخ الامام حافظ الدین محمد بن محمد بن شہاب الدین المعروف ابن بزاز الکردری حنفی متوفّٰی 827ھ لکھتے ہیں:

وَاَرَادُوْا نَقْضَ الْمَسْجِدِ وَبِنَاءَهٗ اَحْكَمَ مِنَ الْاَوَّلِ، اِنْ لَّمْ يَكُنِ الْبَانِيْ مِنْ اَهْلِ الْمَحَلَّةِ لَيْسَ لَهُمْ ذٰلِكَ وَاِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْمَحَلَّةِ لَهُمْ ذٰلِكَ وَلَهُمْ اَيْضًا اَنْ يَفْرِشُوْا بِالْاٰجُرِّ وَالْحَصِيْرِ وَيُعَلِّقُوا الْقَنَادِيْلَ لٰكِنْ مِنْ مَالِ اَنْفُسِهِمْ لَا مِنْ مَالِ الْمَسْجِدِ اِلَّا بِاَمْرِ الْحَاكِمِ

ترجمہ: ''اہلِ محلہ مسجد کو توڑ کر پہلے سے عمدہ و مستحکم بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں، اگر بانی اہلِ محلہ میں سے نہیں ہے، تو انہیں اس کا اختیار نہیں ہے اور اگر وہ اہلِ محلہ میں سے ہے، تو انہیں اس کا اختیار ہے، وہ اینٹوں کا فرش بھی بناسکتے ہیں (آج کل طرح طرح کی ٹائیلوں کے فرش بنتے ہیں) اور چٹائیاں بچھاسکتے ہیں (آج کل ان کی جگہ قیمتی دریوں، قالینوں کا رواج ہے) اور روشنی کے لیے فانوس لٹکا سکتے ہیں، لیکن یہ سب خدمات ان کو اپنے مال سے انجام دینی ہوں گی، حاکم (یا واقف) کی اجازت کے بغیر مسجد کے مال سے نہیں کرسکتے''۔

(فتاویٰ بزازیہ بہامش علی الہندیہ، جلد 6، ص: 268)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''وقف جس غرض کے لیے ہے، اُس کی آمدنی اگرچہ اس کے صرف سے فاضل ہو، دوسری غرض میں صرف کرنی حرام ہے۔ وقف مسجد کی آمدنی مدرسہ میں صرف ہونی درکنار، دوسری مسجد میں بھی صرف نہیں ہوسکتی، نہ ایک مدرسہ کی آمدنی مسجد یا دوسرے مدرسہ میں، درمختار میں ہے:

اِتَّحَدَ الْوَاقِفُ وَالْجِهَةُ وَقَلَّ مَرْسُومُ بَعْضِ الْمَوْقُوفِ عَلَيْهِ جَازَ لِلْحَاكِمِ اَنْ يَصْرِفَ مِنْ فَاضِلِ الْوَقْفِ الْآخَرِ عَلَيْهِ لِاَنَّهُمَا حِينَئِذٍ كَشَيْئٍ وَاحِدٍ وَاِنِ اخْتَلَفَ اَحَدُهُمَا بِاَنْ بَنٰى رَجُلَانِ مَسْجِدَيْنِ اَوْرَجُلٌ مَسْجِدًا وَمَدْرَسَةً وَوَقَفَ عَلَيْهِمَا اَوْقَافًا لَايَجُوْزُ لَهُ ذٰلِكَ۔

ترجمہ: ''جب واقف ایک ہو اور جہت وقف بھی ایک ہو اور آمدن کی تقسیم بعض موقوف علیہ حضرات پر کم پڑ جائے تو حاکم کو اختیار ہے کہ وہ دوسرے فاضل وقف سے ان پر خرچ کر دے کیونکہ یہ دونوں وقف ایک جیسے ہیں اور اگر واقف یا جہت وقف دونوں کی مختلف ہو مثلاً دو حضرات نے علیحدہ علیحدہ مسجد بنائی یا ایک نے مسجد اور دوسرے نے مدرسہ بنایا اور ہر ایک نے ان کے لیے علیحدہ وقف مقرر کیے، تو پھر ایک کی آمدن سے دوسرے کے مصرف کے لیے خرچ کرنا جائز نہیں''۔ چندہ کا جو روپیہ کام ختم ہو کر بچے لازم ہے کہ چندہ دینے والوں کو حصۂ رسد واپس دیا جائے یا وہ جس کام کے لیے اب اجازت دیں اس میں صرف ہو۔ ان کی اجازت کے بغیر صرف کرنا حرام ہے، ہاں! جب ان کا پتا نہ چل سکے تو اب یہ چاہیے کہ جس طرح کے کام کے لیے چندہ لیا تھا، اسی طرح کے دوسرے کام میں اٹھائیں مثلاً تعمیر مسجد کا چندہ تھا، مسجد تعمیر ہو چکی تو باقی بھی کسی مسجد کی تعمیر میں اٹھائیں۔ غیر کام مثلاً تعمیر مدرسہ میں صرف نہ کریں اور اگر اس طرح کا دوسرا کام نہ پائیں تو وہ باقی روپیہ فقیروں کو تقسیم کر دیں، درمختار میں ہے: فَاِنْ فَضَلَ شَيْئٌ رُدَّ لِلْمُتَصَدِّقِ اِنْ عُلِمَ وَاِلَّا كُفِّنَ بِهٖ مِثْلُهٗ وَاِلَّا تُصُدِّقَ بِهٖ۔ (کفن کے چندہ سے کچھ بچ جائے تو یہ چندہ دینے والا معلوم ہو تو اسے لوٹا دیا جائے ورنہ اس سے ایسے ہی فقیر کو کفن پہنا دیا جائے، یہ بھی نہ ہو سکے، تو کسی فقیر کو صدقہ

کر دیا جائے ،)اسی طرح فتاویٰ قاضی خان و عالمگیری وغیرہما میں ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 16 ،ص:206 ،رضا فاؤنڈیشن ،لاہور)

علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''عموماً یہ چندے صدقۂ نافلہ ہوتے ہیں، ان کو وقف نہیں کیا جا سکتا کہ وقف کے لیے یہ ضرور ہے کہ اصل حبس کرکے اس کے منافع کام میں صرف کیے جائیں، جس کے لیے وقف ہو، نہ یہ کہ خود اصل ہی کو خرچ کر دیا جائے ، یہ چندے جس خاص غرض کے لیے کیے گئے ہیں، اس کے غیر میں صرف نہیں کیے جاسکتے ۔ اگر وہ غرض پوری ہو چکی ہو تو جس نے دیے ہیں اس کو واپس کیے جائیں یا اس کی اجازت سے دوسرے کام میں خرچ کریں ۔ بغیر اجازت خرچ کرنا ناجائز ہے''۔ (فتاویٰ امجدیہ، جلد سوم، ص:39)

وقف کا مُنتظم اُس کا مُتولّی ہوتا ہے اور مسجد کا مال اُس کے پاس امانت ہوتا ہے اگر وہ اُس امانت میں خیانت کرتا ہے یا غیرِ مصرف پر اُس کو خرچ کرتا ہے، تو اُس مُتولی کو معزول کرنا لازم ہے، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: وَيُنْزَعُ وُجُوبًا ''بزازية''،لَوِ الْوَاقِفُ، ''دُرَر''، فَغَيْرُهُ بِالْأَوْلٰى (غيرمَامُونٍ) أَوْعَاجِزًا، أَوْ ظَهَرَبِهٖ فِسْقٌ، كَشُرْبِ خَمْرٍ وَنَحْوِهٖ، ''فتح''، أَوْكَانَ يَصْرِفُ مَالَهُ فِي الْكِيمْيَاءِ، ''نَهر'' بَحثًا۔ ترجمہ:''(خیانت پر مُتولی کو) جبراً معزول کرنا واجب ہے، جیسا کہ''بزازیہ'' میں ہے، خواہ وہ واقف خود ہی ہو، جیسا کہ ''دُرَر'' میں ہے تو غیر واقف شخص کو، جو قابلِ اعتماد نہ ہو، بطریق اَولیٰ معزول کیا جائے گا یا مُتولّی عاجز ہو یا اُس کا فسق ظاہر ہو گیا ہو جیسے شراب نوشی وغیرہ یا اسی طرح کا کوئی اور فسق ظاہر ہوا ہو، جیسا کہ''فتح القدیر'' میں ہے یا اپنا مال کیمیا میں صرف کرتا ہو جیسا کہ''النہر'' میں ہے، (تو ان تمام صورتوں میں اس متولی کو معزول کر دیا جائے گا)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 13 ،ص:499 تا 504)

پس صورتِ مسئولہ میں چونکہ ابھی مصالح مسجد سے متعلق اُمور یعنی ٹائلز، رنگ وروغن اور مینار وغیرہ کا کام باقی ہے، لہٰذا پہلے ان کاموں کو مکمل کیا جائے ۔اس کے بعد اگر مصالح

مسجد میں سے کوئی کام باقی نہ رہے، تو چندہ دینے والوں کو واپس کردیا جائے یا اُن کی اجازت سے دوسرے کاموں پر صرف کیا جائے۔

مسجد کے بیت الخلاء میں پانی کا استعمال

سوال:

ہماری مسجد کے بیت الخلاء میں بازار کے دکاندار اور نمازی وغیرہ آتے ہیں، جمعدار اُس کے پیسے وصول کرتا ہے۔ وضوخانے میں استعمال کے لیے جو پانی ٹنکی میں بھرا جاتا ہے، وہی بیت الخلاء میں بھی استعمال ہوتا ہے، پانی بھرنے کے لیے موٹر اور بجلی مسجد کی استعمال ہوتی ہے۔ بازار کے لوگ بھی پانی بھر کر لے جاتے ہیں، کیا یہ طریقہ ٹھیک ہے؟

(فرید قادری، جامع مسجد فرقانیہ، لیاقت آباد کراچی)

جواب:

بیت الخلاء کی صفائی پر مامور جمعدار درحقیقت بیت الخلاء آنے والوں سے جو پیسے وصول کررہا ہے، وہ بیت الخلاء کی صفائی کی اجرت ہے۔ عام حالات میں آپ صفائی کے لیے کسی کو مُتعین کرتے ہیں تو اُس کی تنخواہ یا ماہانہ اجرت طے کرلیتے ہیں، جو یقینی طور پر مسجد کے عطیات سے ادا کی جاتی ہے۔ اگر جمعدار کو مقرر نہ بھی کیا گیا ہوتو بھی ٹنکی میں پانی چڑھانے کے لیے موٹر چلانا اور بیت الخلاء میں پانی کی فراہمی کا اہتمام مسجد سے ہی کیا جاتا ہے۔ دکاندار پینے کے لیے یا دیگر انسانی حاجت کے لیے بقدرِ ضرورت پانی لے سکتے ہیں، لیکن اگر پانی کا استعمال کاروباری مقاصد میں ہوتا ہے تو نہیں لے سکتے۔

مفتی وقار الدین رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا: ''مسجد کی دکانیں کرایہ پر دی ہوئی ہیں، کرایہ دار مسجد کا پانی اپنی ضروریات میں استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''مسجد کی دوکانوں کے کرایہ دار پینے وغیرہ اور دیگر ضروریات انسانی کے لیے بقدرِ ضرورت پانی استعمال کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر ہوٹل وغیرہ ہے تو اس کے لیے پانی کا انتظام ان کو اپنا کرنا ہوگا''۔ (وقار الفتاویٰ، جلد دوم، ص:316)

ٹرسٹ کو سرمایہ کاری کی رقم میں نامزد کرنا

سوال:

زید کی عمر 70 سال سے زائد ہے، اُس نے نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ کے ایکویٹی فنڈ میں اپنی رقم کی سرمایہ کاری کررکھی ہے، یہ سرٹیفکیٹ کمپنی میں شیئرز کا ثبوت اور رسید ہیں۔ زید یہ بانڈز یا سرٹیفکیٹ ایک ٹرسٹ (الف) کو وقف کرنا چاہتا ہے، ٹرسٹ (الف) جو کہ تبرع اور نیکی کے کام کرتا ہے، وہ مستقل بنیادوں پر اس کا نفع وصول کرتا رہے اور نیکی کے کاموں میں یہ رقم خرچ ہوتی رہے اور زید کے لیے صدقۂ جاریہ بنے۔ البتہ زید کی خواہش ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے، سرٹیفکیٹ کی آمدنی کا نفع زید استعمال کرتا رہے، انتقال کے بعد اس فنڈ کی آمدنی ٹرسٹ (الف) ہی کو ملے۔ کیا اس طرح سرٹیفکیٹ یا صکوک کا وقف ہوسکتا ہے؟۔ سرٹیفکیٹ خود کوئی مال نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پر جو اموال مشاع ہیں، یہاں ان کو وقف کیا جارہا ہے۔ کسی مجبوری یا مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کے باعث ٹرسٹ اس اثاثہ کو فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟ ٹرسٹ فروخت شدہ مال کو کس مصرف میں صرف کرنے کا پابند ہے؟

(امجد چاﮈیا، کراچی)

جواب:

سوال میں جو صورت بیان کی گئی ہے، یہ کوئی غیر منقولہ جائیداد نہیں ہے جسے زید نے وقف کیا ہو۔ یہ اس نے ایک کاروباری ادارے میں اپنے نام پر سرمایہ کاری کی ہوئی ہے اور وہ خود اس کا مالک ہے، کیونکہ نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ ایک کاروباری ادارہ ہے، جو شراکت داروں کے مال پر مضاربت کے طور پر سرمایہ کاری کرتا ہے اور اس کا منافع طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق سرمایہ کاروں (اَربابُ الاموال) کو ادا کرتا ہے۔ اس میں انوسٹ کرنے والوں کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ جب چاہیں وہ اپنا پیسا نکلوا سکتے ہیں اور اس کے لیے وہ وقتاً فوقتاً ان حِصص یا سرٹیفکیٹس کی پیشگی قیمت خرید اور قیمت فروخت مقرر کرتے ہیں۔ لہٰذا کسی ٹرسٹ کا نام بطور (Nominee) دینا، یہ وصیت کے حکم میں ہے اور وصیت

زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے کی حد تک جائز ہے۔ اگر یہ رقم اس کے مجموعی ترکے کی ایک تہائی کے برابر ہو یا اس سے کم ہے، تو یہ اس کی وفات کے بعد نافذ ہو جائے گی اور وہ ٹرسٹ ان سرٹیفکیٹس کو فروخت کرکے اپنے مقاصد پر خرچ بھی کر سکتا ہے اور آئندہ مدت کے لیے اپنے ادارے کے نام پر سرمایہ کاری بھی کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس ٹرسٹ کے قواعد وضوابط میں انہیں اس کی اجازت ہو۔ الغرض یہ وقف نہیں ہے، وصیت ہے۔

ایک طویل حدیث میں سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے سال میری عیادت کے لیے تشریف لائے، میں نے اپنی تکلیف کی شکایت کی اور دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس کچھ مال ہے اور میری ایک بیٹی ہے، کیا میں اپنے مال سے تین حصے صدقہ کروں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، آپ نے پوچھا: نصف (صدقہ کروں) آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، پھر فرمایا:

اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ کَبِیْرٌ اَوْ کَثِیْرٌ اِنَّکَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَکَ اَغْنِیَاءَ. خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَھُمْ عَالَۃً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ، وَاِنَّکَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَۃً تَبْتَغِیْ بِھَا وَجْہَ اللہِ اِلَّا اُجِرْتَ بِھَا حَتّٰی مَاتَجْعَلُ فِیْ فِیْ امْرَاَتِکَ۔

ترجمہ: ’’تہائی (صدقہ کرو) اور تہائی بھی بہت ہے، زیادہ ہے، تمہارا اپنے ورثاء کو مال دار چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں تنگ دست چھوڑ جاؤ اور وہ دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کریں اور تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جو بھی کچھ خرچ کرو گے، تمہیں اُس کا اجر ملے گا یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو (اس پر بھی اجر کے حق دار ہو)‘‘۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1295)

کسی ٹرسٹ کے نام جو رقم دی جائے، وہ اس ٹرسٹ کے پہلے سے طے شدہ مقاصد پر ہی صرف ہو سکتی ہے اور رقم دینے والا بھی ان کے مصرف کا تعین کر سکتا ہے۔

وقتی نماز جنازے پر مُقدّم ہے

سوال:

۲۔ اگر نماز کی جماعت کے دوران نمازِ جنازہ آجائے تو کیا فرض نماز کی جماعت کے فوراً بعد نمازِ جنازہ پڑھی جائے یا سنن اور نوافل پڑھ کر پھر نمازِ جنازہ پڑھی جائے۔

(قاری محمد اسحاق سعیدی، جامع مسجد عمر فاروق، سیکٹر 11-A، نارتھ کراچی)

جواب:

نماز کا وقت ہو اور جنازہ لایا جائے تو وقتی نماز کو جنازے پر مقدم کیا جائے گا، علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: (وَتُقَدَّمُ) صَلَاتُهَا (عَلَى صَلَاةِ الْجَنَازَةِ إِذَا اجْتَمَعَتَا) لِأَنَّهُ وَاجِبٌ عَيْنًا، وَالْجَنَازَةُ كِفَايَةٌ۔

ترجمہ: ''جب نماز اور جنازہ ایک وقت میں جمع ہو جائیں تو نماز کو مقدم کیا جائے گا (یعنی پہلے ادا کیا جائے گا)، اس لیے کہ نماز فرضِ عین ہے اور جنازہ فرضِ کفایہ ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 5، ص: 101، دمشق)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال ہوا: ''مغرب کے وقت جنازہ آئے تو پہلے نمازِ فرض کی ادائیگی ہو یا نمازِ جنازہ کی''۔ آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''پہلے نماز مغرب ادا کرنا چاہیے جیسا کہ ردالمحتار میں ہے: بلکہ مقررہ سنتوں کو بھی ادا کر لینا چاہیے، اسی پر فتویٰ ہے جیسا کہ ''البحرالرائق'' وغیرہ (کتب فقہ) میں ہے۔ اقول: ہاں! اگر ضرورت پہلے ادائے جنازہ کی طالب ہے مثلاً مردہ کا پیٹ پھولا ہوا ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر دیر کریں تو پھٹ جائے گا اور ابھی وقت میں اتنی وسعت ہے کہ جنازہ پہلے ادا کرنے سے مغرب فوت نہ ہوگی، تو ایسے وقت میں ناچار بالاتفاق نمازِ جنازہ کی ادائیگی پہلے ہوگی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 184-183)''۔ تاہم اگر جنازہ وقتی نماز کا وقت داخل ہونے سے پہلے کا آیا ہوا ہے، تو اسے فوراً پڑھ لینا چاہیے، خواہ مکروہ تحریمی وقت ہی ہو، تاہم صحیح وقت سے جان بوجھ کر نمازِ جنازہ کو مؤخر کرکے مکروہ وقت میں پڑھنا منع ہے''۔

ایک اور سوال کے جواب میں آپ لکھتے ہیں: ''جب وقتِ ظہر وسیع ہے، تو نمازِ جنازہ پہلے پڑھ لیں، ہاں! اگر جنازہ لے جانے والے بھی اسی جماعت ظہر میں شریک ہوں گے کہ اگر جنازہ کی نماز پہلے ہوجائے، تب بھی جنازہ نمازِ ظہر سے فارغ ہونے کے لیے رکھا رہے گا اور اُس کے تغیر کا اندیشہ نہ ہو تو ظہر فرض وسنّت پہلے پڑھیں کہ اس دیر میں شاید اور نمازی بھی آجائیں اور جنازے پر تکثیر ہو''۔(فتاویٰ رضویہ، جلد9،ص:184)

مسجد میں نمازِ جنازہ کا حکم

سوال:

اگر میت کے ساتھ امام صاحب اور کچھ نمازی بھی مسجد سے باہر ہوں اور باقی نمازی مسجد میں ہوں تو کیا اس صورت میں نمازِ جنازہ ہوجائے گی یا نہیں؟۔میت مسجد سے باہر ہو لیکن امام اور کچھ نمازی محراب اور مسجد میں ہوں تو کیا ایسی صورت میں نمازِ جنازہ کا کیا حکم ہے؟ (قاری محمد اسحاق سعیدی، جامع مسجد عمر فاروق، سیکٹر A-11، نارتھ کراچی)

جواب:

فقہائے احناف کے نزدیک مسجد میں جنازہ رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا بالاتفاق مکروہ ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَنْ صَلَّى عَلَى جَنَازَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَلَا شَيْءَ لَهُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مسجد میں (رکھی ہوئی) میت کی نمازِ جنازہ پڑھی، اس کے لیے کوئی (اجر) نہیں ہے، (سنن ابوداؤد رقم الحدیث:3189)''۔اس حدیث کو امام ابن ماجہ، امام عبدالرزاق، امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔

فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی، علامہ ابن ہمام نے کراہت تنزیہی کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ یہ افضل اور اولیٰ کا خلاف ہے، یعنی مسجد میں

نمازِ جنازہ پڑھنا بھی مباح ہے لیکن افضل یہ ہے کہ خارجِ مسجد پڑھی جائے''۔

(فتح القدیر، بحوالہ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد:2، ص:1026)

علامہ خوارزمی لکھتے ہیں: ''اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں ہے: مَنْ صَلّٰی عَلٰی جَنَازَةٍ فِی الْمَسْجِدِ فَلَا شَیْئَ لَهٗ۔ اِس حدیث میں ظرف (فی المسجد) کا تعلق اگر صلّٰی کے ساتھ کیا جائے تو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہوگا (کیونکہ ایسی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ جس نے مسجد میں کھڑے ہوکر میت کی نمازِ جنازہ پڑھی، خواہ میت مسجد میں رکھی ہو یا مسجد سے باہر، اگر نمازی مسجد کے اندر کھڑا ہے تو یہ نماز جنازہ بہر صورت مکروہ ہے) اور اگر ظرف (فی المسجد) کو جنازہ کی صفت بنایا جائے، تو پھر صرف اس وقت مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہوگا جب جنازہ مسجد میں رکھا ہوا ہو، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کراہت کی علت یہ ہو کہ مسجد کو صرف فرض پڑھنے کے لیے بنایا گیا ہے، تو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، اور اگر کراہت کی علت یہ ہو کہ (مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی صورت میں) مسجد کے نجاست میں آلودہ ہونے کا خدشہ ہے، تو جب جنازہ مسجد سے باہر ہو تو پھر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہوگا، شمس الائمہ نے مبسوط میں اسی طرف میلان کیا ہے''۔

(کفایہ مع فتح القدیر، بحوالہ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، جلد:2، ص:291028,)

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی حنفی لکھتے ہیں:

وَعِنْدَنَا اِذَا كَانَتِ الْجَنَازَةُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ لَمْ یُكْرَهْ اَنْ یُّصَلِّیَ النَّاسُ عَلَیْهَا فِی الْمَسْجِدِ اِنَّمَا الْكَرَاهَةُ فِیْ اِدْخَالِ الْجَنَازَةِ لِقَوْلِهٖ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ صِبْیَانَكُمْ وَمَجَانِیْنَكُمْ فَاِذَا كَانَ الصَّبِیُّ یُنْهٰی عَنِ الْمَسْجِدِ فَالْمَیِّتُ اَوْلٰی۔

ترجمہ: ''جب جنازہ مسجد سے باہر ہو، تو ہمارے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، کراہت صرف میت کو مسجد کے اندر داخل کرنے میں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بچوں اور پاگلوں کو اپنی مسجد سے دور رکھو، جب بچوں کو مسجد سے دور رکھنے کا حکم ہے، تو

میت کو دور رکھنا اولیٰ ہے''۔ (المبسوط جلد 2 ص:68، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت)

علامہ سید طحطاوی لکھتے ہیں:

وَكَلَامُ شَمْسِ الْأَئِمَّةِ السَّرَخْسِي يُفِيدُ أَنَّ هٰذَا هُوَ الْمَذْهَبُ حَيْثُ قَالَ: وَعِنْدَنَا إِنْ كَانَتِ الْجَنَازَةُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ لَمْ يُكْرَهْ أَنْ يُصَلَّى عَلَيْهَا فِي الْمَسْجِدِ۔

ترجمہ: ''شمس الائمہ سرخسی کی (اس) عبارت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ احناف کا مذہب (مختار) یہی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا کہ اگر جنازہ مسجد سے باہر ہو تو ہمارے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے''۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 2، ص:240، المکتبۃ الغوثیہ، کراچی)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: (وَكُرِهَتْ تَحْرِيماً) وَقِيلَ (تَنْزِيهاً فِي مَسْجِدِ جَمَاعَةٍ هُوَ) أَيِ الْمَيِّتُ (فِيهِ) وَحْدَهُ أَوْ مَعَ الْقَوْمِ (وَاخْتُلِفَ فِي الْخَارِجَةِ) عَنِ الْمَسْجِدِ وَحْدَهُ أَوْ مَعَ بَعْضِ الْقَوْمِ (وَالْمُخْتَارُ الْكَرَاهَةُ) مُطْلَقاً۔

ترجمہ: ''اور ایسی مسجد میں جہاں جماعت کا اہتمام ہو، (نمازِ جنازہ) مکروہ تحریمی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مکروہ تنزیہی ہے، خواہ صرف میت مسجد میں رکھی یا میت اور نماز پڑھنے والے سب مسجد میں ہوں، جب صرف میت مسجد سے باہر رکھی ہو (اور نمازی مسجد کے اندر ہوں) یا میت کے ساتھ کچھ نمازی بھی مسجد سے باہر ہوں (اور کچھ نمازی مسجد کے اندر ہوں) تو اس صورت میں فقہاء کا اختلاف ہے، اور مختار قول یہ ہے کہ بہر صورت مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، (یعنی میت اور سب نمازی مسجد کے اندر ہوں یا میت اور بعض نمازی مسجد سے باہر ہوں اور کچھ نمازی مسجد کے اندر ہوں مگر ظاہر ہے کہ کراہت صرف ان نمازیوں کے حق میں ہوگی، جو مسجد کے اندر کھڑے ہیں)۔ درمختار کی اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین شامی نے طویل بحث کی ہے اور اس بحث کے دوران اس امر پر بھی کلام کیا ہے کہ حدیث پاک ''(مَنْ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَلَا شَيْءَ لَهُ)'' (یعنی جس نے مسجد میں میت کی نماز جنازہ پڑھی، اس کے لیے کوئی اجر نہیں) اور ایک

روایت میں ہے ''فَلَیسَ لَہٗ اَجرٌ'')۔ اس حدیث میں ''فی المسجد'' میں تین احتمالات ہیں:
(1) یہ کہ ظرف ''صلیٰ'' سے متعلق ہو (تو معنی یہ ہوں گے کہ: جس نے مسجد میں کھڑے ہوکر کسی میت کا جنازہ پڑھا، تو اس کے لیے کوئی اجر نہیں، (اس کی رو سے دونوں احتمالات یکساں ہیں، خواہ میت مسجد میں رکھی ہو یا خارجِ مسجد)، (2) یہ کہ ظرف ''فی المسجد'' میت سے متعلق ہو (تو معنی یہ ہوں گے کہ جس شخص نے کسی کی نماز جنازہ پڑھی، دراں حالیکہ میت مسجد میں رکھی ہو، تو اس کے لیے کوئی اجر نہیں، اس کی رو سے دونوں احتمالات کا یکساں حکم ہوگا، خواہ نماز پڑھنے والے مسجد میں کھڑے ہوں یا خارجِ مسجد۔ (3) یہ کہ ظرف (فی المسجد) ''صلیٰ'' اور ''میت'' دونوں کے ساتھ متعلق ہو، تو اس صورت میں جب نمازی اور میت دونوں مسجد میں ہوں گے، تو نمازِ جنازہ مکروہ ہوگی، اور اگر کوئی ایک (نمازی یا میت) خارج مسجد ہے تو نماز مکروہ نہیں ہے، (اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شامی لکھتے ہیں: اور ان تمام صورتوں میں یہ مفہوم مذہب مختار کے خلاف ہے، (کیونکہ مذہب مختار یہ ہے) مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے''۔ (ج:3، ص:118، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَصَلَاۃُ الْجَنَازَۃِ فِی الْمَسجِدِ الَّذِی تُقَامُ فِیہِ الْجَمَاعَۃُ مَکْرُوھَۃ سوائٌ کَانَ الْمَیِّتُ وَالْقَومُ فِی الْمَسْجِدِ اَوْکَانَ الْمَیِّتُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ وَالْقَومُ فِی الْمَسْجِدِ اَوکَانَ الْاِمَامُ مَعَ بَعْضِ الْقَومِ خَارِجَ الْمَسْجِدِ وَالْقَومُ الْبَاقِیْ فِی الْمَسْجِدِ اَوِالْمَیِّتُ فِی الْمَسْجِد وَالْاِمَامُ وَالْقَومُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ، ھُوَالْمُخْتَارُ کَذَافِی ''الْخُلَاصَۃ''۔

ترجمہ: ''جس مسجد میں نماز باجماعت (باقاعدگی سے) ہوتی ہو، اس میں نماز جنازہ مکروہ ہے، خواہ (1) میت اور نماز پڑھنے والے سب مسجد میں ہوں، (2) یا میت مسجد سے باہر ہو اور نماز پڑھنے والے مسجد میں ہوں، (3) یا امام اور بعض نماز پڑھنے والے مسجد سے باہر ہوں اور باقی لوگ مسجد میں ہوں، یا میت مسجد میں ہو اور امام اور مقتدی مسجد سے باہر ہوں، یہی مذہب مختار ہے اور ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں اسی طرح ہے، (فتاوی عالمگیری

جلد:1 ،ص:165)''۔اگر بارش ہورہی ہوتو اس صورت میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:''وَلَاتُکْرَہُ بِعُذْرِ الْمَطَرِ وَنَحْوِہٖ ھٰکَذَافِی الْکَافِیْ''۔
ترجمہ:''اور بارش یا اس جیسے دیگر اَعذار کی بنا پر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے''۔
(فتاویٰ عالمگیری، ج:1 ،ص165)

بعض تنگ شہری علاقوں میں مسجد کے باہر کھلی جگہ ہوتی ہی نہیں، جہاں نمازِ جنازہ پڑھی جاسکے،ایسی صورت میں بعض مقامات پر لوگ سڑکوں یا گلیوں کو بلاک کرکے وہاں پر جنازہ پڑھتے ہیں،جبکہ شارعِ عام اور دوسرے کی زمین پر بلااجازت جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:
''تُکْرَہُ فِی الشَّارِعِ وَاَرَاضِ النَّاسِ کَذَافِی ''الْمُضْمَرَات''۔
ترجمہ:''سڑک پر اور لوگوں کی زمین پر (بلااجازت ومنظوری) نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے''۔(فتاویٰ عالمگیری، ج:1 ،ص:165)

سڑک پر چونکہ حقِ مُرور(Right of Passage)سب کا ہوتا ہے،اس لیے اسے بلاک کرنے سے سب کا عمومی حق متاثر ہوتا ہے اور حدیث مبارک میں ہے:
نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَنْ یُصَلّٰی فِیْ سَبْعَۃِ مَوَاطِنَ:فِی الْمَزْبَلَۃِ، وَالْمَجْزَرَۃِ، وَالْمَقْبَرَۃِ، وَقَارِعَۃِ الطَّرِیْقِ وَفِی الْحَمَّامِ،وَفِیْ مَعَاطِنِ الْاِبِلِ وَفَوْقَ ظَھْرِبَیْتِ اللّٰہِ۔
ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے سات مقامات پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے:''کوڑے کا ڈھیر،مَذبح ،مقبرہ، عام راستہ،حمام،اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ اور بیت اللہ کی چھت پر،(سنن ترمذی:346)''۔ان میں بیت اللہ کی چھت پر ممانعت کا سبب ادب ہے،قبرستان میں نماز کی ممانعت سے مراد ہے کہ نمازی کا رخ قبر کی جانب ہو،اگر قبرستان کے اندر یا مُتصل مسجد بنی ہوئی ہے،تو اس میں نماز جائز ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جہاں مسجد کے باہر جنازہ کے لیے جگہ دستیاب ہو،وہاں مسجد میں نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے اور جہاں جگہ دستیاب نہ ہو، جیسے شہروں کے اندر تنگ جگہیں ہوتی

ہیں، وہاں پڑھ سکتے ہیں کیونکہ بعض اکابر فقہائے کرام نے اس کی اجازت دی ہے۔

سرکاری زمین پر مسجد کا قیام

سوال:

لالہ رخ واہ کینٹ میں ایک مسجد کینٹ بورڈ کی ملکیتی زمین پر بغیر اجازت تعمیر کی گئی، تعمیر کے کچھ عرصہ بعد نقشے اور بلڈنگ پلان کی منظوری کے لیے حکومت کے ذمہ داران سے رابطہ کیا تو درج ذیل اعتراض کیے گئے:

(۱) لیز ڈیڈ مسجد کے لیے رجسٹرڈ نہیں کی گئی۔ (۲) مسجد کی تعمیر ناجائز، غیر قانونی اور منظوری کے بغیر کی گئی۔ (۳) حکومت کی زمین پر غاصبانہ قبضہ ہے۔

کیا مذکورہ مسجد میں نماز، اعتکاف ودیگر عبادات کا شرعی حکم کیا ہے؟، اس تمام صورتِ حال پر شرعی حکم بیان فرمائیں، (اختر عالم، واہ کینٹ)۔

جواب:

مسجد ہونے کے لیے وقف ہونا شرط ہے، اگرچہ انہی الفاظ سے کہ ''میں نے اسے مسجد بنادیا'' اس سے بھی وقف ہوجائے گا۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: (وَیَزُولُ مِلکُهٗ عَنِ الْمَسْجِدِ وَالْمُصَلّٰی) بِالْفِعلِ وَ (بِقَولِہٖ جَعلتُهٗ مَسجِدًا)

ترجمہ: ''کسی شخص کے یہ کہنے سے کہ میں نے زمین کے اس حصے کو مسجد بنادیا ہے یا عملاً اس میں نماز پڑھی جارہی ہے، وہ زمین اس کی ملکیت سے نکل جائے گی''۔

(ردالمحتار جلد 6 ص: 426 دار احیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''جب وہ مکان عام مسلمین کے ہمیشہ نماز پڑھنے کے لیے بنایا اسے کسی محدود مدت سے مقید نہ کیا کہ مہینے دو مہینے یا سال دو سال اس میں نماز کی اجازت دیتے ہیں اور اس میں نماز حتّٰی کہ جمعہ وعیدین تک ہوتے ہیں تو اس کے مسجد ہونے میں کیا شک ہے،۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: خالی زمین نماز کے لیے

وقف کی جائے وہ بھی مسجد ہو جائے گی اگر چہ یہ نہ کہا ہو اسے مسجد کیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 16 ص: 281 مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

وقف کے درست ہونے کے لیے اس کی شہرت ہونا کافی ہے، تنویر الابصار مع الدرمختار میں ہے: تَقبلُ فِیہِ۔ بِالشُّھرَۃِ اِلیٰ اَنْ قَالَ حِفظًالِاَوْقَافِ القَدِیمَۃِ عَنِ الاِسْتِھلَاکِ۔

ترجمہ: ''یعنی عامۃ الناس میں مشہور ہونا کہ یہ وقف کی جگہ ہے، یہ بھی شرعاً ایک مقبول شہادت ہے۔۔۔آگے چل کر فرمایا: اصول اس لیے مقرر ہوا تا کہ پرانے اوقاف کو (جن کی کوئی دستاویزی شہادت یا ریکارڈ یا ان افراد کی شہادت جن کے سامنے وقف کیا گیا) ضائع ہونے سے بچایا جاسکے''۔ (درمختار، جلد 6 صفحہ: 484)

اگر حکومت نے سوسائٹیوں اور کالونیوں میں مساجد کے لیے پلاٹ مختص کیے ہیں، تو یہ خود ریاست یا متعلقہ ادارے کی جانب سے اصولی طور پر وقف قائم ہو جاتا ہے، کسی انجمن یا ٹرسٹ کے نام ان کی الاٹمنٹ کا مقصد وقف کے متولی کا تقرر اور تعین ہے۔ لہٰذا بعد میں اُن کالونیوں کے رہائشی لوگوں نے اپنی ضرورت کے تحت اگر انہی مقررہ پلاٹوں پر مسجدیں بنادی ہیں اور حکومت نے بروقت کوئی تعرض نہیں کیا، تو شرعاً ان مساجد میں نماز جائز و درست ہے اور ان مساجد کو اب کسی ضرورت کے تحت شہید کرنا یا ان کی حیثیت کو ختم کرنا درست نہیں ہے۔ باقاعدہ لیز یا الاٹمنٹ قانونی کارروائی کا حصہ ہے، انتظامیہ کو چاہیے کہ قانونی تقاضے پورے کرنے میں مسجد انتظامیہ کی معاونت کرے۔

اگر کسی کالونی یا ہاؤسنگ سوسائٹی کے لوگ کسی ایسی سرکاری زمین پر مسجد بناتے ہیں، جو اصل لے آؤٹ پلان میں مسجد کے لیے متعین نہیں ہے تو حکومت یا سرکاری و نیم سرکاری ادارے کو بروقت اسے روک دینا چاہیے، بعد میں مسجد بن جانے کے بعد ہمارے معاشرے میں صورت حال جذباتی بن جاتی ہے اور فساد کا باعث بنتی ہے۔ اس کا ذمے دار اُن سرکاری افسران اور افراد کو ٹھہرانا چاہیے، جو لینڈ کنٹرول اور نگرانی کے ذمے دار ہیں اور

باقاعدہ اس کی تنخواہیں لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ جب حکومتی اداروں کی ناک کے سامنے زمین پر قبضہ ہوتا ہے، عوام کے عطیات اور صرفِ کثیر سے مسجد تعمیر ہوتی ہے، تو وہ خاموش رہتے ہیں، کوئی قانونی کارروائی نہیں کرتے، تو پھر اسے رضائے سکوتی (Silent Permission) سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر ایک دن میں تو نہیں ہوتی، اس پر عرصہ لگتا ہے، پھر مسجد آباد ہو جاتی ہے، اب بہتر صورت یہی ہے کہ متعلقہ ادارہ اُسے قانونی حیثیت دیدے یعنی Legalize کرے اور اُسے اُس انتظامیہ کے نام الاٹ کر دے، جس نے اُسے تعمیر کیا ہے اور اُس کا انتظام چلا رہی ہے اور اُس کے مالی مصارف پورا کر رہی ہے۔

اصولی طور پر مغصوبہ اور مقبوضہ زمین پر مسجد کا قیام جائز نہیں ہے، لیکن مسجد بننے کے بعد اسے منہدم کرنے سے منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں، حکمت سے کام لینا بہتر ہے۔ اس لیے دین میں سدِّ ذرائع کو اہمیت دی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ، وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشْبَهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ. فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ. وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ: كَرَاعٍ يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى، يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ. أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى. أَلَا إِنَّ حِمَى اللهِ فِي أَرْضِهِ مَحَارِمُهُ. أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً: إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ. وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ. أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ۔

ترجمہ: ”حلال واضح ہے اور حرام (بھی) واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان مُشتبہ (Doubtful) امور ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے اور جو مُشتبہ اُمور سے بچا رہا، تو اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچا لیا، پس جو مشتبہ امور میں پڑا، اُس کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو ممنوعہ چراگاہ کے اردگرد اپنے مویشی چراتا ہے اور اندیشہ رہتا ہے کہ اُس کے مویشی اس چراگاہ میں گھس جائیں گے (اور اسے تاراج کر دیں گے)۔ سنو! ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی زمین پر اس کی ممنوعہ حدود اس کی حرام کی ہوئی اشیاء

(Prohibited) ہیں۔ سنو! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ ٹھیک رہے تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر اس میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، سنو! وہ گوشت کا لوتھڑا دل ہے"۔ (صحیح بخاری:52)

سو حکومت اور متعلقہ اداروں پر لازم ہے کہ سدِّ ذرائع کو اختیار کرتے ہوئے ممنوعات کے قریب جانے سے لوگ اگر خود نہیں رکتے تو انہیں حکومتی اختیارات اور قانونی طاقت سے روکیں۔

دینی مدارس اور مساجد سے Withholding Tax کی کٹوتی

سوال:

حکومت نے 16-2015 کے بجٹ میں بینکوں سے رقوم نکلوانے پر ودہولڈنگ ٹیکس عائد کر دیا ہے اور کسی استثنیٰ کے بغیر ودہولڈنگ ٹیکس مساجد، مدارس، دینی جامعات اور رفاہی اداروں سے بھی کاٹا جا رہا ہے، کیا یہ شرعاً درست ہے؟ (منور احمد، لیاقت مارکیٹ ملیر، کراچی)

جواب:

ہمیں مختلف ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دینی مدارس و جامعات، مساجد اور رفاہی ادارے جب اپنے اکاؤنٹس سے اپنی ضروریات اور مصارف کے لیے رُقوم نکالتے ہیں تو ان سے Withholding Tax وضع کیا جاتا ہے، ہمارے نزدیک یہ درست نہیں ہے۔ دینی مدارس و جامعات کے اکاؤنٹس میں صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، نذر اور کفارات) کی رُقوم جمع ہوتی ہے اور ان کا مستحق ان اداروں کے طلبہ و طالبات ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان رُقوم سے حکومت کا Withholding Tax سمیت کسی بھی قسم کا ٹیکس کاٹنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ برطانیہ، ناروے اور دیگر مغربی ممالک میں مساجد سمیت خیراتی (Charitable) اداروں کو لوگ عطیات دیتے ہیں اور ان پر حکومت جو ٹیکس وصول کر چکی ہوتی ہے، وہ ان خیراتی اداروں کو لوٹا دیتی ہے اور ان کے اکاؤنٹ میں جمع کرتی ہے، جبکہ ہمارے اسلامی ملک میں اس کے برعکس ہو رہا ہے جو انتہائی

افسوس ناک ہے اور حکومت کو جلد از جلد ان اداروں کو اس لازمی ٹیکس کی کٹوتی سے مستثنیٰ قرار دینا چاہیے اور اب تک جو ٹیکس وضع کیا جا چکا ہے، اسے واپس ان اداروں کے اکاؤنٹس میں جمع کرنا چاہیے۔

مسجد امامت کا اجارہ اور امام کی معزولی

سوال:

آج کل اکثر مساجد میں یہ معمول بن گیا ہے کہ انتظامیہ مسجد کے امام صاحبان سے گیارہ ماہ کی مدت کا اجارہ کرتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، امام صاحب اجارہ نہ کریں اور مشاہرے پر ہی امامت کریں تو کیا انہیں اجارہ پر مجبور کیا جا سکتا ہے؟۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ائمہ کرام کو ذاتی ملازم اور مزدور کی سطح پر رکھنا چاہتے ہیں، جبکہ امامت تو امت کی دینی رہنمائی کا منصب ہے؟، (سید اسلم قادری، نارتھ کراچی)۔

جواب:

خطیب و امام مسجد کی اصل ذمے داری جمعہ و عیدین اور نماز پنج گانہ، احکامِ شرع بیان کرنا اور لوگوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے۔ سب سے زیادہ امامت کا مستحق وہ شخص ہے جو نماز و طہارت کے احکام سب سے زیادہ جانتا ہو، قرآن مجید صحیح مخارج کے ساتھ پڑھتا ہو، صحیح العقیدہ ہو، محرمات و ممنوعات سے بچتا ہو۔ اگر کسی امام میں کوئی شرعی خرابی نہ ہو تو اُس کی امامت میں کوئی حرج نہیں، نہ اُس کی امامت کسی اجارہ کی محتاج ہے۔ ایسے لوگ جو اجارہ پر ائمہ سے معاملات طے کرتے ہیں، اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر اجارہ پر رکھا گیا امام کسی اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا ہے، تو کیا اجارہ کی طے شدہ مدت ملازمت (گیارہ ماہ) پوری کرنے کا حق اُسے حاصل ہوگا؟۔

امامت اپنی نوعیت اور ذمے داریوں کے اعتبار سے کل وقتی (Full Time) منصب ہے اور ائمہ و خطباء بھی اسی معاشرے کے افراد ہیں اور اُن کی بھی وہی انسانی حاجات اور ضروریات ہوتی ہیں، اپنے اپنے خاندانوں کی سماجی تقریبات (شادی/وفات)

میں حصہ لینا ہوتا ہے، لہٰذا ان تمام اُمور کو عادلانہ بنیادوں پر طے کر لینا چاہیے تاکہ یہ تاثر نہ ہو کہ امام کے ساتھ یومیہ مزدور کی طرح برتاؤ کیا جارہا ہے۔

امام کو اجارے پر مجبور تو کوئی نہیں کر سکتا، اجارہ فریقین کی رضامندی پر موقوف ہوتا ہے۔ البتہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں، اس میں ملازمین کے کچھ حقوق ہوتے ہیں، مراعات ہوتی ہیں اور ملازمت پر نصب اور عزل کے ضابطے ہوتے ہیں۔ ہر ملازمت، خواہ حکومت کی ہو یا پرائیویٹ، اجارہ ہی ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں وقف کے ملازمین مثلاً مدرسین اور ائمہ وخطباء پر گیارہ ماہ کے اجارے کی تلوار لٹکانے کی فقہی اعتبار سے کوئی نظیر موجود نہیں ہے، وقف کے معاملات میں اپنے عہد کے عرف کا اعتبار ضرور کرنا چاہیے۔ جس معاشرے میں خاکروب تک پر اس طرح کے محدود مدت کے اجارے کی تلوار نہیں لٹکائی جاتی، وہاں مساجد کے ائمہ کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیسے درست ہو سکتا ہے؟۔

مسجدیں وقف ہوتی ہیں اور اُن کے مالی وسائل بھی وقف ہیں، مسجد کا عملہ اُس وقف کے مصارف ہیں، وقف کے ملازمین کو عذرِ شرعی کے بغیر معزول نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ گیارہ ماہ کا اجارہ کرنے کے بعد وہ جب چاہے وقف کے ملازمین کو نوکری سے برطرف کر سکتا ہے تو اس کا یہ خیال باطل ہے۔ عذرِ شرعی کے بغیر اس کو کسی صورت برطرف نہیں کیا جا سکتا۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''اوقاف سے جو ماہوار وظائف مقرر ہوتے ہیں، یہ من وجہ اُجرت ہے اور من وجہ صلہ، اُجرت تو یوں ہے کہ امام وموذن کی اگر اثنائے سال میں وفات ہو جائے تو جتنے دن کام کیا ہے، اُس کی تنخواہ ملے گی اور محض صلہ ہوتا تو نہ ملتی اور اگر پیشگی تنخواہ ان کو دی جا چکی ہے، بعد میں انتقال ہو گیا یا معزول کر دیے گئے تو جو کچھ پہلے دے چکے ہیں، وہ واپس نہیں ہوگا اور محض اُجرت ہوتی تو واپس ہوتی''۔

(بہارِ شریعت، جلد اول، ص: 545)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال کیا گیا: ''راب گڑھ میں دو مسجدیں ہیں، جن میں سے ایک مسجد کا متولی جو نماز وروزہ کا پابند نہیں ہے، اُس نے ایک پیش امام

جوقوم کا صدیقی اور علم کا حافظ ومولوی حکیم مقرر تھا، اس کو مُتولی نے بلا وجہ الگ کردیا اور بجائے اس کے بلا رائے مقتدیوں کے دوسرا امام جو صرف حافظ وقوم کا قصاب ہے۔ مُتولی سے معزولی کا سبب پوچھا تو جواب دیا: ہماری مسجد ہے، ہم جو چاہیں سو کریں، مقتدی پوچھ نہیں سکتے۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''اگر صحتِ مذہب وقراءت وطہارت میں بقدرِ جوازِ نماز ہیں اور امام وظیفہ پاتا ہے تو بلاقصور پہلے کو معزول کرنا گناہ ہوا کہ بلاوجہ ایذائے مسلم کہ لَایُعزَلُ صَاحِبُ وَظِیفَةٍ بِغَیرِ جُنْحَةٍ (کسی صاحب وظیفہ کو بغیر کسی گناہ کے معزول نہیں کیا جاسکتا) اور متولی کا کہنا کہ مسجد ہماری ہے ہم جو چاہیں کریں، محض باطل ہے، مسجدیں اللہ عزّوجل کی ہیں: اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا (یقیناً مسجدیں اللہ تعالیٰ ہی کی ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی کی بندگی نہ کرو) اس میں وہی کیا جائے گا جو حکم شرع ہے اور اس کا یہ زعم باطل ہے کہ مقتدی پوچھ نہیں سکتے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص:615)

ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''امام مذکور جبکہ عالم بھی ہے اور قرآن مجید باتجوید پڑھتا ہے، تو محض اس بنا پر کہ حافظ نہیں، اسے معزول کرنا جائز نہیں، آخر یہ کون سا گناہ ہے، کیا حافظ ہونا شرطِ امامت ہے کہ بغیر اس کی امامت صحیح نہیں، کیا جب اسے مقرر کیا تھا، اُس وقت اُس نے اپنا حافظ ہونا ظاہر کیا تھا اور حافظ سمجھ کر امام بنایا تھا، لہٰذا کمیٹی کو امامت سے معزول کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں، ردالمحتار (جلد 13، ص:506) میں البحر الرائق (جلد 5، ص:380) سے ہے: وَاسْتُفِیدَ مِنْ عَدَمِ صِحَّةِ عَزْلِ النَّاظِرِ بِلَاجُنْحَةٍ عَدَمُهَا لِصَاحِبِ وَظِیفَةٍ فِی وَقفٍ بِغَیرِ جُنْحَةٍ وَعَدَمِ اَھْلِیَّةٍ (مُتولی کو بلاوجہ شرعی معزول کرنے کے عدمِ جواز سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وقف سے وظیفہ پانے والے کسی بھی شخص کو بغیر کسی جرم یا اہلیت نہ ہونے کے معزول کرنا جائز نہیں ہے) کمیٹی تو کمیٹی اگر بلاوجہ شرعی حاکم اسلام معزول کرنا چاہے، تو نہیں کرسکتا، فتاویٰ خیریہ میں ہے: قَدْ صَرَّحَ الْعُلَمَاءُ بِاَنَّہٗ لَایَجُوْزُ عَزْلُ النَّاظِرِ وَلَا عَزْلُ صَاحِبِ وَظِیفَةٍ مَابِغَیرِ جُنْحَةٍ وَلَوعَزَلَہُ الْحَاکِمُ لَایَنعَزِلُ بِغَیرِ جُنْحَةٍ وَلِلْقَاضِی اِبقَاءُہٗ عَلٰی

وَظِیفَتِهٖ، (فتاویٰ خیریہ کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے: ''علماء نے تصریح کی ہے کہ اوقاف کے نگران اور اوقاف سے تنخواہ پانے والے کسی ملازم کو کسی قصور کے بغیر منصب یا ملازمت سے معزول کرنا جائز نہیں ہے، خواہ حاکم معزول کرے تو بھی کسی قصور کے بغیر معزول نہیں ہوگا اور قاضی کو چاہیے کہ اسے منصب پر بحال رکھے)، وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَم۔

(فتاویٰ امجدیہ، جلد اول، ص: 114-113)

مسجد عطیات/فنڈ پر زکوٰۃ نہیں

سوال:

میں اسلام آباد میں ایک مسجد کا خزانچی ہوں، میرے پاس مسجد فنڈ میں کچھ رقم موجود ہے جو کہ زکوٰۃ کے نصاب سے زائد ہے۔ یعنی اس رقم پر زکوٰۃ بنتی ہے۔ مسجد کا کوئی بنک اکاؤنٹ نہیں ہے اور یہ رقم میرے پاس جمع شدہ ہے۔ مہربانی فرما کر یہ بتائیں کہ آیا مسجد کے فنڈ پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں، (عبدالرشید محمد، اسلام آباد)۔

جواب:

مسجد کے عطیات نفلی صدقات اور وقف ہوتے ہیں، اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ زکوٰۃ کے وجوب کی شرائط میں سے ایک شرط کم از کم نصاب کی مقدار یا اس سے زائد مال کا کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں ہونا ہے اور مسجد کے فنڈ کا کوئی شخص مالک نہیں ہوتا۔ وقف کا شرعی حکم یہ ہے کہ مال اللہ تعالیٰ کی مِلک ہوتا ہے اور وقف کا مُتولّی شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اس مال کو وقف کے مقاصد پر خرچ کرتا ہے۔ زکوٰۃ کی رقم مسجد میں صرف نہیں کی جاسکتی۔

انجمن کے فنڈ سے قرض حسن دینے کا حکم

سوال:

ہماری غوثیہ خدمت کمیٹی ہے، جو ویلفیئر کے کام کرتی ہے۔ زکوٰۃ، فطرہ، قربانی کی کھالیں، صدقات، عطیات کے علاوہ ممبر شپ کی مد میں ماہانہ کچھ رقم جمع ہوتی ہے۔ ان

رقوم سے ویلفیر درج ذیل کام کرتی ہے:

(۱) لوگوں کو کفن فراہم کرنا، (۲) رمضان میں راشن کی تقسیم، (۳) مریضوں کے علاج کے لیے رقم فراہم کرنا۔ دفتر میں ایک آفس بوائے ہے، جس کو ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا ویلفیئر جمع ہونے والی رقوم سے یہ کام کرسکتی ہے؟۔ نیز کیا جمع شدہ رقم سے ممبران کو وقتی طور پر ادھار دیا جاسکتا ہے؟۔ (جاوید مغل، لیاقت کالونی، کراچی)

جواب:

زکوٰۃ وفطرہ کی جمع شدہ رقم محض ویلفیئر/کمیونٹی یا برادری کے فنڈ/اکاؤنٹ میں رکھے رہنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، تاوقتیکہ مستحقِ زکوٰۃ تک پہنچادی جائے۔ دوسرا یہ کہ زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم جب تک الگ مد میں رکھ کر تملیک کے شرعی اصول کے مطابق مستحق افراد کو نہیں دی جائے گی، ادا نہیں ہوگی۔ انجمنوں (Associations) کے ذمے داران زکوٰۃ کا مال صَرف کرنے کے لیے اہلِ ثروت کے وکیل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس ذمے داری کو شرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے، تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔

برادریوں کی انجمنیں یا رفاہی ادارے جو مستحقین کی مدد کے لیے زکوٰۃ کی رقم جمع کرتے ہیں، وہ اگر حدودِ شرع میں رہ کر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہتے ہیں، تو اس کی چند صورتیں یہ ہیں:

(۱) زکوٰۃ وفطرہ کی رقم نادار مستحقِ زکوٰۃ کی مِلک میں دے دی جائے۔

(۲) شادی کے موقع پر ناداروں کو جہیز کے لیے نقد رقم دیدی جائے یا سامان خرید کر ان کی مِلک میں دے دیا جائے۔

(۳) کم قیمت فلیٹ یا مکان مالکانہ بنیاد پر ناداروں کو دے دیا جائے۔

(۴) علاج کے لیے دوائیں دی جائیں یا ڈاکٹر کے آپریشن وغیرہ کی فیس کے لیے انہیں رقم دے دی جائے۔

(۵) مختلف صنعت وحرفت سے وابستہ مستحقینِ زکوٰۃ کو ان کی ضرورت کی چیزیں مالکانہ بنیادوں پر زکوٰۃ کی مد سے خرید کر دی جاسکتی ہیں، جیسے سلائی کڑھائی کی مشینیں یا دستکاری

کی مشینیں یا چھوٹے چھوٹے ورکشاپ بنا کر دینا۔

دفتری عملے کو تنخواہ کی مد میں زکوٰۃ وفطرہ کی رقم سے نہیں دیا جا سکتا۔ نیز اس رقم کو ممبران یا کسی بھی فرد کو بطور ادھار یا قرض نہیں دیا جا سکتا۔

قربانی کی کھالوں اور نفلی عطیات کا مصرف ہونے کے لیے نادار ہونا شرط نہیں۔ ممبر شپ کی مد میں حاصل ہونے والی آمدنی نفلی صدقات کی مد میں شمار ہوگی۔ اموات کے کفن اور دفتری ملازم کے مشاہرے ودیگر ضروری اخراجات غوثیہ خدمت کمیٹی کے ارکان کے عطیات، ممبر شپ فیس اور نفلی صدقات سے ادا کیے جا سکتے ہیں اور اس کی وضاحت ممبر شپ فارم پر کر دی جائے۔ اگر انجمن کا اکاؤنٹ ایک ہی ہے تو صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، کفارات اور نذر کی رقوم) کی آمد وخرچ کا حساب (Head of Account) الگ رکھا جائے اور کھاتے کے رجسٹر (Ledger) میں اس کے مصارف کی تفصیل درج ہونی چاہیے اور صدقاتِ واجبہ اور نفلی صدقات کا اکاؤنٹ الگ الگ بھی رکھا جا سکتا ہے۔ انجمن نے اگر اپنے مقاصد میں قرضِ حسن کا شعبہ پہلے سے قائم کر رکھا ہے، تو صدقاتِ نافلہ کی مد سے قرضِ حسن دے سکتے ہیں، ورنہ نہیں۔ آئندہ کے لیے بھی وہ ایسی قرارداد منظور کر سکتے ہیں، اگر انجمن کے چارٹر میں ان کو اس کا اختیار دیا گیا ہو اور عطیہ دینے والوں کو اس کا علم ہونا چاہیے۔

زکوٰۃ کا مصرف

سوال:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس سلسلے میں کہ مسجد سے ملحق وہ مکانات جن میں امام مسجد ومؤذن رہائش پذیر ہوں جن کے یوٹیلیٹی بلز مسجد کے فنڈ سے ادا کیے جاتے ہیں، کیا ایسے مکانات کی تعمیر وتوسیع یا برقی سامان مثلاً پنکھے، بلب اور جنریٹر وغیرہ کی خریداری اور تنصیب زکوٰۃ کی رقم سے کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(قاری محمد اسحاق سعیدی، ایس ٹی 40، سیکٹر A-11، نارتھ کراچی)

جواب:

زکوٰۃ کی رقم کسی بھی قسم کے تعمیراتی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتی کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک (مالک بنانا) شرط ہے۔ آپ نے جتنے مصارف ذکر کیے، ان میں سے کسی مصرف میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی۔ تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے:

شَرْعًا: (تَمْلِيكٌ) خَرَجَ الْإِبَاحَةُ. فَلَوْ أَطْعَمَ يَتِيمًا نَاوِيًا الزَّكَاةَ لَا يُجْزِيهِ. إِلَّا إِذَا دَفَعَ إِلَيْهِ الْمَطْعُومَ. كَمَا لَوْ كَسَاهُ بِشَرْطِ أَنْ يَعْقِلَ الْقَبْضَ۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے شرعی معنی ہیں: ''فقیر کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنا دینا''۔ تملیک کی قید سے محض مباح کر دینا (یعنی فقرا کو مالِ زکوٰۃ کے استعمال کی عام اجازت دینا) خارج ہو گیا، پس اگر کسی شخص نے نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کھانا کھلایا تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مگر جب وہی کھانا یتیم کے حوالے کر دیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، جیسے اگر ادائے زکوٰۃ کے لیے یتیم کو کپڑا پہنایا، بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہے (تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی)''۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَيُشْتَرَطُ أَنْ يَكُونَ الصَّرْفُ (تَمْلِيكًا) لَا إِبَاحَةً كَمَا مَرَّ (لَا) يُصْرَفُ (إِلَى بِنَاءِ) نَحْوِ (مَسْجِدٍ وَ) لَا إِلَى كَفَنِ مَيِّتٍ وَقَضَاءِ دَيْنِهِ۔

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو مالک بنا دیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ (گزشتہ سطور میں) گزرا، (اسی تملیک کی شرط کی وجہ سے) زکوٰۃ کی رقم کسی عمارت پر یا مسجد پر یا میت کو کفن پہنانے پر اور اس کا قرض ادا کرنے پر صرف نہیں کی جاسکتی (کیوں کہ ان صورتوں میں مالک بنانا متحقق نہیں ہوتا، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:3، ص:263، 161)''۔ اسی طرح زکوٰۃ کی رقم کو تعمیر مسجد یا مسجد کے دوسرے مصارفِ جاریہ پر بھی خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

روزے کے مسائل

جمعۃ الوداع کی شرعی حیثیت

سوال: رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو ہمارے خطے میں ''جمعۃ الوداع'' کے عنوان سے رمضانِ مبارک کے عام جمعوں کے مقابلے میں نسبتاً اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے، جمعہ کے خطبے میں ''الوَداعُ الوَداعُ یا شَھر رمضان'' کے کلمات دہرائے جاتے ہیں، پھر آخری دن نعت خواں ''آج رمضان کی الوداع ہے'' جیسے اشعار پُر درد آواز میں پڑھتے ہیں اور اس سے غیر شعوری طور پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی خصوصی اجر کا ذریعہ ہے، ازراہِ کرم بتائیں کہ شریعت میں اس کی اصل کیا ہے؟۔

(مولانا منور احمد نعیمی ،لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی)

جواب: ہفتے کے سات دنوں میں ''جمعۃ المبارک'' وہ مقدس دن ہے، جس کے نام سے قرآن مجید کی ایک پوری سورت نازل ہوئی۔ اس سورۂ مبارکہ کے دوسرے رکوع میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الۡبَیۡعَ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۞ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانۡتَشِرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ ابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَ اذۡکُرُوا اللّٰهَ کَثِیۡرًا لَّعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۞

ترجمہ: ''اے مومنو! جب جمعہ کے دن نمازِ (جمعہ) کی اذان دی جائے، توتم اللہ کے ذکر (نماز) کی طرف دوڑ پڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہی (روش) تمہارے لیے بہتر ہے، اگرتم جانتے ہو۔ پھر جب نماز ادا کردی جائے، توتم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ''۔ (جمعہ:10-9)

ابتداءِ اسلام میں جمعہ کے لیے ایک ہی اذان دی جاتی تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مدینہ طیبہ کے پھیلاؤ کی وجہ سے دوسری اذان شروع کی۔ پہلی اذان وقت شروع ہونے پر مقام ''زوراء'' پر دی جانے لگی اور دوسری اذان جب امام خطبے کے لیے منبر پر بیٹھ جاتا، تواس کے سامنے دی جاتی۔ یہ امر تو سب پر واضح ہے کہ خطبۂ جمعہ

خلیفہ وقت دیتا تھا۔

اس پر بھی فقہائے کرام نے کلام کیا ہے کہ کاروبار پہلی اذان پر ترک کرنا ہوگا یا دوسری اذان پر، اس بارے میں دونوں طرح کی آراء موجود ہیں۔ لیکن حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ پہلی اذان پر کاروباری معمولات چھوڑ کر جمعہ کی تیاری کی جائے تاکہ خطبہ سننے کے لیے بروقت پہنچ سکے، کیونکہ خطبۂ جمعہ سننا واجب ہے۔ جمعہ کی اہمیت بیان کرنے کے لیے چند احادیث درج ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے منبر پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا:

لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ عَنْ وَدعِهِمُ الْجُمُعَاتِ، أَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللهُ عَلٰى قُلُوبِهِم، ثُمَّ لَيَكُونُنَّ مِنَ الْغَافِلِينَ۔

ترجمہ: ''لوگ جمعہ ترک کرنے سے باز آجائیں، ورنہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافلوں میں سے ہو جائیں گے''۔ (صحیح مسلم: 865)

(۲) إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَنْصِتْ وَالإِمَامُ يَخْطُبُ، فَقَدْ لَغَوْتَ۔

ترجمہ: ''جمعے کے دن امام کے خطبے کے دوران اگر تم نے اپنے ساتھی سے کہا کہ چپ ہو جا (اگرچہ بظاہر یہ اچھا کام ہے)، تو تم نے لغو کام کیا''۔ (بخاری: 934)

(۳) مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ تَهَاوُنًا بِهَا طَبَعَ اللهُ عَلٰى قَلْبِهِ۔

ترجمہ: ''جس نے (کسی شرعی عذر کے بغیر) تین جمعے معمولی بات سمجھ کر چھوڑ دیے، تو اللہ اس کے دل پر مہر لگا دے گا''۔ (سنن ترمذی: 500)

جمعۃ المبارک کی نماز کی اہمیت کو جاننے کے لیے یہ وعید کافی ہے۔

(۴) نَحْنُ الآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، بَيْدَ أَنَّهُم أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا، ثُمَّ هٰذَا يَوْمُهُمُ الَّذِي فُرِضَ عَلَيْهِم، يَعْنِي يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَاخْتَلَفُوا فِيهِ، فَهَدَانَا اللهُ لَهُ،

ترجمہ: ''ہم دنیا میں آمد کے اعتبار سے سب سے آخری امت ہیں اور (محشر میں حاضری یا جنت میں داخلے کے اعتبار سے) سب سے اوّل ہوں گے، سوائے اس کے کہ انہیں ہم سے

پہلے کتاب الٰہی عطا کی گئی۔ پھر یہ جمعہ اُن پر فرض کیا گیا، تو انہوں نے اس میں اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کو پانے کی ہدایت فرمائی''۔ (صحیح بخاری:876)
اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ہم پیدائش کے اعتبار سے (سب) اُمتوں سے آخر میں ہیں اور قیامت کے دن سب سے پہلے ہمارا حساب ہوگا''۔
(۵) آپ ﷺ نے جمعے سے (کسی شرعی عذر کے بغیر) پیچھے رہ جانے والوں کے لیے شدید وعید فرمائی: لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ رَجُلاً يُصَلِّي بِالنَّاسِ، ثُمَّ أُحَرِّقَ عَلَىٰ رِجَالٍ يَتَخَلَّفُونَ عَنِ الْجُمُعَةِ بُيُوتَهُم۔ ترجمہ: ''میں ارادہ کرتا ہوں کہ ایک شخص کو لوگوں کی امامت کے لیے کھڑا کروں اور پھر جمعے سے پیچھے رہ جانے والوں کے گھروں کو آگ لگا دوں''۔ (صحیح مسلم:652)
(۶) مَنْ كَانَ يُؤمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ، فَعَلَيْهِ الْجُمُعَةُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، إِلَّا مَرِيضٌ، أَوْ مُسَافِرٌ، أَوْ صَبِيٌّ، أَوْ مَمْلُوكٌ۔ ترجمہ: ''جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس پر نمازِ جمعہ کی ادائیگی لازم ہے، سوائے مریض، مسافر، بچے اور غلام کے (کہ ان کو عذر کی بنا پر جمعہ چھوڑنے کی رخصت ہے)''۔ (سنن دارقطنی:1)
(۷) خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ فِيهِ الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ۔ ترجمہ: ''بہترین دن جس میں سورج طلوع ہوا، جمعے کا دن ہے''۔ (سنن ترمذی:488)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: إِذَا خَرَجَ الإِمَامُ۔۔۔۔ فَلَا صَلَاةَ وَلَا كَلَامَ
ترجمہ: ''جب امام خطبے کے لیے نکل جائے، تو نہ کوئی نماز پڑھی جائے اور نہ کلام کیا جائے''۔

(جلد 5، ص:72، دمشق)

احادیث مبارکہ میں جمعۃ المبارک کے دن بعض اہم واقعات کے ظہور پذیر ہونے کا بیان ہے، جن میں سے چند یہ ہیں: ''آدم علیہ السلام کی پیدائش، اُن کا جنت میں داخل کیا جانا اور جنت سے نکلنا، اُن کی توبہ کا قبول ہونا، اُن کی وفات، قیامت کا قائم ہونا اور اس کے مختلف مراحل کا ظہور''۔ اسی طرح احادیث مبارکہ میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ

جمعۃ المبارک کے دن ایک ''قبولیت کی ساعت'' ہے کہ اگر اس وقت کوئی دعا کرے، تو اللہ تعالیٰ اُس دعا کو قبول فرماتا ہے۔لیلۃ القدر کی طرح دعا کی قبولیت کی اس ساعت کو بھی مستور رکھا گیا ہے تاکہ بندوں کے ذوق وشوق کا پتا چلے۔تاہم بعض روایات کی رو سے یہ امام کے خطبے کے لیے کھڑے ہونے سے لے کر نماز کے ختم ہونے تک ہے اور بعض کی رو سے یہ نمازِ عصر سے غروبِ آفتاب کے درمیان کی کوئی ساعت ہے۔ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ مِن أَفضَلِ أَیَّامِکُمْ یَومَ الْجُمُعَۃِ، فِیہِ خُلِقَ آدَمُ وَفِیہِ قُبِضَ وَفِیہِ النَّفْخَۃُ وَفِیہِ الصَّعْقَۃُ، فَأَکْثِرُوا عَلَیَّ مِنَ الصَّلَاۃِ فِیہِ، فَاِنَّ صَلَاتَکُم مَعْرُوْضَۃٌ عَلَیَّ، قَالَ: قَالُوا: یَارَسُولَ اللہِ! وَکَیفَ تُعرَضُ صَلَاتُنَا عَلَیْکَ وَقَد أَرِمْتَ؟، قَالَ: یَقُولُونَ: بَلِیتَ، فَقَالَ: اِنَّ اللہَ عَزَّوَجَلَّ حَرَّمَ عَلَی الْأَرْضِ أَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ۔

ترجمہ: ''بے شک تمہارے دنوں میں سے سب سے بہترین دن جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، اسی دن اُن کی روح قبض کی گئی، اسی دن (قیامت کا) صور پھونکا جائے گا اور اِسی دن خوفناک کڑک ہوگی (جس کے نتیجے میں تمام جاندار وفات پا جائیں گے)، سوتم اس دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجو، کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے، صحابۂ کرام نے عرض کی: ''یارسول اللہ! ہمارا درود آپ پر کس طرح پیش کیا جائے گا جب کہ آپ کا جسمِ مبارک بوسیدہ ہو چکا ہوگا، راوی بیان کرتے ہیں: انہوں نے کہا: آپ کا جسدِ مبارک پرانا ہو چکا ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاءِ کرام کے اجسامِ مبارکہ پر اثر انداز ہو، (سنن ابوداود:1043)''۔رسول اللہ ﷺ (جمعہ کے دن) زوال کے بعد چار رکعات پڑھتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: اِنَّھَا سَاعَۃٌ تُفْتَحُ فِیھَا أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَأُحِبُّ أَن یَصعَدَ لِی فِیھَا عَمَلٌ صَالِحٌ۔ترجمہ: ''یہ (ایک مبارک) گھڑی ہے، اس میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، تو میں چاہتا ہوں کہ اس میں میرا نیک عمل عالَمِ بالا میں جائے''۔(سنن ترمذی:478)

ہمارے خطے میں رمضانِ مبارک کے آخری جمعے کو ''جمعۃ الوداع'' کے طور پر منایا جاتا

ہے اور اس کے لیے جمعے کے خطبے میں ''اَلوَداعُ الوَداعُ یا شھرَ رمضانَ'' کے کلمات بھی پڑھے جاتے ہیں یا نعت خوان جمعہ کی نماز کے بعد یا رمضان مبارک کے آخری دن ''الوداع اے ماہ رمضان'' کی طرز کے اشعار نعت یا نوحہ کی صورت میں پڑھتے ہیں۔ اس کی شریعت مبارکہ اور سنت نبویہ میں کوئی اصل نہیں ہے۔ امام احمد رضا قادری قُدِسَ سِرّہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''(۱) رمضان المبارک میں نبی کریم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''خطبۃ الوَداع'' پڑھا ہے یا نہیں؟۔ (۲) اگر حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھا ہے، تو سب سے پہلے خطبۃ الوَداع کس نے پڑھا ہے اور اس کا مُوجِد ومُختَرِع (اختراع کرنے والا) کون ہے؟، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یا ائمۂ مجتہدین وفقہاء ومُحدِّثین رحمہم اللہ تعالیٰ۔ (۳) شریعتِ مُقدّسہ مُطَہّرہ مُنوّرہ مُحمّدیہ حنفیہ اہلسنت و جماعت میں خطبۃ الوَداع کا کیا درجہ ہے؟، فرض یا واجب یا سنّت یا مستحب یا مباح؟، صاف صاف مُدلّل تحریر فرمائیں۔ (۴) جس جمعۃ الوَداع کو ''خطبۃ الوَداع'' نہ پڑھا جائے، وہ جمعہ صحیح ہوگا یا نہیں؟ اور ''تارکِ ''خطبۃ الوَداع'' کس درجہ کا خاطی وگنہگار ہے، قابلِ ملامت وزجر ہے یا نہیں؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''(۱) اَلوَداع جس طرح رائج ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ (۲) نہ صحابۂ کرام ومجتہدین عِظام رضی اللہ عنہم سے نہ اس کا مُوجِد معلوم۔ (۳) وہ اپنی حدِ ذات میں مباح ہے، ہر مباح نیتِ حسن سے مستحب ہوجاتا ہے اور عروض وعوارضِ خلاف سے مکروہ سے حرام تک۔ (۴) جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے، خاص ''خطبۃ الوَداع'' کوئی چیز نہیں، اُس (خاص خطبے کے) کے ترک سے نماز پر کچھ اثر نہیں پڑسکتا، اُس کے ترک میں کچھ خلل نہیں، نہ تارک پر زَجر وملامت رَوا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 452-451)

فتاویٰ رضویہ میں مُندرِج اس سوال میں سائل نے کتاب ''شبیہ الانسان'' کے ص: 24 کے حوالے سے فارسی عبارت لکھی ہے، جس کا ترجمہ درج ذیل ہے: ترجمہ: ''رمضان کے

آخری جمعہ میں حسرت وافسوس کے کلمات پڑھنا مباح ہے، لیکن اَسلاف سے منقول نہیں، ترک افضل ہے تاکہ عوام اسے واجب یا سنّت نہ بنالیں، شرط یہ ہے کہ اس میں رسالت مآب ﷺ کی نسبت جھوٹ شامل نہ ہو، ورنہ حرام ہے، اور وہ یہ ہے ۔

''اکثر محمد مصطفیٰ محبوب ومطلوبِ خدا گفتے دریں حسرتا اے ماہِ رمضاں الوَداع''

یعنی'' خدا کے محبوب ومطلوب محمد مصطفیٰ ﷺ (رمضان المبارک کے آخر میں) اکثر حسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے: اے ماہِ رمضاں الوداع''۔

اس کے بارے میں امام احمد رضا قادری مُحدّثِ بریلی نے لکھا: ''اِس فتوے میں جو کچھ لکھا ہے، حرف بحرف صحیح ہے، سوائے اس لفظ کے کہ ''افضل ترک است''، اس کی جگہ یوں لکھنا چاہیے: ''التزامش نہ باید، گاہے ترک ہم کنند تاکہ عوام گمانِ وجوب واستنان نہ کردند'' (ترجمہ: اس کا التزام نہیں کرنا چاہیے، کبھی اسے ترک کردیں تاکہ عوام کو وجوب یا سنّت ہونے کا وہم نہ ہو)، فقد صرّح العُلَمَاءُ الکِرَامُ اَنَّ التَّرکَ اَحیَانًا یُزِیلُ الاِیهَامِ (ترجمہ: ''علماء کرام نے تصریح کی ہے کہ بعض اوقات ترک کردینا عوام کے وہم کو زائل کردیتا ہے)، (حوالہ مذکورہ بالا)۔ ظاہر ہے کہ اس کا التزام ہی کیا جاتا ہے اور ترک پر لوگ ملامت کرتے ہیں اور کسی مباح یا مستحب امر کے ترک پر ملامت کرنا اسے واجب کا درجہ دینا ہے اور یہ صرف اور صرف شارع علیہ الصلاۃ والسلام کا منصب ہے۔

آپ سے سوال کیا گیا کہ: ''منکر رالوداع شریف کوئی عمل شرعی میں نقص رکھتا ہے اور یہ عمل درست ہے یا نادرست؟''۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''الوداع کہ رائج ہے نہ کوئی شرعی حکم ہے نہ اس سے منع شرعی، ہاں! علماء اس کا التزام نہ کریں، کبھی ترک بھی کریں کہ عوام واجب سمجھنے لگیں اور سچی الوداع قلب سے ہے کہ رمضان شریف کے آنے سے خوش ہو اور جانے سے غمگین، اور اگر یہ حالت ہو کہ آنا بار تھا اور جانے کے لیے گھڑیاں گنیں تو جھوٹی الوداع ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 454-451)

دو سال قبل پنجاب سے ایک خطیب کا فون آیا کہ مسجد کی انتظامیہ نے کہا ہے کہ اگر

الوَداع نہیں پڑھو گے تو برطرف کر دیا جائے گا، یہ جاہلانہ روش ہے، جس چیز کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، اسے لازم قرار دینا اپنی طرف سے شریعت اختراع کرنا ہے، شریعت کا تعین صرف شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اختیار ہے۔ امام اہلسنّت کے ان کلمات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ: ''سچی الوداع قلب سے ہے کہ رمضان شریف کے آنے سے خوش ہو اور جانے سے غمگین''۔ ہم نے عشق و محبت کے سارے تقاضے اپنے قلب پر طاری کرنے اور اپنے عمل کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے خوش گلو نعت خوانوں کے سپرد کر دیے ہیں۔ اسی طرح لوگوں کا جمع ہو کر ''آج رمضان کی الوداع ہے'' جیسے اشعار نعت خوانی کے انداز میں پڑھنے کی بھی کوئی اصل نہیں ہے۔ البتہ حدیثِ مبارک کی رو سے رمضان المبارک میں ایک فرض کا اجر ستر فرائض کے برابر ہے لہٰذا رمضان مبارک کے ہر جمعۃ المبارک کا اجر بقیہ سال کے ستر جمعوں کے برابر ہے۔ اس لیے پورے رمضان کی ساری عبادات کو یکساں اہتمام کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ جمعۃ الوداع یا عید الفطر کے دن کثیر تعداد میں حاضر ہوتے ہیں، وہ باقی جمعوں میں کہاں ہوتے ہیں؟۔ شریعت کی رُو سے تو رمضان مبارک کے تمام جمعوں کا اجر برابر ہے۔ مزید یہ کہ رمضان مبارک کی تربیت کا تقاضا یہ ہے کہ عبادت کے ذوق و شوق کو زندگی کا لازمی حصہ بنایا جائے، اسلام کو مکمل صورت میں قبول کیا جائے، Pick & Choose کا شِعار ترک کیا جائے۔ ہاں! اگر کوئی یہ دعا کرنا چاہے کہ اے ربُّ العٰلمین! یہ سعادت زندگی میں بار بار نصیب فرما، تو یہ ''درازیِ عمر بالخیر'' کی دعا ہے اور ایسی دعائیں اور تمام مسنون دعائیں کثرت سے کرنی چاہئیں۔ امام احمد رضا قادری مُحدّث بریلی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عہد کے مطابق: ''خطبۂ الوَداع یا آج ماہِ رمضان کی الوَداع ہے'' وغیرہ کلمات کے ترک کو افضل قرار دینے کی بجائے یہ لکھنے کا مشورہ دیا تھا کہ: ''اس کی جگہ یوں کہنا چاہیے تھا کہ: ''التزام نہیں کرنا چاہیے''۔ لیکن اب ہمارے عہد میں جب یہ نہ پڑھنے پر خطیب کو برطرف کرنے کی دھمکی دی جانے لگے اور لوگ خوش گلو نعت خوانوں کے ساتھ

اسے خصوصی اجر کا باعث سمجھ کر پڑھنے لگیں، تو پھر یہ کہنا لازم ہوگا کہ اس شعار کو ترک کرنا ہی افضل ہے، کیونکہ ہمارے ہاں بدعتِ حسنہ کے نام پر اب شریعت پر زیادات کا رواج بڑھتا جارہا ہے اور ہم حسنِ نیت کی بنا پر دین میں شامل کی گئی ہر نئی بات پر اُس کی اباحت یا جواز کی بات کریں گے تو عوام اسے اَمرِ مشروع اور وسیلۂ اجر ہی سمجھیں گے۔ ہمارے علم میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ہے کہ کسی نے پڑھتے وقت اپنی شرعی ذمے داری پوری کرتے ہوئے عوام کو آگاہ کیا ہو کہ یہ شِعار قُرونِ اُولیٰ ''مَشْهُودلَهَا بِالْخَيْر'' یعنی عہدِ رسالت مآب ﷺ، عہدِ صحابۂ کرام، عہدِ تابعین وتبعِ تابعین عِظام بلکہ اُس کے بعد کے مُتصل ادوار سے بھی ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس کا التزام نہیں کرنا چاہیے تاکہ عوام میں کسی بھی درجے میں اس کے لزومِ شرعی ہونے کا وہم پیدا نہ ہو۔

امام احمد رضا قادری کا حوالہ گزر چکا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''یہ اپنی حدِ ذات میں مباح ہے''۔

جب رسول اللہ ﷺ نمازِ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے، تو وہ آپ کے عہدِ مبارک میں قرآن مجید کی نازل شدہ آیات کے ابلاغ اور احکامِ شرعیہ کی تبلیغ کا مؤثر ذریعہ تھا، بعض اوقات جہادی مہمات کی تشکیل بھی اس موقع پر ہوتی تھی۔ خلفائے راشدین بھی اپنے خطبات میں امت کے اجتماعی معاملات اور ریاستی امور کے بارے میں ہدایات جاری فرماتے، یہ موجودہ دور میں امریکا کے ''اسٹیٹ آف دی یونین ایڈریس'' سے ملتی جلتی صورت تھی۔ فرق یہ ہے کہ اسلام میں حکومت اور نظمِ اجتماعی اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق کی بجا آوری کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ آج کل جمعۃ المبارک کے خطبات احکامِ شریعت کی تبلیغ کا ذریعہ ہیں۔

اصل مسنون تو عربی خطبہ ہے، جو عہدِ نبوت سے توارُث اور تسلسُل کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ لیکن چونکہ سب لوگ عربی نہیں جانتے، اس لیے ہمارے عجمی ممالک میں تبلیغ کے لیے اردو میں خطاب کیا جاتا ہے اور خطبۂ مسنونہ سنتِ رسول کی اِتباع میں عربی میں دیا جاتا

ہے،اس سلسلے میں خطبائے کرام بھی اپنی اداؤں پر غور فرمائیں اور خطباتِ جمعہ کو تعلیمِ دین کا ذریعہ بنائیں، ہر جمعۃ المبارک کے خطاب میں چند شرعی مسائل بھی بیان فرمایا کریں۔ اگر وہ روایتی انداز کے مسلکی امتیازات وتخصُّصات پر مشتمل رٹی رٹائی تقاریر کا سلسلہ جاری رکھیں گے، تو ایک وقت آتا ہے کہ لوگ اکتا جاتے ہیں اور ایسے ماحول میں صرف چند بزرگ یا روایتی سامعین ہی دستیاب ہوتے ہیں۔

اگر ہمارے خطبائے کرام لوگوں کو روزمرہ اور عملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل پر بات کریں، دینی رہنمائی کے ساتھ ساتھ ان کی دینی معلومات میں اضافہ کریں، ان کے سامنے حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ دینی مسائل کی تطبیق کریں اور اخلاقی واصلاحی امور پر جامع، مفصل اور مدلّل انداز میں گفتگو کریں، تو ہمارا تجربہ ہے کہ لوگ سننے کے لیے بھی آتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوان زیرِ بحث موضوع پر غور بھی کرتے ہیں، ان کے ذہنوں میں جو اِشکالات اور سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا بھی اظہار کرتے ہیں اور اس طرح مثبت اور تعمیری انداز میں ربطِ باہمی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں پر کوئی بات مسلط نہ کی جائے بلکہ دلیل اور استدلال سے انہیں قائل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ ترجمہ: ''(لوگوں کو) اپنے رب کے راستے (یعنی دین) کی طرف حکمت اور پُرتاثیر نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور جہاں بحث یا مکالمہ کرنا پڑے تو احسن طریقے سے کرو''۔ (نحل:125)

02 اگست 2015ء مفتی منیب الرحمٰن

رئیس دارالافتاء، دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

مفتی محمد ابراہیم قادری ان الفاظ سے تائید کرتے ہیں:

مجھے اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت کے ان جملوں سے مکمل اتفاق ہے:

1۔ اَلوَدَاع جس طرح رائج ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ثابت نہیں ہے، نہ صحابۂ کرام

ومجتہدینِ عظام رضی اللہ عنہم سے نہ اس کا مُوجِد معلوم۔

2۔ وہ اپنی حدِ ذات میں مباح ہے، ہر مباح نیتِ حسن سے مستحب ہو جاتا ہے اور عروض وعوارضِ خلاف سے مکروہ سے حرام تک۔

3۔ جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے، خاص ''خطبۃُ الوَدَاع'' کوئی چیز نہیں۔

4۔ اس کا التزام نہیں کرنا چاہیے، کبھی اسے ترک کردیں تاکہ عوام کو وجوب یا سنت کا وہم نہ ہو۔

یہ چاروں جملے انتہائی محتاط اور مضمون کی ادائیگی میں بہت نپے تلے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عامۃ الناس، ایک امر مباح میں جب وہ عام ہو جائے اور اس میں ان کی دلچسپی بہت بڑھ جائے، اِفراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں، عُلماء کو چاہیے کہ وہ اس روش کے ازالے کے لیے کبھی کبھار ایسے اُمورِ مباحہ کو ترک کر دیا کریں، جیسا کہ امام اہلسنّت کا فرمان جملہ میں درج کردیا گیا ہے لیکن انتہائی معذرت کے ساتھ عامۃ الناس کو کسی امر میں غلو سے روکنے کے لیے بھی غلو نہیں کرنا چاہیے کہ یہ بھی افراط وتفریط کے زمرے میں آتا ہے، ایسی تحذیرات سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ کام حرام ہے، اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔ ھٰذا ما عندی و العلم عند اللہ تعالیٰ۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ عوام کو یہ مشورہ دیا جائے کہ اسے کبھی ترک کردیا جائے تاکہ وجوب وسنّت کا وہم نہ ہو۔

15، ستمبر 2015ء

مفتی محمد ابراہیم قادری

مفتی صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ جہاں یہ چیزیں رائج ہو جائیں، وہاں لوگ اَحیاناً بھی اس کے ترک پر آمادہ نہیں ہوتے، پنجاب کے خطیب کا حوالہ گزر چکا ہے۔

غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر الجیلانی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں: ''اے رمضان کے مہینے، تجھ پر سلام!، اے ایمان کے مہینے، تجھ پر سلام!، نزولِ قرآن وتلاوت کے مہینے، تجھ

پر سلام!، ماہِ انوار تجھ پر سلام!، ماہِ بخشش ومغفرت، تجھ پر سلام!، درجات جنت کے حصول اور دوزخ کے طبقات سے نجات کے مہینے، تجھ پر سلام!، اے عابدوں اور توبہ کرنے والوں کے مہینے، تجھ پر سلام!، اہلِ معرفت کے مہینے، تجھ پر سلام!، اے عارفوں کے مہینے، تجھ پر سلام!، اے امن وامان کے مہینے، تجھ پر سلام!، سلام ہو ان قندیلوں اور روشن چراغوں پر، سلام ہو ان آنکھوں پر جو بیدار رہتی ہیں، سلام ہو ان آنکھوں پر جو بہتی رہتی ہیں، سلام ہو ان محرابوں پر جو روشن اور منور ہیں، سلام ہو قطرہ قطرہ بن کر گرنے والے آنسوؤں پر، سلام ہو سوختہ دلوں سے نکلنے والی آہوں پر۔ الٰہی! ہمیں بھی ان ان لوگوں میں شامل فرما جن کے روزے اور نمازیں تو نے قبول فرمائی ہیں اور جن کی برائیوں کو تو نے نیکیوں سے بدل دیا ہے اور جنہیں تو نے اپنی رحمت سے جنت میں داخل فریا اور ان کے مراتب بلند فرمائے، یَااَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ!''۔ (غنیۃ الطالبین (اردو) ص:۴۸۸، شبیر برادرز، لاہور، ۱۴۳۲ھ)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا: ''محبوب سبحانی غوث الصمدانی نے غنیۃ الطالبین میں حنفیہ کو گمراہ فرقہ میں مندرج فرمایا ہے، الیٰ آخرہٖ''۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب میں جو کچھ لکھا، اُس کا خلاصہ یہ ہے: ''غنیۃ الطالبین'' حضرت محبوب سبحانی ہی کی تصنیف ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو حضرت محبوب سبحانی کی طرف منسوب کرنے کو صحیح نہیں جانا، جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ آپ نے اُن کا رد فرمایا اور سوال کا جواب یہ دیا: ''غنیۃ الطالبین میں بعض عبارات الحاقی ہیں، جیسا کہ'' فتاویٰ حدیثیہ'' میں علامہ ابن حجر مکی نے لکھا ہے''۔ امام اہلسنت رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''امام غزالی اور شیخ محی الدین ابن عربی اور عبدالوہاب شعرانی کی کتابوں میں بھی حاسدین نے الحاق کیے ہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:29، ص222 تا224)

لیکن امام اہلسنّت نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ اُن کے نزدیک الحاقی عبارات کون کون سی ہیں؟۔ ''خطبۃ الوَداع'' کے بارے میں اُن کا موقف پیچھے بیان ہو چکا ہے، جو

یہ ہے:

''(۱) اَلوَداع جس طرح رائج ہے حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں۔

(۲) نہ صحابۂ کرام ومجتہدینِ عظام رضی اللہ عنہم سے، نہ اُس کا موجِد معلوم۔

(۳) وہ اپنی حدِّ ذات میں مباح ہے، ہر مباح نیتِ حسن سے مستحب ہو جاتا ہے اور عروض وعوارضِ خلاف سے مکروہ سے حرام تک۔

(۴) جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے، خاص ''خطبۃُ الوَداع'' کوئی چیز نہیں، اُس (خاص خطبے) کے ترک سے نماز پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا، اُس کے ترک میں کچھ خلل نہیں، نہ تارک پر زَجر وملامت رَوا''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 452-451)

امام اہلسنّت امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ حضور غوث الاعظم محی الدین عبد القادر الجیلانی رضی اللہ عنہ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ سو اگر ''خطبۃ الوداع'' کے بارے میں امام اہلسنّت کے نزدیک حضور غوث الاعظم محی الدین عبد القادر الجیلانی رضی اللہ عنہ کے جمعۃ الوداع کے بارے میں ''غنیۃ الطالبین'' میں درج عبارت کی کوئی مستند اساس ہوتی، تو وہ ضرور اس کا حوالہ دیتے، لیکن آپ نے سَلَفِ صالحین سے اس کی مطلقاً نفی فرمائی ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے دینی امور سے اُن کی روح نکال کر رسمی حیثیت دے دی جاتی ہے، جیسے گزشتہ چند سالوں سے ٹیلی ویژن چینلز پر اور مجالس میں خوش گلو نعت خواں ''میری توبہ قبول ہو'' پر مشتمل اشعار پڑھ کر سب کی توبہ سے فارغ ہو جاتے ہیں، حالانکہ توبہ نعت خوانی کے انداز میں اشعار پڑھنے کا نام نہیں ہے، بلکہ تو یہ ایک مربوط قلبی اور روحانی عمل کا نام ہے، جو یہ ہے:

(الف) بندۂ مومن اپنی معصیتوں اور گناہوں کا اللہ تعالیٰ کے حضور اقرار کرے۔

(ب) پھر اُن پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نادم وشرمسار ہو۔

(ج) پھر شریعت نے اُن کی تلافی کی جو صورتیں تعلیم فرمائی ہیں، اُن کے مطابق اُن کی تلافی

کرے، مثلاً:

(1) جتنی قضانمازیں اُس کے ذمے باقی ہیں تو اُن کی قضا پڑھے۔

(2) ماضی کے کئی سالوں کی زکوٰۃ اُس کے ذمے ہے تو ادا کرے۔

(3) روزے چھوٹ گئے ہیں تو اُن کی قضا رکھے۔

(4) بندوں کا حق غصب کیا ہے تو انہیں واپس کرے اور اُن سے معافی مانگے۔

(5) دیگر شعبوں میں بھی تلافی کی جو صورتیں شریعت نے مقرر کی ہیں، اُن کو اختیار کرے۔

(6) پھر اللہ تعالیٰ سے عہد کرے کہ آئندہ وہ ان گناہوں کا اعادہ نہیں کرے گا۔

(7) پھر اللہ تعالیٰ سے اس پیمان پر قائم رہنے کی توفیق مانگے۔

ان اصولوں کی روشنی میں ہر مسلمان خلوت میں اللہ تعالیٰ سے رجوع کرے اور توبہ اور استغفار کرے، البتہ جو گناہ کسی نے عَلانیہ کیے ہوں تو اُسی فورم پر اُن سے رجوع کرے اور عمومی استغفار کے علاوہ جو گناہ تعیین کے ساتھ اُسے یاد ہوں، اُن کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے۔ مُعیّن گناہوں کے لیے عمومی توبہ کافی نہیں ہے۔

علامہ مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''توبہ کے متعلق مطلقاً شریعت کا قانون یہ ہے کہ جو گناہ بالاعلان کیا جائے، اس کی توبہ بھی بالاعلان کی جائے گی اور جو گناہ چھپ کر کیا جائے، اس کی توبہ چھپ کر بھی کی جاسکتی ہے۔ حدیث میں فرمایا: ''اِذَا عَمِلْتَ سَیِّئَۃً فَاَحْدِثْ عِنْدَھَا تَوْبَۃً اَلسِّرَّ بِالسِّرِّ وَالْعَلَانِیَۃِ بِالْعَلَانِیَۃِ''۔ ترجمہ: ''یعنی جب تم سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو فوراً توبہ کرلو، پوشیدہ گناہ کے لیے پوشیدہ توبہ کافی ہے اور علانیہ گناہ کی توبہ علانیہ کرنی ہوگی''۔ (الجامع الصغیر للسیوطی، المجلد الاول ص:117، دار الفکر، بیروت)

(وقار الفتاویٰ، جلد: سوم، ص:26، ناشر: بزمِ وقار الدین، کراچی)

تائید وتوثیق وتصویب مفتیانِ عظام بابت فتویٰ: ''جمعۃ الوداع کی شرعی حیثیت''

نمبر شمار	اسمائے گرامی	مدرسہ/دارالعلوم/جامعہ
1	علامہ مفتی محمد اسماعیل رضوی ضیائی	شیخ الحدیث ومفتی دارالعلوم امجدیہ، عالمگیر روڈ، کراچی
2	علامہ مفتی محمد رفیق حسنی	مہتمم ومفتی، شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم گلستانِ جوہر، کراچی
3	علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی	مہتمم ومفتی واستاذ حدیث جامعہ نضرۃ العلوم گارڈن، کراچی
4	مفتی محمد جان نعیمی	مہتمم دارالعلوم مجددیہ نعیمیہ صاحبداد گوٹھ، ملیر کراچی
5	علامہ مفتی محمد اسماعیل نورانی	مفتی ومن کبار الاساتذہ جامعہ انوار القرآن، بلاک 5 گلشن اقبال، کراچی
6	حافظ محمد عبدالستار سعیدی	شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور
7	علامہ مفتی محمد تنویر القادری	مفتی جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور
8	حضرت علامہ جمیل احمد نعیمی ضیائی	ناظم تعلیمات دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

رخصتِ رمضان کی اباحت، افضلیت اور وجوب کا بیان

سوال:

اس سال کراچی میں رمضان المبارک کے ابتدائی ایام میں ہلاکت خیز گرمی پڑی اور بجلی کے بحران نے اس کی شدت میں دوگنا بلکہ سہ گنا اضافہ کردیا اور اخبارات کی رپورٹ کے مطابق سینکڑوں افراد گرمی کی تاب نہ لاتے ہوئے لقمۂ اجل بنے اور اُن میں روزے دار بھی شامل ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے حالات میں روزہ توڑنے کا شرعی حکم کیا ہے؟، (سید شفاعت علی، گلشنِ اقبال، کراچی)۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آیات 184و185 میں دومرتبہ فرمایا: ''بیمار اور مسافر (کے لیے عذر کی بنا پر رمضان کا روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے، لیکن بعد میں) دوسرے دنوں میں (چھوٹے ہوئے روزوں کی) گنتی پوری کرنا ہوگی (یعنی ان روزوں کی قضا رکھنی ہوگی)''۔

آیت 185 میں یہ بھی فرمایا: ''(اس رخصت کی حکمت یہ ہے کہ) اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ دشواری نہیں چاہتا''، نیز آیت: 184 میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ مشورہ دیا: ''(اگرچہ مسافر اور بیمار کو قضا کی شرط کے ساتھ رمضان کا روزہ چھوڑنے کی رخصت دی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود) اگر تم روزہ رکھلو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے''۔

عام حالات میں یہ رخصت قائم رہے گی:

(۱) ''حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی: میں سفر میں روزہ رکھتا ہوں اور وہ کثرت سے روزہ رکھنے والے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہیں اختیار ہے چاہو تو روزہ رکھو اور چاہو تو چھوڑ دو''۔ (بخاری:1943)

(۲) انس بن مالک بیان کرتے ہیں: ہم (سفرِ جہاد میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر

کر رہے تھے، ہم میں سے بعض نے روزہ رکھا اور بعض نے چھوڑ دیا، دونوں نے ایک دوسرے کو ملامت نہیں کیا''۔ (بخاری: 1947)

(۳): حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (رمضان کے دوران) ایک بھیڑ دیکھی جو ایک شخص پر سایہ کیے ہوئے تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: (ایسی حالت میں) سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے''۔ (بخاری: 1946)

(۴) حضرت انس بیان کرتے ہیں: ہم (رمضان کے دوران) ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ ہم میں سے بعض روزے سے تھے اور بعض نے روزہ نہیں رکھا تھا، ہم نے ایک گرم مقام پر پڑاؤ ڈالا، روزے دار تو نڈھال ہو کر گر پڑے، جنہوں نے روزہ نہیں رکھا تھا، وہ اٹھے، انہوں نے خیمے تانے اور جانوروں کو پانی پلایا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آج روزہ نہ رکھنے والے ثواب کمانے میں سبقت لے گئے''۔ (مسلم: 2617)

(۵) حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ (غزوۂ فتح مکہ کے موقع پر) مدینۂ منورہ سے مکہ مکرمہ کے سفر پر تھے، جب آپ ''عُسفان'' کے مقام پر پہنچے تو آپ ﷺ نے پانی منگایا، اپنا ہاتھ بلند کیا تاکہ لوگ دیکھ لیں، پھر آپ نے روزہ توڑ دیا، یہاں تک کہ آپ مکہ مکرمہ پہنچ گئے''۔ (بخاری: 1948)

اس سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں سفر کے دوران رمضان کا روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے اور سازگار حالات میں اللہ تعالیٰ نے روزہ رکھنے کو بہتر قرار دیا ہے، لیکن جہاد کے موقع پر چونکہ مجاہد کو مستعد، چاق و چوبند اور تازہ دم رہنا پڑتا ہے، کیونکہ کسی بھی وقت دشمن کے ساتھ ٹکراؤ کی نوبت آسکتی ہے، اس لیے جب مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے روزہ چھوڑنے کو افضل قرار دیا اور غالباً صحابۂ کرام کو آپ کی زبانی اجازت کے باوجود روزہ توڑنے پر تردد ہوگا، تو آپ نے (ایک روایت کے مطابق) عصر کے بعد علانیہ روزہ توڑا تاکہ صحابۂ کرام کو روزہ توڑنے میں کوئی تردد نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاد کے موقع پر روزہ نہ رکھنا یا توڑنا افضل ہے۔

اس سال کراچی میں گرمی ناقابلِ برداشت ہوگئی اور دو ہزار سے زیادہ اموات گرمی کے سبب واقع ہوئیں، اسے ''ہیٹ اسٹروک'' کا نام دیا گیا، یعنی کثرت سے پسینہ بہہ جانے کی وجہ سے انسانی جسم میں پانی اور نمکیات کی کمی واقع ہوجاتی ہے، جسے طبی زبان میں Dehideration کہتے ہیں۔تو ہماری رائے میں ایسے حالات میں جب کسی شخص کے لیے بیماری کے خطرناک مہلک بن جانے یا روزے دار کی جان تلف ہونے کا ظنِ غالب ہوجائے تو روزہ توڑنے یا چھوڑنے کی شرعی رخصت پر عمل واجب سمجھا جائے، کیونکہ اس کی تائید میں احادیثِ مبارکہ بھی موجود ہیں اور ائمۂ مجتہدین اور فقہاءِ امت کے اقوال بھی موجود ہیں۔ روزہ توڑنے کی صورت میں صرف قضا لازم ہوگی، کفارہ لازم نہیں ہوگا۔اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عَلَیکُمْ بِرُخْصَةِ اللهِ الَّذِیْ رَخَّصَ لَکُمْ

ترجمہ:''اللہ نے تمہارے لیے جو رخصت دی ہے، اُس رخصت پر عمل کرنا تم پر واجب ہے''۔(صحیح مسلم:1115)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ لَمْ یَقْبَلْ رُخْصَةَ اللهِ کَانَ عَلَیْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلُ جِبَالِ عَرَفَةَ۔

ترجمہ:''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت کو قبول نہیں کیا، اُس کو میدانِ عرفات کے پہاڑوں کے برابر گناہ ہوگا''۔(مسند احمد بن حنبل:5392)

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ یُحِبُّ اَنْ تُؤْتٰی رُخَصُهٗ، کَمَا یَکْرَهُ اَنْ تُؤْتٰی مَعْصِیَتُهٗ۔

ترجمہ:''بے شک اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی معصیت کو ناپسند فرماتا ہے، اسی طرح اپنی دی ہوئی رخصت پر عمل کرنے کو پسند فرماتا ہے''۔(مسند احمد بن حنبل:5866)

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ تنویر الابصار مع الدر المختار کی شرح میں لکھتے ہیں:

بِمَا لَیْسَ فِیْہِ خَوْفُ ھَلَاکٍ، وَاِلَّا وَجَبَ الْفِطْرُ۔

ترجمہ:''اگر روزہ رکھنے کی صورت میں ہلاکت کا اندیشہ ہو،تو روزہ توڑنا واجب ہے''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 6،ص:356، دارالثقافہ والتراث، دمشق)

علامہ علاؤالدین ابوبکر کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَرُوِیَ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ۔۔۔ وَالْمُبِیْحُ الْمُطْلَقُ بَلِ الْمُوْجِبُ ھُوَالَّذِیْ یَخَافُ مِنْہُ الْھَلَاکُ لِاَنَّ فِیْہِ اِلْقَاءَ النَّفْسِ اِلَی التَّھْلُکَۃِ لَا لِاِقَامَۃِ حَقِّ اللہِ تَعَالٰی وَھُوَ الْوُجُوْبُ، وَالْوُجُوْبُ لَایَبْقٰی فِیْ ھٰذِہِ الْحَالَۃِ وَاِنَّہٗ حَرَامٌ فَکَانَ الْاِفْطَارُ مُبَاحًا بَلْ وَاجِبًا۔

ترجمہ:''امام ابوحنیفہ سے روایت ہے :اور (عذر کی بنا پر) روزے کو توڑنے کی مُطلق اباحت بلکہ وجوب اُس صورت میں ہے کہ روزے دار کی ہلاکت کا اندیشہ ہو، کیونکہ اس میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، اللہ کے حق کو قائم رکھنے کے لیے نہیں جو کہ واجب ہے، اس حالت میں روزے کا وجوب باقی نہیں رہتا اور یہ حرام ہے، تو ایسی صورت میں روزہ توڑنا مباح بلکہ واجب ہوگا''۔(بدائع الصنائع، جلد ثانی،ص:142، مرکز اہل سنت برکات رضا)

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر المرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

وَنَحْنُ نَقُوْلُ:اِنَّ زِیَادَۃَ الْمَرَضِ وَامْتِدَادَہٗ قَدْ یُفْضِیْ اِلَی الْھَلَاکِ، فَیَجِبُ الْاِحْتِرَازُ عَنْہُ۔

ترجمہ:''اور ہم کہتے ہیں: بیماری کی زیادتی اور اس کا لمبا ہونا کبھی ہلاکت کا سبب بنتا ہے، تو اس سے بچنا واجب ہے''۔(ہدایہ، جلد ثانی،ص:119، مکتبۃ البشریٰ، کراچی)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

وَاِنْ غَلَبَ الظَّنُّ الْھَلَاکَ بِسَبَبِ الصَّوْمِ اَوِ الضَّرَرَ الشَّدِیْدَ کَتَعْطِیْلِ حَاسَّۃٍ مِنَ الْحَوَاسِّ وَجَبَ الْفِطْرُ۔

ترجمہ:''اور اگر روزے کے سبب ہلاکت کا غالب گمان ہو یا شدید تکلیف جیسے کسی حس کا معطل ہونے کا گمان ہو تو اس صورت میں روزہ توڑنا واجب ہے''۔وہ مزید لکھتے ہیں:

''وَلِلْفُقَھَاءِ آرَاءٌ فِیْ فِطْرِ الْمَرِیْضِ: فَقَالَ الْحَنَفِیَّۃُ وَالشَّافِعِیَّۃُ اَلْمَرِیْضُ یُبِیْحُ الْفِطْرَ،

وَقَالَ الْحَنَابِلَةُ: یُسَنُّ الْفِطْرُ حَالَةَ الْمَرَضِ وَیُکْرَہُ الصَّوْمُ وَقَالَ الْمَالِکِیَّةُ: یَخَافُ الْھَلَاکُ مِنَ الْمَرَضِ اَوْلِضُعْفٍ، اِنْ صَامَ فَالْفِطْرُ وَاجِبٌ''۔

ترجمہ: ''بیماری کی حالت میں روزہ توڑنے کے بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں: حنفیہ اور شافعیہ کا قول ہے: ایسی صورت میں روزہ توڑنا مباح ہے، حنابلہ نے کہا: ایسی صورت میں روزہ توڑنا سنت ہے اور رکھنا مکروہ ہے۔اور مالکیہ نے کہا: اگر بیماری یا ضعف کے سبب روزہ رکھنے کی صورت میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، تو روزہ توڑنا واجب ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد:3، ص: 1698-99، دارالفکر)

رمضان المبارک کے حوالے سے چند اہم سوالات

سعودی عرب میں رمضان کا آغاز کرکے پاکستان آیا یا اس کے برعکس ہوا

سوال:(1)

سب کے علم میں ہے کہ مختلف ممالک میں رمضان المبارک اور شوال المعظم (یعنی عیدالفطر) ایک ساتھ شروع نہیں ہوتے، بعض ممالک میں کم از کم ایک دن کا فرق ہوتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ کوئی پاکستان میں رمضان المبارک کا آغاز کرکے سعودی عرب گیا، اس کا ابھی اٹھائیسواں روزہ مکمل ہوا تھا کہ وہاں عید ہوگئی، اب وہ کیا کرے یا سعودی عرب سے رمضان کا ایک روز پہلے آغاز کرکے پاکستان آگیا اور اس کے تیس مکمل ہوگئے، لیکن ابھی رمضان جاری ہے، اگر روزہ رکھتا ہے تو اس کے 31 دن ہوجائیں گے اور روزہ چھوڑ دیتا ہے، جبکہ وہاں تیسواں روزہ ہے تو کیا رمضان المبارک کی بے حرمتی نہیں ہوگی؟۔

(محمد ناصر چشتی، تونسہ شریف)

جواب:(1)

اس کے لیے ہمیں قرآن وحدیث سے یہ رہنمائی ملتی ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ

ترجمہ: ''سو تم میں سے جو (عاقل وبالغ) شخص اس ماہِ (رمضان) کو پائے، تو اس پر لازم

ہے کہ اس کے روزے رکھے''۔(البقرہ:185)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلصَّوْمُ یَوْمَ تَصُوْمُوْنَ وَالْفِطْرُ یَوْمَ تُفْطِرُوْنَ، وَالْاَضْحٰی یَوْمَ تُضَحُّوْنَ۔

ترجمہ:''جس دن لوگ روزہ رکھیں، اُس دن (سب پر) روزہ ہے اور جس دن لوگ عیدالفطر منائیں، اُس دن (سب کے لیے) عید ہے اور جس دن لوگ عیدالاضحیٰ منائیں، اس دن سب کی عیدالاضحیٰ (اور قربانی) ہے''۔اس حدیث کے ذیل میں علامہ محمد بن عیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں:''بعض اہلِ علم نے کہا ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ روزہ اور عید جماعتِ مسلمین کے ساتھ ہوگی''۔(ترمذی:697)

اس حدیث کی رو سے جو شخص سعودی عرب میں رمضان کا ایک دن پہلے آغاز کر کے پاکستان آیا اور اس کے تیس روزے پورے ہو چکے تھے، لیکن اگلے دن یہاں تیسواں روزہ تھا، اس کے حق میں رمضان 31 دن کا ہو جائے گا، کیونکہ اس کے لیے یہاں شہودِ شہر (ماہِ رمضان کا پایا جانا) ثابت ہے اور جماعتِ مسلمین کا روزہ بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّا اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ لَا نَکْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ، اَلشَّھْرُ ھٰکَذَا وَھٰکَذَا، یَعْنِی مَرَّۃً تِسْعَۃً وَّعِشْرِیْنَ وَمَرَّۃً ثَلَاثِیْنَ۔

ترجمہ:''ہم اُمّی قوم ہیں، لکھت پڑھت اور حساب نہیں کرتے، آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے دو بار اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: (قمری) مہینہ کبھی 29 دن کا ہوتا ہے اور کبھی 30 دن کا، (بخاری:1913)''۔رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلام سادہ دین ہے، ہر دور کے لیے اور ہر علمی سطح کے لوگوں کے لیے ہے، خواہ وہ فلکیات اور علم الحساب کے ماہر ہوں یا نہ ہوں۔ لہٰذا قمری مہینہ زیادہ سے زیادہ تیس دن کا ہوتا ہے اور جدید علمِ فلکیات بھی اس کی تائید کرتا ہے، لہٰذا تیس روزے مکمل ہونے پر وہ روزہ چھوڑ سکتا ہے، لیکن اسے مقامی حالات کے مطابق احترامِ رمضان بہر حال کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ

چاہے تو پہلے آپشن کو اختیار کرتے ہوئے روزہ رکھ سکتا ہے اور اس موقف کے دلائل زیادہ قوی ہیں۔ لیکن اگر اس کے انتیس روزے ہوئے تھے کہ یہاں عید ہوگئی، تو اس کے لیے عید منانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ قمری مہینے کے دنوں کی کم از کم تعداد انتیس دن پوری ہوگئی۔ اس کے برعکس جب وہ پاکستان سے رمضان المبارک کا سعودی عرب سے ایک دن بعد آغاز کر کے حرمینِ طیبین گیا اور بالفرض وہاں ابھی اس کے اٹھائیس روزے مکمل ہوئے تھے کہ عید الفطر کا اعلان ہوگیا، تو اس کے لیے گنجائش ہے کہ مقامی حالات کے مطابق عید منائے اور بعد میں رمضان کے ایک روزے کے قضا کرلے، کیونکہ رمضان کم از کم انتیس دن کا ہوتا ہے۔

ممتاز فقیہ علامہ نور اللہ بصیر پوری سے اسی طرح کا سوال ہوا:

''ایک شخص سعودی عرب سے عید کا اعلان سن کر پاکستان آیا اور یہاں اس دن انتیسویں شب رمضان تھی، تو وہ کیا کرے؟''۔ اُنہوں نے جواب میں لکھا: ''صحیح یہ ہے کہ مُوافقت روزہ لازم ہے، کیونکہ جماعت مسلمین جب اکثریت میں ہوں اور اپنے طور پر حسبِ دستور شرع رمضان پاک یا عید قربان منارہے ہوں، پھر انہوں نے استدلال میں یہی حدیث لکھی: اَلْفِطْرُ یَوْمَ یُفْطِرُ النَّاسُ وَالْاَضْحٰی یَوْمَ یُضَحِّی النَّاسُ یعنی ''جس دن مقامی مسلمانوں کی اکثریت عید الفطر منائے، اس دن عید مناؤ اور اسی طرح ان کے ساتھ عید الاضحیٰ مناؤ''۔ اس کے بعد انہوں نے احادیث مبارکہ کے مزید حوالہ جات لکھے ہیں، (فتاویٰ نوریہ، جلد دوم، ص:273-271)''۔ شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی نے بھی شرح صحیح مسلم جلد ثالث صفحہ:50-49 میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور ان کی جامع تحقیق کا ماحصل بھی یہی ہے اور ہم نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

معروف فقیہ مفتی رشید احمد صاحب سے سوال ہوا:

''اگر کسی نے رمضان کا چاند دیکھ کر قاضی کے ہاں شہادت دی، مگر قاضی نے اس کی شہادت قبول نہ کی اور اس نے اپنی رُؤیت کی بنا پر روزہ رکھ لیا اور پھر تیس روزے پورے

ہونے پر بھی رُوئیت نہ ہوئی، تو یہ شخص اکتیسواں روزہ بھی رکھے گا یا صرف تیس روزے رکھ کر چھوڑ دے گا ؟''۔ اُنہوں نے جواب میں لکھا: '' یہ شخص اکتیسواں روزہ بھی رکھے گا اور دوسروں کے ساتھ عید کرے گا (ص:433)''۔ اور آگے حوالہ جات بھی دیے ہیں۔ میں نے اپنے عہد کے ممتاز فقیہ مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب سے بھی اس مسئلے میں مشاورت کی، اُنہوں نے بھی اس موقف سے اتفاق کیا۔

شبِ قدر کی برکات

سوال: (۲)

شب قدر دنیا کے مختلف ممالک میں بعض اوقات ایک دن کے فرق کے ساتھ واقع ہوتی ہے، تو اس کے لیے قرآن وحدیث میں جو برکات مقدر ہیں، وہ کس تاریخ کے مطابق ہوگی؟۔ (محمد ناصر خان چشتی، تونسہ شریف)

جواب: (2)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ فِی الْجُمُعَةِ لَسَاعَةً لَا یُوَافِقُهَا مُسْلِمٌ یَسْاَلُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ فِیْهَا خَیْرًا اِلَّا اَعْطَاهُ اِیَّاهُ، قَالَ: وَهِیَ سَاعَةٌ خَفِیْفَةٌ۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جمعہ کے دن ایک قبولیتِ (دعا) کی ساعت ہے، جو (خوش نصیب) مسلمان دعا کرتے ہوئے اس گھڑی کو پالے، اللہ تعالیٰ اس کی مراد پوری فرمادیتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ خفیف (یعنی مختصر سی) ساعت ہے، (مسلم: 1966)''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ساعتِ قبولیت کو عصر کے وقت کے اختتام پر تلاش کرو''۔ (سنن ابی داؤد: 1044)

خفیہ رکھنے کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے شوقِ دعا اور ذوقِ طلب کو ظاہر فرمانا چاہتا ہے کہ کون ہے جو اس قبولیت کی گھڑی کو پانے کے لیے سارا دن یا دن کا زیادہ تر وقت دعا میں مشغول رہتا ہے۔ اس ساعتِ قبولیت کے بارے میں کئی اقوال ہیں:

(الف) ''یہ کہ امام کے منبر پر (خطبے کے لیے) بیٹھنے کے وقت سے لے کر اختتامِ نماز تک

ہے''۔(ابوداؤد:1045)

(ب)''یہ جمعہ کے دن آخری ساعت ہے''۔(ابوداؤد:1044)

ہمیں ان دونوں مواقع پر دعا میں مشغول رہنا چاہیے۔ظاہر ہے کہ پوری دنیا میں جمعہ ایک وقت میں نہیں ہوتا اور نہ ہی قدرت کے بنائے ہوئے نظامِ گردشِ لیل ونہار کی وجہ سے ایسا ہوسکتا ہے،مثلاً پاکستان میں جب جمعے کا دن ہوتا ہے،تو امریکا میں رات ہوتی ہے۔تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی کو بھی محروم نہیں فرماتا،جس کے لیے جہاں جہاں اُن کے اپنے وقت اور تاریخ کے مطابق وہ ساعت آئے گی،اُس وقت وہاں پر جو اللہ کے بندے مصروفِ دعا ہوں گے،انہیں اللہ تعالیٰ کی عطا سے قبولیت نصیب ہوجائے گی۔اسی طرح شبِ قدر کی برکات وسعادات بھی روئے زمین پر تمام مسلمانوں کو اپنے اپنے مقامی حساب کے مطابق عطا کردی جائیں گی۔ہمیں اللہ تعالیٰ کی عطا اور کرم ورحمت کو محدود ومقید نہیں سمجھنا چاہیے،ورنہ بالفرض اگر رمضان المبارک کا آغاز سب جگہ ایک ساتھ ہو تب بھی کہیں دن ہوگا اور کہیں رات ہوگی۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱)وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ترجمہ:''اور میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے''۔

(اعراف:156)

(۲)اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ترجمہ:''سنو!اس کی قدرت ہر چیز پر محیط ہے''۔

(فصلت:54)

زکوٰۃ کا نصاب

سوال:

صاحبِ نصاب کون ہوگا۔آج کل گورنمنٹ ساڑھے باون تولہ چاندی کے حساب سے نصاب مقرر کرتی ہے،لیکن ہمارے روپے کو گولڈ کے بدلے یا مقابل اسٹیٹ بینک پرنٹ کرتا ہے۔اسلام میں ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے برابر نقدی سال بھر میں بچ جائے،اس پر زکوٰۃ فرض ہے؟،اپنے کسی کالم میں وضاحت فرما

دیں تا کہ سب کے علم میں آجائے؟۔ (عبدالحق انجم)۔

جواب:

سب سے پہلے تو یہ جان لیجیے کہ یہ خیال کہ اسٹیٹ بینک میں نوٹ سونے کے محفوظ ذخائر (Reserves) کی مالیت کے برابر چھاپے جاتے ہیں، درست نہیں ہے۔ کافی زمانہ پہلے یہ روایت تھی، اب نہ ایسی کوئی روایت ہے، نہ قانونی پابندی، حتیٰ کہ امریکا اور یورپ میں بھی ایسا کوئی لازمی ضابطہ نہیں ہے، پس صرف پاکستان کی بات نہیں ہے، دنیا میں کہیں بھی یہ قانونی پابندی نہیں ہے۔ کسی ملک کی کرنسی کی قدر (Value) کا مدار اس کی دَرآمدات (Imports) اور بَرآمدات (Exports) کے توازن پر ہے، جسے مُروجہ معاشی اصطلاح میں ''توازنِ ادائیگی'' (Balance of Payment) کہتے ہیں، یعنی اگر کسی ملک کی برآمدات اس کی دَرآمدات سے زیادہ ہیں، تو توازن ادائیگی اُس کے حق میں ہے اور اُس ملک کی معیشت مستحکم ہے، کیونکہ اس سے ملک کے زَرِمبادلہ کے ذخائر (Foreign Exchang Reserves) میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کے علاوہ حکومت کے محاصل (Revenues) اور مَصارف (Expenditures) کے توازن پر ہے۔ ورنہ حکومت اپنے داخلی مصارف کو پورا کرنے کے لیے نوٹ چھاپتی ہے اور اس سے اس کی کرنسی کی حقیقی قدر (Value) کم ہوتی رہتی ہے۔ پیسے کی قدر کا تعیّن اُس کی قوتِ خرید سے ہوتا رہتا ہے، اسی کو افراطِ زر (Inflation) کہتے ہیں۔ دَرآمدات و برآمدات کے توازن اور بیرونی قرضوں کے بارے عہدہ براہونے کے لیے مزید قرضے لینے پڑتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ملکی معیشت ڈانواں ڈول رہتی ہے۔

شریعت میں مال دار پر زکوٰۃ واجب ہے اور مال کی وہ کم از کم مقدار جس کا مالک بننے سے آدمی شریعت کی نظر میں مال دار قرار پاتا ہے، اُسے ''نصابِ زکوٰۃ'' کہتے ہیں اور زکوٰۃ کا کم از کم نصاب یہ ہے، حدیثِ پاک میں ہے:

(۱) عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ زُهَيْرٌ: أَحْسَبُهُ سَمِعَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ هَاتُوا

رُبْعَ الْعُشُوْرِ مِنْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا دِرْهَمٌ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ شَيْءٌ حَتّٰى تَتِمَّ مِائَتَيْ دِرْهَمٍ فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ فَمَا زَادَ فَعَلٰى حِسَابِ ذٰلِكَ۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، زہیر کہتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات نبی ﷺ سے سن کر بیان فرمائی: یعنی ہر چالیس درہم پر ایک درہم اور تم پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی یہاں تک کہ جب دو سو درہم پورے ہو جائیں، تو ان میں سے پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہے اور جو مقدار اس سے زائد ہو اُس پر اُسی حساب سے زکوٰۃ عائد ہوگی''۔ (سنن ابوداؤد: 1569)

(۲) عَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ فَاِذَا كَانَتْ لَكَ مِائَتَا دِرْهَمٍ وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ، وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ يَعْنِىْ فِى الذَّهَبِ حَتّٰى تَكُوْنَ لَكَ عِشْرُوْنَ دِيْنَارًا، فَاِذَا كَانَتْ لَكَ عِشْرُوْنَ دِيْنَارًا وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ. فَفِيْهَا نِصْفُ دِيْنَارٍ. فَمَا زَادَ فَبِحِسَابِ ذٰلِكَ۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر ایک سال گزر جائے تو ان پر پانچ درہم زکوٰۃ ہے اور سونے پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں ہے جب تک کہ وہ بیس دینار نہ ہو، پس جب سونا بیس دینار ہو جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے، تو اس پر نصف دینار زکوٰۃ ہے، پھر جب سونے کی مقدار بڑھتی چلی جائے تو اُسی حساب سے زکوٰۃ عائد ہوگی''۔ (سنن ابوداؤد: 1570)

اِن احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ شریعت نے 200 درہم چاندی یا 20 دینار سونے کو وجوبِ زکوٰۃ کے لیے کم از کم نصاب قرار دیا ہے، ناپ تول کے موجودہ اَعشاری نظام (Matric System) کے اعتبار سے نصابِ شرعی کی مقدار یہ ہے: 612.36 گرام (یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی) یا اس کی بازاری قیمت کے مساوی نقد رقم یا مالِ تجارت جو اس کی بنیادی حاجت سے زائد ہو یا 87.48 گرام (یعنی ساڑھے سات تولے سونا) یا اس کی موجودہ بازاری قیمت کے مساوی نقد رقم یا مالِ تجارت جو اس کی حاجت سے

زیادہ ہو۔ایک تولہ کا وزن 11.664 گرام ہوتا ہے۔آج کل چاندی اور سونے کے نصاب کی مالیت میں بہت زیادہ فرق ہے۔فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر اَموال متفرق ہوں (یعنی کچھ سونا، کچھ چاندی اور کچھ مال تجارت یا نقد رقم وغیرہ) یا صرف چاندی ہو،تو ان تمام صورتوں میں چاندی کے نصاب کا ہی اعتبار ہوگا تاکہ ناداروں کو فائدہ ہو۔

نصاب کی اس تعیین کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ مال کی کم از کم اتنی مقدار ہر گھرانے میں موجود رہے جس سے وہ بآسانی روزمرہ کی ضروریات زندگی حاصل کرسکیں اور ایسا نہ ہو کہ دوسروں کی مدد واعانت کرنے سے زکوٰۃ دہندہ خود محتاج ہوجائے،اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى

ترجمہ:''بہترین صدقہ وہ ہے جس کے (دینے کے) بعد بھی آدمی مال دار رہے''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1426)

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر اَموال متفرق ہوں (یعنی کچھ سونا، کچھ چاندی اور کچھ مال تجارت یا نقد رقم وغیرہ) یا صرف چاندی ہو،تو چاندی کے نصاب کا ہی اعتبار ہوگا اور ایسی صورت میں یہ متفرق اَموال مل کر 612.36 گرام چاندی کی مقدار یا اُس کی مساوی قیمت کو پہنچیں تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب زکوٰۃ کا کم از کم نصاب مُقرر فرمایا ہو،تو اُس وقت 200 درہم چاندی اور 20 دینار سونے کی قیمت قریب تر ہو،لیکن آج کل دونوں کی بازاری قیمت میں بہت فرق ہے۔مگر چوں کہ نصاب کی کم از کم مقدار مقرر کرنے کا مَدار عقل پر نہیں ہے بلکہ یہ اَمر ''تَعَبُّدِی'' ہے اور اس کا مَدار شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سماع پر ہے،یعنی یہ اَمر ''توقیفی'' ہے،اس لیے نَص (Text of Quran & Sunnah) کو قیاس کے ذریعے ترک نہیں کیا جاسکتا۔اس سال (2016ء) حکومت نے بنکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کے لیے نصاب 35,557 روپے مُقرر کیا ہے۔

صدقۂ فطر کی مقدار

سوال:

بادام، کشمش، کھجور، پستہ اور جو کا صدقۂ فطر دورِ حاضر کے مطابق روپے میں کتنی رقم بنتی ہے؟، (محمد اشرف، قصبہ کالونی کراچی)

جواب:

شریعتِ مُطہرہ نے بنیادی طور پر چار اجناس (گندم، جو، کھجور، کشمش) میں صدقۂ فطر کی ادائیگی کی مقدار مقرر فرمائی ہے، بعض روایات میں پنیر کا بھی ذکر آیا ہے۔ احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱)عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْھُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ زَکٰوۃَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعاً مِنْ شَعِیْرٍ، عَلَی الْعَبْدِ وَالْحُرِّ، وَالذَّکَرِ وَالْأُنْثٰی وَالصَّغِیْرِ وَالْکَبِیْرِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَأَمَرَبِھَا أَنْ تُؤَدّٰی قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ إِلَی الصَّلَاۃِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عیدالفطر کی زکوٰۃ (صدقۂ فطر) ایک صاع (تقریباً چار کلوگرام) کھجوریں یا ایک صاع (تقریباً چار کلوگرام) جَو (مسلمانوں میں سے) ہر غلام و آزاد، ہر مرد و عورت اور ہر چھوٹے، بڑے پر فرض کی ہے (اور آپ نے یہ حکم دیا کہ) لوگوں کے نمازِ عید کے لیے جانے سے پہلے اس کو ادا کر دیا جائے''۔

(صحیح بخاری:1503،سنن ابوداؤد:1607،سنن ترمذی:676)

(۲)عَنْ عِیَاضِ بْنِ عَبْدِ اللہِ بْنِ سَعْدِ بْنِ سَرْحٍ الْعَامِرِیِّ: أَنَّہُ سَمِعَ اَبَا سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیَّ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ یَقُوْلُ: کُنَّا نُخْرِجُ زَکَاۃَ الْفِطْرِ، صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِیْرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ أَقِطٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ زَبِیْبٍ۔

ترجمہ: '' عیاض بن عبداللہ بن سعد بن سرح العامری نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ہم صدقۂ فطر چار کلوگرام گندم دیتے تھے یا چار کلوگرام جو یا چار کلوگرام

پنیر یا چار کلو گرام کشمش دیتے تھے''۔ (صحیح بخاری:1506)

(۳) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ: أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِزَكَاةِ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ أَوْصَاعًا مِّنْ شَعِيْرٍ، قَالَ: عَبْدُ اللهِ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَجَعَلَ النَّاسُ عِدْلَهُ مُدَّيْنِ مِنْ حِنْطَةٍ۔

ترجمہ: ''نافع حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر چار کلو گرام کھجوریں یا اسی مقدار میں جو دینے کا حکم دیا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: پس لوگ (تقریباً) دو کلو گرام گندم کو اس کے برابر قرار دینے لگے''۔
(صحیح بخاری:1507)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَاِنَّمَا تَجِبُ صَدَقَةُ الْفِطْرِ مِنْ أَرْبَعَةِ اَشْيَاءَ مِنَ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَالتَّمْرِ وَالزَّبِيْبِ كَذَا فِيْ خِزَانَةِ الْمُفْتِيْنَ وَشَرْحِ الطَّحَاوِيِّ۔

ترجمہ: ''صدقۂ فطر چار اشیاء میں واجب ہے، جن میں گندم، جو، کھجور اور کشمش ہیں، جیسا کہ ''خزانۃ المفتین'' اور ''شرح الطحاوی'' میں ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:191)

فقہ حنفی کی رو سے صدقۂ فطر کی کم از کم مقدار نصف صاع گندم (یعنی دو کلو گرام) یا ایک صاع کھجور یا کشمش یا جو یا بعض روایات کے مطابق پنیر یا ان کی بازاری قیمت ہے۔ صدقۂ فطر اور فدیۂ صوم کی شرح ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ آیت: 184 میں جہاں ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو دو وقت کھانا فراہم کرنا بتایا ہے، وہیں فرمایا کہ ''اگر تم اس کم از کم مقدار سے زیادہ دیدو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے''، یہ ارشاد اس ربّ کائنات کا ہے، جس نے ہمیں نعمت جان اور نعمتِ مال سے نوازا ہے۔ لہٰذا اہلِ خیر سے گزارش ہے کہ کھجور یا جو یا کشمش یا پنیر کے نصاب کے مطابق فطرہ اور فدیہ ادا کریں۔ جن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے وافر دولت کی نعمت سے نوازا ہے، وہ اپنے ایک دن کے اعلیٰ معیار کے مطابق روزے کا فدیہ اور صدقۂ فطر ادا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اے ایمان والو! اپنی کمائی میں

سے عمدہ چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور (خبردار! اللہ کی راہ میں) ناکارہ (گھٹیا) چیزوں کو دینے کا ارادہ نہ کرو، حالانکہ اگر تمہیں ایسی ناکارہ چیز دی جائے تو تم چشم پوشی کیے بغیر کبھی بھی (خوش دلی سے) اسے قبول نہ کرو، (البقرہ: 267)"۔ خبیث کے ایک معنی یہ ہیں: معنوی اعتبار سے ناپاک چیز اللہ کے نام پر نہ دو، یعنی ایسی چیز جو فی نفسہ حرام ہو یا فی نفسہ تو حلال ہو مگر اسے حرام طریقے سے حاصل کیا گیا ہو یا وہ کوالٹی کے اعتبار سے ناکارہ اور ناقابلِ استعمال ہو۔ زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے مال پر سال گزرنا شرط ہے، جبکہ صدقۂ فطر کے وجوب کے لیے مال پر سال یا اس کا اکثر حصہ گزرنا شرط نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر عید الفطر کے دن صبح صادق کے وقت بھی اس کے پاس مال آگیا تو اس پر صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے واجب ہونے کے لیے سونا چاندی یا نقد رقم یا مال تجارت کا بقدر نصاب ہونا شرط ہے، جبکہ صدقۂ فطر کے واجب ہونے کے لیے اگر اس کے پاس حاجت اصلیہ سے زائد دیگر چیزیں بھی جو نصابِ زکوٰۃ کی مقدار کو پہنچتی ہیں، تو اس پر صدقۂ فطر واجب ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے واجب ہونے کے لیے مال کا نامی ہونا شرط ہے یعنی اس میں بڑھنے (Growing) کی استعداد موجود ہو، اس کے برعکس صدقۂ فطر کے لیے مال کا نامی (Growable) ہونا شرط نہیں ہے۔

روزے میں انجکشن لگانے کا حکم

سوال:

میں شوگر کا مریض ہوں، کیا میں روزے کے دوران انسولین لگوا سکتا ہوں؟، کمزوری کی صورت میں طاقت یا گلوکوز کا انجکشن لگوایا جا سکتا ہے؟۔ اس سے روزے پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟، (تنویر اقبال، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

روزے کے بارے میں اُصول یہ بیان کیا گیا ہے: وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَعِكْرِمَةُ: اَلْفِطْرُ مِمَّا دَخَلَ وَلَيْسَ مِمَّا خَرَجَ ترجمہ: "حضرت ابن عباس اور عکرمہ بیان کرتے ہیں

کہ روزہ کسی چیز کے داخل ہونے سے ٹوٹتا ہے، خارج ہونے سے نہیں ٹوٹتا''۔

(صحیح بخاری، باب الحجامۃ والقئ للصائم)

ہماری تحقیق کے مطابق کسی بھی قسم کا انجکشن لگانے سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے، بعض علماء کے نزدیک اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ جس مسئلے کے بارے میں قرآن وحدیث میں صریح حکم نہ ہو، وہ مسئلہ اجتہادی کہلاتا ہے، اس میں لوگوں کو جس عالم پر اعتماد ہو، اُس کے فتوے پر عمل کریں۔ اجتہادی مسائل میں فقہاء کا اختلاف ایسا ہی ہے، جس طرح ہمارے اعلیٰ عدالتی فیصلوں کا ماخذ آئین، قانون اور مُسلَّمہ عدالتی نظائر (Judicial Precedents) ہوتے ہیں، لیکن بعض اوقات اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے فیصلے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اجتہادی مسائل میں فقہاء کے اختلاف کی صورت بھی یہی ہے۔ شام کے مشہور فقیہ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

اَلْحُقْنُ فِی الْعَضَلِ أَوْتَحْتَ الْجِلْدِ أَوْفِی الْوَرِیْدِ، وَالأَوْلیٰ عِنْدَالإِمْکَانِ تَاْخِیْرُھَا اِلَی الْمَسَاءِ، أَمَاالْحُقْنُ الشَّرْجِیَّۃ فَتفطِرُ۔

ترجمہ: ''انجکشن پٹھوں میں جلد کے اندر (Inter Muscular) لگانا ہو یا رگوں میں (Inter Vein) لگانا ہو، بہتر یہ ہے کہ روزے کی حالت میں نہ لگائے اور افطار کے وقت تک انتظار کرے، اگر رگوں (Inter Vein) میں خون لگائے گا، تو روزہ فاسد ہوجائے گا''۔ (فقہ الاسلامی وادلتہ، جلد 3، ص: 1712)

روزے میں انجکشن لگوانے سے صرف روزہ کی قضا لازم ہوگی، کفارہ لازم نہیں ہوگا۔ انسولین کے بارے میں بھی ہمارا موقف یہی ہے۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس مسئلے پر ''تبیان القرآن'' جلد اول صفحہ: 707، ''شرح صحیح مسلم، جلد اول، صفحات: 338 تا 359 اور ''شرح صحیح مسلم'' جلد ثالث کے ضمیمے میں مُفصّل تحقیق بیان فرمائی ہے۔

قارِن پر جنایت کے سبب ایک یا دو دَم لازم آنے کا ضابطہ

سوال:

کیا قارِن یعنی جو شخص اپنے میقات سے بیک وقت حج اور عمرے کا احرام باندھتا ہے اور پھر وہ احرام کے اندر رہتے ہوئے کسی ایسی جنایت کا ارتکاب کرتا ہے، جس سے دم لازم آتا ہے، تو کیا اس پر دو احرام کی وجہ سے دو دم لازم آئیں گے یا ایک ہی دم کافی ہوگا؟، اسی طرح ان امور میں جہاں بدنہ یا صدقہ لازم آتا ہے، ایک ہی بدنہ یا صدقہ کافی ہوگا یا دو دو لازم آئیں گے؟۔ (پروفیسر رضی الدین، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: ''حج قِران کا احرام باندھنے والے نے اگر قربانی سے پہلے حلق کرلیا (یعنی بال منڈھا دیے)، تو اس پر مذہب صحیح کے مطابق دو دَم لازم آئیں گے، ایک دمِ قِران (یعنی شکرانے کی قربانی) اور ذبح کو حلق سے مؤخر کرنے کے باعث دوسرا دَم لازم آئے گا، جیسا کہ مصنف (علامہ تمرتاشی) نے لکھا ہے، انہوں نے فرمایا: اور اس سے بعض لوگوں کا یہ وہم دور ہوگیا کہ دونوں دَم جنایت کے باعث لازم ہیں (یعنی قارن پر ایک جنایت کے باعث دو دَم لازم ہیں، کیونکہ حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ ہے، ان کا یہ سمجھنا درست نہیں ہے)''۔ اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ترجمہ: ''قارن پر دو دَم تب لازم آتے ہیں، جب اس کے عمرے کے احرام میں کوئی ایسا نقص لازم آیا ہو (جو مُوجِبِ دَم ہو)، ورنہ (قارِن پر بھی) صرف ایک ہی دَم لازم آئے گا، لہٰذا جب قارِن امام سے پہلے میدانِ عرفات سے چلا گیا یا بے وضو یا حالتِ جنابت میں طواف زیارت کیا، تو اس پر صرف ایک دَم لازم آئے گا، کیونکہ عمرہ کا وقوف عرفہ اور طواف زیارت سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 521، باب الجنایات، مطبوعہ: دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اِس مسئلے میں یہ قید لگائی ہے کہ جب قارِن نے

دس ذوالحجہ کی صبح کے بعد ذبح سے پہلے حلق کیا ہو تو ایک دم ہوگا لیکن اگر دس ذوالحجہ کی صبح سے قبل قارن نے قربانی سے قبل حلق کرلیا تو اُس پر دو دم ہوں گے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''اگر قارن نے دس ذوالحجہ کی صبح کے بعد ذبح سے قبل حلق کیا تو اسے دو جنایت قرار دینے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں۔ ہاں! اگر اس نے دس ذوالحجہ کی صبح سے قبل یہ غلطی کی تو بلا شبہ یہ عمرہ اور حج دونوں کے احرام کی جنایت ہے لہٰذا اس پر دو دم ہوں گے اور اس وقت دو دم ہونے میں کسی کا اختلاف مُتصور نہیں ہے''۔ (ارشاد الساری الیٰ مناسک ملا علی قاری، ص:8-407)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: **مسئلہ:** ''جہاں ایک دم یا صدقہ ہے، قارن پر دو ہیں''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص:762)

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''جہاں ایک دم یا صدقہ ہے، قارن پر دو ہیں''۔ (بہارِ شریعت، حصہ ششم، ص:1162)۔ صدرالشریعہ کے موقف کی تائید صاحبِ ہدایہ (علامہ برہان الدین مرغینانی) کی اس عبارت سے ہوتی ہے: وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلَهُ الْقَارِنُ مِمَّا ذَكَرْنَا أَنَّ فِيهِ عَلَى الْمُفْرِدِ دَمًا، فَعَلَيْهِ دَمَانِ دَمٌ لِحَجَّتِهٖ، وَدَمٌ لِعُمْرَتِهٖ۔

ترجمہ: ''اور ہر وہ (مُوجبِ دم) جنایت جو قارن سے سرزد ہو، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، اس میں مُفرِد (صرف حج کرنے والے) پر ایک دم ہوگا اور قارن (ایک احرام کے ساتھ حج وعمرہ کرنے والے) پر دو دم عائد ہوں گے، ایک عبادتِ حج میں جنایت کا دم اور دوسرا عبادتِ عمرہ میں جنایت کا دم''۔ (ہدایہ، جلد:2، ص:319، مکتبۃ البشریٰ)

علامہ علاؤالدین حصکفی اور علامہ ابن عابدین شامی نے قارن پر دو دم ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے جو تفصیلی بحث کی ہے، اس کی روشنی میں یہ ضابطہ بنتا ہے کہ اگر قارن نے احرام کی کسی جنایت کا ارتکاب کیا، جیسے سلا ہوا لباس پہننا، خوشبو لگانا، ناخن یا بال کاٹنا، تو اُس پر دو دم لازم ہوں گے، کیونکہ اُس نے دو احرام کی نیت کر رکھی ہے اور یہ جنایت دونوں احرام کی مانی جائے گی، لہٰذا جزا بھی مُتعدد ہوں گی اور اگر قارن نے حج یا عمرہ کے کسی واجب کو ترک کیا، جیسے اُس نے حج کی سعی یا رمی چھوڑ دی یا میدانِ عرفات سے مغرب سے

قبل چلا گیا یا حج یا عمرے کا طواف اُس نے حالتِ جُنب یا حالتِ اِحداث میں کیا، تو اُس پر ایک ہی کفارہ ہوگا، کیونکہ یہ افعال محض احرام کی جنایات نہیں ہیں بلکہ یہ تو حج یا عمرے کے واجبات میں سے کسی واجب کو ترک کرنا ہے، لہٰذا ایک جرم کی صرف ایک ہی جزا ہوتی ہے''۔ (ملخصاً از الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، ص: 546)

علامہ ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: اگر طوافِ زیارۃ یا عمرے کا طواف حالت جنابت یا بے وضو حالت میں کیا، تو اُس پر ایک جزا ہے، اس میں قارِن اور مُفرِد بالحج کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ طواف زیارۃ کی جنایت حج کے ساتھ خاص ہے، خواہ مُفرِد ہو یا قارِن اور اپنے احرام سے حلق کر کے نکل گیا ہو یا نہ نکلا ہو۔ اور طوافِ عمرہ کی جنایت صرف عمرہ کرنے والے کے لیے خاص ہے جیسا کہ اس پر کلمہ ''اَوْ'' دلالت کرتا ہے، جو کسی چیز یا کسی مسئلے کی دو قسموں (اور ان کے احکام) کو بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب قارِن نے عمرے کا طواف حالتِ جنابت میں یا بے وضو کیا اور طوافِ زیارۃ بھی ایسے ہی حال میں کیا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ دو جزا لازم ہوں گی اور ماتن کے اس قول کے یہی معنی ہیں: ''اگر عمرے اور حج کا طواف حالتِ جنابت و احداث میں کرے گا، تو اس پر دو جزا ہوں گی، خواہ عمرہ اور حج الگ احرام کے ساتھ کرے یا قران کرے''۔

(ارشاد الساری الی مناسک الملا علی القاری: 407)

صاحب ہدایہ (علامہ برہان الدین علی بن ابوبکر مرغینانی)، امام احمد رضا قادری اور صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہم اللہ تعالیٰ کی عبارات سے اگرچہ بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ قارِن پر علی الاطلاق دو دَم یا دو صدقے لازم آئیں گے، خواہ جنایت کے ارتکاب کا تعلق احرام سے ہو یا حج یا عمرے کے کسی واجب کے ترک سے ہو، لیکن علامہ ابن عابدین شامی اور علامہ ملا علی القاری رحمہا اللہ تعالیٰ کی مذکورہ وضاحت کی روشنی میں ان اکابر کے اقوال کو مُطلق نہ سمجھا جائے بلکہ اس پر محمول کیا جائے کہ اگر قارِن نے کسی ایسی جنایت کا ارتکاب کیا ہو، جس کا تعلق احرام کے ساتھ ہو، تو اس پر دو جزائیں (دَم یا صدقہ جو بھی صورت ہو) لازم

آئیں گی اور اگر عمرے یا حج کے کسی واجب کو ترک کیا ہو تو قارِن پر صرف ایک ہی دَم ہوگا۔ یہ مسئلہ جو جنایات کے حوالے سے بیان ہوا، دَمِ قِران (یعنی عمرے اور حج کی عبادت کے جمع ہونے پر شکرانے کی قربانی) اس سے الگ ہے، جو بہر حال قارِن پر واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

عمرے کا طریقہ

سوال:

عمرے کا طریقہ کیا ہے اور رمضان میں عمرہ کرنے کی فضیلت بیان فرمائیں؟

(عبدالمجید چانڈیو، ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی)

جواب:

عمرہ احرام باندھنے کے بعد چند افعال کا نام ہے، جس کا مفصل طریقہ درج ذیل ہے:

میقات سے پہلے احرام باندھے، جب احرام باندھنے کا ارادہ ہو تو پہلے غسل کرے (اگر کوئی مجبوری ہو تو وضو بھی کافی ہے)، حجامت کرائے، ناخن تراشے، بدن کی اچھی طرح صفائی کر کے احرام باندھ لے، احرام کی دو چادریں (نئی یا دھلی ہوئی سفید بہتر ہیں)، ایک اوڑھیں اور ایک تہبند کے طور پر باندھیں، سنت طریقہ یہ ہے کہ طواف کے وقت چادر داہنی بغل کے نیچے کر کے دونوں پلو بائیں مونڈھے پر ڈالیں اور طواف کے علاوہ باقی وقتوں میں عادت کے مطابق چادر اوڑھی جائے یعنی دونوں مونڈھے اور پیٹ، سینہ سب چھپا رہے۔

وقتِ مکروہ نہ ہو تو دو رکعت نماز بہ نیتِ احرام پڑھیں، پھر نیت کریں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اُرِیۡدُ الۡعُمۡرَۃَ فَیَسِّرۡھَا لِیۡ وَتَقَبَّلۡھَا مِنِّیۡ، نَوَیۡتُ الۡعُمۡرَۃَ وَاَحۡرَمۡتُ بِھَا مُخۡلِصًا لِلّٰہِ تَعَالٰی۔

ترجمہ: ''اے اللہ! میں عمرہ کرنے کا ارادہ کرتا ہوں میرے لیے اسے آسان فرما اور مجھ سے اسے قبول فرما اور میں خالص اللہ کے لیے احرام باندھتا ہوں۔ پھر تلبیہ

(لَبَّیۡکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیۡکَ لَبَّیۡکَ لَاشَرِیۡکَ لَکَ لَبَّیۡکَ اِنَّ الۡحَمۡدَ وَالنِّعۡمَۃَ لَکَ وَالۡمُلۡکَ

لَاشَرِیْكَ لَكَ)

پڑھے اور کثرت سے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے پڑھتا رہے، یاد رہے کہ خانۂ کعبہ پر جب پہلی نظر پڑے تو دعا مانگے، اس وقت جو بھی دعا کرے گا، ضرور قبول ہوگی۔ حجر اسود کے سامنے پہنچے تو یہ دعا پڑھے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

طواف شروع کرنے سے قبل مرد اضطباع کرلے یعنی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر کہ دائیں مونڈھا کھلا رہے اور دونوں کنارے بائیں مونڈھے پر ڈال دے۔ حرم شریف پہنچنے کے بعد کعبہ کی طرف منہ کرکے حجرِ اسود کے داہنی طرف رکن یمانی کی جانب سنگِ اسود کے قریب اس طرح کھڑا ہو کہ حجرِ اسود داہنے ہاتھ کی طرف رہے، پھر طواف کی نیت کرے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ طَوَافَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ فَیَسِّرْهُ لِیْ وَتَقَبَّلْهُ مِنِّیْ۔

اس نیت کے بعد کعبہ کی طرف منہ کیے ہوئے اپنی دہنی جانب چلے، کانوں تک ہاتھ اٹھا کر (کہ ہتھیلیاں حجرِ اسود کی طرف رہیں) پڑھے:

بِسْمِ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ۔

ممکن ہو تو دونوں ہتھیلیاں اور ان کے بیچ میں منہ رکھ کر حجرِ اسود کو بوسہ دے یا ہاتھ سے چھو کر یا اشارے سے یا لکڑی سے چھو کر بوسہ دو، اسے ''اِستلام'' کہتے ہیں۔ طواف کے پہلے تین پھیروں میں مرد رَمَل کرتا ہوا چلے یعنی چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے شانے ہلاتے ہوئے چلے لیکن اس عمل میں کسی کو ایذا نہ دے، باقی چار پھیروں میں آہستہ بغیر شانے ہلائے معمول کی رفتار سے چلے۔ جب سات پھیرے مکمل ہو جائیں تو آخر میں حجرِ اسود کو بوسہ دے ہر ایک پھیرے کی طرح۔ ساتوں پھیروں میں جو مسنون دعائیں ہیں انہیں کسی معتبر کتاب سے یاد کرلے۔ مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھے، حدیث مبارک میں ہے

کہ: جو مقامِ ابراہیم پر دو رکعت پڑھے اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ پھر ملتزم پر آکر دعا کرے، پھر زمزم پی کر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے، سعی عمرے کے واجبات میں سے ہے۔ کوہِ صفا سے سعی کا آغاز کیا جائے گا، اگر مروہ سے شروع کی تو یہ شمار نہیں ہوگی۔ سعی کے ساتوں پھیرے پے در پے کرے ''میلین اخضرین'' کے دوران ہلکی رفتار سے دوڑے (نوٹ: آج کل ان کی نشاندہی کے لیے مَسعیٰ میں ہری روشنی والی دو لائٹیں لگی ہوئی ہیں)، سعی کے بعد حلق یا قصر کرے، اگر بال اتنے چھوٹے ہوں کہ ایک پور کے برابر نہ کترواسکے تو حلق ہی کرنا ہوگا۔ حلق کے معنی سر منڈانا ہے اور قصر سے مراد کم از کم انگلی کی ایک پور کے برابر بال کتروانا ہے۔ حلق یا قصر کے بعد احرام کھول دے، عام لباس پہنے، اس طرح عمرہ مکمل ہوگیا۔ متبرک مقامات کی زیارت مستحب ہے۔

عورتیں احرام میں سلے ہوئے کپڑے ہی پہنے رہیں، صرف چہرہ کھلا رہے، تلبیہ بلند آواز سے نہ پڑھیں بلکہ آہستہ آہستہ پڑھیں رمل نہ کریں۔ سعی کے وقت ''میلین اخضرین'' کے درمیان عام رفتار سے چلیں۔ سعی کے بعد اپنے بالوں کے آخری سرے سے صرف ایک پور انگلی کے برابر بال کتریں، ان کے لیے حلق جائز نہیں۔

مخصوص ایام میں اِحرام باندھنے کا شرعی حکم

سوال:

میں عمرے پر جارہی ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ماہانہ ایام شروع ہو گئے ہیں، ایسے میں کیا میں اِحرام باندھ کر جاؤں یا جدہ میں کچھ دن رک کر طہارت کے بعد اِحرام باندھوں۔ میں نے ڈاکٹر سے بھی رجوع کیا تھا، اُنہوں نے کچھ دوائیں دی ہیں جس سے ممکنہ طور پر اتوار تک ماہواری بند ہوجائے گی، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو کیا میں اِحرام باندھ کر روانہ ہوجاؤں؟ (معرفت منور احمد، ملیر، کراچی)

جواب: فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق حیض ونفاس احرام سے مانع نہیں ہیں۔ حیض یا نفاس والی عورت اِحرام باندھ سکتی ہے، اُسے چاہیے کہ حیض یا نفاس ہی کی حالت

میں غسل کر کے احرام باندھ لے اور حج یا عمرے کے لیے روانہ ہوجائے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَاِذَا اَرَادَ الْاِحْرَامَ اغْتَسَلَ اَوْ تَوَضَّاَ وَالْغُسْلُ اَفْضَلُ اِلَّا اَنَّ هٰذَا الْغُسْلَ لِلتَّنْظِيْفِ حَتّٰى تُؤْمَرَبِهِ الْحَائِضُ كَذَا فِى الْهِدَايَةِ وَيُسْتَحَبُّ فِىْ حَقِّ النُّفَسَآءِ وَالصَّبِىِّ الخ۔

ترجمہ:''(عازم حج وعمرہ) جب احرام کا ارادہ کرے تو غسل کرے یا وضو کرے اور غسل کرنا افضل ہے، مگر یہ غسل (نجاست صغریٰ یا کبریٰ سے طہارت کے لیے نہیں بلکہ) صفائی کیلیے ہے، یہاں تک حائض عورت کو بھی اس کا حکم دیا جائے گا،''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے اور نفاس والی عورت اور بچے کے لیے بھی غسل مستحب ہے''۔(فتاویٰ عالمگیری، جلد:1،ص:222)

ائمۂ اربعہ کے نزدیک عورت کا احرام کے لیے غسل کرنا مستحب ہے۔ آپ غسل کر کے احرام باندھ لیں اور عمرہ کی نیت کر کے تلبیہ پڑھ لیں، اس طرح آپ ''مُحرِمہ'' ہوجائیں گی۔ آپ احرام کے لیے نفل نہیں پڑھیں گی۔ آپ حرم شریف پہنچ کر ہوٹل پر قیام کریں یا جدہ میں کوئی آپ کا محرم ہے، تو اس کے ہاں بھی قیام کرسکتی ہیں، ایامِ حیض ختم ہونے پر غسل طہارت کریں اور پھر جا کر اپنا عمرہ ادا کریں۔ آپ جدہ جا کر بھی ایامِ حیض ختم ہونے پر پاک ہوکر احرام باندھ سکتی ہیں، لیکن اگر آپ یہاں سے احرام باندھ کر جائیں گی تو آپ کا یہ سارا سفر عمرے کی عبادت میں شمار ہوگا اور اس پر آپ کو اجر ملے گا۔

عمرہ کے بعد حج کی فرضیت کا حکم

سوال:

ہم نے سنا ہے کہ عمرہ کرنے کے بعد حج فرض ہوجاتا ہے اور اُس وقت تک اُس سرزمین کو نہیں چھوڑ سکتے جب تک کہ حج ادا نہ کرلیں (یہاں پہلا حج مراد ہے) بخاری شریف میں بھی روایت موجود ہے، حج کی اقسام کی صورت میں۔ شرعی رہنمائی فرمائیں۔(مسز عدنان)

جواب:

یہ گمان یا مفروضہ بالکل غلط ہے کہ عمرہ ادا کرنے سے اسی سال حج ادا کرنا لازم ہوجاتا

ہے، حج کی فرضیت کی شرط ''استطاعت'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ: ''اور بیت اللہ کا حج کرنا ان لوگوں پر اللہ کا حق ہے جو اس کے راستہ کی استطاعت رکھتے ہوں اور جس نے (اس فریضہ ربانی کا قولاً یا عملاً) انکار کیا تو بلاشبہ اللہ سب جہانوں سے بے نیاز ہے، (آل عمران:97)''۔ اس آیت سے واضح ہوگیا کہ استطاعت کے بغیر حج فرض نہیں ہوتا۔

استطاعت کی تفسیر میں مولانا امجد علی لکھتے ہیں:

''سفر خرچ اور سواری پر قادر ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ یہ چیزیں اس کی حاجت سے فاضل ہوں، یعنی مکان، لباس، خادم اور سواری کا جانور اور پیشہ کے اوزار اور خانہ داری کے سامان۔ اور قرض سے اتنا زائد ہو کہ سواری پر مکہ معظمہ جائے اور وہاں سے سواری پر واپس آئے۔ اور جانے سے واپسی تک کے ایام کا نفقہ اور مکان کی مرمت کے لیے کافی مال چھوڑ جائے اور جانے آنے میں اپنے نفقے اور گھر اہل وعیال کے نفقے میں قدر متوسط کا اعتبار ہے، نہ کمی نہ اسراف۔ عیال سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا نفقہ اس پر واجب ہے''۔

(بہار شریعت (بحوالہ: درمختار، عالمگیری)، جلد:6، ص:11,12، شیخ علی اینڈ سنز، کراچی)

حدیث پاک میں ہے: مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ وَلَمْ يَحُجَّ، فَلَا عَلَيْهِ اَنْ يَمُوْتَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا۔

ترجمہ: ''جو شخص بیت اللہ تک پہنچنے کیلیے زادِ راہ (یعنی مصارف سفر) اور سواری کا مالک ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے، (سُنن ترمذی:812)''۔ اس موضوع پر تفصیلی فتویٰ روزنامہ جنگ 11 ستمبر 2015ء کی اشاعت میں چھپ چکا ہے۔

نکاح کے مسائل

ارتداد سے لازم شدہ مہر ساقط نہیں ہوتا

سوال:

میں اور میری اہلیہ نے عیسائی مذہب سے اسلام قبول کیا اور کورٹ میرج کی۔ کچھ عرصے بعد میری اہلیہ نے دوبارہ عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے، کیا میں اُسے حق مہر کی رقم ادا کروں یا ساقط ہوگئی، (صفوان احمد، کراچی)۔

جواب:

مہر کی ادائیگی خلوتِ صحیحہ یا فریقین میں سے کسی کے فوت ہوجانے کی صورت میں لازم ہوجاتی ہے یعنی مہر محض نکاح سے واجب ہوجاتا ہے۔ اگر خلوتِ صحیحہ سے پہلے عورت مرتدہ ہوجائے تو مہر ساقط ہوجائے گا لیکن اگر خلوتِ صحیحہ ہوچکی ہے، تو عورت کے ارتداد کے باوجود پورا مہر ادا کرنا ہوگا۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

أنّ الْمَهرَ وَجَبَ بِنَفسِ الْعَقْدِ ،لٰکِن مَعَ اِحْتِمَالِ سُقُوطِهٖ بِرِدَّتِهَا أَوتَقبِيلِهَا اِبنَهٗ أَوْ تَنَصُّفِهٖ بِطَلَاقِهَا قَبلَ الدُّخُولِ، وَاِنَّمَا يَتَأَكَّدُ لُزُوْمُ تَمَامِهٖ بِالْوَطْئِ وَنَحْوِهٖ۔

ترجمہ: ''مہر محض نکاح سے واجب ہوجاتا ہے، لیکن مرتدہ ہوجانے یا شوہر کے بیٹے کو بوس وکنار کرنے سے ساقط ہوجانے کا احتمال باقی رہتا ہے یا دخول سے قبل طلاق ہوجانے کی بنا پر نصف مہر کا احتمال ہوسکتا ہے، اور مباشرت سے پورا مہر لازم ہوجاتا ہے، اسی پر فتویٰ ہے، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 8، ص: 350، دمشق)''۔

مزید لکھتے ہیں: (وارتداد احدھما) ای الزوجین (فسخ)۔۔۔(فللموطوٴة) ولوحکما کل مھرھا لتاکدہ بہ (ولغیرھا نصفہ)

ترجمہ: ''میاں بیوی میں سے کوئی ایک مرتد ہوگیا تو نکاح فوراً ٹوٹ گیا اور یہ فسخ ہے، پس موطوٴنہ کے لیے اگرچہ حکمی ہو، پورا مہر ہے اُس کے نکاح سے مؤکد ہونے کی وجہ سے اور اگر غیر موطوٴنہ ہے تو اس کے لیے نصف ہے''۔ (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 8، ص:

645،دمشق)

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں:

''انها اذا ارتدت والعياذ بالله أو مكنت ابن زوجها فان كان ذلك بعد الدخول كان لها المهر لتأكده بالدخول وان كان قبله فلا مهر لها''۔

ترجمہ:''یعنی اگر کوئی عورت معاذ اللہ مرتد ہوگئی یا اپنے شوہر کے بیٹے کے ساتھ بدکاری کی، پس اگر یہ دخول کے بعد ہے تو اُس کے لیے پورا مہر ہے، کیونکہ دخول سے مہر مؤکد ہوگیا ہے اور اگر یہ ارتداد یا شوہر کی بیٹے سے بدکاری دخول سے پہلے ہے تو اس کے لیے کوئی مہر نہیں ہے''۔(فتح القدیر، ج:3،ص:398)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال کیا گیا اگر بیوی کو فاسقہ ہوجانے کی وجہ سے مرد نے طلاق دے دی ہو تو کیا اس کا مہر ساقط ہوجائے گا یا نہیں؟، آپ نے جواباً مہر کے وجوب کی صورتوں کو بیان کرنے کے بعد لکھا:''ہاں! اگر مہر کو پکا کرنے والی مذکورہ تین چیزوں سے قبل عورت معاذ اللہ مرتد ہوجائے یا خاوند کے باپ یا بیٹے سے یعنی اس کے اصول وفروع میں سے کسی کے ساتھ زنا کیا یا ان میں سے کسی کا شہوت سے بوسہ لیا یا دیا یا اُن کی شرمگاہ کو چھولیا یا ان کی شرمگاہ کو شہوت کے ساتھ دیکھا، یا اپنی شیر خوار سوتن کو دودھ پلایا یا زوجین میں سے کسی کو خیارِ بلوغ تھا تو اس اختیار سے نکاح فسخ کردیا یا نکاح فاسد تھا تو حقیقی وطی سے قبل متارکہ ہوگیا، تو ان تمام صورتوں میں پورا مہر ساقط ہوجائے گا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد12،ص:127)

سو اگر آپ میاں بیوی، بیوی کے مرتد ہونے سے پہلے حالتِ اسلام میں کچھ عرصہ ازدواجی زندگی گزار چکے ہیں، یعنی خلوتِ صحیحہ متحقق ہوچکی ہے تو اس صورت میں آپ کو مہر پورا ادا کرنا لازم ہوچکا ہے اور ارتداد کی بنا پر فوری تفریق کے ساتھ مہر کی ادائیگی بھی لازم ہے یعنی آپ مہر پورا کا پورا ادا کریں گے۔

دو بہنوں سے نکاح

میری بیٹی کوثر کا نکاح سکندر لاشاری کے ہمراہ 2010ء میں ہوا۔ جولائی 2015ء میں وہ میری چھوٹی بیٹی یاسمین کو دھوکے سے بھگا کر لے گیا اور نکاح کرلیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا دو بہنیں بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں رہ سکتی ہیں؟۔

(شہناز پروین، نارتھ ناظم آباد کراچی)

جواب:

کسی شخص کے نکاح میں بیک وقت دو بہنیں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ

ترجمہ: ''اور (جن عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ) تم دو بہنوں کو (بیک وقت نکاح میں) جمع کرو''۔ (نساء:23)

جس بہن سے بعد میں نکاح کیا، وہ نکاح فاسد ہے، پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد بھی مرد اُس وقت تک اپنی پہلی مطلقہ بیوی کی بہن سے نکاح نہیں کرسکتا، جب تک کہ وہ عورت عدت میں ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

فَاِنْ تَزَوَّجَ الْاُخْتَيْنِ فِیْ عُقْدَةٍ وَاحِدَةٍ يُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا وَبَيْنَهُ، فَاِنْ كَانَ قَبْلَ الدُّخُوْلِ فَلَا شَيْئَ لَهُمَا، وَاِنْ كَانَ بَعْدَ الدُّخُوْلِ يَجِبُ لِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا الْاَقَلُّ مِنْ مَهْرِ مِثْلِهَا اَوْمِنَ الْمُسَمّٰى، كَذَا فِی ''الْمُضْمَرَاتِ''۔ وَاِنْ تَزَوَّجَهُمَا فِیْ عُقْدَتَيْنِ، فَنِكَاحُ الْاَخِيْرَةِ فَاسِدٌ وَيَجِبُ عَلَيْهِ اَنْ يُّفَارِقَهَا، وَلَوْعَلِمَ الْقَاضِیْ بِذٰلِكَ يُفَرِّقُ بَيْنَهُمَا، فَاِنْ فَارَقَهَا قَبْلَ الدُّخُوْلِ لَايَثْبُتُ شَيْئٌ مِنَ الْاَحْكَامِ وَاِنْ فَارَقَهَا بَعْدَ الدُّخُوْلِ فَلَهَا الْمَهْرُ وَيَجِبُ الْاَقَلُّ مِنَ الْمُسَمّٰى وَمِنْ مَهْرِ الْمِثْلِ وَعَلَيْهَا الْعِدَّةُ وَيَثْبُتُ النَّسَبُ وَيَعْتَزِلُ عَنِ امْرَأَتِهٖ حَتّٰى تَنْقَضِیَ عِدَّةُ اُخْتِهَا كَذَا فِیْ ''مُحِيْطِ السَّرَخْسِی''۔

ترجمہ: ''اگر دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کیا (تو کسی سے بھی نکاح نہیں ہوا) فوراً اس شخص اور ان کے درمیان علیحدگی کردی جائے گی، اگر ازدواجی تعلق قائم ہونے سے پہلے ہی

علیحدگی کی گئی تو کوئی مہر واجب نہ ہوا اور اگر مباشرت کے بعد علیحدگی ہوئی، تو ان میں سے ہر ایک کو (اگر دونوں سے دخول ہوا ہو تو) ''مہرِ مثل'' اور ''مقرّر مہر'' میں سے جو کم ہو، وہ دیا جائے گا، ''مضمرات'' میں اسی طرح ہے۔ اور اگر دونوں بہنوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کیا ہو، تو جس سے بعد میں نکاح کیا، وہ فاسد ہوگا اور شوہر پر واجب ہے کہ اس سے فوراً علیحدگی اختیار کرلے، اگر قاضی کو اس کا علم ہوجائے تو وہ تفریق کرادے، پس اگر (قاضی نے) مباشرت سے پہلے تفریق کرائی تو اس کے لیے کوئی حکم ثابت نہیں ہے، اور اگر مباشرت کے بعد تفریق ہوئی، تو وہ مہر مثل یا مقرر مہر میں سے جو بھی کم ہو، اس کی حق دار ہوگی اور اس پر عدت لازم ہوگی، (بچہ پیدا ہو تو) ثابت النسب ہوگا، اور اپنی بیوی سے دور رہے گا جب تک اس کی بہن کی عدت پوری نہ ہوجائے، ''محیط سرخسی'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 277، 278، مطبوعہ: مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

نابالغہ کا نکاح

سوال:

ایک شخص نے اپنی بیٹی کا نکاح ڈھائی سال یا تین سال کی عمر میں گواہان اور برادری کی موجودگی میں کردیا تھا، اب جب کہ وہ لڑکی بالغہ ہوگئی ہے اور وہ اس شخص کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی، کیونکہ اس لڑکے کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے، اس لڑکی نے اس رشتہ کو ناپسند کیا اور لڑکے سے طلاق کا مطالبہ کیا، لیکن لڑکے نے طلاق دینے سے انکار کردیا، جس کے بعد لڑکی کے والد نے عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت نے اس لڑکی کے حق میں فیصلہ دے دیا، اب اس لڑکی نے دوسری جگہ اپنی پسند سے نکاح کرلیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اس لڑکی کو اور اس کے شوہر کو اور نکاح خواں کو برادری کے سب لوگ لعن طعن کرتے ہیں کہ لڑکی کا نکاح ٹھیک نہیں ہے کیونکہ پہلے والے شوہر نے طلاق نہیں دی ہے، نکاح خواں نے عدالتی فیصلہ کی وجہ سے لڑکی کا نکاح دوسری جگہ پڑھا دیا۔ اب اس نکاح کے بارے میں کیا حکم ہے؟ نیز بتایئے کہ اگر کسی لڑکی کو اس کا شوہر طلاق نہ دے اور اس کو لٹکا کے رکھے تو وہ

عدالت سے اگر تنسیخ کرالے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(قاری محمد افضل ہاشمی، احسان پور پنجاب)

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق نابالغہ لڑکی کا نکاح اگر اُس کے باپ نے یا اس کے دادا نے کیا ہو، تو وہ صحیح طور پر منعقد ہو جاتا ہے اور بلوغت کے بعد لڑکی کو خیارِ بلوغ نہیں رہتا۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

فَاِنْ زَوَّجَهُمَا الْاَبُ وَالْجَدُّ فَلَا خِيَارَ لَهُمَا بَعْدَ بُلُوْغِهِمَا وَاِنْ زَوَّجَهُمَا غَيْرُ الْاَبِ وَالْجَدِّ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا الْخِيَارُ اِذَا بَلَغَ، اِنْ شَآءَ اَقَامَ عَلَى النِّكَاحِ وَاِنْ شَآءَ فَسَخَ وَهٰذَا عِنْدَ اَبِىْ حَنِيْفَةَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى وَيُشْتَرَطُ فِيْهِ الْقَضَاءُ۔

ترجمہ: ''اگر نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح ان کے باپ اور (باپ کی عدم موجودگی میں) دادا نے کیا ہو، تو ان دونوں کو بالغ ہونے کے بعد (فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہے) اور اگر ان دونوں کا نکاح باپ اور دادا کے علاوہ کسی اور ولی نے کیا ہو، تو بالغ ہونے پر ان دونوں کو اختیار حاصل رہے گا کہ اگر چاہیں تو نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں، اور یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے اور اس میں قضا شرط ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد:1 ص:285)''۔ نباہ نہ ہونے کی صورت میں زوجین کو باہمی رضامندی سے خلع کی تدبیر اختیار کرنی چاہیے اور خاندان کے بزرگوں اور علاقے کے بااثر لوگوں کو اس کے لیے مثبت کردار ادا کرنا چاہیے۔

فقہ حنفی کی رُو سے باپ کی وفات کی صورت میں دادا نے ولی کی حیثیت سے نابالغہ بیٹی یا پوتی کا نکاح کر دیا ہو تو بالغ ہونے پر اس کے پاس خیارِ بلوغ نہیں رہتا اور اگر کسی نابالغہ کا باپ یا باپ کی وفات کی صورت میں دادا نے نہ کیا بلکہ کسی اور ولی نے کیا ہو تو بالغ ہونے پر لڑکی کو خیارِ بلوغ کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ البتہ فقہ حنفی کی رُو سے بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر منعقد نہیں ہوتا، وہ اپنے نکاح کی اپنے ولی کی نسبت زیادہ حق دار ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لَا يَجُوْزُ نِكَاحُ أَحَدٍ عَلٰى بَالِغَةٍ صَحِيْحَةِ الْعَقْلِ مِنْ أَبٍ أَوْ سُلْطَانٍ بِغَيْرِ إِذْنِهَا بِكْرًا كَانَتْ أَوْ ثَيِّبًا فَإِنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَالنِّكَاحُ مَوْقُوْفٌ عَلٰى إِجَازَتِهَا فَإِنْ أَجَازَتْهُ جَازَ وَإِنْ رَدَّتْهُ بَطَلَ كَذَا فِي السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ۔

ترجمہ: ''کسی بھی عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، خواہ وہ نکاح اس کے والد یا حاکمِ وقت نے منعقد کیا ہو، اگر کسی نے (اس کی اجازت کے بغیر) یہ نکاح کر بھی دیا ہو، تو یہ نکاح اُس (لڑکی) کی اجازت پر موقوف ہے، اگر اطلاع ملنے پر وہ اسے قبول کرلے (اور قائم رکھے) تو جائز ہے اور اگر وہ رَد کردے تو نکاح باطل ہوجائے گا، ''السراج الوہاج'' میں بھی اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 287)

یہ ہم نے شرعی حکم بیان کیا ہے، قانونی معاملات کے لیے ماہرین قانون سے رجوع کریں۔ ویسے اس دور میں باپ دادا کو اپنی نابالغہ بیٹی یا پوتی کا نکاح کرنے سے احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے بعد میں لاینحل معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ہمارے میڈیا میں رونق افروز لبرل اور سیکولر عناصر ہماری معاشرتی کمزوریوں اور خرابیوں کا سارا ملبہ مذہب پر ڈالنے اور اپنی بڑھاس نکالنے کے لیے تلے رہتے ہیں۔

محرمات کے بارے میں شرعی حکم

سوال:

بہو کے لیے سسر کس حد تک محرم ہے، اسی طرح داماد کے لیے ساس؟ ان کے ساتھ کس طرح کے معاملات رکھنے چاہییں یا رکھے جاسکتے ہیں؟۔

جواب:

محرمات یعنی وہ عورتیں جن سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے، نکاح حرام ہونے کے چند اسباب ہیں، اُن اسباب کو نو اقسام پر منقسم کیا جاتا ہے۔ ان نو اقسام میں دوسرا سبب حُرمتِ مصاہرت ہے۔ ساس اور بہو اسی دوسری قسم میں داخل ہیں۔ یہ حُرمت ابدی ہے

یعنی بیوی کے نکاح میں رہتے ہوئے یا طلاق کی صورت یا انتقال ہوجانے کے بعد بھی ساس سے نکاح نہیں ہوسکتا، اسی طرح حقیقی بیٹے کی بیوی سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے: وَحَرُمَ بِالْمُصَاهَرَةِ۔۔۔۔ اُمُّ زَوْجَتِہٖ۔ ترجمہ: ''زوجہ کی ماں حُرمت مصاہرت کے سبب حرام ہے''۔ (جلد 8،ص:102،مکتبہ دارالثقافۃ والتراث،دمشق)

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر لکھتے ہیں:

وَلَا بِأُمِّ اِمْرَأَتِہِ الَّتِیْ دَخَلَ بِهَا أَوْلَمْ يَدْخُلْ،لِقَولِہٖ تَعَالٰی:''وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُم''،مِنْ غَيْرِ قَيدِالدُّخُول،۔۔۔۔وَلَا بِاَمْرَاۃِ اِبْنِہٖ وبَنِیْ اَولَادِہٖ،لِقَولِہٖ تَعَالٰی:''وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُم''

ترجمہ:''زوجہ کی ماں سے نکاح جائز نہیں، خواہ وہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:''اور تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری بیویوں کی مائیں''، بغیر قید دخول کے۔ اور بیٹے کی بیوی اور بیٹے کی اولاد کی بیویوں سے بھی نکاح جائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:''اور (تم پر حرام کیا گیا ہے) تمہارے نسلی بیٹوں کی بیویاں''۔ (ہدایہ،جلد 3،ص:9-8)''۔

ستر وحجاب کا فرق

سوال:

محرم مردوں کے سامنے عورت کو کس حد تک ستر یا حجاب کھولنے کی اجازت ہے؟۔ عورت کا پورا بدن ستر ہے تو اس کے سر اور بدن سے اترنے والے بالوں کے لیے کیا حکم ہے؟۔ ایک ہی چھت تلے رہنے والے نامحرموں جیسے چچازاد، تایازاد، دیور، جیٹھ وغیرہ سے پردے کے حوالے سے کیا احتیاط کرنی چاہئیں اور ان سے کس طرح کے معاملات رکھنے چاہییں؟۔ بہنوئی، پھوپھا، خالو سے پردے کے کیا احکامات ہیں؟۔ (سیدہ آمنہ، کراچی)

جواب:

عورت کے ستر اور حجاب کے احکام الگ الگ ہیں۔ قرآن مجید کی سورۃ النور میں عورتوں کے ستر کا بیان ہے اور سورۃ الاحزاب میں حجاب کا حکم بیان فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ

کا فرمان ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ

ترجمہ: ''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہیے کہ وہ (گھر سے نکلتے وقت) اپنی چادروں کا کچھ حصہ (اپنے منہ پر) لٹکالیا کریں''۔

(الاحزاب:59)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں: ''جلباب وہ چادر ہے جس کو عورت کمبل کی طرح اوپر سے اوڑھ لیتی ہے، ابوعبید نے کہا ہے کہ ازہری نے یہ بیان کیا ہے کہ ابن الاعرابی نے جو یہ کہا ہے کہ جلباب ازار (تہبند) ہے، اس سے مراد وہ چادر نہیں ہے جو کمر پر باندھی جاتی ہے بلکہ اس سے مراد وہ چادر ہے جس سے تمام جسم کو ڈھانپ لیا جاتا ہے''۔

(لسان العرب، جلد 1، ص:273)

علامہ غلام رسول سعیدی قاضی ناصرالدین بیضاوی شافعی کے حوالے سے اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''يُغَطِّيْنَ وُجُوْهَهُنَّ وَاَبْدَانَهُنَّ اِذَا بَرَزْنَ لِحَاجَةٍ وَمِنْ لِلتَّبْعِيْضِ فَاِنَّ الْمَرْاَةَ تَرْخِي بَعْضَ جِلْبَابِهَا وَتَتَلَفَّحُ بِبَعْضٍ

ترجمہ: ''(جب عورتیں کسی کام سے باہر نکلیں تو) اپنے چہرے اور بدن کو ڈھانپ لیں، ''مِنْ'' تبعیض کے لیے ہے کیونکہ عورتیں چادر کے بعض حصے کو (چہرہ پر) لٹکا لیتی ہیں اور بعض کو بدن کے گرد لپیٹ لیتی ہیں''۔

(بیضاوی علی ہامش الخفاجی، جلد 7، ص:185۔ تبیان القرآن، جلد 9، ص:559)

ازواجِ مطہرات اور مسلم خواتین جب کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلتیں تو نقاب پہنتیں یا چادروں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتی تھیں۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم الْمَدِيْنَةَ، وَهُوَ عَرُوْسٌ بِصَفِيَّةَ بِنْتِ حُيَيٍّ، جِئْنَ نِسَاءُ الْاَنْصَارِ فَاَخْبَرْنَ عَنْهَا، قَالَتْ: فَتَنَكَّرْتُ وَتَنَقَّبْتُ فَذَهَبْتُ، فَنَظَرَ

رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِلٰی عَیْنِیْ فَعَرَفَنِیْ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خیبر سے مدینہ تشریف لائے، تو اُس وقت آپ نے حضرت صفیہ بنت حُیَیّ سے شادی کی ہوئی تھی، انصار کی عورتوں نے آکر حضرت صفیہ کے متعلق بیان کیا، میں نے اپنا حلیہ بدلا اور نقاب پہن کر گھر سے نکلی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری آنکھوں کو دیکھ کر پہچان لیا''۔

(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1980)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت ایسا اسکارف یا نقاب پہن سکتی ہے، جس میں آنکھ کھلی ہو اور اُسے دیکھنے میں دشواری نہ ہو۔ جوان عورتوں کو نامحرم مردوں کے سامنے چہرہ چھپانے کا حکم ہے۔ تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(وَتُمْنَعُ) الْمَرْأَةُ الشَّابَّةُ (مِنْ كَشْفِ الْوَجْهِ بَيْنَ الرِّجَالِ) لَا لِأَنَّهُ عَوْرَةٌ بَلْ (لِخَوْفِ الْفِتْنَةِ) كَمَسِّهِ وَإِنْ أَمِنَ الشَّهْوَةَ لِأَنَّهُ أَغْلَظُ

ترجمہ: ''جوان عورت کو (نامحرم) مردوں کے سامنے چہرہ کھولنے سے منع کیا جائے، اس لیے نہیں کہ اُس کا ستر واجب ہے بلکہ فتنہ کے خوف سے منع کیا گیا ہے، جیسے عورت کا چھونا، خواہ شہوت کا اندیشہ نہ ہو، کیونکہ چہرے کا کھلا ہونا چھونے سے زیادہ سنگین بات ہے''۔

(جلد 2، ص: 72)

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(فَإِنْ خَافَ الشَّهْوَةَ) أَوْ شَكَّ (امْتَنَعَ نَظَرُهُ إِلَى وَجْهِهَا) فَحِلُّ النَّظَرِ مُقَيَّدٌ بِعَدَمِ الشَّهْوَةِ وَإِلَّا فَحَرَامٌ. وَهٰذَا فِي زَمَانِهِمْ. وَأَمَّا فِي زَمَانِنَا فَمَنَعَ مِنَ الشَّابَّةِ ''قُهُسْتَانِي'' وَغَيْرُهُ۔

ترجمہ: ''اگر شہوت کا خوف یا شک ہو تو مرد کا عورت کے چہرہ کی جانب نظر کرنا منع ہے، نظر کا حلال ہونا شہوت نہ ہونے کے ساتھ مقید ہے ورنہ حرام ہے اور یہ یعنی شہوت نہ ہونے کی صورت میں عورت کو دیکھنے کا جواز گزشتہ زمانہ کے اعتبار سے تھا اور ہمارے زمانے میں تو

جوان عورت کا چہرہ دیکھنا ہر طرح ممنوع ہے یعنی فسادِ زمانہ کے سبب، جیسا کہ ''قہستانی'' وغیرہ میں ہے''۔ (جلد 9، ص: 451)

ستر کا تعلق عورت کے جسم کے اُس حصہ اور اُن اعضاء سے ہے، جن کو شوہر کے سوا ہر شخص سے چھپانا واجب ہے، خواہ وہ شخص اس عورت کا محرم ہو یا غیر محرم اور وہ عورت کے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ اس کا پورا جسم ہے اور پیروں میں اختلاف ہے، چہرے اور ہاتھوں کے سوا باقی جسم کو عورت نہ اپنے مَحارم (مثلاً باپ، بھائی، بیٹا وغیرہ) پر ظاہر کرسکتی ہے اور نہ اجنبی مردوں پر، اور حجاب کا تعلق عورت کے پورے جسم سے ہے اور یہ اجنبی مردوں کے لحاظ سے ہے، سو اجنبی مردوں کے لحاظ سے عورت کا پورا جسم واجبُ السَّتر (چھپانے کی چیز) ہے اور عورت باقی جسم کے علاوہ اپنا چہرہ اور ہاتھ بھی اجنبی مردوں پر ظاہر نہیں کرسکتی البتہ ضروریات مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح ستر کی دو قسمیں ہیں، ایک نماز کے اعتبار سے ستر ہے اور یہ چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ عورتوں کا پورا جسم ہے، سو اجنبی مردوں کے لحاظ سے عورت کا پورا جسم واجبُ السَّتر ہے اور اس کو چھپانا واجب ہے۔

مُتقدمین فقہاء میں سے بعض فقہاء نے ستر اور حجاب میں فرق نہیں کیا اور عورت کے چہرے اور ہاتھوں کو حجاب سے مستثنیٰ رکھا ہے، لیکن جمہور فقہاءِ اسلام نے ستر اور حجاب میں فرق کیا ہے اور اجنبی مردوں کے سامنے عورت کے چہرے اور ہاتھوں کے چھپانے کو بھی واجب قرار دیا ہے اور یہی چیز قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے منشا کے مطابق ہے، امام شافعی کے ایک قول کے مطابق، امام احمد اور متاخرین فقہاءِ احناف کے نزدیک فتنہ کی وجہ سے اجنبی مردوں کا عورتوں کے چہرے کو دیکھنا مطلقاً ناجائز ہے اور امام مالک اور امام شافعی کے دوسرے قول کے مطابق اور متقدمین فقہاء احناف کے نزدیک اگر شہوت کا اندیشہ ہو تو عورت کے چہرے کو دیکھنا حرام ہے اور اگر شہوت کا اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، لیکن یہ رائے ہمارے نزدیک راجح نہیں ہے۔

ستر کا تعلق جسم کے اُن حصوں سے ہے جن کو شوہر کے سوا دوسروں پر ظاہر کرنا شرعاً منع

ہے۔ اِن میں ایک تو عورت کے محارم ہیں، مَحرَم کسی عورت کے اس مرد رشتے دار کو کہتے ہیں، جس کے ساتھ اس کا نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو۔ مَحرَم کے ساتھ چونکہ عورت کا واسطہ زیادہ ہوتا ہے، اس لیے شریعت نے اس میں عُسر وحرج سے بچنے کے لیے رعایت دی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر عورت اور مرد دونوں میں سے کسی کے شہوت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو ناگزیر طور پر محرم مرد عورت کے سر، چہرے، سینے، پنڈلی اور بازوؤں پر نظر ڈال سکتا ہے ہے، یعنی اس پر وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ البتہ جہاں یا جس مرحلے پر شہوت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو وہاں فوراً نظر ہٹالے یا عورت اپنے ستر کو چھپالے ورنہ گنہگار ہوں گے۔

کوئی عورت ضرورت کے وقت اجنبی مرد کے سامنے اپنے چہرے اور ہاتھوں سے پردہ ہٹاسکتی ہے یا اچانک اجنبی مرد کی نظر کسی عورت کے اُن اعضاء پر پڑ جائے تو عُسر اور حرج سے بچنے کے لیے جائز ہے، لیکن اگر کسی مرحلے پر نظر میں خیانت کا عنصر شامل ہو جائے یا شہوت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو احتیاط واجتناب لازم ہے''

(شرح صحیح مسلم، جلد خامس، ص:612)

صورت یا رنگ کی مشابہت نہ ہونے کی وجہ سے نسب میں شک کرنا

سوال:

بعض اوقات کسی کے بیٹے یا بیٹی کا رنگ، خدوخال اور صورت ماں باپ سے مشابہت نہیں رکھتی تو لوگ اُن کے صحیح النسب ہونے کے بارے میں شک کرنے لگتے ہیں۔ کیا یہ رویہ یا قیاس درست ہے؟، (منور احمد، ملیر، کراچی)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ أَنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ وُلِدَلِي غُلَامٌ أَسوَدُ، فَقَالَ: هَل لَكَ مِن اِبِلٍ، قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: مَا أَلْوَانُهَا؟، قَالَ: حُمْرٌ، قَالَ: هَلْ فِيهَا مِن اَورَقٍ، قَالَ: نَعَم، قَالَ: فَاَنّٰی ذٰلِك، قَالَ: لَعَلَّهُ نَزَعَهُ عِرقٌ فَقَالَ: فَلَعَلَّ اِبنَكَ هٰذَا

نَزَعَهُ۔

ترجمہ:'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے (شکایتی انداز میں) عرض کی: یارسول اللہ! میرے ہاں ایک سیاہ بچے نے جنم لیا ہے، آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں؟، اس نے جواب دیا: جی ہاں ہیں، فرمایا: اُن کا رنگ کیسا ہے؟، اُس نے کہا: سرخ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اُن میں کوئی خاکستری بھی ہے، کہنے لگا: ہاں ہے، آپ ﷺ نے پوچھا: تو وہ کہاں سے آ گیا؟، اُس نے کہا: شاید کسی رگ نے اسے کھینچ لیا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: شاید تمہارے بیٹے کو بھی کسی رگ نے کھینچ لیا ہوگا''۔ (صحیح بخاری:5305)

عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ قَالَ لَهٗ مَا وُلِدَ لَكَ؟، قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللهِ مَا عَسٰی اَنْ یُّوْلَدَ لِیْ اِمَّا غُلَامٌ وَاِمَّا جَارِیَةٌ قَالَ: مَنْ یَّشْبَهُ؟، قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللهِ مَا عَسٰی اَنْ یَّشْبَهَ اِمَّا اَبَاهُ وَاِمَّا اُمَّهٗ. فَقَالَ النَّبِیُّ مَهْ لَا تَقُوْلَنَّ هٰكَذَا اِذَا اسْتَقَرَّتِ النُّطْفَةُ فِی الرَّحِمِ اَحْضَرَهَا اللهُ كُلَّ نَسَبٍ بَیْنَهَا وَبَیْنَ آدَمَ اَمَا قَرَأْتَ قَوْلَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (الانفطار:8)

ترجمہ:'' حضرت علی بن رباح اپنے والد کے توسط سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اُن سے پوچھا: تمہارے ہاں کیا پیدا ہوا؟، اُنہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! میرے ہاں جو بھی پیدا ہوگا وہ یا لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کس پر جائے گا؟، عرض کی: یارسول اللہ! اپنے باپ پر جائے گا یا ماں پر۔ نبی ﷺ نے فرمایا: رکو اور آئندہ اس طرح مت کہنا، جب کوئی نطفہ رحم میں ٹھہرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اور حضرت آدم کے درمیان تمام نسبی رشتوں کو حاضر فرماتا ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم نے اللہ کا یہ فرمان نہیں پڑھا: پس اللہ جس صورت میں چاہتا ہے اُس بچے کو بنا دیتا ہے''۔

(الانفطار:8)، (تفسیر طبری:36567، دارالکتب العلمیہ بیروت، معجم طبرانی کبیر:4624)

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهَا اَنَّهَا قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ دَخَلَ عَلَیَّ مَسْرُوْرًا

تَبرُقُ أَسَارِيرُوَجهِهِ، فَقَالَ: اَلَم تَرَی اَنَّ مُجَزِّزًا اَنفًا اِلٰی زیدبنِ حَارِثَةَ وَاُسَامَةَ بنِ زَیدٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالیٰ عَنهُمَا، فَقَالَ: اِنَّ بَعضَ هٰذِهِ الاَقدَامِ لَمِن بَعضٍ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے دراں حالیکہ خوشی سے آپ کا چہرہ انور دمک رہا تھا، آپ نے فرمایا: کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ایک قیافہ شناس نے ابھی زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید کے قدموں کو دیکھ کر بتایا ہے کہ ان میں سے ایک قدم دوسرے قدم کا جز ہے''۔

(صحیح مسلم: 1459)

علامہ نووی لکھتے ہیں:

وَاختَلَفَ العُلَمَاءُ فِي العَمَلِ بِقَولِ القَائِفِ فَنَفَاهُ اَبُوحَنِيفَةَ وَأَصحَابُهُ وَالثَّورِيُّ وَاِسحَاقُ وَأَثبَتَهُ الشَّافِعِيُّ وَجَمَاهِيرُ العُلَمَاءِ، وَالمَشهُورُ عَن مَالِكٍ اِثبَاتُهُ فِي الاِمَاءِ وَنَفيُهُ فِي الحَرَائِرِ وَفِي رِوَايَةٍ عَنهُ اثبَاتُهُ فِيهِمَا. وَدَلِيلُ الشَّافِعِيِّ حَدِيثُ مُجَزِّزٍ لِاَنَّ النَّبِيَّ ﷺ فَرِحَ لِكَونِهِ وَجَدَ فِي أُمَّتِهِ مَن يُمَيِّزُ أَنسَابَهَا عِندَ اِشتِبَاهِهَا وَلَوكَانَتِ القِيَافَةُ بَاطِلَةً لَم يَحصُل بِذٰلِكَ سُرُورٌ

ترجمہ: ''قیافہ شناس کے قول کو قبول کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام ثوری اور امام اسحاق قیافہ شناس کے قول کا اعتبار نہیں کرتے، امام شافعی اور جمہور علماء قیافہ شناس کے قول کا اعتبار کرتے ہیں، امام مالک باندیوں کے حق میں قیافہ شناس کے قول کا اعتبار کرتے ہیں اور آزاد عورتوں کے حق میں نہیں کرتے اور امام مالک سے ایک روایت ہے کہ وہ آزاد اور غلام دونوں میں قیافہ شناس کے قول کا اعتبار کرتے ہیں۔ امام شافعی کی دلیل قیافہ شناس کی وہ روایت ہے کہ نبی ﷺ اس بات سے خوش ہوئے کہ آپ کی امت میں ایسے لوگ ہیں جو نسب کے مشتبہ ہونے کی صورت میں نسب میں تمیز کر سکتے ہیں اور اگر قیافہ شناسی باطل ہوتی تو آپ کو اس کے سبب خوشی حاصل نہ ہوتی''۔

(شرح النووی، جلد 10، ص: 36)

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

وَنَفَاهُ أَبُوْحَنِيْفَةَ مُطْلَقًا لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء:36) وَلَيْسَ فِيْ حَدِيْثِ الْمُدْلِجِيِّ دَلِيْلٌ عَلٰى وُجُوْبِ الْحُكْمِ بِقَوْلِ الْقَافَةِ لِأَنَّ أُسَامَةَ كَانَ نَسَبُهٗ ثَابِتًا مِنْ زَيْدٍ قَبْلَ ذٰلِكَ، وَلَمْ يَحْتَجِ النَّبِيُّ ﷺ فِيْ ذٰلِكَ إِلٰى قَوْلِ أَحَدٍ، وَإِنَّمَا تَعَجَّبَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ إِصَابَةِ مُجَزِّزٍ كَمَا يَتَعَجَّبُ مِنْ ظَنِّ الرَّجُلِ الَّذِيْ يُصِيْبُ ظَنُّهٗ حَقِيْقَةَ الشَّيْءِ الَّذِيْ ظَنَّهٗ، وَلَا يَثْبُتُ الْحُكْمُ بِذٰلِكَ، وَتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْإِنْكَارَ عَلَيْهِ لِأَنَّهٗ لَمْ يَتَعَاطَ فِيْ ذٰلِكَ إِثْبَاتُ مَا لَمْ يَكُنْ ثَابِتًا۔

ترجمہ: ''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ قیافہ شناسی کا بالکل اعتبار نہیں کرتے اور ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''اور اُس بات کی ٹوہ میں نہ لگ جاؤ جس کا تمہیں علم نہیں ہے''، اور مدلجی کی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ قیافہ شناس کا قول لازمی حجت ہے، کیونکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا نسب حضرت زید بن حارثہ سے اس سے پہلے بھی ثابت تھا اور نبی ﷺ ان کے نسب کے ثبوت کے سلسلے میں کسی کے قول کے محتاج نہیں تھے۔ البتہ نبی ﷺ کو قیافہ شناس کی رائے کے درست ہونے پر تعجب ہوا جس طرح کسی شخص کا گمان کسی چیز کی حقیقت کے بارے میں درست ثابت ہو جائے تو اس پر (انسان کو) تعجب ہوتا ہے اور (اگر کسی قطعی ثبوت سے وہ چیز ثابت نہیں ہے تو محض) اس گمان سے اس کا حکم ثابت نہیں ہوتا اور رسول اللہ ﷺ نے انکار اس لیے نہیں فرمایا کہ اس سے کوئی غیر ثابت شدہ چیز تو ثابت نہیں ہو رہی تھی''۔ (عمدۃ القاری، جلد 16، ص:153)

ان احادیث مبارکہ سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

(الف) قرائن کی بنا پر کسی کے نسب کا انکار شرعاً درست نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے غیر معمولی مسرت کا اظہار فرمایا کہ کچھ لوگوں نے حضرت اسامہ بن زید کے صحیح نسب کے بارے میں شبہات کا اظہار کیا اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے انہی کے قیافہ شناسوں کو ان پر حجت بنا دیا۔

(ب)امام اعظم کے حجت نہ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ صحت قاطعہ نہیں ہے، بلکہ محض ظن وتخمین ہے، کیونکہ اس کے قطعی ماننے سے کوئی شخص دو اجنبیوں کے درمیان نسبی رشتے کا دعویٰ کرسکتا ہے،جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں اور نسب ووراثت کے لیے ظنی شہادت کافی نہیں ہے اور دیگر ائمہ کے اسے حجت ماننے کا فائدہ یہ ہے کہ کوئی شخص اس کے نتیجے میں ناروا طعن سے بچ سکتا ہے اور حضرت اسامہ بن زید کا نسب تو پہلے ہی ثابت شدہ تھا اور وہ الحمدللہ صحیح النسب تھے۔

(ج)اولاد اور ماں باپ کے درمیان رنگ یا صورت اور خدوخال کے فرق سے صحیح النسب کے نسب کو مشکوک یا مشتبہ نہیں ٹھہرایا جاسکتا اور آج کی جدید سائنس کا مدار بھی رنگ وروپ، خدوخال اور صورت کے بجائے DNA پر ہے،اگرچہ یہ بھی ظنی ہے۔

(د) بعض طبی یا قدرتی وجوہات کی بنا پر اولاد اور ماں باپ کی رنگت میں فرق واقع ہوسکتا ہے اور صحیح بخاری کی حدیث کی رُو سے رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے سائل کے گمان کو رد کیا، ورنہ اس سے سنگین خطرات کے حامل معاشرتی مسائل پیدا ہوسکتے تھے اور کوئی شخص اپنی بیوی کے بارے میں بدگمانی کرسکتا تھا۔

پس اسلام دینِ حق اور دینِ فطرت ہے اور الحمدللہ علٰی احسانہٖ اس میں اُمت کو درپیش ہر مسئلے کا شافی وکافی اور اطمینان بخش حل موجود ہے۔

طلاق کے مسائل

موبائل SMS کے ذریعے طلاق

سوال:

میرا اور میرے شوہر کا تعلق اہلسنّت سے ہے۔ میرے شوہر محمد اقبال ولد بشیر احمد نے مجھے بتایا کہ اس نے تین ماہ قبل بذریعہ فون message تین طلاقیں لکھ کر ارسال کر دی تھی لیکن میں نے یہ message نہیں پڑھا تھا۔ پھر انہوں نے بتایا انہوں نے بھی قاری/ مولوی صاحبان سے دریافت کیا کہ کیا ایسی صورت میں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں کہ نہیں؟۔ مولوی صاحب نے قرآن پاک سے پڑھ کر بتایا کہ نہیں ہوئیں اور میرا شوہر مجھے آ کر اپنے گھر لے گیا اور میں ان دنوں حمل سے تھی۔ بعد ازاں میں اپنی ماں کے گھر واپس آ گئی تو میں نے بھی مفتی صاحب سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ میری لڑکے (شوہر) سے بات کراؤ تو میں نے فون پر اپنے شوہر سے مفتی صاحب کی بات کرائی تو میرے شوہر نے فون پر بتایا کہ اس نے لڑکی (اپنی بیوی عائشہ) کو تین بار طلاق دے دی ہے، message پر لکھا تھا۔ مفتی صاحب نے میرے شوہر سے بات کرنے کے بعد بتایا کہ مجھے تین طلاقیں ہوگئی ہیں۔ لیکن میں ابھی کشمکش میں ہوں کہ آیا مجھے طلاقیں واقع ہو گئی ہیں کہ نہیں، (عائشہ بشیر بنت محمد بشیر، ساندہ خورد، لاہور)

جواب:

طلاق دینے کے تین طریقے ہیں: ا۔ یہ کہ لفظاً طلاق دی جائے اور یہی طلاق میں اصل ہے، یعنی کوئی شخص اپنی بیوی کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ کہے: ''میں نے تجھے طلاق دی'' یا بیوی کا نام لے کر کہے: ''میں نے فلانہ بنت فلاں کو طلاق دی''۔ یہ طلاق کا نہایت واضح طریقہ ہے اور اس میں کوئی اشکال اور ابہام نہیں رہتا۔ ۲۔ یہ کہ کسی کو طلاق دینے کے لیے اپنا وکیل بنائے، اسے ''توکیل بالطلاق'' کہتے ہیں۔ ۳۔ یہ کہ لکھ کر طلاق دے۔ طلاق جس طرح لفظاً اور زبانی واقع ہوتی ہے، اسی طرح تحریری طلاق بھی مؤثر

ہوتی ہے۔تحریری طلاق کی کئی صورتیں ہیں، عالمگیری میں ہے:

اَلْکِتَابَۃُ عَلٰی نَوْعَیْنِ مَرْسُوْمَۃٌ وَغَیْرُمَرْسُوْمَۃٍ، وَنَعْنِیْ بِالْمَرْسُوْمَۃِ اَنْ یَکُوْنَ مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا، مِثْلَ مَایُکْتَبُ اِلَی الْغَائِبِ،وَغَیْرُالْمَرْسُوْمَۃِ لَایَکُوْنُ مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا،وَھُوَ عَلٰی وَجْھَیْنِ مُسْتَبِیْنَۃٌ وَغَیْرُ مُسْتَبِیْنَۃٍ، فَالْمُسْتَبِیْنَۃُ مَایُکْتَبُ عَلَی الصَّحِیْفَۃِ وَالْحَائِطِ وَالْاَرْضِ عَلٰی وَجْہٍ یُمْکِنُ فَھْمُہٗ وَقِرَاءَ تُہٗ. وَغَیْرُ الْمُسْتَبِیْنَۃِ مَا یُکْتَبُ عَلَی الْھَوَاءِ وَالْمَاءِ وَشَیْءٍ لَایُمْکِنُ فَھْمُہٗ وَقِرَاءَ تُہٗ.فَفِیْ غَیْرِالْمُسْتَبِیْنَۃِ لَایَقَعُ الطَّلَاقُ وَاِنْ نَوٰی،وَاِنْ کَانَتْ مُسْتَبِیْنَۃً لٰکِنَّھَا غَیْرُمَرْسُوْمَۃٍ، اِنْ نَوَی الطَّلَاقَ یَقَعُ وَاِلَّا فَلَا. وَاِنْ کَانَتْ مَرْسُوْمَۃً یَقَعُ الطَّلَاقُ، نَوٰی اَوْ لَمْ یَنْوِ،ثُمَّ الْمَرْسُوْمَۃُ لَا تَخْلُوْ،اِمَّا اِنْ اَرْسَلَ الطَّلَاقَ بِاَنْ کَتَبَ: ''اَمَّا بَعْدُفَاَنْتِ طَالِقٌ''، فَلَمَّا کَتَبَ ھٰذَا یَقَعُ الطَّلَاقُ وَتَلْزَمُھَا الْعِدَّۃُ مِنْ وَقْتِ الْکِتَابَۃِ. وَاِنْ عَلَّقَ طَلَاقَھَا بِمَجِیْءِ الْکِتَابِ. بِاَنْ کَتَبَ:''اِذَا جَاءَ کِتَابِیْ ھٰذَا فَاَنْتِ طَالِقٌ''، فَمَا لَمْ یَجِیْءْ اِلَیْھَاالْکِتَابُ. لَا یَقَعُ. کَذَا فِیْ فَتَاوٰی ''قَاضِیْ خَان''۔

ترجمہ:''تحریری طلاق کی دوقسمیں ہیں،مرسومہ اورغیر مرسومہ: مرسومہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ باقاعدہ مکتوب الیہ کے نام اورعنوان سے شروع کیا جائے، جیسے کسی غائب کوخط لکھا جاتا ہے (عربی میں لکھتے ہیں: الی فلان اوراردو میں لکھتے ہیں: بنام فلاں یافلاں کے نام، فلاں کی جگہ مکتوب الیہ کا نام لکھا جاتا ہے)۔غیر مرسومہ سے مراد یہ ہے کہ مکتوب الیہ کا نام لکھ کر باقاعدہ اُسے مخاطب نہ کیا جائے۔ اوراس کی دوصورتیں ہیں: واضح ہو یا غیر واضح۔ واضح اورنظرآنے والا وہ ہے جسے کاغذ یادیوار یازمین پراس طرح لکھاجائے کہ اُس کا سمجھنا اور پڑھنا ممکن ہو۔اورغیر واضح سے مراد یہ ہے کہ جسے ہوایاپانی یاکسی ایسی چیز (جیسے انگلی سے شفاف شیشے پرلکھنا) پرلکھاجائے کہ اُس کا سمجھنااور پڑھنا ممکن نہ ہو،توغیرواضح تحریر سے طلاق واقع نہیں ہوگی،خواہ لکھنے والے نے نیت بھی کی ہو۔اوراگرتحریرتو واضح ہے، لیکن مکتوب الیہ کونام کے ساتھ مخاطب کرکےنہیں لکھی گئی،تواگرلکھنے والے نے اپنی بیوی کو

طلاق دینے کی نیت سے لکھا ہے، تو طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر اُس نے طلاق کی نیت سے نہیں لکھا، تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر تحریر واضح ہے اور اپنی بیوی کو نام کے ساتھ مخاطب کرکے طلاق نامہ لکھا ہے، تو نیت کی ہو یا نہ، طلاق واقع ہوجائے گی۔ پھر اگر طلاق مرسومہ ہے، یعنی اپنی بیوی کا نام لکھ کر طلاق نامہ لکھا ہے، تو اس کی دوصورتیں ہیں:

(۱) یہ کہ طلاق کو کسی شرط پر مقید نہیں کیا، یعنی شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور اُسے مخاطب کرکے یوں لکھا: ''تجھے طلاق ہے''، تو جس وقت یہ تحریر لکھی، اُسی وقت سے طلاق واقع ہوجائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی۔

(۲) اور اگر شوہر نے اپنی بیوی کا نام لکھا اور پھر اُسے مخاطب کرکے لکھا: ''جیسے ہی میری یہ تحریر یا خط یا طلاق نامہ آپ کو ملے، آپ پر طلاق ہے''، تو جب تک اُس کی بیوی کو تحریر نہیں ملے گی، طلاق واقع نہیں ہوگی (اور تحریر ملتے ہی طلاق واقع ہوجائے گی اور عدت بھی اُسی وقت سے شمار ہوگی)''۔ (جلد:01،ص:378)

حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا: ''ایک شخص نے اپنی بیوی مسمات فاطمہ کو یہ تحریر لکھ کر بھیجی کہ: ''میں نے فاطمہ بی بی کو طلاق دے دی''، نیچے اپنے دستخط کردیئے طلاق ہوگئی یا نہیں؟''۔ مفتی صاحب جواب میں لکھتے ہیں: ''اگر شوہر نے طلاق کی نیت سے یہ عبارت لکھی ہے، تو طلاقِ رجعی واقع ہوگئی، ورنہ نہیں، کیونکہ جو طلاق اَلقاب وآداب کے بغیر ویسے ہی لکھ دی جاوے، وہ نیت پر موقوف ہے۔ اس کے بعد مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتابت کی اقسام اور تعریفات کے حوالے سے وہی عبارات لکھیں، جو ہم نے اوپر درج کی ہیں، انہوں نے ''مُصَدَّرًا وَمُعَنْوَنًا'' کے معنی لکھے ہیں: ''باقاعدہ القاب وآداب کے ساتھ''۔ (ص:150)

موبائل فون سے اپنی بیوی کو SMS کرکے طلاق دینا، مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں طلاق بالکتابت ہی کی ایک قسم ہے اور یہ ''طلاقِ غیر مرسوم، مُستبین، غیر معلق بوصول الکتاب'' کی ایک جدید شکل ہے۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے، اس کی رُو سے

شوہر اقراری ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں، لہٰذا طلاق واقع ہو چکی ہے اور آپ دونوں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ چونکہ طلاق دینے کے وقت آپ حاملہ تھیں، اس لیے آپ کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ پیدا ہونے) تک ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ ترجمہ: ''اور حاملہ عورتوں کی عدت (کی انتہا) ان کا وضع حمل ہے''۔ (الطلاق:4)

سو عدت مکمل ہونے یعنی وضع حمل تک آپ کا نفقہ سابق شوہر کے ذمے ہے، لیکن عدت کے دوران بھی آپ دونوں کا باہم ازدواجی تعلق قائم کرنا حرام ہے، آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔

ثبوتِ طلاق کے لیے شوہر کا اقرار کافی ہے

سوال:

ایک آدمی فون پر اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیتا ہے، جب وہ پہلی بار طلاق کہتا ہے تو بیوی فون بند کر دیتی ہے۔ کچھ گھنٹے بعد اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم نے طلاق ہوش و حواس میں دی ہے، تو وہ گواہی دیتا ہے کہ ہاں! میں نے طلاق ہوش وحواس میں دی ہے، تو کیا طلاق ہوگئی یا نہیں؟ کیا رجوع کیا جا سکتا ہے۔ کچھ گھنٹے بعد طلاق دینے والا آدمی رونا شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ غصے میں دی تھی اور میں رجوع کرنا چاہتا ہوں، ائمۂ اربعہ کا کیا موقف ہے؟۔ خاص طور پر امام ابو حنیفہ اور اہلِ حدیث حضرات کیا کہتے ہیں؟،

(تنویر احمد، سیالکوٹ)

جواب:

ثبوتِ طلاق کے لیے شوہر کا اقرار کافی ہے۔ طلاق غصے ہی میں دی جاتی ہے ایسی حالت نہیں تھی جس میں عقل زائل ہوگئی ہو اور یہ پتا نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہ العزیز لکھتے ہیں: غصہ مانعِ وقوعِ طلاق نہیں بلکہ وہی طلاق پر حامل ہوتا ہے، تو اُسے مانع قرار دینا گویا حکمِ طلاق کا راساً (سرے سے) ابطال (باطل قرار دینا)

ہے، ہاں !اگر شدّتِ غیظ و جوشِ غضب اس حد کو پہنچ جائے کہ اس سے عقل زائل ہو جائے، خبر نہ رہے کہ کیا کہتا ہوں زبان سے کیا نکلتا ہے، تو بیشک ایسی حالت کی طلاق ہرگز واقع نہ ہوگی''۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 12،ص:383)

ائمہ ومشائخ عظام نے تصریح فرمائی ہے کہ غصہ ارادۂ طلاق کی علامت ہے۔ ملک العلماء علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَحَالُ الْغَضَبِ وَمُذَاکَرَۃُ الطَّلَاقِ دَلِیْلُ اِرَادَۃِ الطَّلَاقِ ظَاھِرًا، فَلَایُصَدَّقُ فِی الصَّرْفِ عَنِ الظَّاھِرِ،

ترجمہ: ''غصہ کی حالت (حالتِ غضب)اور مذاکرۂ طلاق (یعنی بیوی شوہر سے طلاق کا مطالبہ کررہی ہو اور اس پر بحث جاری ہو) ظاہری طور پر طلاق کے ارادہ پر دلیل ہوتے ہیں، لہٰذا طلاق کے کلمات بولنے کے بعد اگر شوہر کلام کے ظاہری معنی کے خلاف مراد بیان کرے، تو اُس کی تصدیق نہیں کی جائے گی''۔(بدائع الصنائع، جلد 3،ص:149)

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: (ا)''آج کل اکثر لوگ طلاق دے بیٹھتے ہیں، بعد کو افسوس کرتے اور طرح طرح کے حیلہ سے یہ فتویٰ لیا چاہتے ہیں کہ طلاق واقع نہ ہو۔ ایک عذر اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ غصہ میں طلاق دی تھی۔ مفتی کو چاہیے کہ یہ امر ملحوظ رکھے کہ مطلقاً غصہ کا اعتبار نہیں، معمولی غصہ میں طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ صورت کہ عقل غصہ سے جاتی رہے، بہت نادر ہے، لہٰذا جب تک اس کا ثبوت نہ ہو محض سائل کے کہہ دینے پر اعتماد نہ کرے (بہارِ شریعت، جلد اول ،ص:113)''۔ وہ مزید لکھتے ہیں: ''طلاق اکثر غصے ہی میں ہوتی ہے اور غصہ میں جو طلاق دی جاتی ہے، واقع ہوتی ہے، مگر جب کہ غصہ اس حد کا ہو کہ عقل تکلیفی زائل ہو جائے کہ غصہ کی شدت میں مجنون اور پاگل کی طرح ہو جائے کہ اسے کچھ امتیاز ہی باقی نہ رہے، جو کچھ کہے اُس کا علم نہ رہے کہ کیا کہتا ہے تو اس صورت میں طلاق واقع نہ ہوگی، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر واقع میں اس حد کا غصہ نہ ہوا اور لوگوں پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ مجھے بالکل خبر نہیں کہ کیا کہا تو اپنے اس جھوٹے بیان سے

مؤاخذہ اُخروی سے بری نہ ہوگا۔ اور وہ بیان طلاق کو عنداللہ منع نہ کرے گا اور اگر معمولی غصہ تھا تو جتنی طلاقیں دی ہیں'' ۔ واقع ہیں،(فتاوٰی امجدیہ دوم،ص: 197)

ائمۂ اربعہ کے نزدیک تین طلاقوں سے دونوں ایک دوسرے پر حرام ہوجاتے ہیں۔ علامہ یحییٰ بن شرف الدین نووی شافعی لکھتے ہیں:

وَقَدِ اختَلَفَ العُلَمَاءُ فِیمَن قَالَ لِامرَأَتِہٖ:اَنتِ طَالِقٌ ثَلٰثًا.فَقَالَ الشَّافِعِیُّ وَمَالِکٌ وَاَبُوحَنِیفَۃَ وَاَحمَدُ وَجَمَاھِیرُ العُلَمَاءِ مِنَ السَّلَفِ وَالخَلَفِ:یَقَعُ الثَّلَاثُ۔

ترجمہ:''ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے تین طلاق (یا تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں)، تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے،(ائمۂ مذاہب)امام شافعی ، امام مالک، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اجمعین اور جمہور علماءِ سلف وخلف رحمہم اللہ اجمعین کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی''۔ (شرح صحیح مسلم للنووی،جلد 10،ص:60)

طلاق کا حکم

سوال:

میں نے دس دن پہلے اپنی بیوی کو سخت غصے میں لڑائی کے دوران کہا:''میں تجھے آج بھی طلاق دیتا ہوں،کل بھی طلاق دیتا ہوں، پرسوں بھی طلاق دیتا ہوں''،شرعی حکم کیا ہے؟

(محمد لطیف، ڈالمیا کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی پر ہر روز ایک طلاق واقع ہوئی اور تیسرے روز تیسری طلاق واقع ہونے کے بعد دونوں ایک دوسرے پر حرام ہوگئے، تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی قطعاً گنجائش نہیں۔تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

وَبِقَولِہٖ:(أَنتِ طَالِقٌ غَدًا أَوفِی غَدٍیَقَعُ عِندَ) طُلُوعِ (الصُّبحِ،وَصَحَّ فِی الثَّانِیْ نِیَّۃُ العَصرِ)أَیْ:آخِرِ النَّھَارِ (قَضَاءً، وَصُدِّقَ فِیھِمَا دِیَانَۃً) ومِثلُہٗ:أَنتِ طَالِقٌ شَعبَانَ أَو فِیْ شَعبَانَ۔

ترجمہ: ''شوہر نے بیوی سے کہا: '' تجھے کل طلاق ہے یا کل میں طلاق ہے''، ان کلمات سے (اگلے دن) طلوعِ صبح کے وقت طلاق واقع ہوگی، اور اگر شوہر نے '' تجھے کل میں طلاق ہے'' کے کلمات سے اگلے دن کے آخری حصے یعنی بعد العصر کی نیت کی، تو قضاءً درست ہے۔ اور اگر وہ یہ کہے کہ دونوں کلمات میں میری نیت اگلے دن بعد العصر کی تھی، تو دیانۃً اس کی تصدیق کی جائے گی، اسی کی مانند یہ قول بھی ہے کہ: '' تجھے شعبان کو طلاق ہے یا شعبان میں طلاق ہے''، اگر مُطلَق مراد لیا ہے، تو قولِ اوّل کے مطابق طلوعِ شعبان کے ساتھ ہی طلاق واقع ہوجائے گی، لیکن اگر وہ کہے کہ: '' تجھے شعبان میں طلاق ہے'' سے میری مراد ماہِ شعبان کا آخر ہے، تو قضاءً اس کی تصدیق کی جائے گی (اور شعبان کا مہینہ ختم ہونے پر طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر وہ یہ کہے کہ دونوں کلمات سے میری مراد آخرِ شعبان ہے، تو دیانۃً دونوں اقوال میں اس کی تصدیق کی جائے گی''۔ (جلد 9، ص: 209-207، دمشق)

پس صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی کو پہلی طلاق اسی وقت واقع ہوجائے گی اور دوسری طلاق اگلے دن کے طلوع ہونے پر اور تیسری طلاق اس کے بعد والے دن کے طلوع ہونے پر واقع ہوجائے گی۔

طلاق کا ایک مسئلہ

سوال:

گھر میں شوہر کے ساتھ کسی نہ کسی بات پر اکثر جھگڑا رہتا تھا لیکن تنقید کا اظہار شوہر کی طرف سے ہی ہوتا تھا۔ 3 جولائی 2010 کو ہمارا جھگڑا گھر سے باہر ہوا۔ جھگڑے کی شدت میں سڑک پر ہی میرے شوہر نے یہ الفاظ بولے: **تم میرے سے فارغ ہو تمہارا اور میرا کوئی تعلق نہیں اور تم اپنی ماں کے گھر چلی جاؤ اور میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔** انہوں نے مجھے وہیں چھوڑا، اس کے بعد میں خود ہی واپس اپنے شوہر کے گھر آگئی۔ ایک ہفتے تک ہمارا بولنا ایک دوسرے کے ساتھ بند رہا نہ تو ہمارا زبانی کلامی کوئی تعلق رہا اور نہ ہی جسمانی۔ پورا ایک ہفتہ مکمل ناراضی رہی اس کے بعد دوسری بار 12 جولائی 2010 کو

پھر زیور کے مسئلے پر جھگڑا ہوا اور یہ جھگڑا بھی اس وقت ہوا جب گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ لڑائی کی شدت بڑھتی گئی اور اسی شدت میں پھر دوبارہ یہ الفاظ کہے: **میں نے تمہیں طلاق دی (ایک ہی دفعہ کہا)**۔ اس کے بعد تقریباً ساڑھے تین ماہ تک میں نے اپنے شوہر کے گھر میں رہتے ہوئے شوہر کو اس مسئلے کی نوعیت اور اس کا حل بتایا اور اس پر عمل کرنے یعنی تجدید نکاح کے لیے کہا۔ شوہر کا کہنا ہے کہ اس نے طلاق دی ہی نہیں ہے۔

بالآخر تقریباً چار ماہ گزرنے کے بعد میرا اس گھر میں رہنا مناسب نہیں تھا کیونکہ شوہر رجوع کی خواہش کا اظہار کرتا اور میں طلاق کے وہم میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ پاتی کہ کیا ہمارا یہ رجوع جائز بھی ہے یا نہیں۔ بالآخر اس کے کہنے پر میں 27 اکتوبر 2010 کو اپنے میکے واپس آ گئی۔ کیا طلاق ہو گئی ہے؟ اور 5 سال کے اس عرصے کی کیا اہمیت ہے جس دوران زوجیت کے کوئی حقوق بھی پورے نہیں کیے گئے، (حمیرا علوی، اسلام آباد)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں ''تم میرے سے فارغ ہو تمہارا اور میرا کوئی تعلق نہیں اور تم اپنی ماں کے گھر چلی جاؤ اور میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں''، کنایات میں سے ہے اور اگر یہ کلمہ طلاق کی نیت سے بولا ہو تو ایک طلاقِ بائن واقع ہو گی۔ شوہر کا غصہ ہی نیت طلاق پر دلیل ہے، شامی میں ہے: ''لان دلالة الحال قائمة مقام النية، (باب الصريح، ج:2، ص:430)''۔ مفتی نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''وہ کلمات کنائیہ جو صالحۂ زدو سب نہیں اور صالحۂ طلاق ہیں، غصے کی حالت میں طلاق ہیں، اگرچہ نیت طلاق کا صریح انکار کرے''۔ (فتاویٰ نوریہ، ج:3، ص:143)

لیکن اگر شوہر حلفیہ کہتا ہو کہ اِن الفاظ سے اُس کی طلاق کی نیت نہیں تھی، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہو گی۔ ''میں نے **تمہیں طلاق دی**'' صریح ہے، طلاقِ بائن کے بعد عدت کے دوران دی جانے والی صریح طلاق بائن کو لاحق ہو گئی اور دو طلاقیں بائن ہو گئیں، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: اَلصَّرِیْحُ یَلْحَقُ الصَّرِیْحَ وَیَلْحَقُ الْبَائِنَ بِشَرْطِ الْعِدَّةِ۔

ترجمہ:''صریح طلاق، صریح کو لاحق ہوتی ہے، اور صریح، بائن کو بھی لاحق ہوتی ہے (یعنی پہلے انت طالق کہا، دوبارہ انت طالق کہا یا طلاق مال کے عوض تو یہ (دونوں صریح ہیں) دوسری طلاق بھی واقع ہوگئی اس لیے کہ صریح، صریح کو لاحق ہوتی ہے یا انت بائن کہا، پھر انت طالق کہا تو یہ دوسری صریح طلاق پہلی بائن کو لاحق ہوگی اور بائن ہوجائے گی) بشرطیکہ پہلی بائنہ کی عدت میں واقع ہو (یعنی عورت عدت میں ہو تو دوسری طلاق پہلی طلاق کو لاحق ہوسکتی ہے اور عدت پوری ہونے کے بعد لاحق نہیں ہوسکتی)''۔''ویلحق البائن'' کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

كَمَالَوْقَالَ لَهَا: اَنْتِ بَائِنٌ أَوْ خَالَعَهَا عَلٰى مَالٍ ثُمَّ قَالَ: اَنْتِ طَالِقٌ أَوْ هٰذِهٖ طَالِقٌ۔ ''بحر'' عن ''البزازية''، ثُمَّ قَالَ: وَإِذَا لَحِقَ الصَّرِيْحُ الْبَائِنَ كَانَ بَائِناً، لِأَنَّ الْبَيْنُوْنَةَ السَّابِقَةَ عَلَيْهِ تَمْنَعُ الرَّجْعَةَ كَمَا فِي ''الْخُلَاصَةِ''۔

ترجمہ:''جیسے کسی شخص نے کہا: تجھے طلاق ہے یا طلاق مال کے عوض، پھر کہا: انت طالق، یا یہ رہی طلاق، ''البحر الرائق'' میں بزازیہ سے منقول ہے۔ پھر کہا: اگر بائنہ طلاق کے بعد رجعی طلاق دی تو وہ رجعی بھی بائنہ ہوجائے گی، کیونکہ پہلی بائنہ کے بعد رجوع ممنوع ہوجاتا ہے، جیسا کہ ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 405، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

طلاقِ بائن کا حکم یہ ہے کہ محض رجوع کافی نہیں ہوگا بلکہ باہمی رضامندی سے نئے مہر کے ساتھ تجدیدِ نکاح کرنا ہوگا، کیونکہ طلاقِ بائن کی صورت میں عدت کے دوران اور عدت کے بعد بھی سابق شوہر تجدیدِ نکاح کے ساتھ رجوع کرسکتا ہے بشرطیکہ عورت بھی راضی ہو۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

إِذَا كَانَ الطَّلَاقُ بَائِنًا دُوْنَ الثَّلَاثِ فَلَهٗ أَنْ يَّتَزَوَّجَهَا فِي الْعِدَّةِ وَبَعْدَ انْقِضَائِهَا،

ترجمہ:''اور جب طلاقِ بائن تین سے کم ہوں (یعنی ایک یا دو ہوں) تو شوہر عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد (بیوی کی رضامندی سے دوبارہ) نکاح کرسکتا ہے، (عالمگیری،

جلد:01،ص:472)۔اس کے لیے نیا مہر مقرر کرنا ہوگا، پہلا حق مہر اگر ادا نہیں کیا تھا تو اُس کی ادائیگی بھی شوہر پر واجب ہے۔ لیکن اس عقدِ ثانی کی صورت میں پہلے شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا۔ اور اگر خدانخواستہ اُس نے مستقبل میں (حسبِ صورت) ایک طلاق مزید دیدی تو سابق دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہوکر یہ تین ہوجائیں گی اور پھر تحلیلِ شرعی کے بغیر دونوں میں رجوع بالنکاح نہیں ہوسکے گا۔ عدّت کے بعد عورت آزاد ہے، جہاں چاہے اپنی مرضی سے نکاح کرسکتی ہے جب کہ کوئی مانع شرعی نہ ہو۔

آپ کا کہنا ہے کہ شوہر طلاق کا انکار کررہا ہے، قضاءً یعنی دنیوی احکام کے اعتبار سے ثبوتِ طلاق کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ شوہر خود طلاق کا اقرار کرے، دوسرا یہ کہ طلاق پر دو عادل گواہ موجود ہوں اور اگر عورت طلاق کا دعویٰ کرتی ہے، مگر شوہر منکر ہے، تو اسے قسم دی جائے گی، اگر وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ میری نیت طلاق دینے کی نہیں تھی، تو اسے قضاءً مان لیا جائے، اگر شوہر جھوٹی قسم کھاتا ہے، تو وہ گنہگار ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقیقت واقعہ کے مطابق فیصلہ ہوگا، حدیث پاک میں ہے: نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: اَلْبَیِّنَۃُ عَلَی الْمُدَّعِی وَالْیَمِیْنُ عَلَی الْمُدَّعٰی عَلَیْہِ۔ترجمہ:''کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لیے مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اس سے قسم لی جائے گی، (سنن ترمذی:1340)''۔ یعنی کسی بھی دعوے کے ثبوت کے لیے مدعی پر لازم ہے کہ وہ دو عادل مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ پیش کرے (ورنہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں) مدعیٰ علیہ اگر قبول دعویٰ کا انکار کرتا ہے، تو اسے قسم دی جائے گی، شوہر کی قسم کے بعد فیصلہ ہوگا اور اس طرح قضاءً نکاح قائم رہے گا، کیونکہ اسلامی احکام کی طرح دنیا کی کوئی بھی عدالت محض دعوائے مدعی پر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی۔ شوہر کے قسم اٹھانے کے بعد فیصلہ اُس کے حق میں دے دیا جائے گا اگر شوہر جھوٹی قسم اٹھاتا ہے تو گناہ کا وبال اُس پر ہوگا۔

توکیلِ طلاق

سوال:

میرے اپنی بیوی سے کچھ اختلافات ہوگئے، میں اپنے ایک وکیل دوست کے پاس مشاورت کے لیے گیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھے بغیر طلاق نامہ بنایا، جس میں تین طلاقیں لکھی تھیں، میں نے کہا: میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں نہیں دینا چاہتا۔ دوست کہنے لگا کہ تین طلاقیں ایک ہی ہوتی ہیں، میں نے بہت روکا اور منع کیا لیکن وہ اپنی بات پر بضد رہا، بالآخر میں نے اس کی بات کو درست سمجھتے ہوئے دستخط کردیے۔ دو دن بعد میری بیوی گھر واپس آگئی، عدت کے اندر ہم نے رجوع کرلیا، شرعی حکم بیان فرمائیں، (ڈاکٹر عبداللہ، محمود آباد)۔

جواب:

اگر صورتِ مسئولہ میں سائل کا بیان درست اور حقیقت پر مبنی ہے، تو چونکہ شوہر کا ارادہ ایک طلاق دینے کا تھا، وکیل کے زائد طلاقیں لکھنے سے وہ واقع نہیں ہوں گی۔ ایک طلاقِ رجعی واقع ہونے کا حکم دیا جائے گا اور شوہر کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل ہے، مفتی محمد عبداللہ نعیمی فتاویٰ انقرویہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

قَالَ لِلصَّکَّاکِ اُکْتُبْ طَلَاقَ اِمْرَأَتِیْ تُطَلَّقُ کَتَبَ اَوْلَمْ یَکْتُبْ وَصَحَّ فِی ''اَلْقُنْیَۃِ'' اَنَّہٗ لَایَقَعُ مَالَمْ یَکْتُبْ۔

ترجمہ: ''وثیقہ نویس سے کہا کہ میری بیوی کو طلاق لکھ دے، طلاق واقع ہوجائے گی، خواہ کاتب لکھے یا نہ لکھے اور ''قنیہ'' میں ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر کاتب نے نہ لکھا تو طلاق واقع نہیں ہوگی''۔ مزید لکھتے ہیں: لیکن کاتب حکم میں وکیل کے ہے، کاتب کو آمر کے حکم کے بغیر ایک طلاق سے زائد لکھنے کا کوئی حق نہیں ہے، (فتاویٰ مجددیہ نعیمیہ، ج1 ص: 253-254)۔ صرف ایک طلاق واقع ہوئی، بقیہ طلاقیں موثر نہیں ہیں۔

مُطلّقہ غیر حاملہ کی عدت تین حیض گزرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ

ترجمہ: ''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (عقدِ ثانی سے) روکے رکھیں، (البقرۃ:228)''۔ چونکہ عدت کے دوران آپ نے رجوع کرلیا تھا لہٰذا نکاح بدستور قائم ہے، تحلیلِ شرعی کی حاجت نہیں ہے اور آئندہ دو طلاقوں کا اختیار آپ کو حاصل ہوگا۔ خدانخواستہ آئندہ جب بھی آپ نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دے دیں، تو دونوں ایک دوسرے پر حرام ہوجائیں گے۔

غیر منقسم ترکے کے کاروبار میں ورثاء کا استحقاق

سوال:

40 سال قبل ہمارے نانا خواجہ مشتاق احمد مرحوم نے ایک دکان 3000 روپے پگڑی پر لی تھی، ماہانہ کرایہ =/250 روپے تھا۔ دو بیٹے خواجہ انور مشتاق، خواجہ عامر مشتاق ساتھ کام کرتے تھے۔ نانا کے انتقال کے بعد یہی دونوں بیٹے دکان چلاتے رہے، نانا کے انتقال کے وقت دکان میں تین لاکھ روپے مالیت کا سامان موجود تھا۔ 2000ء میں دکان کے مالک نے پگڑی ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور آفر دی کہ پانچ لاکھ روپے لے لو اور دکان چھوڑ دو یا مجھے پانچ لاکھ دے کر دکان اپنے نام کرالو۔ نانا کے دو اور بیٹے خواجہ اشفاق اور انجم مشتاق تھے۔ انور مشتاق اور عامر مشتاق نے ان دونوں سے مشورہ لیا، انہوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی، انور مشتاق اور عامر مشتاق نے مل کر پانچ لاکھ روپے ادا کیے اور دکان اپنے نام کرالی۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ دکان کا مالک کسے شمار کیا جائے گا اور بطور ترکہ تقسیم ہوگا یا نہیں؟۔

خواجہ مشتاق احمد مرحوم کی مالیت تین ہزار جمع تھی، جن کی ویلیو 2000ء میں پانچ لاکھ روپے ہوگئی، دکان میں تین لاکھ روپے کا سامان بھی تھا۔ کیا یہ مشتاق احمد کا ترکہ شمار ہوگا؟۔ اسی دکان سے ماموؤں نے کمایا، خرچ کیا، نانا کے قرضے بھی اتارے، ان سب امور کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟۔ (مولانا محمد حسن رضا قادری، الماس مسجد، عزیز آباد کراچی)۔

جواب:

باپ کی زندگی میں جو کاروبار تھا، جو بیٹے ساتھ مل کر کام کرتے تھے، وہ مال میں شریک

نہیں ہیں، تمام مال باپ کی ملکیت ہوتا ہے اور باپ کے انتقال کے بعد تمام وارثوں کا ہے، اُس میں جتنا اضافہ ہوگا، وہ ورثاء کا ہوگا۔ اگرچہ کاروبار چلانے والے چند افراد ہوں اور باقی ورثاء عملی طور پر کام نہ کررہے ہوں۔ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

يَقَعُ كَثِيرًا فِي الْفَلَّاحِينَ وَنَحْوِهِمْ أَنَّ أَحَدَهُمْ يَمُوتُ فَتَقُومُ أَوْلَادُهُ عَلَى تَرِكَتِهِ بِلَا قِسْمَةٍ وَيَعْمَلُونَ فِيهَا مِنْ حَرْثٍ وَزِرَاعَةٍ وَبَيْعٍ وَشِرَاءٍ وَاسْتِدَانَةٍ وَنَحْوِ ذٰلِكَ، وَتَارَةً يَكُونُ كَبِيرُهُمْ هُوَ الَّذِي يَتَوَلَّى مُهِمَّاتِهِمْ وَيَعْمَلُونَ عِنْدَهُ بِأَمْرِهِ، وَكُلُّ ذٰلِكَ عَلَى وَجْهِ الْإِطْلَاقِ وَالتَّفْوِيضِ۔

ترجمہ: ''اکثر کاشتکار اور دیگر (پیشوں سے وابستہ) لوگوں میں یہ ہوتا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی فوت ہوجائے، تو اُن کی اولاد ترکے کو تقسیم کیے بغیر اسی طرح قائم رکھتی ہے اور وہ اُس زمین میں کھیتی باڑی، خرید وفروخت، قرض کا لین دین اور دوسرے اُمور جاری رکھتے ہیں۔ اور کبھی فوت ہونے والے کا بڑا بیٹا تمام کاموں کی نگرانی کرتا ہے اور چھوٹے اُس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، یہ سب ایک طرح سے غیر رسمی تفویض اختیار ہوتا ہے (یعنی وہاں کے لوگوں کا عرف یا عادت ہے)''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

فَإِذَا كَانَ سَعْيُهُمْ وَاحِدًا وَلَمْ يَتَمَيَّزْ مَا حَصَّلَهُ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ بِعَمَلِهِ، يَكُونُ مَا جَمَعُوهُ مُشْتَرَكًا بَيْنَهُمْ بِالسَّوِيَّةِ، وَإِنِ اخْتَلَفُوا فِي الْعَمَلِ وَالرَّأْيِ كَثْرَةً وَصَوَابًا، كَمَا أَفْتَى بِهِ فِي ''الْخَيْرِيَّةِ''، وَمَا اشْتَرَاهُ أَحَدُهُمْ لِنَفْسِهِ يَكُونُ لَهُ وَيَضْمَنُ حِصَّةَ شُرَكَائِهِ مِنْ ثَمَنِهِ إِذَا دَفَعَهُ مِنَ الْمَالِ الْمُشْتَرَكِ، ترجمہ: ''پس جب ان کی سعی ایک ہو اور ہر ایک کی محنت کی کمائی جدا جدا نہ ہو، تو سب جمع شدہ مال میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، اگرچہ ذہنی وفکری عمل کی مقدار ایک جیسی نہ ہو، ''فتاویٰ خیریہ'' میں اسی طرح کا فتویٰ دیا ہے۔ اور ان میں سے اگر کسی نے اپنی ذات کے لیے کچھ خریدا تو وہ اُس کا مالک ہوجائے گا اور اگر اُس نے مشترکہ مال سے قیمت دے کر خریدا تھا، تو اس میں شرکاء کا جو حصہ صرف ہوا، اس کا وہ ضامن ہوگا''۔ (جلد 6، ص:372)

صورتِ مسئولہ میں اگر عامر مشتاق اور انور مشتاق نے پانچ لاکھ روپے مشترکہ کاروبار سے دے کر دکان نام کرائی ہے، تو اس رقم کو وراثت یعنی ترکے میں شامل کر کے سب ورثاء کو تناسب کے مطابق حصہ دینا ہوگا اور پانچ لاکھ روپے ادا کر کے اپنے نام کرنے سے پہلے جو دکان کی بازاری قیمت تھی، وہ رقم بھی مجموعی ترکے میں شامل کرنی ہوگی۔

خرید وفروخت
کے مسائل

ڈیلر یا کمیشن ایجنٹ کی اجرت کا تعین ضروری ہے

سوال:

زید چند لوگوں کو کہتا ہے کہ مجھے مکان یا پلاٹ خریدنا ہے، کسی کی نظر میں ہو تو بتانا۔ کسی فرد کے ذریعے زید کو مکان یا پلاٹ مل جاتا ہے، وہ از خود یا اُس شخص کے ساتھ جا کر خرید لیتا ہے، تو زید نے جتنے لوگوں کو کہا تھا، یہ سب زید کے وکیل ہو جاتے ہیں یا نہیں؟، وکیل بنانے کے لیے کس شرط کا لحاظ کیا جائے گا؟۔ زید کے رشتے دار بسا اوقات اُس پر اعتماد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں پلاٹ لے کر دیں، جبکہ زید ڈیلر نہیں ہے۔ زید ڈیلرز سے مل کر پلاٹ دلوا دیتا ہے، ڈیلر سے شرط رکھتا ہے کہ پلاٹ لینے والے سے کمیشن زید لے گا اور پلاٹ لینے والوں کو کہتا ہے کہ کمیشن ڈیلر نے لیا ہے، کیا زید کا اس طرح سے کمیشن لینا جائز ہے؟، (سجاد، ملتان)

جواب:

وکالت کا لغوی معنیٰ: ''تفویض یا سپرد کرنا، اعتماد کرنا اور اپنے کام کے لیے کسی کو نائب بنانا'' ہیں۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: اَلتَّوکِیلُ أَن تَعتَمِدَ عَلیٰ غَیرِكَ وَتَجعَلَهُ نَائِبًا عَنكَ، ترجمہ: ''توکیل کسی دوسرے شخص پر اعتماد کرنا اور اُسے اپنے کام کا نائب بنانا ہے''۔ (المفردات، ص:569)

مذکورہ عمل سے کوئی شخص وکیل نہیں بنے گا، کیونکہ زید نے محض اتنی بات کی تھی کہ جس کسی کی نظر میں کوئی مکان یا پلاٹ ہو تو زید کو آگاہ کرے۔ جبکہ وکیل بنانے کے لیے لازم ہے کہ مذکورہ کام وکیل کے سپرد کر دیا جائے اور خریدنے کا اختیار دیا جائے، خریدی جانے والی شے کی صفت بیان کی جائے اور ثمن واضح کیا جائے۔ وکیل کے لیے عاقل وبالغ ہونا شرط ہے۔

زید کا پلاٹ لینے والوں کے علم میں لائے بغیر کمیشن لینا غبن ہے۔ اگر زید پلاٹ لینے والوں کو بتا کر اپنا کمیشن رکھتا ہے اور پلاٹ لینے والے اس پر رضامندی بھی ظاہر کر دیتے

ہیں، تو زید کے لیے یہ منافع جائز ہے۔ جواز کی صورت یہ ہوگی کہ زید پلاٹ لینے والوں کا وکیل بنے اور اُجرت طے کرلے، اس صورت میں وکالت کا معاملہ اجارہ کی طرح ہو جائے گا۔ شرح المجلۃ میں ہے:

اِذَا اشْتُرِطَتِ الْاُجْرَۃُ فِی الْوَکَالَۃِ وَاَوْفَاھَا الْوَکِیْلُ یَسْتَحِقُّھَا وَاِنْ لَمْ تَشْتَرِطْ وَلَمْ یَکُنِ الْوَکِیْلُ مِمَّنْ یَخْدِمُ بِالْاُجْرَۃِ یَکُوْنُ مُتَبَرِّعًا وَلَیْسَ لَہٗ مُطَالَبَتُہٗ بِاُجْرَۃٍ

ترجمہ: ''جب وکالت میں اُجرت کی شرط لگادی ہو اور وکیل نے اپنی ذمہ داری پوری کردی ہو، تو وہ اُجرت کا مستحق ہو جائے گا اور اگر اُجرت کی شرط نہ کی ہو اور کسی شخص کو اجرت پر وکیل نہ مقرر کیا ہو (اور وہ کوئی تعاون کرے) تو وہ بطور تبرُّع ہوگا اور اس کے لیے اپنی خدمت (یا تعاون) پر اجرت کا مطالبہ جائز نہیں ہوگا''۔ (مادہ: 1467، جلد 4، ص: 445)

نوٹ: تبرُّع کا انگلش مُتبادل ہے: Voluntarily، یعنی بلا معاوضہ کوئی چیز یا مال دینا یا کوئی خدمت بجالانا، اسی کو فضل واحسان بھی کہتے ہیں۔

زید اگر یہ خدمت ڈیلر یا ایجنٹ کے طور پر بجالانا چاہتا ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی خدمت اور اس کی اجرت کو مؤکل پر واضح کرے، اسے مخفی یا مجہول نہ رکھے، بلکہ معلوم اور معین ہونا ضروری ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ ''اجارۂ فاسدہ'' کے بیان میں لکھتے ہیں:

اَلْفَسَادُ قَدْ یَکُوْنُ لِجَھَالَۃِ قَدْرِ الْعَمَلِ بِاَنْ لَّا یُعَیِّنَ مَحَلَّ الْعَمَلِ وَقَدْ یَکُوْنُ لِجَھَالَۃِ قَدْرِ الْمَنْفَعَۃِ بِاَنْ لَّا یُبَیِّنَ الْمُدَّۃَ وَقَدْ یَکُوْنُ لِجَھَالَۃِ الْبَدَلِ۔

ترجمہ: ''اور کبھی اجارہ کام کی مقدار کے مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے، اس طور پر کہ کام کی جگہ مقرر نہ ہو اور کبھی منفعت کی مقدار مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے کہ مدت بیان نہ کی گئی ہو اور کبھی بدل یعنی معاوضے کے مجہول ہونے کے سبب فاسد ہو جاتا ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص: 439)

صحیح بخاری میں سمسار (کمیشن ایجنٹ) کے ساتھ عقد کے جواز کی ایک صورت اثر

عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کہے کہ" بِعْ ھٰذَا الثَّوبَ، فَمَازَادَعَلیٰ کَذَا وَکَذَا فَھُوَلَکَ "یعنی یہ کپڑا اتنے میں بیچ دو، اس سے زیادہ جو رقم تمہیں ملے وہ تمہاری ہے۔ ابن سیرین تابعی نے کہا کہ: اِذَا قَالَ بِعہُ بِکَذَا، فَمَا کَانَ مِن رِبحٍ فَھُوَلَکَ، أَوْ بَینِی وَبَینَکَ، فَلَا بَاسَ بِہٖ ترجمہ: "ایک شخص نے (کمیشن ایجنٹ) سے یہ کہا کہ یہ چیز اتنے میں بیچ دو، اس سے زیادہ جو نفع ملے، وہ تمہارا ہے یا ہم دونوں نصف نصف کے حق دار ہوں گے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، (صحیح البخاری: 2274)"۔ تو جہاں یہ عرف رائج ہو تو بطور استحسان یہ جائز ہے۔

عقدِ مُضارِبت میں نفع میں کمی بیشی پر اختلاف

سوال:

میرے چھوٹے بھائی نے 2014ء میں ایک دوست کے ساتھ کاروبار میں تقریباً 40 لاکھ روپے کیش اور پے آرڈر کی صورت میں انویسٹ کیے زبانی یہ طے پایا کہ نفع ونقصان کی صورت میں 50/50 کا حصہ ہوگا۔ کاروبار میں تقریباً رقم ہماری تھی، یہ کاروبار مویشی منڈی سہراب گوٹھ میں کار پارکنگ کے ٹھیکے کی مد میں عید الفطر سے عید الاضحیٰ تک ہوتا ہے، اس کاروبار میں تمام اخراجات کرنے کے بعد اچھا خاصا نفع حاصل ہوا۔ جب میرے بھائی نے حساب کتاب کی بات کی، تو اس نے کہا کہ جو نفع ہوا ہے، اُس کا 60% میں لوں گا اور 40% تمہیں دوں گا (نفع سے حاصل ہونے والی کچھ رقم ادا بھی کی)۔ کام کے دوران ہونے والی آمدنی کی رقم میرے پاس لکھی ہوئی ہے، مگر اخراجات کی تفصیل میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے تفصیل کا کہا تو اس نے کہا: دکھادوں گا، دو سال کا عرصہ ہوچکا ہے، آج تک معاملہ اٹکا ہوا ہے۔ شرعی اعتبار سے کیا حکم ہے؟،

(فرخ ظفر، جنگ گروپ، کراچی)

جواب:

آپ نے جو صورت بیان کی ہے، یہ مُضاربت کا عقد ہے۔ اس میں ایک فریق کا

سرمایہ ہوتا ہے اور وہ رَبُّ المال (Capital Provider) کہلاتا ہے اور دوسرے فریق کی محنت ہوتی ہے اور وہ مُضارِب (Working Partner) کہلاتا ہے۔ عقدِ مُضاربت کے وقت نفع میں جو تناسب طے ہو، دونوں اس کے پابند ہوتے ہیں، البتہ اگر رَبُّ المال تبرُّع اور فضل واحسان کے طور پر مضارب کو کچھ زیادہ دینا چاہے، تو وہ ایسا کرسکتا ہے، اگر تناسب کے بارے میں فریقین میں اختلاف ہو تو ربُّ المال کا قول معتبر ہوگا، (عالمگیری، جلد 4، ص:324)۔ معاملات میں تحریری دستاویز مُرتب کرنی چاہیے تاکہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو، اس حوالے سے قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی آیتِ مداینہ میں واضح احکامات موجود ہیں۔ شرعی حکم یہی ہے کہ آخرت کی جوابدہی اور خداخوفی کے جذبے سے فریقین کو اپنا معاملہ خوش اسلوبی سے طے کرلینا چاہیے اور مُضارِب کو آپ کی رقم منافع کے حصے سمیت پوری پوری دے دینی چاہیے اور اگر کوئی نزاع ہے تو اسے طے کرنے کے لیے آپ لوگ دو دیانت دار کاروباری حضرات کو، جو اس کاروبار کی نوعیت اور طریقۂ کار سے واقف ہوں، ثالث اور حکم بنالیں اور ان کا فیصلہ برضا ورغبت تسلیم کریں۔ شرعی معاونت کے لیے آپ دونوں کسی مفتی سے رجوع کرسکتے ہیں۔

بیع بالتقسیط کی ایک صورت

سوال:

میں اپنی گاڑی دس لاکھ روپے میں فروخت کرنا چاہتا ہوں، ایک صاحب نے مجھے آفر دی کہ پانچ لاکھ ابھی لے لیں اور دو ماہ بعد مزید ساڑھے پانچ لاکھ روپے لے لیں، کیا یہ شرعاً جائز ہے؟، (میاں محمد فرحان رفیع، یوکے)۔

جواب:

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے، اسے ''بیع بالتقسیط'' (یعنی قسطوں پر خرید وفروخت) کہتے ہیں۔ لیکن اس کے جواز کی شرط یہ ہے کہ ایک قیمت (مثلاً آپ کی بیان کی ہوئی صورت میں ساڑھے پانچ لاکھ روپے) پر عاقدین (بائع ومشتری) کا اتفاق ہو

جائے، یہ نہ ہو کہ بائع کہے کہ نقد پانچ لاکھ روپے ہے اور اُدھار ساڑھے پانچ لاکھ روپے ہے۔ یہ بیع مؤجّل ہے اور اس میں مَبیع (Sold Item) بائع کی ملک میں دے دی جاتی ہے اور یکمشت یا قسطوں میں قیمت کی ادائیگی کے لیے مدت طے کرلی جاتی ہے اور اسلام ایفائے عہد کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے خریدار قیمت بروقت ادا نہ کرسکے تو اضافی مدت کے عوض قیمت نہیں بڑھائی جائے گی، ورنہ یہ سود شمار ہوگا۔

کسی شراکت دار کے لیے نفع کے حصے میں باہمی رضامندی سے اضافہ

سوال:

میں ایک کمپنی میں اکاؤنٹنٹ ہوں، کمپنی کے شیئر ہولڈرز کی تعداد 600 ہے، کمپنی قانون کے مطابق کم از کم سات ڈائرکٹرز منتخب کیے جاتے ہیں جو قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے کمپنی کے معاملات چلانے کے مختار ہوتے ہیں۔ ہماری کمپنی میں سات ڈائرکٹرز ہیں، دو ورکنگ اور پانچ نان ورکنگ ان کی ذمے داریوں، تجربہ اور قابلیت کی بنیاد پر تنخواہ مقرر کی جاتی ہے۔ ورکنگ ڈائرکٹرز کی تنخواہ دولاکھ روپے مقرر کی ہے، تو یہ ڈائرکٹر پانچ لاکھ روپے وصول کررہے ہیں اور کھاتوں میں تین لاکھ کی زائد رقم کو تنخواہ کے بجائے دیگر اخراجات کی مد میں لکھا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ غلط ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہماری مارکیٹ ویلیو یہی ہے اور اگر یہ غلط ہے تو آپ درست طریقے سے ہمیں پانچ لاکھ روپے ادا کریں، ہمیں تو اتنے ہی لینے ہیں۔ ان ڈائرکٹرز نے مزید بتایا کہ دیگر ڈائرکٹرز کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کھاتوں میں غلط اندراج اس لیے کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کا متعلقہ ادارہ اعتراض کرسکتا ہے۔ مزید عرض یہ ہے کہ یہ ڈائرکٹرز آپس میں رشتے دار ہیں۔ سال کے اختتام پر شیئر ہولڈرز کے سامنے حسابات تصدیق کے لیے رکھے جاتے ہیں، تو یہ تصدیق بھی کرلیے جاتے ہیں، کیونکہ کسی کو بھی نہیں معلوم کہ کیا ہورہا ہے۔

مزید عرض یہ ہے کہ اگر گورنمنٹ کے متعلقہ ادارے کی دخل اندازی کو نظر انداز کردیا جائے اور معاملہ کمپنی کے شیئر ہولڈرز کے اجلاس میں منظوری کے لیے پیش کیا جائے تو چونکہ

ورکنگ ڈائرکٹرز اوران کی فیملی کے پاس کمپنی کے 70 فیصد شیئرز ہیں، آسانی سے ان کے حق میں فیصلہ ہوسکتا ہے، لیکن گورنمنٹ کے متعلقہ ادارے کے خوف سے وہ ایسانہیں کر رہے۔سوال یہ ہے کہ: کیاورکنگ ڈائرکٹرز کا زائد رقم لینا جائز ہے؟، میرے لیے کیااحکام ہیں؟۔(محمد عاطف راؤ، لاہور)۔

جواب:

مذکورہ ڈائرکٹرز کا زائد تنخواہ لینا جائز نہیں ہے، کھاتوں میں غلط اندراج کرنا دھوکا دہی اور فریب کے زمرے میں آتا ہے، جوشرعاً حرام اور ناجائز ہے، حدیث مبارک میں اس کی شناعت کو یہ بیان فرمایا: مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا ترجمہ:''جس نے ہمیں دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں''۔(صحیح مسلم:279)

ورکنگ ڈائرکٹرز کی جوتنخواہ مقرر کی گئی ہے، اُس سے زائد لینا غبن ہے، حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ اَبِيْهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰى عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقًا فَمَا اَخَذَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ غُلُوْلٌ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کسی کو ہم کسی کام کے لیے مقرر کریں اور اُسے اُس کی اُجرت ادا کردیں، تو اپنی اجرت کے علاوہ وہ جو کچھ بھی لے گا، وہ غبن کے زمرے میں آئے گا''۔

(سنن ابوداؤد:2941)

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ، رَفَعَهُ، قَالَ: اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ: اَنَا ثَالِثُ الشَّرِيْكَيْنِ، مَالَمْ يَخُنْ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ، فَاِذَا خَانَهُ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزّوجل فرماتا ہے:''دوشریکوں کا ثالث میں ہوتا ہوں، جب تک اُن میں سے کوئی خیانت

نہ کرے اور جب خیانت کرتا ہے تو ان سے جدا ہو جاتا ہوں''۔ (سنن ابوداؤد: 3381)

آپ کے بقول ورکنگ ڈائرکٹر اور نان ورکنگ ڈائرکٹر 70 فیصد شیئر ہولڈر ہیں، لیکن 30 فیصد شیئرز یقیناً دوسرے لوگوں کے ہوں گے، کل منافع سے اُن کا بھی حصہ ہوتا ہے، جو اخراجات میں غلط اندراج کے بعد غبن کیا جارہا ہے، اگر یہ زائد لی جانے والی رقم منافع میں شامل رہے تو 30 فیصد شیئر ہولڈرز کے نفع میں بھی اضافے کا سبب بنے گا، جو نہ دینا اُن کی حق تلفی ہے۔

شریک کو علیحدہ سے تنخواہ لینے کا حق نہیں، یہ ہوسکتا ہے کہ کسی شریک کا کاروبار میں حصہ کم ہو لیکن شرحِ منافع اُسے زیادہ دی جائے، کیونکہ وہ کاروبار میں دوسرے شرکاء کے مقابلے میں زیادہ مہارت رکھتا ہے یا دوسرے شرکاء کی بہ نسبت زیادہ وقت دیتا ہے، تو اُس کے لیے شرحِ منافع زیادہ طے کی جاسکتی ہے، جیسا کہ فقہ حنفی کی معروف کتاب ''المجلۃ الاحکام العدلیہ'' میں ہے:

يَتَقَوَّمُ الْعَمَلُ بِالتَّقْوِيْمِ أَىْ اَنَّ الْعَمَلَ يَتَقَوَّمُ بِتَعْيِيْنِ الْقِيْمَةِ، وَيَجُوْزُ أَنْ يَكُوْنَ عَمَلُ شَخْصٍ أَكْثَرَ قِيْمَةً بِالنِّسْبَةِ إِلٰى عَمَلِ شَخْصٍ آخَرَ مَثَلًا إِذَا كَانَ رَأْسُ الْمَالِ مَالَ الشَّرِيْكَيْنِ فِي شَرِكَةِ عِنَانٍ مُتَسَاوِيًا وَكَانَ مَشْرُوْطًا عَمَلَ كِلَيْهِمَا فَإِذَا شُرِطَ لِأَحَدِهِمَا حِصَّةٌ زَائِدَةٌ فِي الرِّبْحِ جَازَ، لِأَنَّهُ يَجُوْزُ أَنْ يَكُوْنَ أَحَدُهُمَا أَكْثَرَ مَهَارَةً مِنَ الْآخَرِ فِي الْبَيْعِ وَالشِّرَاءِ وَعَمَلُهُ أَزْيَدُ وَأَنْفَعُ۔

ترجمہ: ''کام بھی ان چیزوں میں سے ہے، جن کی قیمت مقرر کی جاتی ہے یعنی عمل کی باقاعدہ قیمت مقرر کی جاسکتی ہے، اس لیے یہ جائز ہے کہ ایک شخص کا عمل (اُس کی پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے) دوسرے شخص کے عمل سے زیادہ قیمتی قرار پائے۔ مثلاً دو شراکت داروں نے ایک شرکت قائم کی، سرمایہ دونوں کا برابر تھا اور یہ بھی شرط تھی کہ دونوں کام کریں گے، اُس کے باوجود اگر معاہدۂ شرکت میں یہ شرط بھی رکھ دی جائے کہ ایک شریک، منافع میں سے زائد حصہ لے گا، تو یہ شرط جائز ہوگی۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایک شریک دوسرے کے بہ نسبت

خرید وفروخت میں زیادہ مہارت رکھتا ہو اور اس کا کام زیادہ نفع بخش ہو، (مجلۃ الاحکام العدلیہ، مادہ:1345)''۔مختصر یہ کہ کسی شراکت دار کا نفع میں حصہ اس کی محنت وصلاحیت کے پیشِ نظر زیادہ مقرر کیا جاسکتا ہے، الگ سے تنخواہ مقرر کرنا ناجائز ہے۔

آپ کی ذمے داری ہے کہ شرعی احکام مذکورہ بورڈ آف ڈائرکٹرز کے علم میں لائیں اور اُنہیں آمادہ کریں کہ ورکنگ ڈائرکٹرز کے لیے نفع کے تناسب میں جائز طریقے سے زیادہ حصہ مقرر کیا جاسکتا ہے، علیحدہ سے تنخواہ مقرر نہیں کی جائے گی۔ آپ حقائق اُن کے علم میں لاکر اپنا فریضہ ادا کردیں، نیز اگر کسی دوسری جگہ شفاف ملازمت دستیاب ہوتو مذکورہ ملازمت چھوڑ دیں۔

حق شفعہ میں ترجیح شریک کا حق پڑوسی پر مُقدّم ہے

سوال:

ضلع قلات بلوچستان میں ایک اراضی کے اصل مالکان دو بلوچ قبیلے (سیاہ پاد اور سوپک) ہیں، یہ فریقِ اول ہیں اور یہ ان کی مشترکہ زمین تھی۔ پھر دونوں نے اس شرط پر فریقِ دوم گرگناڑی قبیلے کو دی کہ اس بنجر زمین کو اپنے خرچ اور محنت سے آباد کریں، بارہواں حصہ ہمارا ہوگا اور گیارہ حصے زمین مع منافع تمہارا ہوگا۔فریق دوم گرگناڑی نے یہ زمین فریقِ سوم محمد صالح گورانجو کو اس طور پر دی کہ تم اسے آباد کرو، نفع کا نصف حصہ تمہارا ہوگا۔ پھر فریقِ سوم محمد صالح نے فریقِ دوم کی اجازت اور موجودگی میں فریق اول کے پورے حصے کو خریدا۔اس کے بعد کئی سال گزر گئے، محمد صالح گورانجو کا بھی انتقال ہوگیا۔ بعدازاں پھر اس کے بیٹوں اور بھتیجوں نے فریقِ دوم گرگناڑی سے ان کے حصے کا 16واں حصہ خریدا۔اس کے چار ماہ بعد ایک شخص عبدالواحد بن وڈیرہ محمد ساسولی نے حق شفعہ کا دعویٰ کیا۔ چالیس سال قبل جب فریقِ سوم محمد صالح نے فریقِ اول کے حصے کو خریدا تھا اس وقت عبدالواحد کے والد محمد ساسولی نے حق شفعہ کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔کیا عبدالواحد ساسولی شفعہ کا حق رکھتا ہے؟۔جس زمین میں کوئی پہلے شفعہ کا دعویٰ کرے، شرعی وقانونی طریقے

سے عدالت سے شفعہ حاصل نہ ہو تو کیا اب وہ حق ملکیت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔
(عبدالرسول، پرانا گولیمار کراچی)

جواب:

غیر منقول جائیداد کو کسی شخص نے جتنی رقم کے عوض خریدا، اُتنے ہی میں اُس جائیداد کے مالک ہونے کا حق جس دوسرے شخص کو حاصل ہو جاتا ہے، اُسے شریعت کی اصطلاح میں ''شفیع'' اور اُس حق کو ''حقِ شُفعہ'' کہتے ہیں۔

شُفعہ کا حق غیر منقولہ جائیداد (Immovable Property) میں ہوتا ہے، یعنی جب کوئی شخص اپنی ملکیتی زمین کو فروخت کرنا چاہے، تو پہلے اپنے شفیع (Preemptor/Intercessor) کو پیشکش کرے کہ آیا وہ اِسے خریدنا چاہتا ہے، اگر وہ خریدنا چاہتا ہے، تو بازاری قیمت یا طے شدہ قیمت پر اُسے دیدے، یعنی اُس کا حق کسی بھی دوسرے خریدار پر مُقدّم ہے۔

اگر زمین کا مالک اُس (شفیع) کو نظر انداز کر کے یا اُس کی لاعلمی میں کسی اور شخص پر اپنی زمین فروخت کرتا ہے، تو اُسی قیمت پر شفیع کو اُس زمین کے لینے کا جبری (Bounden/Compulsory) حق حاصل ہے، یعنی بائع (Seller) کی مرضی کے برعکس وہ اِسے خرید لے گا اور دوسرے خریدار کی بیع کالعدم ہو جائے گی۔ تفصیلی دلائل درجِ ذیل ہیں:

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد العینی لکھتے ہیں:

وَقِیْلَ:ھِیَ تَمَلُّكُ الْعَقَارِ عَلٰی مُشْتَرِیْهِ جَبْرًا بِمِثْلِ ثَمَنِهٖ،وَقَالَ أَصْحَابُنَا: اَلشُّفْعَةُ تَمَلُّكُ الْبُقْعَةِ جَبْرًا عَلَی الْمُشْتَرِیْ بِمَا قَامَ عَلَیْهِ۔ وَقِیْلَ:ھِیَ ضَمُّ بُقْعَةٍ مُشْتَرَاةٍ اِلٰی عَقَارِ الشَّفِیْعِ بِسَبَبِ الشَّرِکَةِ أَوِ الْجِوَارِ،وَھٰذَا أَحْسَنُ،

ترجمہ: ''ایک قول کے مطابق کسی مشتری نے جو زمین خریدی ہے، اُسی قیمت پر پڑوسی کو جبراً مالک بننے کا جو حق حاصل ہوتا ہے، اُسے شفعہ کہتے ہیں۔ ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ

خریدار کو اس کا معاوضہ دے کر اس کی خریدی ہوئی زمین جبراً ملکیت کے حق کو شفعہ کہتے ہیں۔ایک تعریف (یوں کی جاتی) ہے: ''شرکت یا پڑوس کی بنا پر خریدی ہوئی زمین کے ٹکڑے کو شفیع کا اپنی زمین کے ساتھ ملانا اور یہ (تعریف) زیادہ اچھی ہے''۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد 12، ص:101)

شُفعہ کی تعریف میں تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

وَشَرْعًا: تَمْلِيْكُ الْبُقْعَةِ جَبْرًا عَلَى الْمُشْتَرِي بِمَا قَامَ عَلَيْهِ بِمِثْلِهِ لَوْمِثْلِيًا، وَاِلَّا فَبِقِيْمَتِهِ (وَسَبَبُهَا اِتِّصَالُ مِلْكِ الشَّفِيْعِ بِالْمُشْتَرَىٰ) بِشَرِكَةٍ أَوْجِوَارٍ۔

ترجمہ:''شریعت میں شفعہ کے معنیٰ ہیں: خریدار کو ایک حصہ جس ثمنِ مثلی یا قیمت میں پڑا ہو، اُس حصہ کا جبراً کسی کو مالک بنانا ''شفعہ'' ہے اور اس کا سبب شفیع کی ملک کا فروخت شدہ زمین کے ساتھ اتصال ہے، خواہ شرکت کی وجہ سے اتصال ہو یا جوار (پڑوس) کی وجہ سے''۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، ص:261-260)

شُفعہ کب، کہاں اور کسے حاصل ہوتا ہے: حدیثِ پاک میں ہے:

(۱)عَنْ عَمْرِوبْنِ الشَّرِيْدِ قَالَ: وَقَفْتُ عَلَى سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ،فَجَاءَ الْمِسْوَرُ بْنُ مَخْرَمَةَ، فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَى اِحْدَى مَنْكِبَيَّ، اِذْجَاءَ أَبُو رَافِعٍ مَوْلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَاسَعْدُ اِبْتَعْ مِنِّي بَيْتَيَّ فِي دَارِكَ، فَقَالَ سَعْدٌ: وَاللهِ مَاأَبْتَاعُهُمَا، فَقَالَ الْمِسْوَرُ: وَاللهِ لَتَبْتَاعَنَّهُمَا، فَقَالَ سَعْدٌ: وَاللهِ لَاأَزِيْدُكَ عَلَى أَرْبَعَةِ آلَافٍ مُنَجَّمَةً،أَوْمُقَطَّعَةً،قَالَ أَبُورَافِعٍ: لَقَدْ أُعْطِيْتُ بِهَا خَمْسَمِائَةِ دِيْنَارٍ، وَلَوْلَاأَنِّي سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: اَلْجَارُ أَحَقُّ بِسَقَبِهِ،مَا أَعْطَيْتُكَهَا بِأَرْبَعَةِ آلَافٍ وَأَنَا أُعْطَى بِهَا خَمْسَمِائَةِ دِيْنَارٍ، فَأَعْطَاهَااِيَّاهُ۔

ترجمہ:''عمرو بن شرید بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس کھڑا ہوا تھا، اسی اثنا میں حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ آئے، پس انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ایک کندھے پر رکھا، اسی وقت نبی ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ

آئے، تو انہوں نے کہا: اے سعد! تم مجھ سے اپنی حویلی کے دو گھر خرید لو، حضرت سعد نے کہا: اللہ کی قسم! میں ان دو گھروں کو نہیں خریدوں گا، حضرت مسور بن مخرمہ نے کہا: اللہ کی قسم! تم ان دو گھروں کو ضرور خریدو گے، تب حضرت سعد نے کہا: اللہ کی قسم! میں تم کو ان گھروں کے عوض چار ہزار درہم قسط وار سے زیادہ نہیں دوں گا، حضرت ابورافع نے کہا: مجھے ان گھروں کے عوض پانچ سو دینار مل رہے ہیں اور اگر میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ پڑوسی اپنے پڑوس کی وجہ سے خریدنے کا زیادہ حق دار ہے، تو میں تم کو یہ چار ہزار درہم کے عوض فروخت نہ کرتا جب کہ مجھے ان کے عوض پانچ سو دینار مل رہے ہیں پھر اُنہوں نے حضرت سعد کو وہ گھر فروخت کر دیئے''۔ (صحیح بخاری: 2258)

اس سے صحابیِ رسول کی خداخوفی کا پتا چلتا ہے کہ جس جائیداد کے انہیں پانچ سو دینار مل رہے ہیں، اُسے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں چار ہزار درہم میں فروخت کر رہے ہیں اور ایک ہزار درہم کا نقصان برداشت کر رہے ہیں، لیکن ان کی نظر میں ارشاد نبوی کی تعمیل کی اہمیت اس رقم سے بہت زیادہ ہے۔

(۲) عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: اَلْجَارُ أَحَقُّ بِشُفْعَتِهِ وَيُنْتَظَرُ بِهِ اِنْ كَانَ غَائِبًا اِذَا كَانَ طَرِيْقُهُمَا وَاحِدًا۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پڑوسی اپنے پڑوس میں شُفعہ کرنے کا زیادہ حق دار ہے، اگر وہ غائب ہو تو اس کا انتظار کیا جائے گا، جبکہ اُن کا راستہ ایک ہو''۔ (سُنن ترمذی: 1369)

(۳) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَضٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِيْ كُلِّ مَالَمْ يُقْسَمْ، فَاِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ، وَصُرِّفَتِ الطُّرُقُ، فَلَا شُفْعَةَ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ ہر غیر منقسم (Undivided) چیز میں شُفعہ ہے اور جب حدود واقع ہو گئیں اور راستے تقسیم ہو گئے، تو اب شُفعہ نہیں (یعنی شرکت کی وجہ سے جو شُفعہ تھا، وہ اب

نہیں رہا)''۔(صحیح بخاری:2257)

(۴) عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِي كُلِّ شِرْكَةٍ لَمْ تُقْسَمْ، رَبْعَةٍ أَوْحَائِطٍ، لَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يَبِيعَ حَتَّى يُؤْذِنَ شَرِيكَهُ، فَإِنْ شَاءَ أَخَذَ، وَإِنْ شَاءَ تَرَكَ، فَإِذَا بَاعَ وَلَمْ يُؤْذِنْهُ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ۔

ترجمہ:''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہر شرکت والے غیر منقسم مکان یا باغ میں رسول اللہ ﷺ نے شُفعہ کا فیصلہ فرمایا، اس کو شریک سے اجازت لیے بغیر فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اگر وہ (شریک) چاہے تو لے لے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے، پھر اگر وہ شریک کو خبر دیے بغیر فروخت کر دے، تو شریک اُس کا زیادہ حق دار ہے''۔

(صحیح مسلم:4104)

حقِ شُفعہ اتّصال کے سبب حاصل ہوتا ہے اور اتصال میں تین فریق شامل ہیں:

(۱) جس کی عینِ مبیع میں شرکت ہو۔(۲) شرکت تھی، اب بٹوارا ہوگیا لیکن راستے اور پانی میں شراکت باقی ہے۔(۳) پڑوسی

علامہ برہان الدین ابوبکر علی بن حسن الفرغانی حنفی لکھتے ہیں:

قَالَ: اَلشُّفْعَةُ وَاجِبَةٌ لِلْخَلِيطِ فِي نَفْسِ الْمَبِيعِ، ثُمَّ لِلْخَلِيطِ فِي حَقِّ الْمَبِيعِ، كَالشِّرْبِ وَالطَّرِيقِ، ثُمَّ لِلْجَارِ، أَفَادَ هٰذَا اللَّفْظُ ثُبُوتَ حَقِّ الشُّفْعَةِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْ هٰؤُلَاءِ، وَأَفَادَ التَّرْتِيبَ۔

ترجمہ:''(صاحب ''بدایۃ المبتدی'' نے) فرمایا: نفسِ مبیع میں جو شریک ہے، شُفعہ اُس کے لیے ثابت ہے، پھر جو حقِ مبیع میں شریک ہے، اُسے شُفعہ کا حق حاصل ہے، جیسے پانی کا گھاٹ یا کنواں اور راستہ مشترک ہو، پھر پڑوسی کے لیے، اس لفظ (ثُمَّ) نے ان میں سے ہر ایک کے لیے حقِ شُفعہ کا فائدہ دیا اور ترتیب کا بھی فائدہ دیا''۔(ہدایہ، جلد 7، ص:3)

یعنی تینوں کا حق شُفعہ مساوی درجے میں نہیں ہے بلکہ اسی ترتیب کے مطابق ہے۔
جس کا عینِ مبیع میں حصہ ہو، اُسے ''شریک'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور جس کا حقوقِ مبیع میں

اشتراک ہو، اُس کو ''خلیط'' اور پڑوسی کو ''شفیع'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔مزید لکھتے ہیں:

وَأَمَّا التَّرْتِيبُ، فَلِقَوْلِهِ ﷺ: اَلشَّرِيكُ أَحَقُّ مِنَ الْخَلِيطِ، وَالْخَلِيطُ أَحَقُّ مِنَ الشَّفِيعِ، فَالشَّرِيكُ فِي نَفْسِ الْمَبِيعِ، وَالْخَلِيطُ فِي حُقُوقِ الْمَبِيعِ، وَالشَّفِيعُ هُوَالْجَارُ، وَلِأَنَّ الاِتِّصَالَ بِالشَّرِكَةِ فِي الْمَبِيعِ أَقْوٰى، لِأَنَّهُ فِي كُلِّ جُزْءٍ، وَبَعْدَهُ الاِتِّصَالُ فِي الْحُقُوقِ، لِأَنَّهُ شَرِكَةٌ فِي مَرَافِقِ الْمِلْكِ، وَالتَّرْجِيحُ يَتَحَقَّقُ بِقُوَّةِ السَّبَبِ، وَلِأَنَّ ضَرَرَ الْقِسْمَةِ إِنْ لَمْ يَصْلُحْ عِلَّةً صَلَحَ مُرَجِّحًا۔

ترجمہ: ''بہرحال نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق (حق شفعہ) میں ترتیب یہ ہے کہ شریک خلیط سے زیادہ حق دار ہے اور خلیط شفیع سے زیادہ حق دار ہے، شریک نفس مبیع میں ہے اور خلیط حقوقِ مبیع (جیسے راستہ، پانی وغیرہ) میں اور شفیع پڑوسی ہے اور اس لیے مبیع میں شرکت کی صورت میں اتصال زیادہ قوی ہے کہ یہ ہر جُزء میں ہے اور اس کے بعد حقوق میں اتصال ہے، اس لیے کہ یہ منافع ملک میں اتصال ہے اور ترجیح سبب کی قوت سے پیدا ہوتی ہے اور تقسیم کا نقصان اگرچہ علت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، (مگر) ترجیح دینے (Preference) کی صلاحیت تو رکھتا ہے''۔(ہدایہ، جلد 7، ص:6)

خلیط سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کی اپنی ملکیتی زمین اس زمین کے ساتھ ملی ہوئی ہے، جس پر شفعہ کیا جارہا ہے، کیونکہ یہ دونوں زمین سے متعلق حقوق (مثلاً راستہ، پانی کا کنواں یا نالی وغیرہ) میں شریک ہوتے ہیں۔یعنی اصل سبب اِتّصال (Adjacency) یعنی باہم ملا ہوا ہونا ہے، تو اِتّصال جس قدر قوی ہوگا، شُفعہ کی بنا پر خریداری کا جبری حق بھی اُتنا ہی قوی ہوگا اور ملکیت میں شرکت کا اتصال حقوق میں شرکت سے زیادہ ہے۔

علامہ برہان الدین ابوبکر علی بن حسن الفرغانی حنفی نے شُفعہ کے متعلق جو لکھا ہے، آسان الفاظ میں اُس کا مفہوم درج ذیل ہے:

(۱) ایک شخص زمین کی ملکیت میں شریک ہے اور اُس کا دوسرا شریک اپنا حصہ فروخت کرنا چاہتا ہے، تو اِس شریک کا حق سب سے مُقدّم ہے۔

(۲) ایک شخص فروخت کی جانے والی زمین کی ملکیت میں تو شریک نہیں ہے، لیکن اس کی زمین اس کے ساتھ متصل ہے اور اس بنا پر دونوں کا راستہ مشترک ہے یا پانی کا کنواں یا گھاٹ مشترک ہے، تو اسے فقہ کی اصطلاح میں ''خلیط'' کہتے ہیں۔ شریک کے بعد بطور شفیع پھر اُس خلیط کا حق مُقدّم ہے، یعنی یہ اصل مبیع میں تو شراکت نہیں ہے لیکن حقوق ومنافع میں شراکت ہے۔

(۳) ایک شخص کی زمین دوسرے شخص کی زمین کے ساتھ متصل ہے، نہ ملکیت میں شراکت ہے اور نہ حقوق ومنافع میں، بس صرف پڑوس کی بنا پر اُس کی زمین دوسرے شخص کی زمین کے ساتھ ملی ہوئی ہو اور وہ اُسے فروخت کرنا چاہتا ہے، تو پھر کسی بھی دوسرے غیر متعلق خریدار کے مقابلے میں حقِ اتصال کی بنا پر اُس پڑوسی کا حق مُقدّم ہے، خواہ فروخت کرنے والے کی مرضی ہو یا نہ ہو، اسی بنا پر اس حق کو جبری یا اجباری کہا جاتا ہے، یعنی یہ بائع کی مرضی کے برعکس بھی نافذ ہوجاتا ہے اور کسی بھی دوسرے شخص کے ساتھ اُس کی بیع کالعدم ہوجاتی ہے۔

آپ کے بیان کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ سیاہ پاد اور سوپک فریقِ اول ہیں اور یہ ان کی مشترکہ زمین تھی۔ پھر فریقِ دوم گرگناڑی قبیلے کے توسط سے فریقِ سوم محمد صالح گورانجو کو اس طور پر دی کہ تم اسے آباد کرو، نفع کا نصف حصہ تمہارا ہوگا۔ پھر فریقِ سوم محمد صالح نے فریقِ دوم کی اجازت اور موجودگی میں فریقِ اول کے پورے حصے کو خریدا۔ اب عینِ مبیع میں سیاہ پاد، سوپک اور گرگناڑی اور فریقِ سوم صالح محمد گورانجو شریک ہیں، صالح محمد گورانجو کے بیٹوں اور بھتیجوں نے فریقِ دوم گرگناڑی سے ان کے حصے کا 16 واں حصہ خریدا ہے، جائیداد میں شریک ہونے کی وجہ سے حق شفعہ میں انہی کو ترجیح دی جائے گی، لہٰذا عبدالواحد ساسولی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے۔

شراکتی کاروبار میں نقصان کا ضمان

سوال:

اکبر نے مجھے کچھ رقم دی کہ تم اِس رقم سے کاروبار کرو، جو نفع ہوگا، اُس کا 30 فیصد تمہارا اور 70 فیصد میرا ہوگا۔ میں نے کہا کہ میں 40 فیصد لوں گا، اگر نقصان ہوا تو میں ذمہ دار ہوں تمہاری پوری رقم واپس دوں گا۔ اس کی شرعی حیثیت بیان فرمائیں''۔

(محمد شعبان، لاہور)

جواب:

آپ اُس شخص سے عقدِ مُضاربت کرسکتے ہیں اور یہ جائز ہوگا۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ مُضاربت میں ربُّ المال (Capital Provider) اور مضارِب (Working Partner) کے درمیان منافع کی تقسیم کا تناسب (Ratio) پہلے سے طے ہونا ضروری ہے تاکہ بعد میں تنازع پیدا نہ ہو۔ اور اگر خدانخواستہ نقصان ہو تو مضارِب کی محنت ضائع ہوگی اور بے ثمر رہے گی اور ربُّ المال سارا نقصان برداشت کرے گا۔ نقصان کی صورت میں حاصل شدہ کل نفع سے اُس کی تلافی کی جائے گی، تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے: (وَمَاهَلَكَ مِنْ مَالِ الْمُضَارَبَةِ يُصْرَفُ إِلَى الرِّبْحِ) لِأَنَّهُ تَبَعٌ (فَإِنْ زَادَ الْهَالِكُ عَلَى الرِّبْحِ لَمْ يَضْمَنْ)

ترجمہ:''مالِ مضاربت میں سے جو مال ہلاک ہوا، اس کی کمی نفع سے پوری کی جائے گی، کیونکہ نفع اصل زر (رأس المال) کے تابع ہے، پس اگر نقصان اتنا ہوا کہ نفع سے اس کو پورا نہیں کرسکتا، تو مضارب پر ضمان نہیں ہے (بلکہ یہ نقصان ربُّ المال پر عائد ہوگا)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 8، ص:385)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: رَجُلٌ دَفَعَ لِآخَرَ أَمْتِعَةً وَقَالَ بِعْهَا وَاشْتَرِهَا وَمَا رَبِحْتَ فَبَيْنَنَا نِصْفَيْنِ فَخَسِرَ فَلَا خُسْرَانَ عَلَى الْعَامِلِ۔

ترجمہ:''ایک شخص (ربُّ المال) نے دوسرے شخص (مُضارِب) کو کچھ سامان دیا اور کہا:

اس سے خرید وفروخت (یعنی کاروبار) کرو اور جو نفع آئے، وہ ہمارے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا اور (اگر بالفرض) اُسے (کاروبار میں) نقصان ہوگیا، تو عامل (یعنی مُضارِب) کے ذمے نقصان میں سے کچھ نہیں آئے گا (بس اسے صرف محنت کا اجر نہیں ملے گا)''۔

(ردالمحتار، جلد:8،ص:374)

مُضاربت میں نفع کا تناسب باہمی رضامندی سے طے کرنا جائز ہے، البتہ آپ کی بیان کردہ صورت میں آپ کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سارا نقصان میں برداشت کروں گا۔آپ کا نقصان میں زیادہ سے زیادہ حصہ اس کاروبار میں حاصل شدہ نفع کی حد تک ہے، خدانخواستہ نقصان اس سے زیادہ ہوجائے، تو اُس کا بار ربُّ المال پر آئے گا۔

حدِّ سرقہ کے لیے شرعی ثبوت ضروری ہے

سوال:

ایک گاؤں میں ایک شخص کے یہاں چوری ہوئی، چور کے بارے میں جاننے کے لیے اسپیشل ٹریننگ یافتہ کتے منگوائے گئے، وہ کتے ایک گھر میں پہنچ گئے۔گاؤں والوں کا جرگہ ہوا، جرگے نے فیصلہ دیا کہ یہ گھر والے تو چوری میں مُلوث نہیں ہوسکتے۔لہٰذا دوبارہ کتے منگوائے گئے، وہ پھر اُسی گھر میں پہنچ گئے۔ جرگہ دوبارہ ہوا، فیصلہ یہ ہوا کہ اگرچہ یہ گھر والے چوری میں مُلوث نہیں ہیں، لیکن چور کہیں ان کے گھر آکر بیٹھا تھا، اِسی وجہ سے کتے یہاں آئے ہیں۔لہٰذا ان گھر والوں پر دولاکھ روپے بطور تعزیر ڈال دیے گئے۔معلوم یہ کرنا ہے کہ: کیا ان کتوں کی شہادت قابلِ عمل ہے اور جرگے کا فیصلہ درست ہے؟

(قاری صادق حسین، پہلوان گوٹھ، گلستانِ جوہر کراچی)

جواب:

چوری کے ثبوت کے دوطریقے ہیں ایک یہ کہ چور عدالت کے سامنے خود اقرار کرے، دوسرا یہ کہ دو مرد گواہی دیں اور وہ شہادت عدالت کے لیے قابل قبول ہو، اس صورت میں اگر اسلام کا قانون نافذ ہے، تو اس پر حدِ سرقہ یعنی ہاتھ کلائی سے کاٹنے کی سزا نافذ ہوگی

اور چوری شدہ مال بھی مالک کو واپس کرنا پڑے گا۔ لیکن حدِ سرقہ کے نفاذ کے لیے کُتبِ فقہ میں تفصیلی اَحکام ہیں۔ تفتیش کے لیے کتوں کا استعمال یا کسی دوسرے ذرائع سے مدد لینا تو ممکن ہے لیکن اِسے سو فیصد درست قرار دے کر اس معنی میں بطور شہادت تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے نتیجے میں چور پر حدِ سرقہ نافذ کردی جائے۔ ہاں! اگر کتے کی نشاندہی کی صورت میں کسی شخص کے گھر سے چوری شدہ مال برآمد ہوجاتا ہے، تو وہ مال اصل مالک کے حوالے کردیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ملکی قانون کیا کہتا ہے؟ کسی ماہر وکیل سے مشورہ کیا جائے۔ اِس کی بنیاد پر چور کا سراغ لگایا جاسکتا ہے لیکن کسی شخص کو چور قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جرگے کا فیصلہ درست نہیں، شریعت میں مالی جرمانہ جائز نہیں ہے، ہاں! کوئی شخص اگر کسی شخص کا مال ضائع کردے تو اس سے مال کی قیمت لی جاسکتی ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ: اَلْمَالُ بِالْمَالِ یعنی اگر کسی کا مالی نقصان ہوجائے تو وہ اس کے بدلے مال لے سکتا ہے۔ شریعت میں تعزیر بالمال منسوخ ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

مَعْنَی التَّعْزِیْرِ بِأَخْذِ الْمَالِ عَلَی الْقَوْلِ بِهٖ اِمْسَاکُ شَیْءٍ مِنْ مَالِهٖ عِنْدَ مُدَّةٍ لِیَنْزَجِرَثُمَّ یُعِیْدُهُ الْحَاکِمُ اِلَیْهِ، لَااَنْ یَأْخُذَهُ الْحَاکِمُ لِنَفْسِهٖ أَوْ لِبَیْتِ الْمَالِ، کَمَا یَتَوَهَّمُهُ الظَّلَمَةُ، اِذْلَایَجُوْزُ لِأَحَدِ الْمُسْلِمِیْنَ أَخْذُ مَالِ أَحَدٍ بِغَیْرِ سَبَبٍ شَرْعِیٍّ۔ -- وَفِی ''شَرْحِ الْآثَارِ'': اَلتَّعْزِیْرُ بِالْمَالِ کَانَ فِی اِبْتِدَاءِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ نُسِخَ۔

ترجمہ: ''(جن فُقہاء کرام نے) تعزیر بالمال (یعنی مالی جرمانے کے جواز کی) بات کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ملزم کا وہ مال کچھ مدت کے لیے روک لیا جائے تاکہ وہ جرم سے باز آجائے، پھر حاکم وہ مال واپس کردے گا، یہ معنی نہیں کہ حاکم اس مال کو اپنے لیے یا بیت المال کے لیے وصول کرے جیسا کہ ظالم (حکمرانوں) نے سمجھ رکھا ہے، کیونکہ کسی مسلمان کے لیے شرعی جواز کے بغیر کسی دوسرے مسلمان کا مال لینا جائز نہیں ہے۔ ''شرح الآثار'' میں ہے کہ تعزیر بالمال ابتدائے اسلام میں جائز تھی، پھر منسوخ ہوگئی''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص: 77)

کسی جرگے یا پنچایت وغیرہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے، اُنہیں اس سے باز آنا چاہیے۔ مُجاز عدالتیں ثبوت وشواہد کی بنیاد پر سزا دے سکتی ہیں۔

سورۃ النسا کی آیت: 105 کا ترجمہ ہے: ''بیشک ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ فیصلہ کریں اور آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا کرنے والے نہ بنیں''۔

اس آیت کے سببِ نزول میں مُفسّرین نے سُنن ترمذی کی حدیث نمبر: 3036 کے حوالے سے لکھا ہے کہ'' یہ چند آیات ایک واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں جو عہدِ رسالت میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ انصار کے بنی ظفر قبیلہ کے ایک شخص مسمّی طعمہ بن اُبیرق نے اپنے ہمسایہ قتادہ بن نعمان کے مکان میں نقب لگا کر کچھ زِرہیں اور آٹے کی بوری چرالی اور ایک یہودی زید بن سمین کے ہاں جا کر رکھ آیا۔ صبح ہوئی اور حضرت قتادہ کو جب چوری کا پتا چلا تو اُنہوں نے اپنے پڑوسی طعمہ سے دریافت کیا، اُس نے صاف انکار کر دیا اور قسم کھائی کہ مجھے اس کے متعلق علم تک نہیں۔ اتفاق یہ ہوا کہ آٹے کی بوری میں سوراخ تھا، جس سے آٹا گرتا گیا، اُنہوں نے اس گرے ہوئے آٹے کے نشانات کا پیچھا کیا، چنانچہ وہ یہودی کے مکان تک پہنچ گئے۔ تلاش کرنے پر مالِ مسروقہ برآمد ہوگیا، اُس یہودی نے کہا کہ میں چور نہیں بلکہ میرے پاس طعمہ یہ چیزیں رکھ گیا ہے۔ کئی یہودیوں نے اس کی تصدیق کی، طعمہ کے قبیلہ والوں نے کہا: چلو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں چلیں، چنانچہ سب حاضر ہوئے، بنوظفر کو اب علم ہو چکا تھا کہ چور یہودی نہیں بلکہ طعمہ ہے لیکن اپنی بدنامی کے خوف سے وہ طعمہ کو ہر طریقہ سے بری ثابت کرنا چاہتے تھے، اس لیے اس کی حمایت میں بڑی سرگرمی دکھانے لگے، حتیٰ کہ حضور کی جناب میں بھی عرض کرنے لگے کہ اگر فیصلہ طعمہ کے خلاف ہوا تو بے چارا ہلاک ہو جائے گا اور ذلّت ورسوائی کی کوئی حد نہ رہے گی اور یہودی جو اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہے، وہ صاف بری ہو جائے گا، حضور ﷺ کو بھی خیال گزرا کہ بنوظفر جو مسلمان ہیں، سچے ہوں گے، (چنانچہ کوئی فیصلہ صادر ہونے سے پہلے وحی الٰہی پہنچ گئی، جس میں

حقیقتِ حال آشکارا ہوگئی)ارشادِ ربانی ہوا:''ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تا کہ آپ اس علم یقینی کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا کریں جو آپ کو اپنے رب کی طرف سے عطا فرمایا گیا ہے''۔(ضیاء القرآن،جلد اول،ص:386-385)

اِس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے ہاں چوری کے سامان کا برآمد ہونا بھی اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ اسی نے چوری کی ہے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی کا مال چوری کر کے کسی کے ہاں اُس کی لاعلمی میں رکھ آئے یا اُس کو بتا کر رکھے لیکن اس کو یہ نہ بتائے کہ یہ چوری کا سامان ہے،جس طرح یہودی کے ہاں بعض نشانیوں کی وجہ سے مال برآمد ہوا۔مزید یہ کہ عدل بے لاگ ہونا چاہیے نہ کہ اپنے اور غیر کے لیے معیار الگ الگ ہو۔آپ کے بیان کردہ واقعے میں تو محض کتے کی مُخبری ہے،چوری کا مال بھی برآمد نہیں ہوا۔یہ محض ظنّی چیزیں ہیں،جبکہ حدود اللہ کے لیے قطعی ثبوت درکار ہوتا ہے۔

استحقاق کے بغیر ملنے والے اضافے کا شرعی حکم

سوال:

زید 42 سالہ گورنمنٹ ملازمت سے ریٹائر ہوا ہے،اس دورانیے میں متعدد ترقیاں ملیں،ایک مرحلے پر اس کی تنخواہ میں ایک سالانہ وظیفہ اضافی ملا،جس کا استحقاق اسے حاصل نہیں تھا،یہ سالانہ وظیفہ وہ تقریباً22 سال تک لیتا رہا۔جب پینشن کے کاغذ تیار ہوئے،AG آفس نے پڑتال کی تو تین سالانہ وظیفے کم کر کے حساب کتاب بے باق کر دیا۔اس اثنا میں زید کو پتا چلا کہ سپریم کورٹ نے آرڈر دیا ہے کہ پینشنر سے کسی غلطی کے نتیجے میں کوئی کٹوتی نہیں کی جائے گی۔لہٰذا زید نے AG آفس کو درخواست دی اور AG آفس دو سالانہ وظیفے پر پینشن کے بقایا جات دینے کو تیار ہوگیا ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ اضافی رقم زید کو لینی چاہیے یا نہیں جبکہ 23 سال اضافی رقم سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔

(غلام یاسین سومرو،کراچی)

جواب:

آپ کے بیان کے مطابق زید نے ماضی میں قواعد وضوابط کے خلاف اپنی مقررہ تنخواہ سے اضافی رقم لی ہے۔سوال میں یہ بھی واضح نہیں ہے کہ اُس نے کسی مُجاز اتھارٹی کے ساتھ ملی بھگت کرکے یا رشوت دے کر یہ اضافی فائدہ حاصل کیا ہے، کیونکہ اس صورت میں تو دونوں مجرم قرار پائیں گے۔غلطی سے تو بظاہر یہ مراد ہوتا ہے کہ غیر ارادی طور پر یا متعلقہ عملے کے صرفِ نظر یا تساہل سے ایسا ہوگیا ہے، جیسے کمپیوٹر میں Miss Feeding ہو جاتی ہے۔حکومت کے قوانین میں اس کی گنجائش نہیں ہے،تو یہ سارا عمل ناجائز ہے، خواہ اس سے استفادے کی مدت کم ہو یا زیادہ، یہ رقم اُسے سرکاری خزانے میں جمع کردینی چاہیے اور اس پر پنشن میں حاصل ہونے والا اضافہ بھی درست نہیں ہے۔لیکن اگر افسرانِ اعلیٰ کے علم میں یہ بات آچکی تھی اور انہوں نے سروسز رول کے تحت اسے جاری رکھا،تو درست ہے اور اس پر پنشن میں حاصل ہونے والا اضافی فائدہ بھی درست ہے۔جب تک سپریم کورٹ کا فیصلہ سامنے نہ ہو، ہم اس پر کوئی رائے دینے سے قاصر ہیں، بہتر یہ ہے کہ اس پر سپریم کورٹ کے فیصلے کا انتظار کیا جائے، کیونکہ اپنے کسی سابق فیصلے کی وہ خود بہتر طور پر تعبیر وتشریح (Interpretation) کرسکتی ہے اور اسے قانون کا درجہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے سے ہی واضح ہوگا کہ ''غلطی'' سے کیا مراد ہے۔

ویزوں کی خرید وفروخت

سوال:

میرا بھائی PIA میں جاب کرتا ہے، غیر ملکی کمپنیاں پاکستانیوں کو جاب آفر کرتی ہیں اور ویزے جاری کرتی ہیں۔میرے بھائی ان کمپنیوں سے ویزے خرید لیتے ہیں اور کچھ منافع (مثلاً فی ویزا ایک لاکھ یا پچاس ہزار روپے) لے کر ضرورت مند لوگوں کو فروخت کردیتے ہیں۔کیا میرے بھائی کا یہ منافع لینا یا ویزے زیادہ قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے؟۔

(ارسلان، حیدرآباد)

جواب:

ویزا اگر کسی خاص شخص کے نام پر جاری ہوا ہے،تو اس کے استعمال کرنے کا حق اُسی کو حاصل ہے،اس میں رَدوبدل کرنا شرعاً وقانوناً ناجائز ہے البتہ جو شخص ویزوں کا کاروبار کرتا ہے اور وہ ویزے بیرونِ ملک اپنی کلائنٹ کمپنی سے جاب کے حوالے سے لیتا ہے،مثلاً انجینئر، اکاؤنٹنٹ، ڈاکٹر، الیکٹریشن، معمار، مزدور وغیرہ کہ جو اُس اہلیت کا حامل (Bearer) ہو، وہ اس پر سعودی عرب کے سفارتخانے یا قونصل خانے سے اپنے پاسپورٹ پر ویزا لگوا سکتا ہے،تو ویزا خریدنے والا جسے چاہے،اُسے فروخت کرسکتا ہے۔ بعض صورتوں میں ویزا جاری کرنے والا ادارہ اپنے ریکروٹمنٹ ایجنٹ کو مختلف کاموں (Jobs) کے لیے مفت ویزے جاری کرتا ہے اور وہ انہیں کمیشن بھی دیتا ہے،تو اس صورت میں انہیں لوگوں سے مزید رقم نہیں لینی چاہیے۔الغرض یہ ویزہ جاری کرنے والے اور ویزہ حاصل کرنے والے فرد یا ادارے کی معاہدے کی شرائط پر منحصر ہے۔یہ حقوق کی بیع ہے،جو آج کل رائج ہے اور اگر یہ کاروباری بنیاد پر ہے تو وہ شخص اس پر نفع لے سکتا ہے، کاروبار نفع ہی کے لیے ہوتا ہے،نفع کا مدار طلب اور رَسد پر ہوتا ہے،لیکن نفع منصفانہ ہو تو اچھا ہے،لوگوں کی ضرورتوں اور مجبوریوں سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ ویزا اگر اشخاص کے نام پر ہے اور کوئی شخص یا ادارہ متعلقہ ملک کے سفارت خانے سے ویزا لگوا کر ضرورت مند شخص کو دینے پر اجرت لے سکتا ہے،اسے اجارت الخدمات (Contract of Service) کہتے ہیں،مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنی اجرت اجیر (Employee) اور مستاجر (Employer) کے ساتھ طے کرلے،کیونکہ وہ مستاجر کو اس کی مطلوبہ قابلیت کے افراد فراہم کرنے میں اور اجیر کو ملازمت فراہم کرنے میں مدد کرتا ہے،کیونکہ کسی بھی عقد کی شرائط کا پہلے سے طے ہونا ضروری ہے کہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو۔

کتے کی خرید وفروخت کا شرعی حکم

سوال:

میں ایک فلیٹ میں رہتا ہوں، جس کی چھت کافی بڑی ہے۔ میں اعلیٰ نسل کے کتوں (Dogs) کا کاروبار کرنا چاہتا ہوں، میں یہ بزنس اُس کی چھت پر کرنا چاہتا ہوں، کیا یہ بزنس اسلامی لحاظ سے جائز ہے؟، (شہریار)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے: عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عنه أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَمَهْرِ الْبَغِيِّ وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت، فاحشہ کی اجرت اور کاہن کی مٹھائی سے منع فرمایا''۔

(صحیح بخاری: 2237، صحیح مسلم: 1567)

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ، وَالسِّنَّوْرِ إِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شکاری کُتّے کے سوا کُتّے اور بلی کی قیمت سے منع فرمایا ہے''۔ (سنن نسائی: 4682)

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

اَلْأَوَّلُ ثَمَنُ الْكَلْبِ احْتَجَّ بِهٖ جَمَاعَةٌ عَلٰى أَنَّهٗ لَا يَجُوزُ بَيْعُ الْكَلْبِ مُطْلَقًا، الْمُعَلَّمُ وَغَيْرُهٗ وَمَا يَجُوزُ اِقْتِنَاؤُهٗ أَوْ لَا يَجُوزُ وَأَنَّهٗ لَا ثَمَنَ لَهٗ وَإِلَيْهِ ذَهَبَ الْحَسَنُ وَمُحَمَّدُ بْنُ سِيرِينَ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ أَبِي لَيْلٰى وَالْحَكَمُ وَحَمَّادُ بْنُ أَبِي سُلَيْمَانَ وَرَبِيعَةُ وَالْأَوْزَاعِيُّ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ وَإِسْحَاقُ وَأَبُو ثَوْرٍ وَابْنُ الْمُنْذِرِ وَأَهْلُ الظَّاهِرِ وَهُوَ إِحْدَى الرِّوَايَتَيْنِ عَنْ مَالِكٍ۔ وَقَالَ ابْنُ قُدَامَةَ: لَا يَخْتَلِفُ الْمَذْهَبُ فِي أَنَّ بَيْعَ الْكَلْبِ بَاطِلٌ عَلٰى كُلِّ حَالٍ وَكَرِهَ أَبُو هُرَيْرَةَ ثَمَنَ الْكَلْبِ، وَرَخَّصَ فِي ثَمَنِ كَلْبِ الصَّيْدِ خَاصَّةً جَابِرٌ وَبِهٖ قَالَ عَطَاءٌ وَالنَّخَعِيُّ

وَاختلف أَصحَابُ مَالِكٍ فَمِنهُم مَن قَالَ: لَا يَجُوزُ وَمِنْهُم مَن قَالَ: اَلكَلبُ المَاذُونُ فِي إِمسَاكِهِ يُكرَهُ بَيعُهُ وَيَصِحُّ وَلَا تَجُوزُ إِجَارَتُهُ نَصَّ عَلَيهِ أَحمَدُ وَهٰذَا قَولُ بَعضِ أَصحَابِ الشَّافِعِي وَقَالَ بَعضُهُمْ يَجُوزُ وَقَالَ مَالِكٌ فِي (المُوَطَّا) أَكرَهُ ثَمَنَ الكَلبِ الضَّارِي وَغَيرِالضَّارِي لِنَهيِهِ عَن ثَمَنِ الكَلبِ وَفِي (شَرحِ المُوَطَّا) لِابنِ زَرقُونَ: وَاختَلَفَ قَولُ مَالِكٍ فِي ثَمَنِ الكَلبِ المُبَاحِ اِتِّخَاذُهُ فَاَجَازَهُ مَرَّةً وَمَنَعَهُ أُخرَىٰ وَبِإِجَازَتِهِ قَالَ ابنُ كِنَانَةَ وَأَبُوحَنِيفَةَ، وَاحتَجُّوا بِمَا رُوِيَ فِي هٰذَا البَابِ بِالأَحَادِيثِ الَّتِي فِيهَا مَنعُ بَيعِ الكَلبِ وَحُرمَةُ ثَمَنِهِ وَخَالَفَهُمْ فِي ذٰلِكَ جَمَاعَةٌ وَهُم عطاءُ بنُ أَبِي رَبَاحٍ وَإِبرَاهِيمُ النَّخَعِيُّ وَأَبُوحَنِيفَةَ وَأَبُويُوسُفَ وَمُحَمَّدٌوَابنُ كِنَانَةَ وَسَحنُونَ مِنَ المَالِكِيَّةِ ومَالِكٌ فِي رِوَايَةٍ، فَقَالُوا: اَلكِلَابُ الَّتِي يُنتَفَعُ بِهَا يَجُوزُ بَيعُهَا وَيُبَاحُ أَثمَانُهَا وَعَنْ أَبِي حَنِيفَةَ أَنَّ الكَلبَ العُقُورَ لَا يَجُوزُ بَيعُهُ وَلَا يُبَاحُ ثَمَنُهُ

ترجمہ:'' فقہاء کی ایک جماعت نے ان احادیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ کتوں کی بیع مطلقاً ناجائز ہے، خواہ کتے سدھائے ہوئے ہوں یا نہ ہوں، خواہ ان کا رکھنا جائز ہو یا ناجائز، بہر حال میں ان کی قیمت باطل اور حرام ہے۔ حسن بصری، محمد بن سیرین، عبدالرحمن بن ابی لیلی، حکم، حماد بن ابی سلیمان، ربیعہ، اوزاعی، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابوثور، ابن المنذر اور اہل ظاہر کا یہی موقف ہے۔ امام مالک سے بھی ایک روایت یہی ہے اور علامہ ابن قدامہ نے کہا: اس بارے میں مذہب حنبلی میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کتے کی بیع ہر صورت میں باطل ہے اور حضرت ابوہریرہ نے کتے کی قیمت کو مکروہ کہا ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے خاص طور پر شکاری کتے کی قیمت میں رخصت دی ہے اور امام عطاء اور امام نخعی کا بھی یہی قول ہے۔ اور اصحابِ مالک اس بارے میں مختلف الرائے ہیں، ان میں سے بعض نے کہا: جس کتے کو (شریعت میں) رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، اس کی بیع کراہت کے ساتھ جائز ہے اور اس کا کرائے پر دینا جائز نہیں ہے، اس پر امام احمد کی نص ہے اور یہی بعض اصحاب شافعی کا قول ہے۔ امام مالک نے موطا میں کہا: کتا خواہ شکاری ہو

یا غیر شکاری، میں ہر قسم کے کتے کی قیمت کو مکروہ قرار دیتا ہوں، کیونکہ نبی ﷺ نے کتے کی قیمت سے منع فرمایا ہے۔ ابن زرقون نے شرح المؤطا میں لکھا ہے کہ: جس کتے کا رکھنا مباح ہے، اس کی قیمت کے بارے میں امام مالک کے اقوال مختلف ہیں، بعض اقوال میں اس کی اجازت دی ہے اور بعض اقوال میں منع کیا ہے۔ ابن کنانہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اُس کتے کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، جس کا رکھنا مباح ہے۔

جو فقہاء کتے کی بیع کو مطلقاً ممنوع قرار دیتے ہیں، وہ اس باب کی احادیث سے استدلال کرتے ہیں، اس کے برخلاف عطا بن ابی رباح، ابراہیم نخعی، امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، ابن کنانہ، سحنون مالکی اور ایک روایت کے مطابق امام مالک یہ کہتے ہیں کہ جن کتوں سے نفع حاصل کرنا شرعاً جائز ہے، ان کی بیع بھی جائز ہے اور ان کی قیمت مباح ہے اور امام ابوحنیفہ سے ایک روایت یہ ہے کہ کاٹنے والے کتے کی بیع جائز نہیں ہے اور نہ اس کی قیمت مباح ہے''۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد 12، ص:83-82)

امام المفسرین والمحدثین علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ جن احادیث میں بالعموم کتے کی بیع یا اس کی قیمت سے منع کیا ہے، وہ اُن کتوں کے ماسوا پر محمول ہیں، جن کو رکھنے کی اجازت دی گئی ہے اور اس تخصیص پر ایک قرینہ تو یہ احادیث ہیں، جن میں شکاری کتے کی بیع کی اجازت دی گئی ہے اور دوسرا قرینہ وہ احادیث ہیں، جن میں شکاری کتوں اور کھیت اور مویشیوں کی حفاظت کے کتوں کو رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، جن (احادیث) کی صحت پر اتفاق ہے اور اگر ان کتوں کی بیع ناجائز ہو تو پھر ان کو رکھنے کی اجازت کا کوئی معنی نہیں ہے''۔ (شرح صحیح مسلم، جلد 4، ص:300)

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ يَقُولُ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بِقَتْلِ الْكِلَابِ، حَتّٰى إِنَّ الْمَرْأَةَ تَقْدَمُ مِنَ الْبَادِيَةِ بِكَلْبِهَا فَنَقْتُلُهُ، ثُمَّ نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ قَتْلِهَا، وَقَالَ عَلَيْكُمْ بِالْأَسْوَدِ الْبَهِيمِ ذِي النُّقْطَتَيْنِ، فَإِنَّهُ شَيْطَانٌ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں

کُتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، حتیٰ کہ کوئی عورت دیہات سے اپنا کتا لے کر آتی، تو ہم اس کُتے کو بھی قتل کر دیتے، پھر نبی ﷺ نے اس کو قتل کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا: اس کالے کُتے کو قتل کر دو جو دو نقطے والا ہو، کیونکہ وہ شیطان ہے''۔ (صحیح مسلم:3996)

عَن ابنِ مُغفل، قَالَ: أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِقَتلِ الكِلَابِ، ثُمَّ قَالَ: مَا بَالُهُم وَبَالُ الكِلَابِ؟، ثُمَّ رَخَّصَ فِي كَلبِ الصَّيدِ وَكَلبِ الغَنَمِ

ترجمہ:''حضرت ابن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کُتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، پھر فرمایا: کُتے لوگوں کو کیا تکلیف دیتے ہیں؟، پھر آپ نے شکاری کُتے اور بکریوں (کی حفاظت) کے کُتوں کی اجازت دی''۔ (صحیح مسلم:1573)

علامہ بدرالدین عینی حنفی مزید لکھتے ہیں:

وَهٰكَذَا أَجَابَ الطَّحَاوِيُّ عَنِ الأَحَادِيثِ الَّتِي فِيهَا النَّهيُ عَن ثَمَنِ الكَلبِ وَأَنَّهُ سُحتٌ، فَقَالَ: إِنَّ هٰذَا إِنَّمَا كَانَ حِينَ كَانَ حُكمُ الكِلَابِ أَن تُقتَلَ وَلَا يَحِلُّ إِمسَاكُ شَيءٍ مِنهَا وَلَا الِانتِفَاعُ بِهَا وَلَا شَكَّ أَن مَا حَرُمَ الِانتِفَاعُ بِهِ كَانَ ثَمَنُهُ حَرَامًا فَلَمَّا أَبَاحَ رَسُولُ اللهِ الِانتِفَاعَ بِهَا لِلِاصطِيَادِ وَنَحوِهِ مَا نَهَى عَن قَتلِهَا، نَسَخَ مَا كَانَ مِنَ النَّهيِ عَن بَيعِهَا وَتَنَاوُلِ ثَمَنِهَا، فَإِن قُلتَ مَا وَجهُ هٰذَا النَّسخِ قُلتُ: وَجهُهُ ظَاهِرٌ وَهُوَ أَنَّ الأَصلَ فِي الأَشيَاءِ الإِبَاحَةُ فَلَمَّا وَرَدَ النَّهيُ عَنِ اتِّخَاذِ الكِلَابِ وَوَرَدَ الأَمرُ بِقَتلِهَا عَلِمنَا أَنَّ اتِّخَاذَهَا حَرَامٌ وَأَنَّ بَيعَهَا حَرَامٌ أَيضًا لِأَنَّ مَا كَانَ اِنتِفَاعُهُ حَرَامًا قِيمَتُهُ حَرَامٌ كَالخِنزِيرِ وَنَحوِهِ ثُمَّ لَمَّا وَرَدَتِ الإِبَاحَةُ بِالِانتِفَاعِ بِهَا لِلِاصطِيَادِ وَنَحوِهِ وَوَرَدَ النَّهيُ عَن قَتلِهَا عَلِمنَا أَنَّ مَا كَانَ قَبلَ ذٰلِكَ مِنَ الحُكمَينِ المَذكُورَينِ قَدِ انتَسَخَ بِمَا وَرَدَ بَعدَهُ وَلَا شَكَّ أَنَّ الإِبَاحَةَ بَعدَ التَّحرِيمِ نَسخٌ لِذٰلِكَ التَّحرِيمِ وَرَفعٌ لِحُكمِهِ وَسَيَأتِي زِيَادَةُ بَيَانٍ فِي المُزَارَعَةِ وَغَيرِهَا۔

ترجمہ:''جن احادیث میں کُتے کی قیمت سے منع کیا ہے اور اس کو حرام فرمایا ہے، امام طحاوی نے ان احادیث کے جواب میں یہ کہا ہے کہ یہ ممانعت اس وقت تھی، جب کُتوں کو قتل

کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اس وقت کسی کتے کو رکھنا حلال نہیں تھا اور نہ اس وقت کسی کتے سے فائدہ اٹھانا جائز تھا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس چیز سے نفع اٹھانا حرام ہو، اس کی قیمت بھی حرام ہے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے کتوں سے شکار کرنا مباح کر دیا اور اس سے نفع اٹھانا جائز قرار دے دیا اور اس کو قتل کرنے سے منع فرما دیا، تو کتوں کی خرید وفروخت کی ممانعت کا حکم منسوخ ہو گیا، اسی طرح کتوں کی قیمت کی ممانعت کا حکم بھی منسوخ ہو گیا۔ اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ اس نسخ کا سبب کیا ہے؟ تو میں کہتا ہوں: اس کی وجہ ظاہر ہے اور وہ یہ ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے، پس جب کتے پالنے کی ممانعت اور ان کو قتل کرنے کا حکم وارد ہوا، تو ہمیں معلوم ہوا کہ اُن کا پالنا حرام ہے اور بیچنا بھی (حرام ہے)، کیونکہ جس سے نفع اٹھانا حرام ہے، اس کی قیمت بھی حرام ہے، جیسے خنزیر وغیرہ۔ پھر جب شکار وغیرہ کے لیے ان سے نفع اٹھانے کی اباحت کا حکم آیا، اس کے قتل کی ممانعت کا حکم بھی آ گیا، تو ہمیں معلوم ہوا کہ اس سے پہلے جو دو مذکورہ احکام آئے، وہ بعد والے اباحت کے حکم سے منسوخ ہو گئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حرمت کا حکم آنے کے بعد جب اباحت کا حکم آئے تو یہ (سابق) حرمت کے لیے ناسخ ہوتا ہے اور وہ حکم مرتفع ہو جاتا ہے اور اس اصول کا زیادہ بیان عنقریب مزارعت وغیرہ میں آئے گا، (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد 12، ص: 84)"۔ احادیث مبارکہ اور ائمۂ کرام کے اقوال سے معلوم ہوا کہ اسلام میں ابتداءً کتے رکھنے کی ممانعت کا حکم آیا، پھر ضرورت کی بنا پر بتدریج اس کی رخصت دی گئی اور اب کسی اختلاف کے بغیر فتویٰ اسی پر ہے کہ کتا رکھنا جائز ہے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: (وَصَحَّ بَیعُ الْکَلْبِ) وَلَوْعَقُوراً۔ ترجمہ: "کتے کی خرید وفروخت صحیح ہے، اگرچہ وہ کاٹنے والا ہو"۔ مزید لکھتے ہیں: لَایَنْبَغِی اِتِّخَاذُ کَلْبٍ اِلَّا نَخُوفِ لِصٍّ أَوْ غَیْرِہٖ فَلَا بَأسَ بِہٖ،

ترجمہ: "کتا رکھنا مناسب نہیں، لیکن اگر چوری وغیرہ کا اندیشہ ہو تو رکھنے میں حرج نہیں"۔
اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَأَمَّااِقتِنَاؤُہٗ لِلصَّیدِ وَحِرَاسَۃِ الْمَاشِیَۃِ وَالبُیُوتِ وَالزَّرعِ فَیَجُوزُ بِالْاِجْمَاعِ،لٰکِن لَایَنبَغِی أَن یَتَّخِذَہٗ فِی دَارِہٖ اِلَّا اِنْ کَانَ لُصُوصًا أَو أَعْدَاءً لِلْحَدِیثِ الصَّحِیحِ:''مَنِ اقتَنٰی کَلبًا اِلَّا کَلبَ صَیدٍ أَو مَاشِیَۃٍ نَقَصَ مِن أَجرِہٖ کُلَّ یَومٍ قِیرَاطَانِ''۔

ترجمہ:''شکار کے لیے، مویشیوں کے ریوڑ اور گھروں کی رکھوالی اور فصل کی حفاظت کے لیے بالاجماع کتا رکھنا جائز ہے، لیکن اُسے گھر میں رکھنا مناسب نہیں ہے، البتہ چوروں یا دشمنوں کا خوف ہو تو صحیح حدیث کی رو سے گھر پر بھی رکھ سکتے ہیں:''جس نے شکار اور مویشیوں کے ریوڑ (یا گھر بار) کی حفاظت کے بغیر کتا رکھا، اُس کے اجر سے ہر روز دو قیراط کم ہوجاتے ہیں''''۔(جلد 7،ص:368-369،بیروت)

ان تفصیلی دلائل کی روشنی میں اُن کُتوں کی خرید وفروخت اور کاروبار مباح ہے، جو گھر یا مویشیوں کی چوکیداری یا شکار کے لیے رکھے جاتے ہیں، البتہ جو لوگ شوقیہ کتے پالتے ہیں اور ان سے پیار کرتے ہیں، وہ ان کے لباس اور برتنوں میں منہ ڈالتے ہیں، ان کا پالنا اور رکھنا بدستور منع ہے، کیونکہ ان کے ساتھ کوئی انسانی ضرورت یا حاجت یا نفع وابستہ نہیں ہے۔ لیکن کوئی شخص کتا کس مقصد کے لیے خرید رہا ہے یہ اس کی نیت پر موقوف ہے اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہے۔ آج کل چوری کی نشاندہی، مجرموں کی تلاش اور نشہ آور وممنوعہ اشیاء کی نشاندہی کے لیے جو سدھائے ہوئے کتے استعمال کیے جاتے ہیں، یہ بھی ضرورت کی بنا پر جائز ہیں۔ اس لیے سدھائے ہوئے کتے کی نشاندہی پر کسی کا مال برآمد ہوجائے اور ثابت ہوجائے کہ یہ اس کا مال ہے، تو اس مال کو مالک کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔ البتہ جب تک مجرم کے اعتراف جرم (Confession) یا شہادتوں سے چوری کا جرم ثابت نہ ہوجائے، اس پر قطع ید (ہاتھ کاٹنے) کی سزا نافذ نہیں کی جاسکتی۔ ثقہ قرائن کی صورت میں قاضی (Judge) تعزیری سزا دے سکتا ہے۔

وراثت کے مسائل

وراثت کا حکم

سوال:

اگر کسی شخص کی صرف بیٹیاں ہوں، اولادِ نرینہ نہ ہو، اس کی وراثت کیسے تقسیم ہوگی۔ کیا وہ اپنی منقولہ اور غیر منقولہ تمام جائیداد کا اپنی زندگی میں اپنی بیٹیوں کو وارث بنا سکتا ہے۔ یہ تمام جائیداد اس نے اپنی ذاتی محنت سے بنائی ہے، (اظفر صدیقی، لاہور)۔

جواب:

اصولِ وراثت کے قوانین کے تحت کسی شخص کی ایک بیٹی ہو تو وہ کل ترکے کے نصف کی حقدار ہوتی ہے، دو یا زائد بیٹیوں کے لیے کل ترکے کا دو تہائی بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ

ترجمہ: ''سو اگر صرف بیٹیاں (دو یا) دو سے زیادہ ہوں تو ان کا حصہ (تقسیم وراثت کے ماقبل ضروری امور نمٹانے کے بعد بقیہ) کل ترکے کا دو تہائی ہے اور اگر صرف ایک بیٹی ہو تو اس کا حصہ کل ترکے کا نصف ہے، (النساء: 11)''۔ اس کے بعد جو ترکہ بچے گا، دیگر اصحابِ فرائض کو دیا جائے گا اور اگر اصحابِ فرائض نہ ہو تو میت کے عصبات کو مل جائے گا۔ اور اگر عصبات بھی نہ ہوں تو قانون وراثت کے مطابق بقیہ حصے بیٹیوں پر ان کے حصوں کے مطابق لوٹا دیے جائیں گے، یعنی سارا مال بیٹیوں کو ملے گا۔

اپنی زندگی میں بیٹیوں کے درمیان مال تقسیم کرسکتا ہے، لیکن اس غرض سے اپنا تمام مال اور جائیداد کسی ایک یا چند وارثوں کو دینا تاکہ دوسرے ورثاء محروم ہوجائیں ناجائز اور باعثِ گناہ ہے، بلاوجہ شرعی وارث کو محروم کرنے پر سخت وعید آئی ہے، حدیث مبارک میں فرمایا:

''مَنْ فَرَّ مِنْ مِيْرَاثِ وَارِثِهٖ، قَطَعَ اللهُ مِيْرَاثَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''۔

ترجمہ: جو شخص اپنے وارث کو میراث (پہنچنے سے) راہِ فرار اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کی میراث جنت سے قطع کردے گا، (سنن ابن ماجہ: 2703)۔

آپ نے یہ تو لکھا ہے کہ ایک شخص کی نرینہ اولاد نہیں ہے، اس کی وارث صرف بیٹیاں ہیں، لیکن یہ نشاندہی نہیں کی کہ آیا اس کے بھائی وغیرہ بھی ہیں یا نہیں۔ وراثت کا مسئلہ صحیح طور پر جاننے کے لیے تمام وارثوں کی نشاندہی ضروری ہے۔

ترکہ کا مسئلہ

سوال:

ایک شخص کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھے، ایک بیٹا باپ کی زندگی میں فوت ہوجاتا ہے، فوت ہونے والے بیٹے کی ایک بیٹی ہے، ایک سال بعد اس کی بیوہ کا نکاح دیور سے کر دیا گیا۔ جائیداد باپ کے نام ہے، اب چار بیٹے، دو بیٹیاں اور ایک پوتی ہے۔ پوتی کو دادا کی جائیداد سے حصہ ملے گا یا نہیں؟۔ بیوہ کا حصہ ہے، (تنویر احمد، سیالکوٹ)

جواب:

مُورِث (ترکہ چھوڑ کر وفات پانے والے شخص) کی زندگی میں کسی وارث کا انتقال ہوجائے اور ورثاء میں مُورث کے حقیقی بیٹے حیات ہوں تو پوتی یا پوتے کو ترکے سے کچھ نہیں ملے گا، بیٹے کی بیوہ کو بھی سسر کے ترکے سے کچھ نہیں ملے گا، اس کے لیے شریعت کا اصول ہے کہ درجے کے اعتبار سے قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کردیتا ہے، جیسے اگر وفات پانے والے شخص کا باپ زندہ ہے تو دادا اُس کی وراثت سے محروم رہے گا اور اگر اس کی وفات سے پہلے باپ وفات پاچکا ہے اور دادا زندہ ہے، تو اس صورت میں جو حصہ باپ کو ملنا تھا، وہ دادا کو ملے گا۔ وفات یافتہ باپ کا ترکہ اُس کے بیٹے اور بیٹیوں کے درمیان ''لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ'' (ایک لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء:11) کے تحت تقسیم ہوگا، ترکے کی تقسیم سے پہلے کے لازمی مصارف وضع کرنے کے بعد بقیہ ترکے دس حصے ہوں گے۔ چاروں بیٹوں کو 8 حصے (فی کس 2 حصے) اور دو بیٹیوں کو 2 حصے (فی کس ایک ایک حصہ) ملیں گے۔ لیکن قرآن مجید میں ترغیبی حکم یہ دیا گیا ہے کہ تقسیم ترکہ سے پہلے اگر تمام وارث اتفاق رائے سے اپنی یتیم بھتیجی کو فضل واحسان کے

طور پر کچھ دیدیں تو عنداللہ یہ پسندیدہ بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝

''اور جب (ترکے) کی تقسیم کے وقت (وراثت سے محروم رہ جانے والے) قرابت دار، یتیم اور مسکین (بھی) موجود ہوں، تو (ترکے سے) اُن کو بھی کچھ دیدو اور اُن سے خیر خواہی کی بات کرو اور وہ (وُرثاء) یہ سوچ کر (اللہ سے) ڈریں کہ اگر وہ اپنے پیچھے بے سہارا اولاد چھوڑ جاتے، تو انہیں (اپنی وفات کے وقت) اُن کے بارے میں کس طرح کے خدشات لاحق ہوتے، سو انہیں (یتیموں کی بابت) اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور درست بات کہنی چاہیے''۔ (النساء:9-8)

اس سے بھی زیادہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ اگر کوئی مُورِث اپنی وفات کے وقت یتیم پوتے پوتیاں چھوڑ کر جا رہا ہے، تو اسے اپنی وفات سے پہلے ان یتامیٰ کو کچھ نہ کچھ ہبہ کرنا چاہیے یا اُن کے حق میں کوئی وصیت چھوڑ کر جانا چاہیے اور اس میں بھی احسن صورت یہ ہے کہ اتنی مقدار مال کا ہبہ یا وصیت کریں جو ان کے وفات یافتہ بیٹے یا بیٹی کو ان کی وفات کے بعد بصورتِ حیات ملتا۔ علماءِ کرام کو چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً معاشرتی معاملات میں ترغیب (Motivation) اور ترحُّم (Mercy) کے مسائل لوگوں کو بتایا کریں۔

زندگی میں کچھ دے کر وراثت سے محروم نہیں کیا جاسکتا

سوال:

ہم سات بہنیں اور ایک بھائی ہیں، والدہ نے اپنی زندگی میں گھر اور فیکٹری ہمارے بھائی سید طاہر علی کو دے دی تھی اور وصیت نامہ لکھ دیا تھا، ہم سب بہنوں کو بھی کہہ چکی تھی کہ یہ جائیداد سید طاہر علی کی ملکیت ہے، ہم سب بہنیں اس پر گواہ ہیں۔ سید طاہر علی نے اپنی ذاتی آمدنی سے ایک پلاٹ والدہ کے نام سے خریدا اور اُسے بھی فیکٹری میں شامل کر دیا

تھا۔ تین بہنوں کو بھی والدہ اپنی زندگی میں ان کے حصے کے علیحدہ علیحدہ فلیٹ دے چکی ہیں تاکہ بعد میں یہ حصہ طلب نہ کریں۔ دو بہنوں نے اپنے اپنے فلیٹ فروخت کردیے ہیں اور اب بھائی سے اُن کا حصہ پراپرٹی سے طلب کررہی ہیں، جبکہ دونوں اپنے ذاتی گھر میں رہتی ہیں۔ کیا ان کو حصہ مانگنے کا حق ہے؟۔ چار بہنوں کو کچھ نہیں دیا گیا۔ (شبانہ افتخار، کراچی)

جواب:

آپ نے سوال میں لکھا ہے کہ گھر اور فیکٹری کے بارے میں آپ کی والدہ نے سید طاہر علی کے حق میں وصیت لکھی، شرعاً وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''سَمِعتُ أَبَا أمامةَ. سَمِعتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: اِنَّ اللهَ قَدْ أَعْطٰى كُلَّ ذِىْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ''۔

ترجمہ: ''ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمارہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے (ترکے میں سے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، تو (اب) وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے''۔ (سنن ابی داؤد جلد 3 رقم الحدیث 2867)

اگر آپ کی والدہ نے اپنی زندگی میں مذکورہ جائیداد بیٹے کو ہبہ (Gift) کردی تھی اور سید طاہر علی نے اُس پر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو ہبہ مکمل ہوگیا اور مذکورہ جائیداد سید طاہر علی کی ملکیت ہے، کسی وارث کو اُن سے تقسیم کے مطالبے کا حق حاصل نہیں ہے۔ تاہم یہ اُن ورثاء کی حق تلفی ہے، جنہیں جائیداد سے کچھ نہیں دیا گیا۔ آپ کی والدہ کو چاہیے تھا کہ اگر وہ اپنی زندگی میں کچھ مال اولاد کے درمیان تقسیم کررہی تھیں، تو تمام اولاد (بیٹے اور بیٹیوں) کو مساوی (برابر برابر) ہبہ (Gift) کرتیں، لیکن اگر دونوں بیٹیوں کو اُن کے حصے کے طور پر فلیٹ دیے تھے اور یہ طے پا گیا تھا کہ اب ترکے میں اُن کا مزید کوئی حصہ نہیں ہے۔ تو انہیں مزید مطالبے کا حق حاصل نہیں ہے۔

وارث بننا اختیاری امر نہیں ہے بلکہ شریعت کے تحت ایک جبری امر ہے۔ امام احمد رضا

قادری قدس سرہ العزیز نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، اس میں کافی اضطراب ہے، اقوال فقہاء دونوں طرف ہیں، جواز کا قول بھی مل جاتا ہے اور عدمِ جواز کا بھی۔ الاشباہ والنظائر میں ایک قول اس کے جواز اور مؤثر ہونے کا ہے، اسے علامہ جلال الدین امجدی نے اپنے فتاویٰ ''فیض الرسول'' میں اختیار کیا ہے اور اسے اعلیٰ حضرت کا بھی مختار قرار دیا ہے، چنانچہ اُن کا جواب مع سوال درجِ ذیل ہے:

مسئلہ:''باپ نے اپنی زندگی میں اپنے ایک بیٹے کو کچھ جائیداد دے کر الگ کر دیا اور بیٹے نے یہ منظور کرلیا کہ باپ کے انتقال پر اب ہم کو اس کے ترکے میں کچھ حق نہ رہے گا، تو اس صورت میں باپ کے فوت ہونے پر اس کی جائیداد میں اس کے بیٹے کا حق ہے یا نہیں؟۔

جواب:''صورتِ مسئولہ میں باپ کے انتقال کے بعد اس کا ترکے میں کچھ حق نہیں، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان تحریر فرماتے ہیں بزرگ موصوف نے اپنی حیات میں صاحبزادی صاحبہ کو کچھ عطا فرما کر میراث سے علیحدہ کر دیا اور وہ بھی راضی ہوگئیں کہ میں نے اپنا حصہ پالیا اور بعد انتقال مورث کے ترکہ میں میرا حق نہیں، اشباہ میں طبقات علامہ شیخ عبدالقادر سے اس صورت کا جواز نقل کیا اور اسے علامہ ابوالعباس ناطفی پھر جرجانی صاحب خزانہ پھر شیخ عبدالقادر پھر فاضل زین الدین ''صاحب اشباہ'' پھر علامہ سید احمد حموی نے مُقرّر و مُسلّم (یعنی برقرار) رکھا اور فقیہ ابوجعفر محمد بن یمانی نے اس پر فتویٰ دیا اور ایسا ہی فقیہ محدّث ابوعمر وطبری اور اصحاب احمد بن ابی الحارث نے روایت کیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد یازدہم، ص:95)، (فتاویٰ فیض الرسول، حصہ سوم، ص:492)

علامہ زین الدین بن ابراہیم بن نجیم کی جس عبارت کا حوالہ مفتی جلال الدین امجدی نے دیا ہے، وہ یہ ہے:

قَالَ الشَّیۡخُ عَبۡدُالۡقَادِرِ فِی الطَّبَقَاتِ فِیۡ بَابِ الھمزِفِی أَحۡمَدَ: قَالَ الجُرجَانِیۡ فِی الۡخِزَانَة قَالَ العَبَّاسُ النَاطِفِی: رَأَیۡتُ بِخَطِّ بَعۡضِ مَشَایِخِنَا رَحِمَھُمُ اللهُ فِی رَجُلٍ جَعَلَ لِأَحَدِ بَنِیۡه دَارًا بِنَصِیبِهٖ عَلٰی أَن لَّایَکُوۡنَ لَه بَعۡدَ مَوۡتِ الۡأَبِ مِیۡرَاثٌ، جَازَ وَأَفۡتٰی بِهٖ الۡفَقِیۡه

أَبُوجَعفَر مُحَمَّد بن اليَمَانِي أحدُ أصحَابِ مُحَمَّدِ بْنِ شُجَاعِ البَلْخِي، وَحَكٰى ذٰلِكَ اَصحَابُ اَحمَدَ بنِ اَبِي الحَارِثِ وَاَبُوعُمَرَوَ الطَّبَرِي۔

ترجمہ: ''شیخ عبدالقادر نے طبقات کے ''باب الھمزفی احمد'' میں فرمایا، جرجانی نے خزانہ میں کہا کہ ابوالعباس ناطفی نے فرمایا: میں نے ایسے شخص کے بارے میں جس نے دو بیٹوں میں سے ایک کو اُس کے حصے کا مکان اس شرط پر دیا کہ باپ کی موت کے بعد اس کے لیے ترکے سے حصہ نہیں ہوگا، اپنے بعض مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ کی وہ تحریر دیکھی، تو یہ جائز ہے، اسی پر فقیہ ابوجعفر محمد بن الیمانی نے فتویٰ دیا جو کہ محمد بن شجاع بلخی کے تلامذہ میں سے ہیں۔ احمد بن ابو حارث اور ابوعمر طبری کے شاگردوں نے اس کو نقل کیا ہے''۔

(الاشباہ والنظائر، ص: 294، قدیمی کتب خانہ، کراچی)

لیکن امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے طویل بحث سے قبل اپنا مختار موقف یوں بیان کیا ہے: وارث سے اس کے حصہ میراث کی بابت جو صلح حیاتِ مورث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والے شخص کی زندگی) میں کی جائے تحقیق یہ ہے کہ باطل و بے اثر ہے اس سے وارث کا حقِ ارث اصلاً زائل نہیں ہوتا، ہاں! اگر بعد موتِ مُورِث اس صلح پر رضامندی رہے تو اب صحیح ہوجائے گی۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 26، ص: 232، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔ وراثت چھوڑ کر وفات پانے والے شخص نے اپنی زندگی میں کسی وارث کو کچھ دے کر اپنی وفات کے بعد وراثت سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرلیا تھا، تو اس کے نتیجے میں وہ حقِ وراثت سے محروم نہیں رہے گا، البتہ اگر وہ مُورِث کی وفات کے بعد اس پر رضامندی ظاہر کرے، تو درست ہے۔ آپ کے بیان کے مطابق بہنوں نے والدہ کی وفات کے بعد رضامندی ظاہر نہیں کی، تو پھر وہ وراثت میں اپنے حصے کا مطالبہ کرسکتی ہیں۔

یتیم پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی بابت قرآن کا ترغیب و ترحُّم پر مبنی ارشاد

سوال:

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ غلام حسن ولد فتح محمد موضع بن

والا اوچ شریف کے رہائشی ہیں اور ان کا انتقال ہو گیا ہے، ان کی بیوی کا انتقال ان سے پہلے ہو گیا تھا۔ اب ان کے موجودہ ورثاء میں چار بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ ایک بیٹا محمد بلال اور ایک بیٹی نور خاتون کا انتقال غلام حسن ولد فتح محمد کی زندگی میں ہو گیا تھا، لیکن ان کی اولاد موجود ہے۔ شرعی طور پر رہنمائی فرمائیں کہ محمد بلال اور نور خاتون کی اولاد غلام حسن ولد فتح محمد کی جائیداد کے وارث بن سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر بن سکتے ہیں تو ان کو کتنا حصہ دیا جائے گا؟، (محمود احمد، چنی گوٹھ تحصیل احمد پور شرقیہ، ضلع بہاولپور)۔

جواب:

شریعت کی رو سے کسی بھی شخص کی وفات کے بعد اُس کے ترکے میں سے پہلے اُس کے کفن دفن کے اخراجات وضع کیے جاتے ہیں، اس کے بعد اگر اُس کے ذمے کسی کا قرض واجب الادا ہو، تو اس کی ادائیگی عمل میں آئے گی۔ بیوی کا مہر مؤجل اگر اپنی زندگی میں ادا نہیں کر سکا تو اس کو بھی قرض کے طور پر ترکے سے منہا کیا جائے گا۔ اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہوگی تو قابلِ انقسام (Divisible) ترکے کی زیادہ سے زیادہ تہائی حد تک وہ مؤثر اور نافذ العمل ہوگی، یہ تینوں امور تقسیمِ ترکہ سے مقدّم ہوتے ہیں۔ ان سے عہدہ برا ہونے کے بعد بقیہ ترکہ اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو ترکے کی تقسیم حسبِ ذیل ہوگی۔ کل ترکہ بارہ حصوں میں منقسم ہوگا اور بوقتِ وفاتِ مُورِث (Inherited) چار زندہ بیٹوں کو کل آٹھ حصے (فی کس دو دو حصے) اور چار بیٹیوں کو چار حصے (فی کس ایک ایک حصہ) ملیں گے۔ چونکہ وفات یافتہ شخص غلام حسن ولد فتح محمد کا ایک بیٹا محمد بلال اور ایک بیٹی نور خاتون اُن کی حیات ہی میں وفات پا چکے تھے، اس لیے وہ وراثت کے حق دار نہیں ہوں گے، کیونکہ ترکہ یا ورثہ (Inheritance) مُورِث کی وفات کے بعد تقسیم ہوتا ہے، اس کی حیات میں تقسیم نہیں ہوتا، بلکہ ترکہ یا وراثت کہتے ہی اُس مال کو ہیں جو کوئی شخص وفات کے وقت اپنے پیچھے چھوڑ جائے اور وراثت میں حصے کا حق دار وہی وارث (Inheritor)

قرار پاتا ہے جومُورِث کی وفات کے وقت زندہ ہو۔ چونکہ پوتے پوتیاں اورنواسے نواسیاں ترتیبِ وُرَثاء میں بیٹے بیٹیوں سے ایک درجہ نیچے ہوتے ہیں، اس لیے انہیں حصہ نہیں ملتا، کیونکہ اسلامی قانونِ وراثت کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ:''قریب کاوارث دور کے وارث کو محروم کردیتا ہے''۔

تاہم اللہ عزّ وجلّ نے قرآنِ مجید میں اہلِ ایمان کونہایت حکیمانہ انداز میں اس کی ترغیب ضرور دی ہے کہ وہ وُرَثاء جو حصۂ وراثت سے محروم رہ جاتے ہیں، دیگر ورثاء کو چاہیے کہ تقسیمِ وراثت کے وقت صلۂ رحمی کرتے ہوئے انہیں کچھ نہ کچھ دے دیا کریں، اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے:

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝

''اور جب (ترکے) کی تقسیم کے وقت (وراثت سے محروم رہ جانے والے) قرابت دار، یتیم اور مسکین (بھی) موجود ہوں، تو (ترکے سے) اُن کو بھی کچھ دیدو اور اُن سے خیر خواہی کی بات کرو اور وہ (وُرَثاء) یہ سوچ کر (اللہ سے) ڈریں کہ اگر وہ اپنے پیچھے بے سہارا اولاد چھوڑ جاتے، تو انہیں (اپنی وفات کے وقت) اُن کے بارے میں کس طرح کے خدشات لاحق ہوتے، سوانہیں (یتیموں کی بابت) اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور درست بات کہنی چاہیے''۔(النساء:9-8)

اس سے بھی زیادہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ اگر کوئی مُورِث اپنی وفات کے وقت یتیم پوتے پوتیاں چھوڑ کر جارہا ہے، تو اسے اپنی وفات سے پہلے ان یتامیٰ کو کچھ نہ کچھ ہبہ کرنا چاہیے یا اُن کے حق میں کوئی وصیت چھوڑ کر جانا چاہیے اور اس میں بھی احسن صورت یہ ہے کہ اتنی مقدار مال کا ہبہ یا وصیت کریں جو ان کے وفات یافتہ بیٹے یا بیٹی کو ان کی وفات کے بعد بصورتِ حیات ملتا۔ علماءِ کرام کو چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً معاشرتی معاملات میں ترغیب

(Motivation)اور ترَحُّم (Mercy) کے مسائل لوگوں کو بتایا کریں۔

وراثت سے محض دست برداری معتبر نہیں ہے

سوال:

ہمارے صوبہ خیبر پختونخوا میں ''عزیز ولی'' (جس کو وہاں کا عرف یا غیرت سمجھا جاتا ہے) کی وجہ سے بہنیں بھائیوں سے اپنا حصۂ وراثت طلب نہیں کرسکتیں، بلکہ شرم کے مارے کہہ دیتی ہیں کہ ہم اپنے بھائیوں کے حق میں دست بردار ہوتی ہیں، اگر مطالبہ کریں گی تو لوگ بے غیرت سمجھیں گے۔ کچھ لوگ اپنی بہن، بیٹیوں سے گورنمنٹ پیپر پر انگوٹھا لگوا کر حقِ وراثت سے محروم کردیتے ہیں، جبکہ خواتین کی اکثریت لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔

مفتی محمد نوراللہ نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''فتاویٰ نوریہ'' جلد 4 میں ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ لڑکی اگر عدالت کے روبرو کہہ دے کہ ہم نے اپنا حصہ معاف کیا، تو بھائی شرعاً وارث بن جائیں گے۔ کسی بھی وارث کا تقسیم وراثت سے پہلے اپنے حصے کو دیگر ورثاء کے حق میں معاف کردینا جائز ہے یا نہیں؟۔ کیا ازروئے شرع اس طرح کہہ دینے سے حقِ وراثت ساقط ہوجاتا ہے؟، (آثاراللہ، ضلع مانسہرہ تحصیل اوگی)۔

جواب:

مِلک کے سبب دو ہیں: ایک ضروری (یعنی جس کا نفاذ اختیار اور مرضی پر موقوف نہ ہو) اور دوسرا اختیاری یعنی کوئی شخص اپنی مرضی سے کسی چیز کو اپنی مِلک میں لیتا ہے، اس کے کئی ذرائع ہیں: (۱) کسی چیز کو قیمت طے کر کے خرید لینا (۲) جیسے کوئی اسے ہبہ کرے یا عطیہ دے، یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ ہبہ یا عطیہ وہ چاہے تو قبول کرلے، چاہے تو رَد کردے۔ مِلک ضروری کے تحت علماء نے لکھا ہے: ''وہ وراثت ہے، کیا تم نہیں جانتے کہ اگر وارث اپنے حصے کو رَد بھی کردے (یعنی یہ کہے کہ میں نہیں لیتا) تو قاضی کو اختیار ہے کہ اسے اپنا حصہ لینے پر مجبور کرے اور اُس کا حصہ اس کی گود یا اس کے گھر میں ڈال دے (یعنی اس کی تحویل میں دیدے)''۔ (شریفیہ مع سراجیہ، ص:2)

فقہی اصول یہ ہے کہ وراثت کی ملکیت اختیاری نہیں ہوتی بلکہ جبری ہوتی ہے، لہٰذا محض دست برداری سے حقِ وراثت باطل نہیں ہوتا۔ علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں: لَایَدْخُلُ فِی مِلْکِ الْاِنْسَانِ شَیْءٌ بِغَیْرِ اِخْتِیَارِہٖ اِلَّا الْاِرْثُ اِتِّفَاقًا، ترجمہ: ''انسان کی ملکیت میں اس کے اختیار کے بغیر کوئی شے داخل نہیں ہوتی، مگر میراث بالاتفاق داخل ہوتی ہے''۔۔۔مزید لکھتے ہیں: لَوْقَالَ الْوَارِثُ تَرَکْتُ حَقِّیْ لَمْ یَبْطُلُ حَقُّہٗ اِذَالْمِلْکُ لَا یَبْطُلُ بِالتَّرْکِ، ترجمہ: ''اگر وارث نے کہا: میں نے اپنا حق چھوڑ دیا ہے، تو اس کا حق باطل نہیں ہوگا کیونکہ مِلک چھوڑ دینے (یعنی محض دستبردار ہونے) سے باطل نہیں ہوتا''۔

(الاشباہ والنظائر، ص:340۔309)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہ العزیز ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''اِرث (وراثت) جبری ہے کہ مورِث کی موت پر ہر وارث خواہ مخواہ اپنے حصۂ شرعی کا مالک ہوتا ہے، خواہ مانگے یا نہ مانگے، لے یا نہ لے، دینے کا عرف ہو یا نہ ہو، اگرچہ کتنی ہی مدت ترک کو گزر جائے، کتنے ہی اشتراک در اشتراک کی نوبت آئے، میراث کوئی بات بالکل ساقط نہ کرے گی، نہ کوئی عرف اللہ کے فرائض میں تغیر کرسکتا ہے، نہ مانگنا تو درکنار، اگر کوئی وارث صراحۃً کہہ دے کہ میں نے اپنا حصہ چھوڑ دیا، جب بھی اس کی مِلک زائل نہ ہوگی''۔۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں: ''حقِ میراث حکمِ شرع ہے کہ ربُّ العالمین تبارک وتعالیٰ نے مقرر فرمایا، لہٰذا کسی کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوسکتا، قَالَ عُلَمَاؤُنَا: کَمَا فِی ''الْاَشْبَاہِ'' وَغَیْرِہٖ اَلْاِرْثُ جَبْرِیٌّ لَایَسْقُطُ بِالْاِسْقَاطِ۔ ترجمہ: ''ہمارے علماء نے فرمایا جیسا کہ ''الاشباہ'' وغیرہ میں ہے کہ حق میراث جبری ہے، کسی کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوتا''۔ اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ بیٹا اپنے باپ کا اس لیے وارث ہوتا ہے کہ یہ اس کا بیٹا ہے، تو جس طرح یہ اپنے بیٹے ہونے کو نہیں مٹا سکتا، اسی طرح اپنے حق میراث کو نہیں ساقط کرسکتا، پس امداد حسین خان کا متوفّٰی کے ترکے سے دستبردار ہونا ہرگز معتبر نہیں اور وہ اس وجہ سے اب بھی کالعدم نہیں ہوسکتا، اگر لاکھ بار دست برداری کرلے، شرع تسلیم نہ

فرمائے گی اور اُسے اس کے حصہ کا مالک ٹھہرائے گی۔ ہاں! اگر اسے لینا منظور نہیں تو یوں کرے کہ لے کر اپنی بہن خواہ بھاوج جسے چاہے ہبہ کامل کر دے اور جو مال قابلِ تقسیم ہو اُسے تقسیم کے ذریعے الگ کر کے قبضہ دلا دے، اُس وقت بہر صورت اس کا حق منتقل ہو جائے گا ورنہ مجرّد دست برداری بالکل مؤثر نہیں ہوتی''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 26، ص:133-113)

ہاں! اگر عورت اپنے حصۂ وراثت سے دست بردار ہونا چاہتی ہے تو اس کی دو شرطیں ہیں: اول یہ کہ دست برداری رضا کارانہ اور قلبی رضامندی سے ہو۔ اگر عورت پر کسی قسم کا معاشرتی دباؤ ہو کہ کسی علاقے یا برادری میں عورتوں کے وراثت سے حصہ لینے کو معیوب خیال کیا جاتا ہے یا خاندان میں عورتوں کے حصہ لینے کا رواج نہیں ہے یا اس وجہ سے کہ بھائی ناراض ہوں گے یا اُسے حصہ دیں گے ہی نہیں کہ مطالبہ کرنا خود کو بے توقیر کرنا اور تعلقات کو کشیدہ کرنا ہے۔ اگر ان وجوہات میں سے کسی بھی وجہ سے عورت اپنا حصہ معاف کرتی ہے، تب بھی حصہ برقرار رہتا ہے کہ معافی جب تک دلی رضامندی اور شرعی طریقے سے نہ ہو اس کا اعتبار نہیں۔

جو بہنیں اپنا حصہ بھائی کو دینا چاہتی ہیں، تو اس کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ شرعی تقسیم کے مطابق اپنے اپنے حصے کی حقِ ملکیت حاصل کر لیں اور پھر وہ اپنے اپنے حصے کو جس کے نام چاہیں قانونی طریقے سے منتقل کر دیں۔

دست برداری کی دوسری شرط یہ ہے کہ دست برداری بلا معاوضہ نہ ہو، کیونکہ شرعی اصول یہ ہے کہ عین (یعنی ایسی چیز جو خارج میں اپنے وجود کے ساتھ قائم ہے) سے محض بری الذمہ کرنا یا دست بردار ہونا درست نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرضے اور مالی واجبات معاف کرنے سے معاف ہو جاتے ہیں، لیکن مکان، دکان، زمین اور اشیاء معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتیں، بلکہ بدستور ان پر معاف کرنے والے کا حقِ ملکیت قائم رہتا ہے۔ پس اگر عورت اپنی رضا و رغبت سے اور کسی جبر و اکراہ کے بغیر اپنے حصۂ وراثت

کے عوض کوئی چیز قبول کر لے، خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ، تو وہ ایسا کر سکتی ہے۔ ایسی ''عزیز ولی'' یا غیرت یا قبائلی وعلاقائی رسم جس سے شریعت کا کوئی حکم پامال ہوتا ہے، وہ جہالت ہے، حق کا انکار ہے اور دین سے دوری ہے۔ اسلام ایسی جاہلانہ رسوم کو مٹانے کے لیے آیا ہے اور ہمیں اسلامی شعار کو اپنانا چاہیے۔

مفتی نور اللہ نعیمی نور اللہ مرقدہٗ کا فتویٰ حسبِ ذیل ہے، ان سے سوال کیا گیا: ''ولیا ولد ہدایت کو فوت ہوئے تین چار سال گزر چکے ہیں، ولیا مذکور نے اپنی وفات کے بعد چار لڑکیاں اور ایک لڑکا محمود باقی چھوڑا اور جب ولیا مذکور کی وراثت کا انتقال ہونے لگا، لڑکیوں کو حقوقِ وراثت دینے کے لیے بلایا گیا تو اُنہوں نے عدالت کے سامنے بیان حلفی دیا کہ ہم اپنے حصہ کی وراثت اپنے بھائی محمود کو دینا چاہتی ہیں۔ اس کے بعد عدالت نے فیصلہ کیا اور محمود کے نام تمام وراثت منتقل کردی۔ اب محمود بھی فوت ہو گیا ہے اور اس کا کوئی لڑکا یا لڑکی باقی نہیں ہے، لاولد فوت ہوا ہے باقی اسکے ایک بیوی اور چار ہمشیرہ ہیں اور ایک حقیقی چچا اور چچا زاد بھائی بھی ہیں''۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''ولیا کی چار لڑکیاں اپنے حقِ وراثت سے اپنے بھائی محمود کے حق میں دستبردار ہو گئیں تو محمود ہی مالک ہو گیا۔ اب جب محمود لاولد فوت ہو گیا ہے تو وہ بہنیں بھی اس کی وراثت کی حق دار ہیں اور اس کی بیوی اور حقیقی چچا بھی اور چچا زاد بھائی محروم ہیں، چاروں بہنیں دو تہائی ترکہ کی حقدار ہیں (قرآن کریم اور حدیثِ متفق علیہ) یہ مسئلہ بارہ سے آئے گا۔ نوٹ: یہ فتویٰ اس صورت میں ہے کہ چاروں بہنیں محمود ہی کی حقیقی بہنیں یا سب سوتیلی باپ سے ہوں اور اگر بعض حقیقی اور بعض سوتیلی یا کل سوتیلی صرف ماں سے ہوں تو حکم بدل جائے گا، دوبارہ سوال کر کے دریافت کریں''۔ (فتاویٰ نوریہ، جلد 4، ص: 334-332)

مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے مایہ ناز فقیہ تھے، وہ دین کے مسائل اور اُن کی حکمتوں سے واقف تھے۔ لہٰذا ہم حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے یہ قرار دے سکتے ہیں کہ اُنہوں نے معلوم کر لیا ہوگا کہ محکمۂ مال کے عملے نے اپنے کھاتوں اور ریکارڈ میں بہنوں کا

حصہ وراثت ملکیت کے خانے میں اُن کے نام درج کردیا ہوگا اور اُس کے بعد بہنوں نے اپنا حصہ اپنے بھائی کو ہبہ کردیا ہوگا۔ دیہاتی لوگ بعض اوقات صورتِ مسئلہ پوری طرح سے بیان نہیں کرپاتے یا خود اَن پڑھ ہوتے ہیں اور کسی دوسرے سے سوال لکھواتے ہیں۔لیکن مفتی صاحب نے بہرحال پوری صورتِ حال معلوم کرکے فتویٰ دیا ہوگا اگرچہ انسان سے سہو بھی ہوسکتا ہے اور ہم سے بھی ہوتا رہتا ہے اور مطلع ہونے پر اس کی اصلاح ہماری شرعی ذمہ داری ہوتی ہے۔

ترکے کا مسئلہ

سوال:

میرے شوہر کو 29 ستمبر 2012ء میں شہید کردیا گیا تھا۔میرے مرحوم شوہر کے ترکے میں کچھ پلاٹ ہیں، پلاٹ خریدتے وقت میرے شوہر کو کچھ رقم کی ضرورت تھی، انہوں نے مجھ سے میرا زیور (جس کا وزن 91 گرام تھا) مانگا اور کہا کہ بعد میں بنوا کردے دوں گا۔ ورثاء میں شوہر کے والد (مخدوم عبداللطیف)، والدہ (خیر النسا)، ایک بیوہ (ملکہ) میری ایک بیٹی (ملیحہ)، تین بھائی (محمد یعقوب، عبدالفتاح، عبدالکریم) اور پانچ بہنیں (قدر النسا، شائستہ، ذکیہ، ماجدہ، قرۃ العین) ہیں۔ والد مخدوم عبداللطیف کا انتقال میرے شوہر کے انتقال کے ڈیڑھ سال بعد 2013ء میں ہوا۔ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟۔

(ملکہ عبدالرزاق، جمشید روڈ کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، تو مُتوفّٰی کے ترکے سے تکفین وتدفین کے اخراجات، مرحوم کے ذمے جو قرض واجب الادا ہے، اس قرض کی ادائیگی اور اگرکوئی وصیت کی ہو تو تہائی ترکے کی حد تک وصیت کو پورا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ 24 حصوں میں تقسیم ہوگا:

بیوہ ملکہ عبدالرزاق کو 3 حصے، ایک بیٹی ملیحہ کو کل ترکے کا نصف یعنی 12 حصے، والد مخدوم

عبداللطیف کو 5 حصے اور والدہ خیر النساء کو 4 حصے ملیں گے۔ مخدوم عبدللطیف کو ملنے والا حصہ اُن کی وفات کے وقت جو ورثاء موجود تھے، اُن کے درمیان اسلام کے قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوگا۔

آپ کے بیان کے مطابق آپ کے مرحوم شوہر نے آپ سے آپ کا 91 گرام زیور پلاٹ کی خریداری کے وقت آپ سے قرض کے طور پر لیا تھا اور بعد میں زیور بنوا کر دینے کا وعدہ کیا تھا، لہٰذا ترکے کی تقسیم سے پہلے مرحوم کے ترکے میں سے آپ کا زیور بنوا کر دینا ہوگا۔ بعدازاں بقیہ ترکہ مندرجہ بالا تناسب کے مطابق ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

ترکے کی تقسیم

سوال:

میرا ایک غیر شادی شدہ بیٹا فاران الدین احمد 26 سال کی عمر میں انتقال کرگیا۔ جہاں ملازمت کرتا تھا، اس ادارے کی جانب سے بقایا جات اور کسی کو کچھ رقم قرض دی تھی، وصول ہوچکی ہے، یہ سب ملا کر یہ رقم 4,86742/= روپے بنتی ہے۔ ورثاء میں والد، والدہ، چار بھائی اور ایک بہن ہیں۔ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ کیا اس رقم سے ہم بیٹے کا حج بدل کر سکتے ہیں؟، (انعام الدین، گلستانِ جوہر کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیانِ سائل اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، تو مُتوَفّٰی کے ترکے سے تکفین وتدفین کے اخراجات، مرحوم کے ذمے اگر قرض واجب الادا ہے، اس کی ادائیگی اور اگر کوئی وصیت کی ہو تو تہائی ترکے کی حد تک وصیت کو نافذ کرنے کے بعد والد کی موجودگی کی وجہ سے بہن بھائی محروم ہوں گے۔ کل رقم چار لاکھ چھیاسی ہزار سات سو بیالس میں سے والدہ کو 81123.7 روپے ملیں گے جب کہ والد کو بقیہ کل رقم مل جائے گی۔

مذکورہ رقم ورثاء کا حق ہے، جس میں تصرُّف کا اختیار کسی ایک کو حاصل نہیں ہے، آپ

کے بیان کردہ حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بیٹے پر حج فرض نہیں تھا۔ تاہم اگر آپ اپنی مرضی سے چاہیں، تو اُن کی طرف سے حجِ بدل کر سکتے ہیں۔

گمشدہ فرد کی موت کا حکم

سوال:

میرے والد سندھ میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر 1999ء تک فائز تھے، 9 مئی 1999ء کو انہیں اغوا کرلیا گیا، ایک ماہ بعد ایک خط آیا کہ ہم نے انہیں قتل کر دیا ہے، فلاں جگہ سے لاش اٹھالیں، لیکن وہاں کوئی لاش نہیں ملی۔ سات سال بعد حکومت نے انہیں ریٹائر کر دیا اور پنشن لینے کی اجازت دیدی۔ حکومت کی جانب سے انشورنس کے کلیم کے لیے کورٹ سے تاریخِ وفات کا سرٹیفکیٹ درکار ہے، شرعی اعتبار سے تاریخِ وفات کب سے شمار ہوگی؟، (محمد شاہ رخ علی پنہور، کراچی)۔

جواب:

شرعی گواہوں سے جب آپ کے والد کی وفات ثابت ہو، تو جس وقت کے بارے میں ثابت ہوا کہ اُنہوں نے وفات پائی، ان کی موت کا اعتبار کیا جائے گا اور وقت وفات سے ورثاء ترکے سے اپنے اپنے حصے کے حق دار ہوں گے۔ اور اگر قاضی یعنی حاکم اس کی موت کا حکم لگا دے، تو اُس حکمِ وفات کے اجرا کے دن سے وہ وفات یافتہ متصور ہوگا اور اس کے ورثاء اس فیصلہ کی تاریخ سے اس کے ترکے میں سے اپنا اپنا حصہ پانے کے حق دار ہوں گے۔

اسلامی قانونِ میراث کا اصول ہے کہ اگر کوئی شخص لاپتا ہو جائے اور اُس کی زندگی یا موت کے بارے میں کسی کو حتمی علم نہ ہو تو وہ شخص اپنے مال کے اعتبار سے زندہ تصور کیا جائے گا، یعنی اُس کا مال اُس وقت تک تقسیم نہیں کیا جا سکتا جب تک اُس کی موت کے بارے میں کوئی شہادت یا ثبوت حاصل نہ ہو جائے۔ لیکن یہی گم شدہ شخص اگر کسی کا وارث ہے تو اِس کو وراثت سے حصہ نہیں ملے گا۔ امام سراج الدین محمد بن عبدالرشید (مُصنفِ

سراجی) لکھتے ہیں:

اَلْمَفْقُوْدُ حَیٌّ فِیْ مَالِہٖ حَتّٰی لَایَرِثُ مِنْہُ اَحَدٌ وَمَیِّتٌ فِیْ مَالِ غَیْرِہٖ حَتّٰی لَایَرِثُ مِنْ اَحَدٍ وَیُوْقَفُ مَالُہٗ حَتّٰی یَصِحَّ مَوْتُہٗ اَوْتَمْضِیَ عَلَیْہِ مُدَّۃٌ واختلف الرِّوَایَاتُ فِیْ تِلْکَ الْمُدَّۃِ فَفِیْ ظَاھِرِالرِّوَایَۃِ اِذَالَمْ یَبْقَ اَحَدٌ مِنْ اَقْرَانِہٖ حُکِمَ بِمَوْتِہٖ وَرَوَی الْحَسَنُ بْنُ زِیَادٍعَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ رَحِمَہُ اللہ تَعَالٰی اِنَّ تِلْکَ الْمُدَّۃَ مِائَۃٌ وَعِشْرُوْنَ سَنَۃً مِنْ یَوْمٍ وُلِدَ فِیْہِ الْمَفْقُوْدُ، وَقَالَ مُحَمَّدٌ رَحِمَہُ اللہ تَعَالٰی مِائَۃٌ وَعَشَرَ سِنِیْنَ وَقَالَ اَبُوْیُوْسُفَ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی مِائَۃٌ وَخَمْسُ سِنِیْنَ وَقَالَ بَعْضُھُمْ تِسْعُوْنَ سَنَۃً وَعَلَیْہِ الْفَتْوٰی۔

ترجمہ: ''مفقود شخص اپنے مال کے اعتبار سے زندہ ہے یہاں تک کہ اُس کا کوئی وارث نہیں ہوگا (یعنی اس کا مال بطور وراثت تقسیم نہیں ہوگا) اور دوسرے شخص کی میراث کے بارے میں وہ مردہ شمار کیا جائے گا اور وہ کسی کا وارث نہیں بنے گا، اُس کا مال موقوف رکھا جائے گا یہاں تک کہ اُس کی موت ثابت ہوجائے یا اس پر (طویل) مدت گزر جائے۔ اور اس مدت کے بارے میں مختلف روایات ہیں، (فقہِ حنفی) ظاہر روایت یہ ہے کہ جب اُس کے ہم عصروں میں کوئی زندہ نہ رہے تو اس کی موت کا حکم دے دیا جائے گا۔ حسن بن زیاد نے امام اعظم رحمہ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ جس دن مفقود پیدا ہوا، اُس دن سے یہ مدت ایک سو بیس سال ہے، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ ایک سو دس سال ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ علیہ نے ایک سو پانچ سال مدت بیان فرمائی ہے اور بعض (دیگر) علماء نے یہ مدت 90 سال بیان کی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے''۔ (سراجی، ص: 125، مکتبۃ البشری، کراچی)

ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''مفقود (Missing Person یا Non Existent) اُس شخص کو کہتے ہیں جو لاپتا ہو، اس کی موت یا زندگی کا کسی کو کوئی علم نہ ہو''۔ ایسے شخص کے ساتھ اُس مدت کے حوالے سے کہ جس کے گزرنے کے بعد اس کی موت کا حکم دے دیا جائے، تین قسم کے احکام متعلق ہوتے ہیں: (الف) اس کی بیوی کے حوالے سے (ب) اس کے مال کے

حوالے سے (ج) دوسرے سے اُس کے وراثت پانے کے حوالے سے۔۔۔آگے چل کر اس کے مال کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ائمۂ مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ مفقود الخبر اپنے زیرِ ملکیت مال اور دیگر حقوق کے حوالے سے زندہ تصور کیا جائے گا، یہاں تک کہ اس کی وفات پر گواہ قائم ہوجائیں یا قاضی اس کی وفات کا حکم دے دے، یہ مفقود کے حوالے سے سلبی جانب (Negative Aspect) ہے اور اس پر حسبِ ذیل احکام مرتب ہوں گے: اس کا مال وارثوں میں تقسیم نہیں ہوگا، قاضی یعنی حاکم اپنی نگرانی میں اُس کی بیوی اور اُن اصول وفروع، جن کی کفالت اس کے ذمے ہے، پر اُس کے مال میں سے خرچ کرے گا، کیونکہ اِن سب کا نفقہ اس پر اُس کی موجودگی یا غیاب (Absence) دونوں صورتوں میں اُس پر واجب ہے۔ اور اس کے عُقود جیسے اجارہ وغیرہ جو عاقدین میں سے کسی ایک کی وفات سے ختم ہوجاتے ہیں، جاری رہیں گے اور قاضی اس کے مال کی حفاظت اور واجب الادا قرضوں کی وصولی کے لیے کوئی وکیل مقرر کرے گا۔

(فقہ الاسلامی وادلتہٗ ،جلد 10 ،ص:7892)

صورتِ مسئولہ میں آپ اپنے پاس دستیاب شواہد کے ساتھ مسئول کورٹ سے رجوع کریں، جس میں متعلقہ محکمے کی ریٹائرمنٹ کی دستاویزات بھی ہیں۔ عدالت کا اختیار اور صوابدید ہے کہ ریڈیو اور ٹیلیویژن پر اُس کی باتصویر تشہیر کرائے اور ایک مناسب وقفے کے بعد جب اس کی حیات کے کوئی شواہد نہ ملیں، تو موجودہ دور میں عدالت فقہ مالکی پر عمل کرتے ہوئے چار سال کی مدت اس کی تلاش کے لیے دے گی اور اگر اس عرصے میں اس مفقود الخبر کا پتا نہ چلا تو عدالت اس کی موت کا حکم لگائے گی اور اس کے بعد اس کی بیوی چار ماہ دس دن عدتِ وفات گزارے گی اور حکمِ موت ہی پر ترکے کی تقسیم کا عمل شروع ہوگا۔

بہنوں کو حصے سے محروم کرنا ظلم ہے

سوال:

میرے دادا نے وراثت میں زمین چھوڑی اور میرے والد کو دلچسپی نہ تھی۔ میرے

والد کے انتقال کے بعد میرے بھائیوں کو معلوم ہوا کہ میرے دادا نے وراثت میں زمین چھوڑی تھی۔ میرے بھائی اس زمین کو آباد کرتے ہیں، زمین کو آباد کرنے کے دوران کوئی دوسرا فریق میرے بھائیوں کے ساتھ عدالت میں کیس کر دیتا ہے کہ یہ زمین ہماری قوم نے آپ کے دادا کو نہیں دی تھی، لیکن وہ کیس میرے بھائی جیت جاتے ہیں اب پوچھنا یہ ہے کہ اس زمین میں میرا بھی حصہ بنتا ہے کہ نہیں؟۔

وہ مجھے میرا حصہ نہیں دیتے اور میں نے بار بار ان کو کہا ہے، وہ یہی کہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں بہنوں کو کسی نے بھی زمین نہیں دی ہے۔ اگر وہ اپنے بچوں کی خاطر نہیں دیتے کہ ہمارے بچوں کی زمین کم ہو جائے گی تو قرآن اور حدیث میں کیا حکم ہے، (ایک مظلوم خاتون)۔

جواب:

مذکورہ جائیداد میں آپ کے والد کے توسط سے آپ کا حصہ بنتا ہے، جس کی ادائیگی آپ کے بھائیوں پر لازم ہے۔ بیٹی کو باپ یا ماں کے ترکے سے محروم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ بیٹیوں کا حق قرآن کی نصِ قطعی سے ثابت ہے، جسے قطعاً رد نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ**

ترجمہ: ''اللہ تمہاری اولاد (کی وراثت میں حصے) کے متعلق تمہیں حکم دیتا ہے کہ (میت کے) ایک بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں کے حصے برابر ہے، سو اگر (میت کی اولاد میں) صرف بیٹیاں (دو یا) دو سے زیادہ ہوں تو ان کا حصہ (کل ترکے کا) دو تہائی ہے اور اگر صرف ایک بیٹی ہو تو اس کا حصہ (کل ترکہ کا) نصف ہے، (النسا:11)''۔ اگر بیٹا یا کوئی وارث بیٹی کو محروم کرتا ہے تو یہ ظلم ہے اور اس طرح کا کوئی بھی عمل شرعاً ناقابلِ قبول ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:
''جو لوگ بیٹیوں اور بہنوں کو ترکہ نہیں دیتے، (اُن کا یہ عمل) قرآن مجید کے خلاف ہیں، اور

جن کا یہ قول ہو کہ ان کو میت کے مال سے کچھ نہیں پہنچتا، جس کے ظاہر معنیٰ یہ ہیں کہ اُن کا ترکہ میں کوئی حق نہیں ہوتا، یہ صریح کلمۂ کفر ہے، ایسوں پر توبہ فرض ہے، نئے سرے سے کلمۂ اسلام پڑھیں، اس کے بعد اپنی عورتوں سے نکاح دوبارہ کریں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 26، ص:353)

لزومِ کفر کا یہ حکم اُس صورت میں ہے کہ کوئی شخص بیٹی/بہن کے حقِ وراثت کا منکر ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ان کا باپ کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے، کیونکہ یہ قرآن کی نصِ قطعی کا انکار ہے، لیکن اگر وہ بیٹی کے حقِ وراثت کا عقیدۃً تو منکر نہیں ہے، لیکن ظلم کرتے ہوئے اپنی علاقائی یا قبائلی رسوم یا رواج کو بہانہ بنا کر بیٹی یا بہن کو وراثت میں حق دینے سے انکاری ہے، یہ صریح ضلالت اور فسق ہے، کیونکہ اس طرح وہ قرآن میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کے صریح اور قطعی حکم کو رسم و رواج کی بنیاد پر رَد کرتا ہے اور گویا قرآن پر علاقائی یا قبائلی رسم و رواج کو فوقیت دیتے ہوئے بیٹی یا بہن کو اُس کے حقِ وراثت سے محروم رکھتا ہے، تو یہ گناہِ کبیرہ ہے اور ظلماً مال غصب کرنا ہے اور اس پر حدیث پاک میں بڑی وعید آئی ہے:

''مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا، طَوَّقَہُ اللّٰہُ اِیَّاہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ سَبْعِ اَرَضِیْنَ''۔

ترجمہ:''جو شخص کسی کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا بھی ظلماً (یعنی ناحق) لے گا، تو اُسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (سزا کے طور پر) سات زمینوں کا طوق پہنائے گا''۔ (صحیح مسلم:4108)

حلال وحرام کے مسائل

غیر مسلم معلمہ کے ذریعے اسلامیات کی تعلیم

سوال: مسلمانوں کے اسکول میں ایک عیسائی عورت مسلمان بچوں کو اسلامیات پڑھاتی ہے، شرعاً اس کا پڑھانا درست ہے یا نہیں؟ (محمد بلال، ڈرگ روڈ کراچی)۔

جواب: اسکول انتظامیہ کے لیے بہتر صورت تو یہ ہے کہ وہ اسلامیات پڑھانے کے لیے کسی دیندار مسلمان معلّم یا معلّمہ کا انتظام کریں۔ اسلامی تعلیمات عقائد، معاملات اور عمل کے باہمی ربط سے منسلک ہیں۔ ایک استاذ کے لیے لازم ہے کہ جس مضمون کو وہ پڑھا رہا ہے، اُس پر اُسے پورا عبور حاصل ہو۔ اسلاف کا بیان کردہ یہ ضابطہ منارۂ نور ہے:

''عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيرِينَ قَالَ إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِينٌ فَانْظُرُوا عَمَّنْ تَأْخُذُونَ دِينَكُمْ''۔

ترجمہ: ''محمد بن سیرین فرماتے ہیں: حدیث کا علم دین ہے، پس تمہیں سوچنا چاہیے کہ تم کس سے اپنا دین حاصل کر رہے ہو''۔

(صحیح مسلم، باب بیان أن الاسناد من الدین، جلد 1 ص:78، بیروت)

معلم، داعی اور مُبلغ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ پڑھا رہا ہے، اس کی حقانیت پر اس کا یقین وایمان بھی ہو اور وہ خود بھی اس پر عامل ہو، جبکہ واضح بات یہ ہے کہ مسیحی عورت کا اسلامی عقائد اور تعلیمات کی حقانیت پر ایمان نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس پر عامل ہے، امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں: ''غیر مسلم کو واعظ بنا کر مسلمانوں کو اُس کا بیان سننا، اَشدّ سے اَشدّ کبیرہ گناہ اور اسلام کی بدخواہی ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، ج:15 ص:101، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

امام احمد رضا قادری مزید فرماتے ہیں: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے شاگرد سیدنا سعید بن جبیر کو راستے میں ایک بدمذہب ملا اور کہا: کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، فرمایا: ''نہیں سننا چاہتا''۔ عرض کی: ''ایک کلمہ ہی سہی''، انہوں نے اپنا انگوٹھا چھنگلیا کے سرے پر رکھ کر فرمایا: ''وَلَا نِصْفُ كَلِمَةٍ'' یعنی ''آدھا لفظ بھی نہیں''۔ لوگوں نے عرض کی: آپ کی اتنی شدت کا سبب کیا ہے؟ فرمایا: اِن سے دینِ اسلام کی بات سننا منع ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد امام محمد بن سیرین کے پاس دو بدمذہب آئے، عرض کی: ''کلام اللہ کی کچھ آیات آپ کو سنائیں؟''، فرمایا: ''میں نہیں سننا چاہتا''، عرض کی: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ احادیث سنائیں؟''، فرمایا: ''میں نہیں سننا چاہتا''، انہوں نے اصرار کیا، فرمایا: ''تم دونوں اٹھ جاؤ یا میں ہی اٹھ جاتا ہوں''۔ آخر وہ خائب وخاسر ہوکر چلے گئے۔ لوگوں نے عرض کی: ''اے امام! اگر وہ کچھ آیتیں یا حدیثیں سنا دیتے، تو سننے میں کیا حرج تھا؟''، فرمایا: ''مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ آیات واحادیث کے ساتھ اپنی کچھ تاویل لگالیں اور وہ میرے دل میں اتر جائیں تو ہلاک ہوجاؤں گا''۔

غور کا مقام ہے کہ ائمہ کو غیر مسلم سے دین اسلام کی بات سننے میں اس قدر خوف تھا اور اب عوام کو یہ جرأت ہے کہ پرواہی نہیں، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللہِ۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:15، ص:106، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

امام احمد رضا قادری مزید فرماتے ہیں: ''دیکھو امان کی راہ وہی ہے جو تمہیں تمہارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی: ''اِيَّاكُمْ وَاِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا يُفْتِنُوْنَكُمْ''، (ترجمہ: ''ان سے دور رہو اور انہیں اپنے سے دور کرو کہ کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اور تمہیں فتنہ میں نہ ڈال دیں'')۔ دیکھو نجات کی راہ وہی ہے جو تمہارے رب عزوجل نے بتائی: وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ، (ترجمہ: ''اور اگر تمہیں شیطان بھلادے، تو یاد آنے پر ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو، (الانعام:68)''۔ بھولے سے بھی اگر ان میں سے کسی کے پاس بیٹھ گئے ہو تو یاد آنے پر فوراً کھڑے ہوجاؤ، (فتاویٰ رضویہ، ج:15، ص:107)''۔ نوٹ: اعلیٰ حضرت کی عبارت کو ہم نے مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے سمجھنے کے لیے آسان بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ

ترجمہ: ''اور بے شک اللہ نے تم پر کتاب میں یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی

آیتوں کا انکار کیا جارہا ہے اور اُن کا مذاق اڑایا جارہا ہے، تو تم اُن کے ساتھ نہ بیٹھو، یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بحث میں مشغول ہوجائیں، (ورنہ) بلاشبہ تم بھی انہی جیسے ہوجاؤ گے"۔ (النساء: 140)

ایک قابلِ توجہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر اسلامیات کے اسباق میں قرآن کی آیات ہیں، تو انہیں ناپاکی کی حالت میں پڑھنا اور چھونا شرعاً منع ہے اور غیر مسلم سے یہ توقع رکھنا بے جا ہے کہ وہ ان شرعی احکام کی پابندی کرے گا۔

الحمد للہ! پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور یہاں اسلامیات کے لیے معلم یا معلمہ مسلمان ہونے چاہئیں، یہاں اسلامی معلّمین اور معلمات کی قلت نہیں ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ پُرامن طریقے سے جاکر اسکول کی انتظامیہ کو سمجھائیں، فساد سے اجتناب کریں۔ آج کل بہت سی این جی اوز کو بیرونِ ملک سے مالی وسائل صرف اس لیے دیے جاتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کریں اور وہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں، لہٰذا قرآن کے اسلوبِ دعوت وحکمت اور موعظۂ حسنہ سے مُثبت اور پُرامن انداز میں اپنا مقصد حاصل کرنا چاہیے۔ ان تمام مواقع پر ہر ایسے ردِّعمل سے گریز مناسب ہے کہ جس کا نقصان نفع سے زیادہ ہو۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس موقف کو اُس کے سیاق وسباق میں سمجھنا ضروری ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لینا چاہیے کہ اگر کسی مخالف یا لامذہب پر دین کی حجت قائم کرنا اور دلیل سے حق بات کا ابلاغ وقت کی ضرورت ہو، تو اُس سے گریز کیا جائے، یہ نتیجہ اخذ کرنا امام احمد رضا کے کلام کا منشا نہیں ہے، بلکہ اِحقاقِ حق، اِبطالِ باطل اور اِبلاغِ دین ہر صاحبِ علم کی شرعی اور دینی ذمے داری ہے، البتہ بے علم یا کم علم لوگوں کو اپنے مقابلے میں زیادہ علمی استعداد کے حامل لامذہب سے بحث نہیں کرنی چاہیے، اِس کا نقصان نفع سے زیادہ ہوگا اور اُن کا مقصد تلبیس ہوتا ہے، یعنی مسلمان کو اپنے دین، ایمان اور عقائد کے بارے میں تشکیک میں مبتلا کردینا۔

غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کپڑوں کا حکم

سوال: عموماً مارکیٹ میں غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کپڑے فروخت کے لیے دکانوں پر رکھے ہوتے ہیں، جنہیں نوجوانوں کی اکثریت خرید کر استعمال کرتی ہے، کیا یہ کپڑے پاک شمار کیے جائیں گے؟، (ریاض احمد، لیاقت آباد کراچی)۔

جواب: غیر مسلم ملک سے درآمد کیے ہوئے استعمال شدہ سُویٹرز، جُرابیں، قالین، پردے اور دیگر پرانے کپڑے کہ جب تک ان پر نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو، پاک ہیں۔ بغیر دھوئے استعمال کرنے میں حرج نہیں، البتہ پینٹ، پاجامہ، انڈر ویر یا اس طرح کے کپڑوں کو دھو کر اور پاک کر کے استعمال کرنا بہتر ہے، شرعی احتیاط کا تقاضا یہی ہے، کیونکہ وہ لوگ قضاء حاجت کے بعد احتیاط نہیں کرتے۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں:

''وَقَالَ بَعْضُ الْمَشَایِخِ: تُکْرَہُ الصَّلَاۃُ فِی ثِیَابِ الْفَسَقَۃِ لِأَنَّھُمْ لَا یَتَّقُونَ الْخُمُورَ قَالَ الْمُصَنِّفُ: اَلْأَصَحُّ أَنَّہُ لَا یُکْرَہُ لِأَنَّہُ لَمْ یُکْرَہْ مِنْ ثِیَابِ أَھْلِ الذِّمَّۃِ إِلَّا السَّرَاوِیلُ مَعَ اسْتِحْلَالِھِمُ الْخَمْرَ فَھٰذَا أَوْلَی انْتَھَی۔ بِخِلَافِ مَا إِذَا ثَبَتَ بِخَبَرٍ مُوجِبٍ فِی التَّنْجِیسِ''۔

ترجمہ: ''اور بعض مشائخ نے کہا ہے کہ فساق کے استعمال شدہ کپڑوں میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ لوگ شراب سے نہیں بچتے۔ مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مکروہ نہیں ہے، کیونکہ غیر مسلموں کے کپڑوں میں سے شلواروں کے علاوہ باقی کپڑوں کا استعمال مکروہ نہیں ہے، اس کے باوجود کہ وہ شراب کو حلال جانتے ہیں تو فساق کے کپڑے بطریق اولیٰ مکروہ نہیں ہیں، برخلاف اس کے کہ جب اس کی وجہ نجاست کسی یقینی خبر سے ثابت ہو جائے''۔

(فتح القدیر، ج:1،ص:213-212)

صدرُ الشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''فاسقوں کے استعمالی کپڑے جن کا نجس ہونا معلوم نہ ہو، پاک سمجھے جائیں گے، مگر بے نمازی کے پاجامے وغیرہ میں

اِحتیاط یہی ہے کہ رُومالی پاک کرلی جائے کہ اکثر بے نَمازی پیشاب کر کے وَیسے ہی پاجامہ باندھ لیتے ہیں اور کفار کے ان کپڑوں کے پاک کرلینے میں تو بہت خیال کرنا چاہیے''۔

(بہارِشریعت حصہ: 2، صفحہ: 405)

احتیاط اسی میں ہے کہ غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کپڑوں اور دیگر سامان کو دھوکر استعمال کیا جائے اور دھونے کی مشین میں جراثیم کش کیمیکل کا استعمال احتیاط کی بنا پر ضروری ہے تاکہ کوئی وائرس نہ پھیلے۔

چھپکلی مارنے کا حکم

سوال: چھپکلی کو مارنے پر نیکیاں ملتی ہیں، ایسا کیوں ہے جبکہ آقا دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو جانوروں پر بھی شفقت فرمایا کرتے تھے، (محمد عبدالقدیر احمد، ملتان)۔

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام عالَم کے لیے رحمت ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر جاندار پر شفقت فرماتے تھے، احادیث مبارکہ میں جن جانوروں کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے، اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کا بیان ہے اور جن جانوروں کو شارع علیہ السلام نے قتل کرنے کا حکم دیا ہے، اُن کو قتل کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم پر عمل کرنا چاہیے۔ ایک حدیث پاک میں پانچ جانوروں کے متعلق فرمایا:

خَمْسٌ فَوَاسِقُ يُقْتَلْنَ فِي الْحَرَمِ الْفَأْرَةُ، وَالْعَقْرَبُ، وَالْحُدَيَّا، وَالْغُرَابُ، وَالْكَلْبُ الْعَقُورُ

ترجمہ: ''پانچ جانور فاسق ہیں، اُن کو حرم میں (بھی) ماردیا جائے گا، چوہا، بچھو، چیل، کوا اور کاٹنے والا کتا''۔ (صحیح بخاری: 3314)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات انسانیت کے وسیع تر مفاد میں حکمت وفوائد سے بھرے ہوئے ہیں، مثلاً ارشاد فرمایا:

وَأَطْفِئُوا الْمَصَابِيحَ عِنْدَ الرُّقَادِ، فَإِنَّ الْفُوَيْسِقَةَ رُبَّمَا اجْتَرَّتِ الْفَتِيلَةَ فَأَحْرَقَتْ أَهْلَ الْبَيْتِ

ترجمہ:''سوتے وقت چراغوں کو بجھادو کیونکہ فُوَیْسِقَة(چوہا) بعض اوقات چراغ کی بتی کھینچ کرلے جاتا ہے، پس گھر والوں کو جلادیتا ہے''۔(صحیح بخاری:3316)

حدیث پاک میں ہے:عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلی الله علیه وسلم قَالَ لِلْوَزَغِ: الْفُوَيْسِقَةُ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چھپکلی کے بارے میں فرمایا کہ وہ فُوَیْسِقه ہے''۔(سنن ابن ماجہ:3230)

''الوَزَغ'' کامعنی گرگٹ ہے یا چھپکلی؟

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی لکھتے ہیں:''الوَزَغ''، وَزَغَةٌ کی جمع ہے، علامہ کرمانی نے کہا ہے:''الوَزَغ'' ایک چوپایا ہے جو گھاس کی جڑوں میں دوڑتا ہے، ایک قول یہ ہے کہ وہ اونٹنی کے تھن سے دودھ نکال کر اس کو پی جاتا ہے، ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جو آگ جلائی گئی تھی، یہ اُس میں پھونک ماررہا تھا۔الجوہری نے کہا ہے: ''الوَزَغَةُ'' ایک چھوٹا سا چوپایا ہے۔

میں کہتا ہوں:''الوَزَغَةُ'' کی یہ تفسیر گرگٹ پر صادق آتی ہے، دوسری تفسیر درج ذیل ہے، اس کے اعتبار سے اس کا معنی چھپکلی ہے۔علامہ ابن الاثیر نے کہا ہے:''الوَزَغَةُ'' کو ہی''سَامُّ اَبْرَصُ'' کہا جاتا ہے۔(علامہ عینی فرماتے ہیں:) یہی تعریف صحیح ہے، یہ وہی ہے جو دیواروں اور چھتوں پر چلتی رہتی ہے، علامہ ابن الاثیر نے کہا ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: جب بیت المقدس کو آگ لگائی گئی تو چھپکلیاں اس میں پھونکیں مار رہی تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے نہیں سنا کہ نبی ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دیا ہو''۔(عمدۃ القاری، ج:10،ص:264،دارالکتب العلمیہ بیروت)

علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے''نعمة الباری''میں لکھا:''میں کہتا ہوں کہ متعدد احادیث میں چھپکلی کو قتل کرنے کے حکم کی تصریح ہے، (نعمۃ الباری، ج:4، ص:267)''۔ہوسکتا ہے کہ اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو یہ حدیث نہ پہنچی ہو۔

نوٹ: فُوَیسِقہ، فاسقۃٌ کی تصغیر ہے۔''فِسق'' کے معنی ہیں: ''حق وصلاح کے راستے سے ہٹ جانا''، اسی لیے عاصی کو فاسق کہتے ہیں، کیونکہ وہ راہِ اعتدال سے انحراف کرتا ہے۔ ان جانوروں کو ''فَوَاسِق'' استعارے کے طور پر کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ فطرتاً خبیث ہوتے ہیں اور ایک قول کی رُو سے ان جانوروں کو فُوَیسِق اس لیے کہتے ہیں کہ حِل وحرم دونوں میں ان کے لیے کوئی حرمت نہیں ہے، یعنی انہیں حرم میں بھی مارا جا سکتا ہے''۔

(لسان العرب، ج:10، ص:308)

(۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ قَتَلَ وَزَغًا فِي أَوَّلِ ضَرْبَةٍ فَلَهُ كَذَا وَكَذَا حَسَنَةً وَمَنْ قَتَلَهَا فِي الثَّانِيَةِ فَلَهُ كَذَا وَكَذَا، أَدْنَى مِنَ الْأُولَى، وَمَنْ قَتَلَهَا فِي الضَّرْبَةِ الثَّالِثَةِ فَلَهُ كَذَا وَكَذَا حَسَنَةً، أَدْنَى مِنَ الَّذِي ذَكَرَهُ فِي الْمَرَّةِ الثَّانِيَةِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے پہلی ضرب میں چھپکلی کو مار دیا، اس کو اتنی اور اتنی نیکیوں کا اجر ملے گا اور جس نے دوسری ضرب میں مارا، اس کو اتنی اور اتنی نیکیوں کا اجر ملے گا اور یہ اجر پہلی ضرب سے کم ہوگا اور جس نے اس کو تیسری ضرب میں مارا اس کو اتنا اور اتنا اجر ملے گا اور یہ دوسری بار کے اجر سے کم ہوگا''۔ (صحیح مسلم: 2440، سنن ابن ماجہ: 3229)

(۳) عَنْ سَائِبَةَ مَوْلَاةِ الْفَاكِهِ بْنِ الْمُغِيرَةِ أَنَّهَا دَخَلَتْ عَلَى عَائِشَةَ فَرَأَتْ فِي بَيْتِهَا رُمْحًا مَوْضُوعًا فَقَالَتْ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ مَا تَصْنَعِينَ بِهَذَا قَالَتْ نَقْتُلُ بِهِ هَذِهِ الْأَوْزَاغَ فَإِنَّ نَبِيَّ اللهِ صلى الله عليه وسلم أَخْبَرَنَا أَنَّ إِبْرَاهِيمَ لَمَّا أُلْقِيَ فِي النَّارِ لَمْ تَكُنْ فِي الْأَرْضِ دَابَّةٌ إِلَّا أَطْفَأَتِ النَّارَ غَيْرَ الْوَزَغِ فَإِنَّهَا كَانَتْ تَنْفُخُ عَلَيْهِ فَأَمَرَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم بِقَتْلِهِ۔

ترجمہ: ''فاکہ بن مغیرہ کی باندی سائبہ بیان کرتی ہیں کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں، تو دیکھا کہ گھر میں ایک جگہ نیزہ رکھا ہوا ہے، انہوں نے کہا: اے اُمّ المومنین

آپ اس نیزہ سے کیا کرتی ہیں؟، اُنہوں نے فرمایا: ہم اس نیزہ سے چھپکلیوں کو مارتے ہیں کیونکہ نبی ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو روئے زمین کا ہر جانور اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہا تھا، ماسوا چھپکلی کے، وہ آگ میں پھونک مار رہی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو مارنے کا حکم دیا''۔

(سُنن ابن ماجہ:3231)

جس طرح رسول اللہ ﷺ کا کسی کے لیے نفع کی دعا کرنا آپ ﷺ کی صفتِ رحمت کا مظہر ہے، اسی طرح مستحقِ عذاب کے لیے ضرر اور نقصان کی دعا کرنا بھی آپ کی رحمت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ وہ اسی کا حق دار ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن، رؤف اور رحیم بھی ہے اور جبار، قہار اور مُنتقم بھی ہے اور کفار وفساق کو عذاب دینا اس کی صفتِ رحمت کے منافی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکابر کفار کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی دعا کے لیے ''بددعا'' کا کلمہ استعمال نہیں کرتے بلکہ علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے مقامات پر ''دعاءِ ضرر'' لکھتے ہیں اور امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز نے قنوتِ نازلہ کی بحث میں لکھا ہے: ''اور نماز صبح میں قنوت نہ پڑھتے، مگر جب کسی قوم کے لیے ان کے فائدے کی دعا فرماتے یا کسی قوم پر ان کے نقصان کی دعا فرماتے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص:520)

ضرورت کے تحت جانوروں کا مارنا

سوال:

ہمارے فلیٹس میں بلیوں کی بہتات ہے، یہ اکثر دروازوں پر پیشاب پوٹی کر دیتی ہیں۔ پنجرے میں بند کر کے کسی دور علاقے میں چھوڑنے کی کوشش بھی ناکام ہو چکی ہے، ہم انہیں کس حد تک سزا دے سکتے ہیں، کیا کھانے پینے کی اشیاء میں کچھ ملا کر دے سکتے ہیں، جس سے وہ ختم ہو جائیں، اس عمل سے ہم گنہگار تو نہیں ہوں گے؟۔

(محمد حامد انصر، ماریہ لگژری اپارٹمنٹ، کراچی)

جواب:

جو جانور موذی نہیں ہیں، شریعت میں اُن کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، بلی اگر اذیت دیتی ہو تو علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْهِرَّةُ اِذَا كَانَتْ مُؤْذِيَةً لَا تُضْرَبُ وَلَا تُعْرَكُ أُذُنُهَا بَلْ تُذْبَحُ بِسِكِّينٍ حَادٍّ كَذَا فِي الْوَجِيزِ لِلْكَرْدَرِي

ترجمہ:''بلی جب ایذا دیتی ہو تو اُسے نہ ماریں اور نہ اُس کے کان کھینچیں بلکہ تیز چھری سے ذبح کردیں، جیسا کہ''وجیز کردری''میں ہے''۔(فتاویٰ عالمگیری، جلد خامس، ص:361)

بلا سبب بلی یا کسی جانور کو اذیت نہیں دینا چاہیے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَبْدِاللهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ سَجَنَتْهَا حَتّٰى مَاتَتْ فَدَخَلَتْ فِيهَا النَّارَ لَاهِيَ أَطْعَمَتْهَا وَسَقَتْهَا اِذْ حَبَسَتْهَا وَلَاهِيَ تَرَكَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک عورت کو بلی کے سبب عذاب دیا گیا، اُس نے بلی کو باندھ کر رکھا حتیٰ کہ وہ مرگئی، وہ عورت اس سبب سے جہنم میں داخل کی گئی، جب اس عورت نے بلی کو باندھا تو اس کو کھلایا نہ پلایا اور نہ اس کو کیڑے مکوڑے کھانے کے لیے آزاد کیا''۔(صحیح مسلم:2242)

اگر بلیوں سے آلودگی ہورہی ہے اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہے، تو جو صورت آپ نے بتائی ہے، وہ اختیار کی جاسکتی ہے۔ جس طرح شہر میں کتے بہت زیادہ ہوجائیں اور ان سے لوگوں کو نقصان کا اندیشہ ہو تو بلدیاتی ادارے بھی یہ تدبیر اختیار کرتے ہیں، البتہ بلاسبب یعنی گھر کی تلویث اور ان جانوروں کی ایذارسانی کے خطرات کے بغیر ان جانوروں کا مارنا درست نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں کتوں کی بہتات کے سبب اُن کے قتل کرنے کا حکم فرمایا۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابنِ عُمَرَ قَالَ: أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِقَتْلِ الْكِلَابِ فَأَرْسَلَ فِي أَقْطَارِ الْمَدِينَةِ أَنْ تُقْتَلَ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور مدینہ کے اطراف میں کتوں کو قتل کرنے کے لیے لوگ روانہ کیے''۔

(صحیح مسلم: 1570)

ڈی این اے ٹیسٹ کا حکم

سوال:

اسلام میں DNA ٹیسٹ کرانے کی اجازت ہے یا نہیں؟، نیز مغربی ممالک میں خواتین کا بھی Male ڈاکٹرز ہی ٹیسٹ کرتے ہیں، (مسعود کمال صدیقی، ناظم آباد کراچی)

جواب:

DNA دراصل Deoxyribonucleic acid کا مخفف ہے۔ جدید طبی اور سائنسی تحقیقات کے مطابق ڈی این اے ایک وراثتی اکائی کا نام ہے، جس کو عربی میں ''بصمة وراثية'' کہتے ہیں۔ دو افراد کے جسم سے کوئی خلیہ (Cell) لے کر تحقیق کی جاتی ہے کہ آیا ان دونوں میں اپنی اصل کے اعتبار سے وراثتی خصوصیات مشترک ہیں کہ ایک کو دوسرے کی نسبی اولاد قرار دیا جائے، گویا یہ ایک موروثی اشتراک کا مادہ ہے۔ آج کل ڈی این اے ٹیسٹ کو نسب کی تحقیق اور جرائم کی تفتیش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، الغرض یہ تفتیش اور تحقیق کا ایک سائنٹیفک طریقہ ہے۔ اسے قانون کی عدالت میں ایک قرینے کے طور پر تو معتبر مانا جاسکتا ہے، لیکن حدود وقصاص کے معاملات میں اِسے بنیادی شہادت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی تاحال پاکستان کے نظامِ قانون میں ایسی گنجائش ہے کہ محض ڈی این اے ٹیسٹ کی بنیاد پر کسی کو مجرم قرار دیا گیا ہو۔ گویا قانون کی زبان میں یہ ایک ظنی چیز ہے، کسی چیز کا حتمی اور قطعی ثبوت نہیں ہے۔ ہاں! دوسرے متعدد قرائن کے ساتھ مل کر اسے ظنِ غالب کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ ابھی تک ہمارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ آیا

مغرب میں، جو سائنسی وفنی علم اور تحقیقات کے اعتبار سے ہم سے بہت آگے ہے، اِسے حتمی اور قطعی قانونی شہادت کا درجہ حاصل ہے کہ جسے چیلنج نہ کیا جاسکتا ہو؟۔شاید ایسا نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ڈی این اے یعنی اس وراثتی اکائی میں اولاد اور والدین کے درمیان مشابہت کا تعین ہوسکتا ہے۔ ڈی۔این۔اے ٹیسٹ میں مذکورہ مادہ کو لے کر مشین کے ذریعہ جانچا جاتا ہے، مذکورہ ٹیسٹ کا تعلق چونکہ کسی مخصوص شے کی رؤیت ومشاہدہ پر نہیں، بلکہ تمام کارروائی مشین کے ذریعہ ہوتی ہے، اس لیے اس میں غلطی کے امکان کو کلی طور پر رد نہیں کیا جاسکتا۔مغرب میں بھی ایسے شواہد ملے ہیں کہ ڈی این اے کو حتمی اور قطعی شہادت کا درجہ دینا بے حد دشوار ہے۔یہی وجہ ہے کہ اجتماعی آبروریزی کیس میں خود محققین کے بقول ڈی این اے ٹیسٹ پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس ٹیسٹ میں ملے جلے متفرق مادہ مل کر کسی تیسرے شخص کی غلط نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔اسی وجہ سے ہمارے جدید فقہاء نے بھی اس کو حتمی اور قطعی شہادت کا درجہ نہیں دیا۔چنانچہ موجودہ زمانہ کے نامور فقیہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی فرماتے ہیں:

وَتَقَدَّمَ عَنَی الْبِصْمَةِ الْوَرَاثِیَةِ الطُّرُقُ الْمُقَرَّرَةِ فِی شَرِیعَتِنَا لِاِثْبَاتِ النَّسَبِ کَالْبَیِّنَةِ وَالِاسْتِلْحَاقِ وَالْفِرَاشِ أَیْ عَلَاقَةِ الزَّوجِیَةِ، لِاَنَّ هٰذِهِ الطُّرُقَ أَقْوٰی فِی تَقْدِیرِ الشَّرعِ فَلَایُلْجَأُ اِلٰی غَیرِهَا مِنَ الطُّرُقِ کَالبِصْمَةِ الْوَرَاثِیَةِ وَالْقِیَافَةِ اِلَّا عِنْدَ التَّنَازُعِ فِی الِاثْبَاتِ وَعَدمِ الدَّلِیلِ الأَقْوٰی، (ص:151)۔

ترجمہ:''اور یہ بات گزر چکی ہے کہ ہماری شریعت میں ثبوتِ نسب کے لیے شہادت، کسی کا خود اپنے نسب کو کسی کی طرف منسوب کرنے اور نکاح یعنی تعلقِ زوجیت کے طریقے مقرر ہیں، کیونکہ یہ طریقے شرعی اصولوں کے مطابق قوی ترین ہیں، سو ہمیں ڈی این اے اور قیافہ پر انحصار کی ضرورت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ تنازع کی صورت میں ثبوتِ نسب کے لیے قوی ترین دلیل موجود نہ ہو (تو اسے قرینے کے طور پر لیا جاسکتا ہے،)''۔

مذکورہ بالا تفصیل کے پیشِ نظر ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعہ کسی کے نسب کے اثبات یا

نفی کی حیثیت واضح ہوجاتی ہے کہ یہ ثبوت نسب کے اول الذکر متفقہ تین طریقوں (فراش، شہادت اور ادّعاءِ نسب) میں سے کسی طریقے پر فوقیت نہیں رکھتا، زیادہ سے زیادہ اس کی حیثیت قیافہ کی ہے، علماءِ احناف رحمہم اللہ کے ہاں قیافہ کے ذریعہ کسی کے نسب کا ثبوت یا نفی نہیں ہوتی۔ فراش کا حکم حدیث پاک سے ماخوذ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ

ترجمہ: ''بچے کا نسب فراش کی طرف منسوب ہوگا (یعنی بچہ اس شخص کا قرار پائے گا جس کے نکاح میں عورت ہے) اور زانی کے لیے پتھر ہے، (صحیح بخاری:6818)''۔ زانی کے لیے پتھر کے مُحدّثین نے دو معنی بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ وہ نسب کی نسبت سے محروم رہے گا اور دوسرا یہ کہ شادی شدہ زانی کو (ثبوتِ شرعی کے بعد) سنگسار کیا جائے گا۔

اگر ڈی این اے ٹیسٹ کرانا ہے تو خاتون کے خون کا نمونہ یا جسم کا کوئی خلیہ لیڈی ڈاکٹر یا نرس لے سکتی ہے، اس کے بعد ڈی این اے لیبارٹری میں ہوتا ہے، وہ ماہرین کرتے ہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ آج کل ڈی این اے ٹیسٹ کسی نامعلوم قاتل یا مقتول یا خودکش دہشت گرد کی شناخت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان نے بھی قرار دیا ہے کہ جبری آبروریزی کی صورت میں اگر عورت کے رحم سے مادّۂ منویہ کے اجزا لے کر یہ معلوم کیا جائے کہ زانی یا جبری آبروریزی (Rape) کرنے والا کون ہے؟ تو اسے زنا کی حد جاری کرنے کے لیے یا قتل کی صورت میں قصاص جاری کرنے کے لیے قطعی شہادت کے طور پر عدالت تسلیم نہیں کرسکتی ہے۔ البتہ اسے قرائن کی شہادت (Circumstancial Evidence) کے طور پر لیا جاسکتا ہے اور اس کی بنا پر اگر قاضی (Judge) کو اطمینان ہوجائے، تو تعزیر دے سکتا ہے۔

مقامِ حیرت ہے کہ جو NGOs ڈی این اے کو جبری آبروریزی (Rape) کے لیے حتمی اور قطعی ثبوت قرار دینے کے لیے واویلا مچا رہے ہیں، وہ زنا بالرضا کے لیے اسے

حتمی اور قطعی ثبوت قرار دینے کے حوالے سے مہر بلب ہیں۔

قتلِ عمد میں باہمی رضامندی سے مال پر صلح جائز ہے

سوال:

اگر ورثاءِ مقتول قتلِ عمد میں دیت لینا چاہیں، تو شریعتِ محمدی میں قتلِ عمد کی دیت کتنی ہے؟، نیز مقتول کے ورثاء قاتل سے مقدمہ کے خرچہ کا مطالبہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟،

(مولانا لعل مرجان، گلستانِ جوہر بلاک 19، کراچی)

جواب:

قتلِ عمد کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔کفر کے بعد تمام گناہوں میں سخت ترین گناہ قتل ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ۝

ترجمہ: ''اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اللہ اس پر لعنت کرے گا اور اللہ نے اس کے لیے عذاب عظیم تیار کررکھا ہے، (النسا:93)''۔قتلِ عمد میں قصاص لازم آتا ہے، اگر ورثاء راضی ہوں تو قاتل کو دیت لے کر معاف کرسکتے ہیں جب کہ قاتل بھی راضی ہو۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلۡکَبَائِرُ اَلۡاِشۡرَاكُ بِاللهِ وَعُقُوقُ الۡوَالِدَيۡنِ وَقَتۡلُ النَّفۡسِ وَالۡيَمِيۡنُ الۡغَمُوسُ۔

ترجمہ: '' اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، (ناحق) انسانی جان کو قتل کرنا اور (ماضی کے بارے میں قصداً) جھوٹی قسم کھانا (سب کے سب) کبیرہ گناہ ہیں''۔

(صحیح بخاری:6870)

حدیث پاک میں ہے:

مَنۡ قَتَلَ مُؤۡمِنًا مُتَعَمِّدًا دُفِعَ اِلٰی اَوۡلِيَاءِ الۡمَقۡتُولِ فَاِنۡ شَاؤُوۡا قَتَلُوۡا، وَاِنۡ شَاؤُو

أَخَذُواالدِّيَةَ وَهِيَ ثَلَاثُونَ حِقَّةً،وَثَلَاثُونَ جَذَعَةً وَأَرْبَعُونَ خَلِفَةً وَمَاصَالَحُوا عَلَيْهِ فَهُوَلَهُمْ۔

ترجمہ:''جس شخص نے کسی مومن کو عمداً قتل کیا، اس کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کردیا جائے گا، اگر وہ چاہیں تو اس کو قتل کردیں اور اگر وہ چاہیں تو اس سے دیت وصول کرلیں۔ قتل عمد کی دیت یہ ہے: تیس تین سال کی اونٹنیاں، تیس چار سال کی اونٹنیاں اور چالیس پانچ سال کی اونٹنیاں، اس کے علاوہ جس مقدار پر وہ صلح کرلیں''۔(سنن ترمذی:1387)

علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَقِيلَ اِنَّ قَوْلَهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى:فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ اِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ نَزَلَ فِي الصُّلْحِ عَنْ دَمِ الْعَمَدِ فَيَدُلُّ عَلَى جَوَازِ الصُّلْحِ وَسَوَاءٌ كَانَ بَدَلُ الصُّلْحِ قَلِيلًا أَوْ كَثِيرًا مِنْ جِنْسِ الدِّيَةِ أَوْمِنْ خِلَافِ جِنْسِهَا

ترجمہ:''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''سو جس (قاتل) کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کردیا گیا ہو تو (اس کا) دستور کے مطابق مطالبہ کیا جائے اور نیکی کے ساتھ اس کی ادائیگی کی جائے، یہ (حکم) تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے، پھر اس کے بعد جو حد سے تجاوز کرے، اس کے لیے دردناک عذاب ہے، (البقرہ:178)''۔یہ آیت قتلِ عمد میں صلح کے جواز پر دلالت کرتی ہے، خواہ خون کا (مالی) بدل کم ہو یا زیادہ، وہ (بدلِ صلح) جنسِ دیت سے ہو یا اُس کے مخالف جنس سے ہو''۔(بدائع الصنائع، جلد7،ص:370)

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(وَ) مُوجِبُهُ (اَلْقَوَدُعَيْنًا) فَلَا يَصِيرُ مَالًا اِلَّا بِالتَّرَاضِيْ فَيَصِحُّ صُلْحًا وَلَوبِمِثْلِ الدِّيَةِ أَوْ أَكْثَرَ

ترجمہ:''قتلِ عمد پر (اصل کے اعتبار سے) قصاص واجب ہے، لہٰذا قصاص سے مال پر (صلح کی طرف) عدول نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ فریقین باہم راضی ہوجائیں تو (مال

پر) صلح درست ہے، خواہ (قتلِ خطا کی) دیت کے برابر ہو یا زیادہ''۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

اِذَا کَانَ الْقَوَدُ عِنْدَنَا هُوَالْوَاجِبُ فِي الْعَمَدِ فَلَا يَنْقَلِبُ مَالاً اِلاَّ مِنْ جِهَةِ الصُّلْحِ. وَلَوْ بِمِثْلِ الدِّيَةِ أَوْ أَكْثَرَ أَطْلَقَهُ فَشَمَلَ مَالَوْ كَانَ مِنْ جِنْسِهَا أَوْ مِنْ غَيْرِهِ حَالاً أَوْ مُؤَجَلاً

ترجمہ: ''چونکہ اصل حکمِ شرعی کے اعتبار سے قتلِ عمد میں قصاص واجب ہے، پس فریقین کی باہمی رضامندی کے بغیر یہ مال میں تبدیل نہیں ہوگا۔ باہمی رضامندی سے مال پر صلح جائز ہے، خواہ (یہ بدلِ صلح) قتلِ خطا کی دیت کے برابر ہو یا اس سے زیادہ ہو، اُسے مُطلق رکھا ہے تاکہ یہ عام رہے، جنسِ دیت سے ہو یا اس کے غیر سے ہو، فوری ادائیگی کی بنیاد پر ہو یا تاخیر سے ادائیگی (Deffered Payment) کی بنیاد پر ہو۔

(جلد 10، ص:126، بیروت)

مقتول کے ورثاء مقدمے کے اخراجات کے نام پر تو قاتل یا اس کے ورثاء سے مطالبہ نہیں کرسکتے۔ لیکن جب شریعت نے قتلِ عمد کی مال پر صلح کی صورت میں فریقین کے لیے کم یا زیادہ کی گنجائش رکھی اور کسی مقدار مال کا تعین نہیں کیا، تو وہ اپنے حسبِ حال کسی بھی مقدار مال پر صلح کرسکتے ہیں، بس دونوں کی رضامندی شرط ہے۔ مقتول کے ورثاء مقدمے کے اخراجات کو شامل کرکے دیت کی مقدار کا تعین کرسکتے ہیں۔

خنزیر کے بالوں کا ضرورت کے تحت استعمال

سوال:1

خنزیر کے بالوں کا استعمال اور اُن بالوں سے بنی مصنوعات کا شرعی حکم کیا ہے؟۔ خواہ استعمال خارجی ہو مثلاً شیونگ برش وغیرہ۔

سوال:2

جو چیزیں مصنوع ہوکر مارکیٹ میں آرہی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:
پانی کی فائبر ٹنکی، عام رنگ کے برش، شیونگ، میک اپ برش، میز، کرسیاں، گاڑیوں کی

باڈی، جہاز کی سیٹ، مساجد کے گنبد، پارکنگ شیڈ، لنچ باکس وغیرہ۔ان اشیاء کی فروخت اتنی کثیر تعداد میں ہورہی ہے کہ اس کے استعمال سے بچنا ناممکن ہے، کیا عمومِ بلویٰ کے تحت اجازت دی جاسکتی ہے؟۔ اوران مصنوعہ اشیاء کا متبادل نہ ہونے کی صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟۔بعض اشیاء میں اجازت اور بعض میں ممانعت والا معاملہ ہوسکتا ہے؟۔

سوال:3

بعض فقہاء نے امام محمد سے اس بارے میں رخصت کی ایک روایت نقل فرمائی، جیسا کہ البحر الرائق میں ہے:

(وَلٰكِنَّهٗ مُقَيَّدٌ بِالْخَرْزِ لِلضَّرُوْرَةِ هٰذَا بِنَاءً عَلٰى قَوْلِ اَبِيْ يُوْسُفَ بِنَجَاسَتِهٖ اَمَّا عَلٰى قَوْلِ مُحَمَّدٍ اَلْآتِيْ مِنْ اَنَّهٗ طَاهِرٌ فَلَا يَتَقَيَّدُ الْاِنْتِفَاعُ بِهٖ بِالْخَرْزِ، وَلَا بِالضَّرُوْرَةِ، قَالَ الزَّيْلَعِيْ فِيْ تَعْلِيْلِ عَدَمِ اِفْسَادِهِ الْمَآءَ: اِذَا وَقَعَ فِيْهِ لِاَنَّ اِطْلَاقَ الْاِنْتِفَاعِ بِهٖ دَلِيْلُ طَهَارَتِهٖ وَهٰذَا يَقْتَضِيْ جَوَازَ بَيْعِهٖ عِنْدَ مُحَمَّدٍ اَيْضًا، وَلِذَا قَالَ فِي النَّهْرِ وَيَنْبَغِيْ اَنْ يَطِيْبَ لِلْبَائِعِ الثَّمَنُ عَلٰى قَوْلِ مُحَمَّدٍ۔ (البحر الرائق، جز۱۶،ص:۷۷)

سوال:4

کیااس مسئلے کو درختوں پر بور آنے سے پہلے پھل فروخت کرنے والے مسئلے پر قیاس کر کے اجازت دی جاسکتی ہے؟۔

سوال:5

اگر دو پرتوں کے درمیان مذکورہ برش سے رنگ کیا گیا اور برش کے کچھ بال اس میں لگ گئے تو یہ بال اس مصنوعہ چیز کے تابع ہوکر فروخت ہوسکتی ہیں؟ مشکل یہ ہے کہ کوئی دوسرا برش اس معاملے میں ناکام ہے کہ کیمیکل کی حدت کی وجہ سے پھول جاتے ہیں یا منتشر یا پگھل جاتے ہیں۔ ہزاروں خاندان براہ راست اس کاروبار سے منسلک ہیں، وہ کیا کریں؟، (محمد عمر فاروق، PIA افسر، ملیر کراچی)۔

جواب:

خنزیر کی کھال یا بالوں کا استعمال جائز نہیں، کیونکہ خنزیر نجس العین ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اِس کی حُرمت کو بیان کرنے کے بعد فرمایا: فَاِنَّهٗ رِجۡسٌ ترجمہ: ''کیونکہ وہ ناپاک ہے''۔ (الانعام: 145)

علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں:

قَالَ وَكُلُّ اِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ، وَجَازَتِ الصَّلٰوةُ فِيْهِ، وَالْوُضُوْءُ مِنْهُ اِلَّا جِلْدَ الْخِنْزِيْرِ وَالْاٰدَمِيِّ، لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَيُّمَا اِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ،

ترجمہ: ''(صاحبِ قدوری نے) فرمایا: ہر وہ کھال جو دِباغت (کے ذریعے پاک) کرلی گئی ہو، وہ پاک ہے اور اُس پر نماز پڑھنا جائز ہے اور اُس سے (بصورت مشکیزہ) وضو کرنا جائز ہے، سوائے خنزیر اور آدمی کی کھال کے (یعنی انسان کی جلد کا استعمال اکرامِ انسانیت کی وجہ سے حرام ہے اور خنزیر کی کھال نجس العین ہونے کی وجہ سے حرام ہے) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو چمڑا رنگ لیا جائے، وہ پاک ہے''۔ مزید لکھتے ہیں:

وَحُجَّةٌ عَلَى الشَّافِعِيِّ فِيْ جِلْدِ الْكَلْبِ، وَلَيْسَ نَجَسَ الْعَيْنِ، اَلَاتَرٰى اَنَّهٗ يُنْتَفَعُ بِهٖ حِرَاسَةً وَاصْطِيَادًا، بِخِلَافِ الْخِنْزِيْرِ لِاَنَّهٗ نَجَسُ الْعَيْنِ، اِذِ الْهَاءُ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى ''فَاِنَّهٗ رِجْسٌ'' مُنْصَرِفٌ اِلَيْهِ لِقُرْبِهٖ۔

ترجمہ: ''(یہ حدیث اپنے عموم کی وجہ سے) کتے کی کھال کے حق میں امام شافعی کے خلاف حُجّت ہے کیونکہ کتا نجس العین نہیں ہے، کیا آپ کا مشاہدہ نہیں ہے کہ کتے سے نگہبانی اور شکار پکڑنے کے طور پر نفع لیا جاتا ہے، برخلاف سور کے، کیونکہ وہ نجس العین ہے، اللہ تعالیٰ کے قول (فَاِنَّهٗ رِجۡسٌ) میں ضمیر خنزیر کی طرف راجع ہے کیونکہ یہی قریب ہے، (ہدایہ، جلد 1، ص: 62,63,64)''۔ نجس العین سے مراد وہ چیز ہے جو شرعاً اپنی ذات اور ماہیت میں ناپاک ہو۔

خنزیر کے بال بھی ناپاک ہیں، تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

(وَشَعْرُ الْمَيْتَةِ) غَيْرَ الْخِنْزِيْرِ عَلَى الْمَذْهَبِ (وَعَظْمُهَا وَعَصَبُهَا) عَلَى الْمَشْهُوْرِ (وَحَافِرُهَا وَقَرْنُهَا) الْخَالِيَةُ عَنِ الدُّسُوْمَةِ۔۔۔۔۔۔طَاهِرٌ۔

ترجمہ: ''ظاہر الروایت کے مطابق خنزیر کے علاوہ ہر مُردار کے بال، ہڈی، پٹھے، کُھر اور سینگ جو چربی سے خالی ہوں، پاک ہیں۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد1،ص:320)''۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہ العزیز لکھتے ہیں: ''خنزیر نجس العین ہے اور اس کا ہر جزوِ بدن ایسا ناپاک کہ اصلاً صلاحیتِ طہارت نہیں رکھتا''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد4،ص:475)

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

وَأَمَّا الْخِنْزِيْرُ فَشَعْرُهُ وَعَظْمُهُ وَجَمِيْعُ أَجْزَائِهِ نَجِسَةٌ وَرَخَصَ فِيْ شَعْرِهِ لِلْخَرَّازِيْنَ لِلضَّرُوْرَةِ لِأَنَّ غَيْرَهُ لَا يَقُوْمُ مَقَامَهُ عِنْدَهُمْ، وَعَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى: أَنَّهُ كَرِهَ لَهُمْ ذٰلِكَ أَيْضًا وَلَا يَجُوْزُ بَيْعُهُ فِي الرِّوَايَاتِ كُلِّهَا، وَإِنْ وَقَعَ شَعْرُهُ فِي الْمَاءِ الْقَلِيْلِ نَجَسَهُ عِنْدَ أَبِيْ يُوْسُفَ، وَعِنْدَ مُحَمَّدٍ لَا يَنْجُسُ، وَإِنْ صَلّٰى مَعَهُ جَازَ عِنْدَ مُحَمَّدٍ، وَعِنْدَ أَبِيْ يُوْسُفَ لَا يَجُوْزُ إِذَا كَانَ أَكْثَرَ مِنْ قَدْرِ الدِّرْهَمِ، وَاخْتَلَفُوْا فِيْ قَدْرِ الدِّرْهَمِ قِيْلَ وَزْنًا وَقِيْلَ بَسْطًا كَذَا فِي ''السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ''۔ وَذَكَرَ السِّرَاجُ الْهِنْدِيُّ أَنَّ قَوْلَ أَبِيْ يُوْسُفَ بِنَجَاسَتِهِ هُوَ ظَاهِرُ الرِّوَايَةِ وَصَحَّحَهُ فِي ''الْبَدَائِعِ'' وَرَجَّحَهُ فِي ''الْاِخْتِيَارِ''۔

ترجمہ: ''رہا خنزیر، تو اُس کے بال اور اُس کی ہڈی اور اُس کے تمام اجزاء نجس ہیں، البتہ ضرورت کی بنا پر اُس کے بالوں سے جُفت سازوں (Shoe Maker) کو جوتی گانٹھنے کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز اس کے قائم مقام نہیں ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اس کو بھی مکروہ کہا ہے اور فقہاءِ احناف کے تمام اقوال کے مطابق خنزیر کے بالوں کی بیع جائز نہیں ہے اور خنزیر کا بال کم (غیر جاری) پانی میں گر جائے، تو امام ابو یوسف کے نزدیک وہ پانی کو ناپاک کردے گا اور امام محمد کے نزدیک نجس نہیں ہوگا۔ (اگر کپڑوں میں اس کا بال ہوتو) امام محمد کے نزدیک اُس پر نماز جائز ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک نماز ناجائز ہوگی، جبکہ درہم کی مقدار سے زائد ہو۔ اور درہم کی مقدار میں

(ائمّہ کا) اختلاف ہے، بعض نے وزن کا اعتبار کیا ہے اور بعض نے اُس کے پھیلاؤ (Size) کا، ''السراج الوہاج'' میں اسی طرح ہے، ''سراج الہندی'' نے ذکر کیا کہ امام ابو یوسف نے جو خنزیر کے بال کو ناجائز کہا ہے، یہی (فقہِ حنفی کی) ظاہر الروایہ ہے، ''بدائع الصنائع'' میں اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے، ''الاختیار'' میں بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے''۔

(البحر الرائق، جلد 1، ص:191)

آپ کا یہ مفروضہ درست نہیں ہے کہ ان مصنوعہ اشیاء کا متبادل موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پینٹ، شیونگ، منہ کی صفائی اور دیگر استعمال کے لیے عام برش بازار میں دستیاب ہوتے ہیں، پینٹ کرنے کے لیے بہت اچھے اور عمدہ پلاسٹک برش ملتے ہیں، جن سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے، اس لیے ضرورت کے تحت بھی خنزیر کے بالوں سے بنے ہوئے برش کے استعمال کی گنجائش نہیں ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں خنزیر مالِ مُتقوّم نہیں ہے، اس لیے بھی اس کی بنی مصنوعات کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔ فلرز، سلیٹ فائبر، گلاس فائبر، کاٹن وول جیسے ٹھوس مادے جو طبعی خواص بہتر بنانے یا سینتھیٹک مرکبات کی پیداواری لاگت کم کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، سینتھیٹک مرکبات میں ربڑ، پلاسٹک وغیرہ شامل ہیں۔

عرف میں عمومِ بلویٰ پر اُس وقت عمل کیا جاتا ہے، جب قرآن وسنّت کے عام حکم کے خلاف نہ ہو، نصِ شرعی اور فقہاء کے فتاویٰ کے خلاف عرف معتبر نہیں ہوگا، یہ بنیادی اصول ہے۔

سوال نمبر 3 میں آپ نے جو عبارت نقل کی ہے، وہ عبارت ''البحر الرائق'' کی نہیں بلکہ اُس پر علامہ محمد امین بن عمر عابدین المعروف ابن عابدین دمشقی حنفی مُتوفّٰی 1252ھ کے حاشیہ ''منحۃ الخالق علی البحر الرائق'' کی ہے۔ لیکن وہاں بھی صراحت ہے کہ امام محمد نے جفت ساز کے لیے ضرورت کی بنا پر خنزیر کے بالوں کے استعمال کی اجازت دی تھی، لیکن یہ قول مُفتیٰ بہٖ نہیں ہے، یعنی اس پر فتویٰ نہیں دیا جائے گا، ''ظاہر الروایہ'' امام ابو یوسف رحمہ

اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر حرفِ آخر کے طور پر لکھا ہے کہ:

''قدیم فُقہاء نے جو ضرورت کی بنا پر خنزیر کے بالوں سے جوتی گانٹھنے کی اجازت دی تھی، وہ اُس زمانہ کے اعتبار سے تھی، کیونکہ اُس وقت جوتی گانٹھنے کے لیے شاید اس سے زیادہ اور کوئی مضبوط چیز میسر نہیں تھی، لیکن اب چونکہ زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے اور جوتی گانٹھنے کے لیے مختلف نوع کے مضبوط دھاگے اور مٹیریل ایجاد ہو چکا ہے، اس لیے اب خنزیر کے بالوں کا کسی بھی حال میں استعمال جائز نہیں ہے''۔ (تبیان القرآن، جلد 6، ص: 534)

سوال نمبر 4 میں آپ نے درختوں پر بور آنے سے پہلے فروخت کرنے والے مسئلے پر قیاس کرنے کی بابت سوال کیا، خنزیر کے بالوں کو درختوں پر بور آنے سے پہلے فروخت کرنے پر قیاس کرنا ''قیاس مع الفارق'' ہے، یعنی ان دونوں (''مقیس'' (جسے قیاس کیا جارہا ہے اور ''مقیس علیہ'' جس پر قیاس کیا جارہا ہے) میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔

عاقدین کی باہمی رضامندی سے بیع منعقد ہونے کے بعد کسی ایک فریق کو یکطرفہ طور پر فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے

سوال:

سید نجم الحسن 2010 سے ڈاکٹر فرید کے کرایہ دار تھے، مارچ 2012ء میں ڈاکٹر فرید نے فلیٹ فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور سید نجم الحسن سے تین گواہوں کی موجودگی میں 58 لاکھ روپے میں چھ ماہ کی مدت میں ادائیگی کا معاہدہ ہوگیا۔ پانچ لاکھ روپے ایڈوانس اور وقتاً فوقتاً 30 لاکھ روپے ادا کردیے گئے۔ ہر مرتبہ ڈاکٹر فرید سے نجم الحسن نے سیل ایگریمنٹ اور بقیہ کارروائی مکمل کرنے کا کہا، مگر ڈاکٹر فرید نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ ہم چھ ماہ میں کئی بار تمام چیک لے کر ان کے پاس گئے کہ بقایا رقم لے کر فلیٹ ہمارے نام کر دیں، لیکن انہوں نے پیسے لینے سے انکار کردیا۔ اب نہ وہ ہماری رقم واپس کررہے ہیں اور

نہ فلیٹ ہمارے نام کررہے ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ چھ ماہ میں فلیٹ کی قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ شرعی حکم کیا ہے؟،(سید نجم الحسن، کراچی)۔

جواب:

نفسِ مسئلہ سے قبل یہ بات مدِّنظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق تجارت ومعاملات میں دیانت، امانت، صداقت اور عہدوپیمان کی پابندی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور یہ خوبیاں اسلامی تعلیمات کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ

ترجمہ:''اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ سوا اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارت ہو،(النساء:29)''۔ آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ بیع عاقدین کی باہمی رضامندی سے منعقد ہوتی ہے۔

ایجاب وقبول سے بیع منعقد ہوجاتی ہے اور چیز بائع کی مِلک سے نکل کر مشتری کی مِلک میں داخل ہوجاتی ہے۔ بیع منعقد ہونے کے بعد اُسے کوئی ایک فریق یک طرفہ طور پر فسخ نہیں کرسکتا، علامہ ابوبکر فرغانی مرغینانی لکھتے ہیں: وَاِذَاحَصَلَ الْاِیْجَابُ وَالْقُبُوْلُ لَزِمَ الْبَیْعُ وَلَاخِیَارَلِوَاحِدٍمِّنْھُمَا اِلَّا مِنْ عَیْبٍ اَوْ عَدَمِ رُؤْیَۃٍ۔ ترجمہ:''اور جب ایجاب وقبول دونوں ہوجائیں تو بیع لازم اور تمام ہوجاتی ہے اور بائع ومشتری میں سے کسی کو فسخ کا اختیار حاصل نہیں رہتا، سوائے اس کے کہ مبیع (فروخت شدہ چیز) میں کوئی عیب ظاہر ہوجائے یا مشتری نے بیع کے وقت مبیع کو نہ دیکھا ہو (تو خیارِ عیب اور خیارِ رویت حاصل ہوتا ہے)''۔(ہدایہ، ج:5، کتاب البیوع، ص: 60، مکتبۃ البشریٰ، کراچی)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:''بیع ایجاب وقبول سے تمام ہوجاتی ہے اور جب بیع شریعت کے مطابق صحیح طور پر منعقد ہوجائے تو اس کے بعد بائع یا مشتری کسی کو بے رضامندی دوسرے کے اس سے یوں

پھر جانا رَوا نہیں، نہ اس کے پھرنے سے وہ معاہدہ جو مکمل ہو چکا ہے، ٹوٹ سکتا ہے۔ زید پر لازم ہے کہ مال فروخت شدہ تمام وکمال خریدار کو دے، ہدایہ میں ہے: اِذَا حَصَلَ الْاِیْجَابُ وَالْقَبُوْلُ لَزِمَ الْبَیْعُ وَلَاخِیَارَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا اِلَّا مِنْ عَیْبٍ أَوْ عَدَمِ رُؤْیَةٍ۔ ترجمہ: ''اور جب ایجاب وقبول حاصل ہو جائے تو بیع لازم ہو جاتی ہے اور بائع ومشتری میں سے کسی کو فسخ کا خیار حاصل نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ مبیع میں کوئی عیب ظاہر ہو جائے یا مشتری نے بیع کے وقت اس کو دیکھا نہ ہو''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 17، ص: 87، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ایجاب وقبول کے بعد مبیع کی قیمت اگر بڑھ جائے تو بائع کو زائد رقم لینے کا اختیار نہیں بلکہ طے شدہ قیمت پر ہی مُشتری کو دے گا۔ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''ایک نے امر کا صیغہ استعمال کیا، جو حال پر دلالت کرتا ہے، دوسرے نے ماضی کا مثلاً اس نے کہا: اس چیز کو اتنے میں لے، دوسرے نے کہا: میں نے لیا، اقتضاءً بیع صحیح ہوگئی کہ اب نہ بائع دینے سے انکار کر سکتا ہے نہ مشتری لینے سے''۔ (بہار شریعت، جلد دوم، ص: 618)

صورتِ مسئولہ میں چونکہ گواہوں کی موجودگی میں بیع منعقد ہوئی ہے، قیمت طے ہو چکی ہے، بائع نے قیمت کی کچھ اقساط وصول بھی کر لی ہیں، اس لیے ان کے پاس یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ سیل ایگریمنٹ اور خریدار کے نام فلیٹ کی منتقلی قانونی تقاضے ہیں، ان میں التوا سے بیع فسخ نہیں ہوتی اور بائع کو قانونی تقاضے پورے کرنے چاہییں۔

جادو حرام ہے

سوال:

میرا ایک دوست نماز روزے کا پابند ہے، مگر اُس کے ساتھ کچھ روحانی مسائل ہیں۔ کئی عاملوں سے علاج کرایا، مگر وقتی فائدہ ہوتا ہے اور پھر مسئلہ برقرار رہتا ہے، کیا وہ کسی جادوگر سے علاج کرا سکتا ہے، جبکہ اُسے صرف جادوگر کو پیسے دینا ہیں، کام جادوگر خود ہی کرے گا؟، (محسن، حیدر آباد)۔

جواب:

جادو کرنا فی نفسہٖ حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

اِجتَنِبُوا المُوبِقَاتِ اَلشِّرکُ بِاللہِ، وَالسِّحرُ۔

ترجمہ: ''ہلاک کرنے والے کاموں سے بچو: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا''۔

(صحیح بخاری:5764)

کسی کو ضرر پہنچانے کے لیے جادو کرنا یا کروانا بالاتفاق ناجائز وحرام اور کبیرہ گناہ ہے، لیکن جادو کے اُتار وغیرہ کے لیے بھی کسی جادوگر کی خدمات نہ لی جائیں کہ یہ ایسے افراد کی حوصلہ افزائی ہے۔ بحیثیت مسلمان بھی ان اُمور سے اجتناب اور اللہ تعالیٰ سے شفا طلب کرنی چاہیے۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خَیرُ الدَّوَاءِ القُرآنُ۔

ترجمہ: ''بہترین دوا قرآن ہے''۔ (سنن ابن ماجہ:3501)

(۲) اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

اِنَّ رَسُولَ اللہِ ﷺ اِذَا اشتَکٰی نَفَثَ عَلٰی نَفسِہٖ بِالمُعَوِّذَاتِ، وَمَسَحَ عَنہُ بِیَدِہٖ، فَلَمَّا اشتَکٰی وَجَعَہُ الَّذِی تُوُفِّیَ فِیہِ، طَفِقتُ اَنفُثُ عَلٰی نَفسِہٖ بِالمُعَوِّذَاتِ الَّتِی کَانَ یَنفُثُ، وَاَمسَحُ بِیَدِ النَّبِیِّ ﷺ عَنہُ۔

ترجمہ: ''جب رسول اللہ ﷺ بیمار ہوتے تو اپنے اوپر مُعوذتین ''قُل اَعُوذُ بِرَبِّ الفَلَقِ اور قُل اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ'' پڑھ کر دم فرماتے اور اپنا ہاتھ اپنے جسم پر پھیرتے، پھر جب آپ اپنے مرضِ وفات میں مبتلا ہوئے، تو میں ''قُل اَعُوذُ بِرَبِّ الفَلَقِ اور قُل اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ'' پڑھ کر آپ پر دَم کرتی، جن کو پڑھ کر آپ دم فرماتے تھے اور نبی ﷺ کا ہاتھ آپ کے جسم پر پھیرتی تھی''۔ (صحیح بخاری:4439)

(۳) اسی طرح رسول اللہ ﷺ حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے یہ دعا پڑھ کر دم فرماتے:

اَعُوْذُ کُمَا بِکَلِمَاتِ اللہِ التَّامَّۃِ، مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَھَامَّۃٍ، وَمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَامَّۃٍ ۔

ترجمہ: ''میں تم دونوں کو ہر شیطان اور موذی جانور (اور زہریلے حشرات الارض) اور ہر نگاہِ بد سے اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں''۔ (صحیح بخاری: 3371)

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب کسی مریض کی عیادت فرماتے تو یہ کلمات ارشاد فرماتے:

لَابَأْسَ طَھُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللہُ

کوئی حرج نہیں، ان شاء اللہ یہ آپ کے لیے (گناہوں سے) پاکیزگی کا سبب ہوگا''۔

(صحیح بخاری: 5662)

(۴) جب کسی شخص کو کوئی تکلیف ہوتی، آپ اپنا دایاں دست مبارک اس پر پھیرتے اور یہ کلمات ارشاد فرماتے:

أَذْھِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ

ترجمہ: ''اے میرے پروردگار! (اس مریض کی) تکلیف کو دور فرمادے''۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہارے جدِ اعلیٰ (ابراہیم علیہ السلام) یہ کلمات پڑھ کر حضرات اسماعیل واسحاق علیہما السلام کو دم فرماتے تھے''۔ (صحیح بخاری: 5675)

(۵) عثمان بن ابوالعاص ثقفی بیان کرتے ہیں: اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے درد کی شکایت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اپنا سیدھا ہاتھ درد کی جگہ پر رکھو، پھر تین مرتبہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھو اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھو:

''أَعُوْذُ بِاللہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَأُحَاذِرُ''۔

ترجمہ: ''میں اس شر سے جو مجھے لاحق ہے اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خدشہ ہے، اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ میں آتا ہوں، حضرت عثمان بن العاص بیان کرتے ہیں: میں نے یہ دعا پڑھی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اُس درد سے نجات عطا فرمادی''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2202)

(۶) حضرت ابوسعید خُدری بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جبریل امین

میرے پاس آئے اور کہا: اے محمد ﷺ! آپ کو تکلیف ہے، میں نے جواب دیا: ہاں، اُنہوں نے یہ کلمات پڑھ کر مجھے دَم کیا:

بِسْمِ اللهِ أَرْقِيكَ، مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ، مِن شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ، اَللّٰهُ يَشْفِيكَ، بِسمِ اللهِ أَرقِيكَ۔

ترجمہ: ''ہر وہ چیز جو آپ کو تکلیف دے رہی ہے اور ہر حاسد کی نظر سے پناہ دینے کے لیے اللہ کا نام لے کر آپ کو دَم کرتا ہوں، اللہ آپ کو شفا عطا فرمائے، میں اللہ تعالیٰ کے (مبارک) نام سے آپ کو دَم کرتا ہوں''۔ (صحیح مسلم:2186)

استخارہ

سوال:

میں ایک فلیٹ خریدنا چاہتی ہوں، استخارہ کے ذریعے بہتر صورت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ مہربانی فرما کر استخارہ فرمادیں کہ یہ فلیٹ خریدنا میرے حق میں بہتر ہوگا یا نہیں؟

(عصمت ندیم)

جواب:

''استخارہ'' کی روح یہ ہے کہ جس بندے کو کوئی مسئلہ درپیش ہے، وہ خود استخارہ کرے، کیونکہ جتنا درد، شکستگیِ دل، حضوریِ قلب، تضرُّع وعاجزی کسی شخص کو اپنے معاملے میں ہوسکتی ہے، دوسرے شخص کو نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں ہے: ربِ ذوالجلال فرماتا ہے: ترجمہ: میں ان کے پاس ہوتا ہوں، جو میری (خشیت ومحبت اور انکسار کی) وجہ سے شکستہ دل رہتے ہیں''۔ (الاسرار المرفوعہ، رقم الحدیث:249، کشف الخفاء ج1 ص:232، الشفاء قاضی عیاض مالکی ج1 ص:78)

استخارے کی دعا حدیث میں موجود ہے اور اپنی زبان میں بھی مُدعا بیان کر سکتے ہیں۔ اور سُنن ترمذی میں استخارے کی مختصر دعا یہ ہے: ترجمہ: ''اے اللہ! میرے لیے (جو خیر ہے) وہ صورت مقدر فرما''۔

سوال:

میں استخارہ کرتا ہوں لیکن کوئی رہنمائی نہیں ملتی، تو اس صورت میں کوئی بھی فیصلہ کرلوں وہ ٹھیک ہوگا، کسی دوسرے شخص سے اپنا استخارہ کرواسکتے ہیں؟، (فرحان انجم)۔

جواب:

استخارہ کا مقصد اللہ تعالیٰ سے مشاورت کرنا ہے، جس کے نتیجے میں کوئی واضح اشارہ یا خواب نظر آنا ضروری نہیں بلکہ اُس معاملے پر انسان کی رائے پختہ ہوجانا یا کسی حتمی فیصلہ پر پہنچ جانا ہی استخارہ کا حاصل ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَفِی الْحِلْیَةِ: وَیُسْتَحَبُّ افْتِتَاحُ هٰذَا الدُّعَاءِ وَخَتْمُهُ بِالْحَمْدَلَةِ وَالصَّلَاةِ، وَفِی الْأَذْكَارِ أَنَّهُ یَقْرَأُ فِی الرَّكْعَةِ الْأُولٰی الْكَافِرُونَ، وَفِی الثَّانِیَةِ الْإِخْلَاصَ، وَعَنْ بَعْضِ السَّلَفِ أَنَّهُ یَزِیدُ فِی الْأُولٰی ''وَرَبُّكَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۝ وَرَبُّكَ یَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ۝'' وَفِی الثَّانِیَةِ ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ'' (الاحزاب: 36) الْآیَةَ۔ وَیَنْبَغِی أَنْ یُكَرِّرَهَا سَبْعًا، لِمَا رَوَی ابْنُ السُّنِّیِّ یَا أَنَسُ إِذَا هَمَمْتَ بِأَمْرٍ فَاسْتَخِرْ رَبَّكَ فِیهِ سَبْعَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ انْظُرْ إِلَی الَّذِی سَبَقَ إِلٰی قَلْبِكَ فَإِنَّ الْخَیْرَ فِیهِ وَلَوْ تَعَذَّرَتْ عَلَیْهِ الصَّلَاةُ اسْتَخَارَ بِالدُّعَاءِ اھ مُلَخَّصًا۔ وَفِی شَرْحِ الشِّرْعَةِ: الْمَسْمُوعُ مِنَ الْمَشَایِخِ أَنَّهُ یَنْبَغِی أَنْ یَنَامَ عَلٰی طَهَارَةٍ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ بَعْدَ قِرَاءَةِ الدُّعَاءِ الْمَذْكُورِ، فَإِنْ رَأٰی مَنَامَهُ بَیَاضًا أَوْ خُضْرَةً فَذٰلِكَ الْأَمْرُ خَیْرٌ، وَإِنْ رَأٰی فِیهِ سَوَادًا أَوْ حُمْرَةً فَهُوَ شَرٌّ یَنْبَغِی أَنْ یُجْتَنَبَ

ترجمہ: ''اور ''حلیہ'' میں ہے: اس دعاءِ استخارہ کی ابتدا اور آخر میں حمد وصلوٰۃ پڑھنا مستحب ہے، اور ''الاذکار'' میں ہے: پہلی رکعت میں سورۂ ''الکافرون'' پڑھے اور دوسری میں سورۂ ''اخلاص''، اور بعض بزرگوں سے روایت ہے کہ پہلی رکعت میں ''وَرَبُّكَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۝ وَرَبُّكَ یَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ۝ (القصص: 69-68) تک ان کلمات کا اضافہ کرے اور

دوسری رکعت میں سورۂ احزاب، آیت: 36 کا اضافہ کرے۔ (اور اگر درپیش مسئلہ کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں قلبی اطمینان حاصل نہ ہوتو) سات دن تک مسلسل یہ نماز پڑھے، جیسا کہ ابن السّنی نے روایت کیا ہے:

(ترجمہ:) ''اے انس! جب تو کسی کام کا ارادہ کرے، تو اپنے رب سے اس میں سات بار رہنمائی کی دعا کرتا رہے، پھر غور وفکر کر کہ تیرے دل میں جو بات قرار پا گئی ہے (یعنی اس کام کا کرنا یا نہ کرنا)، بس خیر اسی میں ہے''، اور اگر اس کے لیے نماز پڑھنا دشوار ہوتو صرف دعا کر کے استخارہ کرلے، (یہ ''اذکار'' کی عبارت کا) خلاصہ ہے، اور ''شَرۡحُ الشِّرۡعَة'' میں ہے کہ (ہم نے اپنے) مشائخ سے سنا ہے کہ مذکورہ دعا پڑھنے کے بعد باوضو ہوکر قبلہ رو سوجائے، اگر اپنے خواب میں سفید یا ہرا رنگ دیکھے تو سمجھ لے کہ اس میں خیر ہے، (اور اس کام کو کرلے) اور اگر کالا یا سرخ رنگ دیکھے تو سمجھ لے کہ اس میں شر ہے، پھر اس کام سے اجتناب کرے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد نمبر 2 صفحات 409-410 مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

حدیث پاک میں خواب میں کسی چیز کے نظر آنے یا نہ آنے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی خواب کا آنا ضروری ہے، یہ بزرگوں اور اہل خیر کے اپنے اپنے تجربات ہیں، لیکن اگر خواب نظر آجائے، تو اس سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مگر اصل چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرنے کے بعد جب دل کو کسی ایک جانب سکون وقرار نصیب ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے اس کام کو کرلے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں کسی ناکامی کا سامان ہو، تو یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کو سمجھنے میں مجھ سے خطا ہوگئی ہے، اور یا یہ سمجھے کہ اگر اس کے برعکس کیا ہوتا تو ممکن ہے کہ (خدانخواستہ) اس سے بڑی ناکامی یا نقصان کا سامنا کرنا پڑتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَسٰۤی اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـًٔا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ ؕ ۔

ترجمہ: ''ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کوتم اپنے حق میں ناپسندیدہ سمجھو، (مگر) وہ (درحقیقت) تمہارے حق میں بہتر ہو اور (یہ بھی) ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کوتم اپنے لیے پسندیدہ سمجھو (مگر درحقیقت) وہ تمہارے لیے بری ہو''۔(البقرۃ:216)

جنازے کے مسائل

میت کے گھر کا کھانا

سوال:

وفات کے تیسرے دن میت کے گھر والوں کی طرف سے کھانے کا اہتمام اس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ اگر نہیں کیا تو خاندان میں ناک کٹ جائے گی، اور لوگ اس کھانے کو ثواب سمجھ کر کھاتے ہیں، جو نہیں کھاتا، اُسے برا/ بدعقیدہ سمجھا جاتا ہے۔اس کی شرعی حیثیت بیان فرمادیں،(حافظ محمد حسین، کراچی)۔

جواب:

یہ رسم خلافِ شرع ہے۔شریعت کا حکم یہ ہے کہ دووقت یا(ایامِ تعزیت پر محمول کرتے ہوئے) زیادہ سے زیادہ تین دن تک اہلِ میت کو ان کے رشتے دار یا احباب کھانا فراہم کریں، کیونکہ وہ سوگ کی وجہ سے کھانے کا اہتمام نہیں کرسکتے۔حدیث پاک میں ہے:
عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
اِصْنَعُوا لِاٰلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَاِنَّهٗ قَدْ اَتَاهُمْ اَمْرٌ شَغَلَهُمْ۔
ترجمہ:''آلِ جعفر کے لیے کھانا تیار کرو، کیونکہ وہ ایسے غم میں مبتلا ہیں کہ اُنہیں(کھانا تیار کرنے کی) فرصت نہیں ہے''۔(سنن ابوداؤد:3132)

اس کی شرح میں علامہ علی القاری لکھتے ہیں:''اہلِ میت کے لیے جو کھانا بھیجا جاتا ہے، اسے آج کل (یعنی اُن کے دور میں) مکہ میں ''رفعہ'' کہتے ہیں اور یہ کھانا دفن میت کے بعد بھیجا جاتا ہے(پاک وہند کے بعض علاقوں میں اسے کڑوی روٹی کہتے ہیں)''۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں:''طیبی نے کہا: رشتے داروں اور پڑوسیوں کے لیے مستحب ہے کہ میت کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کریں اور یہ میت والوں کی مشغولیت کا دورانیہ ایک دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور بعض نے کہا: اس کو ہم میت کی تعزیت یعنی تین دن پر بھی محمول کرسکتے ہیں''۔(مرقاۃ المفاتیح،جلد4،ص:194)

(۲)عَن اَسمَاءَ بنتِ عُمَیسٍ قَالَت: لَمَّا اُصِیبَ جَعفَرٌ رَجَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اِلَی أَهلِهِ فَقَالَ: اِنَّ آلَ جَعفَرٍ قَد شُغِلُوا بِشَانِ مَیِّتِهِم، فَاصنَعُوا لَهُم طَعَامًا۔ قَالَ عَبدُ اللهِ: فَمَا زَالَت سُنَّۃً، حَتّٰی کَانَ حَدِیثًا فَتُرِکَ۔

ترجمہ: اسماء بنت عُمیس بیان کرتی ہیں: جب جعفر بن ابی طالب کی شہادت واقع ہوگئی، تو رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کے پاس آئے اور فرمایا: ''جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو، کیونکہ وہ میت کے غم میں مبتلا ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں نے ان کے لیے کھانا تیار کیا، عبداللہ بیان کرتے ہیں: یہ شعار بطور سنّت جاری رہا، یہاں تک کہ اس میں بدعات رائج ہوگئیں تو یہ سنّت ترک ہوگئی''۔ (سنن ابن ماجہ: 1611)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں میت کے اہلِ خانہ کے لیے تین دن تک کھانا فراہم کرنے کا شعار سنّت کے طور پر رائج تھا، پھر اس نے اس معنی میں بدعت کی صورت اختیار کرلی کہ اسے فخر ومباہات اور نام ونمود کا ذریعہ بنالیا گیا کہ لوگ میت کے گھر جمع ہوتے ہیں اور وہ ان کے لیے پُرتکلّف کھانے کا اہتمام کرتے ہیں، پس جس عمل سے سنّت ساقط ہوجائے یا اس کی روح پامال ہوجائے، تو وہ یقیناً بدعت ہے۔ البتہ اگر ایصالِ ثواب کی نیت سے فقراء کے لیے کھانا تیار کیا جائے اور انہیں کھلایا جائے، تو یہ شرعاً مستحسن اور پسندیدہ ہے۔ چنانچہ جریر بن عبداللہ البجلی بیان کرتے ہیں:

کُنَّا نَرَی الاِجتِمَاعَ اِلَی أَهلِ المَیِّتِ، وَصَنعَۃَ الطَّعَامِ، مِنَ النِّیَاحَۃِ۔

ترجمہ: ''ہم اہلِ میت کے گھر جمع ہوکر کھانا تیار کرنے کو نوحہ خوانی میں شمار کرتے تھے (جوکہ ممنوع ہے)''۔ (سنن ابن ماجہ: 1612)

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں:

وَیُکرَہُ اتِّخَاذُ الضِّیَافَۃِ مِنَ الطَّعَامِ من أَهلِ المَیِّتِ لأنہ شُرِعَ فِی السُّرُورِ لَا فِی الشُّرُورِ، وَهِیَ بِدعَۃٌ مُستَقبِحَۃٌ، وَرَوَی الاِمَامُ أَحمَدُ وابنُ مَاجَۃَ بِاِسنَادٍ صَحِیحٍ عَن جَرِیرِ بنِ عَبدِ اللهِ قَالَ: کُنَّا نَعُدُّ الاِجتِمَاعَ اِلَی أَهلِ المَیِّتِ، وَصَنعَهُمُ الطَّعَامَ مِنَ النِّیَاحَۃِ۔

ترجمہ: ''اہل میت کی طرف سے کھانے کی ضیافت تیار کرنی منع ہے کہ شرع نے ضیافت خوشی کے موقع پر رکھی ہے نہ کہ غم کے موقع پر اور یہ قبیح بدعت ہے۔ امام احمد اور امام ابن ماجہ نے اپنی سند کے ساتھ جریر بن عبداللہ سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''ہم اہل میت کے گھر جمع ہو کر کھانا تیار کرنے کو نوحہ خوانی میں شمار کرتے تھے (جو کہ ممنوع ہے)''۔

(فتح القدیر، جلد 2 ص: 151)

ترجمہ: ''حضرت کُلَیب ایک انصاری صحابی سے بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک جنازے میں نکلے، تو میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ قبر پر قبر کھودنے والے کو ہدایت فرمارہے تھے کہ قبر کو قدموں اور سر کی جانب سے کشادہ کردو، جب آپ واپس ہوئے تو مُتوفّٰی کی بیوی کا بلاوا آیا، آپ ﷺ اُن کے ہاں تشریف لے گئے اور ہم بھی آپ کے ہمراہ تھے، پس کھانا لایا گیا تو آپ ﷺ نے اُس میں ہاتھ ڈالا اور پھر سب لوگوں نے کھانا کھایا''۔ (مشکوٰۃ المصابیح: 5942)

اس کی شرح میں علامہ علی القاری لکھتے ہیں: یہ حدیث بظاہر اس کے خلاف ہے جو ہمارے اصحابِ مذہب نے بیان کیا ہے کہ میت کے پہلے یا تیسرے دن یا ایک ہفتے کے بعد (اس کے گھر) کھانا تیار کرنا مکروہ ہے، جیسا کہ ''بزازیہ'' میں ہے۔ ''خلاصہ'' میں ذکر کیا کہ تین دن تک میت کے گھر ضیافت کے طور پر کھانا تیار کرنا جائز نہیں ہے۔ اور ''زیلعی'' نے کہا: تین دن تک میت کے گھر بیٹھنے میں حرج نہیں ہے، بشرطیکہ کسی ممنوع کا ارتکاب نہ ہو جیسے دریاں بچھانا اور میت کے گھر والوں سے کھانا تیار کرانا۔ امام ابن ہُمام نے کہا: میت کے گھر ضیافت کا اہتمام مکروہ ہے اور سب نے علت یہ بیان کی کہ ضیافت مسرت کے موقع پر مشروع ہے نہ کہ مصیبت کے موقع پر، اُنہوں نے کہا: یہ بدعتِ قبیحہ ہے۔ امام احمد اور امام ابن حِبان نے سندِ صحیح کے ساتھ جریر بن عبداللہ سے روایت کیا، وہ کہتے ہیں: ہم میت کے گھر جمع ہونے اور کھانا تیار کرنے کو نوحہ خوانی میں شمار کرتے تھے (جو کہ بدعت ہے)۔

اس تفصیل کو بیان کرنے کے بعد علامہ علی القاری لکھتے ہیں: میت کے گھر کھانے کے

اہتمام کی ممانعت اور کراہت کو ان صورتوں پر محمول کیا جائے:

(۱) میت والے شرما حضوری اور ناگواری کے ساتھ کھانے کا اہتمام کریں، اسی کو سوال میں کھانے کا اہتمام نہ ہونے کی صورت میں ناک کٹنے سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) میت کے بعض ورثاء نابالغ ہوں یا موجود نہ ہوں یا اُن کی رضامندی نہ ہو اور میت کے ترکے سے ضیافت کا اہتمام کیا جائے۔ ہاں! اگر کوئی ایک وارث میت کے ترکے سے نہ کرے بلکہ اپنے مال سے کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور امام قاضی خان کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ ایامِ مصیبت میں میت کے گھر ضیافت کا اہتمام مکروہ ہے کیونکہ یہ افسوس کے دن ہیں تو ان دنوں میں وہ کام نہیں کرنے چاہییں جو مسرت کے موقع پر کیے جاتے ہیں۔ اور اگر فقراء کے لیے کھانا تیار کیا جائے تو یہ اچھی بات ہے اور کسی شخص کا اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت کرنا کہ میری موت کے بعد تین دن تک لوگوں کی دعوت کرنا، تو صحیح قول کی رو سے یہ باطل ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ترکے کی ایک تہائی تک اس وصیت پر عمل کرنا جائز ہے اور بظاہر یہی بات اصولِ شرع کے مطابق ہے''۔

(مرقاۃ المفاتیح، جلد 11، ص: 85-84)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں: ''اکثر لوگوں کو اس رسم شنیع کے باعث اپنی طاقت سے زیادہ ضیافت کرنی پڑتی ہے، یہاں تک کہ میّت والے بیچارے اپنے غم کو بھول کر اس آفت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اس میلے کے لیے کھانا، پان چھالیا کہاں سے لائیں اور بارہا ضرورت قرض لینے کی پڑتی ہے۔ ایسا تکلف شرع کو کسی امر مباح کے لیے بھی ہرگز پسند نہیں، نہ کہ ایک رسم ممنوع کے لیے، پھر اس کے باعث جو دقتیں پڑتی ہیں، خود ظاہر ہیں، پھر اگر قرض سودی ملا تو حرام خالص ہو گیا اور معاذ اللہ لعنت الٰہی سے پورا حصہ ملے کہ بے ضرورت شرعیہ سود دینا بھی سود لینے کے باعث لعنت ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں فرمایا۔ غرض اس رسم کی شناعت وممانعت میں شک نہیں، اللہ عزوجل مسلمانوں کو توفیق بخشے کہ قطعاً ایسی رسوم شنیعہ جن سے ان کے دین ودنیا کا ضرر ہے ترک کردیں، اور بیہودہ طعن کا

لحاظ نہ کریں، واللہ الھادی۔

تنبیہ: اگر چہ صرف ایک دن یعنی پہلے ہی روز عزیزوں کو ہمسایوں کو مسنون ہے کہ اہل میت کے لیے اتنا کھانا پکوا کر بھیجیں، جسے وہ دو وقت کھا سکیں اور باصرار انہیں کھلائیں، مگر یہ کھانا صرف اہل میت ہی کے قابل ہونا سنت ہے۔ اس میلے کے لیے بھیجنے کا ہر گز حکم نہیں اوران کے لیے بھی فقط روز اول کا حکم ہے آگے نہیں، کشف الغطاء میں ہے:
مستحب است خویشاں وہمسایہ ہائے میت را کہ اطعام کنند طعام را برائے اہل وے کہ سیر کند ایشاں را یک شبانہ روز والحاح کنند تا بخورند ودر خوردن غیر اہل میت ایں طعام را مشہور آنست کہ مکروہ است اھ ملخصاً۔

ترجمہ: ''میت کے عزیزوں، ہمسایوں کے لیے مستحب ہے کہ اہل میت کے لیے اتنا کھانا پکوائیں جسے ایک دن رات وہ سیر ہوکر کھا سکیں اور اصرار کر کے کھلائیں، غیر اہل میت کے لیے یہ کھانا قول مشہور کی بنیاد پر مکروہ ہے اھ ملخصا۔

عالمگیری میں ہے: حَمْلُ الطَّعَامِ اِلٰی صَاحِبِ الْمُصِیْبَةِ وَالْاَکْلُ مَعَهُمْ فِی الْیَومِ جَائِزٌ لِشُغْلِهِم بِالْجِهَازِ وَبَعْدَهٗ یُکْرَهُ، کَذَا فِی ''التَّتَارخَانِیَة''، وَاللهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ جَلَّ مَجدُهٗ اَتَمُّ وَاَحْکَمُ۔

ترجمہ: ''اہل میت کے یہاں پہلے دن کھانا لے جانا اوران کے ساتھ کھانا جائز ہے کیونکہ وہ جنازے میں مشغول رہتے ہیں اوراس کے بعد مکروہ ہے۔ ایسا ہی تتارخانیہ میں ہے: واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ جل مجدہ اتم واحکم''۔

(فتاویٰ ہندیہ، الباب الثانی عشر فی الہدایا والضیافات، نورانی کتب خانہ پشاور)

مزید لکھتے ہیں: ''یوں ہی چہلم یا برسی یا ششماہی پر کھانا بے نیت ایصال ثواب محض ایک رسمی طور پر پکاتے اور شادیوں کی بھاجی کی طرح برادری میں بانٹتے ہیں، وہ بھی بے اصل ہے، جس سے احتراز چاہیے، ایسے ہی کھانے کو شیخ محقق مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی ''مجمع البرکات'' میں فرماتے ہیں: آنچہ بعد از سالے یا ششماہی یا چہل روز درین دیار

پزند درمیان برادران بخشش کنند چیزے داخل اعتبار نیست بہتر آنست کہ نخورند ھٰکَذَا نَقَلَ عَنہُ شَیخُ الاِسلَامِ فِی ''کشف الغطاء''۔

ترجمہ: ''وہ جو اس دیار میں ایک سال یا چھ ماہ پر پکاتے اور برادری میں بانٹتے ہیں کوئی معتبر چیز نہیں، بہتر یہ ہے کہ نہ کھائیں اھ، اسی طرح ان سے شیخ الاسلام نے کشف الغطاء میں نقل کیا ہے۔ خصوصاً جب اس کے ساتھ ریاء وتفاخر مقصود ہو کہ جب تو اس فعل کی حرمت میں اصلاً کلام نہیں۔

اور حدیث صحیح میں ہے: نَھٰی رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیہِ وَسَلَّمَ عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِیَیْنِ اَنْ یُؤکَلَ، اَخرَجَہٗ اَبُودَاوٗدَ وَالْحَاکِمُ عَنِ ابنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنہُمَا بِاسنَادٍ صَحِیحٍ، قَالَ الْمُنَاوِی: أَیِ الْمُتَعَارِضِینِ بِالضِّیَافَۃِ فَخرًا وَ رِیَاءً لِاَنَّہٗ لِلرِّیَاءِ لَا لِلّٰہِ۔ ترجمہ: یعنی جو کھانے تفاخر وریاء کے لیے پکائے جاتے ہیں ان کے کھانے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ (اسے ابوداؤد اور حاکم نے سندِ صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے۔ امام مناوی نے کہا: یعنی ضیافت کے ذریعہ ناموری اور دکھاوا مقصود ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں دکھاوے کے لیے ہے۔ (المستدرک علی الصحیحین)، (فیض القدیر شرح الجامع الصغیر زیر حدیث مذکور دار المعرفۃ بیروت)، (التیسیر شرح الجامع الصغیر، زیر حدیث مذکور، مکتبۃ الامام الشافعی الریاض السعودیہ)۔ مگر واضح قرینے کے بغیر کسی مسلمان کا یہ سمجھ لینا کہ یہ کام اس نے تفاخر وناموری کے لیے کیا ہے جائز نہیں کہ قلب کا حال اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور مسلمان پر بدگمانی حرام، ھذا ھُوَ بِحَمدِ اللّٰہِ الْقَولُ الْوَسْطُ لَا وَکْسَ فِیہِ وَلَا شَطَطَ وَاِنْ خَالَفَ مَنْ فَرَّطَ فِی الْبَابِ وَ اَفْرَطَ، وَاللّٰہُ سُبحَانَہٗ، وَتَعَالٰی اَعْلَمُ۔ (یہ بحمد اللہ درمیانی قول ہے جس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی، اگرچہ اس باب میں افراط وتفریط کرنے والوں نے اختلاف کیا اور خدائے پاک وبرتر خوب جاننے والا ہے)''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 671-666، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

الغرض جو صورت آپ نے بیان کی ہے، وہ شریعت کی رُو سے ناپسندیدہ ہے اور جس

چیز میں ریا اور نمود شامل ہو جائے، اُس پر اللہ کی بارگاہ سے اجر کی توقع عبث ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ برادری کے طعن سے بچنے کے لیے میت کے گھر والے اپنی عزت بچانے کی خاطر اپنے گھر آنے والوں کے لیے کھانے کا اہتمام کرتے ہیں، تو یہ رسم ناپسندیدہ ہے، قبیح بدعت ہے اور ساری برادری والوں کو مل کر اُسے ختم کرنا چاہیے۔

اگر برادری کا کوئی فرد میت کے گھر کھانا نہیں کھاتا، تو اُس پر طعن کرنا یا اُسے بدعقیدہ سمجھنا درست نہیں ہے، تاوقتیکہ اُس کے بدعقیدہ ہونے کے بارے میں کوئی اور قطعی شواہد آپ کے پاس نہ ہوں۔ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لینا چاہیے، قرآن وسنّت کی تعلیمات بھی یہی ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ اِس رسم کو ناپسندیدہ سمجھ کر نہ کھاتا ہو تاکہ اِس کی حوصلہ شکنی ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ اگر یہ کھانا ایصالِ ثواب کے لیے ہے تو اس کے بہتر حقدار فقراء مساکین ہیں۔

سوئم، چہلم، برسی پر ایصالِ ثواب کا کھانا فقراء کو کھلانا چاہیے وہی اس کے اصل مستحقین ہیں۔ اگر اُمَراء کھالیں تو شرعاً منع بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ نفلی صدقہ ہے اور اس کا فقراء ومساکین پر تصدق افضل ہے واجب نہیں ہے۔ اپنے خوش حال رشتے داروں اور دوست احباب کے لیے دعوت کا اہتمام کرنا بھی باعث اجر ہے، ان کے لیے ہدیہ اور ہبہ کی نیت سے کھلانا بہتر ہے، ایصالِ ثواب اس کا بھی ہوسکتا ہے۔

(۱) امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے پوچھا گیا: ''سوم کے چنوں، بتاشوں کا لینا کیسا ہے؟'' آپ نے جواب دیا: ''اور سوم کے چنے بتاشے بغرض مہمانی نہیں منگائے جاتے بلکہ ثواب پہنچانے کے قصد سے ہوتے ہیں، یہ اس حکم میں داخل نہیں، نہ میرے اس فتوے میں ان کی نسبت کچھ ذکر ہے، یہ اگر مالک نے (الگ سے) محتاجوں کے دینے کے لیے منگائے اور یہی اس کی نیت ہے تو غنی کو ان کا لینا بھی ناجائز، اور اگر اس نے حاضرین کے لیے منگائے تو اگر غنی بھی لے لے گا تو گنہگار نہ ہوگا، اور یہاں بحکم عرف ورواج عام حکم یہی ہے کہ وہ خاص مساکین کے لیے نہیں ہوتے تو غنی کا بھی لینا ناجائز نہیں، اگرچہ احتراز

زیادہ پسندیدہ ہے، اور اسی پر ہمیشہ سے اس فقیر کا عمل ہے''۔

(۲) اسی طرح ان سے پوچھا گیا: ''جو کھانا بہ نیتِ خاص برائے ایصالِ ثواب خواہ بزرگانِ دین سے ہوں یا عام مسلمان، پکوایا جائے تو اس کھانے کو اغنیا کھا سکتے ہیں؟''۔آپ نے جواب دیا: ''اَغنیا بھی کھا سکتے ہیں، سوائے اُس کھانے کے، جو موت میں بھی بطورِ دعوت کیا جائے، وہ ممنوع و بدعت ہے''۔

(۳) اسی طرح امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا: ''جو طعام بہ نیتِ ایصالِ ثواب بروحِ بزرگان تقسیم کیا جاتا ہے، اس کو اَغنیا بھی کھا سکتے ہیں یا نہیں؟، عام اَمواتِ مومنین کے لیے جو کھانا وغیرہ دیا جاتا ہے، اُس میں اور اس طعام میں جو اَنبیاء عظام اور اولیاءِ کرام کی ارواح کے لیے ہدیہ کیا جاتا ہے، کچھ ذاتی فرق ہے یا نہیں؟، برکت وعدمِ برکت کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں مصرف ایک ہوگا، یعنی صرف فقراء کو دینا یا اغنیاء کے لیے بھی کھانا جائز ہوگا''۔آپ نے جواب میں لکھا: ''طعام تین قسم ہے: ایک وہ کہ وہ عوام ایامِ موت میں بطورِ دعوت کرتے ہیں، یہ ناجائز وممنوع ہے، اَغنیا کو اس کا کھانا جائز نہیں۔ دوسرے وہ طعام کہ اپنے اَموات کو ایصالِ ثواب کے لیے بہ نیت تصدُّق کیا جاتا ہے، فقراء اس کے لیے اَحق (زیادہ حق دار) ہیں، اغنیا کو نہ کھانا چاہیے۔ تیسرے وہ طعام کہ نذورِ اَرواحِ طیبہ (یہاں نذر شرعی نہیں بلکہ نذرِ عُرفی مراد ہے) حضرات انبیاء و اولیاء علیہم الصلوٰۃ والثناء کیا جاتا ہے اور فقراء و اغنیاء سب کو بطورِ تبرُّک دیا جاتا ہے، یہ سب کو بلا تکلف روا ہے اور وہ ضرور باعث برکت ہے، برکت والوں کی طرف جو چیز نسبت کی جاتی ہے، اس میں برکت آجاتی ہے، مسلمان اس کھانے کی تعظیم کرتے ہیں اور وہ اس میں مُصیب ہیں (یعنی یہ شِعار درست ہے)''۔

(۴) اسی طرح آپ نے سوم کے چنوں کے بارے میں فرمایا: ''یہ چنے فقراء ہی کھائیں، غنی کو نہ چاہیے، بچہ یا بڑا، غنی بچوں کو ان کے والدین منع کریں''۔ (فتاویٰ رضویہ، ج:9، صفحات: 605، 609، 610، 612، 614، 615، 672، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

بزرگانِ دین کے ایصالِ ثواب کے لیے اَعراس کے مواقع پر جو کھانا تیار ہوتا ہے، اسے اُن بزرگوں کی نسبت کی وجہ سے ''تبرُّک'' کہا جاتا ہے، یہ بھی نفلی صدقہ ہے اور امراء اور فقراء دونوں اسے کھا سکتے ہیں۔ قرض لے کر ایصالِ ثواب کرلیا تو ثواب یقیناً ملے گا، لیکن شریعت نے جس امر کا مکلف نہیں کیا، اپنے آپ کو اُس کا مکلف بنانا اور قرض لے کر خود کو زیر بار کرنا شرعاً پسندیدہ امر نہیں ہے۔ اگر کسی علاقے میں ایصالِ ثواب تہذیب وثقافت کے طور پر کیا جائے یا محض رسم سمجھ کر کیا جائے یا نہ کرنے والے کو ملامت کیا جائے، خواہ وہ استطاعت نہ رکھتا ہو اور اسے مجبوراً قرض لے کر کرنا پڑے ورنہ طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے گا، تو یہ طرزِ عمل غیر شرعی ہے اور کسی مستحب امر کے نہ کرنے پر ملامت کرنا اسے واجب کا درجہ دینا ہے اور یہ بدعت ہے، کسی امر کو واجب قرار دینا صرف شارع کا اختیار ہے۔ وہ صدقہ یا کھانا جو ناک اونچی کرنے کے لیے یا اَنا (جو شریعت کی منشا کے خلاف ہو) اور تفاخرِ نفس کی خاطر دیا جائے، اُس پر اَجر کی اُمید رکھنا عبث ہے۔

جن کا کام تھا کھلانا، وہ خود کھا رہے ہیں
فعلِ قبیح سے اپنے، سنت مٹا رہے ہیں
معاشرتی دباؤ کیسا، ناک کٹنے کا اندیشہ
روزِ سوگ میں، شرفِ ضیافت اڑا رہے ہیں

قبر کی بے حرمتی کی رسم

سوال:

اندرونِ سندھ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے ورثاء قبر پر مٹی ڈال کر اس پر چڑھ جاتے ہیں اور قبر کو پیروں سے خوب لتاڑتے ہیں۔ وہاں یہ مشہور ہے کہ ''پاؤں سے مٹی کو دبانا ورثاء کا حق ہے''، شرعی حکم بیان فرمائیں۔

(عبدالرؤف، ٹھٹھہ)

جواب:

شریعتِ مُطہرہ میں مسلمانوں کی قبروں کی تکریم وادب کا حکم دیا گیا ہے۔حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ''لَأَنْ يَجْلِسَ أَحَدُكُمْ عَلٰى جَمْرَةٍ فَتُحْرِقَ ثِيَابَهُ حَتّٰى تَخْلُصَ إِلٰى جِلْدِهٖ خَيْرٌ لَهٗ مِنْ أَنْ يَجْلِسَ عَلٰى قَبْرٍ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''تم میں سے کسی کا آگ پر بیٹھنا یہاں تک کہ وہ آگ کپڑے جلا کر اس کی کھال تک پہنچ جائے، یہ اذیت اس سے بہتر ہے کہ وہ اس کی قبر پر بیٹھے''(ابوداؤد:3226)

(۲)عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَأَنْ يَجْلِسَ أَحَدُكُمْ عَلٰى جَمْرَةٍ تُحْرِقُهُ خَيْرٌ لَهٗ مِنْ أَنْ يَجْلِسَ عَلٰى قَبْرٍ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی آگ کی چنگاری پر بیٹھے اور وہ اُسے جلا ڈالے، یہ(اذیت) اُس سے بہتر ہے کہ وہ کسی (مسلمان) کی قبر پر بیٹھے''۔(ابن ماجہ:1566)۔

یعنی قبر پر بیٹھنے کا عذاب اس سے زیادہ ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قبر پر بیٹھنے کی سنگینی کو بیان کرنے کے لیے وعید ہے۔

قبروں پر چلنا اور راستہ بنانا بھی حرام ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِأَنَّهُمْ نَصُّوا عَلٰى أَنَّ الْمُرُورَ فِي سِكَّةٍ حَادِثَةٍ فِيهَا حَرَامٌ۔

ترجمہ:''علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ قبرستان کے اندر نئے بنائے ہوئے راستے پر چلنا حرام ہے''۔(ردالمحتار جلد 1 صفحہ:482، داراحیاء التراث العربی بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:''علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ حیات وموت دونوں صورتوں میں مسلمان کی عزت برابر ہے۔محقق علی الاطلاق علامہ کمال الدین بن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ فتح القدیر میں فرماتے ہیں: وَتَوْضِيحُهُ الْاِتِّفَاقُ عَلٰى أَنَّ حُرْمَةَ

اَلْمُسْلِمِ مَیِّتًا کَحُرْمَتِہٖ حَیًّا، ترجمہ: اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ مسلمان کی عزت وحرمت زندہ مسلمان کی طرح ہے، (ترجمہ) نبی ﷺ فرماتے ہیں: کَسْرُ عَظْمِ الْمَیِّتِ وَاَذَاہُ کَکَسْرِہٖ حَیًّا، رَوَاہُ اِمَامُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَۃَ بِاِسْنَادٍ حَسَنٍ عَنْ اُمِّ الْمُؤْمِنِیْنَ عَائِشَۃَ الصِّدِّیْقَۃِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا۔ ترجمہ: ''مردے کی ہڈی کو توڑنا اور اسے ایذا پہنچانا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا، اسے ائمۂ حدیث احمد وابوداؤد وابن ماجہ نے بسندِ حسن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا''۔ یہ حدیث مسند الفردوس میں ان لفظوں سے ہے، اَلْمَیِّتُ یُؤْذِیْہِ فِیْ قَبْرِہٖ مَا یُؤْذِیْہِ فِیْ بَیْتِہٖ۔ ترجمہ: ''سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: مردے کو قبر میں بھی اس بات سے ایذا ہوتی ہے، جس سے اپنے گھر میں اُسے اذیت ہوتی۔ علامہ مناوی شرح میں فرماتے ہیں: اَفَادَاَنَّ حُرْمَۃَ الْمُؤْمِنِ بَعْدَ مَوْتِہٖ بَاقِیَۃٌ۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی حرمت موت کے بعد بھی ویسے ہی باقی ہے۔ سیدنا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اَذَی الْمُؤْمِنِ فِیْ مَوْتِہٖ کَاَذَاہُ فِیْ حَیَاتِہٖ رَوَاہُ اَبُوْبَکْرِ بْنُ اَبِیْ شَیْبَۃَ۔ مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے، جیسے اسے زندگی میں تکلیف پہنچانا، اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا۔ علماء فرماتے ہیں: اَلْمَیِّتُ یَتَاَذّٰی بِمَا یَتَاَذّٰی بِہِ الْحَیُّ، کَذَا فِیْ رَدِّالْمُحْتَارِ وَغَیْرِہٖ مِنْ مُعْتَمَدَاتِ الْاَسْفَارِ۔ (یعنی جس بات سے زندوں کو ایذا پہنچتی ہے، مردے بھی اس سے تکلیف پاتے ہیں، جیسا کہ ردالمحتار وغیرہ معتمد کتب میں مذکور ہے، (ت)۔ علامہ شیخ عبدالحق مُحدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اَشِعۃُ اللّمعات میں امام علامہ ابوعمر یوسف بن عبدالبر سے نقل فرماتے ہیں: ازیں جا مستفاد میگردد کہ میت مُتالّم میگردد بجمیع آنچہ مُتالّم میگردد بدان حی ولازم اینست کہ مُتلذذ گردد بتمام آنچہ مُتلذذ می شود بدان زندہ، انتہی، (یعنی اس جگہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو درد پہنچتا ہے، ان تمام سے مردہ کو بھی اَلم پہنچتا ہے، اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جن چیزوں سے زندہ کو لذت حاصل ہو ان سب سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے، انتہی (مترجم)''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 9،ص:442-441)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قبرِ مسلم کا اکرام لازم ہے، مذکورہ علاقے کے لوگوں کا یہ عقیدہ کہ میت کی قبر پر چڑھ کر پاؤں سے مٹی کو دبانا، ورثاء کا حق ہے، خلافِ شرع اور باطل مفروضہ ہے، اُنہیں گناہ پر مبنی نظریے سے توبہ کرنی چاہیے، اہلِ علم حضرات کو چاہیے کہ وہ اس رسم کی حوصلہ شکنی کریں اور لوگوں کو شریعت کے اَحکام سے آگاہ کریں۔

وقف قبرستان کی حیثیت تبدیل نہیں کی جاسکتی

سوال:

میں آپ کا سلسلہ اپنی دینی رہنمائی کی غرض سے بڑے ذوق وشوق سے پڑھتی چلی آرہی ہوں، مفتی صاحب اس مرتبہ میں آپ سے اپنے ذاتی مسئلہ پر رہنمائی چاہتی ہوں، میرے والد کا انتقال 1988 میں ہوا، اس وقت ہم دونوں بھائی بہن نابالغ تھے۔ انہوں نے انتقال سے کچھ عرصہ قبل گاؤں کی ایک جگہ وراثتی سات کنال اور دوسری جگہ تقریباً بیس کنال زمین قبرستان کے لیے وقف کردی تھی وقت گذرتا رہا، اس دوران دونوں جگہوں نے کمرشل حیثیت اختیار کرلی اور برلب سڑک آگئی۔ سات کنال والی زمین پر ایک طرف اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود صرف تین قبریں ہیں، اور کچھ ایسی ہی صورتحال دوسری جگہ پر ہے، میں اور میرے بھائی چاہتے ہیں کہ اس زمین کو بیچ کر کچھ مدد حاصل کرسکیں۔ آیا ہم اتنا ہی رقبہ اس کے قریب جگہ بطور متبادل رقبہ قبرستان کے لیے وقف کردیں یا پھر جہاں قبریں ہیں وہاں آس پاس تھوڑی زمین چھوڑ کر چاردیواری دیتے ہوئے اس کو قبرستان کے لیے رکھ دیں اور باقی استعمال میں لے آسکتے ہیں، براہ مہربانی رہنمائی کریں، (حنا محمود۔ اسلام آباد)۔

جواب:

کسی چیز کو ایک مرتبہ وقف کیے جانے کے بعد وقف سے رجوع درست نہیں۔ وقف کے معنی ہیں: ''کسی شے کو اپنی مِلک سے خارج کر کے خالص اللہ تعالیٰ کی مِلک کردینا'' کہ اُس کا نفع بندگانِ خدا کو ملتا رہے، وقف کو نہ تو باطل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُسے فروخت کیا جاسکتا ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: فیلزَم ولایُباعُ ولایُوھبُ ولایُورَثُ

كذا في الهداية

ترجمہ: ''پس جب (وقف) لازم ہوجاتا ہے تو اُسے نہ تو بیچا جاسکتا ہے، نہ ہبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُس میں وراثت جاری ہوتی ہے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:350، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔ وقف کرتے وقت وہ شے واقف کی مِلک ہے، تو وقف صحیح ہوگیا اور وقف مکمل ہونے کے بعد یہ پلاٹ واقف (وقف کرنے والے) کی ملکیت سے خارج ہوگیا اور واقف کو بھی اُس میں تبدیلی کی اجازت نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَا يَجُوْزُ تَغْيِيْرُ الْوَقْفِ عَنْ هَيْئَتِهٖ، ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں''۔

(فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490)

وقف مکمل ہونے کے بعد اُسے تبدیل کرنا یا ختم کرنا جائز نہیں ہے اور شرعاً وقف میں تبدیلی کرنا حرام ہے اور تبدیلی کرنے والا سخت گناہ گار ہے۔

البتہ وقف کرنے والے کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ وہ مصارفِ وقف کا تعیّن کرے اور اس سلسلے میں اسلامی فقہ کا مسلّمہ اصول ہے: شَرْطُ الْوَاقِفِ كَنَصِّ الشَّارِعِ، ''یعنی واقف کی مقررہ شرائط قرآن وسنت کی نَص کی طرح شرعاً مؤثر ہوتی ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص:508)

جوتے پہن کر نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال:

نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لیے صفیں بنتے وقت بعض اوقات جوتے/چپل اتارنے کی صدائیں آتی ہیں، کچھ لوگ عمل کرتے ہیں کچھ نہیں، شرعی حکم کیا ہے؟

(ارشاد صدیقی، جامع مسجد غفران، فیڈرل بی ایریا کراچی)

جواب:

نمازِ جنازہ اگر جوتا پہن کر پڑھے، تو جوتا اور اس کے نیچے کی زمین دونوں کا پاک ہونا ضروری ہے، بقدر مانع نجاست ہوگی تو اس کی نماز نہیں ہوگی اور جوتے پر کھڑے ہوکر نماز

پڑھی تو صرف جوتے کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اس کی علت یہ ہے کہ اصولاً جائے نماز، یعنی جس جگہ کھڑے ہوکر نماز پڑھی جارہی ہے، اُس جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اگر جوتا پہن کر نماز پڑھی جائے گی، تو جوتے کی حیثیت لباس جیسی ہوجائے گی اور نماز میں لباس کا پاک ہونا ضروری ہے، اس لیے جوتے کا پاک ہونا بھی ضروری ہے اور جس جگہ کھڑا ہے، اس کا پاک ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر جوتا اتار کر اُس کے اوپر کھڑے ہوکر نماز پڑھ رہا ہے، تو جوتے کی حیثیت جائے نماز یعنی جائے قیام کی ہوجائے گی اور اگر وہ پاک ہے، خواہ نیچے کی زمین ناپاک بھی ہو، تو نماز ہوجائے گی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''وَلَو خَلَعَ نَعْلَیْهِ وَقَامَ عَلَیْهِمَا، جَازَ، سَوَاءٌ کَانَ مَایَلِی الْاَرْضَ مِنْهُ نَجِسًا اَوْ طَاهِرًا، اِذَا کَانَ مَایَلِی الْقَدَمَ طَاهِرًا، وَالْاٰجُرُّ اِذَا کَانَ اَحَدُ وَجْهَیْهَا نَجِسًا فَقَامَ عَلَی الْوَجْهِ الطَّاهِرِ وَصَلّٰی، جَازَ، مَفْرُوْشَةً کَانَتْ اَوْ مَوْضُوْعَةً، هٰکَذَا فِیْ فَتَاوٰی ''قَاضِیْ خَان''۔

ترجمہ: ''اور اگر (نمازی نے) اپنے دونوں جوتے اتارے اور اُن پر کھڑے ہوکر نماز پڑھی تو نماز جائز ہے، خواہ جوتے کا جو حصہ زمین سے ملا ہوا ہے، وہ جگہ پاک ہو یا ناپاک (ہر صورت میں نماز جائز ہے)، بشرطیکہ پاؤں سے ملی ہوئی جگہ پاک ہو (اور وہ جوتا ہے، جس پر وہ کھڑا ہے)، اور اگر اینٹ کا ایک رخ پاک ہو، لیکن نمازی اس کے دوسری جانب پاک رخ پر کھڑے ہوکر نماز پڑھے تو جائز ہے، اینٹ خواہ بچھی ہوئی ہو یا کھڑی ہو، فتاویٰ ''قاضی خان'' میں اسی طرح ہے''۔ (عالمگیری، ج:1، ص:62)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''ایک جنازے کی نماز میں زید نے لوگوں کو، جنہوں نے جوتوں میں سے پیروں کو نکال کر اور جُوتے کے اوپر پیر رکھ کر نماز پڑھنا چاہا، روکا کہ پیر جوتوں سے مت نکالو جُوتے پہنے ہوئے نماز درست ہے۔ عمرو نے ایک شخصیت کے الفاظ میں کہا کہ کوئی کہتا ہے جوتے پہنے ہوئے نماز پڑھو، جوتے سب اتار ڈالیں، چنانچہ بعض نے زید کے کہنے پر عمل کیا بعض نے عمرو کے کہنے پر۔ بعد نماز بحث پیش

آئی۔ زید نے تحریری جواب میں کہ رسول خدا نے نماز میں جوتا اتارا، مقتدیوں نے بھی اتارا، پیغمبر صاحب نے دریافت کیا تم نے جوتے کیوں اتارے؟، جواب دیا کہ اتباع کیا۔ آپ نے فرمایا مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ جوتے میں ناپاکی ہے۔ پس معلوم کرلینا چاہیے، عمرو کو ایسا کہنا خلاف تھا، اس لیے کہ وہ کیسے برجستہ الفاظ صدر کہہ سکتا تھا اس لیے ناپاکی کا ثبوت نہیں رکھتا تھا، مقامی حالت، میں جہاں جوتے اتار کر نماز پڑھنے کے واسطے عمرو نے کہا تھا، یہ تھی کہ وہاں گھوڑے وغیرہ پیشاب کرتے ہیں، جوتے پہنے ہوئے جس قدر لوگ تھے اُن کے جوتے خشک تھے، پس اس حالت میں شرعاً عمرو کا کہنا صحیح سمجھا جائے گا یا زید کا؟''۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''اگر وہ جگہ پیشاب وغیرہ سے ناپاک تھی یا جن کے جوتوں کے تلے ناپاک تھے اور اس حالت میں جوتا پہنے ہوئے نماز پڑھی اُن کی نماز نہ ہوئی، احتیاط یہی ہے کہ جوتا اتار کر اس پر پاؤں رکھ کر نماز پڑھ لی جائے کہ زمین یا تلا ناپاک ہو تو نماز میں خلل نہ آئے۔ ردالمحتار میں ہے: قَد تُوضَعُ فِي بَعْضِ الْمَوَاضِعِ خَارِجَ الْمَسجِدِ فِي الشَّارِعِ فَيُصَلّٰى عَلَيهَا وَيَلزَمُ مِنْهُ فَسَادُهَا مِنْ كَثِيرٍ مِنَ الْمُصَلِّينَ لِعُمُومِ النَّجَاسَةِ وَعَدَمِ خَلْعِهِمْ نِعَالَهُمُ الْمُتَنَجِّسَةَ۔ ترجمہ: کبھی بعض مقامات میں بیرونِ مسجد سڑک پر جنازہ رکھ کر اس پر نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے اس سے بہت سے لوگوں کی نماز کا فساد لازم آتا ہے کیونکہ وہ جگہیں نجس ہوتی ہیں اور لوگ اپنے نجاست آلودہ جوتے اتارتے نہیں''۔ (ردالمحتار، باب صلوٰۃ الجنائز)

اُسی میں ہے: فِي الْبَدَائِعِ لَوصَلّٰى عَلٰى مُكَعَّبٍ اَعلَاهُ طَاهِرٌ وَبَاطِنُهُ نَجِسٌ عِندَ مُحَمَّدٍ يَجُوزُ لِاَنَّهُ صَلّٰى فِي مَوضِعٍ طَاهِرٍ كَثَوبٍ طَاهِرٍ تَحتَهُ ثَوبٌ نَجِسٌ، وَظَاهِرُهُ تَرجِيحُ قَولِ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْاَشْبَهُ (ملخصاً)

ترجمہ: ''بدائع میں ہے: اگر کسی ایسے مکعب پر نماز پڑھی جس کا بالائی حصہ پاک ہے اور اندرونی حصہ ناپاک ہے تو امام محمد کے نزدیک جائز ہے، اس لیے کہ نماز پاک جگہ ادا ہوئی جیسے کوئی پاک کپڑا ہو جس کے نیچے دوسرا ناپاک کپڑا ہوا ہو۔ ظاہراً امام محمد کا قول راجح ہے اور

وہی اشبہ ہے،(ملخصاً)، (ردالمحتار،باب مفسد الصلوٰۃ ومایکرہ فیہا)''۔ زید نے بیانِ حدیث میں غلطی کی، حدیث میں تو لفظ نجاست نہیں لفظ قذر ہے یعنی گھن کی چیز، جیسے ناک کی آمیزش وغیرہ نجاست ہوتی ہے تو نماز سرے سے پڑھی جاتی کہ نماز کا ایک جز باطل ہونا ساری نماز کو باطل کر دیتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔(فتاویٰ رضویہ،جلد 9،ص:189-188)

علامہ ابن عابدین شامی ''بدائع الصنائع'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وَعَلٰی ھٰذَا لَوصَلّٰی عَلٰی حَجَرِ الرَّحی،أَو بَابٍ، أَو بساطٍ غَلیظٍ،أَومکعَبٍ أَعلاہ طَاھِرٌ وَبَاطِنہٗ نَجِسٌ عِنْدَ أَبِی یُوسُفَ لَایَجُوزُ نَظراً اِلیٰ اِتِّحادِ الْمَحَلِ،فَاستَوَی ظَاھِرُہٗ وبَاطِنہ کَالثَّوبِ الصَّفِیق،وَعِندَ مُحَمَّدٍ یَجُوزُ، لِأَنَّہٗ صَلّٰی فِی مَوضِعٍ طاھِرٍ کَثَوبٍ طَاھِرٍ تَحتَہٗ ثَوبٌ نَجِسٌ بِخلَافِ الثَّوبِ الصَّفِیق،لأَنَّ الظَّاھِرنفاذُ الرُّطُوبۃِ اِلَی الْوَجہِ الآخر۔

ترجمہ:''اور اسی بنیاد پر اگر اس نے چکی کے پتھر پر یا دروازے پر یا موٹی چٹائی پر یا ایسے کپڑے پر نماز پڑھی جو تہہ در تہہ مختلف کپڑوں کو جوڑ کر تیار کیا گیا (یعنی رَلی) اور اس کا اوپر کا حصہ تو پاک ہے لیکن اندر کا حصہ ناپاک ہے، تو امام ابو یوسف کے نزدیک اس پر نماز جائز نہیں ہے کیونکہ محل ایک ہے اور باریک کپڑے کی طرح اُس کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ اور امام محمد کے نزدیک اُس پر نماز جائز ہے کیونکہ اس نے پاک جگہ پر نماز پڑھی ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کپڑے کا ظاہری حصہ پاک ہو اور نیچے کا حصہ ناپاک ہو، البتہ باریک کپڑے کی بات الگ ہے، کیونکہ یہ بات عیاں ہے کہ اُس میں رطوبت دوسرے رُخ تک پہنچ جاتی ہے''۔(حاشیہ ابن عابدین شامی،جلد رابع،ص:92،دمشق)

مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال ہوا: مسجد کے ساتھ ایک گراؤنڈ ہے، اس گراؤنڈ میں گھاس لگانے کے لیے کھاد پھیلا دی گئی ہے، آیا اس گراؤنڈ میں نماز جنازہ پڑھنا جب کہ وہ گھاس سوکھی ہوئی ہو، جائز ہے یا نہیں؟۔ بعض لوگ نماز جنازہ کی ادائیگی کے وقت جوتا نہیں اتارتے اور کچھ جوتوں پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ آیا اس طرح نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔

انہوں نے اس کے جواب میں لکھا: ''نماز جنازہ کے لیے بھی طہارت اسی طرح شرط ہے،جس طرح دوسری نمازوں کے لیے۔لہٰذا کھاد پر نماز نہیں ہوگی،ہاں اگر گھاس اتنی بڑی ہوجائے کہ اس پر پاؤں رکھنے سے پاؤں کا کوئی حصہ کھاد سے نہ ملے تو اس صورت میں نماز جائز ہوگی۔جوتے کا تلا اگر پاک ہے،تو اسے پہن کر یا اس پر کھڑے ہوکر نماز جائز ہے اور اگر تلا ناپاک ہے،تو دونوں صورتوں میں یعنی پہن کر یا اس پر کھڑے ہوکر نماز ناجائز ہوگی''۔(وقارالفتاویٰ،ج:2،ص:354)

ہماری ناقص رائے کے مطابق حضرت مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہاں تسامح ہوا ہے۔جوتے کا تلا اُس صورت میں پاک ہونا ضروری ہے،جب جوتا پہن کر نماز پڑھے اور اگر جوتا اتار کر اُس پر کھڑے ہوکر نماز پڑھتا ہے اور اگر جوتا پاک ہے تو اس صورت میں نیچے کی زمین یا جوتے کا تلا ناپاک ہونے کی صورت میں بھی نماز جائز ہوجائے گی۔علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''بعض لوگ جوتا پہنے اور بہت لوگ جوتے پر کھڑے ہوکر نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں،اگر جوتا پہنے پڑھی تو جوتا اور اس کے نیچے کی زمین دونوں کا پاک ہونا ضروری ہے،بقدرِ مانع نجاست ہوگی تو اُس کی نماز نہ ہوگی اور اگر جوتے پر کھڑے ہوکر پڑھی تو جوتے کا پاک ہونا ضروری ہے''۔اس کے نیچے محشی لکھتے ہیں: ''امام احمد رضا علیہ رحمۃ الرحمٰن فرماتے ہیں: ''احتیاط یہی ہے کہ جوتا اتار کر اُس پر پاؤں رکھ کر نماز پڑھی جائے کہ زمین یا تلا اگر ناپاک ہو تو نماز میں خلل نہ آئے،

(فتاویٰ رضویہ،ج:9،ص:188،بہارِ شریعت،ج:1،ص:826،مطبوعہ:المدینۃ العلمیہ)

تنگ علاقوں میں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال:

ہماری مسجد محمد فردوس کالونی کے سامنے شارعِ عام ہے اور مسجد کے دوسرے دروازے کے باہر گلی نہیں ہے جس میں نمازِ جنازہ ہوسکے۔فرض نماز کے بعد کچھ فاصلہ طے کرکے چورنگی کے دائیں یا بائیں جانب نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے۔اس دوران کچھ لوگ

فرض نماز چھوڑ کر میت کے ساتھ چورنگی پر انتظار کرتے ہیں۔ اگر ہم محراب کے سامنے ایک دروازہ نکال کر اس طرح کہ میت محراب کے باہر ہو اور امام محراب میں، نمازی مسجد میں تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟، (انتظامیہ جامع مسجد محمدی، فردوس کالونی کراچی)۔

جواب:

فقہائے احناف کے نزدیک مسجد میں جنازہ رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا بالاتفاق مکروہ ہے، اس کی اصل یہ حدیث ہے:

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ صَلّٰی عَلٰی جَنَازَةٍ فِی الْمَسْجِدِ فَلَا شَیْئَ لَهٗ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مسجد میں (رکھی ہوئی) میت کی نمازِ جنازہ پڑھی، اس کے لیے کوئی (اجر) نہیں ہے، (سنن ابوداؤد: 3187)''۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ، امام عبدالرزاق، امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَصَلَاةُ الْجَنَازَةِ فِی الْمَسْجِدِ الَّذِی تُقَامُ فِیهِ الْجَمَاعَةُ مَکْرُوهَةٌ سَوَاءٌ کَانَ الْمَیِّتُ وَالْقَوْمُ فِی الْمَسْجِدِ اَوْ کَانَ الْمَیِّتُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ وَالْقَوْمُ فِی الْمَسْجِدِ اَوْ کَانَ الْاِمَامُ مَعَ بَعْضِ الْقَوْمِ خَارِجَ الْمَسْجِدِ وَالْقَوْمُ الْبَاقِیْ فِی الْمَسْجِدِ اَوِ الْمَیِّتُ فِی الْمَسْجِدِ وَالْاِمَامُ وَالْقَوْمُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ، هُوَالْمُخْتَارُ کَذَا فِی ''الْخُلَاصَة''۔

ترجمہ: ''ایسی مسجد، جس میں باقاعدہ باجماعت نماز ہوتی ہے، میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، خواہ میت، لوگ سب مسجد میں ہوں یا میت مسجد سے باہر ہو اور لوگ مسجد میں ہوں یا امام اور کچھ لوگ مسجد سے باہر ہوں اور دوسرے لوگ مسجد میں ہوں یا میت مسجد میں اور امام اور سب لوگ مسجد کے باہر ہوں، یہی مختار مسئلہ ہے اور ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج:1، ص165)

جہاں مسجد کے باہر جنازہ کے لیے جگہ دستیاب ہو، وہاں مسجد میں نمازِ جنازہ قطعاً نہ پڑھی جائے اور جہاں جگہ دستیاب نہ ہو، جیسے گنجان آبادی والے شہروں کے اندر بعض علاقوں میں جگہ کی تنگی ہوتی ہے، وہاں میت محراب کے سامنے رکھ دی جائے اور محراب میں امام اور اُس کے ساتھ حسبِ گنجائش چند مقتدی کھڑے ہوجائیں، بقیہ مقتدی مسجد میں صفیں بنا کر نمازِ جنازہ پڑھ سکتے ہیں، کیونکہ بعض اکابر فقہائے کرام نے اس کی اجازت دی ہے۔ اگر بارش ہورہی ہو تو اس صورت میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَلَاتُکرہُ بِعذرِ المَطرِ وَنَحوِہٖ ھٰکَذَا فِی ''الْکَافِی''۔ ترجمہ: ''اور بارش یا اس جیسے دیگر اَعذار کی بنا پر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے، فتاویٰ ''کافی'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج:1،ص165)

بعض تنگ شہری علاقوں میں مسجد کے باہر کھلی جگہ ہوتی ہی نہیں، جہاں نمازِ جنازہ پڑھی جاسکے، ایسی صورت میں بعض مقامات پر لوگ سڑکوں یا گلیوں کو بلاک کر کے وہاں پر جنازہ پڑھتے ہیں، جبکہ شارعِ عام اور دوسرے کی زمین پر بلااجازت جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ''تُکرہُ فِی الشَّارِعِ وَ اَرَاضِ النَّاسِ کَذَافِی ''الْمُضْمَرَات''۔ ترجمہ: ''سڑک پر اور لوگوں کی زمین پر (بلااجازت ومنظوری) نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج:1،ص:165)

سڑک پر چونکہ حقِ مُرور (Right of Passage) سب کا ہوتا ہے، اس لیے اسے بلاک کرنے سے سب کا عمومی حق متاثر ہوتا ہے۔ آپ نے جو صورت مسئلہ بیان کی ہے، اس کے مطابق آپ نماز جنازہ کے لیے یہ صورت اختیار کر سکتے ہیں اور اگر امام اور چند نمازیوں کے لیے مسجد سے باہر گنجائش ہو تو زیادہ بہتر ہے۔

قبر کے لیے مُترادف کلمات

سوال:

لفظ ''مزار، قبر، روضہ، مقبرہ، مدفن'' ان میں سے بزرگان دین کے لیے کون سا لفظ

استعمال کرنا درست ہے؟،(محمد صدیق مدنی، پشاور)۔

جواب:

لفظِ مَزار،''اسمِ ظرف''ہے،اس کے معنیٰ ہیں:زیارت کی جگہ،حدیث پاک میں قبور پر جانے کے لیے''زِیَارَۃ القبور''اور زُورُوھَا(قبرستان جایا کرو)کے کلمات آئے ہیں،''مَزار''(بمعنیٰ قبر)اسی سے ہے،یعنی زیارت یا حاضری کی جگہ اور چونکہ بزرگانِ دین کی قبور پر حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کے لیے مسلمان کثرت سے آتے ہیں،اس لیے وہ زیارت گاہ کہلاتی ہے۔مدینہ منورہ میں اُحد اور دیگر مزارات پر جانے کے لیے ڈرائیور حضرات''زیارۃ''کی آواز لگاتے ہیں۔

قبر کے معنی دفن کرنے کا مقام،احادیث مبارکہ میں''اِذَا قُبِرَ الْمَیِّتُ''(جب میت کو قبر میں دفن کردیا جائے)کے کلمات آئے ہیں،اسی طرح مختلف صیغوں کے ساتھ اس کے ذکر کے علاوہ قبور اور قبرستان کے لیے''مَقْبَرَہ اور مَقْبُرَۃ''کے کلمات آئے ہیں۔ہمارے ہاں اردو میں بعض کلمات کا تلفظ غلط العام کے طور پر استعمال ہوتا ہے،جیسے''تَجُرْبہ'' حالانکہ صحیح تلفظ''تَجْرِبَہ''ہے،اسی طرح مقبرے کو فارسی میں''قَبْرِستان اور گورستان''کہتے ہیں،گور کے معنیٰ قبر کے ہیں،جب کہ عوام اس کا تلفظ''قبرُستان''کرتے ہیں۔روضہ کے معنی باغ کے ہیں اور قبر کے لیے یہ لفظ بھی حدیث میں آیا ہے:قبر جنت کا باغ ہوتی ہے (روضۃُ الْجَنَّۃ)اوریا جہنم کا گڑھا(حُفْرَۃُ النَّار)۔

مَقْبُرَہ اسمِ ظرف ہے اور اس کے معنی ہیں:دفن کرنے کی جگہ اور''مَدْفَن''کے بھی یہی معنیٰ ہیں۔قبر اور مدفَن کا لفظ عام مسلمانوں کے لیے اور مزار و روضہ بزرگانِ دین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے،تاہم یہ کوئی ضابطہ نہیں ہے،فقط عُرف ہے،یہ تمام الفاظ عام مسلمانوں کے لیے بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

تعزیت کی ناپسندیدہ رسوم

سوال:

ہمارے علاقے میں اور بالخصوص ہمارے گاؤں سہگل آباد، چکوال میں فوتگی کے موقع پر لوگ تعزیت کے لیے آتے ہوئے اس بات کا قطعاً خیال نہیں کرتے کہ میت کے گھر والے آرام کررہے ہوں گے یا ان کے کھانے کا وقت ہے، لوگ صبح کی نماز تک آتے رہتے ہیں۔ میت کے گھر والوں کو صبح کی نماز سے رات ساڑھے دس بجے تک بیٹھنا پڑتا ہے، اتنا لمبا وقت بیٹھنا اور کئی دن تک اس سلسلے کا چلتے رہنا میت کے گھر والوں کے لیے دشوار ہوجاتا ہے۔ تعزیت کا یہ سلسلہ مردوں، عورتوں دونوں میں ایک جیسا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے: کیا تعزیت کے لیے گاؤں والے مل کر اوقات مقرر کرسکتے ہیں، یہ خلافِ شریعت تو نہیں؟، اگر تحدید کردی جائے تو عوام کے لیے کیا دلائل رکھے جائیں گے، تعزیت کے لیے کون سا وقت بہتر ہوگا؟، (سلطان محمد سعید اعوان، سہگل آباد تحصیل وضلع چکوال)۔

جواب:

تعزیت مسنون ہے، حدیث پاک میں ہے:

مَا مِنْ مُؤمِنٍ يُعَزِّي أَخَاهُ بِمُصِيبَةٍ إِلَّا كَسَاهُ اللهُ سُبْحَانَهُ مِنْ حُلَلِ الْكَرَامَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

ترجمہ: ''جو بھی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی مصیبت میں تعزیت کرے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُسے کرامت کا جوڑا پہنائے گا''۔ (سُنن ابن ماجہ: 1601)

تعزیت کا وقت موت سے تین دن تک ہے اور تین دن کے بعد تعزیت کرنا مکروہ ہے، تعزیت کے لیے پہلا دن افضل و بہتر ہے۔ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

وَبِالْجُلُوسِ لَهَا فِي غَيْرِ مَسْجِدٍ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، وَأَوَّلُهَا أَفْضَلُ، وَتُكْرَهُ بَعْدَهَا إِلَّا لِغَائِبٍ۔

ترجمہ: ''تعزیت کے لیے اہل میت مسجد کے علاوہ کسی جگہ تین دن بیٹھیں، (تو اس میں کوئی حرج نہیں) ایامِ تعزیت میں پہلا دن افضل ہے اور تین دن کے بعد تعزیت کرنا مکروہ ہے،

لیکن ایسا شخص جو غائب ہے اور تین دن کے بعد آیا، (وہ تعزیت کرسکتا ہے)''۔

(جلد 3،ص:139، بیروت)

امام احمد رضا قادری سے سوال ہوا: ''میت کی تعزیت بعد دفن ہی چاہیے یا پیش از دفن بھی جائز ہے؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''افضل یہ ہے کہ بعد دفن قبر سے پلٹ کر ہو کَمَافِی الْجَوهَرَةِ وَغَیرِھَا (جیسا کہ جوہرہ وغیرہا میں ہے) اور قبل دفن بھی بلا کراہت جائز ہے:

فِی صَحِیْحِ الاِمَامِ ابنِ السَّکَنِ عَنْ اَبِیْ هُرَیرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ اُوْذِنَ بِجَنَازَةٍ فَاَتٰی اَهْلَهَا فَعَزَّاهُم کَتَبَ اللهُ تَعَالٰی قِیرَاطًا، فَاِنْ تَبِعَهَا کَتَبَ اللهُ لَهُ قِیرَاطَینِ، فَاِن صَلّٰی عَلَیْهِمَا کَتَبَ اللهُ لَهُ ثَلٰثَةَ قَرَارِیطَ، فَاِنْ شَهِدَ دَفْنَهَا کَتَبَ اللهُ لَهُ اَرْبَعَةَ قَرَارِیطَ اَلقِیرَاطُ مِثْلُ اُحُدٍ۔

ترجمہ: ''صحیح امام ابن سکن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جسے کسی جنازہ کی خبر ملی اور اس نے اہلِ میت کے پاس جاکر اُن سے تعزیت کی، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک قیراط ثواب لکھ دے گا، پھر اگر جنازہ کے ساتھ گیا، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دو قیراط اجر لکھ دے گا، پھر اگر اس نے اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے تین قیراط اجر لکھ دے گا، پھر اگر وہ دفن میں بھی شریک ہوا، تو اُس کے لیے چار قیراط اجر لکھ دے گا اور ہر قیراط کوہِ اُحد کے برابر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں: مَعْ ہٰذا خاص اس قصد سے یعنی تعزیت کے لیے بیٹھنا بھی اگرچہ رخصت ہے، مگر افضل نہ کرنا ہے، کَمَافِی الْهِندِیَةِ مِن معراجِ الدّرایة عَن خزانةِ الفَتَاوٰی: اَلْجُلُوْسُ لِلْمُصِیْبَةِ ثلٰثَةَ اَیَّامٍ رُخصَةٌ وَتَرکُهُ احسنُ، (جیسا کہ ہندیہ میں معراج الدرایہ سے، اس میں خزانۃ الفتاویٰ سے منقول ہے: موت کے سبب مصیبت سے تین دن بیٹھنے کی اجازت ہے اور اس کا ترک بہتر ہے)۔لہٰذا بہت سے علمائے متاخرین نے میت کے گھر اس ہجوم واجتماع کو پسند نہ فرمایا اور یہی مناسب جانا کہ لوگ دفن کر کے متفرق ہو جائیں، اولیائے میت اپنے کام میں مشغول ہوں اور لوگ اپنے اپنے

کاموں میں مصروف ہوں، کَمَا فِی ''مَرَاقِی الفَلَاحِ'' لِلعَلَّامَۃ الشُّرُنْبُلالِی: قَالَ کَثِیرٌ مِّن مُتَاَخِّرِیْ اَئِمَّتِنَا رَحِمَهُمُ اللهُ تَعَالٰی یُکْرَهُ الاِجْتِمَاعُ عِندَ صَاحِبِ المُصِیبَۃِ حَتّٰی یَاتِیَ اِلَیهِ مَنْ یَّعزِیْ بَلْ اِذَا رَجَعَ النَّاسُ مِنَ الدَّفنِ فَلْیَتَفَرَّقُوا اَوْ یَشْتَغِلُوا بِاُمُورِهِمْ وَصَاحِبُ المَیِّتِ بِاَمرِهٖ۔

ترجمہ: ''جیسا کہ علامہ شرنبلالی کی مراقی الفلاح میں ہے کہ ہمارے بہت سے ائمۂ متاخرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میت والے کے یہاں اس مقصد سے اجتماع کہ اس کے یہاں تعزیت کرنے والے آئیں، مکروہ ہے۔ لوگ جب دفن سے واپس ہوں تو متفرق ہوجائیں، لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول ہوں، اہلِ میت اپنے کام میں مصروف ہوں''۔

بالجملہ قولِ فیصل جس سے اختلاف زائل اور توفیق حاصل ہو یہ ہے کہ نفس تعزیت ودعا وایصالِ ثواب بیشک محمود ومندوب اور وقتِ دعا ہاتھ اٹھانا بھی جائز اور اگر کوئی شخص اولیائے میت کے مکان پر جاکر تعزیت کرآئے تو بھی قطعاً روا۔ مگر اولیاء کا خاص اس قصد سے بیٹھنا اور لوگوں کا ان کے پاس ہجوم ومجمع کرنا خواہ قبلِ دفن ہو یا بعد اُسی وقت اگر ہو یا کبھی مکانِ میت پر ہو یا کہیں اور، بہر طور جائز ومباح ہے جبکہ منکراتِ شرعیہ سے خالی ہو، مگر اُس کا نہ کرنا افضل ہے، نہ یہ کہ مطلقاً حرام اور گناہ اور فاعل مبتدع وگمراہ ٹھہرے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 401-399)

نوٹ: قیراط سونا تولنے کا ایک وزن ہے اور قیراط کو اُحد پہاڑ کے برابر اجر بیان کرنے کی حکمت یہ ہے کہ یہ بے انتہا اجر وثواب کا کام ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ شریعتِ مطہرہ میں تعزیت مسنون ہے، لیکن اس کی پسندیدہ اور افضل صورت یہی ہے کہ اجر کے طلب گار اور تعزیت کرنے والے لوگ جنازے اور تدفین کے تمام مراحل میں شریک ہوں اور دفنِ میت کے بعد متفرق ہوجائیں اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوں۔ اس مقصد کے لیے ہجوم واجتماع کو ائمۂ متاخرین نے ناپسند بلکہ مکروہ فرمایا ہے۔ آپ نے سوال میں تعزیت کی جو صورت بیان کی ہے، وہ میت کے اہلِ خانہ کے لیے

مَشقّت کا باعث ہے۔ اگر کوئی برادری یا کمیونٹی تعزیت کے لیے انتقال کے تین دنوں کے اندر سب کی آسانی کے لیے کوئی وقت مُقرر کر دیں، تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ وقت کی یہ تعیین عرف اور مقامی صورتِ حال کے مطابق کی جاسکتی ہے۔ اس حوالے سے شہروں میں اموات کے لیے دعاءِ مغفرت اور ایصالِ ثواب کے لیے جو سوئم کی تقریب ہوتی ہے، اس میں سہولت ہے کہ جو لوگ نمازِ جنازہ اور تدفین میں شریک نہیں ہو سکے، ان کی طرف سے تعزیت ہو جاتی ہے اور اجتماعی دعا بھی۔

ہمارے ہاں صوبۂ خیبر پختونخوا، قبائلی علاقوں اور ملک کے بعض دیگر علاقوں میں یہ رواج ہے کہ میت کے اہلِ خانہ اپنے کام کاج چھوڑ کر گھر پر بیٹھے رہتے ہیں اور مہمان آتے رہتے ہیں، دعا اور مہمان داری کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ اگر گھر والے موجود نہ ہوں یا اپنی مصروفیات میں لگ جائیں یا ڈیوٹی پر چلے جائیں، تو لوگ طعن کرتے ہیں کہ باپ یا ماں کا کفن بھی ابھی میلا نہیں ہوا اور یہ دنیا داری میں مشغول ہو گئے۔ اسی طرح انتقال کے بعد جو پہلی عید آتی ہے، اُس میں ازسرِ نو تعزیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ گھر والے تنگ بھی ہوتے ہیں اور نہ آنے والوں کا شکوہ بھی کرتے ہیں۔ جب معاملہ اس حد تک بڑھ جائے تو یہ باعثِ تکلیف ہے اور اس بنا پر یہ کم از کم غیر مستحسن اور خلافِ اَولیٰ ہے، ایسی رسوم کا خاتمہ ہونا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:

(۱) یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا ترجمہ: ''(دین میں) آسانی پیدا کرو، دشواری نہیں اور (لوگوں کو رحمتِ باری کی) بشارت سناؤ، انہیں دین سے دور نہ کرو''۔

(صحیح البخاری:69)

(۲) اِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِیْنَ۔ ترجمہ: ''بے شک تمہیں آسانی فراہم کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے اور تمہیں دشواری میں مبتلا کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے، (سُنن ترمذی:147)''۔ حیرت ہے کہ وہ علاقے جہاں تعزیت کی یہ ناپسندیدہ رسم جاری ہے، وہاں ایک مکتبۂ فکر کے علماء کے خطابات و دروس کا من پسند موضوع شرک و بدعت ہوتا

ہے، لیکن اس کو وہ بھی اپنا موضوعِ کلام نہیں بناتے، بلکہ وہ اپنے علاقوں میں خود اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں، بعض اوقات رسوم شریعت پر حاوی ہوجاتی ہیں اور علماء کی قوتِ مزاحمت اور جذبۂ اصلاح بھی دب جاتا ہے۔

خیبر پختونخوا میں تعزیت ودعائے مغفرت کی ایک رسم یہ بھی ہے جو روحِ دعا کے منافی ہے مثلاً اہلِ میت کے گھر میں دس افراد بیک وقت داخل ہوئے۔ ایک نے کہا: دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں، کچھ پڑھے پڑھائے یا کلماتِ دعا کہے بغیر ہاتھ چہروں پر پھیر دیے، پھر دوسرا کہے گا کہ جی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں، الغرض باری باری سب اپنی حاضری لگائیں گے، یہ محض ایک دکھاوے کا عمل ہوتا ہے۔ دعا تو اللہ ربّ العالمین کی بارگاہ میں حضوریِ قلب کے ساتھ التجا کا نام ہے، سوال کرنے کا نام ہے، اسے محض رفعِ یدین برائے دعا کی ایک مشق (Physical Practice) بنادیا گیا ہے۔ اس سے دعا کی روح مجروح ہوتی ہے، اسے بند ہونا چاہیے۔ جب ایک مجلس دعا میں دس یا سو افراد بیٹھے ہیں اور سب نے خلوصِ نیت سے اللہ کی بارگاہ میں وفات پانے والے شخص کے لیے مغفرت کی دعا اور اُس کے پسماندگان کے لیے صبر کی دعا کرلی تو کافی ہے۔ ایک ہی مجلس میں بیٹھے ہوئے الگ الگ حاضری لگانا بے سود ہے، ریاکاری ہے اور دعا کی حقیقت سے ناواقفی کی دلیل ہے۔

ایصالِ ثواب کی مشروعیت اور اس کا مستحسن طریقہ

اجتماعی قرآن خوانی کی شرعی حیثیت

پس منظر:

روزنامہ جنگ کے جمعہ ایڈیشن میں اقرأ صفحہ پر میں بھی ''تفہیم المسائل'' کے عنوان سے دین سے متعلق سوالات کے جوابات لکھتا ہوں اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے مہتمم مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب بھی ''آپ کے مسائل اور اُن کا حل'' کے عنوان سے سوالات کے جوابات لکھتے ہیں۔ اُنہوں نے ایک سے زائد بار ایصالِ ثواب کے لیے اجتماعی قرآن خوانی کو ناجائز لکھا، البتہ مکان یا دکان کے افتتاح کے موقع پر

اسے جائز لکھا۔ اس پر کئی حضرات کو تشویش ہوئی اور سوالات بھیجے، لہٰذا میں نے ''ایصالِ ثواب کی مشروعیت اور اُس کا مستحسن طریقہ'' کے عنوان سے ایک مُدلّل و مُفصّل مقالہ لکھا ہے اور اُس میں اجتماعی قرآن خوانی کی شرعی حیثیت کو بھی واضح کر دیا ہے، اُمید ہے اہلِ علم اور دینی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اِسے مفید پائیں گے۔

سوال:

ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب نے 7 اگست 2015ء کے کالم ''آپ کے مسائل اور اُن کا حل'' میں لکھا ہے: ''کسی شخص کی وفات پر ایصالِ ثواب کے لیے جو اجتماعی قرآن خوانی کی جاتی ہے، وہ تو بہت سے مفاسد کی بنا پر ناجائز ہے، البتہ دکان وغیرہ کے افتتاح اور نئے گھر میں منتقلی کے لیے جو قرآن خوانی کی جاتی ہے، وہ جائز ہے، مگر اس میں بھی شرط ہے کہ اسے ضروری نہ سمجھا جائے اور رسم کی پابندی مقصود نہ ہو، بلکہ حصولِ برکت اور نعمتِ خداوندی کے شکریے میں کی جائے، (ہندیہ، کتاب الکراہیۃ، باب الرابع، ۵/۱۷/۳۱، کفایت المفتی، کتاب الحظر والاباحت ۱۰۹/۹)۔ آپ سے درخواست ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے کالم کے ذریعے مطلع فرمائیں تاکہ لوگوں کے ذہن میں بہت بڑا ایشو کھڑا ہو گیا ہے، دور ہو''۔

(محمد جاوید، راولپنڈی)

جواب:

''ایصالِ ثواب'' کے معنی، کسی شخص کا اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو، یہ شرعاً جائز ہے بلکہ مستحسن امر ہے۔ اَموات واَحیاء یعنی زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں یا ابھی اس دنیا میں نہیں آئے، اُن سب کے لیے دعائے مغفرت اور دعائے برکات وسعادات انبیائے کرام علیہم السلام اور صالحین کی سنّت ہے۔ ایصالِ ثواب کا ایک طریقہ دعائے مغفرت ہے اور اس میں بھی کسی کے غیاب (عدم موجودگی) میں دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے، حدیثِ پاک میں ہے:

اِنَّ اَسْرَعَ الدُّعَاءِ اِجَابَةً دَعْوَةُ غَائِبٍ لِغَائِبٍ

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) سب سے جلد قبولیت پانے والی دعا وہ ہے جو کوئی شخص کسی شخص کے پیٹھ پیچھے اس کے لیے کرے، (سنن ابی داؤد: 1535)۔ کیونکہ یہ سراسر اخلاص پر مبنی ہوتی ہے، سامنے کی دعا میں ریاکاری کا بھی شائبہ ہوسکتا ہے، جبکہ غائبانہ دعا میں اس کا امکان نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: پانچ قسم کی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں: مظلوم کی دعا جب تک کہ وہ اپنا حق وصول کرلے، گھر پہنچنے سے پہلے تک حاجی کی دعا، مجاہد کی دعا جب تک کہ وہ جہاد میں مشغول ہے، بیمار کی دعا صحت یاب ہونے تک، کسی کے پیٹھ پیچھے اس کے لیے دعائے خیر اور سب سے زیادہ جلد مقبول ہونے والی غائبانہ دعا ہے، (مشکوٰۃ المصابیح :2260، سنن بیہقی کے مخطوطے میں اس کی روایت بالمعنیٰ موجود ہے)۔ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے دعا ان آیاتِ مبارکہ سے ثابت ہے:

(۱) قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ: ''(ابراہیم نے) کہا: اور میری اولاد کو بھی! (امامت عطا ہو) اللہ نے فرمایا: میرا عہد (یعنی امامت کا منصب) ظالموں کو نہیں پہنچتا''۔ (بقرہ:124)

(۲) قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

ترجمہ: کہا: اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اُس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی اور میں ایسے نیک کام کروں جن سے تو راضی ہو اور تو میری اولاد میں بھی نیکی رکھ دے، بے شک میں نے تیری طرف رجوع کیا اور بے شک میں اطاعت گزاروں میں سے ہوں''۔ (احقاف:15)

(۳) رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما''۔ (فرقان:74)

(۴) قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝

ترجمہ: ''حضرت موسیٰ نے التجا کی: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی (ہارون) کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے''۔ (الاعراف:151)

(۵) رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝

ترجمہ: ''(حضرت ابراہیم نے دعا کی) اے ہمارے رب! حساب (یعنی قیامت) کے دن میری، میرے والدین اور تمام اہل ایمان کی بخشش فرمانا''۔ (ابراہیم:41)

(۶) رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔

ترجمہ: ''اے ہمارے رب: ہماری مغفرت فرما اور ہمارے اُن مومن بھائیوں کی (بھی مغفرت فرما) جو ہم سے پہلے وفات پا چکے''۔ (الحشر:10)''۔ اور اس کے ایک معنی ہیں: ''جو ایمان لانے میں ہم سے سبقت لے گئے''۔

(۷) رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۖ

ترجمہ: ''(حضرت نوح نے دعا کی) اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) ایمان والے مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما''۔ (نوح:28)

پس اہلِ ایمان کا ایک شعار اہلِ ایمان کے لیے دعائے مغفرت ہے، رسول اللہ ﷺ جب قبرستان جاتے تو یہ دعا فرماتے: ''اَلسَّلَامُ عَلٰی اَھْلِ الدِّیَارِ، وَفِیْ رِوَایَۃِ زُھَیْرٍ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ لَلَاحِقُوْنَ اَسْاَلُ اللّٰہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ۔

ترجمہ: ''السلام علیکم! اے بستی والو! زہیر کی روایت میں ہے کہ (اس طرح کہے:) السلام علیکم! اے مومنین اور مسلمین کی بستی والو! ان شاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں، میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لیے معافی کا سوال کرتا ہوں''۔ (صحیح مسلم:2254)

سو دعا سے دوسروں کو فیض پہنچتا ہے اگر خدانخواستہ یہ دوسروں کے لیے فائدہ مند نہ ہوتی تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ شعار انبیاء کرام اور صفتِ حمیدہ کے طور پر اس کا ذکر نہ فرماتا۔

ایصالِ ثواب کی دوسری صورت اعمالِ صالحہ یعنی بدنی عبادات اور مالی صدقات کا ثواب دوسروں کو پہنچانا ہے۔اس کی تعلیمات احادیث مبارکہ میں موجود ہیں:

(۱) اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ ضَحّٰی بِکَبْشٍ أَقْرَنَ وَقَالَ: هٰذَا عَنِّیْ وَعَمَّنْ لَّمْ یُضَحِّ مِنْ أُمَّتِیْ۔

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے ایک سینگوں والے مینڈھے کی قربانی کی اور فرمایا: یہ میری طرف سے اور میری امت میں سے ہر اس شخص کی طرف سے ہے، جس نے (استطاعت نہ ہونے کی بنا پر) قربانی نہیں کی''۔(مسند احمد:11066)

(۲) عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ، أَنَّهٗ قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللهِ: اِنَّ أُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ، فَأَیُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟، قَالَ: اَلْمَاءُ، قَالَ: فَحَفَرَ بِئْرًا وَّقَالَ: هٰذِهٖ لِأُمِّ سَعْدٍ۔

ترجمہ:''حضرت سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ! امّ سعد (یعنی میری والدہ) وفات پا گئی ہیں تو (ان کے ایصالِ ثواب کے لیے) کون سا صدقہ افضل ہے؟، آپ نے ارشاد فرمایا: ''پانی''، چنانچہ انہوں نے کنواں کھدوا کر (وقف کردیا) اور کہا: یہ ''اُمِّ سعد'' کا کنواں ہے (یعنی ان کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے)''۔(سنن ابی داؤد:1678)

(۳) عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا: أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِیِّ ﷺ: اِنَّ أُمِّیْ اُفْتُلِتَتْ نَفْسُهَا، وَأَظُنُّهَا لَوْ تَکَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ، فَهَلْ لَهَا أَجْرٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟، قَالَ: نَعَمْ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ: ''ایک شخص نے نبی ﷺ کی خدمت میں عرض کی: میری والدہ کا اچانک انتقال ہوگیا ہے، میں گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ (موت سے پہلے) بات کر پاتیں تو صدقہ کرنے کا حکم دیتیں۔سو اب اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا اس کا انہیں اجر ملے گا؟، نبی رحمت ﷺ نے فرمایا: ہاں! (اس کا

اجراُسے ملے گا''۔(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1388،الفاظ متقاربہ کے ساتھ:2760)

(۴)عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى قَبْرَيْنِ، فَقَالَ: إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ مِنْ كَبِيرٍ، ثُمَّ قَالَ: بَلَى، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ يَسْعَى بِالنَّمِيمَةِ، وَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ، قَالَ: ثُمَّ أَخَذَ عُودًا رَطْبًا، فَكَسَرَهُ بِاثْنَتَيْنِ، ثُمَّ غَرَزَ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَلَى قَبْرٍ، ثُمَّ قَالَ: لَعَلَّهُ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ کا دوقبروں پر گزرہوا،(جن کوعذاب دیا جارہا تھا)،آپ ﷺ نے فرمایا:بے شک ان کوعذاب دیا جا رہاہےاوران کوکسی بڑی چیز کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جارہا،پھرفرمایا:ہاں!ان دونوں میں سے ایک چغلی کھاتا تھااوردوسرا پیشاب کے قطروں سے نہیں بچتا تھا،راوی بیان کرتے ہیں: پھرآپ ﷺ نے کھجور کے درخت کی ایک تر شاخ لی،اُس کے دوٹکڑے کیے، پھر ہرایک کی قبر پرایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا۔پھرآپ ﷺ نے فرمایا:امید ہے کہ جب تک یہ شاخیں خشک نہیں ہوں گی، ان کے عذاب میں تخفیف ہوتی رہے گی۔(صحیح بخاری: 1378)''۔اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی احوالِ قبر سے نبی ﷺ کومُطلع فرمایا۔

(۵)عَنْ أَبِي ذَرٍّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ:''يُصْبِحُ عَلَى كُلِّ سُلَامَى مِنْ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ، فَكُلُّ تَسْبِيحَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَحْمِيدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَهْلِيلَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَكْبِيرَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَيُجْزِءُ مِنْ ذٰلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحَى۔

ترجمہ:حضرت ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب کوئی صبح اٹھتا ہےتو اس کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہوتا ہے،اس کا ہر بار''سبحان اللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''الحمد للہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''لا الٰہ الا اللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''اللہ اکبر'' کہنا صدقہ ہے،کسی شخص کونیکی کا حکم دینا صدقہ ہے،کسی کو برائی سے روک دینا صدقہ ہے اور چاشت کی دورکعت نماز پڑھ لینا ان سب کے لیے

کفایت کرتا ہے''۔(صحیح مسلم:1668)

(۶)عَنْ أَبِي ذَرٍّ أَنَّ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ قَالُوْا لِلنَّبِيِّ ﷺ: يَا رَسُوْلَ اللهِ، ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالْأُجُوْرِ: يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّيْ، وَيَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ، وَيَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ أَمْوَالِهِمْ۔ قَالَ: أَوَ لَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللهُ لَكُمْ مَا تَصَدَّقُوْنَ؟ إِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَفِيْ بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ، أَيَأْتِيْ أَحَدُنَا شَهْوَتَهُ وَيَكُوْنُ لَهُ فِيْهَا أَجْرٌ؟، قَالَ: ''أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِيْ حَرَامٍ أَكَانَ عَلَيْهِ فِيْهَا وِزْرٌ؟ فَكَذٰلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهُ أَجْرٌ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے بعض صحابہ نے آپ سے کہا: یارسول اللہ ﷺ! مالدار لوگ تو (ڈھیروں) ثواب کما گئے، وہ ہماری طرح (فرض اور نفل) نمازیں پڑھتے ہیں، ہماری طرح روزے رکھتے ہیں اور اپنے زائد مال سے (اللہ کی راہ میں) صدقہ دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بھی صدقات کے اسباب نہیں بنائے؟ ہر بار''سبحان اللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''اللہ اکبر'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''الحمدللہ'' کہنا صدقہ ہے، ہر بار''لا الٰہ الا اللہ'' کہنا صدقہ ہے۔ اور نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے اور برائی سے روکنا صدقہ ہے، (جائز طریقے سے) ازدواجی عمل صدقہ ہے۔ صحابۂ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنی نفسانی خواہش پوری کرتا ہے، کیا اس میں بھی اس کے لیے اجر ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ذرا سوچو! اگر کوئی شخص حرام طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرے، تو کیا اس پر گناہ نہیں ہوگا؟، پس اسی طرح اگر وہ جائز طریقے سے اپنی خواہش پوری کرتا ہے تو اسے اجر ملے گا''۔(صحیح مسلم:2326)

(۷)عَنْ عَائِشَةَ تَقُوْلُ: إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: ''إِنَّهُ خُلِقَ كُلُّ إِنْسَانٍ مِنْ بَنِيْ آدَمَ عَلٰى سِتِّيْنَ وَثَلَاثِمِائَةِ مَفْصِلٍ: فَمَنْ كَبَّرَ اللهَ، وَحَمِدَ اللهَ، وَهَلَّلَ اللهَ، وَسَبَّحَ اللهَ،

وَاسْتَغْفَرَ اللہَ، وَعَزَلَ حَجَرًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ، أَوْ شَوْكَةً أَوْ عَظْمًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ وَأَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ، أَوْ نَهٰى عَنْ مُنْكَرٍ، عَدَدَ تِلْكَ السِّتِّيْنَ وَالثَّلَاثِمِائَةِ السُّلَامٰى فَإِنَّهٗ يَمْشِيْ يَوْمَئِذٍ وَقَدْ زَحْزَحَ نَفْسَهٗ عَنِ النَّارِ''۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر انسان 360 جوڑوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، پس جس شخص نے ''اَللہُ اَکْبَرُ'' کہا، ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہا، ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ'' کہا، ''سُبْحَانَ اللہِ'' کہا، ''اَسْتَغْفِرُ اللہَ'' کہا، لوگوں کے راستے سے کوئی پتھر یا کانٹا یا ہڈی ہٹائی اور نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا (اس نے یہ کام مجموعی طور پر) 360 جوڑوں کی تعداد کے برابر کیے، تو اُس دن وہ اس حال میں چل رہا ہوگا کہ اس نے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے آزاد کرلیا ہے''۔ (صحیح مسلم: 2327)

ان احادیث مبارکہ میں سُبْحَانَ اللہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَللہُ اَکْبَرُ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے کلمات کہنے کو صدقہ یعنی نیکی سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی طرح امر بالمعروف، نہی عن المنکر، راستے سے کسی کے لیے باعثِ تکلیف بننے والے پتھر یا کانٹے یا ناپاکی کو ہٹانے، استغفار کرنے اور رشتۂ نکاح کے بعد ازدواجی تعلق کو بھی نیکی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ایصالِ ثواب کا ذریعہ دعائے مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل وعمرہ، تلاوت، اذکار، درود پاک وغیرہ، اسی طرح کھانے کا وہ اہتمام ہے، جس کا اَعراس کے مواقع پر اہتمام کیا جاتا ہے۔ مالی صدقات میں صدقۂ جاریہ کو ترجیح دینا افضل ہے۔ قرآن وسنت کی رو سے انسان کو اپنی آخرت کے لیے اعمالِ خیر کا ذخیرہ کرنا چاہیے۔

(۱) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۞

ترجمہ:''ہر شخص ان اعمال کو جان لے گا جو اس نے (آخرت کے لیے آگے بھیجے) اور ان کو بھی جو وہ پیچھے چھوڑ آیا (یعنی ان کے نیک وبد ثمرات بعد میں مرتب ہوتے رہیں گے)''۔

(الانفطار: 5)

(۲) وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ

ترجمہ:''اور ہر شخص غور کرتا رہے کہ اس نے کل (قیامت کے لیے) کیا بھیجا ہے''۔

(حشر:18)

(۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ

ترجمہ:''اے ایمان والو! ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی نہ (کافروں کی) کسی سے دوستی ہوگی اور نہ (کفار کے لیے) شفاعت ہوگی''۔(بقرہ:254)

(۴) وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

ترجمہ:''اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے کچھ (ہماری راہ میں) خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے، پھر وہ کہے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ اور دنوں کی مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں صدقہ کرتا اور نیکوں میں سے ہو جاتا''۔(منافقون:10)

رسول اللہ ﷺ نے انفاق فی الخیر میں صدقاتِ جاریہ کو ترجیح دی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْا لَهٗ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں لیکن تین عمل منقطع نہیں ہوتے، صدقۂ جاریہ، علم نافع اور نیک اولاد جو اُس کے لیے دعا کرتی ہے''۔

(سنن ابوداؤد:2877)

صدقۂ جاریہ سے مراد ایسا عملِ خیر ہے کہ جس کے اجر وفیضان کا سلسلہ متصدِّق کی موت کے

ساتھ منقطع نہ ہوجائے بلکہ اس کا فیضان تادیر جاری وساری رہے، بقول شاعر:

خیر گر چاہے، پھر فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

جیسے کسی نے مسجد بنائی یا تعمیر میں حصہ لیا یا مدرسہ بنایا یا انسانی فلاح کا کوئی کام کیا، تو جب تک وہ مسجد، مدرسہ یا کنواں وغیرہ باقی ہیں، ان کے بانی یا ان میں حصہ لینے والوں کو ثواب ملتا رہے گا۔ اسی طرح کسی دینی طالب علم، زیرِ تعلیم حافظ یا عالم کی کفالت اپنے ذمے لی تو حافظ قرآن یا عالم ومبلغ اور مُدرّس بن کر وہ دین کی خدمت کرتا رہے گا، اس شخص کو ثواب ملتا رہے گا اور اگر اس کے شاگردوں کے ذریعے دین کا کام جاری رہا تو اس کا ثواب بھی اسے ملتا رہے گا۔ اب رہا اجتماعی طور پر قرآن خوانی کا معاملہ، تو یہ شرعاً جائز ہے۔

اس حوالے سے صحیح مسلم میں باب کا عنوان ہے: بَابُ فَضْلُ الِاجْتِمَاعِ عَلٰی تِلَاوَۃِ الْقُرْآنِ وَعَلَی الذِّکْرِ (قرآن کی تلاوت اور ذکر کے لیے اجتماع کی فضیلت) اس عنوان کے تحت ایک قدرے طویل حدیث نمبر 6793 درج ہے، اس کے آخر میں لکھا ہے:

وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِی بَیْتٍ مِنْ بُیُوتِ اللّٰہِ، یَتْلُونَ کِتَابَ اللّٰہِ وَیَتَدَارَسُونَہُ بَیْنَھُمْ، اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ، وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ وحَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ، وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیمَنْ عِنْدَہُ، وَمَنْ اَبْطَأَبِہٖ عَمَلُہُ، لَمْ یُسْرِعْ بِہٖ نَسَبُہُ۔

ترجمہ: ''جب بھی کچھ لوگ اللہ کے کسی گھر (یعنی مسجد) میں جمع ہوکر کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتے اور دیتے ہیں، تو (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) اُن پر تسکین نازل ہوتی ہے اور رحمتِ باری تعالیٰ اُنہیں ڈھانپ لیتی ہے اور ملائکہ اُنہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مُقرّبین کی مجلس میں اُن کا ذکر فرماتا ہے اور جس کا عمل اُسے (خیر کو پانے کا) اہل نہ بنا سکے تو (محض) نسب (کا شرف) اُسے سرخرو نہیں کرسکتا''۔

اس کی شرح میں علامہ نووی لکھتے ہیں: ''یہ حدیث مسجد میں جمع ہوکر قرآن کی تلاوت

کرنے کی فضیلت پر دلیل ہے اور یہ ہمارا اور جمہور فقہاء امت کا مذہب ہے، اس کے بعد والی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ فضیلت مسجد تک محدود نہیں ہے، بلکہ مدرسہ، رباط اور تمام مقامات کے لیے عام ہے، مسجد کا ذکر کثرتِ وقوع کے طور پر ہے (کیونکہ بالعموم ایسے اجتماعات مساجد میں ہوتے ہیں)''۔

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ گواہی دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لَایَقْعُدُ قَوْمٌ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ اِلَّاحَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ، وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ، وَنَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ، وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ۔

ترجمہ: ''جو قوم بھی اللہ عزوجل کے ذکر کے لیے بیٹھتی ہے، اس کو فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان کو رحمت ڈھانپ لیتی ہے اور ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا اپنے فرشتوں میں ذکر کرتا ہے''۔ (صحیح مسلم:6795)

ایصالِ ثواب، حصولِ ثواب اور خیر و برکت کے لیے اجتماعی طور پر قرآن خوانی کرنا شرعاً درست ہے۔ کارِ خیر کے لیے لوگوں کو دعوت دینا باعثِ سعادت اور موجب خیر و برکت ہے۔ اجتماعی قرآن خوانی کے شرکاء اگر آہستہ آواز سے کہ پاس بیٹھے شخص تک اُن کی آواز نہ جائے، تلاوتِ قرآن کر رہے ہوں تو اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نہیں ہے کہ جہری تلاوت پر استماع و انصات (سننا اور خاموش رہنا) لازم آتا ہے۔ جب قرآن مجید پڑھا جائے، تو خاموش رہنا اور توجہ سے سننا واجب ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝

ترجمہ: ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔ (الاعراف:204)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

یُکْرَہُ لِلْقَوْمِ أَنْ یَقْرَؤُا الْقُرْآنَ جُمْلَۃً لِتَضَمُّنِھَا تَرْکَ الِاسْتِمَاعِ وَالْاِنْصَاتِ الْمَامُوْرِ بِھِمَا

کَذَافِی الیَنَابِیعِ۔

ترجمہ: ''لوگوں کا اجتماعی طور پر (بلند آواز سے) قرآن پڑھنا مکروہ ہے، اس سے توجہ کے ساتھ سننے اور خاموش رہنے کے امر کا ترک لازم آتا ہے، ''ینابیع'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 317)

ڈاکٹر صاحب نے اپنے موقف کے حق میں فتاویٰ عالمگیری کی مذکورہ بالا عبارت کا حوالہ دیا ہے اور ہم بھی اس کی تائید کرتے ہیں، لیکن اس کی رُو سے جو اُنہوں نے مطلقاً اجتماعی قرآن خوانی کو بدعت قرار دیا ہے، یہ تحریفِ معنوی ہے۔ علامہ نظام الدین کراہت کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ سورۃ الاعراف: 204 میں قراءت سننے والے پر استماع (توجہ سے سننے) اور اِنصات (خاموش رہنے) کو لازم قرار دیا ہے اور یہ (یعنی ایک سے زائد افراد کا بلند آواز سے تلاوت کرنا) اس میں مانع ہے۔ لیکن یہ تو اُس صورت میں ہوگا کہ عام اجتماع میں چند افراد یا سب افراد بلند آواز سے تلاوت کر رہے ہوں، اس صورت کو ہم بھی منع کرتے ہیں۔ لیکن اگر سب خاموشی سے تلاوت کر رہے ہوں اور ہر تلاوت کرنے والے کی آواز دوسرے فرد تک نہ پہنچے تو پھر استماع و انصات کا واجب کیسے ترک ہوجائے گا؟۔

علامہ ابن عابدین شامی ''یَجِبُ الِاسْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَۃِ مُطْلَقًا'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

(یَجِبُ الِاسْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَۃِ مُطْلَقًا) اَیْ فِی الصَّلَاۃِ وَخَارِجِھَا، لِاَنَّ الْاٰیَۃَ وَاِنْ کَانَتْ وَارِدَۃً فِی الصَّلَاۃِ عَلٰی مَامَرَّ، فَالْعِبْرَۃُ لِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا لِخُصُوْصِ السَّبَبِ، ثُمَّ ھٰذَا حَیْثُ لَاعُذْرَ، وَکَذَا فِی ''الْقُنْیَۃ'': صَبِیٌّ یَقْرَأُ فِی الْبَیْتِ وَاَھْلُہٗ مَشْغُوْلُوْنَ بِالْعَمَلِ یَعْذِرُوْنَ فِیْ تَرْکِ الْاِسْتِمَاعِ، اِنِ افْتَتَحُوا الْعَمَلَ قَبْلَ الْقِرَاءَۃِ وَاِلَّا فَلَا، وَکَذَا قِرَاءَۃُ الْفِقْہِ عِنْدَ قِرَاءَۃِ الْقُرْآنِ، وَفِی ''الْفَتْحِ'' عَنِ ''الخلاصۃ'': رَجُلٌ یَکْتُبُ الْفِقْہَ وَبِجَنْبِہٖ رَجُلٌ یَقْرَأُ الْقُرْآنَ فَلَا یُمْکِنُہٗ اِسْتِمَاعُ الْقُرْآنِ فَالْاِثْمُ عَلَی الْقَارِی، وَعَلٰی ھٰذَا لَوْقَرَأَ عَلَی السَّطْحِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ یَأْثَمُ: اَیْ لِاَنَّہٗ سَبَبٌ لِاِعْرَاضِھِم عَنِ اسْتِمَاعِہٖ اَوْ لِاَنَّہٗ یُؤْذِیْھِمْ بِاِیْقَاظِھِمْ، تَاَمَّلْ۔

ترجمہ:''(قرآن مجید کا سننا مطلقاً واجب ہے) یعنی نماز اور خارجِ نماز دونوں حالتوں میں (قرآن سننا واجب ہے)، یہ آیت اگرچہ نماز کے متعلق وارد ہوئی ہے، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا ہے، لیکن اعتبار خصوصیت سبب کا نہیں، عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے۔ اور یہ حکم اُس وقت ہے جب کوئی عذر نہ ہو جیسا کہ ''قنیہ'' میں مذکور ہے:'' گھر میں بچہ قرآن مجید پڑھ رہا ہو اور گھر والے کام کاج میں مصروف ہوں تو وہ نہ سننے میں معذور ہیں، بشرطیکہ انہوں نے اُس کے پڑھنے سے پہلے کام شروع کیا ہو، ورنہ وہ معذور نہیں ہوں گے۔ اور اسی طرح فقہ (کی کتاب) پڑھنے والے کے پاس قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کا حکم ہے اور ''فتح القدیر'' میں ''خلاصۃ الفتاویٰ'' کے حوالے سے منقول ہے: ایک شخص فقہی مسائل لکھ رہا ہے اور اس کے پاس کوئی شخص (بلند آواز سے) قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے اور اس کے لیے (اپنی علمی مصروفیت کی وجہ سے) توجہ کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کا سننا عملاً دشوار ہے، تو اس کا گناہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے پر ہوگا۔ اسی طرح اگر لوگ سوئے ہوئے ہیں اور ایک شخص چھت پر بیٹھ کر (بلند آواز سے) تلاوت کرتا ہے، تو (لوگوں کے نہ سننے کا) گناہ تلاوت کرنے والے پر ہوگا، کیونکہ لوگوں کے تلاوتِ قرآن کی طرف توجہ نہ کرنے کا سبب وہی شخص بن رہا ہے یا اس لیے کہ وہ انہیں جگا کر اذیت دے رہا ہے، اس مسئلے میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

اِنَّهٗ يَجِبُ عَلَى الْقَارِی اِحْتِرَامُهٗ بِاَنْ لَّا يَقْرَأَهٗ فِی الْاَسْوَاقِ وَمَوَاضِعِ الْاِشْتِغَالِ، فَاِذَا قَرَأَهٗ فِيْهَا كَانَ هُوَ الْمُضَيِّعُ لِحُرْمَتِهٖ، فَيَكُوْنُ الْاِثْمُ عَلَيْهِ دُوْنَ اَهْلِ الْاِشْتِغَالِ دَفْعًا لِلْحَرَجِ۔

ترجمہ:''قرآن کریم پڑھنے والے پر اس کا احترام واجب ہے، وہ اس طرح کہ وہ بازاروں میں (بلند آواز سے) قرآن مجید نہ پڑھے اور اُن مقامات پر بھی قرآن کریم نہ پڑھے جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں، کیونکہ جب کوئی شخص اُن مقامات پر قرآن کی (بلند آواز سے) تلاوت کرے گا، تو قرآن مجید کے احترام کو ضائع کرنے والا

وہی بنے گا اور گناہ اسی پر ہوگا نہ کہ اپنے کام کاج میں مصروف لوگوں پر، لوگوں سے حرج کو دور کرنے کے لیے (یہ مسئلے کی بہتر توجیہہ ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص:237،238)

قرآن بھی ذکر ہے اور مجالس ذکر کی فضیلت کے بارے میں یہ حدیث پاک بھی ہے:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ لِلّٰہِ مَلَائِکَةً یَطُوفُونَ فِی الطُّرُقِ یَلْتَمِسُونَ أَھْلَ الذِّکْرِ فَاِذَا وَجَدُوْا قَوْمًا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ تَنَادَوْا ھَلُمُّوا اِلَی حَاجَتِکُمْ، قَالَ: فَیَحُفُّونَھُم بِأَجْنِحَتِھِم اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا، قَالَ: فَیَسْأَلُھُم رَبُّھُمْ وَھُوَأَعلَمُ مِنھُمْ مَایَقُولُ عِبَادِیْ؟، قَالُوا: یَقُولُونَ: یُسَبِّحُونَکَ وَیُکَبِّرُونَکَ وَیَحمَدُونَکَ وَیُمَجِّدُونَکَ،

ترجمہ: ''اللہ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو راستوں میں گھومتے رہتے ہیں اور ذکر کرنے والوں کو ڈھونڈتے ہیں، پس جب وہ کسی جماعت کو ذکرِ الٰہی میں مشغول پاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں: آؤ اپنی حاجت کی طرف، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر فرشتے اپنے پروں سے آسمانِ دنیا تک اُن لوگوں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اُن کا رب اُن سے سوال کرتا ہے حالانکہ وہ اُن سے زیادہ اُن کے حال کو جاننے والا ہے، میرے بندے کیا کہتے تھے؟، فرشتے عرض کرتے ہیں: وہ تیری پاکی بیان کر رہے تھے اور تیری کبریائی کا اقرار کر رہے تھے، تیری حمد بیان کر رہے تھے اور تیری بزرگی بیان کر رہے تھے، (یعنی وہ سبحان اللہ، اللہ اکبر، الحمدللہ، جلّ جلالہٗ پڑھ رہے تھے)''۔ طویل حدیث کے آخر میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَیَقُولُ: فَأُشھِدُکُم أَنِّی قَد غَفَرتُ لَھُم، قَالَ: یَقُولُ: مَلَکٌ مِنَ الْمَلَائِکَةِ فِیھِم فُلَانٌ لَیسَ مِنھُم اِنَّمَا جَاءَ لِحَاجَةٍ، قَالَ: ھُمُ الْجُلَسَاءُ لَایَشْقٰی بِھِمْ جَلِیسُھُمْ۔

ترجمہ: ''پھر اللہ تعالیٰ (ملائکہ کو) ارشاد فرماتا ہے: میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اُنہیں بخش دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اُن میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے: اِن میں ایک شخص

ایسا بھی تھا جو اپنے کسی کام سے گزر رہا تھا کہ اُن کو دیکھ کر اُن کے ساتھ بیٹھ گیا (یعنی وہ مجلس ذکر میں شمولیت کے ارادے سے نہیں آیا تھا)، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: یہ (ایسی پاکیزہ) مجلس والے ہیں کہ اُن کا ہم نشین بھی بدنصیب نہیں رہتا''۔ (صحیح بخاری:6408)

(۲) عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلٰی سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ حِیْنَ تُوُفِّیَ، فَلَمَّا صَلّٰی عَلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَوُضِعَ فِیْ قَبْرِهٖ سُوِّیَ عَلَیْهِ، سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ، فَسَبَّحْنَا طَوِیْلًا، ثُمَّ کَبَّرَ فَکَبَّرْنَا، فَقِیْلَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ کَبَّرْتَ؟، قَالَ: لَقَدْ تَضَایَقَ عَلٰی هٰذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهٗ، حَتّٰی فَرَّجَهُ اللّٰهُ عَنْهُ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن، ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گئے، رسول اللہ ﷺ نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور جب اُن کی تدفین ہو چکی تو رسول اللہ ﷺ نے سبحان اللہ کہا، پس ہم سب نے بھی دیر تک سبحان اللہ کہا، پھر آپ نے اللہ اکبر کہا، ہم نے بھی اللہ اکبر کہا۔ پھر آپ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! آپ نے (ان کی قبر پر) تسبیح وتکبیر کیوں پڑھی؟، آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اس نیک بندے پر اس کی قبر تنگ ہو رہی تھی، یہاں تک کہ (ہماری تسبیحات کی برکت سے) اللہ تعالیٰ نے اُس کی قبر کو کشادہ کر دیا''۔ (مسند امام احمد:14885، جلد:3)

(۳) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ بِمَجْلِسَیْنِ فِیْ مَسْجِدِهٖ فَقَالَ: کِلَاهُمَا عَلَی الْخَیْرِ، وَأَحَدُهُمَا أَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهٖ، أَمَّا هٰؤُلَاءِ فَیَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَیَرْغَبُوْنَ اِلَیْهِ، فَاِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ وَاِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ، وَأَمَّا هٰؤُلَآءِ فَیَتَعَلَّمُوْنَ الْفِقْهَ أَوِ الْعِلْمَ وَیُعَلِّمُوْنَ الْجَاهِلَ، فَهُمْ أَفْضَلُ، وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا، ثُمَّ جَلَسَ فِیْهِمْ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا گزر مسجدِ نبوی میں دو مجلسوں پر ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دونوں بھلائی پر ہیں، مگر ایک مجلس دوسری سے بہتر ہے، (مجلسِ ذاکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:) یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے دعا والتجا کر رہے ہیں (یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے) اگر چاہے، تو ان کی حاجت پوری فرما دے اور

چاہے تو اُنہیں محروم رکھے۔ اور (دوسری مجلس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:) یہ لوگ فقہ اور علم سیکھ رہے ہیں اور نہ جاننے والوں کو بھی سکھا رہے ہیں، پس (دونوں میں سے) یہ افضل ہیں اور مجھے معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے، پھر آپ ﷺ اُسی مجلس (تعلیم و تعلّم) میں تشریف فرما ہوئے''۔ (سنن دارمی:353)

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجلسِ ذکر کو بھی خیر سے تعبیر فرمایا اور مجلسِ تعلیم و تعلّم کو افضل قرار دے کر اُن کے ساتھ بیٹھ گئے اور ترجیح کا سبب بھی بتادیا۔

سیرۃ النبی ﷺ کے اجتماعات، تبلیغی اجتماعات، دروسِ قرآن و ختمِ قرآن، افتتاحِ بخاری اور ختمِ بخاری کے اجتماعات تمام مکاتبِ فکر کے لوگ باقاعدہ دعوت دے کر منعقد کرتے ہیں، ان کے لیے اشتہارات چھاپے جاتے ہیں اور اخبارات میں اعلانات شائع ہوتے ہیں، آج کل بعض لوگ ان اجتماعات کی تشہیر کے لیے ایس ایم ایس یا ٹیکسٹ میسیج کا میڈیم بھی استعمال کرتے ہیں اور آج تک ان سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ پس میلاد النبی ﷺ اور اعراس و ایصالِ ثواب کے لیے ختمِ قرآن مجید کی مجالس و تقریبات اسی قبیل سے ہیں اور جائز ہیں۔ ان امورِ خیر کے لیے دن، مقام اور وقت کا تعین سہولت کی غرض سے ہوتا ہے، یہ تعیین عُرفی ہے، شرعی نہیں ہے۔ شرعی تعیین سے مراد یہ ہے کہ کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ کسی خاص وقت یا مقام یا دن اور تاریخ کو یہ کام کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے اور اس سے قبل یا بعد یا دوسرے وقت اور مقام پر ایسا کرنا اجر کا سبب نہیں ہے۔ یہ تعینِ شرعی ہے اور ایسی تعیین صرف شارع علیہ السلام کا اختیار ہے جیسے وقوفِ عرفہ کے لیے 9/ذوالحجہ، ایامِ نحر یا ایامِ عید وغیرہ، سہولت کے لیے دینی اجتماعات منعقد ہوسکتے ہیں خواہ یہ مجالس تبلیغ کے لیے ہوں یا ایصالِ ثواب کے لیے۔

حدیثِ مبارک میں ہے:

(۱) كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْأَيَّامِ كَرَاهَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا

ترجمہ: ''نبی ﷺ وعظ و نصیحت (کے ایام یا اوقات مقرر کرنے) میں ہمارا خیال رکھا

کرتے تھے تاکہ ہمارے لیے تنگی نہ ہو''۔(صحیح بخاری:68)

یعنی آپ ﷺ صحابۂ کرام کی آسانی کا خیال رکھا کرتے تھے اور آج کل بھی مجالس خیر کے لیے دن تاریخ اور وقت کا تعین لوگوں کی آسانی کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ پہلے سے لوگوں کے علم میں ہو اور وہ اپنے معمولات میں اس کے لیے گنجائش نکال سکیں۔

(۲) عَنْ أَبِي وَائِلٍ قَالَ: كَانَ عَبْدُاللهِ يُذَكِّرُالنَّاسَ فِي كُلِّ خَمِيْسٍ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَاأَبَاعَبْدِ الرَّحْمٰنِ لَوَدِدْتُ أَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ؟،قَالَ: أَمَا اِنَّهُ يَمْنَعُنِي مِن ذٰلِكَ أَنِّيْ أَكْرَهُ أَنْ أُمِلَّكُمْ،وَاِنِّي أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَاكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّامَةِ عَلَيْنَا۔

ترجمہ:''حضرت ابو وائل کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات لوگوں کو وعظ فرمایا کرتے تھے تو ایک شخص نے ان سے عرض کی: اے ابوعبدالرحمٰن! میری خواہش ہے کہ آپ ہمیں روزانہ وعظ فرماتے، انہوں نے جواب دیا: میرے لیے تمہاری اس خواہش کی تعمیل میں یہ امر مانع ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ (روزانہ مجالسِ وعظ منعقد کرکے) تمہارے لیے تنگی اور طبیعت کے اچاٹ ہونے کا سبب بنوں۔ میں وعظ ونصیحت کے معاملے میں تمہاری سہولت کا اسی طرح خیال رکھتا ہوں، جس طرح نبی کریم ﷺ ہمارا خیال رکھا کرتے تھے، تاکہ ہمارے لیے تنگی کا باعث نہ بنے''۔(صحیح بخاری:70)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وعظ ودرس کے لیے دن مقرر کیا جاسکتا ہے تاکہ عوام کو شرکت میں سہولت رہے۔ یہی حکمت قرآن خوانی سمیت مجالس ایصالِ ثواب میں کارفرما ہوتی ہے۔

شیخ ابن تیمیہ دمشقی سے گھر والوں کے قرآن مجید پڑھنے اور تسبیح، تحمید اور تکبیر وتہلیل کا ثواب میت کو پہنچانے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا:''جب گھر والے قرآن مجید پڑھ کر اور تسبیح وتہلیل اور تمام اذکار کرکے اُن کا ثواب میت کو پہنچائیں تو اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے''۔(مجموعۃ الفتاویٰ، جلد 24، ص:180، مطبوعہ: دار الجیل)

شیخ ابن تیمیہ دمشقی سے پوچھا گیا کہ کوئی شخص ستر ہزار مرتبہ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ'' پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچائے تو اس کا ثواب میت کو پہنچے گا اور کیا یہ میت کے لیے دوزخ سے براءت کا ذریعہ ہوگا؟۔ انہوں نے جواب دیا: ''جب کوئی انسان اس طرح ستر ہزار مرتبہ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ'' پڑھ کر یا اس سے کم یا زیادہ پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچائے تو اللہ تعالیٰ میت کو اُس کا نفع اور فائدہ پہنچائے گا''۔

(مجموعۃ الفتاویٰ، جلد 24، ص:180، مطبوعہ: دارالجیل)

نیز شیخ ابن تیمیہ سے سوال کیا گیا: کبار ائمۂ دین اور فقہاء کرام میت کے لیے قرآن پڑھنے اور اس پر اجرت لینے اور مستحقین کے لیے اہلِ میت کا کھانا کھانا جائز ہے یا نہیں؟۔ انہوں نے جواب میں لکھا: ''الحمد للہ رب العالمین! مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنے کا ثواب میت کو پہنچتا ہے، اس سلسلے میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیثِ صحیحہ ہیں، جیسا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میری والدہ انتقال فرما گئیں اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ کلام کرتیں تو صدقہ کا کہتیں۔ کیا میری طرف سے اُن کے لیے صدقہ کرنا اُن کے لیے نفع کا باعث ہوگا؟، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ اِسی طرح ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ میت کی طرف سے حج، قربانی اور غلام آزاد کرنے کا اُس کے لیے استغفار کرنے کا ثواب بھی اسے پہنچتا ہے۔ میت کی طرف سے نفل نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور قرآن مجید پڑھنے کے سلسلے میں علماء کے دو قول ہیں: (۱) امام احمد بن حنبل اور امام ابوحنیفہ وغیرہم اور بعض شوافع کا مذہب یہ ہے کہ ان کا فائدہ میت کو پہنچتا ہے۔ (۲) امام مالک اور امام شافعی کا مشہور مذہب یہ ہے کہ اس کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا۔ رہا تلاوتِ قرآن پر اجرت لینے کا مسئلہ تو اس میں ایک قول یہ ہے کہ دنیاوی مال کے عوض جو تلاوت کی گئی ہے، وہ مقبول نہیں، اس کا ثواب بھی نہیں ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ فقیر اور تنگدست کا تلاوتِ قرآن پر اجرت لینا جائز ہے اور غنی اور خوشحال کا اجرت لینا جائز نہیں ہے اور یہی بات امام احمد کے مذہب کے موافق ہے، کیونکہ اس نے

اجرت اپنی ضرورت کی بنا پر لی اور اُس کے ذریعے وہ اللہ کی اطاعت پر مدد حاصل کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی نیت پر اجر دے گا۔ پس اس نے طیب چیز کو کھایا اور نیک عمل کیا اور جب کوئی شخص مال کو مستحق پر خرچ کرے، تو اس صدقہ کا ثواب اس میت کو مل جائے گا۔ اگر اس کا مقصود اس سے قرآن کے پڑھنے پر اور اس کی تعلیم پر اعانت کرنا ہو تو یہ افضل اور اَحسن ہے کیونکہ مسلمانوں کی جان و مال سے قرآن مجید کے پڑھنے اس کے تعلیم دینے پر معاونت کرنا افضل ترین اعمال میں سے ہے''۔

(مجموعۃ الفتاویٰ، جلد 24، ص:176-175، مطبوعہ: دار الجیل)

ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب نے کفایت المفتی کا حوالہ دیا ہے، اس میں مجالس الابرار کے حوالے سے جو حدیث نقل کی ہے وہ بنیادی طور پر مجالسِ ذکر کے بارے میں ہے، اجتماعی قرآن خوانی کے بارے میں نہیں ہے۔ یہ حدیث مصنف عبدالرزاق میں موجود ہے اور اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کوفہ کی ایک مسجد میں دو حلقے دیکھے، آپ نے ان سے پوچھا تم میں سے کون سے حلقے والے پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ نے دوسرے حلقے والوں سے فرمایا: تم ان لوگوں کے ساتھ مل جاؤ، پس آپ نے ان کی ایک جماعت بنالی، (المصنف:5425)۔ بعض محدثین نے ممانعت کی روایات کو نمازِ جمعہ سے پہلے حلقہ بنانے پر محمول کیا ہے، (صحیح ابن خزیمہ:1816)۔ سنن ابوداؤد میں بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازِ جمعہ سے پہلے حلقہ بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا''۔ (سنن ابوداؤد:1079)

آج بھی علمائے دیوبند میں اجتماعی طور پر سرّی اور جہری ذکر کرانے کی مثالیں موجود ہیں، سرّی ذکر تو متعدد علماء کراتے ہیں اور کربوغہ شریف کے شیخ مفتی سید مختار الدین شاہ سلسلۂ چشتیہ کے مطابق اجتماعی طور پر جہری ذکر بھی کراتے ہیں، جبکہ خیر المدارس ملتان کے شیخ الحدیث مولانا محمد صدیق نے اجتماعی ذکر کی سرّی و جہری دونوں صورتوں کو بدعت لکھا ہے، سو ہر ایک کا اپنا اپنا اجتہاد ہے۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے فضائلِ ذکر میں ذکر

بالجہر کو مستحسن لکھا ہے۔

بعض حضرات نے مسائلِ شرعیہ کی تعبیر وتشریح پر اپنی خودساختہ اجارہ داری قائم کررکھی ہوتی ہے۔ چنانچہ اجتماعی قرآن خوانی کو ناجائز کہہ دیتے ہیں اور اجتماعی ذکر کو جائز بلکہ مستحسن قرار دیتے ہیں، شاعر نے درست کہا ہے:

تمہاری زلف میں پہنچی تو حُسن کہلائی

وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب اپنے اِسی فتوے میں لکھتے ہیں: ''کسی شخص کی وفات پر ایصالِ ثواب کے لیے جو اجتماعی قرآن خوانی کی جاتی ہے، وہ تو بہت سے مفاسد کی بنا پر ناجائز ہے''۔ اِس عبارت سے مُتصل ہی فوراً بعد لکھتے ہیں: ''البتہ دکان وغیرہ کے افتتاح اور نئے گھر میں منتقلی کے لیے جو قرآن خوانی کی جاتی ہے، وہ جائز ہے، مگر اس میں بھی شرط ہے کہ اسے ضروری نہ سمجھا جائے اور رسم کی پابندی مقصود نہ ہو، بلکہ حصولِ برکت اور نعمتِ خداوندی کے شکریے میں کی جائے''۔

(ہندیہ، کتاب الکراہیۃ، باب الرابع، ۳۱۷/۵، کفایت المفتی، کتاب الحظر والاباحت ۱۰۹/۹)

یہ تقسیم موصوف کی اپنی اختراع ہے، منشائے شریعت ہرگز نہیں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ ایک طرف ایصالِ ثواب کے لیے اجتماعی قرآن خوانی کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور دوسری جانب دکان کے افتتاح اور نئے گھر میں منتقلی کے موقع پر کی جانے والی اسی اجتماعی قرآن خوانی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ دلیل کے طور پر جو حوالہ پیش کیا ہے، اُس کے اطلاق میں ایک صورت (یعنی ایصالِ ثواب کے لیے کی جانے والی قرآن خوانی) عدمِ جواز کی اور دوسری صورت (یعنی دکان کے افتتاح اور نئے گھر میں منتقلی) جواز کی بتائی گئی ہے، مقامِ حیرت یہ ہے کہ اس تقسیم پر کوئی دلیل نہیں دی گئی کہ آیا یہ موصوف کی ذہنی اختراع ہے یا اس کی کوئی فقہی اساس ہے، کیونکہ اصولی طور پر تو اجتماعی قرآن خوانی کو ناجائز قرار دیا ہے۔ ہم اس پر گزشتہ سطور میں کلام کرچکے ہیں۔

تاہم یہ ضروری ہے کہ اجتماعی قرآن خوانی میں آداب کو ملحوظ رکھا جائے۔ ہمارے ہاں کی مُروجہ قرآن خوانی میں چند اُمور اصلاح طلب ہیں:

ا۔ ایک یہ کہ جلدی جلدی پارہ یا قرآن مجید ختم کرنے کی غرض سے صحت تلفظ اور صحت ادا کا خیال نہیں رکھا جاتا، یہ درست نہیں ہے، خلافِ ادب ہے اور بعض صورتوں میں گناہ کا سبب بن سکتا ہے۔ بعض اوقات جلدی ختم کرنے کے لیے ایک صفحہ ایک صاحب پڑھتے ہیں اور دوسرا صفحہ دوسرے صاحب، خواہ آیت مکمل ہو یا نہ ہو، معنوی ربط رہے یا نہ رہے، یہ بھی درست نہیں ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ ایک صاحب نے اپنی سہولت اور دلی رغبت سے ایک پارہ یا دو پارے یا جتنا بھی چاہا پڑھ لیا۔ اب تقریب کے منتظمین اصرار کریں گے کہ ایک پارہ اور پڑھ لیجیے۔ اس صورت میں وہ کبیدہ خاطر ہوکر بیٹھ جاتا ہے اور مارے باندھے پڑھتا رہتا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ صرف اس تلاوت پر اجر کامل وتمام ملتا ہے جو پوری دلی رضا اور رغبت سے کی جائے اور طبیعت پر بار بالکل نہ ہو، حدیثِ پاک میں دعا کی عدمِ قبولیت کا ایک سبب استحسار یعنی اکتا کر چھوڑ دینا یا بے دلی سے دعا کرنا، اُس کے لیے فرمایا گیا: اللہ تعالیٰ غافل اور بے توجہ دل کی دعا قبول نہیں فرماتا۔

۳۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ قرآن مجید کو لازماً ایک مجلس میں ختم کیا جائے ورنہ ''ختمِ قرآن'' نہیں کہلائے گا، جتنا بھی دلی رغبت، حضوریٔ قلب اور خوش دلی سے پڑھ لیا جائے، دعا کرکے ایصالِ ثواب کرسکتے ہیں۔ قرآن خوانی کی بعض مجالس میں باقاعدہ فہرست پڑھ کر سنائی جاتی ہے کہ اتنی بار ختمِ قرآن، اتنی بار آیتِ کریمہ یا کلمہ شریف یا اتنی بار درود شریف وغیرہ پڑھا گیا، یہ کہنا ضروری نہیں ہے۔ بس دعا میں اتنا کہنا کافی ہے: یا اللہ! جس جس نے جہاں جہاں ایصالِ ثواب کی نیت سے جس قدر پڑھا ہے اور دیگر صورتوں میں ایصالِ ثواب کا جو بھی اہتمام کیا ہے، اُن سب حسنات وصالحات کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما اور اس کا اجر مرحوم کو عطا فرما، ایک سے زائد افراد بلکہ جمیع مومنین ومومنات کے لیے بھی ایصالِ

ثواب کر سکتے ہیں، بلکہ یہ صورت پسندیدہ ہے۔

۴۔ بعض مقامات پر ایصالِ ثواب کی فاتحہ کے موقع پر انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات، پھل، کپڑے وغیرہ سب چیزیں سامنے رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے، ایسا کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں ریا کا عنصر بھی شامل ہوسکتا ہے۔ سامنے رکھنا شریعت میں اصولی اعتبار سے منع بھی نہیں ہے اور ایسا کرنے پر اصرار بھی درست نہیں ہے۔ ایصالِ ثواب کی اشیاء کو سامنے رکھے بغیر فاتحہ وایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے اور کھانے کے بعد بھی فاتحہ پڑھی جاسکتی ہے، امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''وقتِ فاتحہ کھانا سامنے رکھنے کی ممانعت نہیں، مگر اُسے ضروری جاننا یا یہ سمجھنا کہ بے اس کے فاتحہ نہیں ہوسکتی، یا ثواب کم ملے گا، غلط و باطل خیال ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص:598)

۵۔ اسی طرح بعض اوقات جون تا اگست ملک کے بیش تر حصوں میں گرمی، حبس اور برسات کا موسم ہوتا ہے اور مکھیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ فاتحہ پڑھنے کے لیے انواع واقسام کے کھانے سامنے رکھے ہوتے ہیں اور مکھیاں بھنک رہی ہوتی ہیں۔ جدید دور کے لوگوں کو ایسے مناظر سے کراہیت محسوس ہوتی ہے اور دیندار لوگوں کے بارے میں طبیعت میں ناگواری پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سبب وہ لوگ بن رہے ہوتے ہیں جو شریعت کی نظر میں محض ایک مباح امر کو ضروری سمجھ کر کر رہے ہوتے ہیں۔

۶۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی صاحب فاتحہ کے لیے رکھے گئے ماکولات ومشروبات کو کپڑے یا اخبار سے ڈھانپ دیں تو کوئی دوسرا شخص شاید یہ سمجھتے ہوئے کہ فاتحہ اس کھانے تک نہیں پہنچے گی، اس کپڑے یا اخبار کو اٹھا دیتے ہیں۔

دین میں حکمت کی بڑی اہمیت ہے، دین کی عظیم تر حکمت کے تحت بعض اوقات پسندیدہ کام کو بھی چھوڑا جاسکتا ہے۔ رسول پاک ﷺ نے بھی اسی دینی حکمت کے تحت اپنے بعض پسندیدہ امور کو ترک فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ بنائے قریش پر بنی ہوئی ''کعبۃ اللہ'' کی عمارت کو شہید کردیں اور پھر اس میں ''حطیم'' کو

شامل کر کے بنائے ابراہیم علیہ السلام پر تعمیر کریں، اسلام کو حجاز میں غلبہ حاصل ہو چکا تھا اور آپ کے پاس مالی وسائل بھی تھے۔لیکن آپ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

لَوۡلَا حَدَاثَةُ عَهۡدِ قَومِكِ بِالۡكُفۡرِ لَنَقَضۡتُ الۡبَيۡتَ وَلَجَعَلۡتُهَا عَلٰى اَسَاسِ اِبۡرَاهِيۡمَ فَاِنَّ قُرَيۡشاً حِيۡنَ بَنَتِ الۡبَيۡتَ اِسۡتَقۡصَرَتۡ وَلَجَعَلۡتُ لَهَا خَلۡفًا۔

ترجمہ: ''اگر تمہاری قوم نے نیا نیا کفر نہ چھوڑا ہوتا تو میں بیت اللہ کی عمارت کو منہدم کر دیتا اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر قائم کرتا، کیونکہ جب قریش نے اس کو بنایا تھا تو (وسائل کی کمی کے سبب ایک جانب سے) اس کو چھوٹا کر دیا تھا اور میں اس کی پچھلی جانب بھی ایک دروازہ بناتا''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3227)

متفرقات

کثرتِ استغفار کی برکات اور حکمتیں

سوال:

میں نے کچھ عرصہ قبل ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ انسان اپنے صغیرہ وکبیرہ گناہوں کی اللہ کی بارگاہ میں سچے دل سے معافی مانگتا ہے تو اللہ وہ گناہ معاف کردیتا ہے۔ بار بار ان گناہوں کی معافی مانگنا اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے، کیا اس سے اللہ ناراض ہوجاتا ہے؟

(رمشا عمر خان، کراچی)

جواب:

بے شک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے اور جب بندہ صدقِ دل سے اُس کے حضور توبہ کرے تو وہ معاف فرمادیتا ہے۔ لیکن استغفار کی کثرت رب کی ناراضی کا سبب بنے! ایسا ہرگز نہیں، بلکہ قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ میں توبہ واستغفار کی کثرت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کی کئی حکمتیں احادیثِ مبارکہ سے مستفاد ہوتی ہیں۔ استغفار کی کثرت نعمتوں کی فراوانی کا سبب بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (حضرت نوح نے جب اپنی قوم سے کہا):

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝

ترجمہ: ''تم اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بہت معاف فرمانے والا ہے۔ وہ تم پر موسلا دھار بارش نازل فرمائے گا اور مالوں اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے لیے باغات اگائے گا اور تمہارے لیے دریا بہائے گا''۔ (نوح:12-10)

(۲) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ

ترجمہ: ''بے شک اللہ کثرت سے توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔ (بقرہ:222)

(۳) وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ

لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٣﴾

ترجمہ:اور اپنے رب کی بخشش اور اس کی جنت کی طرف جلدی کرو، جس کا عرض تمام آسمان اور زمینیں ہیں جو متقین کے لیے تیار کی گئی ہے''۔(آل عمران:133)

احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱)عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: لَلّٰهُ أَفْرَحُ بِتَوْبَةِ أَحَدِكُمْ مِنْ أَحَدِكُمْ بِضَالَّتِهِ إِذَا وَجَدَهَا۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:تم میں سے کسی شخص کو اپنی گمشدہ سواری کے مل جانے سے جتنی خوشی ہوتی ہے،اللہ کو تمہاری توبہ سے اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے،(سنن ترمذی:3538)''۔اس سے معلوم ہوا کہ استغفار رضائے الٰہی کا سبب ہے۔

(۲)حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:اللہ سے بہت زیادہ استغفار کیا کرو کیونکہ اللہ نے تم کو استغفار کی اسی لیے تعلیم دی ہے کہ وہ تم کو بخشنا چاہتا ہے''۔(الدر المنثور،جلد8،ص:269)

(۳)حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کا صحیفۂ اعمال اس کو خوش کرے،وہ بہت زیادہ استغفار کرے،(المعجم الاوسط:843)''۔اس سے معلوم ہوا کہ استغفار آخرت میں نجات کا سبب ہے۔

(۴)عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللهُ لَهُ مِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَخْرَجًا، وَمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا، وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جس شخص نے استغفار کو لازم کرلیا،اللہ تعالیٰ اس کی ہر پریشانی کو حل کردے گا،ہر تنگی میں اس کے لیے فراخی کردے گا اور جہاں اس کا گمان بھی نہ ہوگا،اس کو وہاں سے رزق عطا فرمائے گا''۔(سنن ابوداود:1515)

اِس حدیثِ پاک سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ استغفار مشکلات میں آسانی، غموں سے نجات اور رزق کی کشادگی کا سبب ہے۔

(۵)عَنۡ أَبِی هُرَيۡرَةَ سَمِعۡتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوۡلُ: وَاللّٰهِ اِنِّی لَأَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوۡبُ اِلَيۡهِ فِی الۡيَوۡمِ أَكۡثَرَ مِنۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ کی قسم! بے شک میں دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں اور اُس کی طرف توبہ کرتا ہوں، (صحیح بخاری: 6307)''۔اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہوا کہ استغفار بلندیِ درجات کا سبب ہے۔

(۶)عَنۡ عَائِشَةَ أَنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقُوۡمُ مِنَ اللَّيۡلِ حَتّٰی تَتَفَطَّرَ قَدَمَاهُ، فَقَالَتۡ عَائِشَةُ: لِمَ تَصۡنَعُ هٰذَا يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ وَقَدۡ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ؟، قَالَ: أَفَلَا أُحِبُّ أَنۡ أَكُوۡنَ عَبۡدًا شَكُوۡرًا۔ فَلَمَّا كَثُرَ لَحۡمُهُ صَلّٰی جَالِسًا، فَاِذَا أَرَادَ أَنۡ يَرۡكَعَ قَامَ، فَقَرَأَ، ثُمَّ رَكَعَ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ راتوں کو (اتنا طویل) قیام فرماتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں (مبارک) پھٹ گئے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مغفرت کی قطعی اور کلی سند عطا فرمادی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا زیادہ شکر کرنے والا بندہ بنوں، پھر جب رسول اللہ ﷺ کا جسم ذرا فربہ ہوگیا تو پھر آپ بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے، لیکن جب رکوع کرنے کا ارادہ کرتے تو کھڑے ہوکر (کچھ دیر) قراءت کرتے، پھر رکوع کرتے''۔ (صحیح بخاری: 4837)

اس حدیث پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) عبادت سے مقصود بلندیِ درجات بھی ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر تشکّر کا بہترین ذریعہ ہے، کیونکہ شکر کامل یہ ہے کہ بندہ زبان، اعضاء اور قلب سے شکر ادا کرے یعنی مجسّم

تَشَکُّر بن جائے اور شکر کی ساری صورتیں نماز میں جمع ہوتی ہیں۔

(۶) یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو قیام کی حالت سے رکوع وسجود میں جانا پسند تھا۔

(۷) عَنِ الْأَغَرِّ الْمُزَنِيِّ، وَكَانَتْ لَهُ صُحْبَةٌ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِنَّهُ لَيُغَانُ عَلَى قَلْبِي، وَإِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللهَ، فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ۔

ترجمہ: ''صحابیِ رسول حضرت اَغَرِّ مُزنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے دل پر حجاب چھا جاتا ہے اور میں ایک دن میں اللہ تعالیٰ سے سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں، (صحیح مسلم:2702)''۔حضرت سید علی ہجویری نے لکھا ہے: ''رَین'' قلب پر اس میل یا دھبے کو کہتے ہیں، جو معصیتوں کی پاداش میں مستقل طور پر چھا جاتا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

ترجمہ: ''ہرگز نہیں، بلکہ ان کے برے کاموں نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے، (المطفّفین:14)''۔اور ''غین'' اسے کہتے ہیں جو عارضی طور پر چھا جاتا ہے اور استغفار سے رفع ہوجاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کے قلب پر ''غین'' یا حجاب کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُمّت کی اصلاح کے کاموں میں مشغولیت کے سبب جب آپ کی توجہ حضوریِ بارگاہِ رب العالمین کی طرف کم ہوتی، تو پھر استغفار فرماتے، یعنی آپ کی یہ کیفیت فی نفسہٖ کسی بھی درجے میں خطا نہیں تھی، کیونکہ نبوت کے کاموں میں مشغول رہنا، امت کے احوال کی اصلاح پر توجہ دینا اور امت کی مشکلات کا حل نکالنا، یہ سب بحیثیت نبی آپ کا فریضہ تھا اور اس پر آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجرِ عظیم کے حق دار تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف معمولی سی بے توجہی کو اس کے حضور اپنے مقامِ رفیع وارفع کے شایانِ شان نہیں سمجھتے تھے، اس لیے اس پر استغفار فرماتے۔

گم شدہ گائے کا حکم

سوال:

عید الاضحیٰ سے دو دن قبل ہمارے محلے میں ایک گائے آئی (جس کے بارے میں

غالب گمان یہ ہے کہ یہ کسی کی قربانی کا جانور ہے جو بھاگ کر آیا ہے)۔ محلے کی مسجد انتظامیہ نے مسجد کے سامنے باندھ دیا تاکہ گائے کا مالک آکر لے جائے، کافی تلاش کے بعد بھی کوئی نہ آیا اور مسجد انتظامیہ کے لیے اُس کی دیکھ بھال دشوار ہوئی تو ایک صاحب کچھ دن کے لیے اپنے گھر لے گئے، دو تین روز بعد اُن کے لیے سنبھالنا مشکل ہوگیا اور گائے کھول کر چھوڑ دی، پھر ایک دوسرے شخص نے تین دن گائے کی دیکھ بھال کی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے؟، (سید وسیم شاہ، ایبٹ آباد)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر اُس جانور کی دیکھ بھال لوگوں کے لیے واقعی دشوار ہے، تو اُس جانور کو دو عادل گواہوں کی موجودگی میں مناسب بازاری قیمت پر فروخت کر کے وہ رقم کسی ذمے دار اور امانت دار شخص کے پاس رکھ دیں، ایک سال تک اُس کے مالک کا انتظار کیا جائے، اگر اِس دوران وہ آجائے اور شواہد سے ثابت ہو جائے کہ وہی اِس کا مالک ہے، تو رقم اُس کے حوالے کر دی جائے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَسُئِلَ عَنِ اللُّقَطَةِ؟، فَقَالَ: لَا تَحِلُّ اللُّقَطَةُ، مَنِ الْتَقَطَ شَيْئًا فَلْيُعَرِّفْهُ سَنَةً، فَإِنْ جَاءَهُ صَاحِبُهَا فَلْيَرُدَّهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ لَمْ يَأْتِ صَاحِبُهَا فَلْيَتَصَدَّقْ بِهَا۔

ترجمہ: '' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے لُقطہ (گری پڑی چیزوں) کے بارے میں سوال ہوا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لُقطہ حلال نہیں ہے، جو شخص پڑا ہوا مال اٹھائے، اُس کی ایک سال تک تشہیر کرے، اگر مالک آجائے تو اُسے دے دے اور نہ آئے تو صدقہ کر دے''۔ (سنن دارقطنی: 4309)

اگر اُس شخص یا اُس کے کسی شرعی وارث کا کسی بھی طریقے سے پتا نہ چل سکے، تو وہ رقم اُس کی طرف سے صدقہ کر دیں، جس کا ثبوت آپ کے پاس موجود محفوظ رہنا چاہیے۔ اگر بالفرض بعد میں وہ کبھی آجائے اور اس تصدق سے مطمئن ہو تو آپ اپنی ذمے داری سے

عہدہ براہو جائیں گے، ورنہ آپ لوگوں کو اس کی رقم ادا کرنی ہوگی اور اس تصدُّق کا آپ سب کو اجر ملے گا۔

اگر وہ کسی شخص کی قربانی کا جانور تھا، تو اب قربانی کا وقت گزر جانے کے بعد اُس شخص پر بھی اُس جانور کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''بدائع الصنائع'' میں ہے: جو بکری قربانی کے لیے خریدی گئی ہو اور ایامِ قربانی میں اُس کی قربانی نہ کی ہو اور قربانی کے دن گزر گئے، تو وہ شخص غنی ہے یا فقیر اُس جانور کو زندہ صدقہ کرے، اِس پر ہمارے ائمہ کا اِجماع ہے۔ (اور اگر زندہ صدقہ کرنے کے بجائے ذبح کر دیا) تو اُس شخص کو اُس ذبیحے کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے (بلکہ سارا گوشت فُقراء پر صدقہ کرے)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:9، ص:389)

صاحبِ ''بدائع الصنائع'' کے مطابق ائمۂ احناف کا متفق علیہ قول یہی ہے کہ قربانی کے لیے خریدے ہوئے جانور کی قربانی اگر ایامِ قربانی میں کسی وجہ سے نہ کی ہو، تو فقیر کی طرح مالدار بھی بعینہٖ اُس جانور کو زندہ صدقہ کرے اور ذبح کر کے صدقہ کرنے کی صورت میں اُس کا گوشت خود نہ کھائے بلکہ سارا گوشت فُقراء پر تقسیم کر دے، کیوں کہ اس جانور کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ اگر قربانی کے لیے خریدے ہوئے جانور کو ایامِ قربانی کے بعد فروخت کر دیا ہو تو اُس کی قیمت کا بھی صدقہ کرنا واجب ہے۔

طبی تحقیق کے لیے جانوروں کا استعمال

سوال:

میں کینسر ریسرچ کی طالبہ ہوں، ریسرچ کے لیے مختلف جانور مثلاً چوہا وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ تجربات کے دوران مختلف Compounds کی Toxicity Testing کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اُس میں کینسر داخل کیا جاتا ہے، پھر مختلف Compound سے Treat کر کے دیکھا جاتا ہے کہ اُس پر کیا اثر ہوا، آخر میں خون یا سیل حاصل کرنے کے لیے مار دیا جاتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح تجربات کے لیے Animals

کے استعمال اور مارنے کی اجازت ہے؟۔اس طرح جانوروں کو انسان کے علاج اور فائدے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ سائنسی تجربات کے لیے ہمارے پاس فی الوقت جانوروں کا متبادل موجود نہیں ہے۔(سیدہ روحینہ علی، بلاک 14 ایف۔بی ایریا، کراچی)

جواب:

میڈیکل کے طلبہ کے لیے زمانۂ تعلیم میں ریسرچ اور سرجری کے لیے مختلف جانداروں پر مشق یا تجربات کی ضرورت پڑتی ہے۔شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ: اَلضَّرُوْرَۃُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ (ضرورت ممنوعات کو مباح کردیتی ہے)۔موذی (ضرر اور ایذا پہنچانے والے) جانوروں کو ویسے بھی مارنا جائز ہے۔حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ:قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ: خَمْسُ فَوَاسِقَ یُقْتَلْنَ فِی الْحَرَمِ: اَلْفَارَۃُ وَالْعَقْرَبُ، وَالْغُرَابُ وَالْحُدَیَا، وَالْکَلْبُ الْعَقُوْرُ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پانچ فواسق (موذی) جانوروں کو حرم میں (بھی) ماردیا جائے،(وہ یہ ہیں:) چوہا، بچھو، کوا، چیل اور کاٹنے والا کتا،(سُنن ترمذی:837)''۔

فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ اس حدیث پاک کی رُو سے ضرر رساں کیڑوں کا مارنا مباح ہے۔ الغرض طبی تحقیق، مختلف مہلک اَمراض کے طبی اسباب کو جاننے اور ان کی اَدوِیہ (Medicines) کی دریافت کے لیے آپ کے بیان کیے ہوئے طریقے کے مطابق چوہے، مینڈک یا کسی بھی جانور کا استعمال جائز ہے۔

اچھے اور برے خواب

سوال:

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح برے خواب شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اور اُن خوابوں کا کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہیے، اسی طرح اچھے خوابوں کا بھی کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہیے اور اگر کسی کو رسول اللہ ﷺ کی خواب میں زیارت ہوئی ہو، اس کا بھی ذکر نہیں کرنا

چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنے کی فضیلت اور اس بارے میں احادیث کی وضاحت فرمادیں۔ (رمشا عمر، کراچی)

جواب:

حدیثِ پاک میں ہے:

(۱) عَنْ أَبِي سَعِيدِ الْخُدرِی أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: إِذَا رَأَى أَحَدُكُم رُؤْيَا يُحِبُّهَا فَإِنَّمَا هِيَ مِنَ اللهِ، فَلْيَحْمَدِ اللهَ عَلَيْهَا وَلْيُحَدِّثْ بِهَا، وَإِذَا رَأَى غَيْرَ ذٰلِكَ مِمَّا يَكْرَهُ فَإِنَّمَا هِيَ مِنَ الشَّيْطَانِ فَلْيَسْتَعِذْ مِنْ شَرِّهَا وَلَا يَذْكُرْهَا لِأَحَدٍ فَإِنَّهَا لَا تَضُرُّهُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جو اس کو پسند ہو تو وہ اللہ کی جانب سے ہے، وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور وہ اس خواب کو بیان کرے اور جب وہ کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو وہ شیطان کی طرف سے ہے، وہ اس کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرے اور وہ خواب کسی کے سامنے نہ بیان کرے پھر وہ خواب اس کو ضرر نہیں دے گا''۔ (صحیح بخاری:6985)

(۲) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللهِ وَالْحُلُمُ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَمَنْ رَأَى شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَنْفِثْ عَنْ شِمَالِهِ ثَلَاثًا وَلْيَتَعَوَّذْ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهَا لَا تَضُرُّهُ، وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَرَاءَى بِي۔

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: نیک خواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور برے خواب شیطان کی طرف سے ہیں، پس جب کوئی شخص ناپسندیدہ خواب دیکھے تو اپنی بائیں جانب تین مرتبہ تھتکار دے اور شیطان سے پناہ طلب کرے تو پھر وہ خواب اس کو ضرر نہیں دے گا اور شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا''۔

(صحیح بخاری:6995)

خواب میں زیارتِ رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے:

وَمَنْ رَآنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِیْ، فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ فِیْ صُوْرَتِیْ، وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ''جس نے خواب میں مجھے دیکھا، اُس نے مجھے ہی دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کرسکتا، اور جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 110، 6197)''۔

اس حدیث مبارک کی رُو سے یہ امر ثابت ہے کہ سعادت مند مومن کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوسکتی ہے، یہ بھی ہمارا عقیدہ ہے کہ شیطان رسول اللہ ﷺ کی صورت مبارکہ اختیار نہیں کرسکتا۔ اور مذکورہ حدیث میں جو دوسری اہم بات بیان فرمائی گئی، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنے والا حقیقتاً آپ ہی کو دیکھتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص محض اپنی بڑائی اور شان ظاہر کرنے کی خاطر جھوٹا خواب بیان کرے یعنی اس نے حضور ﷺ کی زیارت نہ کی ہو اور لوگوں سے بیان کرتا پھرے، تو حدیث کے مطابق وہ نارِ جہنم کا مستحق ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں اس طرح پتا چلتا ہے کہ خواب میں کوئی تعارف کرائے یا اس کے دل میں بات آئے کہ یہ نبی کریم ﷺ ہیں۔

رسمِ آمین

سوال:

میری بیٹی کی عمر ساڑھے چھ سال ہے، قرآن کریم ختم کرلیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ''رسمِ آمین'' کا پروگرام کروں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔ چھوٹی بیٹی کی عمر چار سال ہے، اُس کی دینی تعلیم کی ابتدا کے لیے بسم اللہ کی تقریب کرنا کیسا ہے؟۔ نیز بیٹیوں کی پرورش کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟، (سید واثق حسین، صفورہ چورنگی کراچی)۔

جواب:

بنیادی طور پر رسوم ورواج سماجی زندگی کی علامت شمار ہوتے ہیں، کسی بھی قوم کی تہذیب کے اجتماعی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ رسوم عموماً دو سبب سے پروان چڑھتی

ہیں: (۱) معاشرتی دباؤ (۲) مذہبی جذبات۔

اسلام کا نقطۂ نظر اس حوالے سے یہ ہے کہ جو رسمیں انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے موزوں اور مفید ہیں، اُنہیں برقرار رکھا اور بعض مواقع پر اُن کی ترغیب بھی دی گئی، جو رسوم اسلامی مزاج سے ہم آہنگ نہ ہوں یا انسانی معاشرے کے لیے مضر ہوں، اُن کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور اُن کے خاتمے کی تدابیر بھی بیان کی گئی ہیں۔ اسلام کے اس بنیادی اصول کی بہترین مثال خطبۂ حجۃ الوداع ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے بیک وقت کئی جاہلانہ رسوم کا خاتمہ فرمایا، طویل مدت سے جاری سماجی تفریق، انتقامی کارروائیاں اور سودی لین دین کا خاتمہ فرمایا۔ غلاموں، یتامیٰ، مساکین، خواتین اور معاشرے کے کمزور طبقات جو اپنی بنیادی حقوق سے محروم تھے، اُن کے حقوق مُتعین فرمائے۔

علماء نے قرآن وسنت کی روشنی میں کچھ اصول ومعیار مقرر کیے ہیں، ان کی روشنی میں جن رسوم میں خیر کا پہلو پایا جاتا ہو، اُنہیں باقی رکھا جائے، اس حوالے سے ''عرف وعادت'' کو فقہاء نے شریعتِ اسلامی کے ضمنی مآخذ میں شمار کیا ہے۔

بچے کی تعلیم کے آغاز کے لیے ہمارے معاشرے میں رسمِ بسم اللہ کی جاتی ہے، اِس میں شرعی قباحت تو کوئی نہیں البتہ اسراف، تفاخُر، ریاکاری اور معصیت کے پہلو نہیں ہونے چاہئیں، یہ زیادہ سے زیادہ ایک دعائیہ تقریب ہوتی ہے۔ لیکن آج کل اسے نام ونمود اور تحائف کے لین دین کا ذریعہ بنالیا گیا ہے، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے اور اس طرح کی لین دین کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔

امام احمد بن محمد بن ابراہیم ثعلبی ''الکشف والبیان عن تفسیر القرآن'' میں ایک روایت نقل فرماتے ہیں:

فَاِنَّ الْمُعَلِّمَ اِذَا قَالَ لِلصَّبِیِّ: قُلْ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، فَقَالَ الصَّبِیُّ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، کَتَبَ اللهُ بَرَاءَةً لِلصَّبِیِّ، وَبَرَاءَةً لِاَبَوَیْهِ، وَبَرَاءَةً لِلْمُعَلِّمِ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ''جب معلم بچے سے کہتا ہے: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کہو، تو بچہ (اس کے جواب

میں) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ (اس عمل کی برکت سے) بچے، اُس کے والدین اور معلم (تینوں) کے لیے جہنم سے نجات مقدر فرما دیتا ہے''۔

(سورۃ الفاتحہ، فی فضل التسمیہ، جلد 1، ص:21، بیروت)

ہمارے ہاں ''رسمِ آمین'' سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جب بچہ ناظرہ یا حفظ قرآن مکمل کرلے، تو اس کے تشکّر کے طور پر دعائیہ تقریب منعقد کی جائے، سنت میں ایسی روایت ثابت نہیں ہے، لیکن صحابۂ کرام کے بعض آثار سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

مفتی احمد یار خان نعیمی لکھتے ہیں: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سورۂ بقرہ بارہ سال میں تمام حقائق واسرار کے ساتھ پڑھی اور جس دن ختم کی، اُس دن خوشی میں ایک اونٹ ذبح کر کے صحابۂ کرام کی دعوت کی''۔ اس روایت کے ذیل میں مفتی احمد یار خان نعیمی لکھتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا کہ دینی کتابیں شروع یا ختم کرتے وقت شیرینی تقسیم کرنا سنتِ صحابہ ہے، (تفسیر نعیمی، جلد:1، ص:98)''۔ یہی بات دیوبندی مکتبۂ فکر کے معروف عالم مولانا عبدالحفیظ مکی نے ''فتح الجواد فی معارفِ آیاتِ الجہاد'' کی تقریب رونمائی میں بیان کی اور کہا کہ ایک اونٹ ذبح کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم سو آدمیوں کی اُنہوں نے دعوت کی، واضح رہے کہ مولانا مکی مکۃ المکرمہ میں مقیم ہیں، یہی وجہ ہے کہ دینی کتب کی تقریب رونمائی کی جاتی ہے۔ مولانا عبدالحفیظ مکی کی تقریر نیٹ پر موجود ہے۔

احادیث میں بچوں کی اچھی تربیت کا حکم دیا گیا ہے:

(۱) بچوں کی عمدہ تربیت کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مُرُوْا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ، وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرٍ، وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ۔

ترجمہ: ''تمہارے بچے جب سات سال کے ہوجائیں، تو اُنہیں نماز کا حکم دو اور جب وہ دس سال کے ہوجائیں (اور نماز نہ پڑھیں) تو اُنہیں (تادیباً معمولی) مارو اور اُن کے بستر علیحدہ کردو''۔ (سُنن ابوداؤد:491)

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهُ نَحْلًا أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ۔

ترجمہ:''کسی باپ نے اپنے بیٹے کو عمدہ اور بہترین ادب سے زیادہ اچھا ہدیہ نہیں دیا''۔

(مسند امام احمد بن حنبل:16710)

(۳)أَکْرِمُوْا أَوْلَادَکُمْ، وَأَحْسِنُوا أَدَبَهُمْ۔

ترجمہ:''اپنے بچوں کا اکرام کرو اور انہیں اچھی تربیت دو''۔(سنن ابن ماجہ:3671)

بیٹیوں کی اچھی تربیت اور پرورش کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے جنت اور نارِ جہنم سے نجات کی بشارت دی ہے، حدیث پاک میں ہے:

(۱)عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ عَالَ جَارِیَتَیْنِ حَتّٰی تَبْلُغَا، جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ أَنَا وَھُوَ کَھَاتَیْنِ۔ وَضَمَّ أَصَابِعَهُ

ترجمہ:''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے دو لڑکیوں کے بالغ ہونے تک پرورش کی، قیامت کے دِن میں اور وہ اِس طرح آئیں گے (راوی کہتے ہیں کہ) آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں باہم ملا دیں''۔

(صحیح مسلم:6572، سنن ترمذی:1914)

(۲)مَنْ کَانَ لَهُ ثَلَاثُ بَنَاتٍ، فَصَبَرَ عَلَیْهِنَّ وَأَطْعَمَهُنَّ وَسَقَاهُنَّ وَکَسَاهُنَّ مِنْ جِدَتِهٖ، کُنَّ لَهُ حِجَابًا مِنَ النَّارِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔

ترجمہ:''جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان پر صبر کرے، ان کو کھلائے، پلائے اور ان کو اپنی کمائی سے کپڑے پہنائے تو وہ لڑکیاں اس کے لیے دوزخ کی آگ سے حجاب بن جائیں گی''۔(سنن ابن ماجہ:3669)

(۳)وَمَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ أَوْ مِثْلَهُنَّ مِنَ الْأَخَوَاتِ فَأَدَّبَهُنَّ وَرَحِمَهُنَّ حَتّٰی یُغْنِیَهُنَّ اللّٰہُ أَوْجَبَ اللّٰہُ لَهُ الْجَنَّةَ، فَقَالَ رَجُلٌ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! وَاثْنَتَیْنِ؟، قَالَ:''أَوِ اثْنَتَیْنِ''، حَتّٰی لَوْ قَالُوْا: أَوْ وَاحِدَةً؟، لَقَالَ: وَاحِدَةً

ترجمہ:''اور جس نے تین بیٹیوں یا اتنی ہی تعداد میں بہنوں کی کفالت کی، ان کی تربیت کی اور ان کے ساتھ رحم کا برتاؤ کیا، یہاں تک کہ اللہ نے (مال کے ذریعے یا شادی کی صورت

میں یا وفات کی صورت میں) انہیں اس سے مستغنی کردیا، تو ایسے شخص کے لیے اللہ (اپنے کرم سے) جنت کو واجب فرمادے گا، ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ! اگر کسی کی صرف دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں تو؟، آپ نے فرمایا: اگر کسی کی صرف دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں، تب بھی (وہ جنت کا حق دار ہوگا)، (راوی بیان کرتے ہیں، مجھے ایسا لگا کہ) یہاں تک کہ اگر صحابہ پوچھتے: یارسول اللہ! اگر کسی کے زیرِ کفالت صرف ایک بیٹی یا ایک بہن ہو، تو رسول اللہ ﷺ فرماتے: اگر ایک ہو، تب بھی (وہ اس اجر کا حق دار ہوگا)''۔

(شرح السنہ للبغوی:3557)

واضح رہے کہ بیٹیوں اور بہنوں کی کفالت، پرورش اور نگہداشت کی ترغیب اور اجر کی نوید ایک ایسے معاشرے میں دی، جہاں بیٹیوں کی ولادت کو باعثِ ننگ و عار سمجھا جاتا تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۞ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۞ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۞

ترجمہ: ''اور وہ (فرشتوں کو) اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں، اللہ اس سے پاک ہے اور اپنے لیے وہ جس کو پسند کرتے ہیں (یعنی بیٹے) اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جاتی ہے، اُس کا چہرہ سیاہ پڑجاتا ہے اور وہ غصے میں بھر جاتا ہے، اس بشارت کو برا سمجھنے کی وجہ سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، (وہ سوچتا ہے کہ) آیا ذلت برداشت کرکے اسے روکے رکھے (یعنی زندہ رہنے دے) یا اسے (زندہ) زمین میں دبادے، ارے! بہت ہی برا حکم لگاتے ہیں''۔ (النحل:59-57)

کیا حجرۂ انور یا روضۂ انور بھی جنت کی کیاری ہے

سوال:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میرے حجرے سے میرے منبر تک جنت کا ٹکڑا ہے

(جس کو روضۃ الجنۃ کہا جاتا ہے)، قیامت کے دن یہ ٹکڑا اوپر اٹھالیا جائے گا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس میں حجرہ مبارک داخل ہے یا نہیں؟، (مخدوم حسن، ناظم آباد کراچی)۔

جواب:

حدیث شریف میں ہے:

(۱) عَنْ عَبدِ اللہِ بْنِ زَیْدِ الْمَازِنِی رَضِیَ اللہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ ﷺ قَالَ: مَا بَیْنَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوْضَۃٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن زید مازنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے''۔ (صحیح مسلم: 3366)

علامہ یحیٰی بن شرف النووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''قَالَ الطَّبَرِی: فِی الْمُرَادِ بِبَیْتِیْ ھُنَا قَوْلَانِ: أَحَدُھُمَا: اَلْقَبرُ، قَالَہٗ زَیْدُ بْنُ اَسْلَمَ کَمَا رُوِیَ مُفَسَّرًا بَیْنَ قَبْرِیْ وَمِنْبَرِیْ، وَالثَّانِیْ: اَلْمُرَادُ بَیْتُ سُکْنَاہُ عَلٰی ظَاھِرِہٖ وَرُوِیَ مَابَیْنَ حُجْرَتِیْ وَمِنْبَرِی، قَالَ الطَّبَرِی: وَالْقَوْلَانِ مُتَّفِقَانِ لِاَنَّ قَبْرَہٗ فِیْ حُجْرَتِہٖ وَھِیَ بَیْتُہٗ''۔

ترجمہ: ''طبری نے کہا: ''میرے گھر'' کے بارے میں دو قول ہیں، ایک تو یہ کہ آپ کی قبر مبارک، زید بن اسلم نے کہا جیسا کہ ''بین قبری و منبری'' والی روایت میں وضاحت کی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ظاہر طور پر آپ ﷺ کی جائے رہائش ہے، ایک روایت میں ''مَابَیْنَ حُجْرَتِیْ وَمِنْبَرِیْ'' بھی آیا ہے۔ امام طبری نے فرمایا: دونوں اقوال کی مراد ایک ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ کی قبر حجرے میں ہے اور وہی آپ کا بیت ہے''۔

(شرح النووی، جلد 6، ص: 3709، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ)

(۲) عَنْ أَبِی ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَابَیْنَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوْضَۃٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ وَمِنْبَرِیْ عَلٰی حَوْضِیْ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے''۔(صحیح بخاری:1888)

علامہ بدرالدین عینی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:''اَنَّ الْمُرَادَ بِقَوْلِهٖ: بَيْتِيْ، اَحَدُ بُيُوْتِهٖ لَاكُلِّهَا، وَهُوَ بَيْتُ عَائِشَةَ الَّذِيْ دُفِنَ ﷺ فِيهِ فَصَارَ قَبْرَهُ، وَقَدْ وَرَدَ فِي حَدِيثٍ: مَابَيْنَ الْمِنْبَرِ وَبَيْتِ عَائِشَةَ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ، أَخْرَجَهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي (الْأَوْسَطِ)، قَوْلُهٗ:''رَوْضَةٌ''أَيْ: كَرَوْضَةٍ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ فِي نُزُوْلِ الرَّحْمَةِ وَحُصُوْلِ السَّعَادَاتِ، وَحُذِفَ أَدَاةُ التَّشْبِيهِ لِلْمُبَالَغَةِ، وَقِيلَ: مَعْنَاهُ أَنَّ الْعِبَادَةَ فِيهَا تُؤَدِّيْ اِلَى الْجَنَّةِ فَيَكُوْنُ مَجَازًا، أَوِ الْمُرَادُ أَنَّ ذٰلِكَ الْمَوْضِعَ بِعَيْنِهٖ يَنْتَقِلُ اِلَى الْجَنَّةِ،

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں''بیتی''سے مراد آپ ﷺ کے گھروں میں سے ایک گھر ہے، تمام گھر مراد نہیں اور وہ گھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے، جس میں آپ ﷺ کی تدفین ہوئی اور آپ کی قبر شریف بنی۔طبرانی کی المعجم الاوسط کی ایک حدیث میں روایت ہے:''میرے منبر اور عائشہ کے گھر کے درمیان والی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے''۔آپ ﷺ کا قول''روضہ''(جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہونے) سے مراد یہ ہے کہ یہ جگہ نزولِ رحمت اور حصولِ سعادات میں جنت کی مثل ہے، اور مبالغے کے طور پر حرفِ تشبیہ (ک) کو حذف کردیا گیا ہے۔ایک قول یہ ہے کہ اس جگہ عبادت کرنا دخولِ جنت کا سبب ہے اور یہ مجازاً ہے یا مراد یہ ہے کہ یہ جگہ بعینہٖ جنت میں منتقل کردی جائے گی''۔(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جلد10،ص:355)

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے: وَمَكَّةُ اَفْضَلُ مِنْهَا عَلَى الرَّاجِحِ اِلَّا مَاضَمَّ أَعْضَائَهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ فَاِنَّهٗ أَفْضَلُ مُطْلَقًا حَتّٰى مِنَ الْكَعْبَةِ وَالْعَرْشِ وَالْكُرْسِيِّ۔

ترجمہ:''راجح قول یہ ہے کہ مکہ افضل ہے، مگر وہ جگہ جو رسول اللہ ﷺ کے جسمِ اقدس سے متصل ہے، وہ مطلقاً (تمام جگہوں سے) افضل ہے، یہاں تک کہ کعبہ، عرش اور کرسی

سے (بھی) افضل ہے، (جلد 4، ص:47، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔اس تفصیلی بحث سے معلوم ہوا کہ قبرِ انور یعنی روضۂ مبارکہ اور حجرۂ مبارکہ اس بشارت میں شامل ہے۔

بزرگانِ دین کی تصویر لٹکا کر اُس کی تعظیم کرنا اور اس سے حاجات مانگنا

سوال:

میرا تعلق آستانہ خواجہ غریب نواز سے ہے، یہاں کراچی میں آستانے میں کسی مرید نے اجمیری شاہ بابا کی تصویر بڑی کرواکر لگادی ہے، کچھ لوگ اس تصویر پر ہار پھول ڈالتے ہیں۔لوگ تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور حاجات اور منتیں مانتے ہیں۔منع کرنے پر کہتے ہیں کہ شریعت میں اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔اس بابت شرعی حکم بیان فرمائیں، (نعیم احمد، سول اسٹاف کوارٹر کراچی)۔

جواب:

شریعت مطہرہ میں جاندار کی تصاویر بنانے کی ممانعت ہے، سوائے اُن اُمور کے جن کے لیے تصویر بنوانا ناگزیر (Unavoidable) ہے، مثلاً شناختی کارڈ، پاسپورٹ، ویزا، ڈومیسائل، ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ۔کسی بزرگ کی تصویر بنواکر اُس کے سامنے اس طرح عقیدت کا اظہار شرک سے مماثلت رکھتا ہے۔

تعظیم وتکریم کے لیے فوٹو کھینچنا ناجائز وحرام ہے۔امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہ العزیز لکھتے ہیں:''دنیا میں بت پرستی کا آغاز تصاویر کو جانبِ قبلہ صرف نصب کرنے سے ہوا کَمَا فِیْ صَحِیْحِ الْبُخَارِی وَغَیْرِہٖ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا (جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے) نہ کہ سجدہ کہ جانبِ قبلہ نصب سے ہزار ہا درجہ بدتر اور کفر سے ایسا ہی قریب ہے، جیسے آنکھ کی سپیدی سے سیاہی، تصویر کی تعظیم مطلقاً حرام ہے بلکہ غیر محلِ اہانت میں اُس کا رکھنا ہی حرام ومانع دخولِ ملائکۂ رحمت ہے''۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 22، ص:413-412، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ: أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ ذَكَرَتْ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ كَنِيسَةً بِأَرْضِ الْحَبَشَةِ، يُقَالُ لَهَا مَارِيَةُ، فَذَكَرَتْ لَهُ مَا رَأَيْتُ فِيهَا مِنَ الصُّوَرِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أُولَئِكَ قَوْمٌ إِذَا مَاتَ فِيهِمُ الْعَبْدُ الصَّالِحُ، أَوِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ، بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا، وَصَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، أُولَئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللهِ۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: حضرت ام سلمہ نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا کہ انہوں نے حبشہ کی سرزمین میں ایک گرجا دیکھا تھا، جس کا نام ماریہ تھا، انہوں نے اس کا ذکر کیا اوران صورتوں کے مجسموں کا ذکر کیا جو انہوں نے اس میں دیکھے تھے، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان میں سے کوئی نیک بندہ یا نیک شخص فوت ہوجاتا، تو یہ اس کی قبر پر مسجد (یعنی عبادت گاہ) بنادیتے اور اس عبادت گاہ میں اُن کی صورتوں کے مجسمے بنادیتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں''۔

(صحیح بخاری:434)

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری لکھتے ہیں: (إِذَا مَاتَ فِيهِمِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ) أَيْ مِنْ نَبِيٍّ أَوْ وَلِيٍّ (بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا) أَيْ مُتَعَبَّدًا وَيُسَمُّوهُ كَنِيسَةً (ثُمَّ صَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ) أَيْ صُوَرَ الصُّلَحَاءِ تَذْكِيرًا بِهِمْ وَتَرْغِيبًا فِي الْعِبَادَةِ لِأَجْلِهِمْ

ترجمہ: ''جب اُن میں کوئی مردصالح فوت ہوجاتا تھا یعنی نبی یا ولی فوت ہوجاتا، تو اس کی قبر پر مسجد یعنی عبادت گاہ بنالیتے اور اُس کا نام کنیسہ رکھتے، پھر اُس کنیسا میں اُن بزرگوں کی تصویریں (یا مجسمے) بنادیتے تاکہ اُن کی یاد باقی رہے اور اُن کی خاطر عبادت میں رغبت پیدا ہو''۔ (مرقاۃ المفاتیح، جلد ثامن ص:338)

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ علامہ ابوالعباس احمد بن عمر القرطبی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''متقدمین نصاریٰ اپنے مردصالح کی قبر پر اس کا مجسمہ بناکر اس لیے رکھتے تھے تاکہ اس مردصالح کی صورت دیکھ کر وہ مانوس ہوں اور اس کے نیک اعمال کو یاد کریں اور اس کی

عبادت کی طرح خود بھی عبادت کرنے کی کوشش کریں اور ایسے نیک بندوں کی قبروں کے پاس اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، پھر جب کافی زمانہ گزر گیا اور ان کے بعد متاخرین آئے تو وہ قبروں پر ان مجسموں کی اغراض سے ناواقف تھے اور شیطان نے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ ان کے آباء واجداد ان مجسموں کی عبادت کرتے تھے تو انہوں نے ان مجسموں کی تعظیم کی اور ان کی عبادت کرنی شروع کر دی، نبی ﷺ نے ایسے کاموں سے ڈرایا اور ان کاموں کو سختی سے منع کیا اور ان کاموں پر عذاب کی وعید سنائی اور غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ اور اس کا دروازہ بند کر دیا اور فرمایا: ''اس قوم پر اللہ کا شدید غضب نازل ہوتا ہے، جو اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیتی ہے، پس تم قبروں کو مساجد نہ بناؤ''۔ (مؤطا امام مالک، کتاب السفر: 85) یعنی میں تم کو اس کام سے منع کرتا ہوں اور فرمایا: ''اللہ عزوجل یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مساجد بنالیا، (صحیح مسلم: 532)''۔ اور فرمایا: ''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا، جس کی عبادت کی جائے، (تنویر الحوالک، ص: 189، مؤطا امام مالک، کتاب السفر: 85)''۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر انور پر آپ کی عبادت کا ذریعہ قطع کرنے میں بہت مبالغہ کیا اور آپ کی قبر کی دیواروں کو بہت اونچا کر دیا اور ان میں داخلہ مسدود کر دیا، پھر ان کو یہ خوف ہوا کہ کہیں آپ کی قبر کو قبلہ نہ بنالیا جائے تو انہوں نے قبر کے دو رکنوں پر دو دیواریں بنادیں، حتیٰ کہ کسی شخص کے لیے نماز میں عین قبر کی طرف منہ کرنا ممکن نہ ہو، اسی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا کہ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا، تو آپ کی قبر کو ظاہر کر دیا جاتا''۔

(المفہم، جلد 2، ص: 128)، (نعمۃ الباری، شرح صحیح بخاری، جلد 2، ص: 190-189)۔

اگر صالحین کے مزارات کے قریب حصولِ برکت کے لیے مسجد بنائی، تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''فَاَمَّا مَنِ اتَّخَذَ مَسْجِدًا فِیْ جِوَارِ صَالِحٍ وَقَصَدَ التَّبَرُّکَ بِالْقُرْبِ مِنْهُ لَا لِلتَّعْظِیْمِ لَهٗ وَلَا لِلتَّوَجُّهِ اِلَیْهِ فَلَا یَدْخُلُ فِی الْوَعِیْدِ الْمَذْکُوْرِ

ترجمہ:''رہا وہ شخص جس نے کسی نیک شخص کے مزار کے قریب حصول برکت کے لیے مسجد بنائی مگر اس کے قرب سے اس کی تعظیم اور نہ ہی نماز میں اس کی طرف رُخ کرنے کا ارادہ کیا، تو یہ اس وعید میں داخل نہیں ہے، (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد 4، ص:258، دارالکتب علمیہ، بیروت)''۔اس موضوع پر تفصیلی بحث علامہ غلام رسول سعیدی کی شرح صحیح مسلم، جلد2، ص:87-82 پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: كُنْتُ خَلْفَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا، فَقَالَ: يَا غُلَامُ إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ، احْفَظِ اللهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ لَكَ، وَلَوِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ۔

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن ایک سواری پر نبی ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تم کو چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں، تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہاری حفاظت کرے گا، تم اللہ کو یاد رکھو، تم اُسے (مصیبت کے وقت اپنی مدد کے لیے) موجود پاؤ گے، جب تم سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے سوال کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو اور جان لو کہ اگر تمام امت تم کو نفع پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے، تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ اور اگر تمام لوگ تم کو نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائیں، تو تمہیں صرف وہی نقصان پہنچا سکتے ہیں، جسے اللہ نے (پہلے سے) تمہارے لیے لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے (یعنی وہ غیر مرئی Unseen) دستاویز جس میں بندے کی تقدیر کے معاملات لکھے ہوتے ہیں) خشک ہو چکے ہیں، (جامع الترمذی، رقم الحدیث: 2516)''۔ یہ حدیث متعدد کتبِ حدیث میں موجود ہے، جن میں سے چند کے حوالہ جات

درجِ ذیل ہیں:

☆ امام ابویعلیٰ، ''مسند ابویعلیٰ'' (جلد 3،ص:85,84،مطبوعہ بیروت)۔

☆ امام ابن سنی، ''عمل الیوم واللیلۃ'' (ص:136،مجلس الدائرۃ المعارف دکن، بھارت)۔

☆ امام ابن عبدالبر ''تمہید'' (جلد 4،ص:111،مکتبۂ قدوسیہ،لاہور)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذکورہ آستانے پر بزرگوں کی تصاویر آویزاں کرنا، انہیں ہار پہنانا اور لوگوں کا اُس کے سامنے عقیدت کا اظہار کرنا، ان تصاویر کو مخاطب کر کے حاجات اور منتیں ماننا شرعاً ممنوع ہے، مزار کے متولی اور ذمے داران کو چاہیے کہ اس کا فوری تدارک کریں۔ اگر ان باتوں سے بروقت نہ روکا جائے، تو آگے چل کر دیگر شرعی مفاسد کا ذریعہ بنتی ہیں اور بدعت میں حد سے تجاوز کرتے کرتے بندہ شرک کے قریب پہنچ جاتا ہے، جیسا کہ ابتدا میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز کا حوالہ گزر چکا ہے۔

نوٹ: حضرت عثمان بن حُنیف رضی اللہ عنہ کی توسُّل سے متعلق روایت (سُنن ترمذی: 3589،سُنن ابن ماجہ:1385) درست ہے اور اسے لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے، جو شرعی احتیاط اور اس کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور اختیارِ ذاتی اور عطائی کے معنوی فرق اور نزاکت کو سمجھتے ہیں، ہوائے نفس کے پجاریوں کی ذہنی ساخت (Mind Set) جدا ہے۔

علانیہ شرعی مجرم کا سماجی مقاطعہ

سوال:

ہمارے خاندان کے ایک شخص نے کچھ عرصہ قبل نوابشاہ میں ایک عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالا، پکڑا گیا۔ اُس کا ساڑو ضمانت پر اُس کو لے آیا، یہاں آکر بھی اُس کی یہی حرکتیں رہیں۔ سگی بھانجی کے ساتھ اور سگے ساڑو کی سمدھن کے ساتھ بھی یہی حرکت کی۔ اس شخص کی بیٹی اور بیٹے شادی شدہ ہیں ایسے شخص کی شرعی سزا کیا ہے؟۔ اس سے رشتہ یا کسی قسم کا تعلق رکھنا کیسا ہے؟، (عبدالوہاب، اورنگی ٹاؤن کراچی)۔

جواب:

مذکورہ شخص اگر زنا کا مرتکب ہے اور شرعی معیار کے مطابق چار عینی گواہوں یا مجرم کے اقرار سے مُجاز عدالت کے سامنے جرم ثابت ہوجائے تو اسلامی ریاست میں یہ جرم ''موجبِ حد'' ہے اور اس پر حدِ شرعی نافذ کرنا صرف عدالت کا دائرۂ اختیار ہے۔ شادی شدہ زانی کی سزا رجم (سنگسار کرنا) ہے۔ حدود قائم کرنا حاکمِ اسلام یا اُس کے مقررہ و مُجاز قاضی کا کام ہے۔

زنا اسلام میں سنگین جرم ہے اور ان جرائم میں شامل ہے، جن کی سزا اللہ تعالیٰ نے کسی حاکم یا حکومتِ وقت کی صوابدید پر نہیں چھوڑی بلکہ خود اپنی حکمت سے مقرر فرمائی ہے، جس میں کسی کمی بیشی کا اختیار کسی حاکم یا حکومتِ وقت کو بھی نہیں ہے۔ عدالت میں اقرارِ جرم یا گواہوں کے ذریعہ جرم ثابت ہونے کی صورت میں معافی کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ

ترجمہ: ''زانیہ عورت اور زانی مرد ان میں سے ہر ایک کو تم سو کوڑے مارو''۔ (نور:2)

آپ اُسے دعوت و تذکیر سے عذابِ آخرت کا خوف دلائیں اور سچی توبہ پر آمادہ کریں، جسے قرآن نے ''توبۃُ النَّصوح'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ (قال: ابومعاوية: وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ) وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: شَيْخٌ زَانٍ، وَمَلِكٌ كَذَّابٌ، وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ۔

ترجمہ: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین اشخاص سے نہ کلام فرمائے گا اور نہ اُنہیں پاک کرے گا (ایک اور روایت میں ابومعاویہ فرماتے ہیں: نہ اُن کی طرف نظرِ کرم فرمائے گا) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، ایک بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا حاکم اور تیسرا مغرور فقیر''۔ (صحیح مسلم:108)

اسلام چونکہ مسلمان کو جان و مال اور آبرو کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے لہٰذا اگر کوئی شخص

کسی شخص پر زنا کا الزام لگائے اور مُلزَم (Accused Person) اپنی عزت کے تحفظ کے لیے عدالت سے رجوع کرے، جسے آج کل ازالۂ حیثیتِ عرفی یا Defamation کی بابت دعویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو مُدّعی کو عدالت میں اپنا دعویٰ چار عینی گواہوں سے ثابت کرنا ہوگا، دعوے کے ثابت ہوجانے کی صورت میں وہ مُلزَم زنا کا مجرم قرار پائے گا اور اُس پر حدِ زنا جاری ہوگی اور اگر مُدّعی چار عینی گواہوں (Eye Witness) سے اپنا دعویٰ ثابت نہ کرسکا تو اس پر حدِ قذف جاری ہوگی، جو اَسّی کوڑے ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب چار عینی گواہوں کی شہادت رَد ہوگئی، تو ان چاروں کو اَسّی اَسّی کوڑے لگائے گئے۔

انفرادی طور پر اسلام اس بات کو پسند کرتا ہے کہ لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالا جائے اور حتّی الامکان کسی کی پردہ دری یعنی راز افشا کرنے سے گریز کیا جائے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

ترجمہ: ''جس نے کسی مسلمان (بھائی کے عیوب) کی پردہ پوشی کی، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس کی پردہ پوشی فرمائے گا''۔ (صحیح بخاری: 2442)

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سَتَرَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ، سَتَرَ اللهُ عَوْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ كَشَفَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ، كَشَفَ اللهُ عَوْرَتَهُ حَتّٰى يَفْضَحَهُ فِي بَيْتِهِ۔

ترجمہ: ''جس نے اپنے مسلمان بھائی کے کسی عیب پر پردہ ڈالا، تو (اس کی جزا کے طور پر) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا اور جس نے اپنے مسلمان بھائی کی پردہ دری کی، تو اللہ تعالیٰ اُس کے عُیوب کو فاش فرمائے گا، یہاں تک کہ اسے اُس کے گھر میں رسوا فرمادے گا''۔ (سُنن ابن ماجہ: 2546)

(۳) ''وَلَا تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِهِم، فَإِنَّهُ مَن تَتَبَّعَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ تَتَبَّعَ اللهُ عَوْرَتَهُ،

ترجمہ:''مسلمانوں کے پوشیدہ احوال کا سراغ نہ لگاؤ، کیونکہ جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ دری کے دَرپے ہوگا، اللہ اس کی پردہ دری فرمائے گا''۔(سُنن ترمذی:2032)

(۴)ایک شخص سے بشری کمزوری کے تحت زنا کا جرم سرزد ہوا، وہ خود اعترافِ جرم کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا کہ مجھ پر حدِ شرعی جاری فرمادیجیے، اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا:''لَقَدْ سَتَرَكَ اللّٰهُ، لَوْ سَتَرْتَ نَفْسَكَ''۔

ترجمہ:''اللہ تعالیٰ نے تمہارے عیب پر پردہ ڈال رکھا تھا، کاش کہ تم خود بھی اپنے عیب پر پردہ ڈالے رہتے،(صحیح مسلم:2763)''۔یعنی اُس پر کسی نے زنا کا الزام نہیں لگایا تھا، نہ ہی کسی نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا تھا، اُس کے ضمیر (نفسِ لوّامہ) نے خود اسے ملامت کیا، وہ اپنے قصور پر نادم ہوا اور اس نے چاہا کہ آخرت کے عبرتناک انجام سے بہت بہتر ہے کہ اس دنیا ہی میں وہ اپنے کیے کی سزا بھگت لے اور اپنے قلب وروح کو اس گناہ کی آلودگی سے پاک کرلے، پس اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ مقبولہ کی سعادت عطا فرمائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان سے بشری کمزوری کے تحت گناہ سرزد ہوگیا ہو اور اس کا جرم عَیاں نہ ہوا ہو، تو وہ صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہے اور آئندہ اپنی توبہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید کرنی چاہیے کہ وہ اُسے معاف فرمادے گا۔البتہ جس کا جرم عَلانیہ ہے اور وہ گناہوں پر اتنا جری ہے کہ اسے معاشرے میں عار بھی محسوس نہیں ہوتا اور اس کی بدکرداری کی وجہ سے پورا معاشرتی ماحول متاثر ہورہا ہے، تو پھر ایسے شخص کا سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کرنا چاہیے تاکہ اس پر معاشرتی دباؤ پڑے اور وہ اپنی خباثتوں سے باز آجائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱)وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ

ترجمہ:''اور بے شک کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا گیا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا

انکار کیا جارہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جارہا ہے، تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو، حتیٰ کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہوجائیں، ورنہ بلاشبہ تم بھی انہی کی مثل ہوجاؤ گے''۔ (نسا:140)

(۲) وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○

ترجمہ: ''اور (اے مخاطب!) جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات میں کج بحثی کرتے ہیں، تو ان سے منہ پھیر لو، حتیٰ کہ ان کی بحث کا موضوع بدل جائے اور (اے مخاطب!) اگر تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد قومِ ظالمین کے ساتھ نہ بیٹھو''۔ (انعام:68)

(۳) وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ

ترجمہ: ''جن لوگوں نے ظلم کیا، ان کی طرف مائل نہ ہو، ورنہ تمہیں (دوزخ کی) آگ پہنچے گی''۔ (ہود:113)

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے دعائے قنوت کی تعلیم کی، اس میں یہ الفاظ ہیں: نَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ یَّفْجُرُكَ

ترجمہ: '' جو تیری نافرمانی کرے، ہم اُس سے قطع تعلق کرتے ہیں، (مُصنّف ابن ابی شیبہ: 6965)''۔ یعنی ہم وتر کی نماز پڑھتے ہوئے ''دعائے قنوت'' میں اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتے ہیں کہ: ''اے اللہ! جو تیرا نہیں وہ میرا نہیں''، یعنی ہماری ایک دوسرے سے دوستی یا دشمنی، محبت یا نفرت کا مدار نفسانی اغراض وخواہشات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہوتی ہے، اسی بات کو احادیث مبارکہ میں مقامِ مدح میں بیان کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے، جس میں ایسے سات خوش نصیب انسانی طبقات کا ذکر کیا گیا ہے، جو قیامت کی حشر سامانیوں میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی سایۂ رحمت میں عافیت وامان میں ہوں گے، ان کا تفصیلی بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''(ان میں سے) ایسے دو اشخاص بھی ہیں کہ ان کی آپس کی محبت کی اساس اللہ

تعالیٰ کی رضا ہے، مل بیٹھتے ہیں تو محض اللہ کی رضا کی خاطر اور (اگر کبھی) رشتہ توڑنا پڑے تو بھی اللہ کی رضا کے لیے''۔ (صحیح بخاری:660)

علامہ اقبال نے کہا ہے:

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بُتانِ وہم و گماں، لا الٰہ الّا اللہ

حدیث قدسی ہے: ''اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میری محبت ان کے لیے لازم ہے، جو صرف اور صرف میری رضا کے لیے آپس میں محبت کرتے ہیں، باہم مل بیٹھتے ہیں، ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے آتے جاتے ہیں اور ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے ہیں''۔ (مؤطا امام مالک، باب ماجاء فی المتحابین فی اللہ)

اس کے برعکس اللہ عزّوجلّ نے مشرکین کی مذمت میں فرمایا:

وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَیُدۡهِنُوۡنَ ۝

ترجمہ: ''یہ (مشرک) چاہتے ہیں کہ آپ دین کے معاملے میں ان کو بے جا رعایت دیں تاکہ یہ بھی جواباً آپ کو رعایت دیں''۔ (القلم:9)

وظائف اور دعائیں پڑھنا

سوال:

کسی مشکل کے حل کے لیے جو وظائف پڑھے جاتے ہیں، سنا ہے کہ کسی بزرگ کی اجازت کے بغیر نہیں پڑھنا چاہیے، ورنہ انسان پاگل ہو جاتا ہے، کیا اس بات میں کوئی سچائی ہے؟۔ اگر نہیں تو کیا ہم کسی بھی قسم کا وظیفہ کر سکتے ہیں، وہ چاہے شادی کے لیے ہو یا پڑھائی کے لیے، (اسما، لاہور)۔

جواب:

قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں جو دعائیں بیان کی گئی ہیں، اُن کے پڑھنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، اُن میں مختلف انبیاء کرام علیہم السلام کی دعائیں بھی

شامل ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا کسی دعا کی تعلیم فرما دینا ہی اُس کی اجازتِ عام ہے، کیونکہ دعا کی ترغیب اللہ عزّوجلّ نے خود قرآن مجید میں دی اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کی تعلیم فرمائی ہے اور دعا کو عبادت کا مغز قرار دیا ہے، کیونکہ عبادت میں بندہ اپنے معبود کی بارگاہ میں حضوری کے شرف سے مُشرّف ہوتا ہے اور دعا تو اللہ تعالیٰ سے براہِ راست التجا اور تخاطب کا نام ہے، اسی لیے اس پر کسی خاص زبان یا الفاظ کی پابندی بھی نہیں ہے۔ البتہ جو وظائف کسی خاص مقصد کے لیے پابندی اور شرائط کے ساتھ کیے جاتے ہیں، اُن میں رجعت کا احتمال ہوتا ہے، اُنہیں کسی صاحبِ نظر عامل کی اجازت سے پڑھنا افضل ہے۔

تبلیغِ دین فرضِ کفایہ ہے

سوال:

تبلیغی جماعت کی حقیقت کیا ہے؟ مزید یہ کہ تبلیغی جماعت میں شرکاء کے لیے حقوق العباد کی ادائیگی ترک کر کے تبلیغ کو فرض عین سمجھنا کہاں تک جائز ہے؟۔ آپ قرآن وسنت کی روشنی میں ہمیں تعلیم فرمائیں کہ کیا کوئی شخص اپنی بیمار بیوی اور ایک بیٹی عمر 5 سال ایک بیٹا عمر 11 سال دوسرا بیٹا عمر 9 سال تیسرا کمسن بیمار و نحیف بیٹا عمر 3 سال کو اللہ کے رحم وکرم پر چھوڑ کر کبھی سہ روزہ چلے پر کبھی چار ہفتے کے چلے پر تو کبھی چار مہینے کے چلے پر جا سکتا ہے کبھی کبھی اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جاتا ہے اور سب بچوں کو اپنے کسی رشتے دار کے گھر چھوڑ جاتا ہے کیا اس کا یہ عمل قرآن اور سنت کے مطابق ہے۔ آپ کی نظر میں اس کا کیا حل ہے کیا تبلیغی جماعت کے اکابرین ایسے لوگوں سے ناواقف نہیں؟، (ایک دردمند باپ)۔

جواب:

تبلیغی جماعت کو زیرِ بحث لانے سے قطعِ نظر کر کے ہم قرآن وسنت کی روشنی میں نفسِ مسئلہ پر بات کریں گے۔ تبلیغِ دین بحیثیتِ مجموعی اُمّتِ مسلمہ پر فرضِ کفایہ (Community Obligation) ہے، یہ الگ بات ہے کہ اجر کا حق دار صرف وہی

ہوگا جو اس دینی فریضہ سے عہدہ برا ہوگا۔ اس سلسلے میں ارشاداتِ باری تعالیٰ یہ ہیں:

(۱) وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اور تم میں ایسے لوگوں کی ایک جماعت ہونی چاہیے جو اچھائی کی طرف بلائیں اور نیک کاموں کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور وہی لوگ فلاح کو پہنچنے والے ہیں''۔ (آلِ عمران:104)

(۲) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ: ''جو امتیں لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہیں تم ان سب میں بہترین امت ہو، (تمہاری خوبی یہ ہے کہ) تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر تھا، ان میں سے بعض مومن ہیں اور اکثر کافر ہیں'' (آلِ عمران:110)

(۳) وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

ترجمہ: ''اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، ان ہی لوگوں پر عنقریب اللہ رحم فرمائے گا، بے شک اللہ بہت غلبہ والا بے حد حکمت والا ہے، (توبہ:71)''۔

(۴) اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

ترجمہ: ''ان لوگوں کو اگر ہم زمین میں اقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور نیکی کا حکم دیں اور بُرائی سے روکیں اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے''۔ (الحج:41)

حدیثِ پاک میں ارشاد ہے: (۱) مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ

ترجمہ: ''تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنی قوتِ بازو سے روکے اور اگر یہ نہ کر سکے تو اپنی زبان سے روکے (یعنی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے یا وعظ وتذکیر سے کام لے) اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو (کم ازکم) اسے دل سے بُرا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے، (مسلم:49)''۔ علماء نے فرمایا: بُرائی کو طاقت سے روکنا حاکمِ وقت کی ذمے داری ہے، وعظ وتذکیر سے روکنا علماء یا معاشرے کے بااثر لوگوں کی ذمہ داری ہے اور دل سے بُرا جاننا یہ ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا:

(۲) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''مَثَلُ الْمُدَاهِنِ فِيْ حُدُوْدِ اللّٰهِ وَالْوَاقِعِ فِيْهَا، مَثَلُ قَوْمٍ اِسْتَهَمُوْا سَفِيْنَةً فَصَارَ بَعْضُهُمْ فِيْ أَسْفَلِهَا، وَصَارَ بَعْضُهُمْ فِيْ أَعْلَاهَا، فَكَانَ الَّذِيْ فِيْ أَسْفَلِهَا يَمُرُّ بِالْمَاءِ عَلَى الَّذِيْنَ فِيْ أَعْلَاهَا، فَتَأَذَّوْا بِهٖ، فَأَخَذَ فَأْسًا، فَجَعَلَ يَنْقُرُ أَسْفَلَ السَّفِيْنَةِ، فَأَتَوْهُ فَقَالُوْا: مَا لَكَ؟ قَالَ: تَأَذَّيْتُمْ بِيْ وَلَا بُدَّ لِيْ مِنَ الْمَاءِ، فَإِنْ أَخَذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ أَنْجَوْهُ وَنَجَّوْا أَنْفُسَهُمْ، وَإِنْ تَرَكُوْهُ أَهْلَكُوْهُ وَأَهْلَكُوْا أَنْفُسَهُمْ۔

ترجمہ: ''اللہ کی حدود میں مُداہنت کرنے والے (یعنی مصلحت پسندی کا شکار ہو کر لاتعلق رہنے والے یا اہلِ باطل کی بے جا رعایت کرنے والے) اور بُرائی میں مبتلا ہونے والے کی مثال ایسی ہے کہ لوگوں نے کشتی میں سوار ہونے کے لیے آپس میں قرعہ اندازی کی، بعض کشتی کی بالائی منزل پر آ گئے اور کچھ زیریں منزل پر، پھر نچلی منزل والوں نے بالائی منزل والوں سے کہا کہ ہمیں پانی دو، تو انہوں نے اذیت رسانی سے کام لیا۔ اس کے ردِ عمل میں

نچلی منزل والوں نے کلہاڑا اٹھایا اور پانی حاصل کرنے کے لیے کشتی میں سوراخ کرنے لگے، اوپر والوں نے یہ ماجرا دیکھا تو نیچے آئے اور کہا یہ کیا کر رہے ہو؟۔ انہوں نے جواب دیا: آپ لوگوں نے پانی نہ دے کر ہمیں تکلیف پہنچائی ہے، اب ہمیں پانی تو بہر حال چاہیے۔ اگر بالائی منزل والے پانی دے کر کشتی میں شگاف ڈالنے سے انہیں روک لیں گے تو دونوں فریق ڈوبنے سے بچ جائیں گے اور اگر وہ انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیں گے تو کشتی میں پانی داخل ہو جائے گا اور دونوں ہلاک ہو جائیں گے، (مشکوٰۃ: 5138)''۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر معاشرہ مجموعی حیثیت سے شر اور معصیتوں کی مزاحمت نہیں کرے گا اور تبلیغِ دین کے فریضے سے لاتعلق ہو جائے گا، تو انجامِ کار سب تباہی سے دوچار ہوں گے۔

خطبۂ حجۃ الوداع کے مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے مجمعِ عام سے سوال کیا: اِنَّکُمْ تُسْأَلُوْنَ عَنِّیْ فَمَاذَا تُجِیْبُوْنَ؟، تم سے (قیامت کے دن) میرے بارے میں پوچھا جائے گا، تو تم کیا جواب دو گے؟، سب نے جواب دیا: ''آپ نے دین کی امانت بلاکم وکاست ہم تک پہنچادی، آپ نے تبلیغِ دین کا حق ادا کر دیا، آپ نے کمال درجے کی خیر خواہی کی''۔ پھر آپ ﷺ نے سوال کیا: اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ۔ قَالُوْا بَلٰی۔ کیا میں نے اللہ کا پیغام بلاکم وکاست تم تک پہنچا نہیں دیا؟، سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا: یقیناً آپ نے اللہ کا پیغامِ ہدایت ہم تک پہنچا دیا ہے۔ پھر آپ نے تین مرتبہ اپنی انگشت شہادت بلند کر کے نیچے کی اور تینوں بار فرمایا: اے اللہ! تو گواہ رہنا (کہ میں فریضۂ نبوت یعنی تبلیغِ دین کی ذمے داری سے عہدہ برا ہو چکا اور تیرے یہ بندے علی الاعلان اس کا اقرار واعتراف کر رہے ہیں)، پھر آپ نے فرمایا: ''آج جو یہاں (میدان عرفات میں) موجود ہیں، وہ (یہ دعوتِ حق اور امانتِ دین) ان تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں''۔

لیکن تبلیغِ دین کی یہ ذمے داری ہر ایک کے حالات اور استطاعت کے مطابق ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اس فریضے کو ادا کرتے ہوئے حقوق العباد سے غافل ہو جائے، دین کُلّیت (Totality) کا نام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ

اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ۝

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، بے شک شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے''۔ (البقرہ:208)

یعنی دین میں تجزی کرنا اور پسند و ناپسند کی بنیاد پر بعض احکام کو مان لینا اور بعض کو ترک کرنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں اس کے لیے مکمل رہنمائی موجود ہے:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (مواخاتِ انصار و مہاجرین کے موقع پر) حضرت سلمان اور حضرت ابوالدرداء کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا، حضرت سلمان، حضرت ابوالدرداء کی ملاقات کے لیے گئے۔ اُنہوں نے (اُن کی بیوی) حضرت اُم الدرداء کو خستہ حالت میں دیکھا تو ان سے پوچھا: یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟۔ اُنہوں نے بتایا کہ تمہارے بھائی ابوالدرداء کو دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر حضرت ابوالدرداء آئے تو انہوں نے حضرت سلمان کو کھانا پیش کیا، حضرت سلمان نے کہا: آپ بھی کھائیں، تو حضرت ابوالدرداء نے کہا: میں روزے سے ہوں، حضرت سلمان نے کہا: میں اُس وقت تک نہیں کھاؤں گا، جب تک کہ آپ نہیں کھائیں گے، پھر حضرت ابوالدرداء نے (مہمان کی دلداری کے لیے نفلی روزہ توڑ کر) کھانا کھایا۔ پھر جب رات ہوگئی تو حضرت ابوالدرداء (قیام اللیل کے) نوافل پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے، حضرت سلمان نے اُن سے کہا: آپ سو جائیں، سو وہ سو گئے۔ پھر (تھوڑی دیر بعد) وہ نماز کے لیے اٹھے، حضرت سلمان نے پھر کہا: آپ سو جائیں۔ پھر جب رات کا آخری پہر ہوا تو حضرت سلمان نے کہا: اب آپ اٹھیں، پھر دونوں نے نماز پڑھی، پھر اُن سے حضرت سلمان نے کہا: اِنَّ لِرَبِّکَ عَلَیۡکَ حَقًّا، وَلِنَفۡسِکَ عَلَیۡکَ حَقًّا، وَلِاَہۡلِکَ عَلَیۡکَ حَقًّا، فَاَعۡطِ کُلَّ ذِیۡ حَقٍّ حَقَّہٗ، فَاَتَی النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَذَکَرَ ذٰلِکَ لَہٗ، فَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: صَدَقَ سَلۡمَانُ۔

ترجمہ: ''بے شک آپ کے رب کا آپ پر حق ہے، آپ کے نفس کا آپ پر حق ہے اور آپ

کے اہلِ خانہ کا آپ پر حق ہے، سو آپ ہر حق دار کو اُس کا حق (پورا پورا) دیں، پھر حضرت ابوالدرداء نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور (شکایت کے انداز میں) آپ کو یہ قصہ سنایا (کہ میرے بھائی سلمان نے رات مجھے قیام اللیل سے روکے رکھا) تو نبی ﷺ نے فرمایا: سلمان نے سچ کہا ہے''۔ (صحیح بخاری:1968)

(۲): سَمِعَ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ یَقُوْلُ: جَآءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ اِلٰی بُیُوْتِ اَزْوَاجِ النَّبِیِّ ﷺ یَسْاَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِیِّ ﷺ فَلَمَّا اُخْبِرُوْا كَاَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا وَاَیْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِیِّ ﷺ قَدْ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ قَالَ اَحَدُهُمْ اَمَّا اَنَا فَاِنِّیْ اُصَلِّی اللَّیْلَ اَبَدًا وَقَالَ آخَرُ اَنَا اَصُوْمُ الدَّهْرَ وَلَا اُفْطِرُ وَقَالَ آخَرُ اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا فَجَاءَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِلَیْهِمْ فَقَالَ: اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا اَمَا وَاللهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ لٰكِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ: تین افراد نبی ﷺ کی ازواج کے گھروں میں گئے اور ان سے نبی ﷺ کی عبادت (کے معمولات) سے متعلق سوال کیا، پس (ازواجِ مُطہرات نے) آپ ﷺ کے معمولاتِ عبادت بتائے، تو گویا انہوں نے (اپنی دانست میں) اتنی عبادت کو کم سمجھا۔ پھر انہوں نے کہا: کہاں ہم اور کہاں نبی ﷺ؟، آپ کے تو تمام اگلے اور پچھلے بہ ظاہر خلافِ اولیٰ کاموں کی مغفرت کر دی گئی ہے، تو ان میں سے ایک نے کہا: ''میں تو ہمیشہ پوری رات نوافل پڑھتے ہوئے گزاروں گا''، دوسرے نے کہا: ''میں ہمیشہ (نفلی) روزے رکھا کروں گا اور روزہ کبھی نہیں چھوڑوں گا''، تیسرے نے کہا: ''میں ہمیشہ عورتوں سے اجتناب کروں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا (تاکہ نہ بیوی بچے ہوں اور نہ خانگی ذمے داریوں کا جھنجھٹ)''۔ دریں اثنا رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے، تو آپ ﷺ نے (ان کی باتوں کو سن کر) فرمایا: تو تم وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسا ایسا کہا تھا؟، سنو! اللہ کی قسم! بے شک میں تم سب سے زیادہ

متقی ہوں اور میرے دل میں اللہ کی خشیت سب سے زیادہ ہے، لیکن میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور کبھی چھوڑ بھی دیتا ہوں اور رات کو (نفلی) نماز پڑھتا بھی ہوں اور رات کے بعض حصے میں سو بھی جاتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ سو جس نے میری سنت سے اعراض کر کے (تقوے کا اپنا من پسند طریقہ اختیار کیا) تو وہ میرے (پسندیدہ) طریقے پر نہیں ہے''۔ (بخاری:5063)

اگر مذکورہ شخص کی بیوی یا بچے بیمار ہیں اور اُن کی خدمت کرنے اور ضروریات پوری کرنے کے لیے ان کا گھر پر موجود رہنا ضروری ہے اور متبادل کوئی انتظام بھی نہیں ہے، تو اُسے اس ذمے داری کو ترجیح دینی چاہیے، کیونکہ تبلیغ کے لیے دوسرے ایسے افراد معاشرے میں موجود ہو سکتے ہیں، جن کے لیے یہ معاملات رکاوٹ نہ بن رہے ہوں۔ اور آدمی اپنی خاندانی ذمے داریاں نباہتے ہوئے اپنے اپنے دائرۂ کار میں تبلیغ کو بھی جاری رکھ سکتا ہے، اپنے خاندان، محلے، بستی، دفتر اور کارخانے میں یا جہاں بھی وہ کام کرتا ہے۔ اور اگر کچھ لوگ اس کے ساتھ ہیں یا ماتحت ہیں تو انہیں بھی دینی احکام پر عمل کرنے کی احسن طریقے سے ترغیب دے سکتا ہے۔ سو تبلیغِ دین کے ایک سے زیادہ مواقع (Opportunities) ہمیشہ دستیاب رہتے ہیں۔ اسلام توسُّط واعتدال کا دین ہے، دینی امور میں افراط وتفریط اور غُلُو سے بچتے ہوئے متوازن طریقہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ یہ تأثر پیدا نہ ہو کہ دین دار لوگ اپنے آپ کو کوئی مافوق البشر مخلوق سمجھتے ہیں یا انسانی حقوق کی پاس داری نہیں کرتے اور صرف ایک ہی رُخ پر چل پڑتے ہیں اور آخرِ کار ایک انتہا پر پہنچ جاتے ہیں۔

آج سے تیس سال پہلے جنوبی افریقا کے دورے پر تھا، تو کچھ لوگ اس مسئلے پر آپس میں بحث کر رہے تھے، ایک صاحب نے فوراً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ دیا کہ دیکھئے وہ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو بے آب وگیاہ سرزمین پر چھوڑ آئے۔ میں نے اُن کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مَرکَزُ الْمِلَل (Centre Point of three Revealed Religions) تھے، وہ اولوالعزم انبیاءِ کرام میں سے

تھے اور انہوں نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم پر کیا تھا۔ وہ تو اپنے خواب پر عمل کرتے ہوئے بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے اور اس میں ذرا برابر بھی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی، اس لیے کہ نبی کا خواب وحیِ ربانی ہوتا ہے اور حجت ہوتا ہے، جب کہ ہر بندۂ مومن کا الہام یا خواب حُجتِ شرعی نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ بعض اُمورِ نبوت کے خصائص میں سے ہوتے ہیں، جیسے رسول اللہ ﷺ کا صومِ وصال (مسلسل روزے) رکھنا اور بیک وقت چار سے زیادہ ازواجِ مُطہرات کو نکاح میں رکھنا۔

پس جو شخص تبلیغِ دین کے لیے مصروفِ عمل ہے، یقیناً اس کی خواہش ہوگی کہ لوگ اس کی ''دعوت الی اللہ'' پر لبیک کہیں، تو اُسے بھی اخلاص اور للّٰہیت پر مبنی دوسرے دینی بھائی کی دعوتِ خیر پر توجہ دینی چاہیے، دین کے معاملات میں اَڑیل پن اور حُجت بازی پسندیدہ بات نہیں ہے۔

اسلامی یا شرعی لباس کا کم از کم معیار

سوال:

لباس کی شرعی تعریف کیا ہے؟ ساڑھی کے لیے کیا حکم ہے؟، (سیدہ آمنہ، کراچی)۔

جواب:

لباس اُس چیز کو کہتے ہیں، جس کو پہنا جائے۔ علامہ زبیدی لکھتے ہیں: ''لَبِسَ الثَّوبَ'' کا معنیٰ کپڑا پہننا یا پہنانا ہے، اس کا مصدر لُبس ہے اور لباس کا لفظ مشہور ہے، (تاج العروس شرح القاموس، جلد 4،ص:238)''۔ اتنا لباس جس سے سترِ عورت ہو جائے اور گرمی سردی کی تکلیف سے بچے، فرض ہے اور اس سے زائد جس سے زینت مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اظہار کیا جائے، مستحب ہے۔ حدیث پاک میں ہے: اِنَّ اللہَ یُحِبُّ اَن یَرَی اَثَرَ نِعمَتِہٖ عَلیٰ عَبدِہٖ۔ ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ وہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھے (یعنی اسراف سے بچتے ہوئے جائز حد تک اللہ تعالیٰ کی نعمت سے استفادہ شکرِ نعمت کی ایک صورت ہے)''۔ (سُنن ترمذی:2819)

ایسا لباس جس سے ستر مکمل طور پر نہ ڈھانپا جا سکے یا باریک لباس جس سے جسم نظر آئے یا ایسا لباس جس سے واجب الستر اعضاء کی ساخت یا خدوخال واضح ہوتے ہوں، پہننا ممنوع ہے۔ حدیث پاک میں ہے: وَنِسَآءٌ کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ مُمِیلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُؤُسُهُنَّ کَاَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لَایَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَایَجِدْنَ رِیحَهَا وَاِنَّ رِیحَهَا لَیُوجَدُ مِنْ مَسِیرَةِ کَذَا وَکَذَا۔

ترجمہ: ''اور (اہلِ جہنم میں) وہ عورتیں بھی ہوں گی، جو لباس پہننے کے باوجود عریاں ہوں گی، وہ راہِ حق سے ہٹانے والی اور خود بھی ہٹی ہوئی ہوں گی، ان کے سر بختی اونٹوں کی طرح ایک طرف جھکے ہوئے ہوں گے، وہ جنت میں داخل ہوں گی، نہ جنت کی خوشبو پائیں گی اور جنت کی خوشبو اتنی اتنی مسافت سے آتی ہے۔ (صحیح مسلم:2128)''۔ (یعنی بہت دور سے آتی ہے اور ایک حدیث کی رُو سے جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے آتی ہے)''۔

(المستدرک للحاکم، رقم الحدیث:133)

امام نووی نے اس حدیث کی شرح ان الفاظ میں کی ہے: ''کاسیاتٌ'' کے معنی ہیں: وہ اپنے بدن کا بعض حصہ اپنی نمود کے لیے کھلا رکھیں گی یا ایسا باریک اور شفاف لباس پہنیں گی، جس سے ان کے مستور اعضاء جھلک رہے ہوں گے۔ ''مائلاتٌ'' کے معنیٰ ہیں: اللہ کی اطاعت سے انحراف کرنے والی ہوں گی یا سترِ شرعی سے انحراف کر رہی ہوں گی اور اس کے ایک معنیٰ ہیں: متکبرانہ انداز میں کندھوں کو اُچکاتے ہوئے چلیں گی یا ایسا میک اپ کر کے چلیں گی، جس سے وہ لوگوں کے لیے مرکزِ نگاہ بنیں، جسے شمعِ محفل کہا جاتا ہے۔ ''ممیلاتٌ'' کے معنیٰ ہیں: اپنے حسن یا مذموم حرکات کے جلوے دکھائیں گی''۔

(صحیح مسلم بشرح النووی، جلد: 14، ص:92، بیروت)

ساڑھی پہننے سے اگر سترِ شرعی کا مقصد پورا ہوتا ہے تو درست ہے اور اگر ساڑھی پہننے سے بدن کا بعض حصہ بے لباس رہے یا اعضائے مستورہ کی ساخت نمایاں ہو، تو جائز نہیں ہے، الغرض ہر قسم کے لباس کے لیے شرعی ضابطہ ایک ہی ہے۔

نامناسب نظر آنے والے بالوں کا ازالہ

سوال:

چہرے ہاتھ اور پیروں پہ اُگنے والے بالوں کا کیا حکم ہے؟ کیا ان کا صاف کروانا جائز ہے؟۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ مردوں سے مشابہت ہونے کی صورت میں جائز نہیں، تو اس مشابہت کی کیا حد ہے؟، (سیدہ آمنہ، کراچی)۔

جواب:

محض زیبائش کے لیے فطری بناوٹ کو بدلنا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے بال نوچنے اور نُچوانے والیوں پر لعنت فرمائی ہے۔ حدیث پاک میں ہے: عَنْ عبدِ اللہ: لَعَنَ اللہُ الواشِمَاتِ وَالمُستَوشِمَاتِ، وَالمُتَنَمِّصَاتِ، وَالمُتَفَلِّجَاتِ لِلحُسنِ، المُغَيِّرَاتِ خَلقَ اللہ تَعَالیٰ،

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ گودنے والیوں اور گودوانے والیوں پر لعنت فرماتا ہے اور بال نوچنے والیوں اور دانتوں میں حسن کے لیے کشادگی کرانے والیوں پر، جو اللہ کی تخلیق کو متغیر کرنے والی ہیں''۔ (صحیح بخاری:5931)

البتہ اگر عورت کے چہرے اور ہاتھوں پر غیر معتاد بال اُگ آئیں، تو اُن کے صاف کرنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، اسی طرح جن بالوں سے شوہر کو کراہیت ہو تو ان کو صاف کرنے کی بھی اجازت ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَلَعَلَّه مَحمُولٌ عَلیٰ مَا إِذَا فَعَلَتْهُ لِتَتَزَيَّنَ لِلأَجَانِبِ، وَإِلَّا فَلَو كَانَ فِي وَجهِهَا شَعرٌ يَنفِرُ زَوجُهَا عَنهَا بِسَبَبِهِ فَفِي تَحرِيمِ إِزَالَتِه بُعدٌ، لِأَنَّ الزِّينَةَ لِلنِّسَاءِ مَطلُوبَةٌ لِلتَّحسِينِ، إِلَّا أَنْ يُحمَلَ عَلیٰ مَا لَا ضَرُورَةَ إِلَيهِ لِمَا فِي نَتفِهِ بِالمِنمَاصِ مِنَ الإِيذَاءِ۔ وَفِي ''تَبيِينِ المَحَارِمِ'' إِزَالَةُ الشَّعرِ مِنَ الوَجهِ حَرَامٌ، إِلَّا إِذَا نَبَتَ لِلمَرأَةِ لِحيَةٌ أَو شَوَارِبُ فَلَا تَحرُمُ إِزَالَتُهُ بَل تُستَحَبُّ۔ وَفِي ''التَّاتَرخَانِيَةِ'' عَنِ ''المُضمَرَاتِ'': وَلَا بَأسَ بِأَخذِ الحَاجِبَينِ وَشَعرِ وَجهِهِ مَا لَم يُشبِهِ المُخَنَّثَ۔

ترجمہ: ''شاید یہ ممانعت کا حکم اس پر محمول ہے کہ (کوئی عورت) اجنبی مردوں کے سامنے اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کے لیے یہ کام کرے، ورنہ اگر کسی عورت کے چہرے پر ایسے بال ہیں کہ اُن کی وجہ سے اس کا شوہر اس سے نفرت کرتا ہے (یا اعراض کرتا ہے)، تو ایسے بالوں کا ازالہ کرنے (یعنی ہٹانے) کو حرام قرار دینا (حکمتِ شرعی سے) بعید بات ہے، سوائے اس کے اس کی حرمت کو ایسے بالوں کے دور کرنے پر محمول کیا جائے، جن کے ازالے کی ضرورت نہیں ہے اور ان کو نوچنے میں ایذا بھی ہے، ''تبیین المحارم'' میں ہے: چہرے سے بالوں کا دور کرنا حرام ہے، مگر جب عورت کے چہرے پر ڈاڑھی یا مونچھیں اُگ آئیں، تو ان کا دور کرنا حرام نہیں بلکہ مستحب ہے۔ اور ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' میں ''مضمرات'' کے حوالے سے ہے: اَبروؤں اور چہرے کے (غیر ضروری) بالوں کو دور کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جب تک کہ مُخنث سے مُشابہت نہ ہو''۔

(جلد 9، ص:455، بیروت)

اسی طرح ابرو (بھنوؤں) کے بال اگر عام حالت سے زیادہ بڑے ہوئے ہیں اور چہرہ عیب دار معلوم ہوتا ہو تو شرعاً اُس عیب کو ختم کرنے کی غرض سے ان بالوں کو کم کر کے عام حالت کے مطابق کیا جا سکتا ہے، البتہ بغیر کسی عذر کے بالوں کو عام حالت سے کم یا مصنوعی طریقے سے زیادہ کرنا جائز نہیں ہے۔ فقہاء نے ممانعت کے تین سبب بیان کیے ہیں:

(۱) تَغیِیرِ لِخَلقِ اللہ یعنی اللہ کے بنائے ہوئے اعضا اور شکل وصورت میں تبدیلی کرنا۔

(۲) تَزَیُّنُ لِلاَجَانِب یعنی غیر محرم مردوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے خود کو مزین کرنا۔

(۳) خود کو بلا وجہ اذیت دینا۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک باب بعنوان: ''اَلْمُتَشَبِّهُونَ بِالنِّسَاءِ، وَالْمُتَشَبِّهَاتِ بِالرِّجَالِ'' باندھا، جس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

''لَعَنَ رَسُولُ اللہ ﷺ اَلْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ، وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ

النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ۔

ترجمہ:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں سے مشابہت رکھنے والے مردوں اور مردوں سے مشابہت رکھنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے''۔(صحیح بخاری:5885)

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:''أَیْ: هٰذَا بَابٌ فِیْ بَیَانِ ذَمِّ الرِّجَالِ الْمُتَشَبِّهِیْنَ بِالنِّسَاءِ وَبَیَانِ ذَمِّ النِّسَاءِ الْمُتَشَبِّهَاتِ بِالرِّجَالِ، وَیَدُلُّ عَلٰی ذٰلِكَ ذِکْرُ اللَّعْنِ فِیْ حَدِیْثِ الْبَابِ وَتَشَبُّهُ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ فِی اللِّبَاسِ وَالزِّیْنَةِ الَّتِیْ تَخْتَصُّ بِالنِّسَاءِ مِثْلُ لُبْسِ الْمَقَانِعِ وَالْقَلَائِدِ وَالْمَخَانِقِ وَالْأَسْوِرَةِ وَالْخَلَاخِلِ وَالْقُرْطِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ مِمَّا لَیْسَ لِلرِّجَالِ لُبْسُهٗ، وَتَشَبُّهُ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ مِثْلُ لُبْسِ النِّعَالِ الرِّقَاقِ وَالْمَشْیِ بِهَا فِیْ مَحَافِلِ الرِّجَالِ وَلُبْسِ الْأَرْدِیَةِ وَالطَّیَالِسَةِ وَالْعَمَائِمِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ مِمَّا لَیْسَ لَهُنَّ اِسْتِعْمَالُهٗ،

ترجمہ:''یعنی اس باب میں اُن مردوں کی مذمت کا بیان ہے، جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور ان عورتوں کی مذمت کا بیان ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اس باب کی احادیث میں ان پر لعنت کی گئی ہے اور مردوں کا عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے کی صورت یہ ہے کہ ان جیسا لباس یا زینت اختیار کی جائے، مثلاً مرد وہ زیور پہنے جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً گلے کا ہار، کانوں کی بالیاں اور بُندے، پازیب، کنگن، ریشمی کپڑوں کا پہننا اور سونے کی انگوٹھی وغیرہ پہننا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو مردوں کے پہننے کے لیے نہیں ہیں اور عورتوں کی مردوں کے ساتھ مشابہت ایسی چیزوں میں ہے جو مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے مردوں کی مانند جوتے، کپڑے اور پگڑیاں اور دستار وغیرہ پہننا اور اس طرح کا مردانہ لباس پہن کر مردوں کی مجالس میں جانا، یہ ایسی چیزیں ہیں جو عورتوں کے استعمال کے لیے نہیں ہیں''۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد22،ص:63)

اگر مرد کے ہاتھوں پر ایسے بال ہیں کہ وہ بھدے نظر آتے ہیں، جس سے آدمی کریہہ المنظر

ہو جاتا ہے، تو ان کو زائل کرنا درست ہے، لیکن جس طرح آج کل فلموں، ڈراموں اور ٹی وی پروگراموں میں مردوں کا بھی باقاعدہ عورتوں کی طرح باقاعدہ میک اَپ کیا جاتا ہے اور ایک مصنوعی سی شکل بنائی جاتی ہے، جسے آج کل Facial کہتے ہیں، یہ "تَشَبُّہ بِالنِّسَاء" کے زمرے میں آئے گا اور ممنوع ہے۔

نعت خوان کے خلاف شرع ریمارکس

سوال:

میں محافلِ نعت میں بحیثیت نقیبِ محفل شرکت کرتا رہتا ہوں اور میں خود بھی اکثر محافلِ نعت منعقد کراتا ہوں۔ اکثر رشتے داروں اور احباب کے یہاں محافل منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ایک نعت خواں کے وقت کی پابندی نہ کرنے، جھوٹ بولنے اور فقرے بازی کی وجہ سے میں نے اُس کو بلانا چھوڑ دیا، اب جہاں کہیں محفل میں وہ نعت خواں ہوتا ہے، مجھ پر جملے بازی شروع کر دیتا ہے، میں نے یہ طے کیا کہ آئندہ اس نعت خواں کو نہیں سنوں گا۔ جب میں نے یہ عمل کیا تو اُس نے مائک پر بھرے مجمع میں کہا: "میں جیسے ہی نعت پڑھنے بیٹھتا ہوں، شیطان اٹھ کر چلا جاتا ہے"۔ لوگ اُس نعت خواں کو سمجھانے کے بجائے مجھے یکطرفہ طور پر اُس نعت خواں کو معاف کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اور مجھ پر زور دے رہے ہیں کہ میں اُس کے گھر جا کر اُس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں۔ اِس بارے میں شرعی احکام جاننا چاہتا ہوں کہ اُس نعت خواں کے مذکورہ الفاظ کیا حکم رکھتے ہیں؟، (محمد اشرف رشید، کراچی)۔

جواب:

دینِ اسلام ایک مکمل ضابطہ و دستورِ حیات ہے، جس میں ہر شعبۂ زندگی کے افراد کے لیے روشن ہدایات موجود ہیں۔ ہر شخص اَخلاقی اَقدار کا پابند ہے، دوسروں کا احترام لازم ہے، کسی کا تمسخر اُڑانا یا برے القاب سے پکارنا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ

اِلْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ: ''اے ایمان والو! مردوں کا کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ ان (مذاق اڑانے والوں) سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور تم ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے بلاؤ، ایمان کے بعد فاسق کہلانا کتنا برا نام ہے اور جو لوگ توبہ نہ کریں تو وہی ظالم ہیں''۔ (الحجرات:11)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أَلَا أُخْبِرُکُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ کُلُّ ضَعِیفٍ مُتَضَعِّفٍ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ، أَلَا أُخْبِرُکُمْ بِأَهْلِ النَّارِ کُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَکْبِرٍ۔ ترجمہ: ''کیا میں تمہیں اہل جنت کی خبر نہ دوں، وہ بہت زیادہ کمزور شخص ہوتا ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ (کے کرم پر یقین کامل رکھتے ہوئے) کسی کام کے کرنے کی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ وہ کام کر کے اس کو ضرور اس کی قسم میں سچا کر دیتا ہے اور کیا میں تمہیں اہل دوزخ کی خبر نہ دوں، وہ ہر بدخصلت، اُجڈ اور مُتکبر ہوتا ہے''۔ (سنن ابن ماجہ:4116)

نعت خوانی دراصل رسول اللہ ﷺ سے عقیدت اور ادب کے اظہار کا ایک سلیقہ ہے، اور اس عقیدت وادب کا تقاضا یہ ہے کہ کلام پڑھنے والے اور سننے والے دونوں ہی باادب ہونے چاہییں۔ ادب کے یہ تقاضے قرآن وسنّت اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سیکھنے کو ملتے ہیں۔ سچائی، وقت کی پابندی اور عمدہ اخلاق ایک مومن کا زیور ہیں اور تعلیماتِ مصطفیٰ ﷺ کا منشا بھی۔ ثنا خوانِ مصطفیٰ ﷺ کو تو ان کمالات سے مُتصف ہونا ہی چاہیے۔ حدیث پاک میں ہے:

قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ أَیَکُونُ الْمُؤمِنُ جَبَانًا، فَقَالَ: نَعَمْ، فَقِیْلَ لَهُ: أَیَکُونُ الْمُؤْمِنُ بَخِیلًا، فَقَالَ: نَعَمْ، فَقِیْلَ لَهُ: أَیَکُونُ الْمُؤمِنُ کَذَّابًا، فَقَالَ: لَا۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہاں، پھر پوچھا گیا کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، پھر پوچھا گیا کہ کیا

مومن جھوٹا ہوسکتا ہے،فرمایا:نہیں''۔

(موطاامام مالک:2832، 3630، شعب الایمان، جلد10 ،ص: 326، رقم الحدیث:4472)

حدیث پاک میں کسی مسلمان کی تحقیر کو شر سے تعبیر فرمایا ہے:

بِحسبِ امرِءٍ مِنَ الشَّرِ أَن یَحقِرَ أَخَاہُ المُسلِمَ

ترجمہ:''کسی مسلمان کے شریر ہونے کے لیے اتنا ثبوت کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے''۔(صحیح مسلم:2564)

جو نعت خواں آپ سے نفرت کرتا ہے،اس کی محفل میں آپ کا جانا شرعاً ضروری تو نہیں ہے اور نہ ہی ہر محفلِ نعت میں شریک ہونا ضروریاتِ دین میں سے ہے۔اگر کوئی شخص کسی محفل وعظ، درس وتدریس یا محفل نعت میں بیٹھا ہے اور اپنی ضرورت کے لیے یا طبیعت کے عدمِ استحضار کی وجہ سے اُٹھ کر چلا جاتا ہے،تو اس پر ملامت کرنے کا شرعاً کسی کو حق نہیں ہے۔محفل نعت میں باادب ہوکر بیٹھنا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے اور ترکِ مستحب پر کسی کو ملامت کرنا،اُسے واجب کا درجہ دینا ہے اور یہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اختیار ہے نہ کہ کسی واعظ یا نعت خواں کا۔ایسے لوگ جو شریعت کے احکام کی پاس داری نہ کریں اور عُجْب، تَعَلِّی اور تَکَبُّرو اِسْتِکْبار میں مبتلا ہوں،ان کو مجالس میں نہیں بلانا چاہیے۔ایک صحیح العقیدہ مسلمان کو محض ذاتی نفرت کی بنا پر تعریضاً وتوریۃً یعنی اشارات وکنایات میں شیطان کہنا، یہ دین پر بہت بڑی جسارت ہے اور اس پر اُسے اُسی مجمع میں توبہ کرنی چاہیے، کیونکہ علانیہ گناہ کی توبہ بھی علانیہ ہوتی ہے۔

کیا یہ ناشکری ہے

سوال:

آج سے دوسال قبل میں دوبئی گیا تھا،ان دوسالوں میں ہر دن یہی سوچتا تھا کہ میں ویزاختم کر کے اپنے وطن جاؤں گا اور جاب کروں گا۔دوسال ختم ہوگئے اور میں وطن واپس آگیا، چھ ماہ سے بے روزگار ہوں۔اب لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تم سے ناراض ہے کہ تم نے

رزق کی قدر نہیں کی، کیا میں اللہ کا دیا ہوا رزق ٹھکرا کر واپس آیا ہوں، اس لیے اب مجھے جاب نہیں مل رہی۔ میرے خدشات دور کرنے کے لیے جواب ضرور عنایت فرمائیں۔

(موہن رضا)

جواب:

جی ہاں! اسے آپ ناشکری اور بے تدبیری دونوں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ روزی اور روزگار کا کوئی وسیلہ عطا فرمائے تو اُس کی قدر کرنی چاہیے۔ حدیث پاک میں ہے: عَنْ نَافِعٍ، قَالَ: كُنْتُ أُجَهِّزُ إِلَى الشَّامِ وَإِلَى مِصْرَ، فَكَانَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ يَرْزُقُ خَيْرًا كَثِيْرًا. فَجَهَّزْتُ إِلَى الْعِرَاقِ فَلَمْ يَرْجِعْ رَأْسُ مَالِي، فَدَخَلْتُ عَلَىٰ عَائِشَةَ، فَقَالَتْ: يَا بُنَيَّ، الْزَمْ تِجَارَتَكَ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ، يَقُوْلُ: إِذَا فُتِحَ لِأَحَدِكُمْ رِزْقٌ مِنْ بَابٍ فَلْيَلْزَمْهُ

ترجمہ: حضرت نافع بیان کرتے ہیں: میں سامانِ تجارت لے کر شام اور مصر کی طرف جایا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ مجھے کشادہ رزق عطا فرماتا تھا۔ پھر میں سامانِ تجارت لے کر عراق گیا تو اصل مال بھی واپس نہ لا سکا (یعنی اتنا خسارہ ہوا کہ اصل سرمایہ بھی گھٹ گیا)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میرے ہاں تشریف لائیں تو فرمایا: اے پیارے بیٹے تم اپنی تجارت کا (مصر و شام والا سلسلہ) سلسلہ جاری رکھو، کیونکہ میں نے سنا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کے لیے رزق کا کوئی دروازہ (یعنی ذریعۂ معاش) کھول دیا جائے (یعنی اللہ کی طرف سے مقدر ہو جائے) تو اسے لازم پکڑو۔ (الآداب للامام بیہقی: 789)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وسیلۂ معاش مقدر ہو جائے اسے بلا وجہ ترک نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ بہتر مُتبادل کی تلاش میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جب تک مُتبادل وسیلۂ روزگار ہاتھ نہ آئے تو پہلے سے دستیاب وسیلے کو چھوڑنا نہیں چاہیے، یہ کسی حد تک ناشکری بھی ہے اور بے تدبیری بھی۔ اپنے وطن سے محبت بلا شبہ قابلِ قدر ہے، لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستان میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی روزگار کے حصول میں

مشکل پیش آرہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ہر پاکستانی کو پاکستان میں باعزت روزگار ملے اور اُسے بیرونِ ملک طلبِ معاش کے لیے سرگرداں نہ ہونا پڑے۔

اب چونکہ آپ دبئی میں روزگار چھوڑ کر پاکستان آگئے ہیں، توحصولِ روزگار کے لیے جدوجہد کریں اور اللہ تعالیٰ سے رزق کی کشادگی کی دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ

ترجمہ:''اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے (مشکل سے) نکلنے کی کوئی سبیل مقدر فرما دیتا ہے اور اس کو وہاں سے رزق عطا فرما دیتا ہے، جہاں سے اُس کا گمان بھی نہیں ہوتا اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہ اسے کافی ہے، (طلاق:3-2)''۔ ہمارا یہ بھی ایمان ہونا چاہیے کہ جو رزق ہمارے مقدر میں لکھا ہوا ہے، وہ مل کر رہے گا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞

ترجمہ:''آپ فرمایئے! ہمیں ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، ماسوا اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر دی ہے، وہی ہمارا مالک ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے (توبہ:51)''۔ توکل کا معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان عمل سے دست بردار ہوجائے اور رزق کے اسباب کو تلاش کرنا چھوڑ دے بلکہ توکل کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق جد وجہد کرے، اسباب کو اختیار کرے اور اپنی محنت کے بارآور ہونے کے لیے اسباب پر نہیں بلکہ خداوند مُسبّبُ الاسباب پر بھروسا کرے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِنَّ الرِّزْقَ لَيَطْلُبُ الْعَبْدَ كَمَا يَطْلُبُهُ أَجَلُهُ۔

ترجمہ:''حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رزق اسی طرح بندے کے تعاقب میں ہوتا ہے جس طرح موت اس کے تعاقب میں

ہوتی ہے''۔(صحیح ابن حبان:3238)

بعض اوقات انسان کو کامیابی ملنے میں تاخیر ہوجاتی ہے اور انسان بے صبرے پن اور مایوسی کا شکار ہوتا ہے، یہ سوچ اور رویہ درست نہیں ہے، ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہوتی ہے، حدیثِ پاک میں ہے: عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا تَسْتَبْطِئُوا الرِّزْقَ، فَإِنَّهُ لَنْ يَمُوْتَ الْعَبْدُ حَتّٰى يَبْلُغَهُ آخِرُ رِزْقٍ هُوَ لَهُ، فَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ: أَخْذِ الْحَلَالِ وَتَرْكِ الْحَرَامِ۔

ترجمہ:''حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رزق کے حصول میں تاخیر کو (محرومی) نہ سمجھو، کیونکہ بندہ جب تک کہ اپنے حصے کا مقررہ رزق نہ پالے، اُسے موت ہرگز نہیں آئے گی، سوتم اچھے طریقے سے رزق طلب کرو حلال کو لینے والے اور حرام سے بچنے والے بنو، (صحیح ابن حبان:3239)''۔لہٰذا آپ کو مشورہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر، جو کہ چٹان کے اندر کیڑے کو بھی اُس کے حصے کا رزق پہنچاتا ہے، ایمان پختہ رکھو، اُس کی ذات سے اُمید کا رشتہ قائم رکھو اور فرائض وواجبات اور سُنن ومستحبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ کثرت سے دعا کرو۔

حدیث پاک میں ہے: ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ہر رات سورۂ واقعہ پڑھی، وہ کبھی فاقے سے نہیں رہے گا''۔(شعب الایمان:2498)

(۲) ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اپنی عورتوں کو سورۂ واقعہ سکھاؤ کیونکہ یہ خوشحال کرنے والی سورت ہے''۔(الفردوس بماثور الخطاب:4005)

ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: دنیا نے مجھ سے پیٹھ موڑ لی ہے (یعنی رزق میں برکت نہیں، بہت تنگدست ہوں)، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں وہ تسبیح یاد نہیں جو ملائکہ کی تسبیح ہے؟، جس کی برکت سے روزی دی جاتی ہے، خلقِ دنیا تیرے پاس ذلیل وخوار ہوکر آئے گی، طلوعِ فجر (صبحِ صادق) کے ساتھ سو بار پڑھا کرو:''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ، وَبِحَمْدِهٖ أَسْتَغْفِرُ اللّٰه'' سات دن

گزرے تھے کہ وہ صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ''حضور میرے پاس اس کثرت سے آرہا ہے کہ حیران ہوں کہاں اٹھاؤں کہاں رکھوں''۔

(ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت، حصہ اول)

بعد نمازِ عشاء برہنہ سر کھلے آسمان کے نیچے پانچ سو بار روزانہ ''یا مُسَبِّبَ الاسباب'' اول آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھیے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 5، قدیم)

بعد نمازِ فجر 400 مرتبہ ''یَا رَزَّاقُ یَا اَللّٰہُ'' اور بعد نمازِ عشاء ''اَللّٰہُ رَبِّیْ لَا شَرِیْکَ لَہٗ'' 874 مرتبہ پڑھیں اور اپنے مقصد کے لیے دعا کریں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''سورۂ یٰسٓ جس مقصد کے لیے بھی پڑھی جائے اسی کے لیے ہے''۔

نام بگاڑنا

سوال:

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی نسبت سے بچے کا نام حسان رکھا گیا ہے۔ اگر کوئی بچے کا نام بگاڑ دے، اُس کو مختصر کر کے حسّو پکارے تو شرعی حکم کیا ہے؟۔

(عبید الرحمٰن نیازی، گلشن اقبال کراچی)

جواب:

نسبت سے عقیدت کی وجہ سے امت میں نیک لوگوں کے نام پر نام رکھنے کی روایت ہمیشہ موجود رہی ہے، کیونکہ اکابر کے نام پر نام رکھنے میں نسبت کی فضیلت کا حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ شریعتِ مُطہرہ میں برے ناموں سے پکارنے کی ممانعت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ: ''اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے بلاؤ، ایمان کے بعد فاسق کہلانا کتنا برا کام ہے اور جو لوگ توبہ نہ کریں تو وہی ظالم ہیں''۔ (الحجرات: 11)

نام کی تصغیر یعنی مختصر کرنا درست نہیں ہے بلکہ اگر اسماءالٰہیہ میں سے نام ہو اور قصداً اُس کی تصغیر کی گئی ہو تو کفر ہے۔صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

''ہاں اس زمانہ میں چونکہ عوام میں ناموں کی تصغیر کرنے کا بکثرت رواج ہو گیا ہے، لہٰذا جہاں ایسا گمان ہو ایسے نام سے بچنا ہی مناسب ہے۔خصوصاً جب کہ اسماءالٰہیہ کے ساتھ عبد کا لفظ ملا کر نام رکھا گیا،مثلاً عبدالرحیم،عبدالکریم،عبدالعزیز کہ یہاں مضاف الیہ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور ایسی صورت میں تصغیر اگر قصداً ہوتی تو معاذ اللہ کفر ہوتی، کیونکہ یہ اس شخص کی تصغیر نہیں بلکہ معبود برحق کی تصغیر ہے مگر عوام اور ناواقفوں کا یہ مقصد یقیناً نہیں ہے،اسی لیے وہ حکم نہیں دیا جائے گا بلکہ ان کو سمجھایا اور بتایا جائے اور ایسے موقع پر ایسے نام ہی نہ رکھے جائیں جہاں یہ احتمال ہو''۔(بہارِ شریعت،جلد سوم،ص:602)

خلاصۂ کلام یہ کہ نام کا بگاڑنا،کسی کو برے نام یا نسبت سے پکارنا،سوائے اس کے وہ نام ان شخصیات کا عرف بن چکے ہوں،جیسے حداد،قدوری،حافی،غزالی،قصاف وغیرہ۔ لہٰذا حسان نام کو بگاڑ کر حَسُّو پکارنا بھی ناپسندیدہ ہے،ان کو نرمی اور حکمت سے سمجھایا جائے،اس پر کوئی فتویٰ لگانا درست نہیں ہے۔

عائشہ نام رکھنا

سوال:

میرا بیٹا خرم حسن کینیڈا میں مقیم ہے،اُن کی پہلی بیٹی کا نام سعدیہ ہے اور دوسری کا نام عائشہ رکھا ہے۔میرے بیٹے نے معلوم کیا ہے کہ عائشہ نام کیسا ہے؟۔کیونکہ وہ زیادہ چست، ہوشیار محسوس نہیں ہوتی،کیا اس کا نام تبدیل کر دیا جائے؟،(مخدوم صدیقی،کراچی)۔

جواب:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّکُمْ تُدْعَوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِاَسْمَائِکُمْ وَاَسْمَاءِ آبَائِکُمْ، فَاَحْسِنُوْا اَسْمَاءَکُمْ ترجمہ:''تم قیامت کے دن اپنے ناموں اور اپنے باپوں کے ناموں سے پکارے جاؤ گے،سو اپنے اچھے نام رکھو، (سُنن ابوداؤد:4938)''۔اس سے معلوم ہوا

کہ قیامت کے دن حضرت آدم علیہ السلام کے استثناء کے ساتھ ہر ایک کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا اور یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ ماں کے نام سے پکارا جائے گا، درست نہیں ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ماں کے نام سے پکارا جانا اُن کا اعزاز واختصاص ہے، کیونکہ اُن کی ولادت اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خرقِ عادت کے طور پر باپ کے بغیر ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تَسَمَّوا بِأَسْمَاءِ الْأَنْبِيَاءِ، وَأَحَبُّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللهِ: عَبْدُ اللهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ، وَأَصْدَقُهَا حَارِثٌ وَهَمَّامٌ، أَقْبَحُهَا حَرْبٌ وَمُرَّةٌ۔

ترجمہ: ''انبیاءِ کرام کے نام پر اپنے (بچوں کے) نام رکھو، اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں اور سب سے سچے نام حارث اور ہمام ہیں اور سب سے برے نام حرب اور مُرّہ ہیں''۔ (سُنن ابوداؤد: 4940)

''ھَمَّامٌ'' کے معنی ہیں: کسی بات کا ارادہ کرکے اُسے کر گزرنے والا، یعنی اُولُوالعزم اور ہُمام کے معنی ہیں: بلند ہمت بادشاہ، سخی سردار، شیر وغیرہ اور حارث کے معنی کاشت کرنے کے ہیں اور یہ شیر کی کُنیت بھی ہے اور اس اعتبار سے یہ شجاعت کے معنی میں ہوگا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دینی اکابر کے نام پر نام رکھنا چاہیے اور اس صورت میں معنی کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ نسبت کا اعتبار ہوگا۔ پس عائشہ نام کو اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نسبت ہے اور اس لحاظ سے یہ پسندیدہ نام ہے۔ عائشہ معنوی اعتبار سے طویل زندگی اور اچھے حالات سے عبارت ہے، اس بابرکت نام کو بدلنا نہیں چاہیے، یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہوگی۔ دین کا مسئلہ جاہل عاملوں کی بجائے علماءِ کرام سے پوچھنا چاہیے۔ اگر نام کے معنی نامناسب ہوں اور کسی مُقدّس شخصیت سے نسبت بھی نہ ہو تو اُسے بدل دینا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے: سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں:

أَنَّ جَدَّهُ حَزْنًا قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: مَا اسْمُكَ قَالَ: اِسْمِي حَزْنٌ، قَالَ: بَلْ أَنْتَ سَهْلٌ قَالَ: مَا أَنَا بِمُغَيِّرٍ اِسْمًا سَمَّانِيهِ أَبِي، قَالَ ابْنُ الْمُسَيِّبِ: فَمَا زَالَتْ فِينَا

اَلْحُزُوْنَۃُ بَعْدُ۔

ترجمہ: ''اُن کے دادا کا نام حَزن تھا، وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟، اُنہوں نے عرض کی: میرا نام حَزن ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلکہ تم سَہل ہو، اُنہوں نے عرض کی: میں اپنے باپ کے رکھے ہوئے نام کو تبدیل نہیں کروں گا، سعید بن مُسیّب بیان کرتے ہیں کہ ہمارے خاندان کے مزاج میں ہمیشہ سختی رہی ہے''۔ (صحیح بخاری:6193)

حَزن کے معنی سختی کے ہیں اور سَہل کے معنی نرمی کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صورتوں میں نام کے معنوی اَثرات مُرتب ہوسکتے ہیں، اگرچہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ بُرے نام کو تبدیل فرمادیتے تھے''۔

(سُنن ترمذی:2839)

رسول اللہ ﷺ نے جو نام تبدیل فرمائے وہ یہ ہیں: ''آپ نے اصرم (یہ صرم یعنی کاٹنے کے معنی میں اسمِ تفضیل ہے) نام کو بدل کر ''زرعہ'' رکھا، اس کے معنی بیج کے ہیں یعنی قابلِ کاشت زمین۔ اسی طرح آپ نے عاص، عزیز، عَتلہ، شیطان، حَکم، غُراب (دوری، کوا)، حُباب (شیطان کا نام) اور شہاب (آگ کا شعلہ) ناموں کو بھی تبدیل فرمایا۔ عاص کا مادہ اگر عصیان ہو تو اس کے معنی ہیں نافرمان۔ عزیز کے معنی ہیں غالب اور یہ اللہ کی صفت ہے، بندے کی صفت عبد ہے جو تذلّل، تواضع اور خشوع وخضوع کے معنی میں آتا ہے، لہٰذا عبدالعزیز نام رکھنا چاہیے، عَتلہ کے معنی سختی کے ہیں۔

حضرت زینب بیان کرتی ہیں کہ میرا نام ''بَرّہ'' (بہت نیک) رکھا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اپنی پاکیزگی (پارسائی) کا دعویٰ نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، پاک فرماتا ہے''۔ (۲) اور تم میں سے نیکوکاروں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، (صحیح بخاری:6192)''۔ سو ایسے نام جن میں برتری کا دعویٰ ہو، رسول اللہ ﷺ نے اسے ناجائز نہیں کہا۔ رسول اللہ ﷺ کی نانی کا نام ''بَرّہ'' (بمعنی نیکوکار) تھا، لیکن یہ

اسلام سے پہلے کا دور تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی مطلقاً ممانعت بھی نہیں فرمائی۔ اسی طرح ایک اور خاتون کا نام ''بَرَّہ'' تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اُسے تبدیل کرکے ''جویریہ'' رکھ دیا، کیونکہ حضور اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی کہے: بَرَّہ یعنی نہایت نیکوکار خاتون چلی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے عاصیہ (نافرمان) نام کو بدل کر جمیلہ رکھا۔ آپ ﷺ کے سامنے مُنذِر بن اُسید (ڈرانے والا) کو لایا گیا، آپ نے اُسے اپنی گود میں لیا اور فرمایا: ''یہ مُنذَر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرا ہوا۔ آپ ﷺ نے حَکَم (حاکم کے معنی میں) نام کو بھی پسند نہیں فرمایا اور اُسے تبدیل کردیا، اسی طرح آپ ﷺ نے ''اَجدَع'' (جس کی نسل ختم ہوجائے یا جو حُجّت میں لاجواب ہوجائے)۔ آپ ﷺ نے مَلِکُ المُلُوک یا شہنشاہ نام کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ بادشاہوں کا بادشاہ یا حقیقی بادشاہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات ناموں سے نیک فال لیتے تھے، جیسے صلح حدیبیہ کے موقع پر سُہیل بن عمرو قریشِ مکہ کا سفارتی نمائندہ بن کر آیا تو آپ نے اس سے نیک فال مراد لی اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارا معاملہ آسان کردیا''۔ (سُبُل الھدیٰ والرشاد، جلد 5، ص: 52)

غیر قانونی واٹر کنکشن کا مسئلہ

سوال:

کراچی شہر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے 200 کلومیٹر دور سے پانی لایا جاتا ہے، پانی لانے اور شہر کے اندر دور دراز علاقوں تک پہنچانے کے لیے بجلی یا ڈیزل جنریٹر سے چلنے والے پمپس کے ذریعے شہریوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ان کاموں کے لیے ہزاروں کی تعداد میں عملہ رکھا جاتا ہے۔ اربوں روپے سالانہ اخراجات ہوتے ہیں، جو شہریوں کی طرف سے کنکشن فیس اور ٹیکس کی ادائیگی کی صورت میں جمع ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مساجد، امام بارگاہوں اور دیگر عبادت گاہوں میں حکومتی طریقہ کار کو نظر انداز کرکے غیر قانونی کنکشن لینے کی ازروئے شرع کیا حیثیت ہے؟۔ کیا ان اداروں کی انتظامیہ کو ماہانہ ٹیکس کی عدم ادائیگی کی اجازت ہے؟۔ چونکہ فقہاء نے قبضے کی زمین پر بنائی گئی مسجد میں

نماز کو جائز قرار نہیں دیا ہے، تو کیا ناجائز کنکشن کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے؟۔ اور ایسی مساجد جہاں چوری کے کنکشن لیے گئے ہوں، نماز کی ادائیگی درست ہے؟۔

(مصباح الدین فرید، منیجنگ ڈائرکٹر کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ)

جواب:

پانی کا غیر قانونی کنکشن خواہ وہ کسی بھی مقصد کے لیے لیا جائے، ناجائز ہے۔ مسلمان کو اپنی عزتِ نفس کے تحفظ کے لیے اور قانون شکنی کی صورت میں ممکنہ ذلت سے بچنے کے لیے ملک کے ان تمام قوانین کا احترام کرنا چاہیے جو شریعت کے احکام سے متصادم نہیں ہیں۔ حدیث پاک میں ہے:

لَایَنبغِی لِلمُؤمِنِ أَن یُذِلَّ نَفسَہُ، قَالُوا: وَکَیفَ یُذِلُّ نَفسَہُ؟، قَالَ: یَتَعَرَّضُ مِنَ البَلَاءِ لِمَا لَایُطِیقُ۔

ترجمہ: ''مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خود کو ذلیل ورسوا کرے، صحابہ نے عرض کی: (یارسول اللہ!) وہ کیسے اپنے آپ کو ذلیل کرے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ خود کو ایسی مشکل سے دوچار کرے، جس سے عہدہ برا ہونے کی وہ طاقت نہیں رکھتا''۔

(سُنن ترمذی: 2254)

پس ملکی قوانین کی پاس داری ہر شخص پر لازم ہے۔ اسلام قطعاً کسی نیکی کی آڑ میں گناہ یا قانون شکنی کے ارتکاب کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا مسجد، امام بارگاہ یا عبادت گاہ یا دیگر رفاہی اداروں کے لیے غیر قانونی کنکشن لینا ناجائز ہے۔ دینی ودنیوی اُمور میں غیر قانونی طرزِ عمل کو جواز کی سند عطا کرنا اور اس کے لیے حیلے سے کام لینا جائز نہیں ہے۔ ایک سچا مومن کبھی کسی بھلائی کو پانے کے لیے برائی کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ یقینی طور پر حکومتی و ریاستی ٹیکس کی ادائیگی مفادِ عامہ کے لیے بنائے جانے والے منصوبوں کی تکمیل، اُن پر ہونے والے اخراجات اور شہری ضروریات کے عوام الناس تک بلاتعطّل فراہمی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم حکومت کو اور قانونی طور پر بجلی، پانی اور گیس فراہم کرنے

والے اداروں کو مساجد، امام بارگاہوں اور عوامی عطیات سے چلنے والے اداروں کو خصوصی رعایت Subsidy دینی چاہیے۔

جہاں تک وضو کی درستگی اور نماز کی ادائیگی کا سوال ہے، سو اگر نماز تمام فقہی اصولوں اور شرعی احکام کے مطابق صحیح طور پر ادا کی جارہی ہے، تو فقہی طور پر کہا جائے گا کہ نماز درست ہے اور نماز صحیح طور پر ادا ہوگئی اور بندہ ادائے فرض سے بری الذمہ ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت اُس کی رضا پر موقوف ہے اور اس کا علم اسی کے پاس ہے۔ دنیا میں حکم ظاہر پر لگایا جاتا ہے، باطن کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے۔ تاہم اکلِ حرام اور کسبِ حرام کا اثر عبادات اور دعاؤں کی قبولیت پر یقیناً مرتب ہوتا ہے، حدیث پاک میں ہے: عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ''لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُورٍ، وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُولٍ''۔ ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) طہارت کے بغیر نماز مقبول نہیں اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں''۔ (سنن ترمذی: 1)

عام نمازی جن کا مسجد میں پانی کی چوری سے کوئی تعلق نہیں، نہ اُن کی مرضی سے یہ عمل کیا جاتا ہے، اُن کی نمازوں پر سوال اٹھانا بے محل ہے۔ آپ مُجاز ادارے کے سربراہ ہیں اور آپ اپنے اختیارات سے مساجد و امام بارگاہوں کے لیے رعایت کا راستہ نکال سکتے ہیں، یہ آپ کا نیکی کے کام میں تعاون ہوگا۔

پانی کی چوری کے ساتھ ساتھ ایک مسئلہ پانی کے ضیاع کا بھی ہے اور اس میں جتنا کردار عوام کا ہے، اتنا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ پانی کی فراہمی کے حکومتی ادارے Water & Sewerage Board کا عملہ اس کا ذمے دار ہے۔ آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کہیں پانی کی سپلائی لائن یعنی پائپ میں رساؤ (Leakage) شروع ہوجائے تو کئی دنوں یا ہفتوں یا مہینوں تک کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ اور نہ صرف یہ کہ پانی کا ضیاع ہوتا ہے بلکہ نئی تعمیر شدہ سڑکیں تباہ و برباد ہوجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ پانی کی

ترسیل کے غیر قانونی نلکے (Hydrant) جا بجا لگے ہوئے ہیں، جہاں سے کاروباری بنیادوں پر پانی کے ٹینکر بھرے جاتے ہیں اور فروخت کیے جاتے ہیں، اس کاروبار کو قانونی شکل دیدی جائے تو بہتر ہے، ورنہ واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کا عملہ جو واٹر لائن کی حفاظت پر مامور ہے، شریکِ جرم سمجھا جائے گا۔

آپ نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے دلیل کے طور پر یہ لکھا کہ''فقہاء نے قبضے کی زمین پر بنائی گئی مسجد میں نماز کو جائز قرار نہیں دیا''، درست نہیں۔ فقہ حنفی میں غصب شدہ زمین پر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اَلصَّلٰوۃُ فِیْ أَرْضٍ مَغْصُوبَۃٍ جَائِزَۃٌ وَلٰکِنْ یُعَاقَبُ بِظُلْمِہٖ فَمَا کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اللّٰہِ تَعَالٰی یُثَابُ وَمَا کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْعِبَادِ یُعَاقَبُ کَذَا فِیْ ''مختار الفتاویٰ''۔

ترجمہ:''غصب شدہ زمین میں نماز جائز تو ہے (یعنی پڑھنے سے ادا ہو جائے گی) لیکن ظلماً زمین غصب کرنے کے سبب اس کو سزا دی جائے گی۔ جو کچھ اُس بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے، (اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اُسے نماز کا) ثواب دے گا اور جو کچھ اُس کے اور بندوں کے درمیان ہے، اس کا مواخذہ کیا جائے گا، جیسا کہ''مختار الفتاویٰ'' میں ہے، ایسے تمام مقامات پر شرائط وارکانِ صلاۃ کے پائے جانے کی وجہ سے نماز جائز ہے لیکن غیر مکروہ طریقے سے نماز کا اعادہ بہتر ہے، جو نماز کراہت کے ساتھ ادا کی گئی ہو اُس کا یہی حکم ہے۔ ہدایہ میں اسی طرح مذکور ہے، اگر کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہو تو نماز واجب الاعادہ ہے اور کراہتِ تنزیہی کی صورت میں اعادہ مستحب ہے کیونکہ کراہت تحریمی کا ممنوعات میں وہی درجہ ہے جو مامورات میں واجب کا ہے،''فتح القدیر'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:109، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ طحطاوی متوفیٰ 1231ھ لکھتے ہیں: (وَ) یُکْرَہُ فِی (أَرْضِ الْغَیْرِ بِلَا رِضَاہُ)

ترجمہ:''کسی شخص کی زمین پر اُس کی مرضی کے بغیر نماز پڑھنا مکروہ ہے، (حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 1، ص:484)''۔ پس آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ غصب شدہ زمین پر نماز مکروہ ہے۔

الغرض مساجد یا عبادت گاہوں کے منتظمین کے لیے بلاشبہ قانون شکنی کی اجازت نہیں ہے اور انہیں قانونی طریقے سے مُجاز ادارے سے اس کی اجازت لینی چاہیے۔ لیکن حکومت اور حکومتی اداروں پر بھی لازم ہے کہ مساجد کو مفت یا نہایت مناسب نرخوں پر یہ سہولتیں فراہم کریں اور انہیں ٹیکس سے مُستثنیٰ قرار دیں۔ کیونکہ دستورِ پاکستان کی رُو سے یہ حکومت کی ذمے داری ہے کہ وہ مسلمانوں کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے سہولتیں فراہم کرے۔ ہم نے اپنے دارالعلوم نعیمیہ اور جامع مسجد اقصیٰ کے لیے کنویں کھودے ہوئے ہیں، ان کی کھدائی اور دیگر تمام مصارف ان اداروں نے اپنے وسائل سے ادا کیے ہیں اور ان کنووں سے موٹروں کے ذریعے پانی نکالا جاتا ہے اور ان کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ سال دو سال بعد جب یہ خشک ہونے لگتے ہیں تو انہیں مزید گہرا کیا جاتا ہے۔ ہمارے اداروں میں واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کی واٹر سپلائی لائن سے پانی کا کوئی قانونی یا غیر قانونی کنکشن نہیں ہے، اس کے باوجود وقتاً فوقتاً بھاری بل بھیج دیے جاتے ہیں جو ہم نہیں ادا کر پاتے اور واٹر بورڈ کا پانی استعمال نہ کرنے کے باوجود بل بھیجنا اور قیمت طلب کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ ہم آلودگی کے نکاس کے لیے واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کی سیوریج لائن استعمال کرتے ہیں، اس کے لیے مناسب رقم پر مشتمل بل بھیجیں تاکہ ہم ادا کریں اور اپنی شرعی اور قانونی ذمے داری سے بری الذمہ ہوں۔

غیر قانونی طور پر قبضہ کیے ہوئے پلاٹوں پر خواہ مساجد بنائی گئی ہوں یا رہائشی مکانات، اس کا سبب بھی متعلقہ اداروں کی غفلت ہے، جو ان زمینوں کے کسٹوڈین اور محافظ ہیں کہ وہ بروقت کارروائی کرکے غیر قانونی تجاوزات کا سدِّ باب نہیں کرتے، اس لیے وہ بھی شریکِ جرم قرار پاتے ہیں، ورنہ ڈی ایچ اے، کنٹونمنٹ اور دیگر منظم سوسائٹیوں میں اس طرح کی غیر قانونی تجاوزات کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

محفلِ قراءت ونعت میں تالیاں بجانا

سوال:

آج کل بعض اسکولوں میں کوئی دینی پروگرام بھی ہو، کوئی بچہ نعت پڑھے یا تقریر کرے تو استاذ داد دینے کے لیے تالیاں بجاتے ہیں، کیا ایسا کرنا درست ہے؟،

(محمد ایوب، نکیال آزاد کشمیر)

جواب:

(عبادت کی نیت سے) تالیاں بجانا شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے، اور قرآن مجید میں بیت اللہ کے پاس تالیاں بجانے کو کفار کا شِعار قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ۝

ترجمہ: ''اور بیت اللہ کے پاس اُن کی نماز اس کے سوا کیا تھیں کہ یہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے، سو اب عذاب کو چکھو کیونکہ تم کفر کرتے تھے''۔ (الانفال:35)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں: قرآن مجید نے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کی جو مذمت کی ہے، اِس میں اُن جاہل صوفیہ کا رد ہے، جو رقص کرتے ہیں، تالیاں پیٹتے اور بے ہوش ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں''۔

(الجامع الاحکام القرآن، جز9،ص:399،موسسۃ الرسالہ، بیروت)

شریعت مُطہّرہ میں تالیاں بجانے کو مکروہ عمل فرمایا ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (وَكُرِهَ كُلُّ لَهْوٍ) أَيْ كُلُّ لَعِبٍ وَعَبَثٍ، فَالثَّلَاثَةُ بِمَعْنًى وَاحِدٍ كَمَا فِي ''شَرْحِ التَّأْوِيلَاتِ''، وَالْإِطْلَاقُ شَامِلٌ لِنَفْسِ الْفِعْلِ، وَاسْتِمَاعِهِ كَالرَّقْصِ وَالسُّخْرِيَةِ وَالتَّصْفِيقِ وَضَرْبِ الْأَوْتَارِ مِنَ الطُّنْبُورِ وَالْبَرْبَطِ وَالرَّبَابِ وَالْقَانُونِ وَالْمِزْمَارِ وَالصَّنْجِ وَالْبُوقِ، فَإِنَّهَا كُلَّهَا مَكْرُوهَةٌ لِأَنَّهَا زِيُّ الْكُفَّارِ،

ترجمہ: ''(ہر بیہودہ کھیل مکروہ ہے) یعنی ہر لہو ولعب اور عَبث (بے مقصد کام) تینوں (یعنی لہو،لَعب اور عبث) معنی ایک ہیں، جیسا کہ ''شرح التاویلات'' میں ہے۔ لہو کو مطلق (یعنی

کسی قید کے بغیر) ذکر کرنا نفسِ فعل اور اس کی توجہ سے سماعت کو شامل ہے، جیسے رقص کرنا، مذاق کرنا اور تالیاں بجانا، ڈھول بجانا، ستار بجانا، سارنگی بجانا، چنگ بجانا، قانون (ایک تار والا باجا) بجانا، مزامیر کا استعمال، جھانجھ (مجیرا) بجانا اور بگل بجانا، یہ سب مکروہ ہیں کیونکہ یہ عاداتِ کفار ہیں''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص:481)

تلاوتِ قرآن مجید، حمد و نعت سنتے وقت ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پوری طرح سے مُتوجہ ہو کر غور سے سنے اور اگر کہیں تحسین کرنا چاہتا ہو تو ''سبحان اللہ، ماشاء اللہ'' کہہ سکتا ہے۔ لیکن تالیاں بجا کر دینی ماحول کو لغویات و خرافات سے آلودہ کرنا اور نیکی کمانے کے بجائے الٹا گنہگار ہونا عقل و دانش کے خلاف ہے۔

آج کل دنیاوی مجالس میں کسی کو داد دینے اور تحسین و ستائش کے لیے تالیاں بجائی جاتی ہیں، یہ اگرچہ پسندیدہ چیز نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ ہمارے معاشرے میں اور عالمی سطح پر بھی عرف بن چکا ہے، اس لیے اسے مباح ہی سمجھا جائے گا، کیونکہ یہ کسی کا مذہبی شِعار نہیں ہے۔

محافلِ میلاد میں منکَرات کا ارتکاب

سوال:

میلاد شریف کے جلسوں میں دَف کا اہتمام کیا جانا اور جشنِ میلاد شریف کے جلوسوں میں تالیاں بجانا، ڈھول اور رقص پر اصرار کیا جانا، شریعتِ مُطہرہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے، کیا کہیں کوئی جواز کی صورت ہے یا دودھ و شہد میں نجاست و پلیدی ڈالنا اور حلال کو حرام کرنا ہے؟۔ دَف والی حدیث کو بطورِ دلیل پیش کیا جاتا ہے، اس حدیث کی روشنی میں مباح سمجھا جائے یا حدیث کو منسوخ سمجھا جائے یا پھر خصوصیت پر محمول کیا جائے؟۔ بعض حضرات صوفیہ کے سازوں کے ساتھ قوالی سننے کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں۔

(تنظیمات اہل السنۃ والجماعۃ، سرگودھا)

جواب:

میلاد النبی ﷺ کے جلسوں اور جلوس کا محرمات، مکروہات سے پاک ہونا ہی

رسول اللہ ﷺ سے حقیقی محبت کا ثبوت ہے کہ آپ کی بعثتِ مبارکہ کا مقصد ظلمت وجہالت کو دور کرنا اور اَحکامِ الٰہی کا پابند بنانا ہے،لوگوں کی رذیل صفات کو حسنِ اَخلاق میں بدل دینا ہے۔ رسالت مآب ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے دن کا اکرام اُنہی شرعی تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے، جو رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام علیہم الرضوان کی مجالس میں نظر آتے ہیں۔ اُس سے ہٹ کر کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب دعویٔ عشق ومحبت رسول ﷺ کے خلاف ہے۔میلادالنبی ﷺ کے جلوس نہ ضروریاتِ دین سے ہیں اور نہ ہی ضروریاتِ مسلک اہل السنۃ والجماعہ سے،البتہ یہ برصغیر میں شعائرِ اہلسنّت سے ہیں، یہ اگر محرمات، بدعات اور مُنکرات سے پاک ہوں تو زیادہ سے زیادہ استحباب واستحسان کے درجے میں قرار دیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

لَایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ۔

ترجمہ:'' تم میں سے کوئی اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اُس کی خواہش میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہوجائے، (شرح السنۃ للبغوی، رقم الحدیث: 104)''۔حدیث کا واضح مفہوم یہی ہے کہ کامل ایمان کی علامت یہ ہے کہ انسان کا ہر قول وفعل، معاملات ومعمولات اور خواہشات رسول اللہ ﷺ کے اَحکام کے مطابق ہونی چاہییں۔ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے دینی امور کو قرآن وسنّت میں بیان کردہ حقائق کی روشنی میں طے کرنے کے بجائے اپنی وضع کردہ عقیدتوں اور خواہشات کی نذر کردیے ہیں اور عقیدے وعقیدت کا تعین ایک ایسا طبقہ کرتا ہے، جو دینی فہم سے عاری ونابلد ہے۔

محافل میلاد کے نام پر مُقدّس محافل کی آڑ میں بڑے بڑے کاروبار کیے جارہے ہیں، بعض مقامات پر نعت خوانوں اور شعلہ بیان مقررین (جن کی اکثریت موضوع روایات کا سہارا لیتی ہے) کی ایجنٹوں کے ذریعے لاکھوں میں بکنگ ہورہی ہے،کسی زمانے میں شہر بھر میں سیاسی لیڈروں کی بڑی بڑی قدآور تصاویر لگائی جاتی تھیں،اب واعظین اور نعت خواں

حضرات کی تصاویر صرف بازاروں اور چوراہوں تک محدود نہیں بلکہ مساجد کے صدر دروازوں پر بھی آویزاں نظر آتی ہیں۔ انگلینڈ سے فون آیا کہ اب پیر صاحبان کی تصاویر مساجد کے اندر آویزاں کی جارہی ہیں۔

ہمیں حال ہی میں سوشل میڈیا پر ایک باریش پیر کو جُبّے قُبّے کے ساتھ غیر محرم جوان عورتوں کے ساتھ بلاحجاب رقص کرتے ہوئے دکھایا، وہ ان کے ہاتھ پکڑے ہوئے نظر آتے ہیں، کبھی وہ انہیں بوسہ دیتی ہیں، یہ حرام ہے۔ جب ابتذال اس حد تک پہنچ جائے تو علماءِ کرام کو تمام مصلحتوں سے بالاتر ہوکر شدت کے ساتھ اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔

کفار بیت اللہ شریف کے پاس تالیاں بجاتے اور اسے عبادت شمار کرتے تھے، قرآن مجید میں اسے کفر قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۚ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اور بیت اللہ کے پاس اُن کی نماز اس کے سوا کیا تھیں کہ یہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے، سو اب عذاب کو چکھو کیونکہ تم کفر کرتے تھے''۔ (الانفال:35)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں: قرآن مجید نے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کی جو مذمت کی ہے، اس میں اُن جاہل صوفیہ کا رد ہے، جو رقص کرتے ہیں، تالیاں پیٹتے اور بے ہوش ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں (جسے وَجد نہیں بلکہ تواجد سے تعبیر کیا گیا ہے)''۔

(الجامع الاحکام القرآن، جز9،ص: 399، موسسۃ الرسالہ، بیروت)

شریعت مُطَہرہ میں تالیاں بجانے کو مکروہ عمل فرمایا ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (وَكُرِهَ كُلُّ لَهْوٍ) أَيْ كُلُّ لَعِبٍ وَعَبَثٍ، فَالثَّلَاثَةُ بِمَعْنًى وَاحِدٍ كَمَا فِي ''شَرْحِ التَّأْوِيلَاتِ''، وَالْإِطْلَاقُ شَامِلٌ لِنَفْسِ الْفِعْلِ، وَاسْتِمَاعِهِ كَالرَّقْصِ وَالسُّخْرِيَةِ وَالتَّصْفِيقِ وَضَرْبِ الْأَوْتَارِ مِنَ الطُّنْبُوْرِ وَالْبَرْبَطِ وَالرَّبَابِ وَالْقَانُوْنِ وَالْمِزْمَارِ وَالصَّنْجِ وَالْبُوْقِ، فَإِنَّهَا كُلَّهَا مَكْرُوْهَةٌ لِأَنَّهَا زِيُّ الْكُفَّارِ،

ترجمہ: ''(ہر بیہودہ کھیل مکروہ ہے) یعنی ہر لہو ولعب اور عَبَث (بے مقصد کام) تینوں (یعنی

لہو، لَعب اور عبث) کے معنیٰ ایک ہیں، جیسا کہ ''شرح التاویلات'' میں ہے۔ لہو کو مطلق (یعنی کسی قید کے بغیر) ذکر کرنا نفسِ فعل اور اس کی توجہ سے سماعت کو شامل ہے، جیسے رقص کرنا، مذاق کرنا اور تالیاں بجانا، ڈھول بجانا، ستار بجانا، سارنگی بجانا، چنگ بجانا، قانون (ایک تار والا باجا) بجانا، مزامیر کا استعمال، جھانجھ (مجیرا) بجانا اور بگل بجانا، یہ سب مکروہ ہیں کیونکہ یہ عاداتِ کفار ہیں''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص:481)

گانے کی دھن پر بنائی گئی موسیقی اور آلاتِ موسیقی کے ساتھ نعت پڑھنا، پڑھوانا اور سننا سب ناجائز ہے، علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ الباری لکھتے ہیں:

مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ عَلٰی ضَرْبِ الدَّفِّ وَالْقَضِیْبِ یَکْفُرُ. قُلْتُ وَیَقْرُبُ مِنْہُ ضَرْبُ الدَّفِّ وَالْقَضِیْبِ مَعَ ذِکْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَنَعْتِ الْمُصْطَفٰی ﷺ،

ترجمہ: ''جس نے دَف اور ڈانڈیا کے ساتھ قرآن کی تلاوت کی (وہ توہینِ قرآن کی وجہ سے) کفر کا مرتکب ہوا، میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں: اسی حکم کے قریب دَف اور ڈانڈیا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر یا نعتِ مصطفیٰ ﷺ پڑھنا بھی ہے''۔ (الفقہ الاکبر:167)

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ مکمل ضابطہ اور دستور ہے، احادیثِ مبارکہ میں صرف چند مواقع ایسے ملتے ہیں، جہاں دف بجائی جارہی تھی، آپ نے اُن مواقع پر کسی خاص سبب سے اعراض نہ کیا۔ لیکن آج تسکینِ نفس کی تکمیل کے لیے ہر شخص اسے سنت سے ثابت کرنے پر تلا رہتا ہے، جبکہ حدیث پاک میں ہے: ''بُعِثْتُ بِکَسْرِ الْمَزَامِیْرِ (یعنی مجھے آلاتِ موسیقی کو توڑنے والا بنا کر بھیجا گیا) کے کلمات بھی آئے ہیں''۔

(کنز العمال:40689)

(۱) حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک معرکے سے واپس لوٹے تو ایک سیاہ رنگ کی بچی آکر کہنے لگی: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اِنِّیْ کُنْتُ نَذَرْتُ اِنْ رَدَّکَ اللّٰہُ سَالِمًا اَنْ اَضْرِبَ بَیْنَ یَدَیْکَ بِالدُّفِّ وَاَتَغَنّٰی؟، فَقَالَ لَھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنْ کُنْتِ نَذَرْتِ فَاضْرِبِیْ وَاِلَّا فَلَا. فَجَعَلَتْ تَضْرِبُ فَدَخَلَ اَبُوْبَکْرٍ وَھِیَ تَضْرِبُ، ثُمَّ دَخَلَ

عَنِّیْ وَھِیَ تَضرِبُ، ثُمَّ دَخَلَ عُثمَانَ وَھِیَ تَضرِبُ، ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَأَلقَتِ الدُّفَ تَحتَ استِھَا، ثُمَّ قَعَدَت عَلَیهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: إِنَّ الشَّیطَانَ لَیَخَافُ مِنكَ یَا عُمَرُ إِنِّی كُنتُ جَالِسًا وَھِیَ تَضرِبُ فَدَخَلَ أَبُوبَكرٍ وَھِیَ تَضرِبُ، ثُمَّ دَخَلَ عَلِیٌّ وَھِیَ تَضرِبُ، ثُمَّ دَخَلَ عُثمَانَ وَھِیَ تَضرِبُ، فَلَمَّا دَخَلتَ أَنتَ یَا عُمَرُ أَلقَتِ الدُّفَ۔

ترجمہ: ''یارسول اللہ! میں نے نذر مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح سلامت لوٹا دے تو میں آپ کے سامنے دف بجاؤں گی اور گیت گاؤں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم نے نذر مانی تھی تو تو پھر دف بجالو ورنہ نہیں۔ وہ لڑکی دف بجانے لگی، اس اثنا میں حضرت ابوبکر تشریف لائے، وہ دف بجاتی رہی، پھر حضرت علی تشریف لائے، وہ دف بجاتی رہی، پھر حضرت عثمان تشریف لائے، وہ تب بھی دف بجاتی رہی۔ پھر حضرت عمر داخل ہوئے تو وہ دف کو اپنے سرین کے نیچے چھپا کر اُس پر بیٹھ گئی۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: اے عمر! تم سے شیطان ڈرتا ہے، میں بیٹھا تھا، یہ دف بجاتی رہی، پھر ابوبکر آئے، یہ دف بجاتی رہی، پھر علی آئے، یہ دف بجاتی رہی، پھر عثمان آئے یہ دف بجاتی رہی اور پھر اے عمر جب تم آئے تو اس نے دف رکھ دی''۔(سُنن ترمذی:3690)

(۲) قَالَتِ الرُّبَیِّعُ بِنتُ مُعَوِّذِ بنِ عَفرَاءَ: جَاءَ النَّبِیُّ ﷺ فَدَخَلَ حِینَ بُنِیَ عَلَیَّ، فَجَلَسَ عَلَی فِرَاشِی كَمَجلِسِكَ مِنِّی، فَجَعَلَت جُوَیرِیَاتٌ لَنَا، یَضرِبنَ بِالدُّفِّ وَیَندُبنَ مَن قُتِلَ مِن آبَائِی یَومَ بَدرٍ، إِذ قَالَت إِحدَاھُنَّ: وَفِینَا نَبِیٌّ یَعلَمُ مَا فِی غَدٍ۔ فَقَالَ: دَعِی ھٰذِہِ، وَقُولِی بِالَّذِی كُنتِ تَقُولِینَ۔

ترجمہ: ''ربیع بنت معوذ بن عفراء بیان کرتی ہیں کہ جب میں دلہن بنا کر بٹھائی گئی تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، آپ بستر پر ایسے تشریف فرما ہوئے جیسے تم لوگ بیٹھتے ہو۔ پھر کچھ لڑکیاں دف بجانے لگیں اور میرے والد اور چچا جو جنگِ بدر میں شہید ہوئے تھے، اُن کی تعریف کرنے لگیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا: ''ہم میں وہ نبی ہیں جو آنے والے کل کی بات جانتے ہیں''، آپ ﷺ نے فرمایا: اسے چھوڑ دو اور وہ گاؤ جو تم پہلے

گا رہی تھیں''۔(صحیح بخاری:5147)

فی نفسہٖ دف بجانا مشروع ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْهُ عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ (اس نکاح کا اعلان کرو اور نکاح مساجد میں کرو اور اُس پر دف بجاؤ)''۔

(ترمذی:1089)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں:''دَف کہ بے جلاجل یعنی بغیر جھانجھ (اسے جھانجھر بھی کہتے ہیں) کا ہو اور تال سر کی رعایت سے نہ بجایا جائے اور بجانے والے نہ مرد ہوں نہ ذی عزت عورتیں، بلکہ کنیزیں یا ایسی کم حیثیت عورتیں اور وہ غیر محل فتنہ میں بجائیں تو نہ صرف جائز بلکہ مُستحب ومندوب ہے: لِلْاَمْرِبِهٖ فِي الْحَدِيْثِ وَالْقُيُوْدُ مَذْكُوْرَةٌ فِي رَدِّ الْمُحْتَارِ وَغَيْرِهٖ وَشَرَحْنَاهَا فِي فَتَاوَانَا۔ ترجمہ:''حدیث میں مشروط دف کے بجانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی تمام قیود کو فتاویٰ شامی وغیرہ میں ذکر کردیا گیا اور ہم نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تشریح کردی ہے''۔اس کے سوا اور باجوں سے احتراز کیا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد21، ص:643)''۔

دَف اور ڈھولک میں فرق ہے، دَف ایک طرف سے کھلا ہوتا ہے، جبکہ ڈھولک دونوں طرف سے بند ہوتا ہے، لہٰذا دَف سے ڈھولک کا جواز ثابت نہیں کیا جاسکتا اور امام احمد رضا قادری نے دَف کے ساتھ بھی جھانجھر نہ ہونے کی شرط لگائی ہے، جبکہ بعض لوگ جھانجھر والے دَف کے ساتھ نوخیز قریب البلوغ یا بالغہ لڑکیوں سے ٹی وی پر گروپ کی شکل میں نعت پڑھواتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔بعض لوگ ہجرت کے موقع پر قبیلۂ بنونجار کی بچیوں کے ان استقبالیہ اشعار سے استدلال کرتے ہیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ

(سیرۃ الحلبیہ، ۲/۲۳۵)

یہ ''کَلِمَةُ الْحَقِّ أُرِیدُ بِهَا الْبَاطِل'' کے قبیل سے ہے۔ اولاً تو یہ کہ یہ ابتدائے اسلام کا دور تھا، یہ بچیاں عہدِ اسلام کی تربیت یافتہ نہیں تھیں، بلکہ اُس عہد کے قبائلی رواج کے مطابق انہوں نے ایسا کیا اور وہ بھی ایک دائرے میں تھا، جبکہ مزامیر کو توڑنے کی روایات بعد کی ہیں۔ بعدازاں رسول اللہ ﷺ جنگی فتوحات سے واپس تشریف لائے، کئی خوشی کے مواقع آئے، لیکن آپ ﷺ نے اس شعار کو رائج نہیں کیا اور نہ ہی اس کی ترغیب دی۔

مُغنّیات سے کام لینا مشرکینِ مکہ کا شِعار تھا۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی غزوۂ بدر کے بارے میں امام ابن ہشام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'' قریش نے اپنا تمام مال ومتاع داؤ پر لگا کر جنگ کی تیاری کی، جب اُنہوں نے عزمِ سفر کیا تو قریش مکہ کی فوج کی تعداد نو سو پچاس تھی، اُن کے پاس ایک سو گھوڑے تھے، جن پر ایک سو زرہ پوش سوار تھے، پیدل سپاہیوں کے لیے بھی زرہیں مہیا تھیں، اُن کے ساتھ رقص کرنے والی کنیزیں بھی تھیں، جو دَف بجا رہی تھیں اور جوشیلے گیت گا کر ان کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا رہی تھیں، سو قریش کا یہ لشکر جرار مٹھی بھر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے بڑے غرور اور تکبر کے ساتھ روانہ ہوا''۔

(تبیان القرآن، جلد دوم، ص:332)

غزوۂ بدر سے قبل ابوجہل کو بتایا گیا کہ ابوسفیان کے قافلہ نے ساحل کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور وہ محفوظ ہو چکا ہے، تم اب اپنے لوگوں کو واپس مکہ لے جاؤ۔ اُس نے کہا: ''نہیں خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہوسکتا، حتیٰ کہ ہم اونٹوں کو ذبح کریں گے، شراب پئیں گے اور ہماری باندیاں آلاتِ موسیقی کے ساتھ گانا گائیں گی اور تمام قبائل عرب ہمارے خروج کی خبر سن لیں گے، (سُبلُ الہدیٰ والرشاد، جلد رابع، ص:29)''۔ یعنی اس سے ایک عالَم پر ہماری دہشت قائم ہو جائے گی۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ پنجاب میں میلاد النبی ﷺ کے موقع پر منوں کے حساب سے کیک کاٹے جاتے ہیں، اِس طرح کی حرکات میلاد النبی ﷺ کی تقدیس کے منافی ہیں

اور یہ اس لیے ہورہا ہے کہ مذہبی معاملات کو جاہل واعظین اور پیروں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور کچھ اہلِ ثروت اپنی تشہیر و نام و نمود کے لیے یہ کارروائیاں کرتے ہیں۔ علماء کی ذمے داری ہے کہ دینی معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھیں، قوم کی رہنمائی کریں اور مذہبی عنوان سے اس طرح کے اضافات کا راستہ روکیں۔ ہاں! اگر کوئی ایصالِ ثواب کی نیت سے لوگوں کو کیک کھلانا یا تقسیم کرنا چاہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

فکرِ رضا کی روشنی میں

نعت خوانی اور خطابت کے نذرانوں کی جائز و ناجائز صورتیں

سوال:

میت کے ایصالِ ثواب کے لیے پہلے گٹھلیوں پر کلمۂ طیبہ کا ورد کیا جاتا ہے، پھر نعت خوانی ہوتی ہے اور لوگ نعت خوانوں کو پیسے دیتے ہیں۔ پھر ایک یا دو مولانا حضرات جب تک بیان کرتے رہتے ہیں، لوگ اُن کے سامنے بھی پیسے رکھتے رہتے ہیں۔ پھر کئی طرح کے کھانے اور پھلوں سے بھرے تھال رکھ کر ختم پڑھا جاتا ہے، جب تک وہ ختم پڑھتا رہتا ہے، لوگ اُس کے سامنے بھی پیسے رکھتے ہیں، جسے ختم کے بعد وہ اٹھالیتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ سارے اُمور کیا شرعی حیثیت رکھتے ہیں؟۔ (حافظ محمد حسین، کراچی)۔

جواب:

یہ فتویٰ خالصتاً اصلاح کی غرض سے تحریر کیا گیا ہے، تاکہ اُمت میں پائی جانے والی بے اعتدالیوں کو روکا جاسکے۔ حق کو تسلیم کرلینا اور اُس پر عمل پیرا ہونا مومن کی خوبی ہے، آمادۂ اصلاح ہونے کی بجائے مال کی محبت میں غرق ہوکر الٹی سیدھی تاویلیں پیش کرنا، حق کو جھٹلانا یا علماء کی مخالفت کرنا حرام کو حلال نہیں کرسکتا، بلکہ ہٹ دھرمی کی یہ رَوِش آخرت کی بربادی اور خسارے کا باعث ہوگی۔ اس فتویٰ میں تمام دلائل اور حوالے امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز کے فتاویٰ سے لیے گئے ہیں کہ ہمارے اس خطے میں لوگ مسلک اہلسنّت کو امام احمد رضا بریلوی کی نسبت سے جانتے ہیں اور اس میں

لوگوں نے جو من پسند اضافات کیے ہیں، وہ آپ کی طرف منسوب کردیے جاتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز کے فتاویٰ سے یہ ظاہر وعیاں ہوتا ہے کہ آپ کی اصل تعلیمات اور فتاویٰ کیا تھے اور انہیں بدل کر اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے والا طبقہ کیا چاہتا ہے۔ ذاتی مفاد کے لیے امام اہلسنت کی تعلیمات کی من مانی تاویلات کرنے والے اُن کے سچے پیروکار کہلانے کے حق دار نہیں ہوسکتے، اس طبقے کی حوصلہ شکنی کرنا علماء حق پر لازم ہے۔

ایصالِ ثواب کی محافل میں نعت خوانوں، واعظوں اور فاتحہ پڑھنے والوں کے لیے نذرانوں کا اہتمام کیا جانا ایصالِ ثواب کا حصہ نہیں ہے اور اسے دین سے منسلک کرنا زیادتی ہے۔ ایصالِ ثواب کا ذریعہ دعائے مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل وعمرہ، تلاوتِ قرآنِ پاک، اذکار وتسبیحات اور درود پاک وغیرہ۔ میت کو قرآن خوانی وکلمۂ طیبہ ودیگر عبادات کا ثواب پہنچایا جاسکتا ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اَلْاَصْلُ فِیْ ھٰذَا الْبَابِ اَنَّ الْاِنْسَانَ لَہٗ اَنْ یَّجْعَلَ ثَوَابَ عَمَلِہٖ لِغَیْرِہٖ صَلَاۃً کَانَ اَوْ صَوْمًا اَوْ صَدَقَۃً اَوْ غَیْرَھَا کَالْحَجِّ وَقِرَاءَۃِ الْقُرْاٰنِ وَالْاَذْکَارِ وَزِیَارَۃِ قُبُوْرِ الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْھِمُ الصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ وَالشُّھَدَاءِ وَالْاَوْلِیَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ وَتَکْفِیْنِ الْمَوْتٰی وَجَمِیْعِ اَنْوَاعِ الْبِرِّ کَذَا فِیْ ''غَایَۃِ السُّرُوْجِیِّ شَرْحِ الْھِدَایَۃِ''۔

ترجمہ: ''قاعدہ یہ ہے کہ انسان اپنے عمل کا ثواب دوسرے شخص کو پہنچا سکتا ہے، خواہ وہ نماز یا روزہ یا مالی صدقہ یا کوئی بھی نیک عمل ہو، جیسے حج اور قرآن مجید کی تلاوت اور اذکار اور انبیاء علیہم السلام کی قبور کی زیارت اور شہداء اور اولیاء اور صالحین کی قبروں کی زیارت اور مردوں کو کفن دینا اور دیگر تمام نیکی کے کام، ''غایۃ السروجی شرح ہدایہ'' میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 257، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز سے سوال کیا گیا: ''ہمارے یہاں

ملک بنگالہ میں جب کسی نے برائے ثواب رسانی اپنے میت کے مُلّاؤں یا طلباؤں سے قرآن شریف پڑھوایا، یا بعداُن کو کچھ دیا جاتا ہے، وہ خودنہیں مانگتے بلکہ خود پڑھوانے والا اُن کو دیتا ہے، یہ طریقہ ہمارے یہاں عام رواج ہے، تو یہ لینا دینا جائز ہے یا نہیں؟۔ اگر جائز ہے تو کس طریقہ پر اور ایسے ہی بعد پڑھوانے مولود شریف کے جو کچھ دیا جاتا ہے بغیر طلب کرے، مولودخواں کے لیے یہ بھی جائز ہے یا نہیں؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''اصل یہ ہے کہ طاعت وعبادات پر اجرت لینا دینا (سوائے تعلیمِ قرآنِ عظیم وعلوم دین واذان وامامت وغیرہا معدودے چند اشیاء کہ جن پر اجارہ کرنا متاخرین نے بہ ناچاری ومجبوری بنظر حال زمانہ جائز رکھا) مطلقاً حرام ہے اور تلاوتِ قرآن عظیم بغرض ایصالِ ثواب وذکر شریف میلاد پاک حضور سید عالم ﷺ ضرور منجملہ عبادات وطاعت ہیں، تو ان پر اجارہ بھی ضرور حرام ومحذور، کَمَاحَقَّقَهُ السَّیِّدُ الْمُحَقِّقُ مُحَمَّدُ بْنُ عَابِدِیْنَ الشَّامِیْ فِیْ رَدِّالْمُحْتَارِ عَلَی الدُّرِّ الْمُخْتَار. وَلَهُ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی رِسَالَةٌ مُسْتَقِلَّةٌ فِیْ تَحَقُّقِ الْمَسْئَلَةِ سَمَّاهَا ''شِفَاءُ الْعَلِیْلِ وَبَلُّ الْغَلِیْلِ فِیْ حُکْمِ الْوَصِیَّةِ بِالْخَتَمَاتِ وَالتَّهَالِیْل'' قَالَ وَاطَّلَعَ عَلَیْهَا مُحَشِّیْ هٰذَا الْکِتَابِ (یَعْنِی الدُّرِّ) فَقِیْهُ عَصْرِهٖ وَوَحِیْدُ دَهْرِهِ السَّیِّدُ اَحْمَدُ الطَّحْطَاوِی مُفْتِی مِصْرَ سَابِقًا فَکَتَبَ عَلَیْهَا وَاَثْنٰی الثَّنَاءَ الْجَمِیْلَ فَاللهُ یُجْزِیْهِ الْاَجْرَالْجَزِیْلَ وَکَتَبَ عَلَیْهَا غَیْرُهٗ مِنْ فُقَهَاءِ الْعَصْرِ. قُلْتُ وَقَدْ تَشَرَّفَ الْفَقِیْرُ بِمُطَالَعَتِهَا فَوَجَدْتُهٗ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰی کَفٰی وَشَفٰی وَصَفَا وَوَفٰی فَرَحِمَنَا اللهُ وَاِیَّاهُ وَالْمُسْلِمِیْنَ بِعِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، آمین۔

ترجمہ: ''سید محقق محمد بن ابن عابدین شامی نے درمختار کے حاشیہ ردالمحتار میں جیسا کہ اس کی تحقیق فرمائی، اس مسئلہ میں ان کا ایک مستقل رسالہ ہے، جس کا نام ''شِفَاءُ الْعَلِیْل وَبَلُّ الْغَلِیْل فِیْ حُکْمِ الْوَصِیَّةِ بِالْخَتَمَاتِ وَالتَّهَالِیْل'' رکھا ہے، اُنہوں نے خود فرمایا کہ درمختار کے محشی اپنے زمانہ کے فقیہ العصر، وحید دہر سید احمد طحطاوی سابق مفتی مصر نے اس رسالہ کا مطالعہ فرما کر اس پر تقریظ لکھی اور تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ ان کو اللہ تعالیٰ اجر عظیم سے

نوازے اور دیگر فقہاء عصر نے بھی تقریظات لکھی ہیں۔ میں کہتا ہوں اس فقیر نے اس کے مطالعے کا شرف حاصل کیا ہے، تو میں نے بحمدللہ تعالیٰ اس کو کافی شافی اور بھرپور صاف پایا، تو اللہ تعالیٰ ہم پر اور ان پر، تمام مسلمانوں اور اپنے تمام اہل دین بندوں پر رحم فرمائے آمین"۔

اور اجارہ جس طرح صریح عقد زبان سے ہوتا ہے، عرفاً معروف ومعہود سے بھی ہو جاتا ہے مثلاً پڑھنے، پڑھوانے والوں نے زبان سے کچھ نہ کہا مگر جانتے ہیں کہ دینا ہوگا، وہ سمجھ رہے ہیں کہ کچھ ملے گا، انہوں نے اس طور پر پڑھا، انہوں نے اس نیت سے پڑھوایا، اجارہ ہوگیا اور اب دو وجہ سے حرام ہوا، ایک تو طاعت پر اجارہ یہ خود حرام، دوسرے اجرت اگر عرفاً معین نہیں تو اس کی جہالت سے اجارہ فاسدہ، یہ دوسرا حرام۔

أَيْ أَنَّ الإِجَارَةَ بَاطِلَةٌ وَعَلٰى فَرْضِ الِانْعِقَادِ فَاسِدَةٌ فَلِلتَّحْرِيمِ وَجْهَانِ مُتَعَاقِبَانِ. وَذٰلِكَ لِمَا نَصُّوا قَاطِبَةً أَنَّ الْمَعْهُودَ عُرْفًا كَالْمَشْرُوطِ لَفْظًا۔

ترجمہ: "یعنی اجارہ باطل ہے اور انعقاد کی صورت میں وہ فاسد ہے، تو اس کے حرام ہونے کی یکے بعد دیگرے دو وجہیں ہیں اور یہ اس لیے کہ تمام فقہاء کی نص ہے کہ جو چیز عرف میں مشہور ومسلّم لفظوں میں مشروط کی طرح ہے"۔ پس اگر قرارداد کچھ نہ ہو، نہ وہاں لین دین معہود ہوتا ہو تو بعد کو بطور صلہ وحُسنِ سلوک کچھ دے دینا جائز بلکہ حَسن ہوتا، هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ O (احسان کی جزا صرف احسان ہے) وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ O (اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے)۔

مگر جبکہ اس طریقہ کا وہاں عام رواج ہے، تو صورت ثانیہ میں داخل ہوکر حرام محض ہے، اب اس کے حلال ہونے کے دو طریقے ہیں: اول: یہ کہ قبلِ قراءت پڑھنے والے صراحۃً کہہ دیں کہ ہم کچھ نہ لیں گے، پڑھوانے والے صاف انکار کردیں کہ تمہیں کچھ نہ دیا جائے گا، اس شرط کے بعد وہ پڑھیں اور پھر پڑھوانے والے بطور صلہ جو چاہیں دے دیں، یہ لینا دینا حلال ہوگا۔

لِانْتِفَاءِ الإِجَارَةِ بِوَجْهَيْهَا، أَمَّا اللَّفْظُ فَظَاهِرٌ وَأَمَّا الْعُرْفُ فَلِأَنَّهُمْ نَصُّوا عَلٰى نَفْيِهَا

وَالصَّرِیْحُ یَفُوْقُ الدَّلَالَۃَ، فَلَمْ یُعَارِضْہُ الْعُرْفُ الْمَعْھُوْدُ کَمَا نَصَّ عَلَیْہِ الْاِمَامُ فَقِیْہُ النَّفْسِ ''قَاضِی خَان رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی'' فِی الْخَانِیَۃِ وَغَیْرُہٗ فِی غَیْرِھَا مِنَ السَّادَۃِ الرَّبَّانِیَۃِ

ترجمہ: ''دو وجہ سے اجارہ نہ ہونے کی وجہ سے، ایک لفظ کے اعتبار سے تو ظاہر ہے، دوسرا عرف کی وجہ سے کیونکہ انہوں نے اس وجہ کی نفی پر نص کر دی ہے اور صریح بات فائق ہوتی ہے، تو عرف معہود اس کے معارض نہ ہو سکے گا جیسا کہ ''امام فقیہ النفس قاضی خان'' نے اس پر اپنے فتاویٰ اور دیگر فقہاء نے دوسری کتب میں نص فرمائی ہے''۔

دوم: پڑھوانے والے پڑھنے والوں سے یہ بہ تعیینِ وقت و اُجرت ان سے مطلق کار خدمت پر پڑھنے والوں کو اجارے میں لے لیں، مثلاً یہ اُن سے کہیں: ''ہم نے کل صبح سات بجے تک بعوض ایک روپیہ کے اپنے کام کاج کے لیے اجارہ میں لیا، وہ کہیں ہم نے قبول کیا''۔ اب یہ پڑھنے والے اتنے گھنٹوں کے لیے ان کے نوکر ہو گئے، وہ جو کام چاہیں لیں، اس اجارہ کے بعد وہ ان سے کہیں، اتنے پارے کلام اللہ شریف کے پڑھ کر ثواب فلاں کو بخش دو، یا مجلس میلاد مبارک پڑھ دو، یہ جائز ہوگا اور لینا دینا حلال، لِاَنَّ الْاِجَارَۃَ وَقَعَتْ عَلٰی مَنَافِعِ اَبْدَانِھِمْ لَا عَلَی الطَّاعَاتِ وَالْعِبَادَاتِ، وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعلَم۔

ترجمہ: ''کیونکہ یہ اجارہ ان کے ابدان سے انتفاع پر ہوا ہے نہ کہ ان کی عبادات اور طاعات پر ہوا ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 19، ص: 488-486)

مزید سوال ہوا: ''یہاں احمد آباد شہر میں بعض حافظ القرآن حضرات اہلسنّت و جماعت کے مکانوں پر سوم و چہلم منانے جاتے ہیں اور کلام مجید پڑھ کر اَموات کی خدمت میں ایصالِ ثواب کرتے ہیں اور وہاں سے اجرت لیتے ہیں اور اس میں جُہلاء بہت ثواب سمجھتے ہیں، آیا یہ ایصالِ ثواب کر کے اجرت لینا جائز ہے یا حرام ہے، اجرت لے کر ایصالِ ثواب کرے تو اموات کی خدمات میں ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟''۔ آپ نے جواب لکھا: ''اُجرت پر کلام اللہ شریف بغرض ایصالِ ثواب پڑھنا، پڑھوانا دونوں ناجائز اور پڑھنے

والا اور پڑھوانے والا دونوں گنہ گار اور اس میں میت کے لیے کوئی نفع نہیں بلکہ اس کی مرضی وصیت سے ہو تو وہ بھی وبال میں گرفتار، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو) اور یہ کہنا کہ ہم اللہ کے لیے پڑھتے ہیں اور دینے والے بھی ہمیں اللہ کے لیے دیتے ہیں، محض جھوٹ ہے، اگر یہ نہ پڑھیں تو وہ ایک حبہ اُن کو نہ دیں اور اگر وہ نہ دیں تو یہ ایک صفحہ نہ پڑھیں اور شرعِ مطہر کا قاعدہ کلیہ اَلْمَعْرُوْفُ کَالْمَشْرُوْطِ (معروف مشروط کی طرح ہے) بلکہ اس ظاہری شرط نہ کرنے سے ایک اور خباثت بڑھ جاتی ہے، اجارہ جو امر جائز پر ہو وہ بھی اگر بے تعین اجرت ہو تو بوجہ جہالت اجارہ فاسد اور عقدِ حرام ہے، نہ کہ وہ اجارہ کہ خود ناجائز تھا، وہ تو حرام در حرام ہوگیا''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 19، ص: 528)

سوال: میلاد شریف جس کے یہاں ہو وہ پڑھنے والے کی دعوت کرے تو پڑھنے والے کو کھانا چاہیے یا نہیں اور اگر کھایا تو پڑھنے والے کو کچھ ثواب ملے گا یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''پڑھنے کے عوض کھانا کھلاتا ہے تو یہ کھانا نہ کھلانا چاہیے اور اگر کھائے گا تو یہی کھانا اس کا ثواب ہوگیا اور ثواب کیا چاہتا ہے بلکہ جاہلوں میں جو یہ دستور ہے کہ پڑھنے والوں کو عام حصوں سے دونا دیتے ہیں اور بعض احمق پڑھنے والے اگر اُن کو اوروں سے دونا نہ دیا جائے تو اس پر جھگڑتے ہیں، یہ زیادہ لینا دینا بھی منع ہے اور یہی اس کا ثواب ہوگیا، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو)''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 21، ص: 663)

امام احمد رضا قادری سے ایک شخص (بنام زید) کے بارے میں سوال کیا گیا کہ ''زید نے اپنے پانچ روپے فیس مولود شریف کی پڑھوائی مقرر کر رکھے ہیں، بغیر پانچ روپیہ فیس کے کسی کے یہاں جاتا نہیں اور وقتِ نماز سب سے پہلے سبقت امامت کی کرتا ہے اور اپنے آپ کو مولوی صاحب کے لفظوں سے اپنے قلم سے لکھتا ہے اور کچھ معمولی روایتیں علماءِ دین سے یاد کر لی ہیں اور جمعہ کے روز مسجد میں منبر پر بیٹھ کر وعظ پڑھتا ہے اور پیری مریدی بھی

کرتا ہے''۔آپ نے جواب میں لکھا:''زید نے جو اپنی مجلس خوانی خصوصاً راگ سے پڑھنے کی اجرت مقرر کر رکھی ہے، ناجائز وحرام ہے، اس کا لینا اُسے ہرگز جائز نہیں، اس کا کھانا صراحۃً حرام کھانا ہے، اس پر واجب ہے کہ جن جن سے فیس لی ہے، یاد کرکے سب کو واپس دے، وہ نہ رہے ہوں تو ان کے وارثوں کو پھیرے، پتا نہ چلے تو اتنا مال فقیروں پر تصدّق کرے اور آئندہ اس حرام خوری سے توبہ کرے تو گناہ سے پاک ہو۔ اول تو سید عالم ﷺ کا ذکر پاک خود عمدہ طاعات واَجَلِّ عبادات سے ہے اور طاعت وعبادت پر فیس لینی حرام۔ مبسوط پھر خلاصہ پھر عالمگیری میں ہے:

لَایَجُوْزُ الِاسْتِیجَارُ عَلَی الطَّاعَاتِ کَالتَّذْکِیرِ وَلَایَجِبُ الْاَجْرُ

ترجمہ:''نیک کاموں میں اجرت لینا جائز نہیں، جیسے وعظ کرنا اور اجرت واجب نہیں ہوگی''۔

خلاصہ پھر تتارخانیہ پھر ہندیہ میں ہے:

اَلْوَاعِظُ اِذَا سَأَلَ النَّاسَ شَیْئًا فِی الْمَجلِسِ لِنَفسِہٖ لَایَحِلُّ لَہٗ ذٰلِکَ لِاَنَّہٗ اِکْتِسَابُ الدُّنیَا بِالْعِلْمِ۔

ترجمہ:''جب وعظ کرنے والا مجلس میں اپنے لیے کچھ مانگے تو اس کے لیے ایسا کرنا حلال نہیں کیونکہ اس میں علم کے ساتھ دنیا کا حصول ہے''۔

قُنیہ پھر اَشباہ پھر دُرِمختار میں ہے:

وَنَظْمُ الدُّرَرِ اَتَمُّ، اِمَّا (تَقَبُّلٌ) تُسَمّٰی شِرْکَۃَ صَنَائِعَ وَاَعمَالٍ وَاَبدَانٍ (اِنِ اتَّفَقَ) صَانِعَانِ (عَلٰی اَنْ یَتَقَبَّلَا الْاَعْمَالَ) اَلَّتِی یُمْکِنُ اسْتِحْقَاقُھَا وَمِنْہُ تَعْلِیمُ کِتَابَۃٍ وَقُرْاٰنٍ وَفِقْہٍ عَلَی الْمُفْتٰی بِہٖ بِخِلَافِ دَلَّالِیْنَ وَمُغَنِّیْنَ وَشُھُوْدِ مَحَاکِمَ وَقُرَّاءِ مَجَالِسِ وَتَعَازٍ وَوُعَّاظٍ وَسُؤَالٍ۔

ترجمہ:''درمختار کی عبارت زیادہ تام اور مفصّل ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: (ایک قسم شرکت تقبّل ہے) اور اس کو شرکت صنائع واعمال وابدان بھی کہا جاتا ہے۔ اگر دو پیشہ ور اس

بات پر اتفاق کرلیں کہ وہ ایسا کام لیں گے، جس میں استحقاق اجرت ممکن ہے اور اسی شعبہ سے کتابت سکھانا، قرآن مجید اور علمِ فقہ پڑھانا ہے، تو مُفتیٰ بہٖ قول کے مطابق اس پر اجرت لینا جائز ہے، اس کے برعکس دو دلالوں، دو گویوں، فیصلے کے دو گواہوں، مجلس میں قرآن مجید پڑھنے والوں، ماتم کرنے والوں، وعظ کرنے والوں اور اصرار کے ساتھ دعا مانگنے والوں کی شرکت جائز نہیں ہے (اور ان کے عدمِ جواز کی اپنی اپنی وجوہ ہیں)۔

مُفتیٰ بہٖ قول: جب کسی مسئلے پر ایک سے زیادہ اَقوال ہوں اور متاخرین فقہائے کرام نے دینی حکمت یا ضرورت کے تحت کسی قول کو ترجیح دی ہو، تو اسے ''مُفتیٰ بہٖ قول'' کہتے ہیں۔

نوٹ: صنائع صنعت کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں پیشہ اور پیشہ ور کی کارکردگی، اعمال اور ابدان، عمل اور بدن کی جمع ہیں۔ چونکہ اس میں غالباً دونوں افراد کا جسمانی کام ہوتا ہے، اس لیے اس کو یہ نام دیا گیا۔

ثانیاً: بیان سائل سے ظاہر کہ وہ اپنی شعر خوانی وزمزمہ سنجی کی فیس لیتا ہے، یہ بھی محض حرام۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

لَاتَجُوزُ الاِجَارَۃُ عَلٰی شَیْئٍ مِنَ الغِنَاءِ وَقِرَاءَۃِ الشِّعْرِوَلَااَجْرَفِیْ ذٰلِکَ وَھٰذَا کُلُّہٗ قَوْلُ اَبِیْ حَنِیفَۃَ وَاَبِیْ یُوسُفَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَھُم اللّٰہُ تَعَالٰی کَذَافِیْ غَایَۃِ البَیَان، (مختصراً)

ترجمہ: ''گانا اور اشعار پڑھنا (ایسے اعمال ہیں) ان میں سے کسی پر مزدوری اور اجرت لینا جائز نہیں اور نہ ان میں اجرت ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ تینوں کا قول اور فتویٰ ہے، چنانچہ غایۃ البیان میں یونہی مذکور ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص:725-724)

ایصالِ ثواب کی فاتحہ کے موقع پر انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات، پھل، کپڑے وغیرہ سب چیزیں سامنے رکھنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں ریا کا عنصر بھی شامل ہوسکتا ہے۔ سامنے رکھنا شریعت میں اصولی اعتبار سے منع بھی نہیں ہے اور ایسا کرنے پر اصرار بھی درست نہیں ہے۔ ایصالِ ثواب کی اشیاء کو سامنے رکھے بغیر فاتحہ وایصالِ ثواب

کیا جاسکتا ہے اور کھانے کے بعد بھی فاتحہ پڑھی جاسکتی ہے، امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''وقتِ فاتحہ کھانا سامنے رکھنے کی ممانعت نہیں، مگر اُسے ضروری جاننا یا یہ سمجھنا کہ بے اس کے فاتحہ نہیں ہوسکتی، یا ثواب کم ملے گا، غلط و باطل خیال ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 598)

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا: ''علماء جو وعظ مساجد جامع یا غیر جامع میں کہتے ہیں اور حاضرین کو پند و نصائح سناتے ہیں اور وہ ان کی خدمت و تواضع نقود وغیرہ سے کرتے ہیں، یہ آمدنی ان کو جائز ہے یا ناجائز؟ اور بعضے صرف حمد و نعت پڑھتے ہیں اور سامعین ان کی خدمت گزاری نقد و جنس سے کرتے ہیں یہ امر مساجد وغیر مساجد میں مباح و درست ہے یا نہیں اور یہ آمدنی ان کے واسطے درجہ جواز میں ہے یا عدم جواز میں؟۔ یہ لوگ ماتحت آیہ کریمہ: ''اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ'' (یہی وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے بدلے میں خرید لیا ہے)'' کے داخل ہیں یا خارج؟ اس سے تین حاملین کہ مقصود طرفین الصاع اور انتفاع اور نفع رسانی اور مہمان نوازی اور مسافر پروری ہو، بینوا توجروا (بیان فرمایئے اجر پایئے)''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''اس میں تین صورتیں ہیں: اگر وعظ کہنے اور حمد و نعت پڑھنے سے مقصود یہی ہے کہ لوگوں سے کچھ مال حاصل کریں، تو بیشک اس آیت کریمہ کے تحت میں داخل ہیں اور حکم ''لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ وصول کرو)'' کے مخالف۔ وہ آمدنی ان کے حق میں خبیث ہے، خصوصاً جبکہ ایسے حاجت مند نہ ہوں، جن کو سوال کی اجازت ہے کہ اب تو بے ضرورت سوال دوسرا حرام ہوگا اور وہ آمدنی خبیث تر و حرام مثل غصب ہے، عالمگیریہ میں ہے: مَاجَمَعَ السَّائِلُ بِالتَّکَدِّیْ فَھُوَ خَبِیْثٌ، یعنی سائل نے کدو کاوش سے جو کچھ جمع کیا وہ ناپاک ہے۔

(فتاویٰ ہندیہ، کتاب الکراھیۃ، الباب الخامس عشر، نورانی کتب خانہ پشاور)

دوسرے یہ کہ وعظ حمد و نعت سے ان کا مقصود محض اللہ ہے اور مسلمان بطورِ خود ان کی خدمت

کریں تو یہ جائز ہے اور وہ مال حلال، تیسرے یہ کہ وعظ سے مقصود تو اللہ ہی ہو مگر ہے حاجتمند اور عادۃً معلوم ہے کہ لوگ خدمت کریں گے، اُس خدمت کی طمع بھی ساتھ لگی ہوئی ہے، تو اگر چہ یہ صورت دوم کے مثل محمود نہیں مگر صورتِ اُولیٰ کی طرح مذموم بھی نہیں، جسے درمختار میں فرمایا: اَلوَعظُ لِجمعِ المَالِ مِن ضَلالۃِ الیَھُودِ وَ النَّصَارٰی۔ ترجمہ: ''مال جمع کرنے کے لیے وعظ کہنا یہود و نصاریٰ کی گمراہیوں سے ہے''۔ (درمختار، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع)۔ یہ تیسری صورت بین بین ہے اور دوم سے بہ نسبت اولیٰ کے قریب تر ہے، جس طرح حج کو جائے اور تجارت کا کچھ مال بھی ساتھ لے جائے، جسے ''لَیسَ عَلَیکُم جُنَاحٌ اَن تَبتَغُوا فَضلًا مِن رَبِّکُم'' (تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی رزق حلال) تلاش کرو۔ لہٰذا فتویٰ اس کے جواز پر ہے: اَفتٰی بِہٖ الفَقِیہُ أَبُواللَّیثِ رَحِمَہُ اللہ تَعَالٰی کَمَا فِی الخَانِیۃِ وَالھِندِیۃِ وَغَیرِھِمَا وَالَّذِی ذَکَرتُہٗ تَوفِیقٌ بَینَ القَولَینِ وَبِاللہِ التَّوفِیقُ وَاللہُ تَعَالٰی اَعلَمُ۔

ترجمہ: ''حضرت فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر فتویٰ دیا ہے، جیسا کہ فتاویٰ قاضی خاں اور فتاویٰ عالمگیری وغیرہ میں مذکور ہے اور جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، یہ دو قولوں کے درمیان موافقت پیدا کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی سے توفیق ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔

(فتاوی رضویہ، جلد 23، ص:377)

خلاصۂ کلام یہ کہ آپ نے سوال میں ایصالِ ثواب کے موقع پر نعت خوانوں، واعظین اور قُرّاء حضرات کے لیے جس اہتمام کا ذکر فرمایا، اہتمام کرنے والوں کا اِسے ضروریات میں شمار کرنا غلط ہے، شریعت کی رُو سے درست اور پسندیدہ صورت تو یہ ہے کہ اس رقم کو صدقاتِ جاریہ کی مد میں صرف کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے انفاق فی الخیر میں صدقاتِ جاریہ کو ترجیح دی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِذَا مَاتَ الاِنسَانُ اِنقَطَعَ عَنہُ عَمَلُہٗ اِلَّا مِن ثَلَاثَۃٍ: اِلَّا مِن صَدَقَۃٍ جَارِیَۃٍ اَو عِلمٍ یُنتَفَعُ

بِهٖ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوالَهٗ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان فوت ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں لیکن تین عمل منقطع نہیں ہوتے ،صدقۂ جاریہ،علم نافع اور نیک اولاد جو اُس کے لیے دعا کرتی ہے''۔

(سنن ابوداؤد:2877)

صدقۂ جاریہ سے ایسا عملِ خیر مراد ہے،جس کے اجر وفیضان کا سلسلہ متصدِّق کی موت کے ساتھ منقطع نہ ہوجائے بلکہ اس کا فیضان تادیر جاری وساری رہے،بقول شاعر:

خیر گر چاہے، پھر فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

جیسے کسی نے مسجد بنائی یا تعمیر میں حصہ لیا یا مدرسہ بنایا یا انسانی فلاح کا کوئی کام کیا،تو جب تک وہ مسجد، مدرسہ یا کنواں وغیرہ باقی ہیں،ان کے بانی یا ان میں حصہ لینے والوں کو ثواب ملتا رہے گا۔اسی طرح کسی نے دینی طالب علم یعنی زیرِ تعلیم کسی حافظ یا عالم کی کفالت اپنے ذمے لی تو حافظِ قرآن یا عالم ومبلغ اور مدرّس بن کر جب تک وہ دین کی خدمت کرتا رہے گا،اس شخص کو ثواب ملتا رہے گا اور اگر اس کے شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعے دین کا کام جاری رہا تو اس کا ثواب بھی اسے ملتا رہے گا۔

نعت خوانوں اور واعظوں وخطبات کے نذرانوں کی ایک صورت کو امام اہلسنت امام احمد رضا قادری نے جائز کہا ہے،وہ یہ کہ یہ حضرات اپنے وقت کا اجارہ پروگرام کے منتظم کے ساتھ طے کرلیں اور اس وقت وہ ان سے کہے کہ آپ نعت پڑھیں یا خطاب کریں،تو یہ جائز ہے،کیونکہ یہ اجارہ ان کی ذات سے انتفاع کی اجرت ہے نہ کہ عبادات وطاعات کی اجرت ہے۔

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا:''ہندہ سنی حنفی پابند صوم وصلوٰۃ جو پندرہ بیس برس ہوئے کہ اپنے مادری پیشہ کسب سے توبہ کرچکی ،اپنی مقبوضہ کل جائداد واملاک جو اس کی ماں

اور نانی کی متروکہ اوران کوان کے آشناؤں کی ہبہ کی ہوئی ہے، مدرسہ دینیہ کی تعلیم میں یا اس کے یتیم ومفلس طلبہ کی خورد ونوش کی صرف میں لانے کی غرض سے وقف کرنا چاہتی ہے، پس سوال حضرات مفتیان شرع شریف سے یہ ہے کہ منتظمین مدرسہ کو یہ جائداد اپنے قبضہ میں لاکر اس کے محاصل کو ہندہ کی خواہش کے موافق صرف میں لانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا''۔

آپ نے جواب میں لکھا:''جو روپیہ بعوض زنا وغنا حاصل کیا مثل غصب حرام مطلق ہے کہ کسی طرح اس کی ملک نہیں ہوسکتا ہے، وہ جائدادیں جو آشناؤں نے زانیات کو ہبہ کیں وہ ہبہ بھی محض باطل ہے، وہ اصل دینے والوں کی ملک پر رہیں ان کی ملک میں نہیں آسکتیں، قنیہ ودرمختار میں ہے: مَایَدْفَعُهُ الْمُتَعَاشِقَانِ فَهُوَ رِشْوَةٌ۔ ترجمہ:''عشق بازی کرنے والے ایک دوسرے کو جودیں وہ رشوت ہے۔

(فتاوی ہندیہ بحوالہ القنیۃ، کتاب الہبۃ، الباب الحادی عشر فی المتفرقات)

ہاں جو جائداد زانیہ نے خریدی ہو اور اس کے شراء میں عقد ونقد دونوں زرِحرام پر جمع نہ ہوئے ہوں، مثلاً روپیہ پیشگی دے کر کہا کہ اس روپے کے عوض جائداد دے دے بائع نے اس کے عوض بیع کردی یہ تو حرام پر عقد ہوا، اور وہی روپیہ زرِثمن میں دیا گیا یہ حرام کا نقد ہوا دونوں جمع ہوگئے اس صورت میں بھی وہ جائداد ان کی ملک نہ ہوگی ہاں اگر زرحرام پر عقد ونقد دونوں جمع نہ ہوئے ہوں مثلاً جائداد خریدی اس وقت ثمن کی تعین خاص مال حرام سے نہ تھی، نہ وہ دکھایا گیا، نہ پیشگی دیا گیا، مطلق روپے کے بدلے خریدی، تو یہ جائداد اس خریدنے والے کی ملک صحیح وحلال ہوجائے گی، اب زرِثمن اس حرام مال سے ادا کیا گیا تو یہ گناہ ہوا اور بائع کو اس کا لینا حرام تھا، مگر جائداد اس کی ملک میں آگئی۔ اسی طرح جو کچھ اُن کو اُجرت ورشوت کے علاوہ ناچ گانے میں بطور انعام دیا جاتا ہے، جسے 'بیل' کہتے ہیں، وہ ان پر حرام نہیں، كَمَا نَصَّ عَلَيْهِ فِي الْهِنْدِيَة (جیسا کہ فتاوی ہندیہ میں اس پر نص کی گئی ہے)۔ غرض جن صورتوں میں جائداد اس کی ملک ہے، اسے وقف کرسکتی ہے، مدارس کے

مہتمم اُسے لے سکتے ہیں اور جس صورت میں جائداد اُس کی ملک نہیں، وہ اسے وقف نہیں کرسکتی، نہ اس کے وقف کرنے سے وقف ہوا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جائیداد کسی فقیر محتاج مسلمان کو ہبہ کر کے قبضہ کرادے اگرچہ اپنے کسی عزیز قریب مثل ماں بہن وغیرہ کو، اور وہ وقف کردے یا یہ اس سے خرید کرا گرچہ ایک پیسے کو یا اس سے اپنے نام ہبہ کرا کے قبضہ میں کر کے خود وقف کردے، اب یہ وقف صحیح ہوگا اور مدرسہ میں اس کا صرف حلال۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 16 ،ص: 122-121)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی نعت خواں یا واعظ پر جو لوگ پیشگی طے کیے بغیر رضا کارانہ طور پر پیسہ نچھاور کرتے ہیں، وہ اُن کے لیے حرام نہیں ہے۔

عام لنگر پر صدقاتِ واجبہ کی رقم نہیں لگائی جاسکتی

سوال:

آج کل بہت سارے ادارے لوگوں کو مفت کھانا کھلانے کا کام کررہے ہیں، زکوٰۃ وفطرہ کی رقوم لوگوں سے وصول کرتے ہیں۔ کھانا کھانے والوں میں لوگوں کی بڑی تعداد مستحق بھی نہیں ہوتی، یہ لوگ کام کر کے کھانے کے بجائے ایسی جگہوں سے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے کھانا کی ضرورت پوری کرتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہورہا ہے۔ ایسا عمل جو بظاہر نیک ہو، لیکن معاشرے میں بگاڑ پیدا ہورہا ہو تو کیا یہ عمل درست ہے؟۔ کیا ایسے ادارے ہونے چاہییں اور کیا ایسا عمل سنت سے ثابت ہے؟

(فرخ خان، شاہ فیصل ٹاؤن)

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰۤى اَتٰىنَا

الْيَقِيْنُ ۝

ترجمہ:''ہر شخص اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہے،سوائے دائیں طرف والوں کے،وہ جنتوں میں (رہیں گے)،وہ مجرموں سے سوال کریں گے کہ کون سی بات تمہیں جہنم میں لے گئی،وہ کہیں گے:ہم نماز نہیں پڑھتے تھے،مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہم بے ہودہ کاموں میں مشغول رہتے تھے اور ہم یومِ جزا کو جھٹلاتے تھے،یہاں تک کہ موت آگئی''۔(المدثر:47-38)

(۲) فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝

ترجمہ:''پھر وہ بے تامل گھاٹی میں کیوں نہ داخل ہوا اور آپ کیا سمجھے کہ وہ دشوار گھاٹی کیا ہے؟،(قرض یا غلامی سے) کسی کی گردن آزاد کرانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا،ایسے یتیم کو جو قرابت دار بھی ہو یا ایسے مسکین کو جو افتادۂ خاک ہو''۔(البلد:16-11)

(۳) اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝

ترجمہ:''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے،پس یہی وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا''۔(الماعون:3-1)

ان آیات مبارکہ سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

(الف) ان اُمور میں سے،جو جہنمیوں کے جہنم میں جانے کا سبب بنیں گے،ایک مسکینوں کو کھانا نہ کھلانا ہے۔

(ب) یہ کہ آخرت کی دشوار گزار منزل سے کامیابی سے گزرنا اُن لوگوں کے لیے آسان ہوگا،جو

(۱) طوقِ غلامی یا بارِ قرض یا تاوان سے کسی مصیبت میں مبتلا شخص کی گردن چھڑائے،

(۲) کسی افلاس زدہ مسکین کو کھانا کھلائے،خواہ وہ قرابت دار مسکین ہو یا افتادۂ خاک مسکین

ہو۔

(ج) یتیم پر ترس کھانا اور رحم کرنا۔

کھانا کھلانا فی نفسہ ایسا ثوابِ جاریہ ہے جسے شریعتِ مطہرہ میں باعثِ اجر بیان فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابوسعید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أَيُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلَى جُوْعٍ أَطْعَمَهُ اللهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقَى مُسْلِمًا عَلَى ظَمَأٍ سَقَاهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الرَّحِيْقِ الْمَخْتُوْمِ۔

ترجمہ:''جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو بھوک کے وقت کھانا کھلائے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھلوں (نعمتوں) سے کھلائے گا اور جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو سخت پیاس کے وقت پانی پلائے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کی مہر بند شراب طہور پلائے گا''۔

(سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:1679)

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:''پانی یا شربت کی سبیل لگانا، جب کہ بہ نیت محمود اور خالصاً لوجہ اللہ ثواب رسانی ارواحِ طیبہ ائمۂ اَطہار مقصود ہو، تو بلا شبہ بہتر و مستحب و کارِ ثواب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان عالی شان ہے:

اِذَا کَثُرَتْ ذُنُوْبُکَ فَاسْقِ الْمَآءَ عَلَى الْمَآءِ تَتَنَاثَرُ کَمَا یَتَنَاثَرُ الْوَرَقُ مِنَ الشَّجَرِ فِی الرِّیْحِ الْعَاصِفِ، رَوَاہُ الْخَطِیْبُ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ۔

ترجمہ:''جب تیرے گناہ زیادہ ہو جائیں تو (پیاسوں کو) بہ کثرت پانی پلا، اس طرح تیرے گناہ جھڑ جائیں گے جیسے سخت آندھی میں درخت کے پتے جھڑتے ہیں''۔

(رواہ الخطیب عن انس بن مالک)

اسی طرح کھانا کھلانا لنگر بانٹنا بھی باعثِ اجر ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ یُبَاهِیْ مَلٰٓئِکَتَهٗ بِالَّذِیْنَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ مِنْ عَبِیْدِهٖ، رَوَاہُ اَبُو الشَّیْخِ فِی الثَّوَابِ عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا۔

ترجمہ:''بے شک، اللہ تعالیٰ اُن (فیاض بندوں) پر فرشتوں کے سامنے فخر و مسرت کا اظہار

فرماتا ہے، جو اس کے (محتاج) بندوں کو (بھوک کی حالت میں) کھانا کھلاتے ہیں، (رواہ ابو الشیخ فی الثواب عن الحسن مرسلا)۔ مگر لنگر لٹانا جس میں لوگ چھتوں پر بیٹھ کر روٹی وغیرہ پھینکتے ہیں، کچھ ہاتھوں میں جاتی ہیں، کچھ زمین پر گرتی ہیں اور کچھ پاؤں کے نیچے آتی ہیں، یہ منع ہے کہ اس میں رزقِ الٰہی کی بے تعظیمی ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:24،ص:521،520،مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن)

آج کل چوکوں اور چوراہوں پر بالخصوص رمضان المبارک کے مہینے میں بعض لوگ زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ وغیرہ کی رقوم سے عام لنگر کھلاتے ہیں، جس میں اس بات کی کوئی تمیز نہیں ہوتی کہ یہ لوگ مستحقِ زکوٰۃ ہیں یا نہیں؟ اس میں غیر مسلم بھی آکر شامل ہو سکتے ہیں جبکہ وہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں بن سکتے۔ اگر بالفرض سبھی لنگر کھانے والے مستحق ہوں تو بھی اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے محض اباحت (یعنی کسی چیز کو کسی مستحق کے استعمال کے لیے مباح کر دینا) کافی نہیں بلکہ اس کو مالک بنانا ضروری ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کے ادا کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے اور اس طرح سے زکوٰۃ دینے والے اپنے فرض سے بری نہیں ہوں گے۔ اور جو تنظیمیں اس طرح کا نظام چلاتی ہیں، وہ بھی عنداللہ جوابدہ ہوں گی، البتہ اگر نفلی خیرات (Charity) کے طور پر کوئی یہ لنگر چلا رہا ہے تو نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ ہے۔ ویسے ہمارے نزدیک یہ طریقہ احترامِ انسانیت کے منافی ہے۔

ملک العلماء علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَأَمَّا رُكْنُهَا فَالتَّمْلِيكُ لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: ''أَدُّوا عَنْ كُلِّ حُرٍّ وَعَبْدٍ'' الحديث، وَالْأَدَاءُ هُوَ التَّمْلِيكُ فَلَا يَتَأَدَّى بِطَعَامِ الْإِبَاحَةِ وَبِمَا لَيْسَ بِتَمْلِيكٍ أَصْلًا وَلَا بِمَا لَيْسَ بِتَمْلِيكٍ مُطْلَقٍ، وَالْمَسَائِلُ الْمَبْنِيَّةُ عَلَيْهِ ذَكَرْنَاهَا فِي زَكَاةِ الْمَالِ، وَشَرَائِطُ الرُّكْنِ أَيْضًا مَا ذَكَرْنَا هُنَاكَ، غَيْرَ أَنَّ إِسْلَامَ الْمُؤَدَّى إِلَيْهِ هٰهُنَا لَيْسَ بِشَرْطٍ لِجَوَازِ الْأَدَاءِ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَمُحَمَّدٍ فَيَجُوزُ دَفْعُهَا إِلَى أَهْلِ الذِّمَّةِ، وَعِنْدَ أَبِي يُوسُفَ وَالشَّافِعِيِّ شَرْطٌ،

وَلَایَجُوزُ الدَّفعُ اِلَیھِم،

ترجمہ:''صدقۂ فطر کا ایک رکن تملیک (یعنی فقیر کو مالک بنا دینا) ہے، نبی ﷺ کا فرمان ہے:''ہر آزاد اور غلام کی طرف سے ادا کرو''۔ اور ادا کے معنی ہیں مالک بنا دینا، لہٰذا اگر فقیر کے لیے کھانا مباح کر دیا جائے (یعنی اسے کہا جائے کہ بیٹھ کر کھالو، لیکر جانے کی اجازت نہیں) تو صدقۂ فطر ادا نہیں ہوگا، اسی طرح ہر اُس صورت میں ادا نہیں ہوگا جس میں اصلاً تملیک نہ ہو یا مطلقاً نہ ہو۔ اس پر جو مسائل مبنی ہیں، وہ ہم نے ''زکوٰۃ المال'' میں لکھ دیے ہیں اور وہاں پر رکنِ تملیک کی شرائط بھی لکھ دی ہیں، سوائے اس کے کہ جسے صدقۂ فطر دیا جارہا ہے، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، لہٰذا ذمی کو بھی دے سکتے ہیں اور امام ابو یوسف اور امام شافعی کے نزدیک مُؤدّی (یعنی جسے صدقۂ فطر دیا جارہا ہے) کا مسلمان ہونا شرط ہے اور ذمیوں کو دینا جائز نہیں ہے''۔(بدائع الصنائع، جلد:2، ص:112)

ان اداروں کو چاہیے کہ عام لنگر کھلانے کے لیے زکوٰۃ یا فطرہ کی رقم صرف نہ کریں بلکہ نفلی صدقات سے یہ لنگر چلائیں یا اس مقصد کے لیے علیحدہ سے خیراتی فنڈ قائم کریں۔ بھوکے اور ضرورت مند کو کھانا کھلانے سے معاشرے میں کون سا فساد برپا ہورہا ہے، اس کا ہمیں علم نہیں اور نہ ہی سائل نے اس کی تشریح کی ہے۔ ممکن ہے اُن کا یہ گمان ہو کہ لوگ محنت سے جی چرائیں گے اور مفت خورے بن جائیں گے، بہر حال عام لنگر میں یہ امکان تو رہتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ۡ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ۚ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ

ترجمہ:''(صدقات کا مال) ان فقراء کے لیے ہے، جنہیں اللہ کی راہ میں روک دیا گیا ہو (جیسے مجاہد یا دین کا طالب عالم اپنی روزی کی تلاش میں) زمین میں چل پھر نہیں سکتے، ان (کی حقیقتِ حال) سے ناواقف شخص (اُن کی عزتِ نفس کی وجہ سے) انہیں مال دار سمجھے گا،

آپ انہیں ان کی نشانیوں سے پہچان لیں گے، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے''۔

(بقرہ:273)

خیر کے کام میں اگر کسی خرابی کا احتمال ہو تو اُس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے، نہ یہ کہ بھلائی کو مٹانے کے درپے ہوجائے، وہ لوگ جو ''تَعَاوُنٌ عَلَی الْبِرّ'' نہیں کرتے، وہ ''مَنَّاعٍ لِّلْخَیْر'' (خیر کے کاموں میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے) بھی نہ بنیں۔ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً 80 کروڑ لوگ غذائی قلت کا شکار ہیں، تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ دنیا بھر میں تقریباً ایک ارب تیس کروڑ ٹن خوراک یومیہ ضائع ہوتی ہے، تقاریب میں جس قدر کھانا ضائع کیا جاتا ہے، کبھی اُس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی۔

ڈاکوؤں سے مزاحمت میں مارا جانا

سوال:

اگر کسی شخص کے ساتھ خدانخواستہ ڈکیتی ہو تو کیا وہ اپنی چیز بچانے کے لیے مزاحمت کر سکتا ہے؟ جبکہ اسے اس بات کا علم بھی ہو کہ ڈاکو کے پاس ہتھیار ہے اور وہ اسے نقصان پہنچ سکتا ہے، اگر انسان ڈاکوؤں سے مزاحمت پر قتل ہوجائے تو کیا یہ خودکشی کے مترادف تو نہیں؟، (محمد اکرام، فیصل آباد)۔

جواب:

انسانی جان اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، ہمیں اس کے استعمال کرنے کا حق عطا کیا گیا ہے۔لیکن چونکہ ہم اپنی جان کے مالک نہیں ہیں، اس لیے ہمیں خود اپنی جان یا کسی عضو کو بھی ہلاک کرنے یا تلف کرنے کا حق نہیں ہے۔اسی لیے اسلام میں خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيدَةٍ فَحَدِيدَتُهُ فِي يَدِهِ يَتَوَجَّأُ بِهَا فِي بَطْنِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ شَرِبَ سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَحَسَّاهُ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ تَرَدَّى مِنْ جَبَلٍ

فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَرَدَّى فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی ہتھیار سے اپنے آپ کو ہلاک کرے گا تو وہ ہتھیار اس شخص کے ہاتھ میں ہوگا اور اس ہتھیار کو جہنم میں اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا اور ہمیشہ اسی کیفیتِ عذاب میں رہے گا۔ جو شخص زہر پی کر اپنے آپ کو ہلاک کرے گا تو وہ جہنم میں ہمیشہ زہر کھانے کی اذیت میں مبتلا رہے گا اور جو شخص پہاڑ سے گر کر اپنے آپ کو ہلاک کرے گا تو وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ لڑھکتا رہے گا''۔ (صحیح مسلم:109)

اسی طرح ہم پر لازم ہے کہ دوسروں کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کریں اور حدیث پاک میں شرک کے بعد قتلِ ناحق کو سب سے بڑا کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قتلِ ناحق کرنے والے کو آخرت کے دائمی عذاب کا حق دار قرار دیا ہے اور دنیا میں ہر جرم کی طرح عدالت میں قتلِ ناحق کے ثابت ہونے کے دو طریقے ہیں: (۱) اقرارِ جرم (۲) ایسے دو گواہ جو عدالت کے معیار پر پورا اترتے ہوں۔

ہر انسان پر اپنی جان، مال اور آبرو کا تحفظ لازم ہے۔ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے سے منع کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ترجمہ: ''اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، (البقرہ:195)''۔ اس سے مراد اپنے آپ کو ایسے حالات سے دوچار کرنا یا ایسے طریقے اختیار کرنا کہ جن میں جان کی ہلاکت کا خطرہ ہو۔

آج کل ڈکیتی کا کلچر عام ہے۔ اسلام میں اور جدید قانون میں ہر شخص کو اپنے تحفظ (Self Defence) کا حق حاصل ہے۔ اگر صورتِ حال ایسی ہے کہ ڈاکو کے پاس ہتھیار ہے، خواہ وہ تیز دھار خنجر ہو یا ٹی ٹی اور بندوق ہو یا کلاشنکوف ہو اور ایک شخص نہتا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور مقابلے کا استحقاق رکھنے کے باوجود عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی جان بچائے، تاہم اگر کوئی مسلمان اپنے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا، تو وہ شہید کے حکم میں ہے، حدیث پاک میں ہے: عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی

اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُونَ أَهْلِهِ، أَوْ دُونَ دَمِهِ، أَوْ دُونَ دِينِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ

ترجمہ: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے: جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے اور جو شخص اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی جان یا دین کی حفاظت میں مارا گیا، وہ بھی شہید ہے''۔(سنن ابوداؤد: 4757)''۔

تاہم اگر کوئی نہتا شخص کسی مسلح ڈاکو کا مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا، تو وہ ظلماً اور ناحق مارا گیا اور شہید کے حکم میں ہے اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ اُس نے اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈالا یا خدانخواستہ خودکشی کی۔

داڑھی کا مذاق اڑانا

سوال:

اگر کوئی شخص داڑھی کا مذاق اڑائے اور کہے: ''تمہاری داڑھی سکھوں کی طرح ہے''، اس کے لیے کیا حکم ہے؟۔(محمد ناصر خان چشتی، تونسہ شریف)

جواب:

اگر کوئی شخص داڑھی کو سنتِ رسول سمجھتے ہوئے اس کی تحقیر واہانت کرے تو اسے فقہائے کرام نے فعلِ کفر قرار دیا ہے، ایسے شخص کو توبہ کرکے تجدیدِ ایمان کرنی چاہیے، اس لیے کہ داڑھی اسلام کا شعار ہے اور سنّتِ رسول ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص سنت سے قطعِ نظر کسی شخص کی داڑھی کی خاص وضع کا مذاق اڑاتا ہے، تو یہ اگرچہ انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، لیکن کفر نہیں ہے، علامہ علی القاری علیہ رحمۃ الباری لکھتے ہیں:

وَفِي الْجَوَاهِرِ أَوْقَالَ: صَوْتٌ طَرِفَةٌ حِينَ سَمِعَ الْأَذَانَ أَوْ قِرَاءَةَ الْقُرْآنِ اِسْتِهْزَاءً كَفَرَ، وقولہ: اِسْتِهْزَاءً يُفِيدُ مَا قَرَّرْنَا سَابِقًا حَيْثُ أَطْلَقَهُ، وَفِي التَّتِمَّةِ أَوْقَالَ لِمُؤَذِّنٍ يُؤَذِّنُ اِسْتِهْزَاءً بِأَذَانِهِ: مَنْ هٰذَا الْمَحْرُوْمُ الَّذِي يُؤَذِّنُ، وَفِي ''الْمحِيط''، أَوْقَالَ: هٰذَا صَوْتٌ غَيْرُ الْمُتَعَارَفِ أَوْ صَوْتُ الْأَجَانِبِ كَفَرَ فِي الْكُلِّ۔ أَقُوْلُ: فَإِذَا سَمِعَ صَوْتَ مُؤَذِّنٍ غَرِيبٍ

فَقَالَ: هٰذَا صَوْتٌ أَجْنَبِيٌّ، أَوْغَيْرُ مَعْرُوْفٍ لَايَكْفُر، وَيَرِيْدُ مَاقَرَّرْنَا، قَوْلُهُ: وَإِنْ قَالَ لِغَيْرِ الْمُؤَذِّنِ لَايَكْفُرُ، يَعْنِيْ إِذَا أَذَّنَ بِغَيْرِ وَقْتٍ اِسْتِهْزَاءً، فَقَالَ لَهُ هٰذِهِ الْأَلْفَاظُ لَايَكْفُر۔

ترجمہ: ''اور ''جواہر'' میں ہے: یا مؤذن کی اذان سن کر استہزاء اور مذاق کے طور پر کہا: عجیب ہی آواز ہے یا تلاوتِ قرآن کا مذاق اڑایا، اس نے کفر کیا یا مذاق کے طور پر مؤذن کی اذان سن کر کہا: یہ کون مسکین (محروم) اذان دے رہا ہے اور ''محیط'' میں ہے: یا کہا: یہ تو عجیب سی غیر معروف آواز ہے، ان تمام صورتوں میں اس نے کفر کیا، (شرح ملا علی القاری علی الفقہ الاکبر: 303)''۔ فقہائے کرام نے زجر وتوبیخ اور وعید کے طور پر شعائرِ اسلام کے استخفاف، اہانت اور استہزاء کو کفر قرار دیا ہے اور اس سے اجتناب لازم قرار دیا ہے۔

ڈرائیونگ کے دوران موبائل فون کے استعمال کا شرعی حکم

سوال:

حالیہ دنوں میں ایک سعودی اسکالر نے فتویٰ دیا ہے کہ ڈرائیونگ کے دوران موبائل فون کا استعمال حرام ہے، اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ (گلفام احمد، لاہور)

جواب:

انسان پر اپنی اور دوسروں کی جان کا تحفظ لازم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ

ترجمہ: ''اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔ (بقرہ:195)

شریعت میں ایک حرام قطعی ہوتا ہے، یعنی وہ اُمور جنہیں اللہ عزوجل یا اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہو اور وہ ایسی شرعی دلیل سے ثابت ہو جو قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہے اور جو قطعیُ الثبوت اور ظنّی الدلالت یا اُس کے برعکس ہو، اُسے مکروہِ تحریمی کہتے ہیں۔

ڈرائیونگ میں بے احتیاطی سے حادثے کا رونما ہونا ایک ظنّی امر ہے، لہٰذا ایسے اُمور کو کُتب فقہ میں ''محظورات وممنوعات'' (Forbidden) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ڈرائیونگ

کے دوران ذرا سی بے توجہی خدانخواستہ کسی حادثے کا سبب بن سکتی ہے، خاص طور پر ہائی وے اور موٹروے پر جہاں ٹریفک کی رفتار عام طور پر انتہائی حد پر یا بعض اوقات اُس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا احتیاطی تدبیر کے طور پر ڈرائیونگ کے دوران موبائل فون استعمال کرنے پر پابندی کا قانون درست ہے، کیونکہ اسلام کا ایک اصول ''سدِّ ذرائع'' ہے، یعنی خطرات یا برائی کے امکانات کا سدِّ باب کرنا۔ ہمارے مالیاتی اداروں اور بنکوں میں اسے Risk Control Management کہتے ہیں۔ سعودی مفتی/اسکالر نے جو فتویٰ دیا ہے، اُس کی تفصیلات ہماری نظر سے نہیں گزریں، اس لیے بطورِ خاص اس کے مندرجات یا پیش کردہ دلائل اُس کے بارے میں رائے دینا، اُس کا جائزہ لیے بغیر مناسب نہیں ہے۔ تاہم اس حوالے سے حکومت کو تعزیری قانون بنانے اور اُس کو نافذ کرنے کا اختیار حاصل ہے اور اگر قانون پہلے سے موجود ہے، تو قانون شکنی انسان کے لیے بے توقیری کا باعث ہوتی ہے اور مسلمان کے لیے اپنی عزتِ نفس کا تحفظ بھی لازم ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يُذِلَّ نَفْسَهُ. قَالُوْا: وَكَيْفَ يُذِلُّ نَفْسَهُ؟ قَالَ: يَتَعَرَّضُ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا يُطِيقُ۔

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خود کو بے توقیر کرے، صحابۂ کرام نے عرض کی: وہ خود کو کیسے بے توقیر کرے گا؟، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے آپ کو ایسی مصیبت میں مبتلا کرنا جس کے تحمل کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو''۔ (سُنن ترمذی: 2254)

ظاہر ہے کہ قانون شکنی کر کے بندہ اپنے آپ کو بے توقیر کرتا ہے، خود اپنے لیے مصیبت کو دعوت دیتا ہے اور اس کو حدیث مبارک میں ''تذلیل'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت

سوال:

ایک حدیث ہے: ''جس نے مجھے خواب میں دیکھا، وہ جہنم میں نہیں جائے گا''، حدیث بیان کرنے میں اگر کوئی کمی بیشی ہوئی تو اللہ معاف فرمائے۔ میں نے ایک عالم سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر اعمال اچھے ہوں تو جہنم میں نہیں جائے گا، ورنہ صرف خواب میں زیارت ہونے سے جہنم سے نجات نہیں ملے گی۔ آپ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں، (فرحان انجم)۔

جواب:

آپ نے جو حدیث نقل کی ہے، اس طرح کی کوئی حدیث ہمارے علم میں نہیں، البتہ یہ حدیث تو ہے:

وَمَنْ رَآنِيْ فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِيْ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَتِيْ، وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ''جس نے خواب میں مجھے دیکھا، اُس نے مجھے ہی دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا اور جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے''۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث:110، 6197)

اس حدیث مبارک سے یہ امر ثابت ہے کہ سعادت مند مومن کو ہی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت رضامندی کی حالت میں ہوسکتی ہے۔ اس اعتبار سے اُس کے جنتی ہونے اور حسن عاقبت کے بارے میں اچھا گمان کیا جا سکتا ہے اور اس کے شواہد اس کی زندگی میں نظر آنے چاہییں۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ ہماری نماز مقبول ہوگئی؟، آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ

ترجمہ: ''بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے''۔ (عنکبوت:45)

سو اگر نمازی اس آیت کا مصداق بنتا ہے، تو یہ اس کی نماز کے مقبول ہونے کی ظاہری علامت ہے، غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

وسوسے کا علاج

سوال:

میں پنج وقتہ نماز باقاعدگی سے پڑھتا ہوں، لیکن شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے، ہر وقت گندی سوچ اور برے خیالات آتے ہیں، میں بچنا چاہتا ہوں، مجھے کوئی ورد بتادیں۔
(جہانگیر، کراچی)

جواب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ: ''اگر شیطان تمہیں کوئی وسوسہ ڈالے تو اللہ کی پناہ طلب کرو، بے شک وہ بہت سننے والا، جاننے والا ہے''۔ (اعراف: 200)

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب شیطان انسان کو برائی کی طرف راغب کرے تو انسان کو شیطان کے وسوسوں سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں شیطانی وسوسوں سے پناہ مانگنے کا طریقہ ''سورۃ النّاس'' میں بیان کیا گیا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

ترجمہ: ''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایئے! میں سب لوگوں کے رب کی پناہ لیتا ہوں، سب لوگوں کے بادشاہ کی، سب لوگوں کے معبود کی (پناہ لیتا ہوں) پیچھے ہٹ کر چھپ جانے والے کے وسوسہ ڈالنے کے شر سے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، جو جنات اور انسانوں میں سے ہے، (النّاس: 4 تا 6)''۔ یعنی شیطانی وسوسوں اور برے خیالات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ مُعَاذِبْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللہ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ: اِنَّ الشَّیْطَانَ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ کَذِئْبِ الْغَنَمِ یَاخُذُ الشَّاذَّۃَ وَالْقَاصِیَۃَ وَالنَّاحِیَۃَ وَاِیَّاکُمْ وَالشِّعَابَ وَعَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ وَالْعَامَّۃِ۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شیطان آدمی کا بھیڑیا ہے، جیسے بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے، جو ریوڑ سے الگ ہوجانے والی، دور رہ جانے والی اور کسی جانب الگ چلے جانے والی بکری کو پکڑ (کر شکار کر) لیتا ہے، پس تم گھاٹیوں سے بچو اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ وابستہ رہو، (یعنی دین میں اجماعِ اُمت سے الگ راہ اختیار نہ کرو)''۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص:31)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: جَاءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَسَاَلُوْہُ: اِنَّا نَجِدُ فِیْ اَنْفُسِنَا مَا یَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ یَتَکَلَّمَ بِہٖ، قَالَ: اَوَ قَدْ وَجَدْتُمُوْہُ؟ قَالُوْا: نَعَمْ، قَالَ: ذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بعض صحابہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ ہمارے دلوں میں بعض اوقات ایسے گندے خیالات آتے ہیں، جن کا بیان کرنا بھی ہم بڑا گناہ سمجھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں واقعی ایسے خیالات آتے ہیں؟ اُنہوں نے عرض کیا: جی ہاں! فرمایا: یہ تو عین ایمان ہے''۔ (صحیح مسلم:338)

اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کا وسوسے ڈالنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے، کیونکہ شیطان ایمان کا ڈاکو ہے اور یہ وہیں ڈاکا ڈالتا ہے، جہاں اُسے مطلوبہ دولت ملنے کی اُمید ہوتی ہے۔

عَنْ عَبْدِاللہِ قَالَ: سُئِلَ النَّبِیُّ ﷺ عَنِ الْوَسْوَسَۃِ؟، قَالَ: تِلْکَ مَحْضُ الْاِیْمَانِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے

وسوسہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ایمانِ خالص (کی نشانی) ہے"۔
(صحیح مسلم:340)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: لَا یَزَالُ النَّاسُ یَتَسَاءَلُوْنَ حتّٰی یُقَالَ: هٰذَا، خَلَقَ اللهُ الْخَلْقَ، فَمَنْ خَلَقَ اللهَ؟، فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَیْئًا فَلْیَقُلْ: آمَنْتُ بِاللهِ۔

ترجمہ:" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگ ایک دوسرے سے مسلسل اس طرح کے سوالات کرتے رہیں گے حتیٰ کہ یہ کہا جائے گا کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟، جس شخص کو اس بارے میں کوئی تردد ہو وہ یوں کہے: میں اللہ پر ایمان لایا ہوں"۔ (صحیح مسلم:343)

علامہ یحییٰ بن شرف النووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

قَالَ الْاِمَامُ الْمَازِرِیُّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی: ظَاهِرُالْحَدِیْثِ اَنَّهٗ ﷺ أَمَرَهُمْ أَنْ یَدْفَعُوْا الْخَوَاطِرَ بِالْاِعْرَاضِ عَنْهَا، وَالرَّدِلَهَا مِنْ غَیْرِاسْتِدْلَالٍ وَلَانَظْرٍفِیْ اِبْطَالِهَا،

ترجمہ:" علامہ مازری نے کہا ہے کہ ظاہر حدیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے وساوس کو دفع کرنے کے لیے ان سے اعراض (یعنی توجہ ہٹانے) کا حکم دیا ہے اور یہ کہ کسی دلیل یا غور وفکر کے بغیر فوراً ایسے برے خیالات کو رد کر دیا جائے"۔

(شرح مسلم للنووی، جلد1، ص:364)

اعراض سے مراد یہ ہے کہ ان وسوسوں کو دل ودماغ میں جگہ دے کر اُن پر غور وفکر کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے، بلکہ ان وسوسوں کو پہلے ہی مرحلے میں دماغ سے جھٹک کر دل کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ مکرم ﷺ کے ذکر وفکر میں مشغول رکھنا چاہیے۔ یہی طریقہ برے خوابوں کے بارے میں اختیار کرنا چاہیے کہ اُنہیں جھٹک دے، یہ نہیں کہ دنیا بھر کے ماہرین سے ان کی تعبیریں پوچھتا رہے:

عَنْ أَبِی قَتَادَةَ یَقُوْلُ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ یَقُوْلُ: اَلرُّؤْیَامِنَ اللهِ وَالْحُلْمُ

مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَنْفُثْ عَنْ يَسَارِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّهَا فَإِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهُ۔

ترجمہ:''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشادفرماتے ہوئے سنا:''اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہےاور براخواب شیطان کی طرف سے ہے، پس جب تم میں سے کوئی شخص ناگوار خواب دیکھے،تو بائیں جانب تین بارتھتکاردے اوراس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے، پھراس کواس خواب سے کوئی ضرر نہیں ہوگا،(یعنی اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شَرِّ هٰذَا اور لَاحَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْم پڑھ لے)''۔
(صحیح مسلم:2261)

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

کی زیور طبع سے آراستہ ہونے والی مؤثر تصنیف

تفسیر سورۃ النسآء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم تفسیر، انداز بیان مؤثر و دلکش

قدیم و جدید اہم تفاسیر کا نچوڑ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گنج بخش روڈ، لاہور فون 7221953-7220479 فیکس 7238010

الکرم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 7225085-7247350

انفال سینٹر، اردو بازار، کراچی 2210212-2212011-2630411

پروفیسر مُفتی مُنیب الرحمٰن

کی زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی مؤثر تصنیف

تفسیر سورۃ النسآء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم تفسیر، اندازِ بیان مؤثر و دلکش
قدیم و جدید اہم تفاسیر کا نچوڑ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گنج بخش روڈ، لاہور فون 7221953-7220479 فیکس 7238010
الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 7225085-7247350
اقبال سینٹر، اردو بازار، کراچی 2210212-2212011-2630411

تفسیر سورۃ النساء

دورِ جدید کی منفرد جامع اور عام فہم

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

تفسیر سورۃ النساء

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی پاکستان

نام کتاب	تفسیر سورۃ النساء
مصنف	مفتی منیب الرحمٰن
تاریخ اشاعت	جنوری 2005ء
تعداد	ایک ہزار
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
کمپیوٹر کوڈ	1Z380
قیمت	-/165 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔فون:7221953 فیکس:۔042-7238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون:7225085-7247350

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:021-2212011-2630411۔ فیکس:۔021-2210212

e-mail:- sales@zia-ul-quran.com

zquran@brain.net.pk

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

میں اپنی اس عاجزانہ علمی کاوش کو اپنے دو عظیم، نامور اور جلیل القدر اساتذہ حضرت علامہ مفتی محمد عبد القیوم ہزاروی مدظلہم العالی ناظم اعلیٰ تنظیم المدارس پاکستان و ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور و شیخوپورہ و چیئرمین سپریم کونسل، جماعت اہلسنت پاکستان اور حضرت قبلہ جسٹس ڈاکٹر علامہ مفتی سید شجاعت علی قادری قدس اللہ سرہم العزیز و اعلی اللہ مقامہم بانی و مہتمم دار العلوم نعیمیہ کراچی کے اسماء مبارکہ و ذواتِ گرامی سے منسوب کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ یہ دونوں شخصیات میرے محسن و مربی اور علمی فیضان کا سرچشمہ ہیں۔ اول الذکر نے دینی علوم کی طرف پیش قدمی میں مجھے مضبوط بنیاد فراہم کی، میری سمت قبلہ کو درست کیا اور ثانی الذکر نے میری شخصیت کو نکھار کر بتدریج اس مقام تک پہنچایا اور مجھے خود اعتمادی بخشی۔ اول الذکر کا تصلب فی الدین اور نصب العین میں فنائے کلی اور ثانی الذکر کا حلم، تواضع، شفقت سراپا، اخلاقِ کریمانہ، شخصی و علمی توازن، مسلک میں اعتدال اور دلکش و دلربا شخصیت آج بھی میرے لئے مشعل راہ اور سرمایہ حیات ہیں۔ آج میں علمی و عملی میدان میں جو کچھ بھی ہوں وہ انہی بزرگوں کا فیضانِ نظر اور حسن تربیت ہے اور مجھ میں جو بھی علمی اور عملی خامیاں ہیں وہ میری اپنی تنگیٔ داماں کا نتیجہ ہے۔

نہ پوچھو ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

خاکپائے بزرگاں و خوشہ چیں منابع علم

منیب الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تالیف علامہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے پروف بوقت نظر پڑھے ہیں، میرے علم کے مطابق اس کتاب میں درج آیات قرآنی کے الفاظ اور اعراب غلطیوں سے مبرا ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حافظ محمد ابراہیم فیضی

مولانا [illegible]
بی۔ اے۔ و فاضل علوم شرقیہ
منظور شدہ پروف ریڈر حکومت [illegible]

فہرست

حرف اول 21
حرف ناتمام 23
مقدمہ اصول تفسیر 27
ترجمہ: لغوی و اصطلاحی معنیٰ اور
ترجمہ کی اقسام 27
مترجمین کی اقسام 28
اعجاز قرآن 29
تفسیر کے لغوی معنیٰ 29
تفسیر کی اصطلاحی تعریف 30
تفسیر کی دوسری تعریف 30
علم تفسیر کے اجزاء 30
تاویل کے لغوی معنیٰ 31
تفسیر اور تاویل میں فرق 31
موضوع کی تعریف 32
علم تفسیر کا موضوع 32
علم تفسیر کی غرض وغایت 32
علم تفسیر کی فضیلت 33
علم تفسیر کے مراتب وماخذ 33
تفسیر القرآن بالقرآن 33
تفسیر القرآن بالسنۃ 35
تفسیر القرآن بآثار الصحابہ 37
تفسیر القرآن بآثار التابعین 39
تفسیر القرآن باللغۃ العربیہ
والقواعد العربیہ 39
تفسیر القرآن بالعقل السلیم 40
قرآن کا اصل ماخذ وحی زبانی 43
مسلمات دینیہ کی پابندی 43
اثبات ونفی میں تطبیق 44
سورۃ النساء 45
ابتدائیہ 45
اجمالی تعارف 45
اطاعت الٰہی، اطاعت رسول اور
اطاعت اولی الامر 45
ادائے امانت وقیام عدل 46
صلوٰۃ قصر وصلوٰۃ خوب اور تیمم
کے احکام 47
قتل کے احکام 47
منافقین کا طبقہ اور یہود مدینہ کی
روش 48
جدال وقتال کے احکام 49

دفاعی، داخلی اور خارجی حکمت عملی 49

حقوق یتامیٰ 50

احکام وراثت 50

حضرت عیسیٰ اور یہود و نصاریٰ کے عقائد باطلہ 51

حقوق نسواں 51

توبہ 52

مسئلہ غلامی 53

تمہید 53

قرآن میں غلاموں کا ذکر 53

غلام کی تعریف 54

غلامی کا پس منظر 54

غلامی کے اسباب 54

اسلام نے آزاد انسانوں کو غلام بنانے کا فوری سدباب کیا 55

اسلام نے جنگی قیدیوں کے مروجہ قانون میں رعایتیں دیں 56

جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی مشروعیت کا سبب 57

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے احکام 58

اسلام میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیبات 59

اسلام میں غلاموں کو آزاد کرنے کے احکام وقوانین 60

غلاموں کی اقسام 61

مسلمانوں کے غلام آزاد کرنے کی چند مثالیں 61

باندیوں سے مباشرت کے جواز کا مسئلہ 62

کیا اب بھی رسم غلامی جاری رہ سکتی ہے 63

تفسیر سورۃ النساء 65

آیت نمبر ۱ مع ترجمہ 65

مشکل الفاظ کے معانی 65

تفسیر 66

قرآن کا اسلوب خطاب 66

الرب کے معنی 66

نفس واحدہ سے مراد 66

زوج کی کیفیت تخلیق 66

مافوق الاسباب تخلیق کی حکمت 67

صلہ رحمی 69

آیات نمبر ۲۔۳ مع ترجمہ 71

مشکل الفاظ کے معانی 71

تفسیر: یتم اور یتیم کے معنی 72
یتیم کا مال ادا کرنے کا حکم 73
یتیم کا مال کھانے کی ممانعت 73
یتیموں سے ظلماً نکاح کرنے کی ممانعت 74
اجنبی عورت کو نکاح کی غرض سے دیکھنے کی اجازت 75
ولایت نکاح 76
کفو کے معنی 76
مسئلہ تعدد ازواج 77
تعداد ازدواج رسول 78
آیت نمبر ۴ مع ترجمہ 80
مشکل الفاظ کے معانی 81
تفسیر: مہر کا وجوب 81
مہر کا مفہوم 82
آیات نمبر ۵۔۶ مع ترجمہ 83
مشکل الفاظ کے معانی 84
تفسیر: نادان کو اس کا مال سپرد کرنے کی ممانعت 85
یتیموں کی اہلیت کو جانچنا 85
بلوغت کے باوجود اہلیت ضروری ہے 86
یتیموں کے مال میں اسراف کی ممانعت 86
گواہوں کی موجودگی میں مال سپرد کرنے کا حکم 87
آیت نمبر ۷ مع ترجمہ 87
مشکل الفاظ کے معانی 87
تفسیر: ترکہ کی تعریف 88
مقدار وصیت 88
وصیت بحق وارث 88
ترکہ کی تقسیم کے شرعی اصول 89
مصارف تجہیز و تکفین 89
ادائے قرض 89
نفاذ وصیت 89
تقسیم وراثت 89
سبب نزول 89
وراثت میں قرابت کی ترجیح کا اصول 90
آیت نمبر ۸۔۹ مع ترجمہ 90
مشکل الفاظ کے معانی 91
تفسیر: غیر وارث قرابت داروں کی رعایت کا حکم 91
یتیموں پر ترس کھانے کی حکیمانہ

ترغیب	92	حدود الٰہی کی رعایت کا حکم	102
آیت نمبر ۱۰ مع ترجمہ	92	آیات نمبر ۱۵۔۱۶ مع ترجمہ	103
مشکل الفاظ کے معانی	93	مشکل الفاظ کے معانی	103
تفسیر: یتیم کا مال ظلماً کھانے کی		تفسیر: فاحشہ کے معنی ومفہوم	104
اخروی سزا	93	حد زنا	105
آیات نمبر ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴ مع		آیات نمبر ۱۷۔۱۸ مع ترجمہ	106
ترجمہ	93	تفسیر: توبہ کا معنی ومفہوم	107
مشکل الفاظ کے معانی	95	توبہ کا شرعی طریقہ	107
تفسیر: احکام وراثت	97	''علیٰ'' کا مفہوم	108
والدین کے ترکے میں اولاد کا		نادانی میں گناہ کے ارتکاب کا	
حصہ	97	مفہوم	108
اولاد کے ترکے میں والدین کا		جن کی توبہ قبول نہیں	109
حصہ	98	آیات نمبر ۱۹۔ ۲۰ مع ترجمہ	110
وراثت میں حجب	99	مشکل الفاظ کے معانی	110
موانع ارث	99	تفسیر: زبردستی عورتوں کا وارث	
عاق کرنے کا مسئلہ	99	بننے کی ممانعت	111
زوجین کی وراثت کا مسئلہ	100	فاحش بین کے معنی	112
معتدہ (دوران عدت) عورت کی		ناگواری کے باوجود نباہ کرنے کا	
وراثت کا مسئلہ	100	حکم	113
کلالہ کی تعریف	101	عورت کو جان چھڑانے پر مجبور نہ	
بھائی بہن کی اقسام	101	کرو	113
کلالہ کی وراثت	102	مقدار مہر پر شرعاً تحدید نہیں ہے	114

مہر کی کم از کم مقدار	114	آیات نمبر ۲۹ تا ۳۱ مع ترجمہ	127
آیت نمبر ۲۲ مع ترجمہ	115	مشکل الفاظ کے معانی	128
مشکل الفاظ کے معانی	115	تفسیر: باہم ظلم وزیادتی کی ممانعت	129
تفسیر: مُحَرَّمَاتِ مُؤَبَّدَہ	115	گناہ صغیرہ وکبیرہ کی تعریف	130
محرمات نسبیہ	116	آیت نمبر ۳۲ مع ترجمہ	131
محرمات رضاعیہ	116	مشکل الفاظ کے معانی	131
محرمات بالمصاہرہ	116	تفسیر: حسد کی ممانعت	131
محرمات غیر مؤبدہ	116	آیت نمبر ۳۳ مع ترجمہ	133
محرمات کی قبیح ترین قسم	116	مشکل الفاظ کے معانی	133
آیت نمبر ۲۳ مع ترجمہ	117	تفسیر: عقد موالات سے وراثت	
مشکل الفاظ کے معانی	118	ثابت نہیں ہوتی	133
تفسیر: محرمات نسب	118	آیت نمبر ۳۴ مع ترجمہ	134
محرمات رضاعت	119	مشکل الفاظ کے معانی	134
رضاعت کا رشتہ یک طرفہ متعدی		تفسیر: مرد عورتوں کے محافظ و	
ہوتا ہے	120	نگہبان ہیں	135
حرمت مصاہرت	121	نافرمان بیوی کے احکام	136
ربیبہ کا معنی ومفہوم	121	آیت نمبر ۳۵ مع ترجمہ	136
آیات نمبر ۲۴ تا ۲۸ مع ترجمہ	122	مشکل الفاظ کے معانی	137
مشکل الفاظ کے معانی	124	تفسیر: زوجین میں مصالحت کا	
تفسیر: حصن، احصان اور محصنہ		طریقہ	137
کے معانی	125	آیت نمبر ۳۶ مع ترجمہ	138
آیات میں بیان کردہ مسائل	126	مشکل الفاظ کے معانی	138

تفسیر: عبادت سے مراد 139

والدین سے حسن سلوک 139

پڑوسی کی اقسام 140

غلاموں سے حسن سلوک 141

تکبر کی مذمت 142

آیات نمبر ۳۷ تا ۳۹ مع ترجمہ 143

مشکل الفاظ کے معانی 144

تفسیر: بخل کی مذمت 144

ریا کاری کی مذمت 144

آیت نمبر ۴۰ مع ترجمہ 145

تفسیر: معمولی نیکی کا بھی اجر ملے گا 145

آیت نمبر ۴۱-۴۲ مع ترجمہ 146

مشکل الفاظ کے معانی 146

تفسیر: حضور انبیاء پر شاہد ہوں گے 147

آیت نمبر ۴۳ مع ترجمہ 147

مشکل الفاظ کے معانی 148

تفسیر: نماز کے ضمن میں شراب کی ممانعت کا حکم 148

حالت جنابت میں نماز کی ممانعت 149

تیمم کے احکام 150

لمس اور ملامسہ کے معنی 150

تیمم کا طریقہ 151

آیات نمبر ۴۴ تا ۴۶ مع ترجمہ 151

مشکل الفاظ کے معانی 152

تفسیر: کتاب کے ایک حصے سے مراد 153

گمراہی خریدنے کا مفہوم 153

بارگاہ رسالت میں ذو معنی الفاظ کی ممانعت 153

تعریض، توریہ، ایہام 154

''توریہ'' کا اصطلاحی معنی 154

آیات نمبر ۴۷، ۴۸ مع ترجمہ 157

مشکل الفاظ کے معانی 158

تفسیر: قرآن کے مصدق ہونے کا مفہوم 158

یہود کی ایک سزا چہروں کا بگاڑ 159

اصحاب السبت کا مفہوم 159

شرک نا قابل معافی ہے 160

آیات نمبر ۴۹-۵۰ مع ترجمہ 160

مشکل الفاظ کے معانی 160

تفسیر: یہود کی خوش فہمیاں 161

آیات نمبر ۵۱ تا ۵۵ مع ترجمہ 161

مشکل الفاظ کے معانی 162
تفسیر: جبت اور طاغوت کے معنی 163
قرآن کے ملعونین 163
یہود کو سند حقانیت جاری کرنے کا حق نہیں 164
یہود حاسد ہیں 164
آیت نمبر ۵۶ مع ترجمہ 165
مشکل الفاظ کے معانی 165
تفسیر: اہل جہنم کی جلد تبدیل کرنے کی حکمت 165
آیت نمبر ۵۷ مع ترجمہ 165
مشکل الفاظ کے معانی 166
تفسیر: جنتی بیویوں کے پاک ہونے کا مفہوم 166
آیت نمبر ۵۸ مع ترجمہ 166
مشکل الفاظ کے معانی 167
تفسیر: شان نزول 167
ادائے امانت کا مفہوم 167
مشورے میں امانت 168
مجلس میں امانت 168
تفویض مناصب میں امانت 168
حقوق اللہ میں امانت 169
حکومتی اور عدالتی فیصلوں میں عدل 169
آیت نمبر ۵۹ مع ترجمہ 169
مشکل الفاظ کے معانی 170
تفسیر: اطاعت کی اقسام 170
پہلی دو اطاعتیں مستقل اور غیر مشروط ہیں 170
اولی الامر کی اطاعت مشروط 171
تنازعات کے حل کا اصول 172
اولی الامر کا مصداق 172
آیات نمبر ۶۰ تا ۷۰ مع ترجمہ 172
مشکل الفاظ کے معانی 174
تفسیر: سبب نزول 176
حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تائید 177
منافقین کا طرز عمل 178
عصمت نبوت کی دلیل 179
استغفار کے لئے وسیلہ رسول 179
بعد از وصال وسلہ نجات 180
رسول کا فیصلہ دل سے ماننا ضروری ہے 180
مخلص مومنوں کی شان 181
رسول کی غیر مشروط اطاعت کا

انعام	181	تفسیر: موت سے مفر نہیں	190
صدیق، شہید، صالح	181	تقدیر کا مالک اللہ ہے	191
آیات نمبر ۷۱ تا ۷۳ مع ترجمہ	182	خیر اللہ کی عطا ہے اور شر اعمال کی	
مشکل الفاظ کے معانی	182	سزا ہے	191
تفسیر: جہاد کیلئے تیار رہنے کا حکم	183	آیات نمبر ۸۱، ۸۲ مع ترجمہ	192
منافقین کا دہرا طرز عمل	183	مشکل الفاظ کے معانی	192
آیت نمبر ۷۴ مع ترجمہ	184	تفسیر: منافقین کا دوغلا پن اور	
مشکل الفاظ کے معانی	184	ریشہ دوانیاں	193
تفسیر: بیعت کا مفہوم	184	نفاق کا سبب قرآن کا انکار	193
آیت نمبر ۷۵ مع ترجمہ	185	آیت نمبر ۸۳ مع ترجمہ	194
مشکل الفاظ کے معانی	185	مشکل الفاظ کے معانی	194
تفسیر: مظلوموں اور بے بسوں کی		تفسیر: غیر مصدقہ خبریں پھیلانے	
دستگیری امت کا فریضہ ہے	185	کی ممانعت	194
آیت نمبر ۷۶ مع ترجمہ	186	زمانہ جنگ میں خبروں کی ترسیل	
مشکل الفاظ کے معانی	186	پر کنٹرول	195
تفسیر: جنگ اور جہاد میں فرق	186	آیت نمبر ۸۴ مع ترجمہ	195
آیت نمبر ۷۷ مع ترجمہ	187	مشکل الفاظ کے معانی	196
مشکل الفاظ کے معانی	187	تفسیر: حضور کی شان استقامت	196
تفسیر: آیت کا مصداق	188	آیت نمبر ۸۵ مع ترجمہ	196
دنیوی اور اخروی نعمتوں کا تقابل	189	مشکل الفاظ کے معانی	197
آیات نمبر ۷۸ تا ۸۰ مع ترجمہ	189	تفسیر: شفاعت کے معنی اور اقسام	197
مشکل الفاظ کے معانی	190	آیات نمبر ۸۶۔۸۷ مع ترجمہ	197

مشکل الفاظ کے معانی 198
تفسیر: سلام کے فضائل ومسائل 198
سلام کے مسائل 199
مصافحہ کا شرعی حکم 201
آیات نمبر ۸۸۔۹۱ مع ترجمہ 201
مشکل الفاظ کے معانی 203
تفسیر: احوال منافقین 203
منافقین کی اقسام 204
اہل بدعت ومعصیت اور مخالفین
اسلام سے میل جول کی ممانعت 206
منافقین کا مصداق کون؟ 207
آیات نمبر ۹۲۔ ۹۳ مع ترجمہ 209
مشکل الفاظ کے معانی 210
تفسیر: قتل ناحق گناہ کبیرہ ہے 210
فقہائے احناف کے نزدیک قتل
کی اقسام 211
قتل عمد 211
قتل شبہ عمد 211
قتل خطاء 211
قتل بالسبب 212
قتل خطاء کے احکام 213
کفارہ قتل خطاء 213
دیت کا معنی ومفہوم اور مقدار 214
عاقلہ کا مفہوم 214
قتل عمد کا حکم 214
آیت نمبر ۹۴ مع ترجمہ 215
مشکل الفاظ کے معنی 215
تفسیر 126
آیات نمبر ۹۵۔۹۶ مع ترجمہ 218
مشکل الفاظ کے معانی 218
تفسیر: 218
آیات نمبر ۹۷ تا ۱۰۰ مع ترجمہ 219
مشکل الفاظ کے معانی 220
تفسیر: 220
آیات نمبر ۱۰۱ تا ۱۰۴ مع ترجمہ 221
مشکل الفاظ کے معانی 223
تفسیر: قصر کا معنی ومفہوم 224
قصر کی علت 224
مسافت قصر 225
فقہ حنفی 225
فقہ شافعی وحنبلی 225
فقہ مالکی 226
ظاہریہ 226
قصر کی ابتداء وانتہا اور مدت قصر 226

وجوب قصر میں مذاہب 226
فرائض میں قصر 227
سنن میں قصر 227
سفر معصیت کے احکام 227
صلوٰۃ الخوف کے احکام 228
امام ابو یوسف کا نظریہ 229
صلوٰۃ الخوف کا فلسفہ اور حکمت 229
چوکس رہنے کا حکم 229
نماز: عبادت موقوف 230
جمع بین الصلاتین 230
آیات نمبر ۱۰۵ تا ۱۰۹ مع ترجمہ 231
مشکل الفاظ کے معانی 232
تفسیر: سبب نزول 232
نبی کا فیصلہ اللہ کا فیصلہ 233
توکیل بالخصومت 234
استغفار نبی کا محمل 235
اپنے آپ سے خیانت کرنے کا مفہوم 236
اللہ سے چھپانا ناممکن ہے 236
آیت نمبر ۱۱۰ تا ۱۱۲ مع ترجمہ 236
تفسیر: ''خطاء'' اور ''اثم'' مع ترجمہ 237
تہمت لگانا بڑا جرم ہے 237
آیات نمبر ۱۱۳۔۱۱۴ مع ترجمہ 238
مشکل الفاظ کے معانی 238
تفسیر: علامہ آلوسی کی توجیہ 239
علم نبوت کی وسعت کا بیان 239
قرآن اور سنت کی روشنی میں رسول اللہ کے علم کی وسعت 240
امور خیر کے لئے مشاورت رضائے الٰہی کا باعث ہے 245
آیت نمبر ۱۱۵ مع ترجمہ 245
مشکل الفاظ کے معانی 246
تفسیر: سنت واجماع کی حجیت 246
آیات نمبر ۱۱۶ تا ۱۲۱ مع ترجمہ 247
مشکل الفاظ کے معانی 248
تفسیر: ماسوائے شرک ہر گناہ قابل معافی ہے 248
''اناث'' سے مراد معبودان باطلہ ہیں 248
''شیطان مرید'' کی عبادت 249
شیطان کے تزویری حربے 249
''امنیۃ'' کے معنی 249
بحیرہ 250
اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو بگاڑنا 250

شیطان کے وعدے فریب وسراب	251
آیات نمبر ۱۲۲ تا ۱۲۴ مع ترجمہ	251
مشکل الفاظ کے معانی	251
تفسیر: اللہ کا وعدہ سچا ہے	252
نجات کا انحصار خود فریبی پر نہیں ہے	252
آیات نمبر ۱۲۵۔۱۲۶ مع ترجمہ	252
مشکل الفاظ کے معانی	253
تفسیر: دین حنیف، ملت ابراہیمی	253
خلیل: لقب ابراہیم خلیل اللہ	254
آیات نمبر ۱۲۷ تا ۱۳۰ مع ترجمہ	254
مشکل الفاظ کے معانی	256
تفسیر: سیاق وسباق	256
عورتوں کے بارے میں استفتاء و افتاء	257
زوجین میں مصالحت	258
متعدد ازواج کے درمیان عدل	258
اللہ کی غیبی تائید وامداد	258
آیات نمبر ۱۳۱ تا ۱۳۴ مع ترجمہ	259
مشکل الفاظ کے معانی	259
تفسیر: اللہ تعالیٰ کا اقتدار کلی	260
آیات نمبر ۱۳۵ تا ۱۳۷ مع ترجمہ	260
مشکل الفاظ کے معانی	261
تفسیر: قیام عدل	262
ادائے شہادت، دینی فریضہ	262
سچی گواہی میں حائل رکاوٹیں	262
شہادت سے گریز کی ممانعت	263
امام قرطبی کی دلچسپ نکتہ آفرینی	263
نظام عدل سے وابستہ حکام کی ذمہ داری	264
مومن سے مطالبہ ایمان کیوں؟	264
ایمان وکفر کے تکرار کا سبب	265
زندیق کی توبہ	265
آیات نمبر ۱۳۸ تا ۱۴۷ مع ترجمہ	266
مشکل الفاظ کے معانی	268
تفسیر: احوالِ منافقین	268
موالات کفار	268
آیات الٰہی کا مذاق اڑانا	268
تربص، تذبذب	268
تردّد، تساہل، فریب	269
تربص	270
تساہل وتکاسل	270
خداع، فریب	270
ریاکاری	270

عنوان	صفحہ
تذبذب	270
اللہ کی حجت	271
جہنم کے طبقات	271
راہِ نجات کھلا ہے	271
آیات نمبر ۱۴۸-۱۴۹ مع ترجمہ	272
مشکل الفاظ کے معانی	272
تفسیر: سببِ نزول	272
برائی کا اظہار واعلان ناپسندیدہ ہے	273
نیکیوں میں اخفاء بہتر ہے	273
عفوودرگزر صفت الوہیت ہے	273
آیات نمبر ۱۵۰-۱۵۲ مع ترجمہ	274
تفسیر: کفر کی مختلف صورتیں	274
بیچ کی راہ نکالنے کا راستہ	275
آیات نمبر ۱۵۳ تا ۱۵۹ مع ترجمہ	275
مشکل الفاظ کے معانی	277
تفسیر: یہودیوں کی حجت بازی اور عذر لنگ	277
پرنالہ وہیں بہتا رہا	278
یہود سے پختہ عہد لینے کا واقعہ	278
مسلسل نافرمانیوں کی سزا	279
حضرت مریم	279
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت	280
کلمۃ اللہ	282
قیامت میں باپ کے نام سے پکارا جائے گا	282
بن باپ کی پیدائش ماورائے عقل ہوسکتی ہے، خلاف عقل نہیں	283
عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہود کا سنگدلانہ رویہ	283
عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ کے وعدے	283
عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا معاملہ مشتبہ ہوگیا	284
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں شکوک واختلاف	285
رفع عیسیٰ علیہ السلام	285
رفع عیسیٰ علیہ السلام کے منکرین	286
آمد عیسیٰ علیہ السلام	286
آیات نمبر ۱۶۰ تا ۱۶۲ مع ترجمہ	286
مشکل الفاظ کے معانی	287
تفسیر: یہود کی مزید سرکشی اور اس کی سزا کا ذکر	287
آیات نمبر ۱۶۳ تا ۱۶۶ مع ترجمہ	288

تفسیر: راسخین فی العلم اور مومنین کی صفات اور اجر 289
سلسلہ وحی و رسالت شروع سے جاری ہے 289
زبور کا تذکرہ 290
بعثت رسل کا مقصد اتمام حجت ہے 290
آیات نمبر ۱۶۷ تا ۱۷۰ مع ترجمہ 290
تفسیر: کفر نا قابل معافی جرم ہے 291
آیت نمبر ۱۷۱ مع ترجمہ 291
مشکل الفاظ کے معانی 292
تفسیر: غلو فی الدین کا مفہوم 292
تفریط یہود 292
افراط نصاریٰ 292
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل مقام، اسماء والقاب 293
کلمۃ اللہ 293
روح کے معانی 294
حضرت مریم علیہا السلام کا منفرد اعزاز 295
عقیدۂ تثلیث سے ممانعت 295
عقیدۂ تثلیث کی تاویلات و توجیہات 296
اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ہے 296
آیات نمبر ۱۷۲۔۱۷۳ مع ترجمہ 297
مشکل الفاظ کے معانی 297
تفسیر: شان نزول 297
اللہ کی بندگی عار نہیں اعزاز ہے 298
آیت نمبر ۱۷۴۔۱۷۵ مع ترجمہ 298
مشکل الفاظ کے معانی 299
تفسیر: برہان اور نور مبین 299
آیت نمبر ۱۷۶ مع ترجمہ 300
تفسیر: آخری آیت 300
آیت الصیف 301
تکرار احکام کی حکمت 301
سورۃ النساء کی ابتداء و اختتام 301
اخت سے مراد 301
کلالہ کی میراث 302

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَحْمَۃٍ لِّلْعَالَمِیْنَ، سَیِّدِنَا وَ مَوْلٰینَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ وَ عَلٰی صَحَابَتِہِ الصِّدِّیْقِیْنَ الْکَامِلِیْنَ، وَعَلٰی اَوْلِیَآءِ اُمَّتِہٖ وَعُلَمَآءِ مِلَّتِہٖ مِنَ الْفُقَھَآءِ الْمُجْتَھِدِیْنَ وَالْمُحَدِّثِیْنَ وَالْمُفَسِّرِیْنَ اَجْمَعِیْنَ

حرف اول

لیجئے ''تفسیر سورۃ النسآء'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے شروع میں اصول تفسیر پر ایک وقیع مقدمہ بھی شامل ہے جو نصابی ضرورت کی تکمیل کا تقاضا ہے۔ میں نے تفسیر کے شروع میں ''سورۃ النسآء'' کے مضامین پر مشتمل ایک مبسوط تعارف بھی درج کر دیا ہے جو اردو کی متداول بڑی تفاسیر میں بھی دستیاب نہیں ہے۔ چونکہ اس سورۂ مبارکہ میں غلاموں کا تذکرہ ہے، اس لئے میں نے ''مسئلہ غلامی'' پر ایک پر مغز مقالہ بھی مستقل عنوان کے تحت درج کر دیا ہے۔ ترجمہ ''تحت اللفظ'' نہیں بلکہ سلیس اور بامحاورہ ہے، لیکن متن قرآنی کے قریب تر رہ کر میں نے وحی ربانی کی ترجمانی کی امکانی سعی کی ہے۔ میں نے تفسیر میں ایسی آیات کو ملا کر لکھا ہے جو اپنے مفہوم و مضمون کے اعتبار سے باہم مربوط ہیں۔ تفسیر میں ذیلی عنوانات درج کئے ہیں تاکہ اس کی افادیت نمایاں اور واضح ہو۔ فقہی مسائل بھی قدرے تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں۔ اگر آپ ہماری کتاب کی فہرست پر نظر ڈالیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری تفسیر کی انفرادیت اور علمی کاوش کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

تفسیری مباحث میں جن عظیم مآخذ اصلیہ کو میں نے بالاستیعاب پیش نظر رکھا ہے اور جو ''امہات تفاسیر'' میں شمار ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں: علامہ ابوبکر محمد بن عبد اللہ المعروف بابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ کی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن''، امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ کی ''التفسیر الکبیر'' اور علامہ ابوالفضل سید محمود آلوسی حنفی

متوفی ۱۲۷۰ھ کی تفسیر ''روح المعانی'' ان کے علاوہ معاصرین و متقدمین کی دیگر تفاسیر بشمول اردو تفاسیر بھی زیرِ نظر رہی ہیں تا کہ حتی الامکان ایک جامع اور کامل تفسیری تحفہ اہل علم اساتذۂ کرام اور باذوق طلبہ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ امید ہے اب تعلیم و تعلم کے لئے کوئی تشنگی باقی نہیں رہے گی۔ اسلام دیانت و امانت کا سب سے بڑا علمبردار ہے، اساتذہ کی علمی دیانت سے مجھے امید واثق ہے کہ وہ اپنے طلبہ و طالبات کو دستیاب نصابی کتب میں سے بہتر انتخاب کی طرف رہنمائی فرمائیں گے۔ اللہ جل شانہٗ اس عاجزانہ سعی کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے اور اس کو اپنے فضل و کرم سے افادیت و قبولیت عامہ عطا فرمائے، آمین یارب العالمین بجاہ سید المرسلین علیہ وعلی الہ وصحبہ افضل الصلوۃ والتسلیم۔

احقر العباد
منیب الرحمٰن
مہتمم دار العلوم نعیمیہ، کراچی
رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان
رکن مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان
مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان
رکن صوبائی زکوٰۃ کونسل سندھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرف ناتمام

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحۡسَانِہٖ کہ اس نے ''تفسیر سورۃ النسآء'' کو اہل علم میں مقبولیت عطا فرمائی، فاضل اساتذہ کرام اور باذوق طلبہ وطالبات نے اسے شرف پذیرائی بخشا اور پہلا ایڈیشن چند ماہ میں ہی ختم ہوگیا۔ ہم اہل فکر ونظر کے تہہ دل سے شکرگزار ہیں، جنہوں نے ہماری توقعات سے بڑھ کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعاء ہیں کہ وہ اس ''تعاون علی الخیر'' پر ان سب کو بے پایاں اجر وثواب سے نوازے۔

سعیٔ بسیار اور انتہائی محتاط تصحیح کے باوجود پہلے ایڈیشن میں کمپوزنگ و پیسٹنگ کی چند اغلاط اور دو مقامات پر معنوی فروگزاشتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ہم اپنے پبلشر جناب عید محمد فریدی اور ان کے فرزندان کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے کتاب کو از سر نو کمپوز کرایا اور نفع ونقصان کے مادی تصور سے بالاتر ہو کر کتاب کو معنوی حسن کے ساتھ جمالِ صوری عطا کرنے میں ہر ممکن تعاون کیا، اللہ تعالیٰ انہیں جزاء خیر عطا فرمائے۔ میں جناب احمد علی جعفری کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فریضہ سمجھتا ہوں جنہوں نے نہایت دلچسپی اور سرعت رفتار سے کمپوزنگ کا مرحلۂ ثانی مکمل کیا۔

اس بار تصحیح کے تمام مراحل ہم نے خود طے کیے ہیں، پروف کی کئی بار پڑھا اور اس پر نظر ثانی کی، جہاں اجمال وابہام محسوس ہوا، وہاں اضافے کیے۔ بعض مقامات پر عبارت کو مزید سہل اور عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ الغرض ہماری خواہش ہے کہ تفسیر صرف نصابی و امتحانی مقاصد تک محدود نہ رہے بلکہ ہر علم دوست، دین دار اور باذوق قاری کے لئے مفید، معلوماتی اور فیض رساں ثابت ہو۔

پہلے ایڈیشن میں آیاتِ قرآنی اوپر درج تھیں اور ترجمہ نیچے تھا، اب ہم نے طلبہ و طالبات اور عام قارئین کی سہولت کے لئے ترجمہ بین السطور درج کر دیا ہے، تاکہ ترجمے کی

متن سے مناسبت بہ آسانی سمجھ میں آئے۔ اسی طرح جہاں جہاں عربی عبارات ہیں، پہلے ایڈیشن میں کاتب سے لکھوائی گئی تھیں، اب کمپوزنگ کرادی ہے تاکہ یکسانیت پیدا ہو اور کتاب کے حسن میں اضافہ ہو۔

چونکہ سورہ النسآء کراچی یونیورسٹی کے بی۔اے (پاس) و آنرز سال اول اسلامیات (اختیاری) کے نصاب کے علاوہ تنظیم المدارس پاکستان کے زیرِ اہتمام طالبات کے درجہ ثانویہ خاصہ (عالمہ فاضلہ) کے نصاب میں بھی شامل ہے، اس لئے اب ہم نے تفسیر سورۃ النسآء کو علیحدہ طور پر خوبصورت، مجلد اور عمدہ سفید کاغذ پر شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے، امید ہے اس نئے انداز کو قارئین پسند فرمائیں گے۔

ہم کتب عربی کے مشہور مترجم اور پروف ریڈر فاضل علوم دینیہ مولانا حافظ محمد ابراہیم فیضی کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اولاً مطبوعہ کتاب اور ثانیہ طبع ثانی کے حتمی پروف کا آخری مراحل میں انتہائی باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اس اشاعت کو صحتِ لفظی و معنوی کے موجودہ معیار تک پہنچانے میں ہماری مدد کی۔

ہماری دلی خواہش اور کوشش رہی ہے کہ کتاب ہر لحاظ سے معیاری ہو، زبان و بیان کے سقم، لفظی و معنوی فروگزاشت اور کمپوزنگ کی اغلاط سے مکمل طور پر پاک ہو۔ لیکن انسان اپنی تمام تر صلاحیت و اہلیت کو صرف کرنے کے بعد بھی جب اپنے نتیجۂ فکر و عمل کو دیکھتا ہے تو اسے اپنا ہی تراشا ہوا شاہکار، نقش ناتمام نظر آتا ہے، اور اسی اعترافِ عجز کا نام بندگی ہے۔ ہر جہت سے اور زمانے میں اکمل و اتم ذات صرف اور صرف اللہ جل وعلا کی ہے اور یہی شان اس کے کلام کی ہے، بقول شاعر

یَزِیْدُکَ وَجْهُهٗ حُسْنًا اِذَا مَا زِدْتَهٗ نظراً

شاعر اپنے محبوب کے جمال جہاں آرا کی دلکشی و دلفریبی میں ڈوب کر کہتا ہے: "اے مخاطب! تو میرے محبوب کے رخ تاباں پر جب بھی (اور جتنی بار) نظر ڈالے گا، حسن و جمال کا ایک نیا زاویہ اور ایک نیا انداز تجھ پر منکشف ہوگا" یہ تو کسی انسان نے اپنے ذوق

کے مطابق حسن مخلوق اور حسن مادی کی تعریف کی ہے، ذرا غور فرمایئے حسن مطلق، جمال ازلی وابدی اور کلامِ خالق کے حسن و جمال، جامعیت، کاملیت اور معنویت کا عالم کیا ہوگا؟ اس لئے ہر دور میں تفسیریں لکھی جاتی رہیں گی، جو جتنا بڑا صاحبِ علم وکمال ہوگا، وہ آخر میں اپنی کاوش کو "حرف ناتمام" ہی قرار دے گا، اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے یہی کہے گا کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اور کلامِ الٰہی کی جلالت کے آگے صاحبانِ علم وفن کا سپر انداز ہونا، یہی اعجازِ قرآن ہے۔ دعا ہے کہ اللہ جل شانہٗ ہماری اس عاجزانہ کاوش کو اپنی بارگاہِ عالیہ میں مقبول و ماجور فرمائے اور اسے قبولیت عامہ نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وعلی الہ وصحبہ اجمعین۔

بندۂ عاجز

منیب الرحمٰن

مقدمہ اصول تفسیر

قرآن مجید سے متعلق تین چیزیں اہم اور خاص ہیں (۱) ترجمہ (۲) تفسیر (۳) تاویل، ان تینوں کا مفہوم اوران کی اصطلاحی تعریفیں جاننا ضروری ہیں۔

ترجمہ: لغوی واصطلاحی معنی اور ترجمہ کی اقسام:

"تَرْجَمَ الْكَلَامَ" کا لغوی معنی "ترجمہ کرنا" ہے۔ اس سے صفت کا صیغہ "تَرْجَمَان" اور تُرْجُمَان" اور جمع تَرَاجِم آتا ہے۔ کہتے ہیں "تَرْجَمَهٗ بِالتُّرْكِيَّةِ" یعنی "اس نے اس کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا"۔ کسی شخص کی سوانح حیات کو "ترجمہ" کہتے ہیں اور کتاب کے دیباچے کو بھی "تَرْجَمَةُ الْكِتَاب" کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ کسی مفہوم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کو "ترجمہ" کہتے ہیں۔ ترجمہ کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک "تحت اللفظ ترجمہ کرنا" اور دوسرا "زبان کی فصاحت و بلاغت، سلاست ومعنویت، اس کے محاورات اور انداز خطاب کو سمجھ کر اور سیاق وسباق کو دیکھ کر کلام اور متکلم کی ترجمانی کرنا"۔

ان دونوں قسموں کے ترجموں میں دوسری قسم زیادہ بہتر ہے کیونکہ بعض مرتبہ سیاق و سباق دیکھے بغیر تحت اللفظ ترجمہ کرنے سے مفہوم صحیح طور پر ادا نہیں ہو پاتا اور معنی میں بگاڑ پیدا ہو جانے کا خطرہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہوا ہے کہ: وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ (آل عمران: ۱۴۲) کا بعض مترجمین نے تحت اللفظ یہ ترجمہ کر دیا "حالانکہ ابھی اللہ نے ان لوگوں کو تم میں سے جانا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا۔" اس میں اللہ کے علم کی نفی ہو رہی ہے۔

پھر بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے کئی معنی ہوتے ہیں ان میں سے سیاق وسباق کے مطابق صحیح معنی کا انتخاب کرنا بہت ضروری ہے ورنہ اس سے بھی مفہوم میں خرابی ہو جاتی ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (والضحیٰ: ۷)

"ضَالٌّ" کے متعدد معنی ہیں: (۱) گمراہ ہونا، بھٹک جانا، عقیدہ وعمل میں غلط راستہ اختیار کرنا (۲) غفلت (۳) ایسا درخت جو کسی وسیع صحرا میں تنہا کھڑا ہو اور مسافر اس کے ذریعے اپنی منزل کا سراغ لگائیں (۴) محبت

مذکورہ آیت میں "ضَآلًّا" کی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف ہے، جن کے لئے تیسرا یا چوتھا معنی لینا ہی مناسب ہے، یعنی "کفر وشرک کے سنسان ریگستان میں صرف آپ کی ذات ہی ایک پھلدار درخت تھی جس میں ایمان وعرفان کا پھل لگا ہوا تھا۔ پس ہم نے آپ کے ذریعے مخلوق کو ہدایت بخشی یا اللہ نے آپ کو (اپنی محبت میں) گم پایا تو (اپنی طرف) راہ دی۔" بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ یوں کر دیا "اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ دی۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ترجمہ کرتے وقت مندرجہ ذیل چیزوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) اس کا مفہوم اصل عبارت کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔

(۲) اس کے معانی اصل عبارت سے نہ کم ہوں نہ زیادہ۔

(۳) اس کے الفاظ بے حد موزوں، آسان اور ضرورت کے عین مطابق ہوں۔

(۴) اس کے فقرے بامحاورہ، سلیس اور عام فہم ہوں، متروک نہ ہوں۔

(۵) سیاق وسباق کو مدنظر رکھا گیا ہو۔

(۶) قرآن کے منہ میں اپنی زبان اور اپنا مفہوم ڈالنے کے بجائے قرآن کے مُنَزِّل (نازل کرنے والے) اور مُنَزَّلُ عَلَیْہ (جن پر نازل ہوا ہے) کی منشا کی ترجمانی کی گئی ہو۔

مترجمین کی اقسام

مترجمین دو طرح کے ہیں ایک وہ جنہوں نے "تحت اللفظ (لفظی)" ترجمہ کیا ہے، دوسرے وہ جنہوں نے بامحاورہ ترجمہ کیا ہے۔ جنہوں نے لفظی ترجمہ کرنے کو ترجیح دی ہے، انہوں نے یہ چاہا کہ ترجمہ کرتے وقت کلام اللہ کی زیادہ سے زیادہ لفظی رعایت کی جائے، "نظم قرآنی" سے قریب تر رہ کر ترجمہ کیا جائے۔ جنہوں نے بامحاورہ ترجمے کو ترجیح دی ہے، غالباً ان کی خواہش یہ رہی ہے کہ "وحیِ ربانی" اور "کلام الٰہی" کی منشاء ومفہوم کو بہ آسانی

قاری تک پہنچایا جائے اور ابلاغ کا مقصد پورا ہو جو ترجمے سے مطلوب ہے۔ اور بعض نے بہ یک وقت لفظی رعایت اور با محاورہ اسلوب بیان کا حسین امتزاج پیش کرنے کی سعی کی ہے، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ (الجمعہ: ۴)

تاہم چونکہ دونوں کا عمل نیک نیتی پر مبنی ہے، اخلاص وللّٰہیت دونوں کے پیش نظر ہے، اس لئے دونوں عند اللہ ماجور ہوں گے۔

اعجاز قرآن

قرآن مجید ''معجزہ'' ہے اور معجزہ کا معنی ہے: عاجز کر دینے والی چیز، اس اعتبار سے قرآن مجید کے تمام علوم اور مضامین کو دوسری زبان میں سمونا اور اس کی فصاحت و بلاغت کو کماحقہٗ اپنے الفاظ میں منتقل کرنا ناممکن ہے ورنہ قرآن کا اعجاز باقی نہیں رہے گا۔ لیکن پھر بھی ترجمہ کرتے وقت بشری طاقت کی حد تک ترجمہ میں مذکورہ چیزوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصے تک نہ صرف یہ کہ قرآن کا ترجمہ کیا ہی نہیں گیا بلکہ اسے بدعت سمجھا جاتا رہا۔ جنوبی ایشیاء میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فارسی میں مکمل ترجمہ کیا اور اردو میں سب سے پہلے شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ترجمہ کیا اور بالآخر غیر عرب مسلمانوں کے افادے اور تفہیم کے لئے امت نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا لیکن چونکہ کسی بھی انسان کی سعی حرفِ آخر نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ آخری اینٹ کی جگہ باقی رہتی ہے اس لئے بہتر کی جستجو کو امت نے کبھی موقوف نہیں کیا، چنانچہ آج بھی اس حقیقت کے باوجود کہ صرف اردو زبان میں بیسیوں تراجم موجود ہیں، جہد مسلسل اور سعیٔ پیہم کا سلسلہ جاری ہے، کیونکہ انسان کا بنایا ہوا ہر نقش کسی نہ کسی جہت اور زاویے سے ناتمام ہی رہتا ہے، حرف آخر اور نقش کامل صرف اللہ عزوجل ہی کا کلام ہے۔

تفسیر کے لغوی معنی

تفسیر، ''فَسْر'' سے باب تفعیل کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں: کھولنا، واضح کرنا اور بیان کرنا وغیرہ اور ایک قول کے مطابق یہ ''سفر'' سے مقلوب ہے، جس کا معنی ''روشن

کرنا'' ہے۔

قرآن کی تفسیر میں چونکہ نظمِ قرآنی کی وضاحت کی جاتی ہے اور اس کے مفہوم کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے اس لئے اسے علم تفسیر کہا جاتا ہے۔

تفسیر کی اصطلاحی تعریف

علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تفسیر کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں الفاظ قرآن کی ادائیگی کے طریقے، ان کے مدلولات یعنی مفہوم، بطور مفرد اور مرکب ان کے احکام اور ان معانی سے بحث کی جاتی ہے جو ان الفاظ سے ترکیبی حالت میں مراد لئے جاتے ہیں۔ مزید ان معانی کا تکملہ (Complement)، ناسخ ومنسوخ، شانِ نزول اور مبہم قصوں کو توضیح کی شکل میں بھی بیان کیا جاتا ہے''۔

دوسری تعریف

امام ابوحیان تفسیر کا اصطلاحی مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظ کی ادائیگی کے طریقے، ان کے مدلولات، مفرد اور مرکب کی حیثیت سے ان کے احکام اور ان معانی سے بحث کی جاتی ہے جو حالت ترکیبی میں مراد ہوتے ہیں اور ان کے تتمات (Supplementations) کو بیان کیا جاتا ہے۔''

علم تفسیر کے اجزاء

ان دونوں تعریفوں کے مطابق علم تفسیر مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے:

(۱) الفاظ قرآنی کا مفہوم یعنی ان کے لغوی معنی۔ (۲) الفاظ کے انفرادی احکام جن کے لئے علم صرف کی ضرورت پڑتی ہے۔ (۳) الفاظ کے ترکیبی احکام جن کے لئے علم نحو اور علم معانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ (۴) ترکیبی حالت میں الفاظ کے مجموعی معنی جس کے لئے کبھی علم ادب اور بلاغت سے مدد لی جاتی ہے اور کبھی علم حدیث اور فقہ سے (۵) معانی کے

تکملے، جن کے لئے اکثر احادیث کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی کسی اور علم کی ضرورت پڑتی ہے، جیسے علم لغت وغیرہ۔

تاویل کا لغوی معنی

تاویل اَوَلَ اور مَآلَ سے باب تفعیل کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں رجوع کرنا، اگر اس کے بعد "اَلرَّعِیَّةَ" ہو تو اس کا معنی ہوگا سیاست رانی کرنا اور اگر اس کے بعد عَلَی الْقَوْمِ ہو تو اس کا معنی ہوگا حکمرانی کرنا، کسی قوم پر حاکم ہونا۔

تاویل میں بھی چونکہ متعدد معانی اور مختلف وجوہ میں سے کسی ایک معنی اور وجہ کو ترجیح دینا ہوتا ہے، اس لئے اسے تاویل کہتے ہیں۔ جیسے اللہ کا فرمان ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (بقرہ:۲۲۹) یعنی ''مطلقہ'' عورتیں اپنے آپ کو تین ''قروء'' روکے رکھیں۔'' اس میں قروء کا معنی ''طہر'' بھی ہے اور ''حیض'' بھی، فقہائے احناف نے اس سے ''حیض'' مراد لیا ہے، کیونکہ طہر مراد لینے کی حالت میں تین پر عمل نہیں ہوسکتا یا کم ہوگا یا زیادہ کیونکہ جس طہر میں طلاق دی گئی ہو، اس کو عدت میں شامل کرنے سے تین طہر تک مکمل نہیں ہوں گے اور اس کو چھوڑ کر تین طہر عدت میں شامل کرنے سے مدت تین طہر سے زیادہ ہو جائے گی۔ اس لئے ''حیض'' ہی مراد لینا صحیح ہے۔ جس ''طہر'' میں طلاق دی گئی ہو اس کے بعد تین حیض عدت میں شمار ہوں گے۔ ''حالت حیض'' میں طلاق دینے سے اگرچہ طلاق شرعاً نافذ تو ہو جاتی ہے لیکن ایسی حالت میں طلاق دینا شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ فعل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس ''طہر'' میں طلاق دی جائے جس میں شوہر نے عورت کے ساتھ قرب نہ اختیار کیا ہو۔

تفسیر اور تاویل میں فرق

تفسیر اور تاویل دونوں ''ہم معنی'' اور ''مترادف'' ہیں یا ان میں فرق ہے، اس بارے میں بہت سے اقوال ہیں:

امام ابوعبیدہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ دونوں ''ہم معنی'' ہیں۔ علامہ اصبہانی فرماتے ہیں کہ

تفسیر اصطلاحِ علماء میں قرآن کریم کے معانی اور اس کی مراد واضح اور بیان کر دینے کو کہتے ہیں اور تاویل کا تعلق کلام تام سے ہے اور جملوں کے مفہوم متعین کرنے کو کہتے ہیں۔امام ابو نصر قشیری کہتے ہیں کہ تفسیر سماع، روایت اور اتباع نبی کریم ﷺ کو کہتے ہیں اور تاویل اجتہاد واستنباط کو۔ان کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔مثلاً:

۱۔تفسیر الفاظ کے ظاہری معنی بیان کرنے کو کہتے ہیں اور تاویل اصل مراد کی توضیح کو۔

۲۔تفسیر اس آیت کی ہوتی ہے جس میں ایک سے زیادہ معانی کا احتمال نہ ہو اور جس میں ایک سے زیادہ معانی کا احتمال ہو اس میں سے ایک معنی کو کسی دلیل کے تحت اختیار کرنے کو ''تاویل'' کہتے ہیں۔

۳۔تفسیر یقینی تشریح کو کہتے ہیں اور تاویل دلائل کی روشنی میں امکانی ترجیحی مفہوم کو۔

۴۔تفسیر الفاظ کے مفہوم کو اور تاویل اس سے نکلنے والے سبق اور نتائج کی توضیح کو کہتے ہیں۔

موضوع

کسی بھی علم کو دوسرے علوم سے اس کے موضوع کے ذریعے ممتاز اور علیحدہ کرتے ہیں۔اور ہر علم میں اس کے موضوع کے ذاتی عوارض (احوال) سے بحث کی جاتی ہے، جیسے علم طب کا موضوع انسانی جسم ہے۔

علم تفسیر کا موضوع

علم تفسیر کا موضوع قرآن کریم ہے، اس لحاظ سے کہ قرآن کے مطالب اور اغراض و مقاصد بیان کئے جائیں، کیونکہ فن تفسیر میں صرف ایسے امور ہی زیر بحث آسکتے ہیں جن کا تعلق وحی الٰہی، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت وفرمانبرداری، ایمان وکفر وغیرہ سے ہو۔

علم تفسیر کی غرض وغایت

اس علم کی غرض وغایت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی صحیح راستے پر استوار کر سکے تاکہ اسے

سعادتِ دارین حاصل ہو۔

علم تفسیر کی فضیلت

علم تفسیر کی برتری اور شرف سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس میں کلام اللہ سے بحث کی جاتی ہے اور کلام اللہ کی عظمت و برتری سب پر عیاں ہے، علامہ اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کا سب سے بہترین پیشہ اور مشغلہ تفسیر قرآن کریم ہے اور علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ علم تفسیر تمام علوم دینیہ کا سردار ہے کیونکہ تمام علوم دینیہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

علم تفسیر کے مراتب و مآخذ

اصول تفسیر میں اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ مفسرین کے نزدیک تفسیر قرآن کے مراتب و درجات بظاہر چھ قسموں میں منحصر ہیں: (۱) تفسیر القرآن بالقرآن (۲) تفسیر القرآن بالسنہ (۳) تفسیر القرآن بآثار الصحابہ (۴) تفسیر القرآن بآثار التابعین (۵) تفسیر القرآن باللغۃ العربیہ والقواعد العربیہ (۶) تفسیر القرآن بالعقل السلیم۔

تفسیر القرآن بالقرآن

تفسیر القرآن بالقرآن کا معنی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر خود اس کی آیتوں کے ذریعے کی جائے کیونکہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک جگہ کوئی بات مبہم کہی جاتی ہے اور دوسری جگہ اس ابہام کو دور کر دیا جاتا ہے۔ یہ تفسیر کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (الفاتحہ:۶۔۷)

''(اے اللہ!) ہمیں سیدھی راہ چلا، ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔''

یہاں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ جن لوگوں پر انعام فرمایا گیا ہے، ان سے کون لوگ مراد

ہیں؟ لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾

(النساء:٦٩)

''اور جو اللہ اور (اس کے) رسول کی فرمانبرداری کرے تو وہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا جو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں''۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''تم میں سے جب کسی کو موت آئے اور اس نے مال چھوڑا ہو تو اس پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ وصیت کرے۔'' (سورہ بقرہ: آیت نمبر ۱۸۰) اس میں یہ واضح نہیں کیا گیا ہے کہ ہر ایک کے لئے کتنا حق مقرر کرے اور آیا یہ اہم ترین کام لوگوں کی اپنی مرضی اور صرف ان کے رحم و کرم پر ہوگا، لیکن دوسری جگہ سورہ نساء آیت نمبر ۱۱ میں تفصیل کے ساتھ ہر ایک کا حصہ معین کر دیا اور انسانوں سے یہ اختیار ختم کر دیا گیا کہ اس میں رد و بدل کریں۔ چنانچہ اس کے بعد ورثاء کے حق میں وصیت کا اختیار شرعاً ختم کر دیا گیا تاکہ کوئی شخص کسی وارث کے حق میں وصیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حصص اور قرآنی و اسلامی نظامِ وراثت کا توازن و تناسب تبدیل نہ کر سکے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وارث کے حق میں وصیت شرعاً معتبر نہیں ہے''۔ البتہ غیر وارث کے لئے ایک تہائی ترکے تک کی اجازت ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''تمہاری عورتوں میں سے جو کوئی بدکاری کا ارتکاب کرے تو (تہمت لگانے والے سے) ان پر اپنوں میں سے چار گواہ طلب کرو پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو ان کے گھروں میں بند کر دو، یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی (دوسرا) راستہ بنا دے۔'' (النساء:۱۵)

غیر شادی شدہ بدکار مرد اور بدکار عورت کے بارے میں دوسری جگہ وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"جو عورت اور جو مرد بدکار ہو تو ہر ایک کو سو (۱۰۰) سو (۱۰۰) درے لگاؤ" (النور: ۵)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔" (بقرہ: ۱۸۵)

اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ رمضان کی کس تاریخ کو قرآن نازل کیا گیا لیکن دوسری جگہ اس کی وضاحت کردی گئی کہ "ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا۔" (القدر: ۱)

ان کے علاوہ شراب، دیگر احکامات اور مختلف قصص میں تفسیر القرآن بالقرآن کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

تفسیر القرآن بالسنہ

تفسیر القرآن بالسنہ کا معنی یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں کی گئی ہو۔

"قرآن کریم نے متعدد مقامات پر یہ واضح فرمایا ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کو اس دنیا میں مبعوث فرمانے کا مقصد یہی تھا کہ آپ اپنے قول و فعل سے آیات قرآنی کی تفسیر فرمائیں۔ چنانچہ سورۂ نحل میں ارشاد ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴)

"اور ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کو پوری وضاحت سے بتادیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے"۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے کہ آپ کا مقصد بعثت ہی یہی ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی توضیح فرمائیں، نیز ارشاد ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ

لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (عمران: ۱۶۴)

''بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا، جبکہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک عظیم رسول بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاک وصاف کرتا ہے اور ان کو کتاب (قرآن) اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگر چہ وہ اس سے پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے''۔

ان آیات میں خود قرآن کریم نے یہ واضح فرمادیا ہے کہ سرور کائنات حضرت محمد ﷺ کو دنیا میں مبعوث فرمانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ دنیا کو قرآنِ کریم کی ہدایت اور اس کے اسرار ومعارف سے آگاہ کریں اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے طریقے سکھلائیں۔

کتب احادیث میں تفسیر القرآن بالسنہ کا وافر ذخیرہ موجود ہے، مثلاً:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے روزہ رکھنے کا وقت بیان فرمایا:

''اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ (ممتاز ہوکر) ظاہر ہو جائے تمہارے لئے صبح کا سفید تاگا (رات کے) سیاہ تاگے سے (یعنی صبح صادق نمودار ہو جائے) (بقرہ: ۱۸۷)''۔ اس سے بعض لوگوں نے حقیقتاً دھاگا مراد لیا اور اس وقت تک کھاتے رہے جب تک دونوں دھاگوں کا فرق نظر نہیں آیا۔

بخاری شریف میں ہے:

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! سفید دھاگا اور سیاہ دھاگا کیا ہیں؟ کیا ان سے دو دھاگے مراد ہیں؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''تم بھی کیا بھولے بھالے ہو، دو دھاگوں کو دیکھتے رہتے ہو۔'' پھر فرمایا: ''ایسا نہیں ہے بلکہ سیاہ دھاگے سے رات کی سیاہی اور سفید دھاگے سے دن کی سفیدی مراد ہے''۔ (بخاری شریف، کتاب التفسیر سورہ بقرہ)

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہودیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

''اور جب ہم نے کہا اس شہر میں داخل ہو اور اس میں تم جہاں سے چاہو بلا روک ٹوک

کھاؤ، اور دروازے میں جھکتے ہوئے داخل ہونا اور یہ کہو "حطة" (ہمارے گناہ معاف فرما)، تو ہم تمہارے گناہ معاف کردیں گے اور عنقریب نیکی کرنے والوں کو زیادہ اجر دیں گے ○ تو بدل دیا ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی، دوسری بات سے، تو ہم نے ظالموں پر آسمان سے عذاب اتارا، کیوں کہ وہ نافرمانی کرتے تھے، (بقرہ: ۵۸۔۵۹)"۔

اس آیت کریمہ میں صرف یہ بتایا گیا کہ یہودیوں نے حطة کو دوسرے لفظ سے بدل ڈالا، لیکن کس لفظ سے بدل ڈالا؟ یہ نہیں بیان فرمایا، اس کی تفسیر کرتے ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

"انہوں نے "حطة" کی جگہ "حَبَّةٌ فِيْ شِعْرَةٍ" یعنی دانہ بالی میں (یعنی گندم کا خوشہ) کہا تھا" (بخاری شریف، کتاب التفسیر سورہ بقرہ)

ان کے علاوہ ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ حج، حلال وحرام اور دیگر احکامات و معاملات میں "تفسیر القرآن بالسنہ" کی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

تفسیر القرآن بآثار الصحابہ

تفسیر القرآن بآثار الصحابہ کا معنی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اقوال کی روشنی میں کی جائے۔

جن حضرات نے قرآن کریم کی تعلیم براہِ راست آنحضرت ﷺ سے حاصل کی، وہ صحابہ کرام ہیں، ان میں سے بعض حضرات نے اپنی پوری زندگیاں اسی کام کے لئے وقف کی ہوئی تھیں کہ قرآن کریم، اس کی تفسیر اور متعلقات کو براہِ راست آپ کے اقوال و افعال سے حاصل کریں، یہ حضرات اہل زبان بھی تھے اور نزول قرآن کے ماحول سے پوری طرح باخبر بھی، لیکن انہوں نے اپنی زبان دانی پر بھروسہ کرنے کے بجائے قرآن کریم کو سبقاً سبقاً آپ سے پڑھا، امام ابوعبدالرحمٰن سلمی رحمۃ اللہ علیہ مشہور تابعی عالم ہیں وہ فرماتے ہیں:

حَدَّثَنَا الَّذِيْنَ كَانُوْا يُقْرِئُوْنَ الْقُرْآنَ كَعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَغَيْرِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا اِذَا تَعَلَّمُوْا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرَ اٰيَاتٍ لَمْ يَتَجَاوَزُوْهَا حَتّٰى يَعْلَمُوْا مَا فِيْهَا مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ۔

''(صحابہ کرام میں سے) جو حضرات قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے، مثلاً حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ، انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب آپ سے دس آیتیں سیکھتے تو ان سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے، جب تک کہ ان آیتوں کی تمام علمی و عملی باتوں کا علم حاصل نہ کرلیں''۔

اسی لئے مسند احمد میں حضرت انس فرماتے ہیں:

كَانَ الرَّجُلُ اِذَا قَرَءَ الْبَقَرَةَ وَآلَ عِمْرَانَ جَدَّ فِيْ اَعْيُنِنَا۔

''جب کوئی شخص سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں وہ بہت قابلِ احترام ہوجاتا تھا''۔

اس لئے تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالسنہ کے بعد سب سے زیادہ مستند تفسیر، تفسیر القرآن بآثار الصحابہ ہے۔ کتب احادیث میں اس کی بھی بہت مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے۔ ''جو سرپرست غنی ہے اسے چاہئے کہ پرہیز کرے اور جو سرپرست فقیر ہے تو وہ مناسب مقدار سے کھائے، پھر جب تم ان کی طرف ان کے مال لوٹاؤ تو ان پر گواہ بنالو۔'' (النساء:٦)

اس آیت کریمہ میں کس سے پرہیز کرنے اور کس کے مال کھانے اور کس کی طرف لوٹانے کے بارے میں کہا جارہا ہے؟ یہ مبہم ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ''اس آیت سے یتیم کا مال مراد ہے''۔

(بخاری شریف، سورۃ النسآء کتاب التفسیر)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالو۔'' (بقرہ:١٩٥) اس آیت کریمہ میں کیا چیز خرچ کرنے کے بارے میں اور کس چیز کے سبب

اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں نہ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے؟ یہ بیان نہیں کیا گیا۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں خرچ کرنے سے مراد مال خرچ کرنا اور تباہی میں نہ ڈالنے سے مراد جہاد سے غافل ہونا ہے۔

(بخاری شریف، کتاب التفسیر سورہ بقر)

تفسیر القرآن بآثار التابعین

تابعین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے تفسیر کا علم حاصل کیا۔ تفسیر کی اس قسم کا حکم یہ ہے کہ تابعی اگر کوئی تفسیر کسی صحابی سے نقل کر رہے ہوں تو اس کا حکم وہی ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی بیان کردہ تفسیر کا حکم ہے۔ اور اگر تابعی اپنا قول بیان کریں تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ آیا کسی دوسرے تابعی نے اس سے اختلاف کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو وہ قول حجت نہیں ہوگا۔ اور اگر کسی نے اختلاف نہیں کیا تو وہ حجت ہوگا۔

تفسیر القرآن بآثار التابعین کی کتب احادیث میں متعدد مثالیں موجود ہے۔ مثلاً:

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ "بالدِّین" کا معنی بیان کرتے ہیں "حساب" اور "مدینین" کا معنی بیان کرتے ہیں "حساب کئے گئے" (بخاری شریف، کتاب التفسیر سورہ فاتحہ)

اسی طرح عطا رحمۃ اللہ علیہ نسل کا معنی بیان کرتے ہیں کہ نسل بمعنی حیوان ہے (صحیح بخاری، کتاب التفسیر) اس طرح اور بھی متعدد مثالیں کتب احادیث میں موجود ہیں)

تفسیر القرآن باللغۃ العربیۃ والقواعد العربیۃ

قرآن کریم کی جس آیت کے مفہوم میں کوئی الجھن اور پیچیدگی نہ ہو، اس کا مفہوم بالکل واضح ہو، وہاں پر تو لغت عربیہ اور قواعد عربیہ ہی اس کی تفسیر کے لئے کافی ہیں۔ لیکن جہاں کوئی ابہام واجمال اور پیچیدگی پائی جارہی ہو، یا وہ آیت کسی واقعاتی پس منظر میں نازل کی گئی ہو یا اس سے کوئی فقہی حکم مستنبط کیا جارہا ہو، تو وہاں پر مذکورہ ماٰخذ، جن کا بیان پہلے ہو چکا ہے، کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ان ماٰخذ کے بعد لغت عرب کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے

کیونکہ عربی زبان ایک وسیع زبان ہے اور اس میں ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہوتے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے جہاں احادیث اور آثار صحابہ وتابعین بیان کرتے ہیں، وہیں اکثر مقامات پر لغوی طور پر اس کے معنی بھی بیان کرتے ہیں، مثلاً ''العاکف'' کا معنی بیان کرتے ہیں۔ ''المقیم'' یعنی عاکف کا معنی ''مقیم'' قیام کرنے والا ہے۔'' (بخاری شریف، کتاب التفسیر سورہ بقرہ) اسی طرح ''عُفِیَ'' کا معنی بیان کرتے ہیں ''تُرِکَ'' یعنی'' چھوڑ دیا گیا'' (بخاری شریف، کتاب التفسیر سورہ بقرہ)

تفسیر القرآن بالعقل السلیم

یوں تو ہر معاملے میں عقل سلیم کی ضرورت پڑتی ہے لیکن خاص طور پر قرآن کریم کے اسرار و معارف ایک بحر ذخار کی حیثیت رکھتے ہیں اور قرآن کریم کے ان اسرار و معارف پر غور و فکر کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو جا بجا غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ کہیں پر ''لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ'' فرمایا یعنی'' تا کہ تم سمجھو''، کہیں پر ''لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ'' فرمایا یعنی تا کہ'' تم غور و فکر کرو''، کہیں پر ''تَدَبَّرُوْنَ'' فرما کر اور کہیں پر ''تَذَکَّرُوْنَ'' فرما کر غور و فکر کرنے اور عقل سلیم کو استعمال کرنے کی دعوت دی۔ بلکہ قرآن نے صراحت کے ساتھ فرمایا:

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ

(العنکبوت: ۴۳)

'' اور (قرآن میں) یہ مثالیں جن کو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں، ان کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو ظاہری حواس اور باطنی ادراکات عطا فرمائے ہیں، قرآن نے ان کو جتلاتے ہوئے فرمایا کہ اب قبول حق میں کون سی رکاوٹ باقی رہ گئی ہے، چنانچہ فرمایا:

'' کیا ہم نے اسے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کئے؟ اور کیا ہم نے اسے خیر وشر میں تمیز کا شعورِ عقلی عطا نہیں کیا؟'' (البلد: ۸ تا ۱۰)

اور فرمایا: (ترجمہ) ''اور نفس انسانی (ضمیر) اور اس ذات کی قسم جس نے اسے متوازن ومتناسب بنایا اور اسے نیکی وبدی کا شعور عطا کیا۔'' (الشمس: ۷۔۸)

قرآنی صداقتوں کی عقلی توجیہ اس لئے ضروری ہے تاکہ ان لوگوں پر حجت قائم کی جا سکے جو وحی ربانی کی تقدیس وحرمت کے قائل نہیں ہیں، اس سلسلے میں امام المفسرین امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر ایک لازوال وبے مثال شاہکار ہے۔

لہٰذا قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے عقلی اور سائنسی حقائق کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ کوئی قرآن کو ''خلافِ عقل'' اور سائنس کی ضد نہ سمجھے، یہ امر پیش نظر رہے کہ ''خلافِ عقل'' اور بات ہے اور ''ماورائے عقل'' اور بات ہے۔ ''خلافِ عقل'' ہونا نقص ہے اور ''ماورائے عقل'' ہونا کمال ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (الرحمٰن: ۳۳)

اس آیت کریمہ کا ترجمہ مترجمین نے یہ کیا ہے:

(۱) اے گروہ جن وانسان اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے (ہو کر کہیں کو) نکل بھاگو تو نکل دیکھو مگر کچھ ایسا ہی زور ہو تو نکلو (اور وہ تم میں نہ ہے نہ ہو) حافظ نذیر احمد۔

(۲) اے گروہ جن وانس اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ اور زور کے سوا تم نکل سکنے ہی کے نہیں (مولانا فتح محمد خاں جالندھری)

(۳) اے گروہ جن وانس اگر تم سے ہو سکے کہ نکل بھاگو آسمان اور زمین کے کناروں سے تو نکل بھاگو تم نہیں نکل سکو گے مگر ایک قوت سے (مولانا محمد عاشق الٰہی)

(۴) اے فرقے جنوں کے اور انسانوں کے اگر تم سے ہو سکے تو نکل بھاگو آسمان اور زمین کے کناروں سے، نکل بھاگو نہیں نکل سکو گے بے سند۔ (شاہ عبد القادر)

(۵) اے گروہ جن وانس اگرتم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو نہیں بھاگ سکتے اس کے لئے بڑا زور چاہئے (مولانا مودودی)

(۶) ''اے گروہ جنوں کے اور انسانوں کے اگرتم سے ہو سکے کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے کناروں سے تو نکل بھاگو، نہیں نکل سکنے کے بدون سند کے'' (مولانا محمود الحسن)

(۷) اے گروہ جن وانس اگرتم میں طاقت ہے کہ تم نکل بھاگو آسمان اور زمین کی سرحدوں سے تو نکل کر بھاگ جاؤ (سنو) تم نہیں نکل سکتے بجز سلطان کے (اور وہ تم میں مفقود ہے)
(جسٹس علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

(۸) اے جن وانس کے گروہ اگر طاقت رکھتے ہو کہ نکل سکو آسمانوں اور زمینوں کے کناروں سے تو نکل جاؤ، تم کہیں نہ جاسکو گے مگر وہاں اسی کی سلطنت ہے (علامہ سید احمد سعید کاظمی)

(۹) اے جن وانسان کے گروہ اگرتم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ جہاں نکل کر جاؤ گے اسی کی سلطنت ہے۔ (امام احمد رضا خان بریلوی)

آیت کا آخری لفظ ''سلطان'' ہے اس کے معنی ہیں: حجت، دلیل، قدرت، اقتدار، بادشاہ، بیشتر مفسرین نے ترجمے میں ''قوت وطاقت'' کے معنی کو ترجیح دی چنانچہ کسی نے ترجمے میں زور کا لفظ استعمال کیا ہے اور کسی نے طاقت کا اور کسی نے سند کا جو غالباً ''حجت'' کے معنی میں ہے۔ جسٹس علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ترجمے میں لفظ ''سلطان'' ہی استعمال کیا ہے۔

لیکن موجودہ سائنسی دور میں انسانوں کو یہ سائنسی اور مادی طاقت حاصل ہوگئی ہے کہ وہ خلائی جہاز سے راکٹ داغ کر زمین کے محور اور دائرہ کشش سے باہر نکل بھی جاتا ہے اور دوبارہ داخل بھی ہو جاتا ہے، تو اس طرح تو کوئی شخص قرآن کی صداقت پر اعتراض کر سکتا ہے کہ قرآن کا دعویٰ معاذ اللہ باطل ہو گیا۔ اب آگے انسان کا علم کس مقام تک پہنچتا ہے، مستقبل کا علم اللہ ہی کو ہے۔

تاہم مولانا احمد رضا خان بریلوی اور علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے لفظ

سلطان کا ترجمہ ''سلطنت و اقتدار'' سے کیا ہے اور یہ قرآن کی تفہیم میں اللہ تعالیٰ کی نعمت عقل کا بہترین استعمال ہے اور ترجمہ یوں کیا ہے'' جہاں نکل کر جاؤ گے اسی کی سلطنت ہے'' یا '' تم کہیں نہ جا سکو گے مگر وہاں اسی کی سلطنت ہے۔'' اس ترجمے نے قرآن کے دعویٰ، پیشین گوئی اور صداقت کو ابدی بنا دیا۔ یعنی زمین کے مدار و محور اور دائرہ کشش سے تو آج کا انسان نکل ہی گیا ہے، کل خواہ ہزار سال بعد سہی، ممکن ہے کہ انسان کا سفر ارتقاء اس سے بھی بہت اوپر چلا جائے، لیکن تمام حدوں کو عبور کرتا ہوا انسان خواہ کہیں بھی پہنچ جائے اللہ کی سلطنت و اقتدار کی حدوں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ جہاں کہیں بھی نکل کر جائے گا وہاں اللہ ہی کی سلطنت اور اس کی بادشاہت ہوگی۔

قرآن کا اصل ماخذ وحی ربانی

گزشتہ صفحات میں فہم قرآن کے مآخذ کو بیان کیا گیا ہے، جن کی ہمیں قرآن فہمی کے لئے ضرورت پڑتی ہے اور تفسیر کے درجات کے اعتبار سے ان کی ترتیب بھی یہی ہے، لیکن قرآن کا اصل منبع و ماخذ اور سرچشمہ وحی ربانی ہے، لہٰذا قرآن میں ایسی مصطلحات کا بکثرت استعمال ہوا ہے، جن کو قرآن اور صاحب قرآن سے غیر مشروط وابستگی اور تسلیم و رضا کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ مثلاً ایمان، اسلام، نفاق، شرک، کفر، روح، نفس، بعث، الدین، الملۃ، الشرع، الصلوٰۃ، الزکوٰۃ، الحج، الصوم، الربوٰ، صدقہ، انفاق، ابن السبیل، وفات وغیرہ۔

ان سب کے مطالب لغت عربی کی مدد سے نہ متعین کئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی سمجھے جا سکتے ہیں، ان کے لئے ''مہبط وحی'' ذات رسالت مآب ﷺ سے رجوع کرنا لازمی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے تمام مفسرین جنہوں نے محض ''عربی لغت'' کو قرآن کا ماخذ اصلی قرار دیا، وہ بہک گئے اور فکری کجی کا شکار ہوئے جیسے غلام احمد پرویز، سرسید احمد خان، علامہ عنایت اللہ مشرقی، عبداللہ چکڑالوی وغیرہ۔

مسلمات دینیہ کی پابندی

اسلامی عقائد میں بعض ''مسلمات'' ہیں جو اصول دین کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے

ترجمہ، تفسیر اور تاویل کے وقت ایسا اسلوب اختیار کرنا پڑے گا کہ ان ''مسلمات'' (تسلیم شدہ امور) پر حرف نہ آئے۔ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات جسم اور جسمانیت، جسمانی عوارض اور متعلقات اور زمان و مکان کی تحدید سے پاک، بلند تر اور وراء الوراء ہے۔

اس لئے قرآن میں ایسے کلمات کے ترجمے و تفسیر کے وقت اس کا از حد خیال رکھنا لازمی ہے جیسے: يَدُ اللهِ، وَجْهُ اللهِ، يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ، وَيُحَذِّرُكُمُ اللهُ نَفْسَهُ، رُوْحٌ مِّنْهُ، وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ، اَللهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ......، اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى، وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ، وَغَيْرُهَا مِنَ الْاٰيَاتِ۔

اثبات و نفی میں تطبیق

قرآن میں کہیں غیر اللہ سے علم غیب کی مطلقاً نفی کی گئی ہے اور کہیں اطلاع علی الغیب، اظہار علی الغیب، وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ وغیرہ کلمات آئے ہیں، جن سے انبیاء و رسل کے علوم غیبیہ کا اثبات ہوتا ہے۔ اس طرح کہیں قرآن میں شفاعت کی مطلقاً نفی ہے اور کہیں اللہ کے اذن سے شفاعت کا اثبات ہے، اس لئے مفسر و مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کا ایسا مفہوم بیان کرے جس سے دونوں میں تطبیق ہو نہ کہ تضاد نظر آئے، کیونکہ قرآن کا اعجاز ہی یہ ہے کہ یہ اختلاف و تضاد (Contradiction) سے بالکل پاک ہے۔

سورۃ النساء

ابتدائیہ

اس سورۂ مبارکہ کا نام ''النسآء'' ہے۔اس کے نزول کا عرصہ ۳ھ کے اواخر سے ۵ھ کے اوائل تک ہے،لہٰذا یہ بالاتفاق مدنی سورت ہے۔ اس میں ۲۴ رکوع، ۱۷۶ آیات، ۳۰۴۵ کلمات اور ۱۶۰۳۰ حروف ہیں۔ یہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے قرآن مجید کی چوتھی سورت ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر بانوے (۹۲) ہے۔ اور یہ ان سات ابتدائی بڑی سورتوں میں سے ایک ہے جنہیں ''السبع الطوال'' کہا جاتا ہے۔ یہ چوتھے پارے کے ربع آخر سے شروع ہو کر تقریباً چھٹے پارے کے ربع اول تک محیط ہے۔

اجمالی تعارف

قرآن مجید کی بڑی سورتیں بالعموم یکبارگی نازل نہیں ہوئیں، بلکہ عہد رسالت میں جیسے جیسے حوادث ونوازل پیش آتے رہے، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے احکام کے نزول کا سلسلہ جاری رہا، جیسی صورتحال پیدا ہوئی، اسی موقع ومحل کے مطابق وحی ربانی کی ہدایات بھی ملتی رہیں۔ یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کی چند جامع سورتوں میں سے ایک ہے۔ عقائد، عبادات، اخلاقیات، عائلی، معاشرتی وتمدنی امور، امور مملکت و ریاست، حالت امن وحالت جنگ، اہمیت جہاد، دفاعی وخارجی حکمت عملی، اداء امانت وقیام عدل، مقصد بعثت رسالت، الغرض حقوق اللہ وحقوق العباد سے متعلق انفرادی واجتماعی زندگی کے تقریباً تمام شعبہ ہائے حیات پر اس کی تعلیمات محیط ہیں۔ ہم سطور ذیل میں چند اہم موضوعات ومباحث کا اجمالاً ذکر کریں گے۔

اطاعت الٰہی، اطاعت رسول اور اطاعت اولوالامر

آیات نمبر ۵۹، ۶۴ تا ۶۹ میں اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول کا حکم دیا ہے اور یہ حکم

غیر مشروط ہے، یعنی مومن پر جب یہ امر واضح ہو جائے کہ یہ امر ربانی یا امر رسول ہے تو پھر اس پر غیر مشروط اطاعت لازم ہے، اس کے لئے کسی حیل و حجت یا چوں وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ اطاعت الٰہی کیسے کی جائے، اس کے لئے واحد میزان، معیار اور کسوٹی ذات رسالت مآب ﷺ ہے، اور پھر اطاعت اللہ اور اطاعت رسول کا جو انعام واکرام ہے وہ بھی بیان فرمایا ہے۔ "اولوالامر" یعنی مسلمانوں کے جو ارباب اقتدار واختیار یا حاکمان وقت ہیں، ان کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے لیکن یہ اطاعت غیر مشروط نہیں ہے بلکہ اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کے احکام اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی مقررہ حدود کے اندر ہوں، ورنہ ارشاد رسول ہے: "کسی ایسے معاملے میں مخلوق (خواہ اس کا منصب اور عہدہ کوئی بھی ہو) کی اطاعت لازم نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو۔" آیت نمبر ۶۴ اور ۶۵ میں بتایا گیا کہ زندگی کے کسی مرحلے میں خدانخواستہ مومن بھٹک جائے یا بہک جائے تو اس کے لئے اگر کوئی جائے امان ہے تو فقط یہ کہ پلٹ کر اللہ کے رسول کی بارگاہ میں آجائے اور یہ بھی واضح طور پر بتایا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے ہر فیصلے کو دل وجاں سے تسلیم نہ کرے خواہ وہ بظاہر کلمہ گو ہی کیوں نہ ہو، درحقیقت وہ منافق ہے۔

اداءِ امانت و قیامِ عدل

آیات نمبر ۸۵، ۱۰۵ تا ۱۰۷ اور ۱۷۵ میں اداء امانت اور قیام عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ امانت کی پاس داری اور تحفظ شخصی سطح پر بھی لازم ہے اور مملکت کے اجتماعی نظام میں بھی، اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب قومی، ملکی اور ملی مناصب، عہدے اور ذمہ داریاں اہلیت کی بنیاد پر تفویض کی جائیں۔ ارشاد رسول ہے: "جب مسلمانوں کے اقتدار (کی امانت کا) معاملہ نا اہلوں کے سپرد کر دیا جائے تو پھر قیامت کا انتظار کرو۔" مدینہ طیبہ میں اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی اور اسلامی جمہوری فلاحی مملکت کی سب سے بڑی اساس معاشرتی، معاشی اور قانونی عدل ہے، جسے ہم "عدل اجتماعی" (Social Justice) کا نام دیتے

ہیں۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ یہ فیصلہ عدل کی بنیاد پر کرو، خواہ اس کی زد تمہاری ذات، والدین، اہل قرابت یا قبیلے، برادری اور حمایتی گروہ پر ہی کیوں نہ پڑے۔

صلوٰۃ قصر و صلوٰۃ خوف اور تیمّم کے احکام

نماز اسلامی عبادات میں سب سے اہم ہے۔ لہٰذا یہ ہر مسلم عاقل و بالغ مرد اور عورت پر ہر حال میں فرض ہے، سوائے ایسی صورتحال کے کہ انسان کو اپنے ہوش و حواس پر قابو ہی نہ رہے، جسے (Stage of Coma) کہتے ہیں، لہٰذا اگر وہ ہوش میں ہے تو کھڑے، بیٹھے یا لیٹے ہوئے جس حال پر بھی قادر ہے، حکم ہے کہ فرض نماز ضرور پڑھے۔ نماز کے لئے طہارت شرط ہے اور طہارت کا ذریعہ پانی ہے۔ آیت نمبر ۴۳ میں استثنائی صورت میں متبادل کے طور پر تیمّم کا حکم نازل فرمایا گیا اور فقہاء کرام نے اس آیت مبارکہ سے مسائل کا استنباط کرتے ہوئے فرمایا کہ جب ایسی ناگزیر صورت حال درپیش ہو کہ (ا) پانی دستیاب ہی نہ ہو (ب) یا دستیاب تو ہو لیکن قیمتاً ہو اور آدمی اس کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہ ہو (ج) یا صرف اتنی مقدار میں ہو کہ پیاس بجھا لے یا وضو کر لے، تو پھر پیاس کی ضرورت مقدم ہے کہ اس پر بقاءِ حیات کا انحصار ہے (د) یا پانی تو دستیاب ہے لیکن شدید ترین سردی یا کسی بیماری کے سبب پانی استعمال کرنے کی صورت میں اس کی جان تلف ہونے یا کسی عضو کے تلف ہونے یا بیماری کے بڑھ جانے کا ظن غالب ہے، تو ان تمام صورتوں میں تیمّم کر لے لیکن نماز نہ چھوڑے۔ حالت سفر میں فرض نماز کو مکمل طور پر معاف تو نہیں فرمایا لیکن اس میں کچھ تخفیف فرما دی اور اس کو ''صلوٰۃ القصر'' کہتے ہیں، اس کا حکم آیت نمبر ۱۰۱ میں نازل ہوا۔ اسی طرح عین حالت جنگ میں جبکہ معرکہ جہاد برپا ہو، فوجیں مورچوں میں (Red Alert) پوزیشن میں ہوں تب بھی نہ نماز چھوڑی جائے اور نہ جماعت ترک کی جائے، اسے ''صلوٰۃ الخوف'' کہتے ہیں اور اس کا حکم آیت نمبر ۱۰۲، ۱۰۳ میں بیان کیا گیا ہے۔

قتل کے احکام

اللہ جل شانہٗ کی زمین پر ''حقوق العباد'' (Human Rights) میں سب سے سنگین

جرم قتل ناحق ہے اور یہ شرک کے بعد کبیرہ گناہوں میں سب سے شدید ہے۔ آیت نمبر ۹۳ میں قتل عمد (Intentional Murder) کی سنگینی اور اخروی عذاب کا بیان ہے۔ اس سے پہلے آیت نمبر ۹۲ میں قتل خطا (Accidental Homicide) کا حکم نسبتاً تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور تفسیر میں اس مقام پر ہم نے قتل کی تمام ممکنہ صورتیں، ان کی فقہی تعریفات اور احکام تفصیلاً بیان کئے ہیں۔

منافقین کا طبقہ اور یہودِ مدینہ کی روش

رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی کا منظر بالکل واضح اور شفاف تھا، یا تو مومنین مخلصین تھے اور یا کفار مجاہر (Open Infidels) لیکن جب آپ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے اور آپ کا مشن کامیابی کی طرف گامزن ہوا تو یہودِ مدینہ کے باعث ایک طبقہ منافقین پیدا ہوا، یہ موقع پرست، بد باطن اور بزدل لوگ تھے، یہ کلمہ پڑھ کر مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے، مفادات بھی سمیٹنا چاہتے تھے اور ہوا کے بدلتے ہوئے رخ کے بھی منتظر تھے، آیت نمبر ۱۴۲، ۱۴۳ میں ان کی حقیقت کو قرآن نے واضح فرمایا کہ یہ متذبذب اور متردد (Wavering) لوگ ہیں۔ آیات ۱۵۳ تا ۱۵۸ میں یہودِ مدینہ کی حجت بازیوں اور ناروا مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے آباء و اجداد کا رویہ بھی حضرت موسیٰ کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ آیت نمبر ۴۷ میں انہیں متنبہ کیا گیا کہ ہم چاہیں تو ''اہل سبت'' کی طرح ان کی صورتوں کو مسخ (Obliterate) بھی کر سکتے ہیں۔ آیات ۵۱ تا ۶۲ میں متفرق طور پر ان کے خبث باطن کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس بناء پر حسد کی آگ میں جل رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبوبیت کے لئے ختم المرسلین محمد ﷺ اور آپ کی امت کو کیوں منتخب فرمایا؟۔ وہ دین سماوی کے پیروکار ہونے کے باوجود مسلمانوں کی عداوت میں کفار کو خوش کرنے کے لئے بتوں کو بھی سجدہ کر سکتے ہیں۔ اور آیت نمبر ۴۶ میں بتایا گیا کہ وہ خاتم النبیین محمد ﷺ کی عداوت سے اس حد تک آگے نکل چکے ہیں کہ وہ اللہ کے کلام میں تحریف سے بھی باز نہیں آتے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جب بارگاہِ رسالت میں بیٹھے ہوتے اور

ارشادات رسالت مآب ﷺ میں سے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی یا پوری طرح سننے میں نہ آتی تو انتہائی ادب واحترام سے وہ عرض کرتے: "رَاعِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!" "اے اللہ کے حبیب! ہمارا خیال فرمایئے" اس بات کو مکرر ارشاد فرما لیجئے، تو یہ منافق بھی جو بظاہر مسلمان ہو کر مجلس میں بیٹھے ہوتے، اس لفظ کو بگاڑ کر اور زبان کو تھوڑا سا موڑ کر یہ لفظ ادا کرتے تاکہ تاثر تو یہ دیں کہ ہم بھی "رَاعِنَا" کہہ رہے ہیں اور اپنی مجلسوں میں جا کر اظہار مسرت کریں کہ دیکھو ہم نے انہیں "راعینا" (ہمارے چرواہے) کہا ہے، اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے انہیں ملعون قرار دیا۔

جدال وقتال کے احکام

مدینہ منورہ میں چونکہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آچکا تھا، اس لئے اس کی مخالفت میں سارے اندرونی و بیرونی دشمن سرگرم عمل ہو چکے تھے۔ اس سورۂ مبارکہ میں ترغیبی پیرایۂ بیان میں آیات نمبر ۷۱ تا ۱۰۰ میں جہاد کے لئے حکم فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ مظلوم مردوں، عورتوں اور بچوں کی پکار تمہیں سنائی نہیں دیتی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ موت کے ڈر سے جہاد نہ چھوڑو، موت تو آرام دہ بستر پر بھی آ جاتی ہے اور زندگی باقی ہے تو انسان میدان جنگ سے بھی سرخرو ہو کر زندہ بچ نکلتا ہے۔

دفاعی، داخلی اور خارجی حکمت عملی

آیت نمبر ۷۱ میں فرمایا کہ اپنے دفاع کی مکمل تیاری کرتے رہو، پھر موقع پرست اور ابن الوقت گروہوں کے انداز فکر سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ آیت نمبر ۸۱ میں بتایا کہ منافقین کا ایک گروہ ہے جو یہ آرزو دل میں لئے بیٹھا ہے کہ مسلمان بھی ان کی کافرانہ روش کو اختیار کریں، یہ لوگ واجب القتل ہیں اور کسی رعایت کے مستحق نہیں۔ ایک گروہ ایسا ہے جو تمہاری کسی معاہد یا حلیف قوم سے جا ملتا ہے یا تمہارے موافق یا مخالف ہر قسم کی لڑائی سے دلبرداشتہ ہو چکا ہے، آیت نمبر ۹۰ میں فرمایا کہ ان سے تعرض نہ کرو۔ ایک اور گروہ ایسا ہے جو منافقانہ روش اختیار کرتے ہوئے یہ چاہتا ہے کہ تمہاری زد سے بھی بچا رہے اور اندرونِ

خانہ اپنی قوم کے ساتھ راہ ورسم بھی رکھتا ہے۔آیت نمبر ۹۱ میں ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اگر یہ بالکل غیر جانبدار بھی نہ ہوں اور نہ ہی تمہاری جانب مصالحت کا ڈول ڈالیں اور نہ ہی تمہارے مقابلے سے پوری طرح دست بردار ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے کہ جہاں اور جب بھی ان پر قابو پاؤ ان کا صفایا کرو۔

حقوق یتامیٰ

اس سورۂ مبارکہ کی آیات ۲ تا ۶ میں یتیم بچوں (Orphans) کے حقوق اور ان کے اموال کی حفاظت کے بارے میں تاکید فرمائی گئی ہے۔ یہ بھی تاکید فرمائی کہ سن رشد (Maturity of the Mind) کو پہنچنے تک ان کا مال ان کے تصرف میں نہ دو، یعنی محض بلوغت کافی نہیں، عقل وشعور بھی ضروری ہے۔ اور نہ ہی حیلے بہانے سے ان کا مال ہڑپ کرو۔ اور یتیم کا وہ کفیل جو غنی ہے، وہ اپنے آپ کو یتیم کے مال سے بچائے رکھے اور جو نادار ہے وہ ضرورت کی حد تک اسے استعمال کرے۔ اور جب یتیم کا مال اس کے حوالے کرو تو اس پر کسی کو گواہ بناؤ۔

احکام وراثت

آیات ۷ تا ۱۴ اور آیت نمبر ۱۷۶ میں اسلام کے احکام وراثت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، جن کی مکمل تشریح آپ کو تفسیر میں ملے گی۔ ورثاء کے حصے میں تو کسی کو رد و بدل کا اختیار نہیں ہے اور نہ ہی وارث کے حق میں وصیت جائز ہے، البتہ بعض دور کے قرابت دار جو یتیم اور نادار ہیں، اگر تقسیم ترکہ کے وقت آجائیں اور قانونِ وراثت کی رو سے ان کا حصہ نہیں بنتا، تب بھی رضا کارانہ طور پر انہیں تبرعاً (As a Gift) کچھ نہ کچھ دے دو، کم یا زیادہ جتنی بھی توفیق ہو، اس سفارشی حکم کو نظر انداز کرنے والے سوچ لیں کہ اگر کل ان کی اولاد اور پسماندگان ایسی مشکل سے دوچار ہوں تو ان کے دل پر کیا گزرے گی، اس لئے کہ ع

جیسی کرنی ویسی بھرنی

حضرت عیسیٰ اور یہود و نصاریٰ کے عقائد باطلہ

آیت نمبر ۱۵۰ تا ۱۷۲ میں زیادہ تر اہل کتاب یہود و نصاریٰ، ان کے تمرد اور سرکشی کا ذکر ہے کہ وہ انبیاء میں تفریق کرتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کا رویہ، معجزاتِ بینات کے باوجود ان کی سرکشی حتی کہ قتل انبیاء جیسے جرمِ قبیح، حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان اور حضرت عیسی علیہ السلام کے سولی پر چڑھانے اور قتل کیے جانے کے باطل دعووں کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیسی علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے بلکہ ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا ہے اور وہ ایک بار پھر دنیا میں آئیں گے اور اپنی طبعی وفات پائیں گے۔ انہی آیات میں مقصد بعثت رسالت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عیسی علیہ السلام کو جو نصاریٰ نے "ابن اللہ" کہا اور کبھی ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ یعنی عقیدۂ توحید (oneness of God) کے بجائے عقیدۂ تثلیث (Trinity) کا دعویٰ کیا، ان سب باطل عقائد کا رد کر کے صحیح عقائد کو بیان کیا گیا ہے۔

حقوق نسواں

حقوق نسواں (Women Rights) اس سورت کا مرکزی موضوع (Theme) ہے اور اسی لئے اس کا نام "سورۃ النسآء" ہے۔ یہ موضوع شروع سے لے کر آخر تک کسی نہ کسی حوالے سے ذکر ہوتا رہا ہے۔ تاہم آیات نمبر ۱ تا ۳۵ میں تقریباً تسلسل کے ساتھ اس کا ذکر ہے۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی مرتبہ عورت کو اس کی مختلف حیثیتوں میں وارثت کا حق دیا ہے۔ مہر کو عورت کا حق قرار دیا اور اس کی قانونی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ اس کو زوجین کی باہمی رضامندی اور مالی حیثیت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ بلا ثبوت شرعی عورت پر تہمت لگا کر اسے بلیک میل کرے۔ تعداد ازدواج کی اجازت کو عدل کی کڑی شرط کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ مرد کو خاندان کی مالی ذمہ داریوں کا کفیل و مسئول بنایا گیا ہے۔ اور اگر عورت مالی معاونت یا خدمات کی صورت میں کچھ حصہ (Contribution)

ڈالتی ہے تو اسے اس کی ذمہ داری نہیں بلکہ فضل و احسان کا درجہ دیا گیا ہے۔ اگر کوئی عورت خدانخواستہ اپنے شوہر کی نافرمان ہے تو اس سے نمٹنے کے لئے تدریجی اور حکیمانہ تعلیمات عطا کی گئی ہیں۔ ازدواجی رشتہ تو تا حیات نباہنے کے لئے قائم ہوتا ہے لیکن اگر خدانخواستہ اس نازک آبگینے میں بال پڑ جائے یا شگاف پیدا ہو جائے تو اس زخم کو مندمل کرنے کے لئے دونوں خاندانوں پر مصالحت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ نباہ کی کوئی صورت ممکن نہ رہے تو راہیں جدا کرنے کی آبرومندانہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔ محرماتِ نکاح کا بھی تفصیلی بیان ہے۔ آج کی دنیا میں مسلمانوں کی ابتر معاشی حالت اور بدتر سیاسی بے تدبیری کے باوجود مربوط و مضبوط خاندانی ڈھانچہ (Family Structure) اسلام کا سرمایۂ افتخار ہے۔ آج امریکہ جیسا انتہائی ترقی یافتہ ملک و قوم بلکہ واحد سپریم پاور بھی خاندانی انتشار سے سخت پریشان ہے اور انہیں کوئی تدبیر بجھائی نہیں دیتی کہ خاندان کے بکھرے ہوئے تانے بانے کو دوبارہ کیسے جوڑا جائے۔ اس سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۳۶ میں والدین، اہل قرابت، یتامیٰ، مساکین، ہمسایوں کے تین درجات، مسافر، ماتحت، الغرض سب کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی پہلی آیت مبارکہ میں وحدتِ انسانیت، تقویٰ اور صلۂ رحمی کا حکم ہے تاکہ دنیا انسانیت کے لئے گل و گلزار بن جائے۔

توبہ

آیات ۱۷ اور ۱۸ میں بتایا گیا ہے کہ انسان اگر بھٹک جائے یا صراطِ مستقیم سے ہٹ جائے تو پھر بھی اس کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے، اللہ کی رحمت اسے اپنی آغوش میں لینے کے لئے تیار ہے۔ کوئی کتنا بڑے سے بڑا خطا کار اور گنہگار کیوں نہ ہو، اللہ کا فرمان ہے:

''بیشک میری رحمت میرے غضب سے وسیع تر ہے۔''

مسئلہ غلامی (SLAVERY)

تمہید

سورۃ النسآء میں غلاموں کا تذکرہ ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔ مستشرقین اور دشمنان اسلام ہمیشہ اسلام پر یہ طعن کرتے رہے ہیں کہ اس نے غلامی کو رواج دیا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایک ایسا طبقہ ہمیشہ سے رہا ہے جو دین سے بے زار اور فکری الحاد میں مبتلا ہے، یا جو فیشن کے طور پر نام نہاد آزادی کے علمبردار بنتے ہیں اور بد قسمتی سے اپنے دین سے صحیح طور پر واقف بھی نہیں ہیں، وہ بھی بہ آسانی اس پروپیگنڈے کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات اس میں مددومعاون بنتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ اس مسئلے پر جامع بحث کی جائے اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے۔

قرآن میں غلاموں کا ذکر

قرآن میں غلام کے مفہوم و معنی کو ادا کرنے کے لئے کئی کلمات استعمال ہوئے ہیں:

مثلاً:

(۱) مذکر کے لئے "عبد" اور مونث کے لئے "امۃ" (باندی) جس کی جمع "اماء" ہے"۔ "عبد" کی ضد (Opposite) "حر" (آزاد) ہے۔

(۲) بعض مقامات پر اس مفہوم کو مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اور وَمَامَلَكَتْ يَمِيْنُكَ کے کلمات سے تعبیر کیا ہے، یعنی "جن کے تم مالک ہو" یا "جو تمہارے زیر دست اور تابع ہیں" یہ دراصل "مملوک" کا مفہوم ہے جس کی جمع "ممالیک" ہے۔

(۳) "رَقَبَةٌ، یا فِی الرِّقَابِ"، "رِقَابٌ"، "رَقَبَةٌ"، کی جمع ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کی گردن میں طوقِ غلامی ہے یا جس کی گردن پھنسی ہوئی ہے۔

غلام کی تعریف

غلام وہ شخص ہوتا ہے جو دوسرے کی ملکیت میں ہو، وہ مالک اور ''ولی'' بننے کا اہل نہیں ہوتا، نہ ہی وہ شہادت کا اہل ہوتا ہے، وہ مالک کی اجازت کے بغیر اپنی ذات یا کسی چیز میں تصرف کا اختیار نہیں رکھتا۔

غلامی کا پس منظر

اسلام نے رسم غلامی کو ایجاد نہیں کیا بلکہ یہ رسم اور ریت اسلام کو ورثے میں ملی تھی۔ عرب اور سرزمین حجاز کے جس معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی پس منظر میں آفتاب اسلام طلوع ہوا، غلامی کی رسم وہاں پہلے سے موجود تھی اور ایسے حالات بھی نہیں تھے کہ رسم غلامی کو یکسر ختم کر دیا جاتا، لہٰذا اسلام نے پہلے مرحلے میں غلاموں کو بنیادی انسانی حقوق عطا کیے اور پھر بتدریج قانونی، ترغیبی اور اخلاقی تعلیمات کے ذریعے اس کے خاتمے کی طرف قدم بڑھایا۔

غلامی کے اسباب

(۱) کسی شخص کا نسلاً غلام ہونا (۲) میدان جنگ میں جو کافر قیدی بن جاتے، خواہ مرد ہوں یا عورتیں، انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا (۳) پھر یہ غلام اور باندیاں مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتی تھیں، جو جس کے حصے میں آتا وہ اس کا شخصی غلام بن جاتا (۴) مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں دے دیا جاتا، اس کی تقسیم کا نظام امیر کی صوابدید اور مملکت اور اشخاص کی ضرورت کے تحت ہوتا (۵) غلاموں کی خرید و فروخت، ہبہ اور وراثت کا نظام بھی رائج تھا۔

ابتداء اسلام میں اور اسلام سے پہلے بھی کوئی منظم مملکت یا حکومت موجود نہیں تھی اور نہ ہی جنگ کے لئے باقاعدہ تربیت یافتہ منظم افواج تھیں۔ چنانچہ ایسے حالات میں نہ تو جنگی قیدیوں کی نگہداشت، نگرانی اور کفالت کا باقاعدہ نظام تھا اور نہ ہی انہیں واپس دشمن کے حوالے کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ دوبارہ دشمن کی تقویت کا باعث بن سکتے تھے اور مسلمانوں کو

ان سے خطرات لاحق ہو سکتے تھے، اس لئے ان کی نگرانی اور کفالت کی یہی ایک صورت تھی کہ انہیں افراد کی تحویل میں دے دیا جائے۔

اسلام نے آزاد انسانوں کو غلام بنانے کا فوری سد باب کیا

مندرجہ بالا صورت حال تو اسلام کو ورثے میں ملی تھی اور اس کا فوری خاتمہ ممکن نہ تھا، لہٰذا ایک ناگوار مگر ناگزیر حقیقت کے طور پر اس کو "درجۂ اباحت" میں وقتی طور پر جاری رکھا گیا تھا۔ تاہم آزاد انسانوں کو غلام بنانے کا سلسلہ اسلام نے فوری طور پر بند کر دیا۔ عہد جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ ڈکیتی میں، شب خون میں، قافلے سے بچھڑا ہوا کوئی آزاد انسان ہاتھ لگ جاتا تو اسے بھی غلام بنا لیتے اور پھر اس کی خرید و فروخت کا سلسلہ چل پڑتا۔ مثلاً:

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام کو اسی طرح چند کھوٹے سکوں کے عوض ایک قافلے والوں کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ اور پھر قافلے والوں نے انہیں مصر کے بازار میں لے جا کر کھلی منڈی میں فروخت کر دیا اور بالآخر "عزیز مصر" نے حسن یوسف سے متاثر ہو کر بھاری قیمت ادا کر کے انہیں خرید لیا۔

(۲) ایک روایت کے مطابق حضرت زید بن حارثہ کو مکہ کے لوگ کسی طرح یمن سے نکال لائے اور انہیں غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ بالآخر انہیں حکیم بن حزام نے خرید کر اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ بنت خویلد کو دے دیا اور جب ان کا حضور ﷺ سے نکاح ہوا تو انہوں نے اسے حضور کو ہبہ کر دیا۔ اور آپ نے اسے محبت دی، اپنا متبنیٰ بنایا، اگرچہ بعد میں اسلام نے "تبنیہ" (لے پالک بنانا) کو اس معنی میں ممنوع قرار دے دیا کہ اس پر نسبی اور صلبی اولاد کے احکام جاری کیے جائیں۔ ان کے والدان کی تلاش میں مکہ آئے تو حضور ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا اور والد کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن حضرت زید بن حارثہ نے اپنی خواہش سے حضور کی "نسبت غلامی" کو ترجیح دی اور کسی بھی قیمت پر حضور کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا۔

(۳) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلاش حق میں سرگرداں تھے کہ کسی نے ان کو پکڑ

کر غلام بنالیا۔

اسلام نے پہلے مرحلے میں عہد جاہلیت کی اس ظالمانہ رسم کا خاتمہ کیا اور آزاد انسانوں کو غلام بنانے اور ان کی خرید وفروخت کو ممنوع قرار دے دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں قیامت کے دن تین شخصوں سے جھگڑا کروں گا، ایک وہ جس نے میرے نام سے عہد شکنی کی ہو، دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد انسان کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھالی، اور تیسرا وہ شخص جس نے کسی محنت کش سے مزدوری کرا کے اس کی اجرت روک لی۔'' (صحیح بخاری، جلد ۱، ص ۳۰۲)

اسلام نے جنگی قیدیوں کے مروجہ قانون میں رعایتیں دیں

سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جو نظام قانون، اسلام سے پہلے رائج تھا، اس میں جنگی قیدیوں کے لئے غلام بنانے کی رسم موجود تھی۔ اسلام نے اس کے خاتمے کے لئے تدریجی طرز عمل اختیار کیا اور سب سے پہلے اس میں رخصتیں اور رعایتیں دیں اور غلام اور قیدی بنانے کے عمل کو لازم قرار دینے کے بجائے اس کے دو اور متبادل تجویز کئے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''تو جب تمہارا کافروں سے مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں اتارو، حتیٰ کہ جب تم ان کا خوب خون بہا چکو تو ان (جنگی قیدیوں) کو مضبوطی سے باندھ لو، پھر (تمہیں اجازت ہے) خواہ محض احسان کر کے انہیں (بلا معاوضہ) چھوڑ دو، یا ان سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ و۔''
(محمد: ۴)

قرآن کی اس آیہ مبارکہ میں قیدی اور غلام بنانے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے دو اور آپشن (Option) دیئے۔

(۱) ایک یہ کہ تبرع، فضل اور احسان کر کے انہیں بلا معاوضہ رہا کر دو، اس کے لئے قرآن کے الفاظ مبارکہ ہیں: فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً، یعنی ''یا تو احسان کر کے انہیں چھوڑ دو یا فدیہ لے لو''۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کے اسیرین میں سے کئی قیدیوں کو تبرعاً بلا معاوضہ رہا کر دیا، مثلاً ''ابو العاص بن ابو الربیع''، ''مطلب بن حطب'' (بروایت ابن اسحاق) اور ایک شخص ''ابو العزہ الجمحی'' کو محض اس لئے رہا کر دیا کہ اس کی کفالت میں کئی بیٹیاں تھیں۔ اور نبی رحمت ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا دیا کہ:

''اگر معطم بن عدی زندہ ہوتا اور مجھ سے ان بدبوداروں (بدر کے قیدیوں) کی رہائی کے لئے سفارش کرتا تو میں ان کو چھوڑ دیتا۔'' (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۵۷۳)

یہاں ہم اپنی بساط کے مطابق اسلام کے ''رخ تاباں'' سے معاندانہ تعصبات اور پروپیگنڈے کی گرد جھاڑنا چاہتے ہیں، اس لئے صرف اصولی مسائل پر بحث کر رہے ہیں، تفصیلی احکام اور ائمہ مجتہدین وفقہاء عظام کی اختلافی آراء اور ان کے دلائل کے نہ یہ صفحات متحمل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ہمارے قارئین کی علمی استعداد اور ذوق مطالعہ اس امر کی اجازت دیتا ہے۔

(۲) یہ کہ فدیہ یعنی مالی معاوضہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔ غزوۂ بدر کے اکثر قیدیوں کو رسول اللہ ﷺ نے فدیہ لے کر یا ان کی خدمات کے عوض انہیں چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ مبارکہ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ آپ نے مسلمان جنگی قیدیوں کی رہائی کے عوض کفار کے قیدیوں کو رہا کیا۔ اور آج کی متمدن اقوام میں جنگی قیدیوں کے تبادلے کا سلسلہ اب بھی رائج ہے، لیکن اس سلسلے میں پہل کرنے اور قانون سازی میں سبقت کا اعزاز بہر حال اسلام کو حاصل ہے۔

جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی مشروعیت کا سبب

یہ سوال بار بار کیا جاتا ہے کہ اسلام نے اس رسم کو باقی ہی کیوں رکھا، یکسر ختم کیوں نہیں کر دیا، اس کا ایک جواب تو دیا جا چکا ہے کہ اس رسم کا بانی اسلام نہیں ہے بلکہ عہد جاہلیت کا نظام تھا۔ دوسری اور اہم بات یہ کہ چونکہ مسلمان قیدیوں کے ساتھ یہی سلوک بدستور روا رکھا جا رہا تھا، اس لئے اسلام کا ایک عمومی اصول ہے کہ: ''اور برائی کا بدلہ تو اس کی مثل برائی

ہے" (شوریٰ: ۴۰) لہٰذا مسلمانوں پر مظالم ڈھانے والے یہ توقع رکھنے میں حق بجانب کیسے ہو سکتے ہیں کہ وہ ظلم کرتے چلے جائیں اور مسلمان ان کی تلوار کے نیچے گردن رکھتے چلے جائیں تاکہ ان کی بربریت اور درندگی کی تسکین ہوتی رہے۔ لیکن برائی کا بدلہ برائی سے دینے کی یہ اجازت بھی بدرجۂ اباحت ہے، اس میں درجۂ استحسان آگے بیان ہوا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "لیکن جو معاف کردے اور نیکی کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمۂ کرم پر ہے" (شوریٰ آیت ۴۰)

لہٰذا اگر دشمن ہمارے قیدیوں کو تبادلے میں آزاد کرے تو ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں، اگر وہ بلا معاوضہ چھوڑ دے تو مسلمان تو "صاحبِ خلقِ عظیم" کے ماننے والے ہیں، وہ اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ حسن سلوک، تبرع اور فضل و احسان کا مظاہرہ کریں اور اگر یک طرفہ بھی ایسا کرنا مسلمانوں کے لئے نقصان دہ نہ ہو تو وہ "مکارم اخلاق" کا نمونہ دشمنوں کے سامنے بھی پیش کر سکتے ہیں۔

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے احکام

اسلام نے اس قدر تاکید کے ساتھ غلاموں سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی، چنانچہ "سورۃ النسآء" کی آیت نمبر ۳۶ میں والدین، قرابت داروں، مساکین، پڑوسیوں اور مسافروں کے ساتھ غلاموں سے بھی حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ اور رحمۃ للعالمین ﷺ نے فرمایا:

(۱) "تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارا ماتحت کر دیا ہے، پس جس کے ماتحت اس کا بھائی ہو، وہ اسے وہی چیز کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی لباس پہنائے جو خود پہنتا ہے، اور ان سے ان کی قوت برداشت سے زیادہ کام نہ لے"۔

(صحیح بخاری، ج ۱ ص ۹)

(۲) "اپنی اولاد کی طرح اپنے غلاموں کی عزت و توقیر کرو اور ان کو وہ کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہ پہناؤ جو خود پہنتے ہو، ان سے ان کی قوت برداشت سے زیادہ کام نہ لو اور اگر انہیں کوئی

مشکل کام سونپو تو اس میں ان کی مدد کرو۔ (سنن ابن ماجہ، ص ۲۶۲)

(۳) ''جو شخص کسی غلام کو تھپڑ مارے یا پیٹے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس غلام کو آزاد کرے''۔
(سنن ابی داؤد، ج ۲، ص ۳۴۷)

(۴) ابو مسعود انصاری کہتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کو مار رہا تھا کہ میں نے پیچھے سے ایک آواز سنی: اے ابو مسعود تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جتنی قدرت و اختیار تمہیں اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ قدرت و اختیار اللہ تعالیٰ کو تم پر ہے، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ رسول اللہ ﷺ تھے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! یہ اللہ کے لئے آزاد ہے، آپ نے فرمایا: اگر تم یہ نہ کرتے تو تمہیں جہنم کی آگ جلاتی۔
(صحیح مسلم، باب صحبۃ الممالیک)

(۵) رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات ظاہری کے آخری لحات میں جب کہ آپ رفیق اعلیٰ رب العالمین سے وصال فرمانے والے تھے، اپنی امت کو جو آخری وصیت فرمائی وہ یہ تھی:
''اَلصَّلٰوۃُ وَ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ'' نماز کی پابندی کرنا اور غلاموں کا خیال رکھنا۔
(سنن ابی داؤد، ج ۲، ص ۳۴۵)

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے جو احکام حضور ﷺ نے ارشاد فرمائے ہیں، ان کا اطلاق آج کے دور میں ذاتی و گھریلو ملازمین اور دیگر ماتحت ملازمین و زیر دست افراد پر بھی ہوتا ہے۔

جب تک غلامی کا رواج مسلم معاشرے میں موجود تھا، اس کا ایک اہم فائدہ یہ تھا کہ غیر مسلم غلاموں کو مسلمانوں کے قریب رہ کر اسلام کی تعلیمات اور احکام کو جاننے کا موقع ملتا۔ وہ اسلامی تعلیمات کی حقانیت اور اپنے مالکوں کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوتے تھے۔

اسلام میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیبات

غلامی کا رواج جو اسلام کو ورثے میں ملا تھا، اسلام نے اسے بتدریج ختم کرنے کا نظام

وضع کیا۔ ایک تو یہ کہ رضا کارانہ طور پر غلام آزاد کرنے کو بہت بڑی نیکی، سعادت وعبادت اور جہنم سے نجات کا ذریعہ بنایا۔

(۱) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تمہیں کیا خبر کہ دین کی دشوار گزار راہوں پر چلنے کا کیا طریقہ ہے؟ (وہ طریقہ) غلام کو آزاد کرنا، قحط کے ایام میں بھوکوں کو کھانا کھلانا، کسی رشتے دار یتیم کی کفالت یا کسی خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔'' (البلد: ۱۱۔۱۲)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے کسی مسلمان غلام کو آزاد کیا، اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے کے اعضاء کو جہنم کی آگ سے آزاد فرمائے گا۔'' (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۳۴۲)

اسلام میں غلام کو آزاد کرنے کے احکام وقوانین

اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کی رضا کارانہ ترغیبات کے علاوہ تشریعی وقانونی اقدامات بھی کئے، متعدد غلطیوں اور گناہوں کا کفارہ غلام آزاد کرنے کو قرار دیا، جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) سورہ المائدہ: آیت نمبر ۸۹ میں قسم (یمین منعقدہ) توڑنے کے کفارے کی ایک صورت غلام آزاد کرنے کو قرار دیا۔

(۲) سورہ مجادلہ: آیت نمبر ۲ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جو لوگ اپنی بیویوں کو اپنی ماؤں سے تشبیہ دے بیٹھیں، پھر اپنے قول سے رجوع کر لیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ مباشرت سے پہلے ایک غلام آزاد کریں اور جس کو غلام میسر نہ ہو وہ مباشرت سے پہلے دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔''

(۳) سورۃ النسآء: آیت ۹۲ میں مومن کے قتل خطا کا کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنے کو قرار دیا۔

(۴) فقہاء نے قتل شبہ عمد کا کفارہ بھی مومن غلام آزاد کرنے کو قرار دیا ہے۔

(۵) حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ نے قصداً بلا عذر رمضان المبارک کا روزہ توڑنے

کا کفارہ غلام آزاد کرنے کو قرار دیا۔

غلاموں کی اقسام

(۱) رق کامل: وہ شخص جس کی گردن مکمل طور پر طوق غلامی میں پھنسی ہوئی ہو۔

(۲) مکاتب: جس کو مالک یہ اجازت دے دے کہ تم آزادانہ کاروبار کرو اور ایک مقررہ رقم ادا کرنے کے بعد تم بالکل آزاد ہو جاؤ گے۔

(۳) مدبر: جسے مالک یہ کہہ دے کہ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو۔

(۴) ام الولد: مالک سے باندی کا بچہ پیدا ہوا تو بچہ تو پیدا ہوتے ہی آزاد ہو جاتا ہے، وہ باندی بھی مالک کی وفات کے بعد از خود آزاد ہو جاتی ہے۔

(۵) ایک غلام دو ورثا کو مشترکہ طور پر ملا اور ایک وارث نے اپنا حصہ آزاد کر دیا یا دو افراد نے مشترک طور پر خریدا اور ایک شریک نے اپنا حصہ آزاد کر دیا تو دوسرا وارث یا شریک اب اسے "رق کامل" نہیں بنا سکتا بلکہ انہیں اپنے حصے کے تناسب سے اسے مکاتب بنانا پڑے گا۔ مسلمانوں کے غلام آزاد کرنے کی چند مثالیں ہیں:

(۱) خود رسول اللہ ﷺ نے تریسٹھ غلام آزاد کیے۔

(۲) ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انہتر غلام آزاد کیے۔

(۳) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بکثرت غلام آزاد کیے۔

(۴) حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ستر غلام آزاد کیے۔

(۵) حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف محاصرے کے ایام میں بیس غلام آزاد کیے۔

(۶) حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے ایک سو غلام آزاد کیے۔

(۷) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک ہزار غلام آزاد کیے۔

(۸) ذوالکلاع حمیری نے ایک دن میں آٹھ ہزار غلام آزاد کیے۔

(۹) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تیس ہزار غلام آزاد کیے۔

نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے یہ تمام تفصیلات اپنی تصنیف فتح العلام شرح بلوغ المرام میں یکجا کی ہیں، ملاحظہ کیجئے (ج ۲،ص ۳۳۲)

باندیوں سے مباشرت کے جواز کا مسئلہ

قرآن نے سورۃ النساء، سورۃ المعارج اور سورۃ الاحزاب کی آیات میں مالکوں کو باندیوں سے مباشرت کی اجازت دی ہے، بعض تجدد پسند لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور اسے غیر اخلاقی فعل قرار دیتے ہیں کہ نکاح کے بغیر یہ اجازت کیوں؟ ان حضرات سے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ گزارش ہے کہ نکاح کیا ہے؟ دو گواہوں کی موجودگی میں لڑکے اور لڑکی کا اصالتاً یا وکالتاً ایجاب وقبول کرنا۔ امام مالک کے نزدیک تو گواہوں کا تعین بھی ضروری نہیں ہے بلکہ کھلی مجلس میں ایجاب وقبول کافی ہے۔ اور اگر یہی لڑکا اور لڑکی تنہائی میں ایجاب وقبول کرلیں اور کہہ دیں کہ ہم نے اللہ کو گواہ بنایا نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

لہٰذا مرد کے لئے عورت کا حلال ہونا محض نکاح کے باعث نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سبب ہے کیونکہ کسی چیز کو حلال قرار دینا یا حرام قرار دینا اللہ اور اس کے رسول کا اختیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ''محرمات نکاح'' کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اور ان محرمات کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال کردی گئی ہیں کہ حق مہر کے عوض انہیں حاصل کرسکتے ہو، اسی خالق و مالک نے باندیوں کے ساتھ مباشرت کو بھی اپنے حق سے حلال قرار دیا ہے۔ ورنہ جس عورت سے اللہ نے نکاح حرام قرار دیا ہے، خواہ نسب، رضاعت یا مصاہرت کسی بھی سبب سے ہو، ساری دنیا کے انسان ایک طرف ہوجائیں تو اسے حلال قرار نہیں دے سکتے۔

یہ انسانی عقل کا فتور ہی ہوسکتا ہے کہ اللہ کے حکم سے نکاح کی حلت میں تو کراہت محسوس نہ کرے اور اسی کے حکم سے باندی کی حلت میں کراہت محسوس کرے۔

باندیوں سے متعلق مزید مسائل درج ذیل ہیں:

(۱) اگر میاں بیوی بیک وقت جنگ میں گرفتار ہوں تو امام اعظم کے نزدیک ان کا نکاح

قائم رہے گا اور کوئی اس خاتون سے تمتع نہیں کر سکے گا۔

(۲) عورت گرفتار ہو جائے اور اس کا شوہر بدستور دارالحرب میں ہے تو ان کا نکاح کالعدم ہو جائے گا، وہ امیر کی اجازت سے کسی کے ملک میں بھی آ سکتی ہے اور کسی دوسرے شخص سے اس کا نکاح بھی ہو سکتا ہے۔

(۳) جو عورت باندی بن جائے، اس سے اس وقت تک تمتع کی اجازت نہیں تاوقتیکہ اس کا غیر حاملہ ہونا طے نہ ہو جائے، اس کے لئے ایک حیض کا گزرنا شرط ہے، اور اگر حاملہ ہے تو وضع حمل تک اس سے مباشرت ممنوع ہے تاکہ بچے کا نسب صحیح ثابت ہو جائے۔

(۴) دوران جنگ گرفتار ہونے والی عورت پر سپاہی کو براہ راست تصرف اور تسلط کی اجازت نہیں ہے، اس کا فیصلہ امیر کرے گا:

(الف) آیا اسے تبرع اور احسان کے طور پر بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے، (ب) یا فدیہ لے کر چھوڑا جائے۔ (ج) یا مسلمان جنگی قیدیوں کے تبادلے میں چھوڑا جائے۔ (د) یا کسی سپاہی کی تحویل میں دے دیا جائے۔ (ہ) یا بیت المال یعنی خلیفہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔

کیا اب بھی رسم غلامی جاری رہ سکتی ہے؟

ہم نے مسئلہ غلامی پر مفصل بحث کی ہے اور یہ بھی واضح کیا کہ یہ رسم اسلام کو عہد جاہلیت سے ورثے میں ملی ہے اور ایک ناگزیر روایت کے طور پر ایک عرصے تک جاری رہی اور اسلام نے بتدریج اس کا خاتمہ کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اقوام عالم نے جنیوا کنونشن کے تحت غلامی کا خاتمہ کر دیا ہے تو اب اس کے بارے میں اسلام کا رویہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اسلام سے بڑھ کر انسانی حریت اور عزت نفس کا حامی دنیا کا کوئی اور نظام نہیں ہے، اسلام کے معنی سلامتی اور ایمان کے معنی امان کے ہیں۔ اسلام انسان کی جان، مال اور آبرو کا محافظ ہے۔ جب تک دوسری اقوام مسلمانوں کی شخصی آزادی کا احترام کریں، مسلمانوں پر بھی لازم ہے کہ وہ اس کا مثبت جواب دیں، بلکہ اسلام نے "بدی کا بدلہ بدی سے دینے" کی اجازت بر سبیل تنزل ایک رخصت اور رعایت کے طور پر دی ہے، اسلام کی

جو تعلیمات فضل واحسان کے بارے میں ہیں، ان کا تقاضا تو یہ ہے کہ: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ یعنی برائی کا بدلہ اچھائی سے دو، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ شخص جس کی تمہارے ساتھ عداوت ہے تمہارا سرگرم دوست بن جائے گا۔" (حم السجدہ، ۳۴:۴۱)۔ نبی رحمت ﷺ نے فرمایا: "بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی تقلید نہ کرو کہ یہ کہتے پھرو کہ ہم نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا بدلہ بدی سے دیں گے، بلکہ جو تمہارے ساتھ زیادتی کرے اس سے بھی حتیٰ الامکان اچھائی کا برتاؤ کرو۔" مکارم اخلاق، مروت، رواداری، حریت، مساوات اور انسان دوستی کا سب سے بڑا حامی تو اسلام ہے اور مسلمان کو انسانیت کا سب سے بڑا محافظ ہونا چاہئے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

میں شیطان مردود (کے فریب) سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے (بابرکت) نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ①

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا (حوا) بنایا اور ان دونوں سے کثیر تعداد میں مردوں اور عورتوں کو (دنیا میں) پھیلا دیا اور اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابت کے رشتوں کو توڑنے سے اجتناب کرو، بلاشبہ اللہ تم پر نگہبان ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

نَفْسٌ — روح، ذات، شخص، عظمت، نَفْسُ الْاَمْر حقیقت امر یا واقعہ
ہمت، ارادہ، دل

نَفَسٌ — سانس — تَنَفُّس — سانس لینا

زَوْجٌ — جمع ازواج، جوڑا: میاں بیوی دونوں ایک دوسرا کا جوڑا ہوتے ہیں، اس لئے اس کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ — بَثَّ — پھیلا دیا

رِجَالًا — رجل کی جمع مرد — نِسَآءً — امرأة کی جمع عورتیں

تَسَآءَلُوْنَ　تم ایک دوسرے سے سوال کرتے　رَقِیْبًا　نگہبان
ہو

تفسیر

قرآن کا اسلوب خطاب

یَآیُّھَاالنَّاسُ سے تمام عاقل و بالغ مرد و زن (مُکَلَّفِیْنَ) کو یکساں طور پر خطاب کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کا عام انداز بیان یہ ہے کہ یَآیُّھَاالنَّاسُ سے اہل مکہ کو خطاب کیا جاتا ہے اور یَآیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے اہل مدینہ کو اور بعض مقامات پر جہاں توحید اور اصول دین کی طرف دعوت دینی مقصود ہو وہاں یَآیُّھَاالنَّاسُ سے خطاب کیا گیا ہے اور جہاں احکام دین اور شریعت کے تفصیلی احکام کی طرف دعوت دینی مقصود ہو، وہاں یَآیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کے اسلوب بیان اور دعوت کے یہ سارے انداز اور قواعد کلی نہیں بلکہ اکثری ہیں۔

اَلرَّبُّ کے معنی

یہاں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے صفت ''ربوبیت'' کو ذکر کیا گیا ہے تا کہ بندے کا ذہن اس کے کرم کی طرف متوجہ ہو اور وہ اپنے محسن و مربی کی اطاعت پر آمادہ ہو جائے ''اَلرَّبُّ'' کے اصل معنی ہیں ''کسی چیز کو بتدریج نشو و نما دے کر اس کے مرتبہ کمال تک پہنچانا'' رب اور مُرَبِّی کا اطلاق تو موقع کی مناسبت سے غیر اللہ پر بھی ہوتا ہے لیکن الرب ''معرف باللام'' مطلقاً صرف اللہ جل شانہٗ کی ذات کے لئے بولا جاتا ہے۔

نفس واحدہ سے مراد

نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ سے مراد بہ اجماع مفسرین حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور اس حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ''کُلُّکُمْ مِنْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ'' یعنی تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔ لہٰذا تمام نوع انسانی و نسل بنی آدم کی

''اصل'' حضرت آدم علیہ السلام ہیں، رئیس المفسرین امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لفظ آدم، ''ادیم الارض'' سے مشتق ہے اور ''ادیم الارض'' زمین کی اوپری سطح کو کہتے ہیں اور یہی آدم علیہ السلام کے وجود خاکی کا اصل مادۂ تخلیق ہے، اور یہی وجہ ہے کہ خاک زمین کی جتنی رنگتیں (سفید، سیاہ، سرخ، گندمی وغیرہ) اور جتنی خاصیتیں (نرم، سخت وغیرہ) ہیں وہ سب صورت و سیرت بنی آدم میں الگ الگ بعض اشخاص میں توازن واعتدال کے ساتھ اور بعض میں غیر متوازن انداز میں موجود ہیں۔

''زوج'' کی کیفیت تخلیق

رہا یہ سوال کہ وجود آدم سے اللہ تعالیٰ نے ان کا جوڑا کیسے پیدا فرمایا، اس کی کیفیت و ماہیت کے بارے میں قرآن ساکت ہے، البتہ صحیحین کی ایک روایت کے مطابق ارشاد رسول ہے کہ ''عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی کے بالائی حصے میں کجی زیادہ ہوتی ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنے لگ جاؤ گے تو اسے توڑ ڈالو گے اور اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو اس میں کجی رہے گی''۔ غالباً حدیث پاک کا منشا یہ ہے کہ عورت کے مزاج میں جو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص قسم کا تنوع، انفرادیت، خودی اور خود سری پیدا کی ہے اس کا ادراک کرتے ہوئے اس کے ساتھ نباہ کرنا سیکھو کیونکہ اس میں نوع انسانی کی فلاح ہے اور اگر اس کی انفرادیت مزاج اور شخصی انا کو فنا کر کے اسے اطاعت کلی پر ڈھالنے کی کوشش کرو گے تو رشتہ ازدواج کا یہ نازک آبگینہ ٹوٹ جائے گا اور تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ امام رازی نے حضرت ''حواء'' کے نام کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ یہ ''حی'' سے مشتق ہے، جس کے معنی حیات کے ہیں، چونکہ حضرت حواء کو اللہ تعالیٰ نے ''جماد'' کے بجائے ایک ''ذی حیات'' (آدم) سے پیدا کیا، اس لئے ان کا نام حواء قرار پایا۔

مافوق الاسباب تخلیق کی حکمت

اگرچہ نسل انسانی کے توالد و تناسل کے لئے سنتِ الٰہیہ یہی ہے کہ وہ ایک مرد و زن کے اختلاط سے پیدا ہوں، اور بچے کے لئے ماں باپ اس کی تخلیق کا ظاہری سبب قرار

پائیں، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باپ کے وسیلے کے بغیر، حضرت حواء کو عورت کے واسطے کے بغیر اور آدم علیہ السلام کو مرد و زن دونوں کے واسطے کے بغیر پیدا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی ''سنتِ جاریہ مستمرہ'' کی بات اپنی جگہ لیکن اس سے کوئی یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالے کہ اللہ کی قدرت، تخلیق کے لئے کسی واسطے، وسیلے یا سبب کی محتاج ہے، ورنہ ذرے سے لے کر آفتاب تک اور قطرے سے لے کر سمندر تک دنیا میں موجود ہر نوع مخلوق کی خلقتِ اول کیسے ممکن ہوئی؟ آج کل جدید ترین سائنسی شاہکار ''کلوننگ ٹیکنالوجی'' کے ذریعے تخلیق کا بہت چرچا ہے، اگر اس ٹیکنالوجی کو انسانوں پر استعمال کیا گیا تو اس کے قانونی، سماجی، تمدنی اور توریثی اثرات و نتائج کے بارے میں اگرچہ تا حال خود اہل مغرب کے اندر بڑے خدشات ہیں، کافی ابہامات ہیں اور بہت سے سوالیہ نشانات ہیں اور اس پر مستزاد اسلام کی رو سے نسب و رشتۂ مصاہرت کے شرعی اشکالات بھی ہیں۔ لیکن یہ امر بہر حال مسلم ہے کہ براہ راست کسی شخص کے وجود سے دوسرے شخص کی تخلیق کا اولین شاہکار نمونہ پہلے ہی سے حضرت حوا کی ذات میں موجود ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نئی ٹیکنالوجی قانون قدرت کے لئے چیلنج نہیں بلکہ ''تحت القدرت'' ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ

آیت کے اس حصے کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو اوپر درج ہے اور بیشتر مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے اور یہ اس تقدیر پر ہے کہ وَالْاَرْحَامَ کا عطف لفظ "الله" پر مانا جائے۔ اور بعض مفسرین نے ایک دوسرے ممکنہ ترجمہ و مفہوم کو بیان کیا ہے اور یہ اس صورت میں ہوگا کہ وَالْاَرْحَامَ کا عطف "بہ" میں "ہ" ضمیر مجرور پر مانا جائے، اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ ''اور اللہ سے ڈرو اور رشتۂ قرابت (کے ٹوٹ جانے سے) کہ جن کے واسطے اور وسیلے سے تم (اپنے حقوق مانگنے کے لئے) ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔''

تَسَآءَلُوْنَ

باب تفاعل سے ہے، یعنی تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ اہل عرب کا دستور تھا

(اور ہمارے ہاں بھی یہی طریقہ ہے) کہ وہ کہتے تھے: "انشدک باللہ" میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر یہ بات کہتا ہوں اور کبھی یوں کہتے: "انشدک باللہ وبالرحم" یعنی "میں تم سے اللہ کی ذات اور قرابت کا واسطہ دے کر یہ بات کہتا ہوں۔"

صلہ رحمی

"ارحام" رحم کی جمع ہے، یہ لفظ "رَحم" اور "رِحم" بچہ دانی (Womb) کے معنی میں آتا ہے۔ اس کا مادۂ اشتقاق (ORIGIN) "رحم" ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات "رحمٰن" اور "رحیم" مشتق ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی انہی صفات جلیلہ کا پرتو، عکس اور صدقہ ہے کہ ماں صد ہزار تکالیف اٹھا کر بچے کی اپنے "رحم" میں پرورش کرتی ہے اور اس کی جبیں پر شکن نہیں آتی۔ اور ماں ہی کی نسبت سے قریب اور دور کے وہ تمام رشتے وجود میں آتے ہیں جنہیں قرآن نے "الارحام" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسلام نے "رشتۂ قرابت" کی پاس داری پر بہت زور دیا ہے۔ چند منتخب احادیث مبارکہ ملاحظہ ہوں:

۱۔ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَأَلَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ۔ یعنی "جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں کشادگی ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو اسے چاہئے کہ صلہ رحمی کرے" یعنی "رشتۂ قرابت" کی پاسداری کرے اور اسے ملائے رکھے، توڑنے نہ دے۔ (صحیحین بحوالہ مشکوٰۃ)"

۲۔ اَلرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللّٰهُ مَنْ وَّصَلَكَ وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَكَ قَطَعْتُهٗ "رحم" (بمعنی رشتۂ قرابت) اللہ کی صفت الرحمٰن سے مشتق ہے (یعنی اس کا پرتو اور عکس ہے) تو اللہ نے فرمایا: اے رحم! جو تجھے ملائے رکھے گا میں اسے اپنی ذات کریم سے ملائے رکھوں گا اور جو تجھے توڑے گا میں اسے اپنی نگاہ کرم ولطف سے جدا کر دوں گا۔" (بخاری بحوالہ مشکوٰۃ) نوٹ: "لفظ شُجْنَةٌ" ش کی تینوں حرکات (زبر، زیر اور پیش) کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ شجنہ کے لغوی معنی ہیں "درخت کی الجھی ہوئی شاخ اور ایک دوسرے میں گتھم گتھا ٹہنی"۔ حدیث کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ رحم (بمعنی رشتۂ

قرابت) اور اللہ تعالیٰ کی صفت ''الرحمٰن'' کا مادہ (ORIGIN) ایک ہے یعنی ''رح م''۔ لہٰذا ''صلہ رحمی'' اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان پیدائش سے پہلے کچھ وقت ''رحم مادر'' میں گزارتا ہے، تو ماں کے دل میں اور اس نسبت سے قرابت کے دیگر رشتوں میں جو فطری میلان، شفقت اور محبت اللہ نے رکھی ہے وہ اس کی صفت ''الرحمٰن'' کا فیضان ہے۔

۳۔ اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بَالْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَهُ اللّٰهُ۔ یعنی ''رحم عرش الٰہی کے ساتھ معلق ہے اور (زبان حال سے) کہتا ہے کہ جو مجھے ملائے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے رحم وکرم سے ملائے رکھے اور جو مجھے توڑ دے اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ٹوٹ جائے۔ (صحیحین بحوالہ مشکوٰۃ)''۔

۴۔ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ: قطع رحمی کرنے والا (یعنی رشتۂ قرابت کو توڑنے والا) جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ)

۵۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''واصل'' (صلہ رحمی کرنے والا) وہ شخص نہیں ہے جو کسی قرابت دار کی اچھائی کا بدلہ اچھائی سے دے (یعنی ادلے کا بدلہ کے اصول پر عمل پیرا ہو) بلکہ حقیقت میں حق قرابت کو ادا کرنے والا (اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلیٰ انعام کا حق دار) وہ شخص ہے جو ان رشتہ داروں سے بھی تعلق جوڑے رکھے جو اس سے نباہ نہیں کرتے۔

۶۔ مسلم شریف میں روایت ہے کہ ایک شخص نے بارگاہ رسول میں عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میرے رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان سے ملنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں مگر وہ تعلق توڑ لیتے ہیں، میں ان کے ساتھ اچھائی کرتا ہوں مگر وہ اس کا جواب برائی سے دیتے ہیں، میں ان کی زیادتیوں سے درگزر کرتا ہوں مگر وہ مسلسل میرے ساتھ جہالت آمیز سلوک کرتے ہیں (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تیرا برتاؤ (اپنے رشتے داروں سے) ایسا ہی ہے جیسا تو نے بیان کیا تو تم ان کو گرم ریت کھلا رہے ہو، اور تم جب

تک اپنی اس روش پر قائم رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے مقابلے میں تمہارا ایک مددگار رہے گا۔"

وَ اٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا۝ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا۝

"اور یتیموں کے مال ان کو دے دو اور اپنے ناقص مال کو ان کے عمدہ مال سے نہ بدلو، اور ان کے مال اپنے مال میں ملا کر ہڑپ نہ کرو، بلا شبہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اور اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ یتیم (لڑکیوں) کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان کے بجائے) اپنی پسند کے مطابق (بیک وقت) دو دو، تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کر لو اور اگر تمہیں خدشہ ہو کہ (بیک وقت ایک سے زیادہ بیویوں کے مابین) عدل قائم نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر قناعت کر و یا ان کنیزوں پر اکتفا کرو جو تمہاری ملک میں ہیں، یہ بات زیادہ قرین انصاف ہے تا کہ تم ایک جانب نہ جھک جاؤ"۔

مشکل الفاظ کے معانی

اٰتُوا	دو	الْیَتٰمٰی	یتیم کی جمع، اس کی جمع "ایتام" بھی آتی ہے
حُوْبًا	بڑا گناہ	اِنْ خِفْتُمْ	اگر تم ڈرتے ہو
اَنْ لَّا تُقْسِطُوْا	کہ انصاف نہ کر سکو گے، مادہ قسط	فَانْكِحُوْا	پس نکاح کرو
مَثْنٰی	دو دو	ثُلٰثَ	تین تین

رُبٰعَ	چار چار	اَیْمَان	یمین کی جمع دایاں ہاتھ/قسم
اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ	جو تمہاری ملک ہیں	اَدْنٰیٓ	قریب ترین، مؤنث دنیا
اَنْ لَّا تَعُوْلُوْا	کہ (ظلم کی طرف) مائل نہیں ہو گے		

تفسیر

یتم اور یتیم کے معنی

''یتیم'' اس بچے کو کہتے ہیں جس کے باپ کا اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا ہو۔ چونکہ یتیم کا ایک مفہوم ہے ''اکیلا رہ جانا''، اس لئے اپنی نوع کی ہر وہ چیز جو بے مثل و مثال ہو اسے یتیم کہتے ہیں۔ اور عربی زبان میں انمول اور بے مثال ہیرے کو ''در یتیم'' کہتے ہیں۔ باپ عالم اسباب میں بچے کا مربی، کفیل اور سرپرست ہوتا ہے اور یتیم بچہ اس عظیم نعمت سے محروم ہو جاتا ہے، اس لئے وہ سب سے زیادہ شفقت اور پیار کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اسلام میں یتیم کے سر پر دست شفقت رکھنے کا بہت بڑا اجر ہے البتہ بالغ ہونے کے بعد اس پر یتیم کا اطلاق نہیں ہوتا، حدیث پاک میں ہے: ''لَا یُتْمَ بَعْدَ الْبُلُوْغِ'' یعنی بلوغت کے بعد یتیم نہیں ہے۔ یتیم کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دینے والی چند احادیث ملاحظہ ہوں:

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کے گھرانوں میں سے بہترین گھرانا وہ ہے جہاں کوئی یتیم پرورش پا رہا ہو اور اس سے حسن سلوک کیا جائے، اور بدترین گھرانا وہ ہے جہاں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے (سنن ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ)

۲۔ جو شخص کسی یتیم کے سر پر محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے دست شفقت پھیرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ کے نیچے آنے والے ہر بال کے بدلے میں اسے نیکیاں عطا فرمائے گا، اور آپ نے اپنے دست مبارک کی دو انگلیوں کو ملا کر اشارے سے بتایا کہ جس کی

سر پرستی میں کوئی یتیم ہے اور وہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کر رہا ہے تو وہ شخص جنت میں میرے اس قدر قریب ہوگا جیسے ہاتھ کی یہ دو انگلیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

یتیم کا مال ادا کرنے کا حکم

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ: بعض یتیم ایسے ہوتے ہیں جن کے حصے میں وراثت کا مال آتا ہے، اور ان کے ولی، وصی اور سر پرست اس مال کے نگہبان ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ یتیم جب عاقل و بالغ ہو جائے تو اس کے ولی (Guardian) پر لازم ہے کہ اس کا مال اس کے حوالے کر دے۔ بنی غطفان کے ایک شخص کے پاس اس کے یتیم بھتیجوں کا کافی مال تھا، جب بالغ ہونے پر اس کے بھتیجوں نے اپنے مال کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس موقع پر یہ حکم نازل ہوا کہ یتیم جب عاقل و بالغ ہو جائیں تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔

وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ: ''خبیث'' کا اطلاق ناپاک، ناقص اور حرام مال پر ہوتا ہے، اور ''طیب'' کا اطلاق پاک، عمدہ اور حلال مال پر ہوتا ہے۔ وہ مال جسے ظلماً اور ناجائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہے، وہ اگرچہ ظاہری نظر میں عمدہ اور پاک نظر آتا ہے لیکن وہ اس ظالم، غاصب اور خائن کے لئے معنوی طور پر ناپاک ہوتا ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں وہ اخروی سزا کا حق دار ہوگا۔

''اور خبیث مال کو طیب مال سے نہ بدلو'' اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ عہد جاہلیت میں یتامیٰ کے ''ولی'' جب بالغ ہونے پر انہیں مال واپس کرتے تو ان کا عمدہ اور اعلیٰ کوالٹی کا مال روک لیتے، اس آیت میں اس خیانت سے روک دیا گیا۔ دوم یہ کہ اگر حیلے بہانے سے یتیم کا مال ہڑپ کر لیا تو یہ فعل ناپاک اور حرام ہے۔

یتیم کا مال کھانے کی ممانعت

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ: ''الیٰ'' مع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس طرح معنی یہ ہوں گے کہ ''اور یتیموں کے مال کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ''۔ اس کی

ایک صورت یہ ہے کہ یتیم کی کفالت اس کے اپنے مال سے کی جائے اور وہ اس طرح کہ اس کے اور اپنے مال کو باہم ملا کر اس پر ہاتھ صاف کر دیا جائے۔ لیکن اگر یتیم کے مال کو ملائے بغیر بھی ہڑپ کرلیا جائے تو اس آیت کی رو سے حرام ہے۔ البتہ ایسے لوگ جو انتہائی دیانت کے ساتھ یتیم کے مال میں سے جائز حصہ نکال کر اس کو اپنے مال سے ملا دیتے اور پھر دونوں فریق مل بیٹھ کر کھاتے تھے، وہ اس وعید سے گھبرا گئے اور اپنا اور یتیم کا کھانا پکانا الگ کر دیا، اس سے فریقین (یتیم اور اس کے ولی) کے لئے عملی دشواریاں پیدا ہونے لگیں تو ایسے دیانت دار لوگوں کی تسلی کے لئے دوسرے مقام پر فرمایا:

وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ: یعنی اگر تم دیانت، نیک نیتی اور اخلاص عمل کے ساتھ عملی دشواریوں سے بچنے کے لئے ان کا بقدر حصہ مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر اکٹھے مل بیٹھ کر کھاؤ پیو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ: ''اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ''مال کو باہم ملانے'' کے اس عمل میں کون اصلاح پسند اور خیر خواہ ہے اور کون بد نیت (اور یتیم کے مال کو ہڑپ کرنے والا ہے)''۔

یتیموں سے ظلماً نکاح کی ممانعت

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ: عہد رسالت میں بعض لوگوں کی کفالت میں یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں، بعض اوقات یتیم لڑکیاں مالدار بھی ہوتی تھیں۔ ان کے سرپرستوں (اولیاء) میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو ان کے ''محرم'' نہیں تھے اور شرعاً ان کے آپس میں نکاح میں کوئی ممانعت کا سبب نہیں ہوتا تھا۔ ان یتیم لڑکیوں کے ساتھ غیر محرم رشتہ داروں اور سرپرستوں کا نکاح کی بابت جو رویہ تھا، اس کی چند صورتیں یہ تھیں:

ا۔ بعض اوقات یہ یتیم لڑکیاں حسن و جمال والی بھی ہوتیں اور مالدار بھی، ان کے غیر محرم ولی ان کے ساتھ ان کے مال و جمال میں رغبت کی وجہ سے نکاح کر لیتے لیکن ان کو ان کے ہم کفو (Equal Status) لڑکیوں کے برابر مہر اور نفقہ نہ دیتے۔

۲۔ اور اگر ایسی یتیم لڑکیاں حسن و جمال اور مال والی نہ ہوتیں تو ان کے مالدار غیر محرم ولی ان کو نظر انداز کر کے دوسری پسند کی عورتوں سے نکاح کر لیتے۔

۳۔ بعض اوقات یتیم لڑکیوں سے ان کے غیر محرم ولی نکاح محض اس لئے کرتے تھے کہ مہر اور نان نفقہ و دیگر حقوق کے بارے میں ان کے جائز شرعی حقوق کا مطالبہ و دفاع کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ کام تو قریب ترین رشتہ دار بزرگ کرتے ہیں اور اس منصب پر وہ خود فائز تھے۔

۴۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ عہد رسالت میں ایک شخص کی ولایت و سرپرستی میں ایک یتیم لڑکی تھی جو ایک باغ میں اس کی شراکت دار بھی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا، مہر وغیرہ دینا تو درکنار، اس نے یتیم لڑکی کا باغ بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس موقع پر آیۂ مبارکہ نازل ہوئی اور اس میں صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ حکم دیا کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ اپنے زیر ولایت یتیم لڑکیوں کے مہر، نان نفقہ اور دیگر حقوق کی ادائیگی میں تم انصاف نہ کر سکو گے تو ظلماً انہیں اپنی قید نکاح میں رکھنے کے بجائے اپنی پسند کی دوسری عورتوں سے نکاح کر لو۔

اجنبی عورت کو نکاح کی غرض سے دیکھنے کی اجازت

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ: "اپنی پسند کی عورتوں سے نکاح کرو۔"

مسئلہ

قاضی محمد ثناء اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تفسیر مظہری میں مندرجہ بالا کلمات قرآنی سے ایک مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ شریعت نے اپنی پسند کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے اور ظاہر ہے کہ پسند ناپسند کا فیصلہ دیکھے بغیر صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اگرچہ شرعاً حظ نفسانی، تلذذ اور ذوق آوارگی کی تسکین کے لئے غیر محرم عورت کو دیکھنا جائز نہیں ہے لیکن جس عورت سے نکاح کا ارادہ ہو اس کے چہرے اور ہاتھ وغیرہ یعنی جسم کے ظاہری حصے کو دیکھنا نہ صرف

جائز بلکہ قرین مصلحت ہے۔ ابن مقام پر انہوں نے جامع ترمذی، سنن نسائی، ابن ماجہ و مسند دارمی وغیرہ کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ "حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا، تو مجھ سے رسول کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا، نہیں۔ آپ نے فرمایا: اسے دیکھ لو، تمہارے درمیان الفت ومحبت کے لئے یہ بات زیادہ مناسب ہے۔"

مسئلہ

امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک بالغہ لڑکی اپنے نکاح کے سلسلہ میں خودمختار ہے تاہم اگر وہ کسی ایسے شخص سے نکاح کرے جو اس کا کفو (مساوی حیثیت) کا نہیں ہے تو ولی عدالت کے ذریعے اسے فسخ کرا سکتا ہے۔

مسئلہ

دیگر ائمہ کے نزدیک ولی کو ہر صورت میں "ولایت اجبار" کا حق حاصل ہے، خواہ لڑکی بالغہ ہو یا نابالغہ، لہٰذا بالغہ ہونے کے باوجود اگر لڑکی ولی کی اجازت ومرضی کے بغیر نکاح کرے گی تو وہ نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوگا۔

کفو کے معنی

"کفو" سے مراد ہے دین داری، مال و دولت، سماجی رتبہ، پیشہ وغیرہ میں مساوات۔

مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ: عہد جاہلیت میں ازواج کی تعداد پر کوئی قدغن نہیں تھی، چنانچہ کوئی شخص جتنی عورتوں سے چاہتا نکاح کر لیتا۔ ایک شخص غیلان بن اسلمی مشرف بہ اسلام ہوا تو اس کے نکاح میں دس بیویاں تھیں اور وہ بھی مسلمان ہو گئیں، قیس بن حارث اسدی جب اسلام لائے تو ان کے نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں، نوفل بن معاویہ دیلمی اسلام لائے تو ان کے نکاح میں پانچ بیویاں تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے تمام اشخاص کو حکم دیا کہ وہ اپنے حسب منشاء زیادہ سے زیادہ چار ازواج نکاح میں رہنے دیں اور باقی کو طلاق دے دیں۔ ان تمام نومسلم صحابہ کرام نے خوش دلی سے اس پر عمل کیا۔

مسئلہ تعداد ازواج

(۱) اس ارشاد قرآنی کی رو سے اسلام میں بیک وقت چار سے زیادہ بیویوں کو نکاح میں رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ ازواج سے نکاح کی اجازت غیر مشروط نہیں ہے۔

۲۔ ایک وقت میں ایک سے زائد بیویوں سے نکاح کرنے کی اجازت اضطراری اور لازمی نہیں ہے بلکہ اختیاری ہے، نہ ہی یہ اجازت غیر مشروط ہے بلکہ ایک سے زائد ازواج کے درمیان ''شرط عدل'' کے ساتھ مشروط ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً یعنی ''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ایک سے زائد ازواج کے درمیان عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو اس صورت میں صرف ایک پر اکتفا کرو''، اور یہ بہت کڑی شرط ہے۔ ''عدل'' سے مراد ہے تمام ازواج کو یکساں نان نفقہ، ایک ہی معیار کی رہائش و سہولتیں فراہم کرنا اور ان کے درمیان دنوں کی برابر تقسیم وغیرہ۔ یعنی ہر وہ امر جو انسان کے اختیار میں ہے، ہاں طبعی اور فطری میلان اگر غیر اختیاری طور پر کسی جانب زیادہ ہو تو یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی پیمانہ وضع کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ بعض طبقات اسلام کی اس ناگزیر رخصت پر ہمیشہ معترض رہتے ہیں لیکن جس اخلاق باختہ مغربی تمدن کی تقلید میں وہ اسلام کو اپنے لعن طعن کا ہدف بناتے ہیں وہاں دوسری بیوی نکاح میں رکھنا تو خلاف قانون ہے لیکن وہاں باہمی رضامندی سے زنا معیوب نہیں ہے، ناجائز جنسی تعلقات کی کھلی اجازت ہے، داشتائیں رکھنا اخلاقی یا قانونی جرم نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں غیر شادی شدہ کنوارے جوڑوں کی کثرت ہے، بن باپ کے بچوں کی بہتات ہے اور امریکی صدر تک عائلی و خاندانی نظام کی تباہی و بربادی پر چلا رہے ہیں، تو جہاں نکاح معیوب اور زنا عام ہو تو اسلامی احکام کو ان کی کسوٹی پر پرکھنا ظلم نہیں تو اور کیا ہے، بقول علامہ اقبال

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

۴۔ بعض ممالک میں لڑکیوں کی شرح پیدائش قدرتی طور پر لڑکوں سے زیادہ ہے، گذشتہ دنوں جنوبی کوریا کے بارے میں ایک سروے میں بتایا گیا کہ ان کے ہاں آئندہ دس بیس برسوں میں یہ تناسب ایک اور دو کا ہو جائے گا۔ تاریخ انسانی میں ایسا بارہا ہوا کہ جنگوں میں مرد کثیر تعداد میں مارے گئے اور اس کے نتیجے میں مجموعی آبادی میں عورتوں کا تناسب بڑھ گیا۔ کیا ایسے ممکنہ حالات میں حقوق نسواں کے نام نہاد علمبردار ایک سے زائد ازواج سے جائز نکاح کے تعلقات کو ترجیح دیں گے یا ناجائز طریقے سے جنسی خواہشات کی تسکین کو، یا جاگیردار دیہی معاشرے کی طرح بعض صورتوں میں خواتین کو زندگی کے جائز حقوق سے محروم کر کے دم لیں گے۔

۵۔ اسی طرح بعض اوقات عورت اپنی جسمانی کمزوریوں یا کسی قدرتی نقص کی وجہ سے تولید (PROCREATION) کے قابل نہیں ہوتی اور مرد کو فطری طور پر اولاد کی خواہش ہوتی ہے، کیا یہ قرین انصاف نہیں ہے کہ وہ بدستور عقد نکاح میں رہے اور شوہر اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے دوسرا نکاح کر لے اور دونوں کے حقوق مساوی طور پر ادا کرے بشرطیکہ اس کے حالات اس امر کی اجازت دیں۔

تعداد ازواج رسول ﷺ

ختم المرسلین ﷺ کی عقد میں بیک وقت چار سے زائد ازواج رہیں، اس بارے میں سادہ لوح مسلمانوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا کئے جاتے ہیں اور یہ ملحدین اور مستشرقین کا من پسند موضوع ہے۔ ان شبہات وخدشات کا کافی وشافی اور مدلل جواب دینے کے لئے علماء امت نے وقتاً فوقتاً اپنی علمی وفکری کاوشیں صرف کی ہیں اور یہ ہمارے دینی لٹریچر کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ یہاں ان ابحاث کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تنگی داماں مانع ہے۔ تاہم مختصراً سلیم الفطرت اذہان اور صالح نوجوانوں کی تسکین کی خاطر چند

ضروری باتیں درج کی جارہی ہیں۔

۱۔حضور اکرم ﷺ مامور من اللہ تھے اور آپ کا ہر قول وفعل وحی کے تابع تھا اور اس پر آیات قرآنی اور احادیث کے متعدد شواہد موجود ہیں۔لہٰذا آپ کے عقد میں بیک وقت چار سے زائد ازواج مطہرات کا ہونا اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور یہ آپ کے خصائص میں سے ہے۔اور جب قرآن میں لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ ''یعنی آج کے بعد آپ کے لئے عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے'' کا حکم ربانی نازل ہوا تو اس کے بعد آپ نے کوئی مزید نکاح نہیں کیا۔اس سے اشارتاً اور دلالۃً یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس حکم کے نزول سے پہلے جو نکاح آپ نے کئے وہ آپ کے لئے جائز تھے اور زیادہ سے زیادہ چار ازواج کی تحدید کے عمومی حکم سے آپ مستثنیٰ تھے۔

۲۔آپ نے متعدد ازواج سے جو نکاح کئے ان کے اندر کئی دینی، تبلیغی، دعوتی، معاشرتی اور سیاسی حکمتیں کارفرما تھیں، جن کی نشاندہی کے لئے علماءِ امت نے مستقل کتب مرتب کی ہیں۔ دین کی تعلیمات، بالخصوص خواتین سے متعلق امور کا بیشتر حصہ امہات المومنین کے توسط سے امت کو معلوم ہوا۔

۳۔آپ کے خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کے وصال کے بعد امہات المومنین میں سے کسی نے بھی عقد ثانی نہیں کیا اور نہ ہی ان کو اس کی رخصت واجازت تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمادیا تھا: وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا (الاحزاب: ۵۳) ''اور نہ یہ کہ کبھی بھی ان (رسول اللہ) کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو (ابد تک) بے شک تمہاری یہ بات اللہ کے نزدیک بہت بڑی ہے''۔

۴۔رسول اللہ ﷺ کا کوئی بھی عقد نکاح لذتِ نفسانی اور تکمیل شہوت کے لئے نہیں تھا، بلکہ دینی مصلحتوں کے تابع تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ نے عالم انسانیت کے تمام ادوار کا حسین ترین، دلکش ودل آویز اور محبوب ترین نوجوان ہونے کے باوجود ۲۵ برس کی عمر میں ۴۰ برس کی بیوہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے شادی کی اور زندگی کے مزید ۲۵ برس، جو کسی

انسان کی زندگی کا سب سے دلکش ودل ربا دور ہوتا ہے، صرف ان کی رفاقت میں بسر کیے۔

۵۔ نبی اکرم ﷺ کی واحد کنواری بیوی ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جب کاشانۂ نبوت میں تشریف لائیں تو اس وقت آپ کی عمر ۵۴ برس تھی اور عمر کے اس مرحلے تک چار تو در کنار آپ کے کاشانۂ مبارک میں ایک وقت میں صرف ایک بیوی رہی۔ ۵۸ برس کی عمر میں چار بیویاں جمع ہوئیں اور چار سے زائد ازواج سے نکاح آپ نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری چند برسوں میں کیا۔

۶۔ اس کے باوجود آپ کا کردار اتنا پاکیزہ اور طیب وطاہر تھا کہ آج تک کسی بدترین دشمن نے بھی آپ کی عظمت کردار پر انگشت زنی نہیں کی۔

۷۔ رسول اللہ ﷺ نے امت کو اگر ایک سے زائد ازواج کے درمیان حقوق میں عدل کا حکم دیا تو خود ایک وقت میں متعدد ازواج کے درمیان مثالی عدل قائم کر کے دکھایا۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا

"عال یعول" کے معنی میلان کے ہیں، لیکن یہاں راہِ عدل سے پھر جانا اور ظلم وجور کی جانب جھک جانا مراد ہے، یعنی اگر ایک سے زائد ازواج میں تم عدل نہ کر سکو تو ظلم وجور سے بچنے کے لئے محض ایک بیوی پر قناعت کرنا زیادہ قرین انصاف ہے۔ بعض مفسرین نے اس کلمے کو "عالة" سے مشتق مانا ہے، جس کے معنی تنگ دستی کے ہیں تو اس صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ اگر عقد ثانی کے دوسرے دواعی اور اسباب موجود بھی ہوں لیکن معاشی حالت اس کی اجازت نہ دے تو کثرت ازواج واولاد کے سبب فقر وفاقہ اور تنگ دستی میں مبتلا ہونے کے بجائے ایک ہی بیوی پر قناعت کرو۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝

"اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی خوشی ادا کرو پھر اگر وہ خوش دلی کے ساتھ اس میں سے تمہیں کچھ دے دیں تو اسے خوب چاہت اور مزے سے کھاؤ"۔

مشکل الفاظ کے معانی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
صَدُقٰتٌ	صدقۃ کی جمع مہر،	نِحْلَۃً،	عورت کو مہر دینا، خوش
		اَلنَّحْلُ،	دلی سے دیا جانے والا
		اَلنِّحْلُ	عطیہ
فَاِنْ طِبْنَ	(مادہ: طیب) اگر وہ خوشی سے	فَکُلُوْہُ	پس اسے کھاؤ، اُکل سے امر
لَکُمْ عَنْ شَیْءٍ	تمہارے لئے کوئی چیز (چھوڑ دیں)		
ھَنِیْٓئًا	(باب سمع، فتح اور کرم سے) خوشگوار	مَّرِیْٓئًا	(باب سمع، فتح، کرم سے) کھانے کا خوشگوار اور مفید ہونا

تفسیر

مہر کا وجوب

اس آیت سے مہر کا وجوب ثابت ہوتا ہے کہ شوہر پر لازم ہے کہ ہر حال میں وہ اپنی بیوی کا مہر ادا کرے اور جب ادا کرنے کا موقع ہو تو اسے کوئی تاوان یا جرمانہ سمجھ کر نہیں بلکہ اللہ کا فرمان و انعام سمجھ کر کشادہ دلی سے ادا کرے۔ عورت پر اس کے حقِ مہر کے حوالے سے ظلم کی کئی صورتیں تھیں بلکہ بعض خاندانوں اور علاقوں میں آج بھی موجود ہیں۔

اول یہ کہ عورت کو مجبور سمجھ کر مہر ادا ہی نہیں کرتے تھے اور وہ حالات کے جبر تلے دبی ہوئی اپنا حق وصول نہیں کر پاتی تھیں۔

دوم یہ کہ اس پر دباؤ ڈال کر معاف کرا دیا کرتے تھے جبکہ شرعاً اس طریقے سے حق ساقط نہیں ہوتا۔

سوم یہ کہ عورت کے ولی شوہر سے مہر کی رقم وصول کر لیتے اور پھر اسے عورت کے

حوالے نہ کرتے۔اس آیت کے مخاطب مظلوم عورت کے ایسے ظالم ورثاء بھی ہیں۔

ہاں البتہ اگر عورت مہر کی کل رقم یا اس کا بعض حصہ بلا کسی جبر واکراہ کے خوش دلی سے معاف کر دے تو پھر شوہر ایک خوشگوار ہدیہ سمجھ کر اسے اپنے مصرف میں لا سکتا ہے۔عورت کی ''طیب نفس'' اور ''خوش دلی'' کا صحیح اظہار تو اس صورت میں ہوسکتا ہے جب شوہر مہر کی کل رقم اس کے قبضے میں دیدے اور پھر وہ بہ طیب خاطر اس کا کچھ حصہ یا کل شوہر کو واپس کر دے۔اس طرح شوہر کو کل مہر کی ادائیگی کا اجر ملے گا اور بیوی کو ہبہ یا عطیہ کا۔

مہر کا مفہوم

مہر اس مال کو کہتے ہیں جو شوہر عقد نکاح کے موقع پر شرط لازم کے طور پر بیوی کو ادا کرتا ہے یا اس کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔قرآن وحدیث میں اسے ''صَدَاق''، ''صِدَاق'' اور ''صَدُقَۃ'' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، اس کا لفظ مادہ ''صِدق'' ہے۔ملا علی القاری شارح مشکوٰۃ نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ عورت کی جانب شوہر کے میلان کی صداقت کی دلیل اور علامت ہوتا ہے۔شریعت نے مہر عورت کی تکریم کی علامت کے طور پر مقرر کیا ہے کیونکہ ایک اجنبی عورت، جو نکاح سے پہلے حرام ہوتی ہے، عقد نکاح کے نتیجے میں شوہر پر حلال ہو جاتی ہے۔اسلام نے مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار پر کوئی تحدید عائد نہیں کی بلکہ اسے دونوں کی آزادانہ رضامندی اور حیثیت پر چھوڑا ہے۔لہٰذا باہمی رضامندی سے مہر کی جو بھی مقدار مقرر ہوگی وہ شرعی مہر ہی کہلائے گا۔مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مہر کی بھاری مقدار مقرر کرنے پر تنبیہ کی تو ایک عورت اٹھ کھڑی ہوئی اور کہا:

اے امیر المومنین: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا اور ''قِنطَار'' مال کے ڈھیر یا مال کثیر کو کہتے ہیں۔جب اللہ جل شانہٗ نے مہر میں ڈھیر سارا مال دینے کی اجازت دی ہے تو آپ اس پر روک ٹوک لگانے والے کون ہوتے ہیں؟ اس پر انہوں نے فرمایا: ''اَصَابَتْ اِمْرَاَۃٌ وَاَخْطَاَ عُمَرُ'' عورت نے ٹھیک کہا اور عمر کی بات غلط

ہے،تم حسب منشاء مہر مقرر کیا کرو البتہ مہر کی کم از کم مقدار کے بارے میں حدیث پاک میں ہے "لَا مَهْرَ اَقَلُّ مِنْ عَشْرَةِ دَرَاهِمَ" دس درہم سے کم مہر نہیں ہے اور دس درہم تقریباً ۶۲۵ء۲ تولے چاندی کے برابر ہوتے تھے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا۝

"اور نادانوں کو ان کے مال (جو تمہاری تحویل میں ہیں) نہ دو، جنہیں اللہ نے تمہارے گزر بسر کا سہارا بنا رکھا ہے (ہاں) انہیں اس میں سے کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے اچھی بات کہو۔ اور (امور دنیا میں) یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں تو اگر تم ان میں عقلمندی (کی علامات) دیکھو تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو، اور (اس اندیشے کے پیش نظر) فضول خرچی اور جلد بازی سے ان کا مال ہڑپ نہ کرو، کہ وہ بڑے ہو جائیں (اور اپنا حق طلب کریں)، اور (یتیم کا وہ ولی) جو مالدار ہو، وہ (مال یتیم سے) اپنا دامن بچائے رکھے اور جو حاجت مند ہو وہ (یتیم کے مال میں سے) جائز حد تک کھائے، پھر جب تم (یتیم کے عاقل و بالغ ہونے پر) ان کا مال ان کے سپرد کرنے لگو تو ان پر گواہ بنا لو اور حساب لینے کو تو اللہ ہی کافی ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
السُّفَهَآءَ	سَفِیۡہٗ کی جمع بے وقوف، نادان، ناقص العقل	قِیٰمًا	جس پر گزر بسر ہو، جس پر معاش کا سلسلہ قائم ہو
ارۡزُقُوۡهُمۡ	انہیں رزق دو،	اکۡسُوۡهُمۡ	انہیں لباس فراہم کرو،
مَعۡرُوۡف:	دستور کے مطابق اچھی، پسندیدہ،	وَابۡتَلُوا	اور آزماؤ،
اِذَابَلَغُوا	جب وہ پہنچ جائیں	اِنۡ اٰنَسۡتُمۡ	اگر تم دیکھو، محسوس کرو،
رُشۡدًا	ہدایت، عقلندی، یہاں دنیوی معاملات کی سمجھ مراد ہے،	اِدۡفَعُوۡا اِلَیۡهِمۡ	انہیں سپرد کرو،
لَا تَاۡکُلُوۡا	مت کھاؤ،	اِسۡرَاف	فضول خرچی، ضرورت سے زائد خرچ کرنا یا ناجائز امور میں صرف کرنا
بِدَارًا	جلد بازی،	اَنۡ یَّکۡبَرُوۡا	یہ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے،
فَلۡیَسۡتَعۡفِفۡ	اسے چاہئے کہ بچتا رہے	اَشۡهِدُوۡا عَلَیۡهِمۡ	ان پر گواہ بناؤ،
کَفٰی	کافی ہے،	حَسِیۡبًا	حساب لینے والا

تفسیر

نادان کو اس کا مال سپرد کرنے کی ممانعت

وَلَا تُؤۡتُوا السُّفَهَآءَ اَمۡوَالَکُمۡ: اور نادانوں کو اپنا مال نہ دو۔ یہاں ''سفیہ'' سے ناقص العقل مراد ہے، خواہ نادانی کا سبب کم عمری ہو یا ذہنی اہلیت کا فقدان۔ اللہ تعالیٰ کے اس

ارشاد کا منشاء یہ ہے کہ کسی کے زیر کفالت وسرپرستی یتیم جب تک اپنے مال کی صحیح حفاظت کی عمر یا ذہنی استعداد کی منزل تک نہ پہنچے، اس کا مال اس کے حوالے نہ کرو تا کہ ضائع نہ ہو جائے۔ قرآن نے "اپنا مال" کہہ کر یہ لطیف اشارہ دیا کہ یتیم کے مال کی حفاظت اپنے مال ہی کی طرح کرنی چاہئے کیونکہ تم اس کے امین اور نگہبان ہو اور وہ بھی کسی نہ کسی حوالے سے تمہارا اپنا ہی ہے، غیر نہیں ہے۔ وَّارۡزُقُوۡهُمۡ فِيۡهَا وَاكۡسُوۡهُمۡ...... "اور انہیں اس میں سے کھلاؤ اور پہناؤ"، ان کلمات کے ذریعے قرآن نے یہ تعلیم دی کہ جب تک تمہارے زیر سرپرستی یتیم اپنے مال کی حفاظت کا اہل نہ بن جائے، اس کے مال میں سے دیانت وامانت کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اس کی ضروریات پر خرچ کرو۔ اور اگر وہ ناتجربہ کاری کی بناء پر یا کسی بدخواہ کے اکسانے پر یہ مطالبہ کرنے لگے کہ میرا مال میرے حوالے کرو تو اسے حکمت ودانش اور پیار ومحبت سے سمجھاؤ، مثلاً یہ کہو کہ "برخوردار یہ مال آج بھی آپ کا ہے اور کل بھی، میں تو تمہارا نگہبان، خدمت گزار اور خیر خواہ ہوں، بس تھوڑا سا انتظار کرو تا کہ تمہیں زمانے کے اتار چڑھاؤ اور اپنے پرائے کا فرق معلوم ہو جائے۔"

یتیموں کی اہلیت کو جانچنا

وَابۡتَلُوا الۡيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (۱): "اور یتیموں کو آزماؤ یہاں تک کہ وہ اہلیت نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔" یعنی بالغ ہونے سے پہلے جب وہ ذرا ہوشیار ہو جائیں تو ان کی سوجھ بوجھ اور عقل ودانش کی آزمائش کرو، مثلاً یہ کہ انہیں تھوڑا بہت لین دین کا موقع دو تا کہ ان کی اہلیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

(۲) اسی آیت سے استنباط کرتے ہوئے امام اعظم ابو حنیفہ نے کہا کہ اگر ولی کی اجازت سے باشعور اور سمجھدار نابالغ خرید وفروخت کرے تو اس کا تصرف مؤثر اور نافذ العمل ہو گا جبکہ امام شافعی اس کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔

(۳) بلوغت کی علامت لڑکے کے لئے احتلام اور لڑکی کے لئے حیض ہے لیکن اگر ان میں ان علامات کا ظہور نہ ہو تو امام شافعی اور ائمہ احناف کا فتویٰ اس پر ہے کہ ۱۵ سال کی عمر

مکمل ہونے پر لڑکے اور لڑکی کو بالغ تسلیم کیا جائے۔

بلوغت کے باوجود اہلیت ضروری ہے

فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا...... الخ ''یعنی اگر یتیم کے بالغ ہونے پر تم محسوس کرو کہ اس میں نفع نقصان کی تمیز اور دین و دنیا کی مصلحت کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو چکی ہے تو اس کا مال اس کے حوالے کر دو۔'' لیکن اگر علامات یا عمر کے اعتبار سے تو وہ بالغ ہو چکا ہے، لیکن ابھی اس میں ضروری سمجھ بوجھ اور ذہنی استعداد پیدا نہیں ہوئی تو امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اس آیت کے ظاہری مفہوم کے تحت ۲۵ برس تک مزید انتظار کیا جائے گا اور ۲۵ برس مکمل ہونے پر بہر صورت اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائے گا، جبکہ امام شافعی کے نزدیک جب تک وہ اپنے مال کی حفاظت اور نفع نقصان میں تمیز کا اہل نہ ہو جائے، اس کا مال اس کے حوالے نہیں کیا جائے گا خواہ اس کی عمر ۲۵ برس یا اس سے زائد ہی کیوں نہ ہو جائے۔

یتیموں کے مال میں اسراف کی ممانعت

وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا: ''اور اس اندیشے کے تحت کہ یتیم بالغ ہونے پر اپنے مال پر قابض ہو جائے گا، اس کا مال فضول خرچی کے ذریعے یا جلد بازی میں ہڑپ کرنے کی تدبیر نہ کرو''۔ اس لئے کہ یہ امانت میں صریح خیانت، سنگدلی' شقاوت، بے رحمی اور خدا ناترسی ہے۔ کیونکہ اگر انجام کار مال اس کی تحویل میں چلا بھی گیا تو یہ اسی کا مال ہے اور اس پر اول و آخر اسی کا حق ہے نہ کہ تمہارا۔ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی اگر یتیم کا ولی اور سرپرست مالدار ہے تو وہ اس کی اور اس کے مال کی نگرانی بلا معاوضہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرے اور یتیم کے مال میں سے اپنی ذات پر کچھ بھی خرچ نہ کرے۔ اور اگر خدانخواستہ وہ محتاج اور نادار ہے تو یتیم اور اس کے مال کی نگرانی کے عوض اس کے مال میں سے معروف طریقے سے صرف اپنی جائز ضرورت پر خرچ کرے، صرف اتنی مقدار جو اس کے گزر بسر کے لئے ناگزیر ہے، یتیم کے مال پر عیاشی نہ کرے، اللے تللے نہ کرے ورنہ کل اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حساب دینا پڑے گا۔

گواہوں کی موجودگی میں مال سپرد کرنے کا حکم

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ: یعنی جب یتیم بالغ اور سمجھ دار ہو جائے اور اس کا سرپرست اس کا مال اس کے حوالے کرے تو بہتر یہ ہے کہ "ولی یتیم" یہ کام گواہوں کی موجودگی میں سر انجام دے۔ گواہ مقرر کرنا واجب تو نہیں ہے لیکن مستحب اور پسندیدہ امر ہے کیونکہ ایک تو لوگوں کے درمیان اس کی دیانت وامانت مجروح نہیں ہوگی، اس کی عزت نفس کا تحفظ ہوگا، کوئی اس کے کردار پر انگلی نہیں اٹھائے گا اور دوسرا یہ کہ مستقبل میں کسی نزاع کا امکان نہیں رہے گا۔

اس سے ضمناً یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی ملکی، ملی، دینی اور رفاہی خدمات جو فرض کفایہ کا درجہ رکھتی ہیں، ان کی انجام دہی پر مامور اشخاص کی جائز ضروریات کی کفالت ان اداروں سے کرنا جائز ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا ۝

"مردوں کے لئے اس (مال) میں سے حصہ ہے جو (موت کے وقت) ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ گئے اور عورتوں کے لئے (بھی) اس (مال) میں سے حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ کر مرے، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، (یہ) حصہ (اللہ کا) مقرر کیا ہوا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

لِلرِّجَالِ	رَجُلٌ کی جمع مرد	نَصِیْبٌ	حصہ
مِمَّا تَرَكَ	اس (مال) میں سے جو اس نے چھوڑا	وَالِدَانِ	ماں باپ،
اَقْرَبُوْنَ	اقرب کی جمع زیادہ قرابت والے	قَلَّ	کم ہوا،

کَثُرَ	زیادہ ہوا	اَوْ یا
مَفْرُوْض	طے شدہ، مقررہ، واجب اور لازم	

تفسیر

ترکہ کی تعریف

مرتے وقت میت کے ملک میں جو مال ہو، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، منقولہ ہو یا غیر منقولہ، وہ ترکہ، مال متروکہ (پیچھے چھوڑا ہوا مال) یا ورثہ یا موروث یا وراثت کہلاتا ہے۔ مورث: وہ شخص جو مال چھوڑ کر مرے۔ وارث: جسے ترکہ میں اسے از روئے شرع حصہ ملے۔

وصیت

کوئی شخص اپنے مرنے سے پہلے یہ کہے کہ میرے ترکے میں سے اتنا حصہ فلاں شخص یا اشخاص کو دینا یا فلاں کار خیر میں کرنا، اسے ''وصیت'' کہتے ہیں۔

مقدار وصیت

کوئی شخص اپنے مال متروکہ میں سے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی وصیت کر سکتا ہے، اگر ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کی، تب بھی وہ ایک تہائی تک ہی نافذ ہوگی، تہائی سے زائد مقدار کا نفاذ تب ہو سکتا ہے جب تمام بالغ وارث یا کوئی ایک بالغ وارث اپنے حصے سے رضا کارانہ طور پر اسے پورا کرنے کے لئے تیار ہو، ورنہ نہیں۔ البتہ تہائی تک بہر حال نافذ ہوگی۔

وصیت بحق وارث

اگر مرنے والے نے اپنے ورثاء میں سے کسی ایک کے حق میں وصیت کی ہے تو شرعاً وہ نافذ نہیں ہوگی، کیونکہ شریعت کے مقرر کئے ہوئے حصصِ وراثت کا تناسب و توازن بدل جائے گا، جس کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ اور رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے ''لَا وَصِیَّةَ لِوارث'' یعنی ''وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔''

ترکہ کی تقسیم کے شرعی اصول

کسی بھی میت کے ترکے کی تقسیم حسب ذیل اصول شرع کے مطابق ہوگی۔

(۱) مصارف تجہیز و تکفین

سب سے پہلے میت کے ترکے میں اسے اس کی تجہیز و تکفین کے مصارف وضع کئے جائیں گے۔

(۲) ادائے قرض

اس کے بعد اگر اس کے ذمہ کسی کا کچھ قرض ہے تو اس کی ادائیگی ترکے میں سے کی جائے گی۔ امام شافعی کے نزدیک اگر اس کے ذمہ واجبات شرع ہیں، جیسے زکوۃ وغیرہ، تو وہ بھی قرض کے طور پر وضع کئے جائیں گے، جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک ''دین شرع'' کا نفاذ وصیت پر موقوف ہے۔

(۳) نفاذِ وصیت

اس کے بعد اگر اس نے کچھ وصیت کی ہوگی، تو اسے شرعی حدود کے اندر نافذ کیا جائے گا۔

تقسیم وراثت

مندرجہ بالا تین امور کے نفاذ کے بعد ترکے میں سے جو کچھ بچ رہے گا، اسے وارثوں کے درمیان شرعی ضوابط کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

سبب نزول

زمانۂ جاہلیت میں دستور یہ تھا کہ میت کی وراثت کا حق دار صرف بڑا بیٹا یا وہ مرد وارث ہوتے تھے جو لڑائی میں حصہ لینے کے اہل ہوں یا کوئی بوجھ اور ذمہ داری نباہنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، یہ اس سماجی نظام کے تقاضے تھے جو خاندانی اور قبائلی بنیادوں پر قائم تھا۔ لہٰذا اس سماجی نظام میں عورتیں اور نابالغ بچے وراثت سے محروم رہ جاتے تھے۔ چنانچہ اس پس

منظر میں جب اوس بن ثابت کی بیوہ اور چھوٹے بچوں کو ان کے چچا زاد بھائیوں نے وراثت سے محروم کر دیا تو ان کی بیوہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں التجا کی اور اس موقع پر قرآن کے یہ احکام وراثت نازل ہوئے جن کے تحت عورتوں اور نابالغ بچوں کو مال وراثت میں حصہ دار قرار دیا گیا اور عہد جاہلیت کے اس ظالمانہ دستور کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔

مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ: قرآن نے صاف فیصلہ فرما دیا کہ ترکہ کم ہو یا زیادہ، مال منقولہ ہو یا غیر منقولہ، وراثت کا مال بہر حال سب وارثوں کو ملے گا۔

نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا: اور قرآن نے یہ بھی واضح طور پر بتا دیا کہ یہ حصے اللہ کے مقرر کئے ہوئے ہیں، لہٰذا کسی حاکم، حکومت یا مجلس قانون ساز کو اس میں رد و بدل کا کوئی اختیار نہیں، یہ قوانین لازمی، ابدی، غیر متبدل اور ناقابل تسخیر ہیں۔

وراثت میں قرابت کی ترجیح کا اصول

وَ الْاَقْرَبُوْنَ یہ اقرب کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ''نزدیک ترین''۔ اس کلمے کے ذریعے تقسیم وراثت کا ایک ضابطہ اور اصول بتایا گیا ہے کہ اگر ایک ہی درجے میں دو وارث ہیں ایک قریب ترین دوسرا اس کے مقابلے میں ایک درجہ کم تر ہو، تو قریب ترین وارث دور والے کو محروم کر دے گا، جیسے باپ کی موجودگی میں دادا وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝

''اور جب (ترکہ کی) تقسیم کے موقع پر (غیر وارث) رشتے دار اور یتیم اور محتاج آ جائیں تو انہیں (بھی) اس میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو۔ اور وہ لوگ (جو وراثت میں حصے دار ہیں یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ اپنی موت کے وقت اپنے پیچھے کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ گئے ہوتے تو انہیں (ان کے بارے

میں کیا کیا) خدشات ہوتے، تو انہیں چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں"۔

مشکل الفاظ کے معانی

وَاِذَاحَضَرَ	جب موجود ہوا، حاضر ہو	اَلْقِسْمَةَ	تقسیم، مراد تقسیم ترکہ
اُولُوا الْقُرْبٰی	قرابت دار،	وَلْيَخْشَ	اور چاہئے کہ ڈریں
ذُرِّيَّةً	اولاد	ضِعٰفًا	ضعیف کی جمع، کمزور
خَافُوْاعَلَيْهِمْ	وہ ان کی بابت ڈرتے، فکر مند ہوتے	قَوْلًاسَدِيْدًا	درست بات، سیدھی بات

تفسیر

غیر وارث قرابت داروں کی رعایت کا حکم

وَاِذَاحَضَرَ الْقِسْمَةَ......الخ: (۱) اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی میت کے ترکہ کی تقسیم کا موقع آتا ہے تو ان ورثاء کو تو ان کا حصہ مل جاتا ہے جن کو شریعت نے حق دار قرار دیا ہے۔ دراصل اسلام کے "نظامِ وراثت" کی ایک اعلیٰ تر حکمت یہ بھی ہے کہ دولت کا ارتکاز ختم ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔

(۲) بعض اوقات تقسیم وراثت کے موقع پر ایسے دور پار کے رشتے دار بھی آس لگا کر آجاتے ہیں کہ شاید انہیں بھی کچھ مل جائے حالانکہ وہ شرعاً وارث نہیں ہوتے، اسی طرح دوسرے یتیم، مسکین اور نادار لوگ بھی چلے آتے ہیں کہ شاید ان کی کچھ مدد ہو جائے۔

(۳) اس آیت میں قرآن نے وجوباً تو نہیں بلکہ ایک مندوب و مستحب امر کے طور پر تعلیم دی ہے کہ ایسے موقع پر ان لوگوں کی دلداری کے لئے ان کی کچھ نہ کچھ مدد کر دی جائے تو یہ ایک اعلیٰ اخلاقی قدر ہوگی۔ اس کی صورتیں دو ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ تقسیم میراث کا عمل شروع کرنے سے پہلے تمام ورثاء رضا کارانہ طور پر اور باہمی اتفاق رائے سے ان لوگوں

کے لئے کچھ مال الگ کر دیں، دوسری یہ کہ تقسیم کے بعد ہر ایک وارث اپنے اپنے حصے میں سے حسب توفیق کچھ نہ کچھ ان لوگوں کی مدد کرے۔ لیکن تبرع اور صدقہ کا یہ استحبابی حکم بالغ ورثاء کے لئے ہے، نابالغ وارث کے حصے میں کسی کو ایسے تصرف کا اختیار نہیں ہے۔

(۴) وارث تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ سوچیں کہ انہیں محض اللہ تعالیٰ کے قانون وراثت کے تحت بغیر محنت کے یہ مال مل رہا ہے تو شاید ان کے لئے یتیموں، مسکینوں اور دور کے وارثوں پر صدقہ کرنا آسان ہو جائے۔

(۵) اور اگر وارث خود زیادہ ضرورت مند ہیں اور دوسروں کے لئے ترکے میں سے کچھ نہیں نکال سکتے یا ان کی توقع سے کم دے رہے ہیں تو پھر کم از کم انہیں نرم انداز میں مطمئن کر دینا چاہئے۔

یتیموں پر ترس کھانے کی حکیمانہ ترغیب

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ...... : اس کے دو مفہوم نکل سکتے ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر تقسیم وراثت کے وقت حصہ پانے والے وارثوں کے پاس یتیم و نادار بچے امداد کے طلبگار بن کر آ جائیں، تو وارثوں کو سوچنا چاہئے کہ یہ بھی کسی کے بچے ہی ہیں، یہ بھی اپنے ماں باپ کو ایسے ہی پیارے لگتے ہوں گے جیسے انہیں اپنے بچے پیارے لگتے ہیں، خدانخواستہ اگر کل ان کے بعد ان کے بچے بھی اسی طرح بے سہارا ہو جائیں تو ان کا کیا حال ہوگا۔ یہ سوچ کر دل میں ضرور رحم اور ترس کا جذبہ پیدا ہو گا۔ دوسرا یہ کہ اگر بالغ وارثوں کے ساتھ کچھ نابالغ یتیم بچے بھی ہیں تو ان کے مال کی یہ سوچ کر ہر ممکن حفاظت و نگہداشت کرنی چاہئے کہ اگر میں آج بے سہارا یتیموں کا نگہبان بنوں گا تو کل جب میری اولاد پر خدانخواستہ ایسا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد و سرپرستی کے لئے بھی غیب سے اسباب پیدا فرما دے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰

"بلاشبہ جو لوگ ناجائز طریقوں سے یتیموں کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ عنقریب (بعدالموت) بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے"۔

مشکل الفاظ کے معنی

بطُون	بطن کی جمع یعنی پیٹ،	نَارٌ	آگ
سَیَصْلَوْنَ	عنقریب وہ داخل ہوں گے، یا ڈال دیئے جائیں گے	سَعِیْر	بھڑکتی ہوئی، شعلے مارتی ہوئی آگ

تفسیر

یتیم کا مال ظلماً کھانے کی اخروی سزا

اس آیۂ مبارکہ میں یتیموں کا مال ظلماً کھانے والے لوگوں کو اخروی سزا کی وعید سنائی گئی ہے کہ اس فعل کا بدانجام جہنم کی شدید ترین آگ ہے، لہٰذا دنیا کی وقتی لذت و آسائش کی خاطر دائمی عذاب مول لینا دانشمندی کی بات نہیں ہے۔

یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ ۗ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ۚ فَاِنْ کُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ ۚ وَاِنْ کَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَیْهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ اِنْ کَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ کَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصِیْ بِهَآ اَوْ دَیْنٍ ۭ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا ۭ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ﴿۱۱﴾ وَلَکُمْ نِصْفُ مَا تَرَکَ اَزْوَاجُکُمْ اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ کَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَکُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّةٍ

يُوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ (وراثت میں) لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے، پھر اگر (وارث) صرف لڑکیاں ہی ہوں، (دو یا) دو سے زیادہ تو ان کے لئے (مجموعی طور پر) ترکے کا دو تہائی حصہ ہے، اور اگر (وارث) ایک ہی لڑکی ہے تو اس کے لئے آدھا (ترکہ) ہے، اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے ترکے کا چھٹا حصہ ہے اگر وہ صاحب اولاد ہے، (لیکن) اگر اس کی اولاد نہیں ہے اور صرف اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہیں تو اس کی ماں کا ایک تہائی حصہ ہے (باقی سب باپ کا)، پھر اگر اس کے (بہن) بھائی ہیں تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے، (یہ تقسیم) اس وصیت (کے پورا کرنے) کے بعد جاری ہوگی جو اس نے کی ہے یا قرض کی ادائیگی کے بعد (اگر ہو)، تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ دادا اور بیٹوں (پوتوں) میں سے کون تمہارے لئے زیادہ نفع بخش ہے؟ (تقسیم وراثت کا یہ نظام) اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ہے، بلاشبہ اللہ علم والا حکمت والا ہے۔ اور تمہارے لئے تمہاری بیویوں کے ترکے

میں آدھا حصہ ہے اگر ان کی کوئی اولاد نہیں ہے اور اگر ان کی اولاد ہے تو ان کے ترکے میں تمہارا حصہ ایک چوتھائی ہے، اگر انہوں نے کوئی وصیت کر رکھی ہو تو اس کے پورا کرنے اور قرض کی ادائیگی کے بعد، اور ان (بیویوں) کیلئے تمہارے ترکے میں چوتھائی حصہ ہے اگر تمہاری کوئی اولاد نہیں، اگر تمہاری کوئی اولاد ہے تو تمہارے ترکے میں ان کا آٹھواں حصہ ہے، اگر تم نے کوئی وصیت کر رکھی ہے تو اس کے پورا کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد، اور اگر کوئی مرد یا عورت (اس حال میں وفات پائیں کہ) نہ وہ صاحب اولاد ہیں اور نہ ہی ان کے والدین (بقید حیات) ہیں اور اس کا صرف ایک (اخیافی یعنی صرف ماں شریک) بہن یا بھائی ہے تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں (برابر کے) شریک ہوں گے، (لیکن یہ تقسیم) وصیت کے نفاذ کے بعد ہے (اگر اس نے کی ہو اور اسی طرح) ادائیگی قرض کے بعد، (بشرطیکہ وصیت میں کسی وارث کو) نقصان نہ پہنچایا گیا ہو۔ (یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے) اللہ کی طرف سے حکم ہے اور اللہ خوب جاننے والا اور علم والا ہے۔ یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدود ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اللہ اسے ایسے باغات میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے گا، اللہ اسے آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کیلئے رسوا کن عذاب ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

يُوْصِيْكُمْ	تمہیں حکم دیتا ہے	اَوْلَادِ	ولد کی جمع اس کا اطلاق لڑکا لڑکی دونوں پر ہوتا ہے
اَلذَّكَر	لڑکا	اَلْاُنْثَى	لڑکی، عورت

فَوْقَ	اوپر، زیادہ	اثْنَتَیْنِ	دو
ثُلُثَا	دو تہائی، ثلث (تہائی) کی تثنیہ	ثُلُثُ	تہائی
مَاتَرَكَ	جو اس نے مرتے وقت چھوڑا، ترکہ	لِاَبَوَیْهِ	اس کے ماں باپ کے لئے
السُّدُسُ	چھٹا حصہ	وَّوَرِثَهٗٓ	اس کا وارث ہوا
اِخْوَةٌ	بھائی، اخ کی جمع	اُمٌّ	ماں
یُّوْصِیْ بِهَآ	جس کی وہ وصیت کرتا ہے یا کرے	دَیْنٍ	قرض
اٰبَآ	اَبٌ کی جمع باپ، یعنی باپ دادا	اَبْنَاءُ	ابن کی جمع، بیٹے
لَاتَدْرُوْنَ	تم نہیں جانتے	اَیُّهُمْ	ان میں سے کون؟
اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا	تمہارے لئے زیادہ نفع بخش ہے	الرُّبُعُ	چوتھائی
الثُّمُنُ	آٹھواں حصہ	کَلٰلَةً	جس کے نہ والدین ہوں نہ اولاد
شُرَکَاءُ	شریک کی جمع	مُضَآرٍّ	نقصان پہنچایا ہوا
جَنّٰتٌ	جنۃ کی جمع باغ	تَجْرِیْ	بہتی ہیں
اَنْهٰرٌ	نہر کی جمع دریا	خٰلِدِیْنَ فِیْهَا	اس میں ہمیشہ رہیں گے
الْفَوْزُ	کامیابی	الْعَظِیْمُ	بڑی
مَنْ یَّعْصِ	جو نافرمانی کرے گا	یَتَعَدَّ	تجاوز کرے گا

حُدُوْدَہٗ　حد کی جمع، کسی معاملے میں　نَارًا　آگ
رکاوٹ اور قانونی بندش　مُّھِیْنٌ　ذلت آمیز، رسوا کن

تفسیر

احکام وراثت

ان آیات میں اسلام کے احکام وراثت بیان کیے گئے ہیں۔ شریعت میں جن ورثاء کے حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں، انہیں ''ذوی الفرض'' کہتے ہیں، سب سے پہلے والدین اور اولاد کے حصے بیان کیے ہیں جو انہیں ایک دوسرے کے ترکے سے فریق ثانی کی وفات کی صورت میں مل سکتے ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

والدین کے ترکے میں اولاد کا حصہ

متوفی والدین کا ترکہ اولاد میں حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔

(۱) مصارف تجہیز و تکفین، نفاذ وصیت (اگر کی ہو)، ادائے قرض اور ذوی الفرض وارثوں کا حصہ وضع کرنے کے بعد ترکہ اولاد میں تقسیم ہوگا، کیونکہ وہ ''عصبہ'' کہلاتے ہیں۔ اگر صرف لڑکے ہی لڑکے ہیں (لڑکی ایک بھی نہیں) تو بقیہ ترکے میں سب برابر کے حصے دار ہوں گے۔ اگر صرف ایک لڑکا ہے تو سب اسے مل جائے گا۔

(۲) اگر لڑکے اور لڑکیاں ہیں، خواہ ایک بیوی سے یا متعدد بیویوں سے، تو ان میں بقیہ ترکہ دو اور ایک کے تناسب سے تقسیم ہوگا، یعنی ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دگنا ملے گا۔ البتہ ایسا لڑکا یا لڑکی جو ہے تو اس کی بیوی کے بطن سے، مگر کسی سابق شوہر کی اولاد ہے تو اس کا اس سوتیلے باپ کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

(۳) اگر وارث صرف ایک لڑکی ہے تو اسے بقیہ قابل تقسیم ترکے کا نصف ملے گا، باقی نصف دوسرے وارث لے جائیں گے۔

(۴) اگر وارث صرف لڑکیاں ہیں (یعنی لڑکا کوئی نہیں ہے) دو یا دو سے زائد، تو قابل تقسیم

ترکے کے دوتہائی حصے میں وہ سب برابر کی شریک ہوں گی۔

اولاد کے ترکے میں والدین کا حصہ

(۱) سوتیلی اولاد کے ترکے میں سوتیلے باپ کا کوئی حصہ نہیں ہے، یعنی ایسی اولاد جو اس کی بیوی کے بطن سے ہے مگر کسی اور شوہر سے۔

(۲) متوفی بیٹے کے ترکے میں صرف اس کی حقیقی ماں کو حصہ ملے گا، سوتیلی مائیں محروم رہیں گی۔

(۳) اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا اور اس کے والدین بقید حیات ہیں اور اس کی اولاد بھی ہے تو ترکے میں سے ماں اور باپ، ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

(۴) اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا، اس کے والدین تو حیات ہیں مگر نہ تو اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ ہی بھائی بہن، تو ایسی صورت میں ماں کو ترکے کا ایک تہائی حصہ ملے گا اور اگر کوئی اور وارث نہ ہوں تو بقیہ دوتہائی حصہ باپ کو مل جائے گا۔

(۵) اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کے والدین حیات ہیں اور اولاد کوئی نہیں ہے لیکن ایک سے زیادہ (اخیافی یعنی صرف ماں شریک) بہن بھائی ہیں، اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر کوئی وارث نہ ہو تو بقیہ پانچ حصے باپ کو مل جائیں گے۔ اس صورت کو ''حجب نقصان'' کہتے ہیں یعنی متوفی کے (اخیافی) بہن بھائیوں کو خود تو کچھ نہ ملا البتہ ماں کے حصے میں ان کے سبب کمی واقع ہو گئی۔

نوٹ

اس امر پر تقریباً تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ آیت میں اس مقام پر میت کے جن بہن بھائیوں کا ذکر ہے، اس سے اخیافی (یعنی صرف ماں کی طرف سے) بہن بھائی مراد ہیں۔ کیونکہ حقیقی وعلاتی (باپ کی طرف سے) بہن بھائیوں کی وراثت کے مسائل اس سورت کی آخری آیت میں بیان کئے گئے ہیں۔ البتہ اگر اخیافی بہن یا بھائی صرف ایک ہو تو وہ ماں کے ایک تہائی حصے میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔

وراثت میں حجب

نظام وراثت میں بعض صورتوں میں قریب کا وارث دور والے کے لئے حصہ ملنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے اسے اصطلاح علم المیراث میں ''حجب'' کہتے ہیں جیسے باپ کی موجودگی میں دادا محروم رہتا ہے۔

موانع ارث

بعض اسباب وارث کو وراثت کے حصے سے محروم کر دیتے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) یہ کہ قاتل وارث اپنے ''مورثِ مقتول'' کی وراثت سے محروم رہے گا جیسے خدانخواستہ باپ بیٹے کو قتل کر دے یا بیٹا باپ کو وغیرہ۔

(۲) وارث اگر مرتد ہو جائے تو اپنے مسلم مورث کے ترکے سے محروم رہے گا۔

(۳) مورث اگر دار السلام میں ہے اور وارث ''دار الحرب'' میں تو اسے وراثت نہیں ملے گی۔

(۴) مسلمان اور کافر کے درمیان باہمی وراثت کا سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''مسلمان کافر اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا''۔ البتہ ایسا شخص جو پیدائشی طور پر مسلمان تھا مگر بعد میں مرتد ہو گیا تو اس کے زمانہ اسلام کی کمائی سے اس کے وارثوں کو حصہ ملے گا اور زمانہ کفر وارتداد کی کمائی بیت المال میں جمع ہوگی، تاہم مرتدہ عورت کا سارا ترکہ مسلمان ورثاء کو ملے گا۔

''عاق'' کرنے کا مسئلہ

بعض لوگ یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ میں نے اپنے فلاں بیٹے کو اس کی نافرمانی کے سبب اپنی وراثت سے محروم کر دیا ہے کیونکہ ''عاق'' کے معنی ہیں ''نافرمان''، اس عمل یا اعلان کی کوئی شرعی اور قانونی حیثیت نہیں ہے۔ جو شرعاً وارث ہے، اسے حصہ ضرور ملے گا، کیونکہ ''نظام وراثت'' اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ہے، بندوں کو اس میں رد و بدل کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ماں باپ کی نافرمانی گناہ کبیرہ ہے اور نافرمان اولاد دنیا و

آخرت دونوں میں ناکام ونامراد رہے گی اور عذاب الٰہی کی سزاوار ہوگی۔

زوجین کی وراثت کا مسئلہ

اس کے بعد قرآن نے زوجین کی باہمی وراثت کے مسئلے کو بیان فرمایا ہے کہ مختلف صورتوں میں دونوں میں سے ایک کی وفات کی صورت میں اس کے ترکے میں دوسرے کا حصہ کتنا ہوگا۔ چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) وفات پانے والی بیوی کے ترکے سے صرف وہی شوہر وراثت کا حقدار ہوگا جس کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کا انتقال ہوا ہے۔ اگر بفرض تقدیر وہ پہلے بھی کسی شوہر کے نکاح میں رہی ہو مگر اس نے طلاق دے دی تھی، تو اسے ترکہ نہیں ملے گا۔

(۲) وفات پانے والے شوہر کے ترکے سے وہ تمام بیویاں (اگر بالفرض ایک سے زائد ہوں) وراثت کی حقدار ہوں گی جو اس کی وفات کے وقت اس کے نکاح میں تھیں۔

(۳) اگر وفات پانے والی بیوی کی کوئی اولاد نہیں ہے تو اس کے شوہر کو اس کے ترکے سے نصف حصہ ملے گا۔

(۴) اور اگر وفات پانے والی بیوی کی کوئی اولاد ہے خواہ اس شوہر سے ہو یا کسی پہلے شوہر سے، تو شوہر کو ترکے کا ایک چوتھائی حصہ ملے گا۔

(۵) اگر متوفی شوہر کی کوئی اولاد نہیں ہے تو اس کی بیوی کو ترکے میں سے ایک چوتھائی ملے گا اور بالفرض بیویاں ایک سے زائد ہیں تو وہ ایک چوتھائی میں برابر کی شریک ہوں گی۔

(۶) اگر متوفی شوہر صاحب اولاد ہے، خواہ اولاد اسی بیوی سے ہو یا کسی سابقہ بیوی سے، تو بیوی کو اس کے ترکے میں سے آٹھواں حصہ ملے گا اور بالفرض بیویاں ایک سے زائد ہیں تو سب اس آٹھویں حصے میں برابر کی شریک ہوں گی۔

معتدہ (دوران عدت) عورت کی وراثت کا مسئلہ

(۱) کسی عورت کو اس کے شوہر نے طلاق رجعی دی اور عدت گزرنے سے پہلے شوہر کا انتقال ہو گیا تو چونکہ حکماً نکاح قائم ہے اس لئے ''معتدہ رجعیہ'' عدت کے اندر اندر وراثت کی

حقدار ہوگی اور اگر شوہر کا انتقال عدت ختم ہونے کے بعد ہوا اور اس نے عدت کے دوران رجوع بھی نہیں کیا، تو اسے وراثت نہیں ملے گی۔

(۲) اگر کسی شخص نے اپنی ''مرض وفات'' میں بیوی کو ''طلاق بائن یا مغلظہ'' دی اور عدت ختم ہونے سے پہلے شوہر کا انتقال ہو گیا تو وہ معتدہ شوہر کی وراثت پائے گی کیونکہ ''مرض وفات'' کی طلاق کو شوہر کی بدنیتی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

(۳) اگر عام حالات میں کسی شخص نے اپنی بیوی کو ''طلاق بائن'' یا ''مغلظہ'' دی اور قضاء الٰہی سے کسی اچانک بیماری یا حادثے کے نتیجے میں بیوی کی عدت کے دوران ہی اس کا انتقال ہو گیا تو وہ وارث نہیں بنے گی۔

(نوٹ: طلاق مغلظہ سے تین طلاقیں مراد ہیں، جن کے بعد حلالۂ شرعی کے بغیر رجوع کی گنجائش نہیں رہتی۔)

اس کے بعد قرآن نے ''وراثت کلالہ'' کے احکام بیان فرمائے ہیں۔ کلالہ کی تعریف اور احکام حسب ذیل ہیں:

کلالہ کی تعریف

یہ لفظ "کَلَّ یَکِلُّ کَلاًّ" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ''تلوار کا کند ہونا'' "اَلْکَلُّ" کے کئی معانی ہیں: کمزور، یتیم، بھاری، محتاج وغیرہ۔

جس شخص کے ماں باپ بھی موجود نہ ہوں اور اس کی کوئی اولاد بھی نہ ہو تو اسے ''کلالہ'' کہتے ہیں۔ اس میں تین اقوال ہیں: اول یہ کہ ایسا مورث ''کلالہ'' کہلاتا ہے، دوم یہ کہ ایسے شخص کے ورثاء کو ''کلالہ'' کہتے ہیں۔ سوم یہ کہ ایسے شخص کے ترکے کو ''کلالہ'' کہتے ہیں۔

بھائی بہن کی اقسام

(۱) حقیقی یا عینی: ایسے بھائی یا بہنیں جو ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوں، آپس میں ''حقیقی'' یا ''عینی'' کہلاتے ہیں۔

(۲) علاتی: ایسے بھائی بہن جن کا باپ ایک ہو مگر مائیں الگ الگ ہوں (یعنی سوتیلے)

آپس میں ''علاتی'' کہلاتے ہیں، یعنی باپ شریک بہن بھائی۔

(۳) اخیافی: ایسے بھائی بہن جن کی ماں ایک ہو مگر باپ الگ الگ ہوں آپس میں ''اخیافی'' کہلاتے ہیں، یعنی ماں شریک بہن بھائی۔

نوٹ: وصیت کی تعریف اور ضروری احکام اور تقسیم وراثت سے پہلے ترکے میں سے جو ضروری مصارف وضع کرنے لازمی ہیں، ان کو بھی بیان کیا جا چکا ہے۔

کلالہ کی وراثت

(۱) اگر کوئی مرد یا عورت اس حال میں وفات پائے کہ وہ ''کلالہ'' ہے اور اس کے ورثاء میں صرف ایک بھائی یا ایک بہن ہے (یعنی صرف ماں شریک بہن یا بھائی) تو ان میں سے ہر ایک کو (خواہ بھائی ہو یا بہن) ترکہ میں سے چھٹا حصہ ملے گا۔

(۲) اور اگر کلالہ کے وارث بہن یا بھائی (یعنی صرف ماں کی طرف سے) ایک سے زائد ہیں، تو ترکے کے ایک تہائی حصے میں وہ برابر کے شریک ہوں گے، مفسرین کا اس امر پر تقریباً اجماع ہے کہ یہاں اخیافی (صرف ماں شریک) بہن یا بھائی مراد ہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں اگر بھائی بہن حقیقی یا علاتی (صرف باپ شریکے) ہوں تو ان کا حکم الگ ہے جو آیت نمبر ۱۷۶ میں بیان کیا گیا ہے۔

حدود الٰہی کی رعایت کا حکم

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ...... : آیات تیرہ اور چودہ میں اللہ تعالیٰ نے بالواسطہ طور پر احکامِ میراث کو ''حدود الٰہی'' سے تعبیر کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدیں ہیں اور کسی انسان، حاکم یا سب لوگوں کو مل کر بھی اس نظام میں تبدیلی کا اختیار نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص اس کی پیروی کرے گا وہ دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے سرفراز ہوگا اور جو شخص ان حدود کو پامال کرے گا، وہ آخرت میں ذلت آمیز عذاب سے دوچار ہوگا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفات ''علیم''، ''حکیم'' اور ''حلیم'' کا ذکر ہے، یعنی وہ علیم ہے اس لئے ہر ایک کی ضرورت، اہلیت اور ذمہ داریوں کو بہتر جانتا ہے، وہ حکیم ہے لہٰذا اس

نے ہر ایک کے حصے اس کی اہلیت، معاشی ذمہ داریوں اور ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر مقرر کئے
ہیں، وہ حلیم (بردبار) ہے، لہٰذا قانون شکنی پر اگر کسی کو فوراً سزا نہیں دیتا تو کوئی یہ نہ سمجھے کہ
آخرت کے مواخذے اور عذاب سے بھی وہ بچا رہے گا۔

چنانچہ اگر بیوی کے مقابلے میں شوہر کا حصہ زیادہ ہے یا لڑکی کے مقابلے میں لڑکے کا
حصہ زیادہ ہے تو اس سے زیادہ تفاوت ان کی معاشی ذمہ داریوں میں بھی ہے۔

وَ الّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾ وَ الَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَ اَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۶﴾

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں تو (تہمت لگانے والے سے) ان
پر اپنے چار مردوں کی گواہی طلب کرو پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو ان (عورتوں)
کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی
(اور) راہ نکالے۔ اور تم میں سے جو دو آدمی برائی کا ارتکاب کریں، تو انہیں اذیت
پہنچاؤ، پھر اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے درگزر کرو،
بلاشبہ اللہ توبہ قبول کرنے والا بہت مہربان ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

الّٰتِیۡ	الّتی کی جمع ہے وہ عورتیں	الۡفَاحِشَۃَ	قبیح بات، معیوب کام اور اس کی انتہاء ''زنا'' ہے
اِسۡتَشۡہِدُوۡا	گواہی طلب کرو	عَلَیۡہِنَّ	ان کے اوپر
اَرۡبَعَۃً	چار	فَاِنۡ شَہِدُوۡا	اگر وہ گواہی دے دیں
فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ	انہیں روکے رکھو، مقید کردو،	بُیُوۡت	بیت کی جمع گھر

حَتّٰی	یہاں تک کہ	یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ	موت ان کی مہلت کو پورا کردے
فَاٰذُوْھُمَا	انہیں ایذاء پہنچاؤ	فَاِنْ تَابَا	اگر وہ دونوں توبہ کریں
اَصْلَحَا	وہ دونوں اپنی اصلاح کرلیں	فَاَعْرِضُوْا عَنْھُمَا	ان سے درگزر کرو
تَوَّاب	توبہ قبول کرنے والا	یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ	بے حیائی کا ارتکاب کریں

تفسیر

فاحشہ کا معنی ومفہوم

''فاحشہ'' ہر قبیح، معیوب اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت کو کہتے ہیں، اس کا انتہائی درجہ ''زنا'' ہے اور آیت میں یہی مراد ہے۔ اسلام میں زنا ایک قبیح ترین فعل ہے اور اسی لئے اس کی سزا بھی بہت سخت مقرر کی گئی ہے۔ اور چونکہ یہ ایسا قبیح فعل ہے جس سے باہمی اعتماد ومحبت کا مقدس رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، افراد اور خاندانوں کے درمیان نفرتیں اور عداوتیں جنم لیتی ہیں۔ اس لئے اسلام میں اس کے ثبوت اور شہادت کا معیار تمام جرائم حتی کہ قتل وقصاص سے بھی زیادہ کڑا اور انتہائی احتیاط پر مبنی ہے۔ باقی تمام معاملات کے ثبوت کے لئے دو افراد کی شہادت کافی ہے لیکن ثبوت زنا کے لئے چار عاقل وبالغ مردوں کی شہادت قطعی اور لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مرد یا عورت پر زنا کی تہمت لگاتا ہے تو شریعت میں بارِ ثبوت مدعی پر ہے اور اگر وہ عدالت میں مطلوبہ شہادت پیش کرنے اور اپنے الزام کو ثابت کرنے میں ناکام رہا تو اس پر ''حد قذف'' نافذ کی جائے گی جو اسی (۸۰) کوڑے ہے اور جس کا بیان سورہ ''النور'' میں ہے۔ ثبوتِ ''جرم زنا'' کی یہ سخت ترین شرائط اس لئے عائد کی گئی ہیں تاکہ آسانی سے کوئی شخص کسی کی عزت وآبرو سے کھیلنے کی جسارت نہ کرسکے۔

حدزنا

جس طرح اسلام کے باقی احکام تدریجاً نازل ہوئے، یہی تدریجی حکمت ''حدزنا'' کے بارے میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوا: ''کہ ایسی بدکار عورتوں کو گھروں میں روکے رکھو، یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ تعالیٰ (آئندہ) ان کے لئے کوئی سبیل پیدا فرمائے۔'' اس کے بارے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں:

ایک یہ کہ ابتداءِ اسلام میں زانیہ کی یہی سزا تھی۔ پھر سورہ النور میں تفصیلی احکام نازل ہوئے، یعنی زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا سو کوڑے مقرر کی گئی، چنانچہ ''حدزنا'' کے نزول کے بعد یہ آیت حکماً منسوخ ہوگئی اگرچہ تلاوتاً باقی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عبوری سزا اسلام نے مقرر کی تھی اور اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا یعنی یا اللہ ان کے لئے کوئی سبیل پیدا فرمائے، یہ حکم مجمل تھا اور شارع کی طرف سے بیان کا انتظار تھا، چنانچہ کچھ بیان تو سورہ ''النور'' میں آگیا اور بیان شافی وکافی خود شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرما دیا اور فرمایا: ''مجھ سے لے لو، مجھ سے لے لو، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سبیل نکالی ہے (مسلم)'' اور پھر احادیث کی روشنی میں اس کی جو تفصیل آئی وہ یہ ہے:

(الف) غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا سو کوڑے ہے، احادیث میں ایک سال کی جلاوطنی کا بھی ذکر ہے لیکن وہ حد کے طور پر نہیں بلکہ سیاستاً ہے اور حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے۔

(ب) شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا رجم (سنگسار کرنا) ہے۔

اگلی آیت میں زانی مردوں کے لئے یہ بھی فرمایا کہ انہیں ایذا دو، لیکن اسے بھی مجمل رکھا اور اس کی مقدار اور کیفیت کو حاکم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جو زبانی لعن طعن کی حد تک بھی ہوسکتی ہے اور تادیبا تعزیر و سزا کی صورت میں بھی۔ لیکن یہ بتا دیا کہ جب وہ توبہ کرلیں اور اپنے مجرمانہ کردار کی اصلاح کرلیں تو ان کا پیچھا چھوڑ دو۔

آیت نمبر ۱۵ میں ''اَلّٰتِیْ'' کا کلمہ لا کر صرف بدکار عورتوں کا ذکر کیا گیا، اور آیت نمبر ۱۶ میں ''اَلَّذَانِ'' فرما کر بدکار مردوں کا ذکر کیا گیا، اس بناء پر بعض مفسرین نے یہ رائے قائم کی

ہے کہ ''ہم جنس پرست'' عورتوں اور مردوں کی بدکاری کی سزا بیان کی گئی ہے اور ''زنا'' کی حد کا بیان سورۃ ''النور'' اور احادیث مشہورہ میں ہے، جو کثرت طرق کی بنا پر ''حد تواتر'' کو پہنچی ہوئی ہیں۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

''وہ توبہ جس (کی قبولیت) کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے، صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی سے گناہ کر بیٹھیں، پھر جلدی سے توبہ کرلیں تو وہ ایسے لوگ ہیں جن پر اللہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرماتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔ اور (یہ قبولیت) توبہ ان لوگوں کے لئے نہیں جو (مسلسل) گناہ کرتے رہیں، یہاں تک جب ان میں کسی کے سر پر موت آ کھڑی ہو تو کہنے لگے اب میری توبہ، اور نہ (یہ قبولیت) ان لوگوں کے لئے ہے جو کفر پر ہی مر جاتے ہیں، یہی ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

السُّوْءَ	برائی، گناہ،	السَّیِّاٰتِ	سیئۃ کی جمع، گناہ، برائی
إِذَا حَضَرَ	جب آجائے، حاضر ہو	تُبْتُ	میں نے توبہ کی
الْئٰنَ	اب	اَعْتَدْنَا	ہم نے تیار کیا ہے
اَلِیْمًا	دردناک		

تفسیر

توبہ کا معنی و مفہوم

اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ...... ''توبہ'' کے معنی ہیں ''رجوع کرنا'' جب یہ بندے کی صفت واقع ہوتو اس کا مطلب ہوگا'' بندے کا طلب معافی کے لئے اللہ سے رجوع کرنا'' اور جب اللہ کی صفت واقع ہوتو معنی ہوگا:'' اللہ کی رحمت اور شان عفو کا بندے کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی خطاء معاف کرنا۔''

توبہ کا شرعی طریقہ

انسان خطا کا پتلا ہے، غلطی کرنا انسان کی فطری اور جبلی کمزوری ہے۔ لہٰذا غلطی کا ارتکاب انسانیت کے منافی نہیں ہے، البتہ غلطی پر قائم رہنا، ڈٹے رہنا، اپنی غلطی کا جواز تلاش کرنا، یہ شیطانی خصلت ہے اور انسانیت و آدمیت کے منافی ہے۔ لہٰذا اگر بہ تقاضائے بشری انسان سے خطا سرزد ہو جائے تو انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے رجوع کرے اور اپنے رب سے اس کی معافی مانگے۔ اسی جذبے اور ارادے کا نام توبہ ہے۔ حقیقی توبہ، جسے قرآن نے ''عَلَى اللّٰهِ'' کہا ہے، کی چند شرائط ہیں:

۱۔ یہ کہ بندہ صدق دل سے اپنی غلطی کا اقرار و اعتراف کرے۔

۲۔ اس غلطی پر نادم و شرمسار ہو اور اپنے رب سے اس کی معافی مانگے اور آئندہ اس سے اجتناب کا اپنے رب سے عہد کرے۔

۳۔ اس غلطی اور گناہ کے تلافی کی شریعت نے جو صورتیں تعلیم فرمائی ہیں یا احکام بیان کیے ہیں، ان کی تعمیل کرے مثلاً:

(الف) نماز، روزہ وغیرہ رہ گئے ہیں تو ان کی قضا کرے۔

(ب) زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اب ادا کرے۔

(ج) کسی انسان کی حق تلفی کی ہے تو اس کا ازالہ کرے، اس کا ناجائز حاصل کیا ہوا مال اسے

واپس کرے، اس کے نقصان کا ازالہ کرے، اس سے غلطی کی معافی مانگے وغیرہ۔

''علیٰ'' کا مفہوم

''علیٰ'' وجوب ولزوم کے لئے آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ پر کسی کا حق نہیں ہے، نہ ہی اس پر کسی کا کچھ واجب ہے، اس لئے جب قرآن وحدیث میں ''علی اللہ'' آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ'' اللہ تعالیٰ نے ازراہ لطف وکرم اس کا وعدہ فرمایا ہے یا یہ جزا اپنے ذمۂ کرم پر لی ہے۔

نادانی میں گناہ کے ارتکاب کا مفہوم

یَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ...... : ''جب وہ نادانی میں گناہ کا ارتکاب کرلیں'' گناہ کے حوالے سے نادانی وجہالت کے کئی معانی ہوسکتے ہیں:

(۱) بھول کر غلطی کربیٹھیں۔ (۲) جان بوجھ کر وہ کام کریں لیکن اس کے جرم وگناہ ہونے کا احساس نہ ہو (۳) قصداً وہ کام کریں، اس کے جرم ہونے کا احساس بھی ہو لیکن آخرت میں جو اس پر شدید عذاب ہوگا، اس کی جانب ذہن متوجہ نہ ہو۔

موقع ومحل کے مطابق ان سب صورتوں پر'' جہالت ونادانی'' کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ: یعنی'' پھر جلد ہی توبہ کرلیں'' گویا جلدی توبہ کرنا'' قبولیت توبہ'' کی شرط ہے۔ لہٰذا مفسرین کرام نے اس کا مفہوم اس طرح واضح کیا ہے:

۱۔ اس سے قبل کہ گناہ اس کی نیکیوں پر محیط ہوجائے اور نیکیوں کی بربادی کا سبب بن جائے، اس سے توبہ کرلیں۔

۲۔ اس سے قبل کہ اس کے دل پر گناہ کی محبت غالب آجائے اور وہ اس کے دل کو اس قدر زنگ آلود کردے کہ نور ہدایت کے راستے مسدود ہوجائیں، اسے چاہیے کہ فوراً توبہ کرلے۔

۳۔ تاہم توبہ کی گنجائش'' سکرات موت'' اور'' غرغرہ'' کی حالت طاری ہونے تک باقی رہتی ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔

۴۔ ''سکراتِ موت'' سے پہلے دو مرحلے آتے ہیں ایک کو ''باس'' سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی جب انسان یہ یقین کرلے کہ علاج کی ساری تدبیریں ناکام ہوچکی ہیں اور اب بقائے حیات کے سارے امکانات معدوم ہوگئے ہیں۔ ایسے عالم میں گناہوں کی توبہ کی قبولیت کا تو امکان ہے لیکن اس وقت کا ایمان مقبول نہیں ہے۔

۵۔ ''سکراتِ موت'' کا وہ مرحلہ جب بندے کو ''عالم غیب'' کے حقائق، مثلاً فرشتے وغیرہ نظر آنے لگتے ہیں، اس میں نہ ایمان مقبول ہے اور نہ توبہ، کیونکہ اب ''ایمان بالغیب'' نہیں بلکہ حقائق غیبی نظر آنے لگے ہیں۔ اس کیفیت کو ''یاس'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لٰہذا فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ سے، ''کہ اللہ ان کی توبہ قبول فرماتا ہے''، پہلے چار مراحل مراد ہیں۔ البتہ مرتبۂ قبولیت میں سب درجات برابر نہیں ہیں۔

جن کی توبہ قبول نہیں

وَلَیْسَتِ التَّوْبَۃُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کا ارتکاب ہوتے ہی، ضمیر واحساس کی بیداری کے لئے اولین مرحلے پر توبہ کرنا ہی حقیقی توبہ اور توبہ کا ''مرتبۂ کمال'' ہے۔ جو لوگ گناہ پر اصرار کریں، مسلسل گناہ کرتے چلے جائیں اور کسی مرحلے پر انہیں ''احساسِ جرم''، ''تلافیِ جرم'' (یعنی توبہ پر) برانگیختہ نہ کرے تو وہ گناہوں کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں اور ان کے گناہوں کے ''سیلاب بلاخیز'' سے بچ نکلنے کی امید کم ہی ہوتی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ...... : یہاں تک کہ جب موت سر پر آ کھڑی ہو، امید حیات کی آخری کرن بھی ڈوب چکی ہو اور پھر کہے کہ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ میں اب ایمان لایا''۔ ایمان اس کے لئے کسی فائدے کا سبب نہیں بنے گا۔

وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَھُمْ کُفَّارٌ...... یعنی جن کی موت کفر پر واقع ہوئی ہو، ان کے لئے توبہ کی قبولیت یا معافی کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ بعض آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار آخرت میں التجا کریں گے کہ ہم ایمان لے آتے ہیں ہمیں واپس

دنیا میں جانے اور توبہ و عمل صالح کا ایک موقع دے دیا جائے، لیکن ان کی یہ تمنا بے سود ہوگی

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

"اے ایمان والو! تمہارے لئے حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور انہیں اس غرض سے نہ روکو کہ (مہر) تم نے ان کو دیا تھا اس کا کچھ حصہ تم ان سے لے لو، سوائے اس کے کہ وہ کھلی بے حیائی کریں، اور تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، پھر اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ تم کسی چیز کو پسند نہ کرو اور اللہ اس میں (تمہارے لئے) بہت بھلائی رکھ دے۔ اور اگر تم ایک بیوی کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو حالانکہ اسے تم ڈھیر سارا مال دے چکے ہو، تو اس مال میں سے کچھ واپس نہ لو، کیا تم اس مال کو بہتان لگا کر اور کھلے گناہ کا ارتکاب کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم کس طرح اس مال کو واپس لو گے جب کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ (خلوت میں) مل چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں"۔

مشکل الفاظ کے معانی

لَا يَحِلُّ	حلال نہیں ہے	اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ	کہ تم عورتوں کے وارث بن جاؤ

لفظ	معنی	لفظ	معنی
كَرْهًا	جبراً، مجبور کر کے	وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ	یہ کہ تم انہیں نکاح سے روکو
عَضَل	کے معنی ہیں عورت کو اپنی پسند کے شخص کے ساتھ نکاح سے روکنا	اٰتَيْتُمُوْهُنَّ	تم نے انہیں دیا ہے
اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ	یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں	عَاشِرُوْهُنَّ	ان سے برتاؤ کرو
مَعْرُوْفًا	اچھا، پسندیدہ	اِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ	اگر تم انہیں نا پسند کرتے ہو
فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا	قریب ہے کہ تم ناپسند کرو	اِنْ اَرَدْتُّمُ	اگر تم چاہتے ہو
اِسْتِبْدَالَ	بدلنے کی خواہش کرنا، تبدیلی چاہنا	قِنْطَارًا	ڈھیر سارا مال، بہت مال
بُهْتَانًا	جھوٹا الزام	وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا	کھلا گناہ

تفسیر

زبردستی عورتوں کا وارث بننے کی ممانعت

لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا...... ''تمہارے لئے جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔'' بغوی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے اس آیت مبارکہ کا پس منظر اور سبب نزول بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس ماحول اور معاشرت میں قرآن نازل ہوا، اس میں عورت بالعموم انسانی تکریم سے محروم تھی، اس کو محض ایک شے یا مال سمجھا جاتا تھا اور جب عہد جاہلیت میں کوئی عورت بیوہ ہو جاتی تو اس کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا، اس کی چند صورتیں حسب ذیل تھیں:

(۱) اس عورت کا سوتیلا بیٹا یا کوئی اور قریب ترین مرد وارث آ کر اس پر کپڑا ڈال دیتا اور اس طرح وہ اس پر قابض و مختار بن جاتا۔ یا تو خود مہر ادا کئے بغیر اس سے نکاح کر لیتا اور یا کسی اور سے اس کا نکاح کرا کے مہر خود لے لیتا۔

(۲) یا اگر بالفرض اس مظلوم کو وراثت میں مال مل جاتا، یا پہلے سے اس کی ملک میں ہوتا تو اس کا یہ وارث یعنی قریب ترین والی اسے نکاح کرنے سے روکے رکھتا، یہاں تک کہ وہ مجبور ہو کر اپنی جان چھڑانے کے لئے اپنے زیر ملکیت مال اس کے حوالے کر دیتی۔

(۳) کبھی ایسا ہوتا کہ اگر کسی شخص کو اپنی بیوی ناپسند ہوتی تو وہ اسے اتنا تنگ کرتا کہ وہ اپنی گلو خلاصی کے لئے اپنے شوہر سے لیا ہوا مہر اسے واپس کرنے پر آمادہ ہو جاتی، یعنی اسے خلع لینے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

چنانچہ اس آیت مبارکہ میں ان ظالمانہ رسموں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ عورت بھی تمہاری طرح آزاد و خود مختار انسان ہے جو انسانی تکریم اور انسانی حقوق کی حق دار ہے، لہٰذا جبراً مالِ وراثت سمجھ کر اس پر مسلط ہونا اور اس کا استحصال چھوڑ دو۔ اور نہ ہی اسے عدت وفات گزرنے کے بعد نکاح سے محض اس لئے روکو کہ وہ اپنا سارا مال مجبور ہو کر تمہارے حوالے کر دے۔ اور نہ ہی مہر میں دی ہوئی رقم واپس ہتھیانے کے لئے اس پر مظالم ڈھاؤ۔

فاحش بین کے معنی

اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ: سوائے اس صورت کے وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔" یہاں پر "کھلی بے حیائی" سے صحابہ کرام، مفسرین و محدثین کرام نے دو معانی مراد لئے ہیں ایک یہ کہ عورت "ناشزہ" ہو یعنی اپنے شوہر کی نافرمان ہو، اس کے حقوق سے روگردانی کرے۔ دوسرا یہ کہ وہ بدکار ہو، ان دو استثنائی صورتوں میں قرآن نے شوہر کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اسے اس وقت تک قید نکاح سے آزاد نہ کرے جب تک اس کا مہر یا دیا ہوا مال واپس کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ لیکن اس دوران بھی شوہر پر لازم ہے کہ اس کے ساتھ عدل و احسان کا برتاؤ کرے اور اس کے جملہ حقوق ادا کرے، چنانچہ فرمایا: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

اور ایسی (ناگوار صورت حال میں بھی) ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔

ناگواری کے باوجود نباہ کرنے کا حکم

فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ...... ان کلمات مبارکہ میں قرآن مجید نے شوہروں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اگر بالفرض تمہاری بیوی تمہیں بدصورتی یا بداخلاقی کی وجہ سے ناپسند ہے، تب بھی اگر اپنی طبیعت پر جبر کر کے اسے گوارا کر سکتے ہو تو اسے طلاق نہ دو، ہوسکتا ہے شکل وصورت کی کمی کو اللہ تعالیٰ اس کے حسن اخلاق سے پورا فرمادے اور اس کی اچھی سیرت و کردار کی بدولت تمہارا گھر امن وسکون کا گہوارہ بن جائے یا اگر وہ بداخلاق ہے اور تم اس کی اخلاقی کمزوری برداشت کرلو تو اللہ تعالیٰ اس کے انعام کے طور پر تمہیں خوبصورت اور اعلیٰ ذہنی و جسمانی استعداد کی حامل اولاد سے نواز دے۔ چنانچہ فرمایا: فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا۔

''کیا عجب، کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں تمہارے لئے بہت بڑی بھلائی مقدر فرمادے''۔

عورت کو جان چھڑانے پر مجبور نہ کرو

وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ کبھی ایسا ہوتا کہ عورت کا تو کوئی قصور نہیں ہوتا لیکن شوہر اپنے طبعی میلان یا بعض دیگر وجوہ کی بناء پر یہ خواہش اپنے دل میں رکھتا کہ کسی طرح موجودہ بیوی سے علیحدگی ہو جائے اور دوسری من پسند عورت سے نکاح کرلے۔ چنانچہ اول تو ویسے ہی بیوی کو تنگ کرتا اور اس سے کام نہ چلتا تو ناروا الزام تراشیوں پر اتر آتا، طرح طرح کی تہمتیں لگاتا، تاکہ بیوی تنگ ہوکر کہہ دے کہ میری جان چھوڑ دو تم نے جو مہر یا تحائف مجھے دیئے ہیں وہ سب واپس لے لو اور مجھے طلاق دے دو، یعنی اسے خلع پر مجبور کر دیتا، قرآن نے اس سے صراحت کے ساتھ منع کرتے ہوئے فرمایا:

(ترجمہ): ''اور اگر تم اپنی منکوحہ بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہتے ہو اور تم نے اسے ڈھیر سارا مال بھی دے رکھا ہے، تو (طلاق کی صورت میں) اس سے کوئی چیز

واپس نہ لو، بھلا کیا تم بہتان لگا کر کھلا گناہ کر کے (حیلے بہانوں سے) یہ مال واپس لو گے؟"۔

مقدار مہر پر شرعاً تحدید نہیں ہے

گزشتہ صفحات میں ہم "مہر" کا مفہوم اور حکمت بیان کرتے ہوئے یہ واضح کر چکے ہیں کہ شریعت نے اگرچہ بہت زیادہ مہر مقرر کرنے کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مہر کی انتہائی مقدار پر کوئی قانونی روک ٹوک اور پابندی بھی عائد نہیں کی، بلکہ اسے فریقین کے معاشی حالات اور صوابدید پر چھوڑ دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ایک عورت کا مکالمہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ نیز ازواجِ مطہرات رضوان اللہ علیہن اجمعین کے مہر بھی اگرچہ ان کی شان اور حضور اکرم ﷺ کے مقامِ عالی کی نسبت سے نہایت کمتر تھے لیکن اس دور کے اعتبار سے فی نفسہ بالکل برائے نام بھی نہ تھے۔ چنانچہ تفسیر مظہری میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ازواجِ مطہرات کا مہر ساڑھے بارہ تولہ سونا تھا (بحوالہ صحیح مسلم) یہ رقم پانچ سو درہم کے مساوی تھی، لیکن ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر نجاشی شاہ حبشہ نے چار ہزار درہم ادا کیا تھا، خلاصۃ السیر میں ہے کہ ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا مہر ساڑھے بارہ تولہ سونا تھا۔

مہر کی کم از کم مقدار

مہر کی کم از کم مقدار کے بارے میں ائمہ اربعہ کی آراء درج ذیل ہیں:

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مہر کی کم از کم مقدار دس درہم چاندی (جو ۲ء۶۲۵ تولہ یا ۳۰ء۶۱۸ گرام کے برابر ہے) یا ایک دینار سونا ہے، وہ امام بیہقی کی روایت کردہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "دس درہم سے کم مہر نہیں ہے۔" نیز وہ نصاب سرقہ سے بھی استدلال کرتے ہیں جو دس درہم چاندی یا ایک دینار سونا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کم از کم مہر کی مقدار چوتھائی دینار سونا یا تین درہم چاندی ہے جو ۹ء۱۵۸ گرام یا ۰ء۷۸۵ تولہ کے برابر ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک مہر کی کم از کم مقدار متعین نہیں ہے، کچھ بھی مقرر کیا جا سکتا ہے (الفقۃ الاسلامی وادلتۃ مصنفہ دکتور وھبہ زحیلی، جلد نمبر ۷، ص ۲۵۶، ۲۵۷)۔ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک اور شرعی مسئلے کی وضاحت فرمادی، وہ یہ کہ کسی شخص کا کسی عورت سے نکاح ہو جائے لیکن کسی سبب سے وہ رخصتی سے پہلے اسے طلاق دے دے تو صرف آدھا مہر اسے دینا پڑتا ہے۔ لیکن اگر رخصتی عمل میں آ جائے اور زوجین کے درمیان "خلوت صحیحہ" (Privacy) ہو جائے، یعنی تنہائی میں ایسی قربت کہ مباشرت میں کوئی طبعی یا شرعی رکاوٹ نہ ہو، تو طلاق کی صورت میں شوہر پر پورا مہر ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے، چنانچہ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا:

(ترجمہ): اور تم آخر کیسے اس مہر کو واپس لو گے حالانکہ تم ایک دوسرے کے ساتھ خلوت (صحیحہ) کر چکے ہو۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

"اور ان عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ دادا نے نکاح کیا ہو، مگر جو گزر چکا، بلاشبہ یہ بڑی بے حیائی کا کام اور غضب الٰہی کا سبب اور بہت ہی برا دستور ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

قَدْ سَلَفَ گزر چکا مَقْتٌ ناراضگی، غضب سَآءَ برا

تفسیر

یہاں سے محرمات نکاح کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔ محرمات سے مراد، وہ عورتیں ہیں جن کے ساتھ کسی شخص کا نکاح کرنا حرام ہے۔ ان کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

(۱) محرمات مؤبدہ (PROHIBTION OF MARRIAGE FOR EVER):

یعنی وہ عورتیں جن کے ساتھ کسی شخص کا نکاح ابدی اور دائمی طور پر حرام ہے جیسے ماں، بیٹی وغیرہ۔ان کی مزید تین قسمیں ہیں۔

(الف) محرمات نسبیہ (KINSHIP)

نسبی رشتے کے حوالے سے اصولی (ماں، دادی وغیرہ) وفروعی (بیٹی، پوتی وغیرہ) رشتے کی وہ خواتین جن کے ساتھ نکاح دائمی طور پر حرام ہے۔

(ب) محرمات رضاعیہ (FOSTER RELATIONSHIP):

رشتۂ رضاعت (دودھ شریک کا رشتہ) کے حوالے سے وہ رشتے دار خواتین جن کے ساتھ نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہے، جیسے دودھ شریک بہن وغیرہ۔

(ج) محرمات بالمصاہرہ (RELATIONSHIP OF MARRIAGE):

کسی عورت کے ساتھ نکاح کے تعلق سے بعض رشتے وجود میں آتے ہیں، انہیں ''رشتۂ مصاہرت'' کہتے ہیں، یہ بھی دائمی طور پر حرام ہوتے ہیں، جیسے شوہر کے لئے ساس، بیوی کی سابقہ شوہر سے اولاد اور عورت کے لئے خسر اور شوہر کی کسی اور بیوی سے بیٹا وغیرہ۔

(۲) محرمات غیر مؤبدہ

ایسی عورتیں جن کے ساتھ نکاح حرام تو ہے، مگر ابدی اور دائمی طور پر نہیں ہے، جب وجہ حرمت دور ہو جائے تو نکاح جائز ہو جائے گا، جیسے ایک عورت کسی شخص کے نکاح میں ہے، اس کے ساتھ دوسرے شخص کا نکاح حرام ہے، لیکن اگر وہ شخص بالفرض اسے طلاق دے اور عدت گزر جائے تو اب اس کے ساتھ کوئی بھی دوسرا شخص بلا روک ٹوک نکاح کر سکتا ہے، بشرطیکہ کوئی اور وجہ ممانعت نہ ہو، اسے منکوحہ غیر کہتے ہیں وغیرہ۔

محرمات کی قبیح ترین قسم

اس آیۂ مبارکہ میں نکاح کی ایک قبیح ترین قسم سے منع کیا گیا ہے اور وہ ہے اپنے باپ کی منکوحہ سے طلاق یا وفات کے بعد نکاح کرنا یعنی سوتیلی ماں سے نکاح، اس کا ضمناً ذکر پہلے بھی آ چکا ہے اور اجمالاً اگلی آیت میں محرمات کے ضمن میں پھر آ رہا ہے۔لیکن اس کی

شدید ترین قباحت اور بے حیائی کو ظاہر کرنے کے لئے یہاں الگ سے تفصیلاً بھی ذکر کیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور رائج تھا، مفسرین کرام نے ایسے اشخاص کے نام بھی ذکر کئے ہیں جو ماضی میں اپنے باپوں کی منکوحات سے نکاح کر چکے تھے۔ مثلاً اشعث بن قیس، اسود بن خلف، صفوان بن امیہ، منظور بن ریان، ابومعیط وغیرہ۔ رئیس المفسرین امام رازی نے فرمایا کہ کسی چیز کی قباحت کے تین سبب ہو سکتے ہیں، عقلی، شرعی اور عادی، اس میں یہ تینوں جمع ہیں اور قرآن نے انہیں بالترتیب ''فاحشة'' ''مقتا'' اور سَآءَ سَبِيْلًا کے کلمات سے بیان کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک باپ کی مزنیہ سے بھی نکاح حرام ہے جبکہ امام شافعی کے نزدیک صرف ''منکوحة الاب'' سے نکاح حرام ہے۔ کیونکہ امام اعظم کے نزدیک زنا سے حرمت مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے جبکہ امام شافعی کے نزدیک صرف نکاح سے یہ حرمت ثابت ہوتی ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ؗ وَ حَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

''تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری ان بیویوں کی، جن سے تم صحبت کر چکے ہو، (دوسرے شوہروں سے) بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں پرورش پا رہی ہیں، لیکن اگر تم نے ان بیویوں سے

(نکاح کے بعد) صحبت نہ کی ہو تو (انہیں طلاق دے کر) ان کی (سابقہ) لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اور (اسی طرح) تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی (تم پر حرام ہیں) اور یہ (بھی) کہ تم دو بہنوں کو (بیک وقت) نکاح میں جمع کرو، مگر جو گزر چکا (سو گزر چکا)، بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

حُرِّمَتْ	حرام کردی گئی ہیں	اُمَّھٰتُ	اُمّ، کی جمع یعنی ماں، دادی وغیرہ
بَنٰتُ	بنت کی جمع لڑکیاں	اَخَوٰات	اُخت کی جمع بہنیں
عَمّٰتُ	عمہ کی جمع پھوپھیاں	خٰلٰتُ	خالہ کی جمع خالائیں
بَنٰتُ الْاَخِ	بھتیجیاں	بَنٰتُ الْاُخْتِ	بھانجیاں
الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَکُمْ	جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا	الرَّضَاعَةِ	دودھ کا رشتہ
رَبَآئِبُ	ربیبہ کی جمع پرورش پانے والیاں	حُجُوْر	حجر کی جمع گودیں
دَخَلْتُمْ بِهِنَّ	جن سے تم نے صحبت کی ہے	جُنَاحَ	حرج، گناہ
حَلَآئِلُ	حلیلہ کی جمع بیویاں	اَصْلَاب	صلب کی جمع، پشتیں مراد نسبی اولاد
اَنْ تَجْمَعُوْا	یہ کہ تم جمع کرو	اُخْتَیْنِ	دو بہنیں

تفسیر

اس آیہ مبارکہ میں "محرمات نکاح" کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو حسب ذیل ہے:

(ا) محرمات نسب

(الف) ماں (اس میں دادی، نانی اور اس سے اوپر کی جدات سب داخل ہیں)

(ب) بیٹی (اس میں صلبی لڑکی، پوتی، نواسی، نیچے تک سب داخل ہیں) البتہ منہ بولی بیٹی اور لے پالک اس میں شامل نہیں ہیں بشرطیکہ اس میں حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو۔

(ج) اخوات: بہنیں اس میں حقیقی، علاتی (باپ شریک) اور اخیافی (ماں شریک) سب بہنیں شامل ہیں۔

(د) عمات: پھوپھیاں (باپ کی حقیقی، علاتی اور اخیافی سب بہنیں اس میں شامل ہیں)۔

(ہ) خالات: خالائیں (والدہ کی حقیقی، علاتی، اور اخیافی بہنیں سب اس میں شامل ہیں)۔

(و) بَنٰتُ الْاَخِ: بھتیجیاں (حقیقی، علاتی اور اخیافی ہر قسم کے بھائیوں کی بیٹیوں سے نکاح حرام ہے)۔

(ز) بَنٰتُ الْاُخْتِ: بھانجیاں (حقیقی، علاتی اور اخیافی ہر قسم کی بہنوں کی بیٹیوں سے نکاح حرام ہے)۔

(۲) محرمات رضاعت

"رضاعت" کے معنی ہیں "دودھ پلانا"، جس رضاعت کی بناء پر نکاح حرام ہوتا ہے وہ امام اعظم کے نزدیک بچے کی پیدائش سے لے کر اڑھائی سال تک کا عرصہ ہے، جبکہ دیگر ائمہ، جن میں امام اعظم کے دو بڑے تلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمد بھی شامل ہیں، کے نزدیک یہ مدت دو سال ہے۔ یعنی اگر کسی لڑکے نے دودھ پینے کی اس اڑھائی سالہ مدت کے بعد کسی عورت کا دودھ پیا تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ اسی طرح امام اعظم کے نزدیک ایک چسکی سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک کم از کم پانچ چسکیوں سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔

کسی لڑکے نے بچپن میں جس عورت کا دودھ پیا ہے، خواہ ایک چسکی ہی ہو اور خواہ ایک ہی بار پیا ہو، وہ عورت اس کی "رضاعی ماں" کہلاتی ہے اور اس سے نکاح حرام ہے۔ رضاعی بیٹا بھی نسبی بیٹے کے حکم میں ہے۔ اَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ رضاعی بہنیں، یعنی رضاعت کے رشتے سے جو بہنیں ہیں، ان سب سے نکاح حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ" یعنی نسبی قرابت کی بناء پر جن خواتین سے نکاح حرام ہے، رضاعت کے رشتے سے بھی ان سب سے نکاح حرام ہے، مثلاً:

لڑکے نے جس عورت کا دودھ پیا، وہ اس کی رضاعی ماں بن جائے گی، اس عورت کا شوہر رضاعی باپ، "رضاعی بھتیجیاں" اور "رضاعی بھانجیاں" وغیرہ ان سب سے نکاح حرام ہے۔

ایک لڑکا اور لڑکی جو آپس میں اجنبی ہیں، دونوں نے مل کر ایک اجنبی عورت کا دودھ پیا تو وہ عورت ان دونوں کی "رضاعی ماں" بن جائے گی اور یہ دونوں بھی آپس میں رضاعی بھائی بہن بن جائیں گے اور ان کا آپس میں نکاح حرام ہوگا۔ لیکن وہ اجنبی لڑکی جو دودھ کے رشتے سے اس لڑکے کی رضاعی بہن بن کر حرام ہوگئی ہے، اس کی نسبی ماں یا بہن سے اس لڑکے کا نکاح جائز ہے کیونکہ ان کے درمیان کوئی حرمت کا رشتہ نہیں ہے۔

رضاعت کا رشتہ یک طرفہ متعدی ہوتا ہے

"رضاعی رشتہ" متعدی تو ہوتا ہے مگر یک طرفہ طور پر، یعنی اگر ایک لڑکے نے ایک اجنبی عورت کا دودھ پیا ہے تو وہ اس کی رضاعی ماں بن گئی اور اس کی نسبت سے وہ تمام رشتے جن کا ذکر اوپر آیا ہے اس لڑکے پر حرام ہوگئے، لیکن اس لڑکے کے بھائیوں اور بہنوں کے لئے یہ حرمت مؤثر نہیں ہے، اسی طرح اس دودھ پلانے والی عورت کی اولاد پر اس دودھ شریک بھائی کے علاوہ اس کے دوسرے بہن بھائی، جنہوں نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا حلال ہیں۔

رشتۂ رضاعت کے ثبوت کے لئے دو دین دار مردوں یا ایک مرد اور دو دین دار عورتوں کی گواہی ضروری ہے، اس سے کم میں رضاعت ثابت نہیں ہوگی، تاہم اگر ایک دین دار مرد یا ایک دین دار عورت اور ایک مرد یا صرف ایک دین دار عورت بھی گواہی دے دے تو احتیاط بہتر ہے۔

حرمت مصاہرت

''صہر'' داماد کو کہتے ہیں۔ ''حرمت مصاہرت'' سے مراد وہ حرمت ہے جو نکاح کے رشتے سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ منکوحہ بیوی کی ماں (ساس) اور جس بیوی سے صحبت کر چکا ہو، شوہر پر اس کی سابقہ شوہر سے بیٹی بھی حرام ہے۔ اس طرح صلبی بیٹے کی بیوی (بہو) اور پوتے اور نواسے کی بیویوں سے بھی نکاح حرام ہے۔ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ: ''اور دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے'' خواہ وہ حقیقی ہوں، علاتی ہوں یا اخیافی، نسب کے رشتے سے ہوں یا رضاعت کے رشتے سے، اسی طرح پھوپھی، بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو بھی بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ اس کی ممانعت صحیحین کی حدیث میں آئی ہے، فقہاء کرام نے اس کا قاعدہ کلیہ یہ بیان کیا ہے کہ کسی بھی دو ایسی عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا حرام ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو مرد فرض کرلیں تو دوسری اس پر حرام ہو جائے، جیسے دو بہنیں یا پھوپھی اور بھتیجی وغیرہ۔ ہاں البتہ اگر ایک بہن نکاح میں ہے اسے طلاق دے دے اور عدت گزر جائے تو پھر اس کی بہن یا پھوپھی یا خالہ یا بھتیجی یا بھانجی سے نکاح کر سکتا ہے، بس دونوں کو نکاح میں یکجا نہیں کر سکتا۔

ربیبہ کا معنی و مفہوم

وَرَبَآئِبُكُمُ......: ''ربائب'' ''ربیبہ'' کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پرورش پانے والی، حجور، حجر کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں ''گود۔'' آیت کے اس حصے کا مطلب یہ ہے کہ بالفرض ایک شخص نے ایک مطلقہ یا بیوہ عورت سے نکاح کیا اور اس کی گود میں سابقہ شوہر سے بیٹی ہے، تو اگر یہ شوہر اس عورت سے مباشرت کر لیتا ہے تو یہ سوتیلی بیٹی اس پر حرام ہو جائے گی، لیکن اگر نکاح کے بعد مباشرت کا موقع نہیں آیا اور اس شخص نے اس عورت کو طلاق دے دی، تو عدت گزرنے کے بعد وہ شخص اپنی اس مطلقہ بیوی کی اس بچی سے نکاح کر سکتا ہے جو اس کے سابقہ شوہر سے ہے۔

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ: ''مگر جو گزر چکا، سو گزر چکا۔'' یعنی ایسے نکاح، جنہیں شریعت نے

حرام قرار دے دیا ہے، اگر اس حکم کے نزول سے پہلے کئے جا چکے تھے، تو ان کے قصور کو اللہ عذر اور لاعلمی کی بناء پر معاف فرما دے گا۔ لیکن نزولِ حکم کے وقت اگر کہیں ایسا نکاح موجود ہو تو فوراً تفریق کر دی جائے گی اور نکاح باطل قرار پائے گا۔

وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۟ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

"اور وہ عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں) جو دوسروں کے نکاح میں ہیں مگر (کافروں کی وہ عورتیں) جو تمہاری ملکیت میں آ جائیں، یہ حکم تم پر اللہ کا فرض کیا ہوا ہے، اور

ان محرمات کے علاوہ باقی (سب عورتیں) تمہارے لئے حلال ہیں، بشرطیکہ تم شہوت رانی کیلئے نہیں بلکہ (قید) نکاح میں لانے کی غرض سے اپنے مال (یعنی مہر) کے عوض انہیں طلب کرو، تو پھر تم نے جن عورتوں سے (نکاح کر کے) فائدہ اٹھا لیا تو ان کے مقررہ مہر انہیں ادا کر دو، اور مہر مقرر ہونے کے بعد تم باہمی رضامندی سے (کمی بیشی کرلو) تو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، بلاشبہ اللہ بہت جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔ اور تم میں سے جو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی مالی استطاعت نہیں رکھتا، تو وہ ان مسلمان کنیزوں سے نکاح کرے جو تمہارے قبضے میں ہیں، اور اللہ تمہارے ایمان (کی حقیقت) کو خوب جانتا ہے، تم ایک دوسرے کے (ہم جنس) ہو، تو تم ان (باندیوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرلو اور دستور کے مطابق ان کے مہر انہیں ادا کرو، درآں حالیکہ وہ قید (نکاح) میں آنے والیاں ہوں، نہ (کھلی) بدکار ہوں اور نہ غیروں سے پوشیدہ تعلقات جوڑنے والیاں ہوں، پھر جب وہ قید (نکاح) میں آجائیں، پھر بے حیائی کا کام کریں تو ان پر اس کی آدھی سزا ہے جو آزاد (کنواری) عورتوں پر ہے، یہ (باندیوں سے نکاح کا حکم) تم میں سے اس کیلئے ہے جسے بدکاری (میں مبتلا ہونے) کا خوف ہو، اور صبر کرنا تمہارے لئے بہتر ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے (اپنے احکام) کھول کر بیان کر دے اور تمہیں چلائے ان (نیک) لوگوں کی راہ پر جو تم سے پہلے ہو گزرے اور اپنی رحمت سے تم پر توجہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ بہت جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی رحمت سے توجہ فرمائے اور جو لوگ خواہشات (نفسانی) کی پیروی کر رہے ہیں، چاہتے ہیں کہ تم (راہ حق سے) منہ موڑ کر بہت دور ہٹ جاؤ۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کر دے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

الْمُحْصَنٰتُ	محصنہ کی جمع شادی شدہ عورت	اَحْصَنَ الْمَرْاَةُ	عورت کا شادی کرنا
مُحْصِنٌ	شادی شدہ مرد	حَصُنَ یَحْصُنُ حَصَانَةً	عورت کا پاک دامن ہونا
اَلْحِصْنُ	قلعہ	کِتٰبَ اللّٰهِ	اللہ کا لکھا ہوا، جو تحریر کسی بات کو قطعی بنانے کیلئے لکھی جاتی ہے، مراد قانون
اُحِلَّ	حلال قرار دیا گیا ہے	مَّاوَرَآءَ ذٰلِکُمْ	اس کے علاوہ
اَنْ تَبْتَغُوْا	یہ کہ تم طلب کرو، چاہو	مُسٰفِحِیْنَ	مسافح کی جمع، بدکار
سَافَحَ مُسَافَحَةً	بدکاری کرنا	اِسْتَمْتَعْتُمْ	تم فائدہ اٹھاؤ
اُجُوْرَ	اجر کی جمع مراد مہر	فَرِیْضَةً	لازم، مقررہ
فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ	جس میں تم دونوں رضامند ہو	تَرَاضِی	باہمی رضامندی
مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ	جو طاقت نہیں رکھتا	طَوْلًا	قدرت، مالی کشادگی
فَتَیٰتِ	فتاۃ کی جمع نوجوان عورت مراد کنیز	مُتَّخِذٰتِ	پکڑنے والیاں
اَخْدَانٍ	خدن کی جمع دوست، مراد پوشیدہ دوست	لِمَنْ خَشِیَ	جو ڈرتا ہے

اَلْعَنَتَ	بدکاری	لِيُبَيِّنَ	تا کہ کھول کر بیان کرے
يَهْدِيَكُمْ	تمہیں ہدایت دے	سُنَنَ	سنہ کی جمع طریقہ
يَتَّبِعُوْنَ	پیروی کرتے ہیں	الشَّهَوٰتِ	شہوۃ کی جمع خواہش نفس
اَنْ تَمِيْلُوْا	یہ کہ تم پھر جاؤ	اَنْ يُّخَفِّفَ	یہ کہ ہلکا کردے (بوجھ)
خُلِقَ	پیدا کیا گیا ہے		

تفسیر

مندرجہ بالا آیات ۲۴ تا ۲۸ کا مضمون تقریباً مربوط اور مسلسل ہے اس لئے ان کی تفسیر وتشریح ایک ساتھ کی جارہی ہے تا کہ پورا مضمون سمجھ میں آجائے۔طلبہ کی تفہیم کے لئے آیات کے اہم حصوں کی نشاندہی کر کے تشریح کی جائے گی۔

حصن، احصان اور محصنہ کے معانی

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ: یہ لفظ ''حصن'' سے نکلا ہے جس کے معنی، قلعہ، پناہ، مرادی معنی ''قید میں آنا'' یا ''حفاظت وحصار میں آنا'' بھی ہوسکتا ہے۔امام المفسرین امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔اور اس کی اصل روح سب جگہ موجود ہے، وہ معانی یہ ہیں:

(۱) ''احصان'' کے معنی ہیں عورت یا مرد کا شادی شدہ ہونا، وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ یعنی ''شادی شدہ عورتیں''، مراد یہ کہ جو عورتیں دوسروں کی قید نکاح میں بدستور ہیں، ان سے نکاح حرام ہے۔اسی طرح اگلی آیت میں فَاِذَآ اُحْصِنَّ سے بھی یہی معنی مراد ہیں۔یعنی جب وہ قید نکاح میں آجائیں، اسی آیت میں ''محصنین'' سے بھی یہی معنی مراد ہیں، یعنی یہ کہ تم مہر ادا کر کے شادی کرو نہ کہ شہوت رانی۔

(۲) ''احصان'' کے دوسرے معنی ہیں ''حریت'' چنانچہ اگلی آیت میں وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ...... سے یہی معنی مراد ہیں یعنی تم میں سے جو شخص آزاد عورت سے نکاح کرنے کی مالی استطاعت نہیں رکھتا تو وہ مسلمان کنیزوں سے نکاح کر

لے۔اس طرح سورۃ ''النور'' میں وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ میں یہی معنی مراد ہیں۔یعنی یہ کہ جولوگ آزاد عورتوں پر تہمت لگائیں تو انہیں چار گواہوں سے ثابت کرنا ہوگا ورنہ ''حد قذف'' ان پر جاری ہوگی۔

(۳)''احصان'' کے تیسرے معنی ہیں پاک دامنی،عفت،چنانچہ اگلی آیت میں مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ سے یہی مراد ہیں کہ وہ پاک دامن ہوں،بدکار نہ ہوں۔

(۴)''احصان'' کے چوتھے معنی ''اسلام'' کے ہیں،چنانچہ ایک قول کے مطابق فَاِذَآ اُحْصِنَّ سے اسلام کے معنی بھی مراد ہیں۔

آیات میں بیان کردہ مسائل

ان دو آیات میں بیان کردہ مسائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ یہ کہ جو عورت دوسرے کے نکاح میں ہے،جب تک وہ طلاق حاصل کر کے عدت نہ گزار لے،اس سے نکاح حرام ہے،وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ سے یہی مراد ہے۔

۲۔اپنی مملوکہ باندی سے نکاح کے بغیر بھی مباشرت جائز ہے،صرف ایک شرط ہے کہ پہلی بار جب اس کی ملکیت میں آئی ہو،کم از کم حیض کا ایک دورانیہ گزار کر یہ یقین کرلیا جائے کہ وہ حمل سے نہیں ہے،اگر حاملہ ہوتو وضع حمل کے بعد مباشرت کی اجازت ہوگی۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے یہی مراد ہے۔

۳۔اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ سے مراد یہ ہے کہ قرآن نے جن محرمات نکاح کو بیان کر دیا ہے،ان کے علاوہ دیگر عورتوں سے نکاح جائز ہے بشرطیکہ کوئی اور وجہ ممانعت نہ ہو۔

۴۔ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ...... ''یہ کہ تم اپنے مالوں (مہر) کے بدلے میں انہیں حاصل کرو نکاح کر کے نہ کہ شہوت رانی کے لئے''۔اس سے مراد یہ ہے کہ نکاح میں بہر حال مہر شرط لازم ہے۔

۵۔ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ...... یعنی اگر منکوحہ عورت سے شوہر استفادہ کر لے اور ''خلوت صحیحہ'' یا مباشرت ہو جائے تو پورا مہر ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

۶۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ...... اگر زوجین بلا کسی جبر و اکراہ کے باہمی رضا مندی کے ساتھ مقررہ مہر میں کمی یا اس پر زیادہ کریں تو یہ گناہ کی بات نہیں ہے۔

۷۔ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا...... اگر کوئی شخص اتنی مالی استطاعت نہیں رکھتا کہ معقول مہر ادا کر کے آزاد عورت سے نکاح کرے تو مسلمان باندی سے نکاح کر لے۔

۸۔ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ یعنی یہ کہ باندیوں سے نکاح ان کے مالک کی اجازت سے کیا جائے گا۔

۹۔ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی اگر باندیوں سے تم نکاح کرو تو ان کا مہر بھی دستور کے مطابق ادا کرو۔

۱۰۔ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ یعنی باندیوں سے نکاح کا یہ مشورہ تب مفید ہوگا کہ وہ بخوشی نکاح کی پابندیوں کو قبول کریں، نہ کھلی بدکاری کریں اور نہ کسی سے پوشیدہ راز و نیاز کے تعلقات قائم کریں۔

۱۱۔ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ یعنی اگر شادی شدہ باندی بدکاری کا ارتکاب کرے تو آزاد کنواری عورت کی جو حد زنا، سو کوڑے ہے، اس کی سزا اس کا نصف پچاس کوڑے ہوگی۔

۱۲۔ باندی سے نکاح کا قرآنی مشورہ اس نادار کے لئے ہے جو اپنے نفس پر قابو نہیں پا سکتا اور اسے بدکاری میں مبتلا ہونے کا خوف ہو ورنہ صبر بہتر ہے۔

۱۳۔ آیت نمبر ۲۶ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے اور تا کہ تمہیں گزشتہ امتوں کے پاکیزہ لوگوں کی راہ پر چلائے۔

۱۴۔ آیت نمبر ۲۷ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمتوں کا مرکز بنانا چاہتا ہے لیکن بندگانِ ہوس اور شہوت پرست لوگ شرعی حدود و قیود کو پامال کر کے تمہیں صراط مستقیم سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

۱۵۔ آیت نمبر ۲۸ میں فرمایا کہ یہ احکام ''ضعیف البنیان'' (کمزور، قوت ارادی

والے) انسان سے اس کی بداعمالیوں اور فکری کجی کا بوجھ اتارنے کے لئے نازل کئے گئے ہیں نہ کہ بے مقصد بارِ مشقت ڈالنے کے لئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾ إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ﴿٣١﴾

''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقوں سے خورد برد نہ کرو، سوائے اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارت ہو (تو نفع حلال ہے)، اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، بلاشبہ اللہ تم پر بہت رحم فرمانے والا ہے۔ اور جو شخص زیادتی اور ظلم کے ساتھ ایسا کرے گا تو عنقریب ہم اسے (جہنم کی) آگ میں جھونک دیں گے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے آسان سا کام ہے۔ اور اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہے، جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے، تو ہم تمہارے (صغیرہ) گناہوں کو (تمہارے نامہ اعمال سے) مٹا دیں گے اور تمہیں عزت کی جگہ (جنت میں) داخل کریں گے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

لَا تَأْكُلُوا	مت کھاؤ	بِالْبَاطِلِ	ناحق، ناجائز
تَرَاضٍ	باہمی رضامندی	لَا تَقْتُلُوا	قتل نہ کرو
عُدْوَان	حد سے بڑھنا، زیادتی کرنا	نُصْلِيهِ	ہم اسے آگ میں داخل کریں گے
يَسِيرًا	آسان	إِن تَجْتَنِبُوا	اگر تم بچتے رہو گے

كَبَآئِرَ	کبیرہ کی جمع ''بڑا گناہ''	مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ	جن سے تمہیں روکا گیا ہے
نُكَفِّرْ عَنْكُمْ	ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے، مٹا دیں گے	مُّدْخَلًا	داخل ہونے کی جگہ ٹھکانا
كَرِيْمًا	عزت والی		

تفسیر

باہمی ظلم وزیادتی کی ممانعت

ان آیات میں انسانوں کے باہمی حقوق کی پاسداری کا حکم دیا گیا ہے اور ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی سے روکا گیا ہے۔

۱۔ لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ: یعنی آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل طریقوں سے ہڑپ نہ کرو۔ چوری، غصب، لوٹ مار، سود، رشوت، خیانت اور لین دین میں دھوکہ دہی، سب اس میں شامل ہیں۔

۲۔ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ: سوائے اس کے باہمی رضامندی سے تمہاری آپس میں تجارت ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کی رضامندی سے تجارت ہو، دھوکہ دہی اور فریب نہ ہو، اور کوئی نفع کمالے تو یہ بالکل جائز ہے۔

۳۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: اپنے آپ کو قتل نہ کرو، یہ قتل انسانی سے روکنے کا نہایت نفیس اور بلیغ انداز ہے کہ جسے تم قتل کرنے کا ارادہ کر رہے ہو، وہ کوئی غیر نہیں ہے، تمہارا اپنا بھائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن ایک جان کی مانند ہیں۔'' اور اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ''قصاص'' میں تمہاری اپنی جان چلی جائے۔ لہٰذا ایسا سنگین جرم کرنے سے پہلے بار بار سوچو۔

۴۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا......: اور جو ظلم وزیادتی سے ایسا کرے گا تو اسے ہم جہنم میں جھونک دیں گے۔'' ''عدوان'' کے معنی ہیں ''شریعت کی مقرر کردہ حلال وحرام

کی حدود سے تجاوز کرنا'' اور ''ظلم'' کے معنی ہیں کسی کا حق مارنا یا اس کے حق سے کم دینا۔

۵۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ: یعنی ''اگر تم کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو گے تو (اس کے صلے اور انعام کے طور پر) ہم تمہارے صغیرہ گناہوں کو معاف کر دیں گے۔''

گناہ کبیرہ وصغیرہ کی تعریف

گناہ کبیرہ کی کوئی متعین تعریف یا تقسیم کتاب وسنت میں مذکور نہیں ہے۔ تاہم مفسرین، محدثین اور محققین علماء کرام نے اس پر کافی طبع آزمائی کی ہے اور اپنے اپنے موقف پر کتاب وسنت سے استدلال کیا ہے۔ اس موضوع پر مفصل رسائل بھی تصنیف کئے گئے ہیں، تفسیر کبیر میں امام رازی نے بھی کافی مفصل بحث کی ہے۔

سطور ذیل میں ہم ان ابحاث کا خلاصہ پیش کریں گے، دلائل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

(۱) ایک رائے یہ ہے کہ ''گناہ'' صرف گناہ ہے، چھوٹا بڑا نہیں ہے، اور نہ ہی کسی گناہ کو چھوٹا یا حقیر اور کسی نیکی کو بڑا سمجھنا چاہئے، جیسے آگ کا چھوٹا یا بڑا انگارہ۔

(۲) بعض علماء نے کہا گناہ کبیرہ، ''فرض کے ترک'' اور ''حرام کے ارتکاب'' کو کہتے ہیں، جیسے بلا عذر نماز نہ پڑھنا اور شراب پینا وغیرہ۔

(۳) ایک قول یہ ہے کہ جس گناہ پر عذاب کی ''وعید'' آئی یا اسے ''لعنت وغضب الٰہی'' کا سبب قرار دیا گیا ہے، وہ کبیرہ ہے یا جس کے بارے میں ''نہی'' کا حکم آیا ہے۔

(۴) سورہ الحجرات میں کفر، فسوق اور عصیان کا ذکر ہے، پہلے دو کبیرہ ہیں اور عصیان صغیرہ۔

(۵) ''گناہ کبیرہ'' توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتا اور اس کی تلافی بھی لازمی ہے جبکہ صغیرہ گناہ اعمال صالحہ کی برکت سے معاف ہو جاتے ہیں۔ جیسے اس آیت اور بے شمار احادیث میں تذکرہ ہے۔

(۵) کبیرہ گناہوں کی تعداد معین طور پر شریعت میں نہیں بتلائی گئی، تاہم بعض علماء نے سات، دس، چالیس اور ستر سے لے کر سات سو تک شمار کئے ہیں۔ امام رازی نے مثال کے طور پر چند کا تذکرہ کیا ہے اور چند کا احادیث مبارکہ میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے، مثلاً کفر و شرک،

قتل ناحق، ماں باپ کی نافرمانی، میدانِ جہاد سے بھاگ جانا، غیبت، زنا، یتیم کا مال ناحق کھانا، سودخوری، جھوٹی گواہی، جھوٹی تہمت زنا لگانا، شراب نوشی، جھوٹی قسم وغیرہ، اسی طرح جملہ فرائض وواجبات کا ترک، اور گناہِ صغیرہ پر اصرار یعنی بار بار کرنا بھی کبیرہ بن جاتا ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

"اور اللہ نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری عطا کر رکھی ہے، اس کی تمنا نہ کرو، مردوں کے لئے حصہ ہے ان کی کمائی سے اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا، اور اللہ سے اس کا فضل مانگتے رہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

لَاتَتَمَنَّوْا	تمنا نہ کرو	مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ	جو اللہ نے فضیلت عطا کی ہے
مِمَّا اكْتَسَبُوْا	اس میں سے جو انہوں نے کمایا (مردوں نے)	مِمَّا اكْتَسَبْنَ	اس میں سے جو ان عورتوں نے کمایا
وَسْـَٔلُوْا	اور سوال کرو		

تفسیر

حسد کی ممانعت

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ...... انسان کی خوبیاں اور کمالات دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو موہوبہ (God Gifted) ہیں، محض اللہ کی عطا سے ہیں، انسان کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، مثلاً صنف (مرد یا عورت ہونا)، حسن و جمال، موروثی دولت مل جانا، قدرتی

ذہانت، حافظہ، جسمانی قامت وغیرہ۔ اور دوسرے کمالات اور خوبیاں مکسوبہ (SELF ACQUIRED) ہوتی ہیں یعنی جنہیں انسان اپنی جدوجہد اور محنت سے حاصل کرتا ہے۔ جیسے اعلیٰ تعلیم، کوئی ہنر یا فن، کوئی بھی کسب کمال وغیرہ۔ ویسے تو کوئی بھی نعمت اللہ کی تقدیر، عطا اور توفیق کے بغیر نہیں مل سکتی۔ لیکن یہاں بات ظاہری احوال واسباب کے تحت ہو رہی ہے کہ ظاہر حال میں اس میں انسان کی محنت، تدبیر اور جدوجہد کار فرما نظر آتی ہے۔

اس آیت میں یہ فرمایا گیا کہ اگر تم کسی انسان میں کوئی وہبی کمال دیکھو تو اس کی آرزو میں نہ لگ جاؤ۔ کیونکہ اس سے آخر کار انسان میں حسد کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور انسان چاہتا ہے کہ دوسرے سے یہ نعمت چھن جائے اور مجھے مل جائے۔ یہ کیفیت نفسانی انتہائی مہلک اور تباہ کن ہے اور انسان کو غضب اور انتقام پر ابھارتی ہے، ابلیس اور فرزند آدم علیہ السلام قابیل اس دباؤ کا شکار ہوئے۔ اور یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تقسیم اور عطاء پر اعتراض بھی ہے، جس کا بندے کو ہرگز حق نہیں پہنچتا۔ وہ سب کا خالق و مالک ہے اور سب کی اہلیت اور استعداد کو بہتر جانتا ہے کہ کس کو کون سی نعمت عطا کی جائے، اور کون جانتا ہے کہ یہ اس کے لئے انعام ہے یا امتحان۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "حسد انسان کے نیک اعمال کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو۔" اس مرضِ حسد کا نفسیاتی اور حکیمانہ علاج نبی کریم ﷺ نے یہ بتایا کہ "اپنے سے کمتر کو دیکھو (تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ)، اپنے سے اعلیٰ و برتر کو نہ دیکھو (کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کفرانِ نعمت اور ناشکری کر بیٹھو)

باقی جہاں تک انسان کی ان خوبیوں کا تعلق ہے جو جہد مسلسل اور سعی پیہم سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ایسی نعمتوں میں دوسروں کو پھلتا پھولتا دیکھ کر حسد کی آگ میں جلنا اور کڑھتے رہنا بھی ایک نفسیاتی عذاب اور اخلاقی کینسر ہے۔ مثبت اور تعمیری ذہن کے لوگ دوسروں کو آگے بڑھتا دیکھ کر ہمت نہیں ہارتے بلکہ جہد مسلسل سے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اس میدان میں منافست و مسابقت (Competition) ایک تعمیری انسانی قدر ہے اور پسندیدہ صفت ہے، جسے رشک یا غبطہ کہا جاتا ہے، قرآن میں اللہ کا ارشاد ہے: "اور

ان (امور خیر) میں مقابلہ کرنے والوں کو باہم مقابلہ کرنا چاہیے۔"

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿٣٣﴾

"اور ہم نے ہر ایک (کے ترکے) کے لئے وارث مقرر کر دیے ہیں جو والدین یا رشتے دار (بصورت وفات) پیچھے چھوڑ جائیں، اور جن لوگوں کے ساتھ تمہارا عہد و پیمان ہے تو انہیں ان کا حصہ دے دو، بلاشبہ ہر چیز اللہ کے سامنے موجود ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

مَوَالِيَ	مولیٰ کی جمع، اس کے معنی ہیں آقا آزاد غلام اور وارث،	عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ	تم نے پختہ عہد کر رکھا ہے

تفسیر

عقد موالات سے وراثت ثابت نہیں ہوتی

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ...... عہد جاہلیت میں عرب میں یہ دستور تھا کہ دو افراد آپس میں معاہدہ کرتے کہ "میرا خون تمہارا خون، میری سلامتی تمہاری سلامتی، میری جنگ تمہاری جنگ ہوگی، تم میری دیت دو گے اور میں تمہاری، تم میرے وارث ہو گے اور میں تمہارا۔" اس طرح ان دونوں حلیفوں میں سے جو پہلے مر جاتا دوسرا اس کے ترکے میں سے چھٹا حصہ پاتا، ابتداء اسلام تک یہ دستور جاری تھا۔ اسی طرح اگر وہ کسی کو اپنا متبنیٰ (Adopted Son) بنا لیتے تو وہ حقیقی بیٹے کی طرح اس کا وارث قرار پاتا۔ اس آیت میں ابتداءً ایسے قول وقرار کی پابندی کا حکم دیا گیا لیکن بعد میں جب یہ آیت نازل ہوئی کہ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ، کہ رشتے دار (ذوی الارحام) میں سے بعض دوسرے کے مقابلے میں قریب تر ہیں" تو اس کے بعد غیر قرابت دار کے وارث بننے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور اس آیت کا یہ حصہ کہ "جن سے تم پختہ عہد کر چکے ہو، انہیں ان کا حصہ دو" بھی

منسوخ ہو گیا، اب صرف شرعی ورثاء ترکے میں حق دار ہیں۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

''مرد عورتوں پر محافظ و نگہبان ہیں، اس بناء پر کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیل دی ہے اور اس لئے بھی کہ مردوں نے (عورتوں پر) اپنا مال خرچ کیا ہے، پس نیک عورتیں (مردوں کی) فرمانبردار ہوتی ہیں، اللہ کی (تائیدو) حفاظت کے سہارے وہ (شوہروں کی) عدم موجودگی میں (ہر امانت کی) حفاظت کرتی ہیں اور تمہیں جن عورتوں کی نافرمانی کا اندیشہ ہوا، انہیں سمجھاؤ اور (اگر نصیحت بے اثر ثابت ہو تو) خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو، اور (پھر بھی باز نہ آئیں تو) انہیں (تادیباً) مار پیٹ کرو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت پر آمادہ ہو جائیں تو (خواہ مخواہ) انہیں تکلیف دینے کی راہیں نہ نکالو، بلاشبہ اللہ کی ذات سب سے بلند، سب سے بڑی ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

قَوّٰمُوْنَ	قوام کی جمع، قوام یا قیم سے مراد محافظ و نگہبان، معاملات کا نگران	قٰنِتٰتٌ	قانتۃ کی جمع، فرمانبردار
حٰفِظٰتٌ	حافظہ کی جمع حفاظت کرنیوالی	نُشُوْزَ	سرکشی، نافرمانی، نافرمان عورت کو ''ناشرہ'' کہتے ہیں
فَعِظُوْهُنَّ	پس انہیں نصیحت کرو	وَاهْجُرُوْهُنَّ	اور انہیں چھوڑ دو

فِي الْمَضَاجِعِ خواب گاہوں میں، مضجع کی جمع وَاضْرِبُوْهُنَّ اور انہیں مارو
سونے اور آرام کی جگہ
فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں فَلَا تَبْغُوْا مت تلاش کرو
عَلِيًّا بہت بلند

تفسیر

مرد عورتوں کے محافظ ونگہبان ہیں

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ......

۱۔ اس آیت میں بتایا گیا کہ مرد عورت کا محافظ، نگہبان اور اس کی ضروریات کا کفیل ہے، اسلام نے عورت پر کوئی مالی ذمہ داری عائد نہیں کی۔ "قَیِّم" اور "قَوَّام" کا مطلب یہی ہے کہ گھر کے انتظام کا نگران اور کفیل مراد ہے۔

۲۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ذمہ داریوں کے اعتبار سے مرد کو بعض امتیازی استعداد واہلیت سے نوازا ہے اور نبوت ورسالت، امامت، امارت اور بعض دیگر مناصب کے لئے اسے مختص فرمایا ہے۔

۳۔ اس کے برعکس عورت کے ذمہ گھریلو ذمہ داریوں کے سلسلے میں کوئی مالی ذمہ داری عائد نہیں کی، وہ اگر مرد کا ہاتھ بٹاتی ہے تو یہ اس کی طرف سے مرد پر تبرع، فضل اور احسان ہے۔

۴۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ...... آیت کے اس حصے میں قرآن نے ایک نیک خصلت اور وفا شعار بیوی کی خصوصیات بیان کی ہیں کہ وہ شوہر کی فرمانبردار ہوتی ہے اور اس کی عدم موجودگی میں اپنی پاک دامنی اور عفت وحیا کی بھی حفاظت کرتی ہے اور گھر کی بھی حفاظت کرتی ہے۔ لیکن اگر شوہر اپنی بیوی کو کسی خلاف شرع کام کا حکم دے تو ایسے امور میں اس پر اطاعت لازم نہیں ہے۔

نافرمان بیوی کے احکام

وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ...... شوہر کے سامنے عورت کی سرکشی، تمرد اور نافرمانی کو ''نشوز'' کہتے ہیں اور ایسی عورت ''ناشزہ'' کہلاتی ہے۔

''نافرمان'' بیوی کی اصلاح کے لئے قرآن نے تین مرحلے بیان فرمائے ہیں:

(۱) یہ کہ اسے پیار و محبت سے سمجھائیں، واعظانہ اور ناصحانہ انداز میں اسے اس کے رویئے کے نتائج بد سے آگاہ کریں۔ چنانچہ فرمایا: فَعِظُوْهُنَّ انہیں نصیحت کرو۔

(۲) اگر وعظ و نصیحت کارگر ثابت نہ ہو تو تنبیہ کے طور پر خواب گاہ میں اس سے علیحدگی اختیار کرو، شاید اسے عقل آ جائے۔ یہ قطع تعلق نفرت کے جذبے سے نہیں بلکہ اصلاح کی نیت سے کیا جائے، وَاهْجُرُوْهُنَّ سے یہی مراد ہے۔

(۳) اگر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو تو تادیباً محض معمولی مار پیٹ کی اجازت ہے۔ لیکن چہرے پر تھپڑ مارنے یا شدید مارنے کی اجازت نہیں ہے۔

اگر ان میں کسی ایک تدبیر سے بھی عورت کے مزاج میں سدھار آ جائے تو، سب باتیں بھلا کر اس کے ساتھ حسب سابق محبت کا برتاؤ کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر حیلے بہانے سے اسے اذیت پہنچانے کی راہیں نکالی جائیں، چنانچہ فرمایا: فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا۔

اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ایک ایسا رشکِ گلزار کنبہ ہے جہاں ہر سو باہمی احترام و محبت کی خوشبو رچی بسی ہو، چنانچہ فرمان رسول اللہ ﷺ ہے: ''دنیا کی نعمتوں میں سے بہترین چیز وہ عورت ہے کہ جب تو اسے دیکھے تو تجھے سرور حاصل ہو اور جب تم اسے کوئی حکم دو تو وہ سراپا اطاعت بن جائے اور تیری غیر حاضری میں وہ اپنی عصمت اور تیرے مال کی حفاظت کرے''۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

''اور اگر تمہیں ان دونوں کے درمیان بگاڑ کر اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مقرر کرو، اگر وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو (ان کی کوششوں سے) اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا فرمادے گا، بلاشبہ اللہ خوب جاننے والا باخبر ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

شِقَاقَ	ناچاقی، اختلاف	فَابْعَثُوْا	تو بھیجو، مقرر کرو،
حَكَمًا	ثالث، منصف	يُّوَفِّقِ اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ موافقت پیدا کردے گا

تفسیر

زوجین میں مصالحت کا طریقہ

گذشتہ آیات میں میاں بیوی کے معاملات سلجھانے کی جو تدبیریں اور تدریجی اقدامات تجویز کئے گئے ہیں، وہ ان دونوں کی ذات تک محدود تھے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بگاڑ اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ معاملات فریقین کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں، اس آیت میں قرآن نے تجویز کیا ہے کہ اس مرحلے پر دونوں خاندانوں کے بزرگوں کو سامنے آکر حالات کو سدھارنے کی کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ آخر کار اس کے برے اثرات سے دونوں خاندان متاثر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ٹکراؤ زیادہ شدید ہو جاتا ہے، لہٰذا اللہ جل شانہ نے فرمایا: فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا یعنی اس مرحلے پر دونوں خاندان اپنا اپنا مدبر آدمی ثالث بنائیں اور وہ دونوں سارے معاملے کو سلجھائیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ دونوں منصف نیک نیت ہوئے تو قدرت کی طرف سے بھی اسباب سازگار ہو جائیں گے۔ فقہاء کرام نے کہا کہ یہ دونوں ''حکم'' اگر بطور ''مختار خاص'' نامزد ہوں گے تو ان کا دائرہ صرف صلح کی مساعی تک محدود رہے گا اور اگر فریقین نے انہیں کلی اختیارات

تفویض کر کے ''مختار عام'' بنا دیا تو پھر انہیں پورا پورا اختیار ہوگا کہ:
(الف) اگر ممکن ہو تو احسن طریقے سے صلح کرا دیں۔
(ب) کسی فریق کی زیادتی ثابت ہو تو اس پر مناسب تاوان ڈال دیں۔
(ج) اور اگر وہ دیانتداری سے سمجھتے ہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے ذہنی طور پر اتنے متنفر اور بیزار ہو چکے ہیں کہ ''حدود شرع'' میں رہتے ہوئے ان کا نباہ مشکل ہے تو پھر وہ طلاق یا خلع کا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔـا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ﴿٣٦﴾

''اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں اور قرابت دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور مجلس کے ساتھی اور مسافر اور جن کے تم مالک ہو، (ان سب) کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ مغرور متکبر کو پسند نہیں فرماتا''۔

مشکل الفاظ کے معانی

وَاعْبُدُوا	اور عبادت کرو، یہاں شرک کے مقابل ہونے کی وجہ سے توحید کے معنی بھی لئے گئے ہیں	اِحْسَان	نیکی، حسن سلوک
ذِی الْقُرْبٰی	قرابت دار	الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی	رشتے دار پڑوسی
الْجَارِ الْجُنُبِ	اجنبی پڑوسی	الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ	ہمنشیں، مجلس کا ساتھی

ابْنِ السَّبِيْلِ	مسافر	لَا يُحِبُّ	پسند نہیں فرماتا
مُخْتَالًا	اس کا مادہ "الخال" ہے، اس سے الخیلاء بھی آتا ہے، یعنی خود پسند، مغرور، متکبر، اترانے والا	فَخُوْرًا[۱۳]	اپنے آپ پر فخر کرنے والا، متکبر

تفسیر

عبادت سے مراد

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا...... آیت کا آغاز "حکم عبادت" سے ہو رہا ہے لیکن چونکہ اس کے ساتھ متصلاً شرک سے ممانعت کا بھی حکم ہے، اس لئے قرآن مجید میں ایسے تمام مقامات جہاں عبادت کا حکم اور شرک کی ممانعت کا ذکر ایک ساتھ ہو، وہاں مفسرین کرام "عبادت" سے توحید مراد لیتے ہیں۔ گویا معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرو۔

والدین سے حسن سلوک

امر توحید اور اور نہی شرک کے فوراً بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے اس کے علاوہ سورہ انعام آیت ۱۵۱، سورہ بنی اسرائیل آیت ۲۴ اور سورہ احقاف آیت ۱۵ میں بھی یہ دونوں مضامین یکجا بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی حکمت علماء نے یہ بتائی ہے کہ اللہ تعالیٰ "خالق حقیقی" اور "رب حقیقی" ہے لیکن انسان کی پیدائش، تربیت، نشوونما اور ذہنی، روحانی و جسمانی ارتقاء کا ظاہری سبب ماں باپ ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورہ بنی اسرائیل میں ماں باپ کے لئے "ربیانی" کا کلمہ استعمال کر کے گویا انہیں اشارتاً "رب مجازی" قرار دیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ماں باپ کی نافرمانی کو گناہ کبیرہ قرار دیا ہے اور فرمایا: "رِضَی الرَّبِّ فِیْ رِضَی الْوَالِدَیْنِ وَسُخْطُ الرَّبِّ فِیْ سُخْطِ الْوَالِدَیْنِ" یعنی "ماں باپ کی خوشی میں اللہ کی خوشی ہے اور ماں باپ کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی کا سبب

ہے۔'' اور آپ نے فرمایا: (ترجمہ) ''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جو شخص اپنے ماں باپ کے چہرے کی طرف محبت سے ایک نظر دیکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ایک حج مقبول کا ثواب عطا فرماتا ہے۔'' چند چیزیں ایسی ہیں جن کی طرف دیکھنے کو بھی حدیث میں عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ یعنی بیت اللہ، قرآن مجید، ماں باپ کے چہرے کو دیکھنا اور سمندر کو۔ اور حالت ایمان میں رسول اللہ ﷺ کے رخ انور کا دیدار کرنے والا صحابی کہلاتا ہے۔

ماں باپ کی اطاعت اس قدر اہم ہے کہ قرآن مجید کی سورہ لقمان آیت نمبر ۵ اور عنکبوت آیت نمبر ۸ میں یہ بتایا کہ اگر خدانخواستہ کسی مسلمان اولاد کے ماں باپ مشرک ہوں اور وہ انہیں شرک پر مجبور کریں، تو اس معصیت کے کام میں تو ان کی بات ہرگز نہیں مانی جائے گی لیکن اس کے باوجود دیگر معاملات میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کا حکم دیا گیا ہے۔ ضرورت مند ماں باپ کی کفالت اولاد کی ذمہ داری ہے، ان کے ساتھ درشتی سے پیش آنا، اونچی آواز سے گستاخانہ انداز میں ان سے بات کرنا، انہیں جھڑکنا یہاں تک کہ اف تک کہنے کی ممانعت ہے۔

پڑوسی کی اقسام

وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی...... اس آیت میں پڑوسی کی کئی قسمیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) ایسا مسلمان پڑوسی جو رشتے دار بھی ہو، اس کا حق سب سے مقدم ہے اور اس کے حقوق تین وجوہ سے ہیں، اسلام، قرابت اور پڑوس۔

(۲) مسلمان پڑوسی جس کے ساتھ قرابت کا رشتہ نہیں ہے، اس کے حقوق دو سبب سے ہیں، اسلام اور پڑوس۔ آیت میں اسے وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) اجنبی پڑوس جو مسلمان نہیں ہے، اس کا حق پڑوس کی بناء پر ہے۔ اجنبی پڑوس کو الْجَارِ الْجُنُبِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۴) ایسا پڑوسی جو کلاس میں، ریل، بس یا ہوائی جہاز میں یا کسی مجلس میں پاس بیٹھا ہو، اس

کے بھی حقوق ہیں۔ ایسے پڑوسی کو وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ کہا گیا ہے۔ کسی دفتر یا کارخانے میں ایک ساتھ کام کرنے والے بھی اس "حق جوار" کے مستحق ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے پڑوسیوں کے حقوق کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) "کہ جبرئیل امین ہمیشہ مجھے پڑوسی کے بارے میں حسن سلوک کی تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ کہیں انہیں وارث نہ قرار دے دیا جائے۔"

(۲) "وہ حقیقت میں صاحب ایمان نہیں جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہ ہو۔"

(۳) اسلام میں جائداد کی فروخت کے موقع پر پڑوسی کو "حق شفعہ" اسی بناء پر دیا گیا ہے۔

بعض علماء نے پڑوس کے تعلق کو چالیس گھروں تک یا محلے تک وسیع کیا ہے لیکن زیادہ حق اسی کا ہے جو قریب ترین ہے۔

ابْنِ السَّبِيْلِ: ابْنِ السَّبِيْلِ کے معنی ہیں "مسافر" یعنی ایسا شخص جو سفر کے دوران میں کسی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہو اور اس کے لئے اپنے گھر والوں سے رابطہ اور مدد کا حصول بہت مشکل ہو، ایسا شخص نیک دل مسلمانوں کے حسن سلوک کا حق دار ہے۔

غلاموں سے حسن سلوک

وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے غلام، باندیاں اور ماتحت لوگ مراد ہیں کہ ان سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم نہایت تاکید سے بار بار دیا، صحیح مسلم کے حوالے سے چند احادیث کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

(۱) "جس شخص نے اپنے غلام کو بے قصور پیٹا یا اس کے تھپڑ مارا اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اسے آزاد کر دے۔"

(۲) "حضرت ابو مسعود انصاری کہتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کو پیٹ رہا تھا کہ میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی، اے ابو مسعود! تمہیں جان لینا چاہئے کہ جتنی قدرت واختیار تمہیں اس غلام پر ہے۔ اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے، میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ رسول اللہ ﷺ تھے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم وہ اللہ کی رضا

کے لئے آزاد ہے، آپ نے فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے تو تمہیں جہنم کے شعلے لپیٹ لیتے یا فرمایا کہ جہنم کی آگ تمہارے بدن کو چھوتی۔"

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے ابوذر! تم میں ابھی جاہلیت کے اثرات ہیں، یہ تمہارے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے انہیں تمہارے تابع بنا دیا ہے، سو جو تم خود کھاؤ وہی انہیں بھی کھلاؤ اور جو خود پہنو انہیں بھی پہناؤ اور ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کے بس سے باہر ہو۔ اگر تم کوئی ایسا مشکل کام ان کے ذمہ لگا بھی دو تو پھر خود بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"

تکبر کی مذمت

لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے دو بدترین انسانی خصلتوں کا ذکر کیا ہے۔ "مختال" کے معنی خود رائی، خودنگری، خود فریبی اور پرستش نفس کے ہیں اور فخور، متکبر، مغرور، اپنی ذات پر اترانے اور اکڑنے والا۔

یہ دونوں صفاتِ مذمومہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں بلکہ یہ انسانیت کی ضد ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱) "جس شخص کے دل میں ذرہ بھر، رائی کے دانے کے برابر بھی، تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔"

(۲) "عیال دار متکبر پر اللہ تعالیٰ قیامت میں اپنی رحمت کے ساتھ خصوصی توجہ نہیں فرمائے گا۔"

(۳) کبر و عظمت شانِ الوہیت، جامۂ الوہیت ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "جو شخص مجھ سے میری یہ خصوصی خلعت شاہانہ لڑ جھگڑ کر چھیننا چاہے گا، میں اسے جہنم میں جھونک دوں گا۔"

ایسی متعدد آیات و احادیث ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ "بندے کا مغرور ہونا، متکبر ہونا، اپنے آپ پر اترانا اور دوسرے کو اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھنا اللہ کو ہرگز پسند نہیں ہے، بندے کی جو صفات اللہ کو پسند ہیں وہ ہیں عاجزی، تواضع، انکسار اور متانت و شرافت وغیرہ۔

تکبر کیا ہے؟

"صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (جب یہ ارشاد) فرمایا کہ جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہے، وہ (آخرت میں) جنت میں داخل نہیں ہوگا، تو ایک شخص نے عرض کیا: ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کا لباس عمدہ ہو، جوتے اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟) آپ نے فرمایا: "اللہ جمیل ہے اور وہ جمال کو پسند فرماتا ہے۔" (یعنی مزاج میں نفاست اور خوش لباسی تکبر نہیں ہے)، تکبر تو حق کے انکار اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھنے کو کہتے ہیں۔"

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾ وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَ مَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾

"جو لوگ (خود بھی) بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل سے انہیں جو کچھ عطا کر رکھا ہے، اسے چھپاتے ہیں، اور ہم نے کافروں کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے (بھی) جو اپنا مال (محض) نام و نمود کے لئے خرچ کرتے ہیں، اور وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اور شیطان جس کا دوست (بن جائے) تو یہ بہت برا دوست ہے۔ اور ان پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی اگر وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے، اور اللہ کی دی ہوئی نعمت (مال) سے خرچ کرتے اور اللہ انہیں خوب جانتا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

یَبْخَلُوْنَ	بخل کرتے ہیں	یَکْتُمُوْنَ	چھپاتے ہیں
مَآاٰتٰھُمُ اللّٰہُ	جو اللہ نے انہیں دیا ہے	اَعْتَدْنَا	ہم نے تیار کیا ہے
مُّھِیْنًا	ذلت ورسوائی والا	رِئَآءَ	دکھاوا، نام و نمود کی خواہش
قَرِیْنًا	ساتھی	فَسَآءَ	برا

تفسیر

بخل کی مذمت

گذشتہ آیات میں ان مستحق ومحروم طبقات کا ذکر کیا گیا، جو ہمارے حسن سلوک کے مستحق ہیں۔اس آیت میں بتایا کہ اس حسن سلوک میں رکاوٹ ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے ''بخل''، کیونکہ بخیل اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اسے اللہ کے بندوں کی فلاح پر خرچ نہیں کرتا، اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ سے یہی لوگ مراد ہیں۔دوسرے لوگ وہ ہیں جو، خود تو بخیل ہیں ہی، دوسروں کو بھی ''بخل'' پر اکساتے ہیں۔اس گروہ کا ذکر وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ میں کیا گیا ہے، اور تیسرا طبقہ جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو چھپاتا ہے تا کہ لوگوں کو اس سے فیض نہ پہنچے۔خواہ یہ نعمت علم ہو، نعمت دین یا نعمت مال ہو یا جیسے یہود توریت میں سے ''نعت ختم المرسلین'' کو چھپاتے تھے۔

وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ کے کلمات سے اشارتاً یہ بتایا کہ ان بخیل لوگوں کی یہ خصلتیں اسلام کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتیں بلکہ یہ کافرانہ اطوار ہیں اور ''کفران نعمت'' میں نہ تو کوئی شک ہے اور نہ اختلاف۔

ریا کاری کی مذمت

وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَآءَ النَّاسِ اور جو لوگ اپنا مال محض ریا کاری کرنے کے

لئے خرچ کرتے ہیں۔" اس آیت میں ریا کاری، شہرت طلبی اور نام ونمود کے لئے مال خرچ کرنے کی مذمت آئی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تو وہی انفاق مقبول اور اجرِ عظیم کا سبب ہے جو دنیوی نام ونمود سے بے نیاز ہو کر محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خرچ کیا جائے۔ یہ مقامِ اخلاص، مقامِ رضا اور مقامِ صدق ہے۔ جو لوگ مال دکھاوے اور نام ونمود کے لئے خرچ کرتے ہیں، ان کے بارے میں شبہ ہوتا ہے کہ شاید اللہ اور آخرت پر ان کا ایمان صادق وکامل نہیں ہے۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ کے کلمات سے یہ حقیقت بیان کی گئی ہے آخر ان پر کون سی مصیبت نازل ہو جاتی اگر یہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اس کی رضا کے لئے خرچ کرتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۞

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر کوئی نیکی ہوتی ہے تو اسے دگنا کر دیتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

مِثْقَالَ	تولنے کے اوزان، چیز کا وزن یا چیز کا ترازو، عرف میں مثقال ڈیڑھ درہم کا ہوتا ہے، یہاں مقدار کے معنی میں ہے
يُّضٰعِفْهَا	اسے دگنا کر دیتا ہے۔

تفسیر

معمولی نیکی کا بھی اجر ملے گا

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ...... "ذرہ" عربی زبان میں چیونٹی کی ادنیٰ ترین قسم کو بھی کہتے ہیں، ریت اور مٹی کے باریک ترین اجزاء بھی ذرات کہلاتے ہیں۔ اس سے انتہائی

قلیل وحقیر ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کسی کی معمولی سے معمولی نیکی کا بھی حساب رکھے گا اور اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں فرمائے گا، کیونکہ کسی کے حق میں کمی کرنا ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ظلم اور شائبہ ظلم سے پاک ہے۔

وَ اِنۡ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفۡهَا، ارشاد فرما کر یہ بتادیا کہ نیکی کو مٹا دینا یا نیکیوں میں کمی تو درکنار وہ تو نیکیوں کے اجر میں بے پناہ اضافہ فرمائے گا۔ جس کی مقدار اگرچہ متعین نہیں فرمائی گئی لیکن دس گنا سے لے کر لاکھوں گنا تک کی روایات موجود ہیں۔

فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ؁﴿۴۱﴾ يَوۡمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَعَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ ؕ وَ لَا يَكۡتُمُوۡنَ اللّٰهَ حَدِيۡثًا ﴿۴۲﴾

''وہ کیسی صورت حال ہوگی جب ہم لائیں گے ہر امت میں سے ایک گواہ اور (اے محبوب!) ہم آپ کو ان پر (نگران) گواہ بنا کر لائیں گے۔ اس دن تمنا کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی کہ کاش انہیں مٹی میں دبا کر اوپر سے زمین ہموار کر دی جائے، اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ	جب ہم ہر امت سے لائیں گے	شَهِيۡدًا	گواہ
يَوۡمَئِذٍ	آج کے دن	يَوَدُّ	چاہے گا، تمنا اور آرزو کرے گا
عَصَوُا	انہوں نے نافرمانی کی	لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ	کاش (انہیں پیوند زمین بنا کر) مٹی برابر کر دی جائے
لَا يَكۡتُمُوۡنَ	نہیں چھپائیں گے	حَدِيۡثًا	بات

تفسیر

حضور انبیاء پر شاہد ہوں گے

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ قرآن پڑھو، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم قرآن تو آپ پر نازل ہوا ہے آپ کے سامنے میں کیسے پڑھوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں پڑھو میں دوسرے سے سننا چاہتا ہوں۔ چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۃ النسآء کی تلاوت شروع کی اور جب وہ اس مقام پر پہنچے: فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا تو آپ نے فرمایا: ''بس کرو''۔ جب میں نے نظر اٹھا کر آپ کے چہرۂ انور کی طرف دیکھا تو آپ کی مبارک آنکھوں سے (تشکر کے) آنسو بہہ رہے تھے۔ مفسرین نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا منظر حضور اکرم ﷺ کی نظروں کے سامنے آ گیا، جب آپ اللہ کی عدالت میں تمام انبیاء کرام کے حق میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے تبلیغ کا حق ادا کیا ہے۔ تب کافر ناکام و نامراد، خائب و خاسر ہو کر یہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ پیوند خاک ہو جاتے اور یہ دن نہ دیکھنا پڑتا کیونکہ کسی بات کو چھپانا یا کسی حقیقت سے انکار اب ان کے بس کی بات نہیں ہوگی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٤٣﴾

''اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ تم کہتے ہو، اسے سمجھنے لگو، اور نہ ہی جنابت کی حالت میں غسل کئے بغیر (نماز پڑھو)

سوائے اس کے کہ تم حالت سفر میں ہو، اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آئے یا تم نے اپنی عورتوں سے قربت کی ہو، پھر (ایسی صورت میں) پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرلو، پس مسح کرو اپنے چہروں اور ہاتھوں کا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والا نہایت بخشنے والا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ	نماز کے قریب نہ جاؤ	سُكٰرٰى	سکران کی جمع، نشے کی حالت میں
عَابِرِيْ سَبِيْلٍ	راستے کو عبور کرنے والا، مسافر	مَّرْضٰٓى	بیمار، مریض کی جمع
الْغَآئِطِ	بیت الخلاء، قضائے حاجت کی جگہ	لٰمَسْتُمُ	تم نے مباشرت کی
فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً	تم نہ پاؤ پانی	فَتَيَمَّمُوْا	پس تیمم کرو
صَعِيْدًا	مٹی	طَيِّب	پاک
فَامْسَحُوْا	پس مسح کرو	بِوُجُوْهِكُمْ	اپنے چہروں کا، وجہ کی جمع
اَيْدِيْكُمْ	اپنے ہاتھوں کا، ید کی جمع	عَفُوًّا	معاف کرنے والا
غَفُوْرًا	بخشنے والا		

تفسیر

نماز کے ضمن میں شراب کی ممانعت کا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى..... "اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ"۔ اسلام میں بہت سے دیگر احکام کی طرح شراب کی

حرمت کا حکم بھی تدریجاً نازل ہوا ہے، کیونکہ اس زمانے میں شراب نوشی عام تھی، پہلے مرحلے میں نسبتاً نرم انداز میں بتایا کہ یہ ایک نقصان دہ چیز ہے، اس کا نقصان نفع کے بہ نسبت زیادہ ہے، اب اس دوسرے مرحلے پر اس میں ذرا شدت پیدا کی اور فرمایا کہ "نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ"، یعنی نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ اشارتاً یہ بھی بتا دیا کہ شراب عقل پر اثر انداز ہوتی ہے اور حالت نشہ میں آدمی اول فول بکنے لگتا ہے۔ لہٰذا جب تک شراب نوشی کے اثرات مکمل طور پر زائل نہ ہو جائیں، نماز نہ پڑھو، چنانچہ فرمایا: حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ یعنی تمہیں ٹھیک ٹھیک معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ یعنی نماز مکمل ہوش اور حضوریٔ قلب و دماغ (Presence of Mind) کے ساتھ پڑھنی چاہئے۔

ایک حدیث میں فرمان رسول ﷺ ہے۔ "کہ جب تم پر نماز میں نیند کا غلبہ ہو جائے تو جا کر سو جاؤ اور جب شدت نیند کی کیفیت ختم ہو جائے تو اٹھ کر نماز پڑھو۔" اس آیت کے نزول کے بعد مسلمانوں نے اوقات نماز کے قریب شراب نوشی کو ترک کر دیا۔ شراب کی حرمت کا قطعی حکم اس کے بعد سورہ مائدہ کی آیات ۹۱۔۹۰ میں نازل ہوا۔

حالت جنابت میں نماز کی ممانعت

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا۔ اور حالت جنابت میں غسل کئے بغیر نماز نہ پڑھو۔ سوائے اس کے کہ مسافر ہو، اور پانی دستیاب نہ ہو اس کا حکم آگے آ رہا ہے۔ جب یا جنابت اس حالت و کیفیت کو کہتے ہیں جس میں انسان شرعاً ناپاک ہوتا ہے اور غسل کے بغیر طہارت حاصل نہیں ہوتی، یہ کیفیت احتلام (خواب میں انزال) یا مباشرت سے پیدا ہوتی ہے۔

بعض مفسرین فقہاء نے لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ سے نفس نماز نہیں بلکہ موضع صلوٰۃ یعنی مسجد مراد لی ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ نشے اور جنابت کی حالت میں مسجد میں نہ جاؤ، سوائے اس کے کہ مسجد کے اندر سے راستہ عبور کرنا ہو۔ اس صورت میں امام شافعی کے نزدیک راستہ عبور کرنے کے لئے "جنبی" مسجد سے گزر سکتا ہے مگر وہاں ٹھہر نہیں سکتا۔ جبکہ امام اعظم

ابوحنیفہ کے نزدیک حالت جنابت میں مسجد میں داخل ہونا منع ہے۔ ہاں اگر کہیں یہ مجبوری لاحق ہو جائے کہ پانی تک پہنچنے کا راستہ مسجد ہی سے گزر کر جاتا ہے تو تیمم کر کے جائے۔

تیمّم کے احکام

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اس میں چند مسائل ہیں:

(۱) انسان بیمار ہو اور پانی کا استعمال طبی طور پر اس کے لئے نقصان دہ ہو، وہ مقیم ہو یا مسافر دونوں حالتوں میں وہ تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی کو ''جنابت'' لاحق ہو گئی، وہ شدید زخمی تھے، انہوں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا کروں؟ ساتھیوں نے اپنی فہم کے مطابق مشورہ دیا کہ غسل کرو، انہوں نے غسل تو کر لیا لیکن بعد میں اس کے نتیجے میں وفات پا گئے۔ رسول اکرم ﷺ کو یہ خبر ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''قَتَلُوْهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ'' یعنی ''ان پر خدا کی مار، انہوں نے تو اسے مار ہی ڈالا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ مریض کے لئے حالت جنابت میں تیمّم کرنا جائز ہے۔ لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ محض معمولی تکلیف سے بچنے کے لئے تیمم جائز نہیں ہے۔

(۲) اَوْ عَلٰى سَفَرٍ: مسافر کو اگر حالت جنابت میں غسل یا وضو کے لئے پانی دستیاب نہیں ہے تو اس کے لئے تیمّم کرنا جائز ہے۔

(۳) اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ: ''غائط'' پست جگہ کو کہتے ہیں، یہ ''بیت الخلاء'' یا ''مقام قضائے حاجت'' سے کنایہ ہے۔ کیونکہ کھلی بستیوں میں لوگ قضائے حاجت کے لئے پست جگہ تلاش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر نہ پڑے اور حیاء قائم رہے۔ اگر ''قضائے حاجت'' کر کے آیا ہے اور ''بے وضو'' ہو گیا مگر وضو کے لئے پانی دستیاب نہیں ہے تو تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔

لمس اور ملامسہ کے معنی

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ۔ یہ لمس سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: ''چھونا'' اور ''ملامسہ'' کے معنی ہیں ''ایک دوسرے کو چھونا۔'' امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ سے

''جماع'' مراد ہے اور یہاں ''لمس'' کنایۂ مباشرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی ''چھونا''۔ لہٰذا ان کے نزدیک مرد کے عورت کو محض چھونے سے دونوں کا وضو ٹوٹ جاتا ہے بشرطیکہ بیچ میں کپڑا حائل نہ ہو۔ ظاہریہ (یعنی غیر مقلدین) کے نزدیک لامس (چھونے والے) کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ملموس (جس کو چھوا گیا ہو) کا نہیں ٹوٹتا۔ امام مالک کے نزدیک اگر ''لمس'' شہوت کے ساتھ ہو تو دونوں کا ٹوٹ جاتا ہے ورنہ نہیں۔ بہرکیف جو بھی معنی مراد لئے جائیں بصورت ''لمس نساء'' تیمّم جائز ہے۔

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا...... : یعنی مندرجہ بالا صورتوں میں اگر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمّم کرلو۔ اگر محض اتنا پانی دستیاب ہے کہ وضو کرسکتا ہے مگر اس کی زیادہ ضرورت پینے کے لئے ہے یا قیمتاً دستیاب ہے لیکن خریدنے کی استطاعت نہیں ہے، تب بھی تیمّم کرسکتے ہیں۔

تیمّم کا طریقہ

تیمم کے لغوی معنی ہیں ''قصد کرنا''، ''صعید'' کے معنی ہیں ''مٹی یا سطحِ زمین''، ''طیب'' کے معنی ہیں ''پاک'' امام اعظم کے نزدیک چٹان یا پتھر پر ہاتھ مار کر بھی تیمّم ہوسکتا ہے جبکہ امام شافعی کے نزدیک مٹی پر ہاتھ مارنا ضروری ہے۔ امام اعظم'' امام شافعی، امام مالک اور اکثر فقہاء کے نزدیک زمین پر دونوں ہتھیلیوں کی دو ضربیں ماری جائیں گی، پہلی بار ہاتھ چہرے پر پھیر لئے جائیں گے اور دوسری بار کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں پر، جبکہ امام احمد اور غیر مقلدین حضرات کے نزدیک ایک ہی بار ہاتھ چہرے پر اور پھر دونوں ہاتھوں کی کلائیوں تک پھیر لینے کافی ہیں۔ یہ آیت غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی پر اس موقع پر نازل ہوئی جب حضرت عائشہ صدیقہ کا ہار گم ہوگیا تھا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ

مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۴۶

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (آسمانی) کتاب سے حصہ دیا گیا تھا، وہ گمراہی خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ راست سے بھٹک جاؤ۔ اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور تمہاری حمایت کے لئے کافی ہے اور تمہاری مدد کو (بھی) اللہ (ہی) کافی ہے۔ یہودیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کلمات (الٰہی) کو ان کے موقع ومحل سے پھیر دیتے ہیں، اور دین میں طعنہ زنی کی غرض سے اپنی زبانوں کو بل دے کر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا اور ''اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ'' اور ''رَاعِنَا'' اور اگر انہوں نے (اس کے بجائے) ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' اور ''اِسْمَعْ'' اور ''اُنْظُرْنَا'' کہا ہوتا تو ان کے لئے بہتر اور نہایت صحیح بات ہوتی، لیکن ان پر تو ان کے کفر کے سبب اللہ کی پھٹکار ہے، اس لئے وہ لوگ بہت کم ایمان لاتے ہیں''۔

مشکل الفاظ کے معانی

اَلَمْ تَرَ	کیا آپ نے نہیں دیکھا؟	اُوْتُوْا	دیا گیا
يَشْتَرُوْنَ	خریدتے ہیں	اَنْ تَضِلُّوْا	یہ کہ تم بھٹک جاؤ،
اَعْلَمُ	خوب جانتا ہے، بہت جانتا ہے	اَعْدَاءِ	''عدو'' کی جمع دشمن
كَفٰى	کافی ہوا	وَلِيٌّ	مددگار، کارساز
هَادُوْا	(جو) یہودی ہوئے	يُحَرِّفُوْنَ	پھیر دیتے ہیں
سَمِعْنَا	ہم نے سنا	اِسْمَعْ	سنو، سنئے

غَیۡرَ مُسۡمَعٍ	(تو) نہ سنوایا جائے	رَاعِنَا	ہماری رعایت کیجئے
لَیًّا	موڑنا	اَلۡسِنَۃٌ	لسانٌ کی جمع: زبان
لَیًّا بِاَلۡسِنَتِہِمۡ	اپنی زبانوں کو موڑ کر	انۡظُرۡنَا	ہمیں دیکھئے، ہماری طرف نگاہ (کرم) فرمائیے

تفسیر

کتاب کے ایک حصے سے مراد

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ...... یہاں سے یہود کا تذکرہ ہے کہ انہیں کتاب الٰہی (توریت) کا کچھ حصہ دیا گیا تھا۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ توریت ان کے پاس مکمل طور پر محفوظ نہیں تھی اور دوسرا یہ کہ کتابِ الٰہی پر وہ اپنے حسب منشا عمل کرتے تھے جو احکام انہیں پسند نہ ہوتے انہیں نظر انداز کر دیتے۔

گمراہی خریدنے کا مفہوم

یَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَۃَ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِیۡلَ یعنی ہدایت کے تمام تر مواقع اور اسباب کے ہوتے ہوئے وہ گمراہی اختیار کرتے تھے اور نہ صرف وہ خود گمراہ ہوتے بلکہ مسلمانوں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے۔ اور توریت میں جہاں جہاں ختم المرسلین محمد ﷺ کا ذکر اور نعت ملتی اسے مٹا دیتے یا چھپا دیتے، اسی بناء پر اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستحق قرار پائے۔

بارگاہِ رسالت میں ذو معنی الفاظ کی ممانعت

مِنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِہٖ...... یہود کی ایک اور بدترین خصلت یہ تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آکر بیٹھتے یا آپ سے مخاطب ہوتے تو زبانوں کو موڑ کر الفاظ کو اس انداز میں ادا کرتے کہ معنی کچھ کا کچھ ہو جاتا یا ذو معنی الفاظ استعمال

کرتے، اس اندازِ کلام کو "توریہ" اور "تعریض" کہتے ہیں۔

تعریض، توریہ، ایہام

ان کلمات کے لغوی معانی میں تھوڑا بہت تفاوت ہے، مثلاً "تعریض" کے معنی ہیں: "کسی پر ڈھال کر بات کرنا"، "توریہ" کے معنی ہیں: "چھپانا، حقیقت کو چھپانا"، اور "ایہام" کے معنی ہیں: "وہم میں پڑنا، وہم میں ڈالنا"، ان سب معانی میں جو مفہوم مشترک ہے، وہ یہ ہے: "ایسا کلام کرنا جس کی دلالت اپنے مفہوم پر صریح، واضح اور قطعی نہ ہو، یہ فقہی اور شرعی اصطلاحات ہیں۔

"توریہ" کا اصطلاحی معنی

اس سے مراد ایسا لفظ بولنا یا ایسا کلام کرنا، جس کے دو معنی ہوں۔ ایک "معنی قریب"، یعنی وہ جس کی طرف ذہن فوراً آسانی سے منتقل ہو جائے۔ اور دوسرا "معنی بعید"، یعنی وہ جس کی طرف ذہن آسانی کے ساتھ متوجہ نہ ہو، لیکن اس معنی بعید پر دلالت کرنے کے لئے کوئی خفی قرینہ موجود ہو۔ اور جب متکلم اس طرح کا ذو معنی لفظ بول کر مخاطب کو معنی قریب کا تاثر دے یا اس کے وہم میں ڈال دے اور خود بعید معنی مراد لے۔ کتاب وسنت میں اس کی گنجائش موجود ہے۔ "حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: معاریض (یعنی توریہ وکنایہ) میں جھوٹ سے بچنے کی گنجائش ہے"۔ اب رہا یہ سوال کہ انسان توریہ کیوں کرتا ہے اور اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس کے مواقع کئی ہیں، مثلاً:

(۱) مزاح اور خوش طبعی: "صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک شخص بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے سواری دے دیجئے، آپ نے فرمایا: میں تمہیں اونٹ کے بچے پر سوار کروں گا، اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم میں اونٹ کے بچے کا کیا کروں گا؟ آپ نے فرمایا: جو اونٹ پیدا ہوتا ہے، وہ اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے"۔

(۲) دفع شر کے لئے، مشہور واقعہ ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے زمانے میں انگریز پولیس ایک عالم کو گرفتار کرنے کے لئے اس کے ٹھکانے تک پہنچ گئی۔ لیکن وہ اس عالم کو شکل

وصورت سے نہیں جانتے تھے، اچانک ہی مطلوبہ عالم سے ان کا آمنا سامنا ہو گیا، انہوں نے ان سے پوچھا: آپ کو فلاں صاحب کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہیں؟ وہ جس مقام پر کھڑے تھے، وہاں سے دو چار قدم ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور اپنی سابقہ جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ کچھ دیر پہلے وہ یہاں تھے، اب یہاں نہیں ہیں۔ اس طرح صریح جھوٹ سے بھی بچ گئے اور جان بھی بچ گئی۔ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔

(۳) خبث باطن کو چھپانے کے لئے: یہ کہ کوئی منافق یا بے دین شخص اپنے خبث باطن کو چھپانے کے لئے، مسلمانوں سے اپنی نفرت وعداوت کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لئے توریہ کرے، جیسا کہ آیت نمبر ۴۶ میں یہودی منافقین کا تذکرہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اپنے بغض وعداوت کو چھپاتے ہوئے بعض ذو معنی الفاظ بولتے تھے یا نفرت کے کلمے کو آہستہ سے ادا کرتے تھے، قرآن نے ان کے اس مکر کو افشا کر دیا۔ یہ توریہ چونکہ باطل اور حرام مقصد کے لئے ہے، لہٰذا حرام ہے، بلکہ توہین رسالت کا باعث ہے، اس لئے یہ کفر و ارتداد ہے، اور ایسا کرنے والا منافق اور مرتد ہے۔ چنانچہ آیت میں ایسے تین کلمات کا ذکر ہے جو یہودی منافقین نبی کریم ﷺ کے سامنے بولتے اور اپنی دانست میں حضور ﷺ اور صحابہ کو دھوکے میں رکھتے، وہ الفاظ یہ ہیں:

(۱) سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا: سَمِعْنَا کے معنی ہیں "ہم نے سنا" اور عَصَيْنَا کے معنی ہیں "ہم نے نافرمانی کی" وہ سَمِعْنَا بلند آواز سے کہتے اور عَصَيْنَا آہستہ سے کہہ دیتے۔

(۲) اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ: اسْمَعْ کے معنی ہیں سنئے! غَيْرَ مُسْمَعٍ کے معنی ہیں "تو نہ سنوایا جائے۔" اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ "اے مخاطب! تو کوئی ناگوار اور ناپسندیدہ بات نہ سنے" یہ اچھے معنی ہیں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ "کہ تو نہ سن سکے، نہ سن پائے"۔ یہ معنی توہین آمیز ہیں بلکہ ایک لحاظ سے بددعا ہے۔ اور یہود یہ لفظ بول کر یہی ناپسندیدہ معنی مراد لیتے تھے۔

(۳) "راعنا" اس کے معنی ہیں "ہماری رعایت کیجئے"۔ یعنی یا رسول اللہ! یہ بات مکرر

ارشاد فرمائیے۔'' لیکن یہود زبان کو ذرا سا بل دے کر ''راعینا'' کہتے، جس کے معنی ہیں ''ہمارے چرواہے'' اس طرح یہ توہین کا کلمہ بن جاتا ہے۔ اور یا وہ اسے ''رعونت'' کے معنی میں استعمال کرتے جس کا مفہوم ہے ''بیوقوف، طیش میں آنے والا''، یہ معنی صریح توہین پر مبنی ہیں۔ قرآن نے ان مشتبہ مغالطہ آمیز اور توہین آمیز الفاظ کے استعمال کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ ان کے بجائے متبادل الفاظ استعمال کرتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور نہایت درست بات ہوتی۔ متبادل الفاظ یہ ہیں:

سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا کے بجائے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (ہم نے سنا اور تسلیم کیا)۔ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ کے بجائے صرف ''اسمع'' اور ''راعنا'' کے بجائے ''انظرنا'' یعنی توجہ فرمائیے، دوبارہ ارشاد فرمائیے۔

یہاں سے یہ قرآنی ضابطہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی لفظ کے ایک معنی صحیح بھی ہوں، شانِ رسالت کے مطابق ہوں اور کہنے والے کی نیت بھی صحیح ہو لیکن اس سے کوئی دور کے توہین آمیز معنی نکل سکتے ہوں، تو رسول اللہ ﷺ کی شان میں ایسے لفظ کا استعمال نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس کے متبادل ایسا لفظ استعمال کریں جس سے صرف اور صرف تعظیم و توقیر کے معنی ہی مراد لئے جاسکتے ہوں۔

مقاصد خیر کے لئے جھوٹ بولنے کی رخصت

شرعاً کذب حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ تاہم حدیث پاک میں بعض مواقع پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے اور وہ یہ ہیں:

(۱) یہ کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ اظہار محبت میں مبالغہ آرائی سے کام لیں۔

(۲) دو آدمیوں کے درمیان مصالحت کرانے اور اختلاف رفع کرنے کے لئے کسی ایک کی طرف خلاف واقعہ بات منسوب کی جائے تا کہ فریق مخالف کے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو اور وہ صلح پر آمادہ ہو جائے۔

(۳) جنگ کے موقع پر دشمن کو دھوکہ دیا جائے۔

لیکن ان مواقع پر بھی اگر صریح جھوٹ سے بچنے کے لئے ''توریہ'' اور ''کنایہ'' سے کام چل سکتا ہو تو بچنے کی کوشش کی جائے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس کے احکام تفصیل سے لکھے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

(۱) اگر کوئی نیک مقصد سچ بول کر بھی حاصل کیا جا سکتا ہو، تو اس کیلئے جھوٹ بولنا حرام ہے۔

(۲) اگر کوئی نیک مقصد، جسے حاصل کرنا واجب ہے، صرف جھوٹ بولنے سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہو تو بعض صورت میں جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے، مثلاً کوئی شخص کسی شخص کے تعاقب میں ہے، اسے ظلماً قتل کرنا چاہتا ہے یا اسے جانی و مالی نقصان پہنچانے کے درپے ہے اور آپ کو ظن غالب ہے کہ یہ اسے پا لینے کی صورت میں جو چاہتا ہے کر گزرے گا، ایسی صورت میں آپ کو اس کے ٹھکانے کا علم بھی ہو تو نہ بتائیں، توریہ سے کام لیں، اس سے بھی کام نہ چلے تو صریح جھوٹ بولنا بھی واجب ہے، کیونکہ انسانی جان کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔

(۳) اپنی جان و مال کے تحفظ کے لئے جھوٹ بولنا واجب نہیں ہے، عزیمت یہ ہے کہ نہ بولے، اس کی ہمت نہ ہو تو بدرجۂ مجبوری اجازت ہے۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

''اے اہل کتاب! اس (قرآن) پر ایمان لے آؤ جو کہ تمہارے پاس (پہلے سے) موجود کتاب کی تصدیق کرتا ہے، قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں، یا ہم ان پر اس طرح لعنت کریں جس طرح ہم نے ''اصحاب سبت'' پر لعنت کی تھی، اور اللہ کا حکم تو پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ بلاشبہ اللہ اس جرم کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ (جو گناہ ہیں) جس کے لئے چاہے معاف فرما دے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو اس نے

بہت بڑے گناہ کا بہتان تراشا''۔

مشکل الفاظ کے معانی

اُوْتُوا الْکِتٰبَ	کتاب دی گئی	بِمَا نَزَّلْنَا	جو ہم نے اتارا
مُصَدِّقً	تصدیق کرنے والا	مَعَکُمْ	تمہارے ساتھ
اَنْ نَّطْمِسَ	''نطمس'' کے معنی ہیں یہ کہ ہم مٹا دیں گے یہاں مراد چہرے کے نقوش مٹانا، ناک، آنکھیں، ابرو وغیرہ کو مٹانا	وُجُوْهًا	وجہ کی جمع، چہرے
فَنَرُدَّهَا	ہم پھیر دیں گے، لوٹا دیں گے	اَدْبَارِ	دبر کی جمع، مراد پشت
السَّبْتِ	ہفتے کا دن	لَا يَغْفِرُ	نہیں بخشتا
اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ	یہ کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے	لِمَنْ يَّشَآءُ	جس کے لئے چاہے
افْتَرٰى	بہتان باندھا	اِثْمًا عَظِيْمًا	بڑا گناہ

تفسیر

قرآن کے مصدق ہونے کا مفہوم

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ...... : اس آیت میں اہل کتاب کو دعوت دی گئی ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب ''قرآن مجید'' پر ایمان لے آؤ۔ کیونکہ قرآن اس کتاب کی بھی تصدیق کرتا ہے جو پہلے سے تمہارے پاس ہے یعنی توریت۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید توریت کی ان تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے جو تحریف سے محفوظ ہیں اور اپنی اصل شکل میں ہیں، جیسے اوصافِ خاتم الانبیاء وغیرہ۔

یہود کی ایک سزا چہروں کا بگاڑ

مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ یہ اللہ کی طرف سے اہل کتاب (یہود) کو وعید ہے کہ اگر وہ قرآن پر ایمان نہ لائے تو ان کے چہروں کے نقوش مٹا کر انہیں پیٹھ کی جانب پھیر دیا جائے گا۔ مفسرین کرام نے اس "طَمْسِ وُجُوْہ" یا مسخ صورت کے چند مصداق بیان کئے ہیں:

۱۔ یہ کہ ان کی ناک، آنکھیں، اور ابرو وغیرہ مٹا کر ان کا رخ پیٹھ کی جانب پھیر دیا جائے گا۔

۲۔ یہ کہ ان کے ساتھ یہ سلوک قیامت میں بطور سزا کیا جائے گا۔

۳۔ یہ کہ قیامت سے پہلے دنیا ہی میں یہود کو یہ سزا ملے گی۔

۴۔ یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں مدینہ طیبہ سے جلاوطن کر کے دوبارہ سینا کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔

۵۔ یہ کہ ان کے نقوش، خدوخال اور اعضاء جوارح ظاہراً تو قائم رہیں گے لیکن وہ قبولِ حق، عبرت اور ہدایت کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں گے۔

اَصْحٰبَ السَّبْتِ کا مفہوم

اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ "سبت" ہفتے کے دن کو کہتے ہیں۔ یہود کے لئے ہفتے کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ انہوں نے قانونِ الٰہی کو توڑنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے، مثلاً اپنے گھروں میں تالاب بنا لئے اور دریا سے نالیاں کھود کر ان تالابوں تک پہنچا دیں، جن کے ذریعے مچھلیاں آتی تھیں اور ہفتے کو بھی پکڑ لیتے تھے، یہ لوگ اَصْحٰبَ السَّبْتِ، "ہفتے والے" یعنی "ہفتے کے دن ممانعت شکار کے قانون کو توڑنے والے" کہلائے۔ ان کی صورتیں مسخ کر کے بندر بنا دیا گیا اور پھر کچھ وقت کے بعد وہ مر گئے، ان کا انجام یہود مدینہ کو یاد دلا کر انہیں متنبہ کیا گیا کہ کہیں تم بھی اللہ کی لعنت کا شکار نہ بن جاؤ۔

شرک نا قابل معافی ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ یعنی اللہ شرک کو کسی صورت میں بھی معاف نہیں فرماتا۔
شرک سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، افعال اور اسماء میں کسی کو شریک ماننا۔
اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو خالقِ حقیقی، معبودِ مطلق اور موثر بالذات ماننا۔ یہ سب سے بڑا جرم ہے اور اللہ کی بارگاہ میں نا قابل معافی ہے، کفر کا بھی یہی حکم ہے۔
وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ اور شرک وکفر کے علاوہ بندے کے جو بھی گناہ ہیں وہ قابل معافی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ ان کی بخشش اللہ پر لازم ہے بلکہ وہ قادرِ مطلق اور مالک ومختار ہے جسے چاہے معاف فرمادے اور جسے چاہے سزا دے دے۔
بعض کبیرہ گناہوں کی معافی کے لئے توبہ شرط ہے اور بعض کو وہ اپنے کرم سے معاف فرما دیتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ کَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ ؕ وَکَفٰی بِہٖۤ اِثْمًا مُّبِیْنًا ﴿۵۰﴾

"کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو بڑا پاک باز بتاتے ہیں، بلکہ (یہ تو) اللہ ہی ہے کہ جسے چاہے پاکباز بنادے، اور (ہاں یہ ضرور ہے کہ) ان پر کھجور کی گٹھلی کے باریک تار کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ دیکھئے تو سہی! وہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں، اور (ان کے لئے) یہی صریح گناہ ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ	اپنی پاکیزگی اور پارسائی بیان کرتے ہیں	یُزَکِّیْ	پاکیزہ کرتا ہے
فَتِیْل	کھجور کی گٹھلی کے درمیانی شگاف میں جو باریک سا تار ہوتا ہے، اسے فتیل کہتے ہیں یعنی بہت ہی معمولی چیز		

تفسیر

یہود کی خوش فہمیاں

یہود کو جب توحید اور اسلام کی دعوت دی جاتی تو وہ اپنی بزرگی، برتری اور پارسائی کے قصیدے پڑھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ:

نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ: یعنی ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔

لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی یعنی جنت میں تو بس یہودی جائیں گے یا نصاریٰ۔

لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً: ہم اگر بالفرض جہنم میں ڈال بھی دیئے گئے تو یہ محض چند دنوں کے لئے ہوگا۔ تو اس آیت مبارکہ میں بتایا گیا کہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پاکبازی، تزکیہ اور طہارت اللہ کا انعام ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ ہاں اگر بفرض محال تم میں ذرہ بھر بھی پارسائی ہوئی تو تم پر ظلم نہیں ہوگا۔ اس کا اجر ضرور ملے گا، لیکن حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ خود ہی اپنے آپ کو اللہ کا فرزند، محبوب اور جنت کا حق دار قرار دینا اللہ کی ذات پر کتنا بڑا بہتان ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں خود اپنی بڑائی اور تقدیس بیان کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایسے نام رکھنے سے بھی حضور اکرم ﷺ نے منع فرمایا جو تفاخر ذات پر دلالت کرتے ہوں۔ البتہ تحدیث نعمت اور تشکر نعمت کے طور پر اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرنا سعادت اور اجر کی بات ہے بشرطیکہ انسان پندارِ نفس اور فریبِ نفس میں مبتلا نہ ہو جائے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَ الطَّاغُوۡتِ وَ یَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ہٰۤؤُلَآءِ اَہۡدٰی مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِیۡلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ ؕ وَ مَنۡ یَّلۡعَنِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ نَصِیۡرًا ﴿ؕ۵۲﴾ اَمۡ لَہُمۡ نَصِیۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡکِ فَاِذًا لَّا یُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِیۡرًا ﴿ۙ۵۳﴾

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

’’کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جنہیں آسمانی کتاب میں سے حصہ دیا گیا، جو ایمان لاتے ہیں بت اور طاغوت پر، اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے بہ نسبت زیادہ راہ ہدایت پر ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت فرمائی اور جس پر اللہ لعنت فرمائے تو تم اس کے لئے ہرگز کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ کیا سلطنت میں ان کا کوئی حصہ ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگوں کو تل برابر بھی کوئی چیز نہ دیتے۔ یا یہ لوگوں سے اس بناء پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں (نعمت) عطا فرمائی ہے، تو بلاشبہ ہم نے (اس سے قبل) آل ابراہیم کو کتاب وحکمت دی اور انہیں عظیم الشان سلطنت عطا کی۔ تو ان میں سے بعض لوگ (تو) ان پر ایمان لائے اور بعض نے روگردانی کی اور (ان کے لئے) بھڑکتا ہوا دوزخ کافی ہے‘‘۔

مشکل الفاظ کے معانی

اَهْدٰى	زیادہ ہدایت یافتہ	فَلَنْ تَجِدَ	تو ہرگز نہیں پائے گا
نَصِيْرًا	مددگار	نَقِيْرًا	کھجور کی گٹھلی کا گڑھا
نَقْر فِى الْحَجَر	پتھر پر لکھنا	مِنْقَار	پرندے کی چونچ کو کہتے ہیں
صَدَّ عَنْهُ	اس سے منہ موڑا، اعراض کیا		

تفسیر

جبت اور طاغوت کے معنی

يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ۔ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ: ان کے متعدد معانی ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ یہ مشرکوں کے دو بت تھے۔

(۲) جبت اصل میں جبس تھا یعنی ایسی چیز جس میں کوئی خیر نہ ہو، حقیر چیز، اس کا اطلاق کاہن، ساحر، جوتش، رمل اور فال پر بھی ہوتا ہے۔

(۳) طاغوت جو کفر اور سرکشی میں حد سے بڑھ جائے۔

(۴) جبت سے مراد بت اور طاغوت سے مراد بتوں کے مجاور اور ترجمان وغیرہ۔

ایک روایت کے مطابق غزوۂ احد کے بعد یہودِ مدینہ کے دو سردار حیی بن اخطب، اور کعب بن اشرف قریش کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف بھڑکانے کے لئے مکہ گئے تھے۔ قریش نے کہا کہ تم محمد کے پاس سے آئے ہو، لہٰذا جب تک تم ہمارے بتوں کو سجدہ نہیں کرو گے، ہم تم پر اعتبار نہیں کریں گے، ان دونوں نے قریش کو خوش کرنے کے لئے اہل کتاب ہونے کے باوجود ان کے بتوں کو سجدہ کر دیا، اس لئے ان دونوں کا نام ''جبت وطاغوت'' پڑ گیا۔ پھر ان سے ابوسفیان نے پوچھا کہ ہم راہِ راست پر ہیں یا محمد، انہوں نے ان کو خوش کرنے کے لئے کہا کہ تم لوگ زیادہ راستی پر ہو۔ اسی پس منظر میں قرآن نے فرمایا کہ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب میں سے علم دیا گیا، وہ جبت و طاغوت پر ایمان لاتے ہیں اور کافروں سے کہتے ہیں کہ تم مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔ پھر قرآن نے فرمایا: کہ ''ان لوگوں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔''

قرآن کے ملعونین

''لعنت'' کے معنی ہیں ''اللہ کی رحمت سے محرومی'' قرآن میں جن لوگوں پر لعنت کی گئی ہے، ان میں چند یہ ہیں:

ا۔ ''حق'' کو چھپانے والے، جیسے علماء یہود اپنے مفادات کو جاری رکھنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔

۲۔رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچانے والے اور گستاخانِ رسول۔

۳۔ائمہ ضلالت وفساد (۴) کاذبین (۵) ظالمین (۶) یہود (۷) کفار ومشرکین

اس کے علاوہ احادیث مبارکہ میں سود خور، مصور، گودنے والی اور گودوانے والی، نامحرم پر بری نظر ڈالنے والا، منکر تقدیر، ظلماً اقتدار پر قابض ہونے والا، حرام کو حلال کرنے والا، ایسے مرد اور عورتیں جو صنف مخالف کی وضع اپنائیں وغیرہ پر بھی لعنت کی گئی ہے۔

شرعاً جب تک یہ امر متحقق نہ ہو کہ کسی شخص کی موت کفر پر ہوئی ہے، اس کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ ''وصف مذموم'' کی نسبت سے لعنت جائز ہے، جیسے چور، ظالم، زانی اور کافر پر لعنت وغیرہ۔

یہود کو سند حقانیت جاری کرنے کا حق نہیں

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ...... : اسلام دشمنی میں قریش مکہ کو ہدایت یافتہ قرار دینے والے یہودیوں کے لئے اللہ نے فرمایا کہ یہ خوش فہمی میں حق وباطل کی اسناد جاری کر رہے ہیں، اگر بادشاہت میں ان کا کچھ حصہ ہوتا تو کسی کو تل برابر بھی نہ دیتے۔

یہود حاسد ہیں

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ...... ان آیات میں بھی یہودیوں کا تذکرہ ہے کہ انہیں اس بات پر حسد اور جلن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نہ صرف مقام نبوت بلکہ خاتم الانبیاء کے منصب پر سرفراز فرمایا، انہیں اولین وآخرین کا امام بنایا اور ان کی امت کو ''امت وسط'' اور ''خیر الامم'' کا لقب عطا فرمایا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں جواباً فرمایا کہ اس نے آلِ ابراہیم یعنی بنی اسرائیل کو بھی کتاب وحکمت اور سلطنت عظیم عطا کی تھی لیکن یہ لوگ سب کے سب کبھی بھی ان پر ایمان نہیں لائے اور نہ ان کی حمایت کی۔ بلکہ انبیاء کو شہید کیا، اذیتیں پہنچائیں اور ان میں سے انبیاء پر ایمان لانے والے

ہمیشہ کم تعداد میں رہے۔ ''حسد'' کا معنی ومفہوم گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾

''بلاشبہ جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا ہم انہیں (جہنم کی) آگ میں جھونک دیں گے، جب بھی ان کی کھالیں (جل کر) پک جائیں گی، ہم ان کی جگہ دوسری کھالیں بدل دیں گے، تاکہ وہ (مسلسل) عذاب کا مزہ چکھتے رہیں، یقیناً اللہ غالب بڑی حکمت والا ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

نَضِجَتْ	پک جائیں گی	جُلُوْدًا	جلد کی جمع کھال

تفسیر

اہل جہنم کی جلد تبدیل کرنے کی حکمت

اس آیۂ مبارکہ میں کفار کی کیفیت عذاب اور شدتِ عذاب کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس بات پر بھی قادر ہے کہ ہر آن سارا جسم تبدیل ہوتا رہے اور اس پر بھی کہ کھال تبدیل کیے بغیر مسلسل عذاب میں مبتلا رکھے۔ لیکن غالباً ہر آن کھال تبدیل کرنے کی حکمت یہ ہے کہ انسان کے اعضاء میں حساسیت (Sensitivity) کا مادہ کھال میں سب سے زیادہ ہوتا ہے، کھال میں تکلیف کا اثر سب سے زیادہ اور فوری ہوتا ہے، اس لئے ان کی شدتِ عذاب کی کیفیت کو برقرار رکھنے کے لئے بار بار کھال کو تبدیل کیا جاتا رہے گا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، عنقریب ہم انہیں ایسے

باغات (بہشت) میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، وہاں ان کے لئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور ہم انہیں گھنی چھاؤں میں داخل کریں گے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

سَنُدْخِلُهُمْ	ہم عنقریب انہیں داخل کریں گے	جَنّٰتٍ	جنة کی جمع باغات
تَجْرِیْ	بہتی ہیں	الْاَنْهٰرُ	نہر کی جمع
مُّطَهَّرَةٌ	پاکیزہ	ظِلًّا	سایہ

تفسیر

جنتی بیویوں کے پاک ہونے کا مفہوم

اس آیہ مبارکہ میں مومنین صالحین کے لئے جنت کی ابدی اور لازوال نعمتوں کا تذکرہ ہے، جن میں پاک بیویاں بھی شامل ہیں۔ طہارت سے ایک تو معنوی طہارت اور حسن مراد ہے اور دوسرا یہ کہ دنیا میں بہ تقاضائے بشری اجسام پر جو زائد ناخن، بال، میل، پسینہ، بدبو، خارج ہونے والے فضلات، رطوبتیں، بلغم، خون وغیرہ ہوتے ہیں، ان سے وہ کلی طور پر پاک ہوں گی اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ حیض سے بھی پاک ہوں گی۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَاۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ﴿۵۸﴾

"بلاشبہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، اللہ تمہیں کیا ہی عمدہ نصیحت فرماتا ہے، یقیناً اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

اَنْ تُؤَدُّوا	یہ کہ تم ادا کرو	الْاَمٰنٰتِ	امانۃ کی جمع
نِعِمَّا يَعِظُكُمْ	کیا ہی عمدہ نصیحت فرماتا ہے		

تفسیر

شانِ نزول

اس آیت مبارکہ کا سبب نزول یہ ہے کہ عہد جاہلیت میں عثمان بن طلحہ کعبہ کے کلید بردار تھے، وہ پیر اور جمعرات کو بیت اللہ کا دروازہ کھولا کرتے تھے، ایک بار نبی کریم ﷺ نے ان سے چابی مانگی تو اس نے گستاخانہ لب ولہجے میں بات کی۔ آپ نے فرمایا: اے عثمان! ایک وقت آئے گا کہ یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا، عطا کروں گا۔ پھر رمضان المبارک ۸ھ کو مکہ فتح ہوا اور آپ فاتح کی حیثیت سے بیت اللہ میں داخل ہوئے، بیت اللہ کا دروازہ کھلوایا، بتوں سے اللہ کے گھر کو پاک کیا، عبادت کی، اس موقع پر حضرت عباس اور حضرت علی نے خواہش ظاہر کی کہ حجاج کی خدمت اور بیت اللہ کی تولیت بنی ہاشم کے پاس ہے، کنجی بھی انہیں عطا فرمائی جائے۔ آپ نے اس موقع پر آیۂ مبارکہ تلاوت فرمائی، عثمان بن طلحہ کو بلایا، کنجی ان کے حوالے کی اور فرمایا یہ ہمیشہ تمہارے خاندان میں رہے گی کوئی ظالم ہی تم سے چھینے گا۔

ادائے امانت کا مفہوم

''امانت'' کا ایک مفہوم تو بالکل عام فہم ہے کہ کوئی شخص کسی کے پاس کوئی چیز امانتاً رکھے اور جب ''صاحب امانت'' ''امین'' سے اپنی چیز واپس طلب کرے تو کسی تردد کے بغیر بعینہٖ وہ چیز اسے واپس کر دے۔ اور اگر کوئی اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لَآ اِیْمَانَ لِمَنْ لَّآ اَمَانَةَ لَهٗ'' جسے امانت کا پاس نہیں وہ درحقیقت صاحب ایمان ہی نہیں ہے۔ اور قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَالَّذِيْنَ

هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ اور (کامیاب وکامران صاحب ایمان وہ ہیں) جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی پاسداری کرتے ہیں"۔

مشورے میں امانت

اگر کوئی شخص کسی سے مشورہ طلب کرے کہ فلاں شخص کے ساتھ رشتہ کرنا، کاروباری شراکت کرنا، اس کے پڑوس میں مکان خریدنا یا اسے کوئی منصب تفویض کرنا مناسب ہے یا نہیں، تو اسے چاہئے کہ اپنی صحیح معلومات اور دیانت دارانہ رائے کے مطابق مشورہ دے تا کہ اس کے دینی بھائی کو لاعلمی کے سبب نقصان نہ پہنچے، اسی لئے ایسے موقع پر کسی کے بارے میں صحیح رائے دینا، خواہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، غیبت کے زمرے میں بھی نہیں آتا، چنانچہ فرمان رسول ہے: "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ" "جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ (قابل اعتماد اور) امانت دار ہوتا ہے۔"

مجلس میں امانت

بعض اوقات ایک مجلس میں دو یا زیادہ افراد بیٹھے ہوتے ہیں اور وہاں کسی ضرورت کے تحت کسی کے بارے میں رائے زنی ہوتی ہے، یہ رائے شرکاء مجلس کے پاس امانت ہے اور اس کا افشاء خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔ ارشادِ رسول ہے: "اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ": "مجلسیں امانت داری کے ساتھ ہونی چاہئیں۔"

تفویض مناصب میں امانت

حکومت کے مناصب اور عہدے بھی اللہ اور قوم کی امانت ہوتے ہیں۔ خاص طور پر "مناصب عدل" اور ایسے حکومتی عہدے جن سے عوام کے حقوق وابستہ ہوتے ہیں اور جن کے اختیار میں قوم کی دولت اور "بیت المال" ہوتا ہے، یا جن کے پاس قومی راز اور سلامتی و دفاع کے معاملات ہیں، الغرض ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ درجے، حتیٰ کہ سربراہِ مملکت وحکومت تک یہ تمام مناصب اہل اور امین افراد کو تفویض کئے جانے چاہئیں اور کوٹے کی بجائے

اہلیت و دیانت کو معیار بنانا چاہیے۔ رشوت لے کر، دھونس اور دباؤ میں آ کر، اثر و رسوخ یا سفارش کی بنیاد پر عہدے تفویض کرنا صریح خیانت ہے اور حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا: "اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ": یعنی جب قوم کی زمام کار اور اختیارات نااہلوں کو تفویض کر دیئے جائیں تو پھر قیامت کا انتظار کرو، نااہل اور خائن لوگ مظلوم اور بے بس و ناکس لوگوں پر وقت سے پہلے قیامت ڈھادیں گے۔

حقوق اللہ میں امانت

سب سے بڑی امانت تو یہ ہے کہ سجدہ بندگی اس کے حضور بجالائے جو اس کا حق دار ہے یعنی اللہ وحدہٗ لاشریک، زندگی کا ایک ایک سانس، اللہ کی عطا کردہ جسمانی، روحانی، علمی و عملی، ذہنی وفکری صلاحیتوں کو اس کی نعمت و امانت سمجھ کر اس کی اطاعت کرے، ایک لمحہ اور ایک قدم بھی اس کی معصیت میں صرف کرنا بہت بڑی خیانت ہے۔

حکومتی اور عدالتی فیصلوں میں عدل

منصب حکومت و عدالت بلاشبہ اعزاز بھی ہے اور امتحان بھی اور جنت و دوزخ کے درمیان پل صراط بھی، انصاف کے معاملے میں اپنے پرائے، مومن اور کافر میں فرق کی اجازت نہیں دی گئی، اس لئے "بین الناس" (لوگوں کے درمیان) فرمایا، "بین المومنین" (مومنوں کے درمیان) نہیں فرمایا۔ اس عنوان پر تفصیلی گفتگو آئندہ سطور میں آرہی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴿۵۹﴾

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے صاحبان اختیار ہیں، پھر اگر کسی مسئلے میں تمہارے درمیان تنازع پیدا ہو جائے تو اس (معاملے) کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم (واقعی)

اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر بات ہے اور اس کا انجام سب سے اچھا ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

اُولُو الْاَمْرِ	اصحاب اختیار و اقتدار	فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ	پس اگر تم جھگڑنے لگو
فَرُدُّوْهُ	پس اسے لوٹا دو	اَحْسَنُ	سب سے اچھا
تَاْوِيْلًا	انجام کار	اَطِيْعُوا	اطاعت کرو

تفسیر

اطاعت کی اقسام

اس آیہ مبارکہ میں ''اطاعت'' کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں:

(۱) اطاعت اللہ (۲) اطاعت الرسول (۳) اطاعت اولوالامر

پہلی دو اطاعتوں کے بیان کے لئے دونوں جگہ ''اَطِيْعُوا'' کا کلمہ مستقل اور صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جبکہ اُولِي الْاَمْرِ کے ساتھ ''اَطِيْعُوا'' کا کلمہ مستقل ذکر نہیں فرمایا بلکہ اسے اطاعت رسول کے تابع رکھ کر ذکر کیا۔

پہلی دو اطاعتیں مستقل اور غیر مشروط ہیں

اس اسلوب قرآنی اور اندازِ بیان سے علماء نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پہلی دو اطاعتیں یعنی (۱) اللہ کی اطاعت (۲) رسول کی اطاعت، مستقل اور غیر مشروط ہیں، ہر صورت میں نافذ العمل، لازمی اور قطعی ہیں اور ان میں کسی حیل و حجت اور چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن بھی ہر قسم کی غلطی اور شک وشبہ سے بالاتر ہے اور رسول اللہ ﷺ کی ذات بھی معصوم ہے، ان سے غلطی کا صادر ہونا خارج از امکان ہے۔ بلکہ درحقیقت رسول کی ذات ہی ''مرکز اطاعت'' ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا عرفان، معیار، مدار اور کسوٹی رسول ہی کا قول و فعل ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ

اللہ یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت کی، اور خود رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: "مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ" یعنی "جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے (دراصل) اللہ ہی کی نافرمانی کی۔"

اُولِی الْاَمْرِ کی اطاعت مشروط

پہلی دو اطاعتوں کے برعکس اُولِی الْاَمْرِ (یعنی اربابِ اختیار و اقتدار) کی اطاعت مشروط ہے۔ اگر ان کا حکم، حلال و حرام کے بارے میں، اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ہے تو اس کی اطاعت لازم ہے اور اگر وہ اللہ اور اس کے رسولِ مکرم ﷺ کے حکم سے متصادم ہے تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی بلکہ اس کی مخالفت لازم ہوگی، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ": یعنی کسی ایسے معاملے میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی جس میں خالق کی نافرمانی لازم آئے، خواہ وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا صاحب اقتدار و اختیار ہی کیوں نہ ہو، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اولین خطبۂ خلافت میں ارشاد فرمایا:

(ترجمہ): "جب تک میں اللہ اور اس کے رسولِ مکرم کی اطاعت پر کاربند رہوں، تم میری اطاعت کرنا اور اگر، خدانخواستہ میں اللہ اور اس کے رسولِ مکرم کی نافرمانی کروں، تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں ہے۔" یہ اسلام میں حاکم کی اطاعت اور حاکم کے دائرۂ اختیار کا اصل الاصول ہے۔ معاشرے میں زیادہ وسیع دائرہ "مباحات" کا ہوتا ہے یعنی ایسے امور جن کو شریعت نے حرمت کے دائرہ میں نہیں رکھا، بلکہ انہیں ہر دور کے صاحبانِ اقتدار کی صوابدید اور انسانی مصلحت و مفادِ عامہ کے لئے کھلا چھوڑا ہے، ایسے معاملات میں ہر دور کے تقاضوں کے مطابق، کتاب و سنت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون سازی کی جاسکتی ہے۔

تنازعات کے حل کا اصول

اس آیۂ مبارکہ میں قرآن نے یہ اصول بھی مقرر فرما دیا کہ اگر فرد اور حکومت یا افراد کے مابین از روئے شریعت کسی مسئلے کے جواز یا عدمِ جواز پر اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کے متفقہ حل کے لئے فائنل اتھارٹی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور وہ ہے اللہ جل شانہٗ اور اس کے رسولِ مکرم ﷺ کی ذات بابرکات یعنی کتاب وسنت۔ اور جس کی رائے ان کے مطابق ثابت ہوگی، اسے تسلیم کرلیا جائے گا اور جس کی رائے ان سے ٹکرائے گی اسے رد کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''انجام کار یہی بہترین حل ہے'' اس سے قیاس کا بھی جواز ثابت ہوتا ہے یعنی فرع کو اصل پر منطبق کر کے حکم وضع کرنا۔

اُولِی الْاَمْرِ کا مصداق

اُولِی الْاَمْرِ سے مراد مسلمانوں کا حاکم وقت یا ہر سطح پر اس کے مقرر کردہ عمال حکومت اور مجاز افراد ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عامۃ المسلمین کو وقت کے اربابِ اقتدار کی دین داری، دینی فہم، دینی شعور اور خدا ترسی پر اعتماد نہیں رہتا، ایسے حالات میں وہ قابل اعتماد، ثقہ علماء اور اربابِ فتویٰ سے رجوع کرتے ہیں، ایسی صورت حال میں وہ بھی اُولِی الْاَمْرِ کے مصداق ہوں گے۔ اسی طرح وہ ثالث، حَکَم اور غیر سرکاری منصف بھی مراد ہو سکتے ہیں جن پر اعتماد کر کے لوگ ان سے فیصلے کراتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۞ وَاِذَا قِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۞ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَاۗءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ڰ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۞ اُولٰۗىِٕكَ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ ۖ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا ﴿٦٦﴾ وَإِذًا لَآتَيْنَاهُمْ مِنْ لَدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٦٧﴾ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ﴿٦٨﴾ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ﴿٦٩﴾ ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا ﴿٧٠﴾

"کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ آپ پر نازل کی گئی (کتاب) اور آپ سے پہلے اتاری گئی (کتابوں) پر ایمان لائے (لیکن) چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصل کرانے کے لئے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں تو اس کے انکار کا حکم دیا گیا تھا، اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر (راہ راست سے) بہت دور لے جائے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے رسول کی طرف آؤ تو (اے محبوب!) آپ دیکھتے ہیں کہ منافق آپ سے منہ موڑ کر نکل جاتے ہیں۔ پھر کیسی (ڈھٹائی کی) بات ہے کہ جب ان پر ان کے کرتوتوں کی پاداش میں کوئی مصیبت آتی ہے تو پھر اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آپ کے پاس چلے آتے ہیں کہ (جناب!) ہم تو

صرف بھلائی اور موافقت چاہتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے دلوں کی ہر بات جانتا ہے، پس (اے حبیب!) آپ ان سے چشم پوشی فرمائیے اور انہیں نصیحت کیجئے اور ان سے ان کے بارے میں اثر آفریں بات کہئے۔ اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا صرف اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے، اور یہ لوگ جب اپنے آپ پر ظلم کر ہی بیٹھے تھے، تو اگر یہ آپ کے پاس چلے آتے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول کریم بھی ان کے لئے مغفرت طلب کرتے تو وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان پاتے۔ (اے محبوب!) آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ مومن ہو ہی نہیں سکتے، جب تک کہ یہ اپنے باہمی تنازعات میں آپ کو حاکم تسلیم نہ کریں، پھر آپ جو بھی فیصلہ کریں، اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی (اور ملال) محسوس نہ کریں اور اسے دل و جان سے تسلیم کرلیں۔ اور اگر ہم ان پر فرض کردیتے کہ اپنے آپ کو قتل کردو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ، تو ان میں سے تھوڑے ہی لوگ اس پر عمل کرتے اور اگر وہ وہی کرتے، جس کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور (یہ دین میں) زیادہ ثابت قدمی کا باعث ہوتا۔ اور اس صورت میں ہم انہیں اپنے پاس سے اجر عظیم عطا فرماتے۔ اور ہم لازماً انہیں سیدھی راہ پر گامزن کردیتے۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں تو وہ (آخرت میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین، اور یہ لوگ کیسے عمدہ ساتھی ہیں۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے اور اللہ ہی کا جاننا کافی ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

یَزْعُمُوْنَ	گمان کرتے ہیں، بزعم خویش، دعویٰ کرتے ہیں	اَنْ يَّتَحَا كَمُوْا	یہ کہ فیصلہ کرائیں
قَدْ اُمِرُوْا	انہیں حکم دیا گیا ہے	تَعَالَوْا	آؤ

يَصُدُّوْنَ	آپ سے منہ موڑتے ہیں	اَصَابَتْهُمْ	انہیں کوئی مصیبت
عَنْكَ		مُّصِيْبَةٌ	پہنچتی ہے
بِمَاقَدَّمَتْ	جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے	ثُمَّ جَآءُوْكَ	پھر وہ آپ کے پاس
اَيْدِيْهِمْ	آگے بھیجا یا جو ان کے کرتوت ہیں		آتے ہیں
يَحْلِفُوْنَ	اللہ کی قسم کھاتے ہیں	اِنْ اَرَدْنَآ	ہم نے ارادہ نہیں کیا
بِاللّٰهِ			
تَوْفِيْق	موافقت پیدا کرنا	اَعْرِضْ	ان سے درگزر کیجئے،
		عَنْهُمْ	چشم پوشی کیجئے
عِظْهُمْ	انہیں نصیحت کیجئے	قَوْلًا بَلِيْغًا	پراثر کلام
لِيُطَاعَ	تاکہ اطاعت کی جائے	اِذْ ظَّلَمُوْٓا	جب انہوں نے ظلم کیا
فَاسْتَغْفَرُوا	وہ اللہ سے بخشش مانگتے	لَوَجَدُوا اللّٰهَ	وہ ضرور اللہ کو پاتے
اللّٰهَ			
وَرَبِّكَ	تیرے رب کی قسم	فِيْمَا شَجَرَ	جو جھگڑے ان کے
		بَيْنَهُمْ	درمیان پیدا ہوں
لَايَجِدُوْا	وہ نہ پائیں	حَرَج	تنگی، ملال
مِّمَّا قَضَيْتَ	جو آپ نے فیصلہ کیا	وَيُسَلِّمُوْا	اور تسلیم کریں
وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا	اگر ہم ان پر فرض کرتے	اُقْتُلُوْٓا	اپنے آپ کو قتل کرو
عَلَيْهِمْ		اَنْفُسَكُمْ	
اُخْرُجُوْا	نکلو	دِيَارِ	دار کی جمع گھر
مَّا فَعَلُوْهُ	انہوں نے نہیں کیا	مَا يُوْعَظُوْنَ	جس بات کی انہیں
		بِهٖ	نصیحت کی جاتی ہے
تَثْبِيْت	ثابت قدم رکھنا، جمائے رکھنا	لَدُنْ	پاس، نزدیک

أَنْعَمَ اللّٰهُ	اللہ نے انعام کیا	حَسُنَ	کیا ہی اچھا ہے

تفسیر

مندرجہ بالا گیارہ آیات (۶۰ تا ۷۰) کا مضمون تقریباً باہم مربوط ہے اور اسے صحیح طریقے سے سمجھنے کے لئے اس ربط کا ذہن نشین ہونا ضروری ہے، اسی لئے ہم نے انہیں ایک ساتھ درج کیا ہے، ان کا پس منظر اور سبب نزول بھی مشترک ہے، چنانچہ ہم سبب نزول مختصراً بیان کرنے کے بعد متعلقہ آیات کی بحوالہ نمبر الگ الگ تشریح کریں گے۔

سبب نزول

ہجرت کے بعد جب رسولِ اکرم ﷺ نے مدینہ طیبہ کو اپنے قیام سے شرف بخشا، تو جو ابتدائی اقدامات آپ نے کیئے، ان میں مہاجرین وانصار کے درمیان مؤاخات، اور اہل مدینہ کے ساتھ ''پہلے مدنی دستور'' کا معاہدہ تھا، جس کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ اہل مدینہ کے مابین جو بھی تنازعات اور مقدمات ہوں گے، ان کا فیصلہ نبی کریم ﷺ کریں گے۔ یعنی آپ کو منصف اور حاکم تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مہاجرین کے علاوہ مدینہ کے قدیم باشندوں میں دو بڑے قبیلے انصار کے تھے، یعنی اوس اور خزرج، اور تین قبیلے یہود کے تھے یعنی بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنو قینقاع، مدینہ کے جو لوگ اسلام لائے تھے، ان میں سے اکثر تو مؤمنین مخلصین تھے اور انہوں نے تاریخ میں وفا، ایثار، استقامت اور بارگاہِ رسالت میں جاں نثاری کے لازوال نقوش ثبت کئے ہیں، لیکن کچھ منافقین بھی تھے، جن کا سردار عبداللہ بن ابی تھا، یہ لوگ کلمہ پڑھ کر مسلمانوں کی صفوں میں شامل بھی رہتے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور دشمنوں سے خفیہ سازشوں کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

چنانچہ بشر نامی ایک بظاہر کلمہ گو اور در پردہ منافق، کا ایک یہودی سے کوئی جھگڑا ہو گیا، یہودی نے کہا چلو حضرت محمد (ﷺ) سے فیصلہ کراتے ہیں، وہ کافر ہونے کے باوجود جانتا تھا کہ آپ مقدمے کے حقائق وواقعات کو دیکھ کر مکمل غیر جانبداری کے ساتھ منصفانہ فیصلہ کرتے ہیں اور اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرتے۔ اس کے برعکس ''بشر'' نے کہا: ''کعب بن

اشرف'' سے فیصلہ کراتے ہیں، یہ رشوت خور تھا، اور دشمنِ رسول تھا، یہودی علماء میں سے تھا اور قرآن نے اسے ''طاغوت'' یعنی سرکش شیطان کے نام سے پکارا ہے۔ تاہم یہودی کے اصرار پر مقدمہ نبی کریم ﷺ کے حضور پیش ہوا اور آپ نے حقائق کی روشنی میں یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ ''بشر'' اس فیصلے پر مطمئن نہ ہوا اور اصرار کر کے یہودی کو آمادہ کر لیا کہ چلو عمر سے فیصلہ کراتے ہیں۔ اس کا خیال یہ تھا کہ عمر، اسلام کے بارے میں سخت ہیں، دشمنِ مصطفیٰ کوئی بھی ہو، انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا، اس لئے شاید جانبداری کر کے میرے حق میں فیصلہ دے دیں۔

حضرت عمر جب باہر آئے، فریقین نے آمد کا مقصد بیان کیا، انہوں نے کہا تم فیصلہ کرانے حضور ﷺ کے پاس کیوں نہیں گئے، بشر نے کہا: گئے تو تھے لیکن ان کا فیصلہ ہمیں پسند نہیں آیا، اس پر آپ اندر گئے، کھلی تلوار لے آئے اور بشر کا سر قلم کر دیا اور فرمایا: ''هٰذَا قَضَائِي بِمَنْ لَّمْ يَرْضِ بِقَضَآءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ'' یعنی جو اللہ کے رسول کے فیصلے پر راضی نہیں، اس کے بارے میں میرا فیصلہ یہ ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تائید

اس پر ایک تو مدینہ طیبہ میں کہرام مچ گیا کہ عمر نے ایک کلمہ گو مسلمان کو قتل کر دیا ہے، اور بشر کے قبیلے والے بھی اپنا مقدمہ لے کر حضور ﷺ کے پاس چلے گئے، آپ نے فرمایا کہ: ''مجھے یقین ہے کہ عمر کی تلوار کسی مومن کی گردن پر نہیں چل سکتی۔'' چنانچہ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں، جس سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ بشر مومن نہیں تھا، منافق تھا اور آیت نمبر ۶۵ میں یہ واضح فیصلہ صادر کر دیا گیا کہ جو اللہ کے رسول کو حکم اور حاکم نہ مانے یا جسے آپ کے فیصلے پر ذرا سا بھی دل میں ملال ہو، وہ ہزار ایمان کا دعویٰ کرے، کلمہ پڑھے، وہ مومن ہو ہی نہیں سکتا۔ سیرت عمر کی یہی امتیازی شان تھی جس کی بناء پر انہیں بارگاہِ رسالت سے ''فاروق'' کا لقب عطا ہوا تھا، جس کے معنی ہیں ''حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا''۔ یعنی جو حق اور باطل کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ اس تمہید کے بعد ہم متعلقہ

آیات کی ضروری تشریح کریں گے۔

منافقین کا طرزِ عمل

آیت نمبر ۶۰ میں بتایا گیا کہ یہ لوگ بزعم خویش یہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم قرآن اور تورات پر ایمان لائے ہیں، لیکن پھر کیا سبب ہے کہ وہ اپنے مقدمات کا فیصلہ کرانے کے لئے ''طاغوت'' کے پاس جاتے ہیں حالانکہ انہیں تو اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے۔ ''طاغوت'' سے مراد شیطان بھی ہے اور ''کعب بن اشرف'' یہودی بھی اپنے تمرد اور سرکشی کی وجہ سے اس کا مصداق تھا۔ اور اس لئے کہ وہ شیطان کی پیروی ہی میں ایسے لوگوں کے پاس جاتے تھے۔

آیت نمبر ۶۱ میں بتایا کہ انہیں جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب (قرآن) اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اپنے مقدمات میں رجوع کرو، تو وہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ دراصل منافقین کا وطیرہ یہ تھا کہ جس مسئلے میں انہیں امید ہوتی کہ ان کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا، وہ اسے حضور کے پاس لے جاتے، لیکن جہاں انہیں احساس ہوتا کہ وہ حق پر نہیں ہیں، وہاں حیلے بہانوں سے کسی ایسے شخص کو حاکم بنانے پر اصرار کرتے، جس کے بارے میں انہیں یقین ہوتا کہ ہم اس سے رشوت، سفارش، اثر ورسوخ یا کسی تدبیر سے اپنے حق میں فیصلہ کرا لیں گے۔

آیت نمبر ۶۲ میں بتایا گیا کہ جب اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی، تو پھر حضور کے پاس آتے اور اللہ کے نام کی جھوٹی قسمیں کھا کر یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ ہم جو دوسری جگہ فیصلہ کرانے گئے تھے، بدنیتی کی بناء پر نہیں بلکہ مسئلہ سلجھانے کی غرض سے گئے تھے، جیسے بشر کے قتل کا واقعہ ہوا۔ اسی طرح غزوۂ بنی مصطلق کے بعد سورہ ''منافقون'' نازل ہوئی اور منافقین کا پردہ چاک کیا گیا تو وہ اپنی صفائی اور وضاحت پیش کرنے لگے۔

آیت نمبر ۶۳ میں اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ ان کا نفاق تو عیاں ہو چکا ہے، لیکن ابھی

مصلحت وحکمت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ان کی دسیسہ کاریوں پر بدستور چشم پوشی کریں، اتمام حجت کے لئے انہیں سمجھاتے رہیں اور دعوتِ حق میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔

آیت نمبر ۶۴ کا مضمون انتہائی ایمان افروز ہے، اللہ تعالیٰ نے قطعی فیصلہ فرمادیا کہ رسول کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، وہ ''مطاعِ مطلق'' ہوتا ہے، اس کے احکام کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عصمت نبوت کی دلیل

مفسرین کرام نے اس آیت سے ''عصمت نبوت'' پر استدلال کیا ہے۔ امام المفسرین امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ رسول جب ''مطاع مطلق'' (یعنی غیر مشروط طور پر واجب الاتباع) ہے تو ان کے ہر قول وفعل کی اطاعت لازم ہے، لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر حال میں رسول سے معصیت کا صدور ناممکن ہے، کیونکہ اگر رسول سے معصیت کا صدور ممکن مان لیا جائے تو امت پر اس کی اتباع بھی لازم آجائے گی، اس لئے کہ رسول کے ہر قول وفعل کی پیروی بلا استثنا لازم ہے، اس طرح معصیت پر عمل لازم آجائے گا، حالانکہ معصیت پر عمل حرام ہے۔ اور ایک ہی فعل کا وجوب اور حرمت دونوں جمع نہیں ہو سکے۔ لہٰذا نبی کی ذات ہر حال میں معصیت سے پاک ہے۔

استغفار کے لئے وسیلہ رسول

اس آیت کے دوسرے حصے میں قرآن نے یہ تعلیم دی کہ اگر وہ معصیت کا ارتکاب کر کے یارسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کعب بن اشرف یا ابو برزہ کو حکم بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کر چکے تو پھر بھی ان کے لئے نجات کی ایک صورت باقی تھی کہ وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر، اللہ کے رسول کو وسیلہ بنا کر اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے اور رحمۃ للعالمین ﷺ بھی ازراہِ لطف وکرم ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے تو بلا شبہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی مغفرت سے نواز دیتا۔

بعد از وصال وسیلۂ نجات

مفسرین کرام نے اس مقام پر لکھا ہے کہ جس طرح حضور اکرم ﷺ کی ذات اپنی حیات ظاہری میں وسیلۂ نجات و مغفرت تھی، اسی طرح بعد از وصال بھی آپ وسیلۂ نجات ہیں، چنانچہ تفسیر قرطبی اور معارف القرآن میں بحرِ محیط کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت درج ہے کہ حضور انور ﷺ کے وصال کے تین دن کے بعد ایک اعرابی آپ کی قبرِ انور پر حاضر ہوا، روضۂ انور کی مٹی اپنے سر پر ڈال کر زار و قطار رونے لگا اور یہ آیت پڑھ کر عرض کیا کہ اللہ کے حکم کے مطابق میں آپ کے در پر حاضر ہو گیا ہوں، آپ دعا کیجئے کہ میرے گناہ معاف ہو جائیں، چنانچہ قبرِ انور سے آواز آئی کہ "قَدْ غُفِرَ لَکَ" یعنی تمہیں بخش دیا گیا۔

رسول کا فیصلہ دل سے ماننا ضروری ہے

آیت ۶۵ کا مضمون ہم سببِ نزول میں بیان کر چکے ہیں کہ جو لوگ آپس کے مقدمات میں اللہ کے رسول کو حاکم مجاز نہ مانیں، وہ کلمہ پڑھنے کے باوجود مومن نہیں ہو سکتے، منافق ہیں، اور پھر رسول جو فیصلہ فرما دیں وہ قانوناً تو نافذ ہو ہی جاتا ہے، اسے دل کی گہرائیوں سے بھی ماننا ضروری ہے، اگر اس پر دل میں ذرہ بھر بھی رنج و ملال ہوا تو ایمان سے محروم ہو جاؤ گے۔

مخلص مومنوں کی شان

آیت نمبر ۶۶ تا ۶۸ کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ یہود نے مسلمانوں پر طعن کیا کہ ہم نے اپنے نبی کی نافرمانی کی تو توبہ کے لئے اپنے ہاتھوں اپنے ہزاروں افراد کو قتل کیا، جب کہ تم لوگ اپنے نبی کا فیصلہ ماننے کے لئے تیار نہیں، اس پر اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ مخلص مومن، خواہ قلیل تعداد ہی میں کیوں نہ ہوں، اگر ہم انہیں اپنے آپ کو قتل کرنے یا گھروں سے نکلنے کا حکم دے دیں تو وہ کر گزریں گے، یہ تو منافق لوگ تھے جو نبی کے فیصلے پر

راضی نہ ہوئے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اگر یہ نبی کے حکم پر عمل کرتے تو ہم انہیں اجرِ عظیم سے نوازتے اور صراطِ مستقیم پر گامزن کردیتے''۔ اس موقع پر بعض صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم اگر ارشاد ہوتو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جانوں کا نذرانہ پیش کردیں، ان میں حضرتِ ابوبکر صدیق، حضرتِ عمر فاروق، حضرتِ عبداللہ بن مسعود، ثابت بن قیس اور بعض دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نام مذکور ہیں، جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کے دلوں میں ایمان ایسے جما ہوا ہے جیسے زمین میں پہاڑ۔

رسول کی غیر مشروط اطاعت کا انعام

آیات ۶۹۔ ۷۰ میں اللہ تعالیٰ نے ان خوش نصیبوں کے اخروی اجر و انعام کا ذکر فرمایا ہے، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی غیر مشروط اور مخلصانہ اطاعت پر قائم و دائم ہیں کہ انہیں جنت میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے قرب و رفاقت سے نوازا جائے گا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان اور بعض صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم ہمیں آپ کا دیدار کئے بغیر چین نہیں آتا، آخرت میں اگر ہم آپ سے بچھڑ گئے، دور ہوگئے تو یہ لمحات فراق کیسے کٹیں گے، ان کی تسلی و تشفی کے لئے یہ آیات نازل ہوئیں کہ جنت میں غلامانِ مصطفیٰ علی صاحبہم وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو دیدار نصیب ہوگا۔

صدیق

صدیقیت، نبوت کے بعد سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے اور امت خاتم الانبیاء کے صدیق بالاجماع حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جنہوں نے اعلانِ نبوت اور معراج سے لے کر ہر مرحلے پر سب سے پہلے آپ کی تصدیق کی۔

شہید

شہید کے معنی گواہ کے ہیں، یعنی شہید کا حال اس کے کمالِ ایمان کا گواہ ہوتا ہے،

''شہید'' کے ایک معنی حاضر و موجود کے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب شہید، اپنی جان عزیز، اللہ کی راہ میں قربان کرتا ہے تو فرشتے اس کی روح کے استقبال کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور یہ کہ رشتۂ جان منقطع ہوتے ہی اس کی روح ''جنت'' میں حاضر و موجود ہوتی ہے۔

صالح

اس سے مراد یہ ہے کہ جو اعمال و عقائد دونوں میں صالح ہو، جس کی ذات ایمان کامل اور عمل صالح کی مجسم تصویر ہو اور جسے دیکھ کر خدا یاد آ جائے، یہ مقام ولایت ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿٧١﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿٧٢﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧٣﴾

''اے ایمان والو! (دشمن کے مقابلے میں) اپنے بچاؤ کی تدبیر کرو، پھر چاہے دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔ اور بلاشبہ تم میں کوئی (گروہ) ایسا بھی ہے جو (جہاد کے لئے نکلنے میں) ضرور دیر لگائے گا، پھر اگر تمہیں کوئی مصیبت آ پہنچے، تو وہ کہے گا کہ مجھ پر اللہ نے بڑا انعام کیا کہ میں ان کے ساتھ (میدان جنگ میں) موجود نہ تھا۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل ہو جائے تو وہ ضرور کہے گا، اے کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا، تو بڑی کامیابی حاصل کرتا، گویا تمہارے اور اس کے درمیان کوئی دوستی نہ تھی''۔

مشکل الفاظ کے معانی

خُذُوْا اخذ یا خذ سے امر۔ لو اَخَذَ حِذْرَهٗ کسی خوفناک چیز سے ہوشیار اور چوکنا ہونا

فَانفِرُوْا:	جنگ کے لئے نکل کھڑے ہونا	ثُبَات	ثبۃ واحد گروہ، جماعت
نفَر نفِيْرا و نُفُورًا لِلْقِتَال			
ثبۃ	گروہ، جماعت	لَّيُبَطِّئَنَّ	ضرور دیر کرے گا
بُطُوْء	دیر لگانا	مَوَدَّةٌ	ودیود: سے، محبت
يٰلَيْتَنِيْ	کاش کہ میں	فَاَفُوْزَ	میں کامیاب رہوں گا
فَوْزًا	کامیابی		

تفسیر

جہاد کے لئے تیار رہنے کا حکم

یہاں سے جہاد کی ضرورت اور اس سے متعلق امور پر گفتگو شروع ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے تو فرمایا کہ خُذُوْا حِذْرَكُمْ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ دشمن کے مقابلے میں ہوشیار رہو، اور دوسرے معنی ہیں دشمن کے مقابلے کے لئے اسلحہ اور ضروری ساز و سامان تیار رکھو۔ اور جب ضرورت پڑے تو موقع کی مناسبت سے چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں یا بڑے لشکر کی صورت میں نکل کھڑے ہو۔ "نفیر" جہاد کے لئے اعلان عام کو کہتے ہیں جس طرح آج کل فوجیوں کی تعداد کے اعتبار سے کمپنی، پلاٹون اور ڈویژن یا کور کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں، اس طرح عہدِ رسالت میں سریہ، منسر، جحفل، وغیرہ اصطلاحات رائج تھیں۔ عام طور پر لشکر کو کتیبہ اور "جیش" کہتے ہیں۔

منافقین کا دہرا طرزِ عمل

اس کے بعد منافقین کا تذکرہ ہے کہ جب مدنی زندگی کے ابتدائی برسوں میں کوئی لشکر یا دستہ روانہ کیا جاتا تو منافقین طرح طرح کے حیلے بہانوں سے روانگی میں تاخیر کر دیتے اور پیچھے رہ جاتے۔ اگر اس مہم میں مجاہدین کو نقصان اٹھانا پڑتا تو یہ منافق خوشی کے شادیانے

بجاتے اور کہتے کہ اللہ نے ہم پر بڑا اکرم کیا کہ ہم اس موقع پر ساتھ نہیں گئے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت سے مجاہدین کو کفار کے مقابلے میں فتح حاصل ہوتی، مالِ غنیمت ہاتھ آتا، تو یہ منافق کفِ افسوس ملتے اور کہتے کہ کاش ہم ان کے ساتھ ہوتے اور بہت بڑی کامیابی کے ثمرات میں حصے دار ہوتے۔ لیکن یہ اظہار تاسف مسلمانوں سے ہمدردی ومحبت کی بناء پر نہیں بلکہ طمع وحرص کی بناء پر ہوتا ہے۔

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

''پس ان لوگوں کو اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے جو آخرت کے عوض دنیا کی زندگی فروخت کر چکے ہیں، اور جو اللہ کی راہ میں لڑے، پھر خواہ وہ مارا جائے، یا (دشمن پر) غلبہ پالے، (دونوں صورتوں میں) عنقریب ہم اسے بہت بڑے اجر سے نوازیں گے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

فَلْيُقَاتِلْ	چاہئے کہ لڑیں
يَشْرُونَ	''شراء'' خرید و فروخت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یہاں فروخت کے معنی میں ہے
فَسَوْفَ	عنقریب ہم اسے
نُؤْتِيْهِ	دیں گے

تفسیر

بیعت کا مفہوم

اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا جا رہا ہے۔ کیونکہ ''بیعت اسلام'' کا مطلب یہی ہے کہ بندۂ مومن دنیا کی راحتوں، آسائشوں اور لذتوں کو راہ حق میں قربان

کرنے کا عہد کر کے، آخرت کی ابدی اور دائمی نعمتوں کو خرید چکا ہے، اب اس کی جان، مال اور سب کچھ اللہ کی نذر ہے۔ وہ جب جہاد کے لئے نکلتا ہے تو یہ سمجھ کر کہ اس کا مطمحِ نظر دین کی سربلندی اور آخرت کی کامرانی ہے۔ وہ اسے دنیوی نفع نقصان کے پیمانوں سے نہیں ناپتا، کیونکہ یہ تو ایسا مشن ہے کہ ہارے بھی تو بازی مات نہیں، بقول علامہ اقبال ؎

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا ﴿٧٥﴾

"اور (مسلمانو!) آخرتم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں نہیں لڑتے حالانکہ کمزور بے بس مرد، عورتیں اور بچے (مظالم سے عاجز آکر) یہ فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال، جس کے لوگ ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارے لئے کوئی حامی اور مددگار بنا"۔

مشکل الفاظ کے معانی

اَلْمُسْتَضْعَفِيْنَ	عاجز و بے بس، پسے ہوئے لوگ	اَلْقَرْيَةِ	بستی
وَلِيّ	دوست، حامی	نَصِيْرًا	مددگار

تفسیر

مظلوموں اور بے بسوں کی دستگیری امت کا فریضہ ہے: جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کے ہمراہ مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو بہت سے ایسے مسلمان مکے میں رہ گئے جو ہجرت کرنے کے قابل نہیں تھے، یہ کمزور و بے بس لوگ تھے، یہ مرد، عورتیں اور بچے مسلسل

مشرکین مکہ کے مظالم کا شکار تھے، یہ لوگ اللہ کی بارگاہ میں دعائیں اور فریاد کرتے کہ بارِ الہا! یا تو ان ظالموں کی بستی مکے سے، ہمارے نکلنے کی کوئی صورت مقدر فرما اور یا ہمارے لئے اپنی بارگاہِ عالیہ سے کوئی حامی و مددگار بنا کر بھیج، آخر کار ان مظلوموں کی آہوں نے اثر کر دکھایا اور ۸ ھ کو دس ہزار صحابہ کرام کی معیت میں نبی کریم ﷺ فاتح بن کر مکے میں داخل ہوئے۔ اللہ کے پیارے حبیب ان کے ولی بن کر وارد ہوئے اور آپ نے حضرت عتاب بن اسید کو ان پر امیر مقرر کیا تا کہ ظالموں کی دست درازی سے مظلوموں کو نجات دلائیں۔ حضرت ابن عباس، ان کی والدہ، ابو جندل، سلمہ، ولید بن ہشام رضی اللہ عنہم انہیں مظلومین میں شامل تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مظلوم لوگوں کی دستگیری کرنا اور ظالموں کی سرکوبی کرنا، امت مسلمہ کا دینی فریضہ ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾

''جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں، تو (اے مسلمانو!) شیطان کے حامیوں سے لڑو، بلاشبہ شیطان کا مکر کمزور ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

كَیْدَ — مکر، چال، خفیہ تدبیر

تفسیر

جنگ اور جہاد میں فرق

بعض اوقات عمل ایک جیسا ہوتا ہے لیکن اس کا حکم مختلف ہوتا ہے۔ یہی جہاد کی صورت ہے، جہاد بظاہر جدال و قتال کا نام ہے، لوگ مارے جاتے ہیں، علاقے فتح ہوتے ہیں، اور

دنیوی جنگوں میں بھی یہی ہوتا ہے۔لیکن دونوں کے مقاصد مختلف ہیں، دونوں کے پیچھے جو جذبہ محرکہ اور داعیہ ہے وہ اصل فرق کو واضح کرتا ہے۔ جہاد کا اصل مقصد کلمہ حق کی سربلندی، دین اسلام کا فروغ اور اللہ کی رضا ہے۔ اگر اس کے نتیجے میں علاقے فتح ہوں، مال غنیمت ہاتھ لگے یا اور دنیوی منافع ملیں تو یہ محض اللہ کا انعام ہے۔ جبکہ دنیوی جنگوں کا مقصد فتوحات کا حصول، مفتوح قوموں کا استحصال، اقوام کو غلام بنانا، تجارتی منڈیاں قائم کرنا اور اپنے اقتدار کو طول دینا ہے، یہ جنگ شیطان کی جنگ ہے، شیطان کی خوشنودی کے لئے فساد وخوں ریزی ہے، ظلم کا بازار گرم کرنا ہے۔ چنانچہ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا: شیطان کے حامیوں سے لڑو، آخر کار شیطان کی تدبیریں ناکام ہوں گی اور حق کی فتح ہوگی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْیَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۷﴾

”کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (پہلے) کہا گیا تھا کہ (ابھی قتال سے) اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسا ڈرنے لگا، جیسے اللہ سے ڈرا جاتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ، اور کہنے لگے، اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا، ہم کو تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی؟ (اے حبیب!) فرما دیجئے متاع دنیا نہایت کم ہے، اور جو پرہیزگار ہے اس کے لئے تو آخرت (ہی) بہتر ہے اور تم پر دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا“۔

مشکل الفاظ کے معانی

كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ	اپنے ہاتھوں کو روکو	اَلْقِتَالُ	لڑائی

كُتِبَ	فرض کردیا گیا	يَخْشَوْنَ	ڈرتے ہیں
خَشْيَةً	خوف الٰہی	اَشَدَّ	سخت ترین
اَجَلٍ	وقت مقررہ، موت کو بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کا وقت مقرر ہوتا ہے	مَتَاعُ	سامان
لِمَنِ اتَّقٰى	جو پرہیزگار رہوا		

تفسیر

آیت کا مصداق

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس آیت کے مصداق کے بارے میں دو امکانات ہیں اور دونوں اپنی جگہ درست ہیں، یا تو یہ آیت پست ہمت اہل ایمان کے بارے میں نازل ہوئی اور غالب امکان یہ ہے کہ منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ مکی زندگی میں اور مدنی زندگی کے ابتدائی دور تک جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا۔ ان حالات میں بعض مسلمان کفار کے ظلم و جبر سے تنگ آ کر کہہ دیتے تھے کہ ان سے آخری معرکہ ہو ہی جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام کے احکام تدریجاً نازل ہوئے، چنانچہ انہیں کہا جاتا کہ رکو، ابھی صلوٰۃ و زکوٰۃ کے احکام پر عمل کرتے رہو۔ لیکن آخر وہ مرحلہ ہی آ گیا جب غزوۂ بدر کے موقع پر جہاد کے احکام نازل ہوئے۔ اس وقت ان چند جذباتی اور بے صبرے لوگوں پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ لیکن اگر اس سے مسلمان مراد ہیں تو یہ کیفیت بشری تقاضے کے تحت تھی، اس کا سبب ایمان کی کمزوری نہیں تھا۔ اور اگر منافق مراد ہیں تو وہ تو ویسے ہی ایمان سے محروم تھے، جذبۂ جہاد کہاں سے آتا۔ لہٰذا انہوں نے کہا کہ جہاد تو فرض ہونا ہی نہیں چاہئے تھا، ابھی ہم نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے؟

دنیوی اوراخروی نعمتوں کا تقابل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے حبیب کریم! علیک الصلوٰۃ والتسلیم آپ انہیں بتا دیں کہ مہلتِ حیات چاہے کتنی دراز کیوں نہ ہو جائے، آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ان آسائشوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اصل نعمتیں تو اللہ والوں کو وہیں ملیں گی۔ امام رازی نے دنیا و آخرت کی راحتوں کا تقابل کرتے ہوئے فرمایا کہ:

(۱) دنیا کی نعمتیں قلیل ہیں جبکہ آخرت کی نعمتیں بے حد و بے حساب۔

(۲) دنیا کی نعمتیں عارضی اور فانی ہیں جبکہ آخرت کی نعمتیں ابدی اور لازوال۔

(۳) دنیا کی نعمتوں کے ساتھ رنج و الم بھی پیوستہ ہوتے ہیں جبکہ آخرت کی نعمتیں صرف اور صرف راحت و مسرت۔

(۴) دنیا کی نعمتوں کے ہر آن سلب ہونے اور چھن جانے کے اندیشے اور شکوک و شبہات ہوتے ہیں جبکہ آخرت کی نعمتیں قطعی، یقینی اور تمام شکوک شبہات سے مبرا ہوتی ہیں اور لازوال ہوتی ہیں۔

اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا ﴿۷۸﴾ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ﴿۷۹﴾ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰی فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ﴿۸۰﴾

"تم جہاں کہیں بھی ہو گے، موت تمہیں آ دبوچے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں (قلعہ بند ہو کر ہی) رہو، اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ (تو) اللہ کی

جانب سے ہے۔اور اگر کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں (اے رسول!) یہ آپ کی وجہ سے ہے، فرما دیجئے! کہ (نفع ہو یا نقصان) سب اللہ کی طرف سے ہے، تو آخر اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھ ہی نہیں پاتے۔ (اے مخاطب!) تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو تکلیف پہنچے وہ تمہاری اپنی شامت اعمال کے سبب ہے، اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور گواہی کے لئے اللہ کافی ہے۔ اور جس نے رسول کی اطاعت کی تو (درحقیقت) اس نے اللہ (ہی) کی اطاعت کی، اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا"۔

مشکل الفاظ کے معانی

اَیْنَ	تم جہاں جاؤ گے	یُدْرِکْکُمْ	تمہیں پالے گی
مَاتَکُوْنُوْا			
بُرُوْجٍ	برج کی جمع، بلند عمارت یا قلعہ	مُّشَیَّدَۃٍ	مضبوط، چونے سے پلاسٹر شدہ
فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ	ان کو کیا ہو گیا ہے	لَا یَفْقَهُوْنَ	نہیں سمجھتے
حَدِیْثًا	بات	حَفِیْظًا	نگہبان

تفسیر

موت سے مفر نہیں

اس آیہ مبارکہ میں ان لوگوں کے نظریات کی اصلاح کی گئی ہے، جو جہاد سے محض اس لئے گریز کرتے ہیں کہ مارے جائیں گے، موت وقت سے پہلے آجائے گی، وغیرہ۔ قرآن نے بتایا کہ موت کا وقت مقرر ہے جس میں ایک لمحے کی بھی تقدیم وتاخیر نہیں ہوسکتی، خواہ کوئی اپنی خواب گاہ میں سکون کی نیند سو رہا ہو یا اپنے آپ کو موت سے بچانے کے لئے مضبوط

قلعوں میں محفوظ کرلے، فرشتۂ اجل بہر حال اسے آدبوچے گا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حق و باطل کے کئی معرکوں میں شجاعت کے جوہر دکھائے لیکن ہر بار میدان جنگ سے صحیح سلامت لوٹے، اپنی زندگی کے آخری ایام میں شہادت کی آرزو میں تڑپتے رہے۔

تقدیر کا مالک اللہ ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی برکت سے اہل مدینہ کو اخروی سعادتوں کے ساتھ دنیوی برکات سے بھی نوازا تھا، جہاد میں فتوحات کے نتیجے میں اموالِ غنیمت ہاتھ آئے، زمینوں اور باغات کی پیداوار میں اضافہ ہوا، سرسبزی و شادابی آئی۔ یہودِ مدینہ اور منافقین جب ان نعمتوں کا ذکر کرتے تو کہتے یہ اللہ کا فضل و کرم ہے، اور جب کبھی ان کی شامت اعمال کی پاداش میں تنگی آتی تو اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے، جیسے صالح علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا کہ (العیاذ باللہ) آپ کی وجہ سے نحوست آئی۔ وہ بدبخت لوگ یہ نہیں سوچتے تھے کہ جو نعمتیں ملتی ہیں، وہ حضور اکرم ﷺ کے وسیلے سے ملتی ہیں۔

اللہ جل شانہٗ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کی تسلیٔ خاطر کے لئے فرمایا:

(''اے حبیب!) آپ فرما دیجئے سب کچھ اللہ کی جانب سے ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خیر و شر، رنج و راحت، نعمت و غضب اور ہدایت و ضلالت کا خلق اللہ کی تقدیر سے ہے۔ اس لئے کسی بھی مصیبت کے لئے اللہ تعالیٰ کے رسول کی ذات کریم کو ہدف ملامت بنانا بدبختی کی دلیل ہے۔ چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا کہ'' آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اتنی سیدھی اور سادی بات کو بھی نہیں سمجھ پاتے''۔

خیر اللہ کی عطا ہے اور شر اعمال کی سزا ہے

اگلی آیت میں آدابِ بارگاہِ الوہیت کی تعلیم دی گئی ہے لیکن اس سے پہلے عقائد کا ایک اصولی مسئلہ سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ انسانی افعال کا خلق اللہ کی طرف سے ہے اور ان کا کسب (یعنی صدور و ارتکاب) بندے کا فعل ہے، اعمال صالحہ، اگرچہ بندہ کرتا ہے، لیکن یہ

سب اللہ تعالیٰ کی توفیق وعنایت کا صدقہ ہے۔اس کے برعکس انسان پر جو بھی مصیبت نازل ہوتی ہے یا افتاد پڑتی ہے، وہ اس کے اپنے اعمال کا منطقی نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس آیہ مبارکہ میں یہ تعلیم دی کہ ہر خیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا چاہئے اور ہر شر کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرنی چاہئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں: وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ یعنی جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ (اللہ) مجھے شفاء عطا فرماتا ہے۔ مرض نقص ہے اس کی نسبت اپنی طرف کی اور شفا کمال ہے اس کی نسبت اللہ کی طرف فرمائی۔ آیت کے آخر میں حضرت محمد ﷺ کی رسالت عامہ کا ذکر ہے جو آپ کے خصائص میں سے ہے، اگلی آیت میں ایک بار پھر اس مضمون کا اعادہ فرمایا کہ اطاعت رسول ہی میں اطاعت پروردگار ہے، فقط یہی ایک ہستی ہے جو حق کی معرفت کا حتمی معیار ومدار ہے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ؗ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾

''اور وہ (منہ پرتو) کہتے ہیں کہ ہم اطاعت گزار ہیں، لیکن جب آپ کے پاس سے نکل کر باہر جاتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ رات بھر (اس کے برعکس) منصوبے بناتا ہے جو وہ کہہ چکا تھا، اور اللہ ان کی یہ ساری کارگزاریاں لکھ دیتا ہے، پس (اے محبوب!) آپ ان کی پروانہ کریں اور اللہ پر توکل کریں اور اللہ ہی کافی کارساز ہے۔ تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

فَاِذَا بَرَزُوْا	جب وہ باہر نکلتے ہیں	بَيَّتَ	رات گزارتا ہے

بَیَّتَ	کے ساتھ جب دوسرا فعل لگے تو معنی ہوتے ہیں رات بھر اس کام میں مشغول ہونا	اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ	تو کیا وہ قرآن مجید میں غور نہیں کرتے، ''تدبر'' کے معنی ہیں کسی چیز کے عواقب و نتائج پر غور کرنا

تفسیر

منافقین کا دوغلا پن اور ریشہ دوانیاں

اس آیہ مبارکہ میں منافقین کے دوغلے پن اور دورخی پالیسی کو قرآن نے بیان کیا ہے کہ جب حضور ﷺ کے سامنے آتے ہیں تو سراپا اطاعت بن جاتے ہیں، آپ کے ہر حکم کو بجالانے کی یقین دہانیاں کراتے ہیں، لیکن جب وہاں سے باہر نکل جاتے ہیں تو جو عہد و اقرار کر چکے ہوتے ہیں، رات بھر اس کے خلاف منصوبہ بندی کرتے ہیں، اللہ فرماتا ہے کہ ان کی یہ ساری سازشیں اور کارگزاریاں فرشتے ان کے نامۂ اعمال میں درج کر دیتے ہیں۔ یہ مدنی زندگی کا ابتدائی دور تھا، اللہ تعالیٰ نے یہ ساری غیب کی خبریں اپنے پیارے حبیب ﷺ کو بتادیں، لیکن ساتھ ساتھ تسلی بھی دی کہ آپ بددل نہ ہوں اور نہ ہی ان کا یہ راز افشا کریں کیونکہ اس طرح یہ کھلے دشمن بن جائیں گے، آپ بس اللہ پر بھروسا رکھیں۔ لیکن جب اللہ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمایا تو پھر حکم دیا کہ: جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبہ: ۷۳) کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے اس کے بعد آپ نے منافقین کے سارے معاملات کو طشت از بام کر دیا۔

نفاق کا سبب، قرآن کا انکار

اگلی آیت میں فرمایا کہ نفاق اور عداوتِ رسول کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کو ''کلام ربانی'' نہیں مانتے، اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے کبھی قرآن کے علوم و معارف

اور اس کی ابدی صداقتوں پر غور ہی نہیں کیا، ورنہ کسی بھی صاحب عقل و دانش کے لئے قرآن میں انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ امام رازی نے اس مقام پر لکھا ہے کہ قرآن کے کلام الٰہی اور معجزہ ہونے کا ثبوت تین وجوہ سے ہے۔ اول یہ کہ یہ فصاحت و بلاغت میں عدیم المثال ہے، دوم یہ کہ یہ اخبار غیب پر مشتمل ہے۔ سوم یہ کہ یہ ہر طرح کے تضاد، تناقض (Contradiction) اور کذب سے پاک ہے۔

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۳﴾

"اور جب ان کے پاس کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر آتی ہے تو اسے پھیلا دیتے ہیں، اور اگر وہ اس بارے میں رسول یا اپنے "صاحبان اختیار" سے رجوع کرتے، تو ان میں جو لوگ نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ ضرور اس (کی حقیقت) کو جان لیتے، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو معدودے چند افراد کے سوا تم سب شیطان کے پیروکار بن جاتے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

اَذَاعُوْا بِهٖ	اسے شائع کر دیتے ہیں، پھیلا دیتے ہیں	یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ	جو استنباط کر سکتے ہیں یا نتیجہ نکال سکتے ہیں
لَاتَّبَعْتُمْ	تم ضرور پیروی کرتے		

تفسیر

غیر مصدقہ خبریں پھیلانے کی ممانعت

رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی کا ابتدائی دور، حالت جنگ اور ہنگامی حالات کا دور تھا۔ کبھی حضور مختلف مہمات پر دستے روانہ کرتے، کبھی دشمن کے حملہ آور ہونے کی خبر

آتیں، مدینہ منورہ میں یہود بھی تھے اور منافقین بھی، ان کی دلی ہمدردیاں، دشمنانِ اسلام کے ساتھ تھیں۔ ایسے حالات میں طرح طرح کی خبریں گردش کرتیں، کبھی خوفناک خبریں آتیں اور کبھی امید افزا، اور آنِ واحد میں مدینے کی گلی کوچوں میں پھیل جاتیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں دشمن کا ایک مؤثر حربہ جھوٹی خبریں پھیلانا ہوتا ہے جسے "Media War Disinformation" اور "Media Trial" کہا جاتا ہے۔

زمانہ جنگ میں خبروں کی ترسیل پر کنٹرول

چنانچہ قرآن نے یہ رہنما اصول عطا کیا کہ ایسے حالات میں، ہر قسم کی خبروں کے افشا سے پہلے، اربابِ اقتدار اور ذمہ دار لوگوں سے اس کی توثیق کے لئے رجوع کرنا چاہئے، اور متعلقہ شعبوں کے ماہرین سے بھی رجوع کرنا چاہئے، تاکہ بدنظمی اور انتشار نہ پھیلے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ حالتِ جنگ میں حکومت کو قومی، ملی اور ملکی مفاد میں خبروں کی ترسیل کی نگرانی کا حق حاصل ہے۔ جسے "Censorship" کہا جاتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ ''اطمینان بخش'' خبر کے پھیل جانے میں کیا قباحت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات حقائق کو کلی طور پر چھپا کر اطمینان کی جھوٹی خبریں پھیلائی جاتی ہیں اور جب اچانک حقیقتِ حال سامنے آتی ہے تو قوم کا ذہن اس کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس طرح قوم کا اجتماعی Moral پست ہوتا ہے، قوتِ مزاحمت (Potential of Resistance) دم توڑ جاتی ہے، پست ہمت اور ضعیف الاعتقاد لوگ دشمن کے پھیلائے ہوئے مکر وفریب کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِیْلًا ﴿۸۴﴾

''پس (اے حبیب!) اللہ کی راہ میں جہاد کیجئے، آپ صرف اپنی ذات کے مکلف (جوابدہ) ہیں اور مومنوں کو بھی (جہاد پر) برانگیختہ کیجئے، قریب ہے کہ اللہ کافروں

کا جنگی زور توڑ دے، اور اللہ کی گرفت بہت مضبوط اور عذاب بہت سخت ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

حَرِّضِ	برانگیختہ کیجئے، ابھاریئے	اَلْبَاس	شجاعت، قوت و شوکت
نَکَال	عذاب	تَنْکِیْلًا	عذاب دینا

تفسیر

حضور کی شانِ استقامت

اس آیۂ مبارکہ کے نزول کا زمانہ غزوۂ احد کے بعد کا ہے جس میں مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا، حضورانور ﷺ نے اس موقع پر ابوسفیان سے اگلے سال پھر میدان میں آنے کا وعدہ کیا تھا جسے غزوہ بدر صغریٰ کہتے ہیں۔ جب ایفاء عہد کا وقت آیا تو حضور نے روانگی کا اعلان کیا، عام مسلمانوں کے حوصلے اتنے بلند نہیں تھے، لیکن اللہ نے اپنے پیارے حبیب کریم ﷺ سے فرمایا کہ کوئی اور ساتھ دے یا نہ دے، آپ اپنی ذات کی حد تک جوابدہ ہیں، اللہ پر بھروسا کر کے تنہا بھی نکلنا پڑے تو نکل کھڑے ہوں۔ غور کیجئے کتنے حوصلے اور جرأت کا مقام ہے۔ چنانچہ آپ نکل کھڑے ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے علاوہ ستر صحابہ کرام آپ کے ہمرکاب تھے، کفار کو جب اطلاع ملی کہ غزوۂ احد کے صدمے سے سنبھل کر مسلمان میدانِ جہاد میں آ کھڑے ہوئے ہیں تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ مقابلے میں آنے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا ایک مظہر یہ بھی ہوتا ہے کہ دشمن مسلمانوں کے مقابل آنے کا حوصلہ ہی نہ کر سکے اور یہی ہوا۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

"جو شخص کسی نیک بات کی سفارش کرے تو اس کے لئے اس (کے اجر) میں سے

حصہ ہوگا اور جو کسی بری بات کی سفارش کرے تو اس کے لئے اس (کے گناہ) میں سے حصہ ہوگا، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

مَنْ يَّشْفَعْ	جو سفارش کرے گا	كِفْلٌ	بوجھ، گناہ
مُّقِيْتًا	مقتدر، نگران، حاضر، روزی دینے والا		

تفسیر

شفاعت کے معنیٰ اور اقسام

شفاعت کے لفظی معنیٰ ہیں، ملانا، جوڑنا۔ سفارش کرنے والا کسی طلبگار حق کے ساتھ اپنی تائید و حمایت کو ملا کر اسے قوی بناتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بے کسی اور بے بسی کی وجہ سے اپنا جائز حق حاصل کرنے پر قادر نہیں ہے تو اس کے جائز حق کے حصول کے لئے بغیر کسی رشوت اور اجرت کے سفارش کرنا ''شفاعت حسنہ'' ہے۔ ظلم میں یا کسی کی حق تلفی میں معاونت یا سفارش ''شفاعت سیئہ'' ہے۔ ''شفاعت حسنہ'' پر اللہ کی طرف سے اجر ہے اور ''شفاعت سیئہ'' کے نتیجے میں جو ظلم ہوگا، حق تلفی ہوگی، اس کے وبال اور گناہ میں سفارش کرنے والا بھی برابر کا حصے دار ہوگا۔

''شفاعت حسنہ کے بارے میں حضور ﷺ کا فرمان ہے ''اِشْفَعُوْا تُوْجَرُوْا'' سفارش کرو، اجر پاؤ گے۔'' ''شفاعت سیئہ'' کے بارے میں فرمان رسول ہے: ''جس شخص نے کسی مومن کے قتل میں ایک لفظ بول کر بھی مدد کی تو وہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کے حضور اس طرح پیش ہوگا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا کہ یہ شخص اللہ کی رحمت سے محروم ہے۔''

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾

''اور جب تمہیں کسی لفظ سے سلام ودعا دی جائے تو اس سے بہتر الفاظ میں جواب دو یا (کم از کم) اسی انداز میں جواب دو، بلاشبہ اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے اللہ کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ قیامت کے دن، جس میں کوئی شک نہیں، تم سب کو ضرور جمع کرے گا، اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کس کی ہوسکتی ہے؟''

مشکل الفاظ کے معانی

اَلتَّحِيَّةُ	کے معنی ہیں سلام، درازی عمر کی دعا کرنا	اَلتَّحِيَّةُ	''حَيَّاکَ اللّٰهُ'' (یعنی اللہ تمہیں لمبی عمر عطا کرے)
اِذَا حُيِّيْتُمْ	جب تمہیں سلام کیا جائے گا	فَحَيُّوْا	پس سلام کرو
رُدُّوْهَا	اسے لوٹاؤ	حَسِيْبًا	حساب لینے والا

تفسیر

سلام کے فضائل ومسائل

''السلام'' اللہ تعالیٰ کے اسماءِ مبارکہ میں سے ہے، قرآن مجید میں ہے اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ (الحشر: ۲۳) یعنی اللہ تعالیٰ ہر نقص، عیب اور فنا سے پاک ومنزہ ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں میں تحیت کے کئی کلمات رائج تھے مثلاً ''حَيَّاکَ اللّٰهُ'' ''جیتے رہو'' ''انعم صباحا'': ''صبح بخیر'' وغیرہ۔

اسلام نے اسے ''السلام علیکم'' کے پاکیزہ کلمات سے تبدیل کیا اور اب یہ اسلام کے شعائر میں سے ہے۔ اس کے معنی ہیں تم اللہ کی رحمت وحفاظت میں رہو، تم پر سلامتی ہو، یعنی تمہاری جان، مال اور آبرو میری اور سب کی دسترس سے محفوظ رہے، اس طرح یہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے دعا ہے اور ایک طرح سے عہد وپیمان بھی۔

قرآن مجید میں اللہ جل شانہٗ نے کئی جگہ پر انبیاء کرام پر، بعض کا نام لے کر جیسے حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ، ہارون، ال یاسین علیہم السلام اور اجتماعی طور پر بھی جیسے (سَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ) اور عباد صالحین پر بھی جیسے (وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی) سلام بھیجا ہے۔ جنت میں اہل جنت کا استقبال بھی ''تحیت وسلام'' سے ہوگا۔

جامع ترمذی میں حدیث ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: السلام علیکم! آپ نے فرمایا: اس کے لئے دس نیکیاں ہیں، دوسرا آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ! آپ نے فرمایا: اس کے لئے بیس نیکیاں ہیں، تیسرا آیا اور عرض کیا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! آپ نے فرمایا: اس کے لئے تیس نیکیاں ہیں۔

سلام کے مسائل

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد القرطبی نے اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں اس مقام پر سلام کے مسائل نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں اور احادیث مبارکہ بھی روایت کی ہیں۔ ہم ان سے استفادہ کرتے ہوئے یہاں اختصار کے ساتھ مسائل درج کر رہے ہیں، احادیث مبارکہ تفصیل کے ساتھ درج کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

(۱) اس پر علماء امت کا اجماع ہے کہ سلام میں پہل کرنا سنت ہے، اور اس کا جواب دینا واجب ہے۔ رہا یہ سوال کہ ''سلام'' میں پہل کرنا افضل ہے یا جواب دینا۔ چونکہ فرض اور واجب کا ثواب سنت سے زائد ہے، اس لئے جنہوں نے اس کا لحاظ کیا ہے ان کے نزدیک جواب دینا افضل ہے۔ اور ''سلام'' میں پہل کرنا تواضع، انکسار اور حسن اخلاق کی دلیل ہے، اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پہل کرنا افضل ہے۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم کسی کو شخصی طور پر نہیں جانتے ہو یا نہیں ہر ایک کو سلام کرو۔ درمیان میں درخت یا دیوار حائل ہو جائے اور دوبارہ ملاقات ہو تو پھر سلام کرو۔ بعض صحابہؓ کرام صرف سلام اور جواب سلام کا ثواب کمانے کے لئے بازار جایا کرتے تھے۔

(۳) السلام علیکم کہا جائے تو جواباً کہو ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا جا ئے

تو جواباً وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہو، بس اس سے آگے نہیں۔

(۴) سوار پیادہ کو سلام کرنے میں پہل کرے، جو کھڑا ہے وہ بیٹھے ہوئے کو اور جو کم تعداد میں ہیں وہ زیادہ تعداد والوں کو سلام کرنے میں پہل کریں۔

(۵) بچوں کو سلام کر سکتے ہیں، البتہ ان پر جواب دینا واجب نہیں کیونکہ وہ مکلف نہیں ہوتے۔

(۶) نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو بھی سلام کیا ہے، معمر عورتوں کو سلام کرنے میں حرج نہیں، البتہ جوان عورتوں کو سلام کرنے میں فتنے کا اندیشہ ہو تو مکروہ ہے۔ **الفقہ الاسلام وادلتہ** میں ہے کہ اجنبی عورت کو سلام کرنا مکروہ ہے۔

(۷) ہاتھ کے اشارے سے سلام کرنا مکروہ ہے کیونکہ یہ غیر مسلموں کا شعار تھا، اسی طرح سلام کے لئے جھکنا بھی مکروہ ہے۔ البتہ اگر دور سے سلام کے کلمات ادا کر رہا ہے اور ہاتھ کے اشارے سے مخاطب کو سلام کی خبر دے رہا ہے تو کوئی حرج نہیں۔

(۸) غیر مسلم سلام کرے تو جواب میں صرف ''وعلیکم'' یا ''علیک'' کہے یا کہے وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی (اس پر سلام ہو جو راہِ ہدایت پر ہے)۔

(۹) جو شخص نماز میں مشغول ہے یا تلاوت کر رہا ہے یا کھانے میں مشغول ہے یا قضائے حاجت میں مشغول ہے یا حمام میں بے لباس ہے، اسے سلام نہ کرے۔ اسی طرح جو خطبہ دے رہا ہو، وعظ کر رہا ہو، درس و تدریس میں مصروف ہو، علمی مذاکرہ کر رہا ہو، یا اذان و اقامت میں مصروف ہو تو اسے سلام نہ کرے۔ جو شطرنج کھیلنے، یا گانے بجانے یا کسی معصیت میں مشغول ہو، اسے سلام نہ کرے۔

(۱۰) اپنے گھر میں داخل ہو تو اہل خانہ کو سلام کرے۔ دوسرے کے گھر میں جائے تو بھی اہل خانہ کو سلام کرے۔

(۱۱) اہل مجلس کو سلام کیا اور ایک نے جواب دے دیا تو کافی ہے، یعنی ان سب کی طرف جواب ''وَاجِب عَلَی الْکِفَایَہ'' ہے، ثواب تو اسی کو ملے گا جس نے جواب دیا تاہم باقی

پر جواب نہ دینے کا گناہ نہیں ہوگا۔

مصافحہ کا شرعی حکم

سنن ابی داؤد میں حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان مل کر مصافحہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حمد و استغفار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دیتا ہے۔

قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا! کیا نبی ﷺ کے صحابہ مصافحہ کرتے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں بخاری ہی کی روایت ہے کہ حماد بن زید نے ابن مبارک کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ امام احمد اور امام ترمذی کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہارے سلام کی تکمیل مصافحہ ہے۔

اگلی آیہ مبارکہ میں قیامت، جزاء وسزا اور محشر کی قطعیت کو بیان کیا ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۙ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ

وَ يُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

''آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقوں کے بارے میں تم دو گروہوں میں بٹ گئے، حالانکہ اللہ نے تو ان کے کرتوتوں کے سبب انہیں اوندھا کر دیا ہے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہے، اسے راہ راست پر لے آؤ، اور جسے اللہ گمراہ کر دے، تو تم اس کے لئے کبھی رستہ نہ پاؤ گے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ کافر ہوئے تم بھی کافر ہو جاؤ تا کہ تم سب برابر ہو جاؤ، پس تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آ جائیں، پھر اگر وہ (ہجرت سے) منہ موڑیں تو پھر تم جہاں بھی انہیں پاؤ پکڑ واور قتل کرو، اور ان میں سے کسی کو نہ دوست بناؤ اور نہ ہی مددگار۔ مگر ان لوگوں کو (قتل نہ کرو) جو کسی ایسی قوم سے جا ملے ہیں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے یا وہ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ وہ (مس مسئلے میں) دل برداشتہ ہوں کہ تم سے لڑیں یا اپنی قوم سے، اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا پھر وہ لازماً تم سے لڑتے، پھر اگر وہ کنارہ کش ہو جائیں اور تم سے نہ لڑیں اور تمہاری طرف صلح کا پیغام بھیجیں، تو (ایسی صورت میں) اللہ نے تمہارے لئے ان پر (دست درازی کی) کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ عنقریب تم کچھ دوسرے ایسے لوگ بھی پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، لیکن جب بھی انہیں (اپنی قوم کی طرف سے) فساد کا بلاوا آتا ہے تو اس میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں، پھر اگر (یہ لوگ) تم سے (لڑائی میں) کنارہ کشی نہ کریں اور نہ ہی تمہیں صلح کا پیغام بھیجیں اور نہ (جنگ سے) اپنے ہاتھ روکیں تو پھر تم انہیں جہاں بھی پاؤ پکڑ واور قتل کرو، اور یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہم نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
فِئَتَيْنِ	دوگروہ، فئۃ کی تثنیہ	اَرْكَسَهُمْ	انہیں اوندھا کر دیا ہے، ''رکس'' کے معنی ہیں ''الٹ دینا''
وَدُّوْا	وہ چاہتے ہیں، انہوں نے چاہا	يَصِلُوْنَ	ملتے ہیں
حَيْثُ	جہاں	حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ	ان کے دل رک گئے ہیں، یعنی تذبذب کی وجہ سے کسی ایک جانب حمایت کا فیصلہ نہیں کر پاتے۔
لَسَلَّطَهُمْ	انہیں ضرور مسلط کرے گا	فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ	پس اگر وہ تم سے کنارہ کشی کر لیں۔
عَزْل	کے معنی ہیں ''علیحدگی''	اَلْقَوْا	ڈالیں یعنی بھیجیں
يَكُفُّوْا اَيْدِيَهُمْ	اپنے ہاتھوں کو روکیں	حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ	تم جہاں انہیں پاؤ
سُلْطٰنًا	قدرت، اختیار		

تفسیر

احوال منافقین

ان آیات میں منافقین کے احوال، اقسام اور احکام بیان کئے گئے ہیں۔ مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں ''منافقین'' موجود تھے اور عبداللہ بن ابی بن سلول ان کا رئیس تھا۔ مومن سادہ لوح، سچا اور کھرا ہوتا ہے، اس کی نظر دنیا سے زیادہ آخرت پر ہوتی ہے اور وہ نفع

نقصان کے سارے تخمینے آخرت کے حساب سے لگاتا ہے۔ منافق مکار اور فریبی ہوتا ہے، اس کا مطمح نظر یہی دنیا ہوتی ہے، اس لئے صرف دنیوی مفاد کو سامنے رکھ کر اپنی حکمت عملی ترتیب دیتا ہے۔ لیکن اس میں بعض اوقات وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے، مسلمان کو عروج اور فتوحات ملتے دیکھتا ہے تو ادھر لپکتا ہے تاکہ منافع سمیٹ سکے اور اگر کبھی مسلمانوں پر ظاہری ابتلاء آجائے، وقتی طور پر ہزیمت اٹھانی پڑے، افراد شہید اور زخمی ہو جائیں، تو یہ کفار کے ساتھ سلسلہ جنبانی شروع کر دیتا ہے۔ کبھی بین بین رہنے کی کوشش کرتا ہے یعنی نہ ادھر کا نہ ادھر کا۔

منافقین کی اقسام

ان آیات کے نزول کے وقت منافقین کئی طرح کے تھے۔ مکہ مکرمہ سے مسلمانوں پر ہجرت فرض کر دی گئی تھی اور جب مکہ فتح ہوا اور حضور ﷺ نے اعلان فرمایا: "لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ" یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں، کیونکہ اب مکہ "دارالامن" اور "دارالسلام" بن چکا تھا۔ تاہم تاریخ کے کسی بھی دور میں جب مسلمانوں پر اپنے وطن میں عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے، ان کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ ہو، یا انہیں فرائض و شعائر اسلام پر عمل کی آزادی نہ ہو تو ہجرت کا راستہ ان کے لئے ہمیشہ کھلا رہے گا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا: "لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ" ہجرت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے یعنی قیامت تک۔ ہجرت کے مفہوم و مصداق چار ہیں:

(۱) اللہ اور اس کے رسول کی رضا، دینی عقائد و اقدار کی حفاظت اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کے لئے اپنے وطن اور گھر بار کو چھوڑ کر کسی "دارالامن" اور "دارالسلام" کی طرف ہجرت، جیسے رسول اور اصحاب رسول کی مکے سے مدینہ ہجرت۔ یہ ہجرت ابتدائے اسلام میں واجب تھی۔

(۲) اگر کوئی دارالحرب کا باشندہ اسلام قبول کر لے تو اس پر دارالسلام کی طرف ہجرت

واجب ہے۔

(۳) کامل، مکمل اور کلی ہجرت کا مفہوم حضور ﷺ نے یہ بیان فرمایا: "اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ" کمال ہجرت یہ ہے کہ انسان وہ سب کچھ چھوڑ دے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، یعنی "فرائض، واجبات اور سنن کی بجا آوری اور تمام محرمات قطعیہ، مکروہات تحریمہ وتنزیہہ کو مکمل طور پر چھوڑ دینا۔" گویا یہ معصیت سے ہدایت اور تقویٰ کی طرف کامل ہجرت ہے۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ دونوں ہجرتیں اب بھی باقی ہیں۔

(۴) ہجرت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اہل معاصی سے قطع تعلق کرنا اور ان سے میل جول اور سلام وکلام کا سلسلہ اس وقت تک موقوف کرنا، جب تک وہ معصیت سے توبہ نہ کرلیں، جیسا کہ حضرت کعب اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اللہ کی بارگاہ میں ان کی قبولیت توبہ تک تعلقات موقوف رکھے، اسے عرف عام میں سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کہتے ہیں۔

کفار ومشرکین اور منافقین سے موالات کی ممانعت

آیت نمبر ۸۹ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا "اور ان (کفار ومنافقین) میں سے کسی کو نہ اپنا دوست بناؤ اور نہ مددگار۔ اس حکم ربانی میں کفار ومنافقین سے موالات (یعنی دوستی اور محبت کا تعلق قائم کرنے) کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس حکم کو کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے، چند آیات کریمہ ملاحظہ فرمایئے:

(۱) وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ اور ظالموں کی طرف اپنا (قلبی) میلان نہ رکھو، ورنہ تمہیں جہنم کی آگ پہنچے گی۔" (ہود: ۱۱۳)

(۲) "اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا تو وہ (درحقیقت) انہی میں سے

ہے۔" (المائدہ:۵۱)

(۳) "اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم انہیں دوستی کے پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ انہوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آیا ہے۔" (الممتحنہ:۱)

اہل بدعت و معصیت اور مخالفین اسلام سے میل جول کی ممانعت

اسی طرح قرآن و حدیث میں، ان اہل بدعت و معصیت سے بھی، میل جول کی ممانعت فرمائی گئی ہے، جو دین کے بنیادی عقائد و اقدار سے انحراف کرتے ہیں، دین میں نئے نئے فتنے کھڑے کرتے ہیں، یا احکام ربانی کو اپنے تمسخر و استہزاء کا ہدف بناتے ہیں۔ چند آیات و احادیث میں ملاحظہ فرمایئے:

(۱) "اور (اے مخاطب!) جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات میں کج بحثی کرتے ہیں تو ان سے اپنا رخ پھیر لے، حتی کہ وہ (اس سے ہٹ کر) کسی اور بات میں بحث کرنے لگیں، اور (اے مخاطب!) اگر تجھے شیطان (بے دین لوگوں سے لاتعلقی کا خیال) بھلا دے تو یاد آنے پر قومِ ظالمین کی ہم نشینی چھوڑ دو۔" (الانعام:۶۸)

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تقدیر الٰہی کے منکر اس امت کے مجوس ہیں، سو اگر وہ بیمار ہو جائیں تو ان کی عیادت نہ کرو، اور اگر وہ مر جائیں تو ان کے جنازے پر نہ جاؤ، اور اگر تمہاری ان سے ملاقات ہو تو انہیں سلام نہ کرو۔" (سنن ابن ماجہ: ص ۱۰)

(۳) ہم ہر روز نماز وتر میں جب دعائے قنوت پڑھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و پیمان کرتے ہیں: "وَنَخلَعُ وَنَترُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ" "(اے اللہ!) جو تیرا نافرمان ہے، اس سے ہم قطع تعلق کرتے ہیں۔"" مصنف ابن ابی شیبہ میں دعائے قنوت کے یہ کلمات حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہیں۔

"غیر مرتد" کافروں سے قلبی لگاؤ اور الفت و محبت کے بغیر، محض دنیوی معاملات کرنے یا کاروباری لین دین کی شرعاً ممانعت نہیں ہے، بشرطیکہ اس سے دین کو کوئی ضرر

پہنچے اور وہ کام شرعاً ناجائز بھی نہ ہو۔ واضح رہے کہ مرتد کی اولاد اگر اس کے گمراہ اور باطل عقائد پر قائم ہے تو وہ مرتد کے حکم میں نہیں ہے بلکہ عام کفار کے حکم میں ہے، کیونکہ مرتد وہ شخص ہے جو دین اسلام کو ترک کر کے کفر اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''جن لوگوں نے تم سے دین میں جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تمہیں ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔'' (الممتحنہ:۸)

منافقین کا مصداق کون؟

آیت نمبر ۸۸ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے۔'' اس آیت میں منافقین سے کون لوگ مراد ہیں؟ یا اس کا مصداق کون لوگ ہیں؟ مفسرین کرام نے ان کے بارے میں مختلف روایات اور توجیہات نقل کی ہیں، جن کا ہم سطور ذیل میں ذکر کر رہے ہیں:

(ا) کچھ لوگ جنہوں نے مکے میں اسلام کا اقرار کیا تھا، وہ ہجرت کے موقعہ پر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ گئے، کچھ لوگ شروع میں تو مدینہ آئے لیکن بعد میں بارگاہِ رسالت میں حیلے بہانے کر کہ ہمارا سارا مال واسباب ادھر رہ گیا ہے ہم اسے جا کر لے آتے ہیں تاکہ تجارت کریں، واپس مکہ چلے گئے اور پھر نہ آئے یہ لوگ دراصل مرتد ہو چکے تھے۔ علامہ محمود آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں یہ دونوں اقوال بالترتیب مجاہد اور ضحاک کی روایت (بحوالہ ابن جریر) سے نقل کئے ہیں۔

ان کے بارے میں مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک کا خیال تھا کہ انہوں نے کلمہ پڑھا ہے، ان پر کیسے تلوار اٹھائی جائے۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ وہ واپس دارالکفر کی طرف چلے گئے ہیں اور مرتد ہو گئے ہیں۔ تو قرآن نے قول فیصلہ صادر کیا کہ جس کے مقدر میں اللہ نے ہدایت نہ لکھی ہو، اسے کوئی راہِ راست پر نہیں لا سکتا۔ وہ تو یہ چاہیں گے کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ، لہٰذا جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت پر آمادہ نہ ہوں، وہ

واجب القتل ہیں، تمہارے دشمن ہیں، ان سے دوستی کی امید نہ رکھو۔ (تفسیر روح المعانی، جلد ۵، ۶، ص ۱۰۷)

(۲) منافقین کا دوسرا گروہ وہ تھا جن کے بارے میں ابن ابی شیبہ نے بروایت حسن بیان کیا ہے کہ بدر واحد کے غزوات کے بعد جب مدینے کے اردگرد کے لوگ اسلام کی طرف مائل ہونے لگے تو ''سراقہ بن مالک المدلجی'' آیا اور رسول اللہ ﷺ کو پیشکش کی کہ ہماری قوم کے ساتھ مصالحت کر لیجئے۔ حضور نے حضرت خالد بن ولید کو ان کی طرف بھیجا اور یہ معاہدہ طے پایا کہ:

یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں کسی بھی دشمن کی مدد نہیں کریں گے، قریش نے اسلام قبول کر لیا تو یہ بھی مسلمان ہو جائیں گے اور جو دوسرے لوگ ان کے ساتھ آ کر ملیں گے، وہ بھی اس معاہدے میں شامل سمجھے جائیں گے، ابن جریر نے سراقہ بن مالک کے علاوہ ہلال بن عویمر اسلمی اور بنو حذیفہ بن عامر کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ بنیادی طور پر غیر جانبدار (Non Allienment) رہنے کا معاہدہ تھا اور اس طرح مسلمانوں کے لئے اس جانب سے خطرہ ٹل گیا۔ آیت نمبر ۹۰ میں قرآن نے اس طرح کے لوگوں کے بارے میں حکم دیا کہ ان پر زبردستی نہ کی جائے اور ان سے تعرض نہ کیا جائے، یہ کیا کم ہے کہ ان کی حمایت فریق مخالف کو حاصل نہیں ہے۔ گویا مکمل غلبۂ اسلام سے پہلے عبوری دور کے لئے یہ پالیسی اختیار کی گئی۔

(۳) آیت نمبر ۹۱، ایسے دو رخے منافقین کے لئے نازل ہوئی جو رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تو کہتے: ہم ایمان لائے، واپس مکہ والوں کے پاس جاتے تو پھر بت پرستی شروع کر دیتے، ان کی قوم پوچھتی کس پر ایمان لائے ہو؟ کہتے ہم تو بندروں اور بچھوؤں پر ایمان لائے ہیں۔ یہ قابل اعتماد لوگ نہیں تھے بلکہ اندر سے پکے دشمن اسلام تھے اور کبھی طبل جنگ بج جاتا تو ان کی تلوار اسلام کے خلاف اٹھتی۔ قرآن نے فیصلہ صادر کیا کہ اگر یہ اپنی منافقانہ اور معاندانہ روش سے باز نہ آئیں تو ان کے ساتھ بھی پہلے گروہ والا سلوک کیا جائے اور

جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں۔

(۴) بعض مفسرین نے اس کا مصداق منافقین کو بھی قرار دیا ہے جو غزوۂ احد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر میدان جنگ سے واپس چلے گئے تھے۔ صحیحین، ترمذی اور نسائی میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی یہ روایت موجود ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْھَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

"کسی مومن کو یہ روا نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے، سوائے اس کے کہ (اس سے) خطاء یہ فعل سرزد ہو جائے اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر ڈالے تو (اس کا کفارہ یہ ہے کہ) ایک مومن غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا ادا کرے، سوائے اس کے کہ وہ (خون بہا) معاف کر دیں، لیکن اگر وہ مسلمان مقتول تمہاری دشمن قوم سے ہے تو (صرف) ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہے، اور اگر وہ مقتول ایسی قوم کا فرد ہے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو (اس کا کفارہ) اس کے وارثوں کو خون بہا ادا کرنا اور ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے، پس جو شخص (غلام) نہ پائے تو اللہ کی جانب سے قبولیت توبہ کے لئے دو ماہ کے لگا تار روزے رکھے، اور اللہ بہت جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے۔ اور جو شخص کسی مومن کو قصداً قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضب فرمائے گا اور اس

پر لعنت فرمائے گا اور اس کے لئے اللہ نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

خَطَئًا	غلطی سے، بلا قصد وارادہ	تَحْرِيْر	آزاد کرنا
رَقَبَةٍ	گردن، مراد غلام یا باندی	دِيَةٌ	خون بہا
مُّسَلَّمَةٌ	سپرد کیا ہوا	اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا	اِلَّا یہ کہ معاف کر دیں، تصدق کا ایک معنی معاف کرنا ہے
مُتَتَابِعَيْنِ	لگاتار، مسلسل	مُّتَعَمِّدًا	قصداً

تفسیر

قتل ناحق گناہ کبیرہ ہے

"قتل"، کفر و شرک کے بعد سب سے سنگین جرم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ "اَوَّلُ مَا يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الدِّمَآءُ":

قیامت کے دن حقوق العباد میں سے اللہ کی بارگاہ میں سب سے پہلے قتل کا مقدمہ پیش ہوگا اور فیصلہ کیا جائے گا۔

۲۔ "كُلُّ ذَنْبٍ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّغْفِرَ اِلَّا مَنْ مَّاتَ مُشْرِكًا اَوْ مَنْ يَّقْتُلُ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً":

ہر گناہ کی بابت امید کی جاسکتی ہے کہ شاید اللہ اسے معاف فرمادے گا سوائے اس کے کہ کسی کی موت شرک پر واقع ہوئی ہو یا کسی نے عمداً کسی مومن کو قتل کیا ہو۔

۳۔ "يَجِئُ الْمَقْتُوْلُ بِالْقَاتِلِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ نَاصِيَتُهٗ وَرَاْسُهٗ بِيَدِهٖ وَاَوْدَاجُهٗ تَشْخَبُ دَمًا يَقُوْلُ يَا رَبِّ قَتَلَنِيْ حَتّٰى يُدْنِيَهٗ مِنَ الْعَرْشِ":

قیامت کے دن مقتول اپنے قاتل کو سر اور پیشانی سے گھسیٹ کر اللہ کی عدالت میں

پیش کرے گا، اس حالت میں کہ اس کی رگوں سے تازہ خون بہہ رہا ہوگا، اور وہ التجا کرے گا، اے رب! اس نے مجھے قتل کیا ہے یہاں تک کہ (وہ) اسے عرشِ الٰہی کے قریب کرلے گا۔

فقہاءِ احناف کے نزدیک قتل کی اقسام

۱۔ قتل عمد

قتل عمد وہ ہے جس میں جان نکالنے کے لئے ہتھیار سے ضرب لگائی جائے اور جان غیر محسوس ہے، پس وہ جان نکالنے کے لئے ایسے ہتھیار کو استعمال کرے جو زخم ڈالنے والا ہو اور بدن کے ظاہر و باطن میں مؤثر ہو، آج کل آتشیں اسلحہ تمام کے تمام ''آلاتِ جارحہ'' ہیں۔ اس کا حکم آخرت میں عذاب اور دنیا میں قصاص ہے الا یہ کہ مقتول کے وارث دیت پر راضی ہوجائیں یا معاف کردیں۔

۲۔ قتل شبہ عمد

وہ قتل جس میں لاٹھی، کوڑے، پتھر یا ہاتھ سے ضرب لگانے کا قصد کیا جائے اس فعل میں دو جہتیں ہیں، اس لحاظ سے عمد ہے کہ فاعل اس میں ضرب لگانے کا قصد کرتا ہے اور اس لحاظ سے خطا ہے کہ وہ اس ضرب سے قتل کا ارادہ نہیں کرتا۔ کیونکہ جو آلہ اس نے استعمال کیا ہے وہ سزا دینے کے لئے ضرب (punishment) کا آلہ ہے، قتل (Killing) کا نہیں ہے۔ گویا نفس فعل ''ضرب'' میں قصد شامل ہے، لیکن قتل کا قصد نہیں بلکہ تعزیر یا تادیب کا ہے۔ اس میں اسے خطا ہوگئی کہ تادیب، قتل کا باعث بن گئی، اس لئے یہ ''شبہ عمد'' ہے۔

قتل شبہ عمد میں فاعل گنہگار ہوگا اور اس پر کفارہ واجب ہے، وہ یہ کہ ایک مومن غلام آزاد کرے یا دو ماہ مسلسل روزے رکھے، اور اس کے عصبات پر ''دیت مغلظہ'' ہے جو تین سال میں واجب الادا ہوگی۔

۳۔ قتل خطاء

جس کو قتل کرنے کا قصد کیا ہے، اس کے بجائے کوئی اور قتل ہوجائے۔ اس کی دو قسمیں

ہیں، ایک یہ کہ گمان میں خطاء ہو جائے جیسے اس نے شکار سمجھ کر گولی چلائی اور جس کو گولی لگی وہ مسلمان شخص تھا۔ فعل میں خطا یہ ہے کہ اس نے کسی ہدف کی طرف شست باندھ کر نشانہ لگایا اور بیچ میں کسی مسلمان کو گولی لگ گئی۔

(نوٹ): فقہ حنفی کی رو سے قصاص و دیت اور حرمت جان کے مسائل میں مسلمان اور ذمی و مستامن کے احکام یکساں ہیں ''ذمی'' سے آج کل وہ تمام غیر مسلم باشندے مراد ہیں، جو کسی اسلامی ملک میں پابند آئین و قانون بن کر رہتے ہیں اور ملک کے وفادار ہیں، اور ''مستامن'' سے وہ تمام غیر ملکی (FOREIGNERS) باشندے مراد ہیں، جو باقاعدہ اپنے ملکی پاسپورٹ کے ساتھ کسی اسلامی ملک کا ویزا حاصل کر کے اس ملک میں داخل ہوں اور ملکی قوانین کا احترام اور پابندی کریں)

قتل خطاء میں قصاص نہیں ہے، خطاء و نسیان پر اللہ تعالیٰ نے اخروی مواخذہ معاف فرمایا ہے، البتہ اس پر کفارہ لازم ہوگا، یعنی دو ماہ کے مسلسل روزے اور اس کے عصبات پر تین سال میں دیت ادا کرنی لازم ہوگی۔

۴۔ قتل بالسبب

جس میں کسی شخص کا براہِ راست کوئی فعل مقتول پر واقع نہیں ہوا بلکہ اس کے ایک سبب سے دوسرے شخص کی موت واقع ہوگئی، جیسے

(۱) ایک شخص کسی جانور کو ہانک کر لے جا رہا ہے اور وہ جانور بے قابو ہو کر کسی راہ گیر کو ہلاک کر دے۔

(۲) کوئی شخص تیز رفتار ڈرائیو کر رہا ہے اور گاڑی کی زد میں آکر کوئی شخص ہلاک ہو گیا۔

(۳) کوئی اناڑی شخص گاڑی چلائے اور نیچے آکر کوئی ہلاک ہو جائے۔

(۴) کوئی شخص نشہ کی حالت میں گاڑی چلائے اور گاڑی کے نیچے آکر کوئی ہلاک ہو جائے۔

اس میں قاتل پر کفارہ نہیں ہے، البتہ اس کے عصبات پر دیت واجب ہے تاکہ انسانی جان رائیگاں نہ جائے۔

قتل خطاء کے احکام

آیت نمبر ۹۲ میں قتل خطاء کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔اس آیہ مبارکہ اور احادیث کریمہ کی روشنی میں تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) مقتول خواہ مسلمان ہو یا ذمی، اس کے ورثاء کو دیت اور قاتل کو کفارہ بھی ادا کرنا ہوگا۔

(۲) اگر مقتول کسی ایسے دارالکفر کا باشندہ ہے، جس کے ساتھ اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے، تو مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کی جائے گی اور قاتل کو کفارہ بھی ادا کرنا ہوگا۔

(۳) اگر مقتول دارالحرب کا باشندہ ہے یعنی ایسا ملک جس کے ساتھ اسلامی حکومت کی عملاً جنگ ہو رہی ہے یا دونوں حالت جنگ میں ہیں، تو قاتل کو صرف ایک غلام آزاد کرنا ہوگا، باقی نہ دیت ہے نہ کفارہ۔

(۴) جہاں غلام کو آزاد کرنے کا ذکر ہے، اس سے مسلمان غلام مراد ہے۔

(۵) اگر مقتول لاوارث ہے تو دیت کی رقم بیت المال میں جمع ہوگی کیونکہ احادیث کریمہ سے ثابت ہے کہ بعض صورتوں میں، جب قاتل کی عاقلہ کا تعین نہ ہو سکا تو دیت بیت المال سے ادا فرمائی۔

(۶) دیت، شریعت نے اس لئے لازم کی کہ اگرچہ یہ فعل خطا ہے، ایک تو مقتول کا کنبہ اپنے کفیل سے محروم ہو گیا ہے اور دوسرے یہ کہ انسان کا خون رائیگاں نہ جائے۔

(۷) اِلَّآ اَنْ یَّصَّدَّقُوْا (مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں) کے کلمات سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتول کے ورثاء چاہیں تو دیت معاف کر سکتے ہیں، مگر کفارہ بہرحال لازم ہوگا۔

کفارۂ قتل خطاء

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ "قتل خطاء" ہے اور از روئے شریعت فعل خطاء پر مواخذہ نہیں ہے تو شریعت نے علامت قبولیت توبہ کے طور پر کفارہ کیوں لازم کیا؟ اس کا جواب مفسرین وفقہاء نے یہ دیا ہے کہ انسان پر ازحد احتیاط لازم ہے، خاص طور پر ایسے فعل میں کہ جس میں ناحق کسی کی جان تلف ہو سکتی ہے، اس لئے شاید اس نے وہ انتہائی درجے کی

احتیاط نہ کی ہو جو اسے کرنی چاہیے تھی، لہٰذا آئندہ اس کے اور دوسروں کے کان کھل جائیں گے اور پھونک پھونک پر قدم رکھیں گے۔

دیت کا معنی ومفہوم اور مقدار

یہ "وَدٰی یَدِیْ دِیَۃً" سے مشتق ہے، مصدر "ودیا" منقلب ہو کر "صفۃٌ" اور "عدہ" کے وزن پر "دیۃٌ" ہو گیا۔ اس کے معنی ہیں "خون بہا"۔ احادیث کریمہ سے جو اس کی مقدار ثابت ہے۔ وہ یہ ہے:

سو اونٹ یا ایک ہزار دینار (یعنی 4.374 کلو گرام سونا) یا دس ہزار درہم (یعنی 30.618 کلو گرام چاندی) ہے۔ دیت کی ادائیگی عاقلہ پر لازم ہے، جس کی مدت ادائیگی تین سال ہے۔

عاقلہ کا مفہوم

"عاقلہ" "عقل" سے مشتق ہے، اس کے معنی ہیں "روکنا" اسی سے قید خانے کو "معقل" کہتے ہیں، اونٹ باندھنے کی رسی کو "عقال" کہتے ہیں۔ "عاقلہ" سے مراد قاتل کے وہ عصبہ ورثاء ہیں جن پر قاتل کی جانب سے دیت ادا کرنی لازم ہوتی ہے۔ "عقل" کو "عقل" اس لئے کہتے ہیں کہ وہ انسان کو تمام ضرر رساں امور سے روکتی ہے۔ اور عاقلہ یعنی کنبہ، قبیلہ، یا خاندان پر جب مالی ذمہ داری عائد کی جائے گی تو وہ اپنے کنبے کے افراد کو غیر ذمہ دارانہ حرکات اور "لاابالی" کاموں سے روکیں گے۔

امامِ اعظم کے نزدیک کسی شخص کے "اہل دیوان" بھی اس کی عاقلہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک ادارے یا صنعت میں کام کرنے والے لوگ، ڈرائیوروں وغیرہ کی ایسوسی ایشنز، یا یونینز وغیرہ۔ اگر بیمے کا نظام اسلامی اصولوں پر قائم ہو تو اسے بھی "عاقلہ" کی تعریف میں لایا جا سکتا ہے۔

قتل عمد کا حکم

"قتل عمد" کی دنیوی سزا "قصاص" ہے۔ جو قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ مقتول کے

ورثاء کو اختیار ہے کہ: (الف) وہ چاہیں تو قاتل سے قصاص لے لیں۔ (ب) یا اسے بالکل معاف کر دیں۔ (ج) یا اس سے کسی خاص ''مالی معاوضے'' پر صلح کر لیں۔ (د) ہاں اگر کوئی ایک وارث بھی معاف کر دے تو ''قصاص'' ساقط ہو جائے گا اور مقتول کے باقی ورثاء کو قاتل دیت ادا کرے گا۔

اس آیت میں ''قاتل عامد'' (Intentional Murderer) کی اخروی سزا کا ذکر ہے کہ دائمی طور پر جہنم میں رہے گا، اور اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہے۔ اس کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کا یہ سخت حکم قتل کی سنگینی کو بیان کرنے کے لئے ہے، ورنہ قرآن کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ ''اللہ شرک کے سوا ہر گناہ کو چاہے تو معاف فرما دے۔'' لہٰذا اگر قاتل قصاص یا خون بہا ادا کرے اور صدق دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ بھی کرے تو اس کی معافی کی امید کی جا سکتی ہے، سورۃ الحجرات اور بعض احادیث مبارکہ میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذَٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿٩٤﴾

''اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) نکلو تو تحقیق کر لیا کرو، جو تمہیں سلام کرے، اسے (بلا تحقیق) یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو، تم سامان دنیا کے طلب گار ہو لیکن اللہ کے پاس تمہارے لئے بہت سے (اموال) غنیمت ہیں، پہلے تمہاری بھی یہی صورت حال تھی، تو اللہ نے تم پر احسان فرمایا، لہٰذا اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے باخبر ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

ضَرْب فِي الْاَرْضِ	کے معنی ہیں سفر کرنا	ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	جب تم اللہ کی راہ میں نکلو یعنی جہاد کرو

فَتَبَيَّنُوْا	تحقیق کرو، غور و تامل کرنا	تَبْتَغُوْنَ	تم چاہتے ہو
عَرَضَ	سامان	مَغَانِمُ	غنیمت کی جمع

تفسیر

''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا'' آیت نمبر ۹۴ کے ان کلمات مبارکہ کا ایک معنی تو وہ ہے جو ترجمے میں درج ہے، تفسیر کبیر، روح المعانی اور قرطبی میں ایک دوسرے معنی بھی بیان کئے گئے ہیں، وہ یہ کہ ''سَلَمْ'' اور ''سِلْم'' کے ایک معنی اطاعت و فرمانبرداری اور مصالحت کے ہیں، تو ان کلمات مبارکہ کا دوسرا معنی یہ ہوگا کہ '' (کافروں میں سے) جو تمہاری اطاعت قبول کر کے (صلح کرلیں) تو پھر (بلا جواز) یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو''۔

اس آیت کے شانِ نزول میں مفسرین نے ایک سے زائد واقعات درج کئے ہیں، ان میں سے ایک حضرت اسامہ بن زید کا واقعہ ہے، ان کی قیادت میں حضور نے ایک ''سریہ'' روانہ کیا، کفار لشکر اسلام کی آمد کی خبر سن کر بھاگ گئے، مرداس نامی ایک شخص، جو اسلام قبول کر چکا تھا، اپنے مال مویشی کے ساتھ وہیں موجود رہا، جب لشکر اسلام وہاں پہنچا تو اس نے آگے بڑھ کر انہیں ''السلام علیکم'' کہا اور کلمہ پڑھا۔ لیکن حضرت اسامہ نے اسے قتل کر دیا اور اس کے ریوڑ پر قبضہ کرلیا۔ واپسی پر جب یہ خبر حضور کو سنائی گئی تو آپ کبیدہ خاطر ہوئے تاہم چونکہ یہ حضرت اسامہ کی اجتہادی غلطی تھی، اس لئے آپ نے انہیں معاف کر دیا اور ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ اس آیت سے چند مسائل معلوم ہوئے۔

(۱) بلا تحقیق کسی خبر پر کارروائی نہیں کرنی چاہئے (۲) اگر کوئی شخص کلمہ توحید یا کلمہ شہادت پڑھ لے، خواہ جنگ کے دوران ہی کیوں نہ ہو تو اس پر تلوار نہیں چلانی چاہئے۔ (۳) حضرت مقداد بن اسود سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم آپ مجھے بتائیے کہ (بالفرض دورانِ جنگ) میرا ایک کافر سے آمنا سامنا ہوتا ہے، ہم دونوں میں لڑائی ہوتی ہے، وہ کافر میرے ایک ہاتھ پر تلوار سے ضرب لگاتا ہے اور اسے

کاٹ دیتا ہے، پھر وہ مجھ سے بچ کر ایک درخت کی اوٹ میں چلا جاتا ہے اور کہتا ہے: "میں نے اسلام قبول کرلیا ہے"، ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب میں (جوابی کارروائی کرتے ہوئے) اسے قتل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو وہ "لا الہ الا اللہ" پڑھ لیتا ہے، تو کیا میں کلمہ پڑھنے کے بعد اسے قتل کرسکتا ہوں؟" حضور ﷺ نے فرمایا: "نہیں، اسے قتل نہ کرو۔" مقداد نے عرض کیا: "یارسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم وہ تو میرا ایک ہاتھ کاٹ چکا ہے؟" حضور نے فرمایا: "(اس کے باوجود) اسے قتل نہ کرو، کیونکہ اگر (اب) تم نے اسے قتل کردیا تو وہ تمہارے قتل کرنے سے پہلے تمہاری طرح ہے (یعنی اس کی جان کی حرمت اسلام کی بناء پر ہے) اور اس قتل ناحق کے بعد تمہارا خون اسی طرح مباح ہوجائے گا، جیسا کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے اس کا خون مباح تھا۔" (بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ)۔ اسی طرح ایک موقع پر جب حضرت اسامہ بن زید نے قبیلۂ جہنیہ کے ایک شخص کو دورانِ جنگ کلمہ پڑھنے کے باوجود قتل کردیا، تو حضور ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: "کیا تم نے کلمہ پڑھنے کے باوجود اسے قتل کردیا؟" اسامہ کہتے ہیں: "میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم اس نے تو محض جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھا تھا (یعنی دل سے نہیں پڑھا تھا)۔" تو حضور ﷺ نے فرمایا: "تو تم نے اس کے دل کو چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا؟، (یعنی دل کے احوال پر اللہ کے سوا کون مطلع ہوسکتا ہے؟)" (مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین)۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب کلمہ "لا الہ الا اللہ" کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اپنی حرمت کو پامال کرنے پر احتجاج کرے گا، تو تم کیا جواب دوگے؟" (۴) علماء نے کہا ہے کہ اگر عیسائی یا یہودی صرف یہ کہے کہ "میں مومن ہوں" تو کافی نہیں ہے جب تک کہ وہ اپنے عقائد باطلہ سے رجوع نہ کرے۔ (۵) ایک شخص کلمہ پڑھ لیتا ہے لیکن اس سے کھلے عام کفریہ عقائد واعمال سرزد ہوں تو اس کے ایمان کا اعتبار نہیں ہوگا۔ (۶) اس آیت میں صحابہ سے فرمایا گیا کہ تم بھی تو پہلے حالت کفر پر تھے، اس کلمۂ اسلام نے ہی تمہیں عزت وامان دی ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

"بلا عذر جہاد سے بیٹھے رہنے والے مسلمان اور اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر درجے میں فضیلت عطا فرمائی ہے، اور اللہ نے سب سے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے، اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اجر عظیم سے فضیلت دی ہے۔ ان کیلئے اللہ کی جانب سے بلند درجے ہیں اور مغفرت و رحمت (کی نوید) ہے۔ اور اللہ بخشنے والا نہایت مہربان ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

لَا يَسْتَوِي	برابر نہیں ہے	الْقٰعِدُوْنَ	بیٹھنے والے یعنی جہاد سے پیچھے رہ جانے والے
غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ	یعنی جو کسی تکلیف، مرض یا تنگی میں مبتلا نہ ہوں یعنی پیچھے رہ جانے کا سبب عذر نہ ہو	الْحُسْنٰى	نیکی

تفسیر

جہاد کیلئے جب حاکم وقت کی طرف سے "نفیر عام" (General Call to Arms) ہو جائے تو اس صورت میں جہاد سب پر فرض عین ہو جاتا ہے، لیکن بعض مواقع پر جب فرض کفایہ کے طور پر محدود تعداد میں مجاہدین درکار ہوتے تو پرجوش صحابہ بڑھ چڑھ کر شوق سے

نکل آتے اور بعض معذور، مجبور اور بے مایہ لوگ پیچھے رہ جاتے تھے۔ ایسے معذورین کی تسلی کے لئے قرآن نے فرمایا کہ اگرچہ عملاً جہاد کرنے والوں کے مراتب بہت بلند ہیں لیکن مخلص معذورین بھی جو پیچھے رہ گئے ہیں، ثواب سے بالکلیہ محروم نہیں رہیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب بندہ بیمار ہو جاتا ہے تو اللہ فرشتوں کو حکم فرماتا ہے کہ ''میرا بندہ اپنی تندرستی کے ایام میں جو بھی نیک کام کرتا تھا، شفایاب ہونے تک وہ سب اعمالِ حسنہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھتے رہو'' اور ایک غزوہ سے واپسی پر آپ نے فرمایا: ''مدینے میں ایسے لوگ ہیں جو ہر مشکل مرحلے میں تمہارے ساتھ رہے ہیں، انہیں اس بار معذوری نے روک لیا ہے۔''

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾ وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿١٠٠﴾

''جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، جب فرشتوں نے ان کی روحیں قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے؟ انہوں نے کہا: ''ہم زمین میں بے بس تھے''۔ فرشتوں نے کہا: تو کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ مگر (ہاں) جو مرد، عورتیں اور بچے (واقعی) بے بس ہیں، وہ (اس مصیبت سے نکلنے کی) تدبیر پاتے

ہیں اور نہ انہیں کوئی راستہ سوجھتا ہے۔قریب ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کو معاف فرما دے اور اللہ بہت معاف فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے۔اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ کے لئے بہت جگہ اور (رزق کی) کشادگی پائے گا،اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اوراس کے رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے پھر اسے موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ کرم پر ہے اور اللہ نہایت بخشنے والا بے حد مہربان ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ	ملائکہ ان کی روح قبض کریں	ظَالِمِیٓ اَنْفُسِهِمْ	اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے
فِیْمَ كُنْتُمْ	تم کس حال میں تھے؟	مَاْوٰی	ٹھکانا، جہاں انسان لوٹ کر واپس آتا ہے
سَآءَتْ	برا ہے	مَصِیْرًا	ٹھکانا، پلٹ کر واپس آنے کی جگہ
حِیْلَةً	تدبیر		
مُرٰغَمًا	بھاگنے کی جگہ، جائے پناہ۔عربی محاورے میں رَغِمَ اَنْفَهٗ کے معنی ہیں "اس کی ناک خاک آلود ہوگئی" یعنی وہ ذلیل ورسوا ہوا۔یعنی ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو امان ملے گی،تو کفار رسوا ہوں گے		
یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ	اس کو موت آجائے۔		

تفسیر

اعلان نبوت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی میں کفارِ مکہ نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے اوران پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔آخر کار اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا، اور یہ ہجرت فرض قرار دی گئی۔ایسے حالات میں کہ دارالکفر میں مسلمانوں کی

جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہ ہو، اسلامی احکام واقدار پر عمل کی اجازت نہ ہو اور اللہ کی زمین پر کسی دارالسلام میں ان کے لئے پناہ گاہ موجود ہو تو ہجرت فرض ہو جاتی ہے۔ اور اپنی دینی حمیت اور عزتِ نفس کو قربان کر کے محض مادی خوشحالی کے لئے بدستور دارالکفر میں رہتے چلے جانے کو ان آیات میں ''اپنی جانوں پر ظلم'' سے تعبیر کیا ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کی ارواح سے فرشتوں کا مکالمہ قرآن نے نقل کیا ہے۔ البتہ جو لوگ واقعی بے بس و بے کس تھے، ان کے پاس سفر کے وسائل نہ تھے، یا کوئی رفیق سفر نہ تھا، تو قرآن نے ایسے مجبور و معذور لوگوں کو قابلِ معافی قرار دیا ہے، ایسے لوگوں کے نام بھی مفسرین نے درج کئے ہیں، مثلاً عبداللہ بن عباس اور ان کی والدہ، عیاش بن ابی ربیعہ، ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام وغیرہ صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم، ان کے لئے رسول اللہ ﷺ نماز میں دعا فرمایا کرتے تھے کہ: ''اے اللہ! ان بے بسوں کے لئے راہِ نجات مقدر فرما۔'' بعض صحابہ حبشہ اور مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لئے نکلے اور منزلِ مراد تک پہنچنے سے پہلے ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہیں ہجرت کا اجر ضرور ملے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اگر کوئی تجارت کی توسیع، روزگار کے وسیع امکانات اور شادی یا کسی بھی دنیوی مقصد کے لئے ترک وطن کرے تو اس پر ''ہجرت شرعی'' کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اسی لئے فتح مکہ کے بعد جب کہ دارالاسلام بن گیا تو حضور ﷺ نے اعلان فرمایا کہ "لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ۔" یعنی فتح مکہ کے بعد اب ہجرت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ البتہ جب کبھی اور جہاں کہیں ایسے حالات پیدا ہوں گے، ہجرت کی شرعی ضرورت باقی رہے گی، چنانچہ حضور ﷺ کا فرمان ہے: جب تک توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا، ہجرت کا سلسلہ بند نہیں ہوگا، یعنی بوقت ضرورت ہجرت قیامت تک جاری رہے گی۔

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾ وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ

مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

''اور جب تم سفر کے لئے نکلو تو تم پر کچھ حرج نہیں کہ نماز کو قصر کر کے پڑھو، بشرطیکہ تمہیں اندیشہ ہو کہ کفار تمہیں اذیت پہنچائیں گے، بلاشبہ کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ اور (اے حبیب!) جب آپ (حالت جنگ میں) ان کے درمیان موجود ہوں اور نماز پڑھانے لگیں تو ایک گروہ مسلح ہو کر آپ کی اقتداء میں کھڑا ہو جائے، پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو تمہارے پیچھے (مورچے پر) چلے جائیں، اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی وہ آ کر ہوشیار اور مسلح ہو کر آپ کی اقتداء میں نماز پڑھے، کافروں کی یہ تمنا ہے کہ تم کسی طرح اپنے ہتھیاروں اور ساز وسامان سے غافل ہو جاؤ اور وہ یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑیں، اور اگر تمہیں بارش کے سبب تکلیف ہے یا تم بیمار ہو تو تم پر کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنے ہتھیار اتار کر رکھ دو، ہاں (اس کے باوجود دشمن سے) ہوشیار رہو، بے شک اللہ نے کافروں کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ پس جب تم نماز پوری کر لو تو کھڑے، بیٹھے اور

پہلوؤں کے بل (لیٹے ہر حالت میں) اللہ کو یاد کرتے رہو، پھر جب تم (دشمنوں کی جانب سے) مطمئن ہو جاؤ تو (معمول کے مطابق) نماز ادا کرو، بلاشبہ اہل ایمان پر نماز، اوقات مقررہ میں ادا کرنا لازم ہے۔ اور کافروں کی تلاش میں کمزوری نہ دکھاؤ، اگر تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو انہیں بھی تو تمہاری طرح تکلیف پہنچتی ہے، حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کی ذات سے (اجر و ثواب کی) وہ امید رکھتے ہو جو وہ (ہرگز) نہیں رکھتے، اور اللہ تعالیٰ بہت جاننے والا بڑی حکمت والا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

إِذَا ضَرَبْتُمْ	جب تم زمین میں سفر کرو	جُنَاحٌ	گناہ، حرج
أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ	یہ کہ تم نماز قصر پڑھو	أَنْ يَّفْتِنَكُمْ	یہ کہ تمہیں تکلیف پہنچائیں گے
فَلْتَقُمْ	پس چاہئے کہ کھڑا ہو	طَآئِفَةٌ	گروہ، جماعت
وَلْيَأْخُذُوْا أَسْلِحَتَهُمْ	اور انہیں چاہئے کہ اپنے ہتھیار اٹھائے رکھیں	مِنْ وَّرَآئِكُمْ	تمہارے پیچھے
وَلْتَأْتِ	اور چاہئے کہ آئے	لَمْ يُصَلُّوْا	جنہوں نے نماز نہیں پڑھی
فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ	انہیں چاہئے کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھیں	وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ	اور انہیں چاہئے کہ اپنا بچاؤ کیے رکھیں، ہوشیار رہیں
أَسْلِحَةٌ	"سلاح" کی جمع ہتھیار	أَمْتِعَةٌ	متاع کی جمع سامان
فَيَمِيْلُوْنَ	تم پر ٹوٹ پڑیں	مَّيْلَةً وَّاحِدَةً	ایک دم

اَذًى	تکلیف	اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ	یہ کہ اپنے ہتھیار اتار کے رکھو
فَاِذَا قَضَيْتُمُ	جب تم ادا کر چکو، پوری پڑھ لو	قُعُوْدًا	بیٹھنا
جُنُوْب	''جنب'' کی جمع، پہلو، کروٹ	فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ	پس جب تم بے خوف ہو جاؤ، خطرہ ٹل جائے
كِتٰبًا	فرض، لکھا ہوا	مَّوْقُوْتًا	(ہر وہ کام جو) وقت کی پابندی کے ساتھ کرنا لازم ہو

تفسیر

آیت نمبر ۱۰۱ میں ''نماز قصر'' کا حکم بیان کیا گیا ہے۔

قصر کا معنی ومفہوم

امام راغب اصفہانی بیان کرتے ہیں کہ ''قصر'' طول کی ضد ہے (یعنی چھوٹا)۔ لغت عربی میں ''قَصْرُ الشَّیئِ عَلٰی كَذَا'' کے معنی ہیں: ''کسی چیز پر اقتصار کرنا (یعنی رک جانا) اور اس سے تجاوز نہ کرنا۔'' اصطلاحِ شریعت میں ''قصرِ صلوٰۃ'' کے معنی ہیں ''شرعی رخصت کی بناء پر فرض نماز میں ''تخفیف کا حکم''۔ شرعی رخصت سے مراد بندۂ مومن کا حالت سفر میں ہونا۔

قصر کی علت

آیۂ مبارکہ میں نماز کی ''رخصت قصر'' کی علت سفر اور دشمن کے خوف کو قرار دیا گیا ہے، لیکن ائمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہے کہ ''رخصت قصر'' کی علت صرف سفر ہے، دشمن کے خوف کی قید محض اتفاقی ہے، کیونکہ ''صلوٰۃ الخوف'' کا ذکر اگلی آیت میں الگ سے کیا گیا ہے۔ اور اس امر پر بھی اجماع ہے کہ ''سفرِ محض'' ہی ''علتِ قصر'' ہے، خواہ اس میں مشقت

ہو یا نہ ہو، یعنی نماز میں قصر اور روزے میں رخصتِ افطار کے لئے سفر شرعی کا ہونا ہی کافی ہے، خواہ وہ کتنا ہی پر آسائش کیوں نہ ہو۔

مسافت قصر

اس سے مراد وہ کم از کم مسافت ہے، جس کے سفر پر روانہ ہوتے ہی سفر کے شرعی احکام عائد ہو جاتے ہیں، یعنی نماز میں قصر، روزے میں افطار کی اجازت، موزوں پر مسح کی مدت اور عورت پر بغیر محرم کے سفر کی ممانعت وغیرہ۔ اس سلسلے میں مختلف مکاتب فکر اور مسالک کا مسلمہ معیار حسب ذیل ہے:

فقہ حنفی

احناف نبی کریم ﷺ کی اس حدیث مبارکہ سے استدلال کرتے ہیں کہ:

''عورت کے لئے محرم کے بغیر تین دن کا سفر جائز نہیں (صحیح بخاری)۔ اس کی تفصیل میں ائمہ مجتہدین نے کہا کہ تین دن اونٹ پر یا پیادہ ایسا سفر، جس میں رات کو آرام، صبح کو سفر، دوپہر کو قیلولہ اور نمازوں کے اوقات میں نماز پڑھ سکے۔ قدیم علماء کے اس سلسلے میں تین اقوال ہیں: ۱۵ فرسخ، ۱۸ فرسخ اور ۲۱ فرسخ، علامہ ابن عابدین شامی نے ۱۸ فرسخ کو متوسط اور ''مفتیٰ بہ'' قرار دیا ہے۔ ایک فرسخ میں تین شرعی میل (بحساب ۲۰۰۰ گز فی میل) ہوتے ہیں اور ۱۸ فرسخ کے ۵۴ شرعی میل، ۶۱ میل ۲ فرلانگ ۲۰ گز یا ۹۸٫۲۳۴ کلومیٹر ہوتے ہیں۔

فقہ شافعی و حنبلی

امام محی الدین یحییٰ بن شرف نووی نے دو دن کے سفر کو معیار قرار دیا ہے اور وہ اس کی مقدار چار برد بحساب چار فرسخ فی بریدہ بتاتے ہیں، تو اس طرح یہ سولہ فرسخ اور ۴۸ میل شرعی (بحساب ۲۰۰۰ گز فی میل) یا تقریباً ۵۴ میل انگریزی بنتے ہیں۔

فقہ مالکی

علامہ ابن رشد مالکی نے ایک دن کے سفر پر بھی قصر اجازت دی ہے۔

ظاہریہ

داؤد ظاہری کے متبعین یعنی غیر مقلدین مطلق سفر کو قصر کی علت قرار دیتے ہیں، لہٰذا ان کے نزدیک آدمی شہر سے ایک میل یا کلومیٹر بھی باہر نکل جائے تو قصر پڑھ سکتا ہے۔

قصر کی ابتداء وانتہاء

چاروں ائمہ کا اس پر اجماع ہے کہ مسافر جب اپنے شہر کی حدود (بڑے شہروں میں بلدیاتی حدود) سے نکل جائے تو قصر شروع ہو جائے گی اور جب واپسی پر حدود شہر میں داخل ہو جائے گا تو پوری نماز پڑھنی ہوگی۔

مدت قصر

امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اگر دورانِ سفر کسی مقام پر پندرہ دن یا اس سے زیادہ قیام کا ارادہ کرلے، تو وہ جگہ "وطن اقامت" کہلاتی ہے اور اسے وہاں پر پوری نماز پڑھنی ہوگی جبکہ باقی تینوں ائمہ کے نزدیک جہاں چار دن قیام کا ارادہ کرلے تو پوری نماز پڑھنی ہوگی۔

وجوب قصر میں مذاہب

امام شافعی کے نزدیک حالت سفر میں قصر اور ترکِ قصر دونوں جائز ہیں، لیکن قصر افضل ہے، امام احمد بن حنبل اور امام مالک کے نزدیک قصر مباح ہے، یعنی دونوں جانب برابر ہیں، امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک سفر میں قصر واجب ہے اور ترک گناہ۔ یعلی ابن امیہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ ہم حالت امن میں قصر کیوں پڑھتے ہیں؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیا کہ یہی بات جب ہم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھی تو آپ نے فرمایا: "یہ تم پر اللہ کا انعام ہے تو اس کے انعام کو قبول کرو یعنی رد نہ کرو۔" یہاں پر حدیث میں "تصدق" کا لفظ آیا ہے، جو قرآن مجید میں

"حق اور مطالبے" کو ساقط کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، یعنی گویا سفر میں شارع نے ازراہِ لطف وکرم پوری نماز کا مطالبہ ساقط کر دیا ہے، اب اصل مطالبہ شرعی صرف دو رکعات ہی ہے، لہٰذا اس پر عمل کرنا واجب ہے اور کریم کے اکرام وانعام کا رد کرنا ویسے بھی خلافِ ادب ہے، جیسے ایام قربانی میں "ضیافت الٰہی" کی وجہ سے روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

اور اس کے علاوہ کسی ایک بھی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے حالت سفر میں قصر نہ پڑھی ہو بلکہ پوری نماز پڑھی ہو۔ سفر حج کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب پوری نماز پڑھی تو ان سے سبب دریافت کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا: "میں نے مکہ میں شادی کر لی ہے" اور جہاں انسان شادی کر لے، وہ بھی اس کا وطن ہو جاتا ہے اور وہاں پوری نماز پڑھنی پڑتی ہے۔

فرائض میں قصر

چار رکعت والے فرائض میں قصر لازم ہے، یعنی ظہر، عصر اور عشاء میں صرف دو فرض پڑھنے ہوں گے، مغرب کے تین فرض اور عشاء کے تین وتر پورے پڑھنے ہوں گے۔

سنن میں قصر

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سفر میں "سنن مؤکدہ" پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ احناف کے نزدیک جب سفر جاری ہو تو سنتیں چھوڑ دے، البتہ فجر کی سنت ضرور پڑھے، کیونکہ یہ واجب کے قریب تر ہے، اور جہاں عارضی طور پر ٹھہر جائے وہاں سنتیں پڑھ لینا افضل ہے۔

سفر معصیت کے احکام

گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ "قصر" کی علت "سفر" ہے، اس لئے سفر کی نوعیت یا مقصد کوئی بھی ہو، قصر کی رخصت اس کے لئے ثابت ہوگی، خواہ واجب ہو جیسے سفر حج یا سنت ہو جیسے سفر عمرہ یا عیادت وغیرہ کا سفر، یا مباح ہو۔ جیسے کاروباری سفر یا معصیت ہو جیسے چوری یا کسی اور معصیت کے لئے سفر، اور سفر پر اجر یا گناہ کے احکام اس کی نوعیت

کے اعتبار سے ہوں گے۔ جبکہ باقی ائمہ کے نزدیک سفر معصیت پر قصر کی رخصت کا اطلاق نہیں ہوگا۔

صلوٰۃ الخوف کے احکام

آیت نمبر ۱۰۲ میں ''صلوٰۃ الخوف'' کا ذکر ہے اور قرآن نے اسے کافی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ علامہ ابوالحسن مرغینانی (مصنف ہدایہ) فرماتے ہیں:

جب میدانِ جنگ میں خوف بڑھ جائے تو امیر لشکر مجاہدین کو دو گروہوں میں تقسیم کر دے۔ ایک گروہ امام کی اقتداء میں با جماعت نماز شروع کرے اور دوسرا گروہ دشمن کے سامنے مورچہ بند رہے، جب پہلی رکعت دوسرے سجدے پر مکمل ہو جائے تو یہ گروہ سلام پھیرے بغیر دشمن کے سامنے چلا جائے اور دوسرا گروہ آ کر امیر کی اقتدا میں دوسری رکعت میں شامل ہو جائے، امیر دو رکعت مکمل ہونے پر تشہد کے بعد سلام پھیر دے اور یہ گروہ سلام پھیرے بغیر دشمن کے سامنے چلا جائے۔ اور پہلی جماعت آ کر الگ الگ بغیر قرأت کے اپنی رکعت ثانی جو باقی رہ گئی تھی مکمل کر کے سلام پھیر دے، یہ جماعت لاحق ہے (لاحق اس مقتدی کو کہتے ہیں جس کی نماز کا پچھلا حصہ رہ گیا ہو)۔ اس کے بعد وہ جماعت آئے جس کی پہلی رکعت رہ گئی تھی، اور ایک رکعت قرأت کے ساتھ پڑھے اور تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے، یہ جماعت مسبوق ہے، (مسبوق اس مقتدی کو کہتے ہیں جو پہلی رکعت میں امام کے ساتھ شامل نہ ہوسکا)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ نے اسی طریقے پر ''صلوٰۃ الخوف'' پڑھی ہے۔

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی نے تفسیر جامع القرآن میں ''صلوٰۃ الخوف'' کی مختلف ۲۴ صورتوں کا ذکر کیا ہے اور علامہ قاضی ثناء اللہ مظہری نے ۱۴ صورتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

''صلوٰۃ الخوف'' کی یہ صورتیں اس وقت اختیار کی جائیں گی جب دشمن کا خوف مسلط ہو لیکن اگر عملاً معرکہ برپا ہو اور گھمسان کا رن پڑ رہا ہو تو پھر جہاں اور جیسے بن پڑے نماز پڑھ لینی چاہئے، چاہے سوار ہو یا پیادہ ہو، رکوع و سجود نہ کر پائے تو اشارے سے پڑھ لے،

بعض اوقات دشمن کو سامنے رکھنے کی وجہ سے قبلے کی جانب پیٹھ ہو جاتی ہے تو اس وقت اسی حالت میں نماز پڑھ سکتا ہے، یہ ائمہ ثلاثہ کا مسلک ہے۔

امام اعظم سے بھی علامہ قرطبی نے ایک قول اس کے مطابق نقل کیا ہے۔ لیکن ائمہ احناف کی متفقہ رائے انہوں نے یہ بھی نقل کی ہے کہ شدید ترین خطرے کے صورت میں نماز قضا کر لینی چاہئے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع پر چار نمازیں قضا کر لی تھیں اور پھر ترتیب سے انہیں بطور قضا کے ادا فرمایا۔

امام ابو یوسف کا نظریہ

امام ابو یوسف اور حسن بن زیاد کے نزدیک ''صلوٰۃ الخوف'' حضور انور ﷺ کے خصائص میں سے ہے، کیونکہ آیت مذکورہ بالا میں قرآن نے فرمایا'' جب آپ ان میں موجود ہوں اور انہیں نماز پڑھائیں۔'' لیکن جمہور کی رائے یہی ہے کہ احکامِ شرعیہ کا مورد (سبب نزول) تو خاص ہوتا ہے لیکن حکم عام ہوتا ہے اِلاَّ یہ کہ خصوصیت پر کوئی دلیل موجود ہو۔

صلوٰۃ الخوف کا فلسفہ اور حکمت

بظاہر تو انسان سوچتا ہے کہ جب جان کے لالے پڑے ہوں تو نماز کا ہوش کسے ہوگا اور جان کی حفاظت ہر چیز پر مقدم ہے۔ لیکن قرآن نے'' صلوٰۃ الخوف'' کا تصور و حکم دے کر یہ باور کرایا کہ وہ جان کس کام کی جو اپنے رب کی اطاعت سے غافل ہو جائے اور جہاد اور کفار پر غلبے کا بھی یہی مقصد ہے کہ اللہ کی زمین اور اللہ کے بندوں پر اللہ کی شریعت نافذ کی جائے اور نظامِ اسلام کا سب سے اہم رکن نماز ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ امام و امیر کی اقتداء و اطاعت، جماعت اور جمعیت کو مشکل ترین لمحات میں بھی قائم رکھنے کی ترغیب دی ہے تو عام حالات میں اس سے غافل رہنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

چوکس رہنے کا حکم

آیت نمبر ۱۰۲ میں اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دفاع سے کبھی غافل

نہیں رہنا چاہئے۔ بارش ہو، آندھی اور طوفان آئے، بیماری کا غلبہ ہو جائے یا حالات کیسے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، مسلمانوں کو ہر حالت میں چوکس، ہوشیار اور ہتھیار بند رہنا چاہئے اور اسلحہ ہر وقت فائرنگ پوزیشن (Red Alert) میں ہو۔

نماز

عبادتِ موقوت: جس عبادت کی ادائیگی کے لئے وقت کی ابتداء و انتہاء کا تعین کر دیا گیا ہو، اسے عبادت موقوت یا موقت کہتے ہیں اور نماز ایسی ہی عبادت ہے۔ اس لئے وقت مقررہ سے پہلے ادا بھی کر دی جائے تو ادا نہیں ہو گی بلکہ اس کا اعادہ کرنا ہو گا۔ اسی طرح مقررہ وقت کے اندر ادا نہ کی گئی ہو اور وقت گزر جائے تو ''قضاء'' ہو جائے گی۔

جمع بین الصلوٰتین

تاہم میدانِ عرفات میں امام الحج کی اقتداء میں مسجد نمرہ میں عصر کی نماز مقدم کر کے ظہر کی نماز کے ساتھ باجماعت پڑھی جاتی ہے اور مزدلفہ میں نمازِ مغرب کو مؤخر کر کے عشاء کے وقت میں پڑھنے کا حکم ہے اور یہ بالاتفاق جائز ہے کیونکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اسی طرح ثابت ہے۔ البتہ امام شافعی کے نزدیک شدید بارش میں ''جمع بین الصلوتین'' جائز ہے، خواہ جمع تقدیم ہو جیسے ظہر کے وقت میں ظہر و عصر ایک ساتھ ملا کر پڑھیں یا جمع تاخیر جیسے مغرب کو مؤخر کر کے عشاء کے وقت میں مغرب اور عشاء دونوں نمازیں ایک ساتھ پڑھی جائیں۔ امام مالک سے تین قول مروی ہیں، عدم جواز، جواز اور کراہت۔

احناف کے نزدیک عرفات کے علاوہ اور کسی بھی موقع پر ''جمع بین الصلوتین'' جائز نہیں ہے۔ البتہ ''جمع صوری'' جائز ہے یعنی یہ کہ جیسے ظہر کی نماز مؤخر کر کے آخری وقت میں پڑھ لی جائے اور پھر جوں ہی عصر کا وقت شروع ہوا ابتدائی وقت میں عصر پڑھ لی جائے۔

آیت نمبر ۱۰۴ میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ دشمن کے مقابلے میں سستی اور کمزوری کا مظاہرہ نہ کرو، کیونکہ جنگ اور حالت جنگ جس طرح تمہارے لئے رنج و الم کا باعث ہے بالکل اسی طرح کفار مبتلائے مصیبت رہتے ہیں۔ جبکہ ان کی صرف یہی دنیا ہے اور

مسلمانوں کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے آخرت کی ابدی اور دائمی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو ان کی منتظر ہیں۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾

"(اے حبیب!) بلاشبہ ہم نے آپ پر کتاب برحق نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کے عطا کردہ علم (یقینی) کے مطابق فیصلہ کریں اور آپ خائنوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنیں۔ اور آپ اللہ سے بخشش مانگیے، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ اور آپ ان لوگوں کی طرف سے نہ جھگڑیں جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت خیانت کرنے والا گنہگار کو پسند نہیں فرماتا۔ وہ لوگوں سے تو چھپانا چاہتے ہیں لیکن اللہ سے تو نہیں چھپا سکتے (کیونکہ) جب وہ رات کے وقت چھپ کر ایسی باتوں کے مشورے کرتے ہیں جو اسے پسند نہیں، تو وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ ان کے سب کاموں کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ سنتے ہو! تم وہ لوگ ہو کہ دنیا کی زندگی میں تو ان کی طرف سے تم نے جھگڑا کر لیا (مگر کل) قیامت کے دن ان کی طرف اللہ سے کون جھگڑا کرے گا یا کون ان کا وکیل ہوگا؟"

مشکل الفاظ کے معانی

بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ	جو اللہ نے آپ کو دکھایا	لِّلْخَآئِنِيْنَ	خائن کی جمع، خیانت کرنے والا
خَصِيْمًا	(کسی کی حمایت میں) جھگڑنے والا	وَلَا تُجَادِلْ	اور مت جھگڑ
يَخْتَانُوْنَ	خیانت کرتے ہیں	خَوَّانًا	بہت زیادہ خیانت کرنے والا
اَثِيْمًا	گنہگار	يَسْتَخْفُوْنَ	چھپاتے ہیں، شرماتے ہیں
يُبَيِّتُوْنَ	رات بھر (مشورہ) کرتے ہیں	لَا يَرْضٰى	وہ پسند نہیں کرتا

تفسیر

یہاں ہم جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری کی تفسیر ضیاء القرآن سے استفادہ کرتے ہوئے اس کا شانِ نزول من وعن نقل کر رہے ہیں۔

سبب نزول

یہ چند آیات ایک واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں جو عہد رسالت میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ انصار کے بنی ظفر قبیلہ کے ایک شخص مسمی طعمہ بن ابیرق نے اپنے ہمسایہ قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کے مکان میں نقب لگا کر کچھ زرہیں اور آٹے کی بوری چرا لی اور ایک یہودی زید بن سمین کے ہاں جا کر رکھ آیا۔ صبح ہوئی اور حضرت قتادہ کو جب چوری کا پتہ چلا تو انہوں نے اپنے پڑوسی طعمہ سے دریافت کیا، اس نے صاف انکار کر دیا اور قسم اٹھائی کہ مجھے اس کے متعلق علم تک نہیں۔ اتفاق یہ ہوا کہ آٹے کی بوری میں سوراخ تھا جس سے آٹا گرتا گیا۔ انہوں نے اس گرے ہوئے آٹے کے نشانات کا پیچھا کیا۔ چنانچہ وہ یہودی کے مکان تک

پہنچ گئے۔ تلاش کرنے پر مال مسروقہ برآمد ہو گیا۔ اس یہودی نے کہا کہ میں چور نہیں بلکہ میرے پاس طعمہ یہ چیزیں رکھ گیا ہے۔ کئی یہودیوں نے اس کی تصدیق کی۔ طعمہ کے قبیلہ والوں نے کہا چلو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں چلیں۔ چنانچہ سب حاضر ہوئے۔ بنوظفر کو اب علم ہو چکا تھا کہ چور یہودی نہیں بلکہ طعمہ ہے لیکن اپنی بدنامی کے خوف سے وہ طعمہ کو ہر طریقہ سے بری ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اس کی حمایت میں بڑی سرگرمی دکھانے لگے۔ حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں بھی عرض کرنے لگے کہ اگر فیصلہ طعمہ کے خلاف ہوا تو بے چارا ہلاک ہو جائے گا اور ذلت و رسوائی کی کوئی حد نہ رہے گی۔ اور یہودی جو اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہے وہ صاف بری ہو جائے گا۔ حضور کو بھی خیال گزرا کہ بنو ظفر جو مسلمان ہیں سچے ہوں گے۔ چنانچہ کوئی فیصلہ صادر ہونے سے پہلے وحی الٰہی پہنچ گئی جس سے حقیقت حال آشکارا ہو گئی بعد میں طعمہ کا انجام یہ ہوا کہ وہ وہاں سے بھاگ کر مکہ چلا گیا۔ ایک رات وہاں نقب لگا رہا تھا کہ دیوار گر پڑی اور نیچے دب کر ہلاک ہو گیا۔ ارشاد ربانی ہوا: ''ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے'' تا کہ آپ اس علم یقینی کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا کریں جو آپ کو اپنے رب کی طرف سے عطا فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ الشیخ رشید رضا لکھتے ہیں ''وَتَسمِيَةُ اِعْلَامِهٖ تَعَالٰى لِنَبِيِّهٖ بِالْاَحْكَامِ اِرَاءَةً يُشْعِرُ بِاَنَّ عِلْمَهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِهَا يَقِيْنِيٌّ كَالْعِلْمِ بِمَا يَرَهٗ بِعَيْنِهٖ فِي الْجِلَآءِ وَالْوُضُوْحِ (المنار)۔'' یعنی احکام کے متعلق جو علم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عطا فرمایا اس کی تعبیر ارآءۃ (دکھا دینا) سے کی ہے تا کہ یہ پتا چل جائے کہ اس علم میں ظن و گمان کا احتمال نہیں رہا بلکہ یہ علم ایسا یقینی اور قطعی ہے جیسے کسی چیز کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا جاتا ہے۔ اب آپ خود انصاف فرما دیں کہ جس ذاتِ قدسی صفات کے سامنے آنے والے ہر حجاب کو اٹھانے والا اللہ تعالیٰ ہو اس کے علم وسیع پر ہم ایسوں کو زیب دیتا ہے کہ اعتراض کرتے پھریں؟

نبی کا فیصلہ، اللہ کا فیصلہ

لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ: '' تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کے عطا کردہ

علم کی روشنی میں فیصلہ کریں۔''

بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ کے معنی ''جواللہ نے آپ کو دکھایا ہے۔'' یہاں ''ار آ ء ۃ'' (دکھانے) سے مفسرین کرام نے وحی والہام مراد لیا ہے جو علم کا سب سے قطعی، یقینی اور ہر قسم کے شائبہ شک سے پاک ذریعہ ہے، اور جس کا ذریعہ، مصدر اور منبع اللہ تعالیٰ کی ذات کریم ہے۔ اور اس ''علم وحی'' کو ''ار آ ء ۃ'' سے اس لئے تعبیر کیا کہ مادی ذرائع علم میں سب سے زیادہ معتبر ذریعہ علم ''رؤیت'' (دیکھنا) ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے سارے فیصلے اللہ تعالیٰ کی وحی کی رہنمائی اور روشنی میں ہوتے تھے، چنانچہ نبی کا فیصلہ دراصل اللہ ہی کا فیصلہ ہے کیونکہ وہ ہر بات وحی ربانی کی روشنی میں کرتے تھے۔ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حقائقِ امور پر مطلع فرماتا تھا۔ اور ان کلمات سے قبل نزولِ قرآن کا ذکر فرما کر یہ بھی بتا دیا کہ قرآن ہی سارے علوم کا سرچشمہ ہے۔ حقائق پر فیصلہ کرنا اور ہر فیصلے کا غلطی سے مبرا ہونا ''خاصۂ نبوت'' ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر کسی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ جو اللہ نے آپ کو دکھایا ہے اس پر فیصلہ کیجئے تو آپ نے فرمایا: ''یہ صرف نبی کی خصوصیت ہے، عام منصف اور حاکم تو شہادتوں اور واقعات کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہے''۔

توکیل بالخصومت

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا: اور آپ خائنوں کے حامی اور طرف دار نہ بنیں۔

امام رازی اور دیگر مفسرین نے اس مقام پر لکھا ہے کہ جب قرآن میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب فرما کر کوئی ''نہی'' وارد ہوئی ہو یا کسی بات سے منع کیا گیا ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ العیاذ باللہ! آپ وہ کام کر رہے تھے یا کرنے والے تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس طرح آپ کی ذات شروع ہی سے ان قبیح باتوں سے بہت منزہ اور پاک ہے، اسی شانِ عصمت کو ہمیشہ قائم و دائم رکھئے۔ کیونکہ اگر نبی کی عصمت کے بارے میں ادنیٰ سا بھی شائبہ پیدا ہو جائے تو دین و شریعت کا اعتبار اٹھ جائے گا اور وحی ربانی کی تقدیس

مجروح ہوگی۔

دوسری توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ نے قرآن میں بیشتر مقامات پر دراصل نبی مکرم ﷺ کے توسط سے امت کو تعلیم دی ہے۔ اسی آیۂ مبارکہ سے ''فقہاءِ امت'' نے پیشۂ وکالت کے لئے ایک رہنما اصول وضع کیا ہے۔ وہ یہ کہ مظلوم، مستغیث، مدعی یا مدعی علیہ کی وکالت جائز ہے اور شریعت میں اس کی اجازت ہے، لیکن ''توکیل بالخصومت'' جائز نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ موکل اپنے وکیل کو صرف اس امر کا اختیار دے کہ ''فریق مخالف'' کی جو بھی بات میرے خلاف جارہی ہو یا میرے مفاد کے خلاف ہو، اس امر سے قطع نظر کہ وہ فی الواقع درست ہے یا نہیں، اسے رد کردو۔ کیونکہ اس سے بعض صورتوں میں حق کا رد کرنا لازم آتا ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔

البتہ اس اختیار کے ساتھ وکالت کی جائے کہ ہر حق بات کو تسلیم کرلو اور ہر ناحق کو رد کر لو، تو جائز ہے بلکہ یہ باعث اجر ہے۔

آیۂ مبارکہ میں جمع کا صیغہ استعمال کرکے ''خائنین'' کہا گیا ہے حالانکہ اس واقعہ میں تو خائن ایک ہی شخص تھا، اس سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ''خائن'' کا حمایتی اور طرف دار بھی خائن ہوتا ہے اور اس شخص کی حمایت میں اس کا پورا قبیلہ کھڑا ہوگیا تھا۔

استغفارِ نبی کا محمل

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ اللہ نے اپنے حبیب مکرم ﷺ کو مخاطب کرکے فرمایا: ''اور اللہ سے بخشش مانگئے''، حالانکہ نبی تو گناہوں سے کلی طور پر معصوم ہوتا ہے تو استغفار کا کیا مطلب ہے؟ قاضی ثناء اللہ صاحب تفسیر مظہری اور دیگر مفسرین نے اس کی توجیہات اور محمل بیان کئے ہیں، مثلاً (۱) معصوم کا استغفار بلندیٔ درجات کے لئے ہوتا ہے۔ (۲) مقامِ عصمت پر قائم رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی توفیق وعنایت کی التجا ہوتی ہے۔ (۳) نعمت عصمت کا تشکر ہے۔ (۴) بحیثیت شارع بیان جواز کے لئے جو ''خلاف اولیٰ'' کام آپ کو کرنے پڑتے ہیں، اگرچہ فی نفسہٖ وہ مباح ہوتے ہیں، لیکن ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّاٰتُ الْمُقَرَّبِيْنَ''

کے مصداق آپ کے مقام رفیع کے شایانِ شان نہیں ہوتے، اس لئے آپ استغفار فرماتے ہیں۔ (۵) اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ گنہگاران امت کے لئے استغفار فرماتے ہیں۔ (۶) تعلیم امت کے لئے استغفار فرماتے ہیں، وغیرہ

اپنے آپ سے خیانت کرنے کا مفہوم

آیت نمبر ۱۰۷ میں فرمایا کہ "جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں، ان کی حمایت نہ کیجئے، حالانکہ بظاہر اپنے آپ سے خیانت کوئی نہیں کرتا، مفسرین کرام نے بتایا کہ "اپنے آپ پر ظلم" "اپنی ذات سے دھوکہ" اور "اپنے آپ سے خیانت" کا مطلب یہ ہے کہ آخر کاران "اعمال سیئہ" کا وبال انہیں پر نازل ہوگا۔

اللہ سے چھپانا ناممکن ہے

آیت نمبر ۱۰۸ میں فرمایا کہ "وہ لوگوں سے اپنی معصیتوں کو چھپاتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپاتے۔" یہ برائی سے روکنے کا انتہائی حکیمانہ انداز ہے کہ انسان اپنے جرم کو دو وجہ سے لوگوں سے چھپاتا ہے یا تو اس لئے کہ رسوائی سے شرماتا ہے اور یا اس لئے کہ قانون کی گرفت میں نہ آئے اور سزا سے بچ جائے۔ تو یہ انسان کی کس قدر گراوٹ ہے کہ مخلوق سے شرمائے اور خالق سے نہ شرمائے، کیونکہ خالق تو اسے ہر حال میں ہر جگہ دیکھتا ہے، اور دوسرا یہ کہ دنیا کی سزا سے تو انسان "بہ لطائف حیل" بچ سکتا ہے، اللہ کی پکڑ سے کیسے بچے گا؟

پھر اس پر مزید زور دے کر فرمایا کہ نادان لوگو! دنیا میں تو تم ظالموں، خائنوں، غاصبوں اور مجرموں کی مدافعت میں "حجت بازیاں" کر لو گے، لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ کل احکم الحاکمین کی عدالت میں کس کی مجال ہوگی کہ ظالم اور خائن کا حامی بن کر آئے کیونکہ وہ تو سَرِيْعُ الْحِسَابِ (جلد حساب لینے والا) ہے، وہ تو ذُوانْتِقَامٍ (بڑا سخت انتقام لینے والا) ہے، اس کی پکڑ تو بڑی سخت ہے، سوچو، غور کرو، ہوش میں آؤ اور ظالموں کا ساتھ نہ دینا چھوڑ دو۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا

رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾

''اور جو شخص کوئی برا کام کر گزرے یا اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھے، پھر اللہ سے عشق مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت مہربان پائے گا۔ اور جو کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا وبال اسی کی ذات پر ہے اور اللہ بہت جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔ جو شخص کسی خطا یا گناہ کا ارتکاب کرے پھر اس کا الزام کسی بے گناہ کے سر تھوپ دے تو بلاشبہ اس نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر لیا''۔

تفسیر

آیت نمبر ۱۱۰ میں ''اپنے آپ پر ظلم کرنے کے بعد'' توبہ کا ذکر ہے، اس پر گزشتہ آیات میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے، آیت نمبر ۱۱۱ کا مفہوم بھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اگرچہ وقتی طور پر مجرم دوسروں پر ظلم کے پہاڑ توڑتا ہے لیکن آخر کار اس کی سزا خود اسی کو بھگتنی پڑتی ہے۔

''خطاء'' اور ''اثم'' کا فرق:

آیت نمبر ۱۱۲ میں ''خطاء'' اور ''اثم'' (گناہ) کا ذکر ہے، مفسرین کرام اور فقہاء عظام نے ان کا جو تقابلی مفہوم بیان کیا ہے وہ یہ ہے:

(۱) گناہ صغیرہ کو خطاء کہتے ہیں جو اتفاقاً سرزد ہو جائے، لیکن اگر صغیرہ پر اصرار کیا جائے یعنی بار بار ارتکاب کیا جائے تو ''کبیرہ'' بن جاتا ہے اور یہ ''اثم'' ہے۔

(۲) جو گناہ بلا قصد و ارادہ سرزد ہو جائے تو ''خطا'' ہے اور قصداً ارتکاب کیا جائے تو یہ ''اثم'' ہے۔

تہمت لگانا بڑا جرم ہے

اس آیۂ مبارکہ میں فرمایا کہ جو کوئی ارتکابِ گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر ڈال

دے تو یہ دوہرا جرم ہے، ایک ارتکاب گناہ اور دوسرا ''بہتان'' و ''افتراء''۔ ایسے لوگوں کے لئے قرآن نے فرمایا: وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ اور وہ ضرور اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے اور بے قصور مظلومین اور ناروا تہمت کا نشانہ بننے والوں کے گناہوں کا بوجھ بھی، ''تقاضائے انصاف'' کی تکمیل کے لئے اٹھائیں گے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

''اور (اے حبیب!) اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ تو آپ کو بہکانے کا ارادہ کر چکا تھا، حالانکہ ''درحقیقت'' وہ خودفریبی میں مبتلا تھے اور وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور آپ کو وہ (سب) سکھا دیا جو کچھ آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ ان کی اکثر خفیہ سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے، ہاں اگر کوئی صدقے کا یا کسی نیک کام یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا مشورہ دے (تو اس کی بات اور ہے) اور جو اللہ کی رضا جوئی کے لئے ایسا کرے تو عنقریب ہم اسے بڑا اجر عطا کریں گے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

لَهَمَّتْ	ضرور ارادہ کر لیتے، یا کر لیا تھا	نَجْوٰی	سرگوشی کرنا، کانا پھوسی، خفیہ مشورے

اِبۡتِغَآءَ چاہنا مَرۡضَاتِ خوشنودی

تفسیر

آیت نمبر ۱۱۳ میں جس گروہ کا تذکرہ ہے، اس سے مراد انصار کے قبیلہ بنی ظفر کے لوگ ہیں جو "طعمہ بن ابیرق" کے جرم کو جاننے کے باوجود، اس کے تحفظ کے لئے یہودی "زید بن سمین" کو پھانسنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ حضور ایسا کریں لیکن آپ کی شانِ عدل اور مقام عصمت سے یہ ممکن ہی نہ تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل اور رحمت ہمیشہ آپ پر سایہ فگن رہتی تھی اور آپ کی عصمت کی محافظ تھی۔

علامہ آلوسی کی توجیہ

علامہ محمود آلوسی نے امام راغب کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ مسلمان تھے، ان کی اس خواہش پر "اضلال" (بہکانا) کا اطلاق محض صورۃً کیا گیا ہے، اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے کیونکہ کسی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان سے یہ متصور نہیں ہوگا کہ وہ اللہ کے رسول کو بہکانے کا ارادہ کرے۔ بلکہ وہ اپنی جگہ صدق دل سے یہ سمجھتے تھے کہ "یہودی" کے مقابلے میں، واقعات وحقائق سے قطعِ نظر، بہر صورت مسلمان کی حمایت کرنی چاہئے لیکن قرآن نے اس مؤقف کو رد کر دیا، چنانچہ اس تفسیر کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا: "اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ آپ کو بہکانے کا ضرور قصد کر لیتا۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کا حکم سن کر یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔

علم نبوت کی وسعت کا بیان

اس مقام پر امام رازی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے علم کے بارے میں فرمایا: "اور تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔" بلکہ ربِ ذوالجلال نے پوری کائنات کے بارے میں فرمایا: "(اے حبیب!) کہہ دیجئے دنیا کی ساری متاع بہت قلیل ہے۔" لیکن اسی ذات کریم نے اپنے حبیب کریم ﷺ کے بارے میں فرمایا: "اور آپ کو سکھایا جو کچھ آپ

نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔'' اس سے علوم نبوت کی وسعت و جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

قرآن اور سنت کی روشنی میں ﷺ کے علم کی وسعت

رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے تمام مخلوقات سے زیادہ علم عطا فرمایا ہے اور آپ کا یہ علم، غیب اور شہادت دونوں کو محیط ہے اور یہ علم تدریجی ہے، اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کے علم میں تا حیات اضافہ فرماتا رہا۔ اسی علم کو علماء اہل سنت "علمِ کُلّی" اور "علم مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ علم کلی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کل ''معلومات الٰہیہ'' کا علم ہے، کسی مخلوق کے لئے اس علم کو ماننا نہ صرف محال ہے بلکہ شرک ہے۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: کسی علم کی حضرت عزوجل سے تخصیص اور اس کی ذاتِ پاک میں حصر اور اس کے غیر سے مطلقاً نفی چند وجہ پر ہے:

اول: علم کا ذاتی ہونا کہ بذاتِ خود بے عطائے غیر ہو۔

دوم: علم کا غنا کہ کسی آلہ جارحہ و تدبیر فکر و نظر و التفات و انفعال کا اصلاً محتاج نہ ہو۔

سوم: علم کا سرمدی ہونا کہ ازلاً ابداً ہو۔

چہارم: علم کا وجوب کہ کسی طرح اس کا سلب ممکن نہ ہو۔

پنجم: علم کا اثبات و استمرار کہ کبھی کسی وجہ سے اس میں تغیر، تبدل، فرق اور تفاوت کا امکان نہ ہو۔

ششم: علم کا اقصیٰ غایت کمال پر ہونا کہ معلوم کی ذات، ذاتیات، اعراض، احوالِ لازمہ، مفارقہ، ذاتیہ، اضافیہ، ماضیہ، آتیہ (مستقبلہ) موجودہ، ممکنہ سے کوئی ذرہ کسی وجہ پر مخفی نہ ہو سکے۔

ان چھ وجہ پر مطلق علم حضرت احدیت جل وعلا سے خاص اور اس کے غیر سے مطلقاً نفی، یعنی کسی کو کسی ذرہ کا ایسا علم جو ان چھ وجوہ سے ایک وجہ بھی رکھتا ہو حاصل ہونا ممکن نہیں ہے جو کسی غیر اللہ کے لئے، عقولِ مفارقہ ہوں خواہ نفوسِ ناطقہ، ایک ذرے کا ایسا علم ثابت

کرے یقیناً اجماعاً کافر مشرک ہے۔ (الصمام، ص ۶)

نیز امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: میں نے اپنی کتابوں میں تصریح کر دی ہے کہ اگر تمام اولین و آخرین کا علم جمع کیا جائے تو اس علم کو علم الٰہی سے وہ نسبت ہرگز نہیں ہو سکتی جو ایک قطرہ کے کروڑویں حصہ کو سمندر سے ہے، کیونکہ یہ نسبت متناہی (FINITE) کی متناہی کے ساتھ ہے اور وہ غیر متناہی (INFINITE) کی متناہی سے۔ (الملفوظ، ج ۱، ص ۶)

خلاصہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے علوم کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کا علم ایسا ہے جیسے قطرہ کے مقابلہ میں سمندر ہو اور اللہ کے علم کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے علم کی وہ نسبت بھی نہیں ہے جو قطرہ اور سمندر میں ہوتی ہے۔ کیونکہ قطرہ اور سمندر میں متناہی کی نسبت متناہی کی طرف ہے اور آپ کے علم کی اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف نسبت متناہی کی نسبت غیر متناہی کی طرف ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور ان تمام چیزوں کا علم دے دیا جن کو آپ پہلے نہیں جانتے تھے، اور یہ اللہ کا آپ پر فضل عظیم ہے۔

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان ایک مجلس میں کھڑے ہوئے پھر آپ نے ابتداءِ خلق سے خبریں بیان کرنا شروع کیں، حتیٰ کہ جنتیوں کے اپنے ٹھکانوں تک جانے اور جہنمیوں کے اپنے ٹھکانوں تک جانے کی خبریں بیان کیں۔ جس شخص نے اس کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا اس نے اس کو بھلا دیا۔ (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۴۵۳)

نیز امام بخاری روایت کرتے ہیں: حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم میں ایک تقریر فرمائی اور اس میں قیامت تک کے ہونے والے تمام امور بیان فرما دیئے جس شخص نے اسے جان لیا اس نے جان لیا اور جس نے نہ جانا اس نے نہ جانا۔ (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۹۹۷)

امام مسلم روایت کرتے ہیں: "حضرت ابو زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی اور منبر پر رونق افروز ہوئے اور ہمیں خطبہ دیا حتیٰ کہ ظہر کا وقت آ گیا پھر منبر سے اترے اور ظہر کی نماز پڑھائی اور پھر منبر پر رونق افروز ہوئے اور ہمیں خطبہ دیا حتیٰ کہ عصر کا وقت آ گیا، پھر آپ منبر سے اترے اور عصر کی نماز پڑھائی، پھر آپ نے منبر پر چڑھ کر ہمیں خطبہ دیا حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا، پھر آپ نے ہمیں تمام ''ما کان و ما یکون'' کی خبریں دیں سو جو ہم میں زیادہ حافظہ والا تھا اس کو ان کا زیادہ علم تھا۔ (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۳۹۰)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں عصر کی نماز پڑھائی، پھر آپ خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور آپ نے قیامت تک ہونے والے ہر واقعہ اور ہر چیز کی ہمیں خبر دے دی، جس نے اس کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔

(جامع ترمذی، ص ۳۱۹)

امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو میرے لئے لپیٹ دیا اور میں نے اس کے تمام مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا۔ (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۳۹۰)

اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے نیز امام ابو داؤد اور امام احمد نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ امام ترمذی روایت کرتے ہیں: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز میں آنے کے لئے دیر کی، حتی کہ قریب تھا کہ ہم سورج کو دیکھ لیتے، پھر رسول اللہ ﷺ جلدی سے آئے اور نماز کی اقامت کہی گئی، رسول اللہ ﷺ نے مختصر نماز پڑھائی، پھر آپ نے سلام پھیر کر با آواز بلند ہم سے فرمایا جس طرح اپنی صفوں میں بیٹھے ہو، بیٹھے رہو، پھر ہماری طرف مڑے اور فرمایا: میں اب تم کو یہ بیان کروں گا کہ مجھے صبح کی نماز میں آنے سے کیوں دیر ہو گئی، میں رات کو اٹھا اور وضو کر کے میں نے اتنی رکعات نماز پڑھی جتنی میرے لئے مقدر کی گئی تھی پھر مجھے

نماز میں اونگھ آ گئی، اچانک میں نے اچھی صورت میں اپنے رب تبارک وتعالیٰ کو دیکھا، اس نے فرمایا: اے محمد! میں نے کہا اے میرے رب میں حاضر ہوں، فرمایا ملاء اعلیٰ کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا، آپ نے کہا: میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ (قدرت) میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا اور اس کے پوروں کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی پھر ہر چیز مجھ پر منکشف ہو گئی اور میں نے اس کو جان لیا، (الحدیث)۔ امام ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے، میں نے امام بخاری سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔ (جامع ترمذی، ص ۴۶۶)

نیز امام ترمذی روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا میں نے (خواب میں) اپنے رب کو حسین صورت میں دیکھا، میرے رب نے کہا اے محمد! میں نے کہا حاضر ہوں یا رب! فرمایا ملاء اعلیٰ کس چیز میں بحث کر رہے ہیں، میں نے کہا اے میرے رب! میں نہیں جانتا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ (قدرت) میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی پھر میں نے جان لیا جو کچھ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔ (جامع ترمذی، ص ۴۶۶)

امام احمد بن حنبل اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں نبی ﷺ نے فرمایا: آج رات کو نیند میں میرا رب عزوجل حسین صورت میں میرے پاس آیا اور فرمایا: اے محمد! کیا تم جانتے ہو کہ ملاء اعلیٰ کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟ حضرت ابن عباس کہتے ہیں: آپ نے فرمایا نہیں! نبی ﷺ نے فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا حتیٰ کہ میں نے اپنے سینے میں اس کی ٹھنڈک محسوس کی اور میں نے ان تمام چیزوں کو جان لیا جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں۔
(مسند احمد، ج ۱، ص ۳۸۶)

امام احمد بن حنبل نے ایک اور سند سے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور اس میں یہ

الفاظ ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو میرے کندھوں کے درمیان رکھا میں نے اس کی ٹھنڈک کو اپنے سینہ میں محسوس کیا حتیٰ کہ میرے لئے وہ تمام چیزیں منکشف ہوگئیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں۔ (مسند احمد، ج ۴، ص ۶۶)

حافظ الہیثمی ذکر کرتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل نے میرے لئے دنیا اٹھا کر رکھ دی اور میں دنیا کو اور جو کچھ قیامت تک دنیا میں ہونے والا ہے اس کو دیکھ رہا ہوں، جیسا کہ میں اپنی اس ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے، ہر چند کہ اس حدیث کے راوی ضعیف ہیں لیکن ان کی توثیق کی گئی ہے۔ (مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۲۸۱)

ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے لئے علم غیب کا ثبوت بالکل واضح ہے، لیکن اس کے باوجود علماءِ حق نے احتیاط کی بناء پر یہ فرمایا ہے کہ غیر اللہ کے لئے مطلقاً ''عالم الغیب'' نہ بولا جائے، کیونکہ اس سے ظاہراً ''علم غیب ذاتی'' کا تصور ذہن میں آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے، رسول اللہ ﷺ کے لئے یہ لکھا اور بولا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیب کا علم عطا فرمایا یا علوم غیبیہ عطا فرمائے، اس کو ''علم غیب عطائی'' کہتے ہیں۔ چنانچہ امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''علم غیب عطا ہونا اور، اور لفظ ''عالم الغیب'' کا اطلاق اور، اور بعض اجلہ اکابر کے کلام میں اگرچہ بندۂ مومن کی نسبت صریح لفظ "یعلم الغیب" وارد ہے، " کما فی مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح للملا علی القاری''، بلکہ خود حدیث سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما میں سیدنا خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت ارشاد ہے: ''کان یعلم علم الغیب'' (یعنی وہ علم غیب جانتے تھے)، مگر ہماری تحقیق میں لفظ ''عالم الغیب'' کا اطلاق حضرت عزت عز جلالہ کے ساتھ خاص ہے کہ اس سے عرفاً علم بالذات متبادر ہے۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد ۹، ص ۸۱)

امور خیر کے لئے مشاورت رضائے الٰہی کا باعث ہے

آیت نمبر ۱۱۴ میں ''نجویٰ'' کی مذمت بیان کی گئی ہے، لیکن اس سے وہ سرگوشیاں، راز و نیاز کی باتیں اور مشورے مراد ہیں جو کسی خلاف شرع کام کے لئے ہوں، البتہ امور خیر کے لئے مشاورت ''رضائے الٰہی'' کا باعث ہے۔ آیت میں تین باتیں ذکر کی گئی ہیں (۱) صدقہ (۲) معروف (۳) مسلمانوں کے درمیان مصالحت۔

امام رازی نے اس مقام پر لکھا ہے کہ خیر کی دو قسمیں ہیں، ایک ایصالِ منفعت یعنی فائدہ پہنچانا، اس کی پھر دو صورتیں ہیں، پہلی صورت مادی فائدہ پہنچانا، آیت میں اسے ''صدقہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسری صورت ''روحانی'' فائدہ پہنچانا، آیت میں اسے ''معروف'' سے تعبیر کیا گیا ہے، تیسرا ''دفع مضرت'' یعنی ضرر سے بچانا، اسے آیت میں اِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علامہ محمود آلوسی نے کہا کہ ''معروف'' نیکی کی تمام صورتوں پر محیط ہے، جیسے مصیبت زدہ کی اعانت، ''دعوت الی الخیر'' وغیرہ اور ''صدقہ'' عرف میں تو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن متعدد احادیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے اور فساد مٹانے کو ''صدقہ'' بلکہ ''افضل الصدقات'' کہا ہے اور صوم و صلوٰۃ جیسی عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ صحیحین کی روایت میں حضور نے فرمایا: جو شخص دو افراد میں فساد ختم کرنے اور نفرت مٹانے کے لئے ایک دوسرے کے بارے میں خیر خواہی کی خلاف واقعہ باتیں منسوب کرے تو وہ ''کذاب'' نہیں کہلائے گا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ''حالت جنگ''، ''دو افراد کے درمیان صلح'' اور ''میاں بیوی کے اظہار محبت'' میں مبالغہ آرائی کی رخصت دی ہے، بلکہ آیہ کریمہ میں اسے اجر عظیم کا ذریعہ بتایا ہے۔

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۝۱۱۵

''اور جو راہ راست واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ

سے الگ تھلگ راستہ اختیار کرے تو ہم اسے اس طرف پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھرا ہے اور اسے ہم جہنم میں داخل کر دیں گے اور وہ (بہت) برا ٹھکانا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

مَنْ يُّشَاقِقِ	جو مخالفت کرے	نُوَلِّهٖ	ہم اسے پھیر دیں گے
مَاتَوَلّٰى	(جدھر) وہ پھرا		

تفسیر

سنت و اجماع کی حجیت

طعمہ بن ابیرق کے واقعہ کے سیاق وسباق میں اس آیہ مبارکہ کا مفہوم واضح ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے اختلاف اور مومنوں کی (اجماعی) راہ سے الگ تھلگ ہو جانے والوں کا انجام جہنم بتایا ہے، بہ الفاظ دیگر "سنت" اور "اجماع امت" دلیل شرعی ہیں اور جو چیز "سنت" یا "اجماع امت" سے ثابت ہو اس کی مخالفت حرام اور انجام جہنم ہے۔ امام رازی اور امام قرطبی نے لکھا ہے کہ کسی نے امام شافعی سے پوچھا کہ قرآن میں "حجیت اجماع" کی دلیل کون سی ہے؟ انہوں نے تین سو مرتبہ از اول تا آخر قرآن مجید پڑھا اور پھر انہیں شرح صدر ہو گیا کہ یہ آیت "اجماع" کے حجت ہونے کی دلیل ہے۔ "اجماع" (Consesus) سے مراد ہے کسی شرعی مسئلے پر امت کے اہل اجتہاد، اہل فتویٰ، فقہاء اہلِ بصیرت کا متفق ہو جانا، اگر سب متفق ہو جائیں تو "اجماع کلی" کہلاتا ہے، جیسے خلافت صدیق اکبر، نماز تراویح کی جماعت، جمع قرآن، موجودہ دور میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جانا وغیرہ اور اگر اکثریت کا اتفاق ہو جائے تو "اجماع اکثری" کہلاتا ہے۔

اس آیہ مبارکہ کے مضمون کی تائید میں کئی احادیث مبارکہ ہیں، مثلاً:

(۱) لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ: میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔

(۲) یَدُ اللّٰهِ عَلَی الْجَمَاعَةِ: جماعت کی اجماعی رائے کو اللہ کی تائید حاصل

ہوتی ہے۔

(۳) مَنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ: جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں گرا۔

(۴) عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ: جماعت کو لازم پکڑو۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ إِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلَّآ إِنٰثًا ۚ وَ إِنْ يَّدْعُوْنَ إِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَ قَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّ لَأُضِلَّنَّهُمْ وَ لَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَ يُمَنِّيْهِمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ أُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾

''بلاشبہ اللہ (اس جرم کو تو) نہیں بخشتا کہ اس کا کوئی شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے کم تر (جرم) کو جس کے لئے چاہے معاف فرمادے، اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔ یہ مشرک اللہ کے سوا دیویوں ہی کے پجاری ہیں اور یہ سرکش شیطان ہی کو پوجتے ہیں۔ اللہ نے اس پر لعنت کی اور (شیطان نے) کہا: میں تیرے بندوں میں سے مقرر حصہ ضرور لوں گا۔ اور میں انہیں ضرور بہکاؤں گا اور ضرور انہیں آرزوؤں کا (اسیر) بناؤں گا اور میں ضرور انہیں حکم دوں گا تو وہ لازماً جانوروں کے کان چیرتے رہیں گے، اور میں انہیں حکم دوں گا تو وہ ضرور اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو تبدیل کریں گے، اور جس نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنایا تو وہ کھلے خسارے میں رہا۔ شیطان ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا ہے اور امیدیں دلاتا ہے اور شیطان ان سے جو وعدے کرتا ہے وہ سراسر فریب ہیں۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ اس سے نجات

کی کوئی راہ نہیں پائیں گے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ	اس (اللہ) کے سوا عبادت کرتے ہیں	مَّفْرُوْضًا	مقررہ
لَاُضِلَّنَّھُمْ	میں ضرور انہیں گمراہ کروں گا	لَاُمَنِّیَنَّھُمْ	میں ضرور انہیں آرزوئیں دلاؤں گا
اُمْنِیَۃ	جھوٹی آرزو	فَلَیُبَتِّکُنَّ	وہ ضرور چیریں گے
اٰذَانَ	"اذن" کی جمع کان	الْاَنْعَامِ	چوپائے، مویشی
خُسْرَانًا	نقصان، غرور، دھوکا، فریب	مَاْوٰی	ٹھکانا
مَحِیْصًا	بچنے کی جگہ		

تفسیر

ماسوائے شرک ہر گناہ قابل معافی ہے

شرک کی تعریف گذشتہ سطور میں گذر چکی ہے، آیت نمبر ۱۱۶ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شرک نا قابل معافی جرم ہے اور اس کے سوا کسی بھی درجے کا گناہ ہو، اس کی معافی ممکن ہے، لیکن یہ مغفرت بندے کا استحقاق نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی نگاہِ کرم پر موقوف ہے، تاہم بندے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اپنے رب سے مسلسل مغفرت کی التجا کرتا رہے۔

"اناث" سے مراد معبودان باطلہ ہیں

آیت نمبر ۱۱۷ میں مشرکوں کے معبودانِ باطلہ کو "اناث" (عورتیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مفسرین کرام نے اس کی جو توجیہات بیان فرمائی ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) یہ کہ مشرکوں کے بیشتر معبودانِ باطلہ کے نام "صیغہ تانیث" (Feminine

(Form) پر تھے، جیسے لات، منات، عزیٰ وغیرہ

(۲) ہر قبیلے کے مخصوص بت کو "رَبَّةُ بنی فلاں" یا "اُنثٰی بنی فلاں" کہا جاتا تھا، اُنثٰی بمعنی عورت یا مونث، اس لئے ہم نے اس لفظ کا ترجمہ "دیویاں" کیا ہے اور "دیوی" کا تصور ہندومت میں بھی ہے۔

(۳) مشرکین مکہ ملائکہ کو بھی "بنات اللہ" (اللہ کی بیٹیاں) کہتے تھے۔

(۴) پتھر کے بت ہوں یا خودساختہ مٹی کے بنے ہوئے، یا آگ، سورج وغیرہ عربی زبان میں "جمع غیر ذوی العقول" کو مؤنث کے صیغے سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۵) عورت میں انفعالیت (اثر پذیری) ہے، اس لئے وہ بتوں کو انثی یا عورت سے تعبیر کرتے تھے۔

"شیطان مَرید" کی عبادت

"تمرد" کے معنی سرکشی اور طغیان کے ہیں۔ "شیطان مَرید" کے معنی ہیں شیطان جس نے اپنے خالق کا حکم ماننے کے بجائے سرکشی کی۔ چونکہ سب "معبودانِ باطلہ" کے پجاری دراصل شیطان کے چیلے اور غلام ہیں، اس لئے انہیں شیطان کے پجاری کہا گیا ہے۔ کیونکہ شیطان نے بارگاہِ الوہیت سے دھتکارے جانے کے موقع پر کہا تھا، کہ میں بنی آدم کو بہکاؤں گا، ورغلاؤں گا اور صراط مستقیم پر گھات لگا کر بیٹھوں گا۔

شیطان کے تزویری حربے

آیت نمبر ۱۱۸ میں بھی شیطان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "میں تیرے بندوں میں سے اپنا مقررہ حصہ ضرور لوں گا" اور آیت نمبر ۱۱۹ تا ۱۲۱ میں ابلیس لعین کے تزویری حربے اور ان کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں:

(۱) "اُمْنِيَّةٌ" کے معنی ہیں "جھوٹی امید" اور اس کی جمع ہے "امانی"۔ امام المفسرین امام رازی فرماتے ہیں: بندے کو گمراہ کرنے کا سب سے بڑا شیطانی حربہ، بندے کے دل میں جھوٹی امیدوں اور آرزوؤں کے محلات تعمیر کرنا ہے، اس کے نتیجے میں دو خصلتیں جنم لیتی

ہیں، حرص اور امید، اور یہ دونوں چیزیں تمام ''اخلاق ذمیمہ'' کی علت لازمہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انسان جوں جوں بوڑھا ہوتا ہے، اس کے اندر دو چیزیں جوان ہوتی جاتی ہیں اور وہ ہیں ''حرص اور امید''۔ حرص کے نتیجے میں دین اور دنیا کے سارے مصائب انسان پر مسلط ہو جاتے ہیں اور جوں جوں حرص بڑھتی ہے تو انسان اس کے حصول کے لئے اللہ کی معصیت اور مخلوق کو ایذا پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اور جب ''امید'' کا دامن دراز ہوتا چلا جاتا ہے تو انسان آخرت کو بھول جاتا ہے اور طلب دنیا میں غرق ہو جاتا ہے اور توبہ سے محروم ہو جاتا ہے، اس پر کوئی وعظ و نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔

(۲) بحیرہ

مختلف روایات کے مطابق (۱) جب کسی اونٹنی کے پانچ بچے ہو جاتے اور پانچواں نر ہوتا، تو مشرکین عرب اس کا کان چھید کر اسے بت کے نام پر وقف کر دیتے اور اسے اپنے اوپر حرام سمجھتے۔

(۲) جب کسی نر اونٹ سے دس اونٹنیوں کو حمل ہو جاتا تو اس کے کان چھید کر اسے بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے اور اسے وہ ''بحیرہ'' کہتے تھے۔ اس کے علاوہ ''حام اور'' وصیلہ'' بھی ہوتے۔ قرآن نے اس کا ذکر شیطان کے اس ادعاء کی صورت میں کیا کہ میں ''ان سے چوپایوں کے کان میں چیرا یا چھید ڈلواؤں گا۔''

(۳) اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو بگاڑنا

(الف) اس ''تغیر خلق'' کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اللہ نے کسی چیز کو جس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، اسے فاطر (پیدا کرنے والے) کی منشا کے برعکس استعمال کرنا۔ اس میں بتوں اور معبودانِ باطلہ کی پرستش بھی شامل ہے۔

(ب) آنکھیں پھوڑنا، کان کاٹنا (یعنی مسخ صورت یا مثلہ)، ہم جنس پرستی، گودنا، عورتوں کا مردوں سے اور مردوں کا عورتوں سے مشابہت اختیار کرنا، فطرت کی تقسیم کار اور فطری ذمہ داریوں کو بدل دینا وغیرہ۔

شیطان کے وعدے فریب و سراب

آیت نمبر ۱۲۰ میں بتایا کہ شیطان کے وعدے فریب ہیں، سراب ہیں، سراسر نقصان ہیں اور ان کا انجام جہنم ہے اور شیطان کے پیروکاروں کے لئے پھر کوئی راہِ نجات اور جائے امان نہیں ہوگی۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًاؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّاؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖۙ وَ لَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىٕكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ﴿۱۲۴﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ہم عنقریب انہیں ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، (یہ) اللہ کا سچا وعدہ ہے، اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات اور کس کی ہوسکتی ہے۔ (نجات) نہ تمہاری خواہشات پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، (سو) جو کوئی برائی کرے گا، اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ اور وہ اللہ کے سوا نہ کوئی حمایتی پائے گا نہ مددگار۔ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور وہ صاحب ایمان بھی ہو، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

مشکل الفاظ کے معانی

اَبَدًا	ہمیشہ	اَصْدَقُ	سب سے سچا
ذَكَرٍ	مرد	اُنْثٰى	عورت

تفسیر

اللہ کا وعدہ سچا ہے

آیت نمبر ۱۲۲ میں بتایا گیا کہ اہل ایمان اور صالحین کے ساتھ اللہ نے جو جنت کی ابدی راحتوں اور دائمی نعمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے، وہ حق ہے اور پورا ہو کر رہے گا، جب کہ شیطان کے پیروکار آخرت میں کف افسوس ملتے رہ جائیں گے۔

نجات کا انحصار خود فریبی پر نہیں ہے

آیت نمبر ۱۲۳ میں بتایا گیا کہ اخروی فلاح کا انحصار لوگوں کے اپنے مفروضوں اور خود ساختہ دعووں پر نہیں ہوگا بلکہ اللہ کے اٹل ''قانونِ مکافاتِ عمل (NATURAL LAW OF RETAILIATION'' پر ہوگا۔ کفار مکہ کی خوش فہمی یہ تھی کہ یہ ''بت اللہ کی بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہوں گے'' اور ''ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔'' یہود و نصاریٰ کا دعویٰ یہ تھا ''کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں'' اور ''بالفرض اگر ہمیں دوزخ میں جانا پڑا تو چند دنوں کی بات ہوگی۔'' قرآن نے کہا: ''اپنے باطل دعوؤں کی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو؟''

اور اگر خدانخواستہ مسلمان بھی عمل سے عاری ہو کر بلکہ عملاً احکام الٰہی سے بغاوت کر کے محض خوش فہمیوں کے سہارے چلتے رہے کہ آخرت کی فلاح صرف ان کے لئے ہے، تو وہ بھی اس آیت کے بجا طور پر مخاطب ہیں اور انہیں بھی اپنے طرزِ عمل اور اندازِ فکر کی اصلاح کرنی چاہیے۔ آیت نمبر ۱۲۴ میں اس مضمون کا تقریباً اعادہ ہے۔ امام رازی، امام قرطبی اور دیگر مفسرین نے اس مقام پر لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے یہ سنا ''جو برائی کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا'' تو انہیں رنج و ملال ہوا، حضور ﷺ نے ان کی تسلی و تشفی کے لئے فرمایا کہ ''ایک برائی کی سزا اس کی مثل ہے، جبکہ نیکی کی جزا دس گنا یا اس سے زائد ملے گی''۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا

فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

"اور اس شخص سے بہتر دین کس کا ہوسکتا ہے جس نے اپنا رخ (اطاعت) اللہ کے سامنے جھکا دیا اور وہ نیکوکار بھی ہے اور اس نے دین ابراہیم کی پیروی کی جو ہر باطل سے ہٹ کر حق کی طرف مائل تھے، اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا مخلص دوست بنا لیا تھا۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، اللہ ہی کا ہے، اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

اَحْسَنُ	اچھا، بہترین	اَسْلَمَ وَجْهَهٗ	اپنا "رخِ اطاعت" جھکایا
مُحْسِنٌ	نیکوکار	حَنِيْفًا	باطل سے ہٹ کر حق کی طرف مائل ہونے والا
خَلِيْلًا	خالص و مخلص دوست		

تفسیر

دین حنیف، ملت ابراہیمی

ختم المرسلین محمد مصطفیٰ ﷺ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں اور آپ کا فرمان ہے: "اَنَا دَعْوَةُ اَبِيْ اِبْرَاهِيْمَ" یعنی میں اپنے باپ ابراہیم کی دعاؤں کا ثمر ہوں۔ حضرت ابراہیم کی شخصیت انبیاء کرام میں ایک محور و مرکز اور نقطۂ اتصال ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام الہامی کتب کے ماننے والے اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کی طرف منسوب کرتے تھے، خواہ یہود و نصاریٰ ہوں یا قریش مکہ، لیکن قرآن نے فیصلہ کن بات کہی کہ "ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی (اور نہ ہی مشرک) بلکہ وہ مسلم تھے اور دین حنیف کے پیروکار تھے۔" دین حنیف، ملت ابراہیمی اور اسلام سب اصطلاحات معنیً قریب تر ہیں، حنیف سے مراد ایسے دین کا ماننے والا (مسلم) جو باطل کے ہر تصور اور عقیدے سے دور ہو، افراط

وتفریط سے پاک ہو اور صرف ''دین حق'' کی طرف مائل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ملت ابراہیم علیہ السلام کے اصل پیروکار مسلمان ہیں، بلکہ اللہ کے فرستادہ سارے انبیاء کرام دین اسلام ہی کے داعی تھے۔ دین، ان عقائد واقدار کا نام ہے جو تمام انبیاء کرام کی شریعتوں میں اصل الاصول اور مشترکہ عقائد وعبادات کے طور پر شامل رہیں۔ البتہ ''شریعت'' ان تفصیلی احکام کا نام ہے جن میں اللہ کی حکمت اور ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ترمیم وتنسیخ کا سلسلہ جاری رہا۔ اللہ کا ارشاد ہے: ''ہم نے تم میں سے ہر ایک (صاحب شریعت رسول) کے لئے ایک شریعت اور دستور عمل مقرر کیا۔'' (المائدہ: ۴۸) تا آنکہ ختم الرسل پر آ کر یہ سلسلہ کامل، مکمل، جامع اور حتمی وقطعی شکل اختیار کر گیا۔

دین اور ملت عام طور پر مترادف الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، لیکن ان میں تھوڑا سا اعتباری فرق ہے، یعنی اصولی عقائد ونظریات کو دین کہتے ہیں اور ان کے ماننے والوں کو ''ملت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

خلیل، لقب ابراہیم

''خلیل اللہ'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتیازی لقب ہے، امام رازی نے لکھا ہے کہ خلیل کے معنی ہیں: جو محبت، دوستی اور تعلق میں خالص ہو، جس کے دل میں محبوب کے سوا کسی اور کے لئے جگہ نہ ہو یا جو ایک دوسرے کے ''محرم راز'' ہوں۔

وَ یَسْتَفْتُوْنَكَ فِی النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِیْهِنَّ ۙ وَ مَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِیْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَ الصُّلْحُ خَیْرٌ ؕ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ

تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٢٨﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٢٩﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿١٣٠﴾

''(اے حبیب!) لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ مانگتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ان کے بارے میں تمہیں حکم دیتا ہے، (اور تمہیں ان احکام کی طرف بھی متوجہ فرماتا ہے) جو قرآن میں (پہلے سے) تم پر پڑھے جارہے ہیں، ان یتیم عورتوں کے بارے میں جنہیں تم ان کا مقررہ (شرعی) حق نہیں دیتے، اور ان سے (خود ہی) نکاح کی بھی خواہش رکھتے ہو، اور (ایسے ہی) کمزور و بے بس بچوں کے بارے میں بھی، اور یہ کہ یتیموں کے بارے میں انصاف پر قائم رہو، اور جو (بھی) تم بھلائی کے کام کرو گے، تو یقیناً اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔ اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا اندیشہ محسوس ہو، تو کوئی حرج نہیں کہ وہ دونوں آپس میں صلح کریں اور صلح ہی بہتر ہے اور دلوں میں بخل (کا مادہ) رکھا گیا ہے، اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ پر کاربند رہو تو بلاشبہ اللہ تمہارے سب کاموں سے باخبر ہے۔ اور تم شدید خواہش کے باوجود بھی عورتوں کے درمیان (کامل) انصاف نہیں کر پاؤ گے (لیکن ایسا بھی نہ ہو) کہ ایک کی جانب بالکل ہی جھک جاؤ (اور) دوسری کو لٹکتا چھوڑ دو، اور اگر تم (اپنا رویہ) درست کر لو اور پرہیزگار بن جاؤ تو یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ اور اگر (خدانخواستہ) دونوں (میاں بیوی) میں تفریق ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت (رزق و عطا) سے ہر ایک کو دوسرے سے بے نیاز کر دے گا، اور اللہ نہایت وسعت والا بڑی حکمت والا ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

یَسْتَفْتُوْنَکَ	آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں	اِسْتِفْتَاء	فتویٰ مانگنا
یُفْتِیْکُمْ	وہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے	اِفْتَاء	فتویٰ دینا
مَایُتْلٰی عَلَیْکُمْ	جوتم پر تلاوت کیا جاتا ہے	لَاتُؤْتُوْنَھُنَّ	تم ان کونہیں دیتے
مَاکُتِبَ لَھُنَّ	جوان کے لئے لکھ (مقرر کر) دیا گیا ہے	تَرْغَبُوْنَ	تم رغبت رکھتے ہو
اَلْقِسْطُ	انصاف	خَافَتْ	ڈرتی ہے
بَعْل	شوہر	الشُّحَّ	موجود کر دیا گیا ہے، پیدا کر دیا گیا ہے
اُحْضِرَتِ	بخل	لَوْحَرَصْتُمْ	اگر چہ تم شدت سے چاہتے ہو، ''شدت خواہش'' کو بھی حرص کہتے ہیں
فَلَاتَمِیْلُوْا	یہ کہ تم جھک جاؤ	فَتَذَرُوْھَا	پس اسے چھوڑ دو
کَالْمُعَلَّقَةِ	لٹکتی ہوئی(HANGING)	یُغْنِ	غنی کر دے گا
سَعَتِهٖ	کشائش (رزق)		

تفسیر

سیاق وسباق

گزشتہ صفحات میں یہ مضمون گزر چکا ہے، لیکن آنے والی آیات کی تفہیم کے لئے اس کا مختصراً اعادہ ضروری ہے، سنت الٰہیہ بھی یہی ہے کہ بعض احکام کی اہمیت کے پیش نظر انہیں

مختلف انداز سے جا بجا بار بار قرآن میں دہرایا جاتا ہے۔ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ:

عہدِ جاہلیت اور ابتداء اسلام میں جب بعض لوگوں کی ولایت (Guardianship) میں غیر محرم یتیم بچیاں آجاتیں تو:

(الف) اگر وہ حسین وجمیل اور مالدار ہوتیں تو ان سے خود نکاح کر لیتے لیکن ان کا مہر اور نان ونفقہ ادا نہ کرتے اور نہ ہی ان کے حقوق دلانے کے لئے کوئی ان کا حمایتی بنتا۔

(ب) اگر وہ مالدار تو ہوتیں، لیکن صورت وشکل یا کسی اور سبب سے خود انہیں ان سے نکاح میں رغبت نہ ہوتی، تو نہ خود ان سے نکاح کرتے اور نہ ان کی خواہش کے مطابق کسی اور سے ان کا نکاح کراتے تاکہ ان کا موروثی مال ہمیشہ انہی کے تصرف میں رہے۔

(ج) یا مال کی لالچ میں نکاح تو کر لیتے لیکن ان کے حقوق کی ادائیگی میں انصاف قائم نہ کرتے۔

عورتوں کے بارے میں استفتاء وافتاء

اس مقام پر امام فخر الدین رازی نے جو بحث درج فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بات تو روایات سے ثابت نہیں ہے کہ واقعی انہوں نے یتیم ومظلوم عورتوں کے حقوق کی بابت دریافت کیا ہو، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی نے یتیم عورتوں کی حالت زار کو "سوالِ مجسم" سے تعبیر کیا ہو یا ممکن ہے بعض عورتوں نے حضور سے آکر اپنی حالتِ زار بیان کی۔استفتاء، فتویٰ پوچھنے کو کہتے ہیں اور افتاء فتویٰ دینے کو۔تو اللہ نے فرمایا: کچھ احکام تو تمہارے پاس پہلے سے قرآن مجید میں موجود ہیں اور تم شب وروز ان کی تلاوت کرتے ہو، لیکن تاکید مزید کے طور پر ایک بار پھر تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یتیم عورتوں اور بے بس وبے کس بچوں کے بارے میں انصاف پر قائم رہو، اور جن یتیم بچیوں سے تمہیں نکاح کا شوق ہے، ان کے حقوق بھی ادا کرو۔

زوجین میں مصالحت

گزشتہ آیات میں عورتوں کے "نشوز" (نافرمانی) کا ذکر اور دونوں خاندانوں کے بزرگوں کو مصالحت کی سعی کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ آیت نمبر ۱۲۸ میں یہ بتایا کہ "نشوز" کا باعث بعض اوقات شوہر بھی ہوتا ہے، وہ اپنی درشت مزاجی، بداخلاقی اور حرص و ہوس کے باعث عورت کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے، لہٰذا ایسی صورت میں بھی صلح وصفائی کی کوشش ضرور کرنی چاہئے اور شوہر کو ادائیگی حقوق کی ہر ممکن تلقین کرنی چاہئے تاکہ بسا بسایا چمن اجڑنے سے بچ جائے۔ نافرمان بیوی کو "ناشزہ" (Reculcitrant Woman) اور شقی القلب ظلم شعار شوہر کو "زوج متعنت" (Obstinate) کہتے ہیں۔

متعدد ازواج کے درمیان عدل

بعض امور میں انسان بے اختیار اور دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے، یہ کیفیت دو بیویوں میں سے کسی ایک کے "غلبہ محبت" کے باعث بھی ہوتی ہے، اور اولاد میں سے کسی ایک کی طرف ماں باپ کا دل زیادہ مائل ہوتا ہے۔ یہ عین تقاضائے فطرت ہے، چنانچہ قرآن نے آیت نمبر ۱۲۹ میں فرمایا: ازواج کے درمیان کامل عدل قائم کرنا بعض اوقات انسان کے بس سے باہر ہوتا ہے اور شاید اللہ اسے معاف فرما دے، لیکن جو کچھ انسان کے بس میں ہے، اس کا انسان لازماً مکلف اور جواب دہ ہے اور وہ ہے ازواج میں نان نفقے، رہن سہن کے حالات، ایام کی تقسیم اور ظاہری رویے میں عدل قائم کرنا، اس کی اجازت کسی بھی صورت میں نہیں ہے کہ ایک ہی بیوی کے ہو کر رہ جاؤ اور دوسری کو کلی طور پر نظر انداز کر دو۔

اللہ کی غیبی تائید وامداد

اگر خدانخواستہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ سعی بسیار کے باوجود میاں بیوی کا حدود شرعی کے اندر رہتے ہوئے ازدواجی زندگی گزارنا ممکن نہیں رہا، تو حدودِ شرع پامال کرنے کے بجائے شریعت نے تفریق، طلاق، خلع اور فسخ نکاح کے راستے کھلے رکھے ہیں۔ چنانچہ

آیت نمبر ۱۳۰ میں فرمایا کہ اگر تمام تر سعی اور ''اتمامِ حجت'' کے بعد زوجین میں تفریق ہو جائے تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے دونوں کے لئے انعام وعطا اور خوش نصیبی کے ایسے امکانات مقدر فرما دے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جائیں اور ایک نئی خوش وخرم اور قابل رشک زندگی گزاریں۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿١٣١﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٣٢﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿١٣٣﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿١٣٤﴾

''اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے، اور بے شک ہم نے تمہیں اور انہیں بھی، جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، حکم دیا کہ اللہ سے ڈرتے رہو، اور اگر تم کفر کرو تو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ اللہ ہی کا ہے، اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور سزاوار حمد وثناء ہے۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہی کافی کارساز ہے۔ اے لوگو! اگر وہ چاہے تو تمہیں (صفحہ ہستی سے) مٹا کر دوسروں کو لے آئے، اور اللہ اس پر قادر ہے۔ اور جو شخص (صرف) دنیا کی جزا چاہتا ہے تو اللہ کے پاس تو دنیا وآخرت (دونوں) کا اجر ہے، اور اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

وَصَّيْنَا	ہم نے حکم دیا ہے	حَمِيْدًا	لائق تعریف، جس کی تعریف کی جائے

يُذْهِبْكُمْ تمہیں لے جائے گا، مٹادے گا یَأْتِ لے آئے گا

تفسیر

اللہ تعالیٰ کا اقتدار کلی

ان آیات میں یہ جملہ تین بار دہرایا گیا ہے کہ ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔'' یعنی انسان اور ساری کائنات کا مالک حقیقی صرف وہی ہے۔ جان، مال، اولاد، اقتدار اور جسمانی و ذہنی قویٰ کی صورت میں انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے، اس کا مالک صرف اللہ ہے۔ انسان کو ان ساری نعمتوں پر تصرف کا اختیار دیا گیا ہے، کسی چیز پر انسان کی ''ملکیت'' کا اطلاق صرف مجازاً ہے۔ اس حقیقت کے باوجود بندہ درہم و دینار یا اقتدار اور زر و جواہر کا پجاری بن جائے یا اپنے آپ کو ایسا مالک و مختار سمجھ بیٹھے کہ جس سے پوچھنے والا کوئی نہیں، تو یہ اس کی بھول ہے۔

امام رازی نے دوسرا نکتہ یہ بتایا کہ نعمتوں میں کھو جانا اور منعم (نعمت عطا کرنے والے) کو بھول جانا، یہ انسان کی نادانی ہے، اگر وہ نعمت دے سکتا ہے تو اسے چھین بھی سکتا ہے، اللہ کے غضب سے ڈرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا ''ابدی تازیانۂ عبرت'' حرکت میں آئے اور تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا کر یہ کارخانہ قدرت کسی اور کے تصرف میں دے دے، کیونکہ وہ اس پر قادر ہے۔

اور آیت نمبر ۱۳۴ میں بتایا کہ صرف جزائے دنیا کا طلب گار ہونا، انسان کی کوتاہ بینی، کم ظرفی اور کج فہمی ہے۔ اللہ کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں کے خزانے، نعمتیں اور جزا ہے، تم اپنا دامن طلب کیوں تنگ کرتے ہو۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٣٥﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٣٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿١٣٧﴾ؕ

''اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو، اللہ (کی رضا) کے لئے گواہی دو خواہ اس کی زد تمہاری اپنی ذات یا ماں باپ یا رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ (صاحب معاملہ) محتاج ہو یا مالدار، تو اللہ (تمہارے بہ نسبت) ان دونوں کا زیادہ خیر خواہ ہے، پس خواہش نفس کی پیروی میں انصاف (کا دامن) نہ چھوڑو، اور اگر تم لگی لپٹی بات کرو گے یا (شہادت سے) پہلو تہی اختیار کرو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں سے باخبر ہے۔ اے ایمان والو! اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (آخر الزماں) پر نازل کی اور (ہر) اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے نازل کی ہے، ایمان لاؤ، اور جس نے اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز قیامت کا انکار کیا، وہ گمراہی میں بہت دور جا نکلا۔ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے، تو اللہ نہ تو ان کی بخشش فرمائے گا اور نہ انہیں راہ (راست) دکھائے گا''۔

مشکل الفاظ کے معنی

قَوّٰمِيْنَ	قائم رہنے والے	قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ	انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے
شُهَدَآءَ	شاہد کی جمع، گواہ	اَوْلٰى	قریب ترین، (احق) یعنی زیادہ حق دار، زیادہ مہربان

الْھَوٰی خواہش نفس اِنْ تَلْوٗٓا لَوٰی یَلْوِیْ لَیًّا، لَوِیًّا، لُوِیًّا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا، سستی کرنا، پوشیدہ رکھنا، پھیر دینا

تفسیر

قیام عدل

آیت نمبر ۱۳۵ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی تکوینی کائنات عدل، توازن، تناسب اور عدم تجاوز پر قائم ہے، اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کا ''نظامِ تشریع'' بھی عدل پر قائم ہو، انسان اپنے دائرہ اختیار و اقتدار میں انصاف قائم کرے، سورہ الحدید کی پچیسویں آیۂ مبارکہ میں نظام رسالت اور نزول کتب کا مقصد عظیم بھی قیام عدل کو قرار دیا ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ کفر کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے لیکن ظلم کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی، اس لئے فرمایا: ''عدل کو مضبوطی سے قائم کرو''۔

اداءِ شہادت دینی فریضہ

قیام عدل کے لئے ''نظامِ عدل'' لازمی ہے، کسی بھی عدالتی نظام میں مظلوموں کی دادرسی، ظالموں کی سرکوبی، حق داروں کے حقوق کی ادائیگی، اور امن و سلامتی کے قیام کے لئے ''شہادت'' ایک لازمی ضرورت ہے، کیونکہ اس کے بغیر عدل کا قیام ممکن ہی نہیں، آیۂ مبارکہ میں صرف اللہ کی رضا کے لئے شہادت حق کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر کسی کے حق کا ثبوت صرف ایک آدمی کی گواہی پر منحصر ہو تو فقہاء نے کہا کہ اس کے لئے شہادت ''فرض عین'' کا درجہ رکھتی ہے ورنہ فرضِ کفایہ ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۸۲ میں فرمایا: ''گواہوں کو جب گواہی کے لئے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔''

سچی گواہی میں حائل رکاوٹیں

کسی بھی معاملے میں ''شہادتِ حق'' میں جو رکاوٹیں حائل ہو سکتی ہیں، آیۂ مبارکہ میں

تقریباً ان کا احاطہ کر دیا گیا ہے اور فرمایا کہ "شہادتِ حق" کے لئے ان رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لاؤ، وہ رکاوٹیں یہ ہیں:

(۱) ذاتی مفاد کا تحفظ (۲) والدین اور رشتے داروں کے مفاد کی پاسداری (۳) اپنی دانست میں کسی محتاج پر ترس کھا کر اس کی جانبداری کرنا (۴) یا کسی مالدار یا صاحب اختیار کے لالچ، دھونس اور دباؤ میں آکر حق سے منہ موڑ لینا، آخری دو قسموں کے بارے میں فرمایا: "اللہ تمہارے مقابلے میں ان کا زیادہ خیر خواہ ہے" اور ان کی خیر خواہی قیامِ عدل میں ہے نہ کہ جانبداری میں۔ ہاں اگر مفلس و نادار پر تمہیں ترس آتا ہے تو اس کی مدد کرو، اس کا تاوان اور جرمانہ ادا کرو۔

شہادت سے گریز کی ممانعت

شہادتِ حق سے گریز کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ آدمی سرے سے گواہی دینے سے ہی گریز کرے یا واقعہ سے جان بوجھ کر لاعلمی کا اظہار کرے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور گواہی کو چھپاؤ نہیں، اور جو (سچی) گواہی کو چھپائے گا، تو اس کا ضمیر مجرم ہے" (بقرہ آیت ۲۸۳) اس آیت میں اس صورت کو "تُعْرِضُوْا" سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی مارے بندھے گواہی دینے تو آجائے لیکن صراحت کے ساتھ اظہار حق نہ کرے بلکہ ہیر پھیر کرے، لگی لپٹی بات کرے، واقعات وحقائق کو مسخ کر کے یا تحریف کے ساتھ بیان کرے تاکہ حق دار کا دعویٰ مشکوک اور مشتبہ ہو جائے، آیت میں اس کیفیت کو وَاِنْ تَلْوٗا سے تعبیر کر کے دونوں صورتوں کو عدل میں رکاوٹ کا باعث بتایا ہے۔

امام قرطبی کی دلچسپ نکتہ آفرینی

"شَهِدَ لِفُلَانٍ" کے معنی ہیں "کسی کے حق میں گواہی دینا"، اور "شَهِدَ عَلٰی فُلَانٍ" کے معنی ہیں: "کسی کے خلاف گواہی دینا"، امام قرطبی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ماں باپ کے خلاف عدالت میں سچی گواہی دیتا ہے تو اسے ماں باپ کی نافرمانی نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ سچی گواہی دے کر ماں باپ کو ارتکابِ ظلم سے بچانا

ہے اور یہ درحقیقت ماں باپ کے ساتھ ''نیکی'' ہے۔

''خیر القرون'' میں جب لوگوں کا تقویٰ، عدالت اور صداقت شک وشبہے سے بالاتر تھی، تو ماں باپ کی گواہی اولاد کے حق میں اور اس کے برعکس، میاں بیوی کی ایک دوسرے کے حق میں گواہی اور بھائیوں کی ایک دوسرے کے حق میں گواہی، معیوب بات نہیں تھی، بلکہ تسلیم کرلی جاتی تھی۔ لیکن پھر جوں جوں تقویٰ کا معیار گرتا چلا گیا اور مشتبہ امور سامنے آتے چلے گئے تو اسے حکمرانوں نے تہمت (شبہے اور الزام) سے پاک شہادت تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

امام اعظم اور امام مالک نے کہا ہے کہ ایسے امور، جن میں مالی مفادات مشترک ہوں، میاں بیوی کی ایک دوسرے کے حق میں گواہی قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ یہ درحقیقت ایک طرح سے مدعی کی اپنے حق میں گواہی ہے۔

نظام عدل سے وابستہ حکام کی ذمہ داری

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ حکام وقت اور منصفین پر شریعت نے قیام عدل کے سلسلے میں تین ذمہ داریاں عائد کی ہیں (۱) یہ کہ فیصلے کرنے میں وہ حقائق مقدمہ کو سامنے رکھیں اور خواہش نفس کی پیروی نہ کریں۔ قرآن میں فرمایا: ''لوگوں کے درمیان حق پر فیصلہ کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو (کہیں ایسا نہ ہو) کہ تم اللہ کی راہ سے دور ہو جاؤ۔'' کیونکہ ''اتباع ھوی'' ناحق فیصلے اور ظالمانہ فیصلے کا سبب بنتی ہے۔

(۲) فیصلے کرتے وقت صرف اللہ سے ڈرو، لوگوں سے نہ ڈرو۔

(۳) اللہ کی آیات کو قلیل وحقیر قیمت پر نہ بیچو، یعنی رشوت لے کر فیصلے نہ کرو۔

مومن سے مطالبہ ایمان کیوں؟

آیت نمبر ۱۳۶ میں ایمان وعقائد کا ذکر ہے۔ اس کا آغاز ان کلمات سے ہوا ہے: ''اے ایمان والو! ایمان لے آؤ۔'' بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ جو پہلے ایمان لاچکے ہیں، ان سے مطالبہ ایمان کیوں؟ امام رازی اس مقام پر دلچسپ نکات بیان فرماتے ہیں،

ان میں چند یہ ہیں:

(۱) یہاں ایمان والوں کو ایمان پر استقامت و دوام کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۲) یہ اہل کتاب سے خطاب ہے کہ پہلے تم حضرت موسیٰ، و دیگر انبیاء بنی اسرائیل اور توریت پر ایمان لائے تھے، اب ختم الرسل اور قرآن مجید پر بھی ایمان لاؤ۔

(۳) یہ منافقین کو خطاب ہے کہ پہلے تم نے صرف زبانی اقرار کیا تھا، اب تصدیق قلبی کے ساتھ ایمان لاؤ۔

(۴) یہاں کمالِ ایمان مراد ہے، یہی وجہ ہے کہ ایمان کے شعبہ جات سے زیادہ کفر کے شعبوں کو بیان کیا گیا ہے اور اس میں انکارِ ملائکہ اور انکارِ آخرت کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

ایمان و کفر کے تکرار کا سبب

آیت نمبر ۱۳۷ میں دو مرتبہ ایمان اور پھر دو بار کفر اور آخر میں زیادتی کفر کا ذکر ہے۔ امام قرطبی نے اس تکرار در تکرار کی حکمت بیان کی ہے: وہ بتاتے ہیں کہ یہ آیت یہود کے بارے میں ہے اور تکرار در تکرار کی توجیہ حسب ذیل ہے:

یہ کہ پہلے یہود حضرت موسیٰ پر ایمان لائے اور حضرت عزیر کا انکار کر دیا، پھر حضرت عزیر پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰ کا انکار کر دیا، اسی طرح نصاریٰ حضرت موسیٰ و عیسیٰ پر ایمان لائے لیکن ان دونوں گروہوں نے خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کا انکار کر دیا اور یہ کفر کا انتہائی درجہ ہے۔

زندیق کی توبہ

بار بار ایمان لانے اور پھر کفر و ضلالت کی طرف پلٹ جانے والے کو علم العقائد کی اصطلاح میں "زندیق" کہا جاتا ہے چونکہ بار بار ایمان لانے کے بعد کفر کو اختیار کرنا "دین وایمان" کے استخفاف اور توہین کا باعث ہے اس لئے بعض علماء کے نزدیک یہ نا قابل معافی جرم ہے اور "زندیق" کی توبہ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول نہیں، جبکہ اس کے برعکس اسی سورت کی آیت نمبر ۱۱۶ کی روشنی میں زندیق کی توبہ مقبول ہے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ﴿١٣٨﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿١٣٩﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۡ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿١٤٠﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ڮ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿١٤١﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٤٢﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۤ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿١٤٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿١٤٤﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿١٤٥﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٤٦﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿١٤٧﴾

"اور منافقوں کو بشارت دیجئے کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (یہ) وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں؟ بلا شبہ، ساری عزت اللہ کے لئے ہے۔ اور اللہ نے تم پر

کتاب میں (یہ) حکم نازل کیا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ان کے پاس نہ بیٹھو۔ یہاں تک کہ یہ لوگ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں ورنہ تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کافروں اور منافقوں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔ (یہ) وہ لوگ ہیں جو تمہارے (انجام کے) بارے میں منتظر رہتے ہیں کہ اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ اور اگر کافروں کے لئے (کامیابی میں) کوئی حصہ ہو، تو کہتے ہیں: کیا ہم تم پر غالب نہیں آ گئے تھے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے نہیں بچایا؟ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے مسلمانوں پر غلبے کا کوئی راستہ ہرگز نہیں بنائے گا۔ بلاشبہ منافق (اپنے خیال میں) اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے دھوکے کی سزا انہی کو دینے والا ہے، اور جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ (محض) لوگوں کے دکھاوے کیلئے کھڑے ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کم (ہ) کرتے ہیں۔ وہ (کفر و ایمان کے درمیان) ڈانواڈول ہو رہے ہیں، (درحقیقت وہ) نہ ان (مومنوں) کی طرف ہیں اور نہ ان (کافروں) کی طرف، اور اے ا(حبیب!) جسے اللہ گمراہ کرے آپ ہرگز اس کیلئے کوئی رستہ نہ پائیں گے۔ اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کرو۔ یقیناً منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور (اے مخاطب!) تو ان کے لئے ہرگز کوئی مددگار نہ پائے گا۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور اللہ (کے دامن رحمت) کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور انہوں نے اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کر لیا تو ایسے لوگ اہل ایمان کے ساتھ ہیں اور عنقریب اللہ مومنوں کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ اگر تم شکر گزار ہو اور ایمان لے آؤ تو اللہ کو تمہیں عذاب

دینے سے کیا غرض ہے؟ اور اللہ تعالیٰ شکر قبول فرمانے والا بہت جاننے والا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

یُسْتَھْزَأُ بِھَا	ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے	حَتّٰی یَخُوْضُوْا	یہاں تک کہ وہ غور کریں
یَتَرَبَّصُوْنَ	انتظار کرتے ہیں، تاک میں لگے رہتے ہیں	اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْکُمْ	کیا ہم تم پر غالب نہیں آگئے تھے
یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ	وہ اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں	کُسَالٰی	سستی، کاہلی، کسلمندی، "کسلان" کی جمع
یُرَآءُوْنَ	دکھاوا کرتے ہیں	مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ	اس کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں
الدَّرْکِ	درجہ، طبقہ، پستی کا درجہ	الْاَسْفَلِ	سب سے نیچے
وَاعْتَصَمُوْا	اور مضبوطی سے پکڑ لیں	سَوْفَ	عنقریب

تفسیر

احوال منافقین

آیات ۱۳۸ تا ۱۴۷ میں منافقین کے احوال تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، جن میں ان کی اسلام دشمنی، دوغلے پن، مطلب پرستی، ضمیر فروشی، ریا کاری، اور انجام بد سب امور شامل ہیں، ہم سطور ذیل میں ان خصائل نفاق پر قدرے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں گے۔

موالات کفار

آیت نمبر ۱۳۹ میں ایک "خصلت نفاق" یہ بتائی گئی کہ وہ بظاہر کلمہ گو بن کر مسلمانوں میں شامل رہتے تھے لیکن ان کی قلبی دوستی کافروں کے ساتھ تھی، اصل میں وہ کفر کا غلبہ

چاہتے تھے۔ بقول علامہ اقبال ؎

بتوں سے تجھ کو امید خدا سے نومیدی

بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خصلت کو فاش بھی فرمادیا اور اس سے روک بھی دیا اور فرمایا: کیا تم کافروں کے پاس عزت کے طلب گار ہو، حالانکہ عزت وسرفرازی اور ہر قسم کے غلبے کا مصدر ومنبع تو اللہ کی ذات ہے، قرآن میں فرمایا: "عزت اللہ کے لئے ہے، اس کے رسول (مکرم) کے لئے اور اہل ایمان کے لئے، لیکن یہی بات منافق سمجھ نہیں پاتے۔" (المنافقون:۸) ایک جہاد کے موقعہ پر ایک مشرک حضور کے پاس آیا کہ میں آپ کی حمایت میں لڑنا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا: ہمیں مشرک کی مدد کی ضرورت نہیں ہے، چلے جاؤ۔ "عزت" کے معنی ہیں قوت، شدت، غلبہ اور مقابل پر چھا جانے کی استعداد اور اہلیت۔

آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑانا

آیت نمبر ۱۴۰ میں منافقین کی دوسری خصلت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ان مجالس کی رونق بنتے ہیں، جہاں آیات الٰہی کا انکار کیا جارہا ہو، تمسخر اڑایا جارہا ہو، فرمایا: "ان لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو"، کیونکہ یہ بالواسطہ طور پر ان کی تائید وحمایت اور حوصلہ افزائی کا باعث بن جاتا ہے، اور قرآن کا اصول یہ بھی ہے کہ "جو کفار کو دوست رکھتا ہے وہ (آخرکار) انہی کا ساتھی بن جاتا ہے۔" البتہ جب مجلس کا موضوع بدل جائے تو پھر دنیوی ضرورتوں کے لئے بیٹھنے کی اجازت ہے۔

تربص، تذبذب، تردد، تساہل، فریب

آیات ۱۴۱ تا ۱۴۳ میں بھی منافقین کی باطنی کیفیات، خودغرضی اور بے یقینی کو بیان فرمایا ہے۔

(الف) تربص

وہ تاک میں بیٹھے ہیں، منتظر کھڑے ہیں کہ اسلام اور کفر کی جنگ کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور فیصلہ کن غلبہ کسے حاصل ہوتا ہے تا کہ اس کی جانب لڑھک جائیں، لیکن مدنی زندگی کے ابتدائی عبوری دور میں وقتی طور پر صورت حال بدلتی رہتی تھی، اس لئے مسلمانوں کو فتح ملتی تو کہتے ''دیکھا ہم تو تمہارے ہی ساتھی تھے،'' اور اگر وقتی طور پر کہیں کفار کو بالا دستی حاصل ہوتی تو کہتے کہ ''مسلمانوں کے غلبے سے تو ہم نے ہی تمہیں بچا رکھا ہے۔'' اللہ نے فرمایا: ''کفر کو اسلام پر (دائمی) تسلط کبھی حاصل نہیں ہوگا۔''

(ب) تساہل و تکاسل

مارے بندھے یہ منافق مسجد نبوی میں بھی جاتے تھے، نمازیں بھی پڑھتے تھے لیکن دل سے نہیں، اس لئے ان کی یہ نمازیں ان کی سستی، کاہلی، کسلمندی کی عملی تصویر تھیں، کیونکہ ان میں اخلاصِ وللّٰہیت کا تو نام ونشان نہیں تھا۔

(ج) خداع وفریب

ان کے یہ انداز واطوار مسلمانوں کے فریب دینے کے لئے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ شاید وہ (معاذ اللہ) اللہ کو بھی دھوکا دے رہے ہیں، لیکن ان کے اس مکر وخداع کی ان کو کڑی سزا ملے گی۔

(د) ریاکاری

ہر وہ عبادت جس کا مقصد معبودِ مطلق کی رضا کے بجائے کوئی دنیوی منفعت ہو، مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنا ہو یا اپنے تقویٰ اور پارسائی کا ڈھونگ رچانا ہو، اسے ریا اور دکھاوا کہتے ہیں، آخرت میں اس کا کوئی اجر نہیں ہے۔

(ہ) تذبذب

قرآن نے بتایا کہ وہ گھڑیال کے پنڈولم کی طرح کبھی مسلمانوں کی طرف لڑھکتے ہیں

اور کبھی کافروں کی طرف، اپنی بے ضمیری اور خودغرضی کی وجہ سے "فٹ بال" بنے ہوئے ہیں اور ذلت ورسوائی کی مجسم تصویر ہیں۔

اللہ کی حجت

آیت نمبر ۱۴۴ میں اللہ نے فرمایا کہ ایک طرف ہوجاؤ، یہ وتیرہ چھوڑ دو، اسلام قبول کرنا ہے تو اخلاص اور صدق دل سے قبول کرو، اسلام قبول کرنے اور کلمہ پڑھنے کے بعد کفار سے دوستی کا جواز کیا ہے؟ جبکہ ہر مسلمان دعاءِ قنوت میں اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و پیمان کرتا ہے کہ "(اے اللہ!) ہم تیرے دشمن اور تیرے نافرمان سے قطع تعلق کرتے ہیں۔" اور اگر یہ وتیرہ قائم رہا تو پھر قیامت کے دن عذاب کے لئے اللہ کی حجت پوری ہوجائے گی۔

جہنم کے طبقات

منافقوں کا ٹھکانا جہنم کا سب سے نچلا گڑھا ہے، بلندی کے مراتب کو "درجہ" اور پستی کی منازل کو "درک اور درَک" کہتے ہیں، جہنم کے گڑھوں یا طبقات کے نام یہ ہیں:

(۱) جہنم (۲) لظیٰ (۳) حطمہ (۴) سعیر (۵) سقر (۶) جحیم (۷) ہاویہ، یہ سب سے نچلا طبقہ ہے۔

راہِ نجات کھلا ہے

آیات ۱۴۶، ۱۴۷ میں منافقوں کا انجام بتا کر بتایا گیا کہ ہر ایک کے لئے راہِ نجات کھلا ہے، کوئی بدی کی راہ پر کتنا ہی دور کیوں نہ چلا گیا ہو، اگر پلٹ کر واپس راہِ ہدایت کی طرف آنا چاہتا ہے تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے، مگر اس کے لئے چند لازمی شرائط یہ ہیں:

(۱) سچی توبہ، توبۂ نصوح (۲) اپنے عمل و کردار کی اصلاح (۳) تعلق باللہ کی مضبوطی اور استحکام (۴) اخلاص، صدق اور بے ریائی (۵) شکر، گزشتہ صفحات میں "توبہ" کے عنوان پر مفصل بحث آچکی ہے۔ "اخلاص" کے معنی ہیں "انسان اپنے عقیدہ و عمل سے صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کا طلبگار ہو، کوئی دنیوی طمع، حرص، خوف اور دباؤ اس کا سبب نہ ہو"، "شکر"

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صدق دل سے اعتراف، زبان سے اقرار، عمل سے اطاعت کے مجموعی مفہوم کا نام ہے۔"

لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا ﴿۱۴۹﴾

"اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی کس کو علانیہ برا کہے مگر مظلوم (کو اجازت ہے)، اور اللہ بہت سننے والا، بے حد جاننے والا ہے۔ تم کوئی نیکی ظاہر کر دیا اسے پوشیدہ رکھو یا کسی برائی سے درگزر کرو، تو بے شک اللہ معاف فرمانے والا، قدرت والا ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

اَلْجَهْرَ	بلند آواز سے یا علانیہ طور پر بات کرنا، اونچی آواز سے قرأت کرنے کو بھی "جہر" کہتے ہیں	عَفُوًّا	معاف کرنے والا

تفسیر

سبب نزول

اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں امام رازی اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی مجلس میں حضرت ابوبکر صدیق کی مسلسل برائی کیے چلا جا رہا تھا، وہ کافی دیر تک صبر کیے بیٹھے رہے، لیکن جب ان کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور جواب دینے لگے تو نبی کریم ﷺ مجلس سے اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا "یا رسول اللہ! آپ اس کی خرافات سن کر تو بیٹھے رہے اور میں نے جواب دینا شروع کیا تو آپ اٹھ گئے۔" آپ نے فرمایا "جب تک تم خاموش تھے تو فرشتہ تمہاری جانب سے جواب دے رہا تھا اور جب تم

نے خود جواب دینا شروع کیا تو فرشتہ چلا گیا اور شیطان آ گیا تو اب میں کیسے بیٹھا رہتا۔"

برائی کا اظہار و اعلان ناپسندیدہ ہے

آیت نمبر ۱۴۸ سے یہ عمومی حکم شرعی معلوم ہوا کہ کسی برائی کا اعلان، پردہ دری اور رسوائی اللہ کی نظر میں پسندیدہ بات نہیں ہے بلکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے "جو کسی مسلمان کے عیوب پر پردہ ڈالے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔"

لیکن ایک صورت کا استثناء ہے، وہ یہ کہ کوئی شخص کسی کے مظالم کا شکار ہو تو وہ عدالتی چارہ جوئی کر سکتا ہے آہ و فریاد کر سکتا ہے، ظالم کے ظلم کی تفصیلات بیان کرنا بھی غیبت کے زمرے میں نہیں آتا، اور مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس کا ظلم و تعدی اور فسق و فجور حد سے بڑھ کر ہو اور لوگوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو "مفادِ عامہ" میں اس کا بیان کرنا بھی جائز ہے۔

نیکیوں میں اخفاء بہتر ہے

آیت نمبر ۱۴۹ میں نیکیوں کے "اخفاء" (یعنی چھپانا) اور "اظہار" دونوں کی اجازت دی گئی ہے۔ تاہم دونوں کا درجہ ایک نہیں ہے، نیکی کا اخفاء بہر حال افضل ہے لیکن اگر اظہار میں دینی مصلحت ہو، جیسے لوگوں کو خیر کی ترغیب دینا، تو اس کی اجازت ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ فرائض میں اظہار افضل ہے اور نوافل میں اخفاء بہتر ہے۔

"عفو و درگزر" صفتِ الوہیت ہے

اس آیت میں کسی کے جرم کو "معاف" کر دینے کا بھی ذکر ہے، "قدرتِ انتقام" کے باوجود معاف کرنا شانِ الوہیت ہے، اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس کی صفات کا مظہر بنیں، شاعر نے ایک حدیث کے مضمون کو بہت اچھا منظوم کیا ہے ۔

موسیٰ نے عرض کی، اے بارِ خدا!
کون ہے تیرا بندہ بندوں میں سوا؟

ارشاد ہوا، بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے، اور نہ لے، بدی کا بدلہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''بدی کا بدلہ نیکی سے دو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو تمہارا جانی دشمن ہے، جگری دوست بن جائے گا۔'' (حم السجدہ: ۳۴)۔ عفو سے محبتیں پروان چڑھتی ہیں، قربتیں پیدا ہوتی ہیں اور نفرتیں مٹتی ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّ نَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۱۵۱﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ لَمۡ یُفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ اُولٰٓئِکَ سَوۡفَ یُؤۡتِیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۵۲﴾

''بلا شبہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور ایمان اور کفر کے درمیان کوئی راستہ نکالنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت وہی لوگ کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی میں فرق نہ کیا، یہی لوگ ہیں جن کو (اللہ تعالیٰ) عنقریب ان کا اجر عطا فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا مہربان ہے''۔

تفسیر

کفر کی مختلف صورتیں

آیت نمبر ۱۵۰ سے کفار کا بیان ہے۔ اس مقام پر کفر کی کئی ممکنہ صورتیں یہ ہیں: (۱) اللہ پر ایمان لائیں اور انبیاء کے وجود کا سرے سے انکار کر دیں۔ (۲) بعض انبیاء کرام پر

ایمان لائیں اور بعض کا انکار کریں، جیسے یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء ﷺ کا انکار کیا، اور عیسائی حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لائے لیکن ختم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا انکار کیا۔

بیچ کی راہ نکالنے کا راستہ

آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کفار (یعنی اہل کتاب) کفر محض اور اسلام کے درمیان ایک بیچ کا راستہ نکالنا چاہتے ہیں۔ دراصل ایمان ایک حقیقتِ کاملہ کا نام ہے، اس کو اجزاء میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ لوگ حقیقتاً کافر ہی ہیں اور ایک ذلت آمیز عذاب ان کا منتظر ہے۔ چنانچہ آیت میں بتایا کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان ایمان میں تفریق نہیں کرتے، وہی اجر کے مستحق ہوں گے۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِى السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًۢا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾

''اہل کتاب آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے کوئی (لکھی ہوئی) کتاب نازل کردیں، تو وہ موسیٰ سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کر چکے ہیں، انہوں نے کہا: ہمیں اللہ کی ذات کو علانیہ دکھا دو، تو ان کے ظلم کے سبب انہیں بجلی کی کڑک نے آ پکڑا، پھر کھلی نشانیاں آنے کے بعد انہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا، پھر ہم نے ان کا وہ جرم بھی معاف کردیا، اور ہم نے موسیٰ کو واضح غلبہ عطا فرمایا۔ اور ہم نے ان سے عہد لینے کے لئے ان پر (کوہ) طور کو اٹھالیا اور ہم نے ان سے کہا کہ دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ، اور ہم نے ان سے کہا کہ سبت (ہفتے کے دن) کے بارے میں حد سے نہ بڑھو، اور ہم نے ان سے پختہ عہد کر لیا۔ تو ان کی عہد شکنی کے باعث (ہم نے ان پر لعنت کی) اور اس بناء پر کہ انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا اور انبیاء کو ناحق قتل کیا اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف (چڑھے ہوئے) ہیں، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ان کے کفر کے باعث اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، تو (ان میں سے) کم ہی ایمان لائیں گے۔ اور ان کفر اور اس قول کی وجہ سے (بھی) کہ انہوں نے مریم پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ اور ان کے اس قول کے سبب کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا، حالانکہ انہوں نے ان کو قتل نہیں کیا اور نہ انہیں سولی پر چڑھایا بلکہ ان پر (صورت حال) مشتبہ بنا دی گئی، بلاشبہ جن لوگوں نے ان کے بارے میں اختلاف کیا، وہ ان کی بابت شک میں مبتلا ہیں، انہیں ان (عیسیٰ) کی بہت کچھ علم نہیں، مگر یہی کہ وہ گمان کی پیروی کر رہے ہیں، اور انہوں نے ان (عیسیٰ) کو یقیناً قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف (آسمان پر) اٹھا لیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی نہ ہوگا مگر عیسیٰ کی (طبعی) موت سے پہلے ان پر ضرور ایمان لائے گا، اور قیامت کے دن عیسیٰ ان پر گواہ ہوں گے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

اَرِنَا	ہمیں دکھایئے	جَھْرَۃً	کھلم کھلا
الصّٰعِقَۃُ	بجلی کی کڑک	الْعِجْلَ	بچھڑا
عَفَوْنَا	ہم نے معاف کیا	سُلْطٰنًا	غلبہ، حجت، اقتدار
رَفَعْنَا	ہم نے اٹھایا	مِّیْثَاقًا	یقینی، قطعی وعدہ
لَاتَعْدُوْا	تجاوز نہ کرو	السَّبْتِ	ہفتے کا دن
غَلِیْظًا	سخت، گاڑھا	فَبِمَانَقْضِھِمْ	انکے توڑنے کے سبب
غُلْفٌ	غلاف کی جمع، پردے، خول	طَبَعَ	مہر لگائی
مَاصَلَبُوْہُ	انہوں نے ان کو سولی پر نہیں چڑھایا	شُبِّہَ لَھُمْ	ان پر معاملہ مشتبہ بنا دیا گیا

تفسیر

یہودیوں کی حجت بازی اور عذرِ لنگ

یہودیوں کی ابتدا ہی سے عادت تھی کہ جب انکارِ حق کی کوئی معقول دلیل ان کے پاس نہ رہے تو پھر طرح طرح کے حیلے، حجتیں اور عذرِ لنگ تلاش کرتے ہیں اور یہ سب باتیں ان کے تعصب اور عناد پر مبنی ہوتی ہیں۔ چنانچہ کعب بن اشرف کی سرکردگی میں ان کے چند بڑے لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ پر ایمان لانے کے لئے تیار ہیں، بس ہمارا ایک مطالبہ پورا کر دیجئے، وہ یہ کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی طرف سے لکھی ہوئی کتاب نازل ہوئی تھی، آپ اللہ سے کہیں کہ ہم پر بھی ایسی ہی ایک کتاب اتار دے۔ یہود کا یہ مطالبہ اخلاصِ نیت کا مظہر نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی طور پر قبول حق کے لئے آمادہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کی تسلی کے لئے اس کا الزامی جواب دیا کہ آپ ان کی کٹ حجتیوں پر ہرگز دل برداشتہ نہ ہوں۔ یہ ایسے بلکہ اس

سے بڑے انٹ شنٹ مطالبات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی کرتے رہیں ہیں، مثلاً ''آپ ہمیں کھلے عام اللہ کا دیدار کرادیں،'' پھر اس گستاخی کی سزا انہیں یہ دی گئی کہ ان پر آسمانی بجلی ٹوٹ پڑی، یہ ستر نقباء مر گئے، پھر حضرت موسیٰ کی دعا کے نتیجے میں انہیں دوبارہ زندہ کیا گیا۔

پرنالہ وہیں بہتا رہا

سورۂ آل عمران آیت ۱۸۲ میں اس سے ملتا جلتا مضمون مذکور ہے، یہود نے حضور اکرم ﷺ سے مطالبہ کیا کہ: ''ہم آپ پر اس وقت ایمان لائیں گے جب آپ یہ معجزہ دکھائیں کہ آپ قربانی کریں اور آسمان سے آگ آ کر اسے کھالے (یعنی جلا ڈالے)۔'' تو قرآن نے جواب دیا کہ: ''(اے حبیب!) کہہ دیجئے مجھ سے پہلے کئی ایسے رسول آئے جنہوں نے تمہارے (آباء واجداد کے) سامنے قربانی کا یہ معجزہ بھی پیش کیا اور دیگر معجزات بھی پیش کئے، تو اگر تم اپنے مطالبہ میں سچے ہو تو تم نے ان انبیاء کو کیوں قتل کیا؟''

چنانچہ آیۂ مذکورہ میں قرآن نے فرمایا کہ ''ہم نے ان کا یہ جرم (عبادۃ العجل) بھی معاف کیا اور ہم نے موسیٰ کو ان پر صریح حجت عطا فرمائی۔

یہود سے پختہ عہد لینے کا واقعہ

آیت نمبر ۱۵۴ میں قرآن نے اس واقعے کا ذکر کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی کے طور پر کوہِ طور کو ان کے سروں پر لا کر جھکا دیا اور ان سے پختہ عہد لیا، کیونکہ اس سے پہلے یہود بار بار وعدے کر کے پھر جاتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان سے پختہ عہد لیا، اس میں یہ احکام بھی تھے کہ جب تم فاتح کی حیثیت سے ''اریحا'' یا ''بیت المقدس'' میں داخل ہو تو ''باب المدینۃ'' میں عاجزی کے ساتھ جھکتے ہوئے داخل ہونا، نہ کہ اکڑ کر اور اتراتے ہوئے ایک حکم یہ تھا کہ ''سبت'' یعنی ہفتے کے دن مچھلی کا شکار ممنوع ہے۔ لہٰذا اس حکم الٰہی سے کبھی تجاوز نہ کرنا لیکن آگے چل کر انہوں نے اس ''میثاق'' کا بھی پاس نہ کیا اور احکامِ الٰہی کی حرمتوں کو پامال کرتے رہے۔

مسلسل نافرمانیوں کی سزا

آیت نمبر ۱۵۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چونکہ (۱) انہوں نے عہد شکنی کی اور (۲) آیات الٰہی کا انکار کیا، اور (۳) انبیاء کو ناحق قتل کیا، اور (۴) تمرد وسرکشی کی انتہا یہ کہ: یہ کہنے کی جسارت کر بیٹھے کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں (یعنی تمہاری باتیں ہمارے دلوں تک پہنچتی ہی نہیں ہیں، ماننا تو بہت دور کی بات ہے)۔ (۵) حضرت مریم پر بہت بڑا بہتان لگا کر ارتکاب کفر کیا۔ (۶) یہ دعویٰ کیا کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو مصلوب کر کے قتل کر دیا۔ لہٰذا اتنی سنگین نافرمانیوں کی سزا کے طور پر ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ان میں سے بہت کم ایمان لائیں گے، یعنی صرف ان خوش نصیب بنی اسرائیل کو ایمان کی دولت نصیب ہو گی، جو اپنے آباء و اجداد کے ان ظالمانہ، کافرانہ اور باغیانہ کرتوتوں سے نفرت کر کے ان سے اپنی براءت کا اظہار کریں گے۔

حضرت مریم

ام عیسیٰ حضرت مریم کے والد کا نام عمران بن ماثان تھا اور ان کی والدہ کا نام حنہ بنت فاقوذا تھا۔ حضرت مریم کے والد عمران اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد عمران بن یصہر بن قاہث کے درمیان ۱۸۰۰ برس کا وقفہ ہے۔ حضرت حنہ نعمت اولاد سے محروم تھیں، یہ صالحین کا خاندان تھا، انہوں نے بڑھاپے میں منت مانی کہ اگر اللہ ان کو اولاد دے تو وہ اسے "بیت المقدس" کی خدمت کے لئے وقف کر دیں گی۔ اللہ کی قدرت سے ان کی منت پوری ہوئی اور ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام مریم رکھا گیا۔ مریم کے معنی ہیں "عابدہ"۔ حضرت حنہ کے ذہن میں بیٹے کا تصور تھا۔ انہوں نے عالم حیرت میں عرض کیا: "یا اللہ! میرے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تو سب کچھ اچھی طرح معلوم ہے، قرآن اس مقام پر کہتا ہے کہ: وہ بیٹا (جو انہوں نے رب سے مانگا تھا)، اس بیٹی کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا (جو رب نے انہیں عطا کی)"۔

حضرت حنہ نے اپنی نومولود بیٹی مریم کو منت پوری کرنے کے لئے "احبار (علماء،

مجاور) بیت المقدس" کے سامنے پیش کر دیا، یہ لوگ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور بیت المقدس کے خادم یا متولی تھے۔ قرآن مجید بتاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مریم کی کفالت کا طلب گار ہو گیا، ان کی تعداد ۲۷ تھی۔ کیونکہ حضرت مریم انتہائی حسین و جمیل بھی تھیں اور ان کی ولادت بھی ایک کرامت تھی۔ چنانچہ قرعہ اندازی کی گئی اور یہ اعزاز حضرت زکریا علیہ السلام کو نصیب ہوا، حضرت زکریا، حضرت مریم کے خالو بھی تھے۔ حضرت مریم کی نشوونما، ذہنی اور جسمانی ارتقا عام بچوں کے بہ نسبت بہت غیر معمولی تھا۔ حضرت زکریا نے انہیں بیت المقدس کے ایک خاص حجرے میں رکھا، جسے قرآن نے "المحراب" سے تعبیر کیا ہے۔ جب حضرت زکریا ان کے پاس دیکھ بھال کے لئے جاتے تو بے موسم کے تروتازہ اور بے حد لذیذ پھل پاتے۔ وہ حیرت واستعجاب سے پوچھتے یہ کہاں سے آئے؟ وہ جواباً عرض کرتیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ چنانچہ حضرت مریم کا حمل، پیدائش، کفالت، نشوونما، اور قدرتی پھلوں اور میووں کا نزول، یہ سب اللہ کی بارگاہ میں ان کے تقرب کی علامات ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی ولادت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور جب فرشتوں نے کہا! اے مریم! اللہ تعالیٰ نے تمہیں (اپنی نگاہِ انتخاب سے) چن لیا ہے اور خوب پاکیزہ کیا ہے اور سارے جہاں کی عورتوں میں سے تمہیں پسند فرمایا۔ اے مریم! اپنے رب کی اطاعت گزار بن، سجدہ کر اور رکوع کرنے والے کے ساتھ رکوع کر۔" (آل عمران آیات ۴۲۔۴۳)

حضرت مریم نے عفت مآب پاک زندگی گزاری، کنواری رہیں، کسی مرد کے لمس (چھونے) سے ہمیشہ محفوظ رہیں کہ اچانک فرشتے آئے اور انہوں نے کہا: "اے مریم! اللہ تمہیں اپنی طرف سے ایک فرمان (کلمہ) کی خوشخبری سناتا ہے، جس کا نام "مسیح عیسیٰ بن مریم" ہوگا، جو دنیا و آخرت میں معزز ہوگا، اور اللہ کے مقربین میں سے ہوگا۔ اور لوگوں سے گہوارے میں اور پکی عمر میں بھی کلام کرے گا اور (وہ) نیکوکاروں میں سے ہوگا۔ انہوں

نے عرض کیا: اے پروردگار! میرے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ مجھے تو کسی بشر نے چھوا تک نہیں؟ (اللہ نے) فرمایا: اللہ جو چاہتا ہے، اسی طرح پیدا فرما دیتا ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس اسے کہتا ہے "کن" (ہو جا) تو وہ ہو جاتا ہے۔

(آل عمران آیات ۴۵ تا ۴۷)

عیسیٰ، عبرانی زبان میں لفظ ایشوع کا معرب ہے جس کے معنی ہیں "سردار، سید" لفظ مسیح کے معنی ہیں سیاحت کرنے والا، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام نے کسی ایک مقام پر مستقل قیام نہیں فرمایا۔ اسی سورۂ مبارکہ کی اگلی آیات میں عیسیٰ علیہ السلام کو کتاب وحکمت اور توریت و انجیل عطا کئے جائے اور بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر مبعوث کئے جانے کا ذکر ہے، اور پھر ان کا یہ فرمان کہ: "میں اپنے رب کی طرف سے معجزہ لے کر آیا ہوں کہ میں مٹی سے تمہارے سامنے پرندے کی شکل بنا کر اس میں پھونکوں گا تو وہ اللہ کے حکم سے (اڑنے والا) پرندہ بن جائے گا، میں اللہ کے حکم سے پیدائشی نابینا اور برص کے مریضوں کو شفایاب کرتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردے کو زندہ کرتا ہوں اور میں بتلاتا ہوں کہ تم اپنے گھروں میں کیا ذخیرہ کر کے آتے ہو اور کیا کھا کر آتے ہو۔ (آل عمران: ۴۹)۔"

قرآن کہتا ہے: کہ جب حضرت مریم کے دردِ زہ کا وقت آیا تو وہ ایک کھجور کے درخت کے پاس آئیں اور کہنے لگیں، کاش! میں آج سے پہلے مر چکی ہوتی اور کاش میں ایک بھولی بسری کہانی ہوتی، (ان کی طمانیت کے لئے) نیچے سے انہیں آواز آئی کہ گھبرایئے نہیں، آپ کے رب نے نیچے ایک نہر جاری کر دی ہے، درخت کے تنے کو پکڑ کر ہلایئے، آپ پر پکی ہوئی تازہ کھجوریں گریں گی، کھاؤ اور پیو اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھو، اگر تم کسی انسان کو دیکھو تو (اشارے سے) کہہ دو کہ میں نے رحمٰن کے لئے (خاموشی کے) روزے کی منت مانی ہے، تو آج میں کسی انسان سے ہرگز بات نہیں کروں گی۔ وہ بچے کو اٹھا کر قوم کے پاس آئیں، انہوں نے کہا: اے مریم! تم نے بہت برا کام کیا، اے ہارون کی بہن، نہ تو تمہارا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تمہاری ماں بدکار تھی، اس پر حضرت مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا (کہ

اس سے پوچھو) انہوں نے کہا: ہم گھوارے میں بچے سے کیسے بات کریں؟ (بچہ) بولا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب اور نبوت عطا کی ہے، اس نے مجھے بابرکت بنایا ہے جہاں کہیں بھی ہوں، اور اس نے مجھے تاحیات نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ سورہ مریم کی آیات ۱۷ تا ۳۰ میں یہ تمام واقعات تفصیلات کے ساتھ مذکور ہیں۔ آگے چل کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ''مجھ پر سلام ہو جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میری وفات ہوگی اور جس میں اٹھایا جاؤں گا۔''

کلمۃ اللہ

عیسیٰ علیہ السلام کو ''کلمۃ اللہ'' اس لئے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انسانی توالد و تناسل کی سنتِ جاریہ کے برعکس کسی مرد کے واسطے اور لمس کے بغیر اپنی قدرت سے پیدا فرمایا۔ کلمہ سے مراد کلمہ ''کن'' بھی ہوسکتا ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے وجود میں لانے کا ارادہ فرماتا ہے تو فرماتا ہے، ''کن'' (ہوجا) تو وہ چیز وجود میں آجاتی ہے۔ اس کے لئے ''کن'' کہنا ضروری نہیں بلکہ اس کی مشیت اور ارادہ ہی کافی ہے، ''کن'' اسی مشیت کا اظہار ہے۔ چونکہ حضرت مریم کے پاس بیٹے کی بشارت سنانے کے لئے ایک کامل و متناسب انسان کی شکل میں حضرت جبریل امینؑ آئے تھے، جسے اللہ نے ''روحنا'' سے تعبیر فرمایا ہے، جبریل کو قرآن نے ''الروح'' اور ''الروح الامین'' بھی کہا ہے، اس لئے عیسیٰ علیہ السلام کا ایک معروف لقب ''روح اللہ'' بھی ہے۔

قیامت میں باپ کے نام سے پکارا جائے گا

''قرآن میں مسیح عیسیٰ ابن مریم کے حوالے سے بعض لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ قیامت میں ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔ یہ تصور غلط ہے، حدیث پاک میں ہے کہ تمہیں تمہارے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور اس (اللہ) نے تمہارے ''منہ بولے بیٹوں'' (لے پالک) کو تمہارا بیٹا نہیں بنایا، یہ تمہاری خود ساختہ باتیں ہیں اور اللہ حق بات کہتا ہے اور وہی تمہیں راہ راست دکھاتا ہے۔

لے پالکوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کے ناموں سے پکارو، اللہ کے نزدیک یہی انصاف کی بات ہے۔'' (الاحزاب: آیات ۴۔۵)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے'' جس نے اپنا نسبت اپنے (حقیقی) باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا اور وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا (اصلی) باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے۔'' قیامت میں ماں کے نام سے پکارا جانا صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے۔

بن باپ کے پیدائش ماورائے عقل ہو سکتی ہے خلاف عقل نہیں

اللہ تعالیٰ کی عام سنت جاریہ اور عام دستور یہی ہے کہ نظام توالد و تناسل مرد اور عورت کے اشتراک و اختلاط سے قائم رہے، لیکن اس کی قدرتِ مطلق اور صفتِ خالقیت اس واسطے کی محتاج نہیں ہے۔ لہٰذا ہم اپنی کم فہمی کے باعث حضرت عیسیٰ کی پیدائش کو'' ماورائے عقل'' تو کہہ سکتے ہیں،'' خلاف عقل'' ہرگز نہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:'' اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ (علیہ السلام) کی تخلیق کی مثال آدم (علیہ السلام) کے مشابہ ہے، جسے اللہ نے مٹی سے پیدا کیا (آل عمران: آیت ۵۹)۔'' تو زیادہ باعث تعجب اور قابل حیرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہے، اور حضرت حوا کی تخلیق ہے جس میں عورت کا واسطہ ہی نہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہود کا سنگدلانہ رویہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب دعوت و ارشاد اور بنی اسرائیل میں تبلیغِ رسالت کا سلسلہ شروع کیا تو نچلے طبقات کے لوگوں کے علاوہ یہود نے ان کی شدید مخالفت کی، حضرت مریم پر تہمت لگائی اور بالآخر ان کے قتل کا منصوبہ بنایا۔

عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ کے وعدے

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی تسکین قلب کے لئے ان کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور سورہ آل عمران آیت نمبر ۵۵ میں ان پانچ وعدوں کا ذکر ہے۔ (۱) اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ یعنی مخالفین

کی بدخواہی اور سازشوں کے باوجود وہ اپنی طبعی عمر مکمل کریں گے۔ (۲) رَافِعُكَ اِلَیَّ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بحفاظت آسمان پر اٹھالے گا۔ (۳) وَمُطَهِّرُكَ یعنی اللہ یہود کے ناروا الزامات سے ان کی براءت فرمائے گا اور یہ براءت اللہ تعالیٰ نے سید المرسلین ﷺ کے ذریعے فرمائی۔ (۴) جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی حضرت عیسیٰ کے پیروکاران لوگوں پر غالب آئیں گے جنہوں نے ان کی نبوت کا انکار کیا۔ یہ برتری یہود پر دلائل کے اعتبار سے بھی ہوئی اور سیاست واقتدار کے اعتبار سے بھی۔ (۵) ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ پھر حضرت عیسیٰ زمین پر اتریں گے اور اپنی عمر طبعی گزارنے کے بعد ان کا وصال ہوگا۔

یہود نے فلسطین کے رومی گورنر پیلاطس پر دباؤ ڈالا کہ عیسیٰ کو مصلوب کیا جائے۔ گورنر نے بادل نخواستہ ان کے مطالبے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور بعض روایات کے مطابق اُسے خون ناحق قرار دے کر اس کی ذمہ داری سے کھلے عام اپنی براءت کا اظہار کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہود کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا معاملہ مشتبہ ہوگیا

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب ہونے سے بچالیا اور زندہ آسمانوں پر اٹھالیا۔ قرآن نے اس سلسلے میں مجمل بات کی ہے کہ ”حقیقت ان کے لئے مشتبہ ہوگئی۔“ اور حدیث پاک میں اس اجمال کی تفصیل نہیں بیان کی گئی، تاہم مفسرین کرام نے اس کی مختلف امکانی توجیہات روایات کی روشنی میں بیان کی ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) رئیس یہود ”یہوذا“ کو جب حضرت عیسیٰ کے ٹھکانے کا علم ہوگیا تو اس نے ایک شخص ”طیطایوس“ کو اندر بھیجا کہ انہیں پکڑ کر لے آئے، جب وہ اندر داخل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو چھت کے راستے اٹھالیا اور اس کی صورت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بنا دی، چنانچہ انہوں نے اس کو عیسیٰ سمجھ کر سولی پر چڑھایا اور قتل کر دیا۔

(۲) جب انہوں نے حضرت عیسیٰ کی گرفتاری کا پروگرام بنایا تو آپ کے ساتھ اس وقت دس اصحاب تھے، تو آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: کون ہے جو میری شبیہ کو اختیار کر کے

جنت خرید لے؟، ایک صحابی نے رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کیا، ان کی صورت حضرت عیسیٰ کے مشابہ ہوگئی اور وہ قتل کردیئے گئے۔

(۳) سب سے زیادہ قرین قیاس یہ توجیہ لگتی ہے کہ ان کے اصحاب میں ایک شخص منافق تھا، اس نے معمولی رشوت لے کر ان کا پتا بتا دیا، اور جب وہ انہیں گرفتار کرانے آیا تو توہین رسول کی سزا کے طور پر اس کی صورت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بنادی گئی اور وہ مصلوب کر کے مارا گیا۔

(۴) ایک قول یہ ہے کہ جب یہود حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرنے میں ناکام ہو گئے، کیونکہ اللہ نے انہیں اوپر اٹھالیا، تو انہوں نے خود ہی ایک آدمی کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا، ان کے بڑوں کو تو حقیقت معلوم تھی، لیکن عام یہودی مطمئن ہو گئے اور ان پر حقیقت واضح نہ ہو سکی۔

حضرت عیسیٰ کے بارے میں شکوک واختلاف

مصلوب کرنے کے بعد جب یہود نے غور سے میت کو دیکھا تو اس کا چہرہ تو حضرت عیسیٰ کے مشابہ تھا لیکن باقی بدن مشابہ نہیں تھا، تو وہ شک میں مبتلا ہو گئے۔ پھر انہیں اپنے آدمی کا خیال آیا تو کہنے لگے کہ اگر یہ عیسیٰ ہے تو ہمارا آدمی کہاں ہے؟ اور اگر یہ ہمارا آدمی ہے تو عیسیٰ کہاں ہے؟، یا یہ کہ خود نصاریٰ اختلاف میں پڑ گئے، کسی نے کہا کہ عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے، کسی نے کہا کہ تین میں سے ایک ہے۔

مصلوب ہونے کے بارے میں بھی نصاریٰ تین فرقوں میں بٹ گئے، نسطوریہ نے کہا کہ وہ جسمانی طور پر مصلوب ہوئے، ملکانیہ نے کہا کہ وہ روحانی طور پر مصلوب ہوئے۔ اور یعقوبیہ نے کہا کہ ناسوت اور لاہوت یعنی روح اور جسم دونوں مصلوب ہوئے۔

رفع عیسیٰ علیہ السلام

قرآن نے کہا کہ یہ سب قیاس آرائیاں ہیں، یہ ان کے اپنے اپنے ظنون واوہام ہیں، کسی کے پاس بھی علم یقینی نہیں ہے اور فرمایا: وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ علامہ قرطبی نے اس عبارت کی دو طرح سے توجیہ کی ہے۔ (۱) یہ کہ انہوں نے یقیناً ان کو قتل نہیں

کیا، بلکہ اللہ نے انہیں (زندہ) اپنی طرف اٹھالیا۔ اس صورت میں "یقیناً" پر وقف ہوگا۔
(۲) انہوں نے ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ یقینی بات یہ ہے کہ اللہ نے انہیں (زندہ) اپنی طرف اٹھالیا۔ اس صورت میں "وَمَا قَتَلُوْهُ" پر وقف ہوگا "یقیناً" کا تعلق مابعد سے ہوگا۔

رفعِ عیسیٰ کے منکرین

"رفع عیسیٰ" کے منکرین، جن میں مرزا غلام احمد قادیانی بھی شامل ہے، وہ زندہ اٹھائے جانے کے منکر ہیں، اور وہ اس سے درجات کی بلندی مراد لیتے ہیں یا محض روحانی ارتقاء، لیکن یہ تاویلات غلط ہیں، کیونکہ (۱) موت کے بعد روح کے اٹھائے جانے پر قرآن نے کہیں بھی "رفع" کا اطلاق نہیں کیا۔ (۲) ہر مرنے والے کے لئے کہتے ہیں: اللہ نے اسے اٹھالیا، تو محض "رفعِ روح" کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں ہے جس کا ذکر حضرت عیسیٰ کے حوالے سے بڑے اہتمام کے ساتھ کیا جاتا اور یہ حضرت عیسیٰ کے لئے ایک شانِ امتیاز بن جاتی۔ (۳) روح وجسم دونوں کے ساتھ (یعنی زندہ) اٹھائے جانے کا مسلمہ نظریہ عیسائیوں کے ہاں شروع سے چلا آرہا ہے، جس کی بناء پر انہوں نے "الوہیت مسیح" کا عقیدہ اختیار کیا۔

آمد عیسیٰ علیہ السلام

احادیث حدتواتر وشہرت کو پہنچی ہوئی ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے زمین پر آئیں گے، عمر طبعی گزاریں گے طبعی وفات پائیں گے اور حضور ﷺ کے قریب مدفون ہوں گے۔ ارشاد نبوی ہے: "حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: عیسیٰ ابن مریم عادل حکمران بن کر ضرور نازل ہوں گے، وہ دجال اور خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو توڑیں گے اور اس وقت اللہ رب العلمین وحدہٗ لاشریک کی عبادت ہوگی۔"
پھر ابوہریرہ نے کہا اگر دلیل کی ضرورت ہو تو یہ آیت پڑھو: آیت نمبر ۱۵۹ سورۃ النسآء پھر تین بار فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

''تو یہودیوں کے ظلم کے سبب ہم نے کئی ایسی پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کردیں جو پہلے ان کے لئے حلال تھیں، اور اس بناء پر بھی کہ وہ لوگوں کو بکثرت اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ اور ان کے سود لینے کی بناء پر حالانکہ انہیں اس سے روکا گیا تھا، اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کے مال ناحق کھاتے تھے اور کافروں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ لیکن ان میں سے جو پختہ علم والے اور جو صاحب ایمان ہیں، وہ اس (کلام) پر (بھی) ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف نازل ہوا اور اس پر (بھی) جو آپ سے پہلے نازل ہوا، اور (وہ) نماز قائم رکھنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لانے والے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہم عنقریب اجر عظیم عطا کریں گے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

هَادُوْا	جو یہودی ہوئے	الرِّبٰوا	سود
نُهُوْا عَنْهُ	انہیں اس سے روکا گیا تھا	الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ	پختہ علم والے

تفسیر

یہود کی مزید سرکشی اور اس کی سزا کا ذکر

آیات ۱۶۰ اور ۱۶۱ میں یہود کی مزید سرکشیوں کا ذکر ہے اور یہ گذشتہ مضمون کا تسلسل ہے۔ وہ ظلم و تعدی یہ ہے: (۱) لوگوں کو بکثرت راہ حق سے روکنا (۲) ممانعت کے باوجود

سودخوری (۳) لوگوں کے مال ظلماً کھانا، قرآن نے بتایا کہ آخرت میں تو یقیناً دردناک عذاب ان کا منتظر ہے، لیکن دنیا میں بھی سزا کے طور پر ان پر بعض حلال چیزیں حرام کردی گئیں، جن کا تفصیلی بیان سورہ الانعام آیت ۱۶۴ میں ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) ناخن والا جانور، جیسے شترمرغ اور اونٹ (۲) گائے اور بکری کی چربی، سوائے اس کے جو جانور کی پشت یا آنتوں یا ہڈیوں کے ساتھ لگی ہو۔ اس مقام پر بھی بتایا کہ یہ بغاوت وسرکشی کی سزا ہے۔ لیکن آیت نمبر ۱۶۲ میں بتایا کہ پختہ علم والے اصحاب ایمان، جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ، قرآن اور گزشتہ کتب سماوی پر ایمان لانے والے، نظام صلوٰۃ وزکوٰۃ قائم کرنے والے اور اللہ اور یوم آخرت پر سچا ایمان لانے والوں کے لئے اجر عظیم کی بشارت ونوید بھی ہے۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿۱۶۴﴾ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۶۵﴾ لَّٰكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَآ أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُۥ بِعِلْمِهِۦ ۖ وَالْمَلَٰٓئِكَةُ يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿۱۶۶﴾

"(اے حبیب!) ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح اور ان کے بعد دوسرے نبیوں کی طرف بھیجی تھی۔ اور (اس طرح) ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اولاد یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف بھی وحی بھیجی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی تھی۔ اور بہت سے رسول ہیں جن کے واقعات ہم اس سے پہلے آپ کو بیان کر چکے ہیں اور بہت سے رسول ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے آپ سے بیان نہیں کئے اور موسیٰ سے اللہ نے (بلاواسطہ) کلام فرمایا۔ (ہم نے) خوشخبری سنانے والے اور ڈرسنانے

والے رسول (بھیجے) تاکہ رسولوں (کی بعثت) کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے کوئی حجت باقی نہ رہے۔اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔لیکن اللہ نے جو (کتاب) آپ پر نازل کی، اس کے بارے میں گواہی دیتا ہے کہ وہ اس نے اپنے علم سے نازل کی اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ کا گواہ ہونا کافی ہے''۔

تفسیر

الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ اور مومنین کی صفات اور اجر

آیت نمبر ۱۶۲ میں الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (یعنی پختہ علم والے) اور اہل ایمان کا ذکر ہے۔مفسرین نے لکھا ہے کہ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ سے بنی اسرائیل کے وہ حقیقی اہل علم مراد ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے دلائل نبوت کو دیکھ کر ایمان لے آئے، جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ۔اور ''المومنون'' سے مہاجر و انصار صحابہ کرام مراد ہیں۔یہاں ایمان کے جن شعبوں کا ذکر ہے، ان میں قرآن پر اور سابق کتب سماوی پر ایمان، اللہ اور یوم آخرت پر ایمان شامل ہے۔رسالت اور ملائکہ پر ایمان، کتب سماوی پر ایمان کے لئے از خود لازم ہے، کیونکہ جب کتاب پر ایمان ہوگا، تو کتاب لانے والے فرشتوں اور جن انبیاء پر کتابیں اتریں، ان پر بھی ایمان لانا لازمی ہوگا۔عبادت میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کا ذکر ان کی اہمیت کی بناء پر ہے تو ایسے خوش نصیبوں کو اللہ اجر عطا فرمائے گا۔

سلسلہ وحی و رسالت شروع سے جاری ہے

یہود نے، رسول اکرم ﷺ سے مطالبہ کیا تھا کہ اگر ہم پر لکھی ہوئی کتاب اتر آئے تو ہم ایمان لے آئیں۔تو قرآن نے متعدد انبیاء کرام و رسل عظام کا ذکر کر کے بتایا کہ ''وحی'' کا سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے، یہ شروع سے جاری ہے، حضرت نوح سے آغاز اس لئے کیا کہ وہ پہلے صاحب شریعت نبی تھے۔اسباط سے حضرت یعقوب کی اولاد مراد ہے، جن میں بکثرت انبیاء کرام تشریف لائے۔آیت نمبر ۱۶۴ میں بتایا کہ قرآن میں سارے انبیاء و

رسل کا تذکرہ نہیں آیا، بلکہ بعض جلیل القدر انبیاء کا ذکر آیا ہے، انبیاء اور رسل اس کے علاوہ بھی مبعوث کیے گئے ہیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ انبیاء کرام کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش ہے۔ رسولوں کی تعداد ۳۱۳ اور آسمانی صحیفوں کی تعداد ۱۱۰ ہے۔ لیکن یہ سب ظنی روایات ہیں، حقیقی اور قطعی تعداد قرآن وسنت میں مذکور نہیں ہے۔

زبور کا تذکرہ

حضرت داؤد علیہ السلام پر نزول زبور کا تذکرہ ہے، حضرت داؤد شریعت موسوی کے پیروکار، مبلغ اور داعی تھے، اس لئے زبور میں حلال وحرام کے احکام نہیں تھے بلکہ وعظ و نصیحت اور حکیمانہ باتیں تھیں۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ زبور کی ۱۵۰ سورتیں تھیں اور جب حضرت داؤد لحن شیریں کے ساتھ زبور پڑھتے تھے تو جن وانس اور وحوش وطیور سب دم بخود ہوکر سنتے رہتے۔ ''زبور'' کے معنی لکھنے کے ہیں، یعنی لکھی ہوئی کتاب۔

بعثت رسل کا مقصد اتمام حجت ہے

آیت نمبر ۱۶۵ میں اللہ تعالیٰ نے ''بعثت رسالت'' کا مقصد بیان فرمایا ہے، یعنی رسول اس لئے مبعوث کیے گئے تاکہ ''اتمام حجت'' ہوجائے، اخروی جزا وسزا کا تقاضائے عدل پورا ہوجائے، کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ''ہمارے پاس کوئی بشیر (جنت اور رحمت کی بشارت سنانے والا) اور نذیر (جہنم اور عذاب سے ڈرانے والا) نہیں آیا۔ قرآن میں دوسرے مقام پر فرمایا: ''اور ہم عذاب نہیں دیتے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں۔'' آیت نمبر ۱۶۶ میں ایک بار پھر فرمایا کہ اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے قرآن اپنے علم سے اتارا اور فرشتے بھی گواہ ہیں اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١٦٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٦٩﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا

خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

''بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا تو وہ گمراہی میں بہت دور تک چلے گئے۔ بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم کیا، اللہ ان کی بخشش نہیں فرمائے گا اور انہیں کوئی اور راستہ نہیں دکھائے گا۔ سوائے راہ جہنم کے، جس میں وہ ہمیشہ ابد تک رہیں گے، اور یہ کام اللہ کیلئے آسان ہے۔ اے لوگو! تمہارے پاس یہ رسول تمہارے پروردگار کی جانب سے (دعوت) حق لے کر آئے ہیں تو ایمان لے آؤ، (یہی) تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور اگر تم کفر کرو گے تو بے شک آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ یہ کا ہے اور اللہ بہ تجاننے والا حکمت والا ہے''۔

تفسیر

کفر نا قابل معافی جرم ہے

آیات ۱۶۷ تا ۱۷۰ کفر، ظلم اور راہِ حق میں رکاوٹ بننے کو نا قابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا کہ اس کا انجام جہنم کی ابدی اور دائمی سزا ہے اس لئے تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ رسول خدا کی دعوت حق کو قبول کر لو۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ٘ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

''اے اہل کتاب! اللہ کے دین میں حد سے تجاوز نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو، مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول تھے اور اس کا ایک تکوینی

امر تھے جو اس نے مریم کی طرف القا کیا اور اس کی طرف سے ایک روح تھی، پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور (یہ) نہ کہو کہ (معبود) تین ہیں، (ایسی بات کہنے سے) باز رہو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، بلاشبہ اللہ ہی ایک معبود (برحق) ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کا ہے، اللہ ہی کافی کارساز ہے"۔

مشکل الفاظ کے معانی

لَاتَغْلُوْا غلو نہ کرو، حد سے تجاوز نہ کرو اِنْتَھُوْا رک جاؤ

تفسیر

غلو فی الدین کا مفہوم

"غلو" کے معنی ہیں، حد سے تجاوز کرنا، انتہا پسندی، "غلا السعر" کے معنی ہیں "قیمتوں کا چڑھ جانا۔" "غلو فی الدین" کے معنی ہیں، دین کی متوسط و معتدل راہ اور صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر افراط و تفریط میں پڑ جانا، یعنی کسی کو اس کے اصل مقام سے بڑھا دینا (افراط) یا گرا دینا (تفریط) ہے۔ آیت نمبر ۱۷۱ میں اہل کتاب کو "غلو فی الدین" سے منع کیا گیا ہے۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو کہتے ہیں، ان دونوں مذاہب کے لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں افراط و تفریط کا شکار ہوئے۔

تفریطِ یہود

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عفت مآب والدہ پر انہوں نے تہمت لگائی۔ عیسیٰ علیہ السلام کی نہ صرف تکذیب کی بلکہ انہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

افراطِ انصاری

نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو "مقام عبدیت" سے اٹھا کر "مقام الوہیت" تک پہنچا دیا، کبھی انہیں "الٰہ" (خداوند) کہا، کبھی "ابن اللہ" کہا اور کبھی "ثالث ثلثہ" کہا۔ اللہ تعالیٰ

نے فرمایا: ''اللہ کی طرف کوئی ناحق بات منسوب نہ کرو۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''(میرے مقام عالی کو دیکھ) میرے بارے میں ایسی مبالغہ آرائی نہ کرنا جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کی (بلکہ) مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔'' (صحیح بخاری)

حضرت عیسیٰ کا اصل مقام، اسماء والقاب

قرآن مجید نے یہود و نصاریٰ دونوں کے غالی عقائد و نظریات کو رد کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ کا اصل تعارف پیش کیا۔ اس آیہ مبارکہ میں ان کے تمام اسماء والقاب یکجا کر دیئے گئے ہیں، جو یہ ہیں:

مسیح، عیسیٰ، ابن مریم، کلمۃ اللہ، روح من اللہ، رسول اللہ، عبداللہ

رسول اللہ کا مفہوم محتاج بیان نہیں، ''مسیح'' اور ''عیسیٰ'' کے معانی گزشتہ صفحات میں بیان کئے جا چکے ہیں، ابن مریم کا ذکر بھی آ چکا ہے، سطور ذیل میں القاب کی تشریح ملاحظہ کیجئے۔

کلمۃ اللہ

حضرت عیسیٰ کو ''کلمۃ اللہ'' فرمانے کی وجوہ علامہ قرطبی نے یہ بیان کی ہیں:

(۱) چونکہ حضرت عیسیٰ عام انسانوں کے برعکس اللہ تعالیٰ کے تکوینی حکم ''کن'' (ہو جا) کے نتیجے میں بغیر باپ کے تولد ہوئے، اس لئے کلمۂ کن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انہیں ''کلمۃ اللہ'' کہا گیا۔

(۲) کلمہ سے مراد حضرت مریم کی طرف فرشتے کا پیغام ''بشارت'' لے کر آنا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

جب فرشتوں نے کہا: ''اے مریم! بلاشبہ اللہ آپ کو اپنی جانب سے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے جو مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا، دنیا اور آخرت میں باوقار'' تو ''کلمۃ اللہ'' سے مراد ''بشارت اللہ'' ہے''۔

(۳) اس سے ''آیت'' مراد ہے، قرآن میں ہے: ''اس (مریم) نے اپنے رب کی باتوں کی تصدیق کی۔'' (التحریم آیت ۱۲) ''آیت'' کے ایک معنی ''معجزہ'' کے ہیں اور حضرت عیسیٰ کی بن باپ کے ولادت ایک معجزہ تھی۔

''روح'' کے معانی

''روح منہ'' سے نصاریٰ کو اشتباہ ہوا کہ (معاذ اللہ) عیسیٰ اللہ کا جز ہیں۔ اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔ جن میں چند یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں (عالم اجسام سے پہلے) سب انسانوں کی ارواح کو پیدا کیا، باقی تمام ارواح انسانی کو ''صلب آدم'' میں ودیعت کیا، مگر ''روحِ عیسیٰ'' کو اپنے پاس رکھا اور پھر جب تخلیق عیسیٰ کا وقت آیا تو ''روح عیسیٰ'' اللہ کی بارگاہ سے براہِ راست ''رحم مریم'' کی طرف ودیعت کر دی گئی، اس لئے ''روح منہ'' یا ''روح اللہ'' یا ''روح من اللہ'' کہا گیا۔

(۲) کبھی اللہ تعالیٰ کسی چیز کو فضیلت عطا کرنے کے لئے اس کی اضافت (نسبت) اپنی طرف فرماتا ہے، جیسے سب لوگ اللہ ہی کے بندے ہیں، مگر عظمت عطا فرمانے کے لئے اپنے پیارے حبیب کریم ﷺ کو اپنی طرف منسوب کر کے ''عبدہٗ'' فرمایا، اور علامہ اقبال نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ؎

عبد دیگر عبدہ چیزے دگر
ایں سراپا انتظار، او منتظر

اور اللہ نے فرمایا: اور پاک کرو میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں (نماز پڑھنے والوں) کے لئے۔ یعنی ''بیتی'' (میرا گھر) فرمایا، بیت اللہ کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی۔

(۳) جس سے امور عجیبہ کا صدور ہو۔ اسے بھی روح کہتے ہیں، اور حضرت عیسیٰ سے کئی امور عجیبہ سرزد ہوئے، مثلاً مردوں کا زندہ کرنا، وغیرہ۔

(۴) ''روح'' اس لئے کہتے ہیں کہ جبرئیل امین نے حضرت مریم کے گریبان میں پھونک ماری (یعنی استقرار حمل کے لئے)۔

(۵) ''روح منہ'' کے معنی ہیں: ''مِنْ خَلْقِ اللّٰہِ'' یعنی اللہ کی مخلوقات میں ایک ذی شان مخلوق۔

(۶) ''روح'' کے معنی ''رحمۃ'' کے بھی ہیں، یعنی عیسیٰ اپنے پیروکاروں کے لئے اللہ کی رحمت تھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ یعنی اللہ نے اپنی رحمت سے ان کی تائید فرمائی۔

حضرت مریم کا منفرد اعزاز

یوں تو نبی کریم ﷺ نے حضرت مریم کو تاریخ انسانیت کی چند عظیم خواتین میں شمار کیا ہے، جیسے حضرت آسیہ زوجہ فرعون، حضرت ہاجرہ، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، لیکن اس لحاظ سے حضرت مریم کا یہ منفرد اعزاز ہے کہ وہ واحد خاتون ہیں جن کا نام قرآن میں ذکر کیا گیا اور وہ بھی تقریباً ۳۴ مرتبہ۔

عقیدۂ تثلیث سے ممانعت

اس آیۂ مبارکہ میں نصاریٰ کا ''عقیدۂ تثلیث'' (Trinity) کہلاتا ہے۔ یعنی اللہ (مقدس باپ)، عیسیٰ (مقدس بیٹا) اور روح القدس۔ اس آیت میں ''تین خداؤں'' کے عقیدے سے منع فرمایا اور دوسرے مقام پر فرمایا: ''کہ نصاریٰ اللہ کو تین میں سے ایک مانتے ہیں۔''

عیسائی ''عقیدہ تثلیث'' میں ہمیشہ تردد و تذبذب کا شکار رہے اور کبھی اس کی کوئی قابل قبول تاویل و توجیہ پیش نہ کر سکے، نہ وہ توحید کا صراحتاً انکار کر سکے اور نہ تثلیث کا اثبات، کبھی اسے ''متشابہات'' میں سے قرار دیا اور کبھی ''توحید در تثلیث'' کا دعویٰ کیا، یعنی بیک وقت ''توحید'' بھی ہے اور ''تثلیث'' بھی، علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ ''رفع عیسیٰ'' کے بعد تقریباً اسی برس تک نصاریٰ دین اسلام، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصل عقائد پر قائم رہے،

پھر ایک یہودی ''پولس'' نے نصرانیت کا روپ دھار لیا اور اپنے تین شاگردوں نسطورا، ملک اور یعقوب کو الگ الگ نظریات کا داعی بنا کر عیسائیت کو کئی فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ المائدہ میں اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے بغض وعداوت کے شعلے بھڑکا دیئے۔''

عقیدۂ تثلیث کی تاویلات وتوجیہات

نصاریٰ کہتے ہیں کہ ''الوہیت'' تو ایک حقیقت واحدہ جوہر قائم بالذات ہے لیکن اس کے تین ''اقنوم'' ہیں، ''اقنوم'' کے معنی ہیں ''شخص، اصلی'' انہیں ''اقانیم ثلثہ'' کہا جاتا ہے، گویا انہیں الوہیت یا صفات الوہیت کے تین مظاہر کہہ لیجئے۔ ان کے بقول، الوہیت کی تین صفات ہیں:

(۱) صفت الوجود: عیسائی صفت وجود کو ''اب'' یا ''مقدس باپ'' سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ مظہر اول یا ''اقنوم اول'' ہے۔

(۲) صفت الحیاۃ: عیسائی صفت حیات کو ''روح'' یا ''روح القدس'' سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ مظہر ثانی یا اقنوم ثانی ہے۔

(۳) صفت العلم: عیسائی صفت علم کو ''ابن'' یا ''کلمہ'' یا ''مقدس فرزند'' سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ مظہر ثالث یا ''اقنوم ثالث'' ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''کلمہ'' جسد مسیح میں اس طرح حلول کر گیا جیسے شراب پانی میں تحلیل ہو کر ''جسد واحد'' بن جاتا ہے۔

بہر کیف یہ ایک بھول بھلیاں یا چیستان ہے جس پر جب خود ان کا ضمیر اور عقل مضطرب ہوتے ہیں تو اسے ''متشابہات'' میں سے قرار دے دیتے ہیں، حالانکہ ایمان اور عقیدہ تو قطعی، حتمی اور یقینی نظریات کا نام ہوتا ہے۔ متشابہات سے مراد ایسے الفاظ، کلمات یا کلام جس کے قطعی معنی اور مراد معلوم نہ ہو۔

اللہ، وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے

قرآن نے نصاریٰ کو متنبہ کیا کہ ان فاسد اور باطل نظریات سے باز آجاؤ۔ اسی میں

تمہاری فلاح ہے۔ اللہ ہی صرف ایک ''الٰہ'' ہے، وہ بیٹے یا بیوی کی نسبت سے پاک، منزہ، اور بلند تر ہے، ساری کائنات اس کی ملک ہے۔

لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓىٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یَسْتَكْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ یَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَیُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ۬ وَّ لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ﴿۱۷۳﴾

''مسیح اللہ کا بندہ ہونے کو ہرگز عار نہیں سمجھتے اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس بات کو) عار سمجھتے ہیں، اور جو شخص اللہ کا بندہ ہونے کو باعث ننگ و عار سمجھے اور تکبر کرے تو عنقریب وہ (اللہ) ایسے سب لوگوں کو اپنے ہاں جمع کرے گا۔ تو جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے تو اللہ ان کو پورا پورا اجر عطا فرمائے گا اور اپنے فضل سے زیادہ بھی عطا فرمائے گا، لیکن وہ لوگ جنہوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا تو اللہ انہیں دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں پائیں گے''۔

مشکل الفاظ کے معانی

لَنْ	ہرگز عار نہیں سمجھے گا	نَكَفَ	ناک بھوں چڑھانا
یَّسْتَنْكِفَ		یَنْكِفُ	
الْمُقَرَّبُوْنَ	مقرب کی جمع جسے قرب دیا گیا ہو	یَسْتَكْبِرْ	تکبر کرے گا
سَیَحْشُرُهُمْ	عنقریب انہیں جمع کرے گا		

تفسیر

شان نزول

نصاریٰ نجران کا وفد جب رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ آپ

ہمارے صاحب کے عیوب کیوں بیان کرتے ہیں، آپ نے پوچھا: تمہارا صاحب کون ہے؟ انہوں نے کہا: عیسیٰ، ان کا اشارہ اس جانب تھا کہ وہ تو (معاذ اللہ) الٰہ ہیں اور آپ انہیں ''عبداللہ'' کہتے ہیں، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اللہ کی بندگی عار نہیں اعزاز ہے

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی ''بندگی'' عار نہیں ہے، نہ اسے مسیح عیسیٰ علیہ السلام اپنے لئے عار سمجھتے ہیں اور نہ ہی مقرب فرشتے۔ مقرب فرشتوں کو ''کروبین'' کہا جاتا ہے جو عرش الٰہی کے اردگرد رہتے ہیں اور ہمیشہ تسبیح وتحمید باری تعالیٰ میں مشغول رہتے ہیں۔ انسانی رفعت وجلالت کا اعلیٰ ترین مقام وہ ہے جس پر خاتم النبیین سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ شب معراج کو فائز ہوئے یا قیامت میں ''مقام محمود'' ہے جس پر آپ فائز ہوں گے، لیکن اس کے باوجود قرآن نے ہمہ صفت موصوف حبیب رب العالمین کے سفر معراج کا ذکر صفت ''عبدیت'' کے ساتھ کرتے ہوئے فرمایا:

''پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندۂ خاص کو رات کے تھوڑے سے وقت میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔''

اور جب آپ ''مقام حضوری رب العالمین'' پر فائز ہوئے تو اللہ جل شانہٗ نے فرمایا:

اے حبیب! آج میں آپ کو کس اعزاز سے مشرف کروں؟ تو آپ نے فرمایا: اپنی نسبت عبودیت کے ساتھ۔ بندے کی ذاتی صفات صرف ''عبودیت'' و ''عبدیت'' ہے باقی تمام صفات مجازی ہیں۔

آیت نمبر ۱۷۳ میں صالحین اہل ایمان کے لئے اجر کامل کا وعدہ، بلکہ ان کے استحقاق سے بڑھ کر فضل واحسان کا وعدہ ہے اور متکبرین کے لئے ''عذاب الیم'' کی وعید ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ﴿١٧٤﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿١٧٥﴾

''اے لوگو! بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے مستحکم دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک نور درخشاں نازل کیا۔ تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے اس (کے دامن رحمت) کو مضبوطی سے تھام لیا تو عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت اور فضل میں داخل فرمائے گا اور انہیں اپنی طرف (پہنچانے والی) سیدھی راہ دکھائے گا''۔

مشکل الفاظ کے معانی

بُرْهَانٌ	دلیل، حجت	نُوْرًا مُّبِیْنًا	روشن کرنے والا نور

تفسیر

برہان اور نور مبین

اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو چیزوں کی آمد کا تذکرہ ہے۔ (۱) برہان (۲) نور مبین، مفسرین کرام کا اس پر تقریباً اجماع ہے کہ نور مبین سے قرآن مراد ہے اور برہان سے صاحب قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات مراد ہے۔ گزشتہ آیات میں باطل فرقوں کا ذکر اور رد ہوتا چلا آیا ہے، یعنی مشرکین، منافقین، کفار، یہود اور نصاریٰ۔ آیت نمبر ۱۶۵ میں نظام رسالت کے قیام کا مقصد عظیم یہ بتایا کہ اللہ کی طرف سے بندوں پر حجت قائم کرنا ہے تاکہ کسی کے لئے بدی اور گمراہی پر قائم رہنے کا کوئی عقلی جواز باقی نہ رہے۔ اور جو خوش نصیب اللہ تعالیٰ کی رضا کو اپنی زندگی کا مدعا و مقصود بنالیں، ان کے لئے ہدایت کا کافی وشافی نظام موجود ہو۔

چنانچہ اس آیہ مبارکہ میں اسی حجت کی بعثت کا تذکرہ ہے۔ ''برہان'' کے معنی ہیں ''دلیل'' اور ''حجتِ قاطع'' حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی بذات خود اللہ کی ایک ''برہان'' ''حجتِ قطعی'' اور ''معجزہ'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قریش مکہ نے دلیل نبوت کے طور پر آپ سے معجزہ کو طلب کیا تو آپ نے اپنی ذات کو دلیل حق کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''میں نے اس سے پہلے تمہارے درمیان اپنی عمر عزیز کے (چالیس برس) گزارے ہیں۔

کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔" (سورہ یونس: آیت نمبر ۱۶)۔ آپ نے اپنی بے داغ زندگی، بے عیب کردار، بے مثال امانت، دیانت، صداقت، عدالت، اور شجاعت واستقامت کو معجزے کے طور پر پیش کیا۔ اور چونکہ آپ کی شریعت اور رسالت ونبوت قیامت تک جاری وساری رہے گی، اس لئے "قرآن" کی صورت میں آپ کو تاابد قائم رہنے والا معجزہ عطا فرمایا۔

يَسْتَفْتُونَكَ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ۚ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِن لَّمْ يَكُن لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۗ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَن تَضِلُّوا ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٧٦﴾

"(اے حبیب!) آپ سے حکم پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے اللہ تمہیں کلالہ (کی میراث) کے بارے میں حکم دیتا ہے، اگر کوئی ایسا مرد فوت ہو جائے جس کی کوئی اولاد نہ ہو (اور نہ ماں باپ) اور اس کی طرف ایک بہن ہو (حقیقی یا علاتی) تو اسے کل ترکے کا نصف ملے گا اور وہ (بھائی) اس کا وارث ہوگا۔ اگر اس (بہن) کی کوئی اولاد نہ ہو، اور اگر بہنیں دو ہوں (زیا دو سے زیادہ) تو انہیں کل ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا اور اگر (کلالہ کے) وارث بہن بھائی یعنی مرد بھی ہوں اور عورتیں بھی تو ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنے احکام) کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"۔

تفسیر

آخری آیت

علامہ محمود آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ "ترتیب نزول" کے اعتبار سے قرآن کی آخری "مکمل سورت" "سورۃ البراءۃ" ہے اور احکام کے اعتبار سے آخری

آیت ''سورۃ النسآء'' کی یہ آخری آیۂ مبارکہ ہے، یعنی یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی ''آیت الاحکام ہے''۔

آیت الصیف

اس آیت میں ''کلالہ'' کی میراث کا بیان ہے، اور اس سے پہلے آیت نمبر ۱۲ میں بھی ''کلالہ'' کی میراث کا بیان آچکا ہے اور وہاں اس کی مفصل تشریح کی جاچکی ہے، وہ آیت چونکہ سردیوں کے ایام میں نازل ہوئی تھی اس لئے اسے ''آیت الشتآء'' کہتے ہیں اور یہ گرمیوں کے دنوں میں اتری، اس لئے اسے ''آیت الصیف'' کہتے ہیں۔

تکرار احکام کی حکمت

قرآن کا یہ اسلوب ہے کہ ایک ہی مسئلہ اور حکم کئی جگہ بیان ہوا ہے، اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ بار بار نازل کر کے اس کی اہمیت کو جتلانا اور تاکید درتاکید مقصود ہوتی ہے تا کہ اہل ایمان اس سے غافل نہ ہو جائیں اور دوسرا یہ کہ بعض احکام کے نزول میں تدریجی حکمت کارفرما تھی جیسے ''حرمت شراب'' کا حکم تین بار نازل ہوا اور آخری بار اس کی قطعی حرمت کا حکم آیا۔ حضرت عمر سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ میں نے سب سے زیادہ جس مسئلے کی بابت حضور سے دریافت کیا وہ ''مسئلہ کلالہ'' ہے، یہاں تک کہ آپ نے اپنی انگشت مبارک میرے سینے پر چبھوتے ہوئے فرمایا کہ: ''تمہارے لئے سورۃ النسآء کی آخری آیۂ مبارکہ (آیت الصیف) کافی ہے۔''

سورۃ النسآء کی ابتداء واختتام

امام رازی نے لکھا ہے کہ ''سورۃ النسآء'' کی ابتداء میں بھی احکام شرعیہ اور احکام اموال کا بیان ہے اور انتہا بھی اس پر ہوئی ہے اور ''درمیانِ سورت'' میں باطل فرقوں کا رد اور دیگر احکام ومسائل ہیں۔

اخت سے مراد

تمام مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ آیت میں ''اخت'' (بہن) سے مراد حقیقی یا علاتی

(باپ شریک) بہن ہے صرف ماں شریک بہن (اخیافی) یہاں مراد نہیں ہے۔

کلالہ کی میراث

آیت میراث یعنی آیت نمبر ۱۲ میں ''کلالہ'' کی میراث کا حکم آچکا ہے، لیکن وہاں جو صورت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے وارثوں میں اخیافی (یعنی صرف ماں شریک) بہن بھائی ہوں۔ اس آخری آیت میں وارثت کلالہ کی اس صورت کا بیان ہے کہ اس کے وارث حقیقی یا علاتی (باپ شریک) بہن بھائی ہوں۔ کلالہ کی تعریف آیت نمبر ۱۲ کی تفسیر کے تحت تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے، یعنی وفات پانے والا ایسا مرد یا عورت جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور نہ ہی اس کے والدین زندہ ہوں۔ اس کی وراثت کا حکم حسب ذیل ہے:

(۱) ''کلالہ'' (مرد یا عورت) جس کی وارث صرف ایک حقیقی یا علاتی بہن ہے، تو اسے فوت شدہ بھائی یا بہن (یعنی کلالہ) کے ترکے کا نصف ملے گا۔ بقیہ نصف اگر عصبہ وارث ہیں تو ان کو مل جائے گا، ورنہ باقی نصف بھی اسی بہن کو مل جائے گا۔

(۲) ''کلالہ'' (مرد یا عورت) جس کا وارث صرف ایک حقیقی یا علاتی بھائی ہے، تو وہ اس کے تمام ترکے کا وارث ہوگا۔

(۳) کلالہ (مرد یا عورت) جس کے وارث دو یا دو سے زیادہ حقیقی یا علاتی بہنیں ہیں، تو ان کو دو تہائی ترکہ ملے گا۔

(۴) ''کلالہ'' (مرد یا عورت) جس کے وارث دو یا دو سے زائد حقیقی یا علاتی بھائی بہن ہیں، تو ان بھائی بہنوں میں تمام ترکہ ایک اور دو کی نسبت سے تقسیم ہوگا، یعنی ہر بھائی کو بہن سے دگنا ملے گا۔

خوشخبری

مشہور و معروف محدث و مفسر حافظ عماد الدین ابوالفداء ابن کثیرؒ کا عظیم شاہکار

تفسیر ابن کثیر

جس کا جدید اور مکمل اردو ترجمہ ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف نے اپنے نامور فضلاء علامہ محمد اکرم الازہری، علامہ محمد سعید الازہری، علامہ محمد الطاف حسین الازہری سے اپنی نگرانی میں کروایا ہے۔

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

[illegible] عبدالرحمن کی زیورِ طبع سے آراستہ مؤثر تصنیف

تفہیم المسائل

قرآن و حدیث کی روشنی میں

فقہی مسائل کا مؤثر انداز میں نچوڑ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا

"اے نبی! اِن (مومنوں) کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر اُن کے ظاہر و باطن کو پاک صاف کیجیے"، (التوبہ: ۱۰۳)

زکوٰۃ

معنی و مفہوم، اہمیت، فضائل و مسائل

پروفیسر مفتی مُنیب الرحمن

مکتبہ نعیمیہ
دار العلوم نعیمیہ بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا

"اے نبی! اِن (مومنوں) کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر اُن کے ظاہر و باطن کو پاک صاف کیجئے"۔ (التوبہ: ۱۰۳)

زکوٰۃ

معنی و مفہوم، اہمیت، فضائل و مسائل

پروفیسر مفتی مُنیب الرّحمٰن

مکتبہ نعیمیہ

دار العلوم نعیمیہ بلاک 15 فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی

نام کتاب	:	زکوٰۃ معنی ومفہوم، فضائل ومسائل
مصنف	:	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن چیرمین مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی پاکستان صدر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان
کمپوزنگ	:	مولانا یاسر رحمٰن
اشاعتِ اول	:	1100
قیمت	:	200 روپے
پرنٹنگ	:	الشفیع پرنٹرز (پاکستان چوک، کراچی)

پبلشر

مکتبہ نعیمیہ

دارالعلوم نعیمیہ بلاک 15 فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی

021-36314508 - 36324236

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
12	**زکوٰۃ کی حکمت**	1
12	اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے نزدیک مال کی حیثیت	2
14	کنز کا معنی	3
15	شرعی اعتبار سے مال کی تعریف	4
15	فقہ حنفی میں مال کی تعریف	5
16	مال پر زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط	6
17	جان و مال کے حقِ ملکیت کے بارے میں تصورِ اسلام	7
19	اسراف وتبذیر کی تعریف اور حکم	8
25	اللہ تعالیٰ کا خاص کرم	9
26	آخرت کی فکر کرو	10
28	زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لئے قرآن وحدیث میں شدید وعید	11
30	جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ ہلاک ہو جاتا ہے	12
30	مال اپنا ہے یا وارثوں کا؟	13
33	زکوٰۃ کی فرضیت	14
35	مکی زندگی میں صدقات کی ترغیب اور مدنی زندگی میں زکوٰۃ کی فرضیت	15
37	زکوٰۃ کا معنی ومفہوم	16
38	زکوٰۃ ناداروں کا حق ہے، اُن پر احسان نہیں	17
39	صدقہ کا مفہوم	18
41	عوام کے نزدیک صدقات کا مفہوم	19

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
20	زکوٰۃ ایک عبادت ہے	42
21	انفاق فی سبیل اللہ کو قرض حسن سے تعبیر کرنے کی حکمت	42
22	وجوبِ زکوٰۃ	43
23	حَولانِ حَول کا مفہوم	43
24	سال سے مراد قمری سال ہے	45
25	زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے وقت کا اعتبار	45
26	نصابِ زکوٰۃ	46
27	محض رقم الگ کر دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی	47
28	دورانِ سال زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی	48
29	سال کے اختتام پر صاحبِ نصاب نہ رہے تو؟	48
30	اموالِ تجارت پر زکوٰۃ	48
31	مال کی قیمت کا تعین (Valution)	49
32	صنعت کاروں کی تشخیص	49
33	صنعتی و کاروباری مقصد میں استعمال ہونے والی اشیاء کی زکوٰۃ کا حکم	49
34	قرض سے متعلق زکوٰۃ کے احکام	50
35	قرض (دَین) کی اقسام	50
36	بقدرِ نصاب مقروض پر زکوٰۃ نہیں	53
37	وجوبِ زکوٰۃ سے مانع قرض کی مختلف شکلیں	53
38	بیوی کا مہر زکوٰۃ واجب ہونے سے مانع نہیں	53

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
39	طویل المیعاد قرضوں کا مسئلہ	55
40	گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ قرض ہے	56
41	تشخیصِ زکوٰۃ کے وقت واجب الادا قرض کا مسئلہ	56
42	قرض کی زکوٰۃ کس کے ذمے ہے؟	56
43	پھنسے ہوئے اور ڈوبے ہوئے قرض کی زکوٰۃ	58
44	پھنسا ہوا یا ڈوبا ہوا قرض زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہوتا	60
45	رہن رکھے ہوئے مال پر زکوٰۃ نہیں	60
46	بطور زرِ ضمانت جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں	60
47	تعلیمی اداروں میں بطور سیکورٹی رقم کی زکوٰۃ	61
48	بطور بیعانہ دی گئی رقم پر زکوٰۃ	61
49	پگڑی کے طور پر دی ہوئی رقم کی زکوٰۃ	61
50	شیئرز پر زکوٰۃ کا مسئلہ	61
51	پرائز بانڈز پر زکوٰۃ	62
52	مکانات، دکانوں، فلیٹوں اور پلاٹوں پر زکوٰۃ	62
53	استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ	63
54	قیمتی ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ	63
55	بچوں کی شادی کے لئے مختص زیورات پر زکوٰۃ	65
56	نابالغ اولاد کے لئے مختص مال وزیورات پر زکوٰۃ	66
57	حج کے لئے جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ	66

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
58	حرفت میں استعمال ہونے والی اشیاء پر زکوٰۃ	67
59	پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ	67
60	جی پی فنڈ میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ:	68
61	**عُشر کا بیان**	72
62	عُشر کا مفہوم	72
63	عُشر کے وجوب میں دیگر ائمہ کا نظریہ	72
64	امام اعظم ابوحنیفہ کا نظریہ	73
65	پاکستان کی زمینیں عُشری ہیں	74
66	بارانی زمین	74
67	غیر بارانی زمین	75
68	عُشر ادا کرنے سے پہلے پیداوار کا استعمال	75
69	عُشر اصل پیداوار پر مصارف وضع کئے بغیر ادا کیا جائے گا	76
70	مصارفِ پیداوار کے حوالے سے اہلِ فتویٰ کے لئے قابلِ غور مسئلہ	77
71	علامہ ابوبکر محمد عبداللہ ابن عربی کا موقف	78
72	مزارعت یا بٹائی (Sharecroping) کی زمین کا عُشر	79
73	جن چیزوں میں عُشر واجب ہے؟	81
74	جن صورتوں میں عُشر ساقط ہو جاتا ہے	83
75	عُشر پیداوار میں واجب ہوتا ہے	84
76	زمین ٹھیکے پر دی تو عُشر کس پر واجب ہے؟	84

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
85	زمین بٹائی پر دی تو عشر کس پر واجب ہوگا؟	77
86	جانوروں کی زکوٰۃ کا بیان	78
86	سائمہ جانور کیا ہیں؟	79
88	جانوروں کی زکوٰۃ کا جدول	80
89	کن جانوروں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے	81
90	**مصارف زکوٰۃ**	82
90	صدقاتِ واجبہ کا مصرف صرف مسلمان ہیں	83
91	قرآن مجید میں مصارفِ زکوٰۃ کی تفصیل	84
92	فقیر و مسکین کا مصداق	85
93	عاملینِ زکوٰۃ کا مصداق	86
96	مُؤَلَّفَۃُ القلوب کا مصداق	87
98	فی الرقاب کا مصداق	88
100	غارمین کا مصداق	89
104	فی سبیل اللہ کا مصداق	90
110	ابن السبیل کا مصداق	91
110	زکوٰۃ میں تملیک	92
111	پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کے سوالات	93
113	انجمن ارائیاں پاکستان کراچی سندھ کے سوالات	94
114	قرآن وحدیث میں تملیک کے صریح قرائن	95
123	ادائیگی زکوٰۃ کے حوالے سے دینی مدارس/دارلکفالت کے مہتمم کی حیثیت	96
127	کیا رفاہی ادارہ عامل کے حکم میں ہوکر زکوٰۃ اکھٹا کر سکتا ہے	97
132	جامعہ عثمانیہ پشاور کی رائے اور اس پر ایک شبہ	98

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
136	سید اور ہاشمی کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی	96
138	مدارس تعلیم القرآن	97
139	کمیونٹیز اور برادریوں کے رفاہی فنڈ	98
139	لنگر عام پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کا مسئلہ	99
140	مساجد کی تعمیر و مصارف پر زکوٰۃ خرچ کرنا	100
141	ہسپتالوں میں زکوٰۃ سے نادار مریضوں کا علاج	101
141	جامعات کے مستحق طلبہ کی اعانت	102
142	زکوٰۃ فنڈ سے قرض حسن	103
142	زکوٰۃ فنڈ کا انویسٹمنٹ	104
143	اپنے اصول وفروع کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا	105
143	زکوٰۃ کی رقم سے دینی تبلیغی لٹریچر کی اشاعت	106
143	ہر فرد جواب دِہ ہے	107
144	زکوٰۃ کی شرح اور حکمتِ زکوٰۃ	108
144	مستحق زکوٰۃ کو ہبہ یا قرض کہہ کر زکوٰۃ ادا کرنا	109
145	زکوٰۃ کے مختلف مسائل اور اُن کا حل	110
145	بیوی کا مہر زکوٰۃ واجب ہونے سے مانع نہیں	111
145	ترکے کی تقسیم سے پہلے کی مدت پر زکوٰۃ کا حکم	112
147	زکوٰۃ کی رقم مصارفِ مسجد میں استعمال نہیں کی جاسکتی	113
148	زکوٰۃ محض وکیل کو دینے سے ادا نہیں ہوتی	114
149	زکوٰۃ کے چند مسائل	115
152	زکوٰۃ وفطرہ کی جبری وصولی	116
156	زکوٰۃ کی رقم سے قرض کی ادائیگی	117

فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحہ نمبر
115	زکوٰۃ کی رقم سے نادار کے قرض کی ادائی / زکوٰۃ کی رقم ہبہ یا قرض کہہ کر دینا	157
116	ادھار کی رقم سے زکوٰۃ کی ادائیگی	158
117	اسپتال کے لئے زکوٰۃ کی رقم سے آلاتِ طب کی خریداری	158
118	زکوٰۃ کی رقم سے مقامی بچوں کے لئے تعلیم القرآن کا مدرسہ چلانا	159
119	زکوٰۃ کی رقم سے ڈائیلیسس مشین کی خریداری	160
120	مسئلہ زکوٰۃ	162
121	مقدارِ نصاب پر زکوٰۃ بہر صورت واجب ہے	162
122	زکوٰۃ کے مصارف اور اُن میں خرد بُرد	164
123	زکوٰۃ اور کمیونٹی فنڈز	166
124	زکوٰۃ فنڈ سے پگڑی پر مکان لینے کے لئے مدد کرنا	167
125	پینشن بینیفٹ اکاؤنٹ کی رقم پر زکوٰۃ	168
126	صدقۂ فطر	169
127	صدقۂ فطر کی مقدار	171
128	صدقۂ فطر کس پر واجب ہے	173
129	اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے	173
130	مرد پر بیوی اور بالغ اولاد کا صدقۂ فطر ادا کرنا واجب نہیں ہے	174
131	صدقۂ فطر کس پر واجب ہے	175
132	صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جا سکتا ہے	175
133	نمازِ عید کا طریقہ	176
134	اہلِ خیر سے اپیل	177
135	اشاریہ برائے یادداشت	179

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العٰلمین و الصلوٰۃ و السلام علیٰ سیدالمرسلین

سیدنا محمد وّعلیٰ الہٖ و صحبہٖ اجمعین

ابتدائے نگارش

زکوٰۃ کے موضوع پر اردو میں ایک جامع کتاب کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جارہی تھی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری کتبِ فتاویٰ ہر موضوع پر نہایت جامع ہیں اور ہم اُس علمی ذخیرے میں کسی اضافے کا دعویٰ نہیں کررہے، بلکہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے، انہی اکابر کی خوشہ چینی ہے۔اگر کہیں کوئی کمی یا ابہام رہ گیا ہو،تو آپ اُسے ہماری کوتاہ فہمی اور مطالعے کی کمی پر محمول کرسکتے ہیں یا فروگزاشت قرار دے سکتے ہیں۔

جو مسئلہ ہمیشہ درپیش رہتا ہے، وہ نئے پیش آنے والے مسائل کی متفقہ و مسلّمہ اصولوں اور جزئیات (Constituents) پر تطبیق (Application) ہے اور یہ ہمیشہ ایک جاری رہنے والا عمل ہے۔

اسی لئے ہم نے اباحتِ کلی کے نظریئے کے حامل دانشوروں کے اس الزام کا ہمیشہ رد کیا ہے کہ اجتہاد کا سلسلہ موقوف ہوگیا ہے، فقہِ اسلامی پر صدیوں سے جمود (Deadlock) طاری ہے، علماء لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں، انہیں اپنے عہد کے لُمس، عصرِ حاضر کے تقاضوں اور سیاق و سباق (Context) کا صحیح ادراک ہی نہیں ہے۔ ہماری نظر میں عدالتِ عالیہ یا عدالتِ عظمیٰ کا ہر فیصلہ (Judgment) ایک اجتہاد ہوتا ہے۔اُن کے اجتہاد کا ماخذ دستور، قانون اور عدالتی نظائر (Judicial Precedents) ہوتے ہیں، کبھی آئین و قانون کی نئی تعبیرات (Interpretations) و تشریحات کرنی پڑتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے مآخذ کتاب و سنت، اجماعِ امت، آثارِ صحابہ و تابعین، اجتہاداتِ ائمۂ مذاہب، مجتہدین فی المذہب اور اصحابِ ترجیح کے اقوال ہوتے ہیں۔ ان کے دائرے میں رہتے ہوئے ہم مسائلِ جدیدہ کا حل تلاش کرتے ہیں، اِس میں ہماری رائے صَواب (Right,Correct) بھی ہوسکتی ہے اور خطا کا احتمال بھی رہتا ہے۔اس لئے ہمیں ہمیشہ اپنے عہد کے بڑے فقہاءِ کرام اور اہلِ فتویٰ کی رہنمائی کی ضرورت رہتی ہے، اُن کی مخلصانہ اور ناقدانہ گرفت بھی ہمارے لئے حق و صَواب کو پانے کا وسیلہ اور ذریعہ بن سکتی ہے۔ میں نے اس کتاب کے مُسَوّدہ (Draft) کو مُبَیَّضَہ (Fair Copy, Final Draft) کے مرحلے تک پہنچنے سے پہلے اپنے ثقہ مفتیانِ کرام مفتی محمد وسیم اختر المدنی صاحب،

مفتی خالد کمال صاحب، مفتی احمد علی سعیدی صاحب اور مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی صاحب زید مجدہم کو بھی نظرِ ثانی کے لئے پیش کیا اور اُن کے مشوروں اور اصلاحی نِکات سے استفادہ کیا ۔ میرے معاون مفتی عبد الرزاق نقشبندی کی خدمات میرے ہر کام میں شامل رہتی ہیں ۔ بعض مسائل پر ہمیں عہدِ حاضر کے فقہاءِ کرام کی تائیدی یا راجح دلائل پر مبنی اختلافی آراء کا انتظار ہے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں، جو ایک ماہ کے بعد ہی متوقع ہے، ان مسائل کو زیادہ بہتر یا متفقہ حیثیت میں پیش کیا جا سکے۔ میری عاجزانہ دعا ہے اللہ جل شانہٗ اپنے حبیبِ کریم رحمۃ للعٰلمین ﷺ کے طفیل میری اس عاجزانہ کاوش کو اپنی بارگاہ میں مقبول و ماجور فرمائے اور میرے ، میرے والدینِ کریمین اور اساتذۂ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے۔

خوشہ چینِ اہلِ علم

منیب الرحمٰن عفا اللہ تعالیٰ عنہ

زکوٰۃ کی حکمت

توحید و رسالت کی شہادت اور نماز کے بعد زکوٰۃ اسلام کا تیسرا بنیادی رکن ہے۔ یہ خالص مالی عبادت ہے جو تمام اَنبیائے کرام اور رُسُلِ عِظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شریعتوں کا لازمی جزو رہی ہے۔ جس طرح انسان کو جسمانی اَمراض اور عوارِض لاحق ہوتے ہیں، اسی طرح رُوحانی اور اَخلاقی اَمراض بھی لاحق ہوتے ہیں۔ اِن میں سے بہت نمایاں اَخلاقی بیماری، مال کی محبت کا غلبہ اور اس میں بے حد اضافے کی خواہش ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُO حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَO

ترجمہ: ''تمہیں زیادہ سے زیادہ مال (جمع کرنے) کی خواہش نے (آخرت سے) غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم قبروں میں پہنچ گئے، (التکاثر:۲۔۱)''۔

اس کے نتیجے میں انسان کے دل میں تکبر، حرص، بخل، ہوس اور خودغرضی جیسی حقیر صفات پیدا ہوتی ہیں۔ عربی میں مال کو مال کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اس کی طرف اِنسان کا دل بہت جلد مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے فرمایا: اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ط

ترجمہ: ''تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے آزمائش ہیں، (التغابن:۱۵)''۔

ان اخلاقی امراض کے ازالے کے لئے اللہ جل شانہٗ نے زکوٰۃ کی مالی عبادت فرض کی ہے، چنانچہ فرمایا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔

ترجمہ: ''(اے رسول مکرم ﷺ) آپ مومنوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) لیجیے تاکہ اس کے ذریعے آپ ان کے ظاہر و باطن کو (حرص اور بُخل سے) پاک کریں، (توبہ:۱۰۳)''۔

دوسرے مقام پر فرمایا: وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَىO الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰىO

ترجمہ: ''اور آتش دوزخ سے وہ نہایت متقی شخص دور رکھا جائے گا، جو اپنا مال اس لئے (اللہ کی راہ میں) دیتا ہے کہ (اس کا قلب) پاک ہو جائے، (اللیل:۱۷۔۱۸)''۔

اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے نزدیک مال کی حیثیت:

فطری طور پر اِنسان مال و دولت کا حریص واقع ہوا ہے اور مال حاصل کرنے کی دُھن میں سارا وقت مصروفِ عمل

رہتا ہے، نئے نئے منصوبے تیار کرتا ہے، ذرائع اور وسائل کی دستیابی کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ اس کے لئے بعض اوقات وہ شرعی اور اخلاقی حدود کو بھی پامال کر دیتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان میں دنیاوی زندگی کی ناپائیداری کا احساس دلانے اور آخرت کی فکر کے لئے اِنسانوں کی ذہن سازی پر توجہ دی گئی ہے۔

اِسلام دنیا اور متاعِ دنیا کی طرف رغبت کی نفی نہیں کرتا، کیونکہ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِO

ترجمہ: ''لوگوں کے لئے عورتوں (بیویوں)، بیٹوں، سونے اور چاندی کے خزانوں، نشان زدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتی باڑی کی خواہشات کی محبت کو (اُن کے دلوں میں) آراستہ کر دیا گیا ہے، یہ دنیا کی زندگی کا ساز و سامان ہے اور اللہ کے پاس بہترین ٹھکانا ہے، (آل عمران: 14)''۔

جب قرآن نازل ہو رہا تھا تو اُس وقت کے پسندیدہ مال و متاع میں اعلیٰ نسل کے گھوڑے، مویشی اور کھیتی باڑی بھی شامل تھی، اِس لئے اِن چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں ہر دور میں انسان کو محبوب رہی ہیں، البتہ ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق ترجیحات میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ اِس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دنیاوی نعمتوں کے مقابلے میں آخرت کی نعمتوں کو پسندیدہ قرار دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِO

ترجمہ: ''(اے رسول!) آپ کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں ان سب چیزوں سے بہتر چیز کے بارے میں نہ بتاؤں، جو اہلِ تقویٰ کے لئے اُن کے رب کے پاس (موجود) ہے، وہ ایسے باغات ہیں، جن کے نیچے ہمیشہ دریا جاری رہتے ہیں، اِن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور (اُن کے لئے) پاکیزہ بیویاں ہیں اور (سب سے بڑھ کر) اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے، (آل عمران: 15)''۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًاO

ترجمہ: ''مال اور بیٹے دنیاوی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے لئے بہتر ہیں اور (آخرت میں کامیابی) اُمید کے لئے بہت اچھی (الکھف: 46)''۔ اِس آیت میں بھی

اللہ تعالیٰ نے دنیاوی نعمتوں کے مقابل آخرت کی نعمتوں کو افضل فرمایا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں مال جمع کرنے کی مذمت فرمائی گئی ہے، یہ اُس مال کے بارے میں ہے، جس میں سے زکوٰۃ نہ دی جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُم بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَO

ترجمہ:''اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، تو (اے رسول!) آپ انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے، جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اُس سے اُن کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا، (اور اُن سے کہا جائے گا) یہ وہ مال ہے جسے تم نے اپنے لئے (بڑی چاہت سے) جمع کر رکھا تھا، تو (اب) اپنے ہی جمع کئے ہوئے مال کا مزہ چکھو، (توبہ 35-34)''۔

کنز کا معنی:

علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ کنز کا معنی ہے:''مال کو اوپر تلے رکھنا، مال جمع کر کے اُس کی حفاظت کرنا''، خزانے کو کنز کہتے ہیں۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مال جمع کرنے اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کی مذمت فرمائی ہے، (المفردات، جلد 2، ص 70)''۔

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قالَ:لَمَّا نَزَلَتْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃُ:﴿وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ﴾قَالَ: کَبُرَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ، فَقَالَ عُمَرُ رضی اللّٰہُ عَنْہُ:اَنَا اُفَرِّجُ عَنْکُمْ،فَانْطَلَقَ، فَقَالَ : یَانَبِیَّ اللّٰہِ! اِنَّہٗ کَبُرَ عَلٰی اَصْحَابِکَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃُ ،فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَفْرِضِ الزَّکَاۃَ اِلَّا لِیُطَیِّبَ مَابَقِیَ مِنْ اَمْوَالِکُمْ وَاِنَّمَا فَرَضَ الْمَوَارِیْثَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ بَعْدَکُمْ،

ترجمہ:''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب آیت نازل ہوئی:(وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ، التوبہ:34) تو مسلمانوں پر یہ آیت شاق گزری، حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: چلو میں تمہارے لئے اس معاملہ کو کشادہ کراتا ہوں، پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: اے اللہ کے نبی ﷺ! آپ کے اصحاب پر یہ آیت بہت شاق گزری ہے، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ

نے زکوۃ صرف اس لئے فرض کی ہے کہ تمہارا باقی مال پاکیزہ ہو جائے اور وراثت فرض کی ہے تا کہ مال تمہارے بعد والوں کے لئے ہو، (سُنن ابوداؤد: 1661)''۔

(۲) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: كُنْتُ أَلْبِسُ أَوْضَاحًا مِنْ ذَهَبٍ، فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ أَكَنْزٌ هُوَ؟، فَقَالَ: مَابَلَغَ أَنْ تُؤَدَّى زَكَاتُهُ فَزُكِّيَ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ۔

ترجمہ:'' حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں سونے کی پازیب پہنتی تھی، میں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! کیا یہ کنز (یعنی ایسا مال ہے جس پر آگ کے عذاب کی وعید ہے) ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: جو مال زکوۃ کی حد تک پہنچ گیا اور اس کی زکوۃ ادا کردی گئی، وہ کنز نہیں ہے، (سُنن ابو داؤد، رقم الحدیث: 1559)''۔

انسان حرص مال اور ہوس زَر میں مال جمع کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انتہائی حکمت سے انسان کو یہ باور کرایا کہ جو جمع کرے گا، حساب کتاب وہ دے گا اور اس مال پر عیش وعشرت دوسرے لوگ کریں گے۔

شرعی اعتبار سے مال کی تعریف:

ڈاکٹر وھبہ الزُحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ:''لغت میں مال ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جسے ذخیرہ کیا جا سکے اور انسان اُسے عملاً جمع کرے، خواہ وہ عین (Assets, Goods) ہو، جیسے سونا، چاندی، حیوان، نباتات وغیرہ یا اُس سے حاصل ہونے والی منفعت (Usufruct) یا بعض چیزوں کے منافع جیسے سوار ہونا یا رہائش وغیرہ۔ اور جس چیز کو انسان عملاً جمع نہ کر سکے وہ مال نہیں ہے، جیسے ہوا میں پرندہ، دریا میں مچھلی، دور دراز جنگلات میں درخت اور زمین میں پوشیدہ (Hiden) معدنیات (Minerals) وغیرہ''۔

فقہِ حنفی میں مال کی تعریف:

''جس چیز کو حاصل کرنا اور ذخیرہ کرنا اور اُس سے فائدہ اُٹھانا ممکن ہو''۔ اس تعریف کی رُو سے کسی چیز کے مال ہونے کے لئے دو اُمور ضروری ہیں:

(۱) اُس کا جمع کرنا اور ذخیرہ کرنا ممکن ہو۔ پس جن چیزوں کو ذخیرہ کرنا ممکن نہیں، وہ مال نہیں ہے، جیسے: اُمورِ معنویّہ مثلاً علم، صحت، شرف اور ذہانت وغیرہ یا جن پر کنٹرول ممکن نہ ہو، جیسے کھلی ہوا، سورج کی حرارت اور چاند

کی روشنی۔

(۲) اُس سے عادتاً نفع اُٹھانا ممکن ہو، پس جس چیز سے شریعت کی رُو سے نفع اُٹھانا اصلاً ممکن ہی نہ ہو، جیسے مُردار کا گوشت، زہریلا کھانا وغیرہ یا وہ نفع لوگوں کے نزدیک مُعتَدبہٖ (Countable) نہ ہو، جیسے گندم کے چند دانے، پانی کے چند قطرے یا مُٹھی بھر مٹی وغیرہ، خَمر اور خنزیر مسلمانوں کے نزدیک مال نہیں ہے"۔

مَجَلّۃُ الاحکام العَدَلِیَہ زیر مادہ:126 میں ہے: "مال وہ ہے جس کی طرف انسان کی طبیعت مائل ہو اور جسے حاجت کے لئے ذخیرہ کیا جا سکتا ہو، خواہ وہ مالِ منقول (Movable) ہو یا غیرِ منقول (Immovable)۔

اِس تعریف کو ناقص بھی قرار دیا گیا ہے، کیونکہ بعض چیزیں مال ہیں لیکن اُنہیں زیادہ دیر تک ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا جیسے سبزیاں۔ دیگر فقہاءِ کرام کے نزدیک ہر وہ چیز جو قیمت رکھتی ہو اور اُس کے تلَف کئے جانے پر ضمان لازم ہو، وہ مال ہے۔ یہ مال کی قانونی تعریف ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد04،ص7:7-2876 مُلَخَّصاً)"۔

مال پر زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط:

فقہاءِ کرام نے قرآن وسنت کی روشنی میں مال پر زکوٰۃ فرض ہونے کی شرائط کو بیان کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کس مال پر، کب زکوٰۃ فرض ہے؟۔

(۱) مالک کو مال پر مکمل قانونی ملکیت حاصل ہو یعنی مال اس کے قبضے میں ہو اور اُسے خرچ کرنے یا روکے رکھنے کا مکمل اختیار حاصل ہو۔

(۲) مال قابلِ افزائش (Increasing) ہو، یعنی اس مال میں اضافہ ہو رہا ہو یا اضافہ ہونے کی صلاحیت (Potential) رکھتا ہو۔

(۳) شریعت کی مقرر کی ہوئی کم از کم مقدار کے برابر یا اُس سے زیادہ ہو، اصطلاحِ فقہ میں اسے "نِصاب" (Quorum) کہتے ہیں۔

(۴) مالک کی بنیادی اور اصلی ضرورتوں سے زائد ہو۔ لباس، گھر کا ساز وسامان، مکان، سواری کی چیزیں، استعمال کا ہتھیار، عالم کے لئے ذاتی استعمال کی علمی کتابیں، پیشہ ورانہ آلات (جیسے ڈاکٹر کی سرجری کے آلات، ایکسرے والٹرا ساؤنڈ مشینیں، کارخانے یا ورکشاپس کی مشینیں جو زیرِ استعمال ہوں) وغیرہ۔

کسی کا گمشدہ مال کچھ سالوں کے بعد مل جائے یا سمندر میں گرا ہوا مال جو کچھ عرصے بعد مل جائے یا غصب شدہ

مال جس پر گواہ نہ ہوں، کچھ عرصے بعد مل جائے یا جنگل میں دفن کیا ہوا مال جس کی جگہ بھول گئی ہو اور کچھ عرصے بعد ملے یا کسی اجنبی کے پاس امانت کے طور پر رکھا ہوا مال، جس کے بارے میں یاد نہ رہے کہ کس کے پاس امانت رکھا ہے اور کچھ عرصے بعد مل جائے یا مقروض لوگوں کے پاس مال ہو جس کا وہ انکار کرتے ہوں اور دینے والے کے پاس گواہ نہ ہوں اور کچھ عرصے بعد اللہ کی تقدیر سے مل جائے یا کسی نے ظلماً مال لیا ہو اور کچھ برسوں کے بعد مل جائے، تو ان اموال پر گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ یہ اس عرصے میں اُس کے لئے مالِ نامی نہیں رہا۔ لیکن اگر کوئی انتہائی تنگ دست یا مُفلس (Insolvent,Bankrupt) ہے، یعنی جسے دیوالیہ قرار دے دیا گیا ہو، اُس سے کچھ سالوں کے بعد وہ مال مل جائے یا کوئی مقروض مُنکر ہے، لیکن اُس پر گواہ موجود ہیں، تو ایسا مال جب بھی ملے گا اُس پر گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ عائد ہوگی۔

قیمتی موتی اور ہیرے (Diamonds) جواہرات (Jewelery) جیسے یاقوت، زبرجد، فیروزہ اور مَرجان وغیرہ، جو تجارت کی غرض سے نہ ہوں بلکہ محض ذاتی استعمال کے لئے ہوں، تو اُن پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

(۵) مال کو مالک کی مکمل قانونی ملکیت میں پورا ایک قمری سال گزر جائے یا سال کے اول اور آخری حصے میں اس کے پاس کم از کم نصاب کے برابر مال موجود رہا ہو اور سال کے درمیان میں نصاب مکمل طور پر ختم نہ ہوا ہو، یاد رہے کہ مال کے ہر حصے پر سال گزرنا شرط نہیں ہے۔

جان و مال کے حقِ ملکیت کے بارے میں اسلام کا تصور:

اسلامی تعلیمات کی رُوح یہ ہے کہ انسان کی جان، مال حتّٰی کہ ساری کائنات کا مالکِ حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ انسان کے لئے اپنی تمام مملوکہ اشیاء (Owned Objects) پر ملکیت کا اطلاق مجازاً (Metaphor) ہے۔ انسان کو صرف ان پر تصرُّف (Athority To Dispose) کا اختیار ہے اور ان کے منافع (Usufruct) کو استعمال کرنے کا حق عطا کیا گیا ہے۔ لیکن تصرُّف کا یہ حق کچھ شرعی حدود و قیود (Terms & Conditions) کا پابند ہے، بندے کا یہ حق یا اختیار لامحدود نہیں ہے۔ اُس سے پوچھا جائے گا کہ اُس نے مال کن ذرائع سے کمایا، آیا اس کا مال کمانے کا طریقہ حلال تھا یا حرام؟۔ اسی طرح سے بندے کا مال خرچ کرنے کا اختیار بھی شریعت کا پابند ہے۔ مُباح اُمور میں اُسے خرچ کرنے کی اجازت ہے لیکن فضول خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَO

ترجمہ:" (اللہ کے دیئے ہوئے حلال مال میں سے ضرورت کے مطابق) کھاؤ اور پیو اور خرچ کرنے میں حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا، (الاعراف:31)"۔

اور حرام کاموں میں خرچ کرنا شریعت میں مطلقاً منع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًاO

ترجمہ:" بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کی نعمتوں کا انکار کرنے والا ہے، (بنی اسرائیل:27)"۔ یعنی کسبِ مال (To Earn Money) اور صَرفِ مال (TO Expend Money) دونوں اختیارات شریعت کے تابع ہیں۔ شریعت کے اِنہی اَحکام کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی جان کو تلف کرنے یعنی خودکشی (Suicide) کرنے کا حق نہیں رکھتا اور یہ فعل حرام ہے اور قیامت میں اِس کی سنگین سزا ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ قَتَلَ نَفْسَهٗ بِحَدِيْدَةٍ فَحَدِيْدَتُهٗ فِیْ يَدِهٖ يَتَوَجَّأُ بِهَا فِیْ بَطْنِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا، وَمَنْ شَرِبَ سَمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ يَتَحَسَّاهُ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا، وَمَنْ تَرَدّٰى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ يَتَرَدّٰى فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا۔

ترجمہ:" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی آہنی ہتھیار سے خودکشی کرے، تو (آخرت میں) وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ جہنم کی آگ میں (بطورِ سزا) عرصۂ دراز تک یہ ہتھیار اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا، اور جو شخص زہر پی کر خودکشی کرے گا، تو وہ جہنم میں عرصۂ دراز تک زہر پیتا رہے گا، اور جو شخص کسی پہاڑ (یا بلند و بالا عمارت یا مینار) سے گر کر خودکشی کرے گا تو وہ (اس عمل کی سزا کے طور پر) عرصۂ دراز تک جہنم (کے گہرے گڑھوں) میں گرتا رہے گا، (صحیح مسلم:296)"۔

(۲) صحیح مسلم میں ایک طویل حدیث میں ہے کہ حضرت طفیل بن عمرو دوسی اپنی قوم کے ایک شخص کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے، حضرت طفیل کا ساتھی بیمار ہو گیا اور جب بیماری قوت برداشت سے باہر ہو گئی تو اس نے ایک لمبے تیر کے پھل سے اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹ ڈالے، جس کی وجہ سے اُس کے دونوں ہاتھوں سے خون بہنے لگا

اور اسی سبب سے اُس کا انتقال ہوگیا۔ حضرت طفیل نے اُسے خواب میں اچھی حالت میں دیکھا، لیکن اُس نے اپنے دونوں ہاتھ لپیٹے ہوئے تھے، حضرت طفیل نے پوچھا:

مَا صَنَعَ بِكَ رَبُّكَ ؟، فَقَالَ: غَفَرَ لِيْ بِهِجْرَتِيْ اِلٰى نَبِيِّهِ ﷺ ،فَقَالَ: مَالِيْ اَرَاكَ مُغَطِّياً يَدَيْكَ؟، قَالَ: قِيْلَ لِيْ: لَنْ نُصْلِحَ مِنْكَ مَا اَفْسَدْتَ، فَقَصَّهَا الطُّفَيْلُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :اَللّٰهُمَّ وَلِيَدَيْهِ فَاغْفِرْ۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا ؟، اُس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کے سبب سے بخش دیا، حضرت طفیل نے پوچھا: ہاتھوں کو کیوں لپیٹے ہوئے ہو؟، اُنہوں نے کہا: ''مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ جس چیز کو تم نے خود بگاڑا ہے، ہم اُسے درست نہیں کریں گے''، حضرت طفیل نے یہ خواب رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا، خواب سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! اس کے ہاتھوں (کی خطا) کو بھی بخش دے''، (صحیح مسلم، کتاب الایمان، رقم الحدیث: 307)''۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌO

ترجمہ: ''اور اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا (حقیقی) وارث ہے اور اللہ تمہارے سب کاموں سے خوب باخبر ہے، (آل عمران: 180)''۔

(۲) وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔

ترجمہ: ''اور تمہیں کیا ہوا کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، حالانکہ آسمانوں اور زمین (اور جو کچھ ان میں ہے، سب کا حقیقی) وارث اللہ ہی ہے، (الحدید: 10)''۔

اسراف وتبذیر کی تعریف اور حکم:

شریعت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے استعمال کو جائز قرار دیا گیا، لیکن فضول اُمور جن کا نہ دینی فائدہ ہو اور نہ ہی دنیاوی کوئی فائدہ ہو، ان میں خرچ کو اسراف (بے جا خرچ) اور ناجائز کاموں میں خرچ کرنے کو تبذیر سے تعبیر کیا اور فرمایا:

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًاO اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ

ترجمہ: ''اور اِسراف اور فضول خرچ کرنے سے بچو، بے شک فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں،
(بنی اسرائیل: 27-26)''۔

بعض مُفسّرینِ کرام نے اِسراف اور تبذیر میں فرق کیا ہے۔ اسراف کسی فضول کام میں خرچ کرنے کو کہتے ہیں اور تبذیر ناجائز کام میں خرچ کرنے کو کہتے ہیں، خواہ اُس کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ عام معنیٰ کے اعتبار سے تبذیر اسراف کو بھی شامل ہے۔ نیک مَصرف پر خواہ کتنا ہی زیادہ مال خرچ کیا جائے، اُس پر اِسراف کا اِطلاق نہیں ہوتا، اسی لئے کہا جاتا ہے: ''لَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ''، یعنی خیر کے کاموں میں کوئی اِسراف نہیں۔

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ، عَنْ اَبِیْهِ، عَنْ جَدِّهٖ، قَالَ: جَاءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَسَاَلَهٗ عَنِ الْوُضُوْءِ فَاَرَاهُ ثَلَاثًا ثَلَاثًا، ثُمَّ قَالَ: هٰذَا الْوُضُوْءُ فَمَنْ زَادَ عَلٰی هٰذَا فَقَدْ اَسَاءَ اَوْ تَعَدّٰی اَوْ ظَلَمَ۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن شعیب اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک اعرابی آیا اور وضو کے بارے میں سوال کیا، پس آپ نے اُسے تین تین مرتبہ وضو کر کے دکھایا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: یہ وضو کا صحیح طریقہ ہے، پس جس نے اس سے زیادہ کیا، تو اُس نے برا کیا یا حد سے تجاوز کیا یا ظلم کیا، (سنن ابن ماجہ: 422)''۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک وہ امر جو فی نفسہٖ جائز ہے، اُس میں حدِ شرع سے تجاوز کرلیا جائے، تو یہ حدیثِ پاک کی رو سے اساءت اور تعدی ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز لکھتے ہیں:

اقول: اسراف کی تفسیر میں کلمات متعدد وجہ پر آئے:

(۱) غیر حق (یعنی ناجائز امور) میں صرف کرنا، (اس معنی میں) یہ تفسیر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی:

الفریابی و سعید بن منصور و ابو بکر ابی شیبة و البخاری فی الادب المفرد و ابناء جریر و المنذر و ابی حاتم و الطبرانی و الحاکم و صححه و البیهقی فی شعب الایمان و اللفظ لابن جریر کلهم عنه رضی اللّٰه تعالٰی عنه فی قوله تعالٰی و لا تبذر تبذیرا قال التبذیر فی غیر الحق و هو الاسراف۔

ترجمہ: فریابی، سعید بن منصور، ابوبکر بن ابی شیبہ اور بخاری نے ادب المفرد میں، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم،

ابو حاتم طبرانی، حاکم بافادہ تصحیح بیہقی نے شعب الایمان میں اور یہ لفظ ابن جریر کے ہیں۔ان تمام حضرات نے اللہ تعالیٰ کے قول ''وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا'' کی تفسیر میں فرمایا کہ تَبْذِیْر ناحق خرچ کو کہتے ہیں، یہی اسراف ہے۔(ت)
اور اسی کے قریب ہے وہ کہ تاج العروس میں بعض سے نقل کیا ''وَضْعُ الشَّیءِ فِیْ غَیْرِ مَوْضِعِہٖ''، یعنی بے جا خرچ کرنا۔ابن ابی حاتم نے امام مجاہد تلمیذ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھم سے روایت کی:
لَوْ اَنْفَقْتَ مِثْلَ اَبِیْ قُبَیْسٍ ذَھَبًا فِیْ طَاعَةِ اللّٰہِ لَمْ یَکُنْ اِسْرَافًا وَلَوْ اَنْفَقْتَ صَاعًا فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰہِ کَانَ اِسْرَافًا۔
ترجمہ:''اگر تو اللہ کی فرمانبرداری میں کوہ ابوقبیس کے برابر سونا خرچ کردے تو بھی اسراف نہ ہوگا،اور اگر تو ایک صاع بھی اللہ کی نافرمانی میں خرچ کرے تو اسراف ہوگا۔
کسی نے حاتم کی کثرت داد و دہش پر کہا:''لَا خَیْرَ فِیْ سَرَفٍ''،یعنی اسراف میں خیر نہیں۔اُس نے جواب دیا: لَا سَرَفَ فِیْ خَیْرٍ،یعنی کارِ خیر میں صرف کرنا (مقدار سے قطع نظر) اسراف نہیں ہے۔
اقول: حاتم کا مقصود تو خدا نہ تھا، نام تھا کَمَا نَصَّ عَلَیْہِ فِی الْحَدِیْثِ (جیسا کہ حدیث میں نص وارد ہے) تو اُس کی ساری داد و دہش اسراف ہی تھی، مگر سخائے خیر میں بھی شرع مطہر اعتدال کا حکم فرماتی ہے:
قَالَ اللّٰہُ: وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا○
ترجمہ:''فرمانِ الٰہی ہے اور تو اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ کر نہ رکھ،اور نہ اس کو پوری طرح کھول ورنہ تو ملامت زدہ حسرت زدہ ہو کر بیٹھ رہے گا۔(بنی اسرائیل:29)
وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا○
ترجمہ: اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں، تو نہ وہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں، اور ان کا خرچ کرنا میانہ روی پر ہوتا ہے۔(الفرقان:67)۔
آیۂ کریمہ وَاٰتُوْا حَقَّہٗ یَوْمَ حَصَادِہٖ وَلَا تُسْرِفُوْا (اور تم اس کا حق اس کی کٹائی کے دن ادا کرو اور اسراف نہ کرو) کی شان میں میں ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ معلوم و معروف رواھا ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابن جریج۔
اُدھر صحاح کی حدیث جلیل ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے تصدق کا حکم فرمایا: فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ خوش

ہوئے کہ اگر میں کبھی ابوبکر صدیق پر سبقت لے جاسکتا ہوں تو وہ یہی موقع ہے کہ میرے پاس مال بسیار ہے، اپنے جملہ اموال سے نصف حاضرِ خدمت اقدس لائے۔ حضور نے فرمایا: اہل وعیال کے لئے کیا رکھا؟۔ عرض کی اتنا ہی۔ اتنے میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر ہوئے اور کل مال حاضر لائے، گھر میں کچھ نہ چھوڑا۔ ارشاد ہوا: اہل وعیال کے لئے کیا رکھا؟۔ عرض کی: اللہ جل جلالہ اور اس کے رسولِ مکرم ﷺ۔ اس پر حضور پرنور ﷺ نے فرمایا: تم دونوں میں وہی فرق ہے جو تمہارے ان جوابوں میں۔

اور تحقیق یہ ہے کہ عام کے لئے وہی حکم میانہ روی ہے، اور صدق توکل وکمالِ تبتل (مخلوق سے لاتعلق ہوکر اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنا) والوں کی شان بڑی ہے۔

(۲) حکمِ الٰہی کی حد سے بڑھنا، یہ تفسیر ایاس بن معاویہ بن قرۃ تابعی بن تابعی بن صحابی کی ہے۔

روی ابن جریر وابو الشیخ عن سفیان بن حسین عن ابی بشر قال: اطاف الناس بایاس بن معاویة فقالوا: ما السرف؟ قال: ما تجاوزت به امراللّٰہ فھو سرف۔

ترجمہ: ''ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ ابو بشر سے روایت کیا ہے کہ لوگوں نے ایاس بن معاویہ کو گھیر لیا اور ان سے دریافت کیا کہ اسراف کیا ہے؟، تو انہوں نے فرمایا: وہ خرچ جس میں تم اللہ کے حکم سے تجاوز کرو، اسراف ہے (ابن جریر 42/8)۔ (فتاوٰی رضویہ، جلد: 01، ص: 692)

علامہ السید الشریف علی بن محمد بن علی الجرجانی الحنفی لکھتے ہیں:

التبذیر ھو تفریق المال علی وجہ الاسراف۔

ترجمہ ''اسراف کے طور پر مال کو خرچ کرنا''۔

الاسراف انفاق المال الکثیر فی الغرض الخسیس۔

ترجمہ: ''گھٹیا مقصد میں زیادہ مال خرچ کرنا''۔

الاسراف تجاوز الحد فی النفقة، وقیل ان یأکل الرجل ما لا یحل لہ او یأکل مما یحل لہ فوق الاعتدال و مقدارالحاجة ، وقیل الاسراف تجاوز فی الکمیت فھو جھل بمقادیر الحقوق۔

ترجمہ: ''نفقے میں حدِ اعتدال سے تجاوز کرنا، ایک قول یہ ہے کہ آدمی ناجائز چیز کھائے یا جائز چیز حاجت سے

زیادہ اور حدِ اعتدال سے زیادہ کھائے اور ایک قول یہ ہے کہ اسراف مقدار میں تجاوز کا نام ہے (یعنی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا، اسی کو عرفِ عام میں فضول خرچی کہتے ہیں)، پس یہ حقوق کی مقدار سے جہالت ہے۔

الاسراف صرف الشيء فيما ينبغي زائدا على ما ينبغي، بخلاف التبذير فانه صرف الشيء فيما لا ينبغي۔

ترجمہ: ''ایسے امور جہاں خرچ کرنا چاہئے، وہاں حدِ اعتدال سے زیادہ خرچ کرنا، اس کے برعکس تبذیر ناجائز امور میں خرچ کرنے کو کہتے ہیں''۔ (التعریفات، ص:17، 44)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں: التَّبْذِيْرُ بِاِنْفَاقِ الْمَالِ فِي الْمَعَاصِيْ وَتَفْرِيْقُ الْمَالِ فِيْ غَيْرِ حَقٍّ، وَالْاِسْرَافُ هُوَ مُجَاوَزَةُ الْحَدِّ سَوَاءٌ كَانَ فِي الْاَمْوَالِ أَمْ فِيْ غَيْرِهَا كَالْاِسْرَافِ فِي الْقَتْلِ وَالْكَلَامِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ۔

ترجمہ: ''معصیت کے کاموں میں اور ناحق مَصرف پر مال خرچ کرنا ''تبذیر'' ہے اور حد سے تجاوز کرنا ''اِسراف'' ہے، خواہ یہ تجاوز مال میں ہو یا دیگر اُمور میں، جیسے قتل، کلام وغیرہ میں حد سے تجاوز کرنا، (لسان العرب: جلد2، ص: 431)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

تبذیر کا معنی ہے تفریق، اس کی اصل ہے زمین میں بذر (بیج) کو پھینک دینا اور پھر اس کا استعارہ ہر اس شخص کے لئے کیا گیا جو اپنے مال کو ضائع کرنے والا ہو، بظاہر بذر (بیج) کو زمین میں متفرق جگہ پھینک دینا بھی اس شخص کے نزدیک مال کو ضائع کرنا ہے جو بیجوں کو زمین میں ڈالنے کے نتیجہ سے ناواقف ہو۔

(المفردات، ج:1، ص:51، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، 1418ھ)

امام عبدالرحمان بن علی بن محمد جوزی متوفّٰی 597ھ لکھتے ہیں: تبذیر کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا اس کا معنی ہے مال کو باطل اور ناجائز جگہوں میں خرچ کرنا، مجاہد نے کہا اگر کوئی شخص اپنے تمام مال کو حق کی راہ میں خرچ کرے تو وہ مُبذِر نہیں ہے اور اگر وہ ایک کلو چیز بھی ناحق جگہ میں خرچ کرے تو وہ مبذر ہے، زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے علاوہ میں خرچ کرنا تبذیر ہے، زمانہ جاہلیت

میں لوگوں کو دکھانے اور سنانے کے لئے اونٹوں کو ذبح کیا جاتا تھا اور مالوں کو خرچ کیا جاتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ صرف اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے مال کو خرچ کیا جائے۔ ماوردی نے ذکر کیا ہے کہ مال کو بے فائدہ اور فضول خرچ کرنا اور مال کو ضائع کرنا تبذیر ہے۔

(زادالمسیر، ج:5 ص:28-27، مکتب اسلامی بیروت 1407ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی لکھتے ہیں:

مال کو ضائع کرنا اور اس کو فضول اور بے فائدہ خرچ کرنا تبذیر ہے، عثمان بن اسود نے کہا میں مجاہد کے ساتھ کعبہ کے گرد طواف کر رہا تھا، انہوں نے ابو قبیس پہاڑ کی طرف دیکھ کر کہا: اگر کوئی شخص اس پہاڑ کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرے تو وہ مسرفین میں نہیں ہے اور اگر وہ ایک درہم بھی اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ کرے تو وہ مسرفین میں سے ہے، ایک شخص نے کسی نیک کام میں بہت زیادہ مال خرچ کیا تو اس سے کہا گیا کہ اسراف میں کوئی خیر نہیں ہے اس نے کہا خیر میں کوئی اسراف نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر، ج:7 ص:328، مطبوعہ: دار احیاء التراث العربی، بیروت)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کا حضرت سعد کے پاس سے گزر ہوا، وہ اس وقت وضو کر رہے تھے، آپ نے فرمایا: اے سعد یہ کیا اسراف کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کیا وضو میں بھی اسراف ہے، آپ نے فرمایا ہاں خواہ تم دریا کے بہتے ہوئے پانی سے وضو کر رہے ہو، (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:425، مسند احمد، ج:2 ص:221، مسند احمد، رقم الحدیث:7065 عالم الکتب بیروت)۔

اس صورت میں اگرچہ پانی ضائع نہیں ہو رہا، لیکن تین بار سے زیادہ اعضاء وضو کو دھونے میں مومن کے عمل اور وقت کا ضیاع ہو رہا ہے۔

(تبیان القرآن، جلد:06، ص:698)

اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ عرفِ عام میں اسراف و تبذیر ہم معنی استعمال ہوتے ہیں، لیکن ان میں بنیادی معنوی فرق موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ تبذیر مطلقاً ناجائز، ممنوع اور معصیت کے کاموں میں خرچ کرنے کو کہتے ہیں، خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ اسی لئے مفسرینِ کرام اور فقہاءِ کرام نے اسراف کو تجاوز فی الکمیت اور جہل بمقدار الحقوق سے تعبیر کیا ہے جبکہ تبذیر کو جہل بالکیفیت سے تعبیر کیا ہے۔ اور ایسے امور جن میں فی نفسہٖ خرچ

کرنے کی تو اجازت ہے، لیکن ان میں حد سے تجاوز عبث ہے یا کسی درجے میں اساءت ہے۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''اس تقدیر پر اسراف تبذیر سے عام ہوگا کہ ناحق صرف کرنا عبث میں صرف کو بھی شامل اور عبث مطلقاً گناہ نہیں، تو از انجا کہ اسراف ناجائز ہے، یہ صرف معصیت ہوگا، مگر جس میں صرف کیا وہ خود معصیت نہ تھا اور عبارت ''لاتعط فی المعاصی'' کا ظاہر یہی ہے کہ وہ کام خود ہی معصیت ہو، بالجملہ تبذیر کے مقصود و حکم دونوں معصیت ہیں اور اسراف کو صرف حکم میں معصیت لازم، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 01 ص:698)''۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر جس بے مثال انفاق و ایثار کا مظاہرہ کیا، وہ اُن کے مقامِ صدق و ایثار و اخلاص کے عین مطابق تھا، کیونکہ وہ صاحبِ عزیمت تھے اور حق کی راہ میں ہر مشکل کو خوش دلی سے برداشت کرنا اُن کا شِعار تھا، ایسے لوگ کسی مشکل وقت میں بھی پیکرِ صبر و رضا ہوتے ہیں، اللہ کی تقدیر پر قانع اور کسی مصیبت پر اپنے رب تبارک و تعالیٰ سے شکوہ و شکایت نہیں کرتے، بلکہ ع ''ہر چہ از دوست مے رسد نکوست''۔ کا مصداق ہوتے ہیں۔ لیکن شریعت کے عمومی ضابطے عامۃ الناس اور اوسط درجے کے اہلِ ایمان کے لئے ہوتے ہیں، جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خیر الصدقة ما کان عن ظهر غنی، بہترین صدقہ وہ ہے جو جائز حاجات کے لئے پس انداز کرنے کے بعد کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا خاص کرم:

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر کرم ہے کہ وہ خود ہی اُنہیں مال و دولت عطا کرتا ہے اور پھر اُن سے فرماتا ہے کہ مجھے کچھ قرض دے دو یعنی میرے عطا کیے ہوئے مال میں سے میری رضا کے لئے میرے نادار بندوں پر اپنا مال خرچ کرو۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ O

ترجمہ: ''کون ہے وہ شخص جو اللہ کو قرضِ حسن دے، تو اللہ اُسے بڑھا کر اُس کے لئے کئی گُنا کر دے اور اللہ ہی (رزق میں) تنگی اور کشادگی فرماتا ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے، (البقرہ:245)''۔

(۲) اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِیْمٌ O

ترجمہ: ''اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو گے تو وہ اِسے تمہارے لئے دُگنا کردے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ (بندوں کے) شکر کا بہت قدر دان بہت علم والا ہے، (التغابن: 17)''۔

جو لوگ اِس دنیا میں اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اللہ کی رضا کے لئے خرچ نہیں کرتے اور بُخل سے کام لیتے ہیں، وہ آخرت میں بہت پچھتائیں گے لیکن یہ پچھتاوا کسی کام نہیں آئے گا۔

آخرت کی فکر کرو:

انسان اس دنیا کی راحت اور آسائش کے لئے تو بہت تگ ودو کرتا ہے اور تمام جائز و ناجائز طریقوں کو اختیار کر کے مالِ کثیر جمع کرتا ہے تاکہ مشکل وقت میں اس کے کام آئے۔ لیکن اِس دنیا کی زندگی بہر حال محدود ہے اور اس کی راحتیں ناپائیدار ہیں۔ دائمی راحتیں اور پائیدار مسرتیں تو صرف آخرت میں نصیب ہوں گی۔ یہ انسان کی بدنصیبی ہے کہ وہ آخرت کو فراموش کیے رہتا ہے، مگر جب روزِ حساب آئے گا تو پھر اس کا کمایا ہوا یہ مال اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مؤمن کو حکم فرمایا ہے کہ اگر اس دنیا کی رنگینیوں رعنایوں اور چمک دمک میں کھوئے رہنے سے کچھ فرصت ملے تو اُسے چاہئے کہ اپنی آخرت کے بارے میں بھی سوچ لیا کرے۔

اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر انسان کو سوچنا چاہئے کہ وہ کل (روزِ حساب) کے لئے کیا (ذخیرۂ عمل) آگے بھیج رہا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو، بیشک اللہ تمہارے اعمال کو خوب جاننے والا ہے، (الحشر: 18)''۔

(۲) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ط

ترجمہ: ''کیا (وہ اس کتاب پر ایمان لانے کے لئے) اُس کی وعید کے وقوع کا انتظار کر رہے ہیں، جس دن وہ وعید واقع ہوگی تو جو لوگ اس کو پہلے فراموش کر چکے تھے، وہ کہیں گے: بیشک ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے، تو کیا ہمارے کوئی سفارشی ہیں، جو ہماری سفارش کریں؟ یا ہم کو دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جائے تو ہم اُن کاموں (گناہوں) کے

برخلاف کام کریں، جو ہم پہلے کرتے تھے، بے شک انہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا، (الاعراف:53)''۔

اگر بندۂ مومن نے اپنے خالق و مالک کے اس ارشاد پر توجہ نہ دی اور صرف مال جمع کرنے میں مشغول رہا تو کل قیامت کے دن اس کی ذہنی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات میں بیان فرمایا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس دن کا پچھتاوا اور ندامت کچھ کام نہ آئے گی۔

(۳) يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِىْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍمٍ بِبَنِيْهِ Oوَصَاحِبَتِهٖ وَأَخِيْهِ O وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُؤْوِيْهِO وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِO

ترجمہ:''(قیامت کے دِن) مجرم تمنا کرے گا کہ کاش اُس دن کے عذاب سے رہائی کے بدلے میں وہ اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے (تمام) کنبے کو جو (دنیا میں مصیبت کے وقت) اُسے پناہ دیتا ہے اور اُن سب کے بدلے جو زمین میں ہیں بطور فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا لے، (المعارج:11 تا 14)''۔

(٤) وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَO

ترجمہ:''اور اگر ظالموں کے لئے وہ سب کچھ ہوتا جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اس کے برابر (اور بھی) ہوتا، تو وہ قیامت کے دِن کے برے عذاب سے رہائی کے بدلے میں ضرور یہ سب کچھ بطور فدیہ دے کر (اپنی جان چھڑا لیتے) اور اُن کے لئے اللہ کی طرف سے وہ عذاب ظاہر ہوگا، جس کا اُنہیں گمان بھی نہ تھا، (الزمر:47)''۔

(٥) لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعاً وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْءُ الْحِسَابِ وَمَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُO

ترجمہ:''اگر اُن کی مِلک میں وہ سب کچھ ہوتا جو زمین میں ہے اور اس جتنا اور بھی اُس کے ساتھ ہوتا، تو وہ اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں ضرور یہ سب کچھ دے دیتے، اِن کا سخت حساب ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے، (الرعد:18)''۔

(٦) وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ،

ترجمہ:''اور اگر ظلم کرنے والے ہر شخص کی مِلک میں زمین کی ساری دولت ہوتی تو وہ ضرور اِسے دے کر اپنی

جان چھڑا لیتا، (یونس:54)"۔

لہٰذا اُس دِن کے آنے سے پہلے جب پچھتاوا کسی کام نہیں آئے گا، آج جو فرصتِ حیات میسر ہے، اسے اپنی عاقبت کو سنوارنے کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ اِسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو متوجہ فرمایا ہے کہ وہ اِس دنیا کی زندگی میں رہتے ہوئے اپنی عاقبت کا سامان کرلیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَّالْکٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ O

ترجمہ: "اے ایمان والو! اُس دِن کے آنے سے پہلے ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرو کہ جس دن نہ (نیکیوں کی) خرید وفروخت ہوگی اور نہ کسی کی دوستی یا سفارش کام آئے گی، (البقرہ:254)"۔

(۲) وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ O

ترجمہ: "اور جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا ہے، اُس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرو، اِس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے، پھر وہ (حسرت ویاس سے) کہے: اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ دِنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ دیتا اور (تیرے) نیک بندوں میں سے ہوجاتا، (المنافقون:10)"۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لئے قرآن وحدیث میں شدید وعید:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (۱) وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ

ترجمہ: "اور جو لوگ اُس چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اُنہیں عطا کی ہے (یعنی اُس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے)، وہ ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ وہ اُن کے حق میں بہتر ہے بلکہ وہ اُن کے حق میں بہت بری ہے، عنقریب وہ مال جس میں بُخل کیا تھا، قیامت کے دن اُنہیں اُس کا طوق بنا کر ڈالا جائے گا، (آل عمران:180)"۔

(۲) وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ O یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ

فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ٥

ترجمہ: ''اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، تو (اے نبی!) اُنہیں دردناک عذاب کی خبر سنایئے، جس دِن اُس (جمع کیے ہوئے مال) کو دوزخ کی آگ میں گرمایا جائے گا اور پھر اُس سے اُن کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا، (اور ان سے کہا جائے گا:) یہ ہے وہ مال جو تم نے (بڑی چاہت سے) جمع کیا تھا، تو اب اپنے اُس مال کا مزہ چکھو جسے تم (دنیا میں) جمع کیا کرتے (توبہ35-34)''۔

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(١)عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ يَبْلُغُ بِهِ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "مَامِنْ رَّجُلٍ لَايُؤَدِّيْ زَكٰوةَ مَالِهٖ اِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيْ عُنُقِهٖ شُجَاعًا"، ثُمَّ قَرَأَ عَلَيْنَا مِصْدَاقَهٗ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ: " وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ" اَلْاٰيَةَ، وَقَالَ مَرَّةً: قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مِصْدَاقَهٗ: " سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"، "وَمَنِ اقْتَطَعَ مَالَ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ بِيَمِيْنٍ لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ"، ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِصْدَاقَهٗ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ: اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ٥

ترجمہ: '' حضرت عبداللہ بن مسعود مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں دیتا، قیامت کے دن وہ اس کی گردن میں ایک (زہریلے) سانپ کی صورت میں طوق بنا کر لپیٹا جائے گا''، پھر آپ ﷺ نے اللہ عزوجل کی کتاب سے ہم پر اس کے مصداق کی آیت (یعنی سورۂ آل عمران کی آیت نمبر 180) کی تلاوت فرمائی (جو اوپر گزر چکی ہے)، اور ایک بار انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اُس کا مصداق قرآن کریم کے یہ کلمات بیان فرمائے: "سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ". (آل عمران 180)، (اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:) جو شخص اپنے مسلمان بھائی کا مال (جھوٹی) قسم کھا کر لے گا وہ (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ سے غیظ وغضب کے ساتھ اس سے ملے گا، پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کا مصداق کتاب اللہ سے یہ بیان فرمایا: ترجمہ: ''بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی (جھوٹی) قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں، اُن لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ (قیامت کے دِن) اُن سے کلام فرمائے گا نہ ان کی طرف نظرِ (رحمت) فرمائے گا اور نہ ہی اُن کو (گناہوں کے میل سے) پاک فرمائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے''، (آل

عمران:77)،(سنن ترمذی:3012)''۔

جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ ہلاک ہو جاتا ہے:

(۲)عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ : مَاخَالَطَتِ الزَّكٰوةُ مَالاً قَطُّ اِلَّا اَهْلَكَتْهُ رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالْبُخَارِيُّ فِيْ تَارِيْخِهٖ ۔

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جب زکوٰۃ کا مال کسی مال میں مخلوط (Mixed) ہوگا، وہ اُسے ہلاک کردے گا، اس حدیث کو امام شافعی اور امام بخاری نے اپنی تاریخ میں روایت کیا''۔

(مشکوٰۃ المصابیح ص:157)

اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ مال کسی نہ کسی وجہ سے ہلاک ہو جائے گا، دوسرا یہ کہ اُس سے برکت اٹھ جائے گی۔

مال اپنا ہے یا وارثوں کا؟

انسان بعض اوقات اپنی بیوی بچوں اور اہل وعیال کی جائز ونا جائز فرمائشوں اور خواہشات کی تکمیل کی خاطر اِن شرعی احکام کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور پھر ایک دن داعیِ اجل کو لبیک کہنا پڑتا ہے، سارا جمع شدہ مال دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ مرنے والے کے وارث مال پر عیش کرتے ہیں اور قبر میں حساب مردے کو دینا پڑتا ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱) عَنْ مُطَرِّفٍ ،عَنْ أَبِيْهِ قَالَ:أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ يَقْرَأُ ﴿أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ﴾قَالَ: يَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ : مَالِيْ ،مَالِيْ ! قَالَ:وَهَلْ لَكَ يَاابْنَ آدَمَ مِنْ مَّالِكَ إِلَّا مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ ،أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ، أَوْ تَصَدَّقْتَ فَأَمْضَيْتَ؟''۔

ترجمہ:''مُطَرِّف کے والد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ اُس وقت ''اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ'' تلاوت فرما رہے تھے، آپ نے فرمایا: ابن آدم کہتا ہے: میرا مال! میرا مال!، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (اے ابن آدم!) تیرا مال صرف وہی ہے، جو تو نے کھا کر فنا کر دیا یا پہن کر بوسیدہ

کردیا یا صدقہ کر کے (اپنی آخرت کے لئے) آگے بھیج دیا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2958)''۔

(۲) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَوْ أَنَّ ابْنَ آدَمَ أُعْطِيَ وَادِياً مَلَاٴنَ مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ اِلَيْهِ ثَانِيًا، وَلَوْ أُعْطِيَ ثَانِيًا أَحَبَّ اِلَيْهِ ثَالِثاً، وَلَا يَسُدُّ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ، وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ۔

ترجمہ: ''اگر ابن آدم کو سونے سے بھری ہوئی ایک وادی مل جائے، تو وہ چاہے گا کہ ایسی ہی ایک اور وادی اُسے مل جائے۔ اور اگر اُسے دوسری بھی دے دی جائے تو وہ تیسری کی آرزو کریگا۔ حقیقت میں انسان کے پیٹ کو (قبر کی) مٹی ہی بھرے گی، ہاں! اللہ تعالیٰ اس شخص کی توبہ قبول فرماتا ہے، جو توبہ کرنا چاہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6438)''۔

(۳) عَنِ الْحَارِثِ بْنِ سُوَيْدٍ: قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: أَيُّكُمْ مَالُ وَارِثِهٖ أَحَبُّ اِلَيْهِ مِنْ مَالِهٖ، قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا مِنَّا أَحَدٌ اِلَّا مَالُهٗ أَحَبُّ اِلَيْهِ، قَالَ: فَاِنَّ مَالَهٗ مَا قَدَّمَ، وَمَالَ وَارِثِهٖ مَا أَخَّرَ۔

ترجمہ: ''حضرت حارث بن سوید حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ صحابۂ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! ہم میں سے ہر ایک کو تو بس اپنا ہی مال محبوب ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اُس کا مال تو فقط وہ ہے، جو اُس نے اپنی آخرت کے لئے آگے بھیج دیا (یعنی اللہ تعالیٰ کے نام پر صدقہ کردیا) اور جو کچھ اُس نے پیچھے چھوڑا، وہ (اُس کا نہیں بلکہ) اُس کے وارث کا مال ہے، (صحیح بخاری: 6442)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُo حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَo

ترجمہ: ''تمہیں کثرت مال کی خواہش نے (آخرت کی جواب دہی سے) غافل کردیا ہے، یہاں تک کہ تم مر کر قبروں میں (اپنے انجام کو) پہنچ جاؤ گے، (التکاثر: 2-1)''۔

(۲) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ترجمہ: **''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو اس امر کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ اس نے کل (آخرت) کے لئے کیا آگے بھیجا ہے، (الحشر: 18)''۔**

(۳) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ

ترجمہ: ''(قیامت کے دن) ہر شخص جان لے گا کہ اُس نے اپنی آخرت کے لئے کیا آگے بھیجا ہے اور اپنے پیچھے دنیا میں کیا چھوڑ کر آیا ہے، (الانفطار: 5)''۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کتنی رحیم و کریم ہے کہ وہ خود اپنے بندے کو مال و دولت سے نوازتا ہے اور پھر امتحان کے طور پر اس سے فرماتا ہے:

(۴) وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَیْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ

ترجمہ: ''اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرضِ حَسن دو اور جو بھی عملِ خیر تم (بدنی و مالی عبادات کی صورت میں) آگے بھیجو گے، تو اُسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں (کئی درجہ) بہتر اور بہت بڑے اجر کی صورت میں پاؤ گے، (المزمل: 20)''۔

چنانچہ حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ،عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ :لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مال داری مال و اسباب کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ (حقیقت میں) مال داری یہ ہے کہ انسان کا دل (دنیا کی محبت سے) بے نیاز ہو جائے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6446)''۔

قرآن مجید کی اِن آیاتِ مُقدّسہ اور اَحادیثِ مُبارَکہ کی تعلیم یہ ہے کہ بندۂ مومن کو اپنی کمائی میں سے اپنا حصہ نکال کر اُسے اللہ تعالیٰ کی اَمان اور حفاظت میں دے دینا چاہیے۔ امام رازی رَحِمَہُ اللہ تعالیٰ سے کسی نے پوچھا: ''اگر کوئی چاہے کہ اُس کا سارا مال اُس کے ساتھ قبر میں جائے، تو اس کی خواہش کی تکمیل کیسے ممکن ہے؟''۔ انہوں نے فرمایا: ''وہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دے، وہ سارے کا سارا مال اجرِ کثیر کی صورت میں اسے مل جائے گا''۔

حدیث پاک میں ہے:

عن عائشة انهم ذبحوا شاة، فقال النبی ﷺ: مابقی منها؟، قالت: مابقی منها الا كتفها، قال: بقی كلها غیر كتفها۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ اُنہوں نے ایک بار ایک بکری ذبح کی، تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: (بکری کے گوشت میں سے) کتنا بچا ہے؟، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی:

ایک دست کے سوا (گھر میں) کچھ نہیں بچا (یعنی باقی سارا گوشت فقراء پر صدقہ کر دیا ہے)، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (جو اللہ کی راہ میں صدقہ کردیا)، وہ تو سارا ہی بچ گیا ہے، سوائے ایک دست (Shoulder) کے (جو گھر والوں کے لئے رہ گیا)''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث، 2470، مسند احمد، جلد:6،ص:50)

زکوٰۃ کی فرضیت:

نماز کی طرح زکوٰۃ بھی اصولی طور پر سابق انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں شامل رہی ہے، اگرچہ اُن کے تفصیلی احکام جدا تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّاO

ترجمہ: ''اور اُس (اللہ) نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک کہ میں زندہ رہوں، (مریم:31)''۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَکَانَ یَاۡمُرُ اَہۡلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَکَانَ عِنۡدَ رَبِّہٖ مَرۡضِیًّاO

ترجمہ: ''اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے، (مریم: 55)''۔

اعلانِ نبوت کے بعد مکی دور مسلمانوں کے لئے ابتلا کا دور تھا۔ تفصیلی احکام مدنی دور میں نازل ہوئے۔ تاہم مکی دور میں اِنفاق فی سبیل اللہ اور صدقات کی ترغیب ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) کَلَّا بَلۡ لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ Oوَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ Oوَتَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا Oوَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّاO

ترجمہ: ''بات یہ نہیں ہے بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور تم ایک دوسرے کو مسکین کے کھلانے پر رغبت نہیں دیتے اور تم میراث کا پورا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور تم مال سے بہت زیادہ محبت کرتے ہو۔ (الفجر مکیہ: 17 تا 20)''۔

(۲) فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ Oوَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡعَقَبَۃُ Oفَکُّ رَقَبَۃٍ Oاَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ Oیَّتِیۡمًا

ذَا مَقْرَبَةٍ Oأَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ O

ترجمہ: ''پس وہ دشوار گھاٹی میں سے کیوں نہ گزرا، اور تو کیا جانے کہ دشوار گھاٹی کیا ہے؟، (وہ قرض یا غلامی سے کسی کی) گردن چھڑانا ہے یا بھوک کے دِن کھانا کھلانا ہے، یتیم کو (خصوصاً) جو رشتہ دار بھی ہو یا مسکین کو جو خاک نشین ہے، (البلد مکّیۃ: 11 تا 16)''۔

(۳) أَرَأَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ Oفَذَالِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ Oوَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِO

ترجمہ: ''کیا آپ نے اُس شخص کو دیکھا جو دین (یعنی روزِ جزا) کو جھٹلاتا ہے، تو یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کو کھلانے پر (کسی کو) آمادہ نہیں کرتا، (الماعون مکّیۃ: 1 تا 3)''۔

(٤) فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَO

ترجمہ: ''تو قرابت والوں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو، یہ اُن لوگوں کے لئے بہت بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور وہی لوگ کامیاب (ہونے والے) ہیں، (روم مکّیۃ: 38)''۔

(٥) وَفِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔

ترجمہ: ''اور اُن کے مال میں حق (مقرر) ہے، سائل اور (نعمتِ مال سے) محروم کا، (الذاریات مکّیۃ: 19)''۔

دوزخیوں سے اُن کے جہنم میں جانے کا جب سبب پوچھا جائے گا، تو وہ بتائیں گے:

(٦) مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ Oقَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ Oوَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَO

ترجمہ: ''آیا کون سی باتیں تمہیں جہنم میں لے گئیں؟، وہ (جواب میں) کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، (المدثر مکیہ: 42 تا 44)''۔

(٧) وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ O ترجمہ: ''اور (وہ اہلِ ایمان کامیاب ہیں) جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں، (المومنون، مکیہ: 4)''۔

اسی طرح سورۂ نمل (جو مکی ہے) میں بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم موجود ہے:

(٨) الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَO

ترجمہ:''جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہی آخرت پر یقین رکھتے ہیں،(نمل،مکیہ:3)''۔
مکی زندگی میں مسلمانوں کی ایک جماعت نے پہلی ہجرت حبشہ کی طرف کی، وہاں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (اِن کا لقب ذُوالجناحین اور طیّار بھی ہے) نے حبشہ کے بادشاہ اَصحَم بن ابجر نجاشی کے دربار میں جو تقریر فرمائی، اس میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی فرمایا: یَاْمُرُنَا بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَالصِّیَامِ ترجمہ:''وہ (رسول اللہ ﷺ) ہمیں نماز، زکوٰۃ اور روزے کا حکم دیتے ہیں،(سیرت ابن ہشام، جلد 1 ص:359)''۔

مکی زندگی میں صدقات کی ترغیب اور مدنی زندگی میں زکوٰۃ کی فرضیت:

مکی زندگی میں زکوٰۃ رُکنِ اسلام کے طور پر فرض نہیں ہوئی تھی بلکہ اِس کے ذریعے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی، اِس سے مُطلقاً انفاق فی سبیل اللہ مراد تھا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
طٰسٓ O تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ Oهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ Oالَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ O
ترجمہ:''طٰس، یہ قرآن اور روشن کتاب کی آیتیں ہیں، یہ اُن ایمان والوں کے لئے ہدایت اور خوشخبری ہے، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہی آخرت پر یقین رکھتے ہیں،(النمل مکیہ:1 تا 3)''۔
مفسرِ قرآن علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم سورۂ نمل کی ایک آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:''اس جگہ ایک اور اعتراض یہ ہوتا ہے کہ سورۃُ النّمل مکی ہے اور زکوٰۃ مدینہ میں دو ہجری میں رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے فرض ہوئی ہے، سو اس آیت میں نماز کے بعد زکوٰۃ کے ذکر کی کیا توجیہ ہوگی، بعض علماء نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ اس آیت میں زکوٰۃ سے اس کا معروف معنی مراد نہیں ہے بلکہ زکوٰۃ سے مراد تزکیۂ نفس اور نفس کی برائی اور بے حیائی کے کاموں سے پاکیزگی اور طہارت اور نیک کاموں اور عمدہ اخلاق سے نفس کو آراستہ کرنا مراد ہے۔ مگر اس جواب پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ جب بھی نماز کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے مراد معروف زکوٰۃ ہوتی ہے یعنی جو شخص مالک نصاب ہے، وہ سال گزرنے کے بعد اس مال کا چالیسواں حصہ ادا کرے، اس لئے اس سوال کے جواب میں یہ کہنا مناسب ہے کہ نفسِ زکوٰۃ، یعنی اللہ کی راہ میں مطلقاً مال خرچ کرنا، اس قدر مکہ میں ہی فرض ہو چکا تھا اور زکوٰۃ کی تمام تفصیلات، اس کی شرائط اور مختلف اَجناس کے الگ الگ نصابوں کا تعین مدینہ منورہ میں ہجرت کے دوسرے سال میں ہوا''۔
(تبیان القرآن، جلد 8، ص:553)

مکی زندگی میں زکوٰۃ کے تفصیلی احکام نازل نہیں ہوئے تھے، کیونکہ اُس دور میں کفار و مشرکین کے غلبہ کی وجہ سے مسلمانوں کا اجتماعی نظم قائم نہیں ہوا تھا۔ لیکن ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا اجتماعی نظم قائم ہو چکا تھا اور رسول اللہ ﷺ کو پہلی اسلامی مدنی ریاست کا سربراہ تسلیم کیا جا چکا تھا۔ لہٰذا اب یہ مناسب موقع تھا کہ مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی کے لئے اَحکام جاری کئے جائیں۔ چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال روزوں کی فرضیت سے پہلے زکوٰۃ مالی عبادت کے طور پر فرض کی گئی اور صدقۂ فطر واجب ہوا۔

تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے: وَفُرِضَتْ فِي السَّنَةِ الثَّانِيَةِ قَبْلَ فَرْضِ رَمَضَانَ،

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ (ہجرت کے) دوسرے سال رمضان (کے روزوں) کی فرضیت سے پہلے فرض ہوئی، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص: 160، بیروت)''۔

حدیثِ مبارک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ زَكٰوةَ الفِطْرِ طُهْرَةً لِلصِّيَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ، وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِيْنِ، مَنْ أَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلَاةِ فَهِيَ زَكَاةٌ مَقْبُوْلَةٌ، وَمَنْ أَدَّاهَا بَعْدَ الصَّلَاةِ فَهِيَ صَدَقَةٌ مِنَ الصَّدَقَاتِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لغو باتوں اور بے حیائی کے کاموں سے روزوں کی پاکیزگی اور مساکین کو کھانا کھلانے کے لئے ''زکوٰۃِ فطر'' کو فرض فرمایا اور جس نے اس کو عید کی نماز سے پہلے ادا کر دیا تو یہ مقبول زکوٰۃ ہے اور جس نے اس کو نماز کے بعد ادا کیا تو یہ صدقات میں سے ایک صدقہ ہے''۔ (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 1605)

☆☆☆☆☆

زکوٰۃ کا معنی ومفہوم:

لغت میں زکوٰۃ کا معنی پاکیزگی،نُمُو (GROWTH)، اضافہ(INCREMENT) اور برکت ہے۔
اصطلاح میں زکوٰۃ کا معنی ہے:''وہ مال جوحدِ نصاب کوپہنچ چکا ہو،شارع کی طرف سے اُس کے ایک مقررہ حصے کا فقیرکو مالک بنادینا''۔

تنویرالابصارمع الدرالمختار میں ہے:(هِيَ) لُغَةً: اَلطَّهَارَةُ وَالنَّمَاءُ، وَشَرْعًا : (تَمْلِيكُ جُزْءِ مَالٍ عَيَّنَهُ الشَّارِعُ)

ترجمہ:''زکوٰۃ: لغت میں پاک ہونے اور بڑھنے کو کہتے ہیں اورشرعاً کسی مستحق کو مال کے اُس حصے کا مالک بنادینا ہے، جسے شارع علیہ الصلاۃ والسلام نے مقررفرمایا ہے''۔

(ردالمختارعلی الدرالمختار،جلد3،ص:160-161،بیروت)

زکوٰۃ کےلغوی اور اصطلاحی معنی کی باہمی مناسبت یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے مال میں اضافہ ہوتا ہے اور پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔مال کی پاکیزگی کے ساتھ نفسِ انسانی کو بھی پاکیزگی مل جاتی ہے۔گناہ کی نجاستوں سے دل صاف ہوجاتا ہے،مال ودولت کی مَحبت کے غَلَبے ،حرص وہَوَس اور بُخل جیسی اَخلاقی خرابیوں سے باطن پاک ہوجاتا ہے،سیرت وکردار میں اُجلاپن آتا ہےاورفرد کی اصلاح وپاکیزگی سے معاشرے کی ترقی واصلاح ہوتی ہے۔مال اور دولت کی مَحبت غالب ہونے کی وجہ سے انسان میں حِرص، بُخل ،تکبُّر،تَمرُّد اور فِسق وفُجُور کی رذیل (Vice,Mean)صفات پیدا ہوتی ہیں۔مالی عبادت کےطور پراللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض کی ہے تاکہ انفاق فی سبیل اللہ سے ان اخلاقی اَمراض کا ازالہ ہواورانسان میں قناعت،جُود وسَخا، اِنکساراورتقویٰ وحُسنِ عمل کی اعلیٰ صِفات پیدا ہوں۔

ارشادِباری تعالیٰ ہے:خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔
ترجمہ:''(اے نبی ﷺ!)ان کے مال سے زکوٰۃ وصول کرکے اُنہیں (حرص وبُخل سے) پاک کریں اوراس کےذریعےان کے باطن کا تزکیہ کریں،(سورۂ توبہ:103)''۔

زکوٰۃ ناداروں کا حق ہے، اُن پر احسان نہیں:

اسلام کی رو سے زکوٰۃ ادا کر کے مال دار مفلس و نادار پر احسان نہیں کرتا بلکہ وہ حق دار کو اس کا وہ حق لوٹاتا ہے جو مال و دولت عطا کرنے والے ربِ کریم نے اس کے مال میں شامل کر رکھا ہے۔ حدیث مبارک میں ہے:

فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِيْ أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ۔

ترجمہ: ''پس آپ اِن کو بتایئے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو اُن کے مال دار لوگوں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء پر لوٹا دی جائے گی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1395)''۔

زکوٰۃ کے ذریعے پاکیزگی حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فُقراء و مساکین کا حق اپنے مال میں شامل رکھنا، غیر کے مال پر قبضہ کرنے کے مترادف ہے، تو جس مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے، وہ غیر کے حق کی آمیزش سے پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○

ترجمہ: ''اور اِن (مالداروں) کے مال میں سائل اور (نعمتِ مال) سے محروم لوگوں کا حق ہے، (الذاریات: 19)''۔

گویا قرآن مجید کا پیغام یہ ہے کہ جو شخص استطاعت کے باوجود زکوٰۃ ادا نہیں کرتا وہ حق تلفی کرنے والا، ظالم اور غاصب ہے، کیونکہ وہ نادار کے حق کو لوٹانے سے عملاً منکر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نادار کو احسان مند ہونا چاہئے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ۔

ترجمہ: ''جو بندوں (کے احسان) کا شکر ادا نہ کرے، وہ رب کا شکر گزار نہیں بن سکتا''۔

(سُنن ترمذی: رقم الحدیث: 1955)

صدقہ کا مفہوم:

لفظ صَدَقہ ،زکوٰۃ کا ہم معنیٰ ہے،قرآن مجید میں متعدد آیات میں صَدَقہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے،اس کی اصل ''صِدق'' ہے،جس کا معنیٰ ''سچائی'' ہے۔اصطلاح میں صَدَقہ سے مراد وہ عطیہ ہے جسے دیتے وقت اجر وثواب کی نیت کی جائے۔بنیادی طور پر صدقہ نفلی انفاق پر بولا جاتا ہے اور زکوٰۃ واجب انفاق پر،مگر کبھی واجب انفاق (Obligatory Spending Money in the Way of Allah) کو بھی صَدَقہ کہہ دیا جاتا ہے۔قرآن مجید میں ''تَصَدُّق'' کے ایک معنیٰ ''اِبْـــرَاءٌ عَـــنِ الـــذِمَّۃ'' یعنی اپنے حق کو معاف کردینے کے ہیں۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قِصاص کا تفصیلی حکم بیان فرمانے کے بعد فرمایا:

فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۔

ترجمہ:''سو جو شخص اپنے (قصاص کے) حق کو مُعاف کردے،تو یہ اُس کے لئے (گناہوں کا) کفارہ ہوگا، (المائدہ:45)''۔

حدیثِ مبارک میں اللہ تعالیٰ نے بندے پر اپنی نعمتوں کے اعتراف اور اُن پر شکر کو بھی صدقے سے تعبیر کیا ہے، ارشاد فرمایا:

كُلُّ سُلَامٰى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ ۔ ترجمہ:''انسان کے ہر ہر جوڑ (Joint) پر صدقہ واجب ہے''۔پھر فرمایا: اَلْـــكَــلِــمَةُ الـــطَّيِّبَةُ صَـــدَقَةٌ۔ ترجمہ:''کسی کو اچھی بات کہہ دینا بھی صدقہ ہے''۔(صحیح بخاری،رقم الحدیث:2989)

قرآن مجید کی ان آیات میں صدقہ زکوٰۃ کے معنیٰ میں مستعمل ہے:

(1) خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔

ترجمہ:''(اے نبی ﷺ!) ان کے مال سے زکوٰۃ وصول کرکے اُنہیں (حرص وبُخل سے) پاک کریں اور اس کے ذریعے ان کے باطن کا تزکیہ کریں۔(سورۂ توبہ:103)

(2) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔

ترجمہ:''زکوٰۃ کے حق دار صرف فقراء اور مساکین ہیں اور زکوٰۃ کی وصولیابی پر مامور لوگ اور جن کے دلوں کو

اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو اور جن غلاموں کو آزاد کرنا ہو اور مقروض لوگ اور (وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو) اللہ کی راہ میں (وقف کرلیا ہے) اور مسافر لوگ، (سورۂ توبہ:60)"۔

اصل میں صَدَقہ کے مفہوم میں بہت وسعت ہے اور ہر قسم کے کارِ خیر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، خواہ یہ کارِ خیر کسی مدد اور تعاون کی صورت میں ہو، خواہ یہ جسمانی نیکی ہو یا مالی، خواہ اس کا تعلق قول سے ہو یا فعل سے۔ اہلِ علم کے ہاں مالی صدقات اور غیر مالی صدقات کی ترکیب مروّج و مستعمل ہے، جس سے اس امر کی مزید تائید ہوتی ہے کہ صدقہ کا تصور صرف مالی انفاق تک محدود نہیں ہے، البتہ اس مفہوم میں کثرت استعمال کے باعث عُرف میں مالی انفاق کو ہی صدقہ کہا جاتا ہے۔ صدقات کی تین اقسام ہیں:

(۱) فرض صدقہ یعنی زکوٰۃ (۲) واجب صدقات (۳) نفلی صدقات

صدقاتِ واجبہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) قسم توڑنے کا کفارہ (۲) شرعی عذر کے سبب روزے کی جسمانی استطاعت نہ رکھنے والوں پر ایک روزے کے عوض ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلانے کا فدیہ (۳) ظہار کا کفارہ (۴) احرام کی حالت میں شکار کرنے کا کفّارہ اور اِحرام کی حالت میں دوسری جنایات کا کفّارہ جسے بَدَنہ، دَم یا صَدَقہ کہا جاتا ہے۔ (۵) صدقۂ فطر (۶) کسی نے مالی نذر مانی ہو تو اُسے پورا کرنا۔

فرض و واجب صدقات کے مستحق صرف مسلم فقراء و مساکین ہیں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

خُذْ مِنْ اَموَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا۔

ترجمہ: "ان کے مال سے زکوٰۃ وصول کر کے اُنہیں (حرص و بُخل سے) پاک کریں اور اس کے ذریعے ان کے باطن کا تزکیہ کریں۔ (سورۂ توبہ:103)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا: اُدْعُهُمْ اِلَى شَهَادَةِ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ، فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذَالِكَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدِ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ، فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذَالِكَ، فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِيْ اَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ۔

ترجمہ: "اُن کو دعوت دو کہ وہ یہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور بے شک میں اللہ کا رسول

ہوں، پس اگر وہ اس کی اطاعت کرلیں تو پھران کو یہ خبر دو کہ اللہ نے ان پر ہر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، پس اگر وہ اس کی اطاعت کرلیں تو پھران کو خبر دو کہ بے شک اللہ نے اُن کے مالوں میں ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو ان کے مال دار لوگوں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء پر لوٹادی جائے گی''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1395)

البتہ نفلی صدقہ کسی حاجت مند غیر مسلم ذمی کو بھی دیا جاسکتا ہے، اسے آپ (General Charity) کہہ سکتے ہیں۔ نفلی صدقات کے لئے کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے، کوئی شخص جب چاہے، جتنا چاہے، جس صورت میں چاہے اور جس پر چاہے، انفاق کرے۔ ان صدقات کی نہ حد ہے، نہ مقدار مقرر ہے، نہ وقت مقرر ہے، نہ افراد کی تعیین اور نہ ہی استحقاق کی شرط، البتہ بہتر یہ ہے کہ اپنی حاجات کے لئے پس انداز کرنے کے بعد پہلے اپنے رشتے داروں اور قرابت داروں پر صدقہ کیا جائے۔

عوام کے نزدیک صدقات کا مفہوم:

عوام الناس میں صدقہ کا جو عام تصور پایا جاتا ہے، وہ اس کے علمی اور شرعی تصور سے پورے طور پر ہم آہنگ نہیں ہے۔ عام اہلِ عرب صرف سائلوں پر انفاق کرنے اور مالی احسان کے طور پر دیئے گئے عطیات کو صدقہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ پاکستان بھر اور شاید پورے برصغیر میں صدقہ کا عرفی معنی مصائب ومشکلات اور آفات وبلیات سے نجات وازالے کے لئے انفاق کرنا ہے۔ یہ انفاق عام طورر پر کسی زندہ جانور مثلاً بکرا، مرغی وغیرہ یا اُس کے گوشت کی صورت میں ہوتا ہے، یہ محدود تصورات ہیں۔ بعض لوگ جانور صدقہ کرنے سے پہلے رات بھر مریض کے پاس باندھ دیتے ہیں یا مریض کی چارپائی کے گرد چکر لگواتے ہیں یا مریض اُس پر اپنا ہاتھ پھیرتا ہے، یہ سب شاید اس خیال کے تحت کیا جاتا ہے کہ اس طرح بیماری جانور میں منتقل ہوجائے گی اور مریض صحت یاب ہوجائے گا، یہ تمام غیر ضروری اَفعال ہیں، صدقہ کی ادائیگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے ان تمام امور میں نیت ہی کافی ہے۔ اسی طرح مکان کی بنیاد رکھتے وقت بعض لوگ ردِ بلا کے لئے بکرا وغیرہ اسی مقام پر ذبح کرتے ہیں تاکہ اس کا خون مکان کی بنیادوں میں گرے۔ صدقہ کے طور پر یا ردِ بلا کے لئے جانور ذبح کرنا اچھی بات ہے لیکن اس کا خون مکان کی بنیادوں میں گرانا ضروری نہیں ہے۔ کبھی ایسے صدقات فقراء کے سپرد کردیئے جاتے

ہیں اور کبھی چیلوں اور کوؤں وغیرہ، گوشت خور جانوروں اور پرندوں کے سامنے ڈال دیئے جاتے ہیں، حالانکہ چیل یا کوؤں کو کھلانا باعثِ ثواب نہیں کیونکہ حدیث پاک میں ان کو فاسق قرار دیا گیا اور حدودِ حرم جہاں کسی جانور کو مارنا منع ہے وہاں بھی ان کے مارنے کا حکم دیا گیا۔ یونہی پرندوں اور حشرات الارض کی خوراک کے طور پر دالیں، چاول، باجرہ اور دیگر اجناس کا صدقہ کیا جاتا ہے، حالانکہ غیر پالتو جانوروں کو خوراک مہیا کرنے سے زیادہ اہم کام انسانوں کی فلاح و بہبود کا اہتمام کرنا ہے۔ صدقات کی یہ تمام صورتیں بلیّات ومصائب سے ازالے ونجات کے لئے اختیار کی جاتی ہیں اور ایک عام تصور کے تحت اُسے سیاہ رنگ سے تعبیر دے کر صدقہ کے لئے سیاہ جانور اور سیاہ اجناس کا انتخاب کیا جاتا ہے، ایسی پابندی کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

زکوٰۃ ایک عبادت ہے:

اسلام میں زکوٰۃ محض انفاق فی سبیل اللہ نہیں ہے بلکہ یہ مستقل مالی عبادت ہے۔ اور اِس کا مقصد ''تقرُّب الی اللہ'' اور ''رضائے الٰہی'' کا حصول ہے۔ اِس کے ذریعے جو انفرادی اور اجتماعی فوائد حاصل ہوتے ہیں، اُن کی حیثیت اضافی اور ثانوی ہے۔ جس طرح نماز میں بندگی کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور تقرُّب حاصل کیا جاتا ہے، روزے کی مشقت برداشت کرنا ایک طرح سے اپنے بدن اور صحت کا شکرانہ ہے۔ حج کے عمل سے اپنے مال وجان کی نذر پیش کی جاتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ کا عمل اپنے مال ودولت کی نذر پیش کر کے، اس بات کا عملی ثبوت دینا ہے کہ مال کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

زکوٰۃ کا عبادت ہونا اس بات سے بھی واضح ہے کہ یہ کمزوروں اور ناداروں کی مالی اعانت سے بڑھ کر دینی شعائر میں شامل ہے اور اسی لئے صرف مسلمان ہی اسے ادا کرنے کے پابند ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کو قرض حسن سے تعبیر کرنے کی حکمت:

اسلام کی رُو سے انسانی جان ومال کا مالکِ حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، انسان کو صرف اُن پر شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے حقِ تصرُّف (Authority To Dispose) یا حقِ استعمال (Making use of) عطا کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی شخص کا اپنے ہاتھوں اپنی جان کو تلف کرنا یعنی خودکشی (Suicide) حرام ہے اور اس پر وہ عذاب جہنم کا مستحق ہوگا۔ اسی طرح اپنے مال کو بے جا خرچ کرنا جسے شریعت میں اسراف (Excessive Expendituir) کہا جاتا ہے، حرام ہے: اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ۔

ترجمہ: ''فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں''۔(سورۂ اسراء: 27)
اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بلاغت اور اس کی کریمی کا اندازہ لگا لیجئے کہ خود ہی مال عطا کرتا ہے اور پھر اپنے بندے کو عزت عطا کرتے ہوئے فرماتا ہے:
وَأَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ترجمہ: ''اور اللہ کو 'قرضِ حسن' دو، (المزمل: 20)''، اور پھر بندے کو یقین دلاتا ہے کہ جو مال تم اس کی رضا کے لئے اس کے مستحق بندوں کو دو گے، وہ یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کو تم نے ''قرضِ حسن'' (Goodly Loan) دیا اور وہ اللہ تعالیٰ کی امانت وحفاظت میں چلا گیا اور تمہاری یہ امانت محفوظ بھی ہے اور پھل پھول رہی ہے، ارشاد فرمایا: وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا O
ترجمہ: ''اور جو (مال) خیر تم اپنے لئے آگے بھیجو گے تو تم اسے (آخرت میں) خیر کی اور اجرِ عظیم کی صورت میں پاؤ گے، (المزمل: 20)''۔

وجوبِ زکوٰۃ:

مالدار پر زکوٰۃ فرض ہونے کی شرائط یہ ہیں: اسلام، عاقل ہونا، بالغ ہونا، نصاب شرعی کا مالک ہونا (یعنی صاحبِ نصاب ہونا)، نصاب پر پورا ایک قمری سال گزر جانا، مال کا اُس کی مِلک میں ہونا، مال پر قابض ہونا اور نصاب کا دَین (قرض) سے فارغ ہونا۔

حَولانِ حَول کا مفہوم:

زکوٰۃ کے فرض ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مال پر سال گزر جائے، اسے فقہی اصطلاح میں ''حَولانِ حَول'' کہتے ہیں۔حدیث پاک میں ہے:
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لَا زَكَاةَ فِي مَالٍ حَتّٰى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ''۔
ترجمہ: ''کسی مال پر سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہے''۔
(سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1792)
شریعت کی رو سے جس دن کوئی بالغ مسلمان مرد یا عورت زندگی میں پہلی بار مندرجہ بالا تفصیل کے مطابق کم از کم نصاب کا مالک ہو جائے تو اسلامی کیلنڈر کی اسی تاریخ سے وہ ''صاحبِ نصاب'' قرار پاتا ہے۔لیکن اس پر اسی دن سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی تاوقتیکہ اُس نصاب پر اس کی ملکیت میں پورا ایک قمری سال نہ گزر جائے، سال کے اختتام پر

اسی قمری تاریخ پر اسے زکوٰۃ دینی ہوگی۔اور سال بھر کم از کم نصاب کا ملکیت میں رہنا ضروری نہیں ہے بلکہ سال کی ابتدا اور انتہا پر اگر اس کے پاس نصاب کی مقدار مال ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: وَالشَّرطُ تَمَامُ النِّصَابِ فِیْ طَرفَیِ الْحَوْلِ کَمَاسَیَأْتِیْ، ترجمہ: ''اور پورے نصاب کا سال کی ابتدا اور آخر میں (مِلک میں ہونا) شرط ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:3، ص:173)

سال کے دوران اگر کچھ وقت کے لئے مال نصاب سے کم ہوجائے تو یہ کمی وجوبِ زکوٰۃ سے مانع نہیں ہے، البتہ اگر پورا مال ہلاک ہوجائے تو ''حَولانِ حَول'' یعنی نصاب پر سال گزرنے کی شرط باطل ہوجائے گی، یعنی پوری نہیں ہوگی۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (فَلَا یَضُرُّ نُقْصَانُہٗ بَیْنَھُمَا) فَلَوْ ھَلَکَ کُلُّہٗ بَطَلَ الْحَوْلُ۔

ترجمہ: ''پس سال کے درمیان (نصاب کا) کم ہونا ضرر نہیں دیتا، لیکن اگر تمام مال ہلاک ہوجائے تو ''حَولانِ حول'' کی شرط باطل ہوجائے گی، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص 214)''۔

ہر مال پر (خواہ وہ نقد رقم ہو یا سونا چاندی کی صورت میں ہو یا صنعت وتجارت کا مال ہو) سال گزرنا زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے شرط نہیں ہے، اگر مال کے ہر جُزو پر سال گزرنے کی شرط کو لازمی قرار دیا جائے تو تاجر حضرات کے لئے زکوٰۃ کا حساب نکالنا (Assessment) عملاً ناممکن ہوجائے گا، کیونکہ مال کی آمد وخرچ کا سلسلہ روز جاری رہتا ہے، بلکہ تنخواہ دار آدمی بھی ہر ماہ کی تنخواہ سے کچھ پس انداز کرتا ہے، لہٰذا مال کے ہر حصے کی مدت الگ ہوتی۔ دورانِ سال شامل ہونے والے مال کا الگ سال شمار نہیں کیا جاتا بلکہ درمیانِ سال میں حاصل ہونے والا مال جتنا بھی ہو، جب بھی شامل ہو، اس کا وہی سال ہے، جو بنیادی نصاب کا سال ہے۔ بشرطیکہ درمیان میں حاصل شدہ مال مالِ سابق کی جنس میں سے ہو۔

مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں زکوٰۃ کی تشخیص کی مقررہ تاریخ سے چند دن قبل بھی اگر مال 'صاحبِ نصاب'' کی ملکیت میں آجائے تو اسے پہلے سے موجود مال میں شامل کر کے کل مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

سال گزرنے کی شرط کا تعلق سونے، چاندی، نقد رقوم، سامانِ تجارت اور مویشیوں سے ہے۔ زرعی پیداوار، پھلوں، شہد اور کانوں یا زمین سے نکلنے والی چیزوں پر سال گزرنے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ زرعی پیداوار کی کٹائی اور پھلوں کے اتارے جانے پر ہی زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ O

ترجمہ: ''اور (فصل کی) کٹائی کے دن ہی اس کا حق ادا کرو، (الانعام: 141)''۔

سال سے مراد قمری سال ہے:

سال سے مراد ہجری سال کے بارہ مہینے ہیں، چونکہ یہ چاند کے حساب سے ہوتا ہے، اس لئے اسے (Luminar Calendar) کہا جاتا ہے، کیونکہ بعض دینی احکام جیسے عیدین، رمضان المبارک کے روزے، عدت کے احکام اور حج قمری سال سے متعلق ہیں۔ قمری سال تقریباً 354 دنوں پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ شمسی سال 365 دنوں کا ہوتا ہے۔ اگر شمسی سال (Gragorian Calendar) کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے تو قمری مہینوں کے اعتبار سے یہ ایک سال، دس دنوں پر ادا ہوئی، دس دن زائد کی زکوٰۃ اُس کے ذمے رہے گی۔ یعنی 32 شمسی سال (جسے عرفِ عام میں سن عیسوی کہا جاتا ہے) مکمل ہونے پر قمری سال 33 ہوجاتے ہیں اور اس طرح ایک سال کی زکوٰۃ بیچ میں غائب ہوجائے گی، جس کا آخرت میں حساب دینا ہوگا۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے وقت کا اعتبار:

شرعی اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے نہ کوئی مہینہ مقرر ہے نہ تاریخ۔ پاکستان کے بعض علاقوں میں رجب کو زکوٰۃ کا مہینہ کہا جاتا ہے اور کراچی اور بعض دیگر علاقوں میں رمضان المبارک کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا مہینہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ سوچ یا تعامل (Practice) درست نہیں ہے۔ بلکہ وجوبِ زکوٰۃ کی اصل تاریخ وہ دن ہے جس دن کوئی شخص اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ نصاب کے برابر مال کا مالک ہوا۔ اگر کوئی شخص یکم رمضان المبارک کو صاحبِ نصاب ہوا ہو تو اُس کی ادائیگیِ زکوٰۃ کی تاریخ آئندہ سال یکم رمضان المبارک ہے اور آئندہ ہر سال اسی تاریخ کو مال کا حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرے، اس اعتبار سے ہر شخص کے لئے زکوٰۃ کی ادائیگی کی تاریخ الگ الگ ہوگی اور کسی مہینے کو زکوٰۃ کا مہینہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم اگر شروع سے اس کا اہتمام نہیں کیا گیا تو غور وفکر کریں کہ میں کون سے مہینے کی کونسی تاریخ میں نصاب کے برابر مال کا مالک ہوا اور جہاں دل جم جائے اسی کو اپنے سال کی ابتداء شمار کریں اور اگر غور وفکر کے بعد بھی دل کسی تاریخ پر نہ جمے تو اپنی سہولت کے لئے اب کوئی مہینہ اور تاریخ مقرر کر سکتے ہیں، جیسے رجب یا رمضان المبارک کی کوئی تاریخ۔ یونہی رمضان المبارک میں پیشگی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

نصاب زکوٰۃ:

اس سے مراد وہ کم از کم مالیت ہے، جس کا مالک ہونے سے مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے۔ ناپ تول کے موجودہ اَعشاری نظام (Matric System) کے اعتبار سے نصابِ شرعی کی مقدار یہ ہے: 612.36 گرام یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم یا مالِ تجارت جو اس کی بنیادی حاجت سے زائد ہو یا 87.48 گرام یا ساڑھے سات تولہ سونا یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم یا مالِ تجارت جو اس کی حاجت سے زیادہ ہو۔ آج کل چاندی اور سونے کے نصاب کی مالیت میں بہت زیادہ فرق ہے۔ فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر اموال متفرق ہوں (یعنی کچھ سونا، کچھ چاندی اور کچھ مال تجارت یا نقد وغیرہ) یا صرف چاندی ہو، تو چاندی کے نصاب کا ہی اعتبار ہوگا تا کہ ناداروں کو فائدہ ہو، حدیث مبارک میں ہے:

(۱) عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ زُهَيْرٌ: اَحْسِبُهُ سَمِعَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهُ قَالَ هَاتُوْا رُبُعَ الْعُشُوْرِ مِنْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا دِرْهَمٌ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ شَيْءٌ حَتّٰى تَتِمَّ مِائَتَيْ دِرْهَمٍ فَاِذَا كَانَتْ مِاْئَتَيْ دِرْهَمٍ فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ فَمَا زَادَ فَعَلٰى حِسَابِ ذٰلِكَ۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، زہیر کہتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات نبی ﷺ سے سن کر بیان فرمائی: یعنی ہر چالیس درہم پر ایک درہم اور تم پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی جب تک کہ دو سو درہم پورے نہ ہو جائیں، پس جب مالیت دو سو درہم ہو جائے تو ان میں سے پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہے اور جو مقدار اس سے زائد ہو اُس پر اُسی حساب سے زکوٰۃ عائد ہوگی، (سنن ابو داؤد، جلد 1، ص: 220)''۔

(۲) عَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ فَاِذَا كَانَتْ لَكَ مِائَتَا دِرْهَمٍ وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ، وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ يَعْنِيْ فِي الذَّهَبِ حَتّٰى تَكُوْنَ لَكَ عِشْرُوْنَ دِيْنَارًا، فَاِذَا كَانَتْ لَكَ عِشْرُوْنَ دِيْنَارًا وَّحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيْهَا نِصْفُ دِيْنَارٍ، فَمَا زَادَ فَبِحِسَابِ ذٰلِكَ۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر ایک سال گزر جائے تو ان پر پانچ درہم زکوٰۃ ہے اور سونے پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں ہے جب تک

کہ وہ بیس دینار نہ ہو، پس جب سونا بیس دینار ہو جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے، تو اس پر نصف دینار زکوٰۃ ہے، پھر جب سونے کی مقدار بڑھتی چلی جائے تو اُسی حساب سے زکوٰۃ عائد ہوگی، (سنن ابوداؤد، جلد 1، ص:221)"۔ واضح رہے کہ دوسو درہم چاندی کا موجودہ وزن 612.36 گرام یا ساڑھے باون تولہ ہے اور 20 دینار سونے کا موجودہ وزن 87.48 گرام یا ساڑھے سات تولہ ہے۔ ایک تولہ کا وزن 11.664 گرام ہوتا ہے۔

نصاب کی اس تعیین کا مقصد در حقیقت یہ ہے کہ مال کی کم از کم اتنی مقدار ہر گھرانے میں موجود رہے جس سے وہ بآسانی روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی حاصل کر سکیں اور ایسا نہ ہو کہ دوسروں کی مدد و اعانت کرنے سے زکوٰۃ دہندہ خود محتاج ہو جائے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خَیْرُ الصَّدَقَةِ مَا کَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًی

ترجمہ: "بہترین صدقہ وہ ہے جس کے (دینے کے) بعد بھی آدمی مالدار رہے"۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1426)

محض رقم الگ کر دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی:

محض اپنے پاس زکوٰۃ کی نیت سے رقم الگ کر کے رکھ لینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی تاوقتیکہ وہ مستحقین تک پہنچا نہ دی جائے، لہٰذا اگر زکوٰۃ کی نیت سے رقم اپنے پاس الگ کر کے رکھ دی ہو اور خدانخواستہ وہ تلف ہو جائے یا چوری ہو جائے تو زکوٰۃ اب بھی ادا کرنا لازم ہے، اس طرح وہ بری الذمہ نہیں ہوگا۔

اگر کسی نادار شخص نے کسی شخص کے پاس امانت رکھی ہوئی تھی اور وہ اُس سے ضائع ہوگئی، اُس نے جھگڑے سے بچنے کے لئے اُسے زکوٰۃ کی نیت سے کچھ رقم دے دی، تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَاِذَا هلکت الْوَدِیْعَةُ عِنْدَ الْمُوْدِعِ فدفع الْقِیْمَةَ اِلٰی صَاحِبِهَا وَهُوَ فَقِیْرٌ لِدَفْعِ الْخُصُوْمَةِ یُرِیْدُ بِهِ الزَّکَاةَ لَایُجْزِیْهِ، کَذَا فِیْ "فَتَاوٰی قَاضِیْ خَانْ" فِیْ فَصْلِ أَدَاءِ الزَّکَاةِ۔

ترجمہ: "امین کے پاس امانت (کا مال) ضائع ہوگیا، اُس (امین) نے جھگڑے سے بچنے کے لئے (مال کے) مالک کو امانت کے مال کی قیمت (کے برابر) زکوٰۃ کی نیت سے دے دی اور وہ شخص فقیر ہے یعنی زکوٰۃ کا مستحق بھی ہے، تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، جیسا کہ "فتاویٰ قاضی خان" میں احکامِ ادائے زکوٰۃ (کے باب) میں ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری جلد 1، ص: 171)

دورانِ سال زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی:

درحقیقت صاحبِ نصاب ہونے سے زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہوجاتی ہے، فقہی اعتبار سے اِسے ''نفسِ وجوب'' کہتے ہیں، البتہ شریعت کی جانب سے اُس سے ادائیگی کا مطالبہ سال مکمل ہونے پر کیا جاتا ہے، اسے ''وجوبِ ادا'' کہتے ہیں۔ چنانچہ سال مکمل ہونے سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنا اسی فرض کو ادا کرنا ہے۔ اگر دورانِ سال کوئی صاحبِ نصاب تھوڑی تھوڑی رقم وقتاً فوقتاً زکوٰۃ کی نیت سے مستحقین کو ادا کرتا رہا ہے تو سال کے اختتام پر، تشخیصِ زکوٰۃ کے بعد پہلے سے ادا شدہ رقم کو وضع کر کے باقی رقم ادا کرے، اسی طرح مجموعی واجب الاداز کوٰۃ کی رقم کو پیشگی بالاقساط بھی ادا کرسکتا ہے۔

پیشگی زکوٰۃ ادا کرنے میں ایک احتیاط یہ بھی برتی جاسکتی ہے کہ کل مال کا اندازاً حساب کرلیں اور اس پر عائد ہونے والی زکوٰۃ کی رقم علیحدہ رکھ لیں اور روزانہ، ہفتہ وار یا ماہانہ بنیادوں پر جتنا چاہیں، زکوٰۃ دیتے رہیں، سال مکمل ہونے پر جس قدر مال ہو اس کی زکوٰۃ کا حساب لگالیں اور پہلے سے ادا کی ہوئی زکوٰۃ کی رقم منہا کر کے اگر زکوٰۃ باقی ہو تو ادا کردیں۔ اور اگر زیادہ دے دی ہو تو آئندہ سال کی زکوٰۃ سے منہا کرلے۔

سال کے اختتام پر صاحبِ نصاب نہ رہے تو؟:

پیشگی زکوٰۃ ادا کرتے وقت چونکہ یہ علم نہیں ہوتا کہ اختتامِ سال پر نصاب کی صورتحال کیا ہوگی؟، اس لئے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص ابتدائے سال میں صاحبِ نصاب ہو اور اس پر زکوٰۃ واجب ہو اور وہ پیشگی زکوٰۃ ادا کردے، لیکن اختتامِ سال پر اس کے پاس نصاب کے برابر مال نہ رہے اور اس سے زکوٰۃ کا فریضہ ساقط ہوجائے، ایسی صورت میں پیشگی ادا کی ہوئی رقم نفلی صدقہ شمار ہوگی۔

اموالِ تجارت پر زکوٰۃ:

مسلمان تاجر کی ملکیت میں جو بھی مال ہے، یعنی نقد رقم، بینک اکاؤنٹ، بانڈز، ڈیپازٹس، سونا چاندی اور مالِ تجارت وغیرہ، سب مال کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی غرض سے سونا' چاندی اور مالِ تجارت کی وہ قیمت معتبر ہے جو وجوبِ زکوٰۃ کے وقت ہوگی، یعنی قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہے۔ لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان تاجر کو وجوبِ زکوٰۃ کی مقررہ تاریخ پر اپنے مالِ تجارت کی محتاط اسٹاک پیکنگ اور صحیح

قیمت کا تعین (Valuation) کرنا چاہئے۔

مال کی قیمت کا تعین (Valution):

سونا چاندی اور مالِ تجارت کی قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ موجودہ بازاری قیمتِ فروخت (Market Value) کا اعتبار ہوگا۔سونا چاندی کی اشیاء اور زیورات میں غالب جز کا اعتبار ہوگا، یعنی سونے کا زیور جتنے قیراط (مثلاً 20 یا 22 یا 24 Carat وغیرہ) کا ہوگا، اُسی کی قیمت لگائی جائے گی۔

صنعت کاروں کی تشخیص:

وہ کارخانہ جو پیداواری مقاصد کے لئے استعمال ہورہا ہے تو اس کے جامد اثاثہ جات (Fixed Assets) یعنی زمین، عمارت، متعلقہ تنصیبات (Instalations) اور اُس مشینری کی قیمت پر جو اُس صنعت (Industry) میں پیداواری مقاصد میں استعمال ہورہی ہے، زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ البتہ مسلمان صنعت کار کو اپنے دیگر تمام اموال کے ساتھ کارخانے میں موجود تمام خام مال (Raw Material) تیار مال (Finished Goods) اور مارکیٹ میں کریڈٹ پر دیئے ہوئے تمام مال کی بازاری قیمت فروخت (Market Value) نکال کر اس پر زکوٰۃ دینی ہوگی۔

صنعتی وکاروباری مقصد میں استعمال ہونے والی اشیاء کی زکوٰۃ کا حکم:

فرض کریں کہ ایک ٹرانسپورٹر ہے اور اس کی ٹیکسیاں، کاریں، بسیں اور کنٹینرز وغیرہ ہیں، جن کو وہ کرائے پر چلاتا ہے اور کاروبار میں استعمال کرتا ہے، ان کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں بلکہ ان کے کرائے سے حاصل ہونے والی آمدنی سے جو رقم سال کے آخر میں بچ رہے گی، اُس کے تمام ذرائع سے بچے ہوئے مال میں جمع کر کے مجموعی مال پر زکوٰۃ ہے، بشرطیکہ اس مال کی مجموعی مالیت مقدارِ نصاب تک پہنچ چکی ہو۔ اور یہی چیزیں اگر کسی تاجر کے شوروم میں ہیں اور وہ ان کا کاروبار کرتا ہے، تو ان کی موجودہ بازاری قیمت پر زکوٰۃ ہے، کیوں کہ اب یہ مالِ تجارت ہے، پیداوار کا ذریعہ نہیں ہے۔ اسی طرح فرض کریں کہ ٹیکسٹائل مل میں لومز ہیں یا گارمنٹس فیکٹری میں سلائی کی مشینیں (Knitting Machines) ہیں اور وہ اس کارخانے میں صنعتی مقصد کے لئے استعمال ہورہی ہیں، تو ان کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے، جب کہ یہی لومز یا مشینیں اگر تاجر کے شوروم میں ہیں اور برائے فروخت ہیں، تو ان کی موجودہ بازاری قیمت پر زکوٰۃ ہے۔

قرض سے متعلق زکوٰۃ کے احکام

زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جس شخص سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطالبہ ہے، وہ اس قدر مقروض نہ ہو کہ اگر اس کے پاس موجود مال قرض خواہ کو دے دیا جائے تو بقیہ مال نصاب سے کم ہو جائے۔ اگر اتنا مقروض ہے کہ قرض ادا کرنے کے بعد وہ صاحبِ نصاب نہیں رہتا تو گویا اُس کا سارا مال قرض میں گھرا ہوا ہے اور اُس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔

حضرت سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ رمضان المبارک میں اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں: فَمَنْ كَانَ لَهٗ مَالٌ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ فَلْيَحْسِبْ مَالَهٗ بِمَا عَلَيْهِ ثُمَّ لِيُزَكِّ بَقِيَّةَ مَالِهٖ، وَكَانَ بِمَحْضَرٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ، وَلَمْ يُنْكِرْ عَلَيْهِ أَحَدٌ مِّنْهُمْ، فَكَانَ ذٰلِكَ اِجْمَاعًا مِّنْهُمْ عَلٰى أَنَّهٗ لَاتَجِبُ الزَّكَاةُ فِي الْقَدْرِ الْمَشْغُوْلِ بِالدَّيْنِ،

ترجمہ: ''جس شخص کے پاس مال ہے اور اُس شخص پر قرض بھی ہے، تو اُسے چاہیے کہ قرض کے برابر مال کا حساب کر کے بقیہ مال کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اُس وقت صحابۂ کرام کی بڑی تعداد موجود تھی، اُن میں سے کسی ایک نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ لہٰذا اس پر صحابۂ کرام کا اجماع ہوا کہ قرض کے برابر مال پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی، (بدائع الصنائع، جلد 2، ص: 9)''۔

قرض (دین) کی اقسام:

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں:

قَسَّمَ اَبُوْ حَنِيْفَةَ الدَّيْنَ اِلٰى ثَلَاثَةِ اَقْسَامٍ قَوِيٌّ وَهُوَ بَدَلُ الْقَرْضِ وَمَالُ التِّجَارَةِ وَمُتَوَسِّطٌ وَهُوَ بَدَلُ مَالَيْسَ لِلتِّجَارَةِ كَثَمَنِ ثِيَابِ الْبِذْلَةِ وَعَبْدِ الْخِدْمَةِ وَدَارِ السُّكْنٰى وَضَعِيْفٌ وَهُوَ بَدَلُ مَا لَيْسَ بِمَالٍ كَالْمَهْرِ وَالْوَصِيَّةِ وَبَدَلِ الْخُلْعِ وَالصُّلْحِ عَنْ دَمِ الْعَمْدِ وَالدِّيَةِ وَبَدَلِ الْكِتَابَةِ وَالسِّعَايَةِ۔ فَفِي الْقَوِيِّ تَجِبُ الزَّكٰوةُ اذا حال الْحَوْلُ وَيَتَرَاخَى الْاَدَاءُ اِلٰى اَنْ يَّقْبِضَ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا فَفِيْهَا دِرْهَمٌ وَكَذَا فِيْمَا زَادَ فَبِحِسَابِهٖ وَفِي الْمُتَوَسِّطِ لَاتَجِبُ مَالَمْ يَقْبِضْ نِصَابًا وَتُعْتَبَرُ لِمَامَضٰى مِنَ الْحَوْلِ فِيْ صَحِيْحِ الرِّوَايَةِ وفي الضَّعِيْفِ لاتجبُ مالَمْ يَقْبِضْ نِصَابًا وَيَحُوْلُ الْحَوْلُ بَعْدَ الْقَبْضِ عَلَيْهِ، وَثَمَنُ السَّائِمَةِ كثمن عبدالخدمة ولو ورث دَيْنًا على رَجُلٍ فهو كالدَّيْنِ الوسط۔

ترجمہ: ''امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ نے دین کی تین قسمیں بیان کی ہے: (۱) دین قوی (یہ) وہ دین ہے جو قرض اور

مال تجارت کا بدل ہو۔(۲) دین متوسط (یہ) وہ دین ہے جو غیر مال تجارت کا بدل ہو جیسے استعمال کے کپڑوں کا ثمن اور خدمت کے غلام کا ثمن اور رہائشی گھر کا ثمن ۔(۳) دینِ ضعیف (یہ) وہ دین ہے جو غیر مال کا بدل ہو، جیسے (عورت کا) حقِ مہر اور مالِ وصیت اور خلع کا عوض اور قتلِ عمد میں مال پر صلح کرنے کی صورت میں حاصل ہونے والا مال اور مال دیت اور بدل کتابت اور غلام کا اپنے باقی حصے کو آزاد کرنے کے لئے جد وجہد کر کے اس حصے کی رقم مالک کو ادا کرنا (یہ مال بھی دینِ ضعیف ہے)۔دینِ قوی میں سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی (یعنی نفسِ وجوب ثابت ہو جائے گا) اور ادائیگی اس وقت کرے گا جب چالیس درہم پر قبضہ کر لے (یعنی وجوبِ ادا تب لازم ہوگا)، پس چالیس درہم پر ایک درہم واجب ہے۔اسی طرح زیادہ کا اس کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے گا اور دین متوسط میں زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جبکہ پورے نصاب پر قبضہ کر لے اور قبضے کے بعد اس پر ایک سال گزر جائے ۔ چرنے والے جانوروں کا ثمن غلام کے ثمن کی طرح ہے (یعنی یہ بھی دینِ متوسط ہے) اور اگر کوئی شخص کسی کے قرض کا وارث بن جائے تو یہ بھی دین متوسط ہی کی طرح ہے، (فتح القدیر، جلد:02،ص:176)''۔

ملک العلماء علامہ کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

وَجُمْلَةُ الْكَلَامِ فِي الدُّيُوْنِ اَنَّهَا عَلٰى ثَلَاثِ مَرَاتِبَ فِيْ قَوْلِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ دَيْنٌ قَوِيٌّ وَدَيْنٌ ضَعِيْفٌ وَدَيْنٌ وَسَطٌ، كَذَا قَالَ عَامَّةُ مَشَائِخِنَا اَمَّا الْقَوِيُّ وَهُوَالَّذِيْ وَجَبَ بَدَلًا عَنْ مَالِ التِّجَارَةِ كَثَمَنِ عَرَضِ التِّجَارَةِ مِنْ ثِيَابِ التِّجَارَةِ وَعَبِيْدِالتِّجَارَةِ اَوْ غَلَّةِ مَالِ التِّجَارَةِ وَلَا خِلَافَ فِيْ وُجُوْبِ الزَّكٰوةِ فِيْهِ اِلَّا اَنَّهُ لَا يُخَاطَبُ بِاَدَاءِ شَيْءٍ مِنْ زَكٰوةِ مَا مَضٰى مَالَمْ يَقْبِضْ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا فَكُلَّمَا قَبَضَ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا اَدّٰى دِرْهَمًاوَّاحِدًا وَعِنْدَ اَبِيْ يُوْسُفَ وَمُحَمَّدٍ كُلَّمَا قَبَضَ شَيْئًا يُؤَدِّيْ زَكٰوتَهٗ قَلَّ الْمَقْبُوْضُ اَوْ كَثُرَ وَاَمَّاالدَّيْنُ الضَّعِيْفُ فَهُوَالَّذِيْ وَجَبَ لَهٗ بَدَلًا عَنْ شَيْءٍ سَوَاءٌ وَجَبَ لَهٗ بِغَيْرِ صُنْعِهٖ كَالْمِيْرَاثِ اَوْبِصُنْعِهٖ كَالْوَصِيَّةِ اَوْ وَجَبَ بَدَلًا اِمَّا لَيْسَ بِمَالٍ كَالْمَهْرِ وَبَدَلِ الْخُلْعِ وَالصُّلْحِ عَنِ الْقِصَاصِ وَبَدَلِ الْكِتَابَةِ وَلَا زَكٰوةَ فِيْهِ مَالَمْ يَقْبِضْ كُلَّهٗ وَيَحُوْلُ عَلَيْهِ الْحَوْلُ بَعْدَ الْقَبْضِ، وَاَمَّا الدَّيْنُ الْوَسَطُ فَمَا وَجَبَ لَهٗ بَدَلًا عَنْ مَالٍ لَيْسَ لِلتِّجَارَةِ كَثَمَنِ عَبْدِالْخِدْمَةِ وَثَمَنِ ثِيَابِ الْبِذْلَةِ وَالْمِهْنَةِ۔

ترجمہ: ''دیون کے بارے میں خلاصۂ کلام یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں: (۱) دینِ قوی، (۲) دینِ ضعیف، (۳) دین وسط اسی طرح ہمارے مشائخ نے بھی یہی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

دین قوی سے مراد وہ دین ہے جو مالِ تجارت کے بدلے میں (کسی کے) ذمہ واجب ہو، جسے تجارت کے سامان کا ثمن اور تجارت کے کپڑوں کا ثمن اور تجارت کے غلاموں کا ثمن یا مالِ تجارت کے منافع۔ دین قوی میں زکوٰۃ کے واجب ہونے (یعنی نفسِ وجوب) میں کسی کا اختلاف نہیں ہے البتہ جب تک چالیس درہم پر قبضہ نہیں کرے گا تو گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کا اسے حکم نہیں دیا جائے گا، جب بھی چالیس درہم پر قبضہ کرے گا تو ایک درہم زکوٰۃ میں ادا کرے گا (یعنی وجوبِ ادا کا حکم تب لگایا جائے گا) اور صاحبین کے نزدیک جب بھی مال کی کچھ مقدار پر قبضہ کرے گا تو اس کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی، خواہ وہ مقدارِ مقبوض کم ہو یا زیادہ۔ اور دینِ ضعیف سے مراد وہ دین ہے جو کسی شے کے عوض ذمہ پر واجب ہو جائے، خواہ اس کے فعل کا اُس میں دخل ہو یا نہ ہو، جیسا کہ مالِ میراث اور مالِ وصیت، یا جو غیرِ مال کے بدلے میں کسی کے ذمہ پر واجب ہوا ہو جیسے کہ عورت کا حق مہر اور خلع کا عوض اور قتلِ عمد میں مال پر صلح کرنا اور کتابت کا عوض۔ دینِ ضعیف میں جب تک کل مال پر قبضہ نہیں کرے گا، اس وقت اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور یہ ضروری ہے کہ قبضے کے بعد اس پر ایک سال بھی گزر جائے اور دینِ متوسط سے مراد وہ دین ہے، جو غیرِ مالِ تجارت کے بدلے میں کسی کے ذمے پر واجب ہوا ہو جیسے خدمت کے غلاموں کا ثمن اور استعمال اور کام کاج کے کپڑوں کا ثمن، (اس پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کل مال قبضہ ہو جائے اور قبضے کے بعد اس پر سال بھی گزر جائے)، (بدائع الصنائع، جلد:02،ص:14)''۔

حکم:

دینِ قوی اور دینِ متوسط کی زکوٰۃ سال بہ سال واجب ہوتی رہے گی مگر دَین قوی میں واجب الادا اُس وقت ہوگی، جب نصاب کا پانچواں حصہ وصول ہو جائے، جتنا وصول ہوا، اُتنے پر ہی زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً اگر چالیس درہم وصول ہوئے تو ایک درہم زکوٰۃ واجب ہوگی، اسی درہم وصول ہوئے تو دو درہم زکوٰۃ واجب ہوگی۔

دینِ متوسط پر زکوٰۃ اُس وقت واجب ہوگی جب مکمل دو سو درہم پر قبضہ ہو جائے، اس وقت پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہوگی۔ دینِ ضعیف پر زکوٰۃ اُس وقت واجب ہے جب نصاب پر قبضہ کرنے کے بعد سال گزر جائے گزشتہ سالوں کا اس میں اعتبار نہیں یا اُس کے پاس (پہلے سے) کوئی نصاب اُسی جنس کا ہے اور اس کا سال

تمام ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہے۔

بقدر نصاب مقروض پر زکوٰۃ نہیں:

زکوٰۃ لازم ہونے کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ جس شخص سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا جارہا ہے، وہ اس قدر مقروض نہ ہو کہ اگر اس کے پاس موجود مال قرض خواہ کو دے دیا جائے تو بقیہ مال مقدارِ نصاب کی حد سے گھٹ کر نیچے چلا جائے۔ اگر اتنا مقروض ہو کہ قرض وضع کرنے کے بعد اس کا مال زکوٰۃ کے نصاب کی مقدار سے نیچے چلا جائے گا تو گویا اس شخص کا کل مال قرض میں گھرا ہوا ہے اور اس پر زکوٰۃ لازم نہیں۔ مثلاً ایک شخص کے پاس اُس کی حقیقی ضروریات سے زائد ایک لاکھ روپے موجود ہیں اور نصاب یعنی زکوٰۃ لازم ہونے کی کم از کم حد پچیس ہزار روپے ہے، جبکہ اُس شخص پر پچھتر ہزار روپے سے زائد قرض ہے، ایسا شخص مقروض شمار ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگا۔ ہاں! اگر اُس پر اتنا قرض ہے کہ قرض وضع کرنے کے بعد بھی اتنی رقم بچ رہے گی جو نصاب کی حد کو پہنچتی ہو تو اُس بچ جانے والی رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور وہ شخص مقروض کے حکم میں نہیں ہوگا۔

زکوٰۃ واجب ہونے میں وہ قرض رکاوٹ ہے جو زکوٰۃ واجب ہونے سے پہلے کا ہو۔ زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد جو قرض لیا اُس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ قرض نیا ہے اور زکوٰۃ اس سے پہلے واجب ہو چکی تھی۔

وجوب زکوٰۃ سے مانع قرض کی مختلف شکلیں:

ہر وہ قرض جو بندوں کی جانب سے کسی شخص کے ذمے ہو، زکوٰۃ کے وجوب میں مانع ہے، مثلاً کوئی چیز خریدی اور اُس کی قیمت کی ادائیگی باقی ہو، تاوان کی وجہ سے ہو یا خلع کے عوض میں مال ادا کرنا لازم ہو یا بطور دیت رقم کا ادا کرنا لازم ہو۔

بیوی کا مہر زکوٰۃ واجب ہونے سے مانع نہیں:

بیوی کا مہر بھی قرض میں شمار ہوتا ہے، خواہ مُعجّل (Prompt) یعنی فوری واجب الادا ہو یا مؤجّل (Deferred) یعنی فوری واجب الادا نہ ہو۔ آج کل بالعموم عورتوں کا مہر مؤجّل ہی ہوتا ہے، جس کا مطالبہ عام طور پر دونوں میں سے کسی ایک کی موت یا طلاق کے بعد ہی ہوتا ہے۔ تو یہ ایسا قرض نہیں ہے، جو وجوبِ زکوٰۃ میں مانع ہو۔

علامہ علاؤالدین ابوبکر کاسانی حنفی لکھتے ہیں: وَقَالَ بَعْضُ مَشَايِخِنَا :اِنَّ الْمُؤَجَّلَ لَايَمْنَعُ لِأَنَّهُ غَيْرُ مُطَالَبٍ بِهِ عَادَةً ،

ترجمہ: ''ہمارے بعض مشائخ کا کہنا یہ ہے کہ مہر مؤجل زکوٰۃ واجب ہونے میں رکاوٹ نہیں ہے، اس لئے کہ عورت عادتاً مہر کا مطالبہ بھی نہیں کرتی، (بدائع الصنائع، جلد2، ص:9)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: قَالَ مَشَائِخُنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِىْ رَجُلٍ عَلَيْهِ مَهْرٌ مُؤَجَّلٌ لِامْرَاتِهٖ وَهُوَ لَايُرِيْدُ اَدَائَهٗ لايُجعلُ مانعاً مِنَ الزَّكوٰةِ لِعَدَمِ المطالَبَةِ فِى الْعَادَةِ ۔

ترجمہ: ''ہمارے مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ایسا شوہر، جس کے ذمے اس کی بیوی کا مہرِ مؤجل (Defered Dowery) ہے اور وہ اس کے ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، تو یہ قرض وجوبِ زکوٰۃ کے لئے رکاوٹ نہیں ہوگا کیوں کہ عورت عادتاً مہر کا مطالبہ بھی نہیں کرتی، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:173، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

☆☆☆☆☆

طویل المیعاد قرضوں کا مسئلہ:

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کا قرض، بعض زرعی، صنعتی اور تجارتی قرضوں کی ادائیگی فی الفور لازم نہیں ہوتی بلکہ وہ پانچ، دس، پندرہ سال یا اس سے بھی زائد مدت پر محیط ہوتے ہیں اور ماہانہ یا سالانہ اقساط واجب الادا ہوتی ہیں۔فوری ادائیگی کا نہ قرض خواہ مطالبہ کرتا ہے اور نہ مقروض شخص فوری طور پر قرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی ملکیت میں رقم ہونے کے باوجود مقررہ اقساط سے زیادہ ادا نہیں کرتا، ورنہ یہ سوال زیرِ بحث آنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ایسے قرضوں کے بارے میں ہمارے فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ دینِ مؤجل (یعنی جس قرض کی واپسی کا فوری مطالبہ نہ ہو) وجوبِ زکوٰۃ اور ادائیگیِ زکوٰۃ میں مانع نہیں ہے۔صدر الشریعہ مفتی امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ ردالمحتار کے حوالے سے بہارِ شریعت میں لکھتے ہیں: ''جو دَین میعادی ہو وہ مذہبِ صحیح میں وجوبِ زکوٰۃ کا مانع نہیں، (بہارِ شریعت، جلد:01،ص:879)''۔

اس کی ایک مثال فقہاء نے بیوی کے مہرِ مؤجل کی دی ہے کہ بیوی مطالبہ نہیں کرتی اور شوہر کا عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سرِ دست ادا نہیں کرنا چاہتا، لہٰذا شوہر تشخیص زکوٰۃ کے وقت ایسے دینِ مہر کو اپنی کل مالیت سے وضع نہ کرے۔طویل المیعاد (Long Term) قرضوں کی نوعیت بھی اس سے مختلف نہیں ہے، اسی طرح طویل المدتی صنعتی قرضوں کا معاملہ ہے، ایک طرف تو ان قرضوں کے مقابل اتنی یا اس سے زیادہ مالیت کے اثاثے (ASSETS) موجود ہوتے ہیں، صنعت بیمار قرار پاتی ہے لیکن صنعت کار کی مالی صحت پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوتے، اس کے بنگلے، ذاتی اثاثے، جائیدادیں، کاریں، غیر ملکی مہنگے سفر پوری شان کے ساتھ قائم ودائم رہتے ہیں۔ان کے اور ان کے اہل وعیال کی بود وباش اور رہن سہن انتہائی مال داری کی سطح پر نظر آتے ہیں۔کچھ ہمارے انکم ٹیکس وغیرہ کے پیچیدہ قوانین، بیوروکریسی کے لامحدود صوابدیدی اور انضباطی اختیارات، ایسی وجوہ ہیں کہ کالے دھن (Black Money) اور سفید دھن (White Money) کا مسئلہ آج تک حل نہیں ہو پایا۔ہمارے اہلِ ثروت اور صنعت کاروں کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ معاملہ شفاف رکھنا چاہئے اور طویل المدتی قرضوں کو وضع کئے بغیر اپنی پوری مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے تاکہ کل قیامت کے دن اپنے ہی جمع کردہ مال سے داغے نہ جائیں۔

گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ قرض ہے:

اگر ایک شخص کے ذمے کئی سال کی زکوٰۃ واجب الادا ہے اور اب اسے احساسِ فرض ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ادا کرنے کی توفیق وسعادت عطا کی ہے، تو اگر اس کے پاس ریکارڈ ہے کہ گزشتہ سالوں کے اختتام پر اس کی مالیت کیا تھی، تو ہر سال کے اختتام پر کل مالیت میں سے پچھلے سال کی زکوٰۃ وضع کر کے اپنی مالیت کا تعین کرے گا اور اسی ترتیب سے گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

تشخیصِ زکوٰۃ کے وقت واجب الادا قرض کا مسئلہ:

تاجر حضرات کا اکثر مارکیٹ میں لین دین جاری رہتا ہے، کسی سے کچھ لینا ہے اور کسی کو کچھ دینا ہے۔ تجارت سے ہٹ کر بعض اوقات لوگوں کا شخصی لین دین بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا تشخیص زکوٰۃ کے وقت واجب الوصول (Receivable) رقم کو اپنی مالیت میں جمع کر کے اس سے واجب الادا (Payable) رقم کو منہا کر دیا جائے، اس کے بعد جو مجموعی مالیت نصاب زکوٰۃ بنے گی تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قرض کی زکوٰۃ کس کے ذمے ہے؟:

قرض میں ہر فریق کی ملکیت ناقص ہوتی ہے۔ قرض خواہ کی ملکیت اس لئے ناقص ہوتی ہے کہ مکمل ملکیت کے لئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے: (۱) مال پر ملکیت (۲) مال پر قبضہ وتصرُّف (یعنی خرچ کرنے اور روکے رکھنے کا اختیار)۔

قرض دینے والا مال کا حقیقی مالک ہے، مگر قرض دینے کے بعد اُس کی ملکیت تو قائم ہے لیکن تصرُّف موجود نہیں۔ مقروض کی ملکیت اس لئے مکمل نہیں کہ اس کے پاس تصرُّف تو ہے مگر وہ اس مال کا قانونی مالک نہیں ہے۔ فقہ حنفی کے مطابق اگر مقروض صاحبِ حیثیت اور دیانت دار ہے کہ قرض واپس کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور قرض کی ادائیگی سے انکاری بھی نہیں ہے یا اگر مقروض انکاری ہے اور قرض دہندہ کے پاس ٹھوس شہادتیں یا تحریری دستاویزات اور ثبوت موجود ہیں۔ چونکہ ایسی صورت میں قرض وصول ہونے کی قوی امید موجود ہے، تو یہ ایسے ہی ہے جیسے یہ مال قرض دہندہ کے قبضے اور تصرُّف میں ہو، لہٰذا اس قرض کی زکوٰۃ قرض خواہ پر واجب

ہے۔اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہر سال اپنے واجب الوصول (Receiveable) قرض کی رقم کو اپنی کل مالیت میں جمع کر کے زکوٰۃ ادا کرتا رہے، ہوسکتا ہے اس کی برکت سے قرض جلد وصول ہو جائے ورنہ قرض کی رقم جب بھی وصول ہوگی تو اُس پر پچھلے تمام سالوں کی اکٹھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

کسی مال پر زکوٰۃ فرض ہونے کے لئے اس پر ''مِلکِ تام'' ہونا ضروری ہے۔ فقہ حنفی کی رُو سے ''مِلکِ تام'' کے لئے ملکیت (Ownership) اور بالفعل قبضہ (Physical Possession) دونوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ فرض ہونے کے لئے مال کا مملوک (Owned) ہونا شرط ہے۔ لہٰذا مقروض پر جو دَین واجب ہے، اُس کی زکوٰۃ مقروض کے ذمے نہیں ہے، کیونکہ یہ مال اس کی مِلکیت میں نہیں ہے، اس مال کی زکوٰۃ اس کے اصل مالک پر ہوگی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مال مالک کے قبضے میں ہو، لہٰذا:

(الف) مقروض پر اگر دَین ہے اور وہ اُس کا اقرار بھی کرتا ہے، تو اُس کی زکوٰۃ قرض خواہ پر واجب ہے۔

(ب) تنگ دست مقروض یا جس کو قاضی نے مُفلِس اور دیوالیہ (Insolvent) قرار دیا ہو، اسے جدید اصطلاح میں Bankrupt بھی کہا جاتا ہے۔ ایسے شخص کے ذمے اگر کسی کا دَین (قرض) ہے، تو صحیح قول کے مطابق اصل مالک پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ لیکن اس زکوٰۃ کی ادائیگی فی الفور واجب نہیں ہے، بلکہ مقروض سے قرض کی وصولی پر زکوٰۃ دینا واجب ہوگی۔ اور مال جب بھی ملے پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ دینی ہوگی، خواہ اب دے یا قرض کی رقم وصول ہونے پر دے۔ کیونکہ مال آنی جانی چیز ہے، اگر آج بالکل خالی ہاتھ ہے، تو اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں، ممکن ہے وہ محنت کرے تو اس کے پاس دوبارہ مال آجائے۔ اسی طرح جس مال کو قاضی کے ذریعے وصول کیا جاسکتا ہے یعنی مقروض اقراری ہے یا قرض خواہ کے پاس گواہ اور دستاویزی ثبوت موجود ہیں، جن کی بنا پر وہ عدالت کے ذریعے مقروض سے مال وصول کرسکتا ہے، تو اس کی زکوٰۃ اصل مالک پر واجب ہے۔ البتہ ایسا مقروض جو منکر ہے اور قرض خواہ کے پاس گواہ یا دستاویزی ثبوت بھی نہیں ہیں، تو یہ ''مالِ ضمار (گمشدہ مال)'' کی طرح ہے اور اس مال کی زکوٰۃ قرض خواہ پر واجب نہیں ہے۔ تاہم یہ مال بھی اگر خوش قسمتی سے مل جائے تو اس پر بھی آئندہ سالوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

یہ فتاویٰ عالمگیری (جلد 1 ص:174)، بدائع الصنائع (الجزالثانی ص:13)، ردالمحتار علی الدرالمختار (جلد 3 ص:172-171) اور الفقہ الاسلامی وادلتہٗ (جلد 3 ص:1800) کی ابحاث کا خلاصہ ہے۔

اگر قرض خواہ اِس مال کے ملنے سے پہلے بھی مال دار ہے، تو رواں سال کے مال میں جمع کر کے مجموعی مال کی زکوٰۃ دے گا۔ اور اگر پہلے سے مال دار نہیں ہے تو اس مال کے واپس ملنے کی تاریخ سے نیا سال شروع ہوگا اور سال گزرنے پر اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

پھنسے ہوئے اور ڈوبے ہوئے قرض کی زکوٰۃ:

اگر صاحبِ نصاب کے قرض کی رقم پھنسی ہوئی ہے اور مقروض نادہندہ ہے لیکن اس کی واپسی کی آس قائم ہے تو اس کی زکوٰۃ دے دینی چاہئے، اگر نہ دی تو ملنے پر گزشتہ ساری مدت کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔ البتہ قرض کی ڈوبی ہوئی رقم کی زکوٰۃ اگر نہ دی تو وہ جواب دِہ نہیں ہوگا۔ مالِ ضمار پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں ہے یعنی ایسا مال جس پر قانونی ملکیت ہونے کے باوجود اس سے نفع اٹھانا ممکن نہ ہو مثلاً گم شدہ جانوروں اور مال کی زکوٰۃ فرض نہیں۔ یوں ہی جو مال سمندر میں گر جائے یا ایسا ڈوبا ہوا قرض کہ مقروض تسلیم کرنے سے انکاری ہو اور مالک کے پاس اس کی کوئی شہادت یا دستاویز نہ ہو، اسی طرح اگر کوئی شخص جنگل یا صحرا میں اپنا خزانہ چھپا دے، پھر اس کے مقام کو بھول جائے تو اس پر اس کی زکوٰۃ لازم نہ ہوگی، (فقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد 3، ص:1800)، (بہارِ شریعت، جلد 1، حصہ پنجم، ص:877-876)۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَيُشْتَرطُ اَنْ يَتَمَكَّنَ مِنَ الْاِسْتِنْمَاءِ بِكَوْنِ الْمَالِ فِيْ يَدِهٖ اَوْ يَدِنَائِبِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَتَمَكَّنْ مِنَ الْاِسْتِنْمَاءِ فَلَا زَكٰوةَ عَلَيْهِ، وَذَالِكَ مِثْلُ مَالِ الضِّمَارِ كَذَافِي " التَّبْيِيْنِ "☆☆ وَهُوَ كُلُّ مَابَقِيَ اَصْلُهٗ فِيْ مِلْكِهٖ وَلٰكِنْ زَالَ عَنْ يَدِهٖ زَوَالًا لَا يُرْجٰى عَوْدُهٗ فِي الْغَالِبِ كَذَا فِي " الْمُحِيْطِ "☆ وَمِنْ مَالِ الضِّمَارِ الدَّيْنُ الْمَجْحُوْدُ وَالْمَغْصُوْبُ اِذَالَمْ يَكُنْ عَلَيْهِمَا بَيِّنَةٌ فَاِنْ كَانَتْ عَلَيْهِمَا بَيِّنَةٌ وَجَبَتِ الزَّكٰوةُ۔

ترجمہ: ''اور شرط یہ ہے کہ صاحب مال کو مال بڑھانے کی قدرت ہو، وہ اس طرح کہ مال اس کے اپنے قبضے میں ہو یا اس کے نائب کے قبضے میں ہو، پس اگر وہ مال کو بڑھانے پر قادر نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے اور یہ ''مالِ ضمار'' کی طرح ہے، تبیین میں اسی طرح ہے۔ مالِ ضمار سے مراد ہر وہ مال ہے جس پر اُس کی مِلک قائم ہو، لیکن اس کے قبضے سے اس طرح نکل گیا ہو کہ اُس کے ملنے کا غالب امکان نہ ہو، ''محیط'' میں اسی طرح ہے۔ اور مالِ ضمار ہی کے حکم

میں وہ قرض بھی ہے جس کا مقروض منکر ہو جائے یا جس مال کو غصب کر لیا جائے، جبکہ اُس پر کوئی گواہ بھی نہ ہو، اگر اُس پر کوئی گواہ ہے تو زکوٰۃ واجب ہو گی''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:174)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

ترجمہ: ''مندرجہ ذیل اموال میں گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ نہیں ہے:

۱۔ جو مال گم ہو گیا ہو اور کئی سال بعد ملا ہو۔

۲۔ جو مال سمندر میں گر گیا ہو اور کئی سال بعد نکالا گیا ہو۔

۳۔ جس مال کو غصب کر لیا گیا ہو اور اس پر کوئی گواہ نہ ہو اور کئی سال بعد مل جائے۔ ہاں! اگر غصب شدہ مال پر گواہ ہو تو گزشتہ عرصے کی زکوٰۃ دینی ہو گی۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

۴۔ یا خشکی میں دفن ہو، لیکن جگہ بھول گیا ہو اور کچھ سال بعد یاد آئے۔

۵۔ کسی اجنبی کے پاس مال کو امانت رکھا ہے، لیکن مُوَدَع (یعنی جس کے پاس امانت رکھا گیا ہے)، معلوم نہ ہو۔

نوٹ: اس کے تحت علامہ شامی نے لکھا ہے: اگر جان پہچان والے کے پاس امانت رکھا ہے، تو ملنے پر گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ ہو گی، کیونکہ اِس بھول میں اُس کی اپنی کوتاہی ہے، بحوالہ ''البحر الرائق''۔ ہاں! البتہ اگر محفوظ جگہ میں دفن ہے، جیسے اُس کے اپنے گھر میں یا کسی اور کے گھر میں، تو ملنے پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ہو گی، بحوالہ ''البحر الرائق''۔ ایک قول یہ ہے کہ بڑا گھر صحرا کے حکم میں ہے۔ مالِ مدفون کے ملنے پر وجوبِ زکوٰۃ میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ گزشتہ عرصے کی زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ اس تک پہنچنا ممکن ہے اور ایک قول یہ ہے کہ واجب نہیں ہے، کیونکہ وہ محفوظ نہیں ہے، بحوالہ ''البحر الرائق''۔۔۔۔ تنویر الابصار مع الدالمختار میں ہے کہ زکوٰۃ کے عدمِ وجوب کی علت نمو (Growth) کا نہ ہونا اور اس میں اصل، حضرتِ علی کی یہ حدیث ہے کہ: ''مالِ ضمار میں زکوٰۃ نہیں ہے'' اور مالِ ضمار اسے کہتے ہیں کہ مِلک باقی ہو لیکن اُس سے نفع اٹھانا ممکن نہ ہو اور اگر کسی مال دار پر قرض ہے جو اقراری بھی ہے (اس کے تحت علامہ شامی نے لکھا: اس سے مراد وہ غنی ہے جو ادا نہیں کر رہا) یا تنگدست ہے یا دیوالیہ ہے کہ قاضی نے اس کے دیوالیہ ہونے کا حکم لگا دیا ہے یا مقروض منکر ہے، لیکن اُس پر گواہ موجود ہیں۔ تو (ایسے اشخاص کے ذمے واجب الاداء قرض پر زکوٰۃ کے وجوب کے بارے میں) امام محمد کا قول یہ ہے کہ ان پر

زکوٰۃ نہیں ہے اور یہی صحیح ہے، اس قول کو ابنِ مالک وغیرہ نے ذکر کیا کیونکہ کبھی گواہوں کی گواہی رد ہو جاتی ہے یا قاضی کو اس کا علم ہو، اور عنقریب آگے آئے گا کہ علمِ قاضی پر فیصلہ کرنا مفتیٰ بہ نہیں ہے، تو جب یہ مال اُس کی مِلک میں پہنچے گا تو گزشتہ عرصے کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔

نوٹ: اس کے تحت علامہ شامی نے لکھا: "تحفہ"، "غایۃ البیان" اور "خانیہ" میں اسے صحیح قرار دیا گیا ہے اور اسے "امام سرخسی" کی جانب منسوب کیا ہے، بحوالہ "البحر الرائق"۔ اور "النہر الفائق" کے باب المصرف میں عقد الفرائد کے حوالے سے منقول ہے کہ ضروری ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ پھر علامہ شامی لکھتے ہیں: میں کہتا ہوں باقانی نے "الکافی" کے حوالے سے وجوبِ زکوٰۃ کی تصحیح کو نقل کیا ہے اور فرمایا: یہی قول معتمد ہے۔ اور "فخر الاسلام" کا رجحان بھی اسی طرف ہے اور اسی لئے "ہدایہ"، "الغرر" اور "الملتقی" میں اسی پر جزم کیا گیا ہے اور مصنف نے بھی انہیں کی پیروی کی ہے۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:03، ص:72-171 ملخصاً)

پھنسا ہوا یا ڈوبا ہوا قرض زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہوتا:

اگر مقروض نادہند اور نادار ہے تو قرض میں پھنسی ہوئی رقم کے لئے یہ نیت کر لینا کہ وہ زکوٰۃ میں عنداللہ شمار ہو جائے، ایسی نیت کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ ابتدا میں نادار کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت کی ہو۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب اُسے زکوٰۃ کی رقم دے دے اور مقروض اس رقم کا مالک بن کر ادائے قرض میں اسے واپس کر دے، یہ شرعاً جائز ہے۔

رہن رکھے ہوئے مال پر زکوٰۃ نہیں:

جو مال گروی (رہن) رکھا گیا ہو اس پر بھی زکوٰۃ نہیں، نہ مال کے مالک پر اور نہ ہی اس شخص پر جس کے پاس مال گروی رکھا گیا ہے۔ رہن میں مال دینے والا اس وقت مال سے فائدہ اٹھانے سے قاصر ہے اور مال لینے والا اس مال کا قانونی مالک نہیں ہے۔ اسی طرح بینکوں میں بطور ضمانت رکھوائی جانے والی رقوم پر بھی زکوٰۃ لازم نہیں۔

بطور زرِ ضمانت جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں:

ٹیلیفون، گیس اور بجلی کی کمپنیوں کے پاس بھی کچھ زرِ ضمانت (Guarantee Money) کی رقم جمع ہوتی ہے

اور کرائے دار کا مالک مکان کے پاس جو زرِ ضمانت جمع ہوتا ہے، یہ سب اس اصول کے تحت وجوبِ زکوٰۃ سے مانع ہیں۔

تعلیمی اداروں میں بطور سیکورٹی رقم کی زکوٰۃ:

تعلیمی اداروں میں داخلے کے وقت طلباء سیکورٹی فیس کے طور پر کچھ رقم جمع کراتے ہیں۔ پرائیویٹ اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں بھاری رقمیں وصول کی جاتی ہیں، جو فراغت کے وقت یقینی طور پر واپس مل جاتی ہیں۔ جس طرح رہن رکھی ہوئی رقم قابلِ زکوٰۃ نہیں، اُسی پر اِسے قیاس کرتے ہوئے جب تک یہ رقم ادارے کے پاس رہے گی، قابلِ زکوٰۃ شمار نہیں ہوگی، ملنے کے بعد ان پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ نہیں ہے۔

بطور بیعانہ دی گئی رقم پر زکوٰۃ:

زمینوں کے بیعانوں کا بھی یہی حکم ہے کہ بطور بیعانہ پیشگی وصول کی ہوئی رقم کی زکوٰۃ زمین بیچنے والے کے ذمے ہے۔ اسی طرح تعمیراتی کمپنیاں، پلازوں کی دکانوں یا مکانات کے عوض میں بطور ایڈوانس رقوم وصول کرتی ہیں جب کہ دکان یا مکان کا قبضہ دو چار سال بعد دیا جاتا ہے۔ اس ایڈوانس رقم کے چونکہ وہ قانونی مالک ہوتے ہیں اور اس پر ان کا قبضہ بھی ہوتا ہے اور تصرُّف (یعنی استعمال میں لانا) بھی کر سکتے ہیں، لہٰذا اس کی زکوٰۃ بلڈر یا ڈیولپر (Developer) پر ہوگی۔

پگڑی کے طور پر دی ہوئی رقم کی زکوٰۃ:

پگڑی کے جائز یا ناجائز ہونے کی بحث یہاں ہمارے موضوع کا حصہ نہیں ہے، دکان یا مکان کرایہ پر حاصل کرنے کے لئے بھاری رقوم بطور پگڑی دی جاتی ہیں، جن کی واپسی عملاً نہیں ہوتی۔ عرف میں اِسے واپس کرنے کا رواج ہے اور نہ ہی دکان یا مکان خالی کرتے وقت مالک مکان سے اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے بلکہ کرایہ دار نئے کرایہ دار سے اتنی یا اس سے زیادہ رقم ملنے کی شرط پر دکان کا قبضہ دیتا ہے۔ اس طرح مالک کو دی گئی رقم اسی کے قبضے میں رہتی ہے اور اسے اس کا مالک سمجھا جاتا ہے، لہٰذا اس رقم کی زکوٰۃ دکان یا مکان کے مالک پر ہے۔

شیئرز پر زکوٰۃ کا مسئلہ:

سرمائے کی ایک نئی شکل کمپنیوں کے حِصص (Shares) ہیں، جب کوئی آدمی کسی کمپنی میں شرکت کے لئے

سرمائے کی ایک نئی شکل کمپنیوں کے حِصَص (Shares) ہیں، جب کوئی آدمی کسی کمپنی میں شرکت کے لئے اسے اپنا سرمایہ دیتا ہے تو کمپنی حصے دار (Share Holder) کو ایک سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہے، جو اس بات کی سند یا رسید ہوتی ہے کہ اس شخص کا کمپنی میں کس قدر حصہ ہے۔

پبلک لمیٹڈ کمپنیوں کے حِصَص (Shares) کی خرید وفروخت بازارِ حِصَص (Stock Market/Stock Exchange) میں ہوتی ہے۔ حِصَص خریدنے والے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں:

(۱) وہ لوگ جو کمپنی کے شریک بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ Divident کی صورت میں کمپنی جو منافع شرکاء میں تقسیم کرتی ہے، وہ اس کے حق دار ہوتے ہیں اور اپنی شراکت داری کمپنی کے ساتھ جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں دیکھا جائے گا کہ کمپنی کے جامد اثاثہ جات (Fixed Assets) کی مالیت کا فیصد تناسب کمپنی کے کل اثاثہ جات کے ساتھ کیا ہے؟۔ فرض کیجئے کہ جامد اثاثہ جات کا تناسب کمپنی کے کل اثاثوں کا چالیس فیصد ہے، تو ایسی صورت میں شیئر کی Face Value نہیں بلکہ بازاری قیمت فروخت (Market Value) نکال کر اس کا چالیس فیصد منہا کر کے بقیہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (۲) وہ لوگ جو کمپنی کے شیئرز کاروباری مقصد کے لئے خریدتے ہیں، جیسا کہ عام طور پر Stock Exchange میں ہوتا ہے، تو یہ مالِ تجارت ہے اور اس کی کل بازاری قیمتِ فروخت (Market Value) پر زکوٰۃ شراکت دار (Share Holder) پر واجب ہوگی۔

پرائز بانڈز پر زکوٰۃ:

سرمایہ محفوظ رکھنے اور اُسے بڑھانے کا ایک ذریعہ پرائز بانڈز ہیں۔ یہ ایک ایسی سرکاری دستاویز ہے، جسے کسی بھی وقت بینک سے کیش کرا سکتا ہے۔ اس لئے نوٹ کی طرح اس پر بھی زکوٰۃ لازم ہوگی۔

مکانات، دکانوں، فلیٹوں اور پلاٹوں پر زکوٰۃ:

ذاتی استعمال کا مکان زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے، اسی طرح ذاتی مکان کے لئے خریدا ہوا پلاٹ بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ مکانات، پلاٹ، دکانیں اور فلیٹ جو کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں، ان کی سالانہ آمدنی مصارف وضع کرنے کے بعد جائیداد کے مالک کی مجموعی سالانہ آمدنی میں جمع ہوگی اور تمام ذرائع آمدن سے سال کے اختتام پر جو رقم پس انداز ہوگی، اُس پوری رقم پر زکوٰۃ واجب ہے جبکہ مقدار نصاب کو پہنچتی ہو۔ ایسے مکانات،

پلاٹ، دکانیں یا فلیٹ جو کاروباری اور تجارتی مقاصد کے لئے ہیں، یعنی نفع کمانے کی غرض سے خریدے گئے ہیں، ان سب کی مالیت پر زکوٰۃ ہے اور اس میں قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہے بلکہ موجودہ قیمتِ فروخت(Market Value) کا اعتبار ہوگا۔سرمایہ کاری (INVESTMENT) کے طور پر پلاٹ اور جائیدادیں خریدنے والوں کے لئے یہ سب سے زیادہ قابلِ توجہ مسئلہ ہے۔

وہ پلاٹس یا مکانات جو اولاد کو ہبہ کرنے کی نیت سے رکھے ہوئے ہیں، ان کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ یہ مالِ تجارت نہیں ہے۔نیت کا معاملہ بندے اور رب کے درمیان ہے، اور ان پلاٹس یا مکانات کو بیچا، تو اس وقت اُس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔یعنی وہ رقم اس کے پاس پہلے سے موجود رقم میں مل جائے گی اور پہلے سے جاری سال پورا ہونے پر کل رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ:

سونا اور چاندی از روئے شریعت خلقی طور پر (In Born) مال ہیں، لہٰذا یہ کسی بھی ہیئت (Form, Shape) میں ہوں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔مثلاً برتن، مالیاتی سکے (Coins)، سونے یا چاندی کی ڈلی (Golden Bullion) اور استعمال کے زیورات وغیرہ۔

قیمتی ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ:

قیمتی ہیرے (Diamond)، جواہرات (Jewelery) مثلاً زمرد، عقیق اور یاقوت وغیرہ اگر ذاتی استعمال میں ہیں، تو اُن پر زکوٰۃ نہیں ہے۔لیکن اگر جوہری (Jeweler) کی دکان پر تجارت کے لئے ہیں، تو ان کی موجودہ مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے۔اسی طرح اگر کسی نے قیمتی ہیرے و جواہرات خرید کر اس لئے رکھے ہوئے ہیں کہ زیادہ قیمت ملنے پر فروخت کرے گا، تو ان کی موجودہ قیمت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی علیہ الرحمہ درمختار میں لکھتے ہیں:

اشترى شيئاللقنية ناويا انه ان وجد ربحا باعه لا زكوٰة عليه۔

ترجمہ: ''ایک چیز مال محفوظ رکھنے کے لئے اس نیت کے ساتھ خریدی کہ اگر نفع ملے گا تو اسے بیچ دے گا، تو اس پر فی الوقت زکوٰۃ نہیں ہے''۔ (ردالمحتار علی الدالمختار، جلد:03 ص:181)

البتہ جب مال نقد اس کے پاس آجائے گا اور مقدارِ نصاب کے برابر ہے یا وہ پہلے سے صاحبِ نصاب ہے، تو جاری سال پورا ہونے پر اُس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اس حوالے سے احادیث مبارکہ درج ذیل ہیں:

(۱) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ امْرَأَةً أَتَتْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، وَمَعَهَا ابْنَةٌ لَهَا، وَفِي يَدِ ابْنَتِهَا مَسَكَتَانِ غَلِيظَتَانِ مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَ لَهَا: أَتُعْطِينَ زَكَاةَ هَذَا؟، قَالَتْ: لَا، قَالَ: "أَيَسُرُّكِ أَنْ يُسَوِّرَكِ اللَّهُ بِهِمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ؟، قَالَ: فَخَلَعَتْهُمَا فَأَلْقَتْهُمَا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَقَالَتْ: هُمَا لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ"۔

ترجمہ: "عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے دو موٹے اور بھاری کنگن تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم ان کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟۔ اُس نے عرض کی "نہیں"، نبی ﷺ نے فرمایا: "تو کیا تم اس بات پر خوش ہوگی کہ اللہ تعالیٰ (زکوٰۃ نہ دینے کی بنا پر) ان کنگنوں کے عوض قیامت کے دن تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟ (عذاب کی یہ وعید) سنتے ہی اس نے وہ کنگن اتار کر رسول اللہ ﷺ کو دے دیئے اور عرض کی: کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہیں (یعنی آپ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے انہیں صدقہ کردیں)"۔

(سنن ابی داؤد، جلد 2، رقم الحدیث: 1558، بیروت)

(۲) عَنْ أُمِّ سلمةَ قَالَتْ: كُنْتُ أَلْبَسُ أَوْضَاحًا مِنْ ذَهَبٍ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَكَنْزٌ هُوَ؟، فَقَالَ: مَا بَلَغَ أَنْ تُؤَدَّى زَكَاتُهُ فَزُكِّيَ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ،

ترجمہ: "حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں سونے کے "اوضاح" (ایک خاص زیور کا نام ہے) پہنتی تھی، میں نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا یہ بھی اُس کنز میں شامل ہے (یعنی جس پر سورۃ توبہ آیت: ۳۴۔۳۵ میں جہنم کے عذاب کی وعید آئی ہے)؟۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب سونے کے زیورات اتنی مقدار کو پہنچ جائیں کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور پھر ان کی زکوٰۃ ادا کردی جائے تو اُن پر کنز کا اطلاق نہیں ہوتا، (سنن ابی داؤد، جلد 2، رقم الحدیث: 1559)"۔

ان احادیث مبارکہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ استعمال کے زیورات پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، کیونکہ دونوں خواتین نے سونے کے زیورات پہن رکھے تھے۔

اگر سونا یا چاندی مخلوط (Mixed) ہو اور اُس میں کسی اور چیز کی ملاوٹ ہو، تو غالب جزو کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر اس مخلوط چیز میں غالب مقدار سونا ہے تو اسے سونا قرار دے کر ان کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اور موجود بازاری قیمتِ فروخت کا اعتبار ہوگا، قیمتِ خرید کا نہیں۔ اگر سونے کے زیورات میں نگینے جڑے ہوئے ہیں تو اُن زیورات کا وزن کرتے وقت نگینوں کا وزن وضع کیا جائے گا۔

بچوں کی شادی کے لئے مختص زیورات پر زکوٰۃ:

جو رقم والدین اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کے لئے محفوظ رکھتے ہیں، اگر وہ نصاب کی حد کو پہنچ جائے تو اُس پر زکوٰۃ لازم ہے۔ اگر صاحب نصاب نے اپنے بالغ بیٹوں یا بیٹیوں کی شادی کے لئے زیورات بنوا کر رکھے ہوئے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ اس نے اولاد کو اس کا مالک بنا دیا ہے، اس صورت میں اس بالغ بیٹے یا بالغہ بیٹی پر زکوٰۃ واجب ہے اگر اُن کی قیمت نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہے۔ دوسری یہ کہ بدستور اُس شخص کی اپنی مِلک میں ہیں تو اُس شخص پر زکوٰۃ واجب ہے۔

شرعی اصول تو یہ ہے کہ بالغ اولاد کی روزمرہ ضروریات کے اخراجات والدین پر فرض نہیں ہیں، اسی اصول کے تحت بالغ لڑکوں کے نکاح کی ذمہ داری والدین پر عائد نہیں ہوتی بلکہ خود لڑکے اس کے مُکلف اور ذمہ دار ہیں۔ ہاں! لڑکیوں کے نکاح سے متعلق شرعی تقاضا یہ ہے کہ نکاح کی دنیاوی رسومات اور غیر ضروری تکلفات سے ہٹ کر شرعی تقاضوں اور سنتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں اُن کے نکاح کی ذمہ داری والدین پر ہے، اس مقصد کے لئے بھاری رقوم جمع رکھنا، جہیز کے نام پر دنیا بھر کی آسائشیں جمع کرنا شرعی تقاضا نہیں ہے اس کے باوجود اگر کوئی ایسا کرے تو ان مقاصد کے لئے جمع کی جانے والی رقوم حاجاتِ اصلیہ میں شامل نہیں ہیں۔ رہا نابالغ اولاد کی بنیادی ضروریات اور کفالت کا مسئلہ، تو یہ ذمہ داری شرعاً والد پر عائد ہوتی ہے۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین اپنی اولاد کی شادی کے لئے جو رقم جمع رکھتے ہیں، وہ اگر نصاب کو پہنچ جائے اور دیگر شرائطِ زکوٰۃ پائی جائیں، تو اس رقم، زیورات اور مال پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ ہاں اگر اولاد کو مالک بنا دیا ہے اور زیورات مقدارِ نصاب سے کم ہیں اور بیٹا یا بیٹی صاحب نصاب نہیں ہیں، تو ان پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔

نابالغ اولاد کے لئے مختص مال وزیورات پر زکوٰۃ:

کسی شخص کی نابالغ اولاد (بیٹا یا بیٹی) ہے اور وہ اُن کے لئے یا اُن کے نام پر زیورات، نقد رقم، مکان یا دوکان وغیرہ مختص کر کے رکھتا ہے اور نیت یہی ہے کہ اولاد کے بالغ ہونے پر انہیں تصرف کا بھی حق دے گا، تو اس مال پر فقہاء حنفیہ کے نزدیک زکوٰۃ نہیں ہے۔ اولاد کے بالغ ہونے پر شرعی شرائط پوری ہونے پر اُن پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ لیکن اگر اولاد کے نام پر یہ مال وجائیداد محض حیلے کے طور پر ہے تو اللہ تعالیٰ نیتوں کا حال جاننے والا ہے، معاذ اللہ! اُسے فریب نہیں دیا جا سکتا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ

ترجمہ: ''اور اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، (ابراہیم: 38)''۔

حج کے لئے جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ:

اگر کسی نے حج کے لئے رقم جمع کر رکھی ہے اور نیت یہ ہے کہ اس رقم کو حج پر صرف کرے گا، تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ البتہ اگر رقم حکومت کے پاس اس مَد میں جمع کرادی ہے، مگر ابھی تک قرعہ اندازی نہیں ہوئی اور یہ رقم حکومت کے پاس محض امانت کے طور پر ہے، تو بھی یہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کا نام قرعہ اندازی میں نکل آیا ہے تو جو رقم حکومت آمد و رفت کے کرائے، مُعلّم کی فیس، مکانات کے کرائے اور دیگر مصارف کے لئے وصول کرتی ہے، اتنی مقدار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے اور جو رقم روانگی کے وقت حکومت حاجی کو ذاتی مصارف کے لئے زرِ مبادلہ کی شکل میں واپس لوٹاتی ہے، اگر وہ اس کی حاجتِ اصلیہ سے زائد ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

حج کی درخواست جمع کراتے وقت جب رقم حکومت کے اکاؤنٹ میں جمع کرادی جاتی ہے تو اس رقم کا مصرف دو طرح ہوتا ہے:

(۱) رقم کا ایک حصہ حاجی کی آمد و رفت کے کرائے، مکانات کے کرائے، مِنٰی وعرفات کے مصارف اور مُعلّم کی فیس وغیرہ کی غرض سے کاٹ لیا جاتا ہے۔

(۲) ان اخراجات سے بچ جانے والی رقم حج پر روانگی کے وقت بیرونی کرنسی کی شکل میں حاجی کو واپس کردی جاتی ہے۔ لیکن اس سال 1432ھ کے لئے حکومت نے قابلِ واپسی رقم حُجاج سے نہیں لی۔ اور اعلان کیا ہے کہ حجاج روانگی کے وقت خود زرِ مبادلہ خریدیں گے۔

پہلی قسم کی رقم پر زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ یہ رقم مذکورہ خدمات کے عوض میں بطورِ پیشگی ادا کی گئی شمار ہوگی اور پیشگی ادا کی

گئی رقم، ادا کرنیوالے کی ملکیت میں نہیں رہتی بلکہ وصول کرنے والے کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔
دوسری قسم کی رقم عازمِ حج کی ملکیت ہے اوراس کی حیثیت حکومت کو دیئے گئے قرض کی مثل ہے، اس لئے روانگی کے وقت حاجی کو واپس کردی جاتی ہے، لہٰذا اس رقم پر زکوٰۃ لازم ہے بشرطیکہ دیگر شرائطِ زکوٰۃ پائی جائیں۔

حرفت میں استعمال ہونے والی اشیاء پر زکوٰۃ:

کسی خاص پیشے یا حرفت میں جو اشیاء استعمال ہوتی ہیں وہ دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک وہ جو ہلاک یا تلف ہو جاتی ہیں، جیسے واشنگ فیکٹری یا لانڈری میں صابن یا واشنگ پاوڈر وغیرہ، اُن پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ دوسری وہ اشیاء جن کا مصنوع (Product) میں اثر قائم رہتا ہے یا وہ خود موجود رہتی ہیں، جیسے فنِ طب، حکمت اور دواسازی میں استعمال ہونے والی بوتلیں، شیشیاں وغیرہ جن میں دوا بھر کے بیچی جاتی ہے اور رنگریز کی دکان پر کپڑے کو رنگنے کا رنگ وغیرہ، ان چیزوں کے اسٹاک پر زکوٰۃ ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ:

مکمل ملکیت کی شرط ہی سے یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ سرکاری محکموں اور پرائیویٹ کمپنیوں میں ملازمین کی تنخواہوں سے ہر ماہ کچھ رقم بطور فنڈ کاٹ لی جاتی ہے اور مدتِ ملازمت کی تکمیل یا ریٹائرمنٹ سے پہلے ملازمت چھوڑنے پر طے شدہ قواعد کے مطابق محکمے یا کمپنی کی طرف سے کچھ رقم مزید ملا کر ملازم کو دی جاتی ہے دوران ملازمت بھی قواعد کے مطابق ملازم اپنے اس محفوظ فنڈ سے بطور قرض رقم لے سکتا ہے جو کبھی تو اقساط کی صورت میں واپس کرنا ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ یہ رقم چونکہ ملازم کی مِلک میں نہیں آتی بلکہ اُس محکمے یا ادارے کے پاس ہی جمع رہتی ہے اور ملازم اس میں اپنی مرضی سے تصرّف بھی نہیں کرسکتا، تو جب تک جی۔ پی فنڈ کی رقم ملازم کے اکاؤنٹ میں نہیں آجاتی یا اُسے وصول نہیں ہو جاتی اور اس پر اُسے ملکیت و قبضہ حاصل نہیں ہوجاتا، وہ اس کا مال اور نصاب ہی نہیں، کیونکہ محکمہ یا کمپنی اس فنڈ پر ملازم کا صرف حق تسلیم کرتی ہے اور اسے اپنے اوپر واجب الادا سمجھتی ہے۔ اسے واجب الادا قرار دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ملازم کو اس فنڈ کا اُس وقت مالک بنایا جائے گا اور اس کے قبضے میں دیا جائے گا جب وہ ریٹائرمنٹ کی شرائط پوری کرلے گا۔
اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک اس رقم پر مکمل قبضہ اور تصرّف حاصل نہ ہو، اس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی اور قبضہ حاصل ہونے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی واجب نہ ہوگی۔

جی۔پی فنڈ کی وصولی کے وقت اگر ملازم کے پاس پہلے سے نصاب کے مطابق نقد رقم موجود ہو تو جی۔پی فنڈ سے ملنے والی رقم کو بھی اس کے ساتھ شامل کرلیا جائے گا اور جب پہلے سے موجود رقم کا سال مکمل ہوگا تو اس کا بھی سال مکمل سمجھا جائے گا اور رقم کے اس مجموعے سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اگر فنڈ کی وصولی سے پہلے ملازم صاحبِ نصاب نہ ہو تو اس فنڈ پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جی پی فنڈ میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ:

گورنمنٹ ملازمین کی تنخواہ سے جی پی فنڈ کی کٹوتی لازمی ہوتی ہے، اس میں ملازم کا اختیار نہیں ہوتا اور نہ ہی ملازم اس میں تصرف کرسکتا ہے۔ ضرورت کے لئے اگر ملازم اپنے جی پی فنڈ سے رقم نکلواتا ہے، تو اسے واپس جمع کرنی ہوتی ہے اور اس پر اس سے سود بھی وصول کیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ریٹائرڈ ملازم کو رقم ملنے سے پہلے اس رقم پر زکوٰۃ عائد ہوگی یا نہیں؟۔

سطور ذیل میں ہم جی پی فنڈ کے ایک قانون کا حوالہ درج کررہے ہیں:

provident fund shall not in any way be capable of being assigned of charged and shall not be liable to attachment under any decree of order of any civil revenue of criminal court in respect of any debt of liability incurred by the subscriber of depositor and neither the official assignee nor any receiver appointed under the provincial insolvency act, 1920, shall be entitled to, or have any claim on any such compulsory deposit.

یہ عبارت قانونی اصطلاحات پر مشتمل ہے اس کا مفہوم یہ ہے:

''فرض کیجئے کہ ایک سرکاری ملازم کے پراویڈنٹ فنڈ میں رقم جمع ہے اور اس کے ذمے کسی کے مالی واجبات ہیں، جن کی ڈگری کسی دیوانی یا فوجداری عدالت نے جاری کی ہے اور عدالت نے اپنے حکم میں کہا ہے کہ ان واجبات کے عوض اس کی تمام جائیداد قُرق کرلی جائے اور اُسے فروخت کر کے اس کے ذمے جو واجبات ہیں وہ ادا کئے جائیں یا اس شخص پر اتنے مالی دعوے (Claims) ہیں کہ جن کی وجہ سے اسے عدالت نے دیوالیہ

(Insolvent) قرار دے دیا ہے اور اُس کی تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداداور زیرِ ملکیت مال عدالت نے اس کے تصرف سے نکال کر اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اس پر ایک عدالتی ناظر یا نگران (Assignee) مقرر کر دیا گیا ہے تا کہ اس کی جائیداد فروخت کر کے اس کے قرض خواہوں کے واجبات وصول کئے جائیں۔ ان سب کے باوجود Provincial Insolvecy Act, 1920 کے تحت اس کا جمع کیا ہوا پراویڈنٹ فنڈ بالکل محفوظ رہے گا۔ اُس میں سے کسی کے مالی واجبات وصول کئے جاسکیں گے اور نہ ہی بحق سرکار یا قرض خواہوں کے حق میں اسے ضبط کیا جاسکے گا"۔

اس قانون کی رو سے جب تک جی پی فنڈ ملازم کو مل نہیں جاتا، اِس پر اُس کی مِلک تام نہیں ہے۔ چنانچہ قانون میں درج ہے کہ اگر مُجاز عدالت ایسے شخص کو دیوالیہ قرار دے دے اور اس کی تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداداور تمام زیرِ ملکیت مال قرق کرنے اور عدالت کی تحویل میں لینے کا حکم جاری کر دے، تو بھی اُس کا جی پی فنڈ بالکل محفوظ رہے گا، اُسے قرض خواہوں کے حق میں ضبط کیا جاسکے گا اور نہ ہی بحق سرکار ضبط کیا جاسکے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جی پی فنڈ ملازم کی مِلک تام نہیں ہے۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے حکومت کے پاس جمع شدہ جی پی فنڈ پر زکوٰۃ عائد ہونے کا حکم لگایا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ اُن کے سامنے جی پی فنڈ سے متعلق قانون کے تمام پہلو صحیح طور پر بیان کئے گئے ہوں گے یا نہیں؟۔ میرا گمان یہ ہے کہ اگر مندرجہ بالا قانونی پوزیشن اُن پر واضح کی گئی ہوتی، تو وہ اِس کے برعکس رائے دیتے۔ تاہم امامِ اہلسنت امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ مع سوال ذیل میں درج کر رہے ہیں تا کہ ہمارے عہد کے مفتیانِ کرام اور فقہاءِ کرام غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ دیں کہ ہمیں بہر صورت امامِ اہلسنت کے فتوے کو اختیار کرنا چاہئے یا قانون کے مندرجہ بالا پہلو کے پیشِ نظر اس پر نظرِ ثانی کرنی چاہئے، ہم نہایت دیانت کے ساتھ معاصر مفتیانِ کرام کے سامنے یہ مسئلہ پیش کر رہے ہیں اور جس رائے پر ہمارے مستند وثقہ مفتیانِ کرام کی اجماعی یا اکثریتی رائے ہوگی، ہم بھی اُسی جانب رجوع کریں گے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز سے سوال کیا گیا:

''کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید عرصہ تخمیناً بیس سال سے ریلوے کمپنی کے یہاں ملازم ہے اور ریلوے اپنے قاعدے کے موافق بشمول دیگر ملازمان کے زید کی تنخواہ ماہواری سے ایک آنہ

چار پائی فی روپیہ بطور ضمانت مجرا کرلیتی ہے اور بعد چھ ماہ کے اس روپے کو کسی دوسری تجارت وغیرہ میں لگا دیتی ہے، درصورت نفع ونقصان کے رسدی کی بیشی کر کے پھر ششماہی پر رسید دے دیتی ہے، ابتدا میں ایک روپیہ دو آنہ مجرا ہوتا تھا، جُوں جُوں تنخواہ میں ترقی ہوتی گئی اس میں بھی اضافہ ہوتا گیا، چنانچہ اب مبلغ تین روپے ماہوار مجرا کیا جاتا ہے اور اب اصل تعداد مبلغ پانچ سو کی ہوگئی ہے اور کل تعداد ایک ہزار سے زائد ہوگئی ہے، جس وقت زید ملازمت سے علیحدہ ہوگا اس وقت اس کو اور اس کے ورثا کو وصول ہوگا بشرطیکہ میعادِ ملازمت اچھے طریقہ پر ختم ہوجائے اور کوئی قصور وغیرہ واقع نہ ہو، مگر پانچ سو روپے جو اصلی ہے اس میں کسی طرح اندیشہ نہیں ہے سوا اس کے کہ درمیان ملازمت کے روپے وصول ہونا ناممکن ہے جب تک ملازمت سے مستوفی نہ ہو، از روئے شریعت اس روپے پر زکوٰۃ دینا فرض ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس وقت سے دی جائیگی؟ اصلی تعداد پر دی جائے گی یا کل روپے پر؟ اور نصابِ زکوٰۃ کس قدر اور اس پر مقدارِ زکوٰۃ کیا ہے؟ بینوا توجروا''۔

امام اہلسنت نے جواب میں لکھا:

''جب سے وہ اصلی روپیہ خود یا مع اور زکوتی مال کے جو زید کے پاس ہے، قدر نصاب یعنی ۵۶ روپے تک پہنچا اور حوائج اصلیہ سے بچ کر اس پر سال گزرا اس وقت سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوئی اور سال بسال جدیدہ زکوٰۃ واجب ہوتی رہی، ہاں اگلے سال کی جتنی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے اس سال جمع میں سے اتنا کم کرلیں گے کہ اتنا اس پر اللہ تعالیٰ کا دین ہے باقی مع جدید مقدار سال حال پر زکوٰۃ آئے گی، تیسرے سال کی جمع میں سے دو برس گزشتہ کی زکوٰۃ واجب شدہ مجرا کریں گے اور سال حال کا اضافہ شامل کریں گے، اس قدر پر زکوٰۃ آئے گی، چوتھے سال کی جمع میں سے تین سال کی زکوٰۃ مذکور مجرا کریں گے اور سال حال کا اضافہ شامل کریں گے اس قدر پر زکوٰۃ آئے گی، چوتھے سال کی جمع میں سے تین سال کی زکوٰۃ مذکور مجرا اور امسال کا اضافہ شامل ہوگا، اخیر تک یونہی کرینگے، تجارت میں وہ روپیہ اگر اس کی اجازت سے لگایا جاتا ہے تو اس کا منافع شامل ہوگا اس طور پر زکوٰۃ سال بہ سال واجب ہوا کرے گی، مگر اس روپیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا اس وقت لازم ہوگا جب وہ وصول ہوگا، اور جو

اضافہ کمپنی سود کے طریقے پر کرتی ہے اس پر بھی زکوۃ نہ ہوگی، نہ وہ اس کی مِلک ہے نہ اسے سود کی نیت سے کسی طرح جائز ہے، ہاں بعد ختم اگر کمپنی بطور خود اس کو وہ اضافہ دے اور کمپنی میں کوئی مسلمان شریک نہ ہوتو یہ اس اضافہ کو اس نیت سے لے سکتا ہے کہ ایک غیر مسلم جماعت ایک مال بخوشی دیتی ہے، یوں مال مباح سمجھ کر لے سکتا ہے سود کی نیت نہ ہو، واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 58-157، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن)''۔

گورنمنٹ کے پاس جمع شدہ جی پی فنڈ پر زکوۃ عائد نہ ہونے کا مسئلہ ہم نے صرف سرکاری ملازمین کے جی پی فنڈ کے بارے میں بیان کیا ہے۔ ایسے پرائیویٹ ادارے اور کمپنیاں جن کے پاس اپنے جمع شدہ جی پی فنڈ میں سے ملازم کو جب چاہے اور جتنا چاہے (کل رقم یا اُس کا کوئی حصہ) نکالنے کا اختیار ہوتا ہے اور اُس پر یہ رقم کل یا جزمع سود یا بلا سود واپس جمع کرنے کی پابندی نہیں ہوتی، تو اُس جی پی فنڈ پر ملازم کا مِلک تام متصور ہوگا اور پہلے سے صاحبِ نصاب ہونے کی صورت میں یا اس جمع شدہ رقم کے بقدرِ نصاب ہونے کی صورت میں اس پر زکوۃ عائد ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆

عُشر کا بیان

عُشر کا مفہوم:

لفظِ عُشر کے معنی ہیں: ''دسواں حصہ''۔شریعت کی اصطلاح میں رسول اللہ ﷺ نے شرعی واجبات کی جو تفصیل بیان فرمائی اُن میں سے زمین کی پیداوار کے دسویں حصے کو''عُشر'' کہتے ہیں، جو زمین کی زکوٰۃ ہے۔اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اگر زمین بارانی ہو یعنی بارش کے پانی سے سیراب ہوتی ہو، تو اس پیداوار کا دسواں حصہ (یعنی دس فیصد) اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا واجب ہے، یہی زمین سے پیدا ہونے والے زرعی سرمائے کی زکوٰۃ ہے۔

(۲) اگر زمین کو خود سیراب کیا جاتا ہو تو اس کی پیداوار کا بیسواں حصہ (یعنی پانچ فیصد) صدقہ کرنا واجب ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک زرعی پیداوار پر عُشر کا کوئی کم از کم نصاب مقرر نہیں ہے، پس زمین سے جس قدر بھی پیداوار حاصل ہو، اُس پر عُشر (دس فیصد) یا نصف عُشر (پانچ فیصد) واجب ہے۔امام اعظم ابوحنیفہ کی دلیل یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهٖ، ترجمہ: ''درخت جب پھل دے تو اُس پھل سے کھاؤ اور کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو، (الانعام: 141)''۔

سالم بن عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُونُ أَوْ كَانَ عَثَرِيًّا الْعُشْرُ، وما سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ۔

ترجمہ: ''جس زمین کو بارش یا چشموں نے سیراب کیا ہو، یا اس زمین نے خود اپنی رگوں سے پانی لے لیا، اُس میں عُشر ہے۔اور جس زمین کو کنویں کے ڈولوں سے سیراب کیا گیا، (ایسی زمین کو آج کل نہری زمین Irrigation land کہتے ہیں) اُس میں نصف عُشر ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1483)''۔

عُشر کے وجوب میں دیگر ائمہ کا نظریہ:

امام مالک، امام ثوری، امام اوزاعی، امام ابن ابی لیلیٰ، امام شافعی، امام ابو یوسف، امام محمد اور تمام اہلِ علم کا قول یہ ہے کہ پھلوں اور غلّہ میں زکوٰۃ اُس وقت واجب ہوتی ہے، جب اُن کی مقدار پانچ وسق کو پہنچ جائے، البتہ

امام ابوحنیفہ اور مجاہد کہتے ہیں: قلیل اور کثیر سب میں زکوٰۃ (عُشر) واجب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان عام ہے: ''فِیمَا سَقَتِ السَّمَاءُ الْعُشْرُ''، ترجمہ: ''جس زمین کو بارش سیراب کرے، اُس میں عُشر (واجب) ہے''۔

امام اعظم ابوحنیفہ کا نظریہ:

امام ابوحنیفہ کے نزدیک زرعی پیداوار کا کوئی نصاب (مُقرر) نہیں ہے، زمین سے جس قدر پیداوار حاصل ہو گی، سب پر عُشر (دس فیصد) یا نصف عُشر (پانچ فیصد) واجب ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْأَرْضِ ۔

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنی پاک کمائی سے اور جو کچھ زمین سے ہم نے تمہارے لئے نکالا ہے، اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، (البقرہ: 267)''۔

حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ، عَنْ أَبِیهِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: فِیمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُیُوْنُ، أَوْ کَانَ عَثَرِیًّا، الْعُشْرُ، وَمَا سُقِیَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو زمین بارش یا چشموں سے سیراب ہو یا دریائی پانی سے سیراب ہو، اس پر عُشر (واجب) ہے اور جس زمین کو کنویں کے پانی سے اونٹوں کے ذریعہ سیراب کیا جائے، اُس پر نصف عُشر ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1483)''۔

(۲) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فِیمَا سَقَتِ الْأَنْهَارُ وَالْغَیْمُ، الْعُشُوْرُ، وَفِیمَا سُقِیَ بِالسَّانِیَةِ نِصْفُ الْعُشْرِ''۔

ترجمہ: ''جس زمین کو دریا یا بارش سیراب کرے، اُس پر عُشر (دسواں حصہ) ہے اور جس زمین کو کنویں کے پانی سے اونٹوں کے ذریعہ سیراب کیا جائے، اُس پر نصف عُشر (بیسواں حصہ) ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2161)''۔

زمین کی تین قسمیں ہیں: (۱) عشری (۲) خراجی (۳) نہ عشری نہ خراجی

عُشری زمین سے پیداوار کا دسواں حصہ لیا جاتا ہے اور جو زمین خراجی ہو، اُس سے خراج لیا جاتا ہے، عُشر کی ادائیگی عبادت ہے اور یہ صرف مسلمانوں سے وصول کیا جاتا ہے جبکہ خراج اصلاً غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے۔

پاکستان کی زمینیں عُشری ہیں:

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''جو زمینیں پاکستان کے زمینداروں کی ملکیت میں ہیں، اُن پر قطعیت کے ساتھ عُشری یا خراجی ہونے کا حکم لگانا بہت مشکل ہے، کیونکہ جب سلاطین اسلام نے ابتداءً ہندوستان کے اس حصے کو فتح کیا تھا تو یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان سلاطین نے کون سی صورت اختیار کی تھی، بعض صورتیں عُشری زمین کی ہیں اور بعض خَراجی زمین کی اور جو زمینیں مسلمانوں کے زیرِ تصرُّف ہوں اور ان کے متعلق عُشری یا خراجی ہونا یقینی اور مُتحقّق نہ ہو، اُن کو عُشری زمین پر محمول کیا جائے گا۔ علامہ شمس الدین سرخسی لکھتے ہیں: ''ہر وہ شہر جس کے رہنے والے بخوشی مسلمان ہوئے، اُس کی زمین عُشری ہے، کیونکہ مسلمانوں کے مسلمانوں پر وظیفہ (زمین کا محصول)، مقرر کرنے کی ابتداء خراج سے نہیں کی جائے گی تاکہ مسلمان کو ذلت سے محفوظ رکھا جائے لہٰذا ان پر عُشر ہوگا، (المبسوط، جلد 3، ص: 7)''۔ لہٰذا جب پاکستان بنا اور مسلمان مسلمانوں پر حاکم ہوئے تو یہاں کے کاشتکاروں سے زراعت کرنے کے وظیفہ کی ابتداء بھی عُشر سے کی جائے گی نہ کہ خراج سے، کیونکہ عُشر اصالۃً مسلمانوں کا فریضہ ہے اور خراج اصالۃً کافروں پر ہے۔ اِسی طرح حکومتِ پاکستان نے جو زمینیں مسلمانوں کو الاٹ کردیں یا اُن کو بطورِ عطیہ دیں یا کسی کارگزاری یا خدمت کے معاوضہ میں دیں، وہ بھی عُشری ہیں، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''جس زمین کو مالِ غنیمت حاصل کرنے والوں (مجاہدین) کے غیر میں ہماری حکومت تقسیم کرے، وہ بھی عُشری ہے کیونکہ مسلمان پر ابتداءً خراج مقرر نہیں کیا جاتا، (ردالمحتار، جلد 3، ص: 254)''۔ (تبیان القرآن، جلد 1، ص: 1009)

عُشر کی ادائیگی کے اعتبار سے پھر زمین کی دو قسمیں ہیں:

(۱) بارانی زمین (۲) غیر بارانی یا نہری زمین (IRREGATED LAND)

بارانی زمین:

جس میں کاشت کار کو موسمی اور علاقائی خصوصیات کی وجہ سے زمین کو سیراب کرنے میں بہت زیادہ محنت ومشقت نہیں اٹھانا پڑتی، سیرابی کے لئے کاشتکار کو ٹیوب ویل، وغیرہ لگانے اور اس پر سرمایہ خرچ کرنے کی

ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ وہ بارش کے پانی، قدرتی چشموں، زمین کی نمی اور دریاؤں کے پانیوں کی وجہ سے ازخود سیراب ہوتی رہتی ہے، ایسی زمین کی پیداوار پر عُشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ عائد کیا گیا ہے۔
البتہ پہاڑی ندی نالوں میں بارش اور قدرتی چشموں کا پانی ہوتا ہے اور اُن کے اَطراف کی زمین کا کچھ حصہ سیراب ہوتا ہے، وہ زمین بارانی کہلائے گی۔ آج کل بڑے دریاؤں پر ڈیم یا بیراج بنا کر نہریں نکالی جاتی ہیں اور اُن کے ذریعے جو زمین سیراب ہوتی ہے، چونکہ زمیندار یا کاشتکار کو اُس پانی کا آبیانہ (Irrigation Tax) دینا پڑتا ہے لہٰذا اس طرح دریائی پانی کے استعمال والی زمینیں بارانی نہیں رہیں، بلکہ نہری زمینیں بن گئی ہیں اور یہ غیر بارانی ہیں۔

غیر بارانی زمین:

جس کو سیراب کرنے کے لئے کاشتکار کو مشقت کے ساتھ ساتھ محنت کے ذریعے یا قیمتاً پانی حاصل کرنا پڑے، مثلاً ٹیوب ویل یا رہٹ کے ذریعے پانی حاصل کرتا ہے یا پانی کے حصول کے لئے پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے یا نہری پانی کا ٹیکس یا آبیانہ دیتا ہے، اُس پر آدھا عُشر یعنی پیداوار کا بیسواں حصہ (یعنی پانچ فیصد) مقرر کیا گیا ہے۔
عُشر واجب ہونے کے لئے عقل اور بلوغت شرط نہیں ہے، بلکہ نابالغ اور مجنون کی زمین میں جو کچھ پیدا ہو، اُس پر بھی عُشر واجب ہے۔
عُشر کے لئے سال گزرنا بھی شرط نہیں ہے۔ سال میں چند بار ایک کھیت میں زراعت ہوئی تو ہر بار عُشر واجب ہے۔ پورا قمری سال گزرنے کی شرط کا تعلق سونے، چاندی، نقد رقوم، سامانِ تجارت اور مویشیوں سے ہے۔ زرعی پیداوار، پھلوں، شہد اور کانوں یا زمین سے نکلنے والی چیزوں پر سال گزرنے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ زرعی پیداوار کی کٹائی اور پھلوں کے اتارے جانے پر ہی زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ عُشر واجب ہونے میں نصاب بھی شرط نہیں ہے، ایک صاع بھی پیداوار ہو تو عُشر واجب ہے۔

عُشر ادا کرنے سے پہلے پیداوار کا استعمال:

جب تک پیداوار کا عُشر ادا نہ ہو جائے، اُس میں سے کچھ استعمال نہیں کیا جا سکتا، اگر استعمال کر لیا تو جو عُشر کی مقدار بنتی ہے، اُتنا تاوان دینا ہوگا، البتہ اگر تھوڑا استعمال کیا تو معاف ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وَلَا یَأْکُلُ شَیْئًا مِّنْ طَعَامِ الْعُشْرِ حَتّٰی یُؤَدِّیَ عُشْرَہٗ کَذَافِی "الظَّهِيْرِيَّةِ"۔

ترجمہ: ''عُشر ادا کرنے سے پہلے (مالک کو) عُشر کے مال سے کھانا جائز نہیں جب تک کہ اُس کا عُشر ادا نہ کردے، ''ظہیریہ'' میں اِسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 187)''۔

عُشر اصل پیداوار پر مصارف وضع کیے بغیر ادا کیا جائے گا:

جس چیز میں عُشر یا نصف عُشر واجب ہے، اُس میں کل پیداوار کا عُشر یا نصف عُشر لیا جائے گا، یہ نہیں ہوسکتا کہ بیج، کاشت کے مصارف، (ہل بیل وٹریکٹر وغیرہ)، کھاد، آبیانہ حفاظت کرنے والے اور کام کرنے والوں کی اجرت، کٹائی اور گاہنے کے مصارف وغیرہ کی قیمت نکال کر باقی کا عُشر یا نصف عُشر دیا جائے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (بِلَا رَفْعِ مُؤَنٍ) أَیْ کُلَفِ (الزَّرْعِ) وَبِلَا اِخْرَاجِ الْبَذْرِ لِتَصْرِیْحِهِمْ بِالْعُشْرِ فِیْ کُلِّ الْخَارِجِ۔

ترجمہ: ''کاشت کاری کی محنت (وضع کیے) بغیر اور بیج وغیرہ کے اخراجات نکالے بغیر کل پیداوار سے عُشر یا نصف عُشر لیا جائے گا کیوں کہ علماء نے کل پیداوار سے عُشر نکالنے کی صراحت فرمائی ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی اِس کی شرح میں لکھتے ہیں: أَیْ یَجِبُ الْعُشْرُ فِی الْاَوَّلِ وَنِصْفُهٗ فِی الثَّانِیْ بِلَا رَفْعِ أُجْرَةِ الْعُمَّالِ وَنَفَقَةِ الْبَقَرِ وَکَرْیِ الْاَنْهَارِ وَأُجْرَةِ الْحَافِظِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ "دُرَرْ"۔

ترجمہ: ''پہلی (یعنی بارانی زمین کی پیداوار) میں عُشر اور دوسری (یعنی نہری یا آب پاشی والی زمین کی پیداوار) میں نصف عُشر ہے، زرعی کارکنوں (یعنی ہاریوں) کی اجرت، بیلوں کا خرچ، نہروں کی کھدائی اور چوکیدار کی اجرت وغیرہ وضع کیے بغیر کل پیداوار میں سے لازم ہے، بحوالہ ''دُرَر''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3 ص: 245، بیروت)

عُشر (پیداوار کا دسواں حصہ) اُس کھیتی میں بھی واجب ہے جو جانوروں کے چارہ کے لئے ہے اور غلّہ یا چارہ اس میں پیدا ہو، کیونکہ اس کا زمین سے نفع حاصل کرنا مقصود ہے۔ بعض زمینوں پر صرف چارہ ہی کاشت ہوتا ہے اور اس کی باقاعدہ تجارت ہوتی ہے، اس طرح خاص قسم کی گھاس یا سبزہ کاشت کرکے برآمد کی جاتی ہے اور نہایت منفعت بخش ہے۔ پاکستان کے علاقے رحیم یار خان میں ایک زمیندار جہانگیر ترین کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے اعلیٰ قسم کی گھاس کا فارم بنایا ہوا ہے اور بڑی مقدار میں مشرق وسطیٰ کو برآمد کرتے ہیں۔

یہاں تک ہم نے مسلمہ فقہی موقف بیان کیا ہے، جو ہمارے فقہاءِ کرام تسلسل سے بیان کرتے چلے آرہے ہیں۔

مصارف پیداوار کے حوالے سے اہلِ فتویٰ کے لئے قابلِ غور مسئلہ:

ڈاکٹر وھبہ زوحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''کاشتکار عادۃً کاشت کے لئے اخراجات کرتا ہے، جیسے بیج، کھاد، ہل یا ٹریکٹر چلانے والے کی اُجرت، زمین کی سیرابی، کھیتی کی کانٹ چھانٹ اور فصل کی کٹائی اور گاہنا (Threshing) وغیرہ۔ جدہ کی فقہی کونسل میں فتویٰ نمبر: 15 میں قرار دیا گیا کہ اس مسئلے میں تین آراء ہیں:

(۱) تمام مصارف وضع کر کے عشر ادا کیا جائے۔

(۲) مصارف وضع کئے بغیر کل پیداوار پر عشر نکالا جائے

(۳) ایک درمیانی رائے یہ ہے کہ زمین کی پیداوار کا ایک تہائی وضع کر کے باقی پر عشر یا نصف عشر ادا کیا جائے اور شرکاء نے تیسری رائے کو ترجیح دی۔ اور یہ رائے شرح ترمذی میں ابن عربی کے کلام سے مستفاد ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس حدیث پر عمل ہو کہ ''دَعُوا الثُّلُثَ اَوِ الرُّبُعَ'' یعنی ایک تہائی یا چوتھائی چھوڑ دو، یہ مسئلہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی کتاب ''فقہ الزکوٰۃ'' سے مستفاد ہے (ص: 224، مترجم)۔ اور جس بات پر تمام مسلمانوں اور چاروں مذاہب کا عمل ہے جیسا کہ ابن حزم نے ''المحلی'' میں ذکر کیا اور فقہاء نے صراحت کی ہے کہ زمین کی پیداوار سے مصارف وضع کئے بغیر عشر ادا کرنا چاہئے، کیونکہ زکوٰۃ ارضی (یعنی عشر) کا تعلق زمین کی پیداوار سے ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ (اور فصل کی کٹائی کے دن اُس کا حق ادا کرو)''۔ اور میں اسی کو ترجیح دیتا ہوں، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد: 3، ص 94-1893)''۔

مندرجہ بالا حدیث کی شرح میں شیخ عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں:

نبی ﷺ کا حاکم کی طرف سے عُشر وصول کرنے والوں کے لئے ارشاد ہے: ''عُشر کی مقدار کا تخمینہ لگاؤ اور پھر اُس سے تہائی یا چوتھائی چھوڑ دو''، یعنی ایک تہائی عشر اُس مال کے مالک کے پاس چھوڑ و تاکہ وہ خود بھی (کسی حاجت مند کو) صدقہ دے سکے۔ قاضی خطاب نے کہا: عشر دینے والوں کے پاس عُشر کی ایک تہائی یا ایک چوتھائی چھوڑ دو تاکہ وہ اڑوس پڑوس میں رہنے والے مستحقین اور آنے جانے والے سائلین کو دے سکے''۔
(تحفۃ الاحوذی، جلد: 1، ص: 17)

علامہ ابو بکر محمد عبد اللہ ابن عربی کا موقف:

''ہمارے علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا عشری زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ (یعنی عشر) وصول کرنے سے پہلے کاشت سے لے کر کٹائی اور گاہنے تک کے مصارف وضع کئے جائیں گے یا یہ سارے مصارف ربُّ المال کے حصے میں آئیں گے اور زکوٰۃِ عشر کل پیداوار سے وصول کی جائے گی؟۔

صحیح یہ ہے کہ پیداواری مصارف حساب میں آئیں گے۔کل پیداوار سے مصارف وضع کرنے کے بعد باقی پر عشر وصول کیا جائے گا اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تہائی یا چوتھائی (پیداوار) چھوڑ دو اور یہ پیداواری مصارف کی مقدار کے برابر ہے۔ہم نے تجربہ کیا ہے اور غالب صورتوں میں ہم نے ایسا ہی پایا، کیونکہ کچھ مقدار تیاری سے پہلے کھالی جاتی ہے اور مصارف نکال کر دو تہائی یا تین چوتھائی پیداوار رہ جاتی ہے، واللہ اعلم''۔

(عارضۃ الاحوذی، جلد:3،ص:116)۔ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

آج کل زمین کی کاشت (Sowing، اس میں ہل یا ٹریکٹر چلانے کے مصارف شامل ہیں)، بیج، کھاد، زمین کی نگہداشت و پرداخت، فصل پر جراثیم کُش دواؤں کا چھڑکاؤ (Spray) نہری زمین کی صورت میں آبیانہ، ٹیوب ویل، فصل کی کٹائی (Reaping) اور گاہنے (Threshing) وغیرہ کے جملہ اخراجات شامل ہیں۔اور اس ہوش رُبا گرانی کے دور میں یہ ناقابل برداشت ہیں، کھاد انتہائی مہنگی، ٹریکٹر اور ڈیزل مہنگا اور ہر قسم کی لیبر کی اجرت نہایت زیادہ ہے۔لہٰذا پیداواری اخراجات بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے انہیں زمین کی پیداوار سے وضع کر کے باقی پیداوار پر عشر وصول کرنا چاہئے تاکہ لوگ اسے بار نہ سمجھیں۔اِس دور کے اہلِ فتویٰ علماء کو اس مسئلے پر غور کرنا چاہئے۔

میں نے اپنے طلبہ سے کہا کہ اپنے علاقے کے کاشت کاروں سے معلوم کر کے بتاؤ کہ فی ایکڑ اخراجات اور پیداوار کا تناسب کیا ہے؟۔تو انہوں نے اپنے علاقوں سے گندم، کپاس اور گنے کے اخراجات اور پیداوار کا جو تناسب مجھے بتایا، اس کے مطابق مصارف کل پیداوار کے چالیس فیصد کے برابر ہیں۔ہوسکتا ہے اس میں مبالغہ ہو، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید نہری یعنی غیر بارانی زمین کے کل پیداواری مصارف پیداوار کے کم از کم 20 فیصد کے برابر ہوں گے۔ یہ تو اس صورت میں ہے کہ زمین کسی کی اپنی ملکیت ہو اور اگر زمین اجارے

یعنی ٹھیکے پر ہے، تو کاشت کار کو ٹھیکے کی رقم بھی مالک کو دینی ہوتی ہے، پس اس صورت میں پیداواری مصارف اور بڑھ جائیں گے،، کیونکہ زمین کا مالک تو اپنے اجارے (Lease) کی رقم وصول کر لیتا ہے اور اس کا باقی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مزارعت یا بٹائی (Sharecroping) کی زمین کا عشر:

علامہ ابوبکر مرغینانی لکھتے ہیں:

''امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک مزارعت (یعنی بٹائی) پر زمین دینے کا عقد فاسد ہے، لیکن صاحبین کے نزدیک جائز ہے۔ صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ خیبر کے ساتھ فصل اور پھلوں کی نصف پیداوار پر معاملہ کیا۔ یہ مضاربت کی طرح مال اور محنت کی شرکت کا عقد ہے، یعنی ایک فریق کا مال ہوتا ہے اور دوسرے کی محنت اور فریقین کو اس کی حاجت ہے، (الہدایہ، جلد: 7، ص: 99)''۔

امام اعظم کے نزدیک فساد کا سبب مجہول یا معدوم پر اجر ہے۔ اور صاحبین کے استدلال کی بنیاد حدیث ہے اور حاجت بھی کہ کبھی ایک شخص کے پاس زمین ہوتی ہے لیکن وہ کام کا اہل نہیں ہوتا۔ او جو کاشت کاری کا کام کر سکتا ہے، اس کے پاس زمین نہیں ہوتی۔ البتہ معلوم اجرت پر مزارعت امام اعظم کے نزدیک بھی جائز ہے۔ مزارعت میں پیداوار کی تقسیم کا تناسب فریقین کے رضامندی سے طے پا سکتا ہے۔

زمین اگر بٹائی پر ہے، تو مالک اور مزارع دونوں پر اپنے اپنے حصے کا عشر واجب ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیداوار میں سے پہلے عشر نکال لیا جائے اور پھر طے شدہ تناسب (Ratio) کے مطابق آپس میں تقسیم کر لیں۔

اگر زمین ٹھیکے پر دی ہے تو یہ اجارہ ہے۔ زمین کے مالک پر اُس کے دیگر اموال کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ ہے۔ اور جس نے زمین ٹھیکے یا اجارے پر لی ہے، اس پر کل پیداوار کا عشر لازم ہے۔ اگر زمیندار نے عشر ادا کرنے کے بعد غلہ فروخت کر دیا اور یہ مال اُس کے مالِ تجارت یا دیگر اموال کے ساتھ جمع ہو گیا تو اُسے اُس کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ علامہ مفتی محمد نور اللہ نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فتاویٰ نوریہ، جلد دوم، ص: 154 پر اسی طرح لکھا ہے۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

اجارہ یعنی ٹھیکے پر دی ہوئی زمین کے بارے میں فقہاءِ کرام کی دو آراء ہیں:

(۱) امام اعظم کا مسلک ہے کہ زکوٰۃ (عشر) مُوجر (Lessor) یعنی زمین کے مالک پر ہے۔ کیونکہ یہ اس کی

کمائی (مال خرچ کرنے) کا ثمر ہے اور اس کا بدل یا معاوضہ (اجارے یا ٹھیکے کا مال) ہے۔ گویا اس نے خود ہی اسے کاشت کیا اور عشر کے واجب ہونے کی بنیاد زمین ہے۔

(۲) صاحبان (امام ابو یوسف اور امام محمد) کا مسلک یہ ہے کہ عشر مُستاجر (Lessee) پر ہے۔ لیکن فتویٰ امام کے قول پر ہے اور اسی پر عمل ہے اور یہی ''ظاہر الروایہ'' ہے۔ اور چونکہ زکوٰۃ مُستاجر (Lessor) پر ہونے سے فقراء کا زیادہ فائدہ ہے، تو اُسی پر واجب ہے۔ اور متاخرین کا فتویٰ اسی پر ہے۔ نوٹ: مُستاجر پر عشر واجب ہونے میں فقراء کا فائدہ اس معنی میں ہے کہ عُشر کل پیداوار پر عائد ہوگا اور اس کی مقدار زیادہ ہوگی، جبکہ مُؤجر پر عائد ہونے کی صورت میں صرف اجارے یا ٹھیکے کی رقم یا مال پر عائد ہوگا، جو ظاہر ہے کہ کل پیداوار سے ہر صورت میں کم ہوگا۔ پس عشر مُستاجر پر ہی واجب ہے اور متاخرین کا فتویٰ اسی پر ہے۔

جمہور کا قول یہ ہے کہ جب انسان کوئی زمین اجارے پر لے اور کاشت کرے یا عاریۃً لے اور کاشت کرے یا باغبانی کے لئے استعمال کرے اور پھلوں کی پیداوار ہو، تو اس کا عشر مُستاجر (Lessee) اور مُستعیر پر ہوگا، زمین کے مالک پر نہیں۔ (Borrow to Make Use Gratuituos Loan) مالی امور میں استعارہ کے معنی ہیں: ''تملیکُ المنافعِ بغیرِ عوضٍ ''یعنی کسی معاوضے یا بدل کے بغیر کسی چیز کے منافع (Usufructs) کا مالک بنا دینا، اسے انگریزی میں Borrow to Make Use یا Gratuitous Loan کہتے ہیں۔ کیونکہ عشر پیداوار (Agricultural Product) مستاجر یا مُستعیر پر ہے، زمین کے مالک پر نہیں ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اور فصل کی کٹائی کے وقت اُس کا حق ادا کرو، (الانعام: 141)''۔ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو زمین بارش سے سیراب ہو، اس پر عشر ہے''۔ اور عشر مالک پر عائد کرنا یہ ایک نقص فاحش ہے جو جذبۂ ہمدردی کے منافی ہے۔ اور عشر پیداوار پر لازم ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر زمین میں کاشت نہ کی جائے یا پیداوار نہ ہو تو عشر نہیں ہے۔ حالانکہ زمین موجود ہے، جبکہ اس کے برعکس خراج زمین پر لازم ہے، خواہ پیداوار ہو یا نہ ہو۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے ''فقہ الزکوٰۃ'' میں اس مسئلے پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام اعظم کا موقف یہ ہے کہ عُشر زمین کا حق ہے، لہٰذا اجارے پر دی ہوئی زمین کا عشر زمین کے مالک پر نہیں ہے، مستاجر یا

مستغیر پر ہے۔ابن رشد نے بحث کرتے ہوئے قرار دیا ہے کہ عشر زمین اور پیداوار دونوں کا مجموعی حق ہے۔لہٰذا اجارے کی صورت میں دونوں (مالک ومزارع) پر اپنے اپنے حصے کے مطابق عشر عائد ہوگا۔ اور اجارے (Lease) یا ٹھیکے کی صورت میں مستاجر ٹھیکے کی رقم اور مصارف وضع کرنے کے بعد صافی آمدنی (Net Production) پر عُشر ادا کرے گا۔انہوں نے حوالہ دیا ہے کہ شیخ ابوزہرہ کی کتاب ''تنظیم الاسلام للمجتمع'' کے صفحہ 159 پر لکھا ہے:

''عصر حاضر کے بعض علماء نے زکوٰۃ کو قانونی شکل دینے کے لئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ مالک اور مستأجر دونوں سے وصول کی جائے۔مالک سے ٹیکس وصول کرنے کے بعد اور مستأجر کو کاشت کے جو اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں،اُن کو وضع کرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے صافی مال میں سے زکوٰۃ وصول کرلی جائے''۔

یہ ساری بحث میں نے اس لئے تفصیل کے ساتھ تحریر کی کہ آیا دورِ حاضر کے فقہاء اور اہلِ فتویٰ ان مسائل پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں اور ''مُجتهدفيه'' مسائل پر دورِ حاضر کے حقائق کے پیش نظر،نظرِ ثانی ہو سکتی ہے؟ یا ہمیں متقدمین کی اجتہادی آراء پر ہی سختی سے کاربند رہنا چاہئے؟۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ تاجر اگر کرائے کی دوکان میں یا صنعتکار کرائے کے کارخانے میں بالترتیب تجارت یا صنعت میں مصروف ہیں،تو قمری سال کے آخر میں اُسے کرائے کے ادا کردہ یا واجب الاداء مصارف وضع کر کے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی،جبکہ اجارے پر لی ہوئی زمین میں پیداوار ہو یا نہ ہو،کم ہو یا زیادہ اسے اجارے کی رقم بہر حال دینی ہے اور جمہور فقہاءِ کرام کے قول کے مطابق پیداوار کی صورت میں مجموعی پیداوار پر اجارے کی رقم وضع کئے بغیر عُشر بھی دینا ہوگا۔

جمہور فقہاءِ کرام کے قول کے مطابق اجارے کی صورت میں مُوجر (Lessor) پر عشر تو بالکل نہیں ہے اور اجارے یا ٹھیکے کی رقم اُس کی مجموعی آمدنی یا مالِ تجارت میں شامل ہو جائے گی اور سال کے اختتام پر جو بچت ہوگی، اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔یا بالفرض مُوجر کی آمدنی کا یہی ایک ذریعہ ہے،تو قمری سال کے اختتام پر اگر اس کی بچت بالکل نہیں ہے یا زکوٰۃ کے نصاب سے کم ہے،تو اُس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔

جن چیزوں میں عُشر واجب ہے؟:

ایسی چیزیں جن کی پیداوار سے زمین کا نفع حاصل کرنا مقصود ہو،خواہ وہ غلہ،اناج،ساگ،ترکاری،میوہ،پھل،

پھول وغیرہ جو کچھ پیدا ہو، سب کا یہی حکم ہے یعنی عُشر واجب ہے۔ علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود حنفی کاسانی لکھتے ہیں: أَنْ يَكُوْنَ الْخَارِجُ مِنَ الْاَرْضِ مِمَّا يُقْصَدُ بِزِرَاعَتِهِ نَمَاءُ الْاَرْضِ وَتُسْتَغَلُّ الْاَرْضُ بِهِ عَادَةً۔

ترجمہ: "پیداوار ایسی ہو، جس کی کاشت سے زمین کی نمو مقصود ہو اور عادۃً اُس کا غلّہ حاصل کیا جاتا ہو، (بدائع الصنائع، جلد 2، ص: 88)"۔

عُشری زمین یا پہاڑ یا جنگل میں سے اگر شہد نکلا تو اس میں بھی عُشر واجب ہے۔ اناج اور غلّہ میں گندم، جَو، چنا، چاول، مکئی، جوار، باجرہ، کپاس، غرض ہر قسم کے دانے، مونگ پھلی، سورج مکھی، رائی، سرسوں (بنولا) اور لوبن وغیرہ۔

پھلوں میں آم، خربوزہ، تربوز، امرود، مالٹا، لوکاٹ، سیب، چیکو، انار، ناشپاتی، سنگترہ، کھجوریں، پپیتا، ناریل، فالسہ، جامن، لیچی، لیموں، خوبانی، آڑو، آلو بخارا، گرما، اناس، انگور اور آلوچہ وغیرہ وغیرہ۔

سبزیوں میں ککڑی، ٹینڈا، بھنڈی، توری، آلو، لہسن، پیاز، دھنیا، کدو، کریلا، سبز مرچ، اروی، پھول گوبھی، بند گوبھی، شلغم، گاجر، چقندر، مٹر، پالک اور مختلف اقسام کے ساگ، میتھی وغیرہ، غرض جو چیزیں زمین سے پیدا ہوں، پھل سبزیاں، گنے، ککڑی، کھیرے، بینگن، سب پر عُشر واجب ہے، خواہ ان کے پھل باقی رہیں یا نہ رہیں۔

ایسی چیزیں جن کی پیداوار سے زمین کا نفع حاصل کرنا مقصود نہ ہو، اُن میں عُشر واجب نہیں۔ اِن سے غالباً وہ چیزیں مراد ہیں، جن کا حاصل کرنا مقصود بھی نہ ہو اور اُن سے منفعت بھی حاصل نہ ہو۔ لیکن گندم و جَو کا بھوسا وغیرہ قابلِ منفعت مال ہے، یہ جانوروں کی خوراک اور دیگر مقاصد میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ لہٰذا قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر عُشر واجب ہونا چاہئے جب کہ مقصود بالذات ہو۔

صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین ابوبکر الفرغانی حنفی لکھتے ہیں: أَمَّا قَصَبُ السُّكَّرِ، وَقَصَبُ الذَّرِيْرَةِ، فَفِيْهِمَا الْعُشْرُ، لِأَنَّهُ يُقْصَدُ بِهِمَا اِسْتِغْلَالُ الْاَرْضِ، بِخِلَافِ السَّعَفِ وَالتِّبْنِ، لِأَنَّ الْمَقْصُوْدَ الْحَبُّ وَالثَّمَرُ دُوْنَهُمَا۔

ترجمہ: "رہا گنا اور چرائتہ، تو ان دونوں میں عُشر واجب ہے کیونکہ ان دونوں سے زمین کی پیداوار مقصود ہوتی

ہے برخلاف کھجور کی شاخوں اور بھوسے کے۔کیونکہ مقصود تو دانہ اور چھواراہ ہے نہ کہ بھوسا اور شاخیں، (ہدایہ، جلد 2، ص:60)''۔بھوسا اگر دانے سے اتارا جائے تو اُس میں عُشر نہیں کیونکہ مقصودی پیداوار دانہ ہے، بھوسا نہیں۔لہٰذا اس بھوسے پر عُشر واجب ہوگا جسے نفع اور تجارت کی غرض سے حاصل کیا گیا ہو۔

اگرچہ آج کل بڑے جاگیرداروں کے لئے بھوسا بھی منفعت بخش پیداوار ہے اور کثیر النفع مالِ تجارت ہے اور غالباً بڑے زمین داروں اور جاگیرداروں کی بھوسے سے آمدنی لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے، کیونکہ آج کل مہنگائی انتہائی عروج پر ہے اور یہ مالِ تجارت بھی ہے۔لہٰذا شریعت کی رخصت کے مطابق نفسِ بھوسے پر جنس کی صورت میں عُشر نہیں ہوگا، لیکن اِس کی فروخت سے زمیندار کو جو نقد آمدن ہوگی وہ اُس کے دیگر مالِ نامی میں جمع جائے گی اور اختتامِ سال پر مجموعی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی۔

جن صورتوں میں عُشر ساقط ہو جاتا ہے:

(۱) کھیت بویا مگر پیداوار ڈوب گئی، جل گئی یا ٹیری کھا گئی یا لُو وغیرہ سے جاتی رہی، اگر پوری فصل تباہ ہوگئی، تو عُشر وخراج دونوں ساقط ہوگئے اور اگر کچھ فصل باقی ہے، تو اُس باقی فصل کا عُشر ادا کرنا ہوگا

(۲) اگر کسی شخص نے زراعت پر قادر ہونے کے باوجود فصل کاشت نہیں کی، تو اُس پر عُشر کی ادائیگی واجب نہیں کیونکہ عُشر زمین پر نہیں، اُس کی پیداوار پر ہوتا ہے۔

علامہ علاؤالدین کاسانی حنفی لکھتے ہیں: وَمِنْهَا: أَیْ مِنْ شَرَائِطِ الْمَحَلِّيَّةِ: وُجُودُ الْخَارِجِ حَتّٰى أَنَّ الْأَرْضَ لَوْلَمْ تُخْرِجْ شَيْئًا لَمْ يَجِبِ الْعُشْرُ لِأَنَّ الْوَاجِبَ جُزْءٌ مِّنَ الْخَارِجِ وَإِيجَابُ جُزْءٍ مِّنَ الْخَارِجِ وَلَا خَارِجَ مُحَالٌ۔

ترجمہ: ''کسی چیز پر عشر لاگو ہونے کی شرائط میں سے (ایک شرط): پیداوار کا موجود ہونا ہے، چنانچہ اگر کسی زمین میں کوئی پیداوار نہیں ہوئی، تو اُس میں عُشر واجب نہیں ہوگا، اس لئے کہ واجب پیداوار کا ایک جزو ہوتا ہے اور بغیر پیداوار کے اس کا ایک جزو واجب کرنا محال ہے، (بدائع الصنائع، جلد 2، ص:88)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَهُوَ فَرْضٌ وَسَبَبُهُ الْأَرْضُ النَّامِيَةُ بِالْخَارِجِ حَقِيقَةً بِخِلَافِ الْخَرَاجِ فَإِنَّ سَبَبَهُ الْأَرْضُ النَّامِيَةُ حَقِيقَةً أَوْتَقْدِيرًا بِالتَّمَكُّنِ فَلَوْ تَمَكَّنَ وَلَمْ يَزْرَعْ وَجَبَ الْخَرَاجُ دُونَ الْعُشْرِ، وَلَوْأَصَابَ الزَّرْعَ آفَةٌ لَمْ يَجِبْ۔

ترجمہ: ''عُشر فرض ہے اور اُس کا سبب پیداوار والی زمین سے حقیقتاً پیداوار ہونا ہے، جبکہ خراج کا سبب زمین کا پیداواری صلاحیت کا حامل ہونا (Potential Productivity) ہے، چاہے پیداوار حقیقتاً حاصل کی جائے یا نہ کی جائے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص زمین سے پیداوار لینے پر قادر ہو اور وہ زمین کاشت نہ کرے تو خراج کی ادائیگی لازم ہوگی، لیکن عُشر لازم نہ ہوگا اور اگر پیداوار کو کوئی ایسی آفت پہنچے (جو مکمل کاشت کو تباہ کردے) تو عُشر وخراج کچھ بھی لازم نہیں ہوگا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 185)''۔

(۳) احناف کے نزدیک اِرتداد (کسی شخص کا کافر ہوجانا) بھی عُشر ساقط ہونے کا سبب ہے۔ علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود حنفی کاسانی لکھتے ہیں: وَمِنْهَا: الرِّدَّةُ عِنْدَنَا، لِأَنَّ فِي الْعُشْرِ مَعْنَى الْعِبَادَةِ وَالْكَافِرُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِ الْعِبَادَةِ، وَعِنْدَ الشَّافِعِيِّ لَا يَسْقُطُ كَالزَّكَاةِ۔

ترجمہ: ''وجوبِ عُشر کے ساقط ہونے کا ایک سبب ہمارے (احناف) کے نزدیک ارتداد بھی ہے کیونکہ عُشر میں عبادت کا معنی پایا جاتا ہے اور کافر عبادت کا اہل نہیں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک ارتداد سے عُشر ساقط نہیں ہوتا، جیسے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی، (بدائع الصنائع، جلد 2، ص: 96)''۔

عُشر پیداوار میں واجب ہوتا ہے:

علامہ علاء الدین کاسانی حنفی لکھتے ہیں: اَلْعُشْرُ يَجِبُ فِي الْخَارِجِ لَا فِي الْأَرْضِ فَكَانَ مِلْكُ الْأَرْضِ وعدمُهٗ بمنزلةٍ وَاحِدَةٍ،

ترجمہ: ''عُشر پیداوار میں واجب ہوتا ہے، زمین میں نہیں، لہٰذا زمین کی ملکیت اور عدمِ ملکیت ایک ہی درجہ میں ہے، (بدائع الصنائع، جلد 2، ص: 84)''۔

زمین ٹھیکے پر دی تو عُشر کس پر واجب ہے؟:

ٹھیکے پر دی جانے والی زمین کی پیداوار میں عُشر کی ادائیگی کاشتکار پر واجب ہے۔

علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود حنفی کاسانی لکھتے ہیں: ولو آجر أرضهُ العُشرية، فعُشرُ الخارج على المؤاجر عندهٗ وعندهما على المستأجر۔

ترجمہ: ''اگر (کسی شخص نے اپنی) عشری زمین کرائے پر دی، تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک پیداوار کا عُشر مؤجر (کرائے پر دینے والے یعنی مالک) پر واجب ہے اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ

کے نزدیک مُستاجر (کرائے پر لینے والے) پر لازم ہے، (بدائع الصنائع، جلد 2، ص:84)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''اگر زمیندار زمین بٹائی پر جتوائے یا کاشتکار دیگر کاشتکار سے کاشت کرائے اور نصف پیداوار کے مستحق ہوں تو کیا دونوں پر زکوٰۃ فرض ہوگی؟''۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''صاحبین کا مذہب یہ ہے کہ عُشر صرف کاشتکار پر ہے، اس پر فتویٰ دینے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ ان ملکوں میں جہاں اُجرت میں نقدی ٹھہری ہوتی ہے، وہاں اسی پر فتویٰ ہونا چاہئے۔ اور بٹائی میں امام اعظم کے قول کے مطابق فقط زمیندار پر ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص:203)''۔

زمین بٹائی پر دی تو عُشر کس پر واجب ہوگا؟:

اگر زمین کا مالک عُشری زمین کو بٹائی پر دے دیتا ہے تو عُشر دونوں (مالک ومزارع) پر واجب ہوگا۔ علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود حنفی کاسانی لکھتے ہیں:

وَلَوْ دَفَعَهَا مُزَارَعَةً فَاَمَّا عَلٰی مَذْهَبِهِمَا، فَالْمُزَارَعَةُ جَائِزَةٌ، وَالْعُشْرُ يَجِبُ فِي الْخَارِجِ وَالْخَارِجُ بَيْنَهُمَا فَيَجِبُ الْعُشْرُ عَلَيْهِمَا۔

ترجمہ: ''اگر زمین مزارعت پر دی تو صاحبین کے نزدیک مزارعت جائز ہے اور عُشر پیداوار میں واجب ہوتا ہے اور پیداوار میں دونوں شریک ہیں، لہٰذا دونوں پر عُشر واجب ہوگا، (بدائع الصنائع، جلد 2، ص:84)''۔ مزارعت کو ہمارے عرف میں بٹائی کہتے ہیں، یعنی یہ طے ہو کہ پیداوار میں سے مالک اور مزارع نصف نصف کے حق دار ہوں گے یا جو بھی تناسب دونوں کے درمیان طے ہو جائے۔

عشر فرض ہے اور اس (کے فرض ہونے) کا سبب یہ ہے کہ زمین سے حقیقت میں پیداوار حاصل ہو۔ اس کے برعکس خراج کے واجب ہونے کے لئے فقط زمین کا پیداواری صلاحیت کا حامل ہونا (Potential Productivity) ہے، خواہ یہ پیداوار حقیقت میں عملی طور پر حاصل کی جائے یا کاشت کار اپنی مرضی سے یا کاہلی کے سبب عملی طور پر تو حاصل نہ کرے، مگر زمین میں یہ استعداد موجود ہو کہ اگر وہ چاہتا تو محنت کر کے پیداوار حاصل کر لیتا۔ لیکن اگر قدرت کے باوجود زمین کو کاشت نہ کرے، تو خراج پھر بھی واجب ہوگا، جبکہ عشر صرف حقیقی پیداوار پر ہے۔ اور اگر زمین پر کوئی آفت نازل ہوگئی تو پھر خراج بھی واجب نہیں ہوگا، آج کل خراج کی بحث محض نظریاتی ہے، اطلاقی (Applied) نہیں ہے۔ اور عشر صرف مسلمان پر فرض ہے۔

☆☆☆☆☆

جانوروں کی زکوٰۃ کا بیان

اس کائناتِ ارضی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کیساتھ دیگر مخلوقات کو بھی پیدا فرمایا اور اُن میں کچھ جاندار ایسے بھی پیدا فرمائے، جن سے انسان مستفید ہوتا ہے۔ان جانوروں میں مفید ترین جانور وہ ہیں، جنہیں عربی زبان میں ''اَنعام'' (مویشی) کہا جاتا ہے اور یہ اونٹ، گائے (بیل اور بھینس)، بکری، بھیڑ وغیرہ ہیں۔قرآن کریم میں بطورِ احسان بھی اِن کا ذکر فرمایا اور ان کے منافع بھی بیان فرمائے۔

اہلِ عرب کے لئے مویشی اور بالخصوص اونٹ بہت مفید اور کثیر المنافع جانور تھا، اس لئے احادیثِ مبارکہ میں تفصیل کے ساتھ اُن کا نصاب اور اس کی مقدار کو بیان فرمایا۔آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں حیوانی ثروت (ANIMAL WEALTH) کو اہم مالی آمدنی کا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں مویشی پالے اور پرورش کئے جاتے ہیں، اِسے (Live Stock) کہتے ہیں۔

سائمہ جانور کیا ہیں؟:

سائمہ وہ جانور جن میں تین باتیں پائی جائیں:

(۱) سال کا اکثر حصہ کسی سرکاری چراگاہ میں چَرتے ہوں یا اُن کا چارہ قیمت دے کر حاصل نہ کیا جاتا ہو اور گھر میں بھی ان کو کچھ نہ دیا جاتا ہو۔اگر نصف سال خود کسی بھی مقام سے چَر کر گزارہ کرتے ہوں اور نصف سال گھر میں کھلایا جاتا ہو تو وہ سائمہ نہیں، اسی طرح اگر ان کے لئے گھر میں گھاس منگائی جاتی ہو، خواہ قیمت سے خرید کر ہو یا بلا قیمت، تو وہ سائمہ نہیں ہیں۔

(۲) جو گھاس وہ چَرتے ہوں، کسی کی طرف سے اُس کی ممانعت نہ ہو۔

(۳) دودھ حاصل کرنے یا افزائشِ نسل کے لئے جانور رکھے گئے ہوں، اگر اِن دونوں غرضوں سے نہ رکھے ہوں بلکہ گوشت کھانے یا سواری کے لئے ہوں، تو پھر وہ سائمہ نہیں کہلائیں گے۔

جو جانور سال کا بیشتر حصہ جنگل میں چَر کر گزارتے ہوں اور چَرانے کا مقصد محض دودھ اور بچے لینا یا فربہ کرنا ہے، تو یہ جانور ''سائمہ'' کہلاتے ہیں۔سائمہ جانور خواہ نَر ہوں یا مادہ یا ملے جلے ہوں، ان سب پر زکوٰۃ

واجب ہوگی۔ ایسے جانور جو جنگل میں چرتے تو ہیں لیکن اس سے مقصود بوجھ لادنا یا ہل وغیرہ کے کاموں میں لانا یا سواری کے طور پر استعمال کرنا یا اُن کا گوشت کھانا مقصود ہو تو یہ جانور ''سائمہ'' نہیں کہلائیں گے اور نہ ہی اِن پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جن جانوروں کو گھر پر چارہ کھلاتے ہیں، اُن پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

جو جانور تجارت کی غرض سے خریدے گئے ہیں، وہ مالِ تجارت ہیں اور انُ کی زکوٰۃ ان کی قیمت کے حساب سے دی جائے گی، سائمہ کے لحاظ سے نہیں دی جائے گی۔ البتہ اگر کوئی شخص صرف اپنے ذاتی استعمال میں لانے اور خود گوشت کھانے کے لئے جنگل میں جانور چرنے کے لئے چھوڑتا ہے تو اُس پر کسی قسم کی زکوٰۃ نہیں ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: تمام جانوروں میں افزائشِ نسل کی صلاحیت اور مدتِ حمل یکساں نہیں ہوتی، اس لئے تمام جانوروں کی زکوٰۃ کا ایک قاعدہ مقرر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا جانوروں کی مالیت اور قوت افزائش کے لحاظ سے رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کی زکوٰۃ کی حسبِ ذیل شرح مقرر فرمائی:

خیال رہے کہ یہ زکوٰۃ ان جانوروں پر ہے جو قدرتی اور خود رَو گھاس چَر کر گزارہ کرتے ہیں، سال کے بعد ان کی یہ زکوٰۃ ہے:

نوٹ: جدول اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

جانوروں کی زکوٰۃ کا جدول

نمبر شمار	جانور کا نام اور تعداد	شرحِ زکوٰۃ
1	۵ سے ۹ اونٹ	ایک بکری
2	۱۰ سے ۱۴ اونٹ	دو بکریاں
3	۱۵ سے ۱۹ اونٹ	تین بکریاں
4	۲۰ سے ۲۴ اونٹ	چار بکریاں
5	۲۵ سے ۳۵ اونٹ	ایک سالہ اونٹ کی بچی
6	۳۶ سے ۴۵ تک اونٹ	دو سالہ اونٹنی
7	۴۶ سے ۶۰ تک اونٹ	تین سالہ اونٹنی
8	۶۱ سے ۷۵ تک اونٹ	چار سالہ اونٹنی
9	۷۶ سے ۹۰ تک اونٹ	دو، دو سالہ اونٹنیاں
10	۹۱ سے ۱۲۰ تک اونٹ	دو، تین سالہ اونٹنیاں
11	۳۰ سے ۳۹ گائے	ایک سالہ بچھڑی یا بچھڑا
12	۴۰ سے ۵۹ گائے	دو سالہ بچھڑی یا بچھڑا
13	۶۰ سے ۶۹ تک گائے	دو، ایک سالہ بچھڑیاں یا بچھڑے
14	۷۰ سے ۷۹ تک گائے	ایک دو سالہ بچھڑی اور ایک، ایک سالہ بچھڑی
15	۸۰ سے ۸۹ تک گائے	دو، دو سالہ بچھڑیاں
16	۹۰ سے ۹۹ تک گائے	تین ایک سالہ بچھڑیاں
17	۱۰۰ سے 119 تک گائے	دو ایک سالہ اور ایک دو سالہ بچھڑیاں

نمبر شمار	جانور کا نام اور تعداد	شرح زکوٰۃ
18	۴۰ سے ۱۱۹ تک بکریاں	ایک بکری
19	۱۲۰ سے ۲۰۰ تک بکریاں	دو بکریاں
20	۲۰۱ سے ۳۹۹ تک بکریاں	تین بکریاں
21	۴۰۰ سے ۴۹۹ تک بکریاں	چار بکریاں
22	پھر ہر ۱۰۰ پر	ایک بکری کا اضافہ

(شرح صحیح مسلم، جلد 2، ص: 881-880)

جو جانور زکوٰۃ میں دیئے جائیں، اُن میں کوئی عیب نہ ہو یعنی نہ وہ بیمار ہوں، نہ اُن کے اعضاء کہیں سے ٹوٹے یا کٹے ہوئے ہوں، نہ ایسے بوڑھے ہوں کہ ان کے دانت گر گئے ہوں، غرض کوئی ایسا عیب ان میں نہ ہو، جس سے اُن کی منفعت اور قیمت میں کمی آجائے۔ ہاں! اگر سارے ہی جانور عیب دار، بوڑھے یا بیمار ہوں تو زکوٰۃ اُنہی میں سے دی جائے گی۔

کن جانوروں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے:

سواری کے گھوڑے اور زراعت کے بیلوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ ہاں اگر گھوڑے تجارتی مقاصد کے لئے ہوں، تو اُن پر تجارتی نوعیت کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اسی طرح گدھے، خچر، سدھائے ہوئے چیتے اور کتے پر اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی، جب وہ تجارت کے لئے ہوں۔

مصارفِ زکوٰۃ

مَصرف کے معنی ہیں خرچ کرنے کی جگہ، یعنی وہ اشخاص وافراد یا امور جن پر زکوٰۃ وصدقات کا مال خرچ کرنا جائز ہے۔ ایسے فرد کو مستحق (Deserving) کہتے ہیں۔ یہ زکوٰۃ کا ایک انتہائی اہم اور مستقل شعبہ ہے، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ زکوٰۃ وعشر کی حکمت معاشرے کے نادار طبقات کی کفالت ہے تا کہ اسلامی معاشرے میں فقر وافلاس کا خاتمہ ہو، عدلِ اجتماعی اور معاشی انصاف (Social Justice) قائم ہو۔

صدقات واجبہ کا مصرف صرف مسلمان ہیں:

صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فطرہ، فدیۂ صوم، فدیۂ صلوٰۃ، کفارات اور نذر کی رقوم) کا مصرف صرف مسلمان ہیں، غیر مسلموں کو دینے سے ادا نہیں ہوں گے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ مُعَاذًا اِلَی الْیَمَنِ فَقَالَ: اِنَّكَ تَأْتِی قَوْمًا اَهْلَ كِتَابٍ فَادْعُهُمْ اِلٰی شَهَادَةِ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ، فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَیْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِی الْیَوْمِ وَاللَّیْلَةِ، فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ، فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَیْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِهِمْ، فَاِنْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ، فَاِیَّاكَ وَكَرَائِمَ اَمْوَالِهِمْ، وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهُ لَیْسَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ۔

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا: تم اہل کتاب (یعنی یہود ونصاریٰ) کی قوم کے پاس (جب) پہنچو، تو انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد ﷺ کی رسالت کی گواہی دینے کی دعوت دو۔ اگر وہ اس (دعوتِ حق) کو تسلیم کرلیں، تو انہیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اس کو بھی تسلیم کرلیں، تو انہیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے، جو اُن کے مالداروں سے لی جائے اور اُن کے ناداروں کو (ان کے حق کے طور پر) لوٹائی جائے، اگر وہ اس (دعوتِ حق) کو قبول کرلیں تو (زکوٰۃ میں) ان کے عمدہ مال مت لو (بلکہ اوسط درجے کا مال لو) اور مظلوم کی پکار سے ڈرو کیونکہ اُس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے''۔

(صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 1579، سنن ترمذی رقم الحدیث: 625)

واضح رہے کہ نفلی صدقہ (Voluntary Charity) غیر مسلم نادار کو بھی دیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں مصارف زکوٰۃ کی تفصیل:

قرآن نے زکوٰۃ کے فرض ہونے کا بیان تو وضاحت کے ساتھ متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے، لیکن زکوٰۃ کا نصاب، زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط کی تفصیلات بیان نہیں فرمائیں۔ یہ تمام تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں۔ البتہ زکوٰۃ کے جس شعبے کو قرآن نے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے وہ زکوٰۃ کے مصارف کا شعبہ ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے حق دار صرف فقراء اور مساکین ہیں، اور زکوٰۃ کی وصولیابی پر مامور لوگ اور جن کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو، اور (غلامی سے) گردنیں آزاد کرانے میں، اور مقروض لوگ اور اللہ کی راہ میں، اور مسافر لوگ، یہ اللہ کی جانب سے ایک فریضہ ہے اور اللہ بہت علم والا بڑی حکمت والا ہے، (التوبۃ:60)''۔

اس آیت میں زکوٰۃ کے حق داروں کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) فقراء (۲) مساکین (۳) عاملینِ زکوٰۃ (۴) مُؤَلَّفۃُ القلوب (۵) جن کو طوقِ غلامی سے آزاد کرنا مقصود ہو (۶) جو بارِ قرض تلے دبے ہوئے ہوں یا ان پر کوئی تاوان آ پڑا ہو (۷) جنہوں نے اپنے آپ کو کل وقتی (Full Time) دین کی نصرت و حفاظت یا علمِ دین کے حصول کے لئے وقف کر رکھا ہو (۸) ایسے مسافر جو نادار ہوں یا جن کا گھر سے رابطہ منقطع ہو چکا ہو۔

حدیثِ پاک میں اس امر کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ مصارفِ زکوٰۃ اجتہادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصوص (Stipulated, Laid Down) اور متعین (Specified) ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ (بِسَنَدِهٖ) اَنَّهٗ سَمِعَ زِيَادَبْنَ الْحَارِثِ الصُّدَائِيَّ قَالَ: اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَبَايَعْتُهٗ، فَذَكَرَ حَدِيْثًا طَوِيْلًا فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ: اَعْطِنِيْ مِنَ الصَّدَقَةِ، فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ لَمْ

يَرْضَ بِحُكْمِ نَبِيٍّ وَّلَاغَيْرِهٖ حَتّٰى حَكَمَ فِيهَا هُوَ ،فَجَزَّأَهَا ثَمَانِيَةَ أَجْزَاءٍ، فَإِنْ كُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْاَجْزَاءِ، أَعْطَيْتُكَ حَقَّكَ۔

ترجمہ:''عبداللہ بن مسلمہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ زیاد بن حارث صدائی کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے آپ ﷺ کے دستِ اقدس پر بیعتِ اسلام کی، پھر انہوں نے ایک طویل حدیث بیان کی اور اس دوران انہوں نے بیان کیا کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ عنایت فرمایئے!، تو رسول اللہ ﷺ نے اُس سے، فرمایا: (مصارفِ زکوٰۃ کے معاملے کو) اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے حکم پر نہیں چھوڑا (یعنی یہ صوابدیدی مسئلہ نہیں ہے)

بلکہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے (سورۂ توبہ:60 میں) خود ہی فیصلہ فرمادیا ہے اور اس کے آٹھ مصارف بیان کیے ہیں، تو اگر تم ان میں سے کسی مصرف کے تحت حق دار بنتے ہو تو (مالِ زکوٰۃ میں سے) میں تمہارا حق تمہیں دے دوں گا (ورنہ تمہیں نہیں دوں گا)، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:1627)''۔

لہٰذا زکوٰۃ نکالنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل مستحقین تک پہنچانا اور جائز شرعی مصارف پر صَرف کرنا بھی لازم ہے، ورنہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ ہمارے معاشرے میں جمع وصرفِ زکوٰۃ کی بعض صورتیں رائج ہیں جو شرعاً درست نہیں ہیں۔

فقیر و مسکین کا مصداق:

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک فقیر وہ شخص ہے، جس کے پاس کچھ مال ہو لیکن وہ زکوٰۃ کے نصاب سے کم ہو۔ اور مسکین وہ شخص ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ امام شافعی اور امام احمد کا قول اس کے برعکس ہے اور امام مالک کے نزدیک فقیر و مسکین ہم معنی ہیں۔

امام بخاری نے ایک طویل حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے: تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ۔

ترجمہ:''زکوٰۃ اُن (مسلمانوں) کے مالداروں سے لے کر اُن کے غریبوں کو لوٹا دی جائے۔'' (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1395)

اس حدیث کی روشنی میں فقہائے کرام نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ زکوٰۃ کے مال کو خرچ کرنے میں افضل یہ ہے

کہ جس مقام پر زکوٰۃ وصول کی جائے، وہیں کے فقراء اور ناداروں پر صَرف کی جائے، البتہ مندرجہ ذیل صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: (۱) یہ کہ اس مقام پر کوئی مستحق نہ ہو جیسے امریکا، یورپ یا بعض مال دار مسلم ممالک میں ایسا ممکن ہے۔
(۲) یا زکوٰۃ ادا کرنے والے کے مستحق قریبی رشتہ دار کسی دوسرے مقام پر رہتے ہوں۔ (۳) یا کسی جگہ کے مسلمان بہت زیادہ نادار اور ضرورت مند ہوں تو ان صورتوں میں دوسرے مقامات پر بھی زکوٰۃ کی رقوم بھیجی جا سکتی ہیں، لیکن مقامی مستحقین کو بالکل نظر انداز کر کے دوسرے مقامات پر زکوٰۃ کی رقوم بھیجنا شرعاً قابلِ ترجیح اور پسندیدہ امر نہیں ہے، اگرچہ ایسا کرنے سے اصولی طور پر زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

عاملینِ زکوٰۃ کا مصداق:

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حاکمِ وقت کی طرف سے زکوٰۃ وعشر کی وصولیابی پر مامور ہوں۔ ان لوگوں کو زکوٰۃ کے مال میں سے اجرت یا معاوضہ دیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے ان کا فقیر و مسکین ہونا ضروری نہیں ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ان کی اجرت زکوٰۃ وعشر کی وصول کردہ رقم کے نصف سے کم ہو۔ اگر کسی عامل کو زکوٰۃ وعشر کی وصولیابی کے موقع پر کوئی ہدیہ اور تحفہ دے تو اس کے لئے لینا جائز نہیں ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ اَبِی حُمَیْدِنِ السَّاعِدِیِّ: أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اِسْتَعْمَلَ ابْنَ الْاُتْبِیَّةِ (وفِی رِوَایَةٍ اُخْرٰی اِبْنَ الْلُّتْبِیَّةِ) عَلٰی صَدَقَاتِ بَنِی سُلَیْمٍ، فَلَمَّا جَاءَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَحَاسَبَهٗ قَالَ: هٰذَا الَّذِیْ لَکُمْ، وَهٰذِهٖ هَدِیَّةٌ اُهْدِیَتْ لِیْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "فَهَلَّا جَلَسْتَ فِیْ بَیْتِ اَبِیْكَ وَبَیْتِ اُمِّكَ حَتّٰی تَأْتِیَكَ هَدِیَّتُكَ اِنْ کُنْتَ صَادِقًا، ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَخَطَبَ النَّاسَ، وَحَمِدَاللّٰهَ وَاَثْنٰی عَلَیْهِ، ثُمَّ قَالَ: اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اُسْتَعْمِلُ رِجَالًا مِنْکُمْ عَلٰی اُمُوْرٍ مِمَّا وَلَّانِیَ اللّٰهُ، فَیَأْتِیْ اَحَدُکُمْ فَیَقُوْلُ: هٰذَا لَکُمْ وَهٰذِهٖ هَدِیَّةٌ اُهْدِیَتْ لِیْ، فَهَلَّا جَلَسَ فِیْ بَیْتِ أَبِیْهِ وَبَیْتِ اُمِّهٖ حَتّٰی تَأْتِیَهٗ هَدِیَّتُهٗ اِنْ کَانَ صَادِقًا، فَوَاللّٰهِ لَا یَأْخُذُ اَحَدُکُمْ مِنْهَا شَیْئًا، قَالَ هِشَامٌ، بِغَیْرِ حَقِّهٖ، اِلَّا جَاءَ اللّٰهَ یَحْمِلُهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ، اَلَا فَلَاُعْرِفَنَّ مَا جَاءَ اللّٰهَ رَجُلٌ بِبَعِیْرٍ لَهٗ رُغَاءٌ اَوْ بِبَقَرَةٍ لَهَا خُوَارٌ، اَوْ شَاةٍ تَیْعَرُ ثُمَّ رَفَعَ یَدَیْهِ حَتّٰی رَأَیْتُ بَیَاضَ اِبْطَیْهِ: اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ"۔

ترجمہ: "حضرت ابوحمید الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ابن الاُتبیّۃ (اور ایک روایت

میں ہے اِبنَ اللُتبِیَة ہے) کو بَنِی سُلَیم کے صدقات وصول کرنے کا عامل مقرر کیا، جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ نے اس سے حساب لیا، تو اس نے کہا: ''یہ آپ کے لئے (صدقات کا) مال ہے اور یہ مال مجھے ہدیے کے طور پر دیا گیا ہے''۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو (کہ یہ مال تمہیں ہدیہ دیا گیا ہے)، تو اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھے رہے کہ تمہارے پاس یہ ہدیے کا مال آتا''۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: ''میں تم سے کسی شخص کو کسی ایسے کام پر عامل بناتا ہوں جس کام کا اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے، پھر تم میں سے کوئی شخص میرے پاس آ کر کہتا ہے: مال کا یہ حصہ آپ کے لئے ہے اور یہ حصہ مجھے ہدیہ کیا گیا ہے۔ اگر وہ سچا ہے تو کیوں نہ اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر میں بیٹھا رہا کہ اس کے پاس یہ ہدیے آتے۔ اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی اس مال میں سے کچھ بھی نہیں لے گا، ہشام نے کہا یعنی ناحق نہیں لے گا، (اور اگر اس نے ناحق کچھ لیا) تو وہ قیامت کے دن اِس (ناحق) مال کو اٹھائے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوگا۔ سنو! میں اس شخص کو قیامت کے دن ضرور پہچان لوں گا جو بلبلاتے اونٹ کو یا ڈکراتی ہوئے گائے کو یا ممیاتی ہوئی بکری کو لادے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوگا۔ پھر آپ نے (جلالی کیفیت میں) اپنے دونوں ہاتھ اتنے بلند کئے کہ آپ کی دونوں بغلوں کی سفیدی مجھے نظر آئی (اور آپ ﷺ نے فرمایا): سنو! تحقیق میں نے (اللہ تعالیٰ کا) پیغام (حق تم تک) پہنچا دیا ہے، (صحیح بخاری: 7197)''۔

اس حدیث میں اونٹ، گائے اور بکری کا ذکر اس لئے ہے کہ نبی ﷺ نے اُس شخص کو مویشیوں کی زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے مقرر کیا تھا۔

(۲) عن عدیّ بن عمیرة الکندی، قال: سمِعتُ رسُولَ اللہِ ﷺ یقُولُ: "مَنِ استعمَلنَاہُ مِنکُم علی عملٍ، فکتمنا مخیطًا فما فوقہُ، کان غُلُولًا یأتِی بہٖ یوم القیامةِ"، قال: فقام إلیہِ رجُلٌ اسودُ مِن الانصار، کأنِّی انظُرُ الیہِ فقال: یا رسُولَ اللہِ! اِقبل عنِّی عملَك، قال: ومالَكَ؟، قال: سمعتُكَ تقُولُ کذا وکذا، قال: وانا اقُولُہُ الآن، مَنِ استعملناہُ منکُم علی عملٍ فلیجیٔ بقلیلہٖ وکثیرہٖ، فما اُوتِی منہُ اخذ، وما نُہی عنہُ، انتھٰی،

ترجمہ: ''حضرت عدی بن عمیرۃ کندی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے

جس کسی کو ہم نے کسی کام پر مامور کیا اور اس نے ایک سوئی کی مقدار یا اس سے بھی کم تر کوئی چیز (صدقات کے مال میں سے) چھپائی، تو وہ خائن ہے اور قیامت کے دن اس مال کے ساتھ (اللہ کی عدالت میں) حاضر ہوگا، تب ایک سیاہ فام انصاری اٹھا، گویا کہ میں اس کی طرف دیکھ رہا ہوں، اور کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے مجھے جو کام سپرد کیا ہے، اسے واپس لے لیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیوں؟، اس نے کہا: میں نے آپ کو اس طرح فرماتے ہوئے سنا ہے، آپ نے فرمایا: ہاں! میں اب پھر کہتا ہوں: تم میں سے میں جس کو کسی کام پر مامور کروں تو وہ (صدقات کا سارا مال) لے کر آئے، خواہ کم ہو زیادہ، اس کے بعد اُسے (اس کی محنت کی) جو اجرت دی جائے وہ لے لے اور جس چیز سے روکا جائے اس سے رک جائے، (صحیح مسلم:4636)''۔

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ وعشر کی وصولی شرعی اعتبار سے بہت حساس ذمے داری ہے، یہ نہایت دیانت وامانت کا تقاضا کرتی ہے۔ اور خدانخواستہ معمولی سی خیانت بھی قیامت کے دن وبال بن جائے گی۔ ان احادیثِ مبارکہ میں بڑی وعید ہے، اللہ تعالیٰ سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔

وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا: یَعْنِی السُّعَاةَ وَالْجُبَاةَ الَّذِیْنَ یَبْعَثُهُمُ الْإِمَامُ لِتَحْصِیْلِ الزَّکوٰةِ بِالتَّوْکِیْلِ عَلٰی ذَالِكَ۔ وَاخْتَلَفُوْا فِی الْعَامِلِ إِذَا کَانَ هَاشِمِیًّا فَمَنَعَهُ أَبُوْ حَنِیْفَةَ لِقَوْلِهٖ عَلَیْهِ السَّلَامُ: "إِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَحِلُّ لِآلِ مُحَمَّدٍ إِنَّمَاهِیَ أَوْسَاخُ النَّاسِ" وَهٰذِهٖ صَدَقَةٌ مِنْ وَّجْهٍ، لِأَنَّهَا جُزْءٌ مِّنَ الصَّدَقَةِ فَتُلْحَقُ بِالصَّدَقَةِ مِنْ کُلِّ وَجْهٍ کَرَامَةً وَّتَنْزِیْهًا لِقَرَابَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَنْ غُسَالَةِ النَّاسِ۔ وَأَجَازَ عَمَلَهٗ مَالِكٌ وَّالشَّافِعِیُّ، وَیُعْطٰی أَجْرُ عُمَالَتِهٖ، لِأَنَّ النَّبِیَّ ﷺ بَعَثَ عَلِیَّ بْنَ أَبِیْ طَالِبٍ مُصَدِّقًا، وَبَعَثَهٗ عَامِلًا إِلَی الْیَمَنِ عَلَی الزَّکَاةِ، وَوَلّٰی جَمَاعَةً مِّنْ بَنِیْ هَاشِمٍ وَّوَلّٰی الْخُلَفَاءُ بَعْدَهٗ کَذٰلِكَ وَلِأَنَّهٗ أَجِیْرٌ عَلٰی عَمَلٍ مُبَاحٍ فَوَجَبَ أَنْ یَّسْتَوِیَ فِیْهِ الْهَاشِمِیُّ وَغَیْرُهٗ إِعْتِبَارًا بِسَائِرِ الصِّنَاعَاتِ۔ قَالَتِ الْحَنَفِیَّةُ: حَدِیْثُ عَلِیٍّ لَیْسَ فِیْهِ أَنَّهٗ فَرَضَ لَهٗ مِنَ الصَّدَقَةِ، فَإِنْ فَرَضَ لَهٗ مِنْ غَیْرِهَا جَازَ۔

ترجمہ: ''وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا: یعنی وہ لوگ جنہیں امام (حاکمِ وقت) وکیل بناکر زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے مقرر کرے اور (امراء کے پاس جاکر) زکوٰۃ جمع کریں۔

اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اگر ''عاملِ زکوٰۃ'' ہاشمی ہے، تو امام ابوحنیفہ نے انہیں زکوٰۃ میں سے اجرت دینے سے منع کیا ہے اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ: ''صدقات لوگوں کے مال کا میل ہے اور محمد اور آلِ محمد کے

لئے جائز نہیں ہے''۔ یہ اجرت ایک طرح سے صدقہ ہی ہے، کیوں کہ یہ صدقہ ہی کا جزء ہے، تو بحیثیت مجموعی یہ صدقے ہی کے ساتھ ملحق ہوگا (یعنی اس پر صدقہ ہی کے حکم کا اطلاق ہوگا)۔ تو بنی ہاشم کی کرامت اور رسول اللہ ﷺ سے قرابت کی بنا پر انہیں لوگوں کے (مال کے) دھوون سے پاک رکھا جائے گا۔ امام مالک اور امام شافعی نے بنی ہاشم عاملینِ صدقات کے لئے اسی مال سے اجرت کو جائز قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ اور اُس کے بعد خلفاء نے بنی ہاشم کو عامل زکوٰۃ بنایا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ بھی کہ یہ ایک مباح کام پر اَجیر (مامور) ہے، تو اور تمام کاموں کی طرح اس میں ہاشمی اور غیر ہاشمی کا حکم ایک ہونا چاہئے۔

حنفیہ نے کہا: حدیث علی میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرتِ علی کو صدقے کے مال میں سے کچھ دیا تھا اور اگر صدقے کے مال کے علاوہ کچھ دیا ہو تو یہ بالاتفاق جائز ہے، (الجامع لاحکام القرآن، جلد:08، ص:178-177)''۔

مُؤَلَّفَۃُ القلوب کا مصداق:

ڈاکٹر وھبہ زوحیلی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، یہاں اس کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے:

ترجمہ: ''اس سے مراد وہ کفار ہیں جن کو اسلام قبول کرنے کے لئے مائل کرنا مقصود ہو اور اُن سے خیر کی امید ہو یا ان کی اذیت اور شر سے بچنا مقصود ہو یا ایسے ضعیف الاعتقاد مسلمان جن کے ایمان کو تقویت دینا مقصود ہو تاکہ وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں یا اُن کے دیگر لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو۔ ابتدائے اسلام میں ایسے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ وصدقات یا خُمس سے مال عطا کیا۔ غزوۂ حُنین کے موقع پر آپ ﷺ نے ابوسفیان بن حرب، صَفوان بن اُمیہ، عُیینہ بن حصن، اَقرع بن حابس، عباس بن مرداس، مالک بن عوف، حکیم بن حُزام وغیرہ پندرہ افراد میں سے اکثر کو سو سو اونٹ اور بعض کو پچاس اور ستر اونٹ عطا کئے۔ فقہاءِ احناف کے نزدیک اب یہ مصرف باقی نہیں رہا یا منسوخ ہو چکا ہے، کیونکہ اس کی ضرورت اس وقت تک تھی جب تک اسلام غالب نہیں ہوا تھا، جب اسلام اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا فرما دیا تو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے اس کے نسخ کو ظاہر کیا اور چونکہ صحابۂ کرام میں سے کسی کا اس سے اختلاف ثابت نہیں، لہٰذا اس کے نسخ پر اجماعِ صحابہ ہوگیا۔ یا رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ کو قاضی مقرر کر کے یمن بھیجا، تو اُن کو جو ہدایات دیں، ان میں زکوٰۃ کی بابت فرمایا:

خُذْهَا مِنْ اَغْنِيَآءِ هِمْ وَرُدَّ اِلٰی فُقَرَائِهِمْ، زکوٰۃ ان کے مالداروں سے لو اور ان کے ناداروں کو لوٹاؤ، تو گویا مؤلفۃ القلوب کا شعبہ منسوخ ہو گیا۔

بعض مالکیہ کے نزدیک یہ شعبہ غیر مسلموں کے حق میں تو منسوخ ہے لیکن نو مسلموں کے لئے باقی ہے۔ شافعیہ کے نزدیک بھی کافروں کو زکوٰۃ کے مال سے نہیں دیا جائے گا، لیکن ضعیف الاعتقاد نو مسلموں کی ثابت قدمی اور ان کے ایمان کو تقویت کے لئے دیا جائے گا۔ اس سے اُن کے سابق مذہب کے دیگر لوگوں کو بھی ترغیب ملے گی۔ حنابلہ کے نزدیک زکوٰۃ کا یہ مصرف باقی ہے۔ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اس مصرف کو اور بھی وسعت دی ہے، لیکن ہم اسے اسی حد تک محدود رکھتے ہیں''۔

(تلخیص بحث، فقہ الاسلام و اَدِلّتہٗ، جلد: 3، ص: 2003-1998)

اگر ہم مصارف زکوٰۃ سے ''مُؤَلَّفَۃُ الْقُلُوب'' کو منسوخ کرنے کی بات کرتے ہیں، تو اس سے منکرین حدیث (پرویزی) یہ اصول وضع کرتے ہیں کہ حاکم وقت یا حکومت وقت کو معاذ اللہ! قرآن مجید کے کسی صریح حکم کو منسوخ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اسی طرح یہ اصول بھی ماننا پڑے گا کہ ''اجماع'' سے قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تو ہو سکتا ہے کہ ''اجماع اُمت'' سے قرآن مجید کے ایک سے زائد معانی کے حامل کسی کلمے کے ایک معنی کو قطعیت کے ساتھ متعین کر دیا جائے، جیسے پوری امت کا اجماع ہے کہ ''خاتَمُ النَّبِیّٖن'' کے معنی ہیں: ''آخِرُ النَّبِیّٖن''۔

جو بات ہمارے لئے قرین عقل ہے، وہ یہ کہ ''مؤلفۃ القلوب'' کو زکوٰۃ کا مصرف قرار دینے کی علت بھی ضعیف الاعتقاد نو مسلموں کی ثابت قدمی اور ان کے ایمان کو تقویت دینے کے لئے انہیں زکوٰۃ کا مال دینا ہے۔ کیونکہ ابتدائے اسلام میں مسلمان غلبے کی حالت میں نہیں تھے بلکہ کمزور پوزیشن میں تھے۔ مگر خلافت راشدہ کے عہد مبارک میں یقیناً اسلام کو اللہ تعالیٰ نے اُس خطے میں حقیقی اور کامل غلبہ عطا فرما دیا تھا، تو اُس وقت یہ علت موجود نہیں تھی۔ لہٰذا اس مصرف پر زکوٰۃ کا مال خرچ کرنے کا سلسلہ منقطع یا موقوف یا مُعطّل ہو گیا۔ مگر آج عالمی سطح پر اسلام اور مسلمان غالب پوزیشن میں نہیں ہیں، بلکہ پاکستان میں صوبہ سندھ کے ضلع سانگھڑ و تھرپارکر میں ہندوؤں کی کافی آبادی ہے۔ اگر کوئی فرد، خاندان یا چند خاندان اسلام قبول کرتے ہیں تو انہیں ہندوؤں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر خاندان طاقت ور ہے تو اسے وسائل سے محروم کر دیتے ہیں، ایسی

صورت میں اول تو اسلامی ریاست کی ذمے داری ہے کہ انہیں مکمل تحفظ دے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرے اور ضرورت کے موقع پر ان کی کفالت کرے۔ لیکن ہماری حکومتیں آئینی طور پر تو اسلامی ہیں لیکن عملی طور پر سیکولر ہیں۔ تو اس پس منظر میں ''مؤلفۃ القلوب'' کا مصرف زکوٰۃ اب بھی مؤثر ہونا چاہئے اور ہمارے اہل فتویٰ کو اس پر غور کرنا چاہئے۔ عرب علماء میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی کا بھی یہی موقف ہے۔

اس اصول کے پیش نظر کہ صدقاتِ واجبہ صرف مسلمان مستحقین ہی کو دیئے جاسکتے ہیں، مفسرینِ کرام نے کہا ہے کہ جن غیر مسلموں کے قلوب کو اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود تھا یا دفعِ شر کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کو عطا کیا تھا، وہ زکوٰۃ کا مال نہیں تھا بلکہ خُمس کا مال تھا، جس کا آپ ﷺ کو اختیار تھا۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں سورۂ توبہ کی آیت:60 کے تحت مؤلفۃ القلوب کے مصرف کے جاری رہنے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن انہوں نے اس مقام پر لکھا کہ صرف ایک ہی مصرف عاملین زکوٰۃ کا ہے، جن کے لئے فقیر اور مسکین ہونے کی شرط نہیں ہے، مگر مؤلفۃ القلوب (یعنی ضعیف الاعتقاد مسلمانوں) کو صرف فقیر و مسکین ہونے کی صورت میں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

مجھے اس مسئلے کی ضرورت کا احساس اس وقت ہوا جب ایک ٹیلیویژن مباحثے میں اینکر پرسن نے پوچھا: ''کیا آج کے دور میں قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کیا جاسکتا ہے؟''۔ میرے ساتھ بحث میں شریک شیعہ عالم نے کہا: ''کیوں نہیں؟ حضرت عمر نے مصارف زکوٰۃ میں سے مؤلفۃ القلوب کو منسوخ کر دیا تھا''۔ دراصل وہ طنز کر رہے تھے، میں نے اُس وقت یہی جواب دیا کہ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا، حضرت عمر نے غلبۂ اسلام کے سبب اسے معطّل کر دیا تھا، کیونکہ اس دور میں اس کی ضرورت باقی نہیں تھی، لیکن جب بھی ایسے حالات پائیں جائیں تو یہ شعبۂ زکوٰۃ مؤثر رہے گا۔ پس اس پر معاصر علماء کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

فِی الرقاب کا مِصداق:

رقاب، رقبۃ کی جمع ہے، رقبہ کے معنی ''گردن'' کے ہیں۔ اس سے انسان کے پورے وجود کو بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور عہدِ غلامی میں جو شخص مکمل طور پر کسی کا زر خرید ہوتا یا اسے وراثت، ہبہ، تاوان، مالِ غنیمت یا کسی اور صورت میں ملتا، تو اس کامل غلام کو فقہی یا قانونی زبان میں ''مِلکِ رقبہ'' سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ یعنی اس کی گردن پھنسی ہوئی ہے اور وہ اپنے مالک کا پابند ہے، اپنی مرضی سے آزادانہ تصرف نہیں کرسکتا۔ غلاموں کی ایک قسم ''مُکاتَب'' تھی،

یعنی ایسا غلام جسے مالک یہ کہے کہ اتنی رقم (جو اس نے مقرر کی ہے) دے دو تو تم آزاد ہو۔ جب تک غلامی کا رواج تھا، اسلام نے غلام آزاد کرنے کو بڑی نیکی سے تعبیر کیا، یہ اسلام میں غلامی کا نظام ختم کرنے کی جانب ایک تدریجی عمل تھا۔ بعض کفارات میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا اور خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے غلام آزاد کرنے کو سعادت اور اجر کا ذریعہ بتایا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ٥ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ٥ فَكُّ رَقَبَةٍ ٥

(۱) ترجمہ: ''وہ دشوار گزار گھاٹی میں کیوں نہ داخل ہوا اور تو کیا جانے دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟، (یہ) گردن چھڑانا (یعنی غلام کو آزاد کرنا) ہے، (البلد: 11 تا 13)''۔ اور فرمایا: وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا وَاٰتُوهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىْ اٰتَاكُمْ ط

(۲) ترجمہ: اور تمہارے غلاموں میں سے جو مال کے عوض آزاد ہونا چاہیں، انہیں مُکاتَب بنالو، اگر تمہارے علم میں ان کی بہتری ہو، اور تم ان کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے، (النور: 33)''۔ حدیث پاک میں ہے:

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بھی شخص کسی مسلمان شخص کو آزاد کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کے اجر اور انعام کے طور پر اُس آزاد کردہ غلام کے ہر عضو کے بدلے میں اسے نارِ جہنم سے نجات عطا فرمائے گا''۔

(صحیح بخاری: 2517)

اسی مفہوم کی احادیث صحیح مسلم: 509، سنن ترمذی: 1541، السنن الکبریٰ للبیہقی، جلد: 10 ص: 271 اور المعجم الکبیر للطبرانی، جلد: 01، ص: 95 میں مروی ہیں۔ پس غیر ہاشمی مُکاتَب کی آزادی کے لئے زکوٰۃ کا مال خرچ کرنا جائز ہے۔ ہمارے فقہاء نے ''رِقِ کامل'' کی آزادی کو زکوٰۃ کا مصرف قرار نہیں دیا جبکہ بعض ائمہ اس کے جواز کے قائل ہیں۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''مصارفِ زکوٰۃ میں ''فی الرقاب'' سے مراد صدقات کو غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے خرچ کرنا اور یہ کنایہ ہے غلاموں اور باندیوں کو غلامی اور بندگی کی عبرت ناک اذیت سے آزاد کرنا اور اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) یہ کہ مکاتَب غلام کی مدد کی جائے، مکاتَب اس غلام کو کہتے ہیں جسے اُس کے مالک نے باہمی رضامندی سے یہ کہا ہو کہ اتنا (جو بھی مقدار طے پائی ہو) مال کما کر لے آؤ، پس جب وہ یہ مال کما کر مالک کو دے دے گا تو وہ آزاد ہو جائے گا۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں کہ: امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی اوران دونوں کے اصحاب اور امام لیس بن سعد نے عبداللہ بن عباس کی روایت سے استدلال کرتے ہوئے ''فی الرقاب'' سے عبدِ مکاتَب مراد لیا ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مال سے غلام یا باندی کو خریدے اور پھر اُسے آزاد کردے اوراس میں ایک سے زائد افراد بھی شریک ہو سکتے ہیں یا حاکم جو مالِ زکوٰۃ جمع کرتا ہے، اس سے غلاموں اور باندیوں کو خرید کر آزاد کرے، یہ امام مالک، امام احمد اور امام اسحاق کا مشہور قول ہے۔ اور ابن عربی نے کہا کہ یہی صحیح ہے اور ظاہرِ قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جہاں ''رقبہ'' کا ذکر کیا، اُس سے آزاد کرنا ہی مراد ہے اور اگر اس سے مکاتبین مراد ہوتے، تو اُن کا نام لے کر ذکر کیا جاتا۔ لیکن کلامِ الٰہی نے ''رقبہ'' کی طرف عدول فرمایا، تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اِس سے ''عبدِ کامل'' کو آزاد کرنا مراد ہے۔ اوراس کی تحقیق یہ ہے کہ مکاتَب تو ''غارمین'' کے عنوان کے تحت شامل ہے، کیونکہ اس پر دَینِ کتابت ہے، تو یہ ''رقاب'' میں داخل نہیں ہوتا۔ اور بعض اوقات عموم میں مکاتَب شامل ہوتا ہے۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: حق یہ ہے کہ آیت قرآن کی عبارت دونوں کو شامل ہے، یعنی ''مکاتَب'' کو آزاد کرنے میں مدد دینا اور ''عبدِ کامل'' کو خرید کر آزاد کرنا۔ آگے انہوں نے اس پر مزید بحث کی ہے، (فقہ الزکوٰۃ، جلد:2، ص:88-87)''۔

اب غلامی اس دنیا میں رائج نہیں ہے اور اسلام کے نزدیک انسانوں کی حریت ایک اعلیٰ قدر ہے، لہٰذا عالمی سطح پر حقوقِ انسانی کے منشور میں غلامی (Slavery) کے خاتمے کا جو قانون طے ہوا ہے، ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔ لہٰذا موجودہ دور میں کسی بھی قسم کی غلامی چونکہ موجود نہیں ہے، اس لئے مصرفِ زکوٰۃ کے حوالے سے یہ موضوع عملاً غیر متعلق ہے۔

غارمین کا مصداق:

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: الغریمُ یُقالُ لمن لَهُ الدَّینُ و لمن علیه الدَّینُ

ترجمہ: ''قرض خواہ اور مقروض دونوں کو ''غریم'' کہا جاتا ہے''۔

(معجم مفردات الفاظ القرآن، ص:372)

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''غارمین سے مراد وہ لوگ ہیں، جن پر قرض ہے اور جیسا کہ ''ظہیریہ'' میں ہے، ان کو زکوٰۃ دینا فقیر کو دینے سے بہتر ہے، بشرطیکہ یہ قرض اسرافِ بے جا اور معصیت کے لئے (جیسے شراب نوشی وغیرہ) نہ لیا گیا ہو۔ لیکن علامہ نووی نے ''منہاج'' میں کہا ہے کہ میرے نزدیک صحیح ترین بات یہ ہے کہ معصیت کے لئے قرض لینے والا اگر توبہ کرلے تو اسے دیا جاسکتا ہے اور ''روضہ'' میں اس قول کو صحیح قرار دیا گیا ہے، لیکن محرمات کے لئے، لئے گئے قرضوں کی ادائیگی کے لئے زکوٰۃ کی رقم دینے کی ممانعت مطلق ہے، وہ کہتے ہیں کہ کبھی محض زکوٰۃ دینے کے لئے توبہ کی جاتی ہے۔ غارمین کو دینے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان کے اور ان کے زیرِ کفالت افراد کی حاجاتِ ضروریہ سے اتنی فاضل رقم ان کے پاس نہ ہو کہ وہ قرض ادا کرسکیں، ورنہ محض قرض کا ادا کرنا استحقاقِ زکوٰۃ سے مانع نہیں ہے اور یہ امام شافعی کا ایک قول ہے اور یہی ظاہر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت میں عموم ہے اور اس طرح کی کوئی شرط نہیں لگائی جاسکتی اور صاحبِ قدوری (امام احمد بن محمد البغدادی القدوری) نے اسے مُطلق رکھا ہے اور ہمارے اصحاب میں سے صاحبِ کنز الدقائق (علامہ عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی) نے مصارفِ زکوٰۃ میں مقروض کو شمار کیا ہے اور ''الکافی'' نے یہ شرط لگائی ہے کہ اُس کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ قرض ادا کرنے کے بعد کم از کم نصاب کے برابر بچ جائے۔ اور ''البحر الرائق'' نے ذکر کیا ہے کہ اِس آیت کے تحت مصارفِ زکوٰۃ میں غارم سے یہی مراد ہے، کیونکہ لغت میں ''غارم'' اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس پر قرض ہو اور اس کے لئے ادا کرنے کی کوئی سبیل نہ ہو جیسا کہ ''العتبی'' نے ذکر کیا۔ اور انہوں نے آیت میں مقروض کو مطلق چھوڑنے کی وجہ یہ بیان کی کہ ''عامل'' اور ''ابن السبیل'' (جب کہ اس کے پاس وطن میں مال ہو، مگر اس کی دسترس میں نہ ہو تو وہ فقیر ہی کے درجے میں ہے) کے علاوہ تمام مصارفِ زکوٰۃ کے لئے فقیر ہونا شرط ہے، (روح المعانی، جلد:6، ص:122)''۔

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''آیت میں ''غارمین'' سے مراد یہ ہے کہ مالِ زکوٰۃ (مستحق) کی اعانت پر صرف کیا اور معصیت پر اعانت جائز نہیں ہے (یعنی اگر اس نے قرض لے کر معصیت کے کاموں میں خرچ کیا ہے تو اس کو زکوٰۃ کا مال دینا جائز نہیں ہے)۔ اور اگر قرض کسی معصیت کیلئے نہیں لیا، تو اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ قرض جو ضروری

اخراجات کے لئے لیا ہو یا اس میں کوئی دینی مصلحت ہو، (۲) وہ قرض جو مسلمانوں کے درمیان اصلاح کے لئے کسی مالی ذمے داری کو قبول کرنے کی وجہ سے لیا ہو اور یہ سب آیت میں داخل ہیں۔ اصم نے اپنی تفسیر میں روایت کیا کہ جب کسی کی تعدّی (زیادتی) کے سبب جنین (ماں کے پیٹ میں بچہ Embryo) کی موت واقع ہوئی، تو نبی ﷺ نے دیت کے طور پر ایک غلام دینے کا حکم دیا، تو عاقلہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس غلام نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے حمد بن مالک بن نابغہ سے فرمایا: ''صدقات کے مال میں سے غلام دے کر ان کی مدد کرو''، حمد ان دنوں صدقات کے نگران تھے، (التفسیر الکبیر، جلد: 15، ص: 113)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

مقروض سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی جائز ضروریات میں مقروض ہوں نہ کہ وہ لوگ جنہوں نے کسی گناہ کے ارتکاب کے لئے قرض لیا ہو، مثلاً کسی نے سینما ہاؤس، وڈیو شاپ یا شراب کی دکان کھولنے کے لئے قرض لیا ہو یا کسی نے بے جا خرچ اور اسراف کے لئے قرض لیا ہو یا کسی نے اپنے بچوں کی شادی کے سلسلے میں مرجہ رسومات بڑے پیمانے پر منعقد کی ہوں اور مقروض ہو گیا ہو اور اس قرض کو ادا کرنے کے لئے اس کے پاس رقم نہ ہو، تو اس کو زکوٰۃ کی رقم نہیں دینی چاہئے، البتہ علامہ نووی شافعی نے ''الروضہ'' میں یہ لکھا ہے کہ اگر وہ توبہ کر لے تو پھر اس کو بھی زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ مقروض خواہ غنی ہو، لیکن اگر اس کے پاس قرض اتارنے کے لئے رقم نہیں تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ حدیثِ پاک میں ہے:

عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ، إِلَّا لِخَمْسَةٍ: لِغَازٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ، أَوْ لِعَامِلٍ عَلَيْهَا، أَوْ لِغَارِمٍ، أَوْ لِرَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِهِ، أَوْ لِرَجُلٍ كَانَ لَهُ جَارٌ مِسْكِيْنٌ فَتُصُدِّقَ عَلَى الْمِسْكِيْنِ فَأَهْدَاهَا الْمِسْكِيْنُ لِلْغَنِيِّ۔

ترجمہ: ''عطاء بن یسار بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی غنی کے لئے صدقہ لینا جائز نہیں ہے، مگر پانچ قسم کے اشخاص کے لئے (جائز ہے): جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو یا وہ صدقہ وصول کرنے والا عامل ہو یا مقروض ہو یا جس شخص نے صدقے کا مال اپنے مال سے خرید لیا یا جس شخص کا کوئی مسکین پڑوسی ہو اور اس پر کوئی چیز صدقہ کی گئی ہو اور وہ مسکین، غنی کو وہ چیز ہدیہ کر دے، (یہ روایت مرسل ہے)''۔

(سنن ابوداؤد: 1632، سنن ابن ماجہ: 1841)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَا تَحِلُّ الصَّدَقَۃُ لِغَنِیٍّ اِلَّا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ اِبْنِ السَّبِیْلِ، اَوْ جَارٍ فَقِیْرٍ یُتَصَدَّقُ عَلَیْہِ فَیُھْدِیْ لَکَ اَوْ یَدْعُوْکَ۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی غنی کے لئے صدقہ لینا جائز نہیں ہے، مگر اس غنی کے لئے جو اللہ کی راہ میں ہو، یا وہ کسی فقیر کا پڑوسی ہو، اس فقیر پر صدقہ کیا جائے اور وہ غنی تجھے ہدیہ دے یا تیری (یعنی غنی کی) دعوت کرے، (سنن ابوداؤد 1634)"۔

(تبیان القرآن، جلد: 05، ص: 179)

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ: اَھْدَتْ بَرِیْرَۃُ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ لَحْمًا تُصُدِّقَ بِہٖ عَلَیْھَا، فَقَالَ: "ھُوَ لَھَا صَدَقَۃٌ وَلَنَا ھَدِیَّۃٌ"

ترجمہ: "حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ حضرت بَرِیرہ نے نبی ﷺ کو وہ گوشت ہدیہ کیا جوان پر صدقہ کیا گیا تھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اُس (بریرہ) کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے، (صحیح مسلم: 2374)"۔

اس حدیث سے علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ملکیت بدلنے سے چیز کا حکم بدل جاتا ہے، یعنی بریرہ چونکہ نادار تھیں اور زکوٰۃ وصدقات کا مصرف تھیں، اس لئے انہیں صدقے کا مال دیا گیا، مگر جب مال ان کی ملک میں آ گیا تو اب وہ اسے کسی غنی کو بھی کھلا سکتی ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے فرمایا کہ یہ ہمارے لئے ہدیہ ہے۔ اور حضرت عطا بن یسار کی حدیث میں بتایا کہ کوئی غنی شخص کسی فقیر سے صدقے کا مال خرید کر بھی استعمال کر سکتا ہے، یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ صدقہ ہونا مال کی دائمی قطعی اور غیر متبدل صفت بن جاتی ہے، بلکہ ملکیت کے تبدل سے مال کا حکم بدل جاتا ہے۔

امام برہان الدین علی المرغینانی لکھتے ہیں:

"غارم اسے کہتے ہیں کہ جس پر قرض ہو اور قرض کی رقم سے زائد کم از کم نصاب کے برابر اس کے پاس مال نہ ہو۔ اور امام شافعی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے دو متصادم گروہوں کے درمیان صلح کے لئے اور قبیلوں کے درمیان عداوت کو ختم کرنے کے لئے جو مالی ذمے داری کسی نے قبول کی ہو، وہ بھی 'غارم' کے تحت زکوٰۃ کا مصرف بن سکتا ہے، (ہدایہ، ج: 2، ص: 70)"۔

علامہ فخر الدین حسن بن منصور اوز جندی لکھتے ہیں:

اِذَا وُهِبَ الدَّيْنُ مِنَ الْمَدْيُوْنِ بَعْدَ الْحَوْلِ يَنْوِىْ بِهِ الزَّكَاةَ اِنْ كَانَ الْمَدْيُوْنُ غَنِيًّا لَايَجُوْزُ وَيَضْمَنُ الْوَاهِبُ قَدْرَالزَّكَاةِ اِسْتِحْسَانًا وَاِنْ كَانَ الْمَدْيُوْنُ فَقِيْرًا فَوَهَبَ الدَّيْنَ يَنْوِىْ بِهِ زِكَاةَ مَالِ عَيْنٍ عِنْدَالْوَاهِبِ لَا تَسْقُطُ عَنْهُ زَكَاةُ ذَالِكَ الْمَالِ وَكَذَا لَوْنَوٰى بِهٖ زَكَاةَ دَيْنٍ اٰخَرَ عَلٰى غَيْرِهٖ وَلَوْوَهَبَ جَمِيْعَ الدَّيْنِ مِنَ الْمَدْيُوْنِ بِنِيَّةِ الزَّكَاةِ عَنِ الدَّيْنِ فِى الْاِسْتِحْسَانِ يَكُوْنُ مُؤَدِّيًا تَسْقُطُ عَنْهُ الزَّكَاةُ وَكَذَا لَوْ وَهَبَ كُلَّ الدَّيْنِ مِنَ الْمَدْيُوْنِ وَلَمْ يَنْوِ بِهِ الزَّكَاةَ كَانَ مُؤَدِّيًا زَكَاةَ هٰذَا الدَّيْنِ اسْتِحْسَانًا۔

ترجمہ: ''جب قرض خواہ سال گزرنے کے بعد مقروض کو زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت سے قرض ہبہ کردے، تو اگر مقروض غنی ہے، تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی اور واہب استحسانا اُس قرض کی زکوٰۃ کا ضامن ہوگا (کیوں کہ اس سے فقراء کا حق ضائع ہوتا ہے)۔ اگر مدیون فقیر ہے اور دائن نے اپنے پاس موجود مال کی زکوٰۃ کی نیت سے وہ قرض اُس فقیر کو ہبہ کردیا (یعنی اپنا مطالبۂ قرض ساقط کردیا)، تو اس سے اُس مال کی زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی (کیونکہ قرض دیتے وقت اس نے زکوٰۃ کی نیت نہیں کی تھی)، اسی طرح اگر کسی دوسرے شخص پر اُس دائن کا قرض ہے، تو اس فقیر کو اس کے ذمے واجب قرض ہبہ کرنے سے دوسرے مدیون پر عائد اُس رقم کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ اگر دائن نے مدیون کے ذمے واجب الاداء قرض زکوٰۃ کی نیت سے پورے کا پورا ہبہ کردیا، تو اس قرض کی استحسانا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اُس دائن سے اس قرض کی زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر دائن نے مدیون پر عائد کل قرض بغیر نیتِ زکوٰۃ ہبہ کردیا تو بھی اس قرض کی زکوٰۃ استحسانا ادا ہو جائے گی''۔

(فتاویٰ قاضی خان علیٰ ھامش الھندیہ، جلد: 01، ص: 264)

قرض کی مختلف انواع واقسام کے بارے میں الگ عنوان کے تحت بحث آئندہ سطور میں آرہی ہے۔

فی سبیل اللہ کا مصداق:

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں:

''اس سے مجاہدین مراد ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک غنی مجاہد بھی زکوٰۃ کے مال سے لے سکتا ہے، امام مالک، ابو اسحاق اور ابو عبید کا یہی مذہب ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور ان کے صاحبین رحمھم اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف محتاج مجاہد زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ جان لو کہ ''فی سبیل اللہ'' کو مجاہدین تک محدود رکھنا درست نہیں ہے، اسی لئے قفال نے اپنی

تفسیر میں بعض فقہاء سے نقل کیا ہے کہ زکوٰۃ کے مال کو خیر کے تمام کاموں میں خرچ کرنا جائز ہے، جن میں مردوں کو کفن دینا، قلعے تعمیر کرنا اور مسجدیں بنانا شامل ہیں، کیونکہ فی سبیل اللہ میں عموم ہے"۔
(تفسیر کبیر، جلد:15،ص:113)

نوٹ: یہ شوافع کا مذہب ہے۔

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:

"اس سے وہ مجاہدین اور حجاج مراد ہیں، جن کا رابطہ اپنے گھر اور مال سے منقطع ہو گیا ہو۔ اور ایک قول کے مطابق طالبانِ علم مراد ہیں اور "فتاویٰ ظہیریہ" میں اسی تک محدود رکھا ہے۔ "بدائع الصنائع" میں بیان کیا کہ ہر وہ قربت جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیکی کے کاموں کے لئے سعی کی جائے۔ "البحر الرائق" میں ہے کہ تمام صورتوں میں فقر کی قید شامل ہے، اس صورت (فی سبیل اللہ) میں اس کا ثمرہ زکوٰۃ میں ظاہر نہیں ہوگا، یہ وصایا اور اوقاف میں ظاہر ہوگا (یعنی ان کاموں کے لئے صدقۂ جاریہ کی وصیت کی جاسکتی ہے یا وقف کیا جاسکتا ہے)"۔
(روح المعانی، جلد:06،ص:123)

ملک العلماء علامہ علاء الدین کاسانی لکھتے ہیں:

وَاَمَّا قَوْلُهُ تَعَالٰی: (وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، اَلتَّوْبَةُ: 60)عِبَارَةٌ عَنْ جَمِیْعِ الْقُرَبِ ، فَیَدْخُلُ فِیْهِ کُلُّ مَنْ سَعٰی فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ وَسَبِیْلِ الْخَیْرَاتِ اِذَا کَانَ مُحْتَاجًا،وَقَالَ اَبُوْیُوْسُفَ: اَلْمُرَادُ مِنْهُ فُقَرَاءُ الْغُزَاةِ، لِاَنَّ سَبِیْلَ اللّٰهِ اِذَا اُطْلِقَ فِیْ عُرْفِ الشَّرْعِ یُرَادُ بِهٖ ذٰلِكَ، وَقَالَ مُحَمَّدٌ: اَلْمُرَادُ مِنْهُ الْحَاجُّ الْمُنْقَطِعُ لِمَا رُوِیَ اَنَّ رَجُلًا جَعَلَ بَعِیْرًا لَهٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، فَاَمَرَهُ النَّبِیُّ ﷺ اَنْ یَّحْمِلَ عَلَیْهِ الْحَاجَّ، وَقَالَ الشَّافِعِیُّ: یَجُوْزُ دَفْعُ الزَّکٰوةِ اِلَی الْغَازِیْ وَاِنْ کَانَ غَنِیًّا، وَاَمَّا عِنْدَنَا فَلَایَجُوْزُ اِلَّا عِنْدَاعْتِبَارِ حُدُوْثِ الْحَاجَةِ، وَاحْتَجَّ بِمَا رُوِیَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ: "لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِیٍّ اِلَّا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوِ ابْنِ السَّبِیْلِ اَوْ رَجُلٍ لَهٗ جَارٌ مِسْکِیْنٌ تُصُدِّقَ عَلَیْهِ فَاَعْطَاهَا لَهٗ"، وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ: "لَاتَحِلُّ الصَّدَقَةُ اِلَّا لِخَمْسٍ: اَلْعَامِلِ عَلَیْهَا، وَرَجُلٍ اِشْتَرَاهَا، وَغَارِمٍ ، وَغَازٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ، وَفَقِیْرٍ تُصُدِّقَ عَلَیْهِ فَاَهْدَاهَا اِلٰی غَنِیٍّ"، نَفٰی حِلَّ الصَّدَقَةِ لِلْاَغْنِیَاءِ وَاسْتَثْنَی الْغَازِیَ مِنْهُمْ، وَالْاِسْتِثْنَاءُ مِنَ النَّفْیِ اِثْبَاتٌ فَیَقْتَضِیْ حِلَّ الصَّدَقَةِ لِلْغَازِی الْغَنِیِّ۔

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ''، اِس سے وہ تمام (اعمال) ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قربت اور رضا کے لئے ہوں، تو اِس میں ہر وہ شخص داخل ہوگا، جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور نیکی کے کاموں میں سعی کرے، بشرطیکہ وہ محتاج ہو۔ اور امام ابو یوسف نے کہا: اِس سے مراد وہ مجاہدین ہیں، جو فقیر ہوں، اِس لئے کہ جب ''سبیل اللہ'' مطلق بولا جائے تو عرفِ شرع میں اُس سے مجاہدین ہی مراد ہوتے ہیں۔ اور امام محمد نے کہا: اِس سے مراد وہ حجاجِ کرام ہیں جن کا زادِ راہ ختم ہو چکا ہو، کیوں کہ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے اپنا اونٹ ''فی سبیل اللہ'' دے دیا، تو نبی ﷺ نے فرمایا: اِس پر (کسی ضرورت مند) حاجی کو سوار کر دو، اور امام شافعی نے کہا: مجاہد کو زکوٰۃ دینا جائز ہے اگر چہ وہ مال دار ہو۔ لیکن ہمارے (احناف کے) نزدیک (غنی مجاہد یا حاجی کو دینا) اُس وقت جائز ہے جب اِس کی حاجت پیش آجائے، انہوں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مَروی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مال دار کے لئے صدقہ جائز نہیں ہے، مگر اُس کے لئے (۱) جو اللہ کی راہ میں مصروفِ عمل ہو یا (۲) مسافر ہو یا (۳) کسی شخص نے اپنے مسکین پڑوسی کو صدقہ دیا، تو اُس نے اِسے (ہبہ یا تحفے کے طور پر اُس میں سے کچھ) دے دیا۔ اور انہوں نے حضرت عطاء بن یسار سے مروی اِس حدیث سے بھی استدلال کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اِن پانچ قسم کے اشخاص کے سوا (کسی مال دار کے لئے) صدقہ جائز نہیں ہے: (۱) جو شخص حاکمِ اسلام کی طرف سے صدقات کی وصولیابی پر مامور ہو (۲) وہ شخص جس نے کسی مستحق سے صدقے کا مال خریدا ہو (۳) جو کسی مالی تاوان میں پھنس گیا ہو (۴) جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہو (۵) فقیر کو کسی مال دار نے صدقہ دیا ہو اور وہ اپنی طرف سے کسی غنی کو ہدیہ دے دے۔ نبی ﷺ نے مال داروں کے لئے صدقے کے جواز کی نفی فرمائی اور ان میں سے مجاہد کا اِستثناء فرمایا، اور نفی پر جب استثناء داخل ہو تو وہ اثبات کا معنیٰ دیتا ہے، پس اِس کا تقاضا یہ ہے کہ مال دار غازی کے لئے صدقہ جائز ہے------۔ اس کے بعد علامہ کاسانی امام شافعی کے استدلال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَلَنَا قَوْلُ النَّبِیِّ ﷺ: "لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِیٍّ" وَقَوْلُهُ ﷺ: "أُمِرْتُ اَنْ اٰخُذَ الصَّدَقَةَ مِنْ اَغْنِیَائِكُمْ وَاَرُدَّهَا فِیْ فُقَرَائِكُمْ" جَعَلَ النَّاسَ قِسْمَیْنِ: قِسْمًا یُؤْخَذُ مِنْهُمْ وَقِسْمًا یُصْرَفُ اِلَیْهِمْ، فَلَوْ جَازَ صَرْفُ الصَّدَقَةِ اِلَی الْغَنِیِّ لَبَطَلَتِ الْقِسْمَةُ، وَهٰذَا لَا یَجُوْزُ، وَاَمَّا اِسْتِثْنَاءُ الْغَازِیْ فَمَحْمُوْلٌ عَلٰی حَالِ حُدُوْثِ الْحَاجَةِ وَسَمَّاهُ غَنِیًّا عَلَی اعْتِبَارِ مَا كَانَ قَبْلَ حُدُوْثِ الْحَاجَةِ، وَهُوَ اَنْ یَّكُوْنَ غَنِیًّا ثُمَّ

تَحدُثُ لَهُ الحَاجَةُ بِأَنْ كَانَ لَهُ دَارٌ يَسكُنُهَا وَمَتَاعٌ يَمتَهِنُهُ وَثِيَابٌ يَلبَسُهَا وَلَهُ مَعَ ذٰلِكَ فَضلُ مِائَتَي دِرهَمٍ حَتّٰى لَا تَحِلَّ لَهُ الصَّدَقَةُ، ثُمَّ يَعزِمُ عَلَى الخُرُوجِ فِي سَفَرِ غَزوٍ فَيَحتَاجُ إِلٰى اٰلَاتِ سَفَرِهِ وَسِلَاحٍ يَستَعمِلُهُ فِي غَزوِهِ وَمَركَبٍ يَغزُو عَلَيهِ وَخَادِمٍ يَستَعِينُ بِخِدمَتِهِ عَلٰى مَالَم يَكُن مُحتَاجًا إِلَيهِ فِي حَالِ إِقَامَتِهِ، فَيَجُوزُ أَن يُعطٰى مِنَ الصَّدَقَاتِ مَا يَستَعِينُ بِهِ فِي حَاجَتِهِ الَّتِي تَحدُثُ لَهُ فِي سَفَرِهِ وَهُوَ فِي مَقَامِهِ غَنِيٌّ بِمَا يَملِكُهُ لِأَنَّهُ غَيرُ مُحتَاجٍ فِي حَالِ إِقَامَتِهِ فَيَحتَاجُ فِي حَالِ سَفَرِهِ فَيُحمَلُ قَولُهُ: لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ إِلَّا لِغَازٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ عَلٰى مَن كَانَ غَنِيًّا فِي حَالِ مَقَامِهِ، فَيُعطٰى بَعضَ مَا يَحتَاجُ إِلَيهِ لِسَفَرِهِ لِمَا أَحدَثَ السَّفَرُ لَهُ مِنَ الحَاجَةِ إِلَّا أَنَّهُ يُعطٰى حِينَ يُعطٰى وَهُوَ غَنِيٌّ، وَكَذَا تَسمِيَةُ الغَارِمِ غَنِيًّا فِي الحَدِيثِ عَلَى اعتِبَارِ مَا كَانَ قَبلَ حُلُولِ الغُرمِ بِهِ وَقَد حَدَثَت لَهُ الحَاجَةُ بِسَبَبِ الغُرمِ وَهٰذَا لِأَنَّ الغَنِيَّ اسمٌ لِمَن يَستَغنِي عَمَّا يَملِكُهُ، وَإِنَّمَا كَانَ كَذٰلِكَ قَبلَ حُدُوثِ الحَاجَةِ فَأَمَّا بَعدَهُ فَلَا۔

ترجمہ: ''اور ہماری دلیل نبی ﷺ کا یہ قول ہے: ''صدقہ غنی کے لئے جائز نہیں ہے'' اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مال داروں سے صدقہ لوں اور تمہارے فقراء کی طرف لوٹا دوں'' (پس آپ ﷺ نے) لوگوں کی دو قسمیں کی ہیں: ایک قسم وہ ہے جن سے صدقہ لیا جائے گا اور دوسری قسم وہ ہے جن کو صدقہ دیا جائے گا۔ اور اگر غنی کو صدقہ دینا جائز ہوتا، تو یہ تقسیم باطل ہوتی اور یہ بات جائز نہیں ہے۔ لیکن (غنی) مجاہد کو (صدقہ دینے کے لئے) جو مستثنیٰ کیا گیا ہے، تو یہ حاجت پیدا ہونے پر محمول ہے اور اس پر جو غنی کا اطلاق کیا گیا ہے، تو یہ حاجت پیدا ہونے سے پہلے والی حالت کے اعتبار سے ہے۔ اُس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص غنی ہے پھر اُس کو حاجت پیدا ہوگئی، وہ اس طرح کہ اس کے پاس رہنے کے لئے مکان بھی ہے اور ضرورت کا ساز و سامان بھی ہے اور پہننے کو لباس بھی ہے اور اس کے باوجود اُس کے پاس دو سو درہم فاضل رقم بھی ہے، یہاں تک کہ اُس کے لئے صدقہ جائز نہیں ہے پھر وہ جہاد کے سفر پر نکلنے کا ارادہ کرتا ہے، اس کے لئے اُسے سفر کے ساز و سامان اور جہاد کے لئے اسلحہ اور سواری کی بھی ضرورت ہے اور مددگار خادم کی بھی ضرورت ہے، حالانکہ وہ اپنے گھر پر رہتے ہوئے اِن میں سے کسی چیز کا محتاج نہیں تھا۔ پس اس (غنی) مجاہد کو صدقہ دینا جائز ہے، جس کی اسے اپنے سفرِ جہاد کے لئے ضرورت درپیش ہو، حالانکہ وہ اپنے گھر پر اپنے ملکیتی مال کی وجہ

سے غنی ہے اور اُسے کوئی احتیاج نہیں ہے، لیکن سفرِ جہاد کے لئے اُسے حاجت درپیش ہے۔ پس نبی ﷺ کے اس قول: ''غنی کے لئے صدقہ جائز نہیں ہے''، کو اُس مجاہد پر محمول کیا جائے گا جو اپنے گھر پر رہتے ہوئے غنی ہے، (اس کے باجود) چونکہ اسے سفرِ جہاد پیش آ گیا ہے، تو اُس کی سفری ضرروریات کے لئے اُسے صدقے کا مال دیا جائے گا، (یہ ایسی صورتِ حال ہے کہ بظاہر) اُسے غنی ہوتے ہوئے صدقہ دیا جا رہا ہے۔ اِسی طرح کسی مالی تاوان میں پھنسے ہوئے یا مقروض شخص کو بھی حدیث میں غنی کہا گیا ہے، اُس پر بھی غنا کا اطلاق اس مالی تاوان یا قرض میں مبتلا ہونے سے پہلے کے اعتبار سے ہے اور اب مالی تاوان میں پھنس جانے کی وجہ سے اُسے حاجت پیش آ گئی ہے اور یہ اِس لئے کہ غنی اُسے کہتے ہیں جو اپنے ملکیتی مال کی وجہ سے مستغنی ہو، لیکن یہ صورتِ حال حاجت لاحق ہونے سے پہلے تھی، اس کے بعد نہیں''۔ (بدائع الصنائع، جلد:02، ص:68)

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

اس سے مراد وہ حج کرنے والے اور جہاد کرنے والے ہیں جن کے پاس زادِ راہ نہ ہو اور اپنے افلاس کی وجہ سے وہ جنگی ساز و سامان مہیا نہ کر سکتے ہوں ان کی اعانت بھی مالِ زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن محققین کی رائے یہ ہے کہ سبیل اللہ سے مُراد صرف یہ دو قسم کے لوگ نہیں بلکہ ہر وہ کام جس میں عامۃ المسلمین کا فائدہ ہو وہ سبیل اللہ میں داخل ہے۔ چنانچہ دینی مدرسے جس میں قرآن و سنت کی تعلیم دی جاتی ہو اور دین کے مبلغ اور محقق تیار کئے جاتے ہوں وہ بطریقِ اولیٰ اس میں داخل ہیں۔ شیخ رشید رضا نے اپنی تفسیر المنار میں اس کے متعلق بڑی وضاحت سے لکھا ہے: وقال الآلوسی فی تفسیر الکلمة عندالحنفیه ارید بذالك عند ابی یوسف منقطعوا الغزاة والحجیج وقیل المراد طلبة العلم واقتصر علیه فی الفتاویٰ الظهیریة وفسّره فی البدائع بجمیع القرب فیدخل فیه کل سعی فی طاعة اللّٰه: علامہ آلوسی نے اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام ابو یوسف کے نزدیک اس سے مراد وہ غازی اور حاجی ہیں جو اپنے وطن سے دور ہوں اور ان کے پاس اپنے اخراجات پورے کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔ اور بعض نے اس سے مراد طلبہ لئے ہیں۔ اور صاحب فتاویٰ ظہیریہ نے تو اس سے مراد فقط طالبِ علم ہی لئے ہیں۔ اور صاحبِ بدائع کے نزدیک ہر وہ نیک کام سبیل اللہ میں داخل ہے، جس سے قُربِ الٰہی حاصل ہو سکے۔ اس کے بعد صاحب المنار رقم طراز ہیں: والتحقیق انّ سبیل

الله هنا مصالح المسلمين عامة التى بها قوام امر الدّين و الدولة دون الافراد، (ج:١ص:٥٨٥)۔
ترجمہ: ''تحقیق یہ ہے کہ سبیل اللہ سے مراد وہ مصالح اور مفید کام ہیں جن سے مخصوص افراد نہیں بلکہ عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ جن سے دین اور دولت دونوں کو تقویت حاصل ہو''۔ ومن اهم ما ينفق فى سبيل الله فى زماننا هذا اعداد الدعاة الى الاسلام و ارسالهم الى بلاد الكفار من قبل جمعيات منظمة تمدهم بالمال الكافى كما يفعله الكفار فى نشر دينهم، (ج:١٠ص:٥٨٧)۔ ترجمہ: ''ہمارے زمانہ میں سب سے اہم کام جس میں اس مد کا روپیہ خرچ کیا جائے، وہ مبلغینِ اسلام کو تیار کرنا ہے اور انہیں منظم انجمنوں کی نگرانی میں کفار کے ممالک میں تبلیغِ دین کے لئے بھیجنا ہے، وہ ان کی اتنی مالی مدد کریں جو ان کی ضروریات کو پورا کرے، جیسا کہ کفار اپنے دین کی اشاعت کے لئے کرتے ہیں۔ اس میں مدارسِ اسلامیہ داخل ہیں جن میں علومِ دینیہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ وہ کام جن میں مصلحتِ عامہ ہے''۔

(ضیاء القرآن، جلد:02، ص:225-224)

موجودہ دور میں چونکہ مسلم حکومتوں کی باقاعدہ مسلح افواج ہیں، جنہیں باقاعدہ باوقار تنخواہ ملتی ہے، جدید اسلحہ کے استعمال اور جدید دور کی جنگی حکمتِ عملی (War Strategy) کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس لئے غیر تربیت یافتہ مجاہدین کی جنگ میں شرکت عملاً ممکن نہیں ہے۔ اس لئے مجاہدین یا غزاۃ کا شعبہ موجود نہیں ہے۔ عام شہریوں (Civilians) کو بعض اوقات شہری دفاع (Civil Defence) کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ جنگی صورتِ حال میں وہ حساس تنصیبات کی حفاظت کر سکیں، شہریوں کو بیرونی حملے کی صورت میں حفاظتی تدابیر کی تربیت وغیرہ دے سکیں۔ یہ کوئی کل وقتی کام نہیں ہے بلکہ ہنگامی صورتِ حال میں ایسے افراد کی ضرورت پیش آتی ہے، تاہم اگر کبھی اسلامی حکومت کی طرف سے نفیرِ عام (General Call for war) کا اعلان ہو جائے، تو اپنے اپنے وسائل اور استعداد کے مطابق ہر شہری پر مسلح افواج کی معاونت لازم ہے، ایسی صورتِ حال میں ان مجاہدین کی زکوٰۃ سے مدد کی جاسکتی ہے جو جسمانی خدمت تو انجام دے سکتے ہیں لیکن مالی وسائل نہیں رکھتے۔ عام حالات میں زکوٰۃ کا یہ مصرف موجود نہیں ہے۔ البتہ دینی مدارس کے مستحق طلبہ اب بھی ''فی سبیل اللہ'' کے عنوان کے تحت زکوٰۃ کا بہترین مصرف ہیں۔

ابن السبیل کا مصداق:

امام برہان الدین علی المرغینانی لکھتے ہیں:

ابن السبیل سے مراد ایسا مسافر جو وطن سے دور ہو، اگر چہ اس کے پاس وطن میں مال ہو، لیکن اس کی دسترس میں نہ ہو، (ہدایہ، ج:2،ص:70،مطبوعہ:مکتبۃ البشریٰ)''۔

آج کل چونکہ دنیا عالمی قریہ (Global Village) بن چکی ہے اور اطلاعات و پیغام رسانی کے وسائل بہت زیادہ ہیں، اس لئے اگر کوئی مالدار آدمی وطن سے دور ہو تو بہت کم مواقع ایسے ملیں گے کہ وہ اپنے وطن سے رابطہ کر کے اپنی ضرورت کا مال حاصل نہ کر سکے، تاہم ایک خفیف امکان بہر حال موجود رہتا ہے۔

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں:

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا: مسافر جو غیرِ معصیت میں سفر کا ارادہ کرتا ہے اور کسی کی مدد کے بغیر اپنی منزل تک پہنچنے سے عاجز ہے، وہ زکوٰۃ کا مستحق ہے''۔

(تفسیر کبیر، ج:15،ص:113)

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:

وہ مسافر جس کا رابطہ اپنے مال سے منقطع ہو چکا ہو، ''ظہیریہ'' کے مطابق اس کے لئے زکوٰۃ لینے کے بجائے قرض لینا بہتر ہے اور ''فتح القدیر'' میں ہے کہ اسے ضرورت سے زیادہ زکوٰۃ نہیں لینی چاہئے۔ وہ سب لوگ اسی عنوان کے تحت آتے ہیں جن کا اپنے وطن میں مال ہو مگر اس سے رابطے (یا استفادے) کی کوئی صورت نہ ہو۔ اور ''محیط'' میں ہے کہ اگر تاجر کا لوگوں پر قرض ہے، لیکن اسے وصول نہیں ہو رہا اور اس کے پاس کوئی اور مال بھی نہیں ہے تو اس کے لئے زکوٰۃ لینا جائز ہے کیونکہ وہ اس وقت عملاً مسافر کی طرح فقیر ہے''۔

(روح المعانی، جلد:06،ص:124)

زکوٰۃ میں تملیک

تملیک کے بارے میں زکوٰۃ کے چند اہم سوالات:

حال ہی میں ہمارے پاس بعض رفاہی (welfare) اداروں کی جانب سے مصارفِ زکوٰۃ کے بارے میں چند سوالات آئے، بنیادی طور پر یہ سوالات ''تملیک'' ہی سے متعلق ہیں۔ ذیل میں ہم پہلے اُن اداروں کے

سوالات نقل کریں گے اور پھر جوابات پیش کریں گے:

پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کے سوالات

سوال: علماءِ دین ان سوالات کے بارے میں کیا فرماتے ہیں:

(۱) اسلامی حکومت کی موجودگی میں کوئی سیاسی، رفاہی، غیر حکومتی گروہ، تنظیم یا جماعت زکوٰۃ جمع کرسکتی ہے یا نہیں؟۔

(۲) ایسی اسلامی حکومت میں جس کا دستور تو اسلامی ہو لیکن کچھ دفعات معطل ہوں، کوئی سیاسی، رفاہی، غیر حکومتی گروہ، تنظیم یا جماعت زکوٰۃ جمع کرسکتی ہیں یا نہیں؟۔

(۳) اسلامی حکومت کی غیر موجودگی میں کوئی ایسی تنظیم جس کا دستور اسلامی ہو، زکوٰۃ اکٹھی کرسکتی ہے یا نہیں؟۔

(۴) اگر حکومت اسلامی ہو تو اس کا زکوٰۃ لینا کیوں درست ہے، جب کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے افراد قبولیت کے لئے معلوم ہیں۔

(۵) اگر اسلامی حکومت زکوٰۃ جمع کرسکتی ہے تو پھر کوئی بھی اسلامی تنظیم زکوٰۃ جمع کر کے معلوم مدات میں کیوں خرچ نہیں کرسکتی؟۔

(۶) زکوٰۃ جمع کرنے کے ضمن میں عموماً عامل کا تقرر اسلامی حکومت میں امیر/امام/خلیفہ ہی مقرر کرسکتا ہے اور تقسیم کرنے کے ضمن میں تملیک کا تذکرہ ہوتا ہے؟۔

(۷) زکوٰۃ کے لئے کسی فرد کی قبولیت شرط ہے تو پھر فی سبیل اللہ میں زکوٰۃ کی قبولیت کیسے کروائی جائے گی۔ فی سبیل اللہ میں تملیک اور بغیر تملیک جیسے وَفِی الرِّقَابِ (غلام) مُؤَلَّفَۃُ الْقُلُوْب (تالیفِ قلب) فقراء، مساکین، مقروض، مسافر کے کھانے، پناہ گاہ اور دیگر ضرورت کے لئے زکوٰۃ استعمال کی جاسکتی ہے یا نہیں؟۔

(۸) فی سبیل اللہ میں رَجُلٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رستے میں خرچ کی بات کی گئی ہے۔ جس میں درس و تدریس اور رفاہی ہسپتالوں کی بلڈنگ، دفتر، مکانات، کتابوں کی پرنٹنگ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان سب مدات میں تملیک تو ممکن نہیں۔ ایسی تمام مدات میں زکوٰۃ کیسے خرچ کی جائے گی؟۔

(۹) زکوٰۃ میں مریض کے علاج کے لئے دوا، رفاہی ہسپتالوں کے ڈاکٹرز اور دیگر عملہ کی تنخواہیں، ایمبولینس کے اخراجات وغیرہ کئے جاسکتے ہیں یا نہیں؟۔

(۱۰) ہماری تنظیم پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن (پیما) ایک اسلامی تنظیم ہے، اس کا دستور موجود ہے اور یہ "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ (آل عمران 104)" کے تحت کام کررہی ہے۔ اس تنظیم کے پاکستان میں تقریباً 4000 ممبران موجود ہیں۔ یہ تنظیم ڈاکٹروں کی اسلامی خطوط پر ٹریننگ کا کام کرتی ہے تاکہ بحیثیت مسلمان ڈاکٹر اپنے فرائض کو سمجھ سکیں اور ایک اچھے پروفیشنل مسلمان ڈاکٹرز بن سکیں۔ اس تنظیم کو چلانے کے لئے اس کے تنظیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے اس کے ممبران اعانت (عطیات) دیتے ہیں اور اسی اعانت سے یہ تنظیم چل رہی ہے۔

(۱۱) اس کے ساتھ ساتھ یہ تنظیم مختلف رفاہی کام بھی کرتی ہے، قدرتی آفات کی صورت میں پاکستان اور بیرون ملک متاثرین کو طبی امداد فراہم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں رفاہی ہسپتال، کلینک اور فری میڈیکل کیمپس بھی کام کررہے ہیں۔ جن کے اخراجات کے لئے عطیات، صدقات اور زکوٰۃ جمع کئے جاتے ہیں، جو صرف میڈیکل ریلیف کے کاموں میں خرچ ہوتے ہیں۔ ریلیف کے تمام پراجیکٹس کی نگران یہ تنظیم (پیما) ہی ہے۔

(۱۲) زکوٰۃ خرچ کرنے کے معاملے میں کیا ہماری تنظیم (پیما) وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا کے زمرے میں آتی ہے؟ کیا عطیات، صدقات اور زکوٰۃ کا آٹھواں حصہ یعنی 12.5 فیصد اس تنظیم (پیما) کے انتظامی امور، جو کہ ریلیف کے انتظامی امور سے الگ ہوں، کے لئے حاصل کئے جائیں تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟۔

(۱۳) کیا یہ تنظیم (پیما) ایک عامل کی حیثیت رکھتی ہے؟ کیوں کہ اگر یہ تنظیم نہ ہو تو نہ زکوٰۃ اکٹھی ہوسکتی ہے اور نہ ہی ریلیف کا کام ہوسکتا ہے۔ ریلیف کے کام کے لئے الگ سے کوئی تنظیم موجود نہیں ہے بلکہ اس کو چلانے کے لئے اور اسے مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کے لئے فنڈز کی ضرورت ہے تاکہ یہ تنظیم ڈاکٹروں کی تربیت کے ساتھ ساتھ ریلیف کا کام بھی منظم بنیادوں پر کرسکے۔

ڈاکٹر عطاء الرحمٰن

انچارج طبی فقہی بورڈ

پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن (پیما)

انجمن ارائیاں پاکستان، کراچی (سندھ) کے سوالات

انجمن ارائیاں، سندھ بھر کی ارائیں برادری کی نمائندہ سماجی وفلاحی تنظیم ہے جو کہ حکومت سندھ کے متعلقہ ادارے سے رجسٹرڈ ہے۔ ہماری تنظیم، ارائیں برادری کی فلاح وبہبود اور تعمیر وترقی کے امور سرانجام دینے کے علاوہ دیگر برادریوں کے غریب ونادار، یتیم ومساکین، غریب مگر ہونہار طلبہ وطالبات، بیواؤں، جہیز کی حق دار بچیوں کو جہیز کی فراہمی اور مستحق افراد کو طبی امداد اور دیگر ضرورت مند افراد کی بھی زکوٰۃ فنڈ سے مدد کرتی ہے۔ زکوٰۃ کی رقم ارائیں برادری کے صاحبِ حیثیت ومخیّر حضرات سے اکٹھی کی جاتی ہے۔

ہماری تنظیم کے کراچی سمیت سندھ بھر میں ہسپتال، ڈسپنسریاں، سلائی سنٹرز، ناظرہ قرآن کی تعلیم کے سینٹرز (مدرسے) اور تعلیمی ادارے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو کہ مقامی آبادی کے افراد کی بلاتفریق برادری ورنگ ونسل مفت خدمت کررہے ہیں۔ علاوہ ازیں قدرتی آفات سے متاثرہ عوام کو بھی مشکل وقت میں زکوٰۃ فنڈ سے بھرپور مدد کی جاتی ہے۔ گزشتہ سیلاب اور تباہ کن بارشوں سے متاثرہ افراد کی نہ صرف بروقت مدد کی گئی بلکہ متاثرہ علاقوں میں بے گھر لوگوں کی بحالی پر بھی لاکھوں روپے خرچ کیے گئے۔ بارش اور سیلاب زدہ علاقوں میں کام کے دوران ایمبولینس سروس کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی، اس سلسلے میں آپ ہماری رہنمائی فرمائیں کہ کیا ہم زکوٰۃ فنڈ سے ایمبولینس خرید سکتے ہیں تاکہ مخلوق خدا کی مدد کرنے میں مزید بہتری لائی جاسکے۔

(محمد پرویز ارائیں، چوہدری محمد شبیر ارائیں)

جواب: چونکہ ان سوالات کی روح یا مرکزی خیال ایک ہے اور یہ ہمارے فقہاءِ کرام کے بیان کردہ اصول ''تملیك للفقراء فی الزکوٰۃ'' سے متعلق ہے اور کسی حد تک ''فی سبیل اللہ'' سے متعلق ہے۔ جواب طلب سوالات درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ کہ رفاہی اداروں کے منتظمین کی حیثیت کیا ہے؟۔

۲۔ آیا یہ ادارے ''عاملینِ زکوٰۃ'' کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں؟۔ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر ان اداروں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔ ان پر ادائیگیِ زکوٰۃ کے فقہی ''اصول تملیک'' کا اطلاق کیسے ہوگا اور یہ کہ کیا ان اداروں کو زکوٰۃ جمع کرنے کا حق حاصل ہے۔

۳۔ دینی مدارس کے مہتممین / ناظمین اعلیٰ کس زمرے میں آتے ہیں۔

۴۔قرآن مجید میں بیان کردہ مصرفِ زکوٰۃ ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق کیا ہے اور اس کا اطلاق کیسے ہوگا؟۔
ہم پہلے زکوٰۃ میں ''تملیک'' کے فقہی اصول کی تشریح کریں گے اور بعد میں اِن سوالات کی روح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک جامع جواب دیں گے۔

قرآن وحدیث میں تملیک کے صریح قرائن:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱)إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَo

ترجمہ:''تمہارا دوست (محب) اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ مومن ہیں جو نماز ادا کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں (بھی) زکوٰۃ دیتے ہیں،(المائدہ:55)''۔

(۲)فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَo

ترجمہ:میں (دنیا اور آخرت کی بھلائی) ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا، جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں،(الاعراف:156)''۔

(۳)وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ

ترجمہ:''اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں،(توبہ:71)''۔

(۴۔۵)الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَo

ترجمہ:''جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں''۔

(نمل:03،لقمان:04)

مندرجہ بالا آیات مبارکہ اور قرآن مجید میں بعض دیگر مقامات پر زکوٰۃ وصدقات دینے کے لئے ''اِیتاء'' کا کلمہ آیا ہے اور امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

والايتاء الاعطاء وخص وضع الصدقة في القرآن بالايتاء

ترجمہ:''ایتاء کے معنی ہیں عطا کر دینا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صدقہ نکالنے کو عطا کرنے کے ساتھ خاص فرمایا ہے،(المفردات،ص:61)''۔

اسی طرح قرآن مجید میں زکوٰۃ کو سائل اور نادار کا حق قرار دیا ہے اور کسی کا حق اُسی وقت ادا ہوتا ہے، جب اُسے

مالکانہ بنیاد پر دے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ

ترجمہ: ''اور ان (مال داروں) کے مال میں سائل اور (نعمتِ مال) سے محروم کا حق ہے، (الذاریات: 19)''۔

سورۂ توبہ: 60 میں بیشتر مداتِ زکوٰۃ کے لئے کلمہ ''ل'' آیا ہے اور بیشتر مفسرین اور ائمہ کرام نے اسے ''تملیک'' کے معنی میں لیا ہے، یعنی زکوٰۃ کا مال فقراء و مساکین و دیگر مستحقین کی مِلک کر دو۔

علامہ قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی حنفی، متوفّٰی 1069ھ لکھتے ہیں:

ترجمہ ''پہلے چار مصارف کے ساتھ ''لام'' اور آخری چار مصارف کے ساتھ ''فی'' ذکر کرنے میں نقطہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں اُن کو زکوٰۃ سے اُن کا حصہ ادا کر کے اِس کا مالک بنا دیا جائے اور آخری چار مصارف میں اُن کو زکوٰۃ میں سے اُن کے حصے کا مالک نہیں بنایا جائے گا بلکہ ان کا حصہ ان کی فلاح اور اُن کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا، مکاتَب کا مال اُس کے مالک کو دیا جائے گا اور مقروض کا مال (یعنی اُس کے حصے کی زکوٰۃ) اُس کے قرض خواہ کو دیا جائے گا اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنا بالکل واضح ہے اور مسافر بھی اللہ کے راستے میں داخل ہے، اس کو علیحدہ اس لئے ذکر کیا ہے تا کہ اس کی خصوصیت پر تنبیہ ہو''۔

(عنایت القاضی، جلد: 04، ص: 588، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی، متوفّٰی 606ھ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''پہلے چار مصارف میں ''لام'' اور آخری چار مصارف میں ''فی'' ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں زکوٰۃ سے اُن کا حصہ دے کر اُس کا مالک بنا دیا جائے گا کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں، (تفسیر کبیر، جلد: 06، ص: 87-86)''۔

علامہ عمر بن علی الدمشقی حنبلی اور علامہ خازن شافعی نے بھی یہی لکھا ہے کہ پہلے چار مصارف میں تملیک ضروری ہے اور آخری چار میں تملیک کے بجائے اُن کی ضروریات اور مصالح میں زکوٰۃ خرچ کی جائے''۔

(تفسیہ خازن، جلد: 02، ص: 203)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اور امام شافعی نے کہا: ''لام'' تملیک کے لئے ہے، جیسے کہا جاتا ہے ''اَلْمَالُ لِزَیْدٍ وَّعَمْرٍو وَّبَکْرٍ'' یعنی مال زید، عمرو اور بکر کے لئے ہے''۔

(الجامع لاحکام القرآن، جلد:4، ص:167)

علامہ ناصرالدین ابن منیر مالکی لکھتے ہیں:

قَالَ اَحْمَدُ: وَثَمَّ سِرٌّ آخَرُ هُوَ اَظْهَرُ وَاَقْرَبُ، ذٰلِكَ اَنَّ الْاَصْنَافَ الْاَرْبَعَةَ الْاَوَائِلَ مِلَاكٌ لِمَا عَسَاهُ يُدْفَعُ اِلَيْهِمْ، وَاِنَّمَا يَأْخُذُوْنَهُ مِلْكًا فَكَانَ دُخُوْلُ اللَّامِ لَائِقًا بِهِمْ۔

ترجمہ: ''امام احمد نے کہا: یہاں ایک اور راز کی بات ہے اور یہ زیادہ واضح اور نصِ قرآنی کے قریب ہے وہ یہ کہ پہلی چار قسمیں اس چیز کی مالک ہوتی ہیں جو ان کو دیئے جانے کی قوی امید ہے۔ اور وہ اِس مالِ زکوٰۃ کو بطورِ ملکیت لیں گے، تو اِن (چار اقسام) پر ''لام'' کا داخل ہونا مناسب ہے''۔

(کتاب الانتصاف علیٰ حاشیۃ تفسیر الکشاف للزمخشری، ص:439، دارالمعرفہ، بیروت)

علامہ موسیٰ بن احمد الحجاوی الصالحی المتوفّٰی 960ھ، لکھتے ہیں:

وَيُشْتَرَطُ لِمِلْكِ الْفَقِيْرِ لَهَا وَاِجْزَائِهَا عَنْ رَّبِّهَا: قَبْضُهُ لَهَا فَلَا يُجْزِئُ غَدَاءُ الْفُقَرَاءِ وَلَا عَشَاؤُهُمْ وَلَا يُقْضٰى مِنْهَا دَيْنُ مَيِّتٍ غَرِمٍ لِمَصْلِحَتِ نَفْسِهٖ اَوْ غَيْرِهٖ لِعَدَمِ اَهْلِيَّتِهٖ لِقَبُوْلِهَا، كَمَا لَوْ كَفَّنَهُ مِنْهَا، وَلَا يَكْفِيْ اِبْرَاءُ الْمَدِيْنِ مِنْ دَيْنِهٖ بِنِيَّةِ الزَّكٰوةِ،

ترجمہ: ''فقیر کے مالک ہونے کے لئے اور صاحبِ زکوٰۃ کی زکوٰۃ صحیح ادا ہونے کے لئے مالِ زکوٰۃ پر اُس کا قبضہ ضروری ہے، پس فقیر کو صبح یا شام کا کھانا کھلانے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی اور مالِ زکوٰۃ سے مقروض میت کا قرض ادا نہیں کیا جا سکے گا، خواہ اُس کا اپنا قرض ہو یا کسی اور کا، کیوں کہ میت اُس کو قبول کرنے کی اہل نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے میت کو کفن پہنانے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی اور اگر کسی مال دار شخص کا کسی فقیر پر قرض ہے اور وہ یہ چاہے کہ وہ مقروض کو قرض سے بری الذمہ کردے اور یہ قرض زکوٰۃ میں محسوب ہو جائے، تو اِس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ اس کی شرح میں شیخ منصور بن یونس البھوتی الحنبلی المتوفّٰی 1051ھ نے تقریباً انہی کلمات کو دہرایا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہِ حنبلی میں بھی زکوٰۃ کے صحیح طور پر ادا ہونے کے لئے فقیر کا مالِ زکوٰۃ پر ملک اور قبضہ ضروری ہے، (یعنی مالِ زکوٰۃ کو محض فقیر کے لئے مباح کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی)''۔

(کشّافُ الْقِناعِ عَنْ مَتْنِ الْاِقْناعِ، جلد:02، ص:310، دارالکتب العلمیہ)

امام ابواسحاق ابراہیم بن علی فیروز آبادی شیرازی لکھتے ہیں:

وَيَجِبُ صَرْفُ جَمِيعِ الصَّدَقَاتِ إِلَى ثَمَانِيَةِ أَصْنَافٍ، وَهُمْ: الْفُقَرَاءُ وَالْمَسَاكِينُ وَالْعَامِلُونَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةُ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمُونَ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَابْنُ السَّبِيلِ،وَقَالَ الْمُزَنِيُّ وَأَبُو حَفْصٍ الْبَابُ شَامِيُّ: يُصْرَفُ خُمُسُ الرِّكَازِ إِلَى مَنْ يُصْرَفُ إِلَيْهِ خُمُسُ الْفَيْءِ وَالْغَنِيمَةِ، لِأَنَّهُ حَقٌّ مُقَدَّرٌ بِالْخُمُسِ فَأَشْبَهَ خُمُسَ الْفَيْءِ وَالْغَنِيمَةِ لِأَنَّهُ حَقٌّ مُقَدَّرٌ بِالْخُمُسِ، فَأَشْبَهَ خُمُسَ الْفَيْءِ وَالْغَنِيمَةِ---------اس کے بعد اپنے مسلک کے مطابق اصولِ تقسیم بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فَأَضَافَ جَمِيعَ الصَّدَقَاتِ إِلَيْهِمْ بِلَامِ التَّمْلِيكِ وَأَشْرَكَ بَيْنَهُمْ بِوَاوِ التَّشْرِيكِ فَدَلَّ عَلَى أَنَّهُ مَمْلُوكٌ لَهُمْ مُشْتَرَكٌ بَيْنَهُمْ۔

ترجمہ: ''اور تمام صدقات کو آٹھ اقسام میں تقسیم کرنا واجب ہے اور وہ آٹھ اقسام یہ ہیں: فقراء، مساکین، عاملین مؤلفۃ القلوب، وہ جن کی گردن کسی مالی بوجھ تلے دبی ہو یا غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں، جو اپنے آپ کو، اللہ کی راہ میں وقف کئے ہوئے ہوں اور مسافر۔ مُزَنی اور ابوحفص الباب شامی نے کہا: معدنیات کا خُمس (پانچواں حصہ) انہی کو دیا جائے گا جنہیں مالِ فی اور مالِ غنیمت دیا جاتا ہے، کیونکہ اس کی مقدار بھی خُمس بتائی گئی ہے تو یہ مالِ فی اور مالِ غنیمت کے مشابہ ہوگیا۔۔۔۔۔آگے کی سطور میں فقہِ شافعی کے اصولِ تقسیم بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: تمام صدقات کو ان کی طرف لامِ تملیک کے ساتھ مضاف (منسوب) کیا اور ''واوِ جمع'' کے ساتھ ان سب کو اس میں شامل کیا، پس ثابت ہوا کہ اس مالِ زکوٰۃ کی ملکیت ان کے درمیان مشترک ہے''۔ (المہذب فی فقہ الامام الشافعی، جلد: 01، ص: 71-170، مطبوعہ: دار الفکر)

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ سورۂ توبہ: 60 میں بیان کئے گئے مصارفِ زکوٰۃ کی ابتدائی چار مدّات کے لئے چاروں ائمہ کے نزدیک تملیک یعنی مستحقِ زکوٰۃ کو مالک بنانا اور مالِ زکوٰۃ پر اُس کا قبضہ شرط ہے۔ فقہِ حنفی کے مزید حوالہ جات درج ذیل ہیں:

علامہ علاؤالدین حصکفی زکوٰۃ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: شرعاً: (تَمْلِيْكٌ) خَرَجَ الْإِبَاحَةُ، فَلَوْ أَطْعَمَ يَتِيمًا نَاوِياً الزَّكَاةَ لَايُجْزِيهِ، إِلَّا إِذَادُفِعَ إِلَيْهِ الْمَطْعُومُ، كَمَالَوْ كَسَاهُ بِشَرْطِ أَنْ يَّعْقِلَ الْقَبْضَ۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے شرعی معنی ہیں: ''فقیر کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنادینا''۔ تملیک کی قید سے محض مباح کردینا (یعنی فقرا کو مالِ زکوٰۃ کے استعمال کی عام اجازت دینا) خارج ہوگیا، پس اگر کسی شخص نے نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کھانا کھلایا، تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مگر جب وہی کھانا یتیم کے حوالے کردیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، جیسے اگر ادائے زکوٰۃ کے لئے یتیم کو کپڑا پہنایا، بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہے (تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی)''۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَيُشْتَرَطُ أَنْ يَّكُوْنَ الصَّرْفُ (تَمْلِيْكًا) لَا إِبَاحَةً كَمَا مَرَّ (لَا) يُصْرَفُ (إِلَى بِنَاءِ) نَحْوِ (مَسْجِدٍ) لَا إِلَى كَفَنِ مَيِّتٍ وَقَضَاءِ دَيْنِهِ۔

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو مالک بنادیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ (گزشتہ سطور میں) گزرا، (اسی تملیک کی شرط کی وجہ سے) زکوٰۃ کی رقم کسی عمارت پر یا مسجد پر یا میت کو کفن پہنانے پر اور اُس کا قرض ادا کرنے پر صرف نہیں کی جاسکتی (کیوں کہ ان صورتوں میں مالک بنانا متحقق نہیں ہوتا''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد: 3، ص: 161، 263-264)

ملک العلماء علامہ علاؤالدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

فَرُكْنُ الزَّكٰوةِ هُوَاِخْرَاجُ جُزْءٍ مِّنَ النِّصَابِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى، وَتَسْلِيْمُ ذٰلِكَ إِلَيْهِ يَقْطَعُ الْمَالِكُ يَدَهٗ عَنْهُ بِتَمْلِيْكِهٖ مِنَ الْفَقِيْرِ وَتَسْلِيْمِهٖ إِلَيْهِ أَوْإِلَى يَدِمَنْ هُوَنَائِبٌ عَنْهُ وَهُوَالْمُصَدِّقُ، وَالْمِلْكُ لِلْفَقِيْرِ يَثْبُتُ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَصَاحِبُ الْمَالِ نَائِبٌ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰى فِي التَّمْلِيْكِ وَالتَّسْلِيْمِ إِلَى الْفَقِيْرِ، وَالدَّلِيْلُ عَلٰى ذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى: "اَلَمْ يَعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ هُوَيَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَأْخُذُالصَّدَقَاتِ"، وَقَوْلُ النَّبِيِّ ﷺ: "اَلصَّدَقَةُ تَقَعُ فِيْ يَدِالرَّحْمٰنِ قَبْلَ أَنْ تَقَعَ فِي كَفِّ الْفَقِيْرِ"، وَقَدْأَمَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى، الْمُلَّاكَ بِإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ لِقَوْلِهٖ عَزَّوَجَلَّ: "وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ"، وَالْإِيْتَاءُ هُوَالتَّمْلِيْكُ، وَلِذَا سَمَّى اللّٰهُ تَعَالٰى الزَّكَاةَ صَدَقَةً بِقَوْلِهٖ عَزَّوَجَلَّ: ""وَالتَّصَدُّقُ تَمْلِيْكٌ، فَيَصِيْرُ الْمَالِكُ مُخْرِجًا قَدْرَالزَّكَاةِإِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى بِمُقْتَضَى التَّمْلِيْكِ سَابِقًاعَلَيْهِ، وَلِأَنَّ الزَّكَاةَ عِبَادَةٌ عَلٰى أُصُلِنَا، وَالْعِبَادَةُإِخْلَاصُ الْعَمَلِ بِكُلِّيَّتِهٖ لِلّٰهِ تَعَالٰى وَذٰلِكَ

فِيمَا قُلْنَا أَنَّ عِنْدَ التَّسْلِيمِ إِلَى الْفَقِيرِ تَنْقَطِعُ نِسْبَةُ قَدْرِ الزَّكَاةِ عَنْهُ بِالْكُلِّيَّةِ وَتَصِيرُ خَالِصَةً لِلّٰهِ تَعَالَى، وَيَكُونُ مَعْنَى الْقُرْبَةِ فِي الْإِخْرَاجِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى بِإِبْطَالِ مِلْكِهِ عَنْهُ لَا فِي التَّمْلِيكِ مِنَ الْفَقِيرِ بَلِ التَّمْلِيكُ مِنَ اللّٰهِ تَعَالَى فِي الْحَقِيقَةِ وَصَاحِبُ الْمَالِ نَائِبٌ عَنِ اللّٰهِ تَعَالَى ---إِلَى أَنْ قَالَ: وَعَلَى هٰذَا يَخْرُجُ صَرْفُ الزَّكَاةِ إِلَى وُجُوهِ الْبِرِّ مِنْ بِنَاءِ الْمَسَاجِدِ، وَالرِّبَاطَاتِ، وَالسِّقَايَاتِ، وَإِصْلَاحِ الْقَنَاطِرِ، وَتَكْفِينِ الْمَوْتَى وَدَفْنِهِمْ، أَنَّهُ لَا يَجُوزُ، لِأَنَّهُ لَمْ يُوجَدِ التَّمْلِيكُ أَصْلًا، وَكَذٰلِكَ إِذَا اشْتَرَى بِالزَّكَاةِ طَعَامًا فَأَطْعَمَ الْفُقَرَاءَ غَدَاءً وَعَشَاءً وَلَمْ يَدْفَعْ عَيْنَ الطَّعَامِ إِلَيْهِمْ لَا يَجُوزُ لِعَدَمِ التَّمْلِيكِ، وَكَذَا لَوْ قَضَى دَيْنَ مَيِّتٍ فَقِيرٍ بِنِيَّةِ الزَّكَاةِ لِأَنَّهُ لَمْ يُوجَدِ التَّمْلِيكُ مِنَ الْفَقِيرِ لِعَدَمِ قَبْضِهِ، وَلَوْ قَضَى دَيْنَ حَيٍّ فقيران قضى بغير امره لم يجز لانه لم يوجد التمليك من الفقير لعدم قبضه وَإِنْ كَانَ بِأَمْرِهِ يَجُوزُ عَنِ الزَّكَاةِ لِوُجُودِ التَّمْلِيكِ مِنَ الْفَقِيرِ لِأَنَّهُ لَمَّا أَمَرَهُ بِهِ صَارَ وَكِيلًا عَنْهُ فِي الْقَبْضِ فَصَارَ كَأَنَّ الْفَقِيرَ قَبَضَ الصَّدَقَةَ بِنَفْسِهِ وَمَلَّكَهُ مِنَ الْغَرِيمِ، وَلَوْ أَعْتَقَ عَبْدَهُ بِنِيَّةِ الزَّكَاةِ لَا يَجُوزُ لِانْعِدَامِ التَّمْلِيكِ إِذِ الْإِعْتَاقُ لَيْسَ بِتَمْلِيكٍ بَلْ هُوَ إِسْقَاطُ الْمِلْكِ۔

ترجمہ: ”زکوٰۃ کا ایک رُکن یہ ہے کہ نصاب میں سے ایک جز و کو اللہ کی رضا کے لئے نکالا جائے اور مالِ زکوٰۃ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مالک اُس مال سے اپنی ملکیت ختم کر دے اور فقیر کو مالک بنا کر اُس کے یا سرکاری طور پر صدقہ وصول کرنے والے کے حوالے کر دے، جو فقیر کا نائب ہوتا ہے۔ مالِ زکوٰۃ پر فقیر کی مِلک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والا فقیر کو مالک بنا کر مالِ زکوٰۃ اس کے حوالے کرنے میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ترجمہ: ”کیا وہ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہی صدقات لیتا ہے، (توبہ: 104)“۔ اور نبی ﷺ کا یہ ارشاد کہ: ترجمہ: ”صدقہ فقیر کے ہاتھ تک پہنچنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں پہنچ جاتا ہے“۔ اور اللہ تعالیٰ ہی نے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم فرما کر فقیر کو مالک بنانے کا حکم فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اور زکوٰۃ دو“ اور ”اِیتَاء“ کے معنی ہیں مالک بنا دینا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ: 60 میں زکوٰۃ کو صدقہ بھی قرار دیا ہے۔ اور تصدق کے معنی ہیں: ”مالک بنا دینا“، پس اسی تملیک کے تقاضے کے تحت مال کا مالک زکوٰۃ کی رقم کو اللہ تعالیٰ کی طرف (یعنی اس کی رضا کے لئے) نکالنے والا ہوتا ہے، اور اس لئے بھی کہ زکوٰۃ اپنی اصل کے اعتبار

سے عبادتِ (مالی) ہے اور عبادت کے معنی ہیں: ''بندے کا اپنی عمل کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کر دینا''۔ اور اسی بنا پر ہم نے کہا کہ جب مال دار زکوٰۃ فقیر کے حوالے کرتا ہے، تو اُس مال پر سے اُس کی ملکیت کا تعلق مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے اور وہ مال خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جاتا ہے۔

اور قُربت (یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے لئے عبادت کی نیت سے کوئی کام کرنا) کے معنی ہیں: ''مال دار کا مالِ زکوٰۃ پر سے اپنی ملکیت کو باطل کر کے اللہ کی مِلک میں کر دینا، نہ کہ فقیر کی مِلک میں، پس مالِ زکوٰۃ کی فقیر کو تملیک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور صاحبِ مال اُس کا نائب ہوتا ہے۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: اِس بنیاد پر مساجد کی تعمیر، سرائیں، پانی کی سبیلیں، پلوں کی مرمت مردوں کا کفن و دفن اور ان جیسے مصارفِ خیر پر زکوٰۃ کا خرچ کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہاں تملیک بالکل نہیں پائی جاتی۔ اور اسی طرح جب زکوٰۃ کے مال سے کھانا خریدا اور اُسے صبح وشام فقراء کو کھلایا، لیکن وہ طعام اُن کے قبضے میں نہیں دیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی کیوں کہ تملیک نہیں پائی گئی۔ اسی طرح اگر کسی فقیر میت کا قرض زکوٰۃ کی نیت سے ادا کیا، تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کیوں کہ فقیر کی تملیک نہیں پائی گئی، کیوں کہ میت مالک بننے کی اہل نہیں ہے۔ اور اسی طرح اگر کسی زندہ فقیر کا قرض اُس کے حکم کے بغیر مالِ زکوٰۃ سے ادا کیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کیوں کہ فقیر کی جانب سے تملیک نہیں پائی گئی، کیونکہ مال پر اس کا قبضہ نہیں ہوا۔ اور اگر زندہ فقیر کا قرض اُس کی اجازت سے مالِ زکوٰۃ سے ادا کیا، تو زکوٰۃ ادا ہو جائے، کیونکہ فقیر کی جانب سے تملیک پائی گئی، کیوں کہ جب فقیر نے غنی کو حکم دے دیا، تو غنی مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کرنے اور فقیر کی جانب سے قرض ادا کرنے میں اس کا وکیل ہوگیا تو گویا فقیر نے اپنے وکیل کے توسط سے مال پر قبضہ کیا اور پھر قرض خواہ کو اس کا مالک بنا دیا (بدائع الصنائع، جلد: 02، ص: 58)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

''غلاموں، مقروضوں، اللہ کی راہ میں اور مسافروں پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کے لئے تملیک ضروری نہیں: بعض علماء نے کہا ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ مکاتب کی اجازت سے زکوٰۃ میں اس کا حصہ اس کے مالک کو دے دیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے چار مصارف کا ذکر لام تملیک کے ساتھ کیا ہے اور جب رقاب کا ذکر کیا تو لام کے بجائے ''فی'' کا ذکر کیا اور فرمایا وفی الرقاب اور اس فرق کا کوئی فائدہ ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں زکوٰۃ میں سے ان کا حصہ ان کو دے کر ان کو ان حصص کا مالک بنایا جائے اور باقی مصارف میں

زکوۃ میں ان کا حصہ ان کے مصالح اوران کی بہتری اوران کے فوائد میں خرچ کیا جائے اوران کوان کا مالک نہ بنایا جائے۔

زمخشری نے کہا ہے کہ آخری چار مصارف میں لام کے بجائے ''فی'' کا ذکر کیا ہے اوراس میں یہ بتانا ہے کہ آخری چار مصارف پہلے چار مصارف سے صدقہ اورزکوۃ دیئے جانے کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ ''فی'' ظرفیت کے لئے آتا ہے اوراس میں تنبیہ ہے کہ وہ صدقات کا ظرف اورمحل ہیں اور''فی سبیل اللّٰہ وابن السبیل'' میں جو''فی'' کا تکرار کیا ہے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ ان دو مصرفوں کو یعنی فی سبیل اللّٰہ اورابن السبیل کو پہلے دو مصرفوں پر زیادہ ترجیح ہے اورغلام آزاد کرانے اور مقروض کا قرض ادا کرنے کی بہ نسبت مالِ زکوۃ کو اللہ کے راستہ میں اورمسافروں پر خرچ کرنا زیادہ راجح ہے۔''

(اللباب فی علوم الکتاب، جلد:10،ص:126،مطبوعہ:دارالکتب العلمیہ)

قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی حنفی متوفّٰی 1069ھ لکھتے ہیں:

''پہلے چار مصارف کے ساتھ لام اورآخری چار مصارف کے ساتھ''فی'' ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کو زکوۃ سے ان کا حصہ ادا کر کے ان کوان حصوں کا مالک بنادیا جائے اورآخری چار مصارف میں ان کو زکوۃ میں سے ان کے حصہ کا مالک نہیں بنایا جائے گا بلکہ ان کا حصہ ان کی فلاح اوران کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا، مکاتب کا مال اس کے مالک کو دیا جائے گا اورمقروض کا مال (اس کے حصہ کی زکوۃ)اس کے قرض خواہ کو دیا جائے گا اوراللہ کے راستہ میں خرچ کرنا بالکل واضح ہے،اور مسافر بھی اللہ کے راستے میں داخل ہے،اس کو علیحدہ اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ اس کی خصوصیت پر تنبیہ ہو۔''

(عنایت القاضی،جلد:4،ص:588،مطبوعہ:دارالکتب العلمیہ،بیروت)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفّٰی 606ھ پہلے چار مصارف میں لام اورآخری چار مصارف میں''فی'' کو ذکر کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:''پہلے چار مصارف میں ان کو زکوۃ سے ان کا حصہ دے کر ان کو مالک بنادیا جائے گا کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں اورغلاموں کو آزاد کرنے کے لئے ان کا حصہ ان کو نہیں دیا جائے گا اور نہ ان کو اس پر تصرف کی قدرت دی جائے گی کہ وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں بلکہ ان کی طرف سے ان کی قیمت ادا کردی جائے گی،اسی طرح مقروضوں کی زکوۃ کا حصہ ان

کے قرض خواہوں کو دے دیا جائے گا، اسی طرح مجاہدین کی زکوٰۃ کا حصہ ان کی ضرورت کا اسلحہ خریدنے میں خرچ کیا جائے گا اور اسی طرح مسافروں کی ضرورت کی چیزوں میں ان کا حصہ خرچ کیا جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کے حصص ان کو دے دیئے جائیں گے کہ وہ جس طرح چاہیں خرچ کریں اور آخری چار مصارف میں ان کو ان کے حصص نہیں دیئے جائیں گے بلکہ جس جہت سے وہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں اس جہت میں ان کے حصہ کی زکوٰۃ کو خرچ کیا جائے گا، (تفسیر کبیر، جلد:6،ص:7-86)۔''

مفسرین حنبلیہ میں سے علامہ عمر بن علی الدمشقی حنبلی نے اور مفسرینِ شافعیہ میں سے امام رازی کے علاوہ، علامہ خازن شافعی متوفّٰی 725ھ نے یہی لکھا ہے کہ زکوٰۃ کے پہلے چار مصارف میں تملیک ضروری ہے اور آخری چار مصارف میں تملیک کے بجائے ان کی ضروریات اور مصالح میں زکوٰۃ خرچ کی جائے، (تفسیرِ خازن، جلد:2،ص:253)۔ اور مفسرینِ احناف میں سے علامہ خفاجی کے علاوہ علامہ محی الدین شیخ زادہ حنفی متوفّٰی 951ھ اور ابوالسعود محمد بن عمادی حنفی متوفّٰی 982ھ اور علامہ آلوسی حنفی متوفّٰی 1270ھ نے بھی یہی لکھا ہے، (حاشیہ محی الدین شیخ زادہ، جلد:4،ص:478، تفسیر ابوالسعود، جلد:3،ص:162 تفسیر روح المعانی، جلد:1،ص:124)۔ غیر مقلدین میں سے نواب صدیق حسن خان بھوپالی متوفّٰی 1307ھ نے بھی یہی لکھا ہے، (فتح البیان، جلد:5،ص:332)۔

جن مفسرین نے ژرف نگاہی سے کام لیا اور اس پر غور کیا کہ پہلی چار اصناف کے لئے اللہ تعالیٰ نے لام کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور باقی چار اصناف کے لئے ''فی'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے، انہوں نے اس سے یہ مستنبط کیا کہ پہلی چار قسموں میں سے جس کو زکوٰۃ ادا کی جائے اس کو اس مالِ زکوٰۃ کا مالک بنانا ضروری ہے اور دوسری چار قسموں کے شروع میں چونکہ لام تملیک نہیں ہے بلکہ ''فی'' کا ذکر ہے اس لئے ان میں ان کو مالِ زکوٰۃ کا مالک نہیں بنایا جائے گا بلکہ ان کے حصہ کی زکوٰۃ کو ان کی ضروریات اور ان کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا۔ حنبلی، شافعی اور حنفی مفسرین کی تصریحات اس مسئلہ میں گزر چکی ہیں اور ان فقہاءِ مالکیہ کا بھی یہی موقف ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ غلام کو زکوٰۃ کا حصہ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے حصہ سے غلام کو خرید کر آزاد کر دیا جائے۔

علامہ ابوعبداللہ قرطبی مالکی، متوفّٰی 668ھ لکھتے ہیں: امام مالک نے فرمایا کہ غلام کو آزاد کر دیا جائے اور اس کی ولاء مسلمانوں کے لئے ہوگی، (الی قولہ) اس میں اختلاف ہے کہ آیا مکاتب کو آزاد کرانے میں اس کی معاونت کی

جائے یا نہیں، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ رقبہ (غلام) کا ذکر فرماتا ہے تو اس سے مکمل غلام آزاد کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اور رہا مکاتب تو وہ غارمین (مقروضوں) کے کلمہ میں داخل ہے کیونکہ اس کے اوپر مکاتبت کا قرض ہوتا ہے اس لئے وہ رقاب میں داخل نہیں ہوگا، (الجامع لاحکام القرآن، جز:8،ص:109)۔"

(تبیان القرآن، جلد:05،ص:174 تا176)

ادائیگیِ زکوٰۃ کے حوالے سے دینی مدارس/دارالکفالت کے مہتمم کی حیثیت:

ہماری رائے میں ایسے تمام دینی مدارس وجامعات، یتیموں/معذوروں/محتاجوں کے دارالکفالت، جن میں سب طلبہ یا یتامیٰ یا معذورین مستحقِ زکوٰۃ ہوں، اُن کا مہتمم/متولی زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کی وصولی کے لئے اُن کا وکیل ہے۔ لہٰذا جب ایسے ادارے کے متولی یا مہتمم کو زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ دے دیئے جائیں، تو وہ ادا ہوجائیں گے۔ اور ادارے کا متولی/مہتمم اُن کے وکیل کی حیثیت اُن کے مصالح میں دیانت وامانت کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس رقم کو خرچ کرسکتا ہے۔ مَصالح سے مراد اُن کی خوراک، لباس، علاج، کتب اور تعلیم وتدریس کے مصارف ہیں۔ ان میں مدرسین وعملے کے مشاہرات، گیس، بجلی، پانی کے بل، عمارت کی نگہداشت اور دیگر سب امور شامل ہیں۔ ہم نے اپنے دارالعلوم کے داخلہ فارم میں یہ عبارت درج کی ہوئی ہے:

''میں دارالعلوم نعیمیہ کے مہتمم یا ان کے نمائندہ مُجاز کو اپنی جانب سے زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ وصول کرنے اور اُنہیں شرعی مصارف پر صرف کرنے کے لئے اپنا وکیل عام مقرر کرتا ہوں، (نام وولدیت وپتا طالبِ علم مع دستخط)''۔

مستحق طالبِ علم اور اس کا سرپرست اِسے پڑھ کر اور سمجھ کر دستخط کرتے ہیں، جس میں اُن کی طرف سے ادارے کے سربراہ یا اُس کے نمائندہ مجاز کو وصولی وصرفِ زکوٰۃ وصدقات کیلئے وہ اپنا وکیل مقرر کرتے ہیں۔

بعض اداروں کے سربراہان تملیک کے شرعی تقاضے پورے کرنے کے لئے ''حیلۂ شرعیہ'' کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے فقہاءِ کرام نے یہ طریقہ تجویز فرمایا ہے اور شریعت میں اس کی اصل بھی موجود ہے، لیکن آج کل عقلیت کا دور ہے اور بہت سے لوگوں کے اذہان بآسانی اسے قبول نہیں کرتے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بعض حضرات نے حیلے کو بہت وسعت دے دی اور مساجد تک میں صدقاتِ واجبہ کی رقوم کو اس طریقے سے استعمال کرنے کی اطلاعات ملی ہیں۔ اس لئے میں ایسے طریقے کو ترجیح دیتا ہوں جو ہر ایک

پر واضح ہو۔

ذیل میں ہم امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز کا فتویٰ مع سوال و جواب نقل کر رہے ہیں، آپ سے یتیم خانے کے متولی نے چند سوالات کئے، جو درج ذیل ہیں:

(۱) بعض لوگ میت وغیرہ کے استعمالی کپڑے ایسے بھیج دیتے ہیں جو اَیتام (یتیم کی جمع) کے جسم پر درست نہیں آتے یا ان کے استعمال کے لائق نہیں ہوتے۔ پس نادرست کو بعد قطع برید درست کرا کے اَیتام (یتیم کی جمع) کے استعمال میں لانا اور ناقابلِ استعمال کو فروخت کر کے یتیموں کی پرورش میں صرف کرنا کیسا ہے؟۔

(۲) بعض لوگ کلام مجید جدید وغیر مُستعمَل معدّد اور بعض میت کے تلاوت کا یتیم خانے میں عطا کرتے ہیں اور ان سب کی تعداد یتیموں کی تعداد سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ دینے والے بعض یہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر ضرورت سے زیادہ ہوں ہدیہ کر کے قیمت پرورش اَیتام میں صرف کی جائے، مگر بعض بدون کسی بیان کے بھیج دیتے ہیں، پس قسم آخر کو دراں حالیکہ ضرورت سے زیادہ ہوں ہدیہ کر کے قیمت کو ایتام کے مصارف میں لا سکتے ہیں اور نیز یہی قسم کسی غیر ایتام کو تلاوت کے واسطے دے سکتے ہیں یا نہیں؟۔

(۳) یتیم خانہ میں بعض لوگ میت کے استعمال کا پلنگ نواڑ وغیرہ کا جو یتیموں کی معمولی چار پائیوں سے بہت زیادہ قیمتی اور عمدہ ہوتا ہے، بدون کسی بیان کے بھیج دیتے ہیں، اگر وہ بعض اَیتام (یتیم کی جمع) کے کام میں لایا جاوے تو دوسروں کی دل شکنی ہوتی ہے، لہٰذا اوس کو فروخت کر کے قیمت دیگر مصارفِ ایتام میں دی جائے یا قیمت سے معمولی چار پائیاں یتیموں کے واسطے بنوا دی جاویں، تو کیسا ہے؟۔

(۴) جو چندہ کہ یتیموں کے مصارف کے لئے آتا ہے اوسی سے یتیم لڑکوں کی رسم ختنہ اور یتیمات کی رسم نکاح کی جاتی ہے، پس نکاح میں جو براتی دولہا کی طرف سے آتے ہیں، اون کو کھانا کھلانا زرِ مذکورہ سے کیسا ہے؟۔

امام احمد رضا قادری رحمہم اللہ تعالیٰ نے جواب میں لکھا:

مُصحف شریف، کپڑے پلنگ وغیرہ جو کچھ لوگ یتیموں کو بھیجتے ہیں، ظاہر ہے کہ اوس سے مقصود تصدُّق ہوتا ہے اور تصدُّق تملیک ہے۔ وھبۃُ الـمُشـاعِ فیمـا لا یُقسَمُ صَحیحۃٌ وقبضُ مَنْ یَعُولُھم یَکفِی عَن قَبضِھِم، کمـا نصُّوا علیہ، و جماعۃُ المُسلمین حیثُ لَا وِلایۃَلھُم وَ لا قُضاۃَمِن الاسلامِ کالقُضاۃِ فِی النَّظرِ لِلاَیتام و اَمثالُ ذٰلکَ مِن المُھامِ، کماصرّحُوا بِہٖ فِیْ غَیرِ مُقامٍ۔

ترجمہ: ''ناقابلِ تقسیم چیز کا بغیر تقسیم کے بھی ہبہ درست ہے، اور مستحقین (یتیموں) کے کفیل کا قبضہ اُن کی طرف سے کافی ہے، جیسا کہ اِس پر فقہاءِ کرام نے تصریح فرمائی ہے۔ جہاں ولایتِ شرعیہ اور اسلامی حاکم نہ ہوں وہاں یتیموں کی دیکھ بھال کے لئے جماعتِ مسلمین کی حیثیت قاضیوں ہی کی طرح ہے۔ اور جس طرح فقہاءِ کرام نے کئی مقامات پر تصریح فرمائی ہے کہ دیگر اہم امور میں بھی جماعتِ مسلمین کی حیثیت حاکمِ شرعی جیسی ہے''۔

تو جماعت مسلمین کو کہ اس کام پر معین ہیں، روا ہے کہ کپڑے قطع برید کر کے مصارف یتامیٰ میں لائیں یا نا قابل استعمال ملبوس اور پلنگ اور حاجت سے زائد مصاحفِ شریفہ ہدیہ (واضح رہے کہ ہمارے عرف میں قرآن مجید کی قیمت کو ادبا ہدیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے) وبیع کر کے زرِ ثمن کارِ یتامیٰ میں خرچ کریں، مگر مالِ یتیماں دوسرے کو عاریۃً نہیں دے سکتے، اگر چہ تلاوت کے لئے قرآن مجید (ہی کیوں نہ ہو)، فَـاِنَّــهٗ تَبَـرُّعٌ وَلَا وِلَايَةَ فِـي التَّبَرُّعِ (کیونکہ یہ تبرع (فضل واحسان) ہے اور تبرع میں ولایت نہیں ہے)، زر چندہ سے یتیموں کا ختنہ کر سکتے ہیں اور براتیوں کو معمولی کھانا دینا بھی جائز، بشرطیکہ اِسراف نہ ہو، صرف بقدر کفایت ہو، وَفِيْ رَدِّالْـمُحْتَارِ عَنِ "الْـقُنْيَةِ" لَا يَـضْـمَـنُ مَـا اَنْـفَقَ فِـي الْـمُـصَاهَرَاتِ بَيْنَ الْيَتِيْمِ وَالْيَتِيْمَةِ وَغَيْرِهِمَا فِيْ خِلَعِ الْخَاطِبِ اَوِالْـخَـطِيْئَةِ فِي الضِّيَافَاتِ الْمُعْتَادَةِ وَالْهَدَايَا الْمَعْهُوْدَةِ، وَفِيْ اِتِّخَاذِضِيَافَةٍ لِخَتْنَةٍ لِلْاَقَارِبِ وَالْجِيْرَانِ مَالَمْ يُسْرِفْ فِيْهِ اه مُخْتَصَرًا، واللّٰہ اعلم

ترجمہ: ''ردالمحتار میں ''القنیہ'' سے منقول ہے کہ: یتیم لڑکے اور لڑکی وغیرہ کی شادی کے موقع پر دولہا اور دلہن کے جوڑوں، عرف کے مطابق دعوتوں اور تحائف اور قرابت داروں اور پڑوسیوں کی دعوت پر جو خرچ کیا جائے، اس پر تاوان لازم نہیں آتا (یعنی یتیم لڑکے یا لڑکی کا سرپرست اِن مصارف پر اگر اُن کے مال میں سے خرچ کرے)، جب تک کہ اُس میں فضول خرچ نہ کرے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 10، ص: 367)''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 25، ص: 36-435)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس فتوے سے معلوم ہوا کہ ہر وہ ادارہ جو دارالکفالت ہے، جس میں سب کے سب خواہ یتامیٰ ہوں یا فقراء ومساکین یا مستحق طلبہ ہوں، تو اُس کا متولی زکوٰۃ وصول کرنے میں اُن کا وکیل ہے اور اُسے زکوٰۃ ادا کرنے سے مال دار کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، کیونکہ وکیل کا وصول کرنا مؤکل کا وصول کرنا ہے۔ اسی لئے امام احمد رضا نے اس میں توسع فرمائی اور مستحقین کی شادی کے لئے اسراف وتبذیر سے بچتے

ہوئے ایسے مصارف کی اجازت دی، جو حدِ اعتدال میں ہوں۔اس کے علاوہ انہوں نے اُس ادارے کے نام ہبہ کی ہوئی یا عطیہ کے طور پر دی ہوئی ایسی تمام اشیاء کو، جو مستحقین کے استعمال کی نہ ہوں، فروخت کر کے اُن پر صرف کرنے کی اجازت دی ہے، اِس سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت کے اِس موقف سے استفادہ کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طریقے کو ہر دارالکفالت /دینی مدرسہ وجامعہ کے لئے اختیار کر سکتے ہیں، جہاں کے مستفیدین (Beneficiaries) سب مستحق ہوں، کیوں کہ جب نکاح، شادی اور ختنے مصارف، لباس اور معروف دعوتوں کے جواز کا ذکر ہے، تو اِن کا تعلق بالغ حضرات سے ہے۔

اگر یتیم خانے میں متولی زکوٰۃ کی رقم ان کی فلاح وبہبود (welfare) پر خرچ کر سکتا ہے، جن میں شادی کے ضروری اخراجات بھی شامل ہیں، تو دارالکفالت یا دینی مدرسہ وجامعہ میں عمارت کی تعمیر، مرمت ونگہداشت، صفائی، قیام وطعام (Boarding & Lodging) کے جملہ مصارف، یوٹیلیٹی بلز (بجلی، گیس پانی وغیرہ)، علاج معالجہ کے اخراجات، کتب کی فراہمی، اساتذہ اور طلبہ کی مختلف خدمات پر مامور ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ یہ سب ان کے مَصالح (فلاح وبہبود) میں آتے ہیں۔البتہ تدریسی کتب اور بستر کمبل وغیرہ ان کی مِلک کر دینے چاہئیں۔یہ میری رائے ہے، اہلِ فتویٰ علماء اس پر غور فرما کر دلائل کی بنیاد پر اتفاق یا اختلاف کر سکتے ہیں۔

ایسے ادارے جن سے مستحقین کے علاوہ مال دار لوگ بھی استفادہ کرتے ہیں، جیسے شوکت خانم کینسر ہاسپٹل، طبہ ہارٹ ہاسپٹل وغیرہ۔ ان اداروں میں اہلِ ثروت بھی اپنا علاج کرواتے ہیں اور اُس کے مصارف بھی خود برداشت کرتے ہیں، لیکن ساتھ ساتھ مستحقینکو مفت علاج ودواؤں کی سہولت بھی دستیاب ہوتی ہے۔

ایسے اداروں کے سربراہان کی حیثیت زکوٰۃ دینے والوں کے وکیل کی ہے۔ایسے اداروں میں زکوٰۃ کی رقم تب ادا ہوگی جب اصل مستحقین کو دے دی جائے گی۔ میں نے اس کا طریقہ یہ تجویز کیا ہے کہ مستحق مریض قرض لے کر یا کسی بھی ذریعے سے اپنی فیس، ایکسرے، الٹراساؤنڈ مختلف قسم کے لیبارٹری ٹیسٹ، دواؤں، ڈاکٹر کی فیس اور ہسپتال کے واجبات ادا کریں اور زکوٰۃ کے کاؤنٹر پر جا کر یہ رسیدیں جمع کر کے زکوٰۃ کی رقم (کل یا بعض مصارف کے عوض یعنی جتنی اُس ادارے کے فنڈ میں گنجائش ہو) وصول کر لیں۔

علامہ غلام رسول سعیدی کی تحقیق کے مطابق خیراتی ہسپتالوں میں ڈائلیسز مشین (Dialysis Machine)،

ایکسرے مشین، الٹرا ساؤنڈ مشین، سٹی اسکیننگ مشین اور اسی طرح کے دیگر آلات بھی زکوٰۃ کے مد سے خرید کر دیئے جا سکتے ہیں۔

نوٹ: میں اس پر یہ اضافہ کروں گا کہ ایسے ہسپتال جن میں صرف نادار مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور مال دار اُن سے استفادہ نہیں کرتے۔

حال ہی میں ہمارے سامنے علماءِ دیوبند کا موقف بھی آیا، جو حسبِ ذیل ہے:

کیا رفاہی ادارہ عامل کے حکم میں ہو کر زکوٰۃ اکٹھا کر سکتا ہے؟۔

دینی مدارس اور رفاہی ادارے جو عموماً لوگوں سے زکوٰۃ وصدقات کی رقوم جمع کرتے ہیں، شریعتِ مطہرہ کی رو سے ان کی حیثیت متعین کرنے میں دو احتمال ہو سکتے ہیں، اور دونوں ہی اکابر علماء ومشائخ سے منقول ہیں:

پہلی رائے: پہلا احتمال یہ ہے کہ انہیں ''عاملینِ زکوٰۃ'' کے حکم میں مان لیا جائے۔ اس صورت میں یہ ادارے فقرا کی جانب سے اخذِ زکوٰۃ کے وکیل متصور ہوں گے چنانچہ جب ادارہ کے ذمہ داران مزکّیین (زکوٰۃ دینے والوں) سے زکوٰۃ وصول کرلیں، تو ان کے وصول کرتے ہی فقرا کی جانب سے وکالۃً ونیابۃً تملیک ہوجائے گی، لہٰذا مزکّی (زکوٰۃ دہندہ) ذمہ داری سے فارغ ہوجائے گا اور یہ رقم فقراء میں تقسیم کرنے کے علاوہ اُن کی اجازت سے اُنہی کے مفاد کے دیگر کاموں میں بھی خرچ کرنے کا مجاز ہوگا۔ نیز اس رقم سے ادارہ کے اُن ملازمین کو بقدرِ کفایت وظیفہ دینا بھی ٹھیک ہے جو زکوٰۃ کی وصولی یا اُس کی تقسیم میں براہِ راست سرگرم عمل ہوں، تاہم حنفیہ کے ہاں ''بقدرِ کفایت'' کی شرط لازمی ہے۔ اس لئے کسی ملازم کو حاجت سے زائد وظیفہ دینے کی اجازت نہ ہوگی۔ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ملازم کو جو وظیفہ ملے وہ اُس کی جمع کردہ زکوٰۃ کے نصف سے زائد نہ ہو۔

اکابرین میں سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت مفتی محمد شفیع کی آخری رائے یہی تھی کہ مدارس کی انتظامیہ عاملین کے حکم میں داخل ہے چنانچہ امداد الفتاویٰ میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی رائے حضرت تھانوی کے نام اُن کے ایک مکتوب گرامی سے واضح ہوتی ہے، آپ لکھتے ہیں:

''اہلِ مدرسہ مثل عُمّال بیت المال معطیین (زکوٰۃ دینے والے) اور آخذین (زکوٰۃ لینے والے) کی طرف سے وکلاء ہیں''۔

حضرت تھانوی نے اس پر شبہ کرتے ہوئے جواباً تحریر فرمایا کہ:

عُمّالِ بیت المال "مَنصُوب مِنَ السُّلطَان (حاکم کے مقرر کردہ)" ہیں اور سلطان کو ولایتِ عامہ ہے، اس لئے وہ سب کا وکیل بن سکتا ہے۔ اور مَقِیس (یعنی جسے سلطان پر قیاس کیا جارہا ہے یعنی رفاہی تنظیمیں) میں ولایتِ عامہ نہیں ہے، اس لئے آخذین زکوٰۃ یعنی زکوٰۃ لینے والوں کا وکیل کیسے بنے گا؟، کیونکہ توکیلِ صریح ہے نہ اُس پر دلالت ہے۔ اور مَقِیس عَلَیہ (جس پر قیاس کیا جارہا ہے یعنی سلطان) دلیل ہے کہ وہ سب اس کے زیر اطاعت ہیں اور واجب الاطاعت ہے۔

حضرت سہارنپوری نے اِس شبہ کا جواب اِن الفاظ سے دیا: بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں: ایک حکومت جس کا ثمرہ تنفیذ حدود وقصاص ہے اور دوسرا انتظامِ حقوقِ عامہ۔ امرِ اول میں کوئی اس کا قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ امرِ ثانی میں اہلِ حَل وعَقد بہ وقتِ ضرورت قائم مقام ہوسکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اہلِ حل وعقد کی رائے ومشورہ کے ساتھ نصبِ سلطان وابستہ ہے، جو بابِ انتظام سے ہے۔ لہٰذا مالی انتظامِ مدارس جو برضاءِ ملاک وطلبہ ابقاءِ دین کے لئے کیا گیا ہے، بالا ولی معتبر ہوگا، (امداد الفتاویٰ: ۶/۲۶۷)۔

حضرت گنگوہی کے حوالہ سے آپ کے سوانح "تذکرۃ الرشید" میں منقول ہے کہ آپ لکھتے ہیں:

مہتمم مدرسہ کا قیم ونائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جوشئ کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبض ہے۔ اس کے قبض سے مِلکِ مُعطی سے نکلا اور مِلکِ طلبہ ہوگیا۔ اگر چہ وہ مجھول الملکیۃ والذوات ہوں، مگر نائب معین ہے۔ پس بعد موتِ مُعطی کے ملکِ وِرثہ مُعطی کی اس میں نہیں ہوسکتی، (تذکرۃ الرشید: ۱/۱۶۴)۔

حضرت مفتی محمد شفیع نے اگر چہ معارف القرآن میں مہتممینِ مدارس کو عاملین سمجھنے کی نفی کی ہے، لیکن بعد ازاں حضرت سہارنپوری کے مذکورہ مکتوب میں غور وفکر کے بعد آپ نے اسی رائے کو راجح سمجھ کر مہتمم کو عامل قرار دیا ہے اور اپنی پرانی رائے سے رجوع کی صراحت کی ہے۔

امداد المفتین، ص: ۱۰۸۵ پر تحریر فرماتے ہیں:

میں امداد المفتین میں اس مسئلہ سے متعلق شائع شدہ عبارت سے رجوع کر کے اس فیصلہ کو تسلیم کرتا ہوں، جو فیصلہ ان سب اکابر کا ہے، یعنی موجودہ زمانہ کے مہتممانِ مدارس یا ان کے مامور کردہ حضرات جو چندہ یا زکوٰۃ

وصول کرتے ہیں وہ بہ حیثیت وکیل فقرا کے وصول ہوتی ہے اوران کے قبضہ میں پہنچتے ہی معطیین کی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے،(امداد المفتیین:۱۰۸۵)۔

حضرت مفتی محمد شفیع اپنی درجہ بالاتحریر کے آخر میں لکھتے ہیں:

ضروری تنبیہ: اس تحقیق میں مہتممانِ مدارس کے لئے ایک تو آسانی ہوگئی کہ ان کو ہر ایک شخص کا مال زکوٰۃ اوراس کا حساب الگ الگ رکھنے کی ضرورت نہیں رہی اور قبل از خرچ مُعطیِ چندہ کا انتقال ہوجائے تو اس کے وارثوں کو واپس کرنا ضروری نہیں۔۔۔لیکن مہتممان مدرسہ کی گردن پر آخرت کا ایک بڑا بوجھ آپڑا کہ وہ ہزاروں فقرا کے وکیل ہیں جن کے نام اور پتے محفوظ اور یاد رکھنا بھی آسان نہیں کہ خدانخواستہ اگر اس مال کے خرچ کرنے میں کوئی غلطی ہوجائے تو ان سے معافی مانگی جاسکے اس لئے اگر مہتممانِ مدرسہ نے فقرا کی ضروریات کے علاوہ کسی کام میں اس مال کو خرچ کیا تو وہ ایسا نا قابلِ معافی جرم ہوگا جس کی تلافی ان کے قبضہ میں نہیں۔ اس لئے ان سب حضرات پر لازم ہے کہ مدارس کے چندہ کی رقم کو بڑی احتیاط کے ساتھ صرف ان ضروریات پر خرچ کیا جائے جن کا تعلق فقرا وطلبا سے ہے مثلاً ان کا طعام ولباس، دواوعلاج، ان کی رہائشی ضرورتیں، ان کے لئے کتابوں کی خریداری وغیرہ، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم، (امداد المفتیین:۱۰۸۶)۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ مہتممِ مدرسہ یا منتظم رفاہی ادارہ کو عامل متصور کرنے سے اتنا فائدہ تو ہوجائے گا کہ ان کے وصول کرنے سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پھر مہتمم ومنتظم جیسے چاہیں اُسے خرچ کریں۔ بلکہ ان پر فرض ہے کہ جیسے حاکم مالِ زکوٰۃ وصول کرنے کے بعد اُسے مصارفِ زکوٰۃ میں تقسیم کرنے کا پابند ہے، اُس سے پُل، سڑک، ہسپتال وغیرہ تعمیر نہیں کرسکتا ایسے ہی منتظمین ادارہ بھی اسے فقرا پر خرچ کریں گے، کسی اور مد میں استعمال نہیں کرسکتے۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں:

وَعلی هذا یَخرُجُ صَرفُ الزَّکَاۃِ اِلٰی وُجُوہِ الْبِرِّ مِنْ بِنَاءِ الْمَسَاجِدِ وَالرِّبَاطَاتِ وَالسِّقَایَاتِ وَاِصلاحِ الْقَنَاطِرِ وَتکفینِ الْمَوْتٰی وَدَفنِهِمْ اَنَّهٗ لَا یَجُوزُ، لِاَنَّهٗ لَمْ یُوجَدِ التَّمْلِیکُ اَصلًا۔

ترجمہ:''اور اسی (تملیک کی شرط کی) پر تعمیر مساجد اور مسافر خانوں کی تعمیر، پانی کی سبیلوں، پلوں کی مرمت اور مردوں کے کفن دفن پر زکوٰۃ کو خرچ کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہاں تملیک بالکل نہیں پائی گئی، (بدائع الصنائع)''۔

دوسری رائے: دوسری رائے یہ ہے کہ دینی مدارس یا رفاہی اداروں کے ذمہ داران زکوٰۃ دہندگان کی جانب سے وکیل ہیں۔ فقرا کی جانب سے وکیل سمجھ کر عاملین کے زمرہ میں شمار کرنا ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ حسبِ تصریح فقہاء عامل کی تعریف میں یہ بنیادی قید شامل ہے

کہ: ''عامل وہ ہے جسے امام المسلمین نے اخذِ زکوٰۃ کے لئے مقرر کیا''۔

ملاحظہ کتبِ فقہ وتفسیر کی عبارات:

"وَاَمَّا الْعَامِلُوْنَ عَلَيْهَا فَهُمُ الَّذِيْنَ نَصَبَهُمُ الْاِمَامُ لِجِبَايَةِ الصَّدَقَاتِ"

ترجمہ: ''عامل وہ لوگ ہیں جنہیں حاکم صدقات کی وصول کے لئے مقرر کرے''۔ (بدائع الصنائع: ۲/۴۶۷)

صاحب بنایہ فرماتے ہیں:

"وَالْعَامِلُ هُوَالَّذِىْ يَبْعَثُهُ الْاِمَامُ بِجِبَايَةِ الصَّدَقَاتِ"

ترجمہ: ''عامل وہ ہے جسے حاکم نے صدقات کی وصول پر مقرر کیا ہو، (البنایۃ: ۳/۵۲۹)''۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

"اَلْعَامِلُ عَلَى الزَّكوٰةِ وَهُوَ مَنْ نَصَبَهُ الْاِمَامُ لِجَمْعِ الصَّدَقَاتِ"۔

ترجمہ: ''عامل وہ ہے جسے حاکم نے صدقاتِ (واجبہ) کی وصولی پر مامور کیا ہو''۔ (ردالمحتار: ۲/۵۶)

ابوبکر الجصاص ''والعاملین علیھا'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَيَدُلُّ اَيْضًا عَلَى اَنَّ اَخْذَ الزَّكوٰةِ اِلَى الْاِمَامِ"

ترجمہ: ''یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ زکوٰۃ حاکم کی طرف سے وصول کی جاتی ہے''۔ (احکام القرآن للجصاص: ۳/۱۲۳)

امام رازی فرماتے ہیں:

"وَالْعَامِلُ هُوَ الَّذِىْ نَصَبَهُ الْاِمَامُ لِاَخْذِ الزَّكوٰةِ"

ترجمہ: ''عامل وہ ہے جسے حاکم نے زکوٰۃ کی وصولی پر مامور کیا ہو، (تفسیر کبیر: ۱۶/۱۱۴)''۔

معلوم ہوا کہ فقہاو مفسرین عامل کی تعریف میں ''امام المسلمین'' کی طرف سے تقرری کی قید ضرور لگاتے ہیں اور ہمارے علم کے مطابق کسی فقیہ نے اِس قید سے صرفِ نظر نہیں کیا۔ بظاہر اِس قید کی حکمت اور وجہ یہ ہے کہ عامل ملک کے تمام فقرا کی جانب سے وکیل ہوتا ہے جن کی تعداد اور حالات کی عامل کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔ ایسے نامعلوم افراد کی جانب سے وکیل بننا صرف اُسی وقت درست ہوسکتا ہے جب والی یا حاکم اُسے وکالت کی ذمہ داری سونپے، کیونکہ اسے ولایتِ عامہ حاصل ہے۔ والی و حاکم پورے ملک کے فقرا کا نگہبان اور نگران ہوتا ہے۔ ان کی نمائندگی کا حق ادا کرتا ہے اِسے لئے اِس ولایتِ عامہ کی بنیاد پر کسی کو بھی عامل بنانا اس کے دائرۂ اختیار میں ہے۔ جب کہ رفاہی اداروں اور دینی مدارس میں یہ ولایتِ عامہ نہیں پائی جاتی، اِس لئے یہ اپنی جانب سے خود بخود عامل بن کر غیر معین فقرا کے وکیل نہیں بن سکتے۔ علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

وَلَا يَجُوزُ قَبْضُ الْاَجْنَبِيِّ لِلْفَقِيرِ الْبَالِغِ اِلَّا بِتَوْكِيلِهِ لِاَنَّهُ لَا وِلَايَةَ لَهُ عَلَيْهِ ، فَلَا بُدَّ مِنْ اَمْرِهٖ كَمَا فِي قَبْضِ الْهِبَةِ۔

ترجمہ: ''بالغ فقیر کی طرف سے وکیل بنائے بغیر کسی اجنبی شخص کا اُس کی طرف سے زکوٰۃ کا مال وصول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اسے اس پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے۔ پس بالغ فقیر کا دوسرے شخص کو وصولی کا حکم دینا یعنی وکیل ضروری ہے جیسا کہ ہبہ کے قبضہ میں ہوتا ہے، (بدائع الصنائع: ۲/۴۶۷)''۔

مذکورۃ الصدر دوسری رائے کے مطابق جب یہ ادارے مُزکّی (زکوٰۃ دینے والے) کی جانب سے وکیل ہوں تو مسئلہ بالکل بے غبار رہتا ہے، کیونکہ مزکین معلوم و معین ہوتے جو ان اداروں پر اعتماد کر کے انہیں اپنی زکوٰۃ کی رقم مصارف تک پہنچانے کا وکیل بناتے ہیں اور فقہ اسلامی کی رو سے اس توکیل میں کوئی حرج نہیں۔ جیسے کہ بدائع کی مذکورہ بالا عبارت سے بھی معلوم ہوا۔

ابھی جب اس صورت کے مطابق یہ ادارے معطیین کی جانب سے وکیل متصور کر لئے جائیں، تو ان کے رقم وصول کرنے سے زکوٰۃ اُس وقت تک ادا نہ ہوگی، جب تک وہ مصارفِ زکوٰۃ کو سپرد نہ کریں۔ جیسے خود مالک کو ادائیگی زکوٰۃ کے لئے تملیک مال ضروری ہے ایسے ہی اِن اداروں کو بھی بحیثیت وکیل تملیک سے خلاصی نہیں۔ لہٰذا ضروری ہوگا کہ کسی مستحقِ زکوٰۃ کو رقم کا مالک بنا دیا جائے۔ نیز جیسے مالکِ مال زکوٰۃ کو کسی تعمیراتی مد یا دیگر رفاہی مدات (جن میں تملیک نہ ہو) میں استعمال نہیں کرسکتا۔ یونہی اُن کا نمائندہ ادارہ بھی تملیک کئے بغیر مالِ

زکوۃ سے تعمیرات وغیرہ نہیں کرسکتا۔

اکابرین میں سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (امداد الفتاویٰ: ۵۶/۲) اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی (فتاوٰی دیوبند: ۵۸/۶) اور حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی (احسن الفتاویٰ: ۲۹۵/۴) کی یہی رائے رہی۔ اِس سلسلے میں اگرچہ حضرت تھانوی کے ساتھ حضرت سہارنپوری کی مکاتبت ہوئی جس میں حضرت سہارنپوی نے آپ کے اشکالات رفع کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ مکاتبت ۱۳۲۵ھ کی ہے اور امداد الفتاویٰ ۱۳۳۲ھ کے ایک فتویٰ میں بھی مہتممینِ مدارس کو عامل سمجھنے کی نفی کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تھانوی مکاتبت کے بعد بھی اپنی رائے پر قائم رہے۔

جامعہ عثمانیہ پشاور کی رائے:

دلائل کی قوت، کتبِ فقہ کی عبارات سے ہم آہنگی اور احتیاط پر مبنی ہونے کی وجہ سے ہم بھی اِسی دوسرے قول کو راجح سمجھتے ہیں اور اپنے ہاں جامعہ عثمانیہ پشاور میں بھی شروع ہی سے یہی نظام رکھا ہے کہ معطین کی جانب سے وکیل بن کر اُن کی زکوۃ وصول کرنے کے بعد مستحق طلبہ کو زکوۃ کی مد میں رقم دے دی جاتی ہے۔ وہ تملیک کے بعد اپنی اخراجات کی مد میں رقم مدرسہ میں جمع کر لیتے ہیں۔

اِس رائے کے متعلق ایک شبہ:

معطین کی جانب سے توکیل میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ مؤکل کی زکوۃ فقرا میں تقسیم ہونے سے پہلے ہی معطی مرجائے۔ اِس سے اُس کی وکالت بھی ختم ہوجائے گی لہٰذا پھر اُس کا مال ورثا کا حق ٹھہرے گا، چنانچہ اُن کو واپس کرنا ضروری ہوگا۔۔۔ جیسا کہ ''حج عن الغیر'' کی صورت میں مامور (جس کو حج پر بھیجا ہے) کی حج سے واپسی سے قبل اگر آمر (حج پر بھیجنے والا) فوت ہوجائے، تو مامور کی ذمہ داری ہے کہ جو رقم ابھی تک اس نے خرچ نہیں کی، وہ آمر کے ورثا کو واپس کردے۔ اگر وہ خرچ کرے گا تو ورثا کو اُس سے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔ محقق ابن نجیم فرماتے ہیں:

وفی المحیط: ولو دفع الی رجلٍ مالًا لیحُجّ به عنهُ، فاهلّ بحجّہ ثُمّ مات الآمرُ فللورثةِ انْ یّاخذُوا ما بقی من المال معهٗ ویضمنُونهٗ ما انفق منهُ بعد موتہ، ولا یشبهُ الورثۃُ الآمر فی هذا، لانّ نفقةَ الحجّ کنفقة ذوی الارحام، فتبطُلُ بالموت ویرجع المالُ الی الورثۃ۔

ترجمہ: ''اور محیط میں ہے: اگر کسی نے ایک شخص کو مال دیا کہ وہ اس کی طرف سے حج ادا کرے، تو اُس مامور نے اس کی طرف سے حج کی ادائیگی شروع کی، (دورانِ حج) امر کی موت واقع ہوگئی تو اُس کے وارثوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مامور کے پاس جو مال بچ گیا ہے وہ اس سے لے لیں اور امر کی موت کے بعد اُس نے جو اخراجات کئے، ورثاء اُس مامور سے اُن کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اور ورثاء اس میں امر کے مشابہ نہیں ہوں گے، کیوں کہ حج کے مصارف ذوی الارحام کے نان نفقے کی طرح ہیں، جو مورِث کی وفات کے ساتھ ہی باطل ہو جاتے ہیں اور مال کی ملکیت ورثاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، (البحر الرائق: ۱۲۱/۳)''۔

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ کوئی وارث ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اُس کے مورث کے ذمے زکوٰۃ یا دیگر فرائض وواجبات باقی رہیں اور آخرت میں وہ اپنے اعمال کی شکل میں یہ قرضہ چکائے یا اُسے سزا بھگتنا پڑے، اس لئے ورثا کی جانب سے بھی اُن کے مورِث کا مال مصرف میں خرچ کر کے اُس کا ذمہ فارغ ہونے کی عرفاً ودلالۃً اجازت ہوتی ہے۔ اگر ورثاء بالغ ہوں تو اُن کا سکوت اجازت متصور ہوگا۔ اور اگر نابالغ ہوں تو بعد البلوغ سکوت اجازت شمار ہوگا۔ اسی عرفی اجازت کی بنیاد پر مؤکل کے مرنے کی صورت میں بھی یہ رقم ورثا کو لوٹانا لازم نہ ہوگا۔ تاہم اگر کوئی لااُبالی وارِث نااہلی کا ثبوت دے کر ادارہ سے مطالبہ کرے کہ میرے مورِث نے آپ کو زکوٰۃ کے مد میں جو رقم دی تھی، اگر آپ نے اُسے مصرف پر خرچ نہ کیا ہو تو ہمیں واپس کر دیں، تو ایسی صورت میں چونکہ تصریح دلالت سے اقویٰ واولیٰ ہے، اس لئے پھر ادارہ اس بات کا پابند رہے گا کہ وہ مال اُنہیں واپس کردے''۔

(ماہنامہ العصر، جامعہ عثمانیہ پشاور، شمارہ: ۵، جلد 17)۔

نوٹ: ہم نے قارئین کی سہولت کے لئے مذکورہ بالا حوالے میں عربی عبارات پر اعراب لگائے ہیں اور ترجمہ بھی درج کیا ہے۔ اور بعض جگہ عبارت کی نوک پلک درست کی ہے، ایک جگہ ترتیب میں تھوڑا سا ردوبدل کیا ہے۔

مندرجہ بالا فتوے میں عاملِ زکوٰۃ کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ ہماری رائے میں عاملِ زکوٰۃ امام یا امیر یا حاکم کا مقررہ نمائندہ ہوتا ہے اور وہ صرف زکوٰۃ وعُشر وصول کر کے بیت المال میں جمع کراتا ہے، زکوٰۃ وعُشر کے مال کو خرچ کرنے میں اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا، وہ صرف نمائندۂ مُجاز (Authorized

Agent)اور افسر بکارِ خاص (Officer On Special Duty) ہوتا ہے۔اسلامی حکومت میں اصل حیثیت امیر یا امام یا خلیفہ یا حاکمِ اعلیٰ کی ہے۔اور حاکمِ اعلیٰ اپنی ریاست میں تمام مستحقین کا متولی اور وکیل ہوتا ہے، لہٰذا اس کو براہِ راست یا اس کے نمائندے (عامل) کو مال دار جب زکوٰۃ دے گا، تو اس کی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔اب اسے مستحقین پر صرف کرنا اُس حاکمِ اعلیٰ کی ذمے داری ہے۔

دارالکفالت، یتیم خانے یا دینی مدارس کے سربراہان منصبی حیثیت میں دراصل فقراء ومساکین کے متولی یا وکیل ہوتے ہیں۔اوران کو زکوٰۃ دینے سے مال دار کی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے۔اوران مستحقین کی مصالح اور بہبود پر صدقاتِ واجبہ کے مال کو خرچ کرنا اُس ادارے کے سربراہ کی شرعی، قانونی اور اخلاقی ذمے داری ہے اور وہ اس کے لئے جوابدہ ہے۔

ایسے ادارے جن سے امراء بھی استفادہ کرتے ہیں اور مستحقین بھی۔اور مستحقین متعین بھی نہیں ہوتے، ان میں ادارے کا سربراہ زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل ہوتا ہے اور زکوٰۃ جب تک شرعی شرائط کے مطابق مستحقین کو نہیں دی جائے گی، اُس وقت تک زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔اس پر ہم گزشتہ سطور میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

پاکستان آئینی اعتبار سے ایک اسلامی جمہوری ریاست ہے، اور اس میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنے گا۔لیکن خود آئین میں اسلامی اعتبار سے کافی سقم ہیں اور اس دستوری میثاق پر پوری طرح سے عمل بھی نہیں ہورہا۔اگرچہ نظامِ خلافت کے قیام تک جمہوریت کا کوئی متبادل نہیں ہے، لیکن جدید جمہوریت اپنی ساخت، جبلّت اور مزاج کے اعتبار سے سیکولر ہے۔اور ہماری جمہوریت ساری دنیا سے منفرد ہے۔غیر مسلم دنیا کی مسلّمہ بڑی بڑی جمہوریتوں میں مسلم اقلیتوں کے لئے کوئی مخصوص نشستیں نہیں ہیں، لیکن پاکستان میں تمام ایوانوں میں غیر مسلموں کے لئے نشستیں مخصوص ہیں اور بعض اوقات کسی بھی آئینی ترمیم یا قانون سازی کے لئے اُن کا ووٹ فیصلہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔حکومت نے جو نظامِ زکوٰۃ قائم کیا، وہ ناکام رہا، کیونکہ حکومت صرف زکوٰۃ کے حوالے سے مسلمانوں کو مطمئن نہ کرسکی اور صرف وہ زکوٰۃ حکومت کو مل سکی جو بینکوں سے جبراً کاٹی جاتی ہے اور بیشتر لوگ اس سے بھی چھٹکارا حاصل کرتے ہیں۔

اس لئے غیر سرکاری تنظیمیں اور ادارے زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ وصول کرتے ہیں، حکومت کی طرف سے اس کی ممانعت بھی نہیں ہے اور کسی حد تک لوگ ان اداروں پر اعتماد بھی کرتے ہیں۔اور اِن اداروں کے دستور

(Bylaws) میں یہ لکھا بھی ہوتا ہے کہ وہ زکوٰۃ وصدقات اور عطیات جمع کر کے ضرورت مندوں کی مدد کریں گے۔اور یہ دستور حکومت کے ہاں رجسٹرڈ ہوتا ہے۔لہٰذا یہ ایک طرح سے حکومت کی طرف سے قانونی اجازت بھی ہے۔

پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوی ایشن (پیما) کے طبی فقہی بورڈ کے انچارج ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب کافی دینی معلومات رکھتے ہیں اور شاید وہ باقاعدہ دینی علوم پڑھے ہوئے ہیں، اس لئے انہوں نے اپنے موقف کو تقویت دینے کے لئے حوالہ جات اور اشارات دیئے ہیں ۔ میری تحقیق کے مطابق اس طرح کے ادارے زکوٰۃ دینے والوں کے وکیل ہیں اور ان کے بارے میں مندرجہ بالا سطور میں تفصیلی حکم بیان کیا جا چکا ہے۔

وَفِي الرِّقَابِ ، وَفِيْ سَبِيْلِ اللهِ اور وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا کی تشریح متعلقہ مقامات پر کی جا چکی ہے۔ان کو میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنے انتظامی امور کے لئے نفلی عطیات کے امکانات تلاش کریں اور صدقاتِ واجبہ کے صَرف کے حوالے سے شرعی حدود کی پاسداری کریں۔

جن اداروں کے سربراہ مستحقین کے وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ ایک مناسب مقدار تک اپنے عاملین کو دے سکتے ہیں، جیسے ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب نے ساڑھے بارہ فیصد کا ذکر کیا ہے، لیکن جن اداروں کے سربراہان صرف زکوٰۃ دینے والوں کے وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ اپنے عامل کو مالِ زکوٰۃ میں سے نہیں دے سکتے۔

ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب کا یہ سوال کہ اسلامی حکومت زکوٰۃ وصدقات جمع کر کے مستحقین کی فلاح پر خرچ کر سکتی ہے تو رفاہی اداروں کو وہ حیثیت کیوں حاصل نہیں؟۔اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں امیر یا امام یا خلیفۃ المسلمین یا حاکمِ اعلیٰ کو عوام پر ولایتِ عامہ حاصل ہے، جب کہ رفاہی اداروں کو ایسی ولایتِ عامہ حاصل نہیں ہے۔

پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوی ایشن اور اس جیسے رفاہی اداروں کی خدمات بلاشبہ قابلِ قدر ہیں ، وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے ہاں ماجور ہوں گے۔لیکن زکوٰۃ وصدقات کے حوالے سے شرعی تحدیدات کی پابندی ان پر بھی لازم ہے۔

میرے نزدیک محتاط طریقہ یہ ہے کہ پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوی ایشن کے تحت جو ہسپتال قائم ہیں یا ایمبولینس سروس ہے یا لیبارٹری ہے یا ریڈیالوجی کا نظام ہے، تو زکوٰۃ وصدقات کے مستحق مریضوں سے وہ اصل

لاگت کے برابر یا انتظامی مصارف نکالنے کے لئے کچھ منافع کے ساتھ اُجرتیں (Charges) مقرر کر سکتے ہیں، جس میں ڈاکٹرز صاحبان کی فیس بھی شامل کی جاسکتی ہے، مستحق مریض اپنے واجبات ادا کر کے زکوٰۃ کے شعبے میں رسید دکھائیں اور گنجائش کے مطابق وہ ادارہ ان واجبات کا کل یا بعض حصہ زکوٰۃ کی مد میں ان کو واپس کردے۔اور جو لوگ زکوٰۃ وصدقات نہ لینا چاہیں یا اس کے مستحق نہ ہوں تو ان سے واجبات وصول کر لئے جائیں۔فری میڈیکل کیمپس کے لئے اس طرح کی کوئی حکمتِ عملی وضع کی جاسکتی ہے۔

سیداور ہاشمی کوزکوٰۃ نہیں دی جاسکتی:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱) أَخَذَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا تَمْرَةً مِّنْ تَمْرِ الصَّدَقَةِ،فَجَعَلَهَا فِيْ فِيْهِ،فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: كَخٍ، كَخٍ ،لِيَطْرَحَهَا،ثُمَّ قَالَ: أَمَاشَعَرْتَ أَنَّالَا نَأْكُلُ الصَّدَقَةَ۔

ترجمہ:''حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور لے لی اور اس کو اپنے منہ میں رکھ لیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: چھی ،چھی ،تا کہ وہ اس کھجور کو پھینک دیں ، پھر فرمایا: کیا تم کو نہیں معلوم کہ ہم صدقہ کو نہیں کھاتے !،(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1491)''۔

حدیث پاک میں ہے:(۲)عَنْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَاتِ اِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ وَاِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَّلَا لِآلِ مُحَمَّدٍ،

ترجمہ:''عبدالمطلب بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ صدقات لوگوں (کے مال) کا میل ہے اور یہ محمد اور آلِ محمد ﷺ کے لئے جائز نہیں ہے''۔ (صحیح مسلم:2371)

(۳)عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ، اِذَا أُتِيَ بِطَعَامٍ ، سَأَلَ عَنْهُ، فَاِنْ قِيْلَ: هَدِيَّةٌ أَكَلَ مِنْهَا، وَاِنْ قِيْلَ: صَدَقَةٌ لَمْ يَأْكُلْ مِنْهَا۔

ترجمہ:''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کوئی کھانا لایا جاتا،تو آپ اس کے بارے میں پوچھتے (یہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟)،اگر آپ کو بتایا جاتا کہ یہ ہدیہ ہے،تو آپ اس میں سے تناول فرماتے اور اگر یہ بتایا جاتا کہ یہ صدقہ ہے تو آپ اس میں سے کچھ بھی نہ کھاتے،(صحیح مسلم:2380)''۔

ملک العلماء علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''جس کو زکوٰۃ دی جارہی ہے وہ بنو ہاشم میں سے نہ ہو کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے قومِ بنی ہاشم! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لوگوں (کے مال کا) دھوون پسند نہیں فرمایا اور اس کے عوض تمہیں مالِ غنیمت کے خُمس کا پانچواں حصہ دیا ہے'' اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''بنو ہاشم پر صدقہ حرام ہے'' اور ایک روایت میں ہے آپ نے راستے میں ایک کھجور پڑی ہوئی دیکھی تو فرمایا: ''اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقے کی ہو سکتی ہے، تو میں اسے کھالیتا، پھر فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے بنو ہاشم پر لوگوں کے ہاتھوں کا دھوون حرام قرار دیا ہے''، اس کی بھی وہی مراد ہے جسے اوپر والی حدیث میں ''غسالة الناس'' کہا گیا ہے، کیوں کہ اس میں ناپاکی ہو سکتی ہے ،تو اللہ تعالیٰ نے عزت واکرام دینے کے لئے اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کے لئے بنو ہاشم کو اس سے محفوظ رکھا''۔

(بدائع الصنائع ،جلد:02،ص:74)

سید اور ہاشمی کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔تنویر الابصار میں ہے:

وَلَا اِلٰی بَنِیْ هَاشِمٍ اِلَّا مَنْ اَبْطَلَ النَّصُّ قَرَابَتَهٗ وَهُمْ بَنُوْ لَهَبٍ ، فَتَحِلُّ لِمَنْ اَسْلَمَ مِنْهُمْ كَمَا تَحِلُّ لِبَنِی الْمُطَّلِبِ، ثُمَّ ظَاهِرُ الْمَذْهَبِ اِطْلَاقُ الْمَنْعِ، وَقَوْلُ الْعَيْنِيِّ: وَالْهَاشِمِيُّ يَجُوْزُ لَهٗ دَفْعُ زَكوٰتِهٖ لِمِثْلِهٖ ، صَوَابُهٗ لَايَجُوْزُ ''نَهْر'' ۔

ترجمہ: ''اور بنو ہاشم کو زکوٰۃ دینے سے ادا نہیں ہوگی ،سوائے اُن کے جن کی قرابت کو نصِ قرآنی نے باطل کر دیا اور وہ بنولہب ہیں۔لہٰذا ان میں سے جو کوئی ایمان لے آیا ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہے جیسا کہ بنو مطلب کو دینا جائز ہے۔پھر ظاہرِ مذہب (حنفیہ) یہ ہے کہ بنو ہاشم کے لئے زکوٰۃ کی ممانعت مطلقا ہے۔اور عینی نے کہا: ''ہاشمی اپنی زکوٰۃ دوسرے ہاشمی کو دے سکتا ہے''، (مگر) صحیح یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے (بحوالہ النھر الفائق)۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: عبد مناف نبی کریم ﷺ کے اجداد میں چوتھے نمبر پر ہیں، ان کے اَخلاف چار ہیں۔ ہاشم، مطلب، نوفل اور عبد شمس ۔ پھر ہاشم کے اَخلاف چار ہیں، عبد المطلب کے سوا سب کی نسل منقطع ہوگئی ،ان کے اخلاف بارہ ہیں، ان میں سے جو فقیر اور مسلم ہو ان سب کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، سوائے حضرت عباس، حضرت حارث ،اولادِ خواجہ ابو طالب (یعنی حضرت علی، حضرت جعفر اور حضرت عقیل)

رضی اللہ عنہم کی اولاد کے۔اس سے معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کو مطلق رکھنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ تمام بنو ہاشم کو زکوٰۃ دینے کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ بعض کو (استحقاق کی بنیاد پر) دی جاسکتی ہے۔اسی لئے ''السعدیہ'' کے حاشیہ میں لکھا ہے: ''آلِ ابولہب بنو ہاشم کی طرف منسوب ہیں اور انہیں صدقہ دیا جاسکتا ہے''۔ النہر الفائق میں ''النافع'' کے حوالے سے بنو ہاشم کے ذکر کے بعد کہا: مگر جس کی قرابت کو نص نے باطل کر دیا ہو، اس پر ایک حدیث سے استدلال کیا ہے کہ میرے اور ابولہب کے درمیان قرابت نہیں، کیونکہ اس نے ہم پر دو بڑے فاجروں کو ترجیح دی (محشی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث ہمیں کہیں نہیں ملی)، یہ اس مسئلے میں صراحت ہے کہ بنولہب کی نسبت بنو ہاشم سے منقطع ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ علامہ علاؤالدین حصکفی نے بنو ہاشم کے ذکر پر کفایت کی اور کہا کہ اولادِ ابولہب سے جو اسلام لے آئے، وہ بنو ہاشم کو زکوٰۃ دینے کی ممانعت میں داخل نہیں ہیں، اس لئے کہ اسے حضور سے قرابت ہی نہیں ہے۔اور یہ انہوں نے نہایت عمدہ وضاحت کی، کیوں کہ کسی اور نے اس طرح وضاحت نہیں کی، پس غور کا مقام ہے۔بنولہب کو بعض نسخوں میں بنو ابی لہب کہا گیا ہے اور یہی صحیح ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:3،ص:270)''۔

پس سید اور ہاشمی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔نسب چونکہ باپ کی طرف سے ہوتا ہے اس لئے اگر ماں سیدہ اور باپ غیر سید تو اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں: ''اور اس سے یہ مسئلہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ جس کی ماں مثلاً علَوی ہو اور اس کا باپ عجمی تو دوسرا عجمی اس کا کفو بن سکتا ہے، اگر چہ ماں کی نسبت سے اس کے لئے ایک وجہِ شرف ہے، مگر نسب باپ دادا سے چلتا ہے اور اسی لئے اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے اور ماں کے شرف کی وجہ سے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے۔اور میں نے کسی اور جگہ یہ صراحت نہیں دیکھی (یعنی علامہ شامی اسے اپنا تفرد قرار دیتے ہیں)، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:4،ص:151)''۔

مدارس تعلیم القرآن:

بعض جگہ مقامی طور پر مساجد میں یا بعض دینی، تبلیغی اور رفاہی تنظیموں کے تحت مکاتبِ تعلیم القرآن کا ایک نیٹ ورک قائم کیا گیا ہے، ان مدارس و مکاتب میں ان مقامی لوگوں کے بچے حفظ و ناظرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو زکوٰۃ یا فطرہ ان اداروں کو دیتے ہیں۔ان مدارس و مکاتب کے معلمین کے مشاہرے ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ، فطرہ، فدیۂ صوم، نذر اور کفارات کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ایسے مصرف کے لئے زکوٰۃ لینا اور دینا شریعت کی حکمت اور ترجیحات کے

خلاف ہے، کیونکہ یہ خود اپنی زکوٰۃ سے استفادے کی بالواسطہ ایک صورت ہے، سوائے اِس کے کہ کہیں بہت ہی ناگزیر حالات ہوں۔ البتہ وہ دینی مدارس و جامعات جن میں مستحق اقامتی طلبا دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ زکوٰۃ، فطرہ وصدقاتِ واجبہ کا بہترین مصرف ہیں۔

کمیونٹیز اور برادریوں کے رفاہی فنڈ:

بعض کمیونٹیوں، برادریوں، مخصوص خاندانی یا علاقائی وحدت کے لوگوں نے اپنی کمیونٹی یا برادری کے افراد کے لئے رفاہی فنڈ قائم کیے ہوئے ہیں۔ فاؤنڈیشن یا ٹرسٹ کی صورت میں اس فنڈ میں زکوٰۃ، فطرہ اور چرمِ قربانی وغیرہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ اس فنڈ سے برادری یا کمیونٹی کے افراد کو آسان شرائط پر قرض دیے جاتے ہیں۔ خرچ کرتے وقت زکوٰۃ کے استحقاق شرعی معیار کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، یہ طریقہ کار شرعاً درست نہیں ہے۔ اول تو زکوٰۃ جب تک صحیح حقدار تک نہیں پہنچے گی، محض برادری کے فنڈ میں جمع ہونے سے ادا نہیں ہوگی۔ دوم یہ کہ فطرہ و زکوٰۃ کی رقم جب تک الگ مد میں رکھ کر تملیک کے شرعی اصولوں کے مطابق مستحق فرد کو ادا نہیں کی جائے گی، ادا نہیں ہوگی۔ مندرجہ بالا مقاصد بلاشبہ لائقِ تحسین ہیں، لیکن ان کے لئے صدقاتِ واجبہ یعنی زکوٰۃ، فطرہ اور فدیہ وغیرہ سے الگ نفلی صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی رقوم اور عطیات وغیرہ پر مشتمل ''ویلفیئر فنڈ'' قائم کرنا چاہئے۔ جس کے صَرف پر زکوٰۃ، فطرہ والی پابندیاں عائد نہیں ہوں گی۔

لنگرِ عام پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کا مسئلہ:

آج کل چوکوں اور چوراہوں پر بالخصوص رمضان المبارک کے مہینے میں بعض لوگ زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ وغیرہ کی رقوم سے لنگرِ عام کھلاتے ہیں، جس میں اس بات کی کوئی تمیز نہیں ہوتی کہ یہ لوگ مستحقِ زکوٰۃ ہیں یا نہیں؟، اس میں غیر مسلم بھی آکر شامل ہوسکتے ہیں جبکہ وہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں بن سکتے۔ اگر بالفرض سبھی لنگر کھانے والے مستحق ہوں تو بھی اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے محض اِباحت (یعنی کسی چیز کو کسی مستحق کے استعمال کے لئے مباح کردینا) کافی نہیں بلکہ اس کو مالک بنانا ضروری ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کے ادا کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے اور اس طرح سے زکوٰۃ دینے والے اپنے فرض سے بری نہیں ہوں گے۔ اور جو تنظیمیں اس طرح کا نظام چلاتی ہیں، وہ بھی عنداللہ جوابدہ ہوں گی۔ البتہ اگر نفلی خیرات (Charity) کے طور پر کوئی یہ لنگر چلا رہا ہے تو جائز ہے۔ ویسے ہمارے نزدیک یہ طریقہ احترامِ

انسانیت کے منافی ہے۔

ملک العلماء علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''صدقۂ فطر کا ایک رکن تملیک (یعنی فقیر کو مالک بنا دینا) ہے، نبی ﷺ کا فرمان ہے: ''ہر آزاد اور غلام کی طرف سے ادا کرو''۔ اور ادا کے معنی ہیں مالک بنا دینا، لہٰذا اگر فقیر کے لئے کھانا مباح کر دیا جائے (یعنی اسے کہا جائے کہ بیٹھ کر کھالو لیکر جانے کی اجازت نہیں) تو صدقہ ادا نہیں ہوگا، اسی طرح ہر اُس صورت میں ادا نہیں ہوگا جس میں اصلاً تملیک نہ ہو یا مطلقاً نہ ہو۔ اِس پر جو مسائل مبنی ہیں، وہ ہم نے ''زکوٰۃ المال'' میں لکھ دیئے ہیں اور وہاں پر رکنِ تملیک کی شرائط بھی لکھ دی ہیں، سوائے اس کے کہ جسے صدقۂ فطر دیا جار ہا ہے، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، لہٰذا ذمی کو بھی دے سکتے ہیں اور امام ابو یوسف اور امام شافعی کے نزدیک مُوَدّی (یعنی جسے صدقۂ فطر دیا جار ہا ہے) کا مسلمان ہونا شرط ہے اور ذمیوں کو دینا جائز نہیں ہے''۔

(بدائع الصنائع، جلد:2،ص:112)

مساجد کی تعمیر و مصارف پر زکوٰۃ خرچ کرنا:

مساجد کی تعمیر اور مصارفِ جاریہ پر براہِ راست زکوٰۃ و فطرہ کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض لوگ ان مقاصد کے لئے بلاضرورت حیلہ کا سہارا لیتے ہیں، ہماری رائے میں یہ حیلہ کا غلط استعمال ہے اور اس سے شریعت کی منشا کو باطل کرنا مقصود ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۲۶ پر لکھتے ہیں: کسی خفیہ طریقہ سے مقصود حاصل کرنے کو حیلہ کہتے ہیں، علما کے نزدیک اس کی کئی اقسام ہیں:

(۱) اگر جائز طریقے سے کسی کا حق (خواہ اللہ کا حق ہو جیسے زکوٰۃ یا بندے کا حق) باطل کیا جائے یا کسی باطل (مثلاً سود اور رشوت وغیرہ) کو حاصل کیا جائے تو یہ حیلہ حرام ہے۔ (۲) اگر جائز طریقے سے کسی حق کو حاصل کیا جائے یا کسی ظلم یا باطل کو دفع کیا جائے تو یہ حیلہ مستحب یا واجب ہے (۳) اگر جائز طریقے سے کسی ضرر سے محفوظ رہا جائے تو یہ حیلہ مباح ہے (۴) اگر جائز طریقے سے کسی مستحب کو ترک کرنے کا حیلہ کیا جائے تو یہ مکروہ ہے۔

نوٹ: میں نے یہ کتاب مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی حفظہ اللہ تعالیٰ کو تصحیح کے لئے دی، تو انہوں نے اپنے موقف کا اظہار ان الفاظ کے ساتھ کیا:

''راقم حیلہ کا فتویٰ نہیں دیتا بلکہ سائل سے کہتا ہے کہ مستند و معتمد مفتی سے اپنا مسئلہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر کے فتویٰ لیں اگر واقعی حیلے کی ضرورت ہوگی تو جواز کا فتویٰ مل جائے گا ورنہ منع کر دیا جائے گا نیز جو فتویٰ ملے گا اگر وہ جواز کا ہے تو اسی بیان کردہ صورت کا ہوگا نہ یہ کہ اس پر قیاس کر کے حیلے کے فتویٰ کو ہر ایک چیز کے لئے سندِ جواز بنالیا جائے''۔

ہسپتالوں میں زکوٰۃ سے نادار مریضوں کا علاج:

رفاہی ادارے جو مریضوں کے علاج کے لئے زکوٰۃ کی رقم جمع کرتے ہیں، وہ اگر حدودِ شرع میں رہ کر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی چند صورتیں یہ ہیں: (۱) جتنی مالیت کی دوا نادار مستحقِ زکوٰۃ کی ملک میں دے دی جائے گی وہ جائز ہے، اتنی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ (۲) ڈاکٹر کی فیس، بیڈ کے کرائے، ایکسرے، میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ پر جو خرچ آئے، وہ مریض خود ادا کرے اور استحقاق کے تعین کے بعد شعبۂ زکوٰۃ سے مریض کو ان مصارف کے عوض کل یا گنجائش کے تناسب سے جتنی رقم دی جاسکتی ہے، دے دی جائے (۳) زکوٰۃ و فطرہ یعنی صدقاتِ واجبہ کی رقم صرف مستحق مریضوں کو دی جائے اور غیر مسلم نادار مریضوں کے لئے الگ سے ''ویلفیئر فنڈ'' قائم کیا جائے، جو عطیات پر مشتمل ہو۔ (۴) چند سال پیشتر جب مرکزی زکوٰۃ کونسل کے ایک رکن نے ایک رفاہی ادارے کا معائنہ کیا تھا تو انہوں نے زکوٰۃ کے حوالے سے بہت سے ناقص پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی تھی۔

جامعات کے مستحق طلبہ کی اعانت:

کالجوں اور جامعات میں زیرِ تعلیم مستحق طلبہ کی اعانت کی جاسکتی ہے، اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انہیں زکوٰۃ کی مد سے براہِ راست رقم دی جائے اور وہ متعلقہ ادارے کی فیس خود ادا کریں۔ انہیں ذاتی استعمال کے لئے بطورِ ملکیت کتابیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ البتہ زکوٰۃ کی رقم سے لیبارٹری کے آلات، کمپیوٹرز، لائبریری کے لئے کتب نہیں خریدی جاسکتیں، کیونکہ زکوٰۃ محض کسی چیز کو مباح کر دینے یا اس پر تصرف کا موقع دینے سے ادا نہیں ہوتی۔ البتہ جس طالب علم کی اعانت مالِ زکوٰۃ سے کی گئی ہو اس سے ان اشیاء یا لائبریری یا لیبارٹری یا ہاسٹل وغیرہ کے استعمال کی فیس وصول کی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ فنڈ سے قرضِ حسن:

حال ہی میں ہمارے پاس ایک سے زیادہ استفسارات آئے ہیں کہ بعض برادریوں (Communities) کی فلاحی انجمنیں(Welfare Associations) ہیں، وہ برادریوں کے اہلِ ثروت افراد سے زکوٰۃ، فطرہ اور فدیہ کی رقم جمع کر کے اس میں سے برادری کے نادار اور مستحق افراد کی مدد کرتے ہیں، یہ ایک مستحسن امر ہے اور شرعاً درست ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کرتے ہیں کہ اس زکوٰۃ فنڈ سے ضرورت مند افراد کو قرضِ حسن کے طور دیتے ہیں اور پھر ان سے آسان اقساط میں وصول کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا جاری(Regenerating) فنڈ بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، زکوٰۃ کی ادائیگی سے عہدہ برا ہونے کی صورت یہ ہے کہ مستحق زکوٰۃ کو اس کا مالک بنا دیں اور ان کو اختیار ہو کہ اپنی آزادانہ مرضی سے جیسے چاہے تصرف کرے اور انجمنوں (Associations) کے ذمہ داران زکوٰۃ کے لئے اہلِ ثروت کے وکیل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس ذمہ داری کو شرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔ ایسی انجمنوں کے ذمے داروں کو چاہئے کہ وہ صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فدیہ، فطرہ، نذر اور کفارہ کی رقوم) سے الگ عطیات اور نفلی صدقہ وخیرات پر مشتمل ایک رفاہی فنڈ (Welfare Fund) قائم کریں، جس سے ضرورت مندوں کو بلاسود قرضے جاری کریں اور ادائیگی کے لئے انہیں حسبِ حال رعایت دیں۔ اور اگر کوئی نادار قرض کی واپسی کے قابل نہ ہو تو اسے معاف کر دیں۔ یہ اپنی جگہ ایک بہت بڑی نیکی اور اجر کا کام ہے۔

زکوٰۃ فنڈ کا انویسٹمنٹ:

بعض انجمنیں زکوٰۃ کی رقوم کو قومی بچت کی اسکیموں میں لگا کر سرمایہ کاری کرتی ہیں، اور ان سے جو سود حاصل ہوتا ہے اس سے ناداروں کی اعانت کرتی ہیں، یہ عمل بھی شرعاً ناجائز ہے، اس سے زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوتی اور سود لینے کا وبال الگ ہے۔ ایسے لوگ گناہ گار ہیں، اگر زکوٰۃ دینے والوں کی منشا بھی اس میں شامل ہے تو وہ بھی گناہ گار ہوں گے اور ان کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوگی۔

اپنے اصول وفروع کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا:

قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس ونادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔ تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادادادی، نانانانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ) کو زکوٰۃ دینے سے ادا نہیں ہوگی۔ یہی حکم صدقہ فطر، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے، بہو یا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر اپنی بیوی کی کسی سابقہ شوہر سے اولاد کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ البتہ بہن بھائی ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، بشرطیکہ جس کو زکوٰۃ دی جائے وہ اس کا شرعاً مستحق ہو۔

زکوٰۃ کی رقم سے دینی تبلیغی لٹریچر کی اشاعت:

بعض لوگ براہِ راست اپنی زکوٰۃ کی رقم سے دینی کتب تبلیغی مقصد کے لئے شائع کرتے ہیں اور ان کتابوں کو مفت تقسیم کرتے ہیں۔ اگرچہ دینی تبلیغی لٹریچر کی اشاعت ایک قابلِ تحسین کارِ خیر ہے، لیکن اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ البتہ جتنی مالیت کی کتابیں زکوٰۃ کے مستحق افراد کو ان کی مِلک کر کے دے دی جائیں گی، اتنی مالیت کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، مالدار اور صاحبِ نصاب افراد میں ان کتابوں کو مفت بانٹنے سے اجر تو ملے گا، زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

ہر فرد جواب دہ ہے:

اسلامی عبادات خواہ بدنی ہوں (جیسے نماز اور روزہ وغیرہ) یا مالی (جیسے زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ وغیرہ) ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرداً فرداً عائد ہوتی ہیں۔ خاندان پر بحیثیتِ مجموعی عائد نہیں ہوتیں۔ لہٰذا والدین اور اولاد، شوہر اور بیوی میں سے جو بھی ''صاحبِ نصاب'' ہوگا، اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور اسے اپنے مال میں سے ادا کرنی ہوگی۔ تاہم اگر شوہر بیوی کی طرف سے یا اولاد والدین کی طرف سے ان کی مرضی اور اجازت سے زکوٰۃ ادا کریں تو ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ کی شرح اور حکمتِ زکوٰۃ:

زکوٰۃ کی شرح سونا، چاندی، نقدرقوم، شیئرز، بینک ڈیپازٹس، بانڈز، اموالِ تجارت وغیرہ پرڈھائی فیصد ہے، جو فرض کے درجے میں ہے۔شریعت کا کامل مطلوب اور آئیڈیل نہیں ہے۔آئیڈیل تو یہ ہے کہ انسان زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد باقی حلال اور طیب مال میں سے بھی ناداروں اور حاجت مندوں کی مدد کرے۔ضرورت مندوں، قرابت داروں کی اعانت کرے۔نفلی صدقات، عطیات اور صدقاتِ جاریہ کے کاموں میں صَرف کرے، دولت کا بندہ بن کر نہ رہ جائے، دولت کو اللہ کی بندگی میں خرچ کرے۔

مستحقِ زکوٰۃ کو ہبہ یا قرض کہہ کر زکوٰۃ ادا کرنا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْأَلُوْنَ النَّاسَ إِلْحَافًا

ترجمہ: "(یہ خیرات) اُن فقراء کا حق ہے، جو خود کو اللہ کی راہ میں وقف کئے ہوئے ہیں، جو (دینی مشغولیت کے غلبے کی وجہ سے طلبِ معاش کے لئے) زمین میں تگ ودو کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، (ان کے حال سے) ناواقف شخص (خودداری کی بنا پر) ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے ان کو خوشحال تصور کرتا ہے، (اے مخاطَب!) تم ان کی علامتوں سے انہیں پہچان لوگے، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے، (البقرۃ:273)"۔

بہت سے لوگ باعزت اور خوددار ہوتے ہیں، وہ زکوٰۃ کا مستحق ہونے کے باوجود عزتِ نفس کی بنا پر کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔ان کی اسی عادت کی وجہ سے ان کے حال سے ناواقف لوگ انہیں خوشحال سمجھتے ہیں، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو تلاش کر کے زکوٰۃ دینی چاہئے۔اور اگر ان کی عزتِ نفس کو قائم رکھنے کے لئے ہبہ(Gift) یا قرض کہہ کر دے دیا جائے، تو بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔اگر وہ کبھی واپس کریں تو کہہ دیں کہ الحمدللہ مجھے ضرورت نہیں ہے، آپ انہیں استعمال کرتے رہیں۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: "مَن أعطى مسكينًا دراهم وسمَّاها هبةً أو قرضًا ونوى الزّكاة فإنّها تجزيه وهو الأصحّ هكذا في "البحر الرائق"۔

ترجمہ: "اور جس نے کسی مسکین کو رقم دی اور (اس کی عزتِ نفس کا خیال کرتے ہوئے) کہا کہ یہ ھبہ یا قرض ہے اور دل میں زکوٰۃ کی نیت کی، تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، صحیح ترین روایت یہی ہے، "البحرالرائق" میں بھی اسی طرح نقل کیا گیا ہے، (عالمگیری جلد 1، ص:172)"۔

زکوٰۃ کے مختلف مسائل اور اُن کا حل

بیوی کا مہر زکوٰۃ واجب ہونے سے مانع نہیں

سوال: کسی شخص پر اگر بیوی کا مہر واجب ہو، تو اُسے قرض شمار کرتے ہوئے کیا اُس شخص پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟۔

جواب: آج کل بالعموم عورتوں کا مہر مؤجل ہی ہوتا ہے، جس کا مطالبہ عام طور پر دونوں میں سے کسی ایک کی موت یا طلاق کے بعد ہی ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسا قرض نہیں ہے، جس کی ادائیگی وجوبِ زکوٰۃ میں مانع ہو۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قَالَ مَشَایِخُنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ فِیْ رَجُلٍ عَلَیْهِ مَهْرٌ مُؤَجَّلٌ لِاِمْرَأَتِهٖ وَهُوَ لَایُرِیْدُ اَدَائَهٗ لَایُجْعَلُ مَانِعًا مِنَ الزَّکوٰۃِ لِعَدَمِ الْمُطَالَبَۃِ فِی الْعَادَۃِ،

ترجمہ: ''جس شخص پر اس کی بیوی کا مہر مؤجل واجب ہے اور وہ (اس وقت) اُسے ادا بھی نہیں کرنا چاہتا، اُس کے بارے میں ہمارے مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ (ایسے مہر کو) زکوٰۃ ادا کرنے میں رکاوٹ نہیں بنایا جائے گا کیونکہ عادت یہی ہے کہ اس کی ادائیگی کا (بیوی کی طرف سے فوری) مطالبہ نہیں ہوتا۔''

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 173)

ترکے کی تقسیم سے پہلے کی مدت پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایک شخص کا قضاء الٰہی سے انتقال ہوگیا اور اس کی جائداد اس کے شرعی ورثاء میں 2 سال کے بعد تقسیم کی گئی آیا تقسیم کے بعد گزشتہ دو سالوں کی زکوٰۃ ان کے ذمے واجب الادا ہے یا نہیں؟۔

جواب: ترکے میں جو دَین ملے، مذہب صحیح کے مطابق وہ دَین متوسط ہے اور دَین متوسط میں پچھلے سالوں کی زکوٰۃ نصاب پر قبضے کے وقت لازم ہوگی، جیسا کہ پہلے تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ لہٰذا جب دَین میں پچھلے سالوں کی زکوٰۃ لازم ہے، تو وہ رقم جو کسی ایک وارث کے پاس رہی، اس کی ممکن صورتیں دو ہیں:

ا۔ ورثاء کی اجازت اور رضامندی اس میں شامل تھی، تو اس کا قبضہ وارثوں کا ہی قبضہ ہوگا، کیونکہ یہ ان کا نائب ہے۔ لہٰذا پچھلے سالوں کی زکوٰۃ لازمی ہونی چاہئے۔

۲۔ یہ کہ دیگر ورثاء کی اجازت کے بغیر ایک وارث نے اُسے اپنے قبضے میں رکھا، تو یہ غصب ہے اور غصب میں

اگر مالک کے پاس گواہ موجود ہوں، تو پچھلے سالوں کی زکوٰۃ دینی ہوگی، جیسا کہ تفصیل بیان کی جاچکی ہے۔
ہمارے ہاں بعض اوقات فوت شدہ شخص کی رقم بینک میں موجود ہوتی ہے اور بروقت تقسیم نہیں ہو پاتی، کیونکہ قانونی کارروائی میں کچھ عرصہ لگ جاتا ہے، وہ مدت ساقط ہوگی۔ عالمگیری میں ترکے میں ملنے والے دَین کو دَینِ ضعیف شمار کیا ہے، لیکن یہ مفتیٰ بہ قول نہیں ہے، بلکہ یہ ضعیف قول ہے، جیسا کہ درِمختار کے حوالے سے دَین کی اقسام میں گزرا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام اہلسنت امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ترکے میں ملنے والے دَین کو ''دَین متوسط'' قرار دیا ہے اور عالمگیری کے جزئیہ کے بارے میں لکھا: ''کذالك کون الموروث من المتوسط، هو الرجیح، وان جزم فی الهندیة علی الزاهدی انه من الضعیف، فقد مرضهافی الخانیة وأُخر، وهكذ اشار الی تضعیفه فی الفتح والبحر

ترجمہ: ''اور اسی طرح (تاخیر سے ملنے والا) مالِ وراثت بھی ''دَینِ متوسط'' میں شامل ہے اور یہی راجح قول ہے۔ اگرچہ فتاویٰ عالمگیری میں زاہدی کے حوالے سے جزم (یقینی قرار دیا) کیا ہے کہ یہ دَینِ ضعیف ہے۔ فتاویٰ قاضی خان اور دوسرے فتاویٰ میں اسے کمزور قول قرار دیا ہے۔ اِسی طرح فتح القدیر اور البحر الرائق میں بھی اِس قول کے ضُعف کی طرف اشارہ کیا ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد: 10، ص: 165)

ردالمحتار میں ہے:

ای مثل الدین المتوسط فیما مر ونصابهٗ حین ورثه رحمتی وروی انه کاالضعیف، "فتح"، "بحر"، والاول ظاهر الروایة۔

ترجمہ: '' جیسا کہ گزشتہ بحث میں گزرا کہ یہ دَینِ متوسط کی طرح ہے اور اس کا نصاب اسی وقت سے معتبر ہوگا جب وہ اس کا وارث بنا، (بحوالہ) رحمتی اور ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ دَینِ ضعیف کی طرح ہے، (بحوالہ) فتح القدیر والبحر الرائق، اور پہلا قول (یعنی تاخیر سے ملنے والے مالِ وراثت کا دَینِ متوسط ہونا) ظاہر الروایۃ ہے، (جلد: 03، ص: 218)''۔

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں دو سال بعد ملنے والے مالِ وراثت میں سے جو مال نامی ہے، اُس پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

زکوٰۃ کی رقم مصارفِ مسجد میں استعمال نہیں کی جاسکتی

سوال: ہمارے علاقے کی مسجد جس کا بجلی کا بل تقریباً ایک لاکھ روپے تک پہنچ چکا ہے۔اب مسجد کمیٹی کا کہنا ہے کہ اس بل کی ادائیگی زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم سے کی جاسکتی ہے۔کیا شرعاً اس کی اجازت ہے کہ مسجد کا بل زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم سے جمع کرایا جائے؟۔

جواب: زکوٰۃ یا فطرے کی رقم تعمیر مسجد یا مصارفِ مسجد (یوٹیلیٹی بلز وغیرہ کی مد) میں استعمال نہیں کی جاسکتی، اکثر مساجد کمیٹیاں ان مقاصد کے لئے حیلے کا سہارا لیتی ہیں یہ حیلہ کا غلط استعمال ہے اور اس سے منشائے شریعت کو باطل کرنا مقصود ہے۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَلَا یَجُوزُ أَن یُبْنٰی بِالزَّکَاۃِ الْمَسْجِدُ وَکَذَا الْقَنَاطِرُ وَالسِّقَایَاتُ وَاِصْلَاحُ الطُّرُقَاتِ وَکَرْیُ الْاَنْہَارِ وَالْحَجِّ وَالْجِہَادِ وَکُلُّ مَا لَاتَمْلِیْكَ فِیْہِ وَلَایَجُوزُ أَنْ یُکَفَّنَ بِہَا مَیِّتٌ وَلَایُقْضٰی بِہَا دَیْنُ الْمَیِّتِ کَذَا فِی التَّبْیِیْنِ۔

ترجمہ:''اور زکوٰۃ کی رقم سے مسجد کی تعمیر جائز نہیں ہے اور اسی طرح پلوں کی تعمیر، کنوؤں کی کھدائی، راستوں کی درستگی، نہروں کی کھدائی اور حج اور جہاد کے لئے (زکوٰہ کی رقم کا براہِ راست استعمال) جائز نہیں ہے۔ اور (اسی طرح) ہر اُس کام کے لئے جس میں تملیک نہیں پائی جاتی (زکوٰۃ کی رقم کا استعمال) جائز نہیں ہے۔(زکوٰۃ کی رقم کو) میت کے کفن دفن اور اُس کے قرض کی ادائیگی کے لئے بھی (براہِ راست استعمال کرنا) جائز نہیں ہے،''تبیین'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 188)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے خلافت فنڈ میں زکوٰۃ کی رقم دینے کے متعلق سوال کیا گیا، آپ لکھتے ہیں: ''زکوٰۃ مسجد میں دے تو ادا ہو نہیں سکتی، اُسے خلافت فنڈ میں کیسے دیا جاسکتا ہے، زکوٰۃ کا رکن ''فقیر کو مالک بنانا'' ہے۔دُرِّ مختار میں ہے: لَاصَرْفَ اِلٰی مَسْجِدٍ لِعَدَمِ التَّمْلِیْكِ وَھُوَ الرُّکْنُ، ترجمہ:''کسی مسجد میں زکوٰۃ کے مال کو خرچ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں محتاج کو مالک نہیں بنایا جاتا جبکہ فقیر کو مالک بنانا زکوٰۃ کا رکن ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 106، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

اس تفصیل کی روشنی میں مسجد کی بجلی کا بل براہِ راست زکوٰۃ وفطرہ کی رقم سے ادا نہیں کیا جاسکتا، اس طرح زکوٰۃ وفطرے کی ادائیگی سے بری الذمہ نہیں ہوں گے اور عنداللہ مسجد کی انتظامیہ جواب دہ ہوگی۔کراچی میں مساجد کی

انتظامیہ مساجد میں قائم حفظ وناظرہ کے مدارس کے نام پر، جہاں اہلِ محلّہ کے بچے پڑھتے ہیں، زکوٰۃ وفطرہ جمع کرتے ہیں، یہ بھی شرعاً درست نہیں ہے۔ بعض لوگ اِس سلسلے میں حیلے کا سہارا لیتے ہیں، لیکن ضرورتِ شرعی کے بغیر حیلے کا یہ استعمال بھی درست نہیں ہے۔ زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کے مصارف اللہ جل شانہٗ قرآن مجید میں بیان فرمادیئے ہیں (سورہ توبہ:60)، ان میں کسی کو تصرف کا اختیار نہیں ہے۔

حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ (بِسَنَدِهٖ)أَنَّهٗ سَمِعَ زِيَادَبْنَ الْحَارِثِ الصُّدَائِيَّ قَالَ: أَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَبَايَعْتُهٗ، فَذَكَرَ حَدِيْثًا طَوِيْلًا فَأَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ:أَعْطِنِيْ مِنَ الصَّدَقَةِ، فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَرْضَ بِحُكْمِ نَبِيٍّ وَّلَاغَيْرِهٖ حَتّٰى حَكَمَ فِيْهَا هُوَ،فَجَزَّأَهَا ثَمَانِيَةَ أَجْزَاءٍ، فَإِنْ كُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْأَجْزَاءِ، أَعْطَيْتُكَ حَقَّكَ۔

ترجمہ:''عبداللہ بن مسلمہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ان کے شیخ الشیخ نے زیاد بن صدائی کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے آپ ﷺ کے دستِ اقدس پر بیعتِ اسلام کی، پھر انہوں نے ایک طویل حدیث بیان کی اور اس دوران انہوں نے بیان کیا کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ عنایت فرمایئے! تو رسول اللہ ﷺ نے اُس سے فرمایا: (مصارفِ زکوٰۃ کے معاملے کو) اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے حکم پر نہیں چھوڑا (یعنی یہ صوابدیدی مسئلہ نہیں ہے) بلکہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے (سورۂ توبہ:60 میں) خود ہی فیصلہ فرمادیا ہے اور اس کے آٹھ مصارف بیان کئے ہیں، تو اگر تم ان میں سے کسی مصرف کے تحت حق دار بنتے ہو تو (مالِ زکوٰۃ میں سے) تمہارا حق تمہیں دے دوں گا (ورنہ تمہیں نہیں دوں گا)، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:1627)''۔

زکوٰۃ محض وکیل کو دینے سے ادا نہیں ہوتی

سوال: ایک شخص نے اپنی زکوٰۃ کی رقم ہر مہینے ایک بیوہ عورت کو پہنچانے کے لئے ایک قابلِ بھروسا نوجوان کے سپرد کی اور وہ یہ سمجھتا رہا کہ مذکورہ رقم بیوہ تک پہنچ جاتی ہوگی۔ کئی سال بعد اُس شخص کی اُس بیوہ سے ملاقات ہوئی، کسی بات پر یہ راز کھلا کہ چند ماہ تک تو یہ رقم اُسے ملی لیکن تقریباً پانچ چھ سال سے کوئی رقم نہیں ملی۔ جب اُس شخص نے نوجوان سے دریافت کیا تو اُس نے قبول کرلیا کہ ہاں میں نے کئی سال سے یہ گناہ یا بے ایمانی کی ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس گناہ کی سزا کیا ہے اور کفارہ یا تلافی کس طرح ہوگی؟۔

جواب: صورتِ مسئولہ میں مذکورہ نوجوان کی حیثیت زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے محض وکیل کی ہے، اُس پر لازم تھا کہ وکیل کی حیثیت سے بیوہ کو آپ کی زکوٰۃ پہنچاتا، جس میں وہ خیانت کا مرتکب ہوا۔ امانت میں قصداً خیانت کی حرمت سے متعلق قرآنِ مجید میں آیاتِ کریمہ اور احادیثِ مبارکہ بکثرت موجود ہیں اور اُخروی عذاب کی وعیدیں بھی ہیں۔ مذکورہ شخص پر اس رقم کا تاوان دینا لازم ہے کہ وہ اُس شخص کو (جس نے اسے زکوٰۃ ادا کرنے کیلئے اپنا وکیل بنایا) تاوان ادا کرے اور وہ شخص پھر اپنی زکوٰۃ ادا کرے۔ جس عرصے کی زکوٰۃ اس نے مستحق بیوہ تک نہیں پہنچائی، وہ ادا نہیں ہوئی اور اب آپ کے ذمّے اس عرصے کی زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہے۔ البتہ آپ کے وکیل نوجوان نے جو قصداً خیانت کی ہے، اس پر وہ گنہگار ہے اور اس پر توبہ لازم ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ وہ ساری رقم آپ کو واپس لوٹائے۔ ایسے شخص کے لئے حدیث پاک میں وعید ہے: امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ایک حدیث کا حوالہ درج فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

مَا خَالَطَتِ الصَّدَقَةُ أَوْ مَالُ الزَّكٰوةِ مَالًا إِلَّا أَفْسَدَتْهُ رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَالْبَيْهَقِيُّ عَنْ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ الصِّدِّيْقَةِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کا مال جس مال میں ملے گا، وہ اُسے تباہ و برباد کردے گا، اس حدیث کو بزار اور بیہقی نے ام المومنین الصدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 172، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اسی حدیث کی شرح میں علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''بعض ائمہ نے اس حدیث کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ زکوٰۃ واجب ہوئی اور ادا نہ کیا اور اپنے مال میں ملائے رہا تو یہ حرام مال اُس حلال مال کو ہلاک کردے گا۔ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ مالدار شخص مالِ زکوٰۃ لے تو یہ مالِ زکوٰۃ اس کے مال کو ہلاک کردے گا کہ زکوٰۃ فقیروں کے لئے ہے اور دونوں معنی صحیح ہیں، (بہارِ شریعت، جلد اوّل، ص: 357)''۔ ہلاکت کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ وہ مال ہلاک ہوجائے گا اور دوسرا یہ کہ زکوٰۃ کے اختلاط سے اس مال میں برکت نہیں رہے گی۔

زکوٰۃ کے چند مسائل

میری بھانجی جو کہ صاحب نصاب نہیں ہیں، میں اُن کو زکوٰۃ کی رقم سے مکان یا پلاٹ دینا چاہتا ہوں، جس سے

امید ہے کہ اُنہیں مستقبل میں رہنے کی جگہ کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور اگر اُس میں نہ بھی رہیں تو کرائے پر دے کر مالی فوائد حاصل کر سکتی ہیں۔ چند مسائل زکوٰۃ سے متعلق جاننا چاہتا ہوں جو میرے ساتھ دوسروں کی رہنمائی کا بھی ذریعہ بنیں گے۔

سوال: 1۔کیا یہ بتائے بغیر کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، کسی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟، زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے زبان سے کہنا ضروری ہے یا نیت کافی ہے؟۔

کچھ لوگ ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی مروّت یا خودداری کے سبب لینے سے انکار کر دیتے ہیں تو کیا اُنہیں زبردستی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟۔

جواب: جی ہاں! یہ اندیشہ ہو کہ خودداری کی بنا پر نہیں لے گا، تو مستحقِ زکوٰۃ شخص کو یہ بتائے بغیر بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، بلکہ ہبہ یا قرض کہہ کر بھی دی جاسکتی ہے جبکہ دل میں یہ نیت ہو کہ واپس نہیں لوں گا اور دیتے وقت زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کر لے تو یہ ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

"مَنْ أَعْطَى مِسْكِيْنًا دَرَاهِمَ وَسَمَّاهَا هِبَةً أَوْ قَرْضًا وَنَوَى الزَّكَاةَ فَإِنَّهَا تُجْزِيْهِ وَهُوَ الْأَصَحُّ هٰكَذَا فِي "البَحرِ الرَّائق"۔

ترجمہ:''اور جو شخص کسی مسکین (مستحقِ زکوٰۃ شخص) کو کچھ درہم (زکوٰۃ کی مد میں) یہ کہہ کر دے کہ یہ ہبہ یا قرضہ ہے اور دیتے وقت زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت کر لے تو یہ عمل ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی ہے اور یہی قول صحیح ترین ہے ''البحر الرائق'' میں ''المجتبیٰ'' اور ''القنیہ'' سے اسی طرح منقول ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 171، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

مستحقِ زکوٰۃ ضرورت مند رشتے دار یا کسی شخص یا اشخاص کو بتائے بغیر زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں بلکہ دل میں نیت اور ارادہ ہونا کافی ہے۔ رشتے دار اگر مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے، کیونکہ اس میں ادائے زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ صلۂ رحمی کا اجر بھی ملتا ہے اور اُن کی خودداری کو قائم رکھتے ہوئے زکوٰۃ کے بجائے ہبہ یا قرض کہہ کر بھی دے سکتے ہیں۔

سوال: 2۔کیا میں یہ مکان یا پلاٹ (زکوٰۃ کی رقم سے) اس شرط کے ساتھ کہ وہ اُسے نہ بیچیں، دے سکتا ہوں؟۔

جواب: زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک (مالک بنانا) شرط ہے یعنی جسے زکوٰۃ دی جارہی ہے، اُسے اُس مال پر تصرُّف کا مکمل اختیار حاصل ہونا چاہئے اور آپ کی مذکورہ شرط اِس لحاظ سے باطل ہے، کیونکہ اس سے زکوٰۃ میں تملیک کی لازمی شرط مفقود ہو جاتی ہے۔ مگر زکوٰۃ یا صدقہ شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتے، بلکہ ایسی شرط خود ہی کالعدم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر آپ یہ شرط لگا کر یہ مکان یا پلاٹ ان کی مِلک کرتے ہیں، تو آپ کی یہ شرط باطل ہے اور انہیں اسے فروخت کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

سوال: 3۔ ان پلاٹس یا مکان کی دیکھ بھال، مرمت، بجلی وغیرہ کے بل، ٹیکس کی ادائیگی زکوٰۃ کی رقم سے کی جاسکتی ہے؟۔ اسی طرح مکان یا پلاٹس کو نام کرانے کے اخراجات، حکومتی ٹیکس کی ادائیگی یا کسی مرحلے پر رشوت دینا پڑے تو کیا زکوٰۃ کی رقم سے دی جاسکتی ہے؟۔

جواب: مذکورہ مدات یعنی مستحقِ زکوٰۃ کو دیئے گئے پلاٹ کی دیکھ بھال، مرمت، بجلی وغیرہ کے بلوں کی ادائیگی اور ٹیکسز کی ادائیگی براہِ راست کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، البتہ اگر نادار کو زکوٰۃ کی رقم دے دی جائے اور وہ اپنی مرضی سے اسے ان مصارف پر خرچ کرے یا خرچ کرنے والے کو اپنا وکیل بنا دے تو جائز ہے۔ اسی طرح پلاٹ یا مکان کو مستحق کے نام منتقل کرنے کے اخراجات بھی براہِ راست کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، البتہ اگر مستحق کو رقم دے دی جائے اور وہ اپنی مرضی سے ان مصارف پر خرچ کرے یا خرچ کرنے والے کو اپنا وکیل بنا دے تو جائز ہے۔ رشوت کا لین دین شرعاً حرام ہے اور حرام کام میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنا بھی حرام ہے۔

سوال: 4۔ کیا مکان یا پلاٹ کے ساتھ ساتھ نقد رقم بھی دے سکتا ہوں؟۔

جواب: اگر مستحق کو مکان یا پلاٹ کا مالک بنا دیا ہے تو یہ چیزیں حاجتِ اصلیہ میں سے ہیں اور وہ مکان کا مالک بننے کے بعد بھی مستحقِ زکوٰۃ ہے، تو اسے زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔

سوال: 5۔ کیا میں اس بھانجی کے علاوہ بھانجے، بھتیجے، بھتیجی بہن، بہنوئی وغیرہ کو بھی زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟۔

جواب: یہ قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔ تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادا، دادی، نانا نانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ) کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، یہی حکم صدقۂ فطر، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے۔ خالہ، خالو،

ماموں، ممانی، بہو یا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر کی اپنی بیوی کی کسی سابق شوہر سے اولاد (اگر یہ لوگ صاحبِ نصاب نہ ہوں تو) ان سب کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ البتہ اپنے مستحق بھائی یا بہن کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَالْاَفْضَلُ فِي الزَّكَاةِ وَالْفِطْرِ وَالنُّذُوْرِ الصَّرْفُ اَوَّلًا اِلَى الْاِخْوَةِ وَالْاَخَوَاتِ ثُمَّ اِلٰی اَوْلَادِهِمْ ثُمَّ اِلَى الْاَعْمَامِ وَالْعَمَّاتِ ثُمَّ اِلٰی اَوْلَادِهِمْ ثُمَّ اِلَى الْاَخْوَالِ وَالْخَالَاتِ ثُمَّ اِلٰی اَوْلَادِهِمْ ثُمَّ اِلٰی ذَوِی الْاَرْحَامِ ثُمَّ اِلَى الْجِيْرَانِ ثُمَّ اِلٰی اَهْلِ حِرْفَتِهٖ ثُمَّ اِلٰی اَهْلِ مِصْرِهٖ اَوْ قَرْيَتِهٖ كَذَا فِي "السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ"۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ، فطرہ اور نذر کی رقوم میں افضل یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے بہن بھائیوں، پھر ان کی اولاد، پھر چچاؤں اور پھوپھیوں، پھر ان کی اولاد، پھر خالاؤں اور ماموؤں، پھر ان کی اولاد، پھر دور کے غیر نسبی رشتہ داروں، پھر پڑوسیوں، پھر ہم پیشہ افراد، پھر شہر یا بستی والوں کو دی جائے (بشرطیکہ یہ تمام لوگ نادار ہوں اور مستحقِ زکوٰۃ ہوں)، جیسا کہ ''السراج الوہاج'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 190)''۔

زکوٰۃ وفطرہ کی جبری وصولی:

سوال: بعض علاقوں میں کچھ لوگ بدمعاشی اور طاقت کے بل پر لوگوں سے جبراً زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ اور صدقات وصول کرتے ہیں۔ اور لوگ ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، نہ ہی حکومت لوگوں کو ایسے مسلح گروپوں سے تحفظ دیتی ہے، اس لئے لوگ اپنی جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی خاطر مجبوراً ان لوگوں کو زکوٰۃ وصدقات دے دیتے ہیں۔ کیا جبر، خوف اور ڈر سے چندے کی صورت میں زکوٰۃ، فطرے کی ادائیگی سے شرعی حکم پورا ہو جاتا ہے یا دوبارہ مستحق افراد کو ادائیگی کرنا ضروری ہے؟۔

جواب: زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوٰۃ قرآن مجید کی سورۂ توبہ، آیت: 60 میں متعین فرما دیئے ہیں اور وہ آٹھ مدات یہ ہیں:

(1) فقراء (2) مساکین (3) عاملینِ زکوٰۃ (4) مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْب

(5) فی الرِّقَاب: جن کی گردن کسی بڑے مالی بار تلے دبی ہوئی ہو (6) غارمین: جن پر کوئی بھاری تاوان آگیا ہو، جس سے گلوخلاصی کی کوئی سبیل نہ ہو (7) فی سَبِیْلِ اللّٰہ:

جو اپنے آپ کو ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے وقف کر چکے ہوں اور معاشی تگ ودو کیلئے انہیں وقت میسر نہ ہو

(8) اِبنُ السَّبِیل : کوئی مسافر کسی ایسے مقام پر گھر گیا ہو کہ روزی کا محتاج ہو جائے اور گھر سے رابطہ اور مالی معاونت کا حصول ممکن نہ ہو۔

جبری زکوٰۃ وفطرہ کی وصولی کے متعلق فقہاء کے دو قول ہیں: (۱) زیادہ بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ دوبارہ ادا کر دی جائے (۲) آسانی اس میں ہے کہ دوبارہ ادا نہ کی جائے۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

وَاِذَا أَخَذَ الْخَوَارِجُ الْخَرَاجَ وَصَدَقَةَ السَّوَائِمِ لَا يُثَنَّى عَلَيْهِمْ لِأَنَّ الْإِمَامَ لَمْ يَحْمِهِمْ وَالْجِبَايَةُ بِالْحِمَايَةِ وَاَفْتَوْا بِأَنْ يُعِيدُوهَا دُوْنَ الْخَرَاجِ فِيمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اللهِ تَعَالَىٰ لِأَنَّهُمْ مَصَارِفُ الْخَرَاجِ لِكَوْنِهِم مُقَاتِلَةً وَالزَّكوٰةُ مَصرِفُهَا الْفُقَرَاءُ فَلَا يَصْرِفُونَهَا إِلَيْهِمْ، وَقِيلَ إِذَا نَوىٰ بِالدَّفْعِ التَّصَدُّقَ عَلَيْهِمْ سَقَطَ عَنْهُ وَكَذَا مَا دَفَعَ إِلَىٰ كُلِّ جَائِرٍ لِأَنَّهُمْ بِمَا عَلَيْهِمْ مِنَ التَّبِعَاتِ فُقَرَاءُ وَالْأَوَّلُ أَحْوَطُ۔

ترجمہ: ''اور اگر خارجیوں نے خراج (ٹیکس) کو اور سائمہ (چرنے والے) جانوروں کی زکوٰۃ (جبراً) وصول کر لی، تو لوگوں سے دوبارہ نہیں لی جائے گی، کیونکہ امام نے لوگوں کی حفاظت نہیں کی ہے اور ٹیکس تو لوگوں کی ظالموں سے حفاظت کے سبب ہے اور لوگوں کو فتویٰ دیا جائے گا کہ وہ زکوٰۃ دوبارہ (فقیروں کو) دیدیں، خراج دوبارہ نہ دیں۔ (یہ دوبارہ زکوٰۃ دینا) ان کے اور اللہ کے درمیان ہے اس لئے کہ خوارج، خراج کا مصرف ہیں، کیونکہ وہ لڑنے والوں میں سے ہیں اور زکوٰۃ کا مصرف فقراء ہیں اور (غالب امکان یہ ہے کہ) خوارج اس کو فقیروں پر خرچ نہ کریں گے اور کہا گیا (یہ فقیہ ابوجعفر کا قول) ہے کہ: جب مال کے مالک نے خارجیوں کو دیتے وقت ان کو صدقہ دینے کی نیت کی تو مالک سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اور ایسے ہی ہر اُس مال کے دینے میں جو کسی ظالم کو دینا پڑے چونکہ ان لوگوں نے لوگوں کے حقوق اور مال ظلماً غصب کئے ہیں (جن پر ان کا حق نہیں ہے، لہٰذا یہ شرعاً اس مال کے مالک بھی نہیں ہیں، صرف غاصب ہیں)، اس لئے فقیر کے حکم میں ہیں اور قولِ اوّل میں زیادہ احتیاط ہے (یعنی شرعاً احتیاط اسی میں ہے کہ مالدار آدمی دوبارہ اپنی زکوٰۃ ادا کرے)''۔

علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: قَالَ فِي "اَلْجَامِعِ الصَّغِيْرِ" "لِقَاضِي خَانْ": وَكَذٰلِكَ السُّلْطَانُ إِذَا صَادَرَ رَجُلًا، وَأَخَذَ مِنْهُ أَمْوَالًا، فَنَوىٰ صَاحِبُ الْمَالِ الزَّكَاةَ عِنْدَ الدَّفْعِ

سَقَطَتْ عَنْهُ الزَّكَاةُ ، لِأَنَّهُمْ بِمَا عَلَيْهِمْ مِنَ التَّبِعَاتِ فُقَرَاءُ ،فَإِنَّهُمْ إِذَا رُدُّوا أَمْوَالَهُمْ إِلَى مَنْ أَخَذُوهَا مِنْهُمْ لَمْ يَبْقَ مَعَهُمْ شَيْءٌ ۔

ترجمہ: ''''جامع الصغیر'' میں قاضی خان سے منقول ہے: اسی طرح حاکم اگر کسی شخص کے اموال (زبردستی) چھیننے کا حکم صادر کردے اور صاحبِ مال، مال دیتے وقت زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کرلے تو مالک سے زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی۔ اس لئے کہ یہ لوگ (لوگوں کا مال ظلماً لینے کی وجہ سے) فقیر ہیں اگر ان سے یہ سارا مال لے کر حق دار لوگوں کو دے دیا جائے تو ان کے پاس کچھ باقی نہیں رہے گا، (ہدایہ، جلد 2، ص: 32-31)''۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ظلماً لئے ہوئے مال پر ظالم وغاصب کی ملکیت کا حق ثابت نہیں ہوتا، وہ صرف غاصب ہے اور مظلوموں کے حقوق کو ادا کرنا ان پر شرعاً لازم ہے۔ لہٰذا اگر کبھی ان سے مظلوموں کے غصب کئے ہوئے مال اور حقوق وصول کرلئے جائیں، تو وہ فقیر رہ جائیں گے۔ تاہم ہر غاصب وظالم کے بارے میں ایسا قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے پاس اپنا کوئی مال نہیں ہے۔ لہٰذا احتیاطاً زکوٰۃ دوبارہ ادا کرنے کے قول پر ہی عمل کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ آج کل جو مسلح گروہ زبردستی زکوٰۃ، فطرہ اور صدقات وصول کرتے ہیں، وہ خود بھی بااثر اور مال دار ہوتے ہیں۔

صاحبِ ہدایہ اس مسئلے کی تفہیم اس انداز سے کرتے ہیں کہ جب خوارج اہلِ عدل کے شہر میں گھس گئے اور وہاں کے کفار سے زبردستی خراج اور مسلمانوں سے زبردستی زکوٰۃ وصول کرلی، تو اُن سے دوبارہ خراج یا زکوٰۃ نہیں لی جائے گی کہ امامِ عادل نے اُن کی کوئی حفاظت نہیں کی۔ کیونکہ کفار سے محصول (ٹیکس) حفاظت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، تو جب عادل امام حفاظت نہیں کرسکا تو محصول (ٹیکس) واجب نہیں۔ مسلمانوں کو فتویٰ یہ دیا جائے گا کہ وہ دیانتاً زکوٰۃ دوبارہ خود محتاجوں کو دیدیں، کفار خراج نہ دیں، اس لئے کہ خوارج خراج کا مصرف ہیں، کیونکہ وہ باغی ہیں۔ رہا زکوٰۃ کا مسئلہ تو زکوٰۃ کا مصرف مسلمان فقیر ہیں، خوارج اس کو فقیروں پر خرچ نہیں کریں گے، خوارج کے نزدیک اہلِ عدل کا قتل مباح ہے تو یہ مسلمان فقیروں پر زکوٰۃ کا مال کیسے خرچ کریں گے۔ تو جب مسلمانوں کی زکوٰۃ صحیح مصرف میں خرچ نہ ہوئی تو دیانتاً دوبارہ ادا کرنے کا فتویٰ دیا جائے گا۔ فقیہ ابوجعفر نے کہا کہ جب مالک نے خارجیوں کو دیتے وقت زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت کرلی تو اس کی زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی۔ ایسے ہی کسی ظالم وجابر کو دیتے وقت نیت کرلے کہ اس فقیر کو زکوٰۃ دیتا ہوں تو زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی، دوبارہ

ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔صاحبِ ہدایہ نے فرمایا کہ پہلے قول میں احتیاط ہے کہ دوبارہ بذاتِ خود فقراء کو دینے سے زکوٰۃ یقینی اور قطعی ادا ہو جائے گی ،لیکن دوسرے قول میں آسانی ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:(أَخَذَ الْبُغَاةُ)وَالسَّلَاطِيْنُ الْجَائِرَةُ (زَكَاةَ) الْأَمْوَالِ الظَّاهِرَةِ كَـ(السَّوَائِمِ وَالْعُشْرِ وَالْخَرَاجِ لَا إِعَادَةَ عَلَى أَرْبَابِهَا إِنْ صُرِفَ) الْمَأْخُوذُ (فِيْ مَحَلِّهِ) الْآتِيْ ذِكْرُهُ (وَإِلَّا) يُصْرَفُ (فِيْهِ فَعَلَيْهِمْ) فِيْمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اللّٰهِ (إِعَادَةُ غَيْرِ الْخَرَاجِ) لِأَنَّهُمْ مَصَارِفُهُ۔ وَاخْتُلِفَ فِي الْأَمْوَالِ الْبَاطِنَةِ، فَفِي "الْوَلْوَالِجِيَّةِ" وَ"شَرْحِ الْوَهْبَانِيَّةِ": اَلْمُفْتٰى بِهِ عَدَمُ الْإِجْزَاءِ وَفِي "الْمَبْسُوْطِ": اَلْأَصَحُّ الصِّحَّةُ إِذَا نَوٰى بِالدَّفْعِ لِظَلَمَةِ زَمَانِنَا الصَّدَقَةَ عَلَيْهِمْ لِأَنَّهُمْ بِمَا عَلَيْهِمْ مِنَ التَّبِعَاتِ فُقَرَاءُ حَتّٰى أُفْتِيَ أَمِيْرُ بَلْخٍ بِالصِّيَامِ لِكَفَّارَةِ عَنْ يَمِيْنِهِ ؛ وَلَوْ أَخَذَهَا السَّاعِيْ جَبْرًا لَمْ تَقَعْ زَكَاةٌ لِكَوْنِهَا بِلَا اِخْتِيَارٍ،وَلٰكِنْ يُجْبَرُ بِالْحَبْسِ لِيُؤَدِّيَ بِنَفْسِهِ لِأَنَّ الْإِكْرَاهَ لَا يُنَافِي الْإِخْتِيَارَ ۔وَفِي "التَّجْنِيْسِ": اَلْمُفْتٰى بِهِ سُقُوْطُهَا فِي الْأَمْوَالِ الظَّاهِرَةِ لَا الْبَاطِنَةِ ۔

ترجمہ:’’ اگر باغی اور ظالم حکمراں لوگوں سے (زبردستی) اموالِ ظاہری کی زکوٰۃ لے لیں جیسے اونٹوں (جانوروں کی زکوٰۃ) عشراور خراج وغیرہ ،تو مالک کے ذمے دوبارہ ادائیگی لازم نہیں ہے بشرطیکہ اُنہوں نے اُسے صحیح مَصرف پر صرف کیا ہو،جس کا بیان ’’بابُ المصرف‘‘ میں آئے گا ۔اوراگر مَصرف میں خرچ نہیں کیا تو دیانتاً مال کے مالک پر لازم ہے کہ زکوٰۃ دوبارہ ادا کرے،سوائے خراج کے کہ اُس کا اعادہ لازم نہیں ہے، کیونکہ وہ خراج کے مستحق ہیں اوراہلِ بغی اہلِ حرب سے مقاتلہ کرتے ہیں۔

اموالِ باطنہ (نقوداورزیورات وغیرہ) میں اختلاف ہے ’’ولوالجیہ‘‘ اور’’شرح الوہبانیہ‘‘ میں ہے:مفتیٰ بہ قول یہی ہے کہ اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی ،یعنی پھر سے ادا کرنا ہوگی ۔اور’’مبسوط‘‘ میں ہے:صحیح ترین قول یہ ہے کہ ادا ہو جائے گی یعنی مالک پر دوبارہ ادائیگی لازم نہیں ہے، جبکہ پوشیدہ مال کی زکوٰۃ باغیوں اور ظالموں نے لے لی ہو بشرطیکہ مال کا مالک ظالموں کو دیتے وقت اُن پر صدقہ کی نیت کرلے کہ ان پر لوگوں کے واجب الادا حقوق کے سبب وہ فقیر ہیں ،اوراسی لئے امیر بلخ کو علماء نے فتویٰ دیا کہ وہ اپنی قسم توڑنے پر روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرے (یعنی اس کے پاس جو مال ہے،وہ ظلماً لوگوں سے لیا گیا ہے،لہٰذا اس مال پر اس کی مِلک صحیح نہیں ہے کہ قسم کا مالی کفارہ اس کا صحیح تسلیم کیا جائے)۔اوراگر کوئی زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرے اور حاکم کے عامل

(Recovery Inspector) نے زبردستی زکوٰۃ لے لی تو ادا نہ ہوگی کہ اس میں زکوٰۃ دینے والے کا اختیار اور مرضی شامل نہیں ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں نیت اور اختیار ضروری ہے۔لیکن حاکم کا نمائندہ اُس زکوٰۃ نہ دینے والے شخص کو قید و بند کے ذریعے زکوٰۃ کی ادائیگی پر مجبور کرے گا۔تاکہ وہ خود زکوٰۃ ادا کرے کہ مجبور کرنا اختیار کے منافی نہیں ہے۔''تجنیس'' میں ہے کہ: جابر حاکم کو دینے کی صورت میں مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ اموالِ ظاہری میں زکوٰۃ ساقط ہوجاتی ہے نہ کہ باطنی میں، (یعنی ان اموال کی زکوٰۃ دوبارہ دینی ہوگی ،آج سونے ،چاندی کے زیورات ،نقد رقوم ، بینک ڈپازٹس اور مختلف نوعیت کے سیونگ سرٹیفکیٹ ،شیئرز اور مالِ تجارت اموالِ باطنہ میں شمار ہوتے ہیں)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:199 تا 201، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

زکوٰۃ کی رقم سے قرض کی ادائیگی

سوال: (الف) ایک شخص جو کہ قرض دار ہے اور بینک سے سود پر رقم قرض لی ہے، گھر گروی ہے، کچھ اور لوگوں کا پیسہ بھی دینا ہے جو کہ لاکھوں میں ہے ،ضروریاتِ زندگی کی اشیاء گھر میں موجود ہیں۔دریافت یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی قریبی رشتے دار زکوٰۃ کی رقم سے اس کا قرض ادا کرنا چاہے تو کتنی رقم زکوٰۃ کی مد میں اسے دے سکتا ہے؟۔

(ب) ایک شخص مختلف لوگوں سے قرض لیتا ہے اور پھر کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہوجاتا ہے اس کے گھر کے افراد وہ قرض چکانے کی استطاعت نہیں رکھتے کیا کوئی قریبی رشتہ دار یہ قرض زکوٰۃ کی رقم سے ادا کرسکتا ہے؟۔

جواب:

(الف) اگر آپ کا بیان درست ہے اور اُس مقروض شخص کا قرض اُس کے تمام مال پر محیط ہے یا اُس کے مجموعی مال سے زیادہ ہے، تو اُسے قرض سے نجات کے لئے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اگر ایسے شخص کو زکوٰۃ کی اتنی رقم دے دی جائے کہ اُس کا تمام یا اکثر قرض ادا ہوجائے ،تو بھی جائز ہے۔گھریلو سامان جس کا تعلق اُس کی بنیادی حاجات وضروریات سے ہے، اس سے وہ مالدار نہیں قرار پاتا ،جیسے آج کل لوگوں کے پاس ریفریجریٹر اور ٹی۔وی ہوتا ہے یا کوئی سواری ہوتی ہے، جیسے موٹر سائیکل یا کار وغیرہ یا استعمال کے برتن اور فرنیچر وغیرہ ہوتا ہے۔یہ چیزیں استحقاقِ زکوٰۃ سے مانع نہیں ہیں۔البتہ جو لوگ قرض لے کر یہ چیزیں لیتے ہیں، اُن کی یہ

عادت معیوب ہے، کیوں کہ ان کے بغیر گزراوقات ممکن ہے۔ انتہائی اضطرار کے بغیر سودی قرض ناجائز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

(ب) اگر کوئی شخص مقروض تھا اور اُس کا انتقال ہو گیا اور اُس نے اتنا ترکہ بھی نہیں چھوڑا کہ جس سے اُس کا قرض ادا کیا جائے، تو زکوٰۃ کے مال سے اُس کا قرض براہِ راست تو ادا نہیں کیا جا سکتا، البتہ اُس کے ورثاء میں سے کوئی مستحق زکوٰۃ ہے، تو اُسے زکوٰۃ کا مال دے کر اِس بات کی ترغیب دیں کہ وہ اپنے اس فوت شدہ عزیز کا قرض ادا کر دے۔ ہاں! اگر کوئی مال دار شخص اپنے طیب مال میں سے کسی زندہ یا فوت شدہ مقروض کا قرض ادا کر دے تو عنداللہ یہ بہت بڑے اجر کی بات ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے نادار کے قرض کی ادائی از کوٰۃ کی رقم ھبہ یا قرض کہہ کر دینا

سوال: کیا زکوٰۃ کی رقم ایسے عزیز کو دی جا سکتی ہے، جو اپنی قلیل تنخواہ کی وجہ سے مقروض ہے اور اس کی لڑکی کی شادی طے ہو گئی ہے، مگر شادی کا خرچ نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ معلوم ہے کہ وہ شخص زکوٰۃ کی رقم لینے پر تیار نہیں ہوگا تو کیا اس کو بتائے بغیر اس کے قریبی رشتہ دار زکوٰۃ کی رقم دے سکتے ہیں، کیا اس طرح زکوٰۃ کی ادائی ہو جائے گی؟۔

جواب: زکوٰۃ کے صحیح طور پر ادا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جسے زکوٰۃ دی جا رہی ہے، وہ زکوٰۃ کا مستحق ہو، صاحبِ نصاب نہ ہو، سید و ہاشمی نہ ہو، تو ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ زکوٰۃ کا مستحق وہ شخص ہے، جس کے پاس کم از کم نصاب کے مساوی بنیادی ضروریات سے فاضل مال موجود نہ ہو۔ نصابِ شرعی کی مقدار یہ ہے 612.36 گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم، یا مالِ تجارت جو اس کی بنیادی ضروریات سے زائد ہو۔ قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے مستحق کے حکم سے اس کا قرض بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور زکوٰۃ کے مستحق شخص کو بتائے بغیر بھی زکوٰۃ کی رقم دی جا سکتی ہے، بلکہ ہبہ یا قرض کہہ کر بھی دی جا سکتی ہے اور دل میں یہ نیت ہو کہ واپس نہیں لوں گا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ”مَنْ أَعْطَى مِسْكِينًا دَرَاهِمَ وَسَمَّاهَا هِبَةً أَوْ قَرْضًا وَنَوَى الزَّكَاةَ فَإِنَّهَا تُجْزِيهِ وَهُوَ الْأَصَحُّ هٰكَذَا فِي ”اَلْبَحْرِ الرَّائِقِ“۔ ناقلاً عن المبتغی والقنیة۔

ترجمہ: ''اور جو شخص زکوٰۃ کے مستحق مسکین کو کچھ درہم (زکوٰۃ کی مد میں) یہ کہہ کر دے کہ یہ ہبہ یا قرضہ ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کرلے، تو یہ عمل ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی ہے اور یہی قول صحیح ترین ہے ''البحر الرائق'' میں ''المبتغی'' اور ''القنیہ'' سے اسی طرح منقول ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 171، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

ادھار کی رقم سے زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال: میں نے زکوٰۃ کے پیسے رکھے تھے، جو ایک صاحب کو جو انتہائی مجبور تھے، ادھار میں دیدیئے۔ سوال یہ پوچھنا ہے کہ کیا زکوٰۃ میں سے رقم بطور ادھار دی جاسکتی ہے اور آیا سال گزرنے کے بعد جب ادھار دی ہوئی رقم مل جائے، اس وقت زکوٰۃ دینے پر کوئی حرج تو نہیں ہے؟۔

جواب: اپنے مال میں سے زکوٰۃ کی رقم نکال کر اسے اپنے پاس الگ رکھنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی بلکہ اسے مستحق تک پہنچانا اور اُسے اِس کا مالک بنانا ضروری ہے۔ کسی کو واپس وصول کرنے کی نیت سے قرض دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر کا گناہ آپ کے ذمے ہوگا۔ آپ پر لازم ہے کہ جتنی زکوٰۃ آپ پر عائد ہوتی ہے، اسے فوراً اپنے پاس موجود مال سے ادا کردیں، اُس قرض کی واپسی کا انتظار نہ کریں۔ اور اگر آپ نے گزشتہ کئی سالوں سے اس رقم کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، تو مقدارِ واجب کو نکال کر بقیہ رقم اگر نصاب کی مقدار کو پہنچتی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، مثلاً آپ کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور سال گزرنے پر ساڑھے بارہ ہزار روپے زکوٰۃ واجب ہوگئی اور اس سال آپ نے زکوٰۃ ادا نہیں کی تو آئندہ سال کی زکوٰۃ جب ادا کریں گے تو مقدارِ واجب یعنی ساڑھے بارہ ہزار کو چھوڑ کر بقیہ چار لاکھ ستاسی ہزار پانچ سو کی زکوٰۃ آپ پر واجب ہوگی۔ صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ کی نیت سے اپنے کل رقم میں سے جو پیسے آپ نے علیحدہ کئے اور پھر وہ رقم آپ نے دوسرے کو بطورِ قرض دے دی، تو اب آپ آئندہ سال جب بھی زکوٰۃ ادا کریں گے تو گزشتہ سال آپ کی رقم پر جتنی زکوٰۃ واجب تھی اس مقدار واجب کو چھوڑ کر بقیہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اسپتال کے لئے زکوٰۃ کی رقم سے آلات طب کی خریداری

سوال: میرا ایک اسپتال ہے اس میں غربا، مساکین کا مفت علاج کیا جاتا ہے، آنکھوں کے علاج و آپریشن کا

شعبہ بھی ہے۔غیر مستحق افراد سے مناسب فیس اور خرچہ لیا جاتا ہے اس آمدنی سے بھی غرباء ومساکین کے علاج میں رقم خرچ کی جاتی ہے۔اب ہم ہسپتال میں آلات ومشینری وغیرہ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں خصوصاً شعبۂ امراضِ چشم میں۔سوال یہ ہے کہ کیا زکوٰۃ کی رقم سے آلات ومشنری برائے ہسپتال خریدی جاسکتی ہیں؟۔

جواب: محتاط صورت تو یہ ہے کہ آلات ومشینری زکوٰۃ کی رقم سے لے کر کسی بھی مستحقِ زکوٰۃ کی ملک کردی جائے اور وہ اسے آپ کے ہسپتال کو ہبہ کردے۔پھر اسے آپ مستحق زکوٰۃ مریضوں،نصف فیس یا مکمل فیس دینے والے یا غیر مستحق زکوٰۃ مریضوں کے لئے بھی بلا فیس استعمال کر سکتے ہیں اور کسی سے پوری فیس بھی چارج کر سکتے ہیں،فقط واللہ اعلم بالصواب۔

زکوٰۃ کی رقم سے مقامی بچوں کے لئے تعلیم القرآن کا مدرسہ چلانا

سوال: میں اپنی سالانہ زکوٰۃ میں سے محلے کے دو مدرسے اس طرح چلاتا ہوں کہ محلے کے بچے پڑھنے کے لئے آتے ہیں،کوئی رہائشی یا مسافر طالب علم نہیں ہے۔لڑکوں کو معلم قاری صاحب اور لڑکیوں کو معلّمہ قاریہ صاحبہ پڑھاتی ہیں۔ان دونوں کا ماہانہ وظیفہ،مدرسے کے لئے ڈیسکیں،پنکھا اور دیگر اخراجات زکوٰۃ کی رقم سے ادا کرتا ہوں،گزشتہ دو سال سے اسی مذکورہ بالا طرز پر یہ دو مدارس میں چلا رہا ہوں،کیا میری ادا کردہ زکوٰۃ درست ہے؟۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوٰۃ قرآن مجید کی سورۃ التوبۃ :60 میں متعین فرمادیئے ہیں اور وہ آٹھ مدات ہیں: (1) فقراء (2) مساکین (3) عاملین زکوٰۃ (4) مؤلفۃ القلوب (5) جن کی گردن کسی بڑے مالی بار تلے دبی ہوئی ہو (6) جن پر کوئی بھاری تاوان آگیا ہو،جس سے گلوخلاصی کی کوئی سبیل نہ ہو (7) جو اپنے آپ کو ہمہ وقتی اللہ کے دین کے لئے وقف کر چکے ہوں اور معاشی تگ ودو کے لئے انہیں وقت میسر نہ ہو (8) جو مسافر کسی ایسے مقام پر گھر گئے ہوں کہ قوت لایموت دستیاب نہ ہو اور گھر سے رابطہ اور مالی معاونت کا حصول ممکن نہ ہو۔زکوٰۃ کا مال صرف اس پر صرف کیا جاسکتا ہے جو قرآن مجید میں بیان کردہ ان مدات میں سے کسی ایک کے تحت مستحق زکوٰۃ قرار پاتا ہو۔وہ مقامی شہری بچے جو مدارس یا مکاتب تعلیم القرآن میں حفظ وناظرہ کی تعلیم پا رہے ہوتے ہیں اور جن کے والدین اور کفیل خود زکوٰۃ وصدقات ادا کرتے ہیں،ان پر بلاواسطہ زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا درست نہیں ہے،بالواسطہ اس طرح کہ ان کے معلم ومدرس کو اس لئے براہِ راست زکوٰۃ کی رقم میں سے تنخواہ دی جائے کہ وہ ان

کے بچوں کو پڑھاتا ہے یعنی اجرت کی مد میں زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ ہاں البتہ اگر ایسا کوئی مدرس فی نفسہٖ مستحق زکوٰۃ ہے تو اسے اجرت کے ماسوا زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، عام ازیں کہ وہ بچوں کو پڑھائے یا نہ پڑھائے، اگر اسے زکوٰۃ غیر مشروط طور پر استحقاق کی بنا پر دی جارہی ہو اور وہ رضا کارانہ طور پر رضائے الٰہی کے لئے قرآن مجید کی تعلیم دے رہا ہو، اسے اس پر شرط یا لازم نہ قرار دیا گیا ہو تو درست ہے۔ البتہ اگر زیرِ تعلیم بچے بھی ایسے لوگوں کے ہیں، جو نادار اور مستحقِ زکوٰۃ ہیں، تو ادارے کا سربراہ زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل بن کر کسی مستحق زکوٰۃ کو اس کا مالک بنا دے پھر وہ شخص مدرسے کے انتظامات کے لئے اپنی مکمل رضامندی سے وہ رقم ادارے کے سربراہ کے حوالے کر دے، اب وہ رقم ادارے کے انتظامات پر اور معلمین کی تنخواہوں پر خرچ ہوسکتی ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے ڈائلیسس مشین کی خریداری

سوال: عرض یہ ہے کہ ہم "عزیز طبہ فاؤنڈیشن" کے زیر اہتمام فیڈرل "بی" ایریا میں ایک ڈائلیسس سینٹر چلا رہے ہیں جہاں پر ناکارہ گردے کے مریضوں کا ڈائلیسس کیا جاتا ہے اور اس سے زیادہ تر زکوٰۃ کے مستحق لوگوں کا ڈائلیسس کیا جاتا ہے۔ جب کہ کچھ لوگ آدھے چارج یا پورے چارج دیتے ہیں انکا بھی ڈائلیسس کیا جاتا ہے۔

ہمیں کچھ صاحب ثروت حضرات زکوٰۃ کی مد سے ڈائلیسس کی مشین دینا چاہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں کہ: 1۔ کیا زکوٰۃ فنڈ سے ڈائلیسس مشین لی جائے یا نہیں؟۔

2۔ اگر مشین لی جائے تو اس پر پورے یا آدھے چارج دینے والے مریضوں کا علاج کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟، اگر چارج دینے والوں کا علاج زکوٰۃ فنڈ سے لی ہوئی ڈائلیسس مشین سے نہیں کر سکتے تو برائے مہربانی شریعت اسلامیہ کے مطابق اسکا کوئی حل ہوسکتا ہے تاکہ عوام الناس کے فائدے کے لئے زکوٰۃ فنڈ سے خریدی ہوئی ڈائلیسس مشین استعمال ہوسکے۔

جواب: محتاط صورت تو یہ ہے کہ ڈائلیسس مشین زکوٰۃ کی رقم سے لے کر کسی بھی مستحق کی ملک کر دی جائے اور وہ اسے آپ کے ڈائلیسس سنٹر کو ہبہ کر دے، پھر اسے آپ مستحق زکوٰۃ مریضوں، نصف فیس یا مکمل فیس دینے والے یا غیر مستحق زکوٰۃ مریضوں کے لئے بھی بلا فیس استعمال کر سکتے ہیں اور کسی سے پوری فیس بھی چارج کر سکتے ہیں۔

دوسری صورت بر سبیل تنزل یہ ہے کہ ائمہ احناف کے ہاں تو زکوٰۃ میں تملیک یعنی مستحق کو مالک بنانا شرط ہے لیکن اہلسنت کے دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک آخری چار مصارف میں تملیک شرط نہیں ہے۔ ہمارے مفسرین احناف میں سے علامہ خفاجی، علامہ شیخ زادہ، علامہ ابو سعود اور علامہ محمود آلوسی نے فقراء، مساکین، عاملین اور مؤلفة القلوب کے لئے تو تملیک کی شرط کو برقرار رکھا ہے لیکن مکاتب غلاموں کی آزادی، مقروض افراد یا کسی تاوان یا جرمانے میں پھنسے ہوئے افراد، مسافروں اور ان لوگوں کے لئے جو ہمہ وقت اللہ کے دین کے کسی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہیں، جیسے مجاہدین فی سبیل اللہ یا دینی طلبہ، لیکن مستحق زکوٰۃ ہیں، ان کے لئے تملیک کو شرط لازم قرار نہیں دیا بلکہ ان کے مصالح پر خرچ کر سکتے ہیں، پس اگر ڈائیلیسس مشینیں زکوٰۃ فنڈ سے خریدی جائیں تو پھر ان مشینوں سے صرف مستحقین ہی استفادہ کر سکیں گے۔

علامہ قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی حنفی متوفی 1069ھ سورۃ التوبۃ آیت نمبر 60، جس میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کا بیان فرمایا ہے، اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: پہلے چار مصارف کے ساتھ ''لام'' اور آخری چار مصارف کے ساتھ ''فی'' ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ سے ان کا حصہ ادا کر کے ان کو ان حصوں کا مالک بنا دیا جائے۔ اور آخری چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ میں سے ان کے حصے کا مالک نہیں بنایا جائے گا، بلکہ ان کا حصہ ان کی فلاح اور ان کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا، مکاتب کا مال اس کے مالک کو دیا جائے گا اور مقروض کا مال (اس کے حصے کی زکوٰۃ) اس کے قرض خواہ کو دیا جائے گا، اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنا بالکل واضح ہے، (عنایت القاضی جلد 4 ص: 558، دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

چونکہ گردے کی بیماری ایک خطرناک مہلک بیماری ہے، جو جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے، مریض کی بقاء حیات کے لئے ڈائیلیسس طبی طور پر ناگزیر ہے، اس لئے ہم نے اس میں دوسرے ائمہ کے قول کو اس اصول کی بنیاد پر اختیار کیا ہے کہ: ''ضرورت ممنوعات کو بھی مباح کر دیتی ہے''۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی پیش نظر رہے کہ: ''ضرورت کی بناء پر دی جانے والی رخصت یا جواز کو اس کے دائرے میں محدود رکھنا چاہئے''۔ ہم نے اس مسئلے میں بعض حنفی مفسرین کے بیان کردہ یُسر (آسانی) والے قول کو نقل کیا ہے، لیکن فقہ حنفی کا مسلمہ اور مختار مسلک یہی ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے، لہٰذا ہماری بیان کردہ اس رخصت کو دوسرے مقامات یا مواقع کے لئے استعمال نہ کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ زکوٰۃ

سوال: میری مالی حالت صحیح نہیں ہے اور گھر میں کوئی زیور وغیرہ بھی نہیں ہے اور میں 30,000/ روپے کا مقروض ہوں۔ میری بچی ایک ادارے میں قرآن پاک حفظ کر رہی ہے، اور اس ادارے کی ماہانہ فیس ایک ہزار روپے ہے، جو کہ مجھے ادا کرنا ہوتی ہے، لہٰذا کیا میں زکوٰۃ لے سکتا ہوں یا نہیں؟۔

جواب: اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ کے پاس ضروریاتِ زندگی کے علاوہ 612.36 گرام چاندی کی مروجہ قیمت کے برابر بھی رقم فاضل نہیں ہے، تو آپ مستحقِ زکوٰۃ ہیں اور آپ زکوٰۃ لے سکتے ہیں۔

مقدارِ نصاب پر زکوٰۃ بہر صورت واجب ہے

سوال: میری شادی کو اس ماہ 15 سال ہو جائیں گے لیکن میں نے آج تک اپنے زیور کی زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے میرے پاس دونوں طرف سے ملا کر 35 تا 40 تولے سونا ہے۔ شروع میں ہمارے حالات ایسے نہیں تھے کہ ہم زکوٰۃ ادا کرتے، میرے شوہر کی اُس وقت ساڑھے تین ہزار روپے تنخواہ تھی۔ میں نے اپنے شوہر سے دو، تین بار کہا کہ آپ ہر ماہ مجھے (جتنی سہولت ہو) زکوٰۃ کے نام کے پیسے دے دیا کریں، سال کے آخر میں جتنی کمی ہوگی ہم کوئی زیور بیچ کر ادا کر دیں گے لیکن وہ نہیں مانتے۔ ان کے والدین بھی ساتھ ہی تھے لیکن والد اچھا کماتے تھے۔ دس سال تک ہمارے حالات ٹھیک نہیں رہے، گزشتہ 5 سالوں سے اللہ کا بہت کرم ہے اس کا شکر ہے کہ حالات بہتر ہیں، لیکن میرے شوہر کہتے ہیں کہ میں گزشتہ 10 سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کروں گا، وہ مجھ پر فرض نہیں ہے، نہ میرا جیب خرچ دیتے ہیں، نہ ہی میرا کوئی ذریعۂ آمدنی ہے، میں کہاں سے زکوٰۃ ادا کروں، اگر ہر سال زیور بیچتی رہی تو بچیوں کیلئے کیا رکھوں گی۔ برائے مہربانی شرعاً بتائیں کہ میرے اور میرے شوہر کے لئے کیا حکم ہے؟۔

جواب: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔

ترجمہ: "(اے حبیب ﷺ!) آپ مؤمنوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) لیجیے تاکہ اس کے ذریعے آپ ان کے ظاہر و باطن کو پاک وصاف کریں"، (التوبہ:103)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی مال ہی میں سے ہوگی، اگر نقد رقم موجود نہ ہو تو سونے، چاندی ہی میں

سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ حدیث مبارک ہے: عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ اَنَّ امْرَأَةً أَتَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، وَمَعَهَا اِبْنَةٌ لَهَا، وَفِيْ يَدِ اِبْنَتِهَا مَسْكَتَانِ غَلِيْظَتَانِ مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَ لَهَا: أَتُعْطِيْنَ زَكَاةَ هٰذَا؟، قَالَتْ: لَا ،قَالَ: "اَيَسُرُّكِ أَنْ يُسَوِّرَكِ اللّٰهُ بِهِمَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ سِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ ؟، قَالَ: فَخَلَعَتْهُمَا فَأَلْقَتْهُمَا اِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَقَالَتْ: هُمَا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ

ترجمہ: ''عمرو بن شعیب اپنے والد عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے موٹے اور بھاری کنگن تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم ان کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ اس نے عرض کی ''نہیں''، حضور ﷺ نے فرمایا ''تو کیا تم اس بات پر خوش ہو گی کہ اللہ تعالیٰ (زکوٰۃ نہ دینے کی بناء پر) ان کنگنوں کے عوض قیامت کے دن تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟ یہ (وعیدِ عذاب) سنتے ہی اس نے وہ کنگن اتار کر رسول اللہ ﷺ کو دے دیئے اور عرض کی کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہیں (یعنی یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں صدقہ ہیں)''۔

(سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 1558)

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال بڑھتا ہے، یہ خیال کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال گھٹتا ہے، نرا ضعفِ ایمان ہے، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، (البقرہ: 276)''۔

بعض درختوں میں کچھ اجزائے فاسدہ اس قسم کے پیدا ہو جاتے ہیں کہ پیڑ کی اٹھان کو روک دیتے ہیں، احمق نادان انھیں نہ تراشے گا کہ میرے پیڑ سے اتنا کم ہو جائے گا، پر عاقل ہوشمند تو جانتا ہے کہ ان کے چھانٹنے سے یہ نونہال لہلہا کر درخت بنے گا ورنہ یوں ہی مرجھا کر رہ جائے گا، یہی حساب زکوٰتی مال کا ہے۔ حدیث میں حضور پرنور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں: ''مَا خَالَطَتِ الصَّدَقَةُ اَوْ مَالُ الزَّكٰوةِ مَالًا اِلَّا اَفْسَدَتْهُ رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَالْبَيْهَقِيُّ عَنْ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ الصِّدِّيْقَةِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا ۔ ترجمہ: زکوٰۃ کا مال جس مال میں ملا ہو گا اسے تباہ و برباد کر دے گا اسے بزار اور بیہقی نے ام المومنین الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا''۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 10 ص: 172، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)

جو مقدار سونے کی آپ نے بیان کی، آپ پر اس کی زکوٰۃ فرض ہے، اگر زکوٰۃ کی ادائیگی کا کوئی دوسرا ذریعہ آپ کے پاس نہیں تھا تو آپ اسی سونے میں سے چالیسواں حصہ (1/40 یا 2.5 فیصد) زکوٰۃ ادا کرتی رہتیں۔ قرآن کے صریح حکم کا مطلب یہ ہے کہ جو مال (سونے، چاندی، نقد یا مالِ تجارت کی صورت میں) آپ کے پاس ہے، ہر اسلامی قمری سال کے اختتام پر اس میں سے زکوٰۃ ادا کریں، یعنی اس سونے کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دیں، نقد رقم کی صورت میں زکوٰۃ ادا کرنا ضروری نہیں ہے، نقد رقم کی صورت میں ادائیگی تو ہم اپنی سہولت کیلئے کرتے ہیں، کیونکہ ہم سونے یا زیور کو اسی شکل میں باقی رکھنا چاہتے ہیں، لہٰذا گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بدستور آپ پر واجب الادا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اگر آپ کے پاس اور کوئی نقد رقم ان برسوں میں فاضل نہیں بچی تو آپ زکوٰۃ کا حساب اس طرح کریں گے کہ مثلاً سونا 100 گرام ہے تو سال اول کے اختتام پر 2.5 گرام زکوٰۃ لازم ہوگئی، اب اگلے سال 97.5 گرام کی زکوٰۃ آپ کے ذمہ ہے، اسی طرح سے سال بہ سال کا حساب ہوگا۔ بچیوں کیلئے زکوٰۃ روک کر بچانا آپ پر شرعاً لازم نہیں ہے، اگر سونے کی ملکیت آپ کے نام ہے، تو زکوٰۃ بھی آپ کے ذمہ ہے، شوہر پر لازم نہیں، وہ اس سلسلہ میں آپ سے تعاون کریں تو ان کی مہربانی ہے، اور خوشگوار عائلی زندگی کا مدار باہمی مروت اور فضل و احسان پر ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ احسان کا برتاؤ کریں اور جن بچیوں کیلئے آپ سونا بچا کر رکھنا چاہتی ہیں، وہ ان کی بھی اولاد ہے، لیکن جس سونے کی زکوٰۃ دنیا میں ادا نہ کی گئی ہو تو اس کے بارے میں قرآن و حدیث میں سخت وعید ہے کہ اسے آگ میں گرم کر کے اس سے داغا جائے گا۔

زکوٰۃ کے مصارف اور اُن میں خرد بُرد

سوال: 1۔ ہماری برادری کے مُخیّر حضرات ہر سال رمضان المبارک میں لاکھوں روپے (زکوٰۃ و صدقات) نادار گھرانوں کی کفالت کے لئے انجمن کے عہدیداروں کو امین بناتے ہیں، پھر چرمِ قربانی کی مد میں لاکھوں روپے کی رقم جمع ہوتی ہے۔ عہدیداران رمضان المبارک تا عیدِ قرباں منظرِ عام پر رہ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ جمع شدہ زکوٰۃ کی رقم سال بھر خرچ نہیں کرتے، ضرورت مند افراد ایک ایک پیسے کو ترستے ہیں، چرمِ قربانی کی آمدنی پانچ سالوں سے بینک میں سیونگ اکاؤنٹ میں جمع ہے۔ جسے ضرورت کے باوجود خرچ نہیں کیا جا رہا۔ مفتی صاحب! مسلک اہلسنت کی روشنی میں قرآن کیا کہتا ہے؟۔

سوال: 2۔ انجمن کے تحت چلنے والا میڈیکل سینٹر جو 24 گھنٹے دکھی انسانیت کی خدمت انجام دے رہا ہے،

کے فنڈ منجمد کر دیئے گئے ہیں۔ایک مرحومہ کے لواحقین نے میڈیکل سینٹر کی توسیع کے لئے لاکھوں روپے عطیہ کئے۔اُس کے اثاثے میڈیکل سینٹر کے کام تو نہ آئے ،عہدیدار اس سے اپنی ضرورتیں پوری کرر ہے ہیں۔مفتی صاحب!ایسےلوگوں کے لئے قرآن کیا کہہ رہا ہے؟۔

جواب: کمیونٹیز یا انجمنوں کے ذمہ داران زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اہلِ ثروت حضرات کے صرف وکیل ہوتے ہیں،اگر وہ اس ذمہ داری کو شرعی احکام کے مطابق ادانہیں کریں گے تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔زکوٰۃ جب تک مستحق تک نہیں پہنچے گی،محض کمیونٹیز یا برادریوں کے فنڈ/اکاؤنٹ میں جمع ہونے سے ادانہیں ہوگی،نیز فطرہ وزکوٰۃ کی رقوم جب تک الگ مَد میں رکھ کرتملیک (کسی کو مال کا مالک بنانا) کے شرعی اصول کے مطابق مستحق افراد کو ادانہیں کی جائے،ادانہیں ہوگی۔مذکورہ صورت میں ذمہ داران صرف امین ہیں اور اُس رقم کو صحیح طور پرخرچ نہ کرنا یاغبن کرنا،خیانت کے زمرے میں آئے گا، امانت میں قصداً خیانت سے متعلق قرآنِ مجید میں آیاتِ کریمہ اوراحادیثِ مبارکہ بکثرت موجود ہیں اوراُخروی عذاب کی وعیدیں بھی ہیں۔مذکورہ ذمہ داران پراس رقم کا تاوان دینالازم ہےاورزکوٰۃ دینے والوں پراپنی زکوٰۃ کی دوبارہ ادائیگی لازم ہے۔امام احمدرضا قادری قدس سرہ العزیزایک حدیث کا حوالہ درج فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:ماخالطت الصدقة او مال الزكوٰة مالاً الّا افسدتهٗ رواه البزار والبیهقی عن ام المومنین الصدیقه رضی الله تعالیٰ عنها۔

ترجمہ:''زکوٰۃ کا مال جس مال میں ملا ہوگا،اُسے تباہ وبرباد کردے گا،اس حدیث کو بزاراور بیہقی نے ام المومنین الصدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا،(فتاویٰ رضویہ،جلد10،ص:172،مطبوعہ:رضافاؤنڈیشن،لاہور)''۔

اسی حدیث کی شرح میں علامہ امجدعلی اعظمی لکھتے ہیں:''بعض ائمہ نے اس حدیث کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ زکوٰۃ واجب ہوئی اورادانہ کی اوراپنے مال میں ملائے رہاتو یہ حرام اُس حلال کو ہلاک کردے گااورامام احمد نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ مال دارشخص مالِ زکوٰۃ لےتو یہ مالِ زکوٰۃ اس کے مال کو ہلاک کردے گا کہ زکوٰۃ فقیروں کے لئے ہےاوردونوں معنی صحیح ہیں،(بہارِشریعت،جلداوّل،ص:357)''۔

ہلاکت کے دومعنی ہیں:ایک یہ کہ وہ مال ہلاک ہوجائے گااوردوسرا یہ کہ زکوٰۃ کے اختلاط سےاس مال میں برکت نہیں رہے گی۔

ایسے اراکین جو زکوٰۃ وفطرہ کی رقم مستحقین تک نہیں پہنچاتے اُس میں غبن کرتے ہیں، برادری/انجمن کے ذمہ داران کو چاہئے کہ اُنہیں فوری طور پر معزول کردیں، اسی طرح مرحومہ کے لواحقین نے جو رقم میڈیکل سینٹر کے لئے دی، وہ محض اُسی کام کے لئے وقف تھی، اُسے کسی دوسرے مصرف یا ذاتی مصارف میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

زکوٰۃ اور کمیونٹی فنڈز

سوال: ہماری انجمن برادری کی نمائندہ سماجی وفلاحی رجسٹرڈ تنظیم ہے، برادری فلاح و بہبود اور تعمیر وترقی کے علاوہ غریب ونادار، یتیم ومسکین طلباء وطالبات، بیواؤں، جہیز کی حق دار بچیوں اور دیگر ضرورت مند افراد کی زکوٰۃ فنڈ سے مدد کرتی ہے۔ جس کے لئے صاحبِ حیثیت افراد سے زکوٰۃ کی رقم جمع کی جاتی ہے۔ انجمن کے تحت شہرِ کراچی واندرونِ سندھ فری ڈسپنسری، سلائی سینٹر، ناظرہ قرآن کی تعلیم کے سینٹر، ٹیوشن سینٹر وغیرہ بھی چلائے جاتے ہیں۔ کیا ہم زکوٰۃ فنڈ سے ملازمین کی تنخواہیں، دفتری اخراجات اور دیگر ضروریات کی مد میں استعمال کرسکتے ہیں؟۔

(۲) انجمن کے حلقہ جات میں سماجی اداروں کے لئے عمارتیں تعمیر ہورہی ہیں، جن میں ڈسپنسری، سلائی سینٹرز وغیرہ۔ کیا ہم زکوٰۃ فنڈ سے ان اداروں کی تعمیر کرسکتے ہیں؟۔

جواب: بعض کمیونیٹیز، برادریوں، مخصوص خاندانی یا علاقائی وحدت کے لوگوں نے اپنی کمیونیٹی یا برادری کے افراد کے لئے فنڈ قائم کررکھے ہیں، جس میں زکوٰۃ وفطرہ کی رقوم وصول کی جاتی ہیں۔ عمومی طور پر ان رقوم کے خرچ کرتے وقت شرعی معیار کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اول تو زکوٰۃ کی رقم محض برادری کے فنڈ میں جمع ہونے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی تاوقتیکہ مستحقِ زکوٰۃ تک نہ پہنچادی جائے۔ دوسرا یہ کہ زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم جب تک الگ مد میں رکھ کر تملیک کے شرعی اصول کے مطابق مستحق افراد کو نہیں دی جائے گی، ادا نہیں ہوگی۔ انجمنوں (Associations) کے ذمہ داران زکوٰۃ کا مال صَرف کرنے کے لئے اہلِ ثروت کے وکیل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس ذمہ داری کو شرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے، تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔ رفاہی ادارے جو مریضوں کے علاج کے لئے زکوٰۃ کی رقم جمع کرتے ہیں، وہ اگر حدودِ شرع میں رہ کر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہتے ہیں، تو اس کی چند صورتیں یہ ہیں: (۱) جو دوا نادار مستحقِ زکوٰۃ کی مِلک میں دے دی جائے گی، وہ

جائز ہے (۲) ڈاکٹر کی فیس، بیڈ کے کرائے، ایکسرے، میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ پر جو خرچ آئے، وہ مریض خود ادا کرے اور استحقاق کے تعین کے بعد شعبۂ زکوٰۃ سے مریض کو ان مصارف کے عوض کل یا گنجائش کے تناسب سے جتنی رقم دی جاسکتی ہے، دے دی جائے (۳) زکوٰۃ و فطرہ یعنی صدقاتِ واجبہ کی رقم صرف مستحق مریضوں کو دی جائے، غیر مسلم نادار مریضوں کے لئے الگ سے ''ویلفیئر فنڈ'' قائم کیا جائے جو عطیات پر مشتمل ہو، یہ نفلی خیرات، صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ کے زمرے میں آئے گا، جسے (General Charity) کہتے ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ نفلی صدقہ و خیرات اور عطیات پر مشتمل ایک رفاہی فنڈ (Welfare Fund) قائم کریں، جس سے ضرورت مندوں کو علاج معالجے کی سہولیات دیں اور اُسی رقم سے ڈسپنسری کے اخراجات اور انجمن کے کارکنان کی تنخواہیں ادا کریں۔

زکوٰۃ کی رقم تعمیرات کی مد میں استعمال نہیں کی جاسکتی، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَلَا یَجُوزُ أَنْ یُبْنَی بِالزَّکَاۃِ الْمَسْجِدُ وَکَذَا الْقَنَاطِرُ وَالسِّقَایَاتُ وَإِصْلَاحُ الطُّرُقَاتِ وَکَرْیُ الْأَنْهَارِ وَالْحَجُّ وَالْجِهَادُ وَکُلُّ مَا لَا تَمْلِیكَ فِیهِ ۔

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ کی رقم سے مسجد کی تعمیر جائز نہیں اور اسی طرح پلوں کی تعمیر، کنوؤں کی کھدائی، راستوں کی درستگی، نہروں کی کھدائی اور حج اور جہاد کے لئے (زکوٰۃ کی رقم کا براہِ راست استعمال) جائز نہیں ہے، (اسی طرح) ہر اُس کام کے لئے جس میں تملیک نہیں پائی جاتی (زکوٰۃ کی رقم کا استعمال) جائز نہیں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 188، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔ سوال میں مذکور اداروں کی تعمیری مصارف میں بھی زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی کہ وہاں بھی تملیک موجود نہیں ہے۔

زکوٰۃ فنڈ سے پگڑی پر مکان لینے کے لئے مدد کرنا

سوال: ہماری جماعت کا ایک فلاحی ادارہ ہے، جس کے تحت ہمارے غریب اور مستحق اراکین کی فلاح و بہبود کا کام کرتا ہے۔ اس ضمن میں ہمارے مُخیر حضرات غریب اور مستحق اراکین کی رہائش کے لئے زکوٰۃ کی مد میں عطیہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں چونکہ رہائشی فلیٹ تقریباً پگڑی پر ملتے ہیں، غریب مستحق افراد خود ہی ایسے مکان ڈھونڈ لیتے ہیں اور جماعت میں درخواست دے دیتے ہیں۔ ہمارے مُخیر حضرات یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ ایسے غریب اور ضرورت مند اراکین کے لئے ہماری جماعت کو زکوٰۃ فنڈ دے کر پگڑی کا مکان

رہائش کے لئے دلوانے میں مدد کر سکتے ہیں اور اس طرح ان کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟۔

جواب: فقہاءِ کرام کا پگڑی سسٹم کے تحت دکان یا مکان کی بیع کرنے میں اختلاف ہے بعض فقہاء جیسے مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس بیع کو حرام لکھا ہے۔ اور اس سسٹم کے تحت جائیداد لینے یا دینے سے کرایہ دار مالک نہیں بنتا بلکہ اصل مالک کی ملکیت برقرار رہتی ہے (ترکہ ان چیزوں میں تقسیم ہوتا ہے جو مرنے والے کی ملکیت میں ہوں)، پگڑی میں لیا ہوا مکان یا دکان ملکیت میں نہیں ہوتا، کرایہ پر ہوتا ہے۔ جبکہ فقیہ اعظم مفتی نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے پگڑی کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ فی زمانہ حقوق کی بیع کا رواج عام ہے، کمالا یخفی علی من یعرف عرف زمانہ اور پگڑی سسٹم میں بھی قبضے کا حق فروخت کیا جاتا ہے اور ملکیت اصل مالک کی رہتی ہے، جس کا قبضے کا حق خریدنے والا کرایہ ادا کرتا ہے، اس لئے عرفِ عام کی وجہ سے اس کے جواز کا قول ہی مناسب ہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک (مالک بنانا) شرط ہے یعنی جسے زکوٰۃ دی جارہی ہے، اُسے اُس مال پر تصرُّف کا مکمل اختیار حاصل ہونا چاہئے، لہٰذا مستحقِ زکوٰۃ شخص کو پگڑی سسٹم میں مکان یا فلیٹ لینے کے لئے امداد دینا جائز ہے۔

پینشن بینیفٹ اکاؤنٹ کی رقم پر زکوٰۃ

سوال: میں ایک 84 سالہ پنشنر ہوں۔ ریٹائرمنٹ پر مجھے جو رقم ملی تھی، اسے میں نے پینشن بینیفٹ اکاؤنٹ میں جمع کر دیا تھا جس پر مجھے ماہانہ کچھ رقم ملتی ہے، پینشن اور اس رقم سے میری گزر اوقات ہوتی ہے۔ کیا پی بی اے اکاؤنٹ میں جمع شدہ اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے؟۔

جواب: اگر اس رقم کی اصل مالیت 612.36 گرام سونے یا ساڑھے باون تولے چاندی کی موجودہ بازاری قیمت کے برابر ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے، تو سال کے اختتام پر ڈھائی فیصد کی شرح سے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ لیکن آپ پر لازم ہے کہ سودی کھاتے سے اپنی رقم نکلوا لیں تاکہ سود لینے کے گناہ سے بچ سکیں اور کسی اسلامی بینک مضاربہ اکاؤنٹ میں اپنی رقم جمع کروا دیں، اُس سے ملنے والا نفع آپ کے لئے جائز ہوگا۔

☆☆☆☆☆

صدقۂ فطر

احادیثِ مبارکہ:

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ زَكٰوةَ الْفِطْرِ، صَاعًا مِنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ، عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ، وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثٰى وَالصَّغِيْرِ وَالْكَبِيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلَاةِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عید الفطر کی زکوٰۃ (صدقۂ فطر) ایک صاع (تقریباً چار کلوگرام) کھجوریں یا ایک صاع (تقریباً چار کلوگرام) جَو (مسلمانوں میں سے) ہر غلام و آزاد، ہر مرد و عورت اور ہر چھوٹے، بڑے پر فرض کی ہے (اور آپ نے یہ حکم دیا کہ) لوگوں کے نمازِ عید کے لئے جانے سے پہلے اس کو ادا کر دیا جائے''۔

(صحیح بخاری: 1503، سُنن ابوداؤد: 1607، سُنن ترمذی: 676)

(۲) عَنْ عِيَاضِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَعْدِ بْنِ سَرْحٍ الْعَامِرِيِّ: أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيَّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُوْلُ: كُنَّا نُخْرِجُ زَكَاةَ الْفِطْرِ، صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِيْرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ أَقِطٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ زَبِيْبٍ۔

ترجمہ: ''عیاض بن عبداللہ بن سعد بن سرح العامری نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ہم صدقۂ فطر چار کلوگرام گندم دیتے تھے یا چار کلوگرام جو یا چار کلوگرام پنیر یا چار کلوگرام کشمش دیتے تھے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1506)''۔

(۳) عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ: أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِزَكَاةِ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِيْرٍ۔ قَالَ: عَبْدُ اللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَجَعَلَ النَّاسُ عِدْلَهُ مُدَّيْنِ مِنْ حِنْطَةٍ۔

ترجمہ: ''نافع حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر چار کلوگرام کھجوریں یا اسی مقدار میں جو دینے کا حکم دیا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: پس لوگ (تقریباً) دو کلوگرام گندم کو اس کے برابر قرار دینے لگے''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1507)

شریعتِ مُطہرہ میں چار اجناس میں صدقۂ فطر کا نصاب مقرر فرمایا ہے، اِس کے علاوہ جتنی اشیاء ہوں، چاول، دھان یا کپڑا وغیرہ، وہ اِنہی میں کسی ایک کی قیمت کے اعتبار سے مُقرر کیا جائے گا۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وَاِنَّمَا تَجِبُ صَدَقَةُ الْفِطْرِ مِنْ اَرْبَعَةِ اَشْيَاءَ مِنَ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَالتَّمْرِ وَالزَّبِيْبِ كَذَافِيْ خِزَانَةِ الْمُفْتِيْنَ وَشَرْحِ الطَّحَاوِيْ۔

ترجمہ: ''صدقۂ فطر چار اشیاء میں واجب ہے، جن میں گندم، جَو، کھجور اور کشمش ہیں، جیسا کہ ''خزانۃ المفتین'' اور ''شرح الطحاوی'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 191)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''جس طرح قربانی کے جانوروں میں تنوّع ہے اور ان کی کئی اقسام ہیں، اِسی طرح صدقۂ فطر میں بھی تنوّع ہے اور اِس کی کئی اقسام ہیں اور جو لوگ جس حیثیت کے مالک ہیں، وہ اُسی حیثیت سے صدقۂ فطر ادا کریں، مثلاً جو کروڑ پتی لوگ ہیں، وہ چار کلو پنیر (Cheese) کے حساب سے صدقۂ فطر ادا کریں، جو لوگ لکھ پتی ہیں، وہ چار کلو کشمش کے حساب سے صدقۂ فطر ادا کریں اور جو ہزاروں روپوں کی آمدنی والے ہیں، وہ چار کلو گرام کھجور کے حساب سے صدقۂ فطر ادا کریں اور جو سینکڑوں کی آمدنی والے ہیں، وہ دو کلو گندم کے حساب سے صدقۂ فطر ادا کریں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کروڑ پتی ہوں یا سینکڑوں کی آمدنی والے ہوں، سب دو کلو گندم کے حساب سے صدقۂ فطر ادا کرتے ہیں اور ''تنوّع'' پر عمل نہیں کرتے، جبکہ قربانی کے جانوروں میں لوگ ''تنوّع'' پر عمل کرتے ہیں اور کروڑ پتی لوگ کئی کئی لاکھ کے بیل خرید کر اور مُتعدد قیمتی اور مہنگے دنبے اور بکرے خرید کر ان کی قربانی کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ ہم اپنا جائزہ لیں، کہیں اس کی یہ وجہ تو نہیں ہے کہ قربانی کے مہنگے اور قیمتی جانور خرید کر انہیں اپنی شان و شوکت اور امارت دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ ہم بڑے فخر سے وہ قیمتی جانور اپنے عزیزوں کو دکھاتے ہیں اور نمود و نمائش کرتے ہیں اور صدقۂ فطر کسی غریب آدمی کے ہاتھ پر رکھ دیا جاتا ہے، اِس میں دکھانے اور سنانے اور اپنی امارت جتانے کے مواقع نہیں ہیں، اِس لئے کروڑ پتی سے لے کر عام آدمی تک سب دو کلو گندم کے حساب سے صدقۂ فطر ادا کرتے ہیں۔ سوچئے! ہم کیا کر رہے ہیں؟، کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن یہ ساری قربانیاں ریا کاری قرار دے کر ہمارے منہ پر ماردی جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے جانوروں کی مُتعدد قسمیں اس لئے کی ہیں کہ ہر طبقہ کے لوگ اپنی حیثیت کے لحاظ سے قربانی کا تعین کریں۔ اسی طرح آپ نے صدقۂ فطر کی متعدد اقسام بھی اس لئے کی ہیں کہ

ہر طبقہ کے لوگ اپنی حیثیت کے لحاظ سے صدقۂ فطر ادا کریں، سو جس طرح ہم اپنی حیثیت کے لحاظ سے قربانی کے جانوروں کا تعین کرتے ہیں، اس طرح ہمیں اپنی حیثیت کے لحاظ سے صدقۂ فطر کی قسم کا تعین بھی کرنا چاہئے اور تمام طبقات کے لوگوں کو صرف دو کلو گندم کے حساب سے صدقۂ فطر پر نہیں ٹرخانا چاہئے''۔
(نعمۃ الباری شرح صحیح البخاری، جلد 3، ص: 764)

صدقۂ فطر کی مقدار:

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:
وَهِيَ نِصْفُ صَاعٍ مِنْ بُرٍّ أَوْ صَاعٌ مِنْ شَعِيرٍ أَوْ تَمْرٍ وَدَقِيقُ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيرِ وَسَوِيقُهُمَا مِثْلُهُمَا وَالْخُبْزُ لَا يَجُوزُ إِلَّا بِاعْتِبَارِ الْقِيمَةِ وَهُوَ الْأَصَحُّ۔
ترجمہ: ''وہ (صدقۂ فطر کی مقدار) گیہوں میں نصف صاع ہے اور جو اور کھجور میں ایک صاع ہے اور گندم اور جو کا آٹا اور ان دونوں چیزوں کا ستّو انہی (یعنی گندم اور جو) کی مثل ہے اور روٹی میں قیمت کا ہی اعتبار ہوگا اور یہی صحیح ترین ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 191)

(۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ زَكٰوةَ الْفِطْرِ طُهْرَةً لِلصِّيَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ، وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِيْنَ، مَنْ أَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلَاةِ فَهِيَ زَكَاةٌ مَقْبُوْلَةٌ، وَمَنْ أَدَّاهَا بَعْدَ الصَّلَاةِ فَهِيَ صَدَقَةٌ مِنَ الصَّدَقَاتِ۔
ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے روزہ دار کی لغو باتوں اور بے حیائی کے کاموں سے پاکیزگی اور مساکین کو کھانا کھلانے کے لئے زکوٰۃ فطر کو فرض فرمایا اور جس نے اس کو عید کی نماز سے پہلے ادا کر دیا تو یہ زکوٰۃ مقبولہ ہے اور جس نے اس کو نماز کے بعد ادا کیا تو یہ صدقات میں سے ایک صدقہ ہے''۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 1605)

(۵) عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ كَانَ يَأْمُرُ بِإِخْرَاجِ الزَّكَاةِ قَبْلَ الْغُدُوِّ لِلصَّلَاةِ يَوْمَ الْفِطْرِ۔
ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دن نمازِ عید کے

لئے نکلنے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرنیکا حکم فرمایا کرتے تھے"۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:677)

امام ابوعیسیٰ ترمذی کہتے ہیں: اہلِ علم نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ نمازِ عید کے لئے نکلنے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کیا جائے۔

(۲) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ ،عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ مُنَادِياً فِي فِجَاجِ مَكَّةَ أَلَا إِنَّ صَدَقَةَ الْفِطْرِ وَاجِبَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ،ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى ،حُرٍّأَوْ عَبْدٍ،صَغِيرٍأَوْ كَبِيرٍ: مُدَّانِ مِنْ قَمْحٍ،أَوْ سِوَاهُ صَاعٌ مِنْ طَعَامٍ۔

ترجمہ:"عمرو بن شعیب اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا کہ مکہ کے گلی کوچوں میں اعلان کردے کہ صدقۂ فطر ہر مسلمان مرد، عورت، آزاد، غلام، چھوٹے اور بڑے پر دو مُدّ (دوکلو) گندم یا ایک صاع (چارکلو) کھانا ہے"۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:674)

حدیث میں صدقۂ فطر کے لئے فرض کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی فرضیت باوجود حدیث وسنّت سے ثابت ہے، اسے فرض عملی بھی کہتے ہیں۔ حدیث پاک کی رو سے ہر صاحبِ نصاب مسلمان مرد، عورت پر صدقۂ فطر واجب ہے۔ اس کی حکمت حدیثِ پاک میں یہ بیان کی گئی ہے کہ عبادتِ صوم میں جو ہم سے کوتاہیاں (مثلاً بے مقصد اور بے ہودہ باتیں کرنا وغیرہ) رہ جاتی ہیں، اس سے ان کی تلافی ہوجاتی ہے اور روزے کی عبادت کو پاکیزگی عطا ہوتی ہے اور مساکین کی کفالت بھی ہوجاتی ہے۔ صدقۂ فطر عید الفطر کی نماز سے پہلے ادا کردینا چاہئے۔ ابتداءِ رمضان اور رمضان المبارک کے دوران بھی ادا کرسکتے ہیں۔ ہر صاحبِ نصاب پر اس کی زیرِ کفالت نابالغ ومجنون افراد کا صدقۂ فطر ادا کرنا بھی واجب ہے، اس کی مقدار ایک صاع (یعنی تقریباً چارکلو) کھجور یا جو یا پنیر یا کشمش یا نصف صاع (دوکلو) گندم یا ان کی موجودہ بازاری قیمت ہے۔ ایک حدیثِ مبارک میں ایک صاع (تقریباً چارکلو) گندم کی بھی روایت ہے۔ فطرے کی مالیت کے تعین کے لئے خالص چیز کی قیمت دینی چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ ۔

ترجمہ:''اور (اللہ کی راہ میں) ایسی گھٹیا چیز دینے کا ارادہ نہ کرو، جس کو تم خود (کبھی) قبول نہ کرو، سوائے اس کے کہ تم چشم پوشی سے کام لو، (البقرۃ:267)۔

(۲) لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۔

ترجمہ:''تم ہرگز نیکی (کے کامل درجے) کو نہ پاسکو گے تاوقتیکہ تم (اللہ کی راہ میں) وہ مال خرچ کرو جو تمہیں محبوب ہو''
(آل عمران:92)

صدقۂ فطر کس پر واجب ہے:

علامہ برہان الدین ابوبکر المرغینانی حنفی لکھتے ہیں: قَالَ: صَدَقَةُ الْفِطْرِ وَاجِبَةٌ عَلَى الْحُرِّ الْمُسْلِمِ إِذَا كَانَ مَالِكًا لِمِقْدَارِ النِّصَابِ، فَاضِلاً عَنْ مَسْكَنِهِ وَثِيَابِهِ وَأَثَاثِهِ، وَفَرَسِهِ، وَسِلَاحِهِ، وَعَبِيْدِهِ۔

ترجمہ:''(صاحبِ قدوری نے) فرمایا: صدقۂ فطر ہر آزاد مسلمان پر واجب ہے جبکہ وہ مقدارِ نصاب کا مالک ہو، جو رہائشی مکان، کپڑے، گھریلو سامان، گھوڑے (سواری)، ہتھیار اور خدمت کرنے والے غلاموں سے فاضل ہو''۔۔۔آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: وَلَا يُشْتَرَطُ فِيْهِ النُّمُوُّ، وَيَتَعَلَّقُ بِهٰذَا النِّصَابِ حِرْمَانُ الصَّدَقَةِ وَوُجُوْبُ الْأُضْحِيَةِ وَالْفِطْرِ۔

ترجمہ:''اِس نصاب میں نُمو (بڑھنا) شرط نہیں ہے (جو کہ زکوٰۃ کے واجب ہونے میں شرط قرار دیا گیا ہے) اور اِس نصاب کے سبب صدقہ لینے سے محروم ہونے اور قربانی کے واجب ہونے اور صدقۂ فطر کے واجب ہونے کے احکام متعلق ہوتے ہیں''۔ (ہدایہ، جلد2، ص:81-80)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''صدقۂ فطر شخص پر واجب ہے، مال پر نہیں، لہٰذا اگر ادا کئے بغیر مر گیا، تو اُس کے مال میں سے ادا نہیں کیا جائے گا۔ ہاں! اگر ورثاء احسان کے طور پر اپنی طرف سے ادا کریں، تو ہو سکتا ہے، مگر ان پر کوئی جبر نہیں ہے۔ اور اگر وفات پانے والا شخص وصیت کر کے گیا ہے، تو اس کے تہائی ترکے سے ضرور ادا کیا جائے گا، اگر چہ وُرثاء اجازت نہ دیں، (بہارِ شریعت بحوالہ الجوھرۃ النیرۃ)''۔

اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے:

صاحبِ نصاب شخص پر اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے۔

علامہ برہان الدین ابوبکر المرغینانی حنفی لکھتے ہیں: قَالَ: يُخْرِجُ ذَالِكَ عَنْ نَفْسِهِ، لِحَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: "فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ عَلَى الذَّكَرِ وَالْأُنْثٰى"۔ وَيُخْرِجُ عَنْ أَوْلَادِهِ الصِّغَارِ،

ترجمہ: "(صاحبِ قدوری نے) فرمایا: صدقۂ فطر اپنی طرف سے ادا کرے کیونکہ" ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مرد و عورت پر زکوٰۃ فطر فرض کی ہے"۔ اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی صدقۂ فطر ادا کرے، (ہدایہ، جلد 2، ص: 81)"۔

مرد پر بیوی اور بالغ اولاد کا صدقۂ فطر ادا کرنا واجب نہیں ہے:

علامہ برہان الدین ابوبکر المرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

وَلَا يُؤَدِّيْ عَنْ زَوْجَتِهِ، لِقُصُوْرِ الْوِلَايَةِ وَالْمُؤْنَةِ فَإِنَّهُ لَا يَلِيْهَا فِيْ غَيْرِ حُقُوْقِ النِّكَاحِ وَلَا يَمُوْنُهَا فِيْ غَيْرِ الرَّوَاتِبِ كَالْمُدَاوَاةِ، وَلَا عَنْ أَوْلَادِهِ الْكِبَارِ، وَإِنْ كَانُوْا فِيْ عِيَالِهِ، لِانْعِدَامِ الْوِلَايَةِ وَلَوْ أَدّٰى عَنْهُمْ أَوْعَنْ زَوْجَتِهِ بِغَيْرِ أَمْرِهِمْ أَجْزَاهُمْ اِسْتِحْسَاناً لِثُبُوْتِ الْإِذْنِ عَادَةً۔

ترجمہ: "اور مالکِ نصاب پر اپنی بیوی کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنا واجب نہیں، کیونکہ ولایت اور مؤنت (خرچ برداشت کرنا) دونوں ناقص ہیں، اِس لئے کہ شوہر حقوقِ نکاح کے علاوہ میں اُس پر ولایت نہیں رکھتا اور شوہر ثابت شدہ امور کے علاوہ میں خرچ برداشت نہیں کرتا، جیسے علاج معالجہ کرانا۔ اور بالغ اولاد کی طرف سے بھی صدقۂ فطر ادا کرنا واجب نہیں، اگر چہ اُس کے عیال ہوں کیونکہ ولایت نہیں پائی جاتی اور اگر اُن کی طرف سے یا اپنی بیوی کی طرف سے اُن کی اجازت کے بغیر ادا کر دیا تو استحسانا اُن کی طرف سے ادا ہو گیا کیونکہ اجازت عادۃً ثابت ہے، (ہدایہ، جلد 2، ص: 82)"۔

فدیۂ صوم کی شرح بھی فطرے کے برابر ہے اور اس کی اصل روح ایک نادار کے لئے ایک دن کے دونوں اوقات کے طعام کا انتظام کرنا ہے۔ فطرے اور فدیے کی اصل روح ایک مسکین کا ایک دن (دو وقت) کا طعام ہے، جو ہوٹل سے 100 روپے یومیہ سے کم میں ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا جن خوش نصیبوں کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی نعمت سے نوازا ہے، وہ اپنے معیارِ زندگی کے مطابق فطرہ، فدیہ اور کفارہ ادا کریں تاکہ مساکین و مستحقین کی اشک شوئی ہو سکے، کیونکہ ہم ہوش رُبا گرانی کے دور سے گزر رہے ہیں اور ہر چیز کے نرخ نادار لوگوں کی قوت

خرید سے باہر ہیں۔

اہلِ ثروت کو چاہئے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق جَو، کھجور، کشمش یا پنیر کی شرح سے فطرہ اور فدیہ ادا کریں۔ ایک قسم توڑنے کا کفارہ اگر نقد رقم کی صورت میں ادا کرنا ہو تو دس فطروں کے برابر ہے اور ایک روزے کا کفارہ اس شخص کے لئے جس میں دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو ساٹھ فطروں کے برابر ہے اور قضا بھی لازم ہے۔

صدقۂ فطر کس پر واجب ہے

سوال: زکوٰۃ کی طرح صدقۂ فطر بھی صاحبِ نصاب پر واجب ہے، یا ہر مسلمان پر واجب ہے؟۔ موجودہ مہنگائی کے دور میں مشاہدہ ہے کہ بعض سفید پوش گھرانے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو صدقۂ فطر ادا کرنے کے لئے رقم نہیں رکھتے، تو کیا ایسے لوگوں پر بھی صدقۂ فطر واجب ہوگا؟، اگر واجب ہے تو کیا بعد میں رقم آنے پر اُن پر اُس کی قضا لازم ہوگی؟۔

جواب: صدقۂ فطر کا نصاب بھی وہی ہے، جو زکوٰۃ کا ہے یعنی جس شخص کے پاس 87.48 گرام سونا یا 612.36 گرام چاندی یا اُس کے مساوی رقم جو اس کی حاجتِ اصلیہ کے علاوہ ہو، اُس پر صدقۂ فطر واجب ہے۔ صدقۂ فطر کے وجوب کے لئے نصاب پر سال گزرنا یا سال بھر صاحبِ نصاب رہنا شرط نہیں کیونکہ صدقۂ فطر شخص پر واجب ہوتا ہے مال پر نہیں۔ ہر صاحبِ نصاب پر اس کی زیرِ کفالت افراد کا صدقۂ فطر ادا کرنا بھی واجب ہے، اس سے وہ افراد مراد ہیں جو اپنی کفالت میں اس کے محتاج ہیں جیسے نابالغ اولاد یا مجنون اولاد۔ صدقۂ فطر نمازِ عید سے قبل ادا کرنا افضل ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس عید الفطر کے دن یعنی یکم شوال المکرم کو طلوعِ فجر کے وقت وقتی ضرورت سے زائد کم از کم زکوٰۃ کے نصاب کے برابر رقم نہیں ہے، تو اُس پر صدقۂ فطر واجب نہیں ہوگا اور نہ ہی اُس پر بعد میں اُس کی قضا واجب ہوگی۔ ہاں! اگر عید الفطر یعنی یکم شوال المکرم کو صاحبِ نصاب ہوتے ہوئے فطرہ ادا نہ کیا ہو تو جب تک اُسے ادا نہ کیا جائے، ساقط نہیں ہوتا۔

صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جا سکتا ہے

سوال: صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔

جواب: صدقۂ فطر ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر واجب ہے، لیکن صدقۂ فطر کے وجوب کے لئے نصاب پر

سال گزرنا یا سال بھر صاحبِ نصاب رہنا شرط نہیں ہے۔ نصابِ شرعی کی مقدار 612.36 گرام چاندی یا اُس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم ہے جو اس کی بنیادی ضرورت سے زائد ہو۔

سونے کا نصاب اس وقت معتبر ہے جب کسی کے پاس صرف سونا ہو، اگر کچھ سونا ہے مثلاً ایک یا دو تولے اور کچھ چاندی یا کچھ رقم ہے تو پھر پوری مالیت نکالی جائے گی اور چاندی (یعنی 612.36 گرام چاندی کی موجودہ قیمت) کا نصاب معتبر ہوگا۔ اگر عید الفطر کے دن یعنی یکم شوال المکرّم کو وقتی ضرورت سے زائد کم از کم نصابِ زکوٰۃ کے برابر رقم نہیں ہے تو ایسے شخص پر فطرہ واجب نہیں ہے اور اس کی ادائیگی کے لئے قرض لینے کی حاجت نہیں ہے۔ ایسا شخص جو صاحبِ نصاب نہیں، اُس پر فطرہ ادا کرنا واجب نہیں۔ البتہ وہ صدقۂ فطر لینے کا استحقاق رکھتا ہے، اگر سب ہی فطرہ دینے والے ہوں تو لینے والا کون ہوگا؟۔ مفلس شخص اگر چہ مُکلّف نہیں رہے لیکن اگر قرض لے کر فطرہ ادا کیا ہو تو فطرہ ادا ہو جائے گا۔ مالدار شخص اگر کسی سبب سے اُس وقت فطرہ کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو چونکہ اُس پر فطرہ واجب ہے، لہٰذا اُس پر لازم ہے کہ قرض لے کر فطرہ ادا کرے۔

نمازِ عید کا طریقہ:

نمازِ عید عام نمازوں کی طرح ہے، صرف اس میں چھ زائد تکبیریں ہیں، تین زائد تکبیریں پہلی رکعت میں ثنا کے بعد اور قراءت شروع کرنے سے پہلے امام کے ساتھ کہی جائیں گی، پہلی دو تکبیروں کے بعد ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دیئے جائیں اور تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لئے جائیں اور تین زائد تکبیریں دوسری رکعت میں قراءت کے اختتام پر اور رکوع میں جانے سے پہلے امام کے ساتھ کہی جائیں اور تینوں تکبیروں کے بعد ہاتھ اٹھا کر چھوڑ دیئے جائیں، پھر امام کے ساتھ رکوع کی تکبیر کہہ کر بغیر ہاتھ اُٹھائے رکوع میں چلے جائیں، نماز کے بعد دو خطبے پڑھنا اور سننا سنّت ہے۔ نمازِ عیدین کے لئے جاتے ہوئے اور واپس گھر لوٹتے ہوئے یہ تکبیرات کہنا سنّت ہے:

"اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ"

مستحب یہ ہے کہ عید گاہ کی طرف ایک راستے سے جائیں اور دوسرے راستے سے واپس آئیں۔

نوٹ: عید کی زائد تکبیراتِ میں سے بھولے سے کوئی تکبیر امام سے رہ جائے جو مجمع کثیر کی رعایت اور عُسر کی بنا پر سجدۂ سہو ترک کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

اہلِ خیر سے اپیل

دارالعلوم نعیمیہ اہلسنت و جماعت کی مرکزی دینی جامعہ ہے۔ اس کی خدمات کا دائرہ پاکستان اور بیرونِ ملک پھیلا ہوا ہے۔ دارالعلوم نعیمیہ میں الشہادۃ العالمیہ فی العلوم العربیہ والاسلامیہ (مساوی ایم۔اے عربی واسلامیات) کے درجے تک مستحق طلباء کو مفت تعلیم دی جاتی ہے اور ادارہ ان کے جملہ مصارف (تعلیم وتربیت، کتب، لباس، علاج، طعام اور باوقار رہائش) کی کفالت کرتا ہے۔ ہمارے ادارے میں کمپیوٹر کی تعلیم اور میٹرک تک عصری تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ ادارہ پانچ سو طلبہ کا کفیل ہے۔ دارالعلوم نعیمیہ میں ''تخصص فی الفقہ والافتاء'' کا شعبہ بھی قائم ہے، جہاں جید اور لائق فارغ التحصیل علماء کرام کو ''افتاء'' کا باقاعدہ نصاب بھی پڑھایا جاتا ہے اور افتاء کی تربیت بھی دی جاتی ہے اور ان زیرِ تربیت مفتیانِ کرام کو قیام وطعام کے تمام مصارف کے علاوہ دو ہزار روپے ماہانہ نقد وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔

ہمارے مصارفِ جاریہ تقریباً دس لاکھ روپے ماہانہ ہیں اور تعمیر اور عمارت کی مرمت ونگہداشت کے مصارف اس کے علاوہ ہیں۔ حالیہ سالوں میں دینی اداروں کے یوٹیلیٹی بلز (بجلی، گیس وغیرہ) کے مصارف بھی بہت بڑھ چکے ہیں اور مستقبلِ قریب میں ان میں بہت اضافے کا امکان ہے۔ دارالعلوم نعیمیہ کا شعبۂ تصنیف وتالیف برصغیر پاک وہند میں الحمدللہ سب سے ممتاز ہے اور تفسیر، شرحِ حدیث، افتاء اور دیگر شعبوں میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ دارالعلوم نعیمیہ کے شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم العالی کی تفسیر تبیان القرآن بارہ ضخیم مجلّدات، شرح صحیح مسلم ضخیم مجلّدات اور نعمت الباری (شرح صحیح بخاری) کی 8 ضخیم مجلّدات طبع ہو چکی ہیں، نویں اور دسویں جلد زیرِ طبع ہیں اور بقیہ مجلّدات پر کام جاری ہے۔ اور انشاء اللہ العزیز بارہ تا پندرہ ضخیم مجلّدات میں اس کی تکمیل ہوگی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ جل شانہٗ انہیں مختلف اَمراض وعوارض سے صحت کاملہ عطا فرمائے۔ پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن کے جاری کردہ فتاویٰ کی چھ مجلّدات طبع ہو چکی ہیں اور ساتویں اور آٹھویں مجلّدات زیرِ طبع ہیں۔ تفسیر سورۃ النساء بھی طبع ہو چکی ہے۔ پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن صاحب کی سرپرستی میں ''گلوبل شریعہ فاؤنڈیشن'' قائم ہو چکی ہے اور ان شاء اللہ العزیز عالمی سطح پر اس کا نیٹ ورک قائم کیا جائے گا اور ''المنیب شریعہ اکیڈمی'' کے تحت اسلامک بینکنگ اور اسلامک تکافل کے کورسز کا کامیاب آغاز ہو چکا ہے۔ میڈیا کی سطح پر بھی ہمارے ادارے کی وقیع خدمات ہیں، قوانین حدود اور ناموسِ رسالت کے مسئلے پر

مفتی منیب الرحمٰن نے تقریباً تمام ٹیلیویژن چینلز پر مخالفین سے علمی مناظرے اور مباحثے کئے اور اخبارات میں مُدلّل ومُفصّل مضامین شائع کئے۔ الحمد للہ جرأت واستقامت کے ساتھ ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دینِ اسلام کی ترجمانی کا فریضہ ادا کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، ان شاء اللہ العزیز۔

اہلِ خیر سے اپیل ہے کہ ان تمام دینی کاموں کو جاری وساری رکھنے کے لئے زکوٰۃ، صدقات، فطرہ، فدیہ، کفارات ونذر کی رقوم اور عطیات کے ذریعے دارالعلوم نعیمیہ کی مدد فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ دارالعلوم نعیمیہ کے مستحق طلبہ کی عمارت کے بعض تعمیری مراحل ابھی باقی ہیں ایک نئے ونگ کی تعمیر کا منصوبہ ہے جس کا تخمینہ تقریباً دو کروڑ روپے ہے، اس شعبے میں خصوصی تعاون کی درخواست ہے۔ دارالعلوم نعیمیہ میں ہر سال اجتماعی قربانی کا اہتمام ہوتا ہے اور الحمد للہ سارے انتظامات حصہ داروں کے اطمینان اور شریعت کے مطابق بروقت انجام پاتے ہیں۔

آن لائن عطیات کے لئے:

Darul Uloom Naeemia Trust CD A/C No. 08780005001103
HBL Dastagir Colony Branch,Karachi ,Pakistan.

آپ کے تعاون کا طلبگار
پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
مہتمم دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

E-Mail:muftinaeemia@yahoo.com / mufti@naeemia.com
ph:92-21-36314508,36324236 Fax:92-21-36376888

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

کی علمی، تحقیقی اور وقیع تصانیف

☆

تفہیم المسائل (6 مجلّدات مطبوعہ، جلد ہفتم زیرِ طبع)

☆

تفسیر سورۃ النساء

پبلیشر: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور / کراچی

☆

زکوٰۃ

معنی و مفہوم، فضائل و تفصیلی احکام

☆

اسلامیات

(برائے: انٹرمیڈیٹ، بی۔اے، بی۔ایس۔سی، بی۔کام)

دارالعلوم نعیمیہ کے شعبۂ تصنیف وتالیف کے علمی و تحقیقی شاہکار

تصانیف علامہ غلام رسول سعیدی

☆ تفسیر تبیان القرآن (14 مجلدات مع اشاریہ) ☆ شرح صحیح مسلم (9 مجلدات مع اشاریہ)

☆ نعمۃ الباری (8 مجلدات مطبوعہ، 2 مجلدات زیرِ طبع، 5 مجلدات زیرِ تصنیف)

☆ تذکرۃ المحدثین ☆ توضیح البیان ☆ مقام ولایت ونبوت ☆ توضیح البیان

تصانیف پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

☆ تفہیم المسائل (6 مجلدات مطبوعہ، جلد ہفتم زیرِ طبع) ☆ تفسیر سورۃ النساء

☆ زکوٰۃ: معنی ومفہوم، فضائل ومسائل ☆ اصول فقہ اسلام

☆ اسلامیات (برائے: انٹرمیڈیٹ) ☆ اسلامیات (برائے ڈگری کلاسز)